ہاشم ندیم کلیکشن

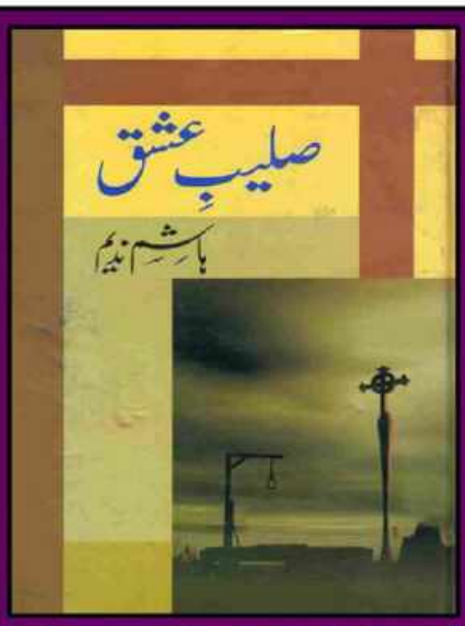

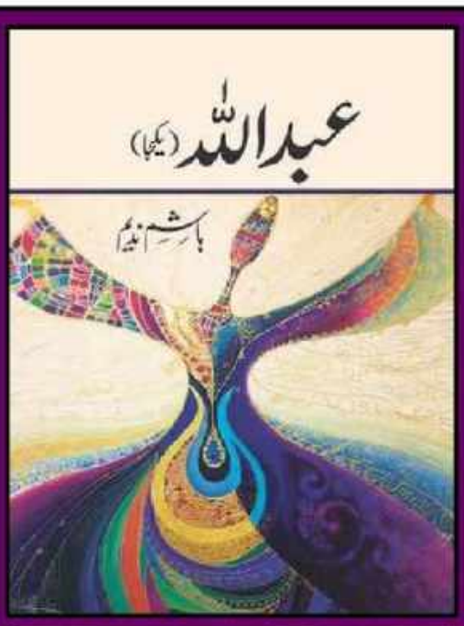

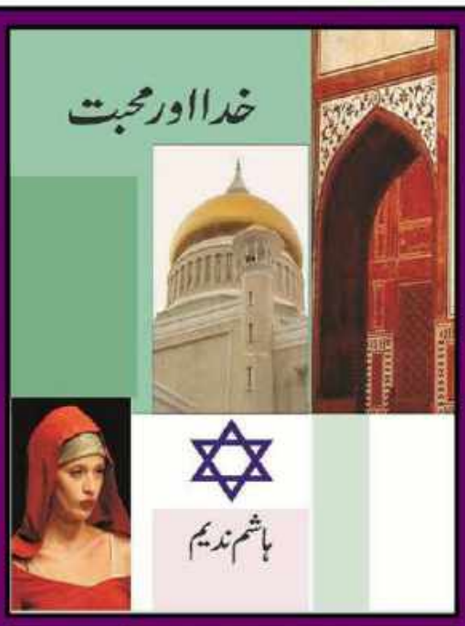

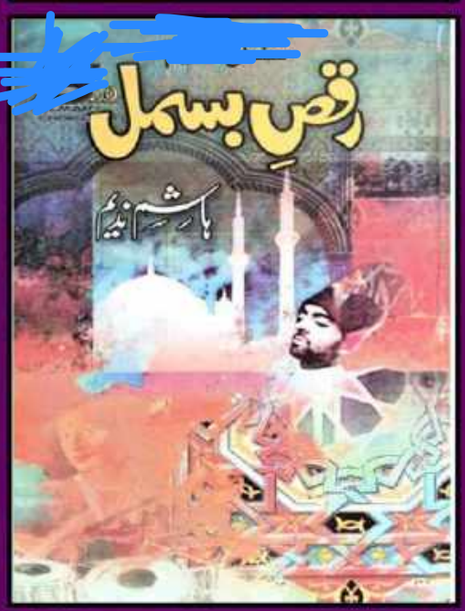

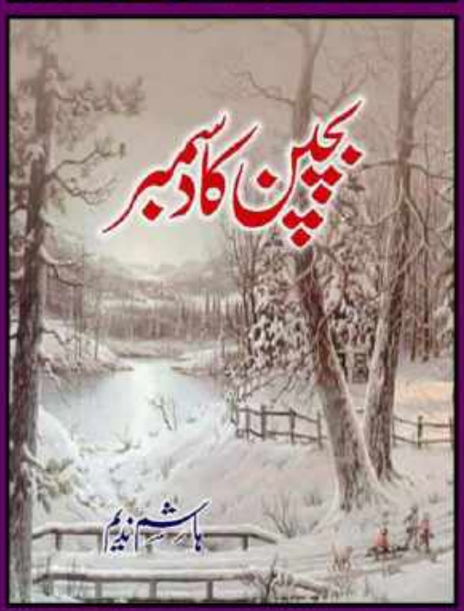



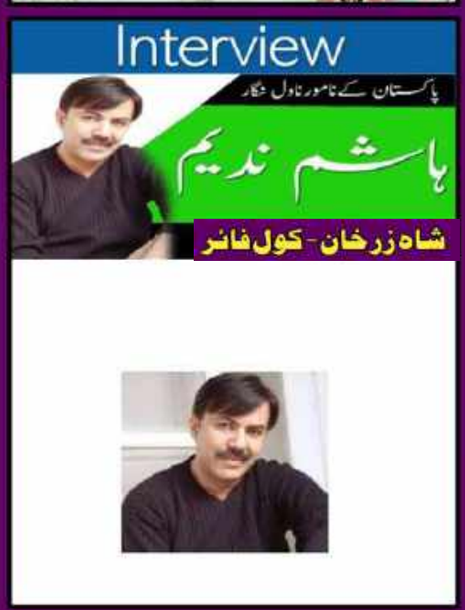

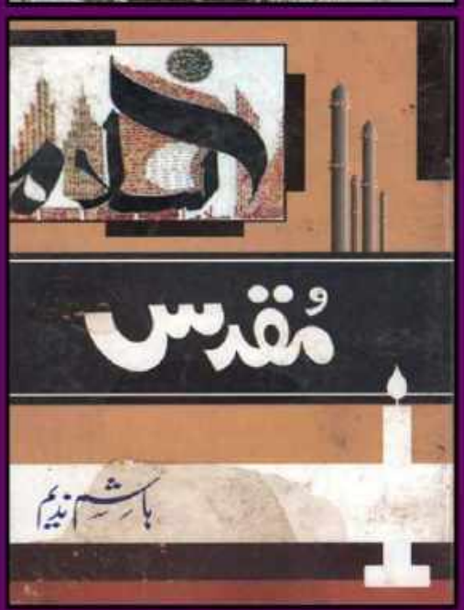

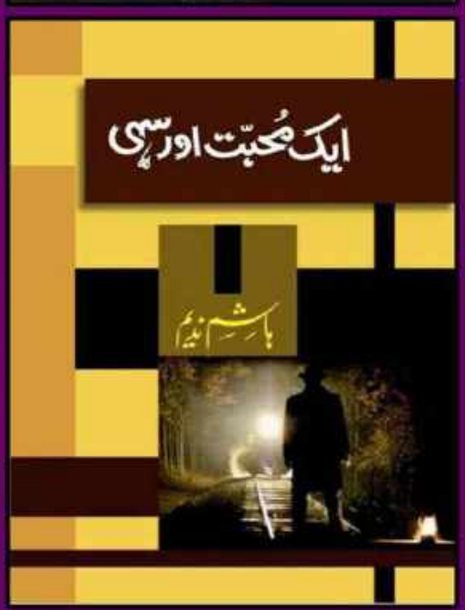

شاہ زر خان - کول فائر

ڈائمنڈ اردو بکس

DiamondUrduBooks.com

اردو ادب، علم اور ثقافت کا بہترین آن لائن ڈیجیٹل ذخیرہ

✦ ویب سائٹ کا جامع تعارف

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے قائم کردہ ایک ممتاز اور بین الاقوامی آن لائن ڈیجیٹل لائبریری ہے۔ ہمارا بنیادی مقصد دنیا بھر میں موجود اردو دان طبقے، بالخصوص قارئین، محققین، اور طلبہ کو اعلیٰ معیار کی کتب بالخصوص تاریخی، مذہبی، اصلاحی، جاسوسی اور ادبی شاہکار پی ڈی ایف (PDF) فارمیٹ میں بالکل مفت اور آسان رسائی کے ساتھ فراہم کرنا ہے۔

✦ ڈائمنڈ اردو بکس کی نمایاں خصوصیات

📚 وسیع ڈیجیٹل لائبریری

ہزاروں کی تعداد میں تاریخی، اسلامی، رومانی اور جاسوسی ناولز کا اعلیٰ ذخیرہ۔

⚡ ایچ ڈی (HD) کوالٹی

تمام کتب انتہائی صاف ستھرے اور ایچ ڈی پی ڈی ایف فارمیٹ میں دستیاب ہیں۔

📱 آسان اور تیز رسائی

موبائل اور کمپیوٹر پر بغیر کسی دشواری کے آن لائن مطالعہ اور ڈاؤن لوڈنگ۔

💎 مفت مطالعہ سروس

قارئین کے لیے تمام مواد مکمل طور پر مفت دستیاب ہے تاکہ علم ہر جگہ پہنچے۔

💡 ہمارا بنیادی عزم و مقصد

اردو زبان کی بقا اور کتاب سے دوستی کے کلچر کو عام کرنا ہمارا اولین مقصد ہے۔ ہم جدید ترین ڈیجیٹل ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے اردو ادب کو ہر جگہ پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

دستیاب کتب و تحاریر کی اقسام

DiamondUrduBooks.com

✦ دستیاب کتب کے اہم شعبہ جات

شعبہ / کیٹیگری	موضوعات	قارئین کی پسندیدگی
تاریخی ناولز	اسلامی تاریخ، فاتحین کے کارنامے اور عظیم سلطنتیں	★★★★★ (بہت اعلیٰ)
سلسلہ وار کتب	اسلم راہی ایم اے، عنایت اللہ التمش وغیرہ	★★★★★ (ممتاز)
شاعری و ادب	کلاسک اور جدید شعراء کے منتخب مجموعے	★★★★☆ (بہترین)
مذہبی و اصلاحی	تربیتی کتب، سیرت النبی ﷺ اور سوانح حیات	★★★★★ (مقبول)

مصنفین، شعراء اور اہل قلم کو دعوت!

کیا آپ ایک مصنف، ناول نگار، شاعر یا کالم نگار ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر یا کتاب دنیا بھر کے لاکھوں اردو قارئین تک پہنچے؟

ڈائمنڈ اردو بکس ڈاٹ کام (DiamondUrduBooks.com) تمام نئے اور تجربہ کار لکھاریوں کو یہ سنہری موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو ہماری معتبر ویب سائٹ اور پلیٹ فارم کے ذریعے قارئین تک پہنچائیں۔

ہم درج ذیل شعبہ جات میں تحاریر کا خیر مقدم کرتے ہیں:

اردو ناولز (تاریخی و معاشرتی) | شاعری و غزلیں | افسانے و کہانیاں | مذہبی و اصلاحی مضامین | تحقیقی مقالے

ہمارے پلیٹ فارم کے ساتھ جڑیں

DiamondUrduBooks.com

✦ مصنفین کے لیے خصوصی سہولیات

🌐 عالمی سطح پر رسائی
آپ کی تحریر پاکستان سمیت پوری دنیا کے اردو قارئین تک فوری پہنچے گی۔

🛡️ محفوظ پی ڈی ایف پیشکش
آپ کے نام، تعارف اور حقوق کے مکمل احترام کے ساتھ کتاب کی پیشکش۔

📈 مفت شائعات اور تشہیر
ویب سائٹ اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر آپ کی تحریر کی مفت تشہیر۔

🤝 مستقل تعاون
نئے اور ابھرتے ہوئے قلمکاروں کی مکمل حوصلہ افزائی اور رہنمائی۔

رابطہ کریں اور اپنی تحریر پہنچائیں

اپنی کتاب، مقالہ، شاعری یا تحریر بھیجنے کے لیے ہماری ایڈمن ٹیم سے واٹس ایپ پر براہ راست رابطہ کریں۔

👇 واٹس ایپ پر آٹو پیغام بھیجنے کے لیے نیچے کلک کریں 👇

واٹس ایپ نمبر: 03176699066

✓ بٹن پر کلک کرنے پر آٹو پیغام کے ساتھ واٹس ایپ چیٹ اوپن ہو جائے گی۔

💎 ڈائمنڈ اردو بکس 💎

آفیشل سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، واٹس ایپ گروپس ڈائریکٹری

🌐 مرکزی پورٹل و آفیشل چینل

آفیشل ویب سائٹ
آن لائن پی ڈی ایف کتب کا وسیع ذخیرہ

ویب سائٹ وزٹ کریں 🔗

آفیشل واٹس ایپ چینل
اہم ترین اپڈیٹس اور خبریں

چینل فالو کریں 📢

💬 آفیشل واٹس ایپ گروپس

ڈائمنڈ اردو بکس 1️⃣
مرکزی کتابی بحث و شیئرنگ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ اردو بکس 2️⃣
ثانوی کتابی اپڈیٹس گروپ

گروپ جوائن کریں 👥

ڈائمنڈ بکس کمیونٹی
مرکزی کمیونٹی حب

کمیونٹی جوائن کریں 🌐

اردو تحاریر کا گلدستہ
منتخب ادبی تحاریر

گروپ جوائن کریں ✍️

کاروان شعر و ادب
شاعری اور شاہکار ادب

گروپ جوائن کریں 📜

کتابوں پر تبصرے
ادبی ریویوز اور تبصرے

گروپ جوائن کریں 📚

ڈی یو بی میڈیا
جنرل پوسٹنگ گروپ

گروپ جوائن کریں 🎬

ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
مختلف مفید لنکس کا مجموعہ

گروپ جوائن کریں 🔗

حمد و نعت آفیشل

اسلامی حمد، نعت و کلام

گروپ جوائن کریں 🕌

بچوں کا کارواں

بچوں کا ادب اور کہانیاں

گروپ جوائن کریں 🎈

📱 دیگر سوشل میڈیا اکاؤنٹس

ٹیلی گرام چینل

ڈائریکٹ پی ڈی ایف ڈاؤن لوڈز

ٹیلی گرام چینل 🚀

ٹیلی گرام گروپ

ڈسکشن اور گفتگو گروپ

ٹیلی گرام گروپ 💬

فیس بک پیج

آفیشل فیس بک اپڈیٹس

فیس بک پیج 👍

فیس بک گروپ

کمیونٹی فیس بک گروپ

فیس بک گروپ 👨‍👩‍👧‍👦

انسٹاگرام

بصری اقتباسات اور پوسٹرز

انسٹاگرام فالو کریں 📸

ٹک ٹاک

مختصر ویڈیو اپڈیٹس

ٹک ٹاک فالو کریں 🎵

⚠️ کسی بھی لنک کے کام نہ کرنے یا ری سیٹ ہونے کی صورت میں فوری رابطہ کریں:

رابطہ منتظم: شاہ زر خان | +92 317 6699066

© 2026 ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس — تمام حقوق محفوظ ہیں۔

خدا اور محبت

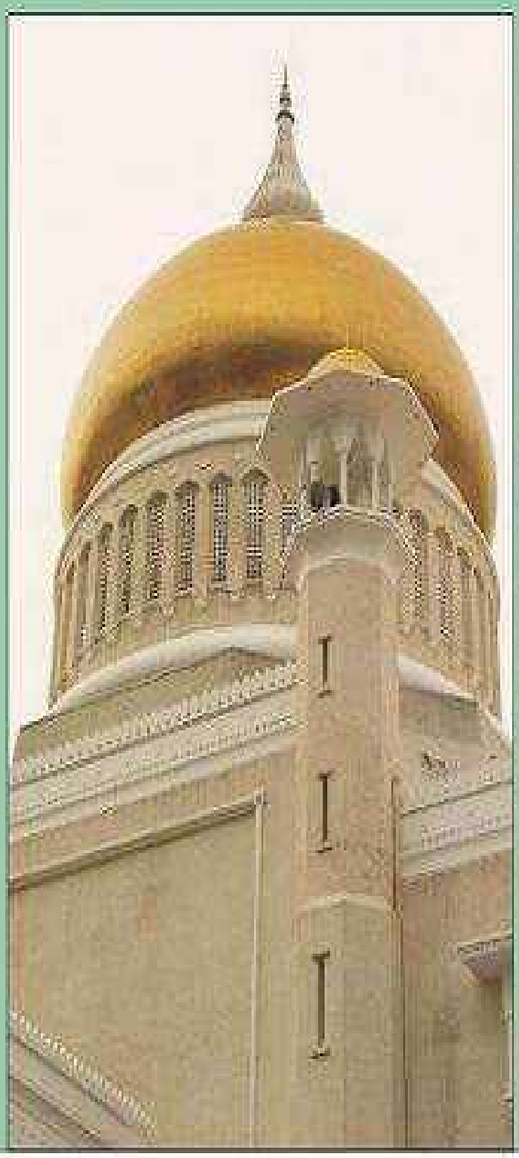



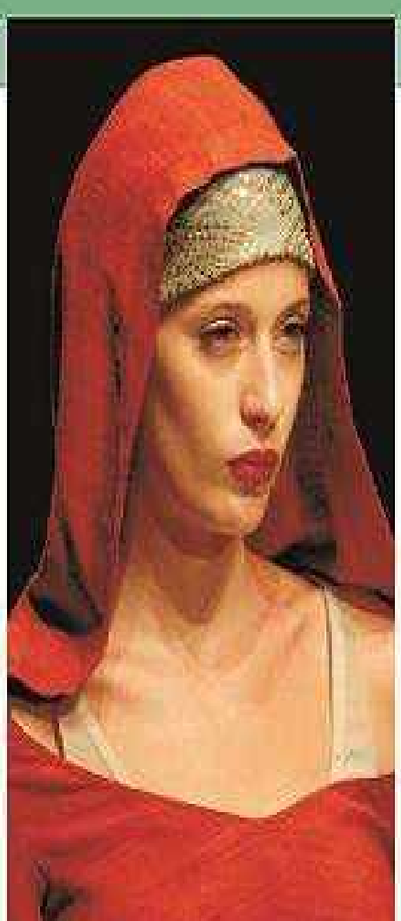

ہاشم ندیم

اِنتساب!

دُنیا کے ہر محبت کرنے والے.....اور
دُنیا کی ہر محبت کے نام

فہرست

☆	پیش لفظ.....ہاشم ندیم	8
☆باب 1:	پہلی بارش	9
☆باب 2:	پھر وہی شام	14
☆باب 3:	محبت.....نیلا موسم	18
☆باب 4:	پھر وہی محبت	23
☆باب 5:	لندن اُداس ہے	31
☆باب 6:	ایمان	40
☆باب 7:	یہودی	50
☆باب 8:	گھائل	57
☆باب 9:	پہلی کلاس	71
☆باب 10:	زہرِ عشق	76
☆باب 11:	زرد لندن	92
☆باب 12:	محبت کی دوپہر	99
☆باب 13:	یادیں	106
☆باب 14:	محبت ناتمام	111
☆باب 15:	نیند	123
☆باب 16:	خدا اور محبت	129

☆باب17: محبت کے تین پہر 141

☆باب18: محبت اور خدا 147

☆باب19: ہالوکاسٹ 158

☆باب20: سنگ دل 163

☆باب21: ٹرم پیپر 171

☆باب22: پھر وہی نظر 176

☆باب23: جیوری کا فیصلہ 187

☆باب24: بے خودی 193

☆باب25: جادوگر 210

☆باب26: دشمن خدائی 215

☆باب27: یہودی بستی 228

☆باب28: وہ اِک ملاقات 236

☆باب29: یادوں کی بارات 277

☆باب30: خوف 282

☆باب31: گریز محبت 287

☆باب32: پہلی بازی 304

☆باب33: نوجوان انقلاب 322

☆باب34: چلتے چلتے 329

☆باب35: الوداع 347

☆باب36: تجدید ایمان 354

☆باب37: کبھی الوداع نہ کہنا 363

☆☆☆

پیش لفظ

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ محبت کو آپ بیتی کیوں کہتے ہیں۔ محبت تو جگ بیتی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا فرد ہے جو اس تجربے سے نہیں گزرا ہوگا؟ شرط صرف تسلیم کرنے کے سچ یا انکار کرنے کی منافقت کی ہے۔ مَیں نے محبت اور مذہب کو جس طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کیا، اُسے اِن صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھیر دیا۔ محبت اور مذہب کی جنگ تو میرے دل نے لڑی اور میری روح نے جھیلی ہے، لیکن جیت مذہب کی ہوئی یا محبت کی ۔۔۔۔ اِس کا فیصلہ مَیں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مقصد محبت یا مذہب میں سے کسی بھی ایک کی برتری ثابت کرنا کبھی نہیں رہا۔ بس کچھ سوال جواب چاہتے تھے۔ لیکن مذہب اور محبت کی اس تکرار میں کچھ نئے سوال جنم لیتے نظر آ رہے ہیں۔ سو میری گزارش ہے کہ اس کتاب کو صرف وہی لوگ پڑھیں جو زندگی میں نئے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جواب البتہ فرض نہیں ہے۔

ہاشم ندیم

پہلی بارش

وہ شاید ہوائی جہاز کے پہیوں کی رن وے سے رگڑ کھانے کی آواز تھی جس سے میری کچی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جہاز لندن کے ہیتھرو ائر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اب دھیرے دھیرے رن وے پر چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا ایئر ہوسٹس کے اعلان کے مطابق لندن کا مقامی وقت صبح چھ بجے کا تھا۔

لندن شہر ایک ملگجھے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی ہے، ہلکی ہلکی سی پھوار اب بھی میری سیٹ کی ونڈ اسکرین پر ارتعاش بکھیر رہی تھی، یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں۔۔۔۔ اور کبھی کسی کے من کو ہر لحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔۔۔۔ لندن کی یہ پہلی بارش بھی کچھ ایسی ہی تھی جس نے میرے وجود کو تو باہر سے بھگو دیا لیکن میرے اندر کی پیاس اب بھی میرے حلق میں کانٹے چبھو رہی تھی۔

جہاز اپنے مقررہ پارکنگ اسٹینڈ پر لگی ٹیوب سے جڑ چکا تھا اور مسافر جمائیاں لیتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹیوب کے ذریعے ٹرمینل پر اُتر رہے تھے۔ جب تک مَیں لاؤنج میں پہنچا تب تک اُفق سے صبح کی ہلکی سی سفیدی جھانکنے لگی تھی، لیکن کالے گھنے بادلوں اور مسلسل بوندا باندی کی وجہ سے لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے باہر اب بھی کسی اداس شام کا سا زردی مائل پیلا اندھیرا باقی تھا۔

مَیں، حماد امجد، پاکستان کے معروف تاجر خاندان کا چشم و چراغ کہ جس کے آباؤ اجداد پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی، انتہائی اہم حکومتی عہدوں پر فائز

رہ چکے تھے۔ تجارت جس کے گھر کی باندی ہے اور ملک کے اہم سرکاری عمّال جس کے گھر شام کی چائے پر طلب کیا جانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ وہ حماد امجد آج لندن کی اس بھیگتی صبح میں تنہا اور اداس ہیتھرو ائر پورٹ کے آمد لاؤنج میں کھڑا تھا، کہنے کو تو میری لندن آمد کا مقصد یہاں کی مشہور کنگسٹن (Kingston) یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات سے اعلیٰ تعلیم کی دو سالہ ڈگری لینا تھا، لیکن مَیں خود جانتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، خود اپنی ذات سے فرار ڈھونڈنے کا ایک بہانہ۔ میں خود کو اس شہر کی گہما گہمی میں اس قدر ملوث کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے پل بھر بھی خود اپنے آپ کے ساتھ تنہا گزارنے کا موقع نہ مل پائے۔ میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں دوسروں کے ناگوار وجود کو بھی جھیلنے کے لیے تیار تھا لیکن خود اپنا سامنا لمحے بھر کو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ انسان بھی کتنا مجبور اور لاچار ہے۔ باہر آس پاس لگے سبھی آئینے پھوڑ بھی ڈالے تب بھی اپنے اندر لگے آئینے کا سامنا ہر دم لازمی ہوتا ہے۔

جب تک میں کسٹم اور دیگر معمول کی کارروائی سے فارغ ہو کر ٹرمینل سے باہر پہنچا تب تک باہر کی خنک ہوا میں برف کے اکا دکا ستارہ نما گالے شامل ہو چکے تھے۔ کھلی فضا میں پہلا قدم رکھتے ہی سردی کی ایک شدید لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھنا سا دیا۔ بے اختیار میرے ہاتھ میرے اوور کوٹ کے کالر کی طرف بڑھ گئے اور میں نے خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ سردی چاہے جتنی بھی شدید کیوں نہ ہو، اس کی پہلی لہر آپ کے اندر تازگی کا ایک احساس ضرور بیدار کر دیتی ہے۔ اس ٹھنڈی ہَوا کے پہلے جھونکے نے میرے اندر بھی تمام احساسات کو جگا سا دیا تھا۔ مَیں نے اپنے بچپن کے لنگوٹیے دوست کامران کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن میری توقع کے مطابق اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

پہلے تو جی میں آیا کہ سامنے پارکنگ اسٹینڈ میں کھڑی ٹیکسی لے کر خود ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں۔ میں لندن پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا اور اس شہر کے در و دیوار میرے لیے کبھی اجنبی نہیں رہے تھے۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر میں ایئر پورٹ ٹرمینل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس گھسیٹتا، دور خشک گھاس کے ایک بڑے سے ویران قطعے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر لگائے گئے لکڑی کے خوبصورت بینچوں کی ایک قطار سی موجود تھی۔

میں نے یہیں بیٹھ کر کامران کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوا میں برف کے گالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی اور جب تک میں اپنے منتخب کردہ بینچ تک پہنچا تب تک باقاعدہ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں، مَیں اور کامران شام کو آسمان پر برف کے مخصوص دودھیا سفید بادل دیکھ کر رات بھر اپنے اپنے گھر میں بستروں میں دبکے، برف گرنے کی دُعائیں کیا کرتے تھے اور صبح جب آسمان سے برف کے ستارے گرتے دیکھتے اور شہر کو برف کی سفید چادر میں لپٹا دیکھتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہتا۔ گھر والے ہمیں ڈھونڈتے ہی رہ جاتے اور ہم کہیں دور آتے جاتے راہ گیروں پر چھپ کر برف کے گولے برسانے میں مصروف رہتے۔ سوچتا ہوں بچپن کا وہ دسمبر اتنی جلدی کیوں بیت جاتا ہے اور جوانی کی یہ کڑی دھوپ ہے کہ جیسے صدیوں سے سر پر تنی ہوئی ہے اک ذرا بھی سرکتی نہیں۔

مَیں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا زمین کا وہ ٹکڑا عام سطح سے کچھ بلند تھا اس لیے دور سے لندن شہر کی اونچی لیکن قدیم عمارتوں کی جھلک یہاں سے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف نے تمام شہر کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ خود مجھے بھی دور سے کوئی دیکھتا تو شاید برف سے بنا اِک مجسمہ ہی سمجھتا۔ کامران کا ابھی تک کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ ہمیشہ کا لاپرواہ، اور صبح جلدی اٹھنے سے تو ہم دونوں کی جیسے جان ہی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے، ہم دونوں سالانہ امتحانات میں بھی بمشکل پرچے بٹنے کے بعد ہی کلاس روم میں پہنچتے تھے۔ بچپن یونہی ہنستے کھیلتے گزر گیا لیکن پھر اچانک کامران کے گھریلو حالات نے پلٹا کھایا، ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے، گھر میں کامران اکیلا رہ گیا کیونکہ اس کی اکلوتی بڑی بہن پہلے ہی بیاہ کر اپنے گھر سدھار چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد کامران کو پتہ چلا کہ اس کے باپ نے قرضوں کا بے تحاشا بوجھ اس کے لیے ورثے میں چھوڑ رکھا ہے۔ قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور آخر کار اسے مجبوراً اپنا آبائی گھر اور بچی کھچی جائیداد بیچ کر لندن شفٹ ہونا پڑا۔ قرض چکانے کے بعد جو کچھ بچا اس سے کامران نے یہاں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیا تھا اور اب اس کی گزر بسر مناسب انداز سے ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ مکمل اسی شہر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل اسے لندن ہمیشہ سے ہی بہت پسند

تھا۔ شاید ہم دونوں کے اندر ایک بے حد قدیم روح بستی تھی۔ کیونکہ قدامت پسندی اور اُداسی لندن شہر کا ہی خاصہ ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی چیختے، چنگھاڑتے شہر اچھے نہیں لگے۔ گرم، حبس زدہ اور بے چین ۔۔۔۔ جیسے ہر لمحہ کچھ کھو جانے کا احساس دل کو جکڑے رکھے، مجھے سرد اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ اور شہر ہمیشہ سے متاثر کرتے تھے، خاموش اور پُرسکون، انسان کا ہر غم، ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینے والے شہر، لندن بھی انہی شہروں میں سے ایک تھا۔

میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا ہنستے ہوئے گزرا، لڑکی نے غور سے میری جانب دیکھا، اُس کے رخسار سردی سے سُرخ انگارہ سے ہو رہے تھے اور آنکھوں میں اِک ازلی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرا پڑی اور دونوں مجھے وش (Wish) کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رکھے دوسرے بینچ پر جا کر بیٹھ گئے اور راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ صبح سویرے جاگنگ (Joging) وغیرہ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ موسم اور ان منچلوں کی یہ ادا، میں یہ سوچ کر مسکرا دیا۔ موسم بھی ہر انسان پر کچھ الگ ہی طور اُترتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے آبائی شہر کوئٹہ میں جب رات بھر برف گرتی تھی تو صبح سویرے غریب مزدور طبقہ اپنے بال بچوں سمیت چھوٹے بڑے بیلچے اور لکڑی کے بڑے بڑے پھٹے لے کر دروازے کے سامنے سے اور چھت کے اوپر سے برف ہٹانے میں جُت جاتا ۔۔۔۔ کیونکہ یہ برف ان کے کچے گھر کی چھت پر زیادہ دیر ٹکتی تو چھت کو چھلنی بنا دیتی تھی۔ ان غریبوں کی ساری سردیاں ایسے برفیلے موسم سے پناہ مانگنے میں ہی گزر جاتی تھیں۔ اور یہاں لندن میں اس برفیلی صبح میں یہ دو متوالے موسم کا لطف لینے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہی موسم کسی بھی دو افراد پر دو مختلف صورتوں میں کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ موسم تو بس موسم ہی ہوتا ہے۔ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میرے کاندھے کو کوئی زور زور سے ہلا رہا تھا۔

"اُٹھ جائیے صاحب، نارووال کا جنکشن آ گیا ہے۔"

مَیں نے چونک کر اوپر دیکھا، کامران گرم کپڑوں میں لپٹا، صرف چہرہ باہر نکالے اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے "معاف کرنا میڈی یار،

کچھ دیر ہوگئی۔ لیکن تم باہر اس برف باری میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ مَیں نے وہاں سارا ٹرمینل چھان مارا تمھاری تلاش میں۔"

میری کامران سے پورے دو سال بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ دو سال پہلے وہ یہیں لندن کے اِسی ہیتھرو ایئرپورٹ پر مجھے آخری مرتبہ الوداع کہنے آیا تھا۔ تب زندگی کتنی حسین تھی۔ تب میں لندن صرف آوارہ گردی کرنے اور کامران کی بے تکان بکواس سننے کے لیے آتا تھا۔ بچپن کے سچے دوست بھی کسی گھنے، سایہ دار شجر کی طرح ہوتے ہیں، ان کی چھاؤں میں کتنا سکون، کتنا آرام ہوتا ہے، پل بھر کو مَیں بھی کامران کے گلے لگ کر اپنے جلتے زخموں کو بھول سا گیا تھا۔

دفعتاً اُس نے مجھے اپنے آپ سے جُدا کیا اور غور سے دیکھ کر کہنے لگا "یار میڈی، تم کتنے کمزور لگ رہے ہو۔" مَیں نے اپنے سوٹ کیس کا ہینڈل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "کاش میں بھی تمھارے لیے کوئی اسی قسم کی رائے دے سکتا۔" کامران ہنس کر ڈھٹائی سے بولا۔ ارے یار، تم تو جانتے ہو نا، بچپن سے ہی مجھ پر کھانا ذرا جلدی لگتا ہے۔ اچھا اب یہیں کھڑے رہ کر فریز ہونے کا ارادہ ہے کیا؟ گھر چلو۔ کامران نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ساتھ والے بینچ پر وہ جوڑا اَب بھی برستی برف میں دُنیا و مافیہا سے لاپرواہ ایک دوجے میں گم تھا۔ کامران نے لڑکے کو دیکھ کر ایک لمبی سی آہ بھری اور بڑبڑاتے ہُوئے اپنے آپ سے کہنے لگا "نہ جانے یہ آج کل لندن کی گوریوں کے معیار کو کیا ہو گیا ہے۔"

کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا زمین پر بچھی برف کی سفید بے داغ پوشاک پر قدموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور مَیں کسی معمول کی مانند اس کے نقشِ قدم طے کرتا پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کامران کی وہی پُرانی موریس کار قریب ہی کہیں پارک تھی۔ اُس نے میرا سامان ڈکی میں رکھا اور ہم کامران کے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

OO

پھر وہی شام

ہم گھنٹے بھر میں ہی کامران کے ساؤتھ لندن والے حصے میں موجود فلیٹ پہنچ گئے تھے۔ جب تک مَیں شاور لے کر فارغ ہوا تب تک کامران ناشتہ بنا چکا تھا مجھے کچھ خاص بھوک نہیں تھی لیکن کامران حسب معمول اپنی پُر جوش روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے میں کچھ زیادہ ہی محو تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد مَیں لمبی تان کر سو گیا۔ کامران بھی اپنے ریسٹورنٹ کے لیے نکل پڑا۔

شاید شام کے چار بجے ہوں گے جب میری آنکھ کسی شور سے کھل گئی کامران کا یہ فلیٹ ساؤتھ لندن کے پوش ایریا میں واقع تھا۔ یہ دراصل سُرخ اینٹوں سے بنے دو منزلہ اپارٹمنٹس کی ایک لمبی سی قطار تھی، جس میں انتہائی چوڑی سڑکوں کے درمیان یہ اپارٹمنٹس شاید آٹھ یا دس قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ہر قطار میں آٹھ دو منزلہ اپارٹمنٹ اس طرح ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ سب مکانوں کے آگے کا باغیچہ ایک لمبی سی قطار میں سیدھا چلا گیا تھا۔ البتہ درمیان میں سب مکانوں کو علیحدہ کرنے کے لیے خوبصورت توازن سے کٹی ہوئی ہری باڑھ موجود تھی۔ ہر مکان کے باہر ایک خوبصورت سا پوسٹ بکس لگا ہوا تھا جس پر مالک مکان کا نام کندہ تھا۔ مجھے یاد تھا جب ہم چھوٹے تھے تو ڈرائنگ کی کاپی پر لکڑی کے اسی پوسٹ بکس جیسا ایک چھوٹا سا مکان ہر بچہ بناتا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی اپنی بالکونی سمیت پچھلی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہ ہلکا سا شور بھی اسی پچھلی سڑک پر بنے قطار نمبر 2 کے اپارٹمنٹس کی طرف سے آ رہا تھا۔ مَیں بالکنی میں کھلتا شیشے کا دروازہ کھول کر ٹیرس میں نکل آیا۔ برف باری تھم چکی تھی لیکن آس پاس دُور تک ہر چیز کو برف نے ڈھانپ دیا تھا، سڑک کے پار گلی کے چند بچے برف کا پتلا بنانے میں مشغول تھے، یہ شور انہی کے معصوم قہقہوں اور آپس میں تکرار کا تھا۔ ان میں سے ایک گروپ پتلے کی ناک کی جگہ گاجر لگانا چاہتا تھا جبکہ

دوسرا گروپ ناک کو لکڑی کی ایک موٹی کیل سے سنوارنا چاہتا تھا۔ بالآخر دونوں گروپوں میں گاجر پر اتفاق رائے ہو گیا اور پتلے کو ہیٹ، مفلر اور کوٹ وغیرہ بھی پہنا دیا گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بچوں کی اس کاوش کو رُک کر دیکھتے اور مسکرا کر آگے بڑھ جاتے۔ اب اندھرا چھانے لگا تھا، ویسے بھی سردیوں کی شام جلد ہی اُتر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ بچوں کی ماؤں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہُوئے انہیں پکارنا شروع کر دیا اور بچے ایک ایک کر کے پتلے سے رُخصت لیتے ہُوئے وہاں سے چل دیے۔ شاید ساری دُنیا کی مائیں اندر سے ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں بچوں کو کھیلنے سے منع کرنے والیاں ۔۔۔۔ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس لوٹ آنے کی تاکید کرنے والیاں ۔۔۔۔ اور بچوں کے دیر تک نہ آنے پر دروازوں، کھڑکیوں اور صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگانے والیاں ۔۔۔۔

جیسے جیسے شام ہو رہی تھی، سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، سڑک کے کنارے کھڑا کافی والا ایسپریسو (Espreso) کافی کے گرما گرم مگ آتے جاتے راہ گیروں کو پیش کر رہا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتے جوڑے چلتے چلتے کچھ دیر کو رکتے اور گرم کافی حلق میں انڈیل کر آگے بڑھ جاتے۔ اس وقت بھی ایک خوبصورت نوجوان جوڑا اسٹال کے سامنے کافی پینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹاتے ہُوئے کافی کے بڑے سے مگ سے نکلتی ہوئی بھاپ کے عقب سے شرارت سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست، اور ظاہر پسند ہوتے ہیں۔ کافی کے مگ سے اٹھتا ہوا دھواں سب کو دکھائی دے جاتا ہے، لیکن اپنے آس پاس بستے انسانوں کے سینے سے اٹھتا ہوا دھواں سب کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کے کناروں پر لگے لیمپ پوسٹ جل چکے تھے۔ پھر وہی شام تھی، پھر وہی میں تھا اور پھر وہی بیتی یادوں کے مہیب سائے تھے۔ کہتے ہیں شام زوال کا وقت ہوتا ہے اور زوال صرف سورج کا ہی تو نہیں ہوتا ۔۔۔۔ مجھ پر تو ویسے بھی یہ وقتِ زوال بہت بھاری ثابت ہوتا تھا۔ جتنی تنہائی مَیں نے اپنی زندگی میں شام کے وقت محسوس کی ہے ۔۔۔۔ اتنی کسی اور پہر میں کبھی نہیں جھیلی۔

دفعتاً فلیٹ کے لاؤنج میں رکھا فون بج اُٹھا۔ دوسری طرف سے کامران کی چہکتی ہوئی

آواز سنائی دی۔ ''اے میرے اُداسیوں کے پرستان کے شہزادے۔۔۔۔رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے۔اگر باہر چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ، مَیں آدھے گھنٹے سے پہنچ رہا ہوں۔اگر گھر پر ہی کھانا ہے تو مَیں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ راستے سے کچھ لیتے ہوئے گھر چلے۔'' مجھے کچھ حیرت سی ہوئی ''تم نے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟ وہ کیوں۔'' کامران کی مخصوص ہنسی کی آواز فون پر گونجی۔ ''دراصل جب مَیں اپنے کیفے کو بند کر کے نکلتا ہوں تو وہاں سے گھر تک کے راستے میں مَیں خود اپنے آپ ہی اپنا ڈرائیور ہوتا ہوں۔دوسروں کو ڈرائیور کا بتانے میں شخصیت ذرا رُعب دار رہتی ہے۔'' میرے منہ سے اس کی شان میں کچھ الفاظ نکلے اور مَیں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کبھی نہیں سدھر سکتے میرا گھر سے نکلنے کا موڈ نہیں ہے۔کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔''

کچھ ہی دیر میں کامران رات کے کھانے کے تمام لوازمات سمیت آن موجود ہوا۔وہ آتے ہوئے تیار کھانا ہی بازار سے لیتا آیا تھا جسے اُس نے کچھ ہی دیر میں کسی سگھڑ عورت کی طرح گرم کر کے کھانے کی میز پر لگا دیا۔کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر آخر کار کامران کی زبان پر وہ بات آ ہی گئی جسے میں انجانے مَیں صبح سے ہی ٹالتا چلا آ رہا تھا۔

کامران نے کافی کا ایک لمبا سا سپ لیتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا ''تم اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دو گے۔۔۔۔ایسی اُمید مجھے تم سے ہرگز نہیں تھی میڈی۔'' میں نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔۔۔۔ ''جب دشمن خود مدمقابل کے خیمے میں آ کر فریاد کرے کہ یہی ایک جیت اِس کی زندگی کا حاصل ہے تو مجھ جیسوں کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔''

کامران کی بے چینی میرے جواب سے کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی۔وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''مجھے تمھاری منطق آج تک سمجھ نہیں آئی۔تم نے اس ایک لڑکی کے لیے زمانے بھر سے بغاوت مول لی تھی۔سارے گھرانے کی مخالفت کے باوجود تم اپنی جگہ ڈٹ گئے تھے۔کیا کچھ نہیں سہا تم نے۔باپ نے تمھیں عاق کر ڈالا۔ماں نے ناطہ توڑ لیا۔گھر بار چھوٹ گیا، پھر یکایک تم نے دست برداری کا اعلان کیسے کر دیا۔''

میرے لبوں پر کمزوری اِک مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''شاید زمانے کی سختیوں نے مجھے

احساس دلا دیا کہ محبت صرف ایک بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھاننے والے صرف احمق ہوتے ہیں، اور کچھ نہیں۔''

کامران صوفے سے اُٹھ کر میری جانب آیا اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''مَیں تمھیں چھ سال کی عمر سے جانتا ہوں مسٹر حماد امجد رضا۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا بچپن، ہماری جوانی ایک دوسرے کے سامنے کسی آئینے کی طرح عیاں ہے۔ تمہارا شمار انہی احمقوں میں ہوتا ہے جو گھر کا نرم بستر چھوڑ کر در بدر کی تپتی ریت چھانتے پھرتے ہیں۔ اس وقت تم تھکے ہوئے ہو، جا کر سو جاؤ۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔''

کامران مجھے تھپکی دیتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مَیں وہیں آرام کرسی پر کھڑکی کے سامنے بیٹھا باہر سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں سے، جو برف کے بوجھ سے بھاری ہو کر جھکی ہوئی تھیں برف گرنے کی مخصوص دھپ دھپ سنتا رہا۔ باہر آسمان سُرخ انگارہ سا ہو گیا تھا۔ اور یہاں اندر کمرے میں آتش دان میں جلتی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز اور دیوار پر لپکتے شعلوں کے سائے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرا ذہن ماضی کے دریچوں کو پھلانگتا ہوا دو سال پہلے کی اس شام کی یادوں تک جا پہنچا تھا جب میری ایمان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

OO

محبت..... نیلا موسم

ہمارا گھرانہ شہر کے انتہائی متمول اور بااثر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا بطور کمشنر ریٹائر ہونے کے بعد باپ دادا کی وسیع وعریض زمینوں کے انتظامات سنبھالتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی پکے زمین دار نہ بن سکے اور ان کے اندر چھپا ایک سخت بیوروکریٹ ان کی شخصیت پر ہمیشہ سے نمایاں اور حاوی رہا تھا۔ امی خود ایک بہت بڑے زمین دار کی بیٹی تھیں اور ان کے اندر پڑھی لکھی جاگیردارنیوں کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انگلش ادب میں ماسٹرز بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن سمیت یہ خوش حال گھرانہ زندگی کی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا۔ بابا کے رابطے ملک کے انتہائی اہم سیاست دانوں سے ہمہ وقت رہتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں ہر شام بابا کی بیٹھک ملک کے موجودہ حکمران طبقے کے وزیروں سے رہتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی تھی کہ ملک میں حکومتیں تو بدلتی رہتی تھیں لیکن بابا کی بیٹھک میں وہی چند مخصوص چہرے روپ بدل بدل کر موجود رہتے تھے۔ شاید بابا کی دوستی ہی ایسے سیاست دانوں سے تھی جو ہر حال میں اقتدار کے پالنے میں جھولتے رہتے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سجاد اور بیٹی مدیحہ کی شادی بھی انہی حکمران خاندانوں میں کروادی تھیں۔ میری بہن مدیحہ سندھ کے ایک بہت بااثر خاندان میں بیاہی گئی تھی جو کہلاتے تو سندھ کے تھے، لیکن ان کی نئی نسل نے پاکستان کو صرف دارالحکومت سے زیادہ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مدیحہ بھی اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سجاد بھائی کی شادی بھی پنجاب کے امرا خاندان کی بیٹی سے ہو چکی تھی اور میری بھابھی عبرینہ کو ہر وقت اس بات کی فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں کسی بھی موقع پر ان کا اُونچا خاندان ہمارے خاندان سے نیچا ثابت نہ ہو جائے۔ ویسے ان کی اور سجاد بھائی کی خوب جمتی تھی، کیونکہ سجاد بھائی کو اپنے بزنس اور بیرونِ ملک دوروں سے ہی فرصت نہیں

تھی لہٰذا بھابھی اور امی خود ہی گھر کی پارٹیز اور تقریبات وغیرہ کے اہتمام میں جُتی رہتی تھیں۔ اَب رہ گئے میں یعنی حماد امجد صاحب اور مجھ سے چھوٹا اور گھر بھر کا لاڈلا عباد تو ہم دونوں ہی کو گھر کے ان ہنگاموں اور شور شرابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے حال ہی میں ماسٹرز کیا تھا اور اب عباد بھی گریجویشن کے بعد فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی زندگی کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے بابا کے لاکھ کہنے کے باوجود مَیں ان کے کاروبار میں اب تک ان کا ہاتھ بٹانے میں اپنا دھیان نہیں لگا پایا تھا۔ اور اس بات پر بابا آج کل مجھ سے کچھ ناراض بھی رہتے تھے۔ دوسری جانب عباد تھا جو پاکستان میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی باہر جا کر رہنے کا جنون تھا۔ لیکن بابا سے کوئی حتمی بات کرنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ہم امیروں کے پاس خوشی منانے کے بہانے اس قدر کم کیوں ہیں۔۔۔۔؟ شاید کہیں پڑھی ہوئی یہ بات سچ ہی تھی کہ امیروں کا یہ خیال کہ غریب زیادہ خوش رہتے ہیں، اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ غریبوں کا یہ گمان کہ امیر ان سے زیادہ خوش ہیں۔

آج بھی ہمارے گھر میں ایک پارٹی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ سجاد بھائی کے اکلوتے بیٹے نے آج پہلا سپارہ ختم کر لیا تھا۔ ہم امیر گھرانوں میں دوسروں کے دیکھا دیکھی آج کل بچوں کو باقاعدہ کسی مولوی سے شام کو سپارہ پڑھوانے کا فیشن بھی زوروں پر تھا۔ یا پھر شاید اس کے پیچھے بابا کے بچپن کی سخت تربیت اور دادا کی مخصوص پرورش کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے سجاد بھائی کو باقاعدہ حکم دے کر ان کے بیٹے سنّی کے لیے کسی مولوی کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو بچے کو شام کو آ کر قرآن کا سبق دے جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مہینے کے بیشتر دن بے چارے مولوی صاحب کو بنگلے کے گیٹ سے ہی بنا سبق دیے واپس پلٹنا پڑتا تھا کیونکہ زیادہ تر گھر میں کسی نہ کسی پارٹی یا تقریب کا ہنگامہ ہی لگا رہتا تھا۔ اَب ایسی ماڈرن پارٹیز میں بھلا ایک سیدھے سادھے مولانا ٹائپ مولوی اور اُس کی پُرانی سی سائیکل کا بھلا کیا جوڑ۔۔۔۔؟ خود بھابھی کو بھی مولوی صاحب کا یہ ٹِنّا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، لیکن بابا کے رعب کے آگے بھلا کسی کی کب چلتی۔۔۔۔؟ لہٰذا بادلِ نخواستہ اس رسم کو نبھایا جا رہا تھا۔ جانے ہم امیر ایسی

چیزوں سے اتنی دور اور غریب ان رسومات سے اتنے قریب کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ ہم مذہب کو بھی ایک رسم کی طرح نبھاتے ہیں اور غریب رسم کو بھی کسی مذہبی فریضے کی طرح نپٹاتے ہیں۔

خود میری بھی سنّی کے مولوی صاحب سے آتے جاتے ایک آدھ بار رسمی سی علیک سلیک بس راستے میں، یا پھر گھر کے مخصوص لاؤنج کے حصّے میں جہاں وہ سنّی کو سبق دے رہے ہوتے تھے، ہو چکی تھی۔ مولوی علیم الدین صاحب دُبلے پتلے سے ایک سیدھے سادھے شخص تھے، جنھیں میں نے ہمیشہ سفید کپڑوں کُرتا، پاجامہ میں ملبوس ہی دیکھا تھا۔ چہرہ پُرنور، آنکھوں پر نظر کا چشمہ چُپ چاپ اور خاموش سے وضع داری ان کی چال ڈھال سے نمایاں تھی۔ ہمیشہ سر اور آنکھیں جھکا کر بات کرنے والے۔ اپنی پُرانی ریلے سائیکل پر شام چار بجے نہایت پابندی سے آن موجود ہوتے اور نوکر جہاں انہیں بٹھا دیتا وہیں چُپ چاپ خاموش بیٹھے رہتے اور سنّی کے نیچے آنے کا انتظار کرتے۔ مجھے اس بات پر بھی ہمیشہ حیرت رہی کہ سنّی جیسا شرارتی بچہ ان کے قابو میں کیسے آ گیا تھا۔ کیونکہ باقی ٹیوٹرز کی جو درگت وہ بناتا تھا۔ اس کا مظاہرہ مَیں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن خلافِ توقع مولوی صاحب کے سامنے وہ بڑا مؤدب بنا بیٹھا رہتا تھا۔ مَیں نے ایک آدھ بار آتے جاتے سنّی کو مولوی صاحب کی نظر بچا کر اُکسانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔

اور شاید یہ سنّی کی ہی فرمائش تھی کہ آج کی پارٹی جو خود سنّی ہی کے پہلا پارہ ختم کرنے کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس میں اس کے اُستاد یعنی مولوی صاحب کی شرکت لازمی تھی ورنہ اس نے گھر بھر کو دھمکی دی تھی کہ وہ خود بھی پارٹی میں نہیں آئے گا اور نہ ہی اپنی مما کے پسند کے کپڑے پہنے گا۔ امی اور بھابھی سنّی کی اس فرمائش پر کافی جذبز ہوئی تھیں۔ بھلا اس ماڈرن پارٹی میں جہاں شہر بھر کی بیگمات اپنے پالتو نما شوہروں کے ساتھ زرق برق لباسوں، نئے ڈیزائن کی جیولری سے لدی پھندی، لمبی لمبی کاروں اور عالی شان گاڑیوں میں تشریف لائیں گی، ایک لمبی سی سفید داڑھی والے اس غریب سے بزرگ کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔۔۔ ہونہہ۔۔۔

لیکن سنّی کی ضد کے آگے آج تک کسی کی چلی ہے جو اس دن چل پاتی۔۔۔؟ آخر گھر

کی خواتین کو ہی ہار ماننا پڑی۔ لیکن اَب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر کے خاص نوکروں نے کل ہی مولوی صاحب کو اس تقریب کی وجہ سے آج کوٹھی آنے سے منع کر دیا تھا لہٰذا ان کے آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ سنّی کے آنسو پھر سے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ آخر بابا کے خاص ڈرائیور شاکر سے پتہ چلا کہ اُسے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم ہے، کیونکہ پہلے وہ بھی شہر کے اسی پُرانے محلے میں رہتا تھا جہاں مولوی علیم الدین اب تک رہائش پذیر تھے۔ طے یہ پایا کہ شاکر جا کر مولوی صاحب اور ان کی فیملی کو بھی باقاعدہ تقریب میں آنے کی دعوت دے آئے۔ سنّی کو شاید شاکر پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لہٰذا وہ خود بھی شاکر کی گاڑی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کو لینے چلا گیا کیونکہ اب تقریب کا وقت تو سمجھو ہو ہی چکا تھا، مولوی صاحب کے انتظار میں دیر بھی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا سستی سے سامنے رکھے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا جب چھوٹے (عباد) نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''ہے بگ بی، کیا نیچے آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ پارٹی شروع ہو چکی ہے۔'' عباد ہمیشہ کی طرح آج بھی شام کی پارٹی کے لیے باقاعدہ سوٹ اور میچنگ بو (Bow) میں ملبوس تھا۔ اُسے دیکھ کر میری بے ساختہ ہنسی نکل پڑی۔

''تم تو اس طرح تیار ہو کر نیچے جا رہے ہو جیسے آج ہی تمھارے رشتے کا بھی فائنل اعلان کر دیا جائے گا۔''

''عباد نے میری بات سن کر بُرا سا منہ بنایا۔'' کم آن بگ بی، آپ بھی نہ۔۔۔۔ یونو آئی آل ویز ریمین ویل ڈریسڈ (You know I always remain well dressed)'' میں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور تکیہ عباد کی طرف پھینکا۔

''خوب جانتا ہوں مَیں تمھاری اس خوش لباسی کو۔۔۔۔ ضرور کسی نئی محبت کے استقبال کے لیے یوں بن ٹھن کر ہال میں جا رہے ہو۔۔۔۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سارے شہر کی لڑکیاں کیا آشوب چشم کی بیماری سے دو چار ہیں۔۔۔۔!۔۔۔۔ ورنہ بھلا کوئی تمھاری جانب دیکھتی ہی کیوں۔۔۔۔''

عباد ہنسا۔۔'' ۔۔گھر کی مرغی دال برابر۔۔۔۔ آپ سب گھر والے بھلا میری قدر کیا جانیں۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔ اب آپ بھی دیر نہ کریں۔۔۔۔ کمشنر صاحب کا حکم ہے کہ

سب لوگ نیچے موجود ہونے چاہئیں۔"

مَیں اور عباد تنہائی میں بابا کو کمشنر صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ مَیں جھنجھلا سا گیا "۔۔۔۔اف۔۔۔۔کیا مصیبت ہے یار۔۔۔۔ایک بچے کی معصوم سی رسم کشائی کو اس قدر دکھاوا اور بڑھاوا دینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔دنیا میں ہزاروں لاکھوں بچے روزانہ پورا قرآن ختم کرتے ہیں، حفظ کر لیتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی یوں اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا، اور پھر ایسے موقع پر اس طرح کی پارٹی۔۔۔۔مَیں تو فیڈ اپ Fed UP ہو گیا ہوں۔"

عباد سمجھانے کے انداز میں بولا" کم آن یگ بی۔۔۔۔بی اے سپورٹ۔۔۔۔میں جانتا ہوں یہ صرف دکھاوا ہے۔ لیکن کسی اور کی نہیں تو صرف سنّی کی خوشی کے لیے ہی آ جائیں، آپ جانتے ہیں وہ آپ سے کس قدر اٹیچ ہے۔" عباد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مَیں سنّی کی خوشی کے لیے پارٹی میں ضرور شرکت کروں گا چاہے اوپری دل سے ہی سہی۔

شاید ہماری زندگی کے نوے فیصد فیصلوں میں ایسے ہی کسی اپنے، کسی لاڈلے کا بھرم رکھنا بنیادی شرط ہوتی ہے۔ ہم بہت تھوڑی زندگی خود اپنے آپ کے لیے جی پاتے ہیں، زیادہ تر تو دوسروں کا بھرم رکھنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔

OO

پھر وہی محبت

شہر کی کنٹونمنٹ میں جہاں علاقے کے بڑے امراء کی کوٹھیاں کئی کئی ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی علاقے میں دور رویہ درختوں سے ڈھکی ایک سڑک کے اختتام پر ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کی عظیم الشان حویلی آج پھر برقی قمقموں سے جھلملا رہی ہے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی لیکن شام کے پَر ابھی پوری طرح پھیلے نہیں تھے۔ دُور سے کمشنر صاحب کی پُرانی مرسڈیز گاڑی، جو اَب زیادہ تر گھر کے کام کاج کے لیے استعمال ہوتی تھی، فراٹے بھرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گاڑی کو گھر کا سب سے پُرانا ڈرائیور شاکر چلا رہا تھا اور سنّی میاں چہرے پر ان جانی خوشی کے تاثرات لیے یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹے ہوں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سفید چادروں میں ڈھکی، دو چھوئی موئی سی لڑکیاں سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں البتہ مولوی علیم کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ گاڑی نے حویلی کے بڑے بڑے جنگلوں والے گیٹ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی مخصوص انداز میں دو مرتبہ ہارن بجا دیا تھا لہٰذا آہنی جنگلوں والے گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے لکڑی کے کیبن سے دو ملازم تیزی سے نکلے اور انہوں نے گاڑی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیا۔ کمشنر صاحب کی نیلی مرسڈیز تیزی سے گھر میں داخل ہوگئی۔

OO

جب تک مَیں تیار ہو کر نیچے حال میں پہنچا تب تک تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے۔ سنّی نے مجھے دیکھتے ہی دور سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود سفید کرتا پاجامہ پہنے اپنے دوستوں اور کزنز وغیرہ میں اس قدر گھرا ہوا تھا کہ اس کا فوری طور پر مجھ تک پہنچانا ممکن تھا۔ عباد صاحب حسبِ معمول بیگمات کے ساتھ آئی ہوئی ان کی بیٹیوں اور دوسری لڑکیوں کو متاثر کرنے کی حتی الوسع کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک

طرف بابا اور سجاد بھائی ہمیشہ کی طرح اس پارٹی میں آئے ہوئے چند بڑے ناموں کے ساتھ بزنس ڈیلز کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ بابا ایسے موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہال میں کافی چہل پہل تھی، ہر طرف جیسے رنگ و نور کی برسات ہو۔ ایک طرف امی اور عریبہ بھابھی بیگمات کو متاثر کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ جیولری کی باتیں تھیں۔ نئے آنے والے فیشن کی باتیں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں گذارنے کی باتیں تھیں۔ رنگین آنچل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سنی کے پہلے پارے کی رسم نہ ہو بلکہ اس کے نکاح کی تقریب ہو۔ میرے سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے بہت سی خواب ناک نگاہوں کے سلام مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن بقول کامران میں اس معاملے میں انتہائی ناشکرا واقع ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ مجھے محبت وغیرہ قسم کی چیزوں کا سوچ کر ہی ہنسی آ جاتی تھی۔ مجھے عورت کبھی برتنے کی حد تک بھی اس طرح پسند نہیں آئی تھی جیسا کہ عام رومانوی داستانوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے ہی مخلوط اداروں میں تعلیم (Co-education) حاصل کی تھی۔ بچپن سے ہی میری بہترین دوست صرف لڑکیاں ہی رہی تھیں۔ میں انہی کے ساتھ بچپن میں انہی کے کھلونوں کے کمروں سے لے کر نوجوانی کے اسٹڈی رومز اور پھر جوانی میں بیڈ رومز تک ساتھ ساتھ رہا تھا۔ میرے لیے اس محفل کی تمام لڑکیاں بس لڑکیاں ہی تو تھیں۔ جیسے کسی ہاسٹل میں رہتے ہوئے بہت سے کلاس فیلوز۔۔۔۔ سبھی مجھے اور میں سبھی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کا خاص راز دار بھی رہ چکا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کبھی اس بات کو کیوں محسوس نہ کر پایا تھا کہ یہ سب اب بچپن اور نوجوانی سے نکل کر اس عمر میں پہنچ چکی ہیں جہاں اب کوئی ایک نامحرم ہی ان کا راز دار ہو سکتا ہے۔ یہ سب بابا کے ساتھ کے ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور امراء کی بیٹیاں تھیں جن کے ماڈرن حُسن کے ایک دیدار کے لیے شہر اور کالج کے عام لڑکے سارا دن چھاؤنی کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ لیکن میں اس حسن کے اس قدر قریب رہا تھا کہ اب میرے لیے اس کا نظارہ ایک معمول کی بات تھی۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی جیسی ہی ایک جنس کے لیے اس قدر بے تابی کا مطلب۔۔۔۔ مجھے تو زیادہ تر حسین لڑکیاں بے وقوف ہی ملی تھیں، وہی ان سب کا ایک ہی جیسا انداز، لڑکوں کے سامنے سنجیدہ

اور معتبر نظر آنے کی کوشش اور تنہائی میں آپس کی لڑکیوں سے ویسی ہی گفتگو جیسے ہم لڑکے آپس میں ان لڑکیوں کے بارے میں کرتے تھے۔

سب سے پہلے مجھے بیگم عشرت کی صاحبزادی لبنیٰ نے سیڑھیوں سے اُترتے ہی اچک لیا۔ ''اف میڈی۔۔۔کہاں رہتے ہو آج کل۔۔۔۔بے رخی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔۔۔'' میں نے اسے چھیڑا۔۔۔'' سنا ہے حسینوں سے دور کی صاحب سلامت ہی اچھی ہوتی ہے۔'' وہ مسکرائی، ''یونائی۔۔۔۔اچھا بتاؤ اس جمعرات کو آ رہے ہو نا ہماری طرف۔ سلمیٰ کی انگیجمنٹ(Engagement) پارٹی ہے۔''

سلمیٰ لبنیٰ سے ایک سال چھوٹی بہن تھی۔ مَیں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''سلمیٰ کی منگنی ہو رہی ہے۔۔۔۔؟ لیکن اس نے تو میرے ساتھ بھی کچھ وعدے کیے تھے۔ ''لبنیٰ نے گھور کر میری طرف دیکھا۔'' تمھارے وعدوں کے انتظار میں بوڑھی ہونے کے لیے میں جو بیٹھی ہوں۔ بتاؤ نا۔۔۔۔آؤ گے نا۔'' اتنے میں دوسری طرف سے ماریہ اور حمیرہ مختلف سمتوں سے لپکیں۔ انہیں میرا لبنیٰ کے ساتھ یوں تنہا کھڑا ہونا قطعاً پسند نہیں تھا۔ حمیرہ جانتی تھی کہ مجھے کالا لباس بہت پسند ہے لہٰذا وہ آج خصوصی طور پر سیاہ ساڑھی پہن کر آئی تھی۔ اور سچ ہے کہ اس کا گورا رنگ کالی ساڑھی میں کچ بھی خوب رہا تھا۔ ماریہ حسب معمول فلیپر اور نئے انداز کی چست سی شرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ اٹھلا کر بولی'' میڈی۔۔۔۔تم نے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بس تم کل شام مجھ سے مل رہے ہو۔۔۔۔ مجھے تمھیں بہت سی باتیں بتانی ہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' وہاں دُور کھڑی نائلہ اور پنکی مجھے ماریہ سے باتیں کرتا دیکھ، غصے سے مجھے گھور رہی تھیں اور لوگوں کی نظر بچا کر کچھ ایسے اشارے کر رہی تھیں کہ مَیں جب اکیلے میں ان سے ملوں گا تب وہ میری خوب خبر لیں گی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سبھی لڑکیوں کے راز، ان کے گلے شکوے اور ان کی باتیں تنہائی میں ایک جیسی ہی ہوتی تھیں۔ شائد ساری دُنیا کی عورتیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی قسم کی مٹی سے بنائی گئی ہیں۔ تنہائی میں سبھی مجھ سے شکوہ کرتیں کہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اب میں ان پر توجہ ہی نہیں دے رہا، کسی نہ کسی بہانے میرا ہاتھ تھام لیتیں۔ مجھ سے روٹھتیں اور پھر

خود ہی من بھی جاتیں۔ سبھی کا یہ گلہ ہوتا کہ مَیں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ان کے لیے کیا معنی رکھتا ہوں۔۔۔۔اور یہ کہ سبھی نے میری بچپن اور لڑکپن کی یادوں کو کس قدر سینت سینت کر اور سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سبھی کا رومان ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس بات پر بھی بہت حیرت ہوتی تھی کہ ان لڑکیوں کے دماغ میں بچپن کی یادیں اور بچپن کا رومان اس قدر گہرا اثر لیے ہُوئے کیوں ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑکیاں وہ معصوم دوستی ہی اس لیے کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر جوانی میں اسی دوست کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنالیں۔۔۔۔؟

بحرحال۔۔۔۔اس وقت میں اس رومان سے بالکل بے خبر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کسی کا محبوب ہونا کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں کا محبوب بننے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن تب بھی یہ مسند کی کسی ایک آدھ خوش نصیب کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہماری ساری عمر دوسروں کو اپنا محبوب بنانے میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود کسی کا محبوب بننا ہمارے اختیار میں ہوتا ہی کب ہے؟ یہ اعزاز تو صرف آسمان سے ہی وارد ہوتا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس اعزاز کو پانے والے خود اس اعزاز، اس رتبے کی حُرمت سے بے خبر ہوتے ہیں۔

مَیں سبھی سے ملتا ملاتا، ان نازنینوں کو چھیڑتا اور ان سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت کا نیلا موسم میرے بہت قریب یوں بکھر رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے بس میری ہی تاک میں ہو۔ اور تبھی دفعتاً میرے قدم جیسے ہال کے لکڑی سے بنے فرش پر جم سے گئے۔ میرے آس پاس کا سبھی شور، وہ نقرئی قہقہوں کا جلترنگ تھم سا گیا۔ فضا ساکت سی ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کسی خودکار ریموٹ کے ذریعے اس ساری محفل کو چند ساعتوں کے لیے جامد (Pause) کر دیا ہو۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈری سی، سہمی سی۔۔۔ بڑے سے سفید دوپٹے کی آڑھ لے کر۔۔۔ آس پاس سے گزرتے مردوں کی نظر سے بچنے کی کوشش میں اس کا سونے جیسا رنگ گلابی آمیزش سے اور بھی تپنے لگا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی گھنی کالی پلکیں اُٹھیں اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنکھوں میں غرق ہو گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔؟ اگر لوگ اسی کو کیوپڈ کا وار کہتے ہیں تو

اس سے زیادہ بے رحم اور سفاک وار آج تک میں نے اپنی تمام زندگی میں نہیں جھیلا تھا ۔۔۔۔ جانے وہ لڑکی کون تھی ۔ سفید کرتے اور تنگ پاجامے میں ملبوس ۔۔۔۔ اس کے نازک سے سراپے نے جیسے اُس پوری محفل کو ٹاٹ کا بنا دیا تھا ۔۔۔۔ اور وہ خود اس ٹاٹ میں مخمل کے ایک پیوند کی طرح لگی بیٹھی تھی ۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکی کے علاوہ اس محفل میں دوسری کوئی حسین موجود نہ تھی ۔ وہاں تو نازنینوں کی بھرمار تھی ۔ ایک سے بڑھ کر ایک عشوہ طراز، نازک اندام مہ جبینوں کا جھرمٹ موجود تھا وہاں ۔۔۔۔ لیکن اس لڑکی میں جو ایک کونے میں اپنے جیسے ہی حلیے میں ملبوس ایک نسبتاً کم عمر کی لڑکی کے ساتھ چُپ چاپ خاموش سی بیٹھی تھی، جانے ایسی کیا بات تھی، وہ سر کے بالوں سے نکلی ایک لمبی سی شریرلٹ سے لے کر پاؤں میں پہنے نازک سے کھسّوں تک پورا ایک جہاں ہی تو تھی ۔ آس پاس سے گزرتے مرد اور عورتیں حیرت سے ان دو لڑکیوں کو دیکھتے جو کسی بھی طرح اس پارٹی سے اور اس کے ماحول سے میل نہیں کھا رہی تھیں ۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی ننھا سا ہاتھ میرے کوٹ کی آستین کھینچ رہا ہے ۔ میں اپنے خیالات کی رو سے باہر نکل آیا ۔ سنّی جانے کب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا ''چاچو ۔۔۔۔ میری بات تو سنیے ۔۔۔۔ میڈی چاچو'' ۔۔۔۔

مَیں اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن میرا دھیان اب بھی اسی لڑکی میں اٹکا ہوا تھا ۔ سنّی مجھ سے کچھ ناراض تھا ۔ ''جائیے چاچو ۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گا ۔ آج سب نے مجھے گفٹ دیے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک ۔۔۔۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پاس پڑی میز پر بٹھا دیا ۔ ''ارے یار ۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمھارا میڈی چاچو تمھیں آج کوئی گفٹ نہ دے ۔ بولو کیا چاہیے ۔ سنّی کے چہرے پر معصوم سی خوشی لہرائی اور وہ باقاعدہ سوچ میں پڑ گیا ۔ ''ہوں ۔۔۔۔ نیا پلے اسٹیشن ۔۔۔۔ دو جاکیز Jokies کے ساتھ ۔۔۔۔''

مَیں نے ہامی بھر لی ۔ ''چلو منظور ہے ۔۔۔۔ کل تک تمھارے روم میں موجود ہوگا ۔ اب خوش ۔۔۔۔'' سنّی نے خوشی سے نعرہ لگایا، ''اوہ چاچو ۔۔۔۔ یو آر گریٹ'' اب میں اپنے مطلب کی بات پر آیا ۔ ''لیکن یار ۔۔۔۔ آج تمھاری پارٹی میں کچھ نئے لوگ بھی نظر آ رہے

ہیں۔تم نے تعارف بھی نہیں کروایا ان سے''میں نے دور بیٹھی دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ وہ دونوں۔۔۔۔وہ تو ایمان آپی اور حیا باجی ہیں۔وہ جو ہیں نا میرے مولوی صاحب۔۔۔۔انہی کی بیٹیاں ہیں۔صرف میرے لیے آج یہاں آئی ہیں۔'' سنی میاں بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور میری نظریں اُسی قیامت کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔پتہ یہ چلا کہ جب ڈرائیور شاکر سنی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب تو گذشتہ رات سے بخار میں تپ رہے تھے۔ان کا تقریب میں شرکت کرنا ناممکن تھا۔لیکن سنی میاں مچل گئے کہ اگر مولوی صاحب کی طرف سے اس کی رسم کشائی کی تقریب میں کوئی شریک نہ ہوا تو سنی وہ تقریب ہی ملتوی کروا دے گا۔دراصل سنی پہلے بھی ڈرائیور کے ساتھ کئی مرتبہ مولوی صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کروانے جا چکا تھا۔کبھی خراب موسم کی وجہ سے اور کبھی مولوی صاحب کی اکلوتی سائیکل کی کسی خرابی کی وجہ سے،اور جب کبھی بھی مولوی صاحب سنی کے ساتھ کمشنر صاحب کی کسی گاؤں میں گھر آتے تو سنی کا گھر کا بنا ہوا خاص شکنجبیں پلوائے بناء، جانے نہ دیتے۔جو خود سنی کا بھی خاص پسندیدہ مشروب تھا۔ اور یہ مشروب بنانے والی ہوتیں سنی میاں کی ایمان آپی، یوں سنی مولوی صاحب کے تمام گھر والوں سے خوب گھل مل چکا تھا۔مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی سنی سے بہت مانوس ہو چکی تھیں۔شاید اسی لیے اس دن سنی کی ضد کے سامنے مولوی صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ ان کی بیوی تو ایسی تقاریب میں جانے کے نام سے ہی ہول کھاتی تھی۔سو انہوں نے دبے الفاظ میں چھوٹی بیٹی حیا کو سنی کے ساتھ بھیجنے کی تجویز دی۔عام طور پر مولوی صاحب ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے کچھ دیر کے لیے حیا کو جانے کی اجازت دے دی۔لیکن حیا نے اکیلے جانے سے صاف منع کر دیا تب کوٹھی کا پرانا ڈرائیور شاکر جو بہت دیر سے گھر کے دروازے پر گاڑی لیے سنی کے انتظار میں کھڑا تھا۔دروازے پر آیا اور تمام معاملے کی سن گن ملنے کے بعد اس نے بخار سے لرزتے کانپتے مولوی صاحب کو تسلی دی کہ حیا اور ایمان دونوں ہی اس کی اپنی بچیاں ہیں اور اسی کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئیں۔اُس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں بچیوں کو سنی میاں کی

خوشی کے لیے چاہے تھوڑی دیر کو ہی سہی، تقریب میں جانے کی اجازت دے دیں۔ شاکر خود انہیں رسم کشائی کے فوراً بعد واپس گھر چھوڑ دے گا۔ حیا کی حد تک تو مولوی صاحب اپنے دل کو منا چکے تھے لیکن ایمان نے تو جوانی کے بعد گھر کی دہلیز سے تنہا قدم باہر نہیں دھرا تھا، جانے کس بھاری دل سے انہوں نے شاکر کی یہ تجویز مان لی۔ جانے شاکر سے پرانی محلے داری کا پاس تھا یا پھر وہ سنی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے، لیکن جب تک دونوں لڑکیاں گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ نہیں گئیں وہ بے چینی سے گھر کے صحن اور باہر گلی میں کھڑی گاڑی تک کے چکر کاٹتے رہے۔ اور گاڑی کے چلتے چلتے بھی انہوں نے شاکر کو کئی مرتبہ کی دھرائی ہوئی ہدایات پھر سے دوبارہ یاددہانی کے طور پر دُہرا دیں۔

ہماری زندگی میں کب، کس موڑ پر کون سا حادثہ ہماری تاک میں ہے۔ یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی دانست میں محبت سے بڑا کوئی اور حادثہ ایسا نہیں جو ہماری زندگیوں میں وارد ہوتا ہو۔ اور ہم انسان اتنے مجبور اور لاچار ہوتے ہیں کہ ایسے ہر حادثے کا الزام لفظ ''کاش'' کو ہی دیے جاتے ہیں۔ کاش میں اس دن گھر پر ہی نہ ہوتا، کاش مولوی صاحب اس دن بیمار نہ ہوتے، کاش سنی انہیں لینے خود ان کے گھر نہ جاتا اور اگر چلا بھی گیا تھا تو ایمان امی کے ساتھ نہ آتی۔۔۔ کاش۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔

اس کے بعد اس تقریب میں کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ دوسری بار جب میں نے اس طرف نظریں دوڑائیں جہاں ایمان اور حیا سمٹی بیٹھی تھیں تو وہ جگہ خالی تھی۔ میں نے بے چینی سے تمام محفل چھان ماری لیکن ایمان جا چکی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ شاکر چونکہ مولوی صاحب سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ مغرب کی اذان سے قبل ان دونوں کو گھر واپس پہنچا دے گا۔ اس لیے ان دونوں نے تقریب کے خاتمے سے قبل ہی شاکر کو واپسی کا پیغام بھجوا دیا تھا۔ اور جانے کس لمحے وہ وہاں سے چلی بھی گئیں اور میں اپنی قسمت کو کوستا ہی رہ گیا۔

لیکن جاتے جاتے وہ لڑکی جیسے میرا بہت کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ پارٹی، وہ محفل جس میں چاروں طرف رنگوں کی برسات تھی، نور کا بسیرا تھا، قہقہے تھے۔ مسکراہٹیں تھیں۔۔۔۔ یکا یک یوں ویران ہو گئی تھی جیسے اچانک کسی نے اس محفل سے سب

رنگ نچوڑ لیے ہوں۔ یہ من سے من کا کیسا ناطہ ہوتا ہے کہ سینکڑوں کی بھیڑ کسی ایک کی وجہ سے اپنی سی لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہاں تو قصہ ہی یک طرفہ تھا، جو بھی طوفان اٹھ رہے تھے وہ صرف میرے من میں تھے۔ ایمان تو اس سب سے بالکل بے خبر تھی۔ اگر لوگ جسے محبت کہتے ہیں، وہ اسی جذبے کا نام تھا جو اس وقت میرے خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا تو کیا یہ محبت اس قدر زور آور ہو سکتی تھی کہ وہ صرف یک طرفہ ہو کر بھی کسی انسان کی زندگی کے سبھی انداز ۔۔۔۔ سبھی اطوار بدل کر رکھ دے۔۔۔۔؟

OO

لندن اُداس ہے

کہتے ہیں نیند سب سے بڑی چور ہوتی ہے، وہ انسان کی آدھی عمر چرا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے میری یہ چور بھی روٹھی ہوئی تھی۔

جانے رات کے کس پہر کامران نے لاؤنج میں جھانکا اور مجھے وہیں آتشدان کے پاس آرام کرسی پر آنکھیں موندھے لیٹے دیکھ کر مجھ پر کمبل ڈال گیا۔ رات یونہی ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے جانے کب بیت گئی اور اس کی جگہ صبح کے اُجالے نے لے لی۔ رات بھر برف باری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کامران نے ناشتے کے دوران مجھے آفر کی کہ وہ مجھے ریسٹورنٹ جاتے ہوئے ''کنگسٹن (Kingstone)'' یونیورسٹی چھوڑتا جائے گا۔ لیکن میں نے اُسے بتایا کہ میں تنہا ہی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک گھر سے نکل جاؤں گا، وہ ریسٹورنٹ چلا جائے۔ ویسے بھی اُسے صبح جلدی پہنچ کر اپنے کاروبار کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ اور میرا اتنی صبح گھر سے نکلنے کا قطعی کوئی موڈ نہ تھا۔ اور پھر لندن میرے لیے کبھی بھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ ایک عجیب سی اُنسیت اور اپنا پن تھا میرے لیے اس شہر میں، شاید اس کی ایک وجہ اس کے موسم کی میرے آبائی شہر کوئٹہ کے موسم سے مماثلت بھی ہو سکتی تھی۔ نہ صرف موسم بلکہ پُرانے لندن میں جہاں اب تک تقسیم ہند سے پہلے وقتوں کی عمارتیں اور تعمیرات موجود تھیں ان میں سے بعض کی بناوٹ تو ہو بہو 1935ء کے زلزلے سے پہلے والے کوئٹہ کی عمارات کی طرح ہے۔ بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ کوئٹہ تقسیم ہند سے قبل خود برٹش ایمپائر کی بہت بڑی چھاؤنی رہ چکا تھا اور اسے آباد کرتے وقت انگلش ہنرکاروں نے فنِ تعمیرات میں اینٹ کا رخ، عمارت کی بیرونی اُٹھان اور طویل اور چوڑی سڑکوں کی کشادگی دیتے وقت شائد لندن ہی کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اور پھر صرف میرے شہر پر ہی کیا منحصر ہے ۔۔۔۔ تقسیم سے قبل انگریز جن علاقوں میں بھی رہا (خاص کر سرد علاقے) وہاں کی طرزِ تعمیر

ایک مخصوص روایت کو ہی جنم دیتی محسوس ہوتی ہے۔ وہی ٹین کے سُرخ چھت، وہی مخصوص بالکونیاں اور انگیٹھیاں، وہی ایک جیسے آتش دان اور ان پر بنے کارنس، ایک جیسے لکڑی کے بڑے بڑے دروازے جن پر انگلش کے نمبر سات کی شکل کے بڑے بڑے تختے کندہ ہوتے تھے۔ وہی اُونچے اُونچے چھت اور ان میں بنے بڑے بڑے روشن دان جنھیں کھولنے اور بند کرنے کے لیے رسی یا ڈوری ٹنگی ہوتی تھی۔ اس لیے آج بھی اگر آپ پُرانے لندن کی گلیوں سے گزریں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ برصغیر کے دور کی کسی بڑی چھاؤنی میں آ گئے ہیں۔

مَیں جب تک گھر سے نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ برف صاف کرنے والی مشین نے سڑکوں سے برف ہٹا کر کناروں پر کر دی تھی۔ برف باری کے بعد نکلنے والی دھوپ بے حد چمک دار ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت کے ان دیکھے ہاتھ نے آس پاس کی سب چیزوں پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ مخصوص رنگ کی پکی اینٹوں سے بنی سڑک تمتما سی رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک خاص سی چمک تھی۔ یہ موسم بھی ہم انسانوں کی طبیعت پر کس کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے انسان کو پل میں خوش یا اُداس کر دیتے ہیں۔ بلا کسی بھی وجہ کے، لیکن میرے لیے تو جیسے ہر موسم میں اُداسی ہی اتر آئی تھی۔ سو لندن بھی مجھے اُداس لگ رہا تھا، چمکتی دھوپ کے باوجود، آس پاس کھلے ہوئے سے چہروں کی موجودگی میں بھی ایک گہری اُداسی تھی۔

گھر سے نکل کر میں پیدل ہی تیسری گلی کے سب وے کی جانب چل پڑا۔ دھوپ کی چمک نے مجھے آنکھوں پر گہرا کالا دھوپ کا چشمہ پہننے پر مجبور کر دیا۔ کاش انسان ایسے گہرے رنگوں کے چشمے بھی بنا پاتا جو دکھوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دھوپ کو بھی روک سکتے۔۔۔۔

گلی کے اختتام پر ایک اسپینش (Spanish) لڑکی گٹار پر کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کے سامنے اسی گٹار کا بڑا سا کالا کیس Case رکھا ہوا تھا جس میں آتے جاتے لوگ چند لمحے گٹار کی دل کو چھو لینے والی دھن سننے کے بعد چند سکّے ڈال کر آگے بڑھ جاتے، مانگنے کا کس قدر آبرومندانہ طریقہ تھا یہ۔ کچھ لوگ مانگتے بھی یوں ہیں کہ دینے والے کو ان کا حق لگتا ہے، اور کچھ لوگ اپنا حق بھی کچھ ایسے انداز میں وصول کرتے ہیں کہ دینے والا بھیک کی طرح

دیتا ہے۔

لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ وہ اس وقت گٹار پر ایک مشہور ہسپانوی گیت کی دھن بجا رہی تھی جس کے بول کچھ یوں تھے کہ "میرے محبوب ۔۔۔۔ اک تمھارے جانے کے بعد ۔۔۔۔ ہر منظر اُداس ہے ۔۔۔۔ ہر شہر ویران ہے۔" میں نے حیرت سے اس گٹار بجانے والی لڑکی کو دیکھا ۔۔۔۔ اُسے میرے دل کے حال کا کیسے پتہ چل گیا ۔۔؟ ۔۔ شائد محبت کو کھو دینے کے تجربے سے گزرنے والے سبھی چہروں کی تحریر ایک سی ہی ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ جیب میں گیا اور واپسی پر جتنے بھی سکے اس ہاتھ میں آئے، وہ سبھی مَیں نے لڑکی کے گٹار میں ڈال دیے اور خود آگے بڑھ گیا۔

سب وے میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زمین دوز ریلوے اسٹیشن مختلف روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور اکا دکا لوگ ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے، بھیڑ نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور یہ وقت دفتری اوقات کار کا نہ تھا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر ایک مخصوص سی گرج کے ساتھ سب وے میں داخل ہوئی۔ خودکار دروازے کھل گئے اور ہم سب مسافر اس میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ انسان نے انسان کی آسانی کے لیے کیسی کیسی ایجادات کی ہیں۔ ہماری زندگی کا شاید ننانوے فیصد سکھ دوسروں کی تیار کردہ ایسی ہزاروں چیزوں کا مرہون منت ہوتا ہے، سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک سبھی کچھ جو ہمارے روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے۔ وہ سبھی کوئی اور ہمارے لیے بنا کر گیا ہے۔ ہم صرف چند سکّے خرچ کر کے ان ایجادات کے آرام و سکون کے حق دار بن سکتے تھے۔ شاید اسی بات نے ان سکوں کے حصول کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے ۔۔۔۔

لیکن سکون کا حصول صرف ان سکّوں سے ہی تو مشروط نہیں ہوتا ۔۔۔۔ دل کا سکون کائنات کی ایک ان مول کیفیت ہے۔ اور اس بات کا صحیح اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس کے اپنے دل کا سکون لُٹ چکا ہو۔ ہم انسان بھی کتنے نادان ہوتے ہیں، جب تک دل کا قرار اپنے قابو میں ہوتا ہے۔ ہم اسے بازاروں میں لُٹ جانے کے لیے پھرتے ہیں، ہر طرف اٹھتی نگاہ کا بس ایک ہی حاصل ایک ہی منزل ہوتی ہے ۔۔۔ کوئی دلبر ۔۔۔۔ کوئی محبوب ۔۔۔۔ اور جب وہی دلبر ہم سے ہمارا چین و سکون لے اُڑتا ہے تو پھر ہم اس کی ہی دُھائی

دیتے پھرتے ہیں۔

انہی اُلٹے سیدھے خیالات کی یورش میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ٹیوب ٹرین میرے مطلوبہ سب وے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اور کب رکی۔ یہ تو اچھا تھا کہ آخری چند لمحوں میں سامنے جگمگاتے ہوئے نیون سائن پر میری نظر پڑ گئی جس پر 17 ڈاؤننگ سٹریٹ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ مجھے جیسے ہوش سا آ گیا اور میں ٹرین کے دروازے بند ہونے سے قبل ہی نیچے اُتر آیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر کی سڑک تک پہنچا۔ اب یہاں سے 9 نمبر کی لندن کی مشہور و مخصوص سُرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سے ایک بس مجھے سیدھا یونیورسٹی کے گیٹ تک پہنچا سکتی تھی۔

لندن بالکل ویسا ہی تھا جیسے میں اسے دو سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بوڑھا برگد کا درخت اب بھی ویسے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے مجھے پھر سے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ انگریز ایسی باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ صرف اس درخت کو بچانے کے لیے انہوں نے چند سال پہلے اپنے ماسٹر پلان کے نقشے میں یہاں سے گزرتی سڑک کا رخ موڑ دیا تھا کیونکہ اگر سڑک لندن ماسٹر پلان کے تحت بنتی تو اس درخت کا کٹنا لازمی تھا، لیکن انگلش ایک روایت پرست اور ماضی پرست قوم ہے۔ وہ اپنی یادوں کو، اپنی تاریخ کو اتنی آسانی سے مسخ نہیں ہوتے دیتے، بلکہ اُسے بچانے کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قوم نے برسوں اس دنیا پر راج کیا ہے۔ سچ ہے۔۔۔ قومیں یونہی نہیں بن جاتیں، اس کے پیچھے صدیوں کی تربیت اور حوادث کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں میری مطلوبہ سرخ ڈبل ڈیکر بس دھیمی سی رفتار سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی اور میں بس میں سوار ہو گیا۔ یونیورسٹی کے راستے میں میرا پُرانا دوست، میرا ہم راز اور میرا مہربان دریا، دریائے ٹیمز (River Thames) پڑتا تھا۔ میرے لڑکپن کی کئی شامیں اور جوانی کی کئی راتیں اس دریا کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت لکڑی کے بینچوں پر گذری تھیں۔ وہ پل، جنھیں اب میں یاد کر رہا تھا تو جیسے سب اک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پک نکس وہ نئے نئے فلرٹ، وہ کچی محبتیں، ٹیمز کا پانی مجھے دیکھ دیکھ کر مستی میں ہلکورے لے رہا تھا جیسے وہ میری لندن آمد سے

ہت خوش ہو، بس دریا کے ساتھ بنی ہوئی چوڑی سی سڑک پر بڑھ رہی تھی اور دریا ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پُرانے محلے میں جب کوئی چمچماتی کار یا بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے تو محلے کے بچے اس گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے موسم، درخت عمارتیں اور اس جیسے دریا، یہ ہمیں کس کس روپ میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہنستے ہوئے ۔۔۔۔ کبھی روتے ہوئے ۔۔۔۔ خوشی، غم ۔۔۔۔ غرض ہماری زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ہمارے اردگرد بستے اس ماحول سے پوشیدہ ہوتا ہے، شاید اسی لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی روتے ہیں، شائد ہر موسم ہمارے اندر کے موسم سے جڑا ہوتا ہے۔

بس یونیورسٹی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں یونیورسٹی کے عظیم الشان آہنی جنگلے کے گیٹ سے اندر بنی اینٹوں کی سڑک پر آ گیا۔ یہ بہت بڑے گھاس کے دالانوں پر مشتمل ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر سے دریائے ٹیمز کی ایک چھوٹی سی شاخ گھاس کے عظیم میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور دور تک بہت بڑے بڑے اور اونچے درخت ایستادہ تھے، جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے سفید لباسوں میں ملبوس بوڑھے بزرگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دریا کے پانی کے اوپر شفاف برف کی ایک سل نما تہہ بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے دریا کا پانی بہتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور برف کے اس ماحول میں اس کے اونچے لمبے ستون اور باقی عمارت بھی برف ہی سے بنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایڈمن ڈیپارٹمنٹ سے فارم لے کر میں نے بھر دیے تھے اور میری کلاسز دو دن کے بعد سے شروع ہونا تھیں۔ پتہ چلا کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ایک یہودی نژاد مسٹر آئزک ہیں جو خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہ صبح گیارہ بجے کی کلاس کے بعد شہر میں ہونے والی کسی تعلیمی تقریب میں چلے گئے ہیں جس میں وہ بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ میرا اب یونیورسٹی میں مزید ٹکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا میں اسی راستے سے واپسی کی بس لے کر سب وے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے اور یہ

دفتری اوقات کے مطابق دن کے کھانے کا وقت تھا۔ لہٰذا سب دے میں بھی صبح کی نسبت زیادہ چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے فی الوقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کافی اور ایک سینڈوچ کا لنچ کرنے قریبی ریستوران میں داخل ہو گیا۔ قدرت نے ہم انسانوں کو ان کی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس دلانے کے لیے اس دنیا میں جن اور بہت سی چیزوں کا اہتمام کر رکھا، وہیں بھوک بھی ان مجبوریوں میں سے ایک ہے، بڑے سے بڑا قد آور اور شہہ زور اس مجبوری کے آگے بے بس ہے۔

اور عزیز سے عزیز ترین رشتہ بھی بھوک کے اس احساس کو مٹا نہیں سکتا۔ ہم اپنے آس پاس روز کیسے کیسے دلداروں کو جان سے زیادہ عزیز رشتوں کو خود سے جدا ہوتا اور مرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان سے جڑے بے بس انسان جو اس لمحے خود کو بھی مٹتا محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ جن کی بھوک پیاس سب ختم ہو چکی ہوتی ہے، جنھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بے جان جسم کے ساتھ ان کا لاشہ بھی قبر میں اُتار دیا گیا ہے اور اب وہ کبھی اس جیتی جاگتی دنیا کے ساتھ چل نہیں پائیں گے۔ جن کا ہر احساس اس لمحے مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن 24 یا 48 گھنٹوں کی مختصر مدت کے بعد ہی یہ معدہ انسان کو اس کی کم ظرفی، بے بسی اور مجبوری کا احساس دلانے کے لیے جاگ اٹھتا ہے، بھوک اسے ستانے لگتی ہے۔

انسان اپنے اندر اپنے آپ سے ہی نفرت اور شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے ہی تو وہ اپنے اندر کتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مٹی میں مل جانے کے دعوے، سب تیاگ دینے کے دعوے، لیکن سچ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ بے بس مخلوق بھی دوسری اور کوئی نہیں۔ ہاں البتہ ایسے موقعوں پر اسی کے جیسے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے خود ساختہ اصول اس کے کام آ جاتے ہیں اور شرم کا کچھ پردہ رہ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے ''میت کے گھر تین دن تک کھانا نہیں پکے گا، بھلا اس سوگ میں ان بے چاروں کو کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہوگا؟ دوسرا کہتا ہے، ہاں ہاں ٹھیک ہے، پہلے دن کا کھانا تو ہمارے گھر سے ہی آئے گا، دوسرا دوسرے دن کا اور کوئی تیسرا تیسرے کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ آتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کل جب ان کے گھر میں یہ ماتم ہوگا تو تب بھی یہی سب اس کی دلجوئی کو وہاں موجود ہوں گے۔ اس کی شرم کا پردہ رکھنے میں اس کی مدد کریں

گے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ انسان بہترین معاشرتی جانور ہے۔

OO

گھر واپس پہنچنے تک شام ہو چکی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا، گلی کے پچھواڑے وہی کل والے شرارتی بچے پھر سے جمع تھے اور اپنے کل کے بنائے ہوئے برف کے پتلے کی باقیات سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سردیوں کی شام کی دھوپ پلک جھپکتے ہی کسی ستم گر محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ہوا میں خنکی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، لوگوں نے اپنے اوور کوٹس کے کالر اوپر چڑھا لیے تھے اور سانس لیتے اور بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔ گٹار بجانے والی لڑکی نے اپنا گٹار اپنے بکس میں رکھ دیا تھا اور اب وہ بھی روانگی کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مانوسیت کی ایک چمک لہرائی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سر کے اشارے سے اسے سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ رات کامران بھی جلد ہی واپس آ گیا تھا اور ہم نے سڑک کے کنارے دوسرے بلاک کے ایک چھوٹے مگر پُرسکون سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اور اب ہم اسی ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں اپنی ٹیبل کے گرد بیٹھے سوپ کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کامران نے آس پاس بیٹھی لڑکیوں اور خواتین کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی حتمی رائے صادر کر دی تھی۔ اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولا ''مرد عورتوں سے اس اُمید پر شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہیں گی جیسے وہ شادی کے وقت ہوتی ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس اُمید میں شادی کرتی ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ لیکن افسوس، بعد میں دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔

میں نے غور سے اُسے دیکھا ''شاید اسی لیے تم نے اب تک شادی نہیں کی۔'' کامران مسکرایا، ''خیر میری بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ آج یونیورسٹی میں دن کیسے گزرا۔'' میں نے نیپکن میز سے اٹھا کر اپنے ہونٹ خشک کیے۔ ''کچھ خاص نہیں۔ بس فارم ہی بھر سکا، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ موجود نہیں تھے۔''

کامران بولا۔ ''تم مسٹر آئزک کی بات کر رہے ہو۔ آج کل اخبارات میں اس کا بڑا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس جیسے کٹر یہودی نے ایک پاکستانی

مسلمان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ کیسے دے دیا اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا۔'' مجھے کامران کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ''کیوں۔۔۔۔ کیا وہ آدم خور ہے جو مجھے کھا جائے گا؟''

کامران سنجیدہ تھا، ''تم ان یہودیوں کی طبیعت سے واقف نہیں ہو شاید۔ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اندازہ ہم جیسے دیار غیر میں بھٹکتے ہوئے مسلمان ہی ٹھیک لگا سکتے ہیں۔ جنھیں ہر بزنس کے معاملے میں ان یہودیوں کی نفرت اور مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فی الحال ان یہودیوں نے ہمیں بزنس کے معاملے میں مکمل مات دے رکھی ہے۔''

مَیں نے سوال کیا، ''لیکن تم لوگوں نے اور یہاں کی دوسری بزنس کمیونٹی نے کبھی ان وجوہات پر غور کیا ہے جو ان یہودیوں کی تجارتی کامیابیوں کا راز ہیں۔''

کامران نے گہری سی سانس لی۔ ''بات بالکل صاف ہے۔ یہودی کبھی تلخ کلامی سے کام نہیں لیتا، اور بزنس کا پہلا اُصول ہی خوش اخلاقی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے ہونٹوں سے چپکی مخصوص مسکراہٹ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دوسری اہم وجہ ہے ایک یہودی کا دوسرے یہودی تاجر کا خیال رکھنا چاہیے دو یہودی تاجر آپس میں بدترین اور جانی دشمن بھی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کا کلائنٹ کوئی ایسی چیز طلب کرتا ہے جو پہلے یہودی کی دوکان پر میسر نہ ہو، تب بھی وہ خود پیدل چل کر اس خریدار کو اس جانی دشمن یہودی کے پاس لے کر جاتا ہے جہاں اسے وہ ضروت کی چیز مل سکتی ہو۔ یہودی کبھی کسی غیر یہودی کو متعارف نہیں کرواتا۔ یہی اس یہودی تجارت کے پنپنے کا راز بھی ہے۔''

میں کامران کے خیالات سے کسی حد تک متفق بھی تھا لیکن میرے خیال میں اس نے یہودی تاجروں کی سب سے بڑی معصومیت کا تذکرہ اب تک نہیں کیا تھا۔

''تم سب سے اہم خصوصیت کا تذکرہ کرنا بھول گئے ہو۔ وہ ہے ایمان داری۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے تاجر اتنے خوش اخلاق اور ٹھنڈے مزاج کے نہیں ہوتے۔۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی کبھی باز نہیں آتے۔ ہمارا اُصول ہے کہ اپنا فائدہ ہو نہ ہو۔۔۔۔ لیکن دوسرے کا نقصان ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان سب سے زیادہ بڑی وجہ ہے بے ایمانی۔ اور یہودی تجارت میں بے ایمان نہیں ہوتے۔۔۔۔ میرے

خیال میں ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔"

ہم دونوں کھانا کھا چکے تھے اور اَب پیدل ہی واپس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ تھے۔ کرسمس کا تہوار قریب آ رہا تھا لہٰذا آس پاس خریداروں کی چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ جا بجا کرسمس کے نمائشی درخت مخصوص جلتے بجھتے قمقموں سے سجے جھلملا رہے تھے۔ لوگ سردی سے بے نیاز ہو کر خود کو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ آس پاس کی جگمگ کرتی دوکانوں سے خریداری کر رہے تھے۔ شاید دنیا کا ہر تہوار ایک سا ہی ہوتا ہے۔ سبھی تہواروں کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے۔ اور سبھی تہواروں کے اصل شوقین بچے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس وقت بھی لندن کے اس بارونق بازار میں زیادہ تر تعداد بچوں کی ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو عید کی رات یا چاند رات سے کئی راتیں قبل ہی ہماری نیند جیسے اڑ ہی تو جاتی تھی۔ اور عید کی رات تو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبح ہو جاتی تھی۔ عیدی ملنے کی خوشی اور پھر اس سے بھی زیادہ اس عیدی کو خرچ کرنے کی خوشی۔ لیکن عید کا پورا دن ہاتھ سے یوں نکل جایا کرتا تھا جیسے بند مٹھی سے ریت۔ شاید چیزوں یا تہواروں کی خوشی کا تعلق ان کی کمیابی اور تھوڑے ہونے سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ آس پاس پھرتے لوگوں کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ یہ چہرے بھی کیسا آئینہ ہوتے ہیں۔

گھر پہنچتے ہی کامران بستر میں گھس گیا کیونکہ اسے اگلی صبح جلد نکلنا تھا، آج اس نے ایمان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی عادتوں سے خوب واقف تھے۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ میں جب سنبھل جاؤں گا تو خود ہی اُسے سب بتا دوں گا، اس سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔ میں نے لائٹ بند کرنے سے پہلے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے رسالوں کی ورق گردانی کی ناکام کوشش کی لیکن پھر آخر کار بتی بجھا دی، لیکن کمرہ اندھیرا ہوتے ہی دماغ کے دریچے روشن ہو گئے۔ یادیں بُری ہوں یا بھلی، دونوں صورتوں میں یادِ ماضی عذاب ہی تو ہے۔

OO

ایمان

سنّی کے پہلے پارے کی دُعائیہ تقریب تو گزر گئی لیکن اس کے بعد جیسے میرے شب و روز ہی بدل گئے۔ مَیں خود جان نہیں پا رہا تھا کہ یہ بے چینی کیسی ہے۔؟۔۔۔ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود میں اس قدر تہی دست اور بے بس سا کیوں ہوتا جا رہا ہوں۔ دل کہیں بھی تو نہیں ٹک پاتا تھا۔ بھیڑ میں ہوتا تو لوگوں سے دور بھاگتا، تنہا ہوتا تو گھبرا کر نیچے لاؤنج میں جا بیٹھتا۔ مولوی صاحب کی بیماری نے بھی طول پکڑ لیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس دن کی بے آرامی کی وجہ سے بخار زور پکڑ گیا تھا۔ لہٰذا اگلا پورا ہفتہ وہ سنّی کو درس دینے نہ آ سکے۔ اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے ان کے نہ آنے سے میری کوئی بہت اہم اور بہت قیمتی چیز مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

یہ اسی ہفتے کی ایک گرم سہ پہر کی بات ہے۔ میں گھر کے دالان میں پیڑوں کے نیچے ڈلی ہوئی آرام کرسیوں میں سے ایک پر آنکھیں موندھے پڑا ہوا تھا۔ گرمیوں کی دوپہریں بھی کتنی لمبی ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج ایک ہی جگہ ٹک کر رہ گیا ہے یا شاید مجھ جیسے شوریدہ سروں کو ہی ان کی بے جا طوالت سے اختلاف تھا، جن کے دلدار کہیں بستے ہوں گے شاید وہ ان سے لمبی ملاقات کے لیے ایسی سہ پہروں کی دُعائیں مانگتے نہ تھکتے ہوں۔۔۔

مَیں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے سنّی میاں شاکر ڈرائیور کے ساتھ شور مچاتے اور اُچھلتے کودتے برآمد ہوئے۔ شاکر کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھرماس تھے اور سنّی کے ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ٹوکری۔ سنّی نے مجھے دالان میں دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آیا۔

''چاچو۔۔۔ دیکھیں میں نے کتنی بہت سی آئس کریم جمع کی ہے۔'' سنّی نے شاکر کے ہاتھوں میں پکڑے جہازی سائز کے تھرماسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سنّی کے کان

پکڑے، ''ہوں۔۔۔تو یہ بات ہے۔دوپہر کو مما سے چھپ کر پکنک منائی جارہی ہے۔''

سنی ہنسا ''نہیں چاچو۔مما تو دادی کے ساتھ کب کی شاپنگ کے لیے جا چکی ہیں۔یہ سب کچھ تو ہم مولوی صاحب کے لیے لے جارہے ہیں۔'' مولوی صاحب کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوگئے۔''کیا مطلب؟ کیا مولوی صاحب کو ڈاکٹر نے بخار میں پیٹ بھر کر آئس کریم کھانے کا کہا ہے؟''

سنی ہنس پڑا، ''افوہ۔۔۔چاچو آپ بھی۔۔؟۔۔مولوی صاحب کے لیے تو ہم یہ پھل لے کر جارہے ہیں۔آئس کریم تو ایمان آپی اور حیا باجی کے لیے ہے۔۔۔اب سمجھے۔''

اتنے میں شاکر گڑگڑایا۔''حماد بابا۔۔۔اب آپ ہی سمجھاؤ نا سنی میاں کو۔۔۔۔اگر سجاد میاں کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہو جائیں گے۔لیکن یہ سنی میاں تو مستقل ضد کیے جارہے ہیں۔گھر میں اس وقت کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں، جس سے ہم اجازت لے سکیں۔''

سنی نے منہ بسورا ''مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔اس سے ثواب ملتا ہے۔پھر ثواب کے کام کے لیے کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ہے نا میڈی چاچو۔''

پھر جیسے کسی خیال سے سنی کی آنکھیں اپنے آپ ہی چمکنے لگیں۔اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔''آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں نا میڈی چاچو۔ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔'' میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔یوں لگا جیسے سنی نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔شاکر نے بھی فوراً سنی کا ساتھ دیا۔''ہاں حماد بابا۔۔۔آپ ساتھ چلیں گے تو میری بھی کچھ بچت ہو جائے گی۔ورنہ آپ سجاد میاں کے غصے سے تو واقف ہیں۔''

اب تو سنی نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔نتیجتاً ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور جاتے ہوئے گیٹ پر دربان کو شاکر نے بتا دیا کہ سنی اپنے میڈی چاچو کے ساتھ کہیں گھومنے جارہا ہے۔گھنٹہ بھر میں واپس آ جائیں گے نہ شاکر نے جان بوجھ کر شاید مولوی صاحب کے گھر کا تذکرہ نہیں کیا۔وہ جانتا تھا کہ میرے گھر والے ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے کے قائل ہیں۔لیکن سنی کا معصوم ذہن ابھی تک زمانے کی ان منافقانہ ترکیبوں سے کوسوں دور تھا۔رہی میری بات، تو مجھے

شاکر اس عمر سے جانتا تھا جس میں اب سنی تھا۔ خود میں بچپن میں اسکول سے واپسی پر شاکر سے ایسی ہی بے جا فرمائشیں کرتا تھا۔ کبھی اسکول کے سامنے کھڑے ہوئے ٹھیلے سے برف کے ٹھنڈے گولے کھانے کی فرمائش، کبھی ایک مخصوص ریڑھی کے بکس میں نمک اور برف میں جمی دودھ کی قلفیاں کھانے کی ضد، تو کبھی سر پہ فالسوں کی ٹوکری رکھے، آواز لگاتے بوڑھے بابے سے فالسے دلوانے کی فرمائش، شاکر گھر والوں سے چھپ کر میری ضدیں پوری کرتا جاتا اور جب کبھی میرا اگلا خراب ہوتا تو امی حیرت سے بڑبڑاتیں۔ ''اس نے تو کبھی باہر کی کوئی چیز چکھی بھی نہیں۔'' اور تب میں اور شاکر امی اور گھر کے فیملی ڈاکٹر سے نظریں چرا کر مسکراتے۔ گھر میں واحد میں ہی تھا جس سے شاکر اپنے دل کی بات کھل کر کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے گاڑی مولوی صاحب کے گھر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے ویسے میرا دل جیسے دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔ جانے یہ کیسی کیفیت تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار شاعروں کے وہ سارے شعر اور قصیدے جو انہوں نے اپنے کسی محبوب کے گھر کے راستے کے بارے میں کہے تھے، یکا یک یاد آنے لگے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اگر اس وقت میں ذرا سی کوشش کرتا تو ایک آدھ شعر تو میں خود بھی کہہ ڈالتا۔ شائد ہم سب کے اندر کہیں نہ کہیں ایک شاعر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بس اُسے ذرا اِک تحریک ملنے کی بات ہے۔ لفظ خود بخود ذہن و دل میں وارد ہونے لگتے ہیں۔ قافیے جڑنے لگتے ہیں، ردیفیں خود بخود ملتی جاتی ہیں اور شعر سرزد ہونے لگتے ہیں۔

گاڑی شہر کے پُرانے حصے میں واقع ایک چھوٹے سے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ حسب معمول محلے کے میدان میں چند بچے گھر والوں سے نظر بچا کر سہ پہر کو اپنا گیند بلا لے آئے تھے اور کرکٹ کا میچ جاری تھا۔ گاڑی کے داخلے پر سب بچوں کی توجہ گاڑی کے جانب مبذول ہوگئی۔ چند ایک بارہویں اور تیرہویں کھلاڑی نما بچوں نے کچھ دیر تک گاڑی کے ساتھ دوڑ لگائی۔ گاڑی کچھ مکانوں کی دو رویہ قطاروں کے سامنے سے گزرتی ہوئی بائیں کو مڑ گئی اور دوسری گلی میں کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ جانے کیوں میرا حال کچھ ایسا تھا کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ کیسا عجیب سا احساس تھا۔ صرف ایک دیوار کی دوری پر وہ نازنین کہیں چل پھر رہی تھی۔ اور یہ جو سامنے لکڑی کا پُرانا سا دروازہ

تھا، جانے کتنی بار اس کے کومل ہاتھوں نے اس کے کواڑوں کو تھاما ہوگا، اور یہ گلی ۔۔۔۔ یہ راستہ ۔۔۔۔ جانے کتنے بار اس کے نازک قدم ان راہوں پر پڑے ہوں گے ۔۔۔۔ اس فضا میں اس کی باتیں ۔۔۔۔ اس کی جلترنگ جیسے ہنسی جانے کتنی بار گونجی ہوگی ۔۔۔۔ یہ چھوٹا سا محلہ ۔۔۔۔ یہ پکی اینٹوں سے بنی گلی یک دم ہی مجھے دنیا کی سب سے حسین جگہ کیوں لگنے لگی تھی ۔۔۔ کسی ایک اجنبی کی موجودگی آس پاس کے پھیکے نظاروں کو اس قدر رنگین کیسے بنا سکتی ہے؟

میں انہی خیالات میں گم تھا۔ سنی اور شاکر گاڑی سے اُتر کر مولوی صاحب کے گھر کے اندر جا چکے تھے۔ شاکر نے مجھے بھی اُترنے کی درخواست کی تھی لیکن میں تو جیسے گاڑی میں ہی جم کر رہ گیا تھا۔ میری حالت اس وقت ایک ایسے سوالی کی سی تھی جو صدیوں سے ایک ہی در کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو ۔۔۔ پر وہ در اس کے لیے کبھی نہ کھلے ۔۔۔۔

اچانک دھڑ سے لکڑی کا دروازہ کھلا اور اُس میں سے آگے آگے بوکھلائے ہوئے اور سٹپٹائے سے مولوی صاحب اور ان کے پیچھے پریشان شاکر تیزی سے باہر نکلے۔ میں بھی ہڑبڑا سا گیا۔ مولوی صاحب نے آتے ہی شدت سے معذرت اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا کہ یہ شاکر کی نالائقی ہے کہ اس نے میری باہر گاڑی میں موجودگی سے انہیں آتے ہی مطلع نہیں کیا ورنہ وہ اتنی دیر مجھے گاڑی میں یوں بیٹھے رہنے کی زحمت کبھی نہ دیتے۔ تو کیا مجھے باہر گاڑی میں بہت دیر ہو گئی تھی؟ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میں ابھی چند لمحے پہلے ہی یہاں آیا تھا۔

مولوی صاحب کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی اور وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے، یہ ایک چھوٹا لیکن بے حد صاف ستھرا مکان تھا۔ صحن کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا برگد کا درخت شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔ درخت کے اردگرد پکا چوبارہ سا بنا دیا گیا تھا۔ درخت کی شاخوں سے ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گلابوں کی چھوٹی چھوٹی سی کیاریاں تھیں جن میں سلیقے سے پھول اگائے گئے تھے۔ صحن کے سامنے ہی ایک لمبا سا برآمدہ تھا جسے لکڑی کی جافریوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ برآمدے کے پیچھے شاید گھر والوں کے رہائشی کمرے تھے، اور شاید وہی زنان خانہ بھی تھا۔ برآمدے کے

آخری حصے میں لکڑی کی جالیوں (جافریوں) کی پارٹیشن میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اسی طرف لیے بڑھ گئے۔ شاید یہی اس چھوٹے سے گھر کا مہمان خانہ یا بیٹھک بھی تھی۔ بیٹھک والے برآمدے کے حصے کو اندر سے بھی لکڑی کی جالی نما پارٹیشن سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں بے خود اور سحر زدہ سا مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اندر سے سنّی کے زور زور سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں، انہی آوازوں میں ایک آدھ نسوانی ہنسی اور باتوں کا جلترنگ بھی شامل تھا۔ میری تو جیسے سانسیں ہی رکنے لگی تھیں۔ وہ مختصر سی بیٹھک یا ڈرائنگ روم گھر والوں کی نفاست کی آئینہ دار تھی۔ مختصر سا پُرانا فرنیچر، سلیقے سے کڑھے ہوئے پوش (کورز) سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے کارنس پر غالب کا دیوان اور چند دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں اور نقوش رسالے کے چند ایڈیشن سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ لگتا تھا گھر کے مکینوں کو اُردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ میرا ذہن پھر سے بھٹکنے لگا۔ جانے کتنی بار اس کی مخروطی انگلیوں نے ان کتابوں کے ورق پلٹے ہوں گے؟ دن میں جانے کتنی بار وہ یہاں آتی ہوگی۔ اور کون جانے وہ گھنٹوں یہاں اسی جگہ بیٹھی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتی ہوگی جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے لہجے میں اَب بھی معذرت تھی۔

''میاں یہ آپ نے بڑی زیادتی کر دی۔۔۔۔ پہلی مرتبہ اس غریب خانے پر تشریف لائے اور یوں دروازے پر ہی کھڑے رہے۔۔۔۔ یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں لیکن۔۔۔''

میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹ دی۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بس یونہی۔۔۔۔'' شاکر نے جلدی سے بات بنائی۔ ''حماد بابا کا خیال تھا کہ ہم دروازے سے ہی سامان دے کر لوٹ آئیں گے۔''

مولوی صاحب نے ناراضگی سے شاکر کی طرف دیکھا۔

''بھئی تم تو ہم سے کوئی بات نہ ہی کرو شاکر بھیا۔ پہلی مرتبہ صاحبزادے اس گھر تک آئیں اور ہم انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیں۔ یہ کہاں کی روایت ہے بھلا۔'' مولوی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے بچھ بچھ جائیں۔ جانے یہ پُرانے طرز کی روایتی وضع داری ہم جیسے امیروں کی بڑی بڑی کوٹھیوں اور حویلیوں سے کہاں غائب ہوتی جا رہی تھی۔

ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے اندر جا کر کیا کھسر پھسر کی کہ چند لمحوں میں ہی باہر کسی طرف بنے نعمت خانے سے مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں اور مہک کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے مولوی صاحب کو روکا۔

''آپ کوئی تکلف نہ کریں، ہم بنا بتائے ہی گھر سے نکل آئے ہیں وہاں سنی کی مما پریشان ہوتی ہوں گی۔''

مولوی صاحب پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ ''میاں غریب کی مہمان نوازی کیا اور اس کا تکلف کیا؟''

معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی دو ہی صاحب زادیاں ہیں۔ کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے مرحوم بڑے بھائی کا ایک بیٹا تھا جو بچپن سے مولوی صاحب کے یہاں ہی پلا بڑھا تھا، عبداللہ صرف نام کا ہی عبداللہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے اعمال سے بھی اس نے اپنے آپ کو مولوی علیم کا صحیح معنوں میں جانشین ثابت کیا تھا۔ وہ انہی کی تربیت کا نقش ثانی تھا۔ مولوی صاحب جس مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ وہیں عبداللہ ہی ہمیشہ ان کی تکبیر دیتا تھا۔ بلکہ اب تو زیادہ تر مولوی صاحب کی طبیعت خراب رہنے کے باعث عبداللہ ہی محلے کی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اندر کے دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے پر آ کر رکا ہو۔ مولوی صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے سے اندر چلے گئے۔ کچھ چوڑیاں کھنکنے کی آواز اور دبی سی چند سرگوشیاں سنائی دیں اور مولوی صاحب ایک ایک کر کے تین چار خوان اندر اٹھا لائے۔ میں اور شاکر بس ''ارے، ارے'' ہی کرتے رہ گئے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے کیا کچھ اہتمام کر ڈالا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لوازمات ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب حاضر تھے۔ گھر کا بنا ہوا پنیر کیک، سموسے، املی کی چٹنی، زعفران سے سجی بالائی، گاجر کا حلوہ اخروٹ سے بنی ہوئی مٹھائی اور جانے کیا کیا۔۔۔؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی ایک عجیب سا مسئلہ تھا، میں کسی کے سامنے کچھ کھاتے ہوئے بے حد شرم محسوس کرتا تھا۔ اور خاص طور پر اگر کوئی اجنبی سامنے بیٹھا ہو تو مجھ سے کچھ

نگلنا محال ہو جاتا تھا۔ جانے میرے دل میں بچپن سے یہ بات کیوں بیٹھ سی گئی تھی کہ کھاتے ہوئے انسان کچھ معتزز دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ وہی مسئلہ اس وقت بھی درپیش تھا لیکن مولوی صاحب کے پُرخلوص اصرار کے سامنے میرے اندر کی اس ازلی کمزوری کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے مجبوراً سب کچھ تھوڑا تھوڑا چکھنا پڑا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ کا بھی ہنر تھا۔ لاجواب تھا۔ میری زبان اس ذائقے کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گھر ہی کا بنا ہوا تھا کیونکہ اتنی جلدی بازار سے یہ سب کچھ منگوانا اور یہ سب اہتمام ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ کون ہو سکتا تھا۔۔؟۔۔ گھر میں تین عورتیں موجود تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی دو بیٹیاں ۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور اس کے ہاتھ کا جادو بھی شامل ہوگا ان سب لوازمات میں ۔۔۔۔ یہی سوچ کر میں ہر چیز اٹھا کر چکھتا رہا۔۔۔۔ اور پھر شاکر نے جیسے میرے دل کی آواز کو زبان دے دی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے بھابھی کی مولوی صاحب۔۔۔ کمر کا درد کچھ کم ہوا یا نہیں۔''

مولوی صاحب پریشانی سے بولے، ''کہاں شاکر میاں ۔۔۔۔ بڑھاپا خود ہی سب سے بڑی بیماری ہوتا ہے۔ اُوپر سے یہ نت نئی بیماریاں ۔۔۔ اب تو زیادہ تر آرام ہی کرتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج بھی بچیوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔''

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ یہ سب کچھ اسی عشوہ طراز کے ہاتھوں اور نگرانی کا کمال فن تھا۔

چائے پینے کے بعد شاکر نے میری طرف سے اجازت چاہی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حسب معمول اور حسب عادت ان کی مہمان نوازی سے اکتا چکا ہوں گا۔ شاکر کے لیے تو یہ بات بھی باعث حیرت ہوگی، کہ میں اتنی دیر سے بنا کچھ کہے یہاں کیسے بیٹھا رہ گیا۔ جب کہ مجھے اس وقت یوں لگا کہ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ ابھی تو میں نے کھل کر اس گھر کی فضا میں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ آخر شاکر کو کس بات کی جلدی تھی؟ کچھ دیر تو اور بیٹھا رہتا۔ بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ شاکر جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مولوی صاحب ہماری آمد پر نہایت ممنون تھے۔ نہ شکریہ ادا کرتے کرتے ان کی آنکھیں ہی بھر آئیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر

انہیں تسلی دی اور انہیں احساس دلایا کہ وہ ہم سب کے لیے کس قدر قابلِ احترام ہیں۔

ہم سب کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھیوں میں پکڑ کر بھینچ لیا ہو۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ جانے پھر کبھی دوبارہ یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ کاش میں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا، کاش۔۔۔۔

اچانک چلتے چلتے شاکر صحن میں رک گیا اور اُس نے سنّی کو آواز دی جو ابھی تک زنان خانے میں ہی تھا۔ بے اختیاری طور پر میری اور مولوی صاحب کی نگاہ بھی اسی طرف اٹھ گئی جہاں سے سنّی کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی صحن میں رک گئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی سنّی دوڑتا ہوا اندر برآمدے سے برآمد ہوا۔ چند لمحے کو لکڑی کی جالیوں کے پرے دروازے پر ڈلی ہوئی ایک چلمن ذرا دیر کو ہٹی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میری تمام زندگی کا مقصد ہی آج پورا ہو گیا ہو۔ ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے مسکراتے ہوئے سنّی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن اس سے چپکی کھڑی تھی۔ اور وہ بھی سنّی کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یہ اوپر تلے والی بہنوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ دونوں کے بس جسم ہی علیحدہ ہیں، ورنہ دونوں کا ذہن اور دل ایک ہی ہے۔ ایک سا سوچنا، ایک سا بولنا، ایک سا پہننا۔۔۔۔ میں نے تو ایسی بہنیں بھی دیکھیں ہیں جو بیک وقت ایک ہی ہستی کی محبت میں مبتلا بھی رہی ہیں۔

اس نازنین کا یہ جلوہ بھی بس چند ساعتوں کا ہی تھا۔ جیسے ہی اُسے احساس ہوا کہ ہم سب صحن میں کھڑے سنّی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اسی ساعت قدرت مجھ پر شائد اپنی ہر مہربانی لٹانے پر تُلی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی اس کی نگاہ میری بے قرار نگاہوں سے ٹکرا ہی گئی۔ ایک لمحے میں چند چنگاریاں اٹھیں اور میرے پہلے سے تار تار ہوئے دامن کو جلا کر خاکستر کر گئیں۔ کیا کیا تھا اس ایک نظر میں۔۔۔۔؟ بیگانگی، خوف، شرم و حیا، اپنی لاپرواہی کی جھنجھلاہٹ۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔

دنیا میں شاعر اور ادیب بہت سے رشتوں کو بیان کرتے سنے گئے ہیں۔ لیکن نظر سے نظر کے رشتے کو اس وقت جتنی شدت سے میں بیان کر سکتا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ زمانے بھر کی بے چینیاں، کسک اور بے بسی میرے اس ایک پل کے نظر کے رشتے میں مقید تھی۔

ہم اس کے گھر سے تو باہر نکل آئے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی روح وہیں اس چلمن کے پیچھے کہیں چھوڑ آیا ہوں۔ سنی نہ جانے راستے بھر مجھے اور شاکر کو کون کون سے قصے سناتا رہا۔ لیکن میں سوائے ہوں ہاں کے اور کچھ جواب نہ دے پایا۔ ہم نے گھر والوں کے سامنے مولوی صاحب کے یہاں جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر روانہ ہوگئی لیکن شاید میری زندگی کا زاویہ اسی دن سے مکمل بدل گیا تھا جس دن ہم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔

مَیں گھنٹوں ایک ہی جگہ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن مجھے پہروں کے ڈھلنے کا اک ذرا احساس بھی نہ ہوتا۔ دوستوں کی سنگت اور محفل چھوٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ ایک دم ہی بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی اس تبدیلی کو سب گھر والوں نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ امی ایسے موقعوں پر فوراً ایلوپیتھی، پھر ہومیوپیتھی اور پھر روحانی علاج کی طرف متوجہ ہوجاتی تھیں۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبی سی ہنکاری بھری اور مجھے آب وہوا بدلنے کا مشورہ دے کر پھر سے اپنا پائپ پینے میں مشغول ہوگئے۔ عبرینہ بھابھی نے فوراً امی کو مشورہ دیا کہ ان کی چھوٹی بہن کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا جائے کیونکہ میری تنہائی دُور کرنے کا یہ واحد اور بہترین حل وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ امی کو دے چکی تھیں۔

میرے ساتھ بچپن سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مسئلہ کیا تھا اک عجب معمہ ہی تھا۔ بچپن میں، مَیں مہینے کی ہر پہلی جمعرات کو شدید بخار میں مبتلا ہوجاتا تھا۔ دنیا کے علاج کروائے گئے، زمانے بھر کے ڈاکٹرز مجھے دیکھ گئے پر یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میری چہیتی خالہ جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور امی سے چھوٹی تھیں، انہوں نے امی کو کسی نظر اُتارنے والے عامل سے ملنے کا کہا۔ ہمارے ماڈرن گھر میں بھلا ایسی دقیانوسی باتوں کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ کمشنر صاحب کو فوراً جلال آ گیا اور امی کو ٹھیک ٹھاک لیکچر سننے کو مل گیا۔ لیکن پھر خالہ خود ہی ہمارے گھر آ دھمکیں اور بابا سے چھپ کر وہ مجھے اور امی کو کسی بزرگ کے پاس لے گئیں جنھوں نے بغور میرا معائنہ کیا اور امی کو بتایا کہ مَیں روحانی طور پر اندر سے بے حد کمزور ہوں لہٰذا مجھے ساری زندگی نظرِ بد کا خطرہ لاحق رہے گا۔ انہوں نے مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ایک کالا دھاگا مجھے گلے میں پہننے کے لیے دیا۔ ساتھ ہی امی کو تاکید کی کہ ہر مہینے کی

پہلی جمعرات کو چاہے خود یا چاہے کسی اور کے ذریعے کچھ صدقہ اور نذر و نیاز وغیرہ دے دیا کریں۔ خود ان بزرگ نے کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ ایک آدھ ماہ تک تو امی کو یہ سب یاد رہا، پھر انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاکر کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ کچھ بانٹ دیا کرے۔ شاکر اب تک یہ ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ حالانکہ امی شاید میرے بچپن کی وہ بیماری بھول بھال چکی تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد میری جو حالت رہنے لگی تھی اس نے انہیں میرے بچپن کی بیماری کی یاد دلا دی تھی۔ فوراً خالہ سے رابطہ کیا گیا اور خالہ نے فوراً ہی فون پر ہی تین چار تیر بہدف نسخے تجویز کر دیے۔ لیکن میرے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ہر خوشی، ہر حاصل کا محور صرف اور صرف ''ایمان'' بنتی جا رہی تھی۔

OO

یہودی

ایک پُرانی کہاوت ہے ''جو یاری کرے گا، وہ شب بیداری بھی کرے گا۔'' سولندن میں میری یہ دوسری رات بھی شب بیداری کی نظر ہوگئی۔ صبح کا مران کسی ہڑتال کی وجہ سے فارغ تھا، لہٰذا اس نے مجھے یونیورسٹی کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا۔ نوٹس بورڈ سے پتہ چلا کہ آج سر آئزک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس سے ہال نمبر تین میں بذریعہ لیکچر خطاب کریں گے۔ سو بھی نئے آنے والوں کا رخ ہال نمبر تین کی طرف ہی تھا۔

بچپن میں ایک ٹی وی سیریل ہم سب بچے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نام تھا ''آخری چٹان'' اس میں ایک یہودی کریکٹر کا نام ڈیوڈ تھا۔ بچپن سے میرے دل میں یہودی شخص کی یہی ایک شبیہ چھپ سی گئی تھی۔ جب بھی کوئی کہیں سی یہودی کی بات کرتا تو وہی بچپن سے دل میں نقش ہوئی صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔ جس دن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی ایک یہودی تھا تب سے اس کی بات کرتے وقت ایک مخصوص حلیے کا یہودی میری نظروں کے سامنے آجاتا۔ دبلا پتلا سا، چہرے پر یہودیوں کی خاص مشابہت والی داڑھی، سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، لمبا سا چغہ، تیز تیز آنکھیں گھمانے والا اور بہت تول کر بولنے والا تسبیح گھماتا شخص۔۔۔۔

لیکن سر آئزک کو دیکھنے کے بعد میرے تخیلات کو بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ٹھیس ضرور لگی۔ یہ تو ایک ماڈرن حلیے کا شخص تھا۔ عمر پچاس سے اوپر، تن پر بہترین اور قیمتی سوٹ، آنکھوں پر نظر کا باریک سا چشمہ، بے حد نرم گفتار سا شخص۔ اس دن میرے ذہن میں سے میرے بچپن والی یہودی کی شبیہ نکل گئی اور اس کی جگہ اس نئی تصویر نے لے لی۔ البتہ ایک مماثلت ضرور تھی کہ سر آئزک کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی تسبیح موجود تھی جسے وہ شائد اپنی عادت کے مطابق کبھی ہاتھ میں گھماتے اور کبھی جیب میں ڈال رہے تھے۔ معاشیات کی اس

کلاس میں تقریباً پینتیس کے قریب طالب علم تھے جن میں لڑکوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ سر آئزک کے ابتدائی لیکن پُر اثر سے لیکچر کا آغاز ہوا۔ شروع میں انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر معاشیات سے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔ کچھ یونیورسٹی کے ڈسپلن کے بارے میں بیان کیا اور آخر میں ہم سب سے تعارف کروانے کو کہا۔ مجھے رول نمبر 17 الاٹ ہوا تھا اور اسی دن مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس پوری کلاس میں ایک مَیں ہی اکیلا مسلمان طالب علم ہوں۔ مَیں نے اپنی باری پر اٹھ کر جب اپنا نام پکارا اور مذہب اسلام بتایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے تمام کلاس پر سناٹا سا چھا گیا ہے۔ شائد یہ میرا وہم ہی ہو لیکن پھر سر آئزک نے مجھ سے میری پچھلی تعلیم اور ڈگریوں وغیرہ کا پوچھ کر سلسلہ آگے بڑھا دیا۔ آخر اسٹوڈنٹس کے تعارف کا سلسلہ ختم ہوا اور سر آئزک نے ان اختتامی جملوں کے ساتھ اپنا پہلا لیکچر ختم کیا۔

''مائی ڈیئر اسٹوڈنٹس ۔۔۔۔ازل سے لے کر اب تک ۔۔۔۔اور پھر شائد ابد تک ہمیشہ دنیا کے اعلیٰ ترین نظریات کو اوسط درجے کے ذہنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھیے ۔۔۔۔جس نے کبھی غلطی نہیں کی ۔۔۔۔اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی ۔۔۔۔اس لیے نظریہ بنانے اور نیا نظریہ پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیجیے گا، ہمیں غلطی اور اوسط درجے کے ان ذہنوں کی مخالفت کے ڈر سے بہت آگے نکلنا ہوگا۔ مَیں ایک بار پھر آپ سب کو اس ادارے میں خوش آمدید کہتا ہوں ۔۔۔۔کل سے ہم باقاعدہ کلاسز کا آغاز کریں گے، گڈ ڈے۔''

سر آئزک اسٹیج سے اُتر کر چلے گئے۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا کر ان کی تقریر اور خیالات کا خیر مقدم کیا۔ سچ یہ ہے کہ سر آئزک کی باتوں نے مجھے بھی خاصا متاثر کیا تھا۔ مجھے کامران کی ان سے بچ کر رہنے کی بات یاد آ گئی اور میرے لبوں پر خود بخود ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کامران نے دوپہر کو واپسی پر مجھے پک کرنے کا کہا تھا اور ابھی اس کے آنے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ سو ہال سے باہر نکل کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کس طرف کو نکلا جائے۔ پھر میری نظر دُور پڑے ان بینچز پر گئی جو یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر (جو کہ دریائے ٹیمز کی ہی ایک شاخ تھی) کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر لگائے

گئے تھے۔ اس طرف آبی پرندوں کے غول بھی موجود تھے، جو اُڑتے ہوئے آتے دریا کنارے بیٹھے اسٹاف اور دیگر طالب علموں کے ہاتھوں پھینکی گئی اپنی مخصوص خوراک کو چگتے اور پھر اُڑ جاتے۔ مجھے بھی یہی گوشۂ تنہائی وقت گزاری کے لیے بہتر لگا اور مَیں انہی لکڑی کے بینچوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا اور سامنے بہتے پانی اور ان پرندوں کی آپس میں ہوتی اٹھکیلیاں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھا شخص سر پر ہیٹ پہنے، لمبے سے اوورکوٹ اور مفلر میں ملبوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پرندوں کو ڈالنے والے دانے کا ایک بڑا سا کاغذی لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں مٹھیاں بھر بھر کے دانے پرندوں کی طرف اچھال کر وہ لفافہ خالی کر دیا اور اسے قریب بنے ہوئے کوڑے دان میں ڈال کر وہ جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''جوزف ۔۔۔ کیا تم نئے آنے والے طلبا میں سے ایک ہو۔'' میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''حماد ۔۔۔ فرسٹ سمسٹر ۔۔۔ معاشیات۔'' اُس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مسکرا کر بولا ۔۔۔

''اوہ آئی سی ۔۔۔ لیکن ینگ مین ۔ تم یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہو ۔۔۔ کیا سینئر اسٹوڈنٹس کی ریگنگ (Raging) سے ڈرتے ہو۔''

مَیں بھی مسکرا دیا۔ ''نہیں ۔۔۔ مجھے ڈر صرف اپنے آپ سے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس طرف آ بیٹھا۔'' جوزف نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

''خوب ۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں ۔۔۔ بھئی اس ملاقات کی طرف تو کبھی اپنا دھیان ہی نہیں گیا، خود سے خود کی ملاقات ۔۔۔''

مَیں نے کھسک کر اس کے لیے تختے پر جگہ خالی کی، جوزف بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُسے جواب دیا۔ ''اس ملاقات کے لیے کسی خاص توجہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان عمر بھر میں اپنے آپ ہی سے سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ جھیلتا

ہے۔شاید کسی اور میں اسے اس قدر جھیلنے کی تاب بھی نہیں ہوتی۔انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔باقی اس کی اپنی ذات سے باہر ہونے والی سبھی دوستیاں اور سبھی دشمنیاں عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔''

جوزف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا''خود سے بہت ناراض لگتے ہو۔یہ تلخی بلاوجہ تو ہو نہیں سکتی۔لگتا ہے کوئی بھٹی تمھارے اندر سلگ رہی ہے۔''

میں نے باتوں کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہا۔''لیکن آپ۔۔۔۔آپ نے نام کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا تعارف نہیں کروایا۔''

جوزف نے گہری سی سانس لی۔''نام تو تمھیں بتا ہی چکا ہوں۔یہیں اسی یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں۔''

مَیں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔''معاف کیجیے۔۔۔۔میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔آپ کا انداز دراصل اساتذہ والا نہیں ہے ورنہ میں اتنی بے تکلفی۔۔۔۔''

جوزف نے ہنس کر میری بات کاٹ دی۔''اس معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں جان بوجھ کر یہاں کو نو جوانوں کو پہلی دفعہ اپنا پورا تعارف نہیں کرواتا۔ایسا کرنے سے وہ مؤدب یا محتاط ہو جاتے ہیں اور مَیں ان میں گھلنے ملنے کا موقع کھو دیتا ہوں۔مَیں یہی چاہوں گا کہ ہم ہمیشہ اسی بے تکلفی سے ملتے اور بات کرتے رہیں۔تم ایک مختلف نوجوان ہو۔تم سے ملنا واقعی ایک انوکھا تجربہ ہے میرے لیے۔''جوزف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے حماد۔مجھے اُمید ہے بہت جلد ہماری ایک دوسری ملاقات ہوگی جو اس جیسی کئی ملاقاتوں کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوگی۔''جوزف گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔کچھ دیر میں کامران کے آنے کا بھی وقت ہو گیا۔میں بھی سامنے بہتے شفاف پانی اور پرندوں سے رخصت لے کر یونیورسٹی کی لمبی لمبی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر گیٹ پر آ گیا۔باہر کامران کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔مَیں نے کامران کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں،موصوف کچھ دور ایک پاپ کارن کی مشین کے قریب کھڑی دو نو جوان میموں کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور انہیں یقین دلا رہے تھے کہ بہت

جلد ان کی زندگی میں ایک خوبرو ایشیائی نوجوان آنے والا ہے جس کے آتے ہی ان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ مجھے کامران کی اس صلاحیت پر ہمیشہ سے ہی رشک آتا تھا۔ مجھے کسی اجنبی لڑکی تو کیا، کسی اجنبی مرد سے بھی پہلی مرتبہ بات کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی تاوقتیکہ وہ اجنبی خود ہی بات کرنے میں پہل نہ کر دے۔ جب کہ کامران راہ چلتے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے کسی بھی وقت کسی کو بھی روک کر گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ شاید میرے اندر ٹھکرائے جانے کا ڈر ہمیشہ سے موجود رہا تھا اور کامران ایسے کسی خوف سے بالکل نا آشنا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ ان گوری میموں کو اپنا کارڈ دیا۔ ان کے فون نمبرز لیے اور مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ مَیں نے کامران کو گھورا، ''تم کبھی نہیں سدھرو گے۔۔۔ ہے نا۔''

کامران ہنسا، ''ارے یار بور ہو رہا تھا پندرہ منٹ سے یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا۔ سوچا ان کا ہاتھ ہی دیکھ لوں۔''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں نے تمھاری پچھلی سات نسلوں میں کسی دست شناس کا تذکرہ تک نہیں سنا۔''

کامران کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شریر سی مسکراہٹ تھی۔ ''جانے دے نا یار۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ لنچ کا کیا پروگرام ہے۔ میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' میں نے سیٹ بیلٹ کچھ ڈھیلی کی۔ ''ہوں۔۔۔۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کہیں بھی لے چلو۔''

کامران نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ''پکاڈلی کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ کافی تعریف سنی ہے۔''

ہماری گاڑی لندن کی دورویہ اور چار رویہ بڑی بڑی شفاف سڑکوں سے ہوتی ہوئی بگ بین (Big Ban) کے سامنے سے دائیں کو مڑ گئی۔ لندن کے مشہور بُرجوں والے پُل سے ہوتے ہوئے ہم پکاڈلی کی طرف مڑ گئے۔ مجھے لندن کی یہ چوڑی چوڑی سی سڑکیں ہمیشہ سے بہت بھلی لگتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اٹھارویں کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یورپین حکام نے عوام کی بغاوتوں اور بلووں کو روکنے کی حکمت عملی کے طور پر ان تمام شاہراہوں کو چوڑا کروا دیا تھا تاکہ حکومت اور فوج کا عملہ آسانی کے ساتھ ہجوم کو ایک ہی

جگہ قابو میں رکھ سکے۔

پکاڈلی سرکس سے بائیں مڑتے ہی دورویہ درختوں کی لمبی سی قطار سے ڈھکی ایک خاموش اور سنسان سی سڑک شروع ہوگئی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی سی نالی میں پگھلتی ہوئی برف کا پانی ایک انجانے سے سُر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اور کامران اس سڑک پر مڑتے ہی ایک دم سے خاموش سے ہوگئے۔ جیسے قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی نے ہماری زبانیں ہی سلب کرلی ہوں۔ سڑک پر درختوں سے گرے ہوئے سرخ اور زرد پتوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ جو زور کی ہوا چلنے سے اس بھیگی ہوئی سڑک پر کچھ اس طرح سے لہراتے تھے جیسے کوئی ریشمی کپڑا بچھائے کوئی کابلی پٹھان بیٹھا ہو، جو اپنی گٹھڑی سے رنگ برنگے نئے تھان نکال کر ہوا میں لہرا رہا ہو۔

کبھی کبھی ہم چند پلوں میں ہی اپنی ساری زندگی پھر سے جی لیتے ہیں، درختوں اور ان سے خزاں رسیدہ پتوں سے گھری ہوئی اس سڑک پر ہم دونوں کا یہ سفر بھی زندگی کے انہی چند پلوں میں سے ایک تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس سڑک کے اختتام پر بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے لیے نکلے تھے۔

بالآخر دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح اس سڑک کا بھی اختتام ہو ہی گیا۔ ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورنٹ میں اپنی پسند کا لنچ کیا۔ کامران مجھ سے یونیورسٹی کے بارے میں پوچھتا رہا اور مَیں نے اُسے سرآئرک کے لیکچر اور اپنے تعارف پر کلاس روم کی خاموشی کے بارے میں بتایا۔ کامران ایسے موقعوں پر بالکل پینڈو ہو جاتا تھا۔ اسے اپنے غصے پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ اس نے زور سے گلاس میز پر مارا۔۔۔ ''یہ سالے گورے کہیں کے۔۔۔ ان کی تو۔۔۔'' بڑی مشکل سے مَیں نے اُسے قابو کیا۔ کامران کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ مَیں نے اسے موڈ میں لانے کے لیے ایک لطیفہ سنایا۔۔۔۔ ''ایک گوری میم پر کسی کتے نے کاٹنے کے لیے حملہ کردیا۔ پاس سے گزرتے ایک شخص نے جان پر کھیل کر اس کتے سے میم کی جان بچائی۔ اگلے دن کے اخباروں میں کتے سے میم کو بچاتے ہوئے اس شخص کی تصویر چھپی اور ہیڈ لائن لگی۔ ''انگلش ہیرو نے عورت کو کتے سے بچا لیا۔''

اس شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے کہا، ''میں انگریز نہیں ہوں۔'' دوسرے دن اخبار نے پھر سرخی لگائی ''غیر ملکی ہیرو نے عورت کو جان پر کھیل کر کتے سے بچایا۔'' اس شخص نے پھر اخبار کے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں غیر ملکی نہیں، ''پاکستانی اور مسلمان ہوں۔''

تیسرے دن اخبار نے اسی تصویر کے نیچے یہ سرخی لگائی، ''خطرناک دہشت گرد نے پالتو کتے پر حملہ کر دیا۔''۔۔۔۔

کچھ دیر تک تو کامران حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہمارے قہقہوں سے گونج رہا تھا اور آس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

OO

گھائل

بچپن میں جب کبھی مجھے کھیلتے ہوئے دوڑ بھاگ میں کوئی چوٹ لگ جاتی تھی تو مَیں کبھی دوسروں کے سامنے نہیں روتا تھا نہ شدید سے شدید درد میں بھی میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے سامنے میرے آنسو نہ نکلیں۔ ایسی صورت میں مَیں فوراً کسی گوشۂ تنہائی کی طرف بھاگتا اور وہاں دل کھول کر روتا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی سب کے سامنے رونا بہت معیوب لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے رو کر اپنی عزّت ان کی نظروں میں کھو دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد بھی میری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رونا چاہتا تھا لیکن رونے کے لیے جگہ میسر نہ تھی۔ عجیب بے بسی تھی۔

مولوی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ سے سنّی کو درس دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی بھی بہانے سے سنی اور مولوی صاحب کے آس پاس ہی چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اس اُمید میں کہ شاید سنی ان سے ایمان کی کوئی بات کرے۔۔۔ یا پھر مولوی صاحب ہی اپنے گھر کا کوئی تذکرہ چھیڑ دیں۔ لیکن میری یہ اُمید بھی ہمیشہ ٹوٹتی ہی رہی۔

پھر میرے جنوں نے ایک اور روپ دھارا۔ میں مولوی صاحب کے آنے کے انتظار میں رہتا اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتے مَیں گاڑی نکال کر ان کے محلے کے گیٹ کے سامنے اور کبھی کبھار تو بالکل ہی ان کی گلی کے پاس لے جا کر گاڑی لگا دیتا اور مولوی صاحب کے واپسی تک گاڑی میں ہی بیٹھا ٹکٹکی لگائے اس نازنین کی راہ تکتا رہتا۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی تو وہ گھر سے باہر نکلے گی۔ لیکن یہ حسرت بھی ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ میں نے کبھی کسی کو اس گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ آس پاس سے گزرتے محلے کے مکین میری گاڑی سے اچھی طرح سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ

مولوی صاحب کے گھر کئی مرتبہ شاکر کو ایسی بڑی گاڑیوں میں آتا جاتا دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اسے بھی کچھ اسی طرح سے تعبیر کیا ہوگا۔ البتہ یہ خیریت رہی کہ ان میں سے کسی نے کبھی مولوی صاحب سے تذکرہ نہ کیا۔ ورنہ میرے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اور میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جیسے قدرت کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ ایک ایسی ہی گرم سہ پہر کو جب مولوی صاحب سنی کو درس دے رہے تھے۔ شاکر انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی گول کمرے کی طرف آ نکلا جہاں میں بھی یونہی بلاوجہ بیٹھا کب سے رسالے کے ایک ہی صفحے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شاکر نے آتے ہی مولوی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہوگئی ہے اور اگلے جمعے کی سہ پہر مولوی صاحب بمع خاندان کے اس کے گھر مدعو ہیں۔ مولوی صاحب نے منگنی طے ہونے پر شاکر کو بے حد مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن انہوں نے شاکر سے معذرت کی کہ جمعے کے دن کا تو وہ پہلے ہی کسی تبلیغی جماعت سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کے ساتھ علاقے کے گشت پر چلیں گے اور اب اس وعدے کو ٹالنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ اپنے بھتیجے عبداللہ کے ساتھ باقی گھر والوں کو منگنی کی تقریب میں ضرور بھیج دیں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں کسی ویران بیابان صحرا میں پھرتے پھرتے اچانک کوئی نخلستان دور سے مجھے نظر آ گیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ شاکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اس امارت زدہ گھر میں سے کوئی بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہونے نہیں آئے گا، ہم سب کو دعوت ضرور دے گا۔ شائد قدرت نے مجھے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہی یہ سب انتظام کیا ہو اور پھر ہوا بھی یونہی۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبا سا ہنکارا بھرا، اور جیب سے پرس نکال کر چند بڑے نوٹ شاکر کے حوالے کر دیے۔

''میری طرف سے بیٹی کے لیے کچھ لے لینا۔''

امی نے بھی گھر میں کام کرنے والیوں کو پرانے صندوق اور الماریاں کھنگالنے کا کہا اور کپڑوں اور پرانے زیورات کی ایک گٹھڑی شاکر کے حوالے کر دی گئی، شاکر نے سب کی طرف سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''میں ضرور آ جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔''

بابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے، جواُن کے پائپ کے دھویں کے پیچھے کھو گئے۔ امی اور بھابھی نے بھی ناک بھوں چڑھائی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس مرتبہ شاکر کی خوشی میں شرکت کرنے میں میری اپنی شدید غرض بھی شامل تھی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر بات ایمان کی ایک جھلک کی نہ بھی ہوتی تو مَیں ضرور شاکر کے گھر جاتا۔ اس کا اور میرا رشتہ نوکر اور مالک سے بہت بڑھ کر تھا اور تمام گھر والے بھی بچپن سے میری شاکر سے اس اُنسیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

شاکر بہت پہلے مولوی صاحب کے اس چھوٹے سے محلے میں ہی رہتا تھا، اُسے بہت چھوٹی عمر میں دادا جان نے گھر کی ڈرائیوری پر رکھ لیا تھا۔ بابا کی شادی بھی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد شاکر کی بھی شادی ہوگئی تو دادا نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے بنگلے کے پیچھے بنے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے کی جگہ دے دی۔ سرونٹ کوارٹرز کیا تھے اچھے خاصے بڑے مکان تھے جو ہماری پُرانی حویلی کے پچھواڑے بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں دادا جان کے ہاں ان کے گاؤں کے رشتے داروں کا بہت آنا جانا تھا۔ سوانہوں نے پچھلے حصے میں یہ تین چار کوارٹرز ڈلوا لیے تھے۔

دادا کی وفات کے بعد بابا نے اپنی کمشنری کے تقاضوں کے مطابق اس جدید علاقے میں یہ کوٹھی بنوالی تھی۔ البتہ ہماری پُرانی حویلی شہر کے مضافات میں اب بھی موجود تھی۔ شاکر اور اس کا خاندان ہی اب بھی اس حویلی کی رکھوالی کرتا تھا اور ان کی رہائش اب بھی وہیں تھی۔ شاکر کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک چھوٹی بیٹی شامل تھی۔ دونوں بیٹے محنت مزدوری کے سلسلے میں شہر سے زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بابا کی خاص دعوتیں اور اجلاس وغیرہ اب بھی اسی حویلی میں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ بلکہ آج کل تو بابا اس پُرانی حویلی کو اپنا کیمپ آفس بنانے کا سوچ رہے تھے۔

شاکر تو اپنی بیٹی کی منگنی کا نیوتا دے کر واپس چلا گیا تھا لیکن اَب میرے لیے ایک ایک پل کاٹنا کس قدر دشوار تھا۔ یہ بس مَیں ہی جانتا تھا۔ دن پہر گھنٹے اور لمحے۔۔۔۔ مجھے اس قدر طویل کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے جتنے ان چار دنوں میں، آخر خدا خدا کر کے جمعے کا دن بھی آ ہی گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن میرا دل کر رہا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں پُرانی حویلی کے گیٹ سے ملحق باغ میں جا بیٹھوں جہاں سے تمام مہمانوں کو داخل ہونا تھا۔ وہ بھی تو وہیں سے گزرے گی۔ جانے وہ کیسا لمحہ ہوگا جب مَیں پھر اُسے ایک مرتبہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ تقریب کا وقت شام 4 بجے کا رکھا گیا تھا اور ابھی تک تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

مَیں سہ پہر تک کسی کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اپنے ہی گھر کی راہداریوں میں اور روشوں میں کٹی پتنگ کی مانند ڈولتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ لمحے گھنٹوں کی طرح کیسے گزرتے ہیں۔ نہ جانے کب دن کے دو بجے اور مَیں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی پُرانی حویلی کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھلنے کے اِنتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھتا ہے۔

شاکر مجھے اس قدر جلدی وہاں پا کر بے حد خوش اور کچھ پریشان بھی ہوا۔ کیونکہ ابھی تک تو وہ اور اس کے بیٹے انتظامات میں ہی مشغول تھے۔ بڑی مشکل سے مَیں نے شاکر کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ میری فکر چھوڑ دے۔ وہ اپنے کام جاری رکھے۔ تب تک مَیں حویلی کا ایک چکر لگا لوں گا۔ شاکر کو دکھانے کے لیے کچھ دیر تک میں اپنی آبائی حویلی میں گھومتا پھرتا رہا اور جیسے ہی شاکر کا دھیان دوسری طرف ہوا مَیں نظر بچا کر گیٹ کے پاس والے باغیچے میں لگی کرسیوں میں سے ایک پر آ بیٹھا۔ تمام مہمانوں کو اسی مرکزی گیٹ سے ہی اندر آنا تھا کیونکہ شاکر کے کوارٹر کے لیے حویلی میں دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ساڑھے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی اور میری دھڑکن کی اتھل پتھل بھی۔۔۔۔ جب بھی کوئی پردہ نشیں دور سے گیٹ کی طرف آتی نظر آتی۔ میری سانسیں تھمنے لگ جاتیں۔ لیکن جس کے انتظار میں مَیں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا تھا اس کا اب تک دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ نہیں آئے گی۔ کہیں مولوی صاحب نے ہی منع نہ کر دیا ہو؟ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟ ہزار وسوسے تھے جو ایک ایک پل میں دل میں آتے اور میری وحشت کو بڑھا کر واپس چلے جاتے۔

پھر اچانک اس ٹھنڈی سڑک کے موڑ سے، جس کے کنارے ہماری حویلی موجود تھی۔

ایک تانگہ اپنی مخصوص ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظریں آخری اُمید کے ٹمٹماتے دیے کی طرح اس تانگے کی مخصوص رفتار پر جم سی گئیں۔ تانگہ حویلی کے بڑے چوبی گیٹ کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس میں اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ ایک پُرنور چہرے اور ہلکی سی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ سفید شلوار کرتے میں ملبوس اس نوجوان نے اُتر کر کوچوان کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور پچھلی سیٹ سے سیاہ برقعوں میں ملبوس دو لڑکیاں نیچے اُتریں۔ فضا تھم سی گئی، ہَوا ساکت ہوگئی اور درختوں کے سبھی پرندے چہچہانا بھول گئے۔ وہ وہی تھی۔ میں ان نازک قدموں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں لڑکیوں کی صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں۔ اف ۔۔۔۔ پھر وہی آنکھیں ۔۔۔۔ اس نوجوان نے حیرت سے پہلے اس عظیم الشان حویلی کو دیکھا اور پھر لڑکیوں سے جیسے ایک مرتبہ دوبارہ تصحیح چاہی کیونکہ ایک ڈرائیور کی ایسی رہائش گاہ کا اسے تصور بھی نہ ہوگا۔ پھر شاید جیسے چھوٹی والی نے اُسے کچھ سمجھایا۔ وہ نوجوان انہیں لیے جیسے کسی شش و پنج میں جھجکتے ہوئے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شاید وہ سب پہلی مرتبہ شاکر کے گھر آئے تھے۔

دفعتاً اس نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور یہ کیا؟ وہ تینوں تو میری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ مَیں ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ چھوٹی والی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر شناسائی کی ایک چمک لہرائی اور اس نے سرگوشی میں ایمان سے کچھ کہا۔ شاید چھوٹی مجھے پہچان گئی تھی۔ ایمان نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک بجلی سی چمکی ۔۔۔۔ یہ اس کی دوسری نظر تھی جو میری نظر سے ٹکرائی تھی۔ بے خودی کی ایک لہر مجھ پر طاری ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی پہلی نظر سے لے کر اس دوسری نظر تک کے فاصلے کے درمیان مجھ پر جو بھی گزری، میری تڑپ، میری کسک، میری وحشت اور میری دربدری ۔۔۔۔ سب کو قرار مل گیا ہو۔

میرے قریب آ کر لڑکے نے مجھے سلام کیا۔ ''جناب ۔۔۔۔ یہ شاکر صاحب ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جن کی بیٹی کی آج منگنی ہے، اُن کا گھر ۔۔۔۔؟''

مَیں نے جلدی سے کہا۔ ''جی جی ۔۔۔۔ آپ ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔ یہاں سے اس راستے سے ہوتے ہوئے آپ پیچھے چلے جایئے۔ تقریب وہیں ہو رہی ہے۔''

لڑکا میرا شکریہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کر انہیں لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ایمان کی طرف براہِ راست دیکھنے سے روکے رکھا۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود اس کے قرب کا ایک عجیب اور لطیف سا احساس میرے ساتھ رہا۔ چھوٹی والی ایمان البتہ کچھ چلبلی سی لگتی تھی۔ وہ جاتے ہوئے پھر سے مجھے غور سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی پھر سے حرکت میں آ گئی ہو۔ ہوا پھر سے چلنے لگی، پرندے پھر سے چہچہانے لگے۔ مَیں وہیں کرسی پر نڈھال ہو کر جیسے گر سا گیا۔ زندگی میں چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم بار بار جینا چاہتے ہیں۔ یہ پل میری زندگی کے انہی چند لمحوں میں سے ایک تھا۔ لیکن افسوس ہر بُری بات کی طرح ہر اچھی بات بھی گزرنے کے بعد صرف ایک یاد بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سب خواب نہیں تھا اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ یہیں موجود تھی۔ میرے سامنے، میرے اتنے قریب۔

اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور پھر اندر سے شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آ نکلا۔

''ارے حماد بابا۔۔۔۔ آپ ادھر بیٹھے ہیں۔۔۔۔ وہاں تقریب میں سبھی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آیئے نا۔۔۔۔''

شاکر زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر مردانے میں لے گیا۔ وہاں سبھی مجھے دیکھ کر مؤدب سے ہو گئے اور ان کا ہنسنا بولنا اور باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ مَیں اسی لیے اس ہجوم میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی آپ کا اپنا تعارف ہی آپ کے لیے سب سے بڑا روگ بن جاتا ہے۔ یہاں پر سب مجھے شاکر کے مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان رہے تھے۔ لہٰذا مَیں جلد ہی اس محفل سے اکتا گیا، ویسے بھی میرا دھیان ہی کہاں تھا ان سب باتوں کی طرف۔ پھر شاکر کو اندر کسی نے زنانے میں بلوا لیا اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ مَیں نے شاکر کو خصوصی تاکید کی تھی کہ مہمانوں کو بٹھانے کا اور ان کے طعام کا انتظام کھلی جگہ پر کرے، اس مقصد کے لیے میں نے اصرار کر کے اُسے حویلی کا بڑا ہال بھی استعمال کرنے کا کہا تھا۔ اُسے بابا کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن میری

ضد کے سامنے اُسے ہمیشہ ہی ہار ماننا پڑی تھی، اسے بڑے ہال کو اب مردانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور اس ہال کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے شاکر کے کوارٹر کا چھوٹا سا باغیچہ اور اس کے پیچھے شاکر کا گھر تھا، جیسے ہی مَیں ہال سے باہر نکلا وہی نوجوان جو ایمان اور حیا کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ مضطرب سا مجھے ہال کے دروازے کے باہر کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔ ''معاف کیجئے ۔۔۔۔ مَیں اس وقت آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ مَیں مولوی علیم الدین صاحب کا بھتیجا ہوں چچا اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں۔''

خوشگواری کی ایک لہر سی میرے تمام وجود میں پھیل گئی، تو گویا کسی بہانے ہی سہی ۔۔۔۔ میرا ذکر ناچیز بھی اس چار دیواری میں ہوتا تھا۔ ہوسکتا ہے کبھی میرا نام اس مہ جبیں کے ہونٹوں پر بھی آیا ہو۔ اُس وقت جانے کیوں، زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے نام پر خود بخود پیار آنے لگا۔ مَیں نے اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس دن آپ کے گھر آنا ہوا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی لیکن آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلیے۔ کچھ ہی دیر میں چائے کا اہتمام ہونے والا ہے۔''

عبداللہ نے کچھ تذبذب سے کہا، ''دراصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ تو چچا کی طبیعت سے واقف ہیں۔ ہمیں اب نکلنا چاہیے۔ مَیں اس انتظار میں یہاں کھڑا ہوں کہ اندر سے کسی کو بھیج کر گھر کی خواتین کو بلوالوں تو چلوں۔''

اتنے میں شاکر اندر زنانے سے برآمد ہوا۔ ہم دونوں کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہماری طرف بڑھا۔۔۔۔ ''حماد بابا۔۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔''

مَیں نے مسکرا کر اُسے عبداللہ کی طرف متوجہ کیا۔

''میری طرف سے تو سب خیر ہی ہے۔ لیکن عبداللہ میاں واپسی کی فکر میں ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔''

شاکر نے حیرت اور کچھ شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی سے ۔۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔۔ ابھی تو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی گئی۔ اور پھر مغرب

کے بعد کھانا کھائے بناء مَیں ہرگز کسی کو نہ جانے دوں گا۔ ناممکن۔''۔۔۔عبداللہ انکساری سے گویا ہوا۔

''شاکر چچا۔۔۔۔مغرب کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہماری طرف کی سواری ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔اور پھر چچا۔''

''بھئی مولوی صاحب سے تو مَیں خود نمٹ لوں گا۔۔۔۔وہ جانتے ہیں کہ میری اکلوتی بچی کی خوشی ہے، ایسے میں دیر سویر تو ہو ہی ہو جاتی ہے۔۔۔۔رہی بات سواری کی۔۔۔تو مَیں خود تم لوگوں کو واپس چھوڑ دوں گا۔۔۔۔بس طے ہو گیا۔''

شاکر نے حتمی فیصلہ دے دیا۔عبداللہ کے پاس بھی مزید بحث کی اب کوئی گنجائش نہ تھی، اس نے شاکر سے مغرب کی نماز کے لیے اجازت چاہی اور قریبی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔شاکر نے اُسے جلد واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ پھر جیسے اچانک شاکر کو کچھ یاد آیا۔اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''ارے حماد بابا۔۔۔۔دیکھو اَب واقعی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔۔اندر نگہت کی امی تمھیں بلاتی ہیں۔''۔۔۔نگہت شاکر کی بیٹی کا نام تھا۔بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد نگہت کے پاس ہی جاتی تھیں۔شاکر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ نگہت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔شاکر کی بیوی کو بچپن سے خالہ کہتا تھا جس پر میری اصل خالائیں خاصی جز بز ہوتیں تھیں اور ان سے مَیں خاصا مانوس بھی تھا۔جیسے آج کل سنی مولوی صاحب کے لیے گھر سے چھپ چھپ کر چیزیں لے جاتا تھا اسی طرح میں بچپن میں نگہت اور خالہ کے لیے اپنے اسکول بیگ میں چاکلیٹس، کتابیں اور دیگر چیزیں لے جایا کرتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر میں شاکر سے ضد کر کے چند لمحوں کے لیے پُرانی حویلی رکتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم تحفے خالہ اور نگہت کو دے آتا۔خالہ اس بات پر مجھ سے ہمیشہ ناراض بھی ہوتیں لیکن میرا یہ معمول تمام اسکول لائف میں جاری رہا۔۔۔۔جب تک کہ مجھے بورڈنگ نہیں بھیج دیا گیا۔البتہ بورڈنگ سے بھی جب میں چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو اس خاندان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

مَیں جانتا تھا، خالہ شاکر سے میرے بارے میں ضرور پوچھیں گی اور مجھے اندر ضرور بلوائیں گی۔ لیکن جانے کیوں مَیں اس پل سے گھبرا رہا تھا، کترا رہا تھا۔ میں اس وقت اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں سب ہوں گے۔ اور پھر سب نہ بھی ہوں تو کیا ہے وہ تو ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے سامنے مَیں خالہ سے یا نگہت سے ڈھنگ سے بات بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔ پہلے وہ یہاں آتے وقت گیٹ پر میری ہڑبڑاہٹ ضرور محسوس کر چکی ہوگی۔ لیکن بہرحال، اس وقت شاکر کو ٹالنے کا یا انکار کرنے کا کوئی موقع بھی مجھے میسر نہ تھا۔ شاکر میرے سر پر ہی کھڑا تھا اور مجھے ساتھ لے کر ہی وہ وہاں سے ٹلتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مَیں تنہا کبھی بھی اندر نہیں جاؤں گا۔ شاکر کے ساتھ بھی میرا عجیب رشتہ تھا۔ مَیں نے کبھی اسے چچا، بابا یا کسی اور احترام کے نام سے پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب کبھی مجھے اسے پکارنا ہی پڑ جاتا تو میں شاکر کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا یہی معمول تھا۔ میں نے کبھی کسی روایتی طریقے سے اپنے دل میں موجود احترام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید ہمارے بیچ موجود اس رشتے کو کسی روایتی نام یا احترام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شاکر مجھے لپٹے ہوئے اندر زنانے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے، ڈھولکی اور شادی بیاہ کے گیتوں کا شور سنائی دے رہا تھا، صحن میں، برآمدے میں اور اندر کمروں میں ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری جانب متوجہ ہوگئیں۔ کچھ ہنسیں، کچھ نے سرگوشیوں میں ایک دوجے سے نہ جانے کیا کہا، مَیں اسی لیے اس طرح کے نسوانی ہجوم میں جانے سے ہمیشہ جھجکتا تھا، جب بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ بہت بے باک ہو جاتی ہیں اور پھر معاملہ کسی ایسی منگنی یا شادی بیاہ کی تقریب کا ہو تو یہ بے باکی مردوں کو بھی مات دیتی ہے۔

خالہ مجھے دیکھ کر آگے بڑھی اور جلدی سے اُس نے میری بلائیں لے لیں۔ نگہت جو سر جھکائے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی، اُس نے میری آمد کا شور سن کر ہلکے سے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا، شاکر نے میرے لیے بمشکل راستہ خالی کروایا۔ مَیں نے نگہت کے سر پہ ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

''میں جانتا تھا۔ یہ ساری شرارت تمھاری ہی ہوگی، کم از کم اپنی منگنی کے دن تو چپ کر

کے بیٹھی رہتیں۔۔۔۔"

نگہت گھونگھٹ تلے مسکائی۔

"حماد بھیا۔۔۔۔ابا نے منگنی کے بعد مجھے کالج جانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں سُسرال والے بُرا مناتے ہیں۔ آپ ابا سے بات کیجئے نا۔۔۔۔ میری خاطر۔" لو بھلا ۔۔۔لڑکیاں مہندی اور منگنی والے دن جانے کیا کیا سوچتی ہیں کہ ان کا ہونے والا دولہا کیسا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اور ان محترمہ کو آج کے دن بھی اپنی پڑھائی کی ہی سوجھ رہی ہے۔ مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔ مَیں نے دھیرے سے نگہت کے کان میں کہا۔

"تمھارے سُسرال والوں کی تو ایسی کی تیسی۔۔۔۔۔ بے فکر ہو جاؤ۔۔۔کوئی تمھیں مزید پڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ نہ تمھارے ابا اور نہ تمھارا چھ مہینے بعد ہونے والا میاں۔ مَیں خود بات کرلوں گا۔اب خوش۔"

اور واقعی خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آ گئے۔ یہ لڑکیوں کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ ذرا ذرا سی بات پہ رو دینے والا، اور پھر خوش بھی کتنی چھوٹی سی بات پر ہو جاتی ہیں۔ دل کا شیشہ اتنا صاف کیسے رکھ لیتی ہیں یہ سب لڑکیاں۔۔۔۔؟

دفعتاً میری نظر چھوٹی حیا پر پڑی۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھی جہاں نگہت کو بٹھایا گیا تھا۔ حیا پاس بیٹھی کسی عورت سے ہلکی آواز میں کچھ بات کر رہی تھی، لیکن ایمان مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ مَیں اَب یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن شاکر عورتوں کے اس ہجوم میں مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بچپن سے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سوچا ساتھ والے کمرے سے ہوتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا کیونکہ سامنے برآمدے میں تو خواتین کی ایک بڑی تعداد نیچے فرش پر ہی دری ڈالے دھرنا جمائے بیٹھی تھیں۔ البتہ ساتھ والا کمرہ چونکہ رہائشی تھا اس لیے اس طرف کسی کے ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ اس دوسرے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے صحن میں کھلتا تھا، جہاں اس وقت دیگیں وغیرہ چڑھائی جا رہی تھیں۔

مَیں نے نگہت کو اشارہ کیا کہ مَیں بعد میں اس سے ملتا ہوں اور دونوں کمروں کو ملانے والے درمیان کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں شام کے وقت کی

وجہ سے ملگجھا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کمرہ سنسان تھا۔ مَیں اپنی ہی دھن میں پچھلے صحن کی طرف کھلنے والے جالی کے دروازے کی طرف بڑھا، اچانک دیوار کے ساتھ بنی ہوئی لکڑی کی بڑی سی الماری کے عقب سے کوئی جلدی میں اپنا آپ سنبھالتے ہوئے نکلا، اس الماری میں زیادہ تر گھر کی کراکری اور شیشے کے برتن وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ وہ سایہ اپنی ہی جھونک میں مجھ سے ٹکرایا اور اُس کے ہاتھ سے شیشے کی تین چار پلیٹیں پھسل کر فرش پر گر گئیں۔ ایک دبی سی نسوانی چیخ فضا میں اُبھری، سچ تو یہ ہے کہ مَیں خود بھی بوکھلا سا گیا، مجھ سے ٹکرا کر وہ سایہ لڑا کھڑا سا گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس تمام معاملے میں سنبھلتے سنبھلتے آنچل ڈھلک کر کاندھوں پر آ چکا تھا۔ وہ ایمان تھی، قیامت کی گھڑی کا تذکرہ تو سب نے ہمیشہ سنا ہوگا لیکن وہ قیامت کی گھڑی ہوگی کیسی؟ اس کا شاید کسی کو مجھ سے بہتر اندازہ کبھی نہ ہوگا۔ اُس کا حسن بے حجاب تھا اور مجھ سے اس قدر قریب تھا کہ اس کی الجھی ہوئی سانسوں کی مہک مَیں اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا، اس کی مخصوص الجھی ہوئی سی لٹ بکھر کر اس کے چہرے پر آ پڑی تھی اور اس کا گلابی دودھ جیسا ملیح چہرہ اس وقت شرم، خوف اور حیا کے مارے انگارہ سا ہو رہا تھا۔

کیا کسی کی دُعاؤں کا ثمر قدرت نے اس قدر جلد اور اس قدر اعلیٰ انعام کے طور پر بھی دیا ہوگا۔۔۔؟ شاید کبھی نہیں۔

وہ ہڑبڑا کر بولی۔۔۔۔ ''معاف کیجئے۔۔۔۔ وہ مَیں۔۔۔۔ مَیں یہاں برتن لینے آئی تھی؟''

مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا گیا۔ شاید میری زبان ہمیشہ کے لیے سلب کر لی گئی تھیں۔۔۔۔ اتنے میں برتن گرنے کی آواز سن کر پاس کے کمرے سے خالہ اور ایمان کی چھوٹی بہن حیا ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں اور فرش پر بکھرا کانچ اور مجھے اور ایمان کو وہاں کھڑا دیکھ کر جیسے خود ہی سب سمجھ گئیں۔ ایمان جلدی سے خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ خالہ ہنس کر بولی۔ ''ڈر گئیں کیا؟۔۔۔۔ ارے یہ اپنا ہی بچہ ہے، حماد۔۔۔۔ نگہت کا تیسرا بھائی ہی سمجھو۔''

حیا نے ہنسی روکنے کے لیے پلّو منہ میں لے لیا تھا۔ اَب ایمان بھی سنبھل چکی تھی۔ اس

نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے جا کر جیسے مجھے آداب کیا۔ خالہ ہنستے ہوئے بولی۔
''اچھا تم جاؤ۔۔۔۔ مَیں اور حیا یہ کانچ اٹھا لیں گے۔ وہاں نگہت اکیلی ہے۔'' ایمان جلدی سے سَٹ پٹائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خالہ نے پھر سے مجھے کھانا کھائے بغیر واپس نہ جانے کی ہدایت کی۔ مجھے یاد نہیں کہ مَیں اس کمرے سے کب اور کس طرح باہر نکلا تھا۔ یہ ایک پل میں کیا ہو گیا تھا۔ کیا آج قدرت نے ایک ہی دن میں میرے اس حقیر جنم میں کی ہوئی چند گنی چنی نیکیوں کا صلہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کس قدر قریب تھی۔۔۔۔ میری شہ رگ سے بھی قریب۔۔۔۔ سچ یہ ہے کہ اُس دن مجھے خدا پر جس قدر ٹوٹ کر پیار آیا، اتنا پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔ آس پاس کی چیزوں سے، رشتوں سے، خدا کی بانٹی ہوئی نعمتوں سے دن میں جانے کتنی مرتبہ پیار جتاتے ہیں۔ ان کے پیار کا ذکر کرنے سے ہی ہماری آنکھیں تک بھیگنے لگتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس خدا پر کبھی پیار نہیں آتا جو ہمارے جینے کے یہ سب بہانے پیدا کرتا ہے۔

مجھے بھی پہلے کبھی نہیں آیا تھا، لیکن اس دن آیا اور بہت ٹوٹ کر آیا، مجھے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازا تھا اس نے، مَیں بے خود سا کسی مے کش کی طرح آس پاس سے بیگانہ وہیں کسی گوشے میں بیٹھا رہا۔ کھانا لگ چکا تھا۔ شاکر نے اسی گوشے میں مجھے کچھ لا دیا۔ جانے کب تقریب ختم ہوئی اور لوگ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ مَیں تب چونکا جب میرے سامنے سے عورتوں کی آخری ٹولی بھی جلدی جلدی اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتی گزر گئی۔ مجھے اپنی بے خودی پر غصہ آیا۔ کتنی دیر بیت گئی تھی۔ وہ ضرور واپس چلی گئی ہوگی۔ مَیں جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف آیا، وہاں عبداللہ کو شاکر کے ساتھ کھڑے دیکھ کر میری جان میں جان سی آ گئی۔ مَیں تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچا۔ شاکر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''لو۔۔۔۔ حماد بابا بھی آ گئے۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

پتہ چلا کہ مہمانوں کو واپس پہنچانے کی غرض سے جو گاڑی کرائے پر منگوائی گئی تھی۔ اُسے شاکر کا بڑا بیٹا لے کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ عبداللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ مَیں نے جھجکتے ہوئے شاکر کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو

مَیں گھر جاتے ہوئے انہیں مولوی صاحب کے یہاں چھوڑتا جاؤں گا۔

''یہی تو مَیں عبداللہ میاں کو کہہ رہا ہوں بابا۔۔۔۔لیکن یہ حضرت کچھ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔''

''اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔مَیں ویسے بھی بس نکل ہی رہا تھا۔راستے میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑتا جاؤں گا۔''

عبداللہ کے پاس میری تجویز ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔رات ڈھلتی جارہی تھی اور اس وقت کسی دوسری سواری کا ملنا بھی اس علاقے میں محال تھا۔جب تک مَیں گاڑی لے کر حویلی کے مرکزی گیٹ تک پہنچا،شاکر اندر سے دونوں لڑکیوں کو بھی بلا لایا تھا۔ایک ہی دن میں اتنے معجزے رونما ہو جائیں گے۔یہاں آنے سے پہلے،ایسا مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔شاکر سے رخصت ہو کر وہ سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔عبداللہ میرے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور ایمان اور حیا پچھلی سیٹ پر۔مَیں نے کار آگے بڑھا دی۔یا خدا۔۔۔۔یہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔نہیں۔۔۔۔ضرور یہ کوئی خواب ہی ہوگا۔وہ میرے ساتھ،میری ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود تھی بیک ویو مرر میں میری نظریں اس کے سراپے کا طواف کرتی رہیں۔گو وہ مکمل پردے میں تھی اور صرف اس کی آنکھیں ہی اس کے نقاب سے باہر تھیں لیکن اس کا اس قدر قریب ہونا ہی کس قدر جاں فزا احساس تھا۔مَیں کسی خواب کے عالم میں ہی گاڑی چلاتا رہا۔عبداللہ خود بھی خاموش طبیعت اور کم گو تھا کچھ میں بھی اپنے خیالات کی رو میں بھٹکا ہوا تھا۔راستے بھر ہم خاموش ہی رہے۔اس دن پہلی مرتبہ مجھے سڑکوں کے خالی ہونے اور رات کی وجہ سے رش نہ ہونے پر بے حد غصہ آیا۔فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔پچھلی سیٹ پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ایمان مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے نظاروں کو ہی دیکھ رہی تھی۔اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر سامنے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔اور مَیں سب کی نظر بچا کر مسلسل شیشے میں اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔جانے اس انجانی سی لڑکی نے مجھ پر یہ کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ مَیں دھیرے دھیرے اپنے اوپر اپنا تمام اختیار ہی کھوتا جا رہا تھا۔۔۔۔

پلک جھپکنے میں ہی مولوی علیم کا محلہ آ گیا۔رات کی وجہ سے محلہ بھی بالکل سنسان پڑا

تھا۔مَیں نے مولوی صاحب کی گلی میں موڑ کر گاڑی کھڑی کر دی۔عبداللہ نے نہایت ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کیا اور رسماً اندر آنے کو بھی کہا۔مَیں نے شکریہ کہا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔پھر کبھی سہی، ایمان اور حیا بھی گاڑی سے اُتر چکی تھیں۔ایمان تو خاموش رہی البتہ حیاء نے اُترتے اُترتے دھیرے سے شکریہ کہا،مَیں صرف لب ہلا کر رہ گیا،مَیں نے گاڑی واپس موڑی اور عبداللہ کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔گلی سے نکلتے نکلتے مَیں نے بیک ویو مرر میں دیکھا کہ دروازہ کھل چکا تھا اور وہ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔پھر جانے کب مَیں گھر پہنچا اور کس طرح مَیں نے خود کو اپنے بستر تک پہنچایا۔لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔اس ساری رات میں مَیں ایک پل کے لیے بھی پلکیں نہیں جھپک پایا تھا۔اس رات مجھے احساس ہوا کہ عشق کا ڈنگ اپنا وار کر چکا ہے اور اب زہر دھیرے دھیرے میرے جسم کی تمام رگوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔۔

OO

پہلی کلاس

اچانک میری آنکھ الارم کلاک کی تیز گھنٹی سے کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آج لندن کا آسمان پھر سے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شاید ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے میری باقاعدہ کلاسز شروع ہو رہی ہیں اور مجھے نو بجے والی پہلی کلاس کے لیے آٹھ بجے تک ہر حال میں سب وے پہنچ جانا چاہیے کیونکہ اگر آٹھ بج کر دس منٹ والی ٹرین نکل گئی تو سمجھو پہلا پیریڈ بھی گیا۔

انسان کی بہت عجیب فطرت ہے۔ جس چیز کا اسے پابند بنا دیا جائے، اُسے رفتہ رفتہ وہ پابندی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ عام حالات میں مَیں اگر پوری رات بھی شب بیداری کر کے اٹھتا تو مجھے تب بھی کبھی اتنا بُرا نہیں لگا جتنا اس دن مجھے یونیورسٹی پہنچنا لگ رہا تھا۔ بادلِ نخواستہ مَیں نے نیم گرم پانی سے شاور لیا اور گرما گرم کافی کا ایک مگ حلق میں انڈیلا، کامران جا چکا تھا۔

لباس تبدیل کر کے مَیں نیچے اُترا، کسی بھی شہر کی صبح، اس کے عام دن کے مقابلے میں بہت مختلف اور کبھی کبھی بے حد خوشگوار ہوتی ہے۔ سبھی لوگ نیند سے جاگ کر اپنے اپنے روز مرّہ کے معمولات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس وقت وہ اسپینش گٹار بجانے والی لڑکی سامنے سے گزرتی ٹرام سے بس اُتری ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا وہی مخصوص گٹار کیس تھا۔ سچ یہ ہے کہ صبح صبح اُس کے چہرے پر جو تازگی تھی اور آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا جو خمار تھا، اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ہم دونوں میں اب کافی شناسائی ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اُسے دینا چاہے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا۔ مَیں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے صرف اپنی گٹار کی دھنوں کے عوض لیتی ہے، اور

اس نے تو ابھی تک مجھے کوئی دھن سنائی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ یہ پیسے قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی یہ بات جانے کیوں بہت اچھی لگی۔ مَیں نے ہنس کر اُسے کہا کہ یہ آج کی دھن کے پیسے نہیں ہیں۔ دو دن پہلے مَیں کافی فاصلے پر کھڑا اس کی دھن بہت دیر تک سنتا رہا تھا لیکن تب میری جیب میں سکے نہیں تھے۔ یہ اُسی دن کا اُدھار ہے۔ یہ سن کر وہ بھی ہنس پڑی اور پھر اس نے انکار نہیں کیا اور میری ہتھیلی پر پڑے سکے اٹھا لیے۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے مجھے اپنا نام بتایا۔ ''جینی'' اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا نام دُھرانا اُس کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔

''آ۔۔۔ماذ''۔۔۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے بالکل ایسے کہا تھا کہ جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے ''آ۔۔۔بیل۔۔۔ مجھے مار۔۔۔'' میں نے اُسے اپنے نام کا مختصر صورت بتائی۔ ''میڈی''۔۔۔ اس نے خوشی سے دہرایا۔ سینور۔۔۔ میڈی۔'' میں ہنس کر آگے بڑھ گیا۔ جب تک میں یونیورسٹی پہنچا۔ تب تک بوندا باندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلاس میں سبھی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ پہلی کلاس سر آئزک کی ہی تھی۔ ان کے کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس میں سناٹا چھا گیا اور واحد آواز صرف کلاس کی اُونچی اُونچی بڑی شیشے کی کھڑکیوں پر پڑتی بارش کی بوچھاڑ کی تھی۔ کبھی کبھی یہ آواز باقاعدہ ایک جلترنگ کی سی کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ سر آئزک نے پہلے پیریڈ میں معاشیات کی چند موٹی موٹی باتیں بتائیں جن میں سے آدھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے میں کتابوں سے بہت دُور رہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ میرا دھیان کلی طور پر لیکچر کی طرف نہیں تھا۔ جب ہمیں ٹائم ٹیبل بانٹا گیا تھا تو اس میں ایک سبجیکٹ (Subject) میرے لیے قطعی طور پر نیا اور انجانا تھا۔ اس مضمون کا نام ٹائم ٹیبل شیٹ میں ''ہیومینیرنگ'' (Humaneering) دیا گیا تھا۔ آج اس مضمون کا پہلا لیکچر ساڑھے گیارہ بجے ہال نمبر سات میں تھا۔

مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب سر آئزک پھر سے کالا گاؤن پہنے کلاس میں داخل ہوئے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ خاص مضمون خود سر آئزک کی ہی فرمائش پر کورس میں شامل کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر لفظ ہیومینیرنگ دو لفظوں کا مرکب تھا نمبر ایک ہیومن اور نمبر دو انجینئرنگ یعنی ''ہیومن انجینئرنگ'' یا دوسرے لفظوں میں آپ اسے انسانی نفسیات کی تعمیر

بھی کہہ سکتے ہیں۔

سر آئزک کے خیال میں ان کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کو نہ صرف اپنے شعبوں میں کامیابی سے داخل ہونا چاہیے بلکہ انہیں نفسیاتی طور پر بھی اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پوری قوت کے ساتھ اپنے مختلف محکموں میں رائج کر سکیں۔ اسی لیے خصوصی طور پر انہوں نے ہیومینیرنگ کا یہ سبجیکٹ (Subject) خود اپنے پڑھانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج پہلے لیکچر کا موضوع تھا ''بہت زیادہ عقل مندی بھی حماقت کا دوسرا نام ہے۔''

سر آئزک کا کہنا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں جن لوگوں کو بہت شدت سے چاہتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم کہیں نہ کہیں انجانے میں اُن سے ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ بھی پال رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پیار میں ہماری بے بسی اور انہیں کھو دینے کا خوف ہمیں ان کے سامنے اس مخالف جذبے کے اظہار سے روکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ اندرونی چڑچڑاہٹ اندر ہی اندر گل سڑ کر شدید نفرت کا رُخ دھار لیتی ہے، اسی لیے جب کبھی ایسے شدید محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں تو ایک پل میں ہی شدید نفرت کا رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک پل میں ہوئی نفرت دراصل پچھلے بہت لمبے عرصے سے ہمارے اندر پلتے منفی جذبات کا نچوڑ ہوتی ہے۔

اُس دن مَیں نے محسوس کیا کہ سر آئزک صرف ایک اچھے اور ماہر معاشیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک فلاسفر ایک دانش ور بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد انہوں نے کلاس کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ مَیں نے اپنی باری آنے پر کہا۔

''جذبہ چاہے شدید محبت کا ہو یا شدید نفرت کا، دونوں صورتوں میں انسان کو توڑ دیتا ہے۔'' میں ذاتی طور پر نفرت سے زیادہ محبت کو خطرناک جذبہ سمجھتا ہوں۔ اور پھر۔۔۔۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی میرے سامنے بیٹھی سنہرے بالوں والی ایک لڑکی نے غصّے اور نفرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولی۔

'' کچھ لوگوں کی فطرت میں ہی ہر بات سے اختلاف کرنا شامل ہوتا ہے ایسے لوگوں کی تربیت میں ہی ضد اور ہٹ دھرمی موجود ہوتی ہے۔''

مَیں اس لڑکی کو نام سے نہیں جانتا تھا، لیکن اس کا رول نمبر بائیس تھا۔ مَیں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن سے میں یونیورسٹی میں آیا تھا یہ لڑکی اور اس کے چار پانچ دوستوں کا

مخصوص گروپ کسی نہ کسی طور پر میرے مذہب اور میری قومیت کو طنز اور مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ عام طور پر مَیں اُن کی سُنی ،اَن سُنی کر دیتا تھا کیونکہ مَیں ان بے مطلب کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جانے کیوں میں بھی اپنے آپ پر اختیار کھو بیٹھا۔

''اس احساس کمتری کا شکار تو مجھے وہ لوگ لگتے ہیں جنھیں بظاہر اپنی تربیت پر بے حد ناز ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر کی جہالت کہیں نہ کہیں رنگ دکھا ہی جاتی ہے۔''

یہ سنتے ہی اس رول نمبر بائیس کا رنگ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن سر آئزک نے روسٹرم پر زور سے ڈسٹر مار کر ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''پلیز پلیز۔۔۔۔ آپ لوگ آپس میں بحث کرنے سے گریز کریں۔ اختلاف رائے ہم سب کا حق ہے لیکن اسے اخلاق کی حدودں میں ہی رہنا چاہیے۔ مس سارہ پیریز، آپ مجھ سے لیکچر کے بعد میرے آفس میں ملیں۔''

اتنے میں لیکچر ختم ہونے کی گھنٹی بھی بج گئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس آتش صفت کا نام سارہ ہے۔ دیکھنے میں کسی بہت معقول گھرانے کی لگتی تھی لیکن جانے مجھ سے اس کی کیا پرخاش تھی۔ سارہ اور اس کا گینگ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کلاس سے نکل گئے۔ مَیں نے بھی اپنا بیگ گلے میں لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ مَیں نے فوراً ہاتھ رگڑ کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ اور ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اٹینڈنٹ نے آ کر بتایا کہ سر آئزک مجھے اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔

مَیں نے اس راہداری کی طرف قدم بڑھا دیے جس کے اختتام پر سر آئزک کا دفتر موجود تھا۔ بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر دیکھا اندر سارہ غصے میں بھری سر آئزک کے میز کی مخالف سمت پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مختصر وقفے میں سارہ کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ سنائی دیے۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایک مسلمان کو بنا کسی خاص وجہ کے اپنی یونیورسٹی میں ایڈمشن کیسے دے دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ۔۔۔''۔ سارہ کی بات آدھی رہ گئی کیونکہ مَیں تب تک اندر داخل ہو چکا تھا۔ سر آئزک نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''آؤ حماد۔۔۔آؤ۔۔۔۔''

سارہ چپ سی ہوگئی۔ میں میز کے سامنے لگی دوسری کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ سر آئزک نے سامنے پڑی فائل پر کچھ نوٹ کر کے اسے بند کر دیا اور پھر نظر اٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''میں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آپس میں تعارف کروا دوں۔ شاید اس سے چیزوں کو سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے۔ سارہ۔۔۔۔ان سے ملو۔۔۔۔ یہ حماد امجد رضا ہیں۔ ان کے دادا برٹش گورنمنٹ میں وائسرائے کے ذاتی سٹاف میں نہایت اُونچے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں داخلے کی تمام کڑی شرائط پر پورا اُترنے کے بعد ان کا داخلہ منظور کیا گیا ہے، ان کا شمار ہمیشہ سے بہترین طالب علموں میں رہا ہے۔''

سارہ نے یہ ساری گفتگو ایک خاص نخوت بھرے انداز میں سنی۔ پھر آئزک نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور مسٹر حماد۔۔۔۔ان سے ملیے ۔۔۔۔ مس سارہ پیریز۔۔۔ سارہ آئزک پیریز۔۔۔۔ اس یونیورسٹی کی پچھلے چار سمسٹر سے لگاتار پوزیشن ہولڈر۔۔۔ اور میری بیٹی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے اس کی تلخ کلامی کا زیادہ اثر نہیں لیا ہوگا۔''

اوہ۔۔۔۔تو یہ خوبصورت بلا سر آئزک کی بیٹی تھی۔ ایک یہودن۔۔۔۔ تبھی اس کے لہجے سے ہر وقت ایک خاص قسم کا زہر ٹپکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چہرہ دوسری طرف کیے، تکبرانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر میں یا ایک انسان نہیں بلکہ کوئی حقیر کیڑا مکوڑا بیٹھا ہو۔ پھر سر آئزک نے ہم دونوں کو کلاس روم کے آداب اور یونیورسٹی ڈسپلن کے بارے میں ایک چھوٹا سا لیکچر دیا اور ہم دونوں سے اُمید ظاہر کی کہ آئندہ ہماری وجہ سے کلاس کا ماحول تناؤ کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ہی چپ کر کے سنتے رہے اور پھر ہمیں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور ایک دوسرے کو دیکھے بنا مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس دن مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شاید میں اس یونیورسٹی سے معاشیات کی ڈگری اتنی آسانی سے لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ میرے اور سارہ کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ بہت جلد ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

OO

زہرِ عشق

مَیں اس رات ایمان کو اس کے گھر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس پل کے بعد مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر گھڑی جیسے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہو۔ مَیں نے عشق اور محبت کی بہت سی داستانیں سُن رکھی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عشق کا ڈنگ اتنا زہریلا ہوگا۔ ایک ہی پل میں یہ عشق کا زہر میری نس نس میں سرایت کر گیا اور اب میری حالت ایسی تھی کہ دن رات کی تڑپ ہی میرا مقدر تھی۔

محبت بذاتِ خود ایک سب سے بڑے عذاب کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ محبت یک طرفہ ہو تو یہ ہر پل انسان کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ ایک ایک پل میں انسان سو سو بار جیتا ہے اور سو سو بار مرتا ہے۔

مجھے کوئی صورت سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ آخر کس طرح ایمان تک میرے اندر لگی اس آگ کی آنچ پہنچ سکے۔ اس کا گھر سے نکلنا محال تھا۔ مَیں پہلے ہی کئی کئی دن گھنٹوں تک اس کے گھر کے باہر پہرہ دے چکا تھا۔ اور اب تو عبداللہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر کے باہر کھڑے رہنے میں اس سے سامنا ہونے کا خطرہ بھی ہر لمحے موجود تھا۔ اور پھر ایمان جیسی لڑکی کو یوں سرِ راہ روک کر بات کرنا بھی اب مجھے بے حد معیوب محسوس ہو رہا تھا۔ جانے وہ اس بات سے میرے متعلق کیا تأثر لیتی؟۔۔۔۔ تو پھر کیسے۔۔۔۔ آخر اس تک رسائی کیسے ہو۔۔۔۔؟ دن رات بس یہی ایک سوال اور یہی ایک دھن میرے سَر پر سوار رہتی تھی۔

یہ سچ ہے انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی کبھی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ہر منزل پر پہنچ جانے کے بعد اُسے وہ منزل ایک سنگ میل لگنے لگتی ہے اور کوئی نئی اور اگلی منزل اس کی خواہش کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اسی سفر میں ہی انسان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ یا

پھر انسان کا مقدر رہی ہمیشہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر ہوتا ہے۔

کل تک ایمان کی صرف ایک جھلک کو پانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ قدرت نے میری یہ خواہش پے در پے کئی مرتبہ پوری کر دی تھی لیکن آج میری التجاؤں کی حد صرف دیکھ لینے سے کہیں بڑھ کر تھی۔ مَیں اس تک اپنے جذبوں کی آنچ پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنا یہ احساس اس تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ شاید انسان کی ناشکری کی بنیادی وجہ بھی کسی مقصد کسی آرزو کو پالینا ہوتا ہے۔ نہ ہم آرزو کو پاتے اور نہ ہی نئی خواہشات جنم لیتیں۔۔۔۔ بس ساری زندگی کسی ایک تمنا میں ہی گزر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

نہ مَیں ایمان کو اس پارٹی کے بعد دوبارہ کبھی دیکھ پاتا اور نہ ہی آج مَیں اس بھنوں میں مبتلا ہوتا۔ ساری زندگی در بدر اس کی دوسری جھلک دیکھنے کے لیے ہی بھٹکتا رہتا تو اچھا ہوتا۔

دن اسی کش مکش میں گزر رہے تھے اور راتیں اسی کرب میں کٹتی تھیں۔ ایک دن شاکر شام کے وقت مجھے ڈھونڈتا ہُوا چھت پر آ پہنچا، جہاں مَیں بہت دیر سے بیٹھا جاتی گرمیوں کا سورج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کا سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی کتنا وقت لیتا ہے، جیسے رات سے اس کی کوئی جنگ چل رہی ہو، اور وہ اپنی دوست شفق کو رات کے کالے سایوں کے حوالے نہ کرنا چاہتا ہو۔

''ارے حماد بابا آپ یہاں ہو۔۔۔۔ کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں، یہ نگہت نے آپ کے لیے دیا ہے۔''

شاکر نے ایک رقعہ میرے حوالے کیا اور پھر واپس چل دیا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔ ''اور ہاں۔۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ حماد بھائی سے کہنا کہ اپنا وعدہ جلدی پورا کریں۔'' شاکر بیٹی کا پیغام دیتے ہوئے اپنے آپ ہی مسکرا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ مَیں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ صرف چند سطریں ہی لکھی تھیں۔

''پیارے بھیا۔

اپنا وعدہ بھول گئے نا، ابا سے میری پڑھائی کی بات بھی نہیں کی۔

امتحانات سر پر آ رہے ہیں۔ اگر فارم نہیں بھرے تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کی سفارش کی منتظر۔۔۔''

تب مجھے یاد آیا کہ واقعی مَیں نے نگہت کی منگنی کے دن اُس سے شاکر سے بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب بھلا اُسے کیا خبر کہ آج کل تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کسی سے کیے ہوئے وعدوں کا کیا بھرم رکھ پاتا۔ لیکن مَیں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ہی شاکر سے اس مسئلے پر حتمی بات کروں گا۔ مَیں جانتا تھا کہ شاکر میری بات کبھی رد نہیں کرے گا۔ اور اس کے لیے اگر ہم دونوں کو نگہت کے منگیتر کے پاس بھی جانا پڑتا تو مَیں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

مَیں نگہت کا رقعہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے یونہی خالی الذہن سا بیٹھا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ نگہت ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ نگہت بھی تو وہ ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ ایمان اور حیا کی سہیلی تھی ۔۔۔۔ ایمان تک براہِ راست پہنچنے کا واحد ذریعہ ۔۔۔۔ حیرت ہے۔ اتنے دن پہلے تک مَیں دیواروں سے ٹکراتا رہا لیکن مجھے نگہت کا خیال کیوں نہیں آیا؟

اور اَب جب یہ خیال میرے ذہن میں آ ہی گیا تھا تو جیسے میری بے چینیوں کو بھی اِک نئی راہ مل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اُڑ کر شاکر کے گھر پہنچ جاؤں۔ بہرطور مَیں نے جیسے تیسے کر کے وہ رات کاٹی۔ اور اگلی صبح سویرے ہی میں پُرانی حویلی پہنچ گیا۔ گزری شام میں نے شاکر کے جاتے جاتے اس سے نگہت کی مزید تعلیم کے سلسلے میں بات بھی کر لی تھی۔ شاکر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ نگہت کے منگیتر عامر سے اس سلسلے میں خود بات کر لے گا۔

گھر سے نکلتے ہوئے مَیں شاکر کو بتاتے ہوئے آیا تھا کہ مَیں پُرانی حویلی کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ مَیں کئی مرتبہ اپنے دوستوں کی وہاں پارٹیز وغیرہ منعقد کر چکا تھا۔ کامران جب بھی لندن سے واپس آتا تو ہم دونوں کا دن رات کا ٹھکانا وہی پُرانی حویلی ہی ہوتی تھی۔ تب مَیں کتنا زندہ دل تھا، ہر وقت اس حویلی کے در و دیوار ہمارے قہقہوں سے، تیز میوزک سے اور ہمارے ہلے گلّے سے گونجتے رہتے تھے۔ ایسے میں ہم نگہت اور خالہ سے ہی فرمائشیں کر کر کے مزے مزے کے پکوان بنواتے تھے۔ خاص طور پر ساون کی بارشوں میں ہم دن بھر پائیں باغ میں دھما چوکڑی مچاتے۔ پوریاں تلوائی

جاتیں۔ سموسے اور پکوڑے بنوائے جاتے، کولڈ ڈرنک کے کریٹ باغ میں بہتی صاف پانی کی نالی میں رکھوا دیے جاتے، آموں کی بڑی بڑی ٹوکریاں چھکڑوں میں لدوا کر حویلی کے نعمت خانے میں پہنچوا دی جاتیں۔ آہ۔۔۔۔ ابھی چند ہفتے پہلے تک میں کس قدر جیتا جاگتا انسان تھا۔ اس ایک محبت نے تو جیسے میرے جسم سے رُوح تک ہی نچوڑ لی تھی۔

نگہت اور خالہ کا معمول تھا کہ ان میں سے جس کسی کو بھی میرے حویلی پہنچنے کی اطلاع کسی چوکیدار وغیرہ سے ملتی تو وہ فوراً میرے ساتھ آنے والے مہمانوں کے بارے میں پوری معلومات کر کے فوراً چائے ناشتہ وغیرہ بھجوا دیتیں۔ میں کبھی تنہا ہوتا تو نگہت خود آ جاتی اسے نت نئی کتابیں پڑھنے اور منگوانے کا بہت شوق تھا، شاکر کے سامنے تو وہ کھل کر کوئی فرمائش کر ہی نہیں پاتی تھی کیونکہ شاکر اس کی فرمائشوں پر اُسے جھڑک دیتا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا، جیسے ہی نگہت کو میرے آنے کی خبر ہوئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں چائے اور نمکین بسکٹ وغیرہ ایک ٹرے میں رکھ کر وہاں آن پہنچی۔ اس دن نگہت کے چہرے سے ہی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ پتہ چلا کی رات ہی شاکر نے اُسے اپنے طور پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ نگہت بھی میری کش مکش کو بھانپ گئی۔

''کیا بات ہے حماد بھائی جان۔۔۔۔ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔''

''نگی۔۔۔ اُس دن منگنی میں تمھیں وہ لڑکی یاد ہے۔۔۔۔ وہی جو مجھ سے اندھیرے کمرے میں ٹکرا گئی تھی۔''

نگہت اپنی ہی دھن میں کپ میں چائے انڈیلتے ہوئی بولی۔

''کون۔۔۔ ارے ہاں۔۔۔۔ امی جان نے مجھ کو بتایا تھا'' نگہت کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''وہ ایمان تھی۔ ہمارے پُرانے محلے میں رہتی ہے۔ مولوی علیم الدین صاحب کی بیٹی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا۔''

پھر جیسے نگہت کو کچھ خیال آیا اور وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''خیر تو ہے

بھیا۔آپ ایمان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ایک خاص شرارت تھی۔میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔دل کے کچھ سچ چھپانا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔جس نگہت کی ہم سب مل کر منگنی اور شادی کے نام پر خوب کھچائی کیا کرتے تھے، اتنی کہ وہ اکثر رونے لگ جاتی تھی۔آج اس کی ایک معصوم شرارت بھری مسکان نے مجھ سے میرا تمام اعتماد ہی چھین لیا تھا۔شاید دل میں چور ہونا اسی کو کہتے ہوں گے۔

''کچھ نہیں۔۔۔۔وہ دراصل مَیں۔۔۔۔میرا مطلب ہے۔''

نگہت نے میری چوری پکڑ لی۔

''ہوں۔۔۔۔تو یہ بات ہے۔۔۔۔بھیا۔دیکھیں اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔۔۔۔وہ بہت بھولی بھالی سی سہیلی ہے میری۔۔۔۔اور بہت مذہبی گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔''

نگہت میری بہت سی سہیلیوں کے بارے میں جانتی تھی۔وہ میری تمام دوستوں کو میری سہیلیاں ہی کہتی تھی۔اور ایمان کے بارے میں میری پوچھ گچھ کو بھی میرے انہی پُرانے معمولات میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔مَیں نے نگہت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بیٹھو یہاں۔۔۔۔اور غور سے میری بات سنو۔''

مَیں نے ''الف'' سے ''ی'' تک اب تک کی تمام کہانی نگہت کو من وعن سنا دی۔نگہت حیرت سے میری رام کتھا سنتی رہی۔

''اب تم ہی بتاؤ، مَیں کیا کروں۔۔۔مَیں بہت مشکل میں ہوں بنگی۔۔۔'' ہوں ۔۔۔یہ تو خاصا گھمبیر معاملہ ہے۔۔۔۔تو ایمان بی بی نے میرے پیارے بھیا کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔۔۔لیکن بھیا۔۔۔۔آپ جیسا سمجھ رہے ہیں۔۔۔۔وہ ویسی لڑکی نہیں ہے۔۔۔ساری زندگی کسی نامحرم سے بات کرنا تو دُور کی بات ہے۔۔۔۔اس پر ایسی کسی چیز کا سایہ تک نہیں پڑا۔اپنی ساری تعلیم بھی اس نے پردے میں ہی حاصل کی ہے۔اسے اپنی اور اپنے گھر کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔محلے کا ہر گھرانا اسے اپنی بہو بنانا چاہتا

ہے اور آپ سے پہلے بھی کئی نوجوان اس کی ایک جھلک کے لیے سالوں اس کے گھر اور گلی کے چکر کاٹتے رہے ہیں۔ لیکن ایمان نے نظر اُٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔۔ وہ زور سے ہنسی یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ مَیں اپنی سب سے پیاری دوست کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔"

مجھے نگہت کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ مَیں اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم رہنے دو۔۔۔۔ مَیں خود ہی کچھ کر لوں گا۔"

مَیں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ نگہت نے جاتے جاتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے چہرے پہ شریر سی مسکراہٹ تھی۔

"اوہو۔۔۔۔ روٹھ گئے پیارے بھیّا۔۔۔۔ لگتا ہے آپ واقعی ایمان کے لیے سنجیدہ ہیں۔۔۔۔ پھر تو واقعی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"تو پھر کچھ سوچو۔۔۔۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اپنے بھیّا کا اتنا سا کام نہیں کرو گی۔"

مَیں اور نگہت سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایمان تک یہ رازِ دل پہنچانے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگے۔ کبھی مجھے کوئی طریقہ سوجھتا تو نگہت اُسے رد کر دیتی اور کبھی نگہت کے ذہن میں کوئی بات آتی تو وہ طریقہ مجھے نہ بھاتا۔ اسی شش و پنج میں جانے کتنی دیر بیت گئی لیکن ہم کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ مَیں نے نگہت کو ایمان کے نام ایک مختصر سا رقعہ لکھ کر دینے کی تجویز بھی دی تھی لیکن نگہت نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق ایمان کبھی اس رقعے کو کھول کر نہ پڑھتی اور اسے پھاڑ دیتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات پر نگہت سے بھی ہمیشہ کے لیے بات چیت بند کر سکتی تھی۔

تھک ہار کر مَیں تو سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ نگہت سے اپنے لاڈلے بھیّا کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی اور اُس نے حیاء کو اس معاملے میں اپنا رازدار بنانے کی ٹھان لی۔ طے یہ پایا کہ نگہت کسی بہانے ایمان اور حیاء کو اپنے گھر بلوائے گی۔ حالانکہ اس معاملے میں مولوی صاحب بہت سخت اُصول پسند واقع ہوئے تھے لیکن نگہت کے مطابق وہ ایک بار انہیں مولوی

صاحب سے بھی اجازت دلوا ہی دے گی چاہے اس کے لیے اُسے خود مولوی صاحب کی منت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس دن مجھے بھی اطلاع کر دی جائے گی اور نگہت چند لمحوں کے لیے میری ایمان سے تنہائی میں ملاقات کا بندوبست کروا دے گی۔ مَیں جانتا تھا کہ نگہت کے لیے یہ سب کس قدر مشکل ثابت ہوگا لیکن میری محبت میں اس نے اپنی بچپن کی دوستی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

طے یہ پایا کہ آنے والی جمعرات کو اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن میری وہاں سے واپسی تک نگہت نے ہزاروں بار مجھ سے تصدیق چاہی کہ مَیں کہیں ایمان سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ کہیں وہ بھی کہیں میری بہت سی سہیلیوں کی بھیڑ میں کھو تو نہیں جائے گی۔ آخر کار مجھے اس کے کان پکڑ کر اُسے یقین دلانا پڑا۔ تصور اس کا بھی نہیں تھا اس کی بچپن کی سہیلی تھی ہی اِک ایسی گوہرِ نایاب۔۔۔۔ اس لمحے مجھے نگہت پر بے حد رشک بھی آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس مہ رو اس گل رُخ سے مل سکتی تھی، بات کر سکتی تھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا مَیں گھنٹوں یہیں بیٹھا نگہت کے ساتھ ایمان کی باتیں کرتا رہوں۔۔۔۔ اس سے ایمان کی باتیں سنتا رہوں۔۔۔۔ محبت میں محبوب کا ذکر بھی کس قدر جاں فزا ہوتا ہے۔ بس اُس کے ذکر سے ہی بھوک پیاس مٹتی رہتی ہے۔ صدیاں گھڑیوں میں بیت جاتی ہیں۔ فضا یونہی خواہ مخواہ ہی دل کش لگنے لگتی ہے۔ آس پاس کا سبھی شور بھی جیسے نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ سخت حبس زدہ پھیلی دھوپ میں بھی جیسے پُروائیاں سی چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ رات اور دن سب ایک خواب زدہ سی کیفیت میں گزرتے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بنا کسی بات کے ایک خاص میٹھی سی مسکان پھیلی رہتی ہے۔ سب دشمن بھی دوستوں جیسے پیارے لگنے لگتے ہیں۔ جانے کیا کچھ ہونے لگتا ہے۔

میں بھی اگلی جمعرات کے آنے تک انہی سب محسوسات سے گزرتا رہا۔۔۔ کہتے ہیں یک طرفہ عشق وسوسوں کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اچانک عجیب سے وسوسے ڈسنے لگتے۔ پتہ نہیں وہ آ بھی پائے گی یا نہیں؟ کہیں مولوی صاحب منع ہی نہ کر دیں۔ وہ مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔۔ جانے وہ میری اس کوشش کو کیا معنی دے گی۔۔۔۔؟

آخر جمعرات کا دن بھی آ ہی گیا۔ نگہت نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

اس کے مطابق سہ پہر تین سے چار بجے کا وقت اس ملاقات کے لیے نہایت مناسب تھا۔ گرمیوں کی اس لمبی سہ پہر میں ہر طرف سناٹا ہی چھایا رہتا تھا۔ پلان کے مطابق مجھے دو بجے ہی پُرانی حویلی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کے بڑے برآمدے کے ساتھ ہی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے بڑی بڑی چکیں تان دی جاتی تھیں، ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے ہم ٹھنڈا کمرہ کہا کرتے تھے۔ اصل میں یہ کبھی دادا کی سٹڈی تھی۔ کمرے کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گرمیوں میں ہوا کے رُخ پر ہو لہٰذا شدید تپتی دوپہروں میں بھی یہ کمرہ ٹھنڈا رہتا تھا۔ اب بھی اس کمرے کے شیلف نادر کتب سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی لمبی لمبی سی دوپہریں ہم اسی کمرے میں اوندھے پڑے ٹارزن اور عمر وعیار کی کہانیاں پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔

نگہت نے ایک اور انکشاف بھی کیا تھا کہ ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، اور اس معاملے میں وہ اکثر نگہت سے کتابیں مستعار لیتی رہتی تھی۔ نگہت نے اُسے میرے دادا کی اس اسٹڈی اور ان میں رکھی کتابوں کا بھی بتا رکھا تھا اور بقول نگہت، ایمان کو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ اسٹڈی بند ہی رہتی تھی۔ آج میں خصوصی طور پر اسٹڈی کی چابی لے کر حویلی آیا تھا اور نگہت نے بھی ایمان کو اسٹڈی دکھانے کے بہانے ہی حویلی طلب کیا تھا۔ البتہ حیاء کو وہ اعتماد میں لے چکی تھی کہ اصل میں مقصد میری ایمان سے ایک ملاقات کا اہتمام ہے۔

مجھے اسٹڈی میں ہی ان کا انتظار کرنا تھا۔ نگہت حیا اور ایمان کو لے کر اسٹڈی دکھانے آتی تو انہیں چند لمحوں میں مجھے ایمان سے اپنے دل کی بات کہنی ہوگی۔ اب یہ آگے میرا نصیب تھا کہ وہ میری بات سنتی، رد کرتی یا پھر غصے میں پلٹ جاتی۔۔۔۔ میں اسٹڈی میں اسی شش و پنج میں بیٹھا سامنے لگی لکڑی کی بڑی سی قدیم گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ ابھی صرف دن کے ڈھائی ہی بجے تھے اور مجھے یہاں پہنچے صرف آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ سٹڈی کے بڑے سے روشن دان میں چڑیوں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور اس وقت چڑیا بھی اپنے بچوں سمیت اپنے گھونسلے میں سستا رہی تھی۔ روشن دان سے سامنے کی دیوار پر پڑتی دھوپ دھیرے

دھیرے سرک رہی تھی اور ڈھلتے ڈھلتے دیوار پر نئے زاویے بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ انتظار بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہوتی ہیں۔ مَیں نے گھبرا کر آس پاس کی الماریوں میں لگی کتابوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ لیکن حرف میری آنکھوں کے سامنے گڈ مڈ سے ہونے لگے۔ ہر آہٹ پر مَیں جیسے اچھل ہی تو پڑتا تھا، لیکن ہر آہٹ کے بعد باہر پھر سے طویل سناٹا چھا جاتا۔ گرمیوں کا مخصوص اور طویل سناٹا جس میں وقفے وقفے سے دُور کسی درخت پر بیٹھے کوّے کی کائیں کائیں کے علاوہ اور کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا پھر حویلی کے باہر سے گزرتی لمبی کالی سنسان سڑک پر کسی تانگے کی گزرنے کی آواز، یا پھر کسی موٹر گاڑی کی گھرر گھرر۔۔۔۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آخر تین بج گئے، میرے وسوسے بڑھتے گئے۔ نہیں۔ وہ نہیں آئے گی۔۔۔ حیاء نے اُسے نگہت کے سارے منصوبے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ نگہت سے بھی ناراض ہوگئی ہوگی۔ ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ یہ سب غلطی ہی میری ہے۔

جانے دل میں کیسے کیسے وہم آنے لگے تھے۔ سوا تین بجے تک تو میرا صبر بھی جواب دے گیا۔ مَیں نے گھبرا کر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی مَیں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، دُور برآمدے کے موڑ سے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور چند نسوانی ہنسی اور باتوں کے جلترنگ سے دُور سے بجتے سنائی دیئے۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ یہ تو اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔۔۔۔ یا خدا۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔۔۔۔۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب سے آگے نگہت اور اس کے پیچھے ایمان اور اس کے پیچھے حیا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ نگہت نے مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''السلام علیکم۔۔۔ ارے۔۔۔ حماد بھیا آپ۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔ اس وقت؟''

میری توقع کے عین مطابق ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی سی پھیل گئی۔ اُس نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا اور فوراً جانے کے لیے پلٹی، لیکن حیا اس کے راستے میں اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی لہٰذا اس کا راستہ رک گیا۔ نگہت نے بھی جاتی ایمان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام

لیا۔

''شاید تمھاری دوست کو میری یہاں موجودگی کچھ پسند نہیں آئی۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔''

ایمان نے گھبرا کر پھر سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ نگہت نے اُسے نظروں نظروں میں ہی گھورا، پھر جلدی سے بولی۔

''نہیں نہیں بھیّا ۔۔۔۔ ہم تو دراصل یہاں کچھ پُرانی کتابیں دیکھنے آئے تھے۔ دراصل ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون ہے نا بس اسی لیے۔۔۔۔''

اَب ایمان نے نگہت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، لیکن نگہت نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

''ضرور۔۔۔ کیوں نہیں ۔۔۔۔ آپ لوگ کتابیں دیکھئے۔۔۔ مَیں ابھی حاضر ہوا۔''

مَیں جلدی سے اسٹڈی سے نکل گیا۔ مجھ میں اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ آج اُس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور کالے دوپٹے میں کچھ زیادہ ہی غضب ڈھا رہی تھی۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں اس کی لرزتی پلکیں اور کانپتے ہونٹوں کا منظر اُبھر رہا تھا اور اس کی وہی ایک پریشان سی لٹ ۔۔۔۔۔

باہر برآمدے میں کچھ دیر کھڑا میں اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ سارا معاملہ ہی اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مَیں کسی بہانے نگہت کو حیا سمیت چند گھڑیوں کے لیے باہر برآمدے میں بھیج دیتا اور ایمان سے بات کر لیتا لیکن اُسے دیکھ کر مَیں سب بھول کر خود ہی باہر نکل آیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ شاید اب دوبارہ اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔ شاید مَیں یہ بازی ہمیشہ کے لیے ہار چکا تھا۔

اتنے میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف کچھ آہٹ ہوئی۔ مَیں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ نگہت دروازے سے دبے پاؤں نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے غصے سے بھرے اشاروں میں پوچھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جواب میں مَیں صرف کاندھے اچکا کر ہی رہ گیا۔ پھر نگہت نے اندر حیا کو کچھ اشارہ کیا اور حیا بھی باہر نکل آئی۔ مَیں اب بھی گم سم اور گنگ سا وہیں کھڑا تھا۔ نگہت آگے بڑھی اور میری کلائی تھام کر کھینچ کر مجھے اسٹڈی کے دروازے تک لے آئی

اور مجھے اندر دھکا دیتے ہوئے اُس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''صرف تین منٹ۔۔۔۔''

مَیں گھبرایا ہوا سا نگہت کے دھکے کے زور میں اسٹڈی کے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ایمان دُور آخری الماری کے قریب کھڑی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ آہٹ ہوئی تو اُس نے بے دھیانی میں پلٹ کر دیکھا۔ شاید اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ نگہت اور حیا دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی ہیں اور ان کی جگہ اب مَیں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ سے کتاب نیچے گر گئی۔ اس نے سر کا پلو جلدی سے ٹھیک کیا اور باہر جانے کے لیے لپکی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ اسٹڈی میں آنے اور جانے کا صرف ایک یہی بڑا سا دروازہ تھا جس کے بیچوں بیچ میں اس وقت کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی سے اُس نے قدم بڑھائے تھے۔ اتنی ہی جلدی اُسے رکنا بھی پڑا۔ بے بسی سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ سر جھکائے، بنا کچھ کہے کمرے کے بیچ و بیچ کھڑی تھی۔ شائد اُسے نگہت اور حیا پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا اور ان کی منصوبہ بندی بھی اب اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے اور صرف ہمارے درمیان موجود خاموشی بولتی رہی۔ مجھے اس کی سانسوں تک کی آواز اس سناٹے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس کی آواز کا سُر کمرے میں بکھرا۔ اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔ آپ راستہ چھوڑ دیں۔'' میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اتنے بہت سے لفظ اکٹھے سنے تھے۔۔۔۔ کچھ دیر تو مَیں بالکل مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر یکا یک جیسے مجھے ہوش آیا۔

''آپ کا راستہ اس طرح روکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے میری یہ حرکت تمام عمر کے لیے مجھے آپ کی نظروں سے گرا دے۔۔۔۔ لیکن یقین جانیے۔۔۔ مَیں نے بہت مجبور ہونے کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھیے۔''

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ مجھے جانے دیجیے۔۔۔ خدا کے لیے۔''

اُس کی آواز اَب بھرانے لگی تھی۔ آنسوؤں کا ارتعاش اس کی پلکوں کے گرد جمع ہو کر

چھلکنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

"مَیں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے مَیں نے آپ کو دیکھا ہے۔ میرا آپ میرا اپنا نہیں رہا۔ میرے پاس شاید وہ لفظ ہی نہیں ہیں جن سے مَیں اپنی کیفیت آپ پر ظاہر کر سکوں۔۔۔۔ میرے جذبے کے لیے اس وقت دنیا کی سبھی ڈکشنریوں میں موجود ہر لفظ مجھے عامیانہ لگ رہا ہے۔ شاید میرا یہ طریقہ بھی بے حد عامیانہ اور ہلکا ہے لیکن مَیں کیا کروں۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ یہ میری اور میرے دل کی شدید مجبوری ہے جس نے مجھے آپ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایسا گرا ہوا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

وہ اَب بھی یونہی خاموش سی سر جھکائے کھڑی نیچے بچھے قالین میں نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ اس نے پھر وہی بات دُہرائی۔

"آپ نے اپنی بات کہہ دی۔۔۔۔ اب مجھے جانے دیں۔۔۔۔ مَیں آپ کی منت کرتی ہوں۔"

"مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔"

مَیں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ ہَوا کے ایک جھونکے کی طرح وہاں سے اپنا نازک وجود سنبھالتی ہوئی نکل گئی۔ بس اس کی خوشبو کمرے میں بکھری رہ گئی۔ مَیں نے باہر کے برآمدے کی طرف اسٹڈی کی کھلنے والی کھڑکی میں اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نگہت اور حیاء کے پاس رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ نگہت اُسے آوازیں دیتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ حیاء کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے آداب کیا اور پھر وہ بھی ایمان کے پیچھے بھاگ گئی۔ مجھے اس لمحے حیا بہت اچھی لگی۔ اس لڑکی نے ایک انجانے انسان پر اعتبار کر کے اپنی جان سے پیاری بہن کو اس سے ملنے بھیج دیا تھا۔ جانے نگہت نے اُسے کس طرح میرا اعتبار دلایا ہوگا۔ بہرحال جو بھی تھا، فی الحال تو نگہت اور حیاء دونوں کی ہی خیر نہیں تھی۔ ظاہر ہے ایمان ان سے شدید ناراض ہوگئی ہوگی۔ جانے اَب وہ دونوں اسے کس طرح منائیں گی۔

مَیں بہت دیر تک اس کمرے میں یونہی سحر زدہ سا بیٹھا رہا۔ جانے کیوں وہاں سے

باہر جانے کے لیے میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ مَیں بار بار اس منظر کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہتا تھا جب وہ ناز پیکر یہیں اس کمرے میں سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا نازک وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا، اور وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔

دھوپ ڈھل چکی تھی اور اَب روشن دان سے اندر چھننے والی روشنی میں وہ حدّت باقی نہیں تھی۔ میری گھڑی پر نظر پڑی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بادل نخواستہ میں وہاں سے اُٹھا۔ اچانک میری نظر اس کتاب پر پڑی جو ایمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھالی۔ بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' تھی۔ اچانک میری نظر کتاب کے پاس ہی پڑے دو چھوٹے سے موتیوں پر پڑی۔ ایسے موتی تو مَیں نے ایمان کے سینڈلز میں لگے دیکھے تھے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر پورا وقت زمین میں گڑی ہوئی تھی اور میری نظر بھی اس کے نظر کے تعاقب میں اس کے قدموں کی طرف کئی بار اٹھی تھی۔ ضرور جب اس کے ہاتھ سے کتاب گری ہوگی تو اس کے قدموں سے ٹکرائی ہوگی۔ تبھی یہ موتی علیحدہ ہو کر گر پڑے ہوں گے۔ میں نے وہ دونوں موتی اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔

اب نگہت کا انتظار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں ٹوٹے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ رات بھر میری پلکوں تلے وہ سارے منظر کسی فلم کی طرح چلتے رہے۔ میری حالت اس نالائق طالب علم کی سی تھی جو پرچے میں ایک بھی سوال ٹھیک طرح سے حل کر کے نہ آیا ہو لیکن پھر بھی اُسے نتیجے کا بے چینی سے انتظار ہو۔

کبھی کبھی ہم زندگی میں کچھ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں نتیجے کی کیفیت سے زیادہ نتیجہ کا پتہ چل جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا مخالفت میں، بس فیصلہ ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسا کمزور اعصاب والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کی اذیت اور چبھن کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہنی دباؤ کے ہاتھوں تنگ آ کر دھائی دینے لگتے ہیں کہ بس جو بھی ہونا ہے وہ آج ہی ہو کر رہے۔ ایسے لوگ اس وقت اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس نتیجے اور جس فیصلے کا اپنی مخالفت میں طے ہو جانے کا خیال ہی انہیں اس قدر ہلکان کر رہا ہے کہ وہ

بے چینی سے اس کے اعلان کی دُعائیں کر رہے ہیں، وہ فیصلہ اعلان ہونے کے بعد جب واقعی ان کے حق میں نہیں ہوگا تو تب ان کا کیا حشر ہوگا۔۔۔؟

میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اس رات۔ مجھے ایمان کے فیصلے کا انتظار تھا اور مَیں ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، بس مجھے جلد از جلد اس کا فیصلہ سنائی دے دیا جائے۔ شاید اس جلد بازی میں میرے دل کی ایک اور چوری تمنا کا بھی عمل دخل تھا۔ میرا دل اس وقت کسی طور بھی اس دلبر کی طرف سے کسی رابطے، کسی کلام کی خواہش میں مچل رہا تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پہ بس میرا نام آئے۔۔۔ چاہے، برسرِ الزام ہی آئے۔ جانے عشق میں یہ دل ایک چھوٹے بچے کی طرح کیوں برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ عشق میں دل کو صرف اُسی پل، اُسی لمحے، اُسی دن کی فکر ہوتی ہے جو گزر رہا ہوتا ہے۔ مستقبل کا ڈر، خوف یا وسوسے اس سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ عشق کو بس حال سے غرض ہوتی ہے۔ عشق انجام سے بے خبر اور لاتعلق ہوتا ہے۔

جانے وہ رات کیسے ڈھلی اور کب صبح ہوئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ مَیں اڑ کر نگہت کے پاس پہنچ جاؤں اور اس سے کل کی تمام روداد پوچھوں، کرید کرید کر سوال کروں، لیکن روز روز یوں پُرانی حویلی جانا بھی تو کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نگہت میری منہ بولی بہن ہی سہی لیکن آس پاس حویلی کے دوسرے نوکر چاکر بھی تو تھے۔ جانے وہ میرے روز روز کے یوں وہاں آنے اور نگہت سے تنہائی میں ملنے کو کیا رنگ دیں۔ پھر مَیں نے خود ہی ان فضول خیالات کو سر سے جھٹک دیا۔ یہ مَیں کیا سوچ رہا تھا، یہ بے بنیاد سے وہم میرے اندر کہاں سے پلنے لگے تھے۔۔۔؟ شاید محبت انسان کو اپنے اُوپر شک کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے شاکر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے تک آن پہنچا۔ مَیں ابھی تک کمرے میں ہی بند تھا صبح سے، شاکر نے مجھے نگہت کا دیا ہُوا ایک بند لفافہ تھمایا اور حسبِ معمول پوچھا۔۔۔ ''بابا۔۔۔ کل آپ حویلی گئے تھے۔۔۔ کچھ کام تھا کیا۔۔۔؟''

حالانکہ شاکر نے اپنے معمول کے مطابق عام سا سوال ہی کیا تھا لیکن جانے کیوں مَیں گڑبڑا سا گیا۔۔'' ۔۔ ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ خاص نہیں۔۔۔ نگہت سے کچھ کتابیں نکالنے کا کہا تھا سنڈی سے۔۔۔ وہی لینے گیا تھا۔''

شاکر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''دیکھیں حماد بابا۔۔۔۔ اگر آپ نے نگہت کو مزید نئی کتابیں دلوائیں تو مَیں بہت ناراض ہو جاؤں گا۔ ضرور اس نے اس لفافے میں نئی کتابوں کی فہرست بھیجی ہوگی۔''

مجھے شاکر کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ جانے وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے مَیں نے اُسے یقین دلایا کہ مَیں اس مہینے میں نگہت کو مزید کوئی کتاب نہیں دلواؤں گا۔ شاکر کے جاتے ہی میں نے بے تابی سے فوراً لفافے کو چاک کیا اور اندر سے نگہت کا خط نکالا۔ میری بے چین نظریں خط پر پھسلنے لگیں، لکھا تھا۔

''بھیا جی۔۔۔۔

بُرا پھنسایا آپ نے، وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ بہت ناراض ہو کر گئی ہے یہاں سے۔ اپنی چھوٹی بہن سے بھی بات نہیں کر رہی تھی۔ مَیں نے آپ کو کہا تھا نا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔۔۔۔ بہر حال جو ہُوا سو ہُوا۔۔۔۔ آج مَیں اُس کے گھر جاؤں گی اور مَیں اور حیاء اسے مل کر منا ہی لیں گے۔۔۔۔ لیکن آپ کے مقدمے کا کیا فیصلہ دیتی ہے۔ یہ اَب خدا ہی جانے۔ میری مانیں تو آپ اپنے گھر والوں سے بات کر کے اُس کے گھر بھیجیں۔۔۔۔ اس سے آپ کی سچائی بھی اس پر واضح ہو جائے گی، ورنہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو بنا کسی رشتے کے ایسا کوئی تعلق جوڑے۔۔۔۔ خوش رہیں۔''

اس چھوٹے سے خط میں نگہت نے وہی سب کچھ لکھا تھا جس کی مَیں توقع کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں مَیں وہ چند سطور پڑھ کر بے حد اُداس اور پہلے سے کہیں زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہی ہُوا، پہلے نتیجہ آنے کی بے چینی تھی اور اَب فیصلہ سننے کے بعد کی بے تابی۔

نا اِس کروٹ چین تھا، نہ اُس کروٹ آرام۔

لیکن انسان کی فطرت میں قدرت نے اُمید اور آس کی ڈور سے ہمیشہ بندھے رہنے کا ایک عجیب سا انتظام کر رکھا ہے۔ ایک ڈور ٹوٹتی ہے تو وہ دوسری تھام لیتا ہے۔ دوسری ٹوٹتی ہے تو تیسری۔۔۔۔ یوں یہ سلسلہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے تک چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید

قدرت نے انسان کی طبیعت میں یہ آس اور اُمید کا سلسلہ نہ رکھا ہوتا تو وہ پہلی نا اُمیدی پر ہی ختم ہو جاتا، مایوسی سے مر جاتا۔

مَیں بھی ایک نئی آس اور اُمید میں مبتلا ہو گیا کہ نگہت اور حیا جب اس مہ جبیں کو منا لیں گے تو شاید تب اُسے میرے حال پر کچھ رحم آ جائے۔۔۔۔شاید وہ کچھ کہے۔

اَب میری دھڑکنوں کو اس کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے اس انتظار کی سولی پر ابھی مزید کچھ روز لٹکنا تھا۔۔۔۔

OO

زرد لندن

لندن کی شام اگر دن بھر دھوپ نکلنے کے بعد ہو تو شاید ہی اس سے حسین شام دنیا کے کسی اور خطے پر اُترتی ہوگی۔ اور اگر موسم خزاں کا ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخی کا رنگ تھا اور زمین پر خزاں میں جلے سُرخ پتوں نے جیسے اک آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مصوّر نے صرف سُرخ اور زرد رنگ کی آمیزش سے کینوس پر ایک خوبصورت تصویر بنا ڈالی ہو۔

میں اور کامران اس روز ہائیڈ پارک سے شہر کی طرف جاتی ہوئی سنسان سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک دونوں طرف سے گھنے پیپل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے خزاں رسیدہ پتے ہَوا سے ہمارے سروں پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی دولہے کے سہرے پر پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ہم دونوں کو اپنے اپنے اوورکوٹ گلے تک بند کرنے اور ان کے کالر اُٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے جمی ہوئی برف کے ڈھیر دھیرے دھیرے پگھل کر ساتھ بنی لوہے کی جالیوں سے ڈھکی نالیوں میں ایک مدھم سے شور کے ساتھ گر رہے تھے۔ قریب ہی ایک جوڑا سردی سے بے نیاز، وہاں کھڑی آئس کریم گاڑی سے اپنی پسند کی کون آئس کریم بنوا رہا تھا۔ سچ ہے، آئس کریم کھانے کا مزہ تو شدید سردی میں ہی آتا ہے۔ لڑکی اپنے لباس میں خود بھی اس وقت کوئی رنگ برنگی آئس کریم ہی لگ رہی تھی۔ لڑکے نے جانے اُسے کیا کہا، دونوں ایک ساتھ زور سے ہنسے۔ کامران نے حسب معمول بُرا سا منہ بنایا اور لندن کی تمام حسین اور جوان لڑکیوں کی عقل کا ماتم کیا۔ دُور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ سڑک ہمیں سیدھے اُس ڈوبتے سورج کے گولے کی طرف ہی لے جا رہی ہو۔

"کچھ بھی ہو یار میڈی۔۔۔۔ مجھے اس یہودن کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ تم

یہاں سکون کی تلاش میں آئے ہو۔ مَیں تو کہتا ہوں چھوڑ دو یہ پڑھائی وڑھائی کا چکر، مَیں بھی کچھ دن آف لیتا ہوں اور نکلتے ہیں سوئٹزرلینڈ کی طرف۔ کچھ نئی محبتوں کی تلاش میں ۔۔۔۔ بول ۔۔۔۔ کیا بولتا ہے۔"

مَیں جانتا تھا کامران کس قسم کی نئی محبتوں کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ "سدھر جاؤ مسٹر کامران۔ تمھاری اپنی حرکتوں کی وجہ سے تین لڑکیاں باقاعدہ سال سال تک تمھاری منگیتر رہنے کے بعد تمھیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اب تک، اَب کیا ڈبل ہیٹ ٹرک کا ارادہ ہے۔"

ہم چوک پر بنے ہوئے بڑے سے فوارے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کے درمیان ایک بڑے سے لوہے کے بنے شیر کے مُنہ سے خون کی دھاروں کی بجائے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کی وجہ سے دو چار دھاریں جم کر باقاعدہ برف کی پتلی کمانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخری ٹرام نکلنے ہی والی تھی۔ ہم دونوں باقاعدہ دوڑتے ہوئے پیلے رنگ کی ٹرام جس پر بڑی سے لال لکیریں ڈلی ہوئی تھیں، میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک جپسی عجیب سے گھاگھرا نما لباس میں باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کامران کو اور کامران اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔

"تم اسے جانتے ہو۔"

"نہیں ۔۔۔۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مجھے جانتی ہے، تبھی تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔" اتنے میں جپسی نے والہانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے اور کامران کی طرف بڑھی۔ کامران کے دل کی کلی کی طرح اس کا چہرہ بھی کھل گیا اور اس نے بھی ہاتھ پھیلا دیے۔ جپسی ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے کھڑے لمبے بالوں والے ایک میلے سے ہپی کے گلے جا لگی، کامران ویسے ہی بازو پھیلائے کھڑا رہ گیا۔ مجبوراً مجھے ہی اسے گلے لگانا پڑا۔ چند لمحے تو وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ہی گنگ سا کھڑا رہ گیا اور پھر ہم دونوں ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ٹرام اپنی مخصوص دھیمی سی رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

کچھ لوگ محبت کو زندگی میں سب سے خالص جذبہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سچی محبت سے زیادہ خالص جذبہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے مَیں اور کامران دونوں ہی

اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

مَیں نفرت کو دُنیا کا سب سے مکمل اور خالص جذبہ سمجھتا تھا، محبت میں تو پھر بھی کہیں کچھ ملاوٹ، کچھ کھوٹ ہوسکتا تھا، لیکن نفرت بنا کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے ہوتی ہے۔ بالکل اصلی، شدید اور خالص۔۔۔۔ جب کہ کامران کے خیال میں ''ہوس'' دنیا کا سب سے سچا جذبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان صرف ہوس کے معاملے میں ہی خالص اور سچا ہوتا ہے۔ باقی سب جذبوں میں وہ کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی جاتا ہے۔ چاہے محبت ہو یا چاہے نفرت لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے محبت ہو یا نفرت، چاہے عشق ہو یا پھر صرف ہوس۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ چاروں ایک ہی جذبے کے چار رُخ دکھائی دیتے تھے۔ محبت کی بنیاد پر نفرت کرنے والے یا عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اپنی ہوس چُھپانے والے مجھے ہمیشہ ہی سے منافق لگتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کھلے عام ہوس کا رشتہ رکھنے والے ہی اصل میں بہادر اور سچے لوگ ہوتے ہیں۔ شاید ہوس ہی دنیا کا ازلی اور شاید ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ اور ہم سب بھی ایسے ہی کسی رشتے کی پیداوار ہیں۔

کامران نے رات سونے سے پہلے پھر مجھے سر آئزک کی بیٹی مس پیریز کے ساتھ اُلجھنے سے منع کیا۔ دراصل اسے بچپن سے میری ایک خاص عادت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ میں کسی ایک خاص حد تک ہی چیزوں کو ٹال پاتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ معاملہ میرے دماغ کی رگوں پر سوار ہونے لگتا تو پھر مَیں اپنے نفع ونقصان کا احساس بُھلا کر اس معاملے کو سدھارنے کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ مَیں یہاں اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آیا ہوں لہٰذا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی قسم کا تناؤ برداشت کروں۔

لیکن شاید قدرت اس وقت کامران کی خواہش کے حق میں نہیں تھی۔

اگلی صبح میری پہلی مڈبھیڑ ہی مس پیریز سے ہوگئی۔ یونیورسٹی کے احاطے میں جوزف ندی کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر کھڑا پرندوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اُس نے مجھے دُور سے آتے دیکھا تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلانے لگا۔ میری کلاس میں ابھی

کچھ وقت باقی تھا۔ سوچا دو گھڑی جوزف سے ہیلو ہائے کرلوں۔ مَیں جوزف کی طرف بڑھنے کے لیے جیسے ہی لکڑی کے بنے ہوئے اس پل پر چڑھا جو ندی کے دونوں کناروں کو ملانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ تو اچانک دوسری طرف سے سارہ اپنے چار دوستوں کے گینگ کے ہمراہ اس پل پر چڑھ آئی۔ اس کے دوستوں میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں اور یہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سارہ نے قریب سے گزرتے ہوئے عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ وہ شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ متروک زبانیں کبھی میری خاص دلچسپی کا حامل ہوا کرتی تھیں۔ جیسے لوگوں کو ٹکٹ جمع کرنے، سکے اکٹھے کرنے مصوری کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح کبھی میرا واحد شوق دنیا کی پُرانی زبانوں کے بارے میں جاننا تھا۔ یہ شوق مجھے دادا جان سے منتقل ہوا تھا۔ ہماری پُرانی حویلی کی لائبریری اور سٹڈی میں اب بھی اس طرح کی کئی قدیم کتابوں کے نسخے محفوظ تھے۔ جن میں توریت اور زبور کے قدیم نسخے بھی شامل تھے۔

اسی لیے مجھے سارہ کی کہی ہُوئی بات سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے میرے مذہب کے بارے میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ لیکن انگریزی کے بجائے عبرانی زبان اس نے شاید اس لیے استعمال کی تھی کہ مقصد شاید مجھے چوٹ پہنچانے سے زیادہ اپنے دوستوں سے داد وصول کرنا تھا۔ مَیں بھی اتنی عبرانی تو بول ہی سکتا تھا، سو مَیں نے بھی عبرانی میں ہی اُسے جواب دیا۔

''کوئی مذہب کسی دوسرے کے مذہب پر کیچڑ اُچھالنے کی اجازت نہیں دیتا، اور کیچڑ اُچھالنے والے دراصل خود اپنے مذہب کو ہی گالی دے رہے ہوتے ہیں۔''

میری بات سنتے ہی چند لمحوں کے لیے سارہ گنگ سی رہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ مَیں اس کی بات سمجھ جاؤں گا۔ نہ صرف سمجھوں گا بلکہ اُسے اس کی زبان میں ہی جواب بھی دوں گا۔ اس کے گروپ میں سے ایک لڑکا جو شاید عبرانی نہیں جانتا تھا جلدی سے سارہ کے قریب آیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ مَیں نے اس سے کیا کہا ہے۔ سارہ اب بھی خاموش کھڑی تھی۔ مَیں آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا لڑکا میرے راستے میں آ کھڑا ہوا اور میرا راستہ بند کر دیا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اِک دوجے کو گھورتے رہے۔

جوزف جو اَب تک دُور کھڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ شاید معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا، اسی لیے وہ تیز تیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا اور دُور ہی سے چلّا کر کہنے لگا ''ہے حماد مین تم کہاں ہو۔۔۔؟ جلدی یہاں آؤ۔۔۔۔ مجھے تُم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

جوزف چونکہ اسی یونیورسٹی کا ایک ٹیچر تھا لہٰذا اُس کے سامنے ان لڑکوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مَیں بھی سامنے کھڑے لڑکے کو ہٹا کر جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کا گروپ بھی دوسری جانب چلا گیا۔

جوزف نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔

''کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ تمھیں۔''

''کچھ نہیں۔۔۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ نائن الیون کے بعد یہ مذہبی تعصب ان بڑی یونیورسٹیوں تک پھیل چکا ہے۔''

''ان لوگوں سے نہ ہی اُلجھو تو بہتر ہے۔ یہ سب ہی یہاں کے اُونچے درجے کے یہودی اُمراء کے بچے ہیں۔ تمھارے لیے کسی بھی وقت کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔''

مَیں اور جوزف چلتے ہُوئے اپنے مخصوص بینچ پر جا بیٹھے۔ ہمارے اردگرد کبوتروں کا ایک غول دانہ چگ کر ایک زوردار آواز کے ساتھ اُڈاری بھر گیا، اور اس کی جگہ نئے کبوتروں نے لے لی۔

''میں کسی سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن جانے یہ لوگ کیوں ہر بار میرا راستہ کاٹ جاتے ہیں۔ جانے انہیں مجھ سے کیا پرخاش ہے۔''

جوزف نے خاکی کاغذ کے لفافے سے کبوتروں کا دانہ نکال کر فضا میں اُچھال دیا۔

''مَیں جانتا ہوں تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو، نہ ہی تم نے کبھی ان لوگوں سے ازخود اُلجھنے کی کبھی کوئی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس یونیورسٹی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اپنی رعایا۔ اور تم رعایا کے جملہ حقوق پر پورے نہیں اُتر رہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔ رعایا کے جملہ حقوق پر کیسے پورا اُترا جا سکتا ہے۔''

''دراصل تمھارے انداز میں، تمھاری چال ڈھال میں اور تمھارے بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک خاص غرور سا ہے۔ تمھاری شخصیت میں مرعوبیت کی ذرا

بھی جھلک نہیں ہے۔ اور یہی بات ان سب کو کھلتی ہے۔ جو شخص ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان کے سامنے تن کر چلے۔ یہ بھلا اُسے کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔"

مجھے غصہ آ گیا۔

"مرعوب ہونے یا ان سے دبنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔۔ مَیں کسی خیراتی سکالر شپ پر تو یہاں آیا نہیں ہوں۔ ہزاروں پونڈ فیس بھری ہے۔ اِس یونیورسٹی کا میرٹ ٹیسٹ پاس کیا ہے۔ بلکہ مَیں شاید یہاں پر موجود ہر اسٹوڈنٹ سے زیادہ ڈونیشن اور فیس دیتا ہوں کیونکہ مجھے اسپیشل سیٹ پر یہاں داخلہ دیا گیا ہے۔ پھر بھلا مَیں کسی کے رُعب میں کیوں آؤں؟"

"تمھارے اسی ڈونیشن اور تمھاری اسی بھاری فیس نے ان یہودی ساہوکاروں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک سونے کی کان ہو جسے یہ اپنی انا کے ہاتھوں کھو نہیں سکتے۔۔۔۔ بُرا مت ماننا۔۔۔۔ یہ تمھاری قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے تمھیں یہاں داخلہ ملا۔۔۔۔ بلکہ وہ تمھاری بینک بیلنس کی شیٹ جو تمھارے ریکارڈ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اُس نے تمھیں اس یونیورسٹی تک پہنچایا ہے۔"

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"یہ سب آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"تم نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔۔ یہاں گنے چُنے مسلمان اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر برائے نام مسلمان ہیں۔ جو یہاں کی تہذیب میں رل مل کر اپنا اور دوسروں کا فرق مٹا چکے ہیں۔ باہر سے صرف تمہی ہو۔ یہ یونیورسٹی داخلہ دیتے وقت سات شجروں تک حسب نسب کھنگالنے کی عادی ہے۔ ہوسکتا ہے تمھارے شجرۂ نسب میں انہیں کوئی قابل فکر چیز بھی نہ ملی ہو۔"

مَیں نے چونک کر جوزف کی جانب دیکھا، یہ بات تو اس نے چاہے انجانے میں ہی کہی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہی تھی۔ میرے دادا، پردادا برٹش گورنمنٹ کے خاص وفادار اور وظیفہ خوار رہ چکے تھے، ہماری سات نسلوں میں کوئی باغی پیدا نہیں ہوا تھا۔

مَیں نے غور سے جوزف کو دیکھا۔

"لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ بھی تو اسی یونیورسٹی کی انتظامیہ

کا ایک حصہ ہیں۔ پھر انتظامیہ کے یہ راز مجھ پر کیوں کھول رہے ہیں۔''

جوزف مسکرایا۔

''مَیں خود بھی اس بات پر کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آخر تُم میں ایسی کیا بات ہے جو اپنا اپنا لگنے پر مجبور کرتی ہے۔ تم اوروں سے مختلف کیوں دِکھتے ہو؟۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ مَیں جانتا ہوں کہ تم نے کبھی ٹوٹ کر کسی سے محبت کی ہے۔۔۔۔ اور میرے دل میں محبت کرنے والوں کا بہت اُونچا مقام ہے۔۔۔۔ بہت اونچا۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''گویا آپ نے بھی کسی سے کبھی محبت کی ہے۔۔۔۔؟ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مَیں نے کبھی ٹوٹ کر کسی کو چاہا ہوگا۔۔۔۔؟ ہوسکتا ہے مَیں محبت کے نام سے بھی واقف نہ رہا ہوں۔''

''ناممکن۔۔۔۔ تمھاری آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔۔۔۔ ان کی گہرائی میں محبت کے کتنے راز، کتنے درد چھپے ہیں۔۔۔۔ یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتے۔۔۔۔ محبت اِنسان میں ٹھہراؤ لے کر آتی ہے۔۔۔۔ وہ اُوپر سے جتنا پُرسکون نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی بے چین ہوتا ہے۔۔۔۔ تم بھی ایک ایسا ہی خاموش اور پُرسکون سمندر ہو۔۔۔۔ جو اپنے اندر ہزاروں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔''

مَیں نے ایک لمبی سی سانس لی۔۔۔۔ تو گویا اَب یہ دل کے راز میرے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔۔؟ کیسے چھپاؤں اپنے اس کرچی کرچی دل کے آئینے کو۔۔۔۔؟

مَیں اور جوزف یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے سامنے نہر میں پانی بہنے سے فضا میں اِک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کبوتروں اور دانے چگتے پرندوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ سرد ہَوا میری آنکھوں سے ٹکرائی تو مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے ہیں۔ مَیں نے کوٹ کی جیب سے گہرا کالا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ دل کے راز جب دل میں ہی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔۔ لیکن جب یہ آنکھوں سے بہہ کر چھلکنے لگیں تب ان پر پردہ ڈال لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

محبت کی دوپہر

محبت اِنسان پر دھوپ کی طرح دھیرے دھیرے اُترتی ہے، جون، جولائی میں کسی صحرا کی تپتی دھوپ کی طرح۔ جس کی شدت کا صبح کے پہلے پہر میں انسان کو اتنا پتہ نہیں چلتا، لیکن جیسے جیسے محبت کی دوپہر قریب آتی ہے، بے چینی اور چبھن سے انسان کا بُرا حال ہونے لگتا ہے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اُگ آتے ہیں۔ دم لبوں پر آ کر اٹک جاتا ہے، نہ جان جسم کے اندر رہتی، نہ پوری طرح جسم سے باہر نکلتی ہے۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب مَیں ایمان کی محبت کے پہلے پہر سے نکل کر اس محبت کی دوپہر تک جا پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی محبت کے پہلے پہر کا سکون بھی نصیب نہیں ہُوا تھا۔ جب تک مَیں اس محبت ابتدائی کے جھٹکے سے سنبھلا، تب تک اس کی محبت کی کڑکتی دوپہر میرے سر پر موجود تھی۔

اس دن حویلی کی سنڈی میں رو کے جانے پر اور اس سازش میں اپنی عزیز از جان سہیلی اور اپنی بہن کے شریک ہونے پر وہ اس قدر برہم تھی کہ اُس نے کئی روز تک اپنی بہن حیا اور نگہت سے بات نہیں کی۔ لیکن نگہت بھی اپنی دھن کی پکی تھی۔ وہ باقاعدہ دھرنا دے کر ایمان کے گھر کے کچے صحن میں جا بیٹھی کہ جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی، مَیں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ ایمان کی اماں نے پہلے نگہت کو اور پھر ایمان کو دُھائیاں دیں کہ گھر کے مردوں کی واپسی کا وقت ہے، خدا کے لیے ان دونوں کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے ختم کر دیں۔ خاص طور پر انہیں مولوی صاحب کا ڈر تھا۔ اگر وہ گھر آ جاتے اور نگہت کو یوں صحن میں بیٹھا دیکھ لیتے تو جانے کیا سمجھتے۔۔۔۔؟ ان کا بچوں پر رعب بھی تو بہت تھا۔ مجبوراً ایمان کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ نگہت کو بازو پکڑ اُٹھا کر اپنے اور حیا کے کمرے میں لے گئی اور پھر وہاں ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ نگہت کے گلے لگ کر خوب روئی اور اُس نے نگہت سے وعدہ لیا

کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ایمان یا اس کے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔ نگہت نے اس سے وعدہ تو کرلیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ یقین دلانے کی بھی پوری کوشش کی کہ مَیں اُن عام نوجوانوں میں سے نہیں ہوں جو اس طرح کے رشتوں کو کھیل سمجھتے ہیں۔ نگہت نے اپنے ماں باپ کی قسم کھا کر اُسے میری اور میرے جذبے کی سچائی کا اعتبار دلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس معاملے میں ایمان نے صرف اتنا ہی کہا کہ اس کی زندگی کا اختیار صرف اس کے ماں باپ کو ہے، وہ جہاں چاہیں گے، جیسے چاہیں گے اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور نہ ہی سننا چاہتی ہے۔

یہ تمام باتیں مجھے نگہت کی زبانی پتہ چلی تھیں۔ نگہت نے پُرانی حویلی بلا کر یہ ساری داستان میرے گوش گزار کرتے ہُوئے مجھے پھر یہی مشورہ دیا کہ مَیں اگر ایمان کی جانب کوئی پیش رفت کرنا چاہتا ہوں تو اس کا صرف، واحد اور ایک ذریعہ میرے گھر والوں کی طرف سے اس کے گھر رشتے کا جانا ہی تھا۔

بہر حال مجھے ایک بات کا اطمینان تو ہو گیا تھا کہ ایمان فی الحال کہیں منسوب نہیں تھی لیکن اس جیسی ماہ تاب کے لیے جانے کتنے اور دل دھڑکتے ہوں گے۔ جانے اور کتنوں کی وہ نورِ نظر ہو گی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا، بہت جلدی کرنا تھا۔ لیکن مجھے اپنے گھر والوں کے ردِ عمل کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ شہر کے سب سے اُونچے اور امیر گھرانے کا رشتہ اور وہ بھی کسی غریب مولوی کے گھر؟ ہماری شان اور انا بھلا یہ سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن گھر والوں سے بات کیے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے مولوی صاحب کے گھر تک پہنچنے کے لیے اپنے گھر والوں کی شناخت کی ضرورت تھی۔ میری اپنی تو فی الحال کوئی شناخت بھی نہیں تھی۔

اور پھر وہی ہُوا جس کی مَیں توقع کر رہا تھا۔ پورے گھر میں جیسے ایک بھونچال سا آ گیا۔ سب سے پہلے امی چلائیں۔ ''کیا۔۔۔؟ تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔''

کمشنر صاحب کو جلال آ گیا۔ وہ مُنہ سے پائپ کا دھواں اُگلتے ہُوئے دھاڑے ''ہماری سات نسلوں کی عزت کو بٹہ لگانے چلا ہے یہ۔'' عبرینہ بھابھی نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''واٹ رَبش What Rubbish۔۔۔۔'' سجاد بھائی نے سر پیٹ لیا۔ ''مجھے پتہ تھا یہ کوئی

نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔'' پورے گھر میں صرف عباد تھا جس نے آ کر میری پیٹھ ٹھونکی ''گریٹ میڈی بھائی گریٹ ۔۔۔۔ زبردست چوائس ہے۔ بیسٹ آف لک'' ۔۔۔ لیکن عباد بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف قسمت کے لیے دُعا دینے سے کسی کی قسمت اچھی نہیں ہو جاتی۔ اور پھر مجھے تو اپنی قسمت کی لکیر پھر نئے سرے سے تراشنی تھی۔ صرف ایک تیشے کی مدد سے پھر سے دودھ کی نہر کھودنا تھی۔ زندگانی پھر سے کوہ کن کا امتحان لینے کو تیار تھی۔

میرے والدین اور بڑوں نے اس معاملے میں میری کوئی بات سننے سے ہی صاف انکار کر دیا۔ مجھے یاد ہے ہم سب ڈنر ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اپنا مدعا پھر سے دُہرایا ۔۔۔۔ بابا نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے چھری اور کانٹے کو زور سے پلیٹ میں دے مارا۔

''بس ۔۔۔۔ بہت سن لی تمھاری عشق کی داستان ۔۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو ۔۔۔۔ تم اگلے ہفتے لندن جا رہے ہو۔ مَیں نے وہاں کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں تمھارے داخلے کا انتظام کر دیا ہے۔ دو سال کی ڈگری ہے۔ پہلے پڑھائی ختم کر لو ۔۔۔۔ شادی وادی بھی ہوتی رہے گی۔''

''لیکن مَیں لندن نہیں جانا چاہتا ۔۔۔۔ مجھے اکنامکس کی ڈگری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

امی چلائیں ''تو پھر کس چیز میں دلچسپی ہے تمھیں ہاں ۔۔۔۔؟ چار دن میں ہی ایسا کیا جادو کر دیا ہے تم پر اس شریف زادی نے ۔۔۔۔؟

عبرینہ بھابھی نے فوراً تڑکا لگایا'' مجھے تو اسی دن اس پر شک ہو گیا جس دن وہ یہاں پارٹی میں نیک پروین بنی بیٹھی تھیں۔ اُف ۔۔۔۔ یہ چھوٹے لوگ۔''

مَیں مزید یہ لغویات نہیں سن سکتا تھا، لہٰذا مَیں غصے میں اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور نیپکن زور سے میز پر جھٹک کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی امی کی تیز غصے میں بھری آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ شاید بابا سے کہہ رہی تھیں۔

''دیکھا ۔۔۔ دیکھا آپ نے ۔۔۔۔ کس قدر خود سر ہو گیا ہے ۔۔۔ مَیں تو کہتی ہوں ۔۔۔۔''

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے مَیں ڈائننگ ہال سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن کاش میں

اس دن وہاں کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے امی کا پورا جملہ سُن لیتا تو اگلے دن وہ غضب نہ ہوتا جو ہُوا۔

سوائے عباد کے تمام گھر والوں نے میرا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اگلے دن مَیں یونہی گم سم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک نیچے سے امی اور بھابھی کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے تو مَیں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ آج کل گھر میں ایسے ڈرامے تقریباً روز ہی ہوتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ تو کچھ مجھ سے متعلق ہے۔ مَیں جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ریلنگ کے قریب آ کر دیکھا تو نیچے لاؤنج میں مولوی علیم سر جھکائے کھڑے تھے، ان کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ آنکھوں میں آنسو اور سارے بدن میں جیسے لرزش سی تھی، امی اور بھابھی مل کر جانے انہیں کیا کیا مغلظات سنا رہی تھیں۔ میرے قدموں کے نیچے سے تو جیسے زمین ہی نکل گئی۔ مَیں وہیں اوپر سے کھڑے کھڑے چلایا۔ ''امی۔۔۔ بس کریں بہت ہو گیا۔''

امی اور بھابھی مجھے دیکھ کر چُپ ہو گئیں اور لاؤنج سے ملحقہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ مولوی صاحب بھی پلٹے اور ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس ہو لیے، جب تک مَیں جوتے پہن کر بھاگتا ہوا باہر پہنچا وہ اپنی سائیکل نکال کر گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ مَیں بھاگتا ہوا ان کے سامنے آ گیا اور ان کے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کی سفید داڑھی بھی بھیگ چکی تھی۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ان سب کی طرف سے مَیں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ حالانکہ ان کا گناہ قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مَیں آپ سے التجا کرتا ہوں۔''

مولوی صاحب نے نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی اس ایک نظر میں جو شکوہ تھا اس نے جیسے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا، میری نظر خود بخود جھک گئی۔

''مَیں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا حماد میاں۔ غریب آدمی کے پاس صرف ایک ہی بھرم ہوتا ہے۔ اس کی عزت کا بھرم۔۔۔ تم نے آج مجھ سے وہ بھرم بھی چھنوا دیا۔ کیوں۔۔۔

آج بھرے بازار میں میری معصوم بچیوں کے کردار پر کیچڑ اُچھالا گیا۔ انہیں رُسوا کیا گیا، صرف تمھاری وجہ سے، کاش۔۔۔۔ کاش مَیں تمھیں کوئی بددُعا دے سکتا۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ بہرحال وہ بڑا انصاف والا ہے۔۔۔۔ میرا انصاف بھی وہ خود ہی کرے گا۔''۔۔۔۔ مولوی صاحب کی آواز جذبات کی رو میں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے۔ مَیں سر جھکائے وہیں گیٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔

میرے ذہن میں طوفانوں کی آندھی چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میرے گھر والے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مجھ پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہوں نے رات ہی کو اس وجہ کو ہی ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس کی وجہ سے مَیں نے بغاوت کی جرأت کی تھی۔ کاش۔۔۔ کاش اگر مجھے پہلے ان کے ارادوں کا علم ہو جاتا تو مَیں مولوی صاحب کو راستے سے ہی واپس بھیج دیتا۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔ لیکن اَب کیا ہو سکتا تھا۔ امی اور بھابھی نے موقع پا کر اپنا وار کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کو گالی دی گئی تھی کہ وہ محفلوں میں اپنی بیٹیوں کو سجا کر اس لیے بھیجتے ہیں کہ مجھ جیسا کوئی رئیس زادہ ان پر فریفتہ ہو جائے۔ اُن کے منہ پر اُس ماہ کی تنخواہ مار کر انہیں آئندہ اِس گھر کا رُخ نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ذرا سوچیے۔۔۔۔ اس سلوک اور ان الزامات کے بعد ایک سفید پوش اور ایک پاک باز غیرت مند انسان کے پاس سوائے مر جانے کے اور کیا چارہ رہ گیا ہوگا؟ لیکن مولوی صاحب جیسوں کے پاس تو موت جیسی عیاشی سرزد ہونے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اگر ہمارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو اس روز مولوی صاحب یقیناً خود کو ختم کر لیتے۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ مَیں ان کی اس بے عزتی کا ذمہ دار تھا۔ مجھے اس لمحے خود سے ہی شدید نفرت کا احساس ہُوا۔ مَیں غصے میں واپس اندر کی طرف پلٹا اور پھر میرے راستے میں ڈرائنگ روم، لاؤنج، لابی کی جو بھی چیز آئی وہ ٹوٹ کر کرچیوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ بھابھی تو ڈر کے مارے اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلیں۔ البتہ امی کے ساتھ خوب بحث ہوگئی۔ انہوں نے روایتی عورتوں کی طرح مجھے طعنے دیے۔ مجھ پر مولوی صاحب کے گھر والوں کی طرف سے تعویز گنڈوں کے زیرِ اثر ہونے کا الزام بھی لگا۔ پھر آخر میں وہی۔۔۔

جوایک ماں کا آخری ہتھیار ہوسکتا ہے۔۔۔آنسو۔۔۔

رات کو کمشنر صاحب کی عدالت لگی اور میرے خلاف حتمی فیصلہ دے دیا گیا کہ مجھے اس گھر کی روایتوں کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔اور اگلے ہفتے مجھے ہر حال میں لندن کی فلائٹ لینی ہی ہوگی۔مَیں نے اس رات کمشنر صاحب سے زیادہ بحث نہیں کی۔مَیں جانتا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں پُرانی حویلی جا پہنچا۔شاکر کو حویلی کے دوسرے نوکروں سے اس معاملے کی سن گن مل چکی تھی۔لیکن گھر پہ کل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اُسے پوری بات کی خبر نہیں تھی۔اس قدر صبح وہ مجھے پُرانی حویلی میں پا کر اور زیادہ پریشان ہوگیا۔اور بھاگا بھاگا میرے پیچھے حویلی کے پُرانے بڑے گول کمرے میں چلا آیا۔

''حماد بابا۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ مَیں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔کل مولوی صاحب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔۔۔۔ بلکہ، مجھے تو شرافت چوکیدار نے بتایا ہے کہ۔۔۔۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے،اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ہے۔''

میں نے شاکر کو ساری بات الف سے لے کر ی تک سنا دی۔شاکر سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔''یہ آپ نے کیا کیا بابا۔۔۔۔؟ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ کے گھر والے اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔۔۔۔اور مولوی صاحب۔۔۔۔وہ تو بہت نازک انسان ہیں بابا۔۔۔۔اور نگہت۔۔۔۔اس سے تو مجھے اس بے وقوفی کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔''

''اس میں نگہت کا کوئی قصور نہیں ہے،تم جانتے ہو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔پلیز تم اُسے کچھ مت کہنا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔لیکن جو زیادتی گھر والوں نے مولوی صاحب کے ساتھ کی ہے اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔''

''اس کا ازالہ بھی مَیں ہی کروں گا۔مَیں چاہتا ہوں کہ تم میرا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے گھر جاؤ۔''شاکر اچھل پڑا۔

''کیا۔۔۔؟۔۔۔۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، حماد بابا۔۔۔۔مَیں بھلا کیسے۔۔۔؟

''اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں۔۔۔۔امی اور بابا کبھی اس گھر رشتہ لے کر نہیں جائیں گے، اور مولوی صاحب کے اُجلے دامن پر جو داغ میری وجہ سے لگا ہے وہ کبھی مٹ نہیں پائے گا۔اس لیے مَیں نے یہ حتمی فیصلہ کرلیا ہے۔اب تمھیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں۔؟''

شاکر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

نگہت چُپ چاپ اندر آئی اور چائے کی ٹرے رکھ کر میرے اور شاکر کے لیے پیالیوں میں چائے ڈال کر واپس چلی گئی۔شاکر نے سر اُٹھایا۔

''بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے آپ نے مجھے بابا۔۔۔۔

ایک طرف برسوں کی مولوی صاحب سے دوستی ہے تو دوسری طرف آپ کا برسوں کا نمک ہے۔مَیں جانتا ہوں کہ شاید مَیں اس طرح مولوی صاحب کی برسوں کی دوستی کو کھونے چلا ہوں۔لیکن کیا کروں۔۔۔۔مَیں آپ کو بھی تو نہیں کھو سکتا۔''

شاکر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔لیکن جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

OO

یادیں

''یادیں بھی ہمارے ساتھ کبھی کبھی کیسے کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ ہمیں وہ سب سوچ کر ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں جب ہم کسی کے ساتھ مل کر روئے تھے۔۔۔۔ اور کبھی ہمیں یہ سوچ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ مل کر ہنسے تھے۔''

اس دن عبرانی زبان والی نوک جھونک کے بعد سارہ کافی محتاط ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر طنز کے وار تو کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے انداز میں احتیاط کا پہلو نمایاں تھا۔ جوزف سے اب بھی ہمارے اسی پسندیدہ اور مخصوص بینچ پر تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بہت سی اندرونی باتیں بھی بتادی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اُس کے خاندان میں اب صرف وہ اور اس کی بیوی ہی ایک چھت تلے رہتے ہیں۔ تینوں بچے جوان ہونے کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے گھر چھوڑتے گئے۔ اس عمر میں وہ یہ نوکری بھی اس لیے کر رہا ہے کیونکر گزر بسر کے لیے اس کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں اور وہ اولڈ ہوم جانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک دن مجھے یونیورسٹی سے واپسی پر برج ٹاؤن میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر بھی لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی میری ایک مہربان عورت تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری اُداسی تھی۔ وہ مجھ سے اسی طرح پیش آئی جیسے ایک ماں اپنے کسی بچھڑے بیٹے سے پیش آسکتی ہے۔ اُس نے دیر تک مجھے واپس نہیں جانے دیا اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بھی کھلائیں اور ہمارے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح جاتے ہوئے میری جیبوں میں بھی بھر دیں۔ جیسے بچپن میں میری نانی اور میری دادی ان کے گھر سے واپسی پر میری جیبیں اخروٹ، کشمش، پستے اور خوبانیوں سے بھر دیتی تھیں۔۔۔۔ شاید دُنیا کے ہر خطے کی محبت کی ایک ہی بولی ہوتی ہے، شیرے جیسی میٹھی اور کچے دھویں جیسی آنکھیں جلانے والی بولی۔۔۔۔

لندن کے موسم کا بھی بے وفا محبوب کی طرح کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی پل میں

دھوپ چمک رہی ہوتی ہے کہ دوسرے ہی پل رم جھم کی جھڑی آپ کا تن من بھگونے لگتی ہے۔ اُس دن بھی جب صبح مَیں نے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تو دھوپ چمک رہی تھی۔لیکن جب مَیں گھر سے نکل کر سڑک کے نکڑ پر لگی کافی کی مشین تک پہنچا تب تک آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور میرے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے پھوار پڑنا شروع ہو چکی تھی۔مَیں یونہی بھیگتا ہوا، کاندھے پر اپنے نوٹس کا بیگ لٹکائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ لیکن یہ کیا۔آج تو کلاس بالکل خالی پڑی تھی۔کیا مَیں جلدی آ گیا تھا یا پھر لیکچر ہی کسی اور کمرے میں ہونا تھا۔مَیں یہی سوچتا ہوا کلاس سے نکلنے کے لیے پلٹا۔اس لمحے میری نظر لیکچر ہال کے بلیک بورڈ پر پڑی۔اور وہاں لکھی تحریروں نے میرے قدم جکڑ لیے۔بلیک بورڈ پر مسلمانوں کے لیے تضحیک آمیز جملے لکھے ہوئے تھے۔اور ہر جملے کے بعد یہودیوں کا مخصوص نشان (Davidstar) یعنی چھ کونوں والا ستارہ بنا ہوا تھا۔ ہر جملے سے زہر ٹپک رہا تھا، ڈاؤن وِد مسلمز (Down with Muslims)، ٹیررسٹس (Terorrists)۔☆ وی آر دی اونلی گریٹ ☆ مسلمانوں یہ کیمپس چھوڑ دو، اور اس طرح کے دوسرے بہت سے نعرے۔۔۔۔

مَیں جانتا تھا کہ اس کلاس میں صرف مَیں ہی ایک اکیلا مسلمان تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ہی لکھا گیا تھا۔اور کس نے لکھا تھا۔یہ بھی مَیں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔میرے خون میں ایک عجیب سی گرم لہر دوڑ گئی۔مجھے پہلی مرتبہ کامران کی کہی ہوئی باتوں میں صداقت محسوس ہوئی۔اتنے میں کلاس میں ربیکا داخل ہوئی ربیکا آسٹریلین تھی اور میرے ہی سیشن میں میری ہم جماعت بھی تھی۔اُس نے بلیک بورڈ پر لکھی تحریریں دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ہے میڈی۔۔۔۔یہ سب بکواس کس نے لکھی ہے یہاں پر۔''

کلاس کی سب سے مغرور اور بد دماغ لڑکی نے۔۔۔۔اور بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔''

''یو مین سارہ۔۔۔۔؟ نو مَین۔۔۔۔وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اگر تمھیں کہیں وہ مل جائے تو اُس سے کہنا کہ مَیں نہیں جانتا تھا کہ خود کو عظیم کہنے اور

سمجھنے والے اس قدر کمزور ہوں گے کہ اُن میں اپنے مخالف کے منہ پر بات کہنے کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔"

مَیں ربیکا کو یہ پیغام دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اَب میرا کلاس لینے کا بھی بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ باہر اب بھی ویسے ہی ہلکی سی پھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ جن دنوں بارش یا برف باری ہوتی تھی، ان دنوں گھاس کے میدانوں میں اور یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر کے کنارے پڑے بینچوں اور کرسیوں پر لگی بڑی بڑی نیلی پیلی چھتریاں کھول دی جاتی تھیں۔ باہر نکلتے ہی جوزف بھی مجھے ایک ایسی ہی نیلی چھتری کے نیچے نہر کنارے اپنے پسندیدہ مقام پر بیٹھا نظر آیا۔ آج وہ بارش کی تصویر کشی کرنے کے لیے اپنے ساتھ کینوس سٹینڈ وغیرہ بھی لے کر آیا تھا اور نہر میں گرتی بوندوں سے پیدا ہونے والے پانی کے ارتعاش اور اس ارتعاش سے بگڑتے، سکڑتے پانی کے عکس پر بنی شبیہوں کی تصویر کشی کر رہا تھا۔

مَیں اُس کی طرف بڑھ گیا اور بیٹھ کر اس کی تصویر بنتے دیکھتا رہا۔ واقعی جوزف بہت اچھا مصوّر تھا۔ اُس نے نہر میں یونیورسٹی کی عمارت کے عکس کی تصویر بنائی تھی، لیکن یہ ساکت عکس کی تصویر نہیں تھی بلکہ نہر کے پانی میں گرتی بارش کی بوندوں سے ہوئی ہلچل کے دوران اس عکس میں ہوتی تبدیلیوں کی تصویر تھی۔ جوزف نے بہت چھوٹی چھوٹی سی جزئیات کا بھی پورا دھیان رکھا تھا۔ جوزف تصویر بناتے بناتے میری طرف پلٹا۔

"کہو، کیسی لگی۔۔۔۔؟"

"بہت خوب، لگتا ہے کہ کینوس خود ایک نہر ہے۔ جس پر تم بارش کے چھینٹوں کی صورت میں رنگ پھینک رہے ہو۔"

جوزف نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی۔

"واہ۔۔۔۔ میری تصویر کی آج تک کسی نے اتنی مکمل تعریف نہیں کی۔ واقعی تمھارے لفظوں کا جواب نہیں ہوتا۔ مَیں رنگوں سے تصویر بناتا ہوں اور تم لفظوں سے تصویر کشی کرتے ہو۔"

جوزف اپنی تصویر کو اختتامی سٹروک دے کر میرے ساتھ بینچ پر آ بیٹھا۔

"کیا بات ہے۔ آج تم کچھ اُلجھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو۔"

مَیں نے جوزف کو کلاس روم میں پیش آنے والا سارا واقعہ سنا دیا۔ جوزف کو بھی غصہ آ گیا۔

''تنگ نظری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن جانے کیوں، مَیں بھی ربیکا کی اس بات سے متفق ہوں کہ سارہ ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید مَیں نے تمھیں پہلے بتایا نہیں۔ وہ یہاں داخلے سے پہلے بھی ایک اور ادارے میں مجھ سے شام کی پینٹنگ کلاسز لیتی رہی ہے۔ اور وہ خود بھی ایک بہت اچھی مصورہ ہے۔ تم لوگوں کے خلاف اس کے دل میں واقعی بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ اس دشمنی میں کسی انتہا تک جا سکتی ہے۔ لیکن اُسے سامنے سے وار کرنے کی عادت ہے۔ وہ یوں چُھپ کر کوئی ایسا نیچ اقدام نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ اِسے بھی یہودیت کی توہین سمجھتی ہے کہ دشمن کی پیٹھ پیچھے وار کیا جائے۔''

مَیں نے بے زاری سے سر ہلایا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔ اَب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا ان لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید پروپیگنڈا ہی ان یہودیوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔''

''ٹھیک سمجھے ہو تم، اسی لیے یہ لوگ ساری دُنیا میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کاروبار کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے اور پروپیگنڈہ کو اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے اس کامیابی سے استعمال کرتے ہیں کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس بزنس سے یہ اتنا کماتے ہیں کہ ان کی دولت دنیا کی چند سب سے بڑی مملکتوں کی بادشاہت بدلنے کا باعث بنتی رہتی ہے۔ شاید تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ دُنیا میں فرنچائز سسٹم کے بانی بھی یہی یہودی ہیں اور اسی سسٹم کی بدولت آج یہ دُنیا کے ہر گلی کوچے میں اپنا کاروبار پھیلا چکے ہیں۔''

مَیں نے غور سے جوزف کی طرف دیکھا۔

''اگر یہ اتنے ہی کامیاب ہیں تو پھر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔''

جوزف مسکرایا۔ ''شاید یہ ایک خوف ہی ان کی قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ آج تک دُنیا میں سب سے زیادہ نبی اسی قوم پر اُترے ہیں۔ یعقوبؑ سے لے کر موسیٰؑ تک چار ہزار نبی اس قوم پر مبعوث ہو چکے تھے۔ اگر اس تعداد کو تم ان کی فی نسل پر تقسیم کرو تو ان کی

ہر نسل پر نوے نبی اُترے ہیں لیکن پھر بھی یہ قوم گمراہ ہی رہی۔ یہ خوف اسی گمراہی کا خوف ہے۔''

مَیں حیرت سے جوزف کی باتیں سُن رہا تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتا ہوگا۔ جوزف نے گہری سانس لی۔

''بہر حال مَیں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ ان لوگوں سے نہ اُلجھنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ سر اور پتھر کی لڑائی میں زخمی ہمیشہ سر ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی عظمت اور برتری کا جنون ہے، جسے ان کے دماغوں سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔''

ہمارے سامنے نہر میں بنتے دائروں میں یک دم تیزی سی آ گئی۔ بارش تیز ہوگئی تھی، مرغابیوں کی ایک ڈار نے تیز بارش سے گھبرا کر لمبی سی اڈار بھری۔ ساکت فضا میں پروں کے پھڑ پھڑانے کا شور گونجا۔ جوزف نے اپنی تصویر اور دیگر سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ مَیں بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ لیکن میرا ذہن اَب بھی جوزف کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ شاید جوزف بھی میری بے خیالی بھانپ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔''

''سوچ رہا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اصل میں وہ خود عظیم نہیں ہیں، عظیم کوئی اور لوگ ہیں۔ اور اصل میں ان کا یہ خوف اسی وجہ سے ہے کہ کہیں وہ دوسری نسل اپنی عظمت کو دوبارہ پہچان نہ لے۔ اسی لیے وہ ان کو اور کسی دوسری نسل کو بھی سنبھلنے نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اگر روزانہ ایک ہی تسلسل اور روانی سے بولا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ جھوٹ جھوٹ نہیں رہتا۔ سچ بن جاتا ہے اور لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہ یہودی بھی اسی کلیے پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جھوٹ دُنیا پر سچ بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ہمارا سچ بھی اَب لوگوں کو جھوٹ لگتا ہے۔ یہ دنیا زور آوروں کی ہے۔ زور آور جو کہے گا، وہی سچ ہوگا۔ اور اس وقت یہودی ہی وہ زور آور ہیں۔'' جوزف بھی میری بات سُن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

OO

محبتِ ناتمام

شاکر سے اپنا رشتہ ایمان کے گھر لے جانے کی بات کرنے کے بعد اس دن شام کو میں واپس گھر پہنچا تو کمشنر صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا ہی رہا تھا کہ ان کی گرجتی آواز نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

''ٹھہرو۔''

میں رک گیا۔ امی اور سجاد بھائی بھی عبرینہ بھابھی سمیت اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بابا آج ایک مکمل کمشنر صاحب کے روپ میں موجود تھے اور میں ان کے سامنے کسی بستہ ''ب'' کے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تو تم لندن نہیں جاؤ گے۔''

''میں لندن جانے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگ اس گھر میں مولوی علیم کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کا ازالہ کر دیں۔''

کمشنر صاحب دھاڑے۔

''واٹ ۔۔۔۔؟۔۔۔۔تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا جس کے نام کی گونج ایوان صدر تک ہے وہ اب ایک معمولی مولوی کے سامنے معذرتیں پیش کرتا پھرے گا۔ جسٹ فارگٹ اِٹ Just forget it۔''

''تو پھر آپ سب بھی یہ بھول جائیں کہ میں آپ لوگوں کی کسی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

میں نے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

کمشنر صاحب پھر دھاڑے۔

''تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ تم جس چھت تلے رہتے ہو وہاں صرف میری ہدایات اور

میرا حکم ہی چلتا ہے۔"

گویا مجھے بالواسطہ یہ دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر میں نے کمشنر صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تو مجھے گھر بدر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کمشنر صاحب اپنی کمشنری کے دور میں بھی تو یونہی مجرموں کو شہر بدر اور قصبہ بدر کرتے رہے ہوں گے۔ اور پھر میرا تو جرم بھی بہت بڑا تھا "جُرمِ عشق"۔۔۔۔ اور اس جرم کی معافی تو کسی بھی دور میں روا نہیں رکھی گئی۔ آج میں بھی اپنے گھر والوں کی اس خود ساختہ عدالت میں محبت کا مجرم بنا کھڑا تھا۔

مَیں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔

"تو کیا مَیں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

امی گھبرا گئیں۔ شائید انہیں بات کچھ بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"نہیں بیٹا۔۔۔۔ ہم بھلا ایسا کیوں چاہیں گے۔۔۔۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ذہن اور دل سے اُس لڑکی کا خیال نکال دو۔"

"مَیں اُسے اپنے ذہن اور دل سے نکالنے سے زیادہ آسان اس گھر سے نکلنے کو سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔"

مَیں نے واپس جانے کے لیے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ امی چلائیں۔

"حماد۔۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے؟"

کمشنر صاحب گرجے، ان کے لہجے میں طنز اور حقارت کا ایک طوفان چھپا تھا۔

"جانے دو اِسے۔۔۔۔ دو دن میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اسے باہر کی دھوپ ابھی تک لگی نہیں ہے۔ نوکروں کی فوج کی خدمتوں تلے ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گزارنے والے اور منرل واٹر پینے والے اس شہزادے نے ابھی تک گھر سے باہر کی سختیوں کی اک جھلک بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔ ایک رات باہر رہے گا تو عشق کا سارا بھوت سر سے اُتر جائے گا۔ اسے تو ٹھیک سے پیدل چلنا بھی نہیں آتا، کہو میاں جہاں جانا چاہتے ہو وہاں تک چلے جاؤ گے یا ڈرائیور سے کہوں کہ تمھیں وہاں تک چھوڑ آئے۔"

مَیں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔

''بچے کو پیدل چلنا اس کے ماں باپ سکھاتے ہیں۔افسوس آپ دونوں نے مجھے واقعی پیدل چلنا نہیں سکھایا۔لیکن وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔وہ بھی جو انسان کے ماں باپ اسے سکھانا بھول جاتے ہیں۔میں بھی نوکروں، ایئر کنڈیشنڈ کمروں اور منرل واٹر کے بنا جینا سیکھ ہی جاؤں گا۔اور اگر نہ بھی سیکھ پایا تو آپ اطمینان رکھیے۔آپ سے مدد مانگنے پھر بھی نہیں آؤں گا۔''

امی چلاتیں رہ گئیں، سجاد بھائی سٹپٹا کے رہ گئے۔بابا تلملا کر اپنے پائپ کا دھواں اُگلتے رہے اور میں اس گھر سے نکل آیا۔

میرے سامنے شہر کے کھلے راستے تھے اور سر پر دھوپ اگلتا آسمان، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کی راہ لوں۔بابا نے سچ کہا تھا، میں کبھی پیدل گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔میں نے اس شہر کا ہر راستہ اپنے نئے ماڈل کی گاڑی کی ونڈ سکرین سے ہی دیکھا تھا۔آج زمین پر ان راستوں پر چلتے ہوئے ان کی طوالت اور اصل منظر کا احساس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں ہر انسان دنیا کو بدلنے کی باتیں تو کرتا ہے۔لیکن خود کو بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔آج سے میں نے خود کو بدلنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔بہت دیر تک میں ایک پارک کے بینچ پر بیٹھا ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔میری جیب میں دو چار سو روپے ہی موجود تھے۔اپنا اے۔ٹی۔ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں وہیں لاؤنج میں گھر سے نکلنے سے پہلے گھر والوں کے سامنے پھینک آیا تھا۔جانے یہ پیسے کیسے رہ گئے تھے جیب میں۔شام دھیرے دھیرے پارک میں اُترتی جا رہی تھی۔لوگ جو آس پاس چہل قدمی یا سستا رہے تھے دھیرے دھیرے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونا شروع ہو چکے تھے اور کچھ ہی دیر میں وہ پارک خالی ہو گیا۔مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔پارک کے چوکیدار نے مجھے آ کر پارک بند ہونے کی اطلاع دی۔ظاہر ہے اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ صاحب پارک بند ہو چکا ہے۔اَب آپ بھی اپنے گھر جایئے۔۔۔۔لیکن میرا تو آج کوئی گھر ہی نہیں تھا۔میں کس کے گھر جاؤں۔۔۔۔؟ بچپن سے لے کر آج تک میں جسے اپنا گھر سمجھتا رہا وہ تو کمشنر صاحب کی عدالت نکلا۔بات مانو تو رہو۔۔۔۔نہ مانو تو نکل جاؤ۔ایسے ماں باپ ہم بچوں سے سالانہ ایک کنٹریکٹ فارم کیوں نہیں بھروا لیا کرتے۔۔۔؟۔جس میں تمام شرائط درج

ہوں اور ہر سال بچوں کو پڑھ کر سنائی جائیں۔ تاکہ ہم کبھی اس چار دیواری کو کبھی اپنا ذاتی گھر سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔

رات کا اندھیرا اب سڑکوں پر اُتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ٹھیلوں پر لٹکے گیس کے بھاری روشن دان اب جلنے لگ پڑے تھے۔ چلتے چلتے میری نظر گورنمنٹ سول ہسپتال کے گیٹ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب میرے تایا یہاں سول سرجن ہوا کرتے تھے تب میں اور کامران اسکول سے واپسی پر یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ ہمارا اسکول اسی ہسپتال سے آگے جاتی سیدھی سڑک پر واقع چوک کے بعد آتا تھا۔ ہم دونوں تایا کے دفتر بھی جاتے اور گھنٹوں اس ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں دھما چوکڑی مچاتے رہتے۔ ہسپتال کی صنوبر بھرے درختوں سے ڈھکی سڑکوں پر کھیلتے رہتے تھے، مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہسپتال کے لمبے لمبے ایورگرین کے درختوں تلے لکڑی کے لمبے لمبے بینچ پڑے ہوئے تھے۔ جن پر مریضوں کے وہ لواحقین پڑے آرام کرتے رہتے تھے جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور شہر میں کوئی ہوٹل یا کسی کمرے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری آج کی رات بھی ایک ایسے ہی لکڑی کے بینچ پر گزرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے ان چند روپوں کا دھیان بھی نہیں رہا تھا جو اس وقت میری شرٹ کے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

مَیں ایک خالی بینچ دیکھ کر اسی پر جا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد سر پر کھلے آسمان اور تاروں کو یوں اپنے آپ سے باتیں کرتا محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جب ہم نانی کے گھر گرمیوں کی رات کو ان کے کھلے صحن میں چارپائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے تو تب بھی کہانی سناتی نانی جان کی آواز صرف ہم تک نہیں بلکہ ہمیں دیکھ کر ان مسکاتے تاروں تک بھی جاتی تھی۔ تبھی تو ہمارے صحن میں چارپائیاں ڈال کر ان پر پڑتے ہی یہ سارے تارے بھی ہماری چارپائیوں کے اوپر نانی کے گرد سمٹ آتے اور پھر جب تک ہم کہانی سن کر سو نہیں جاتے۔ یہ تارے بھی ہمارے ساتھ جاگتے رہتے، ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے رہتے۔

بچپن کی طرح آج بھی یہ سارے تارے میری آج رات کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ مَیں ان تاروں سے کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ مَیں نے انہیں اتنا عرصہ بھلائے رکھا تھا

لیکن آج جیسے ہی تنہا ہو کر میں نے بھیگی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو میرے یہ سبھی پُرانے دوست بنا کسی شکوے اور شکایت کے پھر سے ماضی کی طرح میرے سر پر آن جمع ہوئے تھے، میرا درد بانٹنے کے لیے ۔۔۔۔ بچپن میں ہر بچہ اپنی پسند کا ایک تارہ منتخب کر لیتا ہے۔ وہ کامران والا تارہ تھا، یہ نگی کا تارہ، یہ دو عباد نے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ اور یہ رہا میرا تارہ۔ سب سے چمک دار مجھے بچپن سے ہی سب سے الگ اور سب سے نمایاں چیزیں چننے کی عادت تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ سب میں نمایاں، سب سے الگ، اگر میرے دل نے اس کی خواہش کی تھی تو اس میں ایسا کیا بُرا تھا۔ یہ سارا زمانہ میرا دشمن کیوں ہو گیا تھا ۔۔۔۔؟ یہ زمانہ ہمیشہ ہی سے محبت کرنے والوں کے خلاف کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسے ہی کچھ بے نام سے سوالوں کی یلغار میں ساری رات بیت گئی۔ میں تب چونکا جب میرے دوست ستاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے وداع لینا شروع کر دی اور صنوبر چیڑ اور چیری کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے ننھے منھے بچوں کی چیخ و پکار بلند ہونا شروع ہو گئی۔ شاید پرندوں کے گھونسلے بھی ہمارے گھروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بڑے جاگ کر بچوں کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرتے ہیں پھر چھوٹوں کا جگایا جاتا ہے۔

ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز اُبھری اور پھر نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی طرف چل پڑے۔ مَیں کچھ دیر حیرت سے ان نمازیوں کو دیکھتا رہا جو یوں صبح سویرے، منہ اندھیرے اپنی نیند ترک کر کے، آنکھیں ملتے ایک جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ تھے۔ میں آج تک کبھی یوں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کسی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں یوں مسجد کی جانب کھینچے لے جا رہا تھا؟

میری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی اور اس وقت سورج کی کرنیں اونچے، لمبے پیڑوں کی شاخوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ زندگی کا کاروبار رواں دواں ہو چکا تھا۔ شاید کسی بڑے ڈاکٹر کے دورے کا وقت تھا۔ ہسپتال کے سفید وردی میں ملبوس عملے نے جلدی جلدی ہم سب بینچ کے مکینوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا اب ویسے بھی یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے شاکر کے گھر جانا تھا۔ شاید وہ کل مولوی صاحب کی طرف گیا ہو؟ شاید اس کے پاس کوئی نئی خبر ہو؟ میں نے جیب میں غیر

ارادی طور پر ہاتھ ڈالے تو نوٹوں کی کڑکڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ہاتھ نکال کر دیکھا تو سو سو کے وہی چند نوٹ جو گھر سے چلتے وقت میری جیب میں رہ گئے تھے باہر نکل آئے۔ میں نے ہسپتال کے گیٹ کے قریب کھڑے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر پرانی حویلی کی طرف چلنے کا کہا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے انسان کو آس پاس کے تمام منظر یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی فلم الٹی چل رہی ہو۔

شاکر جو اس وقت حویلی کے گیٹ سے نکل ہی رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا، اور میری طرف دوڑا چلا آیا۔ کچھ دیر تک تو وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا جیسے مَیں کسی اور جہاں کی مخلوق ہوں۔

''حماد بابا۔۔۔ آپ کدھر چلے گئے تھے۔ رات کہاں گزاری ہے آپ نے، یہ کیا حالت بنالی ہے اپنی۔''

شاکر مجھے لے کر اپنے ہی کوارٹر میں چلا آیا، کیونکہ میں نے حویلی کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاکر نے جلدی سے اپنے کوارٹر کی بیٹھک کا دروازہ کھولا جو باہر حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں کھلتا تھا۔ میں آنکھیں موندھے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا جب تک شاکر اندر سے جلدی سے ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ نگہت نے جلدی جلدی چند پراٹھے، تلے ہوئے اور اُبلے ہوئے انڈوں کا خاگینہ اور چائے بنادی تھی لیکن میرا دل اس وقت کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاکر نے بے حد اصرار کر کے چند گھونٹ چائے کے میرے حلق سے نیچے اُتروائے۔ مجھے شاکر سے مولوی صاحب کے گھر کے حالات جاننے کی جلدی تھی۔ لیکن شاکر نے پہلے میرے گھر کا احوال دیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس وقت مولوی صاحب کی طرف گیا ہوا تھا جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ شاکر جب ہمارے گھر پہنچا تو نوکروں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا اس سے ذکر کیا۔ شاکر کے مطابق امی کچھ پریشان تھیں جب کہ بابا اور سجاد بھائی کو یہ اطمینان تھا کہ مَیں دربدر کی ٹھوکریں کھا کر رات بھر میں ہی واپس آ جاؤں گا۔ البتہ چھوٹا عباد رات بھر مجھے میرے دوستوں کے گھروں میں تلاش کرتا رہا تھا۔

مَیں نے شاکر کو یہ نہیں بتایا کہ مَیں نے رات کہاں گزاری تھی۔ اس کے تمام سوالوں

کے جواب میں مَیں نے صرف ایک سوال کیا۔

''تم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔۔۔۔؟ وہاں کی کیا خبر ہے۔'' شاکر میرا سوال سن کر خاموش سا ہو گیا۔

''ہاں گیا تھا، مولوی صاحب تو اُسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس دن سے وہ آپ کے گھر سے واپس آئے تھے۔ پورے گھر پر سوگ جیسی کیفیت طاری ہے۔ ایسے میں مجھے ان سے کوئی دوسری بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ بس ان کی عیادت کر کے واپس چلا آیا۔ انہیں اس صدمے نے بالکل نڈھال کر دیا ہے۔ شریف آدمی کی زندگی بھر کا اثاثہ صرف اس کی غیرت ہوتی ہے بابا۔۔۔۔ اگر کوئی اس پر ہی وار کر دے تو پھر وہ صرف ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔''

مَیں جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہو گی۔ شاکر نے اچھا ہی کیا کہ وہ بنا کچھ بات کیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ اَب میرے وہاں مزید بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے مَیں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاکر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''کدھر کا ارادہ ہے حماد بابا۔۔۔۔ میں اب آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔''

''میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف قدم اٹھیں گے چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے کا ایک موقع ملا ہے۔ مجھے روک کر اُسے ضائع نہ کرو۔ ورنہ میں ساری زندگی بابا تو کیا خود اپنے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔''

شاکر میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کہ مَیں جو بات ایک مرتبہ دل میں ٹھان لوں۔۔۔۔ پھر اس سے پلٹنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ میری ساری زندگی پھولوں کی سیج پر گزری ہے۔ یہ کانٹے مجھے بہت جلد لہولہان کر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مَیں نہیں رکوں گا اور یہ دربدری ہی اب میرا مقدر ہے۔ شاکر میرے ساتھ حویلی کی آخری حد تک آیا گھر سے نکلتے ہوئے نگہت پر میری نظر پڑی جو اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مَیں نے کچھ آگے جا کر زبردستی شاکر کو گھر واپس بھیج دیا۔ اُسے اپنی ڈیوٹی پر بھی پہنچنا تھا۔ کمشنر صاحب کا پارہ

ویسے ہی رات سے بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور مَیں جانتا تھا کہ آج حویلی کے نوکروں کی شامت آئی ہوگی۔ شاکر روتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سڑک پر کچھ دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک تانگا مل گیا۔ مَیں نے تانگے والے کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ کامران کے ایک دُور کے رشتے دار ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ شاید جاوید صدیقی نام تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے لیکن مَیں نے کامران سے ان کا بارہا ذکر سنا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اب تو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر ہی تعینات ہوں؟۔۔۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر مولوی علیم صاحب کا ایک جملہ میرے کانوں میں جیسے اٹک کر ہی رہ گیا تھا۔

اس دن جب میں ان سے گیٹ پر معافی مانگ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی زیادتی کی جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ تو اس دن شاید انجانے میں ہی سہی، لیکن ان کے منہ سے ایک بہت بڑا سچ نکل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

"تمھاری اپنی شناخت ہی کیا ہے؟۔۔۔۔ معافی مانگنے اور معاف کیے جانے کا حق صرف انہیں ہوتا ہے جو خود اپنی کوئی شناخت رکھتے ہیں۔ تم تو خود ان کے محتاج ہو جنھوں نے آج میری سفید پوشی پر اور میری معصوم بچیوں پر کیچڑ اچھالا ہے۔"

جاتے جاتے وہ یہ کیسا طمانچہ مار گئے تھے میرے منہ پر۔ واقعی سچ ہی تو تھا۔ میں تو خود ان لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔ مَیں بھلا کس بل بوتے پر اُن سب کی طرف سے معافی مانگ رہا تھا۔ گویا اتنی زندگی میں نے بنا کسی شناخت کے ہی کاٹ دی تھی۔ صرف کمشنر امجد رضا کا بیٹا بن کر۔ میری معاشرے میں جو عزت تھی، وقار تھا وہ سب کسی اور کی دین تھا؟ لیکن اب میں نے خود اپنی شناخت بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مَیں اب مولوی علیم کا سامنا تب ہی کرنا چاہتا تھا جب میرے پاس حماد رضا کے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر مَیں نے جاوید صدیقی صاحب کا پوچھا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک یہیں تعینات تھے۔ مَیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر کھڑا ان کے چپڑاسی کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا جو اندر میرے نام کی چٹ لے کر گیا تھا۔ کچھ دیر میں مجھے اندر بلوا لیا گیا۔ جاوید صدیقی صاحب پچاس کے پیٹے میں ایک بھرے بدن اور درمیانی قد کے معزز سے

شخص تھے۔ سفید بالوں کو ایک طرف سے مانگ نکال کر سلیقے سے جمار کھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور کان پر ایک بال پوائنٹ۔ انہوں نے فائلوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھے دیکھا اور پھر سے فائل کا ورق پلٹتے ہوئے بولے۔

''ہاں تو حماد میاں۔۔۔۔ تم کامران کے دوست ہو۔۔۔۔ بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں تمھارے لیے۔''

''جی سر۔۔۔۔ میں بے روزگار ہوں۔۔۔۔ اگر کچھ کام مل جاتا تو۔۔۔۔ چاہے عارضی ہی سہی۔۔۔۔''

صدیقی صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور اس مرتبہ غور سے مجھے دیکھا۔

''اوہ۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی سیٹ ریزرویشن وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ لیکن میاں۔۔۔۔ شکل سے تو تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔۔۔۔ بھلا تمھارے لائق یہاں کیا کام ہو سکتا ہے۔ کتنا پڑھے ہو۔''

کبھی کبھی انسان کی اعلیٰ تعلیم بھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لوگ آپ سے ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن آپ کو کوئی کام دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ میں اپنی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

''جی بس گزارہ کر لیتا ہوں۔ آپ مجھے کسی بھی کام پر رکھ سکتے ہیں، میں بہت اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

صدیقی صاحب نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا جیسے پڑھائی والی بات پر انہیں یقین نہ آیا ہو۔ لیکن وہ جہاں دیدہ آدمی تھے انہوں نے اس بات پر دوبارہ کوئی بحث نہیں کی۔

''سامان اٹھا لو گے۔''

''جی ضرور۔''

انہوں نے میز پر پڑی ہاتھ سے بجنے والی پُرانی سی گھنٹی پر ہتھیلی ماری۔ ٹنگ کی آواز گونجتے ہی چپڑاسی کسی حکم کے غلام جن کی طرح نمودار ہو گیا۔ صدیقی صاحب نے اسے حکم دیا۔

''غفورے کو بلاؤ۔''

چپڑاسی سر ہلا کر باہر چلا گیا۔ اور چند لمحوں میں ہی ایک مضبوط بدن والے پکی عمر کے شخص کے ساتھ واپس آ گیا۔ جو قلیوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ کاندھے پر رسی، سُرخ قمیض اور ہاتھ پر لوہے کا بلّا (بیج)۔۔۔۔ اس نے کمرے میں گھسنے سے پہلے بیڑی بجھادی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ غفورا اندر آ کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

صدیقی صاحب نے پھر سر اٹھایا۔

''ہاں بھئی غفورے۔۔۔ تمھاری نفری پوری ہوئی یا نہیں۔''

''کدھر صاحب جی۔۔۔۔ وہ سلّو کا بیٹا جسے پچھلے مہینے نمونیا ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی تک ڈیوٹی پر رپورٹ نہیں کی ہے۔ دو ایک اور بھی ہیں حرام خور، جو مفت کی چھٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کاغذ بنا لیا ہے، کل آپ کو کمپلیٹ مل جائے گی۔''

معلوم ہوا کہ غفورا اسٹیشن پر موجود ڈرائی پورٹ کا لیبر انچارج تھا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسی کے ساتھ عارضی طور پر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ مستقل قُلی بننے کے لیے محکمے سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور یہ لمبا کام تھا۔ البتہ یہ صدیقی صاحب کے اختیار میں تھا کہ وہ روز کی اُجرت پر عارضی طور پر رکھے جانے والے مزدوروں یا قلیوں میں میرا نام ڈلوا دیتے۔

''غفورے۔۔۔ یہ حماد ہے۔۔۔۔ آج سے یہ نوجوان تمھارے انڈر کام کرے گا۔ فی الحال عارضی ہے۔ کام دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ پکا پرمٹ جاری کریں یا نہیں۔''

غفورے نے حیرت سے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ جانے میرے چہرے پر ایسی کون سی تحریر تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے مزدور تسلیم کرنے پر ذہنی طور پر رضامند ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پہلے صدیقی صاحب اور اب یہ غفورا۔ شاید عمر بھر کی خوش حالی از خود ہمارے چہرے پر ایک خاص تحریر اور ایک خاص چمک پیدا کر دیتی ہے۔ لگتا تھا یہ تحریر مٹتے مٹتے مٹے گی اور یہ چمک جاتے جاتے جائے گی۔

صدیقی صاحب نے جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو میں ان کے پاس آ سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس رہنے کا فی الحال کوئی

ٹھکانہ نہیں ہے اور مَیں اکیلا ہوں۔ صدیقی صاحب نے غفورے سے کہا کہ وہ تھرڈ کلاس والے ویٹنگ روم کے چپڑاسیوں کو میرے بارے میں بتا دے کہ مَیں رات وہیں بسر کیا کروں گا فی الحال۔ ویسے تو اس وقت گرمیوں کا موسم تھا اور رات پلیٹ فارم پر بھی گزاری جا سکتی تھی۔ غفورے نے سب سے پہلے میری وردی گودام سے نکلوا کر میرے حوالے کر دی۔ مجھے میری نئی شناخت کا پہلا نمبر بھی الاٹ کر دیا گیا۔ میری پہلی شناخت، حماد۔۔۔۔ مزدور نمبر 137۔ بلکہ یہاں تو مزدوروں کو ان کے نام سے نہیں بلکہ ان کے نمبروں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ میں بھی اب حماد نہ تھا۔ صرف ایک نمبر تھا۔ مزدور نمبر 137۔۔۔۔۔ بلکہ یہ تو اچھا ہی تھا۔ میرا نام بھی ان مزدوروں کے ناموں میں کسی بھی طرح نہیں سجتا تھا۔ اگر شناختی کارڈ کی نقل ریکارڈ میں جمع کروانے کی شرط نہ ہوتی تو شاید میں اپنا نام بھی بدل ہی لیتا۔

ہر ریلوے اسٹیشن کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ الگ ہی صبح شام ہوتے ہیں۔ مَیں آج تک ہوائی جہاز سے ہی سفر کرتا چلا آیا تھا۔ میرا ٹرین کے سفر کا تجربہ صرف لندن اور یورپ کی ٹرینوں کا تھا۔ اپنے ملک میں تو مَیں نے کبھی ٹھیک سے کوئی ریلوے اسٹیشن بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تقدیر کا یہ کیسا پھیر تھا کہ میں آج اپنے ہی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدور بنا کھڑا تھا۔

ڈرائی پورٹ کے قلیوں کو عام قلیوں کی طرح مسافر ٹرینوں سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ انہیں زیادہ تر مال گاڑی سے مال اُتارنا ہوتا تھا۔ اس دن بھی کچھ دیر پہلے ہی پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی آ کر لگی تھی۔ غفورے نے تمام جزئیات طے ہو جانے کے بعد میری کمر تھپکی۔

''چل بھئی جوان۔۔۔۔ لگ جا اپنی مزدوری پر۔ رب بھلی کرے گا۔ مَیں بھی دیگر مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ سامان ڈھونے پر لگ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بوجھ کسے کہتے ہیں، اور صحیح معنوں میں بوجھ اُٹھانے والے کا جسم کس طرح چٹختا ہے۔ مَیں دو پھیروں میں ہی ہلکان ہو گیا۔ غفورا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے قریب بلایا اور ہنس کر کہنے لگا۔

''کیوں بھئی جوان۔۔۔۔ لگتا ہے زندگی میں پہلے کبھی بوجھ نہیں اُٹھایا۔''

''نہیں مجھے عادت نہیں ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔۔۔۔ مَیں اپنے حصے کا کام پورا کروں

گا۔'' غفورے نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور میری ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''او یار غفورے کی نظر کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ تو قلم کاغذ پکڑنے والے ہاتھ ہیں۔ یہ تُو کہاں آ گیا ہے اپنی جوانی جلانے کے لیے میری جان۔ جا چلا جا، یہاں سے۔ ورنہ ہماری طرح ایک دن تیری زندگی بھی یہ بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گل سڑ جائے گی۔ اپنی اس خوبصورت جوانی پر رحم کھا۔''

مَیں نے مسکرا کر غفورے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور پھر سے کام پر لگ گیا۔ اُس بے چارے کو کیا پتہ تھا کہ جوانی تو اس زہرہ جبیں کی پہلی جھلک کی چنگاری سے ہی جل کر خاک ہو چکی تھی۔ اب تو صرف سینے سے اس آگ کی نشانی کے طور پر ہلکا سا دھواں اُٹھتا باقی تھا۔ جس دن راکھ پوری طرح بجھ گئی اُس دن سینے سے یہ اُٹھتا دھواں بھی ختم ہو جائے گا۔

OO

نیند

اُس رات کلاس میں بلیک بورڈ پر نعرے لکھنے والے واقعے کے بعد مَیں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے نیند کو آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی کیوں متصل کر دیا گیا ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے بھی تو ساری عمر جاگ سکتا ہے۔ مَیں تو ایسے کئی لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے تمام عمر نیند میں ہی ڈوبے رہے ہیں۔ شاید ہم جسے نیند سمجھتے ہیں وہ اصل میں نیند ہے ہی نہیں۔ نیند کا تعلق تو سکون سے ہوتا ہے۔ پلکیں بند کر لینے سے نہیں۔ مَیں بھی جانے کتنی صدیوں سے صرف پلکیں ہی بند کر پا رہا تھا۔ نیند تو جانے کب سے مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

اگلے دن صبح کامران نے مجھے یونیورسٹی ڈراپ کیا۔ اتفاق سے پارکنگ میں رُکتے وقت سارہ بھی اپنی سفید بیٹل کار میں سے اُترتی دکھائی دی۔ کامران کی ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ نیلے اسکرٹ میں اور اوپر بند گلے کی سفید سویٹر میں واقعی اس کا حُسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ کامران کے منہ سے سیٹی سی نکلی۔

''یار میڈی۔۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمھاری یونیورسٹی میں ایسی ایسی حوریں بھی پڑھنے آتی ہیں۔ تمھارا اگلا سمیسٹر کب سے شروع ہو رہا ہے یار مجھے آج اپنی جاہلیت کا حد درجے احساس ہو رہا ہے۔''

''زیادہ آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بقول تمھارے یہ وہی یہودن ہے جو میری جان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پر لٹو ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔''

کامران نے ڈھٹائی کی انتہا کر دی اور سارہ کو ایک مشہور ہالی وڈ ایکٹریس سے ملا بیٹھا۔ یہ اس کی پُرانی عادت تھی۔ وہ لوگوں کو ان کے چہرے کی مماثلت سے مشہور اداکاروں

سے ملاتا اور پھر اسی نام سے انہیں پکارتا تھا، اُس نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

''کوئی بات نہیں یار۔ یہودی بھی تو اہل کتاب ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو یہ بالکل سلمٰی ہائیک لگتی ہے یار۔ اتنی خوبصورت لڑکی سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اپنی پچھلی تجویز واپس لیتا ہوں۔ اور تمھیں فوراً اس سے دوستی کرنے کا نیا مشورہ دیتا ہوں۔''

میں نے بمشکل کامران کو زبردستی وہاں سے واپس بھیجا۔ سارہ بھی گاڑی سے اُترتے ہی کسی طالب علم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئی تھی۔ کامران نے حتی الامکان گاڑی اس کے بہت قریب سے گزاری جس کا سارہ نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا۔ میں اپنا بیگ سنبھالے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ سارہ نے مجھے آواز دی۔

''مسٹر حماد۔۔۔۔ ایک منٹ پلیز۔۔۔۔''

میرے بڑھتے قدم رُک گئے۔ سارہ جلدی سے اپنے ہوا میں لہراتے کھلے بالوں کو سنبھالتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ ''ربیکا نے مجھے تمھارا پیغام دے دیا تھا۔ میں نے آج تک زندگی میں کبھی کسی کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن کبھی اپنے اوپر کسی دوسرے کے کیے ہوئے کا الزام بھی برداشت نہیں کیا۔ مَیں نے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر وہ سب کچھ نہیں لکھا تھا۔ اور مجھے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ مَیں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی ہوں اور اس کی ہمت بھی رکھتی ہوں۔''

''تو پھر مَیں اس وضاحت کو کیا سمجھوں۔ کیا تم اپنے دوستوں کی طرف سے بھی وکالت پیش کر رہی ہو، ظاہر ہے یہ ان میں سے ہی کسی ایک کی حرکت ہے۔''

''نہیں میں ان میں سے بھی کسی کی وکالت پیش نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ سچ کو وکالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''سچ کو دلیل کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ اور جن کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہی ایسی پنچگانہ حرکتیں کر کے اپنا غصہ اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں۔''

سارہ نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔ ''دوسروں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن میرے پاس ہزاروں دلائل موجود ہیں۔ لیکن میں نے کہا نا، سچ کو ثابت کرنے کے لیے میں ان دلائل کو بیان کرنے میں اپنا اور تمھارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔''

مَیں نے اُسے فیصلہ سنا دیا۔

''تو پھر طے رہا، ہم دونوں میں سے جس نے بھی دوسرے کو اپنے سچ سے قائل کر دیا، دوسرا اُسی کا راستہ اپنا لے گا، بولو منظور ہے۔''

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید اُسے میری آنکھوں میں چُھپا چیلنج بھی صاف نظر آ گیا۔

''منظور ہے، تمھیں ہرا کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوگی۔''

''اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بیسٹ آف لک'' Best of Luck'' میں اور سارہ مخالف سمتوں میں مڑے اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔ دُور سے کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ ہم ایک ہی کمان سے چھوٹے دو مختلف تیر ہیں جنھیں دو مختلف سمتوں میں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس دن کلاس میں سارہ کے گینگ نے مجھ پر وقتاً فوقتاً فقرے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن میں چُپ رہا۔ ربیکا سارہ کی بہت اچھی دوست تھی لیکن جانے کیوں اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ ہی ڈیسک پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں پڑے ہر ڈیسک پر دو طالب علموں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس دن سے میں کلاس لے رہا تھا تب سے اب تک میں اکیلا ہی بیٹھتا تھا۔ ربیکا بظاہر ہر لمحہ ہلہ گلہ کرنے والی، ہمیشہ جینز جیکٹ میں ملبوس رہنے اور چیونگم چبانے والی ایک شوخ و شنگ تتلی جیسی لڑکی تھی، جو چلتے وقت اپنے بوائے کٹ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹکتی تو آس پاس کے نوجوانوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک آدھ دن جب وہ میرے ساتھ ڈیسک پر بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھائی میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی دوسری شوخیوں اور لاأُبالی پن میں۔

سارہ کا گینگ لیڈر بظاہر ایک یہودی لڑکا جم تھا، اُس کے علاوہ ٹینا بھی ان کے گروپ کی سرگرم رکن تھی۔ یوں سارہ ٹینا، جم اور ڈیوڈ پر مشتمل یہ چار کا ٹولا تھا جو در پردہ سارہ ہی کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ پھر ایک دن بریک کے دوران جب جم نے اسٹوڈنٹس کو ہنسانے کے لیے کچھ رکاوٹوں بنائے اور چند مزاحیہ جملے لکھے تو مجھے اس کی لکھائی سے اندازہ بھی ہو گیا کہ اس دن بلیک بورڈ پر اسی کی تحریر تھی جو زہرا گل رہی تھی۔ بہر حال اس دن کے

یعد کم از کم بلیک بورڈ کی حد تک دوبارہ کسی نے وہ حرکت دُہرانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن میں جانتا تھا، یہ لاوا اندر ہی اندر کہیں پک رہا ہے۔ تیسرے ہی دن یونیورسٹی میں شعبہ جات کے درمیان تقریری مقابلے کا اعلان ہو گیا۔ تقریر کے لیے نام طلب کیے گئے تو ربیکا نے شرارت میں میرا بازو بھی ہوا میں بلند کر دیا جب کہ میں اس وقت کچھ لکھنے میں مگن تھا، سارہ نے ربیکا کی اس حرکت پر اُسے کڑی نظروں سے گھورا، بہر حال میرا نام بھی اب مقرروں کی لسٹ میں شامل ہو چکا تھا۔

اس دن یونیورسٹی کا مرکزی ہال کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لندن کے میئر کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے سارہ کی باری آئی۔ وہ بلیک کوٹ اور اسکارف میں بال باندھے کسی اسکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔ سارہ نے جم کر تقریر کی اور یہودیوں کے ایک مفروضے ''ہالوکاسٹ'' (جس میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنوں نے پچاس لاکھ سے بھی زیادہ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا) کے بارے میں دلائل دیے۔ مَیں اُس وقت اس مفروضے کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔ میں سارہ کی تقریر کے دوران یہی سوچتا رہا کہ بعد مَیں جوزف سے اس معاملے پر تفصیلی بات ضرور کروں گا۔ سارہ کے بعد میرا نام پکارا گیا۔ ہال میں سناٹا سا چھا گیا جس میں صرف ربیکا اور جوزف کی تالیوں کی گونج باقی رہی۔ میری تقریر کا موضوع بین المذہب مکالمہ ''Inter Religion Debate'' تھا۔

مَیں نے صدرِ محفل کا شکریہ ادا کر کے حاضرین کو مخاطب کیا جن میں سب سے اگلی قطار میں سر آئزک بیٹھے ہوئے تھے۔

معزز حاضرین ۔۔۔۔ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ اس دور کی شاید سب سے بڑی ضرورت ہے ۔۔۔۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب، مذہبی تعصب کی اجازت نہیں دیتا ۔۔۔۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ کل جن کو عروج حاصل تھا۔ آج وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے زوال کا شکار ہیں، مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، زمین ان پر تنگ کی جا رہی ہے۔ مذہب اور سائنس کے ٹکراؤ کی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ فزکس میں کوانٹم تھیوری کو تو حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ لیکن روشنی کے اس

سفر کی سب سے بڑی شہادت ''واقعہ معراج'' کو جھٹلایا جاتا ہے ۔۔۔۔؟ ٹائم مشین اور مستقبل میں سفر کے قصے تو سب کی زبان پر ہیں اور ان ایجادات کے ظہور کا انتظار بھی کیا جاتا ہے، لیکن اسی روشنی کی رفتار سے براق پر سفر کرنے والے اور سات آسمانوں کی شہادت لانے والے پر یقین نہیں کیا جاتا۔۔۔۔؟ فتح اور برتری کے جنون میں ایٹم بم برسانے والوں کو تو مہذب کہا جاتا ہے اور اپنے گھر کی حفاظت کے لیے پتھر اُٹھانے والوں کو دہشت گرد کا رتبہ دے دیا جاتا ہے ۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ اور ایسے بہت سے دوسرے سوال ہیں جن کا جواب مَیں اپنی ہی اس نئی نسل سے چاہتا ہوں ۔۔۔۔''

میں ایک جذب کے عالم میں جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اور تب چونکا جب ہر طالب علم کو دیے جانے والے سات منٹ ختم ہونے کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے گھنٹی بجا کر مجھے احساس دلایا کہ میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مَیں شکریہ ادا کر کے نیچے اُتر آیا۔ تمام ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے ربیکا ہی کھڑی ہوئی اور اس کی تالیوں کی گونج میں رفتہ رفتہ دیگر ہال بھی شامل ہو گیا۔ مَیں نے اسٹیج پر کھڑے ہوئے بھی اور پھر نیچے اُترتے وقت بھی سر آئزک کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا تھا۔ سارہ کے چہرے پر البتہ کچھ حیرانی اور کچھ ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں کمال رکھتی تھی۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہال سے نکل کر مَیں راہداری سے گزر رہا تھا کہ ربیکا نہ جانے کہاں سے مجھے آوازیں دیتی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا۔ اور خوشی سے بولی۔

''ہے میڈی ۔۔۔۔ گریٹ یار ۔۔۔۔ میں نے تو یونہی مستی میں تمھارا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنا بہترین بول لیتے ہو۔ ویسے تو بڑے چُپ چاپ رہتے ہو ہاں۔ بہر حال ۔۔۔۔ تم مانو نہ مانو ۔۔۔۔ تمھاری تقریر نے پورے ہال پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔۔۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی تمھاری باتیں سننے اور ان پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ تمھارے پاس ہر بات کی دلیل موجود تھی۔''

مَیں نے مسکرا کر اس زندگی بھری لڑکی کی خوشی کو سراہا۔

''میں نہیں جانتا یہ تمام لاجک (Logic) یہ تمام دلائل میرے پاس کہاں سے یک

دم ہی آ گئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی کوئی خاص مذہبی انسان نہیں رہا۔ اور مَیں نے پہلے سے اس تقریر کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔''

''مَیں جانتی ہوں۔ سب مقررین کو موقع پر ہی تقریر کے عنوان دیے گئے تھے۔ بہرحال، تم نے میدان مار لیا۔ چلو اسی بات پر تمھیں کیفے ٹیریا سے بہترین کافی پلواتی ہوں۔''

ربیکا کی عادت تھی کہ وہ بات کہہ کر جواب سنے بغیر آگے چل دیتی تھی۔ سو میں بھی ایک لمبی سی سانس بھر کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ اس سے بحث کرنے یا منع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا جتنا کافی کا ایک مگ حلق سے نیچے اُتارنے میں لگتا ہے۔

بظاہر یونیورسٹی کا ماحول پُرسکون تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس دن کی، کی ہوئی تقریر آگے چل کر چند ہفتوں میں کن نت نئے اور بڑے طوفانوں کو جنم دینے والی ہے۔ بقول کامران ''مَیں یہود کی نظروں میں آ چکا تھا لیکن بے خبر تھا۔''

OO

خدا اور محبت

مجھے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرتے تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ میرے ہاتھوں کو چونکہ ایسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے پہلی رات ہی ان پر چھالے پڑ گئے تھے۔ جو اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غفورا میرا جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا وہ رکھ رہا تھا۔ ویسے بھی مَیں دوسرے مزدوروں سے کچھ الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے غم تھے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ان سب میں ان کی دانست میں زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے غفورے نے میرا نام "بابو" رکھ چھوڑا تھا۔

میری راتیں پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم کے کسی بینچ پر گزرتی تھیں۔ اور دن سارا مزدوری کرتے ہوئے۔ مجھے ان دنوں میں اس بات کا احساس شدت سے ہُوا کہ ہم انسانوں نے اس زندگی کو ایک خواہ مخواہ کا بکھیڑا بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ انسان چاہے تو اس کا گزارہ دو جوڑے کپڑے میں بھی بہت خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

مَیں حماد اور امجد رضا، جس کے کپڑے لندن کے بڑے بڑے بوتیک سے تیار ہو کر آتے تھے۔ جو کف لنکس اور ٹائی کی پن میچنگ نہ ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا سوٹ اُٹھا کر باہر پھینک دیتا تھا اور جس نے کبھی کسی تقریب میں ایک دفعہ کا پہنا ہوا لباس دوبارہ نہیں پہنا تھا۔ وہ حماد اَب بڑے آرام سے اپنے ایک جوڑا پینٹ شرٹ اور ایک وردی میں گذارا کر رہا تھا۔ ریلوے کے دھوبی گھاٹ سے پانچ روپے میں جوڑا دھل کر آ جاتا تھا اور وردی تو ویسے بھی سرکاری طور پر ہر دوسرے روز دھل کر آ جاتی تھی۔

کبھی میری جیبیں کانٹی نینٹل، انگلش یا عربی ناشتے کے لوازمات کے بغیر مکمل بھی نہ ہوتی تھیں۔ فرانس کا بنا ہوا کارن فلیکس اور مصر کا درآمد شہد نہ ہوتا تو میں ناشتہ ہی اُدھورا چھوڑ کر اُٹھ جاتا تھا۔ اب پلیٹ فارم کے کیبن کی تیز پتی کی چائے اور بند مکھن کے ساتھ بڑے

مزے کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔

فریش اسٹرابری شیک کی جگہ گنے کے رس نے لے لی تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے لنچ اور ڈنر کی جگہ پلیٹ فارم کے ہوٹل کے تنور کی سادہ روٹی اور شوربے نے لے لی تھی، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شروع کے دو تین دن کے علاوہ بعد میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ واقعی ہم انسانوں نے خود اپنی زندگیوں کو مفت کے جھمیلوں میں اُلجھایا ہوا تھا۔ خاص طور پر ہم امیر لوگ، ہماری خود پرستی اور خود پسندی اِک عذاب ہی تو ہے۔

مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آتی گئی کہ انسان کی زندگی میں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو اگر زندگی بتانے کا ایک پیمانہ سمجھا جائے تو ان چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ تر لوگ تو بارہ گھنٹے دن اور رات کی نیند میں ہی بتا دیتے ہیں۔ باقی بچے بارہ گھنٹے تو اس میں سے بھی چھ گھنٹے تو دنیاداری کی فکر، دفتر اور نوکریوں یا کاروبار وغیرہ کے جھمیلے میں گزر جاتے ہیں۔ باقی چھ گھنٹوں میں بھی آپ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے کا دورانیہ شامل کر لیں تو زندگی کے بمشکل دو یا تین گھنٹے ہی گزرتے ہیں جو ہم یا کوئی بھی اِنسان اپنے لیے بتاتا ہے۔ اب ان دو تین گھنٹوں کی زندگی کے لیے اس قدر جدوجہد، اس قدر بے ایمانی، اس قدر کھینچا تانی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان اگر معیار کے مقابلے میں پڑنا چاہے تو پھر معیار اور اعلیٰ زندگی کی بھلا کیا حد ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک تعیش بھری زندگی کی مثالیں ہمارے سامنے آ جائیں گی۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کے پاس ہوتے بس چوبیس گھنٹے ہی ہیں۔ سارا کھیل انہی چوبیس گھنٹوں کو ٹالنے کا ہے۔ چاہے بہترین سے بہترین ملنے کی بے چینی میں کاٹ لیں، یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پر صبر اور شکر کر کے بتا دیں دن بھر شکوہ کرتے رہیں یا پھر سجدہ شکر میں بسر کر دیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تو بہر حال گزر ہی جاتے ہیں۔

زندگی روز مجھے نئے نئے سبق سکھا رہی تھی۔ یا شائد مَیں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا تھا۔ شائد مجھے اس لیے بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اکیلا تھا۔ شاید رشتے ہی انسان کی سب سے بڑی مجبوری بن جاتے ہیں۔ رشتوں کے تقاضے انسان کو ناشکری اور

خوب سے خوب تر کی ریس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاید دُنیا میں اگر ہر آدمی اکیلا ہی ہوتا تو اسے زندگی اتنی کٹھن اور مشکل کبھی نہ لگتی۔ میاں، بیوی، بچے، بچوں کے بچے ۔۔۔۔ یہ سب رشتے ہیں۔ انسان کو اس دلدل میں دھکیل دیتے ہوں شاید؟

ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا اور آج جمعرات کا دن تھا۔ آج میری شام کو چھٹی تھی۔ مَیں غفورے کو بتا کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ یہ پورا ہفتہ مَیں نے باہر کی دُنیا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے میں اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔ اسٹیشن سے ایک تانگے والے کو مَیں نے مولوی علیم کے پُرانے محلے چلنے کو کہا۔ ہم زندگی میں روزانہ کئی فیصلے کرتے ہیں کہ کل یہ کرنا ہے، اگلے ہفتے وہاں جانا ہے۔ فلانی تاریخ کو فلاں کام کرنا ہے لیکن ان میں سے بہت کم فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تکمیل کا وقت قریب آتے ہی آپ کا دل ڈوبنا شروع کر دے۔

بس یہی حالت اس وقت میری بھی مولوی صاحب کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ لیکن مَیں سمجھتا تھا کہ شاید اَب میں ان سے کی گئی زیادتی کی معافی مانگنے کے قابل نہ سہی ۔۔۔۔ پر طلب گار تو ہو سکتا تھا۔

تانگے نے مجھے پُرانے محلے کے گیٹ پر اُتار دیا۔ یہ عصر کا وقت تھا، یہی کوئی شام پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ مَیں دھڑکتے دل اور بھاری قدموں سے مولوی صاحب کی گلی کے نکڑ تک آ پہنچا۔ لیکن اب آگے بڑھنے کی ہمت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ مولوی صاحب کا دوبارہ سامنا کرنے کی وجہ سے اور کچھ اس نازنین کے گھر کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے خیال سے ہی جیسے میرے پسینے سے چھوٹ رہے تھے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ مولوی صاحب کی گلی میں تین چار ہی گھر تھے اور اس وقت گلی تقریباً سنسان ہی پڑی تھی۔ بہت دیر تک مَیں مولوی صاحب کے مکان کے لکڑی کے دروازے کے قریب کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اندر سے دُور کسی کے بولنے کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل پھر سے اُچھلا۔ شاید یہ ایمان کی ہی آواز ہو۔ مَیں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر کسی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

''جی کون ہے۔۔۔۔؟''

یہ ایمان ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز کا جلترنگ میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لیے اس لمحے زمین اور آسمان کی گردش جیسے تھم سی گئی تھی۔ جواب میں مَیں نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے غوں غاں کی کیسی عجیب سی آواز نکلی کہ اسے دوبارہ میرا نام پوچھنا پڑا۔ اتنی دیر میں ایمان دروازے کے بالکل قریب پہنچ کی تھی مولوی صاحب کے تمام ملنے والوں کو شاید کسی کے گھر کے باہر دستک دینے کے تمام آداب کا سخت لحاظ ہوتا ہوگا اور ایمان شاید مجھے بھی انہی مہذب لوگوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہی تھی جو دستک دے کر دس قدم دور جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اندر سے اگر کوئی نسوانی آواز سنائی دے تو باقاعدہ منہ ہی پھیر لیتے ہیں تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ لیکن بھلا مجھ جیسے جاہل کو ان روایتی آداب کا کیا پتہ تھا۔ مَیں نے تو اس طرح سے کسی کے دروازے پر دستک بھی زندگی میں پہلی بار دی تھی۔ میرے تو تمام دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں کے اُونچے اُونچے محل نما مکانات تھے۔ جن کے گیٹوں پر بیٹھے دربان ہارن بجنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیتے تھے۔ اور میری اسپورٹس کار زن سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔

شاید ایمان یہی سمجھی کہ مَیں مولوی صاحب کا کوئی ایسا ہی تہذیب یافتہ مہمان ہوں جو دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد نسوانی آواز سن کر دروازے سے اتنی دور جا کھڑا ہوا ہے کہ اس کی آواز بھی اندر اس تک ٹھیک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازے کو تھوڑا سا کھول کر پوچھنے کے لیے ایک جھری سی بنائی۔ میں گم سم سا ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی نازک اور مخروطی انگلیاں دروازے کے سرے پر نظر آئیں اور پھر ایمان نے دوپٹے کا نقاب اوڑھے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی دروازے کے اتنے پاس ہی کھڑا ہوگا۔ مَیں نے گھبرا کر نظر اُٹھائی اور میری اور اس کی نظر ایک لمحے کے لیے ٹکرائی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں وہی شدید حیرت لہرائی جو بس اس کی آنکھوں کا خاصہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بنا کچھ کہے تیزی سے وہاں پلٹ گئی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا۔ مَیں بھی ابھی تک اس کی نظر کی بجلی سے جیسے

آنکھیں چندھیا جانے کے بعد ٹھیک ہونے کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ کچھ دیر میں حیا دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہلے اس نے کھلا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا اور پھر دروازے کی تھوڑی سی کھلی جھری سے ہی اس نے مجھے سلام کیا۔ مَیں نے سلام کے جواب کے بعد اس سے کہا کہ مَیں مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حیا نے مجھے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے اس لیے آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

''دیکھیں۔۔۔۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ مَیں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس چند لمحوں کے لیے۔۔۔۔ پلیز۔''

جواب میں حیا تو چپ ہی رہی لیکن ایمان جو نہ جانے کب دروازے پر حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی، اس کی آواز اُبھری۔

''دیکھیں آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔ ابا جان کی حالت بڑی مشکل سے کچھ سنبھلی ہے۔ وہ آپ کو یہاں دیکھیں گے تو۔۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے ۔۔۔۔ آپ یہاں دوبارہ نہ آیئے گا۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کے عین بیچ میں کوئی بڑا سا گھُرا گھونپ دیا ہو۔ کسی نے بھاری پتھر سے اُسے کچل دیا ہو۔ لیکن اس میں ان بے چاریوں کا بھی بھلا کیا قصور تھا؟۔۔۔۔ اپنے شریف باپ کی صحت کے لیے کوئی بھی بیٹی کچھ ایسی ہی ترکیب تجویز کرتی۔ چند لمحے تو مجھ سے جیسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر مَیں نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی۔

''دیکھیں۔۔۔۔ مَیں جانتا ہوں کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ورنہ مَیں کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ جو کچھ بھی ہُوا میری وجہ سے ہوا۔ تو ازالہ بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ مجھ سے ان سے معافی مانگنے کا موقع مت چھینئے۔۔۔۔ مَیں آپ کی منت کرتا ہوں۔''

ایمان کی آواز فضا میں پھر سے گنگنائی۔

''اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وقت خود ہی اپنے آپ ان کے زخم بھر دے گا۔ لیکن آپ یوں بار بار اگر ان کے سامنے آتے رہیں گے تو شاید وہ اس بات کو کبھی

بھلا نہ پائیں۔ انہیں آپ سے اب کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ بھی اس بات کو بھول جائیں، جو ہُوا سو ہوا، اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

ایمان کی دلیل اپنی جگہ درست تھی، لیکن میرے لیے یہ تب درست ہوتی کہ اگر میرا مقصد آخری بار مولوی صاحب سے معافی مانگ کر واپس چلے جانے کا ہی ہوتا۔ اس صورت میں مَیں تو سالوں انتظار کر سکتا تھا کہ جب مولوی صاحب کے دل کے داغ ہلکے پڑ جائیں گے تو سامنے آ کر معافی مانگ لوں گا۔

پر میرا مقصد تو اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مجھے ان سے پہلے ان کا اعتماد اور پھر ان کے گھر میں چھپا وہ گدڑی کا لعل جیتنا تھا جس کی ایک نظر نے میری دُنیا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی اس طرف چپکی کھڑی میرے جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور مَیں اس طرف کھڑا اپنے ذہن میں کوئی نئی تاویل گھڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگر میں آج اس دَر سے پلٹ گیا تو شاید دوبارہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ پاؤں۔ مَیں نے آخری بار ہمت جمع کر کے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اندر برآمدے کی طرف سے مولوی صاحب کی آواز اُبھری۔

''کون ہے بھئی دروازے پر وہاں۔۔۔۔؟''

اندر ایک طویل سی خاموشی طاری ہوگئی۔ اتنے میں ایک اور بات عمل پذیر ہوئی۔ عبداللہ گلی کے نکڑ سے تسبیح گھماتا گلی میں داخل ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''آپ۔۔۔۔ یہاں۔''

''جی۔۔۔۔ مَیں مولوی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔''

عبداللہ نے کچھ تأمل کیا۔

''شاید ان سے آپ کا ملنا اس وقت کچھ بہتر نہ ہو۔''

''آپ ان سے اندر جا کر میرا تذکرہ تو کریں۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو مَیں واپس چلا جاؤں گا۔''

عبداللہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ یہ چند لمحے مجھ پر کیا قیامت کی

صورت گزرے۔۔۔۔ یہ بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پھانسی کا کوئی قیدی ہوں اور تختے پر کھڑا دوسری طرف کے مقتول کے ورثاء کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا مجھے معاف کر دیا جائے گا یا پھر لیور کھینچ کر پھانسی دے دی جائے گی۔

صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ پھر کھلا اور عبداللہ برآمد ہوا۔ مَیں نے اُمید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

''آیئے۔۔۔۔ اندر آ جایئے۔''

میری رُکی ہوئی سانس پھر سے جیسے بحال ہوگئی۔ میری جان میں جان سی آ گئی اور مَیں عبداللہ کے پیچھے سر جھکائے پھر سے اس گھر میں داخل ہوگیا جہاں وہ رہتی تھی۔ ہم صحن سے ہوتے ہوئے اسی بیٹھک کی طرف بڑھ گئے جو لکڑی کی جالیوں سے پار برآمدے سے ملحق تھی۔ عبداللہ مجھے بٹھا کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے ایک سناٹا سا طاری رہا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ مَیں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ ہر ترتیب ویسے ہی تھی جیسی میرے یہاں پہلی آمد کے وقت تھی، لیکن تب کے اور اس وقت کے میرے استقبال میں کس قدر فرق تھا۔ وقت کی بازی اچھے اچھوں کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر میں دروازے پر مولوی صاحب کے کھانسنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ مَیں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب چھڑی کے سہارے ٹیکتے ہُوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہ شکل سے برسوں کے بیمار معلوم ہو رہے تھے۔ مَیں ان کے استقبال کے لیے احتراماً کھڑا ہوگیا۔ وہ آ کر چُپ چاپ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے سلام کا انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

کچھ دیر ماحول پر گھمبیر سے خاموشی طاری رہی۔ میرے تو سارے لفظ جیسے پہلے ہی کھو گئے تھے، خود مولوی صاحب بھی گم سم سے تھے، پھر مَیں نے ہی خاموشی توڑی۔

''کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔''

''بھلا ہوں اَب۔۔۔۔ شکر ہے مالک کا۔''

''کیا آج مَیں آپ سے معافی کی اُمید کر سکتا ہوں۔''

''جو بیت چکا اس کا بار بار ذکر کیوں کرتے ہو؟'' معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ معافی دینے والی صرف اس کی ذات ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ میاں۔ یہ بڑے لوگوں کے یاد رکھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔''

ان کا لہجہ آخر میں خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ یہ بھی انہی کا ظرف تھا کہ وہ میرے وجود کو اس وقت خاموشی سے اپنے ہی گھر میں برداشت کر رہے تھے، کوئی اور ہوتا تو شاید مجھے دھکے دے کر دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔

''جو کچھ میرے گھر والوں نے آپ سے کیا وہ ان کی کم ظرفی اور ناقابل تلافی گناہ ہے۔ لیکن آپ سب لوگوں سے خفا کیوں ہیں؟''

مولوی صاحب کے لہجے میں مزید تلخی اُبھر آئی۔

''جانے دو میاں۔۔۔۔ یہ سب کھیل تماشا ہے بڑے لوگوں کا۔۔۔۔ اور تم جیسے امیر زادوں کے لیے روز کا کھیل، پر ہم سفید پوشوں کی عمر بھر کی کمائی چند بھرم ہی تو ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہم جیسوں کے پاس ان کا وہ بھرم بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے۔''

''کیا میرا سب سے بڑا قصور آپ کی نظروں میں بس یہی ہے کہ مَیں ایک امیر زادہ ہوں۔۔۔۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیا کسی کا امیر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی نیت پر کوئی ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار ہی کھو دے۔ تو پھر مجھے بتایئے کہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے مجھے کس امتحان کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ مَیں آپ کا اعتبار پانے کے لیے آگ کے کسی بھی دریا سے گزرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔۔۔ اور پھر آپ میری جس امارت سے خفا ہیں وہ تو خود میری اپنی بھی نہیں ہے۔ دوسروں کی عطا کردہ ہے۔ آپ نے تو خود کہا تھا اُس دن کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی دی ہوئی اس شناخت کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔''

مَیں کچھ جذباتی ہو گیا تھا اور اپنی رو میں جانے کیا کچھ بول گیا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیسے میری باتوں پر غور کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا۔

''تم اگر واقعی معافی کے طلب گار ہو اور چاہتے ہو کہ میرے دل سے تمھارے گھر

والوں کی کہی ہوئی باتوں کا بوجھ ہٹ جائے تو تمھیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آج کے بعد تمھیں مجھے اس گھر کے راستے کو، اس گھر کو اور اس میں بسنے والے سبھی لوگوں کو ان کی عزت اور وقار کی خاطر ہمیشہ کے لیے بھلانا ہوگا۔ مَیں نے تمھاری بات ٹھنڈے دل سے سن لی ہے اور تمھاری معذرت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمھیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم واقعی اپنے اور اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل پر شرمندہ ہو۔ بولو دے سکتے ہو مجھے یہ وعدہ۔۔۔۔؟ پانا چاہتے ہو اپنا پُرانا بھرم واپس؟''

مجھے لگا کہ مَیں لاجواب سا ہو گیا ہوں۔ ضرور شاکر نے اس ایک ہفتے میں مولوی صاحب سے دبے لفظوں میں میری مرضی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ تبھی انہیں اپنی پیش بندی کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ گویا وہ جانتے تھے کہ وہ میرا مقصد اس معافی سے سوا بھی کچھ مزید ہے۔۔۔۔ کچھ اور ہے۔

مَیں نے اپنی ہمت پھر سے جمع کی۔

''دیکھیں۔۔۔۔ اُس دن آپ نے کہا تھا کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ مَیں جو بھی ہوں دوسروں کے بل بوتے پر اور اس گھر کی شان و شوکت کی وجہ سے ہوں۔ مَیں نے اگلے دن ہی وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب مَیں یہاں اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا اس گھر کی دولت اور شان و شوکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مَیں اس وقت ایک معمولی مزدور ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ خود دو وقت کی روٹی کما سکتا ہوں۔ ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں، دلوا سکتا ہوں۔ جو صرف اور صرف میری ذات کے بل بوتے پر ہوگی۔ اس میں میری ماضی کی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اور اپنی اسی نئی شناخت کے بل پر مَیں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

مولوی صاحب کی تیوری پر غصے کے بل نمودار ہوئے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا۔

''کوئی بھی بات دُہرانے سے پہلے اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ میرے کچھ بھرم ابھی باقی ہیں۔ کہیں تمھاری درخواست ان آبگینوں کو بھی پارہ پارہ نہ کر دے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ ناممکن ہے۔''

مَیں جب مولوی صاحب کے گھر کے لیے اسٹیشن سے چلا تھا تو مَیں نے ایسا بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج ہی اس سلسلے میں حتمی بات کرنی پڑے گی۔ لیکن مولوی صاحب کے حتمی انداز ے خود بخود بات کو اس کا حتمی رُخ دے دیا تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ پھر مَیں نے ہی یہ کفر توڑا۔

''مَیں نے سوچا تھا کہ کسی حتمی بات کے لیے کسی بزرگ کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔ میرے گھرانے کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ہیں جو میری التجا آپ تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے شاید پہلے ہی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ اپنی دولت اور امیری کی بدنامی کا طوق تو میں پہلے ہی اپنے گلے سے اُتار چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی کوئی خامی ہے تو میں اُسے بھی دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے دھتکارنے کی کوئی وجہ تو بتا دیں۔''

مولوی صاحب کا ضبط اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے غصے میں چلائے اور کھڑے ہو گئے۔

''بس۔۔۔۔ بہت ہو گیا۔ کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مولوی علیم جس گھرانے میں بچے کو درس دینے جاتے تھے۔ اُسی گھرانے میں اپنی بیٹی بیاہ دی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا زمانہ ہم پر انگلیاں اُٹھائے۔ جو الزام تمھارے گھر والوں نے مجھ پر اور میری بیٹیوں پر لگایا ہے، اُسے ہم اپنے ہاتھوں سے سچ کر دکھائیں۔ نہ میاں نہ ۔۔۔۔ ہمارے حال پر کچھ تو رحم کرو۔''

''تو گویا آپ کو صرف لوگوں کی باتوں کا ڈر ہے۔ اگر میرے گھر والے اگر آپ سے بدتمیزی نہ کرتے اور میری خوشی کے لیے یہ رشتہ لے کر آ بھی جاتے تو آپ اُسے قبول نہ کرتے۔''

''کبھی نہیں۔۔۔۔ ہمارا اور تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔ تمھاری تربیت کچھ اور ہے۔ تم جن لغویات کو پیار اور محبت کا نام دیتے ہو ہمارے ہاں اُسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف گناہ، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں مجھے مزید گناہ گار مت کرو۔ ہماری بیٹیاں ایسے لادین گھرانوں میں نہیں بیاہی جاتیں جہاں سالوں سال کسی نے نماز تک نہ پڑھی ہو۔ جس گھر

کے نوجوانوں کو پہلے یا بمشکل دوسرے کلمے کے بعد کے کلموں کا علم تک نہ ہو۔ جہاں قرآن کو صرف سجا کر طاق میں رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا ہو۔ جہاں عورت مرد بے حجابانہ ملتے ہوں۔ تمھاری تربیت بھی تو ایک ایسے ہی گھر کی ہے۔ صرف گھر چھوڑ دینے سے انسان کا ضمیر نہیں بدل جاتا۔ میں اپنے آنے والی نسلوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اب اجازت دو۔''

مولوی صاحب غصے میں میری کوئی بات سنے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عبداللہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے جانے کا عذر کیا لیکن اس نے پھر بھی جلدی سے چائے کپ میں انڈیل دی تھی۔ مَیں نے دو گھونٹ زہر مار کیے۔ عبداللہ مجھے چھوڑنے باہر گلی تک آیا اور جاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

''چچا جان کی باتوں کا بُرا مت منایئے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں تھے۔ میں نے اسی لیے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ اب ان سے دوبارہ نہ ہی ملیں تو بہتر ہوگا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جایئے۔ شاکر چچا نے اس دن بتایا تھا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ ماں باپ کا بڑا مقام ہوتا ہے، ان سے اتنی ناراضگی اچھی نہیں مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ عبداللہ مجھے محلے سے باہر چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں تو ٹھیک طرح سے عبداللہ کو خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں پیدل ہی کس جانب روانہ ہوں۔ مولوی صاحب کے جملے میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ بہہ کر داخل ہو رہے تھے۔ کیا واقعی محبت بھی ایک گناہ ہے۔۔۔۔؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو پھر یہ کیسا گناہ ہے جو مجھے بے چینی کے بجائے خوشی اور سکون دے رہا تھا؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کے انکار کی وجہ صرف طبقاتی فرق ہوگا میری غریبی کا فرق۔۔۔۔ لیکن یہاں تو جنگ مذہب اور محبت کے درمیان تھی۔ مذہب محبت کو دھتکار رہا تھا۔ میں اس وقت سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر میں پورے چھ کلمے یاد کر لیتا اور میں بھی مولوی صاحب جیسا شرعی لباس پہن کر اگر کسی مسجد کے متولی کی حیثیت سے ان کی بیٹی کا رشتہ لینے

جاتا تو میں کیوں ان کے لیے قابل قبول ہو جاتا۔۔۔۔؟

اگر میں مذہب سے دُور تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ایمان کے لیے میری محبت تو اسی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔ اتنی ہی پاک تھی جتنی کسی مذہب کی شمولیت کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنی تربیت کی وجہ سے کچھ خاص اچھا مسلمان نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا میری محبت سے کیا تعلق تھا۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب ریلوے اسٹیشن آ پہنچا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور آخری میل بھی نکل چکی تھی۔ پلیٹ فارم میرے دل کی طرح ویران پڑا تھا۔ اِکا دُکا کیبن ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ میں گم سم سا آ کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری مذہب سے ان جانی دُوری آج مجھے اور میری محبت کو اس قدر حقیر بنا دے گی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ مولوی علیم کی باتوں نے مجھ سے پل میں مجھ سے میری ذات کا۔۔۔ میری محبت کا غرور چھین لیا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ تنہا شخص اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔

OO

محبت کے تین پہر

میری اس دن کی یونیورسٹی ہال میں کی گئی تقریر نے مجھے خاصا مقبول کر دیا تھا، کہتے ہیں متنازعہ ہونا بھی مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی ہوتا ہے۔ اب میں مقبول زیادہ تھا یا متنازعہ۔۔۔؟۔ اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

اگلے دن ہیومینٹرنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو محبت پر بحث کرنے کی دعوت دی۔ ربیکا نے کہا محبت فانٹا کی بوتل کی طرح ہوتی ہے، جب تک ختم نہ ہو جائے، پیتے جانا چاہیے۔ جم نے کہا کہ محبت جسم ہے جسے پائے بنا پیاس نہیں مٹ سکتی۔ ٹینا نے کہا محبت وارڈروب میں لٹکے کپڑوں کی طرح ہے۔ روز بدل کر پہننے کو دل کرتا ہے۔ سارہ نے کہا محبت اور کچھ نہیں، بس جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اور تبدیلی بھی وہ جو غیر مستقل ہوتی ہے۔ ہارمونز جیسے ہی واپس اپنی مستقل جگہ پر واپس آئے نہیں کہ محبت ختم۔

کسی من چلے نے پیچھے سے گرہ لگائی کہ لیکن جب تک محبت کے ہارمونز واپس اپنی جگہ لینے کے لیے آتے ہیں، تب تک ان دو پریمیوں کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بات پر ساری کلاس ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر سر آئزک میری طرف متوجہ ہوئے۔

''اور حماد تم۔۔۔ تمھارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''سر۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت بھی انسان پر کسی دن کے پہروں کی طرح وارد ہوتی ہے۔''

''اور ئیلی۔۔۔۔؟۔ کیا آپ کلاس کے سامنے محبت کے ان پہروں کو بیان کرنا پسند کریں گے؟''

''محبت کا پہلا پہر ہمیشہ پچھن، تشنگی اور شدید پیاس لے کر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب آپ کا محبوب آپ سے دور ہوتا ہے۔ آپ کے جذبے آپ ہی تک محدود ہوتے ہیں

اور یک طرفہ محبت کی یہ تڑپ آپ کو ہر لحہ کانٹوں پر چلنے کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔

پھر اظہار ہو جاتا ہے اور خوش قسمتی سے اگر اظہار قبولیت کا شرف بھی پا لے تو محبت کا دوسرا پہر شروع ہوتا ہے۔ تب محبت کی اصل ٹھنڈی چھاؤں کا اور ابدی سکون کا احساس ہوتا ہے، تب تپتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک ملتی ہے اور جلتا صحرا بھی نخلستان بن جاتا ہے۔ ایسا نخلستان جس کا ساکت رکا ہوا پانی بھی کسی میٹھے اور صاف بہتے جھرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔"

مجھے ریکا کی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

"اور محبت کا تیسرا پہر۔۔۔اس میں کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ان دو پہروں کو جھیل کر محبت کے تیسرے اور آخری پہر تک پہنچ جاتے ہیں۔ محبت کے تیسرے پہر میں پہلے پہر سے بھی زیادہ شدید تشنگی، شدید تیز پیاس اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تشنگی، یہ پیاس پا لینے کی پیاس ہوتی ہے۔"

سارہ کے منہ سے حیرت میں نکلا، وہ پوچھ کر ضرور پچھتائی ہوگی۔

"پا لینے کی پیاس۔۔۔۔؟ یہ کیسی پیاس ہوتی ہے؟"

ہاں۔۔۔۔ پا لینے کی پیاس۔۔۔۔ جب آب حیات کا دریا سامنے بہہ رہا ہو تو کون ہوگا جو صرف ایک آدھ گھونٹ پر اکتفا کرے گا؟۔۔۔۔ پا لینے کی پیاس، جدائی کی پیاس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔۔۔۔ اور اگر یہ پیاس لگ جائے تو ملن جدائی سے زیادہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہماری محدود زندگی کبھی ہمیں اس دریا سے پوری طرح سیراب نہیں ہونے دیتی۔ ہم ابھی چند گھونٹ ہی حلق سے اُتار پاتے ہیں کہ جانے کا وقت آ جاتا ہے۔"

ساری کلاس پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جم کو شاید کلاس کی وہ محویت پسند نہیں آئی۔ وہ میری باتوں کا اثر زائل کرنے کی نیت سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"بہت خوب۔۔۔۔ اب یہ بھی بتاتے جاؤ کہ محبت کے تیسرے پہر سے گزرنے کے

بعد انجام کیا ہوتا ہے۔۔۔۔؟''

مَیں نے مسکرا کر جم کی طرف دیکھا۔

''انجام وہی ہوتا ہے جو کسی بھی بھرپور دن کا تینوں پہر گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے ۔۔۔۔یعنی شام۔۔۔۔تین پہروں کے بعد محبت کی بھی شام ہو جاتی ہے۔۔۔۔خاموش ۔۔۔۔ٹھہری ہوئی اور ساکت سی اک خوبصورت شام۔۔۔۔محبت کی شام۔'' مَیں خاموش ہو گیا۔ کلاس نے تالیاں بجا بجا کر اور ڈیسک پیٹ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا اور ان میں سب سے سرفہرست ربیکا تھی۔ سارہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ میرے اور کلاس کے باقی طلباء کے درمیان جو ایک عجیب سی جھجک تھی وہ ایک دم ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب آتے جاتے لڑکے لڑکیاں مجھے بھی اسی طرح چیخ چلا کر پوری گرمجوشی سے خوش آمدید اور الوداع کہتے تھے جیسے باقی سب آپس میں وِش (wish) کرتے تھے۔

کامران میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا، اُس نے تو باقاعدہ پوری ایک شام اس خوشی میں ہی منائی اور مجھے زبردستی سنٹرل لندن کے ایک بہت بڑے سینما بھی لے کر گیا جس میں ایک ہی عمارت میں کئی ہال تھے۔ اور ہر حال میں الگ فلم لگی ہوئی تھی۔ کوئی عجیب سی کاؤ بوائے فلم تھی اور پھر اس پر دوسری مصیبت کامران کی پوری فلم میں مسلسل رواں کمنٹری۔ وہ شاید پہلے بھی یہ فلم دس مرتبہ دیکھ چکا تھا لہٰذا اُسے مکالمے تک زبانی یاد تھے۔ وہ ہر منظر سے پہلے ہی مجھے اس کا پورا خلاصہ بتا دیتا تھا۔ تنگ آ کر جب مَیں نے اُسے سینما ہال سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ تب جا کر وہ بمشکل چُپ ہوا لیکن تب تک فلم ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ جب اسکول کے دور میں ہم کلاس سے بھاگ کر کوئنز کے مشہور ریگل سینما میں صبح کا شو دیکھنے جاتے تھے تب بھی ہال میں گھس کر پتہ چلتا کہ کامران صاحب پہلے بھی کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے یہ ٹارزن یا سند باد کے کارناموں سے بھرپور فلم دیکھ چکے ہیں اور آج مجھے اور ہمارے ساتھ بھاگنے والے دوسرے گینگ کو صرف بور کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب ہم نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ ہم اپنے ساتھ سفید رنگ کی بڑی کپڑے کی سرجیکل ٹیپ کی ریل لے کر جاتے اور جہاں کامران کی مَیں مَیں شروع ہوتی ہم سب مل کر

اُس کے منہ پر یہ چوڑی ٹیپ کا پورا رول لپیٹ دیتے۔۔۔۔۔

اُس رات بھی ہال سے نکل کر گھر جاتے ہوئے میں اور کامران بچپن کی ان حسین یادوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ سڑکوں پر سے برف ہٹانے والی مشین نے سڑکوں کے کناروں پر برف کے چھوٹے چھوٹے سے ڈھیر جمع کر دیے تھے، جن میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ بھیگی چمکیلی سڑک پر رات کی وجہ سے اکا دکا گاڑیاں بھاپ اُڑاتی گزر رہی تھیں اور فٹ پاتھ پر لیٹ نائٹ شو سے نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے سے چپکے، سرگوشیاں کرتے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔

اتنے میں ایک گاڑی نے ہمیں کراس کیا اور پھر آگے جا کر رک گئی۔۔۔ پھر فوراً ہی ریورس میں ہماری طرف بڑھی اور قریب آ کر رک گئی۔۔۔ اندر سے ربیکا نے سر نکالا اور زور سے ہاتھ ہلا کر چلائی۔

''ہے میڈی۔۔۔۔ کتنا حسین اتفاق ہے، آؤ ہمیں جوائن کر لو۔''

ربیکا کے ساتھ گاڑی میں میرے دو اور کلاس فیلو بھی تھے جن میں سے ایک ربیکا کا کزن بھی تھا۔ یہ انکشاف بھی مجھ پر اسی رات ہوا تھا۔ میں نے ربیکا کا شکریہ ادا کیا کہ ہم آج پیدل مرگشت کے موڈ میں ہیں۔ کامران نے جلدی سے گھور کر مجھے کہنی ماری۔ اس کی لُغت میں کسی بھی خوبصورت لڑکی کی کوئی بھی پیش کش ٹھکرانے کا سوال ہی کب تھا۔ اوپر سے ربیکا کی ضد، ہم دونوں کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ربیکا کے کزن نے تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے بنے ایک اوپن ائیر ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ کی پچھلی جانب سے کچھ دور بہتے دریائے ٹیمز کے جگمگاتے پانیوں کا عکس اور سرسراہٹیں صاف سُنی جا سکتی تھیں۔ انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ کامران ربیکا کے کزن اور میرے دوسرے ہم جماعت کو ربیکا سمیت ہاتھ دیکھنے کے گُر اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دو لڑکوں کا ہاتھ وہ اس اُمید پر دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد آخر کار اُسے ربیکا کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ اس کا بہت پُرانا طریقۂ واردات تھا، اور سچ ہے کہ وہ اس طریقے سے بہت مرتبہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں نہایت انہماک سے کامران کو اپنے اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ میں اُٹھ کر سیمنٹ کے فرش کے آخری حصے

میں نصب لوہے کے اس جنگلے کی طرف چلا آیا جس کے پار دُور تک گہرائی تھی اور یہیں سے دریائے ٹیمز پر بنا وہ پُل اور اس کے نیچے سے گزرتے اسٹیمر اور چھوٹے بحری جہاز اندھیرے میں چمکتے جگنوؤں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ مَیں دیر تک دُور بہتے پانی میں ان جھلملاتی روشنیوں کا عکس دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ محسوس ہونے پر مڑا تو ربیکا محویت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''مَیں جب بھی تم سے ملتی ہوں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پھر سے ایک نئے انسان سے مل رہی ہوں۔''

''ہر انسان کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں۔ پیاز کی طرح، اُسے جتنا چھیلو، اتنی ہی مرتبہ ایک نئی تہہ اُبھر آتی ہے۔ اب یہ چھیلنے والے پر منحصر ہے کہ وہ دوسرے کی کتنی کھوج کر سکتا ہے۔''

''نہیں ۔۔۔۔ تمھاری کھوج اس عام کھوج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس دن جب تم کلاس میں محبت کے مختلف پہر بیان کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کو جانا ہے اور ایک مجھ پر ہی کیا منحصر ہے، اس دن کے بعد ساری کلاس ہی محبت کے ان نئے پہلوؤں کو کھوجنے میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے ہم سب کو محبت کا ایک نیا چہرہ دکھا دیا ہے۔''

''چہرہ نیا نہیں ہے، بس اس سے پہلے ذرا اوجھل تھا، محبت ایک نظریہ ہی تو ہے اور ہم سب اس نظریے کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''سنو۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

پھر خود ہی اُس نے فوراً اپنے ہی سوال کو جھٹلا دیا۔

''نہیں نہیں۔۔۔۔ یہ سوال تو تم سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ جو انسان محبت کو اتنا زیادہ پہچانتا ہو، وہ خود ضرور اس تجربے سے گزرا ہوگا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محبت کو کیسا پایا؟''

''محبت میرے لیے اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح ثابت ہوئی جس کے نیچے رکھا سر کٹ تو جاتا ہے لیکن پوری طرح دھڑ سے علیحدہ نہیں ہو پاتا۔ جسم تڑپتا رہتا ہے۔ جان

دھیرے دھیرے اور نکلتے نکلتے نکلتی ہے۔خون کے چھینٹے مرتے مرتے بھی آس پاس کی دیواروں کو محبت کی نشانی کے طور پر رنگ جاتے ہیں۔''

ربیکا نے اذیت سے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔

''اف۔۔۔۔اتنی اذیت ناک محبت۔۔۔۔میڈی۔۔۔۔پھر تم اب تک زندہ کیسے ہو۔''

''محبت کی تو پھر اذیت کا ڈر کیسا مس ربیکا۔''

میں نے مسکرا کر ربیکا کو اس نام سے پکارا جس سے تمام کلاس اسے پکارتی تھی۔ربیکا کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

''میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔تمھارا ہر روپ نیا ہے، جانتے ہو میں اپنے سارے پُرانے دوستوں اور سارہ کو ناراض کر کے تمھارے ساتھ ڈیسک پر کیوں آ بیٹھی تھی۔''

مَیں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ جس دن بلیک بورڈ پر وہ بے ہودہ نعرے لکھے دیکھے تھے۔تب میں بہت دیر پہلے سے تمھیں دیکھ رہی تھی۔تم نے جس اطمینان سے ان کے چیلنج کو قبول کیا اور تمھاری آنکھوں میں جو ایک عزم تھا ایسا عزم صرف ان لوگوں کے چہرے پر دکھتا ہے جو دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتے ہوں اور مجھے بچپن سے ہی بہادر اور پُرعزم لوگ اچھے لگتے ہیں۔تم مجھے پوری کلاس میں سب سے مختلف دکھائی دیے۔اس لیے مَیں نے تمھارے ساتھ ہی بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔اور ہر گزرتا دن میرے اس فیصلے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔''

اتنے میں کامران جو بہت دیر سے ربیکا کو میرے پاس کھڑے دیکھ کر دُور سے بُرے بُرے سے منہ بنا رہا تھا، اس کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے باقاعدہ آوازیں دے کر ہمیں بلانا شروع کر دیا۔لگتا تھا ربیکا مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمیں اپنی باتوں کا سلسلہ یہیں ختم کرنا پڑا اور ہم دونوں میز پر پڑی اپنی کافی کو مزید ٹھنڈا ہونے سے بچانے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئے۔

OO

محبت اور خدا

اُس دن مولوی صاحب کی باتوں نے میرا اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مَیں تو سمجھا تھا کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے مجھے جس شناخت کی ضرورت تھی وہ مَیں نے حاصل کر لی ہے لیکن اس دن پتہ چلا کہ مجھ سے تو میری پچھلی شناخت بھی چھن گئی ہے۔

بیچ میں ایک آدھ بار شاکر سے پُرانی حویلی جا کر مل آتا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ گھر میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شاید میری غیر موجودگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ باغیوں کو جتنی جلدی لوگوں کے دل و دماغ سے پھینک نکالا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کی بغاوت کے جراثیم دوسروں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات بھلا کمشنر صاحب سے بہتر اور کون جان جا سکتا تھا۔ سو انہوں نے گھر میں میرا نام لینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ کمشنر صاحب کا خیال تھا کہ مَیں کامران کے پاس لندن جا چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا اور میرا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا گھر والوں کو۔ کوئی کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا جہاں مَیں اتنا عرصہ کسی دوست کے گھر ان سے چھپ کر ٹھہر سکتا۔۔۔۔ شاید عباد کو بھی یہی سوچ کر سکون مل گیا ہو ورنہ وہ مجھے ہر جگہ تلاش تو کر ہی چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ مَیں بھی یہیں اسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پچھلے چار ہفتوں سے مزدوری کر رہا تھا۔

نگہت سے بھی شاکر کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن مَیں اس سے کچھ پوچھ ہی نہیں پایا۔ جب مَیں شاکر سے رخصت ہو کر جانے لگا تب اُس نے اکیلے جاتے دیکھ کر مجھے پیچھے سے آواز دی تھی۔ مَیں ٹھہر گیا۔ نگہت چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یہ آپ نے کیا حالت بنا لی ہے اپنی بھیّا، اس محبت نے تو آپ کو برباد کر کے رکھ دیا

ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے بھیا۔ نہ مَیں آپ کو اس سے ملاتی نہ۔۔۔'' آنسوؤں سے نگی کی آواز رندھ سی گئی۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ مَیں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت اس کے سامنے رو پڑتا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ مَیں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے تھپتھپایا۔

''نگی ایک بات بتاؤں؟''

نگی چُپ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''جی''

''تم آج بھی بچپن کی طرح روتے ہوئے بہت بُری لگتی ہو۔''

چند لمحے تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر جب اُسے میری اس کو چُپ کروانے کی چال سمجھ میں آئی تو روتے روتے ہنس دی۔

نگی نے مجھے بتایا کہ وہ میرے مولوی صاحب سے ملنے کے بعد دو مرتبہ ایمان کے گھر جا چکی ہے۔ مولوی صاحب اَب کافی بہتر ہیں۔ نگہت نے اُسے میرے گھر چھوڑنے اور یوں در بدر بھٹکنے کی تمام داستان سنائی تھی۔ نگہت کی باتیں سُن کر ایمان تو چپ بیٹھی حسب معمول اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین پر بچھا قالین کریدتی رہی البتہ حیاء سے صبر نہیں ہوا اور وہ رو پڑی تھی۔ ایمان نے نگہت سے صرف اتنا کہا کہ اگر مَیں کبھی نگہت سے ملوں تو وہ مجھ سے کہے کہ مَیں اپنی یہ ضد چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔

یہ تھا اتنی صدیوں کے بعد اس دلربا کا میرے لیے ایک پیغام صرف یہی چند لفظ۔۔۔ کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک۔۔۔۔۔

لیکن یہ لفظ بھی میرے لیے بہت تھے، چلو کسی بہانے ہی سہی۔۔۔۔ میرا ذکر تو اس کے لبوں پر آیا، یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ نگہت میرے ہاتھوں کے چھالے چُھو چُھو کر دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ مجھے نگہت کو بتانا پڑا کہ مَیں ریلوے اسٹیشن پر قُلی گیری کا دھندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ اس بات کے بارے میں اپنے یا میرے گھر والوں کو نہیں بتائے گی۔ شاکر نے کبھی میرا پیچھا کر کے میرا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب مَیں مناسب سمجھوں گا خود اُسے بتا دوں گا۔

میں نے اپنی جیب سے وہ دو موتی نکالے جو اب تک ایمان کی غیر موجودگی میں مجھے

اس کے ہونے کا احساس دلاتے رہے تھے۔ وہی دونوں موتی جو حویلی کی سنڈی میں ایمان سے ملاقات والے دن اس کے جانے کے بعد ملے تھے۔ اب تک مجھے جب کبھی اپنی تنہائی میں سخت تھکاوٹ میں، دن بھر کی مشقت کے بعد ٹوٹے بدن کے ساتھ ویٹنگ روم کی کسی سخت آرام کرسی پر گر کر پڑے ہوئے، جب کبھی بھی میرا دل بہت اُداس ہوتا یا ایمان کی بہت یاد آتی تو میں ان دو موتیوں کو اپنی پلکیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا، پل بھر میں ان کی ٹھنڈک میرے بند پپوٹوں سے ہوتی ہوئی میری رُوح کی گہرائیوں تک کو چھو لیتی۔ میرے تصور میں ایمان اُتر آئی، انہی جھکی جھکی، گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ، پھر وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رہتی اور مَیں گھنٹوں اس سے اپنے من کی باتیں کرتا رہتا۔ اور میری ساری رات انہی سپنوں میں گزر جاتی۔

یہ تصوّر اور خواب بھی کیسی نعمت ہوتے ہیں۔ انسان سے اگر شائد تصورات اور خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جائے تو وہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ خواہشوں کی گھٹن اس کا گلا دبا دبا کر اُسے مار ڈالے گی۔ ہم اپنی نوے فیصد خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے ذریعے ہی تو پاتے ہیں۔

نگہت نے حیرت سے ان دو موتیوں کو دیکھا، مَیں نے اُسے ان انمول گوہر کی پوری کہانی سنائی اور وہ دونوں موتی نگہت کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''یہ موتی اُسے واپس دے دینا۔ اور اُس سے کہنا کہ اگر میری تقدیر میں ہوا تو ایک دن وہ خود مجھے یہ موتی واپس لا کر دے گی۔ اب جنگ میری اور زمانے کی نہیں ہے۔۔۔۔ اب لڑائی تقدیر سے ہے۔۔۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔''

مَیں نگہت کو بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہیں کھڑی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ زندگی میں ہم سب پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ جب ہم کسی سے ملنا، کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اس وقت ہمیں اپنی اس خاموش تنہائی کی اپنے آپ باتیں کرنا بھی نہیں بھاتا۔ بس ہمیں اِک سکوت کی تلاش ہوتی ہے، جی چاہتا ہے ہم کچھ دیر کے لیے زمانے بھر کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں کوئی ہم سے کچھ نہ پوچھے، کوئی بات نہ کرے۔

اس دن نگہت سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی شاید جمعے کا دن تھا۔ ابھی ابھی کوئٹہ ایکسپریس چھوٹی تھی اور اسٹیشن سے بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ رہی تھی۔ مَیں چپ چاپ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے شہتوت کے گھنے سے درخت کے نیچے بچھے لکڑی کے بینچ پر بیٹھا ہُوا اس کے پُرانے تختے پر ویسٹرن ریلوے کے کھدے ہوئے الفاظ کو غور سے دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ہماری اردگرد کی نصب ہُوئی کئی چیزوں نے جانے کتنے مہ و سال دیکھ رکھے ہوتے ہیں، جانے کیسے کیسے زمانے ان پر سے وارد ہو کر گزر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اب اسی لکڑی کے بینچ کو ہی لے لیں۔ تقریباً سو سال سے انگریز کے دور سے یہ اب تک یہی نصب تھا، جانے کتنی دھوپیں، جانے کتنے سائے، جانے کتنی بارشیں اور برف باریاں اور جانے کتنی آندھیاں سہی ہوں گی اُس تنہا بینچ نے۔۔۔۔ اور جب مجھ جیسے کئی اور کم ظرف انسان اس پر بیٹھ کر بڑی بڑی شیخیاں بگھارتے ہوں گے تو یہ سب چیزیں آپس میں اشارے کر کر کے ہم کمزور اور فانی انسانوں کا کتنا مذاق اُڑاتی ہوں گی۔ سچ ہے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے پل کی بھی تو خبر نہیں اُسے اپنی۔۔۔ پھر یہ گھمنڈ کس بات کا۔۔۔

مَیں انہی خیالات کی یلغار لیے بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نورانی سے چہرے والے بزرگ جو شاید سامنے لگے نل سے وضو کر کے آئے تھے، کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے، میرے متوجہ ہونے پر مسکرائے۔

''معاف کرنا میاں۔۔۔ تم شائد کسی گہری سوچ میں گم تھے، مَیں نے تمھیں چونکا دیا۔''

سچ تو یہی ہے کہ اس وقت مجھے ان کی یہ مداخلت بے حد ناگوار گزری تھی لیکن بہر حال ان کی عمر کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی تلخی ظاہر نہ کی جائے۔ ہم انسان بھی کیسی کیسی روایات کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں، کچھ سانسیں بھی اپنی مرضی کی مل نہیں پاتیں۔

''جی فرمایئے۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔''

بزرگ مسکرائے۔ ''ارے خدمت ودمت کچھ نہیں میاں۔ جمعے کا وقت ہے، سوچا آپ کو یاد دلا دوں کہ نماز کا وقت ہونے ہی والا ہے، ہو سکتا ہے آپ نے کچھ تیاری کرنی ہو۔''

''جی شکریہ۔آپ چلئے۔۔۔۔مَیں بھی کچھ دیر میں حاضر ہو جاؤں گا، مسجد اس طرف ہے۔''

مَیں نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ بزرگ بھی سخت کائیاں ہی نکلے۔۔۔۔

''میاں مسجد کا راستہ یوں نہیں دکھاتے، مسافر کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں پھر ضبط کر گیا۔

''افسوس۔۔۔۔مَیں آپ کے ساتھ ضرور چلتا لیکن اس وقت مَیں اپنی کچھ اُلجھنوں میں پھنسا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ کسی اور کے ساتھ چلے جایئے، مَیں معذرت خواہ ہوں۔''

بزرگ نے خندہ پیشانی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔۔مَیں خود ہی چلا جاؤں گا۔اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر اس بینچ پر ستا لوں۔ابھی آدھ گھنٹہ ہے خطبہ شروع ہونے میں۔''

ایک بار تو جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ یہ پورا پلیٹ فارم خالی پڑا ہے۔کہیں بھی جا کر ستانے کا شوق پورا کر لیجئے۔۔۔۔پھر مَیں نے سوچا کہ شاید یہ بھی میری طرح تنہائی کا مارا کوئی انسان ہوگا۔دو گھڑی بیٹھ جائے گا تو میرا کیا جائے گا۔مَیں اور میری تنہائی تو صدیوں کے ساتھی ہیں، اور ہمارا ساتھ تو ابد تک کا ہے، ہم دونوں پھر کبھی مل لیں گے۔

مَیں نے ایک طرف ہو کر تختے پر اس بزرگ کی بیٹھنے کی جگہ بنائی۔وہ اپنے کاندھے پر پڑی چادر سے اپنا ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے۔

''میرا نام رحمت اللہ ہے، لاہور جا رہا ہوں۔وہیں کا رہنے والا ہوں یہاں پر کچھ پریس اور کچھ پبلشنگ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔اس لیے دو تین ماہ میں ہفتہ دس دن کے لیے آنا پڑتا ہے۔''

جواب میں انہوں نے میری طرف اس اُمید سے دیکھا کہ اَب میں اپنا شجرۂ نسب ان کے سامنے بیان کروں، مَیں نے مختصراً بتایا۔

''میرا نام حماد ہے۔یہاں پر قلی ہوں۔''

''ماشاءاللہ۔۔۔۔ماشاءاللہ۔۔۔۔محنت میں ہی عظمت ہے،تمھاری تنہائی میں مخل ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔دراصل بہت دیر سے تمھیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تمھاری پیشانی کی اس خاص چمک نے تم سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔''

''جسے آپ میری پیشانی کی خاص چمک سمجھ رہے ہیں، وہ میرے بختوں کی سیاہی ہے۔اور کالک اور سیاہی جب حد سے زیادہ ہو جائے تو اس میں بھی ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔''

بزرگ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

''سبحان اللہ۔۔۔۔میاں۔۔۔۔کیا خوب بات کہی تُم نے۔۔۔۔سیاہی کی چمک۔ واہ۔۔۔بہت خوب۔۔۔پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

جی کچھ صفحے سیاہ کیے ہیں۔لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔''

''علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا،نماز وغیرہ سے کچھ خاص شغف نہیں رکھتے شاید۔''

''میں اسے دل کا معاملہ سمجھتا ہوں، دل چاہے تو پڑھ لیتا ہوں کبھی کبھی۔۔۔ورنہ نہیں۔''

''سچ تو یہ ہے میاں کہ مَیں بھی بس حاضری لگانے کے لیے ہی پڑھتا ہوں۔دل تو کہیں اور ہی اٹکا ہوتا ہے۔کسی اور جوڑ توڑ میں، دھندے کی کسی گتھی کو سلجھانے میں۔''

''تو پھر ایسی حاضری کا فائدہ کیا۔۔۔؟اس سے تو میری غیر حاضری ہی بھلی۔''

''میاں حاضری تو لگانی ہی پڑتی ہے نا۔ورنہ اگلے امتحان میں بیٹھنے ہی نہیں دیا جائے گا۔جانتے ہو نا، حاضری کی بنیاد پر ہی امتحانی داخلہ ملتا ہے۔کچی پکی حاضری پوری ہو گی تو ممتحن امتحان کے لیے بلائے گا۔ورنہ بنا امتحان لیے ہی فیل کر دیا جائے گا۔ایک دفعہ اس ٹوٹی پھوٹی حاضری کی بنیاد پر اگلے جہاں کے امتحاں تک تو پہنچ جاؤں۔پھر وہاں ممتحن کے آگے رو دھو کر کسی نہ کسی طرح صرف پاس ہونے تک کے 33 نمبر لینے کی کوشش کروں گا۔ ایک آدھ مضمون میں سپلی یا کمپارٹ آ بھی گئی تو کیا ہے۔گھس گھس کر نکل ہی جائیں گے آخر۔اس لیے حاضری ضروری ہے۔بنیادی شرط ہے، کچی حاضری ہو یا پکی، دل کی گہرائی اور خلوص دل سے ہو یا دکھاوے اور منافقت بھری۔لیکن یہی حاضری آگے پیش ہونے کا کام

دے گی۔ حاضری پوری ہی نہ ہوئی تو پیشی کا موقعہ ہی نہیں ملے گا اور پیشی اور سنوائی کا موقع ہی نہ ملا تو ہم تو گئے کام سے نا۔''

میں حیرت سے رحمت اللہ صاحب کی تقریر سنتا رہا۔ بہت بڑی بات انہوں نے بہت سہل زبان میں کہہ دی تھی۔ واقعی نالائق سے نالائق تر، کوڑھ مغز سے کوڑھ مغز ترین اور شریر سے شریر تر طالب علم کو بھی امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل ہی جاتا تھا بشرطیکہ اس کی حاضریاں امتحانی معیار کے مطابق پوری ہوں۔ اب پاس فیل ہونا اُس کی قسمت اور اعمال پر تھا۔ ہوسکتا ہے کہ پرچے چیک کرنے والا رحم کھا کر 33 نمبر دے ہی دے۔ لیکن جس طالب علم کی حاضری ہی پوری نہ ہو اُسے تو امتحان لیے بنا ہی فیل تصور کیا جاتا ہے۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔ اس حساب سے تو حاضری بڑی ضروری ہوئی۔'' رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

''نماز کی حاضری کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بڑا کٹھن ہوتا ہے پانچ وقت کی یہ روزانہ حاضری کا ٹنا۔ شروع شروع میں تو مَیں بڑا تنگ ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو جائے نماز پر کھڑا تو کر لیتا لیکن یہاں نیت باندھی اور وہیں ایک تیزی اور دنیا بھر کی جلدی کی ایک ایسی بے چینی سر پر سوار ہو جاتی تھی کہ جسے اگر وہ نماز پڑھنے میں مَیں نے ذرا بھر مزید دیر لگا دی تو جانے کتنے لاکھ کا گھاٹا ہو جائے گا۔ اسی تیزی میں جلد از جلد اُلٹی سیدھی رکعتیں پڑھ کر بس سلام پھیرنے کی کرتا تھا۔ جانے پوری پڑھتا بھی تھا یا آدھی نامکمل پڑھ کر ہی ختم کر دیتا تھا۔ اور اِدھر سلام پھیرا اور اُدھر وہ تیزی وہ بے چینی ختم۔ لگتا تھا جیسے خون میں جو اُبال آ رہا تھا وہ بس اس نماز کی وجہ سے ہی تھا۔ پھر چاہے گھنٹوں وہیں بیٹھا رہوں، کچھ نہ کروں تب بھی ویسی جلدی اور بے چینی پیدا نہ ہوتی، ہاں البتہ جیسے ہی دوسری نماز کے لیے کھڑا ہوا، وہیں وہ بھاگم بھاگ شروع۔

اور اس چند لمحے کی عجلت اور بے چینی بھری نماز کے درمیان بھی ہر لمحہ کسی عورت، کسی دھندے کسی کمائی کا سودا ہی ذہن میں سمایا رہتا۔ کبھی کبھی تو دل اس زور سے دھڑکتا تھا جیسے اگر مَیں نے فوراً پل میں نماز پڑھ کر سلام نہ پھیرا تو یہ کم بخت دل سینے سے ہی باہر نکل آ گرے گا۔''

مَیں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں کسی کے سامنے اس لیے بھی نہیں کرتے کہ کہیں ان کے مذہب پر لوگ شک نہ کرنے لگیں۔ لیکن یہ بزرگ تو بڑے مزے سے اپنی جھوٹی سچی نمازوں کی داستان سنائے جا رہے تھے۔

''تمھیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔ جس مسجد میں مَیں نماز پڑھنے جاتا تھا اس کے سامنے کی کھڑکی باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ مَیں اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلی صف تک پہنچ بھی جاتا تو پوری نماز کے دوران میری نظریں باہر بازار کی گلی میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ دراصل شروع شروع میں نماز میرے لیے بڑا اُکتا دینے والا کام تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ''بورنگ (Boring)'' ہاں۔۔۔۔ بڑا بورنگ کام تھا۔ اس لیے میری نظر خود بخود کھڑکی سے باہر اُٹھ جاتی تھیں۔ اور سچ بتاؤں رمضان میں کبھی دوست کھینچ کھانچ کر تراویح کے لیے لے جاتے تو تب یہ کھڑکیاں میرے بڑے کام آتی تھیں۔ تراویح کی لمبی لمبی رکعتیں بڑے مزے سے گزر جاتیں۔''

رحمت اللہ صاحب یہ بتاتے ہُوئے ہنس پڑے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی مَیں نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔

''اور اب۔۔۔۔؟۔۔۔۔ اب کیا محسوس ہوتا ہے۔''

''اب لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ ٹھہراؤ آتا جا رہا ہے۔ لیکن ہم کیا اور کیا ہماری نمازیں میاں۔۔۔۔ سب دکھاوا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ

''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔۔۔۔''

''مذہب میں کاملیت کروڑوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو یونہی رُل رلا کر بس اپنی نیت کے طفیل ہی یہ دریا پار کر لیتے ہیں۔ یا پھر کسی کی دی ہوئی کوئی دُعا کام آ جاتی ہے۔ منزل نہ سہی، کوئی سنگ میل ہی سہی۔۔۔۔ منزل سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے، ہم تو ذہن میں پہلا پڑاؤ پہلا سنگِ میل رکھ کر ہی چلتے ہیں۔ جانے اُس تک بھی اس مختصر زندگی میں پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ اپنا فرض تو بس قدم بڑھانا ہی ہے۔''

مَیں رحمت اللہ صاحب کی باتیں بڑے غور لیکن دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ میں آج تک مذہب کو بہت مشکل اور بڑا کٹھن کام سمجھتا تھا۔ لیکن رحمت اللہ کی باتوں سے لگ رہا تھا

کہ یہ تو بہت سہل ہے۔ بس نیت کا کھیل ہے۔

اتنے میں جمعے کی اذان شروع ہوگئی۔ مَیں بے اختیاری میں ہی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ اب یوں گیٹ سے پلٹنا مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ رحمت اللہ نے دوبارہ حالانکہ مجھ سے نماز پڑھنے کا ذکر تک بھی نہیں کیا تھا۔ میں بھی دوسرے نمازیوں کے ساتھ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

شاید اس دن وہ میری زندگی کا پہلا سجدہ تھا جو مَیں نے بنا کسی خوف اور کسی جلدی، بنا کسی بےزاری اور بنا کسی مطلب اور لالچ کے ادا کیا تھا۔

اس دن مجھے پہلی بار مذہب سے ڈر نہیں لگا۔ کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے میرے اس پہلے سجدے میں بڑا اطمینان تھا طمانیت تھی اور سکون تھا۔

میں نماز پڑھ کر اسٹیشن سے ملحق مسجد کے باہر ہی کھڑا رحمت اللہ صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ جلد ہی وہ بھی نکل آئے اور ہم دونوں واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ وہاں سپیکر پر اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ لاہور جانے والی گاڑی کسی فنی خرابی کی وجہ سے تین گھنٹے دیر سے جائے گی۔ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

''لو بھئی۔۔۔۔ شاید قدرت کو میرا تمھارا ساتھ کچھ دیر کے لیے مزید منظور تھا۔ تم اگر بُرا نہ مانو تو میں یہیں تمھارے پسندیدہ بینچ پر اپنی گاڑی کا انتظار کر لوں۔''

میں شرمندہ سا ہو گیا، شاید انہیں نماز سے پہلے والا میرا لہجہ اور رویہ یاد تھا۔ میں نے ان سے اپنے پچھلے سلوک کی معذرت چاہی۔ وہ مسکرا دیے۔

''ارے میاں معذرت کیسی۔۔۔۔ ہر بندے کا اپنی تنہائی پر مکمل اختیار اور مکمل حق ہوتا ہے۔ معذرت تو مجھے پیش کرنی چاہیے۔۔۔۔ بہر حال بھئی تمھیں لگی ہو یا نہ لگی ہو۔ پر مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیٹ پوجا ہونی چاہیے۔''

انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک لوہے کا خوبصورت سا چھوٹا ٹفن کیریئر نکالا اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک رکھا۔ سادہ سی آلو ساگ کی سبزی، تھوڑا سا اچار اور چند پراٹھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا، پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مجھے بے رغبتی سے نوالے توڑتے دیکھ کر انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

''دیکھو حماد میاں ۔۔۔۔ چاہے جتنے بھی مصروف کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کے لیے وقت ضرور نکالا کرو۔ ہم اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کس لیے کرتے ہیں۔ اسی دو وقت کی روٹی کے لیے ہی نا۔ یہ روٹی کا چکر ہی نہ ہوتا تو سبھی ہمہ وقت مسجدوں میں سجدے میں ہی نہ پڑے رہتے۔ لیکن ہمیں رزق تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چاہے چند نوالے ہی کھاؤ لیکن عبادت کی طرح خلوص سے کھاؤ اور اس نیت سے کھاؤ کہ اس کے بعد تم خدا کا شکر ادا کر سکو گے۔ بلکہ صرف کھانے پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی میں اس کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس طرح برتو کہ یہ اس مالک کا احسان ہے اور اس نیت سے اس نعمت کا فائدہ اُٹھاؤ کہ یہ اس مالک کے شکر ادا کرنے کا ایک اور بہانہ ہے جو اُس نے تمھیں فراہم کیا ہے۔''

مجھے اس نورانی چہرے والے بوڑھے کی باتیں سن سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ مَیں نے تو زندگی کبھی اس زاویے سے نہیں گزاری تھی۔ مَیں اپنے استعمال کی ہر چیز کھانے پینے، سواری، آرام اور تعیش کی چیزوں اور لمحات کو اپنا اور اپنی محنت کا حق سمجھا تھا۔ اپنے بڑوں کی دین سمجھتا تھا۔ بڑوں کی کمائی سمجھتا تھا۔ نعمت اور شکر کا تصور تو میرے دل میں کہیں دُور دُور تک نہ تھا۔

میں نے کچھ دبے سے لہجے میں رحمت اللہ صاحب سے پوچھا۔

''کیا آپ تبلیغی ہیں ۔۔۔۔؟''

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑے۔

''خوب ۔۔۔۔ تو تم اتنی دیر سے میری باتوں کو تبلیغ سمجھ رہے ہو ۔۔۔۔ بڑے بھولے ہو میاں ۔۔۔۔ مَیں کہاں اور تبلیغ کہاں۔ میں تو ایک وقت کی بھوک بھی برداشت نہیں کر سکتا، تبلیغ کے لیے تو پورا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں آپ کو یہ حق ملتا ہے کہ آپ دوسروں کو کچھ نصیحت کریں، کچھ سکھائیں، کیونکہ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ خود وہ کریں جو دوسروں کو کہتے ہیں اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

اتنے میں رحمت اللہ صاحب کی گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور اب اس کا سائرن بھی وقفے وقفے سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ مَیں نے ان کا سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کی اور ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کا سوٹ کیس اُٹھا کر انہیں ڈبے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئے جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھی تو میں اُتر کر پلیٹ فارم

پر ان کی کھڑکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ ثرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ انہوں نے سر باہر نکال کر میرے ماتھے کا الوداعی بوسہ لیا اور بولے۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمھیں کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ طلب اور اس چیز کی شدت کی چاہت تمھاری آنکھوں سے ہر لحہ ٹپکتی ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مذہب تمھارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھو حماد میاں۔۔۔ مذہب تب تک ہی رکاوٹ لگتا ہے اور اس سے خوف محسوس ہوتا ہے جب تک آپ اس سے دُور رہتے ہیں۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بے ضرر اور بہت دوست نما کوئی چیز ہے۔ مذہب سے دُور نہ رہنا۔۔۔ اسے اپنا دوست بنا لینا۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ آباد رہو۔''

ثرین نے دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی آخری حد تک چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ عجیب نورانی بزرگ ہاتھ ہلاتے ہلاتے ثرین سمیت میری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ جو جاتے جاتے مجھے زندگی کے بہت سے زاویے بس ایک ہی ملاقات میں بتا گیا تھا۔

OO

ہالوکاسٹ

آخر کئی دنوں کی کوشش کے بعد مجھے جوزف سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہالوکاسٹ کا نظریہ کیا ہے۔ جوزف میری بات سنتے ہی ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا جیسے میں نے کوئی بہت ہی انہونی چیز پوچھ لی ہو۔ وہ سرگوشی میں یوں بولا جیسے ہم بہت بڑے ہجوم کے درمیان بیٹھے ہوں حالانکہ وہاں نہر کے آس پاس دُور دُور تک ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''اس جگہ ایسی کوئی بات کسی سے پوچھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ موضوع یہاں پر ممنوعہ ہے۔''

میں نے حیرت سے جوزف کے اس پُر اسرار انداز کی طرف دیکھا۔

''کیوں ۔۔۔ ایسی کیا بات ہے اس موضوع میں ۔۔۔۔ اور پھر سارہ نے اس دن اس نظریے کے حق میں اپنی تقریر کے دوران اتنے زیادہ دلائل بھی تو دیے تھے۔ پھر یہ سب ممنوعہ کیسے ہو گیا۔''

سارہ ایک یہودی لڑکی ہے اور اس کے تمام دلائل ہالوکاسٹ کے حق میں تھے۔ مَیں اس نظریے کے مخالف دلائل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس نظریے کی حقیقت جان کر اس پر دوسروں سے بحث ضرور کرو گے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔''

''کیوں ۔۔۔ کیا تم بھی اس نظریے کے مخالف ہو۔''

''ہاں ۔۔۔ مَیں کیا ایک دُنیا اس مفروضے کی حقیقت سے انکاری ہے۔ لیکن ان یہودیوں کے لیے یہ اس قدر مقدس نظریہ ہے کہ وہ کسی کا اس کے خلاف بولنا تو دور، سوچنا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ایسی کوئی بھی بات کرنے والوں کی زبان بند کرنا انہیں خوب آتا

ہے۔اسے یا تو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے یا پھر ملک بدر اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ بلکہ اب تو انہوں نے باقاعدہ ایک قانون بنا لیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس موضوع کی مخالفت پر پابندی لگا دی ہے باقاعدہ طور پر۔"

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"اس جدید دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی سوچ، کسی کی زبان پر پہرے لگا دیں۔۔۔۔؟۔اور پھر یہ لوگ تو آزادئ اظہار رائے کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ۔ یہ آزادی رائے اس وقت کیوں یاد نہیں آئی انہیں جب یہ لوگ ایسا کوئی جبری قانون بنا رہے تھے۔"

جوزف نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا مشورہ دیا۔

"یہ تمام ڈھنڈورے دوسری قوموں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔شاید تم یہ نہیں جانتے کہ تمھاری اس دن ہال میں کی گئی تقریر نے جانے کتنوں کی نیند اُڑا دی ہوگی۔ یہ اس یونیورسٹی کے ایک سو تیس سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ کوئی اسٹیج پر آ کر باقاعدہ انہیں سچے لفظوں کے تازیانے لگا کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ایسی جرأت کو بھولتے نہیں۔۔۔۔نا ہی پسند کرتے ہیں۔"

مَیں نے جھلا کر کہا۔

"یہ لوگ۔۔۔یہ لوگ۔۔۔۔آخر یہ لوگ ہیں کون۔۔۔۔؟ اگر ان میں اتنی ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔آخر یہ ہالوکاسٹ ہے کیا بلا۔۔۔۔؟"

جوزف نے ایک لمبی سی سانس لی۔وہ سمجھ گیا تھا کہ مَیں کچھ جانے بغیر یہاں سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔وہ دبی دبی سی آواز میں مجھے بتانے لگا۔

"یہودیوں نے اپنے اوپر ہونے والے نام نہاد مظالم کو سب سے زیادہ جرمنی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے جرمنوں پر 1298ء میں جرمن نائٹ رنڈفلیش کی سرکردگی میں جرمنی میں موجود ایک سو چھیالیس یہودی بستیوں میں قتل عام کا الزام لگایا گیا۔ پھر 1336ء میں دو سو یہودی بستیوں کو تباہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔لیکن سب الزاموں سے بڑھ کر الزام یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گورین نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہٹلر پر لگایا کہ

اُس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ختم کروایا تھا۔ کچھ لوگ یہ تعداد 60 لاکھ تک بتاتے ہیں۔ اور یہودی اسی عظیم الشان اموات کے نظریہ کو ہالوکاسٹ کہتے ہیں۔''

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

''لیکن اتنی بڑی تعداد میں اگر یہودی مارے گئے ہوں گے تو ان کی موت کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم اور ہٹلر کا دَور تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔''

''کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ثبوت ڈھونڈنے والوں اور اس نظریے کے خلاف جانے والوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی آسٹریا کی ایک عدالت نے تاریخ کے ایک استاد پروفیسر ڈیوڈ ارونگ کو تین سال کی سزائے قید سنائی ہے۔ صرف اس جرم میں کہ اُس نے ہالوکاسٹ کے دوران یہودیوں کے قتل عام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔''

''حیرت ہے لیکن یہودی اس پروپیگنڈے کے ذریعے کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

''اپنی قوم اور اپنی نئی نسل کے لیے ایک الگ اور آزاد سلطنت، برطانیہ اور امریکہ نے یہودی رہنماؤں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران یقین دلایا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد یہودی سلطنت قائم کر دی جائے گی اور یہ ریاست فلسطین کی مقدس سرزمین پر قائم ہوگی۔ روس نے بھی اس معاملے میں یہودیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔''

جوزف نے مجھے رچرڈ ہارورڈ (Richard Harward) کی کتاب ''کیا واقعی 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔'' فرنچ رائٹر پال راسی نیر کی کتاب ''یورپی یہودیوں کا ڈراما'' امریکی مصنف ڈیوڈ ہوگن کی تصنیف ''مسلط شدہ جنگ'' اور ایسی بہت سی دوسری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ میرے لیے واقعی یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اسی دن شہر کی مختلف گمنام لائبریریوں سے یہ تمام کتابیں منگوالیں کیونکہ شہر کی بڑی لائبریریوں میں ان کتابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں ان کتابوں کو پڑھتا گیا۔ نت نئے راز میرے اندر وا ہوتے چلے گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ہالوکاسٹ کا یہ پروپیگنڈہ تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جرمنی سے تمام اتحادی افواج خائف تھیں، یہودیوں نے جو اس

وقت جرمنی میں اسلحہ سازی کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے، اتحادی افواج اور امریکہ کا درپردہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد انہیں آزاد ریاست بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

جرمن یہودی سازشوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم ہار گئے، ہالوکاسٹ کے واویلے سے یہودیوں نے پورا فائدہ اُٹھایا اور فلسطین تک ان کی بستیوں کی رسائی میں اتحادی ملکوں نے پوری مدد کی۔ اور رفتہ رفتہ ہالوکاسٹ کے موضوع کو ہی مقدس گائے بنا دیا گیا تاکہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہ بولے اور نہ ہی تحقیق کی نوبت آئے۔ مجھے ان سب کتابوں سے بس ایک ہی حقیقت کا واضح اشارہ ملا کہ۔۔۔۔ ''یہودی دراصل سازش کا دوسرا نام ہے۔''

اب مجھے کسی ایسے موقع کا انتظار تھا جب مَیں ان یہودیوں کے اس غرور کو توڑ سکوں۔ کامران نے میرے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے کہ مَیں ان چکروں میں نہ پڑوں۔ اسے مجھ سے زیادہ سارہ کی فکر تھی کہ وہ میرے دوست کامران کے بارے میں کیا سوچے گی جب کہ ابھی تک سارہ کامران کے نام اور شکل سے بھی واقف نہیں تھی۔

اور پھر ایک ہی ہفتے کے دوران مجھے وہ موقع مل ہی گیا۔ ہیومینٹرنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو مختلف موضوعات پر ٹرم پیپر لکھنے کے لیے کہا، موضوع کی کوئی قید نہیں تھی لیکن موضوع پہلے بتانا ضروری تھا کیونکہ اسے طالب علم کے نام کے ساتھ نوٹس بورڈ پر چپکانا ضروری تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر وہ فہرست لگائی گئی جس کے اندر موضوعات بھی واضح کیے گئے تھے اس دن سب لوگ میرے نام کے سامنے مضمون کی فہرست میں ''ہالوکاسٹ'' کا عنوان دیکھ کر ہی سراسیمہ ہو گئے۔ چند لمحوں میں ہی پوری یونیورسٹی میں سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کا ایک ریلا سا بہہ نکلا۔ میں لائبریری سے نکل رہا تھا کہ پریشان سی ربیکا اپنے کٹے بال جھلاتی جانے کہاں سے آ نکلی اور بنا کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی مجھے راہداری کے ایک سنسان گوشے کی طرف لے گئی۔

''میڈی۔۔۔ تم اپنے ہوش وحواس میں تو ہو۔۔۔؟''

''کیوں۔۔۔ مَیں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ تمھیں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''

''تم نے ہالوکاسٹ پر ٹرم پیپر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ یونیورسٹی یہودیوں کی ہے اور اس کی تمام انتظامیہ یہودی ہے۔ پلیز میڈی۔۔۔۔ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لو۔۔۔ دیکھو میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

اُس نے واقعی اپنے گورے گورے سے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''کچھ نہیں ہوگا، تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اگر یہ لوگ دوسری قوموں اور مذاہب کا مذاق اُڑاتے ہیں اور انہیں خود سے کم تر سمجھتے ہیں تو انہیں بھی آئینہ دکھانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔''

''اوہ میڈی۔۔۔۔ تم نہیں جانتے میں تمھارے لیے کتنی پریشان ہوں۔ اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی۔ میں نے چونک کر اُس بظاہر لاأبالی سی لڑکی کو دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے لگا دُور کہیں پھر سے محبت کی راج ہنسی پر پھیلا رہی ہے۔۔۔۔

OO

سنگ دِل

مَیں بنیادی طور پر مذہب کو انسان کا بے حد ذاتی فعل سمجھتا تھا۔ اس دن ٹرین والے بزرگ رحمت اللہ سے ہوئی ایک ملاقات نے میرے اندر سے مذہب کا بہت سارا خوف نکال دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا کہ مذہب کو دوسروں کے ساتھ ڈسکس بھی کیا جا سکتا ہے اور اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی بُرائی بھی نہیں ہے۔

جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ مَیں اپنی چاہت کے راستے میں اپنے مذہب کو حائل سمجھتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب بزرگ تھا جو پل بھر میں میری روح تک کھنگال کر اسے جھنجھوڑ گیا تھا۔ بہرحال اب مجھے میرا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

درمیان میں ایک دفعہ شاکر کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ وہ کمشنر صاحب کو لے کر اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ الیکشن قریب آ رہے تھے اور اب بابا کی بڑے گھروں کی یاترا بھی بڑھنے لگی ہوگی۔ نگہت نے بتایا کہ وہ دونوں موتی ایمان کو دے آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ایمان بہت دیر تک وہ دونوں موتی ہاتھوں میں لیے گم سم سی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے نگہت سے پھر یہی درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سمجھائے کہ میری ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہٰذا مَیں یہ تیاگ ترک کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔ نگہت اس سے اُلجھ پڑی تھی کہ جب اسے میری کوئی فکر ہی نہیں ہے تو پھر میری دربدری اور میری خواری کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دے۔ اسے خواہ مخواہ خود کو مجرم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا ہوں، ایمان کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نگہت کی یہ سخت جوابی سن کر وہ زہرہ جبیں ایمان کس قدر آزردہ ہوئی ہوگی۔ مَیں یہ سوچ کر دکھی ہو گیا۔ لیکن نگہت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ چپ بھی رہتی تب بھی حیا ضرور اپنی بہن سے اُلجھ پڑتی۔ نگہت کو خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ جانے کیوں حیا کو مجھ پر اور میری ایمان

سے محبت پر بے انتہا یقین تھا۔ اور وہ مجھے ایمان کے معاملے میں ذرا بھی قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اس انجانی لڑکی پر اس لمحے بے حد پیار آیا۔ چلو۔۔۔ کوئی تو تھا اس گھر میں جو کھلے عام نہ سہی چھپ کر ہی اس نازنین کے سامنے تنہائی میں میری وکالت کرتا تھا، کہتے ہیں مستقل طور پر اگر پانی کا ایک قطرہ بھی کسی سنگ سخت پر پڑتا رہے تو وہ بھی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ دیکھتے ہیں۔۔۔ اس پتھر دل کا دل کب پگھلتا ہے۔

مَیں جانتا تھا کہ ایمان کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جن لڑکیوں کے دلوں کے ہر کواڑ کی چابی ان کے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے۔ ان کی ہر پسند ناپسند اپنے بزرگوں کی پسند سے مشروط ہوتی ہے، ان کے دلوں کا ہر راستہ ان کے باپ کی بیٹھک سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ بیٹھک جہاں سے آگے بڑھنے کی اجازت ملنے پر ہی وہ اپنے دل کا دروازہ کسی اجنبی کے لیے کھولتی ہیں۔ ورنہ یہ دروازے یہ کواڑ ساری عمر بند ہی رہتے ہیں۔ آپ لاکھ سر پٹخیں، ماتھے کو ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیں پر وہ بہری بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ پرستان کی ان پریوں کی شہزادی کی طرح کہ جس کے محل کے دروازے پر کوئی اژدھا، کوئی دیو یا کوئی جن پہرہ دینے کے لیے ہمہ وقت موجود ہی رہتا ہے۔

لیکن مجھے جانے کیوں اپنی محبت کی طاقت پر کبھی شک نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس اب جینے کے لیے اس محبت اور اس کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں اسی پل خود بھی مر جاتا۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی اس پتھر کی دیوار سے تا عمر سر ٹکرانا تھا۔ بنا کسی تیشے اور اوزار کے صرف اپنے خالی ہاتھوں اور کمزور ناخنوں کی مدد سے اس پہاڑ کو ادھیڑ کر ایک نہر کھودنا تھا۔ میرے ناخن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے، چھل چکے تھے، ہاتھ لہولہان تھے اور پتھر کا پہاڑ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جگہ ویسے ہی قائم تھا۔ لیکن میرا حوصلہ ابھی جوان تھا۔ میری ہمت میرے ساتھ تھی۔ سو مَیں بھی اپنی رفتار کے ساتھ کسی نہ کسی صورت مشقت جاری رکھے ہوا تھا۔ بس شرط سانسوں کی تھی۔۔۔ وہ جب تک ساتھ دیتیں۔۔۔ مَیں رُکنے والا نہیں تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس راستے میں مجھے جو بھی لوگ ملتے گئے انہوں نے کسی نہ کسی طور میری مدد ہی کی تھی۔ میرا راستہ سہل ہی کیا تھا۔ شاکر، نگہت، صدیقی صاحب، غفورا اور اب

یہ صوفی رحمت اللہ۔۔۔۔ سبھی نے میری ہمت کسی نہ کسی طرح سے بڑھائی ہی تھی۔

رحمت اللہ صاحب نے تو ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا تھا۔ اور میں نے اب اسی راستے پر چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر مولوی صاحب کی نظر میں مذہب ہی میری کمی اور میری خامی تھی تو میں نے اب تک اس کمی کو اس خامی کو دُور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ لوگ مذہب سے محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو کیا ہوا اگر میں اپنی محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف قدم بڑھا لوں۔۔۔۔؟ رحمت اللہ صاحب نے کہا تھا کہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایک کامل دین ہوتا ہے۔ تو پھر مَیں بھی اگر ان ہزاروں نوسیکھیوں کے ساتھ مل جاؤں تو اس میں کیا بُرائی ہے؟ مانا کہ یہ سب مَیں اس وقت ایمان کو پانے کے لیے ہی کرتا لیکن اپنی محبت کو ہار دینے اور ہتھیار ڈال دینے سے تو پھر بھی یہ کہیں بہتر تھا۔ دل میں کوئی خلش تو نہیں باقی رہتی کہ کاش یہ بھی کر کے دیکھ لیتے۔

وہ جاتی گرمیوں کے دن تھے اور ستمبر کا مہینہ اور خزاں سر پر تھی۔ مَیں نے اسٹیشن کے چائے والے لڑکے کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے جگا دے۔ وہ رات کی شفٹ میں اسٹیشن پر پھیری لگا کر ایک مخصوص لوہے کے چکر میں شیشے کے گلاس پھنسائے ان پر ایک لوہے کی پتری گھما کر آواز نکال کر چائے بیچتا تھا۔ اور مجھ سے خاصی دوستی ہو گئی تھی اس کی۔ بابر نام تھا اس کا، بابر نے مجھے ٹھیک ساڑھے چار بجے۔ ''چائے گرم'' کے نعرے کے ساتھ ہی اٹھا دیا۔ بہت دنوں سے میں نے بیڈ ٹی نہیں پی تھی، سو اس نے آج یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ البتہ یہ بیڈ ٹی نہیں بلکہ بینچ ٹی تھی کیونکہ ویٹنگ روم میں پڑے وہ لکڑی کے تختے ہی اب میرا بستر تھے۔ چائے پی کر مَیں جلدی سے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور باہر نکلتے نکلتے اسٹیشن کے نل سے منہ پر پانی کے دو چار چھینٹے بھی مار لیے۔ باہر اکا دکا تانگے موجود تھے جو مٹی کے تیل والی بڑی بڑی لالٹینیں اپنے تانگوں پر لٹکائے صبح کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مَیں نے وہیں سے خیرو تانگے والے کو آواز لگائی۔ خیرو تانگہ ہانکتا ہوا قریب آ گیا۔

''خیر تو ہے بابو نمبر 137 ۔۔۔۔ اتنی صبح سویرے کہاں کا ارادہ ہے۔''

وہ ہمیشہ مجھے بابو نمبر 137 ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ مَیں نے اُسے پُرانے محلے چلنے کا کہا۔ اس نے تانگہ آگے ہانک دیا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کوئٹہ سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم

ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے پُرانے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر میں نے خیرو کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خیرو نے تانگہ ایک طرف لگایا اور حسب معمول اپنے تانگے کے ساتھ لٹکے ہوئے پُرانے سنگل بینڈ کے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے ان تانگے والے، رکشہ والوں اور ٹیکسی چلانے والوں کی اس مخصوص عادت پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، زمانہ ادھر کا ادھر ہو جائے پر یہ لوگ خبریں ضرور سنتے اور بعد میں آپس میں بیٹھ کر اس پر تبصرے کرتے جیسے وہ کوئی تانگہ یا رکشہ اسٹینڈ پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ جیسے کسی اسمبلی کے رکن ہوں اور اگر وہ تبصرہ نہ کریں یا خبریں نہ سنیں گے تو جیسے ملک کا بے حد بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس عام طور پر اسمبلیوں تک پہنچنے والے اسمبلی میں اس رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس کی توقع ہم ان تانگہ بانوں سے کر سکتے تھے۔

مَیں خیرو کو وہیں خبروں کی تلاش میں ریڈیو کی سوئی گھماتا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد ابھی تقریباً خالی ہی تھی، اکا دکا نمازی آنے لگے اور پھر جماعت کے وقت مولوی علیم مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے امام کی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھا کر انہوں نے سلام پھیرا اور پھر دُعا کے لیے مقتدیوں کی طرف پلٹے۔ جیسے ہی انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ جیسے سُن ہی ہو کر رہ گئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ خیال آیا اور انہوں نے دُعا ختم کی۔ سب نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل آئے۔ میں بھی مولوی علیم سے بنا کسی بات کے باہر آیا اور خیرو کو واپس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ خیرو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''کیا بات ہے بابو۔۔۔ صرف نماج پڑھنے اتنی دُور تک آئے تھے۔۔۔ کیا کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔''

خیرو نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ سچ ہے محبت بھی تو ایک منت کی طرح ہی ہوتی ہے۔ بلکہ محبت سے بڑی منت اور بھلا کوئی دوسری منت کیا ہوگی۔

اس دن کے بعد سے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ مَیں ہر روز صبح فجر اور پھر عشاء کی

نماز کے لیے اسی مسجد میں جاتا جہاں مولوی صاحب جماعت کرواتے تھے۔ بیچ میں ظہر، عصر اور مغرب کا وقت اسٹیشن پر ڈیوٹی کے دوران ہو جاتا تھا لہٰذا یہ نمازیں مجھے اسٹیشن پر ہی ادا کرنی پڑتی تھیں۔

مَیں نماز پڑھنے کو ہمیشہ سے ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنی تنہا نماز کسی کے سامنے پڑھنے سے اس کی حرمت اور اس کی عظمت متاثر ہوتی تھی۔ جیسے کچھ دکھاوے کا پہلو نمایاں ہو رہا ہو شاید اسی لیے اسٹیشن پر کبھی کسی نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

عبداللہ نے بھی مجھے فجر اور عشاء کی نمازوں پر وہاں آتے جاتے دیکھا لیکن وہ بھی ایک عجیب جوانِ رعنا تھا۔ جب بھی مجھ سے ملا، بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ مَیں نے کبھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا رنج، غصہ یا تناؤ نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں یوں اس مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے روزانہ ایک سرد جنگ لڑ رہا ہوں۔ جس کی کڑواہٹ روز بروز مولوی صاحب کے چہرے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

عشاء کے بعد مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے یا حدیث کو لے کر پندرہ منٹ کا ایک درس دیتے تھے جسے سننے کے لیے چند نمازی پیچھے رُک جاتے تھے۔ جن میں اب میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا تھا۔ عبداللہ بھی ضرور اس درس میں شامل ہوتا تھا بلکہ حدیث یا تفسیر کی کتاب طاق پر سے اُٹھا کر لانے اور واپس رکھنے کی ڈیوٹی بھی عبداللہ کی ہی تھی۔

لیکن شائد مولوی صاحب نے بھی یہ طے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ مَیں سلام کرتا تو جواب دیتے اور پھر وہی لاتعلقی ۔۔۔۔ ان جیسے شریف اور وضع دار شخص سے کچھ ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ میری فجر اور نماز عشاء کا یہ سفر جاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی نمازی درس کے دوران کوئی مسئلہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا جس کا مولوی صاحب کبھی تفصیل اور کبھی تخصیر کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ایک نمازی نے مولوی صاحب سے چھ کلمے سنانے کی اور انہیں یاد کروانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس سے پوچھا کہ اسے اس وقت کتنے کلمے زبانی یاد ہیں۔ اُس شخص نے کہا

دو۔ مولوی صاحب نے وہ دو کلمے اس سے سُنے اور پھر تیسرا کلمہ اُسے یاد کروایا۔ میں بھی وہیں بیٹھا دل ہی دل میں وہ تیسرا کلمہ یاد کرتا رہا۔ پھر اسی طرح اگلے دن انہوں نے اسی نمازی سے عشاء کے بعد تین کلمے سُنے اور چوتھا یاد کروایا۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہراتا اور دل ہی دل میں اُسے پکاتا رہا۔ اسی ترتیب سے پانچویں دن پانچواں اور چھٹے دن چھٹا کلمہ انہوں نے اسے ازبر کروادیا۔ ساتویں دن درس کے بعد مولوی صاحب نے خود اس نمازی سے چھ کلمے سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے فٹافٹ چھ کے چھ کلمے سنا دیے۔ مولوی صاحب نے خوش ہو کر اس نمازی کی پیٹھ تھپکی۔ مَیں نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔

''میں نے بھی یہ چھ کلمے یاد کر لیے ہیں جناب۔۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی تصحیح کے لیے ایک مرتبہ سنا دوں۔''

مولوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ عبداللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً ہی چھپا لیا۔ مولوی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ سر ہلا کر اجازت دے دی۔ مَیں نے بھی چھ کے چھ کلمے مولوی صاحب کو سنا دیے۔ ایک آدھ جگہ میں اٹکا تو مولوی صاحب نے ہی تصحیح بھی کر دی، میں نے چھٹا کلمہ ختم کیا تو مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا۔ ''جذاک اللہ۔''

ان کے فوراً بعد عبداللہ کے منہ سے بھی یہی دُعا نکلی۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا جو نمازی بھی مولوی صاحب سے کچھ بتانے یا سکھانے کی فرمائش کرتا میں بھی اپنے آپ ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ سب ازبر کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایمانِ مفصل، ایمان مجمل، دُعائے قنوت، مختلف مسنون دُعائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ مجھے بھی بچپن میں مولوی صاحب ہی کی طرح کے ایک مولانا نے سکھایا تھا۔ جیسے ہر گھر میں مسلمان بچوں کو سکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ آتا ہی تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے جوانی کی حدوں میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دُعائیں بھولتی گئیں اور ان کی جگہ میرے ذہن میں انگلش گانے اور ان کے سنگرز کے نام بھرتے چلے گئے۔ ان چند دنوں میں مجھے پھر سے وہ سب کچھ ازبر ہو گیا تھا جسے میں کئی سالوں سے نہ دُہرانے کی وجہ سے بھلا بیٹھا تھا۔

مولوی صاحب نے بھی اب جیسے میری موجودگی سے اِک سمجھوتہ ہی کرلیا تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ مَیں نے کبھی کسی مقصد کے لیے بھی براہِ راست ان سے بات کرنے کی یا پھر ان کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی جب مولوی صاحب کسی وجہ سے جماعت کروانے کے لیے نہیں آ پاتے تھے تب عبداللہ یہ فریضہ سرانجام دیا کرتا تھا۔ اُس دن البتہ مَیں عبداللہ سے ضرور براہِ راست کوئی سوال کرلیا کرتا تھا۔ جو پچھلے کچھ دنوں سے میرے ذہن میں موجود تو ہوتا لیکن مولوی صاحب کی موجودگی کی وجہ سے زبان پر نہیں آ پاتا تھا۔ عبداللہ بھی بڑے کھلے دل سے میرے سوال سنتا اور بہت تفصیل سے ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں چاہے میری محبت کی وجہ سے ہی سہی پر دھیرے دھیرے مجھ پر میرا مذہب کھلنے لگا تھا۔

عبداللہ نے کبھی اس دوران تنہائی میں بھی مجھ سے کسی ذاتی مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ اس دوران عبداللہ اور مولوی صاحب کی زبانی بہت سی باتیں جو پہلے میری نظر سے اوجھل تھیں مجھے اب ان کی سمجھ آنے لگی تھی۔ خیرو تانگے والے نے تو اَب یہ روز کا معمول بنا لیا تھا کہ وہ فجر اور عشاء کے وقت کوئی اور سواری اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اور میرے اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے ہی وہ ان اوقات پر اپنا تانگہ سب سے آگے بڑھا کر کھڑا میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اُسے مجھ سے میری ''منّت'' کی وجہ سے عقیدت سی ہوگئی تھی اور اس کی بدولت سارے ریلوے اسٹیشن کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ حماد بابو کسی منّت کے سلسلے میں روزانہ کہیں جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان سبھی نے مجھ سے بنا کوئی بات کہے از خود ہی یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ ضرور یہ منّت کسی محبت کے سلسلے کی ہی ہوگی۔ شاید میری عمر ہی ایسی تھی۔ یا شاید محبت خود عاشق کے روم روم سے ٹپکتی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کی چال ڈھال اس کا چہرہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہے کہ دیکھو۔۔۔ یہ جا رہا ہے وہ شخص جس نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے۔ یہی ہے وہ گناہ گار جو سنگسار کیے جانے کا حق دار ہے۔

بہرحال ان دنوں اسٹیشن پر میری اور میری ''منّت'' کی بڑی دھوم تھی۔ صدیقی صاحب بھی کبھی کبھی دفتر چھوڑ کر ڈرائی پورٹ کے گوداموں کی طرف چلے آتے اور مجھے کہیں تنہا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر میرے بال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیتے اور بنا کچھ کہے واپس چلے جاتے۔

عجیب سی شفقت تھی ان کے انداز میں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، کیے جاؤ یہ محبت کا جرم۔۔۔۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں گھبرانا نہیں۔۔۔۔

شاکر سے گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔۔ عبداللہ نے شاید اُسے مسجد میں میری روزانہ کی حاضری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ نہ بولا۔۔۔۔ بس مجھے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ محبت شاید پیدا ہی سب کو رُلانے کے لیے ہوتی ہے۔ واپسی پر نگہت سوجی آنکھوں کے ساتھ برآمدے کی اوٹ سے باہر نکلی اور اُس نے میرے ہاتھ پر کوئی امامِ ضامن باندھ دیا۔ لو جی۔۔۔۔ یہ تو خیرو کی منت والی بات بھی سچ ہی ہو گئی۔ مجھے نگہت سے اُس نازِ ادا کی حالت پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی اس کے آنسو مجھے دیکھ کر تھم نہیں پاتے تھے۔ کچھ پوچھ بیٹھتا تو اسے سنبھالنا واقعی مشکل ہو جاتا۔ امام ضامن باندھ کر اس نے بڑے پیار سے میرے بال سنوارے اور سر پر ہاتھ رکھ کر یوں دُعا دی جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ اس ایک محبت نے مجھے کتنے لوگوں کی نظروں میں معتبر بنا دیا تھا، مجھے اس دن احساس ہوا کہ محبت بیک وقت ہمیں کئی نظروں میں معیوب کر دیتی ہے اور کئی نظروں میں ہمیں محترم بنا دیتی ہے۔ محبت ایک ہی وقت میں زہر اور اسی لمحے میں تریاق کا کام دیتی ہے۔

OO

ٹرم پیپر

جس دن سے مَیں نے "ہالوکاسٹ" پر اپنا تحقیقی پرچہ لکھنے کا اعلان کیا تھا اسی دن سے سر آئزک بھی مجھ سے کچھ کھچے کھچے سے رہنے لگے تھے۔ جوزف سے ملاقات ہوئی تو اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مَیں جانتا تھا کہ تمھیں روکنا بہت مشکل ہوگا۔ میری دُعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔"

ربیکا جانے کلاس میں زیرلب کیا کچھ پڑھتی رہتی اور مجھ پر آتے جاتے پھونکیں مارتی رہتی۔ سارہ البتہ پُرسکون تھی لیکن اس کا گینگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔

اور پھر اس دن وہی ہوا جس کا کامران بہت دنوں سے خدشہ ظاہر کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی جلدی خالی ہوگئی تھی کیونکہ شہر میں کسی جلسے کی وجہ سے آس پاس کی سڑکوں کو بند کر کے متبادل راستوں سے ٹریفک گزارنے کا اعلان کیا گیا تھا۔

انتظامیہ نے اسٹوڈنٹس کی سہولت کے لیے ایک لیکچر پہلے ہی یونیورسٹی کی بسیں چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دن کامران کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ مَیں اور ربیکا مرکزی عمارت سے نکل ہی رہے تھے کہ کہیں سے جم، ڈیوڈ اور ٹینا نمودار ہو گئے۔ جم حسبِ معمول میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا چاہتے ہو۔۔۔۔ میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے تم نے۔"

"مَیں چاہتا ہوں کہ تم اس یونیورسٹی سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اور دوبارہ پلٹ کر اس طرف کا رخ بھی نہ کرنا۔"

"اور اگر مَیں ایسا نہ کروں تو۔۔۔؟"

ڈیوڈ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"تو پھر ہم تمھارا بندوبست کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔"

جم نے میرا گریبان پکڑ لیا، ربیکا زور سے چلائی۔

''ہے جم۔۔۔چھوڑ دو میڈی کو۔۔۔تم وحشی ہو۔''

لیکن جم نے میرا گریبان نہیں چھوڑا۔

''میرا گریبان چھوڑ دو جم۔۔۔۔مجھے مجبور مت کرو کہ میں۔۔۔۔''

اِتنے میں سارہ جانے کس جانب سے دوڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور میری بات اُدھوری رہ گئی۔ سارہ نے آتے ہی ایک جھٹکے سے میرا گریبان جم کے ہاتھوں سے چھڑوا دیا اور چلا کر بولی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے جم تم گلی کے غنڈوں جیسا برتاؤ کرو گے۔۔۔تم سے یہ توقع نہیں تھی مجھے۔''

جم سارہ کو دیکھ کر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں ربیکا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ مجھے آوازیں دیتی ہوئی پیچھے چلی آئی۔

''جم کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔''

میں نے غور سے سارہ کی طرف دیکھا۔

''شاید وہ سچ کو برداشت نہیں کر پا رہا۔ سچ کو ہضم کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔'' میں سارہ کو یونہی گم صم کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ربیکا نے راستے بھر جم کو دل کھول کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ میں ہائڈ پارک کے علاقے میں واقع اس کے اپارٹمنٹ تک اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ پکاڈلی کی مرکزی سڑک سے دائیں مڑتے ہی وہ بچوں کی طرح چلانے لگی۔ سڑک کے کنارے ایک کینڈی فلاس بیچنے والا جوکروں کے لباس میں کلاؤن بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے بچوں کو مختلف اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے ہنسا رہا تھا اور انہیں لچھوں والی مٹھائی خریدنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہاں۔۔۔۔بچپن میں ہم اسے لچھوں والی مٹھائی ہی تو کہتے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر گلیوں میں ایک بوڑھا سا بابا شیشے کے بڑے سے مرتبان میں بہت سی روئی کے گالوں جیسی سفید اور گلابی مٹھائی کے گولے لے کر آتا اور اُن کو پھر ایک موٹے سے تنکے کے گرد خوب اچھی طرح گھما کر لپیٹ کر ہمیں بہت سے گولے تھما دیتا۔ یہاں پر انہی روئی کے گولوں کو کینڈی فلاس کہا جاتا تھا۔

ربیکا کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر مجھے بھی گاڑی سڑک کے کنارے لگانی پڑی۔ وہ جلدی سے اُچھل کر گاڑی سے اُتر کر بھاگ کر کلاؤن کے پاس پہنچ گئی اور پھر وہاں روئی کے دو بہت بڑے سے پیلے اور گلابی گولے بنوا کر مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ واقعی اس لڑکی کو ایک کروٹ بھی چین نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے بھی نیچے اُترنا پڑا۔ پھر ہم بہت دیر تک وہیں سڑک کنارے پتھر کی لمبی سی سِل پر بیٹھے کلاؤن کی بکری کرواتے رہے۔ ہمارا بچپن بڑھاپے تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اندر کہیں دبک کر بیٹھا رہتا ہے اور موقع ملتے ہی چھم سے باہر نکل آتا ہے۔ ہمیں جیبوں میں کینچے اور اخروٹ بھرنے پر اکساتا ہے۔ تنہا سڑک پر زور سے سیٹی مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ راہ چلتے ٹھیلے والے سے برف کے گولے پر شربت ڈلوا کر مزے سے چوسنے پر مائل کرتا ہے۔ کھٹی میٹھی گولیاں اور چورن گھر والوں سے چھپ کر منہ میں بھرنے پر شاباش دیتا ہے۔ وہی بچپن آج ربیکا کے اندر سے بھی چھلک رہا تھا۔ اور اس لڑکی کے بہانے مَیں نے چند پل اپنے بچپن کے پھر سے پا لیے۔

لیکن اس وقت ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ کل کا سورج کیا لے کر آنے والا ہے۔ اگلے دن یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ میری اور جم کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ہمارا جرم تھا یونیورسٹی کے ماحول اور ڈسپلن کو خراب کرنا اور اس ایکسپلینیشن (Explanation) کال کا جواب ہمیں آج زبانی اور تین دن کے اندر تحریری طور پر جمع کروانا تھا۔ ربیکا اس بات پر بے حد سیخ پا تھی۔ ''یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ساری یونیورسٹی جانتی ہے کہ سارا قصور جم کا تھا۔ اُسی نے تمھارا راستہ روکا تھا اور تم نے تو جواب میں اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ مَیں خود سر آئزک سے بات کروں گی ۔۔۔۔ مَیں دیکھتی ہوں تمھارے خلاف کوئی کیسے ایکشن لیتا ہے۔''

وہ اپنے آپ ہی شدید غصے میں بڑبڑائے جا رہی تھی اور جانے کب سے لان میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ جیسے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر اپنا غصہ نکال رہی ہو۔ مجھے اس کے اس ناراض سے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''تم بیٹھ کر بھی اپنا غصہ نکال سکتی ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اُس نے مجھے بھی غصے سے دیکھا اور اپنی چہل قدمی اور بڑبڑاہٹ ویسے ہی جاری

رکھی۔

''مجھے سارہ سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو خود اس تمام واقعے کی چشم دید گواہ ہے۔ آخر اس نے سر آئزک کو کیوں نہیں بتایا کہ تم بالکل بے قصور ہو۔''

اتنے میں اسپیکر پر میرا اور جم کا نام پکارا جانے لگا کہ ہم پانچ منٹ کے اندر یونیورسٹی کے ڈین یعنی سر آئزک کے کمرے میں کمیٹی کے سامنے پیش ہو جائیں۔ مَیں نے اُٹھ کر ربیکا کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا دیا۔

''یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ، میں ابھی اپنا بیان ریکارڈ کروا کر آتا ہوں۔ اور جب تک مَیں واپس نہ آؤں تم بالکل بھی پریشانی میں چہل قدمی نہیں کرو گی۔ سمجھ گئیں۔۔۔۔ ربیکا چُپ چاپ بیٹھ تو گئی لیکن اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ مَیں اُس نازک دل لڑکی کا سر سہلا کر اور اس کے بال بکھرا کر وہاں سے ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں جم مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میز کی دوسری جانب سر آئزک اور تین کمیٹی کے انتظامی ممبران بھی موجود تھے۔ مجھے الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں ایک ہی الزام تھا کہ میں نے جم کے ساتھ گذشتہ روز ہاتھا پائی کی اور یونیورسٹی کے ڈسپلن اور وقار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے گالی گلوچ وغیرہ کی، جو کہ یونیورسٹی کے قاعدے اور قانون کے لحاظ سے بے حد سنگین جرم تھا۔ سر آئزک میری طرف متوجہ ہوئے۔

''جی مسٹر حماد۔۔۔۔ آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔''

''مَیں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ مَیں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے یونیورسٹی کا کوئی بھی قانون ٹوٹتا ہو۔ میرا راستہ جم نے روکا تھا لیکن بات وہیں ختم ہو گئی تھی۔''

''لیکن جم کے بیان کے مطابق تم اس پر حملہ آور ہوئے تھے اور بات بہت آگے تک بڑھ چکی تھی۔''

مجھے جم کے بیان پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، مَیں نے سکون سے جواب دیا۔

''میرا بیان اب بھی یہی ہے کہ بات معمولی سی تھی اور اسی لمحے ختم ہو گئی تھی۔ اگر انتظامیہ چاہے تو اپنے طور پر بھی اس واقعے کی تحقیق کروا سکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اچھے

خاصے اسٹوڈنٹس وہاں موجود تھے جنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا واقعہ ہوتے دیکھا ہے۔ انہی میں ایک نام مس سارہ آئزک کا بھی ہے جو خود اس واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔''

سارہ کے نام پر سر آئزک نے چونک کر میری طرف دیکھا جسے انہیں میری زبان سے سارہ کا نام بطور گواہ سننے کی اُمید بالکل ہی نہ ہو۔ یہی حال باہر ربیکا کا ہوا جب مَیں نے اُسے کمرے سے نکل کر بتایا کہ مَیں نے بطور گواہ سارہ کا نام انکوائری کمیٹی کو دے دیا ہے۔ سارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اُف میڈی۔۔۔۔ یہ کیا غضب کر دیا تم نے۔۔۔۔ اَب تمھیں یونیورسٹی سے ریسٹی گیٹ Restigate ہونے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی نہیں۔

OO

پھر وہی نظر

مَیں اُسی باقاعدگی سے مولوی علیم کی مسجد میں دن کی دو نمازیں پڑھنے جا رہا تھا۔ اس دوران ایک اور واقعہ درپیش آ گیا۔ کوئٹہ سے کراچی کے لیے سہ پہر چار بجے تک قریب بولان میل نامی ایک گاڑی روزانہ نکلتی ہے۔ جس کا کوئٹہ سے نکلنے کے بعد تیسرا اسٹیشن مچھ نامی شہر پڑتا ہے۔ شہر کیا ہے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی وجۂ شہرت یہاں انگریز سرکار کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی جیل ہے جو "مچھ جیل" کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جزائر انڈیمان کے کالا پانی جیل کی جو شہرت تھی وہی اس مچھ جیل کی بھی تھی۔ اس قصبے کے درمیانے طبقے کے لوگ صبح کراچی سے آتی ہوئی اسی بولان میل کی پہلی گاڑی سے کوئٹہ آ جاتے تھے جو صبح آٹھ بجے کے قریب کراچی سے مچھ پہنچتی تھی۔ دن بھر اپنے کام نپٹا کر وہ شام کو اسی میل کی ڈاؤن ایکسپریس سے چار بجے دوبارہ مچھ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جو انہیں ڈیڑھ گھنٹے میں مچھ پہنچا دیتی تھی۔

اس دن صدیقی صاحب کے کوئی دوست جوان دنوں مچھ ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے اپنے گھر والوں کے ساتھ صدیقی صاحب کی دعوت پر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ شام کی گاڑی سے واپس مچھ جا رہے تھے۔ بیوی بچوں نے شاید کوئٹہ کے بازاروں سے سبھی چیزوں کا ایک آدھ نمونہ ضرور خریدا تھا تبھی ان کے ساتھ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے کا وقت تھا لہٰذا صدیقی صاحب اِدھر اُدھر سے قلیوں کو بلوا کر جلدی جلدی ان کا سامان گاڑی کی بوگی میں رکھوا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا تو میں بھی مدد کے لیے چلا آیا۔ غفورے کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اس سے اور ایک دوسرے بوڑھے قلی سے سوٹ کیس کے لیے اور گاڑی کی طرف پلٹا، نظر اُٹھائی تو عبداللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ عبداللہ مجھے یوں قلیوں کے لباس میں سوٹ کیسوں اور بکسوں کے بوجھ تلے لدا پھندا دیکھ کر

چند لمحے کے لیے گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ مَیں نے مسکرا کر اُس سے پوچھا کیوں عبداللہ میاں ۔۔۔! قلی چاہیے تو بولو۔ لیکن مزدوری۔۔۔۔'' ۔اچانک جیسے میری زبان پر کسی نے کوئی جلتا ہوا کوئلہ رکھ چھوڑا ہو۔ عبداللہ کے بالکل پیچھے کچھ فاصلے پر کالے برقعے میں ملبوس وہ کھڑی تھی۔۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔۔ وہ وہی تھی ۔۔۔ میں اس کی اُن قاتل نگاہوں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ اس کے پیچھے حیا اور ایک بوڑھی سی خاتون بھی تھیں جو سفید شٹل کاک برقعے میں ملبوس تھیں۔ شائد وہ ایمان کی اماں ہی تھیں اور یہ سب لوگ عبداللہ کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ تبھی مجھے پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیے۔ میرے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس گرتے گرتے بچے۔ مَیں نے سامان نیچے رکھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن مَیں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں، پتہ نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ میں نے جتنی مرتبہ بھی ایمان کو اپنے روبرو پایا تھا، مَیں اپنا آپ کھو بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے بعد ہمیشہ خود پر بے حد غصہ آتا تھا اور مَیں حسرت سے سوچتا تھا کہ جتنی گھڑیاں بھی وہ میرے سامنے موجود رہی تھی، مَیں نے اِک اِک پل بنا، کوئی لمحہ ضائع کیے اسے دیکھا کیوں نہیں۔۔۔۔؟ کیوں میری نظر ایک رتی بھر پل کے لیے بھی ادھر ادھر ہوئی۔۔۔۔؟ کیوں اس وقت میں کسی اور بات میں اُلجھا رہا۔۔۔؟ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی میری ہو رہی تھی۔ جانے عبداللہ نے کیا کہا؟ جانے مَیں نے اُسے کیا جواب دیا؟ غفورے اور دوسرے قلیوں نے دیکھا کہ مَیں اپنے کسی جاننے والے سے بات کر رہا ہوں تو وہ خود ہی میرے آس پاس بکھرا صدیقی صاحب کے مہمانوں کا سامان اُٹھا کر چل دیے۔ حیا ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے بزرگ خاتون کو بھی میرے بارے میں کچھ بتایا۔ ایمان حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ پر مَیں نے محسوس کیا کہ جس پل اس کی بے خبری میں پہلی بار یہاں پلیٹ فارم پر مجھ سے نظر چار ہوئی تھی، تب سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ مَیں نے عبداللہ کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے تا کہ ان کی ان کے ڈبے تک رہنمائی کر سکوں۔ سامان لینے کی کوشش کی لیکن عبداللہ نے سامان کو مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

ان کا ڈبا بس دو بوگیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ عبداللہ عورتوں کو اندر بٹھا کر خود باہر میرے پاس

آ گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ شاید ہم دونوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ دفعتاً عبداللہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کی بھیگی پلکیں محسوس کرتے ہی مَیں نے تڑپ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور اُسے کندھے پر تھپکی دی۔ کبھی کبھی واقعی لفظ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں دوسرا سہارا آنکھیں ہوتی ہیں جو ہمارے جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتی ہیں۔ پر اگر اس لمحے آنکھیں بھی چھلک رہی ہوں تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو کبھی ہاتھ پکڑ کر، کبھی کمر سہلا کر، کبھی تھپکی دے کر اور کبھی دوسرے کو گلے لگا کر اُسے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے حال میں شریک ہیں۔ مَیں بھی اس وقت عبداللہ تک بس یہی ہاتھوں کی بولی ہی پہنچا سکا۔ مَیں نے اس لمحے محسوس کیا کہ حیا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں جنھیں اس نے فوراً برقعے کا پلو گرا کر چھپا لیا۔ حیا اور ایمان کھڑکی کے قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے جاتے جاتے بتایا کہ وہ لوگ بھی ''مچھ'' ہی جا رہے ہیں۔ جہاں مولوی صاحب کی بہن رہتی تھیں، شاید کسی تقریب کے سلسلے میں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری ایمان سے ان دو تین ٹوٹی پھوٹی ملاقاتوں کے علاوہ آج تک کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا لیکن پتہ نہیں اس کے کوئٹہ سے باہر جانے کی خبر سن کر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی ہمیشہ کے لیے سنسان ہونے والا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ ٹرین مجھ سے میرا دل، میرا سب کچھ چھین کر لے جانے والی ہے۔ ایک دم ہی سے جانے کتنی بے چینیاں میرے رگ و پے میں تیرنے سی لگی تھیں۔ ٹرین دو بار وسل دے چکی تھی، عبداللہ نے مجھے گلے لگایا اور پلٹ کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے بوگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میری نظر بے اختیار ڈبے میں بیٹھی ایمان کی طرف اُٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے جیسے یہ ٹرین، یہ پلیٹ فارم، یہ آس پاس کے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے لوگ، یہ شور، یہ زمین، یہ آسمان۔۔۔ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایمان اور اس کی دو آنکھیں اس کائنات میں باقی رہ گئیں۔۔۔۔ لیکن میری اس بدحواسی کی صرف اتنی ہی وجہ نہیں تھی۔ ایمان میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، جی ہاں۔۔۔ میری طرف۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے مجھ پر کوئی دوسری نظر ڈالی تھی۔ دوسری نظر، اور وہ بھی اپنی مرضی سے، جیسے ہی میری اس سے نظر ملی۔ اک ثانیے کو اس کی آنکھوں میں نمی کی

ایک چمک سی لہرائی۔ اور پھر اُس نے گھبرا کر نظر جھکالی۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہوگیا ہے۔ اب میری سانسیں تھم جانی چاہئیں، مزید زندگی بے کار ہے۔

مجھے اپنے نصیب پر اتنا رشک پہلے کبھی نہیں آیا۔ جتنا اس لمحے آیا تھا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ ٹی ٹی نے تیسری اور آخری سیٹی بجائی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ عبداللہ بھی آ کر دوسری جانب اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ عبداللہ کو الوداع کہنے کے لیے اوپر اُٹھ گیا۔ عبداللہ نے بھی ہاتھ ہلایا، میں اضطراری طور پر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے کوئی بچہ اپنے کسی عزیز از جان کھلونے کو کسی اور کے ہاتھوں میں سونپ تو دے پر جب وہ جانے لگتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی اور ساتھ ہی میرے قدموں کی بھی ۔۔۔۔ جانے مجھے کس چیز کی آس تھی، کون سی تمنا میرے دل کو اس وقت چیر رہی تھی، کاٹ رہی تھی۔ میری نظریں مستقل اندر بیٹھی سر جھکائے، کانپتی ہوئی ایمان پر تھیں ۔۔۔۔ پلیٹ فارم کا آخری کنارہ قریب آتا جارہا تھا۔ جانے میرے قدم راستے میں پڑی چیزوں اور سامان سے کتنی ٹھوکریں کھا چکے تھے، لیکن تب بھی میں لڑکھڑاتے ہوئے زخمی قدموں سے ٹرین کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ شاید غفورے نے کچھ چلا کر کہا تھا۔ شاید کچھ قلی میری طرف بڑھے بھی تھے تاکہ مجھے روک سکیں تاکہ میں پلیٹ فارم کے سرے سے گر کر ٹرین کے نیچے ہی نہ آ جاؤں۔ پر مجھے اس لمحے ہوش ہی کہاں تھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ایمان میری نظروں سے اُوجھل ہوئی تو پھر شاید میں اُسے دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ میں نظریں اندر ڈبے میں گاڑھے ہی آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے قدرت کو میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ میری بے چارگی میری لاچاری نے عرش پر جتنے ماتھے ٹیکے تھے، شاید آسمان پر وہ سارے سجدے قبول ہوگئے تھے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے سر اُٹھایا اور باہر مجھ پر نظر ڈالی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی ایک نظر میں جانے کتنے سوال، کتنی التجائیں اور کتنی بے بسی تھی۔ دوسرے لمحے ہی ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ مجھے جانے کس کے بازوؤں نے تھام لیا۔ میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا۔ بس ٹرین کے تیز پہیوں کی گڑگڑاہٹ میری سماعتوں کو چیر رہی تھی۔ آنسوؤں سے میرا چہرہ دھل رہا تھا۔ میں وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا دور جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا۔

میرے آس پاس میرے ساتھی قلی، غفورا، صدیقی صاحب اور جانے کون کون مجھے تسلی دینے کے لیے تھپک رہا تھا۔ سہلا رہا تھا، اپنے ساتھ بھینچ رہا تھا، گلے لگا رہا تھا لیکن مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ دنیا میرے لیے فنا ہو چکی تھی۔

جانے ایمان کی نظر میں کیا تھا؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ شاید یہی کہ میں یہ پاگل پن اور یہ دیوانگی چھوڑ دوں، کہیں نہ کہیں تو میرے سینے کی یہ آگ اور میرے سینے سے اٹھتا یہ دھواں اس کا اُجلا دامن بھی تو میلا کر رہا تھا۔ ہاں شاید یہی بات تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ بے بسی کیسی تھی۔۔۔۔؟ یہ سوال کیسے تھے۔۔۔۔؟ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس پٹری پر چلتا جاؤں، چلتا جاؤں۔۔۔۔ وہاں تک، جہاں وہ ٹرین ایمان کو لے کر گئی تھی۔ اُسے جا کر اس انجانے قصبے میں سے کہیں ڈھونڈ نکالوں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میں اس نازنین سے پوچھوں کہ اُس کی آنکھوں میں وہ کیا سوال تھا؟ وہ ایک بار پوچھ کر تو دیکھتی۔۔۔ میں اپنی روح کا آخری دھاگا کھینچ کر بھی اس کے سوال کا جواب ڈھونڈ ہی لاتا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اسٹیشن دھیرے دھیرے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جلائے جانے والے لکڑی کے ٹکڑوں اور دیگر بے کار اشیاء کے جلتے الاؤ کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ آگ میں لکڑی کے تختے چیخ رہے تھے۔ غفورے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"بابو۔۔۔۔ تیرے اندر تو بڑی آگ ہے۔۔۔۔ سب ہی کچھ اندر رکھے گا تو اندر ہی اندر جھلس جائے گا۔ ارے غفورا تو سمجھتا تھا کہ آج تک صرف اُسی نے عشق کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اپنے کو تو عشق کے عین کا بھی نہیں پتہ۔۔۔۔ کہاں سے لایا ہے اتنا لاوا۔۔۔۔ اتنی نار۔۔۔۔ ایک جھلک نے ہی سارا اسٹیشن جلا کر راکھ کر دیا۔ ایسے نہ کر بابو۔۔۔۔ ہم غریبوں پر کچھ رحم کھا۔۔۔۔ بتا دے تُو کون ہے؟۔۔۔۔ کیوں ہم گناہ گاروں سے اور گناہ کروا رہا ہے۔۔۔۔ تُو تو کسی سلطنت کا شہزادہ ہے، ان مزدوروں میں کیا کر رہا ہے۔۔۔۔؟"

میرے پاس غفورے کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا بتاتا میں اُسے؟ میں کچھ نہ بولا بس اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی بولی نے اُسے جانے کیا پیغام دیا کہ پھر اس نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس چپ چاپ بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ جلتی آگ چیختی رہی

اور ہم دونوں کے چہروں کو سنہری اُجالے سے روشن کرتی رہی۔

نہ جانے کیوں اس دن کے بعد سے مَیں جب بھی اسٹیشن کے کسی بھی حصے یا پلیٹ فارم سے گزرتا تو آس پاس کام کرتے میرے ساتھی، اسٹیشن کا عملہ، میرے افسر سبھی رک کر مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احترام در آتا تھا۔ جیسے مجھے اس عشق کی ایک واردات نے ان سب کی نظروں میں بہت محترم کر دیا ہو۔ حالانکہ مَیں خود اپنی اس دن کی بے خودی پر بے حد شرمندہ تھا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر مشکل کس قدر شرمندگی ہوئی تھی یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

مَیں لگاتار روزانہ کراچی سے آنے والی ایکسپریس اور دیگر گاڑیاں ضرور چیک کرتا تھا کہ شاید ایمان واپس آ گئی ہو۔ لیکن ہر روز مجھے مایوسی ہی ہوتی تھی۔ دو دن گزر گئے پھر تین پھر چار۔۔۔۔

میری فجر اور عشاء کی "منت" والی نمازوں میں بھی بے قاعدگی ہونے لگی تھی۔ بس ہر لمحہ ذہن و دل پر وہ دو آنکھیں ہی سوار رہتی تھیں۔ مجھے ہر وقت بخار سا رہنے لگا تھا۔ غفورا ایک بار اصرار کر کے کسی ڈاکٹر کو کہیں سے پکڑ لایا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بیماری پوچھی تو غفورے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "عشق کا بخار ہے ڈاکٹر صاحب۔"

اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی ہنس پڑا۔ واقعی شاید یہ محبت کا ہی بخار تھا۔ یہ جذبے بھی کس قدر طاقت ور ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر گھس کر، خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر ہماری نسوں سے، ہماری رگوں سے چھیڑ چھاڑ تک کر سکتے ہیں۔ ہمارے پورے جسم کا نظام بگاڑ سکتے ہیں، اُلٹ پلٹ کر سکتے ہیں۔ اب بھلا ایسی کسی بیماری کو وہ بے چارہ ڈاکٹر کیا پکڑ پاتا۔

اس رات بھی مجھے شدید بخار تھا، لیکن مَیں نے خیرو کو تانگہ لگانے کا کہا اُس نے میری طبیعت کے پیشِ نظر کچھ لیت و لعل سے کام لیا تو مَیں دوسرے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ مجبوراً خیرو کو ہی اپنا تانگہ آگے بڑھانا پڑا۔ مَیں مسجد کے قریب پہنچ کر اُتر گیا۔ راستے میں خیرو نے اپنی بڑی سی پشاوری شال مجھے زبردستی اوڑھا دی تھی۔ مَیں اندر جا کر ایک کونے میں چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ مولوی علیم حسب معمول اپنے وقت پر پہنچے اور نماز پڑھوائی۔ نماز کے بعد

حسب معمول درس اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی نظر لمحہ بھر کو پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے مجھ پر پڑی اور پھر وہ سوال کرنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان نے پوچھا۔

''مولوی صاحب۔۔۔ یہ بتایئے کہ ہمارے مذہب میں محبت کی شادی کی گنجائش ہے یا نہیں۔''

بے اختیار میری نظر مولوی صاحب کی جانب اُٹھ گئی لیکن انہوں نے مجھے دیکھے بنا اس نوجوان کو جواب دیا۔

''محبت شادی کے بعد میاں بیوی میں ہو تو بھی جائز ہے۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی محبت جائز نہیں ہے۔'' نوجوان کی تسلی نہیں ہوئی۔

''لیکن مولوی صاحب ہمارے مذہب میں لڑکی سے سوال کرنے کی گنجائش تو ہے نا۔ مَیں نے تو سُنا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب لڑکی اور لڑکے کی پسندیدگی ضروری ہے۔''

''مولوی صاحب نے سختی سے کہا۔''

''ہاں اگر ضرورت پڑے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں وہی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں جو والدین کی مرضی سے طے پا جائیں۔ اتنا بڑا فیصلہ ایک کمزور، ناسمجھ اور نا عمر لڑکی پر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ دُنیا کے کوئی ماں باپ جان بوجھ کر اپنی معصوم بیٹی کو کس غلط شخص کے ساتھ کیوں باندھنا چاہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یہ فیصلہ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔''

مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے جواب دے دیا تھا نوجوان تو شاید مطمئن ہو ہی گیا ہو لیکن جانے اس ایک پل میں مجھے کیا ہُوا۔ مَیں کئی ہفتوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس عرصے میں کبھی مَیں نے مولوی صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اس روز نہ جانے میں کیوں بول پڑا۔ مولوی صاحب محفل سمیٹ کر اٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ میری آواز سن کر سبھی چونک کر رُک گئے۔

''مولوی صاحب کسی بھی لڑکی کے لیے اس کے ماں باپ کو رشتہ طے کرتے وقت

لڑکے میں کن شرعی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

کچھ دیر کے لیے مولوی صاحب چُپ سے رہ گئے۔ لیکن باقی نمازیوں کی وجہ سے انہیں جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"تمام شرعی باتوں کا، مذہب، کلمہ، نماز، روزہ، حسب نسب سبھی کچھ۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مولوی صاحب کہ رشتہ مانگتے وقت کوئی اتنا ہی مذہبی ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہو جتنا لڑکی کے گھر والے اس سے توقع کرتے ہوں۔"

"ایسی صورت میں یہ دھوکا ہوگا۔۔۔۔ اور دھوکے کا عذاب اس شخص کو بھگتنا ہوگا۔"

"مَیں پانچ وقت کا نمازی ہوں مولوی صاحب۔۔۔۔ چھ کلمے بھی مجھے یاد ہیں اور مذہب جو شرائط لگاتا ہے کسی مسلمان لڑکی سے شادی کے لیے مَیں ان سب پر پورا اُترتا ہوں۔ دُعا کریں کہ مَیں جس گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو جائے۔"

میری بات سُن کر آس پاس بیٹھے نمازی زیرِ لب مسکرا دیے۔ مولوی صاحب نے بادلِ نخواستہ ہی سہی، پر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ دُعا ختم ہوئی اور لوگ اُٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ مَیں اور مولوی صاحب پیچھے تنہا رہ گئے، انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"مَیں جانتا تھا کہ تم یہ سب کچھ بس دکھاوے کے طور پر کر رہے ہو، تمھارا اصل مقصد کچھ اور ہے اور آخر کار آج تمھارے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔"

"آپ کون ہوتے ہیں کسی کی عبادت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے والے۔ یہ تو بندے کا اپنے خدا کے ساتھ براہِ راست معاملہ ہوتا ہے۔ آپ یا مَیں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ دکھاوا ہے؟ اور آپ کو تو دوسروں کے دکھاوے کو بھی سچ مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کون جانے یہی دکھاوا کسی کو کسی دن سیدھی اور سچی راہ پر لا کھڑا کر دے۔"

مولوی صاحب کچھ لاجواب سے ہو گئے۔ انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

"تم چاہتے کیا ہو، آخر اس طرح سے بار بار میرے سامنے آنے کا تمھارا کیا مقصد ہے۔"

"آپ میرا مقصد جانتے ہیں، آپ نے اس دن مجھے میری لادینی کا احساس دلایا تھا۔ حالانکہ اس کم مذہبی میں بھی میرا اپنا سارا قصور نہیں تھا۔ مجھے بچپن کے بعد کسی نے ان

باتوں کا احساس ہی نہیں دلایا۔ بہر حال ۔۔۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لیکن اب میں آپ کی مذہب کی لگائی ہُوئی شرط پر بھی بہت حد تک پورا اُترتا ہوں۔ اگر کچھ کمی رہ گئی ہے تو مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں اُسے بھی پورا کر دوں گا۔"

مولوی صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔

"میاں تمھاری سمجھ میں جانے یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہمارا اور تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔ مَیں اپنی بیٹی کو اس گھر میں بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درخواست مَیں اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔"

مولوی صاحب کی آواز بھرا سی گئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"کیوں میری برسوں کی کمائی ہُوئی عزت کے درپے ہو۔ جب تمھیں اس مسجد میں یا اپنے محلے کے آس پاس بھی دیکھتا ہوں تو ساری ساری رات فکر سے مجھے نیند نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان اگر چل پڑے تو پھر اُسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ میری بچیوں پر اگر کوئی تہمت لگ گئی تو ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔ ہماری غریبی پر کچھ رحم کرو۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے اور اس سے بھی چھوٹا ہمارا محلہ ہے۔ یہاں بات پھیلتے دیر نہیں لگتی۔ پہلے ہی تمھارے گھر کے نوکروں نے اس دن طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی تھیں ۔۔۔۔ وہ تو بھلا ہو شاکر کا۔ جس نے ان کی زبان وہیں روک دی۔ ورنہ تمھاری ماں اور بھابھی نے مجھے سولی پر لٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جو ہُوا سو ہوا۔ لیکن میری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے۔"

"آپ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ مَیں کبھی ان جانے میں بھی آپ کی کسی بھی طرح کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہوں۔"

"تو پھر میں تم سے دوبارہ یہی التجا کرتا ہوں کہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ میں۔"

مولوی علیم کی آواز آنسوؤں کی لرزش سے لحہ بھر کو کانپی اور ایک پل ہی میں وہ میرے

گھٹنوں کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور روتے ہوئے انہوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

مَیں چند لمحے کے لیے تو سُن ہو کر ہی رہ گیا۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔ مَیں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ مولوی علیم کی اب باقاعدہ رو رو کر ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے مزید گناہ گار اور شرمندہ نہ کریں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ مَیں تو۔۔۔۔''

ان کی حالت دیکھ کر جیسے میں اپنے لفظ ہی کھو بیٹھا تھا۔ میری بات کاٹ کر بولے۔

''تو پھر میری بات مان لو۔ تمھارا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ تمھارے گھر والے اور ہمارا معاشرہ اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ وہ زمین کی خاک ہے، اور تم آسمان ہو۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے کمشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے اور وہ جہاں کہیں سے بھی گزرے گی ایک غریب مولوی کی بیٹی ہی کہلائے گی۔ لوگ اس ملن کو عجیب عجیب طرح کے نام دیں گے۔ کل تک وہ الزام صرف تمھارے گھر والوں کی زبان پر تھے، تب ساری دُنیا پیٹھ پیچھے یہی باتیں کرے گی۔ مَیں ایک پیش امام ہوں، لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ سوچو کل جب یہی لوگ میری پیٹھ پیچھے میرے گھر کی عزت اور ناموس پر انگلیاں اُٹھائیں گے تو مَیں کیسے جی پاؤں گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ مَیں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالوں۔''

بس۔۔۔۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے مولوی صاحب کے ہاتھوں کو زور سے دبایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب اب بھی ان کی سفید داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ مَیں کچھ اس طرح سے مسجد سے نکلا کہ جیسے کوئی جواری جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہو۔ یکا یک آخری بازی بھی ہار دے۔ جانے میں کس طرح تانگے تک پہنچا۔ خیرو میری حالت دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''اوئے خانہ خراب۔۔۔۔ بابو تیرا بخار تو شدید تیز ہو گیا ہے۔''

خیرو نے جلدی سے مجھے تانگے کی پچھلی سیٹ پر آڑھا ترچھا لٹایا اور اُس نے تانگہ سڑک پر ڈال دیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی کی سی اک کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے خود پر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے مولوی صاحب سے اس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے مَیں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آخری اُمید کا بھی خون کر دیا ہے۔

انسان بھی کتنا بے صبرا ہے۔ جب تک اُمید کا دامن ہاتھ میں ہو، تب تک وہ اپنے زخم کریدنے سے باز نہیں آتا۔ ہر بار اس اُمید میں زخموں کا کھرنڈ پکنے سے پہلے ہی دوبارہ کھرچ دیتا ہے۔ اور جب زخم اس بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے پک کر ناسور بن جاتا ہے تب وہی انسان بیٹھ کر ساری زندگی خود کو کوستا رہتا ہے۔

اُس وقت مولوی صاحب کی جو حالت ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہوئے وہاں سے میرا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ اس وقت مولوی صاحب کسی بھی قسم کی توجیہہ سننے کے قابل نہیں تھے۔ انہوں نے ٹوٹ کر اپنی انا کا خول بھی اپنے آپ ہی پاش پاش کر دیا تھا۔ کاش وہ اس دن بھی اپنے اُسی آپے میں ہی رہتے، مجھے ڈانٹتے، بُرا بھلا کہتے، دھتکار دیتے، دھکے دے کر مسجد سے نکال دیتے، پر وہ نہ کرتے جو انہوں نے کیا تھا۔ اَب مَیں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟ رہے لیے تو جیسے ہر دَر ہی بند کر دیا تھا انہوں نے۔

جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے وسوسے پلتے رہے۔ خالی سنسان سڑک پر تانگہ سُستی سے ٹک ٹک کی آوازیں نکالتا اسٹیشن کی جانب رواں تھا۔ سڑک کے کنارے لگی پیلی بجی بتیوں کے دائرے روڈ پر وقفے وقفے سے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ذہن بھی ان دائروں کی روشنی کے بیچ میں سڑک کے اندھیرے حصے کی طرح کبھی ڈوب جاتا اور کبھی روشن ہو جاتا۔ اسٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی مَیں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور میرا ذہن مکمل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔

OO

جیوری کا فیصلہ

مَیں نہیں جانتا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے بلایا یا نہیں، لیکن تین دن کے اندر انکوائری کمیٹی نے اپنا فیصلہ نوٹس بورڈ پر چپکا دیا۔ مجھے اور جم (Jim) دونوں کو ایک ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک سمسٹر کا مطلب چھ مہینے کا تھا۔ البتہ ہمیں موقع دیا گیا تھا کہ ہم اس فیصلے کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ سے اپیل کر سکتے تھے۔ لیکن تین دن کے اندر اس کے بعد ہم یہ حق بھی کھو دیتے۔

اس دوران میرا اور جم کا ایک آدھ بار یونیورسٹی کیمپس میں سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ جم جیسے لڑکوں کے لیے چھ مہینے کی معطلی صرف ایک پکنک تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طریقے سے مجھے یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ مجھے تو اب یونیورسٹی انتظامیہ بھی اُس کی سازش میں برابر کی شریک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گورے ہر کام بہت سوچ سمجھ کر اور طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کا قانون اس قدر سخت ہے کہ مجھے بغیر کسی انکوائری کے یونیورسٹی سے نکال دینے میں انہیں اس بات کا خدشہ ہوگا کہ مَیں کہیں عدالت کا دروازہ نہ کھٹکھٹا دوں۔ اس لیے انہوں نے پکا انتظام کیا تھا اور اپنی ایمان داری اور انصاف ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے جم کو بھی قربانی دینے پر تیار کر لیا تھا۔

پوری یونیورسٹی میں میرے واحد غمگسار صرف جوزف اور ربیکا تھے۔ ربیکا کے تو آنسو ہی نہیں رک پا رہے تھے۔ میں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ ابھی حتمی فیصلہ ہونا باقی ہے لیکن وہ ربیکا ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

آج یونیورسٹی میں اپیل داخل کروانے کا آخری دن تھا، ورنہ کل سے مجھے یہ کیمپس چھوڑ دینا تھا۔ مَیں سیدھا ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمیٹی کے چاروں ارکان

موجود تھے۔ سر آئزک نے دوبارہ مجھے تمام روداد پڑھ کر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی انتظامیہ میرے تحریری جواب سے مطمئن نہیں ہو پائی لہٰذا میرے ایک سمسٹر کے لیے معطلی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا ہے۔ مَیں نے براہِ راست سر آئزک کی آنکھوں میں دیکھا لیکن وہ نظر چُرا گئے، میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آج ہفتے کا دن ہے۔۔۔۔اور مَیں جانتا ہوں کہ چیئرمین انکوائری کمیٹی مسٹر آئزک کے لیے یہ کس قدر مقدس دن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ آج کے دن کوئی جانبدارانہ فیصلہ نہیں کریں گے۔''

ہفتہ یہودیوں کے لیے ویسا ہی مقدس دن ہوتا ہے، جیسا ہمارے لیے جمعہ، مسٹر آئزک میرے اس طنز کو سمجھ گئے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جیوری نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے مزید اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہنا۔ مَیں نے انکار میں سر ہلایا۔ جیوری نے فیصلے پر دستخط کے لیے اپنے اپنے قلم اُٹھا لیے۔

پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور سارہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ سر آئزک نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

''مس سارہ۔۔۔۔کیا آپ نہیں جانتیں کہ آج ڈین آفس میں روزانہ کے معمولات نہیں نپٹائے جا رہے۔ آج یہاں ایک اہم انکوائری کا فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔'' سارہ نے جلدی سے اپنی سانس درست کی۔

''مَیں بھی اُسی انکوائری کے سلسلے میں جیوری کی مدد کرنے آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیان کمیٹی کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے گا۔''

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارہ کو کسی بھی طریقے سے کمرے سے باہر بھجوا دیں۔ لیکن بات چونکہ دوسرے ممبران پر بھی کھل چکی تھی لہٰذا انہیں مجبوراً سارہ کو برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے پھر بھی حتمی لہجے میں کہا اور اس بار ان کے لہجے میں شدید سختی تھی۔

''مَیں نہیں سمجھتا مس سارہ کہ اس موقعے پر کسی مزید بیان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر حماد خود اپنا فائنل بیان دے چکے ہیں۔ اور ہم نے فیصلہ بھی سنا دیا ہے بس اس فیصلے پر ہمارے دستخط ہونا باقی ہیں۔''

سارہ شاید ان کے لہجے میں چھپی دھمکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے بھی حتمی لہجے میں ہی کہا۔

''کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انصاف کے تمام تقاضے نہ پورے کیے جائیں۔ مَیں اس واقعے کی عینی گواہ ہوں اور مجھے آج تک کمیٹی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مسٹر حماد نے میرا نام بطور گواہ کمیٹی کو پیش کیا تھا۔۔۔۔؟ بہر حال میں یہ بیان دینے آئی ہوں کہ اس تمام واقعے میں مسٹر حماد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جم نے ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور میرے سامنے حماد کو یونیورسٹی سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں حماد نے جم سے کچھ نہیں کہا۔''

سر آئزک کا بس چلتا تو اُسی وقت سارہ کو وہاں سے غائب کروا دیتے۔

سارہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی ایک لمبی سی فہرست لہرائی۔

''یہ ان چالیس طلباء کی فہرست ہے جن کے سامنے یہ سارا واقعہ اس دن پیش آیا تھا۔ یہ سب بھی اس وقت میرے ساتھ ہی آئے ہیں اور آپ کے آفس کے باہر اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے جمع ہو چکے ہیں۔ اگر کمیٹی اجازت دے تو ان سب کا بیان بھی ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔''

گویا سارہ پورا انتظام کر کے آئی تھی۔ سر آئزک کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

''نہیں۔۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، ان بدلے ہُوئے حالات میں کمیٹی کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا ہوگی، جیوری ممبرز کی کیا رائے ہے۔''

تمام جیوری کے ممبران نے یہ بات تسلیم کی کہ سارہ کے بیان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ لہٰذا نظر ثانی کے لیے انہیں تین دن کی مہلت دی جائے۔ سر آئزک کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی اور جب مَیں ڈین کے کمرے سے باہر نکلا تو میری پوری کلاس اور یونیورسٹی کے اور بہت سے طلباء باہر میرے انتظار میں اکٹھے تھے۔ سارہ نے جب انہیں بتایا کہ میرے خلاف فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے تو سب سے پہلے چلانے اور نعرہ لگانے والی ربیکا تھی۔ پھر اس کے بعد تو

وہ شور مچا کہ اندر سے سرآئزک کاپی۔ اے گھبرا کر باہر نکل آیا اور سب کی منت کرنے لگا کہ ہم یہاں سے دُور چلے جائیں کیونکہ سرآئزک ناراض ہو رہے ہیں۔ ربیکا نے فوراً ہی پوری یونیورسٹی کو اسی وقت ایک بڑی ٹریٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ بقول اس کے، اس کے باپ کے آسٹریلین پاؤنڈ کس دن کام آئیں گے۔ سب لوگ ہنستے، شور مچاتے کیفے ٹیریا کی طرف چل پڑے لیکن سارہ خاموشی سے دوسری جانب پلٹ گئی۔ میری نظر اس پر تب پڑی جب وہ مرکزی عمارت سے باہر جانے والی راہداری میں مُڑ رہی تھی۔ مَیں فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ تب تک وہ کافی آگے جا چکی تھی۔

''سارہ۔۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔۔ پلیز رکو۔''

وہ ٹھہر گئی، مَیں اُس کے قریب پہنچا۔

''شکریہ۔''

''کس بات کا۔''

''میرا ساتھ دینے کا، آج اگر تم وقت پر نہ آتیں تو کیس میرے خلاف جا رہا تھا۔''

''مَیں نے تمھارا نہیں سچ کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔''

''اس دنیا میں سچ کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی اُن میں سے ایک ہو۔''

سارہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''تو پھر خدا کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے ان نایاب لوگوں میں سے ایک سے تمھاری ملاقات کروا دی۔''

مَیں بھی اس کی بات سُن کر مسکرا دیا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن وہ شکریہ مَیں اس سے اکیلے میں کہہ دوں گا۔ فی الحال تمھارا شکریہ۔'' مَیں پلٹا اور واپس جانے لگا۔ سارہ نے کچھ سوچ کر مجھے آواز دی۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ تم نے انکوائری کے سامنے گواہی کے لیے میرا نام کیوں دیا۔ مَیں تو خود ان میں سے ایک تھی جو تم سے جھگڑ رہے تھے۔''

''پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ مجھے تم ایک اچھی لڑکی لگتی ہو، سوچا کہ ایک بار اپنا یہ بھرم بھی آزما ہی لوں۔

سارہ ہنسی، پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ ہنسنے سے اُس کے گالوں میں دو ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

''واہ۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔ کیا موقع ڈھونڈا ہے جناب نے اپنے بھرم آزمانے کا، مَیں اگر وقت پر نہ پہنچتی تو۔۔۔۔؟

''میرا سچ پر سے یقین اُٹھ جاتا۔''

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''کافی خطرناک لگتے ہو'' ''وش یو بیسٹ آف لک'' Wish you best of luck۔

سارہ ہنستی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔ بعد میں ربیکا نے مجھے بتایا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے طلب ہی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ جم بہر حال اس کا بہت پُرانا اور سب سے اچھا دوست تھا، لیکن جب ربیکا نے سارہ کو یہ بتایا کہ خود مَیں نے انکوائری کمیٹی کے سامنے سارہ کا نام بطور گواہ دیا ہے تو وہ چند لمحوں کے لیے تو سن ہو کر ہی رہ گئی تھی۔ اُسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسی پر یہ سارا معاملہ ڈال دوں گا۔ ربیکا کو اب تک اس بات پر حیرت تھی کہ سارہ میرے حق میں گواہی دینے پر کیسے راضی ہوگئی۔ نہ صرف خود بلکہ اس نے آدھی یونیورسٹی کو بھی اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا۔ ربیکا سے ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سرآئزک سارہ سے اس بات پر اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دن انہوں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ جانے سارہ نے اس سارے معاملے کو کس طرح سے نپٹایا ہوگا۔ واقعی وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

تیسرے دن کمیٹی نے مجھے اور جم دونوں کو ڈین کے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ میرے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا لہٰذا مجھے بری کیا جا رہا ہے، جبکہ جم کو ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے بعد بھی یونیورسٹی انتظامیہ اُسے واپس لینے سے پہلے کمیٹی بٹھائے گی۔ جم کا چہرہ لٹک گیا۔ مَیں نے ڈین سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔ ڈین نے اجازت دے دی۔

''سر میری جم سے کوئی ذاتی جنگ نہیں ہے۔ اس دن میں شاید اس کی بات ٹھیک طرح

سے سمجھ نہیں پایا جب کہ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جم اور ڈیوڈ کا ایک سنجیدہ قسم کا مذاق تھا۔ لیکن ردعمل اس تیزی سے ہوا کہ ہم میں سے کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مَیں جیوری سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی معمولی بات کے لیے جم کو یونیورسٹی سے خارج نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کو اس مذاق کے لیے بھاری جرمانہ کر دیا جائے تو بھی ہم اسے انتظامیہ کی میزبانی سمجھیں گے۔"

جم حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیوری نے میرے "سچ" کی تعریف کی اور ہم دونوں کو ایک تنبیہہ کے بعد کلاس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جم کو کچھ کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے روک لیا گیا اور مَیں ڈین آفس سے نکل آیا۔

اگلے دن مَیں کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ نینسی میڈیم اکنامکس کا لیکچر دے رہی تھیں کہ جم کلاس میں داخل ہوا۔ وہ ویسے بھی کلاس میں آنے جانے کے لیے کبھی اجازت لینے کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھا اور میرے ڈیسک کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ خود نینسی میڈیم کی آواز بھی حلق سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر گھورتا رہا۔ کلاس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ربیکا نے میرا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا۔ پھر جم نے بنا کچھ کہے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر پھیلا دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جم نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ربیکا نے جانے کہاں سے سیٹی مارنا سیکھ لی تھی۔ اُس کی سیٹیاں کلاس میں گونجتی رہیں۔ میری نظر سارہ پر پڑی وہ دُور بیٹھی مسکرا رہی تھی میرے دل نے کہا۔ "محبت فاتح عالم۔۔۔"

OO

بے خودی

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ لیکن یہ جگہ تو میرے لیے کچھ غیر مانوس سی تھی۔ میں کچھ دیر تک گم صم سا لیٹا یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ رات کو تو خیر و مجھے تانگے میں لاد کر اسٹیشن کے لیے ہی نکلا تھا۔ پھر یہ کشادہ سا کمرہ صاف ستھرا بستر، اُجلے اُجلے سے پردے اور بڑے بڑے سے روشن دانوں اور کھڑکیوں والا ٹین کی سیون ٹائپ چھت والا کمرہ کس کا تھا؟

کچھ فاصلے سے ٹرین کا بھونپو بجا اور ٹی ٹی کی سیٹی سنائی دی۔ مطلب یہ جگہ اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ پر یہ کس کا گھر ہے؟ مَیں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر اُٹھاتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر کی جگہ لوہے کا کوئی بھاری گولہ میرے کاندھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو۔ میں ایک کراہ کے ساتھ سر پکڑ کر دوبارہ ڈھے سا گیا۔ میری آواز سن کر باہر کچھ آہٹ ہوئی اور پھر صدیقی صاحب ہاتھ میں کچھ گولیاں اور جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے مجھے کاندھے سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

''لیٹے رہو۔۔۔ ابھی تمھاری حالت پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔''

''لیکن سر مَیں ۔۔۔۔ یہاں۔ کیسے؟''

''میاں تم خود تو کبھی کچھ بتاتے نہیں ہو۔۔۔ جانے سارا درد خود ہی سہنے کی یہ کیا ضد ہے تمھاری۔ پر تمھارا بھی قصور نہیں ہے۔ شاید یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔'' انہوں نے مسکرا کر دو گولیاں میرے منہ میں ڈال کر زبردستی آدھا گلاس پانی میرے حلق سے نیچے اُتار دیا۔ مجھے انہیں یوں اپنی خدمت کرتے دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ مَیں نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

''سر مَیں اب ٹھیک ہوں۔ پر میں یہاں آیا کیسے؟''

انہوں نے تکیہ میری پشت پر سیدھا کر کے مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔

''خیر تمھیں شدید بخار اور ہذیان کی کیفیت میں تین دن پہلے رات کو یہاں اپنے تانگے پر ڈالے لایا تھا۔''

میں اُچھل ہی تو پڑا۔

''تین دن پہلے۔۔۔۔لیکن میں تو کل رات۔''

''ہاں میاں۔۔۔تم تین دن تک تقریباً بے سدھ ہی بخار میں پڑے سڑتے رہے ہو۔ میں نے سوچا ریلوے کے ہسپتال سے بہتر ہے کہ یہیں گھر پر ہی تمھاری نگہداشت کی جائے۔ ڈاکٹر روزانہ تین وقت آتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ آج صبح سے بخار کچھ ٹوٹا ہے۔ لیکن ابھی تم کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی بھی قسم کی ضد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤ یہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔''

یا خدا۔۔۔ میں تین دن سے اس بیماری کی حالت میں یہاں اس شریف انسان پر بوجھ بنا رہا۔ مجھے اپنی کیفیت پر غصہ آ گیا۔ میں نے انہیں اتنی تکلیف پہلے ہی دے دی تھی۔ اب مزید نہیں۔

''سر آپ یقین کریں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ پہلے ہی تین دن آپ اور آپ کے گھر والوں پر بوجھ بنا رہا ہوں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔''

''میاں پہلے تو یہ بوجھ والی بات واپس لے لو۔ دوسری بات یہ کہ میں اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ بیوی سے مزاج مل نہیں پایا لہٰذا وہ سال میں دس مہینے میکے میں ہی گزارتی ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس میں ہوں اور گھر کے دو چار نوکر ہیں۔ خوب مزے میں کٹ رہی ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''ویسے بھی آدمی بنا شادی کے تنہا رہے تو اتنا مزہ نہیں آتا جتنا شادی کے بعد بیوی کے میکے جا کر رہنے کی صورت میں تنہائی میسر آنے کے بعد آتا ہے۔ یقین نہ آئے میری بات پر تو شادی کے بعد بیوی کو میکے بھیج کر کبھی تنہا رہ کر دیکھنا۔''

میں بھی مسکرا دیا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے سر۔۔۔۔لیکن میں اس طرح یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں

جانتا ہوں میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوتا رہا ہوں۔"

"ارے یار تنہائی تو اپنی جنم جنم کی ساتھی ہے، وہ بھی میرے ساتھ رہتے رہتے کبھی کبھی اُکتا سی جاتی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

"میری لاکھ ضد کے باوجود صدیقی صاحب نے مجھے اس گھر سے تو کیا اس کمرے سے بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ البتہ شام کو جب نوکر نے برآمدے میں چائے لگ جانے کی اطلاع دی تب وہ مجھے لیے برآمدے میں آ گئے۔

کوئٹہ میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک ذیلی سڑک آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ایک مرکزی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی سڑک سے ملی ہوئی ہے یہ ٹھنڈی سڑک جسے عرف عام میں کالون روڈ کہتے ہیں۔ اسی ٹھنڈی سڑک پر ریلوے کے بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب کا چھوٹا سا بنگلہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ریلوے کی مخصوص برٹش دور کی طرز تعمیر والے سُرخ ٹین کی چھت والے یہ بنگلے خاص طور پر کوئٹہ کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی راج میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کمروں کے باہر برآمدہ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مخصوص لکڑی کے سبز رنگ کیے ہوئے ستون، برآمدے کو تھامے ہوئے تھے اور برآمدے کے سامنے کشادہ سا باغیچہ جس میں انار، انگور، سیب اور ناشپاتی کے درخت اور بے تحاشا پھول لگے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کافی اعلیٰ ذوق معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

"اپنی بے ہوشی کے ہذیان میں تم بہت کچھ بولتے رہے ہو۔ لیکن اس میں سے زیادہ تر باتیں تم اُردو میں نہیں بلکہ انگلش میں کر رہے تھے۔ شاید تم اپنے گھر میں زیادہ اُردو نہیں بولتے تھے؟"

جس بات کا مجھے ڈر تھا، صدیقی صاحب نے وہی بات آخر پوچھ ہی لی۔ میں پہلے ہی یہ سن کر چونک گیا تھا کہ میں تین دن بے ہوشی کے عالم میں یہاں پڑا رہا ہوں جانے اپنے ہذیان میں کیا کیا بک گیا تھا میں۔۔۔۔؟

میں چند لمحے چُپ رہا، صدیقی صاحب نے بات جاری رکھی۔

"اگر تم نہ بتانا چاہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں جس دن تم سے پہلی مرتبہ ملا

تھا۔ اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو تم دوسروں کو نظر آتے ہو۔ تمھاری آنکھیں، تمھارا لہجہ، تمھارے ہاتھ ۔۔۔۔ سب تمھیں ان لوگوں سے الگ دکھاتے ہیں جن میں تم اتنے دنوں سے رہ رہے ہو۔ میں نہیں جانتا کہ تمھاری کیا مجبوری ہے۔ لیکن بے ہوشی کے دوران تمھارے منہ سے اس قدر شستہ انگریزی سُن کر مجھے کچھ زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی۔ لیکن زمانے سے اس قدر ناراضگی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو جاتا ہے۔''

مَیں آہستہ سے بولا۔

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص زیادہ ہے بھی نہیں۔ ایک مقصد کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا جو اَب میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ اب میری زندگی اور میرے دن اور رات کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔ اور شاید یہ مختصر زندگی اب اسی کھوج میں کٹ جائے گی۔ بس اتنا سا فسانہ ہے میرا۔''

صدیقی صاحب کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''ہوں ۔۔۔۔ خوش نصیب ہو گویا ۔۔۔ کوئی مقصدِ عشق تو ہے زندگی میں اور سچ مانو تو یہی زندگی کا حاصل بھی ہے۔ اگر کبھی میں اس سلسلے میں تمھارے کسی کام آ سکوں تو مجھے ضرور بتانا۔ اپنی بھی حسرت ہے میاں کہ زندگی میں کچھ تو ایسا کر جائیں جس پر ہمیں بھی ناز ہو۔ (عشق نہ سہی ۔۔۔۔ معاونتِ عشق ہی سہی۔)''

صدیقی صاحب نے کچھ اس طرح سے ''معاونتِ عشق'' کی اصطلاح استعمال کی جیسے خالص پولیس والے کسی کے لیے ''معاونتِ جرم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

دو دن مجھے صدیقی صاحب نے بالکل کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تیسرے دن بڑی مشکل سے میں نے اپنی واپسی کے لیے رضامند کیا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ میں ہر روز شام کو چائے پر ان سے ملنے ضرور آؤں گا۔ انہوں یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی دن ناغہ کیا تو وہ خود ڈرائی پورٹ کے گوداموں سے مجھے لے جانے کے لیے آ پہنچیں گے۔ ان کا آخر تک یہی اصرار رہا کہ مَیں ان کی طرف ہی منتقل ہو جاؤں۔ مجھے مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے

مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے میری گذشتہ زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔ مَیں نے انہیں بصد مشکل یقین دلایا کہ میرے وہاں نہ رکنے کی وجہ میرا ماضی یا صدیقی صاحب کے سوالوں کا خوف نہیں ہے۔ بلکہ میرے وہاں رکنے سے میرے اس مقصد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے جس کے لیے میں گھر بار تیاگ کر یہاں اسٹیشن پر آ بیٹھا تھا۔

بڑی حجت کے بعد مَیں نے ساتویں دن کی شام انہیں ان کے بنگلے کے گیٹ سے مل کر واپس اندر بھیجا ورنہ وہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے جانے پر بضد تھے۔ ان کے گھر سے نکل کر مَیں ٹھنڈی سڑک پر پیدل اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا عجیب اور مہربان شخص ہے۔ ایک اجنبی کو اس نے سات دن میں ہی اتنا اپنا لیا کہ اس کی واپسی پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ واقعی، انسان ہی انسان کا سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میرے پہنچتے ہی سب کو خبر ہو گئی اور وہ سب میرے آس پاس یوں جمع ہوتے گئے جیسے شہد کے چھتے پر مکھیاں۔۔۔۔

سب ہی کو فرداً فرداً یقین دلانا پڑا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ان میں سے کئی تو مجھ سے یوں پرتپاک انداز میں گلے ملتے رہے جیسے میں کسی محاذ جنگ سے واپس لوٹا ہوں۔ پھر مجبوراً غفورے کو مداخلت کرنا پڑی اور اُس نے اپنی گرج دار آواز میں سب کو حکم دیا کہ بابو حماد کی طبیعت ابھی مشکل سے سنبھلی ہے۔ اگر سب میرے گرد یونہی جمع رہے تو مجھے آرام کا موقع نہیں ملے گا لہٰذا فی الحال سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ غفورے کا حکم ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی۔ غفورے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بینچ پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''میں جانتا تھا بابو۔۔۔۔ تم زیادہ دن صدیقی صاحب کے گھر نہیں ٹکو گے۔ اور سیدھے یہیں واپس آؤ گے۔ تم اس گھر کا آرام اور سکھ زیادہ دن برداشت نہیں کر پاؤ گے، تمھیں اَب بے آرامی اور بے سکونی میں ہی سکھ ملتا ہے۔''

وہ شاید میرے صدیقی صاحب کے گھر سے واپس چلے آنے پر خفا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ناراض ہو؟''

''جانے دے باؤ۔۔۔اپنی ناراضی کس کام کی۔تُو نے غفورے کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں، ورنہ اس مولوی والی بات کو مجھ سے نہ چھپاتا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں باؤ۔۔۔خیرو تانگے والے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔قصور اس کا بھی نہیں تھا۔اس دن جب تم بخار میں اس مسجد میں اندر گئے اور پھر بہت دیر تک باہر نہیں نکلے تو خیرو گھبرا کر تمھارے پیچھے اندر مسجد میں گھس گیا تھا کہ کہیں تمھاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔پر اندر جانے سے پہلے ہی اس نے تمھاری اور مولوی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔پر خیرو بھی یاروں کا یار ہے۔اس نے یہ باتیں اور کسی کو نہیں بتائی ہیں۔وہ تمھیں صدیقی صاحب کے گھر چھوڑ کر سیدھا میرے پاس آیا تھا۔شاید وہ مجھے کبھی کچھ نہ بتاتا۔پر وہ تیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ کہیں تجھے کچھ ہو ہی نہ جائے۔اگر ایک آدھ دن مزید تیری حالت نہ سدھرتی تو ہم سیدھے تیرے گھر چلے جاتے بتانے کے لیے۔''

میں پھر حیرت سے چونکا۔

''میرے گھر۔۔۔۔؟''

''ہاں باؤ۔۔۔۔خیرو نے سن لیا تھا جو بھی اس مولوی نے کہا تھا۔تُو لاٹ صاحب کا بیٹا ہے، ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔''

شاید غفورا کمشنر صاحب کو ہی لاٹ صاحب کہہ رہا تھا۔مولوی صاحب نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ تم جہاں بھی جاؤ گے کمشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے۔مطلب میرا بھرا راز کھل چکا تھا۔شاید اب یہاں سے بھی میری رخصت کا وقت ہو ہی چلا تھا۔آج نہیں تو کل یہ سب لوگ میری اصلیت جان جائیں گے۔مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔غفورا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے۔

''لیکن خبردار جو تو نے اب یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچا بھی تو۔قسم مولا کی، میں تجھے رسیوں سے باندھ دوں گا اور سب کو بتا دوں گا کہ یہ کون سا شہزادہ اتنے دن سے ہمارے بیچ رہ رہا ہے۔''

مجھے غفورے کی بات پر ہنسی آ گئی۔اس نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور روہانسا سا ہو کر

بولا۔

''دیکھ باؤ۔۔۔۔ تجھے میری دوستی کا واسطہ۔۔۔۔ اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کوئی بھی بات باہر نہیں نکلے گی۔ پر تُو اگر یہاں سے چلا گیا تو غفورا زندگی بھر اپنا چہرہ نہیں دیکھ پائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں روزانہ کی طرح اپنا سارا کام خود ہی کروں گا۔ تم مجھ سے دوستی میں یا میرے گھر کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص سلوک نہیں کرو گے۔ ورنہ میں ایک دن بھی یہاں نہیں رکوں گا۔'' غفورے نے خوشی سے میرے ہاتھ چوم لیے۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی۔

''تُو واقعی اس دنیا کا نہیں ہے، پر تیری محبت کی قدر یہاں کون جانے گا۔۔۔''؟ تو بولے تو میں خود جا کر اس مولوی کے پیروں میں گر جاؤں گا۔ ساری زندگی اس کی غلامی کروں گا۔ بس تو ایک بار حکم کر دے۔''

''نہیں۔۔۔۔ یہ معاملہ حکم کا نہیں ہے۔ عرض کا ہے۔۔۔۔ میں نے بھی اپنی عرضی ڈالی ہوئی ہے۔ اب سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

غفورے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک خاص سی عقیدت در آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے خیرو تانگے والا بھی آیا اور بہت دیر تک مجھ سے گلے مل کر اس نے مجھے جکڑ رکھا۔ یہ غریب لوگ بھی جذبوں کے معاملے میں کتنے امیر ہوتے ہیں۔ جس کسی کو ایک بار دل میں بٹھا لیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ بس شرط صرف اتنی سی ہے کہ کوئی ان کے دل کو چھو لینے والا ہونا چاہیے۔ خیرو اور غفورے دونوں نے میرے دل کی آرزدگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے مولوی صاحب یا میرے گھر والوں کی کوئی بات نہیں کی۔ بس ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔ وہ دونوں ایک معاملے میں ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں کا پسندیدہ فلم اداکار دلیپ کمار تھا اور دونوں ہی ہمہ وقت خود کو دلیپ کمار کا حقیقی پرستار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش میں لگے رہتے تھے۔

خیرو ہر وقت کسی ایک فلم کا حوالہ دیتا تھا جس میں دلیپ صاحب نے تانگے بان کا

کردار ادا کیا تھا اور خیرو بتاتا تھا کہ جس دن سے اس نے وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم دیکھی ہے تب سے وہ دلیپ کمار کی طرح ہی تانگہ چلاتا ہے۔

وہاں غفورے کو ایک ایسی فلم یاد تھی جس میں اس کے پسندیدہ ہیرو نے مزدور لیڈر کا رول بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جس طرح غفور اخود اصل زندگی میں تھا۔ عام طور پر جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو میں جان بوجھ کر دلیپ کمار صاحب کی کوئی بات چھیڑ دیتا تھا جس کے بعد گھنٹوں ان دونوں کی بحث جاری رہتی اور یہ بحث آخر کار دونوں کے اس دن کے جھگڑے کی صورت میں ختم ہوتی۔ اس دن بھی خیرو غصے میں روٹھ کر چلا گیا کیونکہ غفورے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ دلیپ کمار جیسے بڑے اداکار کو تانگے بان جیسا معمولی کردار ادا ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہم دونوں خیرو کے اس جذباتی پن میں اُٹھ کر چلے جانے پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ پھر اچانک جیسے غفورے کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے اپنے ہی سر پر زور سے ایک چپت ماری۔

''دھت تیرے کی غفورے۔۔۔۔ پھر بھول گیا نا۔۔۔۔''

میں نے حیرت سے غفورے کی جانب دیکھا۔

''کیا ہوا، کچھ بھول گئے ہو کیا۔''

''باؤ تیرے آنے کی خوشی میں دیکھ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ تیرے بیمار پڑنے کے بعد پچھلے ہفتے میں ایک داڑھی والا جوان سا لڑکا دو بار تیرے پتے ہوئے اسٹیشن آیا تھا۔۔۔ بھلا سا نام بتایا تھا اُس نے۔۔۔۔۔''

غفورا ماتھے پر ہاتھ رکھے نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک سی گئی اور میں نے سرسراتی سی آواز میں نام دہرایا۔

''عبداللہ''

غفورے نے خوشی میں زور سے تالی ماری۔

''ہاں۔۔۔۔ عبداللہ۔۔۔۔ یہی نام بولا تھا اُس نے۔۔۔۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے تیری بیماری کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ کل پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے یہ پیغام دے دوں کہ ٹھیک ہوتے ہی شاکر صاحب سے مل لینا۔۔۔۔ شاید کوئی ضروری کام ہو؟

میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے تھے۔عبداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟اس نے مجھے شاکر سے ملنے کا کیوں کہا ہے؟۔۔۔۔کہیں مولوی صاحب کی طبیعت۔۔۔؟نہیں نہیں۔۔۔ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔۔لیکن عبداللہ تو خود یہاں نہیں تھا۔وہ تو ایمان اور اُن کے گھر والوں کو لے کر مچھ گیا ہُوا تھا۔اور جس دن میں مولوی صاحب سے آخری مرتبہ مسجد میں ملا تھا تب تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔میرا دل جانے کیوں ڈوبنے لگا تھا۔مغرب کی اذان کا وقت تھا۔میں نے خیرو کو فوراً پیغام بھجوایا کہ تانگہ تیار رکھے۔ہم ابھی کہیں کے لیے نکل رہے ہیں۔غفورے نے مجھے لاکھ منع کیا کہ ابھی دیر ہوگئی ہے اور میری حالت بھی پوری طرح نہیں سنبھلی ہے۔میں کل شاکر سے ملنے چلا جاؤں لیکن اب میرے دل کو ایک پل بھی قرار نہیں تھا۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے ہی پُرانی حویلی پہنچ جاؤں۔

خیرو جس رفتار سے تانگہ بھگا سکتا تھا، بھگا رہا تھا۔میں نے اسے جلد از جلد پُرانی حویلی پہنچنے کا کہا تھا۔شہر کی مرکزی سڑکوں پر کچھ خاص رش نہیں تھا، جلد ہی ہم شہر کے مضافات میں حویلی کو جاتی ہوئی لمبی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔میں اپنے ہی وسوسوں اور خیالات میں اُلجھا ہوا تھا خدا خیر ہی کرے۔۔۔

میں اس وقت چونکا جب خیرو نے حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر زور سے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں، میں نے خیرو کو وہیں رکنے کے لیے کہا۔

نگہت حویلی کے دالان میں ہی کچی خوبانیوں کو جو شاید دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالی گئی تھیں، حویلی کے نوکروں سے جمع کروا رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی تیزی سے میری طرف آئی۔کچھ دیر تو اسے اپنا سانس سنبھالنے میں ہی لگ گئی۔وہ میرے چہرے اور ہاتھوں کو بے تابی سے ٹٹولتی رہی۔

''کیا ہوگیا تھا آپ کو بھیا۔۔۔۔بیمار کیسے ہوگئے تھے۔۔۔۔کتنے کمزور لگ رہے ہیں۔۔۔۔یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔''

مجھے اس کے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی بیماری کے بارے میں مختصراً بتانا پڑا پھر میں نے چھوٹتے ہی اس سے شاکر کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ میں نے نگہت کو عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی بتایا۔

نگہت نے شاکر کے بارے میں تو یہ بتایا کہ وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی جانتی ہے لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔۔۔

مجبوراً مجھے اس کو اپنی قسم دینی پڑی۔ نگہت شاید پہلے ہی بہت دیر سے ضبط کر رہی تھی۔ میرے یوں اصرار کرنے پر اس کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل تو پہلے ہی ہول کھائے جا رہا تھا۔ نگہت کی یہ حالت دیکھ کر تو جیسے ہی میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔

''خدا کے لیے نگی۔۔۔۔ کچھ تو بتاؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔۔ مولوی صاحب کے گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔۔۔۔ ایمان تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔''

نگہت نے عجیب زخمی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کوئی پانی پلانے والا حسرت سے کسی دم توڑتے سپاہی کو میدانِ جنگ میں آخری گھونٹ سے پہلے ہی اس کی سانس رکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

''مولوی صاحب نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے ماہ کی پندرہ کو اس کی رخصتی ہے۔''

چند لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری سننے، سمجھنے، دیکھنے اور بولنے کی تمام حسیات چھین لی گئی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس صرف اِک خلا سا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اتنی غیر متوقع بات بھی نہیں تھی۔ اس دن میری مولوی صاحب سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر انہیں کچھ ایسا ہی قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ وہ کسی صورت میرا ایمان کے لیے رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی بدنامی اور زمانے کی باتوں کا خوف بھی ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ میری دیوانگی اور وحشت بھری حالت کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شریف باپ کو وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ خبر میرے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نگہت کو میری اندرونی حالت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ بہت دیر تک میرے لرزتے ہاتھ پکڑے وہیں کھڑی رہی۔

انسانی اعصاب کا کھیل بھی عجیب ہے۔ شاید ایک انسان کے اندر بیک وقت یہی ایک چیز ہوتی ہے جو سب سے کمزور اور سب سے زیادہ مضبوط ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب کو ایک دن مر جانا ہے۔ پھر بھی کسی اپنے کی موت کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے تو ہمارے اعصاب سُن سے ہو جاتے ہیں۔ شاید ہم جانتے ہوئے بھی ہر لمحہ خود کو اس انہونی کے نہ ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ایمان کے کہیں رشتہ طے ہو جانے کی بات بھی میرے لیے اور میرے اعصاب کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خبر تھی۔ دراصل کچھ باتوں کی سنگینی کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ سرزد ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی روح نچوڑ دینے والا تھا کہ وہ نازنین کسی اور کی ہونے والی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم دونوں میں تو آج تک کبھی کھل کر بات بھی نہ ہونے پائی تھی، تب میرا یہ حال تھا اگر کہیں اس کی طرف سے بھی قول و اقرار ہو چکا ہوتا تو شاید میرا دل وہیں پھٹ جاتا۔

بہت دیر تک میں اور نگہت خاموش کھڑے رہے۔ حویلی کے بلند و بالا درختوں کے پرندے بھی ڈھلتی شام کے ساتھ گھر واپسی پر شور مچاتے مچاتے چُپ ہو گئے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ پھر میں نے ہمت مجتمع کی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں نگہت سے پوچھا۔

''کون ہے وہ۔۔۔۔ کس کے ساتھ ایمان کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

''اس کے چچازاد۔۔۔ عبداللہ کے ساتھ۔''

''عبداللہ۔۔۔۔ لیک۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔''

لفظ میرے منہ میں ہی ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا پہاڑ تھا جو انہی چند لمحوں میں میرے سر پر ٹوٹا تھا۔ عبداللہ تو میری دیوانگی کا خود شاہد تھا۔ پھر عبداللہ۔۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔۔؟ میرے ذہن میں خیالات گڈمڈ سے ہونے لگ گئے تھے۔ نگہت نے بتایا کہ مچھ میں مولوی صاحب کی جو بڑی بہن رہتی تھیں وہ عبداللہ کی پھوپھی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منہ بولی ماں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے مچھ جاتے ہوئے ان کے نام خط اپنے گھر والوں کے ہاتھ ہی بھیج دیا تھا۔ واپسی پر وہ بھی ایمان لوگوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ان کے سامنے ایمان کے رشتے کی بات رکھی تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ کا نام ہی تجویز کر دیا بلکہ بڑی بہن ہونے کے ناطے انہوں نے مولوی صاحب سے بطور حق ایمان کا رشتہ مانگا

شاید مولوی صاحب کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں اندر یہی خواہش پل رہی تھی، تبھی انہوں نے رات بھر سوچنے کے بعد ہاں کر دی۔ لیکن عبداللہ۔۔۔۔ عبداللہ سے کیا کسی نے اس کی رائے نہیں پوچھی۔۔۔؟ اس نے کیوں ہاں کر دی۔۔۔؟ لیکن وہ کیوں ہاں نہ کرتا۔۔۔۔ اس نے ایمان کے لیے میری دیوانگی ہی تو دیکھی تھی۔۔۔۔ اس پردہ نشین نے تو مجھ پر کھل کر آج تک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا اس تمام قصے میں کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔۔ میرا ذہن خود ہی سوال کر رہا تھا اور پھر خود ہی ان کے جواب بھی تلاش کر لیتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہیں بیٹھا اپنی قسمت کو روتا رہا۔۔۔۔۔

نہ جانے شاکر کو اس دن اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ مجھے باہر تانگے میں بیٹھے خیرو کا بھی خیال تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اس لیے نگہت کے بے حد اصرار کے باوجود میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا، چلتے چلتے نگہت نے مجھ سے پوچھا کہ اَب کیا کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ انسان ہزار دشمنوں سے لڑ سکتا ہے لیکن جب اس کی تقدیر ہی اس کی دشمن بن جائے تو پھر اس سے مقابلہ کون کرے۔ میری تقدیر کا وار بھی جانے کب سے میرے درپے تھا۔ اس جیسے اور نہ جانے کتنے حادثے ابھی میرے تعاقب میں تھے۔ میں نگہت کو جھوٹی تسلی دے کر گھر سے نکل آیا۔ خیرو نے مجھے دیکھتے ہی تانگے کو ایڑھ لگائی اور ہم دوبارہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے خیرو کی سب سے اچھی عادت یہی لگی تھی کہ وہ از خود کبھی سوال کر کے دوسروں کی تنہائی میں مخل نہیں ہوتا تھا۔ چپ رہ کر اس بات کو کھلنے کا انتظار کرتا تھا۔ خاموشی بھی تو بہت بڑا صبر ہوتی ہے۔ اور خیرو اس معاملے میں بہت صابر تھا۔

مجھے اسٹیشن کے دروازے پر اُتار کر وہ اپنا تانگہ اسٹینڈ میں کھڑا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ میں لٹا پٹا سا چلتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ اسٹیشن ویران سا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ لیکن اس رات کی تنہائی اور اس رات کے درد کا بیان ہی کچھ مختلف کچھ سوا تھا۔

صبح میں دوبارہ شاکر کی جانب جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں غفورے کی آواز آئی۔

''وہ رہے حماد باؤ۔۔۔۔''

میں اس وقت صبح کی گاڑی میں سے مال اُتروانے کی تیاری میں تھا۔اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بنے گارڈ روم کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ عبداللہ تھا۔۔۔ جو میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں مَیں عبداللہ سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے مَیں اس نوجوان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔تو یہ تھا وہ خوش نصیب جس کے نام میری ایمان کا قرعہ نکلا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔۔۔۔ میں تو اُسے اپنا رقیب بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرا رقیب ہی تو تھا۔عبداللہ کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی اپنے لفظ بھول گئے تھے شاید، پھر مجھے ہی رسم ادا کرنی پڑی۔

''کیسے ہو۔۔۔۔؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔۔؟ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔۔۔۔''جی ۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔۔ مَیں ۔۔۔۔ میں آپ سے یہاں معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''میں اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔''

''میں پہلے صبح شاکر صاحب کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رات آپ وہاں آئے تھے۔۔۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ آپ کی تلاش میں یہاں آ چکا ہوں۔''

''ہاں۔۔۔۔ مجھے خبر مل گئی، نیا رشتہ مبارک ہو۔''

شاید شدید کوشش کے باوجود بھی مَیں اپنے لہجے کی تلخی نہیں چھپا سکا۔عبداللہ نے تڑپ کر سر اُٹھایا۔اُس کی آنکھوں میں اِک عجیب سی شکایت تھی۔ مجھے اپنے الفاظ کے چناؤ پر شرمندگی ہونے لگی۔

''آپ کو حق ہے۔۔۔۔ جو چاہے کہہ لیں۔۔۔۔ شاید مَیں آپ کو کبھی اپنا سینہ چیر کر اپنے دل کی حالت نہ دکھا پاؤں۔''

''میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ شاید کبھی کبھی لفظ اپنے معنی خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا ان کو ادا کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔''

عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''یہ بھی آپ ہی کا ظرف ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی معذرت کر رہے ہیں۔

مَیں بچپن سے مولوی صاحب کے اس قدر احسانوں تلے دبا ہوا ہوں کہ اگر مَیں ان کا شمار بھی کرنا چاہوں تو کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے بچا بن کر نہیں۔۔۔ بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر پالا ہے۔۔۔۔ خود تکلیفیں اُٹھائیں لیکن مجھ پر کبھی کوئی سخت وقت نہیں آنے دیا۔ ان کے اپنے ہاتھ چھل گئے پر انہوں نے کبھی میرے پیروں میں کوئی چھالا نہیں بننے دیا۔"

"تو کیا تمہارے اقرار کی وجہ بھی صرف اُن کے احسانوں کا بوجھ ہی تھا۔" عبداللہ نے پھر اسی کرچی کرچی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"اس وقت اُن کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سی ٹھیس بھی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ جب انہوں نے پھپھو اور تمام گھر والوں سے چھپ کر اکیلے کمرے میں میرے سامنے اپنے سر کی دستار ڈال دی تھی تو مَیں نے اپنی زبان کو بالکل گنگ پایا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں آپ کی ایمان کے لیے دیوانگی سے واقف ہوں۔۔۔۔ شاید اسی لیے انہیں اپنی عزت کو یوں میرے سامنے گروی رکھنا پڑا۔ حالانکہ ان کی ہمیشہ سے یہی مرضی تھی شاید۔۔۔۔ لیکن آپ کے درمیان میں آ جانے سے وہ بہت ڈر گئے تھے۔۔۔ وہ اس بات سے بھی بے حد خوفزدہ تھے کہ ایمان کے کسی دوسرے گھر میں رشتے کے بعد کہیں کسی مقام پر آپ اپنی دیوانگی کے ہاتھوں اگر اس کے سسرال والوں کے سامنے آ گئے یا اگر بات ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے کھل گئی تو ان کی عزیز از جان بیٹی کی زندگی پل میں برباد ہو جائے گی۔۔۔۔

۔۔۔۔ ان سب باتوں کے پس منظر کو اور اپنے ایک ایسے محسن کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟"

عبداللہ میرے سامنے سرتاپا سوال بنا کھڑا تھا۔ مَیں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مَیں بھی وہی کرتا۔۔۔۔ جو تم نے اس وقت کیا۔"

عبداللہ کے اکڑے ہوئے بدن میں جنبش سی ہوئی اور اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

"مَیں نے کہا تھا نا۔۔۔۔ یہ صرف آپ کے ظرف کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور

سچ کا اقرار کرنا چاہتا ہوں آج آپ کے سامنے۔۔۔میں بچپن ہی سے جانتا تھا کہ میری شادی ایمان کے ساتھ ہی ہوگی۔ چچا کی نظر میں ہمیشہ سے میرے لیے وہ خاص پسند موجود رہی ہے جو کسی بھی باپ کی آنکھ میں اپنے ہونے والے فرزند کے لیے ہو سکتی ہے۔ جب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا تو میری پہلی نظر بھی ایمان کی طرف ہی اٹھی تھی۔ اور اس پہلی نظر سے لے کر آج تک میں ایمان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ محبت کی شدت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود کبھی محبت کی ہو۔ لیکن آج تک کبھی اس محبت کے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے اظہار کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ ایمان تو ہمیشہ سے ہی میرے نام لکھی جا چکی تھی۔ سوچا کہ شادی کے بعد پہلی رات اُسے اپنی زندگی بھر کی بے تابیوں کی کہانی سناؤں گا۔۔۔اُسے ایک ایک بات یاد دلا کر بتاؤں گا کہ تب میرا اس کی کتاب میں مور کے پر رکھ دینے کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے جان بوجھ کر اس سے پانی کیوں مانگتا تھا۔ اپنے استری شدہ کپڑے پھر سے اُسے استری کرنے کے لیے کیوں دے دیتا تھا۔ شدید سردیوں کی رات میں چچا سے چھپ کر اس کے لیے اتنی دُور سے پان کیوں لاتا تھا۔''

عبداللہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھپکتی جا رہی تھیں اور میرے دماغ میں جیسے آندھیوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا۔۔۔تو ایک مرتبہ پھر محبت ہی تھی جو اس نوجوان کو ہمیشہ بھیڑ میں بھی سب سے الگ دکھاتی تھی۔ عبداللہ کی بات جاری تھی۔

''لیکن پھر آپ آ گئے، میں جانتا ہوں کہ ایمان نے آج تک پلٹ کر آپ کو کوئی جواب نہیں دیا ہوگا۔ کوئی اُمید نہیں دلائی ہوگی کیونکہ میں اس لڑکی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ شرم و حیا اور رواداری کی جس مٹی سے گوندھ کر خدا نے اُسے بنایا ہے۔ اس میں شاید ایسی محبت کی آمیزش ہی نہیں رکھی گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد مولوی صاحب کی خوشی ہے اور وہ اس خوشی کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک پل کی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی تو کیا۔۔۔۔ اپنا ایمان تک تیاگ سکتی ہے۔۔۔۔۔

لیکن جانے کیوں۔۔۔۔ آپ مجھے باقی سب سے مختلف لگے۔ مجھے دھیرے دھیرے ایسا لگنے لگا کہ آپ مولوی صاحب کے دل میں گھر کر ہی لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں چچا آپ کے سامنے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔۔۔۔

میری خودغرض سوچیں تنہائی میں مجھے رلاتی تھیں کہ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہوگا۔ آپ کی محبت کی طاقت سے مَیں بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی محبت ایک ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا کر لے جا سکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود مَیں کبھی آپ کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکا، کبھی آپ سے دل میں بھی نفرت نہیں کر سکا۔ شاید یہ بھی آپ کی محبت کا ہی کمال ہوگا۔"

لیکن پھر جس دن مَیں نے آپ کو اس اسٹیشن پر ریلوے قلی کے روپ میں دیکھا اس دن میرا دل بھی آپ کے سامنے ہار مان گیا۔ آپ سے جیتنا مجھ جیسے کمزور شخص کے بس کی بات ہی نہیں۔ میری محبت نے اسی دن آپ کی محبت کی عظمت کو سجدہ کر دیا تھا۔۔۔۔ افسوس ۔۔۔۔ چچا اس محبت کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔۔ وہ ایک ڈرے ہوئے مجبور باپ ہیں۔ اور ان کی تربیت اور ماحول میں ایسی کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ مَیں یہاں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے آپ کی، آپ کی عظیم محبت کی قدر نہیں کی۔۔۔۔ آپ ہم سب کو معاف کر دیں۔۔۔۔ معاف کر دیں۔"

عبداللہ کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔ مَیں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ جوانِ رعنا آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے، اپنے ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُسے اپنے گلے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔ ہم دونوں کے پاس مزید کچھ کہنے کو تھا بھی نہیں۔ بس یہ آنسوؤں کی بولی ہی تھی جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھا سکتی تھی۔

کتنا عجیب منظر تھا، دُنیا نے آج تک رقیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرتے، لڑتے اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔۔۔۔ یہ کیسے دو رقیب تھے جو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔۔۔۔ ان میں سے ایک سب کچھ پا کر رو رہا تھا تو دوسرا سب کچھ لٹا کر۔۔۔۔

اس کے بعد عبداللہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے لمحہ بھر کے لیے میرے ہاتھ پکڑے، انہیں اپنی بھیگی آنکھوں سے لگایا اور پلٹ کر وہاں سے چل دیا۔ مَیں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دُنیا میں اتنے ہمت والے لوگ میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

وہ آیا، اس نے کس دیدہ دلیری سے اپنا سچ مجھے بتایا اور واپس چلا گیا۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں ہی اپنی عمر گنوا دیتے ہیں۔ اس سے کہیں چھوٹا سچ بولتے ہوئے ہماری زبانیں سالہا سال پھسلتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ سچ ہمارے منہ سے نکل نہیں پاتا۔ جھوٹ در جھوٹ کی تہیں ہمارے ضمیر کو ڈھانپتی رہتی ہیں اور آخر کار ہم سچ بولنا ہی بھول جاتے ہیں۔ واقعی ۔۔۔۔ سچ بولنا صرف محبت کرنے والوں کا ہی شیوہ ہے۔ کیونکہ شاید دُنیا میں صرف محبت ہی سچ ہے۔ باقی سارے جذبے کسی نہ کسی منافقت کی پیداوار ہیں۔

اگر عبداللہ میرے سامنے ایمان سے اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا تو مجھے ساری زندگی اس کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اُسے کوئی اور مجبوری تھی کہ وہ میرے سامنے یہ راز کھولتا۔ لیکن یہ اس نوجوان کے اندر کا سچ تھا جس نے اُسے یہاں مجھ نامُراد تک چل کر آنے پر مجبور کیا۔ عبداللہ اپنا سچ بول کر چلا گیا تھا، جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے بھیانک سچ تنہا جھیلنے تھے اور ان میں سب سے زیادہ تلخ سچ یہ تھا کہ ایمان اَب کسی اور کے نام سے منسوب ہو چکی تھی۔

OO

جادوگر

ربیکا نے جم کے میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد میرا نام جادوگر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جادوگری میری شخصیت کا حصہ بنانے والی ڈور میرے دیس کی ایک گل فام ہے، جو مجھے جینے کا ہر قاعدہ سکھا گئی ہے۔

اس دن بھی وہ کلاس میں بیٹھی میرے کان کھا رہی تھی۔

''نہیں ۔۔۔۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو۔ سارہ جیسی لڑکی نے تمھارے لیے باپ سے جھگڑ کر گواہی دے دی۔ جم جیسا مغرور اور بدتمیز امیر زادہ خود تمھارے پاس چل کر دوستی کے لیے آ گیا۔ یہ سب جادو نہیں تو کیا ہے۔۔۔۔؟ مجھے بھی سکھا دو نا یہ سب کچھ۔''

''میں نے ایسی کوئی انہونی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے تم اتنی حیران ہو رہی ہو۔ میں، تم، سارہ اور جم۔۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں، بس انسان کو اِک ذرا سا انسان ہی کی طرح سمجھنے کی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔''

''یہی تو سب سے مشکل کام ہے مائی ڈیئر میڈی۔۔۔۔ انسان کو سمجھنا ہی تو محال ہے۔ لیکن تمھارے ساتھ رہوں گی تو یہ بھی سیکھ لوں گی۔''

اتنے میں ربیکا کو اس کی کسی سہیلی نے آواز دے دی اور مجھے نہر کنارے کھڑے جوزف کا پیغام آ گیا۔ آج وہ پھر مصوری کے موڈ میں تھا۔ آج لندن میں چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اس چیز کا فائدہ اُٹھانے کے لیے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے غائب باہر گھاس کے میدانوں میں آڑھے ترچھے پڑے نظر آ رہے تھے۔ سچ ہے لندن میں رہ کر مجھے بھی دھوپ کی اس نایابی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ جوزف نے تصویر ابھی مکمل نہیں کی تھی لیکن مجھے اس نے اپنی تصویر کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑی سارہ کی

پینٹنگ دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ سارہ اپنے دہکتے رنگ پر دھوپ کی گرمی جھیلتی ہوئی گہرے نیلے سکرٹ میں آسمانی رنگ کی سویٹر پہنے دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تصویر مکمل کر رہی تھی۔ جوزف مجھے اس کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مَیں سارہ کو اور اس کی تصویر کو آخری اسٹروک دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سارہ نے تصویر مکمل کر کے میری طرف رائے طلب نظروں سے دیکھا۔

''بہت اچھی ہے۔۔۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی۔۔۔۔ ایک تشنگی۔۔۔ ایک نامکمل پن کا احساس ہو رہا ہے تمھاری تصویر کو دیکھ کر۔''

''بہت خوب۔۔۔۔ گویا رنگوں کی زبان بھی جانتے ہو۔ ٹھیک کیا تم نے۔۔۔۔ میری ہر تصویر میں تمھیں اس نامکمل پنے کا احساس ملے گا۔ لیکن سر جوزف کے بعد تم پہلے انسان ہو جسے اس کمی کا احساس ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، مَیں تصویر مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہوں۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھاری ہر تصویر کا موضوع کوئی تلاش، کوئی کھوج ہوتی ہے۔ اور شاید وہ کھوج پوری ہونے سے قبل ہی تم ہمت ہار دیتی ہو؟''

سارہ نے اُلجھ کر میری طرف دیکھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے بھلا کس چیز کی کھوج ہو سکتی ہے۔''

''سچ کی کھوج۔''

''سچ۔۔۔۔ سچ کو کھوج کی بھلا کیا ضرورت۔۔۔۔ وہ تو سامنے ہی روشن اور عیاں ہوتا ہے، تم یہ بتاؤ تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔''

''ابھی درمیان میں ہوں، لیکن اس ٹرم پیپر کی وجہ سے بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ سر آئزک کی طرف تھا۔ سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔''

''اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو تم سے ڈر نہیں لگتا۔''

''مَیں نے کہا نا۔۔۔ تم سچی لڑکی ہو۔۔۔۔ اور سچ کو اُجالے کا خوف کیسا؟''

سارہ زور سے ہنسی۔

''مَیں نے بھی کہا تھا نا۔۔۔۔تم واقعی بہت خطرناک ہو، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''

مَیں بھی ہنس پڑا۔

''بے فکر رہو، تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ویسے تم نے جم کو معاف کر کے اس کا دل ہی پلٹ دیا ہے، کل تک جو تمھارا جانی دشمن تھا، آج سارا دن تمھاری خوبیوں کے گن گاتا رہتا ہے۔''

''مَیں یہاں دشمنیاں پالنے تو کبھی نہیں آیا تھا، مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھارے اور سر آئزک کے درمیان تلخی پیدا ہوئی۔''

سارہ نے سر پیٹ لیا۔

''اف۔۔۔۔یہ ربیکا بھی نا۔۔۔۔اس کے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہیں رہ سکتی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا اور میرے درمیان ایسی نوک جھونک چلتی ہی رہتی ہے۔ انہیں دراصل اس بات کا بُرا لگا تھا کہ تیس سال میں آج تک یونیورسٹی میں کسی نے ان کے فیصلے کے خلاف سَر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن مَیں نے ان سے کہا کہ ہر نئے کام کی ایک دن ابتداء ہونی ہی ہوتی ہے۔ وہ مزید بگڑ گئے اور پھر مجبوراً مما کو بیچ میں کودنا پڑا۔ پھر حسب معمول پاپا کو ہار ماننا ہی پڑی۔''

''لگتا ہے تمھیں اپنی مما سے بہت پیار ہے۔''

سارہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''اوہ ہاں۔۔۔۔ میری مما ہی تو میری جان ہیں۔ پاپا تو ہمیشہ مجھے بیٹوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات لگاتے ہیں لیکن مما ہمیشہ میری مرضی کو ترجیح دیتی ہیں، وہی میرے دل کی حالت سب سے بہتر جانتی ہیں۔''

سارہ کی اس کی ماں سے محبت اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

''اب تو وہ تمھارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔ کبھی ملواؤں گی تمھیں ان سے۔''

''ضرور۔۔۔۔ مَیں ایسی خاتون سے ضرور ملنا پسند کروں گا جو بیک وقت سرآئزک اور تمھارے دل پر راج کرتی ہیں۔''

میری تعریف کے انداز پر سارہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''مَیں مما کو تمھاری یہ بات ضرور بتاؤں گی۔''

مَیں اور سارہ اس روز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس بات سے بے خبر کہ دُور کہیں دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے کوئی شخص بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔۔۔۔ اور یہ شخص کوئی اور نہیں تھا۔ میرے ساتھ کھڑی اس صاف دل لڑکی کا باپ آئزک تھا۔ جس کا دل اَب میری طرف سے اتنا صاف نہیں تھا۔

ٹرم پیپر جمع کروانے کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے دن اور رات کا بیشتر حصہ ''ہالوکاسٹ'' سے متعلق ریسرچ کی کتابوں کی ورق گردانی اور نوٹس بنانے میں گزر رہا تھا۔ اس دن بھی مَیں لائبریری میں سہ پہر دیر تک اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا رہا۔ مجھے دراصل اپنی یونیورسٹی سے ''ہالوکاسٹ'' کے حق میں ہی مواد مل سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی میرے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ مجھے ہالوکاسٹ کے حق میں اور اس کے مخالف نظریے میں مقابلہ کر کے حقائق جاننے کا مزید موقع میسر آ گیا تھا۔ اب مَیں دلیل در دلیل بحث کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی کے گیٹ سے نکلتے ہوئے مجھے سارہ کی سفید بیٹل نے کراس کیا۔ گاڑی آگے جا کر رک گئی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ سارہ کے ساتھ ایک میٹھی سی مسکراہٹ والی پکی عمر کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے گاڑی تک چل کر آنے کے وقت میں شاید سارہ اُسے میرے بارے میں کچھ بتا چکی تھی۔ عورت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''اچھا تو یہ ہے تمھاری کلاس کا باغی۔۔۔۔ بھئی یہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔'' سارہ مسکرائی۔

''حماد۔۔۔ یہ میری مما ہیں، مسز جینی آئزک۔''

مَیں نے سر جھکا کر مسز جینی کو آداب کیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، سارہ بولی۔

''کہاں جا رہے ہو، آؤ مَیں تمھیں چھوڑ دوں گی۔''

''ہاں ہاں۔۔۔۔آ جاؤ۔۔۔۔راستے میں گپ شپ بھی رہے گی۔'' مسز جینی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں۔۔۔۔مَیں یہاں قریب ہی پیو راما اسکوائر کے قریب والی لائبریری تک جا رہا ہوں۔بس اگلے سگنل کے پاس ہی ہے، آپ لوگ جائیں۔''

''نہیں بھئی، اتنی آسانی سے تو ہم تمھیں نہیں جانے دیں گے۔'' مسز جینی ہنس کر بولیں۔اگر آج رات ہماری طرف کھانے پر آنے کا وعدہ کرو تو جان چھوٹے گی۔''

سارہ نے بھی سر ہلایا، اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا میرے پاس۔مَیں نے ان سے وعدہ کیا کہ مَیں رات کو ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

OO

دشمنِ خدائی

اس دن عبداللہ کے واپس جانے کے بعد جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دم سے ہی جانے کیوں مجھے ساری خدائی ہی دشمن لگنے لگی تھی۔ ایک دم ہی میرا دل جیسے ہرا بھرا احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ میں جس دن سے صوفی رحمت اللہ سے ملا تھا تب سے اس دن عبداللہ کی مجھ سے اسٹیشن پر ملاقات ہونے تک، میری ایک بھی نماز نہیں چھوٹی تھی۔ لیکن اس دن عبداللہ کے واپس چلے جانے کے بعد میرا دل مذہب سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ جیسے میرے اندر کا یقین ہی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ دُعا اور اس کی قبولیت سے میرا بھروسہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب ایک ڈھکوسلہ لگنے لگا تھا، میری ساری نمازیں چھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ یہ نمازیں، یہ دُعائیں سب بے فائدہ ہیں۔ اگر ان نمازوں سے ان دُعاؤں سے کچھ فرق پڑتا ہوتا تو خدا مولوی صاحب کا دل میرے لیے نرم کر دیتا۔ آج ایمان عبداللہ سے منسوب ہونے کی بجائے مجھ سے منسوب ہوتی۔

مجھے مولوی صاحب کی ہر بات بھی صرف ایک ڈھونگ لگنے لگی تھی، مجھے لگتا تھا کہ وہ شخص سر سے پیر تک صرف ایک دکھاوا ہی تو ہے، جو زمانے کے سامنے اپنی پارسائی کا سوانگ رچانے کے لیے میری محبت کے درپے ہے۔ اسے صرف یہ فکر ہے کہ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدیوں اور نمازیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔ جو صرف یہ چاہتا ہے کہ آتے جاتے اور اُسے بازاروں سے گزرتے دیکھ کر لوگ اس کی تعظیم کے لیے اُٹھ اُٹھ کر اسے سلام کرتے رہیں اور اس کے گزر جانے کے بعد اُونچی سرگوشیوں میں اس کی نیکیوں اور پاک بازی کے گُن گاتے رہیں۔ جنھیں سُن کر وہ اپنی عظمت کے نشے میں خود ہی ہمہ وقت سرشار رہے۔

ایسے اور اس جیسے جانے کتنے خیالات دن رات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے

تھے۔شاید مجھ سے یہ توفیق ہی چھین لی گئی تھی کہ میں کوئی مثبت بات سوچ سکوں۔مولوی صاحب کے پاس جب میں عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو نماز کے بعد کے درس میں عجیب و غریب قسم کے مسائل سننے کو ملتے تھے۔مثلاً ایک دن نماز کے بعد ایک نوجوان مولوی صاحب کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ ایک انوکھا مسئلہ ہے۔اور وہ یہ کہ جب وہ گھر سے کہیں دُور کسی کام کے لیے نکلتا ہے، یا پھر جب وہ دوسرے شہر پڑھنے کے لیے جاتا ہے اور اُسے بورڈنگ میں رہنا پڑتا ہے تو اس سے ساری نمازیں چھوٹ جاتی ہیں۔وہ چاہ کر بھی نماز نہیں پڑھ پاتا کیوں کہ نماز پڑھنے سے اُسے گھر کی یاد اور زیادہ ستاتی ہے؟ اُسے لگتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھے گا تو اور زیادہ غمگین ہو جائے گا، لہٰذا وہ نماز پڑھنے کے بجائے ان اوقات میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے اور فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب تشریف لائے جو اُس بات سے بے حد پریشان تھے کہ ان کا دل حج پر جانے کو نہیں مانتا۔حالانکہ وہ صاحبِ استطاعت ہونے کے ساتھ ساتھ تندرست بھی تھے اور ان پر کوئی ایسی ذمہ داری بھی نہیں تھی کہ وہ خود اور اپنی بیگم کو لے کر حج کے لیے نہ نکل پاتے۔لیکن بقول ان کے، ان کا دل ہی اس طرف مائل نہیں ہو پاتا تھا۔انہیں حج پر جانا ایک بڑی خواری کا کام لگتا تھا، اور جو محبت خدا کے گھر کو دیکھنے کے لیے دل میں ہونی چاہیے تھی، وہ اس محبت سے بالکل عاری تھے۔

ان دنوں میں بڑی حیرت سے لوگوں کے یہ مسئلے سنا کرتا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مولوی صاحب کے جواب ہوتے تھے۔مثلاً ان حج والے صاحب کو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ساری بات توفیق ملنے کی ہے۔فی الحال ان کے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ کم از کم اس بات پر پریشان تو ہوتے ہیں کہ انہیں حج سے رغبت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔فی الحال انہیں پریشان ہونے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔جس دن حج پر جانے کی توفیق نصیب ہوگی، وہاں جانے کی محبت اور عجلت خود بخود دل میں پیدا ہو جائے گی۔ہاں البتہ دُعا ضرور کرتے رہیں کیونکہ پریشانی کی بات تب ہوگی جب دل سے حج نہ کرنے کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔ایک دن اسی طرح دُعا کے متعلق ایک عجیب بات سننے کو ملی۔ایک نوجوان مولوی صاحب کے سامنے پریشان حال بیٹھا اس بات کا رونا رو رہا تھا

کہ اس کی دُعا میں خلوص شامل نہیں ہوتا۔ وہ بس برائے نام ہی خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ نہ ہی اس کی توبہ اور معافی میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔ وہ منافقانہ انداز میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی تو مانگ لیتا ہے لیکن اندر سے اُسے اِس گناہ پر خوشی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر کبھی دوبارہ موقع ملا تو وہ یہ گناہ ضرور دوبارہ بھی بنا کسی حجت اور ندامت کے کر گزرے گا۔

مولوی صاحب نے اُسے بھی جواب میں یہی بات کہی۔ ''توفیق۔'' اسے بھی یہی دلاسا دیا گیا کہ ابھی کچی اور منافقانہ معافی کی توفیق ملی ہے۔ پُرخلوص معافی کی بھی وقت آنے پر مل جائے گی۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ اس منافقانہ اور دکھاوے کی معافی کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ ندامت چاہے دکھاوے کی ہو یا چاہے منافقانہ اُسے پیش کر دینا چاہیے۔

اسی لیے مجھے بھی لگ رہا تھا کہ مجھ سے ہر اچھی بات سوچنے کی اور ہر نیک کام کرنے کی توفیق بھی شاید عبداللہ سے ہوئی اس ملاقات کے ساتھ ہی چھین لی گئی تھی۔ مَیں سارا سارا دن یونہی خالی الذہن بیٹھا رہتا اور اپنے سامنے ہونے والے دُنیا کے تماشے کو دیکھتا رہتا تھا۔

اب مَیں نے شاکر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ خیرو اور غفورے سے بھی کم ہی بات چیت ہوتی تھی۔ صدیقی صاحب بھی میری راہ تکتے رہتے تھے اور پھر انتظار سے اکتا کر خود ہی اسٹیشن پر چلے آتے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔ سبھی یہ جانتے تھے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے لیکن میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیرو روزانہ اِس اُمید پر صبح و شام تانگہ جوت کر میرا اسٹیشن کے باہر انتظار کرتا رہتا کہ شاید مجھے اپنی منت پر جانا ہو، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میری ہر منت دم توڑ گئی تھی۔ ایمان کو مانگنے کے بعد میرے پاس مانگنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی کسی مُراد کے پورے ہونے کا یقین ہی دل میں باقی بچا تھا۔ مَیں دُنیا کی ہر خوشی اور ہر غم سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ مَیں ایمان کی قریب آتی ہوئی شادی کے دن یوں گن رہا تھا جیسے کوئی پھانسی کا قیدی کال کوٹھڑی میں اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے۔

وہ ایک ایسا ہی دن تھا، بوجھل، بے نُور، انتہائی طویل اور اُکتا دینے والا۔ مَیں سہ پہر

کو پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی لگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے پچھلے پھاٹک پر بہت دیر سے رُکی ہوئی تھی۔ تھک کر مَیں لیمپ پوسٹ کے نیچے بڑے تھڑے پر بیٹھ گیا اور جس طرف سے مال گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہونا تھا اس طرف کے سگنل کو دیکھنے لگا۔ آج غفورا بھی نہیں تھا اور تمام مال مجھے ہی اتروانا تھا، دفعتاً میری نظر سگنل سے ہوتی ہوئی نیچے پٹریاں کراس کر کے پلیٹ نمبر 2 کی طرف آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔ پر کون تھا یہ آدمی۔ اچانک مَیں اپنے حواس میں ایک جھٹکے سے لوٹ آیا۔ ارے ۔۔۔۔ یہ تو شاکر تھا، اپنی مخصوص ڈرائیوروں والی سفید وردی میں، جس کی وجہ سے مَیں دُور سے اُسے ریلوے کا ہی کوئی اہلکار سمجھ بیٹھا تھا۔ شاکر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ مَیں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکر نے قریب آتے ہی مجھے زور سے بھینچ لیا اور بہت دیر تک بنا کچھ کہے چُپ چاپ مجھے گلے لگائے کھڑا رہا اور جب مجھ سے علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''حماد بابا۔۔۔۔ کیا میرا گھر اس قابل بھی نہیں تھا کہ آپ وہاں کچھ دن رہ سکتے۔''

''تم جانتے ہو ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔ وہ میرا دوسرا گھر ہے۔۔۔۔ لیکن اگر گھر میں ہی رہنا ہوتا تو پھر پہلا گھر ہی کیوں چھوڑتا۔۔۔۔؟ لیکن تمھیں یہاں کا پتہ کس نے دیا۔۔۔

''مَیں جانتا تھا نگہت زیادہ دن تک یہ بات چھپا نہیں پائے گی۔''

''مَیں چاہتا تو آپ کو گھر سے نکلنے کے بعد پہلے دن ہی تلاش کر لیتا بابا۔۔۔۔ لیکن مَیں نے صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ آپ بُرا مان جائیں گے۔ آج بھی واقعی مَیں نگہت کے بتانے پر ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس نے آپ کو ابھی گھر بلایا ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔''

''ابھی۔۔۔۔ لیکن مجھے اس وقت بہت کام ہے۔۔۔۔ مَیں شام کو۔''

''نہیں بابا۔۔۔۔ آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ اگر جلدی نہ ہوتی تو نگہت مجھے کبھی آپ کا پتہ نہ دیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا کتنا مان رکھتی ہے۔''

شاکر کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے مال گاڑی کا معاملہ ایک دوسرے سینئر قلی کے ہاتھوں میں سونپ کر اس کے ساتھ اسٹیشن سے نکلنا ہی پڑا۔ باہر ایک پُرانی اوپل کھڑی

تھی۔ شاکر جانتا تھا کہ میں کمشنر صاحب یا گھر کی کسی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے وہ شاید کسی جاننے والی کی کار لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں شاکر نے بتایا کہ امی اب اندر سے ٹوٹ چکی ہیں اور میری تلاش میں عباد کو ہر طرف دوڑا چکی ہیں۔ لیکن کمشنر صاحب کے ڈر سے کوئی کھلے عام میری جدائی کا ذکر گھر میں نہیں کرتا۔ اب وہ سب ہی جان چکے ہیں کہ میں اپنے کسی دوست کی طرف نہیں گیا تھا اور گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی تنہا کہیں رہ رہا تھا۔ امی نے شاکر سے بھی مجھے تلاش کرنے کو کہا تھا اور آخر کار شاکر کو ان کی تسلی کے لیے انہیں بتانا پڑا تھا کہ میں کبھی کبھار پرانی حویلی میں نگہت اور شاکر سے ملنے کے لیے آتا رہا ہوں اور خیریت سے ہوں۔ امی نے شاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ اب اگر کبھی میں پرانی حویلی آؤں تو شاکر چپکے سے امی یا عباد کو اطلاع کر دے۔ میں نے چونک کر شاکر کی طرف دیکھا۔ کہیں میرا بلاوہ اسی پروگرام کا ہی تو کوئی حصہ نہیں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی کو ملامت کی۔ شاکر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ورنہ وہ مجھے یہ سب تفصیل بتاتا ہی کیوں؟

کچھ ہی دیر میں ہم پرانی حویلی کے پھاٹک نما گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ شاکر نے مجھے گیٹ پر اُتارا اور مجھے گاڑی واپس کر کے جلد آنے کا کہہ کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام کے ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ حویلی پر اک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ سے اندر گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر نگہت پر پڑی جو بے چینی سے حویلی کے بغلی دالان میں ٹہل رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

''اوہ بھیا۔۔۔۔ کہاں رہ گئے تھے آپ۔۔۔۔ کتنے دن سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں مجبوراً مجھے آج ابا کو آپ کے پیچھے بھیجنا پڑا۔ کیا آپ نے ہم سب سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔۔۔۔ تبھی آپ مجھ سے بھی ملنے نہیں آئے نا۔''

نگہت کی آنکھوں میں شکوہ تھا، میں نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی۔

''بڑی چالاک ہو۔۔۔۔ جانتی ہو کہ میرا پتہ بتانے پر ڈانٹ پڑے گی مجھ سے اس لیے پہلے ہی سے تیاری کر رکھی ہے مجھ سے ناراض ہونے کی۔۔۔ ہاں؟''

''بات ہی ایسی تھی۔۔۔۔ ورنہ میں آپ کا پتہ کبھی کسی کو نہ دیتی۔ دراصل حیا آپ

سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکی ہے۔ لیکن تب بھی آپ کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔ مَیں نے اُسے تب یہ کہا تھا کہ شاید آپ ایک آدھ دن میں آئیں گے تو مَیں آپ کو آج کے دن دوبارہ آنے کا کہوں گی۔ تب وہ بھی آ جائے اور آپ سے بات کر لے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور آپ مجھ سے ملنے آئے ہی نہیں اور آج کا دن بھی آ گیا جب مَیں نے حیا کو یہاں دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ بس اسی پریشانی میں ابا کو آپ کی طرف بھیجنا پڑا۔"

میرے لیے حیا کی آمد واقعی بہت حیرانی کا باعث تھی۔ وہ نازک سی لڑکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اُسے دو مرتبہ اپنے قفس جیسے گھر سے نکل کر اتنی دُور تک یہاں آنا پڑا تھا۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر سے نکلنا حیا کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہوگا۔

"کہاں ہے حیا۔۔۔۔؟"

"مَیں نے اُسے حویلی کے بڑے برآمدے والے گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ مَیں اسی پریشانی میں یہاں ٹہل رہی تھی کہ اگر آپ ابا کو اسٹیشن پر نہ ملے تو مَیں حیا کو کیا جواب دُوں گی۔ آپ اس سے دو گھڑی وہیں مل لیں، مَیں ابھی آتی ہوں۔"

نگہت نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ میں گومگو کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر چلتے چلتے مجھے کچھ خیال آیا۔ مَیں نے جاتی ہوئی نگہت سے آواز دے کر پوچھا۔

"لیکن حیا یہاں تک اکیلی آئی کیسے۔۔۔۔؟"

"وہ اکیلی نہیں آئی، اُس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ اندر ہماری طرف اماں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔"

نگہت پلٹ کر چلی گئی، مَیں مزید اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ حیا اپنی امی کے ساتھ آئی ہے ۔۔۔تو کیا اس کی ماں کو بھی اس بات کی خبر ہے جو حیا مجھ سے کہنے کے لیے اتنی دُور آئی ہے؟

میں اسی شش و پنج میں مبتلا چلتا ہوا حویلی کے بڑے برآمدے تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے ہو کر مَیں نے اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی اور پھر مَیں قدم بڑھا

کر اندر داخل ہو گیا۔ حیا نے آہٹ سُن کر چونک کر مجھے اندر آتے دیکھا اور بوکھلاہٹ میں وہ کھڑی ہو گئی۔ جلدی میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ اس دن مَیں نے پہلی مرتبہ حیا کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایمان سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ شاید عمر میں دو تین سال ہی اُس سے چھوٹی ہو گی۔ اس کی پلکیں بھی ہر لمحہ ایمان کی پلکوں کی طرح لرزتی ہی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایمان کی طرح ہی بڑی سی چادر میں لپٹے سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی ان جانے جذبے کی طاقت سے یہاں تک تو آ گئی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ مجھے اس کی دلجوئی کے لیے خود ہی بات شروع کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید ہم دونوں ہی یوں خاموش کھڑے رہتے۔

''آپ کھڑی کیوں ہیں۔ پلیز بیٹھ جایئے۔''

حیا چُپ چاپ بیٹھ گئی، مَیں بھی سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''معافی چاہتا ہوں آپ کو میری وجہ سے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی نگی نے بتایا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔''

حیا نے پلکیں اُٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔

''آپ اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔''

مجھے اس براہِ راست طرزِ تخاطب کی توقع نہیں تھی۔

''شاید میری قسمت میں ہی یہ سزا لکھ دی گئی تھی۔ اور پھر تقدیر سے کیا اُلجھنا۔۔۔۔؟''

''آپ جو محبت کر رہے ہیں وہ اب صرف کتابوں اور افسانوں میں باقی رہ گئی ہے۔۔۔۔ ایسی محبت کو سمجھنے والے اب اس دُنیا میں باقی نہیں ہیں۔''

مَیں نے حیرت سے اس نازک سی گل اندام لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اسکول، کالج سے واپس آئی ہوئی لگتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی بڑی بڑی باتوں کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ رکھتی ہیں۔

''محبت کرنا نہ کرنا اپنے اختیار میں ہی ہوتا تو پھر مسئلہ کس بات کا تھا۔ محبت کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی محبت کو اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ کوئی اسے سمجھے گا یا نہیں۔''

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔

''کاش آپ کا اور ایمان آپی کا میل ممکن ہوتا۔ لیکن ایک اس میل کے نہ ہونے سے آپ باقی ساری دُنیا کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ آپ کے لیے ایمان باجی کا یہی پیغام لائی ہوں مَیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ خدا کے لیے یوں در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ ان کی آپ سے آخری التجا ہے۔''

اوہ۔۔۔۔ تو حیا اُسی ماہ رُو کا پیغام لے کر آئی تھی۔ گویا اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا۔ شاید وہ اس دن اسٹیشن پر میری حالت کو ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ لوگ کتنے معصوم اور بھولے ہوتے ہیں۔ بھول جانے کا کہہ کر سمجھتے ہیں کہ دوسرا شاید سب بھول ہی جائے گا۔ چلو اس سنگ دل کو مجھ پر اتنا رحم تو آیا کہ اُس نے نامہ بر بھیج کر مجھے اپنا درد اور اپنی وحشت بھول جانے کا پیغام تو بھیجا۔ اس ایک جنم کے لیے تو اس کی یہ مہربانی بھی کچھ کم نہ تھی۔

''اگر آپ کی ایمان آپی کی تسلی اس بات سے ہوتی ہے کہ مَیں واپس اپنے رشتوں کے پاس چلا جاؤں تو آپ ان سے جا کر یہی کہہ دیجئے گا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اگلی ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزاریں کہ ان کی وجہ سے کوئی گھر سے بے گھر ہوا تھا۔''

حیا نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

''میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہنا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی اذیت دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو آپی کے احساسات کا ہی خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟''

''پھر آپ ہی بتائیے۔۔۔۔ میں انہیں یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ اس دُنیا کے نہیں لگتے۔۔۔۔ یہ دنیا آپ جیسوں کے لیے بنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکے تو میری درخواست پر غور ضرور کیجئے گا۔ یہ صرف آپی کی ہی خواہش نہیں ہے۔ یہ میری بھی آپ سے یہی التجا ہے۔ اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر ہماری کیا حالت ہوئی تھی۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔۔ اس دن امی نے بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ انہیں بھی آپ

ساری دنیا سے الگ نظر آئے تھے۔ کاش ہماری بدنصیبی کے ستاروں کا سایہ آپ پر کبھی نہ پڑتا۔"

اتنے میں نگہت کمرے میں داخل ہوئی۔ حیا اُسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ نگہت نے اسے بتایا کہ اس کی امی جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ حیا نے مجھ سے رخصت لی اور جانے کے لیے پلٹی۔ میں گم سم سا بیٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک حیا رکی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں چھپا تہ کیا ہوا کاغذ کا رقعہ نکالا۔ اور میرے قریب آ کر اُسے میری طرف بڑھایا۔

"یہ آپی نے مجھے اس وقت آپ کو دینے کا کہا تھا جب مجھے لگے کہ میری درخواست آپ کی قبولیت پانے کے قابل نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔ حیا پلٹ کر چلی گئی اور ہاتھ میں سفید کاغذ کی وہ پرچی تھی کی تھی رہ گئی۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ نگہت بھی حیا کو چھوڑنے باہر چلی گئی تھی۔ مَیں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ محبوب کا خط کھولنے اور اُسے پڑھنے کی لذت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنھوں نے خود اس تجربے سے گزر کر دیکھا ہوتا ہے، وہ چند لمحے کسی قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتے، میرے لیے تو ویسے بھی یہ اس مہ جبیں کے پہلے چند لفظ تھے جو تحریر کی صورت میں اُس نے بھیجے تھے۔ ورنہ لوگ تو ہزاروں مرتبہ کے کہے، سنے اور پڑھے ہوئے لفظوں کو بھی کسی تبرک کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں دن میں ہزار ہزار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار انہیں وہ تحریر اتنی ہی نئی لگتی ہے جتنی پہلی مرتبہ لگی تھی۔ میری نظریں تیزی سے کاغذ پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ خوبصورت لکھائی میں صرف چند جملے ہی لکھے ہوئے تھے۔ بنا کسی القابات اور روایتی سلام و دُعا کے بغیر۔

"آپ کے ارادے اور اس کی سچائی کی عظمت پر شک نہیں ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔۔۔۔ ضد تو دشمنی کی پہچان ہے۔

آپ گھر واپس چلے جائیں اور یہ دشمنی ختم کر دیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری التجا ہے۔"

☆☆☆☆

شاید ان چند لمحوں میں مَیں نے بیسیوں بار اس رقعے کو پڑھا ہوگا۔ ہر دفعہ اس اُمید پر کہ شائد کوئی لفظ مجھ سے پچھلی مرتبہ چھوٹ گیا ہو۔ شائد مجھ سے پڑھنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ دراصل مَیں اب تک خود کو یقین ہی نہیں دلا پایا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اس گل رُخ کی تحریر ہے جو اس نے صرف میرے لیے لکھی ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔۔ حماد امجد رضا کے لیے۔۔۔۔ کیا زندگی مزید جینے کا اس سے بڑا کوئی اور بہانہ ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کاغذ کے ٹکڑے میں، ان لفظوں کی پور پور سے اور اس روشنائی کے ہر نکتے سے اس کی تصویر جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کاغذ نہ ہو۔ ایمان خود میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط میرے لیے پوری ملاقات سے بھی بڑھ کر تھا۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی، قریب ہی چند کاغذ اور ایک پینسل میز پر دھری پڑی تھی۔ مَیں نے پینسل اُٹھائی اور کاغذ پر چند سطور کھینچ دیں۔

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تُم کو خبر ہونے تک

مَیں نے اس کے گھر میں غالب کو بکھرے پایا تھا، غالب اُس کا پسندیدہ شاعر تھا، مَیں نے اسی کے پسندیدہ شاعر کی زبان اپنا حال بیان کر دیا تھا۔ میری بات تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید اپنے شاعر کی بات اس کو سمجھ میں آ جائے۔ دوسرے کاغذ پر میں نے نکہت کے لیے ایک پیغام لکھا کہ اگر حیا اب تک نہیں گئی ہے تو وہ اس کے ذریعے یا پھر کسی اور طریقے سے یہ پیغام ایمان تک پہنچا دے۔ مَیں ان دونوں کاغذوں پر سنگ مرمر کا بنا ہوا خوبصورت سا چھوٹا وزن رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا، مَیں زیادہ دیر وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ امی نے شاکر کے علاوہ بھی حویلی کے کسی نوکر کو میرے آنے پہ اطلاع دینے کا پابند کر رکھا ہو۔ میں حویلی کے پھاٹک سے گزرتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ کچھ ہی دور مجھے ایک تانگہ مل گیا اور مَیں اسے اسٹیشن کا پتہ دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مَیں اپنے خیالوں میں اور اس کاغذ کے ٹکڑے کے دل کے اتنے پاس ہونے کے

احساس میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹیشن پہنچ گیا۔

شام ڈھل رہی تھی، پلیٹ فارم پر پہنچا تو صدیقی صاحب کا خاص بنگالی نوکر جوان کا باورچی بھی تھا، پلیٹ فارم پر میری ہی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ لہرایا، وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔

''وہ حماد شاب۔۔۔۔آپ کو اُدھر بلاتے ہیں۔۔۔۔آپ کے لیے چاول موسلی بنایا ہے ہم نے۔''

مَیں نے تھکن کا عذر پیش کیا لیکن مَیں جانتا تھا کہ ابراہیم اب مجھے ساتھ لیے بنا یہاں سے نہیں ٹلے گا۔ صدیقی صاحب نے اُسے کچھ اسی قسم کی ہدایات دے کر بھیجا ہوگا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ ہی صدیقی صاحب کے بنگلے جانا پڑا۔ وہ برآمدے میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر وہ بھی کھل سے گئے۔

''ہاں میاں۔۔۔۔اب بھلا ہماری یاد کیوں آنے لگی۔ اب تو جناب کی صورت دیکھے بھی ہفتہ ہفتہ ہو جاتا ہے۔''

مَیں مسکرایا۔۔۔۔''ایسی بات نہیں ہے، آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو آپ ہر دم میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔''

صدیقی صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''لفظوں کی کبھی بھی کمی نہیں رہی تمھارے پاس۔ کبھی تو کسی کو ناراض ہونے کا موقع دیا کرو حماد میاں۔''

صدیقی صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے مَیں انہیں کس طرح اور کیا جواب دیتا رہا۔ میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ بس صدیقی صاحب کی دلجوئی کے خیال سے ان کا ساتھ دیتا رہا۔ ابراہیم نے جلد ہی کھانا لگا دیا۔ وہ ہمیشہ سے چاول مچھلی بہت لذیذ بناتا تھا۔ اور پھر کھانے کے دوران وہ آس پاس ٹہلتا رہتا تاکہ ہم اس کے کھانے کی تعریف کر سکیں۔

انسان ہمیشہ سے صرف اپنے ہُنر کی تعریف کا ہی تو بھوکا رہا ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کے پیچھے کی تاریخ کو اگر کھنگالا جائے تو آپ کو کہیں نہ کہیں اس بھوک کا سراغ

ضرور ملے گا۔ یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ، کچھ سب سے بڑھ کر کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے، تب انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں مجھے کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ تعریف اور سراہنے کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو ہم ابھی تک پتھر کے دور میں ہی جی رہے ہوتے۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے صدیقی صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر صحن میں بنے لکڑی کے چھوٹے سے سفید پھاٹک نما گیٹ تک آئے۔ میں رخصت لے کر نکلنے لگا تو انہوں نے پلٹنے سے مجھے روک لیا کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے چہرے پر کچھ کھوج رہے ہوں۔

''زندگی کسی ایک رشتے کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اور پھر ہمیں اسے اکیلے ختم کرنے کا حق ہی کہاں ہے۔ ہم اپنی زندگی اپنے لیے جی ہی کب پاتے ہیں، یہ مختصر زندگی تو دوسروں کے لیے جینے میں ہی کٹ جاتی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم دوسروں کے لیے جینا خوب جانتے ہو۔''

صدیقی صاحب میرا کندھا تھپک کر واپس اندر مڑ گئے۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر میونسپیلٹی کے لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن کی پیلی (Yellow) روشنی سڑک پر دائروں کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رات کو سڑک پر دُور دُور پھیلی یہ گول روشنیاں ہمارا فاصلہ تو کم نہیں کرتیں البتہ ہمارا سفر آسان کر دیتی ہیں۔ اچھے دوستوں کی طرح، جو اگر ساتھ ہوں تو غم بھی خوشی کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ مجھے اُس وقت کامران کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد اب تک فرداً فرداً تمام حالات کے بارے میں اپنے خطوط کے ذریعے باخبر رکھا تھا، لیکن عبداللہ سے ملاقات کے بعد میں اُسے بھی خط نہیں لکھ پایا تھا۔ میں پیدل ہی پلیٹ فارم کی طرف چلتا رہا۔ جانے صدیقی صاحب نے آج میرے گھر سے واپسی کے وقت دوسروں کے لیے جینے والی بات کیوں کہی تھی، کتنی عجیب بات تھی، اپنے حالات سے صرف میں ہی واقف نہیں تھا باقی میرے پاس رہتے بھی لوگ میرے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کتنے لوگ صرف ایک میری وجہ سے پریشان تھے۔ مجھے اب اس شہر سے کہیں

اور چلے جانا چاہیے۔ بنا کسی کو کچھ بتائے، کچھ بولے۔۔۔۔ ہاں واقعی۔۔۔۔ اب مجھے کس بات کا انتظار تھا، مَیں کیوں اس کی رخصتی قریب آنے کے دن گننے کے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ یہ کہانی تو اب ختم ہو چکی تھی، پردہ کتنے دن بعد گرنا ہے، اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔۔۔۔؟

یہ کیسا ستم تھا۔۔۔۔ میری محبت لٹ رہی تھی اور صدیقی صاحب اور ان جیسے اور کتنے ہوں گے جو اس وقت بھی مجھ سے کسی ڈوبتے جہاز کے کپتان کا سا وقار توقع کرتے تھے، ایک ایسے بحری جہاز کا کپتان جو یہ جانتا ہو کہ اس کے آدھے ڈوبے ہوئے جہاز کو پورا غرق ہونے سے اَب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، پھر بھی وہ اپنے عملے اور مسافروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جہاز کے شکستہ عرشے پر سینہ تانے کھڑا رہتا ہے۔ اور آخرکار جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو جاتا ہے، جانے ان لوگوں نے مجھے اتنا دلیر اور اتنے بڑے دل والا کیسے سمجھ لیا تھا۔۔۔؟

OO

یہودی بستی

شام کو جب مَیں سارہ کے گھر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تب کامران آ گیا۔

''کیا۔۔۔تم اس یہودی بستی میں جاؤ گے، ناممکن۔''

''اوہو۔۔۔مَیں کسی یہودی بستی میں نہیں بلکہ سارہ کے گھر جا رہا ہوں جو نیورسٹی کے پچھلے بلاک میں ہی واقع ہے۔''

''جانتا ہوں، اُسی کو مَیں یہودی بستی کہتا ہوں۔تمھارے ایڈمیشن سے پہلے دو مرتبہ تمھارے ہی کام سے گزر ہوا تھا میرا وہاں سے۔ایک عجیب سی حقارت تھی ان سب کی نظروں میں میرے لیے جیسے میں کوئی انسان نہیں، کسی نالی کا کیڑا ہوں۔کسی نے میری بات کا صحیح جواب تک نہیں دیا۔تم نہیں جانتے، صرف تمھارے فارم اس آئزک سے تصدیق کروانے میں مجھے کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔میری مانو تو وہاں جانے کا ارادہ بدل دو۔''

مَیں نے مُسکرا کر کامران کے کاندھے کو تھپتھپایا اور اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے لی۔

''فکر مت کرو، تمھارا دوست اتنی میٹھی گولی نہیں ہے جسے وہ لوگ اتنی آسانی سے نگل جائیں گے۔مَیں صرف سارہ اور اس کی مما کی وجہ سے وہاں جا رہا ہوں۔ان لوگوں سے ملنا میرے ٹرم پیپر میں بھی میری مدد کرے گا۔مَیں ان لوگوں کا رہن سہن قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

کامران نے ٹھنڈی سی سانس لی۔

''اچھا۔۔۔پھر اس یہودی حسینہ کو میرا اسلام بھی کہہ دینا۔۔۔اور یہ بھی کہنا کہ آئندہ جب بھی تمھیں اپنے گھر کھانے پر بلائے تو ساتھ ہی تمھارے جگری دوست کامران کو بھی ضرور بلائے۔کیونکہ تم اس کے بغیر کھانا حلق سے نیچے نہیں اُتار سکتے۔''

مَیں آٹھ بجے کے لگ بھگ سر آئزک کے بنگلے پہنچ گیا۔ سارہ نے گیٹ پر ہی میرا استقبال کیا۔ مسز جینی اندر لاؤنج میں موجود تھیں لیکن سر آئزک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سارہ کا گھر بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز سے نفاست اور اعلیٰ معیار ٹپک رہا تھا۔ سارہ کی بنائی ہوئی بہت سی پینٹنگز دیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا عبادت خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ جس کے چوبارے کے گرد بہت سی موم بتیاں ایک خاص ترتیب میں رکھی گئی تھیں۔ ضرور ان موم بتیوں کا تعلق بھی ان کی عبادت کے کسی خاص حصے سے ہوگا۔ سارہ انتظامات میں لگ گئی اور مسز جینی میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''ہاں تو اب بتاؤ، یہاں تک کیسے پہنچے؟ تمھارے ملک کے بارے میں مَیں نے بہت سنا ہے، لیکن تم اتنے پُر اسرار نہیں لگتے جتنی پُر اسرار کہانیاں تمھارے لوگوں کے بارے میں سنی تھیں؟

''ایسا کچھ خاص ہے نہیں میرے پاس بتانے کے لیے، اور دوری ہمیشہ چیزوں کو پُر اسرار بنا دیتی ہے۔ قریب آنے پر چیزوں اور لوگوں کی پُر اسراریت ختم ہو جاتی ہے تبھی میں آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

سارہ جو قریب ہی میز پر پھلوں کی ٹوکری سجانے میں مشغول تھی میری بات سُن کر ہنس پڑی اور ماں سے کہنے لگی۔

''آپ ان سے کسی بات کے سیدھے جواب کی توقع مت کیجئے گا۔ اسے سوالوں کے جواب میں سوال کرنے کی عادت ہے۔''

مسز جینی ہنس پڑیں۔ مَیں نے اپنے بارے میں انہیں مختصراً بتا دیا۔ مسز جینی غور سے سنتی رہیں۔ مَیں نے ان سے سر آئزک کے بارے میں پوچھا۔

''وہ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ ان کی عبادت کا وقت ہے۔ دراصل تمھارے معاملے کی وجہ سے ان میں اور سارہ میں کچھ تناؤ سا چل رہا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ اس لیے ذرا دیر سے ہی آئیں گے۔''

مَیں حیرت سے اس باوقار سی عورت کو دیکھتا رہا، کس قدر آسانی سے انہوں نے بنا کچھ لگی لپٹی رکھے سب سچ سچ بتا دیا تھا۔ سارہ بھی یقیناً انہی کا پرتو ہوگی۔ وہ بھی انہی کی طرح

صاف دل اور سچی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کوئی بھی بات بنا دیتا لیکن اپنے گھر کی اندرونی بات کبھی نہ بتاتا۔

"اوہ۔۔۔۔ پھر تو آپ کو مجھے یہاں مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے باپ بیٹی کے بیچ تناؤ مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے۔"

"نہیں۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ سارہ نے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مجھے، مَیں خود بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ سارہ کبھی کسی غلط آدمی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ تم سے مل کر مجھے اس بات کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا ہے۔"

کچھ ہی دیر میں سر آئزک بھی گھر کے پچھواڑے سے نمودار ہو گئے۔ آج واقعی وہ اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، جسم پر لمبا سا چغہ اور ہاتھوں میں لکڑی کی بڑی سی تسبیح۔ مجھ سے انہوں نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر ہم موسم کی اور اِدھر اُدھر کی معمول کی باتیں کرتے رہے پھر سارہ نے ہمیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ سارہ اور مسز جینی نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بہت سی ایسی ڈشز تیار کی تھیں جو اس سے پہلے مَیں نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ مثلاً کھجور کا ایک خاص قسم کا حلوہ جو اناناس اور ناریل کی قاشوں میں اُبال کر بھرا گیا تھا۔ ہرن کے گوشت کے نمکین کباب اور اس جیسی اور جانے کیا کیا سوغاتیں۔

مَیں نے مسز جینی سے کھل کر کھانے کی تعریف کی اور انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارہ بھی واقعی اتنا کچھ بنا سکتی ہوگی۔ جواب میں سارہ صرف مسکراتی رہی۔ سر آئزک نے سارہ سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ کھانے کے بعد مسز جینی اور سارہ کچن میں مصری قہوہ بنانے کے لیے چلے گئے۔ مَیں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ گھر میں جو دو چار ملازمائیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں، انہوں نے صرف کھانا لگانے اور برتن اُٹھانے میں ماں بیٹی کی مدد کی ورنہ زیادہ تر کام خود سارہ اور مسز جینی نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ یہودیوں کا دوسروں کو عزت دینے کا ایک خاص انداز تھا۔ مجھے کامران کی بات یاد آئی جو اُس نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

سارہ اور جینی کے جانے کے بعد میں اور سر آئزک ڈائننگ ٹیبل پر تنہا رہ گئے، انہوں

نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ تم کوئی بہتر پرچہ تیار کرو گے۔ کیونکہ یہ آئندہ ہمیشہ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں رہنے والی ایک چیز ہوگی۔'' میں ان سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا۔

''یقیناً سر۔۔۔۔ میں پوری تحقیق کے بعد ہی اپنا نظریہ اس پرچے کی صورت میں جمع کراؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔''

''تم نے اس سلسلے میں لائبریری میں موجود کتابوں سے تو کافی مدد لی ہوگی۔''

''جی بالکل۔۔۔۔ نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری سے بلکہ شہر کی دیگر لائبریریوں سے بھی میں نے کافی مدد لی ہے۔ شہر میں اور انٹرنیٹ پر جتنا مواد مجھے مل سکتا تھا میں نے اکٹھا کر لیا ہے۔'' میری بات پر سر آئزک نے چونک کر سر اُٹھایا۔

''کس کس کتاب سے حوالے جمع کیے ہیں تم نے۔''

میں نے انہیں سر ڈیوڈ رونگ کی کتاب سے لے کر اب تک اس موضوع پر چھپنے والی تمام کتابوں کے نام گنوا دیے۔ سر آئزک کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ کچھ تلخ لہجے میں بولے۔

''اتنے اہم موضوع پر لکھنے کے لیے تم نے ان گھٹیا اور بے تحقیق قسم کی کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ اگر تمھیں مدد کی ضرورت تھی تو مجھے کہتے میں تمھیں ان سے ہزار درجہ بہتر کتابوں کے نام بتا سکتا تھا۔''

''اتنے میں سارہ اور مسز جینی بھی قہوہ لے کر میز پر آ چکی تھیں۔ سارہ نے اپنے باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

''پاپا بہتر ہوگا کہ ہم یونیورسٹی کی باتیں یونیورسٹی میں ہی ڈسکس کریں، یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

لیکن سر آئزک کے لہجے کی تلخی اب بھی برقرار تھی۔

''یہ بات صرف یونیورسٹی یا لائبریری میں جمع کیے جانے والے ایک ٹرم پیپر کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارے عقیدے اور نظریے کی بات ہے۔ اور میں کسی کو بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کے بیچ ممتاز اور منفرد نظر آنے کے لیے اپنے اس نظریے

کا غلط پرچار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"سر مَیں نے کبھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یا منفرد نظر آنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ اور پھر مَیں غلط ہوں یا صحیح، اس کا فیصلہ آپ ابھی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ پہلے میرا پرچہ تو جمع ہو جانے دیں۔ پھر مَیں اس پر کیے گئے اعتراضات کا جواب بھی پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ دوں گا۔"

سر آئزک نے کڑے تیوروں کے ساتھ میری بات سُنی۔ پھر انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا اور وہاں سے اُٹھ گئے۔ لیکن جاتے جاتے انہوں نے عبرانی میں مسز جینی سے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ گھر میں ایک غلط مہمان کو مدعو کیا گیا ہے۔ سارہ نے احتجاجی انداز میں زور سے سر آئزک سے صرف اتنا کہا۔

"پاپا۔۔۔۔"

"سر آئزک اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ مَیں عبرانی زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سارہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور وہ پیر پٹختے ہوئے باپ کے پیچھے اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مَیں نے مسز جینی سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے کھلے دل سے اپنی غلطی تسلیم کی کہ ان کے شوہر کی وجہ سے بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات کے لیے انہوں نے مجھ سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن مَیں نے فوراً انہیں روک دیا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مجھے یہاں آ کر واقعی بہت اچھا لگا۔ آپ سے ملنا بھی زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ ہے۔ آپ کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دراصل مَیں سمجھتی تھی کہ تمھارے یہاں آنے سے آئزک کو تمھارے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملے گا۔ اور اُن کے اور سارہ کے بیچ میں تناؤ میں کچھ کمی آئے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ مَیں نے آج تک پوری زندگی میں کبھی آئزک کو اس قدر بدتہذیب برتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔"

مَیں مسز جینی کا ہاتھ تھپک کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ انہوں نے باہر تک مجھے چھوڑنے کے لیے آنا چاہا لیکن مَیں نے انہیں روک دیا کہ ہمارے ہاں بڑے چھوٹوں کو یوں شرمندہ نہیں

کرتے۔ مَیں باہر نکلا تو ہوا خنک تھی اور ہوا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ذرّے شامل ہو کر اِدھر اُدھر ڈولتے ہوئے گر رہے تھے۔ مَیں نے اپنی جیکٹ کے کالر اُٹھا لیے اور ڈورا ینٹوں سے بنی پکی روش پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے سارہ مجھے آوازیں دیتی، اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُس نے جلدی میں کوئی گرم چیز بھی اوپر اوڑھنے کے لیے نہیں لی تھی اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کپکپانے لگی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔۔ تم مجھ سے وداع لیے بغیر کیسے نکل پڑے ۔۔۔۔ مَیں تو پاپا سے بات کرنے کے لیے دو گھڑی اندر کیا گئی تم تو باقاعدہ رخصت ہی ہو لیے۔؟''

''جس غصے میں تم وہاں سے گئیں تھیں۔ مجھے نہیں لگا تھا کہ تم جلد واپس آؤ گی۔ اور تمھاری مما بے چاری خواہ مخواہ میرے سامنے معذرتیں پیش کر کر کے تھک جاتیں۔ سو مَیں نے سوچا کہ نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ میں رات دیر گئے تمھیں فون ضرور کرتا۔''

سارہ کے چہرے پر بھی خجالت سی تھی۔

''مجھے پاپا سے اس رویے کی اُمید نہیں تھی ۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا ۔۔۔۔ پلیز ۔۔۔'' آج مجھے احساس ہوا کہ اس باہمت لڑکی کے اندر بھی ایک بے حد نازک سا دل دھڑکتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں، مَیں نے جلدی سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یقین جانو مجھے سر آئزک کی کوئی بھی بات بُری نہیں لگی۔ انسان اپنے نظریات کے بارے میں جذباتی ہو ہی جاتا ہے۔ وہ تو انہوں نے خود اس بات کا ذکر چھیڑ دیا تھا ورنہ مَیں اس جگہ کبھی اِن سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا۔ تم یقین کرو، یہاں آ کر میرے دل میں تمھاری، تمھاری مما اور سر آئزک کی عزت اور زیادہ بڑھی ہے۔ اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور یہ مَیں پورے خلوص دل سے کہہ رہا ہوں۔''

سارہ کچھ دیر تک یونہی چُپ سی کھڑی رہی۔ مَیں جانتا تھا اُس جیسی وضع دار لڑکی کے لیے یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو سکتا تھا۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی اور اَب باقاعدہ برف باری شروع ہو گئی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے ہم دونوں کے بالوں میں چاندی سی بکھیرنے لگے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر سارہ کے کاندھوں پر ڈال دی، اور اس کے بال بکھیر دیئے۔

''چلو اب تم اندر جاؤ۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں تمھیں کچھ ہو گیا تو سر آئزک واقعی میرا داخلہ یونیورسٹی میں بند کر دیں گے۔''

میرا یہ وار کارگر رہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا دیکھ کر مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا۔ اُس نے ہلکے سے مجھے چھیڑا۔

''آج احساس ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کو کیسے جیت لیتے ہو۔ لیکن یاد رہے یونیورسٹی میں تمھاری اور تمھارے نظریات کی سب سے بڑی مخالف اب بھی مَیں ہی ہوں۔ مَیں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔''

مَیں مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ مَیں نے اگنیشن آن کی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے جواب دیا۔

''چلو تم نے آج اتنا تو تسلیم کر لیا کہ تم کبھی نہ کبھی ہارو گی ضرور۔۔۔۔ چاہے آسانی سے نہ سہی۔۔۔۔ بہت جدوجہد اور جستجو کے بعد ہی سہی۔۔۔۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہا۔ جب مَیں گاڑی اس کے محل نما گیٹ سے باہر نکال رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر Back view mirror میں دیکھا کہ وہ ابھی تک تیز گرتی برف میں وہیں کھڑی مجھے جاتا دیکھ رہی تھی۔ برف اس کے بالوں اور ہلکے سے گڑھے پڑے گالوں کو چھو چھو کر زمین پر گر رہی تھی۔ جیسے طرف کی کوئی شہزادی اپنی سلطنت میں کھڑی ہو۔ میری گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور مَیں رفتہ رفتہ اس کے محل سے دُور ہوتا چلا گیا۔ لندن سنسان تھا، رات گہری تھی اور سڑکیں خالی تھیں۔ میرا دوست دریائے ٹیمز بھی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ سفید برف کی رضائی نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے درخت ایک دوسرے کو کہانی سناتے سناتے چُپ سے ہو گئے تھے اور حیرت سے برف کے گالوں کو خود سے شرارت کرتا دیکھ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں گرتی برف کا منظر اور لطف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود کبھی رات میں تنہائی میں کسی ویرانے میں برف گرتی دیکھ چکے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت میں نور کی برسات ہو رہی ہو۔ گرتی برف کی اپنی ایک سفید دودھیا سی روشنی ہوتی ہے جیسے بہت سے جگنو بیک وقت آپ کو راستہ دکھا رہے ہوں۔ ایسے ہی بہت سے جگنو اس وقت میری دوڑتی گاڑی کے آس

پاس گزر رہے تھے، مجھے اس وقت بچپن میں نانی اماں سے سُنی ایک لوری بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

"چندا کو ڈھونڈنے سبھی۔۔۔

تارے نکل پڑے

محلوں کی نیند چھوڑ کر

سارے نکل پڑے۔۔۔۔"

میری گاڑی سفید برف سے بھری سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ مَیں بھی تو اک ٹوٹا تارہ تھا۔ جو اپنے چاند سے بچھڑ کر جانے کب سے اُسے ڈھونڈ رہا تھا۔

OO

وہ اِک ملاقات

اس روز صبح سے ہی آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخرِ ستمبر کی میٹھی سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دھوپ اپنی تمازت کھو چکی تھی اور سائے لمبے اور سرد تھے۔ بالآخر بادلوں کے ان شریر ٹکڑوں نے ایک دوسرے کو پکڑ ہی لیا اور سارا آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ مَیں اس وقت گیارہ بجے والی مال گاڑی سے مال اُتروا رہا تھا جب پہلی بوند نے میرا ماتھا چوما تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے مینہ کی جھڑی برسنا شروع ہو گئی۔ مزدوروں نے بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ غفورے نے ایک برآمدے کے لکڑی اور ٹین سے بنے چھت کے نیچے پہنچ کر مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں کہ مَیں وہاں کھڑا بھیگتا نہ رہوں بلکہ برآمدے کی طرف چلا آؤں۔ جانے لوگ بارش سے کیوں چھپتے ہیں۔ بارشیں تو تن اور من کو بھگو کر اُجلا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔

اتنے میں دُور سے صدیقی صاحب کے دفتر کا چپڑاسی چھتری سر پر تانے بارش میں سڑپ سڑپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پلیٹ فارم کے آخری سرے سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

''حماد بابو۔۔۔۔ صدیقی صاحب کے دفتر میں آپ کا فون آیا ہے، وہ بلاتے ہیں آپ کو۔''

''میرا فون۔؟''

مَیں حیرت سے بڑبڑایا۔ لیکن زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ غفورے کو ہاتھ کے اشارے سے دُور ہی سے سمجھایا کہ میرا فون آیا ہے۔ صدیقی صاحب کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں پورا شرابور ہو چکا تھا۔ اس لیے دروازے

کے باہر کھڑے ہو کر باقاعدہ خود کو جھاڑنا پڑا۔

اندر داخل ہوا تو دو چار ملاقاتی یا شاید مسافر صدیقی صاحب کی میز کے گرد جمع تھے۔ صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک ہی نمبر کی دو لائنیں تھیں۔ ایک فون ان کی میز پر اور دوسرا سامنے بیٹھے ہیڈ کلرک میز پر رکھا تھا۔ زیادہ تر فون ان کا ہیڈ کلرک بشیر ہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی فون خاموش کریڈل پر پڑے تھے۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ صدیقی صاحب نے فائلوں پر سے نظر اُٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔

''لائن لمبی ہوتی جا رہی تھی، مَیں نے دوبارہ کرنے کا کہا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی کال آتی ہی ہوگی۔''

مَیں وہیں ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشیر نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''کسی لڑکی کا فون تھا۔''

مَیں نے چونک کر بشیر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ کے علاوہ دیگر کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ کون سی لڑکی تھی جو مجھے صدیقی صاحب کے نمبر پر فون کر رہی تھی۔؟

باہر موسلا دھار بارش مزید تیز ہو گئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جہاں تک اسٹیشن اور پلیٹ فارم دکھائی دیتا تھا وہاں ہر چیز جیسے دھل سی گئی تھی۔ کالی چھتریاں تانے لوگ اِدھر اُدھر تیزی سے چلتے ہوئے گزر رہے تھے، کچھ دُور اندیش جو صبح کے وقت موسم کے تیور دیکھ کر گھر سے نکلتے تھے اور وہ اپنی لمبی لمبی برساتیاں پہنے، کالر اُٹھائے دوسروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھو ہم جانتے تھے کہ آج بارش ہوگی۔ اتنے میں اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مَیں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھا کہ بس اُچھلتے اُچھلتے رہ گیا۔ بشیر نے فون اُٹھایا۔

''جی۔۔۔۔جی جی۔۔۔۔یہ لیں بات کریں۔''

بشیر نے فون میری طرف بڑھایا، مَیں نے ریسیور کان کے ساتھ لگایا۔

''ہیلو۔۔۔۔حماد بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے ایک نازک اور مخملی سی آواز اُبھری۔

''جی۔۔۔۔ہیلو۔۔۔۔''

''جی کون بول رہی ہیں۔''

''مَیں۔۔۔۔مَیں حیا بول رہی ہوں۔''

میرے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ حیاء۔۔۔۔؟ فون پر۔۔۔۔ یہاں ۔۔۔؟اس وقت۔۔۔۔؟

''آپ۔۔۔۔آپ کو یہ نمبر کیسے۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، سب ٹھیک تو ہے نا۔''

حیا کچھ جلدی میں اور کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

''جی۔۔۔سب ٹھیک ہے۔کیا آپ آج شام چار بجے پُرانی حویلی آ سکتے ہیں۔''

''پُرانی حویلی۔۔۔۔جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔۔لیکن۔''

''کوئی سوال نہ پوچھیئے گا، مَیں ہمسایوں کے ہاں سے بڑی مشکل سے فون کر رہی ہوں بس آپ تک ایمان آپی کا یہ پیغام پہنچانا تھا۔ دیکھیں وقت پر آ جایئے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ آیئے گا ضرور۔ خدا حافظ۔

ایمان کا پیغام۔۔۔۔یا خدا۔۔۔۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ایمان بھی وہاں آنے والی تھی، مَیں نے فوراً اسے روکنے کے لیے کہا۔

''ہیلو۔۔۔ہیلو میری بات۔۔۔۔''

لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ باہر زور سے بادل گرجا اور پھوار کا ایک تیز ریلا ہوا کے ایک شدید جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے آ کر ٹکرایا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پانی کی بوندیں اندر کمرے میں بہت کچھ بھگو گئیں۔ بشیر نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی بند کی۔ مَیں اَب تک ویسے ہی گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حیا کیا کہہ گئی تھی۔ ایمان نے مجھے پُرانی حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا۔۔۔؟۔۔۔کیا واقعی وہ خود بھی حویلی آ رہی تھی۔۔۔؟نہیں نہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تین ہفتوں کے بعد اُس کی رخصتی ہونے والی ہے۔ وہ ایسے ہی گھر سے کیسے نکل سکتی ہے، تو پھر۔۔۔۔حیا نے مجھے حویلی یہ کہہ کر کیوں بلایا ہے کہ یہ ایمان کا پیغام ہے۔۔۔؟ ہو سکتا ہے ایمان نے میرے اس دن کے غالب والے شعروں کے بدلے میں

کوئی پیغام دیا ہو۔۔۔۔لیکن کیا۔۔۔۔؟۔۔۔۔

کچھ دن سے صدیقی صاحب نے مجھے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بنا ہوا ہٹ الاٹ کر دیا تھا جس کی چھت ٹین کی تھی ۔ یہ اسٹیشن کے عقب میں درختوں بھری اک سڑک کے اختتام پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں ایسے بہت سے ہٹ ریلوے کے چھڑے اور کنوارے افسروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیسے ان ہٹس میں سے یہ ایک ہٹ خالی ہوا تو صدیقی صاحب نے عارضی طور پر میرے نام الاٹ کر دیا۔ مَیں بشیر کی میز سے فون سن کر گم صم سا اُٹھا اور اپنے ہٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹین کی چھت پر بارش کی بوندیں اپنا مخصوص جلترنگ بجا رہی تھیں ۔ لگتا تھا آج آسمان نے بھی کھل کر برسنے کی قسم کھا رکھی تھی ۔ کوئی اور وقت ہوتا تو مَیں بارش اور اس ٹین کے چھت کے جلترنگ کا خوب لطف لیتا کیونکہ بچپن میں میں اور کامران ایسی بارش میں فوراً میری دادی اماں کی حویلی کے ٹین کے چھت والے کمرے میں بھاگ کر آ جاتے اور پھر ہم ٹین کی چھت پر گرنے والی بارش یا پھر اولوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کو میز بجا بجا کر مختلف دھنوں میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کرتے اور چیخ چیخ کر اپنے بچپن کے گانے گاتے تھے۔

لیکن اس وقت میرا سارا دھیان حیا کے فون کی طرف تھا۔ میری اپنی سوچوں میں دن کے تین بج گئے ،مَیں اس وقت زور سے چونکا جب اسٹیشن کے بڑے گھڑیال نے تین بجے کا گھنٹہ بجایا۔ ٹن ،ٹن ،ٹن ۔۔۔۔

اوہ۔۔۔۔اس وقت تک تو مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا ۔ اتنی تیز بارش میں جانے کوئی سواری بھی ملتی ہے یا نہیں ۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی ۔ ابراہیم میری اکلوتی پینٹ اور شرٹ حسب معمول دھلوا کر اور ریلوے کے دھوبی سے استری کروا کر کمرے میں لٹکا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ لیکن پھر مجھے خود پر ہی ہنسی آ گئی ۔ مَیں نے ایک بھیگا جوڑا جو میری وردی کی صورت میں تھا ، وہ تو اُتار دیا تھا ، لیکن میرے پاس بھلا کون سی چھتری تھی جو مَیں اس دوسرے جوڑے کو بھی بھیگنے سے بچا پاتا ۔ بہر حال ، اب یہ وقت چھتری ڈھونڈنے کا نہیں تھا۔ مَیں تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا پلیٹ فارم جانے والی پٹڑی سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم تک جا پہنچا ۔ بارش کی وجہ سے آس پاس

کوئی دکھائی نہ دیا۔ مَیں نے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک آدھ تانگہ اور ایک دو ٹیکسیاں وہاں سے گزریں لیکن سبھی میں سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خیر وہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مَیں نے وہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ مَیں پیدل ہی بڑی سڑک پر چل پڑوں۔ شاید راستے میں کوئی سواری مل ہی جائے۔ بارش میرے پورے وجود کو بار بار کسی چھلنی کی طرح چھل رہی تھی۔ اسٹیشن سے کافی دُور آنے کے باوجود مجھے ابھی تک کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں وقت پر پُرانی حویلی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کیونکہ ساڑھے تین تو مجھے یہاں شہر میں ہی ہو گئے تھے۔ مجھے خود پر شدید غصہ آنے لگا کہ مَیں پہلے ہی اسٹیشن سے کیوں نہیں نکل آیا تھا۔

پھر جیسے اچانک ہی قدرت کو میری بے بسی اور جھنجلاہٹ پر رحم آ گیا۔ مَیں اس وقت لٹن روڈ کی بڑی سڑک سے ہوتا ہوا چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور اسٹاف کالج روڈ کے قریب پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک موڑ سے ایک خالی تانگہ جو شاید کسی فوجی سواری کو اسٹاف کالج چھوڑ کر واپس جا رہا تھا، نمودار ہوا۔ میں نے فوراً تانگے والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی روپے ہاتھ میں آئے مَیں نے اُسے تھما دیے اور اُسے تیز اور جلدی پُرانی حویلی کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور پکی ڈھلی سڑک پر تانگہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ آس پاس گھنے بادلوں اور کالی گھٹا کی وجہ سے گہری شام جیسا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایسے میں جب بجلی زور سے چمکتی تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے پل بھر کے لیے تمام ماحول پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ بادل ویسے ہی زور زور سے گرج رہے تھے اور برستی بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتے ہوئے پانی سے شرابور گھوڑے کے نتھنوں سے ہر لیتی سانس کے ساتھ گرم بھاپ کے مرغولے سے اُٹھ رہے تھے۔ پکی سڑک سے اُتر کر گھوڑا گیلی کچی زمین پر جمے پانی کے گڑھوں اور کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا پُرانی حویلی کے راستے پر رواں دواں تھا۔

تانگے والے نے اپنے معاوضے کا پورا حق ادا کیا اور مجھے ٹھیک چار بجے حویلی کے پھاٹک پر اُتار دیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور تانگا بھی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کوئی سواری آئی تھی

جس نے موسم کے تیور دیکھ کر اُسے واپسی کے لیے یہیں روک لیا تھا۔ میرے تانگے والے نے بھی مجھے پیش کش کی کہ مَیں اگر واپسی کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ یہیں انتظار کر لے گا۔ مَیں نے اُسے بھی رکنے کا کہہ دیا۔ دونوں تانگے والے آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ مَیں برستی بارش سے بھیگا لکڑی کا پھاٹک کھول کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب سا سناٹا اور ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی پورے ماحول پر۔

اچانک حویلی کا پُرانا چوکیدار اللہ بخش کسی جانب سے نمودار ہوا اور مجھے سلام کر کے بتانے لگا کہ نگہت بی بی ابھی بڑے گول کمرے کی طرف گئی ہیں۔ پُرانی حویلی کے یہ سارے پُرانے نوکر میرے بچپن کے گواہ تھے اور شاید سبھی میرے رازدار بھی۔ ان سبھی کو یہ پتا تھا کہ مَیں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور مَیں شاکر اور نگہت وغیرہ سے ملنے یہاں آتا ہوں۔ سبھی یہ بھی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میری یہاں آمد کے بارے میں باخبر نہیں تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے جا کر بابا یا امی کو میرے بارے میں خبر نہیں دی تھی۔ شاید اس طرح سے ان سب نے میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

میں چوکیدار سے مل کر آگے دالان کی طرف بڑھ گیا جس کے سرے پر برآمدہ تھا جس کے سامنے گرمیوں میں ایک قطار سے لکڑی کی بڑی بڑی سے چکیں ڈلی رہتی تھیں۔ اس وقت بارش کی وجہ سے تمام چکوں کو گول سمیٹ کر اوپر بندھی برآمدے کی ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ برآمدے کی چھت پر بنے پرنالوں سے بارش کا نیالا پانی پوری رفتار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا اور اینٹوں سے بنے صحن میں بنی ہوئی چھوٹی کچی اینٹ کی نالیوں سے ہوتا ہوا مختلف کیاریوں میں گر رہا تھا۔ فضا میں صرف ایک ہی پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی باقی سب کچھ جیسے جامد تھا۔

جیسے ہی مَیں گول کمرے والے برآمدے کی طرف مڑا۔ مجھے برآمدے کے کونے میں سفید چادر میں لپٹی حیا دکھائی دی جو برآمدے کی چھت سے گرتے پانی کے ایک پرنالے سے بنتی پھوار کو اپنی ہتھیلی میں جذب کرنے کی کوشش میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

آہٹ سن کر اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اور جلدی سے مجھے سلام کیا۔

میں اس کی طرف چلا آیا۔

''آپ اِس موسم میں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں۔سب خیریت تو ہے نا۔''

وہ ہلکے سے مسکائی۔

''ہم تو عام اور اچھے موسم میں بھی گھر سے نہیں نکل پاتے ،لیکن آپ کی ان چار لائنوں نے آنے پر مجبور کر دیا۔آپ نے کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔''

مجھے اس کے جواب سے کچھ اُلجھن سی ہوئی۔

''مَیں سمجھا نہیں۔۔۔۔آپ۔''

پھر مجھے فوراً نگہت کا خیال آیا۔

''نگہت کہاں ہے۔آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

اُس کی آنکھوں میں اَب وہی مخصوص سی شرارت تھی۔وہ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''مَیں اکیلی نہیں ہوں، جایئے مل لیجئے۔۔۔۔۔''

مَیں اسی حیرت اور اُلجھن میں اس نازک اندام کو دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔اگر نگہت اندر کمرے میں تھی تو پھر وہ یہاں باہر برآمدے میں برستی بارش میں کیوں کھڑی تھی۔بجلی بھی شاید بارش آتے ہی جا چکی تھی۔اندر کمرے میں دو چار شمعیں روشن تھیں۔مَیں نے دروازہ کھولا تو چند لمحے تو مجھے اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔دفعتاً بادل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے پل بھر کے لیے سب کچھ روشن کر دیا اندر کمرے میں دیوار کے ساتھ سکڑی بیٹھی ہوئی ریشمی وجود کی ایک گٹھڑی میں پل بھر کے لیے ایک جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ طاق پر رکھی موم بتی کا شعلہ زور سے پھڑکا اور کسی کے ماتھے پر وہی اِک مخصوص شرارتی سی لٹ لہرا گئی۔سارا کمرہ اس کی جبیں کے نُور سے روشن ہو گیا۔وہ ایمان تھی۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔وہ ایمان ہی تھی۔۔۔۔مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔میں وہیں دروازے کے پاس اس معجزے کے ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔شاید نہیں۔۔۔۔یقیناً یہ کوئی خواب ہی تھا۔میری تقدیر مجھ پر اتنی مہرباں تو اِک زمانے سے نہ تھی۔

لیکن وہ ایمان ہی تھی۔سرتاپیر مجسم ایمان،اُس نے سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا اور

ایک کالی شال میں ڈھکی ہوئی تھی۔ شاید باہر کھڑے تانگے میں ایمان اور حیاء وغیرہ بھی آئی تھیں۔ کیونکہ ایمان کے ماتھے پر اور بالوں میں ابھی تک بری بوندوں کے ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ ماتھے کی لٹ بھی بھیگی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کونے میں بیٹھی حسب معمول اپنے نازک پاؤں کے ناخنوں سے نیچے بچھے قالین کو کرید رہی تھی۔ اُس نے دھیرے سے ویسے ہی سر جھکائے مجھے سلام کیا۔ چند لمحے تو میں اسے کچھ بول ہی نہیں پایا، جیسے میری آواز ہی گنگ ہوگئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے میری زبان سے کچھ نکلا۔

''آپ۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔؟ ٹھہریئے۔۔۔۔ کچھ دیر لگے گی مجھے اپنی قسمت اور خوش نصیبی پر یقین کرنے میں۔''

پہلی مرتبہ مَیں نے ایمان کے چہرے پر حیاء کی ایک سُرخ لہر کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے یوں بارش میں بھیگا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سی ہوگئی۔

''آپ۔۔۔۔ آپ تو بہت بھیگ چکے ہیں۔ میں نگہت سے کہتی ہوں آپ کے لیے کوئی تولیہ وغیرہ۔۔۔۔''

اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ جیسے مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ اس کمرے سے نکل گئی تو میرا یہ زندگی کا سب سے خوبصورت خواب اُدھورا ہی ٹوٹ جائے گا۔

''پلیز۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ آپ بیٹھی رہیں۔۔۔۔ مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔ کچھ دیر میں خود ہی سب خشک ہو جائے گا۔۔۔ آپ کہیں نہ جائیں۔۔۔۔ پلیز۔''

مَیں جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اُس کے قریب آ گیا۔ ایمان اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اب وہ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اتنے قریب۔۔۔۔ کہ مَیں اس کے وجود کی لرزش کو یہاں سے محسوس کر سکتا تھا۔ مَیں وہیں اس کے قریب بیٹھ گیا، اور بیٹھتے وقت مَیں نے اس زہرہ جبیں کے حجاب بھرے سمٹنے کے انداز کو بھی محسوس کیا۔ یہ لڑکی تھی، یا پھولوں بھری اِک لچکتی ڈال۔۔۔۔

چند لمحے ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی اپنے وجود کی لرزش پر

قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور مَیں پلکیں جھپکے بنا اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پلکیں جھپکنے کا وقفہ بھی اس وقت مجھے بے حد بُرا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں۔ اتنی مشکل تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی بیچ کی خاموشی کا خلا صرف باہر برستی تیز بوندیں پورا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے ہم دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ہم دونوں کے لفظ ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ میں پکڑا وہ تہہ کیا ہُوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا جس پر مَیں نے اس دن وہ چند شعر لکھے تھے مَیں جانتا تھا نکہت اس تک یہ کاغذ کسی نہ کسی طور ضرور پہنچا ئے گی۔

''آپ نے یہ کیا لکھ بھیجا تھا مجھے۔۔۔؟۔۔۔ مَیں نے تو آپ سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔۔۔۔ گھر واپس چلے جائیں۔'' آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔''

بولتے بولتے اُس کی آواز ہلکی سی بھرّا گئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے نازک سے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی سی رگیں نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر بھی ایک پیلاہٹ سا تھا۔

''آپ تو مجھے بیمار لگ رہی ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

اُس نے مجھ پر اک نظر ڈالی۔ اِک زخمی سی نظر جس میں نہ جانے کیا کچھ چھپا تھا۔

''مَیں یہاں آپ سے صرف یہ وعدہ لینے آئی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو مزید سزا نہیں دیں گے۔ اس دن۔۔۔۔ آپ نہیں جانتے اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو کتنا ملامت کیا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ہے۔ نہ آپ مجھے دیکھتے اور نہ۔۔۔۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔۔۔۔ آپ کو دیکھنا میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ تھا اور آپ کی محبت میری اس بے معنی زندگی کا سب سے حسین تجربہ ہے۔ اس محبت نے مجھے آپ سے ملوا دیا۔۔۔۔ ورنہ میں تو بنا خود کو پہچانے ہی اس دُنیا سے چلا جاتا۔۔۔۔ اب مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔۔۔۔ موت بھی آئی تو۔۔۔''

میری بات اُس نے تڑپ کر کاٹ دی۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، کیوں مجھے میری نظروں میں بار بار گراتے ہیں ۔۔۔۔کیوں۔۔۔۔''

وہ اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی رو پڑی۔ دو موٹے موٹے آنسو اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے چھلکے اور زمین پر گرتے سے پہلے ہی مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی پر انہیں سمو لیا۔ اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس جذبے کے عالم میں، مَیں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اُس کے دونوں کومل مخمل جیسے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ باہر بادل زور سے گرجے اور بارش کی جھڑی اور تیز ہوگئی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر ہم دونوں۔ جانے اس کے ہاتھ پکڑتے ہی خود میرے اندر سے یہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں سے باہر اُمڈ پڑا۔ بجائے اس کے کہ مَیں اُسے چُپ کرواتا خود میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس کے نرم ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، کیا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور کسی گھڑی کی تمنا کی جاسکتی تھی؟

ایمان نے نظر اُٹھا کر بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کے حسن کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ستارہ جبیں، بڑی بڑی کالی آنکھوں ستواں سی چھوٹی ناک اور لال زمرد جیسے نازک سُرخ لبوں کی پنکھڑیاں، ٹھوڑی کا خم جیسے کسی مصوّر نے بڑی ادا سے رنگوں کو ایک مخصوص زاویے پر لا کر موڑ دیا ہو۔ کہیں بھی تو کچھ کمی نہیں تھی۔ اِک عجب سا نور تھا اس مہ رُخ کے چہرے پر۔

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں سے اُس کی آنکھوں کے بھیگے کنارے پونچھ ڈالے اُس نے دھیرے سے پھر کہا۔

''آپ میری بات مانیں گے نا حماد۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا نام مجھے اس قدر مقدس، اس قدر محترم اور اس قدر خوابناک محسوس ہوا کہ پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام پکارا تھا۔

''اگر تمھیں اس سے خوشی ملتی ہے تو مَیں تمھاری خاطر یہ بھی کر گزروں گا۔'' میرے منہ سے اپنے آپ اس کے لیے تم نکل گیا۔'' اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑائے

اور اپنے دوپٹے کے سر پر لگی گانٹھ کھول کر نہ جانے کیا چیز ہتھیلی میں بھر لی، پھر اس نے ہتھیلی میرے سامنے کی اور کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر وہی دو موتی جگمگا رہے تھے جو میں نے نگہت کے ہاتھ اُسے واپس بھجوائے تھے۔

''یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ کی یہی ضد تھی نا کہ میں خود انہیں آپ کو واپس کروں۔ آج میں نے آپ کی یہ ضد بھی پوری کر دی۔ اب انہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔ اُس نے جلدی سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس گل اندام کو کیسے سنبھالوں۔۔۔۔ کیا تسلی دوں۔ یہ تو مجھ سے زیادہ گھائل نظر آ رہی تھی۔ میں نے دونوں موتی اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں چوما اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''ایمان۔۔۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔ یہ دو موتی میرے لیے دو جہانوں کی تمام نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی مجھے کیا دے گا۔ سچ کہوں تو آج مجھے اپنی محبت بُری لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے تو رونا سکھا ہی دیا تھا۔ آج تمھاری آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔ بہت بُرا ہوں میں۔۔۔۔ اور بہت بُری ہے میری محبت۔''

اُس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اضطراری طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میری بات کاٹنا چاہتی ہو۔ مجھے اپنی محبت کو بُرا بولنے سے روکنا چاہتی ہو۔

''ایسے نہ کہیں، اگر کوئی بُرا ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔۔ میں آپ کی محبت کے بدلے کچھ نہیں دے پائی آپ کو۔۔۔۔ آپ نہیں جانتے حماد۔۔۔۔ میں کتنی مجبور ہوں۔۔۔۔ کتنی بے بس ہوں۔۔۔۔ ابا نے ساری زندگی کسی خوشی کا منہ نہیں دیکھا۔ میں اور حیا ابھی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے بڑے بھیا آناً فاناً بیماری کا شکار ہو کر ہم سب سے منہ موڑ گئے۔ ابا ان کا غم ابھی تک دل سے نہیں نکال پائے۔ انہوں نے مجھے اور حیا کو دنیا کی ہر وہ نعمت لا کر دی جس کی کوئی اولاد خواہش کر سکتی ہے۔ خود پیوند لگے کپڑے پہنتے رہے لیکن ہمیں کبھی کسی سخت وقت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھیا کے بعد انہوں نے اپنی ساری توقعات مجھ سے وابستہ کر لی تھیں۔ تبھی انہوں نے گھر پر ہی

مجھے دنیاوی اور دین کی ہر تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ مجھے ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ مجھ سے مسائل پر بحث کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں ہی ان کا سارا جہاں ہوں۔ میں ہی ان کا دن ہوں۔۔۔ میں ہی ان کی رات ہوں میرے سفید دامن پر ایک دھبہ ان کی جان لے لے گا۔ وہ آپ کی طوفانی محبت سے بہت گھبرا گئے تھے۔ تبھی انہوں نے عجلت میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا ورنہ وہ ابھی مجھے مزید پڑھانا چاہتے تھے۔ میرا بی۔اے کا داخلہ بھی بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن آپ کی دیوانگی، آپ کے جنون کے آگے سب بہہ گیا۔"

میں چپ چاپ خاموش بُت بنا اس سنگ مرمر کے حسین مجسمے کے لبوں سے لفظوں کے موتی گرتا دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم بھی میری محبت، میرے عشق، میری دیوانگی، میرے جنون کو غلط سمجھتی ہو۔"

میرے ہاتھ پر ایمان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے لگا وہ میرے ہاتھوں کو تھام کر آج میری روح ہی کھینچ لے گی۔۔۔۔ "شروع میں جب آپ نے نگہت کے ذریعے مجھے اس حویلی میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا تب مجھے واقعی بہت بُرا لگا تھا۔ مَیں بھی ابا کی طرح ایسی باتوں کو نہایت بُرا سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اُس وقت آپ کی وہ سب کوششیں کسی امیر زادے کا اپنا دل بہلانے کی ترکیب ہی لگیں۔ پھر جب ایک دن آپ کے گھر والوں نے ابا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو مَیں بہت روئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کے قصور کی سزا ہمیں کیوں سنا دی۔ پھر نگہت سے پتہ چلا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت مَیں نے اسے آپ کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا اور یہی سوچتی تھی کہ دو چار دن میں آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر میں نے ابا کو دوبارہ بہت پریشان دیکھا۔ جس دن آپ ہمارے گھر میرا رشتہ مانگنے آئے تھے اس دن کے بعد سے میں نے آج تک ابا کو کبھی چین کی نیند سوتے نہیں دیکھا۔ ساری ساری رات ٹہلتے رہتے تھے۔ میری اماں ایک سیدھی سادھی سی عورت ہیں جو صرف رو کر ہی اپنے شوہر کا دکھ بانٹ سکتی ہیں۔ پھر عبداللہ نے بتایا کہ آپ نے ابا کی مسجد میں آنا شروع کر دیا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی عبداللہ نے تب بھی اور نہ ہی آج تک آپ کے بارے میں کوئی سخت لفظ استعمال کیے

ہیں۔۔۔۔میرا دل اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے، جس سے آپ کی زندگی بھر میں دو ملاقاتیں بھی نہ ہوئی ہوں، اس کے لیے کوئی اس طرح دُنیا تیاگ سکتا ہے۔

لیکن پھر وہ ہو کر ہی رہا جسے میرا دل اس دن تک جھٹلاتا رہا تھا، اس دن آپ کو ریلوے اسٹیشن پر مزدور کے حلیے میں دیکھ کر ایک ہی لمحے میں میری ساری زندگی کا فخر، میری ساری زندگی کا غرور، میرے سب مان، پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کی محبت کسی بے لگام آندھی کی طرح آئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے دل کے برسوں سے بند کواڑ توڑ کر اندر براجمان ہو گئی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر پائی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ محبت تو اس دن سے کہیں نہ کہیں میرے دل میں ہی پل رہی تھی جس دن آپ نے یہیں اس حویلی کی لائبریری میں میرا رستہ روکا تھا۔ لیکن تب شاید میں اس جذبے سے اس قدر ناواقف تھی کہ اُسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن اس دن اسٹیشن پر آپ نے مجھے مار ڈالا۔ تب سے اب تک مجھے ایک پل بھی قرار نہیں آیا۔ میری ہر وقت یہی سوچتی ہوں کہ یہ کیسا جذبہ ہے جو پل میں شہنشاہ کو فقیر اور فقیر کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ یہ کیسا درد ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل کو چیرتا رہتا ہے۔ کتنا بے بس کر دیا ہے اس جذبے نے مجھے۔۔۔۔کتنا مجبور۔"

میں حیرت سے گنگ اس مہتاب کو سنتا رہا، اس کی پلکوں سے گرتے موتی چنتا رہا۔ وہ اس وقت مجھے پریوں کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی جس کی باتیں میرے لیے کسی الف لیلوی داستان سے کم نہیں تھیں۔ ان چند لمحوں نے ہی میری بے توقیر محبت کو کس قدر معتبر بنا دیا تھا۔ میری اس لاحاصل جدوجہد کو کتنا عظیم اور کتنا معنی خیز بنا دیا تھا۔ وہ بولتی رہی۔

"اور پھر رہی سہی کسر اس دن آپ کے اُن دو اشعار نے پوری کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو زندگی بھر کبھی اپنی حالت کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ کبھی آپ سے نہیں ملوں گی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔اس دن ان دو لائنوں نے میرا اندر بالکل پلٹ دیا۔ وہ شعر پڑھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو بنا کچھ کہے چلے جانا اس کی اس لازوال محبت کی توہین ہو گی۔ شاید مجھے اسی طرح آپ سے ملنا تھا، چاہے پہلی اور آخری مرتبہ ہی سہی۔"

باہر زور سے بجلی کڑکی، ایک لمحے کے لیے کمرے میں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں نے اس

کے لرزتے لبوں پر جمی شبنم کے قطرے بھی دیکھ لیے۔ اُس نے بتایا کہ نگہت سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا فون نمبر معلوم کروانے کے بعد انہیں آج موقع ملا تھا کہ وہ حیا کے ذریعے پڑوس کے ماسٹر صاحب کے گھر سے فون کروا سکے کیونکہ مولوی صاحب دو دن کے لیے شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ایمان نے بتایا کہ یہاں تک پہنچنے میں اُسے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ صرف وہ ہی جانتی ہے اور اگر ایسے میں حیا اور نگہت اس کی مدد نہ کرتیں تو اس کا مجھ سے یوں ملنا ناممکن تھا۔

جانے اتنے دنوں میں اس نازک اندام پر کیا کچھ گزر چکی تھی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ بات کرتے ہوئے بھی باقاعدہ اس کی سانس پھول سی جاتی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، اِک سیدھی سادھی معصوم لڑکی کو میں نے یہ کس پُرخار راستے پر گھسیٹ لیا تھا۔ وہ جس کے کومل قدم پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑیں تب بھی ان کے چھل جانے کا ڈر ہو۔ اسے میں نے کانٹوں پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا، محبت کا زہر اس کے رگ و روپ میں سرایت کر چکا تھا۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور ہی محبت کا تھا۔ مَیں تو خود اُس کی طرح، اس سے کہیں زیادہ بے بس تھا۔ اور پھر قصوروار صرف محبت کو ہی کیوں ٹھہرایا جائے؟۔۔۔۔ اصل قصوروار تو وہ تھا جس نے ہم دونوں کے دلوں میں اس محبت کا بیج بویا، اسے پروان چڑھایا اور اس زہریلی امربیل کو اس قدر تناور کر دیا تھا کہ آج ہم دونوں اس کے زہر سے بے حال تھے۔ جاں لب دم تھے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور اُسی کا تھا، جو ہم کمزور انسانوں کے دلوں میں یہ جذبہ پروان چڑھا کر پھر صرف تماشا دیکھتا تھا۔

ایمان اب تک سسک رہی تھی۔

''مَیں جانتی ہوں آج مَیں نے اس محبت کا آپ کے سامنے اقرار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید خدا مجھے اس محبت کے گناہ کے لیے کبھی نہ بخشے کہ محبت جب کسی رشتے کے بنا ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ لیکن میرا خدا یہ بھی جانتا ہے کہ آپ سے ملے بنا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں آپ کو اپنے لیے یوں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد میری ساری زندگی اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے میں ہی گزرے گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آپ اپنے آپ کو میری اس محبت کی وجہ سے مزید نہیں جلائیں گے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس پہلی اور آخری کوشش کو لاحاصل نہیں جانے دیں گے۔ مَیں چاہتی ہوں کہ آئندہ جب کبھی زندگی میں آپ کا نام کسی حوالے سے سامنے آئے تو اس کے ساتھ یہ جوگ کی، یہ خود کو جلا کر راکھ کر دینے والی باتیں نہ ہوں۔ مَیں اپنی خوشی کے لیے آپ سے آپ کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔''

مَیں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے میری جان مانگی ہوتی جس پر کم از کم میرا اختیار تو ہے، مجھ سے وہ نہ مانگو جو خود میرے بس میں نہیں ہے۔''

''کیوں۔۔۔۔ کیا زندگی اس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی؟ کیا چند سالوں کا یہ محدود سفر صرف اسی ایک ملاقات کی یاد میں بسر نہیں ہو سکتا؟۔۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے۔۔۔۔ مَیں یہاں نہیں تو نہ سہی۔۔۔۔ پر وہاں اگلے جہاں مَیں ضرور آپ کے ساتھ ہوں گی۔۔۔۔ بس اتنا سا وعدہ نہیں دے سکتے مجھے آپ۔''

اس کی باتوں نے اس نازک سی گل رُخ کے اعتماد اور یقین نے مجھے لاجواب سا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے، وہ بے چاری تو اتنی بے بس ہے کہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کھل کر نہیں کر پائی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان لمحوں میں مجھے گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے اس تصور سے ہی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے پھر ایسا لگا کہ جیسے مذہب میری محبت پر ایک مرتبہ پھر ڈاکا مار رہا ہو۔

باہر کی تیز بارش، چھت پر گرنے والی بوندوں کی مسلسل ٹپ ٹپ اور اندر بڑھتے اندھیرے میں جلتی شمعوں کے لرزتے سائے۔ ایسے میں اس پری رُخ کا ساتھ، وہ ویسے ہی کانپتی ہوئی بے چین اور بے کل سی گھٹنے جوڑے بیٹھی تھی۔ اس کی وہ شریر لٹ گیلی ہو کر پھر سے لٹک کر اس کے رُخسار چومنے لگی تھی۔ میں بے خودی میں اپنا ہاتھ روک نہیں سکا اور میں نے اپنی انگلیوں سے اس کی لٹ کو رخسار سے ہٹا کر ماتھے پر پرے کر دیا۔ اُس نے ایک دم گھبرا کر مجھے دیکھا اور شرم سے دوہری ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دیوار پر لگے قدیم گھڑیال پر پڑی تو ایک دم بوکھلا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''اُف۔۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔۔ اندھیرا ہونے کو ہے۔

اماں گھر میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہم لوگ کبھی گھر سے اتنی دیر تک باہر نہیں رہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔"

میرا دل جیسے کسی نے آری سے کاٹ کر رکھ دیا ہو۔ تو اس خواب کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ ایمان جا رہی تھی۔ مَیں نے اس سے کچھ دیر اور رکنے کی التجا کی۔ جواب میں بے بسی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

کاش قدرت ہمیں وقت کو اپنی مرضی سے روکنے کا کوئی کلیہ بھی بتا دیتی۔ تو میں آج سات زمین اور آسمان کے خزانے دے کر بھی بدلے میں صرف چند پل اور سمیٹ لیتا۔ اتنے میں باہر کسی کے چلنے کی دستک ہوئی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایمان نے جلدی سے اپنی کالی شال سنبھالی۔ دروازے سے نگہت اور حیاء کا چہرہ پل بھر کے لیے جھلک دکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی ہمیں اسی قاتل وقت کے گزر جانے کا احساس دلانے کے لیے آئی تھیں۔ ایمان نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے آپ کے وعدے کا انتظار ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

مَیں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

"گھر سے نکلتے وقت مَیں نے بھی اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے چند وعدے کیے تھے۔ مجھے ان کا بھرم بھی رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کوئی میری محبت کی سچائی کو طعنہ دے۔ لیکن تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ تم جو چاہتی ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔ بس مجھے کچھ وقت دے دو۔ کہیں مَیں اپنی نظروں میں ہی نہ گر جاؤں"۔۔۔۔ ایمان نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ "خدانخواستہ۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

اس کے چہرے پر اب سکون کی پرچھائیں تھیں۔

"مَیں جانتی ہوں، آپ میرا مان کبھی نہیں توڑیں گے۔"

وہ جانے کے لیے پلٹی، میرا دل چاہا کہ دوڑ کر اُسے اپنی باہوں کے حصار میں لے لوں۔ ہمیشہ کے لیے، اور اُسے یہاں سے کبھی واپس نہ جانے دوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ سخت ضبط کے باوجود اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھر ہی آئے تھے۔ ایک لمحے کو ہماری نظر ملی۔ اور وہ پلٹ کر باہر چلی گئی۔ مَیں بے چین

ہوکر اس کے پیچھے لپکا، برآمدے میں نگہت اور حیا اُسے لینے کے لیے کھڑی تھیں، ایمان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ دونوں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پائیں اور وہ دونوں بھی بس رو پڑنے کے قریب تھیں۔ مجھ دیکھ کر دونوں نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ حیا میرے بالکل سامنے ہی ایمان کے ساتھ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس اجنبی اور انجانی سی لڑکی نے مجھ غیر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج میری ایمان کو میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے جھکے سر کی طرف اُٹھ گیا۔ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے اس نے چونک کر نظریں اُٹھائیں اور پھر مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھے دیکھ کر اس کا دل چھلک اُٹھا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مَیں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر اُسے تھپکا۔ شاید آج ساری کائنات ہی رو رہی تھی۔ برآمدے سے باہر آسمان آنسو بہا رہا تھا اور یہاں برآمدے میں نگہت اور حیا کی آنکھیں چھلک چھلک کر مینہ برسا رہی تھیں۔ باہر تانگے والے کا بگل بجا، حیا اور ایمان جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ ایمان جاتے جاتے پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس لمحے شائد اُسے اپنی بڑی سی کالی شال بھی سنبھالنے کا دھیان نہیں تھا۔ اس کا مہتاب سا چہرہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ لکڑی کے پھاٹک پر آخری دفعہ میری کالی قسمت کے سیاہ آسماں پر چمکا اور پھر ہمیشہ کے لیے بادلوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ مَیں وہیں گھٹنوں کے بل برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا کہ جس سے آسمان و زمیں پھٹ جائیں۔

OO

اُس دن ایمان کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عشق میں پا لینے کی کسک تو اس کسک اور تڑپ سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور کہیں زیادہ سوا ہوتی ہے جو عشق میں نہ پانے کی صورت میں مجھے ہو رہی تھی۔ مجھے کسی کروٹ بھی تو چین نہیں تھا۔ سچ ہے جنون میں وصل جدائی سے زیادہ زہریلا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مل کر میرے سینے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھتی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے یہ آگ سب کچھ جلا کر راکھ ہی کر دے گی۔

مَیں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں اپنوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کیسے

۔۔۔۔؟ اس کے بارے میں، مَیں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ کبھی سوچتا تھا نگہت کے ذریعے اسے ایک جھوٹا پیغام بھجوا کر کہ مَیں گھر واپس چلا گیا ہوں، ہمیشہ کے لیے یہ شہر ہی چھوڑ دوں۔ اس کی تسلی اور تصدیق کا ذریعہ صرف نگہت ہی تھی اور نگہت میری خاطر یہ جھوٹ بولنے پر بھی تیار ہو ہی جاتی۔ اور پھر شاید یہ ہمارا آخری جھوٹ ہی تو ثابت ہوتا۔ پھر جانے کیوں اس بات پر مجھے خود ہی اپنے آپ پر شرم آ جاتی۔ اس معصوم اور پری صفت لڑکی سے اتنا بڑا جھوٹ، جو صرف میری محبت کی لاج اور بھرم رکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی کی کمائی لٹا کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ صرف اس بھروسے پر کہ مَیں اس کی بات ضرور رکھوں گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی اُلجھتا جاتا تھا۔ وہ اس دن کہہ گئی تھی کہ کیا ساری زندگی بس اِک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی؟ اب مَیں سوچتا تھا کہ ضرور کاٹی جا سکتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھ جیسے کم ظرف کے لیے ایک اور شرط کا پورا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھ سے اس ایک ملاقات کے بعد ہی میرے ہوش و حواس بھی چھین لیے جاتے۔ اُس سے ملنے کے بعد یہ کم بخت حافظہ ہی تو میرا سب سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ بیت چکا تھا اُس سے ملاقات کیے ہوئے لیکن میری آنکھوں کے سامنے اب بھی ہر پل وہی بیٹھی رہتی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اُسی کی وہ مانوس سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میری سماعتوں میں اَب بھی اس کی وہ رُوح کو کھینچ لینے والی ملائم آواز اور چوڑیوں کی کھنک ارتعاش بکھیر رہی تھی۔ میرے لمس کو اب تک اُسی کے جانفزا لمس کی عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب ملاقات تھی؟ کہ مَیں ان چند گھڑیوں کی ملاقات کے بعد اپنی اس سے پہلی گزاری ہوئی تمام عمر ہی بھول گیا تھا۔ میں اس ملاقات سے پہلے کیا تھا؟ میری پسند ناپسند کیا تھی؟ تمام ذائقے، تمام خوشبوئیں، تمام حسیات جیسے مٹ سی گئی تھیں۔ مجھ سے میرا سایہ تک جیسے چھن گیا تھا۔ بس ایمان اور صرف ایمان ہی باقی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا وجود اسی دن اس دُنیا میں وارد ہوا تھا جس دن میری ایمان سے وہ آخری ملاقات ہوئی اور شاید اسی دن میں فنا بھی ہو گیا تھا۔

وہ شاید ایمان سے ملے ہوئے نواں دن تھا۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا، سورج اب جلدی ڈوبنے لگا تھا اور ڈوبنے سے پہلے اس کی سنہری دھوپ ہلکی سردی میں بہت بھلی لگتی تھی۔ جیسے

جیسے سردی بڑھتی جا رہی تھی، دھوپ کا سنہرا پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں پلیٹ فارم کے اس کونے پر جہاں سے سورج کو آخری وقت تک سامنے کے پہاڑ کے پیچھے ڈوبتا دیکھا جا سکتا تھا۔ بہت دیر سے بیٹھا اپنے وجود پر دھوپ کے اس سونے کو جذب کر رہا تھا۔ کہ شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ نکلا، جانے آج کل مَیں اپنے کسی بھی پُرانے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈرسا کیوں جاتا تھا۔ وسوسے دل میں گھر کرنے لگتے تھے۔ شاکر زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ وہ نگہت کا رقعہ مجھے دینے آیا تھا۔ میرے گھر والوں کے بارے میں اُس نے بتایا کہ امی اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ کمشنر صاحب سے ان کی اس موضوع پر کئی مرتبہ بحث ہو چکی ہے۔ وہ سب یہ بھی جان گئے ہیں کہ میں کراچی یا اسلام آباد اپنے کسی دوست کی طرف نہیں ہوں، نہ مَیں لندن کامران کے پاس گیا تھا بلکہ میں یہیں اسی شہر میں کہیں رہ رہا ہوں۔ شاید آتے جاتے کسی جاننے والے کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہو۔ لیکن میرے گھر والے اس ریلوے اسٹیشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹلز یا بڑے گیسٹ ہاؤسز میں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

شاکر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''حماد بابا۔۔۔۔ آپ نے پورے گھر کو، اس پورے زمانے کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ آپ کے جذبے سے زیادہ بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے زمانے کو اپنی ٹھوکر میں لا ڈالا ہے۔ اب میری صرف اتنی التجا ہے کہ اگر گھر والے آپ کو واپس بلانا چاہیں تو انکار مت کیجئے گا۔ نگہت آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی رخصتی بھی طے کر دی ہے اگلے مہینے۔ ہو سکے تو اس سے ملنے کے لیے ایک چکر لگا لیجئے گا۔ چلتا ہوں۔''

شاکر مجھے گلے لگا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے نگہت کا بھیجا ہوا لفافہ کھولا، لگتا تھا نگہت نے بہت کرب کے عالم میں یہ خط لکھا تھا، ہر ہر لفظ سے درد ٹپک رہا تھا۔

''بھیا۔۔۔۔ مَیں جانتی تھی کہ آپ کے جذبوں کے سامنے کوئی نہیں ٹِک پائے گا، بہت طاقت ہے آپ کی محبت میں، آپ کے جنون میں۔ آپ کی محبت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، ایمان جیسی لڑکی نے بھی آپ کے جذبے کے آگے سر جھکا ہی دیا، مجھے آپ پر ہمیشہ سے

فخر تھا، اور ہمیشہ رہے گا، لیکن وہ بہت نازک بہت معصوم سی لڑکی ہے۔
آپ اُس کے لیے دُعا ضرور کیجئے گا، کیونکہ مَیں جانتی ہوں کہ آپ کی
دُعائیں رد نہیں ہوتیں۔ جس دن سے وہ آپ سے مل کر گئی ہے، اس
کی حالت بہت خراب ہے۔ دن رات بخار میں تپ رہی ہے۔ اس
کی اماں کہتی ہیں کہ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی
ہے۔ لیکن مَیں جانتی ہوں کہ یہ اس جذبے کی شدت ہے جو آپ کی
محبت نے اس کے دل میں جگایا ہے۔۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔۔ کیونکہ
وہ ایسے کسی بھی جذبے سے ہمیشہ انجان رہی ہے۔ میں آپ کو نہیں
بتانا چاہتی تھی کیونکہ ایمان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن حیا کے
کہنے پر آپ سے دُعا کی التجا کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ میری ساری
خوشیاں آپ کو اور آپ کے سارے غم خدا مجھے دے دے۔''

یہ بہنیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا عذاب کسی نہ کسی صورت بھگت کر ہی یہاں سے جانا ہے۔ مَیں نگہت کا خط پڑھ کر بے حد فکر مند ہو گیا۔ حیا مجھ سے دُعا کی اُمید کیے بیٹھی تھی۔ وہ پگلی اتنا بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اگر میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج ایمان میری نہ ہوتی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے میرے پر لگ جائیں اور مَیں اُڑ کر ایمان کے پاس جا پہنچوں۔

مجھے خود پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی تو ہو رہا تھا۔ میں نے ہی اس نازک سی لڑکی کی رگوں میں عشق کا یہ نیلگوں زہر اُتارا تھا اور لوگ مجھ سے ہی اس کے تریاق کی اُمید بھی کر رہے تھے۔ سچ ہے کہ محبت ایک نرم گلابی موسم کی طرح جسم پر اُترتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی گلابی موسم ایک دہکتی آگ میں بدل جاتا ہے۔ آس پاس نیلی تتلیاں جھلس کر مر جاتی ہیں۔ سب پھول ساری پنکھڑیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔

اور پھر اس نازنین کے کومل وجود کو جلانے کے لیے تو مذہب کی کڑی دھوپ ہی کافی تھی۔ ایک نامحرم سے بات کرنے کا احساسِ جرم ہی اس کو ساری زندگی تڑپانے کے لیے بہت تھا۔ ایسے میں اگر محبت کی آگ بھی اس تپش کو دو آتشہ کرنے کے لیے موجود ہو تو پھر اس

کی تڑپ کا اندازہ میں خوب کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا وجود اسی مذہب اور محبت کی جنگ کے بیچ جھلس رہا تھا۔ مذہب اسے مولوی علیم کی طرف کھینچ رہا تھا اور محبت اُسے میری طرف دھکیل رہی تھی۔ اور اس کھینچا تانی میں وہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اس کا نازک بدن کٹ رہا تھا۔ روح تقسیم ہو رہی تھی۔ مَیں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مذہب ایسی محبت کے خلاف کیوں ہے؟ اور اگر ایسی محبت جرم ہے تو یہ جرم اپنے ساتھ احساسِ ندامت، خوف اور افسوس کی بجائے خوشی و مسرّت کیوں لے کر آتا ہے؟ کیوں یہ جرم بار بار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گناہ کے بعد انسان کو چند لمحے کے لیے ہی کیوں نہ سہی، پر تاسف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت کیسا گناہ ہے جو ہر روز گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نیا اور حسین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کیسا گناہ ہے جو دل کو مُردہ کرنے کی بجائے ہر لمحہ اس میں نئی روح پھونک رہا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا مَیں سمجھ لوں کہ مذہب کا محبت کے بارے میں یہ کلیہ ہی ہمیشہ سے غلط تھا اور غلط ہے؟ مذہب اگر انسانوں سے، رشتوں سے، جانداروں سے، حتیٰ کہ پھول پودوں اور نباتات و جمادات سے بھی محبت کرنے کا درس دیتا ہے تو پھر اس محبت کو غلط کیوں کہتا ہے۔ کیوں ایسی محبت کو بھی گناہ سمجھتا ہے جس میں سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کے اور کوئی مادی چاہ نہ ہو۔ پاک محبت بھی گناہ کے زمرے میں کیوں آتی ہے۔ صرف اس اندیشے کی بنیاد پر کہ آگے چل کر مواقع ملنے پر اور تنہائی میسر آنے پر یہ محبت بھی سفلی جذبات میں ڈھل جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو۔۔۔۔ اگر جسم کا حصول ہی اس محبت کی ترجیحات میں کبھی شامل بھی نہ رہا ہو تب کیا ایسی محبت مذہب کے لیے قابلِ قبول ہو جاتی ہو گی۔۔۔؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔۔۔۔؟

مذہب کو تو صرف محبت سے پیدا ہونے والے گناہ کے جذبے سے روکنا چاہیے۔ محبت سے نہیں۔ میں تو مذہب کے اس فلسفے کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں تو اسی محبت کے وسیلے سے مذہب کے قریب ہوا تھا۔ اور اب جب کہ یہی مذہب مجھے محبت کرنے سے روک رہا تھا تو مَیں خود بخود اس مذہب سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ مَیں ایمان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی براہِ راست اس مذہب کو ہی سمجھتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مولوی علیم کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں کہ ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار کھڑی نہ کریں۔

ہم دونوں کو مذہب کی ان زنجیروں سے نکال کر محبت کے حوالے کر دیں۔ ہمارا فیصلہ مذہب کو نہیں، بلکہ محبت کر کرنے دیں۔

لیکن مَیں کس قدر بے بس تھا، سوائے ان خیالات کی یلغار کے، میرے پاس لڑنے کے لیے اور کوئی دوسرا میدان بھی تو نہیں بچا تھا۔ دن تھے کہ بیتے جا رہے تھے، ایمان کی رخصتی سر پر آ چکی تھی۔ بس دو دن ہی تو رہ گئے تھے میری سانسوں کو میری روح سے جُدا ہونے میں۔ اگر ایمان مجھے مولوی صاحب کے سامنے گڑگڑانے کی اجازت دے جاتی تو مَیں اسی مسجد کے سامنے خود کو سولی پر لٹکانے کے لیے بھی تیار تھا۔ کیا تب بھی ان کا دل موم نہ ہوتا۔۔۔۔؟

لیکن وہ ستم گر تو مجھے مزید باندھ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے اپنے اُجلے دامن کی حرمت اور اپنے سفید پوش باپ کی مجبوریوں کا ذکر کر کے میرے جنون کو جیسے زنجیروں میں ہی تو جکڑ دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی بیماری کا سن کر باقاعدہ کشکول لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر ہی جا بیٹھتا۔ اور تب تک ان کی چوکھٹ پر سر پٹختا رہتا جب تک وہ خود آ کر میرے لہولہان سر کو تھام نہ لیتے۔۔۔۔ لیکن افسوس، مَیں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

———O———

وہ ایسی ہی اِک اُداس اکتوبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخی میرے ارمانوں کے خون کی طرح بکھری ہوئی تھی، ہَوا سرد تھی، خزاں نے پلیٹ فارم پر بھی ڈیرہ جما لیا تھا۔ شہتوت کے پتے پہلے زرد اور پھر سُرخ ہو کر خشک ٹہنیوں سے کٹی پتنگوں کی طرح گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پلیٹ فارم پر کسی نے زردی مائل سُرخ پتیوں کی کوئی چادر سی بچھا دی ہو۔ مَیں اسی چادر پر رکھے اپنے مخصوص بینچ پر لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل ایمان کے ہاتھوں مَیں عبداللہ کے نام کی مہندی رچ جائے گی اور پرسوں اُسے گھر سے اس جاتی بہار کی طرح رخصت کر دیا جائے گا۔ نگہت نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بعد مولوی صاحب نے انہیں مجھ اپنی بہن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ عبداللہ کے لیے وہاں کسی چھوٹے موٹے کام کا بندوبست بھی کر آئے تھے۔ مچھ میں کوئلے کی بہت سی کانیں بھی تھیں۔ انہی کانوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آباد

تھیں جن میں ان کوئلہ کانوں کے کان کن رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی ایک بستی کی مسجد کی امامت کے لیے انہوں نے عبداللہ کا نام منظور کروالیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی علیم نے یہ قدم بھی صرف اور صرف میری وجہ سے ہی اُٹھایا تھا۔ ورنہ وہ ایمان کی جدائی کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ نگہت نے تو یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ایمان کی رخصتی کے بعد مولوی صاحب بھی زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں ٹکیں گے اور اندر ہی اندر انہوں نے خود بھی بیوی اور حیا سمیت یہاں سے مجھ منتقل ہونے کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرے ذہن میں پھر نفرت کے سانپ نے پھن پھیلائے۔ مذہب میری محبت کو قتل کرنے کے بعد اس کی میت بھی یہاں دفن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اُسے بھی مجھ سے دُور لے جانا چاہتا ہے۔

پھر مجھے عبداللہ کا خیال آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، اُسے ایمان ملنے والی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جنھیں ان کی محبت مل جاتی ہے۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی، ان کے دل کی، کیسی حالت ہوتی ہوگی جب وہ اپنی محبت کے اتنے قریب ہوتے ہوں گے۔ ان کے دل خوشی سے پھٹ کیوں نہیں جاتے اس لمحے۔۔۔؟ مَیں اگر عبداللہ کی جگہ ہوتا تو یقیناً میں اس وصلِ محبت سے پہلے ہی خوشی سے مر جاتا۔

میری عبداللہ کے بارے میں سوچیں اس قدر طاقت ور ہو گئی تھیں کہ مَیں نے اُسے اپنے سامنے ہی پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے، اپنی طرف دور سے بڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس خیالات کی رو سے نکلنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ کا وہ ہیولا اب بھی میرے سامنے ہی بڑھا چلا آ رہا تھا مَیں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو درحقیقت عبداللہ ہی تھا جو ان زرد اور سُرخ خشک پتوں کی چادر کو روندتے ہوئے چہرے پر بے انتہا پریشانی لیے میری جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ دو قدم چل کر مَیں خود اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ بس ساکت کھڑا اُسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عبداللہ میرے قریب آ گیا، اُس نے اپنی بکھری سانسوں کو سمیٹنے کی کوشش کیے بنا ہی براہِ راست مجھے کہا۔

''آپ کو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

مَیں نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ساتھ چلنا ہوگا لیکن کہاں۔''

''ہمارے گھر، زیادہ سوال نہ کیجئے گا، بس چلنے کی کریں۔''

اس وقت عبداللہ کی حالت ایسی تھی کہ مَیں واقعی کوئی دوسرا سوال نہ کر سکا۔ عبداللہ پلٹا اور مَیں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کے تمام لیمپ پوسٹ اور گیس کے ہنڈولے جل چکے تھے۔ لیکن اکتوبر کے آخری دنوں کی شدید دُھند اور کہرے بادلوں نے سارے ماحول کو اس طرح سے لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ سب روشنیاں صرف ٹمٹماتی بتیاں اور دھیمے چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے گہرے سفید بادلوں میں کسی نے بہت سے جگنو چھوڑ دیے ہوں۔

مَیں اور عبداللہ اسی کہرے اور دھند کے بادل میں جیسے رستہ بناتے ہوئے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکلے، باہر سڑک بھی سنسان اور دُھند میں لپٹی پڑی تھی۔ جیسے کوئی سانولی بیوہ سفید ساڑھی لپٹے ابھی ابھی نہا کر کے لیٹی ہو، میں اور عبداللہ اس کہرے میں مایوس سے کھڑے آس پاس کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہے۔ عبداللہ کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی جل بن مچھلی کی ہوتی ہے۔ وہ بار بار بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا جیسے وقت اس کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا ہو۔ جانے اُسے کس بات کی اتنی جلدی تھی۔ اتنے میں خیرو کسی رحمت کے فرشتے کی طرح کسی سواری کو چھوڑ کر واپس آتا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے اُسے آواز دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ہم خیرو کے سبک تانگے میں پُرانے محلے کی طرف روانہ تھے۔ لیکن راستے کی شدید دھند اور کہرے کی وجہ سے خیرو کا گھوڑا بھی جیسے پھونک پھونک کر فضا میں قدم رکھ رہا تھا۔ خیرو نے احتیاطاً تانگے کے اگلے بانسوں کے ساتھ لگے گیس کے دونوں ہنڈولوں کو بھی جلا دیا تھا تاکہ راستہ کچھ تو واضح نظر آئے لیکن اس سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے گھوڑے کے نتھنوں میں سے بار بار بھاپ کی شکل میں آتی جاتی سانس کا نشان مل رہا تھا۔ ہم اندھیری سڑکوں پر دُور دُور لگے لیمپ پوسٹوں کی کمزور پیلی روشنیوں کے دائرے سے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمیں دور سے لٹن روڈ کے دورویہ گھنے درختوں کی قطاروں سے اس بگھی نما تانگے میں اس دھند اور کہرے میں کہیں جاتے دیکھتا تو اُسے ضرور شرلاک ہومز کی فلموں کے ایسے بہت منظر یاد آجاتے۔

بالآخر تانگہ پرانے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوا، محلہ سنسان پڑا تھا، مَیں اور عبداللہ جلدی سے تانگے سے نیچے اُترے۔ عبداللہ تیزی سے گھر کی طرف بڑھا۔ مَیں دفعتاً ٹھٹک کر رک گیا، یہ مَیں کہاں آ گیا تھا، یہ گلی، یہ کوچہ، یہ گھر تو میرے لیے ممنوعہ تھا۔ میرے تو یہاں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مَیں مولوی علیم کی تو کسی پابندی کا کبھی پابند نہیں رہا تھا، لیکن یہ پابندی تو میری زندگی، میری سانسوں کی اس مالک کی لگائی ہوئی تھی۔ جس کا اب میری ہر آتی جاتی سانس پر اختیار تھا۔

عبداللہ کو جب احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ قدم نہیں بڑھا رہا ہوں تو وہ فوراً پلٹا۔

''آپ رُک کیوں گئے، جلدی چلئے۔۔۔''

''میں۔۔۔۔ میں تمھارے اندر نہیں آ سکتا، مجھے ایمان نے منع کیا تھا۔''

مَیں نے نا سمجھی میں ایمان کا نام تو لے لیا لیکن پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ مَیں جلد بازی میں ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے ایمان کا راز افشاں کر بیٹھا ہوں۔ میں نے گھبرا کر بات پلٹنے کی کوشش کی۔''

''میرا مطلب ہے کہ مولوی صاحب۔۔۔۔ انہیں میرا یہاں آنا۔۔۔۔'' عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''انہیں شاید اب اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ اندر آئیں، وقت زیادہ نہیں ہے۔''

مَیں پھر بھی اپنی جگہ جما رہا، مَیں ایمان سے کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔

''لیکن ایمان۔۔۔۔''

''میں ایمان ہی کے کہنے پر آپ کو اسٹیشن لینے کے لیے آیا تھا، آیئے۔۔۔۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔''

عبداللہ مجھے گم صم اور سکتے میں چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانا پڑے۔ صحن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی، ایمان کا گھر بھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحن کا جھولا ہوا کے زور سے یوں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا جیسے ابھی ابھی ایمان یہاں سے اُٹھ کر گئی ہو۔ گھر پر ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا طاری

تھا۔ اچانک آہٹ سُن کر اندر سے نگہت برآمد ہوئی۔ مَیں اس وقت نگہت کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سے طاقوں میں رکھی شمعیں جھلملا رہی تھیں جن کی ہلکی روشنی میں نگہت کی آنکھوں میں چھپے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھند کو چیرتی ہوئی تیزی سے میری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور میرے سینے سے لگ کر سسک سی پڑی۔ مَیں ابھی تک حیران و پریشان سا وہیں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرا ہاتھ تھاما اور برآمدے میں اس حصے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں زنانہ تھا۔ یہ کیا، عبداللہ مجھے گھر کے زنانے حصے کی طرف کیوں لے کر جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اگر مجھے اپنے گھر میں یوں آزادی سے چلتے پھرتے دیکھ لیا تو غضب ہی تو ہو جائے گا۔ لیکن عبداللہ مجھے بنا کچھ کہنے کا موقع دیے زبردستی کھینچتا ہوا اُس کمرے میں لے گیا جو برآمدے کے سرے پر بنا ہوا تھا۔ نگہت بھی میری کہنی سے لپٹی میرے ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔

کمرے کی ملگجی روشنی میں جس پہلے شخص کے چہرے پر میری نظر پڑی وہ خود مولوی علیم ہی تھے۔ مَیں ٹھٹک کر رک گیا، مولوی علیم کے چہرے پر اِک عجیب بے بسی تھی۔ ایسی بے بسی صرف اس شخص کے چہرے پر ہو سکتی ہے جو ایک لمبی جنگ کے بعد اس وقت ہار گیا ہو جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چکا ہو۔ ان کے ساتھ ہی پیچھے حیا موجود تھی۔ اور ایک پُرنور چہرے والی عورت چادر لپیٹے کمرے کے وسط میں پڑے پلنگ کی پائنتی سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ سب خاموش سے کیوں تھے؟ پھر میری نظر کمرے کے ملگجے اندھیرے نما اُجالے سے جیسے ہی مانوس ہوئی تو مجھے لگا کہ پلنگ پر کوئی لیٹا ہوا ہے جس کے ماتھے پر شائد ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کے لیے حیا اور اس کی اماں پلنگ کے دونوں اطراف کی پائنتی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سلور کا بڑا سا تسلا پڑا تھا جس میں کچھ سفید پٹیاں تیر رہی تھیں۔ ایک دم سے میرے ذہن میں کوئی جھماکا سا ہوا۔ مَیں جیسے نیند کے عالم سے یک لخت جاگ گیا تھا۔ پلنگ پر کوئی اور نہیں ایمان ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے شدید نقاہت سی ٹپک رہی تھی لیکن چہرے کے گرد نور کا گلابی سا ہالہ اب بھی ویسے ہی قائم تھا۔ اس کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی اور وہ آنکھیں موندھے کسی سنو وہائٹ کی طرح کسی لمبی اور گہری نیند میں دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحے کے لیے مولوی علیم کی مجھ سے نظریں ملیں اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔

عبداللہ مجھے یوں دروازے پر ہی سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر آہستہ سے کھنکارا اور اس نے نگہت کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ نگہت میرا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوگئی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ آیا۔ عبداللہ ایمان کے پیروں کی جانب بیٹھ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ایمان۔۔۔۔آنکھیں کھولو۔۔۔۔دیکھو تُم سے ملنے کون آیا ہے۔''

ایمان کی نیند یا بے ہوشی اب بھی نہیں ٹوٹی۔ حیا نے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور جانے اس کے کان میں آہستہ سے کیا کہا۔۔۔۔ایمان کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے رفتہ رفتہ اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔وہی جان لیوا دو بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔۔پھر اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔۔وہی روح کھینچ لینے والی نظر، وہ چند لمحے پلکیں جھپکائے بنا مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے میری شبیہہ کو اپنی آنکھوں کے پردے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ نقاہت اور بیماری نے اُس کے حُسن پر ذرا سا بھی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ آج مجھے وہ تھکا تھکا سا حسن پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں بتا رہی تھیں کہ محبت کا قاتل زہر اس کی رگوں میں پوری طرح پھیل چکا ہے۔ اُس محبت نے ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا کیا حال کر ڈالا تھا۔

یا خدا۔۔۔۔! یہ کیسا عجیب دن تھا، کیسی کیسی انہونیاں ہونے کو جا رہی تھیں۔ مولوی علیم کی موجودگی میں مَیں ان کی بیمار بیٹی کے کمرے میں موجود تھا۔ ان کا سارا گھرانہ بشمول ان کے ہونے والے داماد کے، سب ہی تو یہاں موجود تھے لیکن آج مولوی علیم کی زبان پر تالا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اتنا ارتعاش تھا کہ وہ ٹھیک سے تسبیح بھی نہیں پھیر رہے تھے۔ محبت بھی کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس دن مولوی علیم کی خاموشی دیکھ کر ہوا تھا۔

ایمان کے لب ذرا سے ہلے، لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مولوی صاحب تڑپ کر آگے بڑھے اور ایمان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ان کی بیوی کی آنکھوں سے زار و قطار ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی لیکن وہ اتنی خاموشی سے رو رہی تھیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھے نہ اسے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں بس ایمان پر ہی جمی ہوئی

تھیں ۔اور پھر ایک اور معجزہ ہوا، مولوی علیم آگے بڑھے اور میرا ہاتھ خود ہی تھام کر مجھے ایمان کے سرہانے تک لے آئے ۔ حیا نے اُٹھ کر میرے کھڑے ہونے کی جگہ خالی کر دی ۔ ایمان نے ایک لحظہ مجھے دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر وہی ہلکی سی کائنات کو زندگی بخش دینے والی جانفزا سی مسکراہٹ اُبھری جو اس کے گالوں میں ہلکے سے گڑھے ڈال دیتی تھی ۔ اس کی نظر نے ایک لمحے میں ہی میری نظر سے مل کر ساری کائنات کو تسخیر کر لیا، کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ ''محبت فاتح عالم'' اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔ مَیں کچھ دیر تک اُسے ساکت دیکھتا رہا کہ کب وہ دوبارہ آنکھیں کھولے اور کہیں مجھ سے اس کی کوئی نظر چوک نہ جائے ۔ لیکن اس نازنین کی نیند لمبی ہوتی گئی اور پھر مجھے کہیں دُور خلا میں سے مولوی علیم کی آواز آتی سنائی دی ۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون ۔''

کیا۔۔۔؟۔۔۔کیا آس پاس کسی کی موت ہو گئی ہے جو مولوی صاحب اس وقت بے موقع یہ آیت پڑھ رہے تھے ۔ انہیں یوں سکون سے سوئی ہوئی اس شہزادی کے سرہانے ایسا کچھ نہیں پڑھنا چاہیے ۔ بدشگونی بھی تو ہو سکتی ہے نا ۔ مَیں نے غصے اور ناگواری سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو حیا اور نگہت بھی ایک دوسرے سے لپٹی سسکیوں سے رو رہی تھیں ۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے، مَیں نے عبداللہ سے مدد لینے کے لیے اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کہوں کہ ان دو بے وقوف لڑکیوں کو ایمان کے سرہانے سے دُور لے جائے ۔ ابھی تو وہ نازنین تھک کر ذرا سوئی ہے ۔ جانے کب کی جاگی ہوئی تھی ۔ اب ان دونوں کا یہ بین ہی کہیں اس کو نہ جگا دے۔۔۔لیکن یہ کیا، عبداللہ تو خود گھٹنوں میں منہ چھپائے ہڑک ہڑک کر رو رہا تھا ۔ یہی حال ایمان کی اماں کا بھی تھا ۔ حیا اور نگہت بجائے اماں کو چُپ کروانے کے خود بھی ان کے ساتھ مل کر رو رہی تھیں ۔ اماں حیا اور نگہت بار بار بڑھ کر اس کی روشن جبیں کو چوم رہی تھیں ۔ اس کی زلفیں سنوار رہی تھیں ۔ جانے انہیں اتنا سا بھی احساس کیوں نہیں ہو رہا تھا کہ کسی کی نیند میں یوں خلل نہیں ڈالا کرتے ۔ مولوی صاحب اب بھی زور زور سے کچھ آیتیں پڑھ رہے تھے، میں آخری اُمید کے طور پر ان کی جانب مڑا کہ شاید وہ ہی ان نادانوں کو کچھ سمجھا پائیں لیکن یہ کیا خود مولوی صاحب کا چہرہ اور داڑھی بہتے آنسوؤں سے تر تھی ۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو چہرے سے صاف کیے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو

چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نگہت اور حیا کو گھورا اور ویسے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھے انہیں بھی خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن میرے اس حکم کا انہوں نے اُلٹا ہی مطلب لیا۔ حیا کی تو ہچکیاں ہی بندھ گئیں روتے روتے اور اس کی اماں کو اس کا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ نگہت تڑپ کر اٹھی اور میرے پاس آ کر اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''بھیا۔۔۔۔ایمان ہم سے روٹھ گئی ہے، وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔''

میرے دماغ پر جمی دھند اور برف جیسے پگھلنے سی لگی۔ یہ نگہت کیا کہنا چاہ رہی ہے! یہ سب لوگ کیوں رو رہے ہیں۔ دفعتاً میرے دماغ میں مولوی صاحب کی پڑھی ہوئی آیتوں کی گونج ن بازگشت کی طرح ٹکرائی۔ مَیں ایمان کے سرہانے کی پائنتی پر جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ برف کی شہزادی۔ وہ باوقار حسن، وہ نور کا ہالہ اِک چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ آنکھیں موندھے اس کی سانس تھم چکی تھی۔ ہونٹوں پر اَب بھی اک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جسے صرف مَیں ہی محسوس کر سکتا تھا کیونکہ اُس کی وہ آخری مسکراہٹ صرف میرے لیے ہی تو تھی۔

مَیں نے اُسے دھیرے سے آواز دی۔

''ایمان۔۔۔۔''

لیکن وہ ساکت ہی رہی، مَیں نے گھبرا کر پیچھے کھڑے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ ''یہ بول کیوں نہیں رہی مولوی صاحب، اس سے کہیں کہ کوئی تو بات کرے۔ آپ کا کہا یہ کبھی نہیں ٹال سکتی۔ آپ کہیں گے تو ضرور جواب دے گی۔ بہت محبت کرتی ہے یہ آپ سے۔ بڑا احترام ہے آپ کے لیے اس کے دل میں۔''

مولوی صاحب مجھے جواب کیا دیتے البتہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور مجھے کھینچ کر انہوں نے اپنے گلے لگا لیا۔ ان کے گلے لگتے ہی جانے آنسوؤں کا وہ کون سا سیلاب تھا جو میری آنکھوں سے اُمڈ پڑا تھا۔ جتنا وہ مجھے تھپکتے جاتے اتنا ہی میری ہچکیاں بندھتی جاتیں۔ دھیرے دھیرے میرے سُن ذہن میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ ایمان کی سانس کیوں ساکت ہو گئی تھی، اور وہ ہم سب کی التجاؤں کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی اس کی ابدی خاموشی کے لیے وہ لفظ نہیں آ رہے تھے جو کسی ایسے شخص کی کیفیت

کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑا، زمیں کی گردش ساکت کیوں نہیں ہوگئی۔ ہم سب جو اس مہ جبیں سے اس قدر محبت کے دعوے دار تھے۔ ہم سب کی سانسیں بھی اسی لمحہ کیوں نہ تھم گئیں جب اس اکھڑتی سانس کا زیر و بم تھما تھا۔ میری آنکھیں تو اس سے پہلی ملاقات کے بعد اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی تھیں۔ پھر اب تک ان میں روشنی کیوں تھی؟ میرے لب تو اسی کے لفظ بولتے تھے، پھر اب تک میرے بولنے کی قوت کیوں نہیں چھین لی گئی تھی؟۔۔۔۔ میرے کانوں کو تو صرف اُسی کی آہٹوں اور شہد جیسی میٹھی بولی کا انتظار رہتا تھا۔ پھر میری سماعتیں اسی لمحہ ناکارہ کیوں نہیں ہوگئیں، میرا دل جو اس کے نازک دل کے ساتھ دھڑکنے کا دعوے دار تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکن رُکنے کے ساتھ ہی پھٹ کیوں نہیں گیا۔ مَیں تو اس کے سائے کو بھی کسی کو دینے کا روادار نہ تھا، پھر کوئی میرے سامنے اس کے کومل وجود سے رُوح کیسے چھین لے گیا۔

یعنی میرے سارے دعوے ہی جھوٹے نکلے، میرے اندر سے چیخوں کا ایک طوفان اُبل اُبل کر باہر آنے کے لیے تیار تھا لیکن میری مجبوری تو دیکھئے کہ اس ماہ رخ کی حرمت کا خیال مجھے کھل کر ماتم کرنے سے بھی روک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آنسو بھی خشک ہونے لگے اور اس دن مجھے بنا آنسوؤں کے رونے کا مطلب بھی سمجھ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری ہچکیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے حواس کا دامن چھوڑنا ہی پڑا۔ بے سدھ ہونے سے پہلے مَیں نے آخری مرتبہ ایمان کی اماں کو اس کا ماتھا چومتے اور چہرے پر چادر ڈالتے دیکھا اور پھر مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا، مَیں وہیں مولوی صاحب کے گلے لگے لگے ہی ان کی بانہوں میں جھول گیا۔

OO

اُس دن کے بعد شاید جب پہلی مرتبہ میں اپنے حواس میں واپس آیا تو پندرہ دن کا وقفہ بیت چکا تھا۔ مَیں صدیقی صاحب کے گھر میں ہی اُسی کمرے میں ڈرپس اور بازوؤں میں گھسے کینولا زاور سرنجوں سے لدا پھندا اسی بستر پر پڑا تھا۔ بعد میں صدیقی صاحب نے بتایا کہ ریلوے کے ہسپتال میں چھ دن رکھنے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گھر ہی منتقل کروا لیا تھا

کیونکہ ریلوے ہسپتال میں اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں اور شہر کے جس پرائیویٹ ڈاکٹر کو انہوں نے میرے علاج کے لیے طلب کیا تھا اس کا اور اس کی پوری ٹیم کا ریلوے ہسپتال میں روز آنا جانا ممکن نہ تھا۔ پہلے چند دن تو میری یادداشت نے ہی میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں حیرت سے ان اجنبی چہروں اور لوگوں کو دیکھتا رہا جو میرے آس پاس آتے جاتے، ٹہلتے، مجھے انجیکشن وغیرہ لگاتے اور میرا بخار چیک کرتے رہتے۔

صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ پھر مجبوراً ڈاکٹرز نے فیصلہ کر ہی لیا کہ مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ بظاہر تو میری حالت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن کا اور میری یادداشت کا میرے جسم کا ساتھ نہ دینا انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ میں بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دن گزرتے گئے اب میری جسمانی حالت دھیرے دھیرے سدھرنے لگی تھی۔ بخار کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نرس اگر دلیہ وغیرہ میرے حلق سے اُتارنے میں ناکام ہو بھی جاتی تو صدیقی صاحب آ کر ضد سے اور پیار سے مجھے کچھ مائع غذا کھلا جاتے۔ شاید اس دماغی بے ہوشی کے عالم میں بھی مَیں صدیقی صاحب کے احسانوں کی کیفیت تلے دبا ہوا تھا۔ اب دھیرے دھیرے مجھے ایک وہیل چیئر پر شام کے وقت ہسپتال کے بڑے سے دالان میں ایک طرف کو بنی چھوٹی سی جھیل تک یا گھاس کے میدان میں ٹہلانے کے لیے بھی لیجایا جانے لگا۔

لیکن میرے دماغ پر جمی دھند کسی طور پر کم نہیں ہو پا رہی تھی۔ شاید یہ میرے ہوش و حواس کی آخری رات کی وہ دھند تھی جو میرے ذہن سے لپٹ کر ہی رہ گئی تھی۔ مَیں چہروں کو دیکھتا اور انہیں پہچاننے کی کوشش بھی کرتا، لیکن سب ایک خواب کے عالم میں ہو رہا تھا۔ شاید اِن دنوں میں مولوی علیم، عبداللہ، شاکر، خیرو، غفورا اور جانے کون کون مجھ سے ملنے اور مجھے وہاں دیکھنے آتا ہوگا لیکن میں اُن مانوس چہروں کو بھی اجنبیت سے دیکھتا رہا ہوں گا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں میرا دماغ اُن کی دی ہوئی ادویات کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ میرے جسم نے ان کے علاج کی ہر ممکن تعمیل کی تھی۔ اب ڈاکٹروں کے بقول مجھے مزید ہسپتال میں رہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی درخواست پر مجھے ان کے ساتھ واپس گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی

ساتھ بے حد احتیاط کی تلقین بھی کی تھی۔

شاید وہ بڑے ہسپتال میں میری آخری شام تھی کیونکہ اگلے دن مجھے صدیقی صاحب واپس اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے والے تھے۔ کہ اچانک ہسپتال کی راہداریوں میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ مَیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھا خالی نظروں سے باہر کا منظر تک رہا تھا۔ وہیں سے مَیں نے چند لمحے پہلے دو بڑی مرسڈیز گاڑیاں ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی بھی دیکھی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی راہداری کا وہ سارا شور میرے دروازے کے قریب آ کر تھم گیا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سب سے پہلے ایک مانوس سی عورت کا چہرہ اندر آتے ہوئے نظر آیا۔ وہ عورت چند لمحے تو سکتے میں گنگ سی کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر پتہ نہیں اُسے کیا ہوا، وہ روتے ہوئے دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ اس عورت کے پیچھے ہی ایک پکی عمر کا باوقار سا مرد جس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اور دو اور لڑکے بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چھوٹا لڑکا جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال ہی کم ہوگا اس عورت کی طرح رونے لگا اور کبھی میرے چہرے اور کبھی میرے بالوں کو چھونے لگا۔ مجھے بڑی اُلجھن محسوس ہوئی۔ پھر نہ جانے ڈاکٹر نے اندر آ کر اس عورت سے کیا سرگوشی کی اور اس باوقار مرد سے کیا کہا کہ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور اس عورت کو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اُسے چُپ رہنے کو کہا۔ وہ سب لوگ رات دیر تک میرے ہی کمرے میں موجود رہے۔ پھر مجھے نیند آنے لگی تو نرس نے ہیلپر کی مدد سے مجھے بستر تک پہنچا دیا۔ سونے سے پہلے ایک عجیب سی بات ہوئی، اس باوقار مرد نے آگے بڑھ کر میرے گال پر زور سے تھپکی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے بہت پہلے بچپن میں بھی جب مَیں سونے لگتا تھا تو کوئی جاتے جاتے میرے گال کو اسی طرح تھپک کر جاتا تھا۔

اگلے دن سو کر اُٹھا تو میرے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ سب لوگ جو کل میرے کمرے میں گھس آئے تھے وہ بھی وہیں موجود تھے لیکن وہ عورت اور وہ مرد ڈاکٹر سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاید انہیں کچھ اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھے لیکن ڈاکٹر انہیں کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک صدیقی صاحب کے ساتھ ہی جانے دیا جائے۔ اور سچی بات تو یہی

ہے کہ مَیں ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیوں ان سب کو دیکھتے ہی دماغ پر اک عجیب سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ پھر جیسے مرد اور عورت کو ڈاکٹر کی بات سمجھ میں آ گئی کیونکہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر اپنے لیے ناگواری کی لہر دیکھ لی تھی۔ مَیں صدیقی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب لوگ اور گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں تک آ ئیں۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ سب لوگ روز ہی صدیقی صاحب کے گھر چلے آتے جہاں میں برآمدے یا صحن والے باغیچے میں وہیل چیئر پر بیٹھا کسی پھول کسی دیوار کو تک رہا ہوتا۔

پھر ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک شخص جو ڈرائیور کی وردی میں ملبوس تھا ایک جوان لڑکی کے ساتھ صدیقی صاحب کے گھر آیا۔ دونوں ہی جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لڑکی تو نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ پھر اس وردی والے ڈرائیور اور صدیقی صاحب نے اُسے بمشکل چُپ کروایا۔ پھر اُس لڑکی نے صدیقی صاحب سے میرے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ صدیقی صاحب جانے کہاں سے ایک آدھ بُش شرٹ اور قلیوں کی وردی اُٹھا لائے۔ وہ لڑکی تیزی سے اس شرٹ اور وردی کے جیب ٹٹولنے لگی۔ پھر جانے ان کپڑوں کی کس جیب سے دو موتی نکل کر برآمدے کے فرش پر گرے، تب مَیں اسی لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ دو موتی کپڑوں سے نکل کر فرش پر اُچھلے تھے۔ میرے ہاتھ بے اختیاری میں ان موتیوں کو سنبھالنے کے لیے اُٹھ گئے جیسے میری کوئی بہت ہی قیمتی اور انمول چیز زمین پر گرنے جا رہی ہو۔ پھر جانے کیا ہوا، ان موتیوں کے گرنے کی آواز کا ارتعاش جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکرایا۔ میرے اندر نہ جانے کتنا کچھ جھنجھنا سا گیا۔ موتی گرنے کے بعد دوبارہ اُچھلے اور پھر زمین سے ٹکرائے میرے اندر پھر ایک جھنکار سی پیدا ہوئی۔ دُور بیٹھے مجھے یہ سب کچھ ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی فلم کو سلوموشن میں چلا دیا جائے۔ تیسری بار موتی زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی میرے ذہن میں ایک دم جھماکے سے ہونے لگے۔ میرے ذہن پر جمی برف پگھلنے سی لگی۔ یہ موتی تو مجھے ایمان نے دیے تھے۔ ہاں ہاں۔۔۔۔ یہ تو وہی دو موتی تھے، لیکن یہ یہاں۔۔۔۔ اور یہ لڑکی۔۔۔۔ یہ تو نگہت تھی جو وردی میں ملبوس شاکر کے ساتھ

وہاں آئی ہوئی تھی۔اور یہ صدیقی صاحب۔۔۔۔پھر اچانک مجھے اس کالی رات سے لے کر اب تک کا ہر واقعہ ہر چہرہ صاف نظر آ تا گیا۔ہسپتال میں کوئی اور نہیں بلکہ شاکر کے ساتھ کمشنر صاحب امی اور باقی گھر والے آئے تھے۔ایمان چلی گئی تھی اور کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ مَیں اب تک زندہ تھا۔میرے سر میں شدید درد سا اُٹھا۔ڈاکٹرز نے بعد میں مجھے بتایا کہ مَیں شدید صدمے سے اسی رات عارضی طور پر اپنا دماغی کنٹرول کھو بیٹھا تھا۔میڈیکل کی زبان میں اسے شاید ٹمپریری ایمنیز یا کہتے تھے۔ایسے واقعات مَیں آج تک سینما کے پردے پر دیکھتا رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی بھی ایک ایسے دَور سے گزرنے والی تھی۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔کمشنر صاحب اور امی نے صدیقی صاحب کے گھر کے بہت چکر لگائے تا کہ مَیں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔صدیقی صاحب بھی ان کے حامی تھے لیکن جس دن مَیں نے ان کو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مَیں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔لیکن مَیں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔اس دن کے بعد انہوں نے مجھ سے گھر جانے کا کبھی نہیں کہا۔کمشنر صاحب اور امی، بھابھی، سجاد بھائی سب اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھے۔لیکن اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔جس کے لیے مَیں جی رہا تھا جب وہ ہی نہیں رہی تو آگے کی زندگی کے ماہ و سال کہاں اور کس حال میں گزرنے تھے۔اس سے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔عباد البتہ روز شام کو مجھ سے اسٹیشن پر آ کر مل جاتا تھا۔اب سب ہی یہ جان چکے تھے کہ مَیں ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کا بیٹا اور ایک رئیس زادہ ہوں۔لیکن میرے دوست اب بھی وہیں پُرانے لوگ تھے۔خیرو اور غفورا اب بھی میرا اُسی طرح خیال رکھتے تھے۔لیکن ہوش و حواس واپس ملنے کے بعد بھی میرے لفظ مجھے واپس نہیں مل سکے۔میرا بولنا چالنا بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔مَیں گھنٹوں ایک ہی جگہ بنا کسی سے کوئی بات کیے چُپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔کوئی ہاتھ سے پکڑ کر کہیں زبردستی لے جاتا تو چل پڑتا ورنہ وہیں بیٹھا خلا میں تکتا رہتا۔مَیں اب تک ذہنی طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔مجھے اس ساری دنیا سے ہی بے زاری محسوس ہوتی تھی جس میں مَیں خواہ مخواہ ہی جیے جا رہا تھا۔مجھے اس مذہب سے چڑ ہو گئی تھی جس نے مجھ سے میری ایمان کو چھین لیا تھا۔وہ معصوم لڑکی مذہب اور محبت کے درمیان کی اس جنگ میں پس گئی تھی۔اس کا نازک

دل اور سیدھا سادھا دماغ اس جنگ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پایا اور اُس نے اپنی زندگی ہار دی۔ محبت، مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ محبت مذہب پر قربان ہو گئی تھی۔

درمیان میں ایک آدھ مرتبہ عبداللہ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہم دونوں چُپ چاپ بیٹھے رہتے اور پھر وہ الوداع کہہ کر چل دیتا۔ اس کا غم، میرے دکھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہم لفظوں کی بولی سے زیادہ آپس میں خاموشی کی زبان زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لفظ بھی احساسات اور جذبوں کو کس قدر بے توقیر کر دیتے ہیں۔ ان کی عزت اور وقار کم کر دیتے ہیں۔ ان کی شدت کو بیان نہیں کر پاتے۔ سچ مانیے تو لفظ کبھی کبھی ہمارے محسوسات اور جذبوں کو بے عزت کر دیتے ہیں شاید اسی لیے میں اور عبداللہ آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس خاموش رہ کر ایک دوسرے کا کرب محسوس کرتے تھے۔

واپس ہوش میں آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ نگہت سے ملاقات ہوئی تو اُس نے مولوی علیم کی اس کایا پلٹ کے بارے میں بتایا تب مجھے پتہ چلا کہ ایمان اس آخری رات سے دو راتیں پہلے ہی اس جان کنی کے عالم میں تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح نکلنے کے لیے بے چین ہے لیکن کسی کے انتظار میں نکل نہیں پاتی۔ ڈاکٹروں نے تو تین دن پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی دُعاؤں پر دواؤں سے زیادہ بھروسہ تھا لیکن تیسرے دن وہ بھی ٹوٹ گئے۔ عبداللہ نے ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا کہ آخری بار وہ ان سب کی بات مان لیں۔ حیا جانتی تھی کہ ایمان کو کس کا انتظار ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایمان ساری عمر بھی چاہے ایسے ہی کیوں نہ تڑپتی رہے لیکن اس کے اندر کی ایمان اسے کبھی لب نہیں کھولنے دے گی۔ حیا نے بھی عبداللہ کو مجھے بلوانے کے لیے کہا تھا۔ عبداللہ نے حیا سے اس بارے میں دوسرا کوئی سوال ہی نہیں کیا اور براہِ راست مولوی صاحب کی عدالت میں عرضی لگا دی تھی۔ مولوی صاحب پہلی رات تو بہت جز بز ہوئے اور انہوں نے عبداللہ کو سخت سُست بھی سنا دی تھیں۔ لیکن پھر دوسری رات اور پھر آخری رات جیسے جیسے ایمان کی حالت بگڑتی گئی اُن کے اندر کا سخت گیر مذہبی باپ ٹوٹتا گیا، حتیٰ کہ تیسری شام جب عبداللہ ان کے سامنے رو پڑا تو ان سے بھی برداشت نہ ہو سکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے کسی نامحرم کو اپنے گھر کی

نہ صرف دہلیز بلکہ زنانے کی حد عبور کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ شاید وہ اسی لمحہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ ایمان بھی میری محبت میں اُتنی ہی مبتلا تھی جتنا میں۔۔۔۔ شاید اُن کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ ایمان صرف ان کی تابعداری میں اس رشتے کے لیے رضامند ہوئی ہے۔ وہ اپنے تصور کی آخری حد تک جا کر بھی یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کے دل میں یوں چور دروازے سے کوئی اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے اندر کے مذہبی انسان کے لیے یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ دوسری طرف ان کے اندر بسے ایک پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ بہت اذیت ناک تھا کہ ان کی جان سے پیاری بیٹی نے اپنی زندگی ان کی خوشی کے لیے قربان کر دی لیکن انہیں اپنے دل کی حالت کے بارے میں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ شاید اس رات عبداللہ کو مجھے بلا لانے کی اجازت دینے والا شخص مولوی علیم الدین نہیں بلکہ صرف ایک باپ ہی تھا۔ لیکن اس باپ نے بہت دیر کر دی تھی، جب تک اُسے ہوش آیا وہ اپنی بیٹی کھو چکا تھا۔

مجھے نگہت نے ایک بند لفافہ بھی دیا تھا جسے میں روزانہ کھولنے کی ہمت کرتا اور روز ہی ہار کر واپس سنبھال کر رکھ دیتا تھا۔ نگہت نے بتایا تھا کہ یہ لفافہ ایمان نے اُسے اپنی بیماری کے دوران دیا تھا کہ اُس کی شادی کے بعد نگہت وہ لفافہ مجھ تک پہنچا دے اس نازنین کو کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس کی سانسیں ہی گن رکھی ہیں۔

پتہ نہیں میں ایمان کے اس آخری خط کو کھولنے سے اس قدر کیوں ہچکچاتا تھا۔ میں ایک مقدس تحریر کی طرح اس بند لفافے کو روزانہ اُٹھاتا، چومتا، آنکھوں اور ماتھے سے لگاتا اور پھر واپس اسی دراز میں رکھ دیتا جہاں سے میں نے اُسے اٹھایا تھا۔ شاید میں اپنے اندر اس احساس کو جاوداں رکھنا چاہتا تھا کہ ایمان اب بھی اپنی اُس ان پڑھی تحریر کی صورت میں میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اُس کی اَن کہی باتوں کو اپنے صبح و شام کے تحیر کی صورت میں زندگی گزارنے کا اک بہانہ بنانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر ایک دن مجھے اس عذاب سے بھی گزرنا پڑا۔ رحیم کو صدیقی صاحب نے جانے کون سا کاغذ لانے کے لیے دفتر سے دن کے وقت فون کیا۔ وہ گھر پر کھانا بنا رہا تھا۔ وہ جانے کیا سمجھا اور میری دراز سے ایمان کا وہ بند خط اُٹھا لایا اور لا کر صدیقی صاحب کو دے

دیا۔ صدیقی صاحب بھی جانے کس دھن میں تھے کہ لفافہ کھول بیٹھے اور پھر کاغذ پر نظر پڑتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ مَیں اس وقت پلیٹ فارم کے ایک سنسان گوشے میں بیٹھا دو مزدوروں کو مال گاڑی سے سامان اُتارتے دیکھ رہا تھا۔ نظر بھٹکی تو صدیقی صاحب کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ مَیں سٹ پٹا کر کھڑا ہوگیا۔

''معافی چاہتا ہوں میاں ۔۔۔۔ رحیم کو کوئی کاغذ گھر سے لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ جلدی میں تمھاری کوئی ذاتی تحریر اُٹھا لایا۔ اور مَیں بھی بے خیالی میں اُسے کھول بیٹھا، لیکن اطمینان رکھو، اس تحریر کے سارے لفظ ویسے ہی ان چھوئے ہیں جیسے بند لفافے میں تھے۔''

صدیقی صاحب ایمان کا خط کھلے لفافے کی صورت میں میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھما کر واپس چلے گئے۔ میری حالت ایک لمحے میں کسی برسوں کے بیمار جیسی ہوگئی تھی۔ ٹانگوں میں سے جیسے کسی نے ایک لخت ہی جان نکال دی ہو۔ گھبرا کر وہیں بینچ پر بیٹھ گیا۔ دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے میری نظروں کے سامنے ایمان کا خط نہیں بلکہ وہ خود موجود ہو۔ کتنے دن سے یہ خط میرے پاس بند پڑا ہوا تھا لیکن اُسے کھول کر پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی، اور آج جب صدیقی صاحب نے غلطی سے اُسے کھول لیا تھا تو میرا دل اُسے پڑھنے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ایمان سے بات کرتے ہوئے اس دل میں اتھل پتھل ہوتی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی اس وقت میری۔ آخر کار مَیں نے کانپتی انگلیوں سے خط کی تہیں کھول ہی دیں۔ اس گل رُخ کی وہی دل میں سیدھی اُتر جانے والی تحریر میری نظروں کے سامنے تھی اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے رواں ہوگئے۔

''مَیں جانتی ہوں آپ ابھی تک گھر واپس نہیں گئے ہوں گے۔ مَیں نے آپ سے کہا تھا نا۔۔۔۔ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔ محبت تو ہتھیار ڈال دینے کا نام ہے۔ جیت کر بھی ہتھیار ڈال دینا صرف محبت کرنے والوں کا ہی تو شیوہ ہے۔ آپ بھی جیت چکے ہیں حماد۔۔۔۔ بس اب میری خاطر ہتھیار ڈال دیں۔۔۔۔

اور پھر محبت صرف پا لینے کا ہی تو نام نہیں ہوتا۔ مَیں نے آپ سے کہا تھا نا کہ زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی بس ایک ملاقات ہی کافی ہوتی

ہے۔زندگی اس کی یاد کے سہارے آرام سے کاٹی جاسکتی ہے۔میں آپ سے یہاں نہیں مل پائی تو کیا ہوا۔۔۔۔اس ابدی زندگی میں ساتھ رہنے کی دُعا تو سدا میرے ساتھ رہے گی نا۔۔۔۔'مَیں جانتی ہوں آپ کو واپسی کے لیے بہت سے بھرم توڑنا پڑیں گے اپنے اندر کے آئینے سے لڑنا بھی پڑے گا۔لیکن مَیں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہمیشہ خوش رہیے گا۔"

OO

جانے مَیں نے اس عشوۂ طراز کا یہ خط کتنی بار پڑھا اور جانے مَیں کتنی دیر سے ہچکیاں لے لے کر روتا رہا۔پھر کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا، وہ عبداللہ تھا۔پتہ نہیں کب سے وہ یہاں کھڑا تھا۔عبداللہ نے میرے گالوں پر بہے آنسو پونچھ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"کب تک آپ ہم سب کو رُلاتے رہیں گے۔دیکھیں۔۔۔۔آج آپ سے ملنے کون کون آیا ہے۔"

مَیں نے حیرت سے عبداللہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا پلیٹ فارم میرے اور شاکر کے گھر والوں سے ہی بھرا ہوا تھا۔امی، سجاد بھائی، عبرینہ، بھابھی، عباد، سنی، شاکر اور نگہت کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کمشنر صاحب اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سب سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار آنے میں بہت وقت لگا۔مولوی علیم الدین آنکھوں میں آنسو لیے، سب سے آگے کمشنر صاحب کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔شہر کا سب سے دبنگ ریٹائرڈ کمشنر ایک غریب مولوی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا تھا۔اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی سدا کی مغرور آنکھوں میں نفرت کے بجائے شرمندگی تھی اور اس کی ہمیشہ سے اکڑی ہوئی کمر جھکی ہوئی تھی۔وہ سب وہیں کھڑے رہے، بس مولوی صاحب میری طرف بڑھے میری

نظریں خود بخود جھک گئیں، وہ قریب آ گئے اور میرے شانوں پر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"تم جیت گئے ہو حماد میاں، تمھاری محبت جیت گئی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ محبت سچی ہو تو وہ سارے زمانے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ سب تم سے بے حد شرمندہ ہیں۔ کمشنر صاحب خود چل کر میرے گھر آئے تھے۔ انہوں نے اور بیگم صاحبہ نے اور سب نے اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ معاف کر دینے میں ہی عظمت ہے۔ مَیں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ سب سے پہلے مجھے اور پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی معاف کر دو۔ ہم سب تمھاری محبت کی عظمت کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اور چھوٹوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ درگزر کیا جاتا ہے، تم بھی درگزر کر دو۔۔۔۔ دیکھو میں تمھارے سامنے اپنے ہاتھ۔۔۔۔"

مولوی علیم نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن مَیں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں میں چھپے سیلاب بہہ نکلے۔ وہ مجھے تھپکتے رہے لیکن خود کو بھی رونے سے نہ روک پائے۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے چند قدم دُور کھڑے کمشنر صاحب کے پاس لے آئے۔ مَیں سر جھکائے کھڑا رہا۔ انہوں نے بچپن کی طرح میرے گال کو زور سے سہلایا۔ اچانک میرے سامنے سے ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا غائب ہو گئے اور میرے بچپن والے بابا آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور مَیں ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑا، وہ بھی مجھے گلے لگائے روتے رہے۔ برسوں کے بعد ایک باپ نے ایک بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ پھر تو کیا تھا، لگتا تھا کہ سارا اسٹیشن ہی وہاں اُمڈ آیا ہے۔ امی، عباد، سجاد، بھابھی، شاکر، نگہت سب ہی مجھے اپنے جمگھٹے میں لیے ہوئے چھو رہے تھے، پیار کر رہے تھے، رو رہے تھے، یہ آنسو بھی جذبوں کے اظہار کا کیسا عمدہ ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ اُسی کے لیے آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جو آپ کے اپنے ہوتے ہیں، آپ کو پیارے ہوتے ہیں۔ اور بابا کو تو مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بھیگی آنکھوں کے

ساتھ دیکھا تھا۔ غفورا بھی دُور خیرو اور دیگر مزدوروں کے ساتھ کھڑا بار بار کاندھے پر پڑے رومال سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ آج ان سب کے چہروں پر بھی اک عجیب سی خوشی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اندر سے اُداس بھی تھے۔ شاید وہ جان چکے تھے کہ اب میرا ان سے رُخصت ہونے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ لیکن میرا وجود چاہے ان سے دور جا رہا ہو۔ پر میری رُوح تو ہمیشہ انہی رشتوں کے درمیان موجود رہے گی۔ کچھ رشتے ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنتے ہیں۔ غفورا اور خیرو وغیرہ کمشنر صاحب کے رعب کی وجہ سے قریب نہیں آ پا رہے تھے۔ بابا نے انہیں دُور سے میری طرف ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود ان کی طرف چلے آئے۔ مَیں نے ان سب کا بابا سے اسی طرح تعارف کروایا جس طرح میں بچپن میں اپنے دوستوں سے ان کا تعارف کرواتا تھا۔ بابا بھی آج بالکل وہی بچپن والے بابا بن گئے تھے۔ سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا اور ان سب کا میرا اتنا خیال رکھنے پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔ صدیقی صاحب بھی اتنی دیر میں وہاں آ چکے تھے۔ بابا نے بہت دیر تک انہیں گلے سے لگائے رکھا۔ شاید شاکر انہیں صدیقی صاحب اور ان سب کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا چکا تھا۔

مجھے ان سب نے اسٹیشن سے اس طرح رخصت کیا جیسے میری بارات وہاں سے نکل رہی ہو۔ ہاں ۔۔۔۔ سچ ہی تو ہے، میرے ساتھ ایمان کی یادوں کی بارات ہی تو تھی۔ وہ مجھ سے جُدا کب تھی۔ ہر لمحہ میرے ساتھ ہی تو رہتی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ تنہائی میں میرے آنسو پونچھتی تھی۔ میرے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی۔

گھر واپس آ کر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ پایا۔ مَیں نے خود بابا سے کہہ کر لندن میں یونیورسٹی میں داخلے کے فارم منگوا لیے۔ اگلے مہینے ہی یونیورسٹی سے بلاوا آ گیا اور مَیں نومبر کی ایک سرد شام ایمان کے شہر سے اس کی گلابی یادوں سمیت رخصت ہو گیا۔

"تمھیں جب کبھی ملیں فرصتیں
میرے دل سے یہ بوجھ اُتار دو
مَیں بہت دنوں سے اُداس ہوں

مجھے کوئی شام اُدھار دو۔۔۔۔
کسی اور کو میرے حال سے
نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ
مَیں بکھر گیا ہوں
سمیٹ لو۔۔۔۔
مَیں بگڑ گیا ہوں،
سنوار دو۔۔۔"

OO

یادوں کی بارات

ایمان چلی گئی اور مَیں اُس کے جانے کے بعد لندن آ گیا۔ شاید مَیں بھی کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس نظریے کی غلط فہمی کا شکار تھا کہ شاید اس کا شہر چھوڑ دینے کے بعد میرے درد میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی یاد وہ خنجر تھا جو ہمیشہ میرے دل کے عین بیچ گڑا رہا۔ جب تک لوگ آس پاس ہوتے، ذہن کچھ بٹا رہتا، لیکن تنہائی ملتے ہی مجھے اس کی وہ دو بڑی بڑی آنکھیں گھیر لیتیں۔۔۔۔ اس کے دیے ہوئے وہ دونوں موتی اور اس کا آخری خط میرے ساتھی بن جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی یاد کے آنے سے میری تنہائی ہی میری سب سے بڑی محفل بن جاتی اور لوگوں کے بیچ میں اکثر تنہا رہتا۔ جیسے ہی لوگ میرے پاس آتے مَیں تنہا ہو جاتا تھا۔ پھر گھنٹوں بیٹھا بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرتا تا کہ لوگ جائیں، مجھے تنہائی ملے اور پھر سے اپنی محفل جما سکوں۔ صرف ایک کامران میرے دوستوں میں سے ایسا تھا جسے میرے دل کی حالت کا علم تھا۔ جب گذشتہ دنوں مَیں نے اُسے ایمان کے چلے جانے کے بارے میں پہلی مرتبہ کھل کر بتایا تو بہت دیر تک تو وہ سکتے کی کیفیت سے ہی نہیں نکل پایا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایمان کی شادی کہیں اور ہو گئی ہو گی، کیونکہ پچھلے دو سال سے نہ وہ پاکستان آیا تھا اور نہ ہی مَیں نے اسٹیشن پر ملازمت کے بعد اور لندن آنے سے پہلے تک اس سے کوئی رابطہ رکھا تھا۔ کامران اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجبوراً مجھے اُسے خواب آور دوا دے کر اس رات سلانا پڑا تھا۔ بہت دنوں تک وہ مجھ سے بھی روٹھا روٹھا سا رہا کہ مَیں نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اُسے خبر کیوں نہ کی۔ اسے میرے آہنی اعصاب پر بھی حیرت تھی کہ میں اب تک چل پھر کیسے رہا تھا۔۔۔۔ اب مَیں اُسے کیا بتاتا کہ یہی تو اصل شرمندگی کی بات تھی۔ کاش میرے حواس بھی ایمان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے

چلے جاتے۔ لیکن مجھے تو وہ جاتے جاتے جینے کی سزا سنا گئی تھی۔ اور مَیں تھا کہ سزا کے طور پر جیے جا رہا تھا۔۔۔۔۔

ربیکا بھی مجھ سے ہمیشہ یہی گلا کرتی تھی کہ مَیں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب کے بیچ نہیں ہوتا۔ جانے کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ البتہ آج اس کی ناراضگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ دراصل اُسے میں نے صبح ہی بتایا تھا کہ میں سارہ کے گھر رات کھانے پر مدعو تھا۔ ربیکا رات بھر کی برف باری کے بعد نہر کے ساتھ جمی برف سے اسنو مین بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کوشش میں اس کے سفید ہاتھ پہلے سُرخ اور اب سردی سے نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ بات سنتے ہی وہ برف کا ڈھیر چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے میری جانب لپکی۔

''کیا کیا۔۔۔۔ سارہ کے گھر کھانے پر گئے تھے۔ رات کو۔۔۔۔ اور مجھے ابھی بتا رہے ہو، یہ بھلا کیا بات ہوئی۔؟''

''اس نے دوپہر ساڑھے تین بجے مجھے یہ آفر کی تھی تب تک تم جا چکی تھیں۔ شام کو مَیں لائبریری کھنگالتا رہا اور اب جب تم ملی ہو تو بتا رہا ہوں۔''

ربیکا جانے کیوں روہانسی سی ہو گئی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

''جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے تمھیں سارہ کے ساتھ دیکھ کر۔ غلطی میری ہی ہے، ایک ہی شخص ہر کسی کے لیے ایک سا ساون نہیں بن سکتا۔ اس کے وجود کی ٹھنڈی بوندیں سبھی پر یکساں نہیں برس سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے تمھارے وجود کا صحرا ہی غنیمت ہے۔ مَیں اپنے اس مقدر پر بھی بہت خوش ہوں۔۔۔۔''

ابھی ربیکا کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے سارہ آتی دکھائی دی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے گہرے سُرخ کی بند گلے کی سوئیٹر اور کالی جینز پہن رکھی تھی۔ برف سے بچاؤ کے لیے بند جوتے پہنے وہ ہماری طرف بڑھی چلی آئی۔ اس کے کاندھوں پر وہی جیکٹ تھی جو رات سردی سے بچاؤ کے لیے مَیں اس کے کاندھوں پر ڈال آیا تھا۔ ربیکا میری جیکٹ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُس نے غور سے آتی سارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے برف کے ادھ بنے پتلے کی طرف بڑھ گئی۔ سارہ نے قریب آ کر جیکٹ میرے حوالے کی۔

''یہ رہی تمھاری امانت۔۔۔۔رات کو میرا دھیان بٹانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔''

''سر آئزک نے کہیں بعد میں میری جیبوں کی تلاشی تو نہیں لی اکیلے میں۔'' سارہ زور سے ہنس پڑی۔

''اب ایسے بھی نہیں ہیں میرے پاپا۔۔۔۔رات کو بھی انہوں نے تمھارے جانے کے بعد خود مجھ سے سوری کہا تھا۔''

''اوہ۔۔۔۔بہت خوب۔۔۔۔واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔''

ربیکا نے برف سے گیلے اپنے ہاتھ جھاڑے اور پلٹ کر بولی۔

''بھئی میں تو اندر کیمپس میں جا رہی ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ یہیں کٹ کر گر جائیں گے۔''

سارہ اُسے روکتی ہی رہ گئی لیکن ربیکا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے اگر وہ مڑ کر دیکھتی تو اس کی بھیگی آنکھیں بھی سارہ کو نظر آ جاتیں۔ سارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''اِسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔ہے مسٹر حماد۔۔۔تم نے میری سب سے پیاری سہیلی کو اتنا اداس کیوں کر دیا ہے۔ یہ ایسی تو کبھی بھی نہ تھی؟''

''شاید اُداسی میرے آس پاس بکھری رہتی ہے، جو بھی میرے ساتھ رہتا ہے وہ اس اداسی کے گہرے میں ڈوب جاتا ہے۔''

سارہ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''تم باتیں بہت خوبصورت کرتے ہو۔ ربیکا بھی تمھاری انہی باتوں سے گھائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کچھ بات تو ہے تم میں؟''

مجھے اس کے سوالیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔

''یہ سوال ہے یا کوئی فیصلہ۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔۔مَیں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مَیں نے اپنے پاپا کو کل رات سے زیادہ پریشان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ مَیں جانتی ہوں کہ وہ بہت مضبوط انسان ہیں۔ زندگی کی ہر بڑی سختی کو انہوں نے مسکراتے ہوئے جھیلا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ سے

میرے آئیڈیل بھی رہے ہیں۔لیکن جانے کیوں۔۔۔۔جب سے تم اس یونیورسٹی میں آئے ہو،مَیں نے انہیں تمھاری جانب سے کسی نہ کسی اُلجھن میں ہی مبتلا پایا ہے۔کل رات بھی میری پاپا سے اسی بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا وہ مجھے یا میرے عقیدے کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں کہ مَیں اس سے پلٹ جاؤں گی۔ہمیں بچپن سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم عظیم ہیں اور عظیم رہیں گے۔۔۔۔تو کیا ہماری عظمت کسی ایک لڑکے کے انکار کرنے سے کیا کم ہو جائے گی۔کیا ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ کسی اور کا ایمان اس میں دراڑیں ڈال دے گا۔۔۔۔؟''

مَیں چُپ کر کے اس پُر اعتماد لڑکی کی بات سنتا رہا۔

''پھر تمھارے پاپا نے تمھیں کیا جواب دیا۔''

''مجھے حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے روایتی باپ کے رویے سے کام لیا۔جو دلیل اور لاجک کی بجائے اپنا تجربہ اور خدشات اپنے بچے کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر کے خوف سے اُسے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔تم نے اس دن کہا تھا کہ اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔اگر یہ اندھیرا ہے تو مَیں خود بھی اس اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔۔۔۔پھر مجھے تم سے تمھارے عقیدے سے خوف محسوس کیوں نہیں ہوتا؟''

سارہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ سرآئزک کے رویے نے اُسے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔میں اس کی باتیں سن کر یہ سوچتا رہا کہ مغرب اور مشرق کے رویوں میں کس قدر فرق ہے۔یہاں مغرب میں ایک بیٹی باپ سے اپنے غلط یا صحیح ہونے پر باقاعدہ کسی ملزم کی طرح جرح کر سکتی تھی۔اس سے لڑ سکتی تھی،روٹھ کر ناراض ہو سکتی تھی جب کہ مشرق میں کسی جوان لڑکی کا باپ کے سامنے یوں کھڑا ہونا بھی محال تھا۔چہ جائیکہ وہ اپنے باپ سے کوئی سوال کر سکے۔۔۔۔جانے کیوں مجھے اس لمحے ایمان بہت شدت سے یاد آئی۔سارہ اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتی رہی۔پھر اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کہاں کھو جاتے ہو یوں پل بھر میں۔''

آج اس نے بھی اچانک وہی سوال پوچھ لیا تھا جو بیکا اس سے پہلے کئی مرتبہ پوچھ چکی تھی۔

''کہیں نہیں۔۔۔۔بس تمھاری بات سن رہا تھا۔''

''نہیں۔۔۔۔تم میری بات سنتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھے۔تم کبھی بھی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔میں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں اُداسی کے اتنے بھنور ایک جگہ اکٹھے نہیں دیکھے۔اگر کوئی بہت ذاتی بات نہ ہو تو تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔''

اب میں اس معصوم لڑکی کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کتنے غم میرے ابدی ساتھی ہیں۔ میں اُسے یہ سب بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''داستان اتنی لمبی ہے کہ تم سُن سُن کر اکتا جاؤ گی۔ہاں البتہ یہ یقین رکھو کہ اس میں کچھ ایسا ذاتی نہیں ہے جسے تم سے چھپایا جائے۔جب کبھی ہمیں فرصت ہوئی اور ہم دونوں ساتھ ہوئے تو تمھیں ضرور بتاؤں گا۔''

وہ خوش ہوگئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

''وعدہ۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''پکا وعدہ۔''

پھر وہی دو ہلکے سے گڑھے اس کے چہرے کا نور بڑھا گئے۔کلاس کی گھنٹی تیسری بار بج چکی تھی۔ہم دونوں ہی وہاں سے چل دیے۔۔۔۔

OO

خوف

پھر ایک عجیب بات ہوئی، یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اعلان کر دیا کہ اس سال پہلے کی طرح طالب علم اپنا پرچہ اور تحقیق ہمیشہ کی طرح کھلے ہال میں تمام یونیورسٹی کے سامنے نہیں پڑھیں گے۔ بلکہ تمام اسٹوڈنٹس پہلے اپنا ٹرم پیپر لائبریری میں جمع کروائیں گے اور انتظامیہ اس کی جانچ اور تحقیق کے بعد چند منتخب شدہ پرچوں کو عام طلبا کے سامنے تقریب میں پڑھنے کی اجازت دے گی۔

سارہ اس بات سے بھی شدید جھلائی ہوئی تھی لیکن مَیں جانتا تھا کہ اصل میں معاملہ کیا تھا۔ سرآئزک نہیں چاہتے تھے کہ مَیں اپنی تحقیق کسی بھی صورت میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ وہ اس نئی نسل کو "ہالوکاسٹ" کا وہی رُخ دکھانا چاہتے تھے اور اسی یقین میں زندہ رکھنا چاہتے تھے جو برسوں سے اس نسل تک پہنچایا جاتا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار ایک عجیب سا طمانیت بھرا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود کو عظیم کہنے والے اصل میں مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ میرے عقیدے سے خوف زدہ ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو عظیم کہلوانے کا حق اگر کسی کو ہے تو اصل میں وہ ہم ہیں۔ لیکن ہماری عظمت ہم خود اپنے ہاتھوں سے گنوا چکے ہیں۔ اور ان یہودیوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم پھر سے اپنی اس عظمت گم گشتہ کو پا نہ لیں۔

بہت دنوں کے بعد سرآئزک آج کلاس میں پُرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا تھا۔ ربیکا پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی سرآئزک سے پوچھ لیا کہ اس مرتبہ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی نے ٹرم پیپر سے متعلق اپنا اُصول کیوں بدل لیا ہے۔ سرآئزک نے بڑی خوبصورتی سے اُسے انتظامیہ کا اندرونی معاملہ کہہ کر ٹال دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہر سال کچھ معیاری پرچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر معیاری پرچے بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے اس مرتبہ منتخب شدہ پرچوں کو ہی منظر عام پر لایا

جائے گا۔ ربیکا نے کاغذ کی چٹ پر لکھ کر چٹ میری طرف کھسکائی، اُس نے چٹ پر لکھا تھا کہ کیا وہ سر آئزک سے براہِ راست پوچھ لے کہ کہیں یہ پابندی میرے ٹرم پیپر کے موضوع کی وجہ سے تو نہیں لگائی گئی۔۔۔۔؟ مَیں نے آنکھیں نکال کر اُسے گھورا تب کہیں جا کر وہ باز آئی ورنہ اس سے کوئی بعید بھی نہ تھی کہ وہ یہ سوال بھی سر آئزک سے کر ہی بیٹھتی۔

اتفاق سے سارہ کے ٹرم پیپر کا تعلق بھی ''ہالوکاسٹ'' سے ہی تھا۔ وہ دراصل فریڈیچ کیلز، نامی ایک یہودی مصنف کی تحقیق پر مبنی تھا مقالہ لکھ رہی تھی جس نے ''ہالوکاسٹ'' کے حق میں اپنی تصنیف (روزنامچوں) میں مختلف دلائل دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی کتابوں انٹرویوز اور مختلف حوالوں سے اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

سارہ نے مجھ سے کبھی اپنی تحقیق چھپائی نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں اپنی روزانہ کی پیش رفت کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ربیکا پر وہ لمحے بہت گراں گزرتے تھے جب سارہ میرے ساتھ کسی بحث میں مصروف ہوتی۔

پھر ایک ایسے ہی اُجلے دن جب پوری یونیورسٹی دھوپ سینکنے کے چکر میں چھٹی منانے کے موڈ میں تھی۔ مَیں نے ربیکا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ نہر کنارے اپنی مخصوص بینچ پر بٹھا لیا۔ آج مَیں نے اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ آج میرے اس انداز پر خاصی حیران بھی تھی۔

''بیٹھو یہاں۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں پھنسے میرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

''ہے میڈی۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔ آج کہیں مجھے پرپوز کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔'''' کاش میں اتنا خوش نصیب ہوتا۔ تمھارا ساتھ پانے والا دونوں جہاں پا لے گا۔''

ربیکا کی آنکھوں میں بیک وقت بہت سے شرارے لپکے۔

''واقعی۔۔۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔ مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تمھارے وجود میں اور تمھاری اس خوبصورت روح میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی نوجوان کے خوابوں کی تمنا ہو سکتی ہے۔ تم جس راستے سے گزر جاتی ہو، لوگ گھنٹوں

وہاں مسحور بیٹھے رہتے ہیں۔ تمھاری ایک جھلک پانے کے لیے، تم سے دو گھڑی بات کرنے کے لیے مَیں نے یہیں اسی یونیورسٹی میں جانے کتنوں کو دن رات پریشان دیکھا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تُم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

مَیں نے اس بے باک مغربی حُسن کے چہرے پر پہلی مرتبہ شرم کی سُرخی دیکھی۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی بھی ہو۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں یہ وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ وہ ہنس کر بولی "ہاں ۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ خاص بات تو ضرور ہوگی تبھی یہ سب آہیں بھرتے ہیں ۔۔۔۔ لیکن وہ خاص بات نہیں جو اس کے پتھر دل کو موم کر دے۔ جس کو مَیں پگھلانا چاہتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے کس کام کا۔"

تو آج ربیکا نے بھی دل کی بات کھل کر کہنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

ہمارے سامنے ٹیمز سے نکلی اس نہر کا برف جیسا پانی نہایت خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں جمی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تیرتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی برف کے چھوٹے سے سفید سنگِ مرمر کی سِل نما ٹوٹے پر پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا ہمارے سامنے سے گزرا جو برف میں پھنسی گھاس کے ٹکڑے نکالنے میں مشغول تھا۔ دھوپ سیدھی ربیکا کے سنہری رنگ پر پڑ رہی تھی اور اُس کا چہرہ مزید کندن ہو گیا تھا۔ بلیک سکرٹ اور بلیک ٹاپ میں وہ اس وقت بالکل کالے مخمل میں لپٹی سونے کی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔

ربیکا اپنی بات کہہ کر چُپ چاپ بیٹھ کر نہر میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکنے لگی۔ اُس نے کنکر پھینکنے کے لیے ہاتھ ہوا میں اُٹھایا تو مَیں نے وہیں اس کی کلائی تھام لی۔

"کیا ضروری ہے کہ سب جذبے، ساری خوشیاں، ہر خواہش کسی ایک شخص سے ہی متصل کر دی جائے؟ ہو سکتا ہے وہ بدنصیب اس انعام کا حق دار ہی نہ ہو؟ ۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے سارے رنگ، ساری قوس وقزح پہلے ہی کہیں نثار چکا ہو؟"

ربیکا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ "اگر وہ اپنے حصے کی قوس وقزح پہلے ہی کسی اور کی آنکھوں میں ڈھونڈ چکا ہے تو پھر یوں سمجھو کہ میری زندگی میں بھی ہر رنگ سے میرا حق، رنگے بنا ہی چھن چکا ہے۔ میری محبت

بھی ہمیشہ بے نور ہی رہے گی۔"

یا خدا۔۔۔۔اس لڑکی کو اتنی مشکل باتیں بھی آتی ہوں گی۔۔۔۔میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔شاید یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایسی کٹھن بولیاں سکھا جاتی ہے۔ربیکا کا دل بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔محبت پھر سے اپنا صدیوں پُرانا کھیل کھیل رہی تھی۔فرق صرف اتنا تھا کہ عاشق اور محبوب کی جگہ اور نام بدل گئے تھے۔باقی ساری چبھن، ساری کاٹ، سارے گھاؤ وہی تھے۔کاش ہم انسانوں کو اتنا تو اختیار دیا ہوتا خدا نے کہ اگر ہم خود کو نہیں، تو کم از کم دوسروں کو تو اس آگ سے بھرے گڑھے میں گرنے سے روک سکتے۔لیکن قدرت کو تو خود یہ تماشا دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔وہ دو انسانوں میں سے کسی ایک کے دل میں دوسرے کے لیے یہ آگ بھڑکا کر اُسے عمر بھر کے لیے سسکتا اور تڑپتا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے۔قدرت تو اس کھیل کی ازل سے سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔وہ ابد تک ہم انسانوں کو یونہی تڑپاتی سسکاتی رہے گی۔جیسے وہ اس وقت ربیکا کو تڑپا رہی تھی میرے لیے۔وہ ربیکا جسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ میری رُوح تو جانے کب کی ایمان کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔یہ سانس لیتا جسم تو خود اک چلتی پھرتی لاش تھا، محبت کا وہ زہر جو آج اس کی رگوں میں دھیرے دھیرے اُتر رہا تھا۔بہت پہلے میری جان لے چکا تھا۔

ربیکا سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی بلند کی۔اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھوں میں جانے کتنے بھنور مچلنے کو تیار تھے۔

"نہیں۔۔۔۔تم نہیں روؤ گی۔۔۔۔بہت رُلا لیا اس محبت نے ہم جیسے بے بس انسانوں کو۔بہت کھیل لیا ہے اس نے ہمارے جذبات کے ساتھ۔بہت گھاؤ لگا چکی یہ محبت بہت چرکے سہہ لیے ہم نے اس کے چلائے ہوئے اندھے تیروں کے۔۔۔۔نہیں ربیکا۔۔۔۔تم نہیں روؤ گی۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔اب اور نہیں۔"

مَیں اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور اُسے رونے سے منع کرتا جا رہا تھا لیکن جس رفتار سے مَیں اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے مزید آنسو اُمڈتے آ رہے تھے۔ربیکا بار بار مجھ سے معذرت کرتی اور نہ رونے کا وعدہ کر رہی تھی لیکن اس

کے اندر کا سیلاب آج پوری طرح بہہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے دُور چلی گئی۔ مَیں اُسے دُور جاتے دیکھتا رہا۔ نہر پر راج ہنسوں کے ایک جوڑے نے پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور تیزی سے پَر پھڑ پھڑا کر پانی کے اُوپر آ کر بیٹھ گیا۔ ہنسنی سے ہنس سے پوچھا۔ ''وہ راج ہنسنی رو کیوں رہی تھی۔ اس کا ہنس کہاں ہے؟ ہنس نے ایک لمبی اُڑان بھری اور پھر سے ہنسنی کے سَر پر منڈلا کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''یہ انسانوں کی دُنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس ہنسنی کا ہنس تو کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آیا۔ اِک ہنس وہاں نہر کنارے بیٹھا تو ہے لیکن اس کی تو اپنی ہنسنی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ کیسے بے جوڑ سے جوڑے بنا رکھے ہیں تقدیر نے ان انسانوں کے زمین پر۔ ان سے تو ہم ہَوا کے دوش پر تیرتے راج ہنس ہی بھلے۔ ہم میں سے ہر اِک کا اپنا جوڑا تو ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ بھی ہے۔ ہنسنی نے اِک دکھ بھری نظر دُور بھاگتی ریکا پر اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر اچھے ہنس کے ساتھ ایک لمبی اُڑان بھر گئی۔ مَیں وہیں اکیلا تنہا بیٹھا رہ گیا۔۔۔۔۔

OO

گریز محبت

اُس دن کے بعد ربیکا بہت دن تک میرے سامنے آنے سے گریزاں رہی۔ شروع کے دو تین دن تو وہ یونیورسٹی ہی نہیں آئی۔ مَیں نے اُس کے فون پر اور گھر پر رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب نمبر بند ملتے تھے۔ پھر جب وہ یونیورسٹی آئی بھی تو بہت بکھری بکھری سی تھی، اور مجھ سے نظریں چراتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن مجھے ہیومینٹرنگ کی کلاس میں ایک موقع مل ہی گیا۔ اس دن کا موضوع تھا "پا لینے اور کھو دینے کا احساس۔"

مجھ سے جب سر آئزک نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کہا تو مَیں نے اک اچٹتی سی نگاہ ربیکا پر ڈالی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ مَیں نے اصل میں اسی کو مخاطب کیا۔

"احساس اگر محبت کا ہو تو انسان اس میں کبھی کچھ کھوتا نہیں ہے۔ صرف پاتا ہی ہے۔ محبت چاہے یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آپ کو اک خوبصورت احساس دے کر ہی جاتی ہے۔ چاہے دوسری طرف کا جذبہ اس کے ہم پلہ نہ ہو تب بھی۔۔۔۔ محبت کسی سوداگر کا سودا تو نہیں کہ دونوں جانب کے پلڑے ہمیشہ برابر ہی ہوں، دوسرے کا وزن کم ہونے سے ہمارا وزن تو بڑھتا ہی ہے نا۔ اُس کے محبت نہ کرنے سے ہماری محبت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ محبت کسی صلے کی توقع میں نہیں کی جاتی۔ ہاں اگر دوسری طرف سے بھی وہی شدت موجود ہو تو سمجھیں کہ انعام دوگنا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر دوسرے کی کم نصیبی سے وہ اس جذبے سے محروم ہے تو پھر بھی اس بات سے اپنے حصے کا انعام نہیں گنوایا جا سکتا۔ زندگی بتانے کے لیے اک اپنے حصے کا یہ احساس یہ انعام ہی کافی ہے۔ لیکن یاد رہے، محبت کا یہ سفر ننگے پاؤں ایک جلتے اور تپتے صحرا میں سدا کے لیے نکلے ہوئے سورج تلے چلنے کا سفر ہے۔ پاؤں کے چھالے گننے کے لیے بیٹھ جانے والے اپنی منزل کا نشان کھو دیتے ہیں۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔"

مَیں اپنی بات ختم کر کے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک تب بھی کلاس میں گہرا سکوت سا چھایا رہا۔ ربیکا کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔ وہ تو بھلا ہوا اُس گھنٹی کا جو کلاس ختم ہونے کی نشانی کے طور پر بج گئی ورنہ آج ساری کلاس ہی ربیکا کے راز سے واقف ہو جاتی۔ ہم سب کلاس سے رفتہ رفتہ نکل گئے۔ مَیں اپنے خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے پکارتی جوزف کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ تیسری بار اس نے پکارا تو میں چونکا۔ وہ میرے پیچھے ہی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

''ہے مسٹر حماد۔۔۔۔ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو۔۔۔۔؟''

جوزف نے میرا ہاتھ تھاما اور جلدی سے مجھے لے کر یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے جس کے لیے اُسے تنہائی کی ضرورت ہے۔ باہر کھلی فضائیں میں پہنچتے ہی اُس نے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔

''اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ تم ''ہالوکاسٹ'' پر اپنے ٹرم پیپر یا اس یونیورسٹی میں اپنے داخلے کے خاتمے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کر لو، تو تمھارا جواب کیا ہوگا؟

''آپ میرا جواب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مَیں قدم رکھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

''مَیں جانتا تھا تو پھر ذہنی طور پر تیار رہو۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے تم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید وہ مجھے بھی اس اجلاس میں نہ بلاتے جو گورنگ باڈی نے کل طلب کیا تھا، لیکن ان کی نظر میں میری وفاداریاں ابھی تک غیر مشکوک ہیں۔ اور پھر شاید اس لیے بھی کہ انہیں آخر میں کہیں نہ کہیں اس فیصلے پر تمام ٹیچرز کے ساتھ میرے دستخط بھی چاہیے ہوں گے۔''

''لیکن اب مجھ پر کیا الزام ہے؟ ٹرم پیپر کو طلباء تک نہ پہنچنے دینے کا تو انہوں نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا ہے۔۔۔۔ پھر کیا وجہ ہوئی اس اجلاس بلانے کی۔؟''

''تم دو تین دن پہلے پارک اسکوائر ایونیو کی لائبریری میں گئے تھے؟''

''ہاں گیا تھا۔''

مجھے یاد تھا، یہ اُسی دن کی بات ہے جس رات مَیں سارہ کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔

''وہاں تمھاری لائبریرین پیٹر تھامس کے کچھ بحث بھی ہوئی تھی۔''

''اُسے بحث تو نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ مجھے چند کتابیں دینے میں پس و پیش کر رہا تھا جو کہ لائبریری کی فہرست (کیٹلاگ Catlog) کے حساب سے لائبریری میں ہی موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ تو یونیورسٹی سے باہر کا ہے۔ اس سے انتظامیہ کا کیا تعلق۔''

''شاید تم نہیں جانتے۔ پیٹر خود بھی روسی نژاد یہودی ہے۔ اُس نے یونیورسٹی انتظامیہ کو اس دن کے حوالے سے، جب تم لائبریری گئے تھے۔ ایک درخواست دی ہے کہ تم نے اُسے کتابیں نہ دینے پر دھمکیاں دی ہیں اور مذہبی طور پر ہراساں بھی کیا ہے۔ اس لیے تمھارے خلاف کارروائی کرنے کی درخواست کی ہے۔''

مجھے شدید غصہ آ گیا۔

''یہ سب فضول بکواس ہے۔ نہ تو مَیں نے اُسے کوئی دھمکی دی تھی اور نہ ہی کسی بھی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔''

''مَیں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم جانتے ہو کہ انتظامیہ کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔۔۔۔ اور وہ بہانہ تم نے انہیں فراہم کر دیا ہے۔''

جوزف کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو میں اس لائبریری میں گیا تھا۔ مجھے فرانسیسی مصنف رابرٹ فوری سن کے دو طویل مقالے چاہیے تھے۔ جو انہوں نے جنوری 1979 اور دسمبر 1978ء میں لکھے تھے۔ جس میں انہوں نے واضح ثبوت دے کر ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن لائبریرین پیٹر نے پہلے تو ان مقالوں کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔ پھر مَیں نے اُسے لائبریری کی فہرست دکھائی جس میں باقاعدہ ان دو مقالوں کا اندراج تھا اور فہرست اور رجسٹر یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشو بھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے مجھ سے کہا کہ مَیں کل یا پرسوں چکر لگا لوں کیونکہ آج وہ کچھ مصروف ہے۔ اب جب کہ جوزف نے مجھے لائبریرین پیٹر کی قومیت کے بارے میں بتایا تو مجھے اس کے

رویے کی سمجھ آ رہی تھی۔ اُس کے انکار کے بعد مَیں نے ذرا سختی سے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ مَیں لائبریری کی اعلیٰ انتظامیہ یا لندن میٹرآفس میں لائبریری شعبے میں اس کے سُست رویے کی شکایت کر دوں، اس پر اُس نے منہ بناتے ہوئے ان دو میں سے ایک مقالہ مجھے کہیں اندر سے نکال کر دے دیا۔ دوسرے کے بارے میں اُس نے عذر پیش کیا کہ وہ ایک وقت میں دونوں مجھے جاری نہیں کر سکتا لہٰذا پہلا پڑھنے کے بعد وہ واپسی پر مجھے دوسرا دے گا۔ اور مَیں چُپ چاپ ایک ہی مقالہ لے کر واپس چلا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، نہ تو مَیں نے اُس لائبریرین کو کوئی دھمکی دی تھی، نہ ہی اس سے اُونچی آواز میں بات ہی کی تھی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اُسے میری یونیورسٹی کا پتہ کیسے چلا اور وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ڈی کارڈ کا خاکہ سا اُبھرا۔ اوہ۔۔۔۔ تو اس نے کتاب جاری کرتے وقت میری یونیورسٹی سے جاری شدہ میرا آئی۔ڈی (شناختی نمبر) نوٹ کر لیا تھا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میرے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

جوزف کے بتانے کے بعد مَیں شام تک بیٹھا اپنے ٹرم پیپر کو حتمی شکل دیتا رہا۔ اب میں جلد از جلد اُسے ختم کر کے پیش کر دینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب چھ بجے شام یونیورسٹی کے لائبریرین نے بتایا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، باہر واقعی اندھیرا چھا چکا تھا۔ باہر نکلا تو سرد ہَوا کے پہلے تھپیڑے نے میرا بھرپور استقبال کیا۔ آسمان سرخ انگارہ ہو رہا تھا، برف باری کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ گیٹ سے باہر نکلا تو دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اگلے بلاک تک میٹرو کی تلاش میں پیدل چلنے کا ہی فیصلہ کر لیا، دُور لندن شہر کی روشنیاں اب پوری طرح جگمگانے لگی تھیں۔ اونچے اونچے نیون سائن زمین پر اُترے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اچانک میرے اوورکوٹ کی جیب میں رکھا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سارہ تھی۔ اُس کی ملائم آواز فون پر اُبھری۔

''ہے مسٹر حماد۔۔۔۔ کبھی ہم یہودیوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے سے باز بھی آ جایا کرو۔ کیا کر رہے ہو؟''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پیدل چلنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، موسم قاتلانہ ہے، دل جوان ہے اور رستہ طویل ہے۔ سو چلا جا رہا ہوں اپنی دھن میں مگن۔''

سارہ بھی میری بات سن کر ہنس دی۔

''میرے پاس البرٹ ہال میں ہونے والے اسٹیج تھیٹر کے دو ٹکٹ ہیں۔ مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو تم نے ہزار غموں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چلو گے میرے ساتھ تھیٹر دیکھنے کے لیے؟''

''ایک خوبصورت لڑکی جب کسی نوجوان کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانا چاہتی ہو تو اس کے عقل مند ماں باپ کو اسی طرح کے بہانے کر لینے چاہئیں۔''

سارہ کی ہنسی فون پر اُبھری۔

''کہاں ہو اس وقت۔؟''

میں نے اُسے اس سڑک کا پتہ بتایا جس پر میں اس وقت مٹرگشت کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سارہ کی سفید پیٹل کار نمودار ہو گئی۔ اس نے میرون کلر کی اونچے گلے والی سویٹر، بلیک اسکرٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اُسے پوری طرح سجے سنورے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز سادہ سی رہتی تھی۔ اُس نے گاڑی میرے قریب لا کر روکی۔

''یوں سرد شاموں میں ایک جوان پردیسی لڑکے کا لندن کی سڑکوں پر تنہا گھومنا کچھ ٹھیک نہیں۔ جلدی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں تمھیں تمھاری منزل پر پہنچا دوں گی۔''

میں مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم مضافات سے گزرتے ہوئے جاگتے ہوئے جگمگاتے لندن پہنچ گئے۔ چمکتی ہوئی شیشے جیسی دکانیں دونوں اطراف کھلی ہر گزرتے راہی کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ سنٹرل لندن کے بڑے بڑے کسینو (جوئے خانے) شام ہوتے ہی کھل گئے تھے اور باہر کھڑی نیم عریاں لڑکیاں لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ یہ سب کئی کئی منزلہ کسینو تھے۔ جن کے اندر جانے کے لیے بڑے بڑے ڈرائیو وے بنے ہوئے تھے۔ آپ اپنی گاڑی سمیت

اندرونی عمارت جا سکتے تھے، نئی لگنے والی فلموں کے بڑے بڑے بورڈ جل بجھ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا بورڈ نئی فلم کنگ کانگ کا تھا۔ اصل میں بورڈ کیا تھا، کئی منزلہ بہت بڑا کنگ کانگ ہی تھا جو بجلی کی روشنیوں سے بن رہا تھا، بجھ رہا تھا۔ مجھے کنگ کانگ کا بورڈ دیکھ کر سنی یاد آ گیا۔ اُسے یہ فلم بے حد پسند تھی۔ لیکن وہاں کے سینماؤں میں ابھی کنگ کانگ نہیں لگی تھی۔ اب ہم بڑے پل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پل کے گرد بڑی بڑی جہازی سائز کی پیلی روشنیوں نے دن کا سا سماں باندھ رکھا تھا۔ سگنل بند تھا، شاید کوئی اسٹیمر نیچے سے گزر رہا تھا، خودکار پل درمیان میں سے علیحدہ ہو کر اوپر اُٹھ چکا تھا۔ بحری جہاز بھونپو بجاتا ہوا پل کے درمیان سے گزر گیا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے لوگوں نے اپنے شہر کے باسیوں کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ ہاتھ ہلا کر وعدہ کیا کہ الوداع اے شہروں کے شہر لندن۔ ہم چند دن کے لیے تم سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ ہم پھر ملیں گے، اور بہت جلد ملیں گے۔ تب تک اپنی اس رنگینی اور جگمگاہٹوں میں کمی نہ آنے دینا۔ سچ ہے، دنیا کے ہر خطے کے باسیوں کو اپنا شہر ہی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگتا ہے۔ مجھے اپنا کوئٹہ بھی اسی طرح اور اتنا ہی پیارا تھا۔ اس شہر کی فضا میں میری ایمان کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اس کی دسمبر کی شاموں میں بھی ابھی تک کچے کوئلے کے جلنے کی میری پسندیدہ خوشبو موجود تھی، جو بچپن سے ہی میری روح کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمیں کس طرح خود سے باندھ لیتے ہیں۔ جیسے کوئی خون کا رشتہ ہو ان سے۔

سارہ گاڑی بے حد تیز چلا رہی تھی۔ پل جڑتے ہی تھوڑی دیر میں ہم البرٹ ہال کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ہال میں بہت بھیڑ تھی۔ ضرور کوئی خاص تھیٹر تھا۔ ہماری نشستیں دوسری رو میں ہی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی ہال کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سامنے اسٹیج کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ محبت کی کوئی کہانی تھی۔ کہانی محبت کی ہی ہو سکتی ہے۔ محبت ہی تو ایسی لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن سے وداع لے کر رخصت ہو رہا تھا کیونکہ اسے اپنے قصبے سے کہیں دور ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن ہیرو نہیں جانتا کہ راستے میں جو گھنا جنگل پڑتا ہے وہاں چھپے لٹیرے اس کی زندگی کی تاک میں ہیں۔ وہاں ہیروئن کی سوتیلی ماں اسے بحری جہاز کے ذریعے مزدوری کے لیے دور دراز کے شہر لندن بھیج رہی ہے۔

ہیروئن اس بات سے بے خبر ہے کہ اصل میں اس کی لالچی سوتیلی ماں نے بحری قزاقوں کے ہاتھ اس کا سودا کر دیا ہے۔ جو اسی بحری جہاز پر موجود ہیں جس میں اُسے سمندر پار جانا ہے۔ اسٹیج کا منظر لڑکے اور لڑکی کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔ جس میں دونوں ہی اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک سال کے بعد کی ملاقات کے وعدے کر رہے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو جھوٹے دلاسے دے رہے ہیں۔ منظر میں جان بھرنے کے لیے دونوں اداکار جم کر اداکاری کر رہے تھے۔ ہدایت کاری اور مکالمے بھی زبردست تھے۔ پورے ہال پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہیرو جنگل سے گزر رہا ہے۔ پس منظر میں ولیم ورڈزورتھ کی مشہور نظم ''ایک برفیلی شام میں جنگل میں رکنا'' کے مکالمے گونج رہے ہیں۔

''یہ گھنا جنگل
یہ برفیلی شام
سب کس قدر دلفریب ہیں
لیکن مجھے تو اپنے وعدوں کا بھرم رکھنا ہے
اور سونے سے پہلے
میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔۔۔۔
اور سونے سے پہلے۔۔۔۔ میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔''

مَیں نے شاید ساتویں جماعت میں ولیم ورڈزورتھ کی "Stoping by woods in a snowy evening" پڑھی تھی۔ آج اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے اُس منظر کو حقیقت بنتے دیکھ رہا تھا۔ یہاں لٹیرے ہیرو پر حملہ آور ہوتے ہیں۔۔۔۔ وہاں بحری قزاق لڑکی پر بحری سفر کے دوران جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں ہیرو کے سینے میں خنجر گھونپ دیا جاتا ہے وہاں لڑکی قزاقوں سے بچنے کے لیے سمندر میں کود جاتی ہے۔ یہاں ہیرو مرتے مرتے لٹیروں سے التجا کرتا ہے کہ اس کی موت کے بارے میں لڑکی کو نہ بتایا جائے ورنہ وہ بھی مر جائے گی۔ وہاں لڑکی سمندر میں ڈوبنے سے پہلے قزاقوں سے چلا کر زاری کرتی ہے کہ لڑکے کو اس کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گا۔ دو

محبت کرنے والے ایک بار پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ ہال میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی تو باقاعدہ سسکیاں سناٹے میں سنائی دے رہی تھیں۔ پردہ گرنے کے بعد بھی بہت دیر تک سب لوگ مبہوت سے بیٹھے رہے۔ اور پھر اچانک ہی ہال تالیوں کی بے پناہ گونج سے دہل سا جاتا ہے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگے ہوئے تھے۔

میں اور سارہ جب ہال سے باہر نکلے تو لندن برف کی سفید مخملی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ پارکنگ میں کھڑی سارہ کی سفید فوکسی (ہٹل) زمیں پر پڑی برف کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ جیسے شریر بچوں نے سنو مین کی جگہ برف کی گاڑی بنا ڈالی ہو۔ جب تک ہم البرٹ ہال کی قریبی گلیوں سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئے تب تک لندن کی رات سو چکی تھی۔ سارے شہر پر جیسے کسی نے سفید بُرادہ چھڑک کر اس پر جادو کر ڈالا ہو۔ دُور کہیں ٹریفالگر اسکوائر کے گھنٹہ گھر نے رات کے بارہ بجنے کی نوید سنائی۔

ہماری گاڑی برف سے بھری سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سارہ ابھی تک تھیٹر کے اثر میں تھی اور چُپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وِنڈ سکرین سے باہر دیکھ رہی تھی، میں خود بھی کھویا کھویا سا تھا، پھر سارہ نے ہلکے سے کہا۔

''مجھے ایسی محبتوں کا انجام ہمیشہ سے بہت اُداس کر دیتا ہے۔ پھر مَیں گھنٹوں یونہی گم صم سی رہتی ہوں۔''

''محبتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میرا جواب سُن کر اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''تم محبتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہو۔ اس دن تم نے محبت کے پہروں کو جب بیان کیا تھا تو مَیں بہت دن تک مما سے تمھارے محبت کے بارے میں خیالات پر بات کرتی رہی۔ پھر اس دن تم نے یک طرفہ محبت کی بات بھی کی اور اُسی کو محبت کی شام بنا لینے کا مشورہ بھی دیا۔ کوئی محبت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جان سکتا ہے ۔۔۔۔ اس کے لیے تو اُسے ہزار محبتوں کے عذاب جھیلنا بھی کم پڑے ہوں گے۔''

''کبھی کبھی ایک محبت ہی ہزار محبتوں پر بھاری ہوتی ہے ۔۔۔۔ ہزار محبتوں جیسا درد،

ہزار محبتوں جیسی خوشی اور تجربہ دے جاتی ہے۔"

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"گویا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"جانے کیوں کبھی کبھی یہ لفظ محبت مجھے بہت ناکافی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ ہمارے لفظوں کی وسعت اور ویکیبلری بہت محدود ہے۔ ہماری زبان، ہمارے لفظ اور ہماری لغت صرف ظاہری اور اوپری احساسات کو ہی بیان کر سکتے ہیں۔۔۔۔ بات صرف محبت، عشق اور جنون پر ہی آ کر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ جو جذبہ جنون اور دیوانگی سے بھی بڑھ جائے۔ اُس کے لیے کوئی دوسرا نام کیوں نہیں ہوتا ہمارے پاس؟

سارہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر عقیدت سی تھی۔ کچھ ضبط جیسے اندر ہی اندر کچھ مارنے کی کچھ دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے تمھارے جذبات، تمھارے لفظ کم پڑ جاتے ہیں، اس وقت کہاں ہے۔؟"

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔۔۔"

سارہ کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ چھوٹتے چھوٹتے بچا، گاڑی برفیلی سڑک پر زور سے لہرائی سارہ مزید بوکھلا گئی۔ میں نے سیٹ کے ساتھ لگی ہینڈ بریک کھینچ دی۔ گاڑی اپنے ہی زور پر گھومی اور کچھ دیر گھسٹتی ہوئی ڈورفٹ پاتھ کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ سارہ نے اپنا سر اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ میں نے جلدی سے اُسے ہلایا۔

"تم ٹھیک ہو۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے تمھیں اس طرح سے نہیں بتانا چاہیے تھا یہ سب کچھ۔۔۔۔ غلطی میری ہی ہے۔"

سارہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"نہیں۔۔۔۔ تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے۔۔۔۔ میں ہی تمھاری باتوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔"

"تم کہو تو باقی راستہ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔"

سارہ نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ اسٹیرنگ سائڈ سے اُتر کر میری طرف آ گئی۔

مَیں بھی دروازہ کھول کر اُس کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

مَیں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارہ ابھی تک گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ سامنے ونڈ سکرین میں سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

''اتنا بڑا درد دل میں رکھ کر تم کیسے مسکرا لیتے ہو۔۔۔۔ کبھی کسی کو اپنے اندر کے زخم جھانک کر دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔ تم سب سے الگ ہو۔۔۔۔ سب سے جُدا ہو۔۔۔۔ اس دُنیا کے نہیں ہو۔۔۔۔''

مَیں چُپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ ویسٹ منسٹر برج سے کچھ پہلے پکاڈلی سے تیسری سڑک کے قریب سارہ نے مجھے گاڑی ایک بہت ہی کشادہ لیکن انجانی سی سڑک پر موڑنے کا کہا۔ مَیں نے بناء کچھ پوچھے گاڑی اس لمبی چوڑی سنسان سی سڑک پر موڑ دی۔ کچھ دُور چل کر سڑک کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا سا چوراھا تھا، اتنا بڑا کہ اس کے گرد گھومنے کے لیے گاڑی کا پورا اسٹیئرنگ گھمانا پڑتا تھا، یہیں سے سڑک چار حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چوراہے کے اندر ایک بہت بڑا فوارہ لگا ہوا تھا جس میں سے پانی کی دھاریں سردی کی وجہ سے نکلتے نکلتے جم گئیں تھیں۔ چوراہے سے مُڑتے ہی سڑک کے آخر میں بنا یہودیوں کا ایک بہت ہی قدیم، سفید پتھر سے بنا ایک عظیم الشان چرچ سامنے آ گیا۔ چرچ کی سفید عمارت اس وقت برف سے اٹی ہوئی کسی پری کا محل لگ رہی تھی۔

مَیں نے گاڑی چرچ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ چرچ کے دیو ہیکل چوبی دروازے پر حضرت موسیٰ کی ایک شبیہہ بنی ہوئی تھی اور دروازے کے دونوں اطراف بڑی بڑی سے مشعلیں جل رہی تھیں۔ سارہ گاڑی سے اُتر گئی۔۔۔۔ مَیں بھی نیچے اُتر آیا۔ سارہ نے میری جانب دیکھا۔

''یہ میری پسندیدہ عبادت گاہ ہے۔۔۔۔ مَیں صرف خاص موقعوں پر یہاں آتی ہوں۔ آج یوں آدھی رات کو یہاں آنے کا مقصد بھی بہت خاص ہے۔۔۔۔ مَیں تمھاری محبت کے لیے دُعا کرنے آئی ہوں، وہ ہستی جو آج تمھارے لفظوں میں تمھاری یادوں میں اور تمھارے احساس میں زندہ ہے مَیں اس کے لیے یہاں دُعا کرنے آئی ہوں۔''

مَیں گنگ سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ سارہ نے قدم بڑھائے، پھر وہ پلٹ کر بولی۔

''تم اگر چاہو تو یہیں کچھ دیر میرا انتظار کر سکتے ہو، مَیں جلد ہی آ جاؤں گی۔''

سارہ میرے رُکے قدم دیکھ کر یہ سمجھی تھی کہ شاید مَیں یہودیوں کے چرچ کے اندر آنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ سارہ آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے برف پر بنے اس کے قدموں کے نشانات پر چلتا ہوا اس چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ کے اندر اونچی اونچی دیواروں کے اندر بنے ہوئے طاقوں میں ہلکی ہلکی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چرچ میں مدہم سی ایک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ڈائس پر جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے، وہاں لکڑی کے چوبارے پر بہت سی موم بتیاں رکھی جل رہی تھیں۔ سارہ لکڑی کے چوبی فرش پر چلتی ہوئی ایک خاص جگہ پر آ کر رک گئی۔ اور زیرِ لب توریت کی کچھ آیتیں پڑھنے لگی۔ مَیں چُپ چاپ دونوں اطراف پر لگی ہوئی لمبی لمبی بینچوں میں سے ایک پر کونے میں بیٹھ گیا۔ چرچ میں عجیب سا سکوت طاری تھا، اتنی خاموشی تھی کہ موم بتیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والی آواز کی سرسراہٹ بھی گونج رہی تھی۔ سارہ ایک جذبے کے عالم میں کھڑی اپنے دُعائیہ کلمات پڑھ رہی تھی۔ ایک انجانی لڑکی ایمان کے لیے ہزاروں میل دُور اس تنہا رات میں بھیگی پلکیں لیے دُعا کر رہی تھی۔

مَیں کچھ دیر یونہی سارہ کو سینے پر ہاتھ رکھے دُعا کرتا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک جانے کیوں مجھے ایمان کی بے حد کمی محسوس ہوئی۔ اس احساس نے میرے دل کو جیسے ایک خنجر سے چیرنا شروع کر دیا کہ اب مَیں اس زندگی میں کبھی اس سے نہیں مل پاؤں گا۔ اور جانے کس وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنا شروع ہو گئے اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، سارہ دُعا ختم کر کے میری طرف پلٹی اور اس کی نظر میری برستی آنکھوں پر پڑ گئی۔

''ہے حماد۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔؟''

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اور شاید یہی لمحہ ان آنسوؤں کے سیلاب کے بند کو توڑنے کا آخری بہانہ بن گیا۔ پھر میرا خود پر اختیار ہی نہیں رہا اور جانے کتنی دیر تک یہ نمکیں پانی اس کی نازک ہتھیلیوں کو بھگوتا رہا۔ مجھے تسلیاں دیتے دیتے وہ خود بھی نڈھال سی ہو گئی۔ پھر جیسے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ ان تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے گی۔ اس نے میرا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور میری پلکوں سے گرتی شبنم اپنی آنکھوں میں

سموتی رہی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو اپنے دل کا غبار اس کے سامنے بیان کر دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے درد کو اپنا ہی درد سمجھتی ہے اور درد کا درماں بننا چاہتی ہے۔ مَیں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام فسانہ سارہ کو سنا دیا۔ وہ چپ کر کے خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ مجھے تھپکتی رہی۔ کئی مقام پر مجھے ایسا لگا کہ وہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی لیکن اس بہادر لڑکی نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ شاید اُسے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس مرحلے پر اُس نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو پھر مجھے ٹوٹنے سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مَیں جانتا تھا کہ اس کومل اور پھول کی پنکھڑی سی نازک لڑکی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن اُس نے مجھ پر اپنے اندر کے طوفان ظاہر نہیں ہونے دیے۔ کبھی کبھی لفظوں سے زیادہ دو انسانوں کے بیچ کی خاموشی، مضبوط اور زود اثر مرہم ثابت ہوتی ہے۔ اُس وقت وہی خاموشی ہم دونوں کے درمیان، باتوں کا کام دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی اور اپنے لفظ اپنا مرہم، اپنے نرم لمس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں اور میری روح میں منتقل کرتی رہی۔ چرچ کے بڑے بڑے روشن دانوں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی اور جب ہم چرچ سے باہر نکلے، سحر کے سپیدے اور برف کی چادر کی سفیدی نے ہماری آنکھیں چندھیا سی دیں۔ برف پر ابھی تک میرے اور سارہ کے اندر جاتے قدموں کے نشان واضح تھے۔ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیسا جادو ہوتا ہے۔ شاید اسی سحر کے زور میں، مَیں نے رات کو سارہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اب صبح ہوتے ہی مَیں اپنی رات کی حالت پر اس کے سامنے شرمندہ سا تھا۔ کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سارہ نے جیسے اس دن میرا بھرم قائم رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ پہلے اُس نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پر ڈراپ کیا۔ لندن ابھی تک بے خبر سو رہا تھا، مَیں گاڑی سے اُترا تو میرے قریب سے گزرتے دودھ کی بوتلیں پہنچانے والے کی سائیکل گھنٹی بجاتی گزری۔ اُس نے اپنی پی کیپ اٹھا کر چلتے چلتے مجھے انگریزی سلام کیا۔ اور مسکرا کر سارہ کی طرف دیکھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر

جھینپ سی گئی۔

مَیں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ مَیں نے سائڈ والی کھڑکی میں جھک کر اُسے کہا۔

''میں شکریہ جیسے چھوٹے لفظ ادا کر کے تمھارے انمول احساسات کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس رات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ادا کرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔۔۔۔ یقین جانو۔۔۔۔ مَیں نے ہمیشہ ہی تمھیں دوسروں سے بہت مختلف سمجھا ہے۔۔۔۔ اور گزری ہوئی رات کے بعد تمھاری عزت میرے دل میں اپنی آخری حد تک بڑھ گئی ہے۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہوگی۔۔۔۔ تم ہمیشہ آواز دینے سے پہلے مجھے اپنے سامنے پاؤ گے۔''

''میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ احساس میرے لیے ہمیشہ بہت قیمتی رہے گا۔''

مجھے سارہ نے شام کو لائبریری سے واپسی پر آتے ہوئے تھیسز کے لیے لیا تھا۔ میرا بیگ جس میں میرے نوٹس تھے اَب بھی اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ مَیں نے کل شام ہی اپنا ٹرم پیپر مکمل کر لیا تھا۔ میں نے بیگ سے اپنے ٹرم پیپر کے تمام نوٹس نکالے جس پر میری دو مہینے کی محنت میری تحقیق لفظوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھی۔ مَیں نے ٹرم پیپر کی پوری فائل سارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

یہ میرا ٹرم پیپر ہے۔ اس میں میری تمام تحقیق موجود ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو۔ اور اگر کسی بھی وجہ سے مَیں اسے یونیورسٹی میں جمع نہ کروا سکوں تو میری جگہ تم اسے لائبریری ریکارڈ کا حصہ بنوانے کے لیے جمع کروا دینا۔''

سارہ نے حیرت سے فائل کے صفحے پلٹے۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ مجھے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اسے خود چل کر جمع کروائیں گے۔ بلکہ مَیں پاپا کو اس بات کے لیے بھی مجبور کروں گی کہ وہ تمھیں تمھارا ٹرم پیپر پوری یونیورسٹی کے سامنے فائنل تقریب میں خود پڑھنے دیں۔ تمھیں اپنا نظریہ سب کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔''

مَیں نے اس موقعے پر اُسے پیٹر والی بات بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے اس کے ریشمی بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ مَیں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مَیں اپنی سُنسان گلی کے آخری کونے تک اس کی گاڑی کو مڑتے ہوئے دیکھنے کے لیے کھڑا رہا۔ اوپر آیا تو کامران جاگ چکا تھا اور اپنے کاروبار پر جانے کی تیاری میں تھا۔ اُس نے کافی کا مگ میرے ہاتھ میں پکڑایا۔

''آ گیا میرا شہزادہ ساری رات آوارہ گردی کرنے کے بعد۔ مَیں نے تمھیں منع بھی کیا تھا نا کہ اس یہودی حسینہ سے دُور ہی رہنا۔ لیکن لگتا ہے میرے مشورے کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف دن ہی اس کی زلفوں تلے بسر ہوتا تھا۔ اب راتیں بھی انہی کے ساتھ سرگشت کرتے ہوئے گزرتی ہیں۔ یار میڈی۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس کا باپ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ جانے اب تک تمھیں یونیورسٹی میں کس دل سے برداشت کر رہا ہے؟''

شاید کامران نے کھڑکی سے مجھے سارہ کی کار سے اُترتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے اُسے کل یونیورسٹی میں جوزف کی طرف سے دی ہوئی پیٹر والی شکایت کی خبر سنائی۔ کامران نے زیرِلب ان یہودیوں کی شان میں کچھ کہا اور پھر مجھ پر بھی بگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے پنگا نہ لینا۔ تم یہاں کے قانون سے خود اچھی طرح واقف ہو۔ اس لابسٹ پیٹر کی شکایت پر تمھیں انگلینڈ سے ڈی۔ پورٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی ہر بڑی انڈسٹری میں انہی یہودیوں کا پیسہ لگا ہوا ہے۔ قانون بھی انہی کا ساتھ دے گا۔ اور پھر 9/11 ٹائن ٹاور کے بعد تو ہر مسلمان پہلے ہی ان کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے۔ صرف کسی شکایت کی ضرورت ہے۔ انہیں لیبل چسپاں کرنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ جانے کتنے لوگوں کو تو یہ صرف شبہے میں ہی ملک بدر کر چکے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا اس ٹرم پیپر کی آخر ایسی کیا اہمیت ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ''ہالوکاسٹ'' کا واقعہ ہوا تھا تو کہنے دو۔ ہماری بلا سے تمھیں کون سے میڈل مل جائیں گے اس حقیقت سے انکار کرنے پر۔ اور پھر سننے والے تو خود وہ ہیں جنھوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہوا ہے۔ کون تمھارے ٹرم پیپر پر اور تمھاری تحقیق پر یقین کرے گا؟''

مَیں نے کامران کی طرف دیکھا۔

''کوئی اور یقین کرے نہ کرے۔۔۔۔ مجھے خود تو یقین ہے اپنی بات پر، اپنے سچ پر، اور پھر وہ سب بھی جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے۔ بس کسی نے ہمت نہیں کی آج تک ان کے سامنے سچ بولنے کی، لیکن مَیں یہ سچ ان کے سامنے لا کر رہوں گا پوری یونیورسٹی میں اگر ایک بھی طالب علم نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اور میری محنت رنگ لے آئی۔ چاہے اس کے بعد وہ لوگ میرا ٹرم پیپر جلا دیں اور مجھے اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔''

کامران جھنجلا سا گیا۔

''لیکن اس جدوجہد کا فائدہ۔۔۔۔ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اس تحقیق کا اور تمھارے اس سچ کا کوئی مقصد بھی تو ہونا چاہیے۔''

مجھے کامران کی بات پر غصہ آ گیا۔

''تو کیا جو کچھ مَیں نے ابھی تمھیں بتایا، تمھیں اس میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی؟ اور اگر اس سچ کا تمھیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کہ یہ نئی نسل ان یہودیوں کے اس جھوٹ کو جان لے تو پھر میرا ایک اور مقصد بھی سن لو۔ جو اس مقصد سے کہیں بڑا ہے۔ ''ہالوکاسٹ'' کا یہ تمام پروپیگنڈا یہودیوں نے صرف اور صرف فلسطین کی سرزمین پر اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کا خواب پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ اس وقت چندہ جمع کرنے کی عظیم الشان مہم شروع کر دی گئی تھی۔ امریکہ، برطانیہ اور روس نے جرمن قوم کو برباد کرنے کے لیے یہودیوں کو غداری پر آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زخم خوردہ جرمن قوم پلٹ کر ان پر وار ضرور کرے گی۔ وہ جرمنوں کو ہٹلر کی قیادت میں یکجا ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور ہٹلر کے عزائم بھی اس کی جنگی تیاریوں سے بالکل واضح تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں کو قبلہ اوّل پر قبضے کا خواب دکھایا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ان کی پوری مدد کرنے کا یقین بھی دلایا۔ ''ہالوکاسٹ'' کا الزام تو ہٹلر اور جرمنوں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد لگایا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت فلسطین کے مسلمانوں نے یہودی بستیوں اور پھر اسرائیل کی صورت میں چکائی۔ اگر ہٹلر ''ہالوکاسٹ'' کا ذمے دار تھا بھی تو یہودی اس بہانے فلسطین کے مسلمانوں پر کیوں ٹوٹ پڑے۔۔۔۔؟ اور

سچ یہی ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' میں پچاس لاکھ سے ساٹھ لاکھ تک یہودیوں کے مارے جانے کی کہانی صرف اور صرف مفروضہ ہی ہے۔ اتنے بڑے اور اتنے وسیع پیمانے پر گیس چیمبرز کا بنایا جانا ہی ممکن نہیں تھا۔ جن گیس چیمبرز پر یہودی ''یہودی قاتل گیس چیمبرز'' ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ صرف جرمن فوجیوں کی لاشوں کو جنگ کے دوران ٹھکانے لگانے کے لیے بنائے گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان چیمبرز کو بھی ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے جرمنوں کے پاس پورا ایندھن موجود نہیں ہوتا تھا۔ جرمن پہلے ہی اپنا سب کچھ جنگ میں جھونک چکے تھے۔ ان گیس چیمبروں میں جھونکنے کے لیے ان کے پاس کوئلہ تک کافی مقدار میں نہیں بچا تھا۔ یہ صرف اور صرف ایک صیہونی تحریک ہے جس کا مقصد اپنے مفاد کے لیے ہلاکتوں کی تعداد میں زبردست مبالغہ چاہتی ہے۔ تاکہ خود کو مظلوم ثابت کرنے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جا سکیں۔ یاد رکھو، جس قدر یہ لوگ اس مبالغہ آرائی میں کامیاب ہوں گے، فلسطین کے مسلمان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت چکائیں گے۔ یہ تحریک صرف معاشی فائدہ اور مسلمانوں کی زمین حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی اور یہودی اس تحریک میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ لوگ ان کے جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں اور ہمارا سچ بھی انہیں جھوٹ لگتا ہے۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی تھی۔ یاد رکھو، ہمارا زوال اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن ہم نے خود کو صرف مسلمان سمجھنے کے بجائے فلسطینی، مصری عرب اور پاکستانی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر اس دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والا یہودی کا فائدہ، دنیا کے دوسرے کونے میں بیٹھے کسی بھی یہودی کا فائدہ ہو سکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی بھی مسلمان کا نقصان میرا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ تمہارا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔؟''

کامران چپ چاپ ایک ہی جگہ کھڑا میری ساری تقریر سنتا رہا۔۔۔۔ میں بھی تھک کر وہیں صوفے پر ڈھے سا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کاندھے پر کامران کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا اور گلے سے لگا لیا۔

''ہر دفعہ، ہر بازی تم اکیلے ہی کیوں مار جاتے ہو۔۔۔۔ بچپن سے ہر مرتبہ تم سے ہارتا آیا ہوں۔ لیکن جتنا مزہ آج اس ہار میں آیا ہے۔ پہلے کبھی نہیں آیا، اگر مقصد اتنا بڑا ہے اور

کوشش ہر مسلمان کے دل میں اس نقصان کے احساس کو جگانا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی قربانی بہت ہی چھوٹی ہوگی۔ میری ناسمجھ سوچ اتنی آگے کہاں سوچ سکتی تھی۔"

"میں کبھی بھی اپنے ایمان کی کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکا۔ نہ ہی کبھی میں نے کامل مومن ہونے کا کبھی سپنا ہی دیکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، ان یہودیوں کے بیچ رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ضرور ہم میں کوئی خاص بات ہے۔ یہ آخر ہم سے اس قدر خوف زدہ، اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ اسی اپنی خاص بات کی کھوج نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ دُعا کرنا کہ میرے قدم آگے کہیں لڑکھڑا نہ جائیں۔ میں بارش کا پہلا قطرہ ہی سہی۔۔۔۔ لیکن برسوں گا ضرور۔۔۔۔ شاید میرے بعد ہی سہی۔۔۔۔ کچھ قطرے اور برس جائیں۔۔۔۔ شاید چند بوندیں ہی سہی۔۔۔۔ پر ہمارے دلوں پر صدیوں کا لگا زنگ کچھ حد تک ہی دھل جائے۔"

کامران نے مجھے تھپکتے ہوئے کہا اور اس کی آواز رندھ سی گئی تھی۔

"ضرور دُھلے گا یہ زنگ۔ کیسے نہیں دُھلے گا ہمارے دلوں پر لگا یہ زنگ۔۔۔۔"

جب برسنے والی بوندیں ایسے آبِ زم زم کی ہوں گی۔ کون سا زنگ ہے جو اس آبِ حیات کے آگے ٹھہر سکے۔"

کامران مجھے تھپکتا رہا۔۔۔۔ ہم دونوں نے ہمیشہ زندگی بہت لاأبالی انداز میں گزاری تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کہیں نہ کہیں آج کوئی بات ہم دونوں ہی کے دلوں کو چُھو گئی ہے۔ شاید زندگی ایسے ہی موڑ بدلتی ہے۔ شاید دلوں کے انقلاب اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ شاید ہم سبھی کے دلوں پر لگا یہ زنگ کسی آبِ زم زم کی تلاش میں جمار ہتا ہے۔ شاید ہم سب کے دل ہی بہت زمانے سے قلعی چاہتے ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ دل کے ہر زنگ پر وقتی طور کے لیے پردہ ڈال دیتی ہے۔ انسان کو خود سے بھی نظر چُرانے کا ایک موقع فراہم کر دیتی ہے۔

پہلی بازی

دوسرے دن صبح جب مَیں یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تبھی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ آج فضا کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ سب سے پہلے مجھے جم (Jim) نظر آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولا۔

''ہے میڈی۔۔۔۔ تم فکر مت کرنا مَین Man۔۔۔۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ پوری یونیورسٹی کو ہلا کر رکھ دیں گے۔''

کچھ دیر میں ہی کلاس کے باقی طلبا بھی میرے گرد بھیڑ کی صورت میں جمع ہو گئے، سب ہی اپنی اپنی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ سبھی میرے ساتھ ہونے کا اور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ مَیں کچھ سمجھا اور کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اتنی دیر میں میرا نام اسپیکر پر پکارا جانے لگا۔ ڈین آئزک کے کمرے میں میری طلبی کی جا رہی تھی۔ مَیں آئزک کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کمرے میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری کے انچارج پیٹر پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھتے ہی ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اس وقت صرف سر آئزک ہی موجود تھے۔

''آؤ حماد۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے تم نے آج یونیورسٹی آنے کے بعد نوٹس بورڈ پر لگا اپنے خلاف نوٹس سب سے پہلے پڑھا ہوگا۔''

اوہ۔ تو یہ بھیڑ جو باہر میرے گرد جمع تھی وہ اس نوٹس کی وجہ سے تھی۔

''نہیں سر۔۔۔۔ مَیں ابھی پہنچا ہی ہوں۔۔۔۔ آپ ہی مجھے کچھ بتائیے اس نوٹس کے بارے میں۔''

''اس سے پہلے مَیں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا۔ اگر تم کسی تعلیمی ادارے کے انتظامی سربراہ ہوتے اور تمھارے علم میں یہ بات آتی کہ تمھارے زیرِ انتظام تعلیمی

ادارے میں کچھ طالب علم مذہبی سیاست کو ہوا دینے کا باعث بن رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہر میں بھی بے چینی پھیل رہی ہے۔ تو تم ایسی صورت میں کیا کرتے۔"

"میں پوری چھان بین کرتا اور میرٹ اور حق پر فیصلہ کرتا۔ آپ سے بھی مجھے انصاف ہی کی توقع ہے کیونکہ آپ کو بحیثیت سربراہ پوری تحقیق کا فرض بھی سونپا گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ایک فرض شناس استاد بھی ہیں۔ آپ کا فرض انصاف ہے۔" سر آئزک نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے پر طنز یا تلخی کی کوئی جھلک ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

"کیا تم مسٹر پیٹر سے پہلے بھی مل چکے ہو۔"

"جی ہاں۔۔۔۔ اکثر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری جاتا ہوں۔ وہاں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔"

"کیا تم 13 جنوری کی شام بھی سنٹرل اسکوائر لائبریری گئے تھے؟"

"جی ہاں۔۔۔ مجھے دو مقالے چاہیے تھے جن سے میرے ٹرم پیپر کی تکمیل میں مجھے کافی مدد مل سکتی تھی میں وہی لینے گیا تھا۔"

"مسٹر پیٹر نے تمھارے خلاف تحریری شکایت جمع کروائی ہے کہ 13 جنوری کی شام تم نے انہیں کچھ خاص کتابیں جاری نہ کرنے پر مذہبی طور پر ہراساں کیا تھا اور انہیں نتائج بھگتنے دھمکیاں بھی دیں جس کی وجہ سے یہ اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ازراہ کرم ابھی تک لندن پولیس اور انتظامیہ کو اس واقعے سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ یہ یونیورسٹی کی بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ پہلے میرے پاس آئے ہیں تاکہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تمھارا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہراساں نہیں کیا نہ ہی کبھی دھمکانے کی کوشش کی ہے۔"

"تمھارے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے۔"

"بے گناہی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ثبوت الزام لگانے والے کو دینا پڑتے ہیں سر۔۔۔۔"

سر آئزک نے میری بات سُن کر اپنی عینک کے باریک شیشوں کے پیچھے سے مجھے غور سے جھانکا۔ جیسے وہ میرے اعتماد کا جائزہ لینا چاہتے ہوں۔

''ٹھیک ہے، تمھاری بات میں وزن ہے۔ لیکن آخر مسٹر پیٹر کی تم سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ آخر وہ بلاوجہ ایسا الزام کیوں لگائیں گے تم پر۔۔۔۔۔؟''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی پیش کریں۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔تم اپنا تحریری جواب بھی جمع کروادو۔۔۔۔اور یاد رکھو کہ یہ معاملہ پولیس تک جانا نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس سے پہلے ہی معاملہ صاف کرنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی طالب علم کے کسی پولیس کیس میں ملوث ہونے کی صورت میں اُسے ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے خارج کردیا جاتا ہے۔''

''جی۔۔۔مَیں جانتا ہوں۔۔۔۔لیکن اُسی قانون کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پہلے طالب علم پر کیس ثابت ہونا بھی ضروری ہے۔ مَیں اپنا جواب جمع کروادوں گا۔ شکریہ۔''

مَیں کمرے سے باہر نکل آیا اور سب سے پہلی نظر میری سارہ پر ہی پڑی۔ وہ تیزی سے ڈین کی کمرے کی طرف ہی آرہی تھی۔ شاید وہ ابھی یونیورسٹی آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔

''حماد۔۔۔۔ یہ سب مَیں کیا سن رہی ہوں۔۔۔۔ یہ کون سا نیا ڈرامہ رچایا ہے یونیورسٹی والوں نے۔''

''میں نے اُسے مختصراً پیٹر کی شکایت اور لائبریری کے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔۔۔۔وہ حیرت سے میری ساری بات سنتی رہی۔ پھر چونک کر اُس نے مجھ سے جلدی سے پوچھا۔''تم نے لائبریرین کا کیا نام بتایا۔''

''پیٹر۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔پیٹر۔۔۔۔پیٹر گورین تھامس یہ تو پاپا کا بہت پُرانا واقف ہے۔۔۔۔ کئی سالوں سے تہواروں پر اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔''

میرے ذہن میں ایک ساتھ ہی کئی جھماکے ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ سر آئزک

ابھی تک جم والے معاملے میں میرے ہاتھوں ہونے والی ہزیمت کو بھولے نہیں تھے۔ یہ سارا منصوبہ انہی کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ میری شخصیت کو بھی انتظامیہ کے لیے متنازعہ بنا دیا تھا اور میرے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی صورت میں میرا ٹرم پیپر جو پہلے دن سے ان کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس سے بھی ان کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی، سارہ بھی ساری صورت حال سمجھ چکی تھی۔ وہ دانت پیستی ہوئی سر آئزک کے کمرے کی طرف بڑھی، لیکن مَیں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر میری وجہ سے ایک بیٹی، ایک باپ کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ اس سے ان کی انا کو مزید چوٹ لگے گی۔''

سارہ نے حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

''تم اب بھی انہی کی انا اور انہی کے رشتوں کے بارے میں سوچ رہے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمھیں اس یونیورسٹی سے اور شاید اس شہر سے بھی بدر کرنے کی تاک میں ہیں۔''

''مَیں جانتا ہوں۔۔۔ اس بار ان کا وار۔۔۔۔ بڑا گھائل کر دینے والا ہے۔ لیکن میں شدید زخمی ہو کر بھی دشمن پر غلط وار کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ عقل اور تدبیر کی جنگ قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ مَیں بھی ان سے ان کے ہی انداز میں لڑوں گا۔''

سارہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

''صرف تم نہیں۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔ ہم دونوں مل کر یہ جنگ لڑیں گے۔'' مَیں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''راستہ بہت طویل، کٹھن اور کانٹوں بھرا ہے۔''

''میں پاؤں کے چھالے گننے سے نہیں ڈرتی، ویسے بھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ گنتی پر نظر رکھنے والے سوداگر ہوتے ہیں اور مَیں نے سودا کرنا نہیں سیکھا۔''

اس وقت اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں ایک ایسا عزم تھا کہ جس کے آگے پہاڑ بھی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سلیقے سے سنورے بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے سر آئزک پیٹر کو الوداع کہنے کے لیے دروازے میں آئے اور

انہوں نے سارہ کے بکھرے بال اور اس کا میری طرف دیکھ کر مسکرانا دیکھا۔ اِک لمحے کو ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانا خوب سیکھ رکھا تھا۔ انہوں نے پیٹر کو الوداع کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پیٹر سارہ سے نظر چُراتا ہُوا دوسری جانب سے نکل گیا۔

اگر بابا کو پتہ چلتا کہ میرے ٹرم پیپر نے پورے لندن کے یہودیوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو جانے وہ کیا سوچتے۔ ہمارے گھر میں مذہب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں پانچ وقت کی نماز تو دور کی بات ہے جمعہ اور عید پر بھی برائے نام اور دکھاوے کے لیے عیدگاہ جانے کا رواج تھا۔ قرآن کو ہمارے ہاں صرف اُونچے طاق پر سجا کر رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا تھا۔ آخری مرتبہ شاید اُسے میری بڑی بہن کی رخصتی کے وقت اس کے سر پر رکھنے کے لیے اس طاق سے اُسے اُتارا گیا تھا۔

مجھے اپنے لڑکپن کی ایک بات ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا، ٹھیک آج سے قریباً دس سال پہلے، تب میری کلاس کی ایک ہندو لڑکی کامنی پر میرا دل آ گیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گئی تھی، شاید میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس وقت ہمارے گھر روز پڑھانے کے لیے آنے والے مولانا صاحب آئے ہوئے تھے جنھوں نے عصر کے وقت ہمیں زبردستی وضو کروا کر اپنے ساتھ نماز کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ جیسے ہی میری نظر کامنی پر پڑی، میں نے جلدی سے نماز توڑ دی تھی تاکہ کامنی کو یہ نہ پتہ چلے کہ مَیں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ صرف کامنی پر ہی کیا منحصر تھا میں اب تک بھی اپنی کسی لڑکی دوست کے سامنے نماز پڑھنے سے کتراتا تھا۔ پتہ نہیں میرے دل میں ایک عجیب سی جھجک تھی کہ مجھے اپنی گرل فرینڈز کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس سے میرا تاثر ان کی نظر میں خراب ہو جائے گا۔

اس دن جب مَیں نے بابا کو کامنی کے آنے اور میرا اپنی نماز توڑ کر بھاگ کر بڑے کمرے میں چُھپ جانے کا واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔

اس دن جب پیٹر یونیورسٹی آیا تھا، مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ طلبا کی بہت بڑی تعداد اب خود میرا ٹرم پیپر سننا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ انتظامیہ کے پے در پے اقدامات

نے جو وہ میرے خلاف کر رہی تھی۔ ان سب میں تجسس کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر ایک معمولی اور عام طور پر یونیورسٹی کی لائبریری کے طاقوں میں مٹی اور گرد کے نظر ہو جانے والے اس ٹرم پیپر میں، مَیں آخر کیا بات لکھنا اور کہنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن مجھے گھیرنے کے لیے نت نئے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اور یہی سر آئزک کی بنیادی غلطی تھی۔ انہوں نے طلباء کے اس تجسس کو ہوا دے دی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ اگر مجھے روزمرہ کے معمول کی طرح خود اپنا ٹرام پیپر پڑھنے اور پیش کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ تنازعہ تو ضرور ثابت ہوتا لیکن اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو اب بن پڑھے اور پیش کیے ہی دھیرے دھیرے طلبا کے ذہن پر ہو رہا تھا۔

اسی شام جب مَیں نہر کے کنارے اپنے پسندیدہ بینچ پر بیٹھا سامنے نہر میں تیرتے پرندوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا شاید مجھے ڈھونڈتے ہوئے ہی وہاں آ نکلی، دُور سے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف چلی آئی۔ کالے اسکرٹ پر اس نے سفید پھولوں والی بہت خوبصورت سی قمیض پہن رکھی تھی اور اس لباس میں وہ خود بھی کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجھی سوجھی سی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر وہ دھیرے سے بولی۔

''کیا میں تم سے معافی مانگنے کا حق اب بھی رکھتی ہوں؟''

مَیں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''دوست ہر حق رکھتے ہیں، سوائے معافی مانگنے کے حق کے، یہ حق انہیں کبھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دوستی میں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوست کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تو پھر معافی کیسی؟''

''نہیں۔۔۔۔ غلطی تو میری بہت بڑی تھی۔۔۔۔ لیکن مَیں جانتی تھی کہ میڈی کا ظرف کتنا بڑا ہے اور وہ آگے سے مجھے میری معذرت کا یہ جواب دے گا۔''

''جانے دو ان باتوں کو۔۔۔۔ اتنے دنوں کے بعد بات کی ہے تو کچھ اور کہو۔''

''نہیں۔۔۔۔ مجھے کہہ لینے دو۔۔۔۔ ورنہ یہ کانٹا میری روح میں ہمیشہ چُبھا ہی رہے گا۔ اُس دن جب تم نے مجھے یہ کہا تھا کہ کوئی پہلے سے تمھارے دل و جان پر قابض ہے تو مجھے

شدید دکھ، شدید جلن کا احساس ہوا تھا۔ مَیں یہ سمجھتی تھی کہ تمھارے جذبات سارہ کے لیے ہیں۔ اور مَیں سارہ سے بھی شدید ناراض ہوگئی تھی۔ لیکن کل سارہ نے جب زبردستی یہیں اسی نہر کے کنارے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور اُس نے مجھے ایمان کے بارے میں بتایا تو یقین کرو مَیں شرم اور ندامت سے خود سے بھی نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ میری محبت تو بہت سطحی نکلی میڈی۔۔۔۔ اصل میں تو محبت تم نے کی ہے۔۔۔ ہم سب کو ایسی محبت کے پہلے پہر کے بھی حق دار نہیں ہو سکتے۔ مجھ جیسے کم حوصلہ اور کم ظرف محبت کی شام تک بھلا کیسے پہنچ پائیں گے۔''

وہ سر جھکا کر بیٹھی دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ دل کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھوتی رہی۔ مَیں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

''ایسا نہیں ہے ربی۔ تم تو ایک لمحے میں ہی محبت کے تینوں پہر پھلانگ کر محبت کی شام میں پہنچ گئی ہو۔ ورنہ آج اس وقت یوں اس طرح میرے پاس بیٹھ کر یہ سارے اعتراف نہیں کر رہی ہوتیں۔ اصل میں تو تم ہی محبت کی اس شام کی حق دار ہو۔ ٹھنڈی اور میٹھی محبت کی شام۔۔۔۔ جو اس وقت تمھارے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی ہے۔''

ربیکا رو پڑی۔

''نہیں حماد۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا دل درد سے یوں کٹ نہ رہا ہوتا، مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ دل اب بھی یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ مَیں تمھارے سامنے بیٹھی یوں کم ظرفوں کی طرح آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ میں تو اتنی ناشکری ہوں کہ مَیں تمھاری انمول دوستی کی قدر بھی نہیں کی۔ تمھاری محبت پانے کی خواہش میں اس دوستی کو بھی رد کرتی رہی تم مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف مت کرنا۔۔۔ کبھی مجھ پر رحم نہ کھانا۔''

وہ بولتے بولتے بلک پڑی۔ مَیں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ اور اسے کھل کر رونے دیا۔ محبت کا کانٹا جب جسم میں چبھ جائے تو اس کا زہر بدن سے صرف اور صرف آنسوؤں کی صورت میں ہی نکالا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس زہریلی محبت کا ذائقہ بھی نمکین ہی ہوتا ہوگا۔

دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ پیٹر نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر لائبریری ہی

کے دو ماتحتوں کو بیان دینے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں بھی یہودی ہی تھے۔ یونیورسٹی نے عارضی طور پر مجھے کلاسیں لینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ انکوائری مکمل ہونے تک مزید کسی بڑے ''ہنگامے'' سے بچنا چاہتے تھے۔

یونیورسٹی میں جب یہ خبر پھیلی تو میری ساری کلاس باہر نکل آئی۔ طلبا نے میرے حق میں نعرے بازی شروع کر دی، انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے کارڈ اور بینر اُٹھا لیے جن پر ''انصاف۔۔۔۔ انصاف۔۔۔۔ انصاف'' لکھا ہوا تھا۔ طلباء کی قیادت ربیکا اور جم کر رہے تھے۔ جم خاصا مشتعل تھا اور اس نے انتظامیہ کو دھمکی دے دی تھی کہ اگر مجھے کلاس لینے کی فوری اجازت نہ دی گئی تو وہ تمام طلبا کو لے کر باہر سڑک پر نکل جائے گا اور یہ ہڑتال پورے شہر کی تعلیمی درس گاہوں تک پھیلا دی جائے گی۔ یونیورسٹی کا میدان، نہر کنارے، راہداریوں اور چھتوں پر ہر جانب اسٹوڈنٹس ہی دکھائے دے رہے تھے۔ مَیں جب کلاس سے نکل کر باہر آیا تو ان سب کے نعروں میں شدت آ گئی۔ ان سب کو ایک اجنبی لڑکے کے لیے اس طرح لڑتے دیکھ کر میری آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگ گئے۔ مجھے لگا ایمان کسی ستون کی اُوٹ سے مسکرا کر جھانک رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ''مَیں نے کہا تھا نا۔۔۔۔ تم کبھی اکیلے نہیں ہو گے۔۔۔۔ مَیں ہر لمحہ محبت کی صورت میں۔ دوستی کی صورت میں تم پر برستی رہوں گی۔ میری محبت روپ بدل بدل کر تمھارے اردگرد منڈلاتی رہے گی۔ مَیں تمھیں اتنا معتبر کر دوں گی کہ لوگ تم پہ سر مٹنے کے لیے ہر دم تیار رہیں گے۔ میری محبت ہر لمحہ تمھارے گرد عظمت اور حفاظت کا حصار بنائے رکھے گی۔''

جم نے مجھے یوں گم صم بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ساری یونیورسٹی نعروں سے گونج اٹھی۔ مَیں رو پڑا، آنسو خود بخود میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جم نے میرے وجود کو اور مضبوطی سے گلے لگا لیا۔ ربیکا نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو صاف کر دیے اور دھیرے سے میرے کان میں بولی۔

''فکر مت کرو باغی لڑکے۔۔۔۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔''

مَیں نے سارہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

اتنے میں ڈین آئزک کے کمرے سے اعلان ہونے لگا کہ مَیں جہاں کہاں بھی ہوں۔ فوراً ان کے کمرے میں پہنچوں۔ ایک بار پھر شور مچ گیا۔ سب میرے ساتھ ہی ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ جم نے اور دوسرا ربیکا نے تھام رکھا تھا۔ ان سب کو کمرے کے باہر چھوڑ کر مَیں اندر داخل ہوا تو میری نظر سارہ پر پڑی جو غصے میں سُرخ چہرہ لیے ڈین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ دروازے میں ہی اس کا میرے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے چند لمحے میری جانب دیکھا۔ پھر نکلتے نکلتے اس نے میرا ہاتھ اِک گھڑی کے لیے تھاما اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''فکر مت کرنا۔۔۔ یہ لوگ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔ مَیں نے تمام اسٹوڈنٹس کی طرف سے ہڑتال کی کال جمع کروادی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمھیں کیسے یہاں سے باہر کرتے ہیں۔''

سارہ میرا ہاتھ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ اندر کمرے میں سر آئزک انتہائی غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ سارہ کو مجھ سے بات کرتے دیکھ کر تو ان کا چہرہ بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔ سامنے میز پر پرلی جانب جیوری کے دو اور ارکان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سر آئزک میری طرف پلٹے اور غصے میں غرائے۔

''دیکھ رہے ہو مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔ تمھاری وجہ سے آج اس یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈسپلن کی کیسی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ مَیں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی کے نام پر دھبہ لگ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی میں طلبا نے میرے حکم کے خلاف جانے کی جرأت کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔۔۔ اور اس سب کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔

میں نے سکون سے ان کی بات سنی۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یونیورسٹی آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ آپ گیٹ کا رجسٹر دیکھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ تمام اسٹوڈنٹس تو صبح 9 بجے سے آپ کے دفتر کے باہر بلکہ پوری یونیورسٹی میں جمع ہو چکے تھے۔''

''تم اس قدر خطرناک ہو کہ تمھاری موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم

یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی ان سب کو گمراہ کر سکو، بھڑکا سکو، تمھاری موجودگی اس یونیورسٹی کی سلامتی کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔"

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس وقت مجھے اور اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ مَیں نے دھیرے سے کہا۔

"آپ یک طرفہ فیصلے کرنے کے عادی لگتے ہیں سر۔ آپ نے یک طرفہ طور پر فیصلہ کر کے مجھے کلاسز لینے سے منع کر دیا لیکن مَیں نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انکوائری میں کوئی خلل پڑے۔ اس وقت بھی جیوری جو فیصلہ کرے گی۔ مجھے قبول ہوگا۔"

میرا جواب سُن کر سر آئزک دانت کچکچا کر ہی تو رہ گئے۔ وہ مجھے جیوری کے سامنے اشتعال دلوا کر کچھ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اَب مَیں بھی اس کھیل کو پوری طرح سمجھنے لگا تھا۔

جیوری نے مجھے مطلع کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر مجھے کلاس لینے کی اجازت تو دی رہی ہے لیکن دو دن بعد ہونے والی بڑی تقریب میں مَیں اپنا ٹرم پیپر یونیورسٹی کی لائبریری یا ریکارڈ میں جمع نہیں کروا پاؤں گا تا وقتیکہ میرے خلاف انکوائری میرے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ فیصلہ سنا کر جیوری کے ممبروں نے اٹھتے اٹھتے مجھ سے یہ درخواست بھی کہ میں اپنے طور پر لڑکوں کو باہر جا کر کنٹرول کروں اور تمام اسٹوڈنٹس کو کلاس میں جانے پر مجبور کروں کیونکہ ان کے اس برتاؤ سے بات اب یونیورسٹی کی دیواروں سے باہر جانے لگی تھی جس سے یونیورسٹی کی بدنامی کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں نے جیوری سے وعدہ کیا کہ مَیں اسٹوڈنٹس سے ہڑتال ختم کرنے کی اپیل ضرور کروں گا۔ جیوری ارکان باہر نکل گئے۔ میں بھی واپس جانے کے لیے پلٹا۔ سر آئزک جو اَب بھی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے رک گئے اور مجھے پیچھے سے آواز دی۔

"مسٹر حماد۔۔۔۔ سارہ میری اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی ہے، لیکن ابھی بہت نادان ہے۔ اگلے سال مَیں نے اور اس کی ماں نے اس کی شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ لڑکا ہمارے خاندان کا ہے اور ہماری اُمیدوں کا چراغ ہے۔ اُمید ہے تب تک تم اس یونیورسٹی میں رہو

گے تا کہ سارہ کی شادی میں شریک ہوسکو۔ظاہر ہے بطور اس کے بہترین دوست یہ تمھارا حق بھی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں سر۔۔۔۔سارہ واقعی میری بہترین دوست ہے اور اگر اس کی شادی میں شریک ہونے کے لیے مجھے اپنے ملک سے بھی دوبارہ یہاں واپس آنا پڑا تو میں اس کی شادی میں شرکت کے لیے ضرور آؤں گا۔ مجھے بس آپ کے دعوت نامے کا انتظار رہے گا۔"

میں سر آئزک کو خود کو گھورتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔تو گویا یہاں بھی مذہب کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والا باپ بھی میرے خلاف برسرپیکار تھا۔جو یہ سمجھتا تھا کہ میں اُس کی لاڈلی بیٹی کو اس سے چھین کر لے جانے آیا ہوں۔کیا ساری دنیا کی بیٹیوں کے باپ ایک سا ہی سوچتے ہیں۔۔۔۔وہاں مولوی علیم الدین اور یہاں سر آئزک۔

میں نے بڑی مشکل باہر جمع لڑکے اور لڑکیوں کو دوبارہ کلاس میں جانے پر آمادہ کیا۔جم کے تو باقاعدہ ہاتھ پیر جوڑنے پڑے تب جا کر وہ کہیں ٹلا۔ربیکا اس بات پر بھی بے حد خفا تھی کہ میں نے اندر ڈرم پیپر پیش نہ کرنے کی شرط پر حامی کیوں بھری۔میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل میں یہ سارا کھیل ہی مجھے اس پیپر کو پیش نہ کرنے کی خاطر کھیلا گیا تھا۔اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دوسرے کسی طالب علم یا جم وغیرہ کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا جائے۔ مجھے انکوائری کے خاتمے تک انتظار کرنا ہی تھا۔سارہ بھی وہیں کھڑی چپ چاپ ہماری بحث سنتی رہی۔اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔جیسے اس کے اندر بہت سے سوال مچل رہے ہوں لیکن وہ انہیں پوچھ نہیں سکتی ہو۔جیسے اس کے اندر ایک جنگ سی جاری ہو۔میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے آگے چٹکی بجائی۔وہ چونک سی گئی،میں نے اُسے چھیڑا۔

"ہے مس آئزک۔۔۔۔دیکھا لوگ ہم سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔مسلمان نام اتنا خوف ناک تو نہیں تھا کبھی۔۔۔۔۔تمھارے پاپا نے تو ابھی سے مجھے تمھاری مستقبل کی شادی میں باراتی کی حیثیت سے دعوت نامہ بھی دے ڈالا ہے۔انہیں ڈر ہے کہ کہیں میں تمھیں بھگا کر نہ لے جاؤں۔"

سارہ اور ربیکا دونوں ہی ہنس پڑے۔ ربیکا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اب سر آئزک کو کون سمجھائے کہ تم کسی لڑکی کو نہیں ۔۔۔۔ بلکہ مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمھیں اپنے ساتھ بھگا لے جانے کی تاک میں ہیں۔"

ربیکا یونہی سب کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہی لیکن مَیں نے نوٹ کیا کہ سارہ اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہ تھی۔ جانے اس کے دھاگے کہاں اُلجھے ہوئے تھے۔

OO

یونیورسٹی کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج سب طالب علم اپنا اپنا ٹرم پیپر جمع کروانے کے بعد ہال میں جمع ہوئے تھے۔ یہاں پر آج چند بہترین طالب علموں کو اپنا پرچہ اور اپنی تحقیق باقی طالب علموں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ آج صرف تین اسٹوڈنٹ جنھوں نے پچھلے سمسٹر میں یونیورسٹی بھر میں پہلی تین پوزیشنز حاصل کی تھیں۔ وہی اپنا منتخب ٹرم پیپر حاضرین کے سامنے پیش کریں گے۔ خاصی بڑی تقریب تھی۔ لندن کے میئر صاحب حسبِ معمول مہمانِ خصوصی تھے۔ لوگوں کی تعداد پچھلے چند ہفتوں سے جاری انتظامیہ اور میرے درمیان چپقلش کی وجہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔ جانے یہ خبر کہاں کہاں گردش کرتی رہی تھی۔ سائنس کے اس دور میں لوگوں کو لاعلم رکھنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ انہی میں اخباری رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کی بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ہر سال کی طرح اس سال بھی یونیورسٹی کی اس خاص تقریب کی ترویج کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے چہرے سے واقف ہوں گے لیکن بقول جوزف ان میں سے ہر ایک کم از کم میرے نام سے ضرور واقف تھا۔

کچھ ہی دیر میں سر آئزک نے اسٹیج پر آ کر مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ ان چند بڑے ناموں کا اعلان کیا جو یونیورسٹی کو لاکھوں پاؤنڈ سالانہ چندہ دیتے تھے اور جن میں سے اکثر اس وقت اس تقریب میں ہال کی پہلی رَو میں موجود بھی تھے۔ یہ سب کے سب نام یہودیوں کے ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کی اپنی اولادیں بھی اسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھیں تقریب کا

باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے چند طلبا و طالبات کو ان کی غیر معمولی قابلیت پر سند اور میڈل وغیرہ دیے گئے۔ اس کے بعد ان اسٹوڈنٹس کو اپنا پرچہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جن کے نام آج کی فہرست میں شامل تھے۔ ان ناموں میں سارہ کا نام بھی شامل تھا کیونکہ پچھلے سیمسٹر میں بھی ہمیشہ کی طرح اس نے ہی پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

سب سے پہلے جیمی فوکس نامی لڑکی نے معاشیات پر اپنا پرچہ پڑھا اور ہال سے خوب داد وصول کی۔ اس کے بعد مارٹن نامی سال اوّل کے طالب علم نے لندن کی پرانی عمارتوں کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کا پرچہ بھی واقعی لاجواب تھا۔ ہال نے اسے بھی جی بھر کے ستائش کا انعام دیا۔ اس کے بعد سارہ کا نام پکارا گیا۔ بلیک کوٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس سارہ نے سفید قمیض کے ساتھ اپنا پسندیدہ اسکارف بھی گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ سُرخ رنگ کا یہ اسکارف وہ صرف خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی۔ آج بھی اُس نے اپنے لمبے بال پیچھے کس کر باندھے ہوئے تھے اور دُور سے بالکل کسی کانونٹ اسکول کی طالبہ ہی تو لگ رہی تھی۔ سارہ کا نام پکارے جانے پر ہماری ساری کلاس نے خوب شور مچایا جن میں جم اور ربیکا سرفہرست تھے۔ سارہ مسکراتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے ہال کے تمام حاضرین کا اور صدر تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اُس نے اپنے سامنے اسٹیج پر بنے چھوٹے سے شیشے کے روسٹرم (ڈائس) پر رکھے اپنے پرچے کا پہلا صفحہ پلٹا۔

''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میرے پرچے کا عنوان ہے ''ہالوکاسٹ۔۔۔۔ ایک نظریہ یا ایک حقیقت۔؟۔۔۔ آج سے تین ماہ پہلے بھی مَیں نے اسی موضوع پر پہلے حصے کی حیثیت انعام بھی حاصل کیا تھا۔ آج میں اُسی پہلے حصے کا دوسرا حصہ آپ سب کے سامنے پیش کرنا چاہوں گی۔ اُمید ہے آپ سب کی توجہ مجھے حاصل رہے گی۔''

پہلی قطار میں بیٹھے سر آئزک فخر اور مسرت سے اپنی بیٹی کا بااعتماد انداز دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے میئر اور چند دیگر خصوصی مہمانوں کو بھی دھیرے سے بتایا کہ سارہ ان کی بیٹی ہے۔ سب نے ستائش انداز میں سر ہلائے۔ سارہ کی بات جاری تھی۔

''یہاں مَیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ پہلے حصے کو تحریر کرتے وقت مَیں نے تحقیق کی بجائے زیادہ تر مواد اکٹھا کرنے پر اپنی توجہ قائم رکھی تھی۔

شاید اس وقت تک مجھے تحقیق کرنے کی اتنی عادت نہیں تھی یا صرف تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتے رہنے کی وجہ سے مَیں نے دوسرے رُخ کو پلٹنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا ٹرم پیپر پوری تحقیق اور دلائل کے بعد مرتب ہوا ہے۔ میرے پاپا۔۔۔۔ سر آئزک نے مجھے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولنے اور سچ سننے کی تربیت دی ہے اور سچ یہ ہے کہ آج اگر مَیں آپ سب کے سامنے اس اسٹیج پر فخر سے کھڑی ہوں تو یہ فخر دینے والے اصل میں میرے پاپا، میرے سب سے بڑے استاد خود ہیں۔"

سارے ہال نے سارہ کی اس بات پر تالیاں بجائیں۔ سر آئزک کا سر فخر سے مزید تن گیا، سارہ نے پہلا صفحہ ختم کر کے دوسرا صفحہ پلٹا۔

"ہالوکاسٹ، پر تحقیق کے دوران مَیں نے سچ اور مفروضے کی ایک عجیب سی جنگ دیکھی۔ یہ جنگ باہر بھی ہو رہی تھی اور خود میرے اندر بھی، میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لوگوں کو سچ کہنے اور سچ سننے سے اس قدر گریزاں دیکھا۔ ایک عجیب انسان ہماری زندگیوں میں آیا اور اس نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ مَیں نے اپنے پاپا کے بعد سچ کا دوسرا سبق اُسی انسان سے سیکھا۔ مَیں نے یہ بھی سیکھا کہ کوئی کس طرف سچ پر قدم جما کر کھڑا ہو سکتا ہے اور ساری کائنات سے ٹکر لینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ میرا آج کا ٹرم پیپر، یہ تحقیق اور یہ تجربہ دراصل میری نہیں ہے، بلکہ اُسی سچے انسان کی تحقیق ہے جس کا نام حماد رضا ہے۔"

ہال میں جیسے کسی نے بم کا دھماکا کر دیا ہو، اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سر آئزک غصے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کسی سے چلا کر مائیک بند کر دینے کا کہا لیکن تب تک جم اور ڈیوڈ وغیرہ نے ہال کے آڈیو سسٹم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اونگھتے ہوئے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی سی بھر دی تھی۔ وہ دھڑا دھڑ سارہ اور دیگر لوگوں کی سر آئزک سمیت تصاویر بنانے لگے۔ میئر نے آہستہ سے سر آئزک کے کان میں کچھ کہا شاید ان کی توجہ اخباری رپورٹرز کی طرف متوجہ کروائی۔ سر آئزک بے بسی کے عالم میں خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اور بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

خود میرے لیے بھی یہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارہ اپنے پرچے کی جگہ میرا پرچہ پڑھنے کے لیے لے آئے گی۔ اس نازک سی لڑکی کی

جرائتوں کی حد جانے کہاں جا کر ختم ہوتی تھی ۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا ۔ بہت مشکل ۔۔۔۔ سارہ کی تقریر جاری تھی۔

''نظریہ ہالوکاسٹ کی ابتدا صیہونی ورلڈ آرڈر کے اسرائیلی لیڈر اور وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور اس کے لیے جرمنی کے لیڈر اور دوسری جنگ عظیم کے ایک مشہور کردار ہٹلر کو ہدف بنایا گیا۔ وجہ برطانیہ اور امریکہ کی یہودی رہنماؤں کو یہ یقین دہانی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد سلطنت یہودیوں کے نام ہوگی۔۔۔۔

سارہ میرا پیپر پڑھتی جا رہی تھی اور ہال پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرمن اور ہٹلر ہی ہدف کیوں بنے۔۔۔۔؟ جواب ہٹلر کی یہودی دشمنی سے ظاہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہودیوں کو جرمنی بدر کر دیا گیا۔ اسلحے اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فیکٹریاں یہودیوں سے چھین لی گئیں ۔ کلیدی اسامیوں اور عہدوں سے یہودیوں کو ہٹا کر جرمن باشندوں کو تعینات کر دیا گیا تھا اور یوں یہودی جرمنی کے خلاف ہو گئے ۔ یہ سلوک نہ صرف جرمنوں نے بلکہ رومانیہ اور دیگر کئی ملکوں نے بھی یہودیوں کے ساتھ روا رکھا۔ اور یہیں سے ہالوکاسٹ کے نظریے کی ابتدا ہوئی ۔ شروع میں میں نے بھی بغیر تحقیق کے اس حق میں چھپنے والی بہت سی کتابوں سے حوالے لے کر اسے سچ مانا لیکن آج حادر تھا اس کے پرچے اور اس کی تحقیق کے نتیجے میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہودی مصنفین اور محقق آج تک اتنی بڑی ہلاکتوں کے بارے میں ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتیں تو ضرور ہوئی تھیں لیکن اصل تحقیق اور تمام تر شواہد اور ثبوت چند ہزار ہلاکتوں سے زیادہ کی تصدیق نہیں کر پائے۔''

سر آئزک نے غصے میں اُٹھ کر دوبارہ ہال سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ہال سے باہر موجود لوگ بھی اندر گھس آئے تھے اور دروازوں کے قریب اور ہال کے اندر نشستوں کے درمیان بنے راستوں میں اس قدر ہجوم تھا کہ وہ تلملا کر وہیں کہیں بھٹکتے رہ گئے۔ سارہ بولتی رہی۔

''دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنے بڑے پیمانے پر جرمن فوج نے یہودی قتل عام کیا بھی تھا تو اس وقت کے اخبارات، جرائد اور رسائل اس بارے میں اس قدر خاموش

کیوں ہیں۔ پچھلے کئی دنوں میں مَیں نے دوسری جنگ عظیم سے لے کر ہالوکاسٹ کا نظریہ سامنے آنے تک کے دَور کے ہر اخبار، ہر رسالے ہر خبر کو چھان مارا ہے لیکن مجھے اتنی بڑی ہلاکتوں کی خبر جرمن دشمن اخبارات اور رسائل میں بھی نہیں ملی۔ آخر کیوں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' کا الزام تو جرمنوں پر لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس وقت کی یہودی قوم کی طرف سے دباؤ ہمیشہ فلسطین اور قبلہ اوّل اور گولان کی پہاڑیوں کی طرف نقل مکانی کی صورت میں ہی کیوں نکالا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ قبلۂ اوّل ہر یہودی کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ مقدس ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نقل مکانی کے لیے ہالوکاسٹ کے نظریے کا ہی سہارا لیا جاتا۔۔۔۔ کیا کوئی مجھے جرمنوں کے خلاف اُٹھائے جانے والے کسی اقدام کے بارے میں بتائے گا۔۔۔؟ اصل مجرم تو یہودیوں کے نزدیک جرمن تھے ۔۔۔۔ لیکن ان کے خلاف ایسا کچھ نہیں کیا گیا جس کا کوئی قابل ذکر کہیں بھی سنائی دیا ہو۔۔۔؟ آخر کیوں۔۔۔۔؟

پھر سارہ نے ان تمام تصنیفات کے نام پڑھے جن سے مَیں نے ہالوکاسٹ کے نظریے کے خلاف شواہد اکٹھے کیے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس کو ان تصانیف کو ایک بار پڑھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مجھے یقین ہے اتنے دنوں میں سارہ نے خود بھی ایسی ہر ایک تصنیف کو چھان مارا ہوگا جس کا حوالہ مَیں نے اپنے پرچے میں دے رکھا تھا۔ آخر میں سارہ بولی۔

''بحث یہ نہیں ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' مفروضہ ہے یا حقیقت۔ بحث تو اب یہ ہے کہ سچ کو زمانے کے سامنے پیش کرنے سے اور سچ بولنے سے اس قدر خوف کیوں۔۔۔؟ مَیں اپنی نئی نسل کو اس بات کی دعوت دیتی ہوں کہ ہمیں خود آگے بڑھ کر سچ کے نقاب کو اُلٹ دینا چاہیے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے اس وقت کچھ مقاصد حاصل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ کیوں نا ہم خود چل کر سچ کو تلاش کریں حماد امجد رضا کا یہ ٹرم پیپر تو صرف ایک ابتدا ہے۔ ہماری نئی نسل کو سچ کی طرف بلانے کی ابتدا۔ حماد نے اس پرچے میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ ''ہالوکاسٹ'' سراسر جھوٹ ہے۔ لیکن اس نے اس کے مفروضے کے سچے ہونے پر انگلی اٹھائی ہے۔ اس نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ایک قوم کے مظالم اگر ثابت ہو بھی جائیں تب بھی اس کا بدلہ کسی سازش

کے ذریعے دوسری قوم سے لینا ناانصافی ہے۔ حماد کا یہ ٹرم پیپر اسرائیل کی حدوں میں تو کوئی ردوبدل نہیں کرسکتا کیونکہ جو ہو چکا اُسے بدلنا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کس نے کہاں پر اور کتنی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ مَیں پھر کہوں گی یہ ہم سے تین نسلیں پہلے کیے گئے لوگوں کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔ تو پھر ہم آج کی نسل اس کی جواب دہی کیوں کرتے پھریں۔ یاد رکھئے۔۔۔۔ اس دنیا میں امن قائم کرنا ہے تو ہماری اس نسل کو ہی آگے آنا ہوگا۔ پھر چاہے وہ نسل یہودی ہو یا مسلمان، یورپین ہو یا امریکن یا افریقین۔۔۔۔ ہمیں اپنا امن کا نظریہ خود پیش کرنا ہوگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔۔ جس نسل جس قوم کے بھی بزرگوں نے جو کچھ بھی کیا چاہے اپنی دانست میں درست ہی کیوں نہ کیا ہو اور وقت نے اُسے غلط ثابت کر دیا ہو، چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ سب اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ ہمیں حال میں جینا ہے۔ ماضی کا حصہ بن کر اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا، ان کے جرم سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہوگا۔ کیونکہ شاید انہوں نے وہ کام غلطی یا جرم سمجھ کر نہ کیے ہوں۔۔۔۔۔

میں اپنی اور ہر قوم کی نئی نسل کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ''ہالوکاسٹ'' اور اس جیسے کسی بھی مفروضے کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود تحقیق کریں۔ خود قدم آگے بڑھائیں۔ چاہے وہ مفروضہ کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس نئی نسل کو خود رکھنی ہوگی۔ ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے بڑوں کی دشمنیاں ہمیں ان کے ساتھ ہی دفنانا ہوں گی۔''

سارہ نے میرے ٹرم پیپر کا آخری صفحہ بھی ختم کر دیا۔ اور اسٹیج سے اُترنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ ہال پر بہت دیر تک ایک موت کا سا سکوت طاری رہا۔ اور پھر سب سے پہلے لندن کے میئر اور مہمان خصوصی نے اُٹھ کر سارہ کے لیے تالی بجائی۔ پھر اس کے بعد، دو، دو کے بعد چار اور چند لمحوں میں ہی ہال تالیوں، نعروں اور تعریفی کلمات کے شور سے جیسے پھٹنے لگا۔ سارہ کے پیچھے اخباری فوٹوگرافرز کی فلش مشین کی روشنی جھماکے کر رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے اُتر کر سیدھی میرے پاس آئی اور ٹرم پیپر میری طرف بڑھا کر مسکرائی۔

''یہ لو اپنی امانت۔۔۔۔ مَیں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم

کے پاس آج شام تک اس ٹرم پیپر کی ایک ایک نقل پہنچ جائے گی۔ تم نے سچ کے جس سفر کی دعوت دی ہے۔ وہ آج اسی یونیورسٹی کے اسٹیج سے مَیں نے شروع کر دیا ہے۔ اور تم دیکھنا کہ بہت جلد تمھارے قافلے میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں گے۔'' ہمارے اردگرد اسٹوڈنٹس، اخباری نمائندوں اور ہمارے ذاتی دوستوں کا ایک ہجوم تھا۔ اخبار والے دھڑا دھڑ میری اور سارہ کی تصاویر بنا رہے تھے۔ رپورٹرز اپنے مائیک آگے کیے جانے اور کیا کیا سوال کر رہے تھے۔ مجھے ان سب باتوں کا ہوش ہی کہاں تھا۔۔۔۔ دفعتاً میرے سامنے کھڑی سارہ کی جگہ ایمان نے لے لی۔ مَیں نے چونک کر ایمان کو دیکھا، آس پاس ہال کا شور سا کت ہو گیا، لوگ سا کت ہو گئے۔ ایمان دھیرے سے مسکائی۔ ''میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔ محبت فاتح عالم ۔۔۔۔''

دفعتاً ایمان کی جگہ پھر سارہ نے لے لی، ہم دونوں کے گرد ربیکا، جم ڈیوڈ اور ٹینا نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھیرا سا ڈالا ہوا تھا تاکہ ہم ہجوم کے دھکوں سے بچ سکیں۔ مَیں نے سامنے کھڑی سارہ کے بال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیے، سارہ مسکرا دی، سارا ہال مسکرا دیا۔ ساری دُنیا مسکرا دی۔ ساری کائنات مسکرا دی۔

OO

نوجوان انقلاب

رات یونیورسٹی کی تقریب سے مَیں بہت دیر بعد فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ ربیکا نے تقریب کے بعد اپنے خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں سے آتے آتے آدھی رات ہی ہو گئی تھی۔ میں آتے ہی بستر پر پڑ کے سو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے کامران کے شور نے جگا دیا۔ وہ میرے ہی کمرے میں چلاتا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

''اوہ تو میرا شہزادہ پورے شہر میں آگ لگانے کے بعد یہاں پڑا سو رہا ہے۔'' میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

''تم آج ریسٹورنٹ نہیں گئے اپنے۔''

''وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہاں بھی تمھارے ہی فدائین کا ہجوم جمع ہے۔ جو تمھارے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں۔ سارے شہر کے اخبارات میں کل یونیورسٹی ہال میں کی گئی اس یہودی حسینہ کی تقریر کے چرچے ہیں۔ تم دونوں کی تصویروں کی دھوم ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ آج اگر تم یہاں سے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دو تو بلا مقابلہ میئر کا انتخاب جیت جاؤ گے۔ یہ گوری نئی نسل جب کسی کو سر پر بٹھاتی ہے تو پھر اُترنے نہیں دیتی۔''

کامران نے آج کے اخبارات کا موٹا سا پلندا میری طرف پھینکا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر سارہ کی تقریر کے دوران اور پھر میرے ساتھ کھڑے مجھے نرم پیپر واپس کرتے ہوئے کی تصویر اور ایسی کئی دیگر تصاویر چھپی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر اخبار نے اس واقعے کو اور سارہ کی تقریر کو ''نوجوان انقلاب'' سے تشبیہہ دی تھی۔ چند ایسے اخبارات نے جن کے مالکان یہودی تھے یا پھر یہودیوں کے زیرِ اثر تھے اور انہی کے چندے سے چلتے تھے، سارہ کی تقریر اور ہالوکاسٹ پر میرے پرچے پر زبردست تنقید بھی کی تھی۔ اسے ایک جذباتی باتوں کا پلندا قرار دیا تھا لیکن اس وقت ان کی تنقید بھی ہماری شہرت کو بڑھانے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔ اس

نازک لڑکی کی جرأت نے میری بات شہر کے ہر گلی کوچے میں پہنچا دی تھی اور کل تک انہی اخبارات کے ذریعے پورے یورپ میں اور پھر انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں پہنچنے والی تھی۔ لوگوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ نوجوان نسل نے سچ کی تلاش کے عنوان سے اپنے بڑے بزرگوں کو انہی اخبارات میں دعوت دی تھی کہ وہ ان کی مدد کریں، سچ جاننے میں اور سچ کو پھیلانے میں۔ سارہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ قافلہ اَب چل پڑا تھا۔ اس قافلے کی سربراہی خود سارہ ہی تو تھی۔

چند اخبارات نے جو یہودی اثر میں تھے۔ پیٹر کے ساتھ میرے فرضی جھگڑے کو بنیاد بنا کر اور اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے میری کردار کشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ سارہ اور میرے تعلق پر بھی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ ان اخبارات نے خاص طور پر سارہ کے بال بکھراتے میرے بڑھے ہاتھوں والی تصویر کو شائع کیا تھا۔ گویا جنگ چھڑ چکی تھی۔ کچھ اخبارات نے مجھے خاص قوم کا ایک خطرناک ایجنٹ بھی قرار دیا تھا۔ جو ایک خاص ایجنڈہ لے کر یونیورسٹی آیا۔ لیکن زیادہ تر اخبارات نے کیچڑ اُچھالنے کی بجائے میرے پیغام کو آگے بڑھایا تھا۔ سوچنے کے پیغام کو، تحقیق کر کے سچ کے جاننے کے پیغام کو، سارہ کی تو ہر اخبار نے زبردست تعریف کی تھی۔ اسے روایتوں سے ہٹ کر دُنیا کے سامنے کھڑی ہونے والی لڑکی قرار دیا تھا۔ اُسے نئی نسل کی آواز کہا تھا، میرا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بحث شروع ہو چکی تھی اور مَیں جانتا تھا یہ بحث آگے چل کر نئی نسل کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔

لیکن اخبارات میں اکا دکا چند ایسے واقعات کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جو میرے لیے کافی تشویش کا باعث تھے۔ لندن کے مضافات میں اور چند یہودی آبادیوں کے اردگرد تشدد کے اکا دکا واقعات کا بھی ذکر تھا جو سارہ کی اس تقریر کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا الزام تو ہم پر لگایا جاتا رہا ہے ہمیشہ اور ایک تسلسل کے ساتھ، لیکن ان تنگ نظر یہودیوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا جنھوں نے اپنی ہی نسل کی ایک معصوم سی لڑکی کی ایک سچی پکار کو نسلی تعصب کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے دو بجے آج یونیورسٹی جانا تھا لیکن کامران نے مجھے اکیلے جانے نہیں دیا۔ اُسے ان

اکا دکا واقعات کی وجہ سے کافی تشویش تھی جو لندن کی یہودی بستیوں کے مضافات میں ہوئے تھے۔ وہ مجھے خود یونیورسٹی کے گیٹ پر اپنی گاڑی سے اُتار کر ہی واپس ریسٹورنٹ گیا اور مجھے تاکید کر گیا کہ مَیں واپسی پر نکلنے سے پہلے بھی اُسے فون کر کے بلوا لوں اور پیدل، تنہا یونیورسٹی سے نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا، اسکول اور کالج میں جب کبھی میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یونہی میرے سائے کی طرح میرے ساتھ چپکا رہتا تھا اور جب تک وہ خطرہ ٹل نہیں جاتا تھا مجھے کہیں اکیلے نہیں جانے دیتا تھا۔ یوں کئی مرتبہ ہم دونوں نے اکٹھے اور بہت مرتبہ اُس نے میری جگہ اکیلے اپنے جسم پر بہت سے زخم کھائے تھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے دوستوں کو ماں باپ کے ساتھ کا درجہ کیوں نہیں دیا جاتا؟

یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ہیلو، ہائے، اور مبارک باد کی آوازوں نے میرا استقبال کیا۔ حالانکہ آج یونیورسٹی میں کل کی تقریب کی وجہ سے عام تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا اس لیے یونیورسٹی تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف ہوسٹل میں رہنے والے چند اسٹوڈنٹس موجود تھے لیکن مجھے اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں آج بلایا گیا تھا۔ ڈین آئزک کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کاندھے تھپک کر، ہاتھ ملا کر اور گلے لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

ڈین آئزک کے کمرے میں تو پوری عدالت ہی لگی ہوئی تھی۔ جیوری کے ممبر، پیٹر اور اس کے دونوں گواہ موجود تھے۔ ایک دو نئے چہرے بھی موجود تھے جنھیں مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر آئزک کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ یقیناً رات کو دو بجے جب سارہ کو ربیکا نے، مَیں نے اور ہمارے ساتھ کی تمام ٹولی نے گھر چھوڑا تھا تب اُس کے بعد ان کی اور سارہ کی ایک طوفانی بحث یا جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ میری آج سارہ سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں صرف اپنے طور پر خیالی گھوڑے ہی دوڑا سکتا تھا کہ کل رات سارہ کے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔

جیوری نے اپنی کارروائی شروع کی۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں اَب یونیورسٹی کی منفی شہرت کا سبب بننے کا الزام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ لیکن آج مجھے جیوری کسی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب خصوصی

طور پر آج مجھے چھٹی والے دن پیشی کے لیے بلایا گیا تھا۔

نئے آنے والے بھاری بھرکم اور موٹی توند والے صاحب کا نام پارکر تھا۔ وہ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج تھے، ان کے ساتھ خفیہ ایجنسی ایم۔آئی، کے دو اہلکار بھی موجود تھے۔ پیٹر نے پھر سے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس مرتبہ دونوں گواہوں نے بھی بیانات دیے۔ میرا بیان تو پہلے سے وہی تھا کہ مَیں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن جیوری نے میرا اعتراض رد کر دیا اور بالآخر فیصلہ سنا دیا کہ مجھے فوری طور پر یونیورسٹی کے اس ٹرم سمسٹر سے فارغ کیا جاتا ہے اور پیٹر کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ ہتک عزت کا دعویٰ کرنا چاہے یا اگر اُسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ پولیس سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے آج مجھے یہاں پولیس والے حضرات بھی نظر آ رہے تھے۔

پارکر اس تمام کارروائی کے دوران غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ مَیں نے سر آئزک سے پوچھا کہ کیا مجھے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کی حد تک تو فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ مَیں چاہوں تو لندن کی کسی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف جا سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے دبے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دی کہ انہوں نے پیٹر کو فی الحال پولیس میں میرے خلاف جانے سے اسی شرط پر روک رکھا ہے کہ مَیں اس فیصلے کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں گا۔

جیوری نے فیصلہ سنا دیا تھا سر آئزک کا چہرہ فیصلہ سننے کے بعد بھی اُترا ہی رہا۔۔۔۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف میری کلاس عارضی طور پر ختم کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ جیوری کے ساتھ فیصلہ سنانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

مَیں کمرے سے نکل آیا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا کہ پیچھے سے موٹی توند والے پارکر نے مجھے پکارا۔ مَیں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا اُسے ہر لمحہ چیونگم چبانے کی عادت لگتی تھی۔ اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔

''ہوں۔۔۔۔ تو تم ہو حماد۔۔۔۔ جس نے آج پورے لندن میں آگ لگا رکھی ہے۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔ آگ لگانے کی قوت رکھتے ہو۔۔۔ میں جیوری کی تمام

کارروائی کے دوران بہت غور سے تمھیں دیکھ رہا تھا، تمھارے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔"

"مَیں جانتا تھا کہ یونیورسٹی انتظامیہ یہی فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آج صرف سنایا گیا ہے۔"

پارکر چیونگم چباتے ہوئے اپنی ڈھیلی پینٹ کے گیلس اوپر کھینچتے ہوئے بولا۔

"بہت خوب۔۔۔۔ مجھے تمھارا اعتماد واقعی بہت پسند آیا۔۔۔۔ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ یونیورسٹی کے باقی اسٹوڈنٹس کو شہر کی سڑکوں پر لا کر جیوری کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دو گے۔ اگر ایسا ہے تو میں تمھیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ انتظامیہ نے کل سے یونیورسٹی کو پندرہ دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اسٹوڈنٹس کے کسی ممکن ری ایکشن سے بچا جا سکے۔"

پارکر نے خبر سنا کر پھر ماہر پولیس والوں کی طرح میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ حالانکہ وہ یہ سب نہایت غیر محسوس طریقے سے کر رہا تھا۔ مَیں نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

"آپ بے فکر رہیے۔ اس یونیورسٹی کی اسی سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹس کو دو ہفتے کی چھٹی بغیر کسی اطلاع کے مل رہی ہے۔ وہ سب اس چھٹی کو بہت خوشی سے پُر لطف انداز میں گزاریں گے۔"

مَیں آگے بڑھنے لگا۔ پارکر نے جلدی سے پھر مجھے پکارا۔

"آگے کا کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں۔ اپنے خلاف جھوٹے الزام کا سامنا کروں گا۔" مَیں پھر آگے بڑھنے لگا۔ پارکر پھر بولا۔

"مَیں جانتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔"

مَیں رُک گیا۔ مَیں نے حیرت سے پارکر کی جانب دیکھا۔ وہ حسبِ معمول چیونگم چباتا رہا۔ "آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ میرے خلاف ہوتی انکوائری کے دوران چُپ چاپ خاموش بیٹھے رہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟؟؟"

"کیونکہ تمھارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور ان لوگوں کے پاس گواہ کے طور پر

سارے ثبوت موجود تھے۔ تم نہیں جانتے تم نے اور تمھاری دوست سارہ نے اس وقت لندن کی تمام انتظامیہ اور سارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ساری پولیس کو ممکنہ ری ایکشن کی وجہ سے الرٹ کر دیا گیا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ ہمیں طلب نہ کرتی تب بھی لندن انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔"

"لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ ان کا الزام جھوٹا ہے۔"

"تیس سال سے پولیس کے محکمے کی خاک چاٹ رہا ہوں برخوردار۔۔۔۔ اس خبیث لائبریرین کی شکل پر ہی لکھا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے ڈین کی شہ پر ہو رہا ہے۔"

وہ واقعی پکا پولیس والا تھا۔ کچھ دیر میں ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔

"اس کے بعد کا دوسرا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے یہ ذہن میں ضرور رکھنا کہ ان لوگوں نے اب تمھیں لندن سے ڈی پورٹ (علاقہ بدر) کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ جو بھی قدم اُٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اُٹھانا۔"

"آپ مجھے یہ بتائیے کہ پیٹر کی شکایت پر میرے خلاف پولیس کا ردعمل کیا ہوگا۔"

پارکر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔۔

"میری توقع سے کہیں زیادہ ذہین ہو۔ عام حالات میں پولیس اُس کی تمھارے خلاف شکایت پر زیادہ سے زیادہ یہ عمل کرتی کہ تمھیں چند منٹ کے لیے قریبی اسٹیشن بلوا کر تم سے کوئی زبانی یا تحریری ضمانت لے لیتی اور تم دونوں کو مستقبل میں محتاط رہنے کی تنبیہ کر کے جانے دیتی۔ کیونکہ پولیس کے محکمے میں اور کسی یونیورسٹی کے قانون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پولیس بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے صرف گواہوں کی شہادت پر کسی کو ملزم یا مجرم نہیں مان سکتی، اور گواہ بھی وہ خود الزام لگانے والے کے وفادار ملازم ہوں۔ لیکن اس دن کی تقریب اور تمھاری دوست کی اس تقریر کے بعد اب حالات وہ نہیں رہے۔ اب اس یہودی کا الزام ستر فیصد پہلے ہی درست مان لیا گیا ہے۔ لندن انتظامیہ بہت چوکنا ہوگئی ہے۔ رہی سہی کسر تشدد کے ان اکا دکا واقعات نے پوری کر دی ہے۔ ایسے موقع پر چاہے پولیس تمھارے خلاف کوئی ایکشن لے یا نہ لے۔ لیکن ساتھ وہ ہر حال میں تمھاری یونیورسٹی انتظامیہ کا ہی دے گی۔ اس

وقت تم یونیورسٹی اور پولیس دونوں کے لیے ایک سا خطرہ ہو۔"

پارکر نے تفصیل سے مجھے تمام صورت حال کا جائزہ کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آئندہ کسی بھی اقدام کے سلسلے میں آگاہ رکھوں گا۔ پارکر میرا کندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ، ربیکا، جم وغیرہ میں سے کسی کو میری آج یہاں سر آئزک کے سامنے پیشی کا پتہ نہیں تھا ورنہ وہ سب کے سب اس وقت یہاں جمع ہوتے۔ میں نے دانستہ طور پر خود بھی انہیں اس اچانک کال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اس انکوائری کے نتیجے سے پہلے ہی سے بخوبی واقف تھا۔ بالآخر سر آئزک نے اپنا مقصد کسی نہ کسی طور حاصل کر ہی لیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے آگے آنے والے وقت اور حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ کامران کو میں نے فون کر کے یونیورسٹی کے فیصلے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ آج ہی دو چار اچھے وکیلوں سے اس سلسلے میں بات کر لے گا۔ آج سر آئزک اور ان کے درپردہ یہودیوں کے امرا طبقے نے میرے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا تھا مجھے میرے خیالات کی سزا دی جا رہی تھی۔ مجھے ان کی نئی نسل کو سوچ کے راستے پر ڈالنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ سزا دینے والے صرف سر آئزک ہی نہیں تھے، ان کا تو صرف ایک چہرہ تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا یا ان کا نمک خوار پیٹر۔۔۔۔ جس کا کاندھا ان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ اصل میں تو اس سازش کے پیچھے لندن کا ہر تنگ نظر اور رئیس یہودی شامل تھا موجود تھا۔ ایک معمولی سے لڑکے کی جرأت پر ان سب کا تو خون ہی کھول اُٹھا ہوگا جس نے وقت کے اس بہت سے بڑے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ وہ مجھے اب عبرت کی مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ایسی جرأت پھر دوبارہ اور کوئی نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سارہ کی زبانی میرا پیغام لندن کے گلی کوچوں میں پھیل چکا تھا اور اب یہ بات چل نکلی تھی۔ مجھے اس لمحے سارہ پر بے حد پیار آیا۔ کیا دُنیا میں سچ کا دامن تھامنے والی ایسی متوالی لڑکی کوئی اور ہو سکتی ہے۔۔۔۔؟

OO

چلتے چلتے

شام تک سب سے پہلے سرآئزک کے ذریعے سارہ کو اور پھر سارہ کے ذریعے ربیکا، جم ڈیوڈ، ٹینا اور جانے کس کس تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب کامران کے فلیٹ پر جمع ہونا چاہ رہے تھے لیکن مَیں جانتا تھا کہ یہاں کچھ ہی دیر میں وہ ہلڑ بازی ہوگی کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ اس لیے مَیں نے ربیکا کو کہا کہ وہ ان سب کو لے کر کامران کے ریسٹورنٹ پہنچ جائے۔ لیکن سارہ نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور اُس نے مجھے گھر سے لے کر کامران کے ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ مَیں جانتا تھا کہ سارہ سے مزید بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ تھا۔ لہٰذا میں چُپ ہی رہا۔ مَیں اپنی سفید جین کے اوپر نیوی بلیو سویٹر گلے سے نیچے کھینچ ہی رہا تھا کہ سارہ کی گاڑی کا ہارن بج اُٹھا۔ جلدی سے جوتے پیروں میں ڈالے اور نیچے پہنچا تو سارہ پریشان سی اپنی سفید بیٹل سمیت موجود تھی۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ روئی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے گہرے رنگ کا دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگا لیا حالانکہ دھوپ تو اب ڈھل چکی تھی۔ مَیں چُپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سڑک کے کونے پر اسپینیش گٹار بجانے والی لڑکی جینی ابھی تک موجود تھی۔ اُس نے مجھے شاید سارہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے گاڑی جیسے ہی اس کے قریب پہنچی وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کی دو کلیاں تھیں جو اُس نے مجھے اور سارہ کو پیش کر دیں اور مسکرا کر بولی۔

''فار سینورآ۔۔۔۔ماد۔۔۔۔''

میں نے مسکرا کر اس سے پھول لے لیا اور جیب سے اُسے چند روپے نکال کر دینے کے لیے آگے بڑھائے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔

''نہیں ۔۔۔۔ یہ میری طرف سے ہے ۔۔۔۔ آپ کے لیے بھی ۔۔۔۔ اور ماوام کے لیے بھی ۔۔۔۔'' سارہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''ہوں ۔۔۔۔ تمھارے چاہنے والوں کی گنتی پوری نہیں ہو پاتی ۔۔۔۔ جہاں جاتے ہو اپنا جادو بکھیر دیتے ہو ۔۔۔۔ اپنی گلی میں بھی کافی مقبول ہو ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔؟''

مَیں سارہ کی بات سُن کر مسکرا دیا۔

''تم ساتھ ہو نا ۔۔۔۔ اس لیے لوگ خصوصی اہمیت دے رہے ہیں ۔۔۔۔ یہ میرے نہیں ۔۔۔۔ تمھارے جادو کا اثر ہے سارہ میڈم۔''

سارہ میری بات سُن کر ہنس دی۔ اس کے چہرے پر چھایا غبار کچھ چھٹ سا گیا۔ ڈھلتی شام پھر سے روشن ہو گئی۔ سارہ نے رش کی وجہ سے گاڑی کی شہر کی مضافاتی سڑک کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ درمیان شہر کی گلیوں والے راستے سے بہت لمبا تھا لیکن اس وقت دفتروں سے چھٹی کی وجہ سے سڑکوں پر اس قدر ہجوم تھا کہ ہم اس شہر سے باہر والے راستے سے کہیں جلدی ٹریفالگر اسکوائر تک پہنچ جاتے جہاں سے تیسری سڑک کے بہت بڑے اور سڑک سے بھی چوڑے فٹ پاتھ کے کونے پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا۔ اَب ہماری گاڑی ٹیمز ریور کے پُل سے گزر رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں پل کی بڑی بڑی برجیوں کی نوکیلی چوٹیوں کو چوم کر الوداع کہہ رہی تھیں۔ دریا میں پگھلے سونے کی لمبی لمبی سی تاریں تیر رہی تھیں۔ کار اس طویل پُل کو پار کر کے اب پل کے ساتھ دوڑتی، بل کھاتی، کالی لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ نے کچھ دُور جا کر دریا کے کنارے گاڑی روک دی اور گاڑی سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر بنی لوہے کی اس لمبی سی پٹی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی جو دریا کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا لیکن شفق کی لالی اَب آسمان پر نارنجی رنگ بکھیر رہی تھی۔ یہ نارنجی رنگ جب دریا کنارے پڑی برف کی پٹی پر پڑتا تو مجھے اپنے محلے میں آنے والے گولے گنڈے والی کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی سفید برف کا گولا بنا کر اس کے اوپر شیشے کی بوتلوں میں بھری لال، نیلی، پیلی اور نارنجی رنگ کی شربت انڈیل کر گولہ ہمارے حوالے کر دیتا تھا اور پھر ہم سب بچے دیر تک مزے لے لے کر وہ برف کا گولہ چُوستے رہتے تھے۔

سارہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خاموش دریا کے بہتے پانی کو دیکھتی رہی۔ اس نے اب بھی اپنی آنکھوں سے وہ گہرے رنگ کا کالا چشمہ نہیں اُتارا تھا۔ لیکن مَیں جانتا تھا کہ اس چشمے کے نیچے اس کی گھنی پلکیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ پھر بالآخر اس نے خود ہی یہ خاموشی توڑی۔

''پاپا نے اچھا نہیں کیا۔۔۔۔ مَیں انہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔ وہ ایک کمزور شخص نکلے میڈی۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں بالکل ٹوٹ گئی ہوں۔''

بالآخر اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے اپنے اندر بائیس سالوں سے جس باپ کا بُت سب سے اُونچی جگہ پر سجا کر رکھا ہوا تھا۔ شاید آج وہ بُت پاش پاش ہو گیا تھا۔ مَیں نے سارہ کی آنکھوں سے اس کا چشمہ اُتار دیا۔۔۔۔ اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے اس کے بہتے آنسو صاف کیے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔

''تم دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہو مس آئزک۔۔۔۔ تمھارے یہ بہتے آنسو تمھیں کمزور نہیں بنا سکتے۔ ابھی تمھیں زندگی میں ایسے اور بہت سے تجربات سے گزرنا ہوگا۔ اور اس وقت شاید مَیں یا تمھارے دوستوں میں سے بھی بہت سے تم سے دُور ہوں گے۔ اس لیے خود کو ابھی سے سنبھالو سارہ۔۔۔۔ مَیں تمھیں یوں کمزور پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔

سارہ اب بھی سسک رہی تھی۔

''نہیں حماد۔۔۔۔ مَیں اتنی طاقتور نہیں ہوں، مجھے اتنا بڑا مقام نہ دو اپنی نظروں میں۔۔۔۔ اتنی بھاری ذمہ داری نہ ڈالو میرے کاندھوں پر۔۔۔۔ مَیں تو بہت کمزور لڑکی ہوں۔۔۔۔ نہیں نبھا پاؤں گی یہ سب کچھ۔۔۔۔ نہیں نبھا پاؤں گی۔''

''تمھیں نبھانا ہوگا۔۔۔۔ تم ہی نبھاؤ گی۔۔۔۔ یہ مَیں جانتا ہوں۔''

مَیں نے زور سے سارہ کو کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''اور سر آئزک نے وہی کیا جو ایک جنگ میں کوئی دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔ ان سے کیسا گلہ۔۔۔۔؟ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ یقین جانو مجھے ان سے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے۔''

سارہ چلّا کر بول پڑی۔

''لیکن کیوں؟۔۔۔۔ایسی کیا جنگ ہے ان کی تم سے۔۔۔؟۔کیا دشمنی ہے۔۔۔؟ کیا ہے تمھارے پاس ایسا کہ سارا شہر تم سے خوف زدہ ہے۔۔۔۔مَیں آج تک اپنے آپ کو اپنی نسل کو عظیم سمجھتی رہی لیکن تم نے ایک جھٹکے میں ہی ہماری عظمت کے تمام احساسات کو تار تار کر دیا۔۔۔۔مَیں پاپا کو دنیا کا سب سے مضبوط آدمی سمجھتی تھی لیکن وہ تو سب سے زیادہ کمزور نکلے۔۔۔۔تم نے تو ہمیں صرف سچ کو کھوجنے کی دعوت دی تھی۔۔۔۔وہ سچ کیا ہے جس سے میرا مضبوط باپ بھی کتراتا ہے۔۔۔۔مجھے تو یہ معاملہ صرف ہالوکاسٹ تک کا نہیں لگتا۔۔۔۔مجھے بتاؤ حماد۔۔۔۔مَیں کیا کروں۔۔۔۔کس پر اعتبار کروں۔۔۔۔مجھے لگتا ہے مَیں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔۔میرے اندر میرے اپنے بنائے ہوئے آئیڈیلز ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں۔مَیں اندر سے مر رہی ہوں۔۔۔۔میرا اعتبار۔۔۔۔میرا بھرم ٹوٹ رہا ہے۔۔۔۔مَیں کیا کروں۔۔۔۔کہاں جاؤں۔''

سارہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اپنا درد کہتی رہی۔

''تم صرف اپنے دل پر اعتبار کرو۔۔۔۔جو تمھارا دل کہے۔۔۔۔وہی سچ ہے۔۔۔۔کبھی کبھی فیصلہ دل پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔۔۔۔اب چلو۔۔۔۔وہاں ریسٹورنٹ میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔تم جانتی ہو نا ربیکا کے دل پر کیسی چھریاں چل رہی ہوں گی اس وقت۔''

سارہ مسکرا دی مَیں جانتا تھا کہ کس بات سے اس کا موڈ بہتر ہو سکتا ہے اور یہی میں چاہتا تھا۔میں نے اس کا سیاہ چشمہ اس کے بالوں میں سجا دیا۔ہم دونوں دُور اوپر سڑک کے کنارے کھڑی ہماری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔میں سارہ سے دو قدم آگے تھا۔اچانک سارہ نے رک کر مجھے آواز دی۔

''ہے میڈی۔۔۔''

میں نے پلٹ کر سارہ کو دیکھا۔

''کیا تمھیں یقین ہے کہ دل ٹھیک فیصلہ کرے گا۔مجھے کوئی دھوکا تو نہیں دے گا۔'' اس کی بات سُن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نہیں۔۔۔۔تمھارا دل تمھیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔۔۔۔اتنی اچھی لڑکی کا دل کبھی دھوکے باز نہیں ہوسکتا۔''

میرا جواب سُن کر وہ بھی مسکرا دی۔ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر سارہ نے نہ جانے کن شارٹ کٹ راستوں سے گاڑی نکالی کہ ہم آدھے گھنٹے میں کامران کے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔وہاں تو واقعی میلہ سا لگا ہوا تھا۔میری تقریباً پوری کلاس ہی موجود تھی اور چند دیگر سمسٹرز کے لڑکے لڑکیاں بھی وہاں رفتہ رفتہ پہنچ رہے تھے۔کامران ریسٹورنٹ کے اندر اور باہر کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ہم دونوں کو پہنچتے دیکھ کر وہیں دُور سے چلایا۔

''مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔۔پانچ سو سینتیس پاؤنڈ کا بل بن چکا ہے۔براہ مہربانی کاؤنٹر پر تشریف لے آیئے۔''

ربیکا نے فوراً اعلان کیا کہ وہ آج کا تمام بل خود دے گی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کامران کبھی اس سے بل کا ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ہم سب ریسٹورنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر ہی ٹک گئے۔اندھیرا ہو چکا تھا اور پندرھویں اسٹریٹ، جس پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا اب جگمگانے لگی تھی۔کافی کی خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔جہاں دیدہ بوڑھے سگار سلگائے کبھی نہ سلجھنے والے مسئلوں پر بات کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بنے ریسٹورانٹس میں لگی کرسیوں پر جمع ہو رہے تھے۔جلتے سگاروں کی مہک سے سماں دھواں دھار ہونے لگا تھا۔

کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ اگر دن کے چوبیس پہروں میں شام کا پہر نہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے رنگ ہوتی۔۔۔۔ایک خوبصورت شام، دوستوں کا ساتھ چھلکتی خوشبوئیں ۔۔۔۔یہ سب کتنی بڑی نعمت ہیں۔۔۔۔ہماری زندگی میں کیسی کیسی نعمتیں ہیں جن کا ہم شکر تو دُور کی بات ہے ٹھیک سے کبھی احساس بھی نہیں کر پاتے۔۔۔۔آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاعروں نے دیوان کے دیوان صرف اس ایک شام پر کیوں لکھ مارے ہیں۔

میرے تمام کلاس فیلوز بے حد بپھرے ہوئے تھے۔جم کل صبح سے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر مظاہرے کرنے کا شیڈول طے کر رہا تھا، ربیکا ایک میز پر چڑھی تقریر کر رہی تھی

کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے مجھے بے دخل کرنے کے بعد یونیورسٹی صرف اس لیے بند کر دی ہے تاکہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑا رہے۔ آس پاس کے فٹ پاتھ ریستورانوں کی میزوں پر بیٹھے بوڑھے بھی اب ربیکا کی تقریر دلچسپی سے سن رہے تھے اور عام اسٹوڈنٹس کے ساتھ گرمجوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ تمام طالب علموں نے غیر معینہ مدت کے لیے یونیورسٹی سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارہ اُن کو یہ سمجھانے میں لگی ہوئی تھی کہ انہیں جو بھی قدم اُٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور قانون کے دائرے میں رہ کر اٹھانا ہوگا تاکہ یونیورسٹی انتظامیہ کسی بات کا فائدہ نہ اٹھا سکے، لیکن اس وقت ان سب کے جذبات اس قدر بپھرے ہوئے تھے کہ وہ سارہ کی بات بمشکل ہی سمجھ پا رہے تھے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ مَیں نے نیلی بتی چھت پر سجائے تین لمبی سفید کاروں کو پندرہ ویں گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یقیناً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں جن کی آواز والے سائرن بند کیے گئے تھے۔ گاڑیاں ریستوران سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ اگلی گاڑی میں سے پارکر اپنی پتلون کے گیلس کھینچتا ہوا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی دُور سے ہی اُس نے گرمجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں نے کڑی نگاہوں سے ان سب سادہ وردی والے پولیس آفیسرز کو گھورا، اور لندن پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ مَیں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو روکا۔ پارکر چیونگم چباتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے اور سارہ سے ہاتھ ملایا ہم تینوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ اسٹوڈنٹس پھر سے اپنے پُرانے مشغلے میں جُٹ گئے۔ پارکر نے غور سے تمام طلبا اور ان کے جوش اور جذبے کو دیکھا۔

''ایک ہی دن میں یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں مرتبہ تم نے اپنے بے حد مضبوط ہونے کا مجھے احساس دلایا ہے۔ جس طرح سے تمھارے صرف ہاتھ کھڑے کرنے پر یہ سارا ہجوم چُپ ہو گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر یہ تمھارے کہنے پر کسی دریا میں بھی بخوشی چھلانگ لگا دیں گے۔''

اتنے میں بیرا ہم سب کے لیے کافی کے کپ میز پر رکھ گیا۔ ساتھ ہی کچھ نمکین بسکٹ اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ پارکر نے ایک پیسٹری اُٹھا کر منہ میں رکھی۔ سارہ حیرت سے اس کی اور میری بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے سارہ کا تعارف کروایا۔

''یہ مسٹر پارکر ہیں۔لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج۔۔۔۔اور یہ مس سارہ آئزک ہیں۔میری ہم جماعت۔''

''میں ان سے واقف ہوں۔ بلکہ آج کی تاریخ میں لندن کی پولیس اور انتظامیہ میں شاید ہی کوئی بدقسمت ایسا ہو جو مس آئزک سے واقف نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں مسٹر پارکر۔۔۔۔میں اور سارہ اسی لیے یہاں آئے ہیں ان سب کو کسی بھی غلط قدم اُٹھانے سے روک سکیں۔لیکن آپ یہاں کیسے؟''

پارکر مسکرا دیا۔

''اب تو جہاں تم وہاں ہم۔۔۔۔مجھے خصوصی طور پر تم پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمھارے مداحوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ اوپر والوں کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔''

سارہ کے ہاتھ میں کافی کا کپ بہت دیر سے یونہی تھما ہوا تھا۔کافی کی اٹھتی بھاپ کے عقب سے اس کی وہ دو گہری آنکھیں جانے کس سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ پارکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں مس آئزک۔۔۔شاید اپنے دوست کے لیے۔''

سارہ نے چونک کر پارکر کو دیکھا۔

''حماد بے قصور ہے۔۔۔۔اُسے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔''

پارکر نے دوسری چیسٹری منہ میں ڈالی۔

''انقلابی کا سب سے بڑا گناہ، انقلاب کی ترغیب ہی ہوتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایسے گناہ گاروں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔حاکم کے نزدیک لوگوں کی سوچ بدلنے سے بڑا گناہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔اور حماد بھی اسی جرم کا مجرم ہے۔''

''اگر حماد کا ٹرم پیپر کسی انقلاب کی ترغیب تھا تو مَیں بھی تو اس میں برابر کی شریک ہوں۔مَیں نے بھی وہی گناہ کیا ہے۔پھر مجھے کیوں سزا نہیں دی جا رہی۔۔۔؟''

''سزا تو آپ کو بھی دی جا رہی ہے مس پارکر۔۔۔۔آپ کے دوست کو آپ سے دُور کر کے۔۔۔۔آپ کے چہرے پر یہ بے چینی، یہ اُداسی بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی نا۔''

جانے پارکر نے یہ بات دانستہ کی تھی یا نادانستہ طور پر اس کے منہ سے یہ سچ نکل گیا تھا۔

سارہ پھر وہاں بیٹھ نہیں پائی کیونکہ شاید وہ اپنی اندرونی حالت پارکر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس لیے وہ معذرت کر کے وہاں سے اُٹھ گئی۔اس کے جانے کے بعد پارکر نے میری جانب دیکھا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر حماد۔۔۔۔تمھیں سارہ جیسی دوست کا ساتھ ملا ہے ۔۔۔۔ملاوٹ اور بے ایمانی کی اس دُنیا میں ایسے سچے رشتے اور سچے جذبے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔مَیں تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ پیٹر نے باقاعدہ تحریری طور پر تمھارے خلاف درخواست جمع کروادی ہے۔لیکن مَیں نے چیف کو یقین دلایا ہے کہ صبح تم سے ملاقات کے بعد میرے تم سے متعلق تمام خدشات دُور ہو گئے ہیں لہٰذا تمھیں باقاعدہ بلوا کر تم سے جواب لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔لیکن ہماری اطلاع کے مطابق لندن کے مضافات میں اور قرب و جوار کی یہودی بستیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔یہودی تمھاری یہاں موجودگی کو اپنی نئی نسل کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ایک خاص نمائندے آئزک کی بیٹی بھی تمھارے ساتھ وفاداری کا بھرم رکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑی ہے۔یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج اور بڑی تضحیک کی بات ہے۔فی الحال لندن انتظامیہ نے معاملات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ یہودی طبقہ تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کر کے اس معاملے کو بگاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔سارہ کے تمھارے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید وہ براہِ راست تو تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔۔۔۔لیکن مجھے آس پاس تمھاری نسل کے مزدور اور عام محنت کش طبقے کے نقصان کا بے حد خطرہ ہے۔وہ ان غریب لوگوں پر اپنی بھڑاس اس رات کی طرح آسانی سے نکال سکتے ہیں۔''

مجھے پارکر کی بات نے بے حد پریشانی میں ڈال دیا تھا۔میری وجہ سے کوئی دوسرا غریب مسلمان سزا کیوں بھگتے۔پارکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔انہوں نے سارہ کی تقریر والی شام بھی اخبارات نکلنے کے بعد رات کو اکا دکا علاقوں میں وہاں کے رہائشی مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور چند جگہوں پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔یہ آگ دھیرے دھیرے مزید بھڑک بھی سکتی تھی۔لندن انتظامیہ اور پولیس کی تشویش بے جا نہ تھی۔مَیں نے پارکر سے ہی سوال کیا۔

''آپ کے خیال میں ان کے اس غصے کا راستہ روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
میں اُسی طرف آ رہا تھا۔ قانونی طور پر تمھاری پوزیشن بہت مضبوط ہے کیونکہ تم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کا بہانہ لے کر تم پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔ بلکہ لندن پولیس کے لیے تم باہر رہ کر اتنے خطرناک نہیں ہو جتنا اندر جا کر ہو جاؤ گے۔ کوئی بھی اچھا وکیل گرفتاری سے قبل بھی تمھاری ضمانت منظور کروا سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان خطوط پر سوچ ہی نہیں رہے۔ لیکن مَیں اس وقت لندن انتظامیہ کی طرف سے تمھارے پاس ایک رضا کارانہ اپیل لے کر آیا ہوں۔

''رضا کارانہ اپیل۔۔۔۔؟'' مَیں نے حیرت سے دھرایا۔

''ہاں۔۔۔۔ مَیں انتظامیہ کی طرف سے تم سے یہ اپیل کرنے آیا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ چنگاری فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بھڑک اُٹھے۔۔۔۔ تم کچھ عرصے کے لیے لندن چھوڑ دو۔ خود اپنی مرضی سے۔''

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔

''لندن چھوڑ دوں۔۔۔۔؟ لیکن کیوں۔۔۔۔ اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟''

''بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ بھڑکے ہوئے یہودیوں کو فساد کا کوئی بہانہ نہیں مل پائے گا۔ وہ تم کو ہی اصل خطرہ سمجھتے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد ان کے اندر کا خوف اور دشمنی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔۔۔۔ ویسے بھی یونیورسٹی نے تمھیں فی الحال واپس داخلے کی کوئی بھی سفارش رد کر دی ہے۔ تم اگر چاہو تو لندن سے باہر رہ کر بھی یونیورسٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو تمھارے ساتھی طلبا دھیرے دھیرے بھڑک کر لندن کی سڑکوں پر آ جائیں گے اور اس کا نقصان دوسرے لوگوں کو ہوگا۔ مَیں جانتا ہوں کہ تمھارا مقصد طلبا کی طاقت کو منفی انداز میں استعمال کرنا نہیں ہے کیونکہ اگر تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کی یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا ہوتا۔ لیکن میرا یقین کرو۔۔۔۔ تمھاری لندن میں موجودگی بہت سے بے گناہوں اور معصوم انسانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔۔۔۔ مجھے تمھارے جواب کا انتظار رہے گا۔''

پارکر مجھے گہری سوچ میں چھوڑ کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ سارہ بہت دیر سے دُور بیٹھی ہم دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ پارکر کے جاتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی

کہ کیا معاملہ تھا۔ میں نے پارکر کی تمام بات ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک اُسے سنا دی۔ سارہ نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں۔۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جو بھی ہوگا ہم سب مل کر اس کا سامنا کریں گے۔ مَیں جانتا تھا اس وقت سارہ کو کچھ بھی سمجھانا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے مَیں چپ رہا، وہاں ربیکا بار بار ایک میز پر چڑھی میرا نام پکار رہی تھی کہ مَیں آ کر اپنے ''زریں خیالات'' کا اظہار کروں، مَیں نے ان سب کے درمیان جا کر انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ فی الحال ہمارے پاس قانون اور عدالت کا راستہ موجود ہے اور کھلا ہے لہٰذا اس وقت احتجاج کو موخر کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ جب میں نے ان سب سے کہا کہ میرے لیے یونیورسٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ اہم ان سب کی دوستی ہے۔ محبت ہے جو مجھے آج حاصل ہے تو سب ہی افسردہ ہو گئے۔ ربیکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مَیں نے جم کو خصوصی طور پر علیحدگی میں لے جا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ خود کو بھی اور اپنے ساتھ تمام دوسروں کو بھی قابو میں رکھے گا۔ جم کو سمجھانا واقعی ایک مشکل کام تھا لیکن جب مَیں نے اُسے پارکر کی بتائی ہوئی ساری باتیں کہیں اور اسے سمجھایا کہ ہمارے اس احتجاج اور میڈیا پبلسٹی کو ہماری مخالف پارٹی معصوم لوگوں پر تشدد کرنے کے خلاف استعمال کرے گی تو اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ عجیب جذباتی نوجوان تھا یہ جم بھی۔ اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے ہمیشہ عباد کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی تھا، سر پھرا سا، دوستوں کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والا۔ جاتے ہوئے جم نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا، سب ہی فرداً فرداً مجھ سے رُخصت ہوئے۔ ربیکا نے جاتے ہوئے جانے سارہ کے کان میں مجھے دیکھ کر کیا کہا کہ سارہ ہنس پڑی۔ ربیکا بھی ہم سے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے اچانک میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میرے ماتھے کو چوم لیا، اور نم پلکوں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کسی انسان کی معراج اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اُسے ٹوٹ کر چاہے۔ اپنے دن اور رات اس کے نام کر دے۔۔۔۔ آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدائی کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔۔۔۔ جب ایک انسان کا پیار آپ کو اس احساس سے دوچار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر ابد تک آنے والوں انسانوں کی بندگی کا احساس کیا ہوتا ہوگا۔ آج مَیں نے جانا تھا کہ

خدا کو بندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

واپسی پر میں نے آتے ہوئے گاڑی میں سارہ سے پوچھا کہ ریکا نے اُسے جاتے ہوئے کان میں کیا کہا تھا۔ سارہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کہہ رہی تھی یہاں سے سیدھے گھر ہی میڈی کو ڈراپ کرنا۔۔۔۔ کہیں گھومنے نہ نکل جانا۔''

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

''پھر تم نے کیا کہا۔''

''میں نے اُس سے کہا کہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دوں۔'' ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ سارہ نے ہائیڈ پارک سے دائیں کو مڑنے والی چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ دُور پکاڈلی سرکس کے بڑے بڑے جھولوں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔

سارہ مسکرائی۔

''رات کے دس بجے ایک اچھی میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم سفر کو گھر چھوڑنے سے پہلے رات کے کھانے کا ضرور پوچھے۔ یہاں میری پسند کا ایک ریستوران ہے کیا تم میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنا پسند کرو گے؟''

''ہاں۔۔۔۔ ضرور لیکن اس شرط پر کہ بل میں ادا کروں گا۔ دراصل آتے ہوئے میں کامران کا بٹوہ اُٹھا کر لے آیا تھا۔ اسی طرح واپس کر دوں گا تو اس کے دل کو بہت ٹھیس لگے گی۔''

سارہ ہنس دی اور گاڑی ایک لمبا سا موڑ کاٹ کر دھیمی روشنیوں والے اس ریسٹورنٹ کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ کی پسند کبھی عام ہو نہیں سکتی تھی۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ نہایت نفاست سے دُور دُور لگی ہوئی مدھم روشنیوں سے جگمگاتی میزوں والے اس طویل و عریض ہال میں جس کے ایک جانب لکڑی کا بہت بڑا سا فرش (ڈانس فلور) اور بار بھی موجود تھا۔ عام لوگ نہیں آتے ہوں گے۔ سارہ کو وہاں کا عملہ شاید اچھی طرح جانتا تھا۔ تبھی انہوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور سبھی مس

آئزک کہتے کہتے تھک نہیں رہے تھے۔ سارہ نے ہال کی ایک جانب لگی خوبصورت سی میز بیٹھنے کے لیے پسند کی۔ ہال میں ہلکے سُروں میں میرے لڑکپن کا پسندیدہ گانا ''پچھلے کرسمس میں نے تمھیں اپنا دل دے بیٹھا تھا'' کی دھن بج رہی تھی۔ چند جوڑے فلور پر ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے محبوب کے شانوں پر سر رکھے جھوم رہے تھے۔ مغربی موسیقی اگر ہلکے سُروں میں ہو تو کبھی کبھی مشرقی موسیقی سے بھی زیادہ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ جانے کیوں مجھے چیخنے چنگھاڑتے گانے اور موسیقی کبھی بھی نہیں بھائی تھی۔ ہماری میز پر رکھی دو شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور اُن کی لو میں سارہ کا کندن رنگ مزید دمکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بال بکھر بکھر سے جاتے جنھیں وہ پھر سے سنوارنے کی تگ و دو سے تھک سی گئی تھی۔ بے خیالی میں اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اپنی اس معصوم سی حرکت پر خود ہی مسکرا دی۔ اس کی ستارہ آنکھیں بار بار نم ہونے کی کوشش کرتیں لیکن وہ بڑی صفائی سے اُس نمی کا راستہ روک لیتی تھی۔ بہت دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مَیں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''ایک اچھی میزبان کا فرض صرف کھانا کھلانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اچھی اچھی باتیں کر کے اپنے ہم راہی کا دل بہلانا بھی ہوتا ہے مس سارہ آئزک۔''

''تم ہی کچھ بولو نا۔۔۔۔ میں تم جیسی باتیں کہاں کر سکتی ہوں۔۔۔۔ مجھے تو صرف تمھیں سننا اچھا لگتا ہے۔ تمھارے ہونٹوں سے سُنی ہوئی ہر بات نئی لگتی ہے، خوبصورت لگتی ہے۔''

''یہ میری باتوں کا نہیں۔۔۔۔ تمھاری خوبصورت سماعت کا احساس ہے جو تمھیں میری عام سی باتیں بھی شاعری میں ڈھلی لگتی ہیں۔''

''تم کبھی کسی بات کا بھی کریڈٹ کیوں نہیں لینا چاہتے۔۔۔۔ اقرار کر لینا دل کو بہت سی نئی الجھنوں سے بچا دیتا ہے۔ کیا سمجھے مسٹر میڈی۔۔۔۔؟۔ مان لینا ہی سکون کا باعث ہوتا ہے۔''

آج سارہ کے لہجے میں کوئی نئی بات تھی۔۔۔۔ کچھ نیا پن تھا۔۔۔۔

''نہیں۔۔۔۔ مَیں اقرار سے بچ نہیں رہا۔۔۔۔ نہ ہی کسی بات کا کریڈٹ لینے سے

دامن بچا رہا ہوں ۔لیکن سچ یہی ہے کہ میرے اندر آج اگر تمھیں کوئی بھی خوبی نظر آئی ہے۔۔۔۔میری ذات میری شخصیت۔۔۔۔میری باتوں میں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ میں نہیں۔۔۔۔ بلکہ ایمان ہے۔۔۔۔اس کے بخشے ہوئے پیار کا احساس ہے، پیار انسان کو پیارا بنا دیتا ہے سارہ۔۔۔۔اُس کے اندر سے تمام بُرائیاں نکال دیتا ہے۔۔۔ محبت انسان کے لہجے کا زہر چوس لیتی ہے۔۔۔اس کی باتوں میں مصری گھول دیتی ہے ۔۔۔۔آنکھوں سے شہد ٹپکا دیتی ہے۔۔۔۔محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔۔۔۔ پری زاد بنا دیتی ہے۔"

سارہ غور سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔۔میری باتیں جیسے اپنی آنکھوں سے سُن رہی ہو۔۔۔جذب کر رہی ہو۔۔۔۔وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"شاید مَیں بھی انسان نہیں رہی حماد۔۔۔۔شاید میں بھی پری زاد بنتی جا رہی ہوں۔"

مَیں نے چونک کر سارہ کو دیکھا، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں کی شبنم گر کر سارے ماحول پر اُداس کی بارش کرنے والی تھی۔

"ہاں حماد۔۔۔۔مَیں نے خود پر بے حد قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔۔بہت روکا خود کو ۔۔۔۔بہت لڑی ہوں خود سے۔۔۔۔لیکن پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔۔۔۔مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے حماد۔۔۔مَیں نے نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کا یہ میٹھا زہر چکھ لیا ہے حماد۔۔۔ پورا پیالہ حلق سے نیچے انڈیل لیا ہے حماد۔۔۔۔مَیں کیا کروں۔۔۔۔بہت بے بس ہو گئی ہوں۔۔۔بہت لاچار ہو گئی ہوں میں۔۔۔۔"

اس لمحے میرے سارے لفظ ہی جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔مَیں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کچھ بول ہی نہیں پایا۔سارہ کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور میز پر رکھی گلاب کی اِک پنکھڑی پر پڑ گئے۔وہ بڑی ہمت کر کے پھر بولی۔اس کی نظریں اَب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"میں جانتی ہوں۔۔۔۔تمھارے دل کے اندر صرف اِک خوش نصیب کا ہی بسیرا ہے۔وہ جو تمھاری روح کی گہرائیوں تک تمھارے اندر بسی ہوئی ہے۔تم نے کبھی کسی سے یہ راز نہیں چھپایا کہ ایمان کی محبت تمھارے خون کے ذرّوں میں شامل ہے۔کتنی سچی ہے تمھاری محبت۔۔۔۔لیکن اس کے باوجود میرا دل کیوں نہیں مانتا حماد۔۔۔کیوں۔۔۔۔کیوں

مَیں اس دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو گئی ہوں کہ خود میرا مجھ پر، میرے دن رات پر، میری روح پر اختیار نہیں رہا۔۔۔۔ میرے لفظ میرے نہیں رہے۔ میری ساری شخصیت میری نہیں رہی۔۔۔ اُس محبت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے حماد۔۔۔۔ اس سے کہو مجھے میرا آپ واپس لوٹا دے۔۔۔۔ میری سانسیں مجھے واپس سونپ دے۔''

میں سارہ کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ ہی پھیلتے جا رہے تھے۔ یہ سارہ نہیں۔۔۔۔ سارہ کے اندر کی لڑکی بول رہی تھی۔ سارہ تو بہت خاموش بہت کم گو لڑکی تھی۔ یہ تو پھر اُسی محبت کا ایک اور تازیانہ تھا جو اب اس معصوم لڑکی کی روح کو کچوکے لگا رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ محبت کے اس صحرا کی پیاس کب بجھے گی اور کتنے بے بسوں کی، لاچاروں کی روح کو اپنی ریت میں جذب کرے گا یہ صحرا؟ ازل سے انسانوں کے دلوں کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہی ہے محبت۔ جانے کتنے جوان دل اس کی پیاس کی بھینٹ چڑھ چکے ہوں گے اب تک۔۔۔؟ لیکن اس کی حرص پھر بھی نہیں مٹتی۔ اب بھی ہر لمحہ ہر گھڑی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں کسی کی محبت میں مبتلا ہو رہا ہوتا ہے۔ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہوتا ہے اور محبت دُور کھڑی ان روح نکلتے دلوں کی یہ تڑپ اور یہ بے بسی دیکھتی رہی ہے۔

مَیں سارہ سے کچھ نہ کہہ پایا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ بس مَیں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ وہ میز کی دوسری جانب یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ جلتی شمعوں کی روشنی میں اس کی بھیگی آنکھیں جگمگاتی رہیں۔ ہال میں بیٹھے سازندوں نے اسٹیوونڈر کا نغمہ چھیڑا ''ہیلو۔۔۔۔ کیا تم میری ہی راہ دیکھ رہے ہو۔

مَیں تمھاری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں
مَیں تمھاری مسکراہٹ میں کھوج سکتا ہوں
کہ تم تنہا ہو۔۔۔۔
اور کہیں کوئی تمھاری محبت میں مبتلا ہو رہا ہے۔''

اس نغمے کی دھن پر رقص کرتے جوڑوں کے قدم دھیرے دھیرے تھرک رہے تھے۔ پورے ہال کی مدھم روشنی میں دل کو چھو جانے والی محبت کا راج تھا۔ خوشبو تھی، رنگ تھے اور نور تھا۔ سارہ چُپ چاپ بیٹھی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی ایک پل کو جی رہی تھی۔

سمیٹ رہی تھی۔ اپنی عمر کی نقدی میں جمع کر رہی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے عمر کی نقدی میں ایسا ایک پل بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام عمر خرچ کرتے رہو، عمر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس پل کی پونجی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے دھیرے سے سارہ سے پوچھا۔

''مجھے بتاؤ۔۔۔ تمھارے اس درد کو ختم کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری زندگی، میری ساری عمر پر تمھارا حق ہے۔ تم جو چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔''

سارہ دھیمے سے مسکرائی۔

''کاش محبت کا ہونا نہ ہونا بھی ہمارے بس میں ہوتا۔ کاش میرے پاس وقت کو پلٹنے کی طاقت ہوتی تو میں تمھیں تمھاری پہلی محبت سے پہلے ملنے کی کوشش کرتی۔ کاش جو عظمت تمھارے دل میں مجھ سے پہلے ایمان کی ہے۔ اس کی سب سے پہلی حق دار میں ہوتی۔ کاش میری محبت میں یہ ''کاش'' نام کا کوئی لفظ ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس محبت کا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کی ابتدا ہی کاش سے ہوتی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے اپنی پوری زندگی پر مجھے اختیار دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی نعمت، اس سے زیادہ بڑی مہربانی اور انعام کیا ہوگا۔ میری اس ایک زندگی کے لیے تو تمھارا یہ اقرار ہی کافی ہے۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے، میں جانتی ہوں ایمان کی یاد تمھارے دل سے تا ابد نہیں مٹ پائے گی۔ لیکن جب کبھی تم کسی اور کو اپنی اس ابدی محبت کا حصے دار بنانا چاہو گے، تو میرا حق سب سے پہلے ہوگا۔ وعدہ کرو مجھ سے حماد۔۔۔ مجھے میرے ہونے کا بھرم دے دو، میرے وجود کی تصدیق کر دو۔''

میں نے سارہ کی نازک انگلیاں اپنی ہتھیلی میں تھام لیں۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

سارہ نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر بہت دیر تک جوڑے رکھا، جیسے کسی مسیحائی کی تاثیر کو اپنی بند آنکھوں سے اپنے پورے جسم میں، اپنی روح میں دھیرے دھیرے ٹپکا رہی ہو، سیراب کر رہی ہو۔

سازندوں نے جارج مائیکل کا نغمہ چھیڑا۔

''لا پرواہ سرگوشیاں
میری سب سے اچھی دوست ہیں۔۔۔''

سارہ نے جیسے اپنی آخری خواہش ظاہر کی۔

''میرے ساتھ ایک بار رقص کرو گے۔۔۔۔؟''

سارہ کے معصوم انداز پر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں اُٹھ کر لکڑی کے گول فرش کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑے نغمے کی دھن پر اپنے قدم فرش پر رکھتے رہے۔ سازندوں کے سربراہ نے جو ایک لمبا نیگرو تھا، اپنا ہیٹ اُتار کر مجھے سلام پیش کیا۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ اَب جو نغمہ وہ اور اس کا گروپ مل کر بجائیں گے وہ صرف میرے اور سارہ کے لیے ہوگا۔ پھر لمبے نیگرو نے اپنے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا اور نغمے کی دھن بدل گئی۔

(بیک اسٹریٹ بوائز) ایک مشہور بینڈ کا نغمہ گونجا۔

''یہ صرف لفظ ہی تو ہیں

جو میرے پاس ہیں، صرف لفظ۔۔۔۔

جن سے میں تمھارا دل

چرائے جا رہا ہوں۔''

ہم دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ڈانس فلور پر گھومتی ہوئی گول روشنی صرف مجھ پر اور سارہ پر آ کر رُک گئی تھی اور آس پاس کے سبھی رقص کرتے جوڑے لکڑی کے گول فرش کے دائرے میں کناروں پر کھڑے جانے کب سے صرف مجھے اور سارہ کو ہی دیکھ رہے تھے، سارہ کے رقص کا انداز بھی اسی کی طرح باوقار تھا۔ اس کے قدم عجلت میں نہیں اُٹھتے تھے جیسے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی جگہ کا انتخاب کر رہی ہو۔ نغمے کی دھن ختم ہونے کے بعد جب آس پاس سے تالیوں کا شور اُٹھا تو ہم نے دیکھا کہ پورا ہال ہماری طرف ہی متوجہ ہے اور صرف ہم ہی روشنی کے گول دائرے میں کھڑے ہیں۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہنس دی۔ اس کی ہنسی سے لگا جیسے تیز بارش کے دوران کالی گھٹا یک دم چھٹ گئی ہو اور آسمان پر بادلوں کے درمیان سے اچانک سورج نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ سارہ کے چہرے پر چھایا غبار بھی شفق کی میٹھی سُرخی میں بدل چکا تھا۔ یہ محبت بھی

پل پل میں کیسے کرشمے دکھاتی ہے، کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

گھر واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ آج سارہ کو میری طرف سے اُسی بھرم کی ضرورت تھی جو اُس رات چرچ سے واپسی پر مجھے سارہ کی جانب سے درکار تھا۔

محبت اپنے اظہار کے پل جس قدر بے باک ہوتی ہے۔ وہ پل گزر جانے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ سارہ کا بھی اس وقت وہی حال تھا۔ ہماری گاڑی لندن کی سنسان سڑکوں سے ہوتی ہوئی کامران کے فلیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سارہ کے گلے کا سکارف بار بار لہرا رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ اُسے مخل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کسی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کامران کے اپارٹمنٹ کے نیچے آ کر رک گئی۔ سارہ نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔

''آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی حماد۔۔۔۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔'' میں گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے ہال کے دروازے پر کھڑے دربان نے ہمیں گلاب کی ایک ایک کلی پیش کی تھی جو ہوٹل کے خوبصورت مونوگرام والے کپڑے کے چھوٹے سے رومال میں لپٹی ہوئی تھیں۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے میری کلی وہیں اندر ڈیش بورڈ پر پڑی رہ گئی تھی۔ سارہ نے گاڑی میں لگا قلم نکال کر اس رومال پر دن، تاریخ اور وقت لکھ کر اُسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

''میں اُسے نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''گھر پہنچ کر مجھے ایک فون ضرور کر دینا، رات کافی بیت چکی ہے اور شہر میں تمھارے مداحوں کی تعداد بھی کافی ہے۔''

سارہ نے سر ہلایا۔ میں گاڑی سے دو قدم پیچھے ہٹا تاکہ وہ گاڑی آگے بڑھا سکے۔ سارہ نے اپنے گلے سے لپٹا سکارف کھولا اور گاڑی سے نیچے اُتر کر اُسے میرے گلے میں باندھ دیا۔

''یہ تمھارے ساتھ رہے گا تو ہمیشہ میری یاد دلائے گا۔''

سارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ میں اُسے گلی کے موڑ تک

مڑتے وقت تک دیکھتا رہا۔ ٹھنڈی یخ بختہ ہواؤں نے میرے وجود کو جھنجھنا دیا اور میرے گلے میں بندھا سارہ کا سکارف لہراتا رہا۔ یہ صرف ایک سکارف ہی نہیں تھا۔ یہ سارہ کے وجود کی خوشبو تھی۔ جو میرے گلے سے سکارف کی صورت میں لپٹی ہوئی تھی اور تمام ماحول پر دھیرے دھیرے چھا رہی تھی۔ ذور کسی گھنٹہ گھر نے رات کے سناٹے میں دو بجنے کا اعلان کیا۔ مَیں شکستہ قدموں سے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

OO

الوداع

اگلے دو دن بہت ہی ہنگامہ خیز گزرے۔ جم کے بے حد کنٹرول کرنے کے باوجود چند اسٹوڈنٹس نے اچانک یونیورسٹی بند کرنے پر خوب ہنگامہ آرائی کی۔ ایک جلوس تو باقاعدہ سرآئزک اور جیوری کے خلاف نکالا گیا۔ اخبارات نے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہودیوں کے زیر اثر اخبارات نے تو سیاہ پروپیگنڈہ کی حد ہی کر دی۔ ان اخبارات نے میرے ٹرم پیپر کو یہودیوں کی مقدس تاریخ پر ایک حملہ قرار دیا۔ اور ان اخبارات کی ہرزہ سرائیوں کی وجہ سے تشدد کے واقعات میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔

پارکر اس دوران مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور لگاتار اپنی رضا کارانہ پیش کش کے بارے میں میرا جواب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دن بھی میں اور کامران شام کو اکٹھے ہی تھے جب اس کا اپارٹمنٹ کے نمبر پر فون آیا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر پارکر۔۔۔۔ میں لندن چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے چلے جانے سے تشدد کی یہ لہر واقعی تھم جائے گی۔''

''مجھے پورا یقین ہے، ان کی اصل دشمنی تم سے ہے۔ یہ مزدور طبقہ بے چارہ ان کا کیا بگاڑ پائے گا۔ اور پھر میڈیا میں ان کا تاثر بھی ان واقعات کی وجہ سے بُری طرح خراب ہو رہا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ان کے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جائے گی لڑنے کی۔''

''ٹھیک ہے سر۔۔۔ میں تین دن بعد کی پہلی فلائٹ سے لندن چھوڑ دوں گا۔ آپ چاہیں تو اخبارات اور میڈیا کے ذریعے اس خبر کو ابھی سے شہر میں پھیلا دیں۔ میں اب ان کے ہاتھوں مزید کسی بے گناہ کا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

دوسری جانب سے کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر پارکر کے گہرے سے سانس لینے کی آواز اُبھری۔

''مَیں جانتا تھا تم آخر کار یہی فیصلہ کرو گے۔ میں نے صرف اپنے اسی یقین پر ابھی تک لندن پولیس کو تمھارے خلاف کسی غلط الزام پر کوئی جھوٹی کارروائی کرنے سے روکے رکھا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے لیے بہت سے ایسے لوگوں کی بھی سننا پڑی جن سے عام حالات میں میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکے ہو۔ یہ لوگ تمھیں تو یہاں نکلنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جو نظریہ تم بیج کی صورت میں ان کی نئی نسل کے دماغ میں بو گئے ہو۔ وہ اس نظریے کو کبھی اپنی آنے والی نسلوں کے دماغ سے نہیں نکال پائیں گے ۔۔۔۔ ہمیشہ خوش رہو۔''

پار کر نے فون رکھ دیا۔ کامران نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

''تو کیا واقعی تم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی سارے راستے بند نہیں ہوئے میڈی۔ مَیں نے شہر کے بہترین وکیلوں سے بات کی ہے۔ ہم آخری وقت تک ان سے لڑیں گے۔''

''مَیں نے قانونی لڑائی سے ہاتھ کب روکے ہیں یار۔ وہ جنگ تو تم یہاں میری غیر موجودگی میں بھی ضرور لڑو گے۔ لیکن فی الحال میرا منظر سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ میری وجہ سے بہت سے معصوم لوگ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا میرا ہم مذہب ہونا ہی سب سے بڑا جرم بن گیا ہے۔''

کامران کا غصہ اپنی جگہ بجا تھا اور پھر شام تک ٹی۔ وی اور اخبارات کے ذریعے میرے سبھی دوستوں کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے سارہ اور ربیکا پہنچیں۔ ربیکا نے تو آتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیا۔

''یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔۔ تم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ ہم تمھیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس روز ائیر پورٹ جانے والے تمام راستوں کا گھیراؤ کریں گے۔ سڑکوں پر لیٹ جائیں گے۔''

''تم کوئی اچھی سی صاف سڑک دیکھ کر لیٹنا ۔۔۔ ورنہ صبح جو تم تین چار گھنٹے اپنے میک اپ پر لگاتی ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔''

ربیکا غصے میں بھی ہنس پڑی۔ لیکن پھر دوبارہ چلا کر بولی۔

''یہ مذاق کی بات نہیں ہے مسٹر میڈی۔۔۔۔تم پر ہمارا بھی کچھ حق ہے اور مَیں اسی حق کا سہارا لے کر کہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

سارہ چُپ چاپ کھڑی تھی کیونکہ اُسے میرے فیصلے کی وجہ معلوم تھی۔اس دن پارکر سے ہوئی تمام گفتگو اور پھر شہر کے واقعات پر شروع سے ہی اُس کی نظر تھی۔لیکن اس کے انداز سے بھی صاف ظاہر تھا کہ اُسے میرے فیصلے سے سب جانتے ہوئے بھی بے حد دھچکا لگا ہے۔

ہم سب اس وقت کامران کے ریستوران کے باہر والے فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر ہی بکھرے ہوئے تھے۔کچھ ہی دیر میں جم، ڈیوڈ اور ٹینا وغیرہ بھی آ گئے۔مَیں نے ان سب کے جذبات کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔انہیں اپنے لندن چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہا کہ مَیں ہمیشہ کے لیے واپس نہیں جا رہا۔ان سب سے رشتہ میرے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب چاہے مَیں دنیا کے کسی کونے میں بھی رہوں۔میرا دل ان سب کے ساتھ ہی دھڑکے گا۔

ربیکا کے آنسو بار بار چھلک جاتے تھے۔مَیں نے ماحول کو کچھ بدلنے کے لیے ربیکا پر چوٹ کی کہ کچھ لوگ دوستوں کو صرف نمکین آنسوؤں کے گلاس پر ہی ٹرخا کر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہی منعقد کر دیں۔ربیکا بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی اور اُس نے ہم سب کو، اپنی پوری کلاس کو اگلے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ان کا دل رکھنے کے لیے مَیں نے وہیں سے ان کے سامنے ہی فون پر اپنے وکلا کو چند ہدایات دیں کہ میرا کیس کس طرح سے عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔

سارہ اس تمام دوران بالکل گم صم سی اور خاموش بیٹھی رہی۔جانے اس کے ذہن میں کیا کشمکش سی چل رہی تھی۔

رات گئے وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے، سارہ بھی اپنی سفید بیٹل کی جانب بڑھ گئی۔ مَیں آج کامران کے ساتھ آیا تھا۔اور اسی کے ساتھ واپسی کا ارادہ بھی تھا۔سارہ کے قدموں کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔کامران جو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا اُس نے خود ہی سارہ کی مشکل آسان کر دی اور سارہ سے چلّا کر کہنے لگا۔

''مس آئزک۔۔۔۔اگر آپ میرے حال پر رحم کریں اور میرے اس جذباتی

دوست کو گھر چھوڑتی جائیں تو میں اپنا کچھ کام دھندہ کرلوں۔اس کے باپ کے پاس تو اسے ورثے میں دینے کے لیے کافی دولت ہے جب کہ میرا باپ میرے لیے صرف دُعائیں چھوڑ گیا ہے۔'' سارہ کامران کی بات سُن کر مسکرادی۔

''میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

کامران نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''جاؤ بیٹے حماد۔۔۔۔تم بھی کیا یاد کرو گے۔۔۔کیسے جان دجگر قسم کے دوست سے پالا پڑا تھا۔حالانکہ میں جانتا ہوں وہ گاڑی کے قریب کھڑا میرا انتظار کر رہی تھی۔لیکن میں نے تمھیں یہ چانس بخش دیا ہے۔جاؤ عیش کرو۔''

مَیں نے بھی اُٹھتے ہوئے کامران کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

''بلی کے خواب میں چھیچھڑے۔۔۔''

کامران کا منہ بن گیا مَیں آ کر سارہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔سارہ میری اور کامران کی نوک جھونک دُور سے دیکھ رہی تھی۔اُس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

''تمھارا دوست کیا کہہ رہا تھا میڈی۔''

مَیں نے سارہ کو کامران کی بات بتائی۔وہ سُن کر مسکرادی۔

''تمھارا دوست واقعی دوستی کے قابل ہے۔مَیں واقعی اکیلے آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن جانے کیوں تمھیں ساتھ چلنے کا بھی نہیں کہہ پا رہی تھی۔کامران نے میری مشکل حل کر دی۔۔۔تم نے اتنے بہت سے اچھے لوگ اپنے آس پاس کیسے جمع کر رکھے ہیں؟ ہمیں تو ڈھونڈنے سے بھی ایک نہیں ملتا۔''

مَیں سارہ کا اشارہ سمجھ کر مسکرادیا۔

''جس کے گرد یہ سب لوگ جمع ہیں۔وہ تو خود تمھارے ساتھ ہے۔پھر یہ گلہ کیسا؟''

سارہ بھی میرا جواب سُن کر مسکرادی۔لیکن پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر اُداسی کے وہی پُرانے بادل چھا گئے۔

''تو تم جا رہے ہو ہاں۔۔۔۔ہم سب کو تنہا چھوڑ کر۔''

''میں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہی تو ہوں۔ہر لمحہ تمھاری دسترس میں۔''

سارہ چُپ رہی۔ جیسے کوئی گہری سوچ اس کے اندر جنگ چھیڑے ہوئے ہو پھر اُس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مَیں بہت دنوں سے وہ وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کو تم سے خوفزدہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار میری سوچ خالی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی ہے۔ مَیں نے توریت اور انجیل میں بھی کافی سر کھپایا لیکن تمھارے پیغام تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ کیا بات ہے جو تمھیں ہم سب میں ممتاز کرتی ہے۔ خصوصی بناتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو تمھارے اندر فخر اور غرور کا اس قدر مضبوط احساس جگاتی ہے کہ میرے پاپا جیسے مضبوط اور بڑے قد والے انسان بھی تمھارے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ ایسے سازشی بونے جو ایک دراز قد شہزادے کو سینکڑوں کی تعداد میں مل کر گرانے کی اور اس کی مُشکیں کسنے کی فکر میں ہوں۔ لیکن ہر بار منہ کی کھا رہے ہوں۔ بولو۔۔۔ تم میں ایسا کیا ہے میڈی؟''

''سچ کہوں تو مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فخر کرنے کے لیے۔ ہاں اگر میرا مذہب ہی ان کی پریشانی کی وجہ ہے تو یہ مذہب تو میرے سب ہم مذہبوں کا غرور ہے۔ مَیں نے تو آج تک اس مذہب کا ایک حق بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ سچ پوچھو تو مَیں اپنے مذہب کے نام پر خود ایک دھبہ ہوں۔ میرا کوئی بھی تو عمل اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اور ایک بات اور جو تم خود جانتی ہو کہ مَیں تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس مذہب کو اپنا مخالف ۔۔۔۔ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہوں۔۔۔۔ میں یہاں آنے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس مذہب نے ہی مولوی علیم کی صورت میں میری ایمان کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ مذہب مجھے دوسروں میں اتنا ممتاز کر دے گا۔ میرا قد اتنا بڑھا دے گا۔ دشمنوں اور میرے مخالفوں کو مجھ سے اتنا خوف زدہ کر دے گا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس مذہب کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ ان سب لوگوں کی مخالفت نے اسے میرے لیے باعث افتخار بنا دیا۔

''سچ کہوں تو یہاں آنے سے پہلے مَیں ''ہالوکاسٹ'' کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ نہ ہی میرے دل میں کبھی کسی فلسطینی مسلمان کے لیے کوئی درد ہی جاگا تھا۔ اور شاید اگر میرے راستے میں یہاں اس قدر کانٹوں کے جال نہ بچھائے جاتے تو میں کبھی اس ٹرم پیپر کی تحقیق میں نہ پڑتا۔ مَیں بھی عام نوجوانوں کی طرح اسے ایک واقعہ سمجھتا رہتا جس کے سچ یا جھوٹ کو

جاننے کی زحمت بھی کبھی گوارا نہ کرتا، مجھے اس راہ پر ڈالنے والے بھی اصل میں سرآئزک ہی ہیں۔ اگر میرے اندر کوئی جذبہ قابل فخر، قابل غرور ہے تو اسے جگانے میں سب سے بڑا ہاتھ بھی انہی کا ہے۔ لیکن وہ مزید کس سچ سے خوف زدہ ہیں یہ تو میں بھی نہیں جان پایا ابھی تک۔"

"اسی سچ اسی پیغام کی تو میں بھی متلاشی ہوں۔ کیا تم اس کھوج میں میری مدد نہیں کرو گے حماد۔۔۔۔"

میں غور سے سارہ کی بات سن رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔۔؟ ایسا کون سا پیغام ہو سکتا ہے۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں اونچی اونچی عمارتوں کی چوٹیوں اور گنبدوں پر سنہری قلعی پھیر کر واپس پلٹنے کی فکر میں تھی۔ اچانک ایک اونچے گنبد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہم اس سنٹرل لندن کے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ایشیائی باشندوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ میں نے سارہ کو گاڑی سڑک کے کنارے پر لگانے کا کہا۔ ہم دونوں گاڑی سے اُتر آئے، سامنے ہی وہ عمارت موجود تھی جس کے گنبد پر چمکتی سنہری دھوپ نے میرے دماغ کی کھڑکی بھی روشن کر دی تھی۔ یہ سنٹرل لندن کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"شاید میں تمہیں اس پیغام کا کچھ حصہ ابھی اسی وقت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اس عمارت میں جانا ہوگا اور اس عمارت میں داخلے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ ان آداب کو دھرا سکو تو۔۔۔۔؟

سارہ چپ چاپ میرے پیچھے چل پڑی۔ مسجد کے صحن میں ہی بہت سے گرم ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے تھے۔ سارہ نے میری طرف دیکھ دیکھ کر پانی اپنے ہاتھوں پر چہرے پر اور کہنیوں پر بہایا۔ اور وضو کر کے مسجد کے صحن میں ہی ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں اندر سے قرآن اُٹھا لایا۔ شاید ہمارے مولوی صاحب نے جب تیرہ برس کی عمر میں مجھے ختم قرآن کی مبارک باد دی تھی۔ اس کے بعد آج میں نے اس کتاب کو تھاما تھا۔ ہاں البتہ جب مولوی علیم، سنّی کو درس دینے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے تو میں اپنے مطلب کے لیے ان کے آس پاس بیٹھا رہتا تھا اور یوں میرے کانوں میں ان کے مخصوص ہجے اور تلفظ گونجتا رہتا

تھا۔

مَیں نے سورۃ رحمٰن کھولی اور سارہ کو پڑھ پڑھ کر اس کا ترجمہ سنانے لگا۔

''تو تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔۔۔''

مَیں پڑھتا گیا اور سارہ غور سے سنتی گئی۔ پھر جب میری نظریں اٹھیں تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دلوں پر لگا زنگ آنسوؤں کی صورت میں زار و قطار بہہ رہا تھا۔ مَیں خود بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک لمحے میں ہی جانے کتنے چہرے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ مولوی علیم، ریلوے اسٹیشن پر ملنے والے صوفی رحمت اللہ، عبداللہ اور جانے کون کون۔ جو اس دنیا میں اپنی آمد کا حق ادا کر رہے تھے۔ اور مَیں۔۔۔۔ مَیں تو اپنے جینے کا ٹھیک سے شکر بھی ادا نہیں کر پایا تھا کبھی۔ ہماری اس دنیا میں آمد کا مقصد کیا تھا۔۔۔ اور ہم اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ روز اک نیا دھبہ اپنے پہلے ہی سے بے تحاشا داغ دار دامن پر سجا لیتے ہیں۔ پھر بھی کتنے بے خبر کتنے خوش رہتے ہیں۔ واپسی پر سارا راستہ اس کی آنکھیں بھیگی رہیں اور میں بھی خاموش رہا۔۔۔۔ رات کو جب سارہ نے مجھے کامران کے فلیٹ پر ڈراپ کیا تو وہ بے انتہا رونے کے بعد اب پُرسکون تھی مَیں نہیں جانتا تھا کبھی کبھی الوداع کہنا کس قدر مشکل ثابت ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس رات سارہ سے بچھڑتے ہوئے ہوا۔ سارہ چلی گئی لیکن مَیں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اک عجیب سی بے چینی میرے رگ و پے میں سمانے لگی تھی۔

OO

تجدیدِ ایمان

اگلی شام ربیکا کی پارٹی پر اس کے گھر سبھی دوست موجود تھے۔ میری ساری کلاس موجود تھی، سوائے سارہ کے۔ ربیکا نے ہر وہ جگہ جہاں سارہ کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ رابطہ کر کے دیکھ لیا تھا لیکن سارہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس کے سارے فون نمبر بھی آزما لیے گئے لیکن سب بے سود رہا۔ ربیکا نے کئی مرتبہ سارہ کے گھر بھی فون کیا لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک پُرانے نوکر نے جو ربیکا کو اچھی طرح جانتا تھا صرف اتنا بتایا کہ سارہ میڈیم کا سر آئزک کے ساتھ آج صبح بہت جھگڑا ہوا اور پھر نہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ نوکر نے یہ بھی بتایا کہ سارہ کی مما بھی اُسی کی تلاش میں دن کو گھر سے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹیں۔ سر آئزک کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ سرِ شام ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے اور اب بھی یونیورسٹی میں ہی موجود ہیں۔

ربیکا نے پریشانی سے یہ ساری اطلاعات مجھے پارٹی ہال کے ایک کونے میں لے جا کر بتائیں۔ واقعی بات تو فکر کی تھی۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ آخر سارہ اس طرح سب کو بنا بتائے کہاں جا سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ یہاں آ ہی جائے۔ مَیں اور ربیکا اسی اُمید پر گھڑیاں گنتے رہے۔ ہم دونوں ہی اس پارٹی کو چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ربیکا اس دعوت کی میزبان تھی اور میں وہ تھا جس کے اعزاز میں یہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کا من اب اس محفل میں نہیں لگ رہا تھا۔ میری ساری کلاس میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں جمع ہوئی تھی۔ دوسرے سیمسٹرز سے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ربیکا کی شہرت اور دوستی یونیورسٹی کے کونے کونے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہم دونوں درمیانی وقفوں میں بھی سارہ کی تلاش میں نمبر گھماتے رہے۔ کامران جو ریستوران میں تھا اور بعد میں یہاں پارٹی میں ہماری طرف آنے والا تھا اُسے میں نے فون کر کے خصوصی تاکید کی کہ وہ یہاں

آنے سے پہلے سارہ کے گھر سے ضرور ہوتا آئے۔ لیکن اُس نے بھی آ کر یہی بتایا کہ سارہ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

آخر خدا خدا کر کے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب ہی نے مجھے فرداً فرداً جاتے ہوئے گلے لگا کر اپنی پوری حمایت اور سہارے کا یقین دلایا۔ جم، ڈیوڈ اور ٹینا تو رو ہی پڑے۔ کیسے عجیب رشتے تھے یہ۔ میں ان سب کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج وہ سب میرے، سب سے زیادہ اپنے تھے۔ میرے ساتھ طوفان میں جم کر کھڑے تھے۔ آندھیوں کا رُخ موڑنے کی ہمت رکھتے تھے۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جنگیں جذبے سے جیتی جاتی ہیں ایسے جان نثار ساتھ ہوں تو کسی کو کیا غم۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ مَیں بہت جلد پھر سے ان کے درمیان ہوں گا۔ سب ہی میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ ان سب کے خلوص کو دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ یہ دل کا پیمانہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی نفرت سہہ جاتا ہے لیکن چند اپنوں کی محبت پا کر چھلک اُٹھتا ہے۔ سب ہی لوگوں نے ربیکا کا اس شاندار پارٹی دینے پر شکریہ ادا کیا۔ واقعی ربیکا نے کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا محل نما مکان آج پوری طرح سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف باوردی بہرے ہاتھوں میں مشروبات کی ٹرے تھامے سرِ شام ہی ہال میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کھانے پینے اور موسیقی کا ایسا شاندار انتظام مَیں نے کم ہی کہیں دیکھا تھا۔ ربیکا نے ہال کے باہر موجود سوئمنگ پول کے کنارے پر بار بی کیو اور سازندوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سارا ہال اور باہر پول کی جانب روشنیوں کا سیلاب تھا۔ خوشبوئیں تھیں، قہقہے تھے۔ لیکن سارہ کی غیر موجودگی نے سب ہی رنگ پھیکے کر دیے تھے۔ جم وغیرہ بھی جاتے وقت تک سارہ ہی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

آخر کار ہال میں صرف میں ربیکا اور کامران رہ گئے۔ کامران کو مَیں نے دوبارہ سارہ کی خبر لینے کے لیے بھیجنے کا سوچا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ اب تک تو اُسے گھر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ سارہ کے خاص نوکر نے جو اس پارٹی کا چیف بٹلر بھی تھا، آ کر ہمیں ہال میں خبر دی کہ کوئی مسٹر آئزک آئے ہیں اور ربیکا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسٹر آئزک اور اس وقت آدھی رات کو

وہ ربیکا کے گھر کیا لینے آئے تھے۔ ربیکا نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ ہم تینوں نے تشویش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری اور سر آئزک کی نظر ایک دوسرے پر پڑی لیکن انہوں نے جلدی سے ربیکا سے پوچھا۔

''اس وقت آنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سارہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئی۔ مَیں نے سوچا شاید وہ یہاں ہو۔۔۔۔ اُس کا فون بھی بند مل رہا ہے۔''

ربیکا نے سر آئزک کو بتایا کہ ہم خود سارہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور شام سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اور اس وقت بھی دوبارہ اس کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ آپ آ گئے۔

سر آئزک نے ربیکا سے درخواست کی کہ اگر سارہ کے بارے میں کوئی خبر ملے تو انہیں ضرور خبر کرے۔ ربیکا نے سر ہلایا۔

سر آئزک پھر وہاں نہیں رُکے۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ راستے میں ہال سے نکلتے ہوئے ان کی مجھ سے چند لمحوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا ان کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔

''مَیں تم کو اپنی بیٹی چھیننے نہیں دوں گا۔ آخری جیت میری ہی ہوگی۔''

''میرا مقصد کبھی آپ سے آپ کی بیٹی کو چھیننا نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھو دیا ہے۔ البتہ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔ اور آخری جیت کا فیصلہ اگر ہم آخری جنگ پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے راستے میں حائل ہو گیا۔''

سر آئزک نے مجھ پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل گئے۔ مَیں نے کامران سے کہا کہ وہ مشرق کی جانب سارہ کو ممکنہ جگہوں پر تلاش کرے جب کہ مَیں نے مغرب کی جانب ان جگہوں کو ٹٹولنے کا ارادہ کیا جو سارہ آتے جاتے مجھے اپنی پسندیدہ بتاتی رہی تھی۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ اس شہر میں اس وقت سارہ کے درپردہ دشمنوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کامران چلا گیا۔ ربیکا نے گاڑی کی چابی میرے

حوالے کر دی لیکن پھر اُس سے بھی نہیں رہا گیا۔ وہ سارہ کی بچپن کی دوست تھی اور بہت سی ایسی جگہوں سے واقف تھیں جن کے بارے میں مَیں بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم دونوں گاڑی نکال کر لندن کی سنسان سڑکوں پر سارہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ربیکا نے سارہ کا اسکول اور پھر کالج کا رُخ کیا لیکن دونوں جگہوں پر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اب میری بے چینی اور پریشانی اپنی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ مَیں نے اپنے دل میں گڑگڑا کر خدا کو پکارا۔ ہاں ۔۔۔۔ اسی خدا کو جسے مَیں ایمان کی موت کے بعد سے بالکل ہی بھول چکا تھا۔ وہی خدا جس سے مَیں دل میں ناراض تھا۔ جس کو مَیں ایمان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اسی خدا سے میں نے گڑگڑا کر دُعا مانگی کہ یا خدا اس معصوم لڑکی کی حفاظت کرنا۔ ہم سب زندگی میں چند مرتبہ ہی خدا کو سچے دل سے یاد کرتے ہیں اور پورے خلوص سے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ اس رات میری دُعا کا وہ لمحہ بھی شاید انہی چند سچے لمحوں میں سے ایک تھا۔ ابھی میں نے دل ہی دل میں دُعا ختم ہی کی تھی کہ میرا موبائل فون بج اُٹھا۔ فون کی اسکرین پر سارہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے فون آن کیا۔

''کہاں ہو تم ۔۔۔۔ تمھیں کچھ احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان ہیں تمھارے لیے ۔۔۔۔ آدھی رات کو مَیں اور ربیکا لندن کی سڑکوں پر تمھاری تلاش میں گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا ۔۔۔۔؟

میں نے چند لمحوں میں ہی اپنی ساری پریشانی غصے کی صورت میں سارہ پر نکال دی۔ وہ چُپ چاپ میری بات سنتی رہی۔

''مَیں جانتی ہوں میرے اس رویے سے تمھیں اور باقی سب کو کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی ۔۔۔۔ لیکن مَیں مجبور تھی۔ زندگی بدلنے والے چند فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنھیں کرنے کے لیے انسان کو تنہا ہی سب کچھ جھیلنا ہوتا ہے۔ بہرحال ۔۔۔۔ مَیں جو پتہ تمھیں بتا رہی ہوں۔ تم ربیکا کے ساتھ ابھی اسی وقت وہاں چلے آؤ۔ مَیں تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔''

سارہ نے پتہ بتا کر فون کاٹ دیا۔ جو جگہ اُس نے بتائی تھی وہاں ہم دونوں پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس وقت اس جگہ کا نام سنتے ہی میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے چند لمحوں میں اُچھل کر باہر نکل جائے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے ظاہری طور پر اپنی کیفیت پر قابو پایا

اور ربیکا کو گاڑی موڑ کر سارہ کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیرت ربیکا کے چہرے سے بھی عیاں تھی لیکن میری حالت کے پیش نظر وہ چپ ہی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنٹرل لندن کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں سارہ کی سفید پیٹل ڈور ہی سے اندھیری سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ سارہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پُلیا پر کھڑی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ''فرکوٹ'' پہن رکھا تھا جس کے کالر اُس نے سردی سے بچنے کے لیے اوپر اُٹھا رکھے تھے، دور سے ہمیں سارہ کے کوئی اور بھی کھڑا نظر آیا۔ ربیکا نے گاڑی سڑک کی دوسری جانب روکی اور ہم دونوں اُتر کر تیزی سے سارہ کی طرف لپکے۔ سارہ کے ساتھ اس کی مما کو کھڑے دیکھ کر ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ربیکا جاتے ہی سارہ سے لپٹ گئی۔ سارہ نے تھپک تھپک کر اُسے تسلی دی اور بولی۔

''مَیں اس طرح تم سب کو پریشان کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔ مما کو بھی مَیں نے آدھی رات کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔''

مسز آئزک کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ مل کر بہت دیر تک روتی رہی ہیں اور جو بھی طوفان تھا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ اب ان دونوں کے چہروں پر سکون ہی سکون تھا۔ مسز آئزک نے سارہ کے گالوں کو پیار سے تھپکا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ مَیں کچھ حیران سا ان کی جانب بڑھ گیا اور انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر کے انہیں سنوارا اور بولیں۔

''تم ایک سچے اور پیارے لڑکے ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی نے ایک سچے اور بہادر انسان سے دوستی کی ہے۔ میری دُعائیں ہمیشہ سارہ کے اور تمہارے ساتھ ہیں۔''

مَیں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ کی جانب دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار یا پونے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک فضا میں اک ارتعاش سا بکھرا اور مؤذن کی اذان گونجی ''اللہ بڑا ہے۔۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔۔''

مجھے سارہ نے سنٹرل لندن کی اسی بڑی جامع مسجد کے سامنے بلایا تھا جہاں ایک دن پہلے مَیں اور سارہ آئے تھے اور ہم دونوں کے دلوں پر لگا کچھ زنگ دُھلا تھا۔ سارہ میری حیرت دیکھ کر مسکرائی۔

''میں نے سچائی کا پیغام سُن لیا ہے حماد۔۔۔۔اَب میرا راستہ بہت صاف ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں برتری اور احساس فخر کی کھوج میں ہوں۔ آج میری کھوج مکمل ہوگئی ہے۔ تمھاری بدولت مجھے اپنی وہ منزل نظر آ گئی ہے جو آگ کے دریا کے اس پار ہمیشہ سے موجود تھی لیکن میری نظروں سے اوجھل رہی۔ اَب مَیں نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اور میری عظیم ماں نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے ساتھ کھڑے ہوکر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مما اپنی وفا، اپنی مجبوریوں کی وجہ سے میرے ساتھ اس دریا کے پار نہیں چل سکتیں۔ لیکن میرے لیے ان کا، تمھارا، ربیکا کا ساتھ ہی بہت ہے۔''

ربیکا پھٹی پھٹی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اذان ختم ہوگئی تھی۔ سارہ نے میرا اور ربیکا کا ہاتھ تھاما۔

''چلو۔۔۔۔سچ کے راستے پر چلنے میں دیر کیسی۔۔۔۔؟''

ہم سب خواب کے سے عالم میں مسجد میں داخل ہوگئے۔ وہاں پیش امام جو شاید انگریزی نژاد ہی تھا اور جس کے چہرے کے گرد نور کا اِک عجیب سا ہالہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ شاید سارہ پہلے ہی انہیں سب بتا چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے مولوی علیم الدین کی یاد آ گئی۔ کیا سبھی اللہ والوں کی شکلیں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے ہم سب کو عزت کے ساتھ بڑے گنبد کے نیچے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے چند دُعائیں پڑھیں اور پھر سارہ سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پہلا کلمہ دُہرائے۔

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔۔۔۔''

کبوتروں کی ایک ڈار جو غول کی صورت میں صحن میں دانا چگ رہی تھی۔ ایک تیز آواز کے ساتھ فضا میں اُڑی جیسے انہوں نے سارہ کو سلامی پیش کی ہو۔ پھر فضا ساکت ہوگئی۔ پھر دوسرا کلمہ، پھر تیسرا۔۔۔۔چوتھا، پانچواں، چھٹا۔۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے اپنے مطلب کے لیے اور مولوی علیم کی قربت حاصل کرنے کے لیے یہ سارے چھ کے چھ کلمے یاد کیے تھے۔ مجھے لگا جیسے اس انگریزی نژاد گورے پیش امام کی جگہ مولوی علیم ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ ساتھ ہی دیکھا تو عبداللہ بھی

بیٹھا مسکا رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے پلٹ کر ربیکا کی جانب دیکھا تو وہاں بھی صوفی رحمت اللہ ہنستے ہوئے نظر آئے جیسے کہہ رہے ہوں ''میاں ۔۔۔۔ ہم تو مسجد کی کھڑکی سے صرف باہر جھانکتے ہی رہے۔ تم نے تو اسے کھڑکی سے اندر مسجد میں ہی بلا لیا۔''

سارہ نے دُعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی دیکھا دیکھی ربیکا نے بھی گلے میں پڑا اسکارف اپنے سر پہ ڈال لیا تھا اور مؤدب بیٹھی ہوئی تھی۔ امام صاحب نے سارہ کو اور ہم سب کو مبارک باد دی کہ اب سارہ حق کے راستے کی اک مسافر تھی۔

سارہ کی مما کے آنسو تھم نہیں پا رہے تھے۔ سارہ نے انہیں گلے لگا کر بے حد پیار کیا۔ ربیکا بھی بھیگی پلکیں لیے انہیں تھپکتی رہی۔ مَیں نے مسز آئزک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ اس وقت انہیں تسلی دینے کا اس سے بہتر ذریعہ مجھے اور کچھ دوسرا نظر نہ آیا۔

مسز آئزک ۔۔۔۔ جینی فر آئزک ۔۔۔۔ کتنی عظیم عورت تھی۔ کیسا عجب رشتہ تھا ان دو ماں بیٹی کا، سہیلیوں سے بھی بڑھ کر، جیسے یک جان دو قالب ہوں۔ دُنیا کی کون سی ماں ہوگی جو یوں آدھی رات کو اپنی بیٹی کو اپنا مذہب بدلتے وقت حوصلہ دینے کے لیے گھر سے چلی آئے۔ اپنے شوہر کی برسوں کی رفاقت اور اپنے گھر اور اپنے ازدواجی رشتے کو بھی خطرے میں ڈال کر، واقعی یہ سب بہت خاص لوگ تھے۔ سارہ، اس کی مما ۔۔۔۔ ان کا درجہ کچھ الگ ہی تھا۔ ان کی مٹی جس سے یہ لوگ بنائے گئے تھے ضرور کچھ خاص رہی ہوگی۔

امام صاحب نے وہ جذباتی لمحے گزر جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

''خاتون کا نام سارہ ہی ٹھیک ہے یا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں گے؟''

مسز آئزک نے سارہ کی جانب اور سارہ نے میری جانب دیکھا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔

''نہیں ہم سارہ کا نام بدل رہے ہیں۔''

''بہت بہتر۔ نیا نام بھی تجویز کر دیجیے سب کے سامنے۔''

''ایمان۔''

سارہ نے اور ربیکا نے بیک وقت چونک کر میری جانب دیکھا۔

''جی ۔۔۔۔ سارہ کا نیا نام میں ''ایمان'' تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض

نہ ہو۔"

سارہ نے خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

"مَیں اس نام کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔"

امام صاحب نے دُعا کی اور پُرانی سارہ اور نئی ایمان کے سَر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ ربیکا نے بھی جلدی سے اپنا سر آگے کر دیا۔ امام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر اُس نے ربیکا اور میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ کالی رات کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اور یہ صبح بھی کیسی عجیب صبح تھی۔ اتنا سفید اُجالا میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دودھیا سفید اُجالا۔

ہم سب مسجد سے باہر نکل آئے۔ ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہم اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچے۔ لندن کی مخصوص صبح کی دُھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بمشکل ہمیں قریب کھڑی سفید ہیٹل نظر آئی۔ ایمان نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائی۔

"میں نہیں جانتی کہ مَیں کبھی تمھاری محبت پا سکوں گی یا نہیں۔۔۔ لیکن دیکھو۔۔۔ میں نے تمھارے خدا کو پا لیا ہے۔"

مَیں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مسز آئزک کے ہاتھ میں ایمان کا نازک ہاتھ تھمایا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی امانت ہے جسے مَیں آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھیے گا۔"

مسز آئزک مسکرائیں۔

"بے فکر رہو لڑکے۔۔۔۔ تمھاری امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے نقصان پہنچانے والی کسی بھی چیز کو پہلے میرے جسم اور میری رُوح کے پار ہونا پڑے گا۔"

ربیکا نے آگے بڑھ کر ایمان کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر وہ بھی اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ "آج تم سب سے جیت گئی ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمھاری دوست ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ ایمان نے راستے میں آگے کیسے کیسے پُر خار راستے، کیسی کیسی اُلجھنیں

اور تکالیف اور کتنے انگارے بچھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے اور وہ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جانا جانتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں نے مولوی علیم تک پہنچنے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا تھا۔ مذہب کو ایمان کے گھر جانے کے لیے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن میرے اندر شائد کھوٹ تھا۔ لیکن اس سچی لڑکی نے مذہب کو مجھ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا میرے دل میں اُترنے کی صرف ایک سیڑھی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے جو بھی کیا سچے دل سے کیا۔ اس کی کسی محبت میں کوئی منافقت نہیں تھی۔ نہ ہی میری محبت میں اور نہ ہی خدا کی محبت میں۔۔۔۔ وہ دونوں محبتوں میں سچی تھی۔

ہم چاروں لوگ صبح کی شدید دھند میں ایک دوسرے سے وداع ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایمان کی نظریں جاتے وقت تک میرا ہی طواف کرتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے دن میری واپسی کی فلائٹ ہے اور اَب چند گھڑیاں ہی باقی رہ گئی ہیں جس کے بعد ہم جُدا ہو جائیں گے اور کون جانے یہ جُدائی پھر کتنی صدیوں پر محیط ہو گی۔۔۔۔

مَیں اور ربیکا دیر تک ایمان کی سفید ہیل کو لندن کی گہری دُھند میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ جیسے دھواں، دھواں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھر ربیکا نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

OO

کبھی الوداع نہ کہنا

جب مَیں اور کامران لندن ہیتھرو ائیر پورٹ کے لیے نکلے تو اسی وقت بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ائیر پورٹ پر پہنچتے پہنچتے یہ بوندا باندی شدید بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مَیں راستے بھر گاڑی میں اس دن کے اخبارات پڑھتا رہا جنھوں نے سارہ کے قبول اسلام کی خبریں بڑی بڑی سُرخیوں کی صورت میں چھاپی تھیں۔ یہودی زیرِ اثر اخبارات نے اسے ایک جذباتی لڑکی کی اپنی محبت کے لیے مذہب کی قربانی سے تعبیر کیا تھا۔ اور پہلے کی سارہ اور آج کی ایمان کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ محبت کے چند متوالے اخبارات نے اسے محبت کی جیت قرار دیا تھا اور سرآئزک کی تمام اخبارات میں شدید سبکی کے حوالے دیے گئے تھے۔ سرآئزک نے ایمان کو اپنی وراثت اور جائداد سے عاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک انٹرویو میں انہوں نے ایمان کو 30 دن کی مہلت دی تھی کہ اگر وہ اب بھی اپنی غلطی کا ''اعتراف'' کر کے تائب ہو جائے تو وہ اُسے دوبارہ اپنی ولدیت اور وراثت کا حق بخشنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مجھ پر اپنی بیٹی کو بھڑکانے اور اُسے ''راہِ راست'' سے بھٹکانے کا بھی الزام لگایا تھا۔ اخبارات میں میرے لندن چھوڑ کر جانے کی خبریں بھی موجود تھیں۔ ایمان کا تمام اخبارات میں صرف ایک ہی جملہ بطور بیان لگایا گیا تھا کیونکہ شاید اس نے اخباری نمائندوں اور میڈیا کے سامنے کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ: سچ کا نتوں سے بھرا اک بے حد دشوار راستہ ہے اور محبت، ہمیں ان کانٹوں بھری راہ پر چلنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔''

جیسے ہی ہم ائیر پورٹ کی پارکنگ میں رُکے تو گاڑی سے اُترتے ہی مجھے اپنے شناسا چہروں کا بے پناہ ہجوم نظر آیا۔ سب سے پہلے ربیکا بارش میں پھسلتی دوڑ کر میری طرف آئی آتے ہی میرا ہاتھ تھام کر کھینچتی ہوئی مجھے بھیڑ سے دُور لے گئی۔ بارش ہم دونوں کے وجود کو

بھگو رہی تھی۔

''چند لمحے یہاں میرے پاس کھڑے رہو۔ مَیں تمھارے وجود کو اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل میں اُتار کر اس کی شبیہ کو قید کر لینا چاہتی ہوں۔ تاکہ تنہائی میں جب کبھی مَیں اپنے دل میں جھانکوں تو بس تم ہی تم مجھے نظر آؤ۔''

مَیں نے اس کی دیوانگی میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ دوسری طرف کھڑے جم، ڈیوڈ، ٹینا اور باقی لوگ چلا رہے تھے۔ ربیکا چند لمحے مجھے یونہی نظروں نظروں میں نہارتی رہی۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر پھر سے چارلی چپلن کا مشہور قول یاد آ گیا۔

''مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے، کیونکہ تب کوئی میرے بہتے آنسو نہیں دیکھ پاتا۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بھیگی لٹیں بکھرا دیں۔ ربیکا آج مسکرانے کی کوشش میں مزید روہانسی ہوگئی۔ مَیں نے اس سے ایمان کا پوچھا۔ تب اسے ہوش آیا اور اُس نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''جانے وہ کہاں رہ گئی ہے۔ اب تک تو اُسے آ جانا چاہیے تھا۔''

ہیتھرو ائیر پورٹ کے کھلے احاطے میں بورڈنگ سے پہلے بنی ہوئی لمبی راہداریوں میں میرے سبھی دوست، میرے تمام کلاس فیلوز بارش سے بے نیاز مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ائیر پورٹ کا عملہ حیرت سے ان کے لہراتے ہاتھوں اور ان میں پکڑے پھولوں کے خوبصورت گلدستوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون سی اہم شخصیت، کون سی وی۔ آئی۔ پی ہستی ہے جس کے جانے کی اطلاع انہیں پہلے سے نہیں کی گئی۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ ''محبت'' میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود بخود آپ کو دنیا کی سب سے اہم ہستی، سب سے بڑا وی۔ آئی۔ پی بنا دیتی ہے۔ میری نظریں ایمان کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ مَیں نے سب ہی دوستوں سے فرداً فرداً مل لیا اتنے میں اچانک مجھے دُور سے پارکر کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ بورڈنگ کا اعلان ہو چکا تھا اور مَیں اندر شیشے کے دروازے سے ہال میں مسافروں کو قطار میں آگے بڑھتا دیکھ سکتا تھا۔ پارکر کی گاڑی کے پیچھے پولیس کی دو اور نیلی بتی والی گاڑیاں بھی تیزی سے ائیر پورٹ کے احاطے میں داخل ہوگئیں۔ پارکر اپنی گاڑی میں سے حسب معمول چیونگم چباتے ہوئے برآمد ہوا۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایمان اور اس کی مما بھی اس کی گاڑی میں سے اُتریں۔ ایمان تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اور قریب آ کر میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

''ہمارے راستے میں بہت سی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں حماد۔۔۔۔ لیکن دیکھو میں پھر بھی تمھیں الوداع کہنے یہاں تک پہنچ گئی ہوں۔''

''میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔''

مسز آئزک نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوما اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ پارکر بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا کر بولا۔

''جا رہے ہو باغی نوجوان۔۔۔۔ میں جانتا تھا۔۔۔۔ جاتے جاتے بھی آخری بازی تم اپنے نام ہی کر جاؤ گے۔'' غالباً اس کا اشارہ ایمان کی طرف تھا۔

''آپ میری دوست کو ان مشکل حالات میں بھی یہاں تک لے کر آئے۔ میں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔''

''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں دوست۔ مسز آئزک اور ان کے ساتھیوں نے شہر میں ہمارا ہر راستہ روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن آج پارکر نے بھی سوچ رکھا تھا کہ زندگی میں ایک کام تو ایسا ضرور کر جاؤں گا کہ جس کا حوالہ دے کر، جسے یاد کر کے میری گردن بھی فخر سے بلند ہو جائے۔''

پارکر نے دوبارہ مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ اس سے مل کر میں ایمان کی طرف بڑھ گیا جو ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے چُپ چاپ ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے مسکرا کر اُس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا۔

''یہ پھول تم میرے لیے ہی لائی ہو یا واپسی پر مسٹر پارکر کو پیش کرنے کا ارادہ ہے۔''

ایمان مسکرا دی۔

''نہیں۔۔۔۔ یہ پھول تمھارے ہی لیے ہیں۔۔۔۔ لیکن یہ میں تمھیں آج نہیں دوں گی۔۔۔۔ یہ اس دن کے لیے ہیں جب میں اسی ائیر پورٹ پر اسی جگہ تمھاری واپسی پر تمھیں لینے آؤں گی۔ چاہے اس پل کے آنے میں کتنی ہی صدیاں کیوں نہ بیت جائیں۔ میں اُس پل کا انتظار کروں گی۔ اور جب تم واپس آؤ گے تو تب میں یہ گلدستہ تمھیں دوں گی

۔۔۔۔اور دیکھ لینا۔۔۔۔تب بھی یہ پھول میرے انتظار کی طرح تازہ ہوں گے۔۔۔۔یہ کلیاں کبھی نہیں مرجھائیں گی۔۔۔۔کبھی نہیں۔''

ایمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔جدائی کا زہر پھر سے اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔شاید محبت کی تخلیق ہی جُدائی کے لیے۔۔۔۔جدائی کے باعث ہوئی ہوگی۔۔۔۔جُدائی نہ ہوتی تو شاید محبت بھی وجود میں نہ آتی۔۔۔۔جیسے بندگی نہ ہوتی۔۔۔۔تو بندہ بھی کبھی جنم نہ لیتا؟''

ایمان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔اندر سے اَب باقاعدہ بورڈنگ لیڈی میرا نام پکارنے لگی تھی۔ایمان نے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔

''جا رہے ہو۔۔۔؟''

''اُس کے اس انداز پر میرا دل جیسے ڈوب سا گیا۔''

''نہیں۔۔۔۔مَیں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہوں۔۔۔۔تمھارے بہت قریب۔۔۔''

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بال بکھیر دیے۔ایمان ہلکے سے مسکرا دی۔پھر مَیں نے پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا اور تیزی سے بورڈنگ لاؤنج میں داخل ہو گیا۔گہرے رنگ کا کالا چشمہ اس وقت بھی میرے بہت کام آیا۔جسے مَیں نے عجلت میں اپنی آنکھوں پر پہن لیا۔

''مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے کیونکہ ایسے میں لوگ میرے آنسو۔۔۔۔''

مَیں نے دُور جا کر پلٹ کر آخری مرتبہ دیکھا۔سب سے آگے شیشے کی دیوار کے پاس ایمان، کامران پھر ربیکا، مسز آئزک، پارکر، جم، ڈیوڈ، ٹینا اور پھر جانے کون کون کھڑا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا یہ لوگ میرے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔کون کہتا ہے مَیں یہاں اکیلا تھا۔کون کہتا ہے مَیں خالی ہاتھ لندن سے واپس جا رہا تھا۔مَیں نے یہاں کا ایک ایک رشتہ دُنیا جہاں کی دولت سے مہنگا پایا تھا۔آج تو مَیں خود کو دُنیا کا سب سے امیر شخص محسوس کر رہا تھا۔

آخری مرتبہ پلٹنے سے پہلے مَیں نے ان سب کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ایمان کی آنکھوں سے ٹپکتے دو آنسو میں یہاں سے بھی کھڑے ہو کر اپنے دل کی زمین پر ٹپکتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔اور پھر مَیں پلٹا اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔جہاز نے جلد ہی ٹیک

آف کرلیا۔ میں جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا نیچے بھیگتے ہوئے لندن کو دھند میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس کر اس کی دھندلی اسکرین پر راستے سے بناتی ہوئی نیچے خلاؤں میں کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چھ مہینے قبل جب میں لندن پہنچا تھا اُس دن بھی ایسی ہی بارش ہو رہی تھی اور آج جب میں نے اس شہر کو الوداع کہنا تھا تب بھی بارش میری ساتھی تھی۔

''یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں، تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں، اور کبھی ہر پل ہمارے من کو جل تھل کیے رکھتی ہیں۔ لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔''

میں نے آخری مرتبہ سفید دھوئیں جیسی دھند میں غائب ہوتے لندن کو دیکھا اور پھر تھک کر اپنی آنکھیں موند لیں۔۔۔۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے اپنی اک پسندیدہ نظم کے چند بول بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔

''میں نے پوچھا کیسے ہو؟
بدلے ہو یا ویسے ہو؟
روپ وہی انداز وہی
یا پھر اس میں کوئی کمی؟
ہجر کا کچھ احساس تو ہوگا
کوئی تمہارے پاس تو ہوگا؟
میں بچھڑا یہ مجبوری تھی
کب منظور مجھے دُوری تھی
ساتھ ہمارا کب چھوٹا ہے
رُوح کا رشتہ کب ٹوٹا ہے
آنکھ سے جو آنسو بہتے ہیں
تم کو خبر ہے کیا کہتے ہیں

مَیں نے کہا آواز تمھاری
آج بھی ہے ہمراز ہماری
پھول وفا کے کھل جائیں گے
اِک دن ہم پھر مل جائیں گے"

☆A☆S☆I☆F☆

عبداللہ (یکجا)

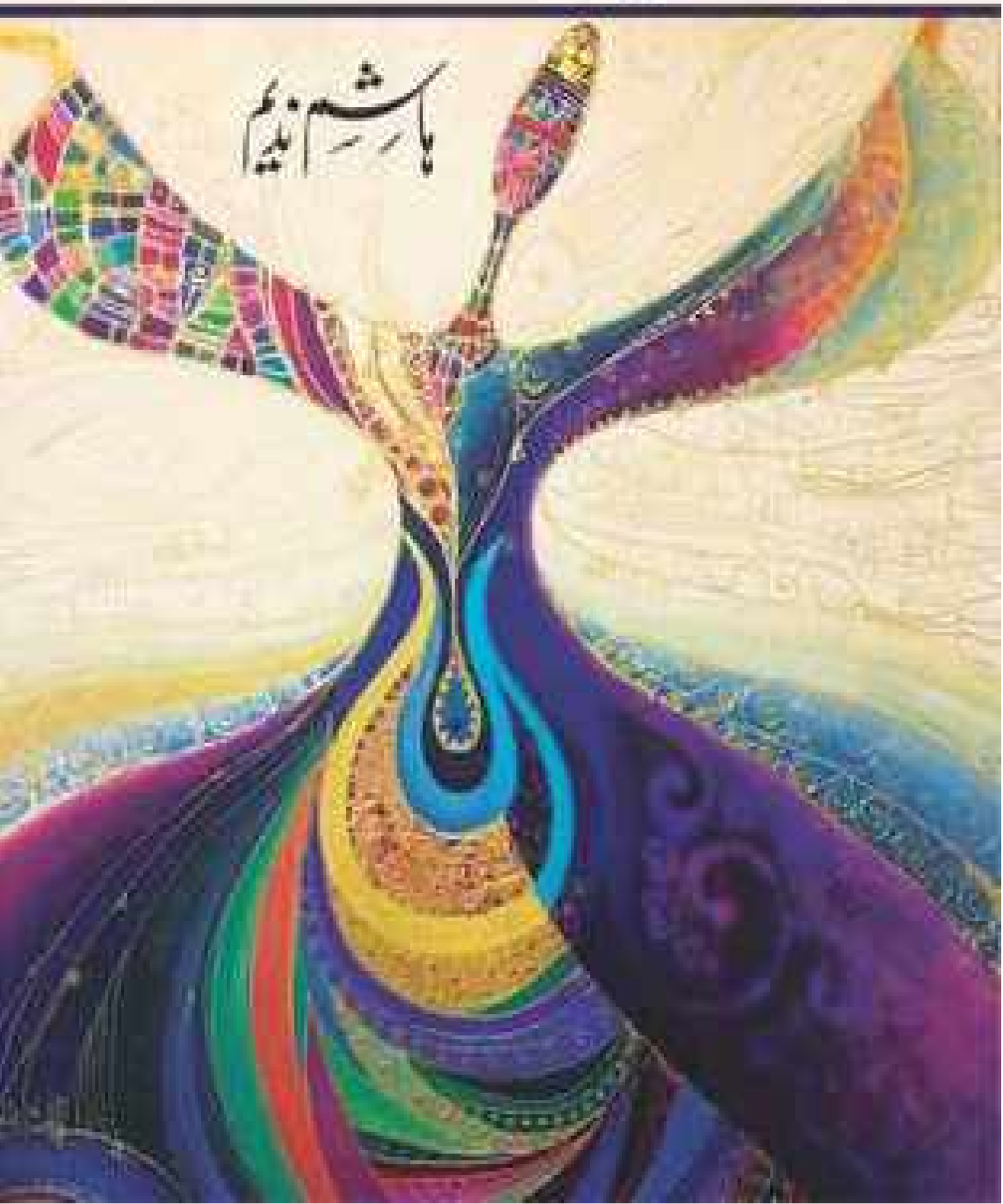

فہرست

۱۔ درگاہ (۱)..... ۹

۲۔ درگاہ (۲)..... ۱۶

۳۔ زہرا..... ۲۳

۴۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا ۳۰

۵۔ محبت سی ہو گئی ہے..... ۳۷

۶۔ نظر کی التجا..... ۴۴

۷۔ رقیب ۵۱

۸۔ پہلی کھوج کا خضر ۵۸

۹۔ دورِ جنوں ۶۶

۱۰۔ تعیناتی ۷۳

۱۱۔ عبداللہ..... ۸۰

۱۲۔ خضر راہ ۸۹

۱۳۔ من کی لگن ۹۷

۱۴۔ تربیت ۱۰۵

۱۵۔ پہلی جیت ۱۱۴

۱۶۔ الوداع ۱۲۳

۱۷۔ کالا پانی ۱۳۴

۱۸۔ آخری انتظار ۱۴۲

۱۹۔ آخری سجدہ ۱۵۱

۲۰۔ عصا اور دیمک ۱۶۱

۲۱۔ یاقوط ۱۷۲

۲۲۔ آسیب محبت ۱۸۳

۲۳۔ صلیب عشق ۱۹۴

۲۴۔ ابھی کچھ دیر باقی ھے ۲۰۵

۲۵۔ دامن اور چنگاری ۲۱۹

۲۶۔ سود و زیاں ۲۳۰

۲۷۔ درد اور مسیحا ۲۳۹

۲۸۔ لاریب ۲۵۷

۲۹۔ دوسرا مسیحا ۲۶۷

۳۰۔ فاصلے ساتھ چلتے ھیں ۲۷۷

۳۱۔ چھلاوہ ۲۸۵

۳۲۔ ایمان فروش ۲۹۴

۳۳۔ تیسری رات ۳۰۵
۳۴۔ معصوم قاتل ۳۱۶
۳۵۔ پھر وہی محبت..... ۳۲۶
۳۶۔ پہلی رہائی ۳۳۶
۳۷۔ دوسری منت ۳۴۸
۳۸۔ خوابوں کا بیوپاری..... ۳۵۷
۳۹۔ خواب مرتے نہیں ۳۶۷

درگاہ

(۱)

ساحل کی طرف جاتی ہوئی مرکزی شاہراہ، جو عام حالات میں کسی جوان بیوہ کی اُجڑی مانگ کی طرح بے رنگ اور سنسان پڑی رہتی تھی، اس وقت شہر کے امراء کی چند بگڑی ہوئی اولادوں کی خرمستیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ فضا میں اسپورٹس کاروں اور ہیوی بائیکس کی چنگھاڑتی آوازوں نے ایک ہل چل اور طوفان سا برپا کیا ہوا تھا۔ معاملہ شہر سے ویران ساحل کی پٹی تک ریس کا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی یہ ریس ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے آگے صوبے کے ہوم سیکریٹری کے لاڈلے صاحب زادے وقار یعنی وکی کی مرسڈیز اسپورٹس کار تھی۔ اس کے بعد ملک کے معروف صنعت کار بختیار احمد کی اکلوتی اولاد ساحر، یعنی میری منی جیگوار تھی اور میرے پیچھے صوبائی وزیر مالیات کا بگڑا شہزادہ کاشف اپنی دوست ردا کے ساتھ ہیوی بائیک پر فراٹے بھرتا، مختلف گاڑیوں کے درمیان لہراتا اور اپنا راستہ بناتے ہوئے صرف چند انچ کے فاصلے سے میری گاڑی کے بمپر کو تقریباً چھوتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ باقی دوست اُس سے ذرا فاصلے پر تھے۔ لوگ ہمیں دُور ہی سے دیکھ کر سراسیمہ ہو کے اِدھر اُدھر اُچھل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ وکی نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہلکا سا چھو لیا۔ ٹھیلے والا ایک جانب کو کودا اور اُس کے ٹھیلے سے ناریل فضا میں یوں اُچھلے جیسے کسی شریر بچے نے یک دم فضا میں بہت سے خاکستری غبارے چھوڑ دیئے ہوں۔ اُن میں سے ایک ناریل کسی گرینیڈ کی طرح میری کار کی ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور شیشے پر اگلے ہی لمحے مکڑی کے جالے جیسی رگیں اُبھر آئیں۔ میری ساتھ گاڑی میں بیٹھی گورنر کی بھتیجی اور میری بہترین دوست عینی زور سے چلائی اور اُس کے منہ سے انگریزی گالیوں اور مغلظات کا ایک طوفان وکی کی شان میں اُبل پڑا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے کاشف کی ایک سو پچاس کی اسپیڈ سے دوڑتی ہوئی بائیک کا پہیہ ناریل کے اُوپر چڑھ گیا اور بائیک فضا میں یوں اُچھلی جیسے کسی توپ سے نکلا ہوا گولا..... لیکن کاشف نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بائیک کو زمین پر لگتے ہی ایک جانب کو جھکا کر اُلٹنے

سے بچا لیا۔ البتہ اُس کے پیچھے آتے ہوئے دو موٹر سائیکل سوار خود کو بچا نہیں پائے۔ سڑک پر دُور تک اُن کی بائیکس کی پھسلنے کی آوازیں اور اسکرتچیں گونجتی رہیں۔ شاید ریس میں شامل ایک آدھ کار بھی پھسلی لیکن میں مڑ کر دیکھ نہیں پایا، کیونکہ اُس وقت میری ساری توجہ آگے سڑک پر دوڑتی وکی کی مرسیڈیز پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب ساحلی پٹی صرف چند کلومیٹر ہی دُور رہ گئی ہے، لہٰذا وہ اپنی گاڑی کو سڑک پر دونوں جانب لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تاکہ میری گاڑی کو آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل سکے۔ کاشف گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ نکال نکال کر مجھے اشتعال دلانے کے لیے مختلف اشارے بھی کر رہا تھا اور اس عمل میں اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی، اُس کی ولایت پلٹ کزن ٹینا بھی برابر کا ساتھ دے رہی تھی، جو عینی کو مزید مشتعل کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ آخری دس کلومیٹر کا بورڈ دیکھتے ہی عینی نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''نہیں ساحر..... اب ہم نہیں جیت سکتے..... فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم ہار گئے ساحر..... ڈیم اٹ یار.....'' میں نے عینی کو کوئی جواب نہیں دیا اور گیئر بدل کر ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ عینی بھی جانتی تھی کہ مجھے ہار سے کس قدر شدید نفرت تھی۔ میں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہم زندگی میں جیتنا سیکھیں، یا نہ سیکھیں، جیت ہمیں خود ہی سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں! البتہ ہار کو باقاعدہ سیکھنا پڑتا ہے کہ ہار آپ کو خود کچھ نہیں سکھاتی۔ لیکن میں خود فی الحال اس فن سے ناآشنا تھا۔ اور کم از کم آج تو میں کسی صورت ہارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مقابلے پر میرا ازلی حریف وکی جو تھا۔

اس ریس کا آئیڈیا کل رات ہی ہمارے شیطان دماغوں میں اُس وقت آیا تھا جب ہم کلب کے نیلگوں دھویں بھرے ماحول میں اپنے اپنے ''بھرے'' ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ فضا میں دھوئیں اور بیئر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور دھواں کشید کرنے کے اس عمل میں ہم میں سے ہر ایک کا۔۔۔۔۔ جوڑا بھی پورے شد و مد سے شریک تھا۔ صرف عینی ہی اُن میں ایک ایسی لڑکی تھی جس کا دم اس مخصوص دھویں کی زیادتی سے گھٹنے لگا تھا اور تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے کلب روم سے باہر کھلی فضا میں کھینچ لائی تھی۔ ''اُف ساحر..... کیوں پیتے ہو یہ زہر..... نفرت ہے مجھے اس دھویں سے۔'' لیکن کل رات عینی کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی وقار نے بحث چھیڑ دی تھی کہ اُس کے باپ نے گزشتہ ہفتے ہی اُسے جو نئی

اسپورٹس مرسڈیز لے کر دی ہے وہ اُسے ڈھائی سو کی رفتار سے دوڑاتا ہوا کالج آ سکتا ہے۔ کاشف نے چڑ کر اُسے ریس لگانے کا چیلنج دے دیا اور رفتہ رفتہ بحث نے اتنا طول پکڑا کہ ہم سب ہی نے اس ریس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے نتیجے میں آج ہم سب کی گاڑیاں اور بائیکس اس ساحلی سڑک پر آگ اُگلتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔

ریس ختم ہونے والا پوائنٹ ساحل پر بنے ہوئے لکڑی کے ہٹس (Huts) کے عین سامنے جا کر ختم ہونے والی یہی کولتار کی سڑک تھی، جہاں پہلے ہی سے یونیورسٹی کا پورا ایک گروپ ہجوم کی شکل میں چیخ چلا کے اور نعرے لگا کر ہمارا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ انہی میں وہ دو لڑکے بھی موجود تھے جن کے ہاتھ میں سفید رومال تھے، جنہیں آخری جیت کی گواہی دینے کے لیے ہم نے بطور جج وہاں کھڑا کیا تھا۔ آخری پوائنٹ اب صرف دو کلومیٹر کی دُوری پر رہ گیا تھا اور ہماری اسپورٹس کاریں جس رفتار سے دوڑ رہی تھیں، اس حساب سے یہ دو کلومیٹر صرف دو لمحے کی دُوری پر تھے۔ وکی کسی صورت مجھے آگے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور مجھے بس ایک لمحے کی تلاش تھی اور پھر وہ لمحہ ایک اُونچے ریت کے ٹیلے کی صورت میں مجھے نظر آ ہی گیا۔ سڑک کے اختتام سے کچھ قدم پہلے سڑک کی بائیں جانب ریت کچھ اس طرح اکٹھی ہو گئی تھی کہ ایک اُونچا سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ میں نے گیئر بدلا اور چلا کر عینی سے کہا۔ ''سیٹ بیلٹ اچھی طرح کس لو.....'' عینی نے شاید میری آنکھوں میں لپکتی چمک کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر چلائی ''نہیں ساحر..... پلیز..... فار گاڈ سیک ساحر۔'' لیکن عینی کی چیخ اُس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میری جیگوار ریت کے ٹیلے پر یوں چڑھی جیسے کوئی گلائیڈر اُونچی اُڑان اُڑنے سے پہلے کسی اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر بنی چٹان پر دوڑتا ہے اور اگلے ہی لمحے میری گاڑی بھی کسی شاہین کی طرح فضا میں تیرتی ہوئی اختتامی حد پر لگے ہوئے سرخ جھنڈے کو کراس کر گئی۔ فضا میں تیرتے ہوئے میری نظر نیچے دو فٹ پیچھے آتی مرسڈیز میں بیٹھے وکی پر پڑی، جس نے جھنجلاہٹ میں اپنا سر زور سے اسٹیئرنگ پر دے مارا تھا۔ میری جیگوار ایک زوردار آواز اور شدید جھٹکے کے ساتھ نیچے ریتلے ساحل سے ٹکرائی اور اس کے اگلے دونوں ٹائر زوردار دھماکے کے ساتھ برسٹ ہو گئے۔ کار زور سے لہرائی لیکن اُس کے اُلٹنے سے پہلے ہی میں نے پوری قوت کے ساتھ ہینڈ بریک کھینچ لی۔ لیکن گاڑی کے بونٹ سے نکلتے ہوئے دھویں اور

گاڑی کے فریم کو دیکھ کر کوئی اناڑی مستری بھی یہ بتا سکتا تھا کہ اب یہ کار کم از کم میرے کسی کام کی نہیں رہ گئی۔ مجھے اپنی پسندیدہ گاڑی کے تباہ ہو جانے کا کوئی دُکھ نہیں تھا۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میں نے ایک بار پھر وکی کو ہرا دیا تھا۔ ہینڈ بریک کھینچنے کی وجہ سے گاڑی نے گھومتے ہوئے ریت کا جو طوفان اُٹھایا تھا وہ اب تھم چکا تھا..... عینی، جس نے کار کے اُڑان بھرتے ہی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا، نے اپنا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور ایک تیز جھرجھری لے کر بولی ''تم بالکل پاگل ہو ساحر..... یو آر ٹوٹلی میڈ.....'' میں نے عینی کی طرف ایک مسکراہٹ بھری نظر ڈالی اور گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ سب دوستوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور سب ہی شور مچا رہے تھے۔ وُور وکی کھڑا چلا رہا تھا کہ مقابلہ زمین پر گاڑی دوڑانے کا تھا نہ کہ فضا میں اُڑانے کا۔ لیکن کوئی اُس کی بات نہیں سن رہا تھا اور سبھی اُس سے شرط ہارنے کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔

ہم سب کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جہاں ایسی معمولی رقم روزانہ گھر کے نوکروں میں بانٹ دی جاتی تھی، لیکن اس رقم کی حیثیت سب سے الگ تھی، کیونکہ یہ میری جیت کی رقم تھی..... تبھی میں نے اس حقیر رقم کے لیے اپنی لاکھوں روپے کی نئی امپورٹڈ گاڑی تباہ کر دی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنی ہر جیت کے لیے میں ساری زندگی روزانہ ایسی کئی گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں اُن سب کو لڑتا جھگڑتا چھوڑ کر ایک اُونچی چٹان پر بنے پتھر کے بنچ پر جا کر بیٹھ گیا اور دُور سے آتی لہروں کو چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ میری شخصیت میں ایک عجیب تضاد بھی تھا کہ ہر جیت، فتح کے فوراً بعد میرے لیے اپنی اہمیت کھو دیتی تھی۔ سو، آج بھی یہی ہوا۔ ابھی چند لمحے پہلے میں نے جس جیت کے لیے اپنے ساتھ ساتھ اپنی عزیز از جان دوست عینی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی، اب میرے لیے ماضی بن چکی تھی اور مجھے اس فتح کی تکرار سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے نیچے عینی گروپ اور وکی کو لڑتے جھگڑتے دیکھا اور اُکتا کر سگریٹ سلگا لی۔ دفعتہً دھوئیں کے نیلے مرغولے کے درمیان سے ہوتی ہوئی میری نظر دُور سڑک پر دوڑتی ہوئی کالے رنگ کی بڑی سی شیورلیٹ کار پر پڑی۔ اچھی گاڑیاں بچپن سے میری کمزوری تھیں اور جو لوگ کاروں کے بارے میں تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ شیورلیٹ کو کاروں کی شہزادی کہا جاتا ہے، اور

نئے ماڈل کی یہ شہزادی تو اب ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہوگئی ہے۔ میری تمام تر توجہ اُس شان دار گاڑی کی جانب مبذول ہو چکی تھی، جو اب ساحل کے کنارے موجود پہاڑی سلسلے کے اندر تراشی ہوئی سفید پتھر کی سیڑھیوں کے قریب آ کر رُک چکی تھی۔ گاڑی میں سے کچھ لوگ اُتر کر ان سنگی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے جن کا اختتام پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی ایک درگاہ کے وسیع صحن میں جا کر ہوتا تھا۔ میں اس کار سے بہت دُور ایک دوسری پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں کار کی سواریوں اور اُن کے حلیے پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔ بہرحال یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کہ اس جدید دور میں بھی ایسے اُونچے طبقے کے لوگ ایسی درگاہوں پر حاضری دینے کے لیے آتے تھے؟ ہم انسانوں نے خود کو تسلی دینے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراش رکھے ہیں..... اچانک میرے دل میں اُس گاڑی کو قریب سے دیکھنے کی شدید خواہش اُبھری۔ ویسے بھی میں یہاں بیٹھا بیٹھا اُکتانے لگا تھا۔ میں نے چٹان سے نیچے ساحل کی جانب نظر دوڑائی تو سبھی کو مشغول پایا۔ کوئی باربی کیو کی تیاری کر رہا تھا، تو کوئی اپنی گاڑی سے بڑے دیوقامت اسپیکر اور میوزک سسٹم اُتار رہا تھا۔ عینی نے دُور سے ہاتھ ہلا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جواباً اُسے اشارہ کیا کہ میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔ چٹان سے دوسری جانب اُترنے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسری پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کار اب بھی وہیں کھڑی تھی اور ایک باوردی شوفر اُس کا بونٹ اُٹھائے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ کہتے ہیں، سواری بھی انسان کی نفاست کو جانچنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس قول کی پرکھ اگر اُس گاڑی سے کی جاتی تو یقیناً اُس کا مالک انتہائی نفیس شخصیت کا مالک ہونا چاہیے تھا، کیونکہ گاڑی کو بڑے سلیقے سے سنبھالا گیا تھا۔ میں کچھ دیر دل چسپی سے گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ڈرائیور نے میری محویت نوٹ کر لی اور مسکرا کر بولا ''کیوں صاحب..... کیا دیکھ رہے ہیں..... گاڑی پسند آ گئی ہے کیا؟'' میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''گاڑیوں کا کوئی بھی شوقین پہلی ہی نظر میں اس گاڑی کا عاشق ہو سکتا ہے۔'' ڈرائیور میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا اور فخر سے بولا ''سچ کہا آپ نے..... دراصل ہمارے سیٹھ صاحب نے بھی ساری عمر میں یہی ایک شوق پالا ہے۔ بلکہ انہیں تو اعلیٰ سے اعلیٰ گاڑی رکھنے کا جنون ہے۔ اب اِسی گاڑی کو دیکھ لیں۔ پچھلے مہینے ہی امریکا سے منگوائی ہے۔

ہمارے صاحب کو جاپانی گاڑیاں بالکل بھی پسند نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ جاپان والوں نے گاڑیوں کو چھوٹا کر کے اُن کی توہین کی ہے۔"

ڈرائیور بات کرتے کرتے آہٹ پا کر اچانک مؤدب سا ہو گیا اور جلدی سے بونٹ بند کر کے پچھلے دروازے کی جانب لپکا۔ میں نے چونک کر ڈرائیور کی نظر کے تعاقب میں اُوپر جاتی سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور چند لمحوں کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ اُوپر سے ایک اُدھیڑ عورت کے ساتھ ایک پری رُخ ماہ جبیں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ اُس کی چال میں ایک ایسا وقار تھا گویا کوئی راج ہنسنی پانی میں تیر رہی ہو۔ عورت اور لڑکی دونوں نے خود کو مناسب حد تک بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا اور اُس عشوہ طراز نے اپنے رُخ پر باریک نقاب کی تہ بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کالے نقاب نے اُس کے چہرے کا نور کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے پہلے حسن سے آشنا نہ تھا، لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسن اور معصومیت کو نئی تعریف اور نئے معنی دے جاتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی اور لاکھوں میں ایک تھا۔ ڈرائیور نے بھاگ کر دونوں پچھلے دروازے کھول دیئے تھے۔

لڑکی نے نظر اُٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور اک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی کے دروازے بند کیے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تبھی مجھے بھی جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے حواس میں واپس آ گیا، لیکن تب تک کار کافی دُور جا چکی تھی۔ مجھے خود پر شدید غصہ آیا۔ ایسی بھی کیا بے خودی؟ کم از کم مجھے گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت میں خود اپنی اس عجیب سی بے چینی اور کچھ کھو دینے کی کسک کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ میں نے زور سے سر کو یوں جھٹکا جیسے خود کو ان بے حد اُداس اور ساکت جھیل جیسی آنکھوں کے سحر سے آزاد کروانے کی کوئی ناکام سی کوشش کی ہو۔

اچانک ہی میری نظر پہاڑی کی چوٹی پر پڑی اور میرے قدم خود بخود اُن پتھریلی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے، جن کا اختتام اُوپر بنی درگاہ پر ہوتا تھا۔ شاید میرے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش مچل اُٹھی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے اس پتھر کی بنی سفید اور سادہ سی عمارت

میں، جس کی زیارت کے لیے اس گل رُخ کے کومل قدم اتنی دُور تک اُٹھے تھے۔ دُور سے دیکھنے میں وہ درگاہ اتنی اُونچائی پر نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو پسینے سے شرابور اور ہانپ رہا تھا۔ وہاں خاصے زائرین موجود تھے، جو اپنے طور پر اپنی اپنی منتوں کی قبولیت کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر کر رہے تھے۔ کوئی پھولوں کی چادر چڑھا رہا تھا، تو کوئی لنگر خانے میں دیگیں کھلوائے بھوکوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ ایک جانب ایک حاجی صاحب دودھ میں زعفران اور روح افزاء گھولے اپنی سبیل چلا رہے تھے۔ ایک جانب چند افراد مورچھل لیے درگاہ کے اندرونی حصے کی صفائی کر رہے تھے۔ مجھے ایک لمحے کو یوں لگا کہ جیسے جس کا گناہ جتنا بڑا ہے وہ اُسی حساب سے کفارہ ادا کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کرنے سے ہم انسانوں کی منتیں پوری ہو جاتی ہوں گی.....؟ کفارے ادا ہو جاتے ہوں گے.....؟ میں اپنی سوچوں میں غلطاں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے ایک بھاری لیکن ملائم سی آواز اُبھری ''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں.....؟'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے میری ہی عمر کا ایک نوجوان ہاتھ میں تسبیح اور ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ سفید رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس اور چہرے پر کالی گھنی شرعی ڈاڑھی خوب جچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس تھی۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''جی..... بہت شکریہ..... میں بس یونہی اس طرف چلا آیا تھا..... آپ کی تعریف.....؟'' ''تعریف کے لائق تو کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس..... ہاں البتہ تعارف کے لیے نام 'عبداللہ' ہے.....''

درگاہ

(۲)

میں نے عبداللہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اُس نے بات جاری رکھی۔ ''اِسی درگاہ کا ایک مجاور ہوں..... خدمت کرتا ہوں یہاں آنے والے زائرین کی.....'' میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا ''آپ اپنی گفتگو سے تو پڑھے لکھے لگتے ہیں..... پھر یہ سب کچھ.....'' میں نے جان بوجھ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔ وہ میری بات سن کر ہلکے سے مسکایا۔ ''شاید آپ بھی پڑھائی کا مقصد صرف کسی سرکاری نوکری کا حصول ہی سمجھتے ہیں۔ ویسے میں نے بھی کچھ صفحے سیاہ تو کیے تھے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ اب تک صرف وقت ہی ضائع کرتا رہا..... بہرحال آپ بتائیے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟'' ''نہیں کچھ نہیں..... دراصل میرے دوست نیچے ساحل پر میری راہ تک رہے ہوں گے..... آپ سے مل کر اچھا لگا.....'' میں نے عبداللہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دبایا اور واپسی کے لیے پلٹا..... پیچھے سے عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ ''کوئی منت نہیں مانگیں گے آپ.....؟'' میں مسکرا کر پلٹا ''چلیں یہ وعدہ رہا..... جب کبھی کوئی منت مانگنی ہوئی تو یہیں آپ کی اِسی درگاہ میں آ کر مانگوں گا۔ اُمید ہے شنوائی ہو گی.....'' میری بات سن کر عبداللہ بھی مسکرا دیا ''مجھے انتظار رہے گا۔'' میں اُس کی جانب الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ نیچے وہ سبھی میرے لیے فکرمند ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب سے پہلے عینی برس پڑی۔ ''ساحر..... یہ کیا مذاق ہے.....؟ تم جانتے ہو ہم سب یہاں تمہاری وجہ سے کس قدر ہلکان ہو رہے تھے..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کچھ ہمارا بھی خیال ہے تمہیں.....'' وہ روہانسی سی ہو کر چپ ہو گئی۔ میں نے اُن سب کے سامنے ہاتھ جوڑے ''معاف کر دو یار..... میرا ارادہ اتنی دیر لگانے کا نہیں تھا..... بس دیر ہو ہی گئی..... میں دوسری پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔'' میرے منہ سے ''درگاہ'' کا نام سنتے ہی وہ سب یوں اُچھلے جیسے میں نے اُن کے عین سامنے کوئی بم پھوڑ دیا ہو۔ ''درگاہ''.....؟..... ''ساحر تم.....؟'' ''خیریت تو ہے نا۔'' اُن سب

کی حیرت بجا تھی۔ ہم میں سے وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا، جس نے آج تک درگاہ تو کیا ''عیدگاہ'' کی بھی کبھی زیارت کی ہو۔ ہم وہ تھے جن کے لیے لوگ منتیں مانگتے تھے، ہمیں بھلا ایسی جگہوں سے کیا واسطہ.....؟ ہم تو خود ایک ''منت'' کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ جنہیں بن مانگے ہی اس جہاں میں سب کچھ میسر تھا۔ پھر بھلا ہمیں کیا ضرورت تھی، ان درگاہوں اور مسجدوں میں ماتھا ٹیکنے کی.....؟ ہم سے تو ہمارا خدا ویسے ہی سدا کے لیے راضی تھا۔

میں نے جرمانے کے طور پر اِسی رات سب ہی کو ہالیڈے ان میں ڈنر کی دعوت دی، تب جا کر اُن لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن عینی ابھی تک رُوٹھی رُوٹھی سی تھی۔ وہ مجھ پر دوسروں سے کہیں زیادہ اپنا حق سمجھتی تھی اور اِسی حق کا مان اُسے یوں رُوٹھنے پر مجبور بھی کرتا تھا۔ عینی کی یہ خاموشی واپسی پر بھی تمام راستے برقرار رہی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ حسب معمول آدھی رات کو مجھے فون کیے بنا اُسے نیند نہیں آئے گی، لیکن اس رات تھکن کی وجہ سے میں اس قدر گہری نیند میں تھا کہ نہ جانے کتنی گھنٹیوں کے بعد فون اُٹھایا۔ دوسری جانب سے عینی کی پریشان اور کسی قدر جھنجھلائی ہوئی آواز اُبھری ''اتنی دیر کیوں لگا دی فون اُٹھانے میں.....؟'' اُس کی جھنجھلاہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ''ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تم نے درجنوں لوگوں کی موجودگی میں یہ عہد کیا تھا کہ اب آئندہ تم مجھ سے کبھی بات نہیں کرو گی۔'' ''تم جانتے ہو نا میں تم سے بات کیے بنا نہیں رہ پاؤں گی..... اسی لیے اتنا اکڑتے ہو.....؟'' ''یار میری کیا مجال کہ میں گورنر صاحب کی اکلوتی بھتیجی کے سامنے ذرا سی بھی اکڑ دکھانے کی جرأت کر سکوں.....؟ مجھے جیل جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' ''مذاق مت کرو ساحر..... میں بے حد سنجیدہ ہوں۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''اچھا بولو..... کیا چاہتی ہو۔'' دوسری جانب سے عینی کی شرارت بھری آواز اُبھری ''تمہیں.....'' ''اچھا..... تو یہ تم سنجیدہ ہو.....؟'' عینی نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری ''یہی تو مسئلہ ہے..... تم نے کبھی میری محبت کو سیریس لیا ہی نہیں.....'' عینی پر ایسے دورے مہینے میں ایک آدھ بار ضرور پڑتے تھے اور لگتا تھا کہ آج کی رات پھر انہی راتوں میں سے ایک تھی جب ہماری زوردار بحث ہونے والی تھی، لیکن آج میں اُس سے بحث کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھا۔ ''اوہ کم آن عینی..... تم جانتی ہو کہ میں یہ محبت وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتا..... محبت صرف جسم کے حصول کی درخواست کا ایک مہذب ذریعہ ہے..... بس ایک لفظ ہے، اپنی

خواہشات پر پردہ ڈالنے کے لیے..... اور کچھ بھی نہیں.....'' وہ میری بات سن کر چپ سی ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ''میں تو تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ تمہاری دل کی بنجر زمین پر یہ خودرو پودا اُگ جائے اور اس کے کانٹے تمہاری رُوح کو بھی اپنی کاٹ اور چبھن سے زخمی کر دیں..... تمہارا قصور نہیں ہے ساحر..... شاید یہ میری آزاد خیالی ہی میرے جذبے کو بے وقعت کرنے کا باعث بنتی ہے..... سویٹ ڈریمز.....'' عینی نے فون کاٹ دیا۔ میں حیرت سے فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اچانک..... آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس قدر ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ پھر میں نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید شام کی بیئر نے اپنا اثر اس وقت دیر رات کو دکھانا شروع کیا ہو گا۔ میں نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں۔

اگلے چند دن تک میں ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں چونک سا جاتا تھا اور میری نظریں دُور تک اُس گاڑی کا پیچھا کرتی رہتیں، لیکن مجھے وہ بڑی شیورلیٹ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ پتا نہیں، وہ اس شہر میں رہتے بھی تھے، یا پھر کہیں اور سے اس درگاہ کی حاضری کے لیے آئے تھے۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میری اس بے چینی کی اصل وجہ کیا تھی اور پھر سب سے پہلے کاشف نے میری یہ ''کار یاترا'' محسوس کر لی اور چوتھے دن اُس نے مجھ سے آخرکار پوچھ ہی لیا ''کیا بات ہے یار..... یہ آج کل ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر تم اُس کے پیچھے ہی کیوں پڑ جاتے ہو.....؟'' میں نے اُس روز درگاہ پر ہونے والی تمام واردات اُسے تفصیل سے سنا دی ''اوہو..... تو یہ بات ہے..... اب سمجھا..... میرا یار دراصل گاڑی نہیں، بلکہ گاڑی والی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یار کسی کو تو بخش دیا کرو..... جو حلیہ تم نے اُس لڑکی کا ابھی ابھی بیان کیا ہے، اس سے ایک بات تو کنفرم ہے کہ شی از ناٹ یور ٹائپ'' ''اوہ شٹ اپ یار..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک تجسس ہے کہ آخر اس شہر میں ایسی کون سی فیملی ہے جو میری طرح گاڑیوں کا شوق رکھتی ہے، لیکن میں اُس سے واقف نہیں ہوں.....'' کاشف بولا ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس شہر سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں..... کہیں اور کسی دوسرے شہر سے وہاں آئے ہوں.....؟'' یہی تو اُلجھن ہے کہ یہ بات کیسے معلوم کی جائے کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے..... پتا نہیں کیوں..... لیکن میں اُس لڑکی کی اُداس آنکھوں میں چھپی داستان

پڑھنا چاہتا تھا..... لیکن افسوس پڑھ نہیں پایا.....'' کاشف کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتا رہا، پھر ایک دم اچانک کھڑا ہو گیا۔ ''چلو اُٹھو.....'' ''کہاں.....'' ''آؤ اس آنکھوں کی کہانی کا راز جاننے کے لیے..... چلو اب دیر نہ کرو۔'' میں کاشف کی عادت سے واقف تھا۔ ایک بار جو بات اُس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی پھر اُسے نکالنا ہم میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد کاشف کی جیپ تیزی سے اُسی سڑک پر رواں تھی جو اُسی ویران ساحل کی پٹی کی جانب جاتی تھی، جہاں وہ درگاہ واقع تھی۔

کاشف نے جیپ بالکل سیڑھیوں کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا ''ہم یہاں کیوں آئے ہیں.....؟'' ''تمہیں وہ گاڑی یہیں نظر آئی تھی نا..... تو اگر ہمیں اس گاڑی کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ یہیں سے ملے گا..... چلو اُوپر درگاہ میں چل کر کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میرے پاس کاشف کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے صحن تک جا پہنچے۔ باہر بیٹھے ایک مجاور نے ہمیں جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ جوتے اُتارتے ہوئے میں کچھ یاد کر کے چونک سا گیا۔ اُس روز بھیڑ کی وجہ سے شاید اس دروازے پر بیٹھے مجاور کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی تھی، لہٰذا میں جوتوں سمیت ہی درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھے تو ان آداب کا کچھ پتا ہی نہیں تھا، لیکن عبداللہ کی نظر تو میرے جوتوں پر ضرور پڑی ہو گی۔ تو پھر آخر اُس نے مجھے جوتے اُتارنے کا کیوں نہیں کہا.....؟ میں اِسی سوچ میں گم کاشف کے پیچھے پیچھے درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ کاشف نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ''میں درگاہ کے متولی سے اُس گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو۔'' میں جانتا تھا کہ کاشف ایسے معاملات میں پیسے کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ضرور متولی کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے گا اور اُس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کاشف تیزی سے درگاہ کے پچھلے دروازے سے نکل کر کسی جانب غائب ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لی اور پیپل کے پیڑوں کے نیچے رکھے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک ہی پیڑوں کے پیچھے سے عبداللہ آتا دکھائی دیا۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا فوراہ تھا۔ شاید وہ پھولوں کو پانی دے کر واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظر بیک وقت ٹکرائی۔

عبداللہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ''ارے آپ.....؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ منت مانگنے کا وقت اتنی جلدی آ گیا.....؟'' میں ہنس دیا۔ ''نہیں..... ابھی وہ وقت نہیں آیا..... دراصل کسی کی کھوج مجھے دوسری بار یہاں تک کھینچ لائی ہے۔'' عبداللہ نے غور سے میری جانب دیکھا ''میں دعا کروں گا کہ آپ کی کھوج تشنہ نہ رہے۔'' ''تھینک یو..... ویسے ایک بات کہوں، گر بُری نہ لگے..... ہم دونوں ہی تقریباً ہم عمر ہیں اور یہ آپ جناب کے چکر میں پڑ کر ہم خواہ مخواہ ہی تکلف کے دھاگوں سے بندھے جا رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کریں تو میں بہت ایزی محسوس کروں گا.....'' عبداللہ مسکرایا۔ ''چلو ایسا ہی سہی..... لفظ اور القاب تو صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔'' ''ایک بات بتاؤ..... اُس دن پہلی مرتبہ جب میں اس درگاہ تک آیا تھا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے جوتے اُتارنا بھول گیا تھا، لیکن تم نے میرے جوتے دیکھ کر بھی مجھے اُتارنے کو نہیں کہا..... کیوں.....؟..... کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح اَن جانے ہی میں سہی، پر میں نے درگاہ کے فرش کی بے حرمتی کی تھی.....؟'' ''فرش تو پھر سے دُھل سکتا ہے، سو دھو لیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تمہیں تمہاری پہلی حاضری پر ہی ٹوک دوں۔'' مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا مجاور ہے جو اپنی درگاہ کے فرش سے زیادہ دلوں کے میلے ہونے کو اہم گردانتا ہے.....؟ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ ''تم اپنے طور واطوار سے کسی بھی طرح اس درگاہ کے مجاور نہیں لگتے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے.....؟'' عبداللہ کے چہرے پر اُس کی وہی ملیح سی مسکراہٹ پھیل گئی ''بس یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی کسی کی کھوج یہاں تک کھینچ لائی ہے۔'' ''تو کیا تمہاری کھوج ابھی مکمل نہیں ہوئی.....؟'' ''میری کھوج تو شاید کبھی مکمل نہ ہو..... میں جس رستے کا مسافر ہوں، اس کی منزل آنے سے پہلے ہی زندگی کی شام ہو جاتی ہے۔ یہ درگاہ بھی صرف میرا ایک پڑاؤ ہی تو ہے، جانے کب یہاں سے بھی کوچ کرنے کا پروانہ مل جائے.....''

میں حیرت سے عبداللہ کا یہ فلسفہ سنتا رہا۔ یہ میری اس نوجوان سے دوسری ملاقات تھی اور دونوں مرتبہ میں نے محسوس کیا تھا کہ عبداللہ وہ نہیں ہے، جو وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ اتنے میں کاشف درگاہ کے عقبی حصے سے نمودار ہوا اور اُس نے وہیں سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے عبداللہ سے رُخصت چاہی۔ ''یہ ہماری دوسری لیکن تشنہ ملاقات تھی۔ اُمید ہے تیسری

اقات جلد ہو گی اور ہم دونوں تب ٹھیک طرح سے ایک دوجے کو جان پائیں گے۔'' عبداللہ نے مسکرا کر مجھ سے جوابی مصافحہ کیا۔ ''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' ں کاشف کی وجہ سے جلدی میں تھا، لہٰذا عبداللہ کی اس گہری بات پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ کاش برا فہم اس وقت اس قدر وسیع ہوتا اور عبداللہ کی اس پیش گوئی کو سمجھ پاتا کہ آئندہ میری زندگی ں کیسے کیسے طوفان برپا ہونے والے ہیں۔

جب میں درگاہ سے باہر نکلا تب تک کاشف جیپ میں سوار ہو چکا تھا۔ میری بیٹھتے ہی س نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ ''کام بن گیا ہے۔ میں نے پوری معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' میں نے بے چین ہو کر کاشف سے وضاحت چاہی۔ ''رُکو مت..... بولتے ہو۔'' کاشف نے گاڑی ہائی وے پر ڈال کر ریس بڑھا دی۔ ''دراصل پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں ریس کے لیے آئے تھے، تب وہ جمعرات کا دن تھا۔ اسی لیے اُس دن یہاں تمہیں بہت یادہ بھیڑ بھی نظر آئی۔ وہ گاڑی بھی یہاں ہر جمعرات کو آتی ہے۔ گاڑی کے مالکان کے ارے میں تو میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا، بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی جدی پشتی رئیس ہیں۔ جن وعورتوں کو تم نے دیکھا تھا وہ ماں بیٹی ہیں۔ کبھی کبھار اُن کے ساتھ لڑکی کا باپ بھی چڑھاوا چڑھانے آ جاتا ہے۔ البتہ ماں بیٹی کا گزشتہ دو برسوں سے یہ پکا معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات کی شام یہاں آتی ہیں اور ہر ہفتے ہزاروں روپے کا چڑھاوا چڑھا کر واپس چلی جاتی ہیں۔'' تمہیں یہ سب کچھ کس سے پتا چلا..... میرا مطلب ہے کہ جمعرات کی شام آنے والے زائرین کی تعداد تو اچھی خاصی ہوتی ہو گی، پھر اُن کے درمیان ایک خاص خاندان کو یاد رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔'' کاشف زور سے ہنسا۔ ''آپ کی اِسی معصومیت پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے جناب..... یار چاہے ہر جمعرات سیکڑوں لوگ درگاہ کی زیارت کو آتے ہوں، پر اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہو گا جو ہر بار ہزاروں روپے کی نذر دیتا ہو..... اور پھر اُن کی گاڑی اور اُن کے رکھ رکھاؤ کو تو تم نے خود نوٹس کیا ہے..... ایسے لوگ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی ہوں تب بھی انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ اب اپنا زیادہ سر مت کھپاؤ..... صرف دو دن کی بات ہے..... اس جمعرات کو ہم خود یہاں درگاہ کے دروازے کے قریب ڈیرہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ صرف ایک بار کار کا رجسٹریشن نمبر پتا چل جائے، پھر اس خاندان کا کھوج لگانا میرے بائیں ہاتھ کا

کھیل ہے، جسٹ ویٹ میری جان.....''

اگلے دو دن میری زندگی کے شاید سب سے زیادہ بے چین شب و روز تھے۔ پر ''وقت کسی طور گزر ہی جاتا ہے''، سو یہ دو دن بھی کٹ ہی گئے اور جمعرات کی سہ پہر میں اور کاشف دونوں ہی اُسی پہاڑی چٹان کی چوٹی پر بیٹھے اُس کار کا انتظار کر رہے تھے، جہاں سے پہلی مرتبہ میری نظر اُس گاڑی پر پڑی تھی۔ وقت بھی اُس کچھوے کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہا تھا، جو دُور ساحل کے کنارے پانی میں اُترنے کی کوشش میں سرگرداں تھا، لیکن ہر بار سمندر کی ایک بڑی لہر اُسے اُٹھا کر پھر سے دُور ریتیلے ساحل پر پٹخ دیتی تھی۔ میں نے بھی جتنی مرتبہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، مجھے یہی لگا کہ میری گھڑی کی سوئیوں کو بھی وقت کی ایسی ہی کوئی منہ زور لہر اُٹھا کر بار بار پیچھے پٹخ دیتی ہے۔ شاید وہ میرا تیرھواں سگریٹ تھا، جب اچانک کاشف زور سے چلایا۔ ''وہ آ گئی.....'' میں متوقع انتظار کے باوجود یوں زور سے چونک کر پلٹا، جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ دُور بل کھاتی سڑک پر وہی شیورلیٹ ریت اُڑاتی دوڑی چلی آ رہی تھی۔

زہرا

ہمارے درگاہ کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے وقفے میں وہ دونوں ماں بیٹی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا چکی تھیں۔ کاشف نے جان بوجھ کر اپنی جیپ شیورلیٹ کار کے بالکل قریب لا کر کھڑی کر دی تھی۔ کار کا وہ باوردی شوفر آج بھی اُسی طرح کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اُس کی جیپ سے اُترتے ہوئے جب مجھ پر نظر پڑی تو اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک جھلک لہرائی۔ جلدی سے سلام کر کے بولا ''ارے صاحب..... لگتا ہے آپ بھی ہماری بیگم صاحبہ کی طرح ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں۔'' ''نہیں..... ہماری تو یہ دوسری ہی جمعرات ہے..... دراصل میرے دوست کو اس درگاہ کی زیارت کا بہت ارمان تھا۔ سو، اس ہفتے اُسے یہاں لے کر آیا ہوں۔'' کاشف میرا اشارہ سمجھ گیا اور گاڑی کے گرد گھوم پھر کر ڈرائیور سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ڈرائیور نے چونکہ آج ہمیں خود ایک بے حد قیمتی گاڑی سے اُترتے دیکھا تھا اس لیے اُس کے رویے میں مرعوبیت کی ایک واضح جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں کاشف کو ڈرائیور سے معلومات لیتا چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں جا پہنچا۔ آج میں جوتے اُتارنا نہیں بھولا تھا۔ صحن میں پچھلی جمعرات کی طرح لوگوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا اور بے حد بھیڑ تھی۔ مجھے عبداللہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اُس ماہ رُخ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو وہ دونوں ماں بیٹی مجھے درگاہ کی مرکزی عمارت کے برآمدے میں بنی پتھر کی جالی کے قریب بیٹھی ہوئی دکھائی دیں اور پھر میرے ساتھ وہی ہوا جو پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ یکایک آس پاس کی ساری بھیڑ، سب لوگوں کا ہجوم اور اُن کا سبھی شور یک دم موقوف سا ہو گیا۔ فضا جیسے ساکت سی ہو گئی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے اس وسیع و عریض سنگ مرمر کے ڈھلے صحن میں صرف میں اور وہ ہی موجود ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تنہائی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، حتیٰ کہ آس پاس چلتی ہوئی پروائی بھی گونگی سی ہو کر صرف جسموں کو چھو کر گزر رہی ہے۔ اچانک کوئی سوالی مجھ سے زور سے ٹکرایا اور ایک جھٹکے سے

میرے حواس واپس آ گئے۔ میں وہیں صحن میں کھڑا تھا۔ جانے دو پل گزرے تھے، یا دو صدیاں.....؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی اب بھی اِسی جذب کے عالم میں دو زانوں بیٹھی جالی کی طرف منہ کیے، گڑگڑاتے ہوئے کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ میں سحرزدہ سا اُسے دیکھتا رہا..... کالی چادر نے اُس کا دمکتا نور اور بھی واضح کر دیا تھا۔ اور اگر میں شاعر ہوتا تو شاید، اِسی لمحے اُس کے ہاتھوں کی گلابی مخروطی اُنگلیوں اور لرزتی پلکوں پر پورا دیوان لکھ ڈالتا۔ رفتہ رفتہ لڑکی کا جسم ہچکیوں سے باقاعدہ لرزنے لگا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اُس کی ماں نے گھبرا کر اُسے تھاما۔ آج اُن کے ساتھ شاید اُن کی کوئی خادمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں نے سراسیمگی کے عالم میں اُسے پانی کی بوتل دینے کا کہا۔ خادمہ ہڑبڑاتی ہوئی سی اُٹھ کر باہر کی جانب بھاگی، شاید وہ گاڑی سے پانی لینے کے لیے گئی تھی۔ کبھی کبھی لمحے کے کسی ہزارویں حصے میں انسان کا دماغ اُسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کچھ ایسا ہی اُس وقت میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے قدم خود ہی یک بہ یک صحن میں درختوں کے نیچے پڑے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گئے اور میں کسی سحرزدہ رُوح کی طرح پانی کا گلاس لیے اُس لڑکی کی ماں کے پاس جا پہنچا۔ ماں نے جلدی سے بنا دیکھے گلاس پکڑ کر بیٹی کے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر اُس پری کی حالت کچھ سنبھلی لیکن اُس کا رنگ اب بھی سرسوں کے کسی تازہ پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ ماں نے گلاس واپس کرتے ہوئے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا ''شکریہ بیٹا.....''

میں گلاس لیے چند قدم دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان چند لمحوں میں نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے میرے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہیں۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے زبان اور لفظوں کی اہمیت اور قوت گویائی سے محروم بدنصیبوں کی بے بسی کا بہت شدت سے اندازہ ہوا۔ اتنے میں اُن کی خادمہ بھی دوڑے ہوئے ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے واپس پہنچ چکی تھی۔ ماں نے چند گھونٹ پانی بوتل سے بھی لڑکی کو پلائے، خادمہ کی مدد سے لڑکی کو کھڑا کیا اور واپسی کے لیے چل پڑیں۔ ماں نے جاتے جاتے ایک بار پھر میری جانب محبت بھری نگاہ ڈالی اور زیرلب شاید کوئی دعا بھی دی، لیکن میں یونہی بنا پلکیں جھپکائے ساکت کھڑا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں درگاہ کا صحن پار کر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل چکی تھیں۔ میں

ایک دم حواس باختہ ہو کر یوں باہر کی جانب لپکا جیسے کوئی مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھین کر لے بھاگا ہو۔ لیکن جب تک میں زائرین کی بھیڑ سے اُلجھتا، راستہ بناتا ہوا باہر سیڑھیوں تک پہنچا وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ ڈرائیور نے کاشف سے ہاتھ ملایا اور میں نے دُور ہی سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملے۔ اس وقت مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ قدرت نے آج خود مجھے اتنا بہترین موقع دیا تھا، میں کم از کم اُس کی ماں کی دعا کا جواب تو دے سکتا تھا، اُن لوگوں کی سیڑھیوں سے اُترنے میں مدد تو کر سکتا تھا، لیکن میں تو بس کسی معذور انسان کی طرح کھڑا ہی رہ گیا۔ بوجھل دل کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو کاشف میری جانب لپکا ''کیوں شہزادے..... کچھ بات بنی۔'' میں نے کاشف کو اپنی بے بسی کا احوال سنایا تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ ''کیا ہو گیا ہے یار.....؟ اتنا بہترین موقع ضائع کر دیا..... آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے.....؟'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اگر مسئلہ ہی سمجھ میں آ جاتا تو پھر رونا کس بات کا تھا.....؟'' کاشف نے اپنا سر جھٹکا۔ ''بہر حال..... میں نے ڈرائیور سے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ گاڑی کے مالک کا نام حاجی مقبول احمد ہے۔ ملک کے بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ آباؤ اجداد یو پی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ اُدھیڑ عورت اُن کی بیوی اور لڑکی اُن کی بیٹی ہے۔ ایک معتدل اسلامی گھرانا ہے اور حاجی صاحب خود بھی درگاہوں اور زیارتوں پر چڑھاوے چڑھانے جاتے رہتے ہیں۔ بھارت میں حاجی علی کی درگاہ کا سالانہ عرس وہ کبھی مس نہیں کرتے۔ اُن کی بیٹی پڑھی لکھی ہے اور حال ہی میں اُس نے یونیورسٹی سے اپنا ماسٹرز مکمل کیا ہے۔ وہ پہلے کبھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ان زیارتوں اور درگاہوں پر نہیں جاتی تھی، لیکن بقول ڈرائیور پتا نہیں، اُس کی بی بی جی کو گزشتہ دو سال سے کیا ہو گیا ہے کہ ہر جمعرات کو اس درگاہ کا پھیرا انہوں نے خود پر لازم کر لیا ہے اور ہاں..... لڑکی ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے.....''

میں نے ستائشی نظروں سے کاشف کو داد دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرائیور سے زیادہ تر باتیں اُگلوا لے گا، لیکن اُس نے میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور وہ بھی اتنے کم وقت میں۔ ''تمہاری اس اعلیٰ کوشش پر میں تمہیں انعام کا حق دار ٹھہراتا ہوں۔'' کاشف نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔ ''آپ کی ذرہ نوازی ہے عالی جاہ..... لیکن غلام کی

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس مخبری کا آخری حصہ سن کر آپ یقیناً اپنی پوری سلطنت میرے حوالے کر دیں گے..... میں نے لڑکی کا نام بھی ڈرائیور کی زبان سے اُگلوا لیا ہے.....'' کاشف نے مجھے تنگ کرنے کے لیے ایک لمبا وقفہ لیا۔ میں دم بخود کھڑا اُس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ ہی دیر میں اُس لڑکی کا نام نہیں، بلکہ مجھے میری زندگی، یا موت میں سے کسی ایک پروانے کی تحریر پڑھ کر سنانے والا ہو۔ شاید میری پوری زندگی میں، میری تمام سماعتوں نے مل کر بھی کبھی کسی ایک لفظ کو سننے کی اتنی شدید تمنا نہیں کی ہوگی، جتنی اس ایک لمحے میں مجھے کاشف کی زبان سے وہ نام سننے کی آرزو تھی..... ''زہرا..... زہرا نام ہے اُس لڑکی کا.....'' میں نے دھیرے سے زیرلب دہرایا ''..... زہرا.....'' اس ماہ کامل کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دن ہی میں بہت سے چاند اکٹھے نکل آئے ہوں۔ کاشف غور سے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پلٹ کر جیپ کا دروازہ کھولا۔ ''اگر میں گزشتہ پانچ برسوں میں اُن پچاسوں لڑکیوں کے نام اور پتے نہ جانتا ہوتا، جو تمہاری زندگی میں ہفتے، دس دن، یا مہینے کے لیے آ کر جا چکی ہیں، تو اس وقت تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یہ یقین کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ تم اُس لڑکی کے شدید عشق میں مبتلا ہو چکے ہو۔ لیکن تمہارے گزشتہ ریکارڈ کی وجہ سے میں تمہیں فی الحال اس الزام سے بری قرار دیتا ہوں۔'' میں نے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جب تک ہم ساحل سے واپس شہر پہنچے تب تک شام ڈھل چکی تھی اور شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔

لیکن اُس دن کے بعد میرے اندر کی تمام روشنی جیسے دھیرے دھیرے گھٹنے لگی۔ رات تک مجھے تیز بخار نے آ گھیرا۔ مما اور پاپا دونوں ہی کسی کانفرنس کے سلسلے میں جنیوا گئے ہوئے تھے۔ اُن کی واپسی اگلی شام تک متوقع تھی، لیکن میں اُن کی آمد سے پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مما تو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی بالکل بوکھلا سی گئیں۔ چند لمحوں ہی میں ہمارے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر یزدانی اپنے تمام ''لوازمات'' سمیت میری خواب گاہ میں موجود تھے۔ میں نے پاپا سے احتجاج کیا ''دیکھیں نا پاپا..... یزدانی انکل پھر سے اپنی پوری لیبارٹری اُٹھا لائے ہیں۔'' ڈاکٹر یزدانی زور سے ہنسے۔ پاپا نے مسکرا کر کہا ''کیا کریں یار..... ان کے تیس سالہ کیریئر میں صرف ہم نے انہیں اپنا فیملی ڈاکٹر ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اب ان کے تجربے تو بھگتنا ہی

پڑیں گے۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا.....'' مما نے ہم دونوں کو غصے سے گھورا اور پاپا کو ٹوکا ''توصیف آپ بھی نا..... بچے کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔ اسے شدید بخار ہے۔ یہ بات مذاق میں ٹالنے والی نہیں ہے..... ڈاکٹر یزدانی آپ پراپر چیک اپ کریں ساحر کا.....'' مما کا موڈ دیکھ کر پاپا نے مجھے منہ پر اُنگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اُن کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ انتہائی غیر معمولی دباؤ میں بھی اُن کا رویہ انتہائی نارمل رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک والد سے کہیں زیادہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ ڈاکٹر یزدانی نے بہت تفصیل سے میرے بخار کی تمام علامات نوٹ کیں اور چند ٹیسٹ کروانے کی تاکید کی۔ لیکن ان تمام ٹیسٹوں کا نتیجہ اُن کے لیے مزید حیران کن تھا کیونکہ میرا ہر تجزیہ معمول کے مطابق تھا۔ تو پھر یہ شدید بخار میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ مما پاپا کے پیچھے پڑ گئیں کہ مجھے فوراً باہر کے کسی بڑے ہسپتال میں مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے بھجوا دیا جائے۔ وہ تو خود بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر یزدانی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ مما کو سمجھائیں کہ اب ہمارے ملک ہی میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے، اور پھر یہ تو صرف ایک معمولی بخار تھا۔ لیکن میں مما کی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اگر مزید کچھ دن میرا بخار نہ اُترتا تو پھر انہیں روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے بخار کو پانچواں روز تھا کہ اچانک ہی عینی ساری چنڈال چوکڑی کے ساتھ نازل ہو گئی۔ میرا گھر ''چڑیا گھر'' میں تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے آتے ہی سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ میرا کمرا کچھ ہی دیر میں کسی میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔ مما نے میرے سارے دوستوں کو لنچ کر کے جانے کا کہا۔ کاشف نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ''آنٹی لنچ کا وقت تو ہو ہی گیا ہے، آپ ڈنر کی تیاری بھی کر لیں کیونکہ اب ہم اس مریض کا مرض دُور کیے بنا یہاں سے نہیں ٹلنے والے.....'' مما ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ہیلتھ منسٹر کا پیٹو بیٹا جواد بولا ''لیکن تمہیں ہوا کیا ہے۔ ریس والے دن تو تم بھلے چنگے تھے.....؟'' کاشف نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا ''اسے روگ لگ گیا ہے..... کوئی چہرہ بھا گیا ہے اسے۔'' عینی زور سی چونکی۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کاشف کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ عینی نے غور سے میری جانب دیکھا ''کیا مطلب..... میں کچھ سمجھی

نہیں..... اور ہاں..... کاشف بتا رہا تھا کہ تم دونوں اس جمعرات کو بھی درگاہ گئے تھے..... کہیں یہ روگ وہیں کا پالا ہوا تو نہیں ہے.....؟'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے کاشف کو گھورا۔ کسی کے پول کا ڈھول پیٹنا تو کوئی اس سے سیکھے۔ کاشف نے گھبرا کر کندھے اُچکائے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ میں نے بات کا رُخ موڑنے کی کوشش کی۔ ''تم بھی کس ایڈیٹ کی باتوں پر یقین کر بیٹھی ہو۔ ہم درگاہ گئے ضرور تھے لیکن ایک شان دار کار کے مالک کی کھوج میں.....'' لیکن عینی بھی بلا کی ذہین تھی۔ اُسے مطمئن کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور وہ دھیرے سے بولی۔ ''خدا کرے کہ یہ کھوج صرف ایک شان دار کار تک ہی محدود رہے۔'' بات آئی گئی تو ہوگئی لیکن پھر سارا دن عینی کا موڈ آف رہا۔ وہ لوگ شام تک میرے گھر میں دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ جاتے ہوئے مما نے اُن سب سے وعدہ لیا کہ وہ لوگ اب آتے رہا کریں گے۔ ''عینی سب سے آخر میں گاڑی میں سوار ہوئی اور مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی باقی سب کے ساتھ رُخصت ہوگئی۔ مما میرے قریب ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''نائس گرل ساحر..... ہے نا'' مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''آپ جیسا سوچ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے.....'' ''اگر ویسا ہو بھی جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا مائی چائلڈ..... بس تم خوش رہا کرو.....''

مما بھی مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئیں۔ لیکن ہم انسانوں کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی تھا کہ ہم کبھی بھی خوشی کا کوئی مستقل فارمولا ہی تلاش نہیں کر پائے تھے۔ دو انسانوں میں سے کوئی ایک بات جو پہلے کے لیے خوشی کا سامان کرسکتی ہے، وہی بات دوسرے کے لیے انتہائی معمول کی خبر ثابت ہوتی ہے۔ شاید خوشی کا تعلق ہمارے اندر کی ضروریات سے ہوتا ہے۔ کوئی سڑک پر گرا ایک روپے کا سکہ پا کر بھی خوشی سے نہال ہو جاتا ہے اور کسی کو بزنس میں کروڑوں کا فائدہ بھی مہمیز نہیں دے پاتا۔ ان دنوں میرے لیے بھی خوشی کے معنی یکسر بدل گئے تھے۔ گاڑیوں کی دوڑ اور ہیوی بائیکس کی ریس، جو چند دن پہلے تک میرا جنون تھا، اب اس شغل میں بھی میرا دل نہیں اٹک رہا تھا..... جیسے جیسے جمعرات کا دن قریب آتا جا رہا تھا، میرے اندر پھر سے ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی جا رہی تھی اور پھر جمعرات کا دن بھی آ گیا۔ مما صبح پاپا کے ساتھ ہی نکل چکی تھیں لہٰذا مجھے روکنے والا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے معمول کی

طرح اپنی گاڑی نکالی اور سہ پہر ہونے سے بھی کافی قبل ساحلی درگاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج اندر بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی خاص ہستی وہاں آئی ہوئی ہو۔ زہرا کی گاڑی عصر کے قریب وہاں آتی تھی اور ابھی تو ظہر کی اذانیں بھی ٹھیک طرح سے شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے عبداللہ کی تلاش میں یہاں وہاں نظر دوڑائی اور پھر وہ مجھے صحن کے وسط میں کسی شخص کے گرد ہجوم میں ایک جانب کھڑا نظر آ گیا۔ اُس نے مجھے دُور سے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ میرا جسم بخار سے پھنک رہا تھا اور اس وقت مجھے کسی سائے کی تلاش تھی لیکن صحن کے وسط میں تو سورج عین ہم سب کے سروں کے اُوپر آگ برسا رہا تھا۔ لیکن میں عبداللہ کے بلاوے پر انکار نہ کر سکا اور اُس کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

قریب جانے پر میں نے ایک باریش بزرگ کو لوگوں کے درمیان بیٹھے پایا۔ اس بوڑھے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا، جو انسان کو اُس کی جانب دوسری نظر ڈالنے سے روکتا تھا۔ آس پاس سبھی لوگ نہایت مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ بزرگ کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جسے وہ آنکھیں بند کیے پڑھے جا رہا تھا۔ مجھے اس سناٹے سے کچھ عجیب سی وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں نے اُلجھن آمیز انداز میں عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے آنکھیں میچ کر مجھے خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اچانک اس بزرگ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زور سے گرج کر بولا

''آ گیا تو.....اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟''

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا

میں نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا، لیکن وہ بزرگ مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے دھیرے سے بزرگ کے کان میں کچھ کہا۔ اُس نے زور سے اپنے لمبے بال جھٹکے اور مجھ پر ایک نگاہِ غلط ڈالی۔ ''جانتا ہوں میں..... اس ساحر کو بھی اور اس کے سحر کو بھی..... اس سے پوچھو کہ یہ یہاں کس پر اپنا سحر پھونکنے آیا ہے..... یہاں اس کی دال نہیں گلے کی.....'' پھر یکایک نہ جانے اُس بوڑھے کو کیا ہوا۔ ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا..... جب لاد چلے گا بنجارا.....'' پھر وہ بزرگ ایک دم ہی یوں مراقبے میں چلا گیا جیسے اُسے ہم سب سے کوئی غرض ہی نہ رہی ہو۔ عبداللہ نے اشارے سے بھیڑ کو چھٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ خاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر دُور ہٹ گئے۔ عبداللہ بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے درختوں کے سائے کی طرف چلا آیا، جہاں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دفعتہً عبداللہ کو احساس ہوا کہ میرا ہاتھ تپ رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے کو چھوا۔ ''اوہ..... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔'' عبداللہ نے جلدی سے گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر مجھے پیش کیا۔ پانی پیتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح تک میں اس کی تاثیر اُترتی چلی گئی ہو۔ میرا دل چاہا کہ میں عبداللہ سے پانی کا ایک اور گلاس مانگ لوں، لیکن جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا۔ عبداللہ نے تشویش سے میری جانب دیکھا ''یہ حالت کب سے ہے تمہاری.....؟'' ''پچھلی جمعرات سے..... جب میں درگاہ سے واپس گھر پہنچا تھا، تب سے اِسی طرح اس بخار میں پھنک رہا ہوں.....'' میری بات سن کر عبداللہ نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا ''اچھا میری بات چھوڑو..... یہ بتاؤ یہ بڑے میاں کون ہیں..... اور اتنے جلال میں کیوں ہیں.....؟'' عبداللہ میری بات سن کر چونکا اور جب اُسے میرا اشارہ سمجھ میں آیا تو ایک گہری مسکراہٹ اُس کے چہرے سے چھلک پڑی۔ ''اوہ..... وہ..... بھئی وہ بڑے میاں تو ہمارے بھی بڑے ہیں..... ہم انہیں حاکم بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔'' ''کیا مطلب.....

کیا یہی صاحب تمہارے باس ہیں؟'' باس کا لفظ سن کر عبداللہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ ''ہاں میاں..... باس بھی کہہ سکتے ہو..... مجھے اور مجھ جیسے اور بہت سوں کو حاکم بابا کے ذریعے ہی احکامات ملتے ہیں۔ کس نے کہاں جانا ہے، کہاں رُکنا ہے؟ کس علاقے میں کس کارندے کی ضرورت ہے، کس طرح کے لوگوں میں تعلیم کس طرح بانٹنی ہے..... یہ سارے معاملات حاکم بابا ہی طے کرتے ہیں۔'' میں حیرت سے عبداللہ کی بات سنتا رہا۔ ''کارندے.....؟ کیا مطلب.....؟ کیا تمہاری طرح اور بھی خدمت گار ہیں اس درگاہ کے اندر.....؟ مطلب تم لوگوں کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ لیکن تم نے ابھی تعلیم کی بات کی تھی..... تم لوگ کیسی تعلیم دیتے ہو لوگوں کو..... اور کیا حاکم بابا کے اُوپر بھی کوئی اور عہدے دار موجود ہے.....؟'' ''تعلیم سے مراد کوئی اسکول کی پڑھائی نہیں ہے..... بس لوگوں کی خدمت کرنا ہوتی ہے..... جیسے میں اس درگاہ میں آنے والے زائرین کی مدد کرتا ہوں..... انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، یا کسی قسم کی معلومات درکار ہوں تو وہ میں انہیں فراہم کرتا ہوں..... جب کہ حاکم بابا سے اُوپر کے تمام انتظامات سلطان بابا سنبھالتے ہیں۔ البتہ ہمارا اُن سے رابطہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ دراصل سلطان بابا، حاکم بابا اور ان جیسے دوسروں کے بھی 'باس' ہیں..... ہم تو اُن کے ماتحتوں کے بھی ماتحت ہیں.....''

میری حیرت لحہ بہ لحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مطلب یہ کہ حاکم بابا جیسے بھی دیگر کئی حکام موجود تھے۔ پھر تو سلطان بابا واقعی کوئی ہستی ہوں گے، کیونکہ میری تو آدھی جان حاکم بابا کا جلال دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ جانے سلطان بابا کے رُعب اور جلال کا کیا عالم ہوگا؟ گویا ان لوگوں کی پوری ایک انتظامیہ تھی، جیسے اسسٹنٹ کمشنر کے اُوپر ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے اُوپر کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ اِسی طرح عبداللہ کے اُوپر کی چین آف کمانڈ بھی پوری طرح متحرک تھی۔ لیکن اس نفسانفسی کے دور میں جب بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹنے پر تلا ہوا ہے، ایسے بے غرض اور لے لوٹ لوگ بھی موجود ہیں جو صرف دوسروں کی تکلیف اور درد کو دُور کرنے کے لیے اپنا چین اور آرام تیاگ دیتے ہوں گے.....؟؟ مجھے اس بات پر اب بھی پوری طرح یقین نہیں آیا تھا..... اور پھر ان لوگوں کے اپنے اخراجات بھی تو ہوتے ہوں گے۔ یہ سارا خرچہ کون اُٹھاتا ہوگا؟ کیا سلطان بابا سے اُوپر بھی کوئی عہدے دار موجود ہوگا؟ جیسے کمشنر کے اُوپر صوبے

کا چیف سیکرٹری ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسے نہ جانے کتنے سوالات کلبلا رہے تھے۔ لیکن ایک دم ہی گھنیرا سایہ سا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے گرم تپتی دوپہر میں ٹھنڈے پانی سے بھری کوئی بدلی سورج کے عین سامنے آ کر رُک گئی ہو۔ وہ ماہ جبیں اپنے کومل قدم درگاہ کے صحن میں دھر چکی تھی اور حسب معمول اُس کی ماں اور خادمہ بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ جانے موسم کی تمام شدت اور دھوپ کی ساری حدت ایک ہی پل میں کہاں غائب ہوگئی۔ مجھے یوں لگا کہ دُور سمندر کی طرف سے چلنے والی پروائی نے ساری درگاہ کے گرد اپنا گھیرا باندھ دیا ہو۔ کسی ایک شخصیت کی موجودگی ہمارے اردگرد کے موسم پر اس قدر شدت اور تیزی سے کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے؟..... مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ کیا باہر کے سبھی موسم جھوٹے ہوتے ہیں اور اُن کا تعلق صرف ہمارے اندر کے موسم ہی سے ہوتا ہے۔ وہ پری رُخ اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی، جیسے پانیوں پر قدم رکھتی ہوئی حاکم بابا کے بالکل سامنے جا بیٹھی تھی۔ حاکم بابا نے اُس کے سلام کے جواب میں دعا دی اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مطلب یہ کہ وہ پہلے بھی حاکم بابا سے مل چکی تھی۔ حاکم بابا نے زہرا کی ماں سے کچھ پوچھا اور قریب کھڑے خادم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اُس پر کچھ پڑھا اور پھونک کر زہرا کو پینے کے لیے دے دیا۔ میں اُس ماہ وش کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے عبداللہ کے اُٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آج یہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے زہرا سے ہم کلام ہونے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اُس سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آخر وہ کون سی منت ہے جو اُسے یہاں اس ویرانے میں اتنی دُور تک کھینچ لائی ہے؟ وہ تو خود کسی منت کی طرح ہے، جس کی قبولیت کے لیے ایک عالم تا عمر سجدے میں پڑا رہ جائے..... روپ کی ایسی دولت، دنیا میں کچھ کم ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو خود ایک دعا تھی..... پھر وہ اپنا وقت دعاؤں میں کیوں ضائع کر رہی تھی۔

میں جانے کتنی دیر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے گم صم سا بیٹھا رہا۔ ہوش اُس وقت آیا جب وہ تینوں واپسی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں جلدی سے پانی کا بھرا گلاس لے کر درگاہ کے داخلی دروازے کے قریب بھیڑ سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جب وہ تینوں میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں نے جلدی سے پانی کا گلاس زہرا کے سامنے کر دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رُک

گئی۔ اُس کے پیچھے آئی اُس کی ماں اور خادمہ کو بھی رُکنا پڑا۔ میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا لیکن خود میرے حلق میں شدید پیاس کے مارے کانٹوں کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا۔ زہرا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ پھر شاید اُس کی ماں نے مجھے پہچان لیا کہ میں وہی ہوں جس نے پچھلی مرتبہ بھی زہرا کے لیے پانی پیش کیا تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں اور زہرا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ''لے لو بیٹا..... پانی کا انکار نہیں کرتے.....''

زہرا نے چپ چاپ میرے ہاتھوں سے گلاس لے کر اپنے نازک لبوں سے لگا لیا اور چند گھونٹ پی کر واپس میری جانب بڑھا دیا۔ میں اُسے اس محویت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہے۔ مجبوراً اُسے ہلکا سا کھنکارنا پڑا اور میں چونک سا گیا۔ میں نے جلدی سے شرمندگی کے عالم میں گلاس واپس لے لیا اور نادم لہجے میں کہا، ''معاف کیجیے گا..... میرا دھیان کسی اور جانب تھا'' اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چادر درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ زہرا کی ماں نے گزرتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔ ''جیتے رہو بیٹا..... کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو..... خدا تمہاری آرزو پورے کرے۔'' پتا نہیں اچانک ہی میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ ''کیا یہاں آ کر مانگنے سے خدا ہر آرزو پورا کر دیتا ہے.....؟'' خاتون نے لمبی سی سانس لی اور دھیرے سے کہا۔ ''ہاں بیٹا..... جس کا نصیب ہو اُسے ملتے زیادہ دیر نہیں لگتی..... پر ہماری آزمائش شاید کچھ طویل ہے..... سدا خوش رہو.....'' وہ مجھے دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر، پیچھے دیکھا تو زہرا پہلے ہی سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور اب اُس کی ماں اور خادمہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُتر کر جا رہی تھیں۔ آج پہلی بار میں نے زہرا اور اُس کی ماں کے لباس پر غور کیا۔ وہ دونوں ہی یو پی کے مخصوص اور روایتی لباس میں ملبوس تھیں۔ زہرا نے جدید وضع کا کرتا پاجامہ، جب کہ ماں نے بھاری کام دار سفید شرارہ پہنا ہوا تھا۔ اُن کے لہجے کی کھنک اور الفاظ کا چناؤ بھی خالص اُردو تہذیب یافتہ گھرانوں والا تھا۔ لیکن اُس گل رُخ کے مرمریں لب تو میری کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکے۔ کاش وہ ایک ''شکریے'' کا لفظ ہی کہہ جاتی۔ آخر ایسا بھی کیا غرور، کیا گھمنڈ تھا اُسے..... لیکن پھر بعد میں، میں نے خود ہی اپنے

خیال کی نفی کر دی۔ ''نہیں..... شکر یہ جیسے تکلفات میں تو وہ لوگ پڑتے ہیں، جن کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے اور اس ماہ رُو کی تو حالت صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ کسی اور پرستان کی شہزادی ہے۔ اُسے اپنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ ایسے ظاہری آداب کا خیال رکھ پاتی۔ زہرا کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اُبھری اور میں ہاتھ میں پکڑا گلاس ساتھ کھڑے زائر کے ہاتھ میں پکڑا کر نیچے کی جانب لپکا۔ پھر ایک ساتھ تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور گاڑی کو دُور ریت اُڑاتی، شہر کی طرف جاتی، زہرا کی گاڑی کے پیچھے ڈال دیا۔

جانے یہ زہرا کا گھر دیکھنے کی خواہش تھی، یا پھر ایک مرتبہ اُس کا روپ اپنی آنکھوں میں بھر لینے کی..... لیکن میں لگاتار اُن کی گاڑی کا پیچھا کرتا رہا، حتیٰ کہ شہر کا وہ بیش قیمت مضافاتی حصہ شروع ہوگیا جہاں پرانی وضع، لیکن انتہائی متمول طبقے کی حویلیاں موجود تھیں۔ یہ تمام حویلیاں کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھیں اور زنانے، مردانے اور پائیں باغ کا جو تصور اب ہمارے بڑے گھروں میں تقریباً مفقود ہی ہو چکا تھا، وہاں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ زہرا کی گاڑی بھی ایک ایسی ہی عظیم الشان حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے اپنی گاڑی پھاٹک کے قریب لا کر روک دی۔ اندر ایک طویل سی رنگین پتھروں کی روش سے ہوتی ہوئی زہرا کی گاڑی پورچ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے اور زہرا اِسی شان سے گاڑی سے اُتری جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میں کافی دیر اِسی سحر میں حویلی کے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھا رہا اور پھر شام ڈھلے وہاں سے لوٹ آیا۔

گھر میں مما اور پاپا پریشانی کے عالم میں لان ہی میں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میری گاڑی کی آواز سنتے ہی مما تیزی سے میری جانب لپکیں۔ ''ساحر..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کتنا پریشان تھے میں اور تمہارے پپا..... کیوں ستاتے ہو ہمیں اتنا.....؟'' مما اور روہانسی سی ہو گئیں، لیکن میں انہیں منانا خوب جانتا تھا۔ ایک عجیب بات اس دوران یہ ہوئی تھی کہ میرا بخار نہ جانے دن کے کسی پہر میں بالکل ہی غائب ہوگیا تھا۔ میں نے مما کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر انہیں یقین دلایا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا خدا کر کے مما کی ناراضی ختم ہوئی اور ہم تینوں نے بہت عرصے بعد اکٹھے بیٹھ کر ڈنر کیا۔ مما کی تسلی تو ہوگئی تھی لیکن پاپا کی نگاہوں میں

ب بھی بہت سے سوال مچل رہے تھے۔ آخر ڈنر کے بعد جب ہم سب لان میں بیٹھے تھے تو
اپا نے مما سے خاص اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی کی فرمائش کی اور وہ اُٹھ کر کافی بنانے چلی
گئیں تو پاپا کو موقع مل گیا۔ انہوں نے مما کے اندر جاتے ہی جلدی سے کہا ''ہاں بھائی
وان..... کوئی سگریٹ وغیرہ ہے تو نکالو..... ابھی تمہاری مما واپس آ جائیں گی تو اُن کے
امنے دھواں نگلنا، اُگلنا مشکل ہو جائے گا.....'' میرا اور پپا کا ایک ہی برانڈ تھا۔ میں نے
ہیں جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کی۔ ایسے موقعوں پر ہم باپ بیٹا نہیں، بلکہ صرف بہت
چھے دوستوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن آج میرا سگریٹ پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پاپا
نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں سے لگائی اور میری جانب غور سے دیکھا۔ ''تم نہیں پیو گے
آج.....'' ''نہیں..... پاپا جی نہیں چاہ رہا.....'' ''میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ہر چیز
سے کچھ اُکتائے اُکتائے سے رہنے لگے ہو..... کوئی خاص وجہ.....؟ اور پھر یہ بخار.....؟.....
ھ سے شیئر نہیں کرو گے.....؟'' میں نے ایک لمبی سی سانس لی اور مما کے آنے سے پہلے مختصراً
ہرا اور اُس درگاہ کے بارے میں ہر بات بتا دی۔ مما کافی لے کر آئیں تو ہماری گفتگو میں
کچھ دیر کا وقفہ آیا۔ کافی پینے کے بعد مما کی یو ایس اے سے ایک ضروری فون کال آ گئی اور
جھے اور پاپا کو پھر سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ''کہیں تمہیں اس لڑکی سے محبت تو
نہیں ہو گئی.....''

''محبت..... نو وے پاپا..... اُس نے آج تک کبھی مجھے نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔
ہمارے درمیان کبھی گفتگو تو کیا ایک آدھ نظر تبادلہ بھی نہیں ہوا..... پھر مجھے اُس سے محبت کیسے
ہو سکتی ہے؟'' ''محبت کا تعلق لفظوں اور گفتگو سے بھلا کب ہوتا ہے؟ میں تو اسے نظر سے نظر کا
شتہ سمجھتا ہوں..... ہاں البتہ تمہارے کیس میں نظر کے اس ٹکراؤ کی بھی کمی ہے..... بہر حال
یک بات یاد رکھنا..... محبت میں مبتلا ہونے کے لیے کسی خاص اور لگے بندھے اُصول کی کبھی
ضرورت نہیں ہوتی..... یہ کسی بھی لمحے بہتی ہوا کی طرح آپ کے خون کے خلیوں میں شامل ہو
کر نسوں میں بہنا شروع کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لمحے تم اس جذبے کو پوری طرح سمجھنے
سے قاصر رہے ہو، لیکن جب کبھی تمہیں محسوس ہوا کہ یہ محبت ہی ہے تو ہمیں اطلاع کر دینا، ہم
گلے ہی دن تمہارا رشتہ لے کر اُس لڑکی کے در پر سوالی بنے کھڑے ہوں گے..... جسٹ ٹیک

یور ٹائم۔'' پاپا میرا گال تھپتھپا کر وہاں سے اُٹھ گئے۔ لیکن مجھے ایک نئے عذاب میں ڈال
گئے۔ وقت ہی تو نہیں تھا میرے پاس۔ نہ جانے کیوں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجھے ای
محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل رہا ہو، جیسے کوئی انہو
ہونے والی ہو۔

مجھ سے یونیورسٹی اور سب دوست تقریباً چھوٹ ہی چکے تھے۔ یہ اُنہی کی ہمت تھی کہ کس
نہ کسی طرح مجھے کہیں سے ڈھونڈ لیتے تھے۔ ورنہ میرے صبح وشام کہاں بسر ہو رہے تھے، اس کی
خبر خود مجھے بھی نہیں تھی۔ جب کبھی ہوش آتا تو خود کو زہرا کے گھر کے باہر، یا پھر درگاہ کے صحن
میں بیٹھا ہوا پاتا تھا۔ ایک ایسی ہی گرم دوپہر، جب میں درگاہ کے صحن میں پہلا قدم ہی رکھ پا
تھا کہ حاکم بابا کی کڑکتی ہوئی آواز نے میرے قدم وہیں جما دیئے۔ ''جا..... نکل جا یہاں
سے..... اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس آستانے پر کوئی جگہ نہیں ہے۔'' میں
نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں تو حاکم بابا کو عین اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ پھر زور سے چلائے
''آخر کب تک لڑے گا..... میں کہتا ہوں ہتھیار ڈال دے.....'' اتنے میں اُن کے پیچھے سے
ایک ملائم سی آواز اُبھری۔ ''حاکم..... بچے کو تنگ مت کر..... اسے اندر آنے دے.....'' حاکم
بابا سامنے سے ہٹے تو اُن کے پیچھے ایک عجیب نورانی چہرے والے سرخ وسپید رنگت والے
بزرگ کھڑے نظر آئے۔ ''آؤ بچے..... اندر آ جاؤ..... میرا نام سلطان ہے..... یہ سب مجھے
سلطان بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔''

جانے سلطان بابا کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی۔ اُن سے نظر ملتے ہی مجھے زور کا چکر
آیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہوش کی وادیوں سے دُور چکرا کر زمین پر گر چکا تھا۔ آخری آواز
جو میرے کانوں میں اُبھری وہ کسی زائر کی تھی ''ارے کوئی اسے پکڑو..... لڑکا بے ہوش ہو گیا۔

محبت سی ہو گئی ہے

جب مجھے ہوش آیا تو میں شہر کے مہنگے ترین ہسپتال کے بستر پر تھا۔ پاپا، مما اور میرے سب ہی دوست پریشان سے میرے سرہانے کھڑے تھے۔ کاشف نے بتایا کہ انہیں ہسپتال ہی سے کسی نے فون کر کے یہاں بلایا تھا اور اُن کے مطابق مجھے درگاہ سے عبداللہ نامی کوئی لڑکا میری ہی گاڑی میں ڈال کر کسی ڈرائیور کے ہمراہ یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے مما، پاپا کے آنے تک وہیں انتظار کیا اور پھر گاڑی کی چابی اُن کے حوالے کر کے چل دیا۔ تب تک ڈاکٹرز میرے تمام ٹیسٹ وغیرہ کروا چکے تھے اور انہوں نے عبداللہ کی موجودگی ہی میں بتایا تھا کہ ''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہوسکتا ہے دھوپ کی زیادتی کی وجہ سے چکر آ گیا ہو۔'' پاپا نے ہی میرے دوستوں کو اطلاع کروائی تھی۔ وہ سب ہی مجھ سے کوئی نہ کوئی بات کر رہے تھے، سوائے عینی کے..... وہ بالکل ہی خاموش اور چپ چاپ سی ایک جانب کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں نرس نے انہیں میرے آرام کی خاطر جانے کو کہا تو وہ سب ایک ایک کر کے مجھ سے رُخصت ہو گئے۔ سب سے آخر میں عینی میرے بستر کے قریب آئی اور ہاتھ ملاتے ہوئے دھیرے سے بولی ''میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہاری درگاہ کی منت پوری کر دے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی بھرائی ہوئی آنکھیں چھلکنے کو تیار ہی تھیں۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے کاشف نے سب کچھ بتا دیا ہے ساحر..... مجھے اپنی ہار سے زیادہ اُس لڑکی کی جیت پر خوشی ہے۔ چلو کوئی تو ہے اس دنیا میں ایسا جو پہلی ہی نظر میں تمہارے دل میں اُترنے کا ہنر جانتا ہے..... میری مانو تو اب دیر نہ کرنا..... کبھی کبھی محبت میں اک ذرا سی دیر بھی صدیوں کی مسافت بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے..... چلتی ہوں..... اپنا بہت خیال رکھنا۔'' عینی پلٹ کر چل دی۔ میں اُسے پیچھے سے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ مما جو اس وسیع و عریض کمرے کی دوسری جانب ڈاکٹر سے میرے متعلق کسی بحث میں مشغول تھیں، انہوں نے غور سے عینی کو یوں پلٹ کر جاتے اور مجھے اُسے روکنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے دیکھا۔

اتنے میں کاشف نے اندر جھانکا تو میں نے غصے سے اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس قریب آتے ہی اپنے کان پکڑ لیے اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہتا، وہ خود تیزی سے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں، تمہیں بہت بُرا لگا ہوگا، لیکن یقین کرو یار میر پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تمہاری حالت کی وجہ سے اُسے پہلے دن ہی سے تم پر شک ہوگیا تھا اور پھر جس طرح سے تم یک دم غائب ہوگئے میرے پاس اُس کے سوالوں کا کو جواب نہیں رہ گیا تھا۔'' ''لیکن تم نے اُس سے یہ کیوں کہا کہ مجھے زہرا سے محبت ہوگئی ہے۔

''میں نے اُس سے ایسا کچھ نہیں کہا یار..... لیکن تمہارے پاگل پن کی یہ جتنی علامات ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی بھی شخص یہی سمجھے گا کہ تمہیں محبت ہوگئی ہے۔'' میں نے کاشف کو گھورا۔ اُس نے ڈر کر جلدی سے بات بدلی ''میرا مطلب ہے کہ محبت سی ہوگئی ہے.....''

مما نے دُور سے کاشف کو آواز دی تو وہ وہاں سے ٹل گیا۔ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبنے لگا۔ کاشف ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، یہ ساری علامات اسی ایک جان لیوا بیماری کی طرف ہی تو اشارہ کرتی تھیں، جسے عرف عام میں ''محبت'' کہا جاتا ہے اور بقول کاشف، اگر محبت نہیں تو کم از کم ''محبت سی'' ضرور ہوگئی تھی۔

اور جب رات کو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں گھر پہنچا تو یہی بحث مما اور میں چھڑ چکی تھی۔ پاپا میرے بے ہوش ہونے کا دباؤ برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں گھبرا کر مما کو سب کچھ بتا دیا تھا اور اب مما بضد تھیں کہ اگر یہ ساری کیفیات، اُس ایک لڑکی کی وجہ سے تھیں تو پھر مزید انتظار کرنا سراسر حماقت ہے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی دونوں نے جھڑک کر خاموش کروا دیا اور طے یہ پایا کہ کل ہی مما اور پاپا جا کر حاجی مقبول میرے لیے زہرا کا ہاتھ مانگ لیں گے۔ شاید میرے والدین دنیا کے سب سے الگ، سب سے منفرد اور سب سے زیادہ پیار کرنے والے والدین تھے۔ حاجی مقبول صاحب کا معاشرے میں بڑا نام تھا۔ جانے ملک کے کتنے فلاحی ادارے اُن کے تعاون سے چل رہے تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زہرا اگر کسی جھونپڑی میں بھی رہ رہی ہوتی تو تب بھی مما اور پاپا اُسے جھٹ اِسی طرح اپنی بہو بنانے پر تیار ہو جاتے، صرف میری خوشی کے لیے۔ اُس نے مجھے اپنے لڑتے جھگڑتے والدین پر بے حد پیار آیا۔ انہوں نے ساری زندگی مجھے ہاتھ کا چھ

بنا کر پالا تھا اور پھر میرے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی یک سر قرار سا آ گیا۔ ''زہرا میری ہو جائے گی۔'' یہ سوچ کر ہی میرے روئیں روئیں میں سکون اور اطمینان کی ایک عجیب سی لہر دوڑنے لگی تھی۔ تو گویا یہ محبت ہی تھی اور مجھے اس دیوی کے چرنوں میں اپنے سارے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے تھے، خواہ مخواہ میں نے اتنے دن تک خود کو اس دردناک عذاب سے دوچار رکھا۔ میں ساری رات زہرا کے خیالوں میں کھویا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہوئی اور کب نوکر نے آ کر مجھے بیڈ ٹی دی۔

تیار ہو کر نیچے آیا تو مما نے بتایا کہ نہ صرف پاپا نے حاجی مقبول صاحب کو فون کر کے اُن کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، بلکہ ہم لوگ آج سہ پہر کی چائے پر حاجی صاحب کے گھر مدعو ہیں۔ میرے اندر ایک دم ہی جیسے ستار کے بہت سے تار جھنجھنا اُٹھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب تک مجھے اس جذبے کا ادراک نہیں تھا، تب تک میں اس کی کسک اور تڑپ سے بھی انجان تھا۔ اور اب، جب میں اس کا مسرور نشہ محسوس کر چکا تھا تو میرے لیے ایک ایک لمحہ کاٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ مما پاپا فوراً ہی مقبول صاحب کے گھر چلے جائیں اور آج ہی واپسی پر کسی طرح زہرا کو اپنے ساتھ لے کر ہی واپس آئیں۔ خدا خدا کر کے دن کا دوسرا پہر ڈھلا اور پاپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ میں بھی جلدی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اُترا، لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل اچانک ہی بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مما نے میرے گال تھپتھپائے اور گاڑی میں پاپا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ پاپا نے میرے جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ''بیسٹ آف لک پاپا.....!''

گاڑی زن سے نکل گئی اور میں وہیں لان میں اپنے بے قابو دل کی دھڑکنیں سنبھالنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت پھانسی کے اُس قیدی کی طرح تھی جسے یہ پتا ہو کہ چند گھنٹوں بعد اُسے تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ مجھے سادہ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اُتارنا مشکل ہو گیا۔ فوراً ہی ابکائی سی آ گئی۔ وقت اپنی جگہ جیسے جامد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ جانے کتنی صدیوں بعد شام ڈھلی اور مغرب کے وقت تک تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے آج میرا یہ جنون مجھے رُسوا کر کے ہی چھوڑے گا۔ اچانک ہی گیٹ کے باہر پاپا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چوکیدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی اندر پورچ

میں آ کر رُک گئی اور مما اور پاپا نے قدم باہر رکھے، میں تقریباً دوڑتا ہوا، اُن دونوں کے پاس جا پہنچا۔ ''کہاں رہ گئے تھے آپ دونوں.....؟ آخر اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟'' میں نے اُن کے اُترتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مما نہ جانے کیوں مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں تھیں۔ میں پاپا کی جانب لپکا ''آپ ہی کچھ بتائیے نا پاپا..... کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' پاپا نے ایک گہری سی سانس لی اور میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ ''ساحر بیٹا..... اُس لڑکی نے تمہارا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے..... آئی ایم سوری..... ہم دونوں مل کر بھی انہیں قائل نہیں کر سکے.....'' مجھے لگا، جیسے کچھ لمحوں کے لیے میری تمام سماعتیں مردہ ہوگئی ہوں، شاید میں پاپا کی بات ٹھیک سے سن ہی نہیں پایا تھا۔ بے یقینی سے انہیں پھر سے زور سے جھنجھوڑا، انہوں نے مجھے زور سے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ ایسا وہ بچپن میں بھی تب کیا کرتے تھے جب مجھے سائیکل سے گر کر، یا کھیلتے ہوئے کوئی زوردار چوٹ لگ جاتی تھی۔ چند لمحے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ پھر رفتہ رفتہ جب اُن کی بات کا مفہوم واضح ہونے لگا تو چوٹ کا درد بھی دھیرے دھیرے رگوں کو کاٹنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی زور سے چیخوں کہ اندر کا سارا شور ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔ مما وہاں رُک نہیں پائیں اور آنکھیں پونچھتی ہوئی تیزی سے اندر چلی گئیں۔

لیکن کیوں.....؟ زہرا نے انکار کیوں کر دیا تھا۔ میرا چند لمحوں کا ساتھ پانے کے لیے نہ جانے کتنی نازنینوں کا دل مچلتا تھا، لیکن وہ جسے میں نے عمر بھر کا ساتھ دینے کی پیش کش کی تھی، اُس نے ایک ہی لمحے میں میرا سارا غرور، سارا بھرم چکنا چور کر دیا..... کیوں..... کیا وہ مجھے بھی انہی ہزاروں عام لوگوں کی فہرست میں رکھتی تھی جو اُس کی ایک جھلک کے طلب گار ہوں گے.....؟..... مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹھکرائے جانے کے اذیت ناک درد کا احساس ہوا..... اس سے پہلے تو میں نے صرف جیتنا اور فتح کرنا سیکھا تھا اور میری فتوحات کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اب تو مجھے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے تھے۔ آج سے پہلے شاید یہ بات کسی نے میرے لیے ہی کہی تھی کہ ''وہ آیا، اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔'' لیکن آج کوئی مجھے دیکھتا تو صرف اتنا کہتا ''وہ آیا، اُس نے دیکھا..... اور ہار گیا۔'' کون سوچ سکتا تھا کہ بین الاقوامی تاجر، ملک کے مشہور انڈسٹریلسٹ، فیڈرل چیمبر آف کامرس کے صدر، توصیف احمد کے بیٹے کا

رشتہ ٹھکرایا بھی جا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔

پاپا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے لان میں بچھی کرسیوں کی طرف آ گئے اور دھیرے دھیرے سارا ماجرا گوش گزار کر دیا کہ حاجی مقبول اور اُن کے تمام گھر والے بہت وضع دار لوگ ہیں۔ مما اور پاپا کا استقبال ویسا ہی کیا گیا جیسا کہ اُن کے شایان شان ہو سکتا تھا لیکن لڑکی کی ماں پہلے ہی سے کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ شاید وہ مما، پاپا کے آنے سے پہلے ہی اُن کی آمد کا مقصد جان چکی تھی، لہٰذا جب پاپا نے زہرا کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُن کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حاجی مقبول نے پاپا سے کہا کہ ''وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں، لہٰذا وہ اُس کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' البتہ انہوں نے مما اور پاپا کا اس بات پر بے حد شکریہ ادا کیا کہ اتنے بڑے خاندان نے اُن کی بیٹی کو اتنی عزت دی۔ پاپا نے پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اگر حاجی صاحب چاہیں تو اِسی وقت اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کروا سکتے ہیں۔ مما میری تصویر لے کر گئی تھیں، انہوں نے وہ تصویر حاجی مقبول صاحب کی بیگم کے حوالے کی اور دم سادھے نتیجے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ لیکن شاید زہرا کی ماں کو نتیجے کا پہلے ہی سے علم تھا، تب ہی وہ کچھ ہی لمحوں میں واپس آ گئیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ ضروری تو نہیں کہ یہ رشتہ پہلا ہو، جو اس غزالہ کی چوکھٹ تک گیا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی شاید یہ عمل دہرایا جا چکا ہو۔ بلکہ ایک بار نہیں، کئی بار یہ عذاب زہرا کے ماں باپ پر وارد ہو چکا ہو، تب ہی انہیں بیٹی کے انکار کا اس قدر کامل یقین تھا۔ زہرا کے انکار کے بعد مما اور پاپا کا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا، لیکن پھر بھی مما نے ایک آخری کوشش کے طور پر زہرا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ زہرا کی ماں نے مما کو ساتھ لیا اور اُس کے کمرے تک جا پہنچیں اور پھر مما کو دروازے تک چھوڑ کر، خود وہیں سے واپس پلٹ گئیں، شاید مما کو زہرا سے کھل کر بات کرنے کا موقع دینے کے لیے۔ مما نے زہرا کو دیکھا تو بقول اُن کے وہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اُس کا حسن ہی ایسا دل موہ لینے والا تھا، لیکن وہ دل رُبا اُس وقت بھی غم و یاس کی مکمل تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اُس نے مما کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر اُن سے معافی مانگ لی کہ اگر اُس کے انکار سے مما کا دل دُکھا ہے تو وہ تہ دل سے اُن سے معذرت چاہتی ہے، لیکن اس مدعا کو مزید نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہوگا، کیونکہ اُس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس نے مما کے ہاتھ تھام کر

اُن سے یہ بھی کہا کہ جو لڑکی بھی اُن کی بہو بنے گی، وہ دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ خود کو اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتی، لہٰذا اُسے اُس کی بدنصیبی کا مزید احساس نہ دلا کر مما اُس پر احسان کریں گی۔ ظاہر ہے اس بات کے بعد مما مزید کیا کہہ سکتی تھیں۔ وہ زہرا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور شگون کے طور پر سونے کے جو جڑاؤ کنگن ساتھ لے کر گئی تھیں، وہ زہرا کے سرہانے چھوڑ کر چلی آئیں۔

پاپا نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا، جس سے ہمارے، یا زہرا کے خاندان کے نام پر کوئی حرف آئے۔ میں پاپا کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ اُٹھ کر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب یہ قصہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ مجھے اُسے جیتنا تھا، یا پھر اپنی ہار کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ البتہ میں نے پاپا کی بات کا اتنا مان ضرور رکھا کہ میں نے براہ راست زہرا کے گھر جانے سے احتراز کیا۔ ورنہ میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں بنا کہیں رُکے، اُس کے گھر کا دروازہ کھولوں اور سیدھے جا کر اُس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ جمعرات آنے میں ابھی دو دن باقی تھے اور یہ دو دن میں نے کس طرح کاٹے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔

تیسرے دن میں نے گاڑی نکالی اور مما کی آوازوں کی پروا کیے بنا تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا ساحل کی جانب نکل پڑا۔ عبداللہ مجھے درگاہ کی سیڑھیوں پر ہی مل گیا۔ شاید وہ قریبی بستی سے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے درگاہ سے باہر نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اُس دن بے ہوش ہونے کے بعد میں نے بے مروتی کی انتہا ہی تو کر دی تھی۔ مجھے کم از کم عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تو ایک بار یہاں آنا چاہیے تھا، لیکن عبداللہ نے اپنے رویے سے ذرہ بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم اتنے دن بعد مل رہے ہیں۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔ وہ اُوپر درگاہ میں میرا انتظار کرے، میں وہیں آ کر اُس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔ عبداللہ سر ہلا کر اُوپر چلا گیا اور میں نے وہیں پتھریلی سیڑھیوں کے پہلے پائیدان پر ڈیرہ جما لیا۔ لوگ سیڑھیاں اُترتے، چڑھتے رہے اور میں اُن کے قدموں سے اُلجھتا رہا، لیکن آج میں نے وہاں سے نہ اُٹھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جانے مجھے یونہی لوگوں کی ٹھوکروں میں بیٹھے کتنی دیر

گزری تھی کہ اچانک ہی دُور سے مجھے زہرا کی گاڑی ریت اُڑاتی درگاہ کی جانب آتی دکھائی دی۔ مجھے یوں لگا کہ ایک ہی لمحے میں میرے جسم کا سارا خون میری کن پٹیوں کی جانب دوڑنے لگا ہو۔ میں ہیجانی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب آ کر رُک چکی تھی اور اس میں سے حسب معمول وہی پرانی خادمہ، زہرا کی ماں اور خود زہرا اُتر رہی تھیں۔ سب سے آگے زہرا کی ماں، پھر زہرا اور پھر سب سے پیچھے زہرا کی خادمہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درگاہ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے اُن میں سے کسی کی نظر اب تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جیسے ہی زہرا کی والدہ نے مجھے کراس کیا، میں ایک دم زہرا کے بالکل اور عین سامنے آ کر کسی چٹان کی طرح جم گیا۔ زہرا جو اپنی ہی دُھن میں سر جھکائے آگے بڑھ رہی تھی، ایک دم ٹھٹھک کر رُک گئی اور غصے میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس کے لفظ اُس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔

میں سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے....."

نظر کی التجا

اُس وقت شاید خود زہرا کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں یوں ایک دم اچانک اور سرِراہ اُس کا راستہ روک لوں گا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اُس کے ماتھے پر غصے، جھنجھلاہٹ کے مارے چند شکنیں اُبھریں اور پسینے کی چند شبنمی بوندیں پھسل کر ستارہ پلکوں کو بھگو گئیں۔ زہرا کی والدہ چونکہ پہلے ہی سیڑھیاں چڑھ چکی تھیں، لہٰذا انہیں اپنے پیچھے ہوئی اس واردات کی فی الحال خبر نہ تھی۔ ویسے بھی وہاں اُس وقت زائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ کوئی زائر یہ بھی محسوس نہیں کر پایا کہ میں دن دہاڑے کسی عفت مآب کا راستہ روکے کھڑا ہوں۔ زہرا نے دوبارہ نگاہیں اُوپر نہیں اُٹھائیں اور اِسی طرح جھکے سر کے ساتھ لیکن لہجے میں شدید سختی لیے مجھ سے کہا ''راستہ چھوڑیں میرا..... آپ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا.....'' میں اپنی جگہ پر جما رہا۔ ''جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گی تب تک میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اُس کی خادمہ سراسیمہ سی پیچھے کھڑی سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بھی ضرور کھلبلی مچا رہا ہوگا کہ اُس کی بڑی مالکن اُوپر درگاہ میں صحن میں کھڑی پریشان ہو رہی ہوں گی کہ یہ دونوں پیچھے کہاں رہ گئیں؟ زہرا زچ ہو کر بولی ''آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے جس کے لیے آپ یوں.....'' میں نے درمیان ہی میں اُس کی بات کاٹ دی ''آپ نے رشتے سے انکار کیوں کیا.....؟ آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے، جو آپ کو کھٹکتی ہے.....؟'' ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ میں کوئی کمی نہیں ہے..... لیکن مجھے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں۔'' اُس کی بات نامکمل رہ گئی اور اتنے میں بھیڑ کا ایک تیز ریلا آیا اور مجھے اپنی جگہ سے دھکیل گیا۔ زہرا کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ خادمہ بھی اُس کے پیچھے لپکی۔ میں نے پیچھے سے چلا کر کہا، ''ٹھیک ہے، بات اگر زندگی کے فیصلے اور اس پر قائم رہنے کی ضد کی ہے تو پھر میں بھی آپ کو ہر جمعرات اسی درگاہ کی چوکھٹ پر پڑا ملوں گا۔ دیکھتے ہیں آپ کی خاموشی پہلے ٹوٹتی ہے، یا پھر

میری سانسوں کی ڈور.....'' زہرا بنا پیچھے دیکھے اور بنا جواب دیے تیزی سے درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اُس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ میں اُس دن کو رو رہا تھا جب پہلی بار میرے قدم اس درگاہ کی جانب اُٹھے تھے۔ نہ میں یہاں آتا، نہ میری زہرا پہ نگاہ پڑتی اور نہ ہی آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں تو بھکاریوں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ انہیں تو پھر بھی مانگنے پر کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا، پر مجھے تو ڈھنگ سے مانگنا بھی نہیں آتا تھا۔ اِسی جھنجھلاہٹ میں اور خود کو کوستا ہوا میں جانے کب درگاہ کے احاطے میں پہنچ گیا۔

زہرا اپنی ماں کے ساتھ حسب معمول دعاؤں میں مشغول تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل پھر سے ڈوبا لیکن میں دُور گھڑوں کے پاس سائے میں بیٹھے عبداللہ کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کے سامنے بہت سی چھوٹی سیپیوں اور موتیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا، جن میں سے ایک ایک دانہ اُٹھا کر وہ تسبیح بن رہا تھا۔ اُس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ''آؤ ساحر میاں آؤ..... دیکھو میں نے تمہارے لیے یہ تسبیح بنی ہے.....'' عبداللہ نے ایک چھوٹی سی مگر بے حد خوب صورت تسبیح اُٹھا کر مجھے دی۔ میں اپنے اندر کی تلخی کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ ''لیکن میں اس کا کیا کروں گا.....؟ میں نے تو آج تک کبھی تسبیح پڑھی ہی نہیں.....'' ''ارے تو کیا ہوا..... آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں..... کبھی نہ کبھی تو دل چاہے گا نا.....؟..... تب تسبیح تمہارے کام آئے گی۔'' ''شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے..... اور پھر اگر کبھی میرا دل تسبیح پڑھنے کو چاہا بھی تو میں یوں دانوں پر گن گن کر نہیں پڑھوں گا، خدا کی یاد میں یہ مول تول کیسا.....؟ اُس کی شان میں تسبیح پڑھنی ہو تو پھر یہ گنتی کیسی.....؟'' عبداللہ نے چونک کر سر اُٹھایا اور پھر کچھ دیر تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''بہت بڑی بات کہہ دی تم نے..... ہاں..... معاملہ جب اُس کی یاد کا ہو تو پھر یہ گنتی کیسی..... لیکن مجھ جیسے عام بندے تو اُس کی یاد میں بھی اس گنتی کا ڈھکوسلا شامل کر ہی دیتے ہیں..... اور پھر یہ تسبیحاں بننا تو ویسے بھی میری مجبوری ہے کیوں کہ میرے روزگار کا فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔'' ''کیا مطلب؟ کیا تم تسبیح کی یہ مالائیں فروخت بھی کرتے ہو.....؟'' عبداللہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ ''جی ساحر میاں..... آخر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہوتا ہے۔'' مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ''تمہاری بیوی اور بچہ..... کیا تم شادی شدہ ہو.....؟'' ''کیوں..... اس میں حیرت کی کیا

بات ہے..... کیا میں شادی شدہ نہیں ہوسکتا.....'' میں گڑبڑا سا گیا..... ''نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا..... دراصل ایسی درگاہوں اور ان میں بسنے والوں کو دیکھ کر ہمیشہ ساری دنیا تیاگ دینے والی کسی مخلوق کا خیال آتا ہے، شاید اِسی لیے مجھے حیرت ہو رہی ہے.....'' ''جانے مجھ جیسے ہر مجاور، یا درگاہ کے متولی کو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ پہ کیسے باور کر لیتے ہیں کہ ہم ساری دنیا تیاگ کر یہاں آ بیٹھے ہوں گے جب کہ ہمارے مذہب میں واضح طور پر رہبانیت سے منع کیا گیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ درگاہ میرے سفر کا بس ایک پڑاؤ ہی تو ہے۔'' ''اور تمہارے بیوی بچے.....؟ وہ کہاں رہتے ہیں..... شادی کب ہوئی تمہاری.....'' ''تین سال ہو گئے ہیں میری شادی کو..... ایک بیٹا ہے میرا..... احمد نام ہے اُس کا..... پچھلے ہفتے ہی ماشاءاللہ پورے دو سال کا ہوا ہے..... میری بیوی اور بچہ یہاں سے تقریباً ایک سو بیس کلومیٹر دُور میرے چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں ہر پندرھواڑے پر اُن سے ملنے جاتا ہوں..... حاکم بابا مجھ پر خاص مہربان ہیں اس لیے عید، شب برأت اور دیگر چھٹیاں بھی انہیں کے ساتھ اپنے گھر میں مناتا ہوں۔'' عبداللہ بولتا جا رہا تھا اور میں حیرت میں ڈوبا سن رہا تھا۔ یہ شخص ہر کروٹ پر میرے لیے اپنے اندر سے تحیر اور تجسس کی ایک پوٹلی لیے برآمد ہوتا تھا۔

میں عبداللہ کی باتوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے زہرا اور اُس کی ماں کے اُٹھنے کا پتا ہی نہیں چلا..... میں اُس وقت چونکا جب اُس عشوہ طراز کے نازک قدم میرے سامنے سے گزرے، میں نے چونک کر جلدی سے نظر اُٹھائی اور پل بھر ہی میں یہ کیا غضب ہو گیا، اُس راج ہنسنی کی ترچھی نظر بے خیالی میں میری جانب اُٹھی اور لمحے کے ہزارویں حصے میں میری رُوح کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ اُس نے عبداللہ کی جانب نظر بدل کر عبداللہ کو دھیرے سے سلام کیا اور آگے بڑھ گئی اور میرے دل کو جو چند لمحوں کا قرار میسر آیا تھا، وہ سب چین، قرار اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گئی۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لوں اور تب تک نہ جانے دوں، جب تک وہ تھک کر ہتھیار نہ ڈال دے لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا اور وہ درگاہ کے احاطے سے نکل گئی۔ عبداللہ غور سے میرے چہرے پر آتی جاتی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کھنکار کر میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ''میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ تم جب بھی اس لڑکی کو دیکھتے ہو، کسی اور ہی دنیا میں

پہنچ جاتے ہو۔ اُس دن اُسے پانی پلاتے وقت بھی تمہاری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔'' میں نے چونک کر عبداللہ کی جانب دیکھا، گویا سارے زمانے کو میری حالت کی خبر تھی، صرف میں ہی خود اپنے آپ سے بے خبر تھا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اس لڑکی کی ایک جھلک پانے کے لیے ہی آج تک اس درگاہ کے چکر کاٹتا رہا ہوں لیکن آج بھی میں اس سے اتنا ہی دُور ہوں، جتنا پہلے دن تھا۔'' عبداللہ ہلکے سے مسکرایا۔ ''محبت کرتے ہو اُس لڑکی سے.....؟'' میں نے گہری سی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''جانے کیا ہے..... محبت، یا کچھ اور..... اس سے بھی سوا ہے..... کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ صرف اور صرف درد اور بے چینی کا رشتہ ہے..... میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی اذیت آج تک کبھی محسوس نہیں کی..... جانے یہ کیسی محبت ہے.....؟ اور اگر یہی وہ جذبہ ہے جس کے اظہار کے لیے شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ مارے ہیں تو ایسے تمام دیوان، تمام کتب خانوں کو آگ لگا دینی چاہیے جو اس جذبے کی خوب صورتی اور حمایت بیان کرتے ہیں۔'' عبداللہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ ''ارے..... ابھی سے گھبرا گئے..... شاید تم نے غالبؔ کو زیادہ نہیں پڑھا..... چچا غالبؔ نے تو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ

؎ یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ویسے کچھ جگہوں پر تیر کر جانا بھی درج ہے.....''

میں نے غور سے عبداللہ کو دیکھا ''تم نے آج تک کبھی کھل کر نہیں بتایا کہ تم کتنا پڑھے ہو..... میرا مطلب ہے کوئی ڈگری وغیرہ.....؟'' ''کیا کوئی سند ہی انسان کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے.....؟ بہرحال تم نے تیسری مرتبہ یہ سوال پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں..... میں نے اُردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔'' یہ ایک اور جھٹکا تھا جو اُس دن میں نے سہا۔ ویسے عبداللہ کے معاملے میں تو اب تک مجھے ان سرپرائزز کا عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں پھر بھی چونکنے سے باز نہیں آتا تھا۔

اُس جمعرات کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر جمعرات خصوصی طور پر زہرا کو دیکھنے اور اُس کی راہ میں بیٹھ کر اپنا سوال پھر سے دہرانے کے لیے درگاہ کے دروازے پر اُس وقت تک کھڑا رہتا جب تک وہ وہاں سے اندر داخل نہ ہوتی..... البتہ اب میں نے اُس کا راستہ

روکنے، یا اُس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کا عمل ترک کر دیا تھا۔ زہرا کی ماں کو بھی اب اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ میں خاص زہرا کے لیے ہی ہر جمعرات درگاہ کی سنگی سیڑھیوں پر ڈیرہ جماتا ہوں اور خاموشی سے اُس وقت تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں جب تک وہ نیلم پری درگاہ سے واپس لوٹ نہیں جاتی۔ پہلی مرتبہ تو زہرا کی والدہ مجھے وہاں اس اُجڑی حالت میں بیٹھا دیکھ کر بالکل گھبرا سی گئیں، میری شیو بہت بڑھ چکی تھی اور جینز اور شرٹ بھی بالکل ملگجی ہو رہی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا اور بہت دیر تک گم صم کھڑی رہیں۔ میں اُن سے نظر نہیں ملا پایا اور وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ لیکن اگر میں زہرا کی ماں سے نظر نہیں ملا پایا تھا تو دوسری جانب زہرا بھی میری طرف دیکھنے سے احتراز کرتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔ رفتہ رفتہ میری نظر کی اس التجا اور زہرا کی نظر کے اس بے رحم احتراز کا یہ کھیل ہمارا معمول ہی بنتا گیا۔ ایک جمعرات کے بعد دوسری جمعرات آتی گئی اور میں اپنی ہر التجا، اپنی ہر بے بسی اور اپنی ہر طاقت اپنی اس ایک نظر میں سموتا گیا جو درگاہ کی ان سیڑھیوں پر بیٹھے ہر جمعرات میں اس سنگ دل کے قدموں میں نچھاور کرتا تھا لیکن اس سنگ مرمر کی مورت کو پگھلنا تھا، نہ وہ پگلی۔ لیکن میں نے بھی نظر کی اس خاموش جنگ کو اس کے منطقی انجام تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری پڑھائی، دوست اور رنگا رنگ زندگی کی ہر خوشی، مصروفیت مجھ سے چھن چکی تھی۔ مما اور پاپا دن رات میری حالت دیکھ کر کڑھتے اور جلتے رہتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بھی میری ضد اور جنون سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے مما کے دن رات بہتے ہوئے آنسو بھی مجھے میری دیوانگی کی راہ سے نہیں ہٹا سکے۔

پھر ایک جمعرات اک عجیب سی بات ہوئی۔ اب میں نے درگاہ کے اندر جانا تقریباً موقوف ہی کر دیا تھا اور زہرا کے آنے سے پہلے درگاہ کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ جب زہرا آ کر اُوپر درگاہ میں چلی جاتی، تب بھی اُس وقت تک باہر ہی بیٹھا رہتا اور زہرا کی واپسی کا انتظار کرتا۔ وہ پلٹ کر واپس چلی جاتی تو میں اپنے گھر کی راہ لیتا۔

ایک ایسے ہی دن، میں تپتی دھوپ میں بیٹھا زہرا کی راہ تک رہا تھا اور جانے کن خیالوں میں کھویا ریت پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا..... کہ اچانک ایک کڑک دار آواز سن کر چونک کر نظریں اُٹھائیں۔ کچھ دیر تک تو سورج کی کرنوں سے چندھیائی ہوئی میری نظریں اُس

شخص کے خاکے کو پہچان ہی نہیں پائیں، جو میرے سر پر کھڑا شعر پڑھ رہا تھا

؎ تیرا چہرہ ہے جب سے آنکھوں میں
میری آنکھوں سے لوگ جلتے ہیں

اور جب اُس شخص کا چہرہ واضح ہوا تو میں حیرت سے اُچھل ہی تو پڑا، وہ حاکم بابا تھا۔ آج اُن کی آنکھوں سے اس روایتی جلال کی جگہ ایک عجیب سی نرمی چھلک رہی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے حسب معمول اُن کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ''تو اندر کیوں نہیں آتا لڑکے..... یہاں باہر کیا بازار سجا رکھا ہے.....؟ کسے بھسم کرنا چاہتا تھا.....؟ وہ تو خود جل کر پہلے ہی راکھ ہو چکی ہے۔'' میں نے چونک کر نظر اُٹھائی..... گویا انہیں بھی میرے فسانے کا علم تھا۔ پتا نہیں اور کتنے لوگ ہوں گے جو میری اس وحشت سے واقف ہوں گے۔ صرف اُسی کو اب تک خبر نہ ہو سکی تھی جس کے لیے میرا یہ سارا جنون تھا۔ میں نے دھیرے سے سر جھکا کر انہیں جواب دیا۔ ''میرا دل نہیں چاہتا اندر آنے کو..... اور پھر اُس دن آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس درگاہ کے احاطے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔'' حاکم بابا مسکرائے ''لگتا ہے تو نے ہماری بات دل پہ لے لی ہے..... چل آج سے ہم خود تجھے اجازت دیتے ہیں، جب کبھی دل چاہے تو اُوپر آ جانا..... پر یاد رکھ..... دل کسی کا دوست نہیں ہوتا..... اس کی نہ دوستی بھلی اور نہ ہی دشمنی اچھی.....'' حاکم بابا کا یہ روپ میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی نرمی، حلاوت تو کبھی نہ تھی اُن کے لہجے میں۔ وہ یونہی مسکراتے ہوئے اپنے چند مریدوں کے ساتھ اُوپر درگاہ کی جانب بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اُوپر سے ایک زائر ہاتھ میں ایک رقعہ اور چند کھجوریں لے کر نیچے اُترا اور دونوں چیزوں کو میرے حوالے کر کے واپس لوٹ گیا۔ میں نے خط کھولا تو عبداللہ کی تحریر تھی ''کہو ساحر میاں.....؟ آخر ہمارے حاکم بابا پر بھی اپنا سحر پھونک ہی ڈالا؟ یہ چند کھجوریں خود انہوں نے تمہارے لیے بھجوائی ہیں..... کہتے ہیں اُس دل جلے کے لیے بھجوا دو، جو نیچے دھوپ میں بیٹھا سورج کے ساتھ اپنے مقدر کی جنگ لڑ رہا ہے..... بھئی واہ..... ایسی مہربانی تو آج تک حاکم بابا نے ہم میں سے کسی پر بھی نہیں کی..... جیتے رہو.....

تمہارا دوست.....عبداللہ"

عبداللہ کی تحریر نے چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی، میرے ہونٹوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ضرور بخش دی تھی۔ اُس نوجوان کو گفتگو کا نایاب فن آتا تھا اور سب سے زیادہ آسانی اور سہولت سے ہم اگر کسی دوسرے کو کوئی خوشی دے سکتے ہیں تو وہ ہماری باتیں ہی تو ہیں۔ سچ ہے کہ یہ صرف لفظ ہی ہیں، جو سب کچھ بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں ابھی عبداللہ کی تحریر کے تانے بانے ہی میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک ہی مجھے اُسی تیزی سے پروائی کے چلنے کا احساس ہوا جو ہمیشہ مجھے زہرا کی آمد کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو اُس زہرا جبیں کی گاڑی آ کر رُک چکی تھی اور وہ اپنی خادمہ کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن آج زہرا کی ماں اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں.....؟ میں حسب معمول اور حسب توقع اس انتظار میں اُس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ کب وہ ہمیشہ کی طرح میری نظر سے بچتی ہوئی اور بنا میری طرف دیکھے، درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر تو میرے جسم سے جیسے ساری جان ہی نکل گئی کہ اُس کا رُخ سیدھا میری ہی جانب تھا۔ وہ غصے میں تنتنائی ہوئی میری جانب بڑھی چلی آئی اور عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر اُس کے یاقوتی لب ہلے....."آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں.....؟..... اس طرح مجھے بدنام کر کے آپ کو کیا مل جائے گا.....؟؟"

رقیب

اتنی صدیوں کے بعد اُس نازک ادا کے نازک لب ہلے بھی تو ایک شکوے کے لیے.....
غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پلکیں لرز رہی تھیں۔ میری نظر چند لمحوں کے لیے اُس کی نظر سے ٹکرائی تو اُس نے جھک کر اپنی پلکیں جھکا لیں۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا کہ مجھ جیسا سرِراہ بیٹھا دیوانہ بھی کبھی کسی کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے.....؟ اور پھر آپ کو بدنام کرنا ہی میرا مقصد ہوتا تو میں یہاں اس درگاہ کے باہر بیٹھنے کے بجائے آپ کے گھر کے باہر اپنا ڈیرا جماتا..... یہاں تو آس پاس مجھ جیسے جانے اور کتنے مقدر جلے اپنی اپنی قسمت کی دھوپ سینک رہے ہیں..... پھر آپ کو مجھی سے شکوہ کیوں ہے.....؟''

وہ غصے سے بولی ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے یہ شکایت کیوں ہے۔ آپ کی اس ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے امی اتنی پریشان ہو گئی ہیں کہ انہوں نے بستر پکڑ لیا ہے۔ وہ اتنی بیمار ہیں کہ آج میرے ساتھ درگاہ تک آنے کی طاقت نہیں تھی اُن میں..... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں آس پاس بسنے والے سبھی لوگ بہرے، گونگے، یا اندھے ہیں، جنہیں کچھ نظر نہیں آتا.....؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ایک غلط مقصد کے لیے اس درگاہ جیسی پاک جگہ کا انتخاب کیا ہے..... شاید آپ مجھے رُسوا کر کے اپنی اس ہزیمت کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں جو آپ کی 'ناقص رائے' میں میرے انکار کی وجہ سے آپ کو اُٹھانا پڑی ہے۔'' اُس کے لفظوں کی کئی آریاں میرے دل پر چل گئیں۔ گویا میری ساری تپسیا کو ایک گھٹیا انتقام کا نام دیا جا رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ میں اپنے جذبے کی تذلیل پر ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ بھول گیا اور ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل ہی باہر اُلٹ دیا۔ ''مجھے آپ کی والدہ کی پریشانی اور بیماری کا سن کر نہایت افسوس ہوا ہے۔ کاش میں بھی آپ کی طرح اپنی اس ساری بربادی کا الزام آپ پر ڈال سکتا۔ لیکن افسوس میں تو اتنا مجبور ہوں کہ آپ کو موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر خود میرا اختیار نہیں

ہے۔ مجھے کون سا جذبہ کھینچ کر یہاں لا بٹھاتا ہے، میں خود اس سے اب تک اَن جان ہوں
کاش میرا اپنے آپ پر کوئی اختیار ہوتا تو میں کبھی خود کو یوں سرِ بازار رُسوا نہ ہونے دیتا۔"
مزید زچ ہوگئی۔ "لیکن یہ تو زبردستی ہے۔ آپ کا جذبہ کسی دھونس دھمکی کی طرح میری راہ میں
رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ بات اگر اختیار کی ہے تو میں خود بھی بے اختیار ہوں اور آپ میرا
بے خودی کے راستے میں زبردستی آ کھڑے ہوئے ہیں۔" مجھے اُس کم گو سے اتنی بات کی اُمید
بھی نہ تھی لیکن خلاف توقع اُس کے پاس لفظوں کا ذخیرہ وسیع تھا۔ "آپ میرے سوال کا
جواب دے دیں، میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گا۔" لیکن اُس نے بھی جیسے میری ضد کے
سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے اپنی شرط منوانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ "ٹھیک ہے لیکن آپ کو بھی
ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ میرے جواب کے بعد آپ کوئی دوسرا سوال نہیں کریں گے اور آئندہ
میری راہ میں اپنے کسی جذبے کی دیوار نہیں کھڑی کریں گے۔" میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی
جواب سے پہلے میرے اردگرد اپنے بھرم کا آہنی قلعہ ضرور تعمیر کرے گی لیکن اُس کی بات مان
لینے کے علاوہ اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ "ٹھیک ہے..... میں وعدہ
کرتا ہوں۔" ہمارے اردگرد زائرین کا ہجوم سیڑھیاں چڑھ اور اُتر رہا تھا اور آس پاس عصر کے
وقت درگاہ پر دی جانے والی ایک مخصوص جڑی بوٹی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہم اتنی دیر سے
وہیں درگاہ کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے لیکن وہاں کسی کو ہم پر توجہ دینے کی فرصت
کہاں تھی۔ زہرا نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال کر اُسے پوری طرح ڈھک لیا۔ "میں نے آپ
کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے رشتے سے انکار کی وجہ آپ کی ذات میں کوئی کمی، یا خرابی نہیں
ہے۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں اور کسی بھی لڑکی کی خوش بختی
ہوگی کہ وہ آپ کے گھر کی بہو بن سکے لیکن میری قسمت میں کاتب تقدیر نے یہ سکھ نہیں لکھا
میری نظر میں کوئی اور سما چکا ہے اور دل کے سودوں میں زبردستی نہیں چلتی ساحر صاحب.....
اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا اور اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔"
میرے دل پہ جیسے ایک ہی لمحے میں کئی قیامتیں آ کر گزر گئیں۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا
اور وہ جانے کب کی سیڑھیاں چڑھ کر آگے بڑھ چکی تھی، حالانکہ میں گزشتہ کئی ہفتوں سے اُسے
یہاں اپنی کسی منت کے سلسلے میں آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اُس کی حالت ابتر، خود اُس

فسانہ سناتی تھی کہ ہو نہ ہو، معاملہ یہاں بھی کچھ دل کا ہی ہے۔ لیکن آج اُس کی زبانی اس
لے اقرار نے جیسے میرے وجود کے اندر آگ سی بھر دی تھی۔ اس اَن دیکھے رقیب کی رقابت
رشک کے ملے جلے جذبات نے میرے دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ کیا کوئی اس
میں اتنا خوش نصیب بھی ہوسکتا ہے، جس کے لیے زہرا جیسی پری، خود منت مانگنے کے لیے
درگاہ تک چل کر آتی ہے.....؟ وہ گل رُخ تو خود کسی منت کی طرح تھی تو وہ کیسا ہوگا جس
لیے یہ منت خود اپنے گھٹنے ٹیکے اس درگاہ کی سنگ مرمر کی جالی سے جبیں زخمی کرنے ہر ہفتے
آتی ہے؟ وہ کون ہوسکتا ہے جس کا پتھر دل اس موم کی لڑکی کی پگھلتی حالت دیکھ کر بھی نہیں
لتا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُوپر سے ایک زائر نے آ کر عبداللہ کا پیغام دیا کہ اُوپر
طان بابا آئے ہوئے ہیں اور میرا پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا میں بھی دھیرے دھیرے سیڑھیاں
ھتا ہوا درگاہ کے صحن میں داخل ہوگیا۔ دھوپ ڈھلنے والی تھی اور درگاہ کے صحن میں سائے
ے ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک سائے میں سلطان بابا، عبداللہ اور حاکم بابا مریدوں کے
رمٹ میں بیٹھے نظر آئے۔ زہرا بھی خواتین والی بھیڑ میں سامنے بیٹھی نظر آئی۔ سبھی عورتوں
سخت پردے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عبداللہ نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا
میں بھی مریدوں کے گروہ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان بابا کوئی درس دے رہے
اور اُن کی بارُعب آواز سارے صحن میں گونج رہی تھی۔ ''گویا سارا جھگڑا ہی اس بات کا
کہ انسان پہلے وجود میں آیا تھا، یا مذہب.....؟ ڈارون کی تھیوری کہتی ہے کہ انسان کا ارتقا
ہوا اور وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد..... اور جب انسان کی موجودہ ہیئت میں اس کی
رسیدھی ہوئی اور ہاتھوں اور پیروں نے اپنی موجودہ ساخت اختیار کی تو پھر دھیرے دھیرے
ب کا ارتقا شروع ہوا..... ہم مسلمان حضرت آدم وحوا کی صورت میں اس عقیدے کے قائل
ا کہ انسان کا وجود ہی مذہب کی وجہ سے ہے اور وہ مذہب کے لیے اس کائنات میں ظہور
یر ہوا تھا۔ گویا مذہب انسان کی آمد سے قبل بھی کائنات میں رائج تھا اور جن اور فرشتے اپنی
دت کے ذریعے اس مذہب کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے۔

؎ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں''

میں بہت غور سے سلطان بابا کی باتیں سنتا رہا، جس خوب صورتی سے انہوں نے ڈارو
کے نظریے اور مذہب کی آمد کے بارے میں دلائل دیئے تھے، وہ اُن کے وسیع مطالعے کا
مظہر تھی۔ میں جب سے اس درگاہ میں آ جا رہا تھا، عبداللہ اور سلطان بابا جیسے نہ جانے کت
''پُراسرار بندوں'' سے اب تک میرا سامنا ہو چکا تھا جو بظاہر سیدھے سادے لیکن اندر سے کہ
سمندر سے بھی زیادہ عمیق اور گہرے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا
بھیڑ میں سے ایک ماڈرن وضع کا لیکن بہت جوشیلا نوجوان اُٹھا اور اُس نے پہلا سوال دا
دیا۔ ''حضرت آپ کی باتیں اپنی جگہ بجا لیکن ہمارے مذہب میں تو شرک کو گناہ عظیم سے بھ
عظیم تر گردانا گیا ہے تو پھر کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان درگاہوں پر آ کر منتیں مانگنا ا
چادریں چڑھانا بھی اُسی شرک کے زمرے میں آتا ہے؟'' ''ٹھیک کہا تم نے..... جو لوگ یہا
اس نیت سے آتے ہیں کہ یہاں قبر میں سویا بزرگ ہی اُن کا مشکل کشا ہے اور وہی اُن
دادرسی کرے گا تو وہ واقعی اس گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جسے ''شرک'' کہا جاتا ہے
خدا انہیں اس گناہِ کبیرہ سے بچنے کی توفیق عطا کرے۔ ہاں البتہ جو لوگ اس آس پر یہاں آ
گڑگڑاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ایک عاجز بندے کے آستانے پر اس اُمید پر آئے ہیں کہ اللہ
یہ نیک بندہ، جو اس قبر میں آنکھیں بند کیے پڑا ہے، شاید اسی کے وسیلے اور سفارش سے اللہ اُ
کی بھی سن لے گا اور اُن کی حاجت روا ہو گی تو ایسی حاضری میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں
بہرحال میرا، تمہارا، اس درگاہ میں دفن اس نیک بندے کا اور ہم سب کا مالک ایک ہی
میرا اللہ.....''

نوجوان کے تنے ہوئے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس کی آنکھوں
سختی یکایک سلطان بابا کے لیے عقیدت میں بدل گئی۔ پھر کچھ اور معمول کے سوال کیے گئے ا
اس سے پہلے کہ سلطان بابا دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے، عورتوں کی بھیڑ میں سے زہرا کی خاد
نے ہلکے سے سلطان بابا کے خاص مرید کے کان میں کچھ کہا۔ مرید نے اُٹھ کر سلطان بابا
عرض کی۔ ''اللہ کی ایک بندی آپ سے اپنے لیے خاص دعا کی متمنی ہے۔'' سلطان بابا کے
چہرے پر بھرسے ایک مبہم سی مسکراہٹ اُبھری اور انہوں نے غور سے خادمہ کی جانب دیکھ
کہا۔ ''میری دعاؤں میں اثر ہوا تو ضرور قبول ہوں گی۔ بہرحال ایک بات ابھی سے جان

بہت ضروری ہے، یاد رہے کہ کسی کو پا لینا کبھی کبھی اُس کو کھو دینے سے بڑا غم ہوتا ہے..... دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ وصل، جُدائی سے بڑا المیہ ہے۔'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ کتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی انہوں نے اور کہیں اُن کا اشارہ میری جانب ہی تو نہیں تھا۔ اِسی لمحے سلطان بابا نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ وہ مجھ سے بولے ''ساحر میاں.....! شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' تو گویا میرا نام بھی انہیں زبانی یاد تھا۔ میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے حسب معمول گریز کیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ انہیں میرے اندر کی بات کا علم کیسے ہو گیا۔ ''جی..... یونہی..... اچانک دل میں کچھ خیال آ گیا تھا، آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں؟'' سلطان بابا نے سر ہلایا۔ ''بسم اللہ.....!'' میں نے دُور بیٹھی زہرا کی جانب دیکھا، وہ سر پر چادر ڈالے جھکے سر بیٹھی تھی۔ میں نے سینے کا غبار باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کلام کسی اور کا تھا لیکن معنی میرے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے
اک شخص کو دیکھا تھا
تاروں کی طرح ہم نے
اک شخص کو چاہا تھا
اپنوں کی طرح ہم نے
اک شخص کو سمجھا تھا
پھولوں کی طرح ہم نے
کچھ تم سے ملتا تھا
باتوں میں، شباہت میں
ہاں تم سا ہی لگتا تھا
شوخی میں، شرارت میں
دِکھتا بھی تمہی سا تھا
دستورِ محبت میں

وہ شخص، ہمیں اک دن
غیروں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ
ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چونکے ہو
کب ذکر تمہارا ہے؟
کب تم سے تقاضا ہے؟
کب تم سے شکایت ہے؟
اک تازہ حکایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

میں ایک جذب کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہتا گیا۔ جب ہوش آیا تو ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ زہرا اُسی طرح سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور باقی سارے مرید بھی خاموش تھے۔ پھر سلطان بابا کی ہلکی سی کھنکار نے ہی اس سکوت کو توڑا اور انہوں نے دھیرے سے زیرلب ''سبحان اللہ'' بھی کہا اور پھر محفل برخاست ہوتے سے پہلے حتمی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔ باقی لوگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور مختصر سی دعا کے بعد سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ وہ خوش ادا بھی اپنی تمام تر نزاکت کے ساتھ سلطان بابا سے دعائیں لیتی ہوئی قدم بڑھا گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل جیسے کٹ سا گیا۔ من میں آیا کہ دوڑ کر ایک بار پھر سے اُس کی راہ کی دُھول بن جاؤں اور اُس سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے انہی نازک قدموں تلے روند کر برباد کر ڈالے لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے خود ہی اُس سے اپنے جنوں کے سامنے بند باندھنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں درگاہ کا صحن تقریباً خالی ہو گیا۔ میں بھی ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اُٹھا اور عبداللہ سے اجازت لے کر واپسی کے لیے پلٹ کر چل دیا۔

اچانک پیچھے سے ایک آواز اُبھری۔

؎ کھلتا کسی پہ کیوں، میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

میں چونک کر مڑا۔ درگاہ کے صحن کے عین وسط میں سلطان بابا اپنی وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے کھڑے تھے۔ ''ساحر میاں.....! واپس چل دیئے.....؟ تم سے ایک ضروری کام تھا مجھے۔'' سلطان بابا کو بھلا مجھ سے کیا کام ہوسکتا تھا.....؟ میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے خدشے اُبھرے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میری جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر ہی جیسے جم سا گیا۔

پہلی کھوج کا خضر

میں ابھی تک اِسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخر ایسی کون سی ضروری بات ہو سکتی ہے او
پھر میں بھلا سلطان بابا کے کس کام آ سکتا تھا۔ سلطان بابا نے غالباً میرا چہرہ پڑھ لیا..... ''تم
سوچتے بہت ہو ساحر میاں..... لیکن شاید تمہیں ابھی تک سپردگی کی طمانیت کا اندازہ نہیں
ہے.....'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''سپردگی کی طمانیت.....؟'' ''ہاں
میاں..... جو سکون اور اطمینان خود کو دوسرے کے فیصلے کے سپرد کر دینے میں ہے..... وہ بھلا
اپنی جدوجہد اور کوشش میں کہاں..... بہتر یہی ہے کہ کسی کو اپنا راہبر مان لو اور پھر اُسی خضر کی
راہ پکڑ لو.....'' ''کاش میں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوتا، جنہیں ایسے راہبر میسر آتے
ہیں، یہاں تو میری منزل ہی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی تو میں اپنی راہ بھی نہیں ڈھونڈ پایا، راہِ خضر
تو بہت دُور کی بات ہے۔'' سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے میری آنکھوں
میں جھانکا ''تمہارے اندر بڑی کھوج ہے اور تمہاری یہ کھوج تمہیں تمہاری اصل راہ سے زیادہ
دیر تک دُور نہیں رکھ پائے گی..... میرا ایک کام کرو گے.....'' ''جی حکم کیجیے.....'' ''اگلی
جمعرات کو ایک دن کے لیے میں عبداللہ کو اپنے ساتھ کسی خدمت پر لے جانا چاہتا ہوں کیا تم
اگلی جمعرات یہاں درگاہ پر چند گھنٹے کی ڈیوٹی دے پاؤ گے..... کام کچھ زیادہ سخت نہیں ہے.....
کچھ مستقل حاجت مند ہیں جو ہر ہفتے درگاہ میں حاضری دیتے ہیں، اُن تک کچھ خاص ہدایات
پہنچانی ہوں گی۔ کچھ نذر نیاز جو جمعرات کو یہاں جمع ہوتی ہے اُسے مستحق لوگوں میں بانٹنا ہوگا
اور کچھ اور اِسی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینا ہوں گے۔ اگر تمہاری اگلی جمعرات
کو کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو.....'' ''جی ضرور میں اگلی جمعرات کو صبح سویرے حاضر ہو جاؤں
گا۔'' سلطان بابا خوش ہو گئے۔ ''شاباش..... لیکن جمعرات سے پہلے کسی ایک دن آ کر عبداللہ
سے ساری ہدایات اچھی طرح سمجھ لینا۔'' سلطان بابا مجھے دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔
میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سیڑھیوں سے نیچے اپنی کار کے قریب عینی کو کھڑ

دیکھ کر سٹپٹا سا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور ہمارا سنگم درگاہ کی سیڑھیوں کے وسط میں ہوا۔ عینی کچھ دیر تک چپ چاپ میری ابتر حالت، بڑھی ہوئی شیو اور شکنوں بھرا لباس دیکھتی رہی۔ ''میں جانتی تھی تم مجھے یہیں ملو گے۔'' میں نے اُس کا دھیان بٹانے کے لیے مسکرا کر اُسے چھیڑا، ''اور میں جانتا تھا کہ تم مجھے ضرور ڈھونڈ لو گی.....'' لیکن عینی کے چہرے کا کرب کم نہیں ہوا۔ ''ڈھونڈ ہی تو نہیں پائی تمہیں..... بس ہر لمحہ کھوتی ہی گئی..... اور آخر کار تمہیں مکمل کھو ہی دیا.....'' ''لیکن میں تمہیں ان لوگوں میں نہیں سمجھتا عینی..... جو محبت کو بھی صرف سود و زیاں ہی کا سودا سمجھتے ہیں..... کبھی کبھی تو یہ درد بھی بن مانگے نہیں ملتا..... کبھی فرصت ملے تو بیٹھ کر سوچنا کہ ہماری دوستی میں تم نے کیا صرف کھویا ہی ہے.....؟'' عینی نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ''اُدھوری خوشی کبھی کبھی مکمل غم سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے ساحر..... بہر حال تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر اچھا لگا..... شاید یہ بھی اُس ہستی کی دین ہے..... میں اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مر رہی ہوں، ضرور وہ کوئی پری زاد ہو گی جس کے لیے تم جیسے شخص نے بھی زمانے سے جوگ لے لیا ہے..... مجھے کب ملواؤ گے اُس سے.....؟'' ''ضرور ملواؤں گا..... پہلے وہ مجھے تو شرف قبولیت بخش دے۔'' ''لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو جائے ساحر..... میں نے کینیڈا کا اسکالر شپ حاصل کر لیا ہے۔ اگلے ہفتے میری روانگی ہے۔ میں اس ماحول، ان یادوں اور خود اپنے آپ سے کچھ عرصے کے لیے فرار چاہتی ہوں۔'' عینی بولتے بولتے سسک پڑی۔ مجھ سے بھی کچھ نہ بولا گیا۔ یہ محبت بھی کتنا عجیب جذبہ ہو ہے لوگ خوشی پانے کے لیے اس جذبے پر اپنے دل کے در وا کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی روتے ہی رہتے ہیں۔ عینی پھر وہاں زیادہ دیر رُک نہیں پائی اور مجھ سے رُخصت ہو کر پلٹ گئی۔ میں اُس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں ساحل پر بیٹھ کر سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا۔ یہ سورج کتنا خوش تھا۔ ہر روز ڈوبنے کے بعد اگلی صبح اسے نئی زندگی مل جاتی تھی لیکن میری قسمت کا تارا تو کچھ ایسا ڈوبا تھا کہ اب اس کے دوبارہ اُبھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میں رات دیر گئے گھر پہنچا تو ڈاکٹر یزدانی کی گاڑی کو باہر نکلتے دیکھ کر ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔ مما کو سخت بخار تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ میری وجہ سے جس شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھیں، اس کا نتیجہ کچھ تو نکلنا ہی تھا۔ اُس رات میں اور پاپا سونے تک اُن کے سرہانے ہ

بیٹھے رہے اور مجھے مما سے بہت سے جھوٹے وعدے بھی کرنے پڑے۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ اُن کے جگر کا ٹکڑا اُن کا دل بہلانے کے لیے اُن کی ہر بات پہ ''ہاں'' کہتا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی اُس کی ہر ''ہاں'' پر اُن کا دل، اُن کے چہرے کی طرح کھلا جاتا ہے۔

مما کے سونے کے بعد پاپا میرے ساتھ ہی ٹیرس پر چلے آئے۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے دل و دماغ میں اُس وقت کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی، لیکن حسب معمول اُن کے چہرے پر وہی مہربان سا سکوت طاری تھا، جیسے کوئی گہرا سمندر، جو اپنی تہ میں جانے کتنے طوفان اور کتنے بھنور چھپائے ہوئے ہوتا ہے لیکن اپنی سطح پر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتا آخر وقت تک نہیں چلنے دیتا۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ ''ہاں ینگ مین..... تمہاری جنگ کیسی جا رہی ہے؟ اُس پتھر دل پر کچھ اثر ہوا کہ نہیں.....؟'' میں بھی اُن کا سوال سن کر مسکرا دیا۔ ''کچھ جنگیں دنوں میں نہیں..... جنموں میں جیتی جاتی ہیں پپا..... لیکن اس بات کا اطمینان ضرور رکھیے کہ آخری جیت آپ کے سپوت ہی کی ہوگی.....'' ''میں جانتا ہوں..... میرے بیٹے نے ہارنا نہیں سیکھا..... لیکن جانے کیوں اس بار مجھے شکست سے بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے.....'' میں نے چونک کر پاپا کی جانب دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں کسی اَن دیکھے خوف کی پرچھائیاں سرزاں تھیں۔ ''میں بہت شرمندہ ہوں پپا..... شاید میں آپ کے خوابوں کی تعبیر ثابت نہیں ہو سکا..... آپ کے کسی کام نہیں آ سکا..... آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ.....''

پاپا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں..... بالکل نہیں..... میں، یا تمہاری مما ایسا کچھ بھی نہیں سوچتے..... اولاد ہمیشہ ماں باپ کے خوابوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہی تو نہیں ہوتی..... ہم تو بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے تمہاری خوشی کہیں بھی ہو.....'' بولتے بولتے پاپا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس لمحے مجھے اُن پر بے حد پیار آیا اور میں نے بڑھ کر انہیں زور سے گلے لگا لیا۔ خود میری آواز بھی بھرا سی گئی۔ ''پپا..... میں کیا کروں..... مجھے اُس کے علاوہ اب اور کچھ سوجھتا ہی نہیں..... کوئی اور لبھاتا ہی نہیں..... میں اتنا بے بس تو کبھی بھی نہیں تھا..... لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوں گا، جو اس راہ پر ناکامی کے بعد بھٹک کر کہیں کھو جاتی ہے..... میں ان اندھیروں میں اپنی رُوح کو کبھی

بھٹکنے نہیں دوں گا..... اتنا بھروسا ضرور رکھیے گا مجھ پر.....'' انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''میں جانتا ہوں..... اور مجھے تم پر پورا اعتبار ہے.....'' ہم تقدیر کو کتنی آسانی سے اپنی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کا الزام دیتے رہتے ہیں لیکن کبھی تقدیر سے ان نعمتوں کی وجہ سے پیار نہیں کرتے جو اس نے ہماری زندگی میں قدم قدم پر فراہم کر رکھی ہوتی ہیں۔ میرے ماں باپ بھی تو قدرت کی ایک ایسی ہی نعمت تھے، جن کے بدلے قدرت کا ہر ستم گوارا تھا۔ مجھے اگر میرے ماں باپ کا اتنا پیار، اتنا حوصلہ نہ ملا ہوتا تو زہرا کی بے رُخی شاید بہت پہلے مجھے توڑ چکی ہوتی۔

اگلے دن میں نے درگاہ جا کر عبداللہ کو سلطان بابا کی دی ہوئی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا اور اُس سے جمعرات کے معمولات کی تفصیل بھی معلوم کی۔ مجھے صبح سویرے درگاہ پہنچنا تھا اور معمول کے چند کام مثلاً درگاہ کے زائرین کے لیے پانی بھرنا، پودوں کو پانی اور پرندوں کو دانہ وغیرہ ڈالنا، جمعرات کے لنگر کے باورچیوں سے اپنی نگرانی میں کھانا بنوانا وغیرہ وغیرہ اور ایسے بہت سے دیگر چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دینا تھے۔ لیکن عبداللہ نے سب سے اہم ذمہ داری کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔ عصر کی نماز کے بعد درگاہ پر آنے والے زائرین کے نذرانے عبداللہ اپنے حجرے میں وصول کرتا تھا۔ مرد دروازے سے اندر آ کر اور عورتیں لکڑی کی جالی والی کھڑکی کے پیچھے سے اپنے نذرانے جمع کرواتی تھیں، جنہیں اُسی وقت مستحقین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس جمعرات کی شام مجھے یہ تمام نذرانے وصول کرنے تھے۔ نقدی کی فہرست بنانا تھی اور باقی تحائف کو الگ کر کے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے مطابق تقسیم کرنا تھا۔ کچھ مستحقین تو خود اپنا حصہ وصول کرنے درگاہ کے احاطے میں جمع ہو جاتے تھے اور کچھ لوگوں کو بذریعہ ڈاک اُن کا حصہ بھیجنا ہوتا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ اس فہرست میں چند لوگوں کی تنخواہ کا ذکر بھی تھا۔ یا میرے خدا..... یہ کیسا نظام تھا۔ یہ کون لوگ تھے جن کی تنخواہ ایک اجنبی ہاتھ اور ایک انجانے منتظم کے تحت بٹتی تھی۔ دولت کی تقسیم کا یہ کیسا نظام تھا.....؟

آخرکار جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ میں صبح سویرے ہی بنا کسی کو بتائے اپنی گاڑی میں درگاہ آ گیا تھا۔ عبداللہ اور سلطان بابا مجھ سے بھی پہلے اپنے سفر پر نکل چکے تھے۔ جاتے جاتے

بھی عبداللہ میرے لیے پورا ہدایت نامہ لکھ گیا تھا۔ میں نے معمول کے تمام کام سہ پہر ہونے سے پہلے ہی نپٹا دیئے۔ میں کئی ہفتوں سے اس درگاہ میں آ رہا تھا لیکن آج تک میں نے کبھی عبداللہ کا حجرہ اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ چھوٹا سا حجرہ درگاہ کے مرکزی صحن سے بہت ہٹ کر تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ عبداللہ سے میری ملاقات عموماً باہر ہی ہو جاتی تھی۔ لیکن آج چونکہ مجھے عصر کے وقت سے اِسی حجرے میں نذر اور نیاز وصول کرنی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے ہی درگاہ کے برآمدے میں بنی لکڑی کی جالیوں سے پرے اس حجرے کو ایک نظر دیکھ ہی آؤں اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی جیسے ہی میں برآمدے میں بنی جالیوں کو پار کر کے حجرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو یکایک میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور اچانک ہی یہ اجنبی ماحول مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہونے لگا اور پھر جیسے ہی میں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو لمحے کے ہزارویں حصے سے بھی شاید کچھ پہلے مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے میں اس حجرے میں پہلے بھی کبھی آ چکا ہوں، پھر تو ذہن میں جلتی بجھتی روشنیاں کچھ اتنی تیزی سے لپکنے لگیں کہ چند لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر ہی رہ گیا۔ سب مجھے یاد آنے لگا کہ میری ایسی حالت تو اُس دن بھی ہوئی تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تھا۔ جب میری پہلی نظر عبداللہ پر پڑی تھی اور جب پہلی مرتبہ سلطان بابا نے مجھے درگاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا..... ہر دفعہ مجھے کچھ یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے میرے ساتھ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آ چکا ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے ذہن کو جھٹک کر خود کو یہ تسلی دے دی تھی کہ ایسا تو کم و بیش ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب اُسے کوئی واقعہ، کوئی بات اور کوئی جگہ، یا کوئی شخصیت پہلی مرتبہ ملنے، یا دیکھنے کے باوجود جانی پہچانی لگتی ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ہمارے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کے منہ سے نکلنے والی بات بھی چند لمحے پہلے جان لیتے ہیں۔ مجھے تو یہ تحت الشعور اور لاشعور کا کوئی معمول کا کھیل لگتا ہے، لہٰذا میں نے حسب معمول ان باتوں پر دھیان دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے حجرے میں داخل ہوتے ہی وہ انجانا احساس اس شدت سے مجھ پر حملہ آور ہوا کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے حواس ہی میں نہ رہ سکا۔ لیکن جتنی تیزی اور شدت سے مجھ پر اس کیفیت کا غلبہ ہوا تھا، اتنی ہی جلدی وہ جھماکا ختم بھی ہو گیا، جیسے بارود کا کوئی ڈھیر جو ایک ہی چنگاری سے لمحوں میں بھسم ہو

جائے..... کچھ دیر تو میں بالکل خالی الذہن سا کھڑا حجرے کی دیواروں کو تکتا رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا، جس میں ایک جانب ایک نیچی سی لکڑی کی کھڑکی بنی ہوئی تھی، جو باہر برآمدے کی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بانس کے موٹے تنکوں والی چک پڑی ہوئی تھی۔ غالباً یہ وہی کھڑکی تھی جو خواتین کی نذر کے لیے مخصوص تھی، تبھی پردے کا ایسا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرا صاف ستھرا تھا اور ایک جانب چند دینی اور کچھ معلوماتی کتب لکڑی کے ایک شیلف پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کی صراحی اور چھت سے لگے ہوئے مورچھل (ہاتھ سے چلنے والے پنکھے) کے علاوہ حجرے میں مزید کوئی سامان نہ تھا۔ کمر ٹکانے کے لیے زمینی دری کے اُوپر دیوار کے قریب ایک تکیہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کو نکالا اور ایک بار پھر غور سے تمام ہدایات کو دہرایا۔

کچھ ہی دیر میں زائرین کی آمد شروع ہوگئی اور میں اُن کے دیئے ہوئے نذرانوں کی فہرست بنانے میں مشغول ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں اچھی خاصی رقم بھی جمع ہوگئی تھی۔ پھر مردوں کا ہجوم چھٹا تو کھڑکی کے قریب سے عورتوں کی بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہوگئیں۔ کسی کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا تو کوئی ناخلف اولاد سے متفکر تھی، کسی کو بیٹے کی شادی کی جلدی تھی تو کوئی ارمانوں سے لائی گئی بہو کے ہاتھوں نالاں تھی۔ کوئی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی تو کوئی پریشانی کی وجہ سے۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق لکڑی کی چک کی چلمن کی دوسری جانب سے انہیں صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا جا رہا تھا اور غالباً عورتیں اب تک مجھے عبداللہ ہی سمجھ رہی تھیں۔ عورت اپنا نام بتاتی، اپنی نذر کھڑکی سے اندر بڑھاتی اور میں عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے حساب سے اُس عورت کا نام پڑھ کر اُسے ہدایت، یا دعا کرنے کی تدبیر بتاتا جاتا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ بظاہر اُوپر سے ہنسی کھیلتی اور خوش حال دنیا تو اندر سے بے حد زخمی اور بہت دُکھی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سبھی کے دُکھ تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ میں خواتین کو ہدایات جاری کرتے ہوئے ہی کچھ چبھتی ہوئی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ یکایک کھڑکی کے قریب سے ایک ملائم سی آواز اُبھری ''آداب.....'' دفعتہً وہی ٹھنڈی سی پروائی چلی اور میرا سانس میرے سینے میں اٹک سا گیا۔ میری زبان گنگ ہوگئی اور میرے سارے لفظ یک لمحے میں ہی کہیں کھو گئے۔ وہ دھیرے سے دوبارہ کھنکاری۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

پڑنے لگے۔ ہاں..... یہ تو وہی تھی۔ میں نے جلدی سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست پر نظر ڈالی
لیکن اُس میں مجھے زہرا کا نام، یا اُس کے لیے کوئی بھی ہدایت لکھی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میں
نے چلمن سے ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ ہاں..... وہی تو تھی صرف ایک دیوار کے فاصلے پر
مجھ سے اتنا قریب کہ میں اُس کی سانس لینے کی مدہم آواز بھی سن سکتا تھا۔ ایک لمحے کو میرا جی
چاہا کہیں وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن میرے قدموں نے تو میرے جسم کا بوجھ بھی
سہارنے سے انکار کر دیا تھا، بھاگ کر کہاں جاتا؟ زہرا بھی دوسری عورتوں کی طرح یہی سمجھ
رہی تھی کہ کھڑکی کے پار عبداللہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چند لمحوں تک جواب کا انتظار کرتی رہی اور پھر
دھیرے سے اپنی جھرنوں جیسی گنگناتی آواز میں بولی۔ ''ہماری نیاز قبول فرمائیں۔'' میں نے
چونک کر دیکھا تو اُس کا مخروطی ہاتھ چلمن سے اندر جھانک رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اُس کے
ہاتھ میں پکڑا خط کے لفافے جیسا چھوٹا سا لفافہ لے لیا۔ شاید لفافے میں کرنسی نوٹ تھے
میری زبان سے صرف ایک لفظ ہی نکل پایا ''شکریہ.....'' دوسری جانب سے اُس کی دل میں
سیدھا اُتر جانے والی آواز اُبھری۔ ''میں آج بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی
ہوں.....'' یا خدا..... یہ کس سوال کی بات کر رہی تھی.....؟..... اب میں اُسے کیا جواب
دوں..... عبداللہ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی۔ باقی سب کے بارے میں تو اُس نے اتنی
تفصیل سے مجھے بتا دیا تھا، پھر زہرا کے بارے میں بتانا کیسے بھول گیا وہ.....؟ مجھے اور تو کچھ
سوجھا نہیں بس ہلکے سے کھانس کر میں نے اپنے ہمہ تن گوش ہونے کا پیغام اُس تک پہنچانے
کی کوشش کی۔ اس بار مجھے زہرا کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی محسوس ہوئی، جیسے وہ بے حد کرب
میں بول رہی ہو۔ ''میں جانتی ہوں..... آپ کے پاس میرے کسی سوال کا کوئی جواب
نہیں..... میں آج بھی ہمیشہ کی طرح یہاں سے ناکام اور نامراد ہی واپس پلٹوں گی..... اگر
آپ کی چپ ہی میرا مقدر ہے تو مجھے یہ خاموشی بھی قبول ہے..... لیکن ایک بات تو آپ بھی
اچھی طرح جانتے ہیں..... میں عمر بھر آپ کی اس چوکھٹ پر اپنا سر پٹختی رہوں گی لیکن کسی اور
کے خیال کو اپنے من کے قریب بھی نہیں بھٹکنے دوں گی۔ آپ سے محبت کی اگر یہی سزا ہے تو
میں اسے بھی اپنے لیے جزا ہی سمجھوں گی.....'' میرے دل و دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے
اور سارا کمرا بلکہ ساری دنیا ہی مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تو گویا اس زہرا جبیں کے دل

میں کوئی اور نہیں بلکہ خود عبداللہ ہی بسا ہوا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا، ایسا عظیم فریب تو کسی جانی دشمن نے بھی نہ دیا ہوگا کسی کو..... پھر عبداللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟؟؟

زہرا جانے کب اُٹھ کر جا چکی تھی۔ حسد، جلن اور کرب کے طوفان نے میری آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چلاؤں کہ یہ ساری کائنات ہی پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس لفافے پر نظر ڈالی جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا نے مجھے تھمایا تھا۔ بہت سے بڑے کرنسی نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پرچی لفافے سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں پرچی باہر نکالی اور اپنی سلگتی ہوئی نظریں اس ستم گر کی شستہ تحریر پر گاڑھ دیں۔ پرچی پر صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

میرے جسم بوسیدہ میں ذرا جو جان باقی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا کوئی امکان باقی ہے
وہ چاہے راستہ بدلے، چاہے رابطہ بدلے
اُسے مجھ سے محبت ہے، میرا ایمان باقی ہے

مجھے یوں لگا جیسے وہ لفظ نہیں، چھوٹے چھوٹے سے سنپولیے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پرچی وہیں پھینک دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔

دورِ جنوں

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے ہی گھر میں بستر پر پسینے میں شرابور پڑا تھا۔ مما، پپا اور ڈاکٹر یزدانی سمیت چند ڈاکٹروں کی ٹیم میرے سرہانے کھڑی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُٹھنا چاہا تو مما نے جلدی سے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر زبردستی واپس لٹا دیا۔ ''لیٹے رہو میری جان..... پورے چھتیس گھنٹے کے بعد تمہیں مکمل ہوش آیا ہے۔ اب اگر تم نے بستر چھوڑا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔'' ۳۶ گھنٹے..... یا میرے خدا..... ابھی چند لمحے پہلے ہی تو میں درگاہ سے اپنی بھیگی اور جلتی ہوئی آنکھیں لے کر دوڑتا ہوا باہر نکلا تھا۔ میرا ارادہ زہرا کو روکنے کا تھا لیکن اُس کی گاڑی میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اپنی گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور میں کب اور کیسے اپنے گھر کے پورچ تک پہنچا تھا۔ بعد میں مما نے بتایا کہ میں گاڑی سے نکلتے ہی لہرا کر وہیں پورچ میں ہی گر پڑا تھا اور تب سے لے کر اب تک میرے بے ہوشی کے وقفے گہرے ہی ہوتے گئے تھے۔ گویا آج ہفتے کا دن تھا اور میں جمعرات کو درگاہ سے نکلا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی سے وقت کے قیمتی لمحے کچھ اس طرح سے بھی چوری ہو جاتے ہیں کہ وہ بس سٹپٹاتا ہی رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ تھا اور پھر اگلے تین چار دن تک مما نے میری کچھ ایسی سختی سے نگرانی کی کہ میں واقعی بستر سے قدم تک نیچے نہ دھر سکا۔ لیکن میری رگوں میں جو انگارے بھر چکے تھے، میں اُن کا کیا کرتا؟ مجھے ہر حال میں عبداللہ سے ملنے جانا تھا۔ میں اُس دھوکے باز انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر زہرا خود اُس کی محبت میں مبتلا تھی تو پھر اُس نے آخر میرے ساتھ ہی چوہے بلی کا کھیل کیوں کھیلا؟ میری پُرخلوص دوستی کا مذاق کیوں اُڑایا؟ اگر وہ پہلے دن مجھے یہ بات بتا دیتا تو میں زہرا کی دیوانگی میں اتنا آگے تو نہ بڑھتا۔ یہ اور اس جیسے جانے کتنے سوالات تھے، جن سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن اس بار مما اور پاپا کا پہرہ اتنا کڑا تھا کہ اُن کے علم میں لائے بنا میرا پلک جھپکنا بھی محال تھا۔ لہٰذا چوتھے

دن مجبوراً مجھے پپا کو اعتماد میں لینا پڑا کہ میرا اگلے دن یعنی جمعرات کی شام کو درگاہ جانا بے حد ضروری ہے لیکن پپا نے بھی اس مرتبہ مما کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ آخر کار خوب بحث ومباحثے کے بعد وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ مما سے مجھے درگاہ جانے کی اجازت دلوانے کی کوشش کریں گے لیکن صرف اور صرف اس شرط پر کہ وہ بھی میرے ساتھ جائیں گے، کیوں کہ اب وہ مجھے وہاں اکیلے بھیجنے کا رسک لینے پر تیار نہیں تھے۔ میرے پاس اُن کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب مما کو ہم دونوں باپ بیٹے کے ارادوں کا پتا چلا تو انہوں نے تو آسمان ہی سر پر اُٹھا لیا۔ وہ پپا پر بہت ناراض ہوئیں کہ انہوں نے ہی مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے جنگ بندی کا اعلان ہوا لیکن تب تک یہ طے پا چکا تھا کہ پپا کے ساتھ اب مما بھی درگاہ کے لیے ہماری ہم رکاب ہوں گی، کیوں کہ اب وہ کسی صورت بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ہم تینوں کو پپا کے ڈرائیور نے درگاہ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور دُور بھیڑ سے پرے مجھے زہرا کی گاڑی بھی کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے یہاں آنے کے لیے جمعرات کے دن تک کا یہ انتظار صرف اسی لیے کیا تھا، کیوں کہ میرا ارادہ زہرا کے سامنے عبداللہ سے بات کرنے کا تھا تاکہ اُسے مزید کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر زائرین کی بھیڑ میں گھرے سلطان بابا پر پڑی۔ میں نے مما اور پپا کو انہیں سلام کرنے کی غرض سے اُس طرف بھیج دیا اور خود عبداللہ کے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ زہرا بھی حجرے کی پچھلی جانب لکڑی کی جالیوں والی چلمن کے برآمدے ہی میں موجود ہوگی۔ میرا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا تھا۔ میں یہ ساری لاحاصل کوشش کیوں کر رہا تھا؟ جب وہ خود میرے نصیب ہی میں نہ تھی تو پھر وہ چاہے کسی کا بھی مقدر ہو۔ اس بات سے میری کالی قسمت کا لکھا ڈھل تو نہیں سکتا تھا۔ جیسے جیسے حجرے کا دروازے قریب آتا گیا، میرے قدم بالکل ہی بے جان ہوتے گئے۔ آج اس جانب مرد حاجت مندوں کی بھیڑ بالکل ہی مفقود تھی۔ شاید میں بہت جلدی آ گیا تھا، یا پھر مجھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر خیالات کی یلغار روکی اور جیسے ہی حجرے کے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا، عبداللہ کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ وہ دوسری جانب کھڑکی

کے پار کسی سے مخاطب تھا۔ اُس کی آواز میں جھنجلاہٹ سی تھی۔ ''عورت..... عورت..... یہ کچھ الگ معاملہ ہے۔ آخر آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ اختیار کا معاملہ ہے۔'' دوسری جانب سے وہ آواز اُبھری، جسے میں دنیا کی کروڑوں آوازوں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ زہرا ہی تھی۔ ''بات اگر اختیار کی ہے تو پھر میں بے اختیار ہوں۔ خود پر اختیار ہوتا تو میں بار بار یہاں کیوں آتی۔ اگر آپ میرے راستے پر نہیں چل سکتے تو نہ سہی، میں تو آپ کے راستے کی دُھول بن سکتی ہوں نا۔''

عبداللہ نے گہرا سانس لیا۔ ''میں شادی شدہ ہوں اور دوسری شادی کر کے میں انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں اپنی بیوی اور بچے سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا لیکن اپنی تقدیر میں یہ کانٹے آپ نے خود بوئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، آپ سنبھل جائیں۔'' زہرا سسکی۔ ''کاش یہ مشورہ آپ چار سال پہلے اُس وقت مجھے دیتے جب میں نے کلاس میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تب تو آپ شادی شدہ بھی نہیں تھے، نہ ہی میں آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی تھی۔ لیکن میرا تو سب کچھ تہس نہس کر دیا آپ کی اُس پہلی نظر نے۔ آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ نے اپنی پہلی نظر کو روکا کیوں نہیں؟'' عبداللہ نے لمبی سی سانس لی۔ ''کسی کے مقدر میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ پہلی نظر ضرور لکھی ہوتی ہے۔ پھر یہ اگلے کا نصیب ہے کہ وہ نظر اُسے گل و گلزار کر دے، یا پھر جلا کر خاکستر۔ افسوس آپ کی قسمت میں اُس نظر کی شبنم کے بجائے یہ چنگاری لکھی تھی۔ لیکن اب بھی یہ آگ شبنم میں بدل سکتی ہے۔ اپنے مقدر پر قناعت کر لینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ اپنی عبادت کو یوں برباد نہ کریں۔ میں آپ کا نصیب نہیں ہوں۔'' مجھے آہٹ سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عبداللہ نے کھڑکی سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا ہو، تبھی زہرا کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''میں آپ سے اپنا نصیب بدل دیے جانے کی دعا کی اُمید تو کر سکتی ہوں، کیا آپ میرے لیے اتنی سی دعا بھی نہیں کریں گے.....؟'' ''میری ہر دعا میں آپ ہمیشہ شامل رہیں گی۔ فی امان اللہ۔'' شاید زہرا کھڑکی سے ہٹ چکی تھی۔ میں پورا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ عبداللہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''آؤ ساحر میاں، اندر آ جاؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

ہم دونوں کو اس حجرے میں خاموش بیٹھے کافی دیر بیت چکی تھی۔ آخر کار میں نے ہی

سکوت توڑا۔ ''سچ کہوں تو پہلے مجھے زہرا کی محبت کا راز جان کر بہت بُرا لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہو، میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہو۔'' عبداللہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ''اور اب..... اب تمہارے خیالات کیا ہیں، اس بارے میں۔'' ''اب مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے تم بھی مجبور ہو، میری طرح، بے حد مجبور۔ میں زہرا کی محبت میں مبتلا ہوں، زہرا تمہارے عشق میں گرفتار ہے۔ تم کسی اور کی چاہت کے حصار میں ہو۔ شاید کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ لیکن تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اس میں کیا بعید ہے۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پایا۔'' عبداللہ نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''سب سے پہلے طے ہوتا ہے ہماری مرضی کہاں چلتی ہے۔ تمہارا اس درگاہ میں آنا، زہرا سے ملنا، محبت کے اس کانٹوں بھرے جنگل سے گزرنا، یہ سب کچھ طے ہی تو تھا، رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔''

عبداللہ نے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی اور زہرا کی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی کہانی سنا دی تھی۔ عبداللہ جس یونیورسٹی سے اُردو ادب میں ایم اے کر رہا تھا، زہرا بھی اُسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ لیکن اُس کا داخلہ چونکہ کچھ دیر سے ہوا تھا لہٰذا اُس کے استاد نے اُس کی کلاس کے ایک لڑکے یعنی عبداللہ کو اُس کی مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے علم اور اُس کے شائستہ اطوار نے زہرا کے دل میں کسی اور ہی جذبے کو ہوا دے دی اور وہ تنہا ہی بہتی چلی گئی۔ پھر شاید زہرا نے روایتی حجاب، یا پھر اپنے حسن کے بھرم میں اقرار کرنے میں کچھ دیر لگا دی۔ عبداللہ کو اپنے والد کی موت کی اطلاع ملتے ہی جلدی میں اپنی ڈگری کے نتیجے کا انتظار چھوڑ کر آبائی گاؤں جانا پڑا، جہاں مقدر نے اُس کی راہ میں شادی کے رشتے کی بیڑیاں گاڑ رکھی تھیں۔ پھر ٹرین سے شہر واپس آتے ہوئے ایک اسٹیشن پر اُس کی سلطان بابا سے ملاقات ہوگئی اور عبداللہ کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ عبداللہ گھر سے اپنی ایم اے کی ڈگری لے کر اپنی ہی یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی وہ نوکری قبول کرنے کے لیے نکلا تھا جس کا انٹرویو کئی ماہ پہلے بڑی تگ و دو کے بعد اُس نے پاس کیا تھا۔ لیکن قدرت نے اُس کے لیے درگاہ کی یہ نوکری شاید بہت پہلے ہی سے ڈھونڈ رکھی تھی۔ قسمت کا لکھا دیکھیے کہ زہرا کے خوابوں کی کمند بھی اسی درگاہ پر آ کر ٹوٹنی تھی۔ وہ پہلے ہی عبداللہ کے یوں بنا بتائے غائب ہو جانے سے بے حال تھی۔ کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ اس درگاہ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے کہ یہاں مانگی

جانے والی منت کبھی رد نہیں ہوتی۔ لیکن زہرا کیا جانتی تھی کہ وہ جس منت کی تلاش میں درگا
کے تپتے صحن میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہے وہ منت خود سر جھکائے کسی اور دعا کے لیے وہاں
سجدے میں پڑی ملے گی۔ عبداللہ اور زہرا کی نظریں ملیں اور زہرا کا سب کچھ ایک بار پھر ہمیشہ
کے لیے لٹ گیا۔ عبداللہ کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ چہرے پر کلین شیو کی جگہ گھنی ڈاڑھی
لے لی تھی اور جدید تراش کے لباس کے بدلے اب وہ سادہ سے سفید کرتے، شلوار میں ملبوس
تھا۔ ابھی زہرا اپنی پہلی حیرت کے صدمے ہی سے باہر نہیں نکلی تھی کہ اُس کے سر پر دوسری
قیامت بھی ٹوٹ پڑی۔ عبداللہ کی شادی کا سن کر تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی اور بس، وہ دن اور
آج کا دن، اُس نے پھر پلٹ کر زندگی کی طرف نہیں دیکھا۔ اُس کی حیات کا محور تب سے یہی
درگاہ اور یہی ایک منت رہ گئی تھی۔

میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ جس کے لیے ایک
پری خود زندگی بھر کے لیے اس کڑکتی اور جھلساتی دھوپ میں اپنا کومل وجود اور موی پَر پگھلانے
کو تیار بیٹھی تھی۔ میں عبداللہ کے فسانے میں اس قدر مگن ہوا کہ مجھے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں
چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے والدین بھی آج میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ سلطان بابا
نے کسی زائر کے ہاتھ پیغام بھیجا تو میں چونکا۔ ورنہ شاید خود میرے لیے اس لمحے وقت اپنی
رفتار کھو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ مما اور پپا سلطان بابا کے ساتھ اب
تک گفتگو میں مشغول تھے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں میرے طویل انتظار سے اُکتا
چکے ہوں گے۔ خاص طور پر مما کو تو ایسی جگہوں سے شدید وحشت ہوتی تھی۔ آج بھی
صرف میری وجہ سے یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر سلطان بابا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ
اُبھری..... ''تو تم نے اپنے والدین کو بھی خوب پریشان کیے رکھا۔ زندگی سے ضد کرنا چھوڑ
میاں..... کچھ صلے اس جہاں کے لیے نہیں ہوتے۔ سبھی خواہشیں اس دنیا میں پوری ہو
لگیں تو پھر اگلے جہاں کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟'' میں نے آج تک کبھی سلطان بابا
جواب نہیں دیا تھا، پر اُس وقت میری ذہنی حالت زہرا کے غم کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ میں
کو روک نہیں پایا..... ''لیکن کچھ خواہشیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں کہ جن کے بدلے دونوں جہاں
گروی رکھے جا سکتے ہیں۔'' سلطان بابا چونکے ''.....نہیں..... ایسی کوئی خواہش نہیں، جو وہاں

بدل ہو..... انسان بڑا جلد باز ہے..... اسے صبر کی عادت نہیں ہے..... جو ملا وہی اس کے لیے ٹھیک ہے..... جو نہیں ملا، اِسی میں اس کی بہتری ہے۔'' میں چڑ سا گیا۔ ''یہ سب دل بہلانے کے بہانے ہیں۔ میں یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ جو مجھے نہیں ملا، مجھے اُس سے ملا دے اور اُسی میں میری بھلائی کا سامان بھی پیدا کر دے..... اگر مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو مجھے زندگی بھی تو میری اپنی مرضی کی ملنی چاہیے۔ میں نے خود تو اس دنیا میں آنے کی خواہش نہیں کی تھی..... جب اُس نے بھیجا ہے تو اُسے میری چاہتوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا، مجھے اگلے جہاں کے صلوں سے کیا واسطہ۔ جو یہاں دے گا..... وہ وہاں بھی نوازے گا۔'' میں جوش جنوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ مما نے گھبرا کر مجھے ٹوکا۔ ''ساحر..... ہوش کرو..... یہ تم سے بڑے ہیں.....'' سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر مما کو خاموش کرا دیا اور میری طرف پلٹے۔ ''اگر صرف دنیا کو قابو کرنا ہے، تب بھی راستہ جنوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے..... تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا کی چاہتیں اتنی آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بولو..... ہمت ہے خود کو جلا کر بھسم کرنے کی؟'' ''میں ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ..... ''سوچ لو..... دنیا پانے کے لیے بھی کبھی کبھی سارے عیش و آرام ترک کرنا پڑتے ہیں۔ کہیں راستے میں تھک کر پلٹ تو نہیں جاؤ گے؟'' میں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ سلطان بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''آزمائش شرط ہے۔'' سلطان بابا مسکرائے۔ ''ٹھیک ہے..... آزمائے لیتے ہیں..... ہم نے عبداللہ کا تبادلہ کسی اور قصبے میں کر دیا ہے۔ تمہارے جنوں کی پہلی آزمائش یہی ہے کہ جلد از جلد اپنا گھر بار اور یہ عیش و عشرت چھوڑو اور اس درگاہ میں بسیرا کر لو۔ تمہیں یہاں لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے گزر بسر کے لیے بھی کوئی مزدوری کرنا ہوگی۔ جیسے عبداللہ کرتا تھا۔ دو دن کے بعد میں اور عبداللہ یہاں سے اپنے سفر پر کوچ کر جائیں گے، تب تک کوئی فیصلہ کر لو۔ لیکن یاد رہے..... تمہارے والدین ماشاء اللہ حیات ہیں..... لہٰذا جو بھی قدم اُٹھاؤ، اس میں اُن کی رضامندی بہت ضروری ہے۔ اُن کی ناراضی کبھی مول نہ لینا.....'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے بڑھنے لگے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر دوبارہ پلٹے اور میری جانب دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔ ''اب بھی وقت ہے، گھر جا کر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر غور کرو۔ دنیا خود ملے تو ملے ورنہ اسے پانا چاہو تو یہ انسان سے بھاگتی ہے۔ اس کا حصول بھی بڑا جوکھم ہے۔ کیوں خود کو اس

جھمیلے میں ڈالتے ہو۔ تمہیں جو ملا ہے وہ بھی کچھ کم تو نہیں۔ ایک خواہش نہ سہی اور ہزاروں ارمان تو پورے ہو ہی رہے ہیں۔ یاد رکھو، یہ جنوں بھی ہر ایک کو راس نہیں آتا۔۔۔۔'' میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ''جو اس جنوں میں پڑ جائیں پھر انہیں کسی راس، یا بے راسی کا دھیان ہی کب رہتا ہے۔۔۔۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔۔'' سلطان بابا کچھ دیر تک میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے رہے۔ مجھے اُن کی آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''پھر بھی میری یہی دعا ہے کہ تمہیں یہ جنوں راس آ جائے۔۔۔۔'' سلطان بابا آگے بڑھ گئے۔

میرے ماں باپ میرے قریب ہی کھڑے حیرت اور پریشانی سے میرے اور سلطان بابا کے درمیان مکالمہ سن رہے تھے۔ میری نظر عبداللہ کے چہرے پر پڑی جہاں تفکر کی نئی پرچھائیاں اپنی جگہ بنا رہی تھیں، مگر میرے دل نے بہت دھیرے سے مجھ سے کہا

جو نہ مل سکے، وہی بے وفا
یہ بڑی عجیب سی بات ہے
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر
وہی آج تک میرے ساتھ ہے

تعیناتی

سلطان بابا نے زہرا کو پانے کے لیے جس کڑے امتحان سے گزرنے کا چیلنج دیا تھا میں اُسے صدقِ دل سے قبول کر چکا تھا۔ لیکن انہوں نے اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے میرے والدین کی رضامندی کی جو ذیلی شرط لگائی تھی وہ میرے لیے اس آزمائش سے بھی بڑا امتحان تھا۔ اُس روز درگاہ سے واپسی پر مما اور پاپا دونوں ہی بالکل خاموش، خیالوں میں گم صم سے تھے۔ شاید اُن دونوں کے ذہن میں بھی یہ سوال کہیں نہ کہیں گردش کر رہا ہوگا کہ اُن کا اس قدر نازوں پلا بیٹا اَن جانے میں سلطان بابا سے بہت بڑی شرط تو لگا آیا ہے لیکن جس کی ساری زندگی مخمل پر کٹی ہو، کیا وہ کبھی ٹاٹ برداشت کر سکتا ہے اور پھر میں تو اکلوتی اولاد کے علاوہ مزاجاً بھی کافی نازک مزاج تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف، یا مشقت جھیلنا تو دُور، اُس کا برائے نام سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ میری ماں کے بقول "میرا تو رنگ بھی چند لمحوں کی دھوپ سے کملا سا جاتا تھا۔" تو پھر اس وقت اُن کے ذہن میں اُٹھتے سوال بھی تو بجا ہی تھے، لیکن میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

گھر کے پورچ میں گاڑی رُکتے ہی میں بنا کسی سے کوئی بات کیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد کاشف کا فون آ گیا۔

"ساحر تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے..... میں یہ کیا سن رہا ہوں....." میں جانتا تھا کہ مما گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی کال کاشف ہی کو کریں گی۔ میری ضد کے سامنے جب کبھی مما پاپا ہارنے لگتے تھے تو ایسے میں کاشف ہی اُن کا آخری سہارا ہوا کرتا تھا۔ "بولو نا..... چپ کیوں ہو.....؟..... لیکن یاد رکھنا، ہم سب تمہیں اس پاگل پن کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ غضب خدا کا..... شہر کا سب سے بڑا کیسونووا (Casonova) ساحر رضا ایک درگاہ کا مجاور بننے چلا ہے..... خبردار! جو تم نے اس حماقت کے بارے میں مزید کچھ سوچا بھی تو.....؟" کاشف اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتا چلا گیا۔ میں چپ چاپ اُس کا لیکچر ختم ہونے کا

انتظار کرتا رہا۔ اُس کی قینچی کی طرح چلتی زبان رُکی تو میں نے اُسے چھیڑنے کے لیے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا.....؟'' ''فار گاڈ سیک ساحر..... یہ ساری باتیں صرف کتابوں میں اچھی لگتی ہیں اور پھر تمہارا واحد مقصد تو صرف اور صرف زہرا کو پانا ہی ہے نا.....؟ تو اُس کے حصول کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، تمہیں اس کے لیے یہ جوگ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' مجھے کاشف کے ناصحانہ انداز پہ ہنسی آ گئی۔ ''اچھا..... بھلا وہ کون سے طریقے ہیں..... ذرا میں بھی تو سنوں۔'' ''میری بات مذاق میں مت اُڑاؤ ساحر..... تم نے اپنی چند دن کی بے ہوشی کے دوران ہزیان میں بہت سے راز افشا کر دیئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی وہاں صرف اُس درگاہ کے متولی عبداللہ کے لیے آتی تھی۔ آج مجھے آنٹی سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ سلطان بابا عبداللہ کو لے کر کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ عبداللہ کی صورت میں تمہارا رقیب زہرا کی نظروں کے سامنے نہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تب تمہاری محبت کا وار ایک نہ ایک دن کارگر ضرور ثابت ہوگا۔ زہرا تمہارے پاگل پن کے سامنے زیادہ دن تک مزاحمت نہیں کر پائے گی۔ تم صرف انتظار کرو ساحر..... جلد بازی میں کوئی قدم نہ اُٹھانا میری جان..... ہم سب تم سے بے حد پیار کرتے ہیں.....'' بولتے بولتے کاشف کی آواز کچھ بھرا سی گئی۔ وہ ایسا ہی تھا جذباتی سا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے بات بدلی۔ ''خدا کے لیے یہ رونے دھونے کا فریضہ تم مما کے لیے ہی چھوڑ دو..... خبردار جو تم نے میری دوسری ماں بننے کی کوشش کی..... ارے یار تم لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... مجھے سلطان بابا نے ایک چیلنج دیا ہے اور میں صرف اس کسوٹی پر پورا اُترنا چاہتا ہوں اور شاید تم بھول رہے ہو، ایسے چیلنج ہم روزانہ ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے۔ یاد ہے تمہیں، پچھلے سال ہی ہم نے چولستان کے صحرا میں پندرہ دن بنا کسی گائیڈ کے رہنے کی شرط لگائی تھی اور آخری میں ہم دونوں ہی وہ شرط جیتے تھے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی شرط ہے، جس کے تحت مجھے چند دن درگاہ میں رہنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں باقاعدہ مجاور بننے کے لیے درگاہ جا رہا ہوں.....؟'' دوسری جانب سے کاشف کی مشکوک سی آواز سنائی دی۔ ''میں کیسے مان لوں کہ یہ سارا معاملہ صرف ایک شرط، یا چیلنج کی حد تک ہی رہے گا۔ مجھے تمہارے دیوانے پن سے ڈر لگتا ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار ایک دوسرا مصرعہ نکل گیا۔

''دیوانوں کی سی نہ بات کرے..... تو اور کرے دیوانہ کیا؟'' کاشف ہنس پڑا۔ ''تم کبھی نہیں سدھرو گے ساحر..... بہرحال میری تشویش کافی حد تک دُور ہوگئی ہے۔ لیکن فی الحال مجھے آنٹی کی تشویش دُور کرنی ہے، وہ اور انکل تمہارے اس نئے ایڈونچر کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔'' میں نے کاشف کو جھاڑا۔ ''زیادہ چمچہ گیری کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکے تو مما پپا کو بھی میرا نقطۂ نظر اِسی طرح سمجھانے کی کوشش کرنا، جیسے میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے اور خبردار، جو اپنی طرف سے ذرا سی بھی کوئی افلاطونی جھاڑنے کی کوشش کی تو!'' کاشف نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔ میں نے کاشف کو تو کسی نہ کسی طور سمجھا دیا تھا، لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے والدین کو سمجھانا کس قدر مشکل مرحلہ ہوگا۔

اُس رات نہ جانے کیوں مجھے عینی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ وہ بھی تو میرے لیے اِسی آگ میں جلتی رہی تھی، جس میں آج میں زہرا کے جل رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کینیڈا کا اسکالر شپ لینے سے پہلے وہ درگاہ کی سیڑھیوں پر مجھ سے آخری بار ملی تھی تو کس قدر کرچی کرچی تھی وہ..... میں اُس وقت اُس کے جذبے کی کاٹ کو محسوس نہیں کر پایا تھا، لیکن آج جب خود میرے اُوپر یہ قیامت گزر رہی تھی تو مجھے اُس کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی مجھے بددعا نہیں دے سکتی تھی، لیکن شاید کبھی کبھی خدا جذبوں کو بھی دعا، یا بددعا دینے کا اختیار دے دیتا ہے اور شاید آج میری اس حالت کے پیچھے بھی عینی کے کسی ایسے ہی جذبے کی بددعا کا عمل دخل تھا۔ کوئی ایسا جذبہ جس کے آبگینے کو میری لاپروائی سے ٹھیس لگی ہوگی۔ اگلی صبح بے حد بوجھل تھی۔ ناشتے کی میز پر مما کی آنکھیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سوئی۔ پپا بھی چپ چپ سے تھے اور پھر بالآخر انہوں نے ہی یہ خاموشی توڑی۔ ''ساحر بیٹا، تمہاری مما تمہارے اس فیصلے سے بے حد ڈسٹرب ہیں۔ میں تو کہتا ہوں بیٹا اُس بزرگ کی بات کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ابھی ہمت نہیں ہاری ہے۔ ہم ایک بار پھر زہرا کا رشتہ لے کر جائیں گے اور مجھے اُمید ہے کہ جلد، یا بدیر ہم انہیں منا ہی لیں گے اور اس کے لیے تمہیں کسی بھی شرط وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میری توقع کے مطابق کاشف نے بہت تفصیل سے مما پپا سے بات کی تھی۔ ''کیوں پپا..... کہیں آپ دونوں کو یہ ڈر تو نہیں کہ اس درگاہ میں رہتے رہتے کہیں میرا من بھی مذہب کی

طرف متوجہ نہ ہو جائے اور فرض کریں، اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ مجھے تو یہ سودا دونوں طرف سے فائدے کا ہی لگتا ہے۔ آخر ہم سب مذہب سے اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ یہ کیسا آسیب ہے جس کا ڈر ساری زندگی ہمارے اردگرد بھٹکتا رہتا ہے اور ہم تمام عمر اس سے بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں ایک بار رُک کر، پلٹ کر اس چیز کا سامنا نہیں کر لیتے۔ آخر مذہب ہم سے ہمارا کیا چھین لے گا؟'' مما اور پپا نے آج تک کبھی میرے منہ سے اس قسم کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ دونوں ہی حیرت زدہ سے بیٹھے تھے۔ پپا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ''ہاں..... شاید ہم خوف زدہ ہیں، ہر اس چیز سے جو تمہیں ہم سے دُور لے جا سکتی ہو۔ پھر چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو اور اکلوتی اولاد کے ماں باپ ہونے کے ناتے، یہ خوف ہمارا حق ہے اور یہ حق ہم سے ہمارا مذہب بھی نہیں چھینتا، شاید اسی لیے اُس بزرگ نے تمہیں بھی یہ حق یاد دلایا تھا۔'' مما بولیں تو اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی۔ ''اور پھر بیٹا..... یہ تو پاگل پن ہے کہ صرف ایک لڑکی کے حصول کے لیے تم دنیا کے باقی سبھی رشتوں کو بھلا دو..... کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟'' ''آپ دونوں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہو، لیکن میری رُوح کے دھاگے قدرت نے اُس لڑکی سے باندھ دیئے ہیں مما..... میرا دم اُس کے بغیر گھٹتا ہے۔ اگر یہ ناانصافی ہے تو یقین کریں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور اُس جذبے کا ہے، اُس جذبے کی شدت کا ہے، جس نے میری رُوح کو اُس کا قیدی بنا دیا ہے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

وہ دونوں ہی چپ چاپ اور لاجواب سے بیٹھے رہے۔ اتنے میں ڈاکٹر یزدانی کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے بات کر کے اپنے کلینک آنے کا کہا۔ شاید کچھ مزید ٹیسٹ وغیرہ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا، پھر مما اور پاپا کا موڈ دیکھ کر ہامی بھر لی۔ پپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور ہم سبھی ڈاکٹر کے کلینک چل پڑے، جہاں سے کافی دیر بعد ہماری واپسی ہوئی۔ واپسی پر سارے راستے مما پپا سے میری بحث جاری رہی۔ وہ دونوں کسی صورت مجھے اجازت دینے پر راضی نہیں تھے۔ مما تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔ ''ساحر..... تم ہوش میں تو ہو..... اتنا پڑھ لکھ کر تم اس درگاہ کی نوکری پر لگ جاؤ گے..... لوگ کیا کہیں گے؟'' ''آپ کو لوگوں کی فکر ہے، یا اپنے بیٹے کی۔ اور پھر مجھے ویسے بھی تو ماسٹرز کے لیے انگلینڈ جانا ہی تھا۔

آپ یہی سمجھے گا کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے باہر ہوں..... بلکہ وہاں سے تو ویک اینڈ اور عید وغیرہ پر گھر آنا بھی ناممکن تھا، جب کہ یہاں سے میں آسانی سے آپ سے ملنے آ سکتا ہوں۔ آپ کو میری دُوری محسوس بھی نہیں ہو گی۔'' ''کم آن ساحر'' اب پپا کی باری تھی۔ ''انگلینڈ سے ماسٹرز کرنے اور ایک درگاہ کا متولی بن کر رہنے میں بہت فرق ہے۔ ہم تمہیں مولوی نہیں، ایم بی اے بنانا چاہتے ہیں۔'' گھر میں بھی یہی بحث جاری رہی۔ ''دنیا کے سبھی والدین یہ کیوں چاہتے ہیں کہ اُن کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ ہی بنے؟ میں وہاں مولوی بننے نہیں جا رہا، کیونکہ شاید لغت میں یہ لفظ جن کے لیے موجود ہے، وہ بہت باعلم اور بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی غرض کے لیے یہ راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنی مرضی سے اپنے کسی ایک بچے کو بھی دین کی راہ پر کیوں نہیں ڈالتے۔ آپ کے ذہن میں مولوی کا جو تاثر ہے، وہ بھی کسی ایسے انسان ہی کا ہے، جو زندگی میں اور کچھ نہیں کر پاتا تو اس نے یہی کام بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر ہمیں گلہ کس بات کا ہے؟ جب ہم اپنی اولاد ہی کو اس راستے پر چلنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر جو اس خدمت میں مشغول ہیں، اُن کی کم علمی پر پتھر اُچھالنے کا بھی بھلا ہمیں کیا حق ہے؟'' پاپا لاجواب ہو گئے۔ ''لیکن ہماری سوسائٹی اسے قبول نہیں کر پائے گی۔'' ''سوسائٹی کے قانون ہم خود بناتے ہیں پپا..... آپ نے ساری عمر میں اتنا کما لیا ہے کہ اگر آپ کی اگلی سات نسلیں بھی بیٹھ کر کھاتی رہیں تو یہ دولت ختم نہیں ہو گی، لیکن مجھے اپنے آپ کو پانے کا موقع شاید یہ زندگی دوبارہ کبھی نہ دے..... مجھے اس راہ پر چلنے دیں..... اگر یہی میرا مقدر ہے تو مجھے اسے جھیلنے دیں..... آپ جانتے ہیں کہ اگر میں اس گھر میں قید رہا تو میری رُوح ہمیشہ کے لیے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ مجھے اپنے دل اور دماغ کی یہ جنگ لڑ لینے دیں۔ جیت دل کی ہو، یا ہے دماغ کی..... اصل فاتح آپ کا بیٹا ہی ہو گا۔''

میں مما پپا کو کشمکش و پیچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ساری رات مما اور پپا کے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری حالت کے پیش نظر پپا بالآخر مما کو منا ہی لیں گے اور پھر یہی ہوا، صبح جب میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو مما کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، شاید وہ رات بھر روتی رہی تھیں۔ میں نے اُن کا دل بہلانے کے لیے بات

شروع کی "آپ جانتی ہیں کہ اگر آپ یونہی روتی رہیں تو میں جانہیں پاؤں گا..... سلطان بابا کی لگائی ہوئی شرط کا فائدہ اُٹھا رہی ہیں کیا؟" اُن کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ اُبھری۔ "بہت ضدی ہو ساحر..... لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ ہر ہفتے گھر آؤ گے اور ہمارا بھی جب کبھی دل چاہے گا، ہم تم سے ملنے وہاں آسکیں گے..... خدا کرے تمہارا یہ جنون جلدی ختم ہو..... مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔" اور پھر مما پپا کی ایسی بہت فکروں اور اُن دونوں کی بھیگی پلکوں کے سائے میں، میں گھر سے رُخصت ہوگیا۔ وہ دونوں مجھے درگاہ تک چھوڑنے کے لیے آنا چاہتے تھے، لیکن میں نے بڑی مشکل سے انہیں گھر ہی میں روک دیا۔ میں جانتا تھا کہ مما کا دل بہت نازک ہے اور وہ زیادہ دیر اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پائیں گی۔ سلطان بابا کی شرط کے مطابق میں گھر سے خالی ہاتھ ہی نکلا تھا۔ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تو سلطان بابا اور عبداللہ کو سفر کے لیے تیار پایا۔ سلطان بابا نے غور سے مجھے دیکھا "..... ہاں میاں..... اپنے والدین کی اجازت سے آئے ہو نا....." "جی ہاں..... بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے، لیکن آ گیا ہوں....." عبداللہ مسکرایا۔ "میں جانتا تھا..... تم ضرور آؤ گے..... آؤ میں تمہیں کچھ ضروری باتیں سمجھا دوں۔" عبداللہ نے کچھ ہی دیر میں مجھے تمام معمولات سے آگاہ کر دیا اور پھر اتنے میں اُن کے جانے کا وقت بھی ہوگیا۔ سلطان بابا جاتے جاتے رُکے اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "پہلا پڑاؤ تو تم نے کامیابی سے طے کرلیا۔ ثابت قدم رہے تو اپنی مراد بھی پا لو گے ایک دن..... جیتے رہو....." عبداللہ نے جاتے ہوئے مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں اندر سے اب تک دو حصوں میں بٹا ہوا ہوں، دعا کرنا کہ میں یہ ذمہ داری ٹھیک طرح سے سرانجام دوں، کہیں میرے قدم نہ لڑکھڑا جائیں....." عبداللہ نے میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور مسکرا کر بولا "گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔" پھر آگے بڑھتے بڑھتے اُسے جیسے کوئی ضروری بات یاد آگئی۔ اُس نے جلدی سے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پرچی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں ایک ضروری بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ سلطان بابا نے تمہارا اپنا نام رکھ دیا ہے۔ ویسے جیسے میرا رکھا گیا تھا، جب میں یہاں پر آیا تھا۔ اس پرچی پر لکھا ہے، ہمارے جانے کے بعد دیکھ لینا۔ لوگ اب تمہیں اِسی نام سے پکاریں گے یہاں....." یہ اک نئی حیرت تھی میرے

لیے۔ ''کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہاں آنے سے پہلے تمہارا کچھ اور نام تھا.....؟ کیا نام تھا تمہارا.....'' ''عدنان..... عامر عدنان نام تھا، پہلے میرا..... اچھا اب چلوں..... سلطان بابا بہت دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں..... نئی جگہ پر پہنچ کر خط لکھوں گا..... اپنا خیال رکھنا..... فی امان اللہ۔''

عبداللہ مجھے گلے لگا کر آگے بڑھ گیا اور میں جانے کتنی دیر حیرت میں ڈوبا، گم صم وہاں کھڑا رہا..... ڈھلتے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں دُور نیچے ساحل کے آخری کنارے پر میں نے عبداللہ اور سلطان بابا کے ہیولے کو آخری بار اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تب ہی اچانک مجھے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی اُس پرچی کا خیال آیا، جو جاتے وقت عبداللہ مجھے دے گیا تھا۔ کچھ عجب سی کیفیت میں لرزتے ہاتھوں سے وہ پرچی کھولی۔ پرچی پر لکھا ہوا نام میری ہتھیلی کے پسینے سے بھیگ کر پھیلنے لگا تھا، میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ ہی کئی جھکڑ سے چلنے لگے۔ پرچی پر اپنا نیا نام دیکھ کر میرے قدم لڑکھڑا سے گئے، میرا نیا نام تھا..... ''عبداللہ''

عبداللہ

میں جانے کتنی دیر سے اپنے نام کی پرچی ہاتھ میں لیے، اپنے آس پاس چلی غیر مرئی سی آندھیوں کے شور میں وہیں درگاہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ سلطان بابا اور عبداللہ کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی اور اب رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے درگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سلطان بابا نے آج سے میری ایک نئی شناخت تجویز کر دی تھی۔ اب میں نساحر نہیں عبداللہ تھا۔ مجھ سے پہلے یہاں کوئی اور عبداللہ تعینات تھا۔ گویا حاکم بابا اور سلطان بابا بھی اصل میں حاکم اور سلطان نہیں تھے، اُن کے اصل نام بھی کبھی کچھ اور ہوں گے اور پھر وہ بھی یونہی عبداللہ کے عہدے سے ترقی کر کے پہلے حاکم اور پھر سلطان بنے ہوں گے.....؟ عہدوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہوگا.....؟ میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر اُلجھتا چلا گیا۔ لیکن میں تو یہاں چند دن کے لیے عارضی طور پر آیا تھا اور میرا مقصد صرف اور صرف زہرا کا حصول تھا۔ مجھے تو زہرا کو پاتے ہی اپنی اصل دنیا کی جانب لوٹ جانا تھا، تو پھر سلطان بابا نے اس عارضی مقصد کو پانے کے لیے میری باقاعدہ "عبداللہ" کے عہدے پر تعیناتی کیوں کر دی تھی.....؟ کیا اس دکھاوے کا مقصد بھی کہیں اُس سنگ مرمر کی مورت کو پگھلانا تو نہیں تھا؟

رات اب باقاعدہ اور پوری طرح سے تمام ساحل پر اپنے پنجے گاڑھ چکی تھی۔ درگاہ میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق درگاہ میں رکھے ہوئے چند مٹی کے چراغ روشن کر دیئے۔ انہی ہدایات میں یہ بات بھی کہیں درج تھی کہ مٹی کے ان دیوں کے لیے تیل خریدنے کا اہتمام بھی مجھے اپنی مزدوری کے پیسوں ہی سے کرنا تھا۔ فی الحال، کچھ تیل ان چراغوں میں باقی تھا۔ دفعتہً تنہائی اور اُداسی کی ایک بھرپور لہر نے میرے پورے وجود کو جیسے لرز سا دیا۔ مجھے اپنے والدین، دوست، رنگین زندگی کی رومانی شامیں اور مدہوش سی راتیں بُری طرح یاد آنے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت اگر کبھی میں خوش قسمتی سے گھر میں موجود ہوتا تھا تو مما کیسے بھاگ بھاگ کر کچن میں کک کو میرے لیے مختلف ڈشز تیا

کرنے کا حکم دیتی رہتی تھیں، پاپا جلدی سے شطرنج کی بازی جما لیتے تھے اور اُن کی ہمیشہ کوشش رہتی کہ وہ مجھ سے جیتنے کے بجائے ہارتے جائیں۔ نہ جانے انہیں مجھ سے ہارنے میں اتنا لطف کیوں آتا تھا؟ میں اپنی ساری دنیا تیاگ کر، اس اندھیری رات میں یہاں اس ویران درگاہ میں کیا کر رہا تھا.....؟ یہ میں نے کیسا سودا کر لیا تھا؟ یہ سب کچھ سوچ کر دل جیسے کٹنے سا لگا۔ جتنی تنہائی اور اُداسی میں نے درگاہ کی اس پہلی رات میں اپنی رُوح کے اندر اُترتی محسوس کی، ویسی تو کبھی زندگی بھر نہیں جھیلی تھی۔ کہتے ہیں، رات کا فسوں ہر چیز کی حقیقت کو اُس کی اصل شدت سے کہیں زیادہ اُبھار کر پیش کرتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ڈھلتی رات کا جادو وہی کھیل، کھیل رہا تھا۔ میں بہت دیر تک درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دُور شور مچاتے ساحل کو دیکھتا رہا۔ کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک بحری جہاز میری طرح تنہا سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ دُور سے جب اس کی ٹمٹماتی بتیاں لمحہ بھر کو چمکتیں تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے وہ بھی حیرت سے میری جانب دیکھ رہی ہیں کہ یہ ''بنجارہ'' اس ویرانے میں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالات کی یلغار میں رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے دھیرے سے میرا کاندھا چھوا ہو۔ میں نے جھٹکے سے پلکیں کھولیں تو صبح ہونے کو تھی۔ کوئی شخص میرے قریب بیٹھا میرا کاندھا ہلا رہا تھا۔ ''اُٹھ جاؤ بھائی..... نماز کا وقت ہونے والا ہے۔'' کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے گھبرا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اپنے حلیے سے مقامی مچھیرا لگتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا ''نماز کھڑی ہونے والی ہے..... اُٹھ جاؤ.....'' میں نے اُس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی تو درگاہ کے بالکل سامنے والی چٹان پر پتھر کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا کے احکامات میں سے ایک حکم پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کا بھی تھا، لیکن مجھے تو نماز پڑھے جانے کتنے سال گزر چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت فجر کی نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بہرحال میں نے جلدی سے اُٹھ کر منہ پہ پانی کے چند چھینٹے مارے۔ بھلا ہو ان چند نمازیوں کا جو مسجد کے باہر بنے چھوٹے سے حوض کے کنارے وضو کر رہے تھے، تو میں نے بھی اُنہی میں سے ایک کے قاعدے کو پوری طرح نقل کیا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ دو نمازی اور بھی مسجد میں داخل ہوئے تھے اور دونوں ہی نے

جلدی سے شاید سنتوں کی نیت باندھ لی۔ میں نے بھی اُنہی کی تقلید کی اور اُن کے ساتھ
سلام پھیر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مولانا صاحب بھی تشریف لے آئے اور جماعت کھڑی ہو
انہوں نے جب پہلی رکعت شروع کی تو مجھے دھیرے دھیرے بچپن میں اپنے اسلامیات
ٹیچر کی حفظ کروائی ہوئی نماز اور سورتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم مذہب کو چا
کتنا بھی بھلا دیں..... مذہب نہیں بھلاتا۔ وہ کسی میٹھی یاد کی طرح ہمارے دل کے
خانوں میں کہیں نہ کہیں چھپا رہتا ہے اور جیسے ہی ہم کبھی کسی مجبوری میں اُسے آواز دیتے
وہ چھم سے کود کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جب تک مولانا صاحب نے سلام پھیرا، میر
ذہن اور دل کے تمام دریچے وا ہو چکے تھے۔ مجھے بہت کچھ یاد آ چکا تھا۔

نماز کے بعد وہ نورانی چہرے والے امام ہماری طرف پلٹے اور کھنکار کر کہنے لگے۔ ''
بھئی ساتھیو..... تو کل ہم نے درس کہاں ختم کیا تھا۔'' مقتدیوں میں سے ایک نے جلدی
لقمہ دیا ''مولانا صاحب..... آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے تک پہنچے تھے۔''
امام نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور غور سے ہم سب کی طرف دیکھا۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا
حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوا تھا، سبھی درباری مؤدب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخ
نہایت گھبرایا ہوا سا اُن کے دربار میں حاضر ہوا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں
وہ آتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے قدموں میں گر گیا کہ اُس نے ابھی ابھی حضر
عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے باہر دیکھا
اور اُسے یقین ہے کہ وہ اُسی کی رُوح قبض کرنے کے لیے آج یہاں آئے ہیں، لہٰذا اُس
گزارش ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہواؤں کو حکم دیں کہ فوراً اُسے اپنی طاقت سے اُڑا
دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچا آئیں۔ ساتھیو، آپ تو جانتے ہیں کہ خدا نے حضرت سلیما
علیہ السلام کو بڑی طاقت عطا کی تھی۔ تمام جنات، ہوائیں، سب چرند پرند، حضرت سلیمان ع
السلام کے تابع تھے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فریادی کی فریاد قبول کر لی اور ہوا کو حکم
کہ اس شخص کو پل بھر میں دنیا کے آخری سرے تک پہنچا آئے۔ ہوا نے حکم کی تعمیل کی اور ا
دربار لگا ہی ہوا تھا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی کسی بھیس میں اُس دربار میں آ پہنچے
حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور مزاح اُن سے پوچھا کہ ''کیوں حضرت..... آج تک ا

جانیں قبض کی ہیں، کبھی کچھ مشکل بھی پیش آئی.....؟'' حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا ''ہاں آج ایک عجیب واقعہ ہوا، جس نے کچھ دیر کے لیے تو مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ہوا یہ کہ آج مجھے دنیا کے دوسرے سرے پر ایک شخص کی رُوح قبض کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن ابھی چند لمحے پہلے میں نے جب اُسی شخص کو آپ کے دربار کے باہر دیکھا تو میں خود بھی متزلزل ہو گیا کہ یہ شخص تو یہاں موجود ہے، جب کہ میری فہرست کے مطابق مجھے یہاں سے ہزاروں میل دُور اُسے بے جان کرنا تھا۔ لیکن ایک لمحہ پہلے جب میں اُس مقام پہ پہنچا، جہاں اُس شخص کا آخری سانس لکھا تھا تو وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھا..... سچ ہے..... خدا کے کام..... خدا ہی جانے.....'' مولانا صاحب نے قصہ ختم کر کے تمام نمازیوں کی طرف دیکھا، جو سبھی دم سادھے مؤدب بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب سے سوال کیا۔ ''ہاں تو ساتھیو..... اس واقعے سے آپ کو کیا سبق ملا.....؟ یہی نہ کہ موت سے کسی کو رُخصت نہیں۔ ہر ذی نفس کو اس کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ چاہے انسان کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کر لے، تقدیر پھر بھی اٹل ہے اور یہ بھی طے ہے کہ جس کی موت جہاں آنی ہے، قدرت اُسے خود وہاں پہنچا دیتی ہے اور تب تک موت خود زندگی کی حفاظت کرتی رہتی ہے.....'' سبھی نمازیوں نے زور سے سر ہلا کر مولانا صاحب کی باتوں کی تائید کی۔ یہ آس پاس کی بستیوں کے چند مچھیرے تھے جو روز صبح سویرے سمندر کی طرف نکلنے سے پہلے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔ مولانا صاحب نے درس ختم کرتے ہوئے اختتامی کلمات کہے ''اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے جب جس سے، جہاں، جو کام لینا ہوتا ہے..... اُسے کسی نہ کسی بہانے وہاں کھینچ لے جایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا..... جب جب، جو جو ہونا ہے، تب تب، سو سو ہوتا ہے.....'' مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا..... بالکل ایسی ہی بات عبداللہ نے تب کہی تھی جب میں زہرا کی تلاش میں دوسری مرتبہ درگاہ آیا تھا۔ سبھی نمازی ایک ایک کر کے پیش امام صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے مسجد سے نکلتے گئے۔ میں نے بھی اِسی روایت کی تقلید میں انہیں سلام کیا اور واپسی کے لیے قدم مسجد کے دروازے کی جانب بڑھائے ہی تھے کہ دفعتہً پیچھے سے پیش امام صاحب کی آواز اُبھری ''عبداللہ بیٹا..... تم ذرا رُکو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے.....'' میں نے اَن جانے میں فوراً پلٹ کر اُن کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا کہ جیسے وہ ''عبداللہ'' ہی سے

مخاطب ہوں، لیکن میری حیرت اُس وقت دوچند ہوگئی جب مجھے یہ پتا چلا کہ اُن کا مخاطب ''میں'' ہوں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے پکارا تھا، لہٰذا میرا چونکنا تو فطری تھا، لیکن انہیں کیسے علم ہوا کہ میرا نام عبداللہ ہے۔ وہ میری حیرت کو بھانپ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ''تمہاری حیرت بجا ہے۔ دراصل پچھلے عبداللہ نے جاتے ہوئے خود مجھے بتایا تھا کہ اُس کا کوئی دوست اُس کی جگہ لینے آرہا ہے اور سلطان بابا نے اُس کا نام بھی ''عبداللہ'' ہی تجویز کیا ہے..... آؤ..... یہاں بیٹھ جاؤ.....''

میں ایک حیرت آمیز اُلجھن لیے، اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے مجھ سے تو کبھی اُن کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر یہ صاحب میرے بارے میں اس قدر تفصیل سے کیسے جانتے تھے۔ میرے دل میں کئی سوال مچلے، لیکن میں احتراماً چپ رہا۔ پھر انہوں نے خود ہی باتوں کا سلسلہ جوڑا۔ ''میرا نام مولوی خضرالدین ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس مسجد کی امامت کر رہا ہوں۔ تم سناؤ..... کیسی گزر رہی ہے..... کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟'' ''نہیں..... ایسی کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہے..... ایک آدھ دن میں عادی ہو جاؤں گا، اس ماحول کا.....'' ''ہاں میاں..... عادت پڑ ہی جاتی ہے..... بات بس خود کو ڈھالنے کی ہے..... تم نے اپنے گزر بسر کے بارے میں کیا سوچا ہے..... درگاہ میں کچھ کھانے پینے کو بھی موجود ہے کہ نہیں.....؟'' مطلب یہ کہ عبداللہ نے انہیں کافی تفصیل سے میرے بارے میں بتا رکھا تھا۔ ''جی..... کچھ سامان عبداللہ چھوڑ گیا ہے..... ایک آدھ دن گزارہ ہو جائے گا..... پھر سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' ''نہیں میاں..... آج کا کام کل پر کیوں چھوڑتے ہو..... میری مانو تو آج ہی سے کام پر لگ جاؤ.....'' مولانا صاحب مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ بار اُٹھ کر مسجد کے اندر ہی بنے اپنے حجرے میں بھی گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں مسجد کے چھوٹے سے کمرے میں چائے کی سوندھی خوشبو پھیلنے لگی۔ اُن کے حجرے کا ایک دروازہ مسجد کے اندرونی کمرے میں بھی کھلتا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں ایک چائے دانی، دو کپ اور شاید رات کی بچی ہوئی روٹی کے کچھ ٹکڑے لیے چلے آئے۔ میں اُن کے اس اچانک تکلف پر کچھ ایسا بوکھلایا کہ جلدی میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور بس ''ارے..... ارے.....'' ہی کرتا رہ گیا۔ مولوی خضر ہلکے سے مسکائے ''بھئی تمہیں تو شاید پسند نہ آئے..... پر ہمارا تو روز کا یہی

ناشتا ہے..... آج تم بھی گزارہ کرلو۔ کل سے اپنی پسند کا بنا لینا.....'' میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''آپ اپنا ناشتا خود ہی بناتے ہیں..... میرا مطلب ہے کہ.....'' ''ہاں میاں..... چھڑا بندہ اپنا سامان خود تیار نہ کرے تو کیا کرے.....'' وہ ہنس کر بولے ''اکیلا رہتا ہوں..... شادی وغیرہ کے جھمیلے میں نہیں پڑا۔ ماں باپ عرصہ ہوا، اللہ کو پیارے ہو چکے..... اب تو خود اپنا بھی چل چلاؤ ہے.....'' ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم چاہو تو آج ہی سے اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ ابھی کچھ دیر میں نیچے ساحل پر سیپیوں اور گھونگھوں کا بازار لگے گا، تم پچاس روپے کی چھوٹی ناکارہ سیپیاں خرید لینا اور پھر قریبی بستی کے اتوار بازار میں بیچ آنا۔ اس روز وہاں زائرین کا بھی خاصا ریلا ہوتا ہے۔ تمہیں ضرور بیس پچیس روپے کا فائدہ ہو جائے گا اور اتنے پیسے تمہاری روزانہ کی گزر بسر اور درگاہ کے چراغوں کے تیل کے لیے کافی ہیں۔''

میں غور سے مولوی صاحب کی بات سنتا رہا، لیکن بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس سیپیاں خریدنے کے لیے پچاس روپے بھی نہیں تھے، کیوں کہ مجھے سلطان بابا کی شرط کے مطابق گھر سے بالکل خالی ہاتھ درگاہ آنا تھا۔ غالباً مولوی خضر میرے اندر کی ہچکچاہٹ محسوس کر گئے۔ ''کیا ہوا.....؟ لگتا ہے، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بھئی یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کرو تم مجھ سے اُدھار لے لو..... پر یاد رہے..... جیسے ہی تمہاری پہلی کمائی ہو..... یہ اُدھار لوٹانا ہوگا..... بولو منظور ہے.....'' میں کچھ ہچکچایا۔ ''لیکن اگر مجھے اس سودے میں نقصان ہو گیا تو..... میرا مطلب ہے، آپ رہنے دیں..... میں کچھ نہ کچھ بندوبست کرلوں گا.....'' حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے پاس پیسوں کا بندوبست کرنے کا اور کوئی بھی ذریعہ موجود نہیں، لیکن نہ جانے کیوں مولوی خضر کی محنت کی کمائی کو داؤ پر لگاتے ہوئے مجھے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے زبردستی پچاس کا نوٹ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولے ''ارے بھئی اُدھار کے نام سے تذبذب میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے..... اچھا چلو..... قرضِ حسنہ ہی سمجھ کر رکھ لو..... اگر نقصان ہو گیا تو قرضہ معاف..... ویسے ان پچاس روپوں میں بڑی برکت ہے..... دیکھ لینا تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔ اچھا چلو، آج میں بھی تمہارے ساتھ ہی ساحل تک چلتا ہوں..... تمہارا پہلا دن ہے..... کہیں خراب مال ہی نہ اُٹھا

لو.....'' مولوی خضر نے برتن سمیٹے اور میرے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ممنونیت سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''آپ کیوں میرے لیے اتنی تکلیف اُٹھاتے ہیں..... میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' لیکن وہ بھی اپنی دُھن کے پکے نکلے۔ فٹافٹ تیار ہو کر سر پر امامہ باندھے، مجھے ساتھ لیے، نیچے ساحل پر بیٹھے مچھیروں کے ٹولے کے قریب پہنچ گئے، جو ذرا ذرا سے فاصلے پر اپنے سامنے تازہ سیپیوں اور گھونگھوں کا انبار سجائے بیٹھے تھے۔ مولوی خضر نے نہایت انہماک اور کافی بھاؤ تاؤ کے بعد سیپیاں خرید لیں۔ ساتھ ہی وہ مجھے اچھی سیپیوں کی خصوصیات اور پہچان بھی بتاتے رہے، تاکہ آئندہ ایسے کسی سودے میں مجھے کوئی نقصان نہ ہو۔ عجیب کمال شخص تھے مولوی خضر الدین..... کچھ ہی دیر میں مجھ سے یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ نہ صرف ساحل پر، بلکہ علاقے کے تقریباً سبھی لوگ اُن کا بے حد احترام کرتے تھے اور اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کر دیتے تو لوگ بنا کسی مول تول ہی کے، سارا کا سارا بازار اُن کے قدموں میں لا ڈالتے، لیکن انہوں نے پکے کاروباریوں کی طرح ایک ایک سیپی پر لمبی بحث کی اور مال خرید کر میرے حوالے کر دیا۔ واپسی پر انہوں نے تفصیل سے مجھے مالائیں بنانے کا ہنر بھی سکھا دیا کہ کس طرح سیپی کو ایک خاص زاویے سے دھاگے میں پرونا ہے۔ ہم دونوں جب اپنی ''خریداری'' کے بعد اُوپر درگاہ تک پہنچے، ظہر کی نماز کا وقت قریب آ چکا تھا، جب کہ مجھے ابھی اپنے دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ عبداللہ نے اپنے حجرے کے چھوٹے سے باورچی خانے میں ضرورت کے چار برتن اور کچھ راشن میرے لیے چھوڑ دیا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو ٹھیک سے انڈا اُبالنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں بھی مولوی خضر ہی میرے کام آئے اور انہوں نے خود میرے کمرے میں آ کر تھوڑی سی دال کے ساتھ کچھ چاول اُبال کر میرے ''لنچ'' اور ''ڈنر'' کا انتظام کر دیا۔

ابھی چوبیس گھنٹے پہلے ہی کی بات تھی، جب میں دوپہر کے ٹھیک اِسی لمحے اپنے سارے دوستوں کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل میں اُن کی طرف سے دیا گیا الوداعی ظہرانہ تناول کر رہا تھا۔ یہ لنچ دراصل کاشف کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ اور اُن سب نے مجھے گلے لگا کر اس دعا کے ساتھ رُخصت کیا تھا کہ میں ایک آدھ ہفتے میں سلطان بابا سے اپنی ''شرط'' جیت کر واپس انہیں جوائن کر لوں گا۔ ہم سب کے لیے یہ ''درگاہ یاترا'' صرف ایک شرط ہی تو

تھی اور میں اس سے پہلے بھی ایسی کئی شرطیں جیت چکا تھا، لیکن یہ میری زندگی کی شاید سب سے مشکل کسوٹی تھی۔ اگر میرے دوست، یا والدین مجھے اس روز وہ سادہ سے دال چاول کھاتے دیکھ لیتے تو شاید حیرت اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتے، البتہ اپنی استقامت پر تو خود مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں کس آسانی سے اس ماحول میں ڈھلتا جا رہا تھا۔

دن ڈھلا اور پھر سے وہی تنہا اور اُداس شام درگاہ کی دیواروں پر اُتر آئی۔ ایک ہی دن میں میری زندگی کس قدر بدل چکی تھی۔ عام حالات میں، میں اس وقت سو کر اُٹھتا تھا اور نیم گرم پانی کا شاور لینے کے بعد تیار ہو کر کلب، ہوٹل، یا کسی دوست کی پارٹی میں محفل جمتی تھی، جس کا خاتمہ عموماً آدھی رات کے بعد ہی ہوتا تھا اور ہم اُس وقت اپنے گھروں کو سونے کے لیے لوٹتے تھے، جب باقی لوگ جاگ کر اپنے کام کاج پر نکل رہے ہوتے تھے۔ اچانک سمندر کی طرف سے چلنے والی ہوا میں کچھ شور اور ہلے گلے کی مدھم سی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ میں نے چونک کر دُور نیچے ساحل پر نظر ڈالی، کچھ نوجوان لڑکے، لڑکیوں کا ایک گروپ ساحل پر رات گزارنے کے لیے کیمپ فائر کر رہا تھا۔ ساحل پر آگ جلا کر اور بڑے بڑے اسپیکرز پر موسیقی کی دُھن پر رقص جاری تھا۔ خوشی تھی، ہنسی تھی، قہقہے تھے اور مستی تھی۔ میں بہت دیر تک دُور نیچے ساحل پر اس گروپ کو دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے ہی دوستوں کا گروپ ہو۔ ہم بھی تو ایسے ہی راتوں کو موج مستی کرنے نکل جاتے تھے۔ اچانک میوزک کی بیٹ بدل گئی اور ہوا میں نئے نغمے کی آواز گونجی۔ لڑکے، لڑکیاں خوشی سے چلائے ''پرانی جینز اور گٹار.....'' لڑکیاں، لڑکے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔

لڑکپن کا..... وہ پہلا پیار.....
وہ لکھنا ہاتھوں پہ..... اے پلس آر (A+R)
وہ دینا تحفے میں..... سونے کی بالیاں
وہ لینا دوستوں سے پیسے اُدھار.....

دفعتہً مجھے اپنے گالوں پر کچھ نمی کا سا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر ہاتھ پھیرا تو میری اُنگلیوں کی پوریں، خود میرے اپنے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو ہے ''بس یادیں اور کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی تو رہ جاتی ہیں'' اور یادوں کے

اسی کڑوے دھویں نے میرے حلق میں کانٹوں کا وہ جنگل اُگایا کہ پھر میرے آنسو روکے
رُکے۔ مجھے یاد آیا کہ یہ گانا عینی کو بھی بہت پسند تھا اور ہم کالج کینٹین میں گھنٹوں میزیں بجا
کر یہ گانا گایا کرتے تھے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی یونہی رواں تھی کہ اچانک
اپنے کاندھے پر کسی نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش

Presented by Pakistan Virtula library

Visit for more beautiful books and novels

www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.org

خضر راہ

میں چونک کر پلٹا تو مولوی خضر میرے پیچھے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں پونچھ ڈالیں، لیکن شاید وہ اس اندھیرے میں بھی میری بھیگی پلکوں کی تحریر پڑھ چکے تھے۔ ''لگتا ہے کچھ یاد آ گیا تمہیں.....؟'' میں نے جلدی سے بات بنائی ''نہیں..... وہ نیچے کچھ نوجوان پارٹی کر رہے ہیں..... شاید اُن کے بار بی کیو کے دھویں سے آنکھیں جلنے لگی تھیں.....'' مولوی خضر دھیرے سے مسکائے ''ہاں میاں..... دھواں لکڑی کا ہو، یا پھر یادوں کا..... دونوں صورتوں میں آنکھ تو جلتی ہے۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ لیکن وہ جہاں دیدہ شخص تھے، بات بدل کر بولے ''کل صبح ساحل کے بازار اکٹھے چلیں گے، مجھے بھی کچھ راشن خریدنا ہے۔ ویسے تم نے آج کتنی سیپیاں پروئیں.....'' ''جی سات مالائیں ہی پرو پایا ہوں اب تک۔'' انہوں نے خوش ہو کر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ ''شاباش..... تم واقعی ایک محنتی اور اپنی دُھن کے پکے لڑکے ہو..... مجھے یقین ہے، تم زندگی کے ہر میدان میں سرخرو ہو گے۔'' میں زندگی میں کبھی کسی کے سامنے نہیں رویا، لیکن نہ جانے اُن کی اس دعا میں اور اس لمحے میں کیسا اثر تھا کہ میرا پہلے ہی سے بھرا دل چھلک پڑا اور میری آنکھیں پھر سے بہہ نکلیں۔ مولوی خضر الدین نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور مجھے تسلی دے کر بولے۔ ''یہ آنسو بھی تمہارا سچ ظاہر کرتے ہیں، کیوں کہ جن کے دل میں کھوٹ ہوتا ہے، اُن کی آنکھوں کے کنویں سدا خشک ہی رہتے ہیں..... لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... یہ آنسو کسی کی بھی زندگی کا رُخ بدل سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہمیشہ اپنی طاقت بنائے رکھنا، کبھی اپنی کمزوری نہ بنانا..... کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ تم کمزور نہیں ہو.....'' مولوی خضر میری ہمت بڑھا کر واپس پلٹ گئے۔

درگاہ میں میری دوسری رات بھی اسی بے چینی، بے کسی اور درد کی تڑپ میں گزر گئی۔ اگلے دن پھر سے وہی سارا معمول جاری رہا اور مولوی خضر میری راہ کے خضر بنے، مجھے راستہ دکھاتے اور سہارا دیتے رہے۔ سچ ہے کہ اگر ان ابتدائی دنوں میں مجھے اُن کا ساتھ حاصل نہ

ہوتا تو شاید میرے لیے درگاہ کی اس سادہ، مگر میرے لیے انتہائی سخت، زندگی کے معمول میں ڈھلنا اتنا آسان نہ ہوتا۔

اِسی طرح تین دن بیت گئے اور جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ جمعرات کو تمام زائرین درگاہ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ نہ جانے کیوں صبح ہی سے میرا دل ہر آہٹ پر چونکنے اور ہر سرگوشی پر بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہی تو وہ دن تھا، جب وہ نسیم سحر، اس درگاہ کے فرش پر اپنے گلاب قدموں کا بوسہ دیتی تھی۔ سہ پہر تک تو میری گھبراہٹ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ جیسے میرا دل ابھی میرے سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آ گرے گا اور پھر چار بجے کے قریب اچانک ہی وہ ٹھنڈی سی پروائی چلی، جو میری رُوح تک کو سرشار کر دیتی تھی۔ میں نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں تو وہ ماہ رُخ اسی شان سے چلتی ہوئی درگاہ کے صحن میں داخل ہو رہی تھی، ساتھ ہی حسب معمول اُس کی ماں اور دو قدم پیچھے اُس کی خادمہ بھی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی آ رہی تھیں۔ اُس نے درگاہ کے دروازے کے قریب صفائی کرتے زائر سے کچھ پوچھا، شاید عبداللہ کے بارے میں استفسار کیا ہو۔ زائر نے جواب میں میری طرف اُنگلی اُٹھا کر اشارہ کر دیا۔ میں اس وقت درگاہ کے مرکزی صحن میں دروازے سے بہت دُور بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب زہرا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اتنی دُور سے بھی اُس کی حیرت آمیز نگاہوں کی تپش سے مجھے اپنا پورا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کی مجھ پر نظر پڑی اور یہ میری تقدیر کی وہ پہلی نظر تھی، جس کا وقفہ شاید سب سے لمبا تھا۔ زہرا نے زندگی میں پہلی بار اتنی دیر تک میری جانب دیکھا تھا۔ شاید وہ حیرت اور صدمے کی وجہ سے اپنی نظر مجھ سے ہٹا نہیں پائی تھی۔ لیکن میں نے اپنی زندگی کے ان چند لمحوں کو کچھ اسی طرح جیا کہ پھر کسی اور سانس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی۔ کسی کے لیے فنا ہو جانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کے دل بر کی نگاہ اُس پر ٹکی ہو اور وہ اپنی جان اُس جان آفرین کے سپرد کر دے۔ کچھ دیر تک زہرا مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت گھنی اور کالی گھٹا کے سائے کے بعد اچانک ہی بے حد تیز اور چبھن والی دھوپ نکل آئی ہو۔ زہرا کی ماں کی نظر بھی مجھ پر پڑی اور انہیں بھی اپنی بیٹی جیسا ہی شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ تیز قدموں سے میری طرف کھنچی چلی آئیں۔ زہرا اور خادمہ اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔

انہوں نے آتے ہی میرے سلام کا جواب دیا اور جلدی سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرے چہرے کو یوں ٹٹولا، جیسے وہ میرے ہونے کا یقین کرنا چاہتی ہوں۔ پھر بہت دیر بعد اُن کے ہونٹوں سے کچھ ٹوٹے لفظ ادا ہوئے۔ ''ساحر بیٹا..... تم..... یہاں..... میرا مطلب ہے اپنا گھر بار چھوڑ کر اس طرح..... لیکن کیوں.....'' شاید انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں اس صدمے سے نکالنے کے لیے خود ہی بات جوڑنے کی کوشش کی۔ ''جی..... میں نے سوچا کہ کچھ دن زندگی کا یہ رُخ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے، اور ہاں..... لوگ مجھے یہاں 'عبداللہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ ساحر اب میرا پرانا نام ہے.....'' اُن جانے میں میرے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو انہیں کچھ دیر سے پتا چلتی تو بہتر ہوتا۔ میرے منہ سے میرا نام سن کر تو وہ جیسے بالکل ہی ڈھے سی گئیں اور وہیں درگاہ کے صحن کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے انہیں قریبی گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر پیش کیا اور تسلی دی ''آپ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ راستہ میں نے خود اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے، بنا کسی جبر کے..... بس آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔''

میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے حجرے کی جانب چلا آیا، کیونکہ کچھ دیر ہی میں نذر و نیاز کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے درگاہ کے معمول کے مطابق پہلے مردانے والے برآمدے کی جانب بیٹھ کر نذرانے جمع کر کے اُن کی فہرست بنائی اور اُسی وقت جمعرات کے دن خصوصی طور پر آئے ہوئے درگاہ کے چند خدمت گاروں کے ذریعے اُن کی تقسیم کے احکامات بھی جاری کر دیئے۔ پھر میں حجرے میں بنی اُس کھڑکی میں آ بیٹھا، جو درگاہ کے پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی اور جمعرات کے دن خصوصی طور پر زنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں خواتین کی آمد بھی شروع ہوگئی، جو اپنی نذر اور صدقہ وغیرہ اس چھوٹی سی کھڑکی سے اندر بڑھا کر اپنے مختلف النوع وقسم کے مسائل کے حل کے لیے دعا کی درخواست کرتیں اور دعا کے بعد اُٹھ کر یوں مطمئن ہو کر چلی جاتیں، جیسے اس دعا کے بعد واقعی اُن کے سب مسائل ایک دم حل ہی تو ہو جائیں گے؟ اور پھر کچھ ہی دیر بعد اُسی مترنم آواز نے دھیرے سے سلام کیا۔ وہی آواز جسے میں دنیا کی اربوں آوازوں میں بھی، بنا ایک پل ضائع کیے، شناخت کر سکتا تھا۔ میری آواز گلے میں اٹکنے سی لگی اور مجھ سے ٹھیک طرح سے جواب بھی نہیں دیا

گیا۔ کچھ دیر دوسری جانب بھی خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ دھیرے سے بولی ''یہ آپ کیا
رہے ہیں..... خدا کے لیے اپنی ضد چھوڑ دیں..... ایسے بھلا کون، کسی کے لیے اپنی زندگی بر
کرتا ہے.....؟'' مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی، جس کی صرف ایک
جھلک دیکھنے کے لیے میں نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ لیکن یہ جوگ مجھے اتنا بڑا انعام د
گا، یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں تو صرف اُس کی آواز سننے کے لیے ایسے
جانے کتنے جنم، اس درگاہ پر تیاگنے کے لیے تیار تھا اور اُسے صرف میری اسی ایک حقیر زندگی
فکر لگی ہوئی تھی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اُس نے پھر بے چین ہو کر اپنی بار
دہرائی۔ ''آپ چپ کیوں ہیں..... بولتے کیوں نہیں.....؟'' میں اپنے خیالات کی رو
چونکا۔ ''شاید کچھ لوگوں کے مقدر ہی میں بربادی ہوتی ہے۔ کچھ زندگیاں ملتی ہی صرف تباہ
جانے کے لیے ہیں.....'' وہ بھڑک سی گئی۔ ''آپ صرف پتھروں سے سر ٹکرا رہے ہیں...
سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں حاصل کر پائیں گے آپ.....'' ''مجھے مرہم کی تمنا بھی نہیں
ہے..... پتھروں سے سر ٹکرانے کا شوق ہی مجھے یہاں تک لے کر آیا ہے۔ لیکن کچھ پتھر شاید
نہیں جانتے کہ جس جبیں کو وہ یوں لہولہان کر رہے ہیں، اُسی پیشانی سے چھلکتا خون، خود انہیں
بھی تو داغ دار کر دے گا۔'' زہرا کو میری بات سن کر غصہ آ گیا۔ ''بات اگر داغ دار ہونے
ہے تو اپنا دامن بھی کون سا اُجلا ہے..... ایک داغ اور سہی..... بہرحال..... میں پھر بھی آ
سے یہی درخواست کروں گی کہ یہ پاگل پن چھوڑ دیں..... یہ راہ پہلے ہی کئی زندگیاں برباد
چکی ہے..... میں نہیں چاہتی کہ ایک اور جیون اس کی بھینٹ چڑھے..... آگے آپ کی
مرضی.....'' وہ وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ مجھے یاد نہیں، میں نے کس طرح اُس کی خادمہ
اُس کا نذرانہ وصول کیا اور کس طرح باقی خواتین کے مسائل سنے۔ بس ایک خواب کی
کیفیت میں سارا وقت گزر گیا۔ ہوش تب آیا، جب مولوی خضر کے بھیجے ہوئے ایک شخص نے
کر اطلاع دی کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے اور مولوی صاحب مسجد میں میرا انتظار کر رہے
ہیں۔ میں نے سارا سامان اور نقد رقم وغیرہ درگاہ کے خصوصی زائر کے حوالے کی اور خود مسجد
آیا۔ نماز کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو مولوی خضر مجھے اپنے ساتھ لیے چہل قدمی کرتے
ساحل کی جانب چلے آئے۔ ساحل اس وقت بالکل سنسان پڑا تھا۔ مغرب کی جانب سے

ٹھنڈی پروائی میں شامل نمی نے کچھ ہی دیر میں ہم دونوں کو بھگو دیا۔ انہوں نے شاید میری
ہ خاموشی کو محسوس کر لیا تھا، تبھی ہلکے سے کھنکار کر بولے ''کیوں میاں..... آج کچھ کھوئے کھوئے
سے لگتے ہو..... سب خیر تو ہے نا.....'' ''جی..... کچھ خاص نہیں..... بس یوں ہی کچھ سوچ رہا
تھا.....'' ''اچھی بات ہے..... انسان کو سوچتے رہنا چاہیے..... ہماری دنیا میں آمد کا اصل مقصد
بھی یہی سوچ اور یہی کھوج ہے..... اور اِسی کھوج اور اِسی جستجو کا ہمیں حکم بھی دیا گیا۔'' ''نہ
جانے آپ کس کھوج کا ذکر کر رہے ہیں، لیکن میری سوچ تو کافی خودغرض سی ہے..... میں
اپنے ہی ایک مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا..... جس کا فائدہ، یا نقصان صرف میری ذات
تک محدود ہے.....'' مولوی خضر چلتے چلتے رُک گئے اور انہوں نے اپنی اُنگلی کے اشارے سے
میری توجہ دُور سمندر میں کھڑے ایک بحری جہاز کی جانب مبذول کروائی۔ ''جانتے ہو.....
سمندر کے بیچوں بیچ کھڑا یہ دیو ہیکل جہاز بھی کسی انسان کی ایسی ہی سوچ کا نتیجہ ہے، جو ہوسکتا
ہے کہ شروع میں اُسے بھی صرف اپنی ایک خودغرضانہ سوچ لگی ہو.....'' ''میں سمجھا نہیں.....
آپ کیا کہنا چاہتے ہیں.....'' مولوی صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا ''دنیا کی ہر ایجاد،
تبدیلی اور ترقی کسی سوچ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے..... ہاں البتہ کوشش اور لگن کا جنون شرط آخر
ہے..... انسان سوچتا ہے پھر کوشش کرتا ہے اور پھر اُوپر والا چاہے تو اُس کی سوچ کو الہام بنا
دیتا ہے۔ انسان کے ذہن میں وہ کلیہ ڈال دیتا ہے، جو آگے چل کر اُس کی، اس بحری جہاز
جیسی ہی کسی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے..... لہٰذا سوچ کس قدر ضروری ہے..... اس کا اندازہ
اب تم خود ہی لگا لو.....'' اُن کی باتیں سن کر میں چونک سا گیا۔ ''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ
بحری جہاز، یا پھر اس جیسی اور سبھی ایجادیں انسان کی اپنی کوشش کی نہیں..... بلکہ کسی الہام کی
رہون منت ہیں.....؟'' وہ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔ ''کافی ذہین ہو..... میں
صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بھرپور کوشش اور شدید محنت کے بعد ملنے والی کامیابی بھی کسی ایسے
اشارے کے تابع ہوتی ہے، جو قدرت انسان کے ذہن میں ڈال دیتی ہے۔ بات لمبی ہو جائے
گی..... چلو عشاء کا وقت ہو رہا ہے..... ہم نماز کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے.....''

ہم دونوں واپس درگاہ کی جانب پلٹ گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب سب نمازی مسجد
سے نکل گئے تو مولوی خضر میری جانب متوجہ ہوئے۔ ''ہاں تو میاں..... میرے کہنے کا مقصد

یہ تھا کہ قدرت نے انسان کو کھوج کے لیے ہی دنیا میں بھیجا ہے اور جو بھی اس سوچ و بچار ا
کھوج پر محنت کرتا ہے، قدرت اُسے کامیابی کا پھل دیتی ہے۔ پھر چاہے وہ ایمان والا ہو
پھر کوئی کافر..... اس سوچ بچار اور تحقیق کے انعام میں قدرت نے کوئی تخصیص نہیں برتی..
اور اس کی مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلمانوں کی کوئی قابل ذ
ایجاد سامنے نہیں آئی، جب کہ غیر مسلم اس تحقیق اور ایجاد کے میدان میں ہم مسلمانوں سے
کہیں زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ چاہے مسلم ہو، یا غیر مسلم شدید محنت
کے بعد کامیابی کا یہ فارمولا قدرت کسی الہام ہی سے اُن کے ذہنوں میں منتقل کرتی ہے، یہ
ہم کمزور انسان اپنی محنت کا ثمر جان کر فخر سے اِتراتے پھرتے ہیں۔ اس کے لیے ایک چھو
سی مثال دیتا ہوں تمہیں۔ کیا نام تھا اُس سائنس دان کا..... ہاں..... نیوٹن..... کیا تم سمجھتے
کہ اُسے خاص اُس لمحے، جب وہ سیب گرنے والا تھا، اُس درخت کے نیچے ازخود پہنچ
چاہیے تھا.....؟ اور کیا اُس کے ذہن میں یہ خیال خود اپنے طور پر ہی آ گیا ہوگا کہ یہ سیب زمی
کی طرف کیوں آیا.....؟..... اور پھر یہی خیال اُس کے آس پاس کے لوگوں، یا پھر اُس سے
پہلے کسی اور کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟ اور اگر کبھی آیا بھی تھا تو اُس نے اس عمل کی جا
کیوں نہیں کی؟ کیا یہ سب باتیں اسے نیوٹن کا الہام ثابت نہیں کرتیں..... اور پھر صرف کشش
ثقل ہی کی کیا بات ہے..... رائٹ برادران کے اُڑنے کے خواب سے لے کر نیل آ
اسٹرانگ کے چاند پر قدم رکھنے تک کا ہر خواب بھی تو ایک الہام ہی تھا، جو کسی نہ کسی خواب
سوچ کے ذریعے قدرت نے اُن کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔'' مولوی خضر بولتے چلے گئے
میں حیرت کے عالم میں ساکت سا بیٹھا، اُن کی باتیں سنتا رہا۔ سائنس میں نے بھی پڑھی تھ
لیکن سائنس کے بارے میں اس قدر تازہ نظریہ میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔ وہ چپ ہو
تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ''آپ کا نام مولوی خضر الدین کے بجائے پروفیسر
ہونا چاہیے تھا.....؟'' میرے اچانک ریمارکس سن کر وہ دھیرے سے ہنس پڑے۔ ''ضرو
نہیں ہوتا کہ علم صرف کتابوں، یا یونیورسٹی ہی سے حاصل کیا جائے..... ایک سچے طالب
کے لیے ساری دنیا ہی ایک درس گاہ ہے..... ویسے کہنے کو میں نے بھی برائے نام کچھ عر
فزکس کی ڈگری لینے کے بعد پروفیسر شپ کی ہے، ایک بڑی یونیورسٹی میں..... لیکن

رائیگاں ہی گیا.....'' میں اپنی جگہ سن سا بیٹھا رہ گیا۔ میں جب سے درگاہ کی اس نئی دنیا میں آیا تھا، قدم قدم پر مجھے ایسی ایسی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ اب تک تو مجھے ان جھٹکوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مولوی خضر بھی ایک ایسے ہی صاحب کمال شخص نکلیں گے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر میرے ہونٹوں پر وہ سوال آ ہی گیا، جو نہ جانے کتنے دنوں سے میرے دل و دماغ میں مچل رہا تھا۔ ''آج آپ مجھے بتا ہی دیں کہ آپ سب کس نگری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے عبداللہ، پھر سلطان بابا اور اب آپ، ایسے اور کتنے لوگ موجود ہیں، میرے آس پاس۔ ان طلسمات کی کوئی حد بھی ہے، یا نہیں..... آخر یہ کون سی دنیا ہے.....؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب بھی اِسی نگری کے ہیں، جہاں تم بستے ہو۔ بس ہم نے راستہ ذرا مختلف اختیار کیا ہے۔ منزل ہماری بھی وہی ہے، جو باقی سب کی ہے۔'' ''لیکن کوئی تو بات ہو گی، جو آپ سب اتنا پڑھنے کے بعد اپنی اپنی فیلڈز چھوڑ کر اس راستے پر نکل پڑے ہیں.....؟ کوئی تو کشش ہو گی اس دنیا کی؟'' ''کشش صرف تحقیق اور جستجو کی ہے۔ آخر ہمیں دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد صرف روزگار کمانا اور بچے پیدا کرنا تو نہیں ہو سکتا نا۔ لیکن افسوس کہ ہم انہی جھمیلوں میں پڑ کر اپنا سارا جیون ضائع کر دیتے ہیں۔ ہماری اس ظاہری دنیا کے آس پاس اور بھی ایسے کئی جہاں ہیں، جنہیں کھوجنے کی ضرورت ہے۔ ہم غیروں پر تکیہ کیے ہی کیوں بیٹھے ہیں، جب کہ یہ سارا علم تو مومن کی معراج ہے.....؟''

مولوی خضر رات گئے تک مجھے تحقیق اور جستجو کی افادیت پر لیکچر دیتے رہے۔ مجھے اُن کی سبھی باتیں سمجھ تو نہیں آئیں، لیکن ایک بات کا یقین پوری طرح ہو چکا تھا کہ ہمارے آس پاس ایک نظر نہ آنے والا غیر مرئی نظام بھی پوری طرح متحرک اور کار بند ہے جس کا دائرہ کار وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہمارا یہ ظاہری نظام ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ماورائی دنیا سے میرا پورا تعارف ہونا ابھی باقی تھا۔ میں رات بہت دیر سے مولوی خضر کے حجرے سے نکل کر ''درگاہ'' لوٹا۔ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ میرا اپنے کمرے میں جا کر سونے کو من نہیں ہوا تو میں وہیں صحن میں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا، اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ ذرا سی لگی ہی تھی کہ اچانک مجھے اپنے آس پاس وہی ٹھنڈی سی پروائی چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہاں..... وہی سکون

آمیزسی ٹھنڈک کا احساس، جو ہر مرتبہ میرے سراپے کو اُس وقت گھیر لیتا تھا، جب کبھی میرا زہرا سے آمنا سامنا ہوتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس احساس نے چھوا..... میں نے گھبرا کر جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تو مجھ سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے، پھر ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میں نے چونک کر درگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ زہرا کھڑی تھی۔

من کی لگن

ہاں..... وہ زہرا تھی۔ پہلے پہل تو مجھے بھی یہ لگا کہ میں دیوانگی کی اس سطح تک پہنچ گیا ہوں جہاں انسان جاگتی آنکھوں سے بھی سپنے دیکھنے لگتا ہے، لیکن جب میں نے زہرا کے پیچھے اُس کی ماں اور ڈرائیور کو بھی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پہ یقین آ ہی گیا۔ لیکن وہ رات کے اس پہر، یہاں اس ویرانے میں کیا کر رہی تھی؟ اور رات بھی کہاں..... اب تو سحر قریب تھی۔ زہرا کی حالت کافی ابتر تھی۔ میں نے آج تک اُسے پورے، یا آدھے نقاب کے بغیر گھر سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن آج اُس کا مہتاب چہرہ بے نقاب تھا اور غزال آنکھوں تلے پڑے حلقے اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ وہ کئی دنوں سے نہیں سوئی۔ پر اس وقت وہ اس قدر پریشان نظر آ رہی تھی کہ میرے منہ سے گھبراہٹ میں صرف دو لفظ ہی نکل پائے۔ ''آپ..... یہاں.....؟'' زہرا سے پہلے اُس کی والدہ بول اُٹھیں۔ ''معاف کرنا بیٹا..... ہمیں اس وقت اس طرح یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن وہ کہتے ہیں نا..... اولاد ضرور ہو..... پر اکلوتی نہ ہو..... بس اِسی اکلوتی اولاد کے پیار کی وجہ سے ہم بھی یوں در در بھٹک رہے ہیں.....'' مجھے اُن کی بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن میں نے اخلاقی فرض نبھایا۔ ''آپ حکم کریں..... میں کیا مدد کر سکتا ہوں.....'' اس بار بولنے میں زہرا نے پہل کی۔ اُس کی نظریں جھکی جھکی اور پلکیں لرز رہی تھیں..... ''میں نے انہیں آس پاس کی تمام درگاہوں میں بہت تلاش کیا ہے..... لیکن اُن کا کچھ پتا نہیں چلا..... کیا آپ مجھے اُن کا پتا دے سکتے ہیں..... میں..... میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی.....'' زہرا نے بات ختم کر کے نگاہ اُٹھائی۔ میں اُس کے کانپتے لب دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں اور میرے دل کا بچا کھچا تنکوں کا آشیانہ بھی ایک ہی پل میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ عموماً شعراء نظر سے نظر کے رشتے کو بہت موضوع گفتگو بناتے ہیں، لیکن ''نظر سے نظر کی التجا'' کو جس قدر تفصیل سے اس وقت میں بیان کر سکتا تھا، شاید کوئی اور نہیں۔ اسے تقدیر کا ستم نہ کہیں تو اور کیا کہ صدیوں کے بعد

محبوب در پر آیا بھی تو صرف رقیب کا پتا لینے..... سچ پوچھیں تو اُس وقت مجھے عبداللہ کی قسمت
پر بے حد رشک آیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اس نازنین کے کتنے قریب تھا اور میں اُس
کی گھائل نگاہ کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کس قدر اوجھل..... شاید وہ میری نظر کی شکایت
بھانپ گئی تھی، تبھی اُس نے پھر سے پلکوں کا پردہ گرا دیا تھا۔ ابھی ایک دن پہلے ہی اتفاق سے
مجھے عبداللہ کا پہلا خط ملا تھا، جو اُس نے اپنی نئی منزل پر پہنچ کر مجھے لکھا تھا۔ عبداللہ اس وقت
یہاں سے تقریباً تین سو کلومیٹر کی دُوری پر کسی اور درگاہ میں تعینات تھا۔ کاش اس پری رُخ نے
مجھ سے میری جان مانگی ہوتی، پر مانگا بھی تو کیا.....؟ رقیب کا پتا..... بہرحال حکم کی تکمیل بھی
بھی میرا فرض ہی ٹھہرا۔ ''آپ یہیں رُکیے.....'' میں جلدی سے اپنے حجرے کی جانب بڑھ
گیا۔ عبداللہ کا خط نکال کر ایک طرف رکھا اور لفافہ لا کر زہرا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''کل مجھے
اُس کا خط ملا..... لفافے کے پیچھے عبداللہ کا پتا موجود ہے.....'' زہرا کی بے چین اُنگلیوں نے
کچھ ایسی تیزی سے لفافے کو ٹٹولا، جیسے شدید پیاس کے عالم میں مرتا ہوا کوئی شخص پانی کا آخری
بچا ہوا گھونٹ پینے کے لیے پیالہ پکڑنے کی سعی کرتا ہے۔ اُس کا بس چلتا تو شاید لفافے پر
لکھے حروف کو بھی نظر سے پی جاتی۔ اب کی بار اُس نے نظریں اُٹھائیں تو اُس کی نگاہ میں پہلی
مرتبہ میرے لیے کچھ نرمی اور ممنونیت سی تھی۔ ''میرے پاس الفاظ نہیں ہیں..... پھر بھی آپ کا
بہت بہت شکریہ..... کاش میں اس قابل ہوتی کہ آپ کے احسان کا یہ قرض کسی بھی طور اُتار
پاتی.....'' زہرا بات ختم کر کے چل دی اور..... میں اُس بھکاری کی طرح کھڑا رہ گیا، جس سے
اُس کی دن بھر کی بھیک بھی کوئی لٹیرا چھین لے جائے۔ زہرا کی ماں نے واپسی کے لیے قدم
بڑھائے اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر میری جانب پلٹ آئیں۔ اُن کی آنکھیں بھیگ رہی
تھیں۔ ''اگر زہرا کے ابا کسی کاروباری دورے پر ملک سے باہر نہ گئے ہوتے تو شاید اپنی
بدنصیب بیٹی کی چاہت بھی مجھے یوں آدھی رات کو اپنی دہلیز پھلانگنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی، مگر
بیٹا، وہ تو سوالی ہے..... اپنے دیوانے پن میں یہاں تک چلی آئی، تم نے اُسے پتا کیوں دے
دیا..... تم چھپا بھی تو سکتے تھے.....'' وہ کہتے کہتے چپ سی ہو گئیں، لیکن میں اُن کا اشارہ سمجھ
گیا تھا۔ ''ایک سوالی کسی دوسرے سوالی کی التجا بھلا کب ٹال سکتا ہے۔ ہم دونوں کی اذیت مشترک
ہے۔ ہاں! فرق بس اتنا ہے کہ انہیں کوئی پتا بتانے والا تو میسر ہے، جب کہ میری تقدیر میں

معاملے میں بھی کھوٹی ہے....." وہ کچھ دیر تک میرے چہرے پر لکھی نہ جانے ضبط کی کون سی تحریر پڑھتی رہیں، پھر بولیں "میرا اپنی دعاؤں سے بھروسا اُٹھے عرصہ ہوگیا ہے..... لیکن پھر بھی اگر کوئی ایک آخری دعا قدرت نے قبولیت کے لیے باقی رکھ چھوڑی ہے تو میں اُسے تمہارے نام کرتی ہوں۔ کاش میرے نصیب میں تمہاری فرزندی لکھی ہو..... جیتے رہو۔"

اُن کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر اُن سے رُکا نہیں گیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ زہرا ڈرائیور کے ساتھ پہلے ہی درگاہ سے نکل چکی تھی۔ میں اُسی طرح تنہا، بے کس اور لاچار سا درگاہ کے صحن میں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے آس پاس ہزاروں آندھیوں کا شور محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے لوگ دیوانوں پر ترس کیوں کھاتے ہیں۔ پاگل پن تو ایک نعمت ہے۔ بدنصیب تو مجھ جیسے ہوش والے ہوتے ہیں، جو ان اذیت ناک لمحوں کا عذاب جھیلنے کے لیے ہوش وحواس میں رہتے ہیں۔

جب فجر کی اذانیں ختم ہوئیں، تب بھی میں وہیں اُسی جگہ گم صم سا کھڑا تھا۔ اتنے میں مولوی خضر کا پیغامبر بھی آ کر نماز کھڑی ہونے کی اطلاع دے کر جا چکا تھا۔ مولوی خضر نے میری "تازہ تازہ" نماز کی وجہ سے اپنا یہ معمول بنا رکھا تھا کہ روز صبح احتیاطاً جگانے کے لیے کسی نہ کسی نمازی کو درگاہ بھیج دیتے تھے۔ اس دن میرا دل نماز پڑھنے پر بھی مائل نہیں تھا، لیکن جب تیسری مرتبہ مسجد سے میرا بلاوا آیا تو بادل نخواستہ مسجد کی جانب چل پڑا۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کی اور اپنا درس شروع کیا۔ ہاں تو بھئی کل میں بتا رہا تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک نہایت ہی عمر رسیدہ بڑھیا دہائی دیتی ہوئی آ پہنچی۔ آپ علیہ السلام نے اُس سے ماجرا دریافت کیا تو بڑھیا نے فریاد کی کہ "یا حضرت..... میرے بچوں کے حق میں دعا فرمایئے..... وہ ڈھائی، تین سو سال کی کچی عمر ہی میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی بیماری کی وجہ سے انتقال کر جاتے ہیں..... آپ اُن کی جوانی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کیجیے....." حضرت نوح علیہ السلام بڑھیا کی فریاد سن کر مسکرا دیئے اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے بڑھیا کے حق میں دعا فرما دی۔ بڑھیا کے جانے کے بعد محفل میں سے کسی نے عرض کیا۔ "یا حضرت نوح علیہ السلام..... جب اس بڑھیا نے آپ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی تو آپ علیہ السلام مسکرائے کیوں.....؟" حضرت نوح علیہ السلام نے پھر تبسم

فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ ''یہ بڑھیا اپنے بچوں کی تین سو سال زندگی کو دراز کرنے کی دعا کی متمنی تھی اور میں یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ اگر میں اُسے یہ بتا دیتا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جب انسان پچاس، ساٹھ سال کی عمر میں پیدا ہو کر نہ صرف بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی اور پھر بڑھاپے کی منزلیں پار کر کے طبعی موت مر بھی جائے گا تو کیا یہ اپنے بچوں کی عمر پر خداوند کریم کے آگے سجدۂ شکر نہ بجا لاتی.....؟''

ساری محفل انگشت بدنداں رہ گئی۔ کسی نے پوچھا۔ ''یا حضرت، کیا واقعی کوئی ایسا زمانہ بھی آئے گا، جب انسان اتنی مختصر عمر میں پیدائش کے بعد بوڑھا ہو کر مر جائے گا۔'' حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔ ''ہاں..... قرب قیامت کے آس پاس ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب انسان پچاس ساٹھ سال کے مختصر عرصے میں پیدائش سے لے کر بڑھاپے اور پھر موت کے تمام مراحل طے کر لے گا۔'' ساری محفل بیک زبان ہو کر بولی۔ ''بخدا اگر ایسا کبھی ہمارے زمانے میں ہوتا تو ہم تو پتے باندھ کر ہی گزارہ کر لیتے اور سجدہ سے سر نہ اُٹھاتے کہ اتنے کم وقت میں گھر بار، کاروبار اور دیگر کام کاج کی طرف کسی کا دھیان ہی کب جاتا.....؟''

حضرت نوح علیہ السلام پھر مسکرائے اور انہوں نے محفل کو تنبیہ کی۔ ''ہاں..... لیکن کتنی عبرت کی بات ہے کہ اُسی دور کے انسان اپنی رہائش کے لیے سب سے پکے محل تعمیر کریں گے.....'' سب نمازیوں نے اپنے اپنے کانوں کو جلدی سے یوں ہاتھ لگائے، جیسے وہ سب ابھی تک حضرت نوح علیہ السلام کے دور ہی میں بیٹھے ہوں۔ مولوی خضر نے اپنا درس ختم کیا۔ ''تو ساتھیو..... ہمیشہ یاد رہے کہ یہ دنیا بڑی عارضی جگہ ہے۔ اس کے لیے بس اتنی ہی محنت کرو، جتنا یہاں رہنا ہے۔'' سب نمازی درس کے خاتمے پر حسب معمول مولوی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے رُخصت ہو گئے۔ مولوی خضر نے سب کے جانے کے بعد غور سے میری جانب دیکھا۔ میں ابھی تک سب سے الگ تھلگ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ انہوں نے شاید میری بے زاری محسوس کر لی۔ ''کیوں میاں..... آج من کہیں اور لگا ہوا ہے کیا..... رات میں تہجد کے لیے اُٹھا تو نیچے ساحل پر بڑی سی موٹر گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ لگتا ہے تمہارے مہمان آئے تھے۔'' اُن کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان اُبھر آئی۔ تو گویا انہیں زہرا کی آمد کا پتا تھا۔ ''ہاں..... وہ مجھ سے عبداللہ کا پتا مانگنے آئی تھی.....'' ''ارے..... تو کہہ دیتا تھا کہ عبداللہ تو

اُس کے سامنے کھڑا ہے..... پھر وہ کسے کھوجتی پھر رہی ہے.....؟'' ''وہ مجھے نہیں..... پرانے عبداللہ کی کھوج میں یوں آدھی رات کو ننگے سر چلی آئی تھی۔ میرے ایسے نصیب کہاں کہ وہ مجھے تلاش کرے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ نہایت تلخ ہو گیا۔ مولوی خضر معنی خیز انداز میں بولے ''لیکن آئی تو تمہارے پاس ہی نا..... کل تک جو تمہارے سائے سے بھی کتراتی تھی آج اُسے مقدر نے اس قدر مجبور کر دیا کہ یوں آدھی رات کو تمہارے پاس دوڑی چلی آئی۔'' میں نے چونک کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ واقعی اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جاتا تو بات تو اُن کی بھی ٹھیک ہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ خدا خدا کر کے میرا نام تو آیا، چاہے برسرالزام ہی کیوں نہ آیا۔ گویا سلطان بابا کا وعدہ پورا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اور دھیرے دھیرے..... ہاں البتہ اس ایفائے عہد کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ یا پھر میرا بے چین دل ہی نہایت بے صبرا تھا۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ آج تک مولوی خضر نے یوں کھل کر تو کبھی مجھ سے زہرا کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن اُن کی معلومات سے لگتا تھا کہ انہیں سارے قصے کی بخوبی خبر ہے۔ مجھے اپنی چند لمحوں پہلے والی بے خودی پر ندامت سی محسوس ہوئی۔ ''تو گویا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں صرف زہرا کے حصول کے لیے اس درگاہ تک آیا ہوں، لیکن آپ نے کبھی مجھ پر یہ جتایا کیوں نہیں.....'' میری سوچ کے دوران وہ حسب معمول اپنے ہاتھ کی مزے دار سی چائے بنا چکے تھے۔ میرے سوال پر دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ''میاں..... سب کچھ جتایا تو نہیں جاتا نا..... اور پھر ویسے بھی یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا۔ میں نے سوچا، تم سے کچھ پوچھوں گا تو تم بھی دل میں سوچو گے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔'' مجھے اُن کی بات پر ہنسی آ گئی۔ ''آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں.....؟..... آپ سے ایک بات پوچھوں..... آپ بُرا تو نہیں منائیں گے.....؟'' ''نہیں نہیں..... ضرور پوچھو..... تم مجھے بہت عزیز ہو.....'' میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟''

میرا سوال سن کر اُن کے چہرے پر بچوں کی طرح حیا کا ایک گلابی رنگ آ کر گزر گیا اور وہ ہنس پڑے۔ ''کیا میاں.....؟..... سبھی کچھ اُگلوا لو گے کیا.....؟'' ''بتائیں نا..... آپ نے کبھی کسی کو چاہا ہے..... اور خدا کے لیے جواب میں یہ نہ کہیے گا کہ ہاں کی ہے، پھولوں سے، موسم سے، سمندر سے اور ان سب کو بنانے والے سے..... آپ جانتے ہیں، میں کس سے محبت

کی بات کر رہا ہوں....." میرے ضدی انداز پر وہ باقاعدہ زور سے ہنس دیئے۔ میں نے اس سے پہلے انہیں یوں ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ جانے کیوں اس لمحے مولوی خضر مجھے بہت اچھے لگے۔ "ہاں بھئی کی ہے..... اپنے زمانے میں ہم نے بھی کی ہے، محبت..... لیکن ہماری محبت میں اور آج کل کی اس طوفانی محبت میں بہت فرق ہے۔ مجھے جس سے محبت ہوئی، اُسے میں نے پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ پہلی بار ایک کتابوں کی دُکان پر، جہاں وہ سائیکل رکشے میں اپنی والدہ کے ہمراہ تشریف لائی تھیں اور دوسری مرتبہ ایک لائبریری میں، جہاں ہم نے کسی طور بڑی ہی مشکل سے انہیں آنے کا کہا تھا۔ وہ بس دو منٹ کے لیے آئیں اور جتنی دیر میں لائبریرین کے ہاتھ سے کتاب اُن کے ہاتھ میں منتقل ہوئی، بس اتنی ہی دیر ٹھہریں۔ یہ اتنی سی ہی ہے، ہماری محبت کی کہانی۔" میرا تجسس بڑھ گیا۔ "تو پھر آپ نے اُن خاتون کے ہاں رشتہ کیوں نہیں بھیجا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے بات آگے کیوں نہیں بڑھائی.....؟" "بات بڑھتی تو بڑھاتے نا..... لمبی کہانی ہے، میاں۔ پھر کبھی سنائیں گے..... فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ محبت کے ہزار سے بھی زیادہ روپ ہوتے ہیں، لیکن محبت ہمیشہ اس خوشبو کی طرح لاحاصل ہی رہتی ہے جو پرفیوم کرتے سمے آس پاس فضا میں بکھر جاتی ہے۔ بس ایک کسک ہی اس عشق مجازی کا حاصل ہے....." "لیکن لوگ محبت میں ایک دوسرے کو پا بھی تو لیتے ہیں..... اس وصل محبت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے..... کچھ لوگوں کو اُن کی محبت مل بھی تو جاتی ہے۔" "محبت کہاں مل پاتی ہے میاں..... بس جسم مل جاتے ہیں..... جانے کس بے وقوف نے اس وصل کو محبت کے وصل کا نام دے دیا ہے۔ محبت ہمیشہ سے ایک لاحاصل جذبہ ہے۔" میں حیرت سے اس وجیہہ بزرگ کو دیکھتا رہا۔ ضرور اُن کا ماضی کسی شدید محبت کی داستان سے گندھا ہوا تھا۔ ورنہ محبت کے بارے میں اتنا منفرد اور انوکھا نظریہ کسی عام شخص کا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن مولوی خضر سے مل کے درگاہ واپسی کے بعد بھی میں بہت دیر تک اُن کے فلسفہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہے تھے تو پھر میری زہرا سے محبت کا مقام کیا تھا.....؟ کیا حقیقت تھی میری محبت کی؟ کیا میری محبت بھی صرف جسم کے حصول کے لیے ہی تھی؟ لیکن میں نے تو آج تک کبھی زہرا کا جسم پانے کی خواہش تک نہیں کی تھی۔ میں نے

جب بھی اُسے دیکھا، بس اُس کے چہرے کے نور میں کھوتا چلا گیا اور پھر جسم، یا روح کا حصول تو بہت دُور کی بات تھی، وہ تو میرے بارے میں سوچتی تک نہ تھی۔ میں ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالوں میں بھنور میں پھنسا غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک ایک بار پھر میرے ساتھ وہی عجیب سا واقعہ ہوا جو پہلے بھی درگاہ میں عبداللہ کے حجرے میں پہلی مرتبہ داخل ہوتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میں کافی دیر سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا تسبیح کی مالائیں پرو رہا تھا اور اپنی محبت کی حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں باہر سے کسی مچھیرے کی آواز سنائی دی۔ ''عبداللہ بھائی..... تسبیحاں بن گئی ہوں تو دے دو..... میں نیچے بازار کی طرف جا رہا ہوں۔ دُکان پر چھوڑتا جاؤں گا۔'' یہ کریم بلوچ کی آواز تھی۔ مولوی خضر نے اُسے خاص طور پر تاکید کر رکھی تھی کہ جب بھی وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے بازار جانے لگے تو مجھ سے بھی پوچھ لیا کرے، تاکہ میرا وقت بچ جائے۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''آیا کریم بھائی.....'' اور اُسی لمحے ایک دم میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ کریم پہلے بھی اِسی طرح مجھ سے تسبیح کی مالائیں لینے کے لیے یونہی درگاہ کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آواز لگا چکا ہے اور میں نے ٹھیک اِسی جگہ بیٹھے، اُسے یہی جواب دیا ہے اور اب جب میں اُسے یہ مالائیں دینے کے لیے باہر نکلوں گا تو وہ مجھے داہنی جانب مسکراتا ہوا کھڑا ملے گا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میں ابھی اسی روشنی کے جھماکے کے اثر میں تھا اور جیسے ہی میں بے اختیار ہو کر اُٹھا اور باہر نکلا تو کریم وہیں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح یہ تمام احساس لمحے بھر کا تھا اور اگلے ہی لمحے میں پھر سے ''زمانۂ حال'' میں واپس پہنچ گیا، لیکن اس بار میرے سر میں درد کی ایک شدید لہر بھی اُٹھی تھی۔ میں نے کریم کو تو جیسے تیسے فارغ کر دیا، لیکن پھر خود مجھ سے بہت دیر تک وہاں سے اُٹھا نہیں گیا۔ عام طور پر ایسا ہم سب ہی کے ساتھ زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور ہوتا ہے کہ ہمیں کسی واقعے، بات، یا منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ایک وقتی سا احساس ہوتا ہے کہ ہم یہ بات پہلے بھی سن چکے ہیں، یا اس سوال کا جواب مخاطب کی زبان سے کیا نکلے گا، یا پھر پہلی مرتبہ کا دیکھا ہوا منظر بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے، جیسے ہم پہلے بھی اس مقام سے گزر چکے ہوں۔ لیکن میرے ساتھ اس درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک صرف ایک مہینے میں تیسری، یا چوتھی مرتبہ یہ واقعہ اس تواتر کے ساتھ پیش آ رہا تھا

کہ خود میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر یہ کیسا اسرار ہے۔ عصر کی نماز کے بعد جیسے ہی مسج
نمازیوں سے خالی ہوئی، میں نے تمام واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ مولوی خضر کے سامنے پیش
کر دیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ خلاف معمول مولوی خضر نے میرے تما
سوالات کے جواب میں بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اتنا کہا "رہنے دو میاں...
بڑی تفصیل طلب باتیں ہیں..... وقت آنے پر تمہیں سب پتا چل جائے گا....." میں نے
صرار کیا۔ "آخر ایسا بھی کیا راز ہے..... پہلے میں نے عبداللہ سے بھی جب اس بات کا ذکر
تھا، تب اُس نے بھی کچھ ایسا ہی گول مول سا جواب دیا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹ جائے گا
میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میری یہ اُلجھن دُور کر دیں..... چاہے اس راز کے افشا ہونے
سے میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہوتا ہو....." انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ "بہت جلد با
ہو..... بہتر ہوتا کہ مناسب وقت کا انتظار کرتے....." لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا "کل کرے
سو آج..... آج کرے سو ابھی....."

مولوی خضر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی۔ "ٹھیک ہے..... یوں لگتا ہے جیسے تمہاری
تربیت کا وقت آ گیا۔"

تربیت

میں مولوی خضر کے منہ سے تربیت کا لفظ سن کر مزید اُلجھن میں پڑ گیا۔ وہ میری تربیت کا ذکر کر رہے تھے؟ کیا زہرا کو پانے کے لیے اب مجھے باقاعدہ کسی تربیت سے بھی گزرنا پڑے گا..... سوالوں کا ایک طوفان تھا، جو میرے اندر سب کچھ اُتھل پتھل کر رہا تھا لیکن میں بنا کچھ کہے، دم سادھے اُن کے سامنے بیٹھا رہا۔ آخر کار انہوں نے ہی اپنی خاموشی کا قفل توڑا۔

''سب سے پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے خیال میں اس دنیا کا سب سے بڑا عہدہ 'مقام و مرتبہ' کون سا ہو سکتا ہے۔ یاد رہے، ماضی اور حال دونوں زمانوں کا پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''شاید کسی 'سپر پاور' کے سربراہ کا عہدہ۔''

''نہیں..... نبوت دنیا کا سب سے بڑا عہدہ 'مقام و مرتبہ' ہے۔ حالانکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا لیکن اب تک اور آنے والے تمام زمانوں کا سب سے بڑا عہدہ نبوت ہی ہے۔ ہمیشہ اس بات کو یاد رکھنا۔'' ''جی بہتر..... لیکن میں اب بھی آپ کے اس سوال کا مقصد نہیں سمجھا؟'' انہوں نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ ''دراصل جو میں اب کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق میرے سوال سے ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری دنیا اس کائنات کی لاتعداد دنیاؤں کے مقابلے میں صرف ریت کے ایک ذرے جیسی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے بالکل قریب، ایک اور مخلوق جسے ہم جنات کے نام سے جانتے ہیں، اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ پھر جانے کتنی کہکشائیں، کتنے سیارے اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس ہماری اپنی دنیا کے اندرونی رابطے کے بہت سے ذرائع ایجاد ہو چکے ہیں مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، موبائل وغیرہ جن سے ہم تمام دنیا میں پلک جھپکنے میں مطلوبہ شخص تک رسائی کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک رابطہ ہمہ وقت اپنے خدا سے بھی تو رہتا ہے۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس غیر مرئی رابطے کے لیے اب تک کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے، نہ ہی کبھی ہوگا۔ اس رابطے کا نظام خود اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ عموماً یہ رابطہ براہ راست غیب سے ہوتا اور

بالواسطہ ہم سبھی ایک پوشیدہ نظام کے تحت اس رابطے سے جڑے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کے اپنے بندے سے براہ راست رابطے کے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ میں صرف تین بڑے ذرائع کا ذکر کروں گا۔ وحی، کشف اور الہام۔" مولوی خضر نے پانی پینے کے لیے ایک چھوٹا سا وقفہ لیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بولا۔ اُن کی اس لمبی تمہید نے میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی بھر دی تھی۔ خدا خدا کر کے انہوں نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ "ہاں تو میں نے فی الحال صرف تین براہ راست رابطوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلا ذریعہ یعنی وحی شرعی کا سلسلہ آخری پیغمبر کے ساتھ ہی موقوف ہو گیا ہے۔ باقی رہ گئے دو ذرائع۔ ان میں سے پہلا ہے کشف، جس کا تعلق حسیات سے ہے۔ جس میں کسی شخص کو باقاعدہ علم غیب، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس واقعے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ ایسے انسان کو کاشف کہتے ہیں اور اس کا یہ کمال کشف کہلاتا ہے۔ جب کہ تیسرے ذریعے کو "الہام" کہا جاتا ہے۔ الہام کا تعلق وجدانیات سے ہوتا ہے۔ وجدان یعنی انسان کو باقاعدہ کچھ نظر تو نہ آئے، پر خدا کی طرف سے اُس کے دل میں ایک خیال ڈال دیا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ کچھ یوں ہوا ہوگا، یا فلاں شخص کس حال میں ہوگا، یا فلاں دو راستوں میں سے ایک راستہ اُسے اُس کی کامیابی کے راستے پر لے کر جائے گا۔ لیکن یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کن خاص بندوں کو الہام، یا کشف کے مرتبے کے لیے چنتا ہے۔"

مولوی خضر نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مجھ سے پوچھا۔ "میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا....." میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے پھر سے سلسلہ جوڑا۔ "لیکن ایک بات تو طے ہے کہ ایسا کمال ہر ایک کو تو عطا نہیں کیا جاتا، ضرور اُس بندے میں کوئی خاص بات تو ہوتی ہو گی۔ میرے نزدیک وہ خاص وصف خالص پن ہے جسے انگریزی میں Purity کہتے ہیں۔ ہم انسان عالم ارواح میں انتہائی معصوم ہوتے ہیں۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ یہاں کے گناہوں کی آلودگی ہمیں داغ دار کر دیتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کسی بچے کے شفاف پھیپھڑے کے مقابلے میں کسی لگاتار سگریٹ، یا تمباکو نوشی کرنے والے کے پھیپھڑے جو بہت زیادہ کاربن کی وجہ سے ایکسرے میں بھی باقاعدہ کالے نظر آتے ہیں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ خدا کم از کم الہام کا تحفہ ہر انسان کے لیے طے کر رکھا ہے۔ لیکن ہمارے اندر کی آلودگی

ہمارے قلب ونظر کے گرد اس طرح پہرہ بن کر پردے گرا دیتی ہے کہ ہم الہام تو دُور، سامنے کی چیز بھی نہیں دیکھ پاتے۔" مولوی خضر نے پھر سے ایک وقفہ لیا۔ شاید وہ مجھے اس بات کا موقع دینا چاہتے تھے کہ میں اُن کی ثقیل باتیں ہضم کر سکوں۔ وہ پھر گویا ہوئے "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کشف اور الہام کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے.....؟ مطلب یہ کہ یہ نعمت بھی تو سبھی میں یکساں بٹی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بھی باقاعدہ درجے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تمہیں ایک مثال دیتا ہوں۔ آج کل سیٹلائٹ کا دور ہے۔ خلا میں بہتی لہروں کے ذریعے خلائی سگنل بھیجے جاتے ہیں اور ان لہروں کو پکڑنے کے لیے کسی اینٹینا کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس اینٹینا کی اُونچائی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ لہریں وہ پکڑ پاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم سب انسانوں کے سر پر بھی ایک ایسا ہی اَن دیکھا اینٹینا موجود ہے۔ جو جتنا بڑا کاشف، یا الہامی ہوگا، اُس کا اینٹینا دوسروں سے اُتنا ہی اُونچا ہوگا اور اس غیر مرئی اینٹینا کی لمبائی، یا اُونچائی کا براہ راست تعلق خود انسان کی اپنی محنت، عبادت، ریاضت اور پاکیزگی سے بھی ہے۔ جو جتنی کوشش اور ریاضت کرے گا اُس کی پہنچ عالم غیب میں اُتنی ہی زیادہ ہوتی جائے گی۔ یعنی اُس کا اینٹینا سر سے اُتنا ہی بلند ہوتا جائے گا۔ آج کل ٹیلی پیتھی اور ریکی وغیرہ کا بڑا چرچا ہے۔ سائنس ان علوم تک بہت دیر میں پہنچی ہے جب کہ "رُوحانیت" نے تو عرصہ قبل یہ سنگ میل عبور کر لیے تھے۔ چین میں ابھی تک باقاعدہ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جو ننگے پاؤں پانی کی سطح پر یوں چلتے پھرتے ہیں جیسے خشکی پر چل پھر رہے ہوں۔ کوئی ندی، دریا، یا سمندر انہیں ڈبو نہیں سکتا۔ یہ سب صرف اور صرف خود پر قابو پانے کی طاقت ہے، جو انہیں رُوحانیت سے عطا ہوتی ہے۔ ایک غیر مسلم جب اپنی توجہ اس قدر مرکوز کر سکتا ہے کہ وہ پانی کی سطح پر چلتے ہوئے پیر کے تلوؤں کے پٹھے کنٹرول کرتے ہوئے اُن کی ساخت عارضی طور پر پانی پر چلنے کے موافق کر لیتا ہے تو پھر سوچو کہ اگر مومن اپنی توجہ مرکوز کرنے پر قدرت حاصل کر لے تو کیا نہیں کر سکتا.....؟؟؟ اب رہی بات تمہارے سوال کی کہ تمہیں بار بار چند لمحے آگے کی بات کیوں نظر آتی ہے تو میری ناقص اور ذاتی رائے یہی ہے کہ اس کا تعلق بھی اُسی کشف اور الہام سے ہے، جس کا میں نے ابھی اتنی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تمہارا اینٹینا کچھ پکڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن شاید ابھی ہم سب عام انسانوں کی طرح صرف سر کی سطح ہی پر ہے۔ میری دعا

ہے کہ خدا تمہیں مکمل وجدان عطا کرے۔" میں حیرت سے منہ کھولے ہوئے مولوی خضر کی
ساری تمہید سن رہا تھا۔ وہ کہاں کی بات کو کہاں لے جا کر جوڑ بیٹھے تھے۔ بھلا میں کہاں اور
رُوحانیت کہاں.....؟ ابھی ایک ہفتہ پہلے تک تو مجھے ٹھیک سے نماز بھی پڑھنا نہیں آتی تھی
اب بھی جو کچے پکے سجدے کر رہا تھا۔ مجھے اگر زہرا کو پانے کی ذرا سی بھی نا اُمیدی ہوتی
میں ایک پل بھی مزید اس درگاہ میں نہ ٹھہرتا، جب کہ یہ حضرت تو نہ جانے کہاں کے قلابے
کہاں ملا رہے تھے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... آپ
اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور آپ میرے ماضی سے بھی
بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی....." انہوں نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔
"میں نے اِسی لیے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا تھا کہ کچھ فیصلے قدرت اپنے پاس محفوظ رکھتی
ہے۔ کس کو اس کام کے لیے چننا ہے اور کسے نہیں..... یہ فیصلہ بھی تقدیر خود ہی کرتی ہے اور
اس فیصلے کے آگے ہم انسانوں کے سبھی جواز دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

مولوی خضر اپنی بات مکمل کر کے مغرب کی نماز کی تیاری کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے
لیکن میری ذات کو ادھورا بھٹکتے چھوڑ گئے۔ پتا نہیں اُن کی باتیں سننے کے بعد مجھے ایسا کیوں
محسوس ہونے لگا تھا جیسے کوئی اَن دیکھا شکنجہ میرے وجود کے گرد کستا جا رہا ہے۔ یہ سلطان بابا
مجھے کس گورکھ دھندے میں اُلجھا گئے تھے۔ میں تو اپنی پہلی اور ظاہری دنیا ہی سے بے زار تھا
یہ دوسری دنیا کے عذاب بھلا اب کون جھیلے گا.....؟ میں نے وہیں مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی
زندگی میں شاید پہلی مرتبہ گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کہ مجھے مزید کسی امتحان میں نہ ڈالے کہ
میں بہت ہی عام اور کمزور سا بندہ ہوں۔ مجھ میں اب مزید کوئی عذاب سہنے کی ہرگز سکت نہیں
ہے۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب میں اپنی اس التجا میں اتنا غرق ہوا اور کب میرا چہرہ میرے
آنسوؤں سے دُھلنے لگا۔ لیکن اُس روز اُس سناٹے میں میری ہچکیاں سننے والا بھی کوئی نہیں تھا
دنیا میں مجھ جیسا کون ہوگا، جس نے اپنی محبت پانے کے لیے اپنی سانسیں تک گروی رکھ دی
ہوں۔ آخر قدرت کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا تھا؟

عشاء کی نماز کے بعد میرا دل جب بہت گھبرانے لگا، تو میں نے ساحل کی چہل قدمی کا
ارادہ کر لیا۔ مولوی خضر نماز کے فوراً بعد ہی نیچے ساحلی بستی میں نہ جانے کس نمازی کی تیمارداری

کے لیے جا چکے تھے۔ میں تنہا ہی ساحل کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرائی تو کچھ گھٹن کا احساس کم ہوا۔ میں نہ جانے کتنی دیر یونہی اپنی دُھن میں ساحل کے کنارے کنارے چلتا گیا۔ اچانک دُور ساحل پر چند روشنیاں تیزی سے مجھے اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد سائلنسر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ چھ سات ہیوی بائیکس ساحل پر دوڑتی ہوئی میری جانب آ رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اس چنگھاڑتے شور میں ان موٹر سائیکل سواروں نے مجھے کراس کیا۔ یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ٹولہ تھا جو شاید شہر سے دُور اس ویران ساحل پر ریس لگانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہر موٹر سائیکل پر ایک لڑکے لڑکی کا جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سبھی چیخ چلا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود ایک دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کچھ ''میٹھی یادوں'' نے میری رگوں میں بہتی کڑاوہٹ کو کافی کم کر دیا۔ مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ لگائی گئی ایسی کئی ریسوں اور ہنگاموں کا دور یاد آ گیا۔ ہمارے گروپ میں کاشف سب سے اچھا بائیک رائڈر تھا لیکن میں اُسے بھی بہت دفعہ ریس میں ہرا چکا تھا۔ میں اپنی یادوں کی جھونک میں بہت آگے چلا آیا تھا۔ ساحلی بستی کی روشنیاں تقریباً غائب ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ ابھی میں درگاہ سے کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ مجھے وہی موٹر سائیکل سوار گروپ ساحل کے کنارے کھڑا نظر آیا۔ وہ سب کے سب ایک موٹر سائیکل کے گرد جمع تھے۔ شاید اُس بائیک میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ میں اُن کے قریب پہنچا تو وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔ اُن میں سے ایک شوخ سے لڑکے نے زور سے کہا۔

''سلام مولانا جی..... یہاں آس پاس کوئی گیراج ہے تو پلیز بتائیے۔'' اُس کے مولانا کہنے پر پہلے تو مجھے یہ گمان ہی نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جب اُس نے دوبارہ زور سے کھنکار کر مجھے متوجہ کیا تو میں رُک گیا۔ میرے علاوہ وہاں اور تھا ہی کون جسے وہ پکارتا۔ پھر میرا ہاتھ بے اختیار میری دو ہفتوں سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی شیو کی جانب چلا گیا۔ میں اس وقت کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر سفید ٹوپی اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی لیے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ایسے میں اُن کا مجھے ''مولانا'' سمجھنا اور پکارنا بالکل جائز تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ نہ جانے میں خود اس سے پہلے کتنے ایسے ظاہری حلیے والوں کو باقاعدہ مولوی سمجھتا رہا تھا۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ لباس اور حلیے کی بنیاد ہی پر درجہ بندیاں کرتے

پھرتے ہیں۔ دل کے حال پر کبھی نہیں جاتے۔ میں نے جواب دیا۔ ''جی فرمایئے۔'' سارا گروپ مجھے نہایت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُن میں سے شریر آنکھوں والی ایک لڑکی بولی ''جناب کسی قریبی ورکشاپ کا پتا بتا دیں۔ ہماری بائیک خراب ہوگئی ہے۔'' میں نے خراب موٹر سائیکل پر دُور ہی سے نظر ڈالی۔ جرمنی کی 700 سی سی سپر ٹرانف (Super-tranf) تھی۔ کسی زمانے میں یہ میری بھی پسندیدہ سواری رہ چکی تھی۔ ''آپ کہیں تو میں دیکھ لوں.....؟'' میں نے اُن سے اجازت طلب کی۔

میری بات سن کر وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ ایک دوسری چیونگم چباتی لڑکی ہنس کر بولی۔ ''مولوی جی..... یہ سپر ہیوی بائیک ہے۔ کوئی سائیکل نہیں، جو پنکچر ہوگئی اور آپ اسے ٹھیک کر دیں گے۔'' لڑکی کی بات سن کر پورا گروپ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ''تو سائیکل ہی نا..... بس ساتھ میں موٹر جڑ گئی ہے۔'' میں نے آگے بڑھ کر سیلف چیک کیا۔ موٹر سائیکل کک سے نہیں، بلکہ سیلف سے اسٹارٹ ہوتی تھی۔ سیلف ٹھیک تھا۔ میں نے ڈسک بریک دیکھی۔ اور ائیر لیور کو دو تین بار پکڑ کر چھوڑا۔ سارا گروپ حیرت سے میری ''کارروائی'' دیکھ رہا تھا۔ میں نے حتمی نتیجے پر پہنچ کر سر اُٹھایا۔ ''بریک کی ڈسکس (Discs) ایک دوسرے میں پھنس گئی ہیں۔ شاید بریک لگاتے وقت کلچ کو ٹھیک طرح سے نہیں دبایا گیا۔ آپ میں سے کسی کے پاس کٹ بیگ ہے؟'' سبھی گروپ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کھنکارنے کی باری میری تھی۔ پھر جیسے میری کھنکار سن کر سبھی کو ہوش آ گیا اور ایک لڑکی جلدی سے کٹ بیگ لے کر میری طرف بھاگا۔ باقی سب بھی بیک وقت بولنے لگے۔ ''واؤ (wow) یار..... کمال ہے..... اٹس امیزنگ..... آپ کو تو پوری بائیک کی انجینئرنگ کا پتا ہے..... کیا آپ مکینک ہیں.....؟'' ''بس مکینک ہی سمجھ لیں..... بس دس منٹ میں آپ کی بائیک تیار ہو جائے گی۔'' میں پوری طرح موٹر سائیکل کی خرابی درست کرنے میں جٹ گیا۔ گروپ کی نظروں میں اب میرے لیے طنز کے بجائے ستائش تھی۔ وہ سب پھر سے اپنی اُسی پرانی بحث میں مصروف ہوگئے جو شاید میرے آنے سے پہلے اُن کے درمیان جاری تھی۔ جس لڑکے نے مجھے مخاطب کیا تھا، وہ بولا ''تم لوگ مانو نہ مانو..... مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں اور تب بھی وہ شب اِسی جگہ اینکر ڈ تھا۔ شرارتی لڑکی بولی ''کم آن

نعمان..... اب یہ نا کہہ دینا کہ یہ تمہارا دوسرا جنم ہے۔'' میں نادانستہ طور پر اُن کی باتوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ایک دوسرا لڑکا بولا ''یار لوگ اس مرر امیج تھیوری (Mirror Image Theory) پر یقین کیوں نہیں کر لیتے۔ نومی کا مسئلہ بھی بس اتنا ہی ہے۔'' اُن کی یہ ساری گفتگو زیادہ انگریزی میں ہو رہی تھی۔ دوسری جانب سے جینز میں ملبوس ایک لڑکی چلائی ''خدا کے لیے کوئی مجھے بھی اس شیشے کی عکس نما تھیوری کے بارے میں بتائے گا۔'' پہلا لڑکا تفصیل سے بتانے لگا ''بھئی یونانی فلسفے کے مطابق ہماری یہ دنیا دراصل ہو بہو ایک ایسی ہی دنیا کا عکس ہے جو بالکل ہمارے سامنے ہی بستی ہے۔ لیکن ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ یعنی جو کچھ وہاں ہو رہا ہے ٹھیک وہ یہاں بھی ہو رہا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کا ڈپلی کیٹ اُس دنیا میں موجود ہے۔ اور یہ جو گڑبڑ نومی کے ساتھ ہو رہی ہے ویسا تب ہوتا ہے، جب ہماری دنیا اور اُس دنیا کے عکس کے چند فریم آگے پیچھے ہو جائیں۔ تب ہم لمحہ بھر کے لیے مستقبل میں جھانک آتے ہیں۔ یار، وہ تم لوگوں نے ہم زاد کا ذکر نہیں سنا..... ہمارا ہم زاد وہی تو ہے۔ اسی جیسی دنیا میں بستا ہمارا ڈپلی کیٹ۔ ہماری کاربن کاپی۔'' میرے ذہن میں اُن لوگوں کی باتیں سن کر جھکڑ سے چلنے لگے تھے۔ یہ تو وہی بات کر رہے تھے جس کی ایک رُوحانی توجیہہ آج شام ہی کو مولوی خضر نے میرے سامنے پیش کی تھی۔ جب کہ یہ تو بالکل ہی کسی نئی تھیوری کا ذکر کر رہے تھے۔ قدرت میرے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں نعمان نے زور دے کر کہا۔ ''میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ وقت اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ باہر کے سائنس دانوں نے حال ہی میں کچھ ایسی آوازیں ریکارڈ کر لی ہیں جن کی زبان عبرانی ہے اور جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی آوازیں ہیں۔ بلکہ وہ تو اُس واقعے تک بھی پہنچ گئے ہیں کہ وہاں بات کسی گدھے کے مرنے کے قصے کے بارے میں ہو رہی ہے۔'' تیز طرار لڑکی نے ناک سکیڑی ''تو اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے؟'' نعمان نے اصرار جاری رکھا ''یار جب آواز کے فریم خلا میں زندہ رہ سکتے ہیں اور صدیوں بعد بھی پکڑے جا سکتے ہیں تو پھر ہماری تصویریں بھی فضا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ میں ضرور باقی رہتی ہوں گی۔ تم دیکھنا جلد ہی ایک ایسی مشین بھی وجود میں آ جائے گی جو ہمیں ہمارے مستقبل نہیں تو کم از کم ماضی میں ضرور پہنچا دے گی، جہاں ہم خود اپنی آنکھوں سے اپنا بچپن، اپنے والدین

اور دیگر حالات دیکھ سکیں گے۔'' شرارتی لڑکی خاموشی سے چلائی ''واؤ..... دیٹس گریٹ..... یو
مین ٹائم مشین..... کاش اُس وقت ہم سب بھی زندہ ہوں اور اپنے ماضی میں جھانک سکیں.....''

اتنے میں، میں بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں نے نعمان کو سیلف مارنے کا کہا۔ اُس
نے سیلف مارا اور موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہوگئی۔ سب نے خوشی کے مارے سیٹیاں
بجائیں اور نعرے لگائے اور اپنی اپنی جوڑی کے ساتھ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے مجھ
سے ہاتھ ملایا اور اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر دینے چاہے۔ میں نے مسکرا کر نوٹ واپس
اُس کی شرٹ کی جیب میں رکھ دیئے اور اُوپر درگاہ کی جانب اشارہ کر کے کہا ''میں وہاں رہتا
ہوں..... کبھی وقت ملے تو وہاں آیئے گا۔ میں آپ کو اس بائیک کے بارے میں کچھ ایسی
ہدایات دوں گا کہ پھر یہ آپ کو مہینوں تنگ نہیں کرے گی۔'' نعمان نے گرم جوشی سے بائیک پر
بیٹھے بیٹھے ہی آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور کہا ''اوہ شیور..... Sure میں ضرور آؤں گا۔''
شرارتی لڑکی نے بھی جاتے جاتے جلدی میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور وہ سب ہی میرا شکریہ ادا
کرتے اور شور مچاتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوگئے۔ جانے میں ساحل پر چہل قدمی کے لیے
کیوں اُترا.....؟ جانے یہ گروپ وہاں کیوں آیا اور اُن تک میری رسائی کیوں ہو پائی.....؟
شاید یہ سارا کھیل ہی مجھے اس نئی تھیوری تک پہنچانے کے لیے تھا.....؟ میں نے دل میں ارادہ
کیا کہ کل صبح موقع ملتے ہی سب سے پہلے مولوی خضر سے اس یونانی فلسفے کے بارے میں
بات کروں گا۔ کیا واقعی ہمارا کوئی ہم زاد بھی ہوتا ہے۔ بالکل ہمارے جیسا؟ ہمارا نام، ہم پیشہ
لیکن اگلا دن جمعرات کا تھا اور حسب معمول فجر کے بعد ہی سے دھیرے دھیرے درگاہ پر
حاضری دینے والوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ اُس روز ویسے بھی نہ جانے کیوں اس قدر بھیڑ تھی کہ
مجھے سر اُٹھانے کی فرصت بھی نہیں مل سکی اور یونہی دیکھتے دیکھتے عصر کا وقت بھی ہوگیا۔

آج میرا دل بالکل ہی بجھا ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ زہرا کو اب یہاں
آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اُسے اپنے عبداللہ کا پتا مل چکا تھا اور شاید اب وہ ہر جمعرات
کو سیکڑوں میل کا سفر کر کے اُس درگاہ کی زیارت کو جایا کرے گی، جہاں اُسے اُس کے من کی
مراد مل سکتی تھی۔ اور پھر وہ درگاہ کی زیارت کو یہاں آتی ہی کب تھی.....؟ وہ تو صرف عبداللہ کی
زیارت کے لیے آتی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر صحن کے پا

دروازے پر پڑی۔ کچھ دیر تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی..... تھکی تھکی..... نڈھال سی..... اپنے آپ اور اس سارے زمانے سے بے زار۔ میں نے لوگوں سے نظر بچا کر دوبارہ اپنی آنکھیں مل کر دیکھا لیکن وہ زہرا ہی تھی۔ آج صرف اُس کی خادمہ ہی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ عورتوں والے حصے کی طرف بڑھ گئی اور لاتعلق سی ہو کر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نوکرانی جلدی جلدی اُسے پنکھا جھلنے لگی۔ زہرا کی حالت بہت ابتر تھی۔ شاید وہ کسی لمبے سفر کی تھکان کے زیر اثر تھی، یا پھر کسی اندرونی کش مکش نے اُس کو اتنا نڈھال کر رکھا تھا۔ میرے دل میں شدید یہ خواہش اُبھری کہ میں کسی طرح اُس سے معلوم کروں کہ اُس کی عبداللہ سے ملاقات ہوئی، یا نہیں۔ لیکن میری یہ حسرت دل میں ہی دبی رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اپنے کمرے میں جانا پڑا اور نذر و نیاز اور مسائل کے حل کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ مردانے سے فارغ ہو کر میں عورتوں والی کھڑکی کی جانب آیا تو حسب معمول میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کی رُوح میں اُتر جانے والی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ آج اُس کی آواز میں بھی تھکن کا غلبہ تھا۔ ''اگر میں آپ سے کچھ مانگوں..... تو کیا آپ دیں گے.....؟'' میرا دل زور سے دھڑکا۔ شہنشاہ خود سوالی سے سوال کر رہا تھا۔ ''میرے پاس میری اس لاحاصل زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی آپ کہیں.....'' کچھ دیر دوسری جانب خاموشی رہی جیسے وہ کسی شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو۔ پھر اُس کی آواز اُبھری ''آپ..... میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ درگاہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں.....''

۴

پہلی جیت

پہلے پہل تو میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔ میں نے وضاحت چاہی
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتی ہیں۔'' ''کہیں بھی..... آپ
کہیں بھی چلے جائیں..... بس یہ درگاہ چھوڑ دیں۔ آپ دھیرے دھیرے میرے راستے
رکاوٹ بنتے جا رہے ہیں۔ آپ کی وجہ سے عبداللہ کو یہاں سے کہیں اور جانا پڑا۔ اور جب
میں وہاں اُن تک پہنچی تو انہوں نے مجھے اس درگاہ کی حاضری کا حکم دے دیا۔ میں اُن کا حکم
ٹال نہیں سکتی، لیکن آپ سے درخواست تو کر سکتی ہوں کہ آپ ہی میرے حال پر رحم کھائیے
براہ مہربانی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہوسکتا ہے آپ کے جانے کے بعد وہ دوبارہ یہیں
جائیں۔'' وہ بولتی جا رہی تھی اور میرے دل پر نہ جانے کتنی چھریاں چل رہی تھیں۔ تو گویا اُس
کی آج کی حاضری کا مقصد بھی اُسی رقیب کی مدح سرائی تھا، جو پہلے ہی میری محبت پر ڈاکا
ڈال چکا تھا۔ مجھے زہرا کی سنگ دلی کا اس شدت سے احساس ہوا کہ رُوح کے نازک دھاگے
اُدھڑنے لگے۔ کیا اُسے میری حالت کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ میں یہاں صرف اور صرف
اُسی کے لیے تو بیٹھا ہوا تھا۔ کیا میری محبت اتنی ہی حقیر اور فضول تھی کہ آج تک اُس پتھر
ایک دراڑ بھی نہ ڈال پائی تھی۔ میری طرف سے گہری خاموشی پا کر اُس جلاد نے مجھے پھر میری
موت یاد دلائی۔ ''میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ میرے اندر کی کڑواہٹ باہر نکل آئی۔ ''آپ جواب کہاں چاہتی
ہیں۔ آپ کو تو بس حکم سنانا آتا ہے۔ سو، آپ نے سنا دیا۔ اب یوں کہیں کہ آپ تعمیل کی منتظر
ہیں۔'' اُسے شاید اپنے لہجے کی سختی کا کچھ احساس ہوا۔ ''اگر میری کسی بات سے آپ کو دُکھ
ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ میری ابتر حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اُس وقت
ڈوب رہی ہوں جب کنارہ بس سامنے نظر آ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کریں، پلیز۔'' جلاد سر قلم کرنے
سے پہلے سزائے موت کے مجرم سے رحم اپیل کر رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے اگر آپ میرے سر

کھڑے ہو کر ڈوبنے سے بچنا چاہتی ہیں تو مجھے یہ موت بھی منظور ہے۔ میری دعا پھر بھی یہی ہوگی کہ خدا آپ کی کشتی پار لگا دے۔ لیکن میں یہاں کچھ شرائط کے تحت اور کچھ معزز لوگوں کے وعدوں اور ضمانت پر آیا ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دیجیے تاکہ میں یہاں سے جانے کا کوئی مناسب موقع اور بہانہ ڈھونڈ سکوں۔ مجھے یہاں سے جانے کے بعد اپنا سامنا بھی کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ مجھے خود اپنے سامنے ذلیل ہونے پر مجبور نہیں کریں گی۔'' ''نہیں نہیں..... خدانخواستہ..... ساحر میں جانتی ہوں، میں آپ کو کتنی مشکل میں ڈال رہی ہوں..... لیکن آپ نہیں جانتے..... بس آپ نہیں جانتے۔''

جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی اور وہ تیزی سے وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ میں ویسے ہی اپنی جگہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام ''ساحر'' پکارا تھا۔ یہ چار حرف اُس کی زبان سے نکل کر کس قدر محترم، کتنے بلند ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بے معنی سے نام کو اُس کی زبان نے معنی دے دیئے تھے۔ ساحر..... پہلے تو کبھی مجھے میرا نام اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ جاتے جاتے بھی مجھے ایک امتحان میں ڈال گئی تھی۔ جانے سلطان بابا اور عبداللہ کو میں یہ بات کیسے سمجھا پاؤں گا کہ جس کے لیے میں اس امتحان گاہ میں آ کر بیٹھا تھا، وہی نہیں چاہتی کہ میں سارے پرچے حل کر کے سرخرو ہو سکوں۔ جب ممتحن نے امتحان سے پہلے ہی نتیجہ سنا دیا تھا کہ کامیابی میرا مقدر نہیں تو پھر اس آزمائش کا تکلف بھی کیوں؟

شام کو مغرب کے بعد جب فراغت ملی تو میں نے سب سے پہلے مولوی خضر کو کل رات ساحل پر موٹر سائیکل گروپ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی انہیں اس ''عکس آئینہ'' تھیوری کے بارے میں بتایا کہ میں اُن کی بات سن کر کافی اُلجھ سا گیا ہوں۔ خاص طور پر ہم زاد والی بات سن کر تو خود مجھے بھی ایک لمحے کو ایسا لگا تھا کہ کہیں واقعی میرا ہم زاد ہی تو میرے ساتھ ساتھ نہیں چلتا۔ جو مجھ سے پہلے ہی ہر مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ مولوی خضر نے غور سے میری بات سنی۔ ''وہ نوجوان ٹھیک کہہ رہا تھا میاں..... ایسا ایک نظریہ بھی موجود ہے، جو اس دنیا کو پہلے سے ہونے والے واقعات کا تسلسل بتاتا ہے۔ سائنس میں اس کے علاوہ بھی دنیا کے وجود میں آنے کی کئی توجیہات پیش کی گئی ہیں مثلاً بگ بینگ کا

نظریہ، ڈارون کی تھیوری وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی ایک اور دل چسپ نظریہ موجود ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کائنات کی اور اس دنیا کی پوری فلم پہلے ہی سے بنا کر کیسٹ میں بند کر دی گئی ہے۔ بنانے والے مالک نے پہلے ہی سے پوری فلم دیکھی ہوئی ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک سب کچھ فلمایا جا چکا ہے۔ آگے جو ہونا ہے، وہ بھی کیسٹ موجود ہے اور یہ الہام، یا کشف، یا مستقبل بینی اُن کے حصے میں آئی ہے، جو فلم کے اگلے حصے کے چند مناظر اپنی کسی خاص رُوحانی طاقت کی وجہ سے پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اِسی تصور پر کام کرتے ہوئے بیرونی ملکوں کے سائنس دان ٹائم مشین کی تخلیق کی کوششوں میں جانے کب سے لگے ہوئے ہیں، کیونکہ اُن کے خیال میں ابد تک فلم موجود ہے تو مستقبل میں بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ اور باقاعدہ مستقبل، یا ماضی میں جا کر حالات و واقعات کا مشاہدہ بھی ممکن ہے۔ میں نے کہا نا میاں، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، حضرت انسان کی کھوج کا یہ سفر اسے ایسے نظریات اور مفروضوں تک لے جاتا رہے گا اور حقائق سامنے آتے رہیں گے۔ البتہ ایک مسلمان کا عقیدہ اٹل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانی حیات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور اب قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر اٹل ہے اور صرف دعا تقدیر بدل سکتی ہے۔ ہمارا قسمت کا فلسفہ بھی تو کسی نہ کسی طرح سب پہلے سے طے شدہ ہونے، یا پھر بقول مغربی محقق "سارے عمل کی مکمل فلم بندی، ہونے کو سہارا دیتا ہے نا۔ بس بنیادی فرق عقیدے کا ہی رہ جاتا ہے ورنہ مغربی سائنس دان بہت سی باتوں میں خود اسلام کی ترویج کر رہے ہوتے ہیں۔ چاہے انجانے میں ہی سہی....."

میں حیرت سے مولوی خضر کی باتیں سن کر رہا تھا۔ ہمارے اِردگرد کتنے اسرار، راز بکھرے پڑے ہیں اور ہم نہ جانے کن چیزوں میں اپنا دھیان کھپاتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو تو چھوڑیئے، خود میں کہاں ان اسرار و رُموز کی حقیقت جاننے کے لیے یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد بھی تو صرف اور صرف زہرا ہی تھی اور اب تو شاید اس کہانی کا خاتمہ بھی قریب آ چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک آدھ دن میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر خود مولوی خضر سے اپنی زہرا سے ہونے والی اس آخری بات چیت کا احوال بیان کر کے درخواست کروں گا کہ کسی طور پر عبداللہ، یا سلطان بابا کو میرے واپسی کے ارادے سے مطلع کر دیں۔ میں درمیان میں صرف ایک

مرتبہ، ایک دن کے لیے گھر ہو کے آیا تھا۔ جب کہ مما، پپا سمیت تمام دوستوں کو سختی سے پہلے مہینے میں درگاہ ملنے آنے سے منع کر رکھا تھا، کیوں کہ میں کسی بھی حوالے سے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ البتہ حسب وعدہ والدین سے ملنے کے لیے ہر دو ہفتے میں ایک رات تو اپنے گھر پر گزارنی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تھا، تب مما اور پاپا دونوں ہی بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے اور شام ہونے سے پہلے میرے دوستوں کا بھی جم گھٹا سا لگ چکا تھا۔ وہ سب مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے تھے جیسے میں جانے کتنی صدیوں بعد اُن سے ملا ہوں۔ باقاعدہ جشن کا سا سماں تھا۔ میں درگاہ میں پندرہ دن گزار کر پہلی مرتبہ گھر گیا تھا اور اُن پچھلے پندرہ دنوں میں میری ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ پہلی وجہ تو سلطان بابا کی شرط تھی اور دوسری مولوی خضر کا ہمہ وقت ساتھ۔ وہ ہر نماز کے وقت سے پہلے ہی پیغامبر بھیج بھیج کر، مسجد پہنچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر مولوی صاحب نہ ہوتے تو مذہب سے میرا یہ تعارف اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر مجھے تو ویسے بھی نماز بہت مشکل اور پابند کر دینے والا عمل لگتا تھا۔ کچھ ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ نماز وغیرہ کی پابندی شاذ و نادر ہی کی جاتی تھی۔ مما کو سال میں کبھی ایک آدھ بار جوش چڑھتا تو کوئی محفل میلاد وغیرہ منعقد کروا لیتی تھیں۔ لیکن مجھے تو وہ بھی میلاد کی محفل سے زیادہ ''فیشن پریڈ'' لگتی تھی۔ رہ گئے پاپا تو کبھی کبھار ہمارے ڈرائیور کی دیکھا دیکھی جمعہ، یا عید کی نماز پڑھنے کے لیے اپنی مرسڈیز بینز میں قریبی جامع مسجد تک چلے تو جاتے تھے لیکن زندگی میں کبھی بھی مجھے اپنے ساتھ نماز کے لیے جانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ مذہب ہمارے گھر میں ایک فالتو بلکہ کسی حد تک ممنوعہ شے تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب میں سکول میں اپنے دوستوں کو رمضان میں روزہ رکھتے ہوئے دیکھتا تھا تو گھر آ کر میں بھی مما پاپا سے روزہ رکھنے کی ضد کرتا تھا، لیکن نہ تو انہوں نے خود کبھی رمضان کی پابندی کی تھی اور نہ کبھی مجھے روزہ رکھنے دیا۔ مما کو ہمیشہ اپنے لاڈلے بیٹے کی صحت گرنے کا غم کھائے جاتا تھا۔ البتہ وہ خود کبھی کبھار ستائیسویں، یا تیسویں کا روزہ رکھ لیتی تھیں۔ رہ گئے پاپا تو اُن کا تو سارا سال ہی بیرون ملک دوروں اور سفر کی نذر ہو جاتا تھا۔ لہٰذا ایسے میں روزہ رکھنے کی بھلا کسے فرصت.....؟ پتا نہیں میرے گھر والے مذہب سے اتنا خوف زدہ کیوں تھے؟ درگاہ میں پہلے دن نماز پڑھتے ہوئے خود مجھے مذہب سے بے حد خوف محسوس ہوا تھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ مولوی

خضر کی صحبت میں علم ہوا کہ مذہب تو بہت ہی آسان اور دوست نما کوئی چیز ہوتی ہے۔ جسے ٹھیک طرح سے اپنایا جائے تو اُلٹا وہ ہمارے اندر کے خوف اور وسوسوں کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن بہرحال میرے گھر میں مذہب ''شناختی کارڈ'' کے خانے میں لکھا جانے والا ایک لفظ ''مسلم'' تھا۔ ہاں البتہ ایک بہت عجیب بات یہ تھی کہ کوئی بھی موت چند دن کے لیے ہمارے گھر میں بھی مذہب کو یوں پھیلا دیتی تھی، جیسے ہم لوگوں سے زیادہ کٹر مذہبی اور کوئی نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا تھا جب یکے بعد دیگرے پہلے دادا ابو اور پھر دادی جان چند مہینوں کے وقفے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب ہر موت کے اگلے چند دنوں تک ہمارے گھر میں صرف اور صرف مذہب کا راج تھا۔ جزدانوں میں برسوں سے پڑے قرآن اور سپارے اُتار کر اُن کی دُھول جھاڑی گئی اور ہفتوں گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ ایک مولوی صاحب روزانہ صبح سے شام تک گھر کے وسیع لان میں لگائے گئے شامیانے میں دعا کرنے کے لیے بیٹھے رہتے اور ہمارے گھر کے دالان میں ظہر، عصر اور مغرب کی تین نمازیں باقاعدہ جماعت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، جن میں پاپا سمیت وہ تمام ملاقاتی بھی شامل ہوتے، جو تعزیت کے لیے آتے تھے۔ مما بھی سر پر سفید چادر ڈالے اور ہاتھ میں تسبیح لیے عورتوں کے جم گھٹے میں درد کرتی نظر آتیں۔ اور میں نے زندگی بھر میں صرف اُن ہی دنوں میں اُن کے ہاتھ میں قرآن دیکھا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف موت ہی ہمارا مذہب سے واحد ذریعہ ملاقات تھا اور چونکہ دادا اور دادی کے بعد گھر میں کسی خونی رشتے کی موت نہیں ہوئی تھی لہٰذا تب سے مذہب کے لیے بھی گھر کے دروازے ہمیشہ کی طرح بند تھے۔

جس دن میں درگاہ سے ایک رات گزارنے کے لیے گھر گیا تھا، اُس دن میں نے بھی کوئی نماز نہیں پڑھی تھی، حالانکہ اس شور اور ہنگامے میں بھی مجھے تمام نمازوں کے اوقات نہ صرف یاد رہے بلکہ ہر نماز کے وقت میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی کی کیفیت بھی اُبھری۔ جیسے مجھ سے کوئی اہم چیز چھوٹ رہی ہو۔ مجھے کھو دینے کا عجیب سا احساس بھی ہوا لیکن پتا نہیں کیوں، میں اپنے گھر والوں اور دوستوں کے سامنے نماز پڑھنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ ایک عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں کوئی جرم کرنے چلا ہوں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ لوگ کیا کہیں گے کہ ''ساحر تو پکا مولوی بن گیا ہے۔ درگاہ جا کر.....'' پتا نہیں، ہمارے گھرانوں

میں مولوی جیسا محترم لفظ کیوں اور کب کیسے ایک الزام کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ہمارا مذہب سے تعلق صرف بچے کے کان میں اذان دلوانے سے لے کر نماز جنازہ پڑھوانے تک ہی رہ گیا تھا۔ درمیان کا مذہب نہ جانے کہاں کھو گیا۔ سو، میں بھی اپنے گھر میں، یا اپنے دوستوں کی محفل میں ایک نماز بھی ادا نہیں کر سکا۔ البتہ واپس آ کر میں نے مولوی خضر سے اپنی اس کمزوری کا ذکر کیا تو انہوں نے دھیرے سے مسکرا بس اتنا کہا۔ ''چلو جو ہوا سو ہوا، تم یوں کرو کہ ان سب نمازوں کی قضا پڑھ لو۔ مذہب کا کام راستہ دینا ہے، راستہ روکنا نہیں۔'' اب میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ سے تو میری پوری زندگی ہی ''قضا'' ہونے کو ہے۔ زہرا کے حصول کی لگن بھی ایک طرح کی اُمید ہی تھی۔ لیکن جب سے اُس نے مجھے اپنا یہ جنون ترک کرنے کی درخواست کی تھی، تب سے مجھے واقعی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ''وہ ایک سجدہ'' جس میں اُسے مانگنا تھا، وہی مجھ سے قضا ہو چکا ہے۔

میں نے آخرکار حتمی فیصلہ کر ہی لیا اور ایک طویل خط میں عبداللہ کو زہرا کی درخواست کے بارے میں ساری تفصیل لکھ ڈالی۔ عبداللہ کو یہ بھی بتا دیا کہ اب میرا اس درگاہ پر مزید ڈیرہ ڈالے رہنے کا کوئی مقصد ہے نہ فائدہ۔ لہٰذا وہ سلطان بابا کو بتا دے کہ میں شرط ہارنے کا اعلان کر رہا ہوں اور اس جمعرات کے بعد درگاہ چھوڑ جاؤں گا۔ ہو سکے تو وہ کسی اور خدمت گار کا بندوبست کر لیں، یا پھر عارضی طور پر عبداللہ ہی واپس یہاں آ جائے۔ خط لکھتے ہوئے بھی یہ بات میرے دل میں آئی تھی کہ زہرا بھی تو یہی چاہتی تھی کہ خود عبداللہ اس درگاہ کا انتظام پھر سے سنبھال لے۔ شاید اِسی طرح میں اُس محبوب کے کچھ کام آ جاؤں؟ ابھی میں خط لکھ کر فارغ ہوا تھا کہ باہر سے کریم کا نعرہ گونجا۔ ''عبداللہ بھائی..... کدھر ہو، آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' میں حیرت کے عالم میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سامنے اُس رات والے موٹر سائیکل گروپ کے نعمان اور اُسی شریر سی چیونگم چباتی لڑکی کو کھڑے پایا، جو اُس رات بھی نعمان ہی کی بائیک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے اُن دونوں کو دیکھ کر مجھے ایک انجانی سی خوشی کا احساس کیوں ہوا۔ میں نے گرم جوشی سے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ لڑکی کا تعارف نعمان نے ٹینا کہہ کر کروایا۔ ٹینا درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔ میں نے نعمان کو اشارہ کیا تو وہ ٹینا کا ہاتھ پکڑے درگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہم صحن ہی میں ایک جانب

درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ٹینا نے آس پاس حیرت سے دیکھا۔ ''آپ یہاں رہ
ہیں.....؟ بور نہیں ہو جاتے۔'' مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ''بہت بور ہوتا ہوں، کبھی کبھ
تو اتنا بور ہوتا ہوں کہ خود بوریت بھی مجھ سے بور ہو کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔'' وہ دونوں میر
بات سن کر ہنس پڑے۔ نعمان نے بتایا کہ وہ حسب وعدہ مجھ سے اپنی بائیک کے بارے م
معلومات لینے آیا ہے۔ میری طرح وہ بھی ہیوی بائیکس کا دیوانہ لگتا تھا۔ میں نے بہت تفصیل
سے اُسے تمام معلومات سے آگاہ کیا اور ہر پرزے کی الگ الگ خصوصیات بھی بتائیں۔ نعما
اور ٹینا دونوں ہی بہت غور اور دل چسپی سے میری باتیں سنتے رہے۔ نعمان نے مجھے بتایا
اُس نے حال ہی میں شپ کے ذریعے یہ بائیک جرمنی سے منگوائی ہے۔ اس لیے اُسے شرو
شروع میں اسے سنبھالنے میں بہت دشواری پیش آ رہی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران ایک
مولوی خضر بھی کسی کام سے درگاہ آئے اور انہوں نے نعمان اور ٹینا کو دعا بھی دی۔ شام ڈ
وہ دونوں رُخصت ہوئے تو بہت خوش تھے۔ ٹینا نے تو باقاعدہ درگاہ کی زندگی پر ایک انگریز
اخبار میں فیچر لکھنے کا پروگرام بھی بنا لیا تھا اور نعمان نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی مجھ
ملنے دوبارہ آئے گا۔ جانے کیوں میں اُسے یہ نہیں بتا سکا کہ اب جب وہ یہاں آئے گا تو شا
مجھ سے اُس کی ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ دو دن کے بعد ہی تو جمعرات تھی۔ میری اس درگاہ
آخری جمعرات۔

لیکن اگلے دو دن میرے لیے بہت ہی کٹھن ثابت ہوئے۔ اُس رات مولوی خض
شدید بخار نے آ گھیرا اور اُن کی تیمارداری اور دیگر اُمور کو نمٹانے میں وقت کچھ یوں گزرا
کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کریم بھی اپنی کشتی لے کر چار دن کے لیے کھلے سمندر میں جال ڈالنے
لیے جا چکا تھا، لہٰذا مجھے اپنی مالاؤں کے ساتھ ساتھ مولوی خضر کی تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں
بیچنے کے لیے جمعرات کو خود بازار جانا پڑا۔ ہمارا طریقہ کار بھی وہی ہوتا تھا جو باقی مچھیرے
بازار سجانے کے لیے اختیار کرتے تھے۔ یعنی ساحل پر کسی چادر، یا لکڑی کے تختے وغیرہ پر
لگا کر گاہک کا انتظار کرنا، لیکن جانے اُس دن ایسی کیا بات تھی کہ کوئی خریدار میری طرف
ہی نہیں کر رہا تھا۔ اُوپر سے جمعرات کی وجہ سے درگاہ میں زائرین کا رش بڑھتا جا رہا تھا۔
سیڑھیوں سے کچھ فاصلے ہی پر اپنی مالائیں اور مولوی خضر کی ٹوپیاں سجائے بیٹھا درگا

سیڑھیوں سے اُوپر جاتے لوگوں کی بھیڑ کو دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا کہ نہ جانے اُوپر صحن میں موجود دو خدمت گار ٹھیک سے اپنا کام کر رہے ہوں گے، یا نہیں۔ مجھے زیادہ فکر یہ تھی کہ عصر سے پہلے اگر میں اپنی چیزیں بیچ نہیں سکا تو نذر و نیاز کا معاملہ کون بھگتائے گا۔ عبداللہ نے جاتے وقت سختی سے مجھے اس معاملے کو ذاتی طور پر نمٹانے کا کہا تھا، کیوں کہ یہ اچھی خاصی رقم کا معاملہ تھا اور لوگوں کی بہت سی امانتیں ہمارے سپرد ہوتی تھیں، ایسے میں کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اِسی شش و پنج میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی راہ گیر کی ٹھوکر لگی اور میری ساری مالائیں زمین پر بکھر گئیں۔ چند ایک کے دانے بھی لڑی سے علیحدہ ہو کر ریت پر دُور تک بکھر گئے۔ نقصان بھی میرا ہوا تھا، لیکن اس پر بھی وہ صاحب جو غالباً اپنی بیگم کو درگاہ کی زیادت کے لیے لے کر آئے تھے، مجھ ہی پر بگڑنے لگے۔ ''غضب خدا کا۔ سارا راستہ ان لوگوں نے بند کر رکھا ہے۔ زیارتوں جیسی مقدس جگہوں کو بھی انہوں نے کاروبار کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ بیگم ہم تو کہتے ہیں کہ ان ہی لوگوں کے بھیس میں وہ چور اُچکے بھی چھپے ہوئے ہیں، جن میں سے ایک نے پچھلے ہفتے آپ کا پرس چھین لیا تھا۔'' وہ جانے کیا اُول فول کہے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی مالائیں چنتے ہوئے اُن سے دھیرے سے بس یہ کہا ''آپ جائیں یہاں سے، میں معافی چاہتا ہوں۔'' لیکن اُن کا غصہ بڑھتا ہی گیا۔ اب آس پاس کے لوگ بھی تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے۔ ''نہیں چلے کیسے جائیں۔ ہم تو یہاں کے ایڈمنسٹریٹر سے مل کر ہی جائیں گے۔ یوں راستہ بند کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ کیسی کھلی بدمعاشی کا بازار گرم کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ آج میں اس کا بندوبست کر کے ہی جاؤں گا۔'' میں سر جھکائے اُن کی باتیں سنتا رہا۔ کیوں کہ میں اس وقت عبداللہ تھا۔ اگر عبداللہ کی جگہ ساحر ہوتا تو نہ جانے اب تک کیا ہو چکا ہوتا۔ لیکن اگر ساحر ہوتا تو وہ بھلا یوں بازار میں عام مزدوروں کی طرح مزدوری کرنے کیوں بیٹھا ہوتا؟ وہ صاحب یوں ہی گرجتے برستے رہے۔ اب اُن کی بیگم اور باقی بھیڑ نے انہیں ٹوکنا شروع کر دیا تھا کہ چلیں جو ہوا سو ہوا۔ اب جانے دیں۔ بھیڑ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں بنا کچھ کہے، سر جھکائے اُن صاحب کی تمام صلواتیں سن رہا ہوں۔ اب ہجوم میں سے ایک آدھ شخص نے باقاعدہ اُن صاحب کو جھاڑ کر کہا کہ لڑکا خاموش کھڑا کب سے آپ کی گالیاں سن رہا ہے۔ لہٰذا شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ اب

آپ بھی یہاں سے آگے بڑھ جائیں۔ لہٰذا خدا خدا کر بادل نخواستہ اُن صاحب نے قدم آگے بڑھائے اور میں نے لمبا سا سانس لے کر اپنی نظریں اُٹھائیں اور پھر میری نظر کسی کی نظر سے ٹکرا کر جم سی گئی۔ جب وہ صاحب دل کھول کر میری بے عزتی کر رہے تھے اور میں سر جھکائے کھڑا تھا تب نہ جانے کس وقت زہرا اپنی ماں اور خادمہ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے شاید بھیڑ کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ یہ سارا تماشا درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب اُسی راستے پر ہو رہا تھا، جو اُس ماہ رُخ کی راہ گزر تھی۔ مطلب یہ کہ اُس نے میری رُسوائی کا یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ زہرا کی والدہ تو زیادہ میری نظر کا سامنا نہیں کر پائیں اور منہ میں چادر کا پلو دبائے سسکتی ہوئی وہاں سے خادمہ سمیت آگے بڑھ گئیں، لیکن سنگ مرمر کی وہ مورت وہیں جمی کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ چند گھڑیوں ہی میں جانے کتنے طوفان گزر گئے۔ پتا نہیں، یہ میرے اندر کی شدید بے بسی کا احساس تھا، اپنی رُسوائی کا غم تھا، یا پھر اُس بے رحم کی ناقدری کا شکوہ۔ لیکن جانے کیوں پل بھر میں ہی میری آنکھوں سے بیک وقت دو آنسو نکلے اور شاید نیچے ریتیلی زمین کے بجائے اُس نازنین کے دل پر ٹپکے۔ میری زبان نے تو آج تک کبھی اُس سے شکوہ نہیں کیا تھا، پر میری آنکھوں نے شاید اُس پل اپنی ساری کہانی کہہ ڈالی۔ پھر زہرا سے بھی وہاں رُکا نہیں گیا اور وہ اپنی پلکیں بھیگنے سے پہلے ہی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اُوپر درگاہ چلا آیا۔ میرے اندر چند لمحوں میں اتنی زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی کہ اب میرا دل کسی کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے تمام کام مولوی خضر کے اُس شاگرد کے حوالے کر دیئے جو جمعرات کے روز خصوصی طور پر میری مدد کے لیے درگاہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ عصر کے بعد نذر اکٹھی کرنے کے لیے بھی اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ شام ڈھل رہی تھی اور میں نڈھال سا آنکھیں موندے درگاہ کے صحن کے ایک پوشیدہ گوشے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دفعتہً کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ ہوئی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرا جسم شل سا ہو گیا۔ اُس کی آواز میں لرزش تھی۔ ”آپ مجھ سے جیت گئے.....“

الوداع

میں حیرت سے گنگ بیٹھا رہا، نہ جانے وہ کون سی جیت کی بات کر رہی تھی۔ میں تو اپنی آخری بازی بھی ہار چکا تھا۔ میں نے شکوہ کیا۔ ''طعنہ دے رہی ہیں.....؟'' ''نہیں نہیں'' وہ جلدی سے بولی۔ ''طعنہ نہیں ہے، اعتراف ہے، میں نے آج تک صرف اپنی لگن کو دنیا کی سب سے سچی لگن مانا ہے اور دنیا کا ہر جنوں، مجھے اپنے جذبے کے سامنے ہیچ اور کم تر لگتا تھا، لیکن آج میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ آپ کا جذبہ اور آپ کی لگن شاید اس دنیا ہی سے ماورا ہے.....'' میری حالت اس وقت اُس سپہ سالار سی تھی، جو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر چکا ہو، سانسیں دھیرے دھیرے ٹوٹ رہی ہوں، مگر سانسوں سے اُڑتی خاک کے پس منظر میں، مرنے سے کچھ لمحے پہلے اپنی فوج کو قلعے پر فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو۔ زہرا کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آج وہ ستم گر بھی میرے جنون کی داد دے رہا تھا، جس نے مجھے دیوانگی کی اس حد تک پہنچایا تھا۔ اُسے روتے دیکھ کر میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا، لیکن میرے لفظ جیسے کہیں کھو سے گئے۔ ''آپ، یہ کیا..... دیکھیں، آپ کے آنسو..... پلیز.....'' میں اُسے کیا کہتا خود میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں، جیسے سارے بند آج ہی ٹوٹے ہوں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم دونوں کا درد جُدا بھی تھا اور مشترک بھی..... اور ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بے وفائی کا الزام بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اتنے میں زہرا کی ماں اور ہڑبڑائی ہوئی کی خادمہ بھی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں چلی آئیں۔ انہوں نے شاید معاملہ کچھ بھانپ لیا کہ میری حالت زار نے اُن کی پتھر دل بیٹی کے سینے پر بھی ''پہلی چوٹ'' ماردی ہے۔ انہوں نے جب میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھوں کی لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولیں تو لہجہ کانپتا سا، بھرایا ہوا تھا۔ ''محلوں کا ایک شہزادہ کیوں اپنی جوانی اس خاک میں رول رہا ہے، کچھ بھکاریوں کی قسمت میں بھیک بھی نہیں ہوتی بیٹا..... جاؤ اپنی سلطنت کو لوٹ جاؤ..... مجھے اُس ماں کی آہ سے ڈر لگنے لگا ہے، جس کی پھول سی اولاد کو ہم نے یوں دربدر کر دیا۔ ہمیں معاف

کر دو، ہماری خطا بخش دو....." وہ جانے کیا کچھ کہتی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر روتی رہیں۔ زہرا کی آنکھیں تو پہلے ہی برس رہی تھیں۔ "اس میں آپ کی کوئی خطا نہیں ہے..... میرا مقد مجھے یہاں کھینچ لایا ہے اور تقدیر کی مار مجھے تب تک جھیلنی ہی ہوگی، جب تک میرے نصیب میں لکھی ہے۔ بعض سلطنتیں خاک ہو جانے کے لیے ہی ملتی ہیں۔" اس کے بعد وہ وہاں رُک نہیں پائیں اور زہرا کو لے کر درگاہ سے نکل گئیں۔

شام کو میں نے مولوی خضر کو بھی اپنی روانگی کے قصد سے آگاہ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ بے حد اداس ہو گئے۔ "کیا کہوں میاں، مجھے تو تمہیں روکنے کا اختیار بھی نہیں۔ پتا نہیں کیوں، چند ہی دنوں میں تم سے کیسا عجیب سا قلبی تعلق بن گیا ہے۔ بہرحال جہاں رہو، خوش رہو....." میں نے انہیں بتایا کہ خود میرا دل بھی یہاں سے جاتے ہوئے بہت بوجھل ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ انجان سے رشتے بھی کسی سرطان کی طرح تیزی سے خون میں شامل ہو رگوں میں اپنی جڑیں بچھا لیتے ہیں۔ کہیں بتائے ہوئے چند دن پچھلی پوری زندگی پر بھاری جاتے ہیں۔ میں بھی یہاں سے ایسے ہی رشتے اور درگاہ سے کچھ ایسا ہی تعلق بنا کر واپس لو رہا تھا۔ کتنے بندھن بندھ گئے تھے میرے اس درگاہ سے۔ کتنے انمول رشتوں کی ٹوکری بھر لے جا رہا تھا میں اپنے ساتھ۔ اور پھر وہ ناز آفرین..... کیا ہوا، جو وہ مجھے مل نہیں پائی۔ اُس محبت کا سدا رہنے والا احساس تو تھا میرے ساتھ، کیا آئندہ زندگی کاٹنے کے لیے یہ سب کافی نہیں تھا۔ میں نے اُس رات بیٹھ کر عبداللہ اور سلطان بابا کے نام الگ الگ لفافوں میں دو خط لکھ کر رکھ دیئے۔ اُن سے بنا ملے چلے جانے پر معذرت کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ جب میں اپنے اندر کی شرمندگی پر قابو پالوں گا تو اُن سب سے ملنے ضرور آؤں گا۔ فجر کی نماز کے بعد میں نے دونوں خط مولوی خضر کے حوالے کر دیے۔ وہ بہت دیر تک مجھے گلے لگا کر تھپکتے رہے۔

میں نے اُن سے آخری الوداع چاہا تو مسکرا کر بولے "کیوں میاں، واپس اپنی دنیا میں جا کر ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟ اور کچھ یاد آئے نہ آئے، لیکن مولوی خضرالدین کے ہاتھ کی صبح کی چائے تو تمہیں ضرور یاد آئے گی، ہے نا.....؟" اُن کی بات سن کر پل بھر ہی میں میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹنے لگے۔ جانے خدا نے ہم انسانوں کا دل اتنا کمزور کیوں بنایا ہے۔ ہم جا بجا خود کو اذیت دینے والے رشتے کیوں پال لیتے ہیں؟

مما اور پپا نے یوں اچانک مجھے گھر میں دیکھا تو اُن پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مما کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں مستقل گھر واپس آ گیا ہوں۔ پاپا بھی بہانے بہانے سے تصدیق کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے کسی طرح سمجھایا کہ اس وقت شدید تھکا ہوا ہوں اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔ اگلی صبح میری آنکھ شور، ہنگامے سے کھلی۔ حسب توقع مما نے میرے سارے دوستوں کو خبر کر دی تھی اور وہ سب نیچے لاؤنج میں جمع ہو کر چلا چلا کے مجھے نیچے بلا رہے تھے۔ اُن کو میرے شرط ہار جانے کا یقین ہی نہیں تھا، کیوں کہ اس سے پہلے میں ایسی کئی شرطیں جیت کر اور سرخرو ہو کر واپس لوٹا تھا۔ بہرحال اُن کے لیے یہی کافی تھا کہ میں واپس لوٹ کر اُن کے درمیان پہنچ چکا تھا، لیکن کیا میں واقعی واپس آ گیا تھا.....؟

دن گزر رہے تھے، لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں۔ گھر میں، دوستوں کی محفل، کلب، پارٹی میں، ہر جگہ جسمانی طور پر پہنچ تو جاتا لیکن گھنٹوں گم صم بیٹھا رہتا۔ یار دوست میری خاموشی سے تنگ آ کر لڑتے جھگڑتے اور میں یوں ہی اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا، لیکن نہ جانے کیوں اُن لمحات میں مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اپنی رُوح کہیں دُور چھوڑ آیا ہوں۔ سب سے زیادہ مسئلہ مجھے نماز کے اوقات میں ہوتا۔ ایک عجب سی بے چینی اور کسک مجھے گھیر لیتی تھی۔ تب میرے لیے گھر، یا باہر کسی بھی محفل میں بیٹھے رہنا دوبھر ہو جاتا اور مسئلہ یہ تھا کہ کلب، یا گھر کا ماحول میری اس مشکل کو ختم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیتا۔ ایسے میں، میں گھر، یا محفل چھوڑ کر کہیں باہر نکل جاتا۔ کسی پُرسکون گوشے کی تلاش میں۔ ایک ایسی ہی سہ پہر جب میرے اندر کی بے چینی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پتا نہیں کب سینٹرل لائبریری کا بورڈ دیکھ کر شہر کی سب سے بڑی لائبریری کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر دی۔ ہال میں مختلف شیلف ہر موضوع کی کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دفعتہً میری نظر ''تصوف'' والے سیکشن میں رکھی کتابوں پر پڑی اور میں یونہی ورق گردانی کے لیے ایک کتاب لے کر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ صفحے پلٹے تو میری بے چین رُوح کو جیسے کچھ مرہم ملا۔ ہاں ٹھیک ہی تو تھا، جانے کب سے میری رُوح گھائل تھی، بیمار تھی۔ اور حیرت ہے کہ ہم اپنی جسمانی بیماری کے لیے تو ڈاکٹر کے پاس

درجنوں چکر لگا آتے ہیں لیکن رُوح کی بیماری ختم کرنے کے لیے کبھی کوئی کتاب تک اُٹھا نہیں پاتے۔ پہلے چند صفحوں ہی میں مجھ پہ یہ حقیقت آشکار ہونے لگی کہ تصوف کی دنیا، ہماری ظاہر دنیا سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس دنیا کے باسی ہیں۔ جو ہر غرض، لا سے بے پروا ہو کر انسانیت کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان میں ہمارے آس پاس پھرتے عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگ بھی شامل ہیں۔ تصوف دراصل رُوح کی دنیا کا دوسرا نام تھا اور میں اس رُوحانی دنیا کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ یہ ایسے لوگوں کی دنیا تھی جو کسی عہدے، مرتبے کی فکر کیے بغیر ہم جیسے بھٹکے ہوئے انسانوں کو اُن کی اصل راہ پر لانے کے لیے شاید ابد تک مصروف رہنے والے تھے۔ جیسے جیسے میں کتاب کے صفحے پلٹتا گیا مجھے ہر صفحے پر اپنے ایک نئے سوال کا جواب ملتا چلا گیا۔ مجھے پتا چلا کہ مذہب صرف پانچ نمازیں پڑھ لینے، یا روزے رکھ لینے کا نام نہیں، یہ صرف بنیادی فرائض ہیں۔ جنہیں ادا کرنے کے بعد مذہب کا اصل سلیقہ اور اصل نظام شروع ہوتا ہے۔ مذہب تو بانٹنے کا نام ہے، چاہے وہ مذہبی تعلیمات ہوں، یا کوئی دنیاوی شے..... مذہب ہر نعمت، علم اور سلیقے کو دوسروں تک پھیلانے کا نام ہے اور یہی کام عبداللہ، سلطان بابا اور مولوی خضر اس درگاہ کی چھوٹی سی دنیا کے ذریعے کر رہے تھے اور یہ سلسلہ لامحدود تھا۔ گھروں میں، مسجدوں، درگاہوں، دفتروں میں، سمندروں، پہاڑوں، ساحلوں پر اور نہ جانے کہاں کہاں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے اور نہ جانے کس کس جگہ میں مذہب سے دُور اور مجھ جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ ہمارے لاکھ دھتکارنے، مذاق اُڑانے اور شک کرنے کے باوجود، یہ دُھن کے پکے اپنا فرض سرانجام دیتے رہے تھے اور میں کس قدر بدنصیب تھا کہ اس نظام کا ایک حصہ بنتے بنتے رہ گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب میں بوجھل دل لے کر لائبریری سے اُٹھا تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہیں میں یہ "لائبریری یاترا" بھی کسی کی دعاؤں کا اثر تھی؟ مولوی خضر سے جب میں بہت زیادہ سوال کیا کرتا تو میری ساری تکرار کے بدلے میں اُن کا جواب صرف اتنا ہی ہوتا تھا۔ "ٹھیک وقت کا انتظار کرو میاں..... وقت آنے پر قدرت تمہیں ہر سوال کے جواب تک خود پہنچا دے گی....." افسوس کہ قدرت نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب تو دیے..... پر بہت دیر سے، یا پھر شاید میں خود ہی کچھ جلد باز نکلا.....

لائبریری سے گھر پہنچتے پہنچتے شام ڈھل چکی تھی اور جیسے ہی میری گاڑی گھر کے قریب پہنچی، میں نے گھر کے گیٹ سے زہرا کی سیاہ شورلیٹ نکلتے دیکھی۔ ہاں..... وہ اُسی کی گاڑی تھی۔ لیکن ہمارے گھر، کیوں.....؟ اگلے ہی لمحے مجھے اس گاڑی نے کراس کیا تو میں نے آگے ڈرائیور اور پچھلی سیٹ پر صرف زہرا کی امی کو بیٹھے دیکھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اُس ماہ رُخ کی گاڑی اپنے گھر سے نکلتے دیکھ کر شاید خوشی کے مارے میرا دم ہی نکل جاتا، لیکن اس وقت میں ایک اُلجھن آمیز سی حیرت لیے گھر میں داخل ہوا۔ مما اور پاپا پورچ ہی میں کھڑے تھے شاید زہرا کی امی کو رُخصت کرنے کے لیے آئے ہوں..... مجھے گاڑی سے اُترتا دیکھ کر مما والہانہ انداز میں میری جانب بڑھیں اور خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''ساحر بیٹا، ابھی زہرا کی امی آئیں تھیں۔ زہرا نے رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے۔'' پل بھر کے لیے تو مجھے لگا کہ ساری زمین گھوم رہی ہے اور یہ آسمان بھی کچھ ہی پل میں میرے سر پر گر جائے گا۔ میرے ماں باپ مجھے گلے لگا کر، چوم کر مبارک باد دے رہے تھے، لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں روؤں، یا ہنسوں..... خوشی سے چلاؤں، یا دُکھ اور اذیت سے چیخ چیخ کر آسمان کو ریزہ ریزہ کر دوں۔ اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی ذریعہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ بات سنتے ہی سجدے میں گر جانا چاہیے تھا۔ صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد منزل پانے والے کو بھلا اور کیا کرنا چاہیے؟ لیکن میں اپنی جگہ گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے ذہن میں اس وقت سوالوں کا جو طوفان اُٹھ رہا تھا، اُس کا کنارا صرف عبداللہ کی ذات تھی۔ اگلی صبح میری گاڑی ساحل کی جانب اُڑی جا رہی تھی۔ میں عبداللہ کی نئی درگاہ کی طرف جانے سے پہلے احتیاطاً اُسے شہر والی ساحلی درگاہ پر دیکھتے ہوئے جانا چاہتا تھا اور پھر درگاہ کے قریب کار پارک کرتے ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کریم مجھے سیڑھیوں کے قریب ہی مل گیا۔ جس نے بتایا کہ سلطان بابا اور عبداللہ دونوں آئے ہوئے ہیں۔ میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے احاطے تک پہنچا تو دُور ہی سے عبداللہ مجھے کسی شخص کو رُخصت کرتے ہوئے دکھائی دیا۔ وہ شخص پلٹا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا میرا منتظر تھا۔ یہ تو وہی صاحب تھے، جنہوں نے اُس دن بازار میں بنا کسی غلطی کے مجھے سرِعام اس قدر بے عزت کیا تھا کہ درد کے رسے میرے آنسو نکل آئے تھے۔ عبداللہ اور وہ صاحب بیک وقت مجھے دیکھ کر ٹھٹکے اور پھر

عبداللہ کی ازلی ملائم سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ''آؤ ساحر میاں..... خوش آمدید۔'' اچانک ہی وہ صاحب تیزی سے میری جانب لپکے۔ غصے سے میرا چہرہ تمتما سا گیا۔ لیکن یہ کیا؟ انہوں نے آتے ہی میرے ہاتھ پکڑ لیے اور نہایت لجاجت سے بولے۔ ''معاف کرنا بیٹا، اُس روز تمہارا بہت دل دُکھایا۔ سچ کہو تو گناہ عظیم کیا۔ پر کیا کرتا، بندے کو یہی حکم ملا تھا..... لیکن آفرین ہے تمہارے حوصلے اور صبر پر، میری ہر گالی، ہر چرکے کو دل پر سہا، لیکن اُف نہ کی۔ میں تم ہی سے معافی مانگنے یہاں آیا تھا۔ اُمید ہے دل میں کوئی میل نہیں رکھو گے۔'' وہ صاحب نہ جانے کیا کچھ کہتے جا رہے تھے اور میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ سارا ڈراما صرف میرے اور زہرا کے لیے رچایا گیا تھا۔ وہ صاحب رُخصت ہو گئے تو میں نے عبداللہ کی طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں جانتا تھا زہرا کی صورت میں تم مجھے بھیک ضرور دو گے۔ لیکن اگر مجھے بھکاری ہی بنانا تھا تو پھر اتنے کڑے امتحان میں کیوں ڈالا۔ پہلے ہی دن زہرا کو کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ میری طرف پلٹ جائے؟'' ''نہیں تم غلط سمجھ رہے ہو۔ سلطان بابا نے صرف تمہارا امتحان لینے کے لیے اُس شخص کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ پہلے دن آنے والے جلد باز اور غصیلے ساحر اور درگاہ پر چند ہفتے جینے والے عبداللہ میں کتنا فرق ہے۔ زہرا کا وہاں پہنچ جانا صرف ایک اتفاق اور تمہاری قسمت کی بدولت تھا۔'' اگر مجھے یہ پتا نہ ہوتا کہ عبداللہ جھوٹ نہیں بولتا تو شاید میں اس وقت اُس کی اس اتفاق والی بات پر کبھی یقین نہ کرتا۔ ''بہر حال، چاہے وہ اتفاق ہی سے وہاں آ پہنچی تھی، لیکن سچ یہی ہے کہ اُس کا دل نرم کرنے میں اتفاق نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ میں یہ کیسے مان لوں کہ اُس کی ہار کے پیچھے مزید کوئی اتفاق چھپا ہوا نہیں ہے۔'' عبداللہ مسکرا دیا۔ ''اگر تم اُس روز بھڑک کر اُس شخص کو پلٹ کر جواب دے دیتے تو یہ اتفاق تمہارے خلاف بھی جا سکتا تھا۔ تمہیں جو بھی ملا تمہارے صبر کے اجر میں ملا ہے اور بجائے خوش ہونے کے تم شکوک و شبہات میں پڑ کر اپنی جیت کا مزہ بھی کرکرا کر رہے ہو۔ میرا یقین کرو، میری اُس لڑکی سے ملاقات تو کیا، بات تک نہیں ہوتی۔'' میرا دل بیک وقت عبداللہ کی بات پر یقین کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اتنے میں سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ''کہاں چلے گئے تھے میاں ہمارا انتظار تو کیا ہوتا.....'' چونک کر پلٹا تو وہ سامنے ہی ہاتھ میں تسبیح لیے کھڑے تھے۔ گرم جوشی سے مجھے اپنے سینے

لگایا اور گال تھپتھپائے۔ میں نے شرمندگی سے معذرت پیش کی۔ ''جب کھلاڑی ہار جائے تو اُسے میدان میں کھڑے رہ کر کسی اشارے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہی میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ اِسی لیے آپ کا سامنا کیے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ خوش دلی سے ہنسے۔ ''ارے نہیں میاں، ناراضی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہ تو دل کا معاملہ ہے۔ تم نے وہی کیا جو تمہارے دل نے کہا۔ اور بھئی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم ہار گئے ہو۔ تمہاری فتح کی خبر بھی ہم تک پہنچ چکی ہے۔ آخری جیت تو تمہاری ہی ہوئی نا۔ تم نے جو چاہا، آخرکار اُسے پالیا۔ جیتے رہو۔'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے۔ گویا زہرا کے اقرار کی انہیں بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرے ذہن میں عبداللہ کا مخصوص جملہ گونجا۔ ''جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے.....'' لیکن میری رُوح کو قرار کیوں نہیں مل رہا تھا؟ میرے اندر کی بے چینی لمحہ لمحہ بڑھتی کیوں جا رہی تھی؟ اور پھر جب عبداللہ نے مجھے یہ بتایا کہ وہ اور سلطان بابا ایک اہم مشن پر بہت جلد کسی دُور دراز سفر پر نکل رہے ہیں، تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تو پھر پیچھے درگاہ کا خیال کون رکھے گا؟'' ''مل ہی جائے گا کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ..... سنا ہے سلطان بابا نے کسی نئے عبداللہ کا انتخاب کر لیا ہے۔'' عبداللہ اپنی دُھن میں مگن مجھے بتاتا رہا۔ لیکن میرا دل تو یہ سن کر ہی ڈوب گیا کہ اب کوئی اور درگاہ کی رکھوالی کرے گا۔ نہ جانے اپنائیت کا یہ کیسا احساس تھا کہ میں درگاہ پر کسی نئے عبداللہ کی آمد کا سن کر کچھ ایسے ہی بے چین ہو گیا، جیسے میری کوئی ذاتی جاگیر لوٹ کر لے جا رہا ہو۔

میں ٹوٹے ہوئے دل سے عبداللہ سے پھر ملنے وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ لیکن پھر میرا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ پایا۔ گھر پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ زہرا نے اپنی والدہ کے ذریعے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ باقاعدہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ ملنا تو مجھے بھی اُس سے تھا، کیوں کہ ہمارے رشتے پر چھائی ہوئی دُھند چھٹنے کے بجائے بڑھنے لگی تھی۔ میں نے ملاقات کے لیے وہی جگہ تجویز کی جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور اگلے دن شام ڈھلے ہم دونوں درگاہ کی سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ زہرا کی امی ڈرائیور سمیت اُوپر درگاہ کی حاضری کو جا چکی تھی۔ آج وہ ناز آفرین

اپنی جبیں پر کوئی شکن لیے بغیر، نظریں جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ کیا اب مجھے اپنی تقدیر سے کوئی گلہ باقی رہ جانا چاہیے تھا؟ پل بھر ہی میں میری نظروں کے سامنے اُس پری کی ناراضی، دھتکار اور اُس سے ہوئی آدھی ادھوری ملاقاتوں کے تمام مناظر گھوم گئے، لیکن آج وہ میرے سامنے اُس بادشاہ کی طرح کھڑی تھی، جو میدان جنگ میں شکست کے بعد دوسرے شہنشاہ سے کہتا ہے کہ اُس سے وہی سلوک کیا جائے، جو بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ میں نے اُس کی لرزتی پلکوں پر نظر ڈالی۔ ''میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے اس فیصلے میں کسی ترحم آمیز جذبے کی ملاوٹ نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ لیکن میرا ماضی بھی آپ کے سامنے پوری طرح عیاں ہے، لہٰذا اب فیصلہ آپ کا ہوگا۔ کیا آپ مجھے میرے ماضی سمیت قبول کر پائیں گے۔ میرا پچھلا جنوں کبھی طعنہ بن کر آپ کے لبوں پر تو نہیں آ جائے گا؟ اپنے ظرف کے پیمانے کی وسعت جانچ کر ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں آپ کی رائے سے اتفاق ہوگا.....'' اُس نے ایک ہی پل میں ساری باتیں کر ڈالیں۔ اب میں اُسے کیا بتایا کہ میرے ظرف کا امتحان تو قدرت نے اُسی دن سے لینا شروع کر دیا تھا، جب میں نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تھا۔ ''ظرف کا پیمانہ وسیع نہ ہوتا تو شاید ہم دونوں آج یوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے۔ لیکن میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ رشتہ صرف تن پر حکمرانی تک رہے گا، یا پھر مجھے رُوح کا غلبہ بھی حاصل ہوگا.....؟'' میری بات سن کر وہ چونکی اور نظریں اُٹھا کر مجھے یوں دیکھا، جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اُس کی وہ پہلی نظر تھی، جو صرف میرے لیے تھی، صرف ساحر کے لیے۔ اُس کے لب ہلے۔ ''رُوح پر قبضہ پانے میں تو کبھی کبھی صدیاں بھی لگ جاتی ہیں ساحر.....'' ''تو پھر میں مزید کئی صدیاں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ میرے انتظار کی منزل تک میرا انتظار کر پائیں گی.....؟'' میری بات سن کر اُس کا گلابی چہرہ کچھ اس طرح کھل گیا، جیسے سوچ اور تفکرات کے سبھی بادل ایک دم ہی چھٹ گئے ہوں۔ ''سوچ لیں، میرے پاس انتظار کے لیے زندگی پڑی ہے۔ لیکن کیا آپ رُوح سے رُوح کے رشتے کے لیے اتنا بڑا جوا کھیل پائیں گے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے؟'' ''نتیجہ جو بھی ہو، ہوگا تو آپ کی رُوح کا ہی..... اور میں اس دربار میں اپنا سر تسلیم ازل ہی سے خم کر چکا ہوں۔'' اُس کے پنکھڑی سے لبوں پر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک

مسکراہٹ اُبھرتی دیکھی، دنیا کی سب سے حسین مسکراہٹ۔ وہ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ''میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں.....'' میں نے چونک کر اُسے دیکھا، لیکن پھر وہ وہاں رُک نہیں پائی اور سلام کر کے چل دی۔ اپنی تقدیر پر جتنا پیار مجھے اس لمحے آیا، شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

گھر واپسی پر جب میں نے مما اور پاپا کو اپنا اور زہرا کا فیصلہ سنایا تو کچھ دیر کے لیے تو وہ دونوں ہی جیسے دنگ رہ گئے۔ پھر پہلے پاپا نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''ہمیں تم پر فخر ہے ساحر بیٹا اور ہم جانتے ہیں کہ تم ایک نہ ایک دن اُس کی رُوح کو بھی فتح کر لو گے۔ گاڈ بلیس یو۔'' ہاں..... شاید میں کبھی زہرا کی رُوح کو بھی جیت ہی لوں گا۔ لیکن ان دنوں خود میری اپنی رُوح جس عذاب سے گزر رہی تھی، میں اس کا بھلا کیا درماں کرتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی آدھی رُوح کہیں اور چھوڑ آیا ہوں۔ آخرکار، اُس رات میرے ضبط کے سارے پیمانے چھلک پڑے اور میں آدھی رات کو کمرے ہی میں سجدے میں گر کر بلک اُٹھا۔ ''یا میرے رب مجھے اس اُلجھن سے نکال دے۔ اگر میرا مقدر دنیا ہے تو مجھے مکمل دنیا کا کر دے اور اگر میرا مقدر تیری نوکری ہے تو پھر مجھے پورا قبول کر لے..... یوں میری رُوح کے کومل ریشوں کو تقسیم نہ کر۔ میں تیرا بہت نازک، بہت کمزور بندہ ہوں۔ مجھ پر اس دوراہے کا اتنا وزن نہ ڈال۔ میری مشکل آسان کر دے.....'' نہ جانے کتنی دیر تک میں ہچکیاں لے لے کر روتا رہا اور پھر مجھے کب نیند آئی، مجھے خبر نہیں ہوئی۔ لیکن اُس رات میرے ماں باپ سو نہ سکے۔ جانے رات کے کس پہر، پاپا کی آنکھ کھلی اور میری ہچکیوں کی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ پھر کب وہ مما کو بھی جگا کر میرے کمرے سے باہر آ کھڑے ہوئے۔ البتہ انہوں نے اُس وقت میرے اور میرے خدا کے رابطے کے درمیان مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح جب میں ناشتے کی میز پر آیا تو اُن دونوں کے چہرے بھی آنسوؤں سے دُھلے ہوئے محسوس ہوئے۔ آخرکار، مما نے میرا ماتھا چوم کر میری ہر کش مکش کا فیصلہ کر دیا۔ مجھے رُخصت کرتے وقت انہوں نے صرف ایک جملہ کہا۔ ''ساحر! کاش میرے کئی بیٹے ہوتے اور سب تمہارے جیسے ہوتے۔ اب ہم بھی تمہارے اس سچ کے سفر میں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں کہیں مستقل ٹھکانہ بناؤ ہمیں بھی بتا دینا۔ ہم بھی وہیں آ بسیں گے.....'' میری زبان سے بے اختیار نکلا ''ہاں، لیکن زہرا کو اپنے ساتھ لے کر

آیئے گا.....'' وہ دونوں ہنس پڑے۔ اس بار مما اور پاپا خود اپنی گاڑی میں مجھے درگاہ چھوڑنے کے لیے آئے اور پھر بہت دیر تک مجھے اپنے سینے سے لگا کر کھڑے رہے۔

جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ سب کسی جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی لمبے سفر کی تیاری ہو۔ میں نے قریب سے گزرتے ایک زائر سے احوال پوچھا تو اُس کا جواب سن کر مجھے اپنی ڈولتی نیا ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''سلطان بابا درگاہ کا انتظام کسی نئے خدمت گار کے سپرد کر کے خود کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔'' عبداللہ نے بتایا تھا کہ نئے عبداللہ کی تقرری کے بعد وہ لوگ نکل جائیں گے اور زائر کی اطلاع کے مطابق نئے عبداللہ کی تقرری ہو چکی تھی۔ میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ اچانک ایک آواز نے میرا راستہ روک لیا۔ ''کہاں چل دیے میاں، ابھی تو ٹھیک طرح سے آئے بھی نہیں۔'' میں پلٹا، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ عبداللہ بھی اُن کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''شاید مجھے دیر ہو گئی ہے۔ آپ کو آپ کا خادم مل گیا ہے۔'' سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میاں جن کی ترقی ہو گئی ہو، انہیں ہم دوبارہ درگاہ کی خدمت پر نہیں لگاتے۔ تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔'' خوشی اور حیرت کے مارے میری تو آواز ہی گم ہو گئی۔ ''لیکن میں، میری ترقی، میرا مطلب ہے کہ یہ عبداللہ۔'' میری حالت پر سبھی مسکرا دیے۔ ''عبداللہ میاں اب ہمارے ساتھ نہیں جا رہے۔ انہیں ہم نے کسی اور جگہ کی خدمت کے لیے بھیجنا ہے۔ ساحر تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔ بولو کیا ارادہ ہے۔'' ''زہے نصیب..... لیکن درگاہ کی خدمت کے لیے بھی تو کسی کو یہاں رہنا تھا، وہ کہاں ہے؟'' دفعتہً عبداللہ کے پیچھے سے نعمان کا چہرہ اُبھرا۔ ہاں وہی کھلنڈرا سا موٹر سائیکل سوار نعمان۔ وہ تیزی سے بڑھ کر میرے گلے لگ گیا۔ ''میں یہاں رہوں گا، آپ بے فکر ہو کر جائیں۔'' سلطان بابا نے کاغذ کی ایک چٹ میرے ہاتھ میں تھمائی اور پلٹ کر جاتے ہوئے بولے۔ ''اس نوجوان کو اس کے نئے نام سے آگاہ کر کے چلے آؤ، ہمیں شام ڈھلنے سے پہلے بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔'' میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کھولا..... کاغذ پر نیا نام جگمگا رہا تھا۔ ''عبداللہ'' میں نعمان سے مل کر اور اُسے ساری تفصیل سمجھا کر سلطان بابا کے پیچھے چل پڑا۔ میری زندگی کا نیا سفر شروع ہو چکا تھا اور ہماری منزل کہاں تھی، یہ صرف سلطان بابا ہی جانتے تھے۔ میں نے

ڈوبتے سورج کی سنہری روشنی میں دُور ساحل پر کھڑے ہو کر درگاہ کی جانب پلٹ کر دیکھا۔ ایک نیا ''عبداللہ'' درگاہ کی منڈیر پر کھڑا ہمیں الوداع کہہ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ ہلایا اور میرے دل نے کہا ''الوداع۔''

کالا پانی

ہمیں سفر کرتے تین دن ہو چکے تھے۔ جانے یہ کیسا سفر تھا، جس کے راہبر نے کچھ کہا
نہ پیروکار ہی نے کچھ پوچھنے کی جسارت کی۔ میں سلطان بابا کے نقش قدم پر چلتا، اُن کے پیچھے
پیچھے روانہ تھا۔ ساحلی پٹی ختم ہوئی تو سلطان بابا نے مرکزی شاہراہ سے پہلی بس لے لی۔
دوسرے دن بس نے ہمیں ایک ویران ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ جہاں سے رات کی واحد پسنجر
ٹرین پکڑ کر ہم پہاڑوں سے گھری ایک وادی کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اگلی رات تک آ پہنچے
تھے۔ رات سلطان بابا نے وہیں اسٹیشن ہی پر بسر کی اور پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی ہم دوبارہ
پیدل ہی قریبی قصبے کو جاتی مرکزی سڑک پر چل پڑے۔ اس وقت سورج ٹھیک ہمارے سروں
پر تیز کونوں کی برچھیاں چبھو رہا تھا۔ میں نے پورے سفر میں سلطان بابا کو بلا ضرورت بولتے
نہیں دیکھا تھا۔ پورا رستہ وہ چپ ہی سادھے رہے، لیکن اُن کی خاموشی میں بھی ایک طرح کی
گفتگو تھی۔ جب کبھی مجھے تھکن کا احساس ہوتا، یا میرے من میں کوئی سوال اُبھرتا، اُسی لمحے وہ
پلٹ کر مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھ لیتے اور میرے ہر سوال کو جیسے ایک جواب سا مل
جاتا اور تھکن جانے کہاں اُڑ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بولتی ہے اور
کچھ لوگ بول کر بھی گونگے رہتے ہیں۔

شام تک آسمان کو کالی گھٹاؤں نے پوری طرح ڈھک لیا اور پھر مغرب سے ذرا پہلے
شدید اور موسلا دھار شروع ہوگئی۔ ان پہاڑی علاقوں کی بارش کے بارے میں سنا تو بہت تھا
کہ پل بھر ہی میں سب جل تھل کر دیتی ہے، لیکن تجربہ آج پہلی بار ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں
ایک چھوٹی سی آبادی کے آثار دکھائی دینا شروع ہوئے اور قصبے کی پہلی سڑک پر مڑتے ہی
ایک چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے پر بنی ہوئی ایک خستہ حال مسجد کے گنبد نظر آنے لگے۔ میں اور
سلطان بابا پوری طرح بھیگ چکے تھے اور جب ہم مسجد کے کچی اینٹوں سے بنے ہوئے صحن
میں داخل ہوئے تو مؤذن مغرب کی اذان کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اذان ختم کرتے ہی وہ

والہانہ انداز میں کچھ اس طرح سلطان بابا کی جانب بڑھا جیسے اُس کی، اُن سے برسوں سے جان پہچان ہو۔ سلطان بابا نے میرا تعارف ''عبداللہ'' کے نام سے کروایا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد میں قریباً درجن بھر نمازی جمع ہو گئے اور سلطان بابا ہی کی معیت میں جماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مؤذن کے سوا تمام نمازی ایک ایک کر کے رُخصت ہو گئے۔ مؤذن کا نام رشید تھا۔ جس نے نمازیوں کے جانے کے بعد جلدی سے ہم دونوں کو گرم گرم قہوہ پیش کیا۔ میں نے ابھی قہوے کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ سلطان بابا کا سوال سن کر میرے ہاتھ سے پیالہ قریباً چھوٹ ہی گیا ''پھانسی کب ہے؟'' وہ رشید سے مخاطب تھے۔ رشید نے اِسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔ ''پرسوں صبح..... ساڑھے چار بجے۔'' سلطان بابا نے لمبا سے ہنکارا بھرا ''ہوں..... گویا ہمارے پاس اڑتالیس گھنٹے سے بھی کم ہیں..... چلو خیر، جو اللہ کو منظور۔'' میں حیرت سے سلطان بابا اور رشید کو دیکھ رہا تھا۔ یہ کس پھانسی کا ذکر ہو رہا تھا اور اڑتالیس گھنٹوں میں ایسا کیا ہونے والا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو کوئی سوال کرنے سے روکا۔ کچھ ہی دیر میں مسجد کے باہر ایک سرکاری جیپ آ کر رُکی اور پھر اندھیرے میں اس کی چمکتی لائٹس کی روشنی میں پانی سے شرابور، کیچڑ میں چھپ چھپ کرتے بڑی بڑی خاکی برساتیوں میں ملبوس چند سرکاری اہل کار اُترے۔ اُن میں سے ایک بارُعب اور عمر رسیدہ شخص، جو ان سب کا آفیسر تھا، چھتری کے سائے تلے تیزی سے چلتا ہوا مسجد کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سر پر چھتری تانے ہوئے ایک اہل کار تقریباً دوڑتا ہوا، اپنے افسر کو پانی کے ریلوں سے بچانے کے لیے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ رشید نے جلدی سے اُٹھ کر افسر کا استقبال کیا۔ ''آیئے آیئے جیلر صاحب..... سلطان بابا آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔'' آنے والے کا نام اقبال تھا اور پتا یہ چلا کہ وہ اس قصبے کی مرکزی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہے۔ وہ سلطان بابا سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا، لیکن اُس کے انداز و اطوار میں بھی پرانے شناساؤں جیسا احترام تھا، البتہ اُس کے چہرے سے پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد جب رشید نے جیلر اقبال کو بھی قہوے کا پیالہ پیش کر دیا تو سلطان بابا نے حتمی سوال کر ڈالا۔ ''ہاں بھئی جیلر صاحب..... ہم تو حاضر ہو گئے آپ کے بلاوے پر..... اب فرمایئے کیا حکم ہے؟'' میں نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا، تو گویا تین دن کے اس لمبے سفر کا مقصد اس جیلر کا بلاوا تھا۔ اقبال نے

عاجزانہ انداز میں جواب دیا۔ ''آپ اتنی دُور سے صرف میرے بلاوے پر یہاں تک آئے، یقین جانیئے، یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ دراصل پریشانی ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کو تکلیف دینی پڑی۔ آپ کو رشید نے بتا تو دیا ہوگا کہ پرسوں صبح میری جیل میں ایک پھانسی کی تیاری ہے۔ ایک ایسے جیلر کی حیثیت سے، جو تقریباً ۲۵ سال کی سروس مکمل کر چکا ہو، یہ پھانسی ایک معمول کی بات ہونی چاہیے، لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ میری کسی بھی بڑی سینٹرل جیل میں یہ دوسری تعیناتی ہے۔ اس سے پہلے تقریباً دو سال تک سندھ کی ایک بڑی جیل میں رہ چکا ہوں، لیکن آپ اسے قدرت کی مہربانی کہیں، یا مقدر کا ستم کہ میں نے اپنی پوری سروس میں کبھی کوئی پھانسی نہیں بھگتائی۔ اور پرسوں دی جانے والی پھانسی نہ صرف میری سروس، بلکہ میری زندگی کی بھی پہلی پھانسی ہے.....''

ہم تینوں نے چونک کر جیلر کی جانب دیکھا، جو سر جھکائے اپنی زندگی کی شاید سب سے بڑی اُلجھن بیان کر رہا تھا۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ رحیم پور کے جس قصبے میں اس وقت ہم سب موجود تھے وہیں ملک کی سب سے بڑی اور شاید سب سے پرانی مرکزی جیل بھی واقع تھی، جس میں ملک بھر سے سنگین ترین جرائم کے قیدی بھیجے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر سزائے موت ہی کے قیدی ہوتے۔ اس جیل کے پہاڑوں میں گھرے محل وقوع اور شدید سخت اور کڑے پہرے کی وجہ سے اُسے دوسرے ''کالے پانی'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ انگریز کے زمانے سے لے کر اب تک یہاں سے صرف دو مرتبہ قیدیوں نے نقب لگا کر بھاگنے کی کوشش کی اور دونوں مرتبہ ہی تین اور پانچ کے دو قیدی گروہ، جیل کی فصیل تک پہنچنے سے پہلے ہی اُونچی بُرجی پر کھڑے جیل کے محافظوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مارے گئے۔ اُس کے بعد آج تک کسی قیدی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اس کالے پانی کی قید سے فرار کا سوچ بھی سکے۔ اقبال جیلر کی سروس کا یہ آخری سال تھا اور رحیم پور کی جیل میں اُس کی تعیناتی کو ابھی بمشکل ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا، لیکن حاضری کے فوراً بعد اُسے جس سرکاری حکم کا پہلا پروانہ موصول ہوا، وہ اُسی سکندر نامی قیدی کی پھانسی تھا۔ بقول جیلر، اُسی دن سے اُس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ پہلے پہل تو اُس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی تھی کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل بھی سینئر اور تجربہ کار افسر ہے، لہٰذا اُس کی موجودگی میں پھانسی کسی نہ کسی طرح

نپٹا ہی دی جائے گی۔ لیکن شومئی قسمت، ڈپٹی کے داماد اور بیٹی کا ساہیوال میں ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور ڈپٹی کو چار دن پہلے ہی انتہائی عجلت میں چھٹی لے کر جانا پڑ گیا اور فی الحال اگلے پندرہ دن تک اُس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جیلر کی دوسری اُمید جیل کا سرکاری ڈاکٹر تھا، جسے اس پھانسی کے تمام عمل میں اور تمام تیاریوں اور انتظامات میں جیلر کی معاونت بھی کرنی تھی۔ لیکن جیلر کے یہ سن کر تو ہوش اُڑ گئے کہ ڈاکٹر نے ابھی دو سال پہلے اپنا ہاؤس جاب مکمل کیا ہے اور کسی بھی جیل میں یہ اُس کی پہلی تعیناتی ہے۔ ڈاکٹر کے تو پہلے ہی یہ سوچ کر ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے کہ ایک زندہ انسان کو اُس کی نظروں کے سامنے چلا کر لایا جائے گا اور پھر اُس کی سانسیں سلب کر لی جائیں گی۔ بقول نوجوان ڈاکٹر ''کسی مریض کو اپنے سامنے دم توڑتا دیکھنے میں اور ایک انسان کو پھانسی پر لٹکتا دیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔'' یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بھی اقبال کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ اُس کی پریشانی بھی اپنی جگہ بجا تھی، کیوں کہ ملک کی سب سے بڑی جیل کا سپرنٹنڈنٹ ہونے کے ناتے اُس پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور اگر اس سارے پھانسی کے عمل میں کوئی بھی قانونی، یا اخلاقی سقم باقی رہ جاتا تو اُس کی تمام تر جواب دہی اُسی کو کرنا تھی۔ سلطان بابا نے بہت غور سے جیلر کی بات سنی اور پھر ہلکے سے کھنکار کر گویا ہوئے ''واقعی یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ تو پھر آپ نے اس مشکل کا کیا حل نکالا۔ ویسے آپ تو خود کافی تجربہ کار ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جیل کا جلاد ایسے موقعوں پر کافی کارآمد ثابت ہوتا ہے..... کیا آپ نے جلاد سے کوئی مدد نہیں لی..... کبھی کبھی اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت سی ایسی باریک تکنیکی تفصیلات جانتا ہے، جو کسی بھی بڑے افسر کے لیے انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔'' اقبال نے بے چینی سے ہاتھ ملے ''اب آپ کو کیا بتاؤں..... جلاد کی پوسٹ پچھلے آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ پُرانا جلاد ریٹائر ہوا تو حسب معمول جلاد کی تعیناتی کے لیے حکام بالا سے اجازت لے کر اخبارات میں اشتہار دے دیا گیا کہ جیل میں جلاد کی جگہ خالی ہے، لیکن کسی نے بھرتی کے لیے درخواست ہی جمع نہیں کروائی۔ حتیٰ کہ پرانے جلاد کے بیٹے کو تو ہم نے پیش کش بھی کی تھی کہ اگر وہ اپنے باپ کی جگہ بھرتی ہونا چاہے تو ہم محکمے سے خصوصی اجازت لے کر بنا کسی ٹیسٹ، یا انٹرویو کے اُسے براہ راست بھرتی کر لیں، لیکن وہ دس جماعت پڑھ چکا ہے اور

اُس کے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہ کام نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اب غیر مسلم بھی اس کام سے کترانے لگے ہیں۔ پہلے تو زیادہ تر جیلوں کے جلاد غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے، لیکن اب اس بے روزگاری کے باوجود بھی کوئی اس پیشے سے منسلک ہونا پسند نہیں کرتا۔ دراصل موت کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے ہوتا ہے جناب..... صبح ہونے سے پہلے کا رات کا سناٹا بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اور اس سناٹے میں لیور کی چرچراہٹ اور تختہ کھلنے کا کھڑاک بہت سے کمزور دل حضرات کا پتا پانی کر سکتا ہے..... اور پھر ان سب سے بڑھ کر قیدی کی گردن کا منکا علیحدہ ہو کر ٹوٹنے کی وہ بے رحم چیختی ہوئی آواز.....'' جیلر کی بات سن کر مؤذن رشید کو جھرجھری سی آ گئی۔ اقبال بظاہر ہمیں پھانسی کی تفصیلات بتا رہا تھا، لیکن اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بار بار اُس لمحے کا ذکر کر کے دراصل اپنے لاشعور میں چھپے کسی خوف کو دُور کرنا چاہتا ہے، جو اندر ہی اندر جانے کب سے اُسے ڈسے جا رہا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کالج پاس کرنے کے بعد میرے بہت سے دوست، جو پری میڈیکل گروپ سے وابستہ تھے، انہوں نے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو میں اور کاشف بہت عرصے تک اپنے پرانے کلاس فیلوز سے ملنے کے لیے اُن کے ہاسٹلز جاتے رہے تھے۔ غالباً تیسرے سال میں طب کی پڑھائی میں ایک مضمون انہیں پڑھایا جاتا تھا، جس کا نام جیورسپروڈنس (Jurisprudence) تھا۔ میں نے ہاسٹل کی اُن ملاقاتوں کے فارغ لمحات میں اس کتاب کے بہت سے باب یونہی پڑھ ڈالے تھے۔ یہ مضمون طب کے مختلف کینسر سے متعلق تھا اور اس میں جرم اور سزا کے باب میں پھانسی کا بھی تفصیلاً ذکر موجود تھا۔ مجھے وہ کتاب پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ ایک عجیب سا احساس بھی ہوا کرتا کہ پھانسی جیسا عمل، جس کے متعلق سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، سزا کی اصطلاح میں وہ بھی ایک بے حد میکانکی سا عمل ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اُن ہی طب کے رسالوں میں کہیں ''بہترین پھانسی'' کی اصطلاح بھی پڑھی تھی۔ طب کے میدان میں اور سزا کی دنیا میں بہترین پھانسی کا تصور یہ تھا کہ قیدی کی گردن کا منکا پہلے ہی جھٹکے میں یوں ٹوٹ جائے کہ اُسے زیادہ ''تکلیف'' کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ اس ایک جھٹکے میں بھی سانس کی ڈور ٹوٹنے کے باوجود قیدی کم از کم آٹھ سے دس منٹ تک سولی پر لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جاتا تھا، کیونکہ اس دوران بھی وہ دماغی طور پر (طب کی

اصطلاح میں) زندہ رہتا تھا اور اس کی مکمل ''دماغی موت'' کے لیے یہ آٹھ منٹ کا وقفہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس دوران قیدی کی تڑپ اور بے چینی جاری رہتی تھی اور اس کا کلیہ بھی اُسی کتاب میں درج تھا کہ جب تک پھانسی کا رسہ خفیف سی حرکت، یا جھول کھاتا رہے، تب تک یہ سمجھنا چاہیے کہ قیدی میں زندگی کی چٹکی بھر رمق باقی ہے۔ لیور کھینچنے، تختہ کھلنے اور قیدی کے جسم کے مکمل بوجھ کے رسے سے لٹک کر جھولنے کے اوّلین لمحے سے لے کر رسے کے مکمل سکوت میں آنے تک کے آخری لمحے کا درمیانی وقت آٹھ منٹ سے لے کر دس منٹ تک محیط ہوسکتا تھا اور اِسی درمیانی وقت کو قیدی کے لیے کم سے کم اذیت ناک بنانے کے لیے جیل حکام کا فرض بنتا تھا کہ وہ قیدی کے لیے ایک ''بہترین پھانسی'' کا انتظام کریں اور اس تیاری اور نظام کی جزئیات کچھ اس طرح تھیں کہ قیدی کے وزن کے حساب سے رسہ تیار کیا جائے۔ اس میں بنایا گیا پھندا، رسے کی لمبائی اور رسے کی ساخت کا تناسب بہترین ہونا چاہیے۔ رسہ ہمیشہ قیدی کے اُس وزن کے مطابق تیار کیا جاتا تھا، جو پھانسی سے ایک دن قبل آخری میڈیکل چیک اَپ کے وقت قیدی کا ہوتا ہے۔ اِسی طرح جلاد کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ایک دن پہلے تختہ دار کے قبضے وغیرہ جانچ لے کہ تختہ کھلنے میں کسی قسم کی دُشواری تو نہیں؟ لیور کا ہینڈل ٹھیک کام کر رہا ہے کہ نہیں؟ عین وقت پر لیور، یا تختہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے جواب تو نہیں دے جائیں گے؟ تختے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے اور ایک ساتھ کھل رہے ہیں، یا نہیں؟ تختے کے قبضوں کو گزشتہ ایک ہفتے کے دوران ٹھیک طرح سے تیل پلایا گیا ہے، یا نہیں۔ کہیں رسے کی رگڑ، یا لکڑی، لوہے کے ستون کی کوئی ناہموار سطح رسہ کاٹنے، یا ٹوٹنے کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے درجنوں سوال تھے، جن کا جواب جلاد اور جیل کے عملے کو مل کر ڈھونڈنا ہوتا تھا، تب ہی کہیں جا کر کوئی پھانسی ''بہترین پھانسی'' کہلائی جاتی تھی۔ اور ان سب باتوں کی براہ راست نگرانی اور ذمہ داری جیل سپرنٹنڈنٹ کی ہوتی، اسی لیے اقبال ہمارے سامنے پریشان سی صورت لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

اُس کے پاس بمشکل چالیس، یا بیالیس گھنٹے ہی بچے تھے اور شاید وہ ابھی تک پوری طرح پھانسی گھاٹ ہی تیار نہیں کروا پایا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم انسان بیک وقت کتنے نرم خو اور کتنے سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ معاشرے کو چلانے کے لیے ہمیں کیسے کیسے دُہرے

معیار اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ گھر میں پالے ہوئے اپنے کسی پالتو جانور کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والے انسانوں کو بھی کبھی اس بات کے لیے سر جوڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے جیسے جیتے جاگتے انسان کی جان لینے کا کون سا طریقہ اختیار کریں۔ بظاہر اقبال کی پریشانی بے جا ہی تو تھی۔ جب ایک انسان کی سانس کی ڈور کا کٹنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر اس میں اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ عملہ پورا تھا، یا نہیں، انتظامات میں کمی بیشی ہوئی بھی تو کیا؟ جان لینے کے لوازمات معیار کے مطابق تھے، یا غیر معیاری۔ بھلا ان باتوں سے اس سیاہ نصیب قیدی کی قسمت پر کیا فرق پڑنے والا تھا۔ مقصد تو اس کی جان لینا تھا، پھر بھلا وہ تلوار سے سر قلم کر کے لی جائے، یا گولی، یا پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر..... کیا فرق پڑتا تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اقبال کی ساری باتیں، وہ طوفانی بارش میں بھیگتا سیاہ سناٹا اور بوندوں سے بھیگتے ہمارے وجود..... سبھی کچھ ''ایک بہت بڑا جھوٹ'' لگنے لگا تھا۔ جیسے ہم سب اس نظام کی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈھکوسلا کر رہے ہوں۔ اور کچھ ہی دیر بعد ہم سب اطمینان سے یہ کہتے ہوئے کپڑے جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوں گے کہ ہم نے اپنے طور پر تو پوری کوشش کر دیکھی، لیکن کیا کریں پورا سسٹم ہی خراب ہے تو اس میں اب ہمارا کیا قصور؟ لیکن بے چارہ جیلر اپنے اندر کے اُس فرض شناس افسر کے ہاتھوں مجبور تھا، جو اُسے اس برستے موسم میں بھی اس بھاگ دوڑ پر مجبور کر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے قیدی کی جان لینے سے پہلے تمام قواعد و ضوابط تو پورے کرنے ہی ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کے اندر سے بھی کبھی نہ کبھی یہ آواز اُٹھی ہوگی کہ ''کس جھنجھٹ میں پڑ رہے ہو میاں..... چڑھا دو سولی۔ یہاں اس ویرانے میں کس نے آ کر یہ قواعد و ضوابط دیکھنے ہیں۔ ختم کرو یہ ٹنٹا۔'' لیکن افسوس..... فطرت ہمیں اُس گناہ سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہیں ہونے دیتی جو صرف ہمارے اندر ہی جنم لیتا ہے اور اندر ہی کہیں فنا ہو جاتا ہے۔ کبھی وفا، کبھی بھرم اور کبھی فرض شناسی جیسے ''دراندازِ جذبے'' ہمارے اس معصوم گناہ کا مزہ بھی کرکرا کرنے کے لیے جانے کہاں کہاں سے جنم لینے لگتے ہیں۔ جیلر بھی اس وقت ایسے ہی ایک معصوم گناہ اور ایک بے رحم ثواب کے بیچ چلتی جنگ کے درمیان پس رہا تھا اور وقت اُس کی بند مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا جا رہا تھا۔

سلطان بابا نے کچھ دیر تک ساری صورت حال پر غور کیا اور پھر جیلر سے مخاطب ہوئے

''واقعی صورت حال تو کافی گمبھیر ہے، لیکن جلاد کی عدم موجودگی میں یہ فریضہ اب کون سرانجام دے گا۔'' اقبال نے لمبی سی سانس بھری۔ ''ویسے تو میں نے دو ہفتے پہلے ہی حکام کو جلاد کی عدم دستیابی کا پروانہ لکھ دیا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے قریبی ضلع کی سینٹرل جیل کے جلاد کو بذریعہ آرڈر پابند بھی کر دیا ہے کہ وہ میری جیل میں حاضر ہو کر مجھے ۴۸ گھنٹے پہلے رپورٹ کرے اور اس پھانسی کو تکمیل تک پہنچائے۔ لیکن ابھی تک تو وہ پہنچا نہیں، شاید صبح والی گاڑی سے پہنچ جائے۔ دراصل اس شدید طوفان اور موسلا دھار بارش نے چند گھنٹوں ہی میں بڑی تباہی مچا دی ہے۔ ابھی جب ہم آپ کی طرف آ رہے تھے تو مجھے وائرلیس سیٹ پر اطلاع ملی کہ قصبے کو بیرونی دنیا سے جوڑنے والی سڑک کا واحد پل بھی پانی سے بہہ گیا ہے اور ریلوے ٹریک بھی ایک آدھ گھنٹے کے بعد قابل استعمال نہیں رہے گا، کیوں کہ ابھی سے قریباً دو میل پٹڑی کا ٹکڑا گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوب چکا ہے۔''

آسمان پر بادل زور سے گرجے اور دُور کسی ویرانے میں بجلی کا کوندا اس زور سے لپکا کہ کچھ دیر کے لیے ہم سبھی نیلی روشنی میں نہا سے گئے۔ میں نے اس لحاتی روشنی میں جیلر کے ماتھے پر بارش کی بوندوں کے ساتھ پسینے کی چند بوندیں بھی ٹپکتی دیکھیں اور پھر اگلے ہی لمحے پھر سے وہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے ''جیلر صاحب لگتا ہے قدرت بھی آپ کی اس زمینی عدالت کے فیصلے کو ماننے پر تیار نہیں ہے۔ ارے ہاں! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آخر ہمیں یہاں بلانے کا کیا مقصد تھا۔ کیوں کہ آپ کی تمام بیان کردہ مجبوریاں اپنی جگہ، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے سرکاری کام ہیں اور ان میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہو سکتا۔''

جیلر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سلطان بابا کی بات سن کر چونک اُٹھا۔ ''جی بالکل..... آپ نے یاد فرمایا۔ دراصل آپ کو زحمت دینے کی وجہ بھی وہی قیدی سکندر ہی ہے۔ اُس کی آخری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے اُس کی آپ سے ملاقات کروا دی جائے۔'' میں نے اور سلطان بابا نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

آخری انتظار

آسمان پر بجلی زور سے چمکی، تیز طوفانی ہوا نے کچھ پل کے لیے برسات کی بوچھاڑ کا رُخ ہماری جانب کر دیا اور ہم سب، جو پہلے ہی مسجد کے برآمدے میں تقریباً دیوار سے لگے بیٹھے تھے، ایک دفعہ پھر بھیگ کر مزید دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ سلطان بابا نے حیرت سے جیلر کی جانب دیکھا۔ ''آپ کے قیدی کی آخری خواہش یہ ہے کہ اُس سے میری ملاقات کروا دی جائے..... لیکن ان آخری لمحات میں تو ہر قیدی اپنے خاندان، اپنے پیاروں سے ملاقات کا خواہش مند ہوتا ہے، پھر اُس نے ایک اجنبی سے ملنے کی خواہش کیوں ظاہر کی؟'' اقبال نے اپنی برساتی پر جمع ہوئی بوندوں کو جھاڑا ''قیدی کا اس دنیا میں اور کوئی رشتہ باقی نہیں رہا..... کم از کم اُس کا دعویٰ تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ اُس کے لیے اجنبی ہیں تو پھر یہ سوال البتہ اب بھی باقی ہے، ہوسکتا ہے آپ سے ملاقات کے بعد اس راز سے بھی پردہ اُٹھ جائے۔'' جیلر نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنی پوری ملازمت میں موت کا ایسا عجیب قیدی نہیں دیکھا، جو اپنی زندگی بچانے کی اپیل کے حق میں بھی نہیں۔ نہ ہی اُس نے گزشتہ آٹھ مہینے میں، جب سے اُسے اس جیل میں لا کر موت کی کال کوٹھڑی میں ڈالا گیا ہے، کسی بھی قسم کی کوئی فرمائش، یا شکایت کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ خود ایک ایک دن گن کر اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ گویا موت نہ ہوئی، اُس کی ''محبوبہ'' ہوگئی۔ جیل کے گزشتہ ریکارڈ سے اقبال کو یہ بھی پتا چلا کہ سکندر نامی اس قیدی نے معمول کے لیے کی جانے والی رحم کی کسی اپیل پر بھی دستخط نہیں کیے تھے، ورنہ کم از کم صدر مملکت کو کی جانے والی اپیل کے فیصلے تک اُس کی سانسیں بڑھ سکتی تھیں اور اُس کی کم عمری کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ شاید اُس کی سزائے موت رحم کھا کر ''عمر قید'' میں بدل دی جاتی۔ وہ سارا دن چپ چاپ رہتا تھا اور شام سے قبل، جب کال کوٹھڑیوں کے قیدیوں کو آدھے گھنٹے کے لیے زندان سے باہر ''ٹہلائی'' کے لیے نکالا جاتا تھا اس دوران بھی وہ خاموشی سے ایک جانب بیٹھا رہتا۔ شاید ہی کسی قیدی، یا جیل کے عملے

نے اُسے بلاضرورت کبھی بولتے دیکھا ہو۔ شروع شروع میں جب اُسے اس جیل میں لایا گیا تھا تب سی آئی ڈی (CID) والے روزانہ اُس سے تفتیش کے لیے جیل آتے تھے۔ سنا ہے اُس کا تعلق ایک بہت خطرناک ملک دشمن تنظیم سے تھا اور اس قیدی کے سینے میں بھی بہت سے ایسے راز دفن تھے جو اگر صحیح وقت پر افشا ہو جاتے تو بہت بڑی تباہی سے بچا جا سکتا تھا، لیکن سکندر کی زبان کھلنا تھی، نہ کھلی۔ اُس پر ملک کے ایک نوجوان اور اُبھرتے ہوئے سائنس دان کے قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا اور اِسی جرم کی پاداش میں وہ آنے والی موت کے انتظار میں اس کال کوٹھڑی میں پڑا، ایک ایک گھڑی گن رہا تھا۔ جیلر ابھی ہمیں یہ ساری تفصیلات بتا ہی رہا تھا کہ دُور جیل کے گھنٹہ گھر سے گیارہ مرتبہ ٹن، ٹن، ٹن..... کی سی آواز سنائی دی۔ جیل میں قیدیوں اور دیگر عملے کو وقت سے مطلع رہنے اور ہوشیار رکھنے کے لیے ایک بہت بڑی سی پیتل کی گھنٹی کو ہر گھنٹے کے بعد اتنی ہی مرتبہ لوہے کی ایک بہت بڑی راڈ کے ذریعے بجایا جاتا تھا۔ جتنی مرتبہ گھنٹی بجتی، وہی دن، یا رات کا وقت ہوتا۔ مطلب یہ کہ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اب ساڑھے گیارہ بجے یعنی آدھے گھنٹے کے بعد صرف ایک ''ٹن'' کی آواز یہ ظاہر کرے گی کہ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بھی ہمیں جیلر کی زبانی ہی پتا چلی۔ جیلر نے اپنے پاس کھڑے جیل کے حوالدار سے کہا ''جا کر پتا کرو، دارالحکومت سے جس افسر نے آنا تھا، اُس کی کوئی خیر خبر پہنچی، یا نہیں..... میری جیپ کے وائرلیس ہی سے قصبے کے باہر والی چوکی کو بھی مطلع کرو کہ اگر وہ لوگ پل کی دوسری جانب پہنچ گئے ہیں تو محکمہ انہار والوں سے کہہ کر کشتی کا انتظام کروائیں اور ندی پار کروا کر جیل کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دیں۔ میں کچھ دیر میں جیل پہنچتا ہوں.....'' حوالدار کچھ ہچکچایا۔ ''لیکن جناب..... ریسٹ ہاؤس میں تو صرف ایک ہی کمرہ کچھ استعمال کے قابل تھا اور اس میں مقتول کی بیوہ، اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ شام ہی سے آپ کے حکم کے مطابق ٹھہرائی گئی ہے..... پھر بھی اگر آپ کہیں تو.....'' جیلر نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر یوں سر جھٹکا، جیسے اُسے خود اپنے بھلکڑ پن پر غصہ آ رہا ہو۔ ''اوہ ہاں..... یاد آیا..... اچھا ٹھیک ہے، اُن کے لیے میرے گھر کا مہمان خانہ تیار کروا دو..... بیوہ کو وہیں ریسٹ ہاؤس میں رہنے دو..... اب اس برستی رات میں وہ بے چاری کہاں کمرے تبدیل کرتی پھرے گی.....'' حوالدار سر ہلا کر جلدی سے مسجد کے باہر کھڑی

جیپ کی جانب بڑھ گیا۔

ہمارے کسی سوال سے پہلے ہی اقبال نے خود ہمیں بتا دیا کہ حکامِ بالا کی خصوصی اجازت سے ایک تفتیشی افسر کو ایک آخری کوشش کے طور پر آج شام اس قصبے میں پہنچنا تھا، لیکن شاید خراب موسم کی وجہ سے اُسے کچھ دیر ہو گئی ہے۔ پولیس کے اعلیٰ تفتیشی حکام اب بھی ایک آخری اُمید رکھے ہوئے تھے کہ شاید اپنی موت سے ایک رات پہلے ہی سکندر کا دل پگھل جائے اور وہ جاتے جاتے کچھ ایسا بتا دے جو اُن کی تفتیش میں کارآمد ثابت ہو سکے اور سکندر کے اصل گروہ کی گرفتاری میں اُن کی مدد کر سکے۔ دوسری جانب چونکہ یہ قتل قصاص و دیت کی مد میں درج کیا گیا تھا، لہٰذا مقتول کی بیوہ کو اس کے پہلے وارث کے طور پر پھانسی دیکھنے کے لیے جیل بلایا گیا تھا۔ قصاص و دیت کے قتل کے کیسز میں مقتول کے سب سے قریبی ورثاء میں سے کسی کو قاتل کی پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے جیل مدعو کیا جاتا تھا اور قاتل کو مقتول کے وارث کے سامنے ہی پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا۔ وارث کو پھانسی سے آخری لمحے قبل تک قاتل کی سانسیں بخش دینے کا اختیار بھی ہوتا تھا، چاہے وہ یہ سانسیں قصاص کی رقم کے عوض ہی کیوں نہ بخشے۔ لیکن اس سکندر نامی قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے مقتول جاوید نامی شخص کی بیوہ نائلہ اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بیرونِ ملک سے اس پس ماندہ قصبے تک پہنچی تھی، کیوں کہ اُس کے شوہر کے قتل کے بعد حفاظت کے نقطۂ نظر سے اُس کے والدین نے اُسے ملک سے باہر بھجوا دیا تھا۔ اقبال کے بقول، اُس کا خیال یہ تھا کہ اتنی دُور سے مقتول کی بیوہ، اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے نہیں پہنچ پائے گی، لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب آج شام ہی بارش سے کچھ قبل نائلہ، اپنے اکلوتے بیٹے سمیت اس قصبے کے اسٹیشن پر صرف ایک سوٹ کیس کے ساتھ کھڑی جیل کی گاڑی کا انتظار کرتی ہوئی ملی۔ جیلر کے ایک سوال کے جواب میں کہ نائلہ نے ہزاروں میل کا یہ سفر کس لیے طے کیا، کیوں کہ پھانسی تو اُس کی غیر موجودگی میں بھی طے پا جاتی، نائلہ نے صرف اتنا ہی کہا کہ وہ اس پھانسی کا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے اور اُسے تب تک سکون کی نیند نہیں آئے گی جب تک وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر جھولتے ہوئے نہیں دیکھ لے گی۔ بقول اقبال، اُس نے آج تک اتنے آہنی اعصاب والی لڑکی نہیں

دیکھی تھی، کیوں کہ ابھی تک مقتول کی بیوہ کم عمر ہی تھی۔ نہ جانے، اُس بے چاری نے اس نوجوانی ہی میں یہ بیوگی کا داغ کیسے جھیلا ہوگا؟ کچھ ہی دیر میں حوالدار نے آ کر خبر دی کہ ''بڑے شہر'' سے افسر آ گیا ہے، لیکن اُس نے آتے ہی جیل میں قیدی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے پاس وقت بہت کم ہے، لہٰذا وہ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا قیدی سے مل کر اپنی تفتیش کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ جیلر یہ سنتے ہی جلدی سے کھڑا ہو گیا ''ٹھیک ہے..... ہم یہاں سے سیدھے جیل ہی جائیں گے اور ہاں..... اُس جلاد کا کیا بنا..... وہ پہنچا کہ نہیں؟'' حوالدار نے اپنی ٹوپی سیدھی کی۔ ''نہیں جناب..... جلاد کافی الحال کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ جیل کے دو سپاہی کشتی سمیت ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پوری رات جلاد کا انتظار کریں گے..... تاکہ رات کو کسی بھی پہر اگر وہ قصبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو ہمارا عملہ اُسے لے کر سیدھا جیل پہنچا دے.....'' ''ہوں'' جیلر نے لمبا سا ہنکارا بھرا اور سلطان بابا سے واپسی کے لیے اجازت چاہی۔ پتا نہیں، اس لمحے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک عجیب سے سوال نے کہاں سے سر اُبھارا اور میں اپنی خواہش کو زبان پر آنے سے روک نہیں پایا۔ ''جیلر صاحب..... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے اس قیدی کو میں آج رات ہی دیکھ پاؤں..... کل تو اُس کی سانسوں کی میعاد بالکل ہی مختصر ہوگی..... جانے اُس وقت وہ اپنے حواس میں بھی ہوگا، یا نہیں.....؟'' میرا فرمائش نما سوال سن کر اقبال شش و پنج میں پڑ گیا۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، لیکن جانے وہ تفتیشی افسر اس بات پر راضی ہو، یا نہیں..... کیوں کہ بہرحال سکندر ایک خطرناک قیدی ہے، جس کی آخری لمحے تک کڑی نگرانی کے احکامات ہمیں بہت پہلے موصول ہو چکے ہیں۔'' میں نے اقبال کی طرف دیکھا ''لیکن جیل میں اس قیدی کا ہر انتظام آپ کے ذمے ہے۔ اس سے کسے ملنے کی اجازت ہو سکتی ہے اور کسے نہیں، اس کا فیصلہ شاید صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، یا پھر وہ قیدی خود..... آپ پر اعلیٰ حکام کا دباؤ تو ضرور ہوگا، لیکن فرض کریں کہ کسی بھی وجہ سے اگر آپ اس تفتیشی افسر کو بھی اس قیدی سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیں تو کوئی لاکھ سر پٹخے، لیکن قیدی کی کوٹھڑی تک نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا آپ کا اختیار تو اپنی جگہ قائم ہے۔'' جیلر کچھ دیر تک میری جانب غور سے دیکھتا رہا، پھر جانے کیا سوچ کر اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ''ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں..... آپ بھی میرے ساتھ ہی چلیے.....''

میں نے سلطان بابا کی جانب اجازت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اپنی تسبیح پر ول رہے تھے۔
''جاؤ میاں..... تم بھی اُس بدنصیب کو دیکھ آؤ..... لیکن یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے.....
تب تب سو سو ہوتا ہے.....'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھنے کی
کوشش کی، لیکن وہ اپنی آنکھیں بند کر کے پھر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

میں جیلر اقبال اور اُس کے حوالدار کے ساتھ بارش میں بھیگتا ہوا مسجد کے باہر کھڑی
جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ جیپ کا ڈرائیور جو بارش کی خنکی سے بچنے کے لیے اپنی بیڑی سلگائے
سکڑا سمٹا سا جیپ میں بیٹھا تھا، ہمیں دیکھ کر فوراً چاق و چوبند ہو گیا اور ہمارے بیٹھتے ہی ایک
جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ قصبے کی واحد مرکزی سڑک اور آس پاس کی گلیاں سب جل
تھل تھیں۔ کچھ بھیگے اور سردی سے کپکپاتے آوارہ کتوں نے جیپ کی آواز سن کر چونک کر سر
اُٹھایا اور پھر بھونک کر پیچھا کرنے کی سکت نہ پا کر صرف غرا کر ہی چپ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد
جیپ نے قصبے کی آخری گلی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ گھپ اندھیرے میں دُور کہیں لپکتی نیلی بجلی کے
جھماکے میں مجھے ایک بہت بڑی قلعہ نما عمارت کی جھلک کسی نیلی روشنی میں نہائے ہیولے کی
طرح دکھائی دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن میں بھی ایک جھماکا ہوا اور مجھے پھر وہی پرا
احساس بُری طرح ڈسنے لگا کہ میں نے پہلے بھی کبھی کہیں نہ کہیں یہ عمارت دیکھی ہے۔ میرے
سر میں شدید درد کی ایک لہر سی اُٹھی اور پھر چند لمحوں ہی میں حسب معمول سب کچھ پہلے کی
طرح معمول پر آ گیا۔ جیپ جیل کی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئی۔ پرانے قلعے کی طرز کی
وہ جیل اس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاید بجلی کا رابطہ منقطع تھا۔ برجیوں پر کھڑے
محافظوں نے برق رفتاری سے اپنی بڑی بڑی مشعل نما ٹارچیں روشن کر کے پہلے اُوپر ہی سے
اپنا اطمینان کیا اور پھر جلدی سے اندرونی دروازے کی دوسری جانب کسی کو بڑے جیلر کی آمد کی
اطلاع دی۔ اندرونی سنتری نے اپنے اطمینان کے لیے جیل کے مرکزی دروازے میں لگے
لوہے کی چھوٹی سی دراز نما کھڑکی سے ایک بار ہمارا جائزہ لیا اور پھر چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

جیلر کا کمرہ مرکزی گیٹ کے ساتھ ہی واقع تھا جس کے بعد ایک اور بڑا سا آہنی گیٹ
تھا، جس کے بعد جیل کی اصل عمارت شروع ہوتی تھی۔ لیکن اقبال نے اپنے حوالدار کو مجھے
اِسی برآمدے میں واقع ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بٹھانے کا کہا اور خود اپنے کمرے کی

اب بڑھ گیا۔ شاید وہ تفتیشی افسر سے پہلے ملاقات کر کے اُسے میرے بارے میں بتانا چاہتا
۔ کچھ ہی دیر بعد حوالدار نے آ کر مجھے بتایا کہ سکندر نامی قیدی کو تفتیش کے لیے بنے خصوصی
مرے میں پہنچا دیا گیا ہے اور بڑے جیلر صاحب میرا وہیں انتظار کر رہے ہیں۔ میں حوالدار
ی سربراہی میں جیل کا اندرونی بڑا گیٹ پار کر کے جیل کی اندرونی دنیا میں داخل ہو گیا، جہاں
ب سے پہلے نہایت احتیاط سے تین مرتبہ میری تلاشی لی گئی اور پھر ہم جیل کی راہ داریوں
ے ہوتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جیل کی تمام عمارت ایک عجیب سے یاسیت زدہ
ندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے پوری عمارت پر کسی بھیانک آسیب کا سایہ ہو۔ دن
بھر کے تھکے ہارے قیدی اپنی کوٹھڑیوں اور بیرکوں میں ایک دوسرے سے اُلجھے، پڑے سو رہے
تھے۔ البتہ پھانسی گھاٹ کی جانب بنی کال کوٹھڑیوں سے زور زور سے قرآن اور تسبیح پر ''اللہ ہو''
کی آوازیں سناٹے کو چیرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر سے موت اور مذہب کے اس
عجیب سے تعلق نے اُلجھا سا دیا۔ آخر صرف موت، یا موت کا تصور ہی ہمیں مذہب کے قریب
ہونے پر کیوں مجبور کرتا ہے؟ کیا صرف موت کے بعد ملنے والی سزا کا خوف ہی ہمیں مذہب کو
اپنانے پر مجبور کرتا ہے؟ ہم خوشی میں اور اپنی مرضی سے کسی سزا کے خوف، یا کسی جزا کی لالچ
کے بنا مذہب کو کیوں نہیں اپنا سکتے.....؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف اس خوف کا سامنا کرنے کے
لیے بھیجا گیا تھا، جو انسانی موت اور اُس کے بعد ملنے والی سزاؤں سے متعلق تھا؟ ہمیں اپنی
خوشی سے بندگی کا اختیار کیوں نہیں دیا گیا؟

میں اِسی سوچ میں مبتلا تھا کہ اچانک حوالدار نے ایک راہ داری کے آخر میں بنی ہوئی
لوہے کی سڑھیوں کے قریب رُک کر مجھے اُوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے برآمدے ہی میں
کاندھے سے اپنی بندوق اُتار کر مستعدی سے پہرہ دینے کے لیے ٹھہر گیا۔ میں لوہے کی بنی
ہوئی سیڑھی چڑھ کر جب اُوپر پہنچا تو خود کو ایک گول کمرے میں پایا۔ سیڑھیاں بہت اُونچی تھیں
اور میرے اندازے کے مطابق مجھے اس وقت تیسری منزل کے برابر اُونچائی پر ہونا چاہیے تھا۔
یہ گول کمرہ دراصل نیچے سے آتی ہوئی دیوار ہی کا تسلسل تھا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں ایک
بہت بڑے تنور کے دھانے پر موجود تھا۔ جیلر اقبال بھی اُوپر موجود تھا اور نیچے کی منزل میں،
جہاں اس تنور کا پیندا تھا، وہاں نچلے گول کمرے میں ایک شخص کمرے میں پڑی دو کرسیوں میں

سے ایک پر یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے ہاتھ کرسی کے پیچھے موٹی رسی کے ذریعے بند
ہوئے تھے۔ یہی نوجوان ''سکندر'' نامی وہ قیدی تھا جس کا ذکر میں شام سے سن رہا تھا۔ کمر
کی دیواریں بالکل چکنی تھیں، اتنی کہ کوئی لاکھ کوشش بھی کرتا، پر اُس کا ان دیواروں سے چپک
کر اُوپر چڑھنا ناممکن تھا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ گول کمرہ، جیسے جیسے بلند ہوتا جاتا تھا، وہ
ہی چاروں طرف سے مزید تنگ ہوتے ہوتے چھت تک صرف ایک گول دھانہ سا رہ جا
تھا۔ شاید یہ سارا انتظام قیدیوں کے ذہن میں اُٹھنے والے فرار کے کسی بھی خیال کو پوری طر
کچلنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں جیلر اقبال کے ساتھ ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی اُوپر
گولائی میں بمشکل دو کرسیاں رکھنے کی ہی گنجائش تھی۔ کچھ ہی دیر میں پینٹ اور کوٹ میں ملبو
ایک ۴۰، ۴۵ سالہ شخص اندر داخل ہوا۔ جیلر نے آہستہ سے مجھے بتایا۔ ''یہ راحیل صاحب
ہیں..... تفتیشی افسر..... ایس ایس پی راحیل.....'' اس وقت نیچے گول کمرے میں بہت سی موم
بتیاں روشن تھیں، جن کے ملگجے اُجالے میں، میں نے راحیل صاحب کو بغور دیکھا۔ چہرے پر
نظر کا سنہرا فریم، ہونٹوں میں سگار، بال سلیقے سے بنے ہوئے، مجھے وہ روایتی پولیس والوں
سے کافی مختلف دکھائی دیے۔ اتنے میں اچانک جیل کی بجلی واپس آ گئی اور نیچے گول کمرہ روشن
ہو گیا، جب کہ اُوپر والے حصے کی بتیاں شاید جیلر نے پہلی ہی بجھا رکھی تھیں، اس لیے ہم دونوں
مزید اندھیرے میں چلے گئے۔ اُوپر سے لوہے کی جالیوں میں سے نچلے گول کمرے میں
جھانکتے ہوئے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی اندھیرے سینما ہال میں بیٹھے روشن
اسکرین پر کوئی فلم دیکھ رہے ہوں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سینما کی اسکرین سامنے ہوتی ہے اور
یہاں اسکرین دیکھنے کے لیے ہمیں نیچے کی جانب جھانکنا پڑ رہا تھا اور ہمارے درمیان لوہے کی
وہ موٹی سی جالی نما کھڑکی بھی حائل تھی جس نے اس تنور کے دھانے کو ڈھک رکھا تھا۔ تفتیشی
کمرے میں روشنی کے لیے ہزار وولٹ کا بجلی کا صرف ایک بلب کمرے کے وسط میں کچھ ایسے
زاویے سے لٹکایا گیا تھا کہ اُس کی براہ راست روشنی صرف قیدی کے چہرے ہی پر پڑ رہی تھی۔
اچانک روشنی سے قیدی کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ پھر اُس نے دھیرے دھیرے اپنی بند
ہوئی آنکھیں کھولیں اور راحیل صاحب کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا ''چلیں شکر ہے، آپ
کے آنے سے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی..... لیکن اَن بجھے چراغوں میں روشنی تو آئی..... وہ

ہیں تو شاید اس ملک کو روشن دیکھنے کی حسرت ہی میں جان دے دیتا..... ویسے سنا ہے کہ ۲۰۰۹ء تک ملک سے لوڈشیڈنگ ختم ہو جائے گی..... آپ کو مبارک ہو راحیل صاحب۔" راحیل صاحب سمیت میں اور جیلر بھی سکندر کا یہ جملہ سن کر چونک گئے۔ راحیل صاحب نے چار کا لمبا سا کش لیا۔ "گزشتہ پندرہ مہینوں سے جیل میں بند ہونے کے باوجود تمہاری معلومات کا ذخیرہ قابل ستائش ہے....." سکندر نے طنز سے راحیل کی جانب دیکھا۔ "جیل میں بند ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان اپنی آنکھیں بھی بند کر لے۔ ویسے آپ کا بھی قصور نہیں ہے، پولیس والوں کو عام طور پر آنکھیں بند کر لینے کی عادت ہوتی ہے۔" راحیل صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ "بہت تلخی ہے، تمہارے لہجے میں..... لیکن یاد رکھو، سب پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔" سکندر کے لبوں پر پھر سے مسکراہٹ آ گئی "ٹھیک کہا آپ نے..... واقعی سب ایک سے نہیں ہوتے..... جو بھی ملا، پچھلے سے کچھ بدتر ہی نکلا۔ ویسے ہمیں تو آنکھیں کھلی رکھنی ہی پڑتی ہیں راحیل صاحب..... ہم آپ جیسے بڑے افسر تو ہیں نہیں، کہ جنہیں ہر ماہ کے آخر میں گھر بیٹھے کچھ نہ کرنے کی بھی تنخواہ مل جائے..... جنہیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہوتی ہے، انہیں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں....." راحیل صاحب نے سگار منہ سے نکالا "کن حقوق کی جنگ کی بات کر رہے ہو تم.....؟ سچ تو یہ ہے کہ چند ملک دشمن عناصر کے ہاتھ میں کھیل رہے ہو تم لوگ..... جانے یہ کیسا برین واش ہے کہ خود اپنی موت کو گلے لگانے کو ترستے ہو..... یہ جانے بغیر کہ تمہاری اس قربانی کی کوئی وقعت نہیں ہے، تمہارے آقاؤں کی نظر میں....." سکندر نے لمبی سی جمائی لی۔ "اچھا بول لیتے ہیں آپ۔ ضرور کالج اور یونیورسٹی میں تقریری مقابلوں میں اوّل آتے رہے ہوں گے....." راحیل صاحب نے سکندر کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا "اسکول اور کالج میں تو تم بھی انتہائی غیر معمولی طالب علم رہے ہو..... میٹرک میں ٹاپ کرنے پر تمہیں صدارتی وظیفہ بھی دیا گیا تھا..... کیا تم نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر ایک دہشت گرد بنو گے.....؟"

جانے اس "دہشت گرد" لفظ میں ایسا کیا تھا کہ سکندر تڑپ کر رہ گیا۔ غصے سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور رسی سے بندھے ہاتھ کمر کے پیچھے بل کھا کر رہ گئے۔ اُس نے تقریباً غراتے ہوئے کہا "اپنے اپنے نظریے کی بات ہے جناب..... آپ کی نظر میں میں ایک

دہشت گرد ہوں، جب کہ میری نظر میں آپ کا محکمہ راشی اور بے ایمان لوگوں کا گڑھ ہے۔ مجھے قدرت نے زیادہ موقع نہیں دیا، ورنہ آپ کے محکمے کی اچھی خاصی صفائی کر جاتا....." ایک بار راحیل صاحب تلملا کر پلٹے۔ "چند غلط لوگوں کا الزام سارے محکمے کے سر دھرنا سراسر بے وقوفی ہے..... اور پھر ٹھیک اور صحیح کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو..... اس کے لیے ایک نظام موجود ہے۔" سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے "ہونہہ..... کیا آپ کا محکمہ اور کیا اس کا نظام..... مت بھولیے کہ اس وقت، جو آپ یہاں کھڑے میرا وقت برباد کر رہے ہیں، اس کی اجازت بھی آپ کو صرف اسی "دہشت گرد" کی مرضی سے ملی ہے..... ورنہ مجھے آپ ہی کے نون نے یہ اجازت دی ہے کہ میں اپنا یہ آخری وقت جیسے بھی چاہوں، صرف کر سکتا ہوں..... میں نے سوچا کہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے بور ہوتا رہوں گا..... چلو، کچھ تفریح ہی سہی..... ورنہ میں نہ چاہوں تو آپ مزید ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتے..... تو ایک دہشت گرد کی آخری دین سمجھ کر اس قیمتی وقت کی قدر کیجیے..... مجھے آپ کے لیکچرز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"

میں اور اقبال جیلر دم سادھے سکندر اور راحیل صاحب کی لفظوں کی یہ جنگ سن رہے تھے۔ راحیل صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر سکندر کے قریب آ گئے اور پھر اُس کی کرسی پر جھک کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "ٹھیک کہا تم نے..... مجھے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے..... تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری تنظیم نے تمہاری پھانسی کے وقت ملک کے کس شہر میں اور کتنے بم دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے.....؟"

آخری سجدہ

راحیل کا سوال سن کر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ''اوہ تو آخر کار دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ یہ آپ جیسے سی ایس پی افسر، جو چند کتابوں کا رٹا لگا کر مقابلے کا امتحان پاس کر لیتے ہیں، وہ آخر اپنے آپ کو عقل کل کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ میری موت سے ایک رات پہلے سگار کے کش لیتے ہوئے آئیں گے اور مجھ سے وہ سب جان لیں گے جس کی کھوج میں آپ کا پورا محکمہ جانے کتنے برسوں سے سرگرداں ہے۔ کاش آپ لوگوں کو سی ایس پی کے بعد عام فہم کی بھی کچھ ٹریننگ دے دی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔'' راحیل صاحب نے بہت سکون سے سکندر کی ساری طعنہ زنی برداشت کی۔ ''تو گویا تمہیں ملک میں لیے جانے والے مقابلے کے امتحان کے طریقۂ کار سے متعلق بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ جہاں تک میں نے تمہارا ریکارڈ دیکھا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ خود تم نے بھی بی اے کے بعد سی ایس ایس کے لیے اپلائی کیا تھا، کہیں تمہاری اس تلخی کی وجہ تمہاری اپنی ناکامی تو نہیں۔'' سکندر زور سے چلایا۔ ''نہیں، میں ناکام نہیں ہوا تھا۔ تحریری امتحان میں میرے بہت اچھے نمبر تھے لیکن زبانی امتحان لینے والوں کو شاید میری صورت پسند نہیں آئی، یا پھر اُن میں سے کوئی ایک صبح اپنی بیوی سے لڑ کر وائیوا لینے آیا تھا۔ تب ہی انہوں نے مجھ سے کچھ ایسے غیر متعلق اور اوٹ پٹانگ سوال پوچھے جن کا نہ سر تھا نہ پیر، یا پھر شاید جس ایک سیٹ پر مجھ میں اور ایک وزیر کے بیٹے میں مقابلہ تھا، اُسے مجھ سے چھیننے کے لیے انہیں مجھ سے افریقا کے جنگلوں میں پائے جانے والے ایک خاص جھینگے کی نسل بتانے جیسے سوالات ہی کرنے چاہیے تھے، جن کا میرے تحریری امتحان کے مضامین سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔ باقی ڈیڑھ سو کے قریب اُمیدواروں میں سے بھی کسی کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا، لیکن صرف اُس وزیر کے بیٹے کو نہ صرف جھینگے کی نسل معلوم تھی بلکہ اُس نے تو جھینگے کا شجرۂ نسب بھی فرفر بیان کر دیا۔ نتیجتاً وہ اگلے مہینے اسسٹنٹ کمشنر تعینات ہو گیا اور میرا نام کامیاب اُمیدواروں کی فہرست سے خارج۔'' راحیل صاحب نے

پھر سے سگار کا لمبا سا کش لیا۔ ''ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہو، لیکن تم نے دوبار
کوشش بھی تو نہیں کی۔ یقین کرو، میں خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور میں بھ
اِسی نظام کے تحت لیے جانے والے امتحان کے ذریعے پاس ہو کر پولیس میں بھرتی ہوا تھا
تمہاری شکایت اپنی جگہ۔'' سکندر نے اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ''میر
شکایت اب بھی اپنی جگہ ہے۔ آپ خود ہی بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ برسوں محنت
کرنے والے اور پروفیشنل کالجوں سے برسوں کی پڑھائی کے بعد نکلنے والے ڈاکٹر اور انجینئر
اس معاشرے میں معمولی کلرکوں کا درجہ پاتے ہیں، جب کہ ایک سادہ بی اے پاس لڑکا چ
مہینوں میں دو چار کتابیں رٹ کر اعلیٰ افسر بن جاتا ہے اور اپنے رٹے کے بل پر کامیاب ہو
قوم کی قسمت کے فیصلے کرنے لگتا ہے۔ کبھی اُن افسر بن جانے والوں سے بعد میں کسی نے ا
مضامین کے بارے میں پوچھنے کی زحمت بھی کی؟ لیکن اگر کوئی پوچھے تو اُسے پتا چلے گا کہ ایک
لفظ بھی یاد نہیں ہوتا اُن ''افسرانِ بالا'' کو۔ پھر یہ مقابلے کا امتحان صرف یادداشت اور رٹے
مقابلہ ہی تو ہوا نا، اور پھر ہم غریبوں کا حافظہ تو پہلے ہی فاقوں اور پریشانیوں کی وجہ سے کمز
اور خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ سو غریب کا بچہ کلرک پیدا ہوتا ہے اور کلرک ہی مر جاتا ہے۔
''ٹھیک ہے، مقابلے کے امتحان کے طریقۂ کار میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں اور ان خامیوں
دُور کرنے کے لیے بذریعہ قلم جدوجہد بھی کی جا سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمارا
نوجوان نسل بندوق اُٹھا کر سڑکوں پر آ جائے، معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ
رنگنے لگے۔'' سکندر نے زور سے سر جھٹکا۔ ''ہونہہ، معصوم اور بے گناہ لوگ..... غلط فہمی
آپ کی، میری تنظیم نے آج تک صرف کرپٹ، راشی اور بے ایمان لوگوں کے خلاف
ایکشن لیا ہے۔ ہم صرف اس غلیظ معاشرے کی صفائی کر رہے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور میرا ضمی
آج پھانسی سے ایک رات قبل بھی بالکل مطمئن ہے کہ میں نے اپنا فرض نبھایا ہے اور بس.....
راحیل صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ''کاش میں اس آخری وقت ہی میں تمہار
آنکھوں پر پڑا یہ پردہ اُٹھا پاتا۔ بہرحال میں تمہیں آج رات کا وقت مزید دے رہا ہوں۔ ایک
بار پھر سوچ لو، کل کی رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی۔ جانے سے پہلے کفارہ ادا
جاؤ گے تو بہت سوں کا بھلا ہو جائے گا اور شاید تمہاری بخشش بھی۔'' راحیل صاحب واپسی

لیے پلٹے، سکندر نے اُن کے جاتے جاتے فقرہ کسا۔ ''اگر آپ کی نظر میں، میں اتنا بڑا گناہ گار ہوں تو پھر یہ بھی جان لیجیے کہ ساری عمر کے گناہ کے داغوں کو یہ ایک آخری سجدہ بھی بھلا کیا دھو پائے گا۔ کم از کم ایسے مشورے دے کر میرے گناہ تو بے لذت نہ کیجیے۔ آپ جس میڈل کی تلاش میں مجھ تک پہنچے ہیں، کم از کم میں اپنے کاندھوں پر چڑھ کر آپ کو اس تمغے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔'' اتنے میں دو سنتری اندر آ گئے۔ راحیل صاحب گول کمرے سے باہر نکل چکے تھے۔ سنتریوں نے سکندر کو کرسی سے کھولنے سے پہلے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا۔ اقبال جیلر اور میں جب گول کمرے کی چھت سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے، تب تک فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ نماز کے بعد سلطان بابا چہل قدمی کے لیے باہر نکل گئے اور میں اپنی جلتی آنکھیں لیے، کچھ دیر کے لیے کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن بند آنکھوں تلے بھی میں سکندر ہی کا چہرہ دیکھتا رہا اور میرے کانوں میں اُس کے سلگتے جملے گونجتے رہے۔

ابھی سورج چڑھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سنتری نے آ کر مجھے جگا دیا کہ سلطان بابا ناشتے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بمشکل چند گھونٹ چائے حلق سے نیچے اُتاری۔ نہ جانے ایک عجیب سی بے چینی کیوں میری رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی، جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہو۔ ناشتے کے فوراً بعد سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''چلو عبداللہ میاں۔ ذرا بچی سے مل آئیں۔'' پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا، لیکن اِسی لمحے جیلر اقبال کی گاڑی اُس احاطے کے باہر آ کر رُکی، جس میں مجھے اور سلطان بابا کو ٹھہرایا گیا تھا۔ جیلر کچھ عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا ''میں نے بیوہ سے بات کر لی ہے۔ اگر آپ لوگ تیار ہیں تو ہم ابھی ریسٹ ہاؤس کے لیے نکل سکتے ہیں۔'' تب مجھے سمجھ میں آیا کہ سلطان بابا کی مراد مقتول کی بیوہ سے تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ صبح نماز کے وقت بارش کچھ تھم سی گئی تھی، لیکن اس وقت پھر سے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے اینٹوں والے کچے صحن میں پانی کا ایک بہت بڑا سا جوہڑ بن گیا تھا اور اس وقت برستی بوندوں کا ارتعاش اس ٹھہرے پانی میں کچھ ویسی ہی ہل چل پیدا کر رہا تھا، جیسے اس وقت میرے دل و دماغ میں مچی ہوئی تھی۔ جیلر ہمیں یہاں کیوں لے کر آیا تھا؟ ہمیں مقتول کی بیوہ سے ملوانے کا کیا مقصد تھا؟ میرا ذہن انہی سوالوں

میں اُلجھا ہوا تھا کہ اتنے میں اندر کمرے کی جانب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آنے والی کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ وہ کالے لباس میں ملبوس چپ چاپ سلام کر کے ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سیاہ لباس میں اُس کا سوگوار حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اس وقت وہ خود بھی آسمان پر چھائی گھٹا ہی کی طرح لگ رہی تھی، کچھ رُکی، کچھ برسی سی برکھا جیسے۔ کچھ دیر تک ماحول پر عجیب سی گمبھیر خاموشی طاری رہی، پھر اُسی نازنین نے اپنے لب کھولے ''سپرنٹنڈنٹ بتا رہے تھے کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' سلطان بابا نے اُسے دعا دی ''جیتی رہو بیٹی۔ ہاں میرا ہی نام سلطان ہے اور میں نے ہی تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تم ایک بہادر لڑکی ہو اور بہادروں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے اور اِسی ظرف کی اُمید پر میں یہاں تک چل کر آیا ہوں۔'' اُس نے چونک کر سر اُٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ ''آپ فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔'' بابا نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا۔ ''مجھے جیلر صاحب نے بتایا ہے کہ تم قاتل کی پھانسی دیکھنے کے لیے ہزاروں میل دُور سے یہاں تک کا سفر طے کر کے آئی ہو لیکن اپنے دل کو ٹٹول کر پوچھو، کیا کل صبح صادق سے پہلے جب یہ پھانسی سرانجام پا چکی ہو گی تو کیا تمہارا سفر ختم ہو جائے گا؟'' اُس نے حیرت سے سلطان بابا کو دیکھا ''میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' ''میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دو سال سے تم نے اپنے اس درد، اپنے اس رنج والم کے سفر کی منزل اس ''پھانسی'' کو بنا رکھا تھا۔ کل یہ منزل بھی سر ہو جائے گی پھر اس کے بعد کیا یہ درد، یہ کرب ختم ہو جائے گا۔ کہیں پہلے سے بھی سوا ہو گیا تو؟'' ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ شاید کل کے بعد میرے درد کا اصل سفر شروع ہو گا۔ میرے دل کی واحد خواہش، واحد تسلی بھی ختم ہو جائے گی۔ رؤف کا قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے گا لیکن میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مجھے تمام عمر اب اِسی کرب، اِسی درد کے ساتھ گزارنی ہے۔ یہی میرا مقدر ہے۔'' ''نہیں بیٹی، تمہارا مقدر ایک ازلی سکون بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم اس وقتی بدلے کی خواہش کو اپنے دل سے نکال کر اُس قاتل کو معاف کر دو۔'' مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا اور نائلہ تڑپ کر غصے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا..... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنے معصوم شوہر اور اپنے بچے کے باپ کے سفاک قاتل کو معاف کر دوں۔ کیا آپ بھی اُسی کے کوئی ساتھی ہیں جو بھیس بدل کر ایک بار پھر مجھے لوٹنے کے لیے

آئے ہیں۔ مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی ہے۔'' نائلہ نے تیزی سے پلٹ کر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ خود مجھے بھی سلطان بابا سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی، لیکن اُن کے لہجے میں اب بھی وہی پرانا ٹھہراؤ تھا۔ ''میں بھی کسی ظرف کے بھرم ہی میں تم تک پہنچا ہوں بیٹی، درگزر سب سے بڑا انتقام ہے۔'' وہ چلتے چلتے رُک گئی اور پلٹ کر تیکھی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ''میری جگہ اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہوتا تو کیا آپ اُسے بھی یہی مشورہ دیتے؟'' سلطان بابا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چار قدم بڑھا کر نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج اگر اس وقت تمہاری جگہ میری اپنی سگی بیٹی بھی کھڑی ہوتی تو میں اُس سے بھی یہی التجا کرتا، کیوں کہ تمہارا مجرم راہ سے بھٹکا ہوا ایک ایسا شخص ہے جو اپنی دانست میں کچھ غلط نہیں کر بیٹھا۔ وہ تم پر کیے گئے ظلم کو بھی کسی کے حق کی دادرسی سمجھتا ہے، ہوسکتا ہے تمہاری معافی اُسے راہ راست پر لے آئے۔'' نائلہ نے بہت ضبط کی کوشش کی لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک ہی پڑے۔ ''تو گویا آپ بھی اُس مکار شخص کی باتوں میں آ گئے۔ وہ آج تک پولیس اور باقی زمانے کو تو یہ جھانسا دیتا ہی رہا ہے کہ اُس کا ہر جرم ایک مقصد کو پانے اور کسی اور کو اُس کے گناہوں کی سزا دینے کی کوشش میں سرزد ہوا۔ اور شاید میں بھی اِسی فلسفے سے متاثر ہو کر اُسے بخشش دینے کا فیصلہ کر ہی لیتی، اگر اُس کی اصلیت نہ جانتی۔ آپ بھی جس لمحے اُس شخص کے اصل مکروہ چہرے کو قریب سے دیکھیں گے تو مجھ سے پہلے خود چلا اُٹھیں گے کہ اُس کا مقدر صرف اور صرف پھانسی کا پھندا ہی ہونا چاہیے۔'' نائلہ اب باقاعدہ بلک بلک کر رو رہی تھی، جب کہ ہم تینوں ابھی تک اسی حیرت اور شش و پنج کی سی کیفیت میں کھڑے تھے کہ آخر اس نازک سی لڑکی کو ایسا کون سا راز پتا ہے، جس نے اُس کے اندر انتقام اور نفرت کا ایک ایسا لاوا دہکا دیا ہے کہ جو اب صرف سکندر کی موت ہی سے ٹھنڈا ہوسکتا ہے۔ سلطان بابا نائلہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے کافی دیر تسلی دیتے رہے۔

کچھ دیر بعد جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اندر کمرے سے ایک لفافہ اُٹھا لائی جسے اُس نے سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ ''اس میں میری زندگی کی وہ تحریر ہے جو آپ کو سارا سچ بتا دے گی، میں نے سوچا تھا کہ میں اُس ظالم کو یہ تب دکھاؤں گی جب اُسے مشکیں کس کر بے بسی کی حالت میں تختۂ دار پر لا کھڑا کیا جائے گا، لیکن آپ کی آنکھوں پر پڑا پردہ اُٹھانے کی

خاطر میں یہ ابھی سے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ پڑھنے کے بعد آپ خود اس لفافے کو اس سفاک شخص تک پہنچا دیجیے گا۔" نائلہ اپنی بات ختم کر کے تیزی سے واپس اندر چلی گئی۔ سلطان بابا نے وہ لفافہ کھولا اور اس میں تہ کی ہوئی بند تحریر پر وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے نظریں دوڑائیں، جیسے جیسے وہ خط پڑھتے گئے، ماتھے کی شکنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور میں اور جیلر ویسے ہی اپنی جگہ کھڑے بے چینی سے پہلو بدلتے رہے۔ سلطان بابا نے تحریر ختم کرنے کے بعد خط کو دوبارہ تہ کر کے لفافے میں ڈال دیا اور گہری سانس لے کر بولے۔ "جیلر صاحب! قیدی کی آخری خواہش کب پوری کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے ہماری اُس سے آخری ملاقات کا وقت کیا طے کیا ہے آپ نے۔" جیلر نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "عام طور پر پھانسی کے قیدی کی آخری ملاقات کا وقت عصر کے بعد کا ہوتا ہے۔" سلطان بابا نے برستے آسمان کی جانب نگاہ ڈالی، جو اس وقت اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے والی نائلہ ہی کی طرح بادلوں کا سارا پانی بہانے پر مصر لگتا تھا۔ "نہیں، عصر کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہم ابھی کچھ دیر بعد ظہر کی نماز پڑھ کر قیدی سے ملنے چلیں گے۔ آپ سارے انتظامات کروالیں۔"

بارش پوری رفتار سے شروع ہو چکی تھی اور جس وقت ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد میں اور سلطان بابا جیلر کی سربراہی میں سزائے موت کے قیدیوں کے مخصوص احاطے میں داخل ہو رہے تھے، تب تک سارا سینٹرل جیل ہی ایک بڑے تالاب کی سی صورت اختیار کر چکا تھا۔ قیدی اپنی اپنی کال کوٹھڑیوں کی سلاخوں سے چپکے ہوئے کھڑے تھے، کیوں کہ پانی پھاٹک گھاٹ کی کوٹھڑیوں میں بھی داخل ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے چہرے کیا تھے، حسرت سے اٹا فریم تھے۔ اُن کی نظریں ہمیں یوں ٹٹول رہی تھیں جیسے ہم کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہوں۔ جیلر نے سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے جا کر اپنی اسٹک سے سلاخیں کھٹ کھٹائیں۔ "سکندر، اُٹھ سے سلطان بابا ملنے کے لیے آئے ہیں۔" سکندر جو کسی گہری سوچ میں غرق، کوٹھڑی کی چھ سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لیے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سکڑ کر بیٹھا تھا، سلطان بابا نام سن کر جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کبوتر خانے کی مانند، چارپائی چھ کی یہ کوٹھی بس اتنی سی تھی اگر کوئی لمبے قد کا قیدی، رات کو سوتے وقت ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا تو سلاخوں سے

برآمدے میں نکل آتیں۔ سکندر لپک کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ ''مجھے یقین تھا آپ انتہائی طویل فاصلے کے باوجود میری آخری خواہش پوری کرنے یہاں تک ضرور آئیں گے۔ میری زندگی تو اب صرف چند گھنٹوں کی مہمان ہے، لیکن آپ کا یہ احسان میری رُوح بھی تاابد نہیں بھولے گی۔'' سکندر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جیل کی شدید مشقت اور تکلیفوں نے بھی اُس کے چہرے کی وجاہت پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ اُس کی گہری کالی آنکھوں میں اب بھی خاصی چمک باقی تھی۔ سلطان بابا نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا ''کہو نوجوان..... میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم پہلے بھی کبھی کہیں ملے ہوں۔'' سکندر نے اُن کا ہاتھ چوم کر تعظیم سے چھوڑ دیا۔ ''نہیں! آپ مجھ سے نہیں ملے، لیکن میری آپ سے ملاقات بہت پرانی ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو، آج سے تین سال قبل ساحل کی درگاہ کے سامنے لنگرانداز بحری جہاز میں ایک بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ بم دھماکا میں نے ہی کیا تھا۔ حالانکہ بحری جہاز تقریباً خالی تھا، لیکن اس میں بھرے خام مال کی وجہ سے دن رات اُس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے اُس بلاسٹ کی تیاری کے لیے تقریباً تین ہفتے تک ایک زائر کا بھیس بدل کر آپ کی درگاہ ہی میں چھپنا پڑا تھا۔ ان تین ہفتوں میں بارہا عصر کی نماز کے بعد مجھے آپ کا درس سننے کا اتفاق ہوا۔ یقین جانیں، اگر میں اپنی زندگی کی راہ پہلے ہی متعین نہ کر چکا ہوتا تو ضرور ہمیشہ کے لیے اُسی درگاہ ہی میں آپ کے قدموں کے پاس اپنا ڈیرہ ڈال دیتا، کیوں کہ آپ مجھے ایک سچے انسان دکھائی دیئے تھے۔ ایک ایسا شخص جو بنا کسی فائدے کے اپنا سب کچھ تیاگ کر مجھ جیسے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ لیکن بلاسٹ کے فوراً بعد مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، کیوں کہ پولیس نے سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ البتہ میں نے اُسی دن یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں گا اور آپ سے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی التجا کروں گا۔ اب اسے مقدر کا ستم کہوں، یا اپنی خوش نصیبی کہ آپ سے تب ملاقات ہو رہی ہے جب میری رُخصتی کا وقت قریب ہے اور مجھے واقعی آپ جیسے کسی بزرگ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' اتنے میں بڑے حوالدار نے پانی میں شرابور دو سپاہیوں کے ساتھ آ کر جیلر اقبال کو مطلع کیا کہ جلاد پہنچ گیا ہے۔ جیلر نے اُن دو سپاہیوں کو وہیں نگرانی پر چھوڑا اور خود عجلت میں سلطان بابا سے اجازت لے کر پھانسی کے انتظامات کا جائزہ لینے چلا گیا۔ جلاد کی آمد کی خبر سن کر سکندر

کے چہرے پر ایک عجیب سی درد بھری مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''چلیں اچھا ہوا، جیلر صاحب کی یہ پریشانی بھی ختم ہوئی۔ بہت پریشان تھے وہ اس جلاد کی غیر حاضری کی وجہ سے۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنی زندگی میں تو میں کسی کو کوئی سکھ دے نہیں پایا اور اب جاتے جاتے بھی زمانے کو ستا کر جا رہا ہوں۔''

سلطان بابا نے وہیں برآمدے ہی میں سکندر کی کوٹھڑی کے سامنے نشست ڈال لی تھی۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور کچھ دیر میں دعا ختم کر کے سکندر پر پھونک کر بولے ''میں تمہیں تمہارے وہ اُصول توڑنے پر مجبور نہیں کروں گا، جنہیں نبھانے کی خاطر تم نے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی ہے، لیکن میری بات یاد رکھنا کہ سوائے شرک کے، ہر گناہ کا کوئی نہ کوئی کفارہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے آخری پل میں بھی تمہیں یہ احساس ہو جائے کہ تم کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہو تو کفارہ ادا کرنے کی کوشش ضرور کرنا۔ شاید وہی کفارہ تمہاری بخشش کا سبب بن جائے۔'' سکندر نے چونک کر ہم دونوں کی جانب دیکھا، لیکن نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ اتنے میں جیل کا ایک وارڈن لمبی سی خاکی برساتی پہنے وہاں آ پہنچا اور سکندر سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی قیدی نمبر ۳۱۸، تمہارا کوئی اپنا ہے، جو تمہاری خواہش کے مطابق کل تمہاری میت وصول کر سکے۔ اُس کا نام، پتا لکھواؤ، یا پھر ہم رفاہ عامہ کے محکمے کو لکھ دیں۔'' وارڈن کا میکانکی انداز اور اُس کا سوال سن کر سکندر ہنس پڑا۔ ''میرے تو سب سے قریبی اب تم ہی ہو کریم خان، کیوں نہ تمہارا ہی نام دے دوں؟'' کریم خان نے جلدی سے آسمان کی طرف دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''نہ بابا نہ، میں تو پہلے ہی موسم کے تیور دیکھ کر ڈر رہا ہوں۔'' سکندر نے دوبارہ اُسے چھیڑا۔ ''فکر نہ کرو وارڈن صاحب، پھانسی بارش میں بھی دی جا سکتی ہے۔ ہاں، البتہ سنا ہے کہ لاش بھیگنے کے بعد بھاری بہت ہو جاتی ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو میری بارات رُخصت کرنے میں کافی دُشواری پیش آئے گی۔'' سکندر کی بات سن کر وارڈن کریم مزید وہاں ٹک نہیں پایا، اُلٹے قدموں دوڑ گیا۔ سکندر کچھ دیر تک اُسے جاتا دیکھتا رہا، پھر اُس نے سلطان بابا کو جواب دیا ''آپ یقین کریں، میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے۔ میں نے آج تک صرف معاشرے کے ناسوروں کے خلاف ہی ہتھیار اُٹھایا ہے، وہ جو اس ملک اور یہاں کے غریب عوام کا خون چوس رہے ہیں اور جنہیں جس قدر جلدی رُخصت کر دیا جاتا

اسی قدر بہتر تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ملکی قانون کی نظر میں یہ ایک بھیانک جرم ہے اور اس کی جو سزا مقرر ہے وہ میں بھگت رہا ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں صرف اپنے حصے کا وہ کام کر کے جا رہا ہوں جو قدرت نے میرے ذمے لگایا تھا اور باقی کام میرے جانے کے بعد میرے ساتھی پورے کرتے رہیں گے۔'' اس موقع پر میں خاموش نہیں رہ سکا اور بول پڑا ''لیکن اس بات کا تعین کون کرتا ہے کہ معاشرے میں پلتا ہوا کون سا شخص کرپشن کی غلاظت میں رہتے رہتے ناسور بن چکا ہے اور اب اُسے سزا دے کر رُخصت کر دینے کا وقت آ چکا ہے؟'' سکندر نے پہلی بار غور سے میری جانب دیکھا۔ شاید اُسے سلطان بابا کی موجودگی میں اُن کے ساتھ آئے کسی خدمت گار سے ایسے کسی سوال کی توقع نہیں تھی۔ سلطان بابا سکندر کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر بولے، ''یہ عبداللہ ہے، اسے میرا ہی ایک حصہ سمجھو اور جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر بتاؤ، ہم دونوں راز کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔'' سکندر کے چہرے پر اطمینان کی لہر آ گئی۔ ہمارا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ یہ ایک منظم تنظیم ہے جو ہر کیس کی مہینوں چھان پھٹک کرتی ہے اور پھر سپریم کمانڈ سزا کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہم بلاوجہ بے قصوروں پر گولیاں نہیں برساتے۔'' اب دوسرا سوال سلطان بابا نے کیا ''جس نوجوان سائنس دان رؤف کے قتل کے الزام میں تمہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے، اُس کا قصور کیا تھا؟'' سکندر نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔ وہ بھی اسی کرپٹ اور چور معاشرے کا ایک حصہ تھا، جس کی جڑیں کاٹنے کے لیے میں اور میری تنظیم سرگرم تھی۔ وہ بظاہر اس ملک کا وفادار تھا اور لاکھوں روپے تنخواہ کی مد میں وصول کر رہا تھا۔ اُس کے بیرونی دوروں اور عالمی کانفرنسوں میں شرکت کا خرچہ بھی ہماری غریب سرکار ہی اُٹھاتی تھی، لیکن درپردہ وہ بھی ایک عیاش اور بے ایمان شخص تھا۔ میں نے خود آخری چار دن تک اس کی نگرانی تب کی تھی جب وہ ایک کانفرنس کے بہانے کسی عورت کے ہم راہ بھور بن کے ایک مہنگے سوئٹ میں مقیم تھا۔ اُس پر گولی چلانے سے قبل میں ہر طرح کا اطمینان کر چکا تھا۔ جب ہی میں نے اُسے ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، حالانکہ میری تنظیم کے بڑوں نے دو مہینے قبل ہی اس کے بوجھ سے معاشرے کو پاک کرنے کا فیصلہ کر کے مجھے آرڈرز پہنچا دیے تھے۔'' سکندر کے لہجے کا یقین اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ اُسے اپنے عمل پر ذرا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔ سلطان بابا نے چند لمحے توقف کیا اور بولے، ''نائلہ تمہاری کیا لگتی ہے؟'' جانے یہ سوال تھا، یا

کوئی بم، جسے سنتے ہی سکندر کچھ اس زور سے اُچھلا، جیسے اُسے کسی نے ہزار وولٹ کرنٹ کا جھٹ
دے دیا ہو۔ ''آپ..... آپ نائلہ کو کیسے جانتے ہیں؟'' سلطان بابا نے اصرار کیا۔ ''پہلے
میرے سوال کا جواب دو۔ پھر میں بھی تمہیں تفصیل بتا دوں گا۔'' سکندر کچھ لمحے اپنے حواس
مجتمع کرتا رہا، پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا ''نائلہ کبھی میری رُوح کا حصہ تھی، میرا سب کچھ تھی۔
لیکن اب وہ میرے لیے ایک نامحرم، ایک اجنبی ہے۔'' سلطان بابا کچھ دیر تک سکندر کو غور سے
دیکھتے رہے، پھر اُن کی ڈوبتی ہوئی سی آواز سنائی دی ''تو گویا تم نہیں جانتے ہو کہ رؤف نامی
جس نوجوان کو تم نے قتل کیا تھا، وہ اُسی نائلہ کا شوہر تھا اور نائلہ آج تمہاری وجہ سے بیو
کہلاتی ہے۔''

عصا اور دیمک

تو خواب دگر ہے تیری تدفین کہاں ہو؟
دل میں تو کسی اور کو دفنایا ہوا ہے
سانپوں میں عصا پھینک کے اب محوِ دعا ہوں
معلوم ہے دیمک نے اُسے کھایا ہوا ہے

سلطان بابا کا انکشاف سن کر سکندر کا وہی حال ہوا، جو اپنے انتہائی عزیز کی موت کا سن کر کسی کا ہوسکتا ہے۔ وہ کچھ دیر تو سکتے میں جما بیٹھا رہا اور پھر یکایک چلا کر کہنے لگا ''نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، نائلہ کے شوہر کا نام تو عمران ہے اور نائلہ نے انتہائی اچھے گھرانے کا رشتہ قبول کیا تھا۔ اگر میں آپ کو اتنے قریب سے نہ جانتا ہوتا تو ضرور یہ سمجھ لیتا کہ یہ بھی پولیس ہی کی کوئی گھٹیا چال ہے، مجھ سے راز اُگلوانے کی۔'' سلطان بابا نے مزید کچھ کہے بنا اپنی جیب سے نائلہ کا دیا ہوا لفافہ نکالا اور سکندر کے حوالے کر دیا۔ ''ہو سکے تو اس تحریر کی سچائی کو جانچنے کی کوشش کرو۔ نائلہ کے شوہر کا پورا نام عمران رؤف تھا اور یہ وہی مقتول ہے، جس نے کیمیکل انجینئرنگ میں بیرون ملک سے ڈگری میں ٹاپ کر کے اپنے ملک کی خدمت کے جنون میں یہاں کے ایک تحقیقاتی ادارے میں بطور جونیئر سائنس دان نوکری قبول کی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس ہونہار نوجوان کی قضا تمہارے ہاتھوں لکھی تھی۔'' سکندر نے جھپٹ کر وہ لفافہ سلطان بابا کے ہاتھ سے لے لیا اور جیسے جیسے اُس کی نظریں کاغذ پر لکھی تحریر پر پھیلتی گئیں، ویسے ویسے اُس کا جسم خشک ریت سے بنے گھروندے کی طرح بکھرتا چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں جب اُس نے تحریر ختم کی تو تب تک وہ بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں، موت زندگی سے رابطہ ٹوٹ جانے کے عمل کا نام ہے اور ضروری تو نہیں انسان کا زندگی سے رابطہ صرف سانس کی ڈور ٹوٹنے ہی سے منقطع ہوسکتا ہو، کچھ اموات ہم پر سانس لینے کے دوران بھی تو وارد ہوسکتی ہیں۔ ہم جیتے جی بھی تو کئی بار مرتے ہیں۔ سکندر پر بھی اُس وقت کچھ ایسی ہی موت طاری تھی اور اُس

کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ یہ موت اُس پر تب طاری ہوئی، جب اُس کی اصل موت میں صرف چند گھنٹے ہی باقی بچے تھے۔ اگر اُسے آج یہ پتا نہ چلتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے شوہر کا قاتل ہے تو تقدیر کا کیا بگڑ جاتا۔ کچھ بھرم زندگی سے بھی بڑے ہوتے ہیں اور انسان اپنی ساری زندگی میں کماتا ہی کیا ہے۔ یہی چند بھرم..... تو پھر اُس شخص کی حالت کیا ہوگی، جس کی عمر بھر کی جمع پونجی، اُس کا سب سے بڑا بھرم موت سے چند لمحے پہلے لٹ جائے۔

اتنے میں عصر کی اذان شروع ہوگئی۔ بارش نے بھی نہ رُکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جانے کیوں اس وقت مجھے حال ہی میں پڑھے گئے ناول ''خدا اور محبت'' کا ایک جملہ شدت سے یاد آیا کہ ''یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی کبھی تو ساری عمر بھی برستی رہیں تو کسی کا اندر بھگو نہیں پاتیں اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔'' سلطان بابا نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ سکندر ویسے ہی گم صم سا سلاخوں سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ میں اور سلطان بابا عصر کی نماز پڑھنے کے بعد جیل کی جامع مسجد سے باہر نکلے تو گھنے کالے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان بابا سکندر کی طرف چلنے کا کہیں گے، لیکن میری توقعات کے برعکس اُن کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ ''اب دل جلے کو تم سنبھالو ساحر میاں۔ میں ایک بار مقتول کی بیوہ سے مل کر اُس کا دل موم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پتا نہیں کیوں، لیکن مجھے اب بھی سکندر اپنی راہ سے بھٹکا ہوا ایک نوجوان لگتا ہے، جسے استعمال کیا گیا ہے۔'' میں پلٹ کر ایک بار پھر رُک گیا اور میرے ہونٹوں پر کئی دن سے رُکا ہوا ایک سوال آ ہی گیا۔ ''بابا آپ مجھے سب کے سامنے عبداللہ، لیکن تنہائی میں ہمیشہ ساحر بلاتے ہیں..... ایسا کیوں؟'' وہ میرا سوال سن کر مسکرا دیے۔ ''اس لیے کہ عبداللہ کے اندر موجود ساحر بھی میرے لیے اتنا ہی اہم ہے، جتنا کہ عبداللہ..... اور ساحر کے اندر کا عبداللہ تو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ ہے۔ یاد رہے، نام بھی ہماری آدھی شناخت ہوتی ہے..... اور میرا مقصد کبھی تمہاری اصل شناخت مٹانا نہیں رہا۔'' سلطان بابا میرا کاندھا تھپک کر آگے بڑھ گئے اور میں یونہی سوچ میں ڈوبا، بھیگتا ہوا دوبارہ سکندر کی کوٹھری کی جانب چلا آیا۔ سکندر کے ہاتھوں میں اب بھی نائلہ کا دیا ہوا خط ویسے ہی تھا۔ ایک بہت ہی مضبوط اور آہنی اعصاب کا انسان جب ٹوٹتا ہے تو پھر ٹوٹتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاید ہم سب ہی بیک وقت اندر سے فولاد اور موم کے بنے

ہوتے ہیں۔ فولاد کا ملمع جب اُترتا ہے تو پھر موم کو پگھلتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ سکندر کا موم چہرہ بھی پگھل پگھل کر آنسوؤں کے جوہڑ میں ڈوب سا گیا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب جا کر پکار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اُس نے پگھلتی نظریں اُٹھائیں۔ ''کیا وہ یہیں ہے.....؟'' ہاں..... وہ جیل کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہے۔'' سکندر میری بات سن کر زخمی سی ہنسی ہنسا۔ ''اوہ..... تو میری پھانسی کا نظارہ دیکھنے کے لیے یہاں تک آئی ہے۔ یہ رشتے بھی پل پل میں کیسے کیسے بدلتے ہیں۔ کل تک جو مجھے آئی ایک کھرونچ کی تکلیف سے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی، آج وہ میرے بے جان وجود کو پھانسی کے پھندے پر جھولتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہاں اس موت کی وادی میں بیٹھی میری سانسیں بند ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔'' مجھے ایک بار پھر اس محبت نامی ازدھے کی سفاکی پر شدید غصہ آنے لگا۔ آخر اس عفریت کا پیٹ کب بھرے گا؟ کب تک یہ ہم معصوم انسانوں کی رُوح نگلتا رہے گا۔ کب تک ہمارے جذبوں کی شہ رگ میں اپنے قاتل دانت گاڑھے ہمارا خون پیتا رہے گا؟ اس کے جان لیوا زہر کا ایک تازہ شکار سکندر کی صورت میں اس وقت بھی میرے سامنے ادھ مرا موجود تھا۔

سکندر کی کہانی بھی اپنی محبت کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں میں سے ایک تھی۔ اُس کی اور نائلہ کی ملاقات انٹر یونیورسٹی کے ایک تقریری مقابلے کے دوران ہوئی تھی۔ جب نائلہ کی بروقت تیاری اور تحقیق کے باوجود سکندر نے مقابلے کا پہلا انعام جیت لیا تھا۔ نائلہ مقابلے کے ساتھ ساتھ اپنا دل بھی ہار کر گھر واپس لوٹی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت صرف دو دلوں کے ملاپ ہی کا نام ہوتا، ہمارے معاشرے میں جذبوں کے سوداگر اس معصوم جذبے کو بھی سونے چاندی کے انباروں سے تولنے کا فن جانتے ہیں اور سکندر کے پاس تو کبھی عام حالات میں بس کا پورا کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کی بیوہ ماں نے بچپن ہی سے دوسروں کے گھروں کے کپڑے اور برتن دھو کر اُس کے سرکاری اسکولوں کی فیس بھری۔ لیکن نائلہ کے کروڑ پتی باپ سیٹھ امجد کو اپنی لاڈلی بیٹی کا دل اُس کے پسندیدہ کھلونوں سے جوڑنا آتا تھا، تو وہ ان کھلونوں سے اُس کا من پھیرنا بھی خوب جانتا تھا اور اُسے اپنی حد سے زیادہ بگڑی ہوئی بیٹی کی ''ٹریاہٹ'' کا بھی بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے غریب پھٹیچر نوجوان کو براہ راست دھکے مار کر اپنے محل سے نکالا تو اُس کی ضدی بیٹی بھی اُس کے ساتھ ہی

سب کچھ ٹھکرا کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے نکل جائے گی، اس لیے اُس نے بڑی مہارت سے سارے معاملے کو سنبھال لیا۔ بیٹی کی پسند کو اُس نے ایک بہترین اداکار کی طرح آنکھوں میں آنسو بھر کر قبول کیا اور سکندر کی انا پر پہلی ضرب اُس نے پہلے ہی روز اُس وقت لگائی، جب اُس نے اپنے دفتر کی سیٹ اور سارا کاروبار سکندر کے حوالے کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ اُس کی توقع کے عین مطابق سکندر نے اپنی ہونے والی منگیتر نائلہ کے سامنے ہی سیٹھ امجد کی یہ پیش کش ٹھکرا دی کہ وہ نائلہ کو اپنے ہاتھوں سے کما کر کھلائے گا۔ سیٹھ امجد یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سکندر جیسے غریب، لیکن آئیڈیلسٹ نوجوان جب تک اپنے خوابوں کی دنیا سے باہر نکلتے ہیں، تب تک اُن کے پاس کسی آفس میں بڑا، یا چھوٹا بابو بن کر کلرکی کرنے، یا پھر کسی ڈپارٹمنٹل سٹور پر شام کو پارٹ ٹائم سیلز مین شپ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن ہزار تجربوں کے بعد بھی ایسے احمق سدھرتے ہیں، نہ سدھر پائیں گے۔ دوسرا وار نائلہ کے باپ نے نائلہ کے چائے لانے کے لیے اُٹھ جانے کے فوراً بعد کیا۔ جب اُس نے باتوں باتوں میں سکندر کو نائلہ کے ایک دن کے خرچ کے بارے میں بتایا، جو سکندر کے مہینوں کے خرچے کے برابر تھا۔ جب تک نائلہ چائے لے کر آئی تب تک سیٹھ امجد سکندر کو یہ بات بہت اچھی طرح سمجھا چکا تھا کہ اُس کی ناز و نعم میں پلی نازک بیٹی کو پانے کے لیے سکندر کو صرف اپنے خوب صورت الفاظ سے بنے محل تراشنا چھوڑ کر کوئی عملی قدم بھی اُٹھانا ہوگا۔ اور پھر جب سکندر نے خود امجد کو یہ بتایا کہ اُس کا ارادہ پہلے ہی سے اس سال کے آخر میں ہونے والے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا ہے اور اُسے قوی اُمید ہے کہ وہ سی ایس ایس کا معرکہ سر کرنے کے بعد سرخرو ہو کر نائلہ کو اُس کے معیار کے مطابق نہ سہی، لیکن ایک قابل عزت جیون کا نکھ دینے کے قابل ضرور ہو جائے گا، تب ہی وہ نائلہ کی رُخصتی کی درخواست لے کر سیٹھ امجد کے در پر دستک دے گا۔ یہ سن کر امجد نے گہری سکھ بھری سانس لی، کیوں کہ فی الحال مصیبت خود اپنی مرضی سے سات آٹھ مہینے کے لیے ٹل رہی تھی اور یہ آٹھ مہینے اُس کے لیے بہت تھے۔ اُس نے دھیرے دھیرے اپنی بیٹی کو یہ احساس دلانا شروع کر دیا کہ زندگی صرف جذباتی وعدوں، خوب صورت باتوں اور مستقبل کے سپنوں کا نام نہیں ہے، اس لیے اُسے سکندر کی "رائی نمائی" کرتے رہنا چاہیے کہ زندگی میں ترقی کرنا کس قدر ضروری ہوتا ہے۔ سکندر نے مقابلے

کے امتحان میں کامیابی کے لیے دن رات ایک کر رکھے تھے، ایسے میں اچانک جب نائلہ اُسے اپنے باپ کے بتائے ہوئے رستے پر چلنے کے مشورے دینے کے لیے چلی آئی تو کبھی کبھار سکندر بے حد چڑ جاتا تھا اور یوں رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی جھڑپوں کی صورت میں "رنجش" نے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیے۔ شومئی قسمت، سکندر مقابلے کے امتحان کے انٹرویو میں فیل ہو گیا۔ سیٹھ امجد کو اپنا آخری اور سب سے کاری وار کرنے کا موقع مل گیا اور اُس نے ہمدردی کی آڑ میں اپنی بیٹی کو خوب سمجھا کر سکندر کے پاس بھیجا کہ سکندر نے آج تک اپنی سی جو کرنی تھی، وہ کر کے دیکھ لی، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنی ضد چھوڑ کر سیٹھ امجد کا کاروبار سنبھال لے اور بیوہ ماں کو لے کر سیٹھ امجد کے بنگلے ہی میں شفٹ ہو جائے۔ امتحان میں ناکامی کا صدمہ دل پر لیے بیٹھے سکندر کو اس لمحے گھر دامادی کا یہ طعنہ کسی گالی کی طرح لگا اور وہ بھڑک کر نائلہ پر برس پڑا۔ نائلہ بھی خود کو ترکی بہ ترکی جواب دینے سے روک نہیں پائی اور باقی کام سیٹھ امجد کی جلتی پر تیل چھڑکنے کی پالیسی نے کر دیا۔ تیسرے ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ہی سکندر اور نائلہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اب دونوں کا مزید ساتھ چلنا ممکن نہ ہوگا اور پھر آخر کار وہ "آخری الوداع" بھی آ پہنچا، جو شاید ایسے ہر محبت کرنے والے جوڑے کا ازل سے مقدر ٹھہرتا ہے۔ پھر سے وہی انا کی دیواریں، پھر سے وہی معصوم تحائف کی واپسی۔ آخر یہ محبت کرنے والے جب بچھڑنے لگتے ہیں، تو ایسی آخری ملاقات کا اہتمام ہی کیوں کرتے ہیں، جس میں وہ اپنی رہی سہی نازک اور خوب صورت یادوں کو بھی لوٹا آتے ہیں! اور جُدا ہونے والوں کی نشانیاں بھی کتنی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہی خوشبو میں بسے گلابی خط، چند خشک پھول..... ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چند ٹکڑے، خزاں کی کسی سرد شام میں ایک ساتھ پی گئی کافی کا کوئی بل..... خالی سینما کے سب سے پچھلے سٹال میں اکٹھے بیٹھ کر دیکھی گئی انتہائی فلاپ فلم کے دو ٹکٹ..... پہلے ساون کی پہلی بارش میں بھیگ کر بچنے کے لیے جائے پناہ کی تلاش میں دوڑتے وقت ٹوٹ جانے والے سینڈل کا ایک فیتہ..... نائلہ کے پاس بھی اس آخری ملاقات کے لیے چند ایسی ہی سوغاتیں تھیں، جو وہ سکندر کو لوٹانے کے لیے آئی تھی۔ سنہرے رنگ کا ایک ٹوٹا کف لنک، ایک پرانا پارکر پین، چند پرانے ٹشو پیپر، جو سکندر نے کپڑوں پر چائے گرنے کے بعد استعمال کر کے پھینک دیے تھے۔ سکندر کے استعمال شدہ پرفیوم کی آدھی بوتل، خزاں رسیدہ چند

پتے اور سکندر کی اخبار میں چھپی چند نظمیں..... بس وہی کل اثاثہ تھا، اُن دونوں کی تین سا
محبت کا..... جنہیں لوٹاتے وقت ایک ایسا لمحہ بھی آیا، جب دونوں کی ہی پلکیں بھیگ چکی تھیں
اور قریب تھا کہ دونوں ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس کمزور لمحے کی گرفت میں آ جاتے...
سیٹھ امجد اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ ایسی آخری ملاقاتیں کبھی کبھی تجدید محبت کی بنیاد بھی بن
جاتی ہیں، لہٰذا اُس نے پورا انتظام کر رکھا تھا اور وہ خود بھی اس ریسٹورنٹ کی نچلی منزل میں
موجود تھا، جہاں اُوپر سکندر اور نائلہ آخری بار مل رہے تھے۔ اُس کے ہرکارے اُن دونوں کے
آس پاس ہی موجود تھے، لہٰذا جیسے ہی سیٹھ امجد کو خبر ملی کہ دونوں اب اس موڑ پر ہیں، جہاں
یادوں کا بہاؤ انہیں بہا کر لے جا سکتا ہے تو اُس نے فوراً نائلہ کے موبائل پر کال کر کے اُسے
واپس حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ نائلہ ٹوٹے دل کے ساتھ وہاں سے اُٹھ آئی اور سکندر کے
اندر جلتی آگ نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔

محلے کی ایک تنظیم کے لیڈرز نے اُسے بڑے لیڈر سے ملوا دیا، جس نے سکندر کو مشورہ
کہ وہ اپنے اس لاوے کا رُخ اُن لوگوں کی جانب کر دے، جو معاشرے میں ایسی
انصافیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جیسی سکندر کے ساتھ سی ایس ایس کے امتحان میں ہوئی
ہے۔ خرچے کی وہ پروا نہ کرے، کیوں کہ آج سے اُس کی اور اُس کی ماں کی ذمہ داری تنظیم
ہے۔ یوں سکندر نے اپنی زندگی کا پہلا جرم اُس رات کیا، جب اُس نے پہلی مرتبہ تنظیم والوں
کے ساتھ مل کر اخبار والوں کا ایک دفتر جلایا۔ کہتے ہیں کہ ماچس سے چراغ بھی جلائے جاتے
ہیں اور آشیانے بھی، لیکن سکندر کے گھر پولیس کا پہلا چھاپہ پڑا اور اُس کی ماں کو پتا چلا کہ اُس
کے گھر کو خود اُسی کے گھر کے چراغ سے آگ لگ چکی ہے تو وہ پہلا صدمہ ہی برداشت نہیں کر
پائی اور دل کا ایک ہی دورہ اُس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ تب سے سکندر کا ہر بڑھتا قدم
اُسے جرائم کی دلدل میں دھکیلتا چلتا گیا اور پولیس کی یہ حسرت ہی رہی کہ وہ کبھی رنگے ہاتھوں
سکندر کو گرفتار کر سکے۔ سکندر کی پہلی اور آخری گرفتاری میں بھی پولیس کی کوشش سے زیادہ
سکندر کی بدقسمتی کا عمل دخل تھا۔ نہ سکندر کی جیپ عین چوراہے پر دغا دیتی اور نہ ہی قریب سے
گزرتی موبائل پولیس کی نظر جام ٹریفک کے ہجوم میں پھنسے سکندر پر پڑتی۔ اس سے آگے کی
کہانی بہت مختصر تھی۔ سکندر کو گرفتاری کی رات ہی خصوصی تفتیش کے سیل میں منتقل کر دیا گیا

تین مہینے کی مختصر مقدمے بازی کے بعد اُسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ تب سے لے کر آج کی اس برستی شام تک سکندر اس پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھا، اپنے اجل کے فرشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کی کہانی ختم ہوئی تو ہم دونوں بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر یکایک سکندر نے سلاخوں سے اپنے ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''ایک مرتے ہوئے شخص کی ایک آخری تمنا پوری کرو گے.....؟ میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ اُس سے ملنا چاہتا ہوں، صرف اُسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا، انجانے میں ہوا۔ میں اُس پولیس آفیسر کو اپنا آخری بیان بھی ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں، کیوں کہ اب بھی بہت سے بھٹکے ہوئے نوجوان اس تنظیم کے آلۂ کار ہیں..... شاید میرا بیان اُن میں سے ایک کی نجات کا باعث بن جائے..... جلدی کرو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

جس وقت راحیل صاحب کیچڑ میں لت پت اپنے جیل کے عملے سمیت بارش میں بھیگتے ہوئے جیل کوٹھری کے احاطے میں داخل ہوئے، تب رات پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ موم بتیوں کی روشنی میں سکندر کا دو گھنٹے کا طویل بیان ریکارڈ کرنے میں جانے کتنے کورے صفحوں کا مقدر سیاہ ہو گیا اور جب بیان مکمل ہونے کے بعد راحیل صاحب چلا چلا کر جیل کے وائرلیس سیٹ سے مختلف چوکیوں کو دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے کے احکامات آگے بڑھا رہے تھے، اُس وقت رات کے دو بج چکے تھے، سکندر کی پھانسی میں صرف دو گھنٹے ہی باقی تھے، لیکن نائلہ نے سکندر سے ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب سکندر سے اُس کی ملاقات پھانسی گھاٹ پر ہی ہوگی۔ راحیل صاحب نے اُسے سمجھانے کی بے حد کوشش کی، حتیٰ کہ سکندر کے کفارے کے طور پر اُس کا دیا گیا آخری بیان بھی نائلہ کو دکھا دیا کہ کس طرح اُس کی تنظیم نے دھوکے سے محبِ وطن عناصر کو سکندر کے ذریعے اپنے راستے سے ہٹایا، جن میں نائلہ کا شوہر بھی شامل تھا، لیکن نائلہ کے پتھر دل کو پگھلنا تھا، نہ پگھلا۔ آخر کار سلطان بابا کے اشارے پر مجھے اُس نازنین دل گرفتہ کے در پر آدھی رات کو دستک دینی پڑی، اُس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ وہ گزشتہ رات سے روتی رہی ہے۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی تلخی سے کہا۔ ''تو اب آپ آئے ہیں، اُس قاتل کی صفائی پیش کرنے کے لیے۔ مجھے حیرت ہے کہ پوری جیل ہی اُس کی جان بخشی کے لیے کیوں دوڑی

چلی آ رہی ہے۔ ویسے اُسے یہ فن تو ہمیشہ سے بہت کمال آتا ہے، اپنی باتوں سے اُس نے سب کو بھی زیر کر ہی لیا، یا پھر کوئی نئی بولی دے دی ہے۔ اُس کی نام نہاد تنظیم نے آپ کو بھی.....'' میں نے خاموشی سے اُس کے طنز کا وار برداشت کیا۔ ''میں آپ کے پاس کوئی رحم کی اپیل لے کر نہیں آیا۔ دنیا میں مری ہوئی محبت سے زیادہ مردہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی زیادہ مرے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اس مردہ محبت کا جنازہ اپنے وجود کے اندر دفنائے زندہ لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میری نظر میں آپ اور سکندر بھی ایسے ہی دو مرے ہوئے جسم ہیں، جو دنیا کے دکھاوے کے لیے اب تک سانس لے رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو سکندر اس معاملے میں آپ سے زیادہ خوش نصیب دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ کچھ لمحوں کے بعد کم از کم وہ اس سانس لینے کی منافقت سے تو چھوٹ جائے گا۔ آپ کو البتہ یہ جھوٹا بھرم شاید مزید کچھ سال تک جاری رکھنا پڑے گا۔'' نائلہ حیرت سے گنگ میری بات سن رہی تھی۔ میں جانے کے لیے پلٹا تو اُس کی ٹوٹی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''ٹھہریں..... میں تیار ہوں..... آپ جیلر صاحب کو مطلع کر دیں۔'' کچھ ہی دیر میں جیل کی فضا سیٹیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ قیدی کی آخری ملاقات شروع ہو چکی ہے۔ جانے سکندر، نائلہ کی ملاقات کیا رنگ لائے گی۔ میں یہی سوچتا ہوا فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل کر گھاٹ پہنچا تو سکندر کی کال کوٹھری کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ جیلر اقبال سمیت جیل کا ڈاکٹر اور مجسٹریٹ صاحب بھی آ چکے تھے۔ سکندر اپنا آخری غسل لے کر تیسویں سپارے کی تلاوت ختم کر چکا تھا۔ تمام پھانسی گھاٹ کی کوٹھریوں کے چراغ جل چکے تھے اور سکندر کے آس پاس کے سبھی قیدی اپنے ایک دیرینہ ساتھی کو آخری الوداع کرنے کے لیے اپنی اپنی کوٹھری کی سلاخوں سے سر ٹکائے، آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے۔ سکندر کی خواہش پر سلطان بابا بھی سکندر کے اس چند قدم کے آخری سفر میں اُس کے ساتھ قدم ملانے کے لیے موجود تھے۔ سکندر نے قرآن پاک واپس رحل پر رکھ دیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس دوران سکندر کا آخری طبی معائنہ کیا اور سکندر کو پیش کش کی کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر جانے میں کچھ دقت محسوس کر رہا ہو تو اُس کے لیے اسٹریچر کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُس نے ڈاکٹر کی یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ جیسے

ہی سکندر نے کال کوٹھری سے باہر قدم رکھا، فضا میں آس پاس کے قیدیوں کے نعرے گونج اُٹھے..... ایک بولا، کلمہ شہادت..... سب بیک زبان بولے..... اشہد ان لا الٰہ الا اللہ..... سکندر کے قدم زمین پر تو پڑ رہے تھے، مگر وہ خود مجھے اس وقت کسی اور ہی دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔ سلطان بابا کے سامنے پہنچ کر وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پایا اور رو پڑا۔ ''بابا..... میرے اس آخری سجدے کی قبولیت کی دعا کیجیے گا..... میں نے اپنی ساری زندگی غیروں کے سامنے ماتھا ٹیکنے میں گنوا دی..... یہ آخری چند لمحے ہی میری کمائی ہیں..... اور میری یہ چند ٹکوں کی کمائی بھی اب آپ کی نذر ہے۔'' سلطان بابا نے سکندر کو گلے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اگلے قدم پر میں کھڑا تھا۔ سکندر کی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے گڑ سی گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں کس کی شبیہ تلاش کر رہا تھا۔ کاش میری آنکھوں کو چند لمحے کے لیے ہی سہی، پر قدرت اتنی صلاحیت تو دے دیتی کہ میں اس سیاہ نصیب کے لیے اُس گل رُخ کا چہرہ اپنی آنکھوں میں سجا لاتا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سکندر کی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ وہاں جا کر کسی مقام پر رُک سکو تو میرا انتظار کرنا..... ابھی میں نے تمہیں اپنی کہانی نہیں سنائی..... میرا یہ قرض تم پر ابھی باقی ہے۔'' سکندر میری بات سن کر ہلکے سے مسکرایا اور گلے لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سب قیدی سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر سکندر کو چھو کر اُسے ''الوداع'' کہتے ہوئے رو رہے تھے۔ نیا جلاد گھاٹ کے باقی عملے کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ سکندر کو تختے پر چڑھا دیا گیا۔ جلاد نے کالے رنگ کا غلاف نما کپڑا سکندر کے چہرے پر چڑھانے کی کوشش کی، لیکن اُس نے ایک ہاتھ سے اُسے کچھ لمحے رُکنے کا اشارہ کیا۔ نائلہ ابھی تک گھاٹ پر نہیں لائی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد راحیل صاحب اُسے لیے ہوئے پھانسی گھاٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نائلہ کی نظر اُوپر اُٹھی اور سکندر کی اپنی جانب گڑی ہوئی نظر سے ملی۔ میں نے اس سرد اور بھیگے موسم میں بھی اس نظر کے ٹکراؤ سے چنگاریاں سی نکلتی ہوئی دیکھیں۔ سزائے موت کی کال کوٹھریاں، جن کی پشت پر یہ پھانسی گھاٹ موجود تھا، وہاں سے کسی قیدی نے زور کی تان لگائی..... ''من عاصیم، من عاجزم، من بے کسم..... تاجدارِ حرم..... ہو نگاہ کرم..... ہم غریبوں کے دن بھی سنور جائیں گے.....'' بادل زور سے گرجا، بارش کی بوچھاڑ نے ہم سب کے جسم پوری طرح بھگو دیے۔ ہماری آنکھیں تو پہلے ہی بہہ رہی تھیں۔ جلاد نے کالا غلاف سکندر کے

چہرے پر چڑھا دیا اور سکندر کو کاندھے سے پکڑ کر بند تختے کے درمیان میں لا کھڑا کیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ کال کوٹھریوں کی جانب سے ''اللہ ہو، اللہ ہو'' کی صداؤں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وہ پھانسی گھاٹ کی اُونچی دیواروں کی وجہ سے اپنے ساتھی کو سانسیں ہارتے دیکھ تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن اُن میں سے کئی ایسے تھے، جنہوں نے اس سے پہلے بھی اپنے کسی ساتھی کو پیروں پر چل کر موت کی اس وادی میں جاتے اور پھر چار کاندھوں پر سوار واپس آتے ہوئے دیکھا تھا، لہٰذا انہیں ہر لمحے کی ترتیب کا خوب اندازہ تھا کہ ٹھیک کس لمحے جلاد کے ہاتھ لیور کی جانب بڑھیں گے اور کب لیور کے کھٹکے سے وہ موت کی چیخ بلند ہوگی۔ لہٰذا وہ اِسی ترتیب سے بآواز بلند دعائیں دہرا رہے تھے۔ پھر وہی موت..... اور پھر وہی مذہب..... جلاد نے مجسٹریٹ کی جانب دیکھا، جو اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ مجسٹریٹ نے نائلہ سے دھیرے سے کچھ پوچھا، لیکن نائلہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجسٹریٹ نے جلاد کو اشارہ کیا۔ جلاد نے لیور پر ہاتھ رکھا اور اپنی قوت مجتمع کی۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اُن کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح تیزی سے گھومنے لگی۔ جلاد نے نائلہ کی جانب رحم طلب نظر ڈالی۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، نائلہ کا جسم تیزی سے لرزنے لگا۔ تیز ہوا نے بارش کی برچھی جیسی بوندوں کا رُخ ہماری جانب کر دیا۔ مجسٹریٹ نے پانچ اُنگلیاں اُٹھا کر جلاد کو پانچ سیکنڈ گننے کا اشارہ دیا۔ جیلر اقبال کے ہونٹوں پر کلمے کا ورد مزید بلند ہوگیا۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ قیدیوں کے نعرے چیخوں میں بدلنے لگے..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... اللہ ہو..... مجسٹریٹ کی پہلی اُنگلی بند ہوئی..... پانچ..... چار..... تین..... دو..... ایک..... جلاد نے زور سے لیور کھینچا..... فضا میں تختہ کھلنے کی چنگھاڑ گونجی..... کھڑاک..... سکندر کا جسم فضا میں پہلے اپنے بوجھ سے تیزی سے نیچے کی جانب گرا اور پھر سفاک پھندے کی بندش نے اُس کا گردن کو جکڑ لیا۔ ٹھک کی آواز آئی اور سکندر چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ ٹھیک اُسی لمحے ایک اور کھٹکا ہوا اور نائلہ کا جسم بھد سے زمین پر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ ڈاکٹر اور جیلر تیزی سے نائلہ کی جانب بھاگے۔ ڈاکٹر نے فوراً نبض دیکھی اور پھر جلدی سے نائلہ کی شہ رگ پر اپنے ہاتھ کی پشت رکھی، جو برف کی طرح سرد ہو چکی تھی۔ نائلہ کی رُوح بھی سکندر کے ساتھ ہی پرواز کر گئی تھی۔ سلطان بابا کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور نائلہ کی بند مٹھی پر گرا، جہاں کاغذ

کی ایک مڑی تڑی سی پرچی دبی بارش سے بھیگ رہی تھی۔ سلطان بابا نے کاغذ کی تہ کھول کر اُسے پڑھا اور پھر اُسے میری جانب بڑھا دیا۔ شاید یہ تمہارے لیے ہے.....'' میں نے جلدی سے کاغذ کی تحریر پر نظر دوڑائی۔ ''آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا..... ہم دونوں ہی بہت پہلے مر چکے تھے، اب صرف شرط اس منافقت سے پہلے جان چھڑانے کی ہے، جو ان سانسوں کی صورت میں ہمیں شرمندہ کر رہی ہیں۔ میں جان چکی ہوں کہ سکندر کو رؤف کے قتل میں استعمال کیا گیا ہے اور میں نے دل سے اُسے معاف بھی کر دیا، لیکن اُس کی تنظیم، اس بیان کے بعد اُسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ میرے لیے سکندر بہت پہلے مر چکا ہے اور میں ایک بار پھر اُسے اُن لوگوں کے ہاتھ سے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اُس کے پچھلے تمام گناہوں کا کفارہ آج یہیں ادا ہو جائے اور وہ سرخرو ہو کر آگے جا سکے۔ میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میں بھی زندہ رہنے کی اس منافقت سے جلد از جلد چھٹکارا پا لوں۔'' میں نے نائلہ کی تحریر اپنی مٹھی میں جکڑ لی۔ اُسے ہماری کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ بھی سکندر کے ساتھ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

یاقوط

ٹرین کو رحیم پور کا اسٹیشن چھوڑے ہوئے تقریباً بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ سکندر اور نائلہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے کہہ کر پلٹ جاؤں۔ محبت کا یہ رنگ بھی ہو سکتا ہے، مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا، لیکن پھر سلطان بابا کا گہرا سمندر جیسا سکوت اور صبر دیکھ کر میں خود ہی کو ملامت بھی کرتا کہ آخر جو کچھ مجھ پر بیتی ہے وہی سب کچھ اُن کے دل نے بھی جھیلا ہے، لہٰذا انہیں مزید پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ جانے یہ سب سوچتے سوچتے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر تب جاگا، جب سلطان بابا کی ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ساحر میاں اُٹھ جاؤ..... ہماری منزل آ گئی ہے۔'' انہوں نے شاید دھیرے سے میرا کاندھا بھی ہلایا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا، لیکن اس وقت صبح سے پہلے کی شدید دُھند اور کہر میں ڈوبا ہوا تھا اور اِسی دُھند میں چلتے پھرتے قلی، ٹھیلے دار اور ویٹنگ کنٹریکٹر سب ہی ایک خواب ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ حسب معمول نہ میں نے سلطان بابا سے کوئی سوال کیا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ ہم دونوں کے پاس سامان کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا چمڑے کا بیگ تھا جس میں میرے اور سلطان بابا کے دو جوڑے کپڑے اور اُن کا مسواک وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میں بیگ اُٹھائے پلیٹ فارم پر اُترا تو سفید وردی میں ملبوس ایک ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں وہاں کھڑا تھا اور اسٹیشن پر لگے بلب کی پیلی روشنی کے دائروں اور سفید دُھند کے ہیولوں میں ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی جلدی سے آگے بڑھا اور سلطان بابا سے مخاطب ہوا ''بابا جی..... کیا آپ حاجی رزاق صاحب کے مہمان ہیں۔ میں آپ ہی کو لینے کے لیے آیا ہوں۔'' کچھ دیر بعد ہم ڈرائیور کے ساتھ اسی کی دہائی کے ماڈل کی ایک کشادہ مرسڈیز گاڑی میں دُھند بھری سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک بہت بڑی حویلی کے بیرونی پھاٹک سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

حویلی بھی کہر میں ڈوبی ہوئی تھی اور مرکزی عمارت کے سامنے اتنا بڑا وسیع اور کشادہ لان تھا، جس میں اس جیسی چار چھ مزید عمارتیں کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ لان کے بیچوں بیچ ایک بہت پرانا پیپل کا درخت کچھ عجیب شان بے نیازی سے اکیلا ایستادہ تھا۔ درخت کے چاروں طرف سیمنٹ کا بڑا سا گول چبوترا تھا اور اس کی صدیوں پرانی شاخوں کے بیچوں بیچ ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ حویلی میں داخلے کی روش کو سرخ بجری سے پاٹا گیا تھا اور یہی روش پورچ سے آگے جا کر انگریزی کے حرف ''ڈی'' کی شکل میں حویلی کے بیرونی گیٹ پر ختم ہوتی تھی۔ داخلے اور بیرونی دونوں گیٹوں پر دربانوں کی موجودگی یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ حویلی کے مکین آنے اور جانے کے دو مختلف گیٹ استعمال کرتے ہیں۔ پورچ میں پہلے ہی سے ایک پکی عمر کا شخص نفیس شیروانی اور سر پر قراقلی پہنے، چند نوکروں کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے اُترنے پر جب اُس نے تعارف اور استقبال کیا تو پتا چلا کہ یہی موصوف حاجی رزاق صاحب ہیں۔ چائے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں حویلی کے عظیم الشان ڈرائنگ روم سے باہر لے آئے۔ اُن کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی، لیکن پھر کچھ پوچھتے پوچھتے رُک سے جاتے۔ آخر کار اُن کے مہمان خانے کی خوب صورت انیکسی میں داخل ہوتے وقت سلطان بابا نے خود ہی اُن کی اُلجھن رفع کر دی۔ ''رزاق صاحب یہ عبداللہ میاں ہیں..... یہ بھی میرے ساتھ ہی رہیں گے..... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔'' حاجی رزاق نے جلدی سے سلطان بابا کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں نہیں جناب..... میری کیا مجال کہ میں کوئی اعتراض کروں..... میں بس یہی کنفرم کرنا چاہتا تھا کہ صاحب زادے بھی آپ کے ساتھ ہی رہیں گے، یا ان کے لیے کہیں اور بندوبست کرنا ہوگا۔ سو بسم اللہ..... آپ کے ساتھ رہیں..... ہمارے سر آنکھوں پر.....'' یہ مہمان خانہ، یا انیکسی حویلی کی مرکزی عمارت کے داہنی طرف بیرونی گیٹ سے تقریباً متصل واقع تھا اور ہم اس وقت شیشے کی دیوار سے پرے جس برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے بھی وہ پیپل کا پیڑ بالکل سامنے نظر آتا تھا۔ حاجی رزاق کی باتوں سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ اُن کی سلطان بابا تک رسائی مولوی خضر کے توسط سے ہوئی ہے۔ لیکن ہماری یہاں آمد کا کیا مقصد تھا، یہ عقدہ بھی کچھ دیر میں حاجی رزاق ہی کی زبانی کھلا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے خاندان سمیت ایک مہینہ تیئس دن قبل اس حویلی میں منتقل ہوئے تھے، لیکن ان

ترپین دنوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو انہوں نے سکون سے گزارا ہو۔ بقول حاجی رزاق، یہ حویلی اُن سے پہلے بھی بہت سے خریدار اور کرائے دار دیکھ چکے ہیں، لیکن جانے کیوں، یہاں کوئی بھی چند راتوں سے زیادہ ٹک نہیں پایا۔ حاجی رزاق ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے اور پھر جب کروڑوں کی یہ جائیداد لاکھوں کے عوض بکنے لگی تو وہ خود کو اسے خریدنے سے باز نہیں رکھ پائے۔ انہوں نے قریباً چار ماہ قبل یہ حویلی خریدی تھی، تب یہ تقریباً کھنڈر ہو چکی تھی۔ انہوں نے دن رات مزدوروں کو لگوا کر اور چار پانچ ٹھیکے داروں کی نگرانی میں اس کھنڈر کو ایک بار پھر سے اس کی موجودہ چمکتی دمکتی حالت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس مہمان خانے میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے، یہ نئی تعمیر تھی۔ اس سے پہلے یہاں انجیر کے درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ تھا، جسے صاف کروا دیا گیا تھا۔ لاکھوں روپے اس حویلی کی تزئین پر خرچ کرنے کے بعد جس روز انہوں نے اپنے پورے خاندان سمیت پہلا قدم اس دالان میں رکھا، بس وہیں سے اُن کی مصیبتوں کی داستان شروع ہو گئی۔ حاجی رزاق کے خاندان میں اُن کی بیگم کے علاوہ اُن کی دو لاڈلی صاحب زادیاں شامل تھیں..... ۱۹ سالہ رُباب اور ۱۷ سالہ نایاب۔ رُباب بچپن ہی میں اپنے چچازاد عامر سے منسوب کر دی گئی تھی، جو اس وقت اپنی طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہاؤس جاب کے دوسرے سال میں تھا اور اگلے ساون سے پہلے اُن کا رُباب کی رُخصتی کا منصوبہ تھا۔ حاجی رزاق کے بقول، جس وقت وہ اس حویلی میں داخل ہوئے تھے، وہ عصر کا وقت تھا اور شام کی چائے انہوں نے نوکروں سے کہہ کر باہر والان ہی میں لگوالی تھی، کیوں کہ اندر کمروں میں ابھی جھاڑ پونچھ جاری تھی۔ لڑکیاں حویلی کے دالان میں چہل قدمی کرتی رہیں اور اِسی اثناء میں مغرب کا وقت بھی ہو گیا۔ انہیں خیال ہی نہیں رہا کہ چھوٹی نایاب تو ماں کے ساتھ اندر کی آرائش دیکھنے کے لیے جا چکی ہے اور وہ خود آخری سامان لانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور منشی کے ساتھ بھاؤ تاؤ میں مصروف رہے مگر..... جب فراغت کے بعد پلٹ کر اندر جانے لگے تو نظر بڑی بیٹی رُباب پر پڑی، جو کچھ عجیب سے انداز میں دالان میں کھڑی ہو کر پیپل کے پیڑ کو دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آواز دی تو وہ چونک کر پلٹی اور کھوئے کھوئے انداز میں اندر کی جانب بڑھ گئی، لیکن اس کے بعد سے آج تک کسی نے اُس لڑکی کو اپنے آپے میں نہیں دیکھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت بگڑتی گئی اور اب تو وہ باقاعدہ راتوں کو اُٹھ

کر اس درخت کے پاس آ جاتی ہے اور باقاعدہ اس سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مستقل بخار کی کیفیت نے اُسے اس قدر چڑچڑا کر دیا ہے کہ اب تو اُس نے اپنے منگیتر عامر سے بھی بات چیت بالکل بند کر دی ہے۔ حالانکہ ایک وہ وقت بھی تھا جب وہ پہروں بیٹھ کر عامر کا شام کی چائے پر انتظار کیا کرتی تھی۔ حاجی رزاق بیٹیوں کی ایک خاص حد تک آزادی کے قائل تھے اور عامر تو اُن کے اپنے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ خود بھی چاہتے تھے کہ رُخصتی سے پہلے لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے مزاج سے آشنا ہو جائیں، لیکن اب تو رُباب عامر کا نام سن کر ہی غصے سے کانپنے لگتی تھی۔ اگر عامر، رُباب سے شدید محبت نہ کرتا ہوتا تو یہ رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ وہ خود بھی رُباب کی اس حالت سے بے حد پریشان تھا اور میڈیکل کی اصطلاح میں جو کچھ بھی علاج ممکن تھا، اپنے سینئر ڈاکٹروں کے مشورے سے آزما چکا تھا، لیکن سب بے سود ہی رہا۔ رُباب کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ حاجی صاحب کی بیگم دبے لفظوں میں کئی بار اُن سے کہہ چکی تھیں کہ انہیں یہ کوئی آسیب وغیرہ کا چکر لگتا ہے، لیکن عامر کو ان توہمات سے شدید چڑ تھی۔ پھر بھی رُباب کی ماں نے سب سے چھپ کر ایک بہت ''پہنچی ہوئی'' پیرنی کو اپنی کراماتی دھونی دینے کے لیے حویلی میں بلا بھیجا۔ لیکن جیسے ہی اُسے چند لمحے کے لیے خود اُسی کے کہنے پر رُباب کے ساتھ اکیلے کمرے میں چھوڑا گیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ چیختی چلاتی ہوئی بدحواسی سے کچھ ایسی تیزی سے وہاں سے بھاگی کہ اپنی پیری فقیری کے سارے کراماتی لوازمات بھی اُٹھانا بھول گئی۔

عامر کو شام کو جب اس بات کا پتا چلا کہ اُس کی چچی نے رُباب کا ''آسیب'' اُتارنے کے لیے کسی عورت کو بلوایا تھا تو وہ بے حد ناراض ہوا اور اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب اگر کسی نے بھی ایسے کسی تجربے کو دہرانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ عامر غصے کا بے حد تیز تھا اور حاجی رزاق تو دونوں طرف سے پس رہے تھے۔ ایک طرف بیٹی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی تو دوسری طرف داماد رُخصتی سے پہلے ہی پھسلا جا رہا تھا۔ لیکن جب میڈیکل نے پوری طرح جواب دے دیا تو انہوں نے بیٹی کی زندگی کے لیے داماد کی ناراضی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا اور مولوی خضر کے ہاتھ پیغام بھیج کر سلطان بابا کو اپنے ہاں بلوا لیا، البتہ عامر اس بات سے ابھی تک بے خبر تھا۔ ابھی حاجی رزاق کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بوندا باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا اور ہم جس شیشے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، اُس کی

دیواروں سے ٹکرا کر بارش کے موتی ایک عجیب سا جل ترنگ بجانے لگے۔ یہ بارشیں چاہے دنیا کے کسی خطے کی بھی ہوں..... ہوتی بالکل ایک جیسی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مبہوت کر دینے والی..... دلوں کے زنگ دھو دینے والی..... ابھی ہم شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر فنا ہونے والی بوندوں کی سرگم سن ہی رہے تھے کہ اندر سے کالے لباس اور کالی چادر میں ملبوس ایک حسین لڑکی ہاتھ میں پانی کا فوارہ اُٹھائے نکلی اور اس برستی بارش میں بھی پیپل کے پیڑ کو پانی دینے لگی۔ اُسے اپنے بھیگنے کا کوئی ہوش نہیں تھا اور اُس کے چہرے کی پیلاہٹ اور زردی، میں یہاں اتنی دُور بیٹھے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔ حاجی رزاق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور اُس کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہی میری بیٹی رُباب ہے..... اس کی ابتر حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔'' دفعتہً رُباب کی نظر اُٹھی اور اُس نے شدید غصے اور بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اُس کی نظر تیر کی طرح ایک سیدھ میں شیشے کی اس دیوار سے پرے بیٹھے ہم لوگوں پر گڑ گئی، حالانکہ پیڑ اور اس برآمدے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ بارش میں ہمارے ہیولے تک باہر سے گزرتے کسی شخص کو واضح نظر نہیں آ سکتے تھے، لیکن رُباب نے سیکڑوں گز دُور سے ہماری جانب یوں دیکھا جیسے ہم اُس کے بالکل سامنے ہی بیٹھے ہوں۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑے فوارے کو زور سے ایک جانب پٹخا اور غصے میں پھنکارتی ہوئی، تیز بارش کی لپٹوں سے اُلجھتی ہوئی ہماری جانب بڑھی۔ طوفانی ہوا نے اُس کے سر سے چادر ڈھلکا دی اور جس وقت اُس نے شیشے کے دروازے کو تڑ دینے والے انداز میں دھکا دیا، تب تک اُس کا کانچ سے بنا کومل وجود ایسے ڈھل چکا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موتی سمندر کی تہ سے باہر نکالا گیا ہو۔ اُس کا بھیگا گلابی حسن غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ گھنی لٹیں بھیگ کر چہرے سے یوں لپٹی جا رہی تھیں، جیسے بے نقاب فتنے پر حجاب کا پردہ ڈالنا چاہتی ہوں۔ رُباب کچھ دیر تک دروازے میں کھڑی غصے سے ہم سب کی جانب دیکھ رہی اور پھر اُس کی نظریں سلطان بابا پر ٹک گئیں جیسے اُسے اُن کا وجود سخت ناگوار گزرا ہو۔ رزاق صاحب بالکل ہی بوکھلا سے گئے۔ ''آؤ بیٹا آؤ..... یہ سلطان بابا ہیں..... بہت دُور سے تم سے ملنے آئے ہیں۔ اور یہ.....'' رُباب نے باپ کی پوری بات سنے بغیر ہی درمیان سے کاٹ دی ''کیوں آئے ہو یہاں.....؟'' وہ براہ راست سلطان بابا سے مخاطب تھی۔ اب تک اُس نے اپنے باپ، یا میری جانب دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی رزاق نے اُس

ڈانٹا۔ ''رُباب..... یہ کون سا طریقہ ہے مہمانوں سے بات کرنے کا.....'' رُباب نے پلٹ کر ایک نگاہ غلط پہلے حاجی رزاق اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر سلطان بابا کو اِسی طرح کھا جانے والی نظروں سے گھورتی ہوئی پلٹ کر وہاں سے چل دی۔ حاجی رزاق نے بے بسی سے ہماری جانب دیکھا۔ ''معافی چاہتا ہوں..... لیکن میں خود بھی بے بس ہوں۔'' سلطان بابا نے، جو رُباب کو دیکھنے کے بعد کسی گہری سوچ میں گم ہو چکے تھے، حاجی رزاق کو تسلی دی کہ اللہ بہتر کرے گا۔

بارش کا زور تو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا، لہٰذا سلطان بابا کی فرمائش پر حاجی رزاق نے چند چھتریوں کی پناہ تلے ہی ہمیں پوری حویلی کا دورہ کروایا۔ سلطان بابا نے بطور خاص حاجی رزاق سے دریافت کیا کہ اس مکان کی بیرونی چار دیواری کے حساب سے حویلی کو کل کتنے کونوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ گھر کی اندرونی ساخت کے مطابق حویلی کے کل سات کونے بنتے تھے۔ سلطان بابا نے اُسی وقت قریب کھڑے نوکروں میں سے ایک کو بازار بھیج کر پانچ انچ لمبی لوہے کی سات کیلیں لانے کا کہا۔ سب اپنی دُھن میں مگن تھے، لیکن نہ جانے مجھے کیوں مسلسل ایک عجیب سی بے چینی اور اُلجھن کا احساس ہو رہا تھا، جیسے کوئی اس سارے عمل کی نگرانی کر رہا ہو اور پھر جب ہم حویلی کے پچھلے حصے میں باغ کی جانب والے کونوں میں سلطان بابا کی پڑھی ہوئی کیلیں ایک ایک کونے میں گاڑھ رہے تھے تو اچانک ہی میری نظر رہائشی کمروں کی اُن کھڑکیوں کی جانب اُٹھ گئی، جو یہاں پچھلے باغ کی جانب کھلتی تھیں، تب میں نے اُن میں سے ایک کھڑکی میں رُباب کو اپنی آنکھوں میں خون لیے گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت وہ غصے میں چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ چند لمحے کے لیے ہماری نظریں ٹکرائیں تو مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ نظر کچھ اور ہی تھی..... اپنے اندر ایک پیغام..... ایک دھمکی لیے ہوئے..... ایک جانی دشمن کی نظر..... ابھی میں اُس ماہ رُخ کی نظر کے پیچ ہی میں اُلجھا ہوا تھا کہ اچانک گیٹ کی جانب سے کسی کار کی اسکریچ کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہی ایک وجیہہ نوجوان غصے میں دندناتا ہوا ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔ میں اُس کے پہلے جملے ہی سے سمجھ گیا کہ وہ رُباب کا منگیتر عامر ہے۔ اُس نے چھوٹتے ہی کہا ''رزاق چچا..... یہ میں کیا سن رہا ہوں..... آپ نے پھر کسی

ڈھونگی کو رُباب کے علاج کے لیے بلوا لیا ہے..... میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود۔'' حاجی رزاق گڑبڑا سے گئے۔ ''آؤ عامر بیٹا..... ان سے ملو..... یہ سلطان بابا ہیں..... میں نے انہیں.....'' عامر غصے سے دھاڑا ''آئی ڈیم کیئر کہ یہ کون سے بابا ہیں..... میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟'' حاجی رزاق کی صورت حال کچھ عجیب سی ہوگئی۔ اُن کے داماد نے آتے ہی اُن کے مہمانوں کو ڈھونگی قرار دے دیا تھا۔ ایسے میں سلطان بابا نے حاجی صاحب کی مشکل آسان کی اور بولے ''کسی کے سچ، یا ڈھونگ کا فیصلہ کرنے کے لیے تم نے بہت کم وقت لیا نوجوان..... ہمیں حاجی صاحب نے نہیں بلایا..... ہم دو دن کے مسافر ہیں..... خود ہی آئے ہیں، کچھ دیر ستا کر آگے بڑھ جائیں گے..... ہمیں کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔'' عامر براہ راست سلطان بابا کی بات سن کر کچھ مخمصے میں پڑ گیا، لیکن تب تک حاجی رزاق سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی عامر میاں..... کچھ بھی ہو، مگر میں کسی کو بھی اپنے گھر میں تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے نہیں دوں گا۔'' عامر غصے سے پلٹا اور زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

وہ پورا دن سلطان بابا نے حویلی کے محل وقوع اور اندرونی جائزے میں گزار دیا۔ شام کی چائے پر حاجی رزاق کی بیگم اور اُن کی چھوٹی بیٹی نایاب سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں بیٹیاں شاید ماں ہی کا عکس تھیں۔ نایاب بھی اپنی بہن کی طرح لاکھوں میں ایک تھی، لیکن اس وقت بہن کی پریشانی کی وجہ سے خود بھی کملائی سی تھی، البتہ رُباب سے ہمارا دوبارہ سامنا نہیں ہوا۔ رات کو تنہائی میسر ہوئی تو میں نے سلطان بابا سے استفسار کیا۔ انہوں نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''بڑی آزمائش پڑنے والی ہے ساحر میاں..... دعا کرنا کہ خدا ہمیں ثابت قدم رکھے۔'' میں نے اُلجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیسی آزمائش..... اس لڑکی کے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے.....؟'' سلطان بابا نے اپنی تسبیح گھماتے ہوئے جواب دیا ''شاید تمہیں مولوی خضر نے بتایا ہو کہ بظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود، اس دنیا کے علاوہ بھی اور بھی بہت سی دنیائیں موجود ہیں..... لیکن ہم اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن اور عقل کو عطا کی جانے والی محدود بصارت کی وجہ سے اس متوازی اور بالکل ہماری دنیا کے ساتھ جیتی جاگتی اُس دنیا کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بس، یوں سمجھ لو کہ یہ بھی ایک ایسی ہی متوازی دنیا کے کسی مکین کا ہماری دنیا میں

دخل دینے کا معاملہ ہے..... اور یاد رہے کہ اس پوری کائنات کا نظام، اس بنیاد اور اُصول پر قائم ہے کہ ہر ذی رُوح اپنے مقرر کردہ دائرے میں سفر کرے اور دوسری دنیا کے محور میں دخل اندازی نہ کرے۔ اِسی اُصول کی بنیاد پر یہ لاکھوں کہکشائیں، چاند، ستارے اور سیارے گردش کر رہے ہیں اور اس گردش کی ذرا سی بھی غیر قدرتی تبدیلی، یا تغیر کو قیامت سے تشبیہ دی جاتی ہے، کیونکہ اس اُصول سے بال برابر انحراف بھی اس قدر تباہی و بربادی کا باعث بن سکتا ہے جو کسی قیامت سے کم نہیں ہوگا۔'' مجھے پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ''میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھا..... یہاں اس گھر میں کون سی دوسری دنیا کے مکین مداخلت کر رہے ہیں.....؟'' سلطان بابا نے تسبیح ختم کر کے خود پر اور مجھ پر پھونکا۔ ''جنات..... اس حویلی پر واقعی کسی آسیب کا سایہ ہے۔'' میری حیرت سے وہ سمجھ گئے کہ میں اس ترقی یافتہ دور کی بھاگتی دوڑتی سیٹلائٹ ایج میں اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہا ہوں۔ انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''جنات پر یقین تو رکھتے ہو نا..... قرآن میں باقاعدہ اُن کا کئی جگہ ذکر موجود ہے..... اور اُن کا مسکن بھی یہی ہماری دنیا ہے..... بس فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہم سے مخفی ہیں اور اُن کا دائرۂ حیات اور معاشرہ ہمارے محور کے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی ہم سے یک سر جُدا ہے اور عام حالات میں وہ کبھی ہمارے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرتے، البتہ ہم انسانوں کی طرح اُن میں بھی نیک اور بد، شریف اور شریر مخلوق کا تصور موجود ہے۔ البتہ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ اس گھر پر آسیب کا بھاری سایہ ہونے کے باوجود مجھے ابھی تک یہاں کسی شر کا شائبہ تک نہیں ہوا، کیونکہ معاملہ اگر بدی، یا شرارت کا ہوتا تو اب تک وہ مخلوق آسمان سر پر اُٹھا چکی ہوتی، حتیٰ کہ اُس نے اس وقت بھی کسی طرح کی دخل اندازی نہیں کی، جب میں نے اُس کی امکانی بندش کا بندوبست کرنے کا سامان کیا تھا۔ عام حالات میں وہ ایسے موقع پر پلٹ کر جوابی وار ضرور کرتی ہے۔ آگ کے خمیر سے اُٹھی اس مخلوق کا برتاؤ بھی کسی نار کی طرح ہی بھڑکیلا، گرم اور جلا دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن خلاف توقع اس بار اُس کا رویہ بالکل مختلف ہے اور دھیان رہے، اس بار تمہاری تربیت کا یہ سب سے نازک اور مشکل مرحلہ ہے۔ ہر گزرتا دن تمہیں اس متوازی دنیا کی مزید جہتیں بتا کر جائے گا۔ شرط صرف خود کو سنبھالے رکھنے کی ہے۔ اب تک ہم جس متوازی دنیا کے اسراروں کا صرف

تذکرہ ہی کرتے آئے ہیں، اُن میں سے ایک متوازی دنیا اپنی مخلوق سمیت خود اس گھر میں موجود ہے.....'' جانے سلطان بابا کی اس تنبیہ میں ایسا کیا تھا کہ مجھے خود اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رات دیر تک بستر پر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اب مجھے سمجھ آنے لگا تھا سکندر اور نائلہ سے ملاقات بھی دراصل میری تربیت ہی کا ایک حصہ تھی، لیکن کیسے؟ دفعتہً میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ مولوی خضر نے بہت تفصیل کے ساتھ مجھے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھایا تھا کہ ہم خواہ مخواہ اپنی جان کی حفاظت کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ موت تو خود زندگی کی تب تک حفاظت کرتی ہے، جب تک اُس کے نزول کا وقت نہیں آ جاتا اور موت زندگی کو خود وہاں کھینچ لاتی ہے، جہاں پر انسان کی آخری سانس لکھی ہوتی ہے۔ مجھے مولوی خضر کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کا سنایا ہوا قصہ بھی یاد آیا کہ کیسے جنات خود مرنے والے کی فرمائش پر اُسے ہزاروں میل دُور وہاں چھوڑ آئے تھے، جہاں وہ اپنی دانست میں موت سے بھاگ کر جانا چاہتا تھا، لیکن ملک الموت کو اُسی مقام پر اُس کی سانسیں ضبط کرنے کا حکم ملا ہوا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک اور بجلی کوندی، تو گویا رحیم پور کی سینٹرل جیل کے اُس پھانسی گھاٹ پر کسی اور کی قضا طے تھی، جس کے لیے قدرت نے سکندر کا اتنا لمبا اسکرپٹ لکھ ڈالا تھا۔ سکندر کی سانسیں تو کب کی گنی جا چکی تھیں۔ اُس کی موت تو بڑی واضح اور طے شدہ تھی، لیکن نائلہ جو اُس پھانسی گھاٹ سے ہزاروں میل دُور ایک اجنبی دیس میں بیٹھی ہوئی تھی، اگر وہ واپس اپنے ملک کی فلائٹ لے کر وہاں نہ پہنچتی اور وقت پر پہلے رحیم پور اور پھر جیل تک نہ پہنچ پاتی تو بظاہر اُس کی موت کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نائلہ کی فلائٹ کیوں مس نہیں ہوئی، ٹرین لیٹ کیوں نہیں ہوئی اور وہ اُس برستے طوفان سے چند لمحے پہلے رحیم پور تک کیسے آن پہنچی تھی، جب کہ اُس کے آنے کے چند لمحے بعد ہی رحیم پور کا واحد پل بھی برساتی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ وہ پل نائلہ کی ٹیکسی گزرنے سے پہلے کیوں نہیں بہا؟ گویا سب کچھ پہلے ہی سے طے شدہ تھا۔ نائلہ کو اپنے شوہر کے قاتل کی پھانسی دیکھنے کے بہانے اُس پھانسی گھاٹ تک پہنچنا ہی تھا، جہاں اُس کی آخری سانس لکھی ہوئی تھی۔ اور اُوپر والے کا اسکرپٹ تو دیکھیے کس غضب کا تھا، دنیا کو مرنے والی کی موت کا کوئی بہانہ بھی فراہم کرنا تھا قدرت کو۔ لہٰذا اس

بہانے کا بھی پورا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ سکندر کے ہاتھوں خود اُسی کی محبت کے شوہر کو قتل کروا کر اس کی پھانسی کا بندوبست کیا گیا اور پھر انتقام کی آگ میں جلتی نائلہ کو قاتل کے سامنے لا کھڑا کیا، تاکہ پہلے تو وہ اُسے پہچان کر معاف کر دے اور پھر خود بھی اُس کی موت کے جھٹکے کے ساتھ ہی اپنی سانسیں بھی جاں آفریں کے سپرد کر دے۔ اب پتا نہیں رُباب کی اس حویلی میں مجھ پر کون سا بھید اور اسرار کھلنے والا تھا۔ اس متوازی دنیا کی وہ کون سی پرت تھی، جس کا میرے اس کمزور وجود پر انکشاف ہونا تھا۔ میں تو سکندر اور نائلہ کے اس پہلے تجربے ہی سے رُوح کے آخری ریشے تک نڈھال ہو چکا تھا۔ اچانک ہی مجھے لاعلمی کے سکون پر رشک اور آگہی کے عذاب سے شدید خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے عام لوگوں کی زندگی ایک نعمت لگنے لگی، لیکن آگہی کا یہ راستہ اور دوسری دنیاؤں کے اسرار و رُموز کا یہ راستہ بھی تو میں نے خود ہی چنا تھا۔ کیا اس طرح بیچ راہ میں حوصلہ ہار دینا ٹھیک ہوگا؟ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ایک کھٹکے نے چونکا دیا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا اور بارش نہ جانے کس وقت تھم چکی تھی۔ پہلے تو میں اسے واہمہ ہی سمجھا، لیکن پھر دوبارہ ویسی ہی آواز پیدا ہوئی، شاید باہر دالان میں کوئی تھا۔ میرے اور سلطان بابا کے کمرے علیحدہ علیحدہ تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ انہیں بھی جگا دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ پچھلی کئی راتوں سے انہوں نے مکمل آرام نہیں کیا، تنہا ہی باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے انیکسی کے شیشے سے بند برآمدے کا دروازہ کھولا تو تیز اور سرد ہوا کے بھیگے جھونکے نے پورے وجود کو جھرجھرا سا دیا۔ اور تبھی وہ گھنگھروؤں کی جھنکار جیسی تیز سرگوشی پہلی مرتبہ واضح طور پر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کان کے بہت قریب اور دھیرے سے کہا ''یاقوط'' ہاں..... یہی لفظ تھا۔ سرگوشی کا لب و لہجہ عربی اور انتہائی نستعلیق نہ ہوتا تو شاید میں بھی اُردو والے یاقوت اور اس لفظ یاقوط میں فرق نہ کر پاتا۔ لیکن آخری حرف ''ط'' کی گردان اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا، لیکن وہاں دُور دُور تک میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ البتہ سرگوشی اتنے قریب سے کی گئی تھی کہ مجھے ابھی تک اپنے کان کی لو کسی کی گرم سانس کی حدت سے پگھلتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں ابھی اس مخمصے کا شکار تھا کہ دفعتہً میری نظر دُور دالان میں چلتے ہوئے کسی سائے پر پڑی۔ ارے..... یہ تو رُباب تھی۔ لیکن اس اندھیری رات اور سناٹے میں وہ اس وقت ننگے سر،

بال کھولے کیا کر رہی تھی؟ وہ اس وقت بھی اُسی کالے جوڑے میں ملبوس تھی اور اُس کا مہتاب چہرہ اس وقت بھی کسی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ میں برآمدے کے سامنے راہ داری کے ستون کی اوٹ لے کر اُسے دیکھتا رہا۔ رُباب کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی پیپل کے پیڑ کے سامنے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کے ہیولے کی غیر واضح حرکتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ وہاں کسی سے محوِ گفتگو تھی۔ میں ستون کی اوٹ سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درخت کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ مجھے یہاں سے دُھند اور کہر میں لپٹی رُباب کا چہرہ تو واضح نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اُس کی آواز بالکل واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے مخاطب تھی۔ ''نہیں..... بہت انتظار کر لیا میں نے..... اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم تو مجھے دیکھ سکو..... جب بھی تمہارا دل چاہے، مجھے اپنی نظر سے نہار سکو..... لیکن میرا من تمہیں دیکھنے کے لیے یونہی ترستا رہے، تڑپتا رہے..... میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہو یاقوط..... میں بھی تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے ترس رہی ہوں..... پل پل مر رہی ہوں..... میرے صبر کو اور مت آزماؤ..... ورنہ اب میں واقعی تم سے رُوٹھ جاؤں گی.....'' یہ رُباب کس سے باتیں کر رہی تھی؟ جواب میں کسی نے کچھ کہا، یا نہیں، یہ میں سن نہیں پایا، کیوں کہ اچانک ہی مخالف سمت کی بہت تیز ہوا چل پڑی تھی اور جب ہوا کی لہر رُکی تو میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کچھ سننے کی کوشش کی، لیکن اب پھر رُباب بول رہی تھی ''نہیں..... اور کتنا چھپو گے مجھ سے..... بس، اب اور نہیں سہا جاتا مجھ سے یہ آنکھ مچولی کا کھیل..... دیکھو..... کیا حالت ہوگئی ہے میری..... میں اتنی سخت جاں نہیں ہوں یاقوط..... میں مر جاؤں گی..... رحم کرو مجھ پر.....'' رُباب کی حالت بالکل بھکاریوں جیسی ہو رہی تھی۔ آخر یہ کون سی ہستی تھی، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہ پری زادیوں گڑگڑا رہی تھی۔ اب تو میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چلا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے درخت کی آڑ سے نکل کر رُباب کے سامنے آ گیا۔ وہ کھٹکے سے گھبرا کر پلٹی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے کی تمام ملامت اور نرمی ایک پل میں غائب ہوگئی۔ وہ بُری طرح چلا کر بولی: ''تم.....؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس وقت یہاں آنے کی.....''

آسیب محبت

اُس ماہ رُخ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا، لیکن میری ساری توجہ اُس ہستی کی جانب تھی، جس کی طرف دیکھ کر رُباب بات کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیا، سامنے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف پیپل کا پیڑ اسی شان سے کھڑا تھا، جس کی اوٹ میں چھپ کر میں نے رُباب کی ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ پھر زور سے چلائی۔ ''میں پوچھتی ہوں کس کی اجازت سے تم یہاں آئے ہو..... چلے جاؤ یہاں سے..... نکل جاؤ میرے گھر سے..... نکل جاؤ۔'' رُباب کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ اتنے میں اندر سے اُس کے ماں باپ، بہن اور کچھ نوکر دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ دوسری جانب مہمان خانے سے سلطان بابا بھی شور سن کر باہر نکل آئے۔ رُباب تب تک بالکل ہی نڈھال ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ اُسے فوراً اندر منتقل کر دیا گیا۔ سلطان بابا نے ماجی صاحب کے اصرار کے باوجود انہیں واپس حویلی بھیج دیا کہ وہ جا کر اپنی بیٹی کی خبر گیری کریں۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں کھڑے کھڑے ساری بات بتا دی۔ وہ کچھ دیر گہری سوچ میں گم اُس پیڑ کی جانب دیکھتے رہے، پھر اچانک بلند آواز سے بولے ''میں جانتا ہوں، تمہارا بسیرا یہیں ہے..... اس سے پہلے کہ میں کوئی حتمی قدم اُٹھاؤں میں آخری بار تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو اپنے اثر سے آزاد کر دو..... اگر ان لوگوں سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے، یا انجانے میں ان سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو انہیں معاف کر دو..... میں تمہیں تمہارا بسیرا چھوڑنے کو نہیں کہتا، تم چاہو تو خود اکیلے، یا پھر اگر دوسرے ساتھی بھی تمہارے ساتھ ہیں تو اُن سمیت ہمیشہ یہیں رہ سکتے ہو، لیکن شرط صرف یہی ہے کہ اب تم ان بھلے لوگوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرو گے..... میں تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں..... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے.....'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے پلٹے اور مہمان خانے کی جانب چل پڑے۔ میں وہیں حیرت کے سمندر میں گنگ کھڑا، اُس بے جان درخت کو دیکھتا رہا کہ وہ اتنی دیر تک کسی نادیدہ ہستی سے باتیں کرتے رہے۔ یہاں تو دُور دُور تک کسی ذی رُوح کا سایہ تک نظر

نہیں آ رہا تھا۔ جب میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ اچانک
مجھے کمرے میں ایک مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ شاید ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھ
یاد آیا کہ ٹھیک یہی خوشبو مجھے تب بھی محسوس ہوئی تھی جب میں نے سلطان بابا کے ہمراہ پہلی
مرتبہ اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے
خشمگیں نگاہوں سے میری جانب دیکھا ''لڑکے..... اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھا کرو، بعض
مرتبہ ہلکی سی چوک کا بھی بہت بھاری خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہاں! یہ وہی خوشبو ہے اور تم نے
شاید غور نہیں کیا کہ یہ خوشبو اُس وقت پیپل کے اُس پیڑ سے بھی اُبھر رہی تھی، جب وہ لڑکی
وہاں موجود تھی اور جب میں اُس سے باتیں کر رہا تھا، لیکن تمہارے حواس کو منظر نے منتشر کیے
رکھا۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، وہاں سارا کھیل ہی حسیات کا ہے۔ حسیات پر عبور حاصل کر
گے تب ہی وجدان تک پہنچو گے.....'' میری تربیت کے دوران یہ پہلی سرزنش تھی جو سلطان با
نے مجھے کی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے اتن
بڑی بڑی توقعات کیوں وابستہ کر لی تھیں؟ میں تو ایک بہت معمولی سا انسان تھا، جس کا چند ہفتے
پہلے تک مذہب سے دُور دُور تک کوئی واسطہ، رابطہ ہی نہ تھا۔ اور پھر ماضی کی کیا بات کروں میں
تو حال کے ان دنوں میں بھی اکثر کھانے سے پہلے ''بسم اللہ'' تک کہنا بھول جاتا تھا۔ اگر
سلطان بابا میرے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتے اور وہ زور سے بسم اللہ نہ پڑھتے تو مجھ
سے ایسی روزمرہ کی نیکی بھی چھوٹ جاتی تھی۔ تو پھر جب میرے نسیان کی یہ حالت تھی تو ایسے
میں عبداللہ، مولوی خضر اور سلطان بابا جیسی بڑی ہستیاں مجھ سے کسی غیر معمولی برتاؤ کی اُمید
کیوں لگائے بیٹھے تھے؟ میں اپنی سوچوں میں گم، بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ کہتے ہیں نیند
سب سے بڑی چور ہوتی ہے۔ وہ انسان کی آدھی عمر چرا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ مجھ
سے یہ چورنی بھی رُوٹھی ہوئی تھی۔ میں یونہی کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کس وقت سلطان بابا
نے فجر کی نماز کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ سلطان بابا نے اُس نادیدہ ہستی کو
جس وقت بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی، اُس وقت رات کے تقریباً ساڑھے تین بجنے کو تھے
مطلب یہ کہ آج سہ پہر تک وہ مہلت ختم ہو جانی تھی لیکن دن تیزی سے ڈھلنے کے باوجود ابھی
تک کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ رُباب ایک آدھ بار دالان

کی طرف آئی، لیکن اُس نے ہماری جانب نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بالآخر عصر کی نماز بھی ہو گئی۔ سلطان بابا نے سلام پھیر کر میری جانب دیکھا۔ ''کیوں میاں..... کیا اب بھی وہ خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟'' میں نے حیرت سے اُن کے انداز کو ٹٹولا۔ آخر انہیں مجھ سے یہ تصدیق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ خوشبو تو اسی طرح چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو جائے نماز اُٹھاتے ہوئے بولے ''چلو تصدیق ہو گئی۔ یاد رکھو..... مشورہ کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ حواسِ خمسہ بھی کبھی کبھار دھوکا دے جاتے ہیں۔'' مطلب یہ کہ یہ خاص خوشبو، جو ہمیں محسوس ہو رہی تھی، اُس کا تعلق اُس نادیدہ ہستی کی موجودگی سے تھا۔ گویا اُس ہستی نے سلطان بابا کی مہلت کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سلطان بابا نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں کسی خاص دعا میں مشغول رہیں گے اور میں اُن کے دروازے کے باہر بیٹھ جاؤں، تب تک کسی کو اس کمرے کے اندر نہ آنے دوں، جب تک وہ خود باہر نہ آ جائیں۔ انہوں نے مجھے سختی سے تلقین کی کہ میں نماز بھی وہیں برآمدے ہی میں کمرے کے باہر ادا کروں اور کسی کو بھی انہیں پریشان کرنے سے روکوں۔ میں نے اُن کی ہدایت کے مطابق دروازے ہی پر ڈیرا ڈال لیا اور پھر اس دوران پہلے مغرب اور پھر عشاء کی نماز کا وقت بھی ہو کر گزر گیا اور پھر رات ڈھلنے لگی۔ میں گزشتہ رات بھی نہیں سو پایا تھا، اگرچہ یہ جگ راتے اب میرے لیے معمول کی بات تھے، لیکن نہ جانے وہ اندھیری رات میری پلکوں پر اس قدر بھاری کیوں ثابت ہو رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب تو مجھے ایسا لگنے لگا کہ اگر میں نے مزید اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی تو میری رُوح آنکھوں کی پتلیوں سے ہو کر باہر نکل جائے گی۔ جانے کتنی بار میرا سر ڈھلکا اور کتنی بار میں اپنی جھونک میں لڑکھڑا کر پھر سے سنبھل کر بیٹھا۔ ایسی ہی جان لیوا غنودگی کا جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اچانک کسی نے شیشے والے برآمدے کا دروازہ کچھ اس زور سے دھڑ دھڑایا کہ کمزوری چٹخنی علیحدہ ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دھماکے سے جا کھلے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے بیچوں بیچ وہی حسن بے حجاب اپنی آنکھوں میں خون اُتارے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ رُباب کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا اور بال کھلے ہوئے۔ ہم دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، پھر اُس کی سرسراتی سی آواز اُبھری ''وہ کہاں

ہیں.....؟'' غالباً اُس کا اشارہ سلطان بابا کی جانب تھا۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا ''وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔ مجھے یہی حکم ہے۔'' اس بار وہ باقاعدہ غرائی ''کیوں نہیں مل سکتے۔ بلایا ہے تو ملنا بھی پڑے گا۔'' اُس نے قدم آگے بڑھائے اور میں باقاعدہ دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی راہ میں مزاحم کھڑا دیکھ کر اُس کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ ''ہٹ جاؤ میرے راستے سے، ورنہ.....'' ابھی اس کی بات آدھی منہ میں تھی کہ اندر کا دروازہ کھل گیا اور مجھے اپنی پشت سے سلطان بابا کی آواز سنائی دی۔ ''اِسے اندر آنے دو عبداللہ میاں.....ہم اِسی کا انتظار کر رہے تھے۔'' میں اُلجھن آمیز حیرت لیے سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ تنتناتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ وہ سلطان بابا کے بالکل سامنے جا کر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''آپ ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا، جب کہ وہاں وہ فرد واحد تھی۔ سلطان بابا نے غور سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''میں نے پہلے ہی تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ بارہ گھنٹے کی مہلت کے بعد مزید مہلت نہیں ملے گی۔ تم میرا سامنا کرنے سے کیوں کتراتے ہو۔ اس معصوم کا سہارا کیوں لے رہے ہو.....؟'' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُن دونوں کے درمیان یہ کس قسم کی گفتگو جاری تھی۔ یہ سوال کس سے کیے جا رہے تھے اور جواب کون دے رہا تھا۔ رُباب نے بے بسی سے سر پٹخا اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے وسط میں پڑی چھوٹی سی تپائی کے نچلے حصے میں ایک قلم اور کاپی رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اُٹھا لیں اور جلدی سے چند حرف گھسیٹ کر کاغذ پھاڑا اور سلطان بابا کے حوالے کر دیا۔ بابا نے غالباً مجھے سنانے کے لیے بلند آواز میں تحریر پڑھی۔ ''میں آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتا، نہ ہی میں رُباب کے نازک اور کومل وجود پر طاری ہو کر اور اُسے اذیت دے کر آپ سے دوبدو بات کرنا چاہتا ہوں، آپ کو سلیمان علیہ السلام کا واسطہ.....آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔'' سلطان بابا نے کاغذ ایک جانب رکھا۔ ''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دو.....تم نے اب تک اسے، یا اس کے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہی تمہاری شرافت کی دلیل ہے.....لیکن تمہارا سحر بھی اس بنت آدم کے کومل وجود پر بے حد گراں ہے۔ دیکھتے نہیں، کیا حالت ہو گئی

ہے اس کی.....؟ اس کے حال پر رحم کرو..... بخش دو اِسے.....'' رُباب نے جھلاہٹ میں جلدی سے مزید چند لائنیں صفحے پر گھسیٹیں اور پھر کاغذ سلطان بابا کو تھما دیا۔ لکھا تھا ''میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں..... آپ ہمارے درمیان نہ آئیں..... میں آپ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا.....'' اس بار سلطان بابا کی آواز میں ایسی سختی تھی، جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ''یہ محبت نہیں سحر ہے..... تم ناری ہو اور یہ خاکی ہے..... اس کی رُوح پر قابض ہو کر اِسے اپنے بس میں کرنے کو تم محبت کہتے ہو..... تمہیں تو اس کی زبان بولنے کے لیے بھی خود کو اس کے قلب پر طاری کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو، میں نے اب تک حتیٰ الامکان سختی سے گریز کیا ہے۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں آخری حد تک بڑھ جاؤں۔'' تحریری جواب آیا۔ ''میں آپ کی حد جانتا ہوں، اس لیے ملتجی ہوں کہ مجھے میری حد تک نہ دھکیلیں..... ناری اور خاکی کا سوال تو تب اُٹھتا، جب بات جسم کے ملاپ کی ہوتی، یہ رُوح سے رُوح کے ملن کا مقدمہ ہے..... آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بولی، یہ لفظ بھی میرے نہیں ہیں، لیکن لفظ تو بس رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی دنیا سے رابطے کے لیے یہ ذریعہ بھی اپنانا پڑا تو میں اپنا لوں گا۔ آپ جو شرط بھی لگائیں گے مجھے قبول ہوگی، بس مجھے یہاں سے بے دخل نہ کریں..... مجھے یہیں ایک کونے میں پڑا رہنے دیں۔ میری ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی.....'' اس مرتبہ سلطان بابا باقاعدہ گرجے۔ ''بس..... بہت ہو گیا۔ یہ فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ تمہیں اس لڑکی کی رُوح پر سے اپنا قبضہ اُٹھانا ہوگا، ورنہ.....'' لیکن سلطان بابا کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رُباب وہاں سے اُٹھ کر واپس چل دی۔

میں نے سائنس کی اصطلاح میں ہپناٹزم کے بارے میں پڑھ ضرور رکھا تھا، لیکن اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اس ہپناٹزم کے زیر اثر دیکھا تھا۔ اگر یہ سارا عمل میری آنکھوں کے سامنے نہ ہوا ہوتا تو میں ضرور اسے کسی ایسے ہی ٹرانس کا کرشمہ سمجھتا، لیکن سائنس کی اب تک کی حد انسانی ذہن کی مقرر کردہ ہے، جب کہ عبداللہ کا لقب پانے کے بعد جس متوازی دنیا کا میں مسافر بننے جا رہا تھا، اس کی سرحد ہی شاید وہاں سے شروع ہوتی تھی، جہاں آ کر سائنس کی حدیں دم توڑ دیتی تھیں۔ یہ کیسا عجیب واقعہ تھا، جو میری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر تھا۔ آسیب کے قصے تو میں بھی بچپن ہی سے سنتا آیا تھا اور بچپن میں تو ہم باقاعدہ ایک دوسرے کو

''اُلٹے پیروں والی چڑیلوں'' کے قصے سنا سنا کر ڈرایا بھی کرتے تھے۔ شاید رات اور اندھیرے کے خوف سے جو ایک براہ راست تعلق ہوتا ہے ایسے قصوں کو جنم دینے میں اُس کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے، لیکن یہاں تو آسیب، ایک گل رُخ کی محبت میں نہ صرف خود گرفتار تھا، بلکہ اُسے اس دل رُبا کے محبوب ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ کیا واقعی جن وانس کے درمیان ایسی کسی محبت کا گمان بھی پایا جا سکتا ہے؟ مجھے ایک مرتبہ پھر سے ''محبت'' نامی اس عفریت کی بے پناہ قوت کا اندازہ ہوا۔ یاقوط نامی یہ نادیدہ ہستی، جو عام حالات میں شاید اپنی ایک پھونک سے اس پوری حویلی کو تہس نہس کر سکتی تھی، جو شر اور بگاڑ پیدا کرنے پر آ جاتی تو شاید اُسے روکنا بھی ہم کمزور انسانوں کے بس میں نہ ہوتا، لیکن ایک نازک سی لڑکی نے اُسے اس قدر مجبور و بے بس کر ڈالا تھا کہ وہ خود سوالی بن کر ہم انسانوں کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ بظاہر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ یاقوط نے سلطان بابا کی تنبیہ کا اثر نہیں لیا تھا۔ خود سلطان بابا کے ذہن میں بھی یہ بات کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگی کہ زیادہ سختی لڑکی کے لیے کسی مصیبت کا باعث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اس حویلی نے اب تک یاقوط کا ایک ہی رُخ دیکھا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر بیک وقت صحرا اور ساون ہوتا ہے۔ البتہ ہمارے اندر کا ساون ہمارے اردگرد موجود کسی ایک آدھ خوش نصیب کے اُوپر ہی برستا ہے، باقی اپنے تو ساری عمر ہمارے اندر کے صحرا کی تپش ہی جھیلتے رہتے ہیں۔ یاقوط کے اندر کا ساون بھی صرف رُباب کی حد تک ہی تھا اور ڈھلتی ہوئی وہ بھیگی رات مجھے ہر پل یہ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں اس کے صحرا کی پیاس ہمارے حلق میں کانٹے چبھو جائے گی۔

فجر کی نماز پڑھتے ہی سلطان بابا نے چند پڑھی ہوئی میخیں اُٹھائیں اور میرے ہاتھوں انہیں ٹھیک پیپل کی جڑوں کے قریب گاڑھ دیا۔ اور شاید ٹھیک اِسی وقت رُباب کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ سورج نکلنے تک اُس کی وحشت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اُسے قابو میں رکھنے کے لیے اُس کی ماں اور بہن کو باقاعدہ جکڑنا پڑ رہا تھا۔ شاید گھر کے کسی نوکر نے عامر کو بھی خبر کر دی تھی اور صبح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ اپنے سینئر ڈاکٹر اور نفسیات کے ایک پروفیسر کے ساتھ حویلی آ پہنچا۔ ہمیں اپنی منگیتر کے پاس دیکھ کر اُس کی تیوری چڑھ گئی۔ ''آپ لوگ ابھی تک یہی ہیں۔ پلیز آپ لوگوں کو جو چاہیے۔ وہ لے کر یہاں سے چلتے بنیئے۔ میں اپنے

سینئر کولیگز کو لے کر آیا ہوں۔ یہ سیدھا سادہ ہسٹریا کا کیس ہے۔ آپ اس میں کچھ نہیں کر سکتے، لہٰذا دخل اندازی نہ کریں تو بہتر ہوگا۔'' رُباب خشمگیں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ نفسیات کے پروفیسر نے اپنی عینک درست کی۔ ''جی جی..... بالکل..... دراصل بچی کے لاشعور میں بچپن کا کوئی خوف دبا رہ گیا ہے، جو اس گھر میں آ کر پھر سے اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ ہمیں اس کے دل سے یہ ڈر نکالنا ہوگا۔'' سینئر ڈاکٹر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''ہسٹریا کی بہت سی اُقسام ہوتی ہیں، لیکن ان سب کا علاج ممکن ہے۔ بس ہمیں مریض کے آرام.....'' لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رُباب زور سے چلائی۔ ''چلے جاؤ..... نکل جاؤ تم سب یہاں سے.....'' حاجی رزاق اور اُن کی بیگم لاچار سے کھڑے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سلطان بابا نے سکون سے ڈاکٹروں کی ساری بات سنی اور پھر دھیرے سے بولے۔ ''آپ کا مریض آپ کے سامنے ہے۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں، اس کی دوا کر سکتے ہیں۔ مجھے بس اس کے لیے دعا کرنے دیں..... کیا مجھے دعا کی اجازت بھی نہیں دیں گے آپ لوگ؟'' سلطان بابا کی بات نے وقتی طور پر انہیں لاجواب کر دیا اور ڈاکٹر صاحبان نے اپنے بکس کھولے اور انجکشن وغیرہ تیار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلطان بابا مجھے لیے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں بہت دیر اُسی پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ سائنس اور رُوحانیت کا یہ جھگڑا آخر کب تک چلے گا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ دنیا میں سائنس پہلے وارد ہوئی تھی، یا رُوحانیت۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں علم اپنے اندر ہر سوال کے جواب کی وسعت رکھتے تھے۔ اگر میں نے رُباب کو رات کو اس رُوپ میں نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی ان ڈاکٹرز کی بات پر یقین کرنے میں کچھ تامل نہ ہوتا، لیکن سائنس تو صرف جسم کے زخموں کو مندمل کرنا جانتی ہے..... اور اگر کسی کی رُوح گھائل ہو تو وہ کہاں جائے.....؟ ہماری زندگی میں دعا کی کیا اہمیت ہے؟ دعا کو عبادت کا مغز کیوں کہا گیا ہے؟ معجزہ کسے کہتے ہیں؟ معجزات اور دعاؤں کا آپس میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جس متوازی دنیا کے اسرار جاننے کے لیے میں گھر سے نکلا تھا، اس دنیا کے زخموں کی پہلی سائنس ہی ''دعا'' تھی۔ اور اس دنیا کی بیماری اور روگ سحر اور جادو تھا۔ میرے ذہن میں ایک اور عجیب بات بھی آئی کہ جب سائنس

نہیں تھی، تب ایسے روگوں کی دوا کیا ہوتی ہوگی؟ میرے خیالوں کا تسلسل اندر سے بلند ہوتی رُباب کی چیخوں نے توڑ دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا جانے کب کے مہمان خانے کی طرف جا چکے تھے۔ رُباب کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے میں نے اُسے ڈاکٹروں کے نرغے میں درد اور بے چینی سے تڑپتے ہوئے، زور لگا کر چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اور کرب سے چلاتے ہوئے دیکھا۔ سلطان بابا نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ انہوں نے پیپل کے پیڑ کے گرد یاقوط کے لیے آخری بندش لگا دی ہے اور اب اگلے چند گھنٹے نہایت سخت گزریں گے، کیوں کہ اب وہ نادیدہ ہستی بے ٹھکانہ ہو چکی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اب کھلی جنگ کا طبل بج چکا تھا اور سلطان بابا کی پیش قدمی کے بعد اب ہمیں یاقوط کی جوابی کارروائی کا منتظر رہنا چاہیے تھا۔ لیکن رُباب اتنی بے چین کیوں تھی؟ کیا یہ کرب اور تکلیف واقعی ایک محبوب پر لگائی گئی پابندیوں کا نتیجہ تھا، یا پھر سینئر ڈاکٹر کے بقول، یہ اُسی ہسٹریا اور خوف کی کیفیت تھی جو رُباب کے لاشعور میں بہت پہلے سے کہیں چھپا بیٹھا تھا اور روپ بدل بدل کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم اُس نازک سی لڑکی کو بے قرار سا تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں کھڑکی سے باہر کافی فاصلے پر، لیکن بالکل سیدھ میں پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا تھا۔ جانے اُس ایک نظر میں کیا کچھ تھا، بے بسی، لاچاری، غصہ، رحم کی فریاد، شکایت اور گلہ۔ مجھے یوں لگا کہ وہ نظر صرف نظر نہیں، کسی گھائل کی آخری آہ ہے۔ جو زہر میں بجھے ایک تیر کی طرح عین میرے دل کے وسط میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔ میں گھبرا کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا، لیکن اس کے بعد پورا دن ایک عجیب سی بے چینی میرے سارے رگ و پے میں دوڑتی رہی۔ کئی بار جی میں آیا کہ سلطان بابا سے اس بدنصیب کے لیے رحم کی اپیل کر دوں۔ آخر ہمیں کیا حق حاصل تھا، کسی کے خوابوں کی سلطنت کو یوں تخت و تاراج کرنے کا۔ اگر یاقوط نامی کوئی ہیولا رُباب کے خوابوں کا مرکز بن چکا تھا اور چاہے وہ صرف ایک سپنا ہی تھا اور رُباب کے انتہائی طاقت ور تخیل نے اس خواب کو اُس کے سامنے ایک حقیقت کے روپ میں لا کھڑا کیا تھا، تب بھی ہم کون ہوتے ہیں کسی کے خوابوں پر ڈاکا ڈالنے والے؟ اور پھر اُس کا منگیتر اور باقی ڈاکٹر اپنی سی کوشش تو کر ہی رہے تھے، کم از کم ہمیں اُس لڑکی کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایک بات کا شدت سے

احساس کیوں ہوا کہ کبھی کبھی یہ دنیا بُروں کی وجہ سے اتنی بُری جگہ نہیں بنتی، جتنا بُرا اسے ہم جیسے "اچھے" بنا دیتے ہیں۔ رُباب کی اس بے کل نظر کے بعد میں خود بھی سارا دن بہت بے چین سا پھرتا رہا۔ سلطان بابا اپنے وظیفے میں مشغول تھے، لہٰذا اُن سے اپنی یہ بے کلی بانٹنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

شام کو پھر وہی ڈاکٹروں کی ٹیم آئی اور پھر سے وہی سارا سلسلہ دوبارہ دہرایا گیا۔ جب وہ لوگ حویلی کے پورچ سے نکل رہے تھے، تب میں وہیں دالان ہی میں موجود تھا۔ سینئر ڈاکٹر، عامر سے کچھ بات کر رہا تھا کہ "آج کل ڈائی پولر تھیوری آف گرے ویٹیشن (Dipolar Theory Gravitation) کا بہت چرچا ہے۔ عامر تم انٹرنیٹ پر ضرور اس صفحے کی تفصیلات پڑھنا۔ انسان کا لاشعور اس سے کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور بھئی مغرب تو یہ بات ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ ہم بذات خود ایک واہمہ ہیں، ایک حقیقی دنیا کا ساتواں عکس ہیں۔ ایسے میں اگر رُباب کسی متوازی دنیا کے خواب کو حقیقت سمجھ بیٹھی ہے تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ بس ایک ذرا سا سرا مل جائے اس گتھی کا، ہم یہ کیس ضرور حل کر لیں گے۔ یو جسٹ ڈونٹ وری ڈیئر، یہ صرف اور صرف خواب در خواب کی بیماری ہے۔ ہمیں سب سے پہلے رُباب کو اُس کے آخری خواب سے باہر لانا ہوگا۔ پھر آخر سے پہلا اور پھر دوسرا۔ دراصل وہ خواب میں بھی خواب دیکھ رہی ہے۔ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں..... لیکن یاد رہے..... بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی اور ہم نے رُباب کے خواب در خواب کے تسلسل کو اسی طرح سے توڑا کہ ہم نے اُس کے آخری خواب سے پہلے کے کسی خواب کو راستے میں چھیڑ دیا تو پھر ہمارے ہاتھوں سے اس بھول بھلیاں کا یہ راستہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا۔ اور رُباب یونہی ساری عمر کے لیے بھٹکتی رہ جائے گی....." وہ سارے کافی دیر تک وہیں سر جوڑے رُباب کی بیماری پر بحث کرتے رہے۔ تو گویا نفسیات کی اصطلاح میں رُباب پیاز کی تہوں کی طرح تخیل کے جال میں پھنس گئی ہے اور اب اُسے اس خوابوں کی دنیا سے نکالنے کے لیے پیاز کی آخری تہ سب سے پہلے کھولنی ہوگی اور پھر ترتیب وار اُسے اس تخیل کے جالے سے نکالنا ہوگا۔ اور اس سارے عمل میں اگر کہیں غلطی سے بھی کوئی غلط تہ کھل گئی تو رُباب ہمیشہ کے لیے اپنے اُسی خواب کی تہ کی قیدی بن جائے گی۔

اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کہیں میں خود بھی تو کسی ایسے ہی خوابوں کے جالے میں پھنسا وقت کا شکار تو نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی تو ایسے ہی منظر دکھائی دیتے رہے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی چند لمحوں کے بعد مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں، کہیں درگاہ میں داخلے کے وقت سے لے کر اب تک میں خود بھی کسی خواب در خواب سلسلے کا شکار تو نہیں ہوتا گیا تھا؟ یا خدا..... یہ کیسے بھید، کیسے راز تھے؟ میں اِسی اُلجھن کے تانے بانے بنتا اور اُدھیڑتا رہا۔ جانے کب رات ڈھلی اور کب حویلی میں سناٹے نے اپنا راج پھیلایا، مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ سلطان بابا تو ویسے بھی عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور جاتے وقت وہ خاص طور پر مجھے تاکید کر کے گئے تھے کہ انہوں نے یاقوط کے غیر مرئی وجود کے لیے پوری حویلی ہی کو بندش لگا کر جائے ممنوعہ میں تبدیل تو کر دیا ہے، لیکن وہ اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں ہے، لہٰذا اُسے جہاں سے بھی ایک ذرا سی بھی درز، یا کوئی ایسی جھری ملی کہ جس سے وہ پھر سے خود کو اس ماحول میں تحلیل کر سکے تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بنا، اپنی پوری طاقت سے اس موقعے کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے میں اگر ذرا سی بھی کوئی خلاف معمول حرکت، یا بات محسوس کروں تو فوراً انہیں مطلع کر دوں۔ میں اِی فکر میں اپنے ذہن کے ریشے اُدھیڑتا رہا اور رات بھیگتی گئی۔ شاید ساڑھے تین کے آس پاس کا کوئی وقت ہوگا کہ اچانک ہی میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے۔ وہی مخصوص سی خوشبو مجھے اپنے اطراف تیرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے کئی بار سر جھٹک کر خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا وہم ہے۔ سلطان بابا نے پوری حویلی کے گرد ایک غیر مرئی آہنی دیوار اُٹھا رکھی تھی، جس میں کوئی چھید، کوئی نقب لگانا ناممکن تھا تو پھر یہ خوشبو کیسی.....؟

اچانک باہر دالان میں کوئی کھٹکا سا ہوا۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ آواز پیپل کے پیڑ کی جانب ہی سے آئی تھی۔ میں نے چند لمحے سلطان بابا کے کمرے کی جانب سے کسی حرکت کی توقع میں انتظار کیا، لیکن اِسی اثناء میں دوسرا کھٹکا ہوا اور میرے قدم میکانکی انداز میں باہر کی جانب اُٹھ گئے۔ میں نے برآمدے کا دروازہ کھولا تو سرد بھیگی ہوا کے ایک جھونکے نے میری سوئی ہوئی رُوح تک کو پہلی سلامی دے کر جگا دیا۔ باہر دالان میں بھی وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اُس کی مہک کی شدت اندر برآمدے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں جلدی سے ننگے پاؤں ہی باہر نکل آ

فا۔ گھاس پر جمی شبنم کے قطرے کسی تیز برچھی کی نوک کی طرح میرے تلوؤں میں پیوست ہو کر میرے وجود کو چھیدتے ہوئے میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ خوشبو مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے..... جگاتا ہوا جادو آئے
تجھ کو چھو لوں تو پھر اے جانِ تمنا
مجھ کو دیر تک اپنے بدن سے تیری خوشبو آئے

پیپل کے پیڑ کی جانب سے ایک آہٹ بلند ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا، کسی کا نازک وجود فضا میں پھیلی دُھند اور کہرے پر تیرتا ہوا سا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری بصارت کو اپنی دو آنکھوں میں سمو کر کہرے کی اس سفید چادر کو چیرنے کی کوشش کی۔ سیاہ لباس میں ملبوس اس نازنین کا آنچل ڈھلکا اور میرے وجود میں روشنی کے کئی مینار پھوٹ پڑے۔ میرے سامنے زہرا بے نقاب کھڑی تھی۔ ہاں..... وہی..... میری اپنی..... زہرا۔

صلیب عشق

ہاں وہ زہرا ہی تھی اور وہی اُس کا رُوح کے اندر تک جذب ہو جانے والا حسن تھا لیکن وہ یہاں سیکڑوں میل دُور، رات کے اس سناٹے میں کیا کر رہی تھی۔ وہ مجھے یونہی ایک ٹک دیکھتی رہی۔ دفعتہً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا وجود ایک پل میں ہی کئی من بھاری ہو گیا ہے۔ میرے کاندھوں میں اس اچانک بوجھ کی وجہ سے شدید درد اُٹھا لیکن شاید میں زہرا کو اپنے سامنے پا کر یہ سب بھول ہی گیا۔ میں لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ ''آپ یہاں.....؟ اس وقت.....لیکن کیسے.....؟'' زہرا اپنی مخصوص سی دھیمی مسکراہٹ اپنے کومل ہونٹوں میں دبا کر بولی ''کیوں..... میں یہاں نہیں آ سکتی.....؟ کیا سبھی کرامات صرف آپ کے لیے ہی مخصوص ہیں.....؟.....'' میں لاجواب سا ہو گیا لیکن میری اُلجھن فزوں تر ہوتی گئی..... ''لیکن پھر بھی.....میرا مطلب ہے.....؟'' اُس نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''بس اور کچھ نہ کہو..... جانے کتنی صدیوں سے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میری یہ پیاسی آنکھیں، خشک اور بنجر پڑی ہیں۔ خاموش رہو اور میرے من پر اپنی شبیہ کا ساون برسنے دو.....'' میں نے چونک کر زہرا کو دیکھا۔ اُس نے آج تک کبھی مجھے ''تم'' کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اُس کی محویت اور بے خودی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم پیپل کے پیڑ کی اوٹ میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جو لوگ زندگی میں اس صلیب عشق پر اپنا وجود وار چکے ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ خاموشی اور تنہائی کے ایسے چند لمحے جب ہونٹ خاموش ہوتے ہیں اور صرف سانسیں بولتی ہیں۔ یہ لمحے سات جنم میں بھی صرف ایک آدھ بار ہی کسی نصیب والے کا مقدر بنتے ہیں۔ لیکن کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں کہ ہماری رُوح اُن سے کبھی سیراب نہیں ہوتی، جن سے ہماری آنکھیں کبھی نہیں تھکتیں۔ جن کو نہارنے کے دوران ہمیں اپنی پلکیں موندھنے کا وقفہ بھی صدیوں جیسا لمبا اور اذیت ناک لگتا ہے کہ جس مقام پر پہنچ کر ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد حاصل ہو

جاتا ہے اور جس کے بعد اپنی پہلے گزری اور بعد میں بسر ہونے والی ساری زندگی صرف اور صرف وقت کا ضیاع ہی لگتی ہے۔ وہ لمحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ نہ جانے ہم دونوں کتنی دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرا تمام حافظہ میرے ذہن کی سلیٹ سے مٹ سا گیا ہے۔ صبح کی سپیدی پھیلنے سے کچھ دیر قبل وہ کھڑی ہو گئی۔ ''اب میں چلتی ہوں..... کل پھر اِسی وقت یہیں ملاقات ہو گی لیکن دھیان رہے..... میرے یہاں آنے کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہیے..... ورنہ میرا یہاں آنا مشکل ہو جائے گا.....'' میری زبان سلب ہی رہی اور وہ دھیرے دھیرے دُھند کی چادر میں بہتی ہوئی اندھیرے کا حصہ بن گئی۔ میرا جسم تپ رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آ کر اپنے بستر پر گر گیا۔ اور صبح جب میں فجر کی نماز قضا ہو جانے کے باوجود سلطان بابا کے کمرے میں نہیں گیا تو روشنی ہونے کے بعد وہ میرے کمرے میں آئے اور میرا جسم چھوتے ہی انہیں میرے شدید بخار کا پتا چل گیا۔ حاجی رزاق تو بالکل ہی بوکھلا گئے اور میں نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی اپنے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیوں کی سرد لہر محسوس کرتا رہا جو شاید حاجی رزاق کا نوکر وقفے وقفے سے میرے ماتھے پر رکھ رہا تھا۔ عصر تک میری جان میں کچھ جان آئی۔ آنکھیں کھولیں تو سلطان بابا کو اپنے سرہانے متفکر سا بیٹھا دیکھ کر میں نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ ''لیٹے رہو میاں..... یہ بخار اچانک کہاں سے پال لیا.....؟'' میں نے انہیں رات کا واقعہ بتانے کی کوشش کی لیکن میرے لفظ کھو سے گئے تھے۔ شدید تھکن اور نقاہت کے مارے میرے منہ سے صرف ''ہوں، آں'' کے علاوہ کچھ نہیں نکل پایا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں کمرے میں گھٹن محسوس کر رہا ہوں، لہٰذا مجھے باہر کھلی فضا میں لے جائیں۔ باہر شام کی ٹھنڈی ہوا نے میرے حواس کافی حد تک بحال کر دیئے۔ باہر اس وقت سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ہاں البتہ ایک بات ضرور خلاف معمول تھی۔ آج رُباب بالکل پُرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ میری کرسی دالان میں جہاں ڈالی گئی تھی وہاں سے میں عامر اور اُس کے ڈاکٹروں کی ٹیم کو اپنی پہلی کامیابی پر خوشی مناتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ عامر اپنے سسر کو یقین دلا رہا تھا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ خاص نفسیات کا مسئلہ ہے۔ آپ نے دیکھا، ڈاکٹر ذاکر کے کل کے پہلے ہی ڈوز نے کتنا اثر ڈالا ہے اور آج رُباب کس قدر پُرسکون ہے.....؟..... آپ خواہ مخواہ

ہی وسوسوں میں پڑے ہوئے تھے، دنیا کی ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج سائنس کے پاس نہ ہو۔" حاجی رزاق کے چہرے پر بھی اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے رُباب دالان کی طرف نکلی تو میری نظر دُور سے اُس کے شانت وجود پر پڑی۔ اچانک وہ پلٹی اور اُس کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کئی گز دُور ہونے کے باوجود اُس کی وہ دو بڑی بڑی کالی اور سلگتی ہوئی سی آنکھیں بالکل میری گھائل آنکھوں کی پلک سے پلک جوڑے مجھے گھور رہی ہیں۔ وہ چند لمحے مجھے یونہی دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر اندر چلی گئی۔ اور میرا جسم پھر سے اُسی بے پناہ بوجھ تلے دبتا گیا لیکن میں پھر چاہ کر بھی سلطان بابا کو کچھ نہیں بتا پایا۔ وہ میری بیماری کی وجہ سے پہلے ہی کافی پریشان تھے اور میں اُن کے چہرے پر مستقل ایک بے چینی اور تفکر کا سایہ دیکھ رہا تھا۔ جب بھی میری اُن سے نظر ملتی وہ مجھے میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈتے سے ہوئے نظر آتے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ ہی دیر بعد اُن کی کھوجتی نظر سے کچھ خوف سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لہٰذا مغرب کے قریب میں سرد ہوا کا بہانہ کر کے وہاں سے اندر اپنے کمرے میں اُٹھ آیا۔ میرا رُواں رُواں اس وقت آدھی رات کا وقت جلد از جلد ہونے کے انتظار میں جلا جا رہا تھا لیکن یہ ستم گر وقت تھا کہ لمحوں کو صدیوں میں تبدیل کر کے کٹا رہا۔ اوپر سے سلطان بابا کی وہ کڑکتی نظر، جو مجھے اپنے وجود کے اندر گڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے سکون کی سانس لی لیکن وقت ٹالنے کا جان لیوا مرحلہ اب بھی ویسے ہی درپیش تھا۔ میں دھیرے سے اُٹھ کر برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا اور اپنی نظروں میں سات جنموں کا انتظار لے کر اُس جانب دیکھنے لگا جہاں سے کل رات زہرا آئی تھی اور پھر وہی گھڑی کی ٹک ٹک اور وہی میری پلکوں کی دوئیاں.....شاید میری قضا سے کچھ لمحے پہلے وہی آہٹ اُبھری اور میں یوں لپک کر باہر نکلا کہ جیسے شدید پیاس میں دم توڑنے والے کسی زخمی کے لب پانی کے آخری بچے ہوئے قطرے کے لیے کھلتے ہیں۔ باہر وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں تیز قدموں سے پیپل کے پیڑ کے عقب میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں میری سماعتوں کو نئی زندگی بخشنے والی قدموں کی وہ چاپ اُبھری جو ہمیشہ ہی میرے دل کی دھڑکنوں کو اُتھل پتھل کر دیتی تھی۔ زہرا اُسی جانب سے چلتی ہوئی آئی اور آ کر میرے مقابل کھڑی ہو گئی اور گزشتہ رات ہی کی طرح میں پھر سے وہ سارے سوال

بھول کر مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ جتنی مرتبہ زہرا میرے سامنے آئی تھی، چاہے درگاہ میں، یا چاہے کہیں اور..... ہر بار میری یہی حالت ہوئی تھی۔ اُس کے یاقوتی لب ہلے اور میرے کان میں جیسے پھر سے وہی انجان سرگوشی سی ہوئی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی "یاقوط..... تم آ گئے..... کتنا انتظار کرواتے ہو....." میں چونکا لیکن اُس کی وہ جان فزا مسکراہٹ مجھے کب کچھ سوچنے دیتی تھی۔ وہ دو قدم بڑھا کر میرے اور قریب آ گئی اور اُس کی مہکتی ہوئی سانسیں میری شہ رگ کو چھو کر میری رگ جان میں ایک نئی زندگی بھر گئیں۔ جانے لوگوں نے زندگی کو صرف سانس لینے سے کیوں متصل کر رکھا ہے۔ زندگی تو کچھ اور شے ہے۔ سانس لینے اور جینے سے بہت بڑھ کر، بہت سوا ہے، جیسے زہرا کے میرے قریب آنے کا وہ لمحہ۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں زندگی کی وہ لہر اپنی رُوح میں سینچتا، ایک چنگھاڑتی ہوئی دھاڑ سنائی دی "عبداللہ....." میں گھبرا کر پلٹا اور سلطان بابا کو اپنے پیچھے غصے میں تنتناتے ہوئے آتے دیکھا۔ زہرا نے ڈر کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ "یہ شخص ہمیں جُدا کرنے آ رہا ہے یاقوط..... مجھے اس سے بچا لو..... بچا لو مجھے۔" میں نے بھی زہرا کو بچانے کی خاطر خود کو اُس کی ڈھال بنا لیا۔ سلطان بابا کی آنکھوں سے غصے کے مارے چنگاڑیاں سی نکل رہی تھیں۔ وہ میرے قریب آئے اور بنا کچھ کہے اُن کا ہاتھ اُٹھا اور پوری قوت سے گھوم کر میرے چہرے پر ایک زوردار چانٹے کا نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ تھا، یا کوئی بجلی کا جھٹکا، ایک ہی لمحے میں میرا سر کچھ اس طرح چکرایا کہ مجھے ساری دنیا ہی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میری بند ہوتی آنکھوں نے پلٹ کر زہرا کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہاں رُباب کو کھڑے دیکھ کر میرے رہے سہے حواس نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہی موجود تھا لیکن میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے بیک وقت کسی نے سیکڑوں سوئیاں پرو دی تھیں۔ سلطان بابا میرے سرہانے ہی آنکھیں موندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ ہونے پر انہوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ "اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟" میں کچھ بول نہیں پایا۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد تھا کہ رات کو میں زہرا کے قریب کھڑا تھا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ لیکن رُباب وہاں کہاں سے آ پہنچی تھی۔ سلطان بابا نے میری آنکھوں میں اُبھرتے

سوال پڑھ لیے اور گہری سی سانس لے کر بولے۔ ''شکست انسان کا مقدر تب بنتی ہے جب وہ اپنے قلعے کی ہر درز، ہر روشن دان، ہر دروازے پر پہرے بٹھا کر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، بنا یہ جانے کہ وہ جن پہرے داروں کو پہرے پر چھوڑ آیا ہے دشمن انہی میں سے اپنا راستہ تلاش کرنے کی دُھن میں ہے۔ اُس نے تمہی پر کمند ڈال کر میرے قلعے میں نقب لگائی ہے میاں..... بڑی بھول ہو گئی مجھ سے..... سبھی جگہوں پر بندش لگا دی لیکن تمہیں بھلا دیا۔ سچ ہے، انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے.....'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔ اتنے میں باہر سے رُباب کی چیخیں بلند ہونے کی آوازیں آنے لگیں اور پتا چلا کہ اُس کی حالت پھر سے بُری طرح بگڑ چکی ہے۔ سلطان بابا کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ شاید جس وقت میں رُباب کی کھڑکی کے سامنے کھڑا اُسے ڈاکٹروں کے نرغے میں تڑپتا ہوا دیکھ رہا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے میرا دل رُباب اور یاقوط کی ماورائی سی محبت کے لیے نرم پڑ رہا تھا شاید اُسی وقت اُس نادیدہ ہستی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے سلطان بابا کے آہنی حصار میں کہاں سے نقب لگانی ہے اور اُسی رات اُس نے میرے وجود پر اپنا قبضہ مضبوط کر لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ رُباب جو جانے کب سے یاقوط کو کسی سانچے، کسی روپ میں دیکھنے کی خواہش میں فنا ہوئی جا رہی تھی اُسے بھی اپنے محبوب کو کسی انسانی صورت میں اپنی آنکھوں سے نہارنے کا موقع مل گیا۔ میرے حواس کو اُس زور آور ہستی نے کچھ اس طرح سے جکڑا کہ خود مجھے بھی رُباب نہیں، زہرا ہی دکھائی دی۔ بقول سلطان بابا وہ مجھے وہی کچھ دکھا رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے من میں بنے عکس کو ہی اُس نے رُباب کے وجود کے آئینے سے بدل کر رُباب کو زہرا کی صورت میں مجھے دکھایا۔ جس وقت سلطان بابا میرے ساتھ ہوئی اس ''واردات'' کی خبر مجھے سنا رہے تھے اس وقت بھی میرا پورا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ یہ جذبے کیا اتنے طاقت ور بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ ہمارے جسم میں، ہماری رگوں میں داخل ہو کر اور ہماری نسوں میں خون بن کر اس طرح دوڑ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے اندر کی ساری فزیالوجی بدل سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے علاوہ مجھے اپنے بخار کی اور کوئی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں سلطان بابا سے بھی شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا کیوں کہ اُن کی ساری محنت صرف میرے اس کمزور وجود کی وجہ سے مٹی میں مل گئی تھی۔ دوسری طرف باہر دالان میں عامر اور باقی سارے ڈاکٹروں کی ٹیم اس

ت کی کھوج میں اپنا سر پیٹ رہی تھی کہ آخر ۲۴ گھنٹے میں ہی ایسی کیا کایا پلٹ ہوگئی کہ سب
کچھ تلپٹ ہوکر رہ گیا تھا اور رُباب ایک بار پھر سے ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے شام ڈھلتی
گئی میرے اندر بے چینی کی سوئیاں پیوست ہوتی گئیں اور مکمل اندھیرا ہونے تک میں خود
آگ سے بنا ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔ میرے وجود کا قابض اپنے خونخوار پنجے میری رُوح
میں دھیرے دھیرے گاڑھ رہا تھا اور کرب اور بے چینی سے میں اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخ رہا تھا۔
یہاں رُباب کی بھی یہی حالت تھی۔ سلطان بابا دو قدم میرے دروازے میں رُکتے تو اگلے ہی
لمحے حاجی صاحب کے بلاوے پر انہیں اندر زنانے کی طرف دوڑ لگانا پڑتی تھی۔ مجھے یوں
محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود کے اندر قطرہ قطرہ کر کے کوئی سیاہ سیال مادہ ٹپکایا جا رہا ہے
جو میرے سرخ خون میں شامل ہو کر میرے وجود کے اندر تاریکی بھر رہا ہے۔ میری سانسیں
غراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سب کچھ تہس نہس کر دوں۔
میری حالت دیکھتے ہوئے سلطان بابا نے نوکروں کو میرے کمرے کا دروازے باہر سے بند
کرنے کی ہدایت کر دی۔ کیوں کہ انہیں خود رُباب کی حالت کے پیش نظر زنانے کی طرف
بھی توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ آخر کار آدھی رات کے ٹھیک اُس لمحے جب میں گزشتہ رات رُباب
سے ملنے کے لیے دالان کی طرف گیا تھا، میری آواز بھی میرے لیے اجنبی ہو چکی تھی۔ مجھے
یوں لگا کہ خود میرے اندر سے اس غراہٹ بھری آواز میں کوئی اور بول رہا ہے۔ میں زور سے
چلایا۔ ''سلطان بابا.....'' کچھ ہی دیر میں بابا کمرے میں داخل ہوئے تو گھبرائے ہوئے سے
حاجی رزاق بھی اُن کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے تڑپ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن تب مجھے پتا چلا
کہ جانے میری غنودگی کے کس لمحے میں حاجی صاحب کے نوکر سلطان بابا ہی کی ہدایت پر
میرے ہاتھ میری پشت پر پلنگ کی لوہے والی جالی کے ساتھ باندھ چکے ہیں۔ میں نے زور
سے خود کو جھٹکا دیا اور بولا، لیکن وہ لفظ میرے تھے اور نہ ہی وہ لہجہ..... ''آپ اپنی سی ہر کوشش
کر کے دیکھ چکے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ چند لمحوں کی یہ عارضی قید مجھے میری راہ سے ہٹا
دے گی.....؟..... میں ہر قید توڑ کر اپنی منزل تک پہنچوں گا۔ اب یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔
آپ مجھے روک سکیں تو روک لیں.....''

سلطان بابا غصے سے گرجے۔ ''مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ اب یہ کھیل زیادہ عرصہ نہیں چلنے

دوں گا میں.....'' میں زور سے ہنسا۔ ''اچھا.....؟ تو پھر کیا کریں گے..... اپنے اس پیارے شاگرد کو مار ڈالیں گے کیا.....؟ یاد رکھیے، اب میں اس کے جسم سے کہیں نہیں جانے والا..... مجھے اس کے جسم سے نکالنے کے لیے آپ کو اپنے اس عزیز کے جسم نازک کو اتنی اذیت دینا ہو گی کہ اس کی سانسیں ہی بند ہو جائیں۔ صرف اس کا مردہ جسم ہی میرے اخراج کا باعث بن سکتا ہے۔ تو پھر کہیں.....؟ ہے ہمت اپنے شاگرد کو قربان کرنے کی.....؟'' سلطان بابا نے غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور میں دیوانہ وار قہقہے لگاتے لگاتے درد اور بے چینی سے بے سدھ ہوتا چلا گیا۔ جانے یہ نیند بھی کیسی راحت لکھی ہے قدرت نے ہمارے نصیب میں۔ درد چاہے کتنا ہی شدید اور مار دینے والا کیوں نہ ہو، یہ ایک مہربان ماں کی طرح اپنی گود میں تھپک تھپک کر ہمیں سلا ہی دیتی ہے اور کچھ وقت کے لیے ہی سہی لیکن ہم اپنا ہر غم، ہر دکھ، درد بھلا کر کسی معصوم بچے کی طرح اس بے رحم دنیا کی گھاتوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کاش ہم ساری زندگی ہی یونہی سو کر گزار سکتے تو اپنے دامن پر لگے اَن گنت داغوں کی کالک سے تو بچ جاتے۔ لیکن افسوس ہر اچھی چیز کی طرح یہ کم بخت نیند بھی ہم سے دامن چھڑا ہی لیتی ہے۔ سو مجھ سے بھی وہ بے وفا اپنی آنکھیں چرا گئی اور میری آنکھ کھلی تو کمزوری اور نقاہت سے میری پلکیں اُٹھنا بھی میرے لیے دوبھر ہو چکا تھا۔ میرے قریب ہی وہ بزرگ پریشان، میرے ہمدم، سلطان بابا چپ چاپ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی کلائیوں میں جلن اور سوزش کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو کٹنے جیسے گہرے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے جن میں سے ہلکا ہلکا سا خون رس رہا تھا۔ سلطان بابا نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''مجھے معاف کر دو ساحر میاں۔ کل رات تمہاری حالت کے پیش نظر میں نے ہی تمہیں باندھنے کا حکم دیا تھا اُن لوگوں کو۔'' میں نے تڑپ کر اُن کے مہربان ہاتھ سختی سے جکڑ لیے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا یہ بوسیدہ جسم اگر آپ کی راہ کی رکاوٹ بن رہا ہے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ اسے جلا کر ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں..... لیکن پھر کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالیے گا۔'' اُن کی آنکھیں شاید زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے بھیگی ہوئی دیکھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اندھیرا ہونے کے ساتھ ہی میرے وجود پر اُس عفریت کا سایہ قابض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ فجر سے لے کر مغرب سے کچھ پہلے تک میں اپنے آپے میں رہتا تھا اور پھر میرا جسم میرے لیے پرایا ہو جاتا تھا۔ میرے ذہن میں سوال اُبھرا ''تو پھر اس وقت میں خود کہاں

ہوتا ہوں؟ کیا خود اپنے ہی ذہن کے کسی پوشیدہ اور خوابیدہ گوشے میں میرا شعور جا چھپتا ہے اور میں خود بھی خواب کی کیفیت میں چلا جاتا ہوں؟'' مجھے خود سے زیادہ سلطان بابا کی فکر تھی۔ وہ تو رُباب کو اس سائے سے بچانے کے لیے آئے تھے اور یہاں خود اُن کا اپنا شاگرد بھی اُن کے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں خود کو کس طرح سے اُن کی راہ کا پتھر بننے سے روکوں۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے اس وجود کی وجہ سے ہی یاقوط سے شکست کھا رہے تھے کیونکہ میرا جسم اُن کی راہ میں حائل تھا۔ وہ مجھے اذیت نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ اب تک جانے وہ کیا کچھ کر گزرے ہوتے۔ اور یاقوط کو میرے جسم سے نکالنے کا واحد ذریعہ اب شدید اذیت ہی رہ گیا تھا۔ لیکن میں انہیں اس طرح ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اُن کی ہتھیلیاں اپنی آنکھوں سے مس کیں۔ ''میری ایک بات مانیں گے بابا.....'' انہوں نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اُن کی بھیگی پلکوں پر ٹھہرے موتیوں کو دیکھا۔ ''آپ مجھے مار ڈالیں۔ ختم کر دیں مجھے..... اگر یہی ایک ذریعہ ہے اُسے میری رُوح کے اندر سے نچوڑنے کا۔ تو آج میں اِسی وقت آپ کو اپنا خون معاف کرتا ہوں لیکن دیر نہ کریں۔ آپ کا مقصد نیک ہے اور بلا جھجک اپنا فرض ادا کریں۔'' انہوں نے میرا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ''میں جانتا ہوں..... تم میرے لیے کسی حد تک بھی جا سکتے ہو لیکن بات صرف فتح اور شکست کی نہیں ہے۔ کچھ جنگیں صرف فتح پانے کی غرض سے نہیں لڑی جاتیں۔ اوروں کا بھی بہت کچھ لگا ہوا ہے اس داؤ پر۔ بس اتنا یاد رہے کہ ابھی ہم دونوں کو بہت اذیت جھیلنی ہے لیکن ہم آخری سانس تک مقابلہ کریں گے.....'' وہ میرا سر تھپکتے رہے اور میرے بے بس آنسو اُن کے شانے کو بھگوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں خود اپنے ہاتھوں اپنی سانسیں روکنے کا کوئی بندوبست کر لوں گا لیکن اب انہیں مزید پریشان نہیں کروں گا۔ مجھے رُباب کا خیال آیا اور میرے من میں عجیب سی سوچ آئی۔

تم ہو اوروں کی محفل میں مصروف
یہاں میں ہوں اور عالم تنہائی
اب لوگ مجھے تیرے نام سے جانتے ہیں
جانے یہ میری شہرت ہے یا رُسوائی؟

وقت ڈھلتا رہا اور پھر سے وہی قاتل رات میرے سامنے اپنے خون آشام جبڑے کھولے آ کھڑی ہوئی۔ میری رگوں میں وہی بے رحم، سفاک اور جلا دینے والی آگ، انگارے بھرتی گئی۔ میری سانس بپھرتی گئی اور کچھ ہی دیر میں میری نس نس سے چنگاڑیاں سی نکلنے لگیں۔ آج میرے جنون کا یہ عالم تھا کہ بان کی بنی ہوئی وہ موٹی رسی بھی میری راہ کی رکاوٹ بننے میں ناکام ہو رہی تھی لہٰذا ایک نوکر کہیں سے ایک موٹی سی فولادی زنجیر اُٹھا لایا اور آٹھ دس بندوں نے مجھے جکڑ کر میرے پیروں میں اُس زنجیر کی بیڑی ڈال دی۔ جنوں، قفس اور آہنی بیڑیاں..... یہ تو اس بے رحم قدرت کا پسندیدہ کھیل تھا جو وہ ازل سے ہم بے بس اور لاچار انسانوں کے ساتھ کھیلتی آ رہی تھی اور شاید ابد تک یہ بے رحم تماشا جاری رہنے والا تھا۔ میری حالت دیکھ کر خود حاجی رزاق بھی رو پڑے اور انہوں نے کسی کے ذریعے عامر کو خبر کروا دی کہ وہ بھی آ کر میری دیوانگی کا یہ نظارہ دیکھ لے اور اگر اُس کی سائنس میں اس جنوں کی بھی کوئی توضیح موجود تھی تو وہ بھی بیان کر جائے۔ لیکن ناصح بھلا کیا جانے کہ زخم کے بھرنے سے پہلے ہی ہم جیسے دیوانوں کے ناخن ہمیشہ بڑھ آتے ہیں۔ عامر نے میری حالت دیکھی تو اُسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ سلطان بابا میرے قریب ہی بیٹھے بار بار کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک رہے تھے۔ اُن کی ہر پھونک سے چند لمحوں کے لیے میرے جلتے ہوئے وجود پر ایک ٹھنڈی پھواری تو ضرور پڑ جاتی تھی لیکن اگلے ہی لمحے وہ رُوح کے ریشے تک جلا دینے والی تپش پھر سے میرے جسم کو گھیر لیتی تھی۔ میرے اندر کی بے چینی مستقل مجھے رُباب کے کمرے کی جانب کھینچ رہی تھی۔ میرے اندر سے طاقت کا ایک لاوا سا اُبلنے کے لیے جیسے اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن میرے اپنے جسم کی لاچاری، کمزوری اور بوسیدگی اس طاقت کا ٹھیک استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔ ورنہ میں کب کا اس زنجیر کے ٹکڑے کر کے وہاں سے نکل چکا ہوتا۔ عامر حیرت کے عالم میں گنگ کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر وہ بھی بے چین سا ہو گیا۔ ''آپ اِسے کھول دیں ورنہ یہ خود کو کوئی نقصان پہنچا کر ہی دم لے گا۔'' سلطان بابا نے غور سے عامر کی جانب دیکھا۔ ''عبداللہ کا انسانی جسم یہ عذاب زیادہ دیر تک جھیل نہیں پائے گا۔ کیونکہ ہمارے اس فانی جسم کے برداشت کی اپنی کچھ حدیں ہیں۔ اور چونکہ اس وقت وہ عبداللہ کے جسم کی حدوں کا محتاج ہے اس لیے وہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح اِسی جسم کی آڑھ

ما رُباب تک پہنچ سکے۔ لیکن اگر اس نے زیادہ زور لگایا تو لوہے کی یہ بیڑیاں عبداللہ کے جسم
ے ریشوں میں سے گزر کر اس کی ہڈیوں کو چیر کر رکھ دیں گی۔ مگر تم فکر نہ کرو..... جب تک
برے اس پیارے کے جسم میں زندگی کی ایک بھی رمق باقی ہے میں تمہاری منگیتر تک اسے
ہیں پہنچنے دوں گا۔ تم بس اپنے رشتے کو کمزور نہ پڑنے دینا.....'' عامر نے زور سے سر ہلایا۔
مجھے یقین نہیں آ رہا..... لیکن..... لیکن یہ بھی تو پاگل پن ہے..... نہیں..... میں ایسا نہیں
نے دوں گا۔'' عامر کو یکایک نہ جانے کیا ہوا وہ بھاگتا ہوا مہمان خانے سے نکل گیا اور کچھ دیر
دھی میری جلتی ہوئی رُوح پر کسی نے جیسے ٹھنڈے پانی کی آبشار بہا دی۔ عامر رُباب کا ہاتھ
پڑے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ رُباب کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ نہایت
غ اور کمزور لگ رہی تھی۔ اُس نے رُباب کو ایک زور کا جھٹکا دیا اور وہ میرے قدموں کے
ب ہی ڈھے گئی۔ عامر زور سے چلایا۔ ''یہ لو..... میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔
ب خدا کے لیے ہمیں بخش دو۔ اگر اس معصوم لڑکی کی جان لینے سے ہی تمہاری تشفی ہو سکتی ہے
آج یہ قصہ ہی ختم کر دو۔ مار ڈالو اسے اور یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔'' رُباب کے پیچھے
اُس کی ماں اور بہن بھی دوڑتی ہوئی چلی آئی تھیں اور اس وقت حاجی رزاق سمیت وہ سب
سادھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کے سامنے سائنس کی طاقت کو حتمی علاج ماننے
لے ایک انسان کے عقیدے نے اپنا کانچ کا بھرم توڑ ڈالا تھا۔ جیسے ہی میری رُباب پر نظر
ی میری ساری بے چینی، ساری تپش، ساری آگ پل بھر میں سرد ہو گئی تھی۔ وہ بھی بنا پلک
پکائے میری جانب دیکھتی رہی۔ میرے لب ہلے۔ میں نے سلطان بابا کی جانب نظر
مائی۔ ''انسانوں کی سنگ دلی کے قصے تو بہت سنے تھے۔ اُن کی بے رحمی اور مکاری کے
مانے بھی عام ہیں لیکن آج دیکھ بھی لیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری محبت جسم کی حدوں
ے بہت آگے کی ہے۔ یہ رُوح سے رُوح کا مقدمہ ہے۔ لیکن آپ نے اپنے علم کی دھاک
انے کے لیے خود اپنے عزیز شاگرد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ
ما کا یہ نازک اور کمزور انسانی جسم زیادہ عرصے تک میرا وجود نہیں جھیل پائے گا لیکن پھر بھی
پ اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔ اب بھی وقت ہے مجھے آزاد کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ
تا ہوں کہ میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میری محبت میں خیر ہے..... اسے شر میں

بدلنے کی کوشش نہ کریں..... اب تو اس کا سب سے بڑا دعویٰ دار بھی اس کے حق سے دس
بردار ہو گیا ہے....."

سلطان بابا کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میری جانب دیکھتے رہے پھر جیسے کسی حتمی نتیجہ
پر پہنچ کر انہوں نے اپنا سر اُٹھایا۔

"ٹھیک ہے..... میں اس لڑکی کی رُوح پر ہمیشہ کے لیے تمہارا تسلط برداشت کرنے کے
لیے تیار ہوں..... میں، یا کوئی بھی اور، کبھی بھی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا لیکن
میری بھی ایک شرط ہے....."

ہم سب نے ہی چونک کر سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ حاجی رزاق اور اُن کے پورے
خاندان کا عامر سمیت پریشانی کے مارے رنگ ہی اُڑ گیا۔ حاجی صاحب ہکلائے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں قبلہ..... اس طرح تو....."

سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر حاجی رزاق کو روک دیا اور میری جانب متوجہ ہوئے۔

"ہاں..... تو بولو..... منظور ہے یہ سودا.....؟"

ابھی کچھ دیر باقی ہے

سلطان بابا نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی ''بولو..... ہمت ہے ایک انسان کی کسوٹی پر پورا اُترنے کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ہم انسانوں کی مکاری اور ہمارے ظالم اور جابر ہونے کے بارے میں کہا تھا، لیکن اب ان میں سے ہی ایک انسان تم سے تمہارا وعدہ مانگ رہا ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ تم جیتے تو رُباب تمہاری اور اگر میں جیتا تو تمہیں یہ بسیرا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانا ہوگا۔ اور یاد رہے، میرے اور تمہارے درمیان ضامن صرف وہی ہوگا جو ہم دونوں کا پروردگار ہے..... یعنی میرا اور تمہارا اللہ.....''

کچھ دیر تک کمرے میں گھمبیر سی خاموشی طاری رہی۔ پھر میرے لب ہلے۔ ''ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے..... بتائیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

سلطان بابا نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ''تم اس لڑکی سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور تمہارے بقول یہ خود بھی تمہاری محبت میں شدید طور سے مبتلا ہے۔ تمہیں یہی بات ہم سب پر ثابت کرنا ہوگی۔ اگر میری بات سچ نکلی اور یہ تمہارے سحر کے زیر اثر ہوئی تو تمہارا دعویٰ خود بخود غلط ثابت ہو جائے گا۔ تمہیں ایک بار اُسے مکمل آزاد کر کے کسی بھی روپ میں اُس کے سامنے آنا ہوگا۔ اگر رُباب یاقوط کے عشق میں مبتلا ہوئی تو اُسے تمہیں قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن یاد رہے، اُس وقت اُس کے ذہن اور دل پر تمہارا کوئی اثر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بولو..... منظور ہے یہ کسوٹی.....''

میں نے اُلجھن آمیز انداز میں سر پٹخا۔ ''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ جانتے ہیں میں اپنا ظاہری شکل وصورت میں اس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ ڈر جائے گی۔ اور پھر آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ یہ صرف رُوح سے رُوح کے تعلق کا معاملہ ہے۔ میری رُوح کے دھاگے اس کی رُوح کی ڈور سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہماری محبت کو جسم اور ظاہری شکل صورت کی بندشوں میں قید کیوں کرنا چاہتے ہیں؟'' سلطان بابا بولے ''میں نے اِسی لیے پہلے

ہی کہہ دیا تھا کہ تم جس صورت میں بھی چاہو، اس کے سامنے آ سکتے ہو۔ مجھے اس سے کو
غرض نہیں ہے۔ تم حسین سے حسین تر روپ دھار سکتے ہو۔ تمہارا دعویٰ تو رُوح سے رُوح کے
ملاپ اور رشتے کا ہی ہے نا..... تو پھر اس کی رُوح تمہاری رُوح کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں
کرے گی۔ اور اگر تب بھی رُباب کے من نے تمہیں پہچان کر قبول کر لیا تو ہمیں بھی کو
اعتراض نہیں ہوگا۔ بات اس بار یہاں بھی چہرے اور جسم کی شناخت کی نہیں ہے..... دل کے
دل کے رشتے کی پہچان کی ہے..... اگر تمہاری محبت سچی ہے اور تمہارا دعویٰ اٹل ہے تو پھر اسے
اپنے تسلط سے آزاد کرنے میں خوف کیسا.....؟..... ایک بار تم نے اِسے اپنی جانب خود کھ
تھا، اب ایک بار خود اِسے اپنی جانب بڑھنے دو..... ورنہ یہ مان لو کہ تم تسلط کے ذریعے اس
محبت کو پانا چاہتے ہو.....''

کمرے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ ہمیں اپنے مساموں سے پھوٹ کر جسم پر
بہنے والے پسینے کی آہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک میرے اندر چپ کا سناٹا رہا۔ پھ
جیسے میں نے خود بھی اپنے اندر ہتھیار ڈالنے کی جھنکار سی سنی اور میرے لب ہلے۔ ''ٹھیک
ہے..... یہی آپ کی ضد ہے تو مجھے آپ کی یہ شرط بھی منظور ہے۔ میں یہیں اس گھر میں رُباب
سے ملاقات کروں گا۔ مجھے اُمید ہے اس کے بعد آپ سب اپنے وعدوں کی پاسداری کریں
گے..... بس مجھے دو دن کی مہلت دے دیں..... میں نہیں چاہتا کہ رُباب اس نڈھال اور
مضمحل حالت میں مجھ سے ملے..... یہ اڑتالیس گھنٹے میں اِسی کی خاطر مانگ رہا ہوں۔ لیکن
آپ کو بھی مجھ سے یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ ان دو دنوں میں کوئی بھی رُباب کے کسی بھی فیصلے، یا طر
طریقے پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہوگا۔ کوئی رشتہ بھی اس کی آزادی میں مخل نہیں ہوگا۔''
غالباً یہ اشارہ عامر کی جانب تھا، یا پھر ایک ہاری ہوئی ماں سے کوئی خطرہ محسوس کر کے یہ ذ
شرط لگائی گئی تھی؟ بہرحال سلطان بابا نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا ''ہوں..... بے فکر رہو۔
رُباب پر کسی بھی طرف سے اور کسی بھی رشتے کا کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ سلطان کا تم سے وعد
ہے۔'' اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور پھر میری آنکھ دوسرے روز دن چڑھے
کھل پائی۔ میری زنجیر کھولی جا چکی تھی۔ لیکن سلطان بابا کے چہرے پر ابھی تک تفکر
پرچھائیاں واضح تھیں۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا ''اب کیسی طبیعت ہے میاں.....

دیر اور آرام کر لیتے تو بہتر ہوتا۔'' میں نے انہیں بتایا کہ مجھے سوائے نقاہت کے اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ حالانکہ یاقوط کے لفظ میری زبان سے ادا ہوتے تھے اور اسی کی بولی میری باتوں کے ذریعے باقی سب تک پہنچتی تھی لیکن خود مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ صبح اُٹھتے ہی میرے حافظے کی سلیٹ بالکل صاف ہو جاتی ہے اور مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تھا کہ میں نے رات کو کیا پیغام پہنچایا تھا۔ لہٰذا مجھے ایک بار پھر سے سلطان بابا سے کرید کرید کر ہر بات پوچھنا پڑتی تھی۔ میں نے پوری بات سن کر حیرت سے سلطان بابا کی جانب دیکھا۔ ''لیکن آپ اُس کی بات پر اس قدر اعتبار کیوں کر رہے ہیں؟ اگر یہ جنون ہے تو جنون کسی اُصول کو بھی نہیں مانتا۔ جنوں تو نام ہی اُصولوں سے ہٹ جانے کا ہے.....'' سلطان بابا نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ''واہ میاں..... بڑی بات کہہ دی آج تم نے۔ واقعی..... جنوں کو کسی اُصول، کسی شرط، کسی وعدے کا پابند نہیں کیا جا سکتا..... لیکن ہمارے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے..... مجھے اُس کی شرط مان کر اُس پر سے اپنا پہرہ آج شام سے پہلے اُٹھانا ہی ہوگا اور بدلے میں اُس کے وعدے پر اعتبار کرنا ہی ہوگا کہ وہ وقتی طور پر رُباب کو اپنے سحر سے آزاد کر دے گا۔ ہمیں یہ جوا کھیلنا ہی ہوگا۔'' میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کسی اَن جانے خطرے کے آثار اُن کے لاکھ چھپانے کے باوجود بھی محسوس کر لیے اور اُسی لمحے میں نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ اگر اس مرتبہ یاقوط نے میرے جسم کے ذریعے انہیں ہرانے کی کوشش کی تو میں خود اُسی لمحے اپنی جان لے لوں گا۔ لیکن کیسے.....؟..... بس یہی طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اُس روز نرم دھوپ تلے کرسی ڈالے میں بہت دیر تک اپنی درگاہ میں آنے کے بعد سے لے کر آج تک کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ مجھے اس متوازی دنیا کے دروازے پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ اس کے اسرار اور رُموز ہر ذی رُوح کا مقدر نہیں بنتے۔ آج مجھے اس رازداری کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ اسرار کبھی کبھی اتنے ہی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے اور انسان کو ایسی جان کنی کی حالت تک بھی پہنچا سکتے تھے جس سے میں خود اس وقت دوچار تھا۔ کچھ دیر بعد عامر کے سینئر ڈاکٹروں کی وہی ٹیم بھی وارد ہو گئی جس میں ایک مشہور ماہر نفسیات بھی شامل تھا۔ وہ بھی دالان میں بیٹھے عامر کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ صرف مینا فزکس

(Metaphysics) کے کھیل ہیں۔ انہی میں سے پھر کسی نے اُسی ڈائی پولر تھیوری آ
گرے وی ٹیشن (Dipolar Theory of Gravitation) کا بھی ذکر کیا۔ عامر ا
سب کے سوالوں اور بحث کے جواب میں انہیں لے کر میری طرف آ گیا اور میری طرف اشا
کر کے بولا۔ ''میں اب بھی میٹافزکس کے کرشموں پر یقین رکھتا ہوں۔ اور سائنس کی ہر تھیور
آج بھی اُسی طرح مجھ پر واضح ہے۔ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی کے تماشے بھی اپنی جگ
موجود ہیں اور اُن پر میرا اعتقاد بھی..... لیکن کل رات جو میری نظروں کے سامنے وقوع پذیر ہ
ہے میں اُسے کیسے جھٹلا دوں۔ رُباب کے چہرے پر آج صبح سے چھائی ہوئی سرخی اور اُس ک
برسوں پرانی وہ مسکان بھی میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی ہے..... آج اُس کے جسم پر
پھر سے بہتے خون کی حرارت محسوس کی ہے میں نے..... اور یہ جولڑکا آپ کے سامنے اس
وقت خاموش بیٹھا ہے، کل رات میں نے اس کے اندر خود وہ عفریت بپھرا ہوا دیکھا ہے ج
سب کچھ ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میں سائنس پر یقین کروں،
اپنی آنکھوں پر.....؟..... کیا اب آپ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پورا گھر ہی کسی خواب کا حص
ہے.....؟ کوئی تہ در تہ خوابی بھول بھلیاں اسے گھیرے ہوئے ہے؟ یا پھر اس وقت بھی ہم کس
خواب کی کیفیت میں ہیں؟ ڈاکٹر لاجواب ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر ماہر
نفسیات نے میری جانب قدم بڑھائے۔ ''کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ کیا تم میری
بات سمجھ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تم اپنی کل رات کی کیفیت کو بیان کر سکتے ہو؟ کیا تمہارے
ساتھ ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟ کیا تمہیں بچپن میں بہت سخت مذہبی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا
تھا.....؟..... کیا تمہیں رُباب میں کوئی ذاتی دل چسپی محسوس ہوئی ہے کبھی.....'' تو گویا وہ
حضرت اب بھی اسے انسانی ذہن کا کوئی شعبدہ سمجھ رہے تھے۔ میرے ظاہری حلیے کی وجہ سے
وہ مجھے کوئی مذہب سے متاثرہ اَن پڑھ سمجھ بیٹھے تھے اور اُن کا گمان یہ تھا کہ میں رُباب کے
ظاہری حسن سے متاثر ہو کر یہ سارا اسٹیج تیار کر رہا تھا تاکہ آخرکار اُسے پا سکوں۔ چند لمحے کے
لیے تو میرا ذہن غصے سے اُبل سا ہی گیا۔ پھر مجھے اُن کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''کیوں جناب!
کیا آپ کی میٹافزکس کی ابتدا ہی مذہب پر شک کرنے سے ہوتی ہے.....؟ مذہب نے تو کبھی
بھی آپ کی فزکس، میٹافزکس، سائیکالوجی، پیراسائیکلوجی، یا کسی بھی قسم کی سائنس پر کوئی

اعتراض نہیں کیا..... تو پھر آپ کا یہ شکوہ کچھ بے جا معلوم ہوتا ہے۔'' میرا تفصیلی جواب سن کر عامر سمیت اُن سب کے چہرے حیرت کا اشتہار بن گئے۔

پھر عامر کے منہ سے صرف اتنا نکلا ''کیا.....؟..... کیا تم پڑھے لکھے ہو.....؟'' مجھے یاد آیا کبھی یہی سوال میں نے عبداللہ سے بھی کیا تھا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جو عبداللہ نے مجھے دیا تھا۔ ''ہاں..... یہاں آنے سے پہلے کچھ صفحے کالے کیے تھے، لیکن سب بے فائدہ ہی رہا.....'' اب ان کی ساری توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ''ابھی کچھ دیر پہلے تم میٹافزکس کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کیا تم نے سائنس پڑھی ہے؟'' ''پڑھی ہے لیکن اتنی ہی جتنا ایک طالب علم انٹر کے امتحان تک پڑھتا ہے۔ اس کے بعد تو بس کالج اور یونیورسٹی میں صرف وقت ہی ضائع کیا۔ لیکن یہاں معاملہ بہت سیدھا سادہ ہے۔ ہم نہ جانے ہمیشہ سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے کے مدّ مقابل لا کر کیوں کھڑا کر دیتے ہیں؟ مذہب اس لیے تو وارد نہیں ہوا تھا کہ وہ سائنس کو رد کرے..... مذہب تو خود علم کے راستوں پر چلنے کی تلقین کرتا ہے اور سائنس بھی تو ایک علم ہے..... اور کیا ضروری ہے کہ سائنس مذہب کی ہر بات کی تصدیق کرے؟ یاد رکھیے مذہب سائنس سے بہت پہلے آیا تھا، لیکن مذہب نے کبھی سائنس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تو پھر آپ سائنس کو کیوں مذہب کے راستے کی دیوار بنانا چاہتے ہیں؟ اور بھلا یہ کیا فارمولا ہوا کہ سائنس مذہب کی جس پیشین گوئی کو ثابت کر دے وہ تو سچ اور باقی سب غلط..... یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا سائنس کی بھی اپنی کچھ حدیں نہیں ہیں؟ تو پھر ہر سوال کے جواب کی توقع صرف سائنس کے علم سے ہی کرنا سراسر نادانی نہیں ہے، کیونکہ سائنس بھی تو صرف ایک علم ہی ہے..... ان ہزاروں دیگر علوم کی طرح جو انسان ازل سے کھوج رہا ہے۔ تو پھر صرف سائنس کے علم کے فارمولے پر ساری کائنات کو پرکھنا کہاں کی عقل مندی ہے.....؟'' میں شاید جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور میری آواز بھی معمول سے کچھ زیادہ بلند ہو گئی تھی لہٰذا مجھے معذرت کر کے اپنی بات ختم کرنا پڑی۔ لیکن عامر سے رہا نہ گیا۔ ''نہیں..... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہم نے کبھی اس نظریے سے سوچا ہی نہیں..... اور پھر ذہن بھلا کہاں تسلیم کرتا ہے ایسی توجیہات..... جو چیز عقل میں نہ آئے اور آنکھ اُسے دیکھ بھی نہ سکے اس پر یقین ذرا مشکل سے ہی آتا ہے اور پھر تم تو باقاعدہ

ایک پوری متوازی دنیا کی بات کر رہے ہو، اسے ہضم کرنا تو ہم جیسوں کے لیے واقعی بڑا مشکل ہے۔'' میں نے ان چاروں کی جانب غور سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ سائنس سے کہیں کہ رُوح کی توجیہہ بیان کر دے..... ہمارے اندر ایسی کیا چیز پائی جاتی ہے جو نہ ہمیں نظر آتی ہے نہ ہی عقل کی حد اُسے چھو سکتی ہے لیکن اُس کے نکل جانے سے ایک پل میں ہم بے جان مٹی کے پتلے کی طرح ڈھے جاتے ہیں۔ وہ جب تک ہمارے جسم کے اندر رہتی ہے، رگوں میں خون کو رواں رکھتی ہے اور جسم چھوڑ جائے تو ہر عضو اپنے آپ مر جاتا ہے۔ کیوں.....؟..... کیا آپ نے اس رُوح کو کبھی دیکھا ہے.....؟..... سائنس سے کہیے کہ وہ رُوح کو ثابت کر دے، یا پھر اس کی نفی ہی کر دے..... اور رُوح کی حقیقت تو میں نے بہت بڑی مثال دے دی ہے..... آپ صرف سائنسی طور پر مجھے اس بات کی وضاحت ہی کہیں سے لا دیں کہ ہم مسلمان اگر مردے کو دفناتے وقت زمین سے یہ کہہ دیں کہ یہ جسم امانتاً دفن کیا جا رہا ہے تو سالوں بعد بھی اس میت کی منتقلی کے وقت جب زمین کھودی جاتی ہے تو وہ مرا ہوا جسم تازہ کیوں ہوتا ہے.....؟ جب کہ سائنس کے اُصولوں کے مطابق تو اس جسم کو گل سڑ جانا چاہیے۔ وہ کون سی چیز ہے جو زمین کو اُسے کھانے سے روکتی ہے.....؟..... جواب دیں..... یہ تو بہت عام اور روزمرہ کی بات ہے۔'' وہ چاروں لاجواب ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''میرا مقصد آپ لوگوں کو لاجواب کرنا نہیں ہے، لیکن یہ سب باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس دنیا سے پرے بھی کچھ دنیائیں موجود ہیں۔ ہم ایلینز (Aliens) کے وجود کو تو اُڑن طشتریوں کے ذریعے ثابت کرتے اور مانتے ہیں لیکن جنات کی ہمارے آس پاس موجودگی سے انکاری رہتے ہیں۔ فون، یا ایس ایم ایس کے ذریعے ایک پل میں دنیا کے دوسرے کونے تک پیغام پہنچانے کے کمال کے تو معترف ہیں، لیکن ایک ماں کے دل سے نکلی ایک پکار پر ہزاروں میل دُور بیٹھے اُس کے بچے کے دل کی اچانک تیز دھڑکن کے جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ چھوٹی سی ٹی وی اسکرین پر لہروں کے ذریعے پہنچی زندہ تصویروں، یا لائیو ٹیلی کاسٹ پر تو یقین کرتے ہیں لیکن بند آنکھوں اور من کے اندر لگی اسکرین جو دل سے دل کے تار جڑنے پر روشن ہوتی ہے اُسے کبھی قابل بھروسا نہیں سمجھتے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے دوسروں کے دل کا حال جاننے کو معتبر جانتے ہیں لیکن جب کوئی

ب کے ذریعے حال دل بیان کرنے لگے تو اُسے دھتکار دیتے ہیں۔ ہاتھ سے نکلتی لہروں
ریکی کے علاج کے لیے تو گھنٹوں قطار میں بیٹھ کر انتظار کر لیتے ہیں لیکن دوسری جانب اگر
لی ہاتھ تھام کر اُس پر دم کر کے پھونک دے تو ہم شک میں پڑ جاتے ہیں۔ مریخ پر زندگی
ہم اس کی کھوج میں تو دن رات ایک کیے رکھتے ہیں، لیکن ہمارے آس پاس جو بے پناہ
ئی بکھری پڑی ہے اُس سے ہمیشہ غافل رہتے ہیں۔ یاد رکھیے، نیل آرمسٹرانگ کے چاند پر
نے سے پہلے بھی چاند موجود تھا لیکن تب تک سائنس ہمارے شق القمر کے عقیدہ کو شک کی
ہی سے دیکھتی رہی۔ یہ سب باتیں کیا ظاہر کرتی ہیں؟ صرف یہی کہ ہمارے متوازی ایک
حانی دنیا بھی ازل سے موجود ہے اور اُس دنیا کو جاننے کے لیے بھی ایک سائنس موجود ہے
ہم رُوحانیت کہتے ہیں۔ اِس دنیا کی سائنس میں جو کمال حاصل کر لے اُسے سائنس دان
ا جاتا ہے اور اُس دنیا کا سائنٹسٹ ''صوفی'' کہلاتا ہے۔ جیسے یہاں کی سائنس ظاہری جسم
درد کو دُور کرنے کے لیے ڈسپرین، یا دوسرا کوئی پین کلر (Painkiller) دیتی ہے ویسے ہی
ں کی سائنس رُوح کے درد کے لیے دعا، دم اور ورد کی شکل میں درد کو مارنے کی دوا تجویز
تی ہے۔ جس طرح ہماری اس ظاہری دنیا کی بیماریاں اور اُن کا علاج موجود ہے، اِسی طرح
ارُوحانی دنیا میں بھی ہم بیمار پڑتے ہیں اور ٹھیک بھی ہوتے رہتے ہیں۔ رُباب بھی ایک
اہی رُوحانی بیماری کا شکار ہے اور اُس کی اس بیماری کا تعلق بھی ہماری متوازی دنیا کی ایک
ق کے اثر سے ہے۔ آپ لوگ بھی بس یہی دعا کریں کہ وہ ٹھیک ہو جائے اور اس دنیا کے
ری مرحلے کے کینسر کی طرح اُس کی رُوح کا ناسور لاعلاج نہ ہو چکا ہو..... سلطان بابا
ک اس ناسور کو بڑھنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ایسے میں اگر آپ ہی
کا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر اُن کے لیے مشکلات بہت بڑھ جائیں گی.....'' بولتے بولتے
ی آواز بیٹھ سی گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ سلطان بابا نہ جانے کب سے میرے عقب میں
ڑے میری یہ ساری تقریر سن رہے تھے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر اچانک ہی مجھے گلے لگا لیا۔
راور اُس کی ٹیم کی آنکھوں سے بھی شک و شبے کی پرچھائیاں مٹ چکی تھیں اور اس بار جب
لسا نے سلطان بابا سے ہاتھ ملایا تو اُن سب کی نگاہیں احترام سے جھکی ہوئی تھیں۔ چلتے
عامر دو لمحے کے لیے رُکا اور مجھ سے بولا'' آج تم نے ہمیں زندگی گزارنے کا ایک ایسا نیا

نظر یہ دیا ہے جو ہمیشہ سے ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تو تھا لیکن ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ آج کے بعد میں ہر مریض کو دوا کی پرچی دیتے وقت ایک مشورہ اور بھی دوں گا کہ دوا کے ساتھ دعا بھی کرتے رہنا۔ دوا تو خون کے خلیوں میں جذب ہو کر اپنا کام کرے گی ہی لیکن دعا تمہاری رُوح کے خلیوں میں جذب ہو کر تمہاری بیماری دُور کرے گی۔'' اُن کے جانے کے بعد سلطان بابا نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ''ساحر میاں..... لگتا ہے مولوی خضر نے پوری تربیت کے بعد ہی تمہیں میرے سپرد کیا ہے۔ جیتے رہو.....'' میں نے مسکرا کر بات ٹال دی لیکن یہی سچ بھی تھا۔ یہ ساری باتیں جو میں نے آج عامر اور اُس کی ٹیم کو قائل کرنے کے لیے کی تھیں ان سب پر میں خود مولوی خضر سے گھنٹوں بحث کر چکا تھا اور انہوں نے ہر بات اس قرینے سے کی تھی کہ میرے سب تشنہ سوال جواب پاتے گئے۔ رفتہ رفتہ شام بھی ڈھل گئی لیکن میری رگوں میں بھر جانے والی اس آگ کا آج دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ گویا یا قوطی الحال اپنے وعدے کی پاسداری کر رہا تھا۔ اندر زنانے سے آنے والی اطلاعات کے مطابق رُباب بھی بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی اور آج ہفتوں بعد اُس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا بھی کھایا تھا۔ دھیرے دھیرے رات ڈھلنے لگی اور وہی اداسی حویلی کی دیواروں اور درزوں سے جھانکنے لگی جو یہاں کا خاصہ تھی۔ سلطان بابا احتیاطاً کئی بار میرے کمرے میں جھانک چکے تھے لیکن آج میں اپنے جسم پر کسی قسم کا بوجھ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میری نظر رات بھر بار بار دالان میں اسی شان سے ایستادہ پیپل کے پیڑ کی جانب اُٹھ جاتی تھی اور میرے من میں عجیب و غریب قسم کے سوال آتے رہے۔ وہ اس وقت کیا سوچ رہا ہو گا.....؟..... اُس کی دنیا میں انتظار کیسا ہوتا ہو گا اور اُس کے انتظار کے لمحے کیسے کٹتے ہوں گے؟ کیا وہ بھی ہم انسانوں کی طرح سجدے میں گر کر اپنے پروردگار سے اس نازنین کی ایک جھلک، ایک لمحے کا ساتھ مانگتا ہو گا؟ اُس کی دعا کیسی ہوتی ہو گی۔ اُس کے جسم اور اُس کی رُوح پر انتظار کے یہ کرب ناک لمحے کیسی کیفیت پیدا کرتے ہوں گے.....؟ کیا وہ بھی محبوب کی جُدائی میں روتا ہو گا.....؟ کیا اُس کے آنسو بھی ہم بے بس انسانوں کی طرح صرف نمکین پانی کہلاتے ہوں گے؟ کیا اُس کا دل بھی ہوتا ہو گا.....؟ کیا وہ بھی آہیں بھرتا ہو گا.....؟ انہی سوالوں کے جھرمٹ میں صبح بھی ہو گئی۔ فجر کی نماز کے بعد میں خود سلطان بابا کے کمرے میں

یا آیا۔ وہ بھی شاید رات بھر سو نہیں پائے تھے۔ آج شام ۴۸ گھنٹے پورے ہونے کے بعد
اب کی اور شاید ہماری بھی قسمت کا فیصلہ جو ہونے والا تھا۔ میں نے اُن سے یونہی پوچھ لیا۔
یا..... ہم مذہب سے اس طرح مطمئن کیوں نہیں ہو پاتے جس کاملیت سے سائنس، یا
ونی اور علم ہمیں مطمئن کر جاتا ہے؟'' وہ ہلکے سے مسکائے۔ شاید وہ خود بھی مجھ سے ایسے کسی
ال کی توقع کر رہے تھے۔ ''وہ اس لیے کہ ہم نے صرف کلمے، نماز اور روزے کو مذہب کی
یل سمجھ لیا ہے۔ جب کہ یہ بنیادی رُکن تو صرف مذہب کی ابتدا ہیں..... اصل آغاز مذہب تو
ا کے بعد ہے..... اور پھر انتہا کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہاں تک تو شاید کئی پیغمبر بھی نہیں پہنچ
ے۔ تو پھر ہم جیسے معمولی انسان بھلا مذہب کی انتہا کو کیا پائیں گے.....؟ جس دن ہم یہ
ی سمجھ گئے کہ فی الحال ہم صرف اسلام لائے ہیں..... ایمان لانا ابھی باقی ہے اس روز
رے مسئلے حل ہو جائیں گے..... لیکن شاید ابھی وہ منزل کچھ دُور ہے..... بہرحال ہمارا سفر تو
ی ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔''

اتنے میں حاجی رزاق صاحب نے آ کر بتایا کہ رُباب کئی مرتبہ عامر کا پوچھ چکی ہے اُسے
جواب دیا جائے۔ سلطان بابا نے انہیں سمجھایا کہ معاہدے کی رُو سے فی الحال عامر کا
ب کے سامنے آنا، یا اُس سے ملنا ممکن نہیں ہے۔ مبادا یاقوط اسے خلاف ورزی سمجھ کر بپھر
نہ جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ عامر کی غیر موجودگی کا کوئی مناسب بہانہ بنا دیا جائے، کیونکہ
تو بات صرف چند گھنٹوں کی ہی رہ گئی تھی۔ ایسے میں ہمیں کوئی بھی ایسی خلاف معمول
ت نہیں کرنی چاہیے جو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔ حاجی صاحب نے یہ بھی بتایا
ن کی بیگم اور چھوٹی بیٹی نایاب بھی بے حد پریشان ہیں اور وہ کسی صورت رُباب کو کھونا نہیں
تے۔ سلطان بابا نے پھر وہی بات کی کہ وہ سب دعا کریں۔ خدا بہتر کرے گا۔ سچی بات تو
ہ کہ میں خود اندر سے بے حد خوف زدہ اور پریشان تھا اگر یاقوط نے سلطان بابا کی شرط مانی
اور اپنی محبت کو اس کڑی کسوٹی پر ثابت کرنے کی ہامی بھری تھی تو اُس کا دعویٰ بھی کچھ وزن
نا ہوگا اور پھر میں تو خود اس محبت نامی اژدھے کا نگلا ہوا شکار تھا۔ میری رگوں میں بھی تو یہ
واز ہر اسی جذبے کی دین تھا۔ ہاں..... وہی محبت جو انسان پر ابتدا میں تو صبح کی نرم اور
دھوپ کی طرح اُترتی ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ تپتے صحرا کی اس دوپہر کی شکل

اختیار کر لیتی ہے جہاں میلوں دُور تک مجھ جیسے بے بس انسانوں کے لیے کوئی نخلستان
سایہ میسر نہیں ہوتا۔ اس کی رُوح تک کو جھلسا دینے والی گرم کرنیں ہمارے نازک بدن
مسام چیر کر ہمارے اندر پیوست ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے حلق میں کانٹوں کا جنگل اُگ
ہے اور دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ کر کے ہماری جان اسی محبت کے دہکتے سورج
جاتی ہے۔ جذبوں اور خواہشوں کی گلابی تتلیاں بے بسی سے ہمیں تڑپتا اور دم توڑتا ہوا
رہتی ہیں اور کچھ ہی دیر میں خود اُن کے سنہری پر بھی جل جاتے ہیں۔ ہاں..... ایسی ہی
اور ظالم ہوتی ہے یہ محبت.....

آخر کار وہ پہر بھی آ ہی گیا جب شرط کے مطابق ہمیں رُباب کو اُس کے کمرے میں
چھوڑ آنا تھا۔ حاجی رزاق جب عامر اور بیگم و بیٹی کے ہمراہ کسی بہانے سے نکل کر مہمان خ
کی جانب آ رہے تھے تو اُن کی چال سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اُس جواری کی چال ہے ج
زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیل کر آ رہا ہو۔ ستم یہ تھا کہ بازی تو کھیلی جا چکی تھی لیکن جیت
مات کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ باقی گھر والوں کے رنگ بھی اُڑے ہوئے تھے۔ ہم سب
سادھے مہمان خانے کے شیشے کے برآمدے سے باہر حویلی کے اُس حصے کی جانب دیکھ
تھے جہاں رُباب کا کمرہ واقع تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری تشویش بے چینی میں بدلنے لگی کیوں
پندرہ منٹ سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ میں اِسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ جانے یاقوط
روپ میں رُباب کے سامنے آئے گا اور کس طرح سے اُسے اپنی محبت کا یقین دلائے گا
اگر اُس کے دعویٰ کے مطابق رُباب بھی اُس کی محبت میں اُسی کی طرح مبتلا تھی تو کیا ہم رُ
کو دوبارہ دیکھ بھی پائیں گے، یا نہیں..... اور اگر یاقوط اپنے وعدوں سے پھر گیا تو.....؟ او
کہیں یہ اُس کی ہمیں رُباب سے چند لمحوں کے لیے دُور رکھنے کی سازش ہوئی تو.....؟
ایسے نہ جانے کتنے سوال میرے ذہن میں سوئیاں چبھو رہے تھے کہ اچانک اندر سے رُبا
چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اُس نے چلا کر کہا..... ''عامر.....'' ہم سب بُری طرح اُچھلے
میرے ذہن میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ اوہ میرے خدا..... یہ بات میرے، یا سلطان
کے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آئی۔ یاقوط کو ہم نے خود کوئی بھی روپ بدلنے کی اجازت د
سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ عامر کا بہروپ بھی تو بھر سکتا ہے۔ اور اب اگر وہ ایسا کر

چکا ہے تو اُس نے معاہدے کی کسی بھی طور خلاف ورزی نہیں کیونکہ ہم نے ایسی کوئی پابندی اُس پر لگائی ہی نہیں تھی۔ ہم سب رُباب کی پہلی چیخ کے بعد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑے تھے اور پھر جب چند ہی لمحوں کے بعد رُباب کی چیخیں ایک تسلسل اور جنونی انداز میں شروع ہوئیں تو ہم سب ہی اُس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی رُباب بے ہوش ہو کر فرش پر گر چکی تھی اور اُس کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ سلطان بابا نے فوراً رُباب کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چند آیتیں زیرلب پڑھیں اور پانی کے ایک گلاس پر کوئی سورۃ پڑھ کر دم کیا اور رُباب کی ماں کو قطرہ قطرہ کر کے وہ پانی رُباب کے حلق میں ٹپکانے کا کہہ کر ہم سارے مرد کمرے سے نکل آئے۔ وہ ساری رات ہم سب نے رُباب سمیت کانٹوں پر گزاری کیوں کہ ہمیں اب بھی اس امتحان کے نتیجے کا پتا نہیں تھا۔ سب کچھ رُباب کے ہوش میں آنے کے بعد ہی واضح ہونا تھا اور رُباب نے ہوش میں آنے کے لیے پورے چودہ گھنٹے لیے۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر تک وہ ہم سب کو اجنبی اور پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر روتے ہوئے اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ سلطان بابا نے اُسے تسلی دی کہ اب ہم سب اُس کی حفاظت کے لیے وہاں موجود ہیں لہٰذا وہ اطمینان رکھے اور ہمیں گزشتہ رات کا پورا واقعہ سنائے۔ بڑی مشکل سے رُباب نے اپنے حواس یک جا کیے اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ ہمیں صرف اتنا بتا پائی کہ کل رات کو وہ کافی دیر تک عامر کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کرتی رہی لیکن فون بند پا کر اُس نے جھنجھلاہٹ میں عامر کو SMS کر دیا کہ اگر اُس نے فوراً ہی رُباب سے رابطہ نہ کیا تو وہ عمر بھر اُس سے بات نہیں کرے گی۔ اِسی اثناء میں باہر آہٹ ہوئی تو رُباب نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ تبھی اُسے عامر کی جھلک دکھائی دی۔ جو شاید اُسے ستانے کی خاطر چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رُباب لپک کر اُس کے قریب پہنچی تو عامر نے اُسے اس اندھیرے کونے کا بلب جلا کر روشنی کرنے سے منع کر دیا کہ گھر والے چونک جائیں گے اور خود اُس نے رُباب کا ہاتھ تھام لیا۔ رُباب کے بقول اُس وقت عامر کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور خلاف معمول عامر نے اُسے ایک بار اقرارِ محبت کی تجدید پھر سے اپنے لفظوں میں کرنے کا کہا۔ رُباب اُلجھ سی گئی کیوں کہ اُس نے آج تک عامر کا ایسا برتاؤ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو گھر میں گھستے ہی آسمان سر پر اُٹھا لینے کا قائل تھا اور محبت کی تجدید تو دُور وہ تو رُباب کو اُس کے اس

''کتابی عشق'' پر اس قدر ٹوکتا اور تنگ کرتا تھا کہ کبھی کبھار تو رُباب تھک کر رو پڑتی تھی اور عامر کو اس طرح کے اظہار محبت سے تو سدا کی چڑ تھی۔ وہ نایاب کو اپنے ساتھ ملا کر رُباب کی ایسی نقلیں اُتارتا کہ رُباب پھر ہفتوں اُس سے بات نہیں کرتی تھی اور آج وہی عامر جب اس تاریک گوشے میں رُباب کے ہونٹوں سے محبت کے دو لفظ ادا ہو جانے کے انتظار میں اپنا سب کچھ لٹانے کا دعویٰ کر رہا تھا تو رُباب کا چوکنا لازمی تھا اور پھر عامر کے پرفیوم کی خوشبو بھی تو خلاف معمول کچھ عجیب سی تھی اور اُس کی وہ گرم سانسیں جو رُباب کا رُوآں جلانے کا باعث بن رہی تھیں۔ رُباب نے ہنس کر اُسے یقین دلایا کہ وہ تو سدا سے اُس کی محبت میں پاگل ہے۔ لیکن عامر نے جب رُباب سے تیسری مرتبہ یہ بات پوچھی کہ کیا اُسے واقعی عامر سے محبت ہے اور کہیں وہ دوسروں کے سامنے اس بات سے مکر تو نہیں جائے گی تب رُباب کا ماتھا ٹھنکا اور اُسے پہلی بار یہ ہڈیوں کے گودے کو جما دینے والا سرد احساس ہوا کہ اُس کے پاس کھڑا یہ شخص عامر نہیں کوئی اور ہے۔ اور جیسے ہی اُس کے حلق سے پہلی چیخ بلند ہوئی تب کسی نے جیسے اُس کے تمام حواس یک بارہی بیدار کر دیئے۔ وہ جان چکی تھی کہ اجنبی ہاتھوں کا یہ لمس اور مہکتے وجود کی یہ خوشبو کسی نامحرم ہستی کی ہے۔ بس پھر کیا تھا رُباب کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش کھو بیٹھی اور شاید یہ وہی لمحہ تھا جب ہم سب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ یاقوط شرط ہار چکا تھا۔ رُباب اُس کی انجان محبت کو شناخت نہیں کر پائی۔ اور شاید یہ پہلی محبت کی ہار تھی جس پر وہاں موجود ہر شخص خوش تھا۔ لیکن شاید وہاں کوئی اور بھی تھا جو اپنی محبت کے یوں سربازار لٹ جانے پر ماتم کناں تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کھڑے پیپل کے پیڑ پر نظر ڈالی۔ باہر ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور پیڑ کے پتوں سے پانی کی بوندیں آنسو بن کر ٹپک رہی تھیں۔ قدرت نے جب ہم خودغرض انسانوں کو کسی کی محبت کی ہار کا جشن مناتے ہوئے دیکھا تو شاید اُس سے رہا نہ گیا اور اُس نے اس ہار کے غم میں خود آنسو بہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تبھی یہ برستی بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہمارے لیے اجنبی تھا۔ دوسری دنیا کا تھا لیکن قدرت کا تو اپنا تھا..... اتنا ہی اپنا، جتنا ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ اُتنا ہی قریب، جتنی قربت کا دعویٰ ہماری یہ انسانی مخلوق کرتی ہے۔

اگلے دو روز حاجی رزاق اور گھر والے اِسی فکر میں گھلتے رہے کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائے

لیکن سلطان بابا نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہ ایک انسان کا وعدہ نہیں کہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جائے۔ اب وہ عمر بھر اپنے عہد کی پاسداری میں رُباب کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ اُسی لمحے نہ جانے مجھے ایک عجیب سا احساس کیوں ہوا۔ سلطان بابا نے بات کرتے وقت غیر ارادی طور پر دو مرتبہ پیپل کے پیڑ کی جانب نظر ڈالی اور مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا نے اُس سیاہ غیب کو کم از کم اس پیڑ پر بسیرے کی اجازت دے دی ہے، لیکن گھر والوں کے اطمینان کے لیے وہ اس راز کو افشا نہیں کرنا چاہتے۔ آخرکار ہمارے رُخصت ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ حاجی رزاق کے تمام گھر والوں کی آنکھیں اس پل نم تھیں۔ سلطان بابا نے خاص طور پر رُباب اور عامر کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی۔ ٹھیک اُسی لمحے میں پیپل کے پیڑ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ''کیا ہوا؟'' میں خاموش رہا اور پھر دھیرے سے اُن کے کان میں کہہ ہی ڈالا۔ ''ایک دل جلے کو آخری سلامی پیش کر رہا تھا۔'' اُن کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم لہرا کر غائب ہو گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ حاجی رزاق کے خاندان کو ہم آخری سلام کر کے باہر نکلنے لگے تو ایک لمحے کو رُکے اور مجھے سامنے کھڑا کر کے بولے۔ ''ساحر میاں..... آج سے تمہارا ساحر سے عبداللہ تک کا سفر ختم ہوا۔ تم ہر امتحان پر پورے اُترے ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب چاہے تم کہیں بھی رہو، تمہارا اس متوازی دنیا کا یہ سفر جاری رہے گا اور اب تم اپنی دنیا خود کھوج سکتے ہو..... جاؤ..... گھر لوٹ جاؤ۔ زہرا تمہارا انتظار کرتی ہو گی..... مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں..... بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے..... میرے ساتھ کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکے ہو..... اب میرا فرض ہے کہ میں تمہارا حق ادا کر دوں..... خوش رہو ہمیشہ۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ میں اُن کی بات سن کر چپ ہی تو گیا۔ ''کیا آپ مجھ سے اُکتا گئے ہیں.....؟ کیوں دُور کرنا چاہتے ہیں مجھ کو خود سے؟ زہرا نے کہا تھا کہ وہ قیامت تک ہماری رُوحوں کے ملاپ کا انتظار کرے گی، لیکن آپ ابھی سے مجھ پر یہ قیامت کیوں ڈھانا چاہتے ہیں.....؟ ہاں البتہ آپ کے اگلے سفر میں اگر آپ پر بوجھ بن رہا ہوں، یا میری وجہ سے آپ کی راہ کھوٹی ہو رہی ہے تو پھر جیسے آپ کا حکم.....'' انہوں نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ''تم ہرگز مجھ پر بوجھ نہیں ہو..... تم تو وہ مسافر ہو جس کی تمنا کوئی بھی راہی کر سکتا ہے.....'' وہ کچھ دیر کے لیے کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے پھر انہوں نے جیسے کوئی حتمی فیصلہ کر کے سر اُٹھایا۔ ''ٹھیک ہے..... تم یہ سفر جاری رکھنا

چاہتے ہو تو پھر یونہی سہی..... لیکن یہاں سے ہماری راہیں عارضی طور پر جُدا ہوتی ہیں۔ ہم دونوں یہاں سے ریلوے اسٹیشن سے مشرق اور مغرب کی طرف جانے والی الگ الگ گاڑیوں میں روانہ ہوں گے۔ تمہاری گاڑی جو مغرب کی طرف جائے گی وہ تمہیں جبل پور کے اسٹیشن تک پہنچائے گی اور میں مشرق کی راہ لوں گا۔ لیکن دھیان رہے جبل پور کی درگاہ بذات خود ایک بہت بڑا امتحان ہے اور اب تمہیں تنہا ہی اس امتحان سے گزرنا ہوگا۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے سر جھکا دیا۔ ''آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔'' انہوں نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ حویلی کے بڑے پھاٹک سے نکلتے وقت نہ جانے میری نظر خود بخود پلٹ کر اُس پیپل کے پیڑ کی جانب کیوں اُٹھ گئی جو اپنے شاخیں کسی ماتم زدہ بیوہ کے انداز میں کھولے، کھڑا ہوا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سوگوار پیڑ کسی سے یہ کہہ رہا ہو.....

ابھی کچھ دیر باقی ہے
خزاں کے بیت جانے میں
گلوں کے مسکرانے میں
خوشی کے گیت گانے میں
بہاروں کے زمانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے.....
میں تم کو بھول جاؤں گا
نہ تم کو یاد آؤں گا
میں تم سے دُور رہ کر بھی
تمہیں جی کر دکھاؤں گا
تمہیں معلوم ہے لیکن
یہ سب میں کر نہ پاؤں گا
کہ تم کو بھول جانے میں
ابھی کچھ دیر باقی ہے.....
ابھی..... کچھ دیر باقی ہے

دامن اور چنگاری

کہتے ہیں ''زندگی میں کتنے پل ملے.....'' یہ سوچ کر جینے سے بہتر ہے کہ ''ہر پل میں کتنی زندگی ملی.....'' اس بات کو جینے کا پیمانہ بنایا جائے۔ لیکن سلطان بابا سے جُدا ہونے کے بعد جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے حصے کے پل اپنی زندگی گنوا بیٹھے ہیں۔ ٹرین کو اسٹیشن چھوڑے اب گھنٹہ بھر سے زائد ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن ابھی تک وہیں اسٹیشن پر سلطان بابا سے ہوئے الوداع میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے میری منزل کہاں تھی؟ سلطان بابا نے تو صرف جبل پور اسٹیشن کا ٹکٹ میرے حوالے کر کے مجھے اس ٹرین پر چڑھا دیا تھا لیکن جبل پور نامی قصبے میں مجھے کہاں جانا تھا؟ کس سے ملنا تھا.....؟ یہ سارے سوال میرے سامنے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لیکن اب تک تو مجھے ان حالات کا عادی ہو جانا چاہیے تھا..... میں کیوں بار بار ان بے معنی سوالوں میں خود کو اُلجھا لیتا تھا۔ میرے گھر سے نکلنے اور درگاہ سے یہاں اس ٹرین کے اکانومی کلاس کے ڈبے تک کے سفر میں جانے ایسے کتنے اُلجھے سوال میری زندگی میں آ کر اپنا حل پا چکے تھے۔ ایک سوال اور سہی..... میں نے تھک کر اپنی آنکھیں موندھنے کی کوشش کی اور اپنا سر اُدھڑی ہوئی سخت نشست کے ٹیک پر ٹکانے کی کوشش کی لیکن ٹرین کے جھٹکے بھلا میرا توازن کہاں برقرار رہنے دیتے.....؟ تنگ آ کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک ماں اپنے بچے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں..... یہ تو سارے ڈبے مل کر اللہ ہو..... اللہ ہو کا ورد کر رہے ہیں۔ ماں نے بچے کے دل سے ڈر نکالنے کے لیے خود ہی ٹرین کے دوڑنے کی آواز اور ڈبوں کے آپس میں ٹکرانے اور ٹھکا ٹھک جیسی آواز کو ایک سُر میں ڈھال کر اُسے اللہ ہو کی شکل دے دی اور اپنے بچے کو تھپکنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اُس کا بچہ بھی اس گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اللہ ہو کا ورد کرنے لگا۔ دوسری جانب کچھ تبلیغی حضرات بیٹھے اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ عصر کی نماز ٹرین میں ہی ادا کر لی جائے، یا پھر کسی چھوٹے اسٹیشن پر دو چار

منٹ کا وقفہ لے کر باقاعدہ جماعت کروالی جائے۔ اُن سے ذرا پرے ایک ادھیڑ عمر کے مولانا اپنی بیوی کو بار بار اپنے برقعے کا نقاب ٹھیک طرح سے گرانے کی تلقین کیے جا رہے تھے۔ اُن کی بیگم کا شاید اتنے بھاری نقاب کے اندر دم گھٹ رہا تھا اور اِسی لیے وہ ہر پانچ سات منٹ کے وقفے کے بعد اپنا نقاب ذرا سا اُلٹ دیتی تھیں اور جلدی جلدی چار چھ لمبی سانسیں لے کر اپنا دم بحال کرنے کی کوشش کرتیں۔ لیکن تبھی مولانا صاحب کی خشمگیں نگاہیں اور اُن کا دھیرے مگر کڑے تیوروں کے ساتھ ''زلیخا'' بولنا ہی اُن کی بیگم کے لیے کافی ہوتا اور وہ بے چاری جلدی سے اپنا نقاب دوبارہ گرا دیتی تھیں۔ دراصل مولانا صاحب کا بھی قصور نہیں تھا۔ سامنے ہی بوگی میں دو نشستیں چھوڑ کر کالج کے تین لاابالی سے لڑکوں کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا جو ذرا ذرا سی دیر میں ریڈیو پر بجتے کسی گیت کی تال میں تال ملا کر اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے اور ایسے میں اُن تینوں کی نظر زیادہ تر اگلے حصے میں بیٹھی اُن دو نازک سی لڑکیوں پر ہوتی تھی جو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں باپ کے ساتھ شاید کسی تقریب میں شرکت کے لیے اپنے گھر سے نکلی تھیں۔ لڑکیاں شوخ تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر کھل کر ہنس رہی تھیں اور اپنی ماں سے کسی بات پر بحث میں مصروف تھیں۔ جب کہ لڑکیوں کے ماں باپ شادی پر دی جانے والی سلامی اور خرچے کے رونے رو رہے تھے۔ کالج کے لڑکے گاہے بگاہے پاس سے گزرنے والے پھیری والوں سے کبھی گرم بھنے ہوئے نمکین چنے، کبھی گزک تو کبھی لمکا اور فالسے کی بوتلیں خرید خرید کر لڑکیوں کے بھائی کو بھی اس دعوت عام میں شریک کر لیتے تھے اور اُن کی زیادہ تر خواہش یہی ہوتی تھی کہ یہ نیمبو اور مرچ لگا بھٹا، گرم مونگ پھلیاں اور نرم ریوڑیاں بھائی سمیت اُس کی دونوں بہنوں تک بھی ترسیل ہوتی رہیں۔ مولانا صاحب دل پر پتھر رکھے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے اور بار بار زیرلب ''لاحول ولاقوۃ'' کا ورد بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اُن سے دو نشست پیچھے دو صاحبان بڑی شد و مد سے ایک دوسرے کے پتے اور ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے میں مصروف تھے، حالانکہ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے اسٹیشن پر اُترتے ہی وہ یوں اپنی اپنی راہ لیں گے کہ پھر کبھی پلٹ کر بھی ایک دوسرے کی جانب نہیں دیکھیں گے۔ لیکن بہرحال، وقت تو کسی طور کاٹنا ہی تھا۔ مجھ سے پچھلی نشستوں پر سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں کے بادل تیر رہے تھے اور اس نیلگوں ماحول میں چار حضرات بیٹھے تاش کھیلنے

میں یوں مگن تھے جیسے انہیں زندگی میں اس ٹرین سے اُترنے کے بعد دوبارہ کبھی تاش کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ اب تک جانے کتنی بازیاں کھیل چکے تھے لیکن کسی پر بھی بازی جیتنے کی خوشی، یا داؤ ہار جانے کے دُکھ کے آثار نمایاں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہر بازی کے اختتام پر چند نعرے بلند ہوتے اور پھر سے وہ چاروں نئی بازی کے پھیرے میں اُلجھ جاتے، جانے یہ کیسی سعی لاحاصل تھی.....؟.....

اچانک ٹرین کی رفتار کم پڑنے لگی۔ اُوپر برتھ پر لیٹے ہوئے ایک حضرت نے جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اپنے چہرے پر ڈلی ہوئی چادر ہٹا کر درجنوں بار تفتیشی انداز میں دولت پور کے اسٹیشن کا پوچھ چکے تھے انہوں نے ایک بار پھر جلدی سے چادر ہٹائی اور وہیں سے آواز لگائی ''کیوں میاں..... دولت پور کا اسٹیشن تو نہیں آ گیا۔'' اور پھر حسب معمول کسی کا جواب نہ پا کر دوبارہ اپنے چہرے پر اپنا کھیس پھیلا کر خراٹے لینے لگ گئے۔ ٹرین نے چند زوردار جھٹکے لیے اور پھر ایک لمبی سی اسکریچ کی آواز کے ساتھ آخری ہچکی لے کر رُک گئی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا جس کے پلیٹ فارم کے سروں پر جڑے تختوں پر لکھا نام تک ماہ و سال کی گردش کی تاب نہ لاتے ہوئے مٹ چکا تھا۔ تاش کی بازی والوں میں سے کوئی ایک چلایا۔ ''چل بے سلو..... اسٹیشن آ گیا۔ اب شرط کے مطابق بھاگ کر گرم گرم پکوڑے اور چٹنی پکڑ لا..... اور دیکھ پکوڑوں پر چاٹ مصالحہ ڈلوانا نہ بھول جائیو.....'' سلو نے حکم کی تعمیل میں فوراً پلیٹ فارم پر جمپ لگائی اور پکوڑے والے کے ٹھیلے کی جانب دوڑ لگا دی۔ مولانا کی بیگم نے بھی شاید گرم پکوڑوں کے تذکرے کو سن کر اپنے میاں کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ مولانا بادل نخواستہ کراہتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ڈبے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بیگم کو نقاب تانے رکھنے کی ہدایت کی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جانے انہیں کیا ہوا کہ میرے سے کھنکار کر رُکے اور آہستہ سے بولے ''میاں..... میں ذرا نیچے سے کچھ سامان پکڑ اؤں۔ آپ زنانے کا دھیان رکھیے گا.....'' میں نے چونک کر حیرت سے اُن کی جانب دیکھا لیکن وہ آگے بڑھ چکے تھے۔ پورے ڈبے میں انہیں میں ہی قابل اعتبار کیوں دکھائی دیا.....؟ ر خود ہی میری توجہ اپنے حلیے کی جانب چلی گئی۔ اوہ..... تو ایک بار پھر میرا یہ ظاہری حلیہ ہی برا تعارف ثابت ہوا تھا۔ جانے ہم انسانوں نے کسی کی ظاہری وضع قطع کو ہی شرافت و

نجابت کا معیار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ یا پھر شاید ہم ظاہر پرستوں کے پاس اس وقتی پیمانے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہو بھی نہیں سکتا تھا.....؟..... تبھی تو وہ مولانا اپنی پوری ''زلیخا'' میرے حوالے کر کے اطمینان سے پلیٹ فارم پر اُتر چکے تھے۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی بیگم نے شوہر کے اُٹھتے ہی اپنا نقاب کچھ اس طرح سے کس کر لپیٹا اور یوں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئیں کہ چاہ کر بھی کسی کی نظر اُن کی جانب اُٹھ نہیں سکتی تھی۔ جانے کیوں مجھے اُس وقت بہت شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ پردہ ہی عورت کی سب سے بڑی ڈھال ہے اور مرد کی غیر موجودگی میں یہ پردہ ہی عورت کا سب سے بڑا تعارف بھی بن جاتا ہے۔ مولانا کی بیگم کو جب تک میاں کی ڈھال میسر تھی وہ گاہے بگاہے خود کو بے نقاب بھی کر لیتی تھیں لیکن جیسے ہی اُن کی یہ آڑھ چند لمحوں کے لیے اُن سے کچھ دُور ہوئی تو فوراً انہوں نے اپنی ڈھال یعنی اپنے پردے کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لیا۔ مجھے اُس پل ایک اور انجانا اور بہت عجیب سا ادراک بھی ہوا کہ مرد کی نظر اور عورت کی حیا میں دامن اور چنگاری کا تعلق ہے۔ مرد کی نظر چنگاری ہے تو عورت کی حیا ایک نازک دامن ہے۔ کبھی چنگاری دامن کی طرف لپکتی ہے تو کبھی دامن اس چنگاری کو ہوا دے کر بڑھکا دیتا ہے۔ اور نتیجہ دونوں صورتوں میں صرف اور صرف آگ بن کر ہی وارد ہوتا ہے۔ یہ دامن اور چنگاری کا کھیل ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

ٹرین کو اس اسٹیشن پر رُکے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہوئے تو کچھ لوگ معلومات کے لیے پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ پتا چلا کہ چند لمحوں میں ہی کوئی کراسنگ ہونے والی ہے لہٰذا سگنل ملنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ تبلیغی جماعت کے حضرات کو بھی موقعہ مل گیا کہ تب تک جلدی سے جماعت ہی کروالی جائے۔ نیچے اُترتے اُترتے اُن میں سے کسی صاحب نے مجھے بھی دعوت دی اور میں بھی اُن کے ساتھ ہی نیچے پلیٹ فارم پر اُتر آیا لیکن جماعت کھڑی ہونے سے پہلے ایک عجیب سی صورت حال آن کھڑی ہوئی۔ جن صاحب نے امامت کروانی تھی وہ اچانک پلٹے اور اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور مجھ سے بولے ''حضرت..... آیئے آپ جماعت کی امامت کیجیے.....'' کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا لیکن جب انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آگے کھڑا کرنا چاہا تب میں بالکل ہی بوکھلا گیا اور میں نے بڑی مشکل سے پوری جماعت کو یقین دلایا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا خود کو..... لیکن سبھی نمازیوں نے امام صاحب کی ہاں میں

ں ملانا شروع کر دی تھی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ جناب ابھی تو میری زبان تکبیر تک دیتے
ے لڑکھڑا سی جاتی ہے تو پھر بھلا میں کہاں اور امامت کہاں؟ درگاہ کی مسجد میں بھی مولوی
ھر کے شدید اصرار کے باوجود میں صف میں بالکل اُن کے پیچھے نہیں کھڑا ہوتا تھا تاکہ مجھے
کبیر نہ کہنی پڑے۔ پتا نہیں میں خود کو اپنے اس داغ دار دامن کے ساتھ ان اعزازات اور ان
نوں کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے پلیٹ فارم پر صورت حال کو اُن سب
ازیوں پر واضح کیا اور جماعت کے لیے اُنہی صاحب کو راضی کیا جو اصل پیش امام تھے۔
ماعت ختم ہونے سے پہلے ٹرین دو بار سیٹی بجا چکی تھی، لہٰذا ہم سب سلام پھیر کر جلدی جلدی
نی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے اور اگلے لمحے ہی ٹرین نے کسی بوڑھے کے غرارے کرنے جیسی آواز
کے ساتھ دو چار جھٹکے لیے اور پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ نوجوان
الب علموں کا گروپ اب اپنی جگہ تبدیل کر کے میرے بالکل سامنے والی نشست اور میرے
قابل اپنی جگہ سنبھال چکا تھا جس کی وجہ شاید وہ ہپی جوڑا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی نہ جانے
س دوسری بوگی سے ہمارے ڈبے میں آ کر بیٹھا تھا۔ مرد کی بھوری مونچھیں حد سے زیادہ پھیلی
ئی تھیں اور چہرے پر ہفتے بھر سے زیادہ کی بڑھی شیو کے ساتھ تھکن کے آثار بھی نمایاں تھے
ب کہ لڑکی کے بال سنہرے تھے جسے اُس نے دو چوٹیوں کی صورت میں اپنے دُھول سے
ٹے لیکن گلابی چہرے پر شانوں کی سمت جھلا رکھا تھا۔ لڑکوں کی ساری توجہ اِسی میم کی جانب
تھی اور وہ سب ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس ہپی جوڑے کا حدود اربعہ معلوم کرنے کی کوشش کر
رہے تھے اور انہیں اپنے مکمل ''تعاون'' کا یقین دلا رہے تھے۔ جب کہ بوگی کے تمام بزرگ
ہیں اس حرکت پر گھور گھور کر باز رہنے کی تلقین میں کوشاں تھے۔ لڑکوں نے مجھے دیکھا تو بوگی
کے لوگوں کا دھیان بٹانے کے لیے اُن میں سے ایک نے بات جوڑی۔

''سلام مولانا جی..... میرا ایک سوال ہے آپ سے..... دراصل مجھے دعائے قنوت پوری
ادنہیں ہوتی..... تو کیا میں عشاء کی نماز کے وتروں میں دعائے قنوت کی جگہ تین بار قل ہو اللہ
پڑھ لیا کروں.....؟'' لڑکے کے سوال کے خاتمے تک اُس کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر
کراہٹ نمودار ہو چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف وقت گزاری اور لوگوں کی نظر کی برچھیوں
کو ٹالنے کے لیے یہ موضوع چھیڑ رہے تھے تاکہ انہیں اس گوری میم کے قریب بیٹھنے کا مزید

کچھ وقت اور موقع مل سکے۔ میرے ہونٹوں پر بھی اُس کا سوال سن کر مسکان آ گئی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں..... میں تو خود ابھی تک تین بار قل ہو اللہ سے ہی کام چلا رہا ہوں۔'' میری بات سن کر آس پاس بیٹھے سبھی لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ سارے لڑکے بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اُن میں سے ایک نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ارے یار تم تو بالکل ہم جیسے ہو۔ پھر اتنی دیر سے یوں سنجیدہ سی صورت بنا کر کیوں بیٹھے ہوئے ہو.....؟'' چند لمحوں میں وہ تینوں مجھ سے یوں گھل مل چکے تھے کہ جیسے میں بھی اُن کا کالج فیلو یا ہم جماعت ہوں۔ حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں اُن میں سے ایک نے مجھ سے یہ سوال بھی کر ڈالا کہ ''حافظ جی! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟'' اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میں جو آج اُن کے ساتھ اس ٹرین میں بیٹھا ہوا یہ سفر کر رہا تھا، یہ راستے یہ منزلیں..... میرا سبھی کچھ اُس ایک محبت کی دین ہی تو تھا۔ پتا نہیں ہم محبت جیسے جذبے کو بھی حلیے کی بنیاد پر کیوں پرکھتے تھے۔ کیا شرعی لباس پہننے سے، یا چہرے پر چند ہفتوں کی ڈاڑھی بڑھ آنے سے انسان ان لازوال رُوحانی جذبوں کا حق رکھنے سے بھی محروم ہو جاتا ہے؟ میں نے اُسے جواب دیا کہ فی الحال تو میں محبت کی کھوج میں ہوں..... ہاں البتہ اگر کبھی اس کھوج میں مجھے کامیابی ہوئی تو اُسے ضرور مطلع کر دوں گا۔ سبھی لڑکے چلائے کہ ''مولانا آپ ہمیں اپنی شادی میں ضرور مدعو کیجیے گا۔'' سبھی بوگی والے ہنس پڑے۔ اچانک ہی مجھے بہت ٹوٹ کر زہرا کی یاد آئی۔ کیا ہم کبھی واقعی مل پائیں گے؟ کیا یہ دنیاوی ملن جسے لوگ یہاں شادی کے بندھن کا نام دیتے ہیں، کیا یہی بندھن ہی صرف اسی زمینی محبتوں کی معراج ہوتا ہے؟ کیا صرف ایک رسم کے ادا ہو جانے سے اور ایک بندھن میں بندھ جانے سے ہماری محبت کی تکمیل ہو جاتی ہے؟ پر مجھے نہ جانے کیوں یہ جسمانی ملاپ ہمیشہ سے ہی اُس گلابی اور اَن چھوئے احساس کی فنا جیسا لگتا تھا جسے ہم صرف دل سے دل اور رُوح سے رُوح کا ملاپ، یا محبت کہتے ہیں۔ مجھے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ جیسے ہم اس بندھن کے سودے میں کچھ نہ کچھ کھو ضرور دیتے ہیں۔ لاحاصل کی کسک اور دسترس سے دُوری کی تڑپ کا بھی تو اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے جس کا خمار ملکیت مل جانے کا احساس مٹا دیتا ہے۔ تبھی کچھ لوگ جس لمحے اس بندھن کی گانٹھ باندھ رہے ہوتے ہیں ٹھیک اُسی پل وہ اپنے رُومان کے انمول سنہری جال کی گرہیں سدا کے لیے کھول بیٹھتے

ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا جسم تو مل جاتا ہے لیکن وہ اپنے رُومان کی رُوح کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے ہیں۔

میں جانے کتنی دیر عشق اور رُومان کی یہ اُلجھی گتھیاں سلجھاتا رہا۔ گاڑی کافی دیر سے کمال آباد نامی شہر کے جنکشن پر کھڑی تھی۔ اچانک میری نظر باہر پلیٹ فارم پر پڑی اور کچھ دیر کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ اب میں واقعی جاگتی آنکھوں سے بھی سپنے دیکھنے لگا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے زہرا کو کسی درمیانی عمر کی عورت کے ساتھ پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہو۔ ہاں..... بالکل..... وہ زہرا ہی تو تھی لیکن نقاب کے بغیر اور عورت بھی میرے لیے انجانی تھی، لیکن زہرا.....؟ یہاں.....؟ کمال آباد کے اس ریلوے پلیٹ فارم پر؟ اگلے ہی لمحے میں لپک کر اُٹھا اور تقریباً دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُتر آیا۔ اسٹیشن کافی بڑا تھا اور یہاں بھیڑ بھاڑ بھی کافی تھی لیکن ابھی تک میں دُور جاتی اُس عورت کی سفید بڑی سی چادر دیکھ سکتا تھا جسے میں نے زہرا کی اس شبیہ کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جب تک میں پلیٹ فارم کے خارجی دروازے تک پہنچا تب تک وہ اسٹیشن سے نکلتی بھیڑ میں گم ہو چکی تھیں۔ میں نے لپک کر باہر دیکھا لیکن سڑک پر تانگوں، سائیکل رکشوں اور موٹر گاڑیوں کے اس ہجوم میں مجھے اُن دونوں کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اتنے میں گاڑی نے تیسری سیٹی بھی بجا دی اور جب تک میں بھاگتا ہوا اپنے ڈبے تک پہنچا، ٹرین تقریباً پلیٹ فارم چھوڑ ہی چکی تھی۔

اپنی نشست پر بیٹھ کر بھی میں کافی دیر تک اِسی اُدھیڑ بن میں ہی اُلجھا رہا۔ کیا یہ میری نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔ زہرا اتنی بھیڑ میں بنا نقاب کیسے گھوم سکتی ہے؟ اور پھر وہ اجنبی عورت اُس کے ساتھ کون تھی؟ لیکن روپ تو بالکل زہرا کا ہی تھا، وہی خیرہ کن اور مبہوت کر دینے والی شبیہ..... مگر وہ یہاں اس دُور دراز شہر میں کس غرض سے آ سکتی ہے؟ ایک بار تو جی میں آیا یہیں کمال آباد کے مضافات سے گزرتی ٹرین کی زنجیر کھینچ کر اُتر جاؤں اور واپس شہر جا کر اُسے تلاش کروں لیکن کہاں.....؟ میرے لیے تو وہ شہر بھی اتنا ہی اجنبی تھا جتنا کہ خود میرا یہ وجود لیکن اُس لمحے میرے اپنے لیے ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی ہم یک لخت اپنے آپ ہی سے بیگانے اور اجنبی بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا وجود اور اپنی ہر کھوج اور کوشش بے معنی اور لاحاصل سی لگنے لگتی ہے۔

میں بھی نا اُمیدی اور مایوسی کے ایسے ہی گردابوں میں پھنسا ہوا تھا کہ اُن لڑکوں کی منزل آ گئی اور مغرب سے پانچ منٹ پہلے ایک درمیانے درجے کے اسٹیشن پر وہ تینوں مجھ سے گلے مل کر اُتر گئے۔ اُترنے سے پہلے اُن میں سے ایک نے شاید اپنا پتا، یا ٹیلی فون نمبر لکھ کر اُن دو بہنوں میں سے ایک کی جانب اُچھالا لیکن چائے والے لڑکے کے درمیان میں آ جانے کی وجہ سے وہ درمیان میں ہی کہیں گر گیا۔ تب تک لڑکیوں کے باپ کی توجہ اُن کی جانب ہو چکی تھی لہٰذا وہ مایوسی کے عالم میں مجھ سے گلے ملتے ہوئے دھیرے سے میرے کان میں بولا "اپنی قسمت خراب ہے حافظ جی..... ہو سکے تو اُترنے سے پہلے بڑی والی کو ارشد کا سلام کہیے گا۔ اُس کا نام ناہید بتایا ہے اُس کے بھائی نے....." فوراً ہی ٹرین نے جھٹکا لیا اور اسٹیشن ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔ تینوں میری جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے مغرب کے وقت کے اندھیرے کا حصہ بنتے گئے۔ حسب معمول مغرب کے وقت کے عجیب سے اثر نے میرے اِردگرد اُداسی کے سائے لمبے کر دیئے۔ میں نہ جانے کیوں اس زوال کے وقت اس قدر نڈھال سا ہو جاتا تھا۔ سارے دن کی تنہائی ایک ہی لمحے میں میرے اندر بسیرا کر لیتی تھی۔ اچانک ہی میرے اِردگرد چنبیلی کے تیل جیسی عجیب سی خوشبو بکھر گئی۔ میں نے چونک کر سامنے والی برتھ پر نظر ڈالی تو ایک چھوٹے قد کا منحنی سا شخص جس کے بال شاید اسی تیل میں چپڑے ہوئے تھے اور پیچھے کی جانب چپکا کر بنائے گئے تھے، اپنی چھوٹی چھوٹی، لیکن نیزے کی نوک جیسی چبھتی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ مجھے اُس کی آمد اور برتھ پر چڑھنے کی بالکل بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شاید وہ اُس وقت برتھ پر آ چڑھا ہو جب میں چلتی ٹرین میں ہی بیٹھے بیٹھے مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی چبھتی نظروں سے اُلجھن سی ہونے لگ گئی تھی۔ جانے یہ جبل پور کا اسٹیشن کب آئے گا۔ اُس نے شاید میرے اندر کی بے چینی بھانپ لی اور وہیں سے بولا "کہاں جانا ہے.....؟....." میں سٹ پٹا سا گیا۔ "جی..... جبل پور....." "ہونہہ..... جبل پور میں کس کے پاس جاؤ گے.....؟..... مجھے بھی وہیں اُترنا ہے....." میں نے بات بنائی "وہ مجھے لینے خود ہی اسٹیشن پر آ جائیں گے....." اب میں اُسے کیا بتاتا کہ خود مجھے ابھی تک پتا نہیں تھا کہ مجھے جبل پور میں کس کے پاس جانا ہے۔ میں تو سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اس ٹرین میں آ بیٹھا تھا اور مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ مجھے

ل پور کے اسٹیشن پر اُتر جانا ہے۔ لیکن شاید اُس کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی لگاتار اُسی رح مجھے گھورے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے یوں لگنے لگا کہ اُس کی نظر کی یہ دھار میرے بود کے آر پار ہو جائے گی۔ وہ تو بھلا ہوا سامنے بیٹھے ہوئے دیہاتی نما ایک مسافر کا جس نے نے کھانے کا ڈبہ کھولا اور سبھی مسافروں کو کھانے کی پیش کش کرنے لگا۔ حالانکہ اُس کے ٹفن ں بمشکل اتنا کھانا تھا کہ صرف ایک انسان کا ہی پیٹ بھر پاتا لیکن شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے ا رزق کی برکت اور فراوانی، نیت کی فراوانی سے متصل ہوتی ہے۔ اُس شخص کے کھانے کا بھلے ہی خالی تھا لیکن اُس کی نیت بھری ہوئی تھی اور باقاعدہ چھلک رہی تھی..... اور اس لکاہٹ کا نور اور اطمینان اُس کے چہرے سے بھی صاف عیاں تھا۔ اُس نے لجاجت سے ے بھی کہا ''بیٹا..... ایک لقمہ تو لے لو..... میری خوشی کی خاطر.....'' میں نے مسکرا کر ایک الہ توڑا اور سالن میں بھگو کر منہ میں رکھ لیا۔ سچ ہے کہ خلوص اور محبت کا اپنا ہی ایک ذائقہ ہوتا ہے جسے اگر زبان کے ذائقے کے غدود نہ بھی محسوس کر سکیں پر رُوح اس ذائقے سے بخوبی آشنا تی ہے۔ اس سارے ہنگامے میں کچھ پل کے لیے ہی سہی، پر کم از کم مجھے اس عجیب الخلقت ں کی گھورتی نگاہوں کے احساس سے نجات مل گئی۔ کچھ دیر بعد جب میں نے اُوپر برتھ کی ب نگاہ ڈالی تو وہ سر تک چادر تانے لیٹ چکا تھا۔ اگلے حصے میں بیٹھی بہنوں میں سے بڑی ں، جس کا نام ارشد نے ناہید بتاتا تھا، نے اپنے ریڈیو کی سوئی گھمائی اور چند سرسراہٹوں کے رکسی نغمے کے بول فضا میں گونجے۔

''مالک نے بنایا..... انسان کو

انسان محبت کر بیٹھا.....

وہ اُوپر بیٹھا..... کیا جانے.....؟

انسانوں پہ کیا گزری ہے..... گزری ہے.....

دیوانوں سے یہ مت پوچھو..... دیوانوں پہ کیا گزری ہے.....

تبلیغی جماعت میں سے ایک بزرگ جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے اُن کے چہرے پر اری کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ دھیرے سے بڑبڑائے ''لاحول ولا..... یہ شاعر حضرات ا کیا کیا اُول فول بکتے رہتے ہیں۔ یہ تو نرا کفر ہے..... بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اُسے

اُوپر بیٹھے کچھ خبر ہی نہیں.....نعوذ باللہ....."

ساری تبلیغی جماعت نے اُن کی بات سن کر اپنا سر دھنا۔ شاید بغاوت اور شکو
انسانوں کے ضمیر کے ساتھ ہی گوندھا گیا ہوگا۔ تبھی ہم اپنے شعروں میں، اپنی دعاؤں میں
اپنی شکایتوں میں اُوپر والے سے اپنے حال سے بے خبر ہونے کی فریاد کرتے رہتے ہیں۔
شاید اسی لیے وہ شعر اور غزلیں بھی زیادہ مشہور ہوتی ہیں جن میں خدا سے شکوہ کیا گیا ہو۔ ہ
بزدل جو خود اپنے دل کی بات براہ راست خدا سے کہہ نہیں پاتے وہ ایسے شعر اور غزلیں پڑھ
ہی خوش ہو جاتے ہیں جس میں خدا کے سامنے اُس کی دی ہوئی تقدیر کی وجہ سے بربادی
فسانے بیان کیے گئے ہوں۔ شاید اسی لیے انسان کو ازل سے "ناشکرے پن" کے طعنے
سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جہاں شکوہ نہ کرنے والوں کا گروہ خود کو خدا
زیادہ قریب تر اور پسندیدہ ہونے کا حق دار سمجھتا تھا، وہیں یہ سارے شاعر، ادیب اور اُن جیسے
دوسرے شکوہ گر بھی خود کو خدا کا سب سے زیادہ لاڈلہ بتاتے تھے۔ اب یہ تو خدا ہی جانتا تھا
اُن میں سے زیادہ سچا کون تھا۔ ہجوم "شکوہ کناں"، یا "شکوہ گریزاں".....؟

اگلے اسٹیشن پر دونوں شوخ بہنیں بھی اپنے بھائی اور ماں باپ سمیت اُتر گئیں۔ جا
ہوئے بڑی بہن کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ مجھے ارشد کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی اور میرے
ہونٹوں پہ خود بخود ایک دھیمی سی مسکان اُبھر آئی۔ ہمارے اِردگرد نہ جانے ایسی کتنی کہانیاں بنتے
سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ بعض مرتبہ تو خود ہمیں بھی پتا نہیں چلتا کہ ہمارے مقدر کی کوئی
سی نظر ہم سے چوک گئی ہے۔ محبت کی جانے کتنی داستانیں بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔
اگر ارشد کا پھینکا ہوا پرچہ ناہید کے قریب گرتا اور وہ اُسے پڑھ لیتی تو کیا ہوتا.....؟..... کیا
تقدیر صرف اُسی قدر لکھے کا نام ہے جو ہمارے ساتھ پیش آتا ہے؟ اور جو ہمارے ساتھ پیش
آتے آتے پیش نہیں آتا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر ارشد کے پھینکے ہوئے پرچے کے
درمیان میں اُس شخص کا کاندھا نہ آتا اور وہ رُقعہ ناہید کے پیروں میں جا گرتا تو کیا اُن کی اک
مختصر سی محبت کی کہانی کا انجام کچھ اور نہ ہوتا.....؟ کہیں ہماری بیک وقت دو تقدیریں تو نہیں
لکھی گئی ہوتیں.....؟..... کہیں ہم ہر بار انجانے میں اپنی اصل تقدیر سے چوک تو نہیں رہے
ہوتے.....؟..... کہیں خدا نے بندے کو یہ اختیار تو نہیں دے رکھا ہوتا کہ وہ اپنی ہمت اور محنت

اسی جستجو سے اپنی تقدیر کو بدل سکے.....؟.....افسوس میرے پاس سوال تو بہت تھے لیکن
ایک بھی نہیں تھا.....

میں نے ایسے ہی کچھ سوال ٹرین سے اُترتی ہوئی ناہید کی آنکھوں میں بھی دیکھے۔ شاید
اترتے وقت مجھ سے یہی گلہ کر رہی تھی کہ میں نے ارشد سے اُس کا مکمل پتا خود ہی پوچھ
سے کیوں نہیں بتا دیا.....؟.....اب وہ کبھی زندگی بھر اُسے دیکھ نہیں پائے گی۔ کسی سے بیاہ
پہلے بیوی، پھر ماں، پھر نانی، دادی بن جائے گی لیکن جاڑے کی خنک رات کی طرح یہ
خلش تا عمر اُس کے دل میں کپکپی سی پیدا کرتی رہے گی۔ ایک چہرہ وقت کی دُھول میں
اٹ کر مٹنے کے باوجود اُس کے کورے دل کے آئینے میں اپنا ہیولہ چھوڑ جائے گا۔ نہ جانے
پل بھر میں مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ مجھے یوں
ے ناہید اور ارشد کے انجان مقدر کی پرچی کسی اور سے نہیں، خود مجھ سے ہی کہیں گم ہو گئی
ناہید کے اُتر جانے کے بعد میں خود بھی نہ جانے کتنی دیر یونہی گم صم سا بیٹھا رہا، تاوقتیکہ کوئی
سے چلایا ''جبل پور آ گیا.....جبل پور.....''

میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو ٹرین رُک چکی تھی۔ میں اپنا مختصر سا بیگ لے کر اندھیرے
ران سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ اسٹیشن سنسان پڑا ہوا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور ٹرین
جانے کے بعد صرف میں ہی وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ اچانک مجھے اس سناٹے میں پھر سے
دو آنکھوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ میں چونک کر پلٹا تو دُور اندھیرے میں وہی عجیب
ت جسامت والا کمزور سا شخص ایک لیمپ پوسٹ کی مریل سی پیلی روشنی کے دائرے میں
مجھے گھور رہا تھا۔ نہ جانے کیوں پل بھر میں ہی مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک عجیب سی
اہٹ کا احساس ہوا۔ آخر یہ شخص مجھ سے کیا چاہتا تھا.....؟

سود و زیاں

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اُس شخص سے اس آنکھ مچولی کا مقصد پوچھوں کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ ''کیا آپ کا نام عبداللہ ہے؟'' میں اس قدر محو تھا کہ اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی سا شخص عام مزدوروں کے حلیے میں کھڑا نظر آیا۔ اُس نے اپنا صافہ سر پر خوب کس کر باندھ رکھا تھا اور پرانے بوسیدہ گرم کوٹ کو آخری بٹن تک خوب کس کر سینے پر باندھ رکھا تھا۔

''جی..... میں عبداللہ ہوں.....'' اُس نے میرا جواب سنتے ہی لپک کر میرا بیگ اُٹھایا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کریم خان صاحب نے بھیجا ہے۔ میرے پیچھے چلے آئیں.....'' میں اُس سے یہ بھی نہیں پوچھ پایا کہ یہ کریم خان صاحب کون ہیں جنہوں نے آدھی رات کو اُسے مجھے اسٹیشن سے لانے کے لیے بھیجا ہے۔ شاید اُس کے انداز میں ہی اتنی بے ساختگی تھی کہ میں نے بھی اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ اچانک مجھے اس لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے شخص کا خیال آیا اور میں پلٹ کر دیکھا اور پھر میرے قدم جم سے گئے۔ لیمپ پوسٹ خالی پڑی تھی۔ وہاں اب دُور دُور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اندھیرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ پھر سے میرے رہبر کی آواز گونجی۔ ''بابو جی چلیں..... ہمیں بہت دُور جانا ہے.....'' میں چونک کر پلٹا لیکن پلیٹ فارم سے نکلتے نکلتے بھی میں نے کئی بار مڑ کر دوبارہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے تو نہ جانے زمین کھا گئی تھی، یا آسمان نگل چکا تھا۔ مجھے زیادہ حیرت اس لیے ہوئی کہ اسٹیشن سے باہر نکلنے کا واحد راستہ صرف وہی بڑا سا آہنی دروازہ تھا جس کے قریب ہم اس وقت کھڑے تھے، پھر وہ کہاں چلا گیا.....؟

میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو رات کے کہرے اور سفید بادلوں جیسی دُھند میں میں نے کریم خان کے بھیجے ہوئے بندے کو ایک تانگے میں کوچوان کی جگہ بیٹھے دیکھا۔ میں بنا کچھ کہے پچھلی

نشست پر بیٹھ گیا اور اُس نے تانگے کو اینٹوں سے بنی سڑک پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد کوچوان نے اپنی جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگائی اور مجھ سے پوچھا ''بابو جی..... بیڑی پئیں گے.....؟'' ''نہیں..... میں بیڑی نہیں پیتا.....'' وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا۔ ''اچھی بات ہے..... یہاں کی بیڑی ویسے بھی کچھ خاص ذائقہ دار نہیں ہوتی۔ بیڑی تو اصلی جبل پور کی ہوتی ہے..... وہی بارڈر پار والا جبل پور..... سنا ہے کہ وہاں بیڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہوتے تھے۔ جہاں سے ساری دنیا کو بیڑی بھیجی جاتی تھی..... پھر وہاں سے کچھ مزدور سرحد سے اس پار اس گاؤں میں آ کر بس گئے اور انہوں نے یہاں بھی بیڑیوں میں دیسی تمباکو بھرنا شروع کر دیا تو اس علاقے کا نام بھی سرحد پار والے جبل پور کے نام پر پڑ گیا۔ پر جناب، اصل جبل پور تو اسی طرف والا ہے۔ ہمارا والا تو اُس کی نقل بھی نہیں..... کیا بات ہے اُس طرف کی بیڑیوں کی..... ایک کش میں ہی رُوح تازہ ہو جاتی ہے..... پر جی میری گھر والی کہتی ہے کہ بیڑی پینا بُری لت ہے..... بندے کو آخری عمر میں ٹی بی ہو جاتی ہے..... پر جناب بیڑی نہ پی کر لمبی عمر جینے سے تو یہی بہتر ہے کہ بندہ بیڑی پی کر جلدی مر جائے.....'' وہ لگاتار اور بنا رُکے بولے جا رہا تھا۔ شاید اُسے بہت دنوں سے کوئی اچھا سامع میسر نہیں آیا تھا۔ اُس کا نام بشیر تھا جو اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ یہ تانگا اُس کے باپ کے دور کی جاگیر تھا جو ترکے میں اُس کے حصے میں آیا تھا اور یہی وہ واحد تانگا تھا جو گاؤں بھر کی سواریوں کو اسٹیشن چھوڑنے اور وہاں سے گاؤں کے لیے لانے کے کام آتا تھا۔ سردی کی وجہ سے دُھند بڑھتی جا رہی تھی اور ہم اب ایک کچی سڑک پر آ چکے تھے۔ کوئی دُور سے ہمیں دیکھتا تو ہم اُسے شاید بادلوں میں تیرتے ہوئے ہی نظر آتے۔ گھوڑا اب تیزی سے ہانپ رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے گرم بھاپ وقفے وقفے سے بھاری آواز کے ساتھ یوں چھوٹ رہی تھی جیسے کوئی پرانا اسٹیم انجن دوڑا جا رہا ہو۔ بشیرے نے تانگے کے بانسوں کے اگلے سرے پر لگے گیس کے دونوں ہنڈولے جلا رکھے تھے اور اُن سے پھیلتی ہوئی مدھم سی روشنی میں ہم کہرے کی اس چادر کو چیر رہے تھے جس کی شدت کی وجہ سے ہم گز بھر پڑی چیز کو بھی دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کسی آبادی کے آثار شروع ہوئے حسب معمول پہلا استقبال گلیوں کے آوارہ کتوں نے کیا۔ کچھ چیزیں، کچھ باتیں شاید دنیا کی خطے میں تبدیل نہیں ہوتیں۔ رات کا فسوں ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ کچھ

ڈرانے والا، کچھ چھپانے والا..... اور بہت سے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا۔

تانگا ایک بڑی سی کچی حویلی کے پھاٹک نما لکڑی کے دروازے کے قریب جا کر رُک گیا۔ بشیرے نے آواز لگائی ''اوئے کرموا وئے..... مہمان آئے ہیں..... بوا کھول دے.....'' اندر سے کسی بوڑھے کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ ''آیا.....'' کچھ ہی دیر میں پھاٹک کھل گیا اور بشیرے نے تانگا اندر وسیع صحن میں ہی ہنکا دیا۔ صحن کچی اینٹوں سے چنا گیا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ حویلی کا بیرونی صحن ہوگا۔ کیونکہ صحن کے چاروں طرف مہمان خانے کے طرز پر کمرے بنے ہوئے تھے اور سامنے ہی ایک اور ڈیوڑھی نظر آ رہی تھی جس کے اندر ایک دوسرا لکڑی کا دروازہ نظر آ رہا تھا جو اندر والے صحن کی جانب کھلتا تھا۔ بوڑھا کرمو اپنے ہاتھ میں ایک سال خوردہ سی لالٹین اُٹھائے ہماری جانب بڑھا اور اُس نے جلدی سے مجھے سلام کیا اور میرا بیگ تھام لیا۔ بشیرے نے اُسے ہدایات جاری کیں۔

''مہمان کو روٹی ٹکر کھلا کر نئے والے مہمان خانے میں سلا دینا۔ خان صاحب اب صبح ہی ملاقات کریں گے..... کیا سمجھا.....؟'' کرمو نے سر ہلایا۔ بشیرا مجھ سے رُخصت ہو کر چلا گیا اور کرم دین نے مجھے پُرانے طرز کی ایک بیٹھک میں پہنچا دیا جو وہیں صحن کے دائیں طرف بنی ہوئی تھی۔ کمرہ کافی کشادہ تھا اور کھڑکی اس صحن کی جانب کھلتی تھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے بشیرے نے مجھے چھوڑا تھا۔ پلنگ کے ساتھ ایک ڈوری لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا چھت پر لگے ایک کنڈے سے ہوتا ہوا ایک بڑے سے کپڑے کے بنے ہوئے ہتھ پنکھے سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج کل سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے ڈوری کو لپیٹ کر پلنگ کی پائینتی سے باندھ دیا گیا تھا۔ بائیں طرف دیوار کے اندر ہی ایک بڑی سی انگیٹھی بنی ہوئی تھی جس میں کچھ ہی دیر میں کرم دین نے دھکتے ہوئے انگاروں کی پوری پرات اُلٹ دی اور کمرہ کچھ ہی دیر میں خنک سے خوشگوار حدت اختیار کر گیا۔ کرم دین عرف کرمو کے اصرار پر میں نے چند لقمے حلق سے نیچے اُتارے اور رات ڈھلنے کا انتظار کرنے لگ گیا۔ نیند کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری یہ سہیلی تو ویسے ہی عام حالات میں بھی مجھ سے رُوٹھی رہتی تھی تو اس انجان منزل پر بھلا کب میری پلکوں تلے ڈیرہ جمانے والی تھی۔ سو یونہی پلکیں جھپکاتے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ نماز پڑھنے کے بعد میں باہر صحن میں نکل آیا۔ یہ پُرانے طرز کی بڑی سی لیکن کچی

دیواروں اور کچے دالان والی حویلی تھی۔ کرم دین جو وہیں بیرونی ڈیوڑھی کے پاس ایک چھوٹی سی لوہے کی انگیٹھی سلگائے ہوئے بیٹھا تھا اُس نے جلدی سے ایک پیڑھا میرے بیٹھنے کے لیے اسی انگیٹھی کے پاس رکھ دیا اور خود جلدی سے اپنی کوٹھڑی سے سلور کی ایک بڑی سی چینک اٹھا کر لے آیا اور مٹی کے پیالے میں گرما گرم چائے اُنڈیل کر اُس نے میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ ہماری زندگیوں میں کچھ تعلق کس قدر مضبوط اور لازم و ملزوم بن جاتے ہیں جیسے صبح سویرے اور چائے کے کپ کا تعلق..... مگر جب چائے ایجاد نہیں ہوئی ہوگی تب لوگوں کی صبح کیسے ہوتی ہوگی؟ میں گرم پیالے کے کناروں سے نکلتی بھاپ کے عقب میں کرم دین کے جھریوں بھرے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر انہی سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ ہمارے شہروں میں صبح ہمیشہ ایک دم چھم سے کود کر اور ایک چیختے چنگھاڑتے شور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جب کہ یہ دُور دراز کے گاؤں اور علاقے ہر روز صبح کو ایک مہربان اور نرم اُجالے کی طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا عموماً مرغ کی بانگ، چرخے کی کوک اور پن گھٹ پر لگے ہینڈ پمپ کی چوں چوں سے ہوتی ہے۔ مویشی اور ڈھور ڈنگر چونک کر سر اُٹھاتے ہیں اور بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی ٹن ٹن بج اُٹھتی ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد کھیت کی رکھوالی کرنے والے راکھے لمبی لمبی جمائیاں لیتے ہوئے منہ اندھیرے گھر کو لوٹتے ہیں تو اُن کے قہقہے راہوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پن چکی کی سیٹی بھی بلند ہوتی ہے۔ گھروں کے آنگن میں دودھ اور لسی بلونے کی رڑک گونجنے لگتی ہے۔ بڑے بوڑھے اور بزرگ کھنکار کھنکار کر جوانوں کی مست نیند میں رخنہ ڈالنے لگتے ہیں۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں مشرق کی جانب سے ایک گلابی آگ فلک کو دھکانے لگتی ہے جو دھیرے دھیرے سنہری آتشیں رنگت دھار لیتی ہے اور یوں نہ جانے کتنے مرحلوں کے بعد سورج اپنا دمکتا مکھڑا دھیرے دھیرے سرکاتا ہوا گاؤں کی ایک روشن صبح کو مکمل کرتا ہے۔ اتنی خوب صورت صبحوں کے چشم دید گواہ یہ گاؤں والے تبھی تو اتنے اُجلے چہروں اور پاک من کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ صبح میری زندگی کی اُن چند صبحوں میں سے ایک تھی جسے میں نے گھونٹ گھونٹ جیا تھا۔ بالکل اس گرم بھاپ اُڑاتی چائے کے پیالے کی طرح..... جو اس وقت میرے ہاتھوں میں تھما تھا۔ میں نے آخری گھونٹ لیا ہی تھا کہ اندرونی پھاٹک کھلا اور اس میں لمبے قد کا ایک رُعب دار شخص اپنے

سراپے کو گرم کھیس میں لپیٹے اندر سے برآمد ہوا۔ دو نوکر اُس کے دائیں بائیں اُس کا حقہ اور تمباکو وغیرہ اُٹھائے ہوئے تیزی سے چلے آ رہے تھے۔ اُس نے آتے ہی مجھے زور سے بھینچ کر گلے لگا لیا۔

''معاف کرنا جی..... رات کو مجھے ذرا تپ چڑھ گئی تھی۔ دوا پی تو اُونگھ آ گئی اور میں آپ کا استقبال نہیں کر سکا۔ میرا نام کریم خان ہے..... سلطان بابا نے آپ کے آنے کی خبر کر دی تھی۔ پر آپ تو بالکل نوجوان ہو جی..... میں سمجھا تھا کہ سلطان بابا نے پہاڑی والی درگاہ کی خدمت کے لیے کسی بزرگ کو بھیجا ہوگا.....''

اوہ..... تو میری ڈیوٹی اس بار جبل پور میں لگائی گئی تھی۔ یہ تو مجھے اُسی وقت سمجھ جانا چاہیے تھا جب سلطان بابا نے مجھے ٹکٹ دے کر جبل پور کے لیے روانہ ہونے کو کہا تھا۔ لیکن اتنی دُور..... ملک کے اس دوسرے کونے میں بھیجنے کی کوئی خاص وجہ ہی ہوگی۔ صرف درگاہ کی خدمت ہی کرنی ہوتی تو سلطان بابا یہیں جبل پور کے آس پاس سے کسی خدمت گار کو ہی بھجوا دیتے۔ کریم خان نے مجھے بتایا کہ سلطان بابا سال چھ مہینے میں یہاں کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔ گاؤں سے پرے پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ میں مدفون بزرگ بھی کریم خان کے آباؤ اجداد سے ہی تعلق رکھتے تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے سپاہیوں میں شامل تھے اور دین کی حفاظت کرتے ہوئے اُنہی سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گئے تھے جنہوں نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانیں، جاں آفریں کے سپرد کی تھیں۔ تب سے لے کر اب تک اس درگاہ پر جلتا دیا کبھی بجھنے نہیں دیا گیا تھا اور اسے ایک نور کے استعارے کے طور پر لیا جاتا تھا جو اس دنیا میں ظلم اور کفر کے اندھیرے کو مٹانے کی نشانی کے طور پر روشن رکھا گیا تھا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ اللہ کے وہ سارے نیک بندے جو ایسی درگاہوں اور مقبروں میں مدفون تھے جنہوں نے خدا کی وحدت اور اُس کے کلمے کی خاطر اپنی جان دی، یا اپنی ساری زندگی لوگوں کو یہ سمجھانے میں بتا دی کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، انہیں اپنے مزاروں پر شرک جیسی بدعات دیکھ کر کس قدر اذیت ہوتی ہوگی۔ جب وہ یہ دیکھتے ہوں گے کہ لوگ انہیں وسیلہ بنا کر خدا سے مانگنے کے بجائے خود اُنہی سے آس لگائے بیٹھے ہیں تو اُن کی رُوح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ کریم خان صاحب نے

بڑی محبت سے مجھے دوپہر کے کھانے تک حویلی میں ہی رُکنے کی درخواست کی اور پھر سہ پہر کو جب بشیرا اپنا تانگا حویلی کے بیرونی صحن میں لگا چکا تو وہ کپڑے کی چند پوٹلیاں سنبھالے مجھے تانگے پر سوار کرانے آ پہنچے۔ ان پوٹلیوں میں گڑ، چنے، اخروٹ اور بادام اور ایسی ہی چند اور چیزیں تھیں جو خان صاحب بطور خاص میرے لیے لے کر آئے تھے۔ میں نے اُن کے خلوص کو تکلف کا زنگ لگا کر داغ دار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور خوشی سے ساری پوٹلیاں تانگے کی پچھلی نشست پر رکھوا دیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ درگاہ کے گودام میں ابھی مہینے بھر سے کچھ زیادہ کا ہی راشن پڑا ہوگا پھر بھی اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں بلا جھجک اُن سے کہلوا دوں۔ بشیرا ہر جمعرات کی شام کو دیے کا تیل بدلنے کے لیے درگاہ جاتا تھا۔ اُسی کو میرے اور خان صاحب کے درمیان پیغامبر کے فرائض سرانجام دینا تھے۔ بشیرے نے تانگا موڑا ہم حویلی کا پھاٹک کراس کر کے نکلے ہی تھے کہ اچانک خان صاحب کو جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی۔ وہ جلدی سے میری جانب بڑھے ''ہاں عبداللہ بیٹا..... ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ آج کل درگاہ میں کوئی سائل آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔ بڑا پریشان اور مجبور لگتا ہے۔ اپنی کسی منت کے پورے ہونے کی آس میں اپنا گھر بار اور آرام تیاگ کر اس ویرانے میں پڑا ہوا ہے۔ تمہیں کچھ دن تک اُسے بھی اپنے ساتھ ہی رکھنا ہوگا۔ بہت پریشان ہے بے چارہ.....'' ''آپ بے فکر رہیں..... میری جانب سے اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' بشیرے نے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی کر دیں اور کچھ ہی دیر میں تانگا گاؤں سے باہر جاتی اُسی سڑک پر دوڑ رہا تھا جو بہت دُور جا کر محبوب کی کمر کی طرح اچانک ہی خم کھا گئی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے اور صاف شفاف تازہ پانی کی ایک نالی بہہ رہی تھی جس میں بہتے پانی کی گنگھروؤں جیسی سرگم اور تانگے کی ٹپ ٹاپ ٹپ ٹاپ مل کر ایک مدھری موسیقی پیدا کر رہے تھے۔ ہماری زندگی میں باتیں تو ہمیشہ ہی بولتی ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ سناٹا ہم سے بات کرے۔ گاؤں کی نارنجی خزاں رسیدہ پتوں سے ڈھکی اس سڑک کے سناٹے اور اس کے کنارے دوڑتے پانی کے اس نالے کی ترنم نے بھی اس دن مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ بشیرے کو جب سے پتا چلا تھا کہ میں درگاہ کا نیا مجاور ہوں تب سے اُس کا انداز کافی عقیدت مندانہ سا ہو گیا تھا۔ حویلی میں ہی وہ کئی بار مجھ سے یہ درخواست کر چکا تھا کہ میں اُس کے لیے

اولاد نرینہ کی ''منت'' ضرور مانگوں۔ بدلے میں بیٹا ہونے پر وہ مجھے پورے ایک سوا کیاون روپے اور گڑ کی پوری ایک بوری نذر کرے گا۔ میں نے اُس سے کہا کہ ''ایک سوا کیاون روپے میں وہ پورا بیٹا مانگ رہے ہو، کم از کم پورے دوسوا ایک روپے کی منت تو ہونی چاہیے۔'' بشیرے نے چونک کر پیچھے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں شرارت کی تحریر پڑھ کر وہ بھی زور سے ہنس پڑا۔ ''واہ جی..... جی خوش کر دیا آپ نے بشیرے کا..... اب مجھے پورا یقین ہے کہ بشیرے کی دعا بھی ضرور پوری ہوگی.....'' میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس یقین کے ساتھ خود خدا سے دعا کیوں نہیں کرتا کہ اللہ اُسے بیٹا عطا کرے۔ جواب میں اُس نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگائے ''نا جی نا..... بھلا یہ گناہ گار بشیرا اس قابل کدھر کہ خود اللہ میاں سے کچھ مانگ سکے..... اور پھر بشیرے کا مانگنا تو صرف مانگنا ہوگا نا جناب..... لیکن آپ لوگ تو اللہ جی سے ضد بھی کر سکتے ہو..... یہ کام صرف مانگنے سے نہیں ہوتا جی..... یہ تو ضد والا معاملہ ہے..... صرف دعا سے ہی بیٹا ملنا ہوتا تو میری گھر والی پچھلے سات سال سے سجدے میں نہ گری ہوتی.....'' میں نے چونک کر بشیرے کی جانب دیکھا۔ اس سیدھے سادھے سے دیہاتی نے دعا کا کتنا بڑا کلیہ بتا دیا تھا مجھے۔ لیکن کیا واقعی ہم اللہ سے ضد بھی کر سکتے تھے؟ اور اپنی خواہشیں اور دعائیں ضد کر کے بھی اس سے منوا سکتے ہیں؟ جب کبھی بہت لاڈلہ بچہ اپنی پسند کا کھلونا نہ ملنے پر گھر کے صحن میں پیر پٹخ پٹخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے تب یا تو اُسے اپنی ماں سے مار پڑتی ہے، یا پھر ممتا کی ماری ماں کسی بھی طرح مانگ تانگ کر اُسے وہ کھلونا دلوا ہی دیتی ہے۔ تو کیا یہی کلیہ اُس ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے کے ہاں بھی چل جاتا ہوگا؟ وہاں تو مار پڑنے کا بھی امکان نہیں تھا تو پھر ہم انسان اپنے خدا سے ضد کیوں نہیں کرتے.....؟ کہیں یہ ہمارے عقیدے کی کمزوری تو نہیں؟ کہیں ہم طلب اور دعا کے اصل اُصول سے ناواقف تو نہیں.....؟

تانگا اب اس دوراہے پر ایستادہ درختوں والی سڑک سے آگے بڑھ کر ایک کھلے میدان والی سڑک پر دوڑ رہا تھا اور دُور پہاڑی پر واقع ایک چھوٹی سی درگاہ کے آثار اب دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگے تھے۔ آخر ہم اُس مقام پر بھی پہنچ گئے جہاں سے آگے تانگے کے راستے کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ بشیرے نے بہت اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ ہی میرا سامان اُٹھا کر اُوپر

پہاڑی تک جانا چاہتا ہے لیکن میں نے وہیں سے اُسے رُخصت کر دیا۔ جاتے جاتے میں نے اُسے ایک بار پھر چھیڑا ''یہ تو بتاتے جاؤ کہ اگر اس بار واقعی بیٹا ہوا تو اُس کا نام کیا رکھو گے..... کچھ سوچا ہوا ہے پہلے سے کہ نہیں.....'' بشیرا جو تانگے پر بیٹھ کر اپنا چھانٹا پکڑ چکا تھا دھیرے سے مسکرایا اور اُس نے میری جانب غور سے دیکھا..... پہلے تو نہیں سوچا تھا جی..... پر اب سوچ لیا ہے..... میں اُس کا نام ''عبداللہ'' رکھوں گا.....'' بشیرا زور سے ہنسا اور تانگا کچی سڑک پر ٹپ ٹاپ کی دُھن پر دوڑنے لگا۔ میں کچھ دیر تک اپنے اس نئے بنتے رشتے کو دیکھتا رہا۔ ہم انسان کس قدر بھولے اور نازک ہوتے ہیں۔ کتنی جلدی رشتوں کے کومل دھاگے اپنی رُوح کے ریشوں سے جوڑ لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم پل پل ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے اندر احساس نام کا یہ جو جذبہ رکھا ہے یہ ہمیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ ایک آس مٹتی ہے تو دوسری جنم لے لیتی ہے۔ بشیرا بھی ایک نئی آس لیے واپس جا رہا تھا۔

جب میں اپنا سامان لیے اُوپر چوٹی پر بنی درگاہ کے کچے صحن میں پہنچا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ دسمبر کی کچی دھوپ میں بھی میرا ماتھا پسینے سے بھیگ چکا تھا اور اسی پسینے نے میرے ماتھے سے ٹپک کر درگاہ کی سرزمین کو اپنا پہلا سجدہ پیش کیا۔ میں کچھ وہیں صحن میں بیٹھ کر سستاتا رہا۔ میرے اِردگرد درجنوں کبوتر اور چڑیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ شاید کوئی کچھ دیر پہلے ہی انہیں دانہ ڈال گیا تھا۔ درگاہ کے صحن کے وسط میں مضبوط ٹین کی چادروں والی چھپر کے نیچے ایک قبر بنی ہوئی تھی جس کے اُوپر سبز چادر اور کچھ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ پھولوں کی خشک پتیاں تیز ہوا سے بکھر کر صحن میں پھیل رہی تھیں۔ اچانک میرے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر پلٹا تو ایک پکی عمر کا مرد شانوں پر کمبل ڈالے اور ہاتھ میں جلانے والی لکڑی کے چند ٹکڑے لیے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ قریب آ گیا اور میری جانب ہاتھ بڑھا کر بولا ''اوہ..... تو تم ہو عبداللہ..... مجھے خان صاحب نے تمہاری آمد کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا نام اصغر ہے..... اصغر احمد..... میں اپنی ایک منت کے سلسلے میں کچھ دن کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں..... اچھا ہوا تم آ گئے..... کبھی کبھی بہت تنہائی کا احساس ہوتا تھا یہاں.....؟''

میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ کون سی منت تھی جس کی خاطر وہ

اس ویرانے میں پڑے ہوئے تھے۔ کیوں کہ بظاہر اپنے حلیے سے وہ صاحب کافی متمول خاندان سے دکھائی دیتے تھے۔ ہاتھ میں انتہائی قیمتی گھڑی، گلے میں سونے کی چین، اُنگلیوں میں ہیرے کی تین تین انگوٹھیاں اور چہرے پر دولت کی وہ خاص چمک جو اس درگاہ کے غریبانہ سے ماحول میں بھی اپنی جلوہ دکھا رہی تھی۔ میں نے اُن کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... چلیں اگر تنہائی صرف ایک سے دو ہونے سے ختم ہو سکتی ہے تو پھر وہ نفری تو میری آمد نے پوری کر دی ہے..... اُمید ہے ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔''

کچھ ہی دیر میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے اصغر صاحب کو بھی نماز کی دعوت دی لیکن مجھے اُن کا جواب سن کر ذرا سی حیرت ہوئی۔

''نہیں عبداللہ میاں..... میں اپنی نمازیں تنہائی میں ہی ادا کرتا ہوں..... دراصل اس کا تعلق بھی میری منت سے ہی ہے۔ اُمید ہے تم بُرا نہیں مانو گے.....''

''نہیں نہیں..... اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے..... نماز آپ کا اور خدا کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ اپنی نماز ادا کریں، میں اپنی نماز پڑھ لوں.....'' وہ اُٹھ کر درگاہ کے صحن میں بنے ہوئے کچے کمروں میں سے ایک کی جانب بڑھ گئے۔ میرے رہنے کا انتظام بھی انہی کمروں میں سے ایک میں کیا گیا تھا لیکن میں نے وہیں صحن میں بچھے جائے نماز پر عصر پڑھ لی۔ حسب معمول نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہی مجھے اُسی ازلی بے چینی اور مختلف وسوسوں اور خیالات نے آگھیرا جو ہمیشہ سے میرے اور میری نماز کے درمیان حائل تھے۔ لشتم پشتم نماز پڑھ کر میں نے سلام پھیرا اور یوں ہانپنے لگا جیسے میلوں دُور سے دوڑ کر آ رہا ہوں۔ مولوی خضر نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی نمازیں جو صرف زمین پر ماتھا ٹکانے کی حد تک ادا کی جاتی ہوں، وہ پلٹ کر واپس نمازی کے چہرے پر مار دی جاتی ہیں۔ شاید تبھی اپنی ہر نماز کے بعد مجھے اپنے چہرے پر ایک اَن دیکھے طمانچے کا احساس ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں نے اپنی نماز کو فلک چھوئے بنا ہی واپس پلٹتے ہوئے محسوس کیا اور اسی بے چین دل کے ساتھ درگاہ کی کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے چھت کی منڈیر سے سرکتی دھوپ مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ میری زندگی کا ایک اور قیمتی دن ضائع ہو کر گزر گیا ہے..... آج بھی میں نے روز کی طرح صرف اپنا وقت ہی کھویا تھا..... بدلے میں کچھ پا نہیں سکا۔

درد اور مسیحا

اگلے روز صبح سویرے نیچے گھاٹی میں جبل پور کے ڈاکیے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی سنائی دی۔ اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ میں درگاہ کے صحن میں نکلا تو ڈاکیا اپنا خاکی تھیلا لٹکائے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آتا نظر آیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اصغر صاحب کے لیے کوئی خط آیا ہوگا۔ ڈاکیا مجھے عبداللہ کے نام سے جانتا تھا لیکن اُس کی بات سن کر میں زور سے چونک پڑا۔

''جناب یہاں کوئی ساحر صاحب بھی ٹھہرے ہوئے ہیں کیا.....؟.....''

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں خود ساحر ہوں۔ ''کیوں؟..... خیر تو ہے.....''

''جی سب خیر ہے..... اُس کے نام کا ایک خط آیا ہے۔ پتا اسی درگاہ کا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ساحر کے نام کے سامنے چھوٹے حاشیے میں آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔''

میں نے ڈاکیے سے خط لے لیا اور خط پر لکھی تحریر دیکھتے ہی میری سانسیں جیسے رُکنے لگیں۔ وہ زہرا کی تحریر تھی۔ ہاں..... اُسی کے کومل ہاتھوں کی اُنگلیوں کے شاہکار لفافے پر جگمگا رہے تھے۔

میں زہرا کی تحریر لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ حرف بھی تو ہم انسانوں جیسی ہی پہچان رکھتے ہیں ان میں سے ہر حرف اپنا ایک چہرہ رکھتا ہے اور میں زہرا کے ہاتھ سے بنے ان سیاہ گلوں کو خوب پہچانتا تھا۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور میری نظر سفید کاغذ پر لکھے ان موتیوں پر پھسلنے لگی۔

''آداب.....

مجھے ہر پل یہ احساس کیوں ستاتا ہے کہ آپ کو اس راہ پر دھکیلنے کے بعد میں خود ہی بار آپ کی راہ کا کانٹا بن جاتی ہوں۔ میں اور اماں اس وقت کمال آباد میں ہیں۔ زندگی کی پلٹ کسی جانب سر ٹکانے نہیں دیتی۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کا پتا پرانی درگاہ سے

ملا۔ اس تحریر میں پوری بات کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہو سکے تو جلد از جلد کمال آباد میں نیچے و
گئے پتے پر پہنچ جائیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اماں کی ضد ہے کہ آپ
ضرور خبر کر دی جائے۔ شاید وہ بھی میری طرح بالکل ٹوٹ گئی ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے پا
وقت بہت کم ہے۔
.....زہرا

خط کیا تھا، ایک معمہ تھا۔ اصغر صاحب غور سے میرے سامنے کھڑے میرے چہرے
بدلتے تاثرات دیکھ رہے تھے۔ میں نے مختصر لفظوں میں انہیں بتایا کہ کوئی بہت خاص ہے
اس وقت میری ضرورت ہے۔ وہ خوش دلی سے مسکرا کر بولے کہ ''میاں! کچھ خاص لوگ
ہوتے ہیں جنہیں کسی ضرورت، یا مصیبت میں پکارا جاتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر وہاں سے ہو آ
یہاں کا دھیان رکھنے کے لیے میں موجود ہوں۔''

کمال آباد جنکشن جبل پور سے تقریباً دو گھنٹے ٹرین کی مسافت پر تھا۔ میں شام کی گا
لے کر کمال آباد پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سارے راستے میرے ذہن میں یہی بات گر
کرتی رہی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال آباد کے اسٹیشن پر میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا
زہرا ہی تھی؟ لیکن زہرا تو پردے کا بے حد اہتمام کر کے گھر سے نکلتی ہے پھر یوں
نقاب.....؟؟ میں جتنا سوچتا گیا اُلجھن بڑھتی گئی۔ زہرا نے خط میں جس ''کاسنی حویلی'' کا
لکھا تھا وہاں تک پہنچنے میں مجھے کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔ اور جب میں سائیکل رکشہ سے ح
کے مرکزی لیکن بوسیدہ سے پھاٹک پر اُترا تو مجھے حویلی کے نام کی وجہ تسمیہ بھی پتا چل گ
ساری حویلی کاسنی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ باہر کوئی دربان موجود نہیں تھا اور آ
ٹوٹا، لٹکتا ہوا پھاٹک تیز ہوا میں جھول رہا تھا۔ باہر سے گزرتا کوئی بھی راہ گیر ایک ہی نظر میں
دیوار کی شکستہ حالی سے اندر مکینوں کا حال جان سکتا تھا۔ سالہا سال سے بنا قلعی کے در و
سے عجیب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں اِسی شش و پنج میں حویلی کے پھاٹک سے چند قدم
تو بڑھ آیا تھا لیکن اب کاسنی پھولوں کی کیاریوں سے متصل روش پر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ
والوں کو اپنے آنے کی خبر کیسے کی جائے؟

اچانک اندر کی جانب سے ایک آہٹ ہوئی اور کسی عورت کے ہلکے سے کھنکارنے
آواز سنائی دی۔ میں اُسے دیکھ کر زور سے چونکا۔ یہ وہی عورت تھی جو اُس دن ریلوے اسٹ

ے زہرا کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد اُس کا اگلا سوال
ے لیے ایک اور حیرت لے کر آیا۔ ''کیا تم عبداللہ ہو؟'' جواب میں میں صرف اثبات میں
ہلا سکا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گئی۔ میں نیم اندھیری سنسان
ہ سی راہ داریوں میں سے ہوتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ حویلی اگرچہ کھنڈر ہو
ی لیکن اُس کے آثار اب بھی اُس کے گزشتہ مکینوں کی شان و شوکت کا پتا دیتے تھے۔
ہی مجھے اس عورت کے پیچھے چلتے چلتے ان اندھیری غلام گردشوں سے ایک انجانے
ف کا احساس ہوا۔ جانے وہ کون تھی اور مجھے کہاں لے جا رہی تھی۔ آخرکار وہ ایک
لیکن شکستہ حال کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اس وقت مجھے ادراک ہوا کہ
ی بجلی کٹی ہوئی تھی اور چند کمزور موم بتیوں اور دیوں کی نامکمل روشنی کی وجہ سے وہ ماحول
پُراسرار ہوگیا تھا۔ اندر کمرے میں حیرت کا دوسرا شدید جھٹکا میرا منتظر تھا۔ اندر داخل
ہی پہلی نظر میں اس ملگجے چراغوں کے اُجالے میں وہ مجھے زہرا ہی دکھائی دی اور میں
بُت جم کر رہ گیا۔ قریب تھا کہ میں اُسے زہرا کے نام سے ہی پکار لیتا لیکن اُس نے
ئے ہوئے انداز میں جب مجھے سلام کیا تب میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ وہ آواز زہرا کی نہیں
ہاں..... وہ زہرا نہیں تھی اور قریب سے دیکھنے پر اُس کی زہرا سے اچھی خاصی مشابہت
وجود چند واضح فرق محسوس کیے جا سکتے تھے۔ اُس کا چہرہ ڈھکا ہوا نہیں تھا اور وہ قد میں
سے کچھ کم تھی اور اُس کی آنکھیں بھی گہری کالی کی بجائے نیلگوں سی تھیں اور شاید نیند، یا
ب کی کمی کی وجہ سے آنکھوں کے گرد ہلکے سے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ہڑبڑا کر
جواب دیا ''وعلیکم السلام۔'' وہ لڑکی کمرے سے نکل گئی۔ عورت بولی ''یہ میری بیٹی ہے
ب..... یہ نام اُس کے والد کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے رکھا تھا۔'' میں نے
سمجھتے ہوئے اُس عورت کی جانب دیکھا۔ دراصل مجھے زہرا مقبول نے یہاں آنے کے
...'' اُس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ ''ہاں..... میں جانتی ہوں.....
ب کا پورا نام زریاب مقبول ہے..... وہ زہرا کی سوتیلی بہن ہے.....'' یہ تیسرا جھٹکا اس قدر
تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ''جی..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' ''ہاں..... میں
مقبول حسین کی پہلی لیکن مطلقہ بیوی ہوں..... مجھے طلاق دینے کے بعد ہی انہوں نے

زہرا کی ماں سے شادی کی تھی۔ تمہاری آمد کی اطلاع مجھے زہرا نے ہی کی تھی۔'' میں نے
چینی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ''لیکن زہرا کہاں ہیں.....؟'' ''تم نے آنے میں کچھ دیر
دی۔ وہ لوگ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اپنے شہر کی گاڑی پکڑنے کے لیے نکل چکے ہیں۔ تمہار
لیے زہرا نے یہ لفافہ دیا ہے۔ دراصل مقبول صاحب کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں دل
دورہ پڑا ہے۔ بس خدا اپنا رحم کرے۔'' میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر گئیں۔ ''اگر وہ لو
صرف آدھا گھنٹہ قبل یہاں سے نکلے ہیں تو شاید میں انہیں ریلوے اسٹیشن پر آخری لمحات
مل پاؤں.....؟'' مجھ سے ایک پل بھی مزید وہاں نہیں ٹھہرا گیا۔ وہ مجھے روکتی ہی رہ گئیں
میں کم از کم ایک پیالی چائے تو پیتا جاؤں لیکن میں اُن سے دوبارہ آنے کا کہہ کر تیزی سے با
کسی سواری کی تلاش میں لپکا۔

میں نے ٹرین کی پہلی سیٹی کی آواز اُس وقت سنی جب میں اپنی دھونکنی جیسی پھولتی سا
کے ساتھ دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم کے مرکزی دروازے سے اسٹیشن کے اندر داخل ہوا۔
نہیں جانتا کہ انسانی نظر ایک پل میں کتنے مناظر اپنی بصارت میں سمیٹ سکتی ہے لیکن
ایک لمحے میں میری آنکھوں نے پوری گاڑی کا یوں جائزہ لیا جیسے میری بصارتیں ہزار گنا
گئی ہوں لیکن وہ کہاں تھی جسے نہارے بنا میری دو آنکھوں کا یہ نور بس اس نعمت کا ایک زیا
ہی تو تھا۔ گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور میری حالت اُس وحشی کی طرح ہونے لگی جو
جنوں میں قفس کی سنگلاخ دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے اپنی زنجیریں تڑوانے کی کوشش
ہے۔ جانے پل بھر میں ہی کیوں مجھے وہ گاڑی ٹین اور لوہے کا جوڑ نہیں بلکہ ایک عفریت
آنے لگی جو کچھ ہی پل میں میری آخری سانس بھی مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ میں
دیوانوں کی طرح ایک سمت قدم بڑھائے۔ ٹرین کو پہلا جھٹکا لگا۔ جب تک میں خود اپنی مر
سے زہرا سے دُور تھا تب تک میرے دل کو ایک انجانی سی ڈھارس تھی کہ وہ دُور سہی پر قر
ہے، لیکن آج جب وہ میرے وجود کے اتنے نزدیک ہو کر بھی میری آنکھوں سے اوجھل تھی
مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کسی کند چھری سے میرا سینہ چیر کر اُسے میرے دل
پیوست کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرا سارا صبر، تمام چین و قرار ایک پل میں ہی لٹ گیا تھا
یہ جلاد دل بھی ہم معصوم انسانوں کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا

میں چند گھڑیوں میں ہی وہی پرانا ساحر بن گیا ہوں جو ساحلی درگاہ پر ایک کار ریس جیتنے کے بعد چند لمحوں بعد ہی زہرا کی پہلی نظر کا شکار ہو کر وہیں اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایئر کنڈیشنڈ سلیپر، ہاں..... اس نازک اندام کو تو وہیں ہونا چاہیے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ گاڑی نے دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے ہی اے سی والی بوگی تھی۔ دفعتہً میری سماعتوں کو دھوکا سا ہوا۔ ''ساحر.....'' یہ تو وہی رُوح میں اُتر جانے والی آواز تھی۔ میں تڑپ کر پلٹا۔ ہاں..... وہ زہرا کی ہی آواز تھی۔ اے سی سلیپر بوگی کی ایک ادھ کھلی کھڑکی سے میری سدا گردش میں رہنے والی تقدیر کا واحد روشن تارہ جھلک رہا تھا۔ میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اُس کا ڈبہ چیونٹی کی رفتار سے میری نظروں کے سامنے سے گزرا۔ وہ بے چینی سے پھر بولی۔ ''ساحر..... گاڑی چھوٹ رہی ہے.....'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کی بوگی مجھ سے چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔ میں کھڑکی سے جھانکتی زہرا کی جانب لپکا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی۔ میرے شکستہ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ تڑپ کر بولی ''خود کو سنبھالیں ساحر، میں نے سب کچھ خط میں لکھ دیا ہے۔ پڑھ لیجیے گا..... اور اپنا خیال رکھیے گا.....'' گاڑی نے مزید رفتار پکڑ لی۔ میری نظر زہرا کی نگاہ میں گڑھ کر رہ گئی تھی۔ میری بصارت کے لیے دیگر ہر منظر جیسے دُھندلا سا گیا تھا۔ وہ ٹرین، پلیٹ فارم، سیٹی بجاتا ٹی ٹی، وہاں پھرتے دیگر لوگ، ویٹنگ کنٹریکٹر، سارے قلی، کہرے میں لپٹی شام، گیس کے ہنڈولوں کی ملگجی پیلی روشنی کے دائروں میں ڈوبا وہ اسٹیشن، سب کچھ پل بھر کے لیے اوجھل سا ہو گیا۔ صرف میں اور وہ رہ گئے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ میرے گھائل قدم کسی چیز میں اُلجھ کر لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے بچا۔ زہرا نے بے قرار ہو کر بے اختیار اپنا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے مجھے گرنے سے بچانا چاہتی ہو۔ لیکن لوہے کی پٹری سے جڑے فاصلے تیزی سے اُسے مجھ سیاہ نصیب سے دُور لے جا رہے تھے۔ اُس کا ہاتھ یونہی فضا میں اُٹھا رہ گیا۔ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ اُس کی پلکیں بھی نم ہو رہی تھیں۔ اُس کے لب ہلے، لیکن پہیوں کی گڑگڑاہٹ نے میرے نصیب کے لفظ بھی میری سماعتوں سے چھین لیے۔ جانے اُس نے کیا کہا تھا؟ شاید ''الوداع''..... لب تو میرے بھی ہلے تھے لیکن اپنے حرف تو میں خود بھی نہیں سن سکا تو بھلا اُس نازخراماں کو کیا سنائی

دیتے.....؟..... کچھ ہی پل میں ہمارے درمیان وہی زمینی فاصلے حائل ہو گئے جو ہمیشہ سے اس نصیب جلی محبت کا مقدر ہوتے ہیں۔ ٹرین پلیٹ فارم سے باہر نکل کر کافی آگے بڑھ چکی تھی اور اب دھیرے دھیرے اُس کہر آلود اندھیرے کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ تیزی سے دوڑتی گاڑی کی جانب سے میری طرف بڑھتے سرد ہوا کے ایک آوارہ جھونکے نے میرے گالوں تک پہنچے دو آنسوؤں کو مخالف سمت میں دھکیل کر اس فضا کا ایک حصہ بنا دیا۔ نہ جانے پانی کی وہ دو نمکین بوندیں کس بدنصیب کے دل کی زمین پر جا کر گری ہوں گی۔ لیکن جہاں بھی گری ہوں مجھے یقین تھا کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر گئی ہوں گی۔

میں نے جیب سے زہرا کا خط نکال کر وہیں پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لیا۔ زہرا کی سوتیلی ماں کا نام نگار تھا اور انہیں اور زریاب کو میری جس مدد کی ضرورت تھی، وہ فوری نوعیت کی نہ ہونے کے باوجود اہم تھی۔ میں نے وہیں اسٹیشن کے تار گھر سے ہی پاپا اور اپنے دوست کاشف کو تار بھیجے اور خط کے بکسے میں خط بھی ڈال دیئے اور کاسنی حویلی کے نام بھی ایک خط لکھ دیا کہ وہ مطمئن رہیں میں نے حکام بالا کو اطلاع کروا دی ہے اور جلد ہی دوبارہ اُن سے آ کر ملوں گا۔

اس تمام مصروفیت سے فارغ ہو کر میں رات کی آخری گاڑی لے کر جب جبل پور واپس پہنچا تو صبح کا سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کی طبیعت پہلے سے اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ انہیں سارا احوال بتا کر میں درگاہ کے پچھلے ایک ہفتے کے ترک شدہ معمولات میں جٹ گیا۔ لیکن سارا وقت میرے ذہن میں نگار اور زریاب سے متعلق زہرا کے لکھے ہوئے خط کے الفاظ ٹکراتے رہے۔

اگلی صبح میں گاڑی پکڑ کر کمال آباد بھی ہو آیا۔ میری توقع کے مطابق پاپا اور کاشف نے تمام متعلقہ حکام کو کاسنی حویلی کے مسئلے کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ درگاہ میں میرے لیے کاشف کا ایک خط بھی موجود تھا جس میں اُس نے بتایا تھا کہ کمال آباد میں حالیہ تعینات اے ایس پی ہمارا ہی ہم جماعت خالد تھا جو سی ایس ایس کرنے کے بعد پولیس جوائن کر چکا تھا۔ خالد مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا اور اُس نے اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین بھی دلایا۔

زہرا کے خط سے مجھے یہ تو پتا چل ہی چکا تھا کہ اُس کی بھی اپنی ماں سمیت زریاب اور

نگار سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن کہانی آج سے نہیں بلکہ بائیس سال پہلے شروع ہوتی تھی جب زہرا کے والد مقبول خان اپنی گریجوایشن کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسرے شہر پہنچے تھے۔ والدین کی اکلوتی اولاد اور بے پناہ دولت کی وجہ سے شاہانہ مزاج اور شہزادوں جیسی عادات تو شروع سے ہی تھیں، رہی سہی کسر جوانی نے پوری کر دی تھی اور شاید انہی چیزوں کے امتزاج کی بدولت اُنہی کی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ نگار چند دنوں بعد ہی اپنا دل اُن کے قدموں میں ہار بیٹھی۔ مقبول بھی زیادہ عرصہ مزاحمت نہ کر سکے اور دونوں یک جاں دو قالب کی تفسیر بن گئے۔ مقبول کو اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اُن کے والدیوں بیچ تعلیم انہیں کسی بندھن میں بندھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ لہٰذا فیصلہ یہی طے ہوا کہ فی الحال گھر والوں سے چھپ کر نگار سے شادی کر لی جائے اور کچھ عرصہ اس رشتے کو مخفی رکھا جائے۔ اُس وقت مقبول کا ارادہ یہی تھا کہ کسی مناسب موقع پر یہ راز والدین کے سامنے کھول دیں گے لیکن وہ مناسب موقع کبھی نہ آیا۔ اگلے سال نتیجہ آنے سے پہلے اُن کے والد کی طبیعت کچھ یوں بگڑی کہ مقبول کو سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگنا پڑا جہاں مقبول کے والد نے پہلے ہی سے اپنے بھائی کی بیٹی سے اُن کا رشتہ جوڑنے کا انتظام مکمل کر رکھا تھا۔ مقبول کے والد کی حالت کے پیش نظر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور شادی کے ٹھیک تیسرے دن والد اگلے جہاں سدھار گئے اور ٹھیک اُسی دن زریاب تین ماہ کی ہوئی۔ چالیسویں کے بعد جب مقبول نے تنہائی میں اپنی ماں کو نگار اور اپنی بچی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی صدمے سے بے حال ہو کر بستر پر پڑ گئیں اور پھر انہوں نے قسم ہی کھا لی کہ جب تک مقبول اس چھوٹے گھر کی لڑکی نگار سے ہر رشتہ توڑ نہیں لیتے تب تک وہ انہیں اپنا حق نہیں بخشیں گی۔ اور یوں ایک عورت نے اپنے حق کی بخشش کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح ایک دوسری عورت کے حق پر ڈاکا ڈال دیا۔ نگار کو جب طلاق کا پروانہ ملا تو وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔ حالانکہ مقبول نے اپنی کمال آباد والی کوٹھی اور ماں اور بچی کی تربیت اور گزارے کے لیے بہت معقول انتظامات کر دیئے تھے لیکن ہوش میں آنے کے بعد نگار نے اُس بے وفا کی دی ہوئی ہر سہولت اور آسائش کو ٹھکرا دیا۔ کئی سال بیت گئے اور زریاب کے ساتھ اُس کی چھوٹی بہن زہرا بھی جوان ہو گئی لیکن مقبول کی دوسری شادی اور طلاق کا راز راز ہی رہا۔ لیکن پچھلے ہفتے جب حاجی مقبول کو تیسرا دل کا دورہ پڑا تو انہیں اپنی ماضی کی غلطیاں یاد آئیں اور انہوں

نے اس جان لیوا بیماری کے بستر پر ہی زہرا کی ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ زہرا کی ماں تو کھل کر اپنے اندر ہوئی ٹوٹ پھوٹ اور کرچیوں کے شور کو بھی باہر نہیں نکال پائیں کیوں کہ اُن کے سہاگ کی حالت ہی اُس وقت کچھ ایسی تھی کہ انہیں اپنے پھٹتے ہوئے دل کی آخری سسکی کو بھی پی جانا پڑا۔ ہاں البتہ ماں نے تنہائی میں زہرا کے سامنے اپنے دل کے سارے سیلاب بہا دیئے۔ حاجی مقبول کی خواہش پر ہی زہرا اور اُس کی ماں کمال آباد آئے تھے تاکہ نگار سے مقبول کی خواہش کے پیش نظر اُس کی زیادتی کو درگزر کرنے کی درخواست کر سکیں۔ خود حاجی مقبول تو بستر سے کچھ ایسے لگے پھر دن بدن اُن کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ نگار نے وہی کیا جو کوئی اعلیٰ ظرف کر سکتا ہے لیکن اُس نے زہرا کی ماں کے ساتھ شہر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر سے پرانے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتی تھیں اور ویسے بھی وہ خود بہت سی اُلجھنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہ کاسنی حویلی پہلے اُن کے دادا اور پھر باپ کی واحد اور آخری جاگیر تھی۔ لیکن دو سال پہلے زریاب کے نانا کے انتقال کے بعد اب زمانے کے گدھ اُن کی اس پشتینی جائداد اور بیٹی پر نظریں گاڑھے بیٹھے تھے اور وہ کسی بھی حال میں اپنے اس آخری خزانے کی حفاظت سے غافل نہیں رہ سکتی تھیں۔ اُن کی حالت کے پیش نظر ہی زہرا کی امی نے اُسے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ زریاب اور اُس کی ماں کی زندگی کا سب سے بڑا کانٹا شہر کا مشہور غنڈہ جگن تھا۔ جو بیک وقت کومل زریاب اور کمال آباد کے وسط میں کھڑی اُس کی جائداد کو ہتھیانے کے درپے تھا۔ اور جگن اس سلسلے میں ہر ہتھکنڈا پہلے ہی آزما چکا تھا۔ میں نے زریاب اور نگار کو اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو ممکن ہوا، ضرور کروں گا۔ فی الحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ جگن کو علاقہ پولیس نے نقص امن کے خدشے میں مہینہ بھر کے لیے شہر بدر کیا ہوا تھا اور فی الحال اُس کی طرف سے ماں بیٹی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس رات میں نے پاپا اور کاشف کو جو تار اور خط بھیجے تھے وہ اسی مسئلے سے متعلق تھے کہ کمال آباد میں پولیس کی اعلیٰ قیادت کو کاسنی حویلی کی حفاظت کرنے کی درخواست کی جائے۔ میں جانتا تھا کہ کاشف تب تک ٹک کر نہیں بیٹھے گا جب تک سارا انتظام مکمل نہیں کر لے گا اور پاپا کا تو آئی جی پولیس کو ایک فون ہی کافی تھا۔ کہتے ہیں انسان ہی انسان کا سب سے بڑا درد اور انسان ہی اُس کا درماں ہے۔ لیکن فی الحال جگن کاسنی حویلی کا درد ثابت ہو رہا تھا۔ تیسرے دن ہی مجھے نگار کا پیغام ملا کہ جگن

ل آباد واپس پہنچ گیا ہے۔ اے ایس پی خالد نے اُسے تھانے بلوا کر پہلے ہی سرزنش کر تو
ہے کہ وہ دوبارہ کاسنی حویلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے لیکن وہ اب بھی بے حد فکر مند تھیں
زریاب کا تو اب جگن کا نام سنتے ہی رنگ پیلا پڑ جاتا تھا۔ میں دو دن پہلے ہی سلطان بابا
لیے بذریعہ تار پیغام بھجوا چکا تھا کہ مجھے کمال آباد میں اُن کی اشد ضرورت ہے لہٰذا وہ کسی
طرح کمال آباد پہنچیں۔ نہ جانے پرانی درگاہ پر بھیجے گئے تار کا پیغام اُن تک پہنچا تھا، یا نہیں
اب میرے لیے مزید دیر کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا میں تمام ذمہ داریاں اصغر صاحب کے
لے کر کے کمال آباد کی گاڑی پکڑنے نکل پڑا۔

"کاسنی حویلی" پر وہی سدا پرانی یاسیت طاری تھی۔ اس شام عصر کے وقت جب میں
پہنچا تو مجھے پوری حویلی میں پھولوں سے بھری کیاریوں اور اُن کی نہایت سلیقے سے کی گئی
خراش کے پیچھے چھپے ہنرمند ہاتھوں کا بھی پتا چل گیا۔ زریاب نہایت انہماک سے بڑا سا
ہاتھ میں لیے پھاٹک سے متصل کیاری کی کاسنی پھولوں کی بیل سے بے جان ڈالیاں اور
پتیاں اور ٹہنیاں تراش رہی تھی۔ شاید یہی اس پژمردہ سے ماحول میں اس نازنین کا واحد
وہ تھا۔ تبھی وہ اس کام میں اس قدر مگن تھی کہ اُسے میری آمد کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ لمحوں
میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ گھبرا کر یوں پلٹی کہ اُس کے
ے کا رنگ بھی انہی پھولوں کی طرح کاسنی سا ہو گیا۔ وہ جلدی سے مجھے سلام کر کے اندر
گئی اور چند لمحوں بعد نگار اندر سے برآمد ہوئیں۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پتا چلا
جگن نے خود تو پہرے کی وجہ سے حویلی کا رُخ نہیں کیا لیکن اُس نے اپنے ہرکاروں کے
لیے نگار کو یہ واضح پیغام بھیجا ہے کہ وہ کسی طور بھی زریاب سے دست بردار نہیں ہو گا اور یہ
روزہ پہرہ اُس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتا۔ زریاب جہاں بھی جائے گی وہ سائے کی
ح اُس کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔ مجھے نگار کے چہرے سے ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو
ا تھا۔ یہ معاملہ پولیس، یا پہرے داری سے کہیں بڑھ کر تھا اور پھر پولیس کے سادہ لباس
لے اہلکار بھی کب تک یوں کاسنی حویلی کے پھاٹک پر ٹنگے رہتے، یا پھر نگار اور زریاب کے
پیچھے بازار اور دیگر روزمرہ کے آنے جانے کی جگہوں پر دُم چھلا بنے پھرتے رہتے.....؟
معاملہ عورتوں کا تھا اور عورت کا پہرہ بذات خود ہمارے معاشرے میں ہزار سوالوں کو جنم دے

ڈالتا ہے۔ کیوں کہ ہم عورت کو پچاس فیصد قصور وار تو ازل سے ہی تسلیم کرتے چلے آ
ہیں۔ باقی کسر شک کا پانچ، یا دس فیصد پورا کر دیتا ہے۔ اور معاشرہ اُس کے خلاف اپنا فیصلہ
دیتا ہے۔ نگار اور زریاب اور پولیس کے پہرے کی یہ ہم راہی بھی تو ایک طرح سے جگن
کے اُس مقصد کی تکمیل تھی جو وہ زریاب کو بدنام کر کے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شرفا تو ویسے
اس در سے سو قدم دُور چلتے ہیں جہاں ان وردی والوں کا پہرہ ہو اور اس پہرے میں اگر
دونوں باہر بھی نکلتیں تو یہ مزید جگ ہنسائی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع دینے کے مترادف
ہوتا۔ اور پولیس جگن پر اُس وقت تک ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتی تھی جب تک وہ کوئی باقاعدہ ج
نہ کرتا۔ وہ پہلے ہی علاقہ بدری کی سزا کاٹ کر آیا تھا اور اے ایس پی خالد اگر اُسے کسی بہا
سے دوبارہ جیل بھجواتا، یا پھر سے علاقہ چھوڑنے کا حکم دے بھی دیتا تو اس کی میعاد کیا ہوتی
اور پھر کسی بھی دوسرے درجے کے وکیل کے ذریعے مجسٹریٹ صاحب کی عدالت سے پولیس
کے اس حکم کے خلاف امتناعی پرچہ لیا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ بہر حال عدالت کسی بھی شخص کو صرف
اس وجہ سے سزا نہیں دے سکتی تھی کہ اُس کی ذات سے دو کمزور اور معصوم عورتیں خوف زد
ہیں۔ دھمکی ثابت کرنے کے لیے نگار کو عدالت کے پھیرے کاٹنے پڑتے اور زریاب کا دامن
بھی اُلجھنے سے بچ نہ پاتا۔ جب کہ یہ سارا بکھیڑا ہی زریاب کے اُجلے دامن کو کسی بھی ایسے
داغ سے بچانے کے لیے ہی کھڑا کیا گیا تھا۔ بات اگر کسی عفت مآب دوشیزہ کی ہو تو یہ معاشرہ
ہر طرف سے ایک دلدل ہی تو ہے۔ چھری خربوزے پر گرے، یا خربوزہ چھری کی زد میں
آئے، نتیجہ تو ایک ہی تھا۔ دفعتہً مجھے محسوس ہونے لگا کہ جگن کے معاملے میں پولیس کو ڈال کر
ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ اب یہ معاملہ پسند، یا لالچ سے بڑھ کر ضد اور انا کی سو
بن چکا تھا جس پر جگن، یا زریاب میں سے کسی ایک کو لٹکنا ہی تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ نگار
سے کہوں کہ وہ اپنا اور زریاب کا چھوٹا موٹا سامان باندھیں اور میرے ساتھ اِسی وقت جبل پور
کے لیے نکل چلیں۔ ابھی روشنی باقی تھی اور ہم رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے جبل پور پہنچ سکتے
تھے۔ اگر جگن نے ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔ اور پھر جبل پور
میں خان صاحب کی پوری حویلی موجود تھی ان دو مظلوم عورتوں کے سر پر سایہ کرنے کے لیے۔
لیکن اگر کاسنی حویلی سے دست برداری ہی اس مسئلے کا حل ہوتا تو نگار خود بہت پہلے ایسا کر

قدم اُٹھا چکی ہوتیں۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا اس معاملے کے پیچ وخم پر غور کرتا رہا۔ اچانک میں نے نگار کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو کر سفید ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے چونک کر اُس کی نظروں کے تعاقب میں پیچھے حویلی کے پھاٹک کی جانب دیکھا۔ ایک بھاری تن و توش اور گہرے سانولے رنگ کا ایک شخص سر پر ترچھی قراقلی پہنے، ہونٹوں میں بیڑی اور کلوں میں پان دبائے ہوئے تانگا حویلی کے پھاٹک پر رُکوائے ہمیں گھور رہا تھا۔ نگار کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز میں صرف اتنا نکلا..... جگن.....''

وہ شخص کچھ دیر تک ہمیں یونہی گھورتا رہا۔ پھر اُس نے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگا آگے بڑھ گیا اور پھر ایک دوسری لیکن انتہائی خوشگوار حیرت اُسی لمحے کے جلو میں میری مایوسیوں اور نا اُمیدیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے نمودار ہوگئی۔ تانگا بڑھتے ہی میں نے اُس کے عقب میں ایک سائیکل رکشہ کو رُکتے اور اُس میں سے سلطان بابا کو اُترتے ہوئے دیکھا۔ چند لمحے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ کمال آباد اور پھر کاسنی حویلی پہنچ چکے ہیں اور اس وقت عین میرے سامنے کھڑے میرے چہرے سے بے اختیار بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو پونچھ رہے ہیں۔ نگار اور زریاب سلطان بابا کے لیے چائے وغیرہ کے انتظامات میں لگ چکی تھیں۔ میں نے سلطان بابا کو چند لمحوں میں ہی ساری کہانی ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک سنا ڈالی، جسے سن کر وہ کافی دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر بہت دیر بعد سر اُٹھا کر بولے ''کمال آباد کے آئی جی صاحب سے پرانی یاد اللہ ہے مجھے اُن سے ملنا ہوگا.....'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ میں انہیں اس بات سے منع کر دوں یہ پولیس، یا قانون کا معاملہ نہیں تھا۔ مانا کہ آئی جی صاحب سارے ضلع کی کوتوالی جگن کے دروازے پر لا بٹھائیں گے لیکن اس سے بھی کیا ہوگا۔ وہ بھی جگن کو عمر بھر کے لیے تو قید نہیں کر پائیں گے نا..... یہ تو اُس کے دل میں پلتے کینے کو مزید بڑھاوا دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن چاہ کر بھی میں سلطان بابا کو یہ سب نہیں کہہ پایا اور سلطان بابا کے ساتھ اگلی صبح آئی جی صاحب کے دفتر جا پہنچا۔ ملاقات کا وقت صبح گیارہ سے بارہ بجے کا تھا اور ملاقاتیوں کی بھیڑ دیکھ کر مجھے کم از کم اگلے تین دن تک اپنا نمبر آتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہرحال میں نے قاعدے کے مطابق کاغذ کی ایک چٹ پر سلطان بابا کا نام لکھ کر استقبالیہ کلرک کو دے دیا جو دس پندرہ منٹ کے وقفے سے جمع شدہ

ناموں کی پرچیاں اندر آئی جی صاحب کے پی اے کو بھجوا رہا تھا۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب بات رُونما ہوئی۔ اندر سے پکی عمر کے ایک صاحب جلد بازی میں برآمد ہوئے۔ اُن کی وردی پر لگے فیتوں سے زیادہ اُن کی شخصیت شاندار تھی۔ اُن کے پیچھے ہی باوردی اسٹاف، پولیس والے گارڈ اور چند اور عملے کے آدمی ہڑبڑاتے ہوئے تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ جس راہ داری میں ہم بیٹھے ہوئے تھے وہاں بھی کھلبلی سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ یہی صاحب آئی جی نصیر احمد ہیں۔ وہ سبھی لوگوں سے لاتعلق تیر کی طرح ہماری جانب بڑھے اور گرم جوشی سے سلطان بابا کے گلے لگ گئے اور انہیں بڑی عزت اور محبت سے اندر اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں حیرت سے اُن کی یہ ساری گرم جوشی دیکھتا رہا۔ دونوں نہ جانے کن کن زمانوں کی پرانی یادوں کو کافی دیر تک کریدتے رہے۔ نصیر صاحب کو بہت دیر بعد میرا خیال آیا اور انہوں نے مجھ سے معذرت کی کہ اُن کی سلطان بابا سے بہت مدت بعد ملاقات ہوئی ہے لہٰذا جذبات کی رو میں وہ میرا تعارف لینا بھول ہی گئے۔ ابتدائی تکلفات سے فارغ ہونے کے بعد اب مدعا کی باری آ چکی تھی لیکن میں سلطان بابا کی فرمائش سن کر کچھ حیران ہوا۔ انہوں نے آئی جی صاحب سے جگن کو اُن کے آفس طلب کرنے کی فرمائش کی۔ نصیر صاحب نے چونک کر سلطان بابا کو دیکھا۔ ''کوئی خاص شخصیت.....؟..... جہاں تک میری معلومات ہیں، اس نام کا اس شہر میں ایک بدنام زمانہ اُچکا اور لفنگا رہتا ہے..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' سلطان بابا مسکرائے ''سب ٹھیک ہے نصیر صاحب..... بس یہ دھیان رہے کہ آپ کے عملے میں سے جو بھی جائے، اُسے میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں تک لے کر آئے.....'' اس مرتبہ نصیر صاحب کے ساتھ ساتھ میری بھی چونکنے کی باری تھی۔ آئی جی صاحب نے سلطان بابا سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور فون پر کسی کو ہدایات جاری کر دیں کہ جگن کو عزت کے ساتھ اُن کے دفتر پہنچا دیا جائے۔ میں ایک بار پھر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں پی اے نے اطلاع کام پر بتایا کہ جگن کو لایا جا چکا ہے۔ آئی جی صاحب نے اُسے وہیں آفس میں بھیجنے کی ہدایت کر دی۔ کچھ ہی دیر میں جگن کمرے میں داخل ہوا۔ جگن جیسے غنڈے کے لیے آئی جی آفس میں طلب کیا جانا بذات خود اُس کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ اُسے آج تک حوالدار سے لے کر سب انسپکٹر تک ہی بھگتتے آ رہے تھے، جو کہیں نہ کہیں خود بھی جگن سے مرعوب ہی

ے تھے۔ کوئی بڑا کیس ہو گیا تو انسپکٹر، یا ایس ایچ او آفس میں پیشی ہو جاتی تھی جہاں چھوٹے
اروں کی خوشامد اور بڑے اہلکاروں کی ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ کا وہ عادی تھا اور وہاں
بلاوے اُس کے لیے اب صرف تفریح کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ایک دن اُسے یوں آئی
فس بھی طلب کیا جائے گا یہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس
ں کے لوگ اِسے اپنے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے اور آئندہ اُن کے ''دھندے''
یہ بلاوہ اُن کی ساکھ بڑھانے میں کافی معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن بہرحال آئی جی کا
اور پھر نصیر صاحب کی شخصیت اور اُن کے دفتر کا وہ رُعب دار ماحول..... یہ سب مل کر کسی
غلط انسان کے حواس کچھ دیر کے لیے معطل کرنے کا باعث بن سکتا تھا۔ اُس دن میں نے
ی محسوس کیا کہ بعض مرتبہ عہدے سے بڑھ کر انسان کا سراپا بولتا ہے۔ نصیر صاحب کی
ی بھرکم شخصیت اور اُن کی اندر تک اُتر جانے والی وہ گہری نظر کسی بھی چھوٹے موٹے مجرم
ہا پانی کر سکتی تھی۔ لیکن جگن بہرحال علاقے کا دادا اور ایک گھاگ شخص تھا جسے کئی بار جیل
اکے بعد قانون کی اتنی سمجھ تو آ ہی چکی تھی کہ فی الحال اُس نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کی
پر اُسے کوئی سزا دی جائے۔ اور اپنے بلاوے سے لے کر آئی جی آفس پہنچنے تک وہ اپنے
ں پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے سرد موسم کے باوجود دفتر میں داخل ہونے
لے کر اب تک کے مختصر عرصے میں وہ دو تین بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ چکا تھا۔ نصیر
ب نے سر سے پیر تک ایک بھرپور نگاہ اُس پر ڈالی ''ہوں..... تو تم ہو جگن.....؟ ماں باپ
کیا نام رکھا تھا؟'' وہ کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ''جی..... وہ..... جہانگیر..... سے ہوتے ہوئے
نا پڑ گیا..... صاحب..... میرے کو یہاں.....؟'' نصیر صاحب نے اُس کا سوال منقطع
تے ہوئے سلطان بابا کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ سلطان بابا ہیں..... میرے خاص
ان..... یہ تم سے ملنا چاہتے تھے.....'' سلطان بابا نے آئی جی صاحب سے درخواست کی کہ
انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم اُن کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ملاقاتی کمرے میں جگن سے
کر لیں..... ویسے بھی ہماری وجہ سے اُن کے دفتر کے معمولات میں پہلے ہی کافی خلل پڑ
تھا۔ نصیر صاحب نے خوش دلی سے سر ہلایا اور چند لمحوں بعد ہم جگن کے سامنے ایک علیحدہ
رے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حالانکہ گزشتہ روز جگن کی مجھ پر کاسنی حویلی کے دالان میں

کھڑے ایک اُچٹتی سی نگاہ تو پڑ چکی تھی لیکن اُس کے تأثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ اب اُس کا چہرہ باقاعدہ ایک سوالیہ نشان بن چکا تھا لیکن جانے یہ سلطان بابا کا تھم ہوا لہجہ تھا، یا پھر اس ماحول کا اثر کہ وہ چاہ کر بھی ہم سے کوئی سوال نہیں کر سکا۔ سلطان بابا نے شاید جان بوجھ کر کچھ زیادہ وقت لیا اور پھر دھیرے سے کھنکار کر بولے۔ ''معافی چاہتا ہوں جہانگیر میاں..... تمہیں اس طرح یہاں بلوا کر زحمت دی۔ اگرچہ پیاسے کو کنویں کے پاس جا چاہیے، لیکن تمہارے پتے ٹھکانے سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے کنویں کو پاس بلانا پڑا..... حالانکہ غرض ہماری ہی تھی.....'' جگن جو پہلے ہی سلطان بابا کے منہ سے اپنا اصل نام سن کر ہڑبڑایا سا ہوا تھا، اُن کی بات سن کر بالکل ہی بوکھلا سا گیا۔ ''نہیں نہیں بابا جی..... آپ کا بولو.....'' سلطان بابا کچھ دیر جیسے سوچ میں پڑ گئے پھر سر اُٹھا کر بولے ''نہیں..... یہاں کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا..... تم اپنا پتا دے دو..... میں اپنی درخواست لے کر وہیں حاضر ہو جاؤں گا.....'' میں نے حیرت سے بابا کی طرف دیکھا، یہ کیا بات ہوئی.....؟ بھلا اس شہر میں جگن جیسے بدنام زمانہ کا پتا ڈھونڈنا کون سی مشکل بات تھی.....؟..... اور پھر اگر ہمیں اُس کے گھر جا کر ہی بات کرنی تھی تو پھر اُسے یہاں آئی جی آفس بلوانے کے لیے اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی.....؟..... خود جگن کے لیے بھی سلطان بابا کی یہ بات کسی اچانک پھٹنے والے پٹاخے سے کم نہیں تھی۔ انتظار بھی تو ایک طرح سے اعصاب کا امتحان ہوتا ہے اور وہ دوبارہ اس پل صراط سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے سٹ پٹائے ہوئے انداز میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ سلطان بابا اپنی بات وہیں کہہ ڈالیں لیکن سلطان بابا بھی شاید اُس کے گھر کی زیارت کا تہیہ کر کے ہی یہاں تک آئے تھے۔ سو آخر کار جگن کو ہی ہار ماننا پڑی اور بے دلی سے اُس نے مجھے اپنے گھر کا پتا لکھوا دیا۔ نصیر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے پہلے انہوں نے چلتے چلتے اُن سے کوئی بات کہی جسے میں آگے نکل جانے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے نہیں سن پایا۔ راستے بھر سلطان بابا خاموش رہے اور کاسنی حویلی پہنچ کر بھی میں نے حسب معمول اُن سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ جو بھی بھید ہے وہ جلد ہی کھل جائے گا۔ شام چار بجے حویلی کے پھاٹک سے باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں پھرتی لمبی سی تسبیح سمیٹی اور اُٹھ کھڑے ہوئے ''چلو میاں..... ذرا جہانگیر کے ہاں ہو آئیں۔'' انہوں نے

سے جگن کا اصلی نام سنا تھا وہ اُس کے تذکرے میں وہی نام لے رہے تھے۔ جب ہم
ں سے باہر نکلے تو میں باہر آئی جی صاحب کی سرکاری موٹر کار کھڑی دیکھ کر زور سے چونکا۔
ی کے ساتھ ہی باوردی شوفر اور چاق و چوبند محافظ کو دیکھ کر میری حیرت دوچند ہوگئی۔ آخر
کردفر سے جگن جیسے غنڈے کے گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر سلطان بابا تو ایسے
وں سے ہمیشہ ہی اجتناب برتتے تھے پھر آج یہ سب کچھ کیوں.....؟ میں اِنہی سوچوں
م تھا جب گاڑی نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم ایک پس ماندہ سے علاقے میں داخل ہو
جہاں کچی گلیوں کی مٹی میں اٹے بچوں نے کچھ دیر تک ہماری گاڑی کا پیچھا کیا اور پھر تھک
حسرت بھری نگاہوں سے دُھول اُڑاتی گرد کا حصہ بنتے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ
ڈرائیور کو ہماری منزل کا بخوبی اندازہ تھا کیوں کہ اُس نے راستے میں ایک بار بھی ہم سے کوئی
ق نہیں چاہی اور گاڑی سیدھی جگن کے بتائے ہوئے پتے پر ہی جا کر روکی۔ تب تک گلی
تمام لوگ چوکنے ہو کر حیرت اور کچھ خوف سے آئی جی صاحب کے محافظ کو ہمارے لیے
زے کھولتا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لیے بھی یہ جگن کی طرح ایک انہونی تھی کیونکہ آج تک
ں نے زیادہ سے زیادہ کسی سب انسپکٹر، یا ایس ایچ او کو جگن کے دروازے مغلظات بکتے،
نڈ کے چند ٹکڑے مٹھی میں دبائے نظریں چرا کر جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس طرح لمبی
ں سرکاری گاڑی میں سے ایک بزرگ درویش اُترتا وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے جو جگن کے
ر ہاتھ پھیر کر اُسے دعائیں بھی دے رہا تھا۔ خود جگن کی اپنی سیٹی گم لگ رہی تھی اور اُسے سمجھ
نہ آ رہا تھا کہ ہمارا استقبال کیسے کرے۔ آئی جی صاحب کا ہمارے ساتھ پُرتپاک سلوک وہ
دیکھ چکا تھا اور اب ہمیں اُن کی گاڑی سے اُترتا دیکھ کر تو جیسے اُس کے اوسان ہی خطا ہو گئے
۔ اُس نے آج تک لوگوں کو خود سے ڈر کر نفرت سے بھاگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ یہ اُس
لیے بھی ایک بالکل نیا تجربہ تھا کہ کوئی خود اُس کا مہمان بننے کے لیے اُس کے گھر کی دہلیز
کے اُس کے کچے اور بوسیدہ صحن سے گزر رہا ہے۔ گھر میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ جگن کے چند
ے کچھ ہی دیر میں لپک کر کسی قریبی بیکری سے چائے کے کچھ لوازمات پکڑ لائے اور اُن
الجھن اور حیرت آمیز نگاہوں کے درمیان ہمیں چائے بھی پیش کر دی گئی۔

خود میں بھی نہایت اچنبھے سے سلطان بابا کو یوں مزے سے چائے پیتا دیکھ رہا تھا جیسے

ہمارا واحد مقصد ہی یہاں آ کر جگن کی گلی کے نکڑ والے ہوٹل کی تیز چینی والی چائے پینا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ جگن کے خاندان کی ساری تاریخ معلوم کر چکے تھے۔ جگن بچپن سے ہی یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا اور پھر چودہ سال کی عمر میں اُس نے وہ سرکاری یتیم خانہ بھی چھوڑ دیا اور تب سے مہینے کا ایک آدھ ہفتہ وہ کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں جیل میں گزارنے لگا۔ رفتہ رفتہ علاقے میں اُس کی دھاک بیٹھتی گئی اور چھوٹے موٹے چور اُچکے اُس کے گروہ میں شامل ہوتے گئے اور وہ علاقے کا سب سے بڑا دادا بنتا گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد سلطان بابا نے پیالہ میز پر رکھا اور براہ راست جگن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "جہانگیر میاں..... تمہاری اتنی شہرت سنی تھی، تبھی اپنی ایک قیمتی چیز تمہارے پاس بطور امانت رکھنے چلا آیا ہوں اور یاد رہے..... یہ کام پولیس، یا کوتوالی کے بس سے باہر کا ہے۔ اُمید ہے مایوس نہیں کرو گے۔" جگن گڑبڑا سا گیا۔ "لیکن آپ تو خود..... میرا مطلب ہے..... اچھا آپ بولو سہی..... میرے بس میں ہوا تو ضرور..... کیوں نہیں....."

سلطان بابا کی نظریں اب بھی جگن پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ "کاسنی حویلی کی ایک بچی ہے..... اپنی بٹیا جیسی ہی ہے..... زریاب..... اسے بطور امانت تمہاری تحویل میں سونپتا ہے..... بولو..... کر سکو گے اُس کی حفاظت.....؟؟؟....." مجھے یوں محسوس ہوا کہ گھمبیر سناٹے میں کسی نے کوئی کان پھاڑ دینے والا دھماکا کر دیا ہو۔ جگن تو بوکھلا کر کھڑا ہو ہی چکا تھا۔ خود میرے کان بھی سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ سلطان بابا نے جگن سے براہ راست بات کرنے کے بجائے اتنا لمبا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر یہ درخواست اسی سیدھے راستے سے آ کر جگن کے سامنے پیش کرتے تو یقیناً وہ ہماری التجا کو بھی اُسی طرح ہوا میں اُڑا دیتا جیسے ہر کمزور کی فریاد کا انجام ہوتا آیا ہے۔ سلطان بابا نے صبح ہی جگن کو یہ باور کرا دیا تھا کہ اُن کی ڈوری کہاں کہاں بندھی ہوئی ہے۔ پھر انہوں نے شام تک کا وقت لے کر جگن کو خود کو اور انہیں مزید تولنے کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ اور پھر اب شام کو پولیس کے سب سے اعلیٰ عہدے دار کی گاڑی میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جگن کے دروازے پر اُتر کر انہوں نے جگن کے حوصلوں پر آخری کاری ضرب بھی لگا دی تھی۔ اور اس ساری تمہید کا مقصد جگن کو صرف اتنا ہی احساس دلانا تھا کہ اُس کے مقابل اتنا وزن رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو وقت

پڑنے پر ساری حکومتی مشینری اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں لیکن اُن کی آخری بات اور عاجزانہ درخواست نے جگن پر یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ آنے والوں کے ظرف کا پیمانہ اُس کے اندازوں سے کہیں زیادہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ اُس کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی اپنے ہتھیار باہر میدان میں پھینک آئے ہیں، حالانکہ وہ چاہتے تو ان ہتھیاروں کی بدولت وہ یہ جنگ جیت بھی سکتے تھے۔ لیکن سلطان بابا کا مقصد جنگ کبھی تھا ہی نہیں..... وہ تو بس عاجزی ہی جانتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جگن کو در پردہ یہ احساس بھی دلا دیا کہ اگر وہ اپنے شرانگیز ارادوں سے باز نہ آیا تو بدلے میں اُن کے پاس زریاب کو کاسنی حویلی سے کہیں دُور لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کیوں کہ معاملہ ایک پردہ نشین کی حرمت کا ہے اور یہ وہ دو دھاری تلوار تھی کہ جس کا شکار ہر حال میں وہ پری وش ہی تھی۔ سلطان بابا اپنی بات ختم کر کے چپ ہو چکے تھے اور جگن کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اُس کے دل و دماغ میں اس وقت نہ جانے کتنے طوفان اور آندھیوں کے جھکڑ اپنی چیخوں سے اُتھل پتھل مچا رہے تھے۔ وہ اُسی طرح گم صم سا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا تھا اور آس پاس منڈلاتے اُس کے ہرکارے بھی دم سادھے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ماحول پر وہ اعصاب شکن خاموشی طاری رہی۔ سلطان بابا نے اُٹھ کر جگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''اگر میری مانگ بہت بڑی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں میاں.....'' جگن کا جسم ذرا دیر کے لیے لرز سا گیا۔ میں بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ ہوا جو یہاں کے باسیوں کے لیے دیکھ پانا کبھی ممکن نہ تھا۔ جگن کو آج تک کسی نے زندگی بھر کبھی اتنی عزت اور پیار سے نہیں پکارا تھا۔ عزت تو دُور کی بات کسی صاحب اختیار نے اُس سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ سلطان بابا نے اُس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ کیا رکھے کہ اُس کے اندر کا دس بارہ سالہ وہ یتیم بچہ کود کر باہر نکل آیا جسے آخری بار اِسی محلے کی مسجد کے پیش امام نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی تھی۔ جگن کے فولادی جسم نے دو چار ہچکیاں لیں اور پھر وہ جامد برف کا پہاڑ کچھ یوں ٹوٹ کر پگھلا کہ آس پاس سب ہی جل تھل ہو گیا۔ اُس کے کارندے اپنے اُستاد کو یوں بچوں کی طرح آنسو بہاتے دیکھ کر پہلے تو اُس کی جانب دوڑے اور چاہا کہ لپک کر اُسے سنبھال لیں لیکن اب اس بپھرے دریا کے آگے بند باندھنا اُن میں سے کسی کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد خود اُن میں سے بھی

چند اپنی آنکھیں پونچھتے نظر آئے۔ سچ ہے کہ شاید ''آنسو ہی بہترین کفارہ ہے۔'' سلطان بابا کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اور جس وقت جگن ہمیں رُخصت کرنے کے لیے اپنی گلی میں آیا تب تک اُس کا اپنے آنسوؤں سے دُھلا ہوا چہرہ یہ صاف بتا رہا تھا کہ اب کمال آباد میں کاسنی حویلی کا اگر کوئی سب سے بڑا محافظ ہوگا تو وہ خود جگن ہی ہوگا۔ اب یہ ظرف سے ظرف کا سودا بن چکا تھا اور آج تک اس بُرے انسان کے اندر کے ظرف کو تولنے کے لیے کسی نے اپنا ترازو یوں پیش ہی نہیں کیا تھا اور آج جب کسی صاحب ذوق نے اُسے خود کو اس کانٹے پر پرکھنے کا موقع فراہم کیا تو اُس کے من کے اندر چھپی کان کا سارا سونا اس زنگ آلود آہن کے نیچے سے جھلک آیا تھا۔

اگلے روز جب ہم کاسنی حویلی سے رُخصت ہوئے تو نگار اور زریاب کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں اور سلطان بابا پھر سے کچھ نئے رشتے بنا کر اپنی اپنی راہ کے لیے نکل پڑے تھے۔ اسٹیشن پر جگن کا پورا ٹولا ہمیں رُخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ میں جبل پور کے اسٹیشن پر اُترنے سے پہلے سلطان بابا سے جلد وہاں کا پھیرا لگانے کا وعدہ لینا نہیں بھولا۔ میں نے جبل پور اسٹیشن پر ہی زہرا کو ساری صورت حال ایک خط میں لکھ کر بھیج دی اور درگاہ کی جانب چل پڑا۔

لاریب

یونہی رات ہوئی اور پھر دن نکل آیا۔ میں نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اصغر صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی اُلجھن اور تناؤ کے آثار ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ خاص طور پر نماز کے اوقات میں وہ عجیب بے چین سے نظر آنے لگتے تھے۔ لیکن میں مذہب کو ہمیشہ سے ایک خاص حد کے اندر انسان کا بے حد ذاتی معاملہ سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں نے کبھی بھی اُن کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی۔ یونہی چار دن گزر گئے اور جمعرات کا دن آ پہنچا جب بشیرے نے دِیوں کا تیل بدلنے کے لیے آنا تھا۔ میں نے دُور چوٹی سے نیچے گھاٹی میں بشیرے کا تانگا آتے ہوئے دیکھا لیکن آج تانگے کی پچھلی نشست خلاف معمول ایک جالی دار پردے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر کچھ زنانہ سواریاں بھی تانگے سے اُتریں۔ کچھ دیر میں سب سے پہلے بشیرا درگاہ کے صحن میں وارد ہوا اور جلدی جلدی تیل کی کپی سے تازہ تیل ہر دیے کی کٹوری میں اُنڈیلنے لگا۔ ساتھ ساتھ اُس کی زبان بھی چلتی رہی۔ ''خان صاحب کی حویلی کی زنانیاں آئی ہیں دعا کرنے، کرم دین بھی ساتھ ہے۔ لاریب بی بی آتی ہیں ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں..... اپنے خان صاحب کی چھوٹی بیٹی ہیں۔ بڑی والی امینہ تو دو سال پہلے ہی بیاہ کر رحمان گڑھ کے چودھری اجمل کے ہاں چلی گئی تھی.....'' پھر جیسے بشیرے کو کچھ یاد آیا اور وہ میرے قریب آ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''امینہ اور چھوٹی بی بی کی سگی ماں کا بہت سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب جو وہ بیگم صاحب لاریب بی بی کے ساتھ اُوپر آ رہی ہیں وہ اُن کی سوتیلی ماں ہے..... خان صاحب نے بیٹیوں کے لیے دوسری شادی رچا لی تھی.....''

اتنے میں وہ دونوں درگاہ کے صحن تک آ پہنچیں اور بشیرے کے رواں تبصرے کو جیسے بریک سی لگ گئی۔ آنے والیوں میں سے ایک بُردباد اور سنجیدہ طبع تھی اور دوسری جو عمر میں چھوٹی تھی کافی شوخ و شنگ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر بشیرے کی زبانی مجھے اس ماں بیٹی کے

رشتے کا پتا نہ چلتا تو میں انہیں کبھی ماں بیٹی نہ سمجھتا، کیونکہ دونوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ شاید خان صاحب کی دوسری بیگم کی نوعمری میں ہی شادی ہوگئی تھی کیوں کہ وہ لاریب کی بڑی بہن ہی لگ رہی تھیں۔ دونوں نے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے فاتحہ پڑھی اور قبر پر پھول چڑھائے۔ میں جب کبھی ان قبروں پر لوگوں کو ازراہ عقیدت پھول چڑھاتے، یا اگر بتیاں جلاتے اور خوشبو بکھیرتے ہوئے دیکھتا تھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے چینی اور اُلجھن کا احساس ہوتا تھا جیسے ہم بیک وقت ان پھولوں کی نازک پنکھڑیوں اور اس قبر کی بے حرمتی سی کر رہے ہوں۔ اصغر صاحب نہ جانے صبح سویرے ہی کہاں نکل گئے تھے۔ میں احاطے کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی انگور کی بیلوں کی جانب بڑھ گیا جس کے پتے سردی کی وجہ سے زرد آتشیں رنگ کے ہو کر زمین پر یوں بکھرتے رہتے تھے جیسے کوئی مصور سبز، دھانی اور زرد رنگوں کے چھینٹے کینوس پر گراتا چلا گیا ہو۔ انہی بیلوں کے نیچے شفاف پانی کی وہ کشادہ نالی بھی بہتی تھی جس کا منبع درگاہ سے باہر کسی اُونچی چوٹی سے نکلتا ہوا ٹھنڈے میٹھے پانی کا وہ چشمہ تھا جس کا دھارا اِسی درگاہ کے صحن سے اس نالے کی صورت ہو کر گزرتا تھا۔ اس بہتے جھرنے اور اس نالے کی رم جھم جیسی ٹھنڈی میٹھی آواز نے درگاہ کے اس سکوت کو اور بھی مقدس بنا رکھا تھا۔ دو تین دن سے رات کو چونکہ سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا لہٰذا اس بہتے پانی پر شفاف سی برف کی شیشے نما تہ سی بن جاتی تھی، جو دن نکلنے اور دھوپ چڑھنے پر دھیرے دھیرے پگھل کر پھر سے اُسی رواں پانی کا حصہ بن جاتی تھی۔ اس وقت بھی شیشے جیسی برف کی وہ پتلی سی تہ درمیان سے ٹوٹ کر پانی بن چکی تھی اور کناروں پر بچی اس کی باقیات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر سے برف اور پانی کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے قریب ہی بشیرے کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اور اُس کی بڑی مالکن نہ جانے کب سے وہاں کھڑے تھے۔ شاید مالکن نے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا لیکن میں اپنی محویت کی وجہ سے اُسے سن نہیں پایا۔ میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

''تو تم ہو اس درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو ابھی کم عمر ہو..... کیا جدی پشتی مجاور ہو.....؟ نام کیا ہے تمہارا.....؟''

''عبداللہ.....'' میں نے اُن کے سوال کے پہلے حصے کا جواب دینے سے گریز کیا۔
ں نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا اور بولیں ''اچھا عبداللہ..... تمہیں کچھ خدمت سرانجام دینا
ی۔ ہمارا ہر جمعرات کو یہاں آنا ممکن نہیں، لہٰذا پچھلے خدمت گار کی طرح اب تمہی کو ہر
رات یہاں نیاز بانٹنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ بشیر تمہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔ کوئی مشکل ہو
پوچھ لینا۔''

''جی بہتر.....'' وہ پلٹ کر جانے لگیں پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ اتنے میں دُور کھڑی
ہزوں کو دانہ ڈالتی لاریب بھی ہاتھ جھاڑ کر ہماری جانب بڑھ آئی۔ بڑی مالکن نے مجھ
ے پوچھا۔

''تمہارے گھر والے کہاں ہیں..... شادی ہوئی ہے تمہاری.....؟''

''نہیں..... میں یہاں اکیلا ہوں..... ماں باپ دُور کسی شہر میں رہتے ہیں۔ میں اکلوتا
ں۔'' اب لاریب کی باری تھی۔ میرا جواب سن کر وہ چونکی اور کچھ تیز لہجے میں بولی۔

''ارے..... تو انہیں بھی ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا نا..... وہ بے چارے اکیلے وہاں کیسے
زارہ کرتے ہوں گے..... اُن کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتا دینا۔ بلکہ میں تو
تی ہوں اُن کو بھی یہیں بلوا لو..... پچھلے مجاور کا تو پورا خاندان اسی درگاہ میں رہتا تھا۔''

مجھے لاریب کی بات سن کر مما کا جملہ یاد آ گیا کہ جہاں کہیں بسیرا کرو ہمیں بھی وہیں بلوا
اور جانے کیوں یہ سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر خود بخود ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی کہ مما اور پاپا
ا میرے ساتھ ہی اس درگاہ کے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے ہوں گے اور پتا نہیں کیسے میرے
سے نکل پڑا۔

''پہلے میں خود تو اس دنیا کے طور طریقے اور رہن سہن سیکھ لوں..... پھر انہیں بھی یہیں
الوں گا.....''

لاریب اور بڑی مالکن نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
ب سے میں نے درگاہ کی زندگی اختیار کی تھی میری حتیٰ الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں
نے الفاظ، برتاؤ، یا کسی بھی اور طور طریقے سے دوسروں پر کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہونے دوں
ں سے انہیں میرے ماضی، یا میرے رشتوں کے بارے میں کوئی بھی اندازہ ہو سکے۔

دراصل میں جس راستے کا مسافر تھا اس کی منزل نمایاں ہونے سے نہیں بلکہ غیر نمایاں ہو کر نظر آ سکتی تھی۔ اسی لیے میں ہمیشہ بھیڑ اور ہجوم میں کھوئے رہنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن آج حد احتیاط کے باوجود شاید مجھ سے الفاظ کے چناؤ میں کوتاہی ہو ہی گئی تھی اور نتیجہ میں اس سامنے کھڑی لاریب کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیرت سے اخذ کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ سورج کی ایک کرن اُس کی نازک سی ناک میں پڑے کوکے سے منعکس ہو کر اُس کے گلابی چہرے پر نور کا ایک سنہری ہالہ سا بنا رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا حسن پہلی نگاہ میں ہماری نظر کو خیرہ نہیں کرتا، بلکہ دھیرے دھیرے کچھ الگ زاویوں سے ہم پر کھلتا ہے۔ لاریب کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پرت در پرت کھلنے والا۔ اُس کی بڑی بڑی سی آنکھوں میں ہر وقت شرارت سی بھری رہتی تھی اور اُسے ہمہ وقت اپنے نچلے ہونٹ دانتوں میں دبانے کی عادت تھی جب کہ اُس کے چہرے پر بائیں گال پر ایک ہلکا سا گڑھا پڑ جاتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ مسکراتی تھی، تب..... اور اس وقت یہ تمام کیفیات پوری طرح اُس کے چہرے پر واضح تھیں جب اُس نے میری بات کے جواب میں شرارتاً کہا۔

''انہیں بھی یہیں بلوا لو..... ویسے بھی کافی کمرے خالی پڑے ہیں..... کچھ رونق ہی رہے گی۔''

بڑی مالکن نے کڑی نظروں سے لاریب کو گھورا۔ جواباً وہ منہ میں اپنی کالی چادر کا پلو دبا کر زور سے ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی کی آواز بالکل اس جھرنے سے مشابہ تھی جو درگاہ سے اُوپر والی چوٹی سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ بڑی مالکن نے جانے سے پہلے مجھے دعا دی۔ ''کسی اچھے گھر کے لگتے ہو..... جیتے رہو.....'' وہ دونوں پلٹ کر چل دیں۔ بشیرے نے جاتے جاتے مجھے یاد دلانا ضروری سمجھا کہ مجھے اُس کی منت کے پورا ہونے کی دعا کرتے رہنا ہے۔ کرم دین ہانپتا کانپتا اپنی لکڑی کی بڑی سی ڈانگ سنبھالے حویلی کی بیبیوں کے آگے تیز تیز دوڑا چلا جا رہا تھا۔ نیچے اُتر کر وہ تانگے پر بیٹھیں اور تانگا آگے چل پڑا۔ اسی اثنا میں اصغر صاحب بھی پسینے میں شرابور درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت دُور سے پیدل چل کر آ رہے ہوں۔ میں نے جلدی سے انگور کی بیلوں کے نیچے رکھے گھڑوں میں سے ایک گلاس پانی بھر کر انہیں پیش کیا جسے وہ ایک ہی سانس میں اُنڈیل گئے۔ ''خوش رہو میاں..... میں دراصل کسی

ام سے نیچے گاؤں کے بازار تک گیا تھا، کچھ لونگ اور لوبان وغیرہ چاہیے تھا۔ واپسی پر
چھوٹے رستے کی لالچ میں زیادہ چڑھائی چڑھ گیا۔ کم بخت اب عمر بھی تو نہیں رہی نا.....''
صغر صاحب حسب معمول بات کرتے وقت اپنے گلے میں پڑے اس سرخ دھاگا نما تعویذ
سے کھیلتے رہے جو میں پہلے دن سے اُن کے گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی
اس دھاگے کی سختی اور اُن کے گلے میں پڑے سرخ نشانات دیکھ کر مجھے اُلجھن سی ہونے لگی
تھی کہ آخر اتنا کس کر دھاگا گلے میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ خواہ مخواہ ہی انسان خود کو
زیت میں ڈالے رکھے، لیکن میں ایک بار پھر اُن سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ شاید یہ دھاگا
بھی اُن کی اُسی منت کا ہی کوئی تسلسل تھا۔ مجھے گہری سوچ میں پڑا دیکھ کر وہ ہلکے سے
مسکرائے۔ ''میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں ہمہ وقت میرے متعلق بہت سارے سوالات
چلتے رہتے ہیں لیکن تمہاری یہی عادت مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ تم کبھی چاہ کر بھی
اپنے دائرے سے باہر نہیں نکلتے اور ہمیشہ غیر ضروری سوالات سے اجتناب کرتے ہو اور یہی
تمہارے گہرے اور اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے۔''

میں نے غور سے اُن کی جانب دیکھا۔ ''پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی شدید
درد کا شکار ہیں۔ جب کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو مجھے ضرور کہیے
گا۔'' اصغر صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھپا
کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

جبل پور ایک چھوٹا سا قصبہ نما گاؤں تھا جو چاروں جانب سے اُونچی پہاڑیوں سے گھرا
ہوا تھا۔ جن کی چوٹیوں کو شام ڈھلے عموماً بادلوں کی دُھند ڈھک لیتی تھی اور پھر رات گئے، یا صبح
سویرے کچھ دیر کے لیے ہلکی بارش ضرور ہوتی تھی۔ گاؤں کا واحد بازار قصبے کے وسط میں واقع
تھا، جہاں ٹین کی چھتوں اور لکڑی کے بڑے بڑے پرانے دروازوں والی چند دکانیں ہٹوارے
سے پہلے سے ایستادہ تھیں جن میں گندم، جو، گڑ، تیل اور دیگر راشن لیے بیٹھے دُکان دار حیرت
زدہ سی نگاہوں سے کسی اجنبی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ بازار کے آخری
سرے پر ایک بڑا سا ٹال تھا جہاں سوختنی لکڑی کے انبار سے لگے رہتے تھے۔ بازار کا لین دین
زیادہ تر موسمی فصل کی بوائی اور کٹائی پر منحصر ہوتا تھا اور انہی دنوں میں لوگ اپنے پرانے اُدھار

اُتارتے اور ایک نیا قرض سر پر اناج کی بوریوں سمیت اُٹھائے چلے آتے۔ پھر بھی یہ سب لوگ خوش باش رہتے تھے اور اُن کی ہنسی میں ہنسی اور آنسوؤں میں آنسوؤں کا ذائقہ ابھی خالص تھا۔ سچ ہے کہ زندگی الگ چیز ہے۔ زندہ رہنا الگ بات ہے۔ میں نے جبل پور کے لوگوں کو زندہ محسوس کیا تھا۔ اُن کی نیند پُرسکون تھی اور صبح اُن کے لیے دھوپ کی صورت میں سورج کا خنجر لیے وارد نہیں ہوتی تھی۔ قصبے کا واحد مال دار اور متمول گھرانا کریم خان صاحب کا تھا جن کی حویلی پورے گاؤں کی واحد اور باعث تکریم نشانی تھی۔ خود کریم خان کا دل بھی اُن کے نام کی طرح بڑا تھا اور گاؤں کے نہ جانے کتنے گھرانے درپردہ اُن کی اعانت سے ہی چل رہے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد اُن کی زندگی کا محور اُن کی دو بیٹیاں ہی رہ گئیں تھیں۔ وہ بچیوں کو دل کا چھالا بنا کر رکھتے تھے اور اُن پر سوتیلی ماں لانے کے بے حد خلاف تھے لیکن سال بھر میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ لڑکیوں کی تربیت میں ایک خاص عنصر اُن کی ماں کا بھی ہوتا ہے جو ایک عورت کی موجودگی سے ہی پورا ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسی عورت کہاں سے ملتی جو اُن کی بیٹیوں کو ماں نہیں، ایک سہیلی بن کر پالتی۔ آخرکار بزرگوں کی نظر میں کریم خان کی مرحومہ بیوی کی چھوٹی بہن صائمہ پر پڑی جس نے ابھی تازہ تازہ بارھویں جماعت کا امتحان دیا تھا اور وہ درحقیقت کریم خان کی دونوں بیٹیوں کی پسندیدہ خالہ بھی تھی۔ تب کریم خان کی بڑی بیٹی امینہ ساتویں جماعت میں تھی اور سکینہ نے ابھی چوتھی جماعت میں قدم رکھا تھا۔ یوں صائمہ اگلے مہینے ہی دو کپڑوں میں بیاہ کر کریم خان کی حویلی میں چھوٹی مالکن سے بڑی مالکن کی گدی سنبھال چکی تھی۔ ایسے وقت میں کریم خان کے سسرال والوں کے ایثار اور سمجھ داری نے بھی بڑا کردار ادا کیا ورنہ صائمہ کی ماں کا دل تو اپنی پھولوں جیسی بیٹی کو یوں رُخصت کرتے وقت کٹا جا رہا تھا۔ لیکن دوسری جانب بھی تو اُن کے اپنے جگر ہی کے دو ٹکڑے تھے جن کے لیے انہیں یہ قربانی دینا ہی تھی۔ صائمہ بیاہ کر کریم خان کے گھر آ گئی اور پھر اُس نے ماں کے نام کے ساتھ لگا یہ ''سوتیلی'' کے لاحقے کو کچھ اس طرح سے مٹایا کہ لوگ سوتیلی لفظ کو ہی بھول گئے۔ صائمہ نے دونوں بیٹیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور بڑی کو تب تک رُخصت نہیں کیا جب تک وہ قریبی ضلع سے بی اے کی فرسٹ ڈویژن کی ڈگری لے کر گھر واپس نہیں آ گئی۔ اسی طرح وہ آج کل اُسی تن دہی سے لاریب کو اُس کی گریجویشن کی تیاری کروا رہی تھی۔ کریم

خان کو لگتا تھا کہ خدا نے اُس کے سبھی اچھے اعمال کا بدلہ اِسی دنیا میں صائمہ کی صورت میں اُسے دے دیا تھا۔ دونوں بیٹیوں نے بھی ماں کو ماں سے زیادہ اپنی سہیلی اور سہیلی سے بڑھ کر ماں سمجھا اور اُسے وہی مان دیا جو وہ اپنی سگی ماں کو دے سکتی تھیں۔ لاریب تو ویسے بھی صائمہ سے بہت قریب تھی اور دونوں ہی یک جان دو قالب کی تشریح بنی اس اُونچی حویلی میں اپنے جیون بیتا رہی تھیں۔ لاریب کو کتابوں سے بے حد شغف تھا اور کریم خان نے بیٹی کی سہولت کے لیے حویلی میں ہی ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی جہاں ہر ہفتہ پندرہ دن کے وقفے کے بعد شہر سے چند نئی کتابیں ضرور شاملِ ذخیرۂ کتب ہو جاتی تھیں۔ لاریب کو اپنے بی اے کے رزلٹ کا انتظار تھا جس کے بعد وہ شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن فی الحال کریم خان اس کے حق میں نہیں تھے مگر لاریب کو یقین تھا کہ اپنی ہر ضد کی طرح وہ اس بات کو بھی اپنی لاڈلی ماں کے توسط سے منوا لے گی۔ ویسے بھی وہ تھی ہی اتنی شوخ و شنگ کے اُس کے ناز کے سامنے اُس کے باپ کا غصہ کچھ کم ہی ٹھہر پاتا تھا۔ سارا دن حویلی میں اُس کی ہنسی اور قہقہوں کا جل ترنگ بجتا رہتا تھا اور وہ پورا دن کسی کو بھی ٹک کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ صبح سویرے دھوپ نکلتے ہی رضائیاں اور الگنیاں دھوپ میں ڈالی جا رہی ہیں تو گیارہ بجے گرم پکوڑے اور سموسے تلے جا رہے ہیں۔ ابھی اندر کا ہنگامہ ختم ہوا نہیں کہ سہ پہر سے پہلے آسمان پر بادلوں کی گھٹا دیکھتے ہی حویلی سے ملحقہ باغ میں جھولے ڈلوائے جا رہے ہیں۔ ابھی پہلی بوند گرتی نہیں کہ بارش کے پکوان باغ کے جھولوں تلے بننا شروع۔ ابھی نوکر باغ میں تیل کی کڑائیاں پہنچا کر اپنی کمر سیدھی بھی نہیں کر پائے ہوتے کہ شام کی چائے کا غلغلہ شروع، ساتھ ہی ساتھ دوپٹوں کی رنگائی اور ساون کے لیے نئے کپڑوں کی بنائی، درزی تو سال بھر جیسے حویلی کے دروازے سے ہی ٹنگا رہتا تھا۔ اور پھر مغرب ڈھلی نہیں کہ حویلی کے سب سے بڑے کمرے میں انگیٹھیاں جلوانے کی دوڑ دھوپ شروع، خشک میوے کی پراتیں فٹافٹ وہاں پہنچا دی جاتیں اور پھر رات کے کھانے کے فوراً بعد گرم قہوہ، سبز، یا کشمیری چائے بڑے بڑے فنجانوں میں وہاں کمرے میں پہنچا دی جاتی اور پھر جب کریم خان باہر کے بکھیروں سے فارغ ہو کر اپنی چہیتی بیٹی کے پاس آتے تو پھر رات گئے تک ماں باپ دونوں ہی بیٹی کی باتوں کی سرگم سے محظوظ ہوتے رہتے، وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی، چند لمحوں میں ہی سب

کو اپنا بنا لینے والی۔ حویلی کے سبھی نوکر بھاگ بھاگ کر اُس کے کام یوں کرتے تھے جیسے اُن سے ذرا سی بھی تاخیر ہوگئی تو اُن کی لاڈلی مالکن کہیں اُن کے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر دے گی۔ اور وہ تو دن بھر اس آس میں اپنے کان اپنی چھوٹی مالکن کی پکار پر لگائے رکھتے تھے کہ کب اُس کے میٹھے لبوں سے اُن میں سے کسی کا نام نکلے اور وہ دوڑتا، یا دوڑتی ہوئی اپنی ہر دل عزیز مالکن کے پاس پہنچ جائیں۔ تبھی تو کریم خان کا دل نہیں مانتا تھا کہ اپنی اس بولتی مینا کو ایک بار پھر سے یونیورسٹی ہوسٹل کی بھول بھلیوں میں بھجوا دے۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو وہ شہر کے کالج سے امتحان دے کر لوٹی تھی۔ اب وہ کسی طور بھی اپنی لاڈلی کو خود سے جُدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بابل جانے پیار پالتے ہوئے ہمیشہ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ بیٹیاں تو سدا سے پرایا دھن ہوتی ہیں۔ صائمہ بھی ہمیشہ شوہر کو یہی سمجھاتی رہتی تھی کہ بیٹی سے اتنا زیادہ پیار اور لگاؤ بعد میں بہت تڑپاتا ہے۔ لیکن ان جذبوں پر انسان کا قابو ہوتا تو پھر زندگی میں رونا ہی کس بات کا تھا اور پھر کچھ لوگوں میں کچھ ایسی ہی بات بھی تو ہوتی ہے، دل میں کھب جانے والی..... وہ بھی ایسی ہی تھی..... چند لمحوں میں ہی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر کر خون سے تحلیل ہو جانے والی..... اور اُس کی یہ شوخ طبیعت اور قہقہے اب واقعی حویلی کے در و دیوار میں تحلیل ہی تو ہو چکے تھے۔

یہ ساری باتیں مجھے آتے جاتے بشیرے اور کسی حد تک کرم دین سے پتا چلتی رہیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ مما کی تاکید کے مطابق میں انہیں ہر ہفتے تاکید سے خط لکھ دیتا تھا اور ہر پندرھواڑے میسر آنے پر فون بھی کر لیتا تھا۔ اس دن بھی جب میں گاؤں کے واحد تار گھر سے مما سے فون پر بات کر کے واپس درگاہ آیا تو بے حد اداس تھا۔ مما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ انہوں نے خود تو نہیں بتایا لیکن پاپا سے جب بات ہوئی تو انہوں نے دبے لفظوں میں اُن کی طبیعت کا ذکر کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سلطان بابا کا کہیں اتا پتا ملے تو میں اُن سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر ہو آؤں۔ لیکن شام ڈھلنے سے پہلے ہی اصغر صاحب کو شدید بخار نے آ گھیرا۔ سردی کی شدت کافی بڑھ چکی تھی اور وہ نہ جانے دن بھر کہاں بھٹکتے رہتے تھے۔ شاید اِسی آوارہ گردی کے دوران انہیں سردی لگ گئی تھی۔ رات ہوتے ہوتے وہ بالکل ہی بے سدھ ہو گئے اور مجبوراً مجھے انہیں کمرے میں اُٹھا کر لانا پڑا۔ اُن کی بے ہوشی کے وقفے گہرے ہوتے

ہا رہے تھے اور درمیان میں تھوڑا بہت ہوش آتا بھی تو بے سدھ سے پڑے رہتے۔ وہ ہذیان میں کچھ عجیب سی باتوں کی گردان بھی کر رہے تھے۔ ''توڑ دوں گا..... میں اس دھاگے کو توڑ دوں گا..... مجھے آزاد کر دو.....'' مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں کیسے سنبھالوں کیونکہ مجھے ایسی کسی تیمارداری کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اور میرے پاس یہاں درگاہ میں ایسی کوئی خاص دوا بھی نہیں تھی جو اس بیماری میں میں انہیں پلا سکتا۔ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ انہوں نے آج تک کبھی اپنے کسی اتے پتے سے بھی مجھے آگاہ نہیں کیا تھا، نہ ہی مجھے اُن کے کسی اور رشتے دار وغیرہ کا پتا تھا۔ آدھی رات تک مجھ سے جو بھی بن پڑا وہ میں نے کیا لیکن اُن کی حالت سدھرنے کے بجائے مزید بگڑتی ہی گئی اور آخرکار مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ مجھے نیچے گاؤں جا کر کسی مدد کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن یوں آدھی رات کو میں کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ مجھے تو وہاں نیچے کسی حکیم، یا طبیب کا بھی پتا نہیں تھا۔ لہٰذا اس نیم شب میں جب سردی رگوں کو اندر سے کاٹ رہی تھی اور گاؤں بھر میں کسی بھی ذی رُوح کا نشان تک ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا، میں نے بڑی حویلی کے پھاٹک پر دستک دی اور پھر جانے کتنی دیر بعد کسی دربان کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھولنے والا کرم دین نہیں تھا، کوئی دوسرا پکی عمر کا مرد تھا جو یوں آدھی رات کو اپنی نیند خراب کیے جانے پر کافی حد تک برہم بھی نظر آ رہا تھا۔ اُس نے پھاٹک کھلتے ہی درشت لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے.....؟.....''

میں نے اُس کے لہجے کو نظرانداز کر دیا۔

''میرا نام عبداللہ ہے..... میں پہاڑی والی درگاہ کا مجاور ہوں..... میں.....'' اُس نے میری بات پوری ہونے سے قبل ہی کاٹ دی۔

''صبح آنا..... اس وقت سب سو رہے ہیں.....'' اُس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کرنے کی ٹھانی اور زیرلب کہا ''نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات..... یہ بھی کوئی وقت ہے مانگنے کا.....'' وہ مجھے کوئی بھکاری سمجھ رہا تھا۔ ویسے ٹھیک بھی تھا، ہر طلب گار بھکاری ہی تو ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے روکا۔

''مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے..... دراصل اُوپر درگاہ میں ایک مریض کی حالت بہت

بُری ہے..... مجھے اُس کے لیے کچھ دوائیں چاہئیں..... آپ اگر خان صاحب سے جا کر....."
اُس نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ ''نہیں نہیں..... خان صاحب اس وقت کسی سے نہیں ملتے..... اور اب اس آدھی رات کو میں کہاں سے دوا دارو کا انتظام کروں.....؟..... تم اگر واپس نہیں جا سکتے تو یہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں ایک طرف پڑے رہو، خان صاحب صبح کی نماز کے لیے اُٹھیں گے تو تمہاری بات کروا دوں گا..... اب جاؤ اور مجھے بھی سونے دو....."

اُس نے ایک بار پھر مجھے دھتکار کر پھاٹک بند کرنے کی ٹھانی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس طرح سے صورت حال کی نزاکت سمجھاؤں۔ میں نے بھی مجبوراً واپسی کی ٹھانی۔ اتنے میں اندر والی ڈیوڑھی کے اندھیرے سے کسی عورت کی آواز اُبھری۔

''دروازے پر کون ہے جمالے.....''

دوسرا مسیحا

حویلی کا دربان چونک کر پلٹا۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے سے بڑی مالکن اور لاریب آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ لگی جلتی مشعل کی روشنی میں آ گئیں۔ وہ دونوں جانے کب دروازے پر بات چیت اور بحث کی آوازیں سن کر ڈیوڑھی میں چلی آئیں تھیں۔ دربان گھبرا سا گیا۔

''پتا نہیں کون بھکاری ہے جی..... آدھی رات کو خان صاحب کو جگانے کا کہہ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ہم اس وقت اُن کی نیند خراب نہیں کر سکتے..... جو بھی چاہیے، صبح آ کر لے جائے، بڑی مالکن.....'' انہوں نے جمالے کی بات پر دھیان نہیں دیا اور آواز دے کر بولیں۔

''کون ہے دروازے پر..... سامنے آؤ.....''

میں نے پھاٹک سے اندر قدم رکھ کر انہیں سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکیں۔ لاریب بھی حیران سی تھی۔ ''عبداللہ..... تم..... خیریت تو ہے.....''

میں نے انہیں اصغر صاحب کی بیماری سے لے کر حویلی کا در کھٹکھٹانے تک کا تمام ماجرا سنا دیا۔ انہوں نے فوراً لاریب کو اندر سے میڈیکل بکس لانے کا کہا اور جمالے کو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی کہ اُسے کتنی بار منع کیا ہے کہ کسی بھی سائل کو یوں دروازے سے واپس نہ لوٹایا کرے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وہ کرم دین کی گھر والی، جو حویلی کے احاطے میں ہی اپنی کوٹھڑی میں بیمار پڑی تھی، کی دوا بنا کر اُسے دینے کے لیے جا رہی تھیں کیونکہ طبیب نے اُسے ہر چھ گھنٹے کے بعد ایک تازہ دوا کی خوراک دینے کی تاکید کی تھی۔ اور لاریب کی ضد تھی کہ وہ خود ہی انہیں دوا کھلائے گی کیونکہ کرم دین کو شک تھا کہ اُس کی گھر والی ان کڑوی کسیلی دواؤں سے تنگ آ کر اب انہیں آنکھ بچا کر بہا دیتی ہے۔ لہٰذا اب دوا کی تمام خوراکیں لاریب کی نگرانی میں پلائی جاتی تھیں۔ اور پھر جب لاریب جاگ رہی ہو تو بھلا وہ اپنی سہیلی اپنی پیاری ماں کو کہاں سونے دے سکتی تھی اور یہی جگ راتا انہیں رات کے اس پہر دروازے تک لے آیا۔ ورنہ شاید مجھے پوری رات وہیں حویلی کی ڈیوڑھی میں انتظار کرنا پڑتا۔ لاریب کچھ ہی دیر میں

میڈیکل بکس لے آئی جس میں بخار کی انگریزی دوائیں بھری پڑی تھیں۔ بڑی مالکن نے وہ بکس میرے حوالے کیا اور مجھے دوا پلانے کے بارے میں کچھ ہدایات جاری کر کے واپس درگاہ جانے کا کہا جب کہ جمالے کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً جا کر حکیم صاحب کو جگائے اور انہیں لے کر اُوپر درگاہ مریض کے پاس پہنچے۔ ویسے تو گاؤں میں ایک سرکاری ڈسپنسری بھی تھی لیکن اُس کا پچھلا سرکاری ڈاکٹر سفارش کروا کر کسی بڑے ضلع میں اپنا تبادلہ کروا چکا تھا اور پچھلے ڈیڑھ سال سے کسی نئے ڈاکٹر کی تعیناتی کھٹائی میں پڑی ہوئی تھی کیوں کہ جس کو بھی اس دُور دراز علاقے میں تعینات کیا جاتا وہ آنے سے پہلے دوڑ دھوپ کر کے اپنا تبادلہ رُکوا لیتا تھا۔

میں دواؤں کا بکس لے کر پلٹنے لگا تو بڑی مالکن نے مجھے آواز دی۔

''سنو عبداللہ.....'' میں ٹھٹھک کر پلٹا تو وہ غور سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

''جمالے کی باتوں کا بُرا نہ ماننا..... تم کوئی مانگنے والے نہیں..... اس گاؤں بھر کے مہمان ہو..... لیکن تمہارے ساتھ آج جو برتاؤ اس حویلی کے دروازے پر ہوا ہے اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں..... خان صاحب کو پتا چلے گا تو وہ اس جمالے کی خوب خبر لیں گے.....''

میں نے جلدی سے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ''نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میرا حلیہ ہی شاید ایسا ہے کہ جمالے کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو دھوکا کھا جاتا۔ آپ خان صاحب کو اس ساری تفصیل سے آگاہ نہ کیجیے گا۔ یہ میری آپ سے گزارش ہے۔ معاف کرنے میں بڑائی ہے..... آپ بھی جمالے کو معاف کر دیجیے.....''

اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''جیتے رہو.....'' لاریب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن تب تک میں وہاں سے پلٹ چکا تھا۔ میں اُوپر درگاہ میں پہنچا تو اصغر صاحب بالکل ہی بے سدھ پڑے تھے۔ بڑی مشکل سے اُن کے حلق میں دوا اُنڈیلی۔ کچھ ہی دیر میں جمالا بھی حکیم صاحب کو لے کر پہنچ گیا اور حکیم نے بڑی جانفشانی سے دن چڑھے تک اصغر صاحب کی کچھ ایسی دیکھ بھال کی کہ دوپہر تک وہ بمشکل آنکھیں کھولنے کے قابل ہو سکے۔ حکیم صاحب ابھی وہیں موجود تھے جب خان صاحب بھی تیمارداری کے لیے درگاہ آ پہنچے اور کافی دیر وہیں اصغر صاحب کے سرہانے بیٹھے رہے۔ انہوں نے بہت چاہا کہ اصغر صاحب کچھ دن کے لیے

نیچے اُن کی حویلی کے مہمان خانے میں منتقل ہو جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ پتا نہیں کیوں اصغر صاحب ایک رات بھی درگاہ سے باہر نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ شاید یہ بھی اُن کی مانی ہوئی منت کی کوئی مجبوری تھی؟ خان صاحب نے جاتے وقت حکیم کو تاکید کہ وہ اصغر صاحب کے ٹھیک ہونے تک دن میں ایک مرتبہ درگاہ کا پھیرا ضرور ڈال جایا کریں کیوں کہ خان صاحب اصغر صاحب کو بھی اپنا مہمان سمجھتے تھے اور مہمان کی تیمارداری اور علاج میں وہ کوئی غفلت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیب کے جانے کے بعد اصغر صاحب بہت دیر تک ممنونیت بھرے لہجے میں میرا شکریہ ادا کرتے رہے کہ میں نے اُن کے لیے بڑی زحمت برداشت کی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں موضوع بدلنے پر آمادہ کیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُن کا دھیان بٹایا۔ اس دن میں نے اُن سے احتیاطاً اُن کا پتا اور چند حوالے پوچھ کر ایک کاغذ پر لکھ لیے تا کہ آئندہ کسی ایسی ہنگامی صورت میں کام آسکیں۔ انہوں نے بے دلی سے مجھے اپنا پتا نوٹ تو کروا دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ خاص طور پر یہ تاکید بھی کی کہ میں حتیٰ الامکان کوشش کروں کہ یہ پتا راز ہی رہے اور صرف اور صرف اُن کی موت کی صورت میں ہی اُن کے گھر والوں سے کوئی رابطہ کیا جائے۔ میں نے جب چونک کر اُن کی جانب دیکھا تو وہ مجھے ایک بے حد ٹوٹے ہوئے انسان دکھائی دیئے۔ ''لمبی کہانی ہے میاں..... پر تمہیں سناؤں گا ضرور..... تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ بس ذرا میری طبیعت سنبھل جانے دو.....'' میں نے انہیں دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے منع کیا اور انہیں نیند کی گولی دے کر باہر صحن میں چلا آیا۔ سفید بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے نیلے آسمان پر آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک کسی پہاڑی کی چوٹی کے پیچھے جا چھپتا اور پھر باقی سب اُسے ڈھونڈنے کے لیے ہوا کے دوش پر اُس کے پیچھے بھاگے جاتے۔ پھر اُن میں سے کوئی ایک اُسے جا پکڑتا اور اُن کے پیچھے باقی لگ جاتے۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک ہوا، آسمان اور بادلوں کا یہ لافانی کھیل دیکھتا رہا۔ تبھی نرم چمکیلی دھوپ نے درگاہ کی منڈیروں کو چوم چوم کر انہیں الوداع کہنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اُن سے یہ وعدہ بھی کرتی جاتی کہ کل صبح وہ پھر اُن سے ملنے آئے گی، لہٰذا وہ اداس نہ ہوں۔ لیکن شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ میری اداسی تو بڑھنی ہی تھی، مجھے یہاں اس دھوپ جیسا کوئی دوست میسر نہیں تھا جو اس شرط پر مجھ سے الوداع ہوتا کہ ''کل پھر ملیں گے.....'' مغرب کی اذان کا

وقت ہو چلا تھا، میں منڈیر پر رکھے دیے جلانے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ مجھے نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کی مخصوص گھنگھروؤں بھری ٹاپ اور اُس کے سال خوردہ بھونپو کی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر نکل کر نیچے جانے والے رستے سے جھانکا تو وہ نیچے سے ہی چلایا۔ ''او عبداللہ باؤ جی..... آپ کو خان صاحب نے ابھی بلایا ہے۔ جلدی سے نیچے آ جاؤ۔'' خان صاحب کے بلاوے کا سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں بڑی مالکن، یا لاریب نے انہیں رات والے واقعے کا تو نہیں بتا دیا؟ اگر ایسا ہوا تو خواہ مخواہ جمالے کی شامت آ جائے گی۔ میں اِسی سوچ میں گھرا نیچے اُترا تو بشیرا تانگا موڑ کر بالکل تیار کھڑا ملا۔ میں نے اُس سے معاملہ پوچھا تو بولا ''پتا نہیں جی..... خان صاحب سے ملنے کچھ مہمان بڑی سی گاڑی میں آئے ہیں کہیں دُور شہر سے..... اس کے بعد خان صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا..... معاملہ تو اب آپ اُنہی سے پوچھنا۔'' میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ خان صاحب نے اپنے مہمانوں کی آمد کے بعد بھی اگر مجھے بلاوا بھیجا ہے تو اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس اُدھیڑ بن میں ہم حویلی پہنچ گئے۔ مجھے کوئی گاڑی حویلی کے باہر کھڑی دکھائی نہیں دی۔ شاید اُسے حویلی کے اندرونی احاطے کے پیچھے والے گیراج میں پارک کر دیا گیا تھا جہاں خان صاحب کی اپنی گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔ حالانکہ میں نے کبھی گاؤں میں آتے جاتے انہیں اپنی کوئی گاڑی استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ گاڑیاں صرف شہر آنے جانے کے لیے استعمال میں آتی تھیں۔ کرم دین میرے پہنچتے ہی جلدی سے اندرونی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا اور مجھے حویلی کے اندر والے بڑے کمرے کی طرف چلنے کا کہہ کر حسب معمول بنا میرا جواب سنے آگے بڑھ گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میں اب تک جتنی بار بھی حویلی آیا تھا میرا تعلق صرف اس بیرونی مہمان خانے والے حصے تک ہی رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے اس اندرونی ڈیوڑھی سے گزر کر اصل حویلی میں قدم دھرنے کا اتفاق ہوا تو کچھ عجیب سی ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ جانے وہ کون سے خاص مہمان تھے جن سے ملوانے کے لیے خان صاحب نے مجھے اپنی حویلی کے زنان خانے کی سرحد بھی پار کروا دی تھی۔ بڑے کمرے سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جب میں نے بڑی سی چک اُٹھا کر اندر کمرے میں قدم رکھا تو میرے پاؤں جیسے زمین میں ہی گڑ کر رہ گئے۔ میرے بالکل سامنے والے صوفے پر مما بیٹھی ہوئی تھیں

ور اُن کے سامنے خان صاحب کے ساتھ پپا بیٹھے سگار پی رہی تھے اور زور وشور سے کوئی بحث
ہاری تھی۔ مما نے مجھے یوں جمے دیکھا تو خود ہی لپک کر مجھ تک پہنچیں اور انہوں نے مجھے زور
ے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ پاپا بھی اُٹھ کر ہماری جانب چلے آئے۔ مما کی آنکھوں سے جیسے
رہوں کا رُکا سیلاب بہہ نکلا۔ پپا بھی ہم دونوں کو چپ کرواتے کرواتے اپنی آنکھیں بھگو بیٹھے
ور ان دونوں کو دلاسا اور تسلی دیتے دیتے میرے اپنے آنسو میرے گالوں سے ٹپکتے ہوئے مما
ے دامن کو بھگونے لگے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے پپا سے فون پر بات کی تھی اور انہوں
نے مجھے بتایا تھا کہ مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ میرے لیے بے حد اداس ہیں۔ اگر کل
ظفر صاحب بیمار نہ پڑتے تو میں خود اُن سے ملنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ لیکن میرے فون کے
عد مما سے رہا نہیں گیا اور وہ سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے پپا سمیت یہاں آ پہنچی تھیں۔ مجھے
ا پپا کی طرف سے یہ سختی سے تاکید تھی کہ میں جہاں بھی بسیرا کروں، اپنے مکمل پتے سے سب
ے پہلے انہیں آگاہ کر دیا کروں۔ اس لیے مجھ تک پہنچنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اور
ل پور میں جب اتنی بڑی گاڑی داخل ہوئی تو سبھی نے یہی سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ اُن کے خان
احب کے ہی مہمان ہوں گے، لہٰذا جس پہلے راہ گیر سے راستہ پوچھا گیا وہ انہیں درگاہ کے
ائے سیدھا خان صاحب کی حویلی تک لے آیا۔ نتیجتاً اس وقت مما پپا دونوں میرے سامنے
ے ہوئے تھے۔ مما کی آنکھیں اب بھی بار بار چھلکی جاتی تھیں اور میں نے محسوس کیا کہ ہم
ں کو یوں روتا دیکھ کر خود خان صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں۔ بڑی مشکل سے میں
، مما اور پپا کو سنبھالا۔ ماحول کی اداسی کچھ کم ہوئی تو خان صاحب نے شکوہ کر ہی ڈالا۔ ''تو
راللہ میاں..... تم عبداللہ نہیں ساحر ہو..... لیکن میاں تم نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کر
ا..... اب جبل پور والے اس زیادتی کا قرض کیسے اُتاریں گے.....؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں اب عبداللہ ہی ہوں۔ ہاں اس سے پہلے ساحر تھا لیکن
پ سے میرا تعارف عبداللہ ہی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ براہ کرم ساحر کے تعارف کی دیوار کو
ے رشتے میں حائل نہ کیجیے اور آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے حد مہربانی کا سلوک روا رکھا ہے
ا کے لیے میں ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا.....''

خان صاحب ابھی تک حیرت کے عالم سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ ''مجھے ابھی تک

پوری طرح یقین نہیں آ رہا کہ کوئی اپنا محل اور شہزادوں جیسی زندگی چھوڑ کر، صرف ایک کھوج کے لیے یوں کٹیا کی زندگی اختیار کر سکتا ہے، اور وہ بھی اس دور میں جب ظاہری شان و شوکت اور بے انتہا دولت ہی لوگوں کی زندگی کا مقصد اور معیار بن چکی ہو..... یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے.....؟'' اتنے میں اندر زنان خانے سے مما کے لیے بڑی مالکن کا پیغام آ گیا کہ وہ کھانے میں اُن کی پسند کا پوچھ رہی ہیں اور اُن کی خواہش ہے کہ رات کے کھانے کی تیاری تک وہ اندر زنان خانے میں رہیں تو انہیں بہت خوشی ہو گی۔ میں جانتا تھا کہ مما کا دل میرے پاس سے اُٹھ کر جانے کو نہیں چاہ رہا ہو گا لیکن وہ دنیا کے بھرم اور تقاضے نبھانا بھی خوب جانتی تھیں لہٰذا فوراً اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ پپا میرا ہاتھ پکڑے وہیں صوفے پر بیٹھے خان صاحب کے ساتھ گپیں ہانکتے رہے مگر خان صاحب کی نظر بار بار پھسل کر مجھ پر پڑتی رہی۔ کبھی کبھی انسان کا رُتبہ اور دنیاوی مقام بھی اُسے ایک عجوبہ ہی بنا دیتا ہے۔ شاید اس وقت میری حیثیت بھی وہی تھی۔ مجھے اُوپر درگاہ میں پڑے اصغر صاحب کی فکر بھی ستا رہی تھی لیکن خان صاحب نے یہ بتا کر میری تسلی کر دی کہ انہوں نے کرم دین اور جمالے دونوں کو ہی اصغر صاحب کی تیمارداری کے لیے اُوپر بھجوا دیا ہے اور میری درگاہ واپسی تک وہ لوگ وہیں رہیں گے۔ رات کا کھانا بھی مما نے اندر زنان خانے میں ہی کھایا۔ پپا نے کھانے کے بعد خان صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی کہ وہ مجھے دو چار دن کے لیے اپنے ساتھ لے کر گھر جانا چاہتے ہیں تو خان صاحب باقاعدہ ناراض ہو گئے کہ یوں رات گئے کیا وہ اپنے مہمانوں کو جانے دیں گے۔ میں نے بھی پپا کو اصغر صاحب کی بیماری اور اپنی مجبوری کے بارے میں بتایا کہ سلطان بابا نے خصوصی طور پر مجھے یہاں بھیجا ہے لہٰذا اُن کو بتائے بنا یوں درگاہ کو چھوڑ جانا میرے لیے بہت مشکل ہو گا۔ دوسری طرف خان صاحب مصر تھے کہ برسوں بعد انہیں کوئی اپنے مزاج کا آشنا ملا ہے لہٰذا شطرنج کی چند بازیاں کھیلے بنا اگر انہوں نے پپا کو واپس جانے دیا تو یہ ''گناہ عظیم'' ہو گا۔ آخرکار گھنٹوں کی بحث اور مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ جو دو چار دن مما اور پپا میرے ساتھ گھر میں گزارنا چاہتے تھے اب یہیں خان صاحب کی حویلی میں ہی گزاریں گے۔ مجھے البتہ اتنی چھوٹ دے دی گئی کہ میں روزانہ صبح و شام درگاہ کا چکر لگا آیا کروں۔ ہمارے رہنے کے لیے دو کمرے پہلے ہی کھلوا دیئے گئے تھے مگر وہ ساری رات مما اور پپا نے میرے کمرے

میں مجھ سے باتیں کرتے ہی گزار دی۔ مجھ سے ملنے کے بعد مما واقعی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور اُن کی بیماری بھی کہیں ''اُڑن چھو'' ہوگئی تھی۔ میرے کمرے کا دروازہ حویلی کے بائیں باغ کی طرف نکلتا تھا اور پپا نے بھی میرے ہی کمرے میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ بہرحال خود انہیں حویلی کے پردے کا خیال رکھنا تھا حالانکہ خان صاحب نے اُن کا اور مما کا کمرہ اندر زنان خانے میں ہی لگوایا تھا۔ مما تو اگلے ہی دن بڑی مالکن کے قصے یوں سنانے لگ گئیں تھیں جیسے وہ اُن کی کوئی برسوں پرانی سہیلی ہوں۔ انہیں لاریب نے بھی بہت متاثر کیا تھا اور اس لڑکی کی زندہ دلی نے تو جیسے اُن کا دل ہی جیت لیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب سے مما اور پپا نے حویلی آ کر میرا ساحر ہونے کا راز کھولا تھا تب سے مجھے بڑی مالکن کے سامنے جانے کا سوچ کر ہی ایک عجیب سی جھجک گھیر لیتی تھی۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اُن کا سامنا کرنے سے بچ نہیں پایا۔ اگلی شام جب میں اصغر صاحب کو دوا پلا کر درگاہ سے واپس حویلی لوٹا تو کرم دین نے بتایا کہ خان صاحب پپا کو اپنی زمینیں دکھانے کے لیے اپنے علاقے کی جانب نکل چکے ہیں اور میرے لیے مما کا یہ پیغام ہے کہ وہ چائے پر باغ میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے اپنے جھجکتے قدم حویلی کے باغ کی جانب بڑھا دیئے۔ باغ میں ایک جانب حویلی کے نوکر مالٹے کے درختوں کے نیچے چائے کے لوازمات وغیرہ بڑی سی ٹرالی پر سجانے میں مصروف تھے، لیکن مما مجھے کہیں آس پاس دکھائی نہیں دیں۔ میں پلٹا ہی تھا کہ میں نے اپنے بالکل سامنے لاریب کو کھڑے پایا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی چائے کے ساتھ پروسے جانے والے ناشتے کی ایک ٹرے تھی۔ میں نے سلام کر کے جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں تھی۔ اُس کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ ''سنیں.....'' میں نے اُس کی جانب دیکھا۔ ''وہ دراصل..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے معذرت کروں.....'' اُس کی پریشانی اُس کے ماتھے پر چمکتی پسینے کی چند ننھی بوندوں سے واضح تھی۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ ''معذرت کیسی.....؟ آپ نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا جس کے لیے آپ معذرت خواہ ہوں.....'' اُس نے غور سے میری جانب دیکھا ''یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے..... ورنہ اُس رات جمالے نے دروازے پر آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ.....'' میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''جمالے نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا..... دربان کا کام اجنبیوں

کو روکنا ہی تو ہوتا ہے..... اور پھر اتنی رات گئے اگر جمالے کی جگہ میں بھی ہوتا تو وہی کرتا جو اُس نے کیا۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں.....'' وہ جلدی سے بولی جیسے اُسے میرے آگے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ ''بوجھ تو میرے دل پر اور بھی بہت سے ہیں، خود میرا رویہ بھی آپ سے کچھ نامناسب ہی رہا ہے..... میرے ذہن میں اَن گنت سوال ہیں لیکن فی الحال میں خود انہیں ترتیب نہیں دے پا رہی..... میں بہت اُلجھن میں ہوں..... آپ..... یہ سب..... کیسے.....؟'' واقعی شاید اُسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی بات کہاں سے شروع کرے۔ ایک دل چسپ بات یہ بھی تھی کہ لوگ ''آپ'' سے ''تم'' تک آتے ہیں۔ میرے معاملے میں وہ ''تم'' سے ''آپ'' تک آئی تھی۔ کیا ہم انسانوں کے یہ سبھی آداب و القابات صرف ہماری دنیاوی حیثیت اور رُتبے کا بدلہ ہوتے ہیں؟ کیا میں ''عبداللہ'' کی حیثیت میں ''آپ'' کہلائے جانے کا حق دار نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اُس شیشے جیسی نازک لڑکی سے یہ سوالات کر کے اُسے مزید پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اِسی اثنا میں اندر سے مما اور بڑی مالکن بھی نکل آئیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے دی۔ ''جیتے رہو.....'' پھر نہ جانے کیوں اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے..... تمہاری امی نے بتایا ہے کہ تم کتنے اچھے بیٹے ہو.....'' جس بات کا مجھے خدشہ تھا، وہی بار بار سامنے آ رہی تھی۔ مجھے اب درگاہ کے مجاور کے طور پر نہیں بلکہ ملک کے ایک مشہور صنعت کار کے بیٹے کے طور پر برتا جا رہا تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے آنے والے دن اور درگاہ کی وہ سادہ سی زندگی بہت زیادہ تکلفات میں گھرنے والی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چائے ختم کی اور وہاں سے اُٹھنے کی ٹھانی تو بڑی مالکن، جو لاریب کے ساتھ ہی بیٹھیں، مما سے باتیں کر رہی تھیں، انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اندر سے ایک نیا سویٹر منگا کر میرے حوالے کیا۔

''انکار مت کرنا..... اس میں میری خوشی چھپی ہے.....''

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ مما شاید میری اندرونی جھجک کو جان گئیں تھیں۔ لہٰذا انہوں نے مجھے اندر کمرے میں جانے کی اجازت دے دی۔ اگلے دو دن میں نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ دوبارہ میرا سامنا بڑی مالکن، یا لاریب سے نہ ہونے پائے۔ شاید میں اُن دونوں کی

لکھوں میں مچلتے سوالات کی یلغار سے بچنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ ایسے ہی سوالات کا سامنا مجھے
ان صاحب کی نظروں سے بھی تھا۔ بہرحال وہ ایک وضع دار شخص تھے اور میری ہچکچاہٹ کی
جہ سے جان چکے تھے کہ میں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ لہٰذا انہوں نے دوبارہ مجھے کسی
متحان میں ڈالنے سے گریز ہی کیا۔ چوتھے دن پپا نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو بات
ہرگلوں شکووں سے ہوتی ہوئی مزید تین دن رُکنے تک چلی گئی اور یوں ساتویں دن بمشکل مما
پا کو خان صاحب اور بڑی مالکن سے واپسی کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب وہ لوگ
یہاں آتے جاتے رہیں گے۔ میں نے پہلے ہی مما پپا سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ لوگ وقت
رخصت اپنی آنکھیں نہیں بھگوئیں گے اور خوشی خوشی الوداع کہہ کر جائیں گے، لیکن یہ کم بخت
الوداع ہمیشہ سے ہی خود میرا اپنا اندر کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سو اس مرتبہ اگر مما اور پپا نے خود پر
قابو پائے رکھا تو خود میری آنکھیں مما سے گلے ملتے ہی نم ہوگئیں۔ بس پھر کیا تھا مما تو پہلے ہی
تیار بیٹھی تھیں، اور ماں کی آنکھ کا ساون تو سدا ہی جاری رہتا ہے، پھر چاہے وہ آنکھ کے سوتوں
سے باہر کو برسے، یا پھر دل کے اندر کی زمین کو دھوتا رہے۔ مما کو سنبھالتے سنبھالتے پپا بھی
نڈھال سے ہو گئے اور پھر بڑی مالکن، لاریب اور آخر میں خان صاحب بھی اپنی آنکھیں
پونچھتے نظر آئے۔ ہم سب اس وقت حویلی کے بیرونی مہمان خانے والے حصے میں جمع تھے۔
جہاں پپا کا ڈرائیور پہلے ہی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مما نے حسب معمول جُدا ہوتے وقت
تب تک اپنی نصیحتوں کا سلسلہ جاری رکھا جب تک پپا نے مسکراتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی
آگے بڑھانے کا اشارہ نہیں کر دیا۔ گاڑی چلنے کے دوران بھی مما کی سدا بہار ہدایات کا
پروگرام جاری رہا اور میں تب تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک اُن کی گاڑی دُھول اُڑاتی ہوئی
گاؤں کی واحد کچی سڑک پر اوجھل نہیں ہوگئی۔ میں نے پلٹ کر خان صاحب سے بھی اجازت
چاہی۔ پچھلے چھ دن سے میں مما پپا کی وجہ سے اپنے فرائض پر مکمل دھیان نہیں دے پا رہا تھا
اس لیے جلد از جلد درگاہ پہنچ کر اپنے معمولات کی طرف دھیان دینا چاہتا تھا۔ خان صاحب
نے رات کے کھانے تک رُکنے کا کہا لیکن میں نے طریقے سے معذرت کر لی۔ بڑی مالکن اور
لاریب بھی اُن کے پیچھے ہی کھڑی مجھے تک رہی تھیں۔ میری معذرت پر بڑی مالکن نے شرط
لگا دی۔

''ٹھیک ہے..... لیکن تمہیں اس شرط پر رُخصت ملے گی کہ اب گاہے بگاہے یہاں آتے رہو گے..... یہ اب تمہارا بھی گھر ہے..... خبردار جو کبھی کوئی غیریت برتی.....''

میں نے مسکرا کر انہیں یقین دلایا کہ ''میں یہاں آپ کی حویلی سے اپنے پن کی ایسی سوغات لے کر جا رہا ہوں جو اب غیریت کی ایسی کسی دیوار کو کبھی ہمارے رشتوں کے درمیان حائل نہیں ہونے دے گی۔'' لاریب جو اُن کے ساتھ کھڑی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھوں میں شرارت کی اک چمک سی لہرائی اور وہ بے اختیار بول پڑی۔ ''انسان کے پاس لفظوں کا اتنا خوب صورت ذخیرہ ہو تو اسے استعمال کرنے میں اتنی کنجوسی نہیں کرنی چاہیے۔'' لاریب کی بات سن کر ہم سبھی ہنس پڑے اور میں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے وقت اُن دل رُبا چہروں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور باہر کھڑے بشیرے کے تانگے کی جانب بڑھ گیا۔

جب میں درگاہ پہنچا تو مغرب کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ اصغر صاحب کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ میں پریشان ہو گیا کہ ابھی خدا خدا کر کے تو اُن کی ذرا طبیعت سنبھلی تھی پھر اچانک کہاں نکل گئے۔ میں اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اچانک درگاہ کی بیرونی دیوار کی پرلی جانب کسی دو اشخاص کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا کہ اس زوال کے وقت یہاں کون ہو سکتا ہے۔ میں نے دیوار کے اُوپر سے جھانکا اور اصغر صاحب کے ساتھ سرگوشیاں کرتے دوسرے شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہونے لگے۔ یہ وہی شخص تھا جو پلیٹ فارم پر مجھے دکھائی دینے کے بعد ایک دم غائب ہو گیا تھا۔

فاصلے ساتھ چلتے ہیں

وہ شخص پہلے مجھے ٹرین کی برتھ پر اور پھر پلیٹ فارم پر دکھائی دیا تھا۔ مجھے اُس کی وہ روح کو چیر دینے والی دو چھوٹی چھوٹی جگنوؤں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں کیسے بھول سکتی تھیں پھر وہ اُس کا عجیب سا بے چین متحرک اور ہر لمحہ کسی کرب جیسی کیفیت میں رہنے والا منحنی اور نحرسا وجود..... لیکن وہ شخص اس وقت یہاں درگاہ کے باہر کیا کر رہا تھا؟ تو کیا وہ اصغر صاحب سے ملنے کے لیے جبل پور آ رہا تھا؟ لیکن اگر اُسے اصغر صاحب سے ملنا بھی تھا تو وہ درگاہ کے ہریوں چوروں کی طرح کیوں اُن سے مل رہا تھا؟ کچھ ہی دیر میں اصغر صاحب بات ختم کر کے جب واپس اندر آئے تب بھی میں وہیں درگاہ کے صحن میں بھی کھڑا تھا۔ وہ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سے گئے۔ اُن کا ملاقاتی اندھیرے میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھے ''ارے عبداللہ میاں..... تم.....؟..... تم کب واپس آئے۔ تمہارے امی ابا واپس چلے گئے کیا.....؟'' ''جی وہ آج واپس لوٹ گئے ہیں..... لیکن آپ بستر سے کیوں اُٹھ آئے.....؟..... اور یہ کون شخص تھا جس سے آپ وہاں اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے.....؟''

میرا سوال سن کر جانے مجھے کیوں لگا کہ جیسے وہ کچھ گھبرا سے گئے ہوں۔ ''ہاں وہ..... کوئی نہیں بس یونہی کوئی سائل تھا..... کسی منت کی تفصیلات پوچھنے آیا تھا.....'' پھر جیسے وہ اچانک ہی چونک سے گئے۔ ''تو کیا تمہیں وہ نظر آیا تھا.....؟ میرا مطلب ہے کہ..... باہر تو بہت اندھیرا تھا۔'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا کیوں کہ ابھی تو صرف شام کا جھٹپٹا ہی چھایا تھا اور ایسا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ چہرے بھی پہچانے نہ جا سکیں۔ ''ہاں میں نے اُسے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا..... جب میں جبل پور آ رہا تھا تب..... پہلے ٹرین میں اور پھر پلیٹ فارم پر..... لیکن پھر نہ جانے یہ شخص کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اُس دن کے بعد آج دکھائی دیا ہے.....'' اصغر صاحب میری بات سن کر نہ جانے پریشان سے کیوں ہو گئے۔ ''اوہ..... اس

کا مطلب ہے تم نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے..... لیکن.....؟ اچھا چلو خیر..... ہوگا کوئی..... تم اپنی سناؤ..... ماں باپ سے مل کر اچھا تو لگا ہوگا.....؟'' میں سمجھ گیا کہ وہ بات ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا اور انہیں حویلی میں پیش آنے والے واقعات بتاتا رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُن کے ملاقاتی کا چہرہ جیسے چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ اصغر صاحب کی شخصیت روز بروز پُراسرار سے پُراسرار تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ساری رات میں نے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری۔ اس لیے صبح ہی سے میرا سر کچھ بھاری سا تھا۔ اگلے دن جمعرات تھی اور حسب معمول ہر جمعرات کی طرح زیارت پر صبح ہی سے زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی میرے من میں یہ سوال بھی اُٹھتا تھا کہ جمعرات کے دن میں، یا شام میں ایسی کیا خاصیت ہے کہ ان درگاہوں پر خاص اِسی دن لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مذہبی حوالے سے تو جمعہ کا دن اہم ہوتا ہے لیکن بعض جگہوں کے علاوہ جمعہ کے دن ان دُور دراز کی زیارتوں اور درگاہوں پر سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔ تو کیا یہ روایت مذہب سے کچھ سوا تو نہیں.....؟

شام تک تمام معمولات نبھاتے نبھاتے میں تھکن سے چور ہو چکا تھا اور پھر رات سے سر میں دھماکے کرتا وہ عجیب سا درد..... نتیجتاً مغرب کا وقت ہوتے ہوتے میرا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے رگ وپے میں جیسے سرایت کرتی جا رہی تھی۔ وہی ایک عجیب سا احساس..... جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ مغرب سے ذرا پہلے بشیرا کرم دین کے ساتھ حویلی سے جمعرات کی شام کی مخصوص نیاز کی دیگیں لے کر اُوپر درگاہ پہنچا اور مختلف زائرین اور سائلوں کو کھانا کھلانے کے دوران اُس کا ہاتھ جب اتفاقاً میرے ہاتھ سے چھو گیا تو وہ اُچھل ہی پڑا۔ ''او جی یہ کیا..... آپ کو تو شدید تپ چڑھ رہا ہے عبداللہ باؤ..... اور آپ پھر بھی کام کر رہے ہیں۔'' اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ زبردستی مجھے درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ بچھی دریوں کے قریب بٹھا کر جھٹ پٹ کرم دین کے ساتھ کھانا بانٹ کر نیچے گاؤں سے دوا لینے چلا گیا۔ میں نے اُسے سختی سے تاکید کی کہ اس بات کا حویلی والوں کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ اصغر صاحب حسب معمول پورا دن کہیں غائب رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جمعرات کے روز خاص طور پر کہیں ٹل جاتے ہیں اور درگاہ پر آیا ہوا نیاز کا کھانا، یا گوشت تو خاص طور پر چکھتے تک نہیں۔ اس روز بھی وہ آخری سائل کے جانے کے بعد ہی درگاہ واپس

لوٹے۔ لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئے اور فوراً ہی انہوں نے ٹھنڈے پانی میں بھیگی پٹیاں بنا کر میرے ماتھے پر رکھنا شروع کر دیں۔ کچھ دیر میں میں خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ''میں آج نیچے بازار گیا تو تمہارے گھر والوں کے بارے میں پتا چلا۔ بھئی تمہارے والد تو بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ سچ پوچھو تو میں اب تک شدید حیرت کے جھٹکے میں ہوں کہ اتنے بڑے گھرانے کا لڑکا اور وہ بھی اس عمر میں اس راہ پر چل نکلا ہے..... اور وہ بھی یوں بے سروسامان..... یہ کیسا جنون ہے.....؟ یہ کیسی تلاش ہے.....؟ میں اب تک سمجھ نہیں پایا.....؟''

مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں بول پڑا ''آپ بھی تو کسی ایسے ہی جنوں کے اثر میں یہاں تک پہنچے ہیں..... ہو سکتا ہے ہماری کہانی مختلف ہو لیکن ہمارے حالات مختلف نہیں ہو سکتے.....'' انہوں نے جلدی سے مجھے ٹوکا ''خدا نہ کرے عبداللہ میاں..... کہ ہمارے حالات کبھی ایک جیسے ہوں۔ خدا تمہیں ایسی ہر آزمائش سے بچائے جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں..... انگاروں بھری وہ راہ خدا کسی دشمن کے حصے میں بھی نہ بچھائے.....'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا لیکن اُن کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہے تھے۔ ''میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ تمہارا واسطہ ضرور خدا کے کچھ خاص بندوں کے ساتھ رہا ہے جس دن تم نے اس درگاہ میں قدم رکھا تھا اور پھر کل جب تمہیں مجھ سے باتیں کرتا وہ شخص بھی دکھائی دے گیا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ واقعی تم باقیوں سے مختلف ہو، کچھ خاص ہو.....''

''آپ نے کل بھی اُس شخص کا ذکر کچھ عجیب سے الفاظ میں کیا تھا۔ ایسی کون سی بات ہے.....؟ آخر کیا بھید ہے اُس شخص کی پہچان میں..... آپ بتا کیوں نہیں دیتے.....؟.....''

اصغر صاحب نے ایک لمبا سا سانس لیا۔ ''سوچتا ہوں بتا ہی دوں۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر تمہارے پاس میرے لیے سوائے نفرت اور حقارت کے اور کچھ نہیں بچے گا۔ لیکن شاید یہی نفرت، یہی بربادی اور یہی حقارت میرا مقدر ہے، سدا کے لیے..... اپنا ایمان بیچنے والا شخص کسی ایسے ہی، یا شاید اس سے بھی بدتر سلوک کا حق دار ہوتا ہے.....'' میں چپ رہا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ آخر کار وہ گرہ کھلنے ہی والی ہے جس نے اصغر صاحب کی شخصیت کو اتنا پُراسرار بنا رکھا ہے۔ ہم دونوں درگاہ کے صحن میں نکل آئے جہاں سردی سے

بچنے کے لیے زائرین نے جنگل کی لکڑیوں کو جلا کر شام سے ایک بڑا سا الاؤ روشن کر رکھا تھا۔ اب صحن بالکل خالی ہو چکا تھا لیکن اصغر صاحب نے ایک شاخ کی مدد سے لکڑیوں کی راکھ کو کریدا اور چند مزید تختے اس انگاروں بھری راکھ میں پھینکے تو پھر سے آگ بھڑک اُٹھی اور ہم دونوں بھی اِسی الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ اصغر صاحب نے اپنی یادوں کی راکھ کو بھی اپنی سوچ کی کسی لمبی چھڑی سے کریدا اور پھر دھیرے دھیرے اُن کے ماضی کی سلگتی آگ بھی اُن کی سوچ کی لکڑیوں کو چٹخانے لگی۔

''میری کہانی آج سے ٹھیک ایک سال پہلے، دسمبر کے اِسی مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے میری زندگی میں کوئی فسانہ، کوئی کہانی نہیں تھی۔ میں ایک عام سینئر کلرک کی بوسیدہ اور پھٹیچر سی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک بہت بڑے شہر کے ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ میں اپنی لڑاکا بیوی اور چار بدتمیز بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ بڑے شہروں کے ان ڈربہ نما فلیٹوں میں ہم چھ بندے کس طرح گزارہ کرتے ہوں گے۔ میرے دونوں بیٹے ماں کے لاڈ پیار کی وجہ سے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ بڑا کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد گریجوایشن تو پاس کر چکا تھا مگر کم نمبروں کی وجہ سے شہر بھر میں جوتے چٹخاتا پھرتا تھا اور چھوٹے نے تو بی اے میں ایک مرتبہ فیل ہونے کے بعد کتابوں سے ناتا ہی توڑ لیا تھا۔ دونوں بیٹیاں بھی دن بھر سوائے فیشن میگزین پڑھنے، یا کیبل پر فلمیں دیکھنے کے علاوہ اور کچھ خاص نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بیٹی نے البتہ یونیورسٹی کے بعد کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی تھی جب کہ چھوٹی بارھویں کا امتحان پاس کرتے ہی کسی شہزادے کے انتظار میں دن بھر میک اپ کورسز پر اپنا دھیان لگائے رکھتی تھی۔ دراصل بچے ہمیشہ ماں میں اپنا آئیڈیل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور ماں کو ہی فالو (Follow) کرتے ہیں اور میرے بچوں نے ہمیشہ اپنی ماں کو اپنے باپ کے ساتھ لڑتے جھگڑتے، طعنے دیتے اور گلے شکوے کرتے ہی دیکھا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اُن کے دل سے میری عزت جاتی رہی تھی۔ اور رفتہ رفتہ وہ دکھاوے کے لحاظ اور شرم و حیا سے بھی رہ چکے تھے اور اب ترکی بہ ترکی مجھے جواب دینے لگے تھے۔ شاید اس میں میری بیوی کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔ میں زندگی میں کبھی کوئی بھی آسائش انہیں مہیا نہیں کر پایا تھا۔ ایک سینئر کلرک کی تنخواہ ہوتی

ی کتنی ہے اور پھر اُوپر سے مہنگائی کا یہ طوفان..... تنخواہ سے زیادہ تو بجلی اور گیس کے بل ہر ماہ
ینے پر مونگ دلنے کے لیے آ پہنچتے تھے۔ ایسے میں ننگا نہائے کیا اور نچوڑے کیا؟ میں کبھی
ضرورت کے مطابق بھی پیسے گھر نہیں لا پایا تھا تو پھر تفریح، پکنک، یا سینما کی تو بات کرنا ہی
فضول تھا۔ میرے بچے اور بیوی ساری عمر پیٹ بھر کھانے کو ہی ترستے رہے۔ بیٹی نے نوکری
ی تو بیوی کا ہاتھ کچھ کھلا لیکن یہ بھی میرے لیے مزید ایک طعنے کا سبب بن گیا کہ ''ہاں
بھئی..... اب تو بیٹی کی کمائی کا ہی آسرا ہے.....'' اپنی ساری نوکری میں مجھے کلرکی کے لیے شعبے
بھی کچھ ایسے ہی دیئے جاتے رہے جہاں رشوت لینے کے مواقع بھی کبھی مجھے میسر نہیں رہے۔
چ تو یہ ہے کہ مجھے ٹھیک طرح سے رشوت لینا بھی نہیں آتی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ کسی سے کہلوا
کر کسی کمائی والے سیکشن میں تبادلہ کروا بھی لیا تھا لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رشوت لینا
بھی ایک فن ہے اور میں اس فن سے قطعی نابلد تھا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھولنے لگتے تھے
ر ذرا سی رقم پکڑتے وقت بھی پورا جسم لرزنا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ نہ جانے کیسے اتنی بڑی
ی رقموں کو بنا ڈکار لیے جیب میں ڈال کر ہضم بھی کر لیتے تھے۔ شاید میں شروع سے ہی
زدل تھا اور رشوت لینا، یا دینا مجھ جیسے بزدلوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے دو چار
نتوں میں ہی اس کمائی والے محکمے کے راشی افسر میرے آگے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کر
یتے تھے کہ ''بس بہت ہوگیا میاں۔ اب یہاں سے چلتے بنو۔'' دراصل میری وجہ سے اُوپر
لوں کا لین دین بھی بگڑتا تھا کیوں کہ بہت سی جگہوں پر مجھ جیسے کلرک ہی ایسے کالے دھندوں
ا پہلا دروازہ ہوتے ہیں۔ یوں میرے دن قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہی گزر رہے تھے۔
ری صبح کا آغاز میرے سرہانے رکھے الارم کلاک کی چیخ سے ہوتا تھا جسے میری بیوی بدمزگی
ے بند کروا کر دوسری کروٹ دوبارہ یہ بڑبڑاتے ہوئے سو جاتی کہ ''نہ خود سوتے ہیں نہ
سروں کو سونے دیتے ہیں۔'' میں کچی اور بے آرام نیند سے تھکا ہارا جاگتا تو پورے گھر میں
ئی مجھے ایک پیالی چائے کا پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔ بیوی کو تو ویسے ہی اپنے آرام میں خلل
ندنہیں تھا۔ بڑی بیٹی کو اپنی نوکری پر جانے کی جلدی ہوتی، چھوٹی بیٹی کبھی خوش قسمتی سے جاگتی
ئی مل بھی جاتی تو وہ خود اس انتظار میں ہوتی کہ کوئی باورچی خانے میں جائے تو اُس کے
یے بھی ایک کپ چائے بنا دے اور بیٹے تو ویسے ہی دن چڑھے جاگنے کے عادی تھے۔ مجھے

ہر صبح ساڑھے چھ بجے والی ٹرام پکڑنی ہوتی تھی کیونکہ اِسی صورت میں میں دو بسیں بدل
ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ سکتا تھا۔ یہ تو شکر ہے کہ سرکاری دفتروں میں کلرک بادشاہ ہو
ہیں اور انہیں ایک آدھ گھنٹہ لیٹ پہنچنے پر کوئی کچھ کہتا نہیں ورنہ دفتر کا اصل وقت تو صبح آ
بجے ہی تھا۔ دن بھر دفتر میں جھک مارنے کے بعد اور مانگے کی چائے پینے کے بعد شام ج
بجے جب میں وہاں سے فارغ ہوتا تو مجھے ایک اور پرائیویٹ دفتر میں چار سے سات
عارضی نوکری بھی بھگتانی ہوتی تھی جو میں نے اپنے قرضے اُتارنے کے لیے کر رکھی تھی۔ یہ
ڈسپیچ کا کام ہوتا تھا، یا پھر چند دفتری خط ٹائپ کرنا ہوتے تھے لیکن اس پرائیویٹ دفتر کا با
عظیم ایک نمبر کا ''کھڑوس'' شخص تھا۔ مجال ہے جو پل بھر کی دیر بھی برداشت کر جائے اور شوم
قسمت میں ہمیشہ دس پندرہ منٹ لیٹ ہو ہی جاتا تھا کیوں کہ اپنے سرکاری دفتر سے نکل کر
مجھے پیدل ہی دو بلاک چل کر اُس نجی آفس تک آنا ہوتا تھا اور یوں دیر سے آنے پر روز ہی عظیم
مجھے اپنی خوب صورت لیڈی سیکرٹری شبانہ کے سامنے جی بھر کر بے عزت کرتا تھا۔ مجھے اس بے
عزتی کی بھی خاص پرواہ نہیں تھی کیوں کہ یہ نوکری میری انتہائی مجبوری تھی لیکن اس بے عزتی
کے دوران مجھے شبانہ کی موجودگی بے حد کھلتی تھی۔ کیوں کہ وہ میری بے عزتی کے دوران مستقل
اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں تلے دابے ایک طنزیہ ہنسی ہنستی رہتی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا کہ کوئی
مجھے سر بازار ننگا کر رہا ہو۔ جانے عظیم کو اس طرح ایک عورت کے سامنے مجھے بے عزت کر کے
کیا ملتا تھا۔ شاید اس تحریک کے پیچھے بھی عظیم کا کوئی انتقام ہی چھپا ہوا تھا کیوں کہ میں نے
ایک دن غلطی سے کسی خط کی تصحیح کے لیے بنا دستک دیئے عظیم کے دفتر کا دروازہ کھول لیا تھا اور
ٹھیک اُسی وقت عظیم اپنی سیکرٹری کو اپنے بہت ہی قریب بٹھائے کوئی ڈکٹیشن (Dictation)
دے رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر شبانہ تو بوکھلا کر باس کی گود سے اُتر گئی لیکن عظیم کا چڑھا ہوا پارہ پھر
کبھی نہیں اُترا۔ اُس دن اُس نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا کہ دراصل میں اُس کی جاسوسی کرتا
پھرتا ہوں اور مجھے اتنے بڑے دفتر میں کام کرنے کے آداب بھی نہیں آتے اور یہ کہ اگر میں
نے باہر جا کر دفتر کے دوسرے لوگوں کے سامنے اس واقعے کا ذکر کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ
مجھے دھکے مار کر یہاں سے باہر نکال دے گا۔ ویسے اُسے اس وقت بھی ایسا کرنے سے کوئی
نہیں روک سکتا تھا لیکن فی الحال اُس نے شاید یہ سوچ کر اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا کہ میں یوں

فوراً دفتر سے بے دخل کر دیئے جانے پر اُس کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر اس واقعے کی دفتر میں اور باہر تشہیر ضرور کروں گا۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی۔ بہرحال اُس دن کے بعد سے عظیم کا غصہ کبھی کم نہیں ہوا اور مجھے روزانہ کسی نہ کسی بہانے سے شبانہ کے سامنے بے عزت ضرور کیا جاتا رہا۔ میں جتنی بھی دیر سے اپنے دوسرے دفتر پہنچتا، اتنے ہی وقت کے لیے مجھے دفتر کے اوقات کے بعد اور ٹائم لگا کر اپنا کام ختم کرنا پڑتا تھا، کیوں کہ عظیم آج کا کام کل پر چھوڑنے کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لہٰذا مجھ سے عام طور پر شام ساڑھے سات بجے والی آخری بس بھی چھوٹ جاتی تھی جس کے بعد پیدل مارچ کر کے رات گئے گھر پہنچنا میری مجبوری بن جاتی تھی اور رات دیر سے گھر پہنچنے کے بعد پھر سے وہی بیوی کے طعنے اور بچوں کی کڑوی کسیلی باتیں کہ ''دن بھر گھر سے غائب رہتے ہو..... بیوی بچوں کا بھی کچھ خیال ہے، یا نہیں..... یا بس تمہارا فرض جنم دینے کی حد تک ہی تھا۔ اب پڑے سڑتے رہیں..... جانے کہاں دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ بھئی ہم نے تو ایسا دفتر کبھی دیکھا نہ سنا.....'' کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے زہر کی چار پڑیاں لا کر گھر والوں کے کھانے میں ملا دوں تا کہ یہ روز روز کا جھگڑا ہی نمٹ جائے لیکن یہاں بھی میری وہی ازلی بزدلی آڑھے آ جاتی تھی اور میں چپ چاپ کان لپیٹ کر کسی کونے میں پڑ کر سو رہتا۔ ایک اگلے اور نئے دن کے کانٹوں بھرے آغاز اور دوبارہ اِسی ذلت بھری زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے.....''

اصغر صاحب بولتے بولتے چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ میں اُن کی کہانی میں اس قدر کھو سا گیا تھا کہ مجھے رات کے ڈھلنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ابھی میں نے عشاء کی نماز بھی ادا کرنی تھی اور اپنے اور اصغر صاحب کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام بھی کرنا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ شام کو کرم دین کی لائی ہوئی دیگوں میں سے کچھ بچ گیا تھا لہٰذا میں نے جلدی سے وہی چاول گرم کر کے اصغر صاحب کے سامنے رکھے اور خود عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

نماز پڑھ کر میں باہر نکلا تو اصغر صاحب ایک مرتبہ پھر سے لکڑیوں کے الاؤ کو دھکا چکے تھے۔ اُن کے چہرے پر آگ کی لپٹوں سے پڑتی روشنی میں میں صاف دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی

کہانی دھراتے وقت کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ دوبارہ اُن کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے بات وہیں سے جوڑی۔

''ہاں تو عبداللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں اس ذلت بھری زندگی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنے دن کسی کولھو کے بیل کی طرح کاٹ رہا تھا۔ پھر ایک دن ایک اور غضب ہوا کہ میں نے بس پر چڑھتے ہوئے گھر واپسی کے وقت اپنی بڑی بیٹی لبنیٰ کو کسی پکی عمر کے مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے دیکھ لیا اور گھر آ کر میں نے باز پرس کی تو بس میرا بات کرنا ہی غضب ہو گیا۔ سارے گھر والے مجھ پر یوں برس پڑے جیسے خود مجھ سے کوئی گناہ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ پتا یہ چلا کہ وہ صاحب اُسی اسکول کے مالک ہیں جہاں لبنیٰ نوکری کرتی تھی اور اُن کا تو اب یہ معمول ہی بن چکا تھا کہ وہ چھٹی کے بعد واپسی پر لبنیٰ کو گھر ڈراپ کرنے آتے تھے۔ اُلٹا بیوی نے مجھے طعنہ دے دیا کہ تم کبھی سرِشام گھر واپس لوٹو تو تمہیں کچھ پتا بھی ہو.....؟ بیٹوں نے سیدھی سادی دھمکی دے دی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی کا فیصلہ خود کریں گے۔ لہٰذا مجھے اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں۔ دراصل وہ شخص پورے گھرانے کو تحفے تحائف اور اپنے پیسے کے جال میں کچھ یوں پھانس چکا تھا کہ اب میرے گھر کا کوئی فرد بھی اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ مجبوراً ایک بار پھر مجھے ہی چپ سادھنا پڑی۔ لیکن اُس دن سے میرے وجود کے اندر خود اپنے لیے ہی ایک عجیب سی نفرت پلنا شروع ہو گئی کہ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں.....؟..... میرا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے.....؟..... کیا میں یونہی عمر بھر خود اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا رہوں گا۔ اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا کیوں کہ مجھ جیسے ناکارہ انسان اور نالی کے کیڑے جیسی زندگی گزارنے والے شخص کو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیسے.....؟ خودکشی بھی تو ہمت مانگتی ہے نا..... لیکن میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اپنی اس بوسیدہ اور ذلت بھری زندگی کا خاتمہ کر کے ہی رہوں گا۔ کب اور کیسے.....؟ بس یہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

چھلاوہ

اصغر صاحب نے پانی کا ایک لمبا سا گھونٹ بھرا اور اپنی داستان جاری رکھی۔ رات خوب بھیگ چکی تھی اور سرد اور خنک ہوا ہمارے جسموں کو چیر کر گزر رہی تھی لیکن ہم دونوں ابھی تک اُسی الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

''تو عبداللہ میاں..... میں نے وہ رات کس طرح کانٹوں پر گزاری یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اگلی صبح پھر وہی بیوی کی چخ چخ۔ پہلے سرکاری دفتر دیر سے پہنچا اور پھر حسب معمول وہاں افسروں کی ڈانٹ سنتے ہوئے اور اپنا کام لیٹ ختم کر کے دوسرے دفتر بھاگم بھاگ پہنچا تو پورے پندرہ منٹ لیٹ تھا۔ دفتر میں میرے واحد دوست جاوید نے مجھے دفتر میں گھستے ہی بتا دیا تھا کہ باس عظیم تین مرتبہ میرا پوچھ چکا ہے۔ میں دل میں ہزار خدشے لیے اُس کے کمرے میں پہنچا تو حسب توقع شبانہ وہیں موجود تھی اور عظیم کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی عظیم نے طنز کیا۔

''آ گئے نواب صاحب..... اس وقت آنے کی زحمت بھی کیوں کی جناب نے..... آپ حکم تو کرتے..... ہم فائلز آپ کے گھر ہی بھجوا دیتے.....''

میں ہکلایا..... وہ سر..... میں وہ..... دراصل۔''

عظیم دھاڑا ''کیا میں میں کی رٹ لگا رکھی ہے..... یہ وقت ہے دفتر آنے کا..... آخر تم کب سدھرو گے..... تنخواہ لینے والوں کی قطار میں تم سب سے آگے کھڑے ہوتے ہو..... اور کام کے لیے آتے ہوئے موت آتی ہے تم کو.....''

شاید اُس دن عظیم نے میری بے عزتی کرنے کی ہر حد کو پار کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ شبانہ اُسی طرح لگاتار مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور میرے تن من میں جیسے آگ سی بھڑتی جا رہی تھی۔ اُس دن مجھے پتا چلا کہ قاتلوں سے قتل کس لمحے میں سرزد ہوتے ہوں گے۔ اُس وقت میرے جسم میں اتنی جان ہوتی، یا میرے پاس کوئی چاقو، یا پسٹل ہوتا تو میں ضرور

اُن دونوں کا وہیں خون کر دیتا۔ مجھے عظیم نے یہ حکم نامہ بھی صادر کیا کہ میں آج پچھلے پورے ہفتے کی فائلز اور خط نکال کر ہی گھر واپس جاؤں گا ورنہ اگلے دن مجھے دفتر آنے کی ضرورت نہیں اور ان پندرہ دنوں کی تنخواہ میرے گھر پہنچا دی جائے گی۔ میں بکتا جھکتا اس جلاد کے کمرے سے نکلا اور اپنی میز پر جا کر فائلوں کے انبار میں کھو گیا۔ جب تک میں نے کام ختم کیا، شام کے سوا سات بج چکے تھے۔ دسمبر کی شامیں ویسے بھی گہری راتوں میں بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتیں۔ میں دفتر سے نکل کر نیچے بس اسٹاپ پر پہنچا تو حسب توقع آخری بس بھی نکل چکی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف ۲۵ روپے اور پانچ روپے کا ایک سکہ نکلا، مطلب رکشے، یا ٹیکسی کی عیاشی تو ناممکن تھی۔ لہٰذا میں نے عظیم کو دل ہی دل میں گندی گالیاں نکالتے ہوئے پیدل ہی گھر جانے کی ٹھانی۔ پیدل مختصر راستے اختیار کرنے کے باوجود میرے گھر کا فاصلہ دفتر سے دو گھنٹے کا تھا۔ میں تنگ اندھیری گلیوں اور ویران سڑکوں سے ہوتا ہوا گھر کی جانب روانہ تھا۔ میرے شہر کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ ایسے راستوں پر دن میں بھی چلتے ہوئے لوگ خوف محسوس کرتے تھے۔ یہ تو پھر رات تھی۔ لہٰذا ذرا سی آہٹ پر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ راستے میں ایک ویران سا پارک بھی پڑتا تھا جسے میں نے پہلے اپنی راہ گزر کے لیے منتخب نہ کرنے کا سوچا کیوں کہ اس پارک کے متعلق عجیب وغریب قسم کی باتیں مشہور تھیں لیکن پھر جب میں نے اس لمبے راستے کا سوچا جو پارک کے اندر سے نہ گزرنے کی صورت میں مجھے طے کرنا پڑتا تو خود بخود میرے تھکے ہوئے قدم اس پارک کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی جانب بڑھ گئے جسے راہ گیروں نے اپنی سہولت کے لیے پارک کراس کرنے کے لیے توڑ رکھا تھا۔ پارک اُس وقت بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گھاس کے خشک میدان کے بیچوں بیچ ایک بوڑھا برگد کا پیڑ اپنی ہزاروں جڑیں زمین میں گاڑھے اور میدان کے اُوپر پَر پھیلائے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بزرگ اپنی ساری آل اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹے کھڑا ہو۔ پیڑ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا پتھر کا بنچ پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں نے کچھ پل اُسی بنچ پر بیٹھ کر ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے بنچ پر بیٹھ کر چند گہری سانسیں لیں تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔ میں نے سر پیچھے ٹکا کر چند لمحوں کے لیے اپنی جلتی آنکھیں موندھ لیں لیکن آنکھیں بند کرتے ہی ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس

ر کے پیڑ کے اُوپر کوئی بیٹھا ہوا مجھے اپنی دو سرخ انگارہ آنکھوں سے گھور رہا ہو۔ میں نے گھبرا
ر جلدی سے آنکھیں کھول دیں لیکن پیڑ کی شاخیں ویسے ہی سنسان پڑی تھیں۔ میں نے سر
ہلک کر دوبارہ آنکھیں موندھیں تو پھر وہی احساس چھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر
ر آیا، لیکن اس بار آنکھیں کھولنے سے پہلے ایک آواز بھی میرے ذہن کے پردے سے
ٹکرائی۔ ''کیسے ہو اصغر.....؟'' میری تو مانو جیسے جان ہی نکل گئی اور میں نے دوبارہ جلدی سے
آنکھیں کھول دیں لیکن پیڑ اب بھی ویسے ہی تنہا کھڑا تھا۔ میرے مساموں سے اتنی سردی کے
باوجود خوف کے مارے پسینہ نکل آیا اور میں نے وہاں سے بھاگ اُٹھنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابھی
میں نے اپنا بوجھ اپنے دو شل بازوؤں پر ڈالا ہی تھا اور میرا جسم ابھی پوری طرح اُٹھنے بھی نہیں
پایا تھا کہ پھر سے وہی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ڈرو نہیں اصغر..... میں تمہیں کوئی
نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے اپنا دوست ہی سمجھو.....''

میں نے خوف کے مارے اِدھر اُدھر دیکھا ''لیکن تم ہو کون..... اور مجھے کھلی آنکھوں سے
نظر کیوں نہیں آ رہے.....''

میرے کانوں میں پھر سے آواز گونجی ''میں بند آنکھوں سے بھی صرف اُنہی کو نظر آتا
ہوں جنہیں آنا چاہتا ہوں..... اگر تم زیادہ خوف زدہ نہیں ہو تو میں تمہیں کھلی آنکھوں سے نظر آ
سکتا ہوں۔ تمہیں بس اپنے حواس قابو میں رکھنے ہوں گے.....''

ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ میں وہاں سے سرپٹ دوڑ لگا دوں لیکن پھر نہ جانے
میرے اندر اتنی ہمت کہاں سے آ گئی اور میں نے ہکلاتے ہوئے اُسے اجازت دے دی۔

''ٹھیک..... ہے..... لیکن مجھے زیادہ ڈرانا نہیں۔ میں دل کا کمزور واقع ہوا ہوں۔'' میں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر درخت کی شاخوں کو دیکھنے لگا کیوں کہ میرے خیال میں اُسے وہیں کہیں
سے کودنا چاہیے تھا لیکن میں اپنے پیچھے سے اُس کی آواز سن کر بنچ سے گرتے گرتے بچا۔

''اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو.....''

میں نے ڈرتے ڈرتے لرزتے دل کے ساتھ پیچھے نظر ڈالی تو کچھ دیر کے لیے میرے
پر کا سانس اُوپر ہی رہ گیا۔ ایک نہایت کالا بھجنگ شخص جس کی آنکھیں دو دہکتے انگاروں
کی چمک رہی تھیں اور جس کی جلد کا رنگ ایسا تھا جس کی رات کی سیاہی میں جانچ، یا دیکھ پانا

تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں نے فوراً خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک کسی کی کرخت آواز فضا میں گونجی ''او بابا..... تم اس اندھیرے میں کیا کرتا ہے.....؟ میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے ڈر کر جھٹ سے آنکھیں کھولیں تو سامنے پارک کا پٹھان چوکیدار حیران سا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے وہ شخص کھڑا تھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں ٹٹولا لیکن وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ چوکیدار ابھی تک میرے سر پر کھڑا شاید مجھے کوئی مخبوط الحواس سمجھ رہا تھا۔ وہ پھر ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔ ''او بھائی تم کون ہے..... ایسے رات کو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھنا چاہیے..... خو یہ اچھا نہیں ہوتا مڑاں.....'' اب میں اُس کو کیا بتاتا کہ میری آدھی رُوح تو پہلے ہی نکل چکی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا ''کیا تم نے ابھی یہاں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا..... وہ یہاں میرے قریب ہی کھڑا تھا۔'' چوکیدار نے حیرت سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ''کون..... اِدھر تو کوئی نہیں تھا۔ خو چہ ہم اِسی لیے بولتا ہے کہ ایسے رات کے وقت اِدھر اکیلا مت بیٹھو..... تم اِدھر اکیلا بیٹھا تھا اور جب ہم اِدھر آیا تو تم اپنے آپ کے ساتھ بولتا پڑا تھا.....'' گویا میں خود کلامی میں مشغول تھا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ شاید کام کے دباؤ نے میرے دل و دماغ پر بھی گہرا اثر چھوڑا تھا اور اب میں جاگتی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھا اور کسی طرح گرتے پڑتے رات گئے گھر تک پہنچ گیا۔ شکر ہے کہ سب لوگ سو چکے تھے۔ میں اس وقت اُن کے ساتھ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آج کے تمام واقعات پھر سے میرے ذہن میں چلنے لگے۔ کیا واقعی وہ سب صرف میرا واہمہ تھا، یا.....؟..... انہی سوچوں میں جانے کب مجھے نیند نے آ گھیرا لیکن ابھی شاید میری آنکھ لگے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پھر سے وہی دو انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں، خود میرے ہی کمرے میں موجود دیوار میں لگی الماری جو چھت سے ذرا پہلے اپنی لمبائی ختم کرتی تھی، اُسی الماری پر وہ شخص بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ ایک جھٹکے سے میری نیند ٹوٹی تو میں پسینے میں شرابور تھا لیکن الماری کے اُوپر کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ میرے خدا..... یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا

ہے۔ یہ کون سی بلا میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور پھر اس جدید دور میں میں اگر کسی کو یہ سب بتاتا بھی تو وہ میرا مذاق ہی اُڑاتا۔ میری بیوی ساتھ والے بستر پر پڑی خراٹے لے رہی تھی لیکن پھر میں دوبارہ سو نہیں پایا۔ ساری رات یہی آنکھ مچولی جاری رہی۔ میں جیسے ہی آنکھ بند کرتا، میری بند آنکھوں کے پردے پر وہ ہولناک شبیہ اُتر آتی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں منہ اندھیرے ہی گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر دفتر جا پہنچا۔ ابھی تک خاکروب نے پوری طرح دفتر کو جھاڑو بھی نہیں لگایا تھا اور چپڑاسی نے بھی اتنی صبح مجھے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت سے اپنے کاندھے اُچکائے۔ لیکن اس وقت میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں وہیں اپنی میز پر بیٹھا اپنے گھٹیا برانڈ کے سگریٹ پھونکتا رہا۔ دھیرے دھیرے لوگ دفتر آنا شروع ہو گئے اور جب میرا یار مرزا دفتر میں داخل ہوا تو مجھے اپنے سے پہلے دفتر میں پا کر وہ تو خوشی اور حیرت سے اُچھل ہی پڑا۔ ''ابے یار اصغر..... تو..... آج سورج کس طرف سے نکلا تھا..... میں نے تو غور ہی نہیں کیا.....'' میں نے فوراً مرزا کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو ایک جانب لے جا کر کل شام کی ساری رُوداد سنا دی۔ کچھ دیر تو وہ حیرت سے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اُس پر جیسے ہنسی کا دورہ ہی پڑ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا ''میں نے تو سنا تھا کہ انسان ساٹھ کے بعد سٹھیاتا ہے..... تو تو چالیس کے بعد ہی.....'' وہ پھر ہنسنے لگا۔ میں ناراض ہو کر پلٹ کر واپس جانے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ابے یار..... ناراض کیوں ہوتا ہے..... دراصل لوگوں کا دماغ دو شادیاں کر کے خراب ہوتا ہے..... لیکن تجھے تیری دو نوکریوں نے پاگل کر دیا ہے..... یہ صرف ذہنی دباؤ اور ہر وقت کی سوچ کے کرشمے ہیں۔ میری جان..... میں تو کہتا ہوں لعنت بھیج اس دوسری نوکری پر..... جس دن سے تو نے اس خبیث عظیم کے دفتر میں نوکری کی ہے تیری پریشانیاں گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہیں..... کیوں اپنی زندگی کو اتنے عذابوں میں ڈال رکھا ہے..... جس گھر اور اولاد کے لیے تو قرض پر قرض لیتا رہتا ہے انہوں نے تو کبھی آج تک تجھے گھاس بھی نہیں ڈالی۔ پھر اپنے اُوپر تو یہ ظلم کیوں کر رہا ہے۔'' مرزا کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ ان دو نوکریوں اور قرض کے چکر میں میں خود گھن چکر بنتا جا رہا تھا۔ لیکن کیا وہ سب جو میرے ساتھ بیتا، صرف ایک خواب ہی تھا؟ اور کیا کوئی خواب اتنے لمبے تسلسل سے بھی دیکھا جا سکتا ہے؟ میرا دل اُسے ایک خواب ماننے پر راضی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اِسی ادھیڑ بن میں

سرکاری دفتر کا وقت ختم ہوا اور مجھے پھر سے اُسی اذیت گاہ کی جانب قدم بڑھانا پڑے جہاں روزانہ میری رُوح کا قتل ہوتا تھا۔ لیکن اُس دن اتفاق سے وہ جلاد عظیم دفتر کچھ دیر سے پہنچا اور آتے ہی اُسے کسی ضروری کام کے سلسلے میں دوبارہ باہر جانا پڑ گیا۔ میں اپنے اندر سرشام ہی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، لہٰذا عظیم کے دفتر سے نکلنے کے بعد مجھ سے بھی دفتر میں نہیں بیٹھا گیا۔ میں دفتر سے نکلا اور میرے قدم خود بخود اُسی پارک کی جانب بڑھ گئے۔ مغرب کا وقت قریب ہی تھا اور بادلوں کی وجہ سے آج سرشام ہی اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ پتا نہیں میں اُس پارک کی جانب کیوں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ شاید میں اُس اُلجھن اور اُس اذیت کو ختم کرنا چاہتا تھا جو اس خواب اور حقیقت کا سچ جاننے کے لیے میرا اندر اس وقت جھیل رہا تھا۔ جب میں پارک پہنچا تو ابھی وہاں اکا دکا لوگ موجود تھے جو شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں چپ چاپ جا کر اُسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چوکیدار کو آس پاس نہ پا کر میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ لیکن کچھ نہیں ہوا..... میں نے آنکھیں کھول کر پھر اطمینان کیا اور ایک بار پھر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس بار بھی کوئی جھماکا نہیں ہوا۔ تو کیا واقعی وہ سب میرا واہمہ ہی تھا۔ میں نے تھک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ کل جب میں یہاں آیا تو مغرب کے بعد کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ جب کہ اس وقت اچھی خاصی روشنی باقی تھی۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے گھر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو آج اپنا شک پوری طرح دُور کر کے ہی واپس جاؤں گا۔ میں نے ٹہل کر پارک کا ایک چکر لگایا اور شاید وہ میرا تیسرا چکر تھا جب مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں چکر ختم کر کے واپس اپنے بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جانے میرا دل اتنے زور زور سے کیوں دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک دو تین کہا اور آنکھیں بند کر لیں اور پوری طرح ذہنی طور پر تیار ہونے کے باوجود میں ایک بار پھر اُچھل پڑا۔ ہاں..... وہی دو سلگتی آنکھیں..... میرے ذہن میں آواز گونجی ''مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر ڈرتے ڈرتے بند کیں اور زیرِ لب جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھا ''تم کون ہو.....؟ اور آخر میرے پیچھے ہی کیوں پڑے ہو..... اور تم کسی اور کو کیوں نظر نہیں آتے۔'' وہ آنکھیں ہنس دیں۔ ''میں صرف اُسی کو نظر آتا ہوں جس کو نظر آنا

ہتا ہوں..... ورنہ تم انسانوں میں ایسے جنونی اور پاگل بھی موجود ہیں جو میری ایک جھلک
یکھنے کے لیے اور مجھے پانے کے لیے برسوں جانے کتنی تپسیا اور کتنے جاپ کرتے ہیں.....
ں رات، صبح و شام اپنا جیون جلاتے ہیں، قبرستانوں میں، دریاؤں میں، صحراؤں میں ایک
ل پر کھڑے ہو کر سالوں جنتر منتر پڑھتے ہیں۔ قبروں سے مردے نکال کر اُن کی ہڈیوں کا
نہ بنا کر اپنی آنکھوں میں اس اُمید پر لگاتے ہیں کہ شاید وہ مجھے دیکھ پائیں گے لیکن جواب
ں صرف اپنی بینائی ہی کھوتے ہیں عمر بھر کے لیے..... کئی تو ایسے بھی ہیں جو اپنے جیسے
رے انسانوں کا خون کرنے سے بھی نہیں چوکتے صرف اس اُمید پر کہ شاید وہ کبھی میری
ک جھلک ہی پالیں گے لیکن میں اُن پر کبھی ظاہر نہیں ہوتا۔ میرا احسان مانو کہ میں کسی
ٹانی، یا امتحان کے بغیر تم سے آج محو کلام ہوں.....''

مجھے اُس کی باتوں سے اُلجھن سی ہونے لگی تھی لہٰذا میں اپنی تلخی چھپا نہیں پایا۔ ''اچھا.....
ب مجھ پر اس مہربانی کی وجہ بھی بتا ہی دو؟'' ''وجہ کچھ خاص نہیں ہے..... بس تم مجھے اچھے
گئے ہو..... مجھ سے دوستی کرو گے.....؟'' ''دوستی.....؟ تم سے..... لیکن تم ہو کیا بلا.....
ا مطلب ہے تم کون سی مخلوق ہو.....؟'' وہ میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''میں جس سے بگڑ
ں اُس کے لیے واقعی ایک بلا ہوں لیکن جس پر مہربان ہو جاؤں اُس کی دنیا بدل دیتا
ں۔ تمہاری دنیا والے مجھے 'چھلاوہ' کہتے ہیں۔'' میں اُس کی بات سن کر اُچھل پڑا.....
چھلاوہ..... تو کیا تم کوئی جن بھوت وغیرہ ہو۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''تم چاہو تو بھوت ہی سمجھ لو.....
ن کیا تم نے آج تک کوئی بھوت دیکھا بھی ہے؟ جنات کا وجود تو پھر بھی ثابت ہے، ورنہ تم
ان ہی خود سب سے بڑے بھوت ہو.....'' میں ابھی تک اُلجھن میں تھا۔ ''کیا تم سامنے آ
مجھ سے بات نہیں کر سکتے.....؟ مجھے یوں بند آنکھوں سے بات کرنے سے اُلجھن ہونے
ا ہے۔'' ''ٹھیک ہے لیکن یاد رہے کہ میں صرف تم پر ہی خود کو واضح کر رہا ہوں۔ دوسروں
لیے میں اب بھی اوجھل ہوں۔ اب تم چاہو تو آنکھیں کھول سکتے ہو۔'' میں نے جھٹ سے
ھیں کھول دیں۔ وہ بالکل میرے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈر
اپنے پیر سکیڑ لیے۔ اُس کے بیٹھنے کا انداز بھی عجیب تھا جیسے کوئی بلی کوئی اُونچی چھلانگ
نے سے پہلے اپنے پیروں پر اپنا پورا بوجھ ڈالتی ہے اور اگلے پنجوں کو زمین پر ٹکا کر اپنا جسم

تولتی ہے۔ وہ بھی یوں ہی زمین پر اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر اور دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اور ہاتھوں کے پنجے کھولے ہوئے یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی اگلے ہی پل کسی پھرتیلے چیتے کی طرح کوئی اُونچی زقند لگا کر درخت کی کسی اُونچی شاخ پر جا بیٹھے گا۔ اُس کے وجود میں جیسے کوئی پارا سا بھرا ہوا تھا، اور نس نس سے بے چینی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میں اُس کی جانب دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ تم مجھ سے دوستی کرو گے، یا نہیں.....؟ لیکن کوئی بھی جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری دوستی اتنی آسان نہیں ہے۔ کچھ شرائط پر پورا اُترنا پڑتا ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد جب تم میرے دوست بن جاؤ گے تو دنیا کی ہر آسائش وہ سب کچھ جس کا تصور تم شاید اپنے آخری خواب میں بھی نہیں کر سکتے، وہ سب تمہارے قدموں میں ہوگا۔ بس صرف تمہاری خواہش دل سے ہونٹوں پر آنے تک کی دیر ہوگی اور اس جہاں کی ہر نعمت تمہارے اختیار میں ہوگی.....''

''اچھا.....؟.....تو اب لگے ہاتھوں وہ شرائط بھی بتا دو جو تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے پوری کرنا ہوگی۔''

''شرط کوئی خاص بڑی نہیں ہے.....بس تمہیں اپنا 'ایمان' مجھے سونپنا ہوگا۔''

میں اُس کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ''کیا مطلب.....؟.....تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟'' اُس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''تم سمجھے نہیں، یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے..... میں نے کوئی اتنی مشکل بات تو نہیں کہی؟ بس تمہیں اپنا مذہب ترک کرنا ہوگا۔ تم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مذہب کا کوئی بھی فرض رُکن ادا نہیں کرو گے۔ کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھو گے۔ کلمہ، نماز، روزہ یہ سب تمہارے لیے میری دوستی کے بعد اجنبی ہو جائیں گے۔ بس اتنی سی شرط ہے تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....''

غصے میں میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''واہ.....کیا شرط ہے.....؟ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری باتوں میں آ کر اپنا مذہب ترک کر دوں گا.....کبھی نہیں..... میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دوستی پر..... دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہ آنا۔'' وہ زور سے ہنسا ''تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو..... میں نے جو عمل تمہیں ترک کرنے کے لیے کہا ہے تم خود نہ جانے کب کا وہ سب

چھوڑ چکے ہو..... ذرا غور تو کرو..... تم نے آخری نماز کب پڑھی تھی.....؟ تمہیں روزہ
ے ہوئے کتنے سال ہو چکے ہیں.....؟ اور آخری بار تم نے کسی مسجد کا دروازہ کب پار کیا
.....؟ تم اور تمہارا پورا گھرانا تو عید کے دن بھی سورج چڑھے نیند سے جاگتا ہے..... تمہاری
ی کتاب پچھلے سات آٹھ سالوں سے تمہارے گھر کے طاق میں پڑی پڑی مٹی سے اَٹ چکی
..... میں نے ایسی کون سی انہونی کہہ دی ہے جو تم یوں مجھ سے اُلجھ رہے ہو.....؟'' میں
ی کی باتیں سن کر مزید غصے اور خجالت کا شکار ہو گیا۔ بہرحال اُس نے کہا سب سچ ہی تھا۔
ہیں یہ سب کس نے بتایا؟ اور کان کھول کر سن لو کہ نماز پڑھنا نا پڑھنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔
ن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں اپنا ایمان ہی تمہاری دوستی کے عوض بیچ ڈالوں۔''

وہ ایک لمحہ پہلے مجھے زمین پر دکھائی دیا لیکن اب اگلے ہی لمحے وہ درخت کی پہلی شاخ پر
ہوا دکھائی دیا۔ وہ مسلسل بات چیت کے دوران ہر لمحہ اپنی جگہ بدلتا ہی رہتا تھا۔ جیسے اُسے
ی کروٹ بھی چین نہ ہو۔ میری بات سن کر وہ غصے میں آ گیا۔ ''کسی نے سچ ہی کہا ہے.....
نسان ہو ہی سدا کے ناشکرے۔ ٹھیک ہے جاؤ مرو اُسی ذلت کی زندگی میں۔ جہاں صبح سے
م تک تمہیں صرف بے عزتی ہی ملتی ہے..... جس سے کل تک تم اتنے بے زار آ چکے تھے کہ
ں اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مرنے کے طریقے سوچ رہے تھے۔ تم جیسوں کو مر ہی جانا
یے۔ میں تمہیں آج جانے دے رہا ہوں، لیکن یاد رہے کہ اب اس طرف کا رُخ تبھی کرنا
ب تم میری دوستی قبول کرنے کا فیصلہ کر لو، ورنہ اگر تمہیں میں نے دوبارہ تمہارے اس برائے
ایمان کے ساتھ اپنے اس ٹھکانے کے آس پاس بھی بھٹکتے ہوئے دیکھا تو میں خود تمہاری
ا لے لوں گا۔ تم نے ابھی تک میری دوستی دیکھی ہے..... میرا جان لیوا روپ نہیں دیکھا.....
اب یہاں سے.....'' وہ پل بھر میں جانے کہاں غائب ہو چکا تھا لیکن اُس کے لہجے نے
ا مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو چوکیدار دُور سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا
اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ میں اُس کے سوالات سے بچنے کے لیے جلدی سے وہاں سے
اور مخالف سمت چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔

ایمان فروش

اصغر صاحب کی داستان ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ صبح کی اذانیں شروع ہوگئیں۔ میں کچھ اس طرح سے اُن کی کہانی میں مگن ہوگیا تھا کہ وقت گزرنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا ہمیں وقفہ لینا پڑا۔ حالانکہ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں نے اصغر صاحب کو کچھ آرام کرنے کا کہ لیکن خود میرا پورا دن اُن کی کہانی کے تانوں بانوں میں اُلجھا رہا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا او رات کو پھر ہمیں تنہائی میسر آئی تو اصغر صاحب نے پھر سے اپنی کہانی کا سرا وہیں سے جوڑ جہاں سے ٹوٹا تھا۔

''عبداللہ میاں..... انسان بڑا کمزور ہے۔ وہ ارادے باندھتا ہے اور پھر توڑ دیتا ہے۔ میرے ارادوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا..... میں اُس روز چھلاوے کو دھتکار تو آیا لیکن اگلے ہی روز صبح ہی سے میری پریشانیوں کا وہی پرانا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا۔ وہی سرکاری دفتر اور وہی افسروں کی چخ چخ، صبح سویرے ہی سب سے پہلے بیوی نے فلیٹ کے کرائے کا رونا شروع کر دیا کہ مالک کئی مہینوں سے کرایہ بڑھانا چاہتا ہے اور کل شام کو اُس نے فائنل نوٹس بھی دے دیا ہے کہ کرائے میں ساڑھے تین ہزار کا اضافہ کرو ورنہ فلیٹ چھوڑو..... اور ہمارے پاس وقت بھی صرف دو ہفتوں کا ہی بچا تھا۔ بیوی سے لڑ کر اور جان چھڑا کر دفتر پہنچا تو وہاں بھی افسر اُکھڑے ہوئے تھے کہ ہفتوں پرانی فائلز ابھی تک میری میز پر کیوں پڑی ہیں.....؟ وہاں سے ڈانٹ کھا کر عظیم کے دفتر پہنچا تو وہ پہلے ہی گزشتہ دن میرے دفتر سے جلدی اُٹھ جانے کا پتا چل جانے پر غصے میں آگ بگولہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اور فائل اُٹھا کر میرے منہ پر دے ماری اور مجھے آفس سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مطلب یہ نوکری بھی میرے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ دفتر سے باہر نکلا تو گھر واپسی کا سوچ کر ہی میرا دل اُلٹنے لگا کہ جب میری بیوی کو پتا چلے گا کہ میں کرائے کا انتظام کرنے کے بجائے اُلٹا اپنی لگی بندھی نوکری بھی گنوا آیا ہوں تو وہ تو آسمان سر

پر اُٹھا لے گی۔ میں نے پی سی او سے دو چار دوستوں کو فون کیا کہ شاید کچھ قرض کا انتظام ہو جائے مگر میں پہلے ہی سب سے اتنا قرض لے چکا تھا کہ اب تو کئی دوست میری آواز سن کر ہی فون بند کر دیتے تھے۔ چھلاوے نے ٹھیک ہی کہا تھا مجھ جیسوں کو تو مر ہی جانا چاہیے تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور قدم بڑھا دیئے اور جب میں اپنے خیالات کی یلغار سے چونکا تو میں پھر وہی اُسی پارک میں اُسی درخت کے نیچے کھڑا تھا اور شام کا ملگجا اندھیرا میری قسمت کی کالک کی طرح آس پاس پھیل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے درخت کے پیچھے سے جھانکا۔

''تم پھر آ گئے..... میں نے تمہیں خبردار بھی کیا تھا کہ.....''

''ہاں..... میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے مار ڈالو..... مجھ میں خود کو مارنے کی ہمت نہیں ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''بڑے بزدل ہو..... خود مر بھی نہیں سکتے..... اور مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے.....؟''

میں نے بے بسی سے سر جھٹکا ''ٹھیک ہے..... تم بھی اُڑا لو مذاق..... میری اپنی دنیا والے بھی یہی کرتے ہیں.....''

''میری پیش کش اب بھی قائم ہے..... جس مذہب سے تم پہلے ہی میلوں دُور ہو..... اُسے میری خاطر ترک کرنے میں آخر تمہیں اعتراض ہی کیا ہے؟ اچھا چلو..... میں تمہاری خاطر اپنی شرط میں کچھ نرمی پیدا کر دیتا ہوں لیکن صرف تمہارے لیے..... کیا سمجھے..... تم چاہو تو صرف ایک سال کے لیے آزمائشی طور پر اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوا سکتے ہو۔ اگر سال کے بعد تمہیں لگے کہ تمہاری پرانی زندگی ہی بہتر تھی تو تم واپس لوٹ جانا۔ لیکن خیال رہے کہ اس ایک سالہ معاہدے میں ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ جو تم کہو گے وہ میں کروں گا اور جس چیز سے میں تمہیں منع کروں گا تمہیں اُس سے پلٹنا ہوگا۔ بولو منظور ہے۔'' میں ابھی تک اُسی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ ''لیکن..... میرا مطلب ہے کہ اگر کسی غلطی، یا مجبوری کی وجہ سے میں نے مذہب کا کوئی ایسا رُکن اختیار کر لیا تو کیا ہوگا..... کیا اُس کے بعد.....'' اُس نے میری بات کاٹ دی ''اس کی تم فکر نہ کرو..... جب تم ایک بار سچے دل سے اپنا ایمان میرے پاس گروی رکھوا دو گے تو پھر سال بھر تمہارے دل میں ایسی کوئی بات اوّل تو پیدا ہوگی نہیں..... اور پھر اگر تمہارا دل 'بھٹکا' بھی تو میرے پاس اس کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم یہ سرخ

دھاگا اپنے گلے میں باندھ لو..... یہ پورے ایک سال تک تمہارے گلے میں موجود رہے گا اور تمہیں ہر اس بات سے بچائے گا جو مجھے پسند نہیں ہے، یا جس سے ہماری دوستی کی کسی بھی شرط پر کوئی بھی آنچ آ سکتی ہو۔ یوں سمجھ لو کہ یہی سرخ دھاگا میرے اور تمہارے رابطے اور معاہدے کا ضامن ہوگا۔'' میں نے سر جھٹک کر دیکھا تو دھاگا اب اُس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ میں شدید ہچکچاہٹ اور کش مکش کا شکار تھا۔ اُس نے مجھے اُکسایا۔ ''سوچو مت..... ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں ملتے..... تمہیں کون سا دین، یا دنیا میں سے کوئی ایک بھی میسر ہے..... دین کی طرف تم گئے نہیں اور دنیا تم سے بھاگتی رہی..... اب ایک موقع ملا ہے تو کم از کم اس زندگی کو ہی جی جاؤ..... صرف ایک سال ہی کی تو بات ہے۔ پھر عمر پڑی ہے دین کو جینے کے لیے..... باندھ لو دھاگا..... لوگ ایسی زندگی کا ایک پل جینے کے لیے عمر بھر ایڑیاں رگڑتے ہیں..... اور میں تمہیں پورا ایک سال دے رہا ہوں..... باندھ لو یہ دھاگا..... دیر مت کرو.....''

میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ کئی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور دھاگا گلے میں ڈال کر اس کی ڈور کس لی۔ دفعتہً ایک زوردار آندھی چلی۔ مجھے یوں لگا یہ ہوا اس درخت کی شاخیں مجھ پر گرا کر ہی دم لے گی۔ گرد کا ایک طوفان اُٹھا، مجھے ایک تیز چکر آیا اور میں لہرا کر وہیں زمین پر گر گیا۔

دوبارہ مجھے تب ہوش آیا جب کوئی دھیرے دھیرے پیار سے میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''اُٹھ جائیں نا..... دیکھیں کتنی دیر ہو گئی ہے..... آج دفتر نہیں جانا کیا.....؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میری جھگڑالو اور لڑاکا بیوی نہایت تمیز اور پیار سے مجھے جگا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں گرم چائے کا ایک کپ بھی تھا..... اوہ، بیڈ ٹی (Bed Tea)..... میں نے جلدی جلدی زور سے اپنی آنکھوں کو رگڑا..... میں نے پہلے کوئی خواب دیکھا تھا، یا ابھی اس وقت کوئی سپنا دیکھ رہا تھا۔ میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور تکیہ سیدھا کر کے مجھے بٹھایا اور چائے کا کپ میرے ہونٹوں سے لگا دیا ''اُف کس سوچ میں پڑے ہیں..... جلدی کریں..... میں آپ کے کپڑے اِستری کر کے باتھ روم میں لٹکا دیتی ہوں۔ جلدی سے چائے پی کر نہا لیں۔ پانی گرم کروا دیا

ہے....." میری بیوی کمرے سے مسکراتی ہوئی نکل گئی۔ اُس کی یہ مسکراہٹ میں نے آج سے ٹھیک ۲۵ سال پہلے دیکھی تھی جب ہماری تازہ تازہ شادی ہوئی تھی۔ تب سے لے کر آج تک میں اُس کی مسکراہٹ تو دُور، اُس کے دو میٹھے بولوں کو بھی ترس گیا تھا۔ بیوی کے نکلتے وقت میری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر پڑی تو اس میں مجھے پیچھے اپنی الماری کے اُوپر وہ بیٹھا مسکراتا ہوا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک خواب کے سے عالم میں چائے ختم کی اور کمرے سے باہر نکلا تو میری بڑی بیٹی تولیہ اور صابن اور دوسری بیٹی ہاتھ میں میرے اِستری شدہ کپڑے پکڑی نظر آئی "ابا آپ جلدی سے نہا لیں..... پھر ہم سب اکٹھے ناشتا کریں گے۔ آج عظمیٰ نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے پراٹھے بنائے ہیں۔" عظمیٰ میری چھوٹی بیٹی کا نام تھا۔ میں حیرت سے وہیں گر پڑنے کے قریب تھا۔ اِسی کیفیت میں غسل کر کے باہر نکلا تو میرا بڑا بیٹا وقار میرے جوتے پالش کر چکنے کے بعد انہیں کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ جب کہ چھوٹا میرے لیے خشک سلیپر لیے پہلے سے میرے انتظار میں غسل خانے کے باہر کھڑا تھا۔ میری تو جیسے زبان ہی گنگ ہو چلی تھی۔ میری بیوی اور بیٹیوں نے جس پیار سے مجھے ناشتا کروایا اور بیٹوں نے جس محبت سے لنچ بکس کا ٹفن کیریئر میرے حوالے کر کے مجھے دفتر کے لیے رُخصت کیا ویسا میں نے خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ فلیٹ سے نکل کر بس اسٹاپ پر پہنچا تو جیسے بس میرے انتظار میں ہی کھڑی تھی اور میری پسندیدہ تین نمبر کی کھڑکی والی سیٹ بھی خالی تھی، جہاں بیٹھ کر میں ڈرائیور سے کہہ کر اپنی پسندیدہ کیسٹ بھی سن سکتا تھا۔ آج خلاف توقع کنڈیکٹر کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا تھا اور جانے کیوں مجھے یہ بھی محسوس ہوا پل بھر کے لیے کہ میں نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے بیک ویو مرر میں اپنے اُسی مہربان کی ایک جھلک بھی دیکھی ہے لیکن جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

دفتر پہنچا تو چپڑاسی نے نہایت ادب سے سلام کیا اور بتایا کہ توصیف صاحب دو تین بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ توصیف صاحب ہمارے سیکشن آفیسر تھے اور اُصولوں اور وقت کے نہایت پابند۔ میں نے جھجکتے ہوئے اُن کے کمرے میں قدم رکھا تو مجھے دیکھتے ہی بولے "آیئے آیئے اصغر صاحب..... بھئی مبارک ہو..... آپ کو سپرنٹنڈنٹ پروموٹ کر دیا گیا ہے اور وہ جو ہاؤس

لون (House Loan) کے لیے آپ نے درخواست دے رکھی تھی، وہ قرضہ بھی منظور ہو گیا ہے۔ کیشیئر سے اپنا چیک لیتے جایئے گا.....'' حیرت اور خوشی کے مارے میری آواز بند ہو گئی۔ میری پروموشن کا کیس پچھلے پانچ سالوں سے اٹکا ہوا تھا۔ کیوں کہ میری اے سی آرز (ACRs) ٹھیک نہیں تھیں اور یہ گھر کے لیے اس قرضے کی درخواست تو میں نے بھرتی کے دوسرے سال سے دے رکھی تھی اور اب تو میں اُسے بھول بھی چکا تھا۔ میں شادی مرگ کی کیفیت میں توصیف صاحب کے کمرے سے نکلا تو وہ مجھے میری میز کے اُوپر اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ ''کیوں..... اب تو خوش ہو.....'' ..... ''خوش.....؟ ہاں مگر یہ سب.....؟ کیسے.....؟''

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جو تم سوچو گے وہ ہو جائے گا..... صبح سے اب تک صرف وہی ہو رہا ہے جس کے بارے میں تم برسوں سے سوچتے آ رہے ہو..... تم نے آج تک ہمیشہ یہی سوچا تھا نا کہ تمہارے گھر میں تمہاری عزت ہو، آرام اور سکون ہو..... اور تمہاری وہ سب چھوٹی چھوٹی سی خواہش پوری ہوں جن کے لیے تم برسوں سے ترس رہے ہو.....؟..... تو بس میں نے صرف تمہاری آج تک کی اُن خواہشوں کو ہی پایۂ تکمیل پہنچایا ہے..... ویسے تم انسان بھی بڑے عجیب ہوتے ہو..... تم نے ان معمولی اور گھٹیا سی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی ساری عمر گنوا دی..... یہ معمولی سا ہاؤس لون اور اس سپرنٹنڈنٹ کی یہ بڑے کلرکوں والی نوکری..... بس یہی پہنچ تھی تمہاری آج تک کی ہر سوچ، ہر جذبے کی..... سچ پوچھو تو مجھے افسوس ہو رہا ہے تمہارے معیار پر.....''

میں حیرت سے بیٹھا اُس کی باتیں سنتا رہا۔ اس وقت دفتر میں کچھ زیادہ چہل پہل نہیں تھی کیوں کہ باقی سارے لوگ کانفرنس ہال میں تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ''مطلب یہ کہ میں جو بھی سوچوں گا، تم میرے لیے ویسا ہی کر دکھاؤ گے.....؟..... کچھ بھی..... جو بھی میرے دل میں آئے؟'' وہ مسکرایا ''آزمائش شرط ہے.....'' اور پھر میں نے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو جب میں عظیم کے دفتر پہنچا تو میرے دل نے کہا ''عظیم میرے لیے دروازہ کھولے.....'' اور پھر دروازہ کھلا تو عظیم میرے سامنے فائلیں لیے کھڑا تھا۔ اُس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ''آئیں سر پلیز..... ہم آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے.....'' شبانہ بھی اُس کے پہلو میں کھڑی مسکرا رہی۔ میں شدید خواہش کے باوجود کچھ ڈگمگا سا گیا۔ اُس نے میرے

ذہن کو دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں..... اس وقت یہ تمہارا نہیں..... تم اس کے باس ہو..... جو دل میں بھڑاس بھری ہے..... سب نکال دو.....'' میں پھر سے خود اعتماد ہو گیا اور عظیم کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے اُس سے کام کے بارے میں پوچھا۔ شبانہ میری کرسی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے وہ عظیم کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ عظیم نے جلدی سے فائل میرے سامنے پیش کی۔ میں نے دو صفحے پلٹے اور پھر فائل اُٹھا کر پوری قوت سے عظیم کے منہ پر دے ماری۔ ''یہ کام کرتے ہو تم..... آج تک تمہیں ٹھیک طرح سے ڈرافٹنگ کرنا بھی نہیں آئی۔ بوڑھے گدھے ہو گئے ہو اور ابھی تک غلطیاں کرتے رہتے ہو۔'' عظیم کے ماتھے سے ویسے ہی پسینہ ٹپک رہا تھا جیسے روزانہ میرے ماتھے سے ٹپکتا تھا۔ شبانہ ویسی ہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے کھڑی طنز سے عظیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں پھر عظیم پر دھاڑا ''چلو اُٹھاؤ یہ فائل اور اپنی منحوس صورت میری نظروں کے سامنے سے دُور لے جاؤ۔ دوبارہ اس طرح کا ڈرافٹ میرے سامنے لے کر آئے تو میں فائل سمیت تم کو بھی اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ دفع ہو جاؤ.....'' عظیم خجالت اور شرمندگی سے کانپتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ مسکراتی ہوئی میری آغوش کی جانب بڑھی لیکن اب اُس کی باری تھی۔ میں زور سے چیخا۔ ''اور یہ تم کیا ہر وقت اپنے ہونٹوں پر طوائفوں جیسی نمائشی مسکراہٹ سجائے میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہو۔ مجھے اپنے دفتر میں کام چاہیے..... بازار نہیں..... تم بھی دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں بھی ابھی اِسی وقت دھکے مار کر دفتر سے نکلوا دوں گا۔ شبانہ کا رنگ ہی جیسے اُڑ گیا اور وہ چند لمحے حیرت اور صدمے میں گنگ سی کھڑی رہ گئی اور پھر روتے ہوئے دوڑ کر دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئی۔ میرے اندر برسوں کے اُبلتے ہوئے لاوے پر جیسے کسی نے پورا ٹھنڈا دریا اُنڈیل دیا ہو۔ اتنا سکون میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں عظیم کے کمرے سے باہر نکلا تو سارے دفتر کے لوگ حیرت میں شاک زدہ سے کھڑے تھے اور یہ سارا ماجرا انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ وہی سب لوگ تھے جن کے سامنے میں برسوں سے ذلیل ہو رہا تھا اور آج انہوں نے مجھے اپنے اندر کا لاوا اُن لوگوں پر اُبلتے ہوئے دیکھ لیا تھا جن سے وہ اندر ہی اندر شاید خود بھی شدید نفرت کرتے تھے لیکن خوف اور مجبوری کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ میں نے ہال سے نکلتے ہوئے سب

کو الوداعی سلام کیا تو سب سے پہلے جاوید کے ہاتھ تالی بجانے کے لیے اُٹھے اور پھر دھیرے دھیرے اُن سب کی تالیوں سے ہال گونجنے لگا۔ میں مسکراتے ہوئے دفتر سے باہر نکلا تو میں نے دھیرے سے خود سے سرگوشی کی ''تم نے یہ سب کیسے کیا.....؟ میرا مطلب ہے عظیم میرے سامنے یوں بھیگی بلی بنا کیسے کھڑا تھا؟ آخر وہ ہے تو میرا باس ہی.....''

وہ مسکرایا ''تم ان باتوں میں اپنا ذہن مت اُلجھاؤ..... یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہرحال فی الحال تم نئے نئے میرے دوست بنے ہو تو یوں سمجھ لو کہ یہ سب نظر بندی کا کھیل تھا۔ عظیم نے تمہیں اپنے ہی کسی بڑے افسر کے روپ میں دیکھا۔ تمہارے دفتر سے نکلنے کے بعد اُسے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوگا کہ اُسے ذلیل کرنے والے خود تم تھے۔ بہرحال اب تم کچھ بڑا سوچو..... پورا دن گزر گیا یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے.....'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا ''بڑا سوچوں.....؟..... کیا مطلب.....'' ''مطلب یہ کہ سب سے پہلے تمہیں اس پھٹیچر فلیٹ سے نکال کر تمہارے لیے اپنے دوست کے ہم منصب زندگی کا سوچنا ہوگا۔ آخر اب تم میرے دوست ہو، کوئی معمولی انسان نہیں..... لیکن تم انسانوں کی مجبوریاں بھی دھیان میں رکھنا پڑتی ہیں۔ بہرحال یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو.....''

اور پھر میں نے واقعی سب اُسی پر چھوڑ دیا۔ اگلے تین دن کے اندر نہ جانے میرے برسوں پرانے خریدے گئے چند پرائز بانڈز اور حال ہی میں خریدا گیا لاٹری کا ایک ٹکٹ یکے بعد دیگرے یوں نکلے کہ اگلے ایک مہینے کے اندر میں پہلے لکھ پتی اور پھر اگلے چند مہینوں میں کروڑ پتی ہو چکا تھا۔ دولت مجھ پر یوں برس رہی تھی جیسے میں نے کوئی پارس پا لیا ہو اور میں جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا وہ سونے کی بن جاتی۔ چھ مہینے کے اندر اندر میری زندگی یکسر بدل چکی تھی اور ان چھ مہینوں میں اس چھلاوے نے خود مجھ سے کوئی خاص کام بھی نہیں لیا تھا سوائے ایک آدھ بار کسی ویرانے سے چند جلے ہوئے بال اُٹھا کر کسی گھر کے آنگن میں ڈال آنے کے، یا پھر کسی جانور کا گوشت کسی ایک جگہ سے اُٹھا کر کسی دوسری جگہ پھینک آنا، وغیرہ وغیرہ۔ سچ پوچھو تو مجھے وہ سب کام انتہائی بچگانہ سے بھی لگتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا کہ ہوگا کوئی جادو ٹونے کا چکر، لہٰذا میں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ ہاں البتہ اس تمام عرصے میں، میں دین سے بالکل دُور رہا اور خود دین رفتہ رفتہ میرے گھر سے دُور ہوتا گیا۔ اس کا انداز پہلی بار مجھے چھ مہینے

کے بعد اُس وقت ہوا جب ایک شام میں تھکا ہارا اپنے آفس سے گھر پہنچا۔ میرا کاروبار اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ مجھے اپنے اور اپنے دو بیٹوں کے لیے الگ الگ تین عظیم الشان دفاتر قائم کرنا پڑے تھے۔ ہم نے اپنے کاروبار کے لیے ایک بڑی عمارت خرید لی تھی۔ اور میں، میرے بیٹے اور اُن کا سارا اسٹاف اِسی عمارت میں بیٹھتا تھا۔ ہمارا زمینوں کی خرید و فروخت کا کاروبار تھا اور ہم شہر کے سب سے بڑے بلڈر کہلاتے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی بڑی گاڑیوں میں صبح گھر سے نکلتے اور شام تک ہم آدھا شہر فتح کر کے گھر واپس لوٹتے تو عام طور پر گھر سنسان ملتا تھا اور نوکروں سے پتا چلتا کہ بیگم صاحبہ کسی تقریب پر گئی ہوئی ہیں اور چھوٹی بیبیاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ البتہ اُس شام میں گھر پہنچا تو میں نے ایک عجیب ہی منظر دیکھا۔ میری بیوی کی کلب والی تمام نئی سہیلیاں میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں اور اُن کے سامنے میز پر تاش کے پتوں اور پیسوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فلیش چل رہا تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھویں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اُس دن پتا چلا کہ میری بیوی نے سگریٹ پینا بھی شروع کر دیا ہے۔ ابھی میں حیرت کے اس پہلے جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے کھڑکی سے باہر چھوٹی عظمیٰ کو شہر کے ایک مشہور لوفر امیر زادے کی گاڑی سے اُترتے ہوئے دیکھا اور جس انداز میں وہ اُس سے گلے مل کر رُخصت ہوئی وہ مجھے شرم سے پانی پانی کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اُس وقت تو کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پائے رکھا لیکن رات کو جب میں نے بیوی سے گھر کو جوا خانہ بنانے اور بیٹی کی آزاد خیالی پر استفسار کیا تو اُس نے لاپرواہی سے اِٹھلا کر کہا ''اوہ کم آن اصغر..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... آپ محلوں تک پہنچنے کے باوجود ابھی تک ذہنی طور پر اُسی دو کمرے کے فلیٹ میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سوسائٹی میں موو (Move) کرنے کے لیے یہ سبھی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اور رہی بات عظمیٰ اور شہزاد کی تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ لڑکے کے گھر والے چند روز میں عظمیٰ کا رشتہ لینے آ رہے ہیں۔'' میں نے تلملا کر کہا ''بات رشتہ لینے دینے تک پہنچ چکی ہے اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی۔ تم جانتی بھی ہو اس لڑکے کو..... ایک نمبر کا غنڈہ ہے..... امیر زادہ ہوا تو کیا ہوا۔'' میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو..... اس معاشرے میں لڑکی کا رشتہ دیتے وقت صرف لڑکے کی حیثیت اور بینک بیلنس دیکھا جاتا ہے۔ چلیں اب سو جائیں۔ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔'' میری بیوی تو کروٹ بدل کر چند لمحوں میں خراٹے

بھرنے لگی لیکن میری نیندیں اُسی روز سے حرام ہو چکی تھیں۔ میں نے چھلاوے سے اس بارے میں شکایت کی تو وہ بھی طنزیہ سی ہنسی ہنس دیا۔ ''تمہاری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تم کبھی بڑے آدمی نہیں بن سکتے۔ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں اُلجھے رہتے ہوں۔ یہی جوا اگر تمہاری بیوی شہر کے کسی بڑے جم خانے، یا آفیسر کلب نما جگہ پر کھیلتی تو تم اسے نئی تہذیب میں شمار کرتے اور اگر وہی تاش کے پتے گھر میں کھل گئے تو وہ جوا ہو گیا؟ اور شکر کرو تمہاری بیٹی نے اُس لڑکے کو گھر رشتہ لانے کا کہا ہے۔ ورنہ جس ماحول میں وہ پل بڑھ رہی ہے وہاں لڑکیاں یا تو بھاگ کر شادی کرتی ہیں، یا پھر باہر شادی رچا کر گھر واپس آتی ہیں۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ایک دم اور آسانی سے بے تحاشا پیسہ مل جانے کے اپنے بھی کچھ اثرات ہوتے ہیں..... اور پھر تم انسان ایک اور پابندی بھی تو خود پر لگائے رکھتے ہو فضول سی۔ وہ کیا کہتے ہیں اُسے، ہاں..... حلال اور حرام..... تو اصغر صاحب تمہارے گھر میں پانی کی طرح بہتا پیسہ بھی تو تمہارے انسانی معیار کے مطابق حرام کا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سارے کمالات اِسی حرام کے پیسے سے کھائی ہوئی روٹی کے ہوں.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی باتیں تلخ اور کڑوی تو کونین سے بھی زیادہ ہوتی تھیں، لیکن سچ ہوتی تھیں۔ اگلے دن ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی۔ میرا چھوٹا بیٹا کرکٹ پر کروڑوں کا سٹہ کھیلتے ہوئے پکڑا گیا۔ گوروں کی کوئی ٹیم آئی تھی خاص اُسے پکڑنے کے لیے۔ چھلاوے کی مدد نہ ہوتی تو عمر بھر باہر کی جیلوں میں سڑتا رہتا۔ ابھی اس پریشانی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ بڑی بیٹی نے نشے میں دُھت تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے کسی راہ گیر کو کچل دیا۔ بیٹی کی ایف آئی آر میں میں نے جب یہ پڑھا کہ اُس کے میڈیکل ٹیسٹ میں شراب کا نتیجہ مثبت آیا ہے تو میں بالکل ہی ڈھے گیا۔ آسانی سے ملا ہوا بے تحاشا اور حرام کا پیسہ واقعی اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ میں ایک شام اِسی غم میں اداس سا اپنے دفتر میں بیٹھا ساحل کی طرف کھلتی کھڑکی سے دُور لنگر انداز جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آواز میرے من میں گونجی..... ''کیا بات ہے..... بہت اداس ہو..... اب تو زندگی کی ہر نعمت تمہارے پاس ہے..... اب اس اداسی کی وجہ کیا ہے..... میرے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی دوست اداس اور پریشان ہو تو پھر میرا کیا فائدہ.....'' میں نے ٹھنڈی سی آہ بھری ''پتا نہیں..... میرا دل اب ان سب چیزوں سے اُوب سا گیا ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ غربت کے اپنے مسائل اور امارت کی اپنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں

یں انسان کا مقدر صرف بے چینی ہی ہے..... سکون کہیں بھی میسر نہیں آتا۔'' اُس نے میرا دل
ہلانے کی کوشش کی۔ ''اچھا چھوڑو یہ مایوسی کی باتیں۔ یہ بتاؤ کبھی کوئی عشق وغیرہ کیا ہے
زندگی میں.....'' ''عشق.....؟..... کیوں دل جلاتے ہو..... تمہارے آنے سے پہلے کھانے
کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے..... ایسے میں عشق کیسے سوجھ سکتا ہے؟'' اُس نے اصرار کیا
'پھر بھی..... شادی سے پہلے کبھی تو کوئی اچھی لگی ہوگی.....؟ کیا تمہارے پاس کوئی بھی سنہری
د نہیں ہے.....؟'' میں ماضی کے دریچوں میں کھو گیا۔ ''ہاں کبھی تھی کوئی..... لیکن پھر وہی
ارت اور غربت کی دیوار..... ہم یونیورسٹی فیلو تھے..... وہ بہت چاہتی تھی مجھے۔ لیکن جب اُس
کے سیٹھ باپ کو پتا چلا تو اُس نے اپنے کارندوں کے ذریعے میری وہ خبر لی کہ یاد رہے اور مجھے
مکی بھی دی کہ اگر میں اُس کی بیٹی کے آس پاس بھی پھٹکا تو میری خیر نہیں۔ بعد میں سنا ہے
ں کی کسی بڑے صنعت کار کے ساتھ شادی ہوگئی تھی..... اب تو نہ جانے وہ کہاں ہوگی.....''
ں وقت تو چھلاوہ چپ رہا لیکن صبح میرے دفتر کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔
رے اسٹاف میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی کہ یوں ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا بورڈ لگا دیکھ کر بھی
رے آفس کا دروازہ کھٹکھٹا سکے..... میں نے چونک کر سر اُٹھایا تو دروازے میں وہی کھڑی
ی۔ ہاں..... وہ سعدیہ ہی تھی..... میری پہلی محبت..... وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی تھی..... بلکہ
ں کا سوگوار سا حسن اور بھی کچھ نکھر گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا۔ ''سعدیہ.....؟
.....؟ یہاں.....؟'' وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی اور پھر اُس نے جو بتایا وہ میرے ہوش اُڑانے
ے لیے کافی تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ چھ مہینے پہلے تک ایک خوش حال
ندگی گزار رہی تھی کہ اچانک ایک دن اُس کا باپ ایک ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ باپ کی
ت اور جائداد شوہر کے قبضے میں آئی تو اُس نے نہ جانے کن اللے تللوں میں اُڑا دی اور
ہ رفتہ اُس کا رویہ سعدیہ سے بھی بد سے بدتر ہوتا گیا۔ باپ کی موت سے ٹھیک دو ماہ بعد
سے طلاق کا تحفہ دے کر گھر سے نکال دیا گیا اور پچھلے ہفتے ہی وہ اپنی عدت ختم کر کے نوکری
تلاش میں نکلی تو اُسے میرا پتا چلا اور آج وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنے باپ کے
یڈنٹ کی جو تاریخ بتائی تھی وہ ٹھیک اُس سے اگلا دن تھا جب میں نے اپنے گلے میں یہ
خ دھاگا باندھا تھا۔ میں نے مشکوک نظروں سے اُس کے پیچھے صوفے پر اکڑوں بیٹھے اُس
لان کے چیلے کو دیکھا جس نے اپنے کاندھے اُچکائے اور میرے دل کی جانب اشارہ کیا۔

یہ سچ ہے کہ جب سے سعدیہ مجھ سے بچھڑی تھی تب سے لے کر آج تک میرے دل میں اُس کے ظالم اور امیر باپ کے لیے شدید نفرت بھری ہوئی تھی اور دن میں کئی مرتبہ خیال آنے پر میں اُس کا قتل بھی کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اُس بے چاری کی زندگی ہی تباہ کر ڈالے۔ میں نے سعدیہ کو تو فوراً نوکری پر رکھ لیا اور اُس کی نظروں میں پڑا ایک پرانی چاہت کے پھر سے جاگ اُٹھنے کا پیغام بھی پڑھ لیا۔ لیکن اُس کے کمرے سے نکلتے ہی میں چھلاوے پر برس پڑا۔ وہ کچھ دیر اطمینان سے میری کڑوی کسیلی باتیں سنتا رہا، پھر اطمینان سے بولا۔ ''بڑے ناشکرے ہو یار..... کیا یہ بھی تمہارے اپنے دل کی ایک چھپی ہوئی حسرت نہیں تھی کہ وہ ایک بار پھر سے کسی پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری آغوش میں آ گرے..... ساری زندگی اُس کے لیے آہیں بھرتے رہتے۔ وہ ٹھیک تھا، یا یہ بہتر ہے کہ اب وہ چوبیس گھنٹے تمہارے آس پاس رہے گی..... اب بننے کی کوشش مت کرو..... میں نے دیکھا تھا تم کس طرح بھوکی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں لاجواب سا ہو گیا۔ ''ہاں مگر..... اس طرح..... میرا مطلب ہے اُس کی زندگی برباد کر کے.....'' وہ ہنسا ''ایک بات یاد رکھو..... اس دنیا میں تمہاری آبادی تبھی ممکن ہے جب تم دوسروں کی بربادی کی فکر چھوڑ دو..... جاؤ اب اُس کے ساتھ عیش کرو۔'' میں نے غصے سے اُس کی جانب دیکھا ''کیا مطلب ہے تمہارا..... وہ عیش کرنے کی چیز نہیں ہے۔ تم جانتے ہو میں اُس سے سچی محبت کرتا ہوں۔'' وہ پھر زور سے ہنسا ''اُف..... یہ تم انسانوں کے چونچلے، محبت سچی ہو جھوٹی..... تم لوگوں کی ہر محبت کا انجام آخرکار ہوس ہی ہوتا ہے..... تم چاہو تو سچی محبت کے نام پر اپنا مقصد حاصل کر لو..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے..... ہونا آخر میں وہی ہے جو ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔'' میں نے لاجواب ہو کر سر پٹخا۔ اُس کے شیطانی دماغ سے لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ بہرحال کچھ دن کے لیے ہی سہی، لیکن میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی تھی..... سعدیہ نے آتے ہی میرے دفتر اور میرے دل کا سارا نظام یوں سنبھالا کہ کچھ پل کے لیے میری اس ویران زندگی میں بھی بہار آ ہی گئی۔ چھلاوے کے ساتھ میرے معاہدے کو چھ مہینے گزر چکے تھے اور ابھی چھ مہینے مزید باقی تھے۔

تیسری رات

اصغر صاحب کی داستان ابھی جاری تھی لیکن ہماری دوسری رات بھی اِسی داستان گوئی میں صبح کے سپیدے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ مجبوراً ایک بار پھر ہمیں باتوں کا سلسلہ روکنا پڑا۔ میں نماز پڑھنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اصغر صاحب اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ آخر اب اس درگاہ پر اُن کی موجودگی کی وجہ کیا ہے؟ میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ راز بھی خود ہی کھل جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ وقت آج کی تیسری رات کا ہی ہو۔ کیوں کہ مجھے اصغر صاحب کی داستان اپنے منطقی انجام کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر میں خود آج سے چھ ماہ پہلے والا ساحر ہوتا تو میں کبھی بھی اُن کی اس ساری کہانی پر یقین نہ کرتا۔ کیوں کہ اس جدید سائنسی دور میں ایسی منفی غیبی قوتوں کا موجود ہونا ازخود ایک بہت بڑا سوال ہے۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں ازل سے لے کر ابد تک نیکی اور بدی کی جنگ جاری تھی اور جاری رہے گی۔ اور پھر خود ہمارا نفس بھی تو ایک چھلاوہ ہی ہے۔ ہم سے چھل کرنے والا، ہمیں فریب اور دھوکے میں رکھنے والا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ خود ہمارا نفس ہمارے سامنے کبھی اِسی چھلاوے کی صورت آ کھڑا ہو جاتا ہو جیسے اصغر صاحب والا چھلاوہ اُن کے لیے ہزاروں نفسانی ترغیبات لے کر آ کھڑا ہوا تھا؟

پتا نہیں ایسے اور نہ جانے کتنے سوالات تھے جو میرے ذہن میں ایک عجیب سی اُتھل پتھل مچائے ہوئے تھے۔ اب مجھے دھیرے دھیرے اصغر صاحب کے پُراسرار رویے اور نماز کے وقت اُن کے غائب ہو جانے کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چھلاوہ پچھلے سال دسمبر میں اُن پر واضح ہوا تھا اور یہ مہینہ بھی دسمبر کا ہی تھا۔ مطلب یہ کہ ابھی اُن کے معاہدے کے کچھ دن باقی تھے؟؟

اصغر صاحب رات بھر کے جگ راتے کے بعد سوئے ہوئے تھے۔ میں نے دن گیارہ

بجے کے قریب درگاہ کا پانی وغیرہ بھرا اور ابھی میں گھڑوں اور صراحیوں کو انگور کی بیلوں کے نیچے رکھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کرم دین اپنی لمبی سی ڈانگ لیے بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ میں داخل ہوا ''سلام عبداللہ باؤ..... بڑی اور چھوٹی مالکن آئی ہیں.....'' میں چونکا..... ''بڑی مالکن اور لاریب، یوں اچانک.....؟..... خیر تو ہے۔'' لیکن کرم دین کے جواب سے پہلے ہی وہ دونوں بھی درگاہ کے احاطے تک پہنچ چکی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو کر دعا پڑھ لی اور خود کچھ دُور جا کر کھڑا ہو گیا تا کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی چادر وغیرہ چڑھا سکیں۔ ان معمولات سے فارغ ہو کر بڑی مالکن میری جانب پلٹیں۔

''بھئی یہ تو بڑی وعدہ خلافی ہوئی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ حویلی کا چکر ضرور لگاؤ گے۔ لیکن لگتا ہے تمہیں حویلی کے مکینوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے.....''

میں کچھ ہڑبڑا سا گیا۔ ''نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں یہاں درگاہ میں میرے علاوہ ایک مریض بھی موجود ہے۔ اُس کی وجہ سے بھی پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھر سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہاں تنہائی میں بڑا سکون ملتا ہے۔ البتہ مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے اور بہت جلد وفا بھی ہو گا۔ بس آپ کسی خاص مدت کی شرط نہ لگائیں۔ یہ میری آپ سے التجا ہے.....'' وہ میری لمبی تمہید سن کر مسکرا دیں۔ ''اپنا دفاع کرنا خوب جانتے ہو.....'' اتنے میں کرم دین نے انہیں بتایا کہ وہ پرندوں کا دانہ اور چوری تانگے سے اُتروا لایا ہے۔ بڑی مالکن نے اُسے ساری چیزیں صحن میں لانے کا کہا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ لاریب جو اُن سے دو قدم پیچھے کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی، آگے بڑھ آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا ''آپ کیسی ہیں.....؟..... آگے تعلیم جاری رکھنے کی اجازت ملی، یا نہیں آپ کو.....'' وہ مسکرائی ''ابھی مقدمہ جاری ہے، لیکن مجھے اُمید ہے کہ خان جی مان جائیں گے.....'' وہ خان صاحب کو خان جی کہتی تھی۔ ''جی مجھے بھی یہی اُمید ہے..... اور سنا ہے کہ آپ کو اپنی بات منوانے کے بہت سے گر بھی آتے ہیں.....'' میری بات سن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ وہی کچی زمین سے تازہ جھرنے کے پھوٹنے جیسی آواز..... ''سچ پوچھیں تو آپ سے مل کر ایک نئی تازگی کا احساس ہوا ہے مجھے۔ میں اس سے پہلے مذہب میں اتنی طاقت اور کشش کی قائل نہیں تھی۔ لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ابھی کھوج کرنے والے باقی

پھر یکایک وہ سنجیدہ ہوگئی۔ ''مجھے آپ سے بہت سے سوال کرنے ہیں۔ ساحر سے
تک کے اس سفر کے بارے میں۔ آپ کی امی سے زہرا کے بارے میں بھی بہت کچھ
اور میں اُس خوش نصیب کی ایک جھلک ضرور دیکھنا چاہوں گی جس کے رُخ سے منعکس
وپ نے پل بھر میں آپ کی کایا پلٹ دی۔ کیا دنیا میں اب بھی ایسے مقدر والے ہوتے
اپنے جلوے میں ایسے معجزے لیے پھرتے ہیں؟ لیکن میرے سارے سوال ہمیشہ تشنہ رہ
ہیں۔ کیا آپ کے اندر کا مذہب آپ کو ان سوالوں کے جواب دینے سے روکتا ہے، یا
بھی مرد و عورت کی تقسیم میں پڑے رہتے ہیں.....؟''

اُسے الفاظ برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ تو گویا اُس شوخ ادا اور چنچل ہنسی کے پیچھے ایک
حساس ذہن اور گہری سوچ بھی موجود تھی۔ ''نہیں..... میرا مذہب مجھے کسی سوال کے
سے نہیں روکتا، نہ ہی میں عورت اور مرد کی کسی تقسیم میں ذہنی طور پر بٹا ہوا ہوں۔ سچ
اتنا ہے کہ میں تو ابھی تک خود سراپا سوال ہوں۔ جواب دینے کے لیے جس کاملیت کی
ہے میں اُسی سے کوسوں دُور ہوں ابھی۔ اور شاید یہ مختصر زندگی سوالوں میں ہی گزر
۔ پھر بھی اگر میرے پاس آپ کے لیے کوئی جواب ہوا تو میں اسے آپ کے ساتھ بانٹنے
سے کام نہیں لوں گا۔''

وہ میری بات سن کر کسی چھوٹے بچے کی طرح خوش ہوگئی ''تو پھر میں کب تک توقع
اپنے سوال پیش کرنے اور آپ کے جوابات ملنے کی..... یاد رہے کہ آپ نے ابھی خود
کے مختصر ہونے کی پابندی بھی بیان کر دی ہے.....'' مجھے اُس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔
اقعی..... یہ کلہاڑی تو میں نے خود ہی چند لمحوں پہلے اپنے پیروں پر ماری ہے۔ لہٰذا اب
ت کا تعین خود ہی کر دیں تو بہتر ہوگا۔ میں حاضر ہوں ہر طرح سے۔'' اُس نے اپنی فتح
ن کر دیا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے کل رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیں گے۔ میں
کو بھی آج ہی آپ کی آمد کا بتا دوں گی۔ وہ خود بھی کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔'' میں
سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''کیا آپ کے سوال اُن کی موجودگی میں اپنے اصل لفظ و
یار کر سکیں گے..... اور کیا خود میں اُن کی موجودگی میں آپ کو جواب دینے کے قابل
وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ہاں..... مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے..... آپ خان جی

کے سامنے بندھے رہیں گے۔ چلیں یہ مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور اس بات کا یقین لے
ہمارے گھر آیئے گا کہ میں آپ کو کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گی....." کچھ ہی دیر میں بڑ
مالکن بھی اپنی مصروفیت سے فارغ ہوگئیں اور رُخصت ہونے سے پہلے انہوں نے ایک بار پ
مجھے یاد دلایا کہ اب وہ اور اُن گھرانے والے مجھے غیروں میں شمار نہیں کرتے۔ لہٰذا میں بھ
اپنے دل و دماغ میں کوئی گرہ باقی نہ رکھوں۔ وہ لاریب کو مجھ سے باتیں کرتا ہوا دیکھ چکی تھیں
اس لیے اُس کی جانب دیکھ کر مسکرائیں اور مجھ سے بولیں "تم نے میرے بلاوے کو تو بڑ
خوب صورتی سے ٹال دیا پر لاریب کی دعوت رد کرو تو جانوں..... اسے بھی تمہاری طر
لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ مطلب انہیں پتا تھا
لاریب مجھے کل رات حویلی مدعو کرے گی؟؟ بہرحال اب تو میں ہاں کہہ چکا تھا، لہٰذا اس مد
پر زیادہ سوچ بچار سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ اِسی بھاگ دوڑ میں شام بھی ہوگئی ا
پھر اصغر صاحب نے بھی مغرب سے ذرا پہلے اپنے "حجرے" سے باہر جھانکا۔ مجھے عجیب
چینی سی ہو رہی تھی کہ کب میں ان روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر اُن کے سامنے جا
بیٹھوں گا اور کب وہ اپنی داستان مکمل کریں گے۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ تیسری رات
رہی تھی جب میں پورے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی نیند لے پا رہا تھا لیکن پھ
بھی تھکاوٹ اور نیند کے کچھ خاص آثار میرے دماغ اور جسم پر طاری نہیں ہو پائے تھے۔ خ
خدا کر کے رات ڈھلی اور عشاء کی نماز کے بعد میں اُن کے سامنے اس بچے کی طرح آ بیٹھ
جس کی کہانی پچھلی رات آدھی رہ گئی ہو اور اُس نے پورا دن اِسی رات کی آس میں گزار دیا
کہ آنے والی رات اُسے پھر سے خوابوں کے اُسی پرانے دیس میں لے جائے گی۔ اصغ
صاحب نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ داستان پھر سے جوڑا۔

"ہاں تو عبداللہ میاں..... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ سعدیہ کے آنے سے زندگی میں ایک
خوش گوار تبدیلی تو آئی لیکن ایک اور عجیب بات بھی میں نے محسوس کی۔ جس سعدیہ کو میں اُس کی
شادی سے پہلے جانتا تھا اور جس کی محبت میری زندگی کا پہلا عشق اور پہلا جنون تھا، جس کے
لیے کبھی میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتا تھا، جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں
گھنٹوں کڑی دھوپ میں، برستی بارشوں میں صبح و شام اُس کی کلاس اور گھر کے چکر لگایا کرتا تھا

کے منہ سے باتیں نہیں موتی جھڑتے تھے اور جس کے چند بول سننے کے لیے میری
ں ترستی تھیں، آج بھی اُس کی دل کشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اب
ں بولتی رہتی تھی تب بھی میرے اندر وہ حلاوت نہیں گھول پاتی تھی جو پہلے صرف اُس
ہ سے ''اصغر'' کا لفظ سنتے ہی میری سماعت سے میری رُوح کے آخری ریشے تک گھل
تی۔ اب وہ زیادہ تر اپنے گزشتہ شوہر اور اُس کی بُری عادتوں کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ وہ
کتنا ستاتا تھا۔ وہ اُس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی خاطر کتنی قربانیاں دیں
وہ کس قدر بے وفا نکلا، وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے اُس کی ساری خوب صورت باتیں کہاں کھو
تھیں۔ وہ میر کی رباعی، وہ خیام کی غزل، وہ تصور جانان کی باتیں..... وہ گرتی پھوار اور
م جیسی بوندوں والی باتیں۔ جانے یہ عورتوں کو گزرتی عمر کے ساتھ ساتھ کیسی کیسی نفسیاتی
ں گھیر لیتی تھیں کہ اُن کے اندر صرف ایک عورت ہی باقی رہ جاتی ہے..... محبوبہ نہ جانے
کھو جاتی ہے۔ سعدیہ کے اندر سے بھی میری وہ دل بر، وہ لیلیٰ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی
ف سعدیہ کا جسم ہی باقی چھوڑ گئی تھی۔ تب مجھے ایک اور بھی عجیب سا ادراک ہوا کہ وقت
نے کے ساتھ ساتھ ہماری محبت کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اور یہ کہ انسان ایک
جس چاہت کو برسوں پہلے کھو چکا ہو، اگر قدرت خوش نصیبی سے اُسے زندگی میں دوبارہ
پانے کا موقع فراہم بھی کرے تو عقل مند وہی ہے جو اس محبت کو بس دُور ہی سے سلام
ے آگے بڑھ جائے، کیوں کہ ہوسکتا ہے وہ حال میں اپنی محبت پانے کے چکر میں اپنی
لی چاہت، اپنا جنوں بھی گنوا دے۔ وہ ایک احساس بھی کھو دے جس کے بھروسے اور
کے سہارے وہ آج تک جیتا آیا ہو۔ میرے ساتھ بھی شاید کچھ ایسا ہی ماجرا چل رہا تھا۔
بھی تو میں یہ بھی سوچنے لگتا کہ اگر سعدیہ اُس وقت مجھے مل بھی گئی ہوتی تو شاید آج ۲۵
بعد وہ ایسی ہی ہوتی۔ لیکن تب شاید میں اُس کے ساتھ زندگی اور وقت گزارنے کی وجہ
س کی ان جان لیوا تبدیلیوں کو محسوس نہ کر پاتا جو اس لمبی جُدائی کی وجہ سے میں اب
ں کر سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے خود میرے اندر بھی کئی ایسی تبدیلیاں آ گئی ہوں جیسی میں سعدیہ
در محسوس کر رہا تھا؟ گویا محبت وہی اچھی جو وقت پر حاصل ہو جائے۔ شاید محبت کے
لے میں ''دیر آید درست آید'' والا مقولہ درست نہیں تھا۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگنے لگا تھا

کہ آخری محبت وہی رہتی ہے جو لاحاصل ہو۔ جو حاصل ہو جائے وہ محبت تو ہو سکتی ہے، آخر محبت نہیں۔ میرے اندر سے رفتہ رفتہ وہ جنوں، وہ تڑپ اور کسک ختم ہوتی جا رہی تھی جو کسی بھی محبت نامی جذبے کا حاصل ہوتی ہے۔ کیا وہ سبھی جوڑے جنہیں اپنی محبت مل جاتی ہے وہ بھی اسی تجربے سے گزرتے ہوں گے جس سے میں ان دنوں گزر رہا تھا؟ کیا محبت دھیرے دھیرے یوں چیخ کر ٹوٹ بھی جاتی ہے جیسے خشک اور کمزور شاخیں.....؟

لیکن وہ میری محبت کو یوں چیختے اور تڑختے ہوئے دیکھ کر خوب قہقہے لگاتا اور مجھے طعنہ دیتا کہ "کیوں..... میں نہ کہتا تھا کہ تم انسان کہیں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے..... نہ تمہارے جذبے لافانی ہیں اور نہ تمہارا پیار..... نہ تمہاری محبت سچی ہے نہ تم لوگوں کو آج تک نفرت کرنے کا ڈھنگ آیا..... تم انسان صرف اور صرف جذباتی پتلے ہو..... بس جس طرف کی ہوا دیکھی اسی طرف کے ہو لیے..... تمہاری ہر محبت ہوس کا نتیجہ ہے اور تمہاری ہر نفرت تمہاری ذاتی انا کی شاخسانہ ہوتی ہے۔" ایک دن وہ میری آفس کی الماری پر بیٹھا مجھے اسی طرح کے طنز کے تیروں سے چھلنی کر رہا تھا کہ میں بھی آخرکار بھڑک اٹھا "تم ہمیشہ ہم انسانوں کی غلطیاں گنواتے رہتے ہو..... ہمیں اس کائنات کی ارزاں ترین مخلوق ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہو..... کبھی اپنے دامن میں بھی جھانک کر دیکھا ہے.....؟ تمہارے جد امجد کی ایک غلطی نے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تمہیں..... اور اب ابد تک تمہارا کام صرف مجھ جیسوں کو شکار بنانا ہے..... لیکن اگر میں نے تمہاری دوستی قبول کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سارے کے سارے ہی مجھ جتنے کمزور اور لاعقیدہ ہیں۔ ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جن پر تمہارا جادو ذرا سا بھی نہیں چل پاتا۔"

میری بات سنتے ہی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری..... تمہاری اس لاغر اور بے ایمان مخلوق میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر میرا سحر نہ چل پائے..... تم سب موم کی وہ ناک ہو جسے میں جب چاہوں موڑ کر رکھ دوں..... مجھے کبھی آزمانے کی بے وقوفی مت کرنا..... ہار جاؤ گے....."

مجھے بھی غصہ آ گیا "نہیں..... غلط فہمی مجھے نہیں..... تمہیں ہے..... تم کیا سمجھتے ہو کہ دولت کے انبار لگا کر اور ہم جیسوں کو عیش و عشرت میں ڈال کر تم نے پوری بازی جیت لی

ہے..... نہیں..... کچھ لوگوں کی منزل یہ دولت، یہ عیش نہیں..... کچھ اور ہے.....''

اُس نے غصے میں میری میز پر پڑی سب ہی چیزیں اُلٹ دیں ''دولت.....؟..... عیش و عشرت.....؟ تم کم ظرفوں کی تان ہمیشہ انہی دو چیزوں پر آ کر کیوں ٹوٹتی ہے؟ اور تم انسان جانتے کیا ہو دولت اور عیش کے بارے میں.....؟..... کہاں آتا ہے تم لوگوں کو دولت کو برتنا اور عیش کرنا.....؟..... تم لوگوں کو جب بھی ذرا مال میسر آیا تو کیا کیا؟..... دو چار جام لنڈھا کر اُلٹے پڑ گئے، یا پھر چار بازیاں کھیل لیں اور اپنی پسند کا کوئی ایک جسم منتخب کر کے رات بیتا دی۔ کیا ہے تم لوگوں کی عیاشی، شراب، جوا اور عورت..... بس.....؟ یہی عیاشی ہے تم لوگوں کے نزدیک.....''

آج تک اُس نے مجھے خوب زخم لگائے تھے۔ اپنے طنز کے تیروں سے مجھے خوب چھلنی کیا تھا لیکن آج جب میں نے اُسے اپنی ایک ضرب سے یوں تڑپتے ہوئے دیکھا تو مجھے بہت مزہ آیا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ ''تم لوگوں نے تو اپنی جنت کا تصور بھی انہی چند آسائشوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ شراب، عورت، ہیرے، موتی اور جواہر..... کم ظرف کہیں کے..... پھر بھی تم لوگ خود کو جنت کا حق دار سمجھتے ہو..... اور تم لوگوں میں سے کچھ دو غلے وہاں یہ سب کچھ پانے کے لیے چند دن یہاں کی زندگی میں ان چیزوں سے دُور بھاگتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ چیزیں یہاں میسر ہوں، یا وہاں..... مقصد تو ایک ہی ہوا نا..... پھر یہ نیک اور زاہد بننے کا ڈرامہ کیسا.....؟..... اور یہ جو تمہارے اندر کچھ لوگ برائے نام اپنے رب کی اطاعت کا ڈھکوسلا کرتے رہتے ہیں، انہوں نے اپنے رب کو جانا ہی کب ہے.....؟..... تم سب کسی ایک کی رحمت کے صدقے جی رہے ہو..... دنیا بھی پا رہے ہو اور دین کے ٹھیکے دار بھی بنے پھرتے ہو..... پتا نہیں خدا نے کیا سوچ کر تم جیسے تھڑدلوں کو اس دنیا کی خلافت سونپ دی۔ سچ کہ سچ تو یہ ہے کہ انسان جیسا کم ہمت، بزدل، احسان فراموش، جھوٹا، دھوکے باز، مکار اور فریبی اس پوری کائنات میں، اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہے.....''

میں نے اُس کی چبھن سے لطف لیتے ہوئے کہا ''بولتے رہو..... تمہیں یوں 'حقیر انسانوں' کی طرح تڑپتے اور گلے شکوے کرتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے.....'' اُس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پھر سمجھ گیا کہ آج میں اُس کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ وہ جھلا

سا گیا۔ ''لعنت ہو تم پر..... واقعی تم انسان بڑے چالباز ہوتے ہو، آج تم نے مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ چلو آج میں تمہیں اصل عیاشی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلاتا ہوں۔ کیا یاد کرو گے کبھی زندگی میں ایک اصل دوست سے بھی واسطہ پڑا تھا تمہارا.....''

میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''اصل عیاشی..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟''

اُس نے طنز سے میری طرف دیکھا۔ ''ہاں..... ایسی عیاشی جو تم جیسوں کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگی۔ تم لوگ عورت کو ہی دنیا کی سب سے نا قابل حصول مخلوق سمجھتے ہو نا..... اور عمر بھر اُسی کے حصول کے لیے بے ایمانیاں کرتے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہتے ہو..... اور بدلے میں پاتے کیا ہو..... صرف ایک آدھ جسم..... اور پھر اُس سے بھی دو چار سال کے اندر اُوب جاتے ہو..... ساری محبت، سارا عشق خشک مٹی کی طرح جھڑ جاتا ہے اور پھر باقی ساری عمر دوسری عورتوں کو دیکھ دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہتے ہو..... کبھی کسی فلم ایکسٹریس پر فدا ہوتے ہو اور کبھی کسی ماڈل کے تصور میں ہی زندگی گزار دیتے ہو۔ آج میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہیں آج تک زندگی میں ایسی جتنی عورتیں یاد ہیں جن کو تم کبھی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے اُن سب کی اپنے ذہن میں ایک فہرست بنا لو۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اُن سب کے ساتھ کچھ وقت گزارو گے۔ چاہے وہ ملک، یا دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہو..... کہیں کی بھی فلم اسٹار ہو، ماڈل ہو، کتنی ہی مشہور اور نا قابل حصول کیوں نہ ہو..... یا پھر چاہے کتنے ہی ہزار پردوں میں کیوں نہ چھپی بیٹھی ہو۔ آج وہ تمہاری دسترس میں ہوگی.....'' میں اُس کی بات سن کر کچھ جھینپ سا گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے میں شادی شدہ اور بیٹیوں کا باپ ہوں..... اب ایسی حرکتیں مجھے زیب نہیں دیتیں۔'' اُس نے میری بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ''اُف یہ انسان..... چاہے دل میں لڈو ہی کیوں نہ پھوٹ رہے ہوں..... ہونٹوں پر تصنع اور بناوٹ کا انکار ہی رہتا ہے..... اچھا چلو تمہارے اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہوگی اصل میں تمہاری بیوی ہی..... یعنی ذہنی طور پر تم کسی بھی عورت کو برتو..... جسمانی طور پر وہ ہوگی تمہاری اپنی ہی عورت..... لہٰذا اب خواہ مخواہ اپنے ضمیر نامی اس فضول احساس کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، جو تمہیں گناہ سے روک تو نہیں پاتا، ہاں البتہ اس کا مزہ ضرور کرکرا کر دیتا ہے..... لہٰذا مزہ کرکرا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دو تاکہ

بری گرفت اس پر مضبوط سے مضبوط تر ہو سکے اور اپنے گھر چلو..... میں ایسے تماشے ہر کسی کو
یں دکھاتا....."

میں اسی شش و پنج میں گاڑی میں بیٹھا اپنے گھر کی جانب روانہ تھا۔ میں نے ایسی
ورتوں کی اپنے ذہن میں فہرست بنانے کی کوشش کی جو زندگی کے کسی بھی دور میں کسی بھی
رح میرے لیے باعث کشش رہی ہوں لیکن اس مقام پر بھی مجھے چھلاوے کے سامنے
رمندگی ہی اُٹھانی پڑی۔ اُس دن خود مجھ پر بھی انکشاف ہوا کہ میں نے آج تک کسی قدر
ے رنگ زندگی گزاری تھی۔ سوائے ایک آدھ فلم ایکٹریس کے مجھے اور کوئی عورت یاد ہی نہ
ئی اور اس شیطان کے چیلے نے میری "بے ذوقی" پر اپنا سر پیٹ لیا۔ اِسی خجالت میں میں
نے گھر میں قدم رکھا تو استقبال کرنے والی پہلی وہی فلم ایکٹریس تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار
ونے کے باوجود اُسے اتنے اپنے قریب پا کر حیرت کے جھٹکے سے گرتے گرتے بچا۔ پھر جب
س نے میرا ہاتھ تھاما اور میری خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے پلٹی تو وہ سعدیہ تھی اور پھر جس
نے مجھے پہلا جام پیش کیا وہ میری سہاگ رات والی میری بیوی تھی۔ لیکن جس نے میری ٹائی
کھولی اور کوٹ اُتار کر کھونٹی پر ٹانگا وہ شبانہ تھی۔ پھر جس نے پیار سے میرے بال سہلائے اور
یرا سر اپنی گود میں رکھا وہ مشہور ماڈل تھی جس کے بل بورڈز میں ہمیشہ پہلے دفتر سے واپسی پر
س کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر جس نے میرا لباس تبدیل کروایا وہ کوئی اور تھی اور جس
نے خواب گاہ کی بتیاں مدھم کیں وہ کوئی اور..... یوں وہ رات میری زندگی کی ایسی رات تھی
جب خود مجھے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے دل میں دبی اور چھپی ہوئی بے شمار اور بے پناہ
چاہتوں کے بارے میں پتا چلا..... کیسی رنگین اور کتنی سنگین رات تھی وہ.....

اور پھر مجھے ایک اور حقیقت کا ادراک بھی انہی دنوں ہوا کہ عیاشی صرف ہمارے ذہن کی
یک اختراع ہے۔ ہمارے جسم کے اندر اُمڈتے مختلف ہارمون اور ان مادوں کی کارستانی ہے
جنہیں ہمارا ذہن کنٹرول کرتا ہے۔ گویا ہم اپنے ذہن پر قابو پانا سیکھ لیں تو ہر عیاشی خود ہمارے
در کی دربان بن سکتی ہے۔ شرابی کو جام کا نشہ، جواری کو اپنی بازی کی لت اور عورت کی تلاش میں
بھٹکنے والوں کے لیے جسم کی لذت کا سرور..... یہ سارا کھیل ہی ذہن کا ہوتا ہے اور اگر ذہن یک
سو نہ ہو تو ان سب کی عیاشیوں کی انتہا بھی اُسے ایک ذرہ برابر بھی لذت نہیں دے سکتی۔

لیکن عبداللہ میاں..... اس انسانی فطرت کا کیا کریں..... کہ ہر چیز کی زیادتی اور اس کی آسان حصول ہی ہمارے دل کو اس نعمت سے اُچاٹ کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ سو میں بھی اُوبنے لگا اور پھر انہی دنوں ایک اور مصیبت طوفان کی طرح میرے گھر میں داخل ہوئی اور اس کے در و دیوار کو لرزا گئی۔ میری چھوٹی بیٹی عظمیٰ نے ضد کر کے اُسی لوفر سے شادی کر لی اور میرا داماد میرے بڑے بیٹے کے ساتھ اُس کے کاروبار میں شریک بن گیا۔ دونوں مل کر زمین کی خرید و فروخت کا دھندا کرنے لگے اور پھر اُن کی نظر شہر کے سب سے اہم مرکز میں ایک قیمتی پلاٹ پر پڑ گئی۔ انہوں نے اپنی ہر ممکن اور سر توڑ کوشش کر لی لیکن اس پلاٹ کا مالک اپنی زمین بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ دراصل اُسے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ اُس زمین پر بچوں کے لیے پارک بنانا چاہتا تھا لیکن اِن دولت کے پجاریوں کو یہ کہاں قبول تھا کہ وہ سونے جیسی زمین کسی پارک کی تعمیر کے لیے چھوڑ کر ضائع کر دی جائے۔ سو میرے بیٹے اور داماد دونوں نے اس پلاٹ کے مالک سے آخری بار بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے گھر پہنچ گئے۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد بھی وہ شخص اپنی بات پر اڑا رہا۔ بحث گرما گرمی میں تبدیل ہو گئی اور میرے داماد نے مشتعل ہو کر اپنے کوٹ کی جیب سے پسٹل نکالا اور چھ کی چھ گولیاں اُس بے گناہ کے سینے میں داغ دیں۔ مالک زمین وہیں ٹھنڈا ہو گیا اور میرا داماد اور میرا بیٹا دونوں فرار ہو گئے لیکن کب تک چھپتے؟ مقتول کے ورثا بھی بہت اثر و رسوخ والے تھے اور انہوں نے عدالت سے میرے داماد اور بیٹے کو پھانسی پر لٹکانے کا فیصلہ لے کر ہی دم لیا۔ میری بیوی یہ سنتے ہی ایسی بستر پر گری کہ پھر فالج کے اثر سے نکل ہی نہیں پائی۔ میرا سارا گھر یوں بکھر گیا کہ پھر کبھی سمٹ نہ پایا۔ میں نے پھر اپنے اُسی دوست کی طرف مدد کے لیے دیکھا جو شاید کہیں نہ کہیں خود ہی میری اس ساری بربادی کا ذمہ دار تھا۔ تب اُس نے یہ کہہ کر میرے ہوش اُڑا دیے کہ وہ اپنی سی ایک کوشش تو کر دیکھے گا لیکن اگر میرے بیٹے اور داماد کی سانسیں اس دنیا میں اتنی ہی لکھی ہیں تو پھر وہ بھی کچھ نہیں کر پائے گا کیوں کہ وہ کسی کی جان قبل از وقت لے تو سکتا ہے لیکن کسی کی سانسیں بڑھا نہیں سکتا۔ کیوں کہ کچھ چیزیں قدرت نے صرف اپنے اختیار میں ہی رکھی ہیں۔ میں اُس پر بہت برسا کہ اُس نے پہلے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا جب بیٹے اور داماد دونوں کی لاشیں وصول کرنے کے لیے

میں سنٹرل جیل کے باہر کھڑا تھا۔ میں نیم پاگل ہو چکا تھا اور میرے گھر میں موت کا وہ ماتم اور سناٹا چھایا کہ پھر ہم میں سے کوئی بھی مسکرا نہ سکا۔ بڑی بیٹی نے چند دن صبر کیا اور پھر وہ بھی اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہ جانے کہاں نکل گئی۔ میری دولت میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس سے کہیں تیزی سے میں اپنے سارے رشتے ایک ایک کر کے کھوتا گیا۔ مجھے اس دولت، اس عیش و عشرت کی زندگی اور خود اپنے وجود سے نفرت سی ہو گئی۔ مجھے چھلاوے کی شکل بھی اب ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی لیکن میں اس معاہدے کی وجہ سے معذور تھا اور پھر آخر کار اُس نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر وقت مجھ سے اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا تھا کہ ہمارا معاہدہ ختم ہونے میں صرف دو ماہ ہی باقی رہ گئے ہیں لیکن میں نے اب تک ایک بھی ڈھنگ کا کام نہیں کیا اُس کے لیے۔ لہٰذا اب یا تو میں معاہدے میں ایک سال کی توسیع کرلوں، یا پھر اس کا کم از کم ایک بڑا کام ضرور سرانجام دوں۔ میں نے اُس کو صاف بتا دیا کہ میں اب اس معاہدے سے بیزار ہو چکا ہوں لہٰذا وہ اپنا کام بتائے تاکہ میں اُسے انجام دے کر اس دھاگے کو کاٹ دوں اور عمر بھر کے لیے اس عذاب سے اپنی گلو خلاصی کرلوں۔ اُس نے پھر مجھے احسان فراموش ہونے کا طعنہ دیا لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار اُس نے وہ کام مجھے بتا دیا اور مجھے اس درگاہ پر وہ عمل سرانجام دینے کے لیے بھیج دیا جس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤں گا۔ تب سے لے کر میں اب تک یہیں اس درگاہ پر پڑا ہوں۔ دیکھو کہ اب کب مجھے اُس کی جانب سے آخری حکم ملتا ہے اور کب میری آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ ویسے بھی میری آزادی میں اب صرف ۲۹ دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

اصغر صاحب نے اپنی داستان ختم کر کے اس طرح ایک لمبا سا سانس لیا جیسے اُن کے دل پر رکھا منوں بوجھ اُتر گیا ہو۔ صبح کی سپیدی کے آثار نظر آ رہے تھے اور دُور نیچے گاؤں کی مسجد سے صبح کی اذان کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر اصغر صاحب سے پوچھا "لیکن وہ آخری حکم کیا ہے جس کے لیے آپ کو اس درگاہ میں بھیجا گیا ہے..... آپ کو کیا کرنا ہے یہاں.....؟....."

"قتل....." اصغر صاحب نے دُور خلا میں گھورتے ہوئے کہا "مجھے یہاں ایک قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے....."

معصوم قاتل

اصغر صاحب کی بات سن کر میں اُچھل پڑا۔ ''قتل..... لیکن کس کا.....؟'' انہوں نے لمبی سی سانس بھری ''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ اُس نے کہا ہے کہ وقت آنے پر مجھے خود پتا چل جائے گا۔ تمہیں میں نے اپنی ساری کہانی من وعن اس لیے سنا دی ہے کہ اس دنیا میں صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جس نے میرے علاوہ اس چھلاوے کا کوئی روپ دیکھا ہے.....'' یہ پے در پے حیرت کا دوسرا جان لیوا جھٹکا تھا میرے لیے..... ''میں نے چھلاوے کو دیکھا ہے؟..... کب.....؟ کہاں.....؟.....'' میں نے انہیں جھنجھوڑ ہی تو ڈالا.....

''جس شخص کو پہلے تم نے ٹرین میں اور پھر یہاں درگاہ کی چار دیواری کے باہر اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑے دیکھا تھا وہی چھلاوہ ہے..... آج کل وہ مجھ سے اِسی روپ میں ملتا ہے..... اُسے اس قسم کی شعبہ بازیاں کرنے میں بہت مزہ آتا ہے..... کچھ دن تک تو وہ خود میرے ہی دفتر میں چائے والا بن کر بھی آتا رہا، کبھی بس کنڈکٹر، کبھی میرا شوفر، کبھی کوئی دلال، کبھی کوئی سادھو..... جانے کس کس روپ میں وہ میری راہ کاٹتا رہا ہے۔''

اصغر صاحب کی بات سن کر میں سن سا رہ گیا۔ تبھی وہ پارے جیسی صفت رکھنے والا شخص مجھے اس قدر بے چین کر گیا تھا کہ میں کئی راتوں تک ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ یا خدا..... یہ کیسی دنیا تھی، کیسے اسرار تھے۔ ابھی یاقوط کا فسوں ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ یہ چھلاوہ میرے کالے نصیب کی تاریکی بڑھانے کے لیے چلا آیا تھا۔ اور پھر وہ آخر کس کے قتل کا حکم دے گا اصغر صاحب کو؟ اِسی اُدھیڑ بن میں سارا دن گزر گیا اور شام سر پر آ گئی۔ مغرب کے فوراً بعد نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ وہ ٹھیک وقت پر مجھے لینے کے لیے آ پہنچا تھا۔ میں حویلی پہنچا تو خان صاحب نے بیرونی ڈیوڑھی کے باہر ہی میرا استقبال کیا اور بڑی محبت سے مجھے اندر والے دیوان خانے میں لے گئے جہاں میں نے پہلی مرتبہ مما پپا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہاں پہلے سے بڑی مالکن اور لاریب موجود تھیں۔ گویا خان صاحب نے

صرف زبانی طور پر ہی مجھے گھر کا فرد اور اپنا بیٹا نہیں کہا تھا بلکہ آج انہوں نے یوں مجھے اپنی حویلی کے زنانے میں بلوا کر اور یہ عزت دے کر عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دیا تھا۔ بڑی مالکن اور لاریب نے ویسے تو پہلے بھی کبھی مجھ سے پردہ نہیں کیا تھا لیکن آج میں ایک مہمان کی حیثیت سے اُن کے گھر کی خواتین کے درمیان موجود تھا جو ان علاقوں میں بہت بڑی عزت اور بڑے مان کی بات سمجھی جاتی تھی۔ لیکن مجھے بہت جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ یہ عزت اور یہ مان بھی تو انسان کو کہیں نہ کہیں باندھ کر رکھ دیتا ہے، اُسے بے بس کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سانپ کے زہر سے زیادہ اثر دار اور زہریلا نمک کا زہر ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر تو پھر بھی کبھی نہ کبھی اپنا اثر کھو ہی بیٹھتا ہے لیکن کسی کے کھائے ہوئے نمک کے زہر کا اثر ظرف والوں کے خون سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ شاید خان صاحب کے اندر بھی کوئی ایسا ہی بھرم تھا میری ذات کے لیے..... میرے ظرف کے بارے میں..... تبھی انہوں نے آج مجھے یہ مان دیا تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر لاریب اور بڑی مالکن کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اُٹھ گئیں۔ خان صاحب کی گفتگو جاری رہی۔ وہ مما اور پپا سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ خاص طور پر مما جنہوں نے مجھے اس راستے پر چلنے کی اجازت دی تھی اور پپا کی سادگی نے تو اُن کا دل ہی موہ لیا تھا کہ اتنا بڑا صنعت کار ہونے کے باوجود اُن میں دکھاوا اور خود پسندی نام کو بھی نہیں تھی۔

اتنے میں لاریب نے آ کر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے اندر زنانے میں ایک آدھ خادمہ کے علاوہ اور کوئی لاریب اور بڑی مالکن کی مدد کے لیے موجود نہیں تھا، یا پھر بڑی مالکن نے خصوصی طور پر مجھے اپنا سمجھتے ہوئے کسی نوکر کو کھانے کی میز کے گرد نہیں آنے دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے میرے لیے نہ صرف کھانا پروسا بلکہ ہر چیز ضد کر کے بلکہ حکم دے کر مجھے چکھائی بھی۔ سبھی کچھ بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ آدھی سے زیادہ چیزیں لاریب کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں اور پورے کھانے کے دوران اُسے یہی فکر کھائے رہی کہ کوئی چیز بدذائقہ، یا بُری تو نہیں بنی۔ جب بھی میں کوئی نیا خوان چکھتا وہ تب تک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہتی جب تک میں وہ لقمہ نگل نہیں لیتا تھا۔ اُس کی اس ''پہرے داری'' پر مجھے ہنسی آ گئی اور آخر کار مجھے اُسے کہنا پڑا'' آپ یقین کریں آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی تمام چیزیں معیار سے کہیں بڑھ کر

اور نہایت لذیذ ہیں۔ لیکن اگر آپ اِسی طرح میرے چہرے پر ہر نئی ڈش کا ذائقہ تلاش کرتی رہیں تو مجھ سے بالکل نہیں کھایا جائے گا۔" میری بات سن کر سبھی ہنس پڑے۔ خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ جب بھی کوئی نیا تجربہ کرتی ہے، اس کا انداز میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھئی میں تو اِسے کہہ دیتا ہوں کہ یہ تو زبردستی تعریف کروانے کا طریقہ ہے۔" یوں ہی ہنستے مسکراتے کھانا ختم ہوا اور پھر ہم نے بڑے کمرے میں بیٹھ کر کشمیری چائے بھی پی لی۔ میں نے خان صاحب سے اجازت چاہی تو لاریب نے جو بڑے کمرے میں ہی چائے کے برتن سمیٹ رہی تھی بڑے اعتماد سے مجھ سے جاتے جاتے کہا "ابھی رُکیے..... میرے سوال ابھی باقی ہیں....." میں نے چونک کر لاریب کی جانب دیکھا کیا خان صاحب اور بڑی مالکن سے اُس نے پہلے ہی اجازت لے رکھی ہے؟ خان صاحب میری اندرونی کش مکش کو شاید میرے چہرے سے بھانپ چکے تھے وہ اُٹھتے ہوئے بولے "لاریب تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے عبداللہ میاں..... لیکن ضروری نہیں کہ تم اِس کے ہر سوال کا جواب دینا چاہو....." مجھے اُس نے بتایا کہ تمہاری روایتی جھجک شاید تمہیں میرے سامنے کھل کر بات کرنے سے روکے..... تم اطمینان سے بات کرو۔ میں ذرا اپنا حقہ تازہ کروا آؤں اور زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں..... اِس کے تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھاڑ سے بچانے کے لیے اِس کی ماں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود ہے....." وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اور میرے دل سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ سا ہٹ گیا۔ لاریب نے خان صاحب اور اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر مجھے ایک بہت بڑے امتحان سے بچا لیا تھا۔ میں جانتا تھا اس شیشے کی بنی ہوئی لڑکی کا من کانچ سے بھی زیادہ صاف اور آئینے کی طرح شفاف تھا لیکن داغ ہمیشہ ایسے ہی کورے کانچ پر جلدی لگتا ہے۔ اور میں خان صاحب، یا بڑی مالکن کے کورے من پر اپنی جانب سے ذرا سی بھی کھرونچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بہت مختلف اور بہت اعلیٰ انسانوں سے برتنے کا معاملہ تھا اور میں انہیں اُن کے معیار جیسا ہی برتنا چاہتا تھا۔

لاریب جلد ہی چائے کے برتن رکھوا کر خادمہ کے ہاتھ خشک میوے کی پراتیں اُٹھائے چلی آئی۔ تب تک بڑی مالکن مجھ سے میری تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں بھی مجھے بتایا کہ اُنہیں انٹر تک شاعری سے کافی لگاؤ پیدا ہو

ا تھا اور اب بھی کبھی کبھار وہ اپنی بیاض میں کچھ لکھ لیتی ہیں۔ لاریب نے خادمہ کو پراتیں
ہ کر جائے کا کہا اور پھر وہ بھی بڑی مالکن کے ساتھ ہی سامنے والے صوفے پر براجمان ہو
ئی۔ ''ہاں تو اب سب سے پہلے یہ بتائیں کہ میں آپ کو ساحر کے نام سے پکاروں، یا عبداللہ
ہہ کر..... ویسے کیا یہ نام بدلنے کی رسم ادا کرنا ضروری تھا..... مذہب کی، یا ایسی کسی اور راہ پر
نے کے لیے اپنی شناخت بدلنا ضروری ہے کیا؟'' میرا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ ممتحن نے پہلا
ال پوچھ کر جواب کے انتظار میں اپنی آنکھیں مجھ پر گاڑھ دیں۔ ''آپ مجھے ساحر کے نام
ے بھی پکار سکتی ہیں۔ نام صرف شناخت کا ذریعہ ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ اب پکارنے والے پر
صر ہے کہ اُسے کس نام کی شناخت پسند ہے۔ اور رہی بات نام بدلنے کی رسم کی تو شاید جس
ت میں اپنے کسی اور جنون میں اپنا گھر چھوڑ کر اس درگاہ پر بسیرا کرنے کے لیے آیا تھا تب
ری گزشتہ شناخت مجھ پر شدید طاری اور زیادہ حاوی تھی ایسے میں مجھے اس نئے ماحول سے
ڑنے کے لیے مجھے ایسی ہی کسی نئی شناخت کی ضرورت تھی اور ایسے میں عبداللہ نام کی اس
ل ہوئی پہچان نے مجھے بڑا سہارا دیا اور شاید یہی میرا نام بدلنے والوں کا مقصد بھی تھا۔''
وہ مطمئن سی ہو گئی۔ ''آپ نے میری اُلجھن تو ختم کر دی۔ اور سچ پوچھیں تو یہ بہت بڑی
جھن تھی کیوں کہ بہرحال مجھ جیسوں کے لیے اپنا بچپن کا نام ہی بہت بڑی شناخت ہوتی ہے
اپنا جنم نام یوں ایک جھٹکے سے بدل دینا بھی بڑی ہمت والوں کا ہی کام ہے..... پھر آپ
ے دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے یہ بھیس بدلا تھا۔ پھر دھیرے
رے آپ کی چاہت نے اس راستے کو پا ہی لیا جس پر چلنے کے لیے آپ کے قدم درگاہ کی
ب پہلی بار بڑھے تھے۔ اس سفر میں زہرا نے بھی آپ کی محبت کی طاقت کے سامنے ہتھیار
ں ہی دیئے۔ آپ وہ تمغہ بھی سینے پر سجائے اس راہ پر آگے بڑھتے گئے۔ آپ جسموں کو نہیں
ح کو فتح کرنے کے لیے اس رُوحانی راہ گزر کے راہی بن گئے..... لیکن یہ سفر آخر ختم کہاں
ا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح گھر بار چھوڑ کر اور زہرا کو اپنا منتظر چھوڑ کر آپ ایک فرض
ادائیگی کے لیے نکل تو آئے لیکن آپ نے اپنے پیچھے بہت سے فرض اُدھورے چھوڑ دیئے
.....؟''

بڑی مالکن نے سرزنش بھری نظر سے لاریب کی جانب دیکھا جیسے انہیں لاریب کے

سوالات کچھ چبھ رہے ہوں۔ لاریب نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ''اگر میں الفاظ کے چناؤ میں کچھ بے احتیاطی کر رہی ہوں تو پلیز آپ.....'' میں نے اُس کی بات پوری ہونے نہیں دی۔ ''نہیں..... آپ کا پیرایہ اور الفاظ کا چناؤ بالکل درست ہے۔ نمک کو نمک اور تھوڑ کو تھوڑ ہی کہا جا سکتا ہے..... قند کہہ دینے سے اس کی تاثیر میں حلاوت شامل نہیں ہو جاتی۔ شاید یہ وہ سوالات ہیں جن کا سامنا مجھے عمر بھر کرنا ہے۔ لہجہ چاہے تلخ ہو، یا آپ جیسا شیریں..... سوالوں کا مدعا تو یہی رہے گا۔ اور میرے پاس بہرحال اپنے ہر عمل کا جواب موجود ہونا ہی چاہیے.....''

وہ دونوں دم بخود سی بیٹھیں میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نے اپنی دنیاوی چاہت کے لیے ہی یہ بھیس بدلا تھا۔ اور سچ پوچھیں تو فی الحال میں صرف بھیس بدلنے کی حد تک ہی کامیاب ہو پایا ہوں۔ آپ کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ خدا کو پانے کے لیے یوں بھیس بدل کر اپنا گھر بار چھوڑنے کی بھی قطعاً ضرورت نہیں..... اُسے تو اپنی شہ رگ سے بھی قریب کہیں آس پاس تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ہمیں ہمارا ضمیر ہمیشہ اس شعبے، یا اس راستے کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتا ہے جس مٹی سے اُسے اُٹھایا گیا ہوتا ہے۔ مصور کو اگر آپ بڑھئی لگا دیں اور بڑھئی کو مصور کا کام سونپ دیں تو کیا ہوتا ہے؟ کسی موسیقار کو اینٹ گارا ڈھلائی کرنے والا مزدور بنوا دیں اور کسی مزدور کو کسی نازک پیانو پر لا بیٹھائیں تو کیا ہوگا؟..... بات کسی بھی راہ، یا حلیے کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کی اور اُسے کسی فرض کو ترک کر کے اختیار کرنے کی نہیں ہے۔ بات رُوح کے قرض کی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میری رُوح کو اس کام کے لیے جنم دیا گیا ہے اور مجھے اِسی میں اپنا سکون، اپنی کاملیت دکھائی دی اور میں اس طرف چل پڑا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے اگر مجھے ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ وغیرہ بننے کا جنون ہوتا اور میں اپنے والدین کی مجھے بزنس مین بنانے کی خواہش کو رد کر کے ایسا کوئی شعبہ اختیار کر لیتا تو شاید دنیا کو اتنا عجیب نہ لگتا۔ تب شاید مجھے کچھ طرف سے داد و تحسین بھی ملتی کہ میں نے اپنا اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کر اپنے دل کی مانتے ہوئے وہ شعبہ اختیار کیا جس میں میری خوشی تھی اور میری مثالیں دی جاتیں کہ اپنے فن اور شعبے کے لیے قربانی ہو تو ایسی ہو۔ تو کیا مذہب، یا رُوحانیت وہ شعبہ اور وہ فن نہیں ہو سکتا جس کی راہ کا

طالب علم بننا میری خوشی ہے.....؟..... بس تو میں نے اپنی خوشی سے ایک شعبہ ہی تو اختیار کیا ہے۔ اور کیا اگر میں ڈاکٹریٹ، یا بزنس مینجمنٹ کے لیے ملک سے باہر جاتا اور چار پانچ سال لگا کر واپس آتا تو کیا تب میں اتنا عرصہ ان رشتوں اور ان سے وابستہ فرائض سے دُور نہ رہتا؟ لیکن تب شاید یہ بھی میرے تمغوں میں مزید ایک تمغے کا اضافہ ثابت ہوتا کہ اپنے شعبے کی تکمیل کے فرض کی خاطر میں نے خونی رشتوں سے دُوری کی قربانی دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ واپسی پر میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور میری سند کو جلی حروف میں میرے نام کی تختی پر کندہ کیا جاتا۔ تو پھر صرف اس راہ پر چلنے والوں پر فرائض سے بھاگنے کا الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید اس شعبے میں روپیہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں..... کیا صرف جس شعبے سے انسان کو لگی بندھی تنخواہ مل سکتی ہو صرف وہی انسان کی کامیابی کی دلیل ہوتا ہے۔ رہی بات حلیے کی تو ہر شعبے کا اپنا ایک یونیفارم بھی ہوتا ہے جس طرح ڈاکٹر سفید کوٹ پہنتے ہیں، انجینئر سائٹ پر جاتے وقت سر پر آہنی ہیلمٹ پہن لیتے ہیں، پائلٹ کاندھے پر پھول سجاتا ہے، اِسی طرح اس شعبے کا بھی اپنا ہی ایک یونیفارم پہلے سے طے ہے۔ آپ سوچیں کہ میں تھری پیس سوٹ میں مزار کا مجاور بنا کیسے لگوں گا.....؟..... بالکل اتنا ہی مضحکہ خیز جتنا اگر میں کسی بزنس ایمپائر کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوتے ہوئے سفید کرتے پاجامے میں صبح اُٹھ کر اپنے دفتر جا پہنچوں.....؟ یہ سادہ لباس ہی میرے شعبہ کا تقاضا اور اس پر جچتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف سادہ لباس ہی انسان کی رُوحانیت کی تکمیل کا باعث ہے۔ یہ تو ابتدا سے بھی پہلے کے چند لوازمات ہیں تبھی میں نے آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ فی الحال میں صرف لباس کی تبدیلی تک ہی پہنچ پایا ہوں۔ اب رہا آپ کا آخری سوال کہ رُوحانیت کے اس سفر میں زہرا کی رُوح کو فتح کرنے کا مرحلہ کب آئے گا تو یہ فیصلہ تو میں نے اُسی پر چھوڑ دیا تھا۔ میری رُوح تو پہلے روز ہی اُس کی اسیر ہوگئی تھی۔ یہ فیصلہ اب زہرا کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنی رُوح کو کب میرے تصرف میں دینے پر خود کو آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ زمینی فاصلے مجھے کبھی بھی اُس سے دُوری کا احساس نہیں دلا پائے۔ وہ ہر پل میرے ساتھ ہی تو ہوتی ہے۔ یہ طویل تنہائیاں اور یہ جگ راتے میں نے اُس سے باتیں کر کے ہی تو گزارے ہیں۔ ہمارا مسئلہ کبھی جسم کی قربت تو تھا نہیں..... مجھے یقین ہے کہ میری

رُوح کی کی ہوئی باتیں اُس تک بھی ضرور پہنچتی ہوں گی.....''

میں اپنی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔ لاریب اور بڑی مالکن بھی بہت دیر تک اپنے لفظ جوڑنے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر آخر کار میں نے ہی انہیں سہارا دیا۔ ''مجھے اُمید ہے کہ آپ کے سبھی سوالوں کے جواب میں نے دے دیئے ہیں۔ پھر بھی آپ کے دل میں اگر مزید کوئی خلش ہو تو آپ پوچھ سکتی ہیں۔'' لاریب کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ ''نہیں..... مجھے اپنی زندگی میں اپنے کسی بھی سوال کے اتنے تسلی بخش جواب نہیں ملے..... آپ نے کوئی تشنگی چھوڑی ہی نہیں میرے واسطے..... لیکن کبھی کبھی اتنی سیرابی بھی ہم جیسوں کے لیے باعث شادی مرگ بن جاتی ہے..... میں شاید اِسی وجہ سے اپنے الفاظ کھو چکی ہوں.....''

ایسے میں بڑی مالکن نے لاریب کو سہارا دیا۔ حالانکہ مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ دیر مزید خاموش رہنا چاہتی تھیں۔ ''تم ایک مختلف نوجوان ہو عبداللہ..... تمہاری راہ بھی مختلف ہے لیکن آج تم نے اپنی راہ کی ہر سچائی کو جس طرح کھول کر بیان کیا ہے اس نے تمہاری قدر ہمارے دلوں میں فزوں تر کر دی ہے..... تم ہمیشہ اپنے اندر اتنی حیرتیں بیک وقت کیسے چھپائے پھرتے ہو۔'' اتنے میں خان صاحب کی بروقت آمد نے مجھے اس مشکل سوال کے جواب سے بچا لیا۔ وہ مصر تھے کہ رات بہت ڈھل چکی ہے لہٰذا آج رات میں یہیں حویلی کے مہمان خانے میں قیام کر لوں لیکن میں نے انہیں اصغر صاحب کی طبیعت کی مجبوری بتائی تو بادل نخواستہ انہیں مجھے اجازت دینی ہی پڑی۔ بشیرا اپنے تانگے سمیت ڈیوڑھی میں ہی موجود تھا کیوں کہ شاید اُسے پہلے ہی وہاں ٹکے رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ میں اُن سب سے رُخصت ہو کر تانگے میں بیٹھا تو لاریب تب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ مجھے الوداع کہتے وقت بھی اُس کی نظریں میرے چہرے پر جانے کیا ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے اُس کے اندر کی کوئی بات اُدھوری رہ گئی ہے۔

تانگا پہاڑی کے پاس آ کر رُکا تو بشیرے نے مجھے پیش کش کی کہ وہ میرے ساتھ درگاہ تک جانا چاہتا ہے کیونکہ سناٹا اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ''عبداللہ باؤ..... سنا ہے اس پہاڑی کے دوسری پار جنات رہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ میں آپ کے ساتھ اُوپر تک آتا ہوں۔ آخر آپ ہمارے خاص مہمان ہو.....''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی ''کیوں تم کیا جنات کے داماد لگتے ہو جو وہ تمہیں کچھ نہیں
ہتے..... اور پھر اُوپر پہنچنے کے بعد تمہیں بھی تو تنہا ہی نیچے آنا پڑے گا نا..... تو پھر تمہیں
وڑنے کے لیے کون آئے گا؟..... اس طرح تو ہم ایک دوسرے کو ہی چھوڑنے کے لیے
اڑی اُترتے چڑھتے رہیں گے اور اِسی بھاگ دوڑ میں صبح ہو جائے گی.....''

بشیرا بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''واقعی..... اکیلے اُترتے ہوئے تو مجھے بھی ڈر لگے
۔ چلو پھر اللہ بیلی.....'' بشیرے نے تانگا موڑا اور میں اُس کی جلد بازی پر مسکراتا ہوا پہاڑی
ں اُوپر جاتی پگ ڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ رات واقعی بہت سرد اور تاریک تھی۔ ان پہاڑی علاقوں
ں ایک پہاڑ پر اگر موسلا دھار بارش برس رہی ہو تو اگلی پہاڑی پر دھوپ چمک رہی ہوتی
ہے۔ اِسی طرح اِس رات کے وقت بھی دُور کسی پہاڑ پر بار بار بجلی چمک کر اُسے کیمرے کی
ش کی طرح نیلی روشنی کے جھماکوں سے منور کر رہی تھی جو اس بات کی غماری تھی کہ دوسرے
اڑ کے جانب بارش برس رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے دوش پر بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی
ن میں پڑ جاتی تھی۔ میں لاریب کے سوالوں پر غور کرتا ہوا اُوپر چڑھا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر
ں سردی کی شدت اور میرے تیز ہانپنے جیسے سانس کی وجہ سے میرے منہ سے بھاپ نکلنے لگی
ہے میں ہر سانس کے ساتھ سگریٹ کا بہت سا نگلا ہوا دھواں اُگل رہا ہوں۔ جیسے جیسے درگاہ
یب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے کہرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک عقب میں ایک آہٹ سی ہوئی۔
رے بڑھتے قدم رُک گئے اور میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میں نے پھر
م اُٹھائے اور پھر وہی آہٹ ہوئی۔ میں پھر رُکا اور میں نے صاف محسوس کیا کہ کوئی میرے
اتھ ہی رُک گیا ہے۔ لیکن کون.....؟ کیوں کہ وہاں تو دُور دُور تک صرف اندھیرے کا راج
ا۔ میں نے پھر سر جھٹک کر چلنا شروع کیا اور اس بار مجھے اپنی دھونکنی جیسی چلتی سانس کے
اتھ کسی اور کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ دفعتہً بجلی کا دُور کہیں ایک اور جھماکا
ا اور دائیں جانب والی چٹان کے اُوپر مجھے کسی اکڑوں بیٹھے ہوئے شخص کا ہیولہ سا دکھائی دیا
ں کی سرخ انگارہ آنکھیں دُور چمکتی بجلی کی منعکس روشنی میں پل بھر کو چمکیں اور پھر دوبارہ گھٹا
پ اندھیرا چھا گیا۔ میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹا اور پل بھر میں میری کن پٹی سے ہوتا ہوا کان
ے پیچھے سے لو تک پہنچ گیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا لیکن چٹان خالی پڑی

تھی۔ وہ میرا واہمہ تھا، یا وہ وہی تھا؟ میں نے کچھ دیر وہیں رُک کر سانس بحال کی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا درگاہ کے احاطے تک پہنچ گیا۔ اصغر صاحب کے کمرے کی لالٹین جل رہی تھی اور روشنی ملگجے شیشوں سے باہر صحن میں جھلک رہی تھی۔ میں نے پہلے آگے بڑھ جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے اتنی رات کو وہ کیوں بیدار ہیں، اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اُن کی آواز اُبھری ''آجاؤ عبداللہ میاں..... دروازہ کھلا ہے.....'' میں اندر داخل ہو گیا۔

''آپ ابھی تک سوئے نہیں.....؟..... اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ باہر دروازے پر میں ہی ہوں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائے ''یہاں اور کون آئے گا بھلا اس آدھی رات کے وقت؟..... وہ شیطان کا چیلا تو اس احاطے میں آ نہیں سکتا کیونکہ بقول اُس کے یہاں مدفون نیک بزرگ کی وجہ سے اُس کی اس احاطے میں بندش ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا تم ہی ہو سکتے ہو۔ کیسی رہی تمہاری دعوت؟ بھئی یہ کریم خان صاحب کی حویلی والے تو تم پر بہت مہربان لگتے ہیں۔ ذرا دھیان رکھنا، کہیں تمہارے لیے کوئی بیڑیاں نہ تیار کر رکھی ہوں.....''

میں اُن کا اشارہ سمجھ کر ہنس دیا ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... وہ جانتے ہیں میں پہلے ہی اپنا آپ بندھوا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔'' پھر میں نے انہیں راستے میں ہوئے ماجرے اور اُن جلتی انگارہ آنکھوں کا سارا حال بھی سنا ڈالا۔ اصغر صاحب میری بات سن کر بے حد متفکر ہو گئے۔

''یہ ضرور وہی ہوگا..... لیکن وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے.....؟ عبداللہ میاں تمہیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے..... وہ بہت خطرناک مخلوق ہے.....'' میں نے کچھ سوچ کر کہا ''لیکن آپ نے اپنی پوری داستان مجھے سنائی ہے..... اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہو۔ آپ سے بھی دوستی کے لیے اُس نے پہلے آپ سے اجازت لی۔ خود کو آپ پر طاری کرنے کی کوشش نہیں کی..... اور پھر اگر اُسے مجھے نقصان ہی پہنچانا ہوتا تو وہ میرے جبل پور کے سفر کے دوران ٹرین میں میری بے خبری میں بھی مجھ پر وار کر کے مجھے پہنچا سکتا تھا۔ پھر اُس کے لیے اس قدر انتظار کیوں.....؟''

''ہاں..... یہی بات تو سمجھ نہیں آ رہی۔ بہرحال مجھے نہ جانے کیوں ایک دم ہی بہت فکر ہونے لگی ہے تمہاری۔'' میں نے انہیں تسلی دی کہ میں محتاط رہوں گا لیکن نہ جانے کیوں میں

اندر سے بہت بے چین تھا۔ میرے لبوں پر وہ سوال آ ہی گیا جو میں اصغر صاحب سے
ہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ پا رہا تھا۔ ''لیکن آپ نے کیا یہ سوچا ہے کہ وہ آپ کو کس آگ میں
نکنے جا رہا ہے۔ کسی انسان کا قتل معمولی بات تو نہیں..... پوری انسانیت کا قتل ہے..... کیا
پ یہ بھیانک جرم کر پائیں گے۔'' اصغر صاحب نے میری بات سن کر لمبا سا سانس لیا۔
ٹھیک کہتے ہو..... لیکن جب انسان خود ہر پل مر رہا ہو، اذیت سے اپنا آپ قتل ہوتا ہوا
وس کرتا ہو تو پھر ایسے میں ایسا ایک قتل اُسے بہت آسان لگنے لگتا ہے۔ میں یہ آخری جرم
رنے کے بعد جس عذاب سے نجات پا لوں گا اس کا اندازہ لگانا بھی محال ہے۔ مجھے اُس
تناہی عذاب کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے اس آخری عذاب سے گزرنا ہی
گا۔ کیونکہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ یہی میرے معاہدے کی آخری شق اور آخری
رط ہے۔''

میں اصغر صاحب کو اُسی سوچ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ رات ڈھلنے ہی والی
ی۔ لہٰذا میں نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور یونہی بستر پر لیٹ کر کروٹیں لینے لگا اور پھر
بھی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ چھلاوے کے اختیارات اُس
ل حد بھی مقرر ہو اور اُسے بھی اپنی کچھ خواہشات سرانجام دینے کے لیے کسی انسانی جسم کی
رورت پڑتی ہو۔ تبھی وہ اصغر صاحب سے یہ قتل کروانا چاہتا ہے؟..... لیکن کس کا قتل.....''
ر پھر تبھی میرے ذہن میں اس جان لیوا خیال کا دوسرا جھماکا ہوا۔

''کہیں وہ مستقبل کا مجوزہ مقتول میں خود ہی تو نہیں.....؟..... اصغر صاحب کو کہیں وہ
چھلاوہ میرے ہی قتل کا حکم تو نہیں دینے والا.....؟..... اور کیا پتا حکم دیا بھی جا چکا ہو اور اب
صرف صحیح وقت پر عمل پیرا ہونا ہی باقی نہ رہ گیا ہو.....؟''

پھر وہی محبت

جانے وہ کیسا خیال تھا کہ اُس نے میرے ذہن میں کچھ یوں جڑ پکڑی کہ میں پھر دن چڑھے تک اُسی سوچ کے تانے بانوں میں اُلجھا رہا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اس قدر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھے جا کر اصغر صاحب سے ہی پوچھ لینا چاہیے کہ اگر میں ہی اُس چھلاوے کا مرکوزِ نظر ہوں تو پھر دیر کیسی؟..... لیکن نہ جانے کیوں میں ہر بار پوچھتے پوچھتے رُک جاتا۔ دو دن اِسی اُدھیڑ بن میں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن اصغر صاحب صبح کی کوسی دھوپ سینکنے کے لیے انگور کی بیلوں کے سامنے دریوں پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے نہ جانے کس سوچوں میں گم تھے، میں دُور کھڑا پرندوں کو دانہ ڈالتے ہوئے کن اکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا کہ انسان کو قسمت کیا کیا روپ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے زندگی میں قاتل تو بہت دیکھے تھے لیکن ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا جو اگلے چند روز میں قاتل بننے جا رہا ہو۔ اتنے میں نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کا مخصوص بھونپو بجا۔ میں چونکا کیوں کہ آج نہ تو جمعرات تھی اور نہ ہی حویلی میں سے کسی مکین کے آنے کا کوئی امکان تھا۔ میں نے درگاہ کی دیوار سے نیچے دیکھا تو لاریب اپنے وجود کو بڑی سی کالی چادر میں لپٹے تانگے سے اُترتی دکھائی دی۔ کرم دین حسب معمول اپنی بڑی سی ڈانگ سنبھالے اپنی چھوٹی بی بی کے آگے آگے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ لاریب.....؟ آج.....؟ یہاں.....؟ اور اس طرح اچانک.....؟..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ کچھ ہی دیر میں درگاہ کے احاطے تک پہنچ گئی اور اُس نے صحن میں کھڑے کھڑے ہی دعا کر کے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب چلی آئی۔ دھوپ اور اُونچائی پر چڑھنے کی وجہ سے اُس کا گلابی چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اُس کے ناک کا لونگ کسی سرخ یاقوت میں جڑا کوئی نگ لگ رہا تھا۔ پسینے کی چند ننھی منھی سی بوندیں اُس کی روشن جبیں پر موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اُس کی سیاہ آنکھوں میں بیک وقت کچھ اُلجھن، کچھ بے چینی اور کچھ حیا کا عنصر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ یہاں تک آ تو گئی ہے لیکن اپنے سارے لفظ نیچے

گھاٹی میں چھوڑ آئی ہے۔ میں نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ ''کیوں لاریب بی بی..... کوئی سوال رہ گیا تھا کیا.....''

وہ بھی مسکرا دی۔ ''نہیں..... یہ تو میں نے اُسی دن بتا دیا تھا کہ آپ نے میرے سوالوں کی سرزمین کو کچھ ایسا سیراب کیا ہے کہ ہر تشنگی مٹا دی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اُس رات کے بعد میں خود ایک سوال بنتی جا رہی ہوں۔ ایک عجیب سی کسک، ایک اَن چاہی سی بے چینی ہے۔ میری رُوح مجھے کسی طرف ٹک کر بیٹھنے نہیں دی رہی۔ ایسے لگتا ہے جیسے میرے جسم کے پنجر میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔ اس کی اُڑان جانے کس سمت کی ہے۔ آج بہت بے چین ہوئی تو یہاں درگاہ پر تنہا ہی دعا کے لیے چلی آئی۔ امی کو میں نے خود اپنے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔ ویسے بھی رات سے اُن کی طبیعت کچھ بھاری سی تھی، لیکن نہ جانے کیوں میں تنہا ہی یہاں آنا چاہتی تھی۔ حالانکہ خان جی کو میرا یوں کہیں تنہا آنا جانا پسند نہیں ہے۔ لیکن میں نے اُن سے بھی کسی طور اجازت لے ہی لی۔ پر اب یہاں آ کر میں پھر اُسی شش و پنج میں ہوں کہ میں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہوں.....؟ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟ میں نے غور سے اُس کی جانب دیکھا وہ اپنی بات پوری کرتے کرتے ہانپنے سی لگ گئی تھی۔ جیسے اپنے اندر چلتی کش مکش کو جلد از جلد مجھ پر عیاں کرنا چاہتی ہو۔

''ایسا ہم سب کے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ یہ کوئی انہونی تو نہیں ہے۔ آپ نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنی آئندہ زندگی کے لیے کوئی راہ چننی ہے..... کبھی کبھی ہم سبھی اس درمیانی دور میں یہ خالی پن محسوس کرتے ہیں۔ منزل کا نشان ملنے تک ایسے دور زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کے اندر کی کھوج آپ کو بے چین رکھتی ہے اور بظاہر سامنے کوئی سنگ میل تک نظر نہ آنے کی وجہ سے ہم اُکتانے لگتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے باقی سب کی طرح آپ کا بھی یہ دور عارضی اور چند روزہ ہوگا۔'' وہ کچھ دیر میری جانب دیکھتی رہی۔ ''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ حویلی جلد چکر لگائیے گا۔ خاں جی اور امی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔''

وہ مجھ سے رُخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ اُس کے جانے کے بعد اصغر صاحب اُٹھ کر میری جانب آ گئے۔ انہوں نے لاریب کو درگاہ کے احاطے سے نکلتے دیکھ کر کہا ''یہ کریم خان صاحب کی بیٹی تھی نا..... کیا کہہ رہی تھی۔''

''کچھ نہیں.....بس دعا مانگنے کے لیے آئی تھی۔''

اصغر صاحب نے میری جانب غور سے دیکھا ''کیا تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، یا جان بوجھ کر انجان بننا چاہ رہے ہو۔''

میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ''میں کچھ سمجھا نہیں..... میں نے کیا محسوس نہیں کیا.....؟'' اصغر صاحب نے لاریب کی راہ گزر پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ ابھی تک درگاہ میں ہی موجود ہو، حالانکہ اُسے نکلے دیر ہو چکی تھی۔ ''یہ لڑکی تم سے محبت کرنے لگی ہے عبداللہ میاں..... حیرت ہے تمہیں اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہوا۔ حالانکہ کوئی اندھا بھی اس کی حالت دیکھ کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ اُس کے دل میں تیر گڑھ چکا ہے.....تمہاری محبت کا اندھا تیر.....''

میں اصغر صاحب کی بات سن کر یوں ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے اُنہوں نے زبان سے بات نہیں، اپنی پٹاری سے کوئی سنپولیا نکال کر میری جانب اُچھال دیا ہو۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے..... ایسا نہیں ہو سکتا..... وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔''

اصغر صاحب میری بات سن کر یوں مسکرائے جیسے کوئی کسی بچے کے منہ سے کوئی معصومانہ سی بات سن کر مسکراتا ہے۔ ''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟ تم کسی اور سے محبت کرتے ہو، اس بات سے اُس کے دل میں جنم لینے والے کسی جذبے کا کیا تعلق ہے؟ یاد رکھو.....محبت ہم بے بس انسانوں کا کچھ اِسی طرح پیچھا کرتی رہتی ہے جیسے کسی گھنے اندھیرے جنگل میں چلایا ہوا کسی ظالم شکاری کا اندھا تیر اپنی زد میں آئے ہوئے کسی معصوم غزال کا پیچھا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہم بھولے بھالے انسان بھی اُسی سیدھ میں بھاگنے کی کوشش کرتے جس طرح وہ بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں والا غزال بنا دائیں بائیں مڑے بس سیدھا ہی بھاگ اُٹھتا ہے، لیکن تیر کی رفتار سے جیت نہیں پاتا اور آخرکار اپنی شہ رگ میں وہ تیز خنجر جیسا تیر پیوست کروا کر وہیں کسی گہری کھائی میں گر کر دم توڑ دیتا ہے۔ مرنے سے کچھ لمحے پہلے خون کا آخری تیز فوارہ اُس کی شہ رگ سے چھوٹتا ہے اور وہ غزال اپنی رُوح نکلنے کی تڑپ میں اپنے پیر پتھریلی چٹان پر بے تابی سے رگڑتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح آج یہ لڑکی بھی اپنی ایڑھیاں رگڑنے اس پتھریلی درگاہ پر آئی تھی۔ اُس کی شہ رگ سے گرم خون کا آخری فوارہ جاری ہو چکا ہے۔ اور اُس

ی رُوح دھیرے دھیرے نکل رہی ہے..... اب دیکھو کب.....''

میں نے چلا کر اُن کی بات کاٹ دی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... وہ بہت معصوم ہے..... میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے ایسی کوئی بھی اذیت کبھی بھی اُسے پہنچے..... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... وہ جان بوجھ کر اس آگ میں نہیں کود سکتی.....''

لیکن اصغر صاحب کا سفاک لہجہ اُسی طرح میری سماعت میں برچھیاں گھونپتا رہا۔

''میں نے کہا نا، اس میں تمہارا، یا اُس معصوم لڑکی کا کوئی قصور نہیں..... خطاوار تو صرف محبت ہے..... ہاں..... وہی محبت کا اندھا تیر..... جس کو چلانے والے ہاتھ اور کمان سے شست باندھنے والی آنکھ اس بے رحم تقدیر کی ہوتی ہے جس پر ہمارا اختیار بھی نہیں چلتا.....''

میں اب بھی اُلجھن میں تھا۔

''لیکن..... لیکن آپ یہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں.....''

'' کچھ باتیں جاننے کے لیے کسی خاص تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میں اس لیے بھی پُر یقین ہوں کہ پچھلے ایک سال میں میں نے چہرے پڑھنا خوب اچھی طرح سیکھا ہے۔ اس لڑکی کا چہرہ تو ویسے بھی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ تم شاید اپنی آنکھوں پر اس خاندان کے احترام کی بندھی پٹی کی وجہ سے اُس کا چہرہ پڑھ نہیں سکے، یا پھر تم نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ چونکہ وہ تمہاری کہانی سے آگاہ ہے لہٰذا اُس کا دل تمہاری جانب مائل نہیں ہوگا۔ عبداللہ میاں..... یہ لڑکیاں من کی بالکل کچی گریاں ہوتی ہیں۔ ذرا سے دباؤ سے چٹخ جانے والی اور پھر کبھی نہ جڑنے والی گریاں..... اس لڑکی کا کومل من بھی کہیں نہ کہیں سے چٹخ گیا ہے..... اب اس کے دل کی نازک اور کچی گری کو سوکھنے اور برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا..... وہ خود بھی نہیں.....''

اصغر صاحب میرے اُوپر بجلیاں گرکر واپس اندر اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔ لیکن مجھے نہ باہر کا چھوڑ گئے اور نہ ہی میں اپنے اندر چھپنے کی کوئی جگہ پا رہا تھا۔ کاش انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف اور صرف اُن کا ایک اندازہ ہو اور ایسا کوئی بھی طوفان لاریب کے اندر نہ پنپ رہا ہو۔ اُس کی ہنسی سے تو اُس کی حویلی ہی کیا پورا جبل پور ہی سدا روشن رہتا تھا۔ وہ اور اُس کی معصوم شرارتیں تو اُس کے ماں باپ کی سانسیں بڑھانے کا باعث تھیں۔ اپنی اس چھوٹی

مالکن کی مسکراہٹ اور کلکاریاں ہی تو حویلی کے سبھی نوکروں کا خون بڑھاتی تھیں۔ ایسی زند لڑکی کو محبت کا منحوس گہن لگ جائے..... نہیں نہیں..... اس سے پہلے خود مجھے اپنا وجود لے کر یہاں سے کہیں دُور چلا جانا چاہیے..... لیکن..... میں جاؤں بھی تو کہاں..... یہ سلطان بابا بھی مجھے یہاں بھیج کر جیسے بھول ہی گئے ہیں۔ میں نے اُسی شام ساحل والی درگاہ کے نئے عبداللہ یعنی نعمان کو ایک تفصیلی خط لکھ ڈالا کہ جیسے بھی ہو وہ سلطان بابا تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اُن کا بے حد بے چینی سے یہاں جبل پور والی درگاہ پر انتظار کر رہا ہوں۔ میں وہ خط شام ہی کو پہنچے گاؤں میں پوسٹ ماسٹر صاحب کے حوالے کر آیا کہ اُسے کل کی ڈاک میں ضرور نکال دیں۔ رات بھر اِسی بے کلی میں بستر کی شکنیں بڑھاتا رہا لیکن اس سے کہیں زیادہ شکنیں میری منہ زور سوچ میرے ماتھے پر ڈالتی رہی۔

کہتے ہیں خدشے اور وسوسے حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو رفتہ رفتہ حقیقت کا روپ دھارنے لگ جاتے ہیں۔ اگلے دن خان صاحب نے بشیرے کے ہاتھ پیغام بھجوا دیا کہ درگاہ کی سالانہ زکوٰۃ بٹائی کا وقت ہو چلا ہے لہٰذا میں سہ پہر تک آ کر اُن سے سارے پیسے، مستحقین کی فہرست اور پتے اور تقسیم کا طریقہ کار وغیرہ جمع کرتا جاؤں تاکہ اگلے دن سے یہ کام شروع کیا جا سکے۔ میں سہ پہر کو وہاں پہنچا اور ہم شام پانچ بجے تک سارا طریقہ کار طے کر چکے تھے۔ خان صاحب کے کچھ مہمان بھی آ گئے تھے لہٰذا میں اُن سے اجازت لے کر واپسی کے لیے باہر نکل آیا۔ بشیرے کو میں نے تانگا نکالنے کا کہا۔ آج میں مردانے میں خان صاحب کے ساتھ بیرونی ڈیوڑھی کے مہمان خانے میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ لہٰذا ایک بار جی میں آیا کہ کرم دین سے کہلوا کر اندر بڑی مالکن کو سلام بھجوا دوں۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے خود کو روک لیا اور پلٹ کر تانگے کی طرف چل دیا۔ لیکن ابھی میرا ایک پاؤں تانگے کی پچھلی سیٹ کے پائیدان پر ہی تھا کہ لاریب نہایت عجلت میں اندر سے نکل کر ہماری جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اتنی بدحواس سی تھی کہ ٹھیک طرح سے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دے پائی۔ ''آپ جا رہے ہیں.....؟ امی سے نہیں ملیں گے.....؟ میرا مطلب ہے یوں اچانک.....؟ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ حویلی آئے ہیں تو سب سے مل کر جائیں گے.....''

''جی خان صاحب نے کچھ کام دیئے ہیں سوچا پہلے اُن کو نپٹا لوں تو پھر بڑی مالکن کی

خدمت میں بھی سلام عرض کرنے آ جاؤں گا..... بہرحال آپ میری جانب سے اُنہیں آداب ضرور کہہ دیجیے گا۔"

وہ کچھ بے چین سی تھی۔ "آپ پھر کب آئیں گے.....؟ میرا مطلب ہے مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں..... لیکن نہ جانے جب کبھی موقع ملتا ہے تو ذہن میں سب کچھ اُتھل پتھل سا کیوں ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے جانے کے بعد خود کو کوستی رہتی ہوں کہ آپ سے ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر پائی۔ اُس روز اتنی دُور چل کر درگاہ بھی آئی لیکن وہاں بھی بات اُدھوری ہی رہی....."

لاریب جب بے چین سی، بار بار اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی اور اپنی نازک سی کلائی میں پڑا ہوا وہ سنہری کڑا بار بار گھما رہی تھی تو نہ جانے مجھے اس میں وہ پہلی ملاقات والی لاریب کہیں بھی جھلکتی نظر نہیں آئی۔ یہ تو کوئی اور لاریب تھی جس کی ہنسی کی جڑوں میں محبت کا دیمک اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اُس کے گلابی رنگت میں محبت کا نیلا زہر دھیرے دھیرے شامل ہوتا جا رہا تھا اور اُس کی نسوں میں بہتے سرخ خون میں عشق نامی زہریلے مادے کی سورج مکھی جیسی زرد رنگت کی ملاوٹ اب اُس لڑکی کے چہرے سے جھلکنے لگی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا لوں اور اُسے شہتوت کے درختوں والی اس جھرنا بہتی سڑک کے کسی پُرسکون کنارے لے جا کر اُس سے صرف اتنا کہوں کہ "دیکھو..... یہ زندگی ہے..... یہ تم ہو..... اپنے اندر کی اس پُرشور بہتے جھرنے جیسی زندگی کو کسی بھی ایسے جذبے کے نام گروی مت رکھ دینا کہ تمہارے اندر بہتی جیتی جاگتی زندگی کے سوتے ہی خشک ہو جائیں۔" لیکن میں اُسے یہ سب کہہ نہ سکا اور میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔ "آپ جب بھی چاہیں مجھے طلب کر سکتی ہیں۔ درگاہ اتنی دُور تو نہیں..... اور پھر میں کم از کم آپ سے ہمیشہ یہی توقع رکھتا ہوں کہ آپ اپنی کسی بھی ذہنی اُلجھن کو دل میں دبائے نہیں رکھیں گی..... اور جب بھی آپ کا من چاہے گا آپ اُسے بانٹ لیں گی..... یا ابھی تک آپ نے مجھے صرف مہمانوں کی فہرست میں ہی سجا رکھا ہے.....؟"

میری بات سن کر اُس کے چہرے پر چھائے فکر کے بادل کچھ حد تک چھٹ گئے اور وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے گھنی بدلیوں کی اوٹ سے سورج نے

جھلک دکھلائی ہو۔ ''نہیں..... مہمانوں کی فہرست سے تو میں کب کا آپ کو نکال چکی۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔ کیا میری کبھی زہرا سے ملاقات ہوسکتی ہے؟ میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ جانے وہ کیسی ہوں گی.....؟ جن کی ایک جھلک نے ہی آپ کی زندگی بدل دی..... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا کوئی اپنے اندر ایسا اثر بھی رکھتا ہے کہ پل بھر میں کایا پلٹ دے..... کیا آپ اُن سے مجھے کبھی ملوائیں گے.....''

مجھے اُس کے بھولے پن پر ہنسی آ گئی۔ ''ضرور ملواؤں گا..... اور ایک بات یاد رکھیے گا کہ ہم میں سے ہر ایک کے مقدر میں ایسی ایک نظر ضرور ہوتی ہے جو ہماری کایا پلٹ کر رکھ دے۔ اب یہ ہماری اپنی کوتاہ نظری ہے اگر ہم اپنے نصیب کی اس ایک نظر کو بھی برت نہ سکیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ خود ہماری اپنی نظر بھی کسی نہ کسی اور کے لیے ویسی ہی تاثیر رکھتی ہے۔ کون جانے ہم خود کس لمحے کس کی زندگی بدل رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں خود بھی اس کی خبر نہیں ہو پاتی..... شاید نظر کا یہ سارا کھیل ہی آنکھ مچولی کا ہے۔''

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ جانے وہ میرے لفظوں کے درپردہ معنی تک پہنچ سکی، یا نہیں لیکن اتنے میں اندر سے بڑی مالکن کا لاریب کے لیے بلاوہ آ گیا۔ خود مجھے بھی اُس کا یوں اتنی دیر تک بیرونی ڈیوڑھی میں کھڑے رہنا کچھ بہتر نہیں لگ رہا تھا۔ وہ واپسی کے لیے پلٹنے سے قبل چند لمحوں کے لیے رُکی ''آپ ٹھیک کہتے ہیں..... لیکن کیا یہ بھی ہماری بدنصیبی نہیں ہوتی کہ نظر کے اس پورے کھیل میں قدرت سارے کے سارے پتے اپنے پاس ہی رکھتی ہے..... اور خود ہم نظر کو سہنے، یا نظر ڈالنے والوں کی حیثیت صرف ایک تماشائی کی سی ہوتی ہے..... نہ تو اپنے مقدر کی نظر کو برتنا ہمارے اپنے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی اور کے نصیب میں لکھی ہماری اپنی نظر کو ہم روک سکتے ہیں..... ہمیں ہوش تب آتا ہے جب ہم اپنا سب کچھ لٹا چکے ہوتے ہیں، یا پھر خود کسی کے مقدر کے قزاق بن کر اُسے لوٹ لیتے ہیں..... آپ کے پاس پھر کبھی وقت ہوا تو ہم اس موضوع پر دوبارہ بات ضرور کریں گے.....'' وہ خدا حافظ کہہ کر پلٹ کر چل دی۔ شیرے نے بھی تانگے کو ایڑھ لگا دی اور دُور ہوتی حویلی کے اُونچے بُرج بھی رفتہ رفتہ دُھندلے پڑنے لگے لیکن مجھے اصغر صاحب کی کہی باتیں یاد آنے لگیں۔ مجھے اِن جذبوں کی طاقت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ کیا یہ جذبے اتنے منہ زور بھی ہو سکتے

ہیں کہ ہمارے خون میں شامل ہو کر ہمارے اندر کو بھی تہس نہس کر دیں؟ ہمارے اندر کی طبعی حالت کو ہی بدل کر رکھ دیں؟ ہماری شخصیت کے رُخ پلٹ دیں؟ کیا ان جذبوں کی اپنی بھی کوئی کیمیائی تاثیر ہوتی ہے جو پل بھر میں ہمیں بخار میں پھنکا دیتی ہے اور سخت گرمی میں میں ہم سرد ہو کر لرزنے لگتے ہیں؟

اگلے دو دن اِسی کش مکش میں گزر گئے۔ تیسرے دن صبح سویرے ڈاکیے کی سائیکل کی مخصوص گھنٹی نیچے بجتی سنائی دی۔ مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی کیوں کہ ابھی دو دن پہلے ہی میں نے عبداللہ میاں کو تفصیلی خط لکھا تھا لیکن اس کا جواب دو ہفتے سے پہلے ملنے کی اُمید نہیں تھی کیوں کہ اس دُور دراز علاقے میں ڈاک کا نظام اس قدر تیز رفتار نہیں تھا کہ کوریئر سروس کی طرح دوسرے ہی دن ڈاک ملک کے کسی بھی کونے میں پہنچا دے۔ تو پھر یہ خط کس کا آیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاک بابو اُوپر آ پہنچا۔ خط میرا ہی تھا اور مجھ سے پہلے والے عبداللہ کی جانب سے تھا۔ اُس نے اپنی اور سلطان بابا کی خیریت سے آگاہ کیا تھا اور میرے لیے خوش خبری یہ تھی کہ سلطان بابا کا کچھ دنوں میں جبل پور آنے کا ارادہ تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے نعمان کو خط لکھ کر جس خواہش کا اظہار کیا تھا قدرت نے ساحلی درگاہ پر میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ دعا قبول کر لی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ سلطان بابا کے آتے ہی اُن سے اجازت لے کر جبل پور سے کہیں آگے نکل جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ لاریب کے اندر کی بے چینی کوئی واضح رُخ اختیار کرے۔ مجھے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا ہی بہتر لگ رہا تھا۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے زہرا بہت ٹوٹ کر یاد آئی اور مجھے لمبے سفر میں شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دراصل مجھے اب ڈر لگنے لگا تھا۔ سنٹرل جیل میں سکندر کی پھانسی سے لے کر یاقوط کے ہتھیار ڈالنے تک میں نے اس محبت نامی جذبے کی تباہ کاریاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور پھر میں تو خود اس منہ زور جذبے کی اندھی طاقت کا ایک چلتا پھرتا ثبوت تھا۔ لیکن میں اب یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور معصوم اس آتشی جذبے کے تیزاب کی زد میں آ کر اپنا آپ جھلسا ڈالے۔ لیکن بات اگر صرف ہمارے چاہنے اور نہ چاہنے کی ہی ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ یہاں تو ہر فیصلہ پہلے ہی سے طے شدہ اور ایک لفافے میں مہر بند ہمیں ملتا تھا۔

اصغر صاحب اس روز صبح سویرے ہی اُٹھ کر کہیں نکل چکے تھے۔ جب ڈاکیے نے مجھے

خط دیا تو اُس وقت میں درگاہ میں اکیلا ہی تھا۔ لیکن آج میں نے طے کیا تھا کہ اصغر صاحب کی واپسی پر اُن سے اُن کی اس ''پُراسرار'' آوارہ گردی کا راز ضرور پوچھوں گا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چھلاوہ اُن سے دن کی روشنی میں کم ہی ملتا ہے اور زیادہ تر وہ شام کے بعد ہی اُن پر واضح ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کی اس یاترا کا مقصد کچھ اور ہی ہوسکتا ہے۔

لیکن اس روز وہ نہ جانے کہاں نکل گئے تھے کہ پہلے دوپہر اور پھر عصر کا وقت بھی گزر گیا لیکن اُن کی واپسی نہ ہوئی۔ عصر کے بعد آسمان پر اُڑتے بادلوں نے گلے ملنا شروع کر دیا اور کچھ ہی پلوں میں سب ہی کے درمیان سازش ہونے لگی کہ کس غریب کی کچی چھت پر برس کر اُسے ستایا جائے۔ بادلوں کے درمیان ہوتی سرگوشیاں آہستہ آہستہ بلند آواز بحث میں تبدیل ہونے لگیں اور اس گڑگڑاہٹ کی آواز نیچے ہم زمین والوں تک بھی پہنچنے لگی۔ موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے اور فی الحال اصغر صاحب کا دُور دُور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ ذرا سی دیر میں ہلکی ہلکی بوندا باندی اور تیز ہوا کے جھکڑوں نے درگاہ کے صحن میں پڑے پتوں کی چادر کو اس طرح لہرانا شروع کیا جیسے کوئی کابلی پٹھان اپنی گٹھڑی میں سے رنگین کپڑوں کے تھان کھول کھول کر نمائش کے لیے ہوا میں لہرا رہا ہو۔ میں نے درگاہ کی منڈیر سے نیچے گھاٹی میں جھانکا۔ گاؤں کی طرف سے آتی سڑک سنسان پڑی تھی۔ لیکن پھر دُور ہی سے کسی تانگے کے گھنگروں کی جھنکار سنائی دینے لگی اور کچھ لمحوں میں ہی سواری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ بشیرے کا تانگا نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ گاؤں سے ذرا پرے ایک اور بستی میں بھی چند تانگے سواریاں لاتے لے جاتے رہتے تھے یہ شاید اُن ہی میں سے کوئی ایک تانگا ہوگا۔ میں نے یہ سوچ کر اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ ضرور اصغر صاحب اِسی تانگے میں آ رہے ہوں گے۔ چلو اچھا ہے۔ شام ڈھلنے سے پہلے اور اندھیرا ہونے سے پہلے وہ اپنے ٹھکانے پر لوٹ آئے تھے۔ نہ جانے چند ہی دنوں میں اُن کے ساتھ کیسا عجیب سا رشتہ بن گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود مجھے بتا چکے تھے کہ وہ کتنے خطرناک ارادے سے اس درگاہ پر قیام پذیر تھے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے اُن سے کبھی بھی خوف محسوس نہیں ہوا حالانکہ اُن کے اس جان لیوا ارادے کا شکار میں خود بھی ہوسکتا تھا۔

لیکن میرا اطمینان عارضی ہی ثابت ہوا۔ تانگے سے کوئی اور شخص اُترا اور پھر تانگے

لے سے راہ پوچھ کر اُوپر درگاہ کی پتھریلی ڈگر پر چڑھنے لگا۔ میں شش و پنج میں وہیں منڈیر پر
ھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے اپنے ساتھ ٹھنڈی برچھیوں جیسی بوندوں کی
غات لیے اُس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ اُوپر پہنچ
یا۔ اُس نے دُور ہی سے مجھے سلام کیا اور قریب آ کر بولا۔

''جناب میرا نام حوالدار اکرم ہے۔ جبل پور پولیس تھانہ کا محرر بھی میں ہی ہوں۔''

''جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' مجھے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ پولیس کا
ں درگاہ پر بھلا کیا کام؟ اُس نے اپنی بیلٹ کسی۔

''آپ کا نام ہی عبداللہ ہے۔''

''جی..... میں عبداللہ ہوں۔''

''آپ کو میرے ساتھ ذرا تھانے تک چلنا ہوگا، نیچے کوئی خون ہو گیا ہے۔''

خون.....؟؟ اچانک ہی مجھے یوں لگنے لگا جیسے ساری درگاہ ہی گھوم رہی ہو۔ اچانک ہی
ے اصغر صاحب کی لمبی غیر حاضری اور اُن کے آخری جرم کے ارتکاب کے خیال نے آ گھیرا۔
کہیں چھلاوے کا آخری حکم حقیقت کا روپ تو نہیں دھار چکا تھا۔

پہلی رہائی

میں نے گھبرا کر حوالدار سے پوچھا ''خون..... لیکن کس کا.....؟ اور آپ کو میرے پاس کس نے بھیجا ہے۔'' ''پتا نہیں جناب..... تھانے دار صاحب نے بھیجا ہے۔ جبل پور سے پچھلے اسٹیشن پر ایک لاش ملی ہے کسی پکی عمر کے شخص کی۔ یہاں گاؤں میں تو کوئی شناخت نہیں کر پایا تو تھانے دار نے یہاں بھجوا دیا کہ آپ کو بھی بلا لاؤں .....شاید آپ کی شناخت کا ہو وہ بندہ.....؟''

پکی عمر کے شخص کی لاش..... یا میرے خدا..... میں نے جلدی سے اپنے کمرے میں پڑی اپنی شال اپنے کاندھوں پر ڈالی اور حوالدار کے ساتھ چل پڑا۔ سارے راستے میرے ذہن و دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جنم لیتے رہے اور میں خدا سے اپنے خدشات کو حقیقت میں نہ بدلنے کی التجا کرتا رہا۔ ہم جبل پور گاؤں کے باہر ہی سے آگے بڑھ گئے۔ جبل پور سے پہلے قادر پور کا ریلوے اسٹیشن آتا تھا جو جبل پور سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ آدھے راستے میں ہی موسلا دھار بارش نے ہمیں آ گھیرا اور ہم نیم پختہ سڑک پر دوڑتے اور کیچڑ کے چھینٹے اُڑاتے تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے بارش کی بوچھاڑ سہتے ہوئے جب اسٹیشن پہنچے تو مغرب کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پیٹرومیکس کے بڑے بڑے لیمپ روشن کر دیئے گئے تھے جن کی پیلی روشنی میں برستی بارش کے قطرے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے آتش بازی والے کسی انار کو اندھیرے میں چلانے کے بعد اُس میں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔

ایک جانب کچھ پولیس والوں اور گاؤں کے چند بڑے بوڑھوں کا ہجوم سا لگا ہوا تھا۔ پولیس والے لمبے لمبے خاکی گرم اوورکوٹوں میں ملبوس تھے اور ایک سپاہی کسی افسر کے لیے چھتری تانے کھڑا تھا۔ شاید یہ ہی قادر پور کا تھانے دار تھا۔ ہم دونوں بھی اُسی کی جانب بڑھ گئے۔ ہمیں اپنی جانب آتے دیکھ کر بھیڑ یوں چھٹی جیسے چیونٹیوں کا کوئی جم گھٹا پانی کی تیز لہر اپنے درمیان سے گزرتے پا کر چاروں جانب چھٹ جاتا ہے۔ نیچے پلیٹ فارم کی زمین پر کسی

لاش پر کپڑا ڈال کر اُس کا بدن چھپا دیا گیا تھا۔ چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے ہاتھ ملایا ''تو تم ہو جبل پور کی درگاہ کے نئے مجاور..... لیکن تم تو کافی کم عمر ہو.....؟..... خان صاحب سے ایک بار تمہارا ذکر سنا تھا۔ اس برستے موسم میں تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ آج صبح منہ اندھیرے یہاں ایک لاش ملی ہے۔ زخم گہرا ہے اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات ہے۔ ڈاکو اسے لوٹنے کی نیت سے آیا ہوگا اور مزاحمت پر چھرا گھونپ کر مال لوٹ کر لے گیا۔ لیکن اس شخص کی شناخت مشکل ہوگئی ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو تین چار نسلوں سے جانتے ہیں لہٰذا یہ بات تو پکی ہے کہ مقتول اس علاقے کا نہیں ہے۔ ہم نے پنچ نامہ تو کر لیا ہے لیکن لاش اُٹھانے سے پہلے سوچا کہ ایک بار تم سے بھی شناخت کروالیں کیونکہ بہت سے لوگ درگاہ کی زیارت کے لیے دُور دراز علاقوں سے بھی آتے ہیں جو سیدھے درگاہ جاتے ہیں منت مانگتے ہیں اور پھر دوسری گاڑی پکڑ کر واپس اپنے علاقے کو پلٹ جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے تم نے اسے پہلے درگاہ پر دیکھا ہو..... اس کا باقی سامان تو لوٹ لیا گیا ہے صرف اس کے پاس یہ پھولوں کے چند ہار ملے ہیں۔ میں نے تھانے دار کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر ڈالی تو چند کملائے باسی پھولوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پلیٹ فارم پر لگی لکڑی کے بنچ کے پاس پڑا ہوا تھا۔ جانے کیوں میرے اندر ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں کچھ چھن سے ٹوٹ سا گیا۔ جانے وہ بدقسمت پھول کس کی لحد پر بچھنے کی قسمت لے کر چلے تھے۔ کیا خریدنے والے کو یہ پتا تھا کہ یہ پھولوں کی چادر آخر کار اُسی کا نصیب ہوگی؟ لیکن پتا نہیں کیوں میں لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹانے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ تھانے دار نے میری مشکل آسان کر دی اور حوالدار کو اشارہ کیا جس نے آگے بڑھ کر چادر کھینچ لی۔ میں نے پلکیں موندھ لیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ مرنے والا واقعی درگاہ کا ایک پرانا زائر ہی تھا اور میں نے بھی ایک آدھ جمعرات کو اُسے وہاں آتے دیکھا تھا۔ میں نے سر ہلا کر تھانے دار کو تصدیق کر دی اور اپنا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ اس شخص نے درگاہ پر چندہ بھی دیا تھا اور اس کا نام پتا درگاہ کے رجسٹر میں درج تھا۔ تھانے دار نے حوالدار کو دوبارہ میرے ساتھ درگاہ تک جانے کا کہا اور ہاتھ ملا کر میرا شکریہ ادا کیا اور مجھ سے درخواست کی کہ اگر مجھے مقتول کے بارے میں مزید کوئی بات پتا چلے تو نام اور پتے کے ساتھ وہ تفصیل بھی ایک کاغذ پر درج کر

کے حوالدار کے حوالے کر دوں۔ میں اور حوالدار جب دوبارہ درگاہ پہنچے تو رات پوری طرح شام کی گردن میں اپنے تاریک پنجے گاڑھ چکی تھی۔ اندھیرے میں پہاڑی پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے پھر سے وہی کسی نادیدہ ہستی کے اپنے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا احساس ہوا۔ لیکن میں حوالدار کی وجہ سے سر جھٹک کر اُوپر چڑھتا گیا۔ درگاہ کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر اصغر صاحب کے کمرے کی جانب اُٹھی۔ اُن کے کمرے کی لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے حوالدار کو تمام تفصیلات ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیں اور اُسے رُخصت کر کے فوراً اصغر صاحب کے کمرے کی جانب لپکا۔

اصغر صاحب کافی نڈھال سے لگ رہے تھے۔ جیسے دن بھر کافی مشقت کاٹی ہو انہوں نے۔ میں نے اُن سے شکایت کی ''کہاں چلے گئے تھے آپ یوں بنا بتائے.....؟..... آپ جانتے ہیں میں کس قدر پریشان ہو گیا تھا.....''

اصغر صاحب مسکرائے ''معاف کرنا عبداللہ..... بس اچانک کام ہی کچھ ایسا پڑ گیا تھا۔ اس لیے بنا بتائے صبح سویرے مجھے نکلنا پڑ گیا..... میں نے اتنی صبح تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''لیکن آپ گئے کہاں تھے۔''

اصغر صاحب نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ''کہیں نہیں..... جبل پور سے آگے ایک اور اسٹیشن ہے..... قادر پور..... بس وہیں تک گیا تھا کسی شخص سے ملنا تھا پر وہ ملا نہیں.....''

میں قادر پور کا نام سن کر زور سے چونکا۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات اصغر صاحب نے بھی محسوس کر لیے۔ ''کیوں کیا ہوا..... تم اتنے حیران اور ایک دم ہی پریشان کیوں ہو گئے ہو.....؟ سب خیر تو ہے نا.....''

میں نے مشکوک نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے قادر پور کے لیے نکلے تھے اور صبح سویرے ہی قادر پور کے ریلوے پلیٹ فارم پر ایک قتل ہو گیا..... کہیں یہ قتل.....؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکا۔ اصغر صاحب نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ''کیا ہوا.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟''

میں نے انہیں شام کی ساری داستان، حوالدار کے آنے سے لے کر میرے قادر پور

جانے اور لاش کی شناخت تک کے تمام مراحل سنا دیئے۔ وہ بھی حیران سے رہ گئے۔

''اوہ..... یہ تو واقعی بڑے افسوس کی بات ہے..... جانے وہ بے چارہ کون تھا.....'' وہ بولتے بولتے اچانک چپ سے ہو گئے۔ ''ٹھہرو..... کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ خون میں نے کیا ہے.....؟..... یقین مانو اس جرم میں میرا کوئی عمل دخل نہیں..... میں تو اسٹیشن کی طرف گیا بھی نہیں.....''

مجھے اُن کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ ویسے بھی آج تک انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ پتا نہیں کیسے ٹھیک اُسی وقت میرے دل میں بہت دنوں کی چھپی بات میرے لبوں پر آ گئی۔ ''کیا آپ کو چھلاوے نے اُس شخص کا نام نہیں بتایا جس کو وہ آپ کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہے..... کہیں وہ میں تو نہیں.....؟''

اب اُچھلنے کی باری اصغر صاحب کی تھی ''کیا.....؟..... نہیں نہیں..... باخدا ایسا کچھ نہیں..... ویسے تو اُس نے مجھے اُس شخص کا نام نہیں بتایا۔ لیکن وہ جو کوئی بھی ہے اُس کا خاتمہ مجھے درگاہ سے باہر کسی مقام پر کرنا ہوگا۔ اُس کا ٹھکانہ یہ درگاہ نہیں ہوگی..... اور یقین کرو کہ اگر مجھے یہ پتا چلتا کہ مجھے اپنی آزادی کے لیے تمہاری جان لینی ہوگی تو میں اُسی پل خود اپنی جان لے لیتا۔ میں بہت بڑا گناہ گار صحیح..... لیکن کچھ گناہ.....''

میں نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ دل پر نہ لیں میرا مقصد آپ کا دل دُکھانا نہیں تھا، اگر کبھی میری اس لاحاصل زندگی سے آپ کی آزادی حاصل ہوتی نظر آئی تو آپ کو کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔''

انہوں نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''میں جانتا ہوں..... لیکن تم فکر نہ کرو..... میری آزادی میں اب کم وقت رہ گیا ہے..... میں نے بہت عذاب ناک قید کاٹ لی..... اس بیڑیاں کھلنے کا وقت قریب ہے۔''

جانے اُس لمحے میں چاہ کر بھی اُن سے یہ کیوں نہیں کہہ سکا کہ کسی کے خون کے بدلے چھینی گئی آزادی بھلا انہیں کیا آزاد کر پائے گی؟ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک قید سے نکل کر کسی دوسرے اور بڑے زندان میں داخلے کی تیاری کر رہے ہوں۔

ساری رات ان ہی سوچوں میں گزر گئی۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا تو

رات بھر مینہ چھاجوں برسا تھا اور اس وقت بھی موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اُوپر والی پہاڑی کی چوٹی سے بارش کا پانی بہت سے پرنالوں کی صورت میں نشیب کی جانب بہہ رہا تھا اور فضا میں صرف اس بہتے پانی کا ہی شور نمایاں تھا۔ شاید دنیا کی بہترین موسیقی اِسی شفاف پانی کے بہنے کی آواز میں کہیں مضمر ہوتی ہے۔ میں کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا پانی کی باتیں سنتا رہا۔ جو مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ دنیا میں سب کچھ خراب ہونے کے باوجود اب بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے بچا کر رکھی ہیں۔ یہ آسمان، یہ بادل، یہ راستے، یہ ہوا.....اور یہ برستی بارش کی بوندیں..... بہت کچھ باقی ہے ابھی یہ بے زار جیون بتانے کے لیے.....

درگاہ کے کچے صحن میں بارش کا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ میں نے پاس رکھی ایک پرانی اخبار کی کشتی بنائی اور اس پانی میں چھوڑ دی۔ ایک پل میں ہی میں اپنے بچپن کے بارش کے پانی اور کاغذ کی کشتی کے کھیل کی یاد میں ایسا کھویا کہ تیز بارش کی بوندوں نے میرا وہ کاغذی سفینہ کب بھگو کر ڈبو دیا، مجھے اس کی بھی خبر نہ ہو سکی۔ باہر کسی آہٹ کی آواز نے جب تک مجھے چونکایا تب تک میری کشتی پوری طرح بھیگ کر کھل چکی تھی اور اب پانی میں صرف اخبار کا ہی وہ ٹکڑا بہہ رہا تھا جس سے میں نے وہ کشتی بنائی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا، حتیٰ کہ میرے وہ آنسو بھی جو بچپن میں یوں اپنی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر میری آنکھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ آنے والا بشیرا تھا، جو اُوپر آتے آتے پوری طرح بھیگ کر اب باقاعدہ کانپ رہا تھا۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''خیر تو ہے بشیرے.....اتنی صبح.....ایسے.....؟''

اتنے میں اصغر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بشیرے نے جلدی سے میرے بڑھائے ہوئے خشک تولیے سے اپنا سر خشک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ''خیر نہیں ہے جناب.....کل شام سے لاریب بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات شدید بخار میں تڑپتی رہی ہیں..... خان صاحب نے آج صدقے اور نیاز کی دیگیں چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے اور آپ کو بھی دعا کے لیے بلوایا ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد نیاز بانٹنی ہے۔ آپ اس سے پہلے ہی

پہنچ جانا..... دعا آپ نے ہی کرنی ہے۔ خان صاحب کی گاڑی آپ کو لینے آ جائے گی۔ میں
اب تک لکڑیاں اور مٹی کا تیل وغیرہ حویلی پہنچا آؤں۔ بس آپ تیار رہیے گا۔'' بشیرا جیسے چھپ
چھپ کرتا آیا تھا ویسے ہی سڑسڑ کرتا اور بھیگتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے اُسے بہت کہا کہ
درگاہ کی چھتری لیتا جائے لیکن اُس نے یہ کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا کہ ''ادباؤ..... ان بارش
کے قطروں سے بچنا نہیں چاہیے..... یہ تو رب ہماری رُوح کو دھونے کے لیے آسمان سے
برساتا ہے.....''

اصغر صاحب چپ چاپ کھڑے ہماری ساری باتیں سنتے رہے۔ بشیرے کے جانے
کے بعد انہوں نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''دیکھا..... میں نے
کہا تھا نا.....؟''

وہ نازک لڑکی محبت نامی اس زہریلے ناگ کا پہلا وار ہی برداشت نہیں کر پائی۔ زہر اس
تیزی سے اُس کی کومل نسوں میں پھیل رہا تھا کہ وہ نڈھال ہو کر بستر سے لگ چکی تھی۔ اور کیسی
ستم ظریفی تھی کہ اُس کے مندمل ہونے کی دعا کے لیے بھی اُسی کو طلب کیا جا رہا تھا جو خود اُن
زخموں کا باعث تھا۔ گویا قاتل کو ہی مسیحائی کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ ایک بار جی میں آیا کہ کوئی
بھی بہانہ کر کے حویلی نہ جاؤں لیکن اصغر صاحب شاید میری سوچیں ہی پڑھ رہے تھے۔ وہ بول
پڑے۔ ''تمہیں جانا چاہیے..... تمہی اُس کا زخم اور تمہی مرہم ہو..... نہیں جاؤ گے تو زخم اور گہرا
ہو جائے گا۔ ہاں البتہ چلے جاؤ گے تو زخم تو لگے گا لیکن ساتھ ہی کچھ مرہم بھی دے آؤ گے.....
سو میرا مشورہ یہی ہے کہ چلے جاؤ..... اور کوشش کرنا کہ زخم کے مقابلے میں مرہم زیادہ بانٹ
پاؤ.....''

''لیکن کیسے.....؟'' میں چلا اُٹھا..... اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا
ہے.....؟..... آخر اُس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اُس کی ہنسی کیوں چھین لی گئی.....؟ یہ زخم اُس
کا مقدر کیوں بن گئے ہیں؟..... میں نے تو کبھی ایسا نہیں چاہا تھا.....''

''جب تم پر تقدیر کا وار ہوا تھا تب تمہارا کیا قصور تھا؟ تم نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟
تمہارے مقدر میں ہی عشق کا وہ کاری وار کیوں لکھ دیا گیا تھا جس نے ایک پل میں ہی تمہاری
دنیا بدل دی؟ ان سب سوالوں کے جواب میں تمہارے پاس.....؟..... نہیں..... کسی کا کوئی

قصور نہیں ہوتا، لیکن بعض سزائیں بنا کسی جرم کے بھی تو بھگتنا پڑتی ہیں۔ ہم تو اس دنیا میں آئے ہی بھگتنے کے لیے ہیں۔ سو جب تک ایک بھی سانس باقی ہے، بھگتتے ہی رہیں گے۔''

اصغر صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ محبت کسی ناکردہ گناہ کی سزا ہی تو تھی۔ یہ سزا ملتی بھی دونوں کو تھی۔ جس نے محبت کی وہ تو خطاوار ٹھہرتا ہی ہے، یہاں تو اُسے بھی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے جس سے دوسرے کو محبت ہو جاتی ہے..... محبت ہمیشہ دو ایسے لوگوں کے درمیان ہی کیوں وارد ہوتی ہے جن کا ملن دنیا کے ناممکنات میں سے ایک ہوتا ہے؟..... کیا صرف ''لاحاصل'' کا نام ہی عشق ہے؟ اور جو حاصل ہو جائے وہ محبت نہیں..... کیا ''حاصل'' کا درجہ عشق سے گر کر صرف ایک کامیابی کی طمانیت ہی رہ جاتا ہے.....؟

میں ظہر سے پہلے ہی حویلی پہنچ گیا۔ بارش تھی کہ رُکنے کا نام ہی بھول چکی تھی۔ خان صاحب بیرونی ڈیوڑھی میں ہی چادر کی چھتوں والے سائبان کے نیچے اپنی نگرانی میں دس بارہ دیگیں پکوائی کے بعد انگاروں پر چڑھوا رہے تھے۔ مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکے۔ ''اچھا ہوا تم جلدی آ گئے عبداللہ میاں..... میری تو پریشانی میں مت ہی ماری گئی ہے۔ شہر سے ڈاکٹرنی بھی بلوالی گئی ہے لیکن اُسے بھی بخار نہ اُترنے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی..... وہ میرے ہاتھ کا چھالا ہے..... میں اُسے اتنی اذیت میں نہیں دیکھ سکتا..... ساری رات وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہذیان بولتی رہی ہے۔ کہیں یہ کوئی سائے وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے.....؟''

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت تو خود سب سے بڑا آسیب ہے۔ لیکن اس معصوم لڑکی کو تو شاید ابھی تک یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اُس پر محبت نامی اس عفریت کا سایہ اپنے پنجے گاڑھ رہا ہے۔ اگر اصغر صاحب مجھے پہلے یہ خبردار نہ کر چکے ہوتے شاید مجھے خود بھی اس حقیقت کا ادراک بہت دیر میں ہوتا۔ حیرت ہے ان بڑے بڑے سائنس دانوں، حکیموں اور ڈاکٹروں نے صدیاں لگا کر ہر بیماری کا علاج دریافت کر لیا تھا۔ انسان ترقی کرتے کرتے اب چاند پر اپنی کالونیاں بنانے کا سوچ رہا ہے، لیکن محبت نامی اس بیماری کا کوئی علاج کیوں نہیں دریافت کر پائے تھے۔ کیوں ہمارے خون میں موجود ان زہریلے مادوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے تھے جو ہماری اس پہلی نظر کے مرکب سے مل کر اس عشق نامی ناسور کا باعث بن جاتے تھے۔

ہاں..... یہ محبت ایک سرطان کی صورت میں تو ہمارے سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ تو پھر جسم کے باقی سرطان کی طرح ہم ہسپتال جا کر اپنے جسم کے اس کینسر کو کیوں نہیں باہر نکلوا سکتے؟ کیوں باقی ناسوروں کی طرح کٹوا کر نہیں پھینک سکتے.....؟

کچھ ہی دیر میں ساری دیگیں تیار ہو گئیں۔ حویلی کے بیرونی احاطے میں ہی شامیانے لگا کر اور ان کی چھتوں پر بڑی بڑی پلاسٹک کی شیٹیں ڈال کر کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور دُور دراز کے علاقوں میں بھی نیاز بانٹنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گاؤں کی مسجد کے امام نے دیگوں کے کھلنے پر ہر دیگ میں سے کچھ چاول اور زردہ وغیرہ لے کر اس پر دعا پڑھ کر دم کیا۔ خان صاحب نے خصوصی طور پر مجھ سے بھی دعا کروائی اور پھر سب دیگیں گاؤں کے لوگوں اور دیگر غربا میں بانٹ دی گئیں۔ عصر کے وقت تک ہم اس فریضے سے مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

اس اثناء میں اندر سے بڑی مالکن کا دو تین بار پیغام آ چکا تھا کہ میں ذرا فارغ ہو چکوں تو اُن سے اندر آ کر مل لوں۔ تیسری بار جب کرم دین اندر سے پیغام لے کر آیا تو خان صاحب نے میری جانب دیکھا اور ہلکے سے مسکائے۔

''عبداللہ میاں..... تم اندر مل آؤ اُن سے..... ورنہ یہ پیغام آتے ہی رہیں گے۔ میں بھی بس ان سب کو نپٹا کر آتا ہوں..... چائے ہم بڑے کمرے میں ہی پئیں گے۔ جلدی نکلنے کی نہ کرنا۔''

میری کوشش یہی تھی کہ میں اور خان صاحب اکٹھے ہی اندر جائیں لیکن آخر کار مجھے اکیلے ہی حویلی کی دوسری ڈیوڑھی پار کرنا پڑی۔ بڑی مالکن سامنے والے برآمدے میں ہی مونڈھے کی باڑھ کے پیچھے والے حصے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکیں۔ اُن سے پتا چلا کہ لاریب کا بخار اب بھی ویسا ہی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

''عبداللہ..... تم لاریب سے ملو گے نہیں..... دیکھو گے نہیں کہ میرا وہ پھول کیسے کملا سا گیا ہے..... میری وہ مینا اپنی ساری باتیں، اپنی تمام چہکار کیسے بھول گئی ہے..... مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس اُس کی تسلی کے لیے وہ لفظ ضرور موجود ہوں گے جو اُس کے جلتے وجود کو جلا بخش سکتے ہیں۔ اُسے تم ہی سمجھا سکتے ہو کہ..... کہ.....''

بڑی مالکن بولتے بولتے خاموش ہوگئیں۔ شاید وہ اپنے الفاظ کھو بیٹھی تھیں۔ لیکن اُن کی اس خاموشی نے بھی سب کچھ کہہ ڈالا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا گویا انہیں بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس فسانے کی خبر ہو چکی تھی، یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود لاریب کے منہ سے ہذیانی کیفیت میں کچھ نکل گیا ہو۔ میں کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ خود میرے لفظ بھی کہاں میرے اختیار میں تھے۔

''کیا آپ سمجھتیں ہیں کہ میرا اُس سے ملنا ٹھیک ہوگا۔ میرا مطلب ہے میں..... آپ سمجھ رہی ہیں نا.....''

''ہاں..... میں سمجھ رہی ہوں..... لیکن تمہارے علاوہ کوئی اور مسیحا بھی تو نہیں..... ابھی اُس کا گھاؤ بہت تازہ ہے اور اُسے شاید خود بھی اس جان لیوا جذبے کا پوری طرح ادراک نہیں ہے جو اُس کے اندر پل رہا ہے۔ خدا کے لیے اُسے روک دو۔ اُس کے معصوم اور چھوٹے جذبے کو بکھرنے سے پہلے ہی کسی طرح پلٹ دو..... یہ ہم سب پر تمہارا کتنا بڑا احسان ہوگا یہ تم نہیں جانتے.....'' بولتے بولتے اُن کی آواز بھرا سی گئی اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکیں۔ میں سر جھکائے اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتبار کے بھرم پر پورا اُتر سکوں۔ آپ کہیں تو میں آج ہی ہمیشہ کے لیے بنا کسی کو کچھ بتائے یہاں سے اتنی دُور چلا جاؤں گا جہاں کسی کو کبھی میری کوئی خبر نہیں مل پائے گی..... کاش میں کبھی جبل پور نہ آتا..... میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں.....''

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ایسا کہہ کر ہمیں شرمندہ نہ کرو..... میں جانتی ہوں کہ تم اندر سے کتنے شفاف ہو..... اور پھر تمہارے دُور جانے سے لاریب کے اندر جنم لیتا جذبہ بھی تو دُور نہیں چلا جائے گا۔ آج مجھے یہ کہنے میں بھی ذرا سی عار محسوس نہیں ہوتی کہ اگر تمہارا من پہلے ہی سے زہرا سے نہ بندھا ہوتا تو میں کسی بھی طرح تمہیں تم سے لاریب کے لیے مانگ لیتی۔ کیوں کہ وہ صرف میری بیٹی ہی نہیں میری سب سے عزیز از جان سہیلی بھی ہے۔ اور میں اپنی سہیلی کو ذرا سی تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہوں۔ پل پل مرتی رہتی ہوں۔ اور مجھے اپنی دوست کی ہر پسند پر ہمیشہ فخر رہا ہے..... اور آج بھی مجھے اُس کے انتخاب پر رشک آرہا ہے..... کاش یہ انتخاب ہی اُس کا مقدر بھی ہوتا..... لیکن کیا کریں کہ ہمارا

زور نصیبوں کے لکھے پر چل نہیں پاتا.....'' میں چپ رہا اور اُن کے نقش قدم پر چلتا ہوا لاریب کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک خادمہ پہلے ہی اُس کے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی۔ باہر بارش اور بادلوں کی وجہ سے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور مجھے چاروں طرف کتابوں کے ریک اور شیلف بھرے پڑے نظر آئے۔ غالبؔ، میرؔ، دردؔ، اقبالؔ، فرازؔ..... اوہ.....تو گویا اُس نے اپنی رُوح کے قتل کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ شاعری ہی تو اپنے اثر سے ہمارے اندر کے بند دروازے کھولتی جاتی ہے۔ اور پھر ہم خود ہی اپنے دل کے اندر گھس آنے والے دَر انداز جذبوں کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔

لاریب آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی۔ ایک گرم لحاف نے اُسے ڈھک رکھا تھا اور اُس کے چہرے پر برسوں کی پیلاہٹ اور زردی نمایاں تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کے چہرے کے نور سے جو ایک ہالہ سا بنتا تھا وہ غیر مرئی ہالہ آج بھی اپنا سفید نور بکھیر رہا تھا۔ بڑی مالکن نے لاریب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ خادمہ اُٹھ کر باہر نکل چکی تھی۔ ''لاریب..... دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے.....''

آہٹ سن کر لاریب نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا اور اُس نے جلدی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بڑی مالکن نے جلدی سے اُسے سہارا دے کر اُس کے لیے تکیے کا ٹیک بنا دیا۔ وہ اب بھی ہڑبڑائی ہوئی سی تھی۔ اُس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بال باندھنے کی کوشش کی۔

''ارے آپ.....؟..... یہاں؟..... کتنی خوشگوار حیرت ہو رہی ہے مجھے۔ میں بتا نہیں سکتی.....'' وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ کے سرخی میں بدلنے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ مجھے پھر ان جذبوں کی طاقت پر رشک آیا۔ سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے طبیب تو خود ہمارے اندر ان جذبوں کی صورت میں پل رہے ہوتے ہیں، پھر نہ جانے کیوں ہم ان بیرونی ویدوں کے پیچھے دوڑے پھرتے ہیں؟

میں نے پاس پڑی کرسی کھینچ لی اور بیٹھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے..... اگر غالبؔ کو پڑھتی ہیں تو پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُس نے بیمار ہونے کے لیے کسی تیماردار کے نہ ہونے کی شرط بھی لگا رکھی ہے۔

جب کہ آپ تو یہاں پورا ایک میلہ سجائے بیٹھی ہیں اپنے تیمارداروں کا..... حتیٰ کہ مجھے بھی یہاں تک آنے پر مجبور کر ہی ڈالا۔"

میری بات سن کر وہ اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ جھرنا پھر سے پُرشور آواز کے ساتھ بہہ کر نکلا اور پوری حویلی کے در و دیوار پر چھا گیا۔ بڑی مالکن غور سے اپنی سہیلی کو دیکھتی رہیں اور اُن کی آنکھیں غیر محسوس طور پر بھیگتی رہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی بہانے سے اب تک پونچھتی ہی آتیں تھیں۔ وہ ہنس کر بولی۔

"بس یہیں میں غالبؔ سے اتفاق نہیں کرتی۔ بھلا ایسے بیمار پڑنے کا فائدہ ہی کیا کہ کوئی آس پاس تیمارداری اور نخرے اُٹھانے کے لیے موجود ہی نہ ہو۔ جناب ہم تو اپنے ساتھ ہی سبھی کو بیمار کرنے کے قائل ہیں یعنی پڑیئے گر بیمار..... تو سب ہوں آس پاس بیمار..... کیوں ٹھیک ہے نا....."

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی بیماری بھول کر ہمارے ساتھ بحث کر رہی تھی۔ بڑی مالکن نے درمیان میں چائے کا انتظام کروانے کے لیے کچھ دیر کی مہلت مانگی اور میں اور لاریب کمرے میں تنہا رہ گئے۔ میں نے غور سے اُس پری کی جانب دیکھا۔

"آپ کے ماں باپ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ آپ سے زیادہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ کے اِردگرد کانچ کے لوگ رہتے ہیں..... جن کی خاطر آپ کو خود اپنے اندر کا شیشہ بہت سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ ورنہ یقین جانیے آپ سے پہلے ان انمول رشتوں کو کچھ ہو جائے گا..... آپ کو اِس خزانے کی حفاظت بھی کرنی ہوگی....."

وہ میری بات سن کر چونک سی گئی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں..... میں اپنی سی پوری کوشش بھی کرتی ہوں لیکن نہ جانے کچھ دن سے مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے..... میرا خود اپنے اُوپر سے اختیار گھٹتا جا رہا ہے..... میں آپ سے چھپاؤں گی نہیں..... شاید آپ کو سن کر بُرا بھی لگے لیکن پتا نہیں کیوں جس دن سے آپ کی امی سے مجھے آپ کی کہانی کے بارے میں پتا چلا ہے میں تب سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر لمحہ آپ ہی کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ مجھے آپ کے جذبے کی طاقت اور سچائی پر رشک آتا ہے

اور میں خود اپنے آپ کو بھی ایسے ہی کسی جذبے کے تحت بہتے ہوئے محسوس کرتی ہوں۔ میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں اور یہ عزت ہر پل مجھے اپنے اندر پلتی اور بڑھتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنے اندر ہوتی ان تبدیلیوں کا سوچ کر ہی خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی رُوح کے آخری ریشے تک کسی اور کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ، یا باقی دنیا میرے اندر پلتے اس الوہی جذبے کو کچھ غلط نہ سمجھ لیں۔ کسی عام رشتے کا نام نہ دے دیں۔"

وہ سر جھکائے بولتی رہی۔ میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ آج پہلی بار اُس نے اتنا کھل کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی اور باہر کھڑکی سے تیز بارش کی گرتی بوندوں کا شور میری اور اُس کی رُوح کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔

دوسری منت

پھر آخر کار میں نے ہی خاموشی توڑی۔

''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں، یا آپ کے اِردگرد بسنے والا کوئی بھی ذی رُوح کبھی بھی آپ کے کسی بھی جذبے کو غلط ہونے کا الزام دینے کا سوچ بھی سکتا ہے۔ ہم سب آپ کے اندر کے شفاف اور کومل جذبوں کی اُتنی ہی قدر کرتے ہیں جس کے وہ حق دار ہیں۔ اور آپ کی سچائی تو آپ کے اندر چلتی اُس جنگ سے اور بھی واضح ہوتی ہے جس کی شدت نے آپ کو یوں بستر پر لا پھینکا ہے۔ یقین جانیئے ہم سب کے دلوں میں آپ کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ بس میری آپ سے اتنی درخواست ہے کہ ایسے ہر جذبے کو اپنی طاقت بنا لیں۔ اُسے اپنے اندر خود پر حاوی ہو کر آپ کو کمزور نہ کرنے دیں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ بہت مشکل کام ہے لیکن آپ جیسی سچی، شفاف اور کومل من کی لڑکی سے میں ہر معجزے کی اُمید رکھتا ہوں.....''

وہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ ''میں نے کہا تھا نا..... آپ کو اپنے لفظوں پر خوب اختیار حاصل ہے..... خوب چن کر یہ خزانہ استعمال کرتے ہیں آپ۔'' پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''چلیں..... آج آپ سے یہ وعدہ بھی رہا کہ میں اپنے اندر کی اس جنگ پر قابو پانے کی کوشش ضرور کروں گی۔ لیکن آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی جنگیں جیتنے کے لیے ہم کمزور انسانوں کے پاس کوئی ہتھیار، کوئی آلہ نہیں ہوتا۔ تبھی عام طور پر ہماری شکست ہوتی ہے اور ان جذبوں کی جیت..... آپ خود بھی تو ابتدا میں ایک ایسی ہی جنگ ہار چکے ہیں..... دعا کیجیے گا کہ خدا مجھے بھی آپ جیسا ظرف عطا کرے..... میں بھی اتنی ہی ثابت قدم اور چٹان جیسی مضبوط بن سکوں کہ میرے اندر چلتے طوفان میری ظاہری ہیئت کو بگاڑ نہ سکیں اور آس پاس کے لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو سکے..... بولیں..... دعا کریں گے نا میرے لیے.....؟''

''میری ہر دعا میں آپ تا عمر شامل رہیں گی۔''

اتنے میں دروازے کی جانب سے آہٹ بلند ہوئی اور خان صاحب بڑی مالکن کے ساتھ کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئے۔ کچھ ہی دیر میں خادمہ نے چائے بھی اُسی کمرے میں ٹرالی پر سجا دی۔ میں نے چائے ختم کر کے خان صاحب سے اجازت چاہی۔ بڑی مالکن نے میرے سر پر ہاتھ کر دعا دی۔ میں نے لاریب کو خدا حافظ کہا اور خان صاحب کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے رُخصت کرنے سے پہلے انہیں نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے زور سے بھینچ کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''آج نہ جانے کیوں تم جیسے ایک بیٹے کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی ہے.....'' میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ ''آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟..... کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں.....؟'' انہوں نے اپنی نم پلکیں پونچھیں ''ہاں..... واقعی آج تم نے ایک بیٹے سے زیادہ بڑھ کر بیٹے کا حق ادا کیا ہے۔ ایک بیٹی کے باپ کو اس سے زیادہ بھلا اور کیا چاہیے ہوگا.....'' میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا اور پھر وہ چھپا نہیں پائے کہ وہ میری اور لاریب کی ساری گفتگو سن چکے ہیں۔ دراصل باہر کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر وہ واپس آئے تب انہوں نے لاریب کے کمرے کا رُخ کیا۔ ٹھیک اُسی وقت بڑی مالکن جو چائے کے لیے کمرے سے نکل چکی تھیں انہیں لاریب کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر روک لیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن پھر دروازے کے قریب ہونے کی وجہ سے خود اُن کے کان بھی ہماری باتوں کی جانب لگ گئے اور پھر ہر بات انہیں سمجھ میں آتی گئی۔ شاید بڑی مالکن اُس وقت کمرے سے جان بوجھ کر باہر نکلی تھیں تا کہ اُن کی دوست اُن کی سہیلی بنا کسی جھجک کے اپنے دل کی بات مجھ سے کر سکے۔ شاید یہ اُن کا مجھ پر حد سے گزرا ہوا مان بھی تھا اور اِسی مان کا بھرم خان صاحب نے بھی بڑی مالکن کی بات مان کر رکھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے یہ سب بتاتے ہوئے اُن کے اندر کے شفیق باپ کو کس دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لہٰذا اب اِسی مان کے آبگینے کا بھرم رکھنا میرا بھی فرض ہو گیا تھا۔ میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی۔

''آپ بے فکر رہیں لاریب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی..... آپ بہت خوش قسمت ہیں خان صاحب کہ آپ کو خدا نے لاریب جیسی بیٹی دی ہے..... اور ایسے انمول تحفوں کی حفاظت

دینے والا خود کرتا ہے..... اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ رشتے صرف خون ہی نہیں بناتا..... بلکہ کبھی کبھی تو خون سے بنے رشتے صرف ایک مجبوری بن کر ہمارے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اصل رشتے وہ ہوتے ہیں جو ہم خود اپنی مرضی سے بناتے اور چنتے ہیں..... جیسا کہ میرا آپ سے، بڑی مالکن سے اور لاریب سے رشتہ ہے..... جو ہم سب نے خود چنا ہے اور ہم سب ہی اس رشتے کی بے حد عزت کرتے ہیں..... اسے جان سے عزیز جانتے ہیں۔''

میں انہیں گلے لگا کر درگاہ کے لیے پلٹ گیا۔ وہ دیر تک وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے گاڑی کو دُور جاتا دیکھتے رہے۔ میرا دل اُس وقت شدت سے بس یہی ایک دعا کر رہا تھا کہ ''اے میرے خدا اس مجبور باپ کے سامنے میری لاج رہ جائے اور وہ خود اپنی ذات کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ اُن کے اندر کا باپ کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہو.....''

قدرت نے دنیا میں جتنے بھی رشتے بنائے ہیں اُن میں سب سے مجبور رشتہ شاید باپ کا ہی بنایا گیا ہے، خاص طور پر اگر یہ رشتہ ایک بیٹی سے شدید محبت کرنے والے ایک وضع دار باپ کا ہو، تب اس مجبوری اور بے کسی کی حدیں لامحدود ہوتی ہیں۔

میں جب درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری جانب بڑھے۔

''کہاں رہ گئے تھے۔ بڑی دیر لگا دی۔''

میں نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا ''خیریت.....؟''

''ہاں..... مجھے میرے مقتول کی اطلاع مل گئی ہے۔ اگلی جمعرات کو پچھلی پہاڑی کی طرف سے آتی ہوئی گاؤں کی کچی سڑک پر مجھے اُس کا ایک خاص مقام پر انتظار کرنا ہوگا اور اُسے وہیں ختم کر کے اپنی آزادی کا پروانہ حاصل کرنا ہوگا۔''

اصغر صاحب کی بات سن کر میرا دل جیسے ایک لمحے میں ہی ڈوب سا گیا۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں ہی پُر جوش سے ساری تفصیلات بتاتے رہے کہ کیسے آج چھلاوے نے انہیں درگاہ کے باہر بلوا کر وہ ساری تفصیلات اُن کے حوالے کی تھیں۔ وہ بہت خوش تھے کہ آخر کار اُن کی آزادی کا دن بھی آ ہی گیا تھا۔ بس چند دن ہی تو رہ گئے تھے۔ لیکن تبھی میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ میں اُن کے ہاتھوں سے یہ گناہ کبیرہ سرزد ہونے نہیں دوں گا، چاہے مجھے اس کے لیے کچھ

بھی کرنا پڑے۔ چاہے میری اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن انہیں اس آخری جرم سے روکنا میری آخری خواہش بنتی جا رہی تھی۔

کاش اس وقت سلطان بابا وہاں ہوتے تو میں خود کو اس قدر تنہا محسوس نہ کرتا۔ اس رات میں نے دو خط لکھے..... پہلا زہرا اور دوسرا عبداللہ کے نام اور صبح ہوتے ہی دونوں خط نیچے گاؤں کے پوسٹ ماسٹر کو مزید پیسوں اور اس درخواست اور تاکید کے ساتھ پکڑا آیا کہ اسے کسی بھی طرح شام سے پہلے کسی بڑے اسٹیشن سے فوری ڈاک، یا کوریئر کے حوالے کروا دیں کیوں کہ اگلی شام تک ان خطوط کا اپنی منزل تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ پوسٹ ماسٹر نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ اِسی وقت صبح نو بجے والی گاڑی سے یہ دونوں خط شہر بھیج دیں گے جہاں سے انہیں اُن کا کوئی ماتحت، یا دوست کوریئر کر دے گا۔ میں نے پوسٹ آفس سے ہی زہرا کے گھر فون کرنے کی کوشش بھی کی لیکن دو دن سے برستی بارش نے ٹیلی فون کی سبھی لائنیں تہس نہس کر رکھی تھیں۔ میں اب صرف یہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ میرے دونوں خطوط وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ اُس دن بھی بارش نے رُکنے کا نام نہیں لیا اور شام تک بادل اپنا رونا روتے رہے۔ عصر کے بعد کرم دین اور بشیرا آئے۔ بڑی مالکن نے اُن کے ہاتھ خاص اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کی مٹھائی اور چنے کی دال کا حلوہ ناریل کی قاشوں میں بھر کر بھیجا تھا۔ اصغر صاحب اپنی مسکراتی اور معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ میں نے نظر بچا کر کرم دین کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ذرا دُور لے جا کر اُس سے اُس کی چھوٹی مالکن کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ کرم دین فوراً ہی اُداس ہو گیا۔ ''اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے جی..... شام تک طبیعت کچھ سنبھلی تھی پھر رات کو دوبارہ بخار چڑھ گیا۔ آپ دعا کریں جی کہ وہ جلد بھلی چنگی ہو جائیں..... ہم سب تو اُن کی ہنسی اور اُن کی ڈانٹ پر ہی زندہ ہیں.....'' میں نے کرم دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے تسلی دی ''فکر مت کرو..... جو لڑکی اتنے بہت سے لوگوں کی زندگی کا باعث ہو اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' بشیرا اور کرم دین زیادہ دیر ٹھہرے نہیں اور چل دیئے۔ اُن کے جانے کے بعد اصغر صاحب نے شرارتی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے میاں.....؟ بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے..... خوش نصیب ہو.....'' میں بھی اُن کی اس شرارت پر مسکرا پڑا۔ ویسے بھی انہیں جب سے اپنی آزادی کی خبر ملی تھی تب سے وہ

بہت خوش رہنے لگے تھے۔ سارا دن کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''کیسی ہے وہ.....؟''

گویا انہیں خبر ہو گئی تھی کہ میں کرم دین سے کیا بات کر رہا تھا۔ ''وہ ٹھیک نہیں ہے..... ایک منت مانگی ہے میں نے بھی آپ کی طرح..... دعا کریں کہ اُس کے لیے مانگی گئی میری وہ منت بھی قبول ہو جائے.....''

اور پھر خط بھیجنے کے تیسرے دن یعنی بدھ کی سہ پہر میری منت قبول ہو ہی گئی۔ اُس روز آسمان صبح سے صاف ہو چکا تھا اور چمکتی دھوپ میں ہر دُھلا منظر جگمگا رہا تھا۔ اِسی خیرہ کرتی دھوپ کی نرم کرنوں کے درمیان درگاہ کے احاطے میں میری قسمت کا سورج تب جگمگایا جب میں تھک کر مایوس ہونے کو تھا۔ اصغر صاحب بھی درگاہ کے صحن میں انگوروں کی بیل کی جانب چگتے پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ پہلے اُنہی کی نظر درگاہ کے دوازے کی جانب اُٹھی اور پھر میں نے اُن کی حیران نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو خود بھی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ہاں..... وہ وہی تھی..... اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ، اُسی شاہانہ جلال کے ساتھ، اُسی کالے نقاب میں، اُسی طرح پاپنوں پر تیرتی راج ہنسنی کی طرح چل کر آتے ہوئے..... ہاں وہ زہرا ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی..... میں نے خط لکھ کر اُسے بلا تو لیا تھا اور مجھے یقین بھی تھا کہ وہ میری پکار پر وہاں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچے گی بھی ضرور..... لیکن اس کے باوجود بھی میں اُسے یوں اپنے سامنے پا کر اس طرح گم صم کھڑا تھا جیسے اب بھی وہ کوئی خواب ہی ہو..... میرا سب سے حسین خواب..... وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں..... آپ نے ہی تو بلایا تھا.....''

''ہاں..... لیکن آپ یہاں تک پہنچ بھی گئی ہیں..... مجھے اس کا یقین تو ہو جانے دیں.....''

میری بات سن کر اُس کی آنکھوں میں شرارت کی لہر تیر گئی۔

''آپ کہیں اور ہم نہ آئیں..... ایسے تو حالات نہیں.....''

پھر اچانک ہی جیسے مجھے ہوش سا آ گیا۔ ''لیکن آپ یہاں تک اکیلے..... میرا مطلب ہے.....'' ''نہیں میں اکیلی بھلا یہاں تک کیسے پہنچتی، امی اور ڈرائیور نیچے گاڑی میں ہیں۔ امی کے گھٹنے اتنی چڑھائی کے متحمل نہیں ہو سکتے.....'' میں جلدی سے اصغر صاحب سے اجازت لینے کے لیے اُن کی جانب بڑھا۔ وہ پہلے ہی سے حیران کھڑے تھے۔

''یہ پری کون ہے عبداللہ میاں۔''

''یہی ہے میری منت..... میری دعا..... اس کو مانگا تھا میں نے خدا سے لاریب کا درد کم کرنے کے لیے۔ زہرا کی اماں نیچے میرا انتظار کر رہی ہیں..... میں انہیں حویلی چھوڑ کر جلد واپس آ جاؤں گا۔'' وہ یوں ہی حیرت زدہ کھڑے رہ گئے۔ میں زہرا کو لیے نیچا پہنچا تو اُس کی امی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جانے اس لمحے مجھے اُن پر اتنا پیار کیوں آ گیا کہ میں سلام کرتے ہی اُن کے گلے لگ گیا۔ وہ بھی بالکل میری امی جیسی ہی تو تھیں۔ اپنی اولاد کے لیے ہر وقت ہر مشکل میں ساتھ دینے کے لیے تیار، ہر خوشی ہر غم میں اُس کے ساتھ اور شریک سفر..... آج بھی وہ میری ایک پکار پر زہرا کے ساتھ یہاں اتنی دُور آ پہنچیں تھیں۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہلکے سے میرا سر تھپتھپا کر مجھے خاموش کروا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس بار باقاعدہ زہرا کے ابا سے اجازت لے کر اُسے یہاں تک لائی ہیں۔ وہ خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر نے اُن کی بیماری کی وجہ سے انہیں کار کے اتنے لمبے سفر سے منع کر رکھا تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی دعاؤں کے ساتھ اپنے خصوصی محافظ اور ڈرائیور کے ساتھ زہرا اور امی کو بھجوایا تھا۔

میں جب زہرا کی گاڑی میں حویلی پہنچا تو خان صاحب اور بڑی مالکن اتنی دُور سے آئے خاص مہمانوں کو اپنے درمیان پا کر نہال ہی تو ہو گئے۔ وہ سب غائبانہ طور پر زہرا کو پہلے ہی سے جانتے تھے اور اُسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں نے خط لکھ کر زہرا کو لاریب کے بارے میں سبھی کچھ بتا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس معصوم لڑکی کی مسیحائی کے لیے مجھے اُس کی شدید ضرورت ہے۔ میری اپنی ایک غرض بھی اس درخواست میں پنہاں تھی۔ میں جمعرات سے پہلے ایک بار زہرا سے ملنا چاہتا تھا کیوں کہ جمعرات کے دن میں نے اصغر صاحب کو اس بھیانک جرم سے روکنے کے لیے خود اس شکارگاہ میں پہنچنے کا فیصلہ کر

لیا تھا جہاں انہیں اپنا آخری جرم سرانجام دینا تھا۔ میں نے اس متوقع مقتول کی جگہ خود لینے کا ارادہ کیا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں کسی بھی طرح اُن کو اس آخری گناہ سے روک سکوں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بات صرف اصغر صاحب کی نہیں ہے۔ میرا واسطہ وہاں اس انجانی مخلوق سے بھی پڑ سکتا تھا اور ضروری نہیں تھا کہ میں زندہ وہاں سے واپس آ پاتا۔ لیکن یہ جوا تو مجھے کھیلنا ہی تھا اور اس آخری بازی سے پہلے میں اپنی زندگی کے سرمائے سے آخری بار مل لینا چاہتا تھا۔ مما اور پپا کو میں نے اس لیے خبر نہیں کی تھی کہ میں آخری لمحوں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

البتہ زہرا کو میں نے اصغر صاحب، یا چھلاوے کی اس داستان کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُسے بس لاریب کی بیماری کا ہی پتا تھا اور یہ کہ میں نے اُسے محبت کے گھاؤ کے آخری مرہم کے طور پر جبل پور بلوایا ہے۔ ساری عورتیں ذرا سی دیر میں ہی آپس میں یوں گھل مل چکی تھیں جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ اندر زنانے کی جانب سے اُن سب کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں یہاں مردانے میں مجھ اور خان صاحب تک بھی آ رہی تھی۔ خان صاحب کو بھی شاید کچھ سمجھ آ رہا تھا کہ میں نے زہرا کو وہاں کیوں بلوایا ہے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''عبداللہ میاں..... اور کتنے احسان کرو گے مجھ پر.....؟..... اُس دن تم نے مجھ سے کہا تھا نا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ لاریب جیسا ہیرا میرے پاس ہے۔ تو آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس روئے زمین پر تم سے زیادہ خوش نصیب اور کوئی نہیں، جس کے پاس بیک وقت اتنے انمول رشتے موجود ہیں اور اُن میں زہرا جیسا نگینہ بھی شامل ہے۔

میں نے درگاہ واپسی سے پہلے زہرا کو کچھ دیر کے لیے اندرونی ڈیوڑھی میں بلوایا تھا تاکہ اُسے یہ بتا سکوں کہ شاید میں شام کو حویلی نہ آ سکوں کیوں کہ مجھے درگاہ کے چند ضروری کام نپٹانے ہیں۔ وہ کچھ ہی دیر میں وہاں آ گئی..... وہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔

''کیوں بھئی ساحر صاحب..... اور کہاں کہاں اپنا سحر بکھیرا ہے آپ نے۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ آپ سلطان بابا کا ہاتھ بٹاتے ہوں گے لیکن یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور ہے۔''

میں مسکرا دیا۔ ''یہ میرا سحر نہیں..... بس آپ سے ہوئی ایک ملاقات کا اثر ہے۔'' میں نے جلدی جلدی اُسے ساری بات سمجھا دی۔ زہرا غور سے میری بات سنتی رہی۔

''آپ بے فکر رہیں..... میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آپ کے مجھ پر کیے ہوئے اعتماد کا بھرم رکھ سکوں.....''

میں مسکرا کر جانے کے لیے پلٹا تو اُس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

''ساحر.....''

میں نے رُک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ بھیگی پلکیں لیے کھڑی تھی۔

''مجھے آپ پر فخر ہے..... آپ میرا مان ہیں.....''

میں کچھ بھی تو نہیں بول پایا۔ بس اگلے ہی لمحے خود میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب دو آنسو میری آنکھوں سے نکلے اور پھسل کر میرے گالوں تک آ پہنچے۔ پل بھر میں ہی اس دل برنے میرے سات جنموں کی ریاضت، میری ساری مشقت، ساری محنت کا معاوضہ اپنے پنکھڑی لبوں سے دو لفظ بول کر ادا کر دیا تھا۔ کیا اس حقیر زندگی کو کسی دیوی کے چرنوں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور پل ہو سکتا تھا۔ کیا اس لمحے کے بعد بھی جینے کی کوئی اور وجہ باقی رہ جاتی تھی.....؟..... ہم دونوں بھی کتنے عجیب تھے، زمانے میں بچھڑنے والے ایک دوسرے کو رو کر وداع کرتے ہیں..... جب کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں اس لیے آنسو تھے کہ ہم ایک دوسرے کو رفتہ رفتہ پا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ مزید ایک پل بھی وہاں رُک نہیں پائی اور جلدی سے اپنی پلکوں کی شبنم اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹتی ہوئی وہاں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔

میں درگاہ پہنچا تو اصغر صاحب کو وہاں موجود نہ پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں اُن کا منصوبہ بدل تو نہیں گیا۔ انہوں نے تو جمعرات کا بتایا تھا مجھے۔ پر کہیں انہوں نے ایک دن پہلے ہی اپنا جرم سرانجام دینے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا۔ خدا نے زہرا کو یہاں تک پہنچا کر میری ایک دعا تو پوری کر دی تھی لیکن میری دوسری دعا۔ میرا دوسرا خط میں نے عبداللہ کے نام لکھا تھا کہ کسی بھی طرح سلطان بابا کو جمعرات سے پہلے جبل پور والی درگاہ پہنچنے کا پیغام دے، پتا نہیں اس خط کا کیا بنا؟

میں کچھ دیر وہیں درگاہ میں اصغر صاحب کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر بے چین ہو کر درگاہ سے باہر نکل آیا۔ مجھے اصغر صاحب نے پچھلے پہاڑ کی اس پگ ڈنڈی کا بتایا تھا جہاں بنی ہوئی

ایک ٹوٹی پھوٹی متروکہ سی ایک عمارت کے کھنڈر اب بھی موجود تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں کوئی مسافر خانہ، یا ستانے کے لیے کوئی قیام گاہ رہی ہوگی۔ اصغر صاحب نے اِسی کھنڈر میں وہ خون کرنا تھا۔ میں بے قراری میں اُس مسافر خانے کے کھنڈر کی جانب ہی چل پڑا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ کھنڈر یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر ہے اور شام کا اندھیرا اتنی تیزی سے پھیل رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے میرا وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ لیکن میرے اندر کی بے قراری میرے قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ پھر اچانک دو کوس کے فاصلے پر پہنچتے ہی ایک موڑ پر مجھے اصغر صاحب کا دُور گھاٹی میں ہیولہ سا دکھائی دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے درگاہ کی جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں نے شکر ادا کر کے سکون کی ایک لمبی سی سانس لی۔ لیکن پل بھر میں ہی میری وہی سانس میرے حلق میں اٹک گئی۔ اصغر صاحب کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا جسے وہ آس پاس کی چٹانوں پر تیز کرنے کے سے انداز میں رگڑتے چلے آ رہے تھے۔ تو کیا انہوں نے خون کر دیا تھا.....

خوابوں کا بیوپاری

اتنے میں اصغر صاحب کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی، وہ کچھ ٹھٹھک کر رُک گئے۔ میں بھاگتا ہوا اُن کے پاس پہنچ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ''کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔'' وہ حیران سے تھے۔ ''بتایا تو تھا تمہیں کل جمعرات ہے نا۔ میں ذرا کھنڈر تک گیا تھا۔ کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے..... لیکن تم اس ڈھلتی شام میں کہاں چل دیئے۔''

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ گویا میرا شک غلط تھا۔ میں نے انہیں ٹال دیا۔ ''کہیں نہیں..... بس آپ درگاہ میں نہیں تھے تو پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ چلیں واپس چلتے ہیں.....'' میں انہیں ساتھ لیے واپس درگاہ آ گیا۔ انہیں اگلی شام سے پہلے کھنڈر پہنچنا تھا اور کھنڈر میں اُس شخص کا انتظار کرنا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے اُن سے بھی پہلے درگاہ سے نکل کر اس کھنڈر والے راستے پر کسی ایسی جگہ مورچہ لگانا تھا جہاں سے اُس آنے والے شخص پر بھی نگاہ رکھ سکتا اور اُسے وہاں سے پلٹا کر مجھے خود کھنڈر بھی پہنچنا تھا۔ ساری رات اِسی اُدھیڑ بن میں گزر گئی۔ صبح کرم دین خان صاحب کا پیغام لے کر آیا کہ انہوں نے دوپہر کے کھانے پر مجھے حویلی بلوایا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زہرا کا لکھا ہوا ایک رُقعہ بھی تھا، جس پر اُس کی جاں فزا تحریر میں صرف دو سطریں تحریر تھیں کہ

''دل پر لگے وار کافی گہرے اور کاری ہوتے ہیں..... لیکن مطمئن رہیے آپ کا بھیجا ہوا مسیحا بھی کچھ کم مشاق نہیں..... وہ اپنا زخم آزمائیں ہم اپنا مرہم آزمائیں گے.....''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور میں نے اُسی رُقعے پر یہ شعر لکھ دیا۔

اُٹھتی رہتی ہے ایک گرد مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
وہ ہے موجود اس قدر مجھ میں

میں نے رُقعہ کرم دین کے حوالے کیا اور اُس سے کہا کہ آج میری جانب سے خان صاحب اور مہمانوں سے معذرت کر لے کیونکہ مجھے ایک بہت ضروری کام سے درگاہ سے باہر جانا ہے لہٰذا آج دیر ہو جائے گی۔ زندگی رہی تو فارغ ہوتے ہی خود حویلی حاضر ہو جاؤں گا۔ پتا نہیں سب کو فرداً فرداً سلام دیتے ہوئے میری آواز کیوں بھرا سی گئی۔ کرم دین پلٹ کر چل دیا۔ اصغر صاحب اپنے کمرے میں جانے کن تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس روز قدرت نے بھی میرے ساتھ کھیلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ شاید دوپہر سے پہلے ہی گھنے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپنا شروع کر دیا اور ظہر سے پہلے وہی موسلا دھار جھڑی شروع ہو گئی جو پچھلے ایک ہفتے سے جبل پور کے پہاڑوں کو نہلا رہی تھی۔ میں نے اصغر صاحب سے بہانہ کیا کہ حویلی سے میرے لیے بلاوا آیا ہے لہٰذا میرا جانا ضروری ہے۔ البتہ میں شام ہونے سے پہلے واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائے ''جاؤ میاں جاؤ..... حویلی میں ایک نہیں دو دو پریاں جس شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں اُس کا دل بھلا ہم بوڑھوں کے ساتھ کہاں لگے گا۔ جاؤ مل آؤ..... آج جب تم لوٹو گے تب تک میں بھی آزاد ہو چکا ہوں گا.....'' بس دعا کرنا کہ آخری لمحے میرے قدم لڑکھڑا نہ جائیں..... بڑی ہمت کی ضروت ہے۔ میں کتنا بڑا گناہ گار ہی کیوں نہ سہی..... لیکن قتل پھر بھی مجھ سے آج تک سرزد نہیں ہوا.....''

میں نے انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے دل میں سوچا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آج بھی میں انہیں قاتل نہیں بننے دوں گا۔ میں جب درگاہ سے باہر نکلا تو اس خیال سے کہ کہیں وہ مجھے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے باہر نہ نکل آئیں میں نے پہلے پہاڑی سے نیچے سیدھے سڑک کا ہی رُخ کیا۔ جب کہ کھنڈر تک پہنچنے کے لیے مجھے اُوپر کی جانب جانا چاہیے تھا کیونکہ کھنڈر سڑک سے بالکل مخالف سمت میں درگاہ کی پچھلی چوٹی کے پیچھے والی پگ ڈنڈی کی راہ اختیار کرنے سے آتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں کچھ دُور سڑک پر جا کر پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ اصغر صاحب کی نظر میں آئے بنا کھنڈر کی ڈگر تک پہنچ جاؤں لیکن بُرا ہو اس طوفانی بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا جس نے دن کے وقت بھی گہری شام سی کر رکھی تھی۔ مجھ سے اندازے میں کچھ چوک ہو گئی اور جس وقت میں گرتے پڑتے دوبارہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا اُس وقت عصر کا وقت گزر چکا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ سرد ہوا

نے میرا وجود برف کر دیا تھا اور بارش کی بوندیں میرے جسم میں ہزاروں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ دُور سے کھنڈر کے آثار نظر آئے تو میرے قدم مزید تیز ہو گئے۔ جانے وہ مسافر کہیں بارش سے چھپتے ہوئے مجھ سے پہلے ہی کھنڈر میں پناہ نہ لے چکا ہو.....؟..... ایسے میں اُسے میں کس طرح سمجھا پاؤں گا کہ اُس کا وہاں کھنڈر میں بیٹھ کر بارش رُکنے کا انتظار اُس کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے..... یا خدا..... مجھے اُس سے پہلے کھنڈر پہنچا دے۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تب بھی یہی دعا میرے لبوں پر جاری تھی۔ لیکن شاید وہ دن میری دعائیں رد ہونے کا دن تھا۔ میں جب کھنڈر میں داخل ہوا تبھی مجھے گیلی لکڑیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والے دُھویں نے کسی ذی رُوح کی موجودگی کا پتا دے دیا تھا۔ دُھویں کی چادر کے پار کوئی شخص گیلی لکڑیاں جمع کیے انہیں جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ لکڑیاں سلگ کر آگ پکڑ چکی تھیں لیکن گیلی اور نم ہونے کی وجہ سے بے حد دُھواں پھینک رہی تھیں۔ اس دُھویں کے نیلے مرغولوں کے جھنڈ میں سے اُس شخص نے سر اُٹھایا۔ میرے قدم وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ آسمان پر بجلی زور سے کڑکی اور مجھے یوں لگا کہ یہ بجلی قدرت نے براہ راست مجھ پر ہی گرائی ہے۔ میرے سامنے سلطان بابا بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کو وہاں بیٹھے دیکھ کر میری اُوپر کی سانس اُوپر ہی رہ گئی۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے۔ ''واللہ ساحر میاں..... یہ تم ہی ہو نا..... میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا..... جیسے ہی تمہارا پیغام ملا میں چل پڑا تھا۔ لیکن راستے میں بس خراب ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ رات بھر سے پہلے تو اب یہ بس ٹھیک ہو گی نہیں تو کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ لیکن بھلا قدرت اپنا زور دکھانے سے کب چوکتی ہے..... سو دیکھو..... راستے میں اس بوچھاڑ نے آگھیرا اور یہاں اس کھنڈر میں پناہ لینی پڑی.....'' پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا ''لیکن تم یہاں کیسے ساحر میاں..... بھئی مان گئے تمہارے الہام کو.....''

سلطان بابا مسکرائے۔ مجھے پل بھر کے لیے یوں لگا جیسے سلطان بابا سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔ یہ قدرت میرے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اصغر صاحب کو اس کھنڈر میں کسی ایک شخص کا قتل کرنا تھا اور ستم ظریفی دیکھیے کہ اس ممکنہ مقتول کو اپنا پیغام بھیج کر اس کھنڈر تک بلوانے والا کوئی اور نہیں، میں خود تھا..... اور میں نے بلایا بھی کس کو

تھا.....؟..... اپنے محسن، اپنے رہبر..... اپنے پیر کامل کو..... یہ مقدر کا میرے ساتھ ایک بھیانک مذاق نہیں تو اور کیا تھا.....؟..... مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں سلطان بابا سے کیا کہوں۔ میرے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ ''آپ یہاں سے چلے جائیں..... یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے..... کوئی شخص آپ کی جان کے درپے ہے.....''

''کیا کہہ رہے ہو میاں..... بھلا ہم درویشوں کی جان لے کر کسی کو کیا ملے گا.....''

میں زچ سا ہو گیا۔ ''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں یہاں آپ کے استقبال کے لیے نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میرا پیغام آپ تک پہنچا بھی ہے کہ نہیں..... میں تو یہاں اس اجنبی شخص کو بچانے کے لیے آیا تھا جسے یہاں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔'' میں نے جلدی جلدی انہیں اپنے جبل نور آنے سے لے کر آج تک کی ہر بات بتا دی کہ کس طرح چھلاوہ اصغر صاحب کی آزادی کے بدلے اُن سے یہاں کسی کے قتل کا وعدہ لے بیٹھا ہے اور اصغر صاحب اب یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ سلطان بابا نے اطمینان سے میری ساری بات سنی اور سکون سے بولے۔ ''ٹھیک ہے ساحر میاں..... اگر میری آخری سانس یہیں لکھی ہے تو پھر اس سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آنے دو تم اپنے اس چھلاوے کو..... میں بھی تو دیکھوں کہ.....''

ابھی سلطان بابا کی بات اُن کے منہ میں ہی تھی کہ اچانک پیچھے سے کوئی زور سے چلایا ''عبداللہ.....''

میں گھبرا کر پلٹا تو ڈھلتی شام کے سائے میں میں نے اصغر صاحب کو وحشت بھرے انداز میں ہاتھ میں وہی چاقو لیے کھڑے دیکھا۔ یہ اصغر صاحب اُس درگاہ والے نرم خو اصغر صاحب سے قطعی مختلف تھے اور اُن کی آنکھوں سے میں نے غصے کی چنگاریاں نکلتے ہوئے دیکھیں۔ وہ پھر سے گرجے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ یہ جگہ آج کسی کا مقتل بننے والی ہے۔ پھر بھی تم یہاں چلے آئے..... بڑی حماقت کی تم نے..... اب بھی وقت ہے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے.....''

میں اُن کی جانب سے پلٹا۔ ''نہیں نہیں..... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ میرے سلطان

بابا ہیں۔ انہیں میں نے ہی درگاہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ نہیں جس کا آپ کو انتظار ہے.....'' اصغر صاحب کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔ اندھیرے میں بجلی زور سے چمکی اور کھنڈر کی منڈیر پر میں نے ملگجے اندھیرے میں وہی دو آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں۔ وہی شخص منڈیر پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا جسے میں اس سے پہلے ٹرین اور پھر درگاہ کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

''نہیں..... یہ وہی ہے جس کا آج خاتمہ ہونا اٹل ہے۔ دیر مت کرو اصغر..... تمہارا شکار تمہارے سامنے ہے۔ اس لڑکے کی پرواہ نہ کرو..... یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... آگے بڑھ کر وار کرو..... تمہاری آزادی تم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ہے.....'' میں جلدی سے آگے بڑھ کر سلطان بابا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''خبردار..... ان کی جانب بڑھتی ہر چیز کو پہلے مجھے پار کرنا ہوگا۔''

وہ زور سے چلایا ''دیر مت کرو اصغر..... اس لڑکے کو بھی راستے سے صاف کر دو..... خس کم جہاں پاک.....''

سلطان بابا سکون سے اپنی جگہ پر کھڑے اپنی مخصوص تسبیح گھما رہے تھے، وہ مجھے ہٹا کر میرے سامنے آ گئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''جس کی جان کا سودا طے کیا جا رہا ہے کوئی اُسے بھی تو بتائے کہ مول کیا لگا ہے؟ مجھے کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

چھلاوہ جو اَب کود کر دوسری منڈیر پر بیٹھا غصے سے ہمیں گھور رہا تھا، چلا کر نفرت سے بولا۔ ''زیادہ بھولے نہ بنو..... تم خوب جانتے ہو کہ تمہاری اور میری دشمنی تو ازل سے ہے..... صدیوں سے تم میرا راستہ کاٹتے آئے ہو۔ کبھی مذہب کی صورت میں، کبھی نیکی کی صورت میں، کبھی اچھائی کی صورت میں۔ آغاز سے ہی تم نے میرا ناطقہ بند کرنے کی کوشش کی ہے..... لیکن آج میں تمہاری سانسیں بند کر کے یہ کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا۔ آج میری وہ پہلی جیت ہوگی جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔''

سلطان بابا کے لہجے میں اب بھی ٹھہراؤ تھا۔ ''تم صدیوں کی بات کر رہے ہو..... جب کہ میں تو ایک عام انسان ہوں جس کی عمر فقط چند سال ہے، پھر تم کس سے اب تک لڑتے آ

ہے ہو۔ ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا.....''

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

''نہیں تم وہی ہو..... بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ جسم سے کیا لینا دینا..... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا..... ہمیشہ کے لیے..... اصغر تم وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ گے۔ کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے..... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... یاد رکھو..... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم پر مسلط رہوں گا..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے..... ساری زندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے گی۔ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے گی.....''

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے لگے، میں زور سے چلایا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... رُک جائیں۔'' چھلاوے نے غصے اور نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم جیسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟ اور پھر اگر یہ اِسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ خود آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اِسے تمہارے کمزور انسانی جذبوں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے بہانے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے..... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر لو..... تھوڑا سوچ لو..... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے..... میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا..... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔''

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رُکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔
"پاگل مت بنو اصغر..... اس شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آنا..... یہ جادوگر ہے..... تمہاری تباہی کے درپے ہے..... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں میں ہی تمہارا واحد دوست ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟..... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ..... جاؤ اس کے سینے میں یہ چاقو گھونپ دو..... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو..... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا..... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔"

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم بڑھا دیئے کہ "میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اِسی میں میری نجات ہے۔" چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہر سی اُٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

"ٹھیک ہے..... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو..... لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے..... کیا اگلے جہاں میں تمہارا بھی اس عفریت کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے..... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اِسے تم جیسے معصوم انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اُکساتا ہے۔" اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تلخی سے ہنسے "معصوم.....؟ اور میں.....؟..... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی حرمت خراب نہ کرتے..... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ اگلے جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید زندگی ہی آرام سے کٹ جائے....."

سلطان بابا گرجے "کتنا جی لو گے مزید تم..... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

رہے ہو۔ ضرور تمہارا دشمن کوئی اور ہوگا.....''

چھلاوہ اب صحن میں کھڑے ایک جلے ہوئے درخت کی شاخ پر اٹکا ہوا تھا، اُس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

''نہیں تم وہی ہو..... بس تمہارے جسم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے تمہارے اس بوسیدہ جسم سے کیا لینا دینا..... میں تو تمہاری اس رُوح کو ختم کرنا چاہتا..... ہمیشہ کے لیے..... اصغر تم وہاں کھڑے کیا تماشا دیکھ رہے ہو، آگے بڑھو ورنہ ہمیشہ کے لیے میرے غلام ہو کر رہ جاؤ گے۔ کیا تمہیں آزادی نہیں چاہیے..... جلدی کرو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... یاد رکھو..... اگر آج تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو جرمانے کے طور پر میں ساری زندگی تم پر مسلط رہوں گا..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری دشمنی کتنی بُری چیز ہے..... ساری زندگی تڑپتے اور سسکتے ہوئے گزر جائے گی۔ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں ملے گی.....''

اصغر صاحب شدید کش مکش میں ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے تھے۔ وہ ہچکچا کر آگے بڑھنے لگے، میں زور سے چلایا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں..... رُک جائیں۔'' چھلاوے نے غصے اور نفرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اُن آنکھوں کے سحر نے جکڑ لیا ہو۔ میں نے اصغر صاحب کے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی لیکن میرے قدم جیسے زمین میں ہی جکڑے رہ گئے۔ سلطان بابا ویسے ہی استقامت سے اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اس بار وہ اصغر صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ میرا خاتمہ کرنے کے بعد یہ عفریت تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا؟ اور پھر اگر یہ اِسی قدر طاقت ور ہے کہ ساری زندگی تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھ سکے تو پھر یہ خود آگے بڑھ کر میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا۔ اس قتل کے لیے اِسے تمہارے کمزور انسانی بازوؤں کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آخری گناہ کروانے کے بہانے ہی پوری عمر کے لیے تمہاری رُوح پر قبضہ کرنا چاہتا ہے..... دو گھڑی رُک کر ذرا غور کر لو..... تھوڑا سوچ لو..... مجھے قتل کرنے کے لیے تو پوری رات پڑی ہے..... میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا..... یہیں تمہارے سامنے ہی کھڑا ہوں۔''

اصغر صاحب ٹھٹھک کر اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ چھلاوہ انہیں رُکتے دیکھ کر زور سے چیخا۔
"پاگل مت بنو اصغر..... اس شخص کی چکنی چپڑی باتوں میں مت آنا..... یہ جادوگر ہے..... تمہاری تباہی کے درپے ہے..... تم جانتے ہو اس پوری دنیا میں میں ہی تمہارا واحد دوست ہوں۔ میں نے آج تک تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟..... جب کہ تمہارے سامنے کھڑا یہ شخص جو تمہیں نصیحتیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے ملے تمہیں ابھی پورا ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ اس پر اعتبار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خاک میں نہ ملاؤ..... جاؤ اس کے سینے میں یہ چاقو گھونپ دو..... اور ہمیشہ کے لیے نجات پا لو..... ورنہ تمہارے گلے میں پڑا یہ سرخ دھاگا ہمیشہ کے لیے تمہاری غلامی کا طوق بن جائے گا..... چلو شاباش اب دیر نہ کرو۔"

سرخ دھاگے کا ذکر آتے ہی اصغر صاحب کا دھیان اپنے گلے کی جانب چلا گیا اور انہوں نے شاید اپنے ماضی کے گزرے اذیت ناک دن یاد کر کے ایک جھرجھری سی لی۔ مجھے لگا کہ چھلاوے کا یہ وار کام کر گیا ہے۔ اصغر صاحب نے یہ کہتے ہوئے سلطان بابا کی جانب قدم بڑھا دیئے کہ "میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن مجھے تمہیں ختم کرنا ہی ہوگا۔ اِسی میں میری نجات ہے۔" چھلاوے کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک لہر سی اُٹھی۔ اصغر صاحب سلطان بابا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میری آواز تک سلب ہو چکی تھی اور میں دم سادھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا سلطان بابا نے کلمہ پڑھ لیا اور آخری بار بولے۔

"ٹھیک ہے..... میرے خاتمے سے تم نجات پا سکتے ہو تو یہ نجات تمہیں مبارک ہو..... لیکن اس عارضی دنیا کی نجات کیا معنی رکھتی ہے..... کیا اگلے جہاں میں تمہارا ابھی اس عفریت کے ساتھ عمر بھر آگ میں جلنے کا ارادہ ہے..... یہی تو اس کا وہ ارادہ ہے جو اِسے تم جیسے معصوم انسانوں سے ایسے کبیرہ گناہ کروانے پر اُکساتا ہے۔" اصغر صاحب معصوم کا لفظ سن کر تلخی سے ہنسے "معصوم.....؟ اور میں.....؟..... تم شاید میرے ماضی سے واقف نہیں ورنہ اس لفظ کی حرمت خراب نہ کرتے..... دنیا کا کون سا گناہ ہے جو آج تک مجھ سے سرزد نہیں ہوا۔ اگلے جہاں کا تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری جان لے کر شاید یہاں کی چند سالہ مزید زندگی ہی آرام سے کٹ جائے....."

سلطان بابا گرجے "کتنا جی لو گے مزید تم..... اور کیا ضمانت ہے کہ وہ زندگی بھی سکون

سے ہی کٹے گی؟..... اور ہاں..... ایک گناہ اب بھی ایسا ہے جو تم نے اب تک نہیں کیا..... قتل..... کیا کسی معصوم انسان کے قتل کا بوجھ اپنے سر پر لے کر تم واقعی سکون کی زندگی جی پاؤ گے؟..... کیا ضروری ہے کہ تم یہ آخری گناہ بھی اپنے کھاتے میں لکھوا کر ہی اُوپر جاؤ..... توبہ اور معافی کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔ تمہارے گناہوں کا کوئی شمار کوئی حد ہو سکتی ہے لیکن اُس کی رحمت بے شمار اور لامحدود ہے..... اب بھی وقت ہے..... تمہاری سانسیں ابھی باقی ہیں..... ان کے ختم ہونے سے پہلے اُس کے دربار میں ہاتھ جوڑ کر اُس سے معافی مانگ لو..... مجھے یقین ہے وہ تمہیں معاف کر دے گا..... اور تمہارے پاس تو کفارہ ادا کرنے کا بھی موقع ہے..... سچے دل سے توبہ کر کے اس بدی کے ہرکارے کی بات ماننے سے انکار کر دو..... شاید تمہیں قدرت نے آج اِس مقام پر اِسی لیے پہنچا دیا ہے کہ تم اپنی گناہوں بھری زندگی کا خود خاتمہ کر لو۔"

بارش کی بوچھاڑ تیز ہو چکی تھی اور بجلی اب یوں کڑک کڑک کر اِردگرد گر رہی تھی جیسے آج اُسے بھی اپنے کسی شکار کی تلاش ہو۔ اصغر صاحب کا اُٹھتا ہوا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے پھر درمیان میں رُک گیا۔ چھلاوہ زچ ہو کر غصے میں پاگل ہو چکا تھا اور سلطان بابا کی گفتگو کے دوران وہ درجنوں بار اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ بالکل ہی لبریز ہو گیا تھا وہ چلا کر بولا۔

"بس بہت ہو چکا یہ کھیل..... اصغر تم اس کا خاتمہ کرتے ہو، یا میں اپنے اِسی سرخ دھاگے کو تمہارے گلے کا پھندا بنا ڈالوں ہمیشہ کے لیے..... میں اب پل بھر بھی انتظار نہیں کروں گا واپس پلٹنے میں..... مار ڈالو اسے..... گھونپ ڈالو اس کے سینے میں یہ چاقو..... ابھی..... میں کہتا ہوں ابھی....." اصغر صاحب جو شاید اس قتل کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ اُنہوں نے چھلاوے کی دھاڑ سے ڈر کر چاقو والا ہاتھ یوں فضا میں بلند کیا جیسے وہ اس بحث کے دوران ہزار بار ٹوٹ کر بکھر چکے ہوں۔ سلطان بابا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اصغر صاحب کے ہاتھ میں پکڑے چاقو کا پھل دُور کہیں گرتی بجلی کی روشنی سے پل بھر کے لیے جگمگایا اور پھر فضا میں سلطان بابا کی آواز گونجی "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ....." اصغر صاحب کا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا میرے منہ سے "نہیں" کی چیخ نکل گئی۔ اصغر صاحب کے تیزی سے نیچے آتے چاقو کے تیز پھل نے اُن کی گردن میں پڑے دھاگے کو اس

طرح کاٹا کہ خود اُن کی گردن سے بھی خون کا ایک تیز فوارہ سا نکلا جس نے سامنے کھڑے سلطان بابا کو رنگ ڈالا۔ اصغر صاحب نے سلطان بابا کے سینے میں چاقو گھونپنے کے بجائے اپنے ہی گلے میں پڑے سرخ دھاگے کو کاٹ ڈالا تھا۔ اُن کا وار چھلتا ہوا پڑا اور چونکہ دھاگا گلے میں مضبوطی سے کسا ہوا تھا لہٰذا چاقو نے دھاگے کی کسی ہوئی ڈور تک پہنچنے سے پہلے اُن کے گلے کی جلد کو کاٹ ڈالا۔ دفعتہً بجلی زور سے کڑکی اور پھر فضا میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اور میں نے اس گھپ اندھیرے میں برستی بوچھاڑ کے پس منظر میں اُن دو سرخ جلتی آنکھوں کو رفتہ رفتہ معدوم ہوتے ہوا دیکھا۔ ایسے جیسے کوئی دو جلتے ہوئے شدید تیز انگاروں پر پانی کی ہلکی ہلکی بوندیں گرا کر انہیں دھیرے دھیرے بجھا دے۔ میں ابھی تک انہی آنکھوں کے سحر میں تھا کہ سلطان بابا کی زوردار آواز نے جیسے مجھے جھنجھوڑ ڈالا ''ساحر میاں.....جلدی کرو.....ابھی جان باقی ہے.....اسے کسی ہسپتال تک پہنچانا ہوگا.....'' میں ایک دم سے جیسے ہوش میں آ گیا۔ اصغر صاحب زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے اور اُن کے گلے سے بھل بھل خون نکل کر پانی کے قطروں کے ساتھ مل کر نیچے کیچڑ میں مل رہا تھا۔ سلطان بابا نے جلدی سے اپنے کاندھے پر پڑی چادر کو پھاڑا اور ایک پٹی سی بنا کر اصغر صاحب کے زخم پر خوب کس کر مضبوطی سے باندھ دی۔ قریب ہی کیچڑ میں لت پت پڑے اُس سرخ دھاگے کو انہوں نے اس بجھتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جو انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے کھنڈر میں روشن کر رکھی تھی۔ دھاگا جل کر یوں تڑخا جیسے کوئی جڑی بوٹی آگ میں جلی ہو۔ میں نے اصغر صاحب کو کاندھے پر ڈالا اور ہم دونوں تیزی سے کھنڈر سے نکل کر گاؤں کی طرف جاتی کچی سڑک کی جانب دوڑ پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے اصغر صاحب کے گلے سے ٹپکتے ہوئے خون کے قطرے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ

ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا
کچھ بخت میں ڈھیروں کالک تھی
کچھ اب کے غضب کا کال پڑا
راکھ لیے جھولی میں
اور سر پہ ساہوکار کھڑا

جب بستی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سُرسنگیت میں کھوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے
جب فصل کٹی تو کیا دیکھا
کچھ زخمی خواب تھے آنکھوں میں
کچھ درد کے ٹوٹے گجرے تھے
ہم خوابوں کے بیوپاری تھے
پر اس میں ہوا نقصان بڑا

خواب مرتے نہیں

آخرکار تیسرے دن اصغر صاحب کو ہوش آ ہی گیا۔ ہم اُس طوفانی رات میں انہیں کس طرح لے کر پہلے گاؤں کے ہسپتال اور پھر خان صاحب کی گاڑی میں قریبی ضلع کے بڑے ہسپتال تک پہنچے یہ ایک الگ اور لمبی داستان تھی۔ پہلے تو ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا، لیکن پھر نہ جانے یہ اُن کے اندر کے جینے کی لگن تھی، یا پھر واقعی اُن کا کفارہ ساتویں آسمان پر قبولیت کا شرف پا گیا تھا۔ ہماری دعائیں رنگ لے آئیں اور اصغر صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے چند گھنٹے تو ہوش وحواس سے بالکل ہی عاری تھے۔ انہیں کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور اس ہسپتال تک کیسے پہنچے۔ پھر دھیرے دھیرے انہیں اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی۔ سلطان بابا نے اُن کی اس کیفیت کی ایک بہت حیرت انگیز سی وجہ بھی بیان کی کہ اگر ہوش میں آنے کے بعد اصغر صاحب کو چھلاوے کے ساتھ گزرا ایک سال صرف چند لمحوں کا خواب لگا، یا انہیں کچھ بھی یاد نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہمارے زمینی وقت کے محور سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا ''زمینی وقت سے کیا مراد ہے آپ کی.....؟ کیا مختلف زمانوں کے لیے وقت کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں؟'' سلطان بابا نے گہری سی سانس لی۔ ''فی الحال تو یہ صرف ایک پہیلی ہی ہے..... اور سائنس بھی کہیں نہ کہیں اس پہیلی کی کھوج میں ہے۔ لیکن نوری سال (Light Year) اور وقت میں سفر کا تصور اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ ہم زمین پر جس وقت کے پیمانے میں زندہ ہیں اس کے علاوہ وقت کے مزید پیمانے بھی ضرور موجود ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہماری گھڑی، پل، منٹ، گھنٹے اور سیکنڈز بھی ان زمانوں کے وقت کے پیمانوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ مثلاً ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اصغر صاحب نے اُس مخلوق کے زیر اثر جو پورا ایک سال گزارا وہ ہماری دنیا کا صرف ایک منٹ، یا چند سیکنڈ ہی ہوں۔ مثلاً ہم خواب میں اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی زندگی کے تمام مناظر دیکھ کر بھی جب اُٹھتے ہیں، تو ہماری پوری نیند میں اس دیکھے گئے

خواب کا اصل دورانیہ چند منٹ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ مطلب خواب میں وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور سالوں کا سفر لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ گویا خواب کے وقت کا پیمانہ جاگتی حالت کے پیمانے سے یک سر مختلف ہے..... اِسی طرح کسی زمانے کے وقت کا پیمانہ ہمارے زمانے کے بالکل اُلٹ بھی ہوسکتا ہے..... یعنی ہم یہاں زمین پر جس وقت کو سالوں میں پورا کر پاتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ کسی زمانے کا ایک پل ہی ہو..... یہ سب کہیں نہ کہیں میٹافزکس سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہی سارے وہ اسرار ہیں جن کی کھوج کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔"

میری اُلجھن ابھی تک قائم تھی۔ "لیکن اصغر صاحب کے معاملے میں صرف وہی تو اس وقت کے پیمانے میں شامل نہیں تھے، اُن کے ساتھ اُن کی بیوی، بچے، دوست، دشمن، باہر کی دنیا اور دفتر والے سیکڑوں لوگ شامل تھے، جن سے پورا سال اصغر صاحب کا تعلق اور واسطہ رہا ہے۔ ہم اگر یہ فرض کر بھی لیں کہ اصغر صاحب ایک خواب کی حالت میں اس چھلاوے کی دنیا کے وقت کے پیمانے کے زیر اثر اپنا پورا سال گزار کر یہاں تک پہنچے ہیں تو پھر باقی لوگوں کی کیفیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر اُن کے آخری تیس دن تو خود میرے ساتھ درگاہ پر ہی گزرے ہیں اور آخری دن کے چند گھنٹے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس وقت کے پیمانے میں شامل تھے..... اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" سلطان بابا ابھی تک اُسی گہری سوچ میں تھے۔ "اِسی لیے میں نے کہا نا کہ ابھی تک یہ ایک پہیلی ہی ہے اور پھر تم بھول رہے ہو کہ انسان جب نیند میں چلتا ہے تو اُس کے اِردگرد کا زمانہ جاگ ہی رہا ہوتا ہے اور پوری طرح اپنے حواس میں ہوتا ہے۔ اگر اصغر صاحب نیند میں تھے تو ہم بھی اُن کے خواب کے چند کردار بن کر اُن کے ساتھ چلتے رہے۔ اِس سے اُن کی خوابیدہ حالت کا کیا تعلق.....؟" "چلیں مان لیا کہ اصغر صاحب خواب کی کیفیت میں ہی تھے، لیکن پھر اس چھلاوے کی وہ شبیہ.....؟ اُس کی وہ دو جلتی ہوئی آنکھیں.....؟..... جو میں نے اور پھر آپ نے بھی خود دیکھیں ہیں..... اُس کی آپ کیا توجیہہ پیش کریں گے.....؟"

سلطان بابا میری تکرار سن کر مسکرا دیئے۔ انہوں نے توصیفی نظر سے میری جانب دیکھا "ہاں..... یہ البتہ مکمل سوال ہے۔ جس کی توجیہہ کی ضرورت ہے..... تمہیں یاد ہے کہ یاقوط نے رُباب کو تمہیں زہرا کے روپ میں دکھایا تھا؟..... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس بار ہم دونوں ہی

اُسی طرح کے کسی خواب کے زیر اثر رہے ہوں لیکن بہرحال یہ بات طے ہے کہ اصغر صاحب کا واسطہ واقعی ایک شیطانی مخلوق سے قائم تھا..... اس مخلوق کے اثرات اور اس کے وقت اور دیگر پیمانوں کا تو اب تب ہی پتا چلے گا جب اصغر صاحب کو مکمل ہوش آئے گا.....''

اور پھر دھیرے دھیرے اصغر صاحب کو مکمل ہوش آ ہی گیا اور ساتھ ہی انہیں پچھلی ساری باتیں بھی یاد آ گئیں۔ انہیں واقعی اپنا پچھلا گزرا پورا سال ایک خواب ہی لگ رہا تھا لیکن وہ سب خواب نہیں تھا۔ انہوں نے جب ہسپتال کے نمبر سے اپنے نئے گھر کا نمبر ملایا تو وہاں سے واقعی اُن کے نوکر نے ہی فون اُٹھایا لیکن اُس نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اصغر صاحب جانے سے پہلے اس قدر دیوالیہ ہو چکے تھے کہ اُن کے تمام کاروبار، گھر اور روپیہ پیسہ گروی ہو چکا تھا اور تین دن پہلے اس رہن کی میعاد ختم ہونے کے بعد بینک اور باقی سود خود جن سے قرضہ لیا گیا تھا، وہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ ٹھیک وہی وقت تھا جب اصغر صاحب نے اپنے گلے میں پڑا دھاگا کاٹ ڈالا تھا۔ گویا عین اُس لمحے جب اصغر صاحب اپنا گروی رکھا ہوا ایمان واپس پا رہے تھے، ٹھیک اُسی وقت اُس رہن رکھے ایمان کے بدلے پائی ہوئی سلطنت کو وہ کھو رہے تھے۔ چھلاوہ اپنی دی ہوئی دنیاوی آسائشوں کو تخت و تاراج کر رہا تھا اور آج ٹھیک ایک سال بعد مالی طور پر اصغر صاحب وہیں کھڑے تھے جہاں سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ البتہ رشتوں کے معاملے میں انہوں نے صرف اور صرف کھویا ہی تھا۔ اُن کا سارا خاندان برباد ہو چکا تھا اور اُس ایمان فروشی کی قیمت اپنے کھوئے ہوئے رشتوں کے بدلے انہیں ساری عمر چکانا تھی۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ بظاہر اُن کے اس عروج و زوال کی کہانی کا اسکرپٹ پوری طرح مکمل کر رکھا تھا اُس چھلاوے نے۔ عام لوگوں کے لیے یہ معاملہ بہت سیدھا سادھا تھا۔ ایک عام جونیئر کلرک جو اپنے دو کمروں کے چھوٹے فلیٹ میں عسرت زدہ زندگی گزار رہا تھا، ایک دن اُس کا پانچ کروڑ کا پرائز بانڈ نکل آتا ہے اور وہ راتوں رات کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ پھر وہ اس پیسے کو اسٹیٹ اور پراپرٹی کے کاروبار میں لگاتا ہے۔ قسمت یہاں بھی اُس کا ساتھ دیتی ہے اور اُس کا زمین کے لین دین کا کاروبار دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہے اور وہ ایک بہت بڑی بزنس ایمپائر کا مالک بن جاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن اُس کا بیٹا اور داماد قتل کے جرم میں گرفتار ہو کر پھانسی تک جا پہنچتے ہیں اور

یہاں سے اُس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ بیوی، بیٹے کی موت کی خبر سن کر ہوش و ہواس کھو بیٹھی ہے۔ بیٹی بیوہ ہو جاتی ہے۔ دوسری بیٹی کسی غنڈے کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور وہ کروڑ پتی بیٹے اور داماد کو پھانسی سے بچانے کے چکر میں اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اپنی ساری جائداد گروی رکھ کر سود پر بازار سے قرضہ اُٹھاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی مقدر اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ بیٹا پھانسی چڑھ جاتا ہے اور وہ شخص دیوالیہ ہو کر ایک دن دنیا کی نظروں میں گھر سے بھاگ کر کہیں چھپ جاتا ہے اور اِسی اثناء میں بینک اور سود پر پیسہ دینے والے مدت ختم ہونے کے بعد اُس کے گھر، جائداد اور کاروبار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور یوں وہ شخص پھر سے غربت کے اُسی گڑھے میں جا گرتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے یہ بس اتنی ہی اور سیدھی سادھی سی کہانی تھی۔ آس پاس کے لوگ اصغر صاحب کی بدقسمتی پر کچھ دیر کے لیے بحث کر کے پھر سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ چند ہفتوں کے بعد یہ کہانی بھی اُن کے ذہنوں سے مٹ جائے گی۔ کوئی اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ اصغر صاحب کے اس عروج اور زوال کی داستان کے پیچھے ''چھلاوے'' نامی کسی مخلوق کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مارڈن سائنسی دور میں کس کے پاس فرصت ہے ایسی طلسماتی داستانوں پر یقین کرنے کی؟..... میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور عجیب سا خیال آیا، ہمارے آس پاس جانے کتنے لکھ پتی کنگلے اور جانے کتنے کنگلے راتوں رات لکھ پتی بن جاتے ہیں..... کون جانے ان کامیابیوں اور بربادیوں کے پیچھے بھی کسی اَن دیکھے ''چھلاوے'' کا ہاتھ ہی نہ ہوتا ہو؟؟ ہم اپنی کامیابیوں کی راہ پر اپنی بے ایمانی اور ایمان فروشی کے ایسے ہی گھوڑے پر سرپٹ دوڑتے جاتے ہیں اور اپنی ہر فتح کو اپنی حکمت اور اپنی منصوبہ بندی کا مرہون منت مان کر جیت کے نشے میں ہر سہرا اپنے سر باندھتے ہوئے یہ بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ کہیں یہ ''بے ایمان'' کامیابیاں، قدرت کی کسی ڈھیل کا نتیجہ تو نہیں.....؟ کہیں کوئی ''چھلاوہ'' ہمارے اِردگرد اپنا جال تو نہیں بن رہا؟ ایک ایسا جال جس کی ڈوریاں خود ہماری ایمان فروشی کے دھاگوں سے بنی ہوئی ہیں اور جب بھی ذرا ہمارے اندر ایمان جاگا وہ چھلاوہ ہمارے قدموں تلے سے زمین کھینچ کر پھر سے ہمیں بے دست و پا کر دے گا.....

ٹھیک اُسی طرح جیسے اُس نے آج پل بھر میں اصغر صاحب کو آسمان سے اُٹھا کر پھر سے

اُسی زمین پر پٹخ دیا تھا جہاں سے وہ ترقی اور دولت کی خواہش لے کر اُٹھے تھے۔ پوری طرح حالت سنبھلنے کے بعد انہوں نے مجھے اور سلطان بابا کو بتایا کہ جس وقت انہوں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تھا اُس وقت تک اُن کا صرف اور واحد ارادہ وہ چاقو سلطان بابا کے عین سینے میں اُن کے دل کے اندر گاڑھ دینے کا ہی تھا، لیکن جیسے ہی اُن کا ہاتھ بلند ہوا اور سلطان بابا کے ہونٹوں سے غیر ارادی طور پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا کرشماتی کلمہ ادا ہوا تو پل بھر میں ہی جانے اُن کے اندر سب کچھ تلپٹ کیسے ہو گیا اور انہوں نے خود اپنی شہ رگ پر ہی وار کر دیا۔ بقول اُن کے اگر خنجر اُٹھانے سے پہلے ہی اُن کا ارادہ دھاگا کاٹ دینے کا ہوتا تو وہ ہاتھ کو سر سے بلند ہی نہ کرتے اور سیدھے اپنی گردن کی جانب لے جا کر دھاگا کاٹ ڈالتے۔ اور اس صورت میں شاید اُن کی گردن بھی اس قدر نہ کٹتی جتنی اس طرح اُوپر سے وار کرنے کی صورت میں کٹی۔ اپنی جانب سے تو وہ اپنا خاتمہ کر ہی چکے تھے، لیکن قدرت کو ابھی اُن کی زندگی، یا یوں کہہ لیں کہ اُن کا امتحان مزید مقصود تھا لہٰذا تین دن زندگی اور موت کی بازی کھیلنے کے بعد وہ پھر سے زندگی کی جانب پلٹ آئے۔ سلطان بابا نے اُن کی پوری بات سن کر سر اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور دھیرے سے بولے "بے شک! اللہ کے کلمے میں بڑی طاقت ہے۔ کاش ہم سب اس کلمے کی اصل طاقت اور اثر سے پوری طرح واقف ہوتے تو کسی اور 'اسم اعظم' کی تلاش میں یوں دربدر نہ بھٹکتے۔ جو کچھ بھی ہے اسی کلمے میں پنہاں ہے....."

میں اصغر صاحب کی بے ہوشی کے وقفے میں تین دن تک سلطان بابا کے ساتھ ہی بنا پلک جھپکائے ہسپتال میں اصغر صاحب کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ اُن کی طبیعت کچھ سنبھلی تو سلطان بابا نے اصرار کر کے مجھے حویلی کی خبر لینے کے لیے گاؤں بھیجا کہ زہرا اور اُس کی ماں صرف میرے بلاوے پر اتنی دُور آئے ہوئے تھے لہٰذا مجھے اُن کی دل جوئی کے لیے ہی سہی، پر حویلی کا ایک چکر ضرور لگا آنا چاہیے۔ حالانکہ جب ہم اصغر صاحب کو کریم خان صاحب کی موٹر میں ضلع کے بڑے ہسپتال کے لیے لے کر نکل رہے تھے تب میں نے بڑی مالکن کے ذریعے زہرا کو یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ "پریشانی کچھ ایسی ہے کہ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔" اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں جن اعلیٰ ظرف لوگوں کے درمیان زہرا اور اُس کی ماں کو چھوڑے جا رہا تھا وہ اپنا سب کچھ لٹا دیں گے لیکن کبھی اپنے مہمانوں کے شیشہ دل پر کوئی بھی خراش نہیں آنے دیں

گے۔لیکن خود اُن کے اپنے گھر میں اُن کے اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی تو مضمحل تھا، زخمی تھا، بے کل تھا..... جانے وہ اُس موم کے پروں والی پری کی اس آنچ سے حفاظت کیسے کر پائے ہوں گے؟ وہ تو اتنی نازک تھی کہ بادلوں سے چھنی ایک ہلکی سی کرن بھی اُس کا اندر پگھلا سکتی تھی۔ پھر جانے یہ تین دن کا سورج اُس پر کیسے برسا ہوگا؟ ہاں البتہ اتنا اطمینان مجھے ضرور تھا کہ میں زہرا نام کا جو اَبر اُس نازنین کے پہرے کے لیے چھوڑ کر گیا تھا وہ خود اپنے وجود پر لاریب کے حصے کی ہر تپش برداشت کر لے گا لیکن اُس کا کومل من کبھی پگھلنے نہیں دے گا۔ انہی سوچوں میں گم جب میں ضلع سے صبح کی پہلی ٹرین لے کر دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے جبل پور اسٹیشن پر اُترا اور حویلی پہنچا تو سارے گھر پر ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ بیرونی ڈیوڑھی میں کرم دین نے مجھے آتے دیکھا تو اندر اطلاع کرنے کے لیے دوڑ گیا۔ اور کچھ ہی پل میں اُلٹے قدموں لوٹا کہ مجھے اندر بلایا گیا ہے۔ حالانکہ میں درجنوں بار یہ ڈیوڑھی پار کر کے حویلی کے اندر جا چکا تھا لیکن آج بھی میرے قدموں میں وہی جھجھک اور وہی ہچکچاہٹ تھی جو پہلی بار یہ دہلیز پار کرتے ہوئے موجود تھی۔

اندر زنانے والے حصے کے برآمدے کو بڑی بڑی چکوں سے ڈھانک دیا گیا تھا۔ شاید یہ اہتمام سخت گرمیوں کے موسم کے لیے کیا گیا ہو تاکہ دوپہر کی تپتی دھوپ کی تپش کو روکا جا سکے۔ لیکن اس سرما کی نرم دھوپ والی سہ پہر میں بھی ان لکڑی کی کھلے تنکوں والی چکوں کا یوں ڈھلکا رہنا ضرور کسی خاص وجہ سے ہی ہو سکتا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ اہتمام زہرا اور اُس کی امی کی وجہ سے کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ بہر حال وہ دونوں حویلی کے آبائی نوکروں کے سامنے بھی یوں آزادانہ پھرنے میں کچھ جھجھک ضرور محسوس کرتی ہوں گی۔

باہر سے چھن کر آنے والی دھوپ چک کے تنکوں کے درمیان سے کچھ ایسے زاویے سے برآمدے کے چمکیلے سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہی تھی کہ نیچے فرش پر بھی دھوپ کے تنکوں کی ایک ''چک'' سی بچھ گئی تھی۔ ایک عجیب سا مٹیالا اُجالا پھیلا ہوا تھا اس طویل برآمدے میں۔ لہٰذا میری آنکھوں کو کچھ پل لگے اس ملگجی روشنی سے نظریں ملانے میں۔ برآمدے کے آخر میں مویتے کی لمبی لمبی بیلوں کے سامنے کوئی پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر وہ وجود پلٹا۔ میری آنکھیں تب تک اس مدہم روشنی سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ لاریب تھی، سفید کرتے پاجامے

میں ملبوس اور سر پر دھانی رنگ کی اوڑھنی لیے ہوئے۔ وہ نور کا ایک ایسا ہالہ لگ رہی تھی جس کے اندر ذرا سی ہلدی کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ شاید یہ اس شدید بخار اور بیماری کا اثر تھا جو اُس کے ملیح چہرے پر پچھلے چند دنوں کے دوران اپنا رنگ چھوڑ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی ستارہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔ میں نے سلام کے بعد اُس سے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھنے سے پہلے اُس کی طبیعت کا پوچھا، وہ دھیرے سے مسکائی ''آپ نے طبیب ہی ایسا بھیجا تھا کہ بیماری کو نہ کہتے ہی بنی..... اتنے اچھے لوگ بیک وقت اپنے آس پاس کیسے جمع کیے رکھتے ہیں آپ.....؟..... میں تو ہر بار کھو دیتی ہوں۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا، جانے یہ بات اُس نے کسی رو میں کہی تھی، یا واقعی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ لڑکیاں اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا بھی خوب جانتی ہیں۔ ہتھیلی پر نام لکھ لکھ کر پلکوں سے مٹاتی رہتی ہیں۔ لیکن آنکھ کے پردے تک وہ تحریر آنے نہیں دیتیں۔ میں نے باقی گھر والوں کے بارے میں پوچھا تو لاریب نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں کسی منگنی کی تقریب میں بڑی مالکن کو بطور لڑکی کی سرپرست دعوت تھی۔ لہٰذا وہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ زہرا اور اُس کی ماں کو بھی تبدیلی کی غرض سے لے گئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے میں اور لاریب بالکل ہی خاموش کھڑے رہے۔ جیسے ہمارے پاس کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہی ہو، یا ہم دونوں ہی جیسے اُس مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں خاموشی خود ہر بات کہہ دیتی ہے۔ اور زبان، لفظ اور باتیں سب بے معنی سے ہو جاتے ہیں۔ میں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔ ''مجھے آپ سے معذرت کرنا تھی.....'' میں چونک کر پلٹا ''معذرت..... لیکن کس بات کی.....'' اُس نے اپنی پلکوں کی جھالر گرا لی۔ ''میں انجانے میں آپ کو اپنے زخموں میں اُلجھا بیٹھی..... آپ تو خود شدید گھائل ہیں..... آپ کے تو اپنے زخموں سے ابھی خون رِسنا بند نہیں ہوا..... آپ کی امی نے آپ کی اور زہرا کی کہانی اتنی تفصیل سے نہیں سنائی تھی۔ اگر میری زہرا سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید آپ کے داغوں پر پڑا یہ پردہ میرے سامنے کبھی اُٹھ نہ پاتا۔ آپ تو ہر حد سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں نے آج تک محبت کو جیتتے اور لوگوں کو محبت میں ہارتے ہوئے ہی دیکھا تھا..... لیکن آپ نے محبت کو جیت کر دکھا دیا..... زمانے کی ہر رسم، محبت کی ہر شرط، مجبوری کا ہر دعویٰ آپ کے سامنے فقط ریت کی ایک دیوار ہی تو ثابت ہوا۔ آپ نے دنیا کو بتا

دیا کہ جو عشق میں جی نہیں سکتے وہ پہلے ہی سے مرے ہوتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہوگئی، جیسے اُس کے پاس کہنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں ہوں کہ وہ ذہن میں اُن کی ترتیب جوڑتے جوڑتے اپنے لفظ ہی بھلا بیٹھی ہو۔ لاریب نے اپنے دھونکنی جیسے چلتے سانس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جانے یہ جذبوں کی بھول بھلیاں ہم کمزور انسانوں کے ساتھ ایسے گھناؤنے کھیل کیوں کھیلتی ہیں کہ ہم کچھ کہتے ہیں تو رُسوا ہوتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں تو لفظوں کے یہ ڈنک ہمیں اندر ہی اندر ڈستے رہتے ہیں۔ اور آخر کار چپ کا یہ ناسور ہماری جان لے کر ہی رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال سے اس وقت وہ کانچ کا پیکر بھی دوچار تھی۔ میں نے کھنکار کر اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ "اپنی اپنی تقدیر کی بات ہے..... میری ہمیشہ یہی دعا رہے گی کہ قدرت آپ کی راہ میں کانٹوں کی بجھی ہر راہ کو گلوں سے بھر دے....."

اُس نے اپنی پلکیں اُٹھائیں "پھولوں کی خواہش تو میں نے بھی کبھی نہیں کی..... اور پھر ان راہوں کے چناؤ کا انتخاب خود ہمارے بس میں ہوتا ہی کب ہے کہ ہم کلیوں، یا کانٹوں کے فرق کو دھیان میں رکھتے ہوئے کسی راستے کو چن کر اپنا پہلا قدم وہاں رکھیں..... ہمیں تو پتا ہی تب چلتا ہے جب ہمارے پاؤں چھل چکے ہوتے ہیں....."

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ بھی پاؤں کے چھالوں کی دُہائی دے رہی تھی۔ میں اب اُس گل اندام کو یہ کیسے سمجھاتا کہ یہ تو وہ راہ ہے جہاں پیر کے چھالے گننے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ میرے مقدر میں تو یہ خار ازل سے لکھ دیئے گئے تھے مگر وہ اپنی گلابوں جیسی کومل جلد لیے اس خارزار کی طرف کیوں بڑھی چلی آ رہی تھی؟ اُس کے جگر ناتواں کے لیے تو یہاں کا صرف ایک زہریلا کانٹا ہی کافی تھا۔ میں سر جھکائے جانے ایسی کتنی سوچوں سے لڑتا رہا۔ پر شاید وہ بھی سوچ پڑھنے کا ہنر جانتی تھی۔ جس کا ثبوت اُس کے اگلے جملے نے دے دیا۔

"لیکن آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیئے گا۔ میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے کہ یہ وہ بازی ہے جو ہار کر ہی جیتی جا سکتی ہے۔ یہ وہ ملن ہے جو جدائی کے بنا مکمل نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کھو کر ہی پایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بستی ہے جو اُجڑ کر ہی بستی ہے۔ یہ وہ جیون ہے جو خود کو وار کر ہی جیا جاتا ہے۔ اور یہ وہ سرد سکون ہے جس کی ٹھنڈک انگاروں پر چل کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے..... تو میں نے بھی ان چند دنوں میں اُس عجائب خانے کو برتنے کا کچھ نہ کچھ ڈھنگ

سیکھ لیا ہے جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ میں نے ہر درد پر عبور حاصل کر لیا ہے لیکن اتنا وعدہ آپ سے ضرور کرتی ہوں کہ میرے اندر اس جذبے سے جو بھی تبدیلی آئے گی، وہ اس اعزاز کی حرمت کی تحقیر کا باعث کبھی نہیں بنے گی۔ میں ہمیشہ سر اُٹھا کر جیوں گی تا کہ میری وجہ سے کبھی محبت کا سر جھکنے نہ پائے..... بس مجھے ہر قدم پر آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی کہ میں ابھی بہت کمزور ہوں اور میرے ظرف کا پیالہ بھی ابھی اتنا گہرا نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے ٹھیک طرح سے ٹوٹنا بھی نہیں آتا جب کہ مجھ سے خود ہی اپنے ریزے سمیٹنے کی اُمید بھی باندھی جا چکی ہے۔ دعا کریں کہ میں ثابت قدم رہ سکوں.....'' وہ چپ ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے لفظ بھی اُسی کے پاس رہ گئے ہیں۔ گویا قدرت نے ایک بار پھر کوہ کن کے ہاتھ ایک چھوٹا سا تیشہ تھما کر اُسے زندگی کے پتھریلے پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ میں اُس نازک سی لڑکی کے الفاظ اور اُن سے پیدا شدہ موجزر پر غور کرتا رہا۔ یہ محبت بھی کتنی بڑی اُستاد ہوتی ہے۔ نہ جانے چند دنوں میں ہی یہ ہم معصوم انسانوں کو اتنے سبق کیسے دے جاتی ہے؟ ہم خود بخود اتنی مشکل بولی کیسے بولنے لگ جاتے ہیں؟ کل تک ہر بات ہنسی مذاق میں اُڑا دینے والی اور ہر پل زندگی کا رس نچوڑنے والی غریب کو بھی تو یہ بولی اُسی ''عشق'' نامی اتالیق کی ہی سکھائی ہوئی تھی۔ سچ کہ محبت صدیوں کا فرلمحوں میں طے کرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ ایک پل میں جواں، رعنا اور حسین دلوں کی رگوں سے زندگی اور نسوں سے خون نچوڑ کر انہیں ضعیف تر کر دیتی ہے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا کہ ''میری دعائیں سدا آپ کے ساتھ ہیں۔'' پھر مجھ سے وہاں رُکا نہیں گیا۔ باہر جاتے وقت کرم دین سے یہ بھی پتا چلا کہ بڑی مالکن لوگ تو اب رات دیر سے ہی لوٹیں گے۔ میں درگاہ پہنچا تو ہماری چار روزہ غیر حاضری کے دوران درگاہ کا صحن خزاں رسیدہ پیلے اور زرد پتوں کی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ انگور کی خشک بیلیں اُداس ہو کر میری راہ دیکھتے دیکھتے منڈیر تک بڑھ آئی تھیں اور چشمے کے یخ اور تازہ پانی کا جھرنا یونہی بہتے بہتے انہیں اپنی جھنکار سے تسلیاں دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اس خاموشی اور سکوت سے مبہوت سا ہو گیا۔ کیا جنت کا سکوں اس ماحول سے کچھ سوا ہو گا؟

شام ڈھلے ایک اور خوش گوار حیرت سلطان بابا اور اصغر صاحب کے روپ میں درگاہ کی

ویرانی کم کرنے کا سبب بن گئی۔ سلطان بابا نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اصغر صاحب کے بے حد اصرار پر کہ وہ دوائیں اور آرام کا سلسلہ درگاہ پر بھی جاری رکھ سکتے ہیں انہیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن صرف اس شرط اور وعدے پر کہ وہ اگلا ایک ہفتہ مسلسل آرام کریں گے اور زخم بھر جانے کے بعد ہی روزمرہ کے کاموں میں حصہ لے سکیں گے۔ اصغر صاحب کی نیت یہی تھی کہ اب وہ باقی ماندہ زندگی یہیں اِسی درگاہ میں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے کاٹ دیں لیکن سلطان بابا نے انہیں پھر سے اپنے گھر لوٹ جانے کی تلقین کر رکھی تھی۔ وہ اصغر صاحب کو پہلے ہی چھ کلمے اور ایمان مفصل اور ایمان مجمل پڑھوا کر اُن کے ایمان کی تجدید کروا چکے تھے۔ سلطان بابا کے بقول اصغر صاحب کا اصل امتحان اور کفارہ جبل پور سے نکلنے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ انہوں نے اصغر صاحب کو یہ بھی بتایا کہ شروع کے چند مہینے اُن پر بے حد سخت گزریں گے کیوں کہ منفی قوتیں اب انہیں چین سے جینے نہیں دیں گی۔ لیکن انہیں ہر حال میں ثابت قدم رہ کر سختی اور ہر مشکل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اِسی میں اُن کی نجات ہے کہ وہ اب آخری سانس تک مذہب کا دامن سختی سے تھامے رہیں۔ اصغر صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ اب ایسا ہی ہوگا۔

اگلی صبح چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ ہفتے بھر کی جھڑی کے بعد سورج نکلا تو جیسے ہر چیز پر لگے گہن کو پھر سے چمکا گیا۔ روشن اور چمکیلی صبحیں بھی تو زندگی بڑھانے کا سبب ہوتی ہیں۔ میں بھی اس صبح کی چمکیلی کرنوں کو انگور کی بیلوں کے چھت سے چھن کر آتے اور نیچے بہتے نالے کے پانی سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ نیچے گھاٹی میں بشیرے کے تانگے کو بھونپو بجا۔ اصغر صاحب اور سلطان بابا ابھی اندر اپنے کمرے میں ہی تھے۔ پھر چند لمحوں بعد ہی وہ نسیم سحر کی طرح بہتی اور جیسے پانیوں پر چلتی ہوئی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ زہرا آج اکیلے ہی آئی تھی۔ ضرور اُسے لاریب نے میری درگاہ پر واپسی کی اطلاع دے دی ہوگی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائی۔

''آپ کے گھائل کے زخم بھرنے تلک میں خود ہی نڈھال ہو کر نہ گر پڑوں..... بہت بڑے امتحان میں ڈال گئے تھے آپ مجھے۔''

میں بھی مسکرا دیا۔ ''وار کاری تھا..... تو مسیحا بھی اُتنا ہی اعلیٰ ظرف چاہیے تھا جتنی زخم کی گہرائی تھی..... کہ اس بیماری کا مرہم بھی تو صرف ظرف کا پیمانہ ہی ہوتا ہے..... اور آپ نے

خوب مسیحائی کی ہے..... جس کا اندازہ مجھے کل ہی اُس سے ملاقات میں ہو گیا تھا۔''

زہرا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف اُسے اتنا ہی بتایا تھا کہ ہم تو خود ابھی تک ایک دوسرے کی کھوج میں ہی تھے۔ اور یہی سچ بھی ہے ساحر..... میں نے آپ کو ریزہ ریزہ چن کر اور پل پل میں پایا ہے..... اور ابھی تو میں صرف آپ کے وجود کی پرچھائی تک ہی پہنچی ہوں..... اور ابھی تک ہر نیا دن مجھے آپ کی رُوح کے ایک نئے رُخ، ایک نئے زاویے سے متعارف کروا رہا ہے۔ ہر روز میری رُوح ایک نئے ساحر سے ملتی ہے۔ اتنا عرصہ دُور رہنے کے باوجود بھی یہ ملاقات ہر لمحہ، ہر پل جاری رہتی تھی..... میں نے تو لاریب سے صرف اتنا ہی کہا کہ اگر وہ بھی میری اس کھوج میں میرے ساتھ شامل ہونا چاہے تو اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی..... کہ یہ تلاش ہی کچھ ایسی ہے کہ شاید تنہا میرا اس پر نہ تو حق ہے اور نہ ہی اختیار.....''

میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف زہرا ہی اعلیٰ ظرفی کا یہ جوا کھیلنے کی جرأت کر سکتی ہے۔

میں نے زہرا سے پوچھا ''تو پھر لاریب نے کیا جواب دیا.....؟''

''وہی جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو دے سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ جذبوں پر اختیار کی ماہر تو نہیں، لیکن وہ اس کھوج پر صرف اور صرف میرا حق اور اختیار مانتی ہے۔ اُسے اس بات پر بھی بے حد شرمندگی تھی کہ اُس کے منہ زور جذبے کی بے پناہ طاقت نے اُس کی ظاہری حالت پر اس قدر اثر ڈالا کہ آپ تک اُس کی خبر پہنچ گئی اور آپ کو پریشانی میں مجھے یہاں بلوانا پڑا..... لیکن بقول لاریب کہ یہ اُس کی در پردہ شدید خواہش کی تکمیل بھی تھی کہ میری اور اُس کی کبھی ملاقات ہو سکے.....'' میں چپ چاپ اور دم سادھے اُس شہزادی کی کہانی سنتا رہا۔ ہاں زہرا اک شہزادی ہی تو تھی جس کا راج پاٹ میرے دل کی سلطنت پر چلتا تھا۔ یہ دل بھی تو ایک بادشاہ کی طرح ہی اپنی سلطنت کا قبضہ کسی ایک کو ہی دیتا ہے۔ خود ہی اپنا سویمبر رچاتا ہے اور پھر جس کسی کے گلے میں یہ اپنے پیار کی مالا ڈال دیتا ہے اُسی کے ساتھ جنموں کے بندھن باندھ لیتا ہے۔ میری مالا بھی اُسی دن زہرا کے گلے میں ڈل گئی تھی جس دن میں نے پہلی بار اُسے درگاہ پر دیکھا تھا۔ لیکن اُس پہلے دن والی زہرا اور آج میرے سامنے کھڑی

ں راج کماری کے دل میں کتنا فرق تھا۔ تب وہ سراپا سنگ تھی اور آج موم کی ایک گڑیا.....
ج پہلی بار اُس نے یوں کھل کر خود اپنی رُوح پر میری سپردگی قبول کی تھی۔ کتنا لمبا سفر طے
ر کے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ کتنی بار میری رُوح نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کتنی بار میرے قدموں
نے لہولہان ہو کر راستے میں ہی سپر ڈالنے کی دہائی دے ڈالی۔ کتنے ہی خار میری کومل رُوح
ں یوں چبھے کہ پھر اندر ہی ٹوٹ کر عمر بھر کا ناسور بن گئے..... کتنی بار اس شدید تپتے صحرا میں
ں یوں جاں بلب ہو کر گھٹنوں کے بل گرا کہ سورج کی تپش اور چبھن سے میری جان میری
تی آنکھوں کے راستے بہتے بہتے خشک ہو کر بے جان ہو گئی۔ لیکن میں چلتا ہی رہا..... ایک
اب کو اپنا نشان منزل بنائے..... اور آخر کار آج میں نے یہ صحرا پار کر ہی لیا تھا۔ میرے
منے اب ایک وسیع سمندر تھا اور میری جان میرے کٹے پھٹے بوسیدہ جسم کے ساتھ میرے
ں گھائل ہونٹوں پر آن اٹکی تھی۔ لیکن کیا اپنی جان اس جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے
ا سے بہتر کوئی گھڑی ہو سکتی تھی.....؟..... میں نے آخر کار محبت کا وہ قلعہ فتح کر ہی لیا تھا
ں کی فصیل تک پہنچنے کی آرزو میں ہی لاکھوں دم توڑ دیتے ہیں..... اور صدیوں کی ریاضت
بعد کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا اگر اس قلعے کے آس پاس پہنچ بھی جائے تو عشق کا وہ
یت، وہ دیو جو اس قلعے کی حفاظت پر معمور ہے، جس کی ہزار آنکھیں اور ہزاروں ہاتھ
ں ہیں، وہ پل بھر میں ہی اُس زخموں سے چور عاشق کو آگے بڑھ کر اپنے ایک ہی ڈنک
دو حصوں میں تقسیم کر کے اُس کی روح قبض کر لیتا ہے۔ لیکن ساحر نے آج عبداللہ کے
ب میں اُس محبت کے قلعے پر اپنا جھنڈا لہرا ہی دیا تھا اور اس قلعے میں قید پری آج میرے
منے خود کو سپرد کرنے کے لیے نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس شہزادی کے لبوں پر ایک دھیمی
ن تھی اور اس کی ستارہ پلکیں لرز رہی تھیں۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ ایک سپہ سالار خود اپنی فتح پر آج رو پڑا تھا۔ یہ
ہزاروں زخموں سے چور اُس کے بدن سے اُٹھتی درد کی ٹیسوں کی وجہ سے نہیں نکلے تھے،
اُسے ان اَن گنت کاٹ کے داغوں اور کٹی پھٹی جلد کا کوئی غم تھا جو اب تا عمر اس معرکے
ملے تمغوں کی صورت میں اُس کے چہرے اور جسم کی نشانی بنے رہیں گے۔ یہ آنسو تو کچھ
کہانی بیان کر رہے تھے کہ ہم بہت زیادہ ہنستے ہنستے بھی تو رو پڑتے ہیں۔

زہرا نے مجھے خاموش پا کر اپنی نظریں اُٹھائیں اور میری آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہی وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ''یہ کیا.....؟ آپ رو رہے ہیں ساحر..... اب تو منزل سامنے ہے..... بہت قریب..... خدا کے لیے خود کو یوں آزردہ نہ کریں..... میری رُوح کا آخری ریشہ تک آپ کا مقروض ہے..... کبھی میں نے آپ کو رُوح کا قبضہ ملنے تک کے انتظار کا کہا تھا..... آج میں آپ سے کہتی ہوں کہ میری رُوح خود آپ کی منتظر ہے..... آ کر اپنی ملکیت کا قبضہ لے لیں..... جب آپ کا جی چاہے..... میری روح پلکیں بچھائے آپ کو آپ کا انتظار کرتی ملے گی.....''

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ آنسو خود میری منزل کو سامنے دیکھ کر اُس کے استقبال کے لیے ہی تو بہہ نکلے تھے۔

اتنے میں سلطان بابا بھی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بہت سی دعائیں دیں۔ پھر مسکراتے ہوئے زہرا کو دیکھ کر کہنے لگے ''تمہارا یہ قیدی اب جلد تمہارے حوالے کر دیا جائے گا کہ اس کا جنوں تو دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لیکن دھیان سے بیڑیاں ڈالنا اس کے اندر کی کھوج کسی کروٹ چین نہیں پاتی.....''

زہرا جو مسکراتے ہوئے سر جھکائے سلطان بابا کی بات سن رہی تھی، اُس کے چہرے پر حیا کے کئی گلابی سائے پل بھر میں ہی گزر گئے۔ پھر وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں پائی اور ہم سے رُخصت ہو کر پلٹ کر چل دی۔ درگاہ کی منڈیر کے پاس رُک کر اُس نے پیچھے مڑ کر مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ کیا کچھ نہیں تھا صرف اُس ایک نظر میں، جانے کتنی صدیوں کا ٹھہراؤ، جانے کتنے جنم کی ایک طمانیت.....

زہرا کے جانے کے بعد وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ایسا میرے ساتھ ہمیشہ ہوا تھا۔ وہ جب جب میرے سامنے آئی تھی، میرے لیے جیسے وقت تھم سا گیا تھا اور جیسے ہی وہ منظر سے اوجھل ہوئی، وقت جیسے پھر اپنی رفتار چل پڑتا تھا۔ تیسرے دن سلطان بابا نے جبل پور سے کوچ کا اعلان کر دیا کیوں کہ یہاں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ کل شام جو اس سال کی آخری شام بھی تھی، ہمیں جبل پور سے رُخصت ہو جانا تھا۔ لیکن کہاں؟ ہمیشہ کی طرح نہ میں نے سلطان بابا سے کچھ پوچھا نہ انہوں نے کوئی وضاحت کی۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہو چلا تھا کہ شاید اس

مرتبہ یہ میرا اور سلطان بابا کا آخری مشترکہ سفر ہوگا۔ اُدھر ہماری روانگی کا سن کر زہرا کی امی نے بھی رخت سفر باندھنے کا ارادہ کر لیا کیوں کہ انہیں بھی ہفتہ بھر سے زائد ہو چکا تھا اور وہاں شہر میں زہرا کے ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔

آخرکار ہماری روانگی کا دن بھی آن پہنچا۔ جاتی خزاں کی شامیں ویسے بھی بہت اُداس ہوتی ہیں لیکن دسمبر کی وہ آخری شام اُداسی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا درد اور کسک بھی اپنے اندر پنہاں لے کر اُتری تھی۔ ہمیں پہلے درگاہ سے خان صاحب کی حویلی اور پھر وہاں سے ریلوے اسٹیشن جانا تھا کیونکہ طے یہ ہوا تھا کہ زہرا کی گاڑی بھی خان صاحب کی گاڑی سمیت ہمیں اسٹیشن چھوڑنے جائے گی کیوں کہ وہاں تک جبل پور سے نکلنے کا راستہ سانجھا تھا۔ درگاہ سے نکلنے سے پہلے میں اصغر صاحب کو وداع کہنے لگا تو وہ مجھے گلے لگا کر بھرا سے گئے۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انہیں تھپکتے تھپکتے خود میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سلطان بابا نے ہم دونوں کو دلاسا دیا اور اصغر صاحب سے بولے "یہ آنسو بہتے رہنے چاہئیں، من ہلکا اور زرخیز رہتا ہے..... یہ خشک ہو جائیں تو دل کی زمین بھی بنجر ہو جاتی ہے، یہ آنسو ہی ہماری آنکھ کا وضو ہوتے ہیں..... سو آنکھوں کو پاک کرتے رہنا ہوگا، کفارہ ادا ہوتے رہنا چاہیے۔" اصغر صاحب نے آخری بار مجھے گلے لگایا "عبداللہ میاں..... میں تمہیں اپنا دوست کہوں، بیٹا کہوں، محسن کہوں، یا رہبر..... ایک ساتھ کتنے رشتوں کا خزانہ دیئے جا رہے ہو تم مجھے..... کیسے لوٹا پاؤں گا میں یہ سب۔" میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا "اپنا بھی کہتے ہیں اور واپس لوٹانے کی بات بھی کرتے ہیں..... اپنوں میں سودے بازی نہیں ہوتی..... آپ جب اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو مجھے اطلاع ضرور کیجیے گا اور اپنا خیال رکھیئے گا..... نصیب میں ہوا تو میں بہت جلد آپ سے آ کر ملوں گا۔"

ہم نیچے گاؤں میں پہنچے تو حویلی کے سبھی ملازمین اُداس سے گیٹ کے باہر ہی سفر کی تیاریوں میں مصروف نظر آئے۔ بشیرے، کرم دین اور جمالے نے خاص طور پر مجھے گلے لگایا اور سلطان بابا سے دعا لی۔

وہاں حویلی کے اندر بیرونی ڈیوڑھی کے پاس بڑی مالکن اور لاریب افسردہ سی زہرا کی گاڑی کے پاس کھڑی تھیں۔ لاریب تو زہرا کو گلے لگا کو وداع کرتے وقت اپنی آنکھیں چھلکا

ہی بیٹھی۔ زہرا کی امی نے بڑی مشکل سے بڑی مالکن اور لاریب کو باہر تک آنے سے روکے رکھا کہ خواہ مخواہ سب کا من الوداعی سے مزید اُداس اور بوجھل ہوگا۔ البتہ یہ وعدہ وہ بڑی مالکن سے لینا نہیں بھولیں کہ وہ جلد ہی لاریب کو لے کر شہر اُن کے ہاں چند دن ٹھہرنے آئیں گی۔ آخرکار حویلی سے وداع ہونے کا وہ جاں گسل لمحہ بھی آ ہی گیا۔ سلطان بابا نے فرداً فرداً سبھی کو دعا دی۔ زہرا اور اُس کی امی نم پلکوں کے ساتھ خان صاحب کے خاندان سے مل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔ میں نے بشیرے کو گلے لگاتے ہوئے دھیرے سے اُس کے کان میں کہا۔ ''عبداللہ کی آمد کی خبر مجھے ضرور دینا۔'' بشیرے نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ کرم دین اور جمالے وغیرہ سے ملتا ہوا میں بڑی مالکن تک پہنچا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ ''ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گے؟'' میں نے اُن کا اپنے سر پر رکھا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا ''میں اپنی آنکھیں یہیں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ جب دل چاہے اِن میں جھانک کر مجھے بلا لیجیے گا۔'' میں مزید اُن کی لرزتی پلکوں سے نظر نہیں ملا پایا اور سب سے آخر میں گم صم سی کھڑی لاریب کی طرف بڑھ گیا۔ ''مجھے رُخصت نہیں کریں گی؟'' وہ جیسے پل بھر میں ہی کسی اور دنیا سے واپس آ گئی۔ ''پہلے میں آپ کے ہونے کا کامل یقین تو خود کو ہو جانے دوں..... رُخصت تو بہت بعد کا مرحلہ ہے..... آپ کے لفظوں کا مرہم سدا میرے ساتھ رہے گا..... اللہ آپ کا نگہبان ہو۔'' میں پلٹ کر خان صاحب کی گاڑی کی طرف چل دیا جہاں سلطان بابا پہلے سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑیاں حویلی سے باہر نکلیں تو میں نے بڑی مالکن اور لاریب کی جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے جبل پور کو ایک عجیب سی اُداسی میں گھرتے ہوئے محسوس کیا۔ ہم اسٹیشن پہنچے تو گاڑی پہلے ہی لگ چکی تھی۔ خان صاحب نے لپکتے جھپکتے نوکروں کی مدد سے ہمارا برائے نام سامان بوگی میں منتقل کروا دیا۔ زہرا اور اُس کی امی بھی ہمیں وداع کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ یہاں سے ایک بار پھر میرے اور زہرا کے راستے عارضی طور پر جُدا ہو رہے تھے۔ پھر وہی الوداع..... پھر وہی کسک اور تڑپ..... مجھے ہر بار یہ الوداع اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح لگتا تھا جس کے نیچے کٹنے کے لیے سجائے گئے عاشق کا سر کٹ تو جائے، پر دھڑ سے پوری طرح علیحدہ نہ ہونے پائے اور اس بے کس اور مجبور عاشق کی جان تڑپ تڑپ کر اور نکلتے نکلتے یوں نکلے کہ اُس کے پیٹھ پیچھے

بندھے ہاتھوں اور پیروں کی سخت مشکیں جان کنی کے عالم میں اُس کے جسم کے ریشوں میں گھستی جائیں لیکن ہاتھوں کی بندش کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے تڑپ بھی نہ سکے اور بندھے پیر اُسے ٹھیک طرح سے ایڑیاں رگڑنے کا موقع بھی نہ دیں۔ کچھ ایسا ہی حال اُس وقت میرا بھی تھا۔ خان صاحب نے رُخصت کرنے سے پہلے زور سے بھینچ کر مجھے گلے لگایا اور دوبارہ جبل پور آنے کا وعدہ لیا۔ زہرا کی امی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے دعا دی ''ہم سب تمہارے منتظر رہیں گے..... اس بار دیر نہ کرنا بیٹا.....'' آخر میں وہ پری زاد ایک بڑی سی کالی چادر میں اپنے گلاب رُخ چہرے اور جھکی پلکوں کے ساتھ میرے وداع کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس کی جھکی نظر اُٹھی ''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' میں نے خود کو مجتمع کیا۔ ''میں آپ کو آپ کے ہر انتظار کی حد سے پہلے آ کر ملوں گا..... اب مجھے وداع کر دیں.....'' اُس نے پھر اپنی نظر جھکا لی..... سب مدہم پڑ گیا۔ ''کچھ الوداع رُخصت کرنے کے لیے نہیں..... اگلی ملاقات کی پیشگی خوش آمدید کہنے کے لیے ہوتے ہیں، سو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ خوش آمدید.....'' میرے منہ سے بھی بے اختیار نکلا ''خوش آمدید۔'' ٹرین کی آخری سیٹی بھی بج چکی تھی۔ سلطان بابا نے زہرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ٹرین نے ایک ہچکولا لیا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے نکلنے لگی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا لیکن زہرا کا ہاتھ یونہی ہوا میں جیسے معلق ہی رہ گیا۔ ٹرین کے سامنے سے ہٹتے ہی دُور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی ایک آخری کرن تیزی سے زہرا کی جانب لپکی اور میں نے بہت دُور سے بھی اُس کی آنکھ میں نمی کی چمک لہراتے دیکھی۔ شاید یہ جبل پور کے سورج کا مجھے اور زہرا کو آخری سلام تھا۔ پلیٹ فارم سے دھوپ اور اسٹیشن سے گاڑی دُور ہوتی جا رہی تھی۔ سورج میرے دل سے بولا

ستمبر

اُسے پکارو

اُسے بلا دو

اُسے ملا دو

اب اِس سے پہلے کہ سال گزرے

اب اِس سے پہلے کہ سانس نکلے
وہی لکیریں، وہی ستارے
میری ہتھیلی میں قید کر دو
یہ آخری شب کے آخری پل
کوئی بڑا اختتام کر دو
یہ زندگی بھی تمام کر دو
سنو دسمبر.....
اُسے پکارو.....
اُسے ملا دو.....

ہاشم ندیم

عبداللہ II

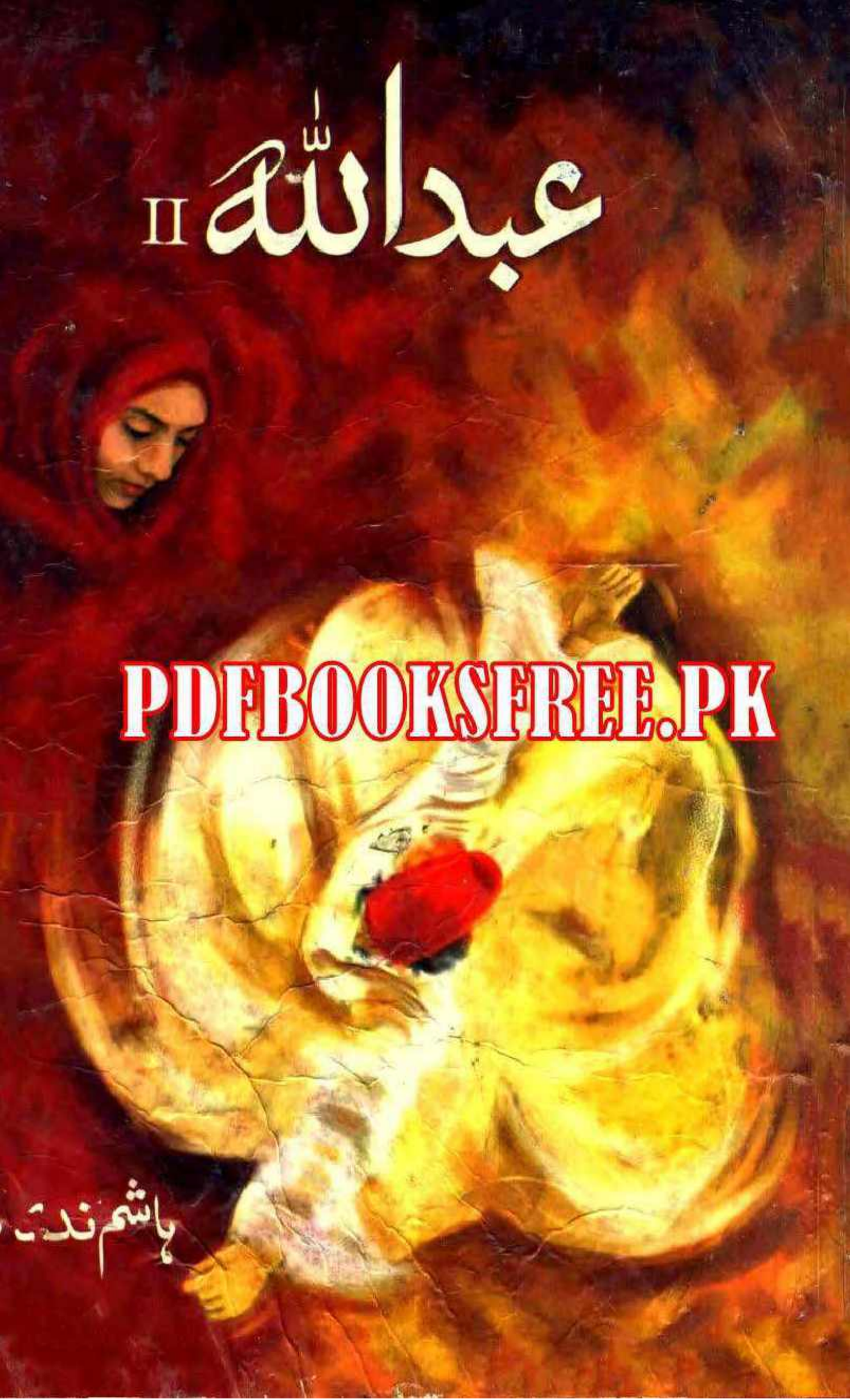

PDFBOOKSFREE.PK

ہاشم ندیم

فہرست

عبداللہ ۷

جبرونت ۹

دوسرا سورج ۱۹

خواب اور سراب ۲۳

لاحاصل کی کھوج ۳۰

روح کا عکس ۳۸

دشمن زمرد ۴۶

دل سے دھواں اٹھتا ہے ۵۴

قفس اور طیر ۶۳

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے ۷۱

اک نئی جنگ ۸۰

معصوم سے معصومیت تک ۸۹

پہلا کفارہ ۹۶

دعائی ۱۰۴

لفظ گر ۱۱۲

ہمارا ہر لفظ تمہارا ہے ۱۲۴

لفظ روٹھ جاتے ہیں ۱۲۹

تم بھول جاؤ گے ۱۳۷

ٹالیسمار ۱۴۶

قاتل ۱۵۳

قفس اور جنوں ۱۶۰

لیو کا لباس ۱۶۷

آدھا چہرہ ۱۷۴

رُوپ بہروپ ۱۸۰

ہم زاد ۱۸۷

آدھا جنوں، آدھا فراق ۱۹۴

گلابی دھند ۲۰۱

"ہوش والوں کو خبر کیا ....." ۲۰۸

کاسابلانکا ۲۱۴

"ایک محبت اور سہی" ۲۲۱

آخری محبت ۲۲۸

"من کی دیوار" ۲۳۵

پہلی قیامت ۲۴۲

21 دسمبر 2012ء ۲۴۹

صیہونی ۲۵۶

آخری مسیحا ۲۶۳

مناظرہ ۲۷۰

ایک اور عبداللہ ۲۷۸

جانشین ۲۸۵

فریفتہ ۲۹۲

"جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے" ۳۰۰

"دوسرا رقیب" ۳۰۸

تارِ عنکبوت ۳۱۶

دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے ۳۲۳

"کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا" ۳۳۲

عبداللہ

عبداللہ کے پہلے حصے، 29 اقساط کا خلاصہ

شہر کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان، ساحر ایک کار ریس کے اختتام پر خود کو ایک ساحلی درگاہ کے قریب پاتا ہے۔ قریب کھڑی ایک بڑی گاڑی کو دیکھنے کا شوق اسے درگاہ تک دھکیل لاتا ہے اور وہاں ایک پری وش زہرا کی ایک ہی جھلک اسے اپنی دنیا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ لیکن زہرا کا من جیتنا ساحر کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ واضح الفاظ میں اس کا بھیجا گیا رشتہ ٹھکرا دیتی ہے۔ ساحر کا جنوں اُسے درگاہ کے متولی عبداللہ تک کھینچ لاتا ہے، جہاں اُس کی سلطان بابا سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو عبداللہ کے اُستاد ہیں۔ ساحر سلطان بابا سے بحث میں اُلجھ کر اپنی تقدیر کا شکوہ کرتا ہے اور سلطان بابا جواباً اُسے اُکساتے ہیں کہ عشق کا حصول کچھ آسان کام نہیں۔ پہلے ساحر خود کو اس جنوں کا اہل ثابت کرے اور اپنی دنیا چھوڑ کر درگاہ پر عارضی بسیرا کر لے تو کوئی اس دعوے کی سچائی کو تسلیم بھی کرے۔ ساحر یہ چیلنج قبول کر لیتا ہے۔ لیکن تب اس پر یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ زہرا کسی اور کی نہیں خود درگاہ کے متولی عبداللہ کی نظر سے گھائل ہے۔ لیکن عبداللہ اُسے بتاتا ہے کہ وہ اب شادی شدہ ہے اور زہرا کبھی بھی اس کی منزل نہیں رہی۔ ساحر گھر والوں کی اجازت سے درگاہ پر آ بیٹھتا ہے اور یہاں اسے اپنے نئے نام "عبداللہ" کی شناخت ملتی ہے۔

سلطان بابا پرانے عبداللہ کے ساتھ کسی سفر پر نکل جاتے ہیں اور ساحر مولوی خضر کی تربیت میں درگاہ پر اپنے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ مولوی خضر کی معیت میں اس پر کئی نئے اسرار کھلتے ہیں اور خود زہرا بھی ساحر کے جنوں کے آگے رکھی اپنی ڈھال کو زنگ زدہ پاتی ہے۔ لہٰذا ساحر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے کیوں کہ ساحر کا جنوں اس کے راستے کی دیوار ہے۔ ساحر گھر تو لوٹتا ہے لیکن اپنا سب

کچھ درگاہ ہی میں چھوڑ آتا ہے۔ آخرکار ساحر کے والدین اس کی بٹی ہوئی زندگی اور تقسیم شدہ رُوح کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے دوبارہ درگاہ جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس بار اُس کی منزل درگاہ نہیں بلکہ سلطان بابا کا ساتھ ہے اور ان دونوں کا پہلا پڑاؤ دُور دراز کی سینٹرل جیل ہے جہاں سکندر نامی قیدی کی پھانسی اگلی صبح طے ہے۔ مقتول کی بیوہ نائلہ خود بھی سکندر کی زندگی کی ڈور تھی لیکن اب وہ سکندر کو پھانسی پر جھولتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عبداللہ (ساحر) کی کوشش تو رنگ لے آتی ہے۔ نائلہ آخری وقت میں سکندر کو معاف تو کر دیتی ہے لیکن خود بھی سکندر کی سانسوں کے ساتھ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔ سلطان بابا کا اگلا پڑاؤ رُباب کی حویلی بنتی ہے جہاں یاقوط نامی ایک جن زادہ رُباب کی زلفوں کا اسیر ہے۔ وہ سلطان بابا کو شکست دینے کے لیے عبداللہ کے جسم پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے لیکن جیت آخر انسان ہی کی ہوتی ہے اور رُباب یاقوط کے چُنگل سے آزاد ہو جاتی ہے۔ سلطان بابا عبداللہ کو جبل پور روانہ کر دیتے ہیں جہاں راستے میں زہرا کی سوتیلی بہن زریاب کو دیکھ کر عبداللہ دنگ رہ جاتا ہے اور پھر اُسے جگن نامی غنڈے کے عذاب سے بچانے کے لیے عبداللہ کو ایک بار پھر سلطان بابا کو پکارنا پڑتا ہے۔ زریاب تو جگن کی دست برد سے نکل آتی ہے لیکن خود جبل پور کے خان کریم کی آنکھوں کا تارا، لاریب عبداللہ کے ماں باپ کی زبانی ساحر اور زہرا کی لازوال داستان سن کر نادانستہ عبداللہ کو دل میں بسا لیتی ہے اور شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ عبداللہ کو ایک بار پھر زہرا کے مرہم کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ زہرا کو جبل پور طلب کر لیتا ہے۔ لیکن خود زہرا اس مرتبہ عبداللہ کی مستقل مزاجی اور محبت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ لاریب کو زہرا کی سچائی اور اس جذبے کی طاقت دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے اور زہرا عبداللہ سے کہتی ہے کہ اب اس کی رُوح عبداللہ کے بلاوے کی منتظر رہے گی۔ سلطان بابا اور عبداللہ جبل پور سے اپنے نئے سفر پر نکل پڑتے ہیں۔

جبروت

میری آوارگی میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی مُحسن
تمہاری یاد آتی ہے تو گھر اچھا نہیں لگتا

ہمیں جبل پور سے نکلے آج تیسرا دن تھا اور اب تک ہم دو ٹرینیں بدل چکے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے آس پاس کے مناظر سے سبزہ اور پہاڑ اُوجھل ہوتے جا رہے تھے اور تیسرے دن دوپہر تک باہر کا موسم یک سر بدل چکا تھا۔ ریت اور گرد کے بگولے گاڑی کی ادھ کھلی کھڑکیوں اور سالوں سے زنگ خوردہ، جامد دروازوں سے ہمارے استقبال کو یوں اندر لپک رہے تھے جیسے کوئی صدیوں کا بچھڑا اپنے گم شدہ محبوب کی طرف بڑھتا ہے۔ گرم لُو کے تھپیڑے چہروں کو جھلسانے لگے تھے اور باہر دوڑتی زمین کے آثار بتا رہے تھے کہ ہم کسی صحرا میں داخل ہو رہے ہیں۔ آس پاس کے مسافروں نے جلدی جلدی سامان سے تولیہ یا کوئی اور کپڑا نکال کر پانی میں بھگویا اور سر اور چہرے چھپانے لگے۔ سلطان بابا نے مجھے بھی یہ احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں مسکرا کر ٹال گیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید "لُو" تو شاید ازل ہی سے میرے اندر چل رہی ہے۔ باہر چلتی ہوا کے یہ چند گرم جھونکے بھلا مجھ سے کرم جلے کا کیا بگاڑ پائیں گے۔ اور پھر بات باہر کے موسم کی تھی ہی کب، جن کے اندر ہی سدا کے لیے خزاں ٹھہر گئی ہو انہیں بیرونی تبدیلیوں سے کیا واسطہ۔

گاڑی اب باقاعدہ ایک وسیع صحرا سے گزر رہی تھی، جہاں اُڑتی ریت کی زیادتی سے گرم دھوپ میں چمکتی دہے کی پٹری بھی جگہ جگہ ریت میں دھنس کر غائب ہو جاتی تھی۔ شاید اسی لیے ٹرین کی رفتار اب کافی مدھم پڑ چکی تھی۔ دو اہل کار ایک بڑی سی قنات نما کپڑے کی رسی لیے گاڑی کے آگے آگے بھاگ رہے تھے، جسے نہوں نے زمین پر یوں ڈھلکا رکھا تھا کہ اس کے پونچھے کی رگڑ سے پٹریوں پر پڑی ریت پونچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی مقصد کے لیے رسی کو اچھی طرح پانی میں بھگویا گیا تھا۔ ایک تیسرا اہل کار ایک بڑے سے کین میں پانی لیے ان کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیسے ہی لُو کے گرم تھپیڑوں سے پونچھا خشک ہونے لگتا وہ جلدی سے دوبارہ انی کا چھڑکاؤ کر کے اُسے بھگو دیتا۔ بعض جگہ ریت کے ٹیلے باقاعدہ لوہے کی پٹری کے اُوپر سرک آئے تھے، نہیں ہٹانے کے لیے متعین عملے کو خاص بیلچوں کی مدد سے ٹرین رُکوا کر ریت ہٹانا پڑتی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ ریت بھی ہم انسانوں کی طرح سفر کرتی ہے اور صحرا کی منزل بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، تو بہت دیر تک س سرکتی ریت اور بدلتے صحرا کے کھیل کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رفتہ رفتہ شام ڈھلنے لگی۔ اُفق کے پار سورج ڈوبنے کے باوجود آتشی گلابی رنگت کی ایک واضح لکیر یوں گاڑی کے ساتھ بہت دیر تک دوڑتی رہی، جیسے کسی دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ رگڑ کھانے کے بعد لکڑی کی تیلی پر اپنے اختتام کی جانب دوڑتا ہے۔ صحرا کے آسمان کی حد پر قدرت نے بھی کوئی دیا سلائی سی جلا دی تھی۔ جواب تیزی سے اُفق کے دوسرے پار تک اپنی گلابی آنچ پہنچا کر سارے فلک کو جلا دینا چاہتی تھی۔ مغرب کی نماز ہم نے ہچکولے کھاتی گاڑی ہی میں پڑھی اور مکمل اندھیرا ہونے تک ہمیں کسی انسانی بستی یا اسٹیشن کے آثار نظر نہیں آئے۔ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا، جب ٹرین نے ایک آخری ہچکی لی اور دھیرے دھیرے ایک ویران سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ سلطان بابا نے مجھے اشارہ کیا "چلو میاں..... ہماری منزل آ گئی ہے"۔

میں اپنے خیالات کی روٹوٹنے پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور ہم نے جس زمین پر قدم رکھے، اسے پلیٹ فارم سے زیادہ ریت کا کوئی ٹیلا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک برآمدے کے پیچھے تین چار کچے کمرے ایستادہ تھے، جن میں سے ایک کے اندر میل خوردہ لالٹین کی کمزور سی روشنی کھڑکی کے ملگجے شیشوں سے چھن کر باہر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہر چیز کو گرد اور ریت کی موٹی تہ نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جب تک سلطان بابا اندر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے کچھ معلومات حاصل کر کے آئے تب تک میں نے پلیٹ فارم پر بچھے ایک لکڑی کے تختے نما بنچ کو دو بار اپنے ہاتھ سے جھاڑ کر اس کی سطح صاف کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چند لمحوں ہی میں پھر سے تیز ہوا کے ساتھ اُڑتی ہوئی ریت نے اُسے ڈھک لیا۔ ہم انسان ساری زندگی اس گرد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن بالآخر ایک دن یہی مٹی ہمیں اپنی پناہ میں لیتی ہے۔ سچ ہے "آخر کار سب مٹی ہو جاتا ہے"۔

دفعتاً مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جیسے کوئی اور بھی پلیٹ فارم پر رات کے اس سناٹے میں موجود ہو اور مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے چونک کر نظر اُٹھائی تو دُور پٹریوں کے دوسری پار، جہاں اسٹیشن کی حد ختم ہو رہی تھی اور جہاں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ کو بطور گھنٹی لٹکایا گیا تھا، ایک نوجوان لڑکی کا ہیولا سا دکھائی دیا۔ لیکن ٹرین تو کب کی جا چکی تھی، پھر اس ویرانے میں اتنی رات گئے ایک تنہا لڑکی کیا کر رہی تھی۔ اس نے ایک کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، جس پر سفید پھول کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن فاصلہ زیادہ اور اسٹیشن کی دم توڑتی روشنی اتنی کم تھی کہ میں اس کے چہرے کے خدوخال کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اور تبھی اچانک اپنے عقب میں مجھے سلطان بابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

"کن سوچوں میں گم ہو..... ہمیں ابھی بہت سفر پیدل بھی طے کرنا ہے۔ اگر تھکن زیادہ ہے تو ہم رات بھر اسی اسٹیشن پر قیام کر سکتے ہیں لیکن پھر بہت سویرے نکلنا ہوگا، کیوں کہ صحرا میں سورج نکلتے ہی موسم بہت شدید ہو جاتا ہے۔" سلطان بابا کو ہمیشہ میرے ہی آرام کی فکر کھائے جاتی تھی۔ میں مسکرایا۔ "نہیں..... ابھی سفر کریں گے..... میں بالکل تازہ دم ہوں۔" سلطان بابا نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں

نے پلیٹ فارم سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکی اب وہاں نہیں تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے یہ کوئی واہمہ ہو۔ لیکن وہم اس قدر جزئیات کے ساتھ تو نہیں اُترتے۔ بہر حال میں سر جھٹک کر صحرا میں آگے بڑھتے سلطان بابا کے نقش قدم پر چل پڑا۔ جن لوگوں نے صحرا کی ڈھلتی رات کو جیا ہے، وہ اس کے سحر سے ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پوری کائنات ایک آسمان بن گئی ہو اور اس پر چمکتے اَن گنت تارے مجھ سے سرگوشیاں کر رہے ہوں کہ ''ہمیں چھوڑ کر کہاں چل دیئے؟'' رات کے وقت صحرا خود ایک لامتناہی سمندر کی طرح نظر آتا ہے۔ بس ہر موڑ پر ایک نیا سراب چھل دینے کے انتظار میں کھڑا ملتا ہے۔ جانے یہ تارے صحرا میں اتنے روشن اور چمک دار کیسے ہو جاتے ہیں، میرے مقدر کا ستارہ تو سدا کا دھندلا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پہلے ہم ایک صحرائی بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ بستی کیا تھی، بس ویرانہ ہی تھا۔ کچے گھروں کی طویل قطاریں دُور دُور تک صحرا میں پھیلی ہوئی تھیں جنہیں کیکر نما ایک جھاڑی کی باڑھ سے ڈھکا گیا تھا۔ بستی کی زبوں حالی اور غربت ان کچے جھونپڑوں ہی سے ظاہر تھی۔ البتہ کچھ آگے بڑھنے پر چند پکی عمارتیں اور پھر خاکی رنگ کی ایک بہت بڑی سی قلعہ نما عمارت بھی نظر آئی۔ شاید پوری بستی میں یہی ایک واحد عمارت تھی جہاں بجلی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی گھرر..... کی سی آواز سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ اُجالا کسی بہت بڑے جنریٹر کا مرہون منت ہے۔ میں نے بستی کی ٹیڑھی میڑھی، اینٹوں سے چُنی سڑکوں اور کچی گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک اور عجیب سی بات بھی محسوس کی کہ کسی ایک آوارہ کتے نے بھی ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید پوری بستی میں کوئی کتا تھا ہی نہیں۔ بس ایک لرزا دینے والا سناٹا طاری تھا۔ اب بستی کا باقاعدہ بازار ختم ہو رہا تھا اور دُور چند گلیوں سے پرے صحرا میں ایک ٹیلے پر ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ بستی ختم ہو جانے کے بعد میں جس روشنی کو بہت قریب سمجھ بیٹھا تھا، صحرا میں وہ عمارت اور وہ چراغ بھی بہت دُور نکلے۔ چراغ نے دھیرے دھیرے ایک بڑی سی گیس بتّی کی شکل اختیار کر لی اور ریت کا ٹیلا دھیرے دھیرے صحرا میں کھڑے ایک بوسیدہ مزار کی عمارت کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہی زرد اینٹوں سے چُنا گیا صدیوں پرانا مزار ہماری منزل تھا، جو صحرا میں ریت کے ایک بہت بلند ٹیلے پر واقع تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دُور بستی کے کچے گھر اور وہ قلعہ بچوں کے بنائے گھروندوں سے معلوم ہو رہے تھے۔

مزار کا بوسیدہ لکڑی کا گیٹ تیز ہوا سے جھول کر اس سناٹے میں ایک عجیب سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ جیسے نئے آنے والے مہمانوں سے اپنی بے کسی کی فریاد کر رہا ہو۔ مزار کا صحن بھی انہی کچی اور پیلے رنگ کی اینٹوں سے جڑا گیا تھا جس کا استعمال قصبے کی سڑک میں نظر آیا تھا۔ صحن سے کافی پرے چند بوسیدہ کمرے اور وسط میں ایک گنبد تھا، جس کے اُوپر کی گئی پتھریلی اور منقش مینا کاری مہ و سال کی گردش کے سبب جگہ جگہ سے اکھڑ گئی تھی اور مزار کی چھت پر کھڑا یہ عظیم گنبد اس وقت خود کسی سجدے کی سی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً میرے دل میں وہی پرانا سوال پھر سے جاگ اُٹھا ''لوگ ان مزاروں پر کیوں آتے ہیں۔ ان برستی ویرانیوں کا ہمارے دل کی

ویرانی سے کیا رشتہ ہے؟'' آہٹ سن کر اندر سے ایک بوڑھا نکل آیا اور اس نے بڑے تپاک سے ہم دونوں کا استقبال کیا۔ سلطان بابا اسے اکرام اللہ کے نام سے مخاطب کر رہے تھے اور جب انہوں نے عبداللہ کے نام سے میرا تعارف کروایا تو اس نے پہلے تو چونک کر ایک بار پھر سے میرا بغور جائزہ لیا اور پھر نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی'' خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ وہ کس مقصد کی بات کر رہا تھا؟ اگر زہرا ہی میرا مقصد تھی تو شاید اُسے تو میں حاصل کر چکا تھا۔ تو پھر زہرا کے بعد وہ کون سا مقصد تھا جو مجھے ان ویرانوں میں در بدر بھٹکا رہا تھا۔ یہ کیسی تلاش تھی، جو ختم ہونے کے بعد ہی شروع ہوتی تھی؟ کچھ ہی دیر میں فجر کا وقت بھی ہو گیا۔ اکرام اللہ صاحب نے اذان دی اور سلطان بابا کی معیت میں ہم دونوں نے باجماعت نماز پڑھ لی۔ کچھ ہی دیر میں پھر شفق سے قدرت کی وہ اَن دیکھی دیا سلائی سُلگی اور مدھم شعلے جیسی اک گلابی روشنی افق کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی جانب لپکی۔ میں پل بھر کے لیے مبہوت سا رہ گیا۔ فلک پر ایسا چراغاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اکرام صاحب پیتل کی چھوٹی سی کیتلی میں چائے اور ایک چنگیر میں روٹی کے چند ٹکڑے لیے اندر سے برآمد ہوئے۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی میرے منہ میں ریت کا ذائقہ اور ذرے بھر سے گئے۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں اس ریت بھری چائے کو نگلوں یا اُگلوں..... یہی حال گندم کے آٹے سے بنی اس روٹی کا بھی تھا۔ اکرام صاحب غور سے میری حالت دیکھ رہے تھے۔ دھیرے سے مسکائے'' بھئی یہاں کی ہر چیز میں تمہیں اس ریت کا ازلی ذائقہ ملے گا۔ آٹا اور چینی کتنے بھی ڈھانک کر رکھو، ریت کہیں نہ کہیں سے اندر چھن ہی آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم' کال گڑھ' والے اب اس ریتلے ذائقے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب تو سالن میں نمک، مرچ اور دیگر مسالوں کے ساتھ ریت کا بھی باقاعدہ حساب رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہیں گھر جیسا ناشتا نہیں پیش کر سکتا۔'' ان کا آخری جملہ سن کر میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ایک وقت تھا کہ ساحر صاحب صبح کا ناشتا صرف اس لیے چھوڑ کر اُٹھ جاتے تھے کہ فرانس کا مارملیڈ اور مصر کا شہد میز پر موجود کیوں نہیں۔ ہالینڈ کے بنے ہوئے دلیے کے علاوہ اگر کوئی دیسی یا بدیسی کارن فلیکس ہوتا تو سارا دن مزاج بگڑا رہتا۔ ہم انسانوں کی زندگی بھی کیسے کیسے انجان موڑوں اور غلام گردش جیسی اجنبی گولائیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ کون، کب کیا ہو جائے..... کس کو خبر.....؟

کچھ ہی دیر میں سورج کا گولا مشرق سے بلند ہوا اور آناً فاناً جیسے ہر چیز کو آگ سی لگ گئی۔ میں نے صحرا کی گرمی اس سے پہلے کبھی نہیں جھیلی تھی۔ کبھی پاپایا کاشف کے ساتھ شکار یا کیمپ فائر کے لیے جاتا ہوا بھی تو ہمارے ساتھ بڑے بڑے جنریٹر ہوتے تھے اور ہمارے خیموں کو ٹھنڈا کرنے کا پورا اہتمام ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا تھا۔ لیکن یہ تپش..... دو گھنٹوں میں ہی مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میرے وجود کے ساتھ ساتھ میری رُوح بھی پگھل کر بہہ جائے گی۔ یہ نیلا آسمان ایسے قہر بھی برساتا ہوگا، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کال گڑھ ایک صحرائی بستی

تھی، جس کے نام کی وجہ تسمیہ بھی سدا کا کال اور قحط ہی تھا۔ یہاں برسوں سے بارش نہیں برسی تھی اور پانی یہاں آب حیات سے بھی بڑی عیاشی تھا۔ قصبے میں نوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے کی زندگی گزارتی تھی اور پوری بستی پر قلعے کے باسیوں کا قبضہ تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے اکرام اللہ صاحب سے پتا چلیں۔ جو خود کال گڑھ کے واحد اور برائے نام مڈل اسکول کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بستی کے بچوں کو درس قرآن دیتے تھے۔ ان کے خاندان میں ان کا اکلوتا بیٹا ہی بچا تھا، جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے شہر میں رہتا تھا۔ اُسے کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی پسند نہیں تھی۔ لہٰذا وہ میٹرک کے بعد ہی باقاعدہ شہر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ قلعے کے ذکر پر اکرام صاحب کچھ بے چین اور باقاعدہ خوف زدہ سے ہو جاتے تھے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا" آپ نے ہر چیز کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا دیا ہے لیکن یہ قلعے اور اس میں بسنے والے قلعے داروں کا اسرار مجھے سمجھ نہیں آیا۔" میرا سوال سنتے ہی اکرام صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ انہوں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ہم دونوں مزار کے برآمدے میں ستون کے گرم سائے میں چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سلطان بابا اندر کمرے میں آرام کرنے جا چکے تھے۔ اکرام صاحب نے سرگوشی کی" عبداللہ میاں..... ان قلعہ داروں کے سائے سے بھی بچ کر رہنا۔ بہت سفاک اور اذیت پسند ہے۔ وہاں کا بڑا قلعے دار۔ سارا علاقہ کانپتا ہے جبروت کے نام سے....." "جبروت.....؟؟ یہ کیسا نام ہے .....؟" "نام تو ماں باپ نے شاید جابر رکھا تھا، جو پیار سے جبرو ہوا اور پھر اس کے ظلم کی دہشت نے اسے جبروت بنا ڈالا۔ اور اب وہ اسی نام سے حکمرانی کرتا ہے۔" جبروت جو کوئی بھی تھا، اس کی دہشت میں اپنے سامنے بیٹھے اکرام اللہ کے چہرے ہی سے محسوس کر سکتا تھا۔ انہوں نے مزید جو کچھ بتایا وہ اس جدید دنیا میں مجھے ایک ماورائی داستان سے کچھ کم محسوس نہیں ہوا۔ کال گڑھ جبروت کی کسی ذاتی جاگیر کی مثال بن چکا تھا۔ علاقے میں کوتوالی یا پولیس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک سب انسپکٹر ایک برائے نام سی تھانہ نما عمارت میں چار چھ کانسٹیبلوں کی نفری کے ساتھ بیٹھتا تو تھا لیکن اس کی حیثیت بھی جبروت کے ذاتی غلاموں جیسی ہی تھی۔ کال گڑھ کا قانون، عدالت اور انصاف سب کچھ جبروت تھا۔ علاقے کے سارے مقدمے اُسی کے سامنے پیش ہوتے تھے اور وہی اُن پر فیصلہ کرتا تھا۔ اُس کی حکم عدولی کی سزا فوری اور انتہائی اذیت ناک تھی۔ قلعے کے اندر اس نے ذاتی جیل بھی بنا رکھی تھی، جس کی کال کوٹھڑیوں میں اس کے مجرم پڑے پڑے سڑتے رہتے تھے۔ صبح سے دن بھر انہی زنجیروں اور بیڑیوں سمیت مشقت لی جاتی تھی اور پھر شام ڈھلے، ان ہی بندھے بھاری پتھروں سمیت پھر سے تہ خانوں کے زندان میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے تو کئی ایسے تھے جنہیں قلعے سے باہر کا آسمان دیکھے بھی برسوں بیت چکے تھے۔ سارا قصبہ جبروت کے دیئے ہوئے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور ان کی دوسری نسل بھی اس قرض کو چکاتے چکاتے اپنی جوانی بڑھاپے میں بدل رہی تھی۔ برسوں کے پٹے ہوئے کال گڑھ کے باسیوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور اب تو انہوں نے قرض کی اس غلامی سے باہر نکلنے کا

خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ قلعے میں جبروت کے پہرے داروں اور محافظوں کی فوج کے علاوہ اس کی تی
بیویاں اور کتوں کی ایک فوج بھی رہتی تھی۔ جبروت کو اگر دنیا میں کسی چیز سے پیار تھا، تو وہ اس کے پالے ہو
خوں خوار کتے تھے، جنہیں وہ اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ویسے بھی جبروت کی تمام اولاد بچپن ہی میں ماں کی
گود ہی میں خدا کو پیاری ہو جاتی تھی۔ اسی اولاد کی خواہش میں اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں او
چوتھی بیوی کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا تھا۔ لیکن کچھ افسانے یہ بھی دہراتے تھے کہ جبروت نے خود ہ
کسی بات پر ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو آج کل پھر جبروت کی چوتھی بیوی کا کمرہ ا
نشست خالی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور ہر بار پوری بستی کی اُس وقت تک جان پر بنی رہتی تھی جب
تک جبروت کہیں نہ کہیں سے کوئی نئی نویلی چوتھی بیوی بیاہ کر نہیں لے آتا تھا۔ چار کی اس گنتی کو تین کرنے میں
جبروت کی کسی نہ کسی بیوی کو کبھی ہیضے، کبھی سانپ کے کاٹے، کبھی بخار اور کبھی کسی دوسری ''انہونی'' کے ہاتھوں
موت کے گھاٹ اُترنا ہی پڑتا تھا۔ سچ ہے ''قدرت کے لکھے'' کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ لیکن چار کی گنتی پوری
کرنے کے چند دن بعد ہی جبروت پھر سے ان کھلونوں سے اُوب جاتا اور پھر سے قدرت کے لکھے کا انتظا
کرنے لگتا۔ ہاں البتہ اس کی دل چسپی اگر سدا کسی مشغلے میں برقرار رہی تو وہ تھی، خون خوار بھیڑیا نما کتوں کی
دیکھ بھال اور نشو ونما۔ سُنا تھا کہ ان کے راتب اور خوراک وغیرہ میں غفلت کرنے والے نوکروں کو وہ انہی
بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ دن میں تین مرتبہ ان کتوں کو خوراک، ورزش اور غسل کے بعد ٹہلانے
کے لیے جب بستی میں نکالا جاتا تھا تو جبروت خود ان کے ساتھ ہوتا اور انہیں دیکھ کر ہی بستی والوں کا پتا پا
ہو جاتا۔ ان کتوں کے بارے میں ایک اور لرزہ خیز فسانہ بھی کال گڑھ میں زبان زد عام تھا۔ کہنے والے کہ
تھے جبروت اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ ایک عجیب کھیل کھیلتا تھا۔ اُسے خود کو انصاف پسند کہلانے کا بہ
شوق تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا اُسے کبھی بے انصاف کا لقب نہ دے، لہٰذا اپنے دشمنوں کو مروانے سے
پہلے وہ انہیں ایک پیش کش کرتا تھا کہ اگر اس کا دشمن چاہے تو اب بھی اس کی جان بخشی ہو سکتی ہے، بس اسے
جبروت کے ان لاڈلوں کو ہرانا ہوگا۔ کھیل یہ طے پاتا تھا کہ ملزم کو کال گڑھ کا تپتا صحرا بھاگ کر پار کرتے ہو
سات کوس کے فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ہوتا تھا۔ شکار کے سرپٹ صحرا میں دوڑنے کے ٹھیک
پندرہ منٹ بعد جبروت کے خون خوار درندے بھی اس دشمن کے تعاقب میں چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ کہتے ہ
کہ آج تک ایک بھی ایسا خوش نصیب ثابت نہیں ہو سکا تھا جس کی لرزہ خیز چیخوں سے کال گڑھ کا صحرا نہ گو
ہو۔ بستی میں داخل ہونے والے ہر ذی رُوح کو پہلی سلامی کے لیے جبروت کے حضور پیش ہونا پڑتا تھا، ورنہ
شخص پہلے دن ہی سے باغی قرار پاتا تھا۔ اکرام صاحب کے بقول میں اور سلطان بابا اس لحاظ سے خوش نصیب
تھے کہ جبروت دو دن سے کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ لہٰذا اُسے فی الحال ہماری کال گڑھ میں موجودگی کا پتا نہ
چل پاتا تھا، لیکن ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جب جبروت کی واپسی ہوگی تو وہ ضرور ہم دونو

سے ملنا چاہے گا۔ اکرام صاحب نے پریشانی سے سر ہلایا۔ دفعتاً تب ہی ہمارے عقب میں آواز اُبھری "جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔" میں اُچھل ہی تو پڑا۔ سلطان بابا جانے کب سے ہمارے عقب میں کھڑے جبروت نامی اس عجیب الخلقت کردار کے فسانے سن رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا، جہاں حسب معمول ملامت آمیز سکوت پھیلا ہوا تھا۔

اکرام صاحب ہمارے دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے چلے گئے۔ اِسی سوچ و بچار میں شام بھی ڈھل گئی اور پھر سے وہی خواب ناک صحرا کی رات تاروں بھرا آنچل لیے ہمارے سروں پر آ کر ٹھہر گئی۔ اکرام صاحب مغرب سے کچھ پہلے ہی واپس لوٹ چکے تھے۔ عشاء کے بعد سلطان بابا نے مجھ سے کہا "اب تم بھی ذرا کمر ٹکا لو عبداللہ میاں..... میں بھی کمرے میں اپنی تسبیح پوری کروں گا۔" لیکن میری بنجر آنکھوں میں بھلا نیند نے کب آبیاری کی تھی۔ سو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد گرمی اور حبس سے پریشان ہو کر میں مزار کے صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر چمکیلے ستاروں کا کارواں مجھے دیکھ کر مُسکایا۔ میں ان تاروں میں اپنا اور زہرا کا تارا تلاش کرنے کے لیے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے مزار کے صحن کے باہر میں نے کسی کے پھولوں بھرے آنچل کی ایک جھلک لہراتے دیکھی ہے۔ ہاں..... وہ وہی تو تھی، جسے میں نے کل رات ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا لیکن وہ میرے پیچھے یہاں اس ویرانے میں آدھی رات کو اس مزار تک بھی آ پہنچی، کیوں.....؟؟؟ مجھے لگا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن کل کی طرح آج بھی ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا اور پھر اس کا وہ لمبا سا صحرائی گھونگھٹ کل کی طرح پردہ بن کر اس کے خدوخال مجھ سے چھپا رہا تھا۔ آخر وہ چاہتی کیا تھی۔ حلیہ تو اِسی ریگستانی بستی ہی کا تھا۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فضا میں دو تین جیپ نما گاڑیوں کا شور گونجا۔ میری توجہ لمحے بھر کو صحرا کی جانب بٹی، جہاں دُور تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس جگمگاتی ہوئی مزار کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں نے دوبارہ وہاں نظر ڈالی، جہاں وہ کچھ دیر پہلے گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی تو اب وہ جگہ سنسان تھی۔ شاید کسی کو آتا دیکھ کر وہاں سے بڑھ گئی ہو۔ تینوں گاڑیاں پرانے ماڈلز کی ولیز جیپیں ہی تھیں جو اَب بالکل مزار کے قریب پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ دفعتاً میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے غرّانے کی آواز گونجی۔ جیپ سے کوئی کود کر نیچے اُترا اور اُس نے بھاگ کر پچھلی جیپ کا دروازہ کھولا۔ ایک دراز قد ہیولا اندھیرے میں نیچے اُتر آیا۔ میری آنکھیں ابھی تک جیپ کی جلتی لائٹس کی وجہ سے چندھیائی ہوئی تھیں لہٰذا روشنی کے پیچھے چھپے سائے بصارت کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے۔ باقی اشخاص پیچھے کھڑے رہے۔ دراز قد شخص روشنی میں آ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اکرام اللہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق میرے سامنے کھڑا وہ شخص جبروت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ اچانک جبروت کے عقب سے ایک خوں خوار کتا میری جانب لپکا۔

دوسرا سورج

اس خوں خوار کتے کی لپک اتنی اچانک اور شدید تھی کہ میں نے اس کی غراہٹ سے گھبرا کر دونوں ہاتھ ہو میں یوں بلند کیے کہ جیسے اس کے حملے کو روک ہی تو لوں گا، لیکن اچانک فضا میں جبروت کی گرج دار آواز گونجی ''ناں..... کالے!!'' اور اس آواز میں جانے کیا جادو تھا کہ زقند بھرنے کے لیے تیار اور اپنے خوں خوار جبڑے کھولے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر اپنے وزن کو تولتے ہوئے کتے کو سکتہ سا ہو گیا اور وہ وہیں زمین پر بنا آواز کے یوں بیٹھ گیا، جیسے اگر ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو پتھر کا ہو جائے گا۔ جبروت نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ ''کون ہو تم..... اور میرے علاقے میں کیا کر رہے ہو؟'' ''عبداللہ..... مزار کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔'' جبروت کو جیسے کچھ یاد آیا۔ ''اوہاں! ہیڈ ماسٹر نے بتایا تھا، تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟'' ''وہ آرام کر رہے ہیں..... لمبے سفر کی تھکن ہے۔'' جبروت نے لمبا سا ہنکارا بھرا ''ہوں..... اور جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چلتے چلتے رُک گیا ''ہیڈ ماسٹر سے کہنا کل تم لوگوں کو قلعے سے ضرورت کا سامان دلوا دے۔ یہاں تم لوگوں کو کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔'' جبروت لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی جیپ کی جانب بڑھ گیا اور پھر اس کے بعد مجھے بھی رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے اکرام صاحب پریشانی میں ہڑبڑائے ہوئے سے تیز تیز چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ''کیا رات کو جبروت یہاں آیا تھا، اس نے کیا کہا؟'' سلطان بابا اس کی پریشانی دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ''بھئی میں تو کمرے میں تھا۔ اس کی ملاقات صرف عبداللہ سے ہوئی تھی۔'' وہ در پردہ ہمیں قلعے میں حاضری لگانے کا حکم دے گیا ہے۔ میں نے اکرام اللہ کو ساری تفصیل بتا دی جسے سن کر اُن کے ماتھے پر پڑی سلوٹیں مزید گہری ہو گئیں۔ میری مانیں تو آپ دونوں دو گھڑی کے لیے آج وہاں سے ہو ہی آئیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر اچھا نہیں ہوتا۔ جو چند دن آپ لوگوں نے یہاں گزارنے ہیں کم از کم وہ تو سکون سے گزر جائیں گے۔'' سلطان بابا پہلے ہی سے کسی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے تسبیح کا آخری دانہ پڑھ کر سر اُٹھایا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں، جتنا ممکن ہو شر اور فساد سے پہلو تہی کرنی چاہیے۔ عبداللہ میاں! آج سہ پہر تم اکرام صاحب کے ساتھ قلعے سے ہو آنا۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ اکرام صاحب ہڑبڑائے۔ ''اور آپ..... آپ نہیں چلیں گے کیا؟''

''نہیں۔ ابھی میرے جانے کا وقت نہیں آیا۔ اگر میرا پوچھیں تو کہیے گا کہ میں بھی جلد ہی اس کے در دولت پر حاضری دوں گا۔ فی الحال میرا نمائندہ ہی سہی۔'' اکرام صاحب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے

کہ ان کے اندر کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی ہے لیکن وہ سلطان بابا کے احترام کی وجہ سے چپ ہی رہے اور میرے ساتھ سہ پہر کا وقت طے کر کے اُلٹے قدم لوٹ گئے۔

رفتہ رفتہ سورج کا گولا پھر سے وہی آگ برسانے لگا۔ جانے کیوں اس صحرا کا یہ آفتاب میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ یہ تو کوئی دوسرا سورج تھا، میری دنیا کے سورج سے بالکل جدا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، کہیں یہ اس سورج کا دوسرا رُخ تو نہیں تھا۔ کہیں میں چلتے چلتے اپنے سورج کی دوسری جانب تو نہیں آ پہنچا؟ ہاں شاید یہ ایسا ہی تھا۔ ورنہ یہ فلک مجھ سے کبھی اتنا اَن جان تو نہ تھا۔ سلطان بابا آنکھیں بند کیے۔ تسبیح پھیر رہے تھے۔ میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ''کیوں میاں..... کبھی اپنی سوچ کے گھوڑے کو لگام بھی دیتے ہو یا نہیں، کبھی تو ان اعصابی ریشوں کو آزاد بھی چھوڑ دیا کرو۔''

جانے انہیں ہر مرتبہ میری سوچ کی خبر کیسے ہو جاتی تھی۔ ہم دونوں اس وقت مزار کے برآمدے میں بنے بوسیدہ سے ایک کمرے میں موجود تھے، جہاں براہ راست لو سے بچنے کے لیے دروازے اور پچھلی جانب کھلتی لکڑی کی جھولتی ہوئی کھڑکی کے اُوپر ایک ٹوٹی پھوٹی چق اور چند کپڑے کی کترنیں لگا کر ڈھانپنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔ کمرے میں فرش کی جگہ ریت کا بستر تھا اور ایک صراحی کمرے کے کونے میں ادھ بھری رکھی تھی۔ میں سلطان بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پھر من میں بہت دنوں سے مچلتا سوال میرے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ''ایک بات بتائیں، ہم ان درگاہوں اور مزاروں کے اردگرد ہی خدا کو کیوں کھوجتے پھرتے ہیں.....؟ میں آپ کی طرح اسے اپنی شہ رگ کے قریب کیوں محسوس نہیں کر سکتا۔ اور ہر بار ہمارا بسیرا ایسی ہی کسی ویران درگاہ یا مزار سے متصل کیوں ہوتا ہے.....؟'' انہوں نے تسبیح ختم کر کے اپنے اور میرے چہرے پہ پھونکا۔ ''اسے کسی مزار یا درگاہ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اپنی شہ رگ سے بھی قریب ڈھونڈنے کے لیے کسی خاص وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس کائنات کے ہر گوشے میں یکساں موجود ہے۔ تمہاری یہ فکر کہ تم اسے محسوس کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ بھی تمہاری اس سے قربت ہی کی ہی ایک نشانی ہے۔ بس اتنا ضرور یاد رہے..... یہ فکر کبھی ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رہی بات کہ ہم ہمیشہ ایسی ہی درگاہوں، مسجدوں یا مزاروں ہی میں کیوں قیام کرتے ہیں تو ہمارے دروازے اب مذہب کے نام پر کچھ کم ہی کھلتے ہیں۔ ایسے میں ان بستیوں میں موجود یہی درگاہیں اور خانقاہیں اپنی بانہیں پھیلائے ہر گھڑی ہمارے استقبال کو تیار ملتی ہیں۔ ہمارے سونے کو اطلس و کمخواب کے بستر نہ سہی، پر مسجد کا فرش ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یہی خاک ازل سے ہمارا مقصد اور ہمارا مقدر رہے اور ہمیں سب کو یاد دلاتے رہنا ہے کہ ہم سب نے آخر خاک ہی ہو جانا ہے۔'' میرے سوال ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ''لیکن! اس بار آپ نے اس قدر دُور دراز علاقے کا انتخاب کیوں کیا۔ ہم راستے میں نہ جانے ایسی کتنی درگاہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔'' سلطان بابا نے گہرا سا سانس لیا۔ ''اس بار معاملہ بے اختیاری کا ہے۔ اب تک تم نے جو بھی جھیلا اس میں کہیں نہ کہیں ہمیں کچھ اختیار ضرور حاصل تھا، لیکن اس مرتبہ

ہم دونوں کسی اور کے اختیار میں ہیں میاں۔'' میں نے چونک کر اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے سلطان بابا کی آواز میں دُور کہیں کسی شدید پریشانی اور آنے والی پریشانیوں کا احساس ملا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے دریچے وا ہوتے چلے گئے۔ ہاں! سچ ہی تو تھا۔ اس سارے علاقے پر ایک ظالم اور انتہائی سفاک شخص کی حکومت تھی۔ ایک طرف سرحد تھی اور دوسری طرف ایک وسیع و عریض تپتا صحرا۔ درمیان میں سات کوس کے فاصلے پر وہ بستی واقع تھی جس سے گزر کر ہی ہم کال گڑھ سے نجات کے واحد ذریعے، یعنی دن میں ایک بار گزرنے والی ٹرین کے اسٹیشن تک پہنچ سکتے تھے۔ جو کم از کم پیدل چار گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ ایک دم ہی میرے رونگھٹے، یہ سوچ کر ہی کھڑے ہونے لگے کہ اگر کبھی ہمیں اس بستی سے ہجرت کرنا بھی پڑی تو اس کی اجازت اور اختیار بھی صرف اس جلاد کو حاصل تھا، جو اس پھانسی گھاٹ کا پہرے دار بھی تھا۔ میں نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سلطان بابا کو دیکھا۔ ''لیکن کیوں..... اس بے اختیاری کی منزل سے گزرنا اس قدر ضروری کیوں، اس امتحان اور اس کسوٹی سے کیا حاصل.....؟'' ''سارا کھیل ہی تو اس اختیار و بے اختیاری میں توازن قائم کرنے کا ہے۔ یاد رکھو، ہمارے اختیار کی حد وہیں ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ہمیں اپنے خود مختار ہونے کا زعم ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سمجھ آ جائے گا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ ابھی ظہر کے بعد تمہیں قلعے بھی جانا ہے۔'' جانے کیوں، ایک دم ہی میرے ذہن میں نہ جانے کتنے سوالوں کے بچھو ڈنک مارنے لگے تھے۔ اختیار و بے اختیاری کے دھاگوں میں میرا من کچھ یوں اُلجھا کہ مجھے اکرام اللہ صاحب کے ساتھ بستی پہنچنے تک بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ میں تب چونکا جب بستی کے کچی اینٹوں والے بازار میں اُونٹوں کی ایک لمبی قطار نے مجھے تقریباً مس کرتے ہوئے کراس کیا۔ کال گڑھ کے اس مختصر سے بازار میں سہ پہر کی اس شدید دھوپ کے باوجود اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ بازار کے بیچوں بیچ بکریوں کے ایک ریوڑ کی خرید و فروخت جاری تھی۔ جس کے ساتھ ہی ایک پرانی سی دکان میں جلیبیاں تلی جا رہی تھیں۔ دکان دار پرانے اخبارات کے بنڈل پھاڑ پھاڑ کر گاہکوں کو شیرے سے بھری نارنجی جلیبیاں پکڑا رہا تھا اور بالکل سامنے خشک گھاس اور بھوسے کے گٹھے بیل گاڑی سے اُتروائے جا رہے تھے۔ سنہری بھوسا نارنجی شیرے میں ضم ہو رہا تھا اور پچھلی جانب پرانی سائیکلوں کے انبار کے بیچ ایک کاریگر سامنے ٹب میں پانی بھرے، پرانی ٹیوبوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ بازار کے سرے پر ایک دھنکیا پرانی رضائیوں اور لحافوں کی روئی دُھن رہا تھا اور فضا میں اُڑتے اُون اور روئی کے ننھے بگولے گرد اور ریت کے ساتھ ہمارے حلق میں پھنس رہے تھے۔ اگلے نکڑ پر ایک ماشکی پرانی سی مشک میں انتہائی گدلا پانی بیچ رہا تھا۔ اُون دھننے والے کے اوزار کی دُھن دُھن، اُونٹوں کی جرس، بھیڑ بکریوں کا شور، گرم شیرے کے نیچے جلتے الاؤ کی دھونکنی اور ماشکی کے آوازے..... سب مل کر چند لمحوں کے لیے اس مردہ کال گڑھ کو کس قدر زندہ کر گئے تھے۔ موڑ مڑتے ہی قلعے کی آسمان سے باتیں کرتی خاکی چار دیواری شروع ہو گئی۔ جیسے جیسے ہم قلعے کے مرکزی دیو ہیکل دروازے کی جانب بڑھتے گئے، ویسے ویسے قلعے کے اندر سے ایک عجیب سے وحشت ناک شور کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اور پھر جیسے ہی میں نے اکرام

صاحب کے پیچھے بڑھتے ہوئے قلعے کی چار دیواری میں اپنا پہلا قدم رکھا تو ان کرب ناک چیخوں کا راز بھی کھل گیا۔ وحشت اور بربریت کا ایک خوف ناک کھیل عین قلعے کی بیرونی چار دیواری کے وسط میں کھیلا جا رہا تھا۔ میرے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جبروت اپنے حواریوں کے جھرمٹ میں ایک اُونچے سے تخت پر براجمان وحشیانہ انداز میں چیخ رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا اور غصے میں گالیاں بک رہا تھا۔ اُس کے سامنے کھلے میدان میں ایک لمبی اور موٹی سی فولادی زنجیر گلے میں ڈالے ایک عظیم الجثہ سیاہ ریچھ اپنا خون خون بدن لیے کھڑا جھول رہا تھا اور جبروت کے آٹھ خوں خوار کتے چاروں طرف سے اُس بیڑیوں میں جکڑے قیدی ریچھ پر حملے کر رہے تھے۔ ریچھ کے جسم سے لپٹے کتے اُسے بھنبھوڑ رہے تھے اور گھائل ریچھ کا زخم زخم بدن خون کا فوارہ بنا ہوا تھا، لیکن ریچھ نے ابھی ہار نہیں مانی تھی۔ اب بھی وہ پوری قوت سے ان وحشی کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کی نکیل کا کڑا زور لگانے کی وجہ سے اس کی ناک کی نازک جلد کو چھیدتا ہوا ہڈی کے اندر تک دھنس چکا تھا، جس کی ناقابل برداشت اذیت نے ریچھ کو انتہائی حد تک خطرناک کر دیا تھا۔ اور وہ کرب اور تکلیف سے بے حال، غصے میں پاگل ہو کر چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ آٹھ طرفہ حملے کو کسی طور روک پائے۔ یہ سارا وحشیانہ کھیل ایک بہت بڑے ہجوم کے دائرے میں ہو رہا تھا۔ تماشائی جبروت کے خوف کے سبب صرف کتوں ہی کو داد دے رہے تھے۔ خود جبروت کا وحشی پن بھی عروج پر تھا۔ وہ کتوں کی ہمت بڑھانے کے لیے انہیں چلا چلا کر ہشکار رہا تھا اور کتوں کے منہ سے بہتے کف کی طرح اس کی رال بھی فرط جوش سے بار بار ٹپک رہی تھی۔ جب کوئی کتا ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کو گہرا زخم لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو جبروت کی حالت مزید ہیجانی ہو جاتی اور اگر ریچھ کی خوش قسمتی سے کوئی کتا اس کے پنجے کے تھپیڑے یا گرفت میں آ جاتا تو جبروت بے قابو ہو کر اپنے کتوں اور اُن کے سدھارنے والے خدمت گاروں کو گندی گندی گالیاں دینے لگتا۔ اُن پر غراتا، چلاتا اور بالکل ہتھے سے اُکھڑ جاتا۔ مقابلہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور تھکن اور پیاس کے مارے کتوں کی زبانیں باہر لٹک آئی تھیں، لیکن شاید ایسے مقابلوں میں کتوں کو پانی کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ تب ہی کتوں کے رکھوالے انہیں بار بار پانی سے دُور ہانک دیتے تھے۔ ان میں وہ کتا بھی شامل تھا جسے جبروت نے رات ''کالے'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دفعتاً ریچھ کو ایک موقع ملا اور ایک چتکبرے کتے کی غلط چھلانگ نے اُسے ریچھ کے بازوؤں کی لپیٹ میں دے دیا۔ ریچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بنا اپنی گرفت شدید تر کر دی اور میں نے اتنی دُور کھڑے ہونے کے باوجود اس کان پھاڑ دینے والے شور میں بھی اس کتے کی ریڑھ کی ہڈی کے چٹخنے اور پھر ٹوٹ کر تڑکنے کی آواز سنی۔ کتے کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور زمین پر گرتے ہی چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اِسی اثناء میں ریچھ کا پنجہ پوری قوت سے لہرایا اور ''کالا'' ہوا میں لہراتے ہوئے ہجوم کے دائرے سے باہر جا گرا اور گرتے ہی بے سُدھ ہو گیا۔ جبروت کا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور وہ زور سے چلایا ''مرنے دے اس مردار کو۔ کوئی ہاتھ نہ لگائے اس حرام خور کو.....'' آٹھ میں سے دو

کتوں کو ریچھ نے مکمل پچھاڑ دیا تھا لیکن اسے اب بھی چھ طرفہ حملے کا سامنا تھا اور ریچھ کے جسم سے تیزی سے بہتا خون اب اسے دھیرے دھیرے نڈھال کر رہا تھا۔ جبروت نے جھولتے اور ڈگمگاتے ریچھ کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔ اس نے پاس کھڑے ڈھولکیے کو ڈھول پیٹنے کا اشارہ کیا۔ ڈھول کی پہلی تھاپ سنتے ہی ادھ مرے کتوں میں جیسے بجلی کی لہر سی کوند گئی اور ان سب نے اپنے گھائل جسم سمیٹے اور ایک ساتھ ہی ریچھ کے شکستہ جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے وہ اذیت و کرب سے لہراتا ریچھ رومن دور کے ان جنگجوؤں کی یاد دلا گیا، جنہیں گلیڈی ایٹر (Gladiater) کہا جاتا تھا اور جنہیں رومن بادشاہ سزا کے طور پر اسی قسم کے اکھاڑوں میں بھوکے شیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ڈھال اور نیزے کے بل پر اُتار دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو ڈھال اور نیزے کا تکلف بھی نہیں تھا۔ بالآخر ایک کتا ریچھ کے نرخرے میں اپنے خونی جبڑے گاڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ریچھ کے نرخرے سے خون کا ایک فوارہ سا نکلا اور آس پاس کئی تماشائیوں کے کپڑے سرخ چھینٹوں سے داغ دار ہو گئے۔ دوسرے کتے موقع پا کر ریچھ کی تھوتھنی اور نکیل والے حصے کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ گلیڈی ایٹر ہار چکا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے اس نے ایک بے کسی کی نگاہ اکھاڑے کے بے حس تماشائیوں پر ڈالی اور اس کا عظیم جُثہ بے دم ہو کر زمین چھونے کے لیے آخر بار جھول کر ڈھلکا، لیکن اس سے پہلے ریچھ کے مالک کی آنکھ سے ٹپکے دو آنسو زمین کو اپنی آخری سلامی پیش کر چکے تھے۔ ایک زوردار دھپ کی آواز کے ساتھ ریچھ زمین پر گرا اور گرد کا ایک طوفان اُٹھا۔ چھ کتوں میں سے دو مزید شدید زخمی حالت میں ایک جانب پڑے تڑپ رہے تھے اور باقی چار کی حالت سے بھی ایسا لگتا تھا کہ انہیں پھر سے اپنے معمول کی حالت تک پہنچنے کے لیے ہفتوں درکار ہوں گے۔ جبروت نے فتح کا نعرہ لگایا اور ڈھولکیے نے ڈھول کی تان تیز کر دی۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر جبروت کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے مٹھائی کے ٹوکرے کا منہ کھولا اور ایک شان دار حریف کی موت کے جشن میں مٹھائی تقسیم کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے رش میں سے راستہ بنایا اور مجھے کھینچتے ہوئے جبروت کے قریب لے گئے۔ نہ جانے اس شور میں جبروت کو ان کی بات سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن اس وقت وہ خوشی سے اس قدر سرشار تھا کہ اس نے میرے وجود کی طرف نظر بھی نہیں ڈالی اور اپنے کسی کارندے کو چلا کر راشن دینے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں جب ہم قلعے سے باہر نکل رہے تھے تو اکرام صاحب کے ہاتھ میں آٹے، چاول اور گڑ کے چند تھیلے موجود تھے۔ جبروت اس ہنگامے کی وجہ میرے دوسرے ساتھی یعنی سلطان بابا کی کمی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ اور اس بات پر اکرام صاحب سارا راستہ اللہ کا شکر ادا کرتے آئے کہ چلو بلا ٹلی تو سہی۔

میرا من اس وحشیانہ کھیل کو دیکھنے کے بعد اس قدر پژمردہ ہوا کہ میں شام تک ایک گھونٹ پانی بھی اپنے حلق سے نیچے نہیں اُتار سکا۔ بار بار میری نظروں کے سامنے اس بے بس اور لاچار ریچھ کی وہ پُرنم آنکھیں اور اس کا ہار کر زمین پر گرنے کا منظر آ جاتا۔ سلطان بابا بہت دیر تک مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھتے رہے۔ انہیں اکرام صاحب نے واپس جانے سے پہلے ساری کہانی سنا دی تھی کہ میں کیوں اتنا گم صم سا واپس لوٹا ہوں۔

مغرب کے بعد سلطان بابا تسبیح ختم کر کے میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی اور دن کا سورج ڈھلنے کے بعد چاند ایک دوسرے تپتے سورج کے روپ میں طلوع ہونے کی تیاری میں تھا۔ انہوں نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیوں میاں..... کچھ سمجھ میں آیا یہ اختیار اور بے اختیاری کا کھیل۔ آج دوپہر کو جو کچھ تم نے دیکھا، وہ بھی اسی معمے کی ایک کڑی ہی تو تھی۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب دیکھا۔ ''وہ کیسے؟'' ''بھئی ذرا غور کرو تو وہ بے بس جانور بھی ہماری زندگی کا ایک استعارہ ہی تو تھا۔ اور آٹھ جانب سے لپکتے وہ حملہ آور وہ مجبوریاں، جرم گناہ اور فریب کے وہ حملے تھے جو ہم ساری عمر جھیلتے ہیں اور ریچھ کی آخر کار وہ موت اختیار سے بے اختیاری کی جانب سے اس کا آخری سفر تھا۔ اس کے پیروں سے بندھی وہ زنجیر اور اس کے ناک میں ڈلی نکیل ہمارے معاشرے کی پابندیاں اور قانون سمجھ لو۔ کبھی کبھی یہ بیڑیاں رشتوں کی صورت میں بھی ہمیں جکڑے رکھتی ہیں۔ زندگی خود اختیاری کی ایک قسم ہے اور موت بے اختیاری ہے۔ ہاں البتہ اس جانور اور انسان میں ایک واضح فرق ضرور ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے اختیار کی حدیں کسی بھی مخلوق سے بہت زیادہ ہیں۔'' مجھے سلطان بابا کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وقت آنے پر یہ معمہ بھی از خود مجھ پر کھل ہی جائے گا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی جس کا ہیولا میں دو مرتبہ کال گڑھ آنے کے بعد دیکھ چکا تھا۔ میں نے سلطان بابا سے ذکر کیا تو وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ''بعض مرتبہ یہ صحرا ہم انسانوں سے عجیب خواب و سراب کے کھیل کھیلتا ہے۔ لیکن سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر یہ کسی انسانی ہیولے کا معاملہ ہے۔ اگر تیسری مرتبہ پھر وہ شبیہہ تمہیں دکھائی دے تو اس کے قریب جانے کی کوشش کرنا، لیکن یاد رہے، صحرا کا فسوں بڑا گہرا ہوتا ہے۔''

عشاء کے بعد سلطان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں پھر سے اپنے نصیب کے چند ستاروں کے ساتھ اس کالی رات میں مزار کے صحن میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ ہماری زندگی کی زیادہ تر انہونیوں کا تعلق رات ہی سے کیوں ہوتا ہے؟ کیا دن کا اُجالا بہت سے حقائق کو ڈھانپ لیتا ہے۔ حالانکہ عموماً ہم یہی خیال کرتے ہیں کہ ڈھانپنے اور پردہ ڈالنے کا واسطہ اندھیرے سے ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر تو زیادہ تر رات ہی کھلتی تھی اور دن ہمیشہ سے ہی میرے لیے ایک دبیز پردے کا کام سرانجام دیتا رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ہوائے دوش پر مجھے دُور سے کسی بانسری کی لے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں تک تو میں اس آواز کو بھی اپنا واہمہ ہی سمجھتا رہا لیکن پھر سلطان بابا کی کہی ہوئی بات نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ ''ہاں..... واہموں اور سراب کا واسطہ تسلسل سے نہیں ہوتا۔'' لیکن یہ مدھر لے تو لگاتار اور مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مزار سے نکل کر اس ٹیلے کی جانب قدم بڑھائے جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر آہٹ کی آواز سنتے ہی بانسری تھم گئی اور کوئی دھیمی سے آواز میں بولا ''نوری..... تم ہو.....؟'' میں ٹیلا پار کر کے دوسری جانب آ گیا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اندازے سے آواز لگائی..... ''میرا نام عبداللہ ہے۔ میں صحرا کے مزار کا

نیا خدمت گار ہوں تم کون ہو.....؟'' چند لمحے دوسری جانب خاموشی رہی اور پھر ایک نوجوان لڑکا بانسری ہاتھوں میں تھامے ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''اوہ..... میں کچھ اور سمجھا تھا۔ نیچے آجاؤ۔ میرا نام سانول ہے۔ میں یہی کال گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ مجید مستری کا بیٹا۔'' لڑکے نے صحرا کی روایت کے مطابق اپنا مکمل تعارف کروادیا تھا اور اب میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنا نام اور مزار سے تعلق دوبارہ دہرانے کے بعد کہا ''تم بانسری اچھی بجا لیتے ہو۔ لیکن اتنی دُور ویرانے میں اور یوں آدھی رات کو.....'' اُس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرے باپ کو میرا بانسری بجانا پسند نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح قلعہ داروں کے ہاں مہینے بھر کی گندم اور گڑ کے بدلے نوکری کرلوں۔ پر مجھے وہ غلامی پسند نہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کسی مزار کا مجاور بن جاؤں۔ ویسے بھی میرا یہاں دل نہیں لگتا۔'' مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ ''مجاور بن کر کیا کرو گے؟ مجاور تو بانسری بھی نہیں بجا سکتے۔'' وہ بھی میری بات سن کر ہنس پڑا۔ ''ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ پر تم مجھے کچھ دوسری قسم کے مجاور لگتے ہو۔ میں تمہیں بانسری سناؤں۔ تم نے کبھی موسیقی سنی ہے۔'' اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ عرصے پہلے تک دنیا کا کوئی چارٹ ٹاپر (Chart topper) ایسا نہیں تھا جو میرے ذاتی کلیکشن میں شامل نہ ہو۔ بیک اسٹریٹ بوائز اور وٹنی ہیوسٹن کی ایل ڈیز سے میرے کمرے کے شیلف بھرے رہتے تھے اور دنیا کے ہر کونے سے میرے دوست میرے لیے نئی تخلیقات بھیج کر میرا خزانہ بڑھاتے رہتے تھے۔ گھر، گاڑی، یونیورسٹی، پارٹی، کلب ڈسکو ہر جگہ ہر لمحہ یہ تانیں میرے ساتھ ہوتی تھی۔ سانول مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ہچکچایا۔ ''اگر تمہیں پسند نہیں تو میں نہیں بجاتا۔'' ''نہیں نہیں۔ تم بجاؤ۔ مجھے بانسری کی اتنی سمجھ تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری لے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔'' سانول کا چہرہ خوشی سے چمک سا گیا۔ اُس نے جلدی سے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک پرانے گیت کی تان چھیڑ دی۔ اُس کی نظریں بانسری بجاتے ہوئے بھی مستقل مجھی پر جمی ہوئی تھیں، جیسے وہ اپنی دُھن کا اثر میری آنکھوں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دنیا کا ہر ہنر، ہر فن اک ستائش ہی سے تو متصل ہوتا ہے۔ ایسے دیوانوں کی ہر کوشش خود کو منوانے اور ہجوم میں الگ و ممتاز رہنے کی ایک پروانہ وار کوشش ہی تو ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے اپنے ہنر کی تعریف کا بھوکا رہا ہے۔ میرے ذہن میں ''خدا اور محبت'' کا ایک جملہ گونجا۔ ''اپنے ہنر کی تعریف کی یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے۔ تب ہی انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہ تعریف اور سراہے جانے کا جذبہ ہم میں نہ ہوتا تو شاید ہم اب تک پتھر کے دور ہی میں زندہ ہوتے۔'' انہیں سوچوں میں گم میں سانول کی بانسری کی مدھر تان سن رہا تھا کہ اچانک مجھے سانول کے عقب میں کچھ دُور اُسی لڑکی کا سراپا لہراتے ہوئے نظر آیا۔ ہاں..... وہی تھی..... بڑا سا پلو لیے۔ میں ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ سانول کے ہاتھ سے بوکھلاہٹ میں بانسری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بولا۔ ''یا اللہ خیر..... کیا ہو گیا.....؟''

خواب اور سراب

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ''وہ.....لڑکی.....'' سانول نے بھی جلدی سے پلٹ کر دیکھا یہی وہ چند لمحے تھے جب میری توجہ اُس کی جانب مبذول ہوئی ہوگی۔ لیکن اب جب ہم دونوں نے سانول کے عقب میں دیکھا تو وہاں صرف سناٹا ہی تھا۔ سانول کچھ دیر تک حیران نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے پیچھے مڑ مڑ کر اُن دیکھے وجود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''تم بھی اس صحرا کے چکر میں آ گئے نا۔ معاف کرنا مزار کے پچھلے خدمت گار کو میں حافظ جی کہتا تھا لیکن تم تو میرے ہی ہم عمر ہو۔ بُرا نہ مانو تو میں تمہیں عبداللہ کہہ کر ہی پکارا کروں.....؟''

''تم جو چاہو مجھے پکار سکتے ہو۔ لیکن میں کسی وہم کا شکار نہیں ہو رہا۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔'' اب سانول کے چونکنے کی باری تھی۔ ''اچھا.....؟؟ ذرا مجھے اس کا حلیہ تو بتاؤ۔'' میں نے جلدی جلدی جو کچھ میرے حافظے میں محفوظ تھا، اس کے سامنے دہرا دیا۔ سانول میری بات سن کر ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''بڑا سا پلو، پھولوں والی چادر، ہاتھ میں کہنیوں تک سفید چوڑیاں، سانولا سا رنگ، ماتھے پر بندیا..... تم کہو تو ایسی دو درجن لڑکیاں میں کال گڑھ کے بڑے میدان میں آج صبح ہی بلوا لوں۔ ارے بھئی، یہ تو اس علاقے کی ہر دوسری لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے تم نے۔ یہاں سب ہی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی خاص نشانی یاد ہو تو بتاؤ؟'' میں سانول کی بات سن کر مخمصے میں پڑ گیا۔ ''خاص نشانی.....؟ ارے ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی نوری کو پکارا تھا، کہیں یہ وہی تو نہیں تھی؟'' سانول نوری کا نام سنتے ہی کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر وہ شرما کر بولا۔ ''نہیں جی.....وہ نوری نہیں ہو سکتی.....میں تو یونہی ہر آہٹ پر اُس کا نام پکار بیٹھتا ہوں۔ وہ بھلا اس ویرانے میں آدھی رات کو کہاں سے آئے گی۔ اس پر تو دن میں بھی ہزار پہرے لگے رہتے ہیں۔'' میں نے شرم سے لجاتے سانول کو چھیڑا۔ ''اوہ.....تو یہ بات ہے۔ پر یہ نوری ہے کون؟'' ''نوری میری منگ ہے جی! یہیں کال گڑھ میں رہتی ہے۔ آپ مزار پر ہیڈ ماسٹر اکرام اللہ سے تو ضرور ملے ہوں گے، نوری اُن ہی کے بھائی کی بیٹی ہے۔ پوری آٹھویں جماعت تک پڑھا ہے اُس نے۔ پھر اُس کے باپ نے گھر بٹھا لیا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کے لیے کال گڑھ سے بیس کوس دُور، دوسری بستی کے ہائی اسکول تک جانا پڑتا ہے۔'' سانول شرما شرما کر اپنے اور نوری کے رشتے کی بابت بتا رہا تھا کہ کیسے، اُس کے گھر والوں نے سانول کی نشانی تو رکھ لی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ جب تک سانول برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا

وہ بیٹی کو رُخصت نہیں کریں گے۔ لیکن کال گڑھ میں روزگار کے نام پر صرف قلعے داروں کی غلامی ہی تھی، جو سانول کو کسی صورت منظور نہیں تھی۔ کیوں کہ قلعے کے قرضے کے چنگل میں ان لوگوں کی تیسری نسل پس رہی تھی اور سود در سود کا یہ جال کال گڑھ والوں کو کسی اَن دیکھے خون آشام عفریت کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ سانول کا باپ بھی اس سے بچ نہیں پایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نوری کو اب تک بیاہ کر گھر نہیں لا سکا تھا، کیوں کہ بستی کے تمام رشتوں کا فیصلہ ہر سال قرض ادا کرنے کے موقعے پر جبروت کی پنچایت ہی کرتی تھی۔ لوگ اپنا پرانا قرضہ چکاتے اور اپنے پیاروں کے رشتے کے لیے نئے قرض کی گٹھڑی اپنے شانوں پر ڈالے قلعے سے نکل آتے۔ اسی لیے سانول کا باپ چاہتا تھا کہ سانول بھی قلعے داروں کی نوکری کر لے تا کہ باپ بیٹا دن رات محنت کر کے قلعے کا سارا قرض اسی سال چکتا کر دیں اور سانول کا رشتہ پکا ہو سکے۔ لیکن خود سانول کو یوں رشتے کے بہانے بار بار نوری اور اُس کے گھر والوں کا قلعے بلایا جانا ایک آنکھ بھی نہیں بھاتا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ نوری کو سات پردوں میں زمانے کی نظر اور ہر دید کی آنچ سے بچا کر چھپا رکھتا۔ لیکن وہ اس وقت بے بس تھا کیوں کہ نوری پر اُس کا پورا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور یہی بات سانول کو ہر دم پریشان رکھتی تھی۔ اُس نے نوری کو بھی سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اپنے باپ یا چچا کے بغیر کبھی اپنے گھر کے آنگن سے قدم بھی باہر نہیں دھرے گی کیوں کہ جبروت کے حواری اور گرگے آوارہ کتوں کی طرح سارا دن کال گڑھ کی گلیوں میں منڈلاتے رہتے تھے۔ سانول کے بقول، جب سے نوری کے ساتھ اُس کی منگنی طے ہوئی تھی وہ ویسے بھی دہرے عذاب کا شکار تھا۔ پہلے تو پھر بھی کبھی کبھار اُسے نوری کی ایک آدھ جھلک نصیب ہو جاتی تھی، لیکن اب تو وہ اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں سانول کو بتاؤں کہ کوئی بھی منگنی یا دوسرا بندھن اُس کا قصوروار نہیں۔ یہ سارا قصور تو اُس محبت کا ہے جو اپنے جلو میں ہر بار جانے ایسی کتنی بے چینیاں، درد اور لا حاصل پن کی چبھن لے کر آتی ہے۔ جب تک ہمیں کسی سے محبت نہیں ہو جاتی، وہ شخص ہمارے لیے کس قدر عام ہوتا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ میں سے کوئی ایک، ہمارے آس پاس باقی لوگوں کی طرح چلتا پھرتا اور ہماری دسترس میں۔ لیکن جیسے ہی ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے، پل بھر میں وہ ہمارے لیے کس قدر ناممکن، کتنا لا حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جو پہلے پہروں ہماری محفل میں سامع بنا بیٹھا رہتا تھا، اب اُس کی قربت کی دو گھڑی کے لیے بھی ہم ترس جاتے ہیں۔ یہ محبت آخر ہے کیا بلا..... کیا اپنے ساتھ ہی یہ مجبوریوں، پریشانیوں، دوریوں اور کرب کا ایک دریا لیے وارد ہوتی ہے؟ پہلے میں سمجھتا تھا کہ محبت کا نزول ہی ہمیشہ دو ایسے افراد کے درمیان ہوتا ہے، جن کا ملن ناممکنات کا دوسرا نام ہو۔ لیکن اب مجھ پر یہ راز دھیرے دھیرے آشکار ہونے لگا کہ اصل میں محبت خود اپنے ساتھ ایک ایسا سحر لیے نمودار ہوتی ہے کہ جو ہمارے محبوب کو ہمارے لیے پری زاد بنا دیتا ہے۔ جانے کوہ قاف کے بلند و بالا پہاڑ خود بخود ہمارے درمیان کہاں سے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ زمانے کی نظر بدل کر برچھی کیوں بن جاتی ہے۔ اپنے بھی پرائے ہو کر طعنے مارنے لگتے ہیں، ہمدردی طنز میں بدل جاتی ہے۔ کل تک

پلکوں پر بٹھانے والے یخ پا ہو کر سرزنش کرنے لگتے ہیں۔ نہ جانے یہ محبت ہمیشہ ہمارے اردگرد کا ہر موسم، رویہ ہمارے خلاف کیوں کر دیتی ہے۔ ہر بہار کو خزاں میں بدل دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں اپنے آپ تک سے جُدا کر دیتی ہے۔ یہی سب کچھ سانول کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک مجھ سے اپنا درد بانٹتا رہا۔ جانے اس نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اتنا بھروسا کیوں اور کیسے کر لیا تھا۔ رُخصت ہوتے وقت بھی اُس نے مجھ سے کئی بار وعدہ لیا کہ میں روز رات کو کچھ دیر کے لیے صحرا میں اُس سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

میں جب سانول کو الوداع کہہ کر مزار کے صحن میں داخل ہوا تو صبح کی اذان کا وقت قریب ہی تھا۔ سو وہیں کچی اینٹ کے صحن کو بستر بنا کر اور ہاتھوں کے تکیے پر سر رکھ کر کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے لیٹ گیا اور پتا نہیں، کس گھڑی میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھے عجیب سے سائے ڈراتے رہے۔ میں نے اچانک خود کو اُسی وسیع و عریض اور لق و دق صحرا کے بیچوں بیچ کھڑا پایا۔ سوا نیزے پر آیا سورج میرے سر پر اپنی تپتی کرنوں کی برچھیاں لیے کھڑا ہے اور پھر اچانک ہی مجھے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں گھبرا کر ایک طرف دوڑتا ہوں تو آٹھوں کتوں کو اپنے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتے پاتا ہوں اور پھر اُن میں ایک کتا اُچھل کر میرے نرخرے میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا ہوں..... یا اللہ..... یہ خواب تھا یا کوئی عذاب.....؟ سلطان بابا صحن ہی میں ایک برتن سے پانی لے کر وضو کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ اُن کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت احتیاط سے پانی کا استعمال کر رہے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ میں نے سنا تھا کہ صبح کے قریبی خواب سچے ہوتے ہیں۔ سلطان بابا میرا خواب سن کر کچھ خاموش سے ہو گئے۔ میں نے اصرار کیا تو دھیرے سے بولے، ''خواب تقدیر نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی مستقبل کی ایک جھلک ضرور ثابت ہو جاتے ہیں اور اگر یہ جھلک سچی ہے تو آنے والے دنوں میں یہ صحرا تمہاری بہت بڑی امتحان گاہ ثابت ہوگا۔ نہ صرف تمہارے لیے بلکہ خود میرے لیے بھی..... لیکن ہمیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ جسم صرف اس دنیاوی زندگی کا ایک استعارہ ہے۔ اصل حیات تو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔''

نہ جانے سلطان بابا کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ میں سر سے پیر تک پسینے میں شرابور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ صحرا کی بے رحم دھوپ نے مزار کی روشوں پر ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے۔ میں ابھی تک رات کے خواب کے اثر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا کہ کوئی کتا درد سے بے چین ہو کر رو رہا ہے۔ چند لمحے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ بھی رات والے خواب ہی کا کوئی تسلسل ہے۔ لیکن جب ایک ہی آواز وقفے وقفے سے مزار کی عقبی دیوار سے اُبھرنے لگی تو مجھے خود کو مجتمع کر کے اُٹھنا ہی پڑا اور پھر میں تپتی ریت میں پیر دھنسائے ہوئے عقبی سمت تک پہنچا تو اپنی جگہ جم کر ہی رہ گیا۔ دیوار کے نامکمل سائے میں ادھ مرا ''کالا'' پڑا ہوا تھا۔ ہاں، جبروت کا وہی لاڈلا کتا جس نے پہلی رات مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور گزشتہ روز جسے ریچھ نے

پوری قوت سے اپنے پنجے کے ایک ہی تھپیڑے سے ہوا میں اُچھال کر ہجوم کے دائرے سے پرے پھینک د
تھا۔ مجھے اکرام اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جبروت اپنے ہار جانے والے یا شدید زخمی کتوں کو مرنے کے لیے
صحرا میں پھینکوا دیتا ہے۔ شاید کالے کو بھی ادھ مرا سمجھ کر وہ لوگ صحرا میں پھینک گئے تھے، لیکن وہ اس حالت میں
یہاں تک کیسے آ پہنچا۔ کتے کا جسم بُری طرح زخمی تھا اور ریچھ کے خوں خوار پنجوں نے کالے کا پیٹ بُری طرح
سے اُدھیڑ دیا تھا۔ وہ گرم ریت پر کچھ اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی دھونکنی جیسی چلتی سانس اور منہ سے لٹکتی زبان
ریت چاٹ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کتے نے
اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ صرف ایک کراہ کے بعد نڈھال ہو کر پھر وہیں پڑ کر رہ گیا۔ مجھے
اور تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں میں جلدی سے بھاگ کر مزار کے احاطے میں پڑی پرانی مشک اُٹھا لایا جس کی تہ میں
ابھی کافی پانی موجود تھا۔ میں نے چند قطرے جانور کے چہرے پر ٹپکائے تو اُس نے جلدی سے زبان باہر نکال
دی اور پانی کی گرتی بوندوں کو بے تابی سے اپنے حلق سے نیچے اُتارنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے زخم کی
اصل گہرائی کا اندازہ ہوا۔ لیکن افسوس میرے پاس اس وقت وہاں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا، جسے میں زخم پر لگاتا۔
اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔ ایک پرانا ٹاٹ کا ٹکڑا صحن کی دیوار کے پاس پڑا نظر
آیا۔ میں نے دیوار کے بنے طاق کے اندر سے ماچس اُٹھائی اور ٹاٹ کو آگ لگا دی۔ بچپن میں ایک بار کاشف
کی بلی کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا، تب میں نے اپنے لنگوٹیے یار کو یہی نسخہ آزماتے دیکھا تھا۔ ٹاٹ کی راکھ میں
کالے کے زخم کے اُوپر بکھیر دی۔ پتا نہیں اُسے اس سے سکون ملا یا نہیں۔ میں رات کی بچی ہوئی روٹی کے چند
خشک ٹکڑے بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ روٹی نگلنے اور پانی پینے کے بعد وہ مجھے کچھ سکون میں دکھائی دیا۔ لیکن مسئلہ
اب بھی وہی تھا۔ بے زبانی ..... اچانک ہی مجھے اس زبان اور ان لفظوں کی شدید اہمیت کا احساس ہوا۔
ہمارے پاس یہی ایک لفظ ہی تو ہوتے ہیں، سب سے خاص، سب سے ممتاز کر دینے والے..... اور اگر ہمارے
زندگی سے یہ لفظ نکال دیئے جائیں تو ہم کس قدر نامکمل، کس قدر کھوکھلے ہو جائیں۔ بے زبانی کا کرب جس
شدت سے اس لمحے میں نے محسوس کیا، شاید ہی کبھی کیا ہو۔ کالے نے اپنے جسم کو تولا اور تقریباً گھسٹتے ہوئے
ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہیں پڑا رہے
لیکن میں تو اشاروں کی زبان بھی نہیں جانتا تھا اور پھر بات اشاروں کی زبان تک ہی کہاں مخصوص تھی میں
بول کر بھی بعض مرتبہ اپنے لفظوں کو گونگا ہی پاتا تھا۔ کالے نے اُونچے ٹیلے سے پلٹ کر ایک بار تشکر بھری
نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر ریت کے اُڑتے گرم بگولوں میں غائب ہو گیا۔ اتنے میں اندر مزار کے
صحن سے کسی کے باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں پلٹ کر واپس صحن میں داخل ہوا تو اکرام صاحب ایک
بوڑھے جوڑے کے ساتھ سلطان بابا کے قریب بیٹھے دکھائی دیئے۔ بوڑھے کی نظر شاید بالکل ہی جواب دے
چکی تھی، لہٰذا وہ بڑھیا کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر سلطان بابا سے مخاطب تھا۔ میں بھی سلام کر کے خاموشی سے ا

لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بڑھیا گزارے لائق بھی اُردو نہیں بول سکتی تھی۔ سو بوڑھے ہی کو اُس کے حصے کے الفاظ بھی ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ خود بوڑھا بھی اپنا مدعا ٹوٹی پھوٹی اُردو اور صحرائی زبان کی آمیزش میں بیان کر رہا تھا۔ اکرام صاحب بھی درمیان میں لقمے دیتے رہے۔ ماجرا کچھ یوں تھا کہ بوڑھے اور بوڑھی کی نواسی چھ ماہ پہلے بیاہ کر اپنے گاؤں سے میاں سمیت کال گڑھ سے دو گاؤں آگے رحمان گڑھ کے لیے روانہ ہوئی تھی لیکن وہ اور اُس کا شوہر کبھی رحمان گڑھ نہیں پہنچ پائے۔ لڑکی کے گاؤں اور رحمان گڑھ کے بیچ صرف کال گڑھ ریلوے سٹیشن ہی پڑتا تھا اور تلاش کے دوران چند ریلوے ملازمین نے اتنی گواہی تو ضرور تھی کہ انہوں نے اُس رات ایک نوجوان شادی شدہ جوڑے کو کال گڑھ کے ریلوے سٹیشن پر اُترتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ ٹرین پر سوار ہوئے یا کہیں اور نکل گئے، اس کی خبر کسی کو نہیں تھی۔ لڑکی کے ماں باپ تو چند سال پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ لڑکی کے نانا نانی نے ہی پال پوس کر اُسے بڑا کیا اور بیاہا تھا۔ لڑکا رحمان گڑھ میں کوئلے کی کان میں مزدور تھا اور ہفتے بھر کی چھٹی لے کر صرف بیاہ کے لیے اپنی دلہن کے گاؤں آیا تھا۔ بوڑھا اور بوڑھی اپنی نواسی کی جدائی میں بے حد نڈھال تھے۔ خاص طور پر بڑھیا کے تو آنسو ہی نہیں رُکتے تھے۔ بقول اُس کے اُسے کال گڑھ کی مٹی میں سے اُس کی سکینہ کی خوشبو آتی تھی اور گزشتہ چھ ماہ ہی سے وہ دونوں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن ابھی تک اُن کی نواسی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا، نہ ہی اُس کے شوہر کا کوئی پتا تھا۔ کال گڑھ کی ناکارہ پولیس بھی چند دن کی دکھاوے کی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی تھی اور اب تو حوالدار نے باقاعدہ ان دونوں کا داخلہ بھی تھانے میں بند کروا دیا تھا کہ کون روزانہ ان دو خبطی بوڑھوں کی تکرار سنتا پھرے۔ اکرام صاحب نے سلطان بابا کو یہ بھی بتایا کہ شروع میں سب سے پہلے سکینہ کے نانا نانی نے علاقے کی روایت کے مطابق جبروت سے بھی رابطہ کیا تھا اور جبروت نے چند دن اپنے ہرکارے آس پاس کے علاقوں میں دوڑائے بھی کہ شاید کہیں لڑکا لڑکی کا کچھ پتا چل سکے، لیکن چند دن بعد کارندے بھی تھک ہار گئے۔ اب تو جبروت نے بوڑھے اور بڑھیا سے ملنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کتے لڑانے جیسے اور بھی بہت سے اہم کام ہوتے تھے، وہ کب تک اپنے وفاداروں کو ہلکان کرتا۔ لیکن سکینہ کی نانی یہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُسے اب بھی اُمید تھی کہ اُس کی لاڈلی کی اگر کوئی خبر ملے گی تو وہ یہیں کال گڑھ سے ملے گی۔ بڑھیا نے بوڑھے کے کان میں کچھ کہا اور بوڑھے نے اُسے ڈانٹا۔ بڑھیا نے پھر منت کی۔ بوڑھا بادل ناخواستہ گڑگڑایا۔ ''میری لگائی سٹھیا گئی ہے پیر صاحب۔ آپ سرکار لوگ ہو، بُرا نہیں ماننا۔ پر یہ کہتی ہے کہ اُسے روزانہ کئی مہینوں سے ہر رات ایک ہی عجیب سا خواب آتا ہے کہ ہماری سکینہ اس صحرا میں دوڑ رہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے کتے لگے ہوئے ہیں۔ سکینہ زور زور سے رو رہی ہے اور ہمیں پکار رہی ہے.....'' میں زور سے چونکا۔ کچھ ایسا ہی خواب تو میں نے بھی رات کو دیکھا تھا۔ یہ صحرا کیا اپنے سبھی باسیوں کو ایک جیسے ہی خواب دکھاتا تھا۔ بوڑھا گڑگڑا رہا تھا۔ ''آپ ہمارے لیے دعا کرو پیر جی..... ہم بہت

مجبور اور بے کس ہیں۔ بڑی دُور سے چل کر آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری فریاد سننے والا نہیں ہے۔'' بوڑھ
بولتے بولتے بھرا سا گیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر مزار کی بنجر زمین میں جذب ہو گئے۔ بڑھیا
اپنے مرد کو روتے دیکھا تو جلدی سے اپنا دکھڑا بھول کر پلو سے اُس کی آنکھیں پونچھنے لگ گئی۔ عجیب نظارہ تھا
دو مجبور اور بے بس انسان ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے، حالانکہ دونوں اس بات سے باخبر تھے کہ ان
دلاسا جھوٹا ہے۔ پتا نہیں کیوں ایک دم ہی میرا دل بھر آیا اور میں نے وہاں سے اُٹھ جانے کی ٹھان لی۔ اسے
میں مزار کے دروازے سے زوردار آواز کے ساتھ سلام کی آواز سنائی دی۔ آنے والا سانول تھا، جو دروازے کے قریب کھڑے ہو کر مجھے پاس آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ مجھے تو ویسے بھی وہاں سے ٹلنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ سانول کے قریب پہنچ کر میں نے اُس سے پوچھا۔ ''خیر تو ہے..... کہیں نوری کے لیے کوئی منت ماننے تو نہیں آئے۔'' وہ مسکرایا۔ ''منتوں سے اگر پیار ملتے تو کال گڑھ کا یہ مزار اتنا ویران نہ ہوتا جناب
.....'' ''واہ..... بڑی بات کہہ دی تم نے۔ کہو کیسے آئے؟'' سانول نے کچھ رازدارانہ انداز میں میرے قریب
ہو کر بتایا کہ نوری کی کسی سہیلی نے اُسے پیغام بھجوایا ہے کہ نوری عصر کے بعد اپنے والدین کے ساتھ مزار پر
کرنے آئے گی۔ شاید چچا اکرام بھی ساتھ ہوں۔ سانول بھی اُس وقت کسی بہانے مزار پر آنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے
یہی بتانے کے لیے اس جھلسا دینے والی دھوپ میں دوڑتا ہوا یہاں تک آیا تھا کہ میں اس کی مدد کروں اور اس
کے ذمے کوئی ایسا کام لگا دوں کہ وہ جب مزار پر آئے تو نوری کے گھر والوں کو شک نہ ہو اور وہ بُرا نہ مانیں۔
بقول سانول نوری کے گھر والے اس معاملے میں بہت سخت تھے، خاص طور پر اپنے پرانے اُستاد ہیڈ ماسٹر
اکرام صاحب سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ میں نے اُس کی رام کہانی سننے کے بعد مسکرا کر اُس سے پوچھا کہ
''جہاں اُس نے اتنی محنت کی ہے، وہیں ضرور کوئی اچھا سا بہانہ بھی خود ہی سوچ لیا ہوگا۔'' سانول بھی ہنس دیا
''اُس کا انتظام بھی میں نے کر دیا ہے۔ آج جمعرات ہے۔ میں یوں ظاہر کروں گا کہ جیسے تمہارے کہنے
مغرب کے بعد پڑھ کر بانٹنے کے لیے چنے اور گڑ وغیرہ لے کر آیا ہوں۔ پچھلے حافظ جی بھی ہر جمعرات کو
نیاز بانٹا کرتے تھے۔'' یہ محبت کرنے والوں کو ہمیشہ ایسے بہانوں کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ میں نے سانول
کو تسلی دی کہ وہ بے فکر ہو کر واپس جائے۔ میں اس ''معاونت عشق'' کے جرم میں اُس کا پورا ساتھ دوں گا۔
سانول کو پریشان دیکھ کر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ پیار اپنے ساتھ اتنی کڑی پابندیوں کے کانٹے کیوں لے کر آتا
ہے۔ ہفتوں صحرا میں سر پٹخنے اور پاؤں میں چھالے پڑنے کے بعد آج جب محبوب کا دیدار نصیب ہو بھی رہا
تو وہ بھی صرف چند گھڑیوں کے لیے۔ اور اس کے لیے بھی سو بہانے اور تاویلیں گھڑنا پڑ رہی تھیں۔ یہ پیار
محبت کا جذبہ ہماری رگوں سے سارا خون نچوڑنے کے بعد ہی خوشی کی دو بوندیں ہماری رُوح کے کشکول میں
کیوں ڈالتا ہے۔ جاتے جاتے سانول کی نظر سلطان بابا کے قریب بیٹھے بوڑھے اور بڑھیا پر پڑی۔ ''اوہ
یہ بے چارے یہاں بھی آ پہنچے.....؟'' ''تم جانتے ہو انہیں.....؟'' کال گڑھ میں کون ہے جو انہیں نہیں جانتا

پچھلے چھ ماہ سے علاقے کے ہر گھر کی چوکھٹ پر دستک دے چکے ہیں یہ دونوں۔ بڑا ظلم کیا ہے قدرت نے ان کے ساتھ۔ جانے ان کی نواسی کہاں کھو گئی ہے۔ علاقے کے سب ہی جوانوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن ان دونوں کا آج تک کہیں پتا نہیں چلا۔ اب تو باقی سب کی طرح میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ضرور وہ لوگ کال گڑھ سے کہیں آگے بڑھ گئے ہوں گے۔ یہاں ہوتے تو اُن کا کچھ نشان تو ملتا؟'' جاتے جاتے سانول ایک بار پھر اپنا پورا منصوبہ دھرا کر اور مجھ سے تصدیق کروا کر واپس پلٹ گیا۔ سلطان بابا نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے تھے۔ میں بھی آ کر دعا میں شامل ہو گیا۔ دعا ختم کر کے سلطان بابا نے سکینہ کے نانا نانی کو تسلی دی کہ انشاء اللہ جلد ہی اُن کی لاڈلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل جائے گا۔ اکرام صاحب نے دعا کے بعد واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ بڑھیا نے بوڑھے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور سلطان بابا سے رُخصت ہو کر جانے کے لیے پلٹے۔ بڑھیا کی گود سے کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی پھسل کر نیچے گر گئی لیکن اُسے شاید اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میں بھی انہیں جاتا دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ پہلے میری نظر بھی وہاں نہیں گئی۔ پھر جب احساس ہوا، تب تک وہ مزار کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے اکرام صاحب کو آواز دے کر روکا اور جلدی سے پوٹلی اُٹھا کر انہیں تھمانے کے لیے دروازے کی جانب دوڑا۔ پوٹلی کی گرہ شاید نرمی سے لگائی گئی تھی، تب ہی وہ بیچ راستے ہی میں کھل گئی اور دو چار کپڑے نکل کر صحن میں بکھر گئے۔ ریت کا تیز بگولا مزار کے صحن میں داخل ہو گیا اور میں نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹنا شروع کر دیئے۔ ریت میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ کپڑے کیا تھے، چند کترنیں ہی تھیں۔ بزرگ ہوا نے ایک زنانہ دوپٹے کو دُور پھینک دیا۔ میں باقی کپڑے سمیٹنے کے بعد اُس جانب بڑھا، جہاں مزار کے صحن میں اُگے کیکر کے ایک جھاڑ میں وہ دوپٹا اٹکا ہوا تھا۔ ریت کے اُڑتے ذرّوں نے آس پاس سب ہی کچھ دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ تب ہی میری نظر دوپٹے پر پڑی اور میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے۔ یہ..... یہ تو وہی پھولوں والی چادر کا ایک حصہ تھا، جو میں نے اُس انجان لڑکی کو اوڑھے دیکھا تھا۔ ہاں وہی تو تھا..... لیکن یہ دوپٹا..... یہاں کیسے.....؟ میں نے جلدی سے کیکر سے کپڑا علیحدہ کیا اور اُسے لے کر تقریباً دوڑتا ہوا دروازے کے قریب کھڑے جوڑے تک پہنچا۔ اکرام صاحب بھی میری ہڑبڑاہٹ دیکھ کر گھبرا سے گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا، ''یہ کپڑے کس کے ہیں؟'' اکرام صاحب نے جواب دینے کے بجائے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ بوڑھے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''یہ ہماری سکینہ کی چادر کا آدھا حصہ ہے۔ شادی کے بعد آتے ہوئے اُس نے اپنی بدنصیب نانی کو اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ اسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی ہے جی۔ کہتی ہے اس میں سے اُسے اپنی لاڈلی کی خوشبو آتی ہے۔'' میرے ذہن میں بیک وقت کتنی آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک جو انجانی لڑکی رات کے اندھیرے میں مجھے اس صحرا میں دکھائی دیتی رہی، وہ سکینہ ہی تھی۔

لاحاصل کی کھوج

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر اُن دونوں کو بتاؤں کہ میں نے سکینہ کو دیکھا ہے لیکن نہ جانے وہ کو
سا احساس تھا جس نے مجھے اس اعلان سے باز رکھا۔ بوڑھا اور بڑھیا اکرام صاحب سمیت اپنی نواسی
کپڑوں کی پوٹلی لیے پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں ریت کے شدید طوفان میں مزار کے دروازے کے قریب
گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ریت کی چادر نے میرے سارے وجود کو اپنی جلتی چا
سے ڈھک دیا۔ یہ کیسا اسرار تھا؟ اگر وہ لڑکی سکینہ ہی تھی، جو مجھے ایک آدھ نہیں، پورے تین بار دکھائی دی تھی
پھر وہ گزشتہ اتنے عرصے میں کال گڑھ کے دوسرے باسیوں کو کیوں نظر نہیں آئی تھی؟ لیکن کیا صرف ایک
پھولوں والی چادر کی مشابہت کی بنا پر مجھے اتنا بڑا دعویٰ کرنا بھی چاہیے یا پھر مزید کسی ثبوت کا انتظار کرنا چاہیے
میں انہی سوچوں میں گم رہا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب عصر کا وقت گزر گیا۔ سلطان بابا نے ٹوکا تو میں
جلدی سے سورج ڈھلنے سے کچھ قبل نماز ادا کی۔ آج مزار پر ہلکی پھلکی چہل پہل بھی تھی۔ شاید جمعرات کی وجہ
سے۔ کچھ ہی دیر میں اکرام اللہ صاحب ایک پکی عمر کے مرد اور عورت کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل
ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جھجکتی سی، چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک سانولی سلونی سی نوجوان لڑکی
علاقے کی ریت کے مطابق بڑا سا پلو نکالے اندر چلی آئی۔ اچھا تو یہ تھی، سانول کی نوری..... واقعی سانول کی
تڑپ اور بے چینی بلاوجہ نہیں تھی۔ نوری کے نور سے مزار چند لمحوں کے لیے جگمگا سا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی سادگی
میں کس قدر کشش ہوتی ہے۔ کچھ سراپے خود سرتاپا ایک گہنا ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کسی زیور کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ نوری نے بھی سادہ سفید چوڑیاں کہنی تک ڈال رکھی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ اور اکرام چچا کے
ساتھ دعا میں مشغول تھی اور میں بار بار باہر صحرا کی طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ نہ جانے سانول کہاں رہ گیا تھا
اُس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ نوری کی خاص سہیلی نے نوری سے بھی چھپ کر اس کے مزار آنے کی یہ خبر سانول
تک پہنچائی تھی۔ نوری کی سب سہیلیاں سانول کی اس بے قراری سے واقف تھیں اور سب ہی کی دلی خواہش
تھی کہ نوری جلد از جلد سانول کی ہو کر اُس کے گھر چلی جائے۔ اس لیے وہ نوری کی ناراضی کا خطرہ مول لے
بھی ایسی حرکت کر گزرتی تھیں۔ جس سے ان دونوں کو دو گھڑی ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع مل سکے
نوری کا سکون بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے سانول کی آمد کی خبر نہیں، ورنہ ایسے شفاف آئینے کہاں کچھ چھپ
پاتے ہیں۔ نوری نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا رکھے تھے اور میں نے دُور صحرا میں نوری کی ہتھیلیوں کے حلقے

پرے سانول کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے مزار کی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی زور دار انداز میں ہم سب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا کپڑے کا تھیلا ایک جانب رکھتے ہوئے بولا ''چھوٹے پیر جی..... آپ نے دعا کے لیے جو سامان منگوایا تھا، سب لے آیا ہوں۔'' اُس کی اس ''چھوٹے پیر جی'' کی اصطلاح نے مجھے بے ساختہ مُسکرانے پر مجبور کر دیا۔ نوری نے چونک کے پلٹ کر دیکھا اور اُس کے چہرے پر بیک وقت حیا، شرم اور کچھ کچھ غصّے کی لالی بکھر گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سانول کی اس ''سعادت مندی'' کے پیچھے کیا راز ہے۔ سانول نے باقی سب لوگوں سے بھی علیک سلیک کی اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظر بار بار پھسل کر نوری کے چہرے کا طواف کر رہی تھی اور چند لمحوں پہلے کسی گہری جھیل کی طرح پُر سکون نظر آنے والی نوری کسی سمندر کے بے چین مدوجزر کی طرح بل کھانے لگی تھی۔ دعا ختم کرنے کے بعد نوری کے والدین نے سلطان بابا سے چند لمحوں کی ملاقات کی۔ اکرام صاحب نے ان سب کا تعارف کروایا۔ اس تمام عرصے میں نوری مستقل سر جھکائے کھڑی رہی۔ سانول کا دیا ہوا لقب نوری کے ماں باپ کی زبان پر بھی چڑھ گیا تھا اور وہ رُخصت ہوتے وقت تک مجھے ''چھوٹے پیر'' کے نام ہی سے پکارتے رہے۔ گویا سلطان بابا کال گڑھ کے بڑے پیر تھے اور میں اُن کا معتمد، چھوٹا پیر۔ سانول کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ اُس کی توجہ صرف نوری کی اک نظر ہے۔ لیکن اس پیکر حیا نے بھی جیسے صرف مزار کی زمین پر بچھی ریت ہی کو نہار لینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ نوری نے آخری وقت تک اپنی نظر جھکائے رکھی، حتیٰ کہ اُس کے ماں باپ اور چچا مزار کے دروازے تک پہنچ گئے۔ سانول بالکل ہی پژمردہ سا ہونے لگا۔ میرے دل سے بے اختیار ایک صدا نکلی کہ اس کے حصے کی نظر اسے نصیب کر دے اور ٹھیک اُسی لمحے نوری نے مزار سے نکلتے نکلتے ایک پل کے لیے پلٹ کر سانول کی جانب دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا۔ اُس ایک نظر میں۔ حجاب، ستائش، سرزنش اور ایک وداع..... تب تک کے لیے جب قدرت ایک بار پھر ان دونوں کا سامنا کرا دے۔ سانول اپنی جگہ بُت سا کھڑا رہ گیا اور نوری پلٹ کر چل دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک نظر سانول کو کیا کچھ دے گئی۔ لیکن مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اب اگلی ملاقات تک سانول کے جگر میں نوری کی یہ آخری نظر، زہر میں بجھے ہوئے ایک تیر کی طرح پیوست رہے گی۔ نہ جانے کتنے جگ راتے اور دھوپ کے کتنے پہر اِسی ایک نظر کی کسک اور تڑپ کے اثر میں لرز جائیں گے۔ صورت چاہے کوئی بھی ہو، یہ محبت ہر حال میں ایک دودھاری تلوار ہی تو ثابت ہوتی ہے۔ نہ ہو تو جُدائی کاٹتی ہے اور ملاقات ہو جائے تو محبوب کا جلوہ جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ سانول بھی اب صرف اپنی راکھ کی صورت ہی میں اس مزار کے احاطے میں موجود رہ گیا تھا اور گرم ہوا کے تیز بگولے اور ریت کا طوفان اس راکھ کو پورے مزار کی چار دیواری میں اُڑا رہا تھا۔ یہ جذبے بھی کتنے منہ زور ہوتے ہیں۔ ایک لمحے ہی میں کیسے کیسے زندہ دلوں کو خاک کر دیتے ہیں۔ سانول بھی کچھ دیر بعد اپنے اس ریزہ ریزہ اور خاکستر وجود کو لیے واپس پلٹ گیا۔ مغرب کے بعد جب سلطان بابا نے اپنی تسبیح ختم کی تو میں نے انہیں سکینہ کے دوپٹے والی

ساری بات بتائی کہ اِسی چادر کا دوسرا حصہ پہنے ہوئے میں نے صحرا میں اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ سلطان بابا میرا
بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے تو لہجہ تب بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ ''گویا وہ صرف ایک
سراب ہی نہ تھی۔ قدرت تم سے کوئی بڑا کام لینے والی ہے ساحر میاں! خیال رہے کہ اب قدم ڈگمگانے
پائیں۔ ویسے میرا قیاس ہے کہ اب وہ لڑکی تمہیں دوبارہ دکھائی نہیں دے گی۔ اس نے تمہیں جو اشارہ دینا تھا
دے چکی۔ اب آگے کی کھوج تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔''

ہمیشہ کی طرح میں سلطان بابا کی پوری بات سمجھ نہیں پایا اور ہمیشہ کی طرح چپ ہی رہا کیوں کہ مجھے
اندازہ تھا کہ سلطان بابا مجھے اتنا ہی بتاتے ہیں جتنا میرے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔ رات ڈھلنے لگی تھی اور
میری ازلی وحشت اور بے چینی کا دور بھی شروع ہونے ہی کو تھا کہ مجھے باہر سے وہی مخصوص غراہٹ سنائی دی۔
مجھے اندازہ تھا کہ ''کالا'' بھوک لگنے پر اب ہمیشہ مزار پر چار دیواری ہی کا رُخ کیا کرے گا کیوں کہ اس کے
پرانے مالک نے تو اسے اس کی زندگی بھر کی وفاداری کا صلہ ایک ''دیس نکالے'' کی صورت ہی دیا تھا۔ وہ دبے
اپنی مخصوص جگہ پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک پرانے برتن میں پانی کا مستقل انتظام کر دیا تھا۔ روٹی
کے چند ٹکڑے نگلنے کے بعد کالا وہیں پیر پسار کر بیٹھ گیا۔ جانے اسے اتنی سمجھ کیسے آ گئی تھی کہ وہ مزار کی چار
دیواری کے اندر پھٹکتا بھی نہیں تھا۔ اتنے میں صحرا کی طرف سے سانول کی پُرسوز بانسری کی لے ہوا کے دوش پر
بکھری۔ اُس کی تان میں جو درد آج تھا۔ اُسے شاید صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ شاید شیلے نے کہا تھا کہ
''ہمارے سب سے میٹھے نغمے وہی ہوتے ہیں جو ہمارے اندر کے شدید غم کو بیان کرتے ہیں۔'' آج سانول کی
بانسری بھی شیلے کے اس قول کو سچ ثابت کر رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے ہونٹوں سے بانسری ہٹا
لی۔ میں نے قریب جا کر اُسے چھیڑا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ نوری کی ایک جھلک تمہاری دُھن کو اتنی زندگی بخش
دے گی۔ ورنہ اُس کے ماں باپ سے کچھ دیر مزار پر ٹھہرنے کی التجا ضرور کرتا۔'' سانول پھیکی سی مسکراہٹ کے
ساتھ بولا ''میں ہر لمحہ اُسے دیکھنے کے لیے تڑپتا ہوں، لیکن جب بھی کبھی اُس کی ایک آدھ جھلک پا لیتا ہوں
پھر ہفتوں یونہی اداس اور بے چین رہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے عبداللہ.....'' ''پہلے تو تم یہ فیصلہ کر لو کہ تم
عبداللہ ہوں یا چھوٹا پیر۔ پھر اس کے بعد ہم مل کر اس درد کا مرہم بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' اس مرتبہ سانول خود
کھلکھلا کر ہنسنے سے روک نہیں پایا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میں اُسے یاسیت کے اس دور سے باہر نکالنا چاہ
تھا۔ اب میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ اس محبت نے آج تک خوشی کم ہی بانٹی ہے۔ کیکر کا مقدر صرف کانٹے ہوتے
ہیں، گلاب نہیں۔

میں ابھی تک سکینہ کے بھید میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے سانول سے دوبارہ اُس کا تذکرہ کیا کہ مجھے
لگتا ہے کہ جس لڑکی کی جھلک میں نے صحرا میں تین مرتبہ دیکھی ہے، وہ سکینہ ہی تھی۔ لیکن اس بار سانول کا
عمل بہت چونکا دینے والا تھا۔ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنی اُنگلی کی مہر لگا دی اور گھبرا کر اِدھر اُ

دیکھنے لگا۔ پھر کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کر کے سرگوشیانہ انداز میں بولا ''میری ایک بات مانو گے اس بات کو یہیں ختم کر دو۔ یہ کھوج تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' مجھے اس کے رویے پر شدید حیرت ہوئی۔ ''کیوں.....؟ ایسا کیا ہے اس کھوج کے انجام میں۔ دیکھو اگر تمہیں اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی پتا ہے تو مجھے ضرور بتاؤ۔ کیوں کہ اب تو دھیرے دھیرے مجھے بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ میری کال گڑھ آمد کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔'' سانول نے بات ٹالنے کی بہتیری کوشش کی، لیکن میرے مصمم ارادے کے آگے اُسے ہار ماننا پڑی۔ ''میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں جانتا لیکن شاید دوسروں سے کچھ بڑھ کر معلومات رکھتا ہوں۔ سکینہ اپنے شوہر کے ساتھ کال گڑھ کے اسٹیشن پر کیوں اُتری، اس کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن وہ ایک رات بستی کے کس مکان میں ٹھہری تھی، مجھے اس جگہ کا پتا ہے۔ میں اور میرا دوست پیرل وہاں گئے بھی تھے۔'' سانول بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے ٹوکا ''تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے اور اب تمہارا دوست کہاں ہے؟'' سانول نے گہری سانس لی ''پیرل کو اُس کے باپ نے اگلے ہفتے ہی شہر بھجوا دیا تھا، کیوں کہ اُسے ڈر تھا کہ یہاں اُس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' اب میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ''خدا کے لیے یہ پہیلیاں بجھوانا بند کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔'' سانول نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''کبھی کبھی مجھے تم وہ نہیں لگتے جو تم ہو..... لیکن پتا نہیں پھر بھی جانے کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل کرتا ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں پوری بات بتاتا ہوں۔''

سانول نے ایک بار پھر اچھی طرح اطمینان کیا کہ ٹیلے کے آس پاس صحرا میں کوئی دوسرا ہماری گفتگو سننے کے لیے موجود نہ ہو۔ پھر اُس نے دھیمے انداز میں بھید کھولنا شروع کیا۔ میں دم بخود سا بیٹھا سنتا رہا۔ سانول کے مطابق وہ اور پیرل اُس رات گھر والوں سے چھپ کر قریبی قصبے میں نوٹنکی دیکھنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر انہیں دیر ہو گئی اور آدھی رات کے وقت جب وہ بستی کی طرف لوٹ رہے تھے تو بستی کی مشرقی سمت جہاں صحرا میں کچے گھر دُور دُور فاصلے پر بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر گھر کے آگے کچا آنگن اور پھر آدھی کچی چار دیواری کی آڑ بنائی گئی ہے، وہاں ایک گھر کے قریب انہیں چند سائے لپکتے نظر آئے۔ سانول اور اُس کا دوست ڈر کر وہیں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر چند لمحوں بعد یہ ہلچل ختم ہوئی تو وہ جلدی جلدی اپنے گھروں کو لوٹے۔ دو دن بعد یہی بوڑھا بڑھیا کال گڑھ پہنچے اور انہوں نے اپنی سکینہ کی تلاش کی دہائی میں ہر دروازے پر دستک دینا شروع کر دی۔ اِسی تلاش میں وہ سانول کے دوست پیرل کے در تک بھی گئے۔ پیرل کا باپ ایک کھوجی ہے، لہٰذا انہوں نے اپنی نواسی کے کھوج کی التجا بھی کی۔ میں نے کھوجی لفظ پر سانول کو ٹوکا۔ ''یہ کھوجی کیا ہوتا ہے.....؟'' سانول نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''کیا تمہیں کھوجی کا نہیں پتا۔ یہ تو بڑے گنی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے باپ دادا سے یہ فن اُن کے اندر نسل در نسل چلتا ہے۔'' سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی وہ ہوتا ہے جو زمین پر پڑے نشانات کے ذریعے گاؤں میں ہوئی کسی بھی واردات کا سراغ لگانے میں مدد کرتا

ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی حسیات تو اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ صرف عورت یا مرد کے جسم یا کپڑوں کی بُو پر
کھوج کر سراغ نکال سکتے ہیں۔ کھوجی اگر اعلیٰ نسل کا ہو تو وہ زمین پر پڑے نشان دیکھ کر یہ بھی بتا سکتا ہے کہ یہ
پاؤں کا نشان کسی عورت کا ہے یا مرد کا، بچے کا ہے یا کسی بوڑھے کا۔ عورت کا ہے تو کیا وہ جوان تھی یا بوڑھی۔ حتیٰ
کہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کا سراغ بھی، وہ مٹی پر پڑے انہی بے جان نشانوں سے ڈھونڈ نکالتے
تھے۔ اس ساری جمع تفریق اور نشان پہچاننے کا ایک گہرا تعلق عورت یا مرد کے وزن سے بھی ہوتا تھا اور کھوجیوں
کی تربیت میں کچھ ایسے خاص کلیے شامل ہوتے تھے، جو انہیں مرد و عورت کی چال ڈھال اور رہن سہن تک کے
بارے میں سراغ دے جاتے تھے۔ بہر حال یہ ایک خداداد صلاحیت تھی، جو آج بھی چند مخصوص لوگوں کو حاصل
ہے۔ میں سانول کی بتائی ہوئی کھوجیوں کی تفصیلات میں کچھ ایسا کھویا کہ چند لمحے کے لیے سکینہ کو بھی بھلا بیٹھا۔
پھر سانول نے اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا کہ سکینہ کے نانا نانی پیرل کے کھوجی باپ کے سامنے بھی اپنی
فریاد لیے آن پہنچے۔ اُن کی گریہ وزاری سے کھوجی کا دل پسیج گیا اور اُس نے حامی بھر لی۔ اگلے دن طے یہ پایا
کہ کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے سکینہ اور اُس کے شوہر کے پیر کے نشان اُٹھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے
گا، کیوں کہ پہلا سراغ وہیں سے مل سکتا تھا۔ لیکن کھوج اور نشان اُٹھانے کے لیے ایک بہت اہم نکتہ زمین کی
ساخت بھی تھا۔ کال گڑھ کا ریلوے اسٹیشن چوں کہ صحرا کے بیچوں بیچ تھا اور شدید تیز ہوا اور رات بھر چلتی آندھی
تو پل بھر پہلے کے بنے نشان بھی زمین پر جمنے نہیں دیتی تھی اُوپر سے وہ ہر لمحہ سرکتی ریت۔ نتیجتاً کھوجی کو ریلوے
اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے مایوس لوٹنا پڑا۔ سانول نے مجھے بتایا کہ وہ، اُس کا دوست پیرل اور سکینہ کے نانا نانی
بھی کھوجی کے ہمراہ ہی تھے، جب وہ ریلوے اسٹیشن سے تھکے ہارے بستی میں داخل ہو رہے تھے۔ سکینہ کی نانی
بار بار سکینہ کی چادر کو چومتی، اپنی آنکھوں سے لگاتی اور روتی ہوئی اُن کے پیچھے چلی آ رہی تھی کہ اچانک کھوجی
کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ وہ پہلے بھی سکینہ کی چادر کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا لیکن اس بار
اُس نے خصوصی طور پر بڑھیا سے چادر جھپٹ کر اُسے خوب اچھی طرح سونگھا اور ایک کچے مکان کے سامنے
کر رُک گیا۔ سانول اور پیرل کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ یہ تو وہی مکان تھا، جہاں تین دن
پہلے رات کو انہوں نے کچھ لپکتے سائے اور کچھ گھٹی گھٹی سی آوازیں سنی تھیں۔ مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن
آدھی کچی چار دیواری کے پار آنگن کی ویرانی اور سناٹا دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ صحن
سے پرے لکڑی کی بلیوں والے چھت کے برآمدے میں کھلنے والے اندر کے کمروں کے دروازے بھی
ادھ کھلے پڑے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور مغرب کے بعد کا جھٹپٹا چھا رہا تھا۔ آخر سانول ہی نے سب سے
پہلے ہمت کی اور دروازہ کھول کر اندر صحن میں داخل ہو گیا۔ لیکن کھوجی کی تیز آواز نے اُسے اپنی جگہ کھڑے
رہنے پر مجبور کر دیا۔ کھوجی چلایا "اپنی جگہ پر کھڑے رہنا سانول۔ صحن کی طرف نہ جانا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی
نشان باقی ہو۔" سانول کے پیچھے کھوجی اور پیرل بھی دبے پاؤں اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھے جوڑے کو انہوں

نے باہر ہی روک دیا۔ سانول اور پیرل دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ کھوجی نے اپنے کرتے کی جیب سے لکڑی کی دو عجیب سی لمبی اور پتلی ڈنڈیاں نکالیں اور اُن سے صحن کی کچی زمین کو پھونکیں مار مار کر صاف کرنے لگا۔ صحن میں اُترنے سے پہلے اُس نے ایک کام اور بھی کیا کہ اپنے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پیروں میں مخصوص ساخت کے بنا نشان والے اُونی موزے پہن لیے۔ شاید اس کا مقصد صحن کی ریتلی زمین پر اپنے پاؤں کے نشانات سے بچنا ہوگا۔ میں حیرت زدہ سا سانول سے فنگر پرنٹس اُٹھانے کا یہ انوکھا واقعہ سن رہا تھا۔ سانول نے بتایا کہ کھوجی نے بڑی احتیاط سے تمام صحن اور پھر دونوں کچے کمروں کی زمین پر پڑی ریت کو صاف کیا اور اس تمام عرصے میں سکینہ کی چادر کی خوشبو سے بھی مدد لیتا رہا۔ پھر ایک خاص جگہ پہنچ کر کھوجی نے اپنی کلائی پر بندھی ایک خاص سفید ڈوری کھولی اور اس کی مدد سے زمین پر پڑی مٹی کو مخصوص طریقے سے یوں کھرچا کہ ڈوری کے دونوں سرے کھوجی نے اپنے ہاتھوں کے دو انگوٹھوں سے باندھ رکھے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اس طرح کھول رکھا تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ زمین پر پھیرتا تو دھاگے کی ڈوری زمین پر رگڑ کھاتی، چند مخصوص نشان مٹی میں اُبھار دیتی۔ کھوجی نے اپنا کام ختم کر کے ایک لمبی سی سانس لی اور صحن سے باہر نکل کر بوڑھے سے پوچھا ''کیا تمہاری نواسی بائیس سے چوبیس سال کی درمیانی عمر کی تھی اور کیا اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چوٹ یا زخم تھا۔'' بوڑھے سے پہلے بڑھیا چلا اُٹھی ''ہاں ہاں! مہندی کی رات پلنگ سے اُترتے وقت اُس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی، اس لیے وہ کچھ تکلیف میں تھی۔ لیکن تمہیں کیسا پتا؟'' کھوجی نے ایک نظر آس پاس ڈالی اور پھر آہستہ سے بولا ''اس صحن میں اور کمروں کے اندر پڑے چند نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ایک بائیس تئیس سالہ نوجوان لڑکی جو اپنے داہنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی، موجود تھی۔ لیکن اس لڑکی کے علاوہ بھی یہاں کم از کم چار مردوں کے چلنے پھرنے کے نشانات موجود ہیں۔ ہوسکتا ان میں سے ایک اس کا شوہر بھی ہو۔ بہر حال ابھی تمہاری نواسی کی خوشبو اس گھر میں موجود ہے۔ اب رات سر پر ہے۔ لہٰذا ہم اب کل صبح گھر کے باہر سے نشان اُٹھانا شروع کریں گے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ یہاں سے سکینہ کس طرف گئی ہے۔'' سانول نے مجھے بتایا کہ کھوجی کے منہ سے اتنا ہی سن کر وہ بوڑھا بوڑھی اس قدر خوش ہوئے کہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ساری رات اِسی ویران مکان کی چوکھٹ ہی پر گزار دیتے۔ بڑی مشکل سے سانول نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ ابھی صبح ہونے میں صرف چند ہی گھنٹے بچے ہیں، لہٰذا کچھ دیر مزید انتظار میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ رات میں ویسے بھی کھوجی نشان نہیں اُٹھا پائے گا۔

اُن کے جانے کے بعد راستے میں کھوجی نے دبے لفظوں میں اپنے بیٹے پیرل اور سانول کو اس بات کا اشارہ دیا کہ اُسے شک ہے کہ لڑکی کو اُس کی مرضی کے بغیر اس گھر سے کہیں اور لے جایا گیا ہے کیوں کہ کھوجی نے صحن میں واضح طور پر گھسیٹے جانے کے چند نشان دیکھے تھے۔ سانول نے کھوجی کو کریدا کہ اُسے اس بات کا یقین کیسے ہوا کہ جس ذی رُوح کو گھسیٹا گیا تھا وہ سکینہ ہی تھی۔ کھوجی نے بتایا کہ چونکہ گھسٹتے وقت بھی لڑکی اپنے

داہنے پاؤں کا پورا وزن زمین پر نہیں ڈال پا رہی تھی اور پھر ایک مقام پر آ کر جب وہ صحن میں گر پڑی تھی تو اُس کے وزن اور مردوں کے پیروں کے نشانات اور کش مکش کے آثار اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں کہ اس صحن میں کوئی اَن ہونی ضرور ہوئی ہے۔ کھوجی کو وہاں زمین پر لڑکی کی ایک بالوں والی پن اور ایک ٹوٹا ہوا ناخن بھی ملا تھا۔ جو اس نے نانا نانی کو دکھائے بغیر ہی اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ بہر حال راز جیسا بھی تھا، اُسے اگلی صبح کھل ہی جانا تھا۔

سانول اتنی کہانی سنا کر چپ ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ''پھر اس کے بعد..... آگے کیا ہوا..... وہ بھی تو بتاؤ نا.....'' لیکن سانول خاموش ہی رہا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔ ''اس کے بعد کی کہانی بے حد مختصر ہے۔ میں اگلی صبح پیرل کے گھر پہنچا تو وہ دونوں بوڑھا بوڑھی پہلے ہی سے کھوجی کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، لیکن دروازے پر پڑا موٹا سا تالا ہم تینوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ تین دن تک سکینہ کے بدنصیب نانا نانی کھوجی کے بند در ہی پر پڑے رہے اور جب چوتھے دن وہ لوٹا تو پیرل اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے گول مول سا جواب دے کر ہمارے منہ بند کروا دیئے کہ بڑے شہر میں اُس کی خالہ نے کسی بنگلے میں چوکیدار کی نوکری ڈھونڈ نکالی تھی، لہٰذا اُسے جلدی میں پیرل کو لے کر جانا پڑا۔ سکینہ کی تلاش کے سلسلے میں بھی وہ بالکل ہی سرد رویے کا اظہار کرتا رہا کہ اب اتنے دن بعد کہاں کوئی نشان بچا ہوگا۔ البتہ بڑھیا کی حد سے زیادہ آہ وزاری سے تنگ آ کر وہ دو گھڑی کے لیے ہمارے ساتھ اُس ویران مکان تک چلا گیا، لیکن کچھ دیر باہر میدان کی خاک چھاننے کے بعد حتمی اعلان کر دیا کہ روزانہ کی چلتی آندھی اور تیز ہوا سے آس پاس کا ہر نشان مٹ چکا ہے لہٰذا اب یہاں سکینہ کی تلاش لاحاصل ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس کے چاہنے والے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کریں۔'' سانول نے بات ختم کر کے کچھ اس طرح میری جانب دیکھا، جیسے اُسے خود بھی اس نامکمل داستان کے انجام سے شدید کوفت ہوئی ہو۔

''لیکن کھوجی نے ایسا کیوں کیا۔ تم نے اُس سے کچھ تو پوچھا ہوتا۔'' سانول نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''کھوجی نے اُس دن کے بعد سے اپنے لب کچھ اس طرح سے سی لیے ہیں کہ اب وہ شاذ و نادر ہی کسی سے کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولتا ہے۔ نہ جانے پیرل کو بھی اس نے کہاں بھیج دیا ہے۔ میں تو گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے جگری یار کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گیا ہوں۔'' ہم نے ساری رات باتوں میں گزار دی تھی۔ بستی کی جانب سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال کسی کوندے کی طرح لپکا۔ ''کیا ہم اس وقت اُس کھوجی کے گھر جا سکتے ہیں؟'' سانول میری بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ ''اس وقت..... کھوجی کے گھر، کیوں خیر تو ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ اپنا وقت ضائع مت کرو، عبداللہ۔'' ''میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے۔ چلو دیر نہ کرو، مجھے روشنی ہونے سے پہلے واپس مزار بھی پہنچنا ہے، ورنہ سلطان بابا پریشان ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد ہی ہم بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک پرانے سے بوسیدہ مکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ سانول کی تیسری دستک پر اندر سے کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی چپل گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ہاتھ میں لالٹین تھامے سر باہر نکال کر کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا "اس وقت کون ہے بھئی....." دفعتاً اُس کی نظر پہلے سانول اور پھر مجھ پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بولا "تم.....؟؟"

رُوح کا عکس

مجھے اس بوڑھے کھوجی کی ہڑبڑاہٹ پر مزید حیرت ہوئی۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں.....؟''
''ہاں.....اُس دن تمھیں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ بستی کے بازار میں دیکھا تھا تم مزار کے نئے مجاور ہو نا.....لیکن اس طرح منہ اندھیرے میرے دروازے پر.....سب ٹھیک تو ہے نا؟'' اب سانول نے بات سنبھالی۔ ''ہاں چاچا! سب ٹھیک ہے۔ اس کا نام عبداللہ ہے۔ میری اس سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔ یہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔ سو میں اسے یہاں لے آیا۔'' کھوجی کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سانول کی یہ ''خدائی خدمت گاری'' ایک آنکھ نہیں بھائی۔ لیکن وہ چپ رہا اور بادل نخواستہ اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور سانول صحن میں پڑی جھلنگا سی چارپائی کی پائنتی پر ٹک گیا۔ باہر گلی میں اکا دُکا نمازیوں کے کھنکھارنے اور چلنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر براہ راست سوال داغ دیا۔ ''آپ سکینہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' میرا سوال سن کر کھوجی بوڑھے کے ہاتھ سے لالٹین گرتے گرتے بچی اور وہ سانول کی طرف دانت پیس کر بولا۔ ''اچھا.....تو یہ تمھاری شرارت ہے، بدمعاش لڑکے۔ اِسی لیے میں نے پیرل کو بھی تمہارے سائے سے دُور بھجوا دیا تھا، لیکن تم اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ نکل جاؤ تم دونوں یہاں سے.....میں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس لڑکی کے بارے میں مزید کچھ نہیں پتا۔'' میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ''سانول نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا جس سے آپ کسی مصیبت میں پڑ جائیں۔ میں نے خود سکینہ کو صحرا میں دیکھا ہے۔''

یہ دوسرا دھماکا تھا جو عین کھوجی کے سر پر کسی بم کی طرح پھٹا۔ ''کیا.....؟ تم نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے۔ مگر کیسے۔ میرا مطلب ہے کہ پھر تم مجھ سے اس کا پتا کیوں پوچھ رہے ہو۔ جا کر اُسی سے پوچھ لو نا۔'' میں کھوجی کے سامنے جا کھڑا ہوا وہ مجھے صرف چند لمحوں کے لیے ایک جھلک کی طرح نظر آئی اور پھر غائب ہوگئی لیکن آپ اس کے بارے میں ضرور کچھ ایسا جانتے ہیں جس سے مجھے اُس کی کھوج میں کچھ مدد مل سکے۔ لیکن شاید آپ کچھ بتانا نہیں چاہتے۔'' کھوجی غصے سے بپھر گیا۔ ''کتنی دفعہ کہوں کہ مجھے اُس کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔ اب تم دونوں یہاں سے چلتے بنو۔ اپنی جوانی پر نہیں تو میرے بڑھاپے پر کچھ رحم کھاؤ۔'' کھوجی کے حتمی انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس مدعا پر مزید کوئی بات نہیں کرے گا۔ وہ صحن کا دروازہ کھولے کھڑا ہماری روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ سانول نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو کھوجی

دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ ''ٹھیک ہے..... آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ آپ کے پاس یہ فن اور یہ خداداد صلاحیت قدرت کی ایک امانت ہے اور آپ نے امانت میں خیانت کی ہے۔ اُوپر والے نے آپ کا اندر اس لیے روشن کیا کہ آپ دوسروں کو اندھیرے میں راستہ دکھائیں اور اُن کی مدد کریں لیکن آج آپ نے اپنے فرض اور کام سے انصاف نہیں کیا۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ بے ایمانی آپ کی آنے والی نسلوں کے اندر سے یہ وجدان و صلاحیت ختم نہ کر دے۔'' میں بات ختم کر کے واپسی کے لیے پلٹا تو کھوجی ہیجانی انداز میں چلایا۔ ''نہیں میں نے اپنے فن کے ساتھ کبھی بے ایمانی نہیں کی..... لیکن بعض دفعہ مصلحت بھی آ جاتی ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں اور میری ساری پونجی میرا جوان بیٹا پیرل ہے۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں۔ پر اُسے اگر کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گا.....'' سانول نے حیرت سے پہلے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہ آخری کوشش اِسی اُمید پر کی تھی کہ شاید کھوجی کے دل و دماغ پر جمی کچھ برف پگھلے۔ ہر فرض شناس کاریگر کی طرح وہ اپنے فن اور ہنر پر آیا الزام برداشت نہیں کر سکا اور تلملا کر بول اُٹھا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ ''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے کہیں زیادہ کمزور اور اس علاقے میں صرف ایک اجنبی ہوں لیکن پھر بھی اس لڑکی کی کھوج میں آپ تک چلا آیا۔ کیا آپ کو ان بدنصیب اور لاچار بوڑھوں پر ترس نہیں آتا جو اپنی زندگی کے آخری دن یوں اس تپتے صحرا کی جلتی ریت چھانتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ ان دنوں میں تو انہیں اپنے گھر کے آنگن میں آرام اور سکون کی زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ جیسے میں اور آپ گزار رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ دونوں اِسی صحرا میں سسک سسک کر اپنی جان دے دیں۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میرے باپ دادا نے بھی انگریزی پولیس میں کھوجی کی ڈیوٹی دی ہے۔ انگریز سرکار نے میرے باپ کو اس کی خدمت کے صلے میں بڑی عزت، بڑا مان دیا۔ خود میں نے بائیس سال کھوجی کی نوکری کی ہے لیکن کبھی خود کو اتنا بے بس نہیں پایا۔ میں اپنے پیشے کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن.....'' کھوجی کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ پھر لمبی سی سانس لے کر بولا، ''اچھا غور سے سنو..... میں اگلی صبح اُس مکان کے باہر نشان اُٹھانے پہنچ گیا تھا۔ نشان اُٹھانے کا بہترین وقت صبح شبنم اور کہرے کے خشک ہونے سے پہلے ہی کا ہوتا ہے تب تک وہ بوڑھی اور بوڑھا نہیں پہنچے تھے۔ لڑکی کو گھر سے نکالنے کے بعد قریباً 30 فٹ تک گھسیٹا گیا تھا اور پھر اُسے کسی اُونٹ پر لاد دیا گیا تھا۔ بس اس جگہ سے آگے لڑکی کے جسم کے نشان ختم ہو گئے تھے۔ اب تو تم بھی سمجھ ہی گئے ہو گے کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ میں یہ بات اگر لڑکی کے نانا نانی کو بتا بھی دیتا تو وہ بے چارے اس پردیس میں کیا کر لیتے۔ اِسی لیے میں چپ رہا اور بس.....'' میں نے غور سے کھوجی کی جانب دیکھا۔ ''لیکن اُس اُونٹ کے پیروں کے نشان بھی تو کسی جانب گئے ہوں۔ آپ نے اس کا کھوج نہیں لگایا؟'' کھوجی نے خود کو جیسے ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ بالکل ہی ہار کر بولا۔ ''وہ ایک نہیں تین اُونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے اور

تمام نشانات دوبارہ صحرا کی طرف ہی پلٹ گئے تھے۔'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ''تو پھر آپ نے یہ بات سکینہ کے گھر والوں کو کیوں نہیں بتائی۔'' کھوجی نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''کیسے بتاتا، اغوا کنندگان کو پچھلی شام ہی ہماری ساری سرگرمی کی اطلاع مل چکی تھی اور صبح جب میں اُس مکان کے سامنے سکینہ کے نشان اُٹھا رہا تھا، تب ہی وہ اندھیرے دو تین نقاب پوش میری بے خبری میں، میرے سر پر آ پہنچے۔ اُن کے ہاتھ میں لڑکی کے شوہر کے خون آلود کپڑے تھے جو انہوں نے میرے سامنے پھینک کر دھمکی دی کہ اگر میں نے اس معاملے میں زیادہ پھرپھری دکھانے کی کوشش کی تو اسی رات اپنے اکلوتے بیٹے کا سر بھی اپنی چوکھٹ پر لٹکا ہوا دیکھوں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کرتا؟ میں اُسی لمحے گھر پلٹا اور سب سے پہلے پیرل کو شہر چھوڑ آیا۔ بس اتنی سی کہانی ہے کہ میرے اندر کھوجی ایک مجبور باپ کے سامنے آ گیا۔''

کھوجی اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا، جیسے برسوں کا بھرا غبار اندر سے نکل گیا ہو۔ میں سانول کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے مزار لوٹا تو سلطان بابا فجر کی نماز ختم کر کے سلام پھیر رہے تھے۔ انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''کیوں میاں! کہاں تک پہنچی تمہاری کھوج۔ کچھ کامیابی ہوئی یا پھر مزید اُلجھنیں سمیٹ لائے ہو۔'' ہمیشہ کی طرح سلطان بابا مجھ سے پہلے میری تہ تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے رات گئے تک کی تمام روداد انہیں سنا دی۔ کھوجی کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے سکینہ کا معاملہ کسی قبائلی رشتہ داری کی خلش کا شاخسانہ بھی ہو سکتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں لڑکی کا رشتہ نہ ملنے پر یا ٹھکرائے جانے پر ایسی ان ہونیاں عام تھیں۔ لیکن اُسی دن جب میں نے اکرام صاحب کے ذریعے بہانے سے سکینہ کے نانی نانا کا کریدا تو یہ بھی محض میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ اُن کے بقول سکینہ بہت پہلے ہی اپنے شوہر رحیم بخش سے منسوب تھی اور بنا کسی اُلجھن کے اُن کا رشتہ ہنسی خوشی طے پایا تھا۔ دھاگے مزید اُلجھتے جا رہے تھے اور ہر جانب سے میرا راستہ ایک بند گلی میں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ سارا دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔ شام کو عصر کے بعد میں انہی سوچوں میں گم مزار کے صحن میں بیٹھا، سورج کے جلتے گولے کو دھیرے دھیرے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ سانول ہڑبڑایا ہوا سا مزار کے احاطے میں داخل ہوا۔ میں بھی اُسے دیکھ کر چونک گیا۔ ''خیریت تو ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے.....؟'' سانول نے سر پٹخا۔ ''یہ لوگ مجھے سکون سے کہاں رہنے دیتے ہیں۔ نوری کے باپ نے آج میرے ابا کو اپنے گھر بلایا تھا۔ انہوں نے رشتہ کے لیے شرط لگا دی کہ اگر لڑکا کال گڑھ میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اُسے شہر جا کر محنت مزدوری کرنی ہو گی تاکہ سال بھر میں اپنی بیٹی رُخصت کر دیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں یہ صحرا چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتا ہوں۔ میرا بانسری کا ہر ساز تو اسی ریت سے زندہ ہے اور میری ہر دُھن اسی 'ایک' کے لیے۔ میں تو مر جاؤں گا اُس سے دُور جا کر..... مجھے تو یہاں کی ہوا میں بھی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ کسی دوسری فضا میں تو میری سانس ہی گھٹ جائے گی۔'' میں چپ چاپ سانول کو اپنے زخم اُدھیڑتے دیکھتا رہا۔ ال کیمسٹ میں پاؤلو نے غلط لکھا ہے

''جب تم کسی کو چاہتے ہو تو کائنات کی ہر چیز تمہیں ملانے میں جٹ جاتی ہے۔'' اگر آج وہ میرے سامنے موجود ہوتا تو میں اُسے بتاتا کہ جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں تو پوری کائنات ہمیں جُدا کرنے کی سازش میں جٹ جاتی ہے۔ ہمارے خلاف منصوبے بنانے لگتی ہے، ہمیں برباد کر دیتی ہے۔ سانول اور نوری کے خلاف بھی سازشیں شروع ہو چکی تھیں۔ محبت بھلا ہمیں کب چین کے دو سانس لینے دیتی ہے۔ جلد ہی ہماری سانسیں گھونٹنے کے لیے آس پاس کی فضا میں جُدائی کا زہریلا دُھواں بھر دیتی ہے۔ ہماری آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ اس عشق کو شاید خشک آنکھیں پسند ہی نہیں۔ وہ انہیں ہر لمحہ بہتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ آج سانول کی آنکھیں بھی عشق کی اس سدا سے پیاسی زمین کو سیراب کر رہی تھیں۔ میں نے اُس سے آگے کے منصوبے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ صحرا میں کسی کا ریوڑ چرا کر گزارا کر لوں گا۔ کاش کال گڑھ میں قلعہ داروں کی غلامی کے علاوہ بھی کوئی دوسرا روزگار ہوتا تو آج میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔'' مغرب سے کچھ پہلے سانول واپس لوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے سے کچھ دیر قبل ''کالا'' بھی مزار کے باہر آ کر مخصوص غراہٹ سے مجھے بلانے لگا۔ اُس کا زخم دھیرے دھیرے بھرنے لگا تھا۔ چال میں بھی کچھ توازن آ گیا تھا۔ وہ انتہائی حد تک سدھایا ہوا کتا تھا۔ اُس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا کہ میں اُس سے اپنے کپڑے مس کرنے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ تب ہی شروع دن سے وہ اپنی شکر گزاری کا اظہار بھی کچھ فاصلے سے کرتا تھا۔ کالے کے جانے کے بعد میں پھر اس ویران مزار کی منڈیر کے قریب آ بیٹھا۔ جانے وہ کس کا مزار تھا۔ اندر کمروں میں بنی ایک گمنام قبر کے اُوپر کسی نے پھولوں کی جو آخری چادر چڑھائی تھی، اب اس کے پھول بھی خشک ہو کر ہوا کے ساتھ اِدھر اُدھر بکھرے جاتے تھے۔ سلطان بابا اندر سے نکلے اور مجھے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر میری طرف آ گئے۔ ''کیا سوچ رہے ہو میاں! کبھی اپنے اندر کی اس وحشت کو لگام بھی دے دیا کرو۔ جنوں حد سے بڑھ جائے تو دیوانگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔'' میں نے اُن کی جانب براہ راست دیکھنے سے گریز کیا۔ ''آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتے۔ نصف جنوں سے مکمل دیوانگی کہیں بہتر ہے۔ میں خود اپنے اندر کی اس پل پل بڑھتی بے چینی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' سلطان بابا مسکرا دیئے۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ کسی کو خرد راس آئے تو کسی کو جنوں۔ اب دیکھو عبداللہ کے مقدر میں دیوانگی ہے یا فرزانگی؟ انہوں نے میری نظروں کے تعاقب میں مزار کے گنبد پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بعد بولے۔ ''بہادر شاہ ظفر کو پڑھا ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''کون؟ وہ آخری مغل شہنشاہ..... نہیں۔ بس اُس کی شاعری کے بارے میں یونیورسٹی میں تھوڑا بہت سن رکھا تھا۔'' سلطان بابا نے مزار کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید اُس کا یہ قطعہ بھی ایسے ہی کسی مزار کے لیے ہو گا۔ سنو اور اسے اپنی زندگی سے جوڑ کر دیکھو۔ یہ ہم سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکا
وہ ایک مشت غبار ہوں
پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

جانے اس قطعے میں کیا بات تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بہت دیر کے لیے ڈوب سا گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہادر شاہ ظفر نے خاص میرے لیے یہ سطریں کہی ہوں گی۔ خود میری حالت بھی تو دن بدن کسی ایسے مزار جیسے ہی ہوتی جا رہی تھی۔ رات ڈھلتے ہی صحرا کی طرف سے سانول کی بانسری کی آواز فضا کے دوش پر بکھرنے لگی۔ لیکن آج اُس کی تان میں کچھ عجیب ہی کسک اور کرب تھا۔ یہ محبت کس قدر قابض اور زور آور ہوتی ہے کہ ہمارے ساز اور ہماری تانیں بھی اُسی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ آج میں سانول کو اس کی اپنی آگ میں جلنے کے لیے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ یہ گرم حبس زدہ رات مجھ پر کسی نئے روپ میں کھلنے والی ہے۔ شاید میرے اندر کہیں یہ خواہش شدید طور پر انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ میں کسی بھی طرح ایک بار پھر سکینہ کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ اس بار میں نے پہلے ہی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ میں اُسے نظروں سے اُوجھل نہیں ہونے دوں گا۔ میں اندھیرے میں باہر صحرا پر یوں نظریں گاڑے بیٹھا تھا جیسے ابھی یہ سیاہ پردہ پھاڑ کر کوئی معجزہ رُونما ہونے والا ہو۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ کئی بار میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہوئیں اور ایک آدھ بار مجھے جھونک بھی آئی، لیکن رات کا کالا پردہ میری مقدر کی طرح بند ہی رہا۔ صبح سے کچھ پہلے میں تھک کر اندر کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی ایک عجیب سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید اُونٹوں کا کوئی قافلہ صحرا سے گزر رہا تھا۔ ہاں..... یہ قافلے کی بجتی جرس کی آواز ہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت سے اُونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ آواز قریب آنے لگی۔ میں دم بخود سا کھڑا انتظار کرتا رہا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ صحرا میں قافلے صبح منہ اندھیرے سے بھی پہلے روانہ ہوتے تھے، کیوں کہ مسافر شب کو اُٹھتے ہیں..... جو جانا دُور ہوتا ہے..... "لیکن یہ کیا..... قافلے کی آواز اب بالکل قریب آ چکی تھی اور مجھے اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر مزار سے باہر کھلے صحرا میں ایک اُونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دُور دُور تک وہی ازلی ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن

یں اپنی سماعتوں کا کیا کرتا.....؟ میرے کانوں میں اب تک قافلے کا شور گونج رہا تھا اور ان آوازوں کی ہر
اریک تفصیل مجھے کسی ریڈیو پر پیش کیے جانے والے کھیل کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ دُور کوئی بچہ رو رہا تھا۔
ونٹوں کے کوہانوں پر رکھا سامان حرکت کی وجہ سے کھڑک رہا تھا۔ کوئی دُور سے ہانکا لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ
رگوشیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُونٹ خرخرا رہے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے ریت پر پڑنے والے
اؤں کی دھمک بھی مجھے علیحدہ سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پازیبوں کی جھنکار، کچھ شریر بچوں کے ہنسنے اور دوڑنے کی
آوازیں اور قافلے کے پہرے داروں کی وقفے وقفے سے سب کو ہوشیار کرنے کے لیے نقارے پر چوٹ کی
آواز تیز ہوگئی۔ ریت کا ایک طوفان سا اُٹھا اور میں اُسی ٹیلے پر کھڑا ریت کا حصہ بنتا گیا۔ میری آنکھیں ریت
لی چبھن سے جلنے لگیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ قافلہ اس وقت میرے آس پاس، بلکہ میرے اندر
ے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرگوشیاں تیز ہوگئیں۔ جیسے لوگ مجھ سے بچ کر دائیں بائیں سے گزر رہے ہوں لیکن
ہری جلتی ہوئی آنکھوں کے پردے پر اب بھی صرف میلوں دُور پھیلتا ہوا ویران صحرا ہی اپنا عکس بکھیر رہا تھا۔
ور دُور تک کسی ذی رُوح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یا خدا..... یہ کیا ماجرا تھا؟ یا تو میری سماعتیں ناکارہ ہو کر
ود آوازیں تخلیق کرنے لگی تھیں یا پھر میری بصارت نے ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ کیا میری دیوانگی
ا آخری دور شروع ہو چکا تھا۔ قافلہ جانے کب کا گزر چکا تھا۔ ریت کا طوفان تھم گیا تھا۔ لیکن میرے اندر اُٹھا
وفان کسی ریت کے جلتے بگولے کی طرح تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں کون تھا، یہاں کیا کر رہا تھا.....؟
رے ساتھ ہی یہ ساری ان ہونیاں کیوں ہوتی تھیں۔ کیا واقعی میرا خرد سے جنوں کا سفر مکمل ہونے کو تھا۔
خر کیا حد تھی میرے اس سفر کی۔ میری وحشت کا اختتام کہاں تھا۔ میں دوسرے عام لوگوں کی طرح اپنی محبت کو
نے کے بعد اس کے ساتھ اپنی باقی زندگی آرام اور سکون سے کسی گھر کے آنگن میں کیوں نہیں گزار سکتا تھا۔
ہرا کی رُوح نے تو کب سے اپنی سپردگی کا اختیار مجھے دے دیا تھا، پھر بھی میں ان ویرانیوں کی خاک کیوں
ان رہا تھا۔ میں جانے کتنی دیر اس ٹیلے پر کھڑا ریت میں گھلتا رہا اور مجھے اس بات کی خبر بھی نہیں ہوئی کہ
نے کب سے تہجد کے لیے جاگے سلطان بابا مزار کے صحن میں نکلے اور مجھے یوں گم صم کھڑا دیکھتے رہے۔ میں
ب چونکا، جب انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ
ا۔ میں نے وہ سارے سوال، جو کچھ دیر پہلے میرا اندر کاٹ رہے تھے، اُن کے سامنے اُگل دیئے اور قافلے کا
را احوال بھی بیان کر دیا۔ میرے سوال سن کر سلطان بابا بہت دیر تک خاموش رہے۔ لیکن انہیں اس بات کا
ساس ہو گیا تھا کہ اب کچھ جواب ناگزیر ہو چکے ہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولے تو اُن کا لہجہ تھما ہوا سا تھا۔ ''میں
تا ہوں تم کس دور سے گزر رہے ہو۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ کچھ رستے اور منزلیں صرف کچھ خاص لوگوں
ے لیے ہوتی ہیں۔ قدرت نے تمہارے لیے عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی راہ چنی ہے، تو ضرور تم میں کچھ خاص ہو
۔ لیکن قصر سلطانی کے گنبد کو چھوڑ کر ہمالے کی چوٹی پر بسیرا کرنے کے لیے اپنی اُڑان بھی اُونچی رکھنی پڑتی

ہے۔ جان جوکھم میں ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ یاد رہے ابھی تمہیں ایسے مزید عذاب جھیلنے ہوں گے۔'' میں در
چلا اُٹھا۔ ''لیکن میں ہی کیوں.....؟'' وہ مسکرائے۔ ''میں نے کہا نا..... کچھ چناؤ قدرت صرف اپنے
میں رکھتی ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چنا۔ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ تو ا
تمہارے اپنے ہاتھ ہے۔ تم چاہو تو ابھی اِسی لمحے یہ سب ترک کر کے واپس پلٹ سکتے ہو۔ تم پر کوئی جبر
تم سے پہلے بھی جانے کتنے پلٹے ہوں گے۔ تم تو پھر بھی اس سفر میں بہت دُور تک چلے آئے ہو۔ کئی ا
ہیں جو قدرت کی طرف سے واضح اشارہ ملنے اور چنے جانے کے باوجود پہلا قدم تک نہیں اُٹھا سکے اور ر
کی بھیڑ میں گم ہو کر رہ گئے۔ یہ تمہاری ہی ہمت تھی کہ تم اس راہ کا ہر کانٹا چنتے ہوئے آج اس مقام تک
ہو۔ اتنا زادِ راہ بھی ایک زندگی کے لیے کافی ہے۔ جانا چاہو تو سلطان تمہیں خوشی سے رُخصت کرے گا۔
نے بے بسی سے سر پٹخا۔ ''آپ جانتے ہیں۔ واپسی میرے بس میں نہیں ہے۔ نہ ہی میری ایسی کوئی خ
ہے۔ لیکن میں خود کو اس بوجھ سے ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اتنا ظرف نہیں ہے مجھ میں، جس کی توقع قا
کیے بیٹھی ہے۔'' انہوں نے میرا کاندھا دبایا۔ ''اپنے ظرف کے پیمانے کا حساب خود نہیں کیا جاتا۔
آزمانے والے پر چھوڑ دو۔'' میں نے تھک کر ہتھیار ڈال دیئے۔ ''لیکن یہ بھرے پرے قافلے کی صدائیں
کیا ماجرا تھا.....؟'' سلطان بابا نے گہرا سانس لیا۔ ''صحرا کا اپنا فسوں اور اپنا ہی جادو ہوتا ہے، البتہ ہوسکتا
کہ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے واقعی کوئی قافلہ گزرا ہو۔ جب سے انسانی بستیاں بے تحاشا بڑھنے لگی
ایسے صحرا اور ویرانے ہی جنات اور دوسری مخلوقات کی آماج گاہ بنتی گئیں۔ ہماری بصارت کا پردہ کسی ما
سے روشنی کی لہر ٹکرانے کا محتاج ہے، لیکن اگر دوسری مخلوق کثیف نہ ہو، بلکہ لطیف ہو یعنی ایسے مادے سے
کہ جس کے اندر سے روشنی بنا ٹکرائے گزر جائے تو ہماری آنکھ کے پردے پر اس شے کی تصویر نہیں بن
گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا واسطہ بھی کسی ایسی مخلوق کے قافلے سے پڑا تھا۔ عام حالات میں ہم انسانو
سماعت بھی ان کی آواز کی لہروں کو پکڑ نہیں سکتی، لیکن تم نے اگر اُن کی دنیا کی آوازیں سنی ہیں تو اس کا م
ہے خاص اس لمحے میں قدرت نے تمہاری سماعت کا پردہ اتنا حساس کر دیا تھا کہ تم نے اُن غیر مرئی صدا
بھی سن لیا۔ دھیان رہے کہ یہ سارا معاملہ فریکوئنسی کا ہے۔ ہماری بصارت اور سماعت کی فریکوئنسی اُن کی د
فریکوئنسی سے جُدا ہے۔ لہٰذا ہم انہیں عام حالات میں دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ ہاں البتہ کچھ خاص لوگ
ارتعاش تک بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے وہ خاص فریکوئنسی پکڑنا بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ میری دع
کہ دو جہانوں کا مالک تمہیں اپنے خاص بندوں میں ہمیشہ کے لیے شامل کر دے۔''

میں حیرت سے سلطان بابا کی بات سنتا رہا اور اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی سی لپکی۔ ''اگر تصویر کا
ہماری بصارت کے پردے پر روشنی کی لہر کے کسی کثیف مادے سے ٹکرانے ہی سے ہے تو پھر اس کا مطلب
کہ سکینہ کا وجود بھی اسی صحرا میں کہیں موجود ہے۔ کیوں کہ میں نے اُس کی واضح تصویر دیکھی ہے۔ دھندلی

ضح انسانی خدوخال کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ سکینہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے.....؟"

"ہاں.....ہو بھی سکتا ہے کہ یہ وہی سکینہ ہو۔ لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو کہ ٹھیک اسی وقت تمہارے اتھ سانول بھی تھا، جسے وہ دکھائی نہیں دی۔ خود میں ریلوے اسٹیشن پر اُس کی جھلک سے چوک گیا تھا۔ اگر ں سارے معاملے سے پھولوں والی وہ خاص چادر نکال دی جاتی تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی عام صحرائی لڑکی کا لا ہو، جو صحرا میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن اطمینان رکھو جلد یا بدیر تم اس ہیولے کی حقیقت تک بھی پہنچ جاؤ گے۔ رہے، ایک بار تم نے خود ہی ایک مفروضے کا ذکر کیا تھا۔ اگر خلا میں ماضی کی لہر زندہ رہ سکتی ہے تو پھر ماضی کی دیر کی جھلک کیوں نہیں؟ ہوسکتا ہے جو تمہیں نظر آ رہا ہو، وہ بھی اس حال کی نہیں بلکہ ماضی کی کسی تصویر کی ل ہو۔ اور قدرت نے ہی تمہاری سماعت کی طرح تمہاری بصارت کے پردے کو بھی چند لمحوں کے لیے یہ ت عطا کی ہو کہ تم نے اس صحرا کے ماضی کی کوئی جھلک اس لڑکی کی تصویر کی صورت دیکھ لی ہو۔ یہاں کچھ بھی ن نہیں کہ اس قدرت کے کارخانے میں "جب جو جو ہونا ہے.....تب تب سو سو ہوتا ہے....." سلطان بابا ابات ختم کر کے اندر پلٹ گئے اور میں اپنی مخصوص جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا۔ میرا سارا وجود ایک ارتعاش سے پ رہا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ سوال تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور جواب تھے کہ مستقل ن بچائے جاتے تھے۔

اچانک صحرا کی جانب سے ایک تیز نسوانی چیخ نے میرے سارے خیالات بکھیر دیئے۔ میں گھبرا کر چیخ دوسری مرتبہ بلند ہوئی۔ سامنے مزار کے صحن میں نماز پڑھتے سلطان بابا بھی سلام پھیر کر چونکے تو مجھے اسا لگا۔ مطلب یہ صرف میرا واہمہ نہیں تھا۔ آواز سلطان بابا نے بھی سنی تھی۔ تیسری چیخ نے مجھے جگہ کا تعین نے کے بارے میں ہر شک سے آزاد کر دیا۔ آواز اُسی جانب سے بلند ہو رہی تھی، جہاں سانول رات بھر ربانسری بجایا کرتا تھا۔ میں بے تحاشا اُس جانب دوڑ پڑا۔ صحرا کی ریت میں میرے پاؤں دھنسے جا رہے ۔ دُور سے میں نے اس اُونچے ٹیلے پر فجر کے جھٹپٹے میں کسی عورت کا ہیولا دیکھا، جو مسلسل نیچے کی طرف ر چیخ رہی تھی، اور اپنی مخصوص زبان میں کسی مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ ٹیلے کو دیکھتے ہی میری سانس رُکنے ۔ یہ وہی ٹیلا تھا جہاں سا ل گزشتہ رات بانسری بجا رہا تھا۔

دشمن زندہ رہے

کچھ لمحے کے لیے تو جیسے میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ جب تک میں دوڑ کر ٹیلے تک پہنچا، اکر
عمر کی چرواھن کے ہاتھوں کے اشارے مجھے سمجھ آ چکے تھے۔ ٹیلے کی پرلی جانب سانول بے سدھ پڑا تھ
اس کے سر سے بہتا ہوا خون نہ جانے کب سے جم کر ریت کو سیراب کر رہا تھا۔ سلطان بابا بھی شاید میرے
ہی صحرا کی جانب لپکے تھے۔ جس وقت میں سانول کی سانسیں ٹٹول رہا تھا، تب تک وہ بھی وہاں پہنچ چکے۔
زندگی اگر صرف سانس لینے کا نام ہے تو سانول ابھی زندہ تھا، لیکن اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ جب
اور سلطان بابا اُسے لے کر بستی پہنچے تو سب سے پہلے بستی کے مضافات میں بکریوں کا دودھ دوہتے، اُس
گوالے کی نظر ہم پر پڑی، جسے میں پہلے بھی ریچھ کے مقابلے کے دوران جبروت کے قلعے میں دیکھ چکا تھ
پھر چند لمحوں ہی میں پورا کال گڑھ سانول کے کچے آنگن میں جمع ہو چکا تھا۔ بستی کے واحد طبیب نے فو
سانول کا زخم دھو کر مرہم پٹی تو کر دی اور کچھ دوائیں بھی اس کے حلق سے نیچے اُنڈیل دیں، لیکن فی ا
سانول بے ہوش ہی تھا۔ بڑی مشکل سے سانول کے باپ، مجید مستری اور طبیب کی درخواست پر لوگو
جمگھٹا چھٹا۔ سانول کو ہم نے آنگن سے اندر کمرے میں پہنچایا ہی تھا کہ اکرام اللہ صاحب اور اُن کے پیچھے
کا باپ ہڑبڑاتے ہوئے سے سانول کے گھر داخل ہوئے۔ وہی چند روایتی سوال ''کیا ہوا؟..... کیسے ہوا
کس نے کیا.....؟'' اور وہی ایک جواب کہ ''اللہ جانے.....؟'' کچھ ہی دیر میں نوری بھی چند دوسری عو
اور اپنی ماں سمیت صحن میں داخل ہوئی اور تیزی سے عورتوں والے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ پریشانی
سانول کے باپ کو سلام کرنا بھی بھول گئی تھی اور پھر برآمدے کے قریب ماں کے کہنی مارنے پر چونکی تو
سے صحن میں بیٹھے مجید کو سلام کر کے اندر پلٹ گئی۔ سچ ہے کہ محبت آداب بھلا دیتی ہے۔ طبیب اپنا کام کر
جا چکا تھا اور اُس کے بقول اب سانول کو دوا کے ساتھ دعا کی بھی اُتنی ہی ضرورت تھی۔ سانول کی دعا تو نور
اور نوری خود سراپا دعا بنی اُسی کے گھر کے آنگن میں ماتھا ٹیکے سجدے میں پڑی تھی۔ پھر بھی قدرت کو رحم
آتے تین راتیں بیت گئیں۔ سانول کی طویل بے ہوشی تیسری فجر سے کچھ پہلے ٹوٹی۔ اس اثناء میں،
سلطان بابا باری باری مزار سے ہو کر آتے رہے۔ اس وقت اتفاق سے میں ہی سانول کے سرہانے موجو
جب اُس نے دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ نوری کی دعا آخر کار فلک میں چھید
ہوئی مقام قبولیت سے جا ٹکرائی تھی۔ سانول کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اُس رات بھی حسب معمول اپنی مخصوص

پر بیٹھا بانسری کی تانوں سے کھیل رہا تھا کہ اچانک ہی اندھیرے سے چار نقاب پوش سائے اُس کی جانب لپکے اور پھر کھینچا تانی کے دوران کوئی کند فولادی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی جس کے بعد سانول اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ ان نقاب پوشوں کی تکرار سے صرف اتنا ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانول کو کال گڑھ میں مزید ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت تو سانول کا ہوش میں آجانا ہی اُس کے پیاروں کے لیے غنیمت تھا۔ سانول کی دگرگوں حالت اس بات کا اشارہ تھی کہ اُسے فی الحال بستر سے اُٹھنے میں چند دن مزید لگیں گے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سانول زیادہ دن تک خود کو پابند نہیں رکھ پائے گا۔ شام کو جب میں مزار واپسی کے لیے اُٹھنے لگا تو اُس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے کچھ دیر مزید رُکنے کا اشارہ کیا۔ عیادت کے لیے آئے ہوئے چند دیہاتی جب کمرے سے باہر نکل گئے تو اُس نے دھیرے سے پوچھا ''وہ آئی تھی.....؟'' مجھے اُس کی حالت سے زیادہ اُس کے سوال پر ہنسی آگئی۔ ''کہیں اُسے بلانے کے لیے خود ہی تو اپنا سر نہیں پھوڑ ڈالا؟'' میری بات سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ ''اُسے بلوانے کے لیے تو یہ سر کاندھوں سے اُتار کر نیچے بھی رکھ سکتا ہوں۔'' پھر اُس نے صحرائی زبان میں ایک مصرعہ پڑھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سانول کی طرف دیکھا تو اس نے لمبی سی آہ بھرتے ہوئے مجھے ترجمہ سنایا کہ ''عاشق چاہے جیسا بھی درد اُٹھا لے۔ کتنی ہی گہری چوٹ کیوں نہ کھا لے، دنیا والے اُس کے زخموں کو ایک ڈھونگ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عاشق جسم پر زخموں کے داغ سجاتا ہی رہتا ہے۔ تاکہ جب کبھی محبوب سے ملاقات ہو تو وہ اس سے داد پا سکے۔'' میں حیرت سے سانول کی زبانی اس صحرائی قطعے کا ترجمہ سنتا رہا۔ کچھ چیزیں اس پوری کائنات میں کس قدر یکساں ہوتی ہیں۔ ہوا، پانی، دھوپ، بارش اور یہ محبت کا جذبہ.....صرف لفظ اور لہجہ ہی بدلتا ہے۔ باقی ہر کسک ایک سی ہی رہتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کی طرح محبت بھی شاید وحدت ہی کی قائل ہوتی ہے۔ درد، تڑپ، چبھن اور کسک کی وحدت۔ رُوح کو آری سے دو حصوں میں چیر دینے کی یکسانیت، قطرہ قطرہ کر کے جان نکالنے کی مماثلت۔ جانے ہم نے دنیا کی ہر اذیت اور درد دینے والی چیزوں کے اتنے مختلف نام کیوں رکھ ڈالے ہیں۔ ہم ایسی سب ہی اذیتوں کا ایک ہی نام ''محبت'' کیوں نہیں رکھ دیتے؟

سانول بھی اس وقت اپنے سر کے زخم اور گھائل وجود کے درد سے زیادہ عشق کے زہریلے ڈنک کے اثر سے تڑپ رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس کے زندگی کی طرف لوٹنے میں نوری کی منت ہی کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ گزشتہ تین دنوں سے وہ اپنی ماں سمیت کسی نہ کسی بہانے سے سانول کے کمرے کے آس پاس ہی بھٹک رہی ہے۔ اگرچہ مردوں کی موجودگی کے سبب وہ سانول کے اتنے قریب نہ آسکی، لیکن میں نے ہر لمحہ اُس کی بے چین آنکھوں اور بے تاب رُوح کو سانول کے سرہانے ہی موجود پایا۔ شاید اب بھی یہیں قریب کسی دیوار سے پرے اپنے من کے ہاتھ اپنے مالک کے سامنے پھیلائے بیٹھی ہو۔ سانول دم بخود سا میری بات سنتا رہا۔ اس کا محبوب اس قدر قریب موجود تھا، یہ سن کر اُس کی حالت مزید ہیجانی سی ہو گئی۔ دیواروں سے پار

جھانکنے کی اتنی شدید خواہش اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کی آنکھوں سے جھلکتی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن دیوار کا دوسرا نام ہی رُکاوٹ، پابندی ہے اور ہم انسان خود ہی تو ایسی کئی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنے لیے، سے جذبوں کے لیے.....

سانول کے گھر سے مزار کی جانب لوٹتے ہوئے جانے کیوں مجھے سکینہ کو اُٹھا لے جانے والے چار نقاب پوش یاد آتے رہے۔ ان میں اور سانول پر حملہ کرنے والے نقاب پوشوں میں کوئی ایسی مماثلت تھی جو میرے ذہن کی کنڈی ہلاتی رہی۔ کہیں وہ سانول کو بھی سکینہ کے معاملے میں میری رہنمائی کرنے کی سزا دینے تو نہیں آئے تھے۔ یہ کیسا معمہ تھا، جو سلجھنے ہی میں نہ آتا تھا۔ مزار کے صحن میں سلطان بابا تسبیح پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد فراغت پائی تو کہنے لگے" تمہارا دوست آیا تھا۔ میں نے اُسے روٹی ڈال دی تھی، لیکن شاید اُسے تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔" وہ شاید کالے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سانول پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں اپنے خدشے سے آگاہ کیا تو بولے" ہاں..... ایسا ممکن ہے..... سانول کو بھی اب احتیاط کرنی چاہیے۔ تقدیر شاید پھر بھی ایک موقع اور دے دیتی ہے، لیکن سچا دشمن کبھی نہیں۔" میں نے ان کی عجیب اصطلاح پر انہیں حیرت سے دیکھا۔" کیا دشمنی بھی خالص اور نا خالص کے پیمانے پر تولی جاتی ہے۔ کیا دشمن بھی کبھی سچا یا جھوٹا ہوتا ہے.....؟" انہوں نے دوسری تسبیح ختم کر کے مجھ پر پھونک ماری۔" سچائی اور خالص پن کی جتنی ضرورت دشمنی کے جذبے میں ہوتی ہے اتنی تو شاید یہ دوستی میں بھی نہ ہوتی ہو۔ دشمن خالص اور معیاری نہ ہو تو اعلیٰ ظرف حریف کے لیے مقابلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ قدیم منگول نسل کے کچھ لوگ شاید آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، جو دشمنی اور انتقام کو ایک اعلیٰ جذبہ سمجھتے ہیں اور دشمن ان کے لیے جینے اور آگے بڑھنے کی تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اِسی لیے ان کا ایک قول ان میں نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔" سلطان بابا کسی آہٹ کی آواز سن کر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو کر باہر صحرا کی جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی" کون سا قول.....؟" سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا اور قول دہرایا" دشمن زندہ رہے۔" وہ اپنی بات ختم کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں یونہی ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔ برآمدے کے قریب رُک کر وہ میری جانب پلٹے۔" لیکن یاد رہے..... یہاں اس بستی میں ہمارا واسطہ شاید کسی اعلیٰ ظرف دشمن سے نہ پڑے، لہٰذا اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔" سلطان بابا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور میں ہمیشہ کی طرح اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ میں آج تک محبت ہی کو طاقت ور ترین انسانی جذبوں میں شمار کرتا تھا لیکن آج میرے اندر کئی دروازے مزید کھل گئے تھے۔ واقعی، کتنی بڑی بات کہہ گئے تھے، سلطان بابا۔" دشمن زندہ رہے۔" جانے یہ قول دعا تھا یا بددعا۔ حسرت تھی یا نفرت کی انتہا۔ میں ساری رات کالے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہیں پلٹا۔ صبح کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تو بھی نیند میں بے چینی کی ہمیشہ کی طرح کسی اَن ہونی کا خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ صبح نہ جانے سلطان بابا کو کیا سوجھی کہ خود

بول پڑے۔ ''چلو میاں! تمہارے دوست کی عیادت کو ہو آئیں۔ اِسی بہانے وہاں اکرام صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' زیادہ تر سلطان بابا کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہمہ وقت مزار پر موجود رہے اور ویسے بھی وہ زیادہ تر بستی کی جانب جانے سے گریز ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ انہوں نے خود ہی سانول کے گھر چلنے کی فرمائش کر دی۔

ہم سانول کے گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو کافی بھیڑ تھی۔ پتا چلا کہ سانول کے باپ نے اُس کے ہوش میں آنے کی خوشی میں شکرانے کے طور پر نیاز بانٹنے کا ارادہ کیا ہے اور اسی لیے بستی کے سب ہی مرد وہاں چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے ''بڑے اور چھوٹے پیر صاحب'' کو بیک وقت اپنے درمیان پایا تو سب ہی خوش ہو گئے۔ کال گڑھ کی واحد جامع مسجد کے مولوی صاحب بھی کچھ دیر میں آ پہنچے۔ نیاز کے چاول ابھی دم پر تھے اور بٹنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ بستی کے چند بزرگوں میں کال گڑھ کے سدا کے کال اور سوکھے کی بات چل پڑی۔ کسی جانب سے ایک بوڑھے نے تشویش زدہ انداز میں سب کی توجہ اس جانب دلائی کہ بستی کے آس پاس قریبی جوہڑ اور تالاب تو تین سال پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، لیکن اب دُور دراز کے پانی کے ذخیرے بھی دھیرے دھیرے خالی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر چند ایک دن میں علاقے میں بارش نہ ہوئی تو کال گڑھ میں پینے کے پانی کا شدید بحران پیدا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات سن کر محفل میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر سب ہی اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قلعہ داراں کی منت کر کے ان سے مزید کچھ قرض لیا جائے اور ایک آخری کوشش کے طور پر مشرقی سمت جہاں پانی ملنے کی کچھ اُمید ہے، وہاں پھر سے کنواں کھود کر پانی تلاش کیا جائے۔ لیکن اکثریت نے اس مشورے کو یک سر رد کر دیا۔ ایسی بارہا کوششیں پہلے ناکام ہو چکی ہیں اور قرض کا بوجھ پہلے ہی اتنا بڑھ چکا ہے کہ مزید ایسی کوئی سعیٔ لا حاصل، صرف وقت کے زیاں ہی کا باعث ہو گی۔ اچانک کوئی کسی کونے سے بولا ''تو پھر بڑے پیر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بارش کی دعا کریں۔ اب اور کوئی چارہ نہیں۔'' اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ سب ہی جانب سے سلطان بابا کے سامنے فریاد پیش کی جانے لگی۔ ایک شور سا مچ گیا۔ مولوی صاحب نے بھی بارش کے لیے دعا کی درخواست دائر کر دی۔ سلطان بابا نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش کروایا اور دھیمے لہجے میں بولے ''اگر آپ سب کا یہی مشورہ ہے تو پھر دعا بھی ہم سب اجتماعی طور پر ہی کریں گے۔ آج عصر کی نماز کے بعد بڑے میدان میں ساری بستی کے مرد نمازِ استسقاء کے لیے جمع ہو جائیں۔ ہم سب پیش امام صاحب کی معیت میں باجماعت نماز ادا کر کے اللہ کے حضور اپنی درخواست پیش کریں گے۔'' سلطان بابا کی بات سن کر نوجوان طبقے نے تو زور و شور سے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن بزرگ کچھ خاموش ہی رہے۔ میں نے پاس بیٹھے اکرام صاحب سے آہستہ سے اس خاموشی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواباً میرے کان میں جو سرگوشی کی۔ اس سے میں صرف اتنا ہی مفہوم اخذ کر سکا کہ جبروت کے علم میں لائے بنا بستی کے باہر ایسا کوئی بھی عوامی جمگھٹا اس کی ناراضی کا سبب

بن سکتا ہے، لہٰذا بزرگ یہی چاہتے ہوں گے کہ قلعے داروں کو بھی باقاعدہ دعا میں شرکت کی دعوت دی جائے
تب تک سلطان بابا مجھے وہاں سے اُٹھنے کا اشارہ کر چکے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ بستی کے تمام مرد عصر کے وقت
باہر والے بڑے میدان میں جمع ہو جائیں گے۔ ہم محفل کو مکھیوں کی طرح بھنبھناتے اور آپس میں سرگوشیاں
کرتے چھوڑ کر وہاں سے نکل آئے۔ جانے ان میں سے کوئی بعد میں جبروت سے باقاعدہ اجازت لینے یا
میں شرکت کرنے کی درخواست لے کر قلعے کی جانب گیا یا نہیں۔ ہم بہر حال عصر سے کچھ پہلے بستی
مضافاتی میدان میں پہنچے تو دعا کے لیے اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ مجھے اُسی دن راستے میں سلطان بابا
بارش کے لیے خصوصی طور پر مانگی جانے والی دعا اور نماز استسقاء کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ شاید یہی
واحد اور منفرد التجا ہے، جو سیدھی ہتھیلیوں کے بجائے ہاتھ کی پشت آسمان کی جانب بلند کر کے دعا کی صورت
میں کی جاتی ہے۔ میرے لیے یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ بستی کے لوگوں، بشمول امام مسجد نے سلطان بابا سے
بار درخواست کی کہ وہ جماعت کی امامت کریں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ یہ بستی کی جامع مسجد
کے امام کا حق ہے۔ بالآخر امام صاحب ہی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلام کے بعد سب نے ہاتھوں کی
پشت آسمان کی طرف کر کے دعا مانگی اور مولوی صاحب نے اپنی چادر پلٹ دی۔ دعا کے بعد نمازی رُخصت
ہونے لگے، تب اچانک میری نظر بے ساختہ دھوپ کا قہر برساتے آسمان کی جانب اُٹھ گئی۔ سورج اب بھی
اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دُور دُور تک کسی بدلی تو کیا کسی مٹی یا ریت کے بگولے کے آثار
بھی نمایاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سلطان بابا کے چہرے پر کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی لیکن
وہاں حسب معمول صرف سکون کا ڈیرہ تھا۔ وہ تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر اور لاپروا ہو گئے تھے، جیسے
خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی تو کسی دعا کی
قبولیت کا اصل کلیہ نہیں۔ کہیں ہماری دعائیں اِسی لیے تو رد نہیں ہو جاتیں کہ ہم اندر سے بے یقین اور بلا
ہوتے ہیں۔ ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں، خود اُسی کی سخاوت اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے
پھر دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا۔ یہ تو اعتبار اور توکل کا سودا ہے اور سچ ہی تو ہے کہ انسان ہی سدا کا خسارے
میں ہے۔

رات کو بھی کئی بار میں نے اُٹھ کر آسمان کو دیکھا۔ میرے اندر کا تول مول کرنے والا سوداگر آج
یقین اور بے یقینی کے بڑے دلیل اور جواز کے پتھروں سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آدھی رات کے
قریب جب مجھے پہلی جھپکی آئی تب تک آسمان بالکل صاف تھا۔ ایمان اور بے یقینی کی جنگ میں سوداگر
شک کی جیت ہوئی اور میں تھک کر سو گیا۔ لیکن صبح بہت سے بچوں کے شور سے میری آنکھ اچانک کھلی تو
نظر سیدھی آسمان پر پڑی۔ سارا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کے سارے بچے کاغذ اور پلاسٹک
پتنگیں، لمبی لمبی ڈوروں سے باندھے صحرا میں چلتی تیز ہوا کے دوش پر اُڑائے پھر رہے تھے۔ میں ایک

سے اُٹھ بیٹھا۔ صحرا میں بادل، کتنا عجیب تضاد آمیز لیکن خوش گوار تجربہ تھا۔ سلطان بابا بھی صحن میں نکل آئے۔ میں نے اُن سے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ کو اس قدر یقین کیسے تھا۔ مجھے تو جو نعمت میری دسترس میں، میرے سامنے موجود ہوتی ہے، اُس کے پانے کا بھی کامل یقین نہیں ہوتا اور آپ ایک اَن ہونی پر بھی اس قدر اعتبار کیسے جمع کیے رکھتے ہیں۔'' انہوں نے غور سے میری جانب دیکھا ''سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں.....اور یقین جانو کہ تم اس کامل یقین کے بہت آس پاس ہو۔ بس ثابت قدمی ہی آخری شرط ہے۔'' سلطان بابا کی بات ختم ہوتے ہی پہلی بوند نے میری پیشانی چوم کر سلامی دی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ جل تھل ہوئی کہ کال گڑھ کی برسوں سے پیاسی اور سوکھی زمین کے ساتھ ساتھ میرا اندر بھی پوری طرح ڈھل گیا۔ کچھ بارشیں ہمارے اندر بھی برستی ہیں۔ کال گڑھ کے لوگوں کو خوشی سے چلاتے اور اُچھلتے کودتے دیکھ کر میرے من میں بھی بوندوں کا جلترنگ بجنے لگا۔ کال گڑھ کی بارش صرف بیس منٹ کے لیے تھی، لیکن میرے اندر کا ساون بہت دیر تک برستا رہا۔ کچھ ہی دیر میں بستی کے تمام لوگ مزار کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ وہ سلطان بابا کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئے تھے کہ اُن کی دعا سے کال گڑھ کے نصیب کی بدلی آج کھل کر برسی تھی، لیکن سلطان بابا نے مسکراتے ہوئے بات انہیں پر اُلٹ دی کہ ''میں نے اللہ سے صرف اتنی دعا کی تھی کہ کال گڑھ میں جو بھی تجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، اُس کے صدقے بارش بھیج دے۔ اب تو یہ تم ہی سب مل کر کھوجو کہ تم میں سے اللہ کا وہ سب سے پیارا کون ہے؟'' یہاں بستی میں سب ہی کے من کی کلی کھل رہی تھی، مگر کوئی ایسا بھی تھا جو قدرت کو اپنی سلطنت میں دخل اندازی کرتے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے اُسی روز احساس ہو گیا تھا کہ جبروت کبھی سلطان بابا کے لیے لوگوں کی آنکھوں کی یہ محبت اور عقیدت برداشت نہیں کر پائے گا اور اِسی خدشے کا اظہار اسی شام سانول نے بھی کر دیا جب میں اُس سے ملنے اُس کے گھر پہنچا تو مغرب کا وقت ڈھل چکا تھا، گھر میں چہل پہل بھی کم تھی۔ سانول نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے سرہانے بٹھا لیا۔ اُس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور زخم بھی بھر رہا تھا، لیکن اُس کے باپ نے اُسے اپنی قسم دے رکھی تھی کہ اب وہ تنہا صحرا میں بانسری بجانے کبھی نہیں جائے گا۔ سانول اس بات پر بھی کافی جھنجھلایا ہوا تھا لیکن فی الحال اُس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جس دن سے اُس پر حملہ ہوا ہے بستی کا بوڑھا کھوجی بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ اُس کے گھر کو بھی تالا لگا ہوا ہے اور بستی میں کوئی نہیں جانتا کہ کھوجی کہاں چلا گیا ہے۔ میں بھی چونکا تب ہی وہ بوڑھا اتنے دنوں سے مجھے بھی دکھائی نہیں دیا تھا نہ ہی وہ سانول کی مزاج پرسی کے لیے اُس کے گھر آیا تھا۔ مطلب میرا شک ٹھیک تھا کہ اُن نقاب پوشوں کا تعلق ضرور سکینہ کے اغوا سے بھی رہا ہوگا۔ سانول نے میرے خدشات دوچند کر دیئے تھے۔ لیکن میں اُسے اپنی پریشانی بتا کر مزید اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھنے کے بعد اُٹھنے لگا تو سانول نے اصرار کیا کہ کھانا کھا کر جاؤں۔ آج نوری کے گھر سے اُس کے لیے خاص طور پر گڑ کے چاول بن کر آنے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُسے چھیڑا کہ تب ہی آج وہ باتیں بھی گڑ

کے شیرے جیسی میٹھی کر رہا ہے۔ ہائے یہ جذبے ..... پل میں ہمیں کتنا کڑوا اور دوسرے پل میں کر
شیریں کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسی اُلٹ پلٹ مچاتے ہیں ہمارے اندر کے ہم خود اپنا اصل بھی بھول جاتے ہیں
میں بھی سانول کی آنکھوں سے پھوٹتی محبت کی وہ میٹھی آنچ پورے کمرے میں پھیلتی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا
سانول کو میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سلطان بابا مزار پر میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ لہٰذا میں کل پھر آؤں
گا اور نوری کے گھر سے آئے گڑ کے چاول بھی ضرور کھاؤں گا۔ میں سانول کے کمرے سے باہر نکلا تو چ
عورتیں لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ساتھ سانول کی ماں بھی تھی۔ میں
جھکا کر سلام کر کے آگے بڑھنے لگا تو سانول کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ''شالا چھوٹا
جیوے .....'' کائنات کی ساری مائیں شاید ایک ہی مٹی سے گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آنسوؤں، دعاؤں ا
خدمت کی مٹی۔ مجھے مما یاد آ گئیں اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ میر
عقب سے ایک سہمی اور ڈری ہوئی سی نازک سی آواز اُبھری۔ ''چھوٹے پیر جی.....!!'' میں ٹھٹھک کر پا
اور حیرت زدہ برآمدے کے ستون کی آڑ میں نوری کو اپنا سراپا سمیٹتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے بھی علاقے
ریت کے مطابق لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا اور میں اُس کے وجود کی لرزش اتنی دُور سے بھی محسوس کر سکتا تھا
باقی عورتیں اندر کی جانب بڑھ چکی تھیں اور اُس وقت صرف ہم دونوں ہی صحن میں موجود تھے۔ اُس نے مجھ
روک تو لیا تھا، پر خود اُس کا بس چلتا تو اگلے لمحے ہی وہاں سے ہوا ہو جاتی۔ میں نے ہلکے سے کھنکار کر اُ
متوجہ کیا۔ وہ ہڑبڑا سی گئی۔ ''وہ جی..... چھوٹے پیر جی..... آپ اس سے کہیں نا کہ وہ شہر چلا جائے
یہاں اس کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ آپ کہو گے تو نہ نہیں کرے گا۔ بہت سنتا ہے آپ کی۔'' مجھے نوری
تشویش کا اندازہ تھا۔ ''آپ اطمینان رکھیں۔ میں سانول سے بات کروں گا۔'' میں بات ختم کر کے دروازے
سے باہر نکل آیا۔ عورت کا دامن کچھ یوں بھی سدا ہی سے کورا ہوتا ہے، لیکن ان علاقوں میں تو زور سے چلتی ہ
بھی اسے داغ دار کر دیتی ہے۔ وہ معصوم لڑکی سانول کی محبت میں شاید چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی، لیکن
مجھے ریت اور رواج کی حدیں یاد تھیں۔ ساری بستی ہی کو چند دن میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سانول کی مجھ سے
گاڑی چھنتی ہے اور وہ ضدی لڑکا میری بات کا بہت مان رکھتا ہے۔ یہ اسی مان کا بھروسا تھا، جس نے نوری
آج مجھ سے بات کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ سانول سے کہوں کہ کچھ عرصے کے
یہاں سے دُور چلا جائے۔ دشمن اگر اَن جانا ہو تو وہ دہرا خطرناک ہو جاتا ہے اور ہمیں اس وقت ایسے ہی
چھپے ہوئے دشمن کا سامنا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم صحرا کے اُونچے ٹیلے پار کرتا ہوا مزار کی جانب بڑھ رہا تھا
اچانک مجھے داہنی طرف کے ٹیلے کے پیچھے سے چند غراہٹیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹھک کر رُک گیا۔ غراہٹ
رُک گئی۔ میں نے کالے کو آواز لگائی۔ لیکن کالا ہوتا تو ایسے چھپتا ہی کیوں۔ میں نے پھر قدم بڑھائے ہی
کہ ٹیلے کے پیچھے سے دو خوف ناک قسم کے کتے ایک دم ہی میرے سامنے آ گئے۔ یہ جبروت کے کتوں

ٹولے میں سے تو نہیں تھے لیکن ان کے تیور بھی اس وقت کچھ ویسے ہی تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ بچپن سے میرے اندر چھپا کتوں کا خوف ایک دم ہی میرے سارے وجود پر طاری ہوگیا ہے اور میں ٹھیک اُسی طرح اپنی جگہ منجمد ہوگیا، جیسے بچپن میں کسی کتے کے غرانے پر اپنے پیروں سے جان نکل جانے پر ہو جاتا تھا۔ کتوں نے رقبہ بھرنے کے لیے اپنے جسم کو تولا، میری رگوں میں بہتے گرم خون نے پل بھر میں ہی میرے سر سے لرکر میرے پاؤں کے تلوؤں تک کا دورانیہ طے کرلیا اور تب اچانک ہی کسی طرف سے کالا دوڑتا ہوا آیا اور میرے پاؤں کے قریب آ کر لوٹنے لگا۔ میں ابھی تک ساکت ہی کھڑا تھا۔ کالے کو یوں میرے پاس قلابازیاں کھاتے دیکھ کر دوسرے دو کتوں کے تنے جبڑے بھی کچھ ڈھیلے ہوگئے۔ شاید کالے نے صحرا میں بھی اپنا گروہ بنا لیا تھا اور باقی دو بھی اُسی کے ساتھی تھے۔ میں نے ایک گہری سی سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ جانے یہ جانور آپس میں کون سی بولی بولتے ہوں گے، کیسے ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہوں گے۔ ان کے لفظ کیسے ہوتے ہوں گے۔ ابھی ابھی کالے نے میری جان کے دشمن بنے ان خوف ناک کتوں کو یہ کیسے سمجھایا ہوگا کہ یہ تو میرا دوست ہے..... تم بھی اسے کچھ نہ کہنا اور کتنی جلدی وہ کالے کی بات مان بھی گئے۔ ہم انسانوں کی طرح کسی کج بحثی یا تکرار میں پڑے بنا، انہوں نے کیسے اپنے دوست کی بات مان لی۔ شاید اس دور کے انسانوں کو بہت سی باتیں ان جانوروں سے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ لفظ صرف ہم انسانوں ہی کی مجبوری تو نہیں ہوتے۔ رابطے کے کئی اور ذرائع بھی تو ہوتے ہوں گے۔ جیسے ان جانوروں کا آپس میں رابطہ، اور پھر وہ رابطہ، وہ جذبہ اور وہ پیام ہی کیا جسے لفظوں کی یا زبان کی ضرورت محسوس ہوتی ہو؟ بات تو تب ہے جب بنا کچھ کہے ہی وہ ہمدم سب جان لے۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالے کا اپنے ساتھیوں کو بھیجا گیا وہ خاموش پیام تھا۔ شاید یہ لفظ ہم کم ظرفوں ہی کی پہچان ہوتے ہیں۔ انہی خیالوں میں گم میں مزار کے سامنے والا بڑا ٹیلا طے کر کے جیسے ہی نیچے اُترا تو میرے پاؤں جیسے ریت پر گڑ کر رہ گئے۔ مزار کے باہر جبروت کی جیپ کھڑی تھی۔ اتنی رات گئے جبروت یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟؟

دل سے دھواں اُٹھتا ہے

مجھے جبروت کی جیپ مزار کے باہر کھڑی دیکھ کر جو پہلا جھٹکا لگا تھا میں اُسی کے زیر اثر تقریباً دوڑ۔ ہوئے مزار کے بیرونی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے جبروت کا خاص کارندہ، اکرم لمبے لمبے قد اُٹھاتے ہوئے باہر نکلا اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالتا ہوا جیپ میں سوار ہو گیا جہاں ڈرائیور سمیت ایک دو محافظ پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ سلطان بابا صحن ہی میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تسبیح گ رہے تھے۔ میں پھولی ہوئی سانسیں لیے اُن کی جانب بڑھا۔ ''یہ لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے ''دھمکانے آئے تھے..... لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں.....'' میں مزید اُلجھ گیا۔ ''پوری بات بتائیں..... سلطان بابا اُٹھ کھڑے ہوئے ''جبروت کا پیغام لائے تھے کہ یہاں اُس کا سکہ چلتا ہے، لہٰذا آئندہ کوئی ب اجتماع کرنے سے پہلے اُس سے اجازت ضرور لے لی جائے۔'' میں نے تشویش بھری نظروں سے سلطان کی جانب دیکھا، گویا میرے خدشات ایک ایک کر کے سچ ثابت ہو رہے تھے۔ ''تو آپ نے کیا جواب دیا وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ ہم فقیر لوگ ہیں۔ ہمارا تو گزارا ہی مانگ کر ہوتا ہے۔'' گویا انہیں سانول کا سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں تھا۔ سلطان بابا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ طبل جنگ بج چکا ہے اور اب جلد یا ب ہماری جبروت سے حتمی ملاقات ہونے والی ہے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد سلطان بابا کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ لیکن میری قسمت میں آر کہاں..... پھر وہی رات، وہی بے خوابی، وہی میری جگ راتوں کی محفل اور وہی میرے ساتھی تارے۔ ک ہیں پرانے زمانوں میں کاہن اور جادوگران تاروں کی چال سے حال اور مستقبل کی کروٹ کا اندازہ لگایا کر تھے۔ میں بھی بہت دیر تک ان شرارتی تاروں میں اپنے مقدر کا تارا کھوجتا رہا۔ لیکن وہ مجھے کیسے دکھائی دیتا۔ گردش میں سدا رہتے ہوں انہیں تو فلک بھی اپنے دامن میں جگہ نہیں دیتا۔ ایسے ستاروں کا آسمان بھی شاید کو دوسرا ہی ہوتا ہوگا۔

اگلے روز میں مزار سے باہر سانول کی زور زور سے باتوں کی آواز سے چونکا۔ جلدی سے اُٹھ کر مزار منڈیر سے باہر جھانکا تو سانول اپنے باپ کے ساتھ لڑتا جھگڑتا اور بحث کرتا مزار کی جانب بڑھا چلا آ رہا تھ اُس کے باپ نے صحن میں داخل ہوتے ہی سلطان بابا کو سلام کے بعد اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا کہ وہ ا لڑکے کے ہاتھوں بے حد پریشان ہے۔ ابھی کل ہی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے اور آج ہی سے اس نے دو

گھر سے نکلنے کی ضد شروع کر دی ہے۔ اب بڑے پیر جی ہی اسے کچھ سمجھائیں کہ اپنے بوڑھے باپ کو اس عمر میں یوں اوازار نہ کرے اور اس کی بات مان کر شہر چلا جائے۔ سانول نے اپنے باپ کو سلطان بابا کے سامنے فریاد سناتے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مزار کی منڈیر کی طرف چلا آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُسے جبروت کے رات والے پیغام کی رُوداد سنائی جسے سن کر وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ''اوہ..... یہ تو بہت فکر کی بات ہے۔ پھر بڑے پیر صاحب نے انہیں کیا جواب دیا۔'' ''وہی جو انہیں دینا چاہیے تھا۔ سلطان بابا جس مقصد سے کال گڑھ آئے ہیں اُسے پورا کیے بنا وہ یہاں سے کوچ نہیں کریں گے۔'' سانول نے مجھ سے پھر وہی سوال کیا۔ ''لیکن ایسا کیا مقصد ہے اُن کا۔ اس ویران بستی میں ان درندوں سے دشمنی مول لے کر کیا ملے گا انہیں؟'' میں نے لمبی سی سانس لی۔ ''یہ تو وہی جانیں۔ ویسے بھی میں اُن سے زیادہ سوال نہیں کرتا۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اُن ہی کو دے رکھا ہے میں نے۔ لیکن تم اپنے گھر والوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ وہ سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی تو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ اِسی میں تمہارے اپنوں کی خوشی ہے۔'' سانول نے تنک کر سر پٹخا۔ ''جانتے ہو میں ایک پل کے لیے بھی اُس سے دُور نہیں جا سکتا۔ اس کے بنا تو میری بانسری سے بھی سر نہیں نکلتا۔'' ''اور اگر تمہاری دُھن اور تمہارے من کی تان بھی تم سے یہی التجا کرے تب.....؟'' سانول نے چونک کر میری جانب دیکھا ''کیا مطلب؟'' میں نے گزشتہ شام نوری سے ہوئی ساری بات بتا دی۔ سانول مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ دل گیر بھی ہو گیا۔ ''وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ میں بستی چھوڑ کر چلا جاؤں۔ وہ جس کے لیے میں سارے زمانے سے لڑتا پھرتا ہوں وہ بھی زمانے کے ساتھ مل گئی ہے۔'' میں نے سانول کو ڈانٹا۔ ''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ تب ہی تمہاری فکر میں گھلتی رہتی ہے۔ اب اور ضد نہ کرو اور پھر تم خود بھی تو یہاں قلعہ داروں کی غلامی سے چڑتے ہو۔ تو پھر اپنی نوری کو پانے کے لیے یہ عارضی جُدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔'' سوچو وہ بھی تمہاری جُدائی میں اتنی ہی پریشان ہو گی جتنا تم، لیکن وہ بے چاری تو لڑکی ہونے کی وجہ سے کسی سے اپنا درد بھی نہیں کہہ سکتی۔ تم اس کا کچھ احساس کرو۔'' سانول نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ آخر کار گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد اُس نے ہتھیار ڈال دیئے اور میں اُس کا ہاتھ پکڑے اُس کے باپ کے پاس چلا آیا۔ ''آپ کو مبارک ہو۔ سانول نے ٹھہر جانے کی ہامی بھر لی ہے۔'' سانول کے باپ کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ پہاڑ اتنی آسانی سے سر ہو گیا ہے۔ اُس نے حیرت سے سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ سلطان بابا مسکرائے ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے عبداللہ میاں ایسے کرشمے دکھاتے رہتے ہیں۔ بھئی میں تو کہتا ہوں کہ اس کا نام عبداللہ کی جگہ ساحر ہونا چاہیے تھا۔ لگتا تمہارے بیٹے پر بھی اس کا جادو چل گیا ہے۔'' سلطان بابا کی اس شرارت پر مجھ سمیت سانول اور اُس کا باپ بھی مسکرا دیئے۔ مزار سے نکلتے ہوئے سانول نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ''لیکن نوری بھی ایک شرط ہے۔ میں نوری سے ملاقات کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا اور یہ ملاقات کل شام ہی ہو

گی۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ کل کسی طرح مجھے گھر سے تنہا نکلنے کی اجازت دلوادو۔ باقی انتظام میں خود کرلوں گا۔'' میں نے مسکرا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو تم نے بھی سودے بازی سیکھ لی ہے۔ ٹھیک ہے کل عصر کے بعد تیار رہنا، میں تمہیں لینے آؤں گا۔

سانول کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی مزار کی بیرونی دیوار سے پرے کالے کی مخصوص غراہٹ گونجی۔ میں روٹی اور پانی لے کر باہر آیا تو دُور کالے کی پشت پر، میں نے اُس کے دونوں دوستوں کو بھی ٹیلے کے اُوپر کھڑے دیکھا۔ میں نے اُس کے لیے روٹی ڈالی اور انہیں بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی آکر اپنے دوست کے ساتھ شریک ہو جائیں، لیکن شاید فی الحال وہ دونوں کچھ شرمیلے تھے۔ میں اندر سے اور روٹی لے آیا اور پانی میں بھگو کر خود دُور مزار کی دیوار کے پاس چلا گیا۔ مجھے مزار کی طرف بڑھتے دیکھ کر کالے کے دوست بھی ٹیلے سے اُتر آئے۔

اگلے روز عصر کے بعد میں سانول کے گھر پہنچا تو وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ سانول کو میرے ساتھ گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر اُس کے ماں باپ کے دل میں جو تھوڑا بہت تذبذب تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے بستی سے باہر نکلتے ہوئے اُس سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے۔ کیا سیدھے نوری کے دروازے پر جا بیٹھو گے؟'' سانول زور سے ہنس پڑا ''نہیں! جو سودا میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا، وہی نوری کے سامنے بھی اُس کی سہیلی کے ذریعے پیغام کی صورت بھیج دیا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ میں شہر جا کر محنت مزدوری کروں جو آج شام اُسے مجھ سے ملنے کے لیے مزار کے پچھلے بڑے ٹیلے پر آنا ہی ہوگا۔'' میں نے حیرت سے سانول کو دیکھا۔ ''تو کیا مان گئی۔ اُس نے تمہیں کوئی جواب بھی دیا کہ نہیں.....؟'' سانول مسکرایا ''نہیں..... جواب تو کوئی نہیں آیا اُس کی طرف سے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ضرور آئے گی۔'' میں نے غور سے سانول کی جانب دیکھا۔ ''تمہیں اتنا یقین کیسے ہے۔'' سانول اپنی ہی دُھن میں مگن تھا۔ ''ساری بات ہی یقین کی ہے چھوٹے پیر جی.....'' میں زور سے چونکا..... میرے ذہن میں سلطان بابا کا جملہ گونجا ''سارا کھیل ہی یقین اور بے یقینی کا ہے میاں..... کیا ہمارے یقین میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ہمارے مجبور اور معاشرے کے قیدی محبوب کو بھی گھر سے نکال کر اس ویران تپتے صحرا میں ہمارے سامنے کھڑا کر سکتا ہے.....؟ اگر زمین والوں پر اس یقین کا اتنا گہرا اثر ہے تو پھر عرش بریں والے کی آمد کا کیا حال ہوگا، جو ہمارے ایک قدم کے بدلے ستر قدم ہماری جانب بڑھا چلا آتا ہے.....؟ اور پھر میں نے دُور ہی سے مزار سے پرے ٹیلے پر نوری کی سرخ اوڑھنی کو سانول کے کامل یقین کی صورت میں لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ شاید اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آئی تھی، جو بظاہر ٹیلے پر اُگی ایک خاص جنگلی بوٹی چننے میں مشغول تھی، جسے جوڑوں کے درد کی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محبت بھی ہمیں کیسے بہانے سکھا دیتی ہے۔ شاید محبت خود دنیا کی سب سے بڑی ''بہانے باز'' ہوتی ہے۔ میں مزار کی منڈیر کے قریب ہی رُک گیا۔ سانول کو نوری کی جانب آتے دیکھ کر اُس کی سہیلی نے نوری کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور ہنستی ہوئی کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ ٹیلے اور مزار کی منڈیر میں کافی فاصلہ تھا۔ اچانک تیز ہوا نے ریت کے

شریر بگولوں کو چھیڑ دیا اور وہ نیند سے جاگ کر صحرا میں ایک دوسرے کے پیچھے لپک کر ''کوکلا چھپا کی'' کھیلنے لگے۔ سانول ریت میں پیر دھنساتا نوری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نوری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھ سے ریت کے ایک شریر بگولے نے کہا ''جانتے ہو وہ آپس میں کیا بات کر رہے ہیں.....؟'' ''ہاں..... میں جانتا ہوں۔ سب ہی بچھڑنے والوں کی بولی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کچھ گلے، کچھ شکوے۔ کچھ دعوے اور کچھ وعدے۔ کبھی نہ پورے ہونے والے وعدے.....'' سانول بھی نوری سے کچھ ایسے ہی وعدے کر رہا تھا۔ جانے مجھے اتنی دُور سے بھی ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے نوری رو رہی ہو۔ سانول اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ یہ لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے تو خود ہی اپنے سے دُور بھیجنے کی جتن کرتی ہیں اور پھر خود ہی جُدائی کا سوچ کر رو پڑتی ہیں۔ اچانک ہی زہرا کی یاد نے میرے وجود کے ہر روئیں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ پورا صحرا جیسے زہرا کی یاد کا اک دریا بن گیا۔ کیا اُسے بھی میری یاد آتی ہوگی۔ کیا وہ بھی نوری کی طرح آنسو بہاتی ہوگی۔ زمانہ چاہے صدیوں ہی پر محیط کیوں نہ ہو۔ محبوب سے ہوئی ملاقات ہمیں ہمیشہ پل بھر کی ہی لگتی ہے۔ سو، نوری اور سانول کی ملاقات کے وہ چند پل بھی پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ نوری اپنی سہیلی کے ساتھ ٹیلے سے اُتر کر بستی کی جانب چل پڑی اور جاتے جاتے پلٹ کر ٹیلے پر کھڑے گم صم سے سانول کو دیکھتی رہی، جس کی آنکھ سے ٹپکتے اس آنسو کی چمک، میں ڈوبتے سورج کی کرنوں میں یہاں اتنی دُور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ خود نوری بھی بار بار پلو سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھ رہی تھی۔ ایک اور الوداع..... ایک اور عذاب جو سانول اور نوری کی جُدائی کی صورت میں میری رُوح کو جھیلنا پڑ رہا تھا۔

نوری کے جانے کے بعد بھی سانول وہیں ٹیلے پر کھڑا اُس جانب دیکھتا رہا، جہاں ریت پر نوری کے قدموں کے نشان گئے تھے۔ میں نے اُس کی تنہائی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت صرف اُس کا جسم ہی اس ٹیلے پر موجود ہے۔ اُس کی رُوح تو نوری کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کو چننے، ان سے وضو کرنے کے لیے نوری کے ساتھ ہی صحرا پار کر گئی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد سانول بھی اپنی محبت کے لروب ہوتے آفتاب کی طرح ٹیلے سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بہت مضمحل لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ دائمی مل کے لیے کبھی کبھی یہ عارضی جُدائی ضروری ہوتی ہے۔ سانول کو اگلی صبح روانہ ہونا تھا۔ وہ رات دیر تک برے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُسے گھر تک چھوڑ آیا۔ لیکن اگلی صبح میرے بے حد اصرار کے باوجود اُس نے مجھے ریلوے اسٹیشن تک ساتھ چل کر اُسے وداع کرنے سے منع کر دیا۔ بقول کے وہ پہلے ہی بہت اداس تھا اور اگر میں اسٹیشن تک ساتھ آیا تو کہیں وہ اپنا ارادہ ہی نہ بدل دے۔ وہ صبح ویرے ہی مزار پہنچ گیا تھا۔ اُس کی گاڑی دوپہر کی تھی۔ میں خود اُسے رخصت کرتے ہوئے بہت اداس تھا۔ کے ساتھ کال گڑھ میں اتنے دن کیسے کٹ گئے، کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ جاتے ہوئے مجھ سے گلے مل کر وہ رو ا۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے ''ارے..... یہ کیا.....؟'' ''تم مجھے بہت یاد آؤ گے عبداللہ۔ میں

روز تمہیں ایک خط لکھا کروں گا اور تم جواب میں مجھے اس بستی، اس صحرا اور نوری کی خبر لکھنا۔'' میں نے ماحول بدلنے کے لیے اُسے چھیڑا۔ ''اچھا تو گویا خط میں بھی اُسی کی باتیں..... میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم میرے لیے خط لکھا کرو گے، پر اپنے ایسے نصیب کہاں؟'' سانول میری بات سن کر مسکرا دیا۔ ''اگر میرا خط اُس تک پہنچ پا تو یقین کرو میں اُسے ہر خط میں عبداللہ کی باتیں لکھا کرتا۔ میں نے نوری کو پیغام کروا دیا ہے کہ تم سے اُسے میری خیر خیریت پتا چلتی رہے گی اور اگر اُسے کوئی ضروری پیغام دینا ہو تو وہ بھی تمہارے ذریعے مجھے دے سکتی ہے۔ میں ڈاک بابو سے بھی خاص التجا کر کے آیا ہوں کہ مزار والی ڈاک کا خاص خیال رکھے۔'' میں نے سانول کو اطمینان دلایا کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں اُس کے ساتھ رابطے میں رہوں گا۔ جانے سے پہلے وہ خصوصی طور پر سلطان بابا کے کمرے میں جا کر اُن کی دعا بھی وصول کر آیا تھا۔

سانول کے جانے کے بعد ایک دم ہی جیسے ساری فضا اداس اور میری تنہائی اور وحشت دو چندی ہو گئی تھی۔ دل پھر سے ہولنے لگا تھا۔

گاہے دل سے دھواں اُٹھتا ہے
ابھی رہتا ہے اس مکاں میں کوئی

اگلے روز سکینہ کے بوڑھے نانا نانی سلطان بابا سے ملنے چلے آئے۔ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اب میرا کہیں چھپ جانے کو دل کرتا تھا۔ مجھ سے اب اُن کی فریاد برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بڑھیا کا آج یہ اصرار تھا کہ اگر سلطان بابا سکینہ کی اوڑھنی پر تین بار دم کر کے اور دعا کر کے پھونکیں گے تو وہ ضرور واپس لوٹ آئے گی۔ سلطان بابا نے شاید اُسی کے اطمینان کی خاطر اُس سے کہا کہ وہ سکینہ کی پھولوں والی چادر یہیں چھوڑ جائے۔ وہ ضرور سکینہ کی بازیابی کی دعا کریں گے۔ وہ دونوں یوں خوش ہو گئے، جیسے واقعی انہیں سکینہ مل گئی ہو۔ مزار سے نکلتے ہوئے بڑھیا کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے دعا دی کہ خدا میری ہر مراد پوری کرے اور ٹھیک اُسی لمحے میرے من کی صرف ایک ہی مراد تھی ''یا خدا اس لاچار بڑھیا کو اس کی نواسی سے ملا دے.....''

کچھ دیر میں سورج ڈوب گیا۔ آج میں کالے اور اُس کے دوستوں کے لیے پہلے ہی پانی اور روٹی باہر رکھ آیا تھا تاکہ اُس کے دوست میری وجہ سے کوئی جھجک محسوس نہ کریں۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُن کی غراہٹوں کی آواز بھی باہر سے بلند ہونے لگیں۔ لیکن خلاف معمول ''کالا'' مزار کے سامنے آ کر بھونکنے لگا۔ اُس نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، جانے کیا بات تھی۔ جب تو اُتر سے آتی آواز نہ رُکی تو مجبوراً مجھے اُٹھ کر مزار سے باہر جانا پڑا۔ وہ مزار کے مرکزی دروازے سے کچھ ہٹ کر کھڑا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ مسئلہ کیا ہے؟ پھر اندھیرے میں اُس کے سامنے ریت پر پڑے سفید کپڑے پر میری نظر پڑی تو میں چونک کر آگے بڑھا۔

ید کہیں سے یہ کپڑا اُٹھالایا تھا اور مجھے یہی دکھانے کے لیے بار بار بھونک کر باہر بلا رہا تھا۔ ارے یہ تو میرا ہی
تا تھا، جو دو دن پہلے ریت کے شدید طوفان کی وجہ سے مزار کی الگنی سے اُڑ کر نہ جانے صحرا میں کہاں کھو گیا
لیکن یہ کالے کو کہاں سے ملا۔ مجھے سانول نے بتایا تھا کہ جبروت کے سب ہی پالتو کتے انتہائی حد تک
ھائے ہوئے اور اپنی حسیات میں کمال حد تک ہوشیار ہوتے ہیں۔ اوہ..... تو پھر ضرور کالے نے کُرتے
میرے جسم کی باس پائی ہوگی، تب ہی وہ یہ کُرتا یہاں اُٹھالایا۔ کہتے ہیں کہ کتے کی سونگھنے کی حس اس قدر
ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں لوگوں میں سے اپنے مالک کے جسم کی بوشناخت کر لیتا ہے۔ آج میں نے اس کا عملی
اہرہ بھی دیکھ لیا تھا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور میں اندر کی
ب دوڑا۔ ایک مبہم سی اُمید نے میرے اندر جیسے بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ میرے کمرے میں ابھی تک سکینہ کی
وڑھنی پڑی تھی، جو آج اُس کی نانی سلطان بابا کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اگر سکینہ اُسی صحرا میں کہیں بھٹک رہی
تو شاید کالا اُس کے دوپٹے میں بسی خوشبو کو پا کر اُس کا بھی کوئی کھوج نکال لائے۔ میں اوڑھنی لے کر اسی
رسے دوبارہ بھاگتا ہوا باہر آیا اور کالے کے سامنے اس پھٹی ہوئی چادر کو ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر چاروں طرف
م کر اس کو سونگھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں کہ ہمیں اس اوڑھنی والی کی تلاش ہے۔
اوڑھنی سونگھنے کر پھر سے میرے اردگرد چکر لگانے لگا۔ شاید اُسے میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے
رزمین سے اُٹھا کر اُس کا ایک گولا سا بنایا اور اُسے دُور صحرا میں اُچھال دیا۔ کالا فوراً بھاگا اور چادر کے قریب
کر بھاگنے لگا۔ اس بار شاید وہ میرا مدعا جان گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے بھونک کر چادر کے گرد چکر کاٹ کر
ر کی جانب دوڑ جاتا اور پھر واپس اپنی جگہ آ کر بھونکنے لگتا۔ میری رگوں میں خون کا دورانیہ بڑھنے لگا، گردش
ہو کر میری نسوں میں انگارے سے بھر گئی۔ میں صحرا میں کالے کے پیچھے لپکا۔ وہ جس طرح خاص سدھائے
ئے کتوں کی طرح کچھ قدموں کے بعد رک کر میرا انتظار کرتا اور پھر بھاگنے لگتا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ
اوڑھنی والی کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں اُس کے نقش قدم پر دوڑتا ہوا صحرا پار کر رہا تھا۔ کالے کا رُخ
ا کی جانب تھا اور کچھ ہی دیر میں ہم نصف شب کے وقت خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے کال گڑھ کی
ن گلیوں میں دھول اُڑا رہے تھے۔ کالا بنا رُکے آگے بڑھتا گیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور قدم جواب
رہے تھے۔ پھر بھی میں ایک اَن جانی قوت کے زیر اثر کالے کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر بستی کے آخر میں
لے کے قدم ایک جگہ جم سے گئے اور اُس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھالیا۔ میں بھی اپنی جگہ ساکت
ہو گیا۔ کالا اپنے پنجوں سے جس دیوار کو بار بار کھرچ تھا، وہ جبروت کے قلعے کی چار دیواری تھی۔ مطلب
ہ دیوار کے اس پار موجود تھی۔ اس وقت میرا بھی دل شدت سے یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش میرے ناخن بھی
جائیں اور میں کالے کے ساتھ مل کر اس پتھر کی دیوار کو کھرچ کھرچ کر ڈھا دوں یا اس میں نقب لگا کر اس
ہ قلعے کے اندر گھس کر سکینہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالوں، لیکن اس وقت ہم دونوں ہی شدید بے بس تھے۔

بلکہ شاید ٹھیک اُس لمحے اس جانور کے اختیار کی حدیں مجھ سے کہیں بڑھ کر ہی تھیں۔ تھکے قدموں سے ہم دو
صحرا کی طرف لوٹ گئے۔ میں جب مزار کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا، تب سلطان بابا تہجد کی نماز ادا کر
اُٹھ ہی رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں سکینہ کی چادر دیکھ کر کچھ چونکے "کیوں میاں؟ کس کھوج میں رہے ر
بھر؟" میں نے انہیں ساری رُوداد سنا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے گہری سانس لی "لگتا ہے کوئی بڑا امتح
سر پر ہے..... یا اللہ ہمیں ثابت قدمی عطا کر۔" انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے اور میں یہی سوچ
کر پریشان ہوتا رہا کہ اگر سکینہ واقعی جبروت کے قلعے میں کہیں قید ہے تو اُسے نکالنے کے لیے پوری فوج د
ہوگی، کیوں کہ اس علاقے میں پتا ہلانے کے لیے بھی جبروت کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس سوچ میں خ
نہیں ہوئی کہ جانے کب سورج نکلا اور میرے وجود میں دھوپ کے نیزے گڑنے لگے۔ میں تب چونکا، ج
میرے ماتھے سے بہتا پسینہ ٹپ ٹپ مزار کے صحن میں بچھی ریت پر گر کر جذب ہونے سے پہلے ہی فضا
تحلیل ہونے لگا۔ سلطان بابا کے ٹوکنے پر میں تپتی دھوپ سے ہٹ کر گرم سائے میں جا بیٹھا لیکن ابھی
میرے مقدر میں بہت کڑی دھوپ باقی تھی۔

کچھ ہی دیر میں مزار کے باہر کچھ آوازیں بلند ہوئیں اور اکرام صاحب نوری کے والد اور کسی دوسر
بزرگ کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن سب کے چہرے سُتے ہوئے تھے اور ماتھے پر
شکنیں اندر کا حال بتا رہی تھیں۔ سچ ہے کہ چہرے کا آئینہ شیشہ ہوتا ہے اور دل کا آئینہ چہرہ۔ لیکن آج اُن
کا آئینہ دھندلایا ہوا تھا۔ نوری کا باپ بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ سلطان بابا کے استفسار پر بمشکل اُ
کے منہ سے صرف ایک جملہ نکلا "جبروت نے نوری کا رشتہ مانگ لیا ہے۔" میرے ہاتھ میں اکرام صاحب
دینے کے لیے پکڑا پانی کا گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ جملہ کیا تھا، ایک ایسا شدید دھماکا تھا، جو پل بھر
پورے صحرا کو تہس نہس کر گیا۔ میں بے ساختہ چلا اُٹھا۔ "لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ساری بستی جانتی ہے
نوری سانول کی منگیتر ہے اور سانول صرف اسی رشتے کی تکمیل کی خاطر ابھی کل ہی محنت مزدوری کے لیے
گیا ہے، پھر یہ سب کچھ....." میرے لفظ میرے اندر ہی گھٹ کر رہ گئے۔ نوری کا باپ تو اس قدر رو ہانسا ہو
تھا کہ اُس سے جواب میں کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ البتہ کچھ لمحوں بعد اکرام صاحب ایک لمبا سا سانس لے
بولے۔ "کاش ہم سانول کے ساتھ ہی نوری کو بھی دو بول پڑھا کر شہر رُخصت کر دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نور
سانول کے گھر والوں نے اُس کے لیے مانگ رکھا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ کوئی رسم تو ادا نہیں کی گئی تھی۔
کی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ایسی صورت میں کسی بھی طرف سے لڑکی کے لیے رشتہ آ سکتا ہے۔ ہاں بستی وا
اس زبانی رشتے کا بھی سدا احترام کرتے لیکن کسی کی نیت ہی اگر بُری ہو تو پھر اس کا کیا علاج.....؟"

میں نے چونک کر اکرام صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے سلطان بابا کو جو تفصیل بتائی، اس کے مط
جبروت شاید بہت پہلے سے اس رشتے کی تاک میں تھا اور اُس نے مناسب موقع پر یہ تیر چلایا تھا۔

ھی وہ یہ تکلف صرف نوری کے ماں باپ کے اطمینان کے لیے کر رہا تھا، ورنہ بستی میں جس کسی گھر میں جب
بھی قلعے کی طرف سے کوئی رشتہ آیا تھا، تب اُس کے بعد نہ تو کسی کو انکار کی جرأت ہوئی اور نہ ہی کبھی بستی میں
سے کسی دوسرے گھر نے جبروت کے مانگے ہوئے رشتے پر کمند ڈالنے کی ہمت کی تھی۔ اس لیے اگر کبھی جبروت
کی طرف سے بستی میں کسی گھر کی بیری کی طرف پتھر آتا تو وہاں ماتم اپنے ڈیرے ڈال دیتا تھا اور پھر ہمیشہ کے
لیے اس گھر میں موت کا سناٹا چھا جاتا تھا۔ میں نے جلدی سے اکرام صاحب سے پوچھا ''سانول کے باپ کا
کیا کہنا ہے؟'' وہ بے چارا کیا کہے گا۔'' اُس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے یہ سنتے ہی۔ غریب کا احتجاج کیا
ہوتا ہے، صرف بددعا اور کڑھ کر اپنے اندر ہی کو مار دینا، وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اُسے اپنے بیٹے
کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سانول یہ سنتے ہی اُلٹے پاؤں بستی دوڑا چلا آئے گا اور سانول کا
باپ یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو لے۔ لہٰذا اس کی پوری کوشش ہوگی کہ یہ خبر سانول
تک کبھی نہ پہنچے۔ کیوں کہ یہاں جس نے بھی قلعے داروں سے جھگڑا مول لیا اس کے کاندھے ہمیشہ کے لیے
سر کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ اکرام صاحب کی بات ختم ہوتے ہی مزار میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف آس پاس
سے لُو کی سائیں سائیں اور ریت کے بگولوں کے رقص کا شور فضا میں باقی رہ گیا۔ کچھ باتوں کی سنگینی کا احساس
میں یک دم نہیں ہوتا، لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، اعصاب کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور ہمیں دھیرے
دھیرے اپنی بے بسی اور اس حادثے کے مضمرات کا پتا چلتا ہے۔ ٹھیک یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ میرے
لیے سانول کا پتا نہیں تھا اور اُس کے گھر والے اب کسی حال میں مجھے اس کی کوئی خبر نہ دیتے۔ شاید نوری کو شہر
میں سانول کے رہنے کی جگہ کی کچھ خبر ہو، لیکن میں نوری سے اس کا پتا کیسے لے سکتا تھا۔ وہ تو سات پردوں میں
چھپی ہوئی تھی۔ میں تو صرف سانول کے پہلے خط ہی کا انتظار کر سکتا تھا، جس کا اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔
لیکن تب تک تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ جانے نوری کا کیا حال ہوگا۔ وہ بھی تو کسی بے بس چڑیا کی طرح
پھڑپھڑا رہی ہوگی۔ میں اپنی ہی سوچوں میں گم تھا کہ سلطان بابا کی آواز نے مجھے ڈرا ہی دیا۔ ''آپ لوگوں نے
اب کیا سوچا ہے۔ کیا پوری بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کر سکے؟'' ان
سارے بزرگوں کے سر ندامت سے جھک گئے۔ ''کاش کسی میں اتنی جرأت ہوتی۔ ہم تو بس آپ سے دعا کی التجا
کرنے آئے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس طرح ظالم شخص کے قہر سے بچا لے۔'' سلطان بابا کی آواز
سخت ہو گئی۔ میں نے انہیں اتنی تیز آواز میں بات کرتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ ''یہ دعا کا نہیں، عمل کا وقت ہے۔
ہم ابھی اُن کی حالت کبھی نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔'' تیسرے بزرگ نے پہلی مرتبہ
گفتگو میں دخل دیا۔ ''آپ بجا فرماتے ہیں، لیکن اس بستی کی تیسری نسل تک قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان
کی رُوحیں تک جبروت کی غلام ہیں۔ ان بوسیدہ جسموں سے آپ ایسی کوئی توقع نہ رکھیں۔ شاید ہم سے زیادہ
بے بس کوئی اور نہ ہو۔'' سلطان بابا نے تسبیح رکھ دی اور گرج کر بولے ''ٹھیک ہے..... اگر ساری بستی کی رُوح

غلام اور جسم بوسیدہ ہو چکے ہیں تو پھر یہ فریضہ بھی اب مجھے ہی سرانجام دینا ہوگا۔ چلو عبداللہ..... مجھے جو
کے قلعے لے چلو۔ وقت آ گیا ہے کہ اس سے دو بدو بات کر لی جائے۔'' سلطان بابا نے پاؤں اپنی کھڑ
میں ڈالے اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں بزرگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ''یہ آپ کر
رہے ہیں؟''

قفس اور جبر

اکرام صاحب نے جواب تک سلطان بابا کے اس اچانک فیصلے سے بوکھلائے ہوئے تھے، مدد مانگنے کے انداز میں یوں میری جانب دیکھا جیسے میں واقعی سلطان بابا کو روک ہی تو لوں گا لیکن میں خود اپنے حواس میں کب تھا اور پھر میرا کام تو صرف تعمیل تھا لہٰذا میں سلطان بابا کے حکم کی تعمیل میں اُن کے پیچھے پیچھے مزار سے نکل پڑا۔ راستے میں نوری کے والد نے ایک بار پھر سلطان بابا سے درخواست کی کہ اس طرح براہ راست جبروت کی مخالفت میں کھڑے ہو جانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن سلطان بابا کا کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ آج نہیں تو کل اس سے کسی نہ کسی کو تو بات کرنی ہی ہوگی تو پھر آج ہی کیوں نہیں۔ بستی قریب آئی تو سلطان بابا نے رُک کر ان تینوں بزرگوں کو مخاطب کیا۔ ''میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں لہٰذا بستی کی اس سرحد سے آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ تینوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ آپ لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ نوری میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح ہے لہٰذا آپ سب یہ اطمینان رکھیں کہ میرا کوئی بھی فیصلہ میری اپنی ذات کے لیے ہوگا اور نہ ہی آپ کو مزید کسی مشکل میں ڈالے گا البتہ جو مشکل پہلے سے سر پر آن پڑی ہے اس کا تدارک اب ضروری ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم کو چپ چاپ سہنے والا ظالم سے بھی بدتر ہے۔'' کچھ دیر کے لیے ماحول پر سناٹا سا چھا گیا، صرف فضا میں اُڑتی چیلوں اور کال گڑھ کے نارنجی آسمان میں بھٹکتے گدھوں کا شور باقی رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اکرام صاحب ہی نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی ہوگی۔ آپ بستی کے سگے نہیں لیکن پھر بھی آپ صرف ہم سب کی خاطر یہ زبان بندی توڑنے کے لیے یہاں تک چلے آئے۔ میں اور لڑکی کا باپ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔'' تیسرے بزرگ کو انہوں نے بڑی مشکل سے بستی کے باہر ہی سے رُخصت کر دیا اور کچھ دیر بعد ہم سب کال گڑھ کے بازار میں جبروت کے قلعے کے سامنے کھڑے تھے۔ بازار میں لوگوں نے نوری کے باپ کو ہمارے ساتھ جاتے دیکھا تو وہ تجسس کے مارے ہمارے ساتھ ہی چل پڑے۔ کال گڑھ کی آبادی مختصر سی تھی اور ظاہر ہے کہ جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے کی ان سب ہی کو خبر ہوگی۔ لیکن جب انہوں نے سلطان بابا کو قلعے کے سامنے رُکتے دیکھا تو اُن سب کے قدم وہیں اپنی اپنی جگہ جمتے چلے گئے اور کچھ ہی دیر میں، میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے باپ سمیت ایک ایسے گول مجمعے کے درمیان گھرے ہوئے تھے جو ہم چاروں سے کچھ فاصلے پر یوں کھڑا تھا جیسے ان سب کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ اندر سے قلعے کے دیوہیکل چوبی دروازے کے دربان نے بھی باہر کوئی غیر معمولی بات

محسوس کر کے دروازے کے ایک پٹ میں بنی چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر جھانکا اور پھر ہمیں یوں را
میں کھڑا دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ ''کیا بات ہے، یہ بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے یہاں.....
دربان کی جھاڑ سن کر مجمع میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسا ایک شور گونجا اور سب ہی لوگ چند قدم مزید پیچھے ہ
گئے۔ سلطان بابا ٹھہری ہوئی آواز میں بولے ''مجھے تمہارے مالک سے بات کرنی ہے۔ جا کر اُسے اطلاع
کہ باہر کچھ ملاقاتی آئے ہیں۔'' دربان کے چہرے پر حیرت کا تاثر اُبھرا۔ اُسے شاید اس لہجے اور اس بے با
کی عادت نہیں تھی۔ ''مالک سے ہر کوئی یوں نہیں مل سکتا۔ مالک اُسی سے ملتا ہے جس سے اُس کی مرضی ہ
ویسے بھی وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، شکار کے لیے صحرا کی طرف گیا ہوا ہے۔ شاید کل تک واپسی ہوگی۔
لوگوں کو اگر ملنا بھی ہے تو پہلے مالک سے وقت طے کرنا ہوگا پھر آنا.....'' دربان اپنی بات ختم کر کے نخوت
منہ بناتا ہوا واپس اندر پلٹ گیا۔ بھیڑ کے لیے اب مزید کوئی دلچسپی یہاں باقی نہیں رہ گئی تھی لہٰذا لوگ بھی اِ
اُدھر چھٹنے لگے۔ بہرحال ہماری آمد کا نصف مقصد تو حل ہو ہی گیا تھا۔ دربان جبروت کی واپسی پر اُسے
اطلاع ضرور دے گا کہ مزار کا بزرگ متولی اُس سے ملنے کے لیے قلعے کے دروازے پر دستک دے چکا ہے
اب ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی اور چارا نہیں تھا۔ لہٰذا میں اور سلطان بابا، اکرام صاحب اور نوری کے وا
سے رُخصت لے کر واپس مزار کی جانب پلٹ آئے۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا
اگر میں کسی طرح نوری کے گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا چاہوں کہ وہ لوگ معاملہ نمٹنے تک نوری کو کہیں
کہیں روپوش ہو جائیں تو کیا یہ عارضی حل انہیں قابل قبول ہوگا۔ لیکن پھر خود میرے ہی دماغ نے اس خیال
رد کر دیا۔ پہلے تو نوری کے گھر والے میری ایسی کوئی بات سنیں گے ہی کیوں؟ اور پھر اگر میں کسی طر
انہیں قائل کر بھی لوں تو کیا جبروت نے ایسے کسی متوقع اقدام کے لیے پیش بندی نہیں کر رکھی ہوگی۔ میں جِ
قدر سوچ رہا تھا اُتنا ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف سے پھندا نوری کے گرد تنگ ہوتا نظر آ رہا تھا اور شاید
اِسی پھندے کی گھٹن ہی تھی کہ جس نے نوری جیسی سہمی ہوئی چڑیا کو بھی اپنے پنجرے میں پھڑپھڑانے پر مج
کر دیا۔

عصر سے کچھ دیر بعد میں نے جب اُسے اپنے شکستہ قدم باپ کے ساتھ صحرا عبور کر کے مزار کی جا
آتے دیکھا تو پہلے تو کچھ دیر تک میں اُسے بھی سراب ہی سمجھتا رہا لیکن پھر جب وہ ایک حقیقت کی طرح مزا
دہلیز عبور کر کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا ہی پڑا۔ میں بے یقینی کے عالم
ان دونوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ سلطان بابا عصر کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور اس وق
مزار کے صحن میں صرف میں تھا یا آس پاس چلتی گرم لو کی سرگوشیاں۔ نوری کے باپ نے سلام کے بعد تو
ہوئے لہجے میں کہا، یہ بدنصیب آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے، میں اسے لے کر یہاں کبھی نہ آتا کہ اب
اس کے گھر سے باہر نکلے قدموں سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لیکن بالآخر ایک مجبور، لاچار باپ اپنی لاڈلی کی آخ

ائش پوری کرنے چلا آیا ہے۔نوری کی حالت میری سوچ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں
ے بھر کے اشکوں کی کہانی سنا رہی تھیں۔وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی ''چھوٹے پیر جی.....آپ کسی طرح سانول کو
اع کروادیں ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گی۔'' گویا اُس نے مجھ سے وہی مانگ لیا جس کی توقع میں اُس
ے کر رہا تھا۔میں نے جلدی سے نوری سے سانول کے شہر کا پتا پوچھا تو اُس نے ہاتھ میں پکڑا ایک مڑا تڑا سا
غذ میرے حوالے کر دیا۔اس پر سانول ہی کی کچی تحریر میں قریبی شہر کے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کسی مسافر
نے کا پتا درج تھا۔لیکن یہ قریب ترین شہر بھی کال گڑھ سے پورے ایک دن کی مسافت پر ریل کے راستے
ے منسلک تھا۔میرے جی میں آیا کہ نوری کے باپ سے کہوں کہ ابھی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اور میرے ساتھ
ل گڑھ سے نکل پڑے۔جبروت کی واپسی سے پہلے ہم ٹرین کے ذریعے سانول تک پہنچ سکتے تھے لیکن
طان بابا کو یہاں اکیلا چھوڑ کر بھی تو میں کہیں نہیں جا سکتا تھا۔میرا سر چکرانے لگا۔میں نے نوری کے باپ کی
ف دیکھا۔وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم مزار کی دیوار سے پرے خلا میں گھور رہا تھا۔میں نے اُسے پکارا تو
ٹ پٹا سا گیا۔''یہاں سے اگلی گاڑی کتنے بجے چھوٹے گی.....؟'' میرا سوال سنتے ہی اُس کے چہرے کا
اُڑ گیا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ میرے ذہن میں کون سا منصوبہ کلبلا رہا ہے۔''نہ چھوٹے پیر جی۔کال گڑھ سے
پیر نکالنے کا مطلب ہمیشہ کے لیے یہاں سے علاقہ بدر ہونا ہے۔پھر میری سات نسلیں بھی یہاں دوبارہ
اچاہیں تو یہ ظالم ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔'''' سوچ لو! تمہیں اپنی اگلی سات نسلیں بچانی ہیں یا اپنی اکلوتی بیٹی
ازندگی.....فیصلہ تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ بیٹی
ہ رہے گی تو.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔نوری کے باپ نے بے بسی سے سر پٹخا اور پھر آدھے
نٹے کے طویل وقفے کے بعد اُس نے نظر اُٹھائی تو وہ ایک ایسے ہارے ہوئے جواری کی نظر تھی، جس نے اپنا
ب کچھ آخری داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔طے یہ پایا کہ رات ساڑھے گیارہ بجے والی گاڑی کو پکڑا جائے
۔نوری کی ماں کو اس سے پہلے ہی اکرام صاحب کے ساتھ اُونٹوں کے قافلے کی ہمراہی میں آج شام اُس کی
نا کے پاس کسی دوسرے بستی کے لیے روانہ کر دیا جائے گا اور نوری صرف اپنے باپ کے ہمراہ رات دس بجے
ے پہلے مجھے بستی کے باہر ریلوے اسٹیشن کی راہ پر ملے گی۔میں انہیں گاڑی پر سوار کروا کر واپس کال گڑھ لوٹ
ل گا۔میں نے سوچ رکھا تھا کہ جبل پور والے خان صاحب کے نام ایک خط بھی نوری کے باپ کے حوالے
ردوں گا اور انہیں مکمل تفصیل اور پتا لکھ کر سمجھا دوں گا کہ وہ شہر پہنچتے ہی سانول کو لے کر آگے جبل پور کے لیے
انہ ہو جائیں۔مجھے یقین تھا کہ خان صاحب کو ان مظلوم لوگوں کو پناہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ساتھ ہی
ا نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ نوری کے باپ کو اپنے دوست کاشف اور پاپا کے تمام ٹیلی فون نمبرز بھی احتیاط
ے الگ کاغذ پر لکھ کر دوں گا تاکہ کسی ہنگامی صورت میں وہ پہلا ٹیلی فون میسر آتے ہی اُن سے بات کر سکے۔
ا نے نوری کے باپ کا کاندھا تھپک کر اُسے ہمت دلائی اور انہیں رُخصت کیا تاکہ وہ گھر جا کر اس ''ہجرت''

کی تیاری کر سکیں۔ نوری اس تمام گفتگو کے دوران سر جھکائے خاموش کھڑی رہی لیکن واپس پلٹنے سے پہلے شکر گزاری کے بول بولنے کی کوشش میں روہانسی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ کبھی کبھی یہ لفظ ہمارے احساس کو منتقل کرنے کے لیے کس قدر کم یاب ہو جاتے ہیں۔ یا شاید بعض جذبے اور احساسات ہوتے ایسے ہیں کہ دنیا کی بہترین لغت بھی ان کے احاطے کے لیے ناکافی ہو جاتی ہے۔

ان کے جاتے ہی میں نے کمرے میں جا کر عبادت میں گم، سلطان بابا کو ساری صورت حال سے کیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر صرف اتنا ہی بولے۔ ''ٹھیک ہے، اگر ان سب پر یہ زمین ہی تنگ ہوگئی ہے تو پھر ان کا یہاں سے ٹل جانا ہی بہتر ہے۔ تم سے جو مدد ممکن ہو ضرور کرو۔''

رات نو بجے تک میں اپنی تمام تیاریاں مکمل کر چکا تھا۔ خطوط کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں بند کرنے کے میں سلطان بابا سے اجازت لے کر بستی کی جانب چل پڑا۔ اچانک ہی مجھے شدت سے اس بات کا احساس کہ اپنا گھر بار چھوڑنا، اپنی جائے جنم ترک کرنا کس قدر مشکل اور اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔ شاید اس مذہب میں ہجرت کا اس قدر اعلیٰ درجہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تو گویا ایک بار پھر سے جنم لینے کے مترادف ہی ہے۔ میں بستی کے باہر اسٹیشن کی راہ کو جانے والی صحرائی پگ ڈنڈی پر پہنچا تو مجھے مزار سے نکلے ٹھیک آدھ گھنٹہ بیت چکا تھا۔ چاند پوری طرح کھل کر آسمان سے نور برسا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں آج یہ چاندنی مجھے کاٹ رہی تھی۔ اُجالے کا واسطہ شناخت سے ہوتا ہے اور جب مقصد ہی اپنی شناخت کو دوسروں سے اوجھل رکھنا ہو اُجالا کبھی کبھی کس انسان کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے۔ ہم انسان بھی کس قدر مطلبی ہوتے ہیں۔ کبھی اسی چاند کی چاندنی کے لیے مہینہ بھر انتظار کرنے کے کرب میں مبتلا رہتا تھا اور ٹھیک ہر چاند کی چودھویں رات کو اپنے تمام دوستوں سمیت ساحل پر، یا کھلے سمندر میں کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہلّہ گلا کرنے اور جشن سجانے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ تب یہ چاندنی مجھے کس قدر رُومان پرور محسوس ہوتی تھی اور آج میرا دل چاہا کہ پورے صحرا کے آسمان پر ایک سیاہ چادر ڈال دوں یا کال گڑھ پر ہی کوئی چھتری تان دوں تاکہ چھوڑنے والوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن ایسی چھتریاں اگر کہیں میسر ہوتیں تو جانے کتنے سیاہ نصیب اپنا مقدر کے سورج پر تانے کے لیے بازار سے خرید نہ لاتے۔ کچھ ہی دیر میں ٹیلے سے پرے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو دُور ٹیلے سے پرے نوری اور اُس کا باپ تیز قدموں سے ریت کا عبور کرتے نظر آئے۔ نوری کے ہاتھ میں شاید اُس کے کپڑوں کی ایک گٹھڑی تھی، جسے اپنے سینے سے لگا اور لمبا گھونگھٹ نکالے وہ اپنے باپ کی تیز رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی تھی، جو ہر چند قدم بعد رُک اپنی بیٹی کو جھڑک کر تیز چلنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ ٹیلے تک پہنچے تو نوری کا سانس بُری طرح پھول چکا تھا لیکن اپنے باپ کے خوف سے اپنی اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی تمام تفصیل نوری کے باپ کو سمجھائی اور خط اُس کے حوالے کر دیا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

کے دس بج چکے تھے اور ابھی ہمیں گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لیے ان دونوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اب وہاں صرف صحرا تھا، چاندنی تھی اور ہمارے ریت میں دھنستے قدموں کی چاپ.....

میری کوشش تھی کہ ہم صحرا کے مرکز کی بجائے آس پاس ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں۔ ہر آہٹ پر ہم تینوں بُری طرح چونک جاتے اور ریت کی غیر معمولی سرسراہٹ سے بھی ہمارا دم اٹکنے لگتا۔ اسٹیشن اب تھوڑی دُور رہ گیا تھا، لیکن منزلوں کا تعلق بھلا فاصلوں کے گھٹنے یا بڑھنے سے کب ہوا ہے اور پھر میری کمند تو ہر بار تب ہی ٹوٹی تھی، جب دو چار ہاتھ باقی تھے بام کو۔ اچانک ہی صحرا میں جیپ کے زوردار انجن کی فراٹے بھرتی آوازیوں گونجی کہ ہم تینوں ہی اُچھل کر رہ گئے۔ جیپ کسی قریبی ٹیلے کے پیچھے ہی چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی اور پھر اگلے ہی لمحے تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے دائرے میں ہمارے پاؤں جم کر رہ گئے۔ نوری کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے روشنی کے دائرے سے پرے جھانکنے کی کوشش کی۔ فضا میں چند بھدے قہقہے اُبھرے اور جیپ میں بیٹھے چار ہیولوں میں سے ایک ترنگ میں بولا۔ ''کہاں جا رہے ہو چھوٹے پیر جی..... کہو تو ہم چھوڑ آئیں۔'' وہ سب لوگ پھر سے ہنسے اور ایک ہیولا جیپ سے نکل کر روشنی کے سامنے آ گیا۔ وہ اکرم تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ۔ میرے سینے میں جیسے ایک تیر سا گڑھ کر رہ گیا۔ میں جسے غافل سمجھ رہا تھا، مجھ سے زیادہ ہوش و حواس میں ثابت ہوا۔ جبروت نے پہلے ہی نوری کے گرد پہرا بٹھا رکھا تھا اور اُسے شاید مزار سے شروع ہوئی اس کہانی کی ہر تفصیل کی خبر تھی۔ وہ صرف ہم سے کھیل رہا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ جب ہمیں رنگے ہاتھ پکڑ سکے اور میں نے یہ موقع اُسے پلیٹ میں رکھ کر فراہم کر دیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور نے نوری پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور زور سے ہنسا ''کیوں پیر جی، تم اسے بھگا رہے تھے یا یہ تمہیں لے کر بھاگ رہی تھی۔ ویسے معاملہ چاہے کچھ بھی ہو، اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ یہ جوانی چیز ہی ایسی ہے کہ انسان خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔'' وہ چاروں پھر سے زوردار قہقہہ لگا کر ہنسے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہم تینوں کو ہانک کر جیپ میں بٹھا کر واپس کال گڑھ کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نوری اور اُس کے باپ کے چہرے پیلے پڑ چکے تھے، خاص طور پر نوری کی حالت بہت بُری تھی۔ مجھے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ وہ ان چاروں کے سردار کی منظورِ نظر نہ ہوتی تو شاید وہ اُس سے مزید بدتمیزی کرتے ہیں لیکن شاید انہیں اتنا ہی حکم دیا گیا تھا کہ ہمیں قابو کر کے قلعے تک پہنچا دیا جائے۔ نوری کے باپ اور میری مشکیں البتہ وہ پہلے ہی کس چکے تھے۔

جیپ قلعے میں داخل ہوئی تو جس احاطے میں ریچھ کی لڑائی ہو رہی تھی، اس کے بائیں جانب ایک تنگ کی راہ داری سے ہوتے ہوئے گاڑی قلعے کی پچھلی جانب ایک صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف بلند شہتیروں کے ستونوں والے برآمدے تھے اور چاروں جانب کمروں کی قطاریں۔ پھر اُوپری منزل میں روشنی

ہوئی اور ایک کرخت چہرے والا بوڑھا ہاتھ میں بڑا سا گیس لیمپ لیے برآمدے میں نکل آیا۔ وہ اُوپر ہی سے چلا کر بولا۔ ''لے آئے ہو انہیں۔ بند کردو، الگ الگ کمروں میں۔ صبح سردار لوٹ کر ان کا فیصلہ کرے گا۔'' اکرم کے ساتھ کھڑے کارندے نے مجھے ایک جانب دھکیلا اور دوسرے نے نوری کے باپ کو دوسری جانب دھکا دیا۔ اُوپر سے بوڑھا چلایا۔ ''لڑکی کو چھوٹی سرکار کے پاس لے جاؤ اور بوڑھے کو بند کردو۔'' نوری چلائی۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' لیکن اتنی دیر میں نہ جانے اندھیرے میں کہاں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں اور نوری کو کھینچتے ہوئے ایک جانب لے گئیں۔ قلعہ نوری کی چیخوں سے کچھ دیر کے لیے گونجا اور پھر نوری کی آواز اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے اور نوری کے باپ کو پہلے ہی چاروں کارندے قابو کر چکے تھے۔ نوری کے باپ نے بہت دہائی دی، فریاد کی لیکن ان لوگوں پر بھلا ایسی فریادوں کا کیا اثر ہونے والا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ہم دونوں کو کال کوٹھڑی نما چھوٹے علیحدہ کمروں میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال کر واپس جا چکے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جبروت فی الحال کال گڑھ میں موجود نہیں تھا اور کل اس کی واپسی متوقع تھی۔ لیکن وہ اس قدر شاطر تھا کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی نوری کے پہرے کا تمام بندوبست کر کے گیا تھا۔ نوری اور اُس کے بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی اور پھر وہاں سلطان بابا بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور جب میں رات بھر مزار نہیں پہنچوں گا، تو وہ بھی تو پریشان ہو جائیں گے۔ سچ ہے کہ تقدیر ہماری تدبیروں سے ایک چال ہمیشہ آگے ہی رہتی ہے۔ رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ اس چھوٹے سے تہ خانے نما کمرے میں صرف ایک مختصر سا روشن دان موجود تھا، جس میں لگی لوہے کی سلاخوں سے باہر آسمان پر چمکتا چاند مجھے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی گول روٹی کو چھری سے چار حصوں میں اُفقی رُخ پر تقسیم کر دیا گیا ہو۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے مجھے اِسی چاند کی روشنی سے شکایت تھی اور اب اس اندھیری کوٹھڑی میں پھر اِسی کی چاندنی اپنا نور بکھیر کر میری وحشت کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلو اچھا ہے کہ قدرت کی نعمتیں بھی انسانوں کی طرح ہماری ناشکری پر ہم سے رُوٹھ نہیں جاتیں، ورنہ آج تک ہم میں سے نہ جانے کتنے بارش، ہوا، بادل، دھوپ، خزاں، بہار اور اس جیسی نہ جانے کتنی سوغاتوں سے محروم ہو چکے ہوتے، کہ انسان کی تو فطرت ہی شکوہ ہے۔ میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے کہ رسی کے سخت ریشے کلائیوں کی جلد میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ میں اِسی طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ اندھیرے میں دیوار ٹٹول کر ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سامنے والی دیوار کی جانب ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اندھیرے میں دو دیا سلائیاں سی جلتی ہوئی نظر آئیں۔ میرے جسم کو پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک ایک سرد سی لہر جھنجھوڑ گئی۔ یہ کسی جہازی سائز کے چوہے کی دو آنکھیں تھیں جو اندھیرے میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بالکل میرے پیروں کے قریب بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے جن چیزوں سے شدید کراہت محسوس ہوتی تھی، چھپکلی اور چوہا اُن میں سرفہرست تھے۔ کہاں تو ان جان داروں کی صرف کمرے میں موجودگی کے احساس ہی سے میری رگیں تن جاتی تھیں اور میں ایک لمحہ بھی

وہاں نہیں گزار سکتا تھا اور کہاں آج میرے قدموں سے صرف چند انچ کے فاصلے پر ایک ایسی ہی مخلوق میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھی تھی۔ شاید میں نے جس جگہ دیوار سے ٹیک لگائی تھی وہیں اس چوہے کا گھر یا راستہ تھا، لیکن اب میرے مجبوری یہ تھی کہ اپنے بند ہاتھوں کی وجہ سے میں گھٹنے ٹیکے بغیر دوبارہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا اور اگر میں گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کرتا تو ڈر تھا کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے۔ لہٰذا میں یونہی ساکت بیٹھا رہا اور ہم دونوں اس طرح ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ شاید وہی لمحہ تھا جب ''جبر'' کی صحیح تعریف مجھے سمجھ میں آئی۔ جبر صرف قید و بند کا نام نہیں۔ نہ صرف جسم کا پابند سلاسل ہونا جبر کہلاتا ہے۔ اصل جبر تو روح کی اسیری ہے۔ ہماری رُوح اور ہمارے اندر کو کسی ایسے کام کے لیے پابند کرنا، جو ہماری سرشت اور فطرت کے خلاف ہو، پھر چاہے، رُوح کی وہ بندش کسی عالیشان محل میں کمخواب کے بستر پر ہو یا پھر کسی ایسی کال کوٹھڑی میں، جہاں آج میں بند تھا۔ قدرت نے آج مجھے ایک ایسے جان دار کے ساتھ اس زندان میں لا ڈالا تھا جس کی موجودگی کے احساس ہی سے میری آنتیں اُلٹنے لگی تھیں۔ اور آج وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز دھونکنی جیسی سانس کی آواز بھی میں سن سکتا تھا۔ اس سے بڑا جبر میرے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں ہی میں یہ خوف ناک قلعہ، جبروت کی قید، اس رات کی تنہائی اور یہ کال کوٹھڑی سب ہی کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ اب اصل امتحان اس چوہے کی جسم کو مس کرتی ہوئی موجودگی میں ساری رات بتانا تھا۔ شاید کچھ اِسی طرح کے جبر کا شکار وہ چوہا بھی تھا۔ ہم دونوں اِسی خیال سے گھنٹوں اپنی جگہ ساکت جمے رہے کہ اگر پہلے نے حرکت کی تو دوسرا بھی ردعمل ظاہر کرے گا اور اسی جبر میں وہ ساری رات گزر گئی۔ روسو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انسان بظاہر آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن تمام عمر اَن دیکھی زنجیروں میں بندھے گزار دیتا ہے۔ آج مجھے اُن اَن دیکھی زنجیروں کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ جانے کب چاند ڈوبا اور کب کال گڑھ کے اس ناراض سورج نے اپنی بھٹی سلگائی، باہر قدموں کی چاپ سن کر میری بیتی رات کا وہ ساتھی، شب گرد جلدی سے دوڑ کر قید خانے کی ایک اُبھری ہوئی اینٹ کی اُوٹ میں جا کر چھپ گیا۔ آنے والے جبروت کے دو غلام تھے۔ انہوں گھسیٹ کر مجھے کھڑا کیا اور کوٹھڑی سے باہر دھکیلا۔ زندان سے نکلنے سے پہلے میری نظر چوہے کی نظر سے ٹکرائی۔ میرے دل نے کہا ''شکریہ دوست تم نے مجھے زندگی کا ایک نیا سبق دیا۔ اگر قسمت میں کچھ سانسیں مزید لکھی ہیں تو اب بڑے سے بڑے جبر کا سامنا بڑی آسانی سے کر سکوں گا.....'' وہ دونوں غلام مجھے دھکیلتے ہوئے اُسی احاطے کی طرف بڑھنے لگے، جہاں میں نے جبروت کا پہلا تماشا دیکھا تھا۔ جیسے جیسے ہم تنگ راہ داریوں سے گزرتے ہوئے قلعے کے بیرونی احاطے سے نزدیک ہوتے گئے، ویسے ویسے کسی ہجوم کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ کا شور بڑھتا گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم دیواروں کی پرلی جانب جمع ہو رہا ہے۔ میں فی الحال برآمدوں کے اندر سایوں سے گزر رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے آخری غلام گردش کے ختم ہونے پر، کھلے احاطے میں آگ برساتے سورج کی روشنی میں، پہلا قدم رکھا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ احاطہ لوگوں

سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور سب ہی لوگ اُسی طرح ایک گول دائرے میں کھڑے تھے جیسے ریچھ کے تماشے والے دن وہ سب یہاں جمع تھے۔ ایک جانب نوری کا باپ بھی میری طرح پشت پر بندھے ہاتھ لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ان میں سے چند چہروں کی آنکھوں میں، جنہیں میں بستی میں سانول کی بیماری اور نماز استسقاء کے موقع پر دیکھ چکا تھا، تاسف اور بے بسی کی ایک لہر سی تھی۔ البتہ جبروت کے کارندے ہماری حالت پر خوش تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اِسی اثناء میں ایک جانب سے شور سا اُٹھا اور لوگوں کے بیچ ایک رستہ سا بنتا گیا۔ مجمعے میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور میرا دل الٹنے لگا۔ اکرم اور دو نئے کارندے سلطان بابا کو لیے قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان بابا کے چہرے پر وہی ازلی سکون طاری تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُن کی حالت کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دی۔ سلطان بابا نے اندر آتے ہی رُعب دار آواز میں سارے ہجوم کو سلام کیا اور اطمینان سے تسبیح گھماتے ہوئے ٹھیک میرے سامنے دوسرے جانب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ میرے بندھے ہاتھ اور حالت دیکھ چکے تھے۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور مجھے لگا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے پوچھا ہو..... ''کیسے ہو عبداللہ میاں؟'' میں نے بھی اسی غیر مرئی رابطے سے سر ہلا کر انہیں اپنے اچھے ہونے کا اطمینان دلایا۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر زیرِ لب دعا دی، لیکن جانے کیوں مجھے اُن کی پلکوں کے گوشے بھیگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے جلدی سے نظر جھکا لی کہ یہ لوگ کہیں میری بھیگی پلکوں کو اس قید اور تکلیف کا شاخسانہ نہ سمجھ لیں۔ کاش دل کی کاٹ سے نکلے آنسوؤں کا رنگ عام درد کے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا.....

اچانک بھیڑ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پہرے داروں نے جلدی جلدی اپنی جگہ سنبھالی اور پھر احاطے میں بچھے تخت کے پیچھے سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا جبروت نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کی وہ سرد، سفاک اور قہر بھری نظر میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ میری نظر اُس کی نظر سے ٹکرائی اور کچھ دیر ہم دونوں یونہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ مجھے اُس کی نظر میں چھپی چنگاریاں فضا میں بکھرتی سی محسوس ہوئیں۔

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

اچانک وہ زور سے دھاڑا ''تو تم ہو عبداللہ..... جسے سولی چڑھنے کا شوق اس بستی تک کھینچ لایا ہے۔ ویسے یک بات ہے تمہاری ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی۔ جبروت کی پسند کو بھگا لے جانے کی کوشش کرنے الا یا کوئی دیوانہ ہوسکتا ہے یا پھر وہ جسے خودکشی کرنے کا کوئی اور طریقہ نہ سوجھا ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر..... لڑکی کی رضامندی بھی شامل تھی، تمہارے ساتھ بھاگنے میں یا تم ہی نے اُسے ورغلایا تھا.....؟'' مجمعے بس سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں اتنی دُور سے بھی سلطان بابا کی تسبیح کے دانے گرنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا'' میں اسے بھگا کر نہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکی کا باپ بھی میرے ساتھ تھا اور وہ شہر جانا چاہتے تھے، کیوں کہ لڑکی کو تمہارا رشتہ منظور نہیں۔ ساری بستی یہ بات جانتی ہے۔'' میری بات سنتے ہی جبروت کے منہ سے غصے کے مارے کف بہنے لگا۔ اُسے شاید اتنے براہ راست جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ زور سے چلایا'' سب بکواس ہے۔ مزار کے متولی اور مجاور کے بھیس میں تم لوگ یہ دھندے کرتے ہو۔ بردہ فروشی کے لیے یہی جگہ ملی تھی تم لوگوں کو..... میں جانتا ہوں ہماری بستی کی عورتیں بہت معصوم ہیں۔ ضرور اس کا باپ بھی تمہارے بہکاوے میں آ گیا ہوگا۔ بہرحال لڑکی بھی تمہارے ساتھ جرم میں برابر کی شریک ہے اور میری عدالت تم دونوں کو.....'' اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ سلطان بابا کی آواز گونجی'' کوئی بھی عدالت فیصلہ دینے سے پہلے ملزم کو صفائی کا پورا موقع دیتی ہے۔ تو پھر یہ تمہاری کیسی عدالت ہے، جو خود ہی وکیل ہے اور خود ہی منصف.....'' جبروت چونک کو پلٹا۔ یہ آج کی دوسری انہونی تھی کیوں کہ آج تک جبروت کے دربار میں کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ سکے۔ وہ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا'' اوہ..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ..... میں بھول گیا تھا کہ گروہ کا سرغنہ بھی یہیں موجود ہے۔ اتفاقاً ایک بارش کیا برس گئی تم نے تو خود کو اس بستی کا مسیحا ہی سمجھ لیا۔ چلو کیا یاد کرو گے، جبروت کی عدالت تمہیں تمہارے ساتھی کی وکالت کا موقع بھی دیتی ہے۔ پھر نہ کہنا کال گڑھ میں تمہارے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔'' جبروت نے داد طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھا جہاں کچھ بزرگ ندامت کی وجہ سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ جبروت ہجوم کی خاموشی سے چڑ سا گیا۔ اُسے شاید احساس ہوگیا تھا کہ بستی کے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اس تماشے سے خوش نہیں ہیں۔ اب یہ خود اس کی اپنی انا کا مسئلہ بھی بنتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی اگر ہمیں عبرت کی مثال نہ بناتا تو اس کی سلطنت کے قلعے میں یہ پہلی نقب ہوتی، جو ایک کمزور اور بے بس بوڑھے کے

ہاتھوں لگتی۔ لہٰذا اُسے اپنے تیور کڑے کرنے پڑے۔ وہ زور سے چلایا ''لیکن یاد رہے کہ اگر تم دونوں
صفائی میں کچھ ثابت نہیں کر سکے تو پھر میں تم دونوں کا وہ حال کروں گا کہ تمہاری اگلی سات نسلیں یاد رکھیں
بولو، کیا ثابت کرنا چاہتے ہو.....'' سارے مجمع کی توجہ سلطان بابا کی جانب ہوگئی۔ یہ اُن سب کے لیے بھی
انتہائی حیرت انگیز تجربہ تھا کہ انہوں نے آج تک لوگوں کو جبروت کے قدموں میں گرتے اور گڑگڑا کر زند
بھیک مانگتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ سلطان بابا کی تسبیح لگاتار گھوم رہی تھی، وہ ٹھہرے ہوئے لہجے
بولے ''عبداللہ کی صفائی کے لیے لڑکی اور اُس کے باپ کا بیان ہی کافی ہے۔ لڑکی تم سے رشتہ نہیں کرنا
اور اپنے باپ کے ساتھ شہر جا کر اپنے منگیتر سے نکاح کرنا چاہتی ہے۔ تم اُسے نہیں روک سکتے۔ یہ لڑکی
ہے۔ اسے شہر جانے دو۔'' جبروت نے زور کا قہقہہ لگایا..... بہت خوب! اسے کہتے ہیں مدعی سست ا
چست۔ جس لڑکی کے حق کے لیے تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو، اُس کا باپ تو وہاں کونے میں سر جھکائے
ہے۔ چلو کوئی تو ہے جو جبروت کو بھی نصیحت کر سکے۔ مرنے سے پہلے کوئی اور حسرت ہو تو وہ بھی بیان کر
کوشش کروں گا تمہارے ہر حکم کی تعمیل ہو۔'' کارندوں نے اپنے آقا کی حس مزاح پر مسکرا کر اُسے داد
سلطان بابا نے جبروت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''ہاں..... ایک خواہش اور ہے میری، اگر پور
سکو تو۔ مجھے اس بزرگ جوڑے کی نواسی سکینہ کا پتا بتا دو۔ انہیں اس عمر میں مزید دربدر اور خوار نہ کرو۔'' جبر
ہنستے ہنستے ایک دم ہی چپ ہو گیا اور اُس نے اپنی قہر بھری نگاہ سلطان بابا کی اُٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں
کی طرف دوڑائی۔ بھیڑ جبروت کی اُٹھتی نگاہ سے گھبرا کر ایک دم درمیان سے یوں چھٹی، جیسے کوئی تیر کمان
نکل کر اُن کی جانب لپکا ہو۔ لوگ دونوں اطراف اس طرح ہٹے جیسے کوئی ساکت پانی میں لکیر کھینچ دے
لوگوں کی آخری قطار میں سکینہ کے نانا، نانی کھڑے تھے۔ پتا نہیں، وہ پہلے ہی سے اس بھیڑ کا حصہ تھے
جب سلطان بابا کو لایا جا رہا تھا تو وہ بھی اُسی وقت اُن کے ساتھ آ گئے۔ جبروت کی ساری زندہ دلی پل بھ
میں ہوا ہو گئی اور وہ شدید طیش کے عالم میں چلایا۔ ''بس! بہت سن لی تمہاری بکواس، تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارا
وعظ سن کر یہاں کے لوگ میرے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کا اَن
کون ہے۔''

''نہیں یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ساری کائنات کا اَن داتا صرف ایک ہی ہے۔'' سلط
بابا نے آسمان کی جانب اُنگلی اُٹھائی۔ ''اب بھی وقت ہے، اپنے گناہوں سے تائب ہو کر معافی مانگ لو۔
توبہ کر لو۔ اُس کی رحمت تمہارے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ابھی تمہاری سانس چل رہی ہے لہٰذا تو
وقت بھی باقی ہے۔ اس مہلت سے فائدہ اُٹھا لو۔'' جبروت کے صبر کا پیمانہ اب بالکل ہی لبریز ہو چکا تھا۔
تک کسی نے اُس کے سامنے یوں سر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اُسے ہماری آنکھوں سے اپنا خ
مفقود دکھائی دے رہا تھا جب کہ اس کی حکومت کی تو اصل بنیاد ہی یہ ''خوف'' تھا۔ اس لمحے مجھ پر ایک اور عج

سا انکشاف ہوا۔ ''خوف'' کا واسطہ دراصل ''پوشیدگی'' سے ہوتا ہے۔ جو چیز ظاہر اور واضح ہو جائے، وہ اپنا اصل خوف اور ڈر کھو دیتی ہے۔ اور شاید ٹھیک اُسی وقت یہی کلیہ جبروت کے ذہن کے کسی کونے میں بھی سر اُٹھا رہا تھا۔ اُسے سمجھ آ گیا تھا کہ مجھ سے اور سلطان بابا سے کسی قسم کی مزید بحث اُس کا خوف، اُس کی رعایا کے دلوں سے مزید کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے دربار ختم کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''تمہاری تبلیغ کا وقت ختم ہوا۔'' افسوس تم اپنے ملزم کا دفاع نہیں کر سکے۔ لہٰذا میری عدالت اس لڑکے کو کال گڑھ کی لڑکی کو ورغلا کر بھگا لے جانے کا مجرم سمجھتی ہے۔ لیکن اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا آخری موقع ضرور دوں گا۔ کل صبح سورج نکلتے ہی عبداللہ کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میرے چھ پالتو کتے بھی اس کے پیچھے چھوڑے جائیں گے۔ اگر ملزم میرے شیروں کی گرفت میں آئے بغیر یہ صحرا پار کر کے اسٹیشن تک پہنچ گیا تو بے قصور سمجھا جائے گا اور باعزت بری ہوگا۔ دوسری صورت میں یہاں موجود یہ بوڑھا بھی اپنی جان سے جائے گا۔ اگر کسی کو اس فیصلے پر اعتراض ہے تو بولے.....'' مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ پیش امام نے کچھ ہمت کی اور حلق تر کر کے بولا'' میری آپ سے درخواست ہے کہ ان دونوں پر رحم کیجیے۔ یہ اس علاقے کے نہیں ہیں۔ انہیں علاقہ بدر کر دیجیے، پر اتنی کڑی سزا نہ دیں۔ ہم سب کی یہی التجا ہے آپ سے.....'' جبروت کے ماتھے پر شکنیں بڑھ گئیں۔ پیش امام کی دیکھا دیکھی چند اور بزرگوں نے بھی جبروت کو دہائی دی، اور اُس کے والد اور دیگر بزرگوں سے اپنے تعلق کے واسطے دیئے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو یک لخت خاموش کروا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ جبروت بے انصاف ہے۔ اگر عبداللہ اپنے جرم کا اقرار کر لے اور مجھ سے رحم کی اپیل کرے تو میں اس کی سزا میں کمی کا سوچوں گا۔'' سارے ہجوم کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ بھیڑ کی پچھلی قطاروں میں سے چند ایک نے اشاروں سے اپنے ہاتھ جوڑ کر آنکھوں آنکھوں میں التجا بھی کی کہ میں جبروت سے معافی مانگ کر یہ قصہ ختم کر دوں۔ میں نے جبروت کی طرف دیکھا'' اگر میری بے گناہی کی سند یہ صحرا دے سکتا ہے تو میں تمہارے پاؤں پڑنے سے یہی بہتر سمجھوں گا کہ میری قسمت کا فیصلہ یہ صحرا ہی کرے۔'' بزرگوں نے سر پیٹ لیے۔ جبروت کے اشارے پر مجھے اور سلطان بابا کو وہاں سے دھکیلتے ہوئے پھر سے ان ہی غلام گردشوں کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ البتہ دوسری راہ داری مڑتے ہی سلطان بابا کو مجھ سے علیحدہ کر کے وہ کسی اور جانب لے گئے اور مجھے دائیں جانب بنی کوٹھڑیوں میں سے ساتویں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔

یہ کمرا بھی گزشتہ رات والے زندان کی طرح مختصر اور تنگ تھا۔ اس میں باہر کی جانب کھلنے والا کوئی روشن دان بھی نہیں تھا۔ البتہ اُوپر کی جانب دیوار میں ایک آدھ اینٹ کی جگہ خالی رکھی گئی تھی، جو شاید ساتھ والی کوٹھڑی کی جانب کھلتی تھی۔ غالباً ہوا کے گزرنے کے لیے یہ انتظام رکھا گیا ہو، کیوں کہ اس کمرے کا دروازہ بھی لکڑوں والا نہیں تھا لہٰذا سخت لکڑی کا بھدا سا بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد دن میں بھی اس کوٹھڑی میں آدھی رات جیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں

بار بار کال گڑھ پہنچنے کے بعد سلطان بابا کا کہا ایک جملہ گونج رہا تھا۔ ''یاد رکھنا، موت صرف جسم کے فنا ہو جانے کا نام ہے۔ موت کے بعد ہی اصل زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔'' تو کیا میری اس فانی جسم سے رُخصتی کا وقت بھی قریب آ چکا ہے۔ لیکن کیا میرے ذمے اس دنیا کے جتنے فرائض تھے، میں نے وہ سب پورے کر دیے ہیں۔ کیا میری ہر تلاش کی آخری حد یہی موت تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا اچانک دیوار کے اُوپر والے حصے میں جہاں ایک اینٹ کی درز خالی تھی، آہٹ سی بلند ہوئی اور ایک سرگوشی سی سنائی دی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن پھر جب دوسری مرتبہ کسی نے دھیرے سے پوچھا۔ ''کوئی ہے؟'' تو میں چونک کر کھڑا ہو گیا ''میں عبداللہ ہوں، تم کون ہو.....؟'' دوسری جانب سے آواز آئی ''شش.....آہستہ بولو۔ جبروت کے کتے نے اگر تمہاری آواز سن لی تو غضب ہو جائے گا۔ میں پانچ مہینوں سے اس قید تنہائی میں پڑا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتوں کی آواز سن کر کوئی تمہاری کوٹھڑی بدل دے۔ ترس گیا ہوں میں کسی کی آواز سننے کو کسی سے بات کرنے کے لیے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''لیکن تم کون ہو اور تمہیں کس جرم میں اتنی لمبی قید دی گئی ہے.....؟'' ''میرا نام خانو ہے۔ پانچ ماہ پہلے میں بھی جبروت کے وفادار کتوں میں شامل تھا۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور اس ظالم نے مجھے یہاں لا پھینکوایا۔ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ اب ساری زندگی مجھے اس کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ ہم سے پہلے یہاں نہ جانے کتنے اپنی سانسیں ہار چکے ہیں۔'' اچانک دُور کہیں آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے بولا ''کوئی آ رہا ہے، اندھیرا ہونے کے بعد بات کروں گا۔'' وہ جو کچھ بھی تھا، دیوار سے دُور ہٹ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی نے خشک روٹی کے چند ٹکڑے اور عجیب سے رنگ کا شوربہ ایک ٹرے میں رکھ کر دوازے کے نیچے، درز سے اندر کھسکا دیا۔ اور زور سے ہنسا ''کھانا کھا لو جوان! کل تمہیں صحرا بھی پار کرنا ہے اور خالی ٹرے واپس کھسکا دینا۔'' پھر دوسری ٹرے سرکانے کی آواز آئی ''لے بھائی خانو بھی عیش کر۔ پھر نہ کہنا یاور یاروں کا خیال نہیں رکھتا۔'' جواب میں خانو نے شاید یاور نامی بندے کو کوئی گالی دی۔ آواز مبہم تھی، لیکن یاور کے قہقہے مجھے راہ داری کے آخر تک سنائی دیتے رہے۔ میں نے کھانے کی ٹرے واپس باہر کھسکا دی اور آنکھیں بند کر کے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی تو اُجالے ہمارے اندر اُتر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب آس پاس ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو۔ سو میں بھی باہر تاریکی سے منہ پھیر کر بند آنکھوں تلے اپنے اندر کے اُجالوں سے باتیں کرنے لگا۔ جانے کتنے گھنٹے یوں ہی گزر گئے۔ پھر دوبارہ دیوار کی درز سے آواز اُبھری۔ ''عبداللہ تم جاگ رہے ہو.....؟'' مجھے اُس کا سوال سن کر ہنسی آ گئی۔ ''تو تمہارا کیا خیال ہے میں اس آرام دہ کمرے کی مسہری پر ٹیک لگائے اپنے غلاموں کا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہوں؟'' دوسری جانب شاید خانو کے ہونٹوں پر بھی صدیوں بعد کوئی مسکراہٹ اُبھری ہو گی۔ تبھی وہ بولا ''زندہ دل لگتے ہو۔ یہاں کیسے آ پھنسے؟'' میں نے مختصراً اپنا جرم بتا دیا۔ خانو دوسری جانب سے خند لہجے میں بولا ''تم ٹھیک سمجھے ہو۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گرا ہوا، خطرناک اور کمینہ صفت انسان ہے۔ وہ

اب کبھی بھی اُس کے چنگل سے نہیں نکل پائے گی اور اِسی قلعے میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اس درندے کی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں۔ آج زندگی میں پہلی بار تمہارے سامنے یہ اقرار کرتے ہوئے میں خود کو بھی انتہائی گرا ہوا انسان محسوس کر رہا ہوں کہ کل تک میں خود بھی اس کے کسی پالتو کی طرح اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا آیا ہوں۔ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے جانے انجانے میں صرف اس کی خوشنودی پانے کی خاطر ہاتھ رنگ چکا ہوں میں۔ اور آج شاید انہی مظلوموں میں سے کسی کی آہ نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔'' خانو نہ جانے ماضی کی کن بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا اور میں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز بلند ہونے سے روکی۔ ''سنو خانو! کیا تم سکینہ نامی کسی لڑکی کو جانتے ہو۔ اُسے بھی اسے قلعے کی طرف ہی لایا گیا تھا.....؟'' میری بات سنتے ہی دوسری جانب کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور پھر خانو کی ہیجانی سی آواز سنائی دی۔ ''تم سکینہ کو کیسے جانتے ہو..... خدا کے لیے بتاؤ۔ پچھلے پانچ مہینوں سے مجھے اُس لڑکی نے سونے نہیں دیا۔ جب بھی ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی ہے وہ میرے خواب میں چلی آتی ہے۔ مجھے اُس کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتاؤ تمہارا اُس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنے گناہوں کا تمہارے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس درد اور خوف کے عذاب سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ میری مدد کرو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔'' خانو کا ہیجان اس قدر بڑھنے لگا تھا کہ خطرہ محسوس ہوا کہ اس کی بلند ہوتی آواز آس پاس کے پہرے داروں ہی کو ہوشیار نہ کر دے۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یہ احساس دلایا کہ ہم دونوں کہاں ہیں۔ کچھ دیر بعد خانو کا جنون کچھ کم ہوا تو اُس نے دھیرے دھیرے سکینہ کی کہانی میرے گوش گزار کرنی شروع کی، جسے سن کر خود میرے اپنے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہوتے گئے۔

خانو نے بتایا کہ آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے رات کی گاڑی کال گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے ٹھہری تھی۔ شاید انجن فیل ہو گیا تھا۔ گرمی اور حبس سے گھبرا کر لوگ پلیٹ فارم پر اُتر آئے۔ انہی میں وہ نوجوان جوڑا بھی تھا، جسے رحمان گڑھ جانا تھا۔ لڑکی شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی شادی کو ابھی پورا ہفتہ بھی نہیں گزرا ہوگا۔ کیوں کہ لڑکی کے ہاتھوں کی مہندی تک تازہ تھی اور سہاگ کا سرخ جوڑا بھی تن پر موجود تھا۔ جبروت کا خاص کارندہ، اکرم اپنے دو مزید ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ رات کی گاڑی دیکھنے کے لیے اسٹیشن ضرور آتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اچھا ''شکار'' ہاتھ لگ جاتا تھا اور آقا کو خوش کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ اُس دن خانو بھی اُن کے ساتھ آیا تھا۔ اِسی اثناء میں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظر اس جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کو شاید پیاس ستا رہی تھی اور لڑکا پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن اس صحرائی اسٹیشن پر بھلا پانی کہاں میسر تھا۔ سکینہ کے مسافروں کے پاس جو تھوڑا بہت پانی تھا، وہ صحرا کے سفر اور پھر اس ویران پلیٹ فارم پر گاڑی کے

تین گھنٹے کے اس غیر متوقع سٹاپ نے ختم کر دیا تھا۔ اور اُس وقت سب ہی مسافر پانی کی تلاش میں سرگر
تھے۔ رہی سہی کسر اس غضب کی گرمی اور حبس نے پوری کر دی تھی۔ ایسے میں اکرم کی لڑکی پر نظر پڑی اور پ
کر ہی رہ گئی۔ اُس نے خانو اور دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ تینوں اُس لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ ٹرین
عملے نے اعلان کر دیا کہ انجن فیل ہونے کی وجہ سے قریب ترین جنکشن سے دوسرا انجن منگوایا گیا ہے لیکن کال
پہنچتے پہنچتے وہ انجن بھی پانچ چھ گھنٹے لے گا۔ یعنی صبح تک انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں لڑکی کا شوہ
ناکام و نامراد بنا پانی کے واپس آ پہنچا۔ یہی وہ موقع تھا جس کا انتظار وہاں کھڑا اکرم کر رہا تھا۔ اُس نے فورا
اور مودبانہ لہجے میں لڑکے سے درخواست کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اُن کے ساتھ بستی تک چل کر پا
کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئے۔ لڑکا جس کا نام رحیم بخش معلوم ہوا، کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ وہ
نو بیاہتا بیوی کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ اکرم نے فورا پانسہ پھینکا کہ رحیم بخش چاہے تو اپنی بیوی کو
ساتھ لے لے۔ اس کے دونوں ساتھی یہیں اسٹیشن پر ٹھہر کر ان کے سامان کی حفاظت کریں گے اور رحیم
اپنی بیوی سمیت جیپ میں اکرم کے ساتھ جا کر ٹرین کے سب ہی مسافروں کے لیے پانی اور کچھ پھل
لے کر واپس آ جائے گا۔ آخر کچھ پس و پیش کے بعد رحیم بخش اس بات کے لیے راضی ہو ہی گیا اور اپنی
کو لے کر اکرم کے ساتھ چل پڑا۔ لڑکی کو وہ سکینہ کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، جو کافی پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔
نے آنکھوں آنکھوں میں رحیم بخش کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن اکرم اس دوران رحیم بخش سے اس قدر
تکلف ہو چکا تھا کہ رحیم بخش جیسے سیدھے سادے انسان کو وہ اس وقت دنیا کا سب سے بھلا آدمی دکھائی
ویسے بھی اکرم جیسے گھاگ شخص کے لیے اس دیہاتی لڑکے کو اپنے جال میں پھانسنا قطعی مشکل ثابت نہیں
خانو اور دوسرا ساتھی دکھاوے کے لیے اسٹیشن ہی پر رُک گئے اور پھر اکرم اور جوڑے کے پلیٹ فارم سے
ہی دوسرے راستے سے کال گڑھ کے لیے نکل پڑے۔ اکرم جیپ میں رحیم بخش اور سکینہ کو لیے سیدھا کال
کے قلعے پہنچ گیا اور انہیں بیرونی احاطے کے ایک مہمان خانے میں چھوڑ کر جبروت کو اپنے ''کارنامے''
اطلاع دینے چلا گیا۔ سکینہ اور رحیم بخش کے لیے کچھ ہی دیر میں ایک خادمہ کھانا لیے پہنچ گئی۔ رحیم کو کچھ
تھی۔ اُس نے خادمہ سے کہا کہ انہیں واپس پلیٹ فارم پہنچنا ہے لہٰذا یہ کھانے وغیرہ کا تکلف نہ کیا جائے
خادمہ نے اُسے بتایا کہ اکرم ٹرین کے باقی مسافروں کے لیے پانی اور کھانے وغیرہ کا انتظام کر کے جب
آئے گا، تب تک اُسے یہی حکم ہے کہ جوڑے کو کھانا کھلا دیا جائے۔ خادمہ نے کھانے کے دوران سکی
پھولوں والی اوڑھنی کی بہت تعریف کی۔ سکینہ نے اُسے بتایا کہ یہ چادر اُس کی بوڑھی نانی نے اس بڑھاپے
بھی خاص اپنے ہاتھوں سے سکینہ کی شادی کے لیے کاڑھی ہے۔ خادمہ نے درخواست کی کہ سکینہ جب
یہاں سے دوبارہ گزرے اُس کے لیے بھی ایسی چادر ضرور بنواتی لائے۔ سکینہ نے بھی وعدہ کر لیا۔ اُن کی
گپیوں میں رحیم بخش اور سکینہ نے کھانا کھا لیا اور خادمہ برتن لے کر واپس چلی گئی۔ اس کے بعد رحیم بخش کی

لی تو سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر جھٹکے سے کھڑا ہوا تو بستر سے گرتے گرتے بچا۔ ایک دوسرا جھٹکا اُس
نتظر تھا۔ وہ اُسی خادمہ کے کمرے میں موجود تھا۔ جو رات اُسے کھانا دینے آئی تھی۔ رحیم نے چلا کر اُس سے
چھا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور سکینہ کہاں ہے.....؟'' خادمہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی باہر کا دروازہ
زور سے پیٹا جانے لگا۔ رحیم بخش نے دروازہ کھولا تو تین چار مرد غصے میں تن تناتے ہوئے اندر داخل
گئے اور آتے ہی رحیم بخش پر چڑھ دوڑے کہ وہ قلعے کی خادمہ کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ رحیم چلاتا ہی رہ
ا کہ وہ تو خود اپنی سکینہ کو تلاش کر رہا ہے لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور بات اتنی بڑھی کہ قلعہ دار کی عدالت کا
ازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہاں اکرم اور خانو کو جبروت کے دائیں بائیں کھڑے دیکھ کر رحیم کو سارا ماجرا سمجھ آ گیا کہ
ں کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اُس کے ہزار چیخنے چلانے کے باوجود اُس پر خادمہ کے کمرے میں
دستی نشے کے عالم میں داخل ہونے کا الزام لگا کر صحرا پار کرنے کی سزا سنا دی گئی۔ البتہ اُس وقت جبروت کا
ر عام نہیں تھا۔ قلعے کے اندر صرف اُس کے چند خاص کارندے ہی موجود تھے۔ سکینہ کو اُس رات بستی کی
نی سمت ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور جبروت کے حکم ہی پر اگلی رات اُسے خانو اور اکرم اُٹھا لائے
۔ آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ رحیم کبھی وہ صحرا پار نہیں کر سکا۔ سکینہ اُس رات جبروت کی خواب گاہ پہنچا دی
، لیکن تب بھی وہ ایک زندہ لاش ہی تھی اور جب صبح اُسے باہر نکالا گیا، تب وہ اس سانس لینے کے تکلف
بھی آزاد ہو چکی تھی۔ کچھ نے کہا کہ وہ خود ہی پھندا لے کر اس ذلت بھری زندگی سے منہ موڑ گئی اور کچھ نے
ے بھی جبروت کے قاتل پنجوں کے دباؤ کا شاخسانہ قرار دیا۔ بہر حال سکینہ مر گئی..... خانو چپ ہو کر ہانپنے لگ
اور میرے زمین و آسمان ایک ہونے لگے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے صرف سکینہ ہی نہیں مری، کال گڑھ
ہر گھر میں موت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔ تب ہی اس بستی میں مجھے ہر پل ماتم کی سی کیفیت محسوس
ا تھی۔ کہتے ہیں، کچھ خون ایسے ہوتے ہیں جنہیں زمین کا دامن بھی خود میں سمیٹنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ خانو
زور سے رو رہا تھا۔ ''جس دن سے سکینہ مری ہے، میں ایک لمحہ بھی چین سے جی نہیں پایا۔ مجھے یوں لگتا ہے
ر پل میرے آس پاس پھرتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ مجھے کیوں مار دیا۔ ابھی تو میں نے جینا بھی نہیں
ا تھا۔ ابھی تو شادی کا پرندہ بھی میرے بالوں سے نہیں کھلا تھا۔ ابھی تو مجھے تتلیاں پکڑنی تھیں۔ جگنوؤں
پیچھے بھاگنا تھا۔ ابھی تو مجھے اپنے رحیم بخش کے ساتھ رنگوں کی پہچان کرنی تھی۔ ابھی تو میری کئی خواہشیں
تھیں۔ پھر تم نے ان کا گلا کیوں گھونٹ دیا۔'' خانو نہ جانے کیا کیا بولتا رہا اور میرا چہرہ نمکین پانی سے جلنے
جانے وہ میری کون تھی۔ مجھے ہی اُس کی شبیہہ اُس کی موت کے بعد کیوں دکھائی دی؟ کیا واقعی آواز کی
سا کی طرح ہماری تصویریں بھی خلا کی کسی تہ میں ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتی ہیں۔ جس طرح لوگ اپنی
ت کے بعد بھی خوابوں میں زندہ نظر آتے ہیں، کیا میں بھی کسی ایسے ہی خواب کا شکار ہوا تھا؟ کیا یہ صحرا مجھے
لوئی سچا خواب دکھا رہا تھا۔ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا۔ میں روتے ہوئے خانو کو دو بول تسلی کے بھی نہ

کہہ سکا۔ پھر اچانک جیسے وہ خود ہی ہوش میں آ گیا۔ ''سنو عبداللہ..... مجھے تم سے کچھ بہت ضروری با
ہیں۔ میں نے ساری زندگی کوئی نیک کام نہیں کیا ور شاید میرا آخری وقت بھی اب کچھ زیادہ دُور نہ
جاتے جاتے میں ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہوں۔ کل صبح جس صحرا سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ اس سے پہلے
کتنے معصوموں کا لہو پی چکا ہے، لیکن اگر تم میری چند باتیں دھیان سے ذہن نشین کر لو تو تم اس صحرا اور
کے درندہ نما کتوں کو شکست دے سکتے ہو۔ تمہیں صحرا میں جس سمت دوڑنے کو کہا جائے گا، بظاہر اس
تاثر ملے گا کہ اگر تم سیدھ میں دوڑتے رہے تو ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے اور تمہاری جاں بخشی
گی۔ یہ درست نہیں۔ اوّل تو یہ خوں خوار صحرا ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اسٹیشن تک پہنچنا ہی نا کا
ہے۔ لیکن بالفرض کوئی خوش قسمت اسٹیشن تک پہنچ بھی جائے تو وہاں اُسے اکرم اپنا انتظار کرتا ہوا ملے
پندرہ منٹ تک لگاتار بھاگنے کے بعد ساتویں بڑے ٹیلے سے دائیں جانب کو مُڑ جانا۔ کتے تمہاری
جانب پلٹیں گے، لیکن تب مقابلہ برابر کا ہوگا، کیوں کہ اُن کے لیے بھی تمہاری طرح یہ علاقہ بالکل
گا۔ وہاں سے ٹھیک سات میل کے فاصلے پر سرحد کی جانب سے آتی ایک نیم پختہ سڑک گزرتی ہے
سڑک تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ آدھی جنگ تم جیت گئے۔ کیوں کہ سڑک پر مشرق کی طرف دوڑتے رہنے
تمہیں فوج کی کوئی چوکی مل جائے گی یا پھر کیکڑا.....'' میں نے حیرت سے دہرایا ''کیکڑا.....؟'' ''ہاں
مال برداری اور مسافروں کے لیے سرحد کی طرف سے جو کھلے ٹرک نما عجیب ہیئت کی گاڑی چلتی ہے، ا
یہاں کیکڑا کہتے ہیں۔ یہ سواری تمہیں کسی بھی سرحدی بستی تک پہنچا دے گی، جہاں سے تم اپنی مرضی
پناہ تک پہنچ سکتے ہو۔ لیکن یاد رکھنا..... تمہیں مستقل بھاگتے رہنا ہوگا۔ پچھلے دنوں یہاں بارش ہوئی
قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو شاید راستے میں تمہیں کوئی برساتی جوہڑ مل جائے لیکن ہوشیار رہنا دو گھو
زیادہ پانی پینے کی کوشش کی تو وہیں گر جاؤ گے۔ صرف ہونٹ تر کر کے آگے بڑھ جانا۔ اس شدید پیاس
بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہوگا۔ اور تمہارا دل بند کر دے گا۔ ایک اور ضروری بات، کوشش کرنا کہ
دوڑتے وقت سانس منہ کی بجائے ناک سے لو اور سورج کو براہ راست دیکھنے سے مکمل گریز کرنا۔ جو
کرنیفے میں اُڑس لینا، پھینکنا نہیں۔ پاؤں شروع میں گرم ریت میں جھلسیں گے لیکن تلوؤں کی جلد پو
جل جانے کے بعد احساس ختم ہو جائے گا۔ پانی میسر آتے ہی کوئی رومال وغیرہ اچھی طرح بھگو کر سر
لینا۔ اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ بھاگتے رہنا۔ یہ تین ساڑھے تین گھنٹے تمہیں اپنی زندگی کی دوڑ دوڑ
ہی جیتنی ہے۔ اگر گناہ گاروں کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں تو میں آج زندگی میں پہلی اور آخری دعا
کہ خدا تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے.....'' خانو کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ مجھے رہ رہ کر سکینہ کے بوڑھے نانا نانی کا دھیان ستا رہا تھا۔ اگ
کہ میں دوبارہ اُن کا سامنا کرنے سے پہلے ہی صحرا کی ریت میں خاک ہو جاؤں ورنہ میں انہیں کیسے

اُن کی لاڈلی سکینہ بھی اب مٹی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں نے خانو سے آخری سوال پوچھا ''کیا تمہیں سکینہ کی قبر کا کچھ اتا پتا معلوم ہے۔ اُس کے ورثاء کو اور کچھ نہیں تو اُس کی لحد کا نظارہ ہی نصیب ہو جائے تو شاید اُن بدنصیبوں کو کچھ قرار مل سکے.....'' خانو کچھ سوچ میں پڑ گیا ''یہاں کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جنہیں باقاعدہ کوئی قبر نصیب ہوتی ہے۔ ٹھہرو مجھے سوچنے دو۔ سکینہ کو تو شاید اسی احاطے میں دفنایا گیا تھا۔'' ''کیا.....؟'' لفظ تھے کہ انگارے..... میری سانسیں رُکنے لگیں۔ ''اسی احاطے میں دفنایا تھا۔ ٹھیک سے یاد کرو، کہاں۔ یہ بہت ضروری ہے خانو.....'' خانو نے اپنا سر پیٹا ''ارے ہاں..... یہی تو جگہ تھی۔ اِسی برآمدے میں دائیں جانب سے ساتویں کوٹھڑی تھی۔ ہاں ہاں، ساتویں کوٹھڑی ہی میں اُسے دفنایا تھا ہم نے۔'' خانو کی بات سنتے ہی میں چکرا کر اپنی جگہ ڈھے سا گیا۔ زمین کی گردش رُک گئی۔ آسمان پلٹ گیا اور زمین اوندھی ہو گئی۔ مجھے جس کوٹھڑی میں قید کیا گیا تھا، اس کا نمبر داہنی طرف سے ساتواں ہی تھا۔ سکینہ اِسی زمین کے نیچے دفن تھی، جہاں میں اس وقت اپنا شکستہ وجود لیے بیٹھا تھا۔

اک نئی جنگ

سورج نکلنے تک میں وہیں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے پاؤں آخری
حد تک سکیڑ کر گھٹنے اپنے سینے کے ساتھ اُس وقت تک جوڑے رکھے، جب تک مجھے لینے والے وہاں پہنچ
گئے۔ میں اُس مظلوم لڑکی کے لیے اور تو کچھ نہ کر پایا لیکن اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ اُس کے مدفن پر اپنے پا
پھیلا کر نہ بیٹھوں۔ باہر آہٹیں بلند ہوئیں تو میں نے خانو کو الوداع کہا۔ ''میں جا رہا ہوں دوست۔ اگر تم یہ
سے زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اتنا ضرور یاد رکھنا کہ کفارے کی آس تو آخری سانس تک رہتی ہے۔'' م
بات پوری ہونے سے قبل ہی پہرے دار آ پہنچے۔ خانو کی آخری آواز، جو میرے کانوں تک پہنچی وہ ''رب را
تھی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے جیپ میں بٹھا کر بستی کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ پوری بستی کے مرد وہاں م
تھے۔ جبروت کے کارندے اور محافظ بھی اسلحہ سنبھالے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ سلطان بابا
وہاں لے آئے۔ اب شاید صرف جبروت اور اُس کے کتوں کا انتظار باقی تھا۔ سلطان بابا میری جانب بڑ
پہرے داروں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ انہوں نے تسبیح ختم کی اور مجھ پر پھونک دیا۔ ''جب تک ہماری ایک
سانس باقی ہے، موت زندگی کی خود سب سے بڑی محافظ ہوتی ہے۔ یہ دنیا صرف ابتدا ہے۔ انتہا کا سفر ا
سے پرے شروع ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، ورنہ میں انہیں آگے بڑ
گلے لگا لیتا۔ مجھے اپنے اس آخری سفر سے پہلے اس زادِ راہ کی اشد ضرورت تھی۔ انہوں نے شاید میری آ
کی تحریر پڑھ لی اور خود ہی بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا، ''جیتے رہو۔'' اُن کے منہ سے بے ساختہ نکلنے والی اس د
اہمیت آج مجھ سے زیادہ بھلا اور کسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں جبروت اپنی مخصوص جیپ میں
لاڈلے کتوں سمیت دُور صحرا سے نمودار ہوتا نظر آیا۔ ریت سے اُٹھتی گرم لہروں کے پس منظر میں اُس کی
شفاف پانی میں تیرتی نظر آ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ جبروت ایک بہ
شعبدہ باز ہے۔ وہ ایسے کھیل صرف اپنی تفریحِ طبع کے لیے کھیلتا ہے۔ پھر چاہے وہ رحیم اور سکینہ کا معا
نوری اور عبداللہ کا قصہ۔ دونوں جگہ وہ پوری طرح مختار تھا کہ بنا کسی حجت کے بھی۔ مجھے اور رحیم کو د
میں ختم کروا سکتا تھا۔ بغیر کسی عدالت اور فیصلے کے ڈھونگ کے بھی وہ ہماری جان لے سکتا تھا۔ یہاں اُ
پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر آس پاس کے علاقے کی پولیس اور قانون خاموش تھا تو ضرور اس کے پیچھے
کا اثر و رسوخ شامل ہوگا۔ کال گڑھ تو ایک جنگل تھا اور اس جنگل میں صرف جبروت نامی بادشاہ کا قانو

جانے ان نسلوں سے غلام چلے آتے لوگوں کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہیں
ں۔ غلامی زنجیروں میں بندھے رہنے ہی کا نام نہیں ہوتا۔ غلامی تو ایک خاص رویے کا نام ہے، جو ذہنوں کو
ر کر لینے سے وابستہ ہے اور جبروت کو پتا تھا کہ ذہنوں کو مسخر کیسے کیا جاتا ہے۔ رُوحوں کا تو پتا نہیں، پر
وں کو تسخیر کرنے کے لیے وہ خوف کے ہتھیار کا استعمال کرتا تھا۔ اُسے لوگوں کو حیران اور خوف زدہ کر کے مزا
تھا۔ یہ سارا تماشا اُس نے اپنے جنون کی سیرابی کے لیے ہی لگا رکھا تھا۔ دو تین سال پہلے میں اور میرا
ت، کاشف لندن گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے گئے تھے تو ہمیں پکاڈلی کے علاقے میں ایک عجیب
ب کے بارے میں پتا چلا تھا۔ وہاں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہوئے
ھا۔ وہاں لوگ اسے ایڈرنالین رَش (Adernaline Rush) کا کھیل کہتے تھے۔ ہمارے جسم میں موجود
ماڈے (ہارمون) کے بہنے کا تعلق شدید خوف سے ہوتا ہے۔ مغرب میں جہاں لوگ ہر قسم کے تعیش
ر بے سے گزر چکے ہوتے ہیں، اُن کے لیے زندگی ایک بے کیف سا معمول بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے میں
ن چلے اپنے جسم میں خون کی روانی بحال رکھنے کے لیے عجیب و غریب قسم کے مشاغل اختیار کر لیتے ہیں۔
ا بہت بلندی سے چھلانگ لگا لیتا ہے، کچھ سانس بند کرنے کی کوشش میں جان سے جاتے ہیں، کچھ ریوالور
ایک چیمبر میں گولی رکھ کر ٹریگر دبانے کا کھیل کھیلتے ہیں اور کچھ وائٹ گولڈ (ہیروئن کی ایک نئی قسم) کے
ب کو اپنے نتھنوں کے ذریعے اس طرح دماغ کے خلیوں تک پہنچاتے ہیں کہ پھر وہ سدا کے لیے کسی اور
ا کے باسی بن جاتے ہیں۔ لیکن اس ایڈرنالین رَش (Adernaline Rush) کا یہ جان لیوا نشہ باقی
نشوں کا سرتاج بن جاتا ہے۔ وہ خود کو موت کے منہ میں دھکیل کر اس قضا کو پل پل اپنی رگوں میں اُترتا ہوا
ں کرنے میں ایسی سدا بہار لذت پاتے ہیں، جو انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتی ہے۔ جبروت
ایسے ہی کسی نشے کا شکار اور رسیا تھا۔ یہ بات مجھے اُسی دن محسوس کر لینی چاہیے تھی، جب میں نے اُسے
سے اپنے کتے لڑاتے اور خون کے چھینٹے اُڑتے دیکھ کر ہیجانی انداز میں خوشی مناتے ہوئے دیکھا
ھیک ایسی ہی خوشی وہ اُس وقت بھی محسوس کرتا ہوگا، جب اُس کے پالتو شکاری صحرا میں اپنے شکار کی
ٹی کر کے اُس کے خون آلود کپڑے اپنے جبڑوں میں دبائے واپس اپنے آقا کے پاس دوڑے چلے آتے
۔ مغرب ایسے جنونیوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے، جو صرف ہیجان کی خاطر قاتل بنے اور پھر کبھی جیک
پر (Jack The Ripper)۔ کبھی فرینکنسٹائن (Frankinstine) اور کبھی فریڈی کے نام سے مشہور
ے۔ ٹھیک اُسی طرح اس وقت میرے سامنے جیپ سے اُتر کر اپنے کتوں کو والہانہ پیار کرنے والا یہ جنونی
بھی کسی ایسی ہی نفسیاتی بیماری کا شکار تھا۔ جسے خود کو جابر سے جبروت بنانے میں جانے کتنے سال لگے
گے۔ کہتے ہیں، نام بھی ہماری شخصیت پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس کا ایک مظاہرہ تو میں اپنے سامنے ہی
ہا تھا۔ جبروت اپنے کتوں کو پیار کر کے میری طرف بڑھا۔ ”ہاں تو تم تیار ہو، مقابلے کے لیے۔ اب بھی

وقت ہے اگر تم اپنے جرم کا اقرار کرلو اور مجھ سے معافی مانگ لو تو تمہاری سزا میں کمی کی جاسکتی ہے،
جی.....'' جبروت کی آنکھوں میں صرف اور صرف تضحیک تھی۔ میں نے چند لمحے اُس کی جانب غور سے
''اگر میں نے تم سے معافی مانگ لی تو تمہارا یہ کھیل ادھورا رہ جائے گا۔ پھر شاید میں نہیں تو کوئی اور اس ج
بھینٹ چڑھ جائے کیوں کہ تمہیں تو بہر حال یہ خونی تماشا کرنا ہی ہے کیوں کہ صرف اِسی صورت تمہار
بھڑکتی یہ لہو کی پیاس شاید کچھ دنوں کے لیے بجھ جائے گی۔ ہو سکے تو آج یہاں سے فراغت پانے کے
کے کسی بڑے ماہر نفسیات سے مل لینا۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔'' وہ کچھ دیر میری جانب عجیب
میں دیکھتا رہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ''یا تو تم واقعی بہادر ہو یا پھر موت کو اتنے قریب پا کر ہر خوا
تمہارے ذہن سے مٹ گیا ہے۔ مجھے بھی روتے گڑگڑاتے اور پیروں میں پڑتے دشمن اچھے نہیں لگتے
میں انہیں بھی مارتا تو ضرور ہوں لیکن عزت کی موت نہیں۔ تم نے البتہ آج اپنے لیے ایک باوقار مو
ہے۔ اطمینان رکھو، تمہاری موت کے بعد بھی کال گڑھ میں تمہارا نام غیرت مند دشمنوں کی فہرست
جائے گا۔'' جبروت اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا۔ میں نے ہجوم اور سلطان بابا پر الوداعی نظر ڈالی ا
میں دوڑ شروع کرنے کے نشان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مجھے غرّاتے، گھورتے اور اپنے خوں خوار جبڑو
رال ٹپکاتے قد آور کتوں کے بے حد قریب سے گزارا گیا تا کہ وہ میرے جسم کی بُو کو اپنے دماغ کے خلیو
اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ جس وقت میں ان چھ کتوں کے قریب سے، اپنا جسم اُن کے جبڑوں
کرتے ہوئے گزر رہا تھا، میری رگوں میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید میرے اندر بھ
ایڈرنالین نامی ہارمون کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا، جس کی لذت پانے کے لیے جبروت تپتی دھوپ میں
تماشا دیکھ رہا تھا۔ میری اور اُس کی کیفیت میں فرق صرف اتنا تھا کہ میری کیفیت میرے متوقع خون بہنے
سے تھی جب کہ جبروت کا ایڈرنالین دوسروں کا خون بہتے دیکھ کر اُس کے اندر دوڑتا تھا۔ اُس نے اپنی کا
بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا ''اب سے ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ان کتوں کے پٹے کھول
جائیں گے۔ تم یہاں سے ٹھیک اپنی سیدھ میں دوڑ دگے تو ایک گھنٹے بعد ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جاؤ گے
شرط صرف اتنی سی ہے کہ میرے یہ پالتو شیر اس سے پہلے تم تک نہ پہنچ جائیں اور ہاں بے فکر رہو یہ سد
ہوئے ہیں لہٰذا یہ اسٹیشن کی عمارت دیکھتے ہی دُور سے پلٹ جائیں گے۔ تو کہو، تم تیار ہو؟'' میں نے م
''ہاں'' کہا اور جبروت کا اشارہ پاتے ہی صحرا میں دوڑ لگا دی۔ پہلے دو تین منٹ تو مجھے کچھ احساس ہی نہ
لیکن جیسے ہی میں نے پہلا ٹیلا پار کر کے خانو کی ہدایت کے مطابق اپنے جوتے اُتارے، ایک لمحے کے
یوں محسوس ہوا، جیسے ہزاروں ننھے مُنے انگارے میرے تلوؤں سے ہوتے ہوئے، خون کے اندر سرایت کر
ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے دن ہی میں تارے نظر آ گئے اور میں نے بے اختیار اپنی ہتھیلیوں سے اپنے تلو
یکے بعد دیگرے اس آگ کی تپش سے بچانے کی کوشش کی، لیکن میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ

سب کچھ کر پاتا۔ میرے ذہن میں بار بار خانو کا ایک جملہ گونج رہا تھا "یاد رکھنا، تمہیں ہر حال میں بس دوڑتے ہی رہنا ہے۔" میں نے شدید تکلیف سے کراہتے ہوئے مجبوراً اس آگ کے سمندر میں دوبارہ پاؤں ڈال دیئے۔ صحرا کے پہلے پانچ منٹ ہی نے میرا وہ حال کر دیا تھا، جو کسی ایسے خستہ حال شخص کا ہو سکتا تھا، جو اس تپتے ریگ زار میں برسوں سے بھٹک رہا ہو۔ میرے ہونٹ خشک ہو کر چٹخنے لگے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے، حلق میں ہزاروں کانٹے چبھنے لگے۔ بے اختیار میں نے منہ سے سانس لینے کی کوشش کی تا کہ حلق میں لگی آگ کو کچھ ٹھنڈک ملے لیکن پہلے ہی سانس میں اُڑتی ریت کے بگولے سے ہزاروں ذرّے کسی خاردار تار کی طرح میرے گلے سے ہوتے ہوئے سانس کی نالی میں اٹک گئے اور مجھے زور دار کھانسی کا پھندا لگا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ خانو کی آواز پھر ذہن کے کسی گوشے سے ٹکرائی "منہ سے سانس لینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔" میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ پانچواں ٹیلا پار کرتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پاؤں کے تلوؤں میں پہلے منٹ میں جوتے اُتارتے ہی جو چھالے بنے تھے، وہ ایک ایک کر کے پھٹنے لگے اور مجھے ہر چھالا پھٹنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے پیروں پر ہزاروں نشتر لگا کر مجھے ان کھلے زخموں کے ساتھ نمک کے سمندر پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو اور وہ نمک میرے کھلے منہ والوں زخموں سے، خون میں مل کر اسے جلا رہا ہو، کھولا رہا ہو۔ اس تُرش نمک کی کڑواہٹ مجھے اپنے حلق میں، سارے جسم میں دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ دسویں منٹ کے ختم ہوتے ہی وہ تپتے جہنم جیسا صحرا میرے ساتھ کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے اپنے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹھاٹھیں مارتا ایک وسیع سمندر دکھائی دیا۔ ارے اتنا بہت سا پانی۔ میں اپنی سمت بھول کر اس جانب لپکا۔ میرے اندر بیٹھا خانو چلایا "براہ راست سورج کو نہ دیکھنا....." لیکن کچھ لمحے پہلے ہی میری نظر اس قہر برساتے گولے پر غیر اختیاری طور پر پڑ چکی تھی۔ یہ سامنے بہتا سمندر اور شفاف لہریں اسی سورج کی جھلتی کرنوں سے ملی میری نظر کا شاخسانہ تھیں۔ مجھے زور کا ایک چکر آیا اور میں اپنی ہی جھونک میں لڑھکتے ہوئے ٹیلے سے نیچے جا گرا۔ میری آنکھوں میں ریت پڑ گئی اور کچھ دیر کے لیے میں اندھا سا ہو گیا۔ اچانک دور کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ میری ساری حسیں جیسے ایک ساتھ ہی بیدار ہو گئیں۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ جبروت نے اپنے کتے میرے تعاقب میں کھول دیئے ہیں۔ اگر مجھے یہاں یہ آواز سنائی دے رہی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میں اتنی دیر تک دوڑنے کے باوجود ابھی آغاز کے مقام سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ سامنے ہی میری جلتی آنکھوں نے ساتویں ٹیلے کے آثار دیکھے اور میرے شدید تھکے، ٹوٹے اور شکستہ جسم نے ایک اور کوشش کی۔ اچانک میرے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ خانو نے کیا کہا تھا۔ ساتویں ٹیلے سے دائیں یا بائیں.....؟ شاید دائیں.....؟ نہیں نہیں بائیں جانب، لیکن.....شاید دائیں.....؟ میں سرپٹ دوڑ تو رہا تھا لیکن میرا ذہن جیسے سُن سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ساتواں ٹیلا ریت کی ایک ڈھیری سے بڑا ہوتے ہوئے ایک سونی پہاڑی میں تبدیل ہوتا گیا اور پھر جیسے ہی میں دوڑتے ہوئے اس کے اُوپر چڑھا تو میرے ذہن نے

میکانیکی انداز میں فیصلہ دے دیا۔ دائیں جانب..... اور میں مشینی انداز میں داہنی طرف مُڑ گیا۔ شدید
سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ بس ایک بوند پانی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پھر
مجھے موت ہی کیوں نہ آجائے۔ اچانک میری نظر دُور صحرا میں چمکتے ایک سکّے پر پڑی جو دھوپ کی کرنو
جگمگا رہا تھا لیکن یہ طلائی سکہ یہاں.....؟ اور پھر وہ جگمگاتا سکہ بڑا ہوتا گیا۔ ارے..... یہ تو لوہے کی ایک
سی پرات تھی۔ نہیں۔ اوہ میرے خدا، یہ تو چھوٹا سا جوہڑ تھا۔ بارش کے پانی سے بنا ایک چھوٹا سا جوہڑ، جو
بڑے ٹیلے کی آڑ میں عمودی رُخ پر اس طرح بنا تھا کہ دھوپ براہِ راست وہاں نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ کیا دع
اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ کیا اس صحرا سے عرش بریں کچھ زیادہ ہی قریب تھا یا پھر میرا آخری وقت آ
آ رہا تھا کہ فرشتوں نے میرے حساب کتاب کے بستے سمیٹتے سمیٹتے میری آخری دعائیں بھی سمیٹنا شروع کر
تھیں۔ میں کسی دیوانے کی طرح دوڑتے ہوئے جوہڑ کے قریب پہنچا اور میرا شدید جی چاہا کہ اپنا سر
گدلے پانی میں ڈال کر وہیں پڑ جاؤں۔ اس وقت وہ چھوٹا سا جوہڑ کیا، میں پورا دریا بھی ایک ہی گھونٹ
پی جانا چاہتا تھا۔ ''خبردار..... گھونٹ بھر پینے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دل بند ہو جائے گا۔'' میں نے خ
''نہیں، اب اور کوئی نصیحت نہیں۔ اس شدید پیاس کے عالم میں مرنے سے تو بہتر ہے کہ میں دو گھونٹ پی
مر جاؤں۔'' اُس وقت مجھے ادراک ہوا کہ لوگ مرنے سے پہلے پانی کیوں مانگتے ہیں۔ میری نسوں میں
خون گاڑھا ہو کر میرے اندر موجود پانی کا آخری قطرہ تک چوس چکا تھا۔ مجھے یوں گا، جیسے کنپٹی پر پھڑکتی
نس اس زور سے پھٹے گی کہ سارے صحرا کو لال کر جائے گی۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں میں پانی بھرا اور
پھر چھم سے کود کر میرے سامنے کسی کے بندھے ہاتھوں کی صورت آن کھڑا ہوا۔ ''نہیں عبداللہ، نہیں۔ یہ
نہیں موت ہے۔'' دفعتاً میری ہتھیلی میں کوئی موٹی سوئی زور سے گڑ گئی۔ تکلیف سے میری چیخ نکلتے نکلتے
اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن کے کٹورے
ابھی تک جوہڑ سے نکالا گیا پانی ٹپک ٹپک کر گر رہا تھا۔ ایک لمبی اور موٹی سی کالی جونک میری ہتھیلی کی جلد
ماس تک اپنے نوکیلے دانت گاڑ چکی تھی اور ایک دوسری جونک چلتی ہوئی میری کلائی کے قریب خون چوسنے
لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر پانی پھینک دیا۔ کلائی والی جونک تو پانی
بہاؤ کے ساتھ ہی گر گئی لیکن ہتھیلی والی سرمئی جونک، میرے سیاہ مقدر کی طرح میرے گوشت سے چپکی ہی رہی
درد، جلن اور چبھن کی ایک کٹیلی لہر میری اُنگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی، پورے بازو میں پھیل گئی۔ میرا
نیلا پڑنے لگا اور میں نے بے اختیار شدید تکلیف کے عالم میں اپنا ہاتھ گرم جلتی ریت میں گھونپ دیا۔ جونک
نازک اور لجلجی سی چمکیلی جلد سے شدید تپتی ریت ٹکرائی تو ہلکی سی ایسی آواز بلند ہوئی، جیسے جلتے ہوئے انگا
پر کوئی پانی کا چھینٹا مار دے۔ جونک تڑپ کر اُچھلی اور اس کا نوکیلا ڈنک میری ہتھیلی سے نکل گیا۔ میں
کانپتے ہاتھوں سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر پانی میں بھگویا اور اسے اپنے خشک چٹختے ہونٹوں سے لگا

رے ہونٹوں کی جلی ہوئی جلد کو ذرا سی نمی میسر آئی تو اِن کی حالت مزید خراب ہوگئی اور خون کی پتلی سی چند
بریں رُومال کی سطح پر اُبھر آئیں۔ دوسری مرتبہ بھیگا رُومال میں نے چہرے پر پھیرا اور تیسری مرتبہ اُسے بھگو
راپنے سر پر باندھ ہی رہا تھا کہ مجھے میری قضا کی آوازیں سنائی دینی لگیں۔ ہاں..... یہ وہی بھونکتے کتوں
دوڑنے اور غرّانے کی آواز تھی۔ مطلب وہ قریب تر ہو رہے تھے۔ میں اُٹھ کر بھاگا۔ فی الحال وہ مجھے نظر
ں آ رہے تھے اور مجھے ایک گمان یہ بھی تھا کہ ساتویں ٹیلے کے بعد اگر وہ اپنی جھونک میں مزید کچھ آگے بڑھ
ے تو انہیں پلٹنے میں دو چار منٹ مزید لگیں گے کیوں کہ اس وقت صحرا میں چلتی گرم لُو کا رُخ بھی اُسی سمت تھا،
ی طرف میں دوڑ رہا تھا۔ لہٰذا اُن تک میرے جسم کی بُو پہنچتے پہنچتے بھی کچھ وقت ضرور لگے گا۔ لیکن اب خود
ی اپنی رُوح دھیرے دھیرے میرے اندر سے سرکنا شروع ہو چکی تھی۔ اگر میں پچھلے چھ مہینوں سے سلطان
کے ساتھ اتنا پیدل نہ چلا ہوتا اور میں نے جبل پور کے بسیرے کے دوران پہاڑی والی درگاہ کے دشوار راستے
انہ کئی بار طے نہ کیے ہوتے تو میں یقیناً بہت پہلے ہی گر چکا ہوتا۔ کیوں کہ کالج اور یونیورسٹی میں اسپورٹس
بعد صرف ایک گھنٹہ روزانہ اسکوائش کا کھیل ہی میری واحد ورزش رہ گیا تھا اور آج اس صحرا نے مجھے ''دوڑ''
مل مطلب سمجھا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے ریت کے بگولوں کے عقب سے اُس پہلے عفریت کو نمودار
تے دیکھا۔ میرا شک صحیح تھا۔ ساتویں ٹیلے کے بعد وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے اور یہ پہلا تھا، جس نے
لو پالی تھی۔ میرے قدم تیز ہو گئے لیکن اس کی غرّاہٹیں بتدریج قریب آنے لگیں۔ میرے پاس پیچھے مڑ کر
نے کا وقت نہیں تھا۔ میری اُلجھی سانسیں خود ایک غرّاہٹ میں تبدیل ہونے لگیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے
بھی تو ایک درندہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اُن آخری لمحات میں میرے اندر کا درندہ بھی بیدار ہو گیا۔ اب میں
للہ یا ساحر نہیں..... صرف ایک انسان باقی رہ گیا تھا، جسے اپنی جان بچانے کے لیے ایک خونی عفریت کا
نا تھا۔ پتھر کے دور کے انسان کی تمام جبلتیں ایک دم ہی میرے اندر انگڑائی لے کر جاگ چکی تھیں اور اب
تے ہوئے میری نظر چاروں جانب کچھ ایسا تلاش کر رہی تھیں، جسے میں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار کے طور
ستعمال کر سکتا۔ غرّاہٹیں اب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تھیں۔ ساتھ ہی ریت پر دوڑنے کی دھمک اور
پ دھپ کی آوازیں میرے حواس معطل کیے دے رہی تھیں۔ میرا دشمن بہترین سدھائے ہوئے شکاری کی
ح بنا بھونکے اور حتی الامکان آواز نکالے بغیر میرے تعاقب میں تھا۔ اچانک ریت میں دبی ایک خشک ٹہنی
ڑی پر میری نظر پڑی اور میں اُسے اُٹھانے کے لیے جھکا اور یہی میری غلطی تھیں۔ لکڑی اندر تک ریت میں
ما ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ چھلنے کے باوجود وہ پوری طرح باہر نہیں نکلی لیکن اس اثنا میں پہلا دشمن میرے سر
آ چکا تھا۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے دوڑتے ہوئے بنا رُکے مجھ پر زقند بھری اور ٹھیک
لمحے وہ لکڑی ریت سے نکل آئی، جسے میں وحشیانہ انداز میں طاقت لگا کر باہر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں
بر اختیاری طور پر وہ خشک لکڑی پوری قوت سے فضا میں لہرائی اور پتا نہیں کتے کو وہ چھڑی کتنی زور سے لگی

کہ اُس کے مُنہ سے ایک سسکی کی آواز نکلی۔ میں ایک جانب اور وہ دوسری جانب جا گرا۔ لیکن اُس نے پلٹ
جھپٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ لکڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی لہٰذا اب مجھے اپنے شکا
بازوؤں ہی پر بھروسا کرنا تھا۔ لیکن وہ بھاری بھرکم وجود اپنے پورے بوجھ کے ساتھ میرے سینے پر گرا تو میر
ہاتھ جیسے ٹوٹ ہی تو گئے۔ اُس کے خونی پنجے میرے شانوں میں یوں پیوست ہوئے کہ کئی خراشوں میں مرچ
بھر گئیں۔ اس کی غرّاہٹیں اور گرم سانس میرے گالوں کو چھو رہی تھیں اور تھوتھنی سے بہتی رال کا دھارا
میری بائیں آنکھ کے اُوپر لٹک رہا تھا۔ اُس کے کھلے جبڑوں کے چاروں کونوں سے جھانکتے وہ چار لمبے نوکی
دانت عین میری شہ رگ میں گڑ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری اور اُس کی نظریں
جھنجھلایا ہوا تھا، اُسے میری مزاحمت بُری لگ رہی تھی۔ اُس کی نظر نے میری نظر سے کہا ''زیادہ مت تڑپو۔
اپنی جان مجھے سونپ دو، میرا مالک انتظار کرتا ہوگا.....'' میرے اندر کا درندہ غرّایا۔ ''نہیں، اتنی آسانی سے
نہیں.....'' اچانک ہی مجھے اس بے بس ریچھ کے پینترے یاد آ گئے۔ وہ ریچھ اس طرح کے کئی عفریتوں سے
ایک موٹی زنجیر سے بندھے ہونے کے باوجود آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ پوری لڑائی کے
دوران مستقل اپنا سر ہلا ہلا کر اپنے نرخرے کو ان کتوں کے جبڑوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مطلب ا
سدھائے ہوئے کتوں کا پہلا نشانہ مقابل کی شہ رگ ہی ہوتی ہے۔ اِسی لیے وہ اس وقت میرے سینے پر ہ
میری رگ جان میں اپنے دانت گاڑنے کی دیوانہ وار کوشش میں مصروف تھا۔ میرے حواس یکے بعد دیگر
پھر سے جامد ہونے لگے تھے۔ اصل میں مجھے اس وقت، اس کتے کے وجود سے اتنی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی جا
اس کی مستقل غرّاہٹ اور سانس کی خرخراہٹ میرے حواس معطل کیے جا رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احسا
ہوا کہ اگر کتے کی آواز سے یہ وحشیانہ صفت نکال دی جائے تو شاید اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔ ہمار
ہاتھوں پیروں میں سے آدھی جان نکالنے کے لیے وہ سب سے پہلے اِسی ہتھیار کا استعمال کرتا ہے۔ شاید
اثر سانپ کی پھنکار اور کسی بھی درندے کی دھاڑ میں بھی ہوتا ہے۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اب تک
کے چہرے کو اس کا گلا دبا کر اپنے چہرے سے دُور رکھنے میں کامیاب تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کامیا
عارضی ہے کیوں کہ میرے بازو شل ہو رہے تھے اور اس کے پنجے میرے سارے جسم پر جلتی خراشیں چھوڑ
جا رہے تھے۔ اچانک میری مٹھی میں کچھ ریت بھر گئی اور بے اختیار میں نے ساری کی ساری ریت اُس
قاتل آنکھوں میں جھونک دی۔ وہ زور سے چیخا اور ایک لمحے کے لیے اُس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میں
پوری قوت لگا کر اُسے اپنے اُوپر سے اُچھال کر دُور پھینک دیا۔ میرا کُرتا چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکا تھا
نے فوراً اُسے جسم سے علیحدہ کیا اور بچے کھچے کپڑے کو بھاگتے ہوئے اپنے گلے کے گرد اچھی طرح کس
باندھ لیا۔ اس کا شکار میری شہ رگ تھی تو مجھے سب سے پہلے اُسے ہی بچانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ تب تک
دشمن اپنا جسم جھٹک کر اپنی آنکھوں سے ریت جھاڑ چکا تھا اور پھر سے میرے پیچھے لپکنے کی تیاری میں تھا۔ اِ

ں پچھلے ٹیلے کی جانب سے اس کے گروہ کے دو اور ساتھی نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ کر انہوں نے خوشی سے
شیانہ آوازیں بلند کیں۔ میرے آخری لمحے شروع ہو چکے تھے۔ میری پوری کوشش کے باوجود میری رفتار مدھم
ہو چکی تھی اور قدم ریت میں دھنسنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے تین اطراف سے وہ تین کتے میرے جسم کو تین
صوں میں تقسیم کرنے کے لیے اُڑے چلے آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے
لطان بابا نظر آئے ''موت صرف جسم کا مقدر اور رُوح کی زندگی کی ابتدا ہے۔'' موت کے بارے میں ہم
ب ہی ساری زندگی سوچتے ہیں، سُنتے ہیں اور بات کرتے ہیں لیکن ٹھیک اس لمحے میں میں نے خود پر موت کو
ارد ہوتے محسوس کیا۔ ''اچھا تو یہ ہے وہ فسانہ، جس کا سارے شہر میں چرچا تھا۔'' اچانک مجھے سانول کی
نسری سنائی دی۔ وہ دُور سے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکراتے ہوئے مجھے بُلا رہا تھا۔ نہیں..... سانول کی بانسری
یں..... یہ تو اُس پیانو کی آواز تھی، جو پاپا ہمیں بچپن میں روزانہ ڈنر کے بعد میری اور مما کی فرمائش پر سُناتے
ھے۔ مما اور پاپا سفید ملبوسات میں اُسی بڑے سے کالے پیانو کے پاس کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے، ''بس
لرو ساحر، اب گھر واپس آ بھی جاؤ۔ کتنا انتظار کرواتے ہو تم۔'' کچھ ہی دیر میں اُسی پیانو کے سامنے زہرا سیاہ
اس میں بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''ساحر کیا میری ہر محبت ہمیشہ یونہی تشنہ رہے گی؟'' میں نے
گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو کاشف اور میرے باقی سارے دوست کالج میوزک شو کی تیاری کے لیے ڈرم
رگٹار بجا رہے تھے۔ کاشف چلایا ''اوئے ساحر کے بچے! آج پھر پریکٹس پر نہیں آئے تم۔'' نہیں یہ کالج کا
رم تو نہیں تھا، یہ تو وہی ڈھول تھا، جو جبروت کے ہرکارے ریچھ اور کتوں کی لڑائی کے دوران پیٹ رہے تھے۔
تے..... ہاں..... میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں..... میں ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ تینوں
تے میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلی۔ سورج کی آگ برساتی کرنوں کا زوردار چانٹا
رے گالوں کو جھلسا گیا۔ ڈوبتی آنکھوں سے میں نے تین اطراف سے بڑھتی موت کو گلے لگانے کے لیے
ارج کو آخری الوداع کہا لیکن یہ کیا.....؟ کتے میرے قریب آ کر رُک سے گئے۔ کیا وہ مجھ سے میری آخری
اہش پوچھ رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے سر کی پچھلی جانب بھی کچھ غرّاہٹیں بلند ہوئی ہیں۔
طلب یہ کہ باقی تین کتے بھی آن پہنچے تھے لیکن اس وقت میرے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں گردن موڑ
ر پیچھے دیکھ لیتا۔ سامنے والے تین دشمنوں میں سے ایک نے غرّا کر اپنا جسم تولا۔ اُس کی ہڈیاں زقند لگانے
ے پہلے جسم کے اندر چٹخیں۔ اُس نے اپنا سارا بوجھ اپنے پچھلے پیروں پر ڈالا اور ہوا میں میری جانب اُچھلا۔
سانے آسمان پر پگھلتے سورج کو اس کے وجود کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ مجھ پر دشمن کے قہر کا سایا ہوا اور پھر اس
ے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا ایک عجیب بات ہوئی۔ ابھی دشمن کا جسم ہوا ہی میں معلق تھا کہ ایک اور جسم زوردار
ھاڑ کے ساتھ غرّاتے ہوئے دشمن کے جسم سے لپٹا، ٹکرایا اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے مجھ سے دُور
لے جا کر ریت پر گر گیا۔ چند لمحوں کے لیے چھپا سورج پھر سے میری پلکوں میں برچھیاں گھونپ گیا اور میری

آنکھیں پھر سے چندھیا گئیں۔ غرّاہٹیں اب باقاعدہ چیخوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ میں نے بمشکل پلٹ
کروٹ لی اور حتی الامکان سر اُٹھا کر اپنے اس محسن جسم کو دیکھنے کی کوشش کی، جس نے ہوا ہی سے میری جا
اُڑ کر آتی قضا کو اُچک لیا تھا اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا، دشمن کو ہوا ہی میں دبوچ لینے والا ''کالا'' تو
وہ اور اُس کے گروہ کے باقی دو ساتھی سینہ تانے میرے اور میرے تین دشمنوں کے درمیان صحرا میں کھڑے
تھے۔ اس وقت دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظروں نظروں میں تول رہے تھے، غرّا رہے تھے، دھمکا رہے تھے
میں کراہ کر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے لگا اس وقت میں کالے اور دشمنوں کے گروہ کے درمیان ہوتی گفتگو سمجھ سکتا ہوں
دشمنوں کا سرغنہ بولا ''تم ہمارے پرانے ساتھی رہے ہو۔ اس لیے ہم تمہارا لحاظ کر رہے ہیں۔ ہٹ جا
ہمارے راستے سے..... ہمیں اس کی شہ رگ چیر کر اپنے آقا کے پاس لے جانی ہے۔ وہی آقا، جو کل تک تم
بھی مالک تھا۔'' کالا جواباً غرّایا ''نہیں..... وہ کبھی میرا مالک تھا لیکن اب یہ بھی میرا دوست ہے۔ میں تم کو
کی جان نہیں لینے دوں گا۔ تم لوگ واپس پلٹ جاؤ.....'' سرغنہ بھونکا ''بس..... بہت ہو چکا.....
ہی دیر میں میرے تین مزید ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پرائے انسان کے چکر میں
اپنا پرانا ساتھی اپنی جان سے جائے۔ ہم نے بہت سے مقابلے ساتھ جیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی جنگیں ایک سا
لڑی ہیں۔ اپنی یہ آخری جنگ ہمارے خلاف نہ لڑو۔ یہ انسان بڑے کم ظرف اور احسان فراموش ہوتے ہیں
ان کے لیے اپنے ساتھ اپنے اِن دو بے وقوف ساتھیوں کی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہ تو ہماری ظر
سدھائے ہوئے ہیں، نہ ہی لڑنا جانتے ہیں..... ہٹ جاؤ.....''

کالے نے جسم تولا..... ''اگر یہ آخری جنگ ہے تو میں اپنی یہ آخری لڑائی ایک غدار اور احسان فرام
بن کر نہیں..... بلکہ ایک دوست بن کر لڑوں گا۔'' اتنے میں دُور سے باقی تین کتوں کے بھونکنے کی آواز
سنائی دینے لگیں۔ سرغنہ نے فاتحانہ انداز میں کالے کی جانب دیکھا ''اچھا تو پھر ٹھیک ہے..... مرنے
لیے تیار ہو جاؤ.....''

معصوم سے معصومیت تک

اس جنگ میں اپنے ساتھ مزید تین ساتھیوں کو پا کر میرے اندر زندگی کی نئی رمق جاگی۔ باقی تین دشمن
ی کچھ فاصلے پر تھے لیکن صحرا میں ان کے وحشیانہ انداز میں بھونکنے کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔
امنے والے تین دشمنوں نے پینترا بدل کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کالا اور اُس کے گروہ کے باقی دو جانباز
ب میرے اور ان دشمنوں کے درمیان حائل تھے۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی دشمن تین سے چھ ہوئے، تب شاید
رے یہ تین وفادار بھی کچھ نہ کر پائیں کیوں کہ ان میں سے صرف کالا ہی باقاعدہ سدھایا ہوا تھا اور وہی اس
نی لڑائی کے گر جانتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ان تین دشمنوں کو اپنے پیچھے لگا کر میدان جنگ تبدیل کیا جاتا رہے
ر پھر مجھے تو ہر حال میں آگے ہی بڑھتے رہنا تھا۔ سو، میں ایک بار پھر ہمت مجتمع کر کے اُٹھا اور دشمنوں سے پہلو
اتے ہوئے صحرا میں سڑک کی سمت دوڑنے لگا اور پھر میرے منہ سے ایک طویل کراہ نما چیخ نکل گئی۔ میرے
گلے پیر میں ہاتھ کی اُنگلی جتنا ایک کانٹا اس طرح گھسا کہ تلوے کو چیرتا ہوا اُوپر سے نکل گیا۔ میں اُسی قدم لڑکھڑا
ر گرا اور پاؤں جیسے شل ہو گئے۔ میں نے زور سے آنکھیں بند کیں اور کانٹے کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر پاؤں
ے علیحدہ کر دیا۔ اچانک میرا دھیان نیفے میں اٹکے اپنے جوتوں کی جانب گیا، جو میں نے شروع ہی میں خانو
ہدایت کے مطابق اپنے جسم کے ساتھ کس کر باندھ لیے تھے۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے۔ زمین سخت
رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب سڑک کہیں قریب ہی تھی۔ کتوں کی آوازیں بھی پچھلے ٹیلے تک آ پہنچی تھیں
ر پھر پہلے تین کا دشمن گروہ میرے سر پر آن پہنچا۔ اس بار سرغنہ نے پیچھے سے میری گردن میں جبڑے سے
ر کیا لیکن میرے گلے میں بندھی قمیض کے چیتھڑوں کی وجہ سے اُس کے دانت ماس میں ٹھیک طرح سے کھب
بس پائے۔ لیکن میں اس کے دھکے سے اپنی جھونک میں سامنے جا گرا۔ تب تک میرے ساتھی بھی پہنچ چکے
تھے۔ کالے کا ایک ساتھی جو میری پہرے داری کے لیے میرے سر کی جانب کھڑا ہو گیا تھا، اُسے سرغنہ نے
ب زوردار پنجہ مارا اور خون کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگو گئے۔ کالا بھی نہایت بے جگری سے لڑ رہا تھا لیکن
ب دشمنوں کی تعداد چھ ہو چکی تھی۔ میں جب دوڑتے ہوئے آخری ٹیلے پر پہنچا تو بہت دُور کالی تارکول کی
رک کسی باریک دھاگے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ٹیلے کے دوسری جانب اُترتے ہوئے آخری مرتبہ
پیچھے نظر ڈالی تو کالے سے میری نظر ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہوں ''ہم نے اپنا نمک حلال کر
دوست! اب آگے تم جانو اور تمہاری قسمت.....'' اچانک میرے پیروں کو نیچے کسی نرم اور لجلجی سطح کا احساس

ہوا اور میرے جوتے چپکنے سے لگے۔ ارے یہ تو وہی سڑک تھی، جسے میں اب بھی بہت دُور دیکھ رہا تھا
سڑک صحرا کے اندر سے ہوتی گزر رہی تھی اور اس کے جس ٹکڑے کی طرف میں بھاگ رہا تھا، وہ اُسی سڑ
تسلسل تھی لیکن یہ ٹکڑا ریت کے طوفان کی وجہ سے شاید نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ خانو کی آواز پھر سے میر
کانوں میں گونجی۔ ''اگر تم اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو کہ تم نے آدھی جنگ جیت لی۔''
نے پیچھے مڑ کر دیکھا، دونوں دشمن کف بہاتے، رال ٹپکاتے اور اپنے مضبوط پنجوں سے بھاگتے اُسی رفتار
میرے تعاقب میں آ رہے تھے بلکہ یہ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں کی بچی کھچی سانسیں
تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی اس ایک زندگی کے لیے ان پھیپھڑوں کے تمام خلیوں کو جس قدر مشا
سرانجام دینی تھی، پچھلے دو گھنٹوں میں وہ اس سے زیادہ محنت کر چکے تھے۔ اچانک بے خیالی میں میری نظر آ
کی جانب اُٹھ گئی۔ شاید وہ میری آخری دعا کا وقت تھا۔ پتا نہیں ہم ہمیشہ دعا کرتے وقت ہر بار اپنی نظر آ
کی جانب کیوں اُٹھاتے ہیں، اپنے دل کی جانب کیوں نہیں دیکھتے۔ کیا یہ بھی ہمارے کمزور ایمان کی نشانی
ہے۔ کیا وہ صرف آسمان پر ہی بسیرا کرتا ہے۔ میری اس آخری اُٹھی نظر نے بھی اُسی لمحے مجھے میری ''
ایمانی'' کی سزا دے دی۔ میرا سر سورج کی تیز روشنی دیکھ کر زور سے چکرایا اور میں کسی مدہوش مے نوش کی طر
لڑکھڑایا اور اگلے ہی لمحے نرم، لجلجی سڑک پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ میری کہنیاں اور گھٹنے چھل کر سیاہ ہو
تھے۔ میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ جسم کا ایک ایک ریشہ اس قدر شدید تھکن سے چور تھا کہ اب
دوڑتی، غرّاتی، رال ٹپکاتی اور اپنی طرف بڑھتی ہوئی وہ موت بھی ایک لمبے اور آرام دہ سکون کا ایک وقفہ ہی
رہی تھی۔ ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے د
ہیں، ایذا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ صحرا میں آج اس دو گھنٹے کی دوڑ اور اس
میری طرف بڑھتی موت نے زندگی کا سارا فلسفہ خوب اچھی طرح مجھے سکھا دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح
ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کے اُصولو
بھول چکے ہیں، ایک بار صحرا کی اِس دوڑ میں لا کھڑا کروں اور جب وہ بھی میری طرح نڈھال ہو کر گر پڑ
موت اپنے خونی جبڑے اُن کی شہ رگ میں پیوست کرنے لگے تو اُن سے بس ایک ہی سوال پوچھوں ''کیا
بے وفا زندگی واقعی اس قابل تھی، جس قدر تم نے اسے پیار دیا؟'' میرے دشمن بس اب چند گز ہی دُور تھ
میں نے ڈوبتی آنکھوں اور بند ہوتی پلکوں سے اُن میں سے اگلے والے کو مجھے یوں زمین پر بے بس گرا دیکھ
خوشی سے ہوکتے ہوئے سنا۔ انہیں بھی تو عرصے بعد کوئی ایسا دشمن میسر آیا تھا، جس نے آج اُن کے مسامو
سے بھی پسینہ چھلکا دیا تھا۔ آخری لمحے میں، میں نے اُس کے خونی جبڑے کو ایک خاص زاویے پر کھلتے اور
کے چار لمبے نوکیلے دانتوں کو خاص میکانزم کے تحت آگے نکلتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اس قاتل جبلت
خاص نشانہ میری شہ رگ ہی تھی۔ میرے دل نے کہا ''خوش آمدید'' اور ٹھیک اُسی لمحے فضا میں فائر کی ایک آ

گونجی۔ دشمن کی اپنی شہ رگ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا اور مجھ سمیت سڑک کے اُبلتے تارکول کو رنگ گیا۔ زمین پر خون گرنے سے ایسی آواز اُبھری جیسے شدید گرم اور تپتے ہوئے توے پر کوئی ٹھنڈا پانی چھڑک دے۔ فضا میں ایک نعرہ گونجا ''اللہ اکبر'' اور دوسرے فائر کی آواز آئی۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا پہلا دشمن، بالکل میرے مقابل گرا ہوا تھا اور دشمن کی نبض بھی ڈوب رہی تھی اور آنکھیں میری طرف پلکوں کے بوجھ سے بوجھل ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے ہم دونوں کی نظر آپس میں ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے اُس نے مجھ سے کہا ہو ''الوداع اے دشمن! تم نے بھی خوب دشمنی نبھائی۔'' لیکن ہم دونوں ہی اپنے اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور تھے اور پھر دشمن کی آنکھیں بھی میری آنکھوں کے ساتھ ہی بند ہو گئیں۔ آخری چند لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی معصومیت دکھائی دی، جو کسی بچے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ واقعی خدا ہمیں اس دنیا میں شفاف اور معصوم ہی بھیجتا ہے مگر ہم رفتہ رفتہ خود کو میلا اور داغ دار کرتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کچھ تو پھر بھی جسم کے گناہ روزانہ وضو کر کے اور رُوح کے گناہ رات کو سوتے وقت توبہ کر کے دھونے کی کامیاب یا ناکام سعی کر ہی لیتے ہیں لیکن ان میں سے وہ، جو میری طرح ان تمام داغوں سمیت ہی دنیا سے رُخصت ہونے کو ہوں، انہیں ان آخری لمحوں میں کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ کیا ہمیں دنیا میں صرف یہی داغ سمیٹنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ مجھے اس سڑک پر پڑے ان آخری لمحوں میں ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ ہم میں سے زمین پر بسنے والے ہر ذی رُوح کا سفر بس ''معصوم سے معصومیت'' تک واپسی کی ایک کہانی ہی ہے۔ میں یونیورسٹی میں اپنی انگریزی کی پروفیسر مارتھا سے ایک اصطلاح ہمیشہ سنتا تھا ''Back to the Innocence'' لیکن ''معصومیت کی طرف واپسی'' کی اس اصطلاح کا مطلب مجھے اس روز سمجھ میں آیا۔ ہم کامل معصوم پیدا ہوتے ہیں، لیکن گناہ ہمیں غیر معصوم اور عاصی بنا دیتے ہیں۔ دراصل مذہب ہم پر وارد ہی اس لیے ہوا ہے کہ وہ ہمیں پھر سے معصوم بنا دے اور تمام عمر مذہب اسی کوشش رہتی ہے کہ وہ ہماری اس ''معصومیت سے معصومیت تک'' کی واپسی کی راہ کو ہموار کر دے۔ اور عین ٹھیک موت کی گھڑی میں چند لمحوں کے لیے ہم سب پھر سے معصوم ہو جاتے ہیں۔ تب ہی ہماری کومل رُوح کو تحلیل ہونے کا موقع ملتا ہے، ورنہ گناہوں سے لتھڑے اس کثیف جسم کے پنجر سے اس نورانی ہیولے کا نکلنا ممکن ہو جاتا۔ کیا میری رُوح بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ میرا جسم تو ابھی گناہوں کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ آنکھیں کھلنے میں اتنی دیر لگی۔ میرے سر پر سبز آسمان تھا، کیا وہاں فلک کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اچانک میرے کانوں میں آواز گونجی ''اُٹھ گیا بھئی جوانا! شاباشے۔'' میں نے چونک کر داہنی طرف آواز کی جانب دیکھا، رینجرز کا ایک سپاہی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ اوہ..... تو میں زندہ تھا اور جسے میں سبز آسمان سمجھ رہا تھا وہ پیراشوٹ کے کپڑے سے بنے ہرے خیمے کی چھت تھی۔ میرے ذہن میں خانو کا آخری جملہ گونجا ''اگر یہ فلک تمہیں سرحد پر بنی کسی فوجی چوکی تک پہنچا دے تو سمجھ لینا کہ یہی تمہاری جیت ہے.....'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سارے جسم میں شدید درد کی ایک ٹیس اُٹھی۔ سپاہی جلدی سے اُٹھ کر میرے قریب

آ گیا۔ ''اوئے آرام سے جوان آرام سے۔ پورے چھ گھنٹے بعد تم ہوش میں آئے ہو۔ میرا نام حوالدار
ہے۔ ہم چھ سپاہی ہیں اس چوکی کی دن کی ڈیوٹی پر..... میں ہی شفٹ انچارج ہوں اور اس وقت میں ہ
سے باہر کھڑا علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، جب میں نے دُور سے پہلے تمہیں اور پھر تمہارے پیچھے ان ک
دوڑتے دیکھا۔ واہ بھئی..... عجب دوڑ تھی وہ بھی..... اور جب تک میں بھاگ کر اندر خیمے سے اپنی بندوق
کر آیا، تم زمین پر گر چکے تھے۔ ٹھیک لمحے پر اپنی بندوق اور اپنا نشانہ آزمانے کو ملا۔ خدا نے سرخرو کیا، ور
بندوق پر لگے دُوربینی نشانے پر کبھی بھروسا نہیں رہا۔ مجھے تمہارے اور اس کتے کے تیزی سے قریب
سروں میں سے کتے کے سر کو علیحدہ رکھ کر گولی چلانی تھی اور یقین کرو کہ ایک لمحے کے لیے بھی اگر میری
کانپ جاتی تو مجھے وزیرے کی ماں سے بہت صلواتیں سُننا پڑتیں۔'' حوالدار زور سے ہنسا ''وزیرا، وزیر
پانچ سال کا بیٹا ہے.....'' میں نے بستر سے اُترنے کی کوشش کی۔ ''مجھے کہیں بہت جلدی پہنچنا ہے.....
تمہاری دیوانہ وار دوڑ سے ہی پتا چل رہا تھا۔ ویسے تو میں نے قریبی یونٹ سے ڈاکٹر کو بلوالیا تھا۔ وہ و
پہلے آ کر تمہیں ضروری انجیکشن وغیرہ لگا چکا ہے اور تمہارے زخموں کی مرہم پٹی بھی کر گیا ہے لیکن اس نے
جاتے یہ بھی کہا ہے کہ تم ایک ہفتے تک بستر سے اُٹھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ویسے یہ ماجرا کیا تھا.....؟ میر
جلدی جلدی شیر محمد کو ضروری تفصیل بتائی کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ شیر محمد حیرت سے
کھولے میری بات سنتا رہا اور اچانک میرے ذہن میں آئی جی نصیر صاحب کا خیال آیا۔ کمال آباد اگرچہ
سے تین دن ٹرین کے فاصلے پر تھا لیکن ان کے حکم پر کسی قریبی ضلع کی پولیس میری مدد کو کال گڑھ آسکتی
میں نے جلدی سے شیر محمد سے پوچھا ''کیا میں یہاں سے کمال آباد ایک فون کر سکتا ہوں۔'' ہاں جی!
نہیں، ایک کیا دس فون کرو۔'' اُس نے خیمے میں رکھے ایک پرانی وضع کے لوہے کے ڈبے کو اُٹھا کر دو تین
اس کی چرخی گھمائی۔ دوسری جانب سے شاید کسی آپریٹر نے اُٹھایا۔ شیر محمد نے مجھ سے کمال آباد کا نمبر پو
میں نے اُسے بتایا کہ مجھے نمبر تو زبانی یاد نہیں ہے لیکن کمال آباد میں آئی جی نصیر کا کوئی بھی نمبر ملا دیں۔ آ
پانچویں کوشش پر دوسری جانب سے گھر کے نمبر پر پہلے کسی آپریٹر نے فون اُٹھایا۔ میں نے اُسے بتایا کہ
سلطان بابا کے حوالے سے عبداللہ بات کر رہا ہوں اور مجھے نصیر صاحب سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔
دیر بعد دوسری جانب سے نصیر صاحب کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید آرام کر رہے تھے۔ وہ تعا
کروانے سے پہلے ہی مجھے پہچان چکے تھے اور جب میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو اُن کے لہجے
فکرمندی کے ساتھ ساتھ روایتی پولیس والوں کی تیزی بھی در آئی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ اگلے آدھے
کے اندر قریب ترین ضلع کے ایس پی اپنی تمام تر مہیا کمک کے ساتھ کال گڑھ کے لیے نکل چکے ہوں گے
جب تک میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچوں گا تب تک وہ بھی مجھے وہیں میرا انتظار کرتے ملیں گے۔ انہوں
سختی سے مجھے منع کیا کہ میں تنہا دوبارہ کال گڑھ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کروں۔ جب میں نصیر صا

ے بات کر کے خیمے سے باہر نکلا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ باہر کچھ فاصلے پر میرے دونوں دشمنوں کی لاشوں کو دو سپاہی ایک گہرا گڑھا کھود کر دفنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ حوالدار نے اپنے انچارج کپتان صاحب سے شفٹ ختم ہونے کے بعد مجھے اپنی جیپ میں کال گڑھ کی سرحد تک پہنچانے کی اجازت لے لی تھی۔ جیپ روانہ ہونے سے پہلے دو سپاہی کود کر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شیر محمد خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہم اُسی تارکول کی سڑک سے ہوتے ہوئے واپس صحرا کی جانب روانہ ہو گئے۔ کچھ گھنٹے قبل یہی قاتل صحرا میری سانسیں گھونٹنے کے لیے کسی اور انداز میں مجھ پر کھلا تھا اور ابھی اس وقت اس جیپ میں گزرتے ہوئے سب کچھ کتنا مختلف اور کتنا مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے دوڑتے دوڑتے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جیپ ریت کے ٹیلوں سے اُترتی چڑھتی کال گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھی اور پھر ایک ٹیلا اُترتے ہی میری زبان سے بے اختیار نکلا ''روکو..... جیپ روکو.....'' حوالدار نے چونک کر جلدی سے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ میں تیزی سے کود کر ٹیلے کی پچھلی جانب دوڑا، اور پھر میرے قدم ریت ہی میں دھنس کر رہ گئے۔ شیر محمد اور سپاہی بھی میرے پیچھے ہی بھاگے چلے آئے اور پھر اُن کی نگاہوں نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں وہ نظارہ دیکھ لیا۔ سامنے ہی کالا اپنے دو ساتھیوں سمیت بے جان پڑا تھا اور چند قدموں کے فاصلے پر اِدھر اُدھر تین دشمنوں کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ میں دوڑتا ہوا کالے کے پاس پہنچا۔ میرے دوست نے زندگی کی بازی ہارنے سے پہلے شدید جدوجہد کی تھی۔ میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے رو پڑا۔ حوالدار حیرت سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''کیا یہ تین تمہارے محافظ تھے۔'' میری آواز بمشکل نکلی ''نہیں۔ یہ تین میرے دوست تھے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے لیے اپنی جان دی ہے۔'' میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر روؤں۔ حوالدار میری حالت سمجھ چکا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود بھی جیپ کے پیچھے سے ترپال کے نیچے رکھے بیلچوں میں سے ایک اُٹھا لایا اور کچھ ہی دیر میں وہ سب گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ میں نے کالے کو الوداعی سلامی پیش کی اور انہوں نے میرے تینوں دوستوں کو گول ریت تلے دبا دیا۔ میں نے شیر محمد کی جانب دیکھا اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ''میں جانتا ہوں جوان! تم اپنے دشمنوں کو بھی یوں پڑا رہنے نہیں دو گے۔ یہی بڑے دشمن کی نشانی ہوتی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں اتنے ہی گہرے گڑھے میں میرے تینوں دشمن بھی ریت نشین ہو چکے تھے۔ وہ میرے دشمن تھے، لیکن وفادار تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی سرحد سے کچھ فاصلے پر تھے تو میں نے ایک جیپ کے ہیولے کو تیزی سے واپس پلٹتے دیکھا۔ لیکن شام کے جھٹپٹے اور فاصلے کی وجہ سے میں ٹھیک طرح سے گاڑی پہچان نہیں سکا۔ حوالدار کا خدشہ صحیح تھا۔ کتوں کے واپس نہ پہنچنے پر جبروت کے ہرکارے صحرا میں اُن کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ جب ہم کال گڑھ کی بیرونی حد تک پہنچے تب تک اندھیرا چھا چکا تھا اور دُور سے پولیس کی جیپوں اور ایک بڑے ٹرک کی جلتی بجھتی بتیاں قریب آتی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پولیس کے جوانوں کا ایک جم غفیر ایک ایس پی اور ڈی

ایس پی کی قیادت میں وہاں آ پہنچا۔ افسروں نے اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ آئی جی صاحب کی خا
ہدایت پر یہاں پہنچے ہیں۔ شیر محمد نے مجھ سے رُخصت ہونے سے پہلے مجھے زور سے گلے لگا لیا اور اور
"مجھے یہاں سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے جوان، ورنہ میں بھی تمہارے اُستاد سے ملنے ضرور
تمہارے ساتھ۔" میں نے اُسے رُخصت کرتے ہوئے دھیرے سے اُس سے کہا "جب تم وزیرے کی
سے فون پر بات کرو تو اُسے بتانا کہ تمہارا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے....." جیپ میں بیٹھتا ہوا شیر محمد زور سے
پڑا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ایس پی نے وہیں ریت پر لکڑی کی ایک چھڑی کی مدد سے میرے معلومات
مطابق کال گڑھ کا ایک چھوٹا سا نقشہ بنا لیا اور قلعے کا جغرافیہ اور آنے جانے کے تمام ممکنہ راستے اپنی فورس
اچھی طرح ذہن نشین کروا دیئے۔ آدھے سپاہی ڈی ایس پی کی قیادت میں دوسری جانب سے صحرا کی طرف
نکلتے راستوں پر پہرے کی چوکیاں بناتے ہوئے کال گڑھ کا محاصرہ کرتے ہوئے بڑھتے گئے جب کہ ایس
صاحب میرے ساتھ آدھے سپاہی لیے کال گڑھ داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی نصیب ہماری ساری گنتی اُلٹی کر
ہے۔ ہر توقع برعکس ثابت ہو جاتی ہے۔ شاید آج یہی جبروت کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کے وہم و گمان
بھی نہیں ہو گا کہ اس قید خانے میں خانو مجھے صحرا کے دوزخ سے نکلنے کے راستے اور گُر بتا دے گا اور میں
کے جانبازوں کو کالے اور اُس کے دو ساتھیوں کی مدد سے پچھاڑ کر صحرا پار کر جاؤں گا اور ایک سرحدی چوکی
بھی پہنچ جاؤں گا۔ چوکی والے بھی اپنے فرائض کی حد بندی کی وجہ سے اتنی جلدی میری مدد نہ کر پاتے کیوں
یہ پولیس کا کیس تھا۔ ایسے میں جبروت نے یہ بھی کہاں سوچا ہو گا کہ مزار پر رہنے والے یہ دو فقیر اتنی پہنچ
رکھتے ہوں گے کہ ایک ٹیلی فون پر ضلع کے ایس پی کو تمام لوازمات کے ساتھ کال گڑھ آنے پر رضامند کر
گے، کیوں کہ عام حالات میں اس سارے انتظام کے لیے کم از کم مہینہ درکار ہوتا لیکن اس کی تمام توقعات
برعکس میں اس وقت ایس پی سمیت قلعے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دربان کو دروازہ کھولتے ہی گرفتار کر لیا گ
اندر سے کچھ مزاحمت ہوئی اور چند کارندوں نے پولیس پر فائر کھولنے کی کوشش کی لیکن آدھے گھنٹے کے اند
قلعے کے اندر موجود دس بارہ محافظ گرفتار ہو چکے تھے۔ میں تیزی سے راہ داریوں میں دوڑتا ہوا قید خانوں
طرف بڑھ گیا۔ نوری اور اُس کے باپ سمیت گیارہ مزید قیدی اس زنداں سے برآمد ہوئے لیکن میری نظر
سلطان بابا کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں نے ایک ایک کال کوٹھڑی میں خود جھانک کر دیکھا لیکن اُن
کہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ قیدی آزاد ہونے کے بعد قلعے کے صحن میں جمع تھے اور خوشی سے نعرے لگا رہے تھے
قلعے سے باہر کال گڑھ کی ساری بستی، رات ہونے کے باوجود جمع ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے بچھڑوں کے لیے
رہے تھے، چلا رہے تھے۔ جبروت کے ظلم کا سورج آج ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا لیکن خود جبروت
جانے کہاں غائب تھا۔ اکرم اور اُس کے دو مزید خاص ہرکاروں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میری سانسیں رُ
لگیں۔ کہیں اُس نے سلطان بابا کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔

نوری بھی اپنے باپ سمیت صحن ہی میں کھڑی رو رہی تھی۔ میں واپس دوڑتا ہوا ایس پی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ سلطان بابا کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ایس پی وائرلیس پر اپنی فورس کو ہدایات دینے میں مشغول ہوگیا۔ اتنے میں قیدیوں کے ہجوم سے ایک قیدی باہر نکلا اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ ''میں جانتا تھا..... تم کامیاب واپس لوٹو گے.....'' آواز سنتے ہی میں نے چونک کر اُسے دیکھا، وہ خانو تھا۔ میں بھی روہانسا سا ہوگیا۔ ''یہ سب تمہاری مدد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے خانو..... لیکن میرے سلطان بابا نہ جانے کہاں ہیں۔ سارا قلعہ چھان مارا ہے لیکن.....'' خانو چلایا ''ٹھہرو! وہ ضرور بابا کو قلعے کی اُس خفیہ سُرنگ کے ذریعے لے جانے کی کوشش میں ہوں گے، جو سیدھی صحرا کو جا نکلتی ہے.....'' ایس پی نے خانو کی بات سنتے ہی مزید ایک لمحہ ضائع کیے بنا کچھ سپاہیوں کو خانو کے ساتھ اُس سرنگ کا پتا لگانے کے لیے دوڑا دیا۔ میں نے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے روک دیا گیا۔ ''آپ رُک جائیں..... وہاں خطرہ ہوسکتا ہے.....'' میرے بس میں ہوتا تو سب سے آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ جاتا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی ہانپتا ہوا دوڑ کر واپس آیا اور اُس کی بات سُن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ زور سے چیخا ''سرنگ مل گئی ہے صاحب۔ وہاں ایک بڑھا اوندھے منہ پڑا ہے.....''

پہلا کفارہ

اُس سپاہی کی بات سن کر مجھے یوں لگا، جیسے ابھی آسمان پھٹ کر ہمارے سروں پر آ گرے گا۔ میں
کر آگے بڑھا تو کسی دوسرے سپاہی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اُسے دھکیل کر قلعے کی
غلام گردش کی طرف بھاگا، جہاں خانو سُرنگ دکھانے کے لیے باقی سپاہیوں کو لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے
فاصلے پر مجھے اندر جاتی سیڑھیاں نظر آ گئیں، جو بظاہر کسی تہ خانے کا راستہ دکھائی دے رہی تھیں۔ جانے جبرو
جیسے ہر قلعے دار کو اپنے قلعے میں ایسی خفیہ سرنگیں بنانے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ میں نے تاریخ میں
ایسے بہت سے بادشاہوں کا تذکرہ پڑھا تھا جو اپنے محل سے فرار کا ایسا کوئی پوشیدہ راستہ ضرور بنا کر رکھتے
کیا جبر اور اقتدار ہمیشہ ہی سے چور راستوں کا محتاج رہا ہے۔ سرنگ کے اندر سپاہیوں کا جمگھٹا سا تھا۔ ا
تنگ ہونے کے باوجود نہ جانے اس سرنگ میں ہوا کہاں سے آ رہی تھی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں بنے دائر
سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا، جس جگہ کی سپاہی نے نشان دہی کی تھی۔ ہاں، وہ سلطان بابا ہی تھے۔ ہوش وحوا
سے بیگانہ، نہایت زرد رنگت اور اُکھڑی سانسوں کے ساتھ بے سدھ پڑے ہوئے۔ کچھ سپاہی اُن کے
پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سلطان بابا کو
کر باہر کھلی فضا میں پہنچا دیا گیا۔ بظاہر انہیں کوئی چوٹ لگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایس پی صاحب نے جب
سپاہی کو اپنی گاڑی سے میڈیکل بکس لانے کا حکم دیا تو عقدہ کھلا کہ وہ ڈاکٹر پہلے ہیں اور سی ایس ایس آفیسر
میں۔ انہوں نے سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کیا اور ایک انجیکشن بھی لگا دیا۔ انہیں بھی بظاہر گھٹن اور تھکن
علاوہ کوئی خاص علامت دکھائی نہیں دی، لیکن انہوں نے مجھے تلقین ضرور کر دی کہ پہلی فرصت میں انہیں
بڑے اسپتال میں مکمل طبّی معائنے کے لیے ضرور لے جاؤں۔ قلعے میں ابھی تک افراتفری پھیلی ہوئی تھی
سپاہیوں کے ساتھ زنانہ پولیس بھی تھی، جس نے قلعے کی تمام خواتین کو اندرونی احاطے میں جمع کر کے انہیں
دی کہ فی الوقت اُن میں سے کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں آرام کر
البتہ واضح رہے کہ اُن میں سے کسی کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات تیزی سے ڈھل رہی تھی
میں وہیں سلطان بابا کے سرہانے پریشان بیٹھا بار بار اُن کا ماتھا چُھو کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ حدّت سی
ہوئی تو میں جلدی سے ایس پی صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے تصدیق کر دی۔ ''ہاں..... کچھ بخار سا تو ہے
اتنی تھکن کے بعد یہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔'' میں نے اُن سے جبروت کے بارے میں پوچھا تو انہوں

ایا کہ سارے علاقے کا محاصرہ کرلیا گیا ہے، لیکن فی الحال اُس کی حراست کی اطلاع نہیں آئی۔ میں نے بھیڑ
ں سکینہ کے نانا نانی کو دیکھا تو میرا جی چاہا کہ دوڑ کر کہیں چھپ جاؤں، لیکن وہ تو خود مجھے ہی تلاش کر رہے
تھے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس وہی ایک تھا۔ جس کے بارے میں سوچ کر ہی میری سانسیں گھٹنے لگتی تھیں۔
چانک ہجوم میں خانو مجھے ایک جانب کھڑا نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ جلدی سے
ری جانب بڑھا ''تم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے نا.....؟'' ہاں۔ اور اِسی لیے میں نے خود
لیس کو اپنے بارے میں سب بتا دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جبروت کے خلاف ''سلطانی گواہ'' بنانے کا
عدہ بھی کیا ہے۔ مجھے جبروت کے ہر گناہ کا اقرار بیان کی صورت میں بھری عدالت میں کرنا ہوگا اور میں اس
ے لیے تیار ہوں۔ بلکہ پولیس اگر مجھے سلطانی گواہ نہ بھی بنائے تب بھی عدالت میں بیان ضرور دوں گا۔'' میں
نے غور سے خانو کی طرف دیکھا۔ ''نہیں تم ضرور سلطانی گواہ ہی بنو گے، لیکن یہ تمہارا کفارہ نہیں ہوگا۔ تمہارا
ل کفارہ تمہاری رہائی کے بعد شروع ہوگا۔ بولو، منظور ہے؟'' خانو نے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا
لیے۔ ''تمہارے لیے خانو کی جان بھی حاضر ہے۔ تم صرف کفارے کی بات کرتے؟'' میں نے اُسے دُور
کھڑے بوڑھے جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بتایا ''یہ بوڑھا اور بڑھیا اُسی سکینہ کے نانا اور نانی ہیں، جو اِسی
ے کی کھولی نمبر سات میں دفن ہے۔ تمہارا پہلا کفارہ یہی ہے کہ تم انہیں لے جا کر سکینہ کی قبر دکھاؤ اور اس بڑھیا
ے شانوں پر پڑی وہ آدھی پھٹی ہوئی پھولوں والی چادر اُس بدنصیب کی قبر پر ڈال دو۔'' خانو کے چہرے کا
ل پیلا پڑ گیا اور وہ یوں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا، جیسے اُس کے قدموں تلے کوئی بچھو نکل آیا ہو۔ ''نہیں نہیں!
ہ سے نہیں ہوگا۔ تم چاہو تو میرا سر کاٹ کر اُن کے قدموں میں ڈال دو، لیکن.....'' ''لیکن کیا؟ ابھی تو تم دعویٰ
رر ہے تھے کہ کفارے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گے۔ پھر اس پہلی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی تمہارے
ں کیوں جلنے لگے.....؟'' وہ بے بسی سے تلملایا ''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن میں اُن کا سامنا کیسے کروں
؟'' میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب موڑا ''تمہیں صرف آج نہیں، ساری عمر اُن کا سامنا کرنا ہے۔ کیوں کہ
ہارا اصل کفارہ اب ان لاچاروں کی کفالت ہی ہے۔ اب تم ہی کو عمر بھر ان کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ زندگی بھر
ے گناہ دھونے کا اس سے بہترین موقع بھلا اور کیا ہوگا؟'' خانو نے شدید کش مکش کے عالم میں سکینہ کے
رگوں کی جانب دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اُسے اُن کی جانب دھکیل دیا۔ بڑھیا اپنے آس پاس سے
زرنے والے ہر شخص سے یہی پوچھ رہی تھی کہ کیا قلعے کے سارے قیدی رہا ہو چکے ہیں اور کیا ان میں سے کسی
نے اُن کی سکینہ کو کہیں دیکھا؟ خانو دھیرے دھیرے چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بوڑھی آنکھوں نے اُس
ے بھی یہی سوال پوچھا۔ خانو نے بنا کچھ کہے اُن دونوں کا ہاتھ پکڑا اور اندرونی راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔
نو کے قدموں میں واضح لرزش مجھے اتنی دُور سے بھی نظر آ رہی تھی، لیکن یہ لڑکھڑاہٹ اُن قدموں کی تھی، جو
ج زندگی میں پہلی مرتبہ کفارے کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جانے ہمارے قدم تب اس طرح کیوں نہیں

لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے جب ہم گناہ کے راستے پر بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ جانے قدرت ہم کمزور و
انسانوں کو اس قدر ثابت قدم اور مضبوط کیوں سمجھتی ہے؟ سچ ہے کہ انسان کا مقدر یہ عمر بھر کی پھسلن ہی
ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جو اس ازلی ڈھلان سے پھسلے بنا ہی سیدھے نیچے اُتر جاتے ہیں۔ خ
کوٹھڑیوں کی جانب گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بڑھیا کی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔
بوڑھے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی، تو ساری بستی والے اُس جانب دوڑے۔ میں وہیں گم صم س
بابا کے سرہانے بیٹھا رہا کہ میں جانتا تھا کہ ان بدنصیبوں پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ایک لمحے کو مجھے یو
میں نے سکینہ کے نانا نانی کی آس سدا کے لیے توڑ کر کچھ اچھا نہیں کیا۔ کیا بُرا تھا اگر میں اُنہیں اُن کی
آخری چند سالوں میں اِسی بھرم ہی میں جینے دیتا کہ اُن کی لاڈلی نواسی گم شدہ، لیکن زندہ ہے۔ ہم میں
بہت سے انسان اپنی ساری زندگی ایسے ہی کسی جھوٹے بھرم میں گزار دیتے ہیں کہ ''وہ مجھے چھوڑ گئی،
وفا نہ تھی۔ وہ واپس لوٹا ہے تو پھر میرا ہی ہوگا۔'' ''یہ دنیا ہماری نہیں تو کیا، آخرت تو ہماری ہی ہے۔'' یا
زندگی کس نے دیکھی ہے، جتنا بھی جینا ہے، یہی جی لیں۔'' تو اگر ایک بھرم اور بڑھ جاتا تو ایسا کیا گناہ
لیکن میں اس عمر بھر کی اذیت سے بھی واقف تھا، جو کسی کے نہ ختم ہونے والے انتظار کی صورت میں جھ
ہے۔ انتظار تو خود پل پل وارد ہوتی موت کا نام ہے اور میں اُن دونوں کی بوڑھی آنکھوں کو انتظار کی ا
صلیب پر مزید نہیں لٹکانا چاہتا تھا، ورنہ شاید اُن کی پلکیں موت کے بعد بھی کھلی رہ جاتیں۔

کچھ دیر میں سلطان بابا نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ میں جلدی سے اُن پر جھکا ''اب
آپ..... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ ہوا کیا تھا؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی
ڈالے۔ سلطان بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ''ابھی تک بہت جلد باز ہو۔'' پھر انہوں نے آہستہ آہستہ
کہ جبروت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں صرف بارہ گھنٹے کے قلیل وقفے میں ضلع بھر کی پول
لے کر قلعے کے دروازے پر آ پہنچوں گا۔ جیسے ہی اُسے پولیس کی آمد کی اطلاع ملی اور صحرا سے آئی جیپ
نے اُسے بتایا کہ صحرا میں صرف اور صرف پولیس ہی کی گاڑیاں نظر آ رہی ہیں، تو اُس نے سب
حکومت میں موجود اپنے اُن اعلیٰ عہدے داروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، جو اُس کے در پردہ ہم
لیکن حسب معمول اس موقع پر سب ہی نے کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کر لی۔ ایک آدھ نے پول
دربار کی گھنٹی ہلانے کی کوشش کی بھی، تو وہاں نصیر صاحب کی ہدایات کا قفل پڑا پایا۔ جبروت کے پا
تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور فورس کال گڑھ میں داخل ہو چکی تھی۔ تب ہی اُس نے سلطان بابا کو طلب کیا
کر اُن سے پوچھا کہ آخر وہ ہیں کون؟ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان بابا کوئی جواب دے پاتے،
گاڑیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں اور مجبوراً جبروت کو افراتفری میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جاتے جا
نے اپنے ہرکاروں کو سلطان بابا کو بھی ساتھ لے جانے کا حکم بھی دے دیا، لیکن اس بھاگ دوڑ میں سلط

دو چار دھکے سینے پر اس زور سے لگے کہ وہ بھاگنے والوں کے تیز قدموں کے لیے زحمت بن گئے۔ جبروت آگے نکل چکا تھا، پیچھے والوں میں سے کسی نے اُن کے سر پر وار کیا اور وہ لوگ انہیں بے سدھ پڑا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے۔ شاید اُن کے ذہن میں کہیں یہ اطمینان بھی ضرور ہوگا کہ اس خفیہ سُرنگ میں یہ ضعیف شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہی جان دے دے گا، کیوں کہ عام حالات میں اُس تہ خانے کی دیواروں میں چھپے، اس سرنگ کے دروازے کو ڈھونڈنے میں ہمیں شاید ہفتوں لگ جاتے ہیں، لیکن ایک بار پھر یہاں خانو کا کفارہ جبروت کی تمام چالوں اور گناہوں پر بازی لے گیا اور چند لمحوں بعد ہی ہم نے انہیں کھوج لیا۔ میں نے انہیں مختصراً سکینہ کے بارے میں بتایا تب تک اندر سے سکینہ کے نڈھال نانا نانی کو کچھ لوگ سہارا دیئے ہوئے باہر نکال لائے۔ خانو بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ایس پی صاحب کو سلطان بابا کے ہوش میں آنے کی خبر ملی، تو انہوں نے فوراً آئی جی صاحب کو کنٹرول لائن کے ذریعے اطلاع کروا دی۔ رات ڈھلنے ہی والی تھی۔ میرے شدید اصرار کے باوجود سلطان بابا نے مزید آرام کرنے سے منع کر دیا اور مؤذن کو وہیں قلعے کی فصیل پر چڑھ کر اذان دینے کی ہدایت کی۔ وہ بہت نڈھال سے لگ رہے تھے، لیکن انہوں نے وہیں قلعے کے پکے صحن کو دھلوا کر چادریں بچھوائیں اور امام صاحب سے درخواست کی کہ وہ آج یہیں قلعے میں فجر کی جماعت کروائیں۔ قلعے کی دیواروں نے صدیوں بعد یہ نظارا بھی دیکھا۔ امام کی قرأت کی آواز اس چار دیواری میں گونجی، تو بستی کے سب ہی مکین نم دیدہ ہو گئے۔ طے یہ پایا کہ ظہر کی نماز کے بعد سکینہ کی آخری رُسومات یہیں قلعے میں ادا کی جائیں گی۔ بوڑھا جوڑا ابھی اسی حق میں تھا کہ اب اِسی کوٹھڑی کو سکینہ کی قبر کے طور پر رہنے دیا جائے۔ البتہ وہاں باقاعدہ مٹی کی ڈھیری اور قرآن و دعا وغیرہ کا انتظام کروا دیا گیا۔ میرا ذہن پھر سے جسم اور رُوح کے اَن دیکھے تعلق کے اُلجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش میں خود اپنے بخیے ادھیڑنے لگا۔ رُوح کا عکس کیسا ہوتا ہوگا؟ کیا ہمارے ظاہری جسم کی شباہت کا بھی اس عکس پر کچھ اثر پڑتا ہوگا یا پھر وہ ہوا کے کسی جھونکے کی طرح بے رنگ، بے شکل ہوتی ہوگی اور مجھے سکینہ کا جو عکس صحرا میں نظر آیا تھا، وہ تو اُس کی موت کے بعد دکھائی دیا تھا۔ گویا وہ عکس رُوح کے بغیر کی تصویر تھی۔ ہم خواب میں جو چلتی پھرتی تصویریں دیکھتے ہیں، وہ بھی تو بے جان ہی ہوتی ہیں۔ جس شخص کو میں اپنے خواب میں چلتا پھرتا، دوڑتا بھاگتا دیکھتا ہوں، وہ اُس وقت اپنی رُوح سمیت کہیں اور جیتا جاگتا موجود ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ذہن کے پردے پر بنا رُوح جو فلم چل رہی ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ کبھی ہمارا اس شخص کے جسم اور رُوح سے کوئی خونی رشتہ بھی رہا ہو۔ ہم بالکل انجان اور نئے چہرے بھی اپنے خواب میں دیکھتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان کا خاکہ کیسے تراش لیتا ہے؟ اُن میں سے کئی چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں ہم باقی ساری زندگی کبھی دوبارہ نہیں دیکھ پاتے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خواب کا شناسا چہرہ مل بھی جاتا ہے۔ تو کیا ہم عالم ارواح میں پہلے اُس چہرے کی رُوح سے مل چکے ہوتے ہیں؟ سلطان بابا کی حالت اُس وقت ایسی نہیں تھی کہ میں انہیں مزید سوال پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا، لیکن خود میں اُلجھتا ہی چلا

گیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آج بھی ہمارے درمیان ایسے لوگ موجود ہیں، جو مستقبل کی جھلکیاں اپنے خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض تو جاگتی آنکھوں چند لمحوں میں آنے والے کسی واقعے کی کچھ تفصیل، کبھی کچھ اشاروں میں اور کبھی باقاعدہ چہرے، نام اور جگہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں وہ اجنبی چہرے اور انجان جگہیں کس طرح خواب میں دکھائی دی جاتی ہیں۔ ضرور میرا اور سکینہ کی تصویر کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ میرے لیے بظاہر انجان ہونے کے باوجود انجان نہیں تھی۔ میرا سارا دن اِسی سوچ بچار میں گزر گیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ سلطان بابا جس قدر ہو سکے، آرام کریں، لیکن بستی والوں نے ہمیں مزار واپس لوٹنے ہی نہیں دیا اور نوری کا باپ ضد کر کے ہمیں اپنے گھر لے آیا۔ میں نے بستی کے ڈاکیے کے ذریعے شیر محمد کو بھی ایک رقعہ بھجوا دیا تھا کہ اگر ہو سکے تو اپنی یونٹ کا ڈاکٹر لے کر کچھ دیر کے لیے کال گڑھ آ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ سلطان بابا کا تفصیلی معائنہ کروا کے اپنا پورا اطمینان کر لوں اور پھر وہ ''شاباشے جوانا شاباشے'' کرتا ہوا عصر کے بعد اپنی جیپ میں ڈاکٹر کو لے کر پہنچ بھی گیا۔ ڈاکٹر نے نہایت تفصیل سے سلطان بابا کا معائنہ کیا۔ وہ اُن کی سر کی چوٹ کے بارے میں کچھ فکر مند نظر آ رہا تھا۔ اُس نے چند تفصیلی ٹیسٹ لکھ کر دے دیئے کہ دو دن آرام کے بعد جب سلطان بابا سفر کے قابل ہو جائیں، تو فوراً شہر کی کسی بڑی لیبارٹری سے یہ ٹیسٹ کروا لیے جائیں۔ تب تک اُس نے سلطان بابا کو سختی سے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

مغرب کے بعد شیر محمد اور ڈاکٹر کو رُخصت ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مکمل اندھیرا چھاتے ہی سرحد کی جانب سے شدید فائرنگ کی آواز نے ہم سب کو چونکا دیا۔ پولیس کی نفری بھی ابھی تک کال گڑھ ہی میں موجود تھی اور پھر کچھ دیر بعد ہی ایس پی صاحب نے آ کر ہمیں وہ خبر سنائی، جو ایک خدشے کی طرح میرے دل و دماغ کے کسی کونے میں صبح سے کھٹک رہی تھی۔ جبروت اور اُس کے چار ساتھی سرحد پار کرنے کی کوشش میں سرحدی رینجرز سے بھڑ گئے اور میری توقع کے عین مطابق جبروت نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ایک بار سلطان بابا نے بتایا تھا کہ معافی اور توبہ کی توفیق بھی مقدر والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ورنہ آنکھوں پر لوہے کے پردے اور کانوں میں سیسہ پگھلا دیا جاتا ہے۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے۔ شاید یہی سب کچھ جبروت کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی انا اُسے کفارے کے راستے پر بڑھنے سے روک رہی تھی۔ موت دونوں جانب ہی اُس کا مقدر تھی۔ وہ گرفتاری دے دیتا، تب بھی صرف سکینہ کا قتل ہی اُسے پھانسی پر چڑھانے کے لیے کافی تھا اور شاید خود کو اپنی مرضی سے دار کے حوالے کر دینے سے قدرت اُس کے چند گناہ دھو بھی ڈالتی، لیکن اُس نے گناہوں کی کالک ماتھے پر لیے ہی اس جہاں سے جانے کی ٹھان لی تھی۔ پولیس کنٹرول کے ذریعے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی کہ اب جبروت کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا ہے۔ اب اُس کے ساتھی بھاگ رہے ہیں اور پھر اُس کا پہلا محافظ گرا پھر دوسرا اور اب جبروت کو آخری تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آ جائے اور پھر مکمل خاموشی..... ایک آخری فائر کی آواز گونجی اور پھر پولیس

کے وائرلیس سیٹ چیخ پڑے، ہر جانب ایک شور سا مچ گیا۔ جبروت نے خود کو کنپٹی پر گولی مار کر اپنا خاتمہ کر لیا تھا۔ بستی کی ساری آبادی، جو پولیس کے عارضی صحرا میں قائم کردہ کنٹرول روم کے گرد جمع تھی، گنگ سی رہ گئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ ظلم کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پہلے تک، جوان سب لوگوں کی قسمت کا فیصلہ گر تھا، آج ایک بے جان لاشے کی صورت ریت پر بے بس پڑا تھا۔ سرخ رنگ اور خون کی دھار تو اُس کا پسندیدہ کھیل تھا اور آج جاتے جاتے بھی وہ یہ کھیل کھیل ہی گیا۔ سلطان بابا کو خبر پہنچی تو اُن کی زبان سے ایک ہی جملہ نکلا ''انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.....'' وہ ابھی نوری کے گھر ہی میں آرام کر رہے تھے اور پھر اگلی صبح سورج نکلتے ہی پہلے سانول اور پھر اُس کا باپ یکے بعد دیگرے نمودار ہوئے۔ سانول مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر میرے گلے لگ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُس کا باپ بھی شرمندہ سا پیچھے کھڑا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے چپ کروایا۔ سانول کے باپ نے ساری بستی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ جبروت کے ڈر کی وجہ سے کھل کر بستی والوں کا ساتھ نہیں دے سکا۔ نہ ہی اُس نے اپنے بیٹے کو جبروت کے نوری کے لیے بھیجے گئے رشتے اور اس سارے معاملے کی خبر ہونے دی، کیوں کہ اُسے خدشہ تھا کہ وہ اپنے جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے۔ وہ خوف زدہ تھا اور زمانے میں خوف سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ کال گڑھ والوں کے سر سے جبروت کے خوف کے بادل چھٹے، تو اُن کی زرد رنگت میں بھی دھیرے دھیرے سرخی شامل ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ صرف سانس لینے کی مجبوری سے نکل کر جینے کے سپنے دیکھنے لگے تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ میں اگلے دن بستی والوں سے رُخصت لے کر سلطان بابا کو شہر کے کسی بڑے اسپتال میں داخل کروا دوں تا کہ اُن کے تمام ٹیسٹ ہو سکیں۔ ویسے بھی کال گڑھ میں ہمارا کام ختم ہو چکا تھا، لیکن جیسے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا بستی والوں کے سامنے اظہار کیا، سب ہی بگڑ گئے۔ سانول تو باقاعدہ لڑنے کے لیے آ پہنچا کہ اگر سلطان بابا کا طبی معائنہ ہی کروانا ہے تو وہ خود میرے ساتھ شہر جا کر دو چار دن میں سارے کام مکمل ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آ جائے گا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ ہمارے پاؤں میں چکر تھا، جانے قدرت نے ہمارا اگلا پڑاؤ کہاں لکھا تھا اور اب مزید کون سا امتحان درپیش ہوگا۔ اُسی شام سانول کے باپ کی درخواست پر نوری کو باقاعدہ نشانی پہنانے کی رسم بھی رکھی گئی تھی۔ شام ہی سے بستی کے سب ہی گھروں کی دیواروں کی منڈیر پر دیئے جلا دیئے گئے۔ یہ اس صحرا کا پہلا چراغاں تھا، جو قلعے کی دیواروں کے باہر خود بستی والوں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ مردوں نے برسوں سے صندوقوں میں پڑی اپنی سفید لٹھے کی گھیر دار شلواریں نکلوا کر انہیں مائع لگا کر تیاری کی۔ بوسکی کی دو گھوڑوں کے نشان والی قمیصیں اور سر پر نیا صافہ یا سرخ پگڑی، عورتوں نے بھی اپنے بازو کہنیوں سے اُوپر تک چوڑیوں سے بھر لیے۔ سرخ، نیلے، پیلے، اودے اور سفید بڑے گھیر والے پلو اور ناک میں چمکیلے کوکے۔ جانے ایکا رسموں کا مہندی سے ایک خاص تعلق کیوں جُڑا ہوتا ہے۔ شاید رنگ اور خوشی کا آپس میں کوئی گہرا ناتہ ہوگا۔

اِسی لیے تو جہاں خوشی بکھرتی ہے، وہیں بہت سے رنگ بھی دَر آتے ہیں۔ میں خود تو ابھی تک اس ''خوشی'' نامی جذبے یا احساس کی گتھی ہی نہیں سلجھا پایا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو ہمیشہ سے ہی زیادہ خوشی مزید افسردہ کر دیتی ہے۔ شاید میرے اندر خوشی جھیلنے کا ظرف ہی نہیں تھا اور کسی ایسے احساس کا جشن کیا منانا، جو چند گھڑیوں سے لے کر بس چند گھنٹوں تک ہی آپ کا ساتھی ہو۔ شاید خوشی کا واسطہ ہی اس کی اس کم یابی کی صفت سے جڑ ہے۔ بڑی سے بڑی خوشی ہمیں بس کچھ دیر کے لیے ہی تو مکمل مسرور رکھ پاتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے یہ سرور ایک اطمینان میں ڈھلنے لگتا ہے اور چند گھنٹوں بعد ہی کسی احساس کی تکمیل کی طمانیت میں تبدیل ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں کروٹ لے کر سو جاتا ہے۔ پھر جب تک ہم خود اس لطیف احساس کو نہ ٹٹولیں، یہ اپنے آپ نہیں جاگتا۔ لیکن اس کے برعکس ''غم'' ہر لمحہ بوند بوند ہو کر ہمارے دل کی زمین پر ٹپکتا رہتا ہے۔ ہمیں خوشی کو کچھ دن کے بعد یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جب کہ غم ہمیں کبھی بھولتا نہیں۔ کسی وفادار دوست کی طرح ہر پل ہمارے وجود کے اندر رہتا ہے۔ خوشی اپنے ساتھ ہمیشہ رُخصت ہونے کا تصور لاتی ہے، جب کہ غم کا کاٹا ایک دائمی چبھن، کاٹ اور جلن لیے دل کے اندر ہی پیوست ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ جانے ہم ہمیشہ خوشی کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس بے وفا کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں، جو ہمیشہ اپنے ماتھے پر ''الوداع'' لکھوا کر آتی ہے۔ اُسے کیوں اُٹھا کر سدا کے لیے اپنے سینے سے نہیں لگا لیتے، جو عمر بھر ہمارے چوکھٹ پر پڑا ہمارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

سانول بھی آج اس بے وفا خوشی کے وار کا شکار تھا۔ جب میں مزار کی دہلیز پر پڑے غم کی چوکھٹ پار کر کے بستی کے لیے نکلا، تو شام ڈھل چکی تھی۔ غم مجھے جاتے دیکھ کر بولا ''جاؤ مل آؤ، اس دو گھڑی کی ساتھی سے میں یہیں پڑا رہ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ پر دیکھو، کہیں دیر نہ کر دینا کہ میرا تمہارا تو سدا کا ساتھ ہے۔'' سلطان بابا کی دیکھ بھال کے لیے پیش امام صاحب نے مسجد سے دو طلبا کو مزار بھیج دیا تھا، کیوں کہ سلطان بابا اس شو شرابے سے گھبرا کر آج شام ہی واپس مزار لوٹ آئے تھے۔ میں جب سانول کے گھر کے قریب پہنچا تو دُور سے مجھے عورتوں کی گنگناہٹ سنائی دی۔ صحرائی گیت کے بول سانول کو مبارک باد دے رہے تھے ''کہ آج سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا۔ تمہاری محبوب سولہ سنگھار کیے اور اپنے ماتھے پر تمہارے نام کی بندیا لگائے کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے..... لیکن خدا مارے ان چوڑیوں والیوں کو..... یہ ہمیشہ دیر کر دیتی ہیں..... شاید تمہاری محبوب سے جلتی ہیں۔'' عورتیں زور سے ہنسیں اور کسی دوسری جانب سے کوئی اور ٹولی گنگنائی، یہ چوڑیوں والیوں کا جواب تھا ''ہاں ہاں..... ہم کیوں جلدی کریں؟ ہمارے تو دل جل رہے ہیں..... بستی میں ایک ہی چھیل چھبیلا تھا، جس کی بانسری سننے کے لیے ہم ساری صحرا میں جمع ہوتی تھیں..... خدا کرے آج اس زور کی آندھی چلے کہ صحرا کا شہزادہ اپنا راستہ بھول کر چوڑی والیوں کی بستی میں آ جائے.....'' سب عورتیں ہنس پڑیں۔ جانے یہ صحرائی گیت اور ٹپے کون لکھتا ہوگا۔ جانے ایسے کتنے گم نام شاعر ہوں گے، جنہیں دنیا کبھی جان

نہیں پائی، لیکن ان کے الاپ اور گیت سدا کے لیے امر ہو کر ان صحراؤں، بستیوں اور گاؤں گلیوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

سانول کی منگنی کی تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ لڑکے والیاں ترکی بہ ترکی لڑکی والیوں کے سوالوں کا جواب دے رہی تھیں۔ مرد قہقہے لگا رہے تھے۔ صحرا کے بنے ہوئے خاص سونف اور شکر کے مشروب سے ساری تقریب کی خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بچے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ہر طرف نور، رنگ، شور اور قہقہے تھے۔ سانول کو عورتوں کے جھرمٹ میں باہر لایا گیا، تو سب ہی اُس جانب دوڑے۔ کچھ ایسا ہی منظر نوری کے صحن کا بھی تھا۔ اس وقت نوری کے چہرے پر شام کی لالی اور صبح کے نور جیسے دو موسم بیک وقت جھلملا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر اتنے بہت سے رنگ بیک وقت کیسے سمیٹ لیتی ہیں۔ اب عورتوں کے تیروں کا رُخ میری جانب ہو گیا تھا۔ ایک نے لے لگائی ''جانے لوگ کس کے غم میں جوگی بن بیٹھے ہیں۔ کاش آسمان پر اُڑتی یہ نیلی پتنگ مزار کے مجاور تک میرا پیغام بھی پہنچا دے.....'' سب زور سے ہنسے۔ دوسری ولی نے تان چھیڑی۔ ''مزار کے مجاور کی آنکھوں کا سرمہ جانے کس کان سے آتا ہے..... اگر وہ چاہے تو ہم سب اپنی اپنی سرمے دانیاں مزار کی چوکھٹ پر چھوڑ آئیں.....'' سانول میرے قریب ہی بیٹھا ہنس ہنس کر اس صحرائی بولی کا ترجمہ مجھے سنا رہا تھا۔ لفظ چاہے کسی بھی زبان کے ہوں..... ان گیتوں کا مطلب سدا ایک سا ہی ہوتا ہے۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ صحن کا دروازہ کھلا اور ایک طالب علم، جسے میں مزار چھوڑ آیا تھا، گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف بڑھا۔ اس کی کچی پکی اُردو سے میں صرف اتنا ہی سمجھ پایا کہ سلطان بابا کو خون کی قے ہوئی ہے اور اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے جسم میں سے جیسے کسی نے پل بھر ہی میں ساری جان نکال دی۔ میں نے سانول سے کہا کہ وہ یہیں رہے، لیکن مجھے ابھی مزار لوٹنا ہوگا۔ لیکن سانول بھی میرے پیچھے ہی لپکا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دیگر بہت سے لوگوں سمیت مزار کی جانب دوڑے چلے جا رہے تھے۔

دھانی

سلطان بابا کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ چند لمحوں ہی میں وہ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے
رات کی گاڑی چھوٹنے میں ابھی سوا گھنٹہ باقی تھا لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سواری کا تھا۔ گھنٹہ
یہاں سے ریلوے اسٹیشن کی مسافت تھی۔ لیکن کسی مریض کو بنا کسی سواری، یہ صحرا پار کرانے میں
ہو جاتی ہے۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم دو دو کی ٹولیوں میں اُونٹوں پر سفر کریں گے۔ بستی میں سواری کے
اُونٹ موجود تھے۔ عام حالات میں ان کے پیچھے دو پہیوں والی ٹھیلا گاڑی بھی لگا دی جاتی تھی۔ لیکن اس
وہ پہیے ریت میں دھنس کر چلنے کی وجہ سے تاخیر کا باعث بن سکتے ہیں لہٰذا ہمیں اُونٹوں کے مضبوط قدموں
انحصار کرنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم دس آدمی پانچ اُونٹوں پر سوار، صحرا میں دوڑے جا رہے تھے۔ سلطان
میرے ساتھ تھے۔ سانول اور اُس کا باپ ایک اُونٹ پر اور نوری کا باپ اور پیش امام صاحب ایک سا
تھے۔ خانو، اکرام صاحب اور بزرگ بقیہ اُونٹوں پر تواتر سے ہمارے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے
ہم بستی کی سرحد سے گزر رہے تھے تو سب ہی مرد اور عورتیں مجھے اور سلطان بابا کو الوداع کہنے کے لیے
آئے۔ میں نے صحرا میں پلٹ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے ہوا دھیرے سے میرے کان میں سکینہ کے
پیغام کی سرگوشی کر کے ہولے سے گنگنائی ہو..... ''الوداع.....''

ہم تیزی سے صحرا عبور کر کے اسٹیشن تک پہنچ تو آئے۔ مگر جس وقت میں نے دُور صحرا میں ریلوے
کی اُجاڑ عمارت اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جلتی مٹیالی سی گیس بتی دیکھی، تب تک ہمیں گھنٹہ بھر سے
زیادہ وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو کانٹا بدلنے والے نے خوش خبری سنائی کہ آج گاڑی دو گھنٹے
ہے، اس لیے ابھی کال گڑھ نہیں پہنچی۔ میں نے سلطان بابا کو وہیں پلیٹ فارم پر بچھے، لکڑی کے تختے نما
دیا۔ نہ جانے کن فکروں میں وقت گزر گیا اور گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر لگ گئی۔ سب ہی کی آنکھیں نم،
افسردہ تھے۔ سانول میرے ساتھ شہر جانے پر مُصر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے واپس جانے پر آما
سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھیڑ کے باوجود مجھے سلطان بابا کو لٹانے کی جگہ مل ہی گئی۔ یہاں سے قریب تر
رحیم پور بھی کم از کم بارہ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اور میں سارا راستہ یہی دعا کرتا رہا کہ ہمارے وہاں
مزید کوئی اَن ہونی نہ ہو جائے۔ بارہ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب جب ٹرین نے رحیم پور کے
سے پلیٹ فارم کو چھوا تو میں نے سب سے پہلے گھر فون کر کے مما پپا سے بات کی اور انہیں کچھ پیسے بھیجنے

شہر کے سب سے بڑے اسپتال کا پتا میں پہلے ہی اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ چکا تھا۔ دوسرا فون میں نے آئی جی نصیر کو کیا کیوں کہ انہوں نے ایس پی کے ذریعے سلطان بابا کی پل پل کی خبر دینے کی ہدایت کی تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں رحیم پور میں ہوں تو فوراً اپنے ایک ریٹائرڈ سینئر کا نام، پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ اسپتال پہنچ کر انہیں بھی ضرور مطلع کردوں۔ یہ صاحب پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اب رحیم پور ہی میں اپنا فارم ہاؤس اور مالٹے، کینو کے باغات کا کام سنبھالتے تھے۔ میں نے بے دھیانی میں ساری تفصیل کاغذ کی ایک چٹ پر لکھ کر جیب میں ڈال لی۔ اُس وقت میری ساری توجہ اس جانب تھی کہ کسی طرح جلد از جلد سلطان بابا کو اسپتال پہنچادوں اسٹیشن کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے گاڑی لے کر میں لشتم پشتم اس بڑے نجی اسپتال تک پہنچا اور یہاں ایک بار پھر میرا حلیہ میرے آڑے آگیا۔ باہر کھڑے دربان کو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا کہ میں اتنے بڑے اسپتال کی فیس بھر سکوں گا۔ تب قریب سے گزرتے ایک معمر ڈاکٹر کو روک کر میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ہمیں اندر جانے کی اجازت دلوائے۔ پپا رقم پہلے ہی اسپتال کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا چکے تھے۔ وہ کوئی بھلا انسان تھا۔ اُس نے ہمدردی سے میری بات سنی اور گارڈ کو ڈانٹا کہ "کتنی بار منع کیا، یوں مریضوں کو گیٹ پر روک کر بحث نہ کیا کرو۔"

میں سلطان بابا کو انہی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف بھجوا کر خود استقبالیہ کی طرف دوڑا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو میں نے پاپا کا اور اپنا نام بتایا کہ وہ چیک کرے کہ کیا اس مد میں کوئی رقم اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوئی ہے۔ اُس نے مستعدی سے جانچ پڑتال کے بعد مسکراتے ہوئے اطلاع دی کہ رقم جمع ہوچکی ہے۔ پاپا نے اتنے پیسے بھیج دیئے تھے کہ اگر ہمیں مہینہ بھر سے زیادہ بھی یہاں رہنا پڑتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کہ "اب تو مسیحا بھی گراں ہوگئے۔" اگر انسان کی جیب میں مناسب رقم نہ ہو تو یہ مسیحائی بھی اس کا مقدر نہیں۔ سلطان بابا کے سر کے بہت سے ایکسریز اور سی ٹی اسکین وغیرہ کے بعد انہیں ایک کشادہ کمرے میں داخل کرلیا گیا۔ اس وقت وہ اپنے حوش وحواس میں تھے۔ اور انہیں مستقل یہی فکر کھائے جارہی تھی کہ میں خواہ مخواہ انہیں اتنے مہنگے اسپتال میں کیوں لے آیا ہوں۔ بقول اُن کے وہ بھلے چنگے تھے اور اب ہمیں وہاں سے چل پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹروں کی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ انہوں نے سر کی اندرونی چوٹ کا خدشہ ظاہر کیا تھا اور اُن کے کلیے کے مطابق اب تک سلطان بابا کا چلنا پھرنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ بہرحال طے یہ ہوا کہ صبح بڑے ڈاکٹروں کا ایک پینل بابا کی تمام رپورٹس کی جانچ کرے گا اور پھر کوئی حتمی بات کی جائے گی۔

اس سارے ہنگامے میں شام ہوچکی تھی اور جب مجھے سلطان بابا کی نگرانی پر مامور نرس نے یہ اطلاع دی کہ یہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تو مجھے ایک دوسری تشویش نے آگھیرا۔ میں سلطان بابا کو اکیلا چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسپتال کے اُصول بھی اٹل تھے۔ ابھی میں اِسی کش مکش میں مبتلا تھا کہ

ایک بزرگ جو نفیس سے سفاری سوٹ میں ملبوس تھے، ہونٹوں میں پائپ دبائے بوکھلائے ہوئے سے وہ
دے کر اندر داخل ہوئے۔ سلام کے بعد دھیرے سے نرس سے پوچھنے لگے۔ ''کیا عبداللہ صاحب کا یہی
ہے۔ میرا نام شیخ امتیاز ہے۔'' اچانک میرے ذہن میں بھی نام گونجا۔ اوہ! یہ تو وہی حضرت تھے، جن کا پ
نصیر صاحب نے بطور خاص لکھوایا تھا۔ میں جلدی سے درمیانی حصے کا پردہ ہٹا کر کمرے کے دوسرے حصے
آ گیا اور انہیں سلام کیا۔ ''جی..... میرا نام عبداللہ ہے۔'' وہ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر جلدی سے آگے بڑ
گرم جوشی سے ملنے لگے۔ ''اوہ! معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں کسی بزرگ کا خاکہ تھا۔
نصیر نے کچھ دیر پہلے ہی فون کر کے ساری تفصیل بتائی ہے۔ وہ بزرگ کیسے ہیں، جن کی طبیعت نا
تھی۔'' میں انہیں اندر سلطان بابا کے پاس لے گیا۔ وہاں انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا کہ وہ اور
صاحب ملازمت میں ایک دوسرے سے سنیارٹی میں کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت قریب تھے ا
تعلق شیخ صاحب کی ملازمت سے فراغت کے بعد بھی بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے بڑی عاجزی سے سلطا
سے درخواست کی کہ اُن کے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کریں۔ سلطان بابا نے اُن کا شکریہ ادا کیا
یہاں تک آ گئے، یہی اُن کے لیے باعث تسلی ہے۔ شیخ صاحب نے جھجکتے ہوئے اسپتال کی فیس کا پوچھا تو
نے انہیں بتایا کہ مہینے بھر کی پیشگی ادائیگی ہو چکی ہے۔ وہ ذرا سے حیران ہوئے لیکن چہرے کے تاثرات
گئے۔ ہمارے ظاہری حلیوں کو دیکھتے ہوئے اُن کی حیرت بجا تھی کہ کاغذ کے ان مخصوص ٹکڑوں کی اہمیت
جگہ مسلم ہے۔ اتنے میں نرس نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مریض کے پاس رہنے کے اوقات ختم ہو چکے ہ
سلطان بابا کو اب بھی میری ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ میں رات کہاں بسر کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی د
میں قریب ہی کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔ وہ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا
رہیں۔ شیخ صاحب جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ساری بحث سن رہے تھے، جلدی سے بولے ''آپ
نوجوان کی فکر نہ کریں۔ میرا اتنا بڑا گھر کس دن کام آئے گا۔ عبداللہ میاں کو میں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گ
صبح ٹھیک وقت پر دوبارہ یہاں پہنچا بھی دوں گا۔'' سلطان بابا میرے چہرے پر پس و پیش کے آثار دیکھ کر
گئے کہ میں ان تکلفات میں پڑنے سے کترا رہا ہوں۔ انسان جب تک اکیلا اور اپنے بس میں ہو تو آزاد
ہے۔ کسی اور کے کرم پر ہو تو جکڑ جاتا ہے۔ میں جب تک اپنے گھر میں بھی تھا تب بھی مجھے گھر کی پابندیاں
مما پاپا کی نصیحتیں کبھی مخصوص اوقات کا پابند نہیں کر سکی تھیں۔ بیرونی گیٹ کی ایک چابی ہمیشہ میری گاڑ
چابی کے چھلے میں موجود رہتی تھی تاکہ جب کبھی میں آدھی رات کو اپنی مٹرگشت کے بعد گھر پہنچوں تو مجھے
بجا کر دروازہ نہ کھلوانا پڑے۔ مجھے بندھے دروازوں، لگے بندھے نظام الاوقات اور ایسی ہر پابندی سے خدا وا
کا بیر تھا، جو میرے اندر کی آزاد دنیا کو قید کرنے کی کوشش کرتی۔ اور شاید وہ آوارہ گرد سا حراب بھی مجھ سے
چھپا بیٹھا تھا۔ سلطان بابا میرے ساتھ ہوتے تو بات اور ہوتی، کیوں کہ اُن کی موجودگی میں کہیں بھی آز

وس کرتا تھا، لیکن یوں تنہا شیخ صاحب کے ساتھ جانے میں مجھے بہت ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ امتیاز صاحب بھی ے ہچکچاہٹ جان گئے مسکرا کر بولے "بھئی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نصیر آج کے بعد مجھ سے کبھی بات نہ کرے ردر کہیں اور ٹھہر جانا۔ کیوں کہ وہ پکا پولیس والا ہے، ایک بار رُوٹھ جائے تو منانا مشکل ہے۔ جب اُسے پتہ گا کہ میرے شہر میں اُس کے مہمان کہیں اور قیام کر رہے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ وہ کیا سوچے گا.....؟" ان بابا نے بھی میرا ہاتھ دبا کر مصلحت سمجھانے کی کوشش کی۔

ہم اسپتال کی پارکنگ میں آئے تو اُن کی بی ایم ڈبلیو کے ڈرائیور نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ لا اور کچھ ہی دیر میں ہم اُن کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ راستے میں انہوں نے اپنے خاندان کا انہ تعارف بھی کروایا۔ اُن کی اہلیہ چار سال پہلے داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ گھر میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ں۔ بڑا لڑکا کاروبار کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہفتے سے بیرون ملک تھا۔ اُس کی آمد دو ہفتے میں متوقع تھی۔ سے چھوٹی دونوں بیٹیاں اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ اور سب سے چھوٹا بیٹا ابھی بی اے کا طالب علم تھا۔ میں چاپ اُن کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ کافی زندہ دل انسان معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنی اولاد کی ہر چھوٹی بڑی دلچسپی پوری طرح شامل ہو اور اپنے گھر ہی کو اپنی کل کائنات سمجھتا ہو۔ میں نے اپنے بارے میں مکمل تفصیلات نے سے اجتناب کیا اور اتنا ہی بتایا کہ ماں باپ کے بعد اب سلطان بابا ہی میرے اپنے اور بزرگ ہیں۔ اِسی میں اُن کا گھر بھی آ گیا۔ کافی بڑا بنگلہ تھا۔ جدید طرز تعمیر کا ایک شاہکار۔ اتنے دن صحرا میں گزارنے کے تنا زیادہ سبزہ اور ہرے بھرے درخت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی دنیا بلیک اینڈ ے سے تبدیل ہو کر رنگین ہو گئی ہو۔ جلتی ہوئی لو کی جگہ گاڑی سے اُترتے ہی بھیگی ہوئی نرم ہوا کے جھونکے میرا چہرہ چوم لیا۔ دو نوکر اندر سے دوڑے چلے آئے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ سے میرے کپڑوں کا تھیلا تھام لیا۔ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ مجھے انیکسی میں لے جائیں۔ اب میرا قیام وہیں ہوگا۔ انہوں نے رات کھانے کے لیے میرے پسند پوچھی تو میں ٹال گیا کہ جو بھی بنا ہو وہی میری پسند ہوگا۔ میں نوکروں کے پیچھے ا کی طرف بڑھنے لگا تو انہیں کچھ یاد آیا "ارے ہاں، عبداللہ میاں! انیکسی کے دوسرے کمرے میں اپنے یار میاں بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک ماہ پہلے ہی دارالحکومت سے تشریف لائے ہیں۔ میرے بہت ے دوست کے صاحب زادے ہیں۔ تمہارے ہی ہم عمر ہیں۔ اُمید ہے کہ تم دونوں کا وقت اچھا گزرے تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ.....ہم کھانا انیکسی ہی میں کھائیں گے۔" میں انیکسی پہنچا تو بنگلے کا ایک پورا حصہ ان خانے کے طور پر پچھلے حصے میں موجود تھا۔ جس کا اپنا پورچ اور باغیچہ بھی اِسی حصے میں واقع تھے۔ انیکسی چار کمرے تھے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ اس کے علاوہ تھا۔ میرے لیے جو کمرہ کھولا گیا، اس کے دوالے کمرے میں پہلے سے روشنی تھی اور تیز موسیقی کی آواز بند دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ گھر کافی ادہ اور اور ہر طرح کے آسائشی لوازمات سے مزین تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے وہاں ایک عجیب سی گھٹن کا

احساس ستانے لگا۔ شاید اتنے بہت دنوں تک تنگ و تاریک اور ویران جگہوں پر رہتے رہتے، میر
ماحول کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم اپنی آسائش اور آرام کے پیمانے خود
بناتے ہیں۔ کبھی یہ آرام دہ بستر میرے آرام کا پیمانہ تھا اور اب ایک رات پہلے تک صحرائی جلتی ریت
سکون سے سو جاتا تھا۔ بات تو بس ذرا اس پگلے من کو بہلانے کی ہوتی ہے۔ اور ہم سے جو کوئی
بہلاوے کا گُر جان لے، دراصل وہی کامیاب کہلاتا ہے۔

کچھ دیر بعد شیخ صاحب بھی کپڑے تبدیل کر کے انیکسی پہنچ گئے۔ مجھے نوکر نے بتایا کہ وہ
صاحب کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ایک کلین شیو نوجوان نے اُٹھ کر میر
کیا۔ ''ہیلو! مجھے شہر یار کہتے ہیں۔'' میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔ ''میں عبداللہ ہوں۔
مسکرایا..... ''عبداللہ تو ہم سب ہی ہیں۔ یعنی اللہ کے بندے۔'' شیخ صاحب زور سے ہنسے ''ارے
بات کا بُرا نہ ماننا، دراصل لفظوں سے کھیلنا ہی شہر یار میاں کا پیشہ ہے۔ قلم کار جو ٹھہرے۔ آج کل
اپنے کسی منصوبے کے لیے کہانی کی تلاش میں آئے ہوئے ہیں۔'' میں بھی دھیرے سے مسکرایا ''پھر
ڈرنا چاہیے، کہیں ہماری ہی کہانی نہ بنا ڈالیں۔'' اُن دونوں ہی کو شاید مجھ سے ایسے کسی جواب کی توقع
ایک لمحے کے لیے دونوں چونکے اور پھر دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ کھانے کے دوران پتا چلا
ایک لکھاری ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا، لیکن عملی زندگی میں باپ
میں ہاتھ بٹانے کی خواہش کو رد کر کے قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ موضوعات کی یکسانیت سے گھبرا کر وہ ایک
لکھنے کی بجائے کہانی کی تلاش میں گھوم گھوم کر لکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔ شہر یار کو مختصراً سلطان بابا کے بار
دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر شیخ صاحب ہم دونوں سے رُخصت ہو کر آرام کے
گئے۔ میں اور شہر یار بھی شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میں عشاء کی نماز ادا کر
بعد بھی بہت دیر تک شیشے کی اس دیوار نما بڑی سی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا رہا، جہاں سے انیکسی کے
موجود باغیچے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ باغ میں ہر تین چار گز کے فاصلے پر بجلی کے سفید دودھیا قمقمے لگ
تھے۔ لہٰذا اس وقت بھی وہاں دن جیسا ہی سماں تھا۔ میری توجہ ابھی اسی لان کی انتہائی نفاست سے
باڑھ اور بیلوں کی جانب ہی تھی کہ اچانک سامنے پڑی چھوٹی سی شیشے کی تپائی پر پڑا فون بج اُٹھا۔ میں
چونکا، رات کے ساڑھے بارہ بجنے کو تھے۔ اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟ اچانک میرا ذہن اسپتال
گیا اور کسی اَن جانے وسوسے کی پھنکار سے ڈر کر میں نے جلدی سے ریسیور اُٹھا لیا۔ ''جی.....'' دوسر
خاموشی تھی۔ میں نے قدرے زور سے کہا ''جی فرمایئے'' دوسرے جانب سے ایک نازک سے نسو
اُبھری۔ جی آپ کون؟'' ''میں عبداللہ ہوں۔'' دوسرے جانب سے کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ شاید کوئی
تھا۔ میں گہرے سانس لے کر اُٹھنے ہی کو تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ جی میں آیا کہ ریسیور اُٹھا کر نیچے رکھ د

ہانے اس فون کی دوسرے لائن کہاں تھی۔ اس طرح مصروف کر دینے سے کوئی ضروری فون بھی تو چوک سکتا
میں نے دوبارہ ریسیور اُٹھایا۔ دوسرے جانب وہی آواز تھی ''جی..... شہر یار.....؟'' اوہ تو یہ شہر یار کے لیے
تھا۔ میں نے جواب دیا ''نہیں..... شہر یار صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔ میں یہاں مہمان ہوں۔''
رے جانب پھر وہی جلترنگ بجا۔ ''اوہ ..... معاف کیجئے گا۔ آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی۔ آپ فون
دیں اور اس بار گھنٹی بجے تو آپ نہ اُٹھایئے گا۔'' شہر یار خود اُٹھالیں گے۔ دراصل اس نمبر کی دو ایکس ٹینشز
۔'' میں نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ دس منٹ کے بعد گھنٹی بجی تو تین گھنٹیوں کے بعد خاموشی چھا گئی۔ شاید
ری جانب سے شہر یار نے فون اُٹھالیا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد ہی مجھے پھر سے وہی گھٹن
نے لگی، حالانکہ اے سی کی وجہ سے کمرے میں خوش گوار خنکی چھائی ہوئی تھی۔ میں ابھی باہر نکلنے کا سوچ رہا تھا
دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور شہر یار نے اندر جھانکا ''ویسے تو آدھی رات کے وقت یہ سوال کرنا خود
زہبی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اجازت ہو تو اندر آجاؤں۔ مجھے بھی نیند نہیں آرہی اور تمہاری نیند شاید
ر اس فون کی بجتی گھنٹی نے اُڑادی ہے۔'' میں خوش دلی سے مسکرایا ''نہیں! میری نیند ازل سے اُڑی ہوئی
۔ شاید میرے اندر ہی کوئی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اندر آجاؤ۔'' شہر یار نے میری کرسی کے سامنے والا صوفہ
ال لیا ''واہ، خوب کہی۔ ویسے تمہاری تعلیم کتنی ہے؟ سچ کہوں تو مجھے تو تم بھی کوئی رائٹر ہی دکھتے ہو۔'' میں
کرٹال گیا اُلٹا شہر یار سے سوال کر دیا ''تم کہانی کی تلاش میں یہاں آئے ہو، تو پھر کچھ کامیابی ہوئی کہ
۔'' شہر یار نے ایک لمبی سی سانس لی ''اب کیا بتاؤں۔ پچھلے چند دنوں سے میں خود ایک کہانی بنا ہوا
۔'' ''کیوں..... خیریت.....؟'' ''ہاں فی الحال تو خیریت ہی ہے۔ دراصل ڈیڈی نے مجھے یہاں کسی اور
مد کے لیے بھیجا ہے۔ کہانی تو بس ایک بہانہ ہی ہے۔ مجھے شیخ انکل کی دو بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بطور ہم
نتخاب کرنا ہے۔ یہ ڈیڈی کی خواہش ہے۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ اختیار دیا
لہ چونکہ ابھی تک کوئی مہ جبیں میری نظروں میں سمائی نہیں، لہٰذا اس چناؤ کے لیے اپنی پہلی تلاش اِسی گھر
شروع کروں۔ اور یہیں سے میری اُلجھن کا آغاز ہوتا ہے۔'' میں نے حیرت سے اُس کی جانب
۔'' ''اس میں اُلجھن کیسی۔ شیخ صاحب کی دونوں صاحب زادیوں سے مل کر دیکھ لو۔ اور پھر دونوں میں سے
دل کو بھائے اُس کے لیے ہاں کہہ دو اور پھر تمہیں تو نہ کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ دل نہ مانے تو
ڈیڈی کو اطلاع کر دینا۔'' شہر یار نے پھر ایک آہ بھری ''یہی تو مشکل ہے۔ مجھے ان میں سے بڑی والی
ہے..... کیا کہوں کہ وہ میرؔ کی غزل ہے یا خیامؔ کی رُباعی، دردؔ کا کوئی قطعہ ہے یا غالبؔ کے خطوط کی نثر
لا.....'' میں مسکرادیا۔ ''تو پھر اُلجھن کیا ہے۔ پہلی فرصت میں گھر والوں کو اطلاع کر دو کہ وہ آکر تمہارے
اُس کا ہاتھ مانگ لیں۔'' شہر یار جلدی سے بولا۔ ''وہ ہے ہی ایسی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے فون پر اُسی کی
رہی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ اُس کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، لٹریچر تو جیسے وہ سارے کا سارا گھول کر پی چکی

ہے، دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر وہ بات نہیں کر سکتی ..... لیکن صرف فون پر..... جیسے ہی وہ سا
ہے، سمجھ زبان کھو جاتی ہے اُس کی۔'' تو کیا اُسے پہلے پتا تھا کہ تمہارے اُن کے ہاں ٹھہرنے کی اصل
ہے.....؟ شہریار مسکرا دیا'' ہاں میرا خیال ہے کہ ڈیڈی نے انکل کو کچھ اشارہ ضرور دیا ہوگا اور خود انکل
اولاد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ضرور اپنی دونوں بیٹیوں کو میری آمد کا مقص
ہوگا۔ ان کے آپس میں شرارت آمیز اشارے تو یہی بتاتے ہیں۔ لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں اُ
تنہائی میں ایک بار مل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک آدھ بار ایسا موقع ملا بھی تو میرے کان وہ سب کچھ
لیے ترستے ہی رہے جو میں فون پر اُس کی میٹھی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فون پر دونو
بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دونوں ہی زور سے ہنس بھی دیتی ہیں۔ مطلب انہوں نے
چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ مجھ سے بات کرتے وقت وہ دونوں ہی دوسری جانب لائن پر موجود ہوتی
مجھے شہریار کی حالت دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ اُس نے شکوہ کیا'' ہاں تم! بھی ہنس لو۔ اپنی صورت حال ہی کچھ
ہے کہ آتے جاتے سب ہی ہماری کھلی اڑاتے ہیں۔'' میں نے اُسے چھیڑا'' تم خواہ مخواہ کہانی کی تلا
یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہو۔ ایک سنسنی خیز تجسس سے بھرپور کہانی تو خود تمہارے آس پاس چل رہی ہے
یار نے قریب پڑا کشن اپنے سر کے پیچھے رکھا'' ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو خواتین کے کسی رسالے کے لیے
ایک ناول کا پلاٹ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آئے مہینے بھر سے کچھ زیادہ ہونے کو آ گیا ہے
مجھے اس سے ایک تو تفصیلی ملاقات میں بہت سے سوالوں کا جواب لینا ہے اور میرے پاس اس کے لیے
وقت بھی نہیں ہے۔ میں نے غور سے شہریار کی جانب دیکھا'' ویسے کیا تم نہیں سمجھتے کہ تم نے مجھے اپنی ا
کی کہانی میں شامل کرنے میں کچھ جلدی کی ہے۔ میں ابھی تک تمہارے لیے ایک اجنبی ہی تو ہوں۔''
مسکرایا'' ہم بھی لکھاری ہیں۔ میاں چلتے پھرتے بہت کرداروں کے اندر تک جھانک لیتے ہیں۔ مانا
ملے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں، لیکن تم میرے لیے پہلے لمحے کے بعد ہی اجنبی نہیں رہے تھے۔ تم وہ
جس کا بھیس تم نے بھر رکھا ہے۔'' میں نے چونک کر اُسے دیکھا'' اچھا.....؟ اتنی جلدی یہ نتیجہ کیسے اخذ
نے۔'' شہریار میرے جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی میز پر زیادہ تر اٹالین اور چائنیز ڈشز موجود تھیں۔
تم نے چھری کانٹے کا استعمال حتی الامکان کم سے کم کیا لیکن تمہیں ان لوازمات کا استعمال کرتے دیکھ
بھی بآسانی بتا سکتا تھا ہے کہ تم وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہو۔'' میں نے حیرت سے شہریار کی طرف دیکھا
کمال کا مشاہدہ تھا اُس کا۔ اتنی چھوٹی سی بات کا بھی اُس نے کس قدر غور سے جائزہ لیا۔ میں نے اُ
دی۔'' واہ بھئی..... مجھے نہیں پتا تھا کہ آج کل کے نئے لکھاری بھی اس قدر گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ تم
متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' شہریار زور سے ہنسا۔'' تو پھر ہو جاؤ نا متاثر۔ کوئی تو ہمارا بھی
'' میں بھی ہنس پڑا۔'' چلو تو پھر آج سے میں تمہارا پہلا پرستار ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اب اس معمے کا کیا کر

جس نے تمہارے راتوں کی نیند اُڑادی ہے۔'' شہریار نے سر کھجایا۔ معما تو حل کرنا ہی پڑے گا۔ انکل کی عادت ہے کہ وہ شام کی چائے سب کے ساتھ ہی کبھی لان میں تو کبھی سن روم میں پیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل تمہارا سامنا بھی ان دونوں سے ہوجائے، پھر تم ہی بتانا کہ فون پر اتنا اچھا بولنے والی، سامنے آتے ہی اس قدر خاموش کیوں ہوجاتی ہے۔ شہریار بہت دیر تک میرے کمرے میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ لہٰذا اگلی صبح مجھ سے فجر قضا ہوگئی۔ آنکھ کھلی تو سر بھی بہت بھاری ہورہا تھا۔ نوکر نے مجھے کمرے سے نکلتے دیکھ کر جلدی سے ناشتا میز پر لگادیا۔

کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے اسپتال چھوڑ آیا۔ شیخ صاحب دوسری گاڑی میں صبح سویرے ہی کسی ضروری کام سے نکل چکے تھے۔ البتہ ڈرائیور کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھے شام چار بجے کے قریب گھر واپس لیتا آئے۔ میرے ذہن میں شہریار کی رات والی بات گونجی۔ سلطان بابا کی حالت آج کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ دوپہر بارہ بجے تک اُن کے تمام ضروری معائنے بھی ہوگئے۔ جن کی رپورٹ کل ملنا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو گھر واپس بھیجنے کی بات کی تو انہوں نے منع کردیا کہ اگر شیخ صاحب نے کہا ہے تو پھر میں شام کو گھر سے ہوآؤں، پھر چاہے تو رات گئے تک اسپتال میں اُن کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں۔ میں ساڑھے چار بجے ڈرائیور سمیت گھر واپس پہنچا تو دربان نے بتایا کہ شیخ صاحب لان میں میرا انتظار کررہے ہیں۔ شام کی چائے پر شہریار اور اُن کا چھوٹا بیٹا وقار بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں چائے لگادی گئی۔ اتنے میں اندر سے جدید وضع قطع کے لباس میں ایک شوخ سی لڑکی نکلی۔ شیخ صاحب نے تعارف کروایا۔ ''عبداللہ میاں! یہ ہماری بڑی صاحبزادی ہیں، شاہانہ۔ ہماری شانی۔'' میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ شانی کے پیچھے پیچھے ایک اور سیدھی سادھی، بیچ میں مانگ نکالے سانولی سلونی لڑکی بھی چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہماری جانب آگئی۔ وہ شاہانہ کی بالکل لٹ دکھائی دیتی تھی۔ سادہ سا کرتا پاجامہ پہنے لمبی سی چٹیا بنائے۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف نظر آئی۔ شیخ صاحب نے پھر تعارف کروایا۔ ''اور بھئی..... یہ ہیں ہماری چھوٹی صاحبزادی..... دھانی.....''

لفظ گر

اگر ان دونوں کا تعارف خود شیخ صاحب نہ کرواتے تو شاید میں کبھی انہیں سگی بہنیں نہیں مانتا۔ ان
کے برتاؤ، چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ میں مشرق و مغرب جتنا فاصلہ اور دن اور رات جیسا فرق تھا۔
خود اعتمادی دونوں میں یکساں اور بلا کی تھی۔ چائے کے دوران دونوں بہنوں نے مجھ سے سلطان بابا کی طـ
کا پوچھا اور اپنی اور شیخ صاحب کی جانب سے خواہش ظاہر کی کہ جب وہ بہتر ہو جائیں تو کچھ دن ان سـ
ساتھ یہیں ان کے گھر پر قیام کریں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ میں ان کی فرمائش ضرور سلطان بابا تک
دوں گا۔ شہریار کی ساری توجہ شاہانہ پر تھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ چائے پینے کے دوران بھی کھویا کھویا سا
تھا۔ میں چائے ختم کر کے شیخ صاحب کی اجازت سے دوبارہ اسپتال کے لیے نکل پڑا۔ باقی سب بھی اُٹھ
تھے۔ شہریار نے مجھ سے کہا کہ وہ رات کے کھانے پر میرا انتظار کرے گا۔ میں اسپتال پہنچا تو سلطان با
کمرے میں تین چار سینئر ڈاکٹروں کا جمگھٹا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ نرس نے مجھ سے درخواست کی کہ جـ
ڈاکٹر کمرے سے نکل نہ جائیں میں بیرونی کمرے میں انتظار کروں۔ دس منٹ کا وہ مختصر عرصہ مجھ
صدیوں جیسا بھاری گزرا۔ پھر جیسے ہی پہلے ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا میں تیزی سے اس کی جانب لپکا۔
ٹھیک تو ہے نا ڈاکٹر صاحب۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''اوہ ہاں..... ڈونٹ وری۔ بس معمول کا چیک اپ تھا۔ ا
لوگوں سے اسپتال والوں نے اتنی فیس لی ہے تو ہمیں بھی کچھ سرگرمی تو دکھانا پڑے گی نا۔'' اُن کی بات
میں بھی مسکرا دیا۔ طبیب کے پاس مریض کے لیے دوا اور اُس کے تیمارداروں کے لیے مسکراہٹ سے
اور بھلا کیا سوغات ہوگی۔ خوش دلی اور اخلاص سے بھری ایک مسکان کی خود اپنی ایک مسیحا گری ہوتی
بہت سے گھائل تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فقط علاج ہی بس ایک مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اور اس لمحے
یہ احساس ہوا کہ طب کے شعبے میں شاید دوا سے بھی زیادہ اور پہلی ضرورت خوش اخلاقی ہے۔

سلطان بابا اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ''میں نے
کہ اسپتال میں بندہ داخل تو اپنی مرضی سے ہوتا ہے، لیکن پھر اس کی 'رہائی' ان ڈاکٹروں کی مرضی
ہو پاتی ہے۔ اب یہ روز بروز نئی محبتیں تراشیں گے مجھے یہاں روکنے کے لیے.....'' مجھے اُن کی ''رہائی
اصطلاح پر ہنسی آ گئی۔ ''ہاں..... ابھی باہر جو ڈاکٹر صاحب ملے تھے، وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پیسے
انہیں حلال بھی تو کرنا ہے۔'' میری بات سن کر بابا بھی مسکرا دیئے۔ ''ٹھیک ہے میاں! کر لو اپنی ضد پور

لبن یاد رہے..... جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' میں نے چونک کر اُن کی جانب یکھا۔ ہر بار کی طرح ان کا یہ مخصوص جملہ ایک بار پھر میرے اندر سب کچھ تلپٹ کر گیا۔ اب تو مجھے اس جملے ے باقاعدہ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، کیوں کہ سلطان بابا نے جب بھی اسے ادا کیا کوئی نہ کوئی انہونی ضرور ش آئی۔ میرے لبوں سے آخر بہت دیر سے اٹکا سوال پھسل ہی پڑا۔ ''آپ ہمیشہ کہتے ہیں کہ دعا سے تقدیر ل سکتی ہے، پھر آپ اپنے لیے شفایابی کی دعا کیوں نہیں کرتے۔ کال گڑھ میں آپ کو جو شدید چوٹ لگی، پ نے اس سے بچاؤ کی دعا پہلے سے کیوں نہ کی؟'' وہ میرا سوال سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے، جیسے میں نے ل از وقت کوئی بات پوچھ لی ہو۔ کچھ دیر بعد خاموشی توڑی اور کہا۔ ''میں ہمیشہ اپنے لیے، تمہارے لیے بلکہ ب کے لیے یکساں دعا مانگتا ہوں۔ سب کے لیے اللہ سے اُس کا فضل، کرم طلب کرتا ہوں۔ اور ہر اس اہش کا اظہار کرتا ہوں جس کی تکمیل میں ہم سب کی بہتری ہو..... لیکن یاد رہے، بہتری کس بات میں پوشیدہ ہے، اس کی خبر تو بس اُسی کو ہے۔ جانے اس سر کی چوٹ اور پھر یہاں اسپتال تک پہنچنے میں اُس کی کون سی صلحت پوشیدہ ہے۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر، بہت قریبی نتائج پر نظر رکھنے والے پیدا کیے گئے ہیں لہٰذا نتائج ی پرواہ ہمیشہ اُسی پر رکھ چھوڑنی چاہیے..... رہی بات خود اپنے جسم کو گھائل ہونے سے بچانے کے لیے دعا رنے کی تو یاد رکھو، اس جسم کی اپنی کچھ حدیں ہیں اور موت ان جسمانی حدوں کو پار کر جانے کا نام ہے۔ یہ جسم یا کی سب سے فانی شے ہے۔ اس دور میں اس بدن کے عروج اور پھر زوال کا دورانیہ اوسطاً ساٹھ سے ستر ال کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کلیے سے میرا جسم اپنی عمومی مدت پوری کر چکا ہے۔ میں ستر کے عدد کو چھونے لا ہوں اور اس دوران میرے جسم میں موجود خون کے خلیے، میری رگیں، پٹھے اور جسم کے بنیادی اعضا اپنی دی مشقت پوری کر چکے ہیں۔ اب ان اعضا کے ساتھ جسم کا جو بھی برتاؤ ہے، وہ خصوصی ہوگا۔ یہاں ایک ت اور دھیان میں رکھنے کی بہت ضرورت ہے کہ موت کا تعلق کبھی براہ راست جسم کے زوال سے نہیں ہوتا۔ ت جسم میں موجود رُوح کے نکلنے کا نام ہے جو نکلتے نکلتے سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لے سکتی ہے۔ اور ت سے ایسے انسان ہمارے آس پاس موجود ہیں، جو اپنے جسم کے اس خصوصی رویئے کی وجہ سے بآسانی اتنی رکا سفر بھی طے کر لیتے ہیں، جب کہ بعض حادثاتی صورتوں میں بیس بائیس سال کے جوان جسم سے بھی رُوح ا بھر میں نکل جاتی ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جسم کی اپنی بھی ایک خاص میعاد اور مدت ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں ریزی میں..... ایکس پائیری ڈیٹ، جو کسی حادثے کی صورت میں فوراً اور طبعی مدت پوری کرنے کی صورت ساساٹھ سے ستر سال کے اندر ہمارے جسم کو اس حال تک پہنچا دیتی ہے کہ جہاں ہماری رُوح کا اس بدن میں ید قیام مشکل ہو جاتا ہے۔'' میں غور سے سلطان بابا کی بات سن رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ایک بہت بڑا اسرار رے ذہن کے دریچوں سے اندر آتے آتے واپس پلٹ گیا۔ جیسے کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے ہی سب کچھ پس میں اُلجھ گیا ہو۔ سلطان بابا نے کچھ وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ''اِسی لیے ہمارے معاشرے میں

عام طور پر لوگ اپنے جسم کے اس عمومی رویئے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنی دینی اور دنیاوی معمولات کا بھی ترتیب دیتے ہیں۔ ایک عام رویئے کا انسان چالیس پینتالیس سال کی عمر کے بعد مذہب کو زیادہ دینے لگتا ہے، کیوں کہ اس کے لاشعور میں کہیں یہ بات دبی ہوتی ہے کہ عمر کی آخری دہائیاں شروع ہو چکی بہتر ہے کہ اب اُوپر والے کو بھی راضی کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پھر بڑھاپا۔ یہ کیفیات بھی صرف ہمارے جسم ہی پر وارد ہوتی ہیں۔ ان کا ہماری رُوح سے کوئی تعلق نہیں، البتہ رُوح کا ہماری ان جسمانی تبدیلیوں پر منحصر ہے۔ تقدیر وہ وقت طے کرتی ہے، جب ہماری روح کو ہمارا یہ جسم چھوڑ ہے اور پھر کوئی نہ کوئی بہانہ، بیماری، چوٹ، حادثہ یا سادہ طبعی موت اس رُوح اور جسم کی دائمی جُدائی کا باعث جاتا ہے۔ یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور پھر موت کے بعد اُسے روزِ حشر سے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور تب ہماری زندگی کا دوسرا اور اصل دور شروع ہوگا۔ اِسی لیے ہمیں دنیا کے لیے اُسی قدر محنت کی تاکید کی گئی ہے، جتنا ہمیں یہاں رہنا ہے۔'' سلطان بابا اپنی بات ختم کر چکے لیکن میرا ذہن حسب معمول کچھ نئے سوالوں میں اُلجھتا چلا گیا۔ تو کیا ہماری معصوم رُوح صرف ہمارے گئے گناہوں کی سزا بھگتتی ہے؟ کیا گناہ اور ثواب کا اختیار صرف ہمارے ایک بنیادی عضو ''ذہن'' کارستانیوں کا شاخسانہ ہے.....؟

رات آٹھ بجے نرس نے دوبارہ آ کر مجھے کل والی بات کی یاد دہانی کروائی کہ تیمارداروں کو رات گزار کی اجازت نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں شیخ صاحب خود بھی آ پہنچے اور پندرہ منٹ سلطان بابا کے ساتھ بیٹھنے بعد ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم نے اسپتال کے اُصولوں کے مطابق روانگی اختیار کر لی۔ شیخ صاحب نے را میں بتایا کہ آج نصیر صاحب نے انہیں فون کر کے سلطان بابا کی تفصیلی خیریت معلوم کی تھی اور مجھے نہ جا کیوں اُن کی باتوں سے کچھ ایسا محسوس ہوا، جیسے آئی جی صاحب نے انہیں کچھ میرے بارے میں بھی بتایا اور شاید وہ یہ بات بھی جان چکے ہیں کہ اسپتال کی ادائیگی بھی میرے گھر والوں کی طرف سے کی گئی بہرحال انہوں نے مصلحتاً اس موضوع کو چھیڑنے سے گریز ہی کیا اور مجھے ایک بڑی مشکل سے بچا لیا کیوں اب میں کسی بھی طور اپنے روایتی حسب نسب اور ماضی کے کسی بھی حوالے کو اپنی ذات کا تعارف نہیں چاہتا تھا۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تو اُن کا چھوٹا بیٹا وقار کار پورچ سے ذرا پرے اپنی ڈی ٹی ایس ہیوی بائ کی ریس چیک کرنے کے لیے اس کے پچھلے پہیے کو اسٹینڈ کے ذریعے اُونچا کر کے ہائیڈرولک جیک لگا رہا سارے گھر میں موٹر سائیکل کی تیز آواز نے ہنگامہ سا برپا کر رکھا تھا۔ میں ایک لمحے ہی میں ماضی کی بھول بھلیو میں کھو کر خود اپنے گھر کے احاطے میں پہنچ گیا اور چند پل ہی میں وقار کی جگہ پرانے ساحر نے لے لی۔ ہرا کو میں اور کاشف میرے ہی گھر میں، اپنی اپنی بائیکس کھول کر اِسی طرح ان کی صفائی کیا کرتے تھے اور گھر سر پر اُٹھائے رکھتے۔ وہ دن گھر کے تمام نوکروں کی شامت کا دن ہوتا کیوں کہ ہمیں ہر دوسرے پل کس

کسی چیز کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ملنے پر یا دیر سے لانے پر کوئی نہ کوئی نوکر ہمارے عتاب کا شکار بن کر ہی رہتا۔ پھر شام کو جب پاپا گھر واپس آتے تو اُن کی عدالت میں ہماری شکایتیں لگتیں اور کبھی مجھے اور کبھی کاشف کو جرمانہ بھرنا پڑتا۔ یہ وقت بھی کیسی کیسی کروٹیں بدل جاتا ہے۔ کاش ہمارا حافظہ بھی گزرتے وقت کی کروٹ کے ساتھ ساتھ کسی سلیٹ کی طرح صاف ہوتا رہتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے اپنی جگہ رُکا دیکھ کر شیخ صاحب آگے جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔ ''کیوں عبداللہ سب ٹھیک تو ہے نا.....'' میں جلدی سے سر جھٹک کر اپنی دنیا میں واپس آیا اور آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے نوکروں سے کہا کہ وہ تازہ دم ہو کر انیکسی ہی میں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم وقار کی جانب بڑھنے سے نہیں روک پایا۔ اُس نے ہائیڈرولک تیل کی لمبی گلاس نما کپی اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور پچھلے پہیے کی ڈسکس میں بنے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر اس نے ایکسیلیٹر چھوڑ دیا لیکن پہیہ اب بھی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں نے تیل کی کپی اُس کے ہاتھ سے لے لی۔ ''جب تک پہیہ مکمل طور پر رُک نہ جائے اور بائیک کا انجن ٹھنڈا نہ ہو جائے، تیل نہ دینا۔ ورنہ یہ آئل صرف پہیے کی ڈسک تک محدود نہیں رہے گا، پورے انجن میں پھیل جائے گا۔ پھر کئی دن تک بائیک بار بار چوک ہوتی رہے گی.....'' وقار کھلے منہ کے ساتھ حیرت سے میرے بات سنتا رہا۔ پھر اُس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''اوہ! تو یہی وجہ تھی کہ بائیک پوری ریس نہیں اُٹھا رہی تھی اور میں پچھلے تین دنوں سے سر کھپا رہا ہوں اور ڈسک کو جام سمجھ کر تیل دیئے جا رہا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر آئل کی بوتل اُسے واپس کر دی۔ وقار بھی جلدی سے ہاتھ پونچھ کر میرے ساتھ ہی انیکسی کی طرف چلنے لگا اور اپنی بائیک کے بارے میں بتانے لگا کہ ابھی دو ماہ پہلے ہی اُس کے ڈیڈ نے اُسے یہ بائیک لے کر دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہدایتی کتابچہ (Manual Guide) نہیں ملا۔ کیوں کہ بائیک سمندر کے ذریعے کھلے بحری جہاز پر پہلے پورٹ اور پھر یہاں تک پہنچی تھی، لہٰذا بہت سے ضروری لوازمات بھی غائب تھے۔ انہی باتوں کے دوران شیخ صاحب بھی پہنچ گئے۔ لیکن آج شہریار نہ جانے کہاں غائب تھا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ شام کو کسی دوست کے ہمراہ کہیں باہر نکل گیا تھا لیکن کھانے لگنے تک شہریار بھی پہنچ گیا۔ وقار بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔ اب تک وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ پھر کھانا کھاتے کھاتے اچانک ہی وہ پوچھ بیٹا..... ''عبداللہ بھائی کیا آپ مولوی ہیں؟'' شیخ صاحب نے اُسے گھور کر دیکھا اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ''ہاں۔ لیکن جیسے نیم حکیم ہوتے ہیں، ویسے ہی میں فی الحال آدھا مولوی ہوں۔'' وقار اور شہریار بھی مسکرا دیئے۔ وقار کی کچھ ہمت بندھی۔ ''آپ کے گھر والے کہاں رہتے ہیں۔ آپ کو اُن کی یاد نہیں آتی؟'' شیخ صاحب نے اُسے ڈانٹا۔ ''وقار! یہ کیا بدتہذیبی ہے؟'' میں نے شیخ صاحب کو روک دیا۔ ''کوئی بات نہیں اسے پوچھنے دیں۔ ہاں تو بھئی میرے گھر والے تو یہاں سے بہت دُور رہتے ہیں اور مجھے اُن کی یاد بھی بہت آتی ہے۔'' ''تو پھر آپ کیا کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اُن کی بہت یاد آتی ہے کیوں کہ میں تو اپنے گھر سے

ایک رات بھی دُور نہیں رہ سکتا۔'' ''رہ تو میں بھی نہیں سکتا، پر کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے نا۔ البتہ جب گھ
والے بہت یاد آتے ہیں تو تھوڑا سا رو لیتا ہوں۔ اس طرح دل کچھ بہل جاتا ہے۔'' وقار زور سے ہنس پڑا
''ارے، آپ روتے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو مجھ سے بھی بڑے ہیں۔'' ''تو کیا ہوا۔ بڑے روتے نہیں کیا؟ میں
تو سمجھتا ہوں بڑوں کو چاہئے چھپ کر ہی سہی، چھوٹوں سے زیادہ رونا چاہیے۔ اس طرح اُن کا دل کبھی خر
نہیں ہوگا۔ میری مانو تو تم بھی ابھی سے پریکٹس شروع کر دو۔ ہر غم کا ڈر دل سے نکل جائے گا۔'' اب شیخ
صاحب اور شہر یار بھی ہماری اس ''معصوم'' بحث سے لطف اندوز ہونے لگے۔ وقار نے جھجکتے ہوئے اپنے دل
ایک اور شک زبان سے اُگل دیا۔ ''آپ تو ہم جیسے ہی ہیں، لیکن شام کو شاہانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ جو لوگ یور
اپنا گھر بار چھوڑ کر اس راستے پر نکل آتے ہیں، وہ رفتہ رفتہ انتہا پسند بن جاتے ہیں۔'' شیخ صاحب کے ہاتھ سے
کانٹا چھوٹ گیا۔ شہر یار نے بھی چونک کر اُوپر دیکھا۔ شیخ صاحب غصے سے بولے۔ ''وقار یور مائنڈ یور اوار
بزنس۔'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر شیخ صاحب کو روکا۔ ''تم انتہا پسندی کسے کہتے ہو.....'' وقار کچھ ہچکچایا۔ ''وہی جو
لوگ زبردستی اپنی منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ''دیکھو اس
پانی کا گلاس تقریباً بھرا ہوا ہے۔ اس کے سانچے میں جتنی گنجائش تھی، اتنا پانی اس میں موجود ہے۔ اگر میں اس
گلاس میں مزید پانی ڈالوں گا تو وہ چھلک کر میز پر گر جائے گا اور اس سے تمہیں، تمہارے ابو اور شہر یار کو پریشانی
ہوگی۔ بالکل اُسی طرح، جیسے تمہارے ڈی ٹی ایس بائیک کی رفتار کی حد ایک سو اسی کی ہے؟ لیکن اگر شہر کی عام
سڑکوں پر تم اسے ساٹھ، ستر کی رفتار سے زیادہ چلاؤ گے تو لوگ ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگیں گے۔ ہو سکتا ہے تم کسی کو
زخمی بھی کر بیٹھو۔ بس یہی انتہا پسندی ہے۔ ہر وہ حد جس سے گزر کر تم دوسرے انسانوں کے لیے کسی بھی طرح
کی پریشانی کا باعث بن جاؤ، وہ انتہا پسندی ہے۔ ہم نے آج کل اس صفت کو نہ جانے کیوں صرف مذہب ہی
سے وابستہ کر دیا ہے۔ انتہا پسندی ایک رویئے کا نام ہے۔ تم اپنی حد سے بڑھ کر بائیک دوڑا کر بھی انتہا پسند بن
سکتے ہو۔ شہر یار تیز ہارن بجا کر بھی اس فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب دن میں آٹھ گھنٹے کے بجائے
بیس گھنٹے اپنے کاروبار پر صرف کر کے بھی انتہا پسند کہلا سکتے ہیں۔ لیکن میرا راستہ تو میری اپنی کھوج کا ہے۔ میں
کچھ سیکھنے کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ میرا مقصد اپنے نظریات کسی پر مسلط کر کے اُسے پریشان کرنا نہیں ہے
بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی تک صرف مختلف نظریات کو جانچنے اور پرکھنے کی حد تک ہی محدود ہوں۔ جانے اس
مختصر زندگی میں، مذہب کی بنیادی باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھ پاؤں گا یا نہیں۔ کسی انتہا تک جانا تو بہت دُور کی
بات ہے۔ ویسے بھی مذہب ہمیں ہر چیز میں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خود عبادت
میں بھی اِسی اعتدال کو مدنظر رکھنے کا حکم ہے۔ تو پھر بھلا مذہب ہمیں کسی بھی انتہا پسندی کی طرف کیسے لے جا سکتا
ہے.....؟''

میری بات ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر میں نے خود ہی وقار

سے پوچھا کہ کوئی اور سوال تو اُس کے ذہن کو پریشان نہیں کر رہا؟ وہ خوش دلی سے مسکرایا..... ''نہیں عبداللہ بھائی..... میں آپ کی باتیں سننے سے پہلے واقعی ایسے لوگوں سے بہت کتراتا تھا، لیکن آج آپ نے مجھے احساس دلایا کہ شاید ہم خود ہی مذہب کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ مذہب ہمیں کبھی اس طرف نہیں دھکیلتا۔ ہمیں خود اپنے رویوں پر قابو پانا ہوگا۔'' شیخ صاحب کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خوش ہو کر بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔ شہریار بھی مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے شہریار سے عشاء کی نماز کے لیے مہلت طلب کی۔ ''ٹھیک ہے جناب، لیکن نماز پڑھتے ہی میرے کمرے میں چلے آنا۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے ہنس کر اسے دیکھا۔ ''میں جانتا ہوں تمہارے ضروری باتوں کا دائرہ کہاں تک محدود ہوگا۔ تم چلو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔'' نماز کے بعد میں شہریار کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ نیلگوں دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے اُدھ جلے سگریٹ راکھ دان میں اب بھی سلگ رہے تھے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو میرا دم ہی گھٹ سا گیا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے لگاتار سگریٹ نوش ہو گے۔'' شہریار نے جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ ''نہیں..... ہر وقت اتنی سگریٹ نہیں پھونکتا۔ بس کبھی کبھی ذہن کسی پلاٹ یا نکتے پر اُلجھ جائے تو پھر یہ نکوٹین ہی میرے سوچوں کی رُکی ہوئی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔'' ''مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ یہ کڑوا دھواں تم جیسے لکھاریوں کے اندر جا کر ایسا کیا جادو کرتا ہے کہ لفظ اور خیال آنسوؤں کی طرح باہر ٹپکنے لگتے ہیں؟'' شہریار زور سے ہنسا۔ ''پتا نہیں، وہ ہو سکتا ہے اندر جا کر یہ دھواں اُن کا بھی دم گھوٹتا ہو تو خیال باہر کو لپکتے ہوں۔ کیا تم بالکل بھی سگریٹ نہیں پیتے.....؟'' مجھے اپنے ماضی کی شامیں، کلب اور ان میں بھرا دھواں یاد آ گیا..... ''کبھی پیتا تھا، دن میں ایک آدھ پیکٹ بھی پھونک جاتا تھا۔ اب نہیں پیتا۔ تم یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا خیال اٹک گیا ہے، تمہارے اندر جسے اس دھوائیں سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' شہریار نے گہری سی سانس لی، لیکن جواب دینے کے لیے اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ شہریار نے جلدی سے فون اُٹھا لیا۔ دوسرے جانب سے شاید کسی نے سلام کیا۔ شہریار نے جواب کے بعد کہا ''زہے نصیب..... کہیے آج کون سا امتحان لیں گی ہمارا.....؟'' میں نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن شہریار نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بٹھا لیا۔ مجھے اُن کی گفتگو کے دوران وہاں بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا، لیکن شہریار نے میرا دوسرا اشارہ بھی نظر انداز کر دیا اور دوسری جانب کی بات سن کر کہا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں۔ دراصل میرے کمرے میں ایک مہمان دوست ہے۔'' دوسری جانب کی بات سن کر شہریار نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔ ''چلیں ٹھیک ہے، کل بات کریں گے اور ہاں آپ کے سوال کا جواب ادھار رہا تھا۔'' فون رکھ کر وہ میری جانب پلٹا۔ ''کافی چلے گی.....؟'' ''نہیں! میری کفین سے کچھ زیادہ بنتی نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ فون بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں تو ویسے بھی جانے ہی والا تھا۔'' شہریار کسی

گہری اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ''پتا نہیں کیوں تم سے ہر اُلجھن بانٹنے کو جی چاہتا ہے۔ ہم رائٹرز ویسے بہت کھلے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ جو بھا جائے، وہی اپنا بن جاتا ہے۔'' میں نے غور سے اُس کی طر دیکھا۔ ''تم کچھ اُلجھے ہوئے سے لگتے ہو؟'' ''ہاں..... ایک عجیب سی بات ہے شاید میرا وہم ہی ہو لیکن نے محسوس کیا ہے کہ شانی جس طرح کھل کر ہر موضوع پر مجھ سے فون پر بات کرتی ہے۔ سامنے آنے پر وہ کے بالکل برعکس چپ سی نظر آتی ہے۔ پہلے پہل تو میں اسے روایتی شرم وحیا کے زمرے میں تولتا رہا، لیکن آدھ مرتبہ ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع بھی ملا تو وہ بس ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔''

میں غور سے اُس کی بات سنتا رہا۔ ''تم ایک لکھاری ہو۔ لفظ تمہارے آس پاس عقیدت سے دو ہوئے بیٹھے رہتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی تمہاری طرح گفتگو کے فن میں طاق ہو۔ ہوسکتا ہے اُ خاموشی کی زبان زیادہ بہتر لگتی ہو۔ ویسے بھی یہ لڑکیاں چپ رہ کر زیادہ بولتی ہیں۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے ''تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔ تو ہوسکتا ہے۔ اُسے بھی یہ لفظ غیر ضروری اور اضافی محسوس ہو۔ ہوں۔'' شہریار اب بھی بے چین تھا۔ ''ہاں! ایسا بھی ہوسکتا ہے، لیکن وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ لفظ ہی تھے، جو ہمیں اتنا قریب لانے کا باعث بنے۔ اُسے یہ بھی پتا ہے کہ اچھے لفظ اور اُن سے بنے چھوئے خیالات ہی میری کمزوری ہیں۔ پھر بھی وہ بولنے میں اس قدر احتیاط، بلکہ کنجوسی کا مظاہرہ کیوں کر ہے.....؟'' یہ سوال تم نے شانی سے کیوں نہیں پوچھا؟'' ''پوچھا تھا۔ اُسی نے بھی کم وبیش وہی تمہارا جوا دھرا دیا کہ تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے۔''

اس رات شہریار نے مجھے تفصیل سے شیخ صاحب کے خاندان کے بارے میں بتایا کہ اُن کا بڑا بیٹا اع اور چھوٹی بیٹی دھانی نقش ونگار کے معاملے میں اپنے باپ پر گئے ہیں، جب کہ بڑی بیٹی شاہانہ اور چھوٹا بیٹا وقا اپنی مرحومہ ماں کے حسن اور رنگ وروپ سے جڑے ہوئے تھے۔ اِسی لیے شانی اور دھانی کے نقش اس قد مختلف تھے۔ لیکن اس چہرے اور دھوپ چھاؤں جیسے رنگ کے فرق سے قطع نظر شیخ صاحب کی تمام اولاد م بے حد ایکا اور محبت تھی۔ خاص طور پر دونوں بہنیں تو جیسے ایک جان دو قالب تھیں۔ البتہ شانی کے مقابلے م دھانی اپنے باپ سے زیادہ جڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نام بھی شیخ صاحب نے دھان کی فصل کی کٹائی کے وقت اُس کی پیدائش پر رکھا تھا۔ سنا ہے اُس سال شیخ صاحب کی گاؤں والی زمینوں پر چاول کی فصل نے برسوں کے ریکارڈ توڑ دیئے تھے، اور پھر دھانی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی دھانی رنگ بھی اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا۔ اسکول میں دھانی رنگ کے واٹر کلر، پنسلیں، پھر کالج بیگ اور پھر یونیورسٹی میں لباس میں دوپٹے، ہاتھ کی چوڑیاں، ہیر بینڈ یا پھر پرس..... کوئی ایک چیز دھانی ضرور ہوتی تھی۔ یہی حال گھر بھر کی کٹلری، پردوں اور صوفوں کی کلر اسکیم حتیٰ کہ اس کے اپنے کمرے کے رنگ اور اس کی اپنی شخصیت پر بھی حاوی تھا۔ وہ خود بھی اس رنگ جیسی پُرسکون، ٹھہری ہوئی اور ساکت تھی۔ البتہ شانی اس کے برعکس تیز گلابی رنگ جیسی تھی۔ شوخ، چلبلی

اور تھرکتی ہوئی۔ سارا گھر اُسی کی وجہ سے حرکت میں رہتا تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتی تھی نہ ہی کسی کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے دیتی تھی۔ دونوں بہنوں کے اس مزاجوں کے فرق ہی نے دراصل شیخ صاحب کے گھر کے توازن کو ایک خوبصورت انداز میں برقرار رکھا ہوا تھا۔ بیٹے بھی باپ کے فرمان بردار تھے البتہ۔ گھر کا سارا انتظام بہنوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شہریار آیا تو کسی کہانی کی تلاش میں تھا، لیکن شیخ صاحب کے ہاں مہمان ہوتے ہی وہ خود ایک کہانی کا حصہ بنتا گیا۔ اُس کا استقبال کرنے والی دھانی تھی، جس نے اپنے گھر کے گیٹ پر اُسے خوش آمدید کہا۔ لیکن..... جس نے شہریار کے دل کے گیٹ پر پہلی دستک دی، وہ شانی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دم ہی نہیں ہوگیا۔ پہلے تعارف میں تو کوئی بھی شاہانہ کے ملکوتی حسن سے متاثر ہوسکتا تھا، لیکن شہریار کو شانی کی دستک سننے میں دو ہفتے سے بھی زیادہ لگ گئے۔ انیکسی میں وہ اُس کی دوسری رات تھی، جب فون کی گھنٹی پہلی بار بجی۔ دوسری طرف جو بھی تھی، اُس نے اپنا نام نہیں بتایا بلکہ یہ کسوٹی بھی اُس نے شہریار ہی پر چھوڑ دی کہ وہ اُسے پہچانے کہ وہ کون ہے، کیوں کہ یہ دعویٰ بھی تو شہریار ہی کا تھا کہ لکھاری لوگوں کی آنکھوں سے اُن کے دل کا حال جاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور شہریار کو اگلے روز ہی شانی کی آنکھوں میں چھپا وہ گلابی پیغام دکھائی دے گیا، جو شاید پہلے ہی دن سے اُس کی گھنیری پلکوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ لیکن شہریار نے مزید کئی دن لیے رات والی اُس آواز کو اُس کی پہچان بتانے میں۔ شاہانہ کو خوشی ہوئی کہ اُس کی نظروں کا پیغام شہریار کے دل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر راتوں کے فون کی یہ شہزادی کچھ ایسی ہی شروع ہوئی کہ لفظوں کی دنیا میں رہنے والا شہریار جیسا لفظ گر بھی ان ملائم لفظوں اور کومل جذبوں کا شکار ہوتا چلا گیا، جو دیر رات گئے تک وہ فون پر اُس کی سماعتوں میں انڈیلتی تھی۔ وہ دونوں دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے۔ شہریار اُسے اپنے افسانوں کے موضوعات پر بحث کی دعوت دیتا اور اُس سے ایک قاری کے طور پر پہلی رائے بھی لیتا۔ لیکن مسئلہ وہاں سے جڑ پکڑنے لگا، جب ایک آدھ مرتبہ شہریار کو شانی سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ وہ فون پر شاہانہ کی منفرد سوچ اور گفتگو میں الفاظ کے نئے زاویوں کی عکاسی سن سن کر خود بھی ایسے کسی موقع کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اُس وقت یہ ملاقات ہوئی، جب سارے گھر والے کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور شام کی سیر کے لیے باغ میں وہ اور شاہانہ تنہا تھے اور دوسری مرتبہ تب جب شیخ صاحب کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں بینک ڈرائیور سمیت شہر سے باہر جانا پڑا اور شہریار گھر کی دوسرے گاڑی میں شاہانہ کو اس مقام سے گھر واپس لے کر آیا، جہاں سے مقررہ وقت پر ڈرائیور نے اُسے لانا تھا۔ لیکن شہریار کے تشنہ کان شانی کے لبوں سے کچھ سننے کی آرزو ہی کرتے رہے اور وہ بس چھوٹے چھوٹے جملوں میں ''ہوں ہاں'' کر کے شہریار کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔ اِسی بات نے شہریار کو اُلجھا رکھا تھا۔ حالانکہ وہ در پردہ اپنے خاندان کو شاہانہ کے لیے اپنے پسندیدگی سے بھی آگاہ کر چکا تھا، لیکن وہ ایک مرتبہ شانی سے کھل کر بات کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کیوں کہ اگلے ماہ اُس کے گھر والے باقاعدہ اس پری رُخ کو شہریار کے لیے مانگنے آرہے تھے اور شاید

شہر یار کے والد اس سلسلے میں شیخ صاحب کو بھی شہر یار کی مرضی سے آگاہ کر چکے تھے۔ شہر یار نے غالباً اپنا پانچویں پیکٹ کے آخری سگریٹ کو راکھ میں تبدیل کیا ہی تھا کہ باہر سے صبح کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

میں شہر یار کو تسلی دے کر جب اپنے کمرے میں آیا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال دھیرے دھیرے گھر کرنے لگا تھا۔ شہر یار کی نظر شاہانہ ہی پر کیوں ٹکی؟ دھانی بھی تو اُسی گھر میں ہی رہتی تھی۔ ہماری نظر ہمیشہ روشن اور اُجلے چہروں ہی میں کیوں اُلجھتی ہے۔ یہ خوبصورتی کیا بلا ہے؟ اگر یہ دیکھنے والی نظر پر منحصر ہوتی ہے تو پھر ہماری نظر عام چہروں پر کیوں نہیں رُکتی؟ ہمارا دل کسی سادہ چہرے کے لیے بھی پہلی جھلک میں اس طرح کیوں نہیں دھڑکتا، جیسے وہ کسی ماہ وش کی پوری پلکیں گرنے سے پہلے ہی اُس کے لیے زانو ہو چکا ہوتا ہے۔ تو پھر کہیں یہ قدرت کی بے انصافی تو نہیں کہ اس نے کچھ آئینے تو اتنے شفاف اور کچھ ہلکے دھندلے بنا ڈالے۔ اور اگر چہروں اور رنگ و روپ میں یہ تفریق پیدا کرنی اتنی ہی ضروری تھی تو ہماری نظر اور ہمارے دلوں میں یہ فرق نہ ڈالا ہوتا۔ کیوں ہمارے سدا کے سودائی اور پاگل دل کو ان شفاف آئینوں میں جھانکنے کی لت ڈال دی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ باہر سورج نکل چکا تھا۔ میں یہ سوچ کر فون بجنے دیا کہ شہر یار خود اُٹھالے گا۔ گھنٹی لگاتار بجتی رہی، پھر بہت دیر بعد بند ہوگئی۔ شاید شہر یار نے اُٹھالیا تھا پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور شہر یار آنکھوں میں نیند کا خمار لیے بچوں بیچ جمائیاں لیتا کھڑا آیا۔ ''عبداللہ فون اُٹھاؤ..... تمہارے لیے کال ہے۔'' میں چونک گیا۔ ''میرا فون ..... اس وقت .....'' شہر پلٹ گیا میں نے دھڑکتے دل سے فون اُٹھایا ''جی کون ہے.....؟'' دوسری جانب کچھ خاموشی کے آواز اُبھری۔ ''جی..... میں دھانی بول رہی ہوں.....''

میرا ہر لفظ تمہارا ہے

کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ''جی.....؟'' وہ کچھ دیر بعد ہلکے سے کھنکار کر دوبارہ بولی ''میں شیخ صاحب کی چھوٹی بیٹی دھانی بول رہی ہوں۔'' میں سنبھل چکا تھا ''جی فرمایئے.....'' وہ کچھ اُلجھی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ ''وہ دراصل مجھے کچھ وضاحت کرنا تھی۔ بعض باتیں سفر کرتے ہوئے اپنا اصل زاویہ کھو بیٹھتی ہیں اور مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔'' مجھے حیرت ہوئی ''جی، میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن مجھے اس تمہید کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔'' وہ کچھ ہچکچائی ''تمہید تو میں نے باندھ دی ہے۔ اب باقی بات آپ کو شانی بتائے گی۔ یہ لیں، اُن سے بات کریں''۔ چند لمحوں بعد کم و بیش بالکل ویسی ہی آواز فون پر اُبھری ''آداب! دراصل کل وقار نے رات کے کھانے پر مجھ سے منسوب کر کے آپ سے کچھ ایسی بات کہی، جو میں نے اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہی تھی۔ نہ ہی میرا مقصد آپ کو ہدف تنقید بنانا تھا۔ میں نے لوگوں کے عمومی رویوں کی بات کی تھی۔ ڈیڈی بھی ہم سے بہت خفا ہوئے۔ آپ کو جو ذہنی تکلیف ہوئی، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''یقین کریں وہ بات تو بس یونہی ہنسی مذاق میں بحث کا حصہ بن گئی اور میں تو بھول بھی چکا تھا۔ آپ ذہن پر کوئی بوجھ نہ رکھیں۔'' ''شکریہ۔ آپ کے بزرگ اب کیسے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اور دھانی بھی ڈیڈی کے ساتھ جا کر اُن کو دیکھ آئیں۔'' ''جی ضرور۔ کیوں نہیں۔ انہیں بہت خوشی ہوگی۔'' پیچھے سے کسی سرگوشی کی آواز آئی۔ شانی جھجکتے ہوئے بولی ''دھانی کہہ رہی ہے کہ آپ ڈیڈی کا دل ضرور صاف کر دیجیے گا، ہماری جانب سے۔ ہم اُن کی ذرہ برابر خفگی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ تو گویا یہ ساری گفتگو شیخ صاحب کی ناراضگی دُور کرنے کے لیے تھی۔ میں نے انہیں مطمئن کیا۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ انہیں آپ سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔'' میں نے بات ختم کر کے فون واپس رکھ دیا اور یہی سوچتا رہا کہ نہ جانے یہ لڑکیاں ایسے کانچ کے من کے ساتھ اس پتھریلی دنیا میں کیسے گزارہ کر پاتی ہیں۔

اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کچھ مضمحل سے لگ رہے تھے۔ لگتا تھا رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائے۔ میں بے چین ہو کر جلدی سے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور بابا کی اس حالت کی وجہ پوچھی۔ اُس نے مسکرا کر تسلی دی۔ ''ایسا ہو جاتا ہے۔ انہیں ہائی ڈوز اینٹی بائیوٹکس دی جا رہی ہیں۔ ایسے میں طبیعت کا بوجھل ہو جانا قدرتی عمل ہے اور پھر اُن کی خوراک بہت کم ہے۔'' میری پریشانی دُور ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ ''لیکن انہیں ہوا کیا ہے۔ اب تو اُن کے تمام معائنے بھی ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اُن کی فائل کھولی اور آسان لفظوں

میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہمیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑ رہا ہے۔ اُن کے داہنی جانب آخری پسلیوں کو اندر کی جانب کسی زوردار دھکے کی وجہ سے شدید دباؤ کا سامنا کرنا پڑا، جس کا اثر اندر جگر کی بیرونی تک ہوا ہے۔ ہمیں ان خراشوں کو بھرنا ہے اور دوسری اہم بات ان کی سر کی چوٹ ہے۔ ہمارے دماغ شریانوں میں خون کی روانی میں ایک لمحے کی رُکاوٹ بھی شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور خون کا دباؤ عارضی یا مستقل فالج کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ خون کے بہاؤ میں یہ رُکاوٹ خون سے بنے ریت کے ذرے سے بھی باریک لوتھڑے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ لوتھڑا اگر شریانوں سے چپک جائے تو اسے تھرو اور اگر خون کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہے تو اسے طب کی زبان میں ایمبولس کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو فی الحال تو کسی ایسے چپکے یا بہنے والے لوتھڑے سے بچے ہوئے ہیں لیکن کبھی کبھی وقت گزرنے کے ساتھ ایسی پیچیدگیاں ظاہر بھی ہونے لگتی ہیں۔ تو بس فی الحال ہماری اتنی سی جنگ ہے، ان کی بیماری کے اور یہی کوشش ہے کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ آپ اطمینان رکھیں۔ وہ ماہر ہاتھوں میں ہیں۔'' ڈاکٹر مستند تجربے کار کی طرح مجھے تسلی دی۔ لیکن اُس کی باتیں سننے کے بعد میرا رہا سہا اطمینان بھی جاتا رہا۔ واپس کمرے میں پلٹا تو سلطان بابا نے میرے چہرے کی تختی پر بکھری سیاہی کو غور سے پڑھا ''تم بھی آگئے ڈاکٹروں کی باتوں میں۔ مطمئن رہو، جب تک سانسیں باقی ہیں، یہ بیماری میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی اور سانس پوری ہوئی تو ان ڈاکٹروں کی ساری دنیا کی مکمل سائنس مل کر بھی مجھے ایک زائد سانس نہیں دے گی۔ پھر اس جھمیلے میں کیوں پڑتے ہو؟'' میں نے انہیں غور سے دیکھا ''میرا بھی ٹھیک یہی یقین ہے، لیکن کے باوجود ہم آخری لمحے تک ہر ممکن دوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دوا کرنا بھی تو ایک طرح دعا ہے۔ یہ بھی تو اُمید اور آخری لمحے تک اس کا کرم یا فضل ہو جانے کا ایک استعارہ ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ دوا کی دعا کرنے سے نہ روکیں۔ میرے ہونٹوں سے ادا ہوتی دعا آسمان کی وسعتوں تک جاتی ہے تو میرے کی یہ دعا آپ کی نسوں میں بہتے خون کے خلیوں میں گھل کر اپنی فریاد اس زندگی کے مالک کو پیش کرتی تیرا ایک بندہ تیرے آسرے پر اس دوا کی کرامات پر یقین کیے بیٹھا ہے۔ اس کو مایوس نہ کرنا۔'' میں نہ کتنی دیر تک بولتا رہا۔ سلطان بابا خاموشی سے میری بات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا تو اُن کی بھیگی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اُن کی جانب بڑھا ''ارے..... یہ کیا، میری کوئی بات ناگوار کیا؟'' انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ''نہیں۔ یہ آنسو بھی اُس کی شکر گزاری کے ہیں۔ آج پھر عبداللہ نے سلطان کو سبق دیا ہے۔ آج شاگرد اس مقام پر ہے، جہاں اُستاد تھک کر بیٹھ گیا ہے۔ جیتے خوش رہو۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ''یہ میں نہیں، میرے اندر خود آپ بول رہے میرے پاس تو خود اپنا کچھ بھی نہیں۔ یہ نام بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔'' میں بہت دیر اُن کے سرہانے بیٹھا رفتہ رفتہ انہیں غنودگی سی ہونے لگی اور وہ گہری نیند سو گئے۔

ظہر کے وقت میں نے دھیرے سے اُن کا کاندھا ہلا کر نماز کے لیے جگا دیا۔ شام چار بجے کمرے کے
کچھ آہٹیں اُبھریں اور پھر شیخ صاحب اپنی دونوں بیٹیوں اور شہر یار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے۔
غان بابا اُن سب سے مل کر کافی ہشاش بشاش ہو گئے۔ انسان سے انسان کا یہ رشتہ بھی کس قدر انوکھا ہے،
ی زہر تو کبھی تریاق۔ جبروت کے زہر نے بابا کو اسپتال کے اس بستر تک پہنچا دیا تھا اور شیخ صاحب اور اُن
خاندان کے ذرا سے تریاق نے پل بھر میں اُن کے زرد چہرے پر کتنے رنگ کھلا دیئے تھے۔ جب شیخ
حب نے شہر یار کا اُن سے یہ کہہ کر تعارف کرایا کہ وہ بہت جلد اُن کی فرزندی میں آنے والا ہے تو سلطان بابا
مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا ''کیوں میاں، نماز وغیرہ بھی پڑھتے ہو یا صرف صفحے ہی سیاہ کرتے رہتے
''شہر یار جو نہ جانے کس خیال میں کھویا کھڑا تھا اس اچانک حملے سے بالکل ہی گھبرا گیا ''جی..... وہ.....
امطلب ہے.....'' ہم سب شہر یار کی یہ حالت دیکھ کر ہنس پڑے۔ سلطان بابا نے اُسے دعا دی ''جیتے رہو
ہاں، نماز پڑھا کرو۔ لکھنے والا تو ویسے بھی خدا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ تب ہی اس کا زیادہ واسطہ الہام
ہوتا ہے۔ اپنی تحریر میں جذب کی کیفیت پیدا کرنا چاہو تو پانچ وقت اُس کے دربار میں حاضری دینے کا پابند
لو خود کو۔'' شہر یار نے جلدی سے یوں سعادت مندی سے سر ہلایا، جیسے آج ہی سے اُن کی نصیحت پر عمل
ع کر دے گا۔ سلطان بابا نے خاص طور پر دھانی اور شانی سے بھی اُن کی مصروفیات کا پوچھا اور انہیں بھی
دی۔ وہ سب بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ سلطان بابا کا کمرہ اُن کے لائے ہوئے سامان سے بھر چکا تھا،
ن ڈاکٹر نے پرہیز کی پابندی بتا کر اُن سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے شیخ صاحب
گھر کا دوسرا ڈرائیو جو روز مجھے لینے آتا تھا، وہ بھی آ پہنچا۔ میرا دل آج سلطان بابا کو چھوڑ کر جانے کو بالکل بھی
ہا چاہ رہا تھا، لیکن رات کی ڈیوٹی والی نرس بھی پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا مجبوراً مجھے سب کے ساتھ اُٹھنا پڑا۔ شہر یار
ے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا اور شیخ صاحب ہماری گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کے پیچھے آنے کا کہہ کر
نی اور شاہانہ کے ساتھ بڑی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اسپتال سے نکلیں تو خلاف
دل شیخ صاحب والی گاڑی نے گھر کی مخالف سمت موڑ کاٹ لیا۔ شاید وہ گھر جانے سے پہلے کہیں اور جانا
ہتے تھے۔ میں نے اپنی سوچوں میں گم شہر یار کو چھیڑا۔ ''عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر چاہنے والوں
چہرے کھلے رہتے ہیں، لیکن تمہاری حالت اس کے برعکس کیوں ہے؟'' شہر یار نے لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری
لا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا۔ کریدتے ہو راکھ، آخر یہ جستجو کیا ہے..... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے
، غالب میرے دل کا ہر معاملہ پہلے ہی ساری دنیا پر کھول گیا ہے۔ اب راکھ کریدنے سے تمہیں بھی کچھ
ل نہ ہوگا اے دوست۔'' میں مسکرا دیا۔ شیخ صاحب کی گاڑی نے شہر کے ایک مشہور پانچ ستارا ہوٹل کی ذیلی
راہ کی جانب موڑ کاٹا اور کچھ دیر بعد ہم سب ریسٹورنٹ میں کھانے کے میز کے گرد جمع تھے۔ شیخ صاحب
لے ''بھئی لڑکیوں کی ضد تھی کہ آج رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں، لہٰذا اب آپ سب بلا تکلف اپنی پسند

بتادیں۔'' کچھ ہی دیر میں مستعد بیروں نے میز پر کھانا سجا دیا۔ ہم سے ذرا فاصلے پر لابی میں ایک پیا
موسیقار پیانو پر مختلف فرمائشی دُھنیں چھیڑ رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگ کاغذ کی چٹ پر اپنی پسند کی دُھن لِ
اردگرد پھرتے بیرے کی ٹرے میں ڈال دیتے جو فوراً اُسے پیانسٹ کے سامنے لے جا کر رکھ دیتا۔ پیا
مسکرا کر اپنا سر ہلاتا اور پھر باری آنے پر جب وہ دُھن بجاتے ہوئے اُس کی اُنگلیاں پیانوں کی لمبی سفید
تھرک رہی ہوتیں تو اُس کی نظریں بار بار فرمائش کرنے والے جوڑے کی جانب اُٹھتی رہتیں۔ سچ ہے کہ
ہر ہنر مند داد کا خواست گار ہوتا ہے۔ مجھے بچپن میں پیانو سیکھنے کا جنون تھا۔ ہمارے گھر کے بڑے ہال
سیلون کی لکڑی سے بنا ایک بھورے رنگ کا بہت بڑا پیانو رکھا ہوا تھا، جسے پاپا کبھی کبھار کسی محفل کے دوران
کبھی تنہائی میں بجاتے تھے۔ اور میں گھنٹوں محویت سے بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا۔ جانے کیوں تب ہی سے
پیانسٹ بہت ہنر مند اور سلجھے ہوئے لوگ لگتے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شیشے کی دیوار پر پانی کا جھرنا
اس طرح سے بہہ رہا تھا، جیسے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کھانے کی میزوں کے اردگرد روشنی کا انتظام
اس انداز میں کیا گیا تھا کہ ہر شخص ایک مدھم روشنی کے دائرے میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے وہ سب
درمیان ہوتے ہوئے بھی تخلیے میں ہے، اور شاید تخلیے و تنہائی کا احساس ہی اس ماحول کو آرام دہ اور پُر
بنائے ہوئے تھا۔ صاحب حیثیت لوگ ایسی جگہوں پر شاید اسی احساس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ کم
یہی ذائقہ ہر دسترخوان پر ان کے گھروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں پیش کیے جانے والے کھ
کی نہیں، یہاں گزارے جانے والے وقت کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ دھانی اور شاہانہ نے بھی مختلف دُھنو
فرمائش شروع کر دی۔ پیانسٹ شاید شیخ صاحب کی ذاتی حیثیت سے واقف تھا، لہٰذا اب اُس کی پور
ہماری میز کی جانب تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں پپا اسٹیو ونڈر کے اِسی نغمے کی دُھن بہت شوق
بجاتے تھے ''ہیلو..... کیا میں وہی ہوں، جس کا تمہیں انتظار ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری مخمور آنکھوں اور تم
گھائل مسکراہٹ میں دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیسے جیتوں اے دلربا..... کہ میں انجان ہوں.....
میں ابھی ان ہی لفظوں کے طلسم سے شروع کروں..... کہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' پیانسٹ نے دُھن ختم
سارے ہال نے اُسے داد دی۔ اب دھانی کی باری تھی، اُس نے چٹ بھیجی، ''لاپرواہ سرگوشیاں (Careless
whispers)..... میری بہترین دوست ہیں..... لیکن اب میں کبھی رقص نہیں کر پاؤں گا، کیوں کہ
بوجھ قدم بنا تال کے ہیں.....'' بہت دیر تک شانی اور دھانی میں جارج مائیکل، ویم اور ماڈرن ٹاکنگ
پرانے نغموں اور پھر شیر (Cherr) بیک سٹریٹ بوائز اور برٹنی سپیئرز کے نئے نغموں کی دُھنوں پر پیا
آزمانے کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ صاحب بھی کچھ اس طرح مطمئن بیٹھے مسکراتے رہے، جیسے اُن کا یہاں
اُٹھنے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے ڈھلتی رات کا فُسوں اب پوری طرح چھا چکا تھا۔ کھانے
ہال میں اب بھی بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں اور دیر رات کو نکلنے والے آوارہ گرد بھی جمع ہو رہے تھے

ایک عجیب سے بات محسوس کی کہ ہمارے دن اور رات کے رویوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ رات
ا بہت حد تک بدل دیتی ہے۔ ہماری اندر چھپے بہت سے خوابیدہ جذبوں کا براہ راست تعلق رات سے ہوتا
اور اگر خوش قسمتی سے ایسا خواب ناک ماحول میسر ہو تو یہ جذبے اپنے پوری قوت سے ہماری شخصیت پر
ں ہو جاتے ہیں۔ ہمارے باتیں نشیلی ہو جاتی ہیں اور ہمارے لہجے ملائم ..... بعض اوقات ہمیں خود سے ہی
ہونے لگتا ہے اور ہم اپنے اندر چھپے کسی معصوم بچے کی ہر ضد مانتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی روایتی وضع داری
ولا اُتار کر بے باک ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر کی رُومان پسند شخصیت چھم سے باہر نکل آتی ہے۔ کہتے
نشے میں بھی یہی تمام خصوصیات ہوتی ہیں۔ گویا ایسے ماحول میں یہ رات بھی ایک نشے کی طرح ہی ہمارے
ں میں تحلیل ہو کر ہمیں دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر سکتی ہے۔ شاید رات خود ایک بہت بڑا نشہ ہے۔ پیانسٹ
تار چھیڑے ''صرف لفظ ..... اور بس یہی لفظ ہی تو ہیں میرے پاس ..... تمہیں دینے کے لیے .....'' اچانک
دھانی نے کھوئے کھوئے سے شہریار سے پوچھا۔ ''آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتایئے
آنے والی تحریر کے بارے میں۔'' شہریار کچھ چونک سا گیا۔ ''آج کل میں ایک ایسے قلم کار کی کہانی لکھ رہا
ں، جس کی تحریر اور لفظوں نے ساری دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اس کی ہر نئی آنے والی کتاب مقبولیت کے
ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔ لوگ بے چینی سے اس کے قلم سے بکھرے لفظوں کی مالا چُننے کے لیے اس کی تحریر کا
ار کرتے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس لکھاری کے پاس اپنے گھر میں بولنے کے لیے صرف
وشی ہے۔ اس لکھاری کی شریک حیات کے حصے میں قلم کار کا کوئی لفظ نہیں آتا۔ وہ دونوں بس خاموشی میں
ں کرتے ہیں۔'' شاہانہ کی ساری توجہ اب شہریار کی جانب تھی۔ دھانی نے دلچسپی سے پوچھا ''لیکن ایسا
ں.....؟ کیا لکھاری کی شریک حیات کو لفظوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یا پھر قلم کار اپنی کسی گزشتہ محبت کے اثر
کھویا رہتا ہے؟'' شہریار نے غور سے شانی کو دیکھا۔ ''نہیں۔ لکھاری کی زندگی کی ساتھی تو اُس کے لفظوں
لیے بے تاب رہتی ہے اور خود لکھاری کی پہلی اور آخری محبت بھی اُس کی شریک حیات ہی ہے۔ لیکن اُسے
کہ ایسا لگتا ہے، کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے، وہ سب اُس کی محبت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔ تو پھر اپنی زبان سے بھی
لفظ ادا کرنا، جو اس کے لفظ کردار ایک دوسرے کے لیے ہمہ وقت اُس کی کہانیوں میں بولتے نظر آتے
ں، اُسے یہ ادائیگی کچھ معیوب سی نظر آتی ہے اور کہیں اُس کے دل میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ان ہی لفظوں
جذبوں کی بے ساختہ زبانی ادائیگی کو دکھاوا نہ سمجھ لیا جائے، لہٰذا اپنی شریک حیات اور محبت کے سامنے وہ عموماً
وش ہی رہتا ہے اور یہیں سے لکھاری کی شریک حیات کی اُلجھن شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ بظاہر آس پاس
ے اور اُس لڑکی کی سہیلیاں اُس پر رشک کرتی ہیں کہ لکھاری کی شریک حیات کس قدر خوش قسمت ہے کہ
ے ان خوب صورت لفظوں کا ہمہ وقت ساتھ میسر ہے، جنہیں کتاب کی صورت میں پڑھنے کے لیے لکھاری
پر ستار مہینوں انتظار کرتے ہیں اور لمبی قطاروں میں کھڑے ہو کر اُس کی کتابیں خریدتے ہیں۔ اِسی کش مکش

اور ذہنی الجھنوں کی یلغار میں ایک دن لکھاری کی محبت اس کا گھر چھوڑ جاتی ہے کہ اب وہ مزید اس خامو
متحمل نہیں ہو سکتی۔'' شانی اور دھانی بہت غور سے شہریار کی بات سن رہی تھیں۔ شیخ صاحب بھی پوری
متوجہ تھے۔ اُن سے شہریار کی خاموشی کا لمبا وقفہ برداشت نہیں ہو سکا اور وہ جلدی سے پوچھ بیٹھے ''تمہار
کہانی کا عنوان کیا ہے؟'' شہریار نے ہم سب کی جانب نگاہ دوڑائی..... ''میرا ہر لفظ تمہارا ہے، لیکن میری
کا انجام ابھی باقی ہے۔ آپ سب بھی اپنی رائے دیجئے کہ انجام کیسا ہونا چاہیے۔'' کچھ دیر کے لیے ماحو
خاموشی طاری رہی۔ پھر دھانی ہی نے سکوت توڑا۔ ''انجام تو بہت واضح ہے، لکھاری کو اپنی محبت کی جدائی
بعد یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ رشتے لفظ مانگتے ہیں۔ جذبے اظہار چاہتے ہیں اور محبت ادائیگی کے لیے
شدہ ہے۔ لہٰذا اُسے بھی دل سے یہ دہرائی ہوئی بات کا خوف نکال کر اپنے لفظ اپنی محبت کے نام کر
گے۔ کیوں کہ محبت کبھی پرانی اور باسی نہیں ہوتی۔ لفظ کبھی میلے نہیں ہوتے اور اپنی محبت کے لیے ان کی
سدا بہار رہتی ہے۔ لہٰذا لکھاری کو اپنی محبت کا اظہار کھل کر کر دینا چاہیے اور اپنی شریک حیات کو اپنی زند
واپس لے آنا چاہیے۔'' شہریار نے مجھ پر نظر ڈالی ''اور تم کیا کہتے ہو عبداللہ۔'' میں شہریار سے ایسے کسی
کی توقع بالکل نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب سب کی توجہ میری جانب مبذول ہو چکی تھی اور خلاصی ناممکن تھی۔
لگتا ہے دھانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیوں کہ ہماری زندگی میں بعض رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی طبعی
کے ساتھ دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں اسی مدت کے اندر ہی ان رشتوں کو برتنا پڑتا ہے۔ ورنہ مد
ہو جانے کے بعد وہ جذبے بھی سرد پڑ جاتے ہیں، جو ان رشتوں کی بنیاد اور ان کی رُوح کا باعث
ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ خون کے رشتوں کے علاوہ سب ہی رشتوں پر اس ایکس
ڈیٹ کی مہر پہلے ہی سے لگی ہوتی ہے۔''

کہانی کا انجام طے ہو چکا تھا۔ ہم سب گھر واپس پہنچے تو شب نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ را
بھی شہریار خاموش رہا۔ ہم دونوں انیکسی میں اپنے کمروں کی جانب بڑھنے لگے وہ اچانک ہی کسی خیال
سے باہر آیا۔ ''آج تم نے ایک عجیب بات محسوس کی، یا پھر یہ میرا ہی واہمہ ہے.....؟'' میں سمجھ گیا کہ
اشارہ کس جانب ہے۔ ''نہیں..... میں پہلے ہی یہ بات محسوس کر چکا ہوں۔ جس وقت تم اپنی کہانی کا پلا
چکے تھے، تب ہی میں نے تمہاری آنکھوں میں سوال پڑھ لیا تھا۔ شانی سوچتی ہے اور دھانی اس کی
لفظوں کا روپ دیتی ہے۔ شاہانہ کے پاس لفظ نہیں ہیں اور دھانی ہی اُس کی لغت ہے۔'' شہریار نے
نظروں سے میری جانب دیکھا ''اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم کچھ اور ہو۔ اتنی باریک بات جسے جاننے
مہینہ بھر سے زیادہ لگ گیا، تم نے دو ملاقاتوں ہی میں کیسے پرکھ لی؟'' ''نہیں..... اس میں ایسی کوئی خا
نہیں۔ تمہاری جگہ اگر میں محبت کے اس سنہری جال میں جکڑا ہوتا تو شاید مجھے اس سے بھی زیادہ وقت
بات محسوس کرنے میں۔ دراصل کچھ جذبے ہمارے حواس پر آہنی پردے ڈال دیتے ہیں۔ اور پھر یہ کوئی

ی تو نہیں..... ہم میں سے بہت سے لوگ کسی ایک میدان ہی میں یکتا ہوتے ہیں۔ کچھ لفظوں کو کاغذ پر
نے کا ہنر جانتے ہیں تو کچھ اُن کی ادائیگی میں کمال رکھتے ہیں۔ اور لکھاریوں کے ساتھ تو یہ مسئلہ بہت عام
بعض بہت بڑے لفظ گر ہونے کے باوجود گفتگو کے معاملے میں خاص ماہر نہیں ہوتے۔ اِسی طرح کچھ جو
ہیں، وہ بول نہیں سکتے۔ شاید شانی کا بھی یہی مسئلہ ہے۔'' شہریار کہیں اور کھویا ہوا تھا ''تو پھر وہ مجھ سے
ن پر گھنٹوں کیسے بات کر لیتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ صرف تخیلے اور جلوت کا ہے؟'' میں نے غور سے شہریار کو
۔ اُس کی زبان پر وہی بات آ کر رُک گئی تھی، جو خود کہیں دُور میرے ذہن کے کسی گوشے میں اٹکی ہوئی
میں نے اپنا سوال دہرانے سے پہلے لفظ اپنے ذہن میں ترتیب دیئے۔ ''ٹھیک سے یاد کر کے بتاؤ، تم
ویل گفتگو کی نشستوں کا ذکر کر رہے ہو، وہ تمہاری یہاں آمد کے بعد سے لے کر کب تک اسی طرح جاری
ہے تم انہیں محسوس کرنا چاہتے تھے۔'' اور کیا ان میں کبھی کوئی بدلاؤ بھی آیا تھا؟'' شہریار کو جیسے ایک جھٹکا سا
الباً وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ ''اُس کی گفتگو اُس وقت تک مکمل تھی، جب تک میں نے شانی
از کی شناخت کا اعلان نہیں کیا۔ اور اس بات میں قریباً دو ہفتے کا عرصہ حائل تھا۔'' میں اور شہریار ایک ہی
پہنچ رہے تھے۔ شہریار کی شیخ صاحب کی کوٹھی میں آمد کا مقصد سب کے لیے ایک کھلا راز تھا اور دوسری
ی سے شہریار کو وہ ٹیلی فون آنا شروع ہوا تھا۔ پھر شہریار اس آواز کے زیر و بم میں کھوتا چلا گیا۔ اس ملائم
کے جادو، لفظوں کے خوب صورت چناؤ اور خیالات کے حسین زاویوں نے اُسے کچھ ایسا مدہوش کیا کہ وہ
پ ہی بھول گیا۔ روز شام کو جب چائے پر شیخ صاحب کے گھرانے سے اُس کی ملاقات ہوتی تو وہ شانی
انی دونوں کے چہروں پر رات والی آواز کی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتا۔ شہریار کی اُلجھن بھی اپنی جگہ بجا تھی
کہ دونوں بہنوں کی آواز بالکل ایک جیسی تھی۔ خود میں نے بھی جب شاہانہ اور دھانی سے اُس روز فون پر
تھی، دونوں آوازوں میں فرق تلاش نہیں کر پایا تھا۔ اور پھر شہریار کو شانی کی آنکھوں میں وہ گلابی معطر
کھائی دے ہی گیا، لہٰذا یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شہریار کو فون کرنے والی شاہانہ ہی تھی۔ شہریار نے اُسی
وہ کسوٹی حل کر دی، جو پچھلے دو ہفتوں سے اُس کے دل میں اتھل پتھل مچا رہی تھی اور اُس نے فون کرنے
از کو شاہانہ کی آواز کے طور پر شناخت کر لیا۔ شانی نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی اور اس کے بعد شہریار کا شوق
نہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک آدھ ملاقات کا موقع میسر بھی آیا، لیکن سماعتیں تشنہ ہی رہیں۔ ایک لفظ گر ایک
ے لفظ تراش سے کچھ لفظوں کی بھیک نہ پا سکا۔ پھر دھیرے دھیرے شہریار کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اب
وزیادہ تر وہی بولتا ہے اور دوسری جانب سے شاہانہ صرف اس کے لفظ جوڑتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح
ر شہریار سے نہ تو بحث کرتی تھی اور نہ ہی شہریار کے نئے افسانوں کے پلاٹ پر کوئی تبصرہ۔ لیکن شہریار
روع میں اس تبدیلی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تاوقتیکہ اُس کی شاہانہ سے تنہائی میں دو ملاقاتیں نہیں
ہ۔ پھر میں شیخ صاحب کے مہمان کے طور پر انیکسی میں شہریار کا ہم سایہ بن گیا اور اس کا زیادہ تر رات کا

وقت میرے ساتھ اپنی کہانیاں سناتے گزرنے لگا اور آج وہ لمحہ بھی آ ہی گیا، جب شہریار نے وہ بات محسو
لی، جو شاید عام حالات میں اُسے بہت پہلے سمجھ آ جاتی۔ ہم دونوں کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک
فون کی گھنٹی نے ہم دونوں کے خیالات کی رو توڑ دی۔ شہریار نے ہچکچا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے اُسے
دی ''سچ ہمیشہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے اور ہم سے بہت نزدیک ہوتا ہے۔ یہ ہماری سوچ اور ہمارے اختیا
گئے راستے کا قصور ہوتا ہے کہ ہم اس سچ تک پہنچنے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں۔ شاید ہم جان بوجھ کر
کتراتے ہیں اور وہ راستہ اختیار کرتے ہیں، جو ہمیں سچ تک پہنچانے میں بہت دیر لگاتا ہے۔ لیکن میں
یہ اُمید رکھتا ہوں کہ تم اس سچ کا سامنا بہادری سے کرو گے۔ جاؤ جا کر فون اُٹھاؤ۔ اب تم سے صبح ما
ہوگی۔'' میں شہریار کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبح ہونے میں کم ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ ا
بعد میں کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔

پھر میری آنکھ فون کی گھنٹی سے ہی کھلی۔ دوسری جانب کوٹھی کا خانساماں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ
مرتبہ پہلے بھی میز پر ناشتا لگا چکا ہے، لیکن جب خلاف معمول میں اپنے وقت پر باہر نہیں نکلا تو اُسے
ہوئی۔ لہٰذا اُس نے میری طبیعت کا پوچھنے اور ناشتا لگانے کی اجازت طلب کرنے کے لیے فون کیا ہے
باہر نکلا تو شہریار پہلے ہی سے باہر کھلتی کھڑکیوں کے قریب کھڑا نہ جانے خلا میں کیا گھور رہا تھا۔ میرے
کی آہٹ سن کر وہ میری جانب پلٹا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا عبداللہ۔ سچ ہمیشہ ہمارے آس پاس موجود
..... ہم خود ہی نہ جانے کہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ میرا سچ بھی میرے سامنے آ گیا ہے۔ مجھ سے شروع ہ
کرنے والی شانی نہیں تھی۔ میں جن سنہرے خوابوں اور کومل جذبوں کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ انہیں
کی صورت دینے والی خواب گر کوئی اور نہیں، دھانی ہی تھی۔''

لفظ رُوٹھ جاتے ہیں

ہماری زندگی میں پیش آنے والے بعض حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا مکمل ادراک ہونے کے باوجود ہم ان کے پیش آنے پر کچھ اس جھٹکے سے چونکتے ہیں، جیسے وہ حقیقت نہیں، کوئی انہونی ہو۔ ٹھیک اس وقت میرا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات گزشتہ شام ہی سے گردش کر رہی تھی کہ شانی کی اس پہلوتہی اور خاموشی کے پیچھے کوئی ایسی ہی کہانی ہوگی، لیکن شہریار کی زبانی یہ بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ سارہ گیا۔ شہریار کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات سو نہیں پایا۔ میں تیزی سے اُس کی جانب بڑھا ''تو کیا تم نے براہ راست شانی سے سوال کر ڈالا؟'' ''نہیں۔'' اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کل رات میری کہانی کا پلاٹ سن کر شاید شانی کو بھی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ میں رویوں کے اس فرق کو پہچان گیا ہوں۔ وہ بہت شرمندہ تھی کہ یہ بات بتانے میں اس سے اتنی دیر لگی۔ حالانکہ اس کی اپنی نیت تو یہی تھی کہ وہ کسی مناسب موقع پر یہ راز کھول دے گی کہ شہریار کو شروع میں فون کرنے والی شانی نہیں دھانی تھی۔ اور پھر جب شہریار کی پسند ان دونوں بہنوں پر کھلی تو شانی نے از خود فون پر دھانی کی جگہ لے لی۔ کیونکہ دھانی کے بقول اُس کے شہریار کے لیے صرف بطور ایک اچھے لکھاری، پسندیدگی کے جذبات تھے۔ جب کہ شانی پہلی نظر ہی میں شہریار کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ہی شاید یہ جان نہیں پائیں کہ شہریار لفظوں کا اسیر ہے۔ اُس کی رگوں میں لفظ زندگی بن کر دوڑتے ہیں اور اس کی نسوں میں خون نہیں، لفظ رواں ہے۔ اُس کے دل کو فتح کرنے والی وہ پہلی آواز، جس نے حسین لفظوں سے خیال کی سنہری وادیوں تک کا سفر شہریار کی اُنگلی پکڑ کر طے کیا تھا، وہ صرف چند میٹھے بول نہیں تھے، وہ ایک فریکوئنسی تھی، جس نے اُن دونوں کو ٹکرا ایک ایسے نکتے پر پہنچا دیا، جہاں سے ان کا وہ سفر شروع ہوتا تھا، جس کے راستے اور منزلیں سب ایک تھے۔ لیکن دھانی کے جانے کے بعد شانی وہ فریکوئنسی برقرار نہیں رکھ سکی۔ وہ دو انسان، جن کے درمیان محبت کے تار جڑتے ہیں، ان کے جذبوں کی لہریں ہوا کے دوش پر ضرور کسی ایک اور خاص مقام پر ملتی ہوں گی، جیسے ریو کی شارٹ ویو، میڈیم لہر کی فریکوئنسی نہیں پکڑ سکتی اور اسی طرح لانگ ویو، شارٹ ویو کی لہروں پر جڑے گانے پکڑ نہیں پاتی، حالانکہ یہ تینوں لہریں اسی فضا میں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں لیکن ان کے دائرہ کار مختلف ہیں۔ محبت کے جگنو بھی ہر لمحہ ہوا میں تیرتے اور جگمگاتے رہتے ہیں، لیکن کس جگنو کی چمک کس اندھیرے دل کا روشن کر اُس انسان کی زندگی میں اُجالے بھر دے گی، اس کا فیصلہ وہ فریکوئنسی کرتی ہے، جس کے ملے بنا دنیا

کا ہر ملن ادھورا رہ جاتا ہے۔ ہاں البتہ شاید محبت کے یہ جگنو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی جگہیں بعض مرتبہ بھی دیتے ہیں۔ ایک لہر کی تہ سے نکل کر سفر کرتے ہوئے، دوسری لہر میں بھی جا ملتے ہیں۔ تب ہی ہمیں اوقات ایسے انسانوں سے بھی محبت ہو جاتی ہے، جو بظاہر پہلے ہمارے لیے بہت عام ہوتے ہیں اور ہما آس پاس ہی برسوں سے موجود ہوتے ہیں، جی رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ایک اور عجیب سی حقیقت کا ادراک ہوا۔ ہمارا معاشرہ جہاں شادی کا بندھن ہی ملن کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں اب بھی نوے فیصد رشتے بزرگو مرضی اور دو خاندانوں کے جوڑ کا سبب ہوتے ہیں۔ ایسی طے شدہ شادیوں میں جہاں دو ہم سفر زندگی میں مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کسی بندھن میں بندھ جانے کے بعد ہیں، وہاں محبت کے جگنوؤں کا سفر تیز جاتا ہے۔ شاید دعاؤں کا ایندھن اس رفتار کو مہمیز دیتا ہے، لیکن شہریار کا ستا ہوا چہرہ اور اُس کی سرخ آنکھ رہی تھیں کہ اُس کے جذبوں کے جگنو اب بھی وہیں، اُسی لہر میں منجمد تھے، جہاں کبھی پہلی رات دھانی کے تار جڑے تھے۔ میں نے غور سے شہریار کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کو دیکھا ''پھر تم نے شانی کیا کہا؟'' ''میں پھٹ پڑا کہ ان دو بہنوں نے میری زندگی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیوں کیا۔ آخر میں نے کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ رو پڑی اور مجھ سے معافی ہی مانگتی رہی کہ اس کا مقصد مجھے دھوکا دینا کبھی نہیں تھا۔ اُس بھی گزشتہ رات ہوٹل میں کھانے کے دوران یہ احساس ہوا کہ میں دھانی کے خیالات اور باتوں سے پہلے ہوا تھا اور شانی کے حسن سے بعد میں۔ جب کہ وہ اب تک یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ میں پہلے ہی دن سے اُس متاثر ہوں۔'' مجھے شہریار کی بات سن کر نہ جانے کیوں بہت دُکھ ہوا۔ ''تمہیں اُسے ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اُ اندر بہت نازک ہے۔ تمہارے دیئے ہوئے لفظوں کے گھاؤ بھرتے بھرتے بھر بھی گئے تو اُن کے داغ جگمگاتے رہیں گے۔'' شہریار اُلجھا ہوا تھا۔ ''میں بہت دباؤ میں تھا۔ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور بہت کچھ گیا۔'' ''دباؤ ہی میں تو خود پر قابو رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانتے ہو اصل فاتح کون ہوتا ہے۔ وہ جو دباؤ میں بھی متانت کا دامن تھامے رکھے۔ انسان کی پہچان اُس کے غصے کے دوران ہی ہوتی ہے۔ حالات میں تو سبھی میٹھے ہوتے ہیں، ہمارے اندر کے زہر کو پرکھنے کا پیمانہ یہ دباؤ اور طیش ہی تو ہے۔ اور چند لمحوں میں کچھ بت ایسے ٹوٹتے ہیں کہ پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ اپنا بت سنبھالو شہریار۔'' وہ چڑ سا گیا ''تو چاہتے ہو، میں ابھی جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔'' ''نہیں۔ یہ دوسری غلطی ہو گی تمہاری۔ تم پہلے ہی اشتعال میں آ کر پہلی غلطی کر چکے ہو۔ زندگی میں بعض غلط فہمیاں ایسی ہوتی ہیں، جو مناسب وقت کا تقاضا ہیں، حالانکہ اس لمحے آپ کے دل و دماغ پر اپنی بھڑاس نکالنے کا جنون طاری ہوتا ہے اور بظاہر آپ کو ایسا رہا ہوتا ہے کہ گنتی برابر کرنے کا یہ موقع اگر آپ کے ہاتھ سے نکل گیا تو شاید ہمیشہ کے لیے دیر ہو جائے گی ہمارا جوابی حملہ خطا ہو جانے کے بعد انہی اَن کہے لفظوں کی صورت میں کانٹا بن کر خود ہمارے دل ہی میں رہے گا۔ لہٰذا ہم اپنے دل کے ہولی اپنی زبان سے زہر میں بجھے تیر بنا کر دوسرے کے دل میں پیوست کر

ہیں۔ اور ایسا کرنے سے وقتی طور پر ہمیں کچھ سکون بھی ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہم اس سارے عمل میں حاصل کیا کرتے ہیں؟ صرف ایک خلش، کبھی نہ مٹنے والی کسک اور بدقسمتی سے غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں عمر بھر کے پچھتاوے، کیوں کہ دل کے شیشے میں آیا بال پھر کبھی نہیں نکلتا۔ اسے نکالنے کے لیے وہ شیشہ چکنا چور کرنا پڑتا ہے یا پھر عمر بھر اسی بال کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ کبھی واپس نہیں پلٹتے۔ اور ہم کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کھو دیتے ہیں، جو پھر کبھی نہیں ملتا۔ اس لیے رویوں میں حد درجہ احتیاط ہی زندگی کے ہر بندھن کی کامیابی کی ضمانت ہے۔'' شہریار خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے پاس کسی اجنبی کے ساتھ بھی کوئی دوسرا رشتہ نہ ہونے کے باوجود بردباری، احترام اور اس کی اور اپنی عزت کا رشتہ تو ہر حال میں قائم رہتا ہے۔ اور دوستی محبت یا خون کے کسی رشتے کی صورت میں تو یہ ذمہ داری دگنی ہو جاتی ہے۔ میں رات کو اپنے ذمہ داری نبھا نہیں پایا۔ میں اب تک اپنی ہر کہانی اور افسانے کو ایک خوب صورت موڑ پر ختم کرنے کا عادی رہا ہوں لیکن خود میری اپنی کہانی کا اتنا بدصورت انجام ہوگا، یہ میں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔'' ''تو پھر اب تم نے کیا سوچا ہے۔ کہانی ختم کرنے کا ایک اُصول یہ بھی ہوتا ہے کہ لکھاری کو ہر کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے بعد اُسے انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔'' شہریار نے لمبی سی آہ بھری۔ ''لیکن میری کہانی کا انجام کچھ مختلف ہے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس افسانے کے ہر کردار کو اپنا انجام خود طے کرنا ہوگا۔'' ہماری باتوں کے دوران ناشتا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مستعد نوکر تھوڑی دیر بعد چائے گرم کر کے میز پر سجاتے رہے تھے۔ میں دو گھونٹ بھر کے اسپتال کے لیے نکل پڑا۔

سلطان بابا کی حالت آج خلاف معمول کچھ بہتر نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولے ''آج اپنی کنڈی کہاں اٹکا آئے ہو میاں۔ کبھی اس ذہن کو دو گھڑی آرام بھی کر لینے دیا کرو۔'' میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔ جانے وہ اتنی آسانی سے چہرے کی سلیٹ کیسے پڑھ لیتے تھے یا پھر میری جبیں کی شکنیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میرے اندر برستی ہر بارش لفظوں کی صورت قطروں کی طرح ٹپکتی اور پھسلتی رہتی تھی۔ چہرہ آئینہ ہوتا ہے اور آئینے بوندوں کا بوجھ زیادہ دیر سہار نہیں پاتے۔ انہیں بہنے کے لیے راستہ دینا ہی پڑتا ہے کہ بہاؤ کا واسطہ ہمیشہ سے شفافیت سے ہے۔ سلطان بابا کو اب اسپتال سے خارج ہونے کی فکر ستا رہی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ یہاں سے بہت دُور ملک کے مغربی ساحل پر کوئی درگاہ ہے، جہاں ہمارا پہنچنا ضروری ہے۔ میں چونک سا گیا۔ ساحل اور درگاہ کا نام سن کر مجھے اچانک ہی اپنا شہر اور زہرا سے ساحل پر ہوئی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ میرا شہر مشرقی ساحل پر تھا اور سلطان بابا مغربی ساحل کی جانب بسے ہوئے شہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہی لہروں کے دوسری پار وہ بھی تو رہتی تھی۔ اس سمندر کے دو کناروں کی لہریں بھی تو آخر کبھی نہ کبھی ایک دوسرے سے مل جاتی ہوں گی۔ جانے ہمارے مقدر کی لہریں کب آپس میں جڑ پائیں گی۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سلطان بابا کی آنکھ لگنے کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور مجھے

لینے آیا تو میں چاہتے ہوئے بھی اُسے واپس نہیں بھیج پایا۔ یہ سلاخیں اور قید خانے ہمیں کیا قید کر پائیں گے، اصل قید تو مروت اور وضع داری کی ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچا تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور موسم کے انہی تیوروں کے باعث آج بڑے والے شیشے کے کمرے میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ثر سمیت شیخ صاحب کا سارا خاندان موجود تھا۔ برستے موسم کی مناسبت سے ہلکے پھلکے پکوان میز پر سج جا رہے تھے۔ ہمارے اندر موجود ذائقوں کا تعلق باہر کے موسموں سے کیسے جڑ جاتا ہے، یہ میں کبھی سمجھ نہ پایا۔ دونوں بہنوں اور شہریار کے رویے میں تناؤ اُن کے بے حد چھپانے کے باوجود محسوس کیا جا سکتا تھا۔ صاحب نے بھی غور سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''کیوں بھئی، کوئی سرد جنگ چل رہی ہے کیا۔ تم تینوں آج بے حد خاموش ہو۔'' وہ تینوں ہی کچھ گڑبڑا سے گئے۔ شہریار جلدی سے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں کبھی کبھی موسم کچھ بولنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ لفظ خود بوندیں بن کر بہہ جاتے ہیں۔'' شیخ صاحب زبان سے بے ساختہ داد نکلی۔ ''بھئی واہ، کیا بات کہی ہے۔ خاموشی کا حق ادا کر دیا۔ کبھی ہم بھی ان برستی بو کے لیے کچھ ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔ عبداللہ میاں! تم ہی کچھ کہو، ان تینوں نے تو بارش سے شرط باندھ ہے۔'' دھانی نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ شیخ صاحب تناؤ محسوس کرنے کے باوجود بڑی خوب صورتی سے ٹال گئے تھے۔ میں نے بات جوڑی ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ کچھ موسم ایسے ہوتے ہیں جو ہم سے تمام گلے شکو بھلا کر بس اس موسم میں ڈوب جانے کا تقاضا کرتے ہیں کہ موسم بھی تو ایک نعمت کی طرح ہوتا ہے۔ کئی نعمت ہو تو موسم ہم سے رُوٹھ جاتے ہیں اور پھر بہت دنوں تک وہ ہمارے کمرے کی کھڑکی پر دستک نہیں دیتے بس دبے پاؤں خاموشی سے باہر ہی سے گزر جاتے ہیں۔'' اب چونکنے کی باری شاہانہ کی تھی، جب کہ مخاطب شہریار تھا، جس نے ہلکے سے نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور پھر چائے کی پیالی سے اُٹھتی بھاپ عقب میں گم ہو گیا۔ باہر گرتی بوندوں نے اب باقاعدہ جل تھل کی شکل اختیار کر لی تھی۔ باہر باغیچے میں ایک جگہ پر پانی کا جوہڑ سا بنتا دیکھ کر میرا بہت شدت سے جی چاہا کہ میں کاغذ کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا کر اس میں چھوڑ آؤں اور پھر اپنے بچپن کی طرح ہاتھ کی چھتری بنا بنا کر، گھنٹوں خود بھیگ کر اس کشتی کو بھیگنے سے رہوں، حتیٰ کہ شام ڈھل جائے اور سرمئی بادلوں کی چمپئی اندھیرے میں مما کہیں سے مجھے ڈھونڈتے ہ وہاں نکل آئیں اور میں اُن کی اُنگلی تھامے ہوئے گھر کی جانب جاتے ہوئے بھی مڑ مڑ کر اپنا سفینہ ڈوبتے کر، آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکاتا رہوں۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی میں آج تک یہ سمجھ پایا تھا کہ ''کاغذی سفینوں'' کو تو ڈوب ہی جانا ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ سفینہ کسی نازک رشتے ہی کا کیوں جیسے اس وقت شانی اور شہریار کے رشتے کی کشتی ڈوب رہی تھی۔ ہم کسی کے کتنے بھی قریب کیوں نہ جائیں، کسی کو کتنا ہی اپنا کیوں نہ مان لیں، اگر وہ رشتہ کاغذی ہو تو سفینے ڈوب ہی جاتے ہیں۔ لفظ رُوٹھ جا ہیں۔ ایک لمحہ پہلے وہی انسان جس پر ہمارا کامل یقین، مان اور بھرم ہوتا ہے کہ بس وہی تو ہے جو ہمیں اس

نیا میں سب سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے، اگلے لمحے ہی ہمارے لیے دنیا کا سب سے انجان شخص بن جاتا ہے۔ میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر پایا تھا کہ بے انتہا اپنائیت کا وہ بھرم جھوٹا ہوتا ہے یا پھر اچانک ہی بیچ میں انداز ہو جانے والی اس بیگانگی اور اجنبیت کا یہ احساس سچا۔ ہم پل بھر ہی میں اتنے اپنے اور پھر ایک دم ایک اتنے بیگانے کیسے ہو جاتے ہیں؟

چائے ختم کر کے میں اسپتال واپس جانے کے لیے اُٹھا تو شیخ صاحب بھی سلطان بابا کو دیکھنے میرے ھی چل پڑے۔ سلطان بابا ہمیں ساتھ آتا دیکھ کر مسکرائے۔ ''لگتا ہے میرے جوگی کا دل آپ کے ہاں ی گیا ہے؟'' شیخ صاحب بھی ہنس پڑے۔ ''پتا نہیں، لیکن عبداللہ میاں کو دیکھ کر تو خود ہمارا بھی جوگ لینے کو جی ہتا ہے۔'' وہ دونوں زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے اور میں کمرے کی کھڑکی کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر رتی بوندوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ بارش میں سب ہی منظر یکساں ہو جاتے ہیں۔ رجم جھم گرتی وہ پھوار باہر ساتھ ساتھ ہمارے اندر سے بھی بہت کچھ دھو ڈالتی ہے۔ گھر واپس پہنچنے پر مجھے شہریار انیکسی میں دکھائی ں دیا۔ نوکر نے بتایا کہ ہمارے جانے کے کچھ دیر بعد وہ بھی دوسری گاڑی لے کر کہیں نکل گیا تھا۔ بارش ے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نوکر نے کھانے کا پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ عشاء کے بعد بھی میں بہت دیر شہریار کا انتظار کرتا رہا، پر وہ نہ جانے کہاں رہ گیا تھا؟ انہی سوچوں میں گم میں باہر لان میں جلتی سفید گول ں پر جگنوؤں کی یلغار جیسی بارش کی بوندیں گرتی دیکھ رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہ یہ فون شہریار کے لیے ہوگا، لیکن وہ تو ابھی واپس ہی نہیں پلٹا۔ گھنٹی بہت دیر تک بج کر چند لمحے کے لیے ہو گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی پھر سے لگاتار بجنے لگی۔ میں نے شش و پنج کے عالم میں فون اُٹھا ہی لیا۔ دوسری ب اُن دونوں سے کوئی ایک بولی۔ ''ہیلو..... جی میں عبداللہ بول رہا ہوں۔ شہریار ابھی گھر واپس نہیں لوٹا۔'' ی جانب کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر وہ بولی۔ ''میں دھانی بول رہی ہوں۔ مجھے دراصل آپ ہی سے کرنی ہے۔'' میں نے اپنی حیرت کو ظاہر ہونے سے روکا۔ ''جی فرمائیے.....'' وہ کچھ دیر تک اپنے لفظ تی رہی۔ ''غالباً شہریار نے آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ مجھے اِسی سلسلے میں آپ کی کچھ مدد ے.....'' میں حاضر ہوں۔ اگر کسی بھی مدد کے قابل ہوں۔'' ''شکریہ..... شانی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کچھ دن میں شہریار کے بہت اچھے دوست بن گئے ہیں۔ آپ انہیں سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ ہماری شروع میں ی نادانی کو بس ایک شرارت سمجھ کر معاف کر دیں۔ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی مقصد انہیں دھوکا دینا نہیں شانی کل رات سے بے حد پریشان ہے اور یقین جانیے اس سارے معاملے میں اگر کوئی قصوروار ہے بھی، میں ہوں، لیکن سزا شاہانہ کو مل رہی ہے۔ مجھ سے مزید اُس کے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ آپ شہریار سے ا اگر سزا دینا اتنا ہی ضروری ہے تو میں حاضر ہوں۔ وہ چاہیں تو ساری عمر مجھ سے کوئی رابطہ بھی نہیں رکھیں، شانی کو معاف کر دیں۔ وہ بہت معصوم ہے۔'' مجھے لگا کہ دھانی بولتے بولتے کچھ بھرا سی گئی ہے۔ میں نے

اُسے تسلی دی۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ضرور اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ حالانکہ بات کچھ نازک جذ
کی ہے۔ آپ نے شہریار سے خود بات کی ہے؟'' ''جی کل رات جب وہ شانی کو ڈانٹ رہے تھے۔ میں
بھی اُن سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور آج شام بھی چائے کے بعد میں نے انہیں فون کیا، لیکن شا
میری کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے۔ وہ میری اس خطا کو شرارت ماننے پر تیار ہی نہیں۔'' میں بے ساختہ کہ
''کیا وہ صرف ایک شرارت ہی تھی؟'' دوسری جانب گہری خاموشی چھا گئی۔ مجھے تاسف ہوا لیکن تیر کمان
چھوٹ چکا تھا اور اندھے تیر کی سب سے بڑی خطا یہی ہوتی ہے کہ اس کا نشانہ نامعلوم رہتا ہے۔ پھر بھی
نے تلافی کی کوشش کی ''معاف کیجیے گا، بعض مفہوم بات سے پہلے اور بہت سے نامناسب انداز میں مخاطب
پہنچ جاتے ہیں۔'' دوسری طرف سے اضطرابی کیفیت اور اُلجھی سانسوں پر قابو پانے کی آہٹ محسوس ہوئی۔
دھانی نے خود کو سنبھالا۔ ''خدا کرے آپ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، شہریار وہاں کبھی نہ پہنچیں۔ سچ یہی ہے
بات شرارت ہی سے شروع ہوئی تھی۔ میری بہن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ شہریار کی پسند
ہے۔ اس حقیقت کے بعد باقی تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے پاس دلیل کی
طاقت ہے، جو شہریار کی تمام اُلجھنیں مٹا سکتی ہے۔ مجھے آپ کی جانب سے کسی پیش رفت کا انتظار رہے گا
بات ختم کر کے دھانی نے فون رکھ دیا۔ گویا میرے ذہن کے کسی گوشے میں پلنے والا خیال صرف میرا واہم
نہیں تھا۔ شاہانہ سے بہت پہلے دھانی شہریار کو اپنے من مندر میں بیٹھا چکی تھی، شاید اُسی وقت جب شہریا
اُس نے گیٹ پر خوش آمدید کہا ہوگا۔ لیکن شہریار نے جب اُس کی آواز کو شانی کی آواز کے طور پر شناخت کی
دھانی اپنے اندر چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہونے والے جذبے کی آخری چیخ کو بھی کچھ اس خوبصو
سے چھپا گئی کہ اس کی ہم نفس اس کی واحد راز دار بہن، جو خود دھانی کا آئینہ تھی، اُسے بھی اس طوفان کے آ
اور پھر خاموشی سے گزر جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ ایک بار پھر روپ کا ڈاکا پڑ گیا۔ یہ من موہنی صورتوں وا
ہی تو سب سے بڑے ڈاکو ہوتے ہیں، لیکن حیرت ہے دنیا کی کسی بھی تعزیرات میں اس ڈاکے کی کوئی سزا
نہیں۔ زیادہ نہ سہی پر کم از کم ان روپ والوں اور بے روپوں کے لیے علیحدہ علیحدہ جزیرے ہی مقرر کر
چاہیے تھے۔ تاکہ کبھی کسی بے روپ کا رستہ نہ کٹتا۔ انہی سوچوں میں ساری رات کٹ گئی۔ شہریار واپس
لوٹا۔ صبح ناشتے کی میز پر میں نے نوکر سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ پہلے ہی کہہ گیا تھا کہ اگر رات کو اُسے زیادہ دی
گئی تو وہ اُسی دوست کے یہاں ٹھہر جائے گا، جہاں وہ جا رہا تھا۔ میں شہریار کی آمد سے مایوس ہو کر اسپتال
لیے نکلنے کا سوچ کر ابھی انیکسی کا باغیچہ پار کر رہی رہا تھا کہ سامنے سے آتی دھانی کو دیکھ کر میرے قدم جم
گئے۔ وہ اس وقت برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے اُسے سلام کیا اور جواب دینے کے
وہ اچانک ہی اس اُلجھن کا شکار ہو گئی، جو کسی بھی فیصلے کے آخری لمحات میں کچھ پل کے لیے ہمارے قدم
سے دیتی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ ''شہریار رات کو واپس نہیں لوٹا، لیکن آپ مطمئن رہیں۔ میں

ضرور اُس سے بات کروں گا۔'' ''جی میں جانتی ہوں۔ دراصل میں کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی..... دراصل.....
.....'' اپنے لفظوں سے زیادہ وہ خود اُلجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ ''کیا شہریار نے آپ
ے کوئی بات کی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟'' ''میں ناراضی سے زیادہ اسے
ب بے نام اُلجھن کہوں گا۔ شہریار اُن لوگوں میں سے ہے، جن کے دل کی کنجی لفظ ہوتے ہیں۔ ان کے من
ے دروازے الفاظ کی چاہتوں سے کھلتے ہیں۔ آپ نے وہ سارے دروازے کھول ڈالے لیکن کسی اور کو اس
ے من میں دھکیل کر خود دل کے دروازے سے ہی واپس پلٹ گئیں۔ شہریار اس وقت دستک دینے والے اور
ر آنے والے مہمان کے فرق کی اُلجھن کا شکار ہے۔ اُسے کچھ وقت دیں۔ وہ اس کش مکش سے ضرور باہر نکل
ے گا۔'' دھانی کی جھکی پلکیں میری بات سن کر بہت دیر تک اُٹھ نہیں پائیں۔ پھر جب وہ بولی تو مجھے یوں لگا
ہ ساری کائنات اس کے اندر کے درد میں ڈوب ہی تو جائے گی۔ ''کوئی بھی مہمان دروازے پر دستک دے
ر خود واپس پلٹنا نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ دستک تو زندگی میں شاید پہلی اور آخری بار ہی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر
ر سے میزبان کون؟'' پوچھنے کے بجائے کسی اور مہمان کا نام لے کر با آواز بلند صرف اُسی کو خوش آمدید کہے
کسی بھی وضع دار مہمان کو پلٹ ہی جانا چاہیے۔'' میں نے چونک کر اپنے سامنے سر جھکائے اس دھان پان سی
انولی سلونی کو دیکھا۔ سچ ہے، ظرف کسی روپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے مزید کھوجا۔ ''اندر بلانے
لے میزبان کو اپنی پہچان بھی تو کروائی جا سکتی تھی۔ کبھی کبھی اچانک نئے آجانے والے مہمان بھی تو اُسی تحیر اور
شی کے ساتھ لبیک کہے جاتے ہیں۔'' اُس نے اپنی بھیگی نظر اُٹھائی۔ درد، شکوہ، قسمت سے گلہ اور اپنی بے بسی
افسوس۔ کیا کچھ نہیں تھا اُس ایک نظر میں..... ''نہیں..... کم از کم میرے معاملے میں یہ انہونی ناممکن تھی۔
ں بچپن سے ان سب چیزوں کی عادی ہو چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ شہریار کے من کی کنجی لفظ ہیں۔ لیکن
ن کے دل کا راستہ بھی اُن کی نظر سے ہو کر ہی گزرتا ہے۔ تب ہی میرے لفظوں کی دستک کے باوجود انہیں باہر
ی نظر آیا، جسے اُن کی نظر نے سراہا تھا۔ رنگ، روپ اور حسن کی طاقت سے کسے انکار ہے اور یقین جانیں
انی کے لیے ایسی ایک دستک تو کیا، میری ہزار زندگیاں بھی قربان ہو جائیں تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم
ہیں۔ کیوں کہ ایسی بہن نصیب والوں ہی کو ملتی ہے۔ وہ بہت نازک ہے، بہت معصوم ہے۔ اور چاہے انجانے
ا میں سہی، پر اب وہی شہریار کے دل کی مکیں ہے اور یہی اس کی خوشی ہے۔ اور میں اپنی بہن کی خوشی کے لیے
نی آخری سانس بھی گروی رکھ سکتی ہوں۔'' میں نے غور سے اُسے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش
کرتے ہوئے دیکھا۔ ''یقیناً شاہانہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ میں نے آپ دونوں کو
یک جان دو قالب پایا ہے۔ پھر آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنی پہلی دستک اُن سے چھپا کر کوئی بے ایمانی کی
ہے؟'' ''نہیں میں نے ہی اُسے یہ سمجھایا تھا کہ اگر شہریار کا دل اُس کی جانب مائل ہے تو شانی کو بھی اپنے دل
سے رائے لینی چاہیے۔ اُس کا دل اگر شہریار کو محرم مانتا ہے تو پھر اُسے بھی قدم بڑھانے میں دیر نہیں کرنی

چاہیے اور شاہانہ نے یہی کیا۔ کیوں کہ وہ خود کہیں اندر سے شہریار کو اپنا مان چکی تھی۔'' دھانی کے کانپتے وجود کی لرزش بڑھنے لگی۔ گویا معاملہ قربانی دینے کا ہے؟'' اُس نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی۔ ''اگر یہ قربانی ہی ہے تو میں قربانی میں اپنے جنم ہی سے دیتی چلی آ رہی ہوں۔ معاملہ اگر خوب صورت لفظوں ہی تک محدود ہوتا تو شہریار کی پہلی نظر مجھ ہی پر پڑتی، لیکن مجھ جیسوں کو شاید خود کو مکمل کرنے کے لیے خوب صورت خیالات اور دانش کی بیساکھی کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوب صورت لوگوں کی زبان سے نکلا ہر لفظ خود حسین اور ہر خیال حسین تر ہو جاتا ہے۔ میں کتابی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی خصوصی سلوک کی توقع ہی کی ہے۔ ہاں، میرے اندر میرے اپنے تخیل کی دنیا ضرور آباد ہے۔ جانے اس بار میرا دل کیسے بھٹک گیا اور شہریار کے دل کا دروازہ کھٹکھٹا بیٹھا۔ لیکن کیا کریں، دل پر زور بھی تو نہیں..... اور اس دل کو بھٹکانے میں بھی شہریار جیسے ادیبوں اور شاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی ہمارے دل کی بجھی راکھ کو اپنے جادو بھرے لفظوں سے کرید کر اس میں دبی چنگاریاں بھڑکاتے ہیں اور پھر ہمارا دل باغی ہو کر ہم سے بس ایک ہی سوال کرتا ہے کہ کیا بدصورت لوگوں کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ کیا کم روپ والوں کا دل کچھ کم دھڑکتا ہے یا سادہ چہرے والوں کے اندر کے جذبے بھی بے رنگ اور سادہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے یہ کیسا نظام بنا رکھا ہے کہ روپ بانٹتے وقت تو ترازو اُوپر نیچے ہو جاتا ہے لیکن جذبے، کسک اور خلش بانٹتے وقت پیمانہ یکساں رکھا جاتا ہے۔ کیوں ہمارے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی اس لازوال خواہش کا پیمانہ ہمارے رنگ و روپ کے مطابق کم یا زیادہ نہیں رکھا گیا۔ اگر چاند اور ستارے توڑ کر لانے کے دعوے صرف روپ والوں کے لیے مخصوص ہیں تو پھر ہم جیسوں کے لیے ایک اور فلک کیوں نہیں تخلیق کیا گیا، جہاں جگمگاتے تارے اور چاند نہ سہی چند آدھ جلے انگارے کچھ مدھم جگنو ہی ٹانک دیے ہوتے، کیوں ہمارے فلک کے مقدر میں بھی ہمارے نصیب کی طرح صرف سیاہی لکھ دی گئی.....؟''

دھانی بولتے بولتے ہانپنے لگ گئی۔ شاید عمر بھر کا لاوا تھا، جو آج میرے سامنے بہہ نکلا۔ ایک آنسو دھانی کی آنکھ سے ٹپکا اور اُس کی قدم بوسی کر گیا۔ پیچھے سے آہٹ بلند ہوئی شانی کسی ستون کی آڑ میں جانے کب سے کھڑی ہماری ساری باتیں سن رہی تھی۔ دھانی کا رنگ اُسے دیکھ کر مزید پیلا پڑ گیا۔ شانی اپنی بہن کی جانب لپکی اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں بہنیں ایک دوسرے کو گلے لگا کر بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ میری پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے آج پوری خدائی رو رہی ہے۔

تم بھول جاؤ گے

ان دو بہنوں کے لگاتار بہتے آنسو مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو سکے۔ میں تو انہیں کوئی تسلی دینے کی
ت میں بھی نہیں تھا۔ بعض دھاگے کچھ اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ انہیں سلجھانے کی ہر کوشش انہیں مزید
عانے کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جذبوں اور رشتوں کے معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں
ں ان جذبوں، رشتوں اور گتھیوں کو اُسی طرح اُلجھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا پڑتا ہے۔ سو، میں بھی ان دونوں
یونہی اُلجھا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زندگی میں سبھی کچھ سیدھا نہیں ہوتا۔ یہ ہم سب کے ساتھ مکمل بھید بھاؤ
تا ہے۔ شہریار، دھانی اور شاہانہ کی زندگی نے بھی اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی حیرت کی بات
، کہ وہ دونوں بہنیں شہریار کا دل جیت کر بھی رو رہی تھیں۔ ایک اپنے لفظوں سے جیتی اور روپ سے ہاری تھی
دوسری روپ سے جیت کر بھی لفظوں سے شکست کھا گئی تھی۔ وہ دونوں ہی فاتح بھی تھیں اور شکست خوردہ
ا..... کچھ ایسا ہی حال محبت کی اس تکون کے تیسرے کردار شہریار کا بھی تھا۔ یہ محبت ہم لاچار انسانوں کے
ھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔ آج دھانی کی فریاد نے مجھے اندر تک لرزا کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کا ہر انسان مرد و
ت کی تخصیص کے بنا خود کو اپنے من کے آئینے میں حسین تر ہی دیکھتا ہے۔ شاید ہمارے ہمیشہ سے دو چہرے
تے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہری دنیا کو نظر آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہم ہر لمحہ خود اپنے من کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔
میں سے بعض اپنے اندر لگے شیشے سے جھلکتے دوسرے چہرے کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں
ظاہری دنیا کے آئینوں کی عادت ہی نہیں رہتی اور تب تک وہ خود کئی بار چونک جاتے ہیں، جب کبھی ان کا واسطہ
ر لگے کسی شیشے سے پڑتا ہے۔ کیوں کہ سامنے نظر آتے آئینے میں کھڑا شخص انہیں بالکل اجنبی نظر آتا ہے۔
ی ہم چونک کر کہتے ہیں ''ارے میری تصویر تو بالکل اچھی نہیں آتی.....'' یا ''بھئی میں تو بالکل ہی 'فوٹو جینک'
ں ہوں، بعض زندہ تصویر کشی سے کترانے لگتے ہیں۔ تنہائی میں بار بار خود کو مختلف زاویوں سے شیشے میں دیکھ
اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چاہے ہماری تصویر اچھی نہیں آتی، چاہے ہم ویڈیو میں
نے ہی بھدے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں، اصل میں تو ہم بہت دل کش ہیں۔ ہمیں ہمیشہ صرف وہی جملے یاد
جاتے ہیں جو کبھی کسی نے ہمارے سراپے کی تعریف میں کہے ہوتے ہیں۔ ہم وہی رنگ پہننا شروع کر دیتے
، جو کسی کی رائے کے مطابق ہم پر جچتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی برتاؤ ہماری تمام شخصیت کے بناؤ سنگھار کے ساتھ
ا ہو جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پہلا دھوکا دینے والا کوئی اور نہیں خود ہمارے کمرے کا آئینہ ہوتا ہے جو ہماری

دائیں جانب نکلی مانگ کو سر کے بائیں جانب دکھاتا ہے۔ اور پھر کبھی کبھی دائیں بائیں کا یہ معمولی سا
ہمارے سر کی مانگ کی طرح ہمارے اندر لگے اور باہر کمرے کے آئینے کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک د
ڈال دیتی ہے۔ مجھے اُس دن نہ جانے اپنے بچپن میں سنی اس معمولی شکل وصورت والی شہزادی کی کہانی بر
یاد آرہی تھی جس نے اپنی سلطنت کے سبھی آئینے توڑ ڈالنے کا حکم دے دیا تھا۔ کاش ہماری دنیا کے سبھی بیو
آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کے من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصور
ہو جاتی۔ کون جانے ہمارے بیچ کتنے ایسے دل جلے بھی ہوں جو آئینے توڑنے کی بجائے آنکھیں پھوڑنے
آس دل میں رکھتے ہوں گے۔ اگر انسانی خوبصورتی کو ماپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش
بے بصارت ہی ہوتے۔ میرا ذہن نہ جانے کن بھول بھلیوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اندر ڈاکٹر سلطان بابا کے چند
معائنے کر رہے تھے۔ اچانک میں شہریار کو سوجی ہوئی آنکھیں لیے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا
کیوں کہ میرے لیے اس کی یہاں اسپتال میں آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں جلد
سے اُس کی جانب بڑھا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے، سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' ''ہاں بس ایک دوست کی طرا
رُک گیا تھا رات کو۔ اب بھی وہیں سے آرہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ سوچا کچھ
تمہارے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ سلطان بابا اب کیسے ہیں؟'' ''وہ بہتر ہیں۔ لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو!
دونوں تمہارے اس رویے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کس کو سزا دے رہے ہو۔ خود کو یا اُن دو
کو.....؟'' شہریار نے ایک لمبی سانس لے کر اپنا سر کرسی کی ٹیک سے ٹکا دیا۔ ''بہت اُلجھ گیا ہوں میں.....
سمجھ نہیں آرہا۔'' ''کیا سمجھ میں نہیں آرہا۔ دل دروازے پر دستک دینے والی کو تم پہلے ہی واپس لوٹا چکے ہو۔
جو دل کے اندر براجمان ہے، اُس کی تو قدر کرو۔'' شہریار نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرا جی چاہا کہ میں وہ
کے ساتھ ہوئی ساری بات اُسے بتا دوں لیکن کسی کا بھرم رکھنا مقصود تھا۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ ان دونوں بہن
کی پریشانی بیان کر دی۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ شہریار کی اُلجھن کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گ
اور پھر میں اس سے کس رویے کی اُمید کر رہا تھا۔ خود میں بھی تو کسی مہ رُخ کی ایک اُچٹتی نظر کا شکار ہو کر
سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ کہیں میں بھی صرف زہرا کے روپ ہی کا تو گھائل نہیں تھا؟ اگر زہرا بھی عام شکل
صورت کی کوئی سیدھی سادی سی لڑکی ہوتی تو کیا تب بھی میں اِسی طرح اپنا چین و قرار لٹا بیٹھتا، خود میں
کسی کی گہری، کالی جھیل جیسی آنکھوں، گلابی عارض اور گالوں میں پڑنے والے گڑھوں کے قریب جا کر رُکا
خود میری منزل بھی تو کسی کے پنکھڑی لبوں کے قریب کا تل تھا اور خود میرا راستہ بھی تو کسی کی صراحی دار گر
کے خم سے ہو کر ہی گزرتا تھا۔ خود میرے خوابوں کی نیند بھی تو کسی کی آنکھوں پر گرتی زُلف نے اُڑا رکھی تھی
میں بھی تو کسی کی گھنیری پلکوں کے تپتے سائے تلے ہر دم جل رہا تھا۔ پھر مجھے شہریار سے کسی بھی گلے شکو
کیا حق تھا۔ شاید ہر گھائل، روپ کا گھائل ہوتا ہے۔ ہر جنوں کسی حسن کا اسیر ہے۔ ہر چاند کسی کی کلائی کا

اور سب تارے کسی کی اوڑھنی کا آنچل تھے۔ اگر ملزمان کی فہرست بنائی جاتی تو سب سے بڑا مجرم تو میں خود تھا۔

شہریار بہت دیر تک میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر معائنے سے فارغ ہوئے تو سلطان بابا نے فوراً اُن کے سامنے دوبارہ اپنی ''رہائی'' کی درخواست پیش کر دی۔ ڈاکٹروں میں سے ایک ہنس کر بولا۔ ''کیوں بابا! کیا آپ کا یہاں ہمارے ساتھ دل نہیں لگتا؟'' سلطان بابا مسکرائے۔ ''جس نے یہاں دل لگا لیا، سمجھو وہ یہیں کا ہو گیا میاں..... آپ مجھے یہاں سے جانے دیں تو یہ وعدہ رہا کہ ہر ہفتے ہم خود یہاں حاضری دینے آ جایا کریں گے۔'' سبھی ڈاکٹر ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہریار، سلطان بابا کے پاس جا بیٹھا۔ میری نظر سامنے دیوار پر لگے کیلنڈر پر پڑی۔ ہمیں کال گڑھ سے نکلے آج ٹھیک پندرھواں دن تھا۔ اچانک نہ جانے کیوں پل بھر ہی میں مجھے ایسا لگا کہ کیلنڈر میں بھرے رنگ غائب ہو گئے ہوں۔ تصویر رنگین سے صرف کالی اور سفید ہو کر رہ گئی۔ پھر میں نے ذرا غور کیا۔ نہیں کالا نہیں یہ تو نیلا اور شاید کچھ پیلا رنگ بھی تصویر میں باقی تھا۔ مطلب یہ کہ صرف سرخ اور سبز رنگ تصویر سے اُڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر زور سے پلکیں جھپکیں جیسے کوئی پرانے کلرٹی وی کے چلتے چلتے رنگ اُڑ جانے پر اُسے زور سے آس پاس سے تھپک کر، ہلا کر جھٹکے سے اُس کے رنگ واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک لحاتی اثر تھا اور دوسرے ہی لمحے میری بصارت کے رنگ واپس لوٹ چکے تھے۔ لیکن ایک اُسی لمحے مجھے اپنی نسوں میں تیز مرچوں جیسی جلن اور چبھن دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اور جلن کا احساس اس قدر شدید اور اچانک تھا کہ میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے قریب رکھے پانی کے جگ سے تین چار گلاس پانی بنا کسی وقفے کے حلق سے نیچے اُنڈیلے۔ شہریار دوسرے کمرے میں سلطان بابا سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں میری اس بگڑتی حالت سے ناواقف تھے۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے لبوں کے کنارے پر ہلکا سا کف جمع ہو کر تحلیل ہو گیا ہو۔ پتا نہیں یہ سب کیا تھا۔ لیکن چند لمحوں ہی میں اس احساس نے میری رُوح نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ شکر ہے کہ جس وقت سلطان بابا نے مجھے آواز دی، تب تک میرا ہانپنا ختم ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے۔ پھر بھی جب میں درمیانی راستے کا پردہ اُٹھا کر اُن کے بستر والے حصے تک پہنچا، تب تک وہ میرے چہرے پر کچھ پڑھ چکے تھے۔ ''کیا ہوا میاں! یہ ہلدی کہاں سے مل لائے ہو چہرے پر۔ رنگ کیوں زرد پڑ رہا ہے؟'' میں نے بات ٹالی۔ ''کچھ نہیں۔ شاید نیند نہ آنے کی وجہ سے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اب ٹھیک ہوں جناب۔'' وہ کچھ دیر تک غور سے میری جانب دیکھتے رہے۔ ''کبھی دو گھڑی آرام بھی کر لیا کرو۔ جنوں حد سے گزر جائے تو وحشت بن جاتا ہے۔'' میں چپ رہا۔ سہ پہر کو شیخ صاحب کا ڈرائیور آ گیا۔ میں نے شہریار سے کہا کہ گھر چلا جائے۔ شیخ صاحب جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ لیکن اُس نے ضد پکڑ لی کہ میں بھی کچھ دیر کے لیے اُس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے پردہ اُٹھا کر دیکھا سلطان بابا کی آنکھ لگ چکی تھی۔ ہم خاموشی سے دبے پاؤں کمرے سے نکل آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی حسب توقع شیخ صاحب نے شہر یار پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ وہ ٹھیک ہے۔ کہیں اُن کی خدمت میں کوئی کمی تو نہیں آ گئی جو شہر یار یوں اُکتا کر دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ شہر یار بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے تو بس اپنی کہانی کے ایک اہم موڑ کے لیے ماحول کی کچھ تبدیلی چاہ تھی اور بس..... ۔ چائے کے دوران شانی اور دھانی نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ ماحول خوشگوار ہے۔ آج گز روز جیسی پھوار تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن آسمان پر آج سفید بادلوں کے بہت سے آوارہ ٹکڑے "کوکلا چھپا کھیل رہے تھے۔ آج دن بھی جمعرات کا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب چھوٹی ماں (میری خالہ) بادلوں کی کہانی سنایا کرتی تھی کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کی بھیڑیں اور دنبے ہوتے ہیں جنہیں اللہ میاں کے وقت نیلے آسمان پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں تو میرے ذہن میں اللہ میاں کا بہت ہی خوبصورت تصور ابھرتا تھا۔ شہر یار آج بھی چپ سا تھا۔ دھانی نے غالباً شیخ صاحب کا دھیان بٹانے کے لیے اِدھر اُ کی باتوں کا سلسلہ جوڑ رکھا تھا۔ شانی بھی بیچ میں ایک آدھ لقمہ دے رہی تھی۔ اچانک ہی دھانی مجھ سے پو بیٹھی۔ "عبداللہ! آپ بتائیں کہ آپ ایسے موسم کو کیسے انجوائے کرتے ہیں؟" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُ آئی۔ ان دو لڑکیوں کو شیخ صاحب کی کتنی فکر تھی۔ کیا سبھی بیٹیاں اپنے باپ کے لیے اِسی طرح گھلتی ہوں "میرے ذہن میں تو ایسے موسم کے لیے بہت خصوصی اہتمام کے کئی طریقے آتے ہیں..... مثلاً ایسا شیشے بہت بڑا کمرہ ہو جس کی شفاف دیواروں سے پرے ہم بوندوں کا کھیل دیکھیں۔ برستے آسمان سے بھیگتی زم تک کا ہر نظارہ ایک ہی فریم میں ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ شیشے کے ہال میں ایک بہت بڑا سا پیانو اور....." شانی اچانک بول اُٹھی۔ "اور اس پیانو پر زیبا بیگم بیٹھیں گنگنا رہی ہوں کسی مہرباں نے آ کے میر زندگی سجا دی....." شانی کی مثال اس قدر بے ساختہ اور عمدہ تھی کہ ہم سبھی زور سے ہنس پڑے۔ شیخ صاحب بہت دیر تک اس بات کا لطف لیتے رہے۔ ماحول پل بھر میں ہی خوشگوار ہو گیا اور شانی اور دھانی کی کوش رائیگاں نہیں گئی۔ وہ رشتے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی پروا کرنے کے لیے لوگ موجود ہوتے ہیں شاید رشتوں کا واسطہ ہی دل جوئی اور دل داری سے ہوتا ہے، ورنہ سارا جہاں اجنبی ٹھہرا۔ چائے کے بعد صاحب سے اجازت لے کر واپس اسپتال جانے کے لیے پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ کہ شانی تیز تیز قدم اُٹھ میرے پیچھے چلی آئی۔ "عبداللہ.....! میں اور دھانی دونوں ہی اپنے صبح کے برتاؤ پر بے حد شرمندہ ہیں دراصل ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے معاملے میں بہت جذباتی ہیں۔ اور میں اُس کی آنکھوں میں آنسو تو ذرا سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ حالانکہ آپ کو یہ سن کر ہنسی آئے گی کہ جب تک امی ہمارے درمیان مو تھیں، ہم ایک دوسرے سے دن میں تین چار بار ضرور لڑا کرتی تھیں لیکن ہمیشہ ان جھگڑوں کا خاتمہ بھی ایک کے آنسوؤں پر ہی ہوتا تھا۔" "جی میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ جانے ان آنسوؤں کا صفت کو عورتوں کے ساتھ ہی کیوں مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور

پڑنے پر یہ خزانہ بہا دینا چاہیے کیوں کہ روتا ہوا انسان اُس لمحے بہت معصوم ہو جاتا ہے۔'' شانی کے چہرے پر چھایا تکدر صاف ہو گیا۔ ''آپ ہر بات کا ایک نیا زاویہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کے کلیے کے مطابق تو میں اور دھانی اس دنیا کے سب سے زیادہ معصوم فرد ہوں گے، کیوں کہ ہم دونوں تو بہت روتے ہیں۔ کبھی امی کو یاد کر کے، کبھی پرانی باتوں پر، کبھی ڈیڈی کی کسی پریشانی پر اور کچھ نہ ملے تو اپنی چوڑیوں کے ٹوٹ جانے یا چھلوں کے کھو جانے پر بھی..... کبھی اپنی پسند کے ایک جیسے دو جوڑوں میں سے کسی ایک کے کپڑے کا رنگ اُتر جانے پر تو کبھی دل پسند سینڈل کی ہیل ٹوٹ جانے پر.....! دھانی اور میرے پاس رونے کے بہانے کبھی بھی کم نہیں رہے۔'' میں نے ہنس کر غور سے اُس زندہ دل لڑکی کو دیکھا۔ کہاں اُلجھا بیٹھی تھی محبت کی رنگین لیکن تیز دھار ڈور میں خود کو۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کی یہ ڈور ہمارے جذبوں کی پتنگ کو اُونچا اور زیادہ اُونچا لے جانے کی خواہش جگا کر ہمیں اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ پھر ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ کب اور کس طرح یہ قاتل ڈور ہمارے شہ رگ پر پھر جاتی ہے۔ ہم جب تک سنبھلتے ہیں، خون کا تیز فوارہ ہمیں پورے وجود تک بھگو چکا ہوتا ہے۔ شانی دراصل مجھ سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں نے شہریار تک اُن کی معذرت پہنچا دی تھی اور یہ کہ ان دونوں نے شیخ صاحب کو پوری بات بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ دونوں چاہتی تھیں کہ میں شیخ صاحب سے بات کروں۔ میں کچھ اُلجھ گیا۔ ''میں.....؟ میرا مطلب ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا آپ نہیں سمجھتیں کہ یہ بہت ذاتی بات ہے، کہیں شیخ صاحب میری زبانی یہ سن کر.....'' ''میں آپ کی بات سمجھ سکتی ہوں لیکن یقین کریں کہ ڈیڈی آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتے ہیں۔ مجھے اور دھانی کو یقین ہے کہ وہ آپ کی بات کو غلط نہیں لیں گے۔ ہم اپنی غلطی پر نادم ہیں۔ لیکن ڈیڈی سے چھپا کر ہم مزید ایک اور غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ آپ کو یہ کس امتحان میں ڈال دیا ہم نے۔'' شاہانہ کی سنہری جبیں پر اپنا بیان کرتے کرتے پسینے کے چند ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ کیا سبھی لڑکیاں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ میں نے اُسے تسلی دی۔ ''آپ اطمینان رکھیے۔ میں اسے امتحان سے زیادہ سعادت سمجھتا ہوں۔ لیکن کیا آپ دونوں کو نہیں لگتا کہ شیخ صاحب سے بات کرنے سے پہلے آپ دونوں کو شہریار سے ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے.....؟ دل کی گرہیں جب مضبوطی سے بھی لگی ہوں تو اُن کا ملائم دھاگا آسانی سے کھل جاتا ہے۔ بعض اوقات وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔ پوری آنچ مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ذرا سی جلدی اور ہلکی آنچ ہی سے اُتار لینے پر کچے رہ جاتے ہیں۔ اور یاد رہے کہ رشتوں کی یہ آنچ بس ایک بار ہی سلگائی جا سکتی ہے۔ دوسری مرتبہ سب جلا کر رکھ دیتی ہے۔'' شاہانہ چپ چاپ سر جھکائے میری بات سنتی رہی۔ جذبوں اور رشتوں کی آنچ کی ٹھیک اُس لمحے میں اس کے چمپئی سے کندن ہوتے گلابی چہرے پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

میں اسپتال پہنچا تو سلطان بابا کا چہرہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل رہا تھا۔ پتا چلا کہ ڈاکٹروں نے اُن سے کہا ہے کہ اگر اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں کوئی پیچیدگی نظر نہ آئی تو انہیں جانے کی اجازت دے دی جائے

گی۔ مجھے اس لمحے وہ بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیئے۔ انہوں نے رات کا کھانا بھی رغبت سے کھایا۔ انسان کا من اندر سے شانت ہو تو پھر کبھی ہارمون شاید مکمل کام کرنے لگتے ہیں۔ انسان اپنے اندر بھی بیک وقت نہ جانے کتنے جادو منتر چلتے رہتے ہیں۔ رات گئے میں گھر واپس پہنچا تو ایک عجیب خاموشی نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے انیکسی میں جا کر شہریار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ شہریار نے سے بولا۔ ''کم ان!'' دروازہ کھولتے ہی میری پہلی نظر شہریار کے سوٹ کیس پر پڑی جس میں وہ اپنا سا رہا تھا۔ ''تو تم نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟'' ''ہاں.....! اور کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہو پا رہا تھا۔'' ''تمہا اس فیصلے کا شیخ صاحب کو پتا ہے؟'' ''نہیں فی الحال صرف اتنا ہی پتا ہے کہ میں اپنی کہانی پوری ہو جا واپس گھر جا رہا ہوں۔ لیکن کون جانے کہ یہ کہانی اب کبھی پوری ہو گی بھی یا نہیں.....؟'' میں نے چونک کر کی جانب دیکھا۔ ''کیا تمہاری ان دونوں سے کوئی بات ہوئی؟'' ''ہاں.....! دونوں ہی سے فرداً فرداً ہوئی، آج شام کو۔'' اتنے میں نوکر نے دستک دے کر بتایا کی شیخ صاحب لاؤنج میں کافی پر میرا انتظار کر ہیں۔ شہریار کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ شانی نے اُسے بھی یہ بتا دیا ہے کہ وہ مجھے شیخ صاحب بات کرنے پر آمادہ کر چکی ہیں۔ میں نے جانے سے پہلے آخری مرتبہ شہریار سے پوچھا۔ ''تم کسی نتیجے چکے ہو تو مجھے بھی بتا دو کہ شاید میں تمہارا مقدمہ ٹھیک طرح سے شیخ صاحب کے سامنے پیش کر پاؤں۔'' کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ اُبھری۔ ''نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو..... مجھے یقین ہے کہ تم ایک بہترین کی طرح میرا مقدمہ لڑو گے۔ فی الحال میں دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہا ہوں۔ تم جاؤ، انکل انتظار کر رہے ہوں گے۔'' میں نوکر کے ساتھ لاؤنج پہنچا تو کافی کے مگ سجائے جا چکے تھے۔ ماحول پر طاری تھی۔ دھانی نے کافی کپس میں اُنڈیل کر ہمارے حوالے کی اور خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ شیخ صا بھی شاید خود کو ذہنی طور پر کسی اہم بات کے لیے تیار کر چکے تھے۔ میں نے آسان لفظوں میں انہیں شہریا یہاں آنے سے لے کر دھانی کے فون اور پھر شانی کی پسند تک کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ وہ چپ چاپ بات سنتے رہے اور جب میں بات ختم کر چکا تب بھی بہت دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ آں کی سرسراہٹیں بتا رہی تھیں کہ دونوں بہنیں پاس ہی کسی ملحقہ کمرے میں موجود ہیں۔ شیخ صاحب اپنا پائپ چکے تھے۔ اور ان کے ماتھے پر بنتی شکنیں بھی دھوئیں کے اُن مرغولوں جیسی تھیں جو اس وقت اُن کے پائپ نکل رہے تھے۔ بہت دیر بعد اُن کے لب کھلے۔ ''تو کیا شہریار اِسی لیے یہاں سے جا رہا ہے؟'' ''یہ بھی وجہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ چند دن کا یہ وقفہ ان تینوں کو کسی ٹھیک فیصلے پر پہنچنے میں مدد دے گا۔'' شیخ صا نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کسی شدید کش مکش کا شکار تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی میں جیت اُن کی دو بیٹیوں میں کسی کی ہوتی، خود اُن کی اپنی ہار یقینی تھی۔ کیوں کہ یہ راز اب اُن پر بھی عیا چکا تھا کہ شانی سے پہلے دھانی، شہریار کی کنڈی ہلا چکی تھی اور انجانے ہی میں سہی پر وہ بھی اس در کے

نظار میں شہریار کے دل کے باہر کھڑی رہی ہے۔ شیخ صاحب اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ ''شہریار کی اُلجھن اپنی جگہ بجا
ی..... لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری دونوں بیٹیاں ایک دوسرے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں
ریں گی۔ شہریار اچھا لڑکا ہے اور میں اُس کی صاف گوئی سے بھی مزید متاثر ہوا ہوں۔ اُس سے بس اتنا کہنا
ہے کہ اس گھر کے دروازے اُس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' گویا شیخ صاحب نے فیصلے کا اختیار شہریار کو
ب دیا تھا۔ میں اُن سے اجازت لے کر واپس انیکسی پہنچا تو شہریار برآمدے ہی میں شیشے کی دیوار کے
یب پڑی آرام کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر سنبھل گیا۔ ''آ گئے وکیل
احب! کہو کیا فیصلہ لے کر آئے ہو.....؟'' ''تمہاری عدالت نے فیصلے کا اختیار بھی تم ہی پر چھوڑ دیا
ہے..... شانی یا دھانی نام کی جو بھی بیڑی تمہیں پسند ہے، تمہیں اُسی کے ساتھ عمر قید سنا دی جائے گی۔'' شہریار
ے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''منصف کسی کو عمر قید کی سزا سنانے سے پہلے کبھی ان ہتھکڑیوں یا
یوں سے کیوں نہیں پوچھتا کہ کیا انہیں اس ملزم کا زیور بننا قبول بھی ہے یا نہیں؟'' میں نے چونک کر اُس کی
ب دیکھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''شام کو پہلے دھانی آئی تھی خود انیکسی میں، مجھے صرف یہ بتانے
شانی کی خوشی اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اور یہ درخواست کرنے کے لیے کہ میں اس ابتدائی ایک ہفتے
اہر بات بھلا کر اگر شانی کو خود اُس کی شخصیت کے تناظر میں دیکھوں تو شانی سے بہتر جیون ساتھی مجھے پوری
یں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ وہ اپنی بہن کی خوشی مانگنے آئی تھی۔'' ''تو تم نے کیا جواب
؟'' ''مجھے جواب دینے کی مہلت ہی کہاں ملی۔ ابھی دھانی کو انیکسی سے نکلے دو لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ
ی کا فون آ گیا اور کیسا ستم ہے کہ دوسری بہن نے بھی مجھ سے وہی مانگا جو اُس کے لیے پہلی بہن مانگ کر گئی
ا۔'' ''کیا مطلب.....! کیا شانی نے بھی.....؟'' ''ہاں اُس نے بھی صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ
ا کے لیے اپنی بہن کے آنسوؤں سے بڑھ کر اور کوئی شے نہیں۔ اور اب چونکہ وہ اپنی بہن کے دل میں چھپے
ان کو جان چکی ہے لہٰذا اُس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی بہن کے سپنوں کی راکھ پر اپنا محل قائم کر لے۔
اُس نے اپنے آپ کو میرے لئے سدا نامحرم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ بھی مجھ سے اپنی آخری خواہش کے
پر دھانی کو اپنانے کا کہہ گئی ہے۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہریار اسی طرح شیشے کے پار دیکھتا رہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہوگا۔ دھانی نے
سے کہا تھا کہ وہ تم سے رات کو بات کرے گی۔'' میں نے اپنے کمرے میں جا کر فون اُٹھایا، دوسری جانب
نی ہی تھی۔ ''یہ آپ نے کیا کیا..... کیا آپ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آپ کی بہن کا خمیر بھی اُسی مٹی سے اُٹھا ہے
ا سے آپ کا جنم ہوا تھا۔ پھر بھی یہ جانتے ہوئے کہ شانی کبھی شہریار کو آپ کی شرط کے مطابق قبول نہیں
ے گی، آپ نے کیوں یہ جوگ لے لیا؟'' دھانی کی آواز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی
ہے۔ ''بعض جوگ ازل سے ہماری قسمت میں لکھے ہوتے ہیں۔ میں شہریار کو پا بھی لیتی تو یہ اُن کے لیے

ادھوری خوشی ہوتی، کیوں کہ اُن کی آدھی خوشی شانی کی شخصیت میں پوشیدہ ہے اور کبھی کبھی ادھوری خوشی کا سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ محبت اگر دو نقطوں کی صورت میں ہو تو کبھی نہ کبھی دائرہ بن کر مکمل ہو ہے۔ لیکن اگر یہی محبت تکون کی صورت اختیار کر لے تو اس کے تین زاویے کبھی جڑ نہیں پاتے۔ شاید م شانی کو منا ہی لوں۔ آپ نے ہمارے لیے جتنا کچھ کیا، میں شکریہ ادا کر کے اس کی اہمیت کم نہیں کرو آپ کو اگر وقت ملے تو شانی سے بات کیجیے گا، اُسے آپ کی باتیں جلد سمجھ آتی ہیں۔'' فون رکھ دینے بھی میں بہت دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ جانے اس محبت کے اور کتنے روپ دیکھنا باقی تھے۔

اگلی صبح میں کمرے سے باہر نکلا تو شہریار کے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ شہریار بہت بکھرا ہو رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ دو انمول انسان اُسے ٹوٹ کر چاہتے تھے لیکن پھر بھی وہ خالی ہاتھ اس گھر واپس جا رہا تھا۔ شیخ صاحب جیسا بڑے دل کا اور وضع دار انسان بھی میں نے کم ہی دیکھا تھا۔ اُن کے ا ایک شکن بھی نہیں تھی کہ جس سے کوئی اُن کی آزردہ دلی کا اندازہ لگا سکے۔ انہوں نے حسب معمول ہنستے ہ شہریار کا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا۔ شانی اور دھانی بھی بظاہر بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہی تھیں اُن دونوں کی آنکھوں میں لکھی تحریر صاف بتا رہی تھی کہ ایک اور محبت کی کہانی بنا کسی انجام کے ختم ہو رہی۔ اس کہانی کے آخر میں بنا سوالیہ نشان ہمیشہ کے لیے اس کہانی کے ساتھ جڑا رہے گا۔ شہریار گاڑی میں بیٹھنے پہلے آخری مرتبہ ہماری جانب مڑا۔ وقار نے اُس سے پوچھا۔ ''شہریار بھائی.....! آپ پھر کب آئیں ہم سب آپ کو بہت مس کریں گے۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں جلد آؤں گا۔'' شانی کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ دھانی کو خود کو سمیٹتے ہوئے دیکھ کر لقمہ دیا۔ ''اسے جلد آنا ہی پڑے گا، ورنہ پیانو پر بیٹھی گنگناتی زیبا بیگم کر کہیں گی کہ 'کسی مہرباں نے آ کے میری زندگی سجا دی'۔'' سب ہنس پڑے۔ شہریار نے شانی اور دھانی پر نظر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ جانے اس لمحے مجھے سانول کی زبانی سنا ایک صحرائی گیت شدت سے کیوں یاد آیا جس میں محبوبہ اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کو دہائی دیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ محبوب اُسے بھول جائے گا، چاہے وہ لاکھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر اُسے یقین دلائے۔ پر وہ جانتی ہے کہ یہ وقتی جواز ہے اور محبوبہ کی قسمت میں تو ازل سے جدائی کی موت ہے کیوں کہ اُس کا محبوب اُسے بھول جا۔

تے کوں یاد ہوسی میں آکھیا سی
دل دار مٹھا توں بھل ویسیں
وَل وَل قرآن تے ہتھ نہ رکھ
نہ قسماں چا..... توں بھل ویسیں
کجھ سوچ سمجھ تے فیصلہ کر

نہ جوش دکھا توں بھل ویسیں
تیرے باجوں میں نئی جی سکدی
نہ ظلم کما..... توں بھل ویسیں
دلدار مٹھا..... توں بھل ویسیں

شالیمار

کبھی کبھی پیار کھو دینے کے بعد ہمارے لیے کسی انمول ہیرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کھوئی ہوئی ہر
''کوہ نور'' بن جاتی ہے۔ کھویا ہوا پیار ''شالی مار'' بن جاتا ہے۔ دھانی اور شاہانہ کی چاہت بھی شالی مار بن
تھی۔ شہر یار کے جانے کے بعد اگلے روز سلطان بابا بھی اسپتال سے فارغ ہو کر شیخ صاحب کے ہاں
آئے۔ اُن کا ارادہ جلد کوچ کرنے کا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت اور شیخ صاحب کے اصرار پر نہ نہ کر
ہوئے بھی ایک ہفتہ مزید بیت ہی گیا۔ اُب بظاہر اُن کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی لیکن میرے اندر کی
چینی اب رفتہ رفتہ کسی لاوے کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ اور اب تو رنگوں کا میری بصارت سے کچھ لمحوں
لیے رُوٹھنا، ہر چوبیس گھنٹے میں ایک معمول کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ لیکن سبھی رنگ نہیں رُوٹھتے تھے، بس
تھے جو کسی پرانی تصویر کی طرح درمیان سے غائب ہو جاتے تھے۔ اور یہ چند لمحے مجھ پر کس عذاب کی صور
بیتتے تھے، یہ بس میرا دل ہی جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے لگتا تھا جیسے میری نسوں میں خون نہیں، گرم کو
سیال مادہ دوڑ رہا ہو۔ میری سانسیں کسی گرم بھٹی کی دھونکنی بن جاتی تھیں اور میں یوں ہانپنے لگتا تھا جیسے میلو
دُور سے دوڑتے ہوئے آیا ہوں۔ لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میری یہ حالت کسی پر ظاہر نہ ہو کیو
کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے سلطان بابا کو مزید دیر ہو۔ وہ پہلے ہی مشرقی ساحل پر بنی کسی مسجد کی مز
تک پہنچنے کے لیے کئی مرتبہ بے چینی کا اظہار کر چکے تھے۔ اب اگر ایسے میں، میں اپنی بگڑتی طبیعت کا رونا
کر بیٹھ جاتا تو وہ ضرور علاج کے مخمصے میں پڑ جاتے اور ہمیں نہ جانے مزید کتنے دن یہاں رُکنا پڑتا اور پھر
کیا تھا، میرے اندر تو جانے ایسے کتنے لاوے میری رُوح کو جھلسانے کے لیے ہر دم بہتے رہتے تھے۔ اور
خود ہی تھک کر سرد بھی ہو جاتے تھے۔ سوچا یہ تپش بھی دل کے سرد خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر خود ہی برف
جائے گی۔

جس دن ہمیں شیخ صاحب کی کوٹھی سے رُخصت ہونا تھا، اُس روز بہت سے کالے بادل ہمیں الوا
کہنے کے لیے آسمان پر جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سلطان بابا سے سن رکھا تھا کہ ہم جس مشرقی ساحل کی جا
جا رہے تھے، وہاں بارشیں بہت برستی ہیں۔ شاید یہ گھنیرے بادل بھی اُسی دیس سے آئے ہوں۔ مہمان
راستوں سے نا آشنا ہوں تو میزبانوں کو انہیں لینے اُن کی بستی جانا ہی پڑتا ہے۔ ہمیں رُخصت کرنے کے
دھانی، شانی، وقار اور شیخ صاحب گیٹ تک آئے۔ پھر وہی الوداع، پھر وہی رگوں کے سرے تک پھیل جا

لی اُداسی۔ جب ہمیں اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دن ہر رشتے، ہر جگہ، اس جہاں ہی سے رُخصت ہو
انا ہے تو ہم اپنے دل کے دھاگوں کی گرہیں یہاں وہاں کیوں باندھتے پھرتے ہیں۔ سلطان بابا نے تینوں
وں کو فرداً فرداً سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ دھانی اُن سے نظر نہیں ملا پائی۔ وہ کچھ دیر
ں کے پاس ٹھہر کر بولے۔ ''جن کے من کے آئینے اتنے اُجلے ہوں، اُن کے مقدر کبھی دھندلے نہیں
تے۔ ہم جو کھو دیتے ہیں، قدرت اُس سے بہتر ہمارے لیے پہلے سے چن رکھتی ہے۔ بس اتنا یقین رکھنا۔''
عانی رو پڑی۔ پھر شانی اور پھر شیخ صاحب بھی اپنی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ مجھے اسی لیے یہ الوداع سدا سے
اٹ جاتے ہیں۔ شیخ صاحب بضد تھے کہ ہم اُن کی گاڑی مع ڈرائیور اپنے سفر کے پہلے حصے کے لیے استعمال
ریں لیکن سلطان بابا نے بس کے سفر کو ترجیح دی۔

بس نے ہمیں تقریباً چھتیس گھنٹے کے سفر کے بعد ایک دریا سے منسلک قصبے تک پہنچا دیا، جہاں سے اگلے
ز صبح ہوتے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیمر نے ہمیں پہلے سمندر کی ایک بڑی شاخ اور پھر کھلے سمندر میں پہنچا
ا۔ میرا شہر اسی سمندر کے مغربی ساحل پر واقع تھا۔ میں اسٹیمر کے عرشے سے ٹکرانے والی لہروں کو دیکھ کر سوچتا
ا کہ جانے ان میں وہ کون سی لہر ہوگی جو اس ساحل کو چھو کر آئی ہوگی جس سے ذرا پرے میرے دل کے
احلوں کی حق دار رہتی ہے۔ پھر اچانک میرے من میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ان میں کوئی ایسی لہر بھی جو اس
اوش کے نازک پاؤں چھو کر آئی ہو۔ زہرا کو بھی تو ساحل کی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت پسند تھا۔ ضرور
جھاگ اُڑاتی، مسکراتی اور شریر سی ہنسی ہنستی ہوئی بے باک لہریں اس لالہ رُخ کی قدم بوسی کر کے ہی مجھ تک
نچی ہوں گی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دل کے دریا، سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں۔ ''دل دریا، سمندروں
ے ننگے۔'' لیکن زہرا کی یاد نے پل بھر میں میری آنکھوں میں نمکین پانی بھر دیا تھا۔ وہ مجھے اس بات کا احساس
ا رہا تھا کہ میرے دل کا دریا کب سے سمندر میں تبدیل ہو چکا ہے ورنہ اتنا نمکین پانی میری آنکھوں کو ہر لمحہ
انے کے لیے کہاں سے آتا۔ میری پتلیوں کا یہ وضو تو شاید ازل سے جاری و ساری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ دن کے
ر کے بعد اسٹیمر نے ہمیں ایک کٹے پھٹے ساحل پر اُتار دیا جہاں کھڑی مخصوص اُونٹ گاڑیوں پر ہمارے سفر کا
خری حصہ طے ہونا تھا۔ شام ڈھلے جب ڈوبتے سورج کی کرنوں کا سونا پورے سمندر کو ایک سنہری قالین میں
دیل کر رہا تھا۔ میں اور سلطان بابا اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ ایک چھوٹی سی مسجد جو سمندر کی لہروں سے ٹکراتی
ہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی تھی۔ پیش امام کا نام مرتضیٰ تھا، جو ہمارے استقبال کے لیے مسجد کے دروازے کے باہر
ا کھڑے تھے۔ اُن کا گھر پہاڑی کے عقب میں واقع چھوٹی سی بستی میں تھا اور اُن کا چھوٹا بیٹا جس کی عمر قریباً
دس برس ہوگی، ہمیں پہاڑی ٹیلے کی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلے ہی دوڑتا ہوا اپنے بابا کے پاس جا کر ہمارے
سنے کی منادی کر چکا تھا۔ جب مرتضیٰ صاحب ہم سے مل رہے تھے تو وہ اُن کے عقب میں کھڑا اپنی حیران
کھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ سلطان بابا نے اُسے پکارا تو وہ جلدی سے اپنے بابا کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اُس کا نام اشرف المرتضیٰ تھا۔ جانے دنیا کے سبھی بچوں کی رُوحیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔ صاف، شفاف، ملائم، شرمیلی اور لجیلی سی..... ہم تمام عمر اپنے بچپن والی رُوح کی شفافیت کو اپنے اندر قائم کیوں نہیں پاتے؟

مرتضیٰ صاحب نے سلطان بابا کو حجرے میں چلنے کی دعوت دی اور میں نے بھی کچی اینٹوں والے صحن اُن کے پیچھے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر وہی بصارت سے رنگ نچوڑ لینے والا دورہ میری نسوں آگ بھر گیا۔ ایک چنگاری سی میرے لہو میں دوڑی اور میں ایک لمحے کے لیے ڈگمگا سا گیا۔ مرتضیٰ صاحب جلدی سے میری جانب بڑھے۔ ''کیوں نوجوان! سب ٹھیک تو ہے نا.....'' میں نے بڑی مشکل سے سلگتی سانسوں پر قابو پایا۔ ''جی.....! میں ٹھیک ہوں۔ بس شاید لمبے سفر کی تھکن ہے۔ کچھ دیر آرام کروں سنبھل جاؤں گا۔'' سلطان بابا نے غور سے میری جانب دیکھا لیکن چپ رہے۔ کچھ ہی دیر میں مرتضیٰ صاحب نے خود ہی عشاء کی اذان بھی دے دی اور ساحلی بستی سے دس بارہ مکین نماز کے لیے جمع ہوتے گئے سبھی اپنے حلیے سے مچھیرے لگ رہے تھے۔ مرتضیٰ صاحب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان بابا جماعت پڑھوانے کی ذمہ داری مرتضیٰ صاحب ہی کو سونپ دی اور ہم نے اس ساحلی مسجد میں عشاء کی باجماعت نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سبھی نمازیوں نے فرداً فرداً سلطان بابا اور مجھے خوش آمدید کہا۔ رات کا کھانا مرتضیٰ صاحب کے گھر سے ہی آ چکا تھا اور اشرف المرتضیٰ جواب دھیرے دھیرے ہم سے مانوس ہوتا جا رہا تھا، ایک جانب شرمایا سا بیٹھا، اپنے بابا کو دسترخوان پر چاول اور خشک مچھلی کے نمکین قتلے لکڑی کی پلیٹوں میں سجاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مرتضیٰ صاحب نے ہمیں کھانے کے دوران بتایا کہ یہاں کی آب وہوا میں شدید سیلن نمک کے مخصوص ذرات کی موجودگی کی وجہ سے لوہے، تانبے یا سلور کا کوئی بھی برتن استعمال نہیں کیا کیوں کہ وہ ہفتوں ہی میں زنگ آلود ہو کر گل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں کی تعمیر میں بھی زیادہ تر اسی مخصوص لکڑی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بنے برتنوں میں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ سمندر کی تیز ہوا حجرے کی بنا شیشے کھڑکیوں اور روشن دانوں سے پار ہوتے ہوئے ایک عجیب سا ساز بجا رہی تھی جیسے کوئی ماؤتھ آرگن ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہو۔ کچھ دیر بعد مرتضیٰ صاحب اپنے بیٹے سمیت رُخصت ہو گئے۔ سلطان بابا کچھ ستانے کی غرض سے لیٹ گئے اور میں خاموشی سے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر میرے سبھی دوست تارے گہرے نیلے آسمان پر اپنی محفل سجا چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکائے۔ میں نے اُن میں سے سب سے روشن اور چمکتے تارے سے زہرا کا پوچھا۔ ''کیسی ہے وہ.....؟'' تارے نے سمندر کی مغربی سمت جھانک ہنس کر بولا۔ ''وہ بھی تمہاری طرح اداس ہے اور اپنے گھر کی وسیع چھت پر ایک آرام کرسی ڈالے ہم تمہاری باتیں کر رہی ہے۔ تمہارا پتا پوچھ رہی ہے۔'' جانے کیوں اس لمحے مجھے ان ستاروں کی قسمت پر رشک آیا۔ وہ آسمان کے چھت پر لٹکے پوری دنیا میں جب چاہیں، جسے چاہیں دیکھ سکتے تھے۔ کاش میں

سمان کا ایک تارا ہوتا، بہت چمک دار نہ سہی مٹیالا اور مدھم ہی سہی، ایک آوارہ تارا.....۔ نصف رات
ے چکی تھی۔ میں نے پہاڑی ٹیلے سے اُٹھنے کا ارادہ کیا اور ٹھیک اُسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے
ی بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی ہے۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ہاں
ی جس ٹیلے کی چوٹی پر میں بیٹھا ہوا تھا، اُس سے کچھ فاصلے پر درمیان کی ایک تنگ گھاٹی سے متصل ایک اور
لے کی چوٹی بھی تھی اور کسی گاڑی کی بیک لائٹس روشن ہو کر دھیرے دھیرے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔
طلب یہ کہ گاڑی پہلے ہی سے وہاں پارک تھی اور اب واپس جا رہی تھی۔ اس ویرانے میں اتنی رات گئے یہ
ان تھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ ''ہوگا کوئی میری طرح رات، تنہائی، سمندر اور تاروں سے بات کرنے
لا.....''

فجر کے بعد اگلی صبح میری آنکھ لگی تو پھر اُٹھتے اُٹھتے بہت دیر ہو گئی۔ سلطان بابا نے بھی جانے کیوں سورج
لنے سے پہلے حسب معمول مجھے نہیں جگایا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد سلطان بابا، مرتضیٰ صاحب،
رف اور ایک انجان شخص کو پریشان سا بیٹھا دیکھ کر میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ میرے سر میں درد کی ایک شدید
س اُٹھی۔ سلطان بابا نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے میاں.....؟'' میں نے حیرت
ے انہیں دیکھا۔ ''مجھے کیا ہوا۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔ شاید رات کو نیند نہ آنے کی
ہ سے۔'' ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انجان شخص نے میری نبض تھامی۔
ایسے دورے کب سے پڑ رہے ہیں آپ کو.....؟'' میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ انہوں
نے گہری سی سانس لی۔ ''فجر کی نماز پڑھ کر جب تم کمرے میں لوٹ رہے تھے تو اچانک چکرا کر کمرے کی
کھٹ ہی پر گر گئے تھے، تمہاری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اور شاید ہونٹوں کے کناروں سے کف بھی بہنے لگا
ا۔ مرتضیٰ صاحب نے فوراً اپنی بستی کے حکیم ریاض السلام صاحب کو بلوا لیا اور تب سے ہم سب تمہارے
رہانے ہی بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب کی تمہارے حلق میں اُنڈیلی گئی دوا کا اثر ہوا تو سہی، پر بہت دیر سے۔'' میں
رت سے منہ کھولے سلطان بابا کی زبانی یہ ساری رُوداد سن رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں تھا کہ میں صبح
دروازے کی چوکھٹ پر ہی گر گیا تھا۔ یہاں کمرے میں آنے تک کی تمام جزئیات میرے ذہن کی سلیٹ پر
لکل واضح تھیں لیکن اس کے بعد سب کورا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ حکیم صاحب کو گزشتہ چند روز سے اپنے
ر ہونے والی آتشی جنگ کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ دن میں دو چار مرتبہ چند لمحوں کے لیے میری
ارت بے رنگ بھی ہونے لگی تھی۔ حکیم صاحب پریشانی سے میری بات سنتے رہے اور پھر انہوں نے غور سے
ری جانب دیکھا۔ ''ایک بات بتائیے..... ماضی قریب میں آپ کے ساتھ کسی جانور کے کاٹنے یا پنجے گوشت
نک پیوست ہو جانے کا واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ خاص طور پر کسی کتے سے کوئی مڈبھیڑ تو نہیں ہوئی آپ کی؟'' میں
یم صاحب کی بات سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ میں نے انہیں مناسب الفاظ میں بتایا کہ کچھ عرصہ قبل ایسا واقعہ

ضرور پیش آیا تھا کہ میں کتوں کے جبڑے کی کاٹ سے تو کسی طور بچتا ہی رہا لیکن اُن کے پنجے میری جلد میں
بار پیوست ہوئے تھے۔ شاید دانت بھی اس دھینگا مشتی میں میرا ماس چھو گئے ہوں۔ پر میں نے انہیں یہ بھی
کہ اسی روز چند گھنٹوں کے اندر اندر مجھے مطلوبہ دوا و یکسین کی صورت میں انجیکٹ بھی کر دی گئی تھی کیوں
میں فوجی چوکی کے مستند ڈاکٹر تک خوش قسمتی سے پہنچ گیا تھا۔ حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں
مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ پر جن کتوں نے حملہ کیا تھا، انہیں اگلے 72 گھنٹے یا پھر چند دن زیر معائنہ رکھا
تھا۔ اُن میں سے کسی کی موت تو واقع نہیں ہوئی تھی؟'' میں ایک بار پھر اُلجھ گیا۔ اب میں انہیں اپنی اس عجیب
غریب جنگ کے بارے میں کیا بتاتا جس میں میری اور مجھ پر حملہ آور فوج کے سبھی رُکن کتے ہی تھے اور بد قسم
سے سبھی کتوں نے اُسی میدان میں جان دے دی تھی۔ میں نے اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولا
''دراصل وہ تین چار کتے تھے اور مجھ پر حملے کے دوران ہی انہیں مار دیا گیا تھا۔ لہٰذا معائنے کی نوبت ہی نہ
آئی۔'' حکیم صاحب نے تشویش بھرا لمبا سا ہنکارا بھرا۔ ''اوہ.....! میں سمجھا۔'' سلطان بابا نے حکیم صاحب
سے پوچھا۔ ''کوئی تشویش کی بات تو نہیں ہے نا جناب.....؟'' حکیم صاحب کچھ ہچکچائے۔ ''مکمل بات
تفصیلی معائنے ہی سے پتا چل سکے گی..... مختصراً اتنا بتا سکتا ہوں کہ بروقت دوا مل جانے کے باوجود بھی
بلکہ خدانخواستہ کچھ زہریلے مادے ان کے خون میں پرورش پا چکے ہیں۔ میں اپنی سی کوشش تو ضرور کر رہا ہو
لیکن بہتر ہوگا کہ انہیں پہلی فرصت میں یہاں سے تیس میل دُور پہلے بڑے ساحلی شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو
دکھا دیا جائے۔ میری حکمت میں جو اثر ہے، وہ سب فی سبیل اللہ آپ لوگوں کے لیے حاضر ہے لیکن زیادہ
کیجیے گا۔'' حکیم صاحب اپنی دوائی کی ایک اور خوراک پلانے کے بعد اور ہمارے ذہنوں میں اتھل پتھ
مچانے کے بعد اپنی دواؤں کی صندوقچی اُٹھا کر چلتے بنے۔ سلطان بابا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر بس میری
میں پڑ چکے تھے۔ دوپہر تک تو وہ مجھ سے باقاعدہ کچھ خفا سے بھی تھے کہ میں نے انہیں پہلے یہ سب کیوں
بتایا۔ مجبوراً ظہر کے بعد مجھے زبردستی اُن کے سامنے مسجد ہی میں صف پر چوکڑی مار کر بیٹھنا پڑ گیا۔ ''میں آپ
سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس اس لیے خاموش رہا۔ آپ بے فکر رہیں میں جلد تندرست ہو جاؤں گا۔
لیکن اگر آپ اسی طرح رُوٹھے رہے تو میں واقعی پورا مریض بن کر بستر پر پڑ جاؤں گا۔'' میرا حربہ کارگر رہا
وہ دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ''بہت ضدی ہو۔ لیکن اب ہم یہاں سے تب ہی آگے سفر کریں گے۔ جب
بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اور پھر میرے ذہن میں بہت عرصے کا اٹکا سوال زبان سے پھسل ہی پڑا۔ ''ہم
منزلوں کی طرف سفر کرتے ہیں، اُن کا تعین آپ کیسے کرتے ہیں.....؟ مثلاً جبل پور، پھر کال گڑھ اور
مشرقی ساحل کی یہ مسجد..... سفر کا یہ نقشہ کون ترتیب دیتا ہے؟'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔
اشارے مل جاتے ہیں۔ کبھی کسی حاجت مند دوست کا بلاوا آ جاتا ہے۔ کبھی وقت ملے اور میسر ہو تو نقشہ دیکھ
اُمید ہے تمہیں سمجھ آ جائے گی۔'' حسب معمول میرے ذہن کی کچھ گرہیں کھلیں، پر کچھ نئی گرہیں مزید پڑ گئیں

میں نے تہیہ کر لیا کہ کہیں سے بھی نقشہ میسر ہوا تو اپنے آج تک کے سفر کا راستہ جوڑ کر ضرور دیکھوں گا۔ میری حالت شام تک وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بگڑتی گئی اور عصر کے بعد تو گرمی اور حبس سے میرا دم اس قدر گھٹنے لگا کہ میں گھبرا کر ٹیلے سے نیچے ساحل کی طرف چلا آیا۔ سامنے ہی اشرف نیلی اور زرد دھاریوں والی بڑی سی پتنگ ہوا میں بلند کیے دوڑ رہا تھا۔ پتنگ کو ڈور کی ڈھیل ملی تو وہ ہواؤں میں بلند ہوتی گئی۔ میں بہت دیر تک اور، پتنگ اور آسمان کا یہ کھیل دیکھتا رہا۔ دفعتاً اشرف کے ہاتھ میں تھمی کچی ڈور کو ایک جھٹکا لگا اور پتنگ آسمان میں ڈولنے لگی۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ اشرف بہت دیر تک ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کے لیے دوڑتا رہا لیکن کٹی پتنگیں اپنے مالک کے ہاتھ بھلا کب آتی ہیں۔ انہیں تو آسمان چھونے کی خواہش مزید اور مزید اُونچا اُڑا لے جاتی ہے۔ اشرف کی پتنگ بھی ساحل کی ہوا کے سنگ بادلوں سے پرے جا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اشرف منہ بسورتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کیا ہوا؟ کٹ گئی پتنگ.....؟'' ''ہاں آج پہلی بار میں نے اتنی اُونچی اڑائی تھی پر.....'' اشرف ابھی تک افسردہ تھا۔ ''کوئی بات نہیں۔ دراصل تمہاری پتنگ بادلوں کو پسند آ گئی تھی۔ سو ان کا دل بھی چاہا کہ وہ اس سے کھیلیں۔ لہٰذا تمہاری پتنگ وہاں چلی گئی۔'' اشرف کچھ حیران ہوا۔ ''اچھا..... کیا بادل بھی پتنگ اُڑاتے ہیں؟'' میں مسکرایا۔ ''ہاں، بادل ہی تو پتنگوں کے سب سے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ تب ہی تو پتنگیں اُن سے باتیں کرنے کے لیے اتنا اُونچا اُڑتی ہیں۔'' اشرف کے چہرے پر چھایا تکدر دُور ہونے لگا۔ ''اچھا، پھر تو کوئی بات نہیں۔ بادل تو مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے بھی دوست ہیں۔'' میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ اپنے اندر یہ بادلوں اور پتنگوں کی دوستی سدا زندہ رکھنا۔ اشرف اپنی دُھن میں بولے چلا جا رہا تھا۔ ''میں بڑی گاڑی والے صاحب سے کہوں گا وہ مجھے ایک نئی پتنگ لا دیں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔'' ''یہ بڑی گاڑی والے صاحب کون ہیں؟'' اشرف نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ایک بہت بڑی سی گاڑی والے صاحب تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن ساحل پر شام کو کچھ دیر کے لیے آتے ہیں، کبھی کبھی اُن کے ساتھ شہر کی کوئی میم صاحب بھی ہوتی ہیں۔ دونوں کچھ دیر کے لیے دوسری جانب والے ٹیلے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ چائے، کافی پیتے ہیں اور کبھی کبھار اپنے ساتھ پتنگ اور ڈور بھی لاتے ہیں۔ یہ پتنگ بھی اُسی صاحب نے اشرف کو دی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں گزشتہ رات والی گاڑی کی بیک لائٹس چمکیں۔ ہو سکتا ہے یہ وہی صاحب ہوں جن کی تعریف کرتا اشرف اس وقت زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کچھ دیر میں سورج ڈھلنے لگا تو مرتضیٰ صاحب مسجد والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشرف کو آوازیں دینے لگے۔ اشرف ابھی مجھے اپنے جگری دوست جانو کی کہانی مزید سنانا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ دونوں ہیڈ ماسٹر صاحب سے نظر بچا کر کبھی کبھی آدھی چھٹی کے وقت بھی ساحل پر تتلیاں اور گھونگے جمع کرنے آ جاتے تھے۔ لیکن اپنے بابا کی مستقل پکار سن کر اُسے بادل نخواستہ اُٹھ کر جانا ہی پڑا۔ میں بھی مغرب کی اذان سن کر اُوپر مسجد میں چلا آیا۔

عشاء کے بعد گزشتہ روز کی طرح مرتضیٰ صاحب کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھے رہے۔ درمیان میں
صاحب بھی چکر لگا گئے تھے۔ نہ جانے ہر بار وہ میری نبض دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر کون سی اَن
تحریر پڑھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے ہر بار وہ کچھ کہتے کہتے رُک سے جاتے
رات بہت دیر تک سلطان بابا میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ میرا جسم اندر سے بُری طرح جل رہا تھا۔ پیا
اتنی بڑھی کہ میں بہت دیر تک اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا پھر نہ جانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ بس مجھے اتنا ہی یا
کہ سلطان بابا دھیرے سے میرے سرہانے سے اُٹھ کر حجرے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ پھر
ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا کوئی بالٹی بھر بھر کر کھارا نمک ملا پانی میرے چہ
پر پھینک رہا ہو۔ تیسرے تھپیڑے پر میں نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو سر پر حجرے کی چھت کی
کھلا آسمان دیکھ کر چند لمحے تو میں سٹپٹا ہی گیا۔ اور پھر پانی کی ایک تیز لہر نے میرے پہلے سے بھیگے ہوئے
مزید بھگو دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں اس وقت حجرے کے بجائے ساحل پر
ریت میں سنا ہوا تر بتر سا بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا.....! میں یہاں کیسے پہنچا.....؟ ابھی رات کو تو میں ا
کمرے میں ہذیانی حالت میں اپنے بستر میں کسمسا رہا تھا پھر یہ ساحل، یہ کھلی فضا.....؟ میں ابھی حیر
کے پہلے شدید جھٹکے ہی سے باہر نہیں نکل پایا تھا کہ اچانک دُور سے کچھ لوگ ہجوم کی صورت میں مجھے اپنی جا
بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہیولے دھیرے دھیرے دھندلی شبیہوں سے واضح خاکوں میں تبدیل ہوئے تو
سے آگے باوردی پولیس والوں کی ایک ٹولی نظر آئی۔ پھر ایک سپاہی کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھتے ہی
سے چلایا۔

"وہ رہا قاتل جناب.....!" پھر کوئی زور سے گرجا۔ "لپکو..... پکڑو..... قاتل جانے
پائے۔" سب پولیس والے میری جانب دوڑے۔

قاتل

میں ہکا بکا سا یوں ہی اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور کچھ ہی دیر میں پولیس والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں
ایک نے لپک کر میری کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ عقب سے چند اور حوالدار بھی نمودار ہو گئے اور پھر ایک
گرجا "کون ہو تم..... اور اس وقت یہاں ساحل پر کیا کر رہے ہو؟" "میں عبداللہ ہوں۔ سامنے والی چھوٹی
ی پر واقع مسجد میں رہتا ہوں۔" ایک سپاہی میرے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دے کر بولا "یہ جھوٹ بول رہا ہے
ب۔ لاش کے قریب جو قدموں کے نشان ہیں، وہ سیدھے یہاں آ کر ختم ہوتے ہیں۔ یہی اس لڑکی کا قاتل
ہے۔" میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے۔ یہ لوگ کس لڑکی کی لاش کا ذکر کر رہے تھے۔ اور میرے
وں کے نشان وہاں تک کیسے پہنچے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ساری بستی ساحل کے گرد جمع ہو چکی
ا۔ افسر کے حکم پر مجھے ہتھکڑی پہنا دی گئی اور پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے جائے وقوعہ تک لے جایا گیا۔ کچھ پولیس
لے زمین پر چونے سے ایک دائرہ لگائے کھڑے تھے۔ درمیان میں سفید چادر کے نیچے ایک آڑا ترچھا جسم
ہوا تھا۔ چادر کے نیچے بھی جسم کے زاویوں کے متوازی سفید چونے کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ دفعتاً زور
ہوا کے جھونکے سے جسم کے چہرے سے چادر ہٹ گئی۔ تیئس، چوبیس سال کی ایک معصوم سی لڑکی آنکھیں
ے پڑی تھی۔ چہرے پر چند گہری خراشوں کے علاوہ اور کوئی ایسی نشانی نہیں تھی کہ جسے دیکھ کر کوئی یہ اندازہ
سکے کہ وہ اپنی سانسیں ہار چکی ہے۔ اس وقت بھی وہ اتنے قریب سے بھی گہری نیند میں سوئی ہوئی ہی لگ
تھی جیسے ابھی پٹ سے آنکھیں کھول دے گی۔ میں ابھی تک پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ چند
ا بعد ہی سامنے سے مرتضیٰ صاحب اور سلطان بابا پریشانی کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتے دکھائی
ے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر سلطان بابا کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ وہ لپک کر میرے قریب آئے اور
ے ہاتھ ٹٹول کر کہنے لگے "یہ ہتھکڑیاں کیسے عبداللہ میاں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے؟" اتنے میں ایک سرکاری
ساحل پر نمودار ہوئی اور سارے پولیس والے ہوشیار اور مؤدب ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے لوگوں کو
اُدھر ہٹایا۔ "اے ہٹو، ایک طرف ہو جاؤ۔ ایس۔ پی صاحب آ رہے ہیں۔" ایس۔ پی کے قریب آتے ہی
پولیس والوں نے کھٹا کھٹ سلیوٹ کیے۔ افسر نے جواباً سر ہلایا اور میری طرف چلا آیا۔ اور غور سے میری
ف دیکھ کر بولا "ہونہہ..... تو یہ ہے وہ لڑکا؟" سلطان بابا نے کھنکار کر ایس۔ پی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "کیا
کیا ہے عبداللہ میاں نے..... آپ نے اسے ہتھکڑیاں کیوں لگا رکھی ہیں؟" افسر نے غور سے سلطان بابا کو

دیکھا ''یہ آپ کا بیٹا ہے؟'' ''بیٹے سے کچھ بڑھ کر ہی ہے میاں..... رشتے صرف خون کے ہی تو نہیں ہو
ایس۔ پی نے غور سے بابا کو دیکھا ''خوب..... اور آپ کون ہیں؟'' ''ہم دونوں ہی مسافر ہیں۔ ایک
راستے کے۔ فی الحال چند دن کے لیے پہاڑی ٹیلے کی اُوپر والی مسجد میں بسیرا ہے، پھر آگے بڑھ جائیں
میاں۔'' افسر نے گہری سانس لی۔ لیکن فی الحال شاید ایسا ممکن نہ ہو۔ اس لڑکے پر خون کا شک ہے
بظاہر دکھائی دینے والے تمام شواہد بھی اس کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے ہم اسے گرفتار کر کے لے جا
ہیں۔ ہاں، البتہ آپ میری تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دیں کہ آپ کے بیان کے مطابق اگر آپ لوگ اُو
مسجد کے حجرے میں مقیم ہیں تو پھر یہ لڑکا اتنی صبح سویرے یہاں ساحل پر کیا کر رہا تھا؟'' سلطان بابا
سانس لیا ''میں نہیں جانتا، کیوں کہ میں رات کو عبداللہ کو حجرے ہی میں سوتا چھوڑ گیا تھا۔'' ایس پی نے چ
سلطان بابا کو دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مشکل مرحلے پر بھی سچ کا دامن نہیں چھوڑا۔ لیکن آپ
سچ عبداللہ کو ہماری نظر میں مزید مشکوک بناتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ کسی اچھے وکیل سے رابطہ کر لیں۔'' پولیس
نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا اور وہ لوگوں کے درمیان سے مجھے دھکیلتے ہوئے پولیس کی جیپ کی طرف
پڑے۔ مرتضیٰ صاحب اتنے پریشان تھے کہ اُن سے ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔ میں نے چلتے ہوئے پلٹ
سلطان بابا کو کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میرے سارے لفظ نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ بھیڑ میں کھڑے
صاحب کی نظریں مجھ سے ملیں اور مجھے لگا کہ اُن کے اندر جانے کتنے طوفان اُمڈ رہے ہیں لیکن وہ پولیس
سے کچھ بول نہیں پا رہے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے میری نظر آخری بار اُس معصوم چہرے پر پڑی، جس کے
داغ اپنے ماتھے پر سجائے میں پولیس کے گھیرے میں ایک ان جانے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کیا میرا جنون
اپنی آخری حدیں بھی پار کرنے کو تھا۔ بستی والے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ریت اُڑاتی جیپ
سے ساحل سے دُور ہوتی گئی اور کچھ ہی دیر میں سارا منظر دھندلا گیا۔

تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے بعد ایک خستہ حال سی پرانی عمارت نظر آئی جس پر برسوں پہلے کیا گیا پلا
جگہ جگہ سے اُڑ چکا تھا۔ عمارت کے گیٹ پر پرانے سے ٹین کا ایک زنگ آلود بورڈ جھول رہا تھا، جس پر
بغور دیکھنے پر بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ میں صرف اتنا ہی پڑھ پایا ''پولیس تھانہ، تحصیل ماہی۔'' اور
جیپ تھانے کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔ ایس۔ پی کے وقوعہ پر پہنچنے سے پہلے، جس تھانے دار
سے بات کی تھی، وہ یہاں کا ایس ایچ او تھا۔ مجھے تھانے دار کے کمرے میں لے جا کر دیوار کے قریب
رہنے کو کہا گیا۔ پتا چلا کہ ایس۔ پی صاحب ہیڈ کوارٹر یعنی شہر والے دفتر میں بیٹھتے ہیں اور یہاں صرف
کی اطلاع پر پہنچے ہیں، کیوں کہ مرنے والی شاید خود بہت اہم تھی یا پھر اُس کا تعلق شہر کے بہت اہم لوگوں
تھا۔ ورنہ عام حالات میں ایسے مقدمات خود تھانے دار ہی نپٹا دیا کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ تھی میں
واقعے کے دوران ذہنی طور پر بالکل سُن اور یوں بے فکر اور لاتعلق سا تھا جیسے پولیس قتل کے الزام

ں..... کسی بچگانے کو پکڑ کر تھانے لائی ہے اور میں کسی فلم کے پردے پر یہ سب مناظر دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی
یں ایس پی صاحب بھی کمرے میں آ گئے اور تھانے دار اور چند مؤدب حوالدار اُن کے آس پاس اکڑ کر
ڑے ہو گئے ہیں۔ میں نے پہلی بار ایس پی کے سینے پر لگی چھوٹی سی نام کی تختی پڑھی۔ اُن کا نام رحمٰن تھا۔
پی نے میز پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا میں سے ایک سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں داب کر ماچس کے لیے نظر
ائی۔ تھانے دار نے جلدی سے بڑھ کر سگریٹ سلگا دیا۔ انہوں نے ایک زوردار کش لے کر دھوئیں کا مرغولہ
یں بکھیرا اور دھوئیں کی اس نیلگوں چادر سے پرے اپنی گھورتی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ ''ہونہہ..... تو
اللہ نام ہے تمہارا۔ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟'' میں نے مختصراً انہیں تفصیل بتائی۔ کتنا پڑھے لکھے ہو؟
مطلب ہے مدرسے کی کون سی سند تک پڑھا ہے تم نے اب تک؟'' ''جی مدرسے کی تو کوئی سند نہیں ہے
ے پاس۔ ابھی کچا طالب علم ہوں۔'' میرا جواب سن کر انہیں ذرا حیرت ہوئی کیوں کہ شاید میری صاف
گوئی سے وہ مجھے دین کا بہت پرانا طالب علم سمجھ بیٹھے تھے۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم رات کو ساحل پر کیا کرنے گئے
جس لڑکی کی لاش کے پاس تمہارے قدموں کے نشان ملے ہیں تم نے اُسے پہلی بار کب دیکھا
'' ''میں نے پہلی بار اُسے آج صبح ہی دیکھا ہے، جب چند لمحوں کے لیے اُس کے چہرے سے کپڑا ہٹ گیا
مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں رات اپنے حجرے سے ساحل تک کیسے پہنچا اور میرے قدموں کے نشان ریت پر
رہ گئے؟'' تھانے دار سے صبر نہیں ہو سکا اور وہ کڑک کر بولا۔ ''کیوں، کیا تم کو نیند میں چلنے کی عادت
سیدھی طرح سے بتاتے ہو یا پھر؟'' ایس پی نے ہاتھ اُٹھا کر تھانے دار کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر خود
فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو۔ میں نے ابھی تک روایتی پولیس والے حربوں سے خود کو روک رکھا
دراصل مجھے لڑکی کے پوسٹ مارٹم کا انتظار ہے۔ شام تک شہر سے رپورٹ آ جائے تو میں کسی نتیجے پر پہنچ کر
ئی فیصلہ کروں گا، لیکن تب تک تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔ بعد میں اگر مجھے یہ پتا
تم نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہو گا۔'' ''میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ
بولا۔ نہ ہی مستقبل میں میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ آپ اپنی تفتیش مکمل کریں۔ اگر میں گناہ گار ہوں تو بھی
کے اختیار میں ہوں۔ جو سزا مقرر ہو گی، مجھے قبول ہے۔'' رحمٰن صاحب کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نہ
کیا تلاش کرتے رہے۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ اصل پولیس والے کی نظر کس قدر گہری اور کتنی چبھتی
ہوتی ہے۔ تب ہی تو انہیں آنکھوں کے راستے رُوح میں جھانک لینے کا فن آتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی
کر بتایا کہ بستی کے چند بزرگ اور حکیم صاحب اُن سے ملنا چاہتے ہیں۔ ایس پی نے انہیں دوسرے
ے میں بیٹھانے کو کہا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کا حکم دے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صرف ایک
کو میری نگرانی پر مامور رہنے دیا گیا۔ البتہ میرے ہاتھ اب بھی ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ کھڑے
ے میرے پاؤں شل ہونے لگے۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ پھر اچانک وہی لاوا میرے خون میں پھوٹا

اور میری نسوں میں چنگاریاں بھر گیا۔ سپاہی نے پہلے حیرت سے میری پھولتی سانسوں اور بگڑتی حالت کو
اور پھر مجھے ڈولتے دیکھ کر وہ باہر کی جانب بھاگا۔ مجھے یوں لگا کہ سامنے والی پیلی دیوار پر کچھ عجیب
عفریت نما سائے اُبھر کر میری جانب بڑھ رہے ہوں اور پھر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جانے کتنی
بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو حکیم صاحب دھیرے دھیرے میرے گال تھپتھپا رہے تھے۔ ہ
وقت حوالات کے سنگی سل نما چبوترے پر لیٹا ہوا تھا اور میرے آس پاس سلطان بابا کے علاوہ ایک ڈا
ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ حوالات کے چھوٹے سے روشن دان سے اندر آئی دھوپ کے زاویے اور
رنگت سے پتا چل رہا تھا کہ سورج ڈھلنے کو ہے۔ گویا میری زندگی سے پھر چند گھنٹے کچھ اس طرح سے
پاؤں نکل گئے تھے کہ مجھے خبر بھی نہ ہو سکی۔ سلطان بابا نے مجھے بتایا تھا کہ روز قیامت جب ہم دوبارہ
جائیں گے تو ہمیں یوں لگے گا جیسے ہم صرف دو گھڑی کی زندگی بتا کر آخرت تک پہنچے ہیں۔ پچھلے چ
سے میری زندگی کے کئی طویل گھنٹے بھی یونہی دو پل کی طرح میری بے ہوشی کے دوران بیت جاتے تھے
جب میں دوبارہ حواس میں آتا تھا تو مجھے بالکل اُسی طرح محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے ابھی دو پل کے
آنکھیں موندی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری
اُٹھ بیٹھا۔ بہتر ہوں۔ بس سر میں شدید درد ہے۔"

"ہوں..... تمہارا بلڈ پریشر انتہائی خطرناک حد تک بلند ہو گیا تھا۔ بلڈ پریشر سمجھتے ہو۔ فشار خون
وباؤ؟" "جی سمجھ گیا....." رحمٰن صاحب غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سگریٹ حسب معمول اُن کی اُنگلیو
درمیان سلگ کر راکھ ہو رہا تھا۔ "تمہیں یہ بیماری کب سے ہے؟" میں نے حیرت سے سلطان بابا کی
دیکھا، کیوں کہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس بیماری کا ذکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے میری نبض تھامی
(Tetanus) کا علاج تو بروقت ہوا لگتا ہے۔ ٹیکوں کے نشان تو ابھی تک واضح ہیں۔ خدا کرے کہ یہ
خدشات کے مطابق (Rabies) ریبیز کا کیس نہ ہو۔ لیکن علامات تو سبھی موجود ہیں۔" حکیم صاحب
کہنے کی کوشش کی جناب یہ جنون کا قصہ ہے۔ میرا مطلب ہے ہماری طب کی زبان میں اسے "سگ
" بھی کہتے ہیں۔ جب یہ دورہ پڑتا ہے تو انسان اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ کسی نئی دنیا میں پہنچ جاتا
اسے ہیولے دکھائی دینے لگتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اُس کی یادداشت کی سلیٹ مٹ جاتی ہے۔ یعنی
کو حکیم کی یہ فاضلانہ تقریر شاید کچھ پسند نہیں آئی وہ ہاتھ جھٹک کر بولا "ہاں ہاں..... یہی ساری علامات
ہیں ریبیز کی بھی۔ لیکن میں نے آج تک ریبیز کو زندہ بچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب کہ یہ تو جوان تو
گزر جانے کے باوجود چل پھر رہا ہے۔" بحث طول پکڑنے لگی تو ایس پی کو مداخلت کرنی پڑی۔ انہوں
سخت لہجے میں دونوں کو تنبیہ کی کہ میرے خون کے نمونے شہر کی لیبارٹری کو بھجوا دیے گئے ہیں
رپورٹ آنے ہی پر کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔ فی الحال اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ شاید طب

ایلوپیتھی (Allopathy) ٹرین کی دو ایسی پٹریاں ہیں، جو ساری عمر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں اور جن کی منزل
ایک ہوتی ہے لیکن وہ کبھی مل نہیں پاتیں۔ سلطان بابا اس سارے عرصے میں چپ چاپ بیٹھے مجھے دیکھتے
ہے۔ حوالات میں اندھیرا ہونے لگا تو ایک سنتری نے بیرونی طاق میں رکھا دیا جلا دیا، جو سلاخوں سے پرے
طرح بنایا گیا تھا کہ اس کی روشنی تو حوالات تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ قیدی کی دست برد سے پرے رہتا تھا۔
دیر میں باقی لوگ باہر نکل گئے اور صرف میں اور سلاخوں کے پار بیٹھے سلطان بابا حوالات میں باقی رہ
۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی۔ ''یہ کیسا مقدر لکھوا کر لائے
یاں۔ کبھی کبھی تو میں خود بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ کہیں کوئی مستقل جنوں ہی تمہاری تقدیر نہ ہو۔'' میں
ان کا ہاتھ تھپتھپایا ''آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ دیوانے سے کوئی پرسش نہیں، تو پھر دیوانگی تو نعمت ہوئی نا۔
فرزانگی کے عذاب سے تو جان چھوٹے گی۔ بس، یہ دعا کریں کہ میری یہ دیوانگی، یہ جنوں کسی کے لیے
نقصان نہ ہو۔'' اتنے میں سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ قیدی کو باقاعدہ ''لاک اپ'' میں بند کرنے کا
ہو گیا ہے، لہٰذا ملاقات ختم کی جائے۔

کچھ ہی دیر میں اس خستہ حوالات کی سلاخوں پر بڑا سا لوہے کا تالا ڈال کر اور دروازے کو مقفل کر کے
''لاک اپ'' بنا دیا گیا۔ سلطان بابا کو میں نے بمشکل بستی واپس جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ وہ وہیں تھانے کے
پاس رات گزارنے کی دُھن میں تھے۔ ایس پی صاحب کی مہربانی سے مجھے وہ کھانا کھانے کی اجازت
دی گئی، جو مرتضیٰ صاحب اپنے گھر سے بنا کر لائے تھے۔ تھانے دار نے مجھے بتایا کہ رحمٰن صاحب واپس
جا چکے ہیں اور اب وہ صبح آئیں گے اور کل صبح ہی مجھے ریمانڈ کے لیے باقاعدہ کسی عدالت کے روبرو پیش
جائے گا۔ تھانے میں اب باقاعدہ مجھے مریض سمجھ لیا گیا تھا، لہٰذا عملے کا رویہ صبح سے کافی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر
صرف رات کی ڈیوٹی والے تین چار سپاہی تھانے میں باقی رہ گئے اور عمارت سنسان ہو گئی۔ بس میں، میرا
اور یہ تاریک قفس باقی رہ گئے۔ کس سے گلہ کرتا کہ جنوں کا تو واسطہ ہی سدا سے قفس تھا۔ میں تو وہ
بے، دیوانہ تھا، جو ناصح کو اپنے ناخن بڑھ جانے کی دہائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے
ٹک کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور صبح سے ہوئے اب تک کے واقعات کا از سرِ نو جائزہ لینے لگا۔ اب تک
لڑیاں کچھ یوں جڑتی تھیں کہ کال گڑھ کے بے زبان دشمنوں کا زہر میرے خون میں شامل ہو کر اسے بھی
کر چکا تھا اور اب میرے اندر اپنی بھیڑیوں کی درندگی اور وحشت خون بن کر دوڑ رہی تھی، جو مجھے دن کے
کسی بھی لمحے میں خود سے بیگانہ کر سکتی تھی۔ پہلی رات فجر کے بعد مجھ پر جنوں کا پہلا طویل دورہ پڑا۔ لیکن اس
خوش قسمتی سے میں حجرے میں سلطان بابا کے سامنے ہی موجود تھا، لہٰذا فوراً حکیم صاحب کو بلوا لیا گیا اور
کی میرے حلق میں ٹپکائی گئی دوا نے شاید میرا کچھ بھرم رکھ لیا۔ لیکن دوسری رات میرا جنوں مجھے گھسیٹ کر
سے باہر لے آیا۔ نہ جانے وہ معصوم کون تھی، جو ساحل پر لاش کی صورت موجود تھی اور کون جانے کہ واقعی

وہ میرے ہی ہاتھوں اس حال کو پہنچی ہو؟ کیوں کہ مجھے نہ تو کچھ یاد رہتا تھا اور نہ ہی ایسی حالت میں، میرا اپنے قابو میں ہوتا تھا۔ لیکن وہ کون تھی، چہرے اور لباس سے تو پڑھی لکھی اور کسی بڑے گھر کی دکھائی دیتی تھی۔ پھر اتنی رات کو اس ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی؟ اور اگر میں نے ہی اُس کی جان لی تھی تو کیا وہ تنہا آئی تھی۔ نہ جانے ایسے کتنے سوالوں کو سنپو لیے تھے، جو مجھے رات بھر ڈستے رہے۔

رات پل پل کر کے سرکتی رہی اور کھلے روشن دان سے ریت کے ذرے اُڑ اُڑ کے میرے چہرے اور سر پر گل باشی کرتے رہے۔ ہاں سچ ہے، دیوانوں کے لیے تو یہ خاک بھی گل جیسی ہوتی ہے اور جو جس قدر خاک آلود ہو، اُتنا ہی گل زار ہوتا ہے۔ فجر کے بعد ایک سنتری چھوٹی سی چینک میں چائے اور ایک چھوٹی سی گلاسی لیے نمودار ہوا۔ ''لے بھئی مولوی، چائے پی لی۔ بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ خون تیرے ہاتھوں ہوا ہے، لیکن باقی سب کہتے ہیں کہ تجھے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور اسی دورے کے دوران نے اس لڑکی کی جان لے لی۔ اب اللہ جانے سچ کیا ہے.....؟'' میں نے سنتری سے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کون جس کے قتل کا الزام میرے سر ہے؟'' سنتری جو خود بھی میرے سامنے سلاخوں کے پار اسٹول پر چائے دوسری گلاسی لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اُس نے اپنا ماتھا مسلا۔ ''کیا بھلا سا نام تھا اس بے چاری کا..... ہاں..... لیلیٰ..... یہی نام تھا۔ سنا ہے کسی بہت بڑی کمپنی میں کام کرتی تھی اور اُسی کے مالک ریحان منگیتر بھی تھی۔ ویسے ریحان کا نام یہاں سبھی جانتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا سب سے بڑا رئیس ہے وہاں شہر میں اس کی بیسیوں فیکٹریاں ہیں اور وہ خود بھی شہر میں اپنے محل نما بنگلے میں رہتا ہے۔ گورنر اور وزرا کے ہاں شام کی چائے پر دعوت ملنا اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ تبھی تو ہمارے ایس پی صاحب بھی اطلاع ملتے ہی دوڑے چلے آئے تھے۔ اس لڑکی کے قتل نے جانے کتنوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔'' میں نے سنتری کو ٹٹولا ''لیکن وہ شہر سے اتنی دُور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھیں۔ وہ بھی تنہا۔'' ''پتا نہیں۔ سنا ہے اُس کی ریحان صاحب کی شادی میں بس تین دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ ویسے بھی بستی کے لوگوں نے پہلے بھی دونوں کو ساحل پر گھومتے دیکھا تھا۔ شاید شور شرابے اور رش سے گھبرا کر چلے آئے ہوں۔'' سنتری کی بات ہی میرے ذہن میں اشرف کی بات گونجی۔ اُس نے بھی تو کسی میم صاحبہ اور صاحب کا ذکر کیا تھا، جو وہاں آتے جاتے تھے اور جس نے ننھے اشرف کو پتنگ بھی اُڑانے کے لیے دی تھی۔ کہیں یہ وہی صاحب اور صاحب تو نہیں؟ سنتری نے بات جاری رکھی۔ ''ویسے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے کل شام ہی یہ پتا چلا تھا کہ لڑکی کی موت بلندی سے نیچے گرنے سے ہوئی ہے۔ لیکن اُس کے گلے پر بھی خراشیں ہیں، جن سے لگتا ہے کہ اُوپر پہاڑی پر کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شاید اسی دھینگا مشتی میں وہ نیچے گر گئی یا اُسے دھکا دے دیا گیا۔ بہر حال، جو بھی ہوا، بہت بُرا ہوا۔ اس بے چاری نے تو شاید اپنی سہاگ کی مہندی اپنے ہاتھوں میں رچانے کے لیے گیلی کر رکھی ہو۔ تین دن بعد ہی تو اس کی رُخصتی تھی۔'' سنتری کی بات

رادل ڈوب سا گیا۔ کاش یہ جرم مجھ سے سرزد نہ ہوا ہو۔ باہر دھوپ نکل آئی تھی۔ سنتری برتن اُٹھا کر واپس جا
ا تھا۔ میرے چہرے پر بھی سلاخوں سے چھن کر آتی دھوپ نے سلاخیں سی بنا دی تھیں۔ چہرے کی ہی کیا بات
ی، اس وقت تو خود میرے سارے وجود میں جانے ایسی کتنی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔"

کچھ دیر میں باہر کچھ ہلچل ہوئی۔ شاید کچھ گاڑیوں کے رُکنے کی آوازیں بھی اُبھریں اور کچھ لوگوں کی
وں کی آواز آنے لگی۔ صبح سویرے جس سنتری نے مجھے چائے لا کر دی تھی وہ تیز تیز چلتا ہوا میری طرف آیا۔
چلو حافظ جی..... تمہاری ملاقات آئی ہے۔" میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اگر بستی سے سلطان بابا یا کوئی اور
لنے آیا ہوتا تو اُسے سیدھا حوالات کی طرف لایا جاتا۔ میں نے سنتری سے پوچھا "مجھ سے ملنے کون آیا ہے؟"
نتری نے حوالات کا تالا کھولا۔ "ریحان صاحب آئے ہیں۔" میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا.....
ریحان..... اُس لڑکی کا منگیتر.....؟" میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا تھانے دار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
ایک شخص نفیس سا سوٹ پہنے منہ موڑے کمرے میں کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ کے باوجود اُس نے
ٹ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں ہلکے سے کھنکارا۔ ریحان نامی شخص دھیرے دھیرے پلٹا۔ ہم دونوں کی
ظریں ملیں اور میں اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔

قفس اور جنوں

کچھ دیر تک ہم دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ میرے
اس وقت وہ شخص کھڑا تھا، جس کی محبت کے قتل کا الزام میرے سر تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے نفیس
سجے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ، ٹائی، لف لنکس، کوٹ اور پتلون کی گھڑی
کر نہایت سلیقے سے بنائی گئی کریز اور امپورٹڈ چمکتے ہوئے جوتے۔ کبھی میں بھی لندن کے ہیرالڈز اسٹور
ہر دوسرا پیراہن خریدا کرتا تھا۔ اس وقت ریحان کے سرمئی سوٹ کی جیب پر بھی وہی مخصوص چھوٹا مرو
جگمگا رہا تھا، لیکن اُس کا چہرہ اُسی قدر تاریک تھا۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ جس شخص کی محبت
ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں، اُسے اتنا نفیس لباس پہننے اور شیو بنانے کا دھیان بھی کیسے رہ سکتا
ریحان کے ہاتھ میں ہوانا کا ایک قیمتی سگار تھا، جس کی میٹھی سی خوشبو کمرے میں چاروں طرف پھیل چکی
اس تمام تر اہتمام کے باوجود اس کی حالت ابتر لگ رہی تھی۔ کلین شیو چہرہ، جس پر نسوانیت کی نازک سی
دِکھتی تھی، کس قدر ڈھلکا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے تھے کہ وہ گزشتہ کئی راتوں سے سو نہیں پا
کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ''تو تم ہو عبداللہ.....''۔ میں چپ رہا ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم کسی ا
بیماری کا شکار ہو؟'' ''مجھے بھی یہی بتایا گیا ہے، لیکن اگر آپ یقین کر سکتے ہیں تو کم از کم اس بات پر یقین
کہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے اور مجھے آپ کی منگیتر کی موت پر از حد دکھ ہوا ہے۔'' ریحان کچھ کھویا کھویا سا
تھا جیسے صدمے سے اُس کے حواس ابھی تک شل تھے۔ وہ اس طرح بولا جیسے کوئی اپنے آپ سے
کرتا ہے۔ ''جسے جانا تھا، وہ تو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ کس کے جنوں کا شاخسانہ ہے، اس بحث سے
حاصل۔ میری دنیا تو اُجڑ گئی۔''

اتنے میں باہر کسی سرکاری جیپ کے ہوٹر کی آواز گونجی اور چند لمحوں کے بعد ایس پی رحمٰن صاحب
سے پولیس والی ٹوپی اُتارتے ہوئے جلدی میں اندر داخل ہوئے ''معافی چاہتا ہوں ریحان صاحب
راستے میں گاڑی کا انجن گرم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر رُکنا پڑا۔'' ریحان کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔ ''اُس اور
نے پیغام بھیجا تھا میرے لیے۔'' ''اوہ ہاں..... آپ کو زحمت دینے کے لیے معذرت۔ میں جانتا ہوں
اس وقت کس کرب سے گزر رہے ہیں، لیکن سرکاری فرائض کی ادائیگی کبھی کبھی ہمیں پتھر بننے پر مجبور
ہے۔ دراصل آپ کو جائے وقوعہ پر ملی کچھ چیزیں دکھانا تھیں۔ اُن کی شناخت اور پولیس کو مطلوب

لیے آپ کو میرے ساتھ جائے واردات تک چلنا ہوگا۔" ریحان اب تھانے دار کے کمرے میں پڑی کرسی
چکا تھا۔ جس کی ادھوری جھلک میں یہاں حوالات کی سلاخوں سے دیکھ سکتا تھا۔ تھانے دار کے کمرے کا
لکڑی کی چوکھٹ سے اُدھڑا ہوا تھا اور چوکھٹے پر پڑی چق بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ انہی
ے خانوں میں سے ایک مستطیل خانہ مجھے اس وقت سامنے بیٹھے سگار پیتے ریحان کے چہرے کی نامکمل
دکھار ہا تھا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ یونہی کھویا کھویا رہتا تھا یا پھر اس حادثے نے اُس کی یہ حالت کر دی تھی۔
ی کی آواز گونجی "آپ کے خیال میں لیلیٰ اتنی رات گئے اس ویرانے میں اکیلے کیوں گئی ہوگی؟" "وہ ہمارا
ہ تفریحی مقام تھا۔ میں اور لیلیٰ اکثر وہاں آتے تھے۔ لیلیٰ کو پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا اور شہر کی
ی اور ہجوم میں یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا، لہٰذا ہم اکثر چھٹی منانے وہاں چلے جاتے تھے۔ کمپنی نے لیلیٰ
گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے دل گھبرایا ہو تو اکیلی ہی اس جانب نکل گئی ہو۔ پہلے بھی جب کبھی
خالف سمتوں سے یہاں پہنچنا ہوتا تھا تو میں لیلیٰ کو کہہ دیتا تھا اور وہ بآسانی وہاں تک آجاتی تھی۔ البتہ
وتنہا آنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔" رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا "لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ واردات
ام سے ہمیں بیک وقت دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ملے ہیں۔ پہلی گاڑی تو وہی لیکسز (Lexus)
لیلیٰ کے استعمال میں تھی، اور جائے واردات ہی پر کھڑی تھی، لیکن وہاں ایک دوسرے گاڑی بھی آئی
ا، جس کے واپس جانے کے نشانات بھی پکی سڑک تک ملے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی، کار یا جیپ بھی
ہے۔" ریحان کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، لیلیٰ کی
دست یا جاننے والے کے پاس کوئی چھوٹی گاڑی نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ چھوٹی گاڑی بھی
م وہاں آئی ہو، لیکن لیلیٰ کی گاڑی آنے سے پہلے ہی چلی گئی ہو۔ وہ ایک تفریحی مقام بھی ہے اور شہر
ے ہوا خوری کے لیے وہاں آتے رہتے ہیں۔ کئی بار جب میں اور لیلیٰ وہاں آتے تھے تو ہم سے پہلے ہی
اندان، کوئی جوڑا یا منچلے نوجوان وہاں پکنک مناتے ہوئے ملتے تھے۔ ایسی صورت میں ہم آگے بڑھ
تھے۔"

حمٰن صاحب نے بھی اپنا سگریٹ سلگایا۔ "ہاں..... ہم اس زاویے سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ شاید وہ
اڑی لیلیٰ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے چلی گئی ہو۔ میرا عملہ بستی والوں کے بیانات لے رہا ہے، لیکن
ے ایک تو وہ پوائنٹ بستی سے کچھ فاصلے پر ہے اور پھر ایسی جگہ ہے کہ وہاں عموماً لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔
بستی کے لوگ سرِشام ہی خود کو گھروں میں بند کر لینے اور عشاء کے فوراً بعد سو جانے کے بھی عادی
ہیں کہ لیلیٰ کی موت کا وقت رات بارہ بجے کے بعد کا ہے۔ بہرحال، فی الحال تو تمام اشارے اُسی
کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو پہلے ہی ہماری حراست میں ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔
فجر ہو رہی ہے۔"

رحمٰن صاحب اور ریحان کمرے سے باہر نکلے۔ ریحان کی نظر مجھ سے ملی۔ مجھے اس جوان رعنا
اور ضبط پر اس لمحے بے حد رشک آیا۔ جانے اُس کے اندر اس وقت کتنے طوفان مچل رہے ہوں
چہرے پر سمندر جیسا سکوت طاری تھا۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں پلٹا ہی تھا کہ باہر ایک دم
اور سپاہی ایک ملنگ نما مجذوب شخص کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لائے اور اُسے بھی حوالات میں دھکیل کر
ملنگ غصے میں اول فول بکتا رہا اور سپاہی اپنی بولی بولتے رہے۔ پتا چلا کہ ملنگ اس سے پہلے بھی لوگو
یا پتھر مار کر زخمی کر چکا تھا لیکن اُسے جھاڑ جھپٹ کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پر آج تو اس نے حد ہی کر
مار مار کر سارے علاقے کے گھروں کے شیشے توڑ ڈالے۔ تھانے دار ایس پی صاحب کے ساتھ جائے
کی طرف نکل چکا تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ اُس کی واپسی تک ملنگ کو حوالات ہی میں قید رکھا جائے۔ مج
جھکتا وہیں سلاخوں کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ
بیٹھا تھا۔ ملنگ کو ایک جھٹکا سا لگا ''تو..... تو یہاں کیا کر رہا ہے.....؟'' میں گڑبڑا سا گیا۔ ''میں...
قیدی ہوں۔'' ملنگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''قیدی..... ہونہہ..... تو صرف اپنی خواہشوں کا قیدی ہے۔
تو تو نے خود اپنی قسمت میں لکھوائی ہیں۔'' میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے پولیس والوں کو
گالیاں دینے والا مجذوب اس وقت بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ اتنے میں چائے والا سنتری سلاخوں
سے گزرا اور ہنس کر بولا ''اس کی باتوں میں نہ آنا عبداللہ۔ یہ تو ہے ہی سدا کا مجنوں۔ گھڑی میں تولہ
میں ماشہ'' کتنی عجیب بات تھی۔ اس وقت حوالات میں دو ہی قیدی بند تھے، ان میں سے ایک مجنوں تھا
دیوانہ۔ دفعتاً ملنگ اپنی جگہ سے اچھل کر بالکل میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور براہ راست میری آ
جھانکتے ہوئے بولا ''یہ تو مجھے کسی خونی کی آنکھیں لگتی ہیں۔ سچ بتا، کس کا خون کر کے آیا ہے یہاں...
زور سے چونکا گویا اس ملنگ کو بھی میرے فسانے کی خبر ہو چکی تھی۔ اچانک ملنگ نے زور سے میرا ہا
''سچ بتا.....؟ کیوں مارا اسے..... تو اور کتنے خون کرے گا.....؟'' میں چپ رہا۔ ملنگ بالکل ہی جنو
''تو کیا سمجھتا ہے..... یوں در بدر بھٹکنے سے تو اسے پا لے گا۔ نہیں، کبھی نہیں۔ تیرا مقدر ہی یہ سدا ک
ہے۔ تو یونہی سر پٹک پٹک کر مر جائے گا، لیکن جب تک اپنے من میں نہیں جھانکے گا، تب تک تیرا
نہیں ہوگا۔ کبھی یہ سلاخیں تیرا مقدر بنیں گی اور کبھی جنوں۔ کبھی کتے تجھ پر لپکیں گے اور کبھی اژ
بھنبھوڑیں گے۔ ترس آتا ہے مجھے تجھ پر۔ عورت کا عشق تو نبھا نہیں پایا۔ اُس کے عشق کی گرد بھی کیا
صرف نام ہی عبداللہ رکھ لیا ہے۔ عمل کوڑی بھر کا بھی نہیں۔'' مجذوب نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہا تھا
اندر بیک وقت نہ جانے کتنی آندھیاں، کتنے جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ملنگ ضرور میرے بارے میں
جانتا تھا۔ مجھے گم صم بیٹھا دیکھ کر وہ زور سے چلایا ''تو ایسے نہیں مانے گا..... نہ مان..... کھاتا رہ ہو
ٹھوکریں۔ ایک روز یونہی سولی چڑھ جائے گا۔ نہ ہی عورت تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ خدا۔'' ملنگ مج

لر دوبارہ زور سلاخوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اُس نے اپنے ہونٹ جیسے سی لیے۔ میری حالت پھر سے
ونے لگی۔ وہی چنگاری میرے دماغ سے نکلی اور میرے سارے جسم کو جھلسا گئی۔ سامنے بیٹھا مجذوب ایک
یڑیے کی شکل اختیار کر کے مجھ پر لپکا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں نے اس حملے کو روکنے کے لیے
وفضا میں بلند کر دیے۔

مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ میں کسی اسپتال کی چار دیواری میں تھا اور آس پاس بہت سے ڈاکٹر
ف آلات لئے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ، سب ہی نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ
دی۔ ''تم ٹھیک تو ہو..... تمہیں بخار تو نہیں رہتا، ہر وقت تھکن تو محسوس نہیں ہوتی۔ سر میں دھماکے سے
تے ہیں؟'' سانس لینے میں دشواری ہوتی۔ کھانا ٹھیک سے نگلا جاتا ہے کہ نہیں.....؟ ہاتھ پاؤں شل تو نہیں
ہاتے اچانک؟ میں نے بمشکل اپنی کیفیت بیان کی کہ میں اس دورے کے دوران اپنے حواس ہی میں کب
ہوں جو اتنا کچھ یاد رکھ سکوں، پھر ایک سینیئر ڈاکٹر نے نوجوان ڈاکٹروں کو ڈانٹا اور کمرے کی روشنیاں مدہم
نے کو کہا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے بات کرنے لگا، لیکن اس کی باتوں کا دائرہ بھی اچانک دکھائی
یڑ والے ہیولوں، بے یقینی، پُرتشدد رویے اور فالج کی کیفیات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اتنے میں باہر سے کسی
ی نے آکر بتایا ایس۔ پی رحمٰن پوچھ رہے ہیں کہ کیا قیدی کو آج جیل وارڈ ہی میں رات گزارنی ہوگی یا وہ
واپس جیل لے جا سکتے ہیں۔ سینیئر ڈاکٹر نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم ایک لمبی راہ داری
ہو کر ان کے کمرے تک پہنچ گئے۔ جہاں پہلے سے رحمٰن صاحب تھانے دار سمیت ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر
مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لیکن میں کھڑا ہی رہا۔ قید کے اپنے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں اور شاید
صرف قیدی یا قیدی ہونے کی تھی ہی نہیں۔ یہ قواعد وضوابط ہی تو ہیں جو ہمیں ہر جگہ قیدی بنائے رکھتے ہیں۔
نے سچ ہی کہا تھا کہ ''ہم بظاہر آزاد ہوتے ہیں، لیکن تمام عمر ان دیکھی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔''
صاحب نے ڈاکٹر سے میری بیماری کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب انگریزی میں بولے
ہر عجیب سی بات لگتی ہے لیکن سائنس اور ایلوپیتھی کی دنیا میں ہر دن ایک نئی کھوج کا دن ہوتا ہے۔ ہم
سینکڑوں پرانی بیماریوں کا علاج دریافت کرتے ہیں تو ہر پل کوئی نئی بیماری ایک نیا چیلنج بن کر ہمارے
آ کھڑی ہوتی ہے اور بیماری بھی کیا۔ یہ تو دراصل ہمارے خون میں موجود مختلف مرکبات اور مادوں کی
بگڑنے کا ایک نام ہے۔ ساری زندگی، یہ دنیا اور یہ ساری کائنات ایک ترتیب ہی کا تو مظہر ہے۔ انسانی
کے اندر ہمہ وقت ایک بے حد پیچیدہ نظام ایک خاص ترتیب میں چل رہا ہے۔ جس میں اس نظام کے تحت
سلے مادوں کی مدت، اوقات اور بناوٹ خود بھی ایک خاص ترتیب اور نظام کے تحت ہوتی ہے۔ ان
کی بھی چیز کی کمی بیشی یا ملاوٹ ایسی ہی کسی حالت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، جسے ہم اپنی زبان میں
کہتے ہیں۔ اس نوجوان کے خون میں بہنے والے مادوں میں بھی حیران کن طور پر چند ایسے زہریلے

مرکب شامل ملے ہیں جو عام طور پر کسی درندے کے خون میں ملتے ہیں۔ اسے کتے کے کاٹے کی مکمل
بھی ماضی قریب میں دی جا چکی ہے۔ اینٹی ٹیٹنیس ٹیکے بھی لگ چکے ہیں، لیکن پھر بھی نہ جانے یہ کیڑا
جواب تک باقی ہے۔ میرے لئے یہ میڈیکل ہسٹری میں ایک نئی دریافت ہے۔۔۔۔ اسے ریبیز بھی
پھر بھی یہ بار بار کے دورے خطرناک علامت ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر جلد ہی ہم اس بیماری کی تہ تک نہ
اس نوجوان کا اعصابی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جائے گا، جس کا نتیجہ فالج یا پھر مکمل دیوانگی کی صورت
نکل سکتا ہے۔'' میرے ذہن میں فوراً ملنگ کی دھمکی گونجی کہ نہ مجھے خدا ملے گا نہ وصال صنم..... میں
ڈاکٹر سے پوچھ بیٹھا ''میرے پاس کتنا وقت باقی ہے ڈاکٹر صاحب.....'' ڈاکٹر سمیت رحمٰن صاحب بھی
بھی اچھل پڑے۔ سینئر ڈاکٹر نے یہ ساری گفتگو انگریزی میں شاید اس لیے کی تھی کہ وہ مریض کے سامنے
کی نوعیت بتا کر اُسے مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن میرا سوال سن کر اُن تینوں کو ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ
ساری گفتگو سمجھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر انگریزی میں پوچھا ''تم انگریزی جانتے ہو'' میں نے اردو میں
دیا ''جی کچھ شدھ بدھ ہے، اس زبان سے میری۔ آپ برائے مہربانی میرے سوال کا جواب دیں۔ کتنا
پن میں اور کتنا عرصہ باقی ہے میرے پاس.....؟ رحمٰن صاحب غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر
جلدی سے نفی میں سر ہلایا ''دیکھو نوجوان..... ڈاکٹر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ تم جوان ہو، صحت مند ہو
تمہارے معائنے کے دوران آج یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ تم بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہو۔ مجھے
میں اور تم مل کر اس بیماری کو بھی ہرا دیں گے۔ بس اپنا یقین مت کھونے دینا۔ آدھی جنگ یقین اور حو
جیتی جاتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ریلیکس''

ایک اچھے طبیب کی طرح سینئر ڈاکٹر میرا سوال ٹال گئے۔ انہوں نے ایس۔ پی صاحب کو اجا
دی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں، لیکن اب مجھے لگاتار معائنے کے لئے شہر کے اس بڑے ا
لانا ہوگا۔ ہم اسپتال سے باہر نکلے تو جیپ کے قریب کھڑے دو سپاہی جلدی سے ہتھکڑی لے کر میر
لپکے لیکن رحمٰن صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا ''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... عبداللہ
گاڑی میں تھانے لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ تھانے دار صاحب کے ساتھ ہماری گاڑی کے
رہو'' حوالدار نے کھٹ سے سلیوٹ کر کے سر ہلایا ''بہتر جناب'' اور رحمٰن صاحب مجھے لیے اپنی سرکا
کی جانب بڑھ گئے۔ اسپتال سے باہر نکل کر مجھے احساس ہوا کہ یہ ساحلی شہر بھی میرے شہر کی طرح
جدید تھا۔ شاید ساحل پر بسنے والے شہروں میں بہت سی مماثلتیں ہوتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ہم جگمگ
چھوڑ کر مضافات میں نکل آئے۔ ہمارے داہنی جانب کچھ فاصلے پر سمندر ٹھاٹھیں مارتا سڑک کے
دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ شاید یہی ساحلی سڑک سیدھی ''تحصیل ماہی'' کے تھانے تک جاتی تھی۔ مجھے یاد آیا
صاحب نے شہر سے بستی کا فاصلہ تقریباً 30 کلومیٹر بتایا تھا۔ رحمٰن صاحب خود ہی گاڑی ڈرائیو کر

ڈرائیور اور گارڈ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی
پر گم صم بیٹھا، اندھیرے میں سمندر کی سفید لہروں کو کناروں سے ٹکرا کر فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر
کا انجام "فنا" ہی تو ہے۔ میری کہانی بھی خاتمے کے قریب ہی تھی شاید۔ رحمٰن صاحب نے سگریٹ
میں دبایا۔ ڈرائیور نے جلدی سے لائٹر دکھا کر ان کا سگریٹ سلگایا اور دوبارہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری
دیکھے بنا بولے "اُس دن جب میں نے تم سے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھا تو تم نے ٹھیک طرح
ے بتایا کیوں نہیں؟" "آپ نے مدرسے کی سند کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے پاس واقعی مدرسے
ی سند نہیں ہے۔" رحمٰن صاحب ہنس پڑے۔ "اچھا تو اب بتا دو، تمہارے پاس کون سی سند ہے؟
یزی ادب میں ایم اے کیا ہے میں نے....." وہ اُچھل ہی تو پڑے۔ "واقعی.....؟ تو پھر اتنا پڑھ لکھ کر ان
ں کی خاک کیوں چھان رہے ہو، کوئی اچھی ملازمت کیوں نہیں کی تم نے۔" میں نے بات ٹالنے کی غرض
ا "اسے بھی میری ایک ملازمت ہی سمجھیں۔ ملازمت صرف تنخواہ پانے کے لیے ہی تو نہیں کی
رحمٰن صاحب نے چونک کر میری جانب دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنے لفظوں کے بے وقت چناؤ اور
اس طرح اچانک زبان سے پھسل جانے پر خود پر شدید غصہ آیا لیکن تیر ایک بار پھر کمان سے نکل چکا
وب..... میں تو آج تک ملازمت کو صرف تنخواہ پانے کے ذرائع میں سے ایک سمجھتا رہا۔ تم اگر مناسب
اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ۔ لیکن اُسے زبردستی ہرگز نہ سمجھنا۔ جی چاہے تو بتا دو۔" "میری گزارش
یہ حکم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ فی الحال میں ایک ممکنہ مجرم کی حیثیت میں آپ کا قیدی ہوں اور
ن بہت جگہوں پر بٹا ہوا ہے۔ مجھے اپنے رہنما بزرگ کی بھی فکر ستائے جا رہی ہے۔ جانے وہ کیسے ہوں
نا کی طبیعت یہاں آنے سے پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" رحمٰن صاحب نے دھواں اُگلا "وہ بزرگ بھی
طرح ادھوری باتیں کرتے ہیں۔ بہرحال اسپتال آنے سے پہلے میں بستی میں ہی تھا تفتیش کے
ہری اُن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمہارے بارے میں تسلی دی تھی انہیں۔" میں نے تشکر
ردل سے ان کی جانب دیکھا۔ "شکریہ..... آپ ایک مختلف پولیس والے ہیں۔ رحمٰن صاحب ہنس
یہ لقب ہے یا الزام۔ چلو یہ بھی قبول ہے۔ تم جانتے ہو، آج بستی کے ایک بچے نے ایسا بیان دیا ہے کہ
ا ہوا تو پورے کیس کا رُخ ہی بدل جائے گا۔ تم جس مسجد میں مقیم ہو۔ وہاں کے پیش امام کے بیٹے نے
بتایا ہے کہ اس نے قتل کی رات اسی پہاڑی ٹیلے پر ایک دوسری عورت کو بھی جاتے ہوئے دیکھا تھا۔
ورت کی چھوٹی گاڑی میں سوار تھی۔ بچہ ابھی چھوٹا ہے اُس لیے زیادہ جزئیات نہیں بتا سکا۔ لیکن اس کا
ہ کہ وہ اپنی میم صاحبہ کی گاڑی ٹیلے کی طرف جاتی دیکھ کر بستی سے نکل کر اس جانب بھاگا تو اس نے
نا کہ اس دوسری گاڑی کو بھی اس ٹیلے کی جانب جاتے دیکھا۔ لیکن اُسی لمحے مسجد سے اُس کے باپ
را اُسے آواز دے کر واپس بلا لیا اور ڈانٹا کہ وہ مغرب کے بعد اندھیرے میں گھر سے کیوں نکلا ہے۔

بچے نے باپ کے ڈر سے اس وقت اُسے یہ نہیں بتایا کہ اس کی میم صاحب ٹیلے پر گئی ہیں اور ان کے پیچھ
نے ایک دوسرے گاڑی بھی جاتے دیکھی ہے۔ جسے کوئی اور عورت چلا رہی تھی۔ پیش امام صاحب
لے آئے اور آج جب ہم بیانات لینے کے لیے گئے تو اس بات کا پتہ چلا۔'' ایس پی صاحب ضرور اثر
بات کر رہے تھ۔ لیکن یہ دوسری عورت کون تھی؟ میں اور رحمٰن صاحب دونوں ہی اس سوچ میں گم تھے کہ جی
کا گیٹ آ پہنچا۔

ابھی میں ایس۔ پی صاحب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر تھانے کے برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ ا
تھانے کا محرر بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ وہ جلدی سے سلیوٹ کر کے بولا
پوسٹ مارٹم کی مکمل رپورٹ آ گئی ہے۔ لڑکی کے چہرے، شانے اور کمر پر جو کھرونچیں اور خراشیں آئی تھ
اس رپورٹ کے مطابق کسی درندے کے پنجوں کے نشانات تھے۔'' محرر کی بات سن کر ماحول پر ایک
طاری ہو گیا۔ رحمٰن صاحب نے یوں مایوسی سے میری جانب دیکھا، جیسے اُن کا کچھ دیر پہلے جلا، اُمید کا
ایک جھونکے ہی سے بجھ گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کے پنجوں پر نظر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے
ناخنوں سے تازہ خون ٹپک رہا ہو۔

لہو کا لباس

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ میں حوالات میں بیٹھا چھوٹے سے روشن دان کی تنگ سلاخوں کی
ے اپنے حصے کے چاند کو مستطیل ٹکڑوں میں بٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کاش ان قید خانوں میں ایسے روشن دان
ے جاتے، جہاں سے کم از کم مجھ جیسے سیاہ مقدر قیدی اپنے دوست، چاند تاروں سے تو ملاقات کر لیتے۔ کیا
پورے جسم کے ساتھ ساتھ ہمارے نظر، سوچ اور نظریے کو بھی قید کرنے کا ایک مکمل انتظام ہوتی ہے۔ میں
حوالات میں آتے ہی اپنے ہم ذرد سنتری سے ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ سنتری اسماعیل ہنس کر بولا "وہ
مجنوں..... اُسے تو شام ہی کو ایس۔ پی صاحب نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔" آج شام جب
۔پی صاحب تھانے آئے تو وہ بڑے ادب سے اُن سے بولا، "جناب میرا کام یہاں ختم ہو گیا۔ آپ
ت دیں تو میں کوچ کر جاؤں۔" صاحب بہت ہنسے اور انہوں نے اُسے آزاد کر دیا۔ میں مایوس ہو گیا۔
نے اسماعیل سے درخواست کی "اسماعیل..... تم میرا ایک کام کرو گے؟" اسماعیل جلدی سے بولا "ہاں
..... ضرور..... کیوں نہیں۔" "کیا تم کل صبح کہیں سے اُس ملنگ کو یہاں بلوا سکتے ہو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا
ا۔ وہ مجھ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا تھا، لیکن تب میں اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ کیا تم اُسے مجھ
لوا سکتے ہو؟" "حافظ جی یہ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ وہ تو سدا کا دیوانہ ہے۔ اُس کی باتوں میں نہ آنا۔" میں
سنتری کی منت کی کہ دیوانہ تو شاید میں بھی ہوں، تو کیا وہ ایک دیوانے کی ملاقات، دوسرے دیوانے سے
ا کروائے گا۔ جانے اس وقت میرا دل اتنا بوجھل کیوں ہو رہا تھا کہ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اسماعیل
دم گھبرا سا گیا "ارے ارے..... یہ کیا..... نہ عبداللہ..... نہ..... ایسے نہیں روتے..... تم تو بہت بہادر
کے ہو۔ یوں دل چھوٹا نہیں کرتے۔ میں کل صبح اُسے ضرور کہیں سے بھی تمہارے لیے ڈھونڈ کر پکڑ لاؤں گا۔
اب آنکھیں پونچھ لو۔" وہ مجھے کسی بزرگ کی طرح دیر تک سمجھاتا رہا۔ پتا نہیں، کبھی کبھی ہم جی کھول کر رونا
چاہتے ہیں، تو وہ ہی ہم سے اتنی زیادہ دور کیوں ہوتا ہے، جس کو بھگونے کے لیے ہمارے یہ آنسو بہہ رہے
ہوتے ہیں۔ اس رات مجھے زہرا کی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ میں نے دل میں عہد کر لیا کہ کل صبح سلطان بابا سے
کر زہرہ کو پیغام ضرور بھیجوں گا کہ وہ کسی بھی طرح یہاں آ کر مجھ سے ایک بار مل جائے۔ میں ایک بار اپنے
ل ہوش وحواس میں اُس سے ملنا چاہتا تھا۔ نہ جانے پھر کبھی مکمل فرزانگی نصیب ہو گی یا نہیں۔ ڈاکٹر کی
لسے آج مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میرے پاس کچھ زیادہ وقت نہیں ہے۔ میرے ذہن میں بار بار اُس

مجذوب کی یہ پیشین گوئی گونج رہی تھی کہ ''نہ تو تجھے دنیا کا عشق نصیب ہوگا اور نہ تو مالک کی محبت کا حق
ٹھہرے گا۔'' پتا نہیں کیوں، لیکن وہ مجذوب میرے اندر سے جیسے زندگی کی آخری رمق، اُمید کا آخری قطرہ
نچوڑ کر لے گیا تھا۔ کیا میرا یہ سفر یونہی لاحاصل ہی چلا جائے گا؟ کیا واقعی میرے حصے میں نہ تو عشق مجازی
چنگاری آئے گی اور نہ ہی عشق حقیقی کی مکمل بھڑکتی آگ..... کیا میں یونہی خوامخواہ اِدھر اُدھر سر پٹک رہا تھا؟
سوچوں میں نہ جانے کب صبح ہوگئی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ایک بار پھر میرا پورا جسم جلنے لگا۔ بڑی مشکل سے
میں نے خود کو اپنا سر سلاخوں سے ٹکرانے سے روکے رکھا، ورنہ میرے سر میں شدید درد کے جو دھماکے ہو
تھے، اُن کا فوری حل مجھے بس یہی نظر آ رہا تھا کہ اپنا سر اس زور سے دیوار یا سلاخوں پر دے ماروں کہ وہ ٹکڑے
ٹکڑے ہو جائے اور اس میں جو بھی مادہ، اس درد کا باعث ہے، وہ بہہ جائے۔ جانے کتنی دیر میں اپنے بال
پاؤں یونہی جکڑے بیٹھا رہا، حتیٰ کہ میری ہاتھ پیر کی اُنگلیاں مُڑ کر تقریباً چیخ ہی گئیں۔ اِسی اثناء میں اسماعیل
چائے لیے حوالات کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور جلدی سے میری جانب دوڑا
عبداللہ..... یہ کیا ہو رہا ہے تمہیں.....'' میں نے بمشکل اپنے لب کھولے۔ ''کچھ نہیں..... تم بس جا کر
ڈھونڈ لاؤ۔ اس سے پہلے کہ میرا ہوش جواب دے جائے۔ تم اُسے لے آؤ.....'' اسماعیل اُلٹے پاؤں
بھاگا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج اس جنوں کو خود پر تب تک حاوی نہیں ہونے دوں گا، جب تک مجھے
کچھ سوالوں کے جواب نہیں مل جاتے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں خود اپنے ہی ماس میں اپنے دانت گاڑ دوں
جبڑے کی اینٹھن نے مجھے اس قدر مجبور کیا کہ میں نے زمین پر ریت میں پڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اُٹھا
اسے اپنے دانتوں کے درمیان اس زور سے جکڑ لیا کہ چند لمحوں بعد ہی وہ کڑک سے ٹوٹ کر گر گیا۔ کچھ ہی
میں اسماعیل دوڑتا ہوا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ وہ بازار میں چاروں طرف بھاگ بھاگ کر تھک گیا، لیکن
ملنگ دوبارہ اُسے کہیں نظر نہیں آیا، حالانکہ وہ عام طور پر اُسی بازار میں کسی نہ کسی دکان یا ہوٹل کے باہر تھڑے
چبوترے پر پڑا نظر آتا تھا۔ آج تو لوگوں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ میری حالت تب تک قدرے سنبھل
تھی۔ لیکن میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا اور میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شاید مجھے پھر سے بخار ہو رہا
اسماعیل جلدی سے تھانے دار کے کمرے سے ایک موٹی سی کھیس نما چادر اُٹھا لایا، جسے میں نے اچھی طرح
جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ اسماعیل دُکھ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا ''یہ روگ کہاں سے لگا لیا اپنے
کو بابو..... ابھی تو تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔'' پھر اچانک ہی جیسے اُسے کوئی ضروری بات یا
''ارے ہاں، رات کو یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک بات یاد آئی، سوچا تھا صبح آ کر تمہیں بتاؤں گا
یہاں پہنچتے ہی تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔ وہ دیوانہ جب حوالات میں تمہاری طبیعت خراب ہونے کے
رہ گیا تھا، تب بار بار تمہیں خیالوں میں مخاطب کر کے بس ایک ہی بات کہے جا رہا تھا کہ ''اُس سے کہو مشرق
دیکھے..... مشرق کو دیکھے۔'' جانے مشرق میں کیا ہے؟ میں نے چونک کر اسماعیل کو دیکھا۔ حوالات کی

دروازہ مغرب کی جانب کھلتے تھے۔ میں جہاں قید تھا، وہاں مشرق کی جانب صرف ایک سپاٹ دیوار تھی اور
میں چھوٹا سا روشن دان تھا اور بس..... پھر بھی میں بہت دیر تک آنکھیں پھاڑے دیوار کی جانب اس اُمید
دیکھتا رہا کہ شاید مجھے وہاں کچھ نظر آ جائے، لیکن سب بے سود ہی رہا۔

کچھ ہی دیر میں سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے۔ سلطان بابا دو دن ہی میں
ں کے بیمار اور نڈھال سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ابھی کال گڑھ والے حادثے سے ٹھیک طرح سنبھل نہیں
ے تھے کہ یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ کاش ہم شیخ صاحب کے ہاں کچھ روز اور ٹھہر جاتے تو اُن کی حالت بہتر ہو
لیکن یہ سب اگر ہمارے ہی بس میں ہوتا تو پھر یہ ''کاش'' لفظ ہماری لغت میں کہاں سے آتا؟ مرتضیٰ
ب مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن سلطان بابا چُپ چاپ بس میری جانب دیکھتے رہے۔
زکار مجھے ہی ان سے پوچھنا پڑا ''آپ کچھ کہتے کیوں نہیں..... اس طرح چپ رہیں گے تو میں اور بھی
یشان ہو جاؤں گا۔ کچھ بات کیجیے۔'' ''کیا کہوں میاں..... سوچتا ہوں تمہارا یہ امتحان کب ختم ہوگا۔ اتنی کڑی
زمائش تو شاید ہی کسی نے جھیلی ہو۔ لگتا ہے اس بار خود مجھ سے بھی کوئی سرا چھوٹ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں
تا۔'' میں نے مختصر لفظوں میں انہیں ملنگ کی ساری بات بتا دی۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر
ہری سانس لے کر بولے ''وہ اب شاید کسی کو دوبارہ نظر نہ آئے۔ اگر اُس کا مقصد اشارہ دینا تھا تو وہ دے کر
لا گیا۔ اس کا کام واقعی ختم ہوا۔'' میں چاہ کر بھی اُن سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ اگر اُس کی تنبیہہ سچ ثابت ہوئی تو
ہر انجام کیا ہوگا۔ میں نے دبے لفظوں میں انہیں زہرا کو پیغام بھیجنے کا کہا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئے۔ اتنے میں
ہر ہلچل سی مچی۔ پتا چلا کہ ایس پی صاحب شہر سے روانہ ہو چکے ہیں اور اب چند لمحوں میں ان کی آمد متوقع
ہے۔ اس چھوٹے سے تھانے کے لیے بھی یہ ایک اَن ہونی تھی۔ عام حالات میں ایس پی جیسا بڑا افسر شاید
سال میں ایک آدھ بار ہی کسی معائنے کے لیے یہاں آیا ہوگا، لیکن ریحان صاحب کے حکومت میں اثر و رسوخ
کی وجہ سے اس تھانے کے در و دیوار گزشتہ تین دنوں سے یہ ساری گہما گہمی دیکھ رہے تھے۔ اہل کاروں کی
مہینوں پرانی وردیوں کو روز کلف لگا کر چمکایا جا رہا تھا۔ تھانے کے در و دیوار اور احاطے کی صبح و شام دو بار صفائی
ہو رہی تھی اور کچھ زیادہ صحت مند سنتری اپنی توند کو چھپانے کے لیے بیلٹ کو اس کے آخری حلقے سے آگے کچھ
نئے سوراخ کر کے اور بیلٹ کا فیتہ سانس گھٹنے کی حد تک کس کر تھانے آنے لگے تھے۔ بکل قلعی سے جگمگا رہے
تھے اور جوتے پالش سے چمکنے لگے تھے۔ ہفتوں کی بڑھی حجامت روزانہ بننے لگی تھی اور سارے رنگروٹ صبح
سویرے اپنی گردن پر موٹی مشین پھروا کر اور سارے بال اُڑا کر آنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایس۔ پی
صاحب تیزی سے تھانے میں داخل ہوئے۔ تھانے دار نے سلطان بابا اور مرتضیٰ صاحب کو پہلے ہی برآمدے
میں بٹھا دیا تھا۔ آج ایس پی کا رُخ خلاف معمول سیدھا حوالات کی جانب تھا۔ وہ سلاخوں کے قریب آ کر
ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولے ''آئی جی نصیر صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا

''کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن بہت مہربان ہیں وہ میرے۔'' رحمٰن صاحب پشیمانی سے بولے ''عجیب لڑکے ہو بھی۔ تم نے اتنے دن سے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم..... میرا مطلب ہے تم کم از کم کوئی اشارہ ہی دے دیتے۔'' میرے منہ سے اچانک بے اختیار ایک تلخ بات نکل گئی ''کیا ایسا کوئی اشارہ دینے سے میرے جرم کی نوعیت بدل جاتی.....؟'' وہ چونکے ''نہیں..... لیکن شاید میں اتنا شرمندہ نہ ہوتا جتنا آج صبح اُن کے فون کے بعد ہوا۔ لیکن میں نے تو اُن سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہ بات تو آپ خود بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔'' ''ہاں، جانتا ہوں، لیکن شاید تمہارے بزرگ نے اُن سے رابطہ کیا ہے۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آئے۔'' تھانے دار نے جلدی سے ایس پی صاحب کو بتایا کہ اس نے ایس پی کے معائنے کی وجہ سے میرے دونوں ملاقاتیوں کو پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا ہے۔ رحمٰن صاحب نے جلدی سے انہیں اندر لانے کو کہا۔ تھانے دار خود بھاگا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم چاروں تھانیدار کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رحمٰن صاحب بہت اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ''یقین جانیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا کیس ہے اور پہلا موقع ہے کہ میں ایک ہی دن میں کئی کئی بار حیرت کے اتنے شدید جھٹکوں سے دوچار ہوا ہوں۔ آپ لوگ پہلے ہی نصیر صاحب سے اپنا ناتا بتا دیتے۔ وہ میرے نہایت قابلِ احترام اُستاد ہیں۔ میں نے اکیڈمی میں اُنہی کی سرپرستی میں ٹریننگ لی تھی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اُنہی کی وجہ سے ہوں۔ اور آج صبح سویرے جب اُن کی کال آئی تو یقین جانیے، میں دل ہی دل میں بہت نادم ہوا۔ اس تمام عرصے میں میرے کسی بھی برتاؤ سے آپ کو جو بھی کوفت ہوئی ہو، میں اس سب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ سلطان بابا بولے ''آپ نے کچھ بھی ایسا برتاؤ نہیں کیا جو آپ کے فرض کے دائرے سے باہر ہو اور پھر سچ تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ میاں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو شاید نصیر صاحب تک میری عرض داشت کبھی نہ جاتی۔ اس جیسے نہ جانے اور کتنے الزام کتنے کلنک لگنا ابھی باقی ہیں۔ کہاں ہر بار نصیر صاحب کو زحمت دیتے پھریں گے ہم، لیکن اس بار معاملہ کچھ اور تھا لہٰذا انہیں درمیان میں لانا ہی پڑا۔ اُمید ہے آپ اس سفارش کا بُرا نہیں مانیں گے۔'' رحمٰن صاحب گڑبڑا کر بولے ''نہیں..... ہرگز نہیں..... یقین جانیے یہ سب میرے لیے بہت عجیب ہے۔ اتنا اختیار رکھنے کے باوجود اگر کوئی اتنی تکلیف جھیلے تو اُسے سچائی کی دوسری سند کی ضرورت ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی ذاتی مچلکہ بھر کر عبداللہ کو ضمانت پر لے جا سکتا ہے۔ ہاں، بس اتنا خیال رکھنا ہوگا کہ جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی اسے علاقے ہی میں موجود رہنا ہوگا۔ میں ذاتی مچلکے کے تکلف میں بھی نہ پڑتا کہ نصیر صاحب کی ضمانت میرے لیے دنیا کی کسی بھی ضمانت سے بڑھ کر ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، سرکاری قواعد و ضوابط بھی میرے پاؤں کی بہت سی زنجیروں میں سے ایک ہیں۔''

مرتضیٰ صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے بستی کے پیش امام کی حیثیت سے ایک مچلکہ بھر دیا اور اس پر اپنے دستخط اور انگوٹھے کی مہر ثبت کر دی۔ جاتے جاتے رحمٰن صاحب نے ایک اور خبر سنائی کہ لڑکی کے چہرے اور جسم

خراشوں اور ناخن کے کھرونچوں کے جو نشانات تھے، وہ میرے خون اور گزشتہ شام لیے گئے میرے ناخنوں کے مواد سے مماثلت نہیں رکھتے۔ گویا فی الحال میں ایک فوری نوعیت کے شک سے پھر باہر نکل چکا تھا۔ انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اشرف نے جو کچا پکا حلیہ اُس دوسری عورت کا بتایا تھا، اُس کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، لیکن چونکہ ایک بچے کی یادداشت اور منظر نگاری بہرحال اتنی پختہ نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا ابھی کچھ مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن رحمٰن صاحب پُر اُمید تھے کہ پولیس جلد درست خطوط پر کیس کی تفتیش شروع کر دے گی۔ وہ ہمیں رُخصت کرنے خود تھانے کے صحن تک آئے اور سلطان بابا کے لاکھ انکار کے باوجود اپنے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں بستی چھوڑ آئے۔ شاید اس ہدایت کے پیچھے کہیں نہ کہیں اُن کی یہ خواہش بھی کارفرما تھی کہ بستی سے مجھے ہتھکڑیاں لگا کر گرفتار کر کے لاتے وقت بستی والوں کی نظر میں میرے مجموعی تاثر میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا، اس کی کچھ تلافی تو ممکن ہو۔ ہم انسان ہوتے ہی اتنے ظاہر پرست ہیں کہ ہماری عزت اور ذلت کے پیمانے اسی قدر سطحی اور ناپائیدار بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے رحمٰن صاحب کا یہ کلیہ سولہ آنے درست ثابت ہوا اور ہمیں ایس۔ پی کی گاڑی سے اُترتے دیکھ کر بستی والوں کے دل میں اگر کوئی رہا سہا شک باقی بھی تھا، تو جاتا رہا۔ ویسے بھی یہ سیدھے سادے مچھیروں کی بستی تھی اور یہاں کے لوگ رشتوں کے معاملے میں زیادہ بھاؤ تاؤ کے قائل نہیں تھے۔

اشرف کو اسکول سے آتے ہی جب یہ پتا چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ دوڑتا ہوا مسجد آ پہنچا۔ میں مسجد سے ذرا فاصلے پر کھجور کے تین چار جڑے ہوئے درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھا ہوا تھا۔ اشرف مجھے کچھ بتانے کے لیے بے چین تھا، لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ہی ظہر کی نماز ختم ہوئی تھی اور دو چار نمازی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ دیر رُک گئے تھے، لہٰذا اُن کے جانے تک اشرف ریت میں گھروندے بنانے کا کھیل کھیلتا رہا اور پھر جیسے ہی آخری نمازی مجھ سے رُخصت ہوا وہ جلدی سے لپک کر میرے قریب آ گیا۔ ''پتا ہے..... کل وہ پتنگ والے صاحب آئے تھے شام کو وہاں۔ میرے لیے بہت سی پتنگیں بھی لائے تھے۔ پر میں نے چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ رو رہے تھے اُس جگہ بیٹھ کر۔'' میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اُس بدنصیب کو تو اب تمام عمر رونا تھا۔ ''اور پتا ہے۔۔۔۔ وہ زور زور سے کسی کو کہہ رہے تھے کہ تم نے اچھا نہیں کیا..... یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... پر طالب می..... وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔'' میں زور سے چونکا۔ اشرف مجھے طالب اور سلطان بابا کو بڑے مولوی جی کہتا تھا۔ لیکن آخر یہ ریحان کس سے خود کلامی کر رہا تھا۔ کس نے، کیا اچھا نہیں کیا۔ میں نے اشرف کو زیادہ کریدا تو مجھے اتنا سمجھ میں آیا کہ ریحان عموماً جب کبھی وہاں تنہا آتا تھا تو خود کلامی ضرور کرتا تھا۔ دنیا کے زیادہ تر بڑے اور کامیاب انسان اندرونی طور پر شدید تنہائی کا شکار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے آس پاس عملہ تو سینکڑوں اور ہزاروں میں ہوتا ہے لیکن ایک دوست کی کمی انہیں سدا پریشان کرتی رہتی ہے، اُن میں سے بہت سے اس خود کلامی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید ریحان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ شام تک دو چار مرتبہ میری

طبیعت بگڑی اور پھر سنبھل بھی گئی، لیکن اس دھوپ چھاؤں کے کھیل نے مجھے نڈھال کر ڈالا، لہٰذا مغرب کے بعد میں کچھ دیر کے لیے مسجد کے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران سلطان بابا لگاتار مجھے سادہ پانی پر کچھ دم کر کے پلاتے رہے اور میرے اندر کی جلن کو اس پانی سے قدرے سکون بھی ملتا رہا۔ درمیان میں حکیم صاحب بھی آئے تھے اور انہوں نے بڑی عجیب سی بات بتائی کہ کچھ گھاؤ اور کچھ زخم بظاہر بھر جانے کے باوجود اس خاص مدت میں ایک بار پھر ٹیس پکڑ لیتے ہیں، جب وہ تاریخیں اور وہی خاص وقت پلٹتا ہے، جس میں ماضی میں ہم نے وہ زخم یا چوٹ کھائی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ زخم سہ ماہی، ششماہی اور کچھ تو سال بھر کے بعد بھی دوبارہ ہرے نہ بھی ہوں، تب بھی اپنی پوری کسک اور بے چینی کے ساتھ پلٹتے ہیں۔ اُن کے اس کلیے کی رُو سے مجھے پچھلے ماہ انہی تاریخوں میں یہ زہریلے گھاؤ لگے تھے اور کتوں کا زہر میرے جسم میں پھیلا تھا۔ بروقت ملی دوا اور ویکسین کے ٹیکوں نے وقتی طور پر میری جان تو بچالی لیکن ان درندوں کے خون خوار جبڑوں کا زہر میرے خون کے خلیوں ہی میں دوا اور ویکسین سے بچنے کے لیے اپنے ہی بنائے کسی حفاظتی خول میں جا کر چھپ گیا تھا اور اب ٹھیک اُسی وقت اور تاریخ کو تیس دن کا عرصہ گزرتے ہی وہ پھر سے میرے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوا تھا۔ گویا اس زہر نے اپنے دائرے کو مکمل کرنے میں مہینے بھر کا عرصہ لیا تھا اور یہ حملے اب ہر ماہ انہی تاریخوں میں اور اِسی خاص وقت پر میرے اعصابی نظام کو تباہ کرنے کے لیے ہوتے رہیں گے۔ بظاہر ایلوپیتھی اور جدید طب میں اس کی وجہ اور مثال ڈاکٹروں کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی، پر بقول حکیم صاحب ان کی سات نسلیں حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہی ہیں اور وہ اپنی پرانی حکمت کی کتابوں میں موجود مستند تفصیل پڑھنے کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ انہی سوچوں میں گم نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی ہماری نیند اس قدر بے چین اور کچی ہوتی ہے کہ ہم سوتے وقت بھی خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو بند آنکھوں کے پردے تلے بھی ہمیں اپنے آس پاس ہوتی حرکات کا ادراک ہوتا رہتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ جانے وہ خواب تھا یا سراب..... لیکن میں نے اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں تلے ایک عورت کی شبیہہ بنتی محسوس کی۔ میں بے چینی سے کسمسایا، لیکن اُس عورت کی تصویر بنتی چلی گئی۔ عجیب سی سفاکی تھی اُس کے چہرے پر۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اُسے کہیں دیکھا ہے..... کہاں.....؟ وہ بیک وقت میرے لیے بے حد اجنبی اور بہت شناسا چہرہ تھا۔ اور وہ عجیب سی سفاکی لیے میری جانب گھور رہی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور خوف کے مارے جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کچھ دیر تک تو مجھ سے حرکت بھی نہ ہو سکی۔ وہی عجیب سی کپکپی میرے سارے وجود پر طاری تھی۔ میں نے سنا تھا، ہم جس بات کا بوجھ اپنے ذہن پر لیے بستر پر جاتے ہیں، وہی واقعہ ٹھیک اُسی طرح ہمارے خواب میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایس پی صاحب کی زبانی جب سے ایک دوسری عورت کا اس قصے میں ذکر سُنا تھا، تب سے شاید وہی عورت میرے حواس پر بھی سوار تھی۔ تبھی میں سوتے میں بھی اُس کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک

مجھے دور سے کسی چھوٹی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہوا کا رُخ بدلا اور آواز غائب ہوگئی۔ میں لپک کر حجرے سے باہر نکلا۔ دُور اُسی پہاڑی ٹیلے پر کسی گاڑی کی روشنیاں مجھے نظر آئیں۔ میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں اس جانب دوڑا۔ دُور سے میں نے کسی عورت کی پشت دیکھی۔ اس کی لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی اور وہ سمندر کی جانب منہ کیے کھڑی تھی۔ گاڑی کی پارکنگ والی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میرے بھاگتے قدموں کی آواز پر وہ گھبرا کر پلٹی اور چند لمحوں کے لیے ملگجے سرخ اُجالے میں اُس کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہوگیا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے کچھ دیر پہلے میں نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا تھا۔

آدھا چہرہ

کچھ لمحے وہ مجھے اور میں اُسے یونہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ ٹیلے پر بہت اندھیرا تھا اور پر منظر میں ساحل پر پھیلی چاند کی قدرتی روشنی اس چوٹی کو مزید تاریک بنا رہی تھی۔ اگر اس چھوٹی مارک ٹو کار کی پارکنگ والی بتیاں روشن نہ ہوتیں تو میں اتنی دُور سے شاید اُس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔ گاڑی کے اردگرد روشنی کا ایک سرخ ہالہ سا بنا ہوا تھا اور اسی ہالے میں مجھے اُس کے چہرے کی دھیمی سی لیکن بے حد سفاک جھلک نظر آئی تھی۔ نہ جانے اُس چہرے میں ایسا کیا تھا کہ میرے ریڑھ کی ہڈی پر گردن کی پشت سے ہوتی ہوئی سرد پسینے کی ایک لہر سی دوڑ گئی، میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اُس جانب آتے ہوئے دوڑتے وقت اپنے قدموں کی چاپ پر قابو نہ رکھ پایا تھا اور اسی آواز اُسے ہوشیار کر دیا تھا۔ وہ پل بھر میں ایک جھٹکے سے مڑی اور بجلی کی طرح گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ میں زور سے چیخا ''میری بات سنیے..... رک جائیے۔'' لیکن وہ بھلا کہاں رُکنے والی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی گاڑی نے لمبا سا موڑ کاٹا اور فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی اور جب تک میں گاڑی کے مقام تک پہنچا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو چکی تھی۔ بہت دیر تک تو میں اپنی پھولی سانسوں پر قابو ہی نہیں پا سکا۔ گاڑی جا چکی تھی اور اب صرف اس کے پہیوں کے نشانات ہی وہاں باقی رہ گئے تھے۔ یہ ٹھیک وہی جگہ تھی، جہاں سے پولیس کی تفتیش کے مطابق لیلیٰ نیچے گری تھی یا اُسے دھکا دیا گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹانوں کے نیچے جھانکا تاکہ میں وہ قاتل گہرائی دیکھ سکوں، جس نے ایک معصوم جان لی تھی اچانک مجھے زوردار چکر آیا اور مجھے لگا کہ میں خود بھی چند لمحوں میں اسی گہرائی کا شکار ہو جاؤں گا لیکن بھلا ہو قریب نکلی چٹان کے ایک پتھر کا جو لہراتے وقت میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اُسی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مجھے کبھی بھی اُونچائی کے خوف (HeightPhobia) کا عارضہ لاحق نہیں رہا۔ لیکن آج میں نہ جانے اُونچائی کیوں جھیل نہیں پا رہا تھا۔ میں اکثر خواب میں خود کو کسی اُونچی جگہ پر معلق یا پھر اُونچائی سے خود کو نیچے گرتے ہوئے محسوس کرتا تھا اور ہر بار میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج یوں لگا جیسے وہ خواب سچ ہونے کو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اسپتال والے سینئر ڈاکٹر نے ریبیز کی ایک علامت ''اُونچائی کا خوف'' بھی بتائی تھی۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو مشرق کی سمت میں کوئی چیز ریت میں پڑی چمکتی نظر آئی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو سرخ ریگ کی ایک پتلی نوک دار ہیل تھی۔ اوہ گویا وہ پُراسرار عورت اپنی جوتی کی ایڑی تڑوا کر جلدی میں یہیں چھوڑ گئی تھی۔ اگلے روز ٹھیک اسی جگہ میں رحمٰن صاحب اور اُن کی ٹیم کے ہم راہ کھڑا تھا اور وہ سرخ جوتی کی ایڑی اب

رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں تھی، جسے وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ ''حیرت ہے..... اگر یہ وہی عورت تھی، جس کی تلاش میں ہم دربدر بھٹک رہے ہیں تو پھر اس کی ہمت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہوگی اور میں یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ میں بھی روایتی پولیس والوں کی طرح تفتیش میں اُلجھ کر اور ہر طرف جال بچھا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ جب کہ سب سے اہم لیکن غیر متوقع جگہ پر ناکہ لگوانا بھول گیا۔ میرے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ اگر کوئی اور عورت بھی اس کیس کا مرکزی کردار ہے تو وہ واپس یہاں بھی آسکتی ہے۔ ضرور اس جگہ میں کوئی خاص بات ہے، جو بظاہر ہمیں محسوس نہیں ہوئی، لیکن اس کی کیس کے باقی کرداروں کے لیے کوئی نہ کوئی شدید جذباتی اہمیت ہے۔ اب شاید وہ دوبارہ یہاں نہ آئے، کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں میں آگئی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں خود اس کے پیچھے جانا ہوگا۔'' رحمٰن صاحب نے گاڑی کا حلیہ اور عورت کی شبیہہ کی تفصیلات مجھ سے کئی بار پوچھیں۔ نمبر میں نوٹ نہیں کر پایا تھا، کیوں کہ میرا فاصلہ گاڑی سے بہت زیادہ تھا۔ البتہ گہرے نیلے یا سیاہ رنگ کی ایسی مارک ٹو گاڑیاں تو شہر میں نہ جانے کتنی ہوں گی۔ بہرحال، رحمٰن صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ کیس میں بڑی پیش رفت تھی اور شام ڈھلنے تک اس مقام والوں پر مختلف پولیس والوں کا آنا جانا برقرار رہا۔

اس وقت بھی سورج ڈھلنے کے قریب میں دُور ریت پر بیٹھا تھانے دار کو اپنے محرر کو کچھ تفصیلات لکھواتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ وقوعے کا نقشہ پھر سے بنا رہے تھے۔ تھانے دار کی آواز مجھ تک آرہی تھی۔ محرر نے کچھ غلط لکھ ڈالا۔ تھانے دار چلایا ''میں نے کہا تھا مشرق کی سمت سے نشانی ملی..... مشرق کی سمت سے..... سمجھ نہیں آتا کیا.....؟'' اور ٹھیک اُسی لمحے میرے کان میں اسماعیل سنتری کی آواز گونجی۔ ہاں اس نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ وہ مجذوب میرے لیے یہی پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں مشرق کی سمت دیکھوں، اور مجھے پہلی نشانی مشرق ہی میں ملی تھی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ رات جب میں اُس عورت کو دیکھنے کے بعد واپس حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا میری تلاش میں نکلنے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں اپنے خواب اور پھر اُس عورت کے بارے میں بتایا کہ جس ہیولے کو چند لمحے پہلے میں نے بند آنکھوں کے پردے تلے دیکھا، وہی کچھ دیر بعد میرے سامنے حقیقت بن کر کھڑا تھا۔ سلطان بابا میری بات ختم ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میری جانب دیکھتے رہے۔ ''جانتے ہو..... یہ تمہارا پہلا الہام تھا۔ آج تک تمہیں جو کچھ نظر آتا رہا، وہ ماضی میں ہو چکا تھا اور وہ کیا کہتی ہے سائنس کی ڈائی پولر تھیوری آف گریوٹی،..... اس کے مطابق وہ سب صرف بنی ہوئی اور گزری ہوئی تصویروں کے فریم ہوتے تھے، لیکن اب جو تم نے دیکھا وہ ماضی نہیں مستقبل تھا۔ لگتا ہے تمہاری ریاضت قبول ہو رہی ہے عبداللہ میاں..... جیتے رہو۔'' مجھے دعا دیتے وقت اُن کے آنکھوں میں نمی اور میرے سر پر رکھا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ تھانے دار اور محرر نے اپنا کام ختم کر لیا اور جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کروں تو فوراً بستی کے پوسٹ آفس سے ماہی تحصیل تھانے کے نمبر

پر فون کر کے بتا دوں۔ سورج ڈھلتے ہی سب عملہ وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

اگلی صبح رحمٰن صاحب کا پیغام آ گیا کہ میں تھانے آ کر اُس عورت کا خاکہ بنوا دوں۔ میں بستی سے چلنے
واحد قدیم سی بس میں سوار ہو کر تھانے پہنچا تو زیادہ تر عملہ تھانے دار سمیت کسی چھاپے پر گیا ہوا تھا۔ آسمان
بادلوں کے چند ٹکڑے ان شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے، جو اسکول سے بھاگ کر کھلیانوں
میدانوں میں مٹر گشت کرتے پھرتے ہیں۔ خاکے بنانے والا فنکار اور محرر تھانے میں موجود تھے۔ محرر نے
اپنی ہی کمرے میں بلا لیا۔ کمرہ کیا تھا چھوٹا سا کیبن تھا، جہاں ایک طرف میز پر ایک پرانا سا وائرلیس نظام
ایک قدیم سا مٹیالے رنگ کا ٹیلی فون پڑا ہوا تھا، جس کے ڈائل کے اُوپر ایک چھوٹا سا زنگ آلود تالا لگا
تالے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس میں چابی گھمانے کے مواقع کم ہی آتے ہوں گے۔ محرر نے مجھے فنکار
کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود چائے کا کہنے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اُس رات اُس عورت
چہرے کا صرف دایاں حصہ ہی دیکھا تھا، وہ بھی سرخ ملگجے اندھیرے میں، چہرے کا بایاں حصہ نقاب اور
اندھیرے میں چھپا ہوا تھا، لہٰذا میں احتیاط سے سوچ سوچ کر مصور کو اُس عورت کے خدوخال اپنی یادداشت
کے مطابق بتا رہا تھا، جسے وہ تیزی سے کاغذ پر پنسل کے ذریعے اسکیچ کی صورت میں اُتار رہا تھا۔ اچانک
نے اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی اور پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ کمرے کی مشرقی سمت میں بیٹھا ہوا
اُس کے ہٹتے ہی میں نے دیکھا، اُس کے پیچھے دیوار پر میخوں کی مدد سے جھولتا ہوا ملک کا ایک پرانا سا نقشہ
ہوا تھا۔ میں مصور کو تفصیلات بتاتے بتاتے بے خیالی میں نقشے میں اپنا شہر ڈھونڈنے لگا۔ اپنے شہر سے رحیم
رحمٰن آباد پھر جبل پور، کمال آباد اور پھر کال گڑھ اور اب یہ چھوٹی سی تحصیل ماہی..... میں نقشے پر خیالی اُنگلی
اپنے سفر کی منزلوں کے نقطے جوڑتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ میں نے جلدی میں
تین بار پھر نقشے پر ان نقطوں کو جوڑا، سلطان بابا نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ وقت ملے تو میں نقشہ دیکھ لوں
مصور اپنے کام میں جتا ہوا تھا اُسے مجھ سے جتنی تفصیل مل سکتی تھی، میں اُسے بتا چکا تھا، میں نے زمین پر پڑے
اُس کے کینوس کے تھیلے میں سے جھانکتی بہت سی رنگ برنگی پینسلوں میں سے ایک پینسل نکالی اور اس کی
سے اب تک کے اپنے سفر کے نقطوں کو جوڑا اور میری آنکھیں پھیلتی گئیں۔ ان نقطوں کو جوڑنے سے جو شکل
اس مٹیالے نقشے پر میری رنگین پینسل نے بنائی تھی وہ پہلے الف اور پھر لہ تک آ کر رُک گئی تھی یعنی اگر مکمل
جوڑا جاتا تو اللہ کا الہ بنتا تھا یعنی حرف ہ کی کمی تھی، جسے جوڑنے سے پورا "اللہ" کا نام بن جاتا۔ میرے دل
دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ سلطان بابا نے کہا تھا کہ انہیں ہمارے سفر کے راستوں اور منزلوں کے بارے
میں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ کیا قدرت میرے راستوں اور پڑاؤ کے مقامات کے ذریعے اپنا پورا نام لکھنا
چاہتی ہے۔ تو کیا اب تک کا میرا یہ سارا سفر پہلے ہی سے طے شدہ تھا؟ کیا یہ سفر اُسی وقت طے ہو چکا تھا، جب
عبداللہ نام کا یہ اعزاز ساحر کے نام کی جگہ میرے حصے میں لکھ دیا گیا تھا۔ مصور جانے کب سے خاکہ مکمل کر

اس انتظار میں تھا کہ میں دیوار کے نقشے سے ہٹ کر اُس کی تصویر کو دیکھ اپنا حتمی فیصلہ سناؤں، لیکن اس
ہرے حواس میرے قابو ہی میں کب تھے۔ محرر کب کا چائے رکھ کر جا چکا تھا، جواب پانی ہو چکی تھی۔ میں
کے پر نظر ڈالی۔ مصور اصل چہرے سے بہت قریب تھا۔ میں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ ایسا ہی
اکہ میرے لیے بھی بنا دے۔ مصور نے بنا کسی پس وپیش کے ہو بہو ویسا ہی دوسرا خاکہ بنا کر میرے
کر دیا اور ایک بار پھر اس آدھے چہرے کے خاکے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میری اُس عورت
لے بھی کہیں نہ کہیں ملاقات ہو چکی ہے۔ کاش میں اُسے بروقت پہچان پاتا۔

میرے بستی پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت بس نکلنے کو تھا۔ نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے باہر آیا تو دُور آسمان پر
نے دھانی رنگ کی ایک پتنگ اُڑتے ہوئے دیکھی۔ نیچے ساحل پر اشرف اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی
ثار پتنگ کو ڈھیل دیئے جا رہا تھا اور اُس کی دھانی پتنگ، دُور آسمان میں اتنی بلند ہو چکی تھی، جہاں سے
کے اُوپر کا ہلکا نیلا آسمان بھی دھانی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میں نے چونک کر دُور ٹیلے کی جانب دیکھا
حان کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔ مجھے تھانے دار نے بتایا تھا کہ ٹھیک اِسی رنگ اور ماڈل کی دوسری گاڑی
ن نے لیلیٰ کو بھی کمپنی کی طرف سے دے رکھی تھی۔ ریحان حسب معمول سمندر کی طرف چہرہ کیے گم صم سا
ا تھا۔ آج اُس کے ساتھ اُس کا پرانا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اُس ڈرائیور کو میں پہلے بھی ریحان کے ساتھ
نے والی ملاقات کے روز دیکھ چکا تھا، جو پینسٹھ سے ستر برس کے پیٹے کا ایک سنجیدہ اور کم گو شخص تھا۔ دل
بات یہ تھی کہ میں اپنی زندگی میں اب تک جتنے بھی ڈرائیوروں سے ملا تھا وہ گفتگو کے معاملے میں دو
اں پر تھے۔ یا تو بے انتہا باتونی یا پھر انتہائی خاموش..... ریحان میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹا
.....تم ہو..... مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تمہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ چلو اچھا ہوا..... پولیس
لط فہمی دُور ہو گئی.....'' میں نے غور سے ریحان کی طرف دیکھا ''مجھے پولیس کی کبھی اتنی پرواہ رہی بھی نہیں،
کیا آپ کا دل بھی میری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔'' ریحان اُسی طرح خلا میں گھورتا رہا۔ ''جو خود اپنی
نی سے بدگمان ہو، اُسے بھلا اوروں سے بدگمانی کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں
'' ریحان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اُسے اپنی تنہائی میں مداخلت
ناپسند نہیں آئی تھی۔ اتنے میں اُس کا ڈرائیور گاڑی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا اور ریحان سے بولا
سٹے صاحب..... سورج ڈھلنے والا ہے، ہماری واپسی کا وقت ہو گیا ہے۔'' ریحان کی آواز درشت تھی۔
دیر میں چلتے ہیں.....'' لیکن میری حیرت بڑھ گئی، جب ڈرائیور نے دوبارہ اصرار کیا۔ ''نہیں چھوٹے
ب..... سورج ڈھل جائے گا..... ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے.....'' ریحان نے کڑی نظروں سے
ندر کو دیکھا لیکن بادل نخواستہ اُس نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ایک ڈرائیور کی ہدایت پر
ن کا یوں بنا چوں چرا اس کیے چل دینا مجھے عجیب سا لگا اور پھر سورج ڈھل جانے میں ایسی کیا بات تھی۔ ایسی

ہدایات تو عام طور پر چھوٹے بچوں کے لیے ہوتی ہیں کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آنا، جب کہ ر
بارے میں مجھے جتنا کچھ پتا چلا تھا اس اعتبار سے تو وہ اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے ا
چکے تھے اور وہ اکلوتا تھا، لہٰذا اُس کا گھر میں انتظار کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک لیلیٰ تھی، جو اُس کی
میں بہار بن کر آنے سے پہلے ہی پت جھڑ کی نذر ہو چکی تھی۔ پھر گھر واپس لوٹنے کی یہ جلدی کیوں؟
اپنے آپ ہی سے سوال کر کے خود ہی ان کے جواب تلاش کرتا رہا۔ سورج ڈھلنے کا تعلق اندھیرے سے
تو کیا ریحان تاریکی سے خوف کے کسی اسرار میں مبتلا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں ریحان کے پیچھے جا کر دیکھ
وہ اس وقت اپنے گھر ہی گیا ہے یا اُس کی کوئی اور مصروفیت ہے؟ عشاء کے بعد مرتضیٰ صاحب میر
سلطان بابا کے لیے گھر کا بنا ہوا کچھ میٹھا لے کر آئے تو اشرف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ میں نے اشرف کو ا
اور ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے اور میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران اُس سے پوچھا کہ کیا
پتنگ والے صاحب کبھی شام ڈھلنے کے بعد بھی ساحل کی طرف آئے ہیں۔ اشرف نے کچھ دیر سوچا ا
میں سر ہلایا۔ ''نہیں ناں..... وہ تو میم صاحبہ کو بھی کبھی دیر تک وہاں نہیں رہنے دیتے تھے، حالانکہ میرے
کئی مرتبہ میم صاحب نے اُن کو بولا بھی تھا کہ ہم رات کو پتنگ اُڑائیں گے اور اپنی پتنگ ستاروں تک
جائیں گے، لیکن صاحب کبھی رات تک رُکتے ہی نہیں تھے۔'' میں نے مصور کا بنا ہوا خاکہ اشرف کو دکھا
اُس رات تم نے اسی عورت کو پہاڑی پر آتے دیکھا تھا۔'' اشرف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا
ہاں..... یہی تو تھی۔ بہت تیز گاڑی چلا رہی تھی۔'' کچھ گتھیاں ایک جانب سے اُلجھ رہی ہوتی ہیں تو د
سرے سے ان کی گرہیں کھل بھی رہی ہوتی ہیں۔

اگلی صبح میں نے پوسٹ آفس سے تھانے فون کر کے رحمٰن صاحب کے دفتر کا نمبر لیا اور انہیں فور
گزارش کی کہ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے مجھے تھانے پہنچنے کی ہدایت کی اور خود بھی دو
وہاں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ سینیئر ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق میرے دوروں کی تعداد میں ا
ان کے درمیانی وقفے میں روز بروز کمی ہو رہی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مکمل جنوں سے پہلے
قتل کی گتھی سلجھ جائے اور اس کے لیے مجھے اُن کی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔ رحمٰن صاحب نے چونک
دیکھا ''لیکن تمہارا علاج بھی تو ساتھ ساتھ چل رہا ہے..... پھر تمہیں اتنا پختہ یقین کیوں ہے کہ تم مکمل
منزل کو پہنچ کر ہی رہو گے.....؟ بہرحال، میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں..... اور یہی میرا
ہے.....'' ''نہیں..... میرے لیے فرض سے بڑھ کر آپ کا ایک اور احسان ہوگا۔ میں صرف اتنا چاہتا
آپ میری اور ریحان کی ایک ملاقات کا بندوبست کروا دیں، لیکن ہماری ملاقات شام ڈھلنے کے
چاہیے۔'' ریحان صاحب کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''لیکن شام ڈھلنے کے بعد ہی کیوں..... شاید
بات کا علم نہیں کہ ریحان شام کے بعد کسی سے بھی ملاقات نہیں کرتا۔ پولیس کو بھی اُس نے ہمارے

ذریعے خاص ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ مغرب کے بعد کسی شخص سے بھی نہیں ملتا، چاہے طوفان ہی کیوں نہ آجائے۔ ہم بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے، کیوں کہ بڑا آدمی ہے اور اُس کی پہنچ بھی دُور تک ہے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا ''لیکن کیا یہ بہت عجیب بات ہے..... ایک شخص مغرب ہوتے ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو اُس سے کیسے رابطہ ہو سکے گا۔'''' ایمرجنسی کے لیے اُس کے ایک پرانے ڈرائیور کا فون نمبر موجود ہے، جو مغرب کے بعد ریحان کی تمام فون کالز اور پیغام وصول کرتا ہے۔ اصل میں یہ ڈرائیور ریحان کے باپ سیٹھ غیاث کے دور کا ہے اور یہی دنیا کا وہ واحد فرد ہے، جیسے ریحان کا اعتماد حاصل ہے۔'' ''لیکن یہ معما کیسا ہے؟'' ''کچھ نہیں..... بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ ویسے عام لوگوں میں یہی بات مشہور ہے کہ ریحان کو بچپن ہی سے اندھیرے کا کوئی خوف (Darkness Phobia) ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں میں تنہائی کی وجہ سے ایسی نفسیاتی بیماریاں کچھ زیادہ اچنبھے کی بات نہیں ہوتیں۔ اور پھر آخر یہ اُس کی اپنی زندگی ہے۔ اُس کی مرضی کہ وہ اندھیرا ہونے کے بعد کسی سے ملے یا انکار کر دے۔ ہم اُس پر زبردستی بھی تو نہیں کر سکتے۔'' میں نے گہری سانس لی ''مطلب یہ کہ میرا ریحان سے مغرب کے بعد ملنا ممکن نہیں ہوگا۔'' ''میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ماضی کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے یہ بہت مشکل لگتا ہے۔'' ''اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ مجھے شام ڈھلے اُس کے گھر تک پہنچا دیں یا مجھے اُس کا پتا دے دیں۔ میں اپنے طور پر اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔'' رحمٰن صاحب اب بھی کچھ مخمصے میں تھے۔ ''ہاں..... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے..... میرا عملہ تمہیں ریحان کے کوٹھی کے باہر پہنچا دے گا، لیکن میں اب بھی سمجھ نہیں پایا کہ تم اُس سے مغرب کے بعد کیوں ملنا چاہتے ہو۔ میں نے سنا ہے ریحان اپنی اس اندھیرے سے ڈرنے والی بیماری کے علاج کے لیے بیرون ملک کے بھی بہت سے چکر لگا چکا ہے اور وہاں کے اعلیٰ پائے کے معالجین سے بھی مشورہ کر چکا ہے، لیکن اُس کا مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی، کے مصداق پھیلتا ہی چلا گیا۔ مجھے ڈر ہے تمہاری اس مداخلت پر وہ ناراض ہو کر تمہارے لیے مزید مسائل نہ کھڑے کر دے۔ یاد رکھو، تم ابھی تک ضمانت پر ہو۔ تمہیں مکمل رہائی نہیں ملی۔'' ''میں جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ خطرہ مول لینا چاہوں گا۔ میں آپ کی سرکاری مجبوریاں اور ریحان کا اثر و رسوخ جانتا ہوں۔ اِسی لیے خود اپنے طور پر ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' رحمٰن صاحب نے ہنکارا بھرا اور ٹھیک تین گھنٹے بعد مغرب سے کچھ پہلے مجھے ایک عظیم الشان کوٹھی کے بہت بڑے سے گیٹ کے قریب اُتار کر پولیس کی جیپ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مغرب کی اذان ختم ہوتے ہی گیٹ پر لگی گھنٹی پر اُنگلی رکھ دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے انٹر کام پر کسی کی آواز اُبھری ''کون ہے؟'' ''میں عبداللہ ہوں۔ مجھے ریحان صاحب سے ملنا ہے۔'' فوراً جواب ملا۔ ''وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔ آپ صبح آئیں۔'' انٹر کام پر کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر کوئی تھکی تھکی سی آواز میں بولا ''ہاں بولو..... کیا بات کرنی ہے تمہیں؟'' یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت ریحان کی آواز میں بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

رُوپ بہروپ

میں کچھ دیر تو اُس آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی میں اُلجھا رہا۔ انٹر کام پر دوبارہ ذرا درشتی سے پوچھا گیا "تم کچھ لیلیٰ کے بارے میں بتانے والے تھے؟" "جی..... لیکن آپ کون بول رہے ہیں؟ کیا میں ریحان صاحب سے بات کر سکتا ہوں.....؟" دوسری جانب سے جھنجھلاتی ہوئی تیز آواز اُبھری "میں ریحان بول رہا ہوں، جلدی بولو تمہیں کیا کہنا ہے۔" اس بار آواز واقعی ریحان ہی کی تھی۔ میں نے اپنی درخواست دہرائی۔ "کیا میں آپ سے مل کر بات نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے مہمانوں کو اس طرح دروازے ہی سے بات کر کے لوٹا دیتے ہیں؟" دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ شاید انٹر کام رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کے قریب قدموں کی چاپ اُبھری اور دربان نے گیٹ کھول دیا۔ دروازے کے بالکل سامنے اندر جاتی پکی سڑک کے دونوں طرف دُور تک خوب صورت بجلی کے کمان نما کھمبوں کی قطار سی چلی گئی تھی اور جن پر لٹکے چھوٹے چھوٹے فانوس یوں جل رہے تھے کہ انہوں نے دُودھیا روشنی کا ایک سیلاب سا بہا رکھا تھا۔ میں نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ کوٹھی میں چاروں طرف روشنی کا ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ ہر سُو چراغاں جیسی کیفیت تھی۔ میں نے جس شخص کے قدموں کی چاپ سنی تھی وہ ریحان کا وفادار ڈرائیور تھا، جس کے چہرے پر برہمی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ لیکن پھر اپنے تاثرات چھپا کر بولا "معذرت چاہتا ہوں، لیکن اس وقت چھوٹے صاحب کسی سے بھی نہیں ملتے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" "چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" چاہے معاملہ کسی کی زندگی یا موت ہی کا کیوں نہ ہو۔" ڈرائیور نے میری بات کے جواب میں دوبارہ سختی سے کہا "ہاں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن ایسے موقعوں کے لیے میں ہمیشہ موجود رہتا ہوں۔ تم تو اُسی ساحلی مسجد کے طالب ہونا۔ تو تمہارا نام عبداللہ ہے۔ تمہیں جو بھی اطلاع دینی ہے، تم مجھے دے سکتے ہو۔" ڈرائیور نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے اور میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ شاید وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ریحان کی حیثیت دیکھ کر کچھ پیسے بٹورنے کے لیے اتنی دُور آیا ہوں اور خاص اِسی مقصد کے لیے ریحان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے نوٹ دوبارہ ڈرائیور کے ہاتھ پکڑائے "تم غلط سمجھ رہے ہو، مجھے جو بات کرنی ہے اس کا براہ راست تعلق ریحان صاحب سے ہی ہے۔ لیکن اگر وہ واقعی اس قدر مجبور ہیں کہ مجھ سے ملنے کے لیے دروازے تک بھی نہیں آ سکتے تو مجھے واپس پلٹ جانا چاہیے۔ ہاں البتہ ایک پیغام ضرور دے دینا کہ میں اُس عورت کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، جو لیلیٰ کی موت کی رات پہاڑی ٹیلے پر آئی تھی۔" میں اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا۔ لیکن ابھی

نے مُڑتے مُڑتے بھی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرتے دیکھ لیا، حالانکہ میں نے صرف اشرف سے ہی اب تک اُس عورت کی قتل والی رات ٹیلے پر آمد کا سُنا تھا لیکن پھر بھی یہ صرف ایک اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہیں تھا، میرا وجدان نہ جانے کیوں مجھے بار بار اس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اُس پراسرار عورت کا اس قتل سے ضرور کوئی ایسا تعلق تھا، جس کے دھاگے لیلیٰ اور ریحان کے ماضی سے جڑے ہوئے تھے۔ میں شہر سے ساحل کی طرف جانے والی آخری بس لے کر جب ساحل پر اُترا تو عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ جانے سے پہلے میں سلطان بابا کو بتا گیا تھا، پھر بھی وہ مسجد کے باہر مجھے اپنا انتظار کرتے ملے۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہرے پر بشاشت سی آ گئی۔ ''جانتے ہو میاں..... کسی اُستاد کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے.....؟'' میں اُن کا مُدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ''جب وہ اپنے کسی نالائق شاگرد کو اپنے راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ میری 'نالائق شاگرد' والی اصطلاح پر وہ بھی مُسکرا دیئے۔ کال گڑھ سے نکلنے کے بعد میری زیادہ تر کوشش یہی رہی تھی کہ میں سلطان بابا کی طبیعت کے پیشِ نظر انہیں کم سے کم زحمت دوں۔ ڈاکٹروں نے بھی انہیں سختی سے آرام کی تلقین کی تھی اس لیے میں حتی الامکان اُن کے ذہن پر کسی بھی طرح کا بوجھ ڈالنے سے احتراز کرتا، لیکن آج ان کی بات سن کر نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ سلطان بابا خود بھی دانستہ مجھے اس معاملے میں اپنا وجدان آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ شاید میری تربیت کا عملی دور شروع ہو چکا تھا اور اب زندگی کی گرہیں مجھے خود کھولنا تھیں۔

اگلی صبح فجر کے بعد میں ساحل پر چہل قدمی کرنے چلا گیا۔ صبح کی اوس سے بھیگی ٹھنڈی ریت، پاؤں کے تلوؤں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے حکیم صاحب نے کل ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بقول اُن کے، یہ میرے کمزور اعصاب کے لیے بہت اچھا تھا۔ انہوں نے مجھے دھوپ اور گرمی سے بھی خود کو حتی الامکان بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شاید جنون اور تپش کا آپس میں کچھ گہرا تعلق تھا۔ پھر سورج کا تانبا زمین پر بہنے کے چند لمحے بعد ہی، جب ابتدائی کرنیں شریر بچوں کی طرح آپس میں لڑتی جھگڑتی زمین کو سب سے پہلے چومنے کے لیے لپک رہی تھیں اور میں اپنی چہل قدمی ختم کر کے حجرے میں جانے کے لیے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا تو میں نے اچانک اپنے شام والے تیر کو ٹھیک نشانے پر لگتے دیکھا۔ دُور نیچے آتی کو تار کی سڑک پر سفید مرسڈیز دوڑتی ہوئی اُوپر پہاڑی کی جانب آ رہی تھی۔ یہ مرسڈیز میں کل شام ہی ریحان کے پورچ میں کھڑی دیکھ چکا تھا۔ شاید شہر کے اندرونی راستوں کے لیے وہ یہی کار استعمال کرتا ہوگا۔ گاڑی چند لمحوں میں مسجد کے باہر ریت کے بڑے میدان میں پہنچ کر رُک گئی اور اس میں سے ریحان کا ڈرائیور برآمد ہوا۔ وہ تنہا آیا تھا۔ ''چھوٹے صاحب تم سے کل شام نہ ملنے پر معذرت خواہ ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہیں لینے کے لیے بھیجا ہے۔ تم چاہو تو ناشتا وہیں چل کر کر لینا۔'' سلطان بابا گاڑی کی آواز سن کر صحن ہی میں نکل آئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب دیکھا۔ انہوں نے رضامندی کے اظہار میں دھیرے سے سر ہلایا۔ ڈرائیور کا نام

یعقوب تھا اور وہ راستہ بھر بالکل خاموش رہا۔ میں نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے تو دربان نے بتایا کہ ریحان صاحب کوٹھی کے پچھلے حصے میں بنے گالف کورس میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایکڑوں پر پھیلی ہوئی جدید وضع کی کوٹھی تھی، جس کے اندر ہی گھاس کے اتنے وسیع لان تھے کہ ایک بہت بڑے گھاس کے قطعے کو گالف کے کھیل کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا نے بھی فارم ہاؤس کے پیچھے ایک چھوٹا سا گالف کورس بنا رکھا تھا لیکن مجھے کبھی بھی اس دھیمے سے کھیل کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ یعقوب کے ساتھ گاڑی سے اُتر کر پچھلی جانب جاتے ہوئے میں نے ٹینس کورٹ اور باسکٹ بال کے پختہ میدان بھی بنے دیکھے۔ شاید ریحان اپنے تمام کھیلوں کے شوق گھر ہی میں پورے کر لیتا تھا۔ گھر کے اندر ہی ایک مصنوعی ندی بھی بنائی گئی تھی، جس پر بنا پل پار کرتے ہی دُور بڑی بڑی سبز چھتریوں کے نیچے ریحان اور دو افراد کا عملہ مجھے نظر آیا۔ جو ریحان کے گالف والی چھڑیوں کا بیگ اور گیند وغیرہ تھامے کھڑے تھے۔ ریحان نے ریت کے ایک چھوٹے سے مصنوعی ڈھیر کے پیچھے پڑی گیند کو بہت احتیاط سے تاک کر چھڑی کی ضرب لگا کر اُچھالا اور گیند کچھ دُور ایک چھوٹی سی ڈھلوان پر بنے ایک سفید گول سوراخ میں غائب ہو گئی۔ عملے نے ستائشی جملوں سے اپنے صاحب کی پذیرائی کی۔ مجھے دیکھ کر ریحان نے چھڑی عملے کے حوالے کی اور اپنے ہاتھوں پر پہنے چھوٹے سفید دستانے بھی یکے بعد دیگرے اُتار دیئے۔ عملہ اِدھر اُدھر ہو گیا اور ڈرائیور یعقوب بھی ایک خاص مقام پر آ کر رُک گیا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا ریحان کے قریب پہنچا۔ اُس کے سفید کرمچ جوتے گھاس پر عجیب سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اُس نے میز پر پڑے جوس کے گلاس کے اُوپر سے پلاسٹک کا کور اُتارا۔ ''ناشتہ کرو گے.....''؟ ''نہیں..... میں ناشتے میں صرف ایک کپ چائے لیتا ہوں، ساتھ میں رات کی باسی روٹی کا کوئی بچا ٹکڑا۔'' ریحان نے جوس کا ایک لمبا سا گھونٹ اپنے حلق سے نیچے اُتارا اور قریب پڑی رس بھری کی پلیٹ سے ایک تازہ رس بھری اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھی۔ وہ حسبِ معمول کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے مجھ سے نہیں، مجھ سے پرے کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہو۔ ''کیا مذہب کے لیے یہ جوگ لازمی ہوتا ہے؟ میں یعقوب کی کل کی بیسوں والی حرکت پر معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے رحمٰن صاحب نے بتایا تھا کہ تم کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ وہ تمہیں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ کل تم کچھ اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ تم چاہو تو ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں۔'' ریحان نے اپنے اندر کی بے چینی کو اپنے سرد رویے سے بخوبی ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن اس کے لہجے کی لرزش کو میں صاف محسوس کر سکتا تھا۔ شاید لیلیٰ اس کی ایسی کمزوری تھی، جس کا ذکر آتے ہی وہ خود اپنے بنائے پہرے پھلانگ کر اپنے خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن عمر بھر کی پروئی خاردار تاروں کو کاٹنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے غور سے اُس کے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو دیکھا۔ ''آپ نے یہی بات گزشتہ شام کیوں نہیں سنی.....؟ میں لیلیٰ کے آخری لمحات کا واحد عینی شاہد ہوں۔ میری ذہنی حالت بھی کچھ ایسی بہتر نہیں کہ میں تمام باریکیوں کو ٹھیک طرح سے اپنے ذہن میں جمع رکھ

اس لیے میں شام ڈھلے آپ کے دروازے تک آیا تھا۔'' ریحان نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپانے کی
شش کی۔ ''تمہیں ایک چھوٹی سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ میں شام ڈھلنے کے بعد کسی سے ملاقات نہیں
میرے کاروباری حلقے میں بھی سب ہی کو یہ بات پتا ہے اور میں اپنے معمول کے خلاف کبھی نہیں
''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' ریحان کی آواز بلند ہوگئی ''نہیں..... میں اپنے ذاتی معاملات پر
رنا پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا تم بھی اس موضوع پر دوبارہ بات نہ کرو۔'' میں نے واپسی کے لیے قدم
ے۔ ''بہتر ہے..... اگر ہم دونوں کے درمیان اعتماد کا اِسی قدر فقدان ہے تو پھر میری یہاں موجودگی بھی
تی ہے۔'' ریحان نے مجھے آواز دی، ''سنو..... تم..... تم..... سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ سب ہی
تے ہیں کہ اس کا تعلق میرے بچپن کے ایک خوف سے ہے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کسی طرح
ہسٹریا پر قابو پا سکو..... لیکن فی الحال میرے لیے اس موضوع پر بات کرنا بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوتا
اُمید ہے اب تم مزید اصرار نہیں کرو گے۔'' میں نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔ اس وقت روئے زمین
ا سے زیادہ مجبور انسان شاید اور کوئی نہ ہوگا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یقین جانو، کل جب سے
نہارا پیغام ملا کہ تم لیلیٰ کی آخری سانسوں کے شاہد ہو اور مجھے اُس کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہو تو میں
بھر سو نہیں پایا۔ تم نہیں جانتے کہ یہ محبت کس قدر ظالم اور جابر جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے، اب وہ اس دنیا میں
ارہی لیکن اُس سے متعلق ہر ذکر، ہر یاد میرے لیے پہلے سے کہیں قیمتی ہوگئی ہے۔ میں اپنی ساری دولت
کر بھی اُس سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر یاد اپنے دل کی پٹاری میں بند کر لینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا
تمہیں روپے پیسے یا کسی صلے کی حرص نہیں ہے لیکن میں تمہیں دل سے نکلی دعا کا خزانہ تو دے سکتا
ں۔ کاش تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو آج میرے دل کا حال جان پاتے۔'' ریحان اپنی بات ختم کر
ہاں ہانپنے لگا، جیسے نہ جانے کتنی دُور سے دوڑ کر آیا ہو۔ تو اب نوبت یہ آگئی تھی کہ لوگ میرے حلیے کو دیکھ کر
محبت کی دہائی دینے لگے تھے۔ بہر حال، ریحان نے لیلیٰ کے لیے اپنے جذبات کھول کر بیان کر دیئے
مجھے اُس کے لہجے میں کوئی کھوٹ محسوس نہیں ہوا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے اپنے اندر کوئی کھوٹ کیسے
سکتے ہیں۔ محبت ہمارے اندر اتنی جگہ ہی کہاں رہنے دیتی ہے کہ کوئی اور جذبہ پنپ سکے؟ محبت ہمیں اندر
ر دیتی ہے، مکمل کر دیتی ہے۔ ریحان بھی اندر سے مکمل تھا۔ لیلیٰ کی محبت نے اُس کے اندر کسی چھل کپٹ کا
خال ہی نہیں چھوڑا تھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں یہ خوف کیسا تھا۔ یہ اذیت کیسی تھی، جو اُسے اپنا درد اندر
ے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں پلٹ کر چند قدم آگے بڑھا اور ریحان کے بالکل قریب جا کھڑا ہو۔ ''لیلیٰ
مجھ سے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی سانسیں ہار گئی.....'' ریحان نے تڑپ کر میرے
ں کا کاندھے اتنی زور سے پکڑ لیے کہ اُس کی اُنگلیاں میرے شانوں میں پیوست ہونے لگیں۔ ''کیا..... لیلیٰ
اُس نے کیا کہا تھا..... مجھے بتاؤ..... خدا کے لیے مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ.....'' اور ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب

میرے ذہن میں بیک وقت بہت سے جھماکے ہوئے۔ مجھے آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ تھا لیکن ریحان
آنکھوں نے میرے اندر نہ جانے ایک ہی پل میں کتنی بصارتیں بھر دیں۔ شاید قدرت بیک وقت مجھ سے
فرزانگی چھین بھی رہی تھی اور میرے اندر دیوانگی کے ساتھ ساتھ ایک اَن جانی روشنی بھی کسی درز سے مستقل
کر آ رہی تھی۔ میں دھیرے سے بولا "لیلیٰ نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں نے اُسے معاف کیا۔" ریحا
کے سر پر جیسے کسی نے وزنی ہتھوڑے سے حملہ کر دیا ہو۔ وہ اپنا سر تھام کر وہیں کرسی پر گر گیا۔ دُور کھڑ
یعقوب کے ساکت وجود میں بے چینی سے حرکت پیدا ہوئی، لیکن شاید اُس کی حد وہیں تک تھی۔ بادل نخو
پھر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ ریحان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور اُس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں
جلدی نمودار ہوئیں، جیسے کوئی کسی گیلے اسپنج کو دبا دے۔ پھر جب وہ بولا تو اُس کی آواز لرز رہی تھی "لیلیٰ
..... وہ کس کو معاف کرنے کی بات کر رہی تھی....." "یہ تو میں نہیں جانتا۔ شاید اُسی اَن جان عورت کو، جسے
رات پہاڑی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" ریحان بالکل ہی چُپ ہو گیا۔ میرے مزید وہاں ٹھہر
رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اب ریحان کو لیلیٰ کی یادوں کی بارات کو ڈولی چڑھانے
گھنٹوں لگ جائیں گے۔ میں نے یعقوب سے کہا کہ وہ اپنے صاحب کا خیال رکھے، میں بس لے کر بستی
جاؤں گا۔ واپسی پر آتے ہوئے میں تھانہ ماہی کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ اسماعیل سنتری کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر
واپس بستی آ گیا۔ جانے اُس دن گرمی ہی کچھ زیادہ تھی یا پھر خود میرا ہی دم، جس سے گھٹا جا رہا تھا۔ وہی
عجیب سی بے چینی چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی تھی، جو مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ کچھ انہو
ہونے کو ہے۔ شام تک میں بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ مجھے سلطان بابا نے بتایا تھا کہ پیش گوئی، الہام
وجدان کا خود بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ منوں اور ٹنوں جیسا وزنی اور ہمارے کومل انسانی وجود پر ایسے لمحات بے
گراں اور بھاری گزرتے ہیں تو کیا میرے شانوں کو بھی اس وجدان کا بھاری وزن توڑ رہا تھا۔ آج پھر
رات تھی، لہٰذا ساحل پر اور پہاڑی ٹیلے پر غیر معمولی چہل قدمی تھی۔ کافی خاندان چھوٹے بچوں سمیت ساحل
سیر کو آئے ہوئے تھے۔ مغرب سر پر آ گئی تھی لیکن ابھی تک کافی لوگ ساحل کی اس ویران پٹی کے
گرد بکھرے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد میرے اندر کی بے چینی نے مجھے ستایا تو میں ٹیلے کی چوٹی کی جانب
گیا۔ ملگجا اندھیر چھایا ہوا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر فاصلے پر ٹولیوں میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے، مشروبات پی رہے
تھے، اپنے بچوں کے ساتھ دل بہلا رہے تھے۔ میں اُن سب سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا اور دُور پہاڑی سے
جھاگ اُڑاتے سمندر کو دیکھنے لگا۔ وہی سمندر، جس کے دوسرے کنارے پر زہرا رہتی تھی۔ جانے سلطان
بابا نے اُسے میرا پیغام بھیجا ہوگا یا نہیں۔ میرے اندر زہرا کو براہ راست مخاطب کرنے کی جھجک آج بھی
اوّل کی طرح موجود تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے کسی نے پشت پر موجود ٹیلے کے پیچھے سے دھیرے
سے آواز دی "عبداللہ....." میں چونک کر پلٹا، لیکن اندھیرے کی وجہ سے مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اپنا دھیان

کر پھر سے سمندر کی جانب متوجہ ہوا۔ اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔ ''عبداللہ۔'' عجیب سی کرخت، لیکن نسوانی آواز کے تعاقب میں، میں نے ایک بار پھر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر اگلے ہی لمحے میرے سارے جسم کا خون ایک ہی پل میں میری نسوں میں جم گیا۔ اپنا آدھا چہرہ سُرخ پلّو میں چھپائے اور اپنے وجود کو ایک بڑی سی چادر میں ڈھکے وہ چٹان کی آڑ میں کھڑی تھی۔ ہاں..... یہ وہی تھی، جسے اُس رات میں نے اس جگہ اپنی سرخ سینڈل کی ایڑی ٹوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی تلاش میں پولیس دربدر بھٹک رہی تھی اور جسے لیلیٰ کے قتل کی رات چوٹی کی جانب آتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ اس طرح چھپ کر کھڑی تھی کہ کچھ دُور موجود ایک خاندان کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی تھی کہ وہاں کوئی اور موجود ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور ہماری باتوں کی آواز بھی بمشکل ہی وہاں تک پہنچتی۔ میرے حواس ابھی تک جامد تھے۔ ''تم اُس روز بھاگ کیوں گئی تھی.....؟'' وہ غرائی ''میرے پاس ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ ریحان سے دُور رہو۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالو، ورنہ جہاں ایک جان گئی ہے، وہاں دوسری بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے گہرا سانس لیا ''تو میرا شک صحیح ہے۔ لیلیٰ کی موت تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے۔'' وہ دبی آواز میں چلائی۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا، جیسے وہ آواز بگاڑ کر بول رہی ہے۔ ''تم اپنے کام سے کام رکھو بولوی.....اور تم نے ریحان سے جھوٹ کیوں بولا کہ اس رات لیلیٰ نے تم سے کوئی بات کی تھی۔ میں اسی ٹیلے پر موجود تھی جب وہ نیچے گری تھی۔ اس وقت نیچے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اُسے نہیں مارا۔ لیکن اگر وہ میرے اور ریحان کے درمیان آنے سے باز نہ آتی تو میں واقعی اسے ختم کر دیتی۔ اُس کی آواز میں اس قدر سفاکی تھی کہ میں اندر تک لرز کر رہ گیا۔ اُس نے آج بھی اپنا آدھا چہرہ پوری طرح ڈھک رکھا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی شخصیت میں کسی بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر غرائی ''میں تمہیں آج آخری بار تنبیہہ کرنے آئی ہوں کہ اگر تم نے دوبارہ ریحان کے دل میں اس منحوس لیلیٰ کی محبت جگانے کی کوشش کی تو اگلا نمبر تمہارا ہی ہوگا۔'' اچانک تین چار بچے اپنی گیند کے پیچھے پیچھے چوٹی کی جانب دوڑے اور ان کی مائیں انہیں روکنے کے لیے اُن کی طرف لپکیں۔ جونہی چند لوگ ہمارے درمیان حائل ہوئے اور ایک لمحے کے لیے میری توجہ بٹی تو میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو وہ کسی چھلاوے کی طرح وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر چٹان کے پیچھے پہنچا۔ مجھے دُور اندھیرے میں ایک ہیولا تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس جانب بڑھتا نظر آیا، جہاں کچھ لوگوں کی گاڑیاں پارک تھی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جلدی میں اُس کی جانب دوڑا۔ آج وہ کسی دوسری گاڑی میں آئی تھی۔ شاید اُسے پولیس کے پہرے کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن وہ شاطر تھی۔ اُس نے اصل پر آنے کے لیے ہفتے کی شام کا انتخاب کیا تھا، جب ویک اینڈ منانے کے لیے شہر کے بہت سے مہمان اس پوائنٹ کا رُخ کرتے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اُس

کی گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ دفعتاً مجھے اندھیرے میں ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل ریت پر گر گیا۔ اُٹھتے وقت میری نظر ریت میں دھنسی ایک چھوٹی سی چیز پر پڑی اور میری آنکھیں پتھر ہو گئیں۔ میں وہیں ڈھے گیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ عورت کون تھی۔

ہم زاد

اس رات میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہیں جھپکا پایا۔ زندگی کے کتنے زاویے اور محبت نامی اس
ت کے کتنے رُخ ہو سکتے ہیں۔ شاید یہ بتانا ہم میں سے کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ کم از کم میں نے تو
ہ سوچ کر آخری صفحہ پلٹا کہ شاید یہ باب بند ہوا، ٹھیک اُسی لمحے خود کو پھر سے پہلے صفحے پر پایا۔ اگلی صبح
ڈاک خانہ کھلتے ہی سب سے پہلا فون رحمٰن صاحب کو کیا اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں تھانہ ماہی میں
سامنے بیٹھا تھا۔ میری بات سن کر اُن کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ حسب معمول اُن کا چہرہ سگریٹ کے
یں کے پار دھند میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ''تم جانتے ہو، تم جس جگہ مجھے رات کو چھاپہ مارنے کا کہہ رہے
ں دن میں باقاعدہ اجازت لے کر جانے کے لیے بھی نہ جانے کتنے ایوانوں کی گھنٹیاں ہلانا پڑتی ہیں۔
ے اجازت ملنا تو دُور، اس بات کا ذکر کرتے ہی سخت سست سنا کر تبادلہ کر دیا جائے گا۔'' ''لیکن آپ
ے عرصے کی نوکری میں چند افسران بالا تو ایسے ہوں گے، جن پر آپ کا بھرم اور اعتماد قائم ہوگا۔ کیا آپ
ی مدد کے لیے نہیں پکار سکتے۔ آپ بہر حال اپنا فرض ہی تو پورا کریں گے یا پھر محکمہ آپ کو صرف وہاں
ی کی اجازت دیتا ہے جہاں کارروائی کرنے سے کسی ایوان کی گھنٹی نہ ہلتی ہو۔'' رحمٰن صاحب نے ایک
ش لے کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ''بات تلخ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ہماری اَن دیکھی حدیں
ا سے مقرر ہیں۔'' وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں گم رہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے ''ٹھیک ہے
ج یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں۔ مجھے تمہارے وجدان پر بھروسا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ سجھائی بھی
ے رہا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہاتھ ذرا سا بھی ترچھا پڑا تو حکام کو
ارغ کرنے میں چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت لگے گا اور ایسی صورت میں، میں بھی تمہاری ہی مسجد کے
ے میں اپنا بستر ڈالوں گا۔'' انہوں نے چند فون نمبر گھمائے اور پھر شام ڈھلتے ہی ہم کچھ ضروری نفری کے
ہمراہ منزل کے دروازے پر موجود تھے۔ ممکنہ مزاحمت کے بعد دروازہ کھلوا لیا گیا۔ رحمٰن صاحب نے اپنے
ہدایت کر دی تھی کہ جب تک وہ خود کسی سے بات کرنے کا نہ کہیں، تب تک کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا
یفون انہیں منتقل نہ کیا جائے۔ گھر میں عجیب سناٹا جاری تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے تو مرکزی عمارت
دروازے کو مقفل پایا۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر دو مضبوط جسم کے سپاہیوں نے کافی مشقت کے بعد
توڑ ڈالا۔ اندرونی جانب سے دو تین سہمے ہوئے نوکر اور خدام نکلے، جو باورچی خانے کے دروازے سے

باہر نکلنے کی تگ و دو میں تھے۔ انہیں اطمینان دلوایا گیا کہ کوتوالی کو اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ اُوپر کی منزل کے کمرے کھلے پڑے تھے۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے سے دو گھنگھروؤں کی جوڑیاں بھی جھلکتی نظر آئیں۔ سامنے چھوٹا سا ہال تھا، جہاں طبلہ اور ہارمونیم سلیقے سے پڑے تھے۔ شاید یہاں رقص کی مشق کی جاتی ہو۔ ہال اس گھر میں داخل ہونے سے لے کر اب تک لگاتار رحمٰن صاحب کے ڈرائیور، گارڈز، تھانے دار اور دیگر کے دستی وائرلیس سیٹ (واکی ٹاکی) پر درجنوں پیغام وصول ہو چکے تھے۔ جس میں رحمٰن صاحب کو اعلیٰ حکام شہر کے کمشنر اور آئی جی وغیرہ کی طرف سے مسلسل ہدایت کی جا رہی تھیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنا مشن ختم فوراً ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں۔ رفتہ رفتہ یہ پیغام دھمکیوں کی صورت اختیار کر گئے لیکن ایس پی صاحب آخری کشتی بھی جلا کر نکلے تھے۔ پولیس کے جوان مختلف دروازوں کو دھکیلتے جا رہے تھے۔ اور ہر کمرہ بے ہوا، نفیس ساز و سامان سے آراستہ اور بہترین آرائش کا شاہکار تھا۔ کمروں کی کلر اسکیم پر بھی بہت دھیان دیا تھا۔ لیکن سبھی کمرے خالی تھے اور پھر آخری کمرہ بند ملا۔ رحمٰن صاحب نے اندر موجود فرد کو تنبیہہ کی کہ دروازہ کھول دیا جائے ورنہ وہ اسے توڑ دیں گے۔ اندر سے آواز اُبھری ''تھوڑا انتظار کریں۔.....'' کچھ دیر بعد کے تھکے قدم گھسٹنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ زنانہ کپڑے اور کاسمیٹکس اِدھر اُدھر بکھرے پڑے کمرے کی ڈریسنگ ٹیبل پر دنیا کی بہترین کمپنیوں کا میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ ایک پردے کے پیچھے مجھے وہ سرخ سینڈل بھی جھانکتے ہوئے نظر آ گئے، جن کی ایک ایڑی اس وقت پولیس کی تحویل میں تھی۔ عورت دروازہ کھولنے کے بعد کمرے میں اندھیرا کر کے دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ رحمٰن صاحب کے اشارے پر عملے کے کسی فرد نے کمرے کی بتی جلائی تو پہلے ہماری نظر کمرے کے سامان اور پھر اس سکڑے وجود پر پڑی۔ رحمٰن صاحب نے کڑک کر اُسے کھڑا ہونے کو کہا تو گھٹنوں میں چھپا ایک چہرہ دھیرے دھیرے اُٹھا اور پولیس کا سارا عملہ رحمٰن صاحب سمیت ہکا بکا رہ گیا۔ عورت کے بھیس میں ہمارے سامنے ریحان تھا۔ اور اُس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

آگے کی کہانی زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ رحمٰن صاحب نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اخبار اور میڈیا اس چھاپے کی خبر نہ پہنچے لیکن پھر بھی صبح کے تمام اخبارات کی شہ سرخی ملک کے بڑے صنعت کار ریحان منگیتر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتاری ہی کی تھی۔ ایک رات پہلے جب میں اُس عورت کا پیچھا کرتے گر پڑا تھا۔ تب نیچے ریت میں مجھے سفید کرمچ کے جوتوں کا ایک سول نظر آیا تھا۔ یہ اُن ہی جوتوں ایک کا سول تھا، جو میں اُسی صبح ریحان کو گالف کورس میں پہنے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ ریحان گرفتار ہوا تو نہایت بے چین رہا اور اپنا وجود چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا برتاؤ بھی بہت عجیب تھا۔ کبھی وہ نسوانی میں پولیس کے عملے کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا تو کبھی اُن کی منت کرتا کہ اُسے واپس جانے دیا جائے کہ گھر میں ''ریحان'' اکیلا گھبرا رہا ہوگا۔

نے رحمٰن صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ اس کی یہ حالت عام نہ ہونے پائے اور ہمیں ہر
ریحان کا پردہ رکھنا ہوگا۔ اگلی صبح تک ریحان بالکل لاتعلق ہو چکا تھا اور ہر سوال کے جواب میں صرف
گھورتا رہتا۔ اُس نے صبح ہی اقرار کرلیا کہ ''وہ لیلیٰ کو مارنا نہیں چاہتی تھی'' لیکن ہاتھا پائی کے دوران
پھسلا اور وہ اُونچائی سے گر گئی۔ ریحان کے بیان سے لگتا تھا جیسے وہ کسی تیسری ہستی کے بارے
دے رہا ہو لیکن ''وہ'' کون تھی جو ریحان کے اندر سالوں سے بسیرا کیے بیٹھی تھی۔ یہ وہ معما تھا جس کا
ہر نفسیات دانوں کی سات رُکنی ٹیم پورے پانچ دن بعد لگا پائی۔

نیش کا آغاز ریحان کے بچپن سے ہوا۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والا ریحان ماں باپ
وں کا تارا تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کبھی اُسے بیٹے کا پیار دیتی اور کبھی بیٹی کا سنگھار کر کے اُس
کھیلتی۔ لیکن منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہونے والے بچے کو گھر سے باہر کم ہی نکالا جاتا۔ پھر نہ جانے
یحان کے باپ غیاث الدین کی زندگی میں ایک کنول نامی لڑکی، جو اُس کی پرانی سیکرٹری کی جگہ صرف
کے لیے آئی تھی، داخل ہوگئی اور دھیرے دھیرے اُس کے دل و دماغ ہی پر نہیں، پورے کاروبار پر
ہوتی چلی گئی۔ غیاث کا اپنی بیوی سے آئے دن جھگڑا رہنے لگا اور چار سالہ ریحان پردوں کے پیچھے چھپا
باپ کو چیخ چیخ کر لڑتے ہوئے دیکھ کر روتا رہتا۔ بات اتنی بڑھی کہ غیاث اپنی بیوی پر ہاتھ بھی اُٹھانے
ک دن تو ریحان نے اپنے باپ کو اپنی ماں کا گلا دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ بات کورٹ
تک چلی گئی اور ریحان کی ماں کو اُس کے والدین آکر اپنے ساتھ لے گئے۔ ریحان کو اُس کے باپ
نے نہیں دیا اور معصوم ریحان اپنے گھر کے پورچ میں کھڑا روتے ہوئے اپنی ماں کو نانا کی کار میں پچھلی
ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی ماں کی آنکھوں سے ٹپکے آخری دو آنسو
کے لیے ریحان کی رُوح کو بھگو گئے۔ شاید پہلی مرتبہ اُسی دن اُس کے اندر کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم
ا، جس میں سے ایک حصہ ریحان کے پاس رہ گیا اور دوسرا حصہ ہمیشہ کے لیے اُس کی ماں کے ساتھ
ہو گیا۔

باپ نے ننھے، ریحان کو درختوں اور پردوں کے پیچھے چھپ کر اپنی ماں کے لیے روتے ہوئے دیکھا تو
وفادار ڈرائیور یعقوب کو ہدایت کی کہ اُس کے دفتر سے واپس آنے تک وہی ریحان کے بہلنے کا کچھ سامان
ے۔ ڈرائیور کو اور تو کچھ نہ سوجھی، وہ اداس ریحان کو لیے بنگلے کے پیچھے اپنے سرونٹ کوارٹر میں لے
جہاں اس کی بیوی اور چھ بیٹیاں ہر ممکن کوشش کرتیں کہ اُن کے صاحب کے لاڈلے کا دل بہلا رہے۔
کے کھیل زیادہ تر وہی ہوتے، گڑیا اور گڈے کی شادی، کوکلا چھپا کی، ہنڈکلیا بنانا یا پھر ایک دوسرے کو
نیل پالش اور سرخی سے سنوارنا۔ سو، ریحان بھی انہی مشغلوں میں گم ہوتا گیا۔ تیسرے ماہ ریحان کی سگی
طلاق بھیجنے کے ساتھ ہی اُس کا باپ غیاث، کنول کو ریحان کی سوتیلی ماں کے روپ میں گھر لے آیا۔

کنول نے دو چار دن غیاث الدین کو دکھانے کے لیے ریحان سے جھوٹا پیار جتایا لیکن جلد ہی وہ اس ناٹک
اُوب ہوگئی اور ریحان اُسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ بات صرف سوتیلے پن کی حد تک ہوتی تو بھی کنول
ریحان کی موجودگی کا کڑوا گھونٹ پی ہی لیتی لیکن کچھ عرصے بعد غیاث الدین کی فیکٹری کا نوجوان منیجر
غیر موجودگی میں کسی نہ کسی بہانے کوٹھی کے چکر لگانے لگا تو ایسے میں کنول کو ریحان کی گھر میں موجودگی
ایسے میں یا تو ریحان کو اُوپر اُس کے کمرے میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے بند کر دیا جاتا یا پھر کوٹھی کے پچھواڑ
دیا جاتا کہ وہ جا کر یعقوب کی بیٹیوں سے کھیلے۔ اس تمام احتیاط کے باوجود ریحان کی سوتیلی ماں اس کو
طریقوں سے ڈراتی رہتی اور اُسے سیڑھیوں سے جڑے کمرے کے نیچے والے تہ خانے میں بند کرنے کی
دیتی تا کہ وہ اپنے باپ کی رات گئے واپسی پر منیجر کی آمد کا ذکر نہ کرے۔ ایسے موقعوں پر اگر یعقوب کی گ
اور بچیاں کہیں گئیں ہوتیں تو ریحان اپنے کمرے میں بند ہی گڑیا اور گڈے کا کھیل کھیلتا رہتا۔ پھر اُس کے
کہیں سے لپ اسٹک لگ گئی تو وہ اپنی باجیوں کی طرح ہونٹوں پر سرخی لگانے میں مگن رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس
آنکھوں میں کاجل بھرنا اور نیل پالش لگانا بھی سیکھ لیا۔ پھر ایک دن اُسے سوتیلی ماں کی ڈریسنگ ٹیبل پر
اپ کے سامان کی پوری کٹ ہی نظر آ گئی تو وہ چپکے سے وہ بھی اپنے کمرے میں اُٹھا لایا اور کئی دن تک
شیڈز سے اپنا چہرہ رنگین کرتا رہا۔ بدقسمتی سے اُس کی یہ چوری جلد ہی پکڑی گئی اور اُس کی ماں، نے، جو
پر اس کٹ کی گمشدگی پر کئی دن سے برس رہی تھی، ریحان کو میک اپ استعمال کرتے پکڑ لیا۔ سوتیلی ما
اس دن عروج پر تھا اور اُس نے سزا کے طور پر ننھے ریحان کو اُس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف اُسی تہ
میں قید کر کے بخش دیا جس تہ خانے کے ذکر ہی سے ریحان بھاگ کر اپنے کمرے کی الماری کے پیچھے
جاتا تھا۔ وہ دو گھنٹے اُس تاریک تہ خانے میں ریحان نے کس طرح روتے، سسکتے اور ڈر سے کانپتے گز
اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں، جن کی اپنی کوئی اولاد ہو۔ اس تہ خانے کی دیواروں پر اُس روز اند
میں ریحان نے اتنے عجیب وغریب ہیولے بنتے اور مٹتے دیکھے کہ اُس دن اُس کی اپنی شخصیت ہی ایک
بن کر رہ گئی۔ شام کو باپ کے آنے سے پہلے سوتیلی ماں ریحان کے جسم کو تہ خانے سے باہر کھینچ لائی لیکن
کی رُوح وہیں اندھیرے میں بھٹکتی رہ گئی۔ اس رات کے بعد سے اندھیرا ریحان کو ڈسنے لگا اور وہ سونے
بھی کمرے کی تمام بتیاں جلائے رکھنے کا عادی ہوگیا۔ ایسے میں کمرے میں پڑا آئینہ ریحان کا سب سے
دوست بنتا گیا۔ ریحان کو میک اپ کا شوق تو اپنی باجیوں سے پہلے ہی مل چکا تھا اب اس تنہائی کو دُور
کے لیے اور اپنے راتوں کے خوف کو مٹانے کے لیے اُس نے اپنے ہی کمرے میں ایک دوسری دنیا آ
تھی، کیوں کہ اُس کے باپ کو اتنی فرصت تھی نہیں کہ وہ اپنے خوف زدہ بیٹے کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر
باتیں ہی کر لیتا یا اُسے لوری سنا کر سلا دیتا۔ ایسے میں ریحان نے اپنے خوف کو لوری دینے والی خود ایجا
رات گئے جب سارے گھر کی بتیاں بجھ جاتیں تو وہ چپکے سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سا

ا اور اِدھر اُدھر سے چرائی سُرخی اور غازہ اپنے چہرے پر مل کر اپنے آدھے چہرے کا میک اپ کرتا۔ پھر یہی رھا چہرہ اُس کی ماں، بہن، دوست، سب ہی کچھ بن جاتا۔ داہنی حصے والی عورت ریحان سے باتیں کرتی، ے کہانیاں اور لطیفے سناتی اور چہرے کے بائیں حصے والا ریحان خوش ہوتا، ہنستا اور اپنے چہرے کے داہنے ے سے وہ سب کہتا، جو وہ اپنی سگی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا کہ ریحان کو جب عورت سے ت کرنی ہوتی تو وہ اپنے چہرے کا بایاں حصہ جو بنا میک اپ سادہ رہتا، اُسے آئینے کے رُخ پر رکھتا اور سوال رتا، ضد کرتا، کہانیاں اور لوریاں سننے کی فرمائش کرتا اور پھر جواب کے لیے، چہرے کا دایاں حصہ ایسے رُخ پر ینے کو دکھاتا کہ صرف وہ مہربان عورت ہی اُسے شیشے میں جھانکتی نظر آتی جو ریحان کی سب ضدیں، ہر فرمائش ری کرتی اور پھر جب رات نصف سے بھی زیادہ بیت جاتی تو ریحان کی دوست، ماں، بہن اور ہمدرد اُسے ب اچھی سی لوری سناتی۔ وہ لوری، جو ریحان اپنی سگی ماں سے سنا کرتا تھا اور پھر آخر کار ریحان کو نیند آ جاتی۔ ں تمام عرصے میں ریحان کے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رہتا اور صبح تب ہی کھلتا، جب وہ عورت ریحان اما تھا چوم کر اگلی شام تک کے لیے رُخصت ہو جاتی۔ اب ریحان کو باقی دنیا سے شدید بے زاریت اور نفرت سوس ہونے لگی تھی۔ بس ایک یعقوب اور اُس کا گھرانہ ہی تھا، جہاں کچھ دیر کے لیے ریحان کا دل لگ پاتا ا۔ لیکن اب وہاں سے بھی ریحان سرِ شام ہی بھاگنے کی کرتا کیوں کہ اندھیرا ہوتے ہی اُس کی پیاری اور ربان دوست نے جو آنا ہوتا تھا۔

وہاں ریحان کی سوتیلی ماں کنول نے بھی ایک ہی بار بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا اور ایک صبح جب گھر ے مکین اُٹھے تو تمام تجوریوں اور زیورات سمیت بینک بیلنس کو صاف پایا۔ اس دن کے بعد سے کنول اور لٹری کے منیجر کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی۔ ریحان کا باپ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا۔ بات صرف پیسے کی ی تو وہ ایک سال ہی میں کھوئے ہوئے مال سے تین گنا زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اُسے بستر پر ال دینے والا صدمہ بے وفائی کا تھا۔ رفتہ رفتہ جب باتیں کھلنے لگیں تو پتا چلا کہ کنول نے یہ سارا منصوبہ ہی پنے چاہنے والے فیکٹری منیجر کی وساطت سے بنایا تھا اور اُس کی شادی سے لے کر اب تک ہر بات پہلے سے یک منصوبے کے تحت طے شدہ تھی۔ ریحان کا باپ دوبارہ بستر سے نہیں اُٹھ سکا اور پندرہ سالہ ریحان کو اپنے فادار ڈرائیور کی سپردگی میں دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گیا۔ اس دوران ریحان کی سگی ماں کو بھی تلاش رنے کی بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود۔ یعقوب نے نمک کا حق ادا تو کیا۔ لیکن اب ریحان جوان ہو رہا ا اور اُس نے اپنے گرد اتنا مضبوط خول بنا رکھا تھا کہ اُس کے دل کی بات کسی تک پہنچنا محال تھا۔ آخر کار، قوب کی سب سے چھوٹی بیٹی بھی اپنے گھر سدھار گئی اور یعقوب کی بیوی کی موت کے بعد ریحان کی زندگی کا آخری روشن دان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن یعقوب کی بیوی مرتے مرتے اپنے شوہر کو اس کے چھوٹے احب کے اندر پلتی دو الگ شخصیات کا حال دے گئی کیوں کہ اس نے بھی ایک ماں کی طرح ہی ریحان کو پالا

تھا اور وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ریحان کی سرِ شام شروع ہو جانے والی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ یعقوب زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن زمانہ شناس ضرور تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ریحان اپنے اندر پلتی اس عورت کے ساتھ اتنی دور آ چکا ہے کہ اب اُس کی واپسی بہت مشکل ہے۔ ریحان نے شام کے بعد خود کو دنیا سے بالکل کاٹ دیا اور دنیا میں اب صرف یعقوب ہی وہ واحد فرد تھا، جسے پتا تھا کہ شام ڈھلنے کے بعد ریحان، ریحان نہیں رہتا، اُس کے اندر کی عورت باہر نکل آتی ہے۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ ریحان کے اندر کی عورت کی عمر، ریحان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گھٹتی گئی۔ بچپن میں وہ اُس کی ماں تھی، لڑکپن میں دوست اور ہم درد اور جوانی میں وہ باقاعدہ ایک محبوبہ کے حقوق حاصل کر چکی تھی۔ دن میں اگر عملے کی کسی لڑکی سے ریحان دو گھڑی رُک کر بات کر لیتا یا کوئی ریحان کی شان دار شخصیت کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو شام کو کمرے میں آنے کے بعد جب ریحان آئینے کے سامنے بیٹھتا تو اُس کی رُوح کی قابض باقاعدہ اُس سے لڑتی، جھگڑتی اور رُوٹھ جاتی۔ دونوں کے درمیان مکالمے کی صورت کچھ یوں بنتی کہ ریحان بائیں جانب چہرے کی اوٹ سے اُس سے پوچھتا ''آج کچھ چپ سی ہو۔ کوئی ناراضی ہے کیا۔'' داہنا میک اپ زدہ حصہ منہ بنا کر کہتا ''تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو اُس پھلجھڑی شائستہ کے نخرے اُٹھانے سے ہی فرصت نہیں۔'' ریحان اُسے مناتا ''اوہو..... اب جانے بھی دو۔ وہ نئی اکاؤنٹینٹ ہے۔ کچھ رہنمائی کی ضرورت تھی اُسے۔ سو، میں نے بتا دیا، ورنہ تم تو جانتی ہو کہ.....'' فوراً وہ پلٹ کر آئینے پر قابض ہو جاتی اور غصے سے کہتی ''ہاں ہاں..... تین چار ہزار کے عملے میں سے اُسے اور کوئی نہیں ملا تھا، اپنی اُلجھن دُور کرنے کے لیے۔ میں سب جانتی ہوں، ان عورتوں کے چلتر..... ٹھیک ہے اگر تمہیں اُس کی اتنی فکر ہے تو پھر جاؤ۔ اُسی کی رہنمائی کرو۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟'' ریحان بے بس ہو جاتا ''اوہ..... تم پھر رُوٹھ گئیں۔ اچھا بابا..... پکا وعدہ..... آئندہ کسی سے، کوئی کام کی بات بھی نہیں کروں گا۔ چلو اب ناراضی ختم کر دو، ورنہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' جواباً نیم رضامندی کا اظہار بھی مصنوعی غصے سے کیا جاتا۔ ''خوب جانتی ہو میں یہ سب بہانے، تمہیں پتا ہے نا کہ میں تمہیں بھوکا سوتے نہیں دیکھ سکتی۔ تب ہی مجھے اتنا ستاتے ہو۔ اچھا چلو اب منہ نہ بسورو۔ اُٹھ کر کھا لو۔'' ریحان خوش ہو کر مسکرا دیتا اور وقتی طور پر جھگڑا ختم ہو جاتا۔ لیکن پھر چند دن بعد ایسی کوئی بات ہو جاتی اور پھر رات گئے تک یہی تکرار چلتی رہتی۔ عام دنیا کے لیے ریحان اندھیرے کے خوف کا ایک عام مریض تھا اور اُس کے کاروباری حلقے میں سب ہی اس بات کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے کہ ریحان صرف دن کے اُجالے کا ساتھی ہے۔ ریحان نے کبھی دوستیاں اور رشتے پالے ہی نہیں تھے، جو اُس کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل مچاتے۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی پسند تھا اور تنہائی ہی اُس کی سب سے بڑی رفیق تھی۔ لیکن پھر لیلیٰ نام کی ایک معصوم سی لڑکی اُس کے عملے میں حادثاتی طور پر شامل ہوئی اور ریحان کی زندگی اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ لیلیٰ ریحان کی فرم کے سینیئر ڈرافٹس مین کی بیٹی تھی، جو اپنے باپ کی علالت کی وجہ سے یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کا کام سنبھالنے کے لیے صرف دو ماہ کے عارضی معاہدے

ہمنی میں رکھی گئی تھی۔ لیکن شاید یہی دو ماہ ریحان کے اندر وہ اُچھوتا احساس جگانے کے لیے کافی تھے، جس
ے وہ عمر بھر انجان رہا تھا۔ پہلے پہل تو خود ریحان کو بھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں اس کومل سی لڑکی کے اپنے آفس
یں آنے پر ایک انجانی سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اپنی رات کی رازداں اور اپنے اندر
کی عورت سے بھی کوئی بات چھپانے کی کوشش کی۔ ریحان ویسے بھی اپنے اسٹاف سے بہت کم بات کرتا تھا اور
خواتین تو اُس کے دفتر سے سات در پرے ہی گزرا کرتی تھیں لیکن لیلیٰ میں نہ جانے ایسی کون سی کشش تھی، جو
ریحان کو اُس کی جانب کھینچے لے جا رہی تھی۔ شاید اُس کا عام لڑکیوں کی طرح ریحان کے اردگرد چکر نہ کاٹنا ہی
ریحان کو بھا گیا تھا۔ لیکن اُس کے اندر والی سے یہ راز بھلا کہاں چھپ پاتا۔ اس رات پہلی بار ریحان کا آئینے
یں بیٹھی اپنی اس ہم زاد سے جھگڑا ہوا۔ وہ اتنا بگڑی کہ اُس نے کمرے کا سارا کانچ توڑ ڈالا۔ کوٹھی میں اپنے
سرونٹ کوارٹرز میں پڑے نوکر حیرت اور خوف سے اپنے صاحب کے کمرے میں اس عجیب وغریب شور شرابے
کی دُور سے آتی آوازیں سنتے رہے، کیوں کہ انہیں شام کے بعد صاحب کے کمرے کی طرف جانے کی نہ تو
اجازت تھی اور نہ ہی وہ کوٹھی کے اندرونی حصے میں پاؤں دھر سکتے تھے۔ صرف یعقوب ہی تھا جو ایسے موقعوں پر
اندر جا کر کوئی پیغام دے سکتا تھا۔ عموماً نصف شب کے بعد کوٹھی سے گھنگھروؤں کی جھنکار بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن
اس رات کچھ عجیب سا سناٹا طاری رہا۔ ریحان اپنی ہم زاد کے اپنے اندر جنم لینے کے بعد زندگی میں پہلی بار اسی
رات بھوکا سویا تھا۔ اگلی صبح دفتر پہنچتے ہی شدید غصے کے عالم میں اُس نے انٹرکام پر لیلیٰ کو اپنے دفتر میں آنے کو
کہا۔ لیلیٰ دفتر میں داخلی ہوئی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آدھا جنوں، آدھا فراق

ریحان شدید اذیت کے عالم میں جیسے خود اپنے آپ سے ہی لڑتے ہوئے نڈھال ہو کر اس طرح کرسی پر ڈھلکا ہوا تھا کہ اُس کا سر میز کے کونے پر اٹک گیا تھا۔ فوراً کمپنی کے ماہر ڈاکٹروں کی ٹیم کو طلب کیا گیا اور معالج خاص نے اسے شدید ذہنی تناؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ ساتھ ہی اُسے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی گئی کہ وہ اگلے ایک ہفتے تک کسی دفتری کام یا فائل کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ لیکن ریحان بھلا کب ماننے والا تھا۔ اُسے اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور درحقیقت یہ کام ہی تو تھا، جو ریحان کے دن کے آٹھ دس گھنٹے گزارنے میں اُس کی مدد کرتا تھا۔ مجبوراً ہیڈ آفس کے جنرل منیجر کو ریحان کا کام گھر ہی پر بھجوانے کا انتظام کرنا پڑا۔ جنرل منیجر ریحان کے باپ کے وفاداروں میں سے ایک تھا اور ریحان کو اُس کی مانتے ہی بنی۔ یہی وہ سات دن تھے، جب لیلیٰ ریحان کے حواس پر پوری طرح چھاتی گئی۔ ریحان کے اندر کا معصوم، سہما سا بچہ، جس نے اپنی ماں کو روتے ہوئے، خود سے دور جاتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے کوئی اوٹ ڈھونڈ لی تھی۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی چھپ کے باہر نکل آتا۔ زندگی میں پہلی بار ریحان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ نظر آنے لگی اور اُس کا دل بھی چاہنے لگا کہ وہ اپنے اندر کی معصوم سی خواہشیں اور باتیں کسی سے بانٹے، لیکن یہ ساری خوشی اور سرشاری صرف سورج ڈھلنے سے پہلے تک ہی رہتی اور جب شام ڈھلے ریحان خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا تو پھر وہی طوفان آ جاتا۔ وہی اُس کی ہم زاد کے شکوے، طعنے اور جھگڑے۔ اب تو وہ ریحان کے منانے سے بھی نہیں مانتی تھی۔ اُس کا بس ایک ہی تقاضا ہوتا کہ ریحان کسی بھی طرح لیلیٰ کو کمپنی سے باہر نکال پھینکے۔ ریحان اُس کے سامنے عذر تراش تراش کر تھک جاتا، لیکن وہ روٹھی رہتی اور ریحان سے لڑتی رہتی کہ ریحان اب اُس سے اتنا پیار نہیں کرتا، جتنا لیلیٰ کے آنے سے پہلے کرتا تھا۔ اُس کی ہم زاد کو لیلیٰ سے شدید نفرت ہونے لگی تھی اور پھر جب ریحان کو ڈاکٹروں نے گھر پر مکمل آرام کا مشورہ دیا اور لیلیٰ دفتر کے کچھ اہل کاروں کے ساتھ ضروری فائلوں پر دستخط کروانے کوٹھی بھی آنے لگی، تب تو سمجھو بھونچال ہی آ گیا۔ ہم زاد نے ریحان سے بات چیت بند کر دی اور پورے تین دن تک ریحان کی بھرپور منت سماجت کے باوجود بھی چپ سادھے بیٹھی آئینے سے ریحان کو تکتی رہی۔ ریحان کی حالت ان تین دنوں میں مزید بگڑ گئی، کیوں کہ وہ ساری ساری رات اُسے منانے کے لیے روتا رہتا۔ پھر جب ریحان نے اُس سے آخر کار یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جلد ہی لیلیٰ کو خود سے دُور کر دے گا، تب وہ ذرا مانی۔ لیکن تب تک لیلیٰ خود ریحان کی اُلجھی، خاموش اور کسی حد تک شرمیلی سی شخصیت کے

ے دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے شیشے کے کیبن کے بالکل سامنے راہ داری میں، دوسری جانب موجود ریحان کے آفس کے کانچ کی دیوار سے پرے اُسے مختلف کاموں میں اُلجھا ہوا دیکھتی رہتی۔ اُسے یہ کھویا کھویا سا، اپنے آپ سے باتیں کرتا اور نہایت شائستہ اور نفیس عادات واطوار والا نوجوان کسی اور ہی دنیا کا فرد دکھائی دیتا۔ اِسی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت ریحان اپنے اندر چلتے اس شدید نفسیاتی ہیجان کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ کر بکھرنے کے بالکل قریب تھا ٹھیک اُسی وقت لیلیٰ نے آ کر اُسے تھام لیا اور وہ ریحان، جو لیلیٰ کو نوکری سے فارغ کرنے کا لیٹر تیار کروائے بیٹھا تھا، اُسے اپنی زندگی کا ہم سفر بننے کا پیام دے بیٹھا۔ لیلیٰ کی تو جیسے کائنات ہی مکمل ہوگئی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے، لیلیٰ کی اُلجھنیں بڑھتی گئیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی بیٹھے بٹھائے ریحان کا رویہ بالکل ہی تبدیل ہو جاتا۔ کبھی کبھار جب وہ صبح اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لیے دیر سے دفتر پہنچتا تو بالکل ہی ہتھے سے اکھڑا ہوتا۔ ایسے میں اُس کا برتاؤ لیلیٰ سے بالکل اجنبیوں والا ہو جاتا۔ اُس بے چاری کو کیا پتا کہ رات بھر اُس کا ہم نفس کس عذاب سے گزر کر صبح کی سیڑھی پھلانگ کر اُس تک پہنچا ہے۔ لیلیٰ شروع میں اُسے کام کے بوجھ اور ریحان کی ازلی تنہائی پسندی کا شاخسانہ ہی سمجھتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ بات بننے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ ان دونوں کی بحث، خاص طور پر اُس وقت طول پکڑ لیتی، جب لیلیٰ ریحان کو شام ڈھلنے کے بعد کہیں آؤٹنگ کے لیے لے جانے کی ضد کر بیٹھتی اُس کا اصرار کچھ بے جا بھی تو نہ ہوتا، کیوں کہ سارا دن تو ریحان دفتر کے کاموں اور میٹنگز ہی میں اُلجھا رہتا۔ بس، گھڑی دو گھڑی کے لیے دوپہر کے کھانے یا شام کی چائے پر ان دونوں کی ملاقات ہو پاتی۔ وہ بھی تمام دفتر کے عملے کے سامنے۔ اب بھلا ایسے موقعے پر کوئی دل کی بات کیسے کی جا سکتی تھی، حالانکہ تمام عملے کو بھی ریحان اور لیلیٰ کے مستقبل میں ہونے والے رشتے کے بارے میں خبر تھی اور درحقیقت سب ہی اس بات سے خوش بھی تھے، کیوں کہ ریحان نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہمیشہ اپنے تمام عملے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن پھر بھی لیلیٰ کو ریحان سے کچھ ایسے لمحوں کی ہمیشہ ہی تمنا رہی، جب صرف وہ اور ریحان ہوں اور وہ دل کی ہر بات بنا کسی جھجک کے کہہ سکے۔ لیکن شام ہوتے ہی ریحان کے اندر جیسے تمام جہان کی بے چینیاں سی بھر جاتی تھیں۔ عصر کے بعد تو وہ اپنے کئی کام ادھورے چھوڑ کر ہی گھر واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتا۔ ایسے میں یعقوب بھی ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا اور آج تک کبھی کسی نے اُسے لیٹ ہوتے یا ناغہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ لیلیٰ انٹرکام پر یا میٹنگ کے دوران مختلف کاغذوں پر لکھ لکھ کر تھک جاتی، مگر ریحان کا دل کبھی نہ پسیجتا۔ لیلیٰ کو بھی ریحان کے بچپن کے خوف کی کچھ خبر پہنچ چکی تھی اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی اس خوف کے جال سے نکلنے میں مدد کرے، مگر شام کا ریحان اس کے لیے بالکل اجنبی ہوتا تھا۔ ایک آدھ بار اُس نے جب ریحان کو زبردستی روکنے کی کوشش کی بھی تو ریحان نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا۔ پھر بھی لیلیٰ کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ اُمید ضرور دیا جلائے رکھتی تھی کہ وہ شادی کے بعد ریحان کے دل میں چھپا ہر خوف اپنی محبت سے مٹا دے گی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریحان شام

کے بعد بہت ضروری فون بھی اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ ایک بار لیلیٰ اندھیرا ہونے کے بعد ریحان کی کوٹھی کے گیر
تک بھی جا پہنچی، مگر اُس کے لاکھ سر پٹخنے پر بھی دربان نے اُسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔ اُلٹا اگلی ہ
ریحان لیلیٰ پر بُری طرح برس پڑا کہ وہاں کے انتہائی منع کرنے کے باوجود شام ڈھلنے کے بعد اُس کی چوکھٹ پ
کیوں آئی۔ لیلیٰ اپنے آنسو روک نہیں پائی اور بھاگتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی۔

دو تین روز تک دونوں میں بات چیت بند رہی اور ان تین راتوں میں ریحان کی ہم زاد نے جی بھر کے
ریحان کے لاڈ اُٹھائے۔ اسے اُس کی پسندیدہ شاعری سنائی۔ رقص کر کے اُس کا دل بہلایا اور اُس سے بہت
سے گلے شکوے بھی کیے کہ وہ بچپن سے ریحان کی ہم زاد اور ہم نفس رہی ہے اور ہر مشکل اور کرب میں اُس
نے ریحان کا ساتھ دیا، لیکن جب اُسے ریحان کی ضرورت پڑی تو ریحان اُس سے منہ موڑ کر کسی اور کی زلفوں
کا اسیر ہو گیا۔ اُس نے ریحان سے وعدہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لیلیٰ کے رشتے سے چھٹکارا پا کر دوبارہ اپنی
ساتھی کے پاس آ جائے گا۔ لیکن ریحان تین دن تک ہی یہ وعدہ نبھا پایا اور چوتھے دن جب خود لیلیٰ نے اُس
کے سامنے آ کر ہاتھ جوڑ دیئے تو دونوں ہی مسکرا دیئے۔ اس رات پہلی مرتبہ ریحان کی ہم زاد نے اُس سے ضد
کی کہ وہ بھی ریحان کی پسند سے ملنا چاہتی ہے۔ لہٰذا ریحان اُسے رات کو کہیں مدعو کرے۔ ریحان نے سختی سے
انکار کر دیا کہ جب تک شادی نہ ہو جائے، یہ راز راز ہی رہنا چاہیے۔ لیکن ہم زاد کی تکرار بھی طول پکڑتی گئی۔
ہم زاد کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کا راج صرف سورج نکلنے تک ہی قائم رہتا تھا۔ اور اُجالا ہوتے ہی
اُسے ریحان کی رُوح کو آزاد کرنا پڑتا تھا۔ پھر سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈھلنے تک ریحان کے دل و دماغ پر
صرف لیلیٰ ہی کا قبضہ ہوتا تھا۔ اس لیے ہم زاد دن میں بھی ریحان کے اعصاب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈنے
لگی۔ پھر لیلیٰ خود بھی ریحان کی نفسیاتی پیچیدگیاں دُور کرنے کی آس میں گاہے بگاہے اُسے شام ڈھلنے کے بعد
ملنے پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ رات کو ہم زاد اُسے بڑھاوا دیتی "اگر وہ تم سے رات کو ملنا چاہتی ہے تو اس میں حرج
ہی کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم مجھے بھی اُس سے جلد از جلد ملوا دو۔ آخر شادی کی پہلی رات بھی تو مجھے ہی اُس
کا استقبال کرنا ہے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ میں پہلے ہی اُس سے دوستی کر لوں۔ کہیں پہلی رات وہ مجھے تمہارے
کمرے میں دیکھ کر بالکل ہی نہ گھبرا جائے اور تمہارا راز سب کے سامنے فاش نہ کر دے۔" کبھی کبھی تو ریحان
ان دونوں کی ضد اور تکرار کے سامنے بالکل ہی لاجواب ہو جاتا اور اُسے لگتا کہ اُس کے اندر پلتی وہ عورت، اُ
کی ہم زاد ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لیلیٰ کو اس راز سے پہلے ہی آگاہ کر دینا چاہیے کہ یہ اُس کا حق بھی تو تھا۔ آخر دل
اور دماغ کی جنگ میں ہمیشہ کی طرح جیت دل نادان ہی کی ہوئی اور ریحان نے پہلی اور آخری مرتبہ لیلیٰ سے
شام کے بعد ملنے کی ہامی بھر لی۔ اس روز لیلیٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ آسمان
خیمے کی زمین سے بندھی گرہیں کھول کر پورا آسمان اوڑھنی کی جگہ اپنے سر پر اوڑھ لے۔ سارا دن وہ ہواؤں
میں اڑتی رہی۔ بات بے بات خود ہی مسکاتی رہی۔ شام کو اُس نے ریحان کی پسندیدہ سفید ساڑھی پہن

لوں میں گجرا لگایا اور اپنی کالی آنکھوں میں محبوب کی دید کی آس لیے ساحل کی اس پٹی کی طرف اُسی گاڑی میں
ور ہی ڈرائیو کرتی ہوئی چل دی، جس کی پہاڑی کے ٹیلے پر آج مغرب کے بعد ریحان نے اُس سے ملنے کا
عدہ کیا تھا۔ وہ ریحان کے ساتھ دن میں پہلے بھی کئی مرتبہ ڈرائیو پر اس جگہ آ چکی تھی۔ اُسے وہاں پتنگ اُڑانا
ہت پسند تھا اور آج بھی وہ اپنے ساتھ بہت سی پتنگیں لے کر جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ آج وہ رات دیر
ک ریحان کے ساتھ مل کر پتنگیں اُڑائے گی اور اُسے اتنا اُونچا کر دے گی کہ اُس کی پتنگ اُس کے اور ریحان
ے ملن کے ستارے کو چھو کر لوٹے گی۔ جب تک لیلیٰ پہاڑی ٹیلے پر پہنچی، تب تک شام ڈھل چکی تھی اور مغرب
ے وقت کا جھٹ پٹا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ ریحان ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ لیلیٰ اپنی گاڑی سے نکل
کر پہاڑی کے سرے تک چلی گئی اور وہاں کھڑے کھڑے اُس نے دُور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی
یکھیں، وہ خوش ہو گئی کہ ریحان آ رہا ہے لیکن جب گاڑی کچھ قریب پہنچی تو وہ مایوس ہو گئی۔ یہ تو کوئی چھوٹی
گاڑی تھی لیکن وہ گاڑی تو اُسی طرف آ رہی تھی۔ لیلیٰ کچھ دیر گاڑی کو پہاڑی پر چڑھتے دیکھتی رہی، پھر اُس کی
توجہ دوبارہ سمندر کی طرف ہو گئی، جو آج نہ جانے اتنا بپھرا ہوا کیوں لگ رہا تھا۔ گاڑی نہ جانے کب لیلیٰ کی
گاڑی کے پیچھے آ کر پارک ہو گئی اور لیلیٰ تب چونکی، جب دھیرے سے کسی نے اُس کا نام لیا۔ وہ آواز کتنی اپنی
اور کتنی اجنبی بھی تھی۔ لیلیٰ نے اندھیرے میں کسی لمبی عورت کو پلو نکالے کچھ دُور کھڑے دیکھا۔ چہرہ واضح نہیں
تھا۔ لیلیٰ کچھ ڈر سی گئی۔ ''جی..... آپ کون؟'' اور پھر وہ عورت قریب آ گئی۔ لیلیٰ کے منہ سے زوردار چیخ نکل
گئی۔ اُس کے سامنے ریحان اپنے آدھے چہرے پر میک اپ کیے، آدھی عورت کے روپ میں کھڑا تھا۔ لیلیٰ
سہم کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے لرزتے ہوئے لہجے میں ریحان سے پوچھا کہ یہ کیسا بے ہودہ مذاق ہے
اور ریحان نے اتنا بھیانک حلیہ کیوں بنا رکھا ہے۔ بائیں جانب والے آدھے سادے چہرے والا ریحان رُخ
موڑ کر بولا کہ لیلیٰ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج وہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی سچائی سے ملوانا
چاہتا ہے۔ اس کے اندر پلتی آدھی عورت اور آدھا مرد..... یہی اس کی تقسیم شدہ شخصیت کی حقیقت ہے اور اگر وہ
ریحان کو اس کے اندر کی عورت سمیت اپنانے کا حوصلہ رکھتی ہے، تب ہی اس نازک بندھن کی گرہ باندھنے کی
سوچے، کیوں کہ ریحان کی دہری شخصیت اس اندھیرے میں پلنے والے وجود کے بنا ادھوری ہے۔ لیلیٰ تب
تک پہلے صدمے سے کچھ سنبھل چکی تھی اور اُسے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اُس نے چلا کر ریحان
سے کہا، یہ سب اس کا وہم ہے اور خود اُس کی اپنی خود ساختہ پرچھائیں ہے۔ ایسی کسی عورت کا کوئی وجود نہیں
ہے اور ریحان نے اپنی ساری زندگی ایک سائے کے ساتھ برباد کر دی ہے، لیکن اب بھی وقت ہے، اگر وہ لیلیٰ
کا ساتھ دے تو وہ دونوں مل کر اس عفریت کی پرچھائیں پر قابو پا سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی چہرے کے دائیں جانب
والا بگڑ گئی اور غرا کر بولی کہ ''وہ بہت دیر سے لیلیٰ کی یہ بکواس برداشت کر رہی ہے۔ لیکن اب اگر اُس نے،
کہ کے ریحان کو چھیننے کی کوشش کی تو انجام بہت بُرا ہو گا، کیوں کہ اُسے پہلے دن ہی سے لیلیٰ سے شدید نفرت

ہے۔ لہٰذا لیلیٰ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلی جائے اور دوبارہ کبھی پلٹ کر اس طرف رُخ نہ کرے۔'' لیلیٰ ریحان کو ایک بدلی ہوئی آواز میں چلاّتے دیکھ کر ایک بار پھر لرز گئی۔ اُس نے ریحان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ سارا کھیل صرف اور صرف قوت ارادی کا ہے اور اگر آج ریحان نے اپنے اندر کی طاقت سے اس عورت سے اپنے وجود سے باہر نہ نکال پھینکا تو شاید پھر ساری زندگی وہ اس کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ریحان، لیلیٰ کی منت سماجت کر کے اُسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ اُس کے اندر کی ہم زاد لیلیٰ کو دھتکار رہی تھی، اس پر چلا رہی تھی اور اُسے ریحان کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔ لیلیٰ کبھی ریحان کے آگے روتی اور کبھی اُس کی ہم زاد سے لڑتی۔ اِسی کش مکش میں نہ جانے کب اور کیسے لیلیٰ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑی کی نوک تک جا پہنچی۔ اُس کی سوت نے اُسے تھپڑ مارا اور دھکا دیا۔ ریحان والی بائیں طرف نے لپک کر لیلیٰ کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی، لیکن تب تک لیلیٰ کا توازن بگڑ چکا تھا۔ فضا میں ایک زوردار چیخ گونجی اور چند لمحوں کے لیے لیلیٰ کی سفید ساڑھی کا پلو گہرائی کے خلا میں لہرایا اور پھر ایک زوردار ''دھپ'' کی آواز کے ساتھ سناٹا چھا گیا۔ نیچے ساحل پر موجود ایک آدھ آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جیسے وہ گرنے والے کی طرف لپکا ہو۔ ریحان تڑپ کر لیلیٰ کے پیچھے جانے کے لیے گہرائی کی طرف دوڑا، لیکن ہم زاد نے اُسے زبردستی روکا اور جھاڑا کہ نیچے کسی شخص کا ہیولا نظر آ رہا ہے، شاید کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں ہذیان کے عالم میں حجرے سے نکل کر ساحل کی طرف نکل گیا تھا۔ مجھے اس طرف آتے دیکھ کر وہ زبردستی ریحان کو وہاں سے لے گئی۔

اگلی صبح ریحان کو پتا چلا کہ لیلیٰ کے قتل کے الزام میں عبداللہ نامی ایک نوجوان گرفتار ہو چکا ہے۔ ریحان کا دماغ اس وقت لیلیٰ کی موت کی وجہ سے سُن ہو چکا تھا اور اُس کی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت اُس کی تمام ڈوریں اُسی ہم زاد کے ہاتھ میں تھیں، جو اُسے یہ کہہ کر ڈراتی رہی کہ اگر ریحان نے پولیس کو حقیقت بتا دی تو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی آدھی شخصیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیلیٰ تو پہلے ہی اُس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ پھر ایک شام وہی عبداللہ نامی نوجوان اُس کے دروازے پر یہ پیغام لے کر آیا کہ اُس نے لیلیٰ کی آخری سرگوشی سنی ہے۔ ریحان اُس وقت اُس سے ملاقات تو نہیں کر پایا، لیکن اُس رات اپنی ہم زاد سے اُس کی شدید تلخ کلامی ہوئی اور ریحان نے اُس پر لیلیٰ کی قاتل ہونے کا الزام لگایا اور یہ بھی کہا کہ لیلیٰ اُونچائی سے گرنے کے بعد بھی زندہ تھی تب ہی اُس نے مسجد کے اُس طالب کو پیغام دیا۔ اگر ریحان موقع پر نیچے جاتا تو شاید وہ لیلیٰ کی جان بچا لیتا۔ پھر ہم زاد کے منع کرنے کے باوجود ریحان نے صبح سویرے اپنے ڈرائیور کو بھیج کر عبداللہ کو اپنی کوٹھی بلوا لیا اور عبداللہ نے جب اُسے یہ بتایا کہ لیلیٰ نے اپنی سانسیں رُکنے سے پہلے اُس عورت کو معاف کرنے کا پیغام دیا تھا تو خود ریحان کو اپنی سانسیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس روز شام سے پہلے وہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اگلے روز پولیس کو جا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا دے گا لیکن شام ہوتے ہی اُس کی رُوح کی قابض

نے حکم دیا کہ چل کر اُس عینی گواہ کو دھمکایا جائے۔ ریحان کی ہم زاد کو عبداللہ نامی نوجوان کا کوٹھی آنا اور یوں
یحان کے دل میں دبی چنگاری کو ہوا دے کر لیلیٰ کی یادیں ابھارنا بھی بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اِسی لیے وہ اُس
ن ساحلی چوٹی پر اُس کے پیچھے آئی تھی۔ ریحان ابھی تک صبح سے گالف کے لباس ہی میں تھا اور اس کا اپنا من
لکل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ساحل پر جائے کیوں کہ وہاں اُسے لیلیٰ کی یاد ستاتی تھی۔ اسی کش مکش میں وہ چلا تو
یا لیکن اپنے سفید کرمچ کے جوتے تبدیل کرنا بھول گیا یا شاید یہ اُس کے آدھے مردانہ حصے کا انوکھا احتجاج
۔ بہر حال، یہی جوتے اُس کی گرفتاری کا سبب بن گئے۔ لیکن پولیس ابھی تک مخمصے میں تھی کہ وہ ریحان ہی
و پکڑ لائے ہیں یا کسی اجنبی کو.....۔

ماہر نفسیات نے ریحان کی کہانی ختم کر کے چند لمحے کی خاموشی اختیار کر لی۔ ہم سب اس وقت رحمٰن
احب کے کمرے میں موجود تھے، جہاں گزشتہ پانچ گھنٹوں سے یہ بریفنگ چل رہی تھی۔ کمرے میں گمبھیر
ناطاری تھا۔ پولیس کی تاریخ میں یہ ایک ایسا انوکھا کیس تھا، جس نے اُن سب کے دماغوں کی چولیں ہلا دی
یں۔ ریحان کو اس وقت پولیس کے پہرے میں اسپتال کے نفسیاتی وارڈ میں منتقل کیا جا چکا تھا، جہاں اُس کی
ات شام کے بعد انتہائی ابتر بتائی جاتی تھی۔ ملک کے بڑے اور مشہور نفسیات دان اور معالج اس بحث میں
ڑے ہوئے تھے کہ کیا یہ تقسیم شدہ شخصیت (split personality) کا کیس ہے یا پھر دُہری شخصیت کا تضاد
(multiple personality disorder) ہے۔ سچ ہے کہ انسانی نفسیات ایک ایسا گھنا جنگل ہے، جس
یں اگر ریحان جیسے کسی شخص کا معصوم بچپن کھو جائے تو پھر وہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ انسان بھی کس قدر پیچیدہ
لوق ہے۔ انسانی ذہن کی بھول بھلیوں کا پہلا ادراک مجھے وہیں پہلی بار ہوا اور مجھے خود اپنے آپ سے بھی
ید خوف محسوس ہونے لگا۔ کیوں کہ میں بھی تو جانے انجانے میں اسی نفسیاتی اور اعصابی نظام کے خاتمے کی
رف بڑھ رہا تھا۔ میری رگوں میں پھیلتے زہر کا انجام بھی تو آخر کار ایک مکمل دیوانگی ہی بیان کیا جا رہا تھا۔

بریفنگ ختم ہونے کے بعد جب معالجین رحمٰن صاحب کے کمرے سے نکل گئے تو میں نے بھی اُن سے
خصت چاہی تو انہوں نے مجھے کچھ دیر رُکنے کا کہا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولے، ''تم کون ہو؟'' میں اُن کا سوال
ن کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ''میں عبداللہ ہوں..... آپ جانتے ہیں۔.....'' ''نہیں .....میں وہ جاننا چاہتا
ہوں، جواب تک نہیں جانتا۔ بہت سے سوال ہیں میرے ذہن میں، مگر میں انہیں ترتیب نہیں دے پا رہا.....
یکن اتنا مجھے یقین ہے کہ تم کچھ اور ہو..... اوروں سے کچھ سوا..... کچھ الگ۔'' میں نے بات ٹالی ''آپ کا
ہم ہے۔ میں باقی سب ہی کی طرح ہوں۔ بلکہ شاید اُن سے بہت کم، بہت عام.....۔'' لیکن انہوں نے
میری بات سنی ہی نہیں'' ساری تفتیشی ٹیم اس پُر اسرار عورت کی کھوج میں تو تھی لیکن ہم میں سے کسی کے
گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ریحان ہی کی دوسری شبیہ ہو گی۔ میں نہیں مان سکتا کہ یہ صرف تمہارے
حران کی کاریگری تھی کہ تم نے ریحان سے شام کے بعد ملنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر دھاگے سے دھاگا جڑتا

گیا اور سبھی کڑیاں آپس میں یوں ملتی گئیں کہ آج لیلیٰ کا پورا کیس ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے
اب تم ہی کہو، میں اسے کیا کہوں.....؟'' کچھ دیر چپ رہا'' آپ اسے وجدان کہہ لیں یا الہام..... سچ یہ ہے
کہ میں صرف ریحان کے اندھیرے سے خوف کی کہانی سن کر ہی اُس کے گھر گیا تھا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے
پہلے دن ہی سے اس عورت کی شبیہہ میں کچھ ایسا اسرار جھلکتا نظر آیا کہ مجھے اس کا تعلق لیلیٰ کی موت سے ہے
محسوس ہوا۔ میں خود بھی یہ بات تب ہی جان پایا کہ ریحان ہی وہ عورت ہے، جب میں نے اُس کے جوتے
سول ساحل پر پایا۔ شاید قدرت کچھ راستے خاص میرے لیے ہی کھولتی گئی اور آپ کا کیس حل ہوتا گیا۔'' اس
میں میز پر پڑے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ رحمان صاحب نے فون اُٹھایا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا۔ رحمان
صاحب نے جلدی سے کہا'' ٹھیک ہے..... ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔'' انہوں نے فون رکھ کر میری جانب
دیکھا،'' ریحان اپنے حواس میں آچکا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔''

گلابی دھند

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ہم شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب پہنچ چکے
ے۔ سامنے کچھ بھیڑ تھی اور راستہ بند تھا۔ پتا چلا کہ کوئی مریض دم توڑ گیا ہے اور اُس کی میت لے جائی جا رہی
ہے۔ قریبی عزیز، چند رفقا، اور آس پاس کے چند راہ گیر کاندھا دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے۔ مجھے
ں لگا جیسے انسان اپنی پوری زندگی میں بس اتنا ہی کماتا ہے جتنے لوگ اُس کے جنازے کو کاندھا دینے اور اُس
ے آخری سفر میں چار قدم ساتھ چلنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ باقی سب ضائع جاتا ہے۔ انسان کا سب
ے بڑا نفع خود ''انسان'' ہی ہوتا ہے اور یہی وہ سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جسے وہ اپنی زندگی کے دوران مختلف
دوار میں نقصان کی صورت میں کھو دیتا ہے۔ کیسے کیسے بیش قیمت لوگ ہمارے ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔
یہ بے رحم ''وقت'' کیسے ڈاکا مار جاتا ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی اور کوئی ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے
اُٹھ کر چل دیتا ہے اور اُس کے بعد صرف یادیں، پچھتاوے اور افسوس باقی رہ جاتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں
گم تھا کہ رحمان صاحب کی جیپ نے ایک لمبا سا موڑ کاٹا اور ہم اسپتال کی مرکزی راہ داری کے بالکل سامنے
والے پورچ میں پہنچ گئے۔ رحمٰن صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''جاؤ..... جا کر اُس سے مل
لو.....''۔ ''آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ؟'' ''نہیں..... اس وقت وہ صرف تم سے ملنا چاہتا
ہے۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کر پائے گا۔'' میں سامنے کھڑے مستعد اور چاق چوبند سپاہی کے
ساتھ مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا نفسیاتی اور اعصابی مریضوں کے لیے مخصوص کمروں تک جا پہنچا۔ سپاہی
نے 13 نمبر کمرے کی طرف اشارہ کیا، جس کے باہر پہلے ہی دو پولیس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ میں
دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو کمرہ بالکل یخ بستہ ہو رہا تھا۔ شاید کمرے کے مرکزی ٹھنڈا کرنے کے نظام کو
اس کے آخری درجے پر رکھا گیا تھا۔ کمرے میں فرنیچر کے نام پر صرف پلاسٹک کی دو کرسیاں پڑی تھیں اور
اسے کمرے سے زیادہ بیرک کہنا مناسب ہوتا، کیوں کہ چوکور کی بجائے مستطیل ساخت کی دیواریں دُور تک
بڑھ گئی تھیں۔ فرش پر بے داغ سفید ٹائلز لگے ہوئے تھے اور ریحان سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے
زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی کا انتظام کچھ اس طرح تھا کہ آنکھوں کو مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا تھا۔
آہٹ سن کر ریحان نے سر اُٹھایا۔ لیکن یہ..... یہ تو وہ ریحان نہیں تھا، جسے میں جانتا تھا، وہ ریحان تو بے حد سجا
سنورا، نہایت نفیس اور نازک سا تھا، جب کہ میرے سامنے بیٹھا شخص آنکھوں کے گرد گہرے کالے حلقے لیے،

چہرے پر برسوں کی تھکن، بال اُلجھے ہوئے اور کئی دن کی بڑھی شیو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کبھی پہلے دارا ریحان کے چہرے یا لباس پر شکن نہیں دیکھی تھی، لیکن اس ریحان کے لباس اور چہرے پر اتنی زیادہ شکنیں تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے عمر بھر کی ''بے شکنی'' کا حساب لے لیا ہو۔ کچھ دیر کے لیے میں اُس کی یہ حالت دیکھ کر دروازے ہی پر جما رہ گیا۔ پھر ریحان ہی نے ابتدا کی ''تم آ گئے عبداللہ.....'' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا.....'' میں اُس کی جانب بڑھا ''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے.....وہ تمہیں اگر اس طرح دیکھتی تو اُسے کتنا دکھ ہوتا.....'' ریحان نے ایک گہری سی سانس لی ''جب سارے شہر کے آئینے ہی ٹوٹ جائیں تو بننے سنورنے سے کیا فائدہ.....؟ میں نے تم سے معافی مانگنے کے لیے آج تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں دانستہ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں پہنچائی، لیکن میری وجہ سے تمہیں بے حد اذیت اُٹھانی پڑی تمہیں ہتھکڑیاں لگائی گئیں، شدید بیماری کے عالم میں تمہیں اس تندور نما حوالات میں راتیں کاٹنی پڑیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ میں یہ سب نہیں چاہتا تھا لیکن یقین جانو میں بے اختیار تھا۔'' میں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''معذرت غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور پھر میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ میرا نصیب تھا لیکن اگر معافی ہی کسی اذیت کا مداوا ہے تو تم مجھے معاف کر دو، کیوں کہ تمہاری گرفتاری میرے وجدان کا شاخسانہ ہے اور میں خود کہیں نہ کہیں اپنے آپ کو بھی مجرم گردانتا ہوں۔'' ریحان تڑپ سا گیا۔ ''نہیں ..... بالکل نہیں ..... جسے تم گرفتاری کہتے ہو، اصل میں یہ میری پہلی رہائی ہے۔ میری ٹوٹی پھوٹی اور اندر سے کئی حصوں میں تقسیم شخصیت کے اتنے ریزے ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کرچیاں چننا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میری رُوح کی قابض نے میرا سب کچھ لوٹ لیا اور اس کا واحد علاج اسے پابند سلاسل کرنا ہی تھا۔ وہ ابھی تک میرے وجود پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے اور میری راتوں کا اندھیرا اب بھی اتنا ہی خوف ناک ہے۔ کاش تم میری زندگی میں لیلیٰ کی موت سے قبل آئے ہوتے تو شاید میری ساری جمع پونجی نہ لٹتی۔ کاش.....'' بولتے بولتے ریحان کی آواز بھرا گئی اور شدید ضبط کے باوجود اس کی معصوم آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ آنسو کیا تھے، تیزاب کی دو بوندیں تھیں، جو میرے دل کی پوری کائنات کو پل بھر میں جلا کر خاکستر کر گئیں۔ ہم انسان کتنے بے بس، کتنے معذور ہوتے ہیں کہ صرف زبانی ہمدردی کے علاوہ کسی اپنے کا غم تک اپنے اندر اُتار کر اس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے یوں لگا کہ میرے سامنے بیٹھ کر رونے والا ریحان نہیں، کوئی سات آٹھ سالہ بچہ ہے، جس کا سب سے پیارا کھلونا، کوئی اِسی کے سامنے توڑ کر چلا گیا اور وہ کچھ بھی نہیں کر پایا۔ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میری ایک بات مانو گے ریحان.....؟'' معصوم سے بھولے بچے نے سر اُٹھا کر گردن ہلائی۔ میں نے اُس کے ہاتھ مزید مضبوطی سے تھام لیے۔ ''جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو تنہائی میں خوب زور زور سے چیخ چیخ کر رونا.....اتنا رونا کہ یہ فلک پھٹ جائے اور اس آسمان سے پرے کی گلابی دُھند میں تمہیں تمہاری لیلیٰ کا چہرہ دکھائی دینے لگے۔ مجھے

ہے، تمہارے آنسو اس دُھند کو چیر کر اُس تک ضرور پہنچیں گے۔ پھر اُس سے جی بھر کر باتیں کرنا۔ مجھے
ہے، وہ اب بھی مسکرا کر تم سے بات کر لے گی۔'' ریحان نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کی آنکھوں
بہتا پانی مسلسل میری ہتھیلیوں کی پشت کو بھگو رہا تھا۔ زمانے کے لیے وہ ایک قاتل تھا، لیکن کیا کبھی کسی نے
معصوم قاتل بھی دیکھا ہوگا۔ مجھے کچھ یاد آیا۔ ''اور ہاں..... مجھے تم سے اپنے ایک اور جھوٹ کی معافی بھی
ہے۔ میں نے تمہیں لیلیٰ کے آخری جملے کے بارے میں جو بات کہی تھی۔ وہ صرف اُس پُراسرار عورت کا
رنگ لگانے کے لیے میری ذہنی اختراع تھی پتا نہیں، کیوں اور کب میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے
دی۔ مجھے اپنے اس جھوٹ پر بے حد شرمندگی ہے۔'' ریحان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''لیکن تم نے تو
ئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے خود اُس رات نیچے جھانک کر دیکھا تھا، تم لیلیٰ کے گرتے ہی چند لمحوں بعد اُس
قریب پہنچ گئے تھے۔ اور ٹھیک اُس کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ ضرور لیلیٰ نے تم سے کچھ بات کی ہوگی مگر
اپنی دگرگوں ذہنی حالت کی وجہ سے یاد نہیں رکھ پائے۔'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ میرا ذہن
میں سائیں کرنے لگا۔ تو گویا میری زبان سے جو لفظ ادا ہوئے تھے، وہ میرے ذہن میں ٹھیک اُسی وقت
ں آئے تھے، جب میں ریحان سے اُس کے گھر گالف کورس میں ملا تھا۔ لیلیٰ کی زبان سے ادا ہوئے وہ لفظ
رے سوئے ہوئے ذہن کی کسی دراز میں بند رہ گئے تھے اور صبح جب مجھے پولیس نے ساحل سے گرفتار کیا تو
رے جنوں کا وہ دور حسب معمول میری یاد سے محو ہو گیا۔ لیکن جب ریحان میرے سامنے آیا تو یاد کی کھڑکی
ے لیلیٰ کا وہ جملہ ہو کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور میری زبان سے ادا ہو گیا۔ مجھے انسانی ذہن کی بھول
لیوں اور اس کے کرشموں سے ایک بار پھر خوف محسوس ہونے لگا۔ جانے کتنے شعبدے جانے، کتنے عفریت
ہا چھٹانک بھر کے ذہن میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس ذہن کی موجودگی میں شاید ہر انسان ایک چلتا پھرتا
ل فشاں ہی تو ہوتا ہے، جو کسی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔ ریحان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی
ں اور صرف یہ ذہن ہی تھا۔

میں بہت دیر تک ریحان کے آنسو پونچھتا رہا۔ کاش اُس کے اندر بیٹھی وہ قابض قاتلہ میری رسائی میں
تا تو میں اس کو تصرف کے لیے اپنا ناکارہ وجود پیش کر دیتا کہ یہ جسم بوسیدہ تو اب خود دیوانگی کی راہ پر گام زن
ریحان نے مجھے بتایا کہ فی الحال نفسیات دانوں اور ڈاکٹروں نے اُس کی ہم زاد سے اُس کی جان چھڑانے
لیے نیند کو بطور ڈھال استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور سرِ شام ہی اندھیرا ہونے سے قبل ریحان کے جسم
ایک خاص مقدار میں نیند کی دوا تحلیل کر دی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر صبح دیر گئے تک ریحان سویا رہتا
ہے لیکن بقول ریحان، اُسے ڈر تھا کہ یہ ترکیب زیادہ عرصہ چل نہیں پائے گی، کیوں کہ وہ بہت پہلے خود بھی
تجربہ آزما چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اُسے نیند آجاتی تھی لیکن پھر رفتہ رفتہ بے چینی شروع ہونے لگی اور چند
ہفتوں بعد تو وہ اس کے خوابوں پر بھی قابض ہوتی گئی۔ نتیجتاً ریحان کو دورے پڑنے لگے اور اُسے نیند کی دوا ترک

کر دینی پڑی۔ اور پھر میں اس وقت اپنا ضبط کھو ہی بیٹھا، جب ریحان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ "کیا میں
اُسے ایک قاتل سمجھتا ہوں اور کیا میں کبھی ریحان کے لیے دعا کروں گا.....؟" میں جواب دیتے ہوئے رو
کہ میری اور میری دعاؤں کی کیا اوقات ہے۔ ہاں البتہ اگر اُوپر والے کے سامنے ہاتھ پھیلا کر اور گڑگڑا
مانگنے ہی کو دعا کہا جاتا ہے تو میں یہ مشق ریحان کی گرفتاری سے بھی پہلے سے کر رہا ہوں۔ کہ "یا مالک.....
انسان کو صبر دے، سکون دے اور ہمت عطا کر....." میں بہت دیر سے ریحان کے ساتھ بیٹھا تھا اور مجھے یہ
کے گزرتے وقت کی اطلاع صرف روشن دان سے چھنتی دھوپ کے مختلف زاویوں ہی سے مل رہی تھی۔ دھیرے
دھیرے شام قریب آ رہی تھی۔ میں نے نماز بھی ریحان کے کمرے ہی میں ایک صاف چادر بچھا کر ادا کی تا
ریحان سے بھی کہا کہ وہ نماز کی پابندی کی کوشش کیا کرے۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ بچپن میں یعقوب ڈرائیور
کے ساتھ وہ ہمیشہ جمعہ اور عید کی نماز کے لیے ضرور جاتا تھا۔ یعقوب کی بیوی، جو ریحان کی رُوحانی ماں کے
برابر تھی، اُس نے اُسے نماز اور سورتیں یاد کروائیں تھیں لیکن پھر دھیرے دھیرے وہ سب بھولتا گیا۔ میں نے
اُسے یقین دلایا کہ چاہے وہ مذہب کو بھلا بیٹھا ہو، لیکن مذہب اُسے کبھی نہیں بھولے گا اور جس دن ریحان
باوضو ہو کر جائے نماز پر کھڑا ہو گا، اُسے خود بخود سب یاد آ جائے گا۔ خود میرے ساتھ بھی تو یہی ہو چکا تھا
مذہب ہمارے اندر آتی جاتی سانس کی طرح زندہ رہتا ہے۔ جب ہم سانس لینا نہیں بھولتے اور کوئی ہمیں
سانس لینا سکھاتا بھی نہیں تو پھر مذہب ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔ بس، کچھ طریقہ کار سیکھنے کے لیے کبھی کسی رہ
اور کبھی ماحول کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عصر کے فوراً بعد ریحان کی دوا کا وقت ہونے لگا اور میرے جانے کی خبر سن کر نہ جانے وہ کیوں ایک
ہی بہت بے چین سا ہو گیا۔ شاید میں اُس کی عمر بھر میں اُس کا واحد دوست تھا، جس کے ساتھ اس نے صبح
شام تک کا وقت گزارا اور اپنے دل کی اتنی بہت سی انمول باتیں بانٹی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر عجیب
درد بھرے لہجے میں التجا کی "پھر آؤ گے نا عبداللہ.....؟" "ہاں..... ضرور..... کیوں نہیں..... اور اُس دن
صرف تمہاری لیلیٰ کی بات کریں گے۔ پتنگوں کی باتیں، دھانی آسمان اور نیلی ڈور کی باتیں..... جھاگ اُڑاتے
سمندر اور دودھیا بادلوں کی باتیں..... ٹھیک ہے نا.....؟" وہ بہت خوش ہو کر بولا "ہاں..... بالکل ٹھیک
ہے..... لیکن پکا..... تم آؤ گے نا..... ہاں..... بالکل پکا....." میں نے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھپتھپایا اور
نرس نے ریحان کے بازو میں نیند کی دوا انجیکٹ کر دی۔ میں ریحان کی پلکیں بوجھل ہونے تک وہیں اُس
سرہانے بیٹھا رہا۔ نیند کی سرمئی پری نے دھیرے دھیرے اپنے پنکھ اُس کے بوجھل پپوٹوں پر پھیرنا شروع
دیئے۔ ریحان کی پلکیں بھاری ہونے لگیں، لیکن سوتے سوتے بھی آج اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم اور
سی مسکان موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اُس کی زندگی کی سب سے پُرسکون نیند کی رات ہو
نیند کا یہ مکمل خزانہ آج کل ہم سب میں سے کسی کا بھی نصیب نہیں ہے۔ ہم سو تو جاتے ہیں مگر بنا نیند کے

ریحان کے سو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں گم صم سا بیٹھا رہا۔ میری بھیگی پلکیں مجھ سے بہت سے
ل کرتی رہیں مگر آج بھی میرا دامن جوابوں سے خالی تھا۔

رات بہت دیر سے میں ساحلی مسجد کے قریب بس سے اُترا تو ایک نئی پریشانی میرے انتظار میں مسجد کے
ہی ٹہل رہی تھی۔ مرتضیٰ صاحب مجھے آتا دیکھ کر تیزی سے میری جانب بڑھے اور انہوں نے بتایا کہ مغرب
نماز کے بعد اچانک سلطان بابا کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ فوری طور پر بستی کے حکیم کو لایا گیا، مگر معاملہ اُس کی پہنچ
ے دُور کا تھا۔ لہٰذا بستی والوں نے شہر کے ڈاکٹر کا انتظام کیا۔ میرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر واپس جا
تھا۔ میں لپک کر حجرے میں پہنچا تو سلطان بابا نیند میں تھے۔ پتا چلا کہ ڈاکٹر نے عارضی طور پر کوئی دوا اور نیند
یکا لگا تو دیا ہے لیکن اس نے ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کی ہے کہ پہلی فرصت میں صبح سلطان بابا کو شہر کے
ے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے۔

میں ساری رات وہیں بابا کے سرہانے ہی بیٹھا رہا اور اس ہم درد اور بزرگ مخلص کے چہرے کو دیکھتا
ا۔ چند مہینوں ہی میں میری زندگی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی کو کایا پلٹ کہتے ہیں۔ لیکن کتنی عجیب
ت تھی کہ اس پوری راہ میں میں نے زہرا کے علاوہ کوئی اور خوشی نہیں دیکھی تھی۔ ساحر کی زندگی جتنی ہموار تھی،
بداللہ کی زندگی اُسی قدر دشوار اور ہچکولوں سے بھری ہوئی تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جس
ذبے کو ہم نے خوشی کا نام دے رکھا ہے وہ کہیں بھی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی غم کا نہ ہونا ہی اصل میں خوشی
ہے۔ ورنہ سب طرف غم ہی غم ہوتا ہے۔ حسب معمول فجر کے وقت سلطان بابا کی آنکھیں میکانکی انداز میں
کھل گئیں۔ ہمارے ذہن میں لگے الارم کلاک کی سوئیاں سوتے میں بھی بالکل ٹھیک کام کرتی ہیں۔ میں نے
ہیں آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُن سے پوچھا ''آپ مجھے کیوں اتنا ستاتے ہیں.....؟'' سلطان بابا کے نحیف
ہرے پر ہلکی سی مسکان آ گئی۔ ''ستایا تو اپنوں ہی کو جاتا ہے میاں اور پھر جسے عبداللہ جیسا تیماردار میسر ہو وہ بار
ار بیمار نہ پڑے تو اور کیا کرے؟'' میں نے منت سماجت کر کے انہیں کم سے کم حرکت کرنے پر آمادہ کیا تو
انہوں نے وضو کے بعد بیٹھ کر اشاروں سے نماز ادا کی۔ سورج نکلتے ہی میں نے رحمٰن صاحب کو فون کر کے کسی
واری کا بندوبست کرنے کی درخواست کی اور ٹھیک پونے گھنٹے بعد ایک بڑی سی آرام دہ کار سمیت وہ خود مسجد
کے باہر موجود تھے۔ ہم نے سفر کے دوران بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی کہ سلطان بابا کے جسم کو راستے
کے ہچکولوں سے بچایا جائے، کیوں کہ رات والے ڈاکٹر کی بھی یہی ہدایت تھی۔

شہر کے بڑے اسپتال کے ڈاکٹر نے سلطان بابا کو معائنے کے دوران ہی اسپتال میں داخل کرنے کی
ہدایت کر دی۔ میں اور رحمٰن صاحب راہ داری ہی میں موجود تھے، جب ڈاکٹر صاحب مریض کے معائنے
والے کمرے سے باہر نکلے۔ ہم دونوں اُن کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ان بزرگ کو
ماضی قریب میں کوئی سر کی شدید چوٹ لگی ہے شاید۔'' ''جی..... کچھ حادثہ ہو گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا ''تو میرا

اندازہ درست تھا۔ کچھ پیچیدگی ہوگئی ہے۔ لیکن میں حتمی رائے تب ہی دوں گا، جب ان کے تمام معائنوں کی رپورٹ میرے پاس آجائے گی..... اللہ خیر کرے گا۔'' ڈاکٹر میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان بابا کو فوری نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا اور پھر سے وہی شیشے کی نلکیاں اور بوتلیں اُن کے جسم سے چپکا دی گئیں، جن سے انہیں شدید چڑ تھی۔ رحمان صاحب بھی بہت دیر تک میرے ساتھ ہی شیشے کی دیوار سے پرے کمرے میں لیٹے سلطان بابا کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں کوئی ضروری فون آیا تو وہ مجھ سے معذرت کر کے اپنے دفتر کی جانب روانہ ہوگئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ وقت جب اُڑنے پر آئے تو پر لگا کر اُڑتا ہے اور جب سر پر آئے تو یوں ایک ایک صدی کر کے سرکتا ہے کہ ہم ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے کئی جنم گزار دیتے ہیں۔ میں نے بھی نہ جانے اس لکڑی کی بنچ پر بیٹھے کتنے جنم پھر سے جی کر فنا کر دیئے۔ ڈاکٹروں کی نہ جانے کتنی ٹولیاں اندر آتی جاتی رہیں اور سلطان بابا کا معائنہ جاری رہا۔ نہ جانے کب پھر سے رات ہوئی اور پھر سویرا بھی ہوگیا۔ درمیان میں دو مرتبہ رحمٰن صاحب کا فون بھی آیا۔ میں دو رات پہلے ریحان سے ملنے کا وعدہ کر کے آیا تھا لیکن آج دوسرا دن چڑھ آنے کے باوجود یہاں سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔ جانے ہم انسان کس بل بوتے پر ایسے وعدے اور اتنے بڑے بڑے دعوے کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک پل کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔

پھر سہ پہر ڈھلنے کے بعد تھکے تھکے سے رحمٰن صاحب بھی آگئے۔ میں نے اُن سے ریحان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئے۔ میں بے چین ہوگیا اور اُن کی منت کی کہ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ آخر رحمٰن صاحب نے ہتھیار ڈال کر مجھے وہ اَن ہونی بھی سنا دی، جس کا خدشہ شاید میرے اندر بہت پہلے سے کہیں بیٹھا ڈنک مار رہا تھا۔ رحمٰن صاحب نے بتایا کہ ریحان اس رات بے حد پُرسکون نیند سویا تھا اور اُٹھنے کے بعد بھی وہ بہت پُرسکون رہا۔ لیکن سہ پہر کے بعد اُس کے اندر عجیب سی بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ فوراً کمرے کی کھڑکیاں کھول دی گئیں تاکہ اُسے دن ہونے کا احساس ہوتا رہے مگر وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر سر پٹختا رہا۔ شاید اُس کا وجود اندر سے چیخ رہا تھا اور برسوں سے اُس کے اندر پلتی دہری شخصیت کا جب لگاتار کئی راتوں تک اپنے اظہار کا موقع نہیں مل پایا تو اُس نے ریحان کے اعصاب اُکھیڑنا شروع کر دیئے تھے۔ ماہر نفسیات کے کہنے پر شام سے پہلے ہی کھڑکیوں کے پردے گرا کر ریحان کے کمرے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل اور میک اپ کا کچھ سامان پہنچا دیا گیا اور کمرہ باہر سے بند کر دیا گیا، لیکن کچھ ہی دیر میں ریحان نے سنگھار میز کے آئینے کو ایک ہی ضرب سے کرچی کرچی کر دیا اور سنگھار کا سارا سامان اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ اسپتال کے عملے نے فوراً ریحان کو قابو کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس کا جنوں بڑھتا ہی گیا اور نصف شب تک وہ خرد کی آخری حد بھی پار کر چکا تھا۔ مجبوراً اُسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے لیکن ریحان جس گلابی دُھند کے پار جا چکا تھا، وہاں سے واپس نہ لوٹ پایا۔ اگلی صبح اسپتال کی راہ داریاں اُس کے دیوانہ وار قہقہوں سے گونج رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر میں لوگوں کو کسی معصوم بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ معصوم بچہ، جس کی

پاری ماں کو لوگ اُس سے چھین کر لے جا رہے ہوں اور وہ رو رو کر اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو کہ اب اُسے رات
لوری کون سنائے گی، کون صبح اُس کے بال سنوارے گی اور کون اُسے ہنس کر اپنے سینے سے لگائے گی۔ میرا
ل پھٹنے لگا اور مجھے یوں لگا کہ ریحان کے ساتھ ساتھ میں بھی اسی گلابی دُھند کے پار جا رہا ہوں۔

''ہوش والوں کو خبر کیا.....''

ریحان نے ہمیشہ کے لیے اپنا ناتا اس ہوش کی دنیا سے توڑ لیا تھا، جہاں اُس جیسے نازک احساس وا
کے لیے ذی ہوش خود دیوانہ تھا۔ یہ دنیا ویسے بھی اس کے کام کی نہیں تھی، جہاں کانچ کا من رکھنے والوں کو ہر
پتھروں کا سامنا رہتا ہے۔ اس شام جب سلطان بابا نے تین دن کی بے چینی کے بعد ذرا دیر کے لیے غنودگی کی
چادر اوڑھی تو میں رحمٰن صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ریحان کو دیکھنے کے لیے گیا۔ آہنی سلاخوں سے
پرے ایک ایسے کمرے میں، جس کی دیواروں کو اندر سے چکنے اسٹیل سے ڈھک دیا گیا تھا اور جس کی اونچی
چھت کے اندر صرف ایک بلب کے جلنے کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔ ریحان گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔
ہماری آہٹ سن کر اس نے سر اُٹھایا اور کسی بچے کی طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر جلدی سے ہماری جانب سے
پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا لیکن اچانک ہی جیسے اُسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے بھاگ کر سلاخوں کے قریب آ گیا
رحمٰن صاحب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میری امی کب آئیں گی.....؟'' رحمٰن صاحب نے جھوٹی مسکراہٹ
لبوں پر سجائی۔ ''تمہاری امی جلد آ جائیں گی شرط یہ ہے کہ تم روؤ گے نہیں، نہ ہی یہاں کے عملے کو تنگ کرو گے۔
ریحان خوش ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے..... پکا؟'' رحمٰن صاحب نے اُس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''بالکل
پکا.....'' وہ فوراً جا کر اپنی جگہ پر یوں باادب بیٹھ گیا، جیسے کوئی بہت تمیز دار بچہ اپنی ماں کے حکم کے مطابق
جگہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ مجھ سے پھر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ کتنا نازک ہوتا ہے یہ انسان، کتنا کومل،
ملائم احساس والا..... پھر بدل کیسے جاتا ہے۔ مکاریاں، فریب، چال بازیاں، دشمنیاں، حسد، برائیاں
کینہ پروری، چوری، جھوٹ، خیانت اور دغا بازیاں کیسے سیکھ لیتا ہے؟ اگر جنوں انسان کو پھر سے ریحان
طرح معصوم بنانے کے عمل ہی کا نام ہے تو اے کاش قدرت سب ہی ہوش مندوں کو مجنوں کر دے اور پھر
کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ہوش والے بھلا جنوں کی حکایت کو کیا جانیں، بے خودی کی لذت تو صرف دیوانو
ہی کا انعام ہے۔ یہ نادان ہوش والے تو بس ساہوکار کی طرح لین دین اور نفع و نقصان کے پھیرے میں پڑ
رہتے ہیں لیکن ایک دن انہیں بھی سب کچھ یہیں چھوڑ کر دیوانوں کے ساتھ ہی کوچ کرنا پڑتا ہے۔

میں واپس اسپتال تو آ گیا تھا لیکن اپنے دل کا ایک ٹکڑا وہیں ریحان کے پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ خود
اپنی حالت بھی نہایت ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ رگوں میں سلگتی چنگاریاں وقفے وقفے سے ایک بھڑکتا شعلہ بن
میرے پورے سراپے کو جھلسا رہی تھیں لیکن میں ضبط کیے بیٹھا رہا۔ میں ایسے موقع پر ڈاکٹروں کی توجہ اپنی جا

ل کروا کر سلطان بابا کے سامنے سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ جبر میں نے رات بھر خود پر اس طرح جھیلا
ع میرا سارا بدن بخار میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر صبح ڈاکٹروں نے سلطان بابا کے معائنوں کے حتمی نتائج
ے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ انہیں جس جدید علاج کی ضرورت ہے، وہ ملک کے صرف دو شہروں میں
ب ہے، جس میں ایک میرا اپنا شہر بھی شامل تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے ہمارے شہر کے لیے ہفتے بھر
رف ایک جہاز اُڑتا تھا اور بدقسمتی سے آج وہی دن تھا اور اُڑان کا وقت بھی نکل چکا تھا۔ زمینی راستے سے
نے والی سلطان بابا کی حالت نہیں تھی اور ٹرین تک پہنچنے کے لیے کم از کم یہاں سے دو دن کا زمینی سفر درکار
پھر نہ جانے رحمٰن صاحب کے ذہن میں کیا خیال آیا۔ انہوں نے دو چار فون گھمائے اور گھنٹے بھر بعد ہی آ
یہ مژدہ سنایا کہ شہر کی بندرگاہ پر ایک بہت بڑا غیر ملکی بحری جہاز آ کر لگا اور ٹھیک چھ گھنٹے بعد اُس کی روانگی
رحمٰن صاحب نے ہمارے لیے دو فرسٹ کلاس کے کیبن مختص کروا لیے تھے۔ ہمیں یہ بحری جہاز آج سے
پانچویں دن شہر کی بندرگاہ پر اُتار دیتا۔ بقول رحمٰن صاحب یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی منزل
جانب چل پڑتے کیوں کہ سات دن بعد بھی اگر موسم یا کسی دوسری انہونی کی وجہ سے ہم سے اگلی فلائٹ بھی
جاتی تو مزید دیر بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو انہوں نے زور سے میرا کاندھا تھپتھپایا
برے ساتھ سامان سمیٹنے میں مشغول ہو گئے۔

جب ہم بندرگاہ پہنچے تو وہ عظیم الشان نیلے رنگ کا بحری جہاز جس کی سات منزلیں تو دُور ہی سے گنی جا سکتی
کسی فوج کے فاتح سپہ سالار کی طرح سینہ تانے لنگر انداز تھا۔ جہاز پر سنہری اور سفید حروف میں بڑا بڑا
بلانکا لکھا ہوا تھا اور اطالوی نژاد عملہ عرشے پر اور نیچے سیڑھیوں پر کھڑا آنے والے مہمانوں کا استقبال کر رہا
اس بحری جہاز کو دیکھتے ہی مجھے اِسی جیسے ایک دیو ہیکل سفینے کے ڈوبنے کا واقعہ یاد آ گیا، جس سے جڑی
ن کی ایک لافانی داستان کو لوگوں نے پردے پر بھی بے حد سراہا تھا۔ رحمٰن صاحب کے عملے نے ایمبولینس
اُتار کر اسٹریچر پر لیٹے سلطان بابا کو نہایت احتیاط سے مشین کے ذریعے اوپر جہاز پر پہنچا دیا۔ جہاز کے
نے ایک زوردار ھنکار اُبھرا اور میں نے رحمٰن صاحب کی جانب الوداعی ہاتھ بڑھا دیا۔ انہوں نے میرا
کھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے "زندگی رہی تو تم سے ملاقات ضرور ہو گی۔ میں جانتا ہوں تم نے
سلطان بابا کی حالت کے پیش نظر اپنی تکلیف ہم سب سے چھپائے رکھی، لیکن تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست
اپنے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنا چیک اب بھی ضرور کراؤ گے۔ تمہارے یہاں کے معالج تمہارے لیے
فکرمند ہیں۔ انہیں ابھی تک تمہاری بیماری بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں آئی اور تمہیں یوں درمیان میں ہی
چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے....." میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں اُن کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا۔ وہ تب تک
بندرگاہ کی میلوں پھیلی سلیب پر کھڑے رہے، جب تک جہاز لہریں اُچھالتا اور کسی مست ہاتھی کی طرح
گہرے پانیوں میں نہیں نکل آیا۔

جہاز نے جس وقت لنگر اُٹھایا تھا اس وقت عصر کا وقت تھا اور اب مغرب بھی ڈھل چکی تھی۔ میں سلطان بابا کو اُن کے کیبن میں دوا کھلا کر، کمبل اوڑھا کر باہر عرشے پر نکل آیا۔ کھلے سمندر میں سورج ڈوبنے کے بعد بھی بہت دیر تک شفق کی لالی برقرار رہتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سورج غروب ہونے سے پہلے سمندر کے ساتھ اپنی آخری جنگ لڑ رہا تھا، تب اُس کی سنہری کرنوں نے اُفق تا اُفق لہروں کو اپنا سونا سونپ کے درخواست کی کہ آج وہ سورج کو نہ ڈبوئے..... لیکن سمندر بھلا کب کسی کی سنتا ہے، جو ان معصوم کرنوں کی مانتا۔ نتیجتاً ازل سے جاری اس لڑائی میں ایک بار پھر شام ڈھلے سورج کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور سمندر ایک بار پھر جیت گیا۔

میں جانے کتنی دیر عرشے پر لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑا لہروں کو سمندر کی جیت کا جشن مناتے دیکھ رہا۔ اچانک پیچھے سے کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ چونک کر پلٹا تو احرام باندھے کوئی عازم حج کھڑا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہوتے، میری نظر عازمین حج کی ایک ٹولی پر بھی پڑی تھی وہ راہِ حق کا مسافر مجھے دیکھ کر مسکرایا "کہیں بہت دُور کھوئے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہیں سمندر کا جادو تمہیں کھینچ نہ لے..... اس لیے مخل ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں۔" میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ "میرے اندر بیک وقت نہ جانے ایسے کتنے سمندر ٹھاٹھیں مارتے رہتے ہیں، اس کا جادو ٹونا میرے لیے نیا نہیں۔" "بہت خوب..... کوئی لمبا سفر درپیش ہے؟ اور وہ بزرگ اب کیسے ہیں، جو تمہارے ہم سفر ہیں۔ میں نے جہاز پر سوار ہوتے وقت انہیں تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔" "جی وہ آرام کر رہے ہیں۔ طبیعت کچھ مضمحل ہے اُن کی۔ ہم اگلی بڑی بندرگاہ پر اُتر جائیں گے۔ وہی میرا شہر اور ہماری منزل بھی ہے۔" اُس نے بآواز بلند کہا "انشاءاللہ..... کچھ دیر ہم دونوں پہاڑ جیسی لہروں کو نیچے جہاز کے پیندے سے ٹکرا کر فنا ہوتے دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آداب تکلم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بات جوڑی "البتہ آپ کا سفر کافی طویل ہے۔ کتنے عرصے میں پہنچ جائیں گے اُس کے گھر.....؟؟" "شاید چودہ پندرہ دن لگیں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ یہی پندرہ دن پچپن سال زندگی کا حاصل ہیں۔ تم نے حج کیا ہے.....؟؟" "نہیں..... مجھے فی الحال یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی..... اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ بہت ہمت اور حوصلے کا کام لگتا ہے۔ جانے میرا ظرف اس قابل کبھی ہو گا پائے گا یا نہیں۔" وہ ہنس دیئے "سب بلاوے کی بات ہے میاں..... بلاوا آجائے تو لمحوں میں انسان کا انتظام تیار ہو جاتا ہے۔ خود میرا بھی حال تم سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں کبھی اس سفر کے لیے نکل ہی نہیں پاؤں گا۔ لیکن جب بات بننے لگی تو یوں بنی کہ جیسے بس اِسی سفر کے انتظار میں ہی تو میری ساری عمر کٹی ہے۔" کافی دلچسپ انسان تھے۔ اُن کا نام حبیب البشر تھا۔ تیسری منزل پر چند دوسرے ایشیائی باشندوں کے ساتھ اُن کا مشترکہ کیبن تھا۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ عرشے پر کھڑے باتیں کرتے رہے، اُنہوں نے بتایا کہ دو سال پہلے نیویارک میں کاروبار کرتے تھے اور مذہب سے اُن کا دُور دُور تک کوئی واسطہ یا رابطہ نہیں تھا۔ میں نے بے خیالی ہی میں پوچھ لیا۔ "آپ نیویارک میں کیا کرتے تھے؟" "میرا ڈانس کلب تھا وہاں۔ ویک اینڈ

پارٹی اور فنکشن کا اہتمام کروایا کرتا تھا میں۔'' جواب سن کر میں زور سے چونکا۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے۔ میں نے معذرت کی کہ خواہ مخواہ اُن کی نجی زندگی کو کریدا۔ وہ ہنس دیئے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں میاں..... میں نے کہا نا کہ میں چودہ پندرہ سال کی عمر میں امریکا منتقل ہو گیا تھا، لہٰذا میرا اسلام سے برائے نام رشتہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ پھر ایک دن کچھ لوگ میری زندگی میں آئے اور میری راہیں بدلتی گئیں۔'' وہ دُور اُفق کے پار کچھ دیکھتے ہوئے کھو سے گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُس روز نیویارک میں پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا تھا لہٰذا لوگ قریبی مقامات تک پیدل چل کر جا رہے تھے۔ سڑکوں پر کسی میلے یا تہوار جیسی بھیڑ تھی۔ نوجوان حبیب بھی ہلکی ہلکی گرتی برف میں سردی سے جمتے ہاتھ اوورکوٹ کی جیب میں ڈالے، سیٹی پر کوئی مشہور دُھن گنگناتا، کلب کی جانب جا رہا تھا۔ آسمان کے تیور بتا رہے تھے کہ کسی بھی وقت برف باری تیز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا لوگوں کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ تیز سرد ہوا کے تھپیڑے لباس کے اندر داخل ہو کر جسم کے پار نکلے جاتے تھے۔ حبیب قریبی چوراہے کے سگنل پر پہنچا تو بتی سرخ تھی۔ اچانک پیچھے سے کسی نے پکارا۔ ''نوجوان''..... کیا تم دو لمحوں کے لیے ہماری بات سن سکتے ہو؟'' حبیب چونک کر پلٹا۔ پیچھے پانچ باریش بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ ''جی فرمایئے.....'' کیا تم ہمیں اپنے قیمتی وقت میں سے صرف دس منٹ دے سکتے ہو، اللہ کے لیے.....'' حبیب سمجھا کہ وہ کوئی چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بزرگ اُس کا مقصد سمجھ کر مسکرائے ''نہیں..... پیسہ نہیں..... صرف وقت..... اور وہ بھی دس منٹ.....'' ''لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور پھر نیویارک جیسے شہر میں آپ کو کوئی بھی دس منٹ نہیں دے گا۔ یہاں وقت ہی سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔'' ''تب ہی تو ہم نے کہا کہ اپنا قیمتی وقت دے سکتے ہو۔ اُس اللہ کے نام پر، جس نے تمہیں پیدا کیا اور اتنی اچھی صورت دی اور آرام دہ زندگی عطا کی۔ ہم تم سے تمہارے دس منٹ مانگنے کے لیے سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ اور یہاں سب سے ہمارا بس اتنا ہی مطالبہ ہے لیکن اب تک زیادہ تر دھتکار ہی ملی ہے۔'' حبیب نے کچھ دیر سوچا اور پھر نہ جانے کیوں اُس کا دل پسیج گیا۔ ''ٹھیک ہے..... لیکن صرف دس منٹ..... ایک سیکنڈ بھی زیادہ نہیں، کیوں کہ مجھے اپنے کلب پہنچنا ہے اور ایک بہت ضروری شو کا اہتمام کرنا ہے۔'' سگنل کھل چکا تھا۔ باریش ٹولی حبیب کو سامنے ہی شیشوں کے بڑے بڑے دروازوں والے ایک کیفے میں لے گئی۔ برف باری تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پار کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں کے نشان برف پر بننے شروع ہو چکے تھے۔ حبیب نے کیفے میں داخل ہو کر سر کے بالوں میں جمی برف کو جھاڑا۔ انہوں نے کھڑکی کے سامنے والی میز سنبھال لی۔ ایک بزرگ نے بیگ میں سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تلاوت کی۔ ساتھ بیٹھے دوسرے بزرگ نے ترجمہ سنایا ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے.....؟'' تلاوت جاری رہی اور ترجمہ ہوتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو منٹ بعد بزرگ نے تلاوت بند کر دی۔ ''دس منٹ پورے ہونے کو ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اپنے وقت میں سے دس منٹ اللہ کے نام کر دیئے۔ جزاک اللہ.....'' لیکن

حبیب ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔ ''کیا آپ میرے لیے پانچ منٹ مزید یہ کتاب پڑھ سکتے ہیں..... میں اپنا وقت کور کرنے کے لیے زیر زمین ٹرین پکڑ لوں گا۔'' بزرگ نے بنا کچھ کہے پھر سے کتاب کھولی اور مزید پانچ منٹ تلاوت کی۔ حبیب نے گھڑی دیکھی ''اگر میں اپنے عملے کو موبائل کے ذریعے ایک پیغام بھیج دوں تو وہ میرے پہنچنے تک کچھ انتظامات شروع کر سکیں گے۔ اس صورت میں میرے پاس مزید پندرہ منٹ بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو میں مزید سُننا چاہوں گا۔'' پندرہ منٹ مزید تلاوت ہوتی رہی۔ لیکن حبیب اب بھی کچھ بے چین سا تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنا شو ختم کر کے رات دس بجے دوبارہ اس کیفے میں آئے گا اور پوری سورۃ دوبارہ سنے گا۔ وہ رات بھی آ گئی اور نصف شب تک تلاوت بھی ہوتی رہی لیکن معاملہ اب بھی وہی تھا۔ حبیب کی تشنگی..... پھر طے یہ ہوا کہ حبیب اتوار کے روز جماعت کے ساتھ مین ہٹن کے علاقے میں پورا ایک دن گزارے گا۔ وہ دن بھی گزر گیا۔ حبیب نے ہچکچاتے ہوئے بزرگ سے پوچھا کہ یہ پوری کتاب اور یہ پورا پیغام سننے کے لیے اُسے ان لوگوں کے ساتھ کتنا وقت بتانا ہوگا؟ کیوں کہ تین دن تو وہ کسی نہ کسی طرح نکال ہی لے گا۔ بزرگ نے کہا ''جزاک اللہ۔'' اور تین دن کے لیے حبیب البشر اُن کے ساتھ ہو لیا۔ پھر تین سے دس اور دس سے بات چالیس دنوں تک جا پہنچی اور جب چالیس دن کے بعد حبیب گھر پہنچا تو وہ حبیب نہ تھا، جسے اُس کی گلی نمبر 128 والے لوگ جانتے تھے۔ ڈانس کلب دھیرے دھیرے کافی کے کیفے میں تبدیل ہو گیا، جس کے باہر لگا بڑا سا بورڈ دُور سے لوگوں کو نظر آ جاتا تھا۔ جس پر لکھا تھا ''یہاں شراب فروخت نہیں کی جاتی۔'' زندگی کا پہیہ گھومتا رہا اور اپنے وقت میں سے دیئے گئے دس منٹوں نے حبیب کو کچھ ایسا خراج ادا کیا کہ وہ خود اُن لوگوں کا سربراہ بن گیا، جو لوگوں سے اللہ کے لیے چند منٹ طلب کرنے دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک دن حبیب چند لوگوں کے ساتھ مشرقی ساحل والے اپنے آبائی شہر میں اُترا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ حبیب صاحب اپنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئے۔ بیس برس کا جمع پانی اُن کی آنکھوں سے نکل کر سمندر کے نمک کو مزید نمکین کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ بقول اُن کے، بیس برس بعد آخر کار اُن کا وہاں سے بلاوا آ ہی گیا تھا، جہاں جا کر وہ ماتھا ٹیک کر تب تک نہ اُٹھتے، جب تک انہیں اپنے پچھلے ہر گناہ کی معافی کا یقین نہیں ہو جاتا۔ وہ یہ شکوہ بھی کرنے جا رہے تھے کہ وہ پراسرار بندے جو عمر کے چونتیسویں سال میں نیویارک کے ایک چوراہے پر اُن سے ملے تھے وہ انہیں پہلے کیوں نہیں ملے.....؟ وہ اس کے پیارے حبیب ﷺ کے روضے کی جالی سے اپنی جبیں ٹکا کر تب تک رونا چاہتے تھے، جب تک اُن کی آنکھوں کا پانی بھی آبِ زم زم کی طرح میٹھا نہ ہو جائے..... میں عقیدت سے اس انسان کی طلب کو محسوس کرتا رہا۔ سمندر کی لہریں اب بپھرنی جا رہی ہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ نچلی منزل پر اوّل درجے کے مہمانوں کے ریسٹورنٹ کی گھنٹی بج چکی تھی اور اندر سے پیانو کی ہلکی سی موسیقی کی تانیں باہر عرشے تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ حبیب صاحب تیسری منزل کے مہمان تھے، لہٰذا انہیں اُسی ریستوران میں کھانا کھانے جانا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ رحمٰن صاحب نے بتایا، مجھ

ے پوچھے ہی جہاز کے سب سے اعلیٰ حصے کے ٹکٹ کروا لیے تھے۔ مجھے جہاز کا اطالوی عملہ دو مرتبہ آ کر یاد دہانی کروا چکا تھا کہ کھانا نیچے ریستوران میں چن دیا گیا ہے۔ حبیب صاحب بھی نیچے جانے کے لیے پلٹے۔ چانک میں اُن سے پوچھ بیٹھا "کیا وہاں پہنچنے تک میں آپ کو یاد رہ پاؤں گا؟ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ برے لیے اُس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا مانگ سکتے ہیں اور اُس جالی کے سامنے بھی، اگر آپ کو یاد ہے تو.....؟" حبیب صاحب تڑپ کر پلٹے "ہاں ضرور..... کیوں نہیں..... یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی خاص دعا کروانی ہے تو وہ بھی بتا دو....." میں کچھ دیر خاموش رہا "ہاں ..... بہت خاص..... دعا بھی کیا ہے، بس ایک پیغام ہے کہ آپ نے اسے صرف چالیس دن میں پالیا، میں چالیس صدیاں بھی ریاضت کرنے کو تیار ہوں، بس مجھے مکمل دیوانہ کرنے سے پہلے ایک بار چند لمحوں کے لیے فرزانگی عطا کر دے۔ وہ فرزانگی، جو میری آنکھوں پر پڑے سب پردے اُٹھا دے۔" جانے حبیب صاحب کو میری بات سمجھ بھی آئی کہ نہیں۔ وہ کچھ دیر نم آنکھوں سے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے سے بولے "انشاءاللہ۔۔۔۔۔"

میں اُن سے رخصت ہو کر نیچے ریستوران میں پہنچا تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ خوب صورت سفید اور نیلی وردیوں میں چاق چوبند بیرے اور دیگر عملہ مہمانوں کی خدمت میں مشغول تھا۔ ایک جانب پیانو پر ایک خوش گلو دوشیزہ بیٹھی کسی اطالوی اوپیرا کا کوئی مشہور گیت بجانے کے ساتھ دھیمے سُروں میں گنگنا بھی رہی تھی۔ سارے ہال میں غیر ملکی مسافر ہی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد اور اناس کی چند قاشیں رکھیں اور ایک اندھیرے گوشے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ سامنے سے آتی ایک غیر ملکی خاتون سے، جو اپنی چار پانچ سالہ بچی کو پکڑنے کے لیے لپک ہی رہی تھیں، زور سے ٹکرا گیا۔ میری پلیٹ سے سلاد اُن کے لباس اور پھر زمین پر بکھر گیا۔ اُن کا پارہ ایک دم ہی آسمان کو چھو گیا اور انہوں نے بنا میری معذرت سُنے انگریزی میں مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں، حالانکہ غلطی بھی اُن ہی کی تھی۔ میرے سادہ سے شلوار کرتے کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی نچلے عملے ہی کا کوئی رُکن سمجھی تھیں اور پھر پورا ہال ہماری جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ "جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں احمق لوگ۔ جنہیں ریستوران کے آداب کی بھی تمیز نہیں۔ میرے سارے لباس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اس آدمی کو کس نے ہال میں آنے دیا ہے۔ میری کپتان سے بات کرواؤ ابھی....." وہ بنا وقفے کے چلائے جا رہی تھیں۔ میں چپ چاپ کھڑا اپنی وضاحت پیش کرنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک جہاز کی ایک اٹینڈنٹ بدحواس سی میری جانب دوڑتی ہوئی آئی "وہ جو بزرگ آپ کے ساتھ تھے..... اُن کی حالت بگڑ رہی ہے....."

کاسابلانکا

یہ سنتے ہی میں اُس عورت کو چیختا چلاتا چھوڑ کر اپنے کیبن کی جانب لپکا، وہاں پہلے ہی سے جہاز کی طبّی ٹیم کے مستند ڈاکٹر موجود تھے۔ سلطان بابا کو آکسیجن لگائی جا چکی تھی اور ان کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر سے پوچھا کہ ''کیا ماجرا ہے؟'' ڈاکٹر نے سلطان بابا کی نبض سے ہاتھ اُٹھایا۔ ''عام طور پر بوڑھے افراد کو سمندری بخار (Sea sickness) ہو جاتا ہے۔ ایسے میں متلی، چکر آنا یا دل گھبرانا معمول کی بات ہے، لیکن چونکہ یہ بزرگ پہلے ہی سے بیمار چلے آ رہے تھے، لہٰذا دونوں وجوہ نے مل کر ان کے نظام تنفس کو ایک دھچکا دیا ہے۔ بہر حال..... ہم نے آکسیجن لگا دی ہے۔ ہمارے عملے کی نرس ساتھ والے کیبن ہی میں رات بھر موجود رہے گی۔ اگر آپ ذرا سی بھی غیر معمولی بات محسوس کریں تو فوراً اُسے طلب کر سکتے ہیں۔ شب بخیر.....'' فرانسیسی ڈاکٹر انگریزی میں مجھے تسلی دے کر وہاں سے رُخصت ہو گیا۔ نرس بھی اطالوی تھی۔ اُس نے مجھے خودکار گھنٹی کا ریموٹ پکڑا دیا کہ ضرورت پڑنے پر میں صرف یہ بٹن دبا دوں تو وہ حاضر ہو جائے گی۔ میں نے سلطان بابا کے بستر کے بالکل سامنے پڑی آرام کرسی سنبھالی اور کیبن کی روشنیاں مدھم کر کے کرسی پر کمر ٹکا لی۔ جانے کتنی دیر میں آکسیجن سلنڈر کے ساتھ جڑی شیشے کی نلکی میں پانی کے بلبلے بن کر ختم ہوتے دیکھتا رہا۔ ہماری زندگی بھی تو فقط پانی کا ایک بلبلہ ہی ہے۔ یہاں بنا..... وہاں ختم..... جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن دوسری مرتبہ دستک کی آواز واضح تھی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو راہ داری میں رات کے کھانے کے لباس (ڈنر سوٹ) میں ایک وجیہہ شخص، باریک سا خوب صورت نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ اُس نے میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ ''اس وقت زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں، مجھے راحیل کہتے ہیں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں عبداللہ ہوں۔ کہیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' وہ کچھ ہچکچایا۔ ''دراصل میں تم سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ ڈائننگ ہال میں تم پر بلاوجہ چلّانے والی میری بیوی نتاشا تھی۔ میں جانتا ہوں کہ غلطی تمہاری نہیں تھی، لیکن اُس نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ اُس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ایشیائی ہو اور پھر جب میں نے جہاز کے عملے سے تمہارے کوائف پوچھے تو پتا چلا کہ تم میرے ہم وطن بھی ہو۔ میں درحقیقت تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''بھول جائیے۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' ''نہیں..... یہ بھولنے والی بات نہیں ہے، لیکن نتاشا خود شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور

نے جانے کس بات کا غصہ تم پر اُتار دیا، ورنہ وہ عمومی طور پر نہایت شائستہ اطوار کی خاتون ہے۔'' میں نے
اتاسف کم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ '' آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں، یقین کریں میں ڈائننگ ہال
نکلنے سے پہلے ہی سب فراموش کر چکا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لیے مجھے جلدی
وہاں سے نکلنا پڑا۔'' ''ہاں مجھے پتا چلا ہے۔ اب کیسے ہیں وہ بزرگ؟'' ''کچھ بہتر ہیں۔ یہ انہی کا کیبن
میرا کیبن ساتھ والا ہے۔'' اتنے میں عملے کی ایک اٹینڈنٹ ہمارے قریب آئی اور مؤدب انداز میں
ل صاحب سے مخاطب ہوئی۔ ''جناب آپ نے فرسٹ کلاس کے ایگزیکٹو سوئیٹ کے لیے حکم دیا تھا، لیکن
بات کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس وقت کوئی بھی رائل یا ایگزیکٹو کیبن خالی نہیں ہے، لہٰذا ہم معذرت خواہ
۔ البتہ اگر آپ پسند کریں تو چوتھی منزل پر ایک دوسرے درجے کا کیبن فی الوقت میسر ہے۔ آپ کہیں تو
آج رات کے لیے بک کر دیا جائے۔'' راحیل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، جیسا آپ
ب سمجھیں۔'' اطالوی لہجے میں انگریزی بولنے والی اٹینڈنٹ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے راحیل
ب سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ رات میرے کیبن میں بھی گزار
ہیں۔ میں ویسے بھی رات بھر اپنے ہم سفر کے کمرے میں گزاروں گا۔ انہیں میری تیمارداری کی ضرورت
۔'' راحیل صاحب ہچکچا سے گئے۔ ''نہیں نہیں..... کچھ انتظام ہو جائے گا، آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔''
ں میں نے اصرار کر کے اپنے کیبن کی چابی اُن کے حوالے کر دی۔ اور خود سلطان بابا کے کیبن میں چلا آیا۔
ت کے آخری پہر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ والے کیبن میں کچھ تیز لہجے میں بحث کی آوازیں
رہی ہوں، لیکن میں نے دانستہ راہ داری میں نکلنے سے گریز کیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میاں بیوی میں کچھ
ان چل رہی ہے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں انہیں اپنے معاملات سلجھانے کا موقع دوں۔ صبح تک سلطان بابا
دو مرتبہ آنکھیں کھولیں اور دونوں مرتبہ مجھے جا کر سونے کا اشارہ کیا، لیکن وہ میرے جواب سے بھی خوب
ف تھے۔ صبح کے بعد اُن کی نیند کچھ پرسکون ہوئی تو میں باہر نکل آیا۔ ٹھیک اُسی وقت راحیل صاحب بھی
ٹہلنے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ''رات میں
کسی طرح سے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ نتاشا نے مجھے آدھی رات کو ڈھونڈ لیا تھا۔ دراصل ہمارے
یان تمہارے معاملے پر ہی کچھ اَن بن ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنا کیبن چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ پہلے تو وہ میرے
ن سے یوں چلے آنے پر بہت ناراض ہوئی اور پھر جب میں نے اُسے یہ بتایا کہ میں اس وقت اُسی نوجوان
کیبن میں ہوں، جسے اُس نے بھرے ہال میں سخت سست سنائی تھی، تو وہ بہت دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں
سکا۔ اتنا شرمندہ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں رات ہی اپنے کیبن واپس لوٹ گیا تھا۔ بہر حال، تمہارا
شکریہ۔'' انہوں نے کیبن کی چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور مجھے اپنے ساتھ ناشتے کے لیے چلنے کی
دعوت دی۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں لباس تبدیل کر کے نیچے ہال میں اُن سے ملوں گا۔ کبھی کبھی نیم گرم پانی

کا ایک طویل شاور ہماری رگوں سے تھکن یوں نچوڑ لیتا ہے، جیسے گیلی ریت پر لکھے کسی نام کو سمندر کی ایک لہر اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ میں نیچے ڈائننگ ہال پہنچا تو کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور آسمان پر ہلکے بادلوں سے چھن کر آتی دھوپ نے ہال کے چاروں طرف لکڑی کے چکنے فرش پر دھوپ درجنوں کھڑکیاں سی بنا رکھی تھیں۔ میں ابھی بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ راحیل صاحب نے آواز دی۔ ''یہیں آ جاؤ نوجوان..... ہماری میز پر ایک کرسی خالی ہے.....'' لیکن میں نے دُور ہی سے ہاتھ ہلا کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور عرشے کے جانب کھلتی ایک کھڑکی کے قریب پڑی میز پر اپنے دلیہ کا پیالہ رکھ تب ہی میں نے نتاشا کو میز سے اُٹھ کر اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک دل کش خاتو تھیں۔ سلیقے سے کٹے ہوئے سنہرے بال، جو فلیپر سے میچنگ اسکارف سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں آج دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور دونوں ہی مرتبہ جانے کیوں مجھے اُن کے چہرے کے ایک زاویے سے کسی کے ساحر کی پسندیدہ ہالی وڈ آرٹسٹ کیتھرین زیٹا جونز کی جھلک بہت واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُر میں اجازت لے کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کل رات راحیل صاحب بھی مجھ سے اُردو میں بات کر رہے تھے لیکن نتاشا کو اُردو میں اپنے لفظ جوڑنے کے لیے کافی مشقت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے کچھ انہیں یہ ''ناکام کوشش'' کرنے دی اور پھر دھیرے سے اُن سے انگریزی میں کہا کہ وہ چاہیں تو اب یہ کوش ترک کر کے مجھ سے انگلش میں بات کر سکتی ہیں۔ کچھ دیر کے لیے تو وہ بھونچکا سی رہ گئیں اور پھر انتہائی مدا سے بولیں۔ ''اوہ..... تو تم انگلش بول لیتے ہو، لیکن مجھے راحیل نے تو بتایا تھا کہ..... پھر تو میں مزید نادم ہوا کیوں کہ تم نے میری گزشتہ رات کی ساری گفتگو سمجھ لی ہوگی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کبھی کسی پر طرح نہیں چلائی۔'' میں مسکرایا۔ ''چلیں یہ اعزاز میری قسمت میں لکھا تھا، ورنہ عام طور پر بے چارے شو نصیب ہوتا ہے۔'' میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور اُن کے چہرے پر چھایا ہوا تکدر کم ہو گیا۔ ''ویسے تم عجیب لڑکے ہو، جس عورت نے تمہیں یوں سر بازار رُسوا کیا، اُسی کے شوہر کو تم نے رات گزارنے کے لیے اپنا کیبن پیش کر دیا۔ کیوں؟.....'' میں نے اُن سے بھی وہی کہا جو رات کو راحیل صاحب سے کہہ چکا تھا کہ وہ یہ سب اموش کر دیں۔ ہماری میز کے بالکل ساتھ والی میز پر ایک نو بیاہتا انگریز جوڑا ناشتہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس با پر لڑکے نے لڑکی سے بہت پیار سے پوچھا۔ ''سچ کہو، تم میرے ساتھ خوش تو ہو نا۔'' لڑکی نے ہنستے ہوئے سے ''ہاں'' کہا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ قریب ہونے کی وجہ سے اُن کی ساری گفتگو ہم تک پہنچ رہی تھی۔ مسکرائی۔ ''کتنی عجیب بات ہے برسوں سے یہ سوال عورت سے تب ہی کیا جاتا ہے، جب اُس کے 'ہاں' کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔'' ''ظاہر ہے، کون بے وقوف شوہر ہوگا، جو اپنی بیوی کو پیٹتے ہو یہ سوال کرے گا؟'' میری بات سن کر وہ پھر زور سے ہنس پڑیں، لیکن اُن کی اداس آنکھیں کچھ اور ہی فسا رہی تھیں۔ میں نے اُن سے معذرت کی کہ کل رات میری وجہ سے راحیل صاحب کا اُن سے جھگڑا ہوا۔

ے بولیں ''نہیں نہیں.....ایسی کوئی بات نہیں.....تم صرف ایک بہانہ بنے، ورنہ ہمارے درمیان بہت دن
ہی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اُتر کر ہم قانونی طور پر ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں
''میرے اندر جیسے ایک چھناکا سا ہوا۔ یہ بات میرے لیے کچھ اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ شاید میری
ت بھانپ گئیں۔ ''شاید میں نے تمھیں دھچکا پہنچایا۔ مجھے افسوس ہے۔ مگر سچ یہی ہے۔ ہمارے درمیان
طاری ہو رہا تھا اور شاید جمود محبت کی موت ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ محبت کو جمود سے بچانا بھی ہمارے اختیار
نہیں ہوتا، بالکل اُسی طرح جیسے محبت کا ہو جانا ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے۔'' میں نے چونک کر اُن کی
ب دیکھا۔ مشرق کی عورت جس بات کو چھپانے کے لیے زندگی بھر چپ رہتی ہے، مغرب کی عورت نے
ی حقیقت کتنی آسانی سے بیان کر دی تھی۔ میں چپ رہنا چاہتا تھا لیکن پھر وہی آداب گفتگو کی زنجیر آڑے
ا۔ ''ہمارے مشرق میں ہزاروں لاکھوں محبتیں ایسے جمود کا شکار ہونے کے باوجود صرف ایک بندھن کی
مت کی خاطر اپنی طبعی موت کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جانے یہ اُن کی خوش قسمتی ہے یا حرمان نصیبی۔ لیکن شاید
رشتہ کبھی نہ کبھی ایسی قربانی ضرور مانگتا ہے۔'' وہ اپنی پلیٹ میں رکھے آملیٹ کو کانٹے سے اِدھر اُدھر دھکیلتی
ہیں، لیکن اُن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ ''جانتی ہوں، ساری بات شاید اختیار کی ہے۔ کاش میں بھی
ہمارے مشرق کی عورت کی طرح بہت سی باتوں پر اختیار رکھنے کے باوجود بے اختیار ہوتی۔'' میں نے تردید
مناسب نہیں سمجھی۔ ناشتے کے بعد میں بہت دیر تک سلطان بابا کے کیبن میں اُن کے سرہانے بیٹھا رہا۔ انہیں
ب بھی خود سے زیادہ میری فکر کھائے جا رہی تھی اور وہ مختلف بہانوں سے مجھ سے وعدہ لیتے رہے کہ میں شہر
پہنچتے ہی خود کو کم از کم ایک ہفتے کے لیے ڈاکٹروں کے حوالے کر دوں گا۔ شہر کا ذکر آنے پر ایک دم ہی میرے
ذہن اُس پری کا تصور اُبھر آیا، جو اس سارے فسانے کی بنیاد تھی۔ جانے میں اُس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔
میری سانسیں تو اُس کے تصور سے ہی تھمنے لگتی تھیں۔ اتنے عرصے بعد اُسے اپنے سامنے دیکھ کر جانے میرا
کیا حال ہوگا۔ میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل ہی رحمٰن صاحب کے ذریعے اپنے گھر واپسی کی اطلاع کروا
چکا تھا اور یقیناً مما پپا نے زہرا کو بھی میری آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔ جہاز کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہونے
میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن مجھے ان لمحوں میں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ کبھی کبھی انتظار خود وصل کی
لذت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کیفیت کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو خود کسی طویل
ریاضت سے گزر کر اپنی منزل کو بالکل سامنے پا کر بھی خود کو سویا ہوا نہ ہونے تک روکے رکھتے ہیں۔ میں بھی عرشے
پر بچھی نیلی بان سے بنی آرام کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا دور اس اُفق کو دیکھ رہا تھا، جس سے پرے وہ زہر
جبین رہتی تھی، اور انتظار کی اُسی لذت کو محسوس کر رہا تھا، جو کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔ اتنے میں مجھے اپنے عقب
سے نتاشا کی آواز سنائی دی۔ ''کیا میں مخل ہو سکتی ہوں؟'' میں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے
ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ راحیل صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ نتاشا نے بات شروع کی۔ ''تم نے کبھی

محسوس کیا، ہماری زندگی کی ننانوے فی صد ضروریات کسی نہ کسی تخلیق کار کے ذہن کی مرہون منت ہیں۔ سوئی سے لے کر بحری جہاز تک، کوئی بھی ایجاد اُٹھالو، انسان نے انسان کی سہولت کے لیے، کیا کچھ نہیں کیا۔ بس ایک زیادتی ہوگئی کہ ان سب آسائشوں کے حصول کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے منسلک کر دیا، جسے ہم آج کل پیسہ کہتے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.....اور شاید جہاں سے پیسے کا عمل دخل شروع ہوتا ہے، وہیں سے تخلیق کے عمل کا خاتمہ شروع ہو جاتا ہے۔ ویسے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ تخلیق یا creativity خود کو غلطیاں کرنے کی اجازت دینے کا دوسرا نام ہے جب کہ 'آرٹ' انہی غلطیوں میں سے کسی ایک کو جاری رکھنے کو کہتے ہیں۔'' نتاشا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''ایک بات کہوں اگر بُرا نہ مانو تو.....تمہارا یہ حلیہ اور تمھاری باتیں آپس میں بالکل میچ نہیں کرتیں۔ یہ کیا معما ہے؟'' میں مسکرایا۔ ''اگر میں آپ سے کہوں کہ یہ باتیں مجھے یہ حلیہ اختیار کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئی ہیں تو آپ مزید اُلجھ نہ جائیں.....آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ کے اور راحیل صاحب کے درمیان صلح کی کوئی گنجائش نہیں؟ میں نے انہیں ایک بے حد نفیس انسان پایا ہے اور یقیناً وہ آپ سے شدید محبت بھی کرتے ہیں۔'' نتاشا نے گہرا سانس لیا۔ ''صلح وہاں ہوتی ہے، جہاں جھگڑے کی کوئی بنیادی وجہ بھی ہو۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ راحیل جیسا عمدہ اور نفیس انسان بڑی مشکل سے میسر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کی محبت پر کوئی شک نہیں ہے، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ہم دونوں جُدا ہو رہے ہیں۔ ہماری بیٹی عینی ابھی بہت چھوٹی ہے، لہٰذا ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ وہ شروع میں کچھ عرصہ میرے ساتھ رہے گی اور پھر جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جائے گی تو آخری چناؤ اُس کے ہاتھ ہی میں ہوگا۔'' نتاشا نے جتنی بار اپنا گھر ٹوٹنے کا ذکر کیا تھا میں نے اُن کی آنکھوں میں ایک خاص دُکھ کی لہر محسوس کی تھی۔ مشرق ہو یا مغرب، رشتے ٹوٹنے کی چبھن شاید یکساں ہوتی ہے۔ ''میں جانتا ہوں شاید یہ بہت ذاتی سوال ہوگا، لیکن کیا میں اس جُدائی کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' نتاشا نے کچھ دیر توقف کیا پھر اُن کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ ساحلوں سے پرے بیٹھی ہوں۔ ''وفا.....ہماری جُدائی کا سبب وفا ہے۔'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لیکن چپ رہ کر انہیں خود کو مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ''جو بات میں تمہیں اب بتانے جا رہی ہوں، جانے اس کے بعد تمہارے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی عزت رہے گی یا نہیں۔ ہمارے مغرب میں آپس میں ہم آہنگی نہ ہونے پر گھروں کا ٹوٹ جانا ایسی کوئی معیوب بات نہیں رہی۔ بلکہ اب تو کسی بندھن کے تکلف ہی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ لیکن میں نے ایک مشرقی مرد سے محبت کے بعد شادی کی تھی اور اس کی ہر روایت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔ پھر نہ جانے یہ تیسری 'دراندازِ محبت' کہاں سے ہمارے درمیان کی دیوار بنتی گئی۔ مجھے اُمید ہے تم مجھے دیگر لوگوں کی طرح ایک بے راہ رو مغربی عورت نہیں سمجھو گے۔ سچ یہ ہے کہ میری وفا مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں راحیل کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی سوچوں کے دروازے کسی اور کے تصور پر وا کروں۔ میں نے اُسی لمحے راحیل کو بتا دیا تھا کہ شاید میں کسی اور کی کشش کا شکار ہو رہی ہوں۔ اور یہ راحیل ہی

ظرف ہے کہ اس نے آٹھ سالہ رفاقت اور شدید محبت کے باوجود فیصلہ میرے اُوپر چھوڑ دیا۔ ہم دونوں
ے میں 'تجدید وفا' کے قائل نہیں ہیں .....اور پھر وہ وفا ہی کیا، جسے 'تجدید' کی ضرورت پڑ جائے۔ میں
ہوں کہ جب محبت فرسودہ ہو کر دامن چھڑانا چاہتی ہے، تب وفا اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جاتی
ہبت کو اس کا راستہ بدلنے نہیں دیتی۔ ننانوے فیصد کیسز میں جیت وفا ہی کی ہوتی ہے۔ لیکن افسوس میرا
100 سواں تھا۔'' میں چپ کر کے نتاشا کی بات سنتا رہا۔ انہیں اپنا دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے کسی
امع کی ضرورت شاید بہت عرصے سے تھی۔ اُن کی کہانی بھی ہر محبت کی کہانی کی طرح اُن کی پہلی
ے سے شروع ہوتی تھی۔ راحیل اور نتاشا کی ملاقات پیرس کی ایک نمائش میں ہوئی تھی۔ جہاں راحیل
ن سے اپنے ادارے کے ملبوسات کی تشہیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ راحیل کی شاندار شخصیت، متانت اور سمجھ
کے امتزاج نے جلد ہی مشکل پسند اور سچی نتاشا کے دل میں گھر کر لیا۔ خود نتاشا اٹلی سے فیشن ڈیزائننگ
رس کے لیے پیرس آئی ہوئی تھی، دو چار ملاقاتوں ہی میں سارے پیمان بندھ چکے تھے تو راحیل نے اپنے
والوں سے فون پر نتاشا کی بات کروائی، کیوں کہ وہ اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتا
ماں نے بیٹے کی آواز میں جھلکتی خوشی کو مستقل کرنے کا عندیہ دے ڈالا اور نتاشا راحیل کی ہو گئی۔ دونوں کا
ایسا تھا کہ انہیں فرانس اور پیرس ہی سب سے زیادہ جچتا تھا، لہٰذا رہائش وہیں رکھی گئی۔ اُن کی اکلوتی بیٹی عینی
یدائش بھی پیرس ہی میں ہوئی۔ سات سال یوں پر لگا کر اُڑ گئے کہ دونوں کو پتا ہی نہیں چلا۔ ہاں بس،
ں میں کبھی ہنستے کھیلتے اختلاف ہوا بھی تو صرف اس بات پر کہ راحیل محبت کے حصول کو ہی محبت کی معراج
تھا، جب کہ نتاشا اس حاصل پن کو صرف ایک ابتدا۔ وہ محبت میں جنوں کے سرد ہونے کو منافقت کے طور
تھی اور یہیں شاید راحیل سے کچھ چوک ہو گئی اور فرہاد اُن کی زندگیوں میں داخل ہو گیا۔ فرہاد ایک ایرانی
ر، جس کی تصویروں کی نمائش پیرس کی ایک بہت بڑی آرٹ گیلری میں لگی ہوئی تھی اور نتاشا کے لاکھ
ر کے باوجود راحیل نے گھر پر عینی کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دی۔ جب کہ اس سے قبل راحیل اور نتاشا ایک
ر ہر تقریب میں نہ صرف شرکت کرتے بلکہ واپس آ کر ہفتوں ان فن پاروں پر بحث کر کے اپنے خیالات
بانٹا کرتے تھے، لیکن اس بار نتاشا کو مجبوراً تنہا ہی نمائش دیکھنے جانا پڑا۔ شاید کچھ ''ان ہونیاں'' سدا ہی سے
ناٹک میں ہوتی ہیں۔ وہ تصویریں بھی کچھ یوں ہی تھیں۔ ایک حادثے کی طرح اچانک اور فن کا ایک
نٹاہکار، نتاشا پینٹنگز میں کچھ ایسی کھوئی کہ خود اپنا آپ ہی بھولتی چلی گئی۔ کتنا درد، کتنی پیاس، کیسی گہری
رنگی ہر تصویر میں، رُوح میں سے رُوح نچوڑ لینے والی تاثیر لیے ان رنگوں نے گیلری میں سب ہی لوگوں کو
ت کر رکھا تھا۔ اور پھر نتاشا کی نظر فرہاد پر پڑی۔ وہ کسی شخص کو اپنی کسی تصویر کا عنوان بتا رہا تھا۔ ''کھوج
ں تصویر کا عنوان کھوج ہے .....لاحاصل کی کھوج..... یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی اپنے کسی نہایت عزیز اور
ہارے کے لیے چھلنی میں بھر کر پانی لے جانے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہو جو اُسی کے سامنے شدید پیاس

سے دم توڑ رہا ہو یا میدان جنگ میں پیاس سے تڑپتے، جان دیتے سپہ سالار کے لیے اُس کے کسی وفادار
کا اپنی ہتھیلیوں کے پیالے میں دو گھونٹ پانی لے کر بھاگنا..... بس کچھ ایسا ہی بیان کرنے کی کوشش
میں نے اس تصویر میں.....'' نتاشا خاموشی سے فرہاد کی بات سنتی رہی۔ اور یہی وہ ابتدا تھی، جس کی
میرے سامنے کا سابلانکا کے عرشے پر موجود تھی۔ شروع کے چند ہفتے تو نتاشا کو سمجھ نہیں آیا کہ یہ کشش فرہاد
فن کی ہے یا شخصیت کی۔ وہ راحیل کو بھی اگلے ہفتے نمائش دکھانے لے گئی اور راحیل نے بھی فرہاد
خوب سراہا۔ خود فرہاد اس بات سے ہمیشہ بے خبر رہا کہ انجانے میں وہ کسی کے اندر ہونے والی کتنی
پھوٹ کا ذمہ دار ہے، کیوں کہ نتاشا نے کبھی اُسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ نتاشا اس لیے بھی شدید اُلجھن
کیوں کہ اس کے پاس بظاہر ایک اور محبت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔ لیکن کیا کبھی محبت کو کسی
ضرورت رہی ہے؟ کیا محبت کسی عمر کی مرہون منت ہوتی ہے؟ نہیں..... دل کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ
ہے..... کہ دل کب کسی کا دوست ہوا ہے.....

''ایک محبت اور سہی''

سراپا عشق ہوں میں، اب بکھر جاؤں تو بہتر ہے
جدھر جاتے ہیں یہ بادل، اُدھر جاؤں تو بہتر ہے
یہ دل کہتا ہے تیرے شہر میں کچھ دن ٹھہر جاؤں
مگر حالات کہتے ہیں کہ گھر جاؤں تو بہتر ہے
یہاں ہے کون میرا جو مجھے اپنا بھی سمجھے گا
میں کوشش کر کے اب خود بھی سنور جاؤں تو بہتر ہے

نتاشا کے حالات سنورنے کے بجائے بگڑتے ہی چلے گئے، حالانکہ وہ صرف دو مرتبہ ہی فرہاد کی آرٹ
ری میں گئی تھی۔ پہلی مرتبہ تنہا اور دوسری بار راحیل کے ساتھ اور اس کے بعد اُس نے کئی ہفتے دوبارہ اُس
ب کا رُخ بھی نہیں کیا۔ اُسے راحیل، اپنی بیٹی اور اپنی پُرسکون زندگی ہاتھوں سے پھسلتی نظر آنے لگی۔ یہ
ت ہمارے دلوں پر تب ہی شب خون کیوں مارتی ہے، جب ہم اس کے وار سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں،
ہی جرم ہمارے مشرق میں کسی عورت سے سرزد ہوا ہوتا تو طوفان آ جاتا۔ پھر چاہے وہ نتاشا کی طرح یک
ہ اور بنا اظہار والا جذبہ ہی کیوں نہ ہوتا لیکن ایک مکمل بربادی عورت کا مقدر ہوتی۔ لیکن یہ پیرس تھا اور نتاشا
ہ اطالوی نژاد فرانسیسی شہری۔ پھر بھی راحیل کے اندر اپنی پرانی اقدار گہری جڑوں تک موجود تھیں۔ اور پھر
ے اب بھی نتاشا سے شدید محبت تھی۔ وہ چاہتا تو چیختا چلاتا، اُسے بے وفائی کے طعنے دیتا، ہاتھ پکڑ کر گھر سے
ہی کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو دوسرے کے پلٹ جانے پر اپنی
ت ہی کھو دے۔ اپنا وقار، اپنی گریس ختم کر دے۔ راحیل نے ٹھیک اس ڈوبتے جہاز کے کپتان جیسا بھرم
رکھا۔ جس کے سامنے اُس کی متاعِ حیات قطرہ قطرہ کر کے ڈوب رہی ہو، لیکن وہ آخری مسافر کو بھی
نے کی خاطر عرشے پر آخری وقت تک سینہ تانے کھڑا رہے اور جہاز سے بندھی آخری کشتی کے سمندر میں
نے کے بعد جہاز کے ساتھ ہی غرقاب ہو جائے۔ نتاشا نے بھی مغربی معاشرے کی ایک آزاد عورت ہونے
باوجود اپنی گم گشتہ محبت کی حرمت قائم رکھی اور آخری وقت تک فرہاد کو اپنے دل و دماغ میں چلتی جنگ کے
ے میں کچھ نہیں بتایا تاوقتیکہ اُس نے راحیل سے ہر بات بانٹ نہ لی۔ راحیل کو نتاشا کے اس آخری کڑوے

سچ پر بھی مان تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دنیا لٹتے ہوئے زیادہ دیر نہیں
پائے گا۔ اُس نے نتاشا سے آخری فیصلہ کرنے کا کہا۔ نتاشا خود بھی راحیل کو یوں لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتے نہیں دیکھ
تھی۔ سو، اُس نے خود ہی اپنی فرد جرم پڑھ کر سنائی اور خود ہی اپنی سزا بھی طے کر دی۔ عمر بھر کی جُدائی کی
جب کوئی جج کسی کو عمر قید کی سزا سناتا ہے تو وہ اصل میں ملزم کو اُس کے پیاروں سے عمر بھر کی جُدائی کی سزا
دے رہا ہوتا ہے۔ سو، نتاشا نے بھی اپنے لیے اک نئے طرز کی ''عمر قید'' چن لی تھی۔ راحیل نے نتاشا سے
بھی پوچھا کہ کیوپڈ کے وار کا شکار اگر نتاشا کا دل ہوا تھا اور جُرم کی سرزدگی بھی اُسی کے دل کے سر ہے تو یہ
راحیل کو بھی کیوں مل رہی ہے۔ شاید دلوں کے جرم ہی ایسے ہوتے ہیں کہ کرتا کوئی اور بھرتا کوئی
.....دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کے تیسرے مرکزی کردار فرہاد کو ابھی تک اس بات کی خبر نہیں تھی
کتنی زندگیوں میں طوفان کا باعث بن رہا تھا۔ حالانکہ اب اُس کی نتاشا سے اچھی خاصی پہچان ہو چکی تھی
وہ اس کے تمام خاندان سے بھی مل چکا تھا لیکن نتاشا نے راحیل کے کہنے پر بھی اپنے دل کا حال فرہاد پر
نہیں کیا۔ اُس نے اپنے دل کو سزا دینے کے لیے ایک عجیب جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس کا ظرف اسے
بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ راحیل کی ہوتے ہوئے فرہاد کے سامنے دل کے لٹ جانے کی دہائی دے
پھر اگر کسی وجہ سے فرہاد ہی اُسے ٹھکرا دے تو پھر سے روتی دھوتی راحیل کی زندگی میں واپس آ جائے۔ لہٰذا
نے آخری کشتی جلا کر تخت یا تختے کا فیصلہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اُس نے راحیل کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا
جب تک وہ علیحدہ نہ ہو جائیں، تب تک فرہاد کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے کہ اُن کی علیحدگی کی
خود اُسی ''مرد مغرور'' کے ہاتھ سے کینوس پر پھینکے گئے چند رنگ کے چھینٹے ہیں۔ بظاہر ناممکن نظر آنے
ایسی داستانیں صرف مغرب ہی میں جنم لے سکتی ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں کسی مرد کا ایک کے بعد دوسری
پھر تیسری محبت میں ''مبتلا'' ہو جانا تو عام سی بات سمجھی جاتی ہے مگر عورت بے چاری اپنے خواب میں سا
عکس سے پرے بھی اگر کسی غیر کی شبیہہ دیکھ لے تو گھبرا کر خود ہی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ مشرق میں وفا کے پلڑ
سارا بوجھ عورت ہی کو پورا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہاں کا مرد اُس ترازو میں تلتا ہی نہیں۔ لیکن نتاشا نے
ہوتے ہوئے بھی اپنی وفا کا ایک معیار قائم رکھنے کی یہ انوکھی کوشش ضرور کی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ راحیل
علیحدہ ہونے کے بعد فرہاد اُسے اپنائے گا یا اُس کی ساری داستان کو ایک قہقہے میں ختم کر دے گا۔ کیوں کہ
تو صرف نتاشا ہی نے اپنی زندگی کے ساتھ کھیلا تھا۔ فرہاد کی وفا اور محبت تو کبھی اس کھیل سے مشروط ہی
تھی۔ راحیل نتاشا کے اس پاگل پن سے کبھی کبھار اتنا بکھر جاتا کہ اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر اُسے فر
آرٹ گیلری چھوڑ آئے تا کہ نتاشا یہ اندھی چال چلنے سے پہلے صرف ایک بار اپنے پتے ضرور دیکھ لے کہ
مات ہی تو اس بازی کا مقدر نہیں؟ لیکن بالآخر راحیل ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں اُس کی ماں کی طبی
پاکستان میں مسلسل بگڑتی جا رہی تھی اور اُس کی شدید خواہش تھی کہ ایک بار اپنی بہو اور پوتی سے مل لے

نتاشا شادی کے بعد سے اب تک راحیل کے وطن نہیں جا پائی تھی۔ لہٰذا راحیل نے اُس سے اس آخری ''ہم نی'' کی درخواست کی اور طے پایا کہ راحیل کی ماں سے ملاقات کے بعد خاموشی سے وہ دونوں جُدا ہو ئیں گے اور اس کی خبر راحیل کی بوڑھی ماں کو کبھی نہیں ہو پائے گی، کیوں کہ وہ یہی سمجھتی رہے گی کہ اُس کا بیٹا ر بہو خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے ہیں۔

نتاشا کی عجیب داستان کا اختتام ابھی باقی تھا لیکن میں اُس رات لمحہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں جھپک سکا۔ یا محبت دوبارہ بھی ہماری زندگیوں میں پلٹتی ہے، وفا کیا ہے اور اس کی حدیں کہاں تک مقرر ہیں۔ ہم اپنی ندگی میں جس محبت کے حصول کے لیے پاگل ہوتے ہیں، اپنے دل کے کواڑ دوسرے پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیتے ہیں، کیا وہی ہماری ''آخری محبت'' ہوتی ہے۔ کیا ''محبت'' اور ''وفا'' کے معیار بھی ہماری معاشرتی قدار کے تابع ہوتے ہیں؟ اور ہم صرف انہی کی پیروی ہی کو ان جذبوں کے پرکھنے کا اصل پیمانہ تو نہیں سمجھ بیٹھے۔ جانے اس ''محبت'' نامی معمے کی کتنی پرتیں، کتنے پہلو اور کتنے زاویے مزید ایسے تھے جن سے میرا پالا پڑنا ابھی باقی تھا۔ رات پھر سلطان بابا بے حد بے چین رہے اور بار بار اُن کی آنکھ کھلتی رہی۔ مجھے اُن کی طرف سے بے حد تشویش تھی اور میں اس پریشانی میں کئی مرتبہ خود اپنی دوائیں لینا بھی بھول جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اپنے شہر پہنچنے تک مجھے ہر حال میں ان دواؤں کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ ورنہ سمندر کے سفر میں میری طبیعت مزید بگڑنے کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔ میرے دوروں کا دورانیہ ویسے بھی اب طویل تر ہونے لگا تھا۔ اُس رات بھی کئی مرتبہ میری رگوں میں جیسے مکمل اندھیرا سا چھانے لگتا اور کئی مرتبہ مجھے اپنا سر جھٹک کر اُٹھ کے ٹہلنا پڑا۔ نتیجتاً صبح میری طبیعت نہایت بوجھل تھی اور سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ لہٰذا میں اپنے کیبن ہی میں پڑا رہا۔ سلطان بابا کے کمرے میں نرس اُن کی دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر میں میرے کیبن کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے راحیل صاحب کھڑے تھے۔ ''میں مخل تو نہیں ہوا، دراصل تمہیں ناشتے پر ڈائننگ ہال میں نہیں دیکھا تو تشویش ہوئی۔'' ''جی ۔۔۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی اس وجہ سے نیچے نہیں آسکا۔'' انہوں نے فوراً میری نبض دیکھی اور تیز بخار کا خدشہ ظاہر کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دوا لے چکا تھا۔ اُنہوں نے تجویز دی کہ مجھے اس حال میں بند کمرے کے بجائے عرشے پر کھلی فضا میں رہنا چاہیے تاکہ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں میرے تپتے جسم کو کچھ راحت مل سکے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں جہاز کے ڈیک والے حصے میں لکڑی کے پتلے تختوں سے ایک اُونچے پلیٹ فارم نما عرشے پر کھڑے تھے۔ آس پاس سفید وردی پر نیلی لکیر والی مخصوص ٹوپی پہنے جہاز کا عملہ صفائی کر رہا تھا اور سیلز مین اطالوی زبان میں کوئی گیت گنگنا رہے تھے۔ راحیل صاحب نے دُور بنتی لہروں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''جانتے ہو یہ ملاح کس اطالوی گیت میں کیا گنگنا رہے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''یہ کہہ رہے ہیں کہ بادبان اُونچے کرلو۔ پتوار اور تیز چلاؤ، کیوں کہ ایک بڑا طوفان ہماری تاک میں ہے۔۔۔۔ ہمارا ساحل

دُور ہے اور کپتان کی محبوب پھول لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔'' ''آپ کو اطالوی آتی ہے؟'' ''ہاں۔۔۔۔کچھ عرصہ رہا ہوں وہاں۔۔۔۔نتاشا کے گھر والوں کے سامنے بہت پاپڑ بیلنے پڑے تھے مجھے۔ وہاں کی بہت سی رسمیں اب بھی ہم سے ملتی جلتی ہیں۔'' میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ ''کیا بادبان اُونچے کرنے اور پتوار تیز چلانے سے طوفانوں سے بچا جاسکتا ہے؟'' انہوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید وہ میرا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ ''نہیں۔۔۔۔طوفان تو آکر ہی رہتے ہیں۔ لیکن طوفانوں کے ڈر سے سمندروں کو ویران بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا اور پھر جن کی ناؤ ہی میں چھید ہو جائے انہیں طوفانوں سے کیا گلہ..... گر ڈوبنا ہی مقدر ہے تو پھر سکون سے بنا کسی آواز کے کیوں نہ ڈوبا جائے۔ شور مچا کے اور واویلا کر کے سمندر کا تقدس پامال کرنے سے کیا فائدہ؟ میں اُن کے چہرے ہی سے اُن کے اندر اُٹھتے طوفانوں کی ایک جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں پھر ٹٹولا ''آپ اتنی آسانی سے کیسے ہار مان سکتے ہیں۔ جو ڈوبنے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ طوفانوں کا رُخ بھی تو موڑ سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائے۔ کتنی گھائل مسکراہٹ تھی۔ ''وہ جس معاشرے میں پلی بڑھی ہے، وہاں محبت کا ہو جانا حادثہ تو ہوسکتا ہے، جرم نہیں۔ اور محبت جرم تب بنتی ہے جب وہ اپنے ساتھ احساس جرم لے کر آئے۔۔۔۔اور پھر یہ دلوں کے سودے ہیں۔ یہاں ڈوبنے والے ہی فاتح قرار پاتے ہیں۔ اس کے دل میں بال آجانے سے میری محبت پر کوئی فرق پڑے تو پھر یہ محبت نہیں ''سوداگری'' ہوئی۔ میں صرف اپنے احساس کے ساتھ بھی تو ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ جانتے ہو، محبت جتنی پرانی ہوتی ہے، اُتنی ہی خون میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت، پچھلی محبت کا خون میں بسا یہ زہر نچوڑ نہیں سکتی۔'' ''پھر آپ خون میں سرایت کی ہوئی اس محبت کو اتنا بڑا جوا کھیلنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟ آپ پاکستان میں رہ جائیں گے اور وہاں فرانس میں فرہاد انہیں قبول نہیں کرے گا بھی یا ان کے اتنے بڑے قدم اُٹھانے پر صرف افسوس کا اظہار کر کے اپنی زندگی میں پھر مگن ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے اُسے پہلے سے کسی اور سے محبت ہو۔ محبت بھلا کب کسی کا انتظار کرتی ہے؟'' میرا لہجہ شاید جذبات کی وجہ سے کچھ زیادہ تلخ اور بلند ہو گیا تھا تب ہی ہمارے پاس سے گزرتی ایک بوڑھی خاتون مسافر نے اپنے کالے جالی دار ہیٹ کے نیچے سے ہم پر خشمگیں سی نگاہ ڈالی۔ راحیل صاحب کچھ دیر چپ رہے۔'' جو نتاشا نے کھیلا ہے۔ لیکن بازی میں نے بچھائی ہے۔ میں اپنی ہم سفر کو اُس کی زندگی کے سب سے مشکل سفر میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ دو دن بعد ہم جس بندرگاہ پر اُتر رہے ہیں وہاں فرہاد پہلے سے موجود ہوگا۔'' میرے پاؤں تلے سے جیسے کسی نے عرشے کا تختہ کھینچ لیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں دھڑام سے سمندر میں جا گرا ہوں۔ راحیل صاحب میری کیفیت سے بے خبر مجھے تفصیل بتاتے رہے کہ کس طرح پیرس میں جب وہ نتاشا کی ضد کے آگے ہار مان گئے اور انہوں نے اُسے آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تب انہوں نے نتاشا کی سب سے قریبی دوست سونیا سے رابطہ کیا۔ سونیا، نتاشا کی کلاس فیلو بھی رہ چکی تھی، لہٰذا راحیل اور نتاشا کی علیحدگی کا سن کر وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نتاشا سے

ہنی تھی، مگر راحیل نے بڑی مشکل سے اُسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ خبر کسی طریقے سے فرہاد تک پہنچا
ے کہ راحیل اور نتاشا آپس کی اَن بن اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں۔ راحیل نے
دنیا کو سختی سے تاکید کی کہ نتاشا کا بھرم کبھی نہ ٹوٹنے پائے اور فرہاد کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ نتاشا
احیل سے کیوں جُدا ہو رہی ہے۔ سونیا کو فرہاد کے سامنے یہ ظاہر کرنا تھا کہ کہ وہ اپنی عزیز از جان سہیلی کے
لیے بہت پریشان ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اگر فرہاد پر پہلے سے کسی وعدے یا رشتے کا بوجھ نہیں ہے تو وہ نتاشا کو
پا لے۔ راحیل نے سونیا کو یہ پیغام دے کر فرہاد کے پاس تو بھیج دیا لیکن خود انگاروں پر لوٹتا رہا۔ دنیا میں بھلا
کون ہوگا، جو کسی لٹیرے کو خود مدعو کرے کہ ''آؤ اور میری متاعِ حیات لوٹ کر چلتے بنو۔''

دوسرے دن جب سونیا نے راحیل کو آ کر یہ بتایا کہ پہلے پہلے تو فرہاد اُن کی جُدائی کے صدمے سے
سنبھل ہی نہیں پایا کیوں کہ وہ نتاشا کے پورے خاندان سے واقف تھا اور اُسے ایک فرد کی حیثیت دی جاتی
تھی۔ پھر اُس نے سونیا سے التجا کی کہ کیا وہ نتاشا کی ذاتی زندگی میں دخل دے کر اُسے سمجھا سکتا ہے۔ لیکن
جب سونیا نے اُسے نتاشا کے بھرم کی قسم دی تو اُس نے سونیا کو بتایا کہ وہ ہمیشہ راحیل کی قسمت پر رشک کرتا آیا
ہے کیوں کہ نتاشا جیسی ہم سفر قسمت والوں ہی کو ملتی ہے اور اُس نے سونیا سے کہا کہ وہ نتاشا کو اپنانا اپنے لیے
ایک اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔ یہ سب سن کر راحیل کا دل آخری بار دھڑک کر جیسے بند ہو گیا۔ شاید کہیں دُور اُس
کے دل میں اب بھی یہ اُمید تھی کہ فرہاد نتاشا کو کسی وجہ سے اپنا نہ پائے مگر اب تو کہانی ہی ختم ہو چکی تھی۔ نتاشا کو
اس واردات کی خبر نہیں تھی کہ فرہاد کو سونیا نے پہلے ہی جہاز کے ذریعے ہمارے شہر بھیج دیا ہے اور راحیل اُسے
بندرگاہ ہی پر الوداع کہہ دے گا۔ البتہ ماں سے کیا بہانہ کرنا ہے، وہ بعد کی بات تھی۔ دنیا کا سب سے مشکل کام
ایدا اپنی محبت کو خود اپنے دل میں پل پل مرتے دیکھنا ہے اور اس سے بھی مشکل خود اسی محبت کی لاش کو اپنے
ں میں دفن کرنا ہے۔ میرے سامنے اس وقت ایک ایسا ہی شخص کھڑا تھا، جو اپنی محبت کے لیے اپنے دل میں
لڑھا کھود چکا تھا اور اب صرف اُسے دفنانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حبیب البشر صاحب
سے بھی ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ اُن کے ساتھ جانے والے سبھی حاجیوں سے انہوں نے میرے
لیے دعا کرنے کا وعدہ لیا ہے۔ انہیں شاید جہاز کے طبی مشن سے میری ناسازی طبیعت کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ
بہت دیر میرے ساتھ عرشے پر بیٹھے رہے۔

عشاء کے بعد جب اُن کے جانے کا وقت ہوا تو مجھے اُوپر والے چوبی ڈیک پر جہاز کے آخری ریلنگ
کے پاس نتاشا نظر آئی۔ عام طور پر جہاز کا عملہ کسی مسافر کو مغرب کے بعد اتنی اُونچائی پر کھڑے رہنے کی
اجازت نہیں دیتا، کیوں کہ کوئی بھی بڑی لہر انسان کا توازن بگاڑ کر اُسے بیچ سمندر میں پھینک سکتی ہے۔ ایک
لمحے کے لیے تو خود نتاشا کے ارادے بھی مجھے کچھ بدلے سے نظر آئے۔ میں جلدی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر
اُن کے قریب پہنچا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ پلٹیں ''کہیں آپ نے کسی شارک مچھلی کے ساتھ ڈنر کا وعدہ

تو نہیں کر رکھا؟'' وہ مسکرائیں ''نہیں! میری شارک مچھلیوں سے کبھی اچھی سلام دُعا نہیں رہی.....'' ہم دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے لہروں کو گنتے رہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال کر ڈالا ''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے عبداللہ؟'' ''نہیں..... میں ابھی محبت کے ''م'' اور عشق کے ''عین'' تک بھی نہیں پہنچ پایا اور پھر سچ یہ ہے کہ آپ سے ملنے کے بعد تو مجھے اپنے جذبے کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔'' اُن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ ''کیوں؟'' میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا'' آپ سے ملنے کے بعد میں نے یہ جان لیا ہے کہ ہماری محبتوں کا کوئی اختتام نہیں ہوتا، شاید محبت کی بقا صرف اس کے لاحاصل رہنے ہی میں ہے۔ جسے پالیا جائے، شاید وہ محبت نہیں رہتی، ورنہ انسان کا دل اس معراج کو پالینے کے بعد پھر سے خاک میں کیوں لوٹتا؟ رشتوں کے نیلے بھنور بھی جب محبت کی سنہری کمند کو نئی فصیلوں پر اٹکنے سے نہیں روک پاتے تو پھر ہم ایک نیا کلیہ کیوں نہ ایجاد کر لیں؟'' نتاشا کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔'' کیسا کلیہ؟'' میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ''یہی کہ ہم اپنی زندگی کی سب سے پہلی اور شدید محبت کو اس شرط سے متصل نہیں رکھ سکتے کہ خود ہم بھی اس کے لیے آخری محبت ہی ثابت ہوں گے۔ بلکہ ہمیں یہ گنجائش بھی رکھنی ہوگی کہ خود ہمارا دل بھی پلٹ سکتا ہے۔ تو پھر ایسی پلٹ جانے والی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے ایک نئی راہ دکھا دی۔'' نتاشا کی آواز میں بے چینی تھی ''لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جو واردات میرے دل کے ساتھ ہوئی ہے وہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ تم اپنے نظریہ کیوں بدل رہے ہو۔ یہ صرف میری بدبختی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میں نے آخری وار کر دیا ''تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سیاہ نصیبی پھر سے اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی؟'' ''کیا مطلب؟'' ''مطلب یہ کہ جس راستے پر آپ چل رہی ہیں وہ تو سدا کا بے نشان و منزل ہے۔ کل تک راحیل آپ کی پہلی محبت تھے۔ آپ کا ہر خواب اُن سے وابستہ تھا۔ لیکن آج آپ کو اپنا من فرہاد کی جانب کھنچتا محسوس ہوا ہے۔ ایک اجنبی آپ کے سارے خوابوں پر قابض ہو بیٹھا۔ تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کل یہ من اپنے دھاگے کہیں اور نہیں اُلجھا بیٹھے گا؟'' نتاشا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ''لیکن تم.....؟'' ''میں صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ بات اگر دل کے اختیار پر چلنے کی ہے تو پھر ہمارا ایک شاعر صدیوں پہلے کہہ گیا تھا کہ 'دل پر زور نہیں'..... آپ جس ماحول میں پلی بڑھی ہیں، اُس معاشرے میں انسان کی آخری سانس تک، ایسے دل کش ہیولے اُس کا دل کھینچنے کے لیے اُس کے آس پاس بھٹکتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی فلم اسٹار، کبھی کوئی کھلاڑی، کبھی کوئی سنگر..... تو پھر آپ کے کلیے کے حساب سے ایک پل کا سکون ملنا بھی محال ہوگا۔ انسان کی ذات اندر سے جن سینکڑوں، ہزاروں خانوں میں بٹی ہوئی ہے دوسرا کوئی بھی ایک انسان ان سب خانوں کے خلا کو بھرنے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ یہ کسی فرد واحد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ ہم خود بھی کسی دوسرے کے بنائے ہوئے ہیولے کا صرف پندرہ یا بیس فی صد ہی پورا کر پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان مشہور لوگوں (سیلیبریٹیز) میں اپنے من کے بنائے خاکے کی خوبیاں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے

ل کے من کے ہیولے کو ٹٹولا ہے۔ ہوسکتا ہے۔ خود آپ بھی اس کے اندر کی شبیہ کا صرف پانچ فی صد ہی
رتی ہوں۔'' نتاشا نے چونک کر میری جانب دیکھا ''لیکن راحیل نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ
کرو میں اُس کے من کے اندر موجود ہر تصویر کو اُس کے سامنے لا کھڑا کرتی۔ میں اُس کے لیے کچھ بھی کر
ہوں۔'' ''کتنی تصویریں جمع کر پاتیں آپ.....؟ اور کیا انسان ساری زندگی انہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے
زار دے۔ اور آخر میں خود ایک ہیولہ بن کر رہ جائے۔ کہا یہی مقدر ہے ہم مجبور اور بے کسی انسانوں کا۔
یں زندگی تو صرف ایک ملتی ہے مگر خواہشیں ہزار صدیوں کے وزن جتنی۔'' نتاشا کی طرف سے بہت دیر تک
وشی چھائی رہی۔ پھر جب وہ بولی تو آواز سمندر کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔ ''پھر ان ہزار صدی کی
اہشوں کا کیا ہوا؟ دل پر قفل کیسے لگایا جائے؟'' میں نے اُن کی جانب دیکھا ''اگر اس دل نے ہمارے ساتھ
حاصل کو خاص سے عام کرنے کا کھیل رچایا ہوا ہے تو پھر ہمیں بھی اس کے لیے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے ''لا
صل'' رکھ چھوڑنا چاہیے تاکہ وہی ''لا حاصل'' اس کی آخری چاہت ثابت ہو۔ ہم اگر کسی ضدی بچے کی طرح
دل کی ہر بات مانتے گئے اور اس کی پسند کا ہر کھلونا اس کی جھولی میں ڈالتے رہے تو پھر یہ بھی اُسی بچے کی
رح چند دن کھیل کر اس کھلونے کو پرانا کر دے گا یا دل بھر گیا تو توڑ دے گا اور پھر سے کسی نئے کھولنے کے
لیے مچلنے لگے گا۔ تو کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے ایک کھلونے کی آس ہی میں منتظر چھوڑ دیا جائے..... تاکہ وہ
یشہ کے لیے اس کے لیے 'خاص' رہے۔

میں نتاشا کو سوچوں کے بھنور میں چھوڑ کر نیچے کیبن میں چلا آیا۔ اگلی شام جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہونے
کے لیے اپنی رفتار دھیمی کر چکا تھا۔ میرے سامنے وہی ساحل بانہیں کھولے کھڑا تھا، جس کی ایک درگاہ پر نظر آئی
یک جھلک اور جلوے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ دُور سے میں نے مما اور پپا کو میزبانوں والے حصے
کی جالی کے پرے دیکھا۔ اُن کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ لیکن مجھے زہرا کا دھانی
آنچل تو ہمیشہ پہلی نظر میں نہار جاتا تھا مگر کیوں آج ابھی تک میری نظر اُسے ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ جہاز بندرگاہ پر
لگ گیا۔ ہم سب ایک ایک کر کے سیڑھیاں اُتر کر زمین پر قدم رکھتے گئے۔ راحیل کے بعد اُس کی بچی عینی اور
پھر نتاشا نے آخری سیڑھی کو الوداع کہا۔ دفعتاً نتاشا کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک سجے سنورے شخص پر پڑی
اور اُس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ میرے دل نے دھڑک کر مجھ سے کہا ''فرہاد.....''

آخری محبت

میں نے بھی نتاشا کی نظروں کی تعاقب میں نگاہ ڈالی۔ وہ یقیناً فرہاد تھا۔ اُس کے انداز میں جو ایک خاص لاپروائی تھی اور اُس کے سفید لباس پر جچتی نیلی پی کیپ اُسے دُور ہی سے کوئی مصور بتا رہی تھی۔ یہ سب ہی تخلیقی کاموں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ وہ عمر میں نتاشا سے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ نتاشا ابھی تک شاک کی کیفیت سے نہیں نکل پائی تھی۔ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی ''فرہاد..... تم..... یہاں.....؟'' فرہاد مسکراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا ''ہاں مجھے سونیا سے پتا چلا کہ تم پاکستان آ رہی ہو۔ اتفاق سے میری بھی ایک تصویری نمائش ہے، اسی شہر کی آرٹ گیلری میں۔ سوچا تمہیں سرپرائز دے کر حیران کر دوں۔'' نتاشا ابھی تک کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ راحیل کی آنکھیں نم ہونے کو تھیں، مگر وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر نتاشا سے کہا ''چلیں..... آپ کا کام آسان ہو گیا۔ لوگوں کو خواب دیکھنے کے لیے رات کو آنکھیں بند کر کے نیند کا محتاج ہونا پڑتا ہے، جب کہ آپ کا خواب خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اب اپنے سپنے کے ساتھ ہی لوٹ جائیں۔ خوابوں کو جینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیوں کہ سہانے خوابوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔'' اتنے میں راحیل نے بھی تائید کی ''عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے نتاشا! میں اپنی ماں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم یہاں تک میرے ساتھ آئیں میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اب یہاں سے آگے ہمارے راستے جُدا ہیں۔'' نتاشا شاید سمجھ گئی تھی کہ فرہاد کی یہاں آمد کے پیچھے کس کا مقصد کارفرما ہے۔ اُس کے بدن پر جیسے ایک لرزہ سا طاری تھا۔ وہ کسی پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور اپنی لرزاہٹ چھپانے کی کوشش میں اُس کا وجود مزید ریت ہوا جا رہا تھا۔ راحیل نے عینی کا ہاتھ پکڑا اور مخالف سمت میں قدم اُٹھائے۔ عینی نے حیرت سے اپنی ماں کو وہیں جمے دیکھا اور پھر اُسے جاتے جاتے آواز دی۔ ''مما.....'' نتاشا کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جلدی سے پلٹ کر چلائی ''رک جاؤ راحیل.....'' راحیل کے قدم جم گئے، لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نتاشا تیزی سے میری جانب بڑھی ''کل رات تم نے ٹھیک کہا تھا۔ دل جیسے ضدی بچے کی بات سنی جائے تو ہماری محبتوں کا کبھی اختتام نہ ہو۔ تو پھر کیوں نہ کسی ایک کو اپنی 'آخری محبت' بنا لیا جائے۔ میرے رشتوں کے نیلے بھنور نے آج ہمیشہ کے لیے وہ سنہری کمند توڑ ڈالی ہے، جو آر پار بکھرے ہزاروں دل کش ہیولوں کی فصیل پر ہر بار اپنی کنڈی اٹکا بیٹھتی ہے۔ میں پیرس واپس جانے سے پہلے تم سے ملنے ضرور آؤں گی عبداللہ۔ اس 'تجدید وفا' کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ لیکن تم بھی مجھ سے ایک

وعدہ کرو کہ اپنا نظریہ کبھی نہیں بدلو گے۔ کیوں کہ آج سے میرا بھی یہی نظریہ ہے اور میں یہ پیغام ہر محبت کرنے والے تک ضرور پہنچاؤں گی۔'' میں نے مسکرا کر اس نئی نتاشا کو دیکھا۔ ''ہر محبت آخری محبت ہوتی ہے اور آخری محبت بن کر ہی نازل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی محبت میں مبتلا ہی نہ ہو پاتے۔ محبت سورج کی کرنوں کی طرح درزوں سے چھن کر ہمارا آس پاس منور کر سکتی ہے، مگر محبت کو کسی بھی شرط سے متصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بندھن اور رشتے خود محبت کے آخری ہونے کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں سورج ہیں، مگر ہمیں بس اپنے حصے کے ایک آفتاب ہی کی روشنی سمیٹنی ہوتی ہے۔ لیکن سورج کی طرح چمکنے کے لیے پہلے اس کی طرح جھلسنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ آج آپ بھی تپ کر کندن بن چکی ہیں۔ جائیے..... آپ کی محبت کا سورج آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' نتاشا نے میرے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں دُور کھڑے راحیل کی جانب دیکھا۔ فرہاد کو سنانے کے لیے اس بار میں نے انگریزی میں بات کی تھی۔ نتاشا پلٹنے سے پہلے فرہاد کی طرف بڑھی۔ ''تمہارا بہت شکریہ فرہاد کہ تم میرا استقبال کرنے کے لیے یہاں تک آئے، لیکن ابھی مجھے جانا ہے، راحیل کے ساتھ۔ ہاں البتہ، اپنی نمائش کا دعوت نامہ ضرور بھیجنا۔ میں، راحیل اور عینی نمائش دیکھنے ضرور آئیں گے اور تم سے اچھی سی ٹریٹ بھی لیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔'' نتاشا نے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور فرہاد کو یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر راحیل کے سنگ آگے بڑھ گئی۔ کافی دُور جا کر اُس نے پلٹ کر میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ راحیل صاحب نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ اُن کی ایک نگاہ ہی سارا خراج ادا کرنے کے لیے کافی تھی اور پھر اگلے لمحے وہ تینوں بندرگاہ کی بھیڑ میں غائب ہو چکے تھے۔ فرہاد بھی تھکے تھکے قدموں سے پلٹ گیا۔ اُسے اپنی محبت کے سورج کے لیے ابھی کچھ اور آسمان چھاننا باقی تھے۔ میں سلطان بابا کے لیے آئے کرین اسٹریچر کے ذریعے انہیں لے کر نیچے اُترا ہی تھا کہ پپا کی ہمیشہ کی طرح زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ ''ساحر..... ہم یہاں ہیں.....'' پپا کے ساتھ مما بھی کھڑی تھیں لیکن اُن کی آواز اُن کے بہتے آنسو پہلے ہی گھونٹ چکے تھے۔ میں لپک کر اُن کے قریب پہنچا اور پھر ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو چپ کراتے کراتے رو رہے تھے۔ میں قریباً چھ ماہ کے بعد اُن سے مل رہا تھا اور مما بار بار میرا چہرہ اپنے ہاتھوں سے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں اب تک یقین نہ آ رہا ہو کہ میں واقعی اُن کے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ مائیں سدا سے اولاد کے معاملے میں اتنی بے یقین کیوں ہوتی ہیں۔ اتنی دیر میں ایمبولینس بھی بندرگاہ کے مرکزی داخلے سے ہوتی ہوئی مقررہ جگہ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹروں کی یہی ہدایت تھی کہ اب مزید کوئی دیر کیے بنا سلطان بابا کو بڑے اسپتال پہنچا دیا جائے۔ میری آنکھیں بار بار میزبانوں کی گیلری کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ جتنی دیر میں سلطان بابا کو ایمبولینس میں منتقل کیا گیا، تب تک میں شاید سینکڑوں بار اُس جانب دیکھ چکا تھا، جہاں سے اس نازآفریں کو آنا تھا۔ لیکن وہ راستہ اتنے زیادہ ہجوم کے باوجود میرے لیے سنسان ہی رہا۔ مما پپا دونوں میری بے چینی بہت اچھی طرح بھانپ چکے تھے، لیکن نہ جانے کیوں دونوں ہی چپ سے تھے۔ بالآخر میں نے مما

سے پوچھا ہی لیا کہ زہرا کیوں نہیں آئی؟ مما نے بتایا کہ انہوں نے میرے آنے کی خبر اُسی دن زہرا کے گھر والوں تک پہنچادی تھی، جس دن انہیں پتا چلا تھا۔ پھر بھی زہرا میرے استقبال کو نہیں آئی..... کیوں؟؟

سلطان بابا کو اسپتال لے جاتے ہوئے بھی میرے اندر خود ہی سوال اُٹھتے رہے اور میرا نادان دل خود ہی ان وسوسوں کے جواب اور جواز تراشتا رہا۔ ہوسکتا ہے، اُسے ٹھیک خبر ہی نہ ملی ہو۔ یا ہوسکتا ہے وہ کہیں بھیڑ ہی میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ یہ بڑے شہروں کا ٹریفک بھی تو کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یا پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے بندرگاہ سے نکلتے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔ ہم بھی تو سلطان بابا کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے تھے۔ وہ آئی ہوگی اور مجھے وہاں نہ پاکر کتنی پریشان ہوئی ہوگی۔ میرا ذہن کسی ایک خدشے کا سر اُبھارتا تو میرا سودائی دل اس کے سو عذر تراش کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ محبت ہمیں کتنے بہانے بنانا سکھا دیتی ہے۔ بندرگاہ سے نکلنے سے پہلے میں خاص طور پر عرشے پر کھڑے حبیب البشر صاحب سے ملنے کے لیے اُوپر گیا۔ وہ مجھے بہت دیر تک گلے لگائے تھپکتے رہے اور میرے شانے اُن کی پلکوں سے نم ہوتے رہے۔ آتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دھیرے سے بولے ''ہم اگر اس کی جانب ایک قدم بڑھاتے ہیں تو وہ ہماری جانب ستر قدم آتا ہے۔ یقین جانو، تم اُس کے بہت قریب ہو۔ میں جتنی بار بھی اُس کے گھر پر نگاہ ڈالوں گا میرے دل سے تمہارے لیے دعا ضرور نکلے گی اور مجھے یقین ہے ایک دن تمہاری کھوج ضرور اپنے انجام کو پہنچے گی۔'' میں اپنے خیالات سے تب چونکا جب ایمبولینس اسپتال کے ''انتہائی نگہداشت'' کے شعبے کی پارکنگ میں جاکر رُک گئی۔ مما پپا بھی اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی پہنچ چکے تھے اور اگلے چند لمحوں میں ہم سلطان بابا کو علیحدہ کمرے میں منتقل کر چکے تھے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم ہماری منتظر تھی۔ سلطان بابا نے غنودگی کے عالم میں ایک دو بار مجھ پر نگاہ ڈالی اور پھر دواؤں کے اثر تلے اُن کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ ہمیں بڑے معالج کی ہدایت پر باہر انتظار کرنے کا کہا گیا۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں کچھ دیر کے لیے گھر سے تازہ دم ہو آؤں، تب تک وہ اسپتال میں ٹھہرتے لیکن میں نے منع کر دیا اور ہم دونوں نے تقریباً زبردستی مما کو گھر واپس بھیجا، کیوں کہ انہیں اسپتال کے ماحول اور اردگرد ہوتی انہونیوں سے ہمیشہ ہی خوف آتا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ سلطان بابا کی طبیعت سنبھلتے ہی میں کچھ دیر کے لیے گھر ضرور آؤں گا اور پھر ہم سب رات کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔ وہ بادل نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتیں وہاں سے چلی تو گئیں، لیکن تقریباً ہر قدم ہی پر مڑ کر انہوں نے مجھ سے میرے عہد کی تجدید ضرور چاہی۔ دنیا کا کوئی بھی فرد اپنے ماں باپ کا قرض نہیں چکا سکتا۔ یہ وہ سود ہے، جو سود در سود ہر پل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور شاید اس جہان کا یہ واحد اُدھار ہے جس کی ادائیگی کیے بنا ہی ہم سب یکے بعد دیگرے الوداع کہتے جاتے ہیں۔

مما کے جانے کے بعد میں نے کافی وقفے سے مناسب الفاظ میں پپا کو اپنی بیماری کے بارے میں بتایا اور میری توقع کے مطابق وہ میرے لاکھ سہل انداز اور تسلی کے باوجود ایک دم ہی گھبرا سے گئے۔ اگر سلطان بابا

ی طبیعت کا خیال نہ ہوتا تو وہ اُسی وقت مجھے بھی اِسی اسپتال میں داخل کروا دیتے۔ پھر بھی جب تک میں نے
ن سے وعدہ نہیں کر لیا کہ اگلی صبح سب سے پہلے میں اپنے تمام معائنے خود انہی کی نگرانی میں کرواؤں گا، تب
ی وہ چین سے نہیں بیٹھے اور راہ داری ہی میں ٹہلتے رہے۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جب تک میں اپنے
گھر میں تھا اور مما پپا کے لاڈلے کے طور پر اُن کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، تب تک مجھے کبھی پپا کے اندر
سلطان بابا جیسی بزرگانہ جھلک نظر نہیں آئی تھی، لیکن آج میرے سامنے ماتھے پر بل ڈالے، بڑبڑاتے اور مجھے
ڈانٹتے ہوئے ٹہلنے والا یہ شخص مجھے اپنا پپا سے زیادہ اپنا بزرگ دوست لگ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ
بزرگی کا تعلق صرف انسان کی عمر بڑھنے سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی صرف عقل و دانش اس کی وجہ ہوتی ہے۔ ''بزرگ''
کچھ اس سے بڑھ کر، کچھ سوا ہوتا ہے۔ پپا ہی نے مجھے میرے جگری دوست کاشف کے بارے میں بتایا کہ وہ
ان دنوں کسی کاروبار کے سلسلے میں لندن گیا ہوا ہے۔ وہ میرے اندر کی بے چینی سے خوب واقف تھے، لہٰذا
مختلف بہانوں سے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میرے ذہن کی جو کنڈی اس زہرا جبیں کی
پلک کے خم میں اٹک چکی تھی، اُسے شام ڈھلے تک اُس کی مسلسل غیر موجودگی کے تمام جواز بھر بھرے ہوتے نظر
آئے۔ اگر کسی وجہ سے وہ بندرگاہ پر میرے استقبال کے لیے نہیں پہنچ سکی، تو پھر بھی اب تک اُسے مجھ تک پہنچ
جانا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے شہر میں اُترے سات گھنٹے ہو چکے تھے لیکن اُس کی طرف سے کوئی پیام، کوئی رقعہ، کوئی
سندیس تک موصول نہیں ہوا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں تحصیل ماہی کے مجذوب کی آواز گونجی ''جا..... تجھے خدا
ملے گا، نہ ہی وصال صنم.....'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ٹھیک اُسی لمحے سلطان بابا کے کمرے کا دروازہ
کھلا اور سب ہی ڈاکٹر ایک ایک کر کے باہر نکل آئے۔ میں لپک کر اُن کے سربراہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ فکر مند
سے تھے ''آپ اُن سے مل سکتے ہیں..... لیکن دھیان رہے کہ انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ سر پر گہری
چوٹ لگنے کے بعد مسلسل آرام نہ کرنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی گئیں ہیں۔ بہر حال مایوسی
کفر ہے..... ہمیں ایک آدھ دن ہی میں بڑا آپریشن کرنا ہوگا۔'' میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں اور پپا کمرے میں
داخل ہوئے تو آہٹ سن کر بابا نے آنکھیں کھولیں اور مسکرائے۔ لیکن اُن کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔ ''تم
نے پھر ایک بار اپنی ضد پوری کر لی نا میاں..... اب یہ ڈاکٹر دن رات تمہیں ڈراتے رہیں گے، حالانکہ ان کے
ہاتھ میں شفا تو ہو سکتی ہے، لیکن 'جزا' نہیں۔ قضا اور جزا کا اختیار صرف اُس کے پاس ہے۔ جتنی سانسیں لکھوا کر
لائے ہیں وہ تو بہر حال کاٹنی ہی ہیں۔'' میں نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ ''بات اگر سانسوں کی گنتی کی ہے تو پھر مجھے
وہ کلیہ بھی آج بتا ہی دیں، جس کے ذریعے میں اپنی باقی ماندہ سانسیں بھی آپ کے حساب میں منتقل کروا
سکوں۔'' انہوں نے میری بھیگی پلکیں پونچھیں۔ ''زندگی صرف سانسوں ہی میں نہیں بانٹی جاتی۔ تم نہیں جانتے تم
مجھے کتنی زندگی دے چکے ہو اور ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی ہمیشہ سانسوں ہی سے منسلک نہیں ہوتی۔ ایک سفر ختم ہوگا تو
دوسرا شروع ہو جائے گا۔'' پپا نے دھیرے سے میرے کاندھے کو دبا کر مجھے یہ احساس دلایا کہ مجھے سلطان با

کو آرام کا موقع دینا چاہیے۔ میری آنکھیں بہتی رہیں۔ جانے ہم اپنے سب سے زیادہ عزیز رشتوں سے ہمیشہ یہ توقع کیوں لگا بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی جُدا نہیں ہوں گے۔ میرا دل اور ذہن کسی طور پر بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ ''بزرگ دانش'' بھی باقی سب کی طرح ایک دن اپنی پلکیں موند کر گہری نیند کی چادر اوڑھ کر چلے بنیں گے۔

عشاء کے بعد رات کی ڈیوٹی والی نرس نے ہمیں یاد دلایا کہ اسپتال کے قوانین کے مطابق کوئی ایک تیماردار ہی وہاں رات گزار سکتا ہے اور وہ بھی سلطان بابا کے کمرے سے ملحقہ گیسٹ روم میں۔ مجھے مما سے کیا گیا وعدہ بھی یاد تھا۔ سو، میں سلطان بابا کو آرام کرتا چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے پپا کے ساتھ گھر چلا آیا۔ وہی مانوس دیواریں، وہی جانی پہچانی سی خوشبو..... وہی مما کی اپنی اپنی سی نوکروں کو ڈانٹنے کی آوازیں، وہی دیواروں سے لپٹی بیلیں۔ شاید اگلی زندگی میں جسے جنت سے بھی بڑھ کر کسی کو کچھ عطا کرنے کا فیصلہ ہوا تو اُسے واپس اپنے ہی گھر بھیج دیا جائے گا۔ میرا کمرہ بھی بالکل اُسی طرح ''بکھرا'' ہوا تھا جیسے میں اپنی عادت کے مطابق اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید مما نے میرے جانے کے بعد کسی کو میرے کمرے میں داخلے کی اجازت ہی نہیں دی ہوگی۔ میرے پرفیومز، سی ڈیز، سن گلاسز، سوئس، میوزک سسٹم اور ذاتی تھیٹر..... سبھی کچھ ویسا ہی تو تھا۔ حتیٰ کہ میرے کف لنکس اور ٹائی پنز بھی اُسی طرح اپنی جگہ پر پڑی تھیں۔ ایک پل کے لیے تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنا کمرہ چھوڑ کر دوست کے پاس گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس لوٹ آیا ہوں۔ میں نے اپنے کمرے کے فون سے زہرا کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف بجتی ہر گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن اتھل پتھل ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ گھنٹی دوسری جانب کے فون کی بجائے میرے اپنے من مندر میں بج رہی ہو۔ لیکن بہت دیر بجنے کے باوجود دوسری جانب سے فون نہیں اُٹھایا گیا۔ زہرا موبائل استعمال نہیں کرتی تھی اور اس ایک رابطہ نمبر کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی اور نمبر بھی نہیں تھا۔

کھانے کے دوران بھی میرا دھیان اُسی جانب اٹکا رہا۔ مما نے آج کھانے پر پچھلے تمام مہینوں کی کسر ایک ہی بار نکالنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مجبوراً مجھے اُن کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے پاس بٹھانا پڑا۔ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر پپا نے تجویز پیش کی کہ ہم تینوں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے زہرا کی طرف سے بھی ہو آتے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہاں جانا کچھ معیوب سا لگا اور پھر ویسے بھی مجھے واپس اسپتال پہنچنا تھا۔ اور پھر اس سے پہلے کہ پپا مزید اصرار کرتے، اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں اندر تک جھنجھنا اُٹھا۔ لیکن دوسری جانب کی بات سنتے ہی مما کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ''کیا..... اوہ..... اچھا..... جی جی..... لیکن کس اسپتال میں..... اچھا ٹھیک ہے.....'' مما نے فون رکھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کی ''زہرا کی گاڑی تلے کوئی شخص آ گیا ہے۔'' میرے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں گر گیا۔ مما نے جلدی میں بتایا کہ زہرا کا ڈرائیور ٹھیک وقت پر اُسے بندرگاہ لانے کے لیے نہیں پہنچا تو اُس نے خود ہی اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی

ں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ گھر سے خود ہی گاڑی لے کر نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈرائیور بھی پہنچ گیا
ے بھی زہرا کے پیچھے دوسری گاڑی دے کر بھیج دیا گیا اور پھر بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ ہجوم
ہ کر ڈرائیور نے بریک لگائی اور پھر اپنی مالکن کی گاڑی کے گرد خون بکھرا دیکھ کر اُس کے تو ہوش ہی گم ہو
ئے۔ پتا چلا کہ کوئی موٹر سائیکل سوار زہرا کی گاڑی تلے آ گیا ہے۔ نوجوان کی نبضیں ابھی چل رہی تھیں۔ لہٰذا
وں کے چیخنے چلانے کے باوجود ڈرائیور نے اُسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور زہرا سمیت اُسے لے کر قریبی
پتال کی طرف گاڑی بھگا دی۔ یہ فون وہیں سے زہرا کے والد نے کیا تھا۔ جب زہرا گھر سے نکلی تھی، تب تک
وا اپنے دفتر سے واپس نہیں لوٹے تھے اور پھر جب گھر پہنچے تو اس افتاد کا سنتے ہی وہ زہرا کی اماں کو لے کر فوراً
سپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہیوی بائیک پر سوار نوجوان کسی اُونچے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور دوسری
جانب کے لوگ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ زہرا کے ابا نے پپا اور مجھ سے بھی وہاں آنے کی درخواست کی تھی،
کیوں کہ معاملہ پولیس کا تھا۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی، لیکن مما کے بقول زہرا کے ابا کی آواز سے شدید پریشانی
جھلک رہی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار صدا نکلی کہ ''یا میرے مولا..... اُس گھائل کو اپنی امان میں رکھنا۔''
ابھی ہم نے گھر سے نکلنے کے لیے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور اس مرتبہ میں نے
لرزتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سلطان بابا کے وہ سینیئر معالج تھے، جنہیں میں خاص طور پر
اپنے گھر کا فون نمبر دے کر آیا تھا کہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں مجھے فون پر اطلاع دے سکیں۔ میں صرف
اتنا ہی سن سکا کہ سلطان بابا کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں، لہٰذا انہیں پھر سے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ
نزدیکی میں کئی بار میرا پوچھ چکے ہیں۔ میں ریسیور رکھ کر باہر کی جانب لپکا، جہاں مما پپا پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ
چکے تھے۔ دونوں طرف ہی کچھ ایسی صورت حال تھی کہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کس طرف کو نکلا جائے۔
میں نے پپا کو زہرا لوگوں کی جانب جانے کا کہا اور خود دوسری گاڑی میں سلطان بابا کی جانب روانہ ہونے کا
ارادہ کیا۔ ڈرائیور جلدی میں گیراج سے گاڑی نکال کر ابھی پورچ تک پہنچا ہی تھا کہ میری رگوں میں پھر سے
وہی اندھیرا اچھانے لگا۔ میں نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن میری بصارت سے رنگ غائب ہوتے گئے اور
پھر میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ذہن میں جیل کی قید کے دوران کیے گئے معائنے والے بڑے
ڈاکٹر کے الفاظ پھر سے گونجے۔ ''کوئی بھی شدید پریشانی یا اچانک خوشی کی خبر ان کے اعصاب کو جھنجوڑ کر اس
نظام کو متحرک کر سکتی ہے جو آگے چل کر کسی بھی بڑے اعصابی حملے کی بنیاد بن سکتا ہے۔'' افسوس وہ نظام متحرک
ہوا بھی تو کس گھڑی، جب چاروں طرف سے مصائب میرا گھیراؤ کر چکے تھے۔ میں زور سے لہرایا اور گاڑی
کے بونٹ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ میری حالت دیکھ کر پپا تیزی سے میری جانب بڑھے۔ ''ساحر..... خود کو
سنبھالو بیٹا.....'' لیکن میں شاید بہت پہلے سنبھلنے کے مقام سے آگے گزر آیا تھا۔ میری ڈوبتی آنکھوں اور بند
ہوتی پلکوں نے مما کو چیختے ہوئے میری جانب بڑھتے دیکھا۔ لیکن میری سماعتیں آس پاس کے شور سے بے نیاز

ہو چکی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں پپا کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ پھر نہ جانے میں ہوش میں تھا یا کوئی
تھا۔ ایمبولینس کی گھومتی سرخ بتی، شور مچاتی سڑک، کسی غیر ملکی اسپتال کی ہمارے شہر میں موجود کڑی کا
بورڈ، سفید گاؤن پہنے اور میرے اسٹریچر کے ساتھ بھاگتے ڈاکٹر، بدحواس سی نرسیں، آپریشن تھیٹر کی ایک
سے جلنے والی گول فانوس نما روشنیاں، کچھ چمکتے اوزار، خون کے چھینٹے، درد، کسک، بوجھل پن، میری
بائیں جانب کسی انتہائی تیز نشتر کی نوک کی چبھن اور پھر جلد سے گزر کر ماس کے اندر تک کاٹ کا احساس.....
پھر وہی سرخ اندھیرا..... کئی صدیوں کے بعد میری سماعت میں کچھ ہلکی سی سرگوشیاں گونجیں..... ہمیں افسو
ہے..... آپ کے بیٹے کے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ البتہ آپ اگر چانس لینا چاہیں تو اسے فوراً لندن کے
ویل اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ وہاں ڈاکٹر البرٹ ہی واحد ماہر اعصابی امراض ہیں، جو شاید
کچھ کر سکتے ہیں۔'' پھر مما کے رونے کی آواز، ایئر پورٹ ٹرمینل کے مخصوص اعلانات، ہوائی جہاز کے پہیوں
رن وے پر رگڑ سے اُڑتی چنگاریاں، اور پھر ایک ملائم آواز'' ہم لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر آپ کو خوش آمد
کہتے ہیں۔''

''من کی دیوار''

عجب جنون مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں کہ یہ سورج کدھر سے نکلا تھا
یہ کون پھر سے مجھے راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا
یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا
میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا
وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
تیری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا.....

سچ تو یہی ہے کہ میں خود ہی اپنی راہ کی سب سے بڑی دیوار تھا۔ میرے ہوش وحواس تب میرا ساتھ چھوڑ گئے، جب دو چار ہاتھ ہی اُس بام کی منڈیر چھونے کو رہ گئے تھے، جس پر میری قسمت کا واحد چاند چمک رہا تھا۔ لیکن چکور کی قسمت میں بھلا چاند کو پانا کب ممکن ہوا ہے۔ اس کا مقدر تو صرف اُسے چھونے کی خواہش میں اُڑتے جانا ہے۔ اُونچا اور اُونچا تر، حتیٰ کہ اُس کی سانسیں رُکنے لگیں، دم گھٹنے لگے اور پھر بے دم ہو کر فلک سے زمین پر نیست و نابود ہونے کے لیے ایک آخری قلابازی اور پھر سب ختم..... شاید میرا خاتمہ بھی قریب تھا۔ جھپکتی گھڑیوں کے چند لمحے مجھے ایک بہت بڑی سی شیشے کی کھڑکی دکھاتے، جس کے کانچ پر پھسلتی بوندوں سے ہمیں مجھے ایک دریا رواں دکھائی دیتا۔ میں اس دریا کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بلکہ کئی کئی گھنٹے میں نے اس کے کنارے بچھے بینچوں پر اس سے باتیں کرتے گزارے تھے۔ ہاں..... شاید یہ دریائے ٹیمز ہی تھا۔ میں اس کی لمبی لہروں کی خاموش سرگوشیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر کچھ وقفوں سے دھیرے دھیرے میرے پاؤں میں حرکت ہونے لگی۔ شاید نصف صدی بعد میں اپنی بوجھل پلکیں اُٹھانے میں کامیاب ہوا اور سب سے

پہلے جو شبیہہ میری بصارت کے سامنے دھیرے دھیرے متعارف ہوئی، وہ اپنے پورے جسم اور سر کو ایک چادر سے اچھی طرح ڈھانپے جانماز پر سجدہ میں پڑی ہوئی میری ماں کی تھی۔ ہاں..... وہ مما ہی تھیں، جن کی جبیں نے ماتھا ٹیکنا سیکھ ہی لیا تھا۔ اولاد کی محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا ایک دوسرا مظاہرہ کھڑکی کے قریب بیٹھے تسبیح کے دانے گراتے اپنے والد کی صورت مجھے نظر آیا۔ محبت چاہے کیسی بھی ہو، سجدہ کرنا سکھا دیتی ہے۔ میری پلکیں اُٹھتی دیکھ کر پپا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور وہ باہر کی جانب لپکے۔ مما بھی وہیں جانماز پر جمی رہ گئیں اور آنکھیں بند ہونے سے پہلے میں نے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو چند معاونوں کے ساتھ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسری بار جب میرے حواس جاگے تو میں نے کینڈر پر مزید تین ہنڈے سے بڑھے ہوئے دیکھے اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں پورے پندرہ دن تک اس سوتی جاگتی حالت میں بنا جیے گزار چکا ہوں۔ ہم لندن کے روز ویل اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے اعصابی حصے میں موجود تھے اور میرے گرد ڈاکٹروں کا ایک ہجوم جمع تھا، جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور پھر ایک معمر ڈاکٹر کی آمد پر سب چپ ہو گئے۔ اُس نے اپنا تعارف کروایا ''ہیلو لڑکے..... میرا نام البرٹ ہے ڈاکٹر البرٹ۔ تمہیں نئی زندگی کی جانب پہلا قدم مبارک ہو۔'' مجھ سے جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ میں پپا سے سلطان بابا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری زبان تالو سے جیسے چپک کر رہ گئی تھی۔ شدید پیاس کا احساس میرے حلق میں کانٹے چبھو گیا۔ ڈاکٹر البرٹ کو شاید میری کیفیت کی کچھ خبر تھی۔ ''تمہیں کچھ عرصہ احتیاط کرنی ہوگی۔ اس وقت پانی کی ایک بوند بھی تمہارے لیے زہر ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ریے بیز کا ایسا کیس آج تک کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا موت کے منہ سے واپس لوٹ آنا میرے لیے ایک معجزے سے کم نہیں۔'' وہ میرے گال تھپتھپا کر پلٹ گئے۔ چند گھنٹے بعد جب میں لکنت کے ساتھ بولنے کے قابل ہوا تو میں نے پہلا سوال بابا کے متعلق ہی کیا۔ پپا نے مجھے بتایا کہ ہمارے ملک سے روانہ ہوتے وقت وہ تقریباً کومے میں تھے اور ڈاکٹر اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے پپا کی بات ادھوری سی لگی۔ لیکن میں خود اس وقت کچھ ایسی معذوری کے عالم میں بستر پر پڑا تھا کہ خود اُٹھ کر اور دو قدم چل کر پاکستان فون بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جن لمحوں میں، میں ہوش کی سرحد سے پار تھا، تب سلطان بابا بھی دنیا والوں کے نزدیک بے ہوش پڑے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس تمام بے ہوشی کے دوران بھی میرا اُن سے مسلسل رابطہ تھا۔ میں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹا کھڑکی سے باہر دریائے ٹیمز کی رواں لہروں میں ضم ہو کر فنا ہوتی بوندوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پانی اپنے اندر پانی کو کتنی آسانی سے جذب کر لیتا ہے۔ شاید ساری بات (میڈیم) عنصر کی ہوتی ہے۔ ہر عنصر اپنے ہم جنس کو اتنی ہی آسانی سے قبول کرتا ہے گویا ہم انسانوں کا میڈیم بھی اس دنیا سے کچھ سوا ہی ہوتا ہوگا، کیوں کہ ہم اپنی ساری زندگی اس جہاں میں کاٹ کر بھی اس سے کتنے اجنبی رہتے ہیں، کتنے جُدا اور کتنے الگ سے۔ کہیں

امیڈیم وہی تو نہیں، جہاں سے ہمیں نکالا گیا تھا؟ اچانک میری نظر کمرے کی دیوار پر لگے پتلے سے اسکرین
ٹی وی پر پڑی، جو بند آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ پپا وقت گزاری کے لیے مختلف چینلز بدل رہے تھے اور پھر
لمحے کے لیے ٹی وی کے پردے پر وہ منظر گزرا، جس نے میرے وجود کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑا
پپا تب تک تین چار مزید چینل گزار چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں آواز دے کر پھر سے چینل پلٹنے کو
کہا۔ وہ میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے اور انہوں نے جلدی سے چینل پلٹ دیا۔ میں نے جلدی
سے ہاتھ اُٹھا کر انہیں رُکنے کو کہا۔ ہاں..... یہی وہ چینل تھا۔ حجاج آخری مناسک حج ادا کرنے کے بعد میدان
میں جمع ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا چکے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان میں سے ہر ہاتھ حبیب البشر صاحب ہی کا
ہو۔ میں نے جلدی سے اپنے چارٹ پر نظر ڈالی۔ میرے ہوش میں آنے کا وقت ٹھیک وہی تھا، جب حبیب
صاحب کی پہلی نظر اُس کے گھر پر پڑی تھی۔ ٹھیک چار دن پہلے..... جب حجاج پہلی مرتبہ حرم میں داخل ہوئے
اور جب دل زندگی میں پہلی مرتبہ کسی خشک پتے کی طرح لرز کر چند گھڑیوں کے لیے رُک گیا ہوگا، جب پوری
کائنات میں اپنے ایک مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس مساموں سے پسینے کی صورت بہا ہوگا اور
سب رواں رواں سجدے میں جھک کر رو پڑا ہوگا۔ تب وہ لمحہ تھا، جب میں نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں
مغرب میں ڈاکٹر اب ساری عمر سر کھپاتے رہیں گے کہ یہ اُن ہونی کیسے ممکن ہوئی۔ جس بیماری کو وہ لاعلاج
قرار دے کر میرے لیے ساری عمر مدہوشی یا جنون کے عالم میں مبتلا رہنے کا اعلان بہت پہلے کر چکے تھے، ایک
دن میں اس کے آثار کیسے مٹنے لگے۔ یہاں مغرب میں ایسے واقعات پر فوراً ایک لیبل لگا دیا جاتا ہے۔
Miracl (معجزہ)..... اور لوگ چند دن بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔
ب ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ ''سانس کی آمد و رفت'' سے بڑا بھی کیا کوئی ''معجزہ'' ہوگا اس دور کا؟ اُس
کے گھر سے ہزاروں میل دُور بیٹھ کر بھی جب اُس کے حضور مانگی گئی دعا پلک جھپکنے سے پہلے اُس کی بارگاہ میں
پہنچ جاتی ہے تو پھر اُس کی چوکھٹ کو چومتے ہوئے ماتھے کی سرسراہٹیں وہاں تک پہنچنے میں بھلا کیا وقت لیتی
ہوں گی؟ ڈاکٹر البرٹ کی ٹیم کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس کی تشخیص کے مطابق ریبیز کے کچھ جرثومے
ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحیح وقت پر ویکسین دیئے جانے کے باوجود عین موقعے پر اپنے آپ کو کسی سیپ نما چادر
میں چھپا کر خود پر کوئی ''جھوٹ خول'' چڑھا لیتے ہیں لہٰذا ویکسین کے خلیے اُسے پہچان نہیں پاتے اور اُس کا اثر ختم
ہونے کے بعد یہ زہریلے جراثیم اپنی قلعہ نما پناہ گاہوں سے باہر نکلتے ہیں اور دوا کے بچے کھچے اور دم توڑتے
خلیوں پر ایک تازہ دم فوج کی طرح حملہ کر کے اعصاب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ البرٹ کی تشخیص کے مطابق
جب مجھے لندن کے روز ویل اسپتال لایا گیا تھا، تب میرے تقریباً 90 فی صد اعصاب پر وہ زہریلی فوج اپنا
قبضہ کر چکی تھی اور ایسے مریضوں کا زندگی کی طرف لوٹنا یا پھر اپنے اعصاب ہی کو واپس پا لینا تقریباً ناممکن ہو جاتا
ہے۔ لیکن اُن کے سامنے ایک ایسا مریض موجود تھا، جس کے تھکے ہوئے اور قریب المرگ اعصاب کے چند

آخری سپاہی اُس پوری فوج کا مقابلہ کر کے یہ آخری جنگ جیت چکے تھے۔ میرے کمزور اعصاب کی فصیل ٹکا میرے ذہن کا قلعہ مفتوح ہونے سے بچا لیا گیا۔ لیکن جدید ایلوپیتھی اور سائنس اس معمے کو کبھی نہیں پا پائے گی۔ سچ ہے، انسان سدا سے خسارے میں ہے۔ سدا کا کوتاہ نظر ہے۔ اپنے سامنے روزانہ سورج نکلتے اور چاند تارے ڈوبتے دیکھ کر بھی اُسے یقین نہیں آتا۔ یہ پانی سے بھرے بادل، یہ ہوائیں، یہ روشنی، یہ پہاڑ، یہ آسمان..... بھلا اور کیا نشانی باقی رہ جاتی ہے اپنے اندر بیٹھے "دلیل کے سوداگر" کو مطمئن کرنے کے لیے.....؟ لیکن میرے اندر پھیلتی بے چینی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ پندرہ دن سے زہرا سے مما پپا کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک بار اُس کا فون آیا بھی تو بس چند لمحوں کے لیے۔ پپا ایسی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتے تھے، لیکن مما کچھ کھنچی ہوئی سی لگتی تھیں، جیسے زہرا کا ایسی حالت میں مجھ سے لاتعلق رہنا انہیں پسند نہ آیا ہو..... تب ہی شام کو میرے حلق میں سوپ کے چھوٹے چمچ اُنڈیلتے ہوئے اُن کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ "کون بے وقوف ہو گی، جو موت کے منہ میں جانے والے کو الوداع کہنے ایئرپورٹ پر آئے گی یا اُس کا انتظار کرے گی....." پپا نے نظروں نظروں میں مما کو ڈانٹا۔ وہ بڑبڑا کر چپ ہو گئیں، لیکن میرے ذہن میں کئی سوال کلبلانے لگے۔ وہ میری حالت جانے کے باوجود ایئرپورٹ تک کیوں نہیں آئی؟ اور اگر کوئی مجبوری بھی تھی، تب بھی وہ ایک بار فون کر کے میری خیریت تو پوچھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں محبت وسوسوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس زاویے سے بھی اس کا عکس دیکھیں کوئی نیا وسوسہ کچھ الگ ہی خدشہ سر اُٹھاتا ہے۔ ایک پل پہلے مل کر جانے والا محبوب بھی موڑ مڑتے ہوئے آخری بار پلٹ کر نہ دیکھے تو دیوانوں کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگتی ہے کہ جانے کیا ہو گیا؟ کہیں وہ رُوٹھ تو نہیں گیا۔ کوئی بات بُری تو نہیں لگ گئی اُسے.....؟ اور پھر اگلی ملاقات تک سارا چین و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا لیکن میں کتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس انسانی جسم کی لاچاری پر بے حد غصہ آتا تھا۔ ہمارے جسم کو ہماری سوچ جیسی پرواز کیوں نہیں عطا کی گئی؟ ایسا ہوتا تو میں اُڑ کر اُس بے پروا کے در پر جا پہنچتا کہ اس تغافل کی وجہ تو بتا دے؟ مجھے سلطان بابا کی فکر بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ عجیب بات یہ تھی کہ جب میں بے ہوش تھا، خود کو اُن کے بے حد قریب محسوس کرتا تھا، لیکن جب سے میں دنیا والوں کے لیے ہوش میں آیا تھا، اس خرد نے انہیں مجھ سے جیسے چھین لیا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب ہم اپنے عزیز ترین رشتوں سے جسمانی طور پر دُور ہوں تو ہمارے اندر موجود کوئی غیر مرئی نظام ہمیں رُوحانی طور پر ان کے قریب تر کر دیتا ہو؟

میں ابھی تک چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھا، لیکن تین دن بعد ڈاکٹر البرٹ کی ہدایت پر مجھے ایک نرس بیساکھی اور وہیل چیئر کی مدد سے اسپتال کی اندرونی حدود میں واقع، باغیچوں یا نہر کے کنارے مختصر سیر کے لیے لے جانے لگی۔ یہ اسپتال دریائے ٹیمز کے بالکل کنارے اور ایک چوڑی سڑک سے ملحق تھا۔ میں جانے کتنی بار اس سڑک سے گزرا ہوں گا، کیوں کہ لندن کی زرد شام کے سب رنگ اس سڑک پر بکھرے پتوں کی صورت، ہر

مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں کسی دن اس شکستہ بدن کے ساتھ
ک کی دیوار سے پرے اسپتال میں یوں بے بس اور لاچار بھی پڑا ملوں گا؟ ہماری زندگی میں کون سا
م پر کس وقت، کس صورت میں کھلے گا، یہ ہم اگر پہلے جان جائیں تو شاید بہت سے مقامات سے کبھی
دوستی بھی نہ ہو پائے۔ اس روز بھی میں وہیل چیئر پہ بیٹھا اسپتال کے وسیع گھاس کے میدان میں
ے سرخ اور زرد پتوں کی چادر پر سفید برف کے ننھے ستاروں کو اپنے موتی ٹانکتے ہوئے دیکھ کر کچھ ایسی
چوں میں گم تھا۔ موسم کی پہلی برف باری لندن کے در و دیوار کو سفیدے کی ململ سے ڈھک رہی تھی۔
برف گرتی ہے وہاں کے لوگ جانتے ہوں گے کہ پہلی برف کی کوری چادر زمین کو یوں ڈھانپتی ہے، جیسے
اں اپنی بیٹی کے داغوں پر سفید مرہم لگاتی ہے۔ اس کی بدصورتی چھپانے کے لیے اُسے سفید نور کی اوڑھنی
ادیتی ہے۔ جب برف کے سفید گالوں نے میرے بالوں میں جمع ہو کر میرے ماتھے پر میرے سیاہ مقدر کی
وں کی تلاش شروع کی تو نرس نے میرے منع کرنے کے باوجود وہیل چیئر کو جلدی سے آگے دھکیلا اور ٹھیک
لمحے مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظریں اُٹھائی۔ گیروے رنگ کا چولا
ہاتھوں میں آہنی کڑے ڈالے اور سر پر عام گول ٹوپی کی گولائی سے نصف ایک چھوٹی سی سفید ٹوپی پہنے
پکی عمر کا شخص بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی پوری شخصیت ہی میں ایک عجیب سی چکا چوند تھی۔ جیسے
م تپتی دوپہر کا سوا نیزے پر کھڑا سورج، جس پر کبھی نگاہ ٹک نہیں پاتی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں..... کس
چبھن تھی اُس کی نظر میں۔ میں ایک پل ہی میں لہولہان سا ہو گیا۔ ''مجھے یہاں سب گرو کے نام سے جانتے
ہیں۔ ویسے میرا نام پارکر گولڈ مین ہے اور میں آسٹریلین نژاد یہودی ہوں۔'' مجھے لگا تمہیں ابدی سکون کی
ل ہے لڑکے..... نرس گرو نامی اس پُراسرار شخص کو دیکھ کر موؤب سی ہو گئی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ
ں اسپتال کے عملے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ گرو نے میرے ماتھے پر اپنی دو اُنگلیاں رکھیں اور منہ ہی منہ میں
جانے کیا بڑبڑانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے گرم دہکتے الاؤ میں کسی نے برف کی دو سلاخیں گاڑ دی ہوں۔ اتنے
مانے دوسری منزل پر موجود میرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا اور زور سے بولیں ''ساحر برف باری
ع ہو چکی ہے..... فوراً اندر آ جاؤ۔'' وہ جانتی تھیں کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر آسمان سے اس نور کی برسات کو دیکھتا
ں، تب بھی میرا دل نہیں بھرے گا۔ گرو نے مسکرا کر ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ لیکن وہ دو آنکھیں ساری رات نیند
ھی مجھے اپنی پلکوں کے پیچھے چبھتی رہیں۔

صبح ہوئی تو دودھیا برف، لندن کے سب گناہوں پر پردہ ڈال چکی تھی۔ باہر بہتا دریائے ٹیمز اور دُور نظر
آتا ویسٹ منسٹر کا پل بھی برف سے بنا سانچا لگ رہے تھے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی دوسرا نظارہ کسی برفیلی صبح سے
یادہ محرز دہ اور مبہوت کر دینے والا ہو سکتا ہے۔ جانے کیوں مجھے ایسی ہر برفیلی صبح کے بعد اپنی رُوح پھر سے
نیا جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب پڑی آرام کرسی پر ادھ لیٹا باہر بنے نور کے مجسموں

کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور گرو اپنے مخصوص حلیے میں دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ ہم
اسے دیکھ کر ڈر ہی گئیں۔ اُس نے شستہ انگریزی میں سب سے معذرت کی کہ وہ صرف میری خیریت دریافت
کرنے آیا ہے۔ پاپا اُس کا مدعا سمجھ کر اپنی جگہ سے اُٹھے اور مما کو بھی باہر آنے کا اشارہ کیا۔ مما مجھے اس شخص
کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن پپا نے اپنی آدھی زندگی اسی ماحول میں گزاری تھی اور وہ یہاں کے
آداب سے واقف تھے، لہٰذا بادل نخواستہ مما کو بھی ساتھ ہی اُٹھنا پڑا۔ گرو نے غور سے میری جانب دیکھا
''مسلمان ہو.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''الحمدللہ.....'' گرو چونک سا گیا۔ خود مجھے اپنی اس بے
ساختگی پر حیرت ہوئی۔ مجھے یہ انداز افتخار پہلے تو کبھی نہیں سوجھا تھا۔ شاید اُس کے سوال ہی میں کچھ ایسا پوشیدہ
تھا کہ میرے اندر سے خود بہ خود یہ آواز باہر نکل آئی ''کیا نام ہے تمہارا؟'' ''عبداللہ'' کچھ دیر تک میں کمرے
سے باہر اور وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کرتا رہا۔ ''پورے روز ویل اسپتال میں تمہارے عجیب
مرض اور پھر عجیب ترین شفا کا چرچا ہے۔ یہاں کے ڈاکٹر اسے حسب معمول کسی معجزے سے تعبیر کر رہے ہیں
لیکن میں جانتا ہوں کہ آج کل معجزے اتنی آسانی سے رُونما نہیں ہوتے، ان کے پیچھے ضرور کچھ راز پوشیدہ
ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھے وہ راز بتاؤ گے.....؟'' میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر اُس
نے اپنے دل کی بات پہلی باقاعدہ ملاقات ہی میں میرے سامنے رکھ دی تھی۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے
شخص بہت خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا ''معجزے ناقابل
بیان ہوتے ہیں اور بات اگر راز کی ہے تو پھر وہ راز ہی کیا جو افشاء ہو جائے.....'' گرو نے بے چینی سے پہلو
بدلا ''ٹھیک کہا تم نے..... راز کا واسطہ اخفا سے ہے۔ لیکن یہ معاملہ انسان کی بھلائی کا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے
افشا سے کسی دوسرے مریض کی حالت سدھرنے کی ترکیب بھی ہو جائے.....'' میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا
شاید یہ میرا وہم ہی ہو، لیکن مجھے یوں لگا کہ اُس کی آنکھیں ہر لمحہ مجھے تسخیر کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں
''بات اگر کسی کی بھلائی کی ہے تو پھر جان لو کہ میری رُوح پر صرف دُعا کا معجزہ رُونما ہوا ہے۔ ہزاروں میل دُور
بیٹھے کسی شخص کے اُٹھے ہاتھوں کے پیالے میں میری مسیحائی کا تبرک ڈال دیا گیا۔ دعائیں تو میرے لیے
میرے اپنوں نے بھی بہت مانگی ہوں گی، لیکن کچھ اعجاز اجنبیوں کے حصے آتے ہیں۔ بس، اتنا سا افسانہ
میرا.....'' گرو غور سے میری جانب دیکھتا رہا، جیسے اُسے میری بات کا یقین تو ہو لیکن نصف۔ لیکن اُس نے مجھ
سے مزید بحث نہیں کی اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں مجھے اُس کے بارے میں بہت
کچھ پتا چل چکا تھا۔ مغرب میں آج کل لوگوں کا رُجحان رُوحانی علاج کی طرف بہت بڑھ چکا ہے۔ باقاعدہ
رُوحانی علاج کے کلینک کھل چکے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے بے چین من اور رُوح کی کسک دُور کرنے کی نیت سے
آتے تھے۔ گرو بھی یہاں کا ایک ویسا ہی رُوحانی مسیحا تھا جسے اسپتال کے بعض مریضوں کی خصوصی درخواست
پر مختلف اوقات میں رُوحانی سیشن کرنے کے لیے خاص دعوت دی جاتی تھی۔ پارکر نام کا یہ یہودی اپنی شفا

ہاں بہت مقبول بھی تھا اور بھٹکی رُوحوں کے ستائے جسم اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُس کا یہ حلیہ اور
ہام کا لقب اُس کے ہندوستان کے ایک دورے کے بعد کے عطا کردہ تھے، جب اُس نے وہاں بہت
وں کا کھڑے کھڑے علاج کر کے اُن کی رُوحوں کو سکون بخشا تھا۔ لیکن نہ جانے میرے ساتھ یہ اُلٹ
یوں تھا کہ وہ جتنی بار بھی میرے سامنے آیا تھا، میری رُوح میں بیک وقت کئی کانٹے چبھو گیا تھا۔ لیکن
؟ کیا نگاہوں کی طرح رُوحیں بھی آپس میں کچھ بھید بھاؤ رکھتی ہیں؟ ہاں..... بظاہر یہ رُوح کی ناپسندیدگی
لہ ہی لگتا تھا۔ کیوں کہ اُس کی ظاہری شخصیت عام لوگوں کے لیے بے حد پرکشش تھی۔ میں مما پپا کے
سلطان بابا کی خیریت تو کسی نہ کسی طور پر دریافت کروا ہی لیتا تھا، لیکن زہرا کی خبر ملنا محال ہوتا جا رہا تھا۔
ایک آدھ بار میرے کمرے ہی سے زہرا کے گھر بھی فون ملا کر دیکھا لیکن زیادہ تر اُس کے گھر کے
ں سے ہی بات ہو سکی۔ ایک بار زہرا کی اماں نے فون اُٹھایا بھی تو پتا چلا کہ زہرا گھر پر نہیں ہے۔ مما نے
ہو کر فون کرنا ہی چھوڑ دیا۔ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتا۔ جو دن کسی نہ کسی طور گزار ہی لیتا تھا مگر شام
ی جانے کہاں سے سارے جہاں کی بے چینیاں اس کے مٹھی بھر وجود کے چار خانوں میں در آتی
۔ کاش ہمارا دل بھی ان ٹیلی فونوں کی طرح یادوں کے لیے خاص نمبر اور ڈائل کا محتاج ہوتا اور جب تک
ں نمبر نہ گھمایا جاتا، تب تک یاد کی گھنٹی بھی نہ بجتی۔ یہ قدرت بھی ہمارے ساتھ کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے
بطوں کو آزاد چھوڑنا چاہیے تھا، انہیں ٹیلی فون جیسی ایجادوں میں قید کر دیا اور جن بے لگام جذبوں کو
میں بند کر کے رکھنا لازمی تھا، انہیں دل جیسی بے پروا سلطنت کے حوالے کر ڈالا۔ مگر تقدیر کو گلہ پھر بھی ہم
انسانوں ہی سے رہتا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی اور میں گھنٹوں کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند سے کوسوں دُور تھا۔ تنگ آ کر وہیل چیئر
یے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا اور باہر گرتی برف اور درختوں کی آپس میں ہوتی سرگوشیاں سننے لگا۔ برف
ل سوکھی ٹہنیوں سے گلہ کر رہے تھے کہ ابھی تو وہ انہیں خود سے لپٹائے بیٹھی ہیں، لیکن بہار آتے ہی جب
نے کھلیں گے تو وہ ان سے ناتا توڑ لیں گی اور ٹہنیاں بے وفا محبوب کی طرح ان سے کبھی پورے نہ
والے عہد و پیماں کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر برف میں جمے ایک وجود پر پڑی جو یوگا کے کسی آسن کو
رتی برف میں کھڑا تھا۔ وہ گرو تھا۔ گرو کی آنکھیں کھلیں اور تیر کی طرح میری نظروں میں گڑ گئیں۔
کیوں مجھے اُس کی آنکھوں میں شدید غصے کی جھلک نظر آئی۔ گرو نے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی
ی طرح پلٹا۔ مجھے لگا میں خود پر اختیار کھو بیٹھا ہوں۔

پہلی قیامت

میں نے ہپناٹزم کے بارے میں آج تک جتنا کچھ سنا تھا، اس کے تمام آثار میں اپنے وجود پر اس
محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میرے ذہن کا کوئی ایک حصہ ایسا ضرور تھا جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔ تب ہی
جب برف کی چادر پر اپنی موٹرائزڈ وہیل چیئر کے پہیوں کے نشان ثبت کرتا ہوا نیچے گھاس کے برف سے
میدان میں گرو کے قریب پہنچا تب بھی سوچ سکتا تھا اور یہ سب محسوس کر سکتا تھا۔ گرو کچھ دیر تک فاتحانہ
میں مجھے دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ''دیکھا..... کیسے کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے.....'' لیکن اگلے
ہی میری زبان سے نکلے سوال نے اُس کی نظر کا سارا غرور چکنا چور کر دیا۔ ''کیا تم ہپناٹزم بھی جانتے ہو.....
گرو کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ''کیا مطلب..... یعنی کہ تم..... تم یہ سب کچھ محسوس کر
ہو.....؟'' میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ہاں میرا وجود تمہاری نظر کے اثر میں یہاں نیچے تک خود کو دھکیل تو
ہے لیکن میں اب بھی جاگ رہا ہوں۔'' آسمان سے برستی برف ہمارے وجود ڈھانپ رہی تھی۔ رات کے
جب آسمان سے برف گرتی ہے تو برف کی اپنی ایک خاص روشنی ہوتی ہے، جیسے صفر سے بھی کہیں کم حرا
والے بہت سے دُودھیا بلب آس پاس جل رہے ہوں۔ میں اور گرو بھی ایسی ہی مدہم روشنی میں رات
سرکتے پہروں کو اپنی جھولی میں جمع کر رہے تھے۔ گرو مزید بے چین ہو گیا۔ ''میں پہلے ہی سے دن سے محسو
کر رہا ہوں کہ تمہاری رُوح میرا تسلط قبول کرنے میں شدید مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی ہے، جو تمہارے اندر
کر تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہی تمہاری طاقت ہے۔ لیکن میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ وقت آ گیا ہے کہ تم
مجھے بتا دو کہ کس ہستی کا سایا ہے تم پر.....؟'' میں اپنے آپ کو اندر سے انتہائی مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ ''تم
ے وجود پر تو شاید کبھی اپنا تسلط قائم کر بھی لو، لیکن میری رُوح کے کواڑ صرف چند مخصوص دستکوں ہی پر
ہیں۔'' گرو کچھ دیر نظروں ہی نظروں میں مجھے تولتا رہا۔ ''ٹھیک ہے، تو پھر کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر سودا ہو گا
مجھے اپنا راز دو گے اور بدلے میں تمہیں کچھ ایسا بتا جاؤں گا کہ تمہاری عاقبت سنور جائے گی بولو منظور ہے؟''
حال میں بھی میرے ہونٹوں پر ایک نامکمل اور زخمی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اگر میری عاقبت کا سنورنا اور
تقدیر نے تمہارے ذمہ ہی لگا چھوڑا ہے تو ٹھیک ہے۔ ایک سودا اور سہی.....'' اتنے میں ہم پر رات والی ڈ
شفٹ کے خاتمے کے بعد واپس جاتی کسی نرس کی نظر پڑ گئی اور وہ جلدی سے شور مچاتے ہوئے میری طر
دوڑی اور جلدی سے میرے برف سے بھرے وجود کو وہیل چیئر سمیت دھکیلتی ہوئی اندر راہ داری کی جانب

ئی۔ گرو وہیں برف میں کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ بعد میں مجھے اُس پکی عمر کی ہیڈ نرس کا نام اسٹاف ایمی معلوم ہوا۔ صبح ب وہ میرا معمول کا چیک اپ کرنے آئی تو کافی خفا معلوم ہو رہی تھی۔ مما پپا رات کو میرے کمرے سے ملحق مرے میں ہوتے تھے لہٰذا انہیں گزشتہ رات کی واردات کی خبر نہیں ہو سکی۔ میں نے نظروں نظروں میں ایمی کو نع کیا کہ وہ میرے رات بھر برف اوڑھنے کا ذکر نہ کرے۔ وہ ناراض ناراض سی، تھرمامیٹر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بخار ہو گیا۔ اب تمہیں ڈانٹ پڑنی چاہیے۔'' مما پپا دُور بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا۔ ''یہ فریضہ مما ہر دو گھنٹے بعد ادا کرتی رہتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے معمولات میں تھوڑی بہت تبدیلی ضروری ہے۔'' وہ بھی ہنس پڑی۔ ''باتیں خوب بنا لیتے ہو۔ تم رات کو اُس عجیب شخص کے سا تھ کون سی بحث کر رہے تھے؟'' ''کون.....؟ وہ گرو.....؟ وہ میرے ساتھ کوئی سودا کرنا چاہتا تھا۔'' ایمی کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ ''دیکھو، میری مانو تو اُس شخص سے دُور ہی رہو۔ پتا نہیں اسپتال والوں نے اُسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو اُس کا یہاں داخلہ ہی بند کر دوں۔'' ایمی، گرو سے کافی بد دل دکھائی دیتی تھی۔ ''میں نے سنا تھا کہ نرس ہر ذی رُوح کے لیے ایک نرم دل رکھنے والی ہستی کا نام ہوتا ہے، لیکن آپ تو گرو کے لیے کافی تلخ جذبات رکھتی ہیں، ایسا کیوں؟'' ایمی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''دیکھو لڑکے! میں تمہیں پوری بات نہیں بتا سکتی، بس اتنا جان لو کہ وہ ایک 'صیہونی' ہے۔ دراصل .....'' ابھی ایمی نے بات شروع ہی کی تھی کہ ڈاکٹر البرٹ اپنے دو معاونین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے اور ایمی جلدی سے سامان کی ٹرے اُٹھا کر چل پڑی۔ میں اخبارات اور ٹی وی پر روزانہ کئی بار صیہونیت اور صیہونی کی اصطلاح سنتا اور پڑھتا رہتا تھا، لیکن مجھے ابھی تک اس لفظ کے اصل معنی نہیں آتے تھے۔ شام تک میں اِسی ادھیڑ بن میں رہا کہ یمی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی۔ شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل آسمان پر جڑے بادلوں میں سے کسی ایک شریر ٹوڑے نے کچھ دیر کے لیے، اپنے ایک دوسرے سے بندھے ہاتھ کھول دیئے، تو چند لمحوں کے لیے فلک پر کسا اُودے بادلوں کا خیمہ ایک جانب سے کھل گیا۔ اور مٹھی بھر آسمان جھلکنے لگا۔ ٹھیک اُسی لمحے سورج کے نصف پیا لے نے مسکرا کر زمین سے چھڑخانی کی اور اس کی الوداعی کرنیں نیچے بچھی برف پر کچھ اس طرح پڑیں، جیسے بچپن میں ہمارے محلّے میں گولے گنڈے والا سفید دُودھیا برف کے گولے پر نارنجی رنگ کا شربت اُنڈیلتا تھا۔ میرا اس وقت شدت سے جی چاہا کہ میں کسی اُونچی عمارت سے سارے لندن کا نظارہ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت پورا لندن سورج مکھی کے کسی پھول کی طرح دمک رہا ہوگا..... زرد لندن کی نارنجی بہتی زمین اور جما ہوا دریائے ٹیمز، وہی شام اور وہی زہرہ کی یاد کا پھندا، جو ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ یوں کسا جاتا تھا، جیسے گیلی بان کی رسی خشک ہونے پر سکڑتی جاتی ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے جھلک دکھلا کر پھر سے گہرے بادلوں کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔

برف باری کے بعد ہونے والی شام عام شاموں سے کہیں زیادہ اُداس، بوجھل اور تھکا دینے والی ہوتی

ہے۔ ایسے میں جن کے دل دار اُن کے قریب بستے ہیں، وہ گرم چمنیوں کے سامنے بھاپ اُڑاتی کافی کے مگ لیے، کشادہ کھڑکیوں کے کانچ سے پرے درختوں کو برف سے بوجھل شاخوں کو سجدے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں تنہا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر ٹیمز کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ تب ہی گرو دروازے پر ہلکی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ مما اور پپا کو میں نے آج زبردستی لندن کے مشہور و یمبلے تھیٹر میں بہت عرصے سے لگا تار چلنے والا شیکسپیئر کا ڈراما میکبتھ (Mecbith) دیکھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک زمانے میں پپا لندن کا تھیٹر دیکھنے کے لیے خصوصی طور پر یہاں آیا کرتے تھے، لیکن میری پریشانی کی وجہ سے وہ آج لندن میں موجود ہوتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل پا رہے تھے۔ گرو نے میرا حال چال پوچھنے کے بعد پھر سے وہی سوال دُہرایا۔ لیکن آج میرے پاس بھی اُس کے لیے ایک سوال موجود تھا۔ ''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے ہوش میں لوٹ آنے کا واقعہ تمہارے لیے اتنا اہم کیوں ہے۔ ایسے درجنوں واقعات تمہارے آس پاس روزانہ ہوتے ہوں گے، پھر یہی ایک شفا تمہارے لیے معجزہ کیوں بن کر رہ گئی ہے.....؟'' ''اس لیے کہ میرا علم کہتا تھا کہ تم کبھی اپنے حواس میں واپس نہیں آؤ گے۔ تمہارے علم میں شاید یہ بات نہ ہو، مگر سچ یہ ہے کہ جب تم کوے میں تھے، تب مجھے ڈاکٹر البرٹ نے تمہارے رُوحانی علاج کے لیے خصوصی طور پر تین مرتبہ آئی سی یو میں بلایا تھا۔ تمہاری بے ہوشی میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ اور میں نے گھنٹوں تمہارے سرہانے تنہا کھڑے ہو کر تمہاری رُوح میں جھانکنے کی کوشش کی اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ تمہاری واپسی کے تمام راستے بند کر دیئے گئے ہیں۔ یہی بات میں نے تمام عملے کو بھی منتقل کر دی تھی، لیکن انہوں نے باعثِ مصلحت تمہارے والدین سے یہ بات چھپائے رکھی، حالانکہ مجھے بلانے سے پہلے خود ان کی تمام تر جدید طب تمہاری عجیب و غریب بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی، لیکن ایک ہی رات میں یہ ساری کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ میں ابھی تک شدید حیرت کا شکار ہوں۔'' میں غور سے گرو کو دیکھتا رہا۔ بظاہر سیدھا سادا نظر آنے والا شخص اندر سے کتنا گہرا تھا، اس کا اندازہ لگانا میرے لیے بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا، لیکن ایک بات تو طے تھی کہ خود اُس کے پاس بھی کوئی ایسا علم ضرور تھا، جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ میں نے اِس بار اُسے تفصیل سے پانی کے جہاز کا سا بلانکا، میں حبیب البشر صاحب سے ہونے والی ملاقات سے لے کر دس ذی الحج کے دن پہلی بار کچھ دیر کے لیے اپنے حواس میں آنے تک کے تمام واقعات سنا دیے۔ گرو کی آنکھوں میں کبھی حیرت، کبھی بے چینی اور کبھی بے یقینی کی لہریں وقفے وقفے سے جنم لیتی رہیں۔ شاید کہیں بہت گہرائی میں اپنے اندر خود کو یقین دلانے میں اُسے بہت مشکل ہو رہی تھی۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ ''تمہاری کہانی میں اب بھی بہت سی باتیں میرے لیے وضاحت طلب ہیں، لیکن میرے پاس یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔ کیوں کہ ایک بات تو طے ہے کہ تم کچھ 'خاص' ہو۔'' میں مسکرایا۔ ''میں تمہاری بے چینی کی وجہ سمجھ سکتا ہوں۔ اگر یہی دُعا کوئی میرے لیے یروشلم میں مانگتا تو شاید تم اتنے بے یقین نہ ہوتے.....'' حالانکہ

ں نے یہ بات کسی خاص نقطۂ نظر یا طنزیہ لہجے میں نہیں کی تھی۔ میرا مقصد صرف دو مقدس مقامات کے لیے
پنے اپنے جذبات کا زاویہ بیان کرنا تھا۔ لیکن گرو یوں اُچھلا، جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ شدید
ے میں بولا۔ ''تو گویا تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو آج زمانے بھر میں تم لوگوں کی ناکامی اور رُسوائی کی
یادی وجہ کیا ہے۔ یہی کہ تم لوگ بولتے زیادہ اور عمل کم کرتے ہو۔ لیکن آج میں تمہیں عملی طور پر ایک مظاہرہ
ھانا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تمہیں کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن اور حواس پر میرا تسلط قبول کرنا ہوگا۔'' میں
نے حیرت سے گرو کی طرف دیکھا ''لیکن یہ کیسے ہوگا؟'' ''کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ رات کو سونے سے قبل
پنے دماغ کو سُست چھوڑ دینا اور میرا تصور اپنے ذہن میں تواتر سے دہراتے رہنا۔ جیسے تم مجھے اپنے اعصاب
ے ذریعے مدعو کر رہے ہو۔ لیکن یاد رہے کہ تمہیں ٹھیک رات بارہ بجے سو جانا ہوگا۔'' میں نے گرو کو ٹٹولا۔
کیا تم پھر سے مجھ ہپناٹائز کرنا چاہتے ہو، یا پھر ٹیلی پیتھی کا سہارا لو گے.....'' گرو کچھ جھنجھلا سا گیا۔ ''جنہیں
پنے چاہنے والوں کی دعاؤں اور خدا پر اتنا کامل یقین ہو..... انہیں ان ہپناٹزم یا ٹیلی پیتھی جیسے معمولی شعبدوں
ے نہیں ڈرنا چاہیے.....'' گرو میرے اندر کے ساحر کو جگا چکا تھا۔ اب مزید کسی دلیل یا وضاحت کی گنجائش باقی
ہیں رہ گئی تھی۔ مما پپا کے واپس لوٹنے سے قبل میں اپنے کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مما
نے دھیرے سے کمرے میں جھانکا اور پھر میرا کمبل دُرست کر کے آہستگی سے پلٹ گئیں۔ میری نظریں گھڑی
ی سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے بارہ کے ہندسے تک پہنچ گئیں۔ میں نے گرو کی ہدایت کے
طابق اپنے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا اور میری بار بار بند ہوتی پلکوں تلے گرو کی شبیہہ وقفے وقفے سے
بھرتی رہی۔ اور پھر ٹھیک بارہ بجے میری مکمل غنودگی سے پہلے میرے ذہن میں گرو کی وہ چبھتی آنکھیں بُری
رح کھٹکنے لگیں۔ اور پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے میں گرو کی آنکھوں ہی سے سارا منظر دیکھ رہا ہوں۔ وہ
ب بہت بڑا سا ہال تھا، جس کی اُونچی دیواروں پر درجنوں وسیع روشن دانوں سے برف میں چٹکی چاندنی کی
لکوں روشنی اس طرح اندر آ رہی تھی کہ لکڑی کے پتلے تختوں سے بنے فرش پر چوکور نیلی روشنی کے مستطیل ٹکڑوں
ے ایک دائرہ سا بن گیا تھا۔ دائرے کے درمیان میں یہودیوں کے مقدس نشان، داؤد کا ستارہ (David
Star) بنا ہوا تھا، جس کے گرد دائرے میں گرو سمیت تیرہ لوگ اپنے سر، چہرے اور جسم کو بڑے بڑے کالے
غوں سے ڈھکے ہوئے مؤدب کھڑے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چاندی کا پیالہ تھا، جس
ں کی بھیڑ کا خون بھرا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر بنے ہوئے ستارے کو میں نے غور سے دیکھا تو وہ باقاعدہ دھات
ناپتلی نالیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ گرو نے دھیرے سے زیرلب عبرانی زبان میں کوئی آیت پڑھی۔ یوں لگتا
ا، جیسے وہ سب جس تقریب کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، اُس کا وقت پورا ہونے کو ہے۔ گرو نے عبرانی
بان میں زور زور سے قوم یہود پر مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے عبرانی نام دہرانا شروع کر دیئے۔ ''میکا
ا، عاموس، پرمیاہ، جون، یوحنا.....'' پھر سب سے پہلے گرو اور پھر اُس کی تقلید میں باقی سب چغہ پوشوں نے

اپنے اپنے پیالے کا خون زمین میں کھدے آہنی داؤدی ستارے کے بالائی کونے میں اُنڈیل دیا۔ خون تیزی سے چھ کونوں کی جانب یوں دوڑا کہ ترتیب وار پہلے کونے سے دوسرا کونا، پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔ مجھے احساس ہوا کہ زمین میں ستارہ کھود کر اُس میں چکنا فولاد اس طرح بھر گیا ہے کہ کسی بھی سیال مادے کو بہنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اور ستارے کو خاص طور پر اس طرح ڈھلان کی ایک سمت دی گئی ہے کہ اس کی ہموار فولادی نالیوں میں اُنڈیلا جانے والا مائع پہلے کونے سے ہوتا ہوا ترتیب وار اور یکے بعد دیگرے باقی پانچ کونوں تک یوں بہتا ہے کہ چھٹا کونا چھوتے ہی داؤدی ستارہ مکمل ہو جائے۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ نالیوں میں بہایا جانے والا خون رُک رُک کر آگے بڑھ رہا تھا، جیسے کوئی اَن دیکھی رُکاوٹ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ سب ہی چغہ پوشوں نے بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے گرو کو اِس مزاحمت کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اُس نے زیرِلب کچھ پڑھ کر ایک جھٹکے سے آنکھیں بند کر لیں اور ٹھیک اُسی لمحے میرے ذہن کے چلتی وہ فلم بھی ایک دم یوں غائب ہو گئی، جیسے کسی سینما کی اسکرین پر ریل کا فیتہ ٹوٹ جانے سے سب کچھ پل بھر میں مٹ جاتا ہے۔ یا کسی ٹی وی کا پردہ بجلی جانے سے ایک چمک کے بعد سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گرو کی آنکھیں بند ہوتے ہی کھٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہوتی طرف باری اور شدید ٹھنڈ کے باوجود میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں پہلے عالمِ خواب میں تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟ باہر گرتی برف کے گالوں کا حجم اور ان کی رفتار، دونوں ہی زیادتی کی جانب مائل تھے۔ بارش کے موسم اور برف باری میں یہی ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ بارش بے صبری ہوتی ہے، چیختی چلاتی، شور مچاتی، سارے آنگن کو سر پر اُٹھا لینے والی، جب کہ برف صابر ہوتی ہے، خاموشی اور سکون سے برسنے والی۔ ایک سکوت سا طاری کر کے مبہوت کر دینے والی..... مجھے اس لمحے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ بارش اگر ''عاشق'' ہے تو برف ''معشوق''..... کہ دونوں کا مزاج خود اُن کی درجہ بندی کا آئینہ ہے۔ رفتہ رفتہ صبح کا سپیدہ نمودار ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے کمرے کی کھڑکی کے شیشوں پر کوئی تازہ سفید قلعی پھیر گیا ہو۔ مما پپا سے پہلے ایمی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ ''لندن کی خوبصورت برفیلی صبح بخیر.....'' میں مسکرایا۔ ''ڈاکٹر البرٹ جانتے ہیں کہ مسیحا گری کی ابتدا خوبصورت لفظوں اور ایک بھرپور مسکراہٹ سے ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے انہوں نے ٹیم بھی خوب چنی ہے۔'' ایمی بھی ہنس دی۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے مما پھر پپا اور پھر ڈاکٹر البرٹ کی آمد نے اُس کا مقصد پورا نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر البرٹ نے میرے معائنے کے بعد اطمینان سے سر ہلایا۔ ''بہترین..... لگتا ہے تم نے بہت جلد ہمیں الوداع کہنے کی تیاری کر رکھی ہے نوجوان..... اِسے جاری رکھو۔'' ایمی وہاں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی تھی، لیکن البرٹ نے کمرے سے نکلتے وقت کچھ کام بتائے، مجبوراً اُسے بھی ڈاکٹر کے ساتھ ہی وہاں سے جانا پڑا۔ انہیں نکلے ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ گرو اپنے مخصوص حلیے میں کمرے میں داخل ہوا۔ مما کی تیوریاں چڑھنے سے پہلے ہی میں نے پپا کو نظروں نظروں میں

دوسرے کمرے میں لے جانے کی درخواست کی۔ پپا نے مسکرا کر پائپ کا ایک بھرپور کش لیا اور کسی سے مما کو وہاں سے لے کر اُٹھ گئے۔ گرو نے بات جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ ''کیا مجھے گزشتہ رات کی دُہرانے کی ضرورت ہے، یا ہم اگلی بات کریں؟'' تو گویا رات میں نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ خواب نہیں رو کا کوئی شعبدہ تھا۔ اس لمحے مجھے شدت سے سلطان بابا کی یاد آئی۔ اگر وہ مہینوں میری اتنی سخت تربیت نہ تے تو آج میں گرو کے اس پہلے حملے ہی میں چاروں خانے چت ہو چکا ہوتا، لیکن میں یاقوتِ سے لے کر ت تک جانے ایسی کتنی انہونیاں جھیل چکا تھا۔ اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگا کر گرو کو دیکھتا رہا۔ ں..... میں نے رات کو وہ سب کچھ دیکھا، جو تم مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم چابک چلتی ہوئی فلم کی ریل کیوں کاٹ دی؟'' اب چونکنے کی باری گرو کی تھی۔ ''گویا تم سمجھ گئے تھے کہ نے جان بوجھ کر تم سے اپنا ذہنی رابطہ ختم کر دیا تھا۔ دراصل تمہاری وہاں موجودگی سے ہماری عبادت میں پڑ رہا تھا'' ''لیکن میں تو یہیں تھا..... اپنے کمرے میں.....'' گرو مسلسل مجھے گھور رہا تھا۔ ''اس کمرے میں تمہارا جسم موجود تھا، لیکن تم اتنے خطرناک ہو کہ تمہاری صرف میرے ذہن میں موجودگی بھی ہماری ت میں رُکاوٹ کا باعث بن رہی تھی۔ اِسی لیے مجھے تم سے رابطہ توڑنا پڑا۔'' گرو نے مجھے بتایا کہ رات جو میں نے اپنے ذہن کے پردے پر چلتے ہوئے دیکھی، اُسے قدیم عبرانی زبان میں ''مقدس بہاؤ'' اور زی میں ''پوراوور'' (Pour over) کہتے ہیں۔ صدیوں پہلے قوم یہود کے تیرہ معزز خاندانوں کے راہ بھیڑ کی مقدس قربانی کے بعد تبرک کے طور پر بھیڑ کا خون سات دن تک اپنے گھر کے دروازے پر لگا کر تے تھے اور پھر ساتویں دن ایک بہت بڑے جشن کی صورت میں اس رسم کا خاتمہ ہوتا تھا۔ بقول گرو قدامت یہودیوں میں یہ رسم اب بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھی۔ اور کل رات میں نے جو منظر دیکھا، وہ دراصل ئیں دن کے خاتمے پر اُسی پوراوور کی رسم کی اختتامی تقریب تھی۔ جس وقت گرو سرگوشی میں مجھے یہ ساری بلات بتا رہا تھا، تب ایمی نے دو بار وقفوں سے میرے کمرے میں جھانکا اور نظروں نظروں میں کسی ناراض ل کی طرح ڈانٹا کہ میں اُس کے منع کرنے کے باوجود، کیوں اس شخص کے ساتھ دوبارہ بات کر رہا ا؟ وہ مما سے بہت چھوٹی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے اُس میں مما ہی کی جھلک دکھائی دی۔ شاید ائے بزرگیت'' سب ہی جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اب میں ایمی کو کیا بتاتا کہ اسکول اور کالج میں بھی مجھے ہمیشہ ہ سے زیادہ تجسس اور بات کرنے کی خواہش اُسی بچے سے ہوتی، جس سے بات کرنے یا کھیلنے سے مجھے مما ا کیا کرتی تھیں۔ لیکن ایمی کو مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کا موقع سہ پہر کی چائے کے بعد ہی مل سکا۔ جب مما اور پپا ے کے لیے نیچے جا چکے تھے۔ ''لڑکے..... میں نے تمہیں منع کیا تھا نا، اس گرو کے ساتھ بات کرنے ے؟'' مجھے اُس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''آخر آپ اُس شخص سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ بظاہر تو مجھے وہ کافی ھا لکھا اور شائستہ اطوار کا دکھتا ہے.....'' ایمی کو غصہ آ گیا۔ ''اس کا یہی علم نہ جانے کتنے گھروں کے بچوں کی

زندگی برباد کر چکا ہے۔ میں ڈرتی ہوں، کہیں وہ اپنا سحر تم پر بھی نہ آزما بیٹھے ....." گویا ایمی کو بھی گرو کے کمالات کی کچھ خبر تھی۔ اُس نے جلدی میں مجھے بتایا کہ آج کل لندن کے اعلیٰ طبقے میں گرو کا کافی اثر و رسوخ ہے اور اس نے ایک بہت مہنگے علاقے میں اپنا نروانا ہاؤس (Nirvana House) بھی بنا رکھا ہے، جہاں وہ ہر ہفتہ اپنے درجنوں پیروکاروں کو سکون حاصل کرنے کے گر بتاتا ہے۔ ان ہی نوجوان شیدائیوں میں ایمی کا اپنا بوائے فرینڈ پیٹر بھی شامل تھا، جو بقول ایمی گرو سے ملنے کے بعد باقاعدہ اُس کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔ اور اپنا گھر بار چھوڑ کر اب سارا دن گرو کی خدمت ہی میں لگا رہتا تھا۔ ایمی مجھے ابھی اتنا ہی بتا پائی تھی کہ باہر کی راہ داری کے اسپیکر پر کسی ایمرجنسی کے لیے ایمی کا نام پکارا جانے لگا۔ ایمی کو جلدی میں جانا پڑا۔ باہر سہ پہر تک تھمی برف باری پھر سے ہلکے گالوں کی صورت آغاز کی تیاری کر رہی تھی۔ گرو جاتے وقت مجھے شام 5 بجے نیچے نہر کی جانب آنے کا کہہ کر گیا تھا، لیکن مجھے اپنی مددگار نرس کو منانے میں بہت دیر لگی کہ وہ مجھے کچھ دیر کے لیے کھلی ہوا میں لے جائے۔ میں نیچے پہنچا تو مجھے دُور سے گرو اپنے لمبے جوتوں سمیت برف کے میدان میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی جانب آتے نظر آیا۔ اُس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے برف میں کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ نرس کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ گرو نے میرے قریب پہنچ کر میری وہیل چیئر پر اپنی چھتری تان لی۔ "اچھا ہوا تم آ گئے۔ میرا تم سے وعدہ تھا کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتاؤں گا، جسے پانے کے لیے دنیا صدیوں سے انتظار کر رہی ہے۔" میں نے اپنی پلک پر برف کے ایک موٹے گالے کی نمی محسوس کی۔ "میں سننے کے لیے تیار ہوں....." گرو نے عجیب سے لہجے میں سرگوشی کی۔ "تو پھر سنو..... میں جانتا ہوں کہ وہ دن، جسے تم مسلمان روزِ حساب کہتے ہو..... اور جس "قیامت" کا انتظار یہ زمانہ ازل سے کر رہا ہے..... مجھے خبر ہے کہ وہ 'قیامت' کب آئے گی.....؟"

21 دسمبر 2012ء

میں گرو سے باقی کسی بھی بات کی توقع کر سکتا تھا لیکن اُس نے قیامت کا ذکر چھیڑ کر مجھے چونکا ہی دیا
کیا مطلب.....؟'' ''مطلب یہ کہ میں تمہیں قیامت کی صحیح تاریخ بتا سکتا ہوں، کیوں کہ میرے حساب سے
مت آنے کی تمام نشانیاں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔'' برف ہمارے چاروں طرف یخ بستے قلعے کی فصیلیں کھڑی
رہی تھی۔ سرد ہوا نے میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ ''تم کن نشانیوں کی بات کر رہے ہو؟'' ''لاتعداد
انیاں ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا ذکر ایک ذہین نجومی 'ناسٹراڈیمس' صدیوں قبل کر چکا ہے مثلاً چار فولادی
دروں کا عظمت کے دو میناروں سے ٹکرانا (نائن الیون)، یہودیوں کو اپنی مادر ملت (اسرائیل) کا واپس ملنا،
ری دنیا پر یہود کا قبضہ ہونا (ڈالر اور بینک سودی نظام) وغیرہ وغیرہ۔ اب بس ایک آخری نشانی باقی ہے۔
لیم دجال کی آمد اور یہود کی آخری فتح اور میرے عمل کے مطابق یہ سمندروں میں بہت پہلے ہو چکی ہے۔ اب
رف لدگشت کے مقام پر اُن کا ظہور باقی ہے اور پھر قیامت اٹل ہے.....'' میں گم صم سا گرو کی یہ ساری بحث
تا رہا۔ اب مجھے ایمی کے کہے ہوئے لفظ ''صیہونی'' کی اصل تشریح سمجھ آ رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار جبل
ر میں سلطان بابا نے بھی قیامت کے آثار اور اُس کی واضح نشانیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا تھا
ن ہمارے عقیدے کے مطابق ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور باقی تھا اور گرو جس فتح کو یہود کی آخری
ا بتا رہا تھا وہ دراصل ہمارے ایمان کی فتح کا وقت تھا۔ مجھے اس لمحے اُس آخری لڑائی کا نام بھی یاد آ گیا جسے
ود ''آرما گیڈون'' (Armageddon) کے نام سے یاد کرتے تھے اور جس میں ایک فوج کے اتنی
م (جھنڈے) بتائے جاتے تھے۔ برف باری تیز ہو چکی تھی اور گرو کا پورا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اُس
نے مجھ پر تانی ہوئی چھتری کو زور سے جھٹکا، جو برف کے بوجھ کی وجہ سے تقریباً چٹخنے ہی والی تھی۔ چھتری ہٹتے
ا برف کے موٹے گالوں نے میرے بالوں میں چاندی بھر دی۔ میں نے غور سے گرو کی چبھتی آنکھوں میں
ھانکا۔ ''کیا ہے وہ تاریخ؟'' گرو دریائے ٹیمز سے بھی پرے خلا میں برستی برف کے ستاروں کے پار کسی اَن
بھی مخلوق کو دیکھتے ہوئے بولا ''21 دسمبر 2012'' کیا۔ اتنی جلدی؟ یعنی صرف تین سال بعد، ''ہاں میرا علم
ا کہتا ہے۔ اور یہی وہ پیغام ہے جو میں اپنے سب ہی چاہنے والوں میں عام کر رہا ہوں کہ آنے والے وقت
ا تیاری کو لو، وقت بہت کم ہے۔'' گرو واپس پلٹا اور ٹخنوں سے ذرا اُونچی پڑی برف میں اپنے قدموں کے
نان بناتا برف کی دُھند میں کہیں غائب ہو گیا، لیکن میرے وجود کے اندر جو دُھند چھوڑ گیا تھا، وہ اس باہر کے

کہرے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔

مجھے اُس لمحے سلطان بابا کی شدت سے یاد آئی۔ ساری رات یہی سوچتے ہوئے گزر گئی کہ یہ نئی جنگ اُن کے بنا میں کیسے لڑ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کس پہر کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگی تو نیند میں بھی میرے خوابوں کو اس گہری سفید دُھند نے ڈھانپ رکھا تھا اور پھر اچانک اِسی دُھند میں سے دُودھیا سفید لباس پہنے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے لبوں پر وہی اپنی ازلی اور مخصوص مسکراہٹ سجائے سلطان بابا نمودار ہوتے چلے گئے۔

''کیوں میاں! پھر اُلجھا بیٹھے اپنے دھاگے کہیں.....؟'' مجھے شدید حیرانی کے ساتھ بے پایاں خوشی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ ''آپ کہاں رہ گئے تھے مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر۔ آپ جانتے ہیں ایک قدم بھی آپ کے بنا اُٹھانا دوبھر ہو جاتا ہے میرا.....؟'' وہ میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ''موجودگی صرف جسمانی ہی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر اب تمہاری تربیت مکمل ہونے کو ہے۔ اب تمہیں تنہا فیصلے کرنے کی عادت ڈالنا ہوگی ساحر میاں.....'' میں شدید پریشان ہو کر بولا ''آپ آج یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا آپ کہیں جا رہے ہیں.....؟''

''سب ہی کو جانا ہے، کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ سب ہی اسی رستے کے مسافر ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ جانے والوں کے ساتھ کاروبارِ زندگی رُک نہیں جاتا اور پھر جب جسم دُور ہو جائیں تو رُوحیں مزید قریب ہو جاتی ہیں۔ عبداللہ کو خود کو سلطان کا جانشین ثابت کرنا ہوگا۔ جیتے رہو۔'' سلطان بابا نہ جانے اچانک ہی اُس دُھند میں کہاں کھو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کا کمزور پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ فجر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ میری یادداشت میں دریائے ٹیمز یا ویسٹ منسٹر پل کے علاقے میں کوئی بہت بڑی مسجد نہیں آ رہی تھی، لیکن میرے کانوں میں اذان کی واضح آواز پہنچ رہی تھی۔ بے خیالی میں وہیل چیئر کے بجائے بستر کے قریب رکھی اسٹیل کی بیساکھیاں تھام کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف وضو کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا کہ میرے بے جان قدم اور مفلوج ٹانگیں آج میرا بوجھ سنبھالنے کے قابل ہو چکی ہیں۔ چاہے بیساکھی کا سہارا اب بھی درکار تھا، مگر یہ بیساکھیاں ڈاکٹر البرٹ نے دو روز قبل صرف ناپ لینے کے لیے منگوائی تھیں اور اُن کی تشخیص کے مطابق مجھے ابھی اپنے قدموں پر بوجھ ڈالنے کے لیے مزید کئی ہفتے درکار تھے۔ بقول ایمی، جب اُس نے البرٹ کو صبح کے معائنے سے قبل اُن کے دفتر میں یہ خبر سنائی تو اُن کے ہاتھ میں پکڑا اسٹیتھ گر گیا اور وہ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔ ''کیا تم نے ہمیں مستقل حیرت زدہ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے نوجوان.....؟'' ڈاکٹر البرٹ بہت دیر تک اپنی ٹیم کے ساتھ میرے مختلف ٹیسٹ اور معائنے کرتے رہے۔ ''ناقابلِ یقین..... اگر یہ صرف قوتِ ارادی کا کمال ہے تو پھر مجھے کہنا پڑے گا کہ تم آہن سے بھی کہیں بڑھ کر مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔'' مما پپا بھی بے حد خوش تھے۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک رات والے خواب میں اُلجھا ہوا تھا۔ دل بار بار ڈوبا جاتا تھا لہٰذا ڈاکٹروں کے جاتے ہی میں نے اپنے سامنے پایا

ر کے ہسپتال کا نمبر ملانے کا کہا، جہاں سلطان بابا داخل تھے۔ وہاں کے بڑے ڈاکٹر کی بات سن کر میرا
ا نک گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کل رات سلطان بابا کی طبیعت بہت خراب ہونے لگی تو انہیں مصنوعی
کے لیے آکسیجن پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اُڑ کر واپس اپنے شہر پہنچ
مجھے سلطان بابا نے ہمیشہ یہی سبق دیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ فانی یہ انسانی جسم ہی ہوتا ہے اور
خاتمہ ہی اصل زندگی کی ابتدا ہے۔ لیکن ہم انسانوں کو ازل سے ابد تک اِسی فانی جسم کی محبت ہی میں مبتلا
ا ہے۔ ہم اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے، پھر چاہے وہ جسم ہمارا اپنا ہو یا پھر ہمارے کسی
ا..... سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کو کھو دینے کا احساس ہی ہماری سانسیں گھوٹنا شروع کر دیتا ہے۔
زندگی بھر جی کر بھی جینے کا ظرف تو خود میں پیدا کر نہیں پاتا، تو پھر ایک ''اجنبی موت'' کو گلے لگانے کا
کہاں سے لائے گا۔ مجھے جب ڈاکٹر البرٹ نے یہ بتایا کہ فی الحال میں ہوائی سفر کے قابل نہیں تو مجھے
بے بسی پر شدید غصہ آیا اور چند لمحوں کے لیے جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دراصل ہمارا یہ جسم خود ہماری راہ
ب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ میں اِسی خیال میں بیسا کھیاں ٹیکتا شیشے کی چھت اور شفاف دیواروں والی
اہ داری میں نکل آیا، جو ایک لمبی سی سرنگ یا ٹیوب کی مانند بہت دُور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی دیواروں
یک جانب بہت سے زرد رنگ کے پلاسٹک کے بنچ نما تختے درجنوں کی تعداد میں جڑے ہوئے تھے۔
ہسپتال کے مریض باہر موسم کی دست برد سے محفوظ رہتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر باہر ہوتی بارش، برف یا
دنوں کی دھوپ کا مزا لے سکتے تھے لیکن اس وقت شیشے کی چھت اور کانچ کی دیواروں کے پرے کا ہر منظر
یا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے سے آتے گرو پر پڑی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ''میں
یں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تو تم نے ایک بار پھر یہاں سب کو چونکا ہی دیا۔ تمہارے اندر جو بھی چھپا ہے۔ اُسے
ساتھ ہی سب پر ظاہر کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ کھیل کیوں کھیل رہے ہو؟'' گرو کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ نہ
نے اُس نے اپنے اندر یہ رقابت کیوں پال رکھی تھی۔ لیکن آج میں پہلے ہی سلطان بابا کی وجہ سے شدید ذہنی
ُ کا شکار تھا لہٰذا بہتر یہی سمجھا تھا کہ اُسے کوئی جواب دیئے بنا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ لیکن دو قدم ہی آگے
ا تھا کہ پیچھے سے گرو کی آواز نے پھر میرے قدم جکڑ لیے۔ ''کیوں خود پر سے بھروسا اُٹھ گیا ہے یا پھر اپنے
حانی اُستاد کی ناکامی کا ڈر ہے.....؟'' مجھے یوں لگا جیسے عبداللہ کے وجود کا ہر بند کواڑ توڑتے ہوئے ساحر باہر
ل کر گرو کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بلند ہوتی آواز کو دھیما رکھنے کی کوشش
ا۔ ''تم میں اور مجھ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ تم جسے شعبدہ سمجھتے ہو، وہ میرے لیے ایک معجزہ ہے۔ تم جس ہنر
پانے کے لیے جانے کتنی صدیوں سے سرگرداں ہو میرے نزدیک وہ دعا کی صورت پل بھر میں قبول ہو سکتا
ہے۔ بات صرف یقین کی ہے۔ اٹل یقین..... لیکن افسوس تم نے سب کچھ سیکھ کر بھی یقین کرنا نہیں سیکھا.....

اور شاید اِسی لیے تم اس قدر خوف زدہ ہو.....'' گرو میری بات سن کر دھیرے سے مسکرایا ''نہیں..... میں کسی سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے ابدیت کا راز پالیا ہے۔ پھر مجھے بھلا کیسا خوف؟ ڈرنے کی ضرورت تو جیسوں کو ہے، جنہیں آنے والے خطرے کا ادراک ہوتے ہوئے بھی کبوتر کی طرح آنکھیں موند لینے کی عادت ہے۔'' میں نے غور سے گرو کی طرف دیکھا۔ ''مجھے صاف صاف کہو تم چاہتے کیا ہو.....؟'' گرو کے چہرے کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی شخصیت کے گرد لپٹے یہ سارے خول اُتار دو۔ پہلے پہل تو میں واقعی تمہیں کوئی چھوٹا موٹا شعبدے باز ہی سمجھا تھا لیکن اُس رات عبادت کے دوران جب تم نے ہم سب کا ارتقا توڑنے کی کوشش کی، تب مجھے سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچنا پڑا۔ تم واقعی 'اس' ابدی راہ کے مسافر ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ میں تمہیں منزل تک پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔'' گرو کی باتیں حسب معمول اُس کی شخصیت کی طرح اُلجھی ہوئی تھیں لیکن آج میں نے اُسے ٹٹولنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ ''اور اس ابدی منزل کو پانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے تم یہ سب کسی صلے کی اُمید ہی میں کرو گے۔'' گرو مجھے راستے پر آتا دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔ ''تمہاری ذہانت پر مجھے پہلے بھی کوئی شبہ نہیں تھا لیکن بے فکر رہو، مجھے تم سے کوئی دنیاوی صلہ نہیں چاہیے، میرا مقصد مقدس ترین ہے۔ دراصل ہمارا مشن ہی دنیا کے اعلیٰ دماغوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے اور پھر تم تو یوں بھی میرے لیے بہت قیمتی ہو، کیوں کہ تمہارے پاس دوسروں سے کچھ سوا ہے۔ تم اگر میرے دائرے میں شامل ہو جاؤ تو میں تم سے 'ابدی سکون' کا وعدہ کرتا ہوں وہی ابدی سکون جس کی تلاش میں دنیا کا ہر ذی رُوح ازل سے بھٹک رہا ہے اور ابد تک سرگرداں ہی رہے گا بولو منظور ہے میری پیش کش.....؟'' گرو اُمید طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں بات کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ گرو چاہتا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو کر اُس کے نظریے کا پرچار کروں۔ میری دن بدن تیزی سے بہتر ہوتی حالت کو وہ اب بھی میرے کسی خاص علم یا شعبدے سے محمول کر رہا تھا۔ اِسے مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ گرو اپنی رہائش گاہ ہی پر باقاعدہ ایسی محافل کا انعقاد کرواتا تھا، جہاں اُس کی شخصیت اور تعلیمات سے متاثر طبقہ حاضر ہو کر وہ صرف اُسے سنتا اور سراہتا بلکہ اس کے گروہ کے رُکن باقاعدگی سے گرو کی رُوحانی تعلیمات کا پرچار بھی کرتے اور لوگوں کو اپنی جماعت میں شمولیت کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اِسی لیے گرو کے فدائین کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا، لیکن گروہ کا اصل نظریہ آخر کیا تھا؟ یہ بات ابھی تک میرے لیے ایک معمار ہی تھی۔ اتنا تو میں جان چکا تھا کہ اُسے کامل یقین تھا کہ 21 دسمبر 2012ء کو قیامت برپا ہونے والی ہے اور بظاہر وہ اپنی تعلیمات کے ذریعے آس پاس کے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان نسل کو آنے والے وقت کے لیے تیاری کا سبق دیتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایک زاویئے سے بہت آسان اور سادہ دکھائی دینے والی گرو کی یہ مہم بے حد پیچیدہ اور پُراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں مغرب کو لوگوں کو اپنے نظریات کے پرچار کی کھلی آزادی تھی تاوقتیکہ کسی کا نظریہ ریاست کے قوانین سے نہ ٹکرائے، اس لیے لندن

ہڈ پارک میں تقریباً روزانہ ہی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ کوئی دنیا سے مشینوں کے خاتمے
چلا رہا ہے تو کسی کو چاند پر بکنے والے پلاٹوں سے اختلاف تھا، کوئی ہم جنس پرستوں کا پیشوا تھا تو کوئی
دنیا سے ویزا پابندی کے خاتمے کے لیے بھوک ہڑتال کیے بیٹھا رہتا تھا۔ ایسے میں گرو اگر کھلے عام اپنے
کا پرچار کر رہا تھا تو یہ کوئی انہونی نہ تھی۔ میں نے تو لندن میں ایسے گروہ بھی دیکھے تھے جو حکومت
علانیہ اجتماعی خودکشی'' کو جائز قرار دینے کے لیے قانونی جنگ شروع کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس لحاظ
ن کے معاشرے میں گرو کی ''تعلیمات'' کو خاصی عزت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو بھی کمی نہ تھی۔ ایک
طبقہ ایسا بھی تھا، جس نے گرو کو باقاعدہ ''روحانی دیوتا'' کا درجہ دے رکھا تھا اور انہی سرپھروں میں ایمی
ابھائی پیٹر بھی شامل تھا۔

باہر گرتی برف کے گالے بڑے ہو گئے تھے اور ایسے میں اگر کوئی دُور سے مجھے اور گرو کو اس شیشے کی
یوب میں کھڑا دیکھتا تو اُسے یہ جگمگاتی بقعہ نور بنی راہ داری بالکل ایسے ہی دکھائی دیتی، جیسے برف سے
دھیا سمندر میں روشنیوں سے بھرا کوئی لشکارہ تیر رہا ہو۔ راہ داری کی اندرونی حدت کی وجہ سے شیشے کی
ں اور بیضوی چھت پر برف جم نہیں پا رہی تھی اور مستقل پگھل کر یوں بہ رہی تھی، جیسے ہم کسی شیشے کے
ں بند گہرے دریا میں ڈوب رہے ہوں۔ اتنے میں اچانک اسپیکر پر ڈاکٹر البرٹ کی آواز گونجی۔ وہ گرو کو
ریض کی درخواست پر 'ریکی' کے لیے خصوصی کمرہ نمبر 137 میں طلب کر رہے تھے، کیوں کہ یہ گرو کے
کے دورے کے مخصوص اوقات تھے۔ سو، اُس نے ایک لمبی سی سانس لی۔ ''مجھے تمہارے جواب کا
رہے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اس 'سچ کے سفر' میں میرا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرو گے۔'' وہ اپنی بات ختم
، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ شام تک میرا ذہن گرو کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں اُلجھا
انے اس بار قدرت کو میرا کون سا امتحان مقصود تھا۔ مجھے اپنی کوئی پروا نہیں تھی، لیکن میں اس اجنبی دیس
پنے والدین کو مزید کسی نئی اُلجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ پہلے ہی وہ دونوں میری وجہ سے انتہائی پریشان
ں میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کاتب تقدیر نے
سمت کی سیاہی کچھ زیادہ گاڑھی بنا ڈالی تھی۔ شام ہوتے ہی زہرا کی یاد کا پھندا پھر سے میری شہ رگ
ے کے لیے اپنے بل کسنے لگا۔ ہمارے تھکے ہوئے بے دم پھیپھڑے اپنا پورا زور لگا کر کرتا زہ ہوا کی ایک
پنے اندر اُتارنے کے لیے بے تابی سے پھڑپھڑاتے ہیں لیکن عشق کی ڈالی ہوئی خاک ہمارے سانس
کے تمام راستے پہلے ہی مسدود کر چکی ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان جتنا بے چین ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہے، اُتنی
اُسے اذیت ہوتی ہے۔ جان رُک رُک کر نکلتی ہے۔ ایسے میں فدا ہونے کا بہترین کلیہ یہی ہے کہ
لینے کی اور دم کھینچنے کی ہر کوشش ترک کر دی جائے اور محبت کو اپنی رگوں سے زندگی نچوڑ کی اجازت دے
ئے۔ سو میں نے بھی زہرا کی یاد کے پھندے کو اپنی شہ رگ کے ساتھ بے حد مضبوطی سے لپٹنے دیا۔ شاید

میرا مقدر یہی یادوں کی امربیل تھی، کیوں کہ جس کی ذات سے ان یادوں کی ڈور بندھی تھی، وہ تو نہ جانے کہاں جا چھپی تھی۔ وسوسے محبت کا آئینہ ہوتے ہیں، میری چاہت بھی انہی وسوسوں کے عکس کا شکار ہو رہی تھی۔ کہتا ہے کہ محبت دنیا کا مضبوط ترین جذبہ ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے تار عنکبوت ہی پایا۔ بدنامیاں، رُسوائیاں، ناکامیاں، درد، تڑپ، کسک اور جلن ہی عاشقوں کا سدا سے مقدر رہے اور لندن کی کالی سیاہ رات جیسی نہ جانے کتنی سیاہ راتیں اس مقدر کو رونے کے لیے اپنی زلفیں کھولے ہم جیسوں کا انتظار کرتی ہیں۔ مجھے بھی ایسی ہی ایک اور رات جھلنا ابھی باقی تھا۔

اگلی صبح ایمی میری دواؤں کی فہرست مکمل کرنے کے لیے آئی تو اُس کے چہرے پر معمول کی روشنی سے بہت کم تھی۔ کچھ چہرے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ ہلکا دھیما پن بھی اُن کی پوری شخصیت کو بجھا کر رکھ دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ایمی کے ساتھ بھی تھا۔ میرے بے حد اصرار پر وہ رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی بتا پائی کہ اُس کے چھوٹے بھائی پیٹر کو گزشتہ رات خون کی دو بوتلیں چڑھائی گئی ہیں، کیوں کہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے چوری چھپے کسی ''مقدس عبادت'' کے لیے اپنے جسم سے تھوڑا تھوڑا کر کے خون بہاتا رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے ایک لمحے ہی میں گرو کا عبادت خانہ اور 'پوراوو' کی رسم کا منظر کوندے کی طرح لپک کر رہ گیا، جو میں نے ایمی کے سامنے اس ذکر سے گریز کیا۔ وہ پہلے ہی بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کو چھلکنے سے روکے ہوئے تھی۔ وہ کام ختم کر کے پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میری کوئی بہن نہیں ہے، ہے بڑی بہن ماں کی غیر موجودگی میں ڈانٹنے کے تمام فرائض بخوبی ادا کرتی ہے۔ کیا آپ وہ جگہ پُر کریں گی میری مما کا ہاتھ بٹانے کی زحمت کریں گی۔ ویسے بھی اب مما..... مجھے ٹھیک طرح سے ڈانٹ بھی نہیں سکتیں جلد ہی تھک جاتی ہیں۔'' میرا وار کارگر رہا اور ایمی کا چہرہ پھر سے جگمگا سا گیا۔ ''بے فکر رہو میں اس صفت میں خود کفیل ہوں۔ اچھا ہے پیٹر کو بھی تمہاری بدولت کچھ رعایت مل جائے گی، ورنہ بچپن سے اب تک وہ انعام کا اکیلا حق دار تھا۔ آج سے عبداللہ بھی اس فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔'' ایمی جتنی اداس آئی تھی اُتنی خوش اور مسکراتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ جاتے جاتے میں اُس سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ وہ پہلی فرصت میں کسی بھی طرح میری پیٹر سے ایک ملاقات ضرور کروائے گی۔ سلطان بابا سے ملاقات کے بعد میری زندگی میں جتنے بھی واقعات رُونما ہو چکے تھے، اُن سب کا کوئی ایک خاص مقصد ضرور رہا تھا۔ آج ایمی سے ملاقات کے بعد مجھے گرو سے ملنے کا مقصد بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ گرو مما کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کر چکا تھا لہٰذا اب اُس کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اُن کی غیر موجودگی میں ہی مجھ سے ملا کرے۔ لیکن اس شام پہلی مرتبہ میں خود اُسے تلاش کرنے کے لیے چہل قدمی کے بہانے اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ مجھے ان بیساکھیوں کے سہارے چلنا اور لوگوں کی ہمدردی بھری نظروں کو جھیلنا بہت دشوار لگا لیکن شاید یہ بھی قدرت کا میرے لیے ایک سبق ہی تو تھا۔ لاچارگی، بے بسی اور انسان نامی اس کم ظرف

لو اپنی اوقات سکھانے کا سبق۔ میرے بس میں ہوتا تو میں دنیا کے تمام انسانوں کو ایک مرتبہ کچھ روز کے لیے بیساکھیوں کے سہارے چلنا لازمی قرار دے دیتا، تاکہ یہ کمزور حافظے والی مخلوق جب کبھی اکڑ کر اس زمین پر چلنے کی کوشش کرتی تو اُسے اُس کی حیثیت یاد دلائی جا سکتی۔

آج لندن میں بہت دنوں بعد کچھ دیر کے لیے شام کا سورج جھلکا تھا۔ زمین پر جب سورج کی شریر کرنیں چھم سے گرتیں تو کچھ دیر کے لیے برف بھی گدگدا سی جاتی اور روشنی کی ایک خیرہ کن چمک سے آنکھیں چندھیا سی جاتی تھیں۔ ہسپتال کے مرکزی احاطے میں کسی نے برف سے مدر میری کا مجسمہ تراشا ہوا تھا، پاس ہی برف میں راستہ بنانے والی مشین پکی اینٹوں والی روش سے برف ہٹا رہی تھی۔ تب ہی مجھے ایمی ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ اپنی جانب بڑھتی نظر آئی۔ لڑکے کی حالت کافی ابتر دکھائی دے رہی تھی اور وہ سارے راستے ایمی سے کسی بات پر اُلجھتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ایمی نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور قریب پہنچ کر تعارفی کلمات کہے۔ ''پیٹر..... یہ ہے عبداللہ..... تمہارا بڑا بھائی۔'' پیٹر نے بے دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہیلو بڑے بھائی! مجھے تمہارا نام پسند آیا۔'' میں مسکرایا۔ ''تمہیں پسند ہے تو تم بھی رکھ لو۔ پیٹر عبداللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پیٹر ہنس دیا۔ ''میں نے سنا تھا کہ مشرق بڑا سخی ہے، آج دیکھ بھی لیا'' میں نے بات جوڑی ''ہاں..... اگر سخاوت صرف نام بانٹنے سے ہی پوری ہو جاتی ہو تو مجھ جیسے بخیل بھی سخی ہو جاتے ہیں۔'' اس بار پیٹر اپنے قہقہے کو روک نہیں پایا۔ ایمی نے شاید بڑے عرصے بعد اپنے ماں جائے کے ہونٹوں پر یہ جادو دیکھا تھا۔ وہ رو پڑی۔ پیٹر نے شکوہ کیا۔ ''دیکھو نا! میں روؤں تو یہ روتی ہے اور میں ہنسوں تو مزید رو پڑتی ہے۔ اس کا علاج کیا جائے۔'' میں خاموشی سے کھڑا بہن بھائی کی یہ انمول تکرار سنتا رہا۔ پھر پیٹر مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ جاتے جاتے اُس نے ایمی سے کہا کہ وہ رات دیر سے گھر لوٹے گا، کیوں کہ اُسے کسی خاص تقریب میں جانا ہے۔ ایمی کی بڑبڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ خاص تقریب ضرور گرو سے متعلق تھی۔ ایمی کو رُخصت کر کے میں پلٹا ہی تھا کہ مجھے گرو اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ ''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟'' ''میں نے تمہاری پیش کش پر کافی غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل مجھے تمہارا پیغام سن لینا چاہیے۔ تو کیا تم آج رات مجھے اپنی عبادت کی تقریب میں مدعو کر سکتے ہو؟'' گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

صیہونی

شاید گرو مجھ سے ایسی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ میں خود، اس کے ہاں ہونے والی کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی فرمائش کر بیٹھوں گا۔ لیکن اُسے اپنے جذبات اور تاثرات کو چھپانا خوب آتا تھا۔ لہٰذا اگلے لمحے وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ ''ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ آج نہیں، تو کل تمہیں وہاں آنا ہی تھا، تو پھر آج ہی سہی۔ لیکن تم اسپتال سے چھٹی کیسے لو گے..... اور پھر تمہارے والدین..... وہ شاید تمہیں کبھی بھی یوں تنہا میرے ساتھ نہ جانے دیں۔'' ''والدین کی تم پروا نہ کرو۔ میں انہیں منا لوں گا۔ البتہ اسپتال سے باہر لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ تمہیں ڈاکٹر البرٹ سے میرے لیے خصوصی مختصر چھٹی لینا ہوگی۔ کہہ دینا کہ تم مجھے اپنے رُوحانی علاج کے کسی سیشن میں لے جانا چاہتے ہو، جو میری بیماری کو دُور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔'' گرو مسکرایا۔ ''ٹھیک ہے، تو طے رہا کہ ہم رات ٹھیک نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ تم تیار رہنا۔''

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر پاپا اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ نہ جانے انہوں نے کس طرح مما سے مجھے گرو کے ساتھ باہر جانے کی اجازت دلوائی۔ میں گرو کی گاڑی میں اسپتال سے باہر نکلا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ لوگ ماں کے رشتے کے بارے میں ہمیشہ بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہے ہیں، کاش کوئی باپ بیٹے کے اس انوکھے اور خوب صورت رشتے کو بھی کبھی اُس طرح بیان کرے۔ ابھی رات زیادہ نہیں ڈھلی تھی، لیکن قدامت پسند لندن کی سڑکیں سونے کی تیاری شروع کر چکی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پر جمع کیے ہوئے برف کے ڈھیر سرد ہوا کی وجہ سے جم چکے تھے اور سنٹرل لندن کی خاموش گلیوں میں کہیں کہیں بے گھر بنجارے لوہے کے بڑے ڈرمز میں آگ سلگا کر اس کے گرد کھڑے ہاتھ اور جسم تاپ رہے تھے۔ جدید لندن کی طرف سے آتی گاڑیوں میں زندگی ابھی جاگ کر انگڑائی لیتی محسوس ہو رہی تھی۔ خوب صورت چہروں، خوشبوؤں، کلونز اور ملبوسات کے ہجوم تیزی سے شہر کے ڈسکوز، اوپرا تھیٹرز اور کلبوں کی جانب رواں دواں تھے۔ جہاں فجر کے اُجالے تک سب ہی کو مدہوش رہنا تھا، رقص کرنا تھا اور اپنے جیسے انسانوں کی دنیا کو کھوجنا تھا۔ اس رنگ و خوشبو کے سیلاب میں کون یقین کرتا کہ اِسی دنیا میں کال گڑھ اور تحصیل ماہی جیسے اندھیرے قطعے بھی موجود ہیں جہاں چراغوں کا تیل پوری طرح شام ڈھلنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہاں رات اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ستارے بھی تھک کر بجھ جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں تب ہی ایک عجیب سا خیال آیا کہ کیا اگلے جہاں میں ان اندھیری راتوں اور ان روشن اُجالوں کی بنیاد پر بھی کوئی فرق، کوئی امتیاز برتا جائے گا؟ کوئی صلہ دیا

ے گا یا نہیں..... کیا وہاں کے اور یہاں کے گناہ گار ایک ہی سزا پائیں گے اور کیا جزا کاروں کو ایک ہی سی
ملے گی؟ میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ گرو کے ڈرائیور نے ایک طویل احاطے میں گاڑی موڑ لی۔ گرو خود
لینے نہیں آیا تھا۔ اُسے اچانک کوئی مصروفیت درپیش ہوگئی تھی۔ گاڑی رُکتے ہی ایک خادم کی معیت میں
ایک بڑے سے ہال کی بالکونی میں پہنچا دیا گیا۔ ہال اور بالکونی پہلے سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ پتا چلا
آج گرو کا لیکچر ہے۔ اس کے بعد وہ یہیں اسٹیج پر لوگوں کا رُوحانی علاج بھی کرے گا۔ مجھے تیسری رو میں
ہوئے پیٹر کی ایک جھلک بھی دکھائی دے گئی۔ کچھ ہی دیر میں گرو اپنے مخصوص چغے میں اسٹیج پر نمودار ہوا تو
میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے کھڑا رہا، پھر اُس نے یونہی آنکھیں موندے
ے ہال سے گزارش کی کہ سب لوگ ابدی سکون کے لیے ایک منٹ تک آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی
دعا کریں۔ سب کے ساتھ میری آنکھیں بھی میکانکی انداز میں بند ہوگئیں اور ٹھیک اُسی لمحے میری بند
وں کے پردے کے پیچھے گرو کی شبیہہ مسکرائی ''خوش آمدید''۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گرو
طرح آنکھیں موندے اسٹیج پر کھڑا تھا۔ جانے کیوں، پر ایک لمحے کے لیے میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس بار
مقابل ٹیلی پیتھی کے ہتھیار سے لیس تھا اور میں بالکل تہی دامن۔ ہال میں زیادہ تر تعداد اُن لوگوں کی تھی
رو کی شہرت سن کر پہلی مرتبہ اُس کے اس ہفتہ وار رُوحانی درس میں شامل ہونے آئے تھے۔ گرو کے چاق
ند شاگرد ہال کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے۔ علاج کے لیے آنے والوں کی نشستیں علیحدہ لگائی گئی
ں۔ کچھ دیر میں باقی تمام ہال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور صرف اسٹیج پر کھڑے گرو کے گرد نور کا ایک ہالہ
نا کے دائرے کی صورت میں باقی رہنے دیا گیا۔ گرو کو لوگوں کو مسخر کرنے کا فن بخوبی آتا تھا۔ سب ہی لوگوں
ل ارتکاز اب اسٹیج کی جانب ہو چکا تھا۔ میں نے اُس لمحے محسوس کیا کہ اس جدید دنیا کے سب سے ترقی
شہروں کی فہرست میں سے ایک شہر، لندن بھی ایسے باسیوں سے خالی نہیں، جنہیں رُوح کی پیاس ایسی
دل پر کھینچ لاتی ہے، جہاں رُوحانیت اور توہم پرستی کے درمیان بہت معمولی سا فرق رہ جاتا ہے۔ شاید
ان جس قدر زیادہ سائنسی ترقی کرتا جاتا ہے، اُس کی رُوحانی پیاس بھی اُسی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے
ل میں گرو جیسے لوگوں کی کامیابی اور تعظیم سو فی صد یقینی ہوتی ہے، کیوں کہ اس جدید معاشرے کے ترقی یافتہ
سب کچھ پا لینے کے باوجود بھی کسی رُوحانی مسیحا کی تلاش میں در بدر بھٹک رہے ہوتے ہیں۔

گرو نے اپنے درس کا آغاز عبرانی زبان میں چند دعاؤں کے ساتھ کیا ''قسم ہے مجھے اُس خدائے عظیم و
کی جس نے ہمارے اکابر پر کبھی من و سلویٰ برسائی تھی، جو موسیٰ سے کلام کرتا تھا اور جس نے ہمیں عظیم تر
جس نے ہمارے لیے بارہ چشمے تفویض کیے اور فرعون سے مقابلے کو سمندر پھاڑ کر راستہ بنایا۔ اُسی رب
کم یہ دنیا بہت عارضی اور جلد مٹ جانے والی ہے۔ سو، میرا یہ پیغام ہے، جہاں تک پہنچے کہ آؤ ہم سب مل
اُس اگلے جہاں کی تیاری کر لیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارے رب نے ہمیں یہاں اس دنیا میں بھی عظیم پیدا

کیا ہے اور وہاں بھی وہ اپنے لاڈلے بندوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرے گا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ہم
اُس کا محبوب بندہ ثابت کریں اور اس ابدی سکون کی دعوت کو دیگر بے چین لوگوں تک پہنچائیں جنہیں
تلاش ہے مگر وہ ابھی تک سچ کو جان نہیں پائے۔'' گرو کافی دیر تک مختلف حوالے اور ترغیبات دے کر لوگو
اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا رہا اور پھر اُس نے اپنے درس کا اختتام بھی چند عبرانی آیات
ساتھ ہی کیا۔ ہال میں ابھی تک ملگجا اندھیرا اور مکمل سکون چھایا ہوا تھا۔ اچانک میری نظر اُن بڑے بڑے
دانوں پر پڑی، جہاں سے برف باری شروع ہونے سے پہلے کا سرخ انگارہ آسمان پر جھلک رہا تھا۔ اور
چھت پر بنے داؤدی ستارے کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی ہال تھا، جہاں ''تو
بہاؤ'' کی رسم ادا کی گئی تھی۔ میں نے بے چینی سے زمین پر کھدے آہنی ڈیوڈ اسٹار کو ڈھونڈنے کے لیے
دوڑائی لیکن فرش پر اس وقت لکڑی کی نشستیں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر بیٹھے لوگ محویت سے گرو کی بات
رہے تھے۔ درس کے بعد رُوحانی علاج کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک یہودی عورت ترتیب وار نام پکار کر مریضوں
کو یکے بعد دیگرے اسٹیج پر بلانے لگی۔ مریض بدحال اور نڈھال حالت میں اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے جاتے۔
ان میں سے کئی وہیل چیئر اور بعض دوسروں کے سہارے گرو کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ گرو اُن سے
نام پوچھ کر مرض کی نوعیت معلوم کرتا اور پھر اپنے داہنے ہاتھ کی دو اُنگلیاں مریض کے ماتھے پر رکھ کر منہ ہی منہ
میں کچھ پڑھ کر مریض کے سر پر پھونک مار دیتا۔ نہ جانے اس طلسماتی لمس اور پھونک میں کیا اثر ہوتا کہ مریض
ایک لمحے کے لیے بالکل ہی بے سُدھ ہو کر وہیں جھول جاتا، جسے سنبھالنے کے لیے آس پاس دو خادم پہلے تیار
کھڑے تھے، اور پھر چند لمحوں پر بعد جب اُسے ہوش آتا تو وہ بالکل ہشاش بشاش اپنے پیروں پر چل کر واپس
اپنی نشست پر آ بیٹھتا۔ ہر بار مریض کے ہوش میں آنے اور ٹھیک ہونے پر پورے ہال میں داد و تحسین کا طوفان
سا اُمڈ آتا۔ عورتوں نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا اور نوجوان طبقہ زور زور سے چلا کر گرو سے مسیحائی
درخواست گزار تھا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک گرو نے ہاتھ اُٹھایا اور پورا ہال
یک دم یوں خاموش ہو گیا، جیسے وہاں کبھی کوئی ذی رُوح موجود ہی نہیں تھا۔ گرو کا اشارہ میری طرف تھا
''عبداللہ..... میرے دوست..... تم بھی یہاں نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری بے یقینی کو یقین میں بدلنا چاہتا ہوں۔''
سب ہی کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور میرے تمام جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرے پاس انکار کا کوئی موقع
نہیں تھا۔ گرو کا یہ حملہ میرے لیے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند لمحوں کے لیے میرا ذہن جیسے سُن ہو کر رہ
گیا۔ ہوش تب آیا جب میں اپنی بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے گرو کے سامنے اسٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ گرو نے غور سے
میری جانب دیکھا ''اپنے دل سے ہر شک و شبے کو نکال دو میرے دوست۔ یاد رہے کہ دائمی علاج صرف
میرے رب کی دسترس میں ہے۔ میں صرف رُوح کو پاک کرنے کی دعا کر سکتا ہوں اور اس دعا کا اثر صرف
اُن پر ہوتا ہے جو آئندہ کے لیے اپنی رُوح کو کسی گناہ سے پراگندہ نہ کرنے کا عہد کر کے میرے پاس آئے

۔لیکن اگر اُن کے دل میں کوئی چور ہو تو میری یہ دُعا بھی چند لمحوں بعد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے۔ لہٰذا تم بھی عہد
کہ ہمیشہ اپنی رُوح کو پاک رکھو گے۔'' گرو کی آواز برقی مائک کے ذریعے پورے ہال میں پھیل رہی تھی
سب ہی دم سادھے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا دیکھ رہے تھے۔ شاید میرے انداز میں
ت کی لہر کو اُن سب ہی نے محسوس کر لیا تھا۔ جانے کیوں، مگر جتنی بار بھی میرا گرو سے سامنا ہوا تھا میں نے
ے اندر سے کچھ منفی لہریں نکلتی محسوس کی تھیں، حالانکہ اب تک کی ہر ملاقات میں اُس نے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور
یا کیا تھا، جسے دیکھ یا سُن کر عام انسان خود کو صرف سحر زدہ ہی محسوس کر پاتا۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی قوت
ور تھی، جو مجھے گرو سے دُور دھکیلتی رہتی تھی۔ وہی قوت اس وقت اسٹیج پر اُس کے سامنے کھڑے ہونے کے
خود بھی مجھے بار بار خبردار کر رہی تھی کہ مجھے اپنا آپ اُس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اُس نے مجھے کچھ
نے کا موقع ہی نہیں دیا اور اگلے ہی لمحے اُس کی شہادت کی اُنگلی سمیت دو اُنگلیاں میرے ماتھے میں جیسے
اعدہ پیوست ہو چکی تھیں۔ گرو کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اور ایک پل ہی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے
رے ماتھے کے مرکز سے ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ آبِ حیات نے میری نس نس میں ٹھنڈ
ے، تازگی اور خمار آلود سکون کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ میں نے اس مدہوشی سے بچنے کے لیے اپنے قدم زور
ے زمین پر جمانے کی کوشش کی، لیکن اگلے ہی لمحے میں کسی مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑایا اور میرے ہاتھ سے
ماکھیاں چھوٹ گئیں۔ گرنے سے پہلے مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھام لیا گیا اور اس کے بعد نشست
ک پہنچائے جانے کے مرحلے سے لے کر واپس اسپتال آنے تک میں جیسے ایک خواب کے عالم میں مدہوش
ا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم میں سُن کرنے والے بہت سے ٹیکے بیک وقت پیوست کر
یے گئے ہوں۔

میری یہ کیفیت اگلی صبح تک برقرار رہی۔ گھنٹوں نیم گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑے ہونے کے بعد
ہیں جا کر میرے حواس کچھ بحال ہوئے۔ مما نے جب چوتھی بار دروازہ دھڑ دھڑا کر مجھے ناشتا ٹھنڈا ہونے کی
ہائی دی، تب میں باہر نکلا۔ اور تب ہی میری نظر دروازے سے باہر کھڑے پیٹر پر پڑی، جو ہاتھوں میں گلدستہ
لیے بے چین سا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مما ہم دونوں کو کافی کے مگ تھما کر دوسرے
مرے کی طرف بڑھ گئیں۔ پیٹر اُن کے جاتے ہی جلدی سے بولا ''بڑے بھائی، تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم بھی
رو کے معتقد ہو۔ میں تو کل رات تمہیں وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ تم اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے
سکرا کر پیٹر کو دیکھا ''ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے اتنے شدید وار کے اثر سے نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔'' پیٹر کو
ر کا جھٹکا لگا۔ ''گویا تم بھی.....؟ ایمی بھی ایسی باتیں کرتی ہے۔ جانے تم لوگوں کو گرو کی رُوحانی طاقتوں پر
یقین کیوں نہیں آتا۔'' میں نے غور سے پیٹر کی جانب دیکھا۔ ''یقین ایک ایسا سودا ہے، جسے دلیل کی تلوار سے
نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یا تو یقین کرتے ہیں یا پھر نہیں..... تم اپنے یقین کے ساتھ خوش رہ اور مجھے میری بے یقینی

کے ساتھ جینے دو..... جانتے ہو، کامل یقین بھی کسی دولت کی طرح ہوتا ہے اور یہ خزانہ کم خوش نصیبوں ہی
نصیب ہوتا ہے۔ تمہیں تمہاری دولت مبارک، ہمیں ہماری غریبی۔'' پیٹر میری بات سُن کر ہنس پڑا ''مجھے تمہاری
یہی بات سب سے اچھی لگتی ہے عبداللہ۔ تم ایمی کی طرح مجھ پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ
بھی جلد ہی گرو کو اپنا اُستاد مان لو گے۔ وہ زبردست انسان ہے۔'' ''میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں گرو کی عظمت
تسلیم کرلوں گا، لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اگر زندگی میں تمہیں کسی لمحے بھی ایسا محسوس ہوا کہ تم نے جو
راہ چنی ہے، وہ منزل کی طرف نہیں جاتی، تو تم ایمی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنی تعلیم مکمل کرو گے اور ایمی کے خواب
پورے کرو گے۔'' پیٹر نے خوش دلی سے میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو وعدہ رہا..... پکا وعدہ۔'' ٹھیک اُس
لمحے ایمی دواؤں کی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور پیٹر کو دیکھ کر بولی ''چلو بچے، ڈاکٹر البرٹ کے
راؤنڈ کا وقت ہونے والا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں تمہیں یہاں لے تو آئی ہوں، لیکن اسپتال کے نظم کا خیال
رکھنا بھی میرا فرض ہے۔'' پیٹر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ ایمی نے بھیگی پلکوں کے ساتھ میرا شکریہ ادا
کیا۔ ''آج سالوں بعد پیٹر نے خود کسی سے ملنے کی فرمائش کی۔ جانے کیوں۔ پر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے
کہ میرا پیٹر بہت جلد گھر واپس لوٹ آئے گا۔'' میرا دل اندر سے لرز سا گیا اور بس ایک ہی صدا نکلی کہ یا اللہ اس
معصوم بہن کے یقین کی لاج رکھنا۔ میں نے گزشتہ روز ایمی سے یہودیوں کے بارے میں لکھی گئی چند اہم
کتابیں لانے کو کہا تھا۔ ایمی نے دو کتابیں میرے حوالے کیں۔ ''تمہاری فہرست میں موجود کچھ کتابیں لندن
کے کسی بھی بک اسٹور سے نہیں مل پائیں، لیکن میں نے ہالینڈ میں اپنی ایک دوست کو ای میل کی ہے وہ جلد ہی
وہاں سے کتابیں ڈھونڈ نکالے گی۔ میں جانتی ہوں، تم ان کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو۔ چاہو تو میں
تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ میں یہود کے بارے میں یہودیوں سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔'' میں نے چونک کر
ایمی کو دیکھا۔ ''وہ کیسے.....؟'' ایمی نے گہرا سانس لیا ''کیوں کہ میری سگی ماں ایک یہودن تھی۔'' میرے ہاتھ
سے کتابیں گرتے گرتے بچیں۔ ''ہاں، بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ میری ماں قوم یہود سے تھی۔ میرا
باپ سادہ لوح عیسائی تھا۔ لیکن میری ماں کی زندگی برباد کرنے والا بھی ایک صیہونی ہی تھا۔ تم اُس دن
صیہونیت کے بارے میں پوچھ رہے تھے نا۔ تو سنو، یہ سچ ہے کہ ہر صیہونی یہودی ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک
حقیقت ہے کہ ہر یہودی صیہونی نہیں ہوتا۔ بس، یوں سمجھ لو کہ قوم یہود کا وہ شدت پسند طبقہ، جو اپنے نظریے اور
مقصد کے حصول کے لیے ہر ناجائز کو جائز سمجھتا ہے اور اس کے لیے پوری دنیا کا امن برباد کرنے پر تل جاتا
ہے، اُسے صیہونی کہا جاتا ہے۔'' ایمی بولتی رہی اور میں دم سادھے بیٹھا سُنتا رہا۔ ایمی نے مجھے بتایا کہ اُن کی
زندگی بہت پُرسکون تھی۔ جب وہ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی پیٹر کے ساتھ لندن کے مضافات میں رہتی
تھی۔ ایمی تب اپنے اسکول کی نویں جماعت کی ذہین طالبہ تھی۔ اُس کا باپ مضافات میں موجود ایک فیکٹری
میں فائر مین کا کام کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا، تاوقتیکہ اُن کے قصبے میں جم نامی وہ یہودی اسکول ٹیچر آیا، جس کی

ی اور آخر کار اپنے شوہر سے طلاق لے کر اَن جانے سفر پر ایسی روانہ ہوئی کہ پھر ایک روز اُس کی موت کی
ہی واپس آئی۔ ایمی کا باپ اس صدمے سے کبھی سنبھل نہ پایا اور دو سال کے اندر اندر وہ بھی اپنی شریک
ت کے پیچھے ابدی سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایمی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نرسنگ کا شعبہ اختیار کرنا پڑا۔ لیکن سب
ختم ہونے کے باوجود اُس کے دل سے صیہونیت اور اُس صیہونی جم کے خلاف نفرت کبھی ختم نہ ہو پائی۔ وہ
ری لمحے تک اِسی کھوج میں رہی کہ آخر اُس ٹیچر کی تعلیمات میں ایسا کیا سحر تھا کہ اُس کی ماں کی ماما اور وفا
اُسے نہ روک پائی۔ ایمی کی یہی کھوج اُسے اس حادثے والی جگہ پر لے گئی، جہاں اُس کی ماں ایک کار
یڈنٹ میں ماری گئی تھی، تب ہی ایمی کے ہاتھ بیت المقدس کی عمارت کے وہ نقشے لگ گئے، جو ایمی کی ماں
اپنے پرانے کپڑوں کے صندوق میں چھپا کر رکھے تھے۔ اُس وقت ایمی پر یہ انکشاف ہوا کہ اُس کی ماں
یونیوں کے کسی ایسے گروہ کی آلۂ کار بن چکی تھی، جو مقدس ہیکل سلیمانی کی تلاش میں بیت المقدس کے گرد
رائی کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایمی نے پیٹر سے چھپا کر وہ نقشے تو گھر آتے ہی جلا دیئے، لیکن اپنے دل میں جلتی
ں کا الاؤ کبھی بجھا نہیں پائی۔ وہ آج تک صیہونیت ہی کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی، اِسی لیے پیٹر کو اپنی نظروں
سامنے پھر سے اُسی جال کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے باوجود ضبط کے رو پڑی
م نہیں جانتے عبداللہ۔ کم سنی میں ماں باپ کی جدائی کا دُکھ کیا ہوتا ہے۔ میں اُسے بھی تقدیر سمجھ کر صبر کر لیتی
ن وہ کون سی بہن ہو گی، جو اپنے سگے بھائی کو یوں پل پل مرتے دیکھ سکے۔ پیٹر کا جسم پچھلے تین ماہ میں گھل سا
یا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سرخ خلیے ختم ہو رہے ہیں اور جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس لیے ہر پندرہ دن
اُسے تازہ خون کی بوتلیں لگائی جاتی ہیں۔ رہی سہی کسر اُس گرو نے پوری کر دی ہے۔ پیٹر آج بھی یہی
تا ہے کہ وہ گرو کے رُوحانی علاج کی طاقت سے ٹھیک ہو جائے گا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گرو سے کئی
ٹن کروانے کے باوجود اُس کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے۔'' ایمی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور
اُسے تسلی کے دو لفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول پا رہا تھا۔ اس رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا
میں بیت المقدس کے باہر کھڑا ہوں، جہاں یہودیوں نے ایک لمبی سی خندق کھود رکھی ہے اور وہ زمانہ قدیم
مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ لوگ قبلۂ اول میں داخل ہو کر عبادت کرنا چاہتے ہیں لیکن
دی ہجوم انہیں درخت کی لمبی لمبی شاخوں سے مار کر دھکیل رہا ہے۔ ایسے میں میری نظر سلطان بابا پر پڑتی
ہے، جو مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہیں اور نہ جانے میں کس طرح خندق کے آخری کونے تک پہنچ جاتا
ں۔ مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ہجوم بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے اور مسلمان عبادت کے لیے بیت المقدس کے
ن تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا ہونے کے باوجود نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، جیسے کوئی آنکھ مسلسل میری
رانی کر رہی ہو۔ کھڑکی سے باہر دریائے ٹیمز کا جما ہوا یخ پانی آسمان سے گرتی برف کی ہلکی پھوار کے ساتھ
سلے ہوئے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے ایمی کی لائی کتابوں کے صفحے پلٹنے شروع کر

دیئے اور صبح کا اُجالا پھیلنے تک مجھے قوم یہود کے بارے میں جو کچھ پتا چلا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ کبھی یہ قوم واقعی خدا کی محبوب ترین قوموں میں سے تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہر اعزاز سے محروم ہوتی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ اسلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک اس قوم کی ناشکری اور بدعہدیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے نبیوں کو بھی قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور زکریا علیہ السلام، یوحنا (جون) اور میکھا پاہ کا خون ناحق اسی قوم کے سر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نافرمانیاں اور ناشکرے پن سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کروانے کی سازش تک ہر موقعے پر خود اس قوم نے خدا کے غضب کو دعوت دی اور آخر کار ان سے نبوت اور وطن چھین کر قدرت نے ان کی سزا پر مہر لگا دی۔ یہ قوم در بدر ہوئی، زمانے بھر کی لعنت اور پھٹکار اس کا مقدر بنی، لیکن اس نے پھر بھی اپنے اعمال نہ بدلے اور سود خوری کی شکل میں خدا سے جنگ جاری رکھی، جو آج تک جاری ہے۔ رفتہ رفتہ سود کے ذریعے انہوں نے دنیا کی معاشیات کو اپنے قبضے میں لے کر مختلف سلطنتوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور پھر ایک وقت یہ بھی آیا جب دنیا کی عظیم طاقتیں (سُپر پاورز) ان کے پنجہ سود تلے دبی ان کی اُنگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہی یہودیوں میں سے ایک انتہا پسند طبقہ اُبھرتا گیا، جو بعد میں صیہونی کہلائے اور جن کے اندر نبوت چھننے اور بے وطن ہونے کا غصہ انتقام میں بدلتا گیا اور انہوں نے قبلہ اوّل کو ڈھانے کی ناپاک سازشیں شروع کر دیں اور نبوت کی جگہ دجال کو اپنا آخری مسیحا مان کر اُس کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں، جو بقول اُن کے، اُن کی آخری فتح کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں سے ان کی بنیادی نفرت کی ایک وجہ ہمیشہ یہ بھی رہی کہ مسلم عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصلی مسیحا ثابت ہوں گے، جو دجال کو قتل کر کے اس دنیا میں امن قائم کریں گے۔ مذہبی عقیدے سے قطع نظر یہ قوم بے حد منظم، متحد اور ذہین تھی اور ہے۔ اصل یہود اسلام کی سچائی اور عظمت سے واقف ہونے کے باوجود فطرتاً سازشی ہونے کی وجہ سے اسے کبھی دل سے تسلیم نہیں کر پائے، اور کہیں نہ کہیں وہ اب بھی اسلام ہی کو اپنی بربادی کی اصل وجہ گردانتے ہیں اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کے کسی موقعے سے نہیں چوکتے۔ جب کہ انہی یہودیوں میں آج بھی ایک ایسا معتدل طبقہ موجود ہے، جو صیہونیت کو یہودیت کے لیے ایک گالی سے کم نہیں سمجھتا، لیکن ایسے یہود کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کہیں کم ہے۔

میں نے کتاب کا آخری صفحہ پلٹا تو نسبتاً صاف آسمان سے سورج اپنی پہلی جھلک دکھلا چکا تھا۔ میرا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ میں نے گرم پانی کا شاور لینے کے ارادے سے اُٹھنا چاہا، تب ہی میرے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ مجھے گرو کا تمتماتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر گرو ہی نے سانپ جیسی پھنکارتی آواز میں اس خاموشی کو توڑا۔

''کیا تم کبھی بیت المقدس گئے ہو.....؟''

آخری مسیحا

مجھے یوں لگا، جیسے وہ رات بھر میرے اندر کو پڑھتا رہا ہو۔ میں نے گرو کا سوال سن کر جانے کیوں اثبات
ر ہلا دیا۔ ''ہاں، میں گزشتہ رات خواب میں بیت المقدس میں تھا۔'' گرو نے گہری سی سانس لی، وہ کچھ
رب سا لگ رہا تھا۔ ''تم..... آخر کون ہو تم؟'' میں پلٹا۔ ''یقین جانو میں خود اِسی سوال کی کھوج میں یہاں
پہنچا ہوں، لیکن کل رات ایک جواب تو مجھے زندگی نے دے ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ تمہارا اور میرا راستہ جدا
تم 21 دسمبر 2012ء کو جس قیامت کی آمد کی تیاریاں کر رہے ہو میرے نزدیک وہ سراب ہے۔ تمہارا
ی مسیحا کوئی اور..... اور میرا نجات دہندہ کوئی اور ہے۔'' گرو نے اطمینان سے میری بات سنی۔ پھر تاسف
بولا ''تو آخر تم بھی اُس مذہبی تعصب کا شکار ہو ہی گئے، جو ہر مسلمان کا خاصہ ہے۔ جانے کیوں میں تمہیں
روں سے کچھ الگ سمجھ بیٹھا تھا۔ یاد رکھو کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔'' اچانک گرو کی نظر
ا بستر کے ساتھ جڑی چھوٹی سی میز پر پڑی، جہاں ابھی تک ایمی کی لائی کتابیں رکھی تھیں۔ گرو کے ہونٹوں
ب طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''جانتے ہو تم میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں نے تمہیں اپنے خدا کی
طت سے جانا ہے، جب کہ تم مجھے ابھی تک ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہو۔ جس دن مجھے جاننے کے لیے
ے خدا کی رسی ہلاؤ گے۔ سارے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے۔'' گرو اپنی بات ختم کر
پلٹا اور پھر رُک گیا۔ ''اور ہاں، مقدس دجال کا ظہور ہو چکا ہے اور تم دیکھنا کہ قیامت بھی اپنی مقررہ تاریخ پر
ے گی۔ میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ اُس وقت تم فائدہ پانے والوں کے ساتھ رہو۔'' گرو پلٹ کر چلا
لیکن میرے لیے اَن گنت سوالوں کا بھنڈارا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں جانتا تھا کہ میں اور میرا عقیدہ ہی سچ، لیکن
مجھے پورا اطمینان کیوں نہیں سونپ رہا تھا۔ کوئی ایک چیز ایسی تھی، جو میرے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی
ی آنکھوں سے ابھی تک اوجھل تھی، لیکن کیا.....؟ میں شام تک سر پٹختا رہا، لیکن وہ سادہ سا کلیہ میرے ذہن
انہ بیٹھ سکا۔ گرو ٹھیک ہی تو کہتا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں تو پھر اس نے اپنے خدا کی
طت سے میری حقیقت اتنی جلدی کیسے جان لی تھی، جب کہ میں ابھی تک مکمل اندھیرے میں تھا۔ شام
تے ہی میرے اندر کی بے چینی اتنی بڑھ گئی کہ میں مما پاپا سے ضد کر کے تنہا اپنی بیسا کھیاں ٹیکتا باہر برف سے
ے میدان میں چلا آیا۔ کچھ درختوں پر ابھی تک خزاں کی نشانی کے طور پر زرد پتوں کے سوکھے ہار جھول رہے
ر شاید خزاں کا واسطہ بھی موت کی طرح رگوں سے زندگی نچوڑ لینے سے ہوتا ہے۔ میں اپنی زندگی سے

نچڑے ہوئے پتوں کے ڈھیر تلے دبے ایک چوبی بینچ کو جھاڑ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سرد ہوا میرے منہ سے نکلتی سانس کو بھاپ میں تبدیل کر رہی تھی، لیکن میرے دل سے جو دھواں اُٹھ رہا تھا اُس کی شاید کسی کو خبر نہیں تھی۔ شاید عصر کی اذان تھی، جس کی آواز کہیں دُور مضافات سے ہوا کے دوش پر ایک سرسراہٹ کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے کان خود بخود اپنی تمام تر سماعتوں کو جگا کر فضا میں گم ہوتی اس آواز کے تعاقب میں کھڑے ہو گئے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ اذان دنیا کی وہ واحد آواز ہے، جو دن رات کے چوبیس گھنٹوں، تمام وقت، دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں گونج رہی ہوتی ہے۔ مؤذن کی آواز میں عجیب سا سوز تھا، جو میں اتنی دُور بیٹھ کر بھی اس سرگوشی نما صدا میں محسوس کر سکتا تھا۔ ''**اشهد ان محمد رسول الله**..... **اشهد ان محمد رسول الله**.....'' اور تب ہی میرے ذہن میں پہلا جھماکا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرے ذہن میں بارود کے کسی ڈھیر کو فیتہ دکھا دیا گیا ہو۔ ہاں یہی تو تھا وہ کھلا راز، حیرت ہے اتنے سامنے کی بات مجھے اتنی دیر سے کیوں سمجھ میں آئی؟ جھگڑا خدا کا تو کبھی تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی ﷺ کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی آخر الزماں ﷺ کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہود کی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھن گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہود کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔ اچانک ہی میرا جسم ناتواں اس احساس سے لرزنے لگا کہ میں آخری نبی ﷺ کا اُمتی ہوں جس کے لیے اس ساری دنیا کا بکھیڑا کھڑا کیا گیا ہے۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ خود اپنی ہی عظمت سے بے بہرہ ہوں۔ ایک عالم ہماری عظمت و بڑائی سے واقف ہونے کی بنیاد پر بھیڑیوں کی طرح ہماری بوٹیوں کو نوچنے کے لیے ہمارے درپے ہے اور ہم خود کو تھالی میں سجا کر انہیں پیش کر رہے ہیں۔ گرو ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرا اور اُس کا بھلا کیا مقابلہ۔ اُس نے ہم سے سچی دوستی نبھائی۔ وہ ہماری نفرت میں علم کے کتنے سمندر پی گیا اور میں جو مذہب کی محبت کا دعویٰ دار تھا، میں نے کیا سیکھا؟ صرف چھ کلمے اور پانچ نمازیں..... کیا بس اتنا ہی تھا میرا دین.....؟ صرف ایک سال پہلے تک میں خود اِسی لندن کے کلبز اور ڈسکوز میں بھٹکتا پھرتا تھا اور آج سال بعد اللہ کے اتنے نیک بندوں کی صحبت کے بعد بھی میں کیا تھا۔ دَر دَر بھٹکتا ہوا ایک بھکاری..... وہ تلاش ہی کیا، جو آپ کو اندر سے مومن نہ کر سکے، انسان کے ضمیر کو پاک نہ کر سکے۔ کیا میں اُس نبی آخر الزمان ﷺ کے اُمتی ہونے کے اعزاز کا حق دار تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں

وہ یہودی، جو خدا کی محبت کے بل، اپنی ساری زندگی ایک مقصد کے سپرد کر چکا ہے اور ایک میں، جسے خدا
بت پانے کے لیے اُس کے نبی ﷺ کی محبت کا سادہ اور آسان کلیہ بتا کر، خدا نے ساری کائنات اس اُمتی
ردینے وعدہ کیا ہے، جو صرف اس کلیے ہی کو شرط بنا لے۔ مگر مجھ جیسے اور نہ جانے کتنے کم نصیب ہوں گے،
رف زبانی ہی اس محبت کا دعویٰ کرتے ہوں گے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہتی
اور پھر کچھ دیر بعد ہی آسمان سے گرتی برف کو میرے آنسو زمین پر جمنے سے قبل ہی دھونے لگے۔ کاش
ن کے گناہ بھی اس برف کی طرح اتنی ہی آسانی سے دُھل پاتے۔ پھر نہ جانے کب ایمی میری تلاش میں
طرف آنکلی اور کب وہ مجھے میرے شکستہ وجود سمیت، سمیٹ کر میرے کمرے تک لے آئی۔ میری حالت
پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا مگر اگلی صبح ایک اور خبر میرے حواس معطل کرنے کے لیے تیار تھی۔
درا صل گزشتہ روز ہی خبر سنانے کے لیے مجھے تلاش کرتی ہوئی اسپتال کے احاطے میں آئی تھی، لیکن مجھے
حال دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گرو اس ہفتے کے درس کے بعد یروشلم اور فلسطین کے
رے کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور پیٹر نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ بھی گرو کے وفد کے ساتھ ضرور اس ''مقدس
'' پر جائے گا، جب کہ پیٹر کی اپنی حالت اس بیماری کی وجہ سے پہلے ہی بے حد خراب تھی۔ ایمی کو ڈر تھا کہ وہ
ب بار گرو کے ساتھ چل پڑنے کے بعد اپنے بھائی کی صورت دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گی۔ برسوں پہلے ٹھیک اسی
رح ایک روز اُس کی ماں بھی اپنا سب کچھ تیاگ کر کسی مقدس فریضے کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکلی تھی اور
کبھی نہیں لوٹی۔ ایمی کو سو فی صد یقین تھا کہ گرو بھی اپنے ساتھ جانے والے سب ہی نوجوانوں کو کسی اسرائیلی
نری کے حوالے کر دے گا، جہاں سے آج تک کسی کی واپسی نہیں ہوئی۔ ایمی اپنی بات ختم کر کے آنکھیں
جھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خلاف توقع گرو نے دو دن سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنے سفر کی تیاری
ں مشغول تھا۔ شام تک میری طبیعت بے حد نڈھال ہو گئی، لیکن میں چپ چاپ بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا
ہا۔ کبھی کبھی جب انسان کا ٹوٹ کر بکھرنے کو جی چاہے لیکن اُسے اپنوں کی دل جمعی کی خاطر خود کو سمیٹے رکھنا
ے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔

اچانک بند پلکوں کے عقب سے مجھے گرو کی آواز سنائی دی ''کیا تم میرے بارے میں سوچ رہے ہو؟''
ں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے ہی دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کمرے میں مغرب سے
ہلے کا اداس اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مما پپا شاید مجھے سوتا سمجھ کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل چکے تھے۔ حسب
معمول گرو کی آنکھوں میں وہی جیت لینے والی چمک اور ہونٹوں پر فتح کا غرور لیے ہلکی سی مسکراہٹ۔ میں نے
پہلی مرتبہ گرو سے درخواست کی ''کیا تم میری ایک بات مان سکتے ہو؟ پیٹر بہت بیمار ہے، اُسے اپنے ساتھ مت
لے جاؤ۔'' گرو زور سے ہنسا ''تمہارے لبوں پر یہ عاجزانہ درخواست کچھ سجتی نہیں۔ جنہیں قدرت کے عزیز
ہونے کا غرور ہو وہ گزارشات نہیں کرتے، حکم دیا کرتے ہیں۔'' میں گرو کا یہ طنز بھی جھیل گیا۔ ''شاید میں کبھی خود

کو حکم دینے کا اہل ثابت نہ کر سکوں۔ تمہیں اپنی اس جنگ کے لیے اور بہت سے جان نثار مل جائیں گے۔ اس معصوم لڑکے کو بخشش دو۔ وہ اپنی کمزور بہن کا آخری سہارا ہے۔'' گرو کو جیسے میری بے بسی دیکھ کر لطف آ رہا تھا ''ٹھیک ہے۔ تو پھر ایک سودا کرتے ہیں۔ میں پیٹر کو منع کر دوں گا، لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے ساتھ بیت المقدس چلنا ہوگا۔ بولو منظور ہے.....؟'' میرے اندر بیک وقت جیسے بہت سی پُرشور ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی اور پھر میرے لب ہلے ''ٹھیک ہے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔ پیٹر کی جگہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' گرو کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی، لیکن ٹھیک اُسی وقت اُس کے عقب سے ایمی کی تیز آواز ابھری ''نہیں، عبداللہ تمہارے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ میں اپنے ایک بھائی کو بچانے کے لیے دوسرے کی قربانی نہیں دے سکتی۔ اگر پیٹر کی جدائی ہی میرا مقدر ہے تو یوں ہی سہی۔'' گرو ایمی کی بے وقت مداخلت سے کچھ بدمزا دکھائی دے رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے، جیسی تم لوگوں کی مرضی۔'' وہ غصے سے مڑا اور واپسی کے لیے قدم اُٹھائے۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی گھنٹی بجی۔ ''رکو..... اگر بات اختیار کی ہی ہے تو واقعی تمہیں اس وقت پورا اختیار حاصل ہے۔ اور اس اختیار کا گھمنڈ بھی تمہارے انداز سے ظاہر ہے۔ تو پھر ایک بیمار اور کمزور لڑکے پر اپنی مرضی چلانے سے کیا حاصل.....؟ اگر تمہیں پیٹر کو ساتھ لے جانا ہی ہے تو اُسے ٹھیک کر کے کیوں نہیں لے جاتے۔ تم تو مسیحا ہو، پھر اپنی اس مسیحائی کا اعجاز اپنے ایک چاہنے والے پر کیوں نہیں آزماتے۔ یا تمہاری ٹیلی پیتھی صرف لمحاتی اور کچھ دیر کے لیے مندمل کرنے کا ہنر ہی جانتی ہے۔ پیٹر کے جسم میں تازہ خون نہیں بن رہا۔ اس حالت میں وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی سانسیں ہار جائے گا۔ اگر تم اُسے تندرست کر دو تو میں خود تمہارا بے دام غلام بن کر رہوں گا۔ بولو منظور ہے یہ سودا.....؟'' میری بات سن کر وہ سودا گر پلٹا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''تو گویا تم مجھے للکار رہے ہو۔ تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ سودا کرنے کا حق صرف فاتح کے پاس ہوتا ہے، اگر ہمت ہے تو لڑ کر فتح حاصل کرو اور پھر اپنی مرضی کے فیصلے صادر کرنا۔'' گرو نے بڑی ہوشیاری سے پتے پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت ایک اپنی ہاری ہوئی فوج کا آخری اور تنہا بچا ہوا سپاہی تھا، جس کے سامنے جیتی ہوئی سپاہ کا سالار اپنے تمام ساتھیوں سمیت کھڑے ہو کر مذاق اُڑا رہا تھا، اُسے اُکسا رہا تھا کہ یا تو وہ گھٹنے ٹیک کر پوری فاتح فوج کے سامنے ناک رگڑ کر معافی مانگے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہارے ہوئے سپاہی نے کراہ کر اپنی تھکن سے چور پلکیں اُٹھائیں۔ فاتح سپہ سالار جیت کے نشے میں جنگ کا ایک بنیادی اُصول بھول گیا تھا کہ ہارے ہوئے کو اتنا ہی ہرانا چاہیے، جتنی اس میں ہارنے کی سکت ہو، کیوں کہ ہر شکست کی آخری حد سے پرے ایک نئی جنگ چھپی ہوتی ہے۔ پھر چاہے لڑنے والا وہ ایک آخری بچا ہوا گھائل سپاہی ہی کیوں نہ ہو اور چاہے انجام میں اس سپاہی کو اپنے گھائل جسم میں ہزاروں تیروں کے نئے شگاف ہی کیوں نہ ملیں، سپاہی وہ جنگ لڑتا ضرور ہے۔ میں نے بھی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ''ٹھیک ہے، اگر فتح صرف لڑ کر ہی ملتی ہے تو یونہی سہی۔ میں تیار ہوں۔'' گرو

ہلی ہنسا'' اچھا..... تو پھر میدان بھی تم خود ہی منتخب کرلو۔ کل تمہیں یہ گلہ نہ ہو کہ گرو نے اپنے علاقے میں
یں ہرا دیا۔'' میں نے غور سے گرو کو دیکھا۔ ''علاقہ بھی تمہارا ہی ہوگا اور مجھ سے ایسے کسی گلے کی کبھی توقع
رکھنا۔ میں تو سدا ہی ہارتا آیا ہوں اور شکست کے تمام آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ہماری یہ جنگ
ری اس آنے والے درس کے دور میں ہوگی۔ تمہارے ہی گھر پر۔'' گرو نے چونک کر میری طرف دیکھا
ہ تو آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ ویسے میں تمہاری ہمت کی داد ضرور دوں گا۔ ٹھیک ہے، مجھے اس مناظرے
عوت قبول ہے۔ لیکن شرط اب بھی وہی ہے۔ ہار کی صورت میں تمہیں سدا کے لیے میری غلامی قبول کرنا
ا۔'' میں نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ ''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے.....'' ایمی گنگ سی کھڑی میری اور گرو کی یہ
ن رہی تھی۔ گرو کے کمرے سے نکلتے ہی چلا پڑی۔ ''یہ تم نے کیا کیا لڑکے! وہ وہ بہت طاقت ور ہے اور تم
ال۔ یہ کیسا سودا کرلیا تم نے؟'' میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ''کچھ سودے تمام تر نقصان جان کر بھی طے
نا پڑتے ہیں۔ دلوں کی سودوں کی طرح، سدا گھاٹے والے۔'' ایمی بے بسی سے ہاتھ ملتی رہی۔ میں نے
ے ہدایت کی کہ وہ گرو کے اگلے سیشن میں پیٹر کے ساتھ خود بھی درس والے ہال میں آئے۔ لیکن وہ ابھی تک
چین تھی۔ ''آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ کیا واقعی تمہارا گرو کے ساتھ باقاعدہ کوئی 'مناظرہ' کرنے کا ارادہ
.....؟'' میرا سر ابھی تک جھکا ہوا تھا۔ ''میں نہیں جانتا کہ مناظرہ کسے کہتے ہیں۔ بلکہ میں نے اپنی پوری
ی میں یہ لفظ بھی دو چار مرتبہ ہی سنا ہوگا۔ لیکن میں لڑے بنا ہار نہیں مان سکتا، کیوں کہ اب معاملہ صرف میری
ت کا نہیں، بلکہ میرا ایمان، میرے عقیدے اور کامل یقین کا ہے۔ میں نے آج تک جو بھی اس ایمان سے
ایا ہے، وہ ساری جمع پونجی لگا کر بھی مجھے یہ آخری داؤ کھیلنا ہی ہوگا۔'' لیکن شاید قدرت کو میرا یہ آخری جوا بھی
ل نہ تھا۔

اگلے روز مجھے ایمی نے بتایا کہ پیٹر کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور اُسے اِسی اسپتال کے انتقال خون والے
ے کے وارڈ میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ گرو کے رُوحانی درس میں ابھی تین دن باقی تھے، لیکن ایمی کی رپورٹ
مطابق پیٹر کی حالت سنبھلنے میں کئی ہفتے بھی لگ سکتے تھے۔ زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ پیٹر اب بھی بضد تھا
وہ جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوا، گرو کی ہمراہی اختیار کرلے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ لمحے بھی
ظالم ہوتے ہیں، جب ہم ان کے ٹلنے کی دعا کرتے ہیں تو یہ صدیوں میں ڈھل کر جنموں میں گھلتے ہیں اور
ہم ان کے رُکنے کی آس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں تب انہیں ہزاروں پر لگ جاتے ہیں۔ میرے نصیب کے
پرواز کرنے لگے اور آخر کار وہ رات بھی آ پہنچی جس سے پرے کا سورج میرے اور گرو کے فیصلے کا اعلان
کر آتا۔ مما اور پپا میری بے چینی دیکھ دیکھ کر مزید پریشان ہو رہے تھے۔ پاپا نے حسب معمول براہِ راست
سوال کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ اور مما میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ میری آنکھیں ڈبڈبا
گئیں۔ میں نے اُن کا اپنے کاندھے پر رکھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔'' میں ایک ایسی جنگ لڑنے جا

رہا ہوں، جس کی ہار یا جیت پر شاید میری پوری زندگی کا انحصار ہے۔ یہ جنگ ہی اس بات کا تعین کرے گی میں اب تک درست راستے پر تھا یا غلط..... میرے مستقبل کا فیصلہ بھی اسی جنگ سے ہوگا۔ مگر افسوس مجھے جنگل لڑنے کے لیے کوئی اوزار، کوئی ہتھیار میسر نہیں۔ مجھے خالی ہاتھ صرف اپنے یقین کے سہارے ہی یہ لڑائی لڑنا ہوگی۔ مجھے آپ دونوں کی دعا کی ضرورت ہے۔ اور بس۔'' پس منظر میں کھڑی مما میری بات سن کر رو پڑیں۔ مائیں تو یوں بھی رونے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا واسطہ خوشی سے کچھ کم ہی ہوتا ہے، مگر نہ جانے کیوں اس پل میرے مضبوط پاپا بھی اپنے آنسو چھپا نہیں پائے۔ میں نے تڑپ کر انہیں گلے لگا لیا۔ جب کوئی بیٹا اپنے باپ کو تسلی دینے کے لیے اپنے سینے سے لگاتا ہو تو رفوگری کا باقی ماندہ کام قدرت خود سنبھال لیتی ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب آتا ہے۔ آہوں، ہچکیوں کے طوفان گزرتے ہیں اور آخر کار دل کے غبار دھل جاتے ہیں۔ پپا بھی مجھ سے اپنی بھیگی ہوئی آواز میں صرف اتنا ہی کہہ پائے ''مجھے اپنے ساحر اور اس کے یقین پر خود سے زیادہ بھروسا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس لڑائی میں اس کی جیت ہو یا ہار..... میرا بیٹا یہ جنگ اپنی پوری قوت اور ایمان داری سے لڑے گا۔ میں جانتا ہوں کبھی کبھی ہار یا جیت سے بھی زیادہ اہم جنگ لڑنا ہوتا ہے۔'' پپا مجھے تھپکتے رہے۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ جنگیں صرف ہتھیاروں ہی سے نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ کا بنیادی عنصر ''حوصلہ'' ہوتا ہے اور یہ ہمت و حوصلہ ہمیں ہمارے ''اپنے'' دیتے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ باہر آسمان اور اندر کمرے میں میرا دل برسنے کو بے تاب تھے۔ آج کی رات میرے لیے بہت اہم تھی۔ اپنوں کے سامنے تو میں نے کسی طور بھرم قائم رکھ ہی لیا تھا مگر وہ اوپر والا تو میرے من کی حالت جانتا تھا۔ سو میں نے کھڑکی کے قریب جائے نماز بچھا لی اور پلکیں زمین پر بچھا کر سجدے میں جس قدر گڑگڑا سکتا تھا، اس سے بھی کہیں بڑھ کر گڑگڑایا۔ ''یا خدا..... تو جانتا ہے ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سہی، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اُکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے نبی ﷺ کا واسطہ، میری لاج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بھر دے میرے مالک.....'' میں جس قدر گڑگڑاتا، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی اتنی ہی تیزی سے بہتی۔ اُس روز مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو دعا مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ اور آتا بھی کیسے مجھے آج تک بنا مانگے ہی سب کچھ جو ملتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ دعا صرف لفظوں سے مانگنے کا نام نہیں۔ اللہ کے سامنے تو ویسے ہی ہمارے بہترین لفظ کھو جاتے ہیں۔ ہم بس ''غوں غاں'' ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور دعا کا وقت نکل

ہے۔ ہم بڑی تیاری سے دعاؤں کی فہرست ذہن میں ترتیب دے کر اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں
گلے ہی لمحے سب بھول بھال کر کسی چھوٹے بچے کی طرح صرف ''میٹھا'' مانگنے ہی پر اکتفا کیے رہتے ہیں۔
ینے والے کی وسعت ہے کہ وہ پھر بھی ہم بے زبانوں کو، نادانوں کو، صرف ''میٹھے'' کے لالچیوں کو سب کی
ت کے مطابق دیتا ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری طلب، کبھی اس قابل نہ تھی کہ ہمیں کچھ عطا کیا جاتا۔

میں بھی ساری رات ہڑکتا رہا لیکن ڈھنگ سے کچھ مانگ نہ سکا، حالانکہ دینے والے نے اپنے سب ہی
ں کے منہ کھول رکھے تھے۔ صبح لندن کا موسم بہت اداس تھا۔ برف کی تازہ جھڑی نے پرانے سفیدے پر
ں پھیر دی تھی۔ باسی برف پر جب تازہ برف کی چادر پڑتی ہے، تو یوں لگتا ہے جیسے پرانی رضائی پر نیا لحاف
ا دیا گیا ہو۔ سہ پہر تک ایمی تین مرتبہ چکر لگا کر مایوسی سے سر ہلا گئی تھی۔ مطلب پیٹر کی حالت ابھی تک
ل نہیں پائی تھی۔ جانے کیوں، میرے دل میں ایک نئے خدشے کے سانپ نے پھن پھیلایا، کہیں گرو نے
ہنگ شروع تو نہیں کر دی۔ شام کو جب میں گرو کی رہائش گاہ جانے کے لیے نکلنے لگا، تو مما اور پاپا پہلے سے
ں میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اپنے ساحر کو تنہا نہیں جانے دیں گے،
یں چپ ہی رہا۔ اندھیرا ہونے کے قریب ہم گرو کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ باہر میڈیا کے رپورٹرز، اور
ے ٹی وی چینلز کے مائیک دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں جانتا تھا کہ گرو اس موقع کی تشہیر سے نہیں چوکے گا۔
ے ایک بہترین موقع مل رہا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلے میں اپنا عقیدہ اور مسلک کو فاتح ثابت کر کے
ں کے ذہن مزید تسخیر کر سکے۔ میں ہال میں داخل ہوا تو کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے
ں کی ایک نشست بھی خالی نہیں تھی۔ لوگ دیواروں کے ساتھ، بالکنی میں اور نشستوں کے درمیان والی جگہ پر
ے بھرے پڑے تھے۔ کیمروں کے زاویے اور فلیش کی چکاچوند سے صاف ظاہر تھا کہ یہ سب کچھ ٹی وی سے
راست بھی نشر ہو گا۔ گرو پہلے سے اسٹیج پر مائیک سنبھالے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے باآواز بلند
ف کروایا۔ ''خواتین و حضرات..... آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ ہمیں جس شخصیت کا انتظار تھا وہ اب ہمارے
یان ہے۔'' سارے ہال پر پل بھر کے لیے سناٹا سا چھا گیا اور سب ہی کی نظر میکانکی انداز میں میری طرف
ئی۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی ایک بوند پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ قدموں کے نیچے سے زمین جیسے
سکتی گئی۔ مناظرہ شروع ہو چکا تھا۔

مناظرہ

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ آج خصوصی طور پر ہال میں ایک بہت بڑی اسکرین بھی لگائی گئی تھی جس کے ذریعے ہال کے آخری کونے میں بیٹھا شخص بھی اسٹیج کا تمام منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ دو شخص میرا ہاتھ تھام کر میرا بیساکھی سنبھالتے، مجھے اسٹیج پر لے گئے اور باقی دو نے مما اور پپا کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی اور انہیں لے کر ہال کے نیلگوں اندھیرے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ گرو نے ''عبداللہ'' کے نام سے میرا تعارف کروایا۔ اسٹیج پر کیمروں کے فلیش کی چکاچوند اتنی زیادہ تھی کہ مجھے سامنے ہال میں بیٹھے ہجوم کا بس ایک دھندلا سا خاکہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گرو نے بات کا آغاز کیا۔ ''آج ہم یہاں ایک عظیم اور مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے، جو میرے اور اپنے عقیدے کی جانچ کے لیے یہاں تک آیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے قطع نظر اور کسی بھی فیصلے کے اعلان سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اس شخص کی ہمت کا اعتراف کریں۔'' سارے ہال نے تالیاں بجا کر گرو کی بات کی تائید کی۔ ہال میں داخل ہوتے وقت میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ناظرین میں زیادہ تر تعداد نوجوان اور جوشیلے طبقے کی ہے، جو ذہنی طور پر پہلے ہی گرو کی فتح تسلیم کر چکے ہیں۔ بزرگ طبقہ، البتہ کچھ خاموش اور بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ گرو کی تقریر جاری تھی۔ ''ہم دنیا میں صرف مذہب اور عقیدے کے لیے وارد ہوئے ہیں اور وقت رُخصت یہی ہمارا زادِراہ ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ کئی لیکچرز میں وقت کا پہیہ رُک جانے کی حقیقت بیان کر چکا ہوں۔ اور میرے عقیدے کے مطابق وہ گھڑی اب زیادہ دور نہیں، جو ہمارے لیے صدیوں اور سالوں کا وقفہ ہے۔ وہی وقت قدرت کے پہیے کے لیے بس ایک پل کی ساعت ہے۔'' گرو نے چھت پر فانوس کی صورت لٹکے ہوئے داؤدی ستارے اور اس کے اطراف کھینچی دو نیلی لکیروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ مقدس نشان دو جڑی ہوئی مثلثوں اور دو لکیروں سے مل کر بنا ہے۔ اس میں اُوپر کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس خدائے بزرگ و برتر کی عظیم الشان بڑائی کا استعارہ ہے اور اُوپر والی نیلی لکیر آسمان پر خدا کی خدائی کو بیان کرتی ہے، ٹھیک اِسی طرح نیچے کی جانب اشارہ کرتی مثلث اس ذات کا استعارہ ہے، جو آخر کار خداوند کی مرضی سے زمین پر آخری مسیحا کی صورت میں وارد ہوگا اور ہمیشہ کے لیے خدا کا قانون نافذ کرے گا۔ اُلٹی مثلث کے نیچے والی لکیر اس روئے ارض پر موجود سمندروں کا استعارہ ہے۔ جہاں میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ آخری مسیحا (دجال) وارد ہونے کے بعد خود کو دنیا کی نظر سے خفیہ رکھے ہوئے ہے۔'' بے خیال

میری نظر بھی گرو کی اُٹھی اُنگلی کے تعاقب میں اُٹھ گئی اور اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ تو ڈے پر بنی ہوئی شبیہہ تھی۔ ہاں، یہود کا جھنڈا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس شبیہہ کی توجیہہ سمجھ میں آئی۔ و کی بات ختم ہو رہی تھی۔ ''میں ایک بار پھر آپ سب کو سچ کے سفر کی دعوت دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم سب اس سفر کے لیے روانہ ہوں، تو عبداللہ ہمارا ہم سفر ہو۔'' تالیوں کی شدید گونج میں گرو اپنی بات ختم کے پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ اب مجھے دو قدم آگے بڑھ کر اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا ہوگا اور کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوگا۔ ہال میں کچھ آوازے کسے گئے اور بوڑھوں نے میرے اپنی جگہ چپ پ جے رہنے پر کھانس کر اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور کوئی درمیانی نشستوں میں سے چلایا۔ ''آگے بڑھ کر صفائی پیش کرو لڑکے..... ہم تمہیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔'' تب میرا ماتھا ٹھنکا اور میں کچھ یہ قہقہوں کی بازگشت میں قدم بڑھا کر مائیک کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کھنکھارتے ہی ہال میں پھر سے ا سناٹا چھا گیا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ''میرا نام عبداللہ ہے اور میں نہیں جانتا کہ ایسی محفل کے تقاضے کیا تے ہیں۔ میں تو ابھی تک اپنے نام کی لاج ہی نہیں رکھ پایا تو 'آداب مناظرہ' سے بھلا میری کیا واقفیت کی۔ مذہب اور عقیدے کی سچائی کے لیے لڑنے والے تو بہت عظیم لوگ ہوتے ہوں گے۔ مجھ پر تو ابھی ٹھیک رح سے منصب اور عقیدہ کھلا بھی نہیں، دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا میں یہاں تک پہنچا ہوں اور میرا واحد اثاثہ ج بھی صرف اور صرف میرا کامل یقین ہے۔ یقین اپنے مذہب پر، عقیدے پر اور اپنے خدا اور اُس کے خری نبی ﷺ پر اور میرا ایمان ہے کہ وقت کا پہیہ تھمے گا اور ضرور تھمے گا، مگر ابھی اس گھڑی میں ذرا دیر باقی ہے۔ میرا آخری مسیحا ابھی تک آسمانوں میں ہے اور وہ تب زمین پر بھیجا جائے گا، جب اُسے صلیب پر سے ندہ اُٹھا لینے والا میرا مالک حکم دے گا۔ مجھے بھی اس آخری جنگ کا پورا یقین ہے، البتہ میرا فاتح کوئی اور سیح) ہے۔ آسمانوں، زمینوں اور سمندروں کا مالک بس وہی میرا اللہ ہے، جو یہاں موجود ہر بندے کا خدا ہے۔'' میں نے اپنی بات ختم کی تو پورے ہال میں ایک تالی کی گونج بھی نہیں تھی۔ پھر ایک کونے سے کسی نفس کا ھیولا اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور تالی بجنے کی آواز اُبھری۔ کوئی بھرائی ہوئی آواز میں زور سے بولا۔ ''جیتے ہو ساحر، مجھے تم پر فخر ہے۔'' اور پھر پپا کی تالیوں کی آواز میں مما کے ہاتھ بھی شامل ہو گئے۔ کیا ہوا جو پورے ل میں میرا ایک حمایتی بھی نہیں تھا۔ میرے اپنے، مجھے جنم دینے والے عظیم ترین ماں باپ تو تھے۔ کیمروں کا رخ مما پپا کی طرف ہو گیا۔ ہال میں لگی اسکرین پر مجھے دونوں کی آنکھ سے بہتے آنسو صاف دکھائی دیئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جلتی آنکھوں کو بہنے سے روکا۔ سپاہی جنگ میں رویا نہیں کرتے۔ ہال میں خرسرگوشیاں ہونے لگیں۔

گرو نے پہلے دور میں اپنا اثر کچھ زائل ہوتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھا۔ ''اب میں عبداللہ کو راست دعوت دیتا ہوں کہ اگر اس کے پاس اپنے عقیدے کی سچائی کے حق میں کوئی بھی ثبوت، علم، معجزہ یا

کرشمہ ہے تو وہ پورے ہال کے سامنے پیش کرے۔ یا اگر وہ چاہے تو میں پہل کروں؟'' ہال میں موجود
ہی افراد کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ ہال میں لگی اسکرین پر صرف میرے چہرے کو فوکس کیا جا رہا تھا۔ ''میں نے
پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ میں یہاں ثبوت یا کرشمے کے بنا، صرف اپنے یقین کے بل پر آیا ہوں اور اگر
میرا یقین سچا ہے تو اسے کسی معجزے یا کرامت کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس کوئی مخصوص علم بھی نہیں، جس کے
ذریعے میں لوگوں کو مسحور کر سکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ گرو نے رُوحانیات کی تعلیم کے دوران جتنا کچھ سیکھا ہے، مجھے
اس کا عشر عشیر بھی نہیں آتا۔ میں یہاں کسی سے مقابلے کے لیے نہیں آیا۔ بنا کسی ثبوت اور بنا کسی دستاویز
صرف اپنے عقیدے کی سچائی بیان کرنا ہی میرا مقصد ہے۔ لہٰذا میں پہلے گرو سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام
حاضرین کے سامنے اپنے وسیع علم کا مظاہرہ کرے۔'' گرو نے فاتحانہ انداز میں یوں میری طرف دیکھا، جیسے
کہہ رہا ہو، ''تم نے تو لڑے بنا ہی آدھی بازی ہار دی۔'' ہال میں بھی جو لوگ کسی بڑے ''تماشے'' کی اُمید میں
گھروں سے نکل کر آئے تھے، سب ہی کے چہروں پر مایوسی اور بددلی سی چھانے لگی۔ ہال میں لگے کیمرے
اسکرین پر ناظرین کے تاثرات جھلکیوں کی صورت پیش کر رہے تھے۔ پھر گرو کے عملے نے مریضوں کے نام
اور اُن کی بیماریوں کی تفصیل فہرست سے پڑھنا شروع کی اور یکے بعد دیگرے مختلف مریض اسٹیج پر آ کر گرو کی
کرشماتی شفا سے فیض یاب ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کی جبینوں سے گرو کی دو اُنگلیاں چھوتے ہی سارے درد،
کھنچاؤ اور تکالیف غائب ہو جاتیں۔ گرو نے مجھے پیش کش کی کہ اگر مجھے کسی قسم کا کوئی شک ہو تو آج کے دن
کے لیے خصوصی طور پر معالجین کی ایک ٹیم بھی طلب کی گئی ہے، جو یہیں اسٹیج پر دستی مشینیں لگا کر باقاعدہ مریضوں
کی طبیعت سنبھلنے سے پہلے اور بعد کی رپورٹ پیش کر کے میرے شبہات بھی دُور کر سکتی ہے، لیکن میں نے گرو
سے کہا کہ مجھے اُس کی مسیحا گری پر پورا یقین ہے۔ اسکرین ہر چند لمحے بعد مما اور پپا کے چہرے کے تاثرات
فوکس کر رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر مجھے رفتہ رفتہ شدید پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے نظر آنے لگے تھے۔
دنیا کے کوئی بھی والدین اپنے نالائق ترین بچے کو بھی یوں بھری دنیا کے سامنے شکست کھاتا نہیں دیکھ سکتے
کیوں کہ ہر ماں کے لیے اُس کا بیٹا دُنیا کا سب سے بڑا فاتح اور ہر باپ کے لیے اُس کا لختِ جگر سب سے
زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن ہال کی لحہ بہ لحہ بدلتی صورت میرے والدین کو کچھ اور ہی آئینہ دکھا رہی تھی۔ ہال
کے بڑے بڑے روشن دانوں سے باہر برف کے گالے گرتے نظر آ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو میں اور
میرے دوست کوئٹہ جیسے پہاڑی علاقوں میں گزارے اپنے بچپن کے دسمبر کے دوران، ان برفیلی شاموں میں
گھنٹوں سر جھوڑے بیٹھ کر یہ سوچا کرتے تھے کہ آخر اللہ میاں نے صرف ہمارے محلے پر برف برسانے کے
لیے کتنے فرشتوں کی ''ڈیوٹی'' لگا رکھی ہوگی اور فرشتے آخر کیسے اتنی بہت سی برف اکٹھی کر کے بوریوں میں بھر
بھر لاتے ہوں گے، اور پھر کسی بہت بڑی چھلنی سے چھان کر ہم پر گراتے ہوں گے۔ ہم ان دُودھیا بادلوں ہی
کو فرشتوں کی بوریاں سمجھتے تھے، جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے رات بھر آسمان پر ڈھویا کرتے تھے۔ جانے وہ

ین کے دوست اور وہ بادلوں کی بوریاں ڈھوتے معصوم فرشتے اب کہاں ہوں گے۔ میں اِسی سوچ میں
گرو کی آواز نے مجھے پھر سے اِسی ہال میں پہنچا دیا۔ وہ آخری مریض کو شفایاب کرنے کے بعد اب
ت دے رہا تھا۔ تب، عین اُسی وقت میں نے ایک اور فرشتے کو ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فرشتہ
ے لیے کچھ ڈھو کر لایا تھا اور میرے دل کی دھڑکن آج بھی اتنی ہی تیز ہوگئی، جتنی کبھی برف کے پہلے
پلکوں پر ٹھہرانے سے ہوتی تھی۔ ہاں، وہ ایمی ہی تھی جو میری درخواست پر نہ جانے کس مشکل سے
ر پر بیٹھے پیٹر کو اتنی خراب طبیعت کے باوجود اس ہال تک لانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

ل کے سناٹے میں وہیل چیئر کے پہیوں کی آواز گونجی تو سب ہی کی کیمروں کا رُخ پیٹر اور ایمی کی
وگیا۔ گرو نے بھی چونک کر ایمی کی جانب دیکھا اور جلدی سے عملے کو اُس کی مدد کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں
، پیٹر سمیت اسٹیج پر موجود تھی۔ میرا دل کچھ ایسی تیزی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ابھی پسلیوں کی دیوار توڑ
نکل آئے گا۔ ہال میں پھر سے سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ گرو کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر گڑی تھیں۔ میرے
لے۔ ''میں گرو کے علم کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں۔ اور میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جس سے گرو
علم کی کسی ساخت یا قسم پر تبصرہ کروں، کیوں کہ اگر یہ ٹیلی پیتھی یا ہپناٹزم کی بھی کوئی شاخ ہے تو بہر حال
ں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ میری گرو سے صرف اتنی درخواست ہے کہ وہ اس نڈھال لڑکے کو بھی
ب کر دے، جس کے جسم میں تازہ خون بننا بند ہو چکا ہے۔ یہ گھائل لڑکا پیٹر خود گرو کا بہت بڑا پرستار اور
ہے اور گرو کے ساتھ اس کے اگلے دورے پر جانے کا خواہش مند بھی ہے۔ مجھے اُمید ہے گرو میری یہ
ت رد نہیں کرے گا۔'' گرو کے چہرے پر پیٹر کے ہال میں آنے پر جو کرخت تاثر اُبھرا تھا، اب وہ ایک
ٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے بڑے بچوں کی کسی ''شرارت'' پر تنبیہہ کرنے
لے دیکھتے ہیں۔ وہ بولا۔ ''میں عبداللہ کو پہلے بھی یہ بات کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ
ات، انسان کو ان بیماریوں سے شفایاب کرنے کا نام ہے، جو کسی رُوحانی پیچیدگی کی وجہ سے پیدا ہوتی
ایسے میں بھی انسان بظاہر کسی طبی بیماری کا شکار تو نظر آتا ہے مثلاً درد، بخار، جسم کی معذوری، فالج کے
، دل کی بیماریاں، ذہنی کشیدگی، جگر کی پراگندگی، بصارت و سماعت کا متاثر ہونا یا پھر معدے کے امراض
لیکن اصل میں ان تمام بیماریوں کی اصل وجہ انسان کے جسم کے اندر موجود رُوح کا گھائل ہونا یا رُوح کی
ہے۔ رُوحانی علم سے ہم ایسی ہی بیماریوں کا علاج کرتے ہی اور رُوح کے مندمل ہوتے ہیں جسم کی
خود بخود دُور ہو جاتی ہے، لیکن رُوحانی علاج کے ذریعے ہم خاص الخاص صرف جسمانی بیماریوں کو فوری
ٹھیک کر سکتے مثلاً اگر کوئی حادثہ، جسم سے چوٹ کی صورت میں خون بہنا، کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے
نا اعضاء کی ٹوٹ پھوٹ۔ ایسی صورت میں پہلے مریض کو فوراً جسمانی طبی علاج کی طرف متوجہ کیا جاتا
ہاں، البتہ ایسی صورت میں رُوحانیات اپنا کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ پیٹر کی بیماری بھی خاص ایک جسمانی

بیماری ہے، جس میں ہڈیوں کے گودے کے پورا کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم میں سرخ خلیوں کی پیدا
ہونے کے قریب ہے۔ یہ بیماری بھی ایک چوٹ کا نتیجہ ہے اور پیٹر جانتا ہے کہ گزشتہ تین ماہ سے طبعی علا
کہیں زیادہ اس کا دارومدار میرے رُوحانی علاج پر ہی ہے۔ آج بھی میں رُوحانی عمل کے ذریعے پیٹر کی
کو اس حد تک ضرور مندمل کردوں گا کہ وہ اس ابتر حالت سے باہر نکل آئے اور پھر سے کچھ دن تک اپنی
بنا کسی رُوحانی درد اور تکلیف کے گزار سکے۔ ہاں البتہ اس کا طبی علاج جاری رہے تو مجھے اُمید ہے کہ پیٹر آ
اس بیماری سے چھٹکارا پا ہی لے گا۔'' گرو نے زیرلب کچھ پڑھنا شروع کیا اور وقفے وقفے سے اپنی دوا
پیٹر کے ماتھے پر رکھ کر پھونکتا رہا۔ چند لمحوں بعد ہی پیٹر کی حالت میں بہتری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔
میں لگی برقی اسکرین پر پیٹر کا چہرہ اور لرزتی، دھیرے دھیرے کھلتی پلکوں کا منظر واضح تھا۔ گرو اب اپنی آ
بند کر کے مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بنا لب ہلائے پیٹر کی رُوحانی مسیحا گری میں مشغول تھا۔ میں نے آج
جتنی مرتبہ پیٹر کو دیکھا تھا۔ جانے کیوں ہر مرتبہ وہ مجھے کسی سحر کے زیر اثر دکھائی دیا۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم
جادو کی قسمیں ہیں۔ چند لمحوں میں گرو نے آنکھیں کھولیں اور پیٹر سے پوچھا۔ ''اب تم کیسا محسوس کر
پیٹر.....؟'' پیٹر مسکرایا۔ وہ اب مکمل ہوش میں آچکا تھا۔ ''میں پہلے سے بہت بہتر ہوں.....'' ہال نے
آواز سنتے ہی تالیوں کے شور سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ گرو نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے
ہو ''تم مکمل ہار چکے ہو۔ لہٰذا اب ہتھیار ڈال دو۔'' میں نے طبی ماہرین کی ٹیم کو اشارہ کیا، جنہوں نے چ
میں پیٹر کی تمام تر جسمانی حالت کی رپورٹ بیان کردی۔ اسکرین پر بھی وہی تفصیلات لفظوں کی صورت
نمایاں ہونے لگیں۔ پیٹر کو ابھی تک بخار تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ زیادہ اور اُس کے
دباؤ بھی بڑھا ہوا تھا۔ ایک فوری معائنے کے ذریعے پیٹر کے جسم میں موجود تازہ سفید اور سرخ خلیوں کی
بھی بیان کردی گئی، جو تازہ خون بناتے جسم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ گرو کچھ حیرت اور
سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا، لیکن چپ رہا۔

اب وہ آخری بازی کھیلنے کا وقت آچکا تھا، جو میرے یقین کی پہلی اور آخری بنیاد تھی اور جس کے عو
کی دیواروں پر کھڑی ہو کر میں نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے آنکھ
کیں اور میرا دل زور سے جیسے آخری بار دھڑکا، اندر سے آخری فریاد اُبھری ''تیرا ہی آسرا ہے
مولا'' بس تیرا ہی توکل ہے۔ میرے اعمال کو نہ دیکھ، میرے دل میں چھپے کسی منافق اور چور سے در
میری ریاکاری اور عیبوں کو صرف نظر کردے۔ میرے گناہوں کو نہ دیکھ، اپنی رحمت جلوہ گر کر، اپنی رحم
صدقے، پیارے نبی ﷺ کی رحمت کے صدقے، میرے اُمتی ہونے کے صدقے اور اپنی اس عظیم
شفقت کے صدقے کہ جس کے آگے ساری کائنات کے تمام جرم اور گناہ مل کر بھی ریت کے ایک حقیر
جتنا وزن بھی نہیں رکھتے۔ بس، اُسی رحمت کی ایک جھلک دکھلا دے میرے مولا۔ آج تو ہی میرا پردہ

اپنے اس عاجز گناہ گار، عاصی، منافق اور ریاکار بندے کا پردہ رکھ لے، رحم کر میرے مولا..... رحم
..." میرا ایک ہاتھ پیٹر کے سر پر تھا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی کسی تیز بارش کی طرح جاری
میں نے سحر کے توڑ کے لیے ہمیشہ سلطان بابا کو سورہ فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھتے ہوئے سنا تھا اور
نے مجھے بھی خصوصی طور پر یاد کرانے کے بعد ان چاروں قلوں کا ورد ہر امتحان میں جاری رکھنے کا حکم دیا تھا۔
ے لب تیزی سے اس وقت ہی یہ ورد دُھرا رہے تھے..... **قل یاایھا الکٰفرون**..... **قل ھو اللہ احد**.....
عوذ برب الفلق..... **قل اعوذ برب الناس**..... جس تیزی سے میرے ہونٹ میرے دل کی آواز پر
ہے تھے، اتنی ہی تیزی سے میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پیٹر کا جسم ابھی تک مختلف تاروں کے ذریعے ان
ں سے جڑا ہوا تھا، جو اس کی حالت کے پل پل کی خبر پورے ہال تک بذریعہ اسکرین پہنچا رہی تھیں۔ بند
دں کے پردے تلے مجھے کسی ڈاکٹر کے چلانے کی آواز آئی۔ "پیٹر کا دل ڈوب رہا ہے..... اوہ میرے
....." ہال میں سراسیمگی سی پھیل گئی، جسے میں بند آنکھوں کے پردے تلے بھی خوب محسوس کر سکتا تھا۔ کوئی
ت زور سے چلائی۔ "اس لڑکے کو روکو، یہ پیٹر کو مار دے گا۔" میرے لب مزید تیزی سے ہلنے لگے۔ پیٹر کی
یں اُکھڑنے لگیں۔ رُوح کے سفید اور کالے قابضوں کے درمیان جنگ شدید ہونے لگی۔ ایمی کے رونے
آوازیں میری سماعتیں شل کر رہی تھیں۔ اس کی ڈوبتی فریاد ابھری۔ "مجھے تم پر بھروسا ہے عبداللہ۔ میں نے
تم پر قربان کیا۔" میرے جسم کے مساموں سے پسینہ یوں تیزی سے بہہ رہا تھا، جیسے تیز طوفان اور شدید
ب کے دوران پانی چھوٹے نکاسوں سے سارے بند توڑ کر بہتا ہے۔ پھر کوئی ڈاکٹر زور سے چیخا "اوہ
ے خدا..... بند کرو یہ سب کچھ..... مگر..... ٹھہرو....." میری گزارش جاری رہی۔ "**قل یاایھا الکٰفرون**
" "ارے یہ لڑکا تو اُبھر رہا ہے....." "**قل ھو اللہ احد**....." "پیٹر کو جھٹکے لگ رہے ہیں....."
ل اعوذ برب الفلق" "پیٹر کا بخار کم ہو رہا ہے۔" "**قل اعوذ برب الناس**....." "پیٹر کا دل معمول پر
گیا ہے۔ اُسے ہوش آ رہا ہے....." میری التجا اور ہال کے ہجوم کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں اور پھر
لمازور سے چلائی..... "یسوع مسیح کی قسم، پیٹر کے جسم میں سرخ خلیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔" میں نے بے
ہوکر آنکھیں کھول دیں۔

ہال پر سکتہ طاری تھا۔ سب ہی کی نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں۔ جہاں پیٹر کی لحہ بہ لحہ بدلتی حالت کی
تفصیل جگمگا رہی تھی۔ پیٹر وہیل چیئر پر بیٹھا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ خود اس کا جسم بھی پسینے سے تر
ہار گرو کو جیسے کوئی سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے ایمی کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ وہ روتے
ئے بھی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ دُور سے میری ماں نے مجھے پکارا..... "عبداللہ....." میں نے بھیگی پلکوں سے
ں کی جانب دیکھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ مما نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے مجھے پکارا تھا۔ وہ خود
گاروقطار رو رہی تھیں۔ لیکن انہیں اور پاپا کو شاید اپنے آنسوؤں کا ادراک نہ تھا۔ مما نے دُور سے مجھے اپنی

آنکھیں پونچھنے کا اشارہ کیا، جیسے وہ مجھے رونے سے منع کر رہی ہوں مگر خود وہ دونوں بھی تو رو رہے تھے اور جب ماں روتی ہے تو دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ دنیا کے لیے کتنا ہی بڑا اور بہادر کیوں نہ ہوں پھر رفتہ رفتہ ہال کے پچھلے کونوں سے لوگ کھڑے ہونے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں اور پھر کچھ ہی دیر میں پورا ہال اس شور سے گونج رہا تھا۔ آج ایک بار پھر ایک انتہائی گناہ گار بندے کی التجا رد نہیں ہوئی تھی۔ میرے سارے گناہوں اور کم ظرفی کے باوجود اُس کی عظیم الشان رحمت نے جوش مارا تھا۔ ڈاکٹر دوڑ دوڑ کر پیٹر کا معائنہ کر رہے تھے۔ اور خود پیٹر بھی بھیگی پلکیں لیے حیرت زدہ سا گنگ کھڑا تھا۔ ایمی کبھی اُسے اپنے ساتھ لپٹاتی اور کبھی میرا سر اور ماتھا چومتی۔ مما سے رہا نہ گیا اور وہ دوڑ کر میرے پاس چلی آئیں۔ پپا بھی اُن کی تقلید میں اسٹیج پر چڑھ آئے تھے۔ ہال میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کیمروں کے زاویے، فلش کی چکا چوند، ٹی وی اور اخبار کے رپورٹرز کے بڑھتے مائیک، بیک وقت سینکڑوں سوال..... لیکن میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اس قابل بھی کب تھا کہ کسی کو کوئی جواب دے سکتا۔ میں تو خود ایک سوال تھا..... سراپا سوال..... آج ایک بار پھر ثابت ہو گیا تھا کہ اُس کی رحمت ہمارے گناہوں سے متصل نہیں۔ بس، یقین کی حد لامحدود ہونی چاہیے۔ اور رحمت طلب کرتے لمحے دل کو اتنا ہی عاجز، پاک اور منافقت و ریا سے مبرا ہونا چاہیے۔ جتنا کسی معصوم بچے کا دل دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے وقت ہوتا ہے۔ اگر مجھ جیسے نالی کے کیڑے کے لیے اُس کی رحمت کی یہ وسعت تھی تو پھر نیک اور پاک باز بندوں کے لیے یہ ابر کس قدر وسیع ہوگا۔ میری عقل اسے ناپنے سے عاجز تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر بمشکل ہال کو خاموش رہنے کی التجا کی۔ کافی دیر بعد شور تھما، میری آنسوؤں سے لرزتی آواز اُبھری۔ ''شروع اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ سب تعریفیں اُسی اللہ کے لیے ہیں، جو ہم سب کا مالک اور پالنے والا ہے۔ جس نے آج اپنے اس عاجز، گناہ گار اور ناکارہ انسان کی فریاد کی لاج رکھی۔ یہ کسی کی ہار ہے اور نہ کسی کی جیت۔ یہ تو بس ایک اشارہ ہے، فلاح کی جانب بڑھنے کا اشارہ..... خود اپنا راستہ طے کرنے کا اشارہ..... یہ کوئی معجزہ ہے نہ کوئی کرشمہ..... یہ بس اُس کی بے کراں رحمت کی چھوٹی سی ایک بوند ہے اور اُس کی نعمت ہمیں دن رات یوں تلاش کرتی ہے، جیسے اندھیرے کی تلاش میں روشنی کے جگنو..... اور یہ رحمت اور اُس کا کرم کسی ایک انسان کے جسم میں خون کے چند خلیے بڑھ جانے سے کہیں زیادہ اور عظیم تر ہے۔ میرا مذہب صرف سلامتی ہے اور سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اور میرا پیغام آپ سب کے لیے، بس یہی رحمت ہے..... خدا ہم سب کو اس رحمت کا سایہ نصیب کرے۔'' میں اپنی بات ختم کر کے مما، پپا اور ایمی کو لیے اسٹیج سے اُترا تو میرے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی روتی ہوئی ماں کا سر اپنے کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ پپا لوگوں سے درخواست کر کے راستہ بنا رہے تھے۔ اچانک میں اور گرو آمنے سامنے آ گئے۔ اُس کی آنکھیں سرخ اور آواز دبی ہوئی تھی۔ ''تم نے میری برسوں کی بنی ساکھ اور محنت برباد کر دی۔ آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کون ہو.....؟'' میں نے

ھ اور حیرت سے اس گم راہ کو دیکھا، شاید دلوں کو آہنی پردوں سے ڈھک دیئے جانے کی ایک مثال میرے
ا منے کھڑی تھی۔ گرو نے پھر اپنا سوال دہرایا، اس مرتبہ اس کا انداز ہیجانی تھی۔ ''خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کون
.....؟'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا ''عبداللہ۔ اللہ کا ایک بندہ.....'' گرو اپنی جگہ جمارہ گیا اور ہم اسے
ا کر ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی۔ لندن کی سڑکیں پھر سے دوبارہ برف سے ڈھک
ی تھیں۔ چوراہوں پر میں نے بہت سے لوگوں کو اُونچی عمارتوں پر لگی برقی اسکرینوں کے نیچے کھڑے ہال
ں ہوئی کارروائی پر بحث کرتے دیکھا۔ اسپتال میں پہنچنے سے پہلے شاید ہماری خبر پہنچ چکی تھی۔ اِسی لیے ڈاکٹر
برٹ سمیت بہت سا عملہ استقبالیہ پر ہماری راہ تک رہا تھا۔ پاپا نے میری بیساکھیاں جانے کہاں پھینک دی
یں اور میرا سارا بوجھ، اپنے جسم پر سنبھالے ہوئے تھے۔ ایمی کو جیسے پر سے لگے ہوئے تھے اور وہ بھاگ
اگ کر سب کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہمارے اپنے کمرے میں پہنچنے سے قبل ہی عملے کی ایک نرس تیزی سے
لتی ہوئی میری جانب بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ''آپ کے ملک سے آپ کے لیے ضروری
یس آیا ہے۔ اس پر ارجنٹ کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔'' پپا نے جلدی سے کاغذ لے کر اس پر نظریں دوڑائیں۔
جس اسپتال میں سلطان بابا داخل ہیں، وہاں سے خبر آئی ہے کہ اُن کی حالت ابتر ہے۔ تمہیں جلد از جلد ملک
اپس پہنچنے کی تاکید کی گئی ہے۔'' میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ میں نے پاپا سے التجا کی۔ ''کل صبح کی فلائٹ
ے میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اس بار میری التجا رد نہ کیجئے گا۔'' پپا نے گہری سی سانس لی اور اگلے روز ہم
اکٹر البرٹ کے ہزار منع کرنے کے باوجود ہیتھرو ائر پورٹ کے ٹرمینل پر موجود تھے۔ گاڑی سے اُترتے ہی
ری پہلی نظر جس شخص پر پڑی وہ گرو تھا۔

۲۷۷

ایک اور عبداللہ

میں گرو کو دیکھ کر چونکا، دُور کہیں پس منظر میں مجھے ایمی اور پیٹر کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے الوداع کہنے کے لیے اسپتال کے سارے عملے سمیت ایک ہجوم بے کراں اس وقت ہیتھرو ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ گرو میری جانب بڑھا۔ ''تم نے واپسی میں بہت جلدی دکھائی۔ میرا خیال تھا تم کچھ دن مزید لندن میں بتاؤ گے تاکہ اپنی فتح کا لطف لے سکو..... لیکن میری توقعات کے برعکس شاید تمہیں ہر فتح کے بعد آگے بڑھ جانے کی عادت ہے۔'' میں نے غور سے گرو کی جانب دیکھا۔ ''تم اپنے ہر گزرتے دن کو یونہی فتح اور شکست کے پیمانے پر جانچتے رہے تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لیے صرف جیت اور ہار سے بہت بڑھ کر ہے یہ حیات۔ وقت ملے تو کبھی سوچنا۔'' میں آگے بڑھنے لگا لیکن گرو کی ڈوبتی آواز نے میرے قدم پھر روک دیئے۔ ''میرے لیے میرے عقیدے کی فتح سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے لڑکے۔ اور میں آج تمہیں یہی بتانے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ میری اور تمہاری ایک آخری جنگ ابھی باقی ہے۔ اور جانتے ہو، یہ جنگ کہاں ہوگی یروشلم میں۔'' میں چونک کر پلٹا۔ ''یروشلم میں.....؟'' ''ہاں، بیت المقدس میں۔ میرا گیان کہتا ہے کہ تم سے میری اگلی ملاقات فلسطین میں ہوگی۔'' جانے کیوں اس لمحے گرو کی آنکھوں میں مجھے اُس زخمی بھیڑیے کی ایک جھلک دکھائی دی، جس کے پنجوں سے عین اُس وقت شکار چھین لیا گیا ہو، جب وہ اپنی کچھار میں معصوم میمنے کی چیر پھاڑ کرنے کی تیاری میں ہو۔ اور تب ہی مجھے اپنے عقب سے میمنے کی آواز سنائی دی۔ ''عبداللہ..... تم لیٹ ہو رہے ہو مین۔'' پیٹر اور ایمی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ دُور مما پپا، ڈاکٹر البرٹ اور عملے سے رُخصت لے رہے تھے اور ڈاکٹر البرٹ اس آخری لمحے میں پپا کو میرے لیے برتی جانے والی ہدایات کی فہرست دہرانے میں مصروف تھے۔ ایمی کی سدا برسنے والی آنکھیں آج بھی بن بادل برسات لیے تیار کھڑی تھیں۔ جانے یہ بہنیں اتنا بہت سا نمکین پانی کیسے جمع رکھ لیتی ہیں ان کٹوروں میں۔ میں نے پیٹر کا کالر درست کیا ''کیسے ہو کھلنڈرے لڑکے؟ اپنا بہت خیال رکھنا اور ایمی کا بھی۔'' پیٹر کی آواز مجھے کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''وہ اب ایمی نہیں رہی، آمنہ بن چکی ہے۔'' مجھے یوں لگا، جیسے سارا ایئرپورٹ ہی پل بھر میں رنگ و نور کی بارات میں نہا سا گیا ہو۔ ''کیا.....؟ آمنہ.....'' میں ایمی کی جانب پلٹا۔ اُس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ''ہاں عبداللہ! میں نے سچ کی وہ راہ پا لی ہے، جس کی ایک جھلک تم نے گزشتہ رات پورے لندن کو دکھائی تھی۔ دعا کرنا میں ثابت قدم رہوں۔'' میں نے گرو کے چہرے پر کالی آندھی سی چلتی دیکھی۔ لیکن شاید

نے ابھی کچھ مزید اندھیرا اس کی تقدیر کے لیے بچا رکھا تھا۔ آمنہ نے پیٹر کا ہاتھ تھاما اور اُسے میرے
کھڑا کر دیا۔ ''اور یہ رہا اس راستے کا ایک اور راہی۔ اس نے اپنے نام کا حق تمھارے لیے بچا رکھا ہے۔
اس کا نیا نام تجویز کر دو۔ جو اس راہ حق پر تا عمر اس کے ساتھ رہے۔'' مجھے یوں لگا جیسے میری رُوح روشنی
ردی گئی ہو۔ نور کے جھماکے میرے چہرے سے چھلک کر آس پاس کھڑے لوگوں کے چہروں پر بھی
ی ہو رہے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے میری لندن آمد کا مقصد پورا ہو گیا۔ ہمارے گرد الوداع کہنے
کی دائرہ نما بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور لاؤنج میں لگے اسپیکر، ہمارے جہاز کی روانگی کا آخری اعلان نشر کر
تھے۔ میں نے پیٹر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ گرو کے اندر کا کرب شدید بے چینی کی صورت، اُس کے
ے سے جھلک رہا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ چند لمحوں کے لیے اپنی ٹیلی پیتھی کے ذریعے سارے ایئر پورٹ
ہائی اور سماعت سلب کر لیتا تا کہ وہ دلوں کے پلٹنے کی کرامت نہ دیکھ سکیں۔ لیکن آج گرو بے بس تھا کہ
کرامتیں رُونما ہوں تو تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔ پیٹر کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلی سے
ذب کی۔ ''آج میں پیٹر کو وہ نام دیتا ہوں، جس نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عبداللہ..... پیٹر آج سے
للہ ہے۔'' سارا ایئر پورٹ تالیوں سے گونج اُٹھا۔ عبداللہ نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ میرے سامنے میرا
یا جنم کھڑا تھا۔ ایک عبداللہ لندن سے پلٹ رہا تھا اور دوسرا اپنے اندر ایمان کی روشنی لیے فرنگ و یہود کی
یوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں اب اُس کے لیے قدم قدم پر گرو جیسے فتنوں کی سازشوں کا جال بچھا
میں نے رن وے سے ٹیک آف کرتے جہاز کی کھڑکی سے آخری بار دُھند میں لپٹے لندن کو دیکھتے ہوئے
عا کی کہ ''یا میرے اللہ! ان دونوں بہن بھائی کی ہر مشکل آسان کرنا۔''

ایئر ہوسٹس نے اخبار میرے حوالے کیا اور میری ٹانگوں پر پڑا کمبل درست کر کے آگے بڑھ گئی۔ تب ہی
ا نظریں انگریزی اخبار کی ایک ذیلی سرخی پر جیسے جم سی گئیں۔ ''فلسطینی مسلمانوں کا قبلۂ اول کے
رہوتی غیر قانونی کھدائی کے خلاف یروشلم کی سڑکوں پر مظاہرہ.....'' میں نے جلدی سے پوری خبر پر نظر
ائی، جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ برسوں سے یہودی کسی نہ کسی بہانے بیت المقدس کے گرد کھدائی جاری
ے ہوئے ہیں، جس کا واحد مقصد ''ہیکل سلیمانی'' کی تلاش تھی صیہونیوں کا ایک گروہ اس بات پر یقین رکھتا
کہ ان کا مقدس ترین نشان یعنی 'ہیکل سلیمانی' اسی قبلۂ اوّل کے نیچے کہیں دفن ہے، لہٰذا اس تک پہنچنے کا
جو بیت المقدس کی بنیادوں سے ہی ہو کر گزرتا ہے۔ اس تلاش کے لیے انہیں (نعوذ باللہ) بیت المقدس کو
انا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں گرو کی آواز گونجی ''میری اور تمہاری آخری ملاقات بیت المقدس میں ہو
'' جانے کیوں میں نے اس لمحے اپنی رگوں میں ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی محسوس کی، اور پھر اس بے چینی
تب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا، جب تک جہاز کے پہیوں نے میرے شہر کی زمین کو چھو نہیں لیا۔ ایئر پورٹ
لگتے ہی مجھے سلطان بابا کی فکر نے یوں گھیرا کہ دنیا کی ہر یاد جیسے ذہن سے محو سی ہو گئی۔ ہم ایئر پورٹ سے

سیدھے اسپتال پہنچے تو پتا چلا کہ سلطان بابا ابھی تک کومے میں ہیں۔ مما پپا جانتے تھے کہ میں اب اسپتال سے ٹلنے والا نہیں، لہٰذا وہ میری ضرورت کا سامان لینے گھر روانہ ہو گئے۔ میرے قدم اب میرا بوجھ سہار سکتے تھے لیکن کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹر البرٹ نے مزید کچھ روز کے لیے مجھے بیساکھی کا سہارا لینے کی تاکید کی تھی۔ اس لیے میری ایک بیساکھی اب بھی راہ داری میں پڑے بنچ کے ساتھ ہی ٹکی ہوئی تھی، جہاں میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھا ڈاکٹروں کے سلطان بابا کے کمرے سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بالکل سامنے والی دیوار پر شیشے کی قد آدم کھڑکیوں کا سلسلہ اس طرح سے جڑا تھا کہ باہر پھیلتی ملگجی شام کے ڈیرے دھیرے دھیرے طویل برآمدے میں بھی اُترتے محسوس ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی شام کچھ اس طور ڈھلتی ہے کہ ہمیں اپنے وجود سمیت سب کچھ ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زوال چاہے بھرپور دن کا ہو یا پھر کسی بھی عروج کا، ہمیشہ اُداس کر جاتا ہے۔ میں بھی اُس ڈھلتی شام میں اُداسی کا گہرا نیلا رنگ اپنی نسوں میں اُترتے محسوس کر رہا تھا۔ اچانک مجھے باہر کی جانب بل کھاتی اسپتال کی مرکزی سڑک پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ کون تھا وہ؟ اچانک ذہن میں دوسرا جھماکہ ہوا۔ ''ارے..... یہ تو انور تھا۔ زہرا کی مرسڈیز کا ڈرائیور۔'' میرے قدموں میں جیسے بجلی سی بھر گئی اور میں بیساکھی بھول بھال کر لڑکھڑاتے قدموں سے باہر کی جانب لپکا۔ ایک نرس میری دیوانگی دیکھ کر بوکھلا گئی اور جلدی سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے ایک جانب رکھ کر میری بیساکھی میرے حوالے کرنے لگی۔ لیکن اس وقفے میں انور میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اس نیم اندھیری سڑک پر دُور تک بیساکھی کے تقریباً دوڑتا چلا گیا، لیکن آس پاس گزرتے چہروں میں مجھے انور کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے انور ہی کو دیکھا تھا۔ اچانک ذہن میں ایک نئے خیال نے گھنٹی بجائی اور میں جلدی سے اسپتال کی پارکنگ کی جانب لپکا، لیکن شاید تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے، اور میں تو سدا کا تقدیر کا مارا تھا۔ لہٰذا جس وقت میں زہرا کی کالی مرسڈیز کار کی تلاش میں پارکنگ میں مارا مارا بھٹک رہا تھا، میں نے انور کو سفید رنگ کی ایک ایم ڈبلیو میں پارکنگ کے آخری گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ میرا ہوا میں اُٹھا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا، لیکن گاڑی مجھ سے اتنی دُور تھی کہ میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا اور آواز کہیں اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ شاید کار کی پچھلی نشست پر میں نے کسی کا ہیولا بھی دیکھا، لیکن کون، شاید وہ زہرا ہی ہو گی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو بے اختیار نکلے اور پارکنگ کے چمکیلے فرش پر کہیں لڑھک گئے۔ جن آنسوؤں کی قسمت میں کسی دلبر کا شانہ نہیں ہوتا، وہ یونہی خاک میں مل کر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔ کاش میں بھی کسی کی آنکھ کا ایسا ہی ایک فانی آنسو ہوتا۔ جس شخص کے لیے میں ساری دنیا کا سفر طے کر کے واپس یہاں تک پہنچا تھا، وہ آج بھی مجھ سے اتنی ہی دُور تھی، جتنی میری پہلی نظر کی خطا والے لمحے میں تھی۔ لیکن ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ جس نے اُس کو میری خبر لینے سے روکے رکھا۔ کہیں مما کے خدشات سچ تو نہیں تھے۔ ایک دیوانے ہوتے مجنوں کے لیے کون اپنی عمر برباد کرنے کو تیار ہو گا۔ فرزانگی کا یہی تقاضا ہو گا کہ خاموشی سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔ اور پھر یہاں سے لندن جا

وقت تو میری معذوری اور بیساکھیوں کے سہارے کا بھی سارا زمانہ شاہد تھا۔ دیوانے کو تو چلتے پھرتے بھی برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سو مجنوں اگر بیساکھیوں پر اپنا وجود گھسیٹتا پھرتا ہو تو پھر کسی بھی ہوش مند کو اپنے قدم روک ہی لینے چاہئیں۔ لیکن کیا میری زہرا بھی ایسی ہی تھی۔ وہ صرف ایک بار مجھے اشارہ تو کرتی، میں خود اپنا بوسیدہ جسم لے کر ہمیشہ کے لیے اُس کی دنیا سے دُور چلا جاتا۔ آخر، اُس نے ساحر کو اتنا کمزور کیوں جانا۔ جب میں اپنی ہر سانس اُس کے نام کر چکا تھا، تو پھر خود اپنے ہاتھوں سے اپنا دم گھونٹنے میں بھلا مجھے کیا مشکل ہوتی۔ صرف ایک بار..... بس ایک بار وہ اپنے ابرو گرا کر اشارہ تو کرتی، میں جس قدر سوچتا رہا، اُسی قدر میرے اندر کی اُلجھی ڈوریں مزید اُلجھتی گئیں۔ جب تک میں واپس سلطان بابا کے کمرے کے باہر والے برآمدے تک پہنچا، تب تک رات اسپتال کے در و دیوار پر پوری طرح اپنی سیاہی مل چکی تھی۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں۔ روشنی کے چند فانوس اور برقی قمقمے جلا کر اور ان کی نامکمل روشنی کے دائروں میں بیٹھ کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ہم نے ''رات'' کو شکست دے دی۔ ہم کبھی نہیں سمجھ پاتے کہ رات تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ تو بھلا ازل کو کیسی شکست۔ میرے اندر کی رات بھی ازلی تھی۔ میرے اندر کے اندھیرے بھی سدا کے لیے تھے۔ اچانک ایک ڈاکٹر کی آواز اس اندھیرے میں کسی جگنو کی طرح لپکی۔ ''آپ کے مریض کو ہوش آ رہا ہے، جلدی کریں۔ یہ ہوش کا وقفہ نہایت عارضی بھی ہو سکتا ہے'' میں تیزی سے اُٹھا۔ میری بیساکھی چکنے فرش پر پھسلی اور میں گرتے گرتے بچا۔

جس وقت میں سلطان بابا کے کمرے میں داخل ہوا، تب تک وہ اپنی پلکیں دھیرے دھیرے کھول چکے تھے۔ میری بیساکھی پر اُن کی نظر پڑی تو اُن کی آنکھوں کا وضو ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ ''کیوں ستاتے ہیں آپ مجھے اتنا۔ جلدی سے ٹھیک کیوں نہیں ہو جاتے۔ عبداللہ بہت تھک گیا ہے۔ اسے اور نہ رلائیں۔'' انہیں چپ کراتے کراتے خود میری آنکھیں برسنے لگیں۔ سلطان بابا کو نقاہت کی وجہ سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اُن کی سرگوشی نما آواز اُبھری۔ کیا ہے میاں..... ؟ رلاتے بھی خود ہو اور الزام بھی ہم ہی کو دیتے ہو۔ یاد رہے، جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔ تمھیں ابھی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانا ہے۔ ابھی سے عبداللہ تھک گیا تو پھر.....'' اُن کی آواز ڈوب سی گئی۔ میں جو اُن کے سینے پر سر رکھے رو رہا تھا، گھبرا کر جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُن کی پلکیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے ڈاکٹر کو پکارا۔

نرس دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر سلطان بابا کو پھر سے آکسیجن اور مختلف انجکشن اور ڈرپ کے کینولاز سے لاد دیا گیا۔ میں بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتا وہیں کمرے کے ایک کونے میں بے دم سا بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اگر ہماری رُوح ہی سب کچھ ہے، تو پھر ہمیں اس نازک اور خستہ جسم کے اندر قید کیوں کر دیا گیا ہے۔ ہمیں رُوح کی صورت ہی کیوں نہیں بھیجا گیا، اس فانی دُنیا میں۔ یہ روز روز اپنوں کے

بچھڑنے اور اُن کے جسم کے تڑپنے کی تکلیف سے تو نجات مل جاتی ہمیں۔ یہ کیسی سزا دے دی تھی قدرت نے ہمیں اس جسم کی قید کی صورت میں۔ میں ساری رات سلطان بابا کو جسم کی قید کی یہ سزا بھگتتے دیکھتا رہا۔ اُن کی سانس رُک رُک کر اور کچھ اس اذیت سے سینے کے پنجر سے نکل رہی تھی کہ خود مجھے اپنے پھیپھڑوں میں بیک وقت ہزاروں چھریاں گھستی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی حلق سے سانس بھی کچھ اس طور نکلتی ہے، جیسے جسم سے رُوح۔ شاید وہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری رات تھی۔ صبح تک خود میری رُوح بھی نہ جانے کتنی بار، جسم سے نکل کر واپس اس قید خانے میں داخل ہوئی۔ صبح کا اُجالا پھیلنے تک سلطان بابا کی طبیعت ذرا سنبھلی تو میں بھی باہر برآمدے میں نکل آیا۔ مما پاپا ناشتا لیے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے مما کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئیں، لیکن اُن کی نظر جھکتی چلی گئی۔ اور میں اُن کے کچھ کہے بنا ہی سمجھ گیا کہ اُن کا زہرا سے اب تک کوئی رابطہ نہیں ہو پایا۔ اب تو یہ سوال خود ایک بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ میں نے انور کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتا کیا کرنا تھا میں مما کے اصرار پر چائے کے کچھ گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیل کر وہیں برآمدے کے بنچ پر اُن کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور نہ جانے کس پل میری آنکھ لگ گئی۔ یہ ماں کی گود بھی کس قدر نشیلی ہوتی ہے۔ اندر چاہے کتنا ہی بڑا درد کیوں نہ پل رہا ہو، تھپک تھپک کر بن بولوں والی میٹھی لوری سنا کر سلا ہی دیتی ہے اور یہ مائیں بھی اپنی گود میں سر رکھے اپنے لاڈلے کے لیے کیسی سنگ مرمر کی مورت بنے بیٹھی رہتی ہیں۔ مجال ہے ذرہ برابر بھی جنبش ہو جائے ان کے جامد وجود میں۔ میری ماں بھی یونہی اکڑی بیٹھی رہی، تب تک، جب تک میری پلکیں دھیرے دھیرے دوبارہ کھل نہیں گئیں۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ مما کے گالوں پر اُن کے بہتے آنسوؤں کی دھاریں اب بھی موجود تھیں۔ میں نے جلدی سے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا" آپ رو رہی تھیں۔ اتنی دیر ہو گئی مما۔ آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟" وہ مسکرا دیں۔ "بڑی مشکل سے اپنے آنسو تمہاری پلکوں پر گرنے سے روکے رکھے میں نے۔ میرا عبداللہ برسوں بعد میری گود میں سر رکھ کر سویا تھا، کیسے جگا دیتی.....؟" مما اب مجھے ساحر کی جگہ عبداللہ کے نام ہی سے پکارتی تھیں اور میں جانتا تھا کہ وہ اپنے سیاہ نصیب بیٹے کے کالے مقدروں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سلطان بابا اُسی طرح اپنے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ میں شام سے ذرا پہلے کسی شکستہ اُمید کی آس لیے پارکنگ کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے بچھے ایک بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ بھکاریوں کو تو سدا راہ میں بیٹھے رہنا ہوتا ہے۔ چاہے بھیک کا سکہ کشکول میں پڑے یا خالی کشکول لے کر ہی رات گئے گھر واپس لوٹنا پڑے۔ میں بھی اپنے نصیب کا خالی کشکول لیے، تقدیر کی راہ پر بیٹھا اندر آنے والی ہر گاڑی کو اُسی نظر سے دیکھنے لگا، جیسے کوئی گداگر چمکتے سکوں کو دیکھتا ہے اور پھر میرے نصیب کا سکہ چمکا۔ میں ہیجانی انداز میں کھڑا ہو گیا۔ سفید بی ایم ڈبلیو نے لمبا سا موڑ کاٹا اور پارکنگ کی جانب بڑھی۔ میں تیزی سے سڑک کی جانب لپکا۔ جلدی میں بیساکھی مجھ سے چھوٹ گئی اور میں منہ کے بل ٹھیک اُسی گاڑی کے سامنے

کر۔ کار نے زور کی بریک لگائی۔ ڈرائیور غصے میں بکتا جھکتا گاڑی سے اُترا۔ ''مرنے کا ارادہ ہے یا؟'' میں نے اپنا خاک آلود چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ ''مار ہی ڈالو، لیکن دھیان رہے کہ پوری موت دینا۔ تڑپتے ئے نہ چھوڑ جانا.....'' انور کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر میری جانب لپکا۔ ''ارے..... ساحر بابا..... پ، یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ آپ نے.....'' انور نے جلدی سے اپنی جیب سے رُومال نکال کر میرے چہرے ے خاک صاف کی۔ کاش قدرت ایسے رُومال بھی بنا دیتی جو ہمارے مقدروں پر پڑی گرد بھی جھاڑ سکتے۔ انور نے جلدی سے گاڑی ایک جانب پارک کی اور میرے قریب اُسی بنچ پر آ بیٹھا، جہاں میری بیساکھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ رو پڑا ''ساحر بابا..... یہ کیا.....؟ آپ ابھی تک.....؟'' میری تلخی زبان پر آ ہی گئی ''ہاں..... میں ابھی بھی معذور ہوں..... کیا تم بھی اپنی مالکن کی طرح معذوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے؟'' انور نے جلدی سے اپنے ہاتھ جوڑے ''میرے بچے آپ پر قربان ہوں ساحر بابا! ایسا کیوں کہا آپ نے.....؟'' پھر نہ جانے کیوں وہ خود ہی کچھ کہتے کہتے چپ سا ہو گیا۔ شاید وہ میرا مدعا سمجھ گیا تھا۔ ''کیا آپ کی زہرا بی بی سے ملاقات نہیں ہوئی؟'' میں روہانسا ہو گیا۔ ''نہیں انور..... تمہاری زہرا بی بی مجھ سے کہیں کھو گئی ہے۔ کیا تم مجھے اُس سے ایک بار ملوا سکتے ہو.....؟'' انور کچھ دیر چپ رہا پھر اُس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ اب زہرا کے ہاں نوکری نہیں کرتا۔ کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے اب وہ شہر کے معروف صنعت کار، کمال صاحب کے ہاں ڈرائیور تھا اور یہ سفید بی ایم ڈبلیو بھی اُنہی کی تھی۔ انور یہاں اپنے مالک کے کسی جاننے والے مریض کے لیے کھانا وغیرہ لے کر آتا تھا۔ مجھے نہ جانے ایسا کیوں لگا کہ انور مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے اُس سے زہرا کا پتا پوچھا۔ کیوں کہ اُس کے پرانے گھر پر سوائے نوکروں کے اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ انور نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ زہرا کے ابا کا اسی شہر کے مضافات میں ایک اور بہت بڑا بنگلا ہے، جو سالوں سے بند پڑا تھا، لیکن کچھ عرصہ پہلے اچانک نہ جانے کس وجہ سے برسوں سے بند پڑے کواڑ کھول کر پھر سے تازہ قلعی پھروائی گئی اور سب ہی گھر والے وہاں منتقل ہو گئے۔ میں نے لمبی سی سانس لی، تب ہی زہرا کے پرانے گھر پر ہمارا فون اُٹھانے والا بھی کوئی نہیں بچا۔ انور کی آنکھیں بار بار چھلک جاتی تھیں۔ اُسے میرے ساحر سے عبداللہ بننے تک کا پورا احوال معلوم تھا اور یہ انور ہی تھا، جس کی گاڑی دیکھ کر میں پہلی مرتبہ درگاہ پر رُکا تھا۔ میں نے انور سے زہرا کے نئے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ کچھ ہکلایا۔ ''آپ وہاں نہ جاؤ ساحر بابا..... میرا مطلب ہے پہلے آپ پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر جانا۔ ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے غور سے انور کو دیکھا ''تم جانتے ہو انور، میرا جنون اُس مقام پر ہے، جہاں مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے راستوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جس راستے پر بھی چلوں وہ راستہ خود مجھے زہرا کی چوکھٹ پر پہنچا دے گا۔ تم اگر مجھے آزمانا چاہتے ہو تو یونہی سہی۔'' ملی جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ انور نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ساحر بابا..... میں آپ کو بھی خوب جانتا ہوں اور آپ کی دیوانگی کو بھی۔ میں نے آپ کی نظر کی تپش سے سخت فولاد کو پگھلتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آپ

سے التجا ہے کہ ابھی وہاں نہ جاؤ، جہاں تک میری معلومات ہیں، اس ماہ زہرا بی بی کی منگنی کی تیاری ہے اور پر..... خرم میاں اسی شہر کے ایک بڑے رئیس کی اکلوتی اولاد ہیں۔ میں آپ سے منت کرتا ہوں، آپ وہاں نہ جائیں۔ اسی میں شاید سب کی بھلائی ہے"۔ انور نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے کانوں میں وہ پہلے ہی ایک ایسا پگھلا سیسہ اُنڈیل چکا تھا کہ جس کے بعد میری سماعتوں کو اور کچھ سننے کا چارا ہی نہ تھا میں وہیں ڈھے گیا۔

جانشین

جاتے جاتے انور میری حالت کے پیش نظر مجھے زہرا کے دوسرے مکان کا پتہ دے گیا بلکہ اُس نے مجھ
ے وعدہ کیا کہ وہ خود مجھے وہاں لے کر جائے گا لیکن اب بھلا میرا وہاں کیا کام تھا۔ میرا اہم سفر تو اپنی راہ بدل
یا تھا، پھر وہاں جا کر اُس کی راہ کھوٹی کرنے سے بھلا کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے اپنی وفا کی
ہائیاں دینے والے بہت بُرے لگتے تھے۔ جیسے وہ اپنے کسی اَن مول جذبے کی توہین کر رہے ہوں۔ وہ وفا ہی
ہا، جسے رُو کر اور دہائی دے کر بیان کرنا پڑے۔ اگر دنیا کا بازار ہی کھوٹا ہے تو پھر اپنے وفا کے چمکتے سکے کی بے
زتی کرنا فضول ہی تو ٹھہرا۔ بے وفائی کی سولی چڑھنا ہی مقدر ہو تو پھر خاموشی سے چپ چاپ یہ پھندا اپنے
لے میں ڈال لینا چاہیے۔ چیخ و پکار کر کے اور زمانے بھر کو اپنی رُسوائی کا تماشا دکھا کر خود کو کم ظرف ثابت کرنا
ے کبھی گوارہ نہ تھا لیکن یہ دل..... ہاں..... یہ دل ہی تو ہمیں عرش سے فرش پر لا پھینکتا ہے۔ ہماری خودداری،
..... ہمارا سب کچھ، اِسی دل کے پاس ہی تو گروی پڑا رہتا ہے۔ تب ہی یہ ہماری انا اور خودداری کے سودے
ر بازار کرتا پھرتا ہے۔ ایک لمحہ پہلے ہم جس ارادے کا اٹل فیصلہ کر کے سکون کا ایک سانس بھی پوری طرح نہیں
لے پاتے کہ دوسرے ہی لمحے یہ ہمارا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ ہمیں پھر سے اُسی بے چینی اور اُسی تڑپ کی تنگی
چھیوں کے جنگل میں لا پھینکتا ہے، جہاں پل پل مرنا ہی ہمارا مقدر ٹھہرتا ہے۔ ہم لوگوں کی اور خود اپنی نظر میں
گرتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار فیصلے بدلتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں، پھر توڑ دیتے ہیں، لیکن کچھ حاصل
یں ہوتا۔ خود اپنا آپ بیچ کر بھی ہم اس دلبر کو جیت نہیں سکتے، جس کے لیے ہم اپنے اس دشمن دل کے ہاتھوں
نی ذلت تھگت رہے ہوتے ہیں۔ میں بھی پوری رات اُسی عذاب سے گزرتا رہا۔ ایک پل میں مجھے یوں
سوس ہوتا ہے کہ آج کے بعد مجھے کبھی زہرا کی چوکھٹ کا رُخ نہیں کرنا چاہیے، پھر دوسرے ہی پل میرا دل کوئی
ہرا پتا پھینک دیتا۔ 'نہیں، ضرور اُس کی کوئی مجبوری ہوئی ہوگی۔ ورنہ وہ ایسی تو نہ تھی۔'' میں پھر تڑپ کر
کروٹ بدلتا۔ ''تو کیا مجھے ایک آخری بار اُس سے مل کر سب سوالوں کے جواب نہیں مانگ لینے چاہیں.....؟
یں، اُسے تمہاری اتنی فکر ہوتی، تو وہ خود آ کر تم سے اپنی مجبوری بیان کر دیتی۔ اب خبردار جو تم نے اُس جانب کا
رخ بھی کیا تو.....'' اِسی ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی لیکن بعض مرتبہ ہمارے رات کے اندھیرے میں کیے
گئے فیصلے دن کے اُجالے کے ساتھ ہی اُس تاریکی کی طرح غائب ہو جاتے ہیں، جو صرف رات کا خاصہ ہوتی
ہے۔ رات ہمیں بہت بہادر بنا دیتی ہے اور دن پھر سے ہمارے نازک دل کو مسل کر خوف، خدشات اور

وسوسوں سے بھر دیتا ہے۔ اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے شدید تیز بخار نے آگھیرا۔ میں ابھی تک سلطان بابا کے کمرے سے ملحق ملاقاتیوں کے کمرے ہی میں لیٹا ہوا تھا۔ پپا نے میری بگڑی حالت دیکھی تو دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لائے۔ مما ٹھنڈی پٹیاں میری پیشانی پر رکھ کر نہ جانے کیا پڑھ پڑھ کر پھونکتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ انہیں اتنی خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں اپنی اولاد کے لیے کسی خاص وظیفے کی ضرورت بھلا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بس خالی پھونک ہی مار دیں تو اُن کی محبت کی معجزاتی تاثیر اولاد کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اگر شام تک میرا بخار نہ اُترا تو مجھے بھی اسپتال میں داخل کرلیا جائے گا۔ شام تک میری حالت کیا سنبھلتی، البتہ سلطان بابا کی سانسیں پھر اُکھڑنے لگیں اور پھر میں نے کچھ شناسا چہروں کو اسپتال کی راہ داری میں چلتے دیکھا۔ ارے..... یہ تو سب سے آگے حاکم بابا تھے، پھر مولوی خضر، پھر عامر، ہاں، وہی پہلا عبداللہ جس نے اپنی گدی مجھے سونپی تھی اور پھر آخر میں نعمان..... وہ جسے میں عبداللہ کے لقب کے ساتھ ساحل والی درگاہ کا انتظام سونپ کر آیا تھا اور بھی کچھ لوگ تھے، لیکن میں اُن کے نورانی چہروں میں اپنی پہچان کی کوئی شبیہ تلاش نہیں کر پایا۔ وہ سب لوگ چلتے ہوئے میرے بستر کے گرد جمع ہو گئے۔ حاکم بابا نے میرا ہاتھ تھام لیا ''میرے جوگی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا شاید..... کیا سب ہی بازیاں تم ہی مار جاؤ گے میاں۔'' میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن پہلے عبداللہ نے میرا کاندھا دبا کر مجھے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ میری آواز میں نقاہت تھی۔ ''آپ سب ایک ساتھ..... یہاں کیسے.....؟'' ''ہمیں سلطان بابا نے یاد کیا تھا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں۔'' میں نے حیرت سے اُن سب کی طرف دیکھا ''لیکن سلطان بابا تو..... میرا مطلب ہے کہ کیا حکم.....؟'' مولوی خضر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''اب بھی وہی سوال کرنے کی عادت..... ہم سلطان بابا کو لے جانے آئے ہیں۔ وہ حجاج مقدس کی زیارت کو جانا چاہتے ہیں۔ ہم سب انہیں رُخصت کرنے آئے ہیں۔'' میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ''حجاز مقدس۔ لیکن وہ تو بہت بیمار ہیں، وہ اتنا لمبا سفر کیسے کریں گے؟'' حاکم بابا نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی بزرگ کسی ضدی بچے کو دیکھتا ہے اور پھر انہوں نے میرے سر کو یوں تھپتھپایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''فکر نہ کرو بچے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نہ جانے اُن کے ہاتھوں میں کیسا جادو تھا کہ میں پل بھر ہی میں مدہوش سا ہو گیا۔ مجھ پر غنودگی کا شدید حملہ ہوا اور پلکیں بوجھل ہو کر خود بخود گرتی چلی گئیں۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہولے ہولے میرا شانہ ہلا رہا ہو۔ پھر مجھے دُور کہیں سے پاپا کی آواز سنائی دی ''آنکھیں کھولو بیٹا۔ دیکھو شام ڈھل رہی ہے۔'' میں نے نقاہت کے بوجھ تلے دبے پپوٹوں کو دھیرے دھیرے کھولا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا، مطلب بخار اُتر چکا تھا، لیکن وہ جو کچھ میں ابھی چند لمحوں پہلے محسوس کر رہا تھا، وہ سب کیا صرف ایک خواب تھا۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر کمرے میں نظر دوڑائی، لیکن وہاں نہ تو مولوی خضر موجود تھے اور نہ ہی حاکم بابا..... باقی سب لوگ بھی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پاس بیٹھی مما سے پوچھا کہ ''کیا ابھی کچھ دیر

پہلے یہاں ساحلی درگاہ سے کچھ ملاقاتی آئے تھے.....؟'' مما نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیسا خواب تھا۔ اتنے میں نرس نے آکر بتایا کہ سلطان بابا کی بے ہوشی کا وقفہ کچھ دیر کے لیے پھر ٹوٹ گیا ہے۔ میں لپک کر اُن کے بستر کے قریب پہنچا مجھے دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرائے۔ میں نے اُن کے اشارے پر اپنا کان اُن کے ہونٹوں کے قریب کر دیا اُن کی آواز بمشکل مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ''ساحر میاں! اب عارضی جدائی کا وقت ہو چلا ہے۔ میں اپنے حواس کی آخری حد سے پہلے حجاز کے سفر پر جانا چاہتا ہوں۔ میں نے حاکم اور خضر کو پیغام بھیج دیا ہے۔ بس، اب تم بھی مجھے رُخصت کر دو۔'' ''میری بدحواسی فزوں تر ہو گئی۔'' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ اس حالت میں کیسے جا سکتے ہیں۔ اور پھر جانا طے ہی ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ جہاں سلطان بابا، وہیں عبداللہ۔ آپ نے اکیلے سفر کا تصور بھی کیسے کر لیا؟'' اُن کی مسکراہٹ گہری، لیکن آواز دُور ہوتی گئی۔ ''عبداللہ بھلا سلطان سے کب جُدا ہوا ہے۔ لیکن تمہیں یہاں ابھی میرے بہت سے اُدھورے کام سرانجام دینا ہیں، لہٰذا تمہارا یہیں رُکنا ضروری ہے۔ اور یاد رہے، ثابت قدم رہنا۔ وقت کی آندھی اپنا آخری زور ضرور لگائے گی تمہارے قدم اُکھاڑنے کی کوشش بھرپور کرے گی، مگر تمھیں جمے رہنا ہوگا۔ یہی میرا آخری حکم ہے۔'' میں نے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اُن کی ہتھیلیوں کی پشت بھیگتی چلی گئی۔ ''لیکن میں یہاں اکیلا کیسے رہ پاؤں گا۔ مجھے تو ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں آتا اور آپ مجھے براہِ راست دوڑ کے میدان میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ میں ٹوٹ جاؤں گا آپ کے بنا.....'' اُن کی آواز ٹوٹ کر اُبھر رہی تھی۔ ''کوئی کبھی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا ساحر میاں۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن جدا ہو جانا ہے۔ لیکن اطمینان رکھو، یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی جدائی ہوگی۔ سلطان بابا ہمیشہ تمہارے آس پاس موجود رہے گا۔ اب مسکرا کر میری طرف دیکھو ایک بار۔ تم نے سلطان کو بھی اپنے سحر کے حصار میں لے ہی لیا میاں۔ واقعی پکے ساحر ہو۔'' میں اُن کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی اُن کی دل جوئی کے لیے مسکرا دیا۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر غنودگی میں ڈوبتے گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سلطان بابا نے حجاز جانے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اُن کی وہ تمنا کیسے پوری ہوگی۔ اور سلطان بابا یہ جدائی کی بات بار بار کیوں کر رہے تھے؟ انہی اُلجھنوں میں گھرے جانے کب صبح کا سورج بھی نمودار ہو گیا۔ صبح اُن کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں کی ٹیم کے چہرے پر مایوسی کے اثرات میں صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ مجھے اُسی ہجوم میں کسی ڈاکٹر کی سرگوشی سنائی دی۔ ''صرف دماغ ہی کام کر رہا ہے، باقی تمام اعضاء تقریباً کام چھوڑ چکے۔'' میرا جی چاہا کہ میں اس شخص کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پورے اسپتال سے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو انہوں نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اُن کے منہ میں پانی ٹپکایا تھا۔ پھر یہ ڈاکٹر کیا اناپ شناپ بولے جا رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ڈاکٹر ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں نمودار ہوا۔ ''سعودیہ اسپتال کا فیکس آ گیا ہے، ڈاکٹر حیات بن حبیب نے مریض کو حجاز منتقل کرنے کی

اجازت دے دی ہے۔ اب ان کے علاج کی آخری اُمید بس ڈاکٹر حیات ہی ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اجازت نامے پر دستخط کون کرے گا؟ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی تو نہیں ہے آس پاس۔'' سب کی نظر میری جانب اُٹھ گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ سلطان بابا کی تمنا پوری ہونے پر ہنسوں یا اُن کے جدا ہونے پر زور زور سے روؤں۔ جانے ڈاکٹر حیات بن حبیب کون تھے اور اُن کا سلطان بابا کی بیماری سے کیا تعلق تھا۔ لیکن اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ سلطان بابا نے اپنے حجاز کے سفر کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ میں نے اجازت نامے پر اُن کے شاگرد کے طور پر دستخط کر دیئے اور ضمانت نامہ بھی بھر دیا کہ کسی بھی اَن ہونی کی ذمہ داری میری ہو گی۔ یہ نادان طبیب کیا جانیں کہ جو اَن ہونی ہونی تھی، وہ تو ہونے جا رہی تھی۔ میرے جسم سے جیسے میری رُوح جدا ہو رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر کومے کی حالت میں بھی ایسا سکون آمیز تاثر تھا، جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ اُن سے کیا وعدہ توڑ دوں اور اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے، میں بھی اُسی جہاز پر سوار ہو جاؤں، جو ابھی کچھ دیر بعد انہیں لے کر حجاز کی مقدس سرزمین کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ لیکن ایمبولینس سے اُترتے ہی میرے دل کا یہ چور بھی پکڑا گیا۔

مریضوں کے لیے بنائی گئی خصوصی راہ داری جو اسٹریچر سمیت مریض کو سیدھا رن وے تک لے کر جاتی تھی، اس کے سرے پر مجھے حاکم بابا اور مولوی خضر سمیت اپنے پرانے سب ہی ساتھی انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اب مجھے ان باتوں پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ شاید رفتہ رفتہ میں خود بھی اِسی غیر مرئی نظام کا حصہ بنتا جا رہا تھا، جو سلطان بابا کے اردگرد اور اُن کے معتقدین کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ حاکم بابا اس سفر میں سلطان بابا کے ہم سفر ہوں گے۔ کتنا بے بس تھا میں اس لمحے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بیماری تو صرف ایک بہانہ ہے۔ سلطان بابا نے خُدا کے گھر کی زیارت کرنی تھی اور بس..... وہ جانتے تھے کہ میں انہیں اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گا، لہٰذا انہوں نے چپ سادھ کر میری ضد کا راستہ ہی بند کر ڈالا تھا۔ حاکم بابا بہت دیر تک مجھے سینے سے لگا کر تھپکتے رہے۔ کچھ سفر آغاز ہی سے اپنا انجام بیان کر دیتے ہیں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے علاوہ وہاں موجود سب ہی لوگ اس انجام سے واقف ہیں۔ صرف ایک میں ہی ہوں ان سب میں ایسا کم ظرف تھا جسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں فضا میں ہوائی جہاز کو بلند ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں میرے دل سے ایک خاموش صدا نکلی..... ''الوداع.....'' کبھی کبھی ہماری زندگی میں اچانک ہی کچھ ایسے خلا پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنا آپ ہوا میں معلق نظر آتا ہے، کچھ ایسی ہی میری بھی صورت حال تھی۔ مولوی خضر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں رات گزارنے کے لیے گھر چلا جاؤں اور جی چاہے تو صبح ساحل والی پرانی درگاہ پر آ جاؤں۔

گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نہ جانے کیوں اسی پرانے ساحر کی یاد نے شدت سے آگھیرا۔ شاید اس یاد کے پیچھے بھی زہرا کی سلگتی یادوں کے انگاروں کی آنچ اور حدت موجود تھی۔ مجھے ساحر اس لیے بھی

ل وہ جھپٹ کر چھین لینے کا عادی تھا، جب کہ اس کے برعکس عبداللہ خود اپنی دنیا لٹتے دیکھ کر بھی ہونٹ
بھا تھا۔ آج اگر وہ پرانا ساحر ہوتا تو کسی کیا مجال تھی کہ وہ یوں اطمینان سے اُس کی محبت کو چھین کر لے
وہ زہرا کے محل کی چوکھٹ پر جا بیٹھتا اور اپنی قضا یا پھر زہرا کا ہاتھ، کوئی ایک سوغات لے کر ہی واپس
لیکن یہ کیسا المیہ تھا کہ سلطان بابا نے میرے اندر کے ساحر کی تمام گرہیں عبداللہ نام کی عاجزی سے باندھ
ں۔ جب ہم مجبور اور لاچار انسان بہت زیادہ بے بس ہو جاتے ہیں تو ہمارا جھگڑا، ہمارے خدا سے شروع
ا ہے۔ ہمیں اپنے گزشتہ تمام گناہ جائز لگنے لگتے ہیں اور ہمارے دل میں کہیں دُور یہ خواہش انگڑائیاں
ی ہے کہ ہمارا خدا بھی ہمیں اُسی طرح منا لے، جس طرح کسی بے جا ضد پر رات کو کھانا کھائے بغیر سو
پر ہماری ماں مناتی ہے۔ بالوں میں اُنگلیاں پھیر کر، کبھی گدگدا کر اور کبھی رُو کر..... میں بھی اپنے خدا سے
ا سا بنا کھانا کھائے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ جب انتقام لینے کے لیے کوئی ہستی میسر نہ ہو پھر انسان خود
پ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور میں تو خود ہی اپنے آپ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ مجھے بھلا
ور دشمن کی ضرورت ہی کب تھی، لہٰذا میں خود ہی اپنی رُوح کو غم، دُکھ اور جلن کی برچھیاں گھونپتا، نہ جانے
نیند کی وادی میں پہنچ گیا۔ تب ہی مجھے یوں لگا جیسے سلطان بابا میرے پلکیں موندنے کے انتظار ہی میں
ٹیوں کے پیچھے کہیں چھپے بیٹھے تھے۔ اُن کا لباس سفید اور تسبیح کا رنگ دُودھیا تھا۔ دُور پس منظر میں سبز
ی ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دے رہی تھی۔ سلطان بابا کے چہرے پر خلاف معمول بے حد تازگی اور
ت کے آثار نمایاں تھے۔ انہوں نے تر و تازہ لہجے میں مجھے اُسی طرح چھیڑ کر مخاطب کیا جو اس دنیا میں بس
ا خاصہ تھا۔ ''کیوں میاں! تمہاری خدا سے ضد کی عادت نہ گئی۔ کبھی دو گھڑی کے لیے اپنے اندر کی اس
ور روک بھی لیا کرو۔ کیوں خود کو ہر پل لہولہان کیے رکھتے ہو۔'' میرے لہجے میں شکوہ تھا ''آپ کو اس سے
...؟ آپ تو مجھے تنہا چھوڑ گئے نا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اس راہ پر آپ کا ہاتھ پکڑے بنا ایک قدم
گے نہیں چل سکتا۔ پھر بھی آپ مجھے یوں ہی درمیان بھی بھٹکتا چھوڑ کر چل دیئے۔'' سلطان بابا دھیرے
رائے۔ ''پرندے کو پرواز سکھانے کے لیے اُس کے اپنے شہپر کو بھی ایک مرتبہ اُسے چوٹی سے نیچے پھینکنا
ا ہے۔ یہ اس نوزائیدہ کے پر کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مخالف ہوا کا دباؤ، تیزی سے قریب آتی
ا، زمین کی کشش اور آندھی جیسی چنگھاڑتی آوازیں اس شاہین بچے کو اپنے پنکھ پھڑ پھڑانے پر مجبور کر ہی
ا۔'' میں گڑگڑایا ''لیکن میرے پر تو پہلے ہی کسی کے ناکام عشق نے کاٹ دیئے ہیں۔ مجھے پرواز کا سبق
ا گے آپ۔ میری اُڑان تو بھرنے سے پہلے ہی کسی کی زہریلی محبت نے گھونٹ دی ہے۔ اب میرا مقدر
چوٹی سے نیچے کی جانب جھانکتی قاتل چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا ہے۔ فنا ہی میرا مقدر ہے،
فسوس کہ میری تباہی کا یہ منظر دیکھنے کے لیے آپ یہاں نہیں ہیں۔ کم از کم مجھے آخری کندھا تو دے
ے'' میری آواز خلا میں بھٹک کر واپس آ گئی اور اگلے ہی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر پوری رات میں

کروٹیں ہی بدلتا رہا۔

شاید وہ فجر سے ذرا پہلے کی کوئی ساعت تھی، جب کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں میرے کمرے
دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں نے ہڑ بڑا کر جلدی سے دروازہ کھولا تو مما اور پپا دونوں ہی تاریک چہرے لیے با
موجود تھے۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ ''کیا ہوا.....؟'' مما نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اُن کی آواز اندر
گھٹ گئی اور وہ رونے لگیں'' میں نے پپا کو پکڑ کر جھنجھوڑا..... ''خدا کے لیے کچھ تو بولیں.....'' پاپا نے میر
کاندھے زور سے تھام لیے۔ ''ابھی ابھی درگاہ سے مولوی خضر کا پیغام آیا ہے، سلطان بابا اب ہمارے درمیا
نہیں رہے.....'' میری سماعتیں شل ہوگئیں۔ اس کے بعد پپا نہ جانے کیا بولتے رہے مجھے صرف اُن کے ل
ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شاید میں وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر گر بھی گیا تھا اور شاید نیچے ڈھتے وق
دروازے کی چوکھٹ میرے سر سے ٹکرائی بھی تھی کیوں کہ میں نے مما کو جلدی سے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر سر پر
باندھتے محسوس کیا، لیکن کیا میری نسوں میں ابھی خون کی روانی باقی تھی اور کیا میری سانس ابھی چل رہی تھی۔
میری بصارت کا ہر رنگ ابھی قائم تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر میں واقعی بڑا ''کم ظرف'' تھا۔ عقیدت اور محبت کا تقا
تو یہ تھا کہ میرے حواس بھی ٹھیک اُسی لمحے ہمیشہ کے لیے معطل ہو جاتے، جس لمحے میں نے پپا سے وہ لفظ
تھے۔ لیکن حیف مجھ پر کہ میں اب بھی پپا کو زور زور سے چلاتے ہوئے سن رہا تھا۔ ''ساحر ہوش میں آؤ۔ مولو
خضر نے ظہر کے بعد درگاہ پر سلطان بابا کی غائبانہ نماز جنازہ کا پیغام بھیجا ہے اور تمہارے لیے خاص حکم۔
وہاں پہنچنے کا۔ شاید یہ بھی سلطان بابا ہی کی کوئی آخری خواہش ہو۔'' لیکن میں اس وقت کسی حکم کی تعمیل کے قا
ہی کہاں تھا۔ پتا نہیں کب سورج چڑھا اور کب پاپا مجھے دو نوکروں کی مدد سے سنبھالے اپنی گاڑی میں درگاہ
جانب روانہ ہوئے۔ کچھ انہونیاں ایسی ہوتی ہیں، جو ہمیں صاف نظر آتے ہوئے بھی درپیش آنے کے بعد ا
ہی بڑا اعصابی جھٹکا دے جاتی ہیں، جیسے کہ ہم ان کی حقیقت سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ میں کہیں نہ کہیں
بات سلطان بابا کے حجاز کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ شاید یہ اُن کا آخری سفر ہے، لیکن اُن
قضا کی خبر نے میرے اندر سب ہی کچھ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کی رُخصتی کا ٹھیک وہ
وقت تھا جس وقت وہ میرے خواب میں مجھ سے ہم کلام تھے۔ میرے ذہن میں اُن کی بات گونجی۔ ''یاد رکھ
یہ جدائی صرف اس خاکی جسم کی دُوری ہوگی۔'' لیکن میرے لیے تو اب بھی یہ جسم ہی سب کچھ تھا۔ میں ا
رُوح کی حدوں تک پہنچا ہی کب تھا۔ ہم درگاہ پہنچے تو حاکم بابا کے علاوہ باقی سب لوگ موجود تھے۔ جانے مجھ
کس نے صحن میں وہیں بٹھا دیا جہاں میں کبھی سلطان بابا کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے تو اب
جانب وہی نظر آ رہے تھے، پھر یہ لوگ اُن کی جدائی پر اس قدر افسردہ کیوں بیٹھے تھے۔ مجھے مولوی خضر کی آو
کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی ''سوگ صرف تین دن کا ہوتا ہے.....'' ''سوگ.....'' میں نے حیرت
اُن کی جانب دیکھا ''کیسا سوگ.....؟ آج یہ سب کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔'' ظہر کی نماز شروع ہوئی

سی نے مجھے بھی صف میں لا کھڑا کیا اور پھر فرض نماز کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کی نیت بھی باندھ لی گئی۔ کبھی سی نے زندوں کی نماز جنازہ بھی پڑھی ہے؟ نماز کے بعد درگاہ کے لوگوں کے علاوہ باقی سب لوگ تتر بتر ہو ئے۔ مجھ سے پہلے اور بعد والے عبداللہ، مولوی خضر اور کچھ انجان لوگ سر جوڑے پتا نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔ پپا میرے قریب ہی خاموش سے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اس درگاہ سے وحشت ہو رہی تھی۔ جانے ون بتا رہا تھا کہ سلطان بابا کی وصیت کے مطابق انہیں مکہ کی سرزمین کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ میرا جی چاہ ہا تھا کہ پپا سے کہوں کہ آج رات ہی ٹکٹ کروالیں۔ میں بابا کے پاس سعودیہ جانا چاہتا ہوں۔ عصر کے بعد ولوی خضر نے حجرے سے ایک کاغذ منگوایا اور دھیرے سے بولے ''سلطان بابا کی وصیت پڑھنے کی اجازت اہوں گا۔'' پھر مولوی خضر دھیرے دھیرے سلطان بابا کی استعمال کی چیزوں کو اُن کی وصیت کے مطابق نٹتے گئے۔ کسی کے حصے میں تسبیح آئی تو کسی کو اُن کا جانماز ملا۔ کوئی لباس اور لاٹھی کا حق دار ٹھہرا، میرے لیے کچھ نہ بچا۔ مولوی خضر نے وصیت ختم کی..... ''اور اب میں آخر میں سلطان بابا کی وصیت کے مطابق اُن کے انشین کا اعلان کرنا چاہوں گا۔ سلطان بابا نے اپنا جانشین اُسے مقرر کیا ہے جو اُن کے مطابق سب سے زیادہ ں اعزاز کا حق دار ہے اور وہ ہیں ساحر میاں..... سلطان بابا کے عبداللہ.....'' میرے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔

فریفتہ

کچھ لمحوں کے لیے مجھے لگا، جیسے اس ساحلی درگاہ کے آس پاس کا تمام شور بالکل ساکت ہو گیا ہو۔ لہریں اپنی اپنی جگہ تھم کر رُک گئیں اور فضا میں تیرتے پرندے بھی جامد و معلق ہو گئے۔ میں تو خود اپنی ذات کا جانشین بننے کے قابل نہیں تھا، پھر یہ مولوی خضر کیا کہہ گئے تھے؟ ضرور انہیں وصیت نامہ پڑھتے، نظر کا کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ وہ بھی تو شدید غم کے عالم میں تھے۔ اور غم میں انسان کے سامنے لکھی تحریر کے لفظ اکثر آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، لیکن وہ سب خاموش بیٹھے میری جانب یوں دیکھ رہے تھے، جیسے اُن کا فریضہ تمام ہوا اور اب جو بھی کہنا ہے، مجھے کہنا ہے۔ پر میرے پاس لفظ ہی کہاں بچے تھے؟ میری تمام لغت تو سلطان بابا اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے اور اب بھلا مجھے الفاظ اور قوت گویائی کی ضرورت ہی کب تھی۔ جن کے لیے اظہار کا یہ ذریعہ، یہ فن گفتگو میرے اندر پنپ رہا تھا، وہ دونوں ہی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کبھی کبھی جب زبان تالو سے چپکی رہنا چاہیے اور لوگ آپ کو کچھ کہنے پر مجبور کریں، تو یہ لفظ بھی کتنا بڑا بوجھ بن جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ بوجھ ڈھونے کی ہر ممکن سعی کی، لیکن ہونٹوں سے الفاظ تو نہ نکل پائے، البتہ آنکھوں سے دو موٹے آنسو نکل کر درگاہ کے چکنے فرش پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ مولوی خضر جلدی سے میری جانب لپکے ''ارے..... یہ کیا عبداللہ میاں..... یہ آنسو.....؟'' بس پھر کیا تھا۔ سیلاب کا راستہ روکنے والے سب ہی بند خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ میں یوں بلک بلک کر رو رہا تھا، جیسے کوئی معصوم بچہ میلے میں اپنوں سے بچھڑ کر تب روتا ہے، جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ آس پاس کے تمام جھولے اور ٹھیلے سنسان ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے چھاتا اندھیرا اُسے ڈرانے لگتا ہے۔ درگاہ پر بھی شام ڈھل رہی تھی اور میری آنکھوں کا ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ مجھے چپ کراتے کراتے سب ہی نڈھال ہونے لگے اور پپا تو باقاعدہ خود بھی رو پڑے۔ شاید ہم انسانوں کے آنسوؤں کا کچھ باہمی رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ تب ہی ہم اکثر کسی دوسرے کو روتا دیکھ کر خود بھی رو پڑتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ہمارا رونا اُن دوسرے باوقار اور سنجیدہ طبع لوگوں کے لیے بھی ایک نعمت ثابت ہوتا ہے، جو دوسروں کے سامنے رونے میں پہل سے ہچکچاتے ہیں۔ میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھ سے کوئی دوسرا سوال نہیں کیا۔ مغرب کے بعد پپا نے مولوی خضر سے مجھے گھر لے جانے کی اجازت طلب کی۔ مولوی خضر نے میری جانب یوں دیکھا جیسے وہ مجھ سے میری رائے جاننا چاہتے ہوں، لیکن اب مجھے زمان و مکان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں پتھر ہو چکا تھا اور پتھر کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی درگاہ کی دیوار میں جڑا رہے یا پھر کسی مکان کی طاق

ہیں..... البتہ پپا اس کلیے سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ غم سے عارضی فرار کا بہترین ذریعہ نیند ہے۔ سو، نہوں نے گھر پہنچتے ہی نہ جانے کسی بہانے، مجھے نیند کی کوئی دوا پلا دی۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ اب نیند یرے لیے دوسری بیداری بن چکی تھی۔ ایک جہاں کی طرف سے آنکھیں بند ہونے لگتیں، تو دوسرا جہاں نظروں کے سامنے کھل جاتا تھا، لہٰذا..... آنکھیں بند کرتے ہی میرؔ روح کے بند کواڑ کھلنے لگے۔ میں نے خود کو کسی میلاد کی محفل میں پایا۔ سب ہی چپ چاپ ورد میں مشغول تھے۔ میری آنکھیں سلطان بابا کو ڈھونڈتی رہیں، پر وہ مجھے وہاں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے قریب بیٹھے ایک بزرگ سے اُن کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور مجھ پر ہلکی سی سرزنش بھری نظر بھی ڈالی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سب لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، لیکن میں بھی اُن ہی کے ساتھ فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا اور خود بھی باقی سب حاضرین کی تقلید میں آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھیک اُسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر دن چڑھ کر اُترنے کے قریب تھا۔ شاید عصر سے کچھ پہلے کا وقت ہوگا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گویا میں پوری رات اور سارا دن سوتا رہا۔ عام طور پر میں قضا نمازوں کو بھی بہت پابندی سے ادا کرتا تھا، لیکن اس روز نہ جانے کیوں عصر کی فرض نماز میں بھی میرا دھیان کسی اور جانب ہی بٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے آج تک اپنی ایک بھی نماز مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی ہو۔ ہر بار کوئی سودا ذہن میں سمایا ہی رہا۔ کبھی نفس اور کبھی جنس..... بس اتنا ہی محدود دائرہ تھا میرا۔ پھر مغرب ہوئی اور پھر عشاء، لیکن میں اپنے کمرے ہی میں بند رہا۔ مما تین چار بار کمرے میں جھانک کر واپس چلی گئیں، لیکن مجھے باہر نکلنے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا، جب میرے بعد والا عبداللہ (نعمان) مجھے لینے کے لیے آن پہنچا۔ مولوی خضر نے بلوا بھیجا تھا۔ میں درگاہ نہیں جانا چاہتا تھا، مگر مولوی خضر کی بات ٹالی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں چپ چاپ درگاہ چلا آیا۔ صحن میں بہت سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ سب ہی میری آمد پر یوں چونکے اور مجھ سے کچھ ایسا خاص برتاؤ کیا گیا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے عصر کے بعد دعا ہوئی تو کچھ تنہائی میسر آئی۔ میں ڈھلتی دھوپ کے ایک شریر، لیکن نامکمل ٹکڑے میں دیوار کی منڈیر کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ شاید دھوپ بھی زندگی کی علامت ہوتی ہے، تب ہی وہ ہم سے اس قدر جلد رُوٹھ جاتی ہے، خاص طور پر عصر کے بعد کی دھوپ تو کچھ یوں لپکتی جھپکتی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، جیسے اس نے شام کے اندھیرے سے کچھ وعدے جوڑ رکھے ہوں، کچھ قسمیں باندھ رکھی ہوں۔ میں بھی اسی عصر کے بعد کی دھوپ کو گاؤں کی اس الہڑ کی طرح تیزی سے پلٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا، جسے کنویں کی منڈیر پر پانی بھرنے کے بہانے اپنے محبوب کے انتظار میں شام پڑ گئی ہو۔ اس کے محبوب کے گھوڑے کی ٹاپیں کنویں تک آتی پگ ڈنڈی پر نہ گونجی ہوں اور اب وہ بے چاری اس سوچ میں تیز قدموں سے گھر لوٹ رہی ہو کہ گھر کے آنگن میں ٹہلتے بابل کو یوں اندھیرے تک باہر رہنے کا کیا جواز بتائے گی۔ میں نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا کہ قریب ہی کسی کے ہلکے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ''مخل

ہونے کی معذرت چاہتا ہوں..... لیکن میں نے سوچا کہ گھر واپس پلٹنے سے پہلے آپ سے دعا لیتا جاؤں۔'' میں نے چونک کر نظریں اُٹھائیں۔ مناسب قیمتی لباس میں ایک ادھیڑ عمر شخص مؤدب سا سر جھکائے میرے قریب کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر چیچک کے ہلکے سے داغ تھے اور ماتھے سے بال کافی حد تک اُڑے ہوئے تھے۔ گہرا سانولا رنگ اور چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھیں۔ میں نے اپنی بے زاری چھپانے کی کوشش کی اور مولوی خضر کی جانب اشارہ کیا، جو صحن میں موجود زائرین میں نیاز بٹوانے میں مشغول تھے۔ ''آپ اُن صاحب سے مل لیں۔ وہ میرے اُستاد بھی ہیں اور وہی اس درگاہ میں اس وقت سب سے معمر اور قابل احترام شخصیت ہیں۔ وہ آپ کے لیے ضرور دعا کریں گے، میں کسی کو دعا دینے کے قابل نہیں۔ مجھے تو خود آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' وہ شخص اپنی جگہ جما رہا۔ ''جی..... میں پہلے اُن ہی مولانا کے پاس گیا تھا، لیکن انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ دیکھیے، آپ مجھے ٹالیے گا نہیں۔ میں بڑی دُور سے یہاں تک آیا ہوں۔'' میں نے حیرت سے پہلے اُسے اور پھر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ بھلا انہوں نے یہ ذمہ داری مجھ پر کیوں ڈالی۔ بہر حال، مجھے وہ شخص ٹلتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجبوراً میں نے اُس سے پوچھا ''آپ ضد کرتے ہیں تو یوں ہی سہی، لیکن آپ کے لیے کیا دعا کروں، کوئی خاص حاجت.....؟'' وہ شخص کچھ ہچکچایا ''کچھ عجیب سی بات ہے، لیکن اب بے چینی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ کی دُھول چاٹ چکا۔ اب آخر کار کسی نے اس درگاہ کا پتا دیا ہے کہ یہاں میرا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔'' میں نے دل میں سوچا کہ جس ہستی پر خدا کا یہ خاص کرم تھا، وہ تو خود اُس کی جانب پلٹ چکی۔ اب کون بھلا وہ دعائے خاص کرے گا تمہارے لیے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اُس نے اپنا گلا تر کیا اور بمشکل بولا ''میرا مرض بڑا عجیب ہے جناب۔ میں 'فریفتہ' ہوں۔'' میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ ''جی.....؟'' وہ گڑبڑا کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے میں 'فریفتہ صفت' ہوں۔'' ''میں اب بھی نہیں سمجھا۔'' اس نے ایک گہری سی سانس لی۔ ''جی مجھے اندازہ ہے۔ دراصل یہ بات ہی اتنی اُلجھی ہوئی ہے کہ میں کبھی کسی کو ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ میرا نام بختیار ہے، لیکن میری 'بخت' سے کبھی یاری نہیں رہی۔ ہوش سنبھالا تو متوسط طبقے کے ایک خاندان کا عام سا بچہ تھا، نین نقش بھی عام سے تھے، لیکن تب یہ چیچک کے داغ میرے چہرے کی زینت نہیں بنے تھے۔ یہ جوانی کا تحفہ ہے۔ البتہ رنگ تب بھی سانولا ہی تھا۔ میری طرح کے ہزاروں لاکھوں بچے اس ملک کے گھرانوں میں پل بھر میں بڑھ کر جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ بے حد اور شدید حساسیت بھی شاید ہی کبھی کسی کی راہ کی دیوار بنی ہو یا شاید متوسط طبقے کے شب و روز ایسے بچوں سے خود بخود حساسیت چھین لیتے ہیں لیکن قدرت نے میرے اندر کچھ اور ہی جذبے دہکا رکھے تھے۔ بے حد شرمیلا ہونے کے باوجود میں قدرت کی ہر خوب صورتی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ نویں دسویں جماعت میں ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہنا شروع کر دیئے اور پھر انٹر کے بعد مجھے ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ مجھے عورت کی خوب صورتی اپنی جانب عام انسانوں سے کئی درجے زیادہ کھینچتی اور اور متاثر کرتی ہے۔ میرا

صورت چہروں کے اردگرد گھنٹوں منڈلانے کے لیے مچل مچل جاتا تھا۔ لیکن المیہ یہ تھا کہ میری حد
، بلکہ کسی حد تک بھدّی شخصیت کے لیے میری ہم عمر لڑکیوں اور آس پاس کی دیگر خواتین کے دل میں
نہیں تھی۔ لڑکیاں پیٹھ پیچھے مجھ پر ہنستیں اور میری بُردباری اور باوقار بنے رہنے کی کوششوں پر آوازے
تے۔ کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کا دور شروع ہوا، تو میں بزم ادب کا منتظم منتخب ہو گیا۔ تب تک میری
کے برعکس میری شاعری کافی نکھر چکی تھی۔ اُردو شعبے میں میری کافی دھاک بیٹھ گئی تھی اور جونیئر لڑکیاں
لفظوں کی وجہ سے میرا احترام بھی کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ ساری عزت میرے شعروں کی مرہون منت
ود میرا وجود اُن کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

یسے جیسے دن گزرتے گئے، میرے اندر چاہے جانے کی خواہش امربیل کی طرح پھیلتی چلی گئی، لیکن پوری
ں میں کوئی بھی ایسی لڑکی نہ تھی، جس نے کبھی نظر بھر کر بھی میری جانب دیکھا ہو۔ ان ہی میں میری کلاس
لالہ بھی تھی۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی۔ جس کی ایک جھلک پانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے
ں لڑکے اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں صبح سویرے اُس کی راہ میں پلکیں بچھائے اور ہاتھ باندھے کھڑے
تھے۔ میرا دل بھی گل لالہ کے لیے اِسی شدت سے دھڑکتا تھا، لیکن اُسے متاثر کرنے کے لیے کچھ بھی تو
ا میرے پاس، نہ شکل وصورت، نہ روپیہ پیسہ اور نہ ہی کوئی منفرد اور بھرپور صلاحیت۔ بدقسمتی سے اُسے
دب کی محفلوں سے بھی کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا، لہٰذا یونیورسٹی کے چار سالوں میں چار مرتبہ بھی میری اُس
ت نہیں ہو پائی۔ لیکن میرا وحشی دل مزید وحشی ہوتا گیا اور نتیجتاً مجھے جاگتے میں بھی خواب دیکھتے رہنے کی
گئی۔ میرے خواب عموماً کچھ اس طرح کے ہوتے کہ میرے اردگرد خوب صورت چہروں کا جمگھٹا ہے اور
ں سب کی نظروں میں محبوب ہوں۔ کبھی میں خود کو کسی انتہائی شعلہ بیان مقرر کے روپ میں دیکھتا، جو
ٹی کے اسٹیج پر سارے ہال کو انقلابی تقریروں سے گرما رہا ہے، تو کبھی پوری محفل لوٹ لینے والا موسیقار یا
بن جاتا اور کبھی فوجی یا سپاہی، جو سب کا ہیرو ہوتا۔ لیکن میری ہر مہم جوئی کا انعام صرف مہ رُخوں کا کوئی
ٹ ہوتا۔ میرے خوابوں میں خوب صورت خواتین مجھ سے صرف چند لفظ سننے کے لیے مری جاتیں اور
ب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر مسکراتا ہوا محفل سے گزر جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں کبھی کسی ایک چہرے
ایک گل رُخ کے لیے ہیرو نہ بنتا، بلکہ بیک وقت کئی نازنینائیں میری مدح سرائی میں مشغول رہتیں۔ لیکن
تو پھر خواب ہوتے ہیں۔ میں جب ان خوابوں کے سحر سے باہر نکلتا تو میری عام سی شخصیت میرا منہ
ا۔ ادیب اور مصنف عورت کی کم صورتی اور اُس سے متعلق المیوں کا ذکر تو اپنے افسانوں میں بارہا کرتے
یکن کسی مرد کی کم تر شخصیت اور اس سے جڑے دُکھوں کو آج تک کسی نے بیان کرنے کی زحمت نہیں کی۔
ر بھی کیسا..... مجھ جیسا "فریفتہ صفت"..... جسے ہر لمحہ کسی پری رُخ کے عارض پر پھیلتے گلال کے گلابی پن
رورت رہتی تھی۔ یاد رہے کہ میں بدکردار ہرگز نہ تھا۔ مجھے تو بس خوب صورتی کے ایک احساس کی ضرورت

تھی، جو ہر لمحہ میرے چار سُو پھیلا رہے۔ شاید میرے اندر محبوب بننے کی تمنا اپنی آخری حدوں سے بھ
کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ پر افسوس، میں کبھی کسی کا محبوب نہ بن سکا۔ میں ہمیشہ ان تقاریب میں سب سے پہلا
پہنچ جاتا، جہاں کسی بھی اچھے چہرے کی ایک جھلک نظر آنے کی بھی اُمید ہوتی۔ بظاہر میں لاپرواہ سا بنا اس محفل
میں ٹہلتا رہتا، پر میری نظریں اپنا مخصوص طواف جاری رکھتیں۔ مجھے ہر دم یہی خوش فہمی گھیرے رکھتی کہ محفل
سب سے حسین چہرہ میری کسی بات سے متاثر ضرور ہوگا اور قدرت میرے لیے ایسا کوئی موقع ضرور تراشے گی
جب خود اُس مہ جبیں کے گھر والے مجھے اپنے ہاں کسی تقریب میں مدعو کریں گے۔ شاید کوئی مجھے اُردو شاعری
میں مدد کے لیے شام کی چائے پر بلا لے..... لیکن افسوس میرا کوئی خواب پورا نہ ہو سکا اور آخر کار گھر والوں کی
پسند سے میری شادی ہوگئی۔ میں کسی کا محبوب بننے سے پہلے ہی شوہر بن گیا۔ میری بیوی ایک سادہ اور نیک
دل عورت تھی۔ پر، وہ کبھی مجھے محبوب کے درجے پر فائز ہی نہ کر سکی۔ شادی کے ایک سال بعد جب میں پہلی بار
اُس کے ساتھ چند دن اس کے گاؤں میں رہنے کے لیے گیا، تو یہ چیچک کے داغوں کا تحفہ میرا منتظر تھا۔ بیمار
کے بعد میرا دل کچھ یوں اچاٹ ہوا کہ میں نے روزگار کے لیے دبئی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع
کر دیئے۔ شاید اس کوشش کے پیچھے بھی کہیں میری فریفتگی ہی کا دخل تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ پیسہ ہاتھ آنے کے
بعد میں ضرور چاہا جاؤں گا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پیسہ مرد کی تمام بدصورتیاں چھپا لیتا ہے۔ دس سال میں
دن رات بھلا کر دبئی کے ریگ زاروں میں اپنا پسینہ بہایا اور جب میں واپس ملک لوٹا تو ایک رئیس تھا
میں نے آتے ہی شہر کی مختلف سماجی سرگرمیوں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور پھر چند ہفتوں ہی میں، میں کئی
ادبی و سماجی تنظیموں کا اعزازی صدر بن چکا تھا۔ شہر کی کوئی تقریب میری شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی، لیکن
میرا مسئلہ اب بھی اپنی جگہ قائم تھا۔ میں معاشرے میں زبردستی کی عزت تو کسی نہ کسی طور کما چکا تھا، لیکن محبت کی
ایک نظر اب بھی میری واحد تلاش تھی۔ میں اپنی ساری دولت دے کر بھی صرف اس ایک ستائش بھری نظر کا
طالب تھا، جو مجھے چند لمحوں کے لیے ہی محبوبیت کے مقام تک پہنچا دیتی۔ میں ہوائی جہاز کا سفر اس اُمید پر کرتا
کہ شاید میری ساتھ والی نشست پر کوئی حسینہ بیٹھی مل جائے۔ شاید کوئی ایئر ہوسٹس ہی میری طرف نظر بھر کے
دیکھ لے۔ اسپتال میں نزلے زکام کے لیے بھی بہترین کمرہ مخصوص کروا لیتا کہ شاید میری طبیب یا نرس ہی وہ
چہرہ ہوں جس کے التفات کے انتظار میں میری ساری عمر کٹ گئی۔ میں جان بوجھ کر اپنے اردگرد کسی نہ کسی
بہانے حسین چہروں کا جمگھٹا لگائے رکھتا، مگر کبھی بھی اپنے دل کے اندر کسی پائل کی نازک جھنکار سنائی نہ دی۔
کچھ میرے قریب بھی آئیں، مگر وہ صرف روپے کی پجارنیں نکلیں..... میرا پیسہ بھی میری ادھوری اور بدصورت
شخصیت کو مکمل نہ کر سکا۔ میں سدا سانول ہی رہا، کبھی ساجن نہ بن سکا۔ اور آج زندگی کی 68 خزائیں جھیلنے کے
بعد بھی میں یہاں اس دعا کی اُمید میں کھڑا ہوں، جو میرے وحشی من کو سکون کا ایک لمحہ ہی نصیب کر دے۔ میں
بے حد نڈھال ہوں۔ میرے قدم تھک کر شل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ''فریفتہ پن'' میری جان کا روگ بن

ا ہے۔ یہ دنیا، بدصورت لوگوں کے لیے بڑی بدصورت جگہ ہے جناب۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر قدرت
نے میرا من اتنا کومل ہی بنانا تھا، تو میری شخصیت کو بھی اتنا ہی شگفتہ کیوں نہ بنایا.....؟ قدرت نے میرے وجود
کے سب ہی تاروں کو اگر سر اور موسیقی کی مدھرتانوں سے جوڑ کر کرنسوں میں عجب ہیجان خیز خواب دیکھنے کی
لاحیت پیدا کر ہی دی تھی، تو پھر بے ڈھنگی شخصیت کا تال میل بھی کیوں درست نہ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری
اہی میں، دل کے ساتھ ساتھ میری سماعت کا بھی برابر کا قصور ہے۔ جانے یہ میلوڈی ایک ہی لمحے میں میرے
در سب کچھ اتھل پتھل کیسے کر دیتی ہے۔ میں پل بھر میں مکروہ بھکاری سے حسین شہزادہ بن جاتا ہوں۔ ساری
ررت میرے سامنے دوزانو ہو جاتی ہے۔ پریاں رقص کرتی ہیں اور میرے روم روم سے فریفتگی جھلکنے لگ جاتی
ہے۔ آپ ضرور مجھے کوئی دیوانہ ہی سمجھ رہے ہوں گے، لیکن یقین کریں کہ میں نے ابھی اپنی دیوانگی کا دس فی
صد بھی آپ کو نہیں سنایا۔ میں اپنے اندر کے پرستان اور باہر کی بے رحم اور کانٹوں بھری دنیا کے درمیان پس کر
ہ گیا ہوں۔ میں اپنے اندر راجا اِندر اور باہر صرف ایک شودر ہوں، جس کے لیے کسی نازنین کے دل میں کوئی
لکہ نہیں.....'' بختیار اپنی بات ختم کر کے یوں ہانپنے لگا، جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو۔ سچ ہے، یہ تھکن تو ساری زندگی
لی تھی۔ اندھیرا ڈھل چکا تھا اور بختیار کی آنکھوں میں جھلکنے والے دو آنسو اس لمحے مجھے ان دو بے مراد چراغوں
لی طرح دکھائی دیئے، جو کسی گم نام کے ویران مزار پر، کوئی ترس کھا کر جلا گیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں اس تھکے
وئے معصوم اور اندر سے بے انتہا خوب صورت شخص کے آنسو پونچھ کر اُسے بتاؤں کہ اس دنیا میں کون ہے، جو
ریفتہ نہیں ہے۔ کوئی عورت پر فریفتہ ہے تو کوئی جاہ وحشم پر، کسی کو دولت کی فریفتگی ہے تو کوئی سونے کے محلوں
پر شیدا ہے۔ شاید انسان پیدا ہی ''فریفتہ صفت'' ہوتا ہے۔ پھر جن کی ظاہری صورت اور شخصیت دنیا کے معیار
پر پوری اُترتی ہے انہیں تو اپنی فریفتگی کا صلہ مل جاتا ہے اور کچھ بختیار جیسے سیاہ نصیب بھی ہوتے ہیں جو اس
ڑپ اور کسک کی کانٹوں بھری خلش اور لاحاصل پن کے ساتھ ہی پوری زندگی جیتے ہیں۔ میں نے مزید کچھ
کہے بنا دعا کے لیے ہاتھ تو اُٹھا دیئے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میری پاس دعا کے لیے لفظ تھے ہی نہیں۔ شاید کچھ
عاؤں کے لیے لفظ ضروری نہیں ہوتے۔

بختیار نے پلٹنے سے پہلے مجھ سے کہا کہ وہ اگلے ہفتے دوبارہ یہاں آئے گا۔ اُس کے جاتے ہی مجھے مما
رگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید وہ زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے خود ہی میرے اور پپا
کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج مجھے اُن کا زرد چہرہ کچھ اور ہی داستان سناتا ہوا دکھائی
ے رہا تھا۔ پپا بھی میرے گھٹنوں کے قریب آ بیٹھے۔ شاید وہ بھی مما کے مضطرب چہرے کی کوئی تحریر پڑھ چکے
تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ کچھ بولنے کی ہمت جمع کر پائیں۔ ''ساحر..... آج میری زہرا سے ملاقات ہوئی
تھی.....'' کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اتنا سن کر ہی میرا دم نکل جاتا، لیکن آج میرے لہجے میں ایک عجیب سی بے
گانگی تھی۔ ''اچھا.....؟'' مما کچھ دیر چپ رہی، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ زہرا کی پرانی ہمسائی کو خصوصی تاکید

کر چکی تھیں کہ جب کبھی زہرا کے گھر والے یا وہ خود اپنے پرانے گھر کسی بھی کام سے آئیں تو مما کو ضرور اطلاع کر دی جائے۔ یہ بات بھی ہمسائی ہی نے مما کو بتائی تھی کہ زہرا کے گھر والے اپنے کچھ ضروری سامان سمیت کچھ عرصے سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ آج شام اچانک ہی مما کو اس ہمسائی کا فون آ گیا کہ اُس نے ابھی ابھی ڈرائیور سمیت زہرا کی گاڑی کو اُن کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ مما ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گھر سے نکل پڑیں اور جب وہ وہاں پہنچیں تو زہرا واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ مما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا، لیکن وہ پوری تعظیم سے اُن سے ملی۔ البتہ مما کے تمام سوالوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی کہ ساحر کو اُس کا بس ایک پیغام پہنچا دیا جائے کہ ''شاید قدرت کو ہمارا ملن منظور نہیں۔ اور وہ قدرت کا یہ فیصلہ منظور کر چکی ہے۔ سو، بہتر ہوگا کہ ساحر بھی اس اَن ہونی کو تسلیم کر لے۔ شاید یہی ہمارا نصیب تھا۔'' لوگ کتنی آسانی سے اپنا کیا دھرا نصیب اور قدرت کی سیاہی سے جوڑ دیتے ہیں؟ مما اُس کے سامنے بہت روئیں اور گڑگڑائیں کہ وہ بس ایک بار ہی مجھ سے مل لے تاکہ ساحر کے وحشی من کو کچھ تو سکون نصیب ہو، لیکن زہرا نے بھیگی آنکھوں سمیت مما کی یہ درخواست بھی نامنظور کر دی۔ میرا جی چاہا کہ میں مما کو اُس کی بے رُخی کی اصل وجہ بھی بتا دوں کہ اُس کے ہاتھوں میں کسی اور کے نام کی مہندی رچنے والی ہے، لہٰذا اُسے اب ہمارے بے رنگ آنسوؤں سے بھلا کیا غرض ہو سکتی ہے؟ مما اپنی بات ختم کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور میں یوں ہی اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگا، پل بھر میں زہرا نے مجھے بھی بختیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ایک لمحے ہی میں شہزادے سے مکروہ بھکاری بن گیا ہوں اور ساری دنیا مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہے۔ میں نے پپا کے کوٹ کی جیب میں اٹکا پین نکالا اور قریب پڑے ایک کاغذ پر اپنی زندگی کی پہلی تحریک کا عنوان لکھ ڈالا۔ ''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....'' پتا نہیں یہ نظم تھی، نثر تھی، یا پھر صرف چند بھٹکے ہوئے خیالات، لیکن میں لکھتا چلا گیا۔

سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو.....

یوں تو پورا یقین ہے.....

پر..... زمانے کے وار کا کچھ بھروسا نہیں ہے

سو گر کبھی ایسا ہو جائے..... اور تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....

تو ان راہوں سے نفرت نہ کرنا..... جن پر کبھی ہم اک ساتھ چلے تھے

کہ کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے..... بھلا ان بل کھاتی راہوں کو کیا راستہ؟

ان نظاروں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی اک ساتھ دیکھے تھے

کہ کسی کے وجود کی بدہیئت ویرانی سے..... بھلا ان خوبصورت نظاروں کو کیا واسطہ؟

ان باتوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں
کہ کسی کی بے توازن شخصیت کی کڑواہٹ..... بھلا اُن میٹھی باتوں کا کیا سابقہ.....؟
ان خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو ہم نے کبھی ایک ساتھ مل کر دیکھے تھے
کہ کسی ''پیکر بدنصیب'' کے گھناؤنے پن سے..... بھلا اُن روشن تعبیروں کا کیا رابطہ.....؟
بس مجھ ہی سے نفرت کرنا..... کہ میری رُوح کی سیاہی سے ہی..... چار سو یہ اندھیرا ہے.....
میری بدصورتی کی وجہ سے ہی..... دنیا کا ہر رنگ پھیکا ہے..... ہر راہ بے راہ ہے.....
ہر نظارہ مکروہ ہے..... ہر خواب سراب ہے.....
بس مجھ سے ہی نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی تھا..... تمہاری اس نفرت
اہل ہوں،،

ساحر

میں نے کاغذ لفافے میں ڈالا اور اس پر زہرا کا پتا لکھ کر پپا کی جانب بڑھا دیا۔ ''اس پر زہرا کا پتا لکھا ہوا
۔ایک اور احسان کر دیں مجھ پر، گھر واپسی پر یہ لفافہ اُس کے گھر دیتے جایئے گا..... آج اس
نے کا اختتام بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے.....'' مما پپا کے چہرے سفید پڑ گئے۔

''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے''

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن اور رات کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ موسم میرے لیے بے معنی ہو گئے اور
زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا گیا۔ جہاں ٹھہر جاتا، گھنٹوں کھڑا رہتا، اور جہاں بیٹھ جاتا، وہاں تب تک خا
سے جُدا رہتا، جب تک کوئی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھا نہ لے جاتا۔ مجھے آئینہ دیکھے نہ جانے کتنا زمانہ بیت چکا
لوگ مجھے مجذوب کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ عشق بھی ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے۔ کیا صرف ہوش و حوا
چھن جانے ہی سے کوئی مجذوب بن جاتا ہے یا پھر شاید سبھی مجذوب کسی نہ کسی ناکام عشق کی بھٹی سے تپ
نکلتے ہوں گے۔ درگاہ پر مولوی خضر ہی میرے ساتھ باقی رہ گئے۔ سب اپنی اپنی تعیناتی کی منزل کی جا
پلٹ چکے تھے۔ لیکن سلطان بابا جاتے جاتے جان نشینی کا جو طوق میرے گلے میں ڈال گئے تھے، وہ اب
میرے پیروں کی زنجیر بنا ہوا تھا، ورنہ شاید میں کب کا کسی ویرانے کی جانب کوچ کر چکا ہوتا، کیوں کہ اب
اِن انسانوں کی محفل میں گزارہ بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں جتنا لوگوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتا،
ہی مجھے اُن کا سامنا کرنا پڑتا۔ شاید ان مزاروں پر ''پہلو تہی'' انسان کو مزید مُعتبر بنا دیتی ہے۔ اُس رات پپا
خط لے کر زہرا کے در تک پہنچے تو بہت دیر انتظار کے بعد اندر سے کوئی نوکر برآمد ہوا۔ پپا نے اُس سے زہر
پوچھا تو پتا چلا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر موجود ہے۔ پپا نے اُسے میرا رقعہ دے کر زہرا تک پہنچا
کی درخواست کی اور خود پلٹ کر گاڑی میں واپسی کے لیے جا بیٹھے۔ جب اُن کی گاڑی زہرا کی حویلی کو مڑ
والی سڑک کے موڑ تک پہنچی تو انہوں نے حویلی کے اندر پورچ میں سے تیزی سے کسی کو حویلی کے پھاٹک
جانب آتے دیکھا تھا لیکن میری التجا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے زہرا کے گھرانے کے کسی بھی فرد سے
راست رابطہ کرنے سے اجتناب برتا، حالانکہ انہیں فاصلہ ہونے کے باوجود یہ گمان ہوا تھا کہ باہر لپک کر آ
والی زہرا ہی تھی۔ یہ وہی رات تھی، جب میرے ماں باپ کی زبانی آخری بار میری سماعتوں میں زہرا کے نا
امرت اُنڈیلا گیا تھا۔ اس کے بعد صرف کڑواہٹ ہی میرا نصیب تھی۔ میں اپنے خوابوں میں سلطان با
انتظار کرتا، مختلف محفلوں اور ویرانوں میں بھٹکتا رہتا، لیکن وہ مجھے نہ ملتے۔ ہاں البتہ اُن کے پیغام کبھی کبھار
تک کسی وسیلے سے پہنچ جایا کرتے۔ کئی بار اُن کے ہاتھ کے لکھے پُرانے اوراق مجھے حجرے میں یا درگاہ کے
اور کونے میں پڑے مل جاتے۔ وہ بظاہر تو اُن کی موت سے پہلے کی یادداشتیں تھیں، مگر دوسری یا تیسری مر
پڑھنے پر مجھے اپنے حال سے مطابق کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ

پرانی تاریخوں کے باوجود تازہ لکھے ہوئے ہوتے۔ اُس روز بھی مجھے درگاہ کے کے حجرے کی پرانی
ں کے پیچھے سے صفائی کے دوران ایک ایسا ہی رقعہ دُھول اور کالک میں اٹا ملا۔ میں نے اُسے جھاڑ کر
کیا اور اُس کی شکستہ تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا ''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو.....''
کچھ مٹی ہوئی تھی اور کچھ کالک کی سیاہی سے سیاہ ہو چکی تھی۔ مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے بہت دفعہ
ن بابا کو مختلف رُقعہ نما کاغذوں پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن یہ کاغذیوں ایک ایک کر کے بعد میں مجھے
لتے جائیں گے، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ورنہ میں اُسی وقت یہ تمام پرچیاں سینت سینت کر سنبھال
میں تو آخری وقت تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ ان پرچیوں پر مختلف احکامات لکھ کر بانٹ دیتے ہوں گے۔
نے کاغذ کی گرد کو پھر سے پھونک مار کر جھاڑا اور جو حصہ پڑھے جانے کے قابل تھا، اس کا ربط جوڑنے کی
ں کی ''عصر کا وقت اہم ہے..... کہ اُس کی قسم کھائی گئی ہے..... دھیان رہے..... سائل نہ چوکے.....''
تنا ہی سمجھ آیا۔ کیا عصر کے وقت کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر ہونے والا تھا؟ اور یہ کس سائل کا ذکر ہو رہا تھا۔
کی طرح میں اپنے ذہن میں بہت سے سوالات لیے خود ہی سے اُلجھتا، درگاہ کے صحن میں آ بیٹھا۔ مولوی
چند سائلوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کبھی لوگوں سے اُکتاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہتے
کہ ہم رزق کی طرح اپنے نصیب کے بندے بھی اُوپر سے لکھوا کر لاتے ہیں۔ سو جسے قدرت نے ہم تک
دیا، وہ ضرور کچھ مقصد لے کر ہی آیا ہوگا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ میرے نصیب میں تو بس میرا قاتل ہی لکھا تھا،
قدرت نے اُسے میری فنا کے لیے ہی اس درگاہ پر بھیجا تھا۔

عصر کی نماز ختم ہوئی۔ ابھی مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہی تھے کہ دو افراد جلدی سے دُعا
لے بنا ہی اُٹھ کر چل دیئے اور ٹھیک اُسی لمحے دو اشخاص درگاہ کے مسجد والے حصے میں داخل ہوئے اور مولوی
کو دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے دیکھ کر جلدی سے صف کے آخر میں بیٹھ گئے اور پھر سب نمازیوں کے ساتھ ہی
ں نے دُعا کر لی۔ دُعا کے خاتمے کے بعد اُٹھ کر اپنی عصر کی نماز ادا کرنے لگے۔ باقی نمازیوں کے جانے
بعد مولوی خضر نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیوں میاں، دیکھا تم نے محنت کس کے حصے میں آئی اور انعام کسے
...؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُن کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''دُعا کو عبادت کا مغز کہا
ہے۔ شاید ہمیں عبادت کا حکم بھی کہیں اسی دُعا مانگنے کی فضیلت عطا کرنے کی نیت سے دیا گیا ہوگا۔ وہ جو
خاص نماز پڑھ کر بنا دُعا مانگے اُٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اپنے حصے کی مشقت تو کر لی پر انعام لیے بنا ہی
ا دیئے، اور وہ دو، جو اپنی جماعت تو قضا کر بیٹھے تھے، لیکن عین وقت پر پہنچ کر دُعا میں شامل ہو گئے، انہوں
محنت تو نہیں کی، لیکن قدرت نے انعام اُن کے حصے میں لکھ رکھا تھا۔ سو، انہیں دُعا میں اپنا حصہ مانگنے کا
خیال آ گیا اور کون جانے کہ یہی وہ خاص وقت دُعا ہو، جس میں دُعائیں ساتویں عرش پر سنی جاتی ہیں.....''
مولوی خضر ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے، ساری عمر سجدے میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ، جب وہ سجدہ ہی قضا ہو

جائے، جس میں رب سے اُسے مانگنا تھا..... میں بھی شاید وہ سجدہ قضا کر چکا تھا اور پھر میری قضاؤں کی تو گنتی بھی اب محال تھی۔ میں تو اپنی ساری دنیا قضا کر چکا تھا اور اب دین بھی مجھ سے دھیرے دھیرے قضا ہو رہا تھا۔ تحصیل ماہی کے مجذوب کی پیش گوئی پوری ہو رہی تھی، لیکن خود میرے ہاتھ میں بھلا میرا کوئی فیصلہ کب تھا۔ عصر کے بعد مولوی خضر حجرے میں کچھ دیر آرام کے لیے چلے گئے، اور میں پھر سے اپنے وجود کی گرہیں کھولنے کی ناکام کوشش کرنے درگاہ کے صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد کسی اُونچے گھرانے کی ایک عورت اپنے ڈرائیور اور دو خادماؤں سمیت درگاہ کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس نے درگاہ میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر کسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور پھر تیزی سے میری جانب بڑھی۔ ''سنو لڑکے! یہاں کے بزرگ بابا کہاں ہیں.....؟'' شاید وہ مولوی خضر کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ''وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی.....؟'' وہ کچھ ہچکچائی ''تم..... میرا مطلب ہے تم تو..... اچھا ٹھیک ہے۔ تم یہ نذر اور نیاز درگاہ پر چڑھا دو اور اپنے بزرگ سے درخواست کرو کہ وہ چند لمحوں کے لیے میرے ساتھ نیچے سیڑھیوں تک چلے آئیں۔ دراصل میں اپنے بیٹے کے لیے خصوصی دُعا کروانا چاہتی ہوں۔ وہ یہاں تک نہیں آ سکتا۔'' مجھے لگا کہ بڑے گھر کی کوئی مجبور ماں اپنے لاڈلے کے لیے دُعا کروانے آئی ہے، جو ماں کی خواہش کے باوجود اپنے قدموں کو زحمت دے کر درگاہ کی سیڑھیاں نہیں چڑھنا چاہتا۔ کبھی میں خود بھی تو ایسا ہی تھا۔ مما مجھے پکارتی رہ جاتیں لیکن اگر میرا کہیں جانے کا موڈ نہ ہوتا تو میں کان لپیٹے پڑا رہتا۔ میں مولوی خضر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ خاتون کسی بزرگ کی تلاش میں یہاں تک آئی تھیں۔ کچھ دیر میں مولوی خضر بھی باہر نکل آئے۔ خاتون نے اپنا مدعا پھر سے بیان کیا۔ مولوی خضر نے میری جانب دیکھا اور اُن کو بتایا ''یہ عبداللہ میاں ہیں۔ یہی اب درگاہ کے متولی ہیں۔ بہرحال، آپ کہتی ہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔'' عورت کے چہرے پر حیرت کے تاثرات اُبھرے ''تو یہ عبداللہ ہے؟'' میں درگاہ کی سیڑھیوں کے پاس آ کر ٹھہر گیا، کیوں کہ میں چاہتا تھا کہ سائل کی خواہش کے مطابق مولوی خضر ہی اُس لڑکے کے لیے دُعا کریں۔ کیوں کہ یہ اُن کے اعتماد اور یقین کا معاملہ اور دُعا بنا کامل یقین کب اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لیکن مولوی خضر جب چند سیڑھیاں نیچے اُتر چکے اور انہوں نے مجھے ہم قدم نہیں پایا تو وہ بھی ٹھٹھک کر رُک گئے ''عبداللہ میاں..... آپ نہیں آئیں گے میرے ساتھ ان صاحبزادے کو دُعا دینے.....؟'' مجبوراً مجھے بھی قدم بڑھانا پڑے۔ نیچے نئے سال کے ماڈل کی ایک چمکتی دمکتی کار کھڑی تھی اور ایک نوجوان لڑکا کانوں میں ہیڈ فون لگائے کسی نغمے کی دُھن پر اپنی اُنگلیوں کی تال ملانے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس وقت گاڑی کے اسٹیئرنگ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ اُس نے ایک مسکراتی نگاہ پہلے ماں اور پھر ہم دونوں پر ڈالی لیکن وہ گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ خاتون نے ہمارا تعارف کروایا۔ ''شہزاد بیٹا..... بزرگ تمہیں دُعا دینے آئے ہیں اور یہ نوجوان اس درگاہ کا متولی ہے.....'' شہزاد مسکرایا ''واہ..... کیا بات ہے

کیا۔ آج کل درگاہوں پر بھی نئے لڑکے سی ایس ایس یا اس قسم کا کوئی دوسرا مقابلے کا امتحان پاس کر کے آنے لگے ہیں۔ آئی مین، ہی از کوائٹ ینگ فار اینی سچ پلیس مام۔'' ماں نے بیٹے کو گھور کر تنبیہہ کی۔ مولوی خضر نے بنا کچھ کہے، وہیں کار کے قریب کھڑے شہزاد کے لیے دُعا کی اور ہم دونوں نے آمین کہہ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیا۔ شہزاد اب بھی اپنی جگہ کار میں جما بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو ماں نے ممنونیت سے ہمیں دُعا دی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جو ماں ہمیں دُعا دے رہی تھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے دُعا کروانے اتنی دُور چلی آئی تھی۔ ان ماؤں کو اولاد کے معاملے میں اپنی دُعاؤں پر اک ذرا سا اعتماد بھی کیوں نہیں ہوتا۔ کسی ماں کی دُعا سے بڑھ کر کسی بھی درگاہ کے مجاور، متولی یا بزرگ کی دُعا بھلا کیا ہوگی؟ ہمارے مڑتے وقت لڑکے نے اپنی ماں سے انگریزی میں کہا'' آپ نے خواہ مخواہ اتنی دُور آ کر اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔ اس بوڑھے اور اس لڑکے کو تو خود دُعا کی ضرورت ہے، ورنہ یہ دونوں یہاں اس ویرانے میں نہ پڑے ہوتے۔'' میں سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا، لیکن خلاف معمول اور خلاف توقع نہ جانے مولوی خضر کیوں رُک گئے اور انہوں نے شدھ انگریزی میں شہزاد کو جواب دیا۔'' دُعا کی ضرورت کسے نہیں ہوتی۔ کوئی دُعا کی محبت میں یہاں وہاں بھٹکتا ہے اور کسی کو محبت کی دُعا کے لیے اِن ویرانوں تک آنا پڑتا ہے۔ اللہ سب کی سنتا ہے، میری دُعا ہے کہ وہ تمہاری بھی سنے۔''

ہم شہزاد اور اُس کی ماں کو ہکا بکا چھوڑ کر اُوپر درگاہ میں چلے آئے۔ جانے کیوں مولوی خضر مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آئے، لیکن میں نے حسب عادت انہیں کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ مغرب کے بعد میرے اندر وہی اک عجیب سی بے چینی سرایت کرنے لگی، جواب شاید میری زندگی کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ لیکن آج بہت دنوں کے بعد زہرا کی یاد کا وہ مستقل کانٹا سر شام ہی ٹیس دینے لگا تھا، جسے میں عموماً ساری دنیا کے سو جانے کے بعد رات کی تنہائی میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے نشتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بے اختیار رونا آ گیا اور نہ جانے کب حجرے کی دیوار سے ٹیک لگائے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں بھی میں روتا ہی رہا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ گھٹنوں سے سر جوڑے دنیا میں آنے کا انتظار کرتا ہے۔ کہتے ہیں، جسم کا یہی آسن انسان کو فطرت سے سب سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ کچھ لوگ ساری عمر نیند میں گھٹنے سینے کی جانب موڑے رکھتے ہیں۔ میں بھی اس وقت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رُو رہا تھا، تبھی مجھے اپنے سر کے اُوپر کسی کے ہاتھ کا مانوس شفقت بھرا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اُٹھایا۔ وہ سلطان بابا تھے۔ ہاں..... وہی تو تھے، لیکن میں تو اُن سے رُوٹھا ہوا تھا۔ اس لیے سلام کر کے چپ چاپ اپنے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے صاف کر کے رُوٹھا سا بیٹھا رہا۔ اُن کے ہونٹوں پر وہی دھیمی سی مخصوص مسکراہٹ سجی ہوئی تھی'' یہ کیا ساحر میاں؟ اپنے سلطان بابا سے بات بھی نہیں کرو گے کیا۔ اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا۔ یہود سے اتنی بڑی جنگ جیتنے والا بھی کبھی روتا ہے کیا؟'' میں نے اُن کی جانب شکایت بھری نظر ڈالی'' آپ جانتے ہیں آپ کے بنا میری ہر جیت، ہار ہے۔ اور جانے

آپ نے مجھ سے اتنی توقعات کیوں وابستہ کرلیں ہیں۔ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مت ڈالیں اتنے بڑے امتحان میں مجھے۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پلٹ جاؤ گے.....؟ واپسی کا رستہ اس ڈگر سے کہیں زیادہ طویل ہے، جو سیدھی تمہاری منزل مقصود تک جاتی ہے۔" اب میں انہیں کیا بتاتا کہ محبت کے سفینے عموماً اپنے ساحلوں کے قریب ہی غرق ہوتے ہیں۔ میری ناؤ تو زہرا کے جاتے ہی ڈوب چکی تھی اور میں لہروں سے لڑنے کی ہر کوشش بھی ترک کر چکا تھا۔ اب تو بس سمندر کی تہ میں جا لیٹنا باقی تھا۔ وہاں کی ریت، سیپیاں اور گھونگھے ساحر کا انتظار کر رہے تھے۔ سلطان بابا نے میرا ہاتھ میرے ہی دل پر رکھ دیا۔ "جو لوگ یہاں سے سوچتے اور فیصلے کرتے ہیں انہیں زیادہ مخمصے نہیں ستاتے۔ اور ہاں، یاد رہے کہ ہمارے راستے پہلے سے مقرر ہیں۔ ہمیں بس قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کل تمہارے قدم بھی تمہارے مقررہ رستے پر اُٹھ ہی جائیں گے۔" مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے سلطان بابا کے ہاتھ سے کوئی قوت آمیز حرارت میرے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی، جسم میں منتقل ہوگئی ہے۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میں وہیں درگاہ کی منڈیر کے پاس گھٹنے جوڑے بیٹھا ہوا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیریں اب بھی میرے گالوں پر جمی ہوئی تھیں۔ میرا دایاں ہاتھ ٹھیک اِسی جگہ میرے دل پر اب بھی اُسی طرح جما ہوا تھا، جیسے سلطان بابا اُسے رکھ گئے تھے۔ رات ابھی نصف سے زیادہ باقی تھی اور اس سے کہیں زیادہ باقی میرے اندر کی گرہیں تھیں۔ رات تو شاید کچھ دیر بعد بیت ہی جاتی تھی، لیکن یہ گرہیں کھلنے کے لیے نہ جانے کتنی صدیاں درکار تھیں۔

صبح ہوئی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں بند کیے حجرے میں پڑا رہوں کیوں کہ مجھے سورج کی کرنیں برچھیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ شاید ساڑھے دس کے قریب کا وقت تھا، جب مجھے صحن سے مولوی خضر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی کیوں کہ فجر کی نماز کے بعد خود انہوں نے ہی مجھے حجرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا، کیوں کہ وہ میری سوجی ہوئی آنکھوں سے میری ابتر حالت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اُن کی دوسری آواز کے ساتھ ہی میں حجرے سے باہر نکل آیا۔ صحن میں وہی گزشتہ روز والی خاتون شدید پریشان سا چہرہ لیے کھڑی نظر آئیں۔ مولوی خضر میری جانب بڑھے "عبداللہ میاں..... یہ بی بی اپنی ایک پریشانی لے کر آئی ہیں۔ کل تم نے ان کے بیٹے کے لیے میرے ساتھ دُعا کی تھی نا۔ آج پھر اس لڑکے کی طبیعت بہت خراب ہے، اتنی زیادہ کہ وہ چل کر یہاں تک آ بھی نہیں سکتا۔ یہ بی بی اس لیے پریشان ہیں کہ کل ان کے بیٹے نے کچھ اُلٹا سیدھا کہہ دیا تھا تو کہیں یہ اُسی کیے کی سزا تو نہیں مل اُسے۔ میں کافی دیر سے انہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ فقیروں کے پاس سوائے دُعا کے اور کوئی نذرانہ نہیں ہوتا۔ بددُعا نام کا کوئی بھی سکہ ہمارے کشکول میں کہاں، لیکن انہیں اطمینان نہیں ہو رہا۔ تم ایسا کرو کہ ذرا دیر کے لیے اِن کے ساتھ اِن کے گھر ہو آؤ۔ یہ پڑھا ہوا پانی اُس نوجوان کو پلا دینا۔ انشا اللہ افاقہ

وگا۔'' مولوی خضر نے پانی کی بوتل میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں کچھ کہہ نہیں پایا۔ کوئی بات تو خلاف معمول
رور تھی، ورنہ مولوی خضر مجھے اس بخار نما کیفیت میں کبھی اس عورت کے ساتھ جانے کا نہ کہتے، حالانکہ نہ
انے کیوں میں اندر سے وہاں جانے کے لیے راضی نہیں تھا۔ شہزاد کا متوقع برتاؤ بھی میرے پیش نظر تھا، لیکن
ں صرف تعمیل کرنا جانتا تھا، لہٰذا پانی کی بوتل اُٹھائے چپ چاپ نیچے کھڑی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ
لیا۔ شہر کے مضافات کے آس پاس ہی ایک بہت بڑی سی محل نما کوٹھی میں گاڑی داخل ہوئی، تو مکینوں کی
ناست کا اندازہ بڑے باغیچے کی نہایت عمدگی سے تراشی باڑھ ہی سے ہوگیا۔ پورچ میں کچھ اور گاڑیاں بھی
وجود تھیں۔ ہم مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے ایک نفیس سی خواب گاہ میں داخل ہوگئے۔ سامنے بستر پر
نہزاد جسم پر ایک بڑا سا لحاف ڈالے پڑا، بخار میں تپ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
پھیل گئی۔ ہے یو اینگری مین! مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم ممی کے ساتھ آؤ گے۔ کل جب میں نے تم لوگوں کو ڈی
گریڈ کرنے کی حماقت کی تھی، مجھے اُسی وقت تمھارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم بھی میری
ات سمجھ گئے ہو۔ لیکن میری توقع کے برعکس جواب تمہارے بزرگ کی طرف سے آیا۔ ہو سکے تو میری معذرت
بول کرلو۔ دراصل اس بیماری نے مجھے بے حد چڑچڑا بنا دیا ہے۔'' میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ بھول جاؤ
ب کچھ..... یہ پانی پی لو..... انشا اللہ افاقہ ہوگا.....'' شہزاد نے بے دلی سے پانی کا گھونٹ بھرا۔ ''تمہیں سچ
ناؤں..... مجھے ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ میں بس ممی کی وجہ سے.....'' شہزاد کی ماں نے گھور کر اپنے بیٹے
و تنبیہہ کی۔ شہزاد بادل نخواستہ پانی پی گیا۔ ماں مجھ سے بولی ''بیٹا تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ تو سدا کا
پگلا ہے۔ تم اپنا عمل پورا کرو۔ میں تمہارے لیے چائے کا کہہ کر ابھی آئی۔'' میں نے جلدی سے انہیں روکا نہیں
نہیں۔ چائے کی ضرورت نہیں..... اور مجھے کوئی ایسا خاص عمل نہیں کرنا۔ بس مولوی خضر کی ہدایت کے مطابق
چند دُعائیں پڑھنی ہیں۔ آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں۔ مجھے جلد واپس لوٹنا ہے۔'' لیکن مائیں بھلا کب کسی کی
نتی ہیں۔ سو، وہ بھی میری سنے بغیر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ شہزاد اپنی تمام تر زندہ دلی کے
باوجود خاصی تکلیف میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تمام بات چیت کے دوران لیٹا ہی رہا۔ میں نے دُعا کے لیے
ہاتھ اُٹھائے تو وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دُعا ختم ہونے کے بعد اُس کا سوال ہونٹوں پر آ ہی گیا۔ ''کیا تمہیں
پنی دُعا پر پورا یقین ہے.....؟'' میں نے غور سے اُسے دیکھا ''جب تک دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھتے نہیں، تب تک
میں بھی اُتنا ہی بے یقین رہتا ہوں، جتنے تم اس وقت ہو۔ لیکن ہاتھ آسمان کی جانب اُٹھنے کے بعد نہ جانے
کہاں سے اتنا یقین میرے اندر بھر جاتا ہے کہ ہاتھ گرنے سے پہلے سارا جہاں اپنی ان دو جڑی ہتھیلیوں کے
پیالے میں پڑا نظر آتا ہے۔ کبھی موقع ملے تو تم بھی آزمانا۔ یقین خود بخود تمہارے اندر کی خالی درزیں بھر دے
گا۔ ویسے تمہیں ہوا کیا ہے، کوئی خاص بیماری.....؟'' شہزاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری '' کہتے ہیں جس کو
عشق..... خلل ہے دماغ کا..... بس یوں سمجھ لو کہ یہی خلل دماغ کی چولیں ہلا گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی سودا میرے

من میں بھی سما گیا ہے۔ بولو..... ہے کوئی دُعا تمہارے پاس اس خلل کو رفع کرنے کے لیے.....؟'' میں نے چونک کر شہزاد کو دیکھا۔ تو گویا یہ مرض یہاں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں شہزاد کو منع کر دوں کہ اس راستے پر قدم نہ بڑھائے۔ جتنی جلدی ہو سکے، واپس پلٹ آئے، ورنہ محبت کی اِن بل کھاتی پگ ڈنڈیوں پر واپسی کے راستوں میں گھنے جنگل اُگ آتے ہیں۔ دُکھ کی امربیل عاشق کے قدم آگے بڑھتے ہی پیچھے یوں تیزی سے ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے لپٹتی ہے کہ پھر کوئی مڑنا بھی چاہے تو واپسی کا کوئی راستہ سُجھائی نہیں دیتا۔ درد اور غم کے عفریت ان گھنے جنگلوں میں سرِشام ہی اہل تاس کے پیڑوں سے نیچے اُتر آتے ہیں اور واپسی کے بھٹکتے معصوم مسافروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ محبت کے راستے پر آگے بھی موت ہے اور پیچھے بھی فنا۔ محبت وہ خونی جزیرہ ہے، جو اپنے باسیوں کے لیے پل بھر میں اُس برفیلے گلیشیئر میں تبدیل ہو جاتا ہے، جو اپنے ساحل سے کٹ کر گہرے سمندر میں بہہ چکا ہے اور اب دھیرے دھیرے گھل کر خود بھی پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ اس جزیرے پر بسنے والوں کے لیے ایک ایک انچ کر کے پاؤں دھرنے کی جگہ ختم ہوتی جاتی ہے اور آخر کار سبھی ڈوب جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے لپٹے چیختے چلاتے، روتے، سسکیاں بھرتے، کسی برباد ہوتے ٹائی ٹینک کی طرح.....

میں جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ شہزاد کی ممی کے کھنکارنے کی آواز سن کر پھر سے حال میں پہنچ گیا۔ وہ جانے کب کی چائے کی ٹرالی دھکیلتی خادمہ کے ساتھ واپس آ چکی تھیں۔ شہزاد نے مُسکراتے ہوئے اپنا سوال دُہرایا۔ ''کن خیالوں میں کھو گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ عشق لاعلاج ہوتا ہے۔ اس جرثومے کا علاج دنیا کی کوئی بھی سائنس آج تک نہیں ڈھونڈ پائی۔ تم بھی اپنے رُوحانی علاج کی حدیں آزما دیکھو۔'' شہزاد کی ماں نے پھر اُسے ٹوکا ''شیری! تم باز نہیں آؤ گے نا۔ کیوں مہمان کو زچ کر رہے ہو۔ یہ صرف تمہارے لیے اتنی دُور سے یہاں تک آیا ہے۔'' خادمہ نے چائے کی پیالی مجھے پیش کی، لیکن خلاف توقع شہزاد نے چائے پینے سے گریز کیا۔ میں نے جلدی میں دو چار گھونٹ حلق سے نیچے اُنڈیلے اور واپسی کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہزاد نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا۔ ''پھر کب ملاقات ہوگی پیر جی.....'' میں جانتا تھا کہ ''پیر جی'' کی اصطلاح صرف اُس نے الوداعی لمحات کو خوش گوار بنانے کے لیے گھڑی تھی۔ ''جلد ہوگی، لیکن پہلے تمہارے اس خلل کی کوئی ترکیب تو ڈھونڈ نکالوں حالانکہ یہ تو وہ عارضہ ہے کہ جس کے طبیب بھی بعض اوقات اس جرثومے کے زہر کا شکار ہو کر مجنوں بنے پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی محبت چھوت کی طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ سو، پہلے میں اس کا اینٹی وائرس ڈھونڈ لوں، پھر تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔'' شہزاد کی ممی حیرت سے ہم دونوں کے درمیان ہوتی اس گفتگو کو سن رہی تھیں، مسکرا کر بولیں۔ ''اس کے لیے تمہیں کوئی اینٹی وائرس ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ یہ پہلے ہی محبت کی جنگ جیت چکا ہے۔ جانے اس کے دل سے یہ بے معنی خدشات کیوں نہیں نکلتے۔ اگلے ماہ ہی تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہمارے آنگن میں بہار بن کر اُترنے والی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، میرا

ا سدا کا پگلا ہے۔'' شہزاد نے مسکرا کر اپنی ماں کو دیکھا اور تکیے کے نیچے سے ایک تصویر نکالی اور دھیرے
ے جیسے اپنے آپ سے بولا.....'' اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق.....'' ماں نے ہنس کر بیٹے
ے تصویر لی اور فخر سے اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالی اور پھر مجھ سے بولیں.....'' بیٹا! اپنے بزرگ سے کہیے
ا کہ میرے بیٹے کی خوشیوں کے لیے بھی دُعا کریں۔ میں خود کسی دن اپنی ہونے والی بہو کو لے کر درگاہ
ؤں گی.....''

میں نے سلام کر کے واپسی کے لیے قدم بڑھائے اور مڑتے مڑتے میری چھلتی سی نظر ماں کے ہاتھوں
ں پکڑی بہو کی تصویر پر پڑ گئیں۔ میرے ذہن میں قیامت کا دھما کا ہوا اور زمین شق ہو گئی۔ میں چکرا کر زمین
گر پڑا لیکن گرتے گرتے بھی میری زخمی نگاہ شہزاد کی ماں کے ہاتھ میں پکڑی زہرا کی تصویر پر ہی جمی رہی۔
ں.....وہ زہرا ہی تھی..... جو کبھی میری تھی۔

''دوسرا رقیب''

جانے میں کتنی دیر اپنے حواس سے بیگانہ رہا۔ جب ہوش آیا تو شہزاد کی ماں اور گھر کے نوکر پریشانی کے عالم میں میرے اطراف کھڑے تھے۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ طبیعت سنبھل جانے تک میں وہیں آرام کرلوں، لیکن میں نے بمشکل اُن سب کو یقین دلایا کہ ایسے دورے میرے لیے معمول کی بات ہیں اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لہٰذا میرا درگاہ پہنچنا ضروری ہے کہ وہاں کی بہت سی ذمہ داریاں میری راہ تک رہی ہیں۔ میرے جسم کی لرزش ابھی تک قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب گاڑی میں بیٹھا اور کب ڈرائیور نے مجھے درگاہ کی سیڑھیوں کے قریب لاکر اُتار دیا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو مجھے زہرا کے پرانے ڈرائیور کی بات یاد آئی۔ اُس نے تو زہرا کے ہونے والے ہم سفر کا نام خرم بتایا تھا۔ تو پھر یہ شہزاد.....؟ میں فوراً واپس پلٹا۔ ڈرائیور تب تک گاڑی موڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ''یہ جو لڑکا بیمار تھا..... اُس کا پورا نام کیا ہے.....؟'' ڈرائیور چونکا ''کون..... چھوٹے صاحب۔ ان کا نام شہزاد ہے..... خرم شہزاد.....'' ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی اور میرے جیسے صدیوں پیچھے کا سفر ایک ہی پل میں طے کر گیا۔ کیا ہاتھ آیا میرے.....؟ میں تو آج بھی اُتنا ہی تہی دامن تھا۔ میں جب تک درگاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر صحن تک پہنچا، تب تک میرا جسم باقاعدہ کانپنا شروع کر چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر حجرے میں تھے، ورنہ بوکھلا ہی جاتے۔ میں بمشکل خود کو کسی طرح گھسیٹ کر درگاہ کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہیں ٹیک لگا کر گر سا گیا۔ کچھ ہونیاں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو بالکل کسی انہونی کی طرح ہم پر وارد ہوتی ہیں۔ مجھے تقریباً ایک ماہ پہلے ہی یہ خبر مل چکی تھی کہ زہرا کسی اور کی ہونے والی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر میرے حواس پر آج اُسی طرح بجلی بن کر گری، جیسے مجھے آج ہی اس بات کی آگہی ہوئی ہو۔ شاید انسان کی فطرت ہی میں آخری لمحے تک طوفان ٹل جانے کی اُمید کہیں نہ کہیں باقی رہتی ہے، لیکن جن طوفانوں کو آنا ہوتا ہے..... وہ آکر ہی رہتے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا طوفان بھی آچکا تھا اور کیسی بے بسی تھی کہ مجھے تو کوئی سائبان بھی میسر نہیں تھا یا طوفان شاید اُن کے لیے ہی طوفان کہلاتا ہے، جو مجھ جیسے بے سائبان ہوتے ہیں۔ ساری رات میں یوں ہی درگاہ کی دیوار سے ٹیک لگائے ہڑکتا رہا اور صبح میری آنکھوں سے پوری رات کی بہتی شبنم درگاہ کی زمین پر کہرے کے موتیوں کی صورت چمک رہی تھی۔ لیکن میرا نصیب وہی سدا کا ماندہ، مدہم اور کالک زدہ تھا۔ مجھے جس کی مسیحائی کے لیے چنا گیا تھا، وہ خود میرا ہی رقیب تھا۔ عاشق

پنے رقیب کے خلاف تعویذ گنڈے کروانے کے لیے عاملوں کے در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ایک میں
فاکہ جسے مقدر خود اپنے رقیب کے در پر لے آیا تھا کہ جا اپنے دامن میں بچا آخری اُمید کا گلاب بھی اپنے
رقیب کے حوالے کر دے اور اُس کی جھولی میں بھرے سبھی کانٹے اپنے جگر میں پرو کر لہولہان اور خالی ہاتھ واپس
لوٹ جا۔ سو میں خالی ہاتھ درگاہ کے صحن میں دُھول میں اٹا بیٹھا تھا، دُھوپ نے درگاہ کی منڈیر کا ماتھا چوما تو
مولوی خضر حجرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے اپنی آواز میں چھپے طوفان دبانے کی کوشش کی ''آپ جانتے
تھے کہ خرم شہزاد ہی زہرا کا ہونے والا جیون ساتھی ہے، پھر آپ نے مجھے وہاں کیوں بھیجا اُس کی تیمارداری کے
لیے.....؟ کیا آپ کو بھی عبداللہ کو بار بار تپتی آگ میں جھونکنا بہت بھاتا ہے۔ ایک ہی بار مجھے بھسم کیوں نہیں کر
دیا جاتا ہے۔ یہ روز روز کے سلگتے داغ میری رُوح کو کب تک سہنا ہوں گے.....؟'' شاید میرا لہجہ کچھ زیادہ تلخ
ہوتا گیا لیکن مولوی خضر حسب عادت چپ چاپ سر جھکائے سنتے رہے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب بولتے
بولتے میرا گلا رُندھ گیا اور ازل سے بھیگی پلکیں پھر سے نم ہونے لگیں۔ مولوی خضر نے دھیرے سے سر اُٹھایا
اور میرا ہاتھ تھام کر کچھ دیر تک لفظ جوڑتے رہے۔ ''یقین جانو، عبداللہ میاں..... میرے بس میں ہوتا تو یہ
ساری آگ اپنے مقدر کے پیالے میں بھر لیتا لیکن تمہاری رُوح پر مزید کوئی ضرب نہ پڑنے دیتا۔ پر ہم
دوسروں کے نصیب مول پاتے تو بات ہی کیا تھی۔ بس، اتنا سمجھ لو کہ سب پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ اور ہم
شدید خواہش رکھنے کے باوجود کبھی دُعا کی کنجی سے بھی کچھ بند تالے کھول نہیں پاتے.....'' مولوی خضر یونہی
چپ چاپ بیٹھے کافی دیر تک میرا ہاتھ تھپکتے رہے۔ کبھی کبھی خاموشی ہی بہترین گفتگو ہوتی ہے۔ لفظ ہلکے پڑنے
لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خاموشی اور سکوت قدرت کے عطیات میں سے ایک ہیں اور لفظ اور بولی انسان کی
اپنی ایجاد۔ سو، میں اور مولوی خضر بھی سکوت میں خاموشی کی آہٹوں اور سرگوشیوں والی بولی بولتے اور سنتے رہے
لیکن ہمارے لب ساکت ہی رہے۔

سہ پہر کے بعد مولوی خضر کو چند زائرین نے آگھیرا تو میرا جی گھبرانے لگا اور میں نے خود کو درگاہ کی
سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر واقع بازار میں گم کرنے کا تہیہ کر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بعض اوقات
اجنبی ہجوم بھی ذہن کی اُلجھی گرہیں اٹکانے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن ابھی میرے قدم تیسری
سیڑھی ہی پر تھے کہ میں نے خرم کی ماں کو درگاہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اُن کا ڈرائیور بھی اُن کے پیچھے چلا آ رہا
تھا، جس کے ہاتھ میں پھلوں کی چند ٹوکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاتون کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جلدی
سے میری جانب بڑھیں ''عبداللہ..... تم کہیں جا رہے ہو بیٹا.....؟'' میں رُک گیا۔ ''جی..... بس ذرا دل گھبرا
رہا تھا، سوچا کچھ دیر ٹہل آؤں.....'' انہوں نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا ''اوہ..... تمہیں تو بہت تیز
بخار ہے۔ ایسی حالت میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔'' میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ ''اب اِسی حالت میں
مجھے آرام ملتا ہے۔'' لیکن اچھا ہوا کہ میرے لب سِلے ہی رہے۔ مجبوراً مجھے اُن کے ساتھ ہی درگاہ واپس لوٹنا

پڑا۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، انہوں نے خصوصی طور پر مولوی خضر کا شکریہ ادا کیا کہ خرم کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ سب اُن کے بقول اس ''کرشماتی پانی'' کا اثر تھا، جو میں گزشتہ روز خرم کو پلا کر آیا تھا۔ مولوی خضر مسکرا کر بولے ''اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے بی بی۔ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں۔ میں نے تو بس اُس خالق کے لازوال کلام کی چند آیات پڑھ کر اس پانی پر پھونکی تھیں۔ اور یہ عمل آپ خود اپنے گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ میں آپ کو چند مخصوص آیات لکھ کر دے دوں گا۔ آپ روزانہ شام کو مغرب سے پہلے اپنے بیٹے کو پانی دم کر کے پلا دیا کریں۔ اللہ شفا دے گا۔'' خرم کی والدہ میری جانب مڑیں۔ ''وہ تمہیں بھی یاد کر رہا تھا بیٹا۔ جب کبھی وقت ملے تو ہماری طرف ضرور چکر لگانا۔ مجھے خوشی ہوگی۔'' میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر نہ جانے کیوں اُن کی آواز بھرّا سی گئی ''ہمارے پاس خوشیوں کی ویسے بھی بہت کمی ہے۔ میں تو بس اب اُس دن کے انتظار میں جی رہی ہوں جب زہرا خرم شہزاد کی دلہن بن کر ہمارے گھر کی رونق بنے گی۔ مجھے یقین ہے اُس دن میرے پگلے بیٹے کے ہونٹوں پر سدا قائم رہنے والی مسکان اُبھرے گی اور اُس کی زندگی کا ہر درد ہر غم ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔'' زہرا کا نام سنتے ہی میرے آس پاس وہی تیز آندھیاں چلنے لگیں، جو ہمیشہ مجھے ایک کمزور تنکے کی طرح اُڑا لے جاتی تھیں۔ خرم کی والدہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ جسے زہرا نصیب ہو جائے، پھر بھلا اُسے کسی اور چاندنی کی ضرورت کہاں.....؟ کبھی وہ میرے مقدر کا چاند تھی، جسے میں نے پا کر کھو دیا تھا۔ کچھ آنگن سدا سونے بھی تو رہتے ہیں۔ اُن کے نصیب کی چاندنی کسی اور کی منڈیر پر چمک جاتی ہے۔ تقدیر کے گھنے کالے سائے پیپل کے پیڑ سے لپٹ کر اُس آنگن تک روشنی کی ایک نیلی کرن بھی نہیں پہنچنے دیتے اور پھر مجھے مقدر سے گلہ کرنے کا حق بھی کب تھا۔ زہرا تو جبل پور میں لاریب کی حویلی ہی میں، مجھے اپنی رُوح سونپنے کا عندیہ دے چکی تھی، لیکن میں ہی اُسے انتظار کی صلیب پر مصلوب کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔ مجھے تو اُسی وقت سلطان بابا نے اجازت دے دی تھی کہ میرے سفر کا پہلا پڑاؤ آ چکا لہٰذا میں چاہوں تو زہرا کا ہاتھ تھام کر واپس پلٹ سکتا ہوں۔ میں نے تبھی اپنا نصیب کیوں نہیں سمیٹ لیا۔ نصیب بھی تو دسترخوان پر بچھے رزق کی طرح ہوتا ہے، اُسے زیادہ دیر انتظار کروایا جائے تو اُس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مقدر رُوٹھ جاتے ہیں، کسی اور کی تقدیر بن جاتے ہیں۔ لیکن میں بھلا کب ناشکرا تھا؟ میرے دل میں اگر کچھ بھرم تھے تو وہ بھی بلاوجہ کے تو نہیں تھے۔ زہرا کے انتظار کا بھرم، میری واپسی تک اُس کی مخمل پلکوں کو اپنی راہ میں بچھے دیکھنے کا بھرم، اپنی اس برباد محبت پر اعتماد کا بھرم، لیکن بھرم تو بس ٹوٹ جانے کے لیے ہی قائم ہوا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آبگینے جیسے نازک بھرم اپنے دل کے اندر پالتے تو ہم خود ہیں، لیکن ان کے ٹوٹنے کی دہائی ہم اوروں کو دیتے پھرتے ہیں۔ میرا پاگل دل بھی اپنے بھرم کی شکست کا بار زہرا پر ڈالنے کے جواز ڈھونڈ رہا تھا، لیکن اب میں اپنے اس ''نادان دوست'' کے بہکاوے میں آنے والا نہیں تھا۔ زہرا اگر میرا انتظار نہیں کر پائی تو کیا ہوا۔ اُس نے کبھی ایک بار مجھے اپنی رُوح سونپی تھی۔ کیا یہ ایک اعزاز ہی میرے پورے جنم کے لیے کافی نہیں تھا، تو پھر میرا یہ دیوانہ پن ختم

کیوں نہیں ہو جاتا۔ میری کومل رُوح کے پرزے یوں پارہ پارہ ہو کر فضا میں کیوں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ آخر ہم انسان اپنے نصیب کے لمحے جی کر بھی پل پل کیوں مرتے رہتے ہیں۔ مقدر ہمارا ظرف اتنا وسیع کیوں نہیں کر دیتا کہ ہم اپنی تمام عمر اُس ایک جاوداں پل ہی میں گزار دیں، جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔ ہم یادیں سمیٹنے کی دُھن میں اتنی دُور کیوں چلے آتے ہیں کہ پھر واپسی کے خیال ہی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا ہے؟ خرم کی والدہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اُن کے مستقبل کے سنہرے سپنوں کی داستان میں اپنا آج جلتے دیکھتا رہا۔ شاید محبت کی پیاس بھی پانی کی پیاس جیسی ہی ہوتی ہے۔ ہر بار سیر ہو چکنے کے بعد پھر سے پلٹ آنے والی پیاس۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولوی خضر وہاں موجود تھے اور وہ خاتون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ورنہ میں تو بس گنگ ہی بیٹھا رہا۔ وہ نہ جانے کب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر، دُعا دے کر چل دیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

رات تک میرا جسم شدید بخار میں پھنکنے لگا۔ بات صرف جسم تک ہی محدود ہوتی تو میرا یہ جسم ایسے کئی عذاب بیک وقت جھیلنے کی سکت رکھتا تھا، لیکن یہ حدت تو میری رُوح کے ریشوں کو بھی جھلسا رہی تھی۔ دل کچھ اس عجب انداز میں دھڑک رہا تھا، جیسے اپنی گنتی کی دھڑکنیں اس رات پوری کر کے ہی دم لے گا اور پھر اگلی صبح جب اس بے چینی کا عروج میرے زوال کا اختتامی باب لکھنے کے قریب ہی تھا کہ اچانک پھر اُسی بادِ نسیم کے معطر اور یخ جھونکے نے میرے تن من کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ تو وہی مانوس خوشبو تھی، جو اُس ہستی قاتل سے منسوب تھی، جس کے ہاتھوں پر میرے خون کے متبادل مہندی کا رنگ سجنے کو تیار تھا۔ ہاں، یہ تو وہی مانوس ہوا تھی، جو زہرا کی آمد سے منسوب تھی۔ میں اُس وقت صحن میں آنکھیں موندے پڑا تھا اور مولوی خضر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر پٹیاں رکھ رہے تھے۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ مولوی خضر ''ارے..... ارے'' ہی کرتے رہ گئے، لیکن میری نظریں درگاہ کے صحن میں داخلی دروازے پر جم کر رہ گئیں۔ مولوی خضر نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں نظر ڈالی، لیکن داخلی راستہ تو سنسان پڑا تھا۔ مولوی خضر نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''کیا ہوا میاں..... کس کی راہ دیکھ رہے ہو.....؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''وہ..... جس کی راہ کی دُھول بننا میرا مقدر ٹھہر چکا ہے۔'' مولوی خضر نے دوبارہ دروازے کی جانب دیکھا۔ ''لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے میاں.....'' میرے دل نے آج تک پہلے کبھی اُس کی آمد کی جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ لیکن آج درگاہ کا سنسان دروازہ میرا یہ بچا کھچا اور آخری مان بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔ میری نظر پتھر ہونے لگی اور میری آنکھ کا جھرنا بہنے لگا اور تبھی میری دھندلائی ہوئی نگاہ نے خرم کی والدہ کی اوٹ میں اُس چاند کو نمودار ہوتے دیکھا۔ میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے سینے کا پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہاں!..... وہ زہرا ہی تھی۔ وہی سیاہ لباس میں ملبوس۔ ویسے ہی جیسے پانیوں پر تیرتی ہوئی رانی ہنسی۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ بصارت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا، اضافی تھا۔ زہرا کی رنگت میں پیلاہٹ کی جھلک نمایاں تھی۔ مجھے یوں لگا کہ سارے ساحل پر سرسوں اُگ آئی ہو۔ یا پھ

درگاہ ہی پر کسی نے ہلدی کی پوری پرات اُلٹ دی تھی۔ وہی پلکوں کی مسلسل لرزش، وہ نظریں جھکائے خرم کی والدہ کے پیچھے مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی، لیکن کبھی کبھی چند قدم بھی صدیوں کا فاصلہ بن جاتے ہیں۔ یا شاید ہمارا دُوری کو ناپنے کا پیمانہ ہی سدا سے غلط ہے۔ دُوریوں کا بھلا فاصلوں سے کیا واسطہ۔ ٹھیک اُسی لمحے مجھے اس دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں اور اُن کی تمام لغات کے محدود ہونے کے احساس نے آگھیرا۔ ہمارے لفظ اور ہماری بولیاں صرف اور صرف ظاہری جذبوں اور احساسات ہی کو بیان کر پاتی ہیں۔ جسم سے جسم کے فاصلے کو ''دُوری'' کہتے ہیں لیکن رُوح سے رُوح کے فاصلے کو کیا کہا جائے۔ جو جسم کو جلائے وہ ''آگ'' کہلاتی ہے، لیکن جو رُوح کو جھلسائے اُسے کیا نام دیا جائے۔ جو بولی زبان سے ادا ہو اُسے ''لفظ'' کہتے ہیں، لیکن جو بن بولے اور بن سنے ہی رُوح کو جھنجھوڑ جائے اُس بولی کو کیا کہیں۔ میں بھی اپنے سامنے سر جھکائے کھڑی زہرا کی رُوح سے کچھ ایسی ہی بولی بول رہا تھا۔ وہ رُوح جو کبھی میری ملکیت تھی، لیکن آج کسی پرائے کے تصرف کے بوجھ تلے دبی نظر آ رہی تھی۔ خرم کی والدہ مولوی خضر سے باتوں میں مشغول تھیں۔ ''آپ ہی اسے سمجھائیں مولوی صاحب..... یہ تو یہاں آنے کے لیے کبھی راضی ہی نہ ہوتیں اگر خرم ضد نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے اسے یہاں لائی ہوں۔ خرم کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ بھی ضرور آتا۔ لیکن آج آپ میری ہونے والی بہو اور بیٹے کے لیے کچھ ایسی دُعا کریں کہ ان کے آنے والی زندگی سے غم اور تکلیف کے سائے ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائیں۔ ہم نے بہت غم دیکھے ہیں مولوی صاحب۔ اب اگر خوشی مل رہی ہے تو دُعا کریں کہ وہ بھی پوری اور بھرپور ملے۔'' مولوی خضر ہلکے سے بولے ''بی بی میری اللہ سے یہی دُعا ہے کہ وہ آپ کے سارے خاندان کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور آپ کے ساتھ سب خیر ہی کا معاملہ رہے۔ بس، اتنا جان لیں کہ خوشی نام کے جذبے کا بنیادی عنصر ہی اس کی کم یابی سے ہے۔ جو سدا کے لیے ہو وہ ''خوشی'' نہیں رہتی، معمول بن جاتی ہے۔'' مولوی خضر نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے لیکن میرے ہاتھ گرے ہی رہے۔ میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج وہ کسی اور کی نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں خرم کی والدہ کی بات کی بازگشت گونجتی رہی۔ ''یہ تو یہاں کبھی نہ آتی اگر خرم ضد نہ کرتا.....'' گویا آج کا یہ پھیرا بھی میرے مقدر کی دین نہیں بلکہ اُس رقیب کی دی ہوئی خیرات تھا۔ مولوی خضر نے دُعا ختم کر کے زہرا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''سدا سکھی رہو.....'' خرم کی والدہ واپسی کے لیے پلٹتے پلٹتے رُک گئیں۔ ''ارے ہاں عبداللہ بیٹا! وہ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اُس کی بہت کم لوگوں سے اتنی جلدی بنی ہوگی۔ تم بھی ہمارے ساتھ گھر چلو نا۔ خرم تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ شام سے پہلے ڈرائیور تمہیں واپس چھوڑ جائے گا.....'' مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ مولوی خضر نے جلدی سے بات بنائی ''عبداللہ میاں ضرور آپ کے ساتھ چلے چلتے، لیکن آج تو انہیں بخار نے بُری طرح سے گھیر رکھا ہے۔ طبیعت کچھ سنبھل جائے تو میں خود لے کر آؤں گا آپ کے دولت خانے پر.....'' جانے یہ میرا وہم تھا، کوئی سراب تھا یا میری خوش فہمی کہ جس وقت مولوی خضر نے میری بیماری کا ذکر کیا تو اُس بے رحم کی جھکی

ں کی جھالر میں ارتعاش کی اک لہری پیدا ہوئی تھی۔ خرم کی والدہ میرے بخار کا سن کر پریشان ہوگئیں اور
ں نے جلدی سے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھوا ''ہاں بخار تو بڑا تیز ہے۔ عبداللہ تم باقاعدگی سے اپنا علاج
ں نہیں کراتے۔ آخر یہ کیسا روگ ہے.....؟'' اور یہی وہ لمحہ تھا جب شدید ضبط کے باوجود میری زبان پھسل
ئی۔ ''وفا کا روگ ہے مجھے..... آپ دُعا کریں کہ قدرت مجھے بھی بے وفائی کا مرہم عطا کرے۔'' خاتون
حیرت سے میری جانب دیکھا اور میں اس شکاری کی طرح پچھتایا، جس سے کمان سیدھی کرنے کے دوران
تیر پھسل جائے اور وہ اندھا تیر کسی بے گناہ کی جان کے درپے ہو جائے۔ میری زبان سے پھسلے تیر نے بھی
ں کانچ کی شہزادی کے کورے من کو داغ دیا تھا۔ لمحہ بھر کو زہرا کی پلکیں اُٹھیں اور میرا سارا جہاں ڈھے گیا۔
ی کہانی کا آغاز بھی اِسی درگاہ سے اور زہرا کی اُٹھی اک ایسی ہی نگاہ سے ہوا تھا اور میرا انجام بھی وہی ایک
تھی۔ پھر نہ جانے کب خرم کی والدہ نے مولوی خضر سے اجازت طلب کی اور کب وہ دونوں درگاہ سے واپس
ے گئیں، مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی۔ میں وہیں درگاہ کے صحن میں بکھرے پتوں کی مانند پڑا رہا اور ساحل کی ہوا
ے نوحے پڑھتی رہی۔ مغرب کے قریب مولوی خضر نے زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے بیٹھا دیا اور کہیں سے
کمبل لا کر میرے لرزتے جسم پر ڈھک دیا، پر رُوح کی لرزش کا کیا علاج.....؟ اتنے میں میرے قریب ہی
موں کی آہٹ اُبھری اور شام کے ملگجے اندھیرے میں کوئی سایہ میرے قریب آ کر رُک گیا۔ مجھ میں گردن
ا کر دیکھنے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی۔ پھر کسی نے اچانک بڑھ کر میرے ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا
یے۔ میں نے چہرہ پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ بختیار تھا۔ ہاں..... وہی ''فریفتہ نصیب'' بختیار..... لیکن آج اس
ے چہرے پر ایک خاص چمک نظر آ رہی تھی، اس کا لہجہ ممنونیت سے بھرپور تھا۔ ''آپ کی ایک دُعا نے میری
دگی بدل دی..... مجھے ازل کے صحرا سے نکال کر اُمید کے ایک ایسے نخلستان میں پہنچا دیا، جہاں میں نے سب
لیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اُس کی جانب دیکھا۔ بختیار نے ہیجان
میز خوشی کے ساتھ بتایا کہ آخر کار اُسے پوری کائنات کھوجنے کے بعد وہ اک نگاہ میسر ہو ہی گئی، جو صرف اور
رف اُس کی مدح سرائی میں اُٹھی اور پھر اُسی کے لیے جھک گئی تھی۔ بختیار کے بقول وہ ایک مجسمہ ساز تھی،
ں کے ادارے کا سالانہ چندہ بختیار کے ہاں سے ہی جاتا تھا۔ کچھ دن پہلے ادارے نے اُس کے مجسموں کی
مائش کا اہتمام کیا تو بختیار کو بھی بطور مہمان خصوصی وہاں مدعو کیا گیا اور تبھی بختیار کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس
سین مجسمہ ساز، سائرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے، لیکن یہ تو بختیار کے لیے معمول کی بات تھی۔ پوری زندگی وہ
ی فریفتہ پن ہی کا تو شکار رہا تھا۔ لیکن یہ معاملہ تب ''خلاف معمول'' تک جا پہنچا، جب سائرہ نے بختیار کی
بانی اپنے فن کی تعریف سن کر شرماتے اور کچھ جھجکتے ہوئے بختیار کے چہرے کا مجسمہ بنانے کی اجازت طلب کر
ا۔ بختیار حیرت زدہ سا رہ گیا لیکن وہ اس معصوم خواہش کو چاہتے ہوئے بھی رد نہ کر سکا۔ سائرہ بختیار کی
صر وفیات کے پیش نظر اُس کے گھر ہی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آنے لگی اور بختیار کی اپنی ذاتی آرٹ گیلری

ہی میں اُس نے کچی مٹی اور کلے سے بختیار کا بت تراشنا شروع کر دیا۔ تب زندگی میں پہلی بار بختیار کی جھلـ
رُوح پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑے، جب سائرہ نے اُسے یہ بتایا کہ وہ بختیار کی سوچ، خیالات ا
شاعری سے بے حد متاثر ہوئی ہے اور اِسی لیے اُس نے زندگی میں پہلی بار اتنی جرأت کی ہے کہ خود کسی
فرمائش کر کے اُس کا مجسمہ گوندھے۔ آخر کار بختیار کے چہرے کا مجسمہ تیار ہو گیا اور بختیار کے بقول اُس
آج تک کبھی اپنے آپ پر پیار آتا محسوس نہیں کیا تھا لیکن سائرہ کے کمال فن نے اُسے بھی اتنا حسین کر دیا
خود بختیار کئی گھنٹے اپنے چہرے کے زاویئے اور خط سراہتا رہا۔ بختیار کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب میری دُعا کی قبولیـ
کی وجہ سے ہوا ہے، ورنہ سائرہ اُس کے اندر چھپے خوب صورت انسان کے چہرے کو یوں نہ گوندھ پاتی۔
نے بختیار کی جانب دیکھا۔ ''کاش میں اتنا معتبر ہوتا کہ میری دُعائیں بھی قبولیت کا شرف پاتیں۔ بہرحا
مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا خواب پورا ہو گیا۔'' بختیار کچھ ہچکچایا۔ ''ہاں، مگر ابھی ایک اُلجھن باقی
اُمید ہے کہ آپ آج بھی میرے حق میں دعا کریں گے۔'' میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا'' کـ
اُلجھن.....؟'' بختیار نے نظریں چرائیں۔ ''آپ یہ دُعا کریں کہ قدرت کبھی سائرہ کی بینائی نہ لوٹائے...
میرے اندر ایک زور دار چھناکا ہوا اور میری رگوں اور نسوں میں وہ سب کانچ دُور تک پیوست ہو گ
''کیا.....؟ کیا مطلب..... کیا سائرہ نابینا ہے..... مگر..... مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ قدرت نے آپ کو آ
کے حصے کی وہ ایک نظر بخش دی ہے، لیکن اگر سائرہ دیکھ ہی نہیں سکتی تو پھر.....؟'' بختیار نے عجیب سی نظر
سے میری جانب دیکھا ''ہاں..... یہ سچ ہے کہ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ سائرہ نابینا۔
لیکن کیا ضروری ہے کہ نظر کا واسطہ صرف بینائی ہی سے ہو.....؟'' میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا۔ بہت
بات کہہ گیا تھا وہ۔ واقعی، ضروری تو نہیں کہ بختیار کے مقدر میں صرف ''بینا نظر'' ہی لکھی ہو؟ بختیار نے
بات جاری رکھی۔ ''وہ اپنی اُنگلیوں سے چھو کر دیکھتی ہے۔ قسمت نے اُس کی اُنگلیوں کی پوروں میں اُس
بصارت چھپا رکھی ہے۔ میرے چہرے کا مجسمہ بھی اُس نے اپنی پوروں کی بینائی سے چھو کر اور محسوس کر
گوندھا تھا۔ تب ہی اس مجسمے کے چہرے پر کوئی داغ نہیں تھا۔ کوئی سلوٹ کوئی بدنما زاویہ نہیں تھا۔ مجھے
شام یہ احساس بھی ہوا کہ کبھی کبھی مجھ جیسے بدبختوں کے لیے بصارت بھی کس قدر بڑا عذاب بن جاتی۔
کاش میں بھی سائرہ کی طرح نابینا ہوتا اور قدرت میری اُنگلیوں کی پوروں کو بھی سائرہ جیسی خوب صورت
عطا کر دیتی..... کاش.....'' بختیار بولے جا رہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میرے سامنے
ایسا شخص بیٹھا، جو اپنی محبوب کے لیے سدا کی بے بصیرتی کی بددُعا لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا، کیوں کہ اُ
خوف تھا کہ بینائی لوٹ آنے کے بعد اُس کے نصیب کی نظر ہمیشہ کے لیے پلٹ جائے گی۔ پھر سے وہی نفـ
اُس کا مقدر ہو گی، جو جنم سے اب تک اُس کی رُوح کو چھلنی کرتی آئی ہے۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ڈاکٹروں
حساب سے سائرہ کی نظر واپس آ سکتی تھی۔ بات صرف اُس کے جوڑ کے خلیے والی پتلیوں کے ملنے تک کی

ختیار یہ چاہتا تھا کہ یہ وقفہ بختیار کی موت سے پہلے تک کبھی مکمل نہ ہو۔ بختیار جانتا تھا کہ اُس کی یہ خواہش
ید خودغرضی کے زمرے میں شمار کی جائے گی لیکن وہ بے بس تھا۔ شاید زندگی میں ہم سب کبھی نہ کبھی ایسی خود
ی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ بختیار نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر جلدی سے میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ
ے لیے دُعا کریں گے نا..... دیکھیں میں بڑی اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ بھیجئے گا
س.....'' ''آپ نے ٹھیک کہا..... نظر کا بھلا بینائی سے کیا واسطہ.....؟ اور یہ بھی سچ ہے کہ کبھی بینا وہ نظر نہیں
تے، تو پھر ہم دونوں مل کر یہ دُعا کیوں نہ کریں کہ خدا سائرہ کو بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کے مقدر کی وہ ایک
ر بھی عطا کر دے۔'' وہ بے چین سا ہو گیا ''بات صرف میری نہیں ہے۔ ہماری بصارت کی دنیا سائرہ کی
وں والی دنیا کے مقابلے میں انتہائی بدصورت ہے۔ یہاں صرف میں ہی بدنما نہیں۔ وہ یہ سب برداشت
بس کر پائے گی۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''ٹھیک ہے..... لیکن دُعائیں عرش پار کر جائیں تو پھر واپس
یں پلٹا کرتیں۔ اس لیے دُعا مانگتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کل شام
ک دوبارہ سوچ لیں۔ اگر پھر بھی آپ کا یہی فیصلہ رہا تو ہم دونوں مل کر اللہ کے دربار میں اس بددُعا کی عرضی
ی ڈال دیں گے۔'' اچانک میرے عقب سے وہی رُوح کھینچ لینے والی ملائم سی آواز اُبھری ''اگر بددُعا ہی کسی
یاہ نصیب کی دنیا کو بدلنے کا ایک واحد ذریعہ ہے تو ایک بددُعا میرے حق میں بھی فرما دیجیے۔''

میں تڑپ کر پلٹا..... درگاہ کے دروازے کے قریب زہرا کھڑی تھی۔

تارِ عنکبوت

ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ اگر بختیار میرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا۔ لیکن وہ تعبیر تھی۔ میرے نہ سہی..... کسی اور کے خوابوں ہی کی سہی..... لیکن زہرا یوں شام ڈھلے اور اس طرح اکیلے یہاں.....؟ میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ بختیار کی آنکھوں میں بھی حیرت کی جھلک تھی۔ اُس نے ایک جانب ہو کر زہرا کے لیے جگہ خالی کی اور زہرا میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آج بھی پلکوں کی وہی ''لرزش بے کراں'' میرے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے کائنات تھم سی گئی اور پھر اُس کے لب ہلے ''خرم کی ای آپ کا نیچے گاڑی میں انتظار کر رہی ہیں۔ خرم بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ اُوپر تک نہیں آ سکتے اس لیے.....'' میرے اندر زور کا جھکڑ چلا اور میرے دل کی ڈالی پر بچا آخری پتا بھی ٹوٹ کر خاک میں جا ملا۔ گویا اب میرا نصیب بھی میرا رقیب لکھے گا۔ میں نے بختیار سے معذرت طلب کی، لیکن میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوتا چلا گیا ''معافی چاہتا ہوں..... مجھے کچھ دیر کے لیے درگاہ سے باہر جانا ہوگا۔ آپ تو بددعا لینے کے لیے خود یہاں تک چل کر آتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کو دعا بھی اپنے دروازے پر درکار ہوتی ہے۔ وہ خود اُٹھ کر کسی کے در پر نہیں آتے۔ اپنا اپنا مقدر ہوتا ہے۔'' زہرا نے میری بات کا گھاؤ محسوس کر کے بھی اپنی نظر جھکائے رکھی۔ بختیار جو حیرت سے ہم دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کچھ ہڑبڑا سا گیا ''جی جی..... ضرور کیوں نہیں..... میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ سائل کی سن لیں.....'' ''جانے ہم دونوں میں سے سائل کون ہے اور سوالی کون.....؟'' بختیار میری بات سن کر اُٹھتے اُٹھتے ایک بار پھر ٹھٹھک گیا اور پھر موقعے کی نزاکت سمجھتے ہوئے سلام کر کے وہاں سے چل دیا۔ میں اور زہرا درگاہ کے صحن میں اکیلے رہ گئے۔ زہرا کی لرزتی پلکیں کچھ نم سی ہونے لگیں۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا ''چلیں..... میں حاضر ہوں۔'' میں نے قدم آگے بڑھائے۔ زہرا کی آواز نے میرا تعاقب کیا ''سنیں.....'' میں رُک گیا، لیکن پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا کہ میں جانتا تھا کہ یہ وہ طلسم ہے، جو پلٹ کر دیکھنے والوں کو پتھر کا بنا دیتا ہے۔ ''میں آپ سے معافی نہیں مانگوں گی، کیوں کہ کچھ جرم اپنی سزا خود اپنے آپ ہوتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی آپ کے سامنے دوبارہ نہ آتی۔ لیکن ساری بات ہی اختیار کی ہے۔ بس اتنا جان لیں کہ میں بے اختیار اور مجبور تھی۔'' کاش وہ اتنی سی وضاحت بھی نہ کرتی۔ جانے ہم ہمیشہ اُنہی ہستیوں کے سامنے اپنا سارا ضبط کیوں کھو بیٹھتے ہیں، جن کے سامنے ہمیں ضبط کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی ایک لمحے کے لیے اپنا سارا ضبط کھو بیٹھا اور

پ کر پلٹا، وہ سر جھکائے اپنا کانپتا وجود سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''کم از کم آپ کی زبان سے یہ مجبوری حیلہ بہت عجیب لگتا ہے۔ میں نے آپ سے کوئی وضاحت طلب نہیں کی، نہ ہی آپ کو اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ لیے رکھنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں لڑکیاں اپنے مستقبل کے بارے میں کافی محتاط ہوتی ہیں۔ ایسے میں اگر انہیں کسی معذوری کے قریب تر دیوانے اور کسی شہزادے / امیر زادے کے درمیان کسی ایک کا چناؤ کرنا ہو تو فیصلہ وہی ہوگا جو آپ نے کیا۔ ساری عمر کے لیے کسی معذور کی بیساکھیاں بننے سے بہتر ہے کسی مضبوط شانے کا سہارا بن کر زندگی گزار دی جائے۔ مجھے اس فیصلے پر آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔'' میں نے اپنی ترکش کے سبھی تیر خالی کر دینے کے بعد دوبارہ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے دم توڑتے گھائل کی طرح ڈوبتی آواز سنائی دی ''آپ کو حق ہے مجھ سے نفرت کرنے کا۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ گھر سے چلتے ہوئے میں نے کچھ سطریں لکھی تھیں، وقت ملے تو انہیں پڑھ لیجیے گا۔'' زہرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا، ایک تہ شدہ ورق میرے حوالے کر دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ پایا کہ ''نفرت'' محبت کا سب سے خطرناک روپ ہوتا ہے اور شاید محبت سے بھی کہیں زیادہ خالص اور سچا روپ۔ میں درگاہ کی سیڑھیاں اُتر کر زہرا کے نقش قدم پر چلتا ہوا جب نیچے پہنچا تو مجھے دیکھ کر خرم کی والدہ جلدی سے گاڑی سے نیچے اُتر آئیں، لیکن خرم حسب معمول گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ آج بھی وہ ڈرائیور کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ کے مقابل والی نشست پر بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے سے آج پیلاہٹ جھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ''بڑے مغرور ہو میرے مسیحا۔ آخر مجھے ہی یہاں تک آنا پڑا۔'' خرم کی ماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گھور کر اپنے بیٹے کی تنبیہہ کی۔ ''شہزاد..... تمیز سے.....'' تب میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ خرم کی امی جب بہت پریشان یا سنجیدہ ہوتیں تو خرم کو شہزاد بلاتی تھیں۔ ''میرے پاس غرور کے قابل کچھ نہیں ہے۔ سب مان، سارے غرور ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں تو اب بس خاک کا ایک ڈھیر ہوں۔ غرور اور فخر کے گہنے تو آپ جیسوں پر سجتے ہیں، جنہیں ایک کائنات میسر ہے۔ اپنا نصیب تو بس داغ ہی ہیں۔'' خرم نے چونک کر میری آنکھوں میں جھانکا ''سوری..... میرا مقصد تمہارا دل دُکھانا نہیں تھا عبداللہ، اور سچ تو یہ ہے کہ میری کائنات میں بس ایک ہی قابلِ فخر گہنا ہے۔ میرے پاس بھی بس ایک غرور ہی تو باقی بچا ہے۔ جس سے میری ساری کائنات منور ہے۔'' خرم نے مسکرا کر زہرا کی جانب دیکھا۔ وہ جو کبھی میرا مان تھی، آج کسی اور کا غرور تھی۔ اس دنیا میں تخت لٹتے اور تاج بدلتے کب دیر لگتی ہے۔ کل کے بادشاہ آج کے بھکاری بنے پھرتے ہیں۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ مولوی خضر نے خرم کے لیے سہ پہر کو پانی پر دم کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے خرم کی والدہ سے کہا کہ وہ خرم کو اُوپر درگاہ ہی پر لے چلیں تاکہ مولوی صاحب ہی اُس کو وہ پانی بھی پلا دیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ میری بات سنتے ہی اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا تردّد چھا گیا۔ انہیں ہچکچاتے دیکھ کر میں نے خرم سے کہا کہ دو گھڑی کے لیے وہ میرے ساتھ درگاہ کے حجرے تک آجائے تاکہ مولوی خضر سے بھی اُس کی ملاقات ہو

جائے۔ خرم بھی کسی سوچ میں پڑ گیا، جیسے میں نے کوئی بہت ہی مشکل سوال پوچھ لیا ہو۔ زہرا کے چہرے پر بھ
کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں خاموشی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر خ
نے جیسے کوئی فیصلہ کر لیا اور اس کے چہرے کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی ''اچھا چلو..... آج ہم بھی یہ معرکہ سر
ہی لیتے ہیں، ورنہ تم یہی سوچو گے کہ یہ کیسا مغرور اور سر پھرا امیر زادہ ہے، جو خود اپنے مطلب کے لیے بھی
قدم چل کر اُوپر نہیں آ سکتا۔'' خرم نے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھا، جو جلدی سے گاڑی سے اُتر کر خرم کے
دروازے کی جانب بڑھ گیا لیکن خرم کا دروازہ کھولنے سے پہلے اُس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی
نکالی اور پھر خرم کی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ میرے وجود کے اندر ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے
ارد گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں دو بیساکھیاں تھیں اور گاڑی میں بیٹھے خرم کی دونو
ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے مصنوعی تھیں۔ ڈرائیور نے سہارا دے کر خرم کو گاڑی سے باہر نکالا اور بیساکھیاں اُسے
دیں۔ خرم نے کچھ لڑکھڑا کر پہلا قدم اُٹھایا۔ میں سوچنے سمجھنے سمیت اپنے تمام حواس کھو چکا تھا۔ گویا خرم ا
اس معذوری کی وجہ سے آج تک کبھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بند ہونے۔
پہلے کار کے کلچ اور ایکسیلیٹر کا وہ مخصوص خودکار نظام بھی دیکھ لیا، جو خاص طور پر معذور افراد کی گاڑیوں میں نص
کیا جاتا ہے۔ خرم نے ڈگمگاتے ہوئے دوسرا قدم اٹھایا اور ڈرائیور کے سہارے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ ا
میں اُوپر سے مولوی خضر کی گھبرائی ہوئی سے آواز سنائی دی۔ ''ارے میاں..... تم وہیں رُکو میں نیچے آ رہا ہوں
مولوی خضر ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گئے اور انہوں نے وہیں کھڑ۔
کھڑے خرم کو چند گھونٹ پانی پلا دیا، جوان دو قدموں کے سفر ہی میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ میں ویسے ہی ا
جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا۔ خرم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا ''میں نے کہا تھا نا..... میرے پاس فخر کرنے کی
ایک ہی وجہ رہ گئی ہے لیکن یقین مانو، یہ آخری مان اور بھرم ہی اس ایک زندگی کو کنارے لگانے کے لیے کا
ہے۔'' ڈرائیور نے خرم کو پھر سے سہارا دے کر گاڑی کے اندر بیٹھا دیا۔ خرم کی والدہ اپنے آنسو چھپانے
ناکام کوشش کرتی نظر آئیں۔ زہرا ویسے ہی سر جھکائے اپنا پیلا چہرہ چھپاتی کار کی پچھلی نشست پر جا کر بیٹھ گئ
مولوی خضر نے خرم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور میری جانب دیکھ کر دھیرے سے کھانسے، میں جیسے کسی خواب کے
سے نکل کر ہوش کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن تب تک خرم کا ڈرائیور گاڑی کے انجن کو بیدار کر چکا تھا۔ میرا ہاتھ
میں اُٹھا رہ گیا اور خرم کی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں گاڑی کے پچھلے پہیوں کی رگڑ سے فضا میں اُڑتی ریت
ساتھ دُھول ہوتا چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ مولوی خضر نے مجھے خرم کو الوداع کہنے کے لیے کھنکار کر ہوش
لانے کی کوشش کی تھی کہ تہذیب اور آداب کا یہی تقاضا تھا لیکن خرم کی معذوری دیکھنے کے بعد میں اپنے حوا
میں تھا ہی کب.....؟ کاش دنیا کے سبھی دیوانوں کے ماتھے پر قدرت ہوش چھینتے ہی کوئی واضح مہر ثبت کر د
تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُن کی جبیں پر پڑے داغ کو دیکھ کر ہی دوسرا اُن سے کسی ادب آداب یا تہذیب کی کوئی اُ

رکھتا۔ نہ جانے میں کس طرح لرزتے قدموں کو سنبھالتا واپس درگاہ کے صحن تک پہنچا۔

آج سمندر کی لہروں کی بھی آپس میں کوئی جنگ چل رہی تھی شاید..... اِسی لیے ان کے چنگھاڑنے اور لڑنے کی آوازیں درگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اس شور سے کئی گنا زیادہ شور اس وقت خود میرے وجود کے سمندر میں اُٹھ رہا تھا۔ سماعتیں معطل کر دینے والا شور۔ شاید بہت شدید اور حدوں کو پار کر جانے والا شور بھی خاموشی ہی کی ایک قسم بن جاتا ہے۔ ایسی ہی کسی لرزتی خاموشی کی ساعت میں میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے زہرا کا دیا ہوا کاغذ کھولا۔ میں زہرا کی تحریر کو خط کہہ کر اس کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر نامہ ''خط'' ہی ہو، یا ہر ''خط'' کسی کی تحریر ہی سے جڑا ہوا؟ کچھ تعلق خط سے بڑھ کر بھی تو ہوتے ہیں اور کچھ ''خط'' لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ آنسوؤں سے بھیگی میری دھندلی نگاہ ان سیاہ موتیوں پر پھسلنے سے پہلے تعظیم کے تمام تقاضے پورے کرنا نہیں بھولی۔ وہی دل میں اُتر جانے والی تحریر اور وہی انداز تکلم۔ کون کہتا ہے کہ ثبات صرف اک تغیر کو ہے.....؟ اور بھی کچھ ایسا ہے کہ جس کی دل کشی سدا قائم رہنے والی ہے۔ میں نے بمشکل اپنی نظر کاغذ پر جمائی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اب میرا کوئی بھی لفظ آپ کے زخموں کا مرہم نہ ہو سکے گا۔ شاید کچھ لوگ پیدا ہی سدا زخم دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ میری آرزو تھی کہ میں آپ کی راہ میں پھول بچھاؤں، لیکن اپنے مقدر کے کانٹے بھی آپ کے راستے میں پرو دوں گی، ایسا بھلا کب سوچا تھا.....؟ آپ کی ہر بدگمانی جائز ہے اور اگر میرا اور آپ کا دوبارہ سامنا نہ ہوتا تو شاید میں انہی بدگمانیوں کے تپتے سائے تلے اپنی باقی تمام زندگی گزار دیتی، کیوں کہ کبھی کبھی یہ بدگمانی ہی کسی کے جینے کا سہارا بن جاتی ہے۔ آپ کا مجھ سے بدگمان رہنا ہی خود آپ کے لیے بہتر تھا، لیکن میری بے بسی کی انتہا دیکھیے کہ میں اپنے حق میں کسی کی عمر بھر کی بدگمانی کی حق دار بھی نہیں رہی۔'' میری نظریں تیزی سے خط کے منظر نامے کو اپنے ذہن کے پردے پر منتقل کرنے لگیں۔

زہرا کی کہانی ٹھیک اُسی دن سے شروع ہوتی تھی، جس دن میری داستان کا اختتام لکھا تھا۔ اُس دن ''کاسابلانکا'' کو زہرا کے شہر اُسی ساحل پر لنگر انداز ہونا تھا، جہاں اُس کی ساحر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ زہرا کو ساحر کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ زہرا کو بندرگاہ کے ساحل پر پہلا قدم دھرتے ہی اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے کہ یہی تو وہ ساحل تھا جہاں ساحر کے دل نے آخری بار لنگر انداز ہو کر زہرا کے قدموں میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ساحر کو سفر پر نکلے آج چھ مہینے پورے ہو رہے تھے اور یہ بات صرف زہرا کا دل ہی جانتا تھا کہ اُس نے یہ چھ ماہ کس طرح پل پل کر کے کاٹے تھے۔ لیکن آج کا دن کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جہاز سہ پہر کو لنگر انداز ہونے والا تھا مگر کبھی کبھی یہ دن اتنا طویل کیوں ہو جاتا ہے کہ اس کا پہلا پہر ہی سال ہا سال کی طرح ڈھلتا ہے۔ زہرا بھی بمشکل دوسرے پہر تک انتظار کی سولی پر خود کو ٹانگ سکی اور پھر دوپہر کو آنے والے ڈرائیور کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے گاڑی نکالی اور بندرگاہ جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اپنی دُھن میں اتنی سرشار تھی کہ اُسے اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی کہ روزانہ کی طرح ایک سپورٹس بائیک پر بیٹھا ہیلمٹ پوش اُس کی گاڑی

کے پیچھے چل پڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہیلمٹ پہنے یہ نوجوان گزشتہ چند روز سے زہرا کے گھر کے آس پاس
منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی زہرا ڈرائیور وغیرہ کے ساتھ کسی بھی مقصد سے گھر سے باہر نکلتی تو وہ اُس وقت تک
زہرا کی گاڑی کا طواف جاری رکھتا، جب تک وہ واپس گھر نہیں پہنچ جاتی۔ زہرا سے پہلے زہرا کے ڈرائیور
یہ بات محسوس کر لی تھی اور اُس نے ایک آدھ بار رُک کر موٹر سائیکل سوار سے یہ پوچھنے کی کوشش بھی کی کہ
کیوں گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ لیکن ڈرائیور کے گاڑی سے اُترتے ہی وہ ہیوی بائیک ایک زور د
ایکسیلیٹر کے ساتھ فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی۔ ڈرائیور نے زہرا کی توجہ بھی اس جانب مبذو
کروائی، اُلجھن تو زہرا کو بھی ہوئی مگر اُس نے ڈرائیور کو یہ بات گھر میں کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کیوں
وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے والدین بلاوجہ پریشان ہوں۔ ہاں البتہ زہرا نے خود گھر سے نکلنا کم کر دیا اور اگر
اشد ضرورت سے گھر سے باہر جانا بھی پڑتا، تو وہ دن کے اُجالے ہی میں کام نمٹا کر جلد از جلد واپس گھر پہنچنے
کرتی، لیکن اُس روز ساحر کے آنے کی خوشی میں وہ تمام احتیاطیں بھلا بیٹھی اور اُسے ہوش تب آیا، جب اُ
نے ایک قدرے ویران سڑک پر اُسی نیلے رنگ کی ہیوی سپورٹس بائیک کو اپنی گاڑی کے تعاقب میں آ
دیکھا۔ زہرا کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کیوں کہ وہ نہایت معمولی سی رفتار کے ساتھ گاڑی چلانے کی عادی
اور اُسے تیز رفتاری کا بالکل بھی تجربہ نہیں تھا، جب کہ اس وقت وہ بائیک سوار اُس کی گاڑی کے پچھلے بمپر
بالکل چھوتے ہوئے اپنی بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ زہرا نے بھی بوکھلا کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔
فاصلہ بڑھنے کے بجائے مزید کم ہوتا چلا گیا۔ زہرا کا پاؤں ایکسیلیٹر پر دبتا چلا گیا اور مرسڈیز کا بھرپور طاقت
انجن اپنے وحشی زور کے بل پر بے قابو ہونے لگا اور پھر جب ایک مصروف سڑک پر موڑ کاٹتے ہی اچانک اشا
سرخ ہو گیا تو زہرا سے گاڑی سنبھالنا مشکل تر ہو گیا۔ عجلت میں لگائی گئی بریک نے مرسڈیز کے چاروں پہیے
تارکول کی سڑک پر پیوست کر دیئے لیکن گاڑی کی بقیہ باڈی اس اچانک جھٹکے کی وجہ سے بُری طرح جھول
گھومی اور پیچھے سے آتی ہیوی بائیک زوردار آواز کے ساتھ گھومتی ہوئی گاڑی کے دروازے والی طرف
ٹکرائی۔ موٹر سائیکل سوار اس طرح ہوا میں اُچھلا جیسے کسی توپ سے نکلا کوئی گولا اور فضا میں قلابازیاں کھا
گاڑی کے اُوپر سے ہوتا ہوا، دوسری جانب سڑک پر دھم سے گر کر بے سدھ ہو گیا۔ لیکن آنکھیں بند ہونے
پہلے اُس نے بائیں جانب سے ایک کار کو تیزی سے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ سوار نے کسمسا کر اپنا د
بچانے کی ایک آخری کوشش کے طور پر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن کار رُکتے رُکتے بھی اس کی گھائل ٹانگ
کو روند گئی۔ فضا میں خون کے چند چھینٹے اُڑے اور زہرا جس کا سر جھٹکے کی وجہ سے زوردار طریقے سے اسٹیئر
سے ٹکرا چکا تھا یہ سب دیکھ کر کر وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھے گئی اور جب اُسے ہوش آیا تو رات آدھی سے زیادہ بی
چکی تھی اور وہ شہر کے معروف ہسپتال کے آئی سی یو میں اپنے پریشان والدین اور ڈاکٹروں کے ہجوم میں گھ
ہوئی تھی۔ اُس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ ساحر کا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہوگا اور جب ساحر

کو وہاں اپنے استقبال کے لیے نہیں پایا ہوگا، تو وہ کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ ضرور ساحر نے زہرا کے گھر پر بھی
طے کی کوشش کی ہوگی، لیکن گھر پر نوکروں کے سوا اور کون تھا، جو اُسے کوئی تسلی بخش جواب ہی دے پاتا۔ زہرا
ڈاکٹروں سے پہلا سوال اُس سپورٹس بائیک والے گھائل کے بارے میں پوچھا لیکن جواب میں اُسے
کا انجیکشن ملا اور زہرا اپنے سر میں اُٹھتی ٹیسوں سمیت پھر سے غافل ہوگئی۔ شاید یہ ٹھیک وہی لمحہ تھا، جب
ری جانب ساحر اپنے حواس کھو رہا تھا اور پھر جب تک دو دن بعد زہرا کے ہوش سنبھلے، تب تک ساحر اپنے
ں کے آخری دورے سے گزر کر لندن کے لیے پرواز کر چکا تھا۔ لیکن زہرا کے المیے کا آخر ابھی لکھا جانا باقی
۔ ایک نئی قیامت اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں اُس کا انتظار کر رہی تھی، جہاں اُس کی گاڑی سے ٹکرا کر
نے والا موٹر سائیکل سوار موت و زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا تھا، جہاں سے کچھ کم خوش نصیب ہی واپس
تے ہیں اور یہ دیکھ کر تو زہرا کی رُوح ہی اُس کے بدن سے نکل گئی کہ اس نوجوان کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے
چے غائب تھیں۔ کار نے اس بُری طرح سے انہیں کچل ڈالا تھا کہ ڈاکٹروں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔
اسا مزید انتظار سارے جسم میں زہر پھیلنے کے باعث بن سکتا تھا۔ نوجوان کا نام خرم شہزاد تھا اور اُس کے
حال سے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ زہرا تو ٹھیک طرح سے انہیں آداب بھی نہیں کہہ پائی۔ پولیس کی
ابتدائی تفتیش کے مطابق بظاہر یہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کا کیس تھا، جس میں سراسر غلطی زہرا کی تیز رفتاری
اچانک بریک تھی لیکن خرم کے والد نے پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے سے روک دیا تھا۔ وہ خود بھی شہر
ے بڑے متمول تھے اور براہِ راست زہرا کے والد حاجی مقبول کو نہ جاننے کے باوجود، وہ اُن کے بڑے خاندان
رُتبے سے واقف تھے۔ خرم نے بھی پہلی مرتبہ ہوش میں آتے ہی پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ غلطی زہرا کی
یں تھی، وہ خود ہی نہایت تیز رفتار کا عادی تھا۔ زہرا کے والدین کو بھی اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ اگر
رم کا خاندان جذبات میں آکر زہرا کے خلاف کوئی شکایت درج کرا دیتا تو انہیں اپنی بیٹی کی بے گناہی ثابت
کرنے کے لیے کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور معاشرہ کس کس انداز میں انہیں اپنے تیروں کا نشانہ بناتا،
یکن یہ اُن کی بھی خوش قسمتی تھی کہ اُن کا پالا ظرف والوں سے پڑا تھا۔ ہاں مگر اگلے کے ظرف کا بوجھ اُٹھانا بھی
صرف ظرف والوں ہی کا خاصہ ہے۔ جبھی تو زہرا کے والدین بھی گزشتہ تین روز سے خرم کے پرائیویٹ وارڈ
کے دروازے سے لگے کھڑے تھے مگر جن کا جوان بیٹا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا ہو اُن کا دُکھ کوئی کیا
اپنے.....؟ خود خرم کی اپنی دنیا ہمیشہ کے لیے لٹ چکی تھی، وہ تیز رفتار کا دل دادہ اور زندگی سے بھی ایک قدم
آگے چلنے کا عادی تھا، مگر وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ اپنے قدم ہی کھو بیٹھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی زندہ دلی اور
ہمت پر کہ اُس نے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کا خوب حق ادا کیا اور اپنے ہونٹوں کی ازلی مسکراہٹ کو
لوں سے جُدا نہیں ہونے دیا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ٹوٹ گیا تو پھر اُس کے ماں باپ کی کرچیاں بھی
کوئی نہیں سنبھال پائے گا۔ لیکن ابھی کسی اور کے من آئینے میں دراڑ آنا باقی تھا۔ قدرت جب زندگیاں بدلنے

کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر ہر دعا بد دعا میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ خرم نے پہلی تنہائی پاتے ہی زہرا کو بتا دیا کہ
پچھلے کئی ہفتوں سے صرف زہرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں اُس کی کوٹھی کے چکر کاٹتا رہا ہے۔ خ
نے زہرا کو پہلی مرتبہ کتابوں کی ایک بڑی نمائش میں غالب اور میر میں گھرے دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا
زہرا کا نقاب سے جھلکتا خیرہ کن حسن اُس کے دل پر بجلی کی چمک کی طرح کوندا اور پل بھر میں ہی سب بھسم
گیا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ خرم کی اُس پہلی نظر کا انجام اُس کی ازلی معذوری کی صورت نکلے گا۔ خرم کی حالہ
حادثے کے دن سے لے کر اب تک بنتی بگڑتی رہی تھی۔ خون کے حد سے زیادہ اخراج اور پھر ایک طو
آپریشن نے اُس کی رگوں سے جان کھینچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن زہرا کو دیکھتے ہی اُس کے اندر
سے جینے کی خواہش جاگ اُٹھتی تھی اور پھر ایسے ہی ایک لمحے میں جب نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں خرم نے زہرا
اُس کا سدا کا ساتھ مانگ لیا۔ فیصلہ کرنے کی آزادی بہر حال زہرا کو میسر تھی اور خرم نے ''نہ'' کا حق بھی اُ
تفویض کر دیا تھا، لیکن کبھی کبھی یہ حق اور یہ ''اختیار'' خود انسان کے لیے سب سے بڑی زنجیر بن جاتا ہے۔ ز
ابھی خرم کو یہ بتا بھی نہیں پائی تھی کہ اُس کی رُوح پہلے ہی ساحر کی راہ میں پلکیں بچھائے منتظر ہے کیوں کہ خر
بنتی بگڑتی حالت کو قرار نہ تھا۔ زہرا نے خود کو گھر میں بند کر لیا۔ خرم کی معذوری ہی زہرا کی سب سے بڑی مجبو
بنتی چلی گئی، کیوں کہ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں اُس کی اس حالت کا ذمہ دار خود ہی کو سمجھتی تھی حالانکہ خرم نے
اپنے والدین سے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اپنی اس معذوری کے بعد وہ خود کو کسی طور بھی زہرا کے قابل نہیں
اور زہرا کے انکار کا اُسے صدمہ ضرور ہوگا پر اچنبھا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی بھی لڑکی عمر بھر کے لیے کسی مع
کی بیساکھیاں بننا پسند نہیں کرے گی۔ زہرا تک خرم کے یہ خیالات بھی خرم کی ماں کے وسیلے ہی سے پہنچے
زہرا یہ چاہتی تھی کہ وہ خرم کو اُنہی کے ذریعے یہ پیغام پہنچائے کہ اُس کی ''نہ'' کی وجہ خرم کی معذوری نہیں
''اور'' ہے۔ لیکن کچھ پیغام ہمیشہ ہونٹوں میں دبے اور کچھ باتیں ہمیشہ اَن کہی رہ جاتی ہیں۔ اس سے پہ
زہرا انہیں کچھ بتا پاتی، خرم کی ماں نے اُس کی تازہ طبی رپورٹ زہرا کے سامنے رکھ دی جس میں واضح در
کہ خرم کی پوری صحت یابی اب دوا سے زیادہ اُس کی قوت ارادی پر منحصر ہے اور خرم کی ماں کو یہ پتا تھا کہ اُ
بیٹا اب زندگی کی طرف تبھی لوٹ پائے گا، جب اُسے دوسرے کنارے پر زہرا اپنا انتظار کرتی ملے گی، ور
کا بخار اب اُس کی سانس کے ساتھ ہی ٹوٹے گا۔ خرم کا پیغام آئے آج ساتواں دن تھا اور اتنے ہی دن خ
مسلسل اور لگاتار حرارت ہونے کو آئے تھے۔ ابھی زہرا اسی شش و پنج میں تھی کہ ہسپتال سے خرم کی والد
لیے جلد پہنچنے کا پیغام آ گیا کیوں کہ خرم کی سانس پھر سے اُکھڑنے لگی تھی۔ وہ سب بھاگم بھاگ ہسپتال
اس ابتر حالت میں بھی زہرا کو اپنے سامنے دیکھ کر خرم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کمرے سے نکلتے ہی خ
ماں سسک پڑی اور اُس نے زہرا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ زہرا نے روتے ہوئے اُن کے
ہاتھ کھول کر اپنے مقدر کے سبھی دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے۔ زہرا کے والدین کے ہاتھ تو حا

لے دن ہی سے بندھے ہوئے تھے لیکن زہرا نے اپنے گھر والوں کے سامنے واحد شرط یہی رکھی کہ ماضی کے
نہری دھاگوں سے ناتا توڑنے کے لیے شہر والی کوٹھی چھوڑ کر مضافات والی حویلی میں بسیرا ڈالا جائے۔ پرانے
گھر کے نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ نئے ٹھکانے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ زہرا کے سامنے دو ہی
راستے تھے کہ ساحر کو یہ سب بتا کر اُس کے جنوں کو دیوانگی کی آخری حد تک پہنچا دے یا پھر خاموشی سے سب کچھ
سہہ کر ساحر کے ٹھیک ہو کر پلٹ آنے تک خود کو کہیں چھپا لے۔ بدگمانیوں کو اس حد تک ہوا دے کہ ہلکی آنچ
بھڑکتی ہوئی آگ میں بدل جائے اور ساحر سے ہر رشتہ جل کر بھسم ہو جائے۔ زہرا نے دوسرا راستہ اختیار کیا کہ
اس میں اُسے سب کا بھلا نظر آیا۔ لیکن نصیب تدبیر سے ہمیشہ ایک قدم آگے کی چال چلتا ہے کہ زہرا کا سامنا
ایک بار پھر ساحر سے ہونا بھی تو اسی مقدر نے طے کیا تھا۔ ''میں نے لرزتے ہاتھوں سے زہرا کا خط تہہ کیا۔ مجھے
خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب آسمان نے میرے آنسو دھونے کے لیے اپنی بوندوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ میں
برستی بارش میں درگاہ کے صحن میں بیٹھا بھیگتا رہا اور زہرا کی تحریر کے لفظ ڈھل کر صحن میں بہتے چلے گئے۔'' کاش
میرے نصیب کی تحریر بھی اتنی ہی کچی ہوتی کہ میرے آنسوؤں سے ڈھل جاتی۔ میرے ذہن میں پھر اُسی
مجذوب کی پیش گوئی گونجی ''تجھے خدا ہی ملے گا..... نہ وصالِ صنم.....''

دُھندلے اُجالے، اُجلے اندھیرے

زہرا کی تحریر نے ایک ہی پل میں میرے اندر کی ساری دنیا تلپٹ کر دی۔ سیدھ میں تو پہلے بھی کچھ نہ تھا مگر اس کاغذ نے رہا سہا بھی سب اُلٹ دیا۔ کبھی کبھی انسان کی برسوں کی ریاضت بھی بس ایک لمحے کی نذر ہو جاتی ہے، دل پلٹ جاتے ہیں اور ہمیں اس وقت تک کا سب کیا دھرا محض ایک بے مقصد مشق لگنے لگتا ہے۔ شاید انسانی سوچ میں آج تک جتنے بھی انقلابات رُونما ہوئے ہیں، وہ سب اِسی ایک لمحے کی کایا پلٹ کا کرشمہ ہیں۔ پھر کون طوفان سے لڑ کر ساحل تک پہنچے اور کون بدنصیب اس لمحے کا شکار ہو کر پُرسکون ساحل سے پیچھا چھڑا کر خود کو بپھرتے طوفانوں کے حوالے کر جائے، اپنی اپنی قسمت۔ میرا دل بھی پلٹ گیا۔ ایک لمحے میں میرے اندر یہ سوال شدت سے اُبھرا کہ آخر اس بے مقصد سفر کا حاصل کیا تھا۔ کیا قدرت نے یہ سارا کھیل زہرا کو خرم سے ملانے کے لیے کھیلا؟ کیا میرا کردار اس کہانی میں بس اس قدر تھا۔ میں نے زہرا کی تحریر کا آخری صفحہ پلٹا اور تب ہی اندر سے ایک تہ شدہ رقعہ گر پڑا۔ شاید کوئی اہم بات باقی رہ گئی تھی، جسے الگ سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اُسی بے خیالی میں رقعے کی تہ کھولی اور اندر لکھی تحریر نے میری رُوح کا آخری ریشہ بھی ادھیڑ دیا۔ یہ وہی نظم تھی، جو میں نے پاپا کے ہاتھ زہرا کو بھیجی تھی۔ میری نظر ڈبڈبانے لگی ''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....'' نظم میری اپنی، لیکن تحریر زہرا کی تھی۔ اُس نے دوبارہ وہی سطریں مجھے لکھ بھیجی تھیں۔ ''سنو..... تمہاری وفا پہ مجھ کو..... یوں تو پورا یقین ہے..... مگر.....'' میرے اندر کا شور بڑھتا گیا..... ''سو، گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے تو اُن راہوں سے نفرت نہ کرنا، جن پر کبھی ہم ساتھ مل کر چلے تھے.....'' تیز ہوا کا ایک جھونکا میری آنکھ سے بہتے آنسو کا رستہ بدل گیا.....؟ ''ان باتوں سے نفرت نہ کرنا جو کبھی ہم نے تنہائی میں کی تھیں..... اُن خوابوں سے نفرت مت کرنا..... جو کبھی ہم نے ساتھ مل کر دیکھے تھے.....'' مجھے ایک دم ہی وہ سب ہی تیر یاد آ گئے، جو میں نے یکے بعد دیگرے زہرا کے کومل وجود میں پیوست کر دیئے تھے ''بس مجھ سے..... اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ صرف میں..... اور بس میں ہی..... تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں.....'' ''نفرت..... چار حرفی یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر کتنی کاٹ، کتنے گھاؤ، کتنی جلن اور کتنی چبھن چھپائے رکھتا ہے، اس کا ادراک مجھے ٹھیک اُسی لمحے ہوا تھا۔ لیکن نفرت، زہرا سے نفرت..... یہ اُس نے کیسے سوچ لیا.....؟ وہ تو میرے خون میں رنگ بن کر بہتی تھی، تو کیا کوئی خود سے بھی نفرت کر سکتا ہے۔ جن کے اپنے سپنے سچ نہیں ہوتے، وہ دوسروں کے خوابوں کو تعبیر دینے کا فریضہ انجام نہ دیں تو پھر بھلا اور کیا کریں۔ زہرا بھی تو یہی کر رہی تھی لیکن میرے

خواب، اُن کی تعبیر کیا ہوئی۔ سچ ہے کہ تعبیریں بھی ہر کسی کا مقدر نہیں ہوتیں۔ ساری رات میں برستی بارش میں زہرا کی تحریر اپنے ہاتھ میں لیے گم صم بیٹھا رہا۔ تیز بارشیں کاغذ کی تحریر تو دھو ڈالتی ہیں، مگر مقدر کے لکھے بھلا بہتے پانیوں سے کب دُھلے ہیں۔ اگلی صبح کی پہلی اُجلی کرن کے ساتھ ہی بختیار اپنے چہرے پر زمانے بھر کے اندھیرے سجائے درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کا انداز ہیجانی تھا "میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کسی جھمیلے میں پڑے بنا ہی میرے لیے دُعا کر ڈالیں۔ آپ نے دیر کر دی اور جانتے ہیں اب کسی نے سائرہ کی آنکھوں میں بصارت پانے کا خواب بھر دیا ہے۔" میں نے چونک کر بختیار کی جانب دیکھا، لیکن میں اُسے یہ کہہ نہیں پایا کہ کون جانے کہ یہ "دیر" بھی قدرت نے کسی اور کے لیے طے کر رکھی ہو۔ اور بختیار صرف ایک مہرہ ہو۔ سائرہ کی کہانی کو انجام کے قریب لانے کا ایک بہانہ ہو۔ بختیار اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کوئی اور نوجوان مجسمہ ساز ہے، جو آج کل بڑی تن دہی سے سائرہ کی بے بینا آنکھوں کے لیے کسی جڑواں پتلی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اُس کا آج کل زیادہ تر وقت سائرہ کی آرٹ گیلری ہی میں گزرتا ہے۔ وہ جوان ہے۔ خوبصورت اور متاثر کن شخصیت کا مالک ہے۔ اور دن بدن سائرہ کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہے۔ بختیار کی پریشانی اُس کے چہرے سے واضح تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آج یا کل سائرہ کو اُس کی بصارت واپس مل ہی جائے گی اور تب وہ اپنے حصے کی اُس نظر کو کھو دے گا، جو عمر بھر کی کھوج کے بعد اُس کا مقدر بنی ہے۔ میری اپنی حالت، رات بھر بارش میں بھیگتے رہنے کے بعد اس وقت تک اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ مجبوراً مجھے بختیار سے معذرت کرنی پڑی کہ ہم اس ملاقات کو کسی اور وقت پر ٹال رکھیں تو اُس کی بڑی مہربانی ہوگی۔ وہ خود بھی میری آنکھوں کی سرخی دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے واپس پلٹ گیا۔

شام تک میرا جی اس بُری طرح گھبرانے لگا کہ میرے لیے درگاہ میں ٹکے رہنا ناممکن ہو گیا اور پھر جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے خود کو ساحل کی نم ریت پر چلتے پایا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چند بچے بیٹھے ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل کھیل رہے تھے، اس بات سے بے خبر کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں کچھ ہی دیر میں سمندر کی لہریں آگے بڑھ کر اُن کے گھروندوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔ پھر مجھے ایک عجیب سا خیال آیا کہ بنانے والے کو بنانے سے کام اور اُجاڑنے والے کو اپنے فرض سے سروکار ہوتا ہے۔ جو بنتا ہے اُسے اُجڑ ہی جانا ہوتا ہے، وقت کی کمی یا زیادتی تو بس اضافی ہے۔ اچانک دائیں جانب سے کچھ آوازے کسے جانے اور پھر کسی کی غصے سے بھری ڈانٹ ڈپٹ اور دھتکار کی آوازیں سنائی دیں۔ دُور ایک ٹیلے کے پاس کچھ بچے کسی عمر رسیدہ شخص کو شاید اُس کے عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے۔ اور وہ بوڑھا انہی کی طرف دیکھتے ہوئے بکتا جھکتا چلا آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُسی شرارتی ہجوم کی طرف تھا لہٰذا چلتے ہوئے اُسے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا۔ عقب سے زوردار قہقہے بلند ہوئے اور میں تیزی سے اُس فقیر کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ایک گرج دار آواز آئی "ہٹ جا میرے سامنے سے..... جو خ

گرے ہوں، وہ دوسروں کو سہارا بھلا کیا دیں گے.....؟'' بوڑھے کا چہرہ گرنے کی وجہ سے ریت اور مٹی سے لت پت تھا۔ اُس نے زور سے اپنی دراز لٹوں کو جھاڑا اور مجھے یوں لگا کہ زمانے بھر کی گرد سے میرا وجود اَٹ گیا ہے۔ یہ تو وہی مجذوب تھا، جو مجھے تھانہ ماہی کی حوالات میں ملا تھا، لیکن میں اُسے یہاں اپنے شہر کے ساحل پر یوں پالوں گا، یہ تو میرے گمان کی آخری حدوں سے بھی پرے کی سوچ تھی۔ میری لڑکھڑاتی زبان سے بس اتنا ہی نکل سکا ''آپ..... یہاں..... کیسے.....؟'' مجذوب نے بے نیازی سے قدم آگے بڑھائے ''فقیروں کے لیے زمین کبھی تنگ نہیں پڑتی۔ تیرے لیے اگر شاندار بحری جہاز بھیجا گیا تھا، تو کوئی ٹوٹی کشتی میرے لیے بھی تو آسکتی ہے۔'' میں نے جلدی سے اُس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ ''آپ ہمیشہ آدھی بات کہہ کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ آج میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے.....'' میں نے قدم بڑھا کر مجذوب کا راستہ روک لیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ شدید غصے کے عالم میں وہ زمین سے کوئی پتھر اُٹھا کر مجھے دے مارے گا۔ وہ جونہی غصے سے زمین پر جھکا، میں نے کسی متوقع گھاؤ کی اُمید میں آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ لیکن وہ ہنس پڑا ''تو کیا سمجھتا ہے تیری یہ ضد تجھے پار لگا دے گی۔ کبھی نہیں۔ ضد چھوڑ کر عاجز بن جا۔ عشق میں ضد نہیں چلتی۔'' ''میرے پاس ضد کرنے کے لیے بچا ہی کیا ہے.....؟'' میرے جواب پر مجذوب پھر سے غصے میں آ گیا۔ ''بس، یہی تو تیری ضد ہے۔ جو تیرا ہے ہی نہیں، اُسے اپنا سمجھنے کی زبردستی نہ کر۔ کب سے خاک چھان رہا ہے، ان درگاہوں اور ویرانوں کی۔ تجھے سمجھاتے سمجھاتے وہ اللہ کا بندہ بھی رُخصت ہوا، پر تیری عقل میں یہ بات نہ آئی۔'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا، وہ ضرور سلطان بابا کی بات کر رہا تھا۔ میں اپنی آواز کو اُونچا ہونے سے نہیں روک پایا۔ ''ہاں، انہوں نے بھی مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اگر میری ناؤ کھینا ہی تھی تو یوں بیچ بھنور میں تنہا تو نہ چھوڑتے۔ اب میں کہاں جاؤں.....؟'' مجذوب نے مجھے ڈانٹا۔ ''لڑکے! جو جتنی سانسیں لکھوا کر لاتا ہے، وہ اُتنا ہی جیتا ہے۔ مجھے، تجھے، ہم سب کو واپس جانا ہے۔ اُس کا وقت پورا ہو گیا تھا، وہ چلا گیا۔ یاد رکھ، یہاں سب فانی ہے۔'' میرے اندر کا شور پھر سے باہر کو اُمڈ آیا۔ ''ٹھیک ہے، تو پھر آپ میری فنا کی دُعا تو کر سکتے ہیں۔ جب راستے ہی اتنے دُھندلے ہو گئے، تو پھر منزل کی توقع بھی کیوں رکھوں؟'' مجذوب نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا..... ''فنا تو تو کب کا ہو چکا۔ چل، اب میرا رستہ کھوٹا نہ کر۔ ابھی بہت کام ادھورے پڑے ہیں۔'' میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کے روؤں۔ اتنا بے بس ولاچار، میں نے خود کو آج تک کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں مجذوب کے راستے سے ہٹ گیا، لیکن شدید ضبط کے باوجود میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر زمین کو بنجر کر گیا۔ مجذوب قدم اُٹھا چکا تھا، لیکن میری بھیگی آنکھیں دیکھ کر یک دم نہ جانے اُسے کیا ہوا اور وہ تیزی سے پلٹا ''روتا کیوں ہے پگلے، پہلے ہی تیرے آنسوؤں نے چاروں طرف آگ لگا رکھی ہے۔ اب اور کس کس کو جلائے گا.....؟'' پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر میں اپنی رُوح سے چھلکتے اس نمکین سمندر پر مزید کوئی بند نہ باندھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کچھ دیر پہلے پتھر بنا وہ مجذوب اب

ے یوں چپ کرا رہا تھا جیسے کوئی کسی چھوٹے بچے کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آس پاس سے گزرتے لوگ رت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک پروانہ کسی دیوانے کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ شاید لوگوں کو یہ پہچاننے ں دشواری ہو رہی ہوگی کہ ہم دونوں میں سے قیس کون ہے اور فرہاد کون.....؟'' میں نے کہا تھا نا، تو بہت دی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے تجھ سے ایک ملاقات ضرور ہوگی۔ اب واپس چلا جا۔ وہ بزرگ نا تیری راہ تکتا ہوگا اور ایک بات یاد رکھنا۔ تو جس خدا کو ان درگاہوں اور ویرانوں میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ رے اندر موجود ہے۔ تیری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ ان پتھر کی بے جان عمارتوں سے نکل اور خود کو ریافت کر..... تیری اسی دریافت کے لیے سلطان نے تجھے یہاں سے نکالا اور اپنے ساتھ لیے در بدر کی ٹوکریں کھائیں۔ پر تو آخر کار پھر وہیں آ ٹھہرا، جہاں سے چلا تھا.....'' میں ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا اور مجذوب پنی ہی دُھن میں نہ جانے کیا بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ذہن میں نہ جانے کتنے سوالات کی قطار لیے جب میں درگاہ پہنچا'' تو مولوی خضر پریشان سے، میری لاش میں نکلنے ہی کو تھے۔ ''کہاں رہ گئے تھے میاں! شام ڈھلے لوٹے ہو''۔ ''کون جانے، واپس لوٹا بھی ہوں پھر خود بھی اس شام کے ساتھ کہیں ڈھل آیا ہوں۔'' مولوی خضر چونکے ''کوئی خاص بات.....؟'' میں نے نہیں مجذوب سے ملاقات کا تمام احوال سنا دیا اور یہ بھی بتایا کہ یہ میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ مولوی خضر بہت یر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ مجبوراً مجھے ہی یہ سکوت توڑنا پڑا۔ ''بتائیں نا، ان درگاہوں کا اسرار کیا ہے؟ ہمارا ٹھکانہ زیادہ تر یہیں کیوں طے ہے.....؟ اور رہبانیت کی حدیں کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہم ان ویرانوں میں رہ کر خدا سے دُور ہو رہے ہیں یا اُسے پا رہے ہوتے ہیں.....؟'' مولوی خضر کچھ دیر تک میرے چہرے پر جیسے کچھ ٹٹولتے رہے۔

''رہبانیت کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب تنہائی کی مکڑی دل کی دیواروں پر خود پسندی کے جال بننا شروع کر دیتی ہے۔ انسان حقوق العباد سے بیگانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کو پانے کی چاہ میں، اُس کے بندوں کو کھونا شروع کر دیتا ہے۔ سارا فیض خود اکٹھا کر لینا چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی مخلوق کو بے فیض رکھتا ہے۔ ایک ایسا پھل دار درخت بن جاتا ہے، جس کے ثمر سے عام شخص بے بہرہ رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس تمہاری ساری تربیت حقوق العباد کی ادائیگی کی اوّلیت کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ وہ مجذوب نہیں تھا۔ وہ اللہ کے انتہائی تربیتی بندوں میں سے کوئی ایک ہوگا، جو اتنی بڑی بات کہہ گیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ یہ درگاہیں اگر مستند ہوں تو بس اللہ کے نیک بندوں کی آرام گاہیں ہوتی ہیں۔ کسی کی تقدیر بدلنے کا اعجاز بھلا کسی مقبرے کو کہاں.....؟ تقدیر صرف دُعا سے بدل سکتی ہے اور کون جانے کہ ان درگاہوں پر مانگی گئی وہ دُعائیں جو قبولیت کا شرف پا گئیں وہ اُس کامل یقین کا انعام ہوں، جو دُعا مانگتے وقت سائل کے دل میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ خدا ویرانوں میں رہ کر دل کے زیادہ قریب ہوتا ہے، نہ ہجوم میں دل سے دُور..... وہ ہر حال میں ہماری دھڑکن کی

طرح ہمارے اندر موجود رہتا ہے.....'' میرے اندر مچلتے سوال باہر آنے لگے..... ''تو پھر میں اُسے اپنی شہ رگ سے زیادہ قریب کیوں نہیں محسوس کرتا۔ مجھے اُسے محسوس کرنے کے لیے یوں در بدر کی خاک کیوں چھانن رہی ہے.....؟ کیا یہ میرے اندر کے ایمان کی کمزوری ہے۔'' ''نہیں میاں! یہ درجہ بندی تو بس وہی جانتا ہے سب ہی کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر ہے۔ تمہارا راستہ زہرا کے گھر کی پگ ڈنڈی سے ہو کر گزرا ہے تو یہ اُسی کی مرضی ہے۔ بس، اتنا جان لو کہ اگر عشق مجازی کی ناکامی رہبانیت کی پہلی سیڑھی بن سکتی ہے تو قدر چاہے تو یہ ناکامی کسی کی کایا بھی پلٹ سکتی ہے۔'' مولوی خضر جاتے جاتے رُک گئے اور پلٹ کر بولے ''تمہارے آخری سوال کا جواب مجھ پر اُدھار رہا۔ ہم اپنی درگاہوں اور ویرانوں میں ٹھکانہ کیوں کرتے ہیں وقت آنے پر حقیقت بھی تم پر کھل جائے گی..... اور آج مجھے وہ وقت بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔'' میرے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گئے اور میں ساری رات اسی ادھڑ بن میں مبتلا رہا کہ میں زہرا کی تلاش یا عشق حقیقی کی راہ پر چل پڑا تھا یا اللہ کی راہ سے بھٹک کر دنیاوی محبتوں کے جال میں اُلجھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر کے ساحر اور عبداللہ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ ساحر، عبداللہ کو دوغلے پن کا طعنہ دیتا تھا بظاہر اللہ کی راہ کھوجنے والا اب بھی اُسی محبت کی کھوج میں در بدر ہے، جس محبت نے ساحر سے اُس کی شناخت چھین کر اُسے عبداللہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اور عبداللہ کو ساحر سے یہ گلہ رہتا کہ وہ بار بار سامنے آ کر عبداللہ کی کھوٹی کر جاتا ہے۔ اگر ساحر کو زہرا نہیں ملی تو اس میں عبداللہ کا کیا قصور.....؟ گر ساحر، زہرا کو نہ پا سکا تو انتقاماً عبداللہ کے راستے میں کانٹے تو نہ بچھائے.....

صبح تک میرے اندر کی یہ جنگ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ مجھے یوں لگنے لگا کہ میرے اندر وین اور میں بٹی ہوئی یہ دُہری شخصیت کٹ کر دو حصوں میں دائیں بائیں گر جائے گی۔ آخر کار، جیت ساحر کی ہی ہوئی اور طے پا گیا کہ اس دنیا میں قدم رکھنے کا واحد مقصد اگر زہرا کی محبت کا حصول تھا تو یہ کمند تو لب بام ہی ٹوٹ چکی لہٰذا اب عبداللہ کو میرے اندر سے رُخصت ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر اس سال بھر سے زائد کے عرصے میں بھی وہ عبداللہ میرے اندر کے ساحر کی جگہ نہیں لے سکا تو اب اُسے ساحر کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ ٹھیک ہے ساحر، زہرا کو نہیں پا سکا مگر عبداللہ بھی تو زہرا کی چاہت کو ساحر کے دل سے نہیں مٹا پایا۔ ''مات'' اگر ساحر کے عشق مجازی کا مقدر بنی تو ''جیت'' عبداللہ کے عشق حقیقی کا نصیب بھی نہیں بن پائی۔ میرے دل میں یہ احساس پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ میرا عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں ہی ایک دوسرے کی راہ کا کانٹا بن چکے ہیں اور دونوں کی بیک وقت موجودگی اب میرے اندر کے طوفانوں کو کبھی تھمنے نہیں دے گی۔ زہرا کا نام کسی اور سے جڑنے کو تھا مگر میرا یہ پاگل دل اب بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرا یہ جنوں اس عفت مآب کسی رُسوائی کا سبب بنے مجھے اس شہر ہی سے کہیں دُور چلے جانا چاہیے کیوں کہ میرے دل کا معاملہ زیادہ تک ان دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور یہ ظاہر پرست دنیا تو بس تیروں سے چھلنی کرنا ہی جانتی ہے

میرے ذہن میں ابھی سے آنے والے وقت کی صدائیں گونجنے لگیں۔ ''ذرا دیکھو تو..... ان درگاہوں کی آڑ میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا ہے.....'' ''ہونہہ! حلیہ تو بڑا مذہبی بنا رکھا ہے اور دل کے اندر کتنا بڑا چور چھپائے بیٹھا ہے۔'' ''توبہ ہے بھئی، ان جیسے لوگوں ہی نے مذہب کا نام بدنام کر رکھا ہے۔'' ''یہ شخص تو نرا کافر ہے۔ ماتھے پر محراب سجائے ایک لڑکی کے عشق میں دیوانہ بنا پھرتا ہے۔'' ''اِسے تو سنگسار کر دینا چاہیے..... یہ ایمان کے دائرے سے خارج ہو چکا ہے۔'' میں نے گھبرا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی سماعتیں سلب کر لینا چاہیں لیکن کان بند کر لینے سے رُوح کی سماعت بھلا کب چوکتی ہے۔ میں نے آسمان پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ یا تو میرے اندر اپنی محبت کو اس قدر بھر دے کہ دنیا کی سبھی محبتیں چھلک کر باہر جا گریں اور یا پھر میرے ادھورے مجازی عشق کو مکمل جنون میں بدل دے تاکہ خود کو بھی بھول جاؤں۔ مجھے دودھاری تلوار پر نہ چلا میرے رب جو بھی بخشنا ہے، پورا بخش دے۔ آدھے مذہب اور آدھی دنیا میں سے کسی ایک تو مکمل کر دے۔ ورنہ یہ آدھے جنوں اور آدھا فراق مجھے ریزہ ریزہ کر ڈالے گا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اپنے اندر کے ساحر کی موجودگی میں اپنے بقیہ نصف کے حق دار، عبداللہ سے یہ منافقت کا کھیل اب ختم کر دینا چاہیے۔ مجھے مولوی خضر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سلطان بابا کی جان نشینی کا تاج اور درگاہ کی ذمہ داری کسی اور کے حوالے کرنے کی درخواست کر کے خود پہلی فرصت میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میری بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ نہ میں ساحر رہا اور نہ ہی عبداللہ بن سکا۔ عبداللہ کے لقب نے مجھے پورا ساحر نہ رہنے دیا اور زہرا کی محبت نے مجھے مکمل عبداللہ نہ بننے دیا۔ لیکن میں ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ ہم عشق مجازی کی آنچ اپنے دل میں قائم رکھتے ہوئے بھی عشق حقیقی کو کیوں نہیں پا سکتے۔ بیک وقت دونوں حدوں کو اپنے وجود میں محسوس کرنے والا دنیا کی نظر میں منافق اور گناہ گار ہی کیوں ٹھہرتا ہے، جب کہ دونوں ہی معاملوں میں اختیار کا حق کسی اور کے پاس ہے اور مجھ جیسا کمزور انسان تو مکمل بے بس ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اختیار رکھتے ہوئے بھی اس اختیار سے نابلد ہوتے ہیں، ورنہ قدرت کبھی کسی ناکردہ جرم کی سزا تو نہیں دیتی۔'' کہہ جانے میں مزید کتنی دیر خود ہی کو اُدھیڑتا رہتا، اگر بختیار کی آواز میرے خیالات کا تسلسل توڑ نہ دیتی۔ ''کہہ کھوئے ہوئے ہیں جناب! دخل اندازی کی معذرت چاہتا ہوں.....'' سچ یہ ہے کہ اس وقت بختیار کی آمد کسی غیبی امداد سے کم نہیں لگی۔ کبھی کبھی جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے بھی اُکتا سے جاتے ہیں، تب ا میں کسی تیسرے آئینے کی موجودگی ہمیں خود اپنی شبیہہ سے چھٹکارا دلا جاتی ہے۔ لیکن خود بختیار کا کانچ کرچی کرچی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے نہایت پریشانی اور دُکھی دل سے مجھے بتایا کہ آخر کار اُس نوجوان ڈ ساز نے سائرہ کی جڑاؤ آنکھ کی پتلی ڈھونڈ لی ہے اور اِسی ہفتے وہ سائرہ کا آپریشن کروانے کا منصوبہ بھی ہے۔ سائرہ بھی بصارت پانے کے خیال سے بے حد خوش ہے اور پل پل گن کے دن کاٹ رہی ہے۔ اُ اس بات کی سب سے زیادہ خوشی ہے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد اپنے محسن اور مربی بختیار کو بھی دیکھ سکے

جس نے اُس کے فن کو ملک بھر میں پھیلانے کی ٹھان رکھی تھی، لیکن خود بختیار کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی صورت دیکھتے ہی سائرہ کی نظر پلٹ جائے گی اور وہ اپنے نوجوان رفیق کے ساتھ مل کر اُسی طرح اُس کا تمسخر اُڑائے گی، جیسے آج تک باقی ساری دنیا اُڑاتی رہی ہے۔ میں نے تحمل سے اُس کی ساری بات سنی۔ ''مجھے افسوس ہے اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے درگاہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا اگر میری دُعا میں خدا نے کوئی تاثیر رکھی بھی تھی تو وہ اس فیصلے کے ساتھ ہی ختم ہو جانی چاہیے۔'' بختیار ہکا بکا سا رہ گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ منزل پہ پہنچ کر پھر سے رختِ سفر کیوں باندھ رہے ہیں؟ ایسا نہ کریں خدارا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی ''کچھ لوگوں کا مقدر سدا مسافت ہی رہتا ہے۔ اُن کے نصیب میں منزل کا سکون نہیں ہوتا۔ وہ بھی آپ کی طرح سدا 'فریفتہ' ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی اس فریفتگی کے ساتھ پھر سے دنیا کی اس بے چین بھیڑ میں کھو جانا ہے۔'' جانے کیوں میری بات سن کر بختیار کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی، اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا ''کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا، لیکن میں تو خود بھکاری ہوں۔ اور آج آپ سے ایک آخری دُعا کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ کیا آپ جاتے جاتے میرے حق میں ایک آخری دُعا بھی نہیں کریں گے.....؟'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ دُعا صرف انسان کے اپنے کامل یقین سے پوری ہوتی ہے، لیکن آپ کہتے ہیں تو یونہی سہی.....'' میں نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور بختیار کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں چرا کر بولا ''آپ دُعا کریں کہ میرا رقیب مر جائے.....'' میرے اندر ایک دھماکا سا ہوا اور میرے ہاتھ نیچے گر گئے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں کسی کی موت کی دُعا کیسے کر سکتا ہوں؟'' بختیار روہانسا ہو گیا۔ ''تو پھر آپ یہ دُعا کریں کہ سائرہ کو بصارت ملنے سے پہلے میں مر جاؤں۔ آپ نہیں جانتے، رقیب لفظ کی دھار ہی کسی دل جلے کے جگر کو پار کرنے کو کافی ہے۔ رقیب سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ نہ ہی رقابت سے بڑا کوئی دوسرا عذاب ہے۔'' میں چونک گیا۔ میری نظر میں خرم کا چہرہ گھوم گیا۔ میں بختیار کو کیا بتاتا کہ اس زہر کی کڑواہٹ سے آشنا، مجھ سے زیادہ بھلا اور کون ہوگا۔ مولوی خضر کے ہمارے طرف چلے آنے کی وجہ سے بختیار زیادہ دیر تک وہاں ٹک نہیں پایا، لیکن جاتے جاتے بھی اُس نے اشارے سے مجھے یاد دہانی کروا دی کہ مجھے اُس کے لیے کوئی ''منت'' مانگنی ہے۔ مولوی خضر نے اس کے پلٹتے ہی مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ''گویا تمہاری دُعا کی تاثیر پر لوگوں کو اعتبار ہونے لگا ہے۔'' میں نے اُن کی آنکھوں میں جھانکا ''کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ میری دُعا سن لے گا۔ جب کہ خود آپ ہی نے مجھے بتایا کہ ان جگہوں پر مانگی گئی زیادہ تر دُعائیں خود سائل کے کامل یقین کی بنیاد پر قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم یہاں آ کر دُعا کے لیے فریاد کرنے والوں کو براہِ راست یہ کلیہ کیوں نہیں سکھا دیتے کہ اِسی اعتماد کے ساتھ وہ اپنی چوکھٹ پر بھی ماتھا رگڑیں گے تو خدا اُن کی ضرور سنے گا۔ اس میں ہم جیسوں کا یا ان درگاہوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔'' ''ٹھیک کہتے ہو میاں..... لیکن اگر ایک شخص اتنی دُور چل کر، اس اُمید میں یہاں تک پہنچا ہے کہ تم اُس کے لیے دو گھڑی ہاتھ اُٹھا کر اللہ

ے دُعا مانگ لو گے تو ایسی دُعا میں بھلا کیا حرج ہے؟ ہوسکتا ہے اللہ ہم گناہ گاروں کی صرف اس لیے سن لے
ہ اُس کا ایک مجبور بندہ دُعا کی آس میں اتنی دُور چل کر آیا ہے۔ کون جانے اُس کی دُعا کی قبولیت گھر بیٹھے نہ
ھی ہو۔ یہاں تک چل کر آنے کی سعی کے بعد ہی لکھی ہو۔ اور کبھی کبھی خدا اپنے کسی خاص بندے کی دُعا میں
ر بھی ڈال دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے، عبداللہ میاں بھی اُنہی خاص بندوں میں سے ایک ہوں۔'' مولوی خضر میرا سر
پتھپا کر مسکراتے ہوئے ظہر کی نماز کے لیے چل دیئے۔ ''دفعتاً مجھے درگاہ کے دروازے کے پاس سے مجذوب
ی آواز سنائی دی ''اپنی رُخصت کا وقت ہوگیا ہے لڑکے! تجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سو، آگیا ہوں۔'' میں
لدی سے باہر نکلا تو وہ سیڑھیوں سے پرے کھڑا تھا ''آپ کہاں جارہے ہیں؟'' اُس نے سر جھٹکا ''سب ہی کو
یک دن جانا ہے، تو بھی تو جارہا ہے.....'' میں چونکا، وہ اپنی دُھن میں بولتا رہا۔ ''بس ایک بات یاد رکھ، لڑنا
چھوڑ دے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ صرف اپنا ماتھا ہی پھوڑے گا اور کچھ نہیں۔'' میں نے زخمی نگاہ اُٹھائی ''اپنی پیشانی
ی پرواہ نہیں ہے مجھے۔ ہاں اس گھاؤ سے اُڑتے خون کے چھینٹے کسی کے اُجلے دامن کو داغ دار نہ کردیں، بس
س بات کا ڈر ہے۔ اِسی لیے جارہا ہوں۔'' مجذوب نے غور سے مجھے دیکھا، اتنا بُزدل دکھائی تو نہیں دیتا۔ تو تو
دوسروں کو بھسم کرنے والوں میں سے تھا، پھر خود جل کر راکھ کیسے ہوگیا؟'' ''میں تو سدا کا 'راکھ' تھا۔ پتا نہیں،
یہاں کے لوگوں نے مجھے چنگاری کیسے مان لیا.....؟'' میری کپکپاتی آواز نے جانے اُس پر کیسا اثر کیا کہ وہ
جلال میں آگیا'' تو کہے تو ابھی فیصلہ کرادوں، تجھے دنیا چاہیے نا..... جا میرے مالک نے آج سے دنیا تیرے
نام کردی۔ وہ تجھے مل جائے گی، لیکن اب کی بار چوکا تو پھر کبھی فریاد نہ کرنا۔ وہ تجھ سے صرف ایک بددُعا کی
دُوری پر ہے۔ تجھے اُوپر والے سے یہی گلہ تھا نا کہ اُس نے تجھے آدھا دین اور آدھی دُنیا کیوں دی۔ جا..... آج
سے تیری دنیا پوری کردی گئی ہے۔ اب آگے تیری اپنی ہمت ہے۔'' مجذوب ایک جھٹکے سے مڑا اور مزید کچھ
کہے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے سب قضا ہوگیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے درگاہ لوٹ آیا، جہاں
مولوی خضر پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے ''خرم کے گھر سے پیغام آیا
تھا میاں! اُس کی حالت گزشتہ رات سے کافی ابتر ہے۔ جانے اُس کے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی ہے کہ وہ
اگر صحت یاب ہوگا تو صرف تمہاری مسیحائی سے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہاں جانا چاہیے۔'' میرے ذہن میں
مجذوب کی آواز گونجی ''وہ صرف ایک بددُعا کی دُوری پر ہے.....'' میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اچانک
درگاہ کے دروازے سے خرم کی ماں بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں۔ جانے کیوں اُن کی حالت دیکھ کر میں
پہلی مرتبہ خوف زدہ ہوگیا۔ خرم کی والدہ میری جانب لپکیں۔ ''جلدی چلو، عبداللہ بیٹا..... خرم کی سانسیں اکھڑ
رہی ہیں۔ میرے بچے کو اب صرف تم ہی بچا سکتے ہو۔'' میری نظر مولوی خضر کی نظر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا،
مجذوب کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔

''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا''

خرم کے گھر کی جانب جاتے ہوئے، تمام راستے مجھے مجذوب کی کہی باتوں کی بازگشت نے گھیر رکھا
پھر خرم کے سرہانے زہرا کو کھڑے دیکھ کر میرا دم اٹکنے لگا۔ اُس کی موجودگی میں تو اکثر میں سانس لینا بھی بھ
جاتا تھا۔ کسی بیمار کے لیے دعا کیا خاک کر پاتا؟ جانے کس مشکل سے میں نے اپنے حواس یک جا کیے۔ خرم
حالت واقعی بہت خراب تھی۔ پتا چلا طبی تشخیص کے مطابق حادثے کے بعد اگرچہ خرم کو فوری طور پر آپریشن تھ
پہنچا دیا گیا تھا، لیکن تمام احتیاط کے باوجود، جسم میں پھیلتا زہر اپنا اثر دکھا دیا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونو
ٹانگیں کٹنے کے باوجود خرم ون بدن نڈھال ہوتا گیا اور اس کا ہر چوبیس گھنٹے بعد پلٹنے والا بخار اب دن را
مستقل اُس کا وجود پھُنکا تا رہتا تھا۔ ڈاکٹر اپنی سی تمام کوششیں کر چکے تھے۔ اُن کی آخری اُمید بیرون ملک
سے منگوائی گئی ایک خاص دیکسین تھی، جو اگلی شام کے ہوائی جہاز سے لائی جا رہی تھی۔ لیکن خود خرم اپنی ہر اُم
تیاگ چکا تھا۔ اس تمام عرصے میں اُس کے جلتے بدن اور سلگتی رُوح کو اگر چند لمحے کی ٹھنڈک نصیب ہوئی تھی
وہ صرف درگاہ سے آئے، پڑھے ہوئے پانی کی مہربانی تھی۔ مولوی خضر کی بتائی ہوئی وہی چند مخصوص آیا
پڑھ کر میں نے پانی کے گلاس پر پھونک دیں اور خرم نے بے تابی سے وہ پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔ کچھ
کے لیے اُس کی انگارہ سانسوں کو قرار سا مل گیا۔ میں بغور اُس کی حالت دیکھتا رہا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا
''میں نے سنا ہے تمہاری دعا میں بڑی تاثیر ہے عبداللہ..... تم میرے لیے دعا کرو گے نا۔'' ''تمہاری جینے
خواہش ہی تمہاری سب سے بڑی دعا ہے خرم۔ کسی بھی دعا سے کہیں زیادہ تمہاری اپنی قوت ارادی پر بھروسے
کی ضرورت ہے۔'' اُس نے سر جھٹکا ''نہیں..... مسیحا کو عام طور پر اپنی مسیحائی کا اعجاز کم ہی ہوتا ہے۔ میں جب
بھی تمہیں دیکھتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دُور کہیں میری رُوح سے جڑے ہو۔ کچھ نا تا تو تم سے ایسا ضرور
ہے جس نے مجھے یہ احساس بخشا ہے کہ میرے درد کی ہر دوا بس تمہارے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اگر اِ
بار بھی تم نے میری مسیحائی نہیں کی، تو میں مر جاؤں گا۔'' خرم کی بات سن کر اُس کی ماں رو پڑی۔ میری نظر اُٹھ
اور زہرا کی ڈبڈبائی نظر کا سارا ترش نمک میرے حلق میں اُنڈیل گئی، پھر مجھ سے وہاں نہیں ٹھہرا گیا اور میں چپ
چاپ باہر نکل آیا۔ درگاہ تک واپس پہنچتے پہنچتے رات ڈھل چکی تھی۔ مولوی خضر میرے انتظار میں صحن سے
چوبارے پر بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ ''کہو میاں، کچھ آرام آیا تمہارے مریض کو.....؟'' ''آپ بھی وہی با
کہہ رہے ہیں۔ میں دوبارہ خرم کے گھر نہیں جاؤں گا۔ آخر اُن سب لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ میں

ی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ کیا میں اور کیا میری دعا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔'' مولوی خضر نے غور سے میری
ب دیکھا ''جیسے تمہاری مرضی میاں! لیکن یاد رہے، کبھی کبھی دعا نہ دینے کا مطلب بددعا دینا بھی ہوجاتا
ہے۔'' میں اپنی جگہ جم سا گیا۔ مجذوب نے بھی تو یہی کہا تھا کہ زہرا مجھ سے صرف ایک بددعا کی دُوری پر ہے۔
نہیں، یہ وہی بددعا تو نہیں۔ یہ کیسا ستم ہے کہ قدرت نے میرے رقیب کے نصیب کی آخری دعا میرے حصے
ں رکھ چھوڑی تھی۔ اور اس دعا کی قبولیت کی پہلی اور آخری شرط میرے خلوص سے متصل کردی گئی تھی۔ بھلا
وئی اپنے رقیب کے لیے بھی پوری شدت اور کامل خلوص کے ساتھ دعا مانگ سکتا ہے؟ میں وہیں درگاہ کے
بوترے پر ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور جانے کب آسمان پر اپنے مقدر کا دُھندلا ستارہ ڈھونڈتے
ھونڈتے میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر وہی گہری دُھند تھی اور وہ وہی اک نیا دُھندلا جہاں بانہیں
پھیلائے میرا انتظار کررہا تھا۔ لیکن میں خواب میں بھی درگاہ کے صحن میں ملزم بنا کھڑا تھا اور میری فردِ جرم پڑھ کر
سنائی جارہی تھی ''یہی ہے وہ سیاہ نصیب، جس نے درگاہ کے مجاور کے روپ میں محبت جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب
کیا ہے۔ اس کا حلیہ تو بظاہر شرعی ہے لیکن اس کا اندر شدید آلودہ اور کالک زدہ ہے۔ بظاہر خدا کی تلاش میں
سرگرداں، مگر اصل میں اپنے محبوب کی چاہت میں دربدر ہے۔ یہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے اور
ایسی مقدس چاردیواریوں کے بیچ بھی بس اُسی ایک چہرہ کو سوچتا رہتا ہے۔ اسے اس کے رہبر نے زمانے کے
سب ہی سرد و گرم سے آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا من پھر بھی اُسی ایک عشق سے اٹا رہا۔ اس کا دل
کبھی پوری طرح پاک نہ ہو پایا اور یہ جہاں بھی گیا، وہاں دین کی تبلیغ کے برعکس اپنی محبت کی ترویج ہی کرتا رہا۔
تو بولو، ایسے گھناؤنے جرم کی سزا کیا ہونی چاہیے؟'' سارا مجمع چلانے لگا ''اسے سنگسار کردو۔ اسے مار ڈالو۔''
چاروں طرف سے مجھ پر پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ میں گھٹنوں کے بل گر گیا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر خود کو
پتھروں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ ''ٹھہرو، مجھے مت مارو..... میں نے کبھی پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔
سب جانتے ہیں کہ میں تو بس اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے اس دنیا تک پہنچا تھا اور مجھے اُسی محبت کو
پانے کے دعوے کے ساتھ اس چوکھٹ کو پار کرایا گیا تھا۔ میں نے اس تمام سفر میں کبھی 'اعلان بزرگیت' نہیں
کیا، پھر مجھ سے پاکیٔ داماں کا تقاضا اور اُمید کیوں.....؟ اگر اس تمام سفر میں میرے دل سے اس گناہ محبت کے
داغوں کو کھرچا نہ جاسکا تو اس مدر واویلا کیوں؟ ایک 'بے اختیار' کو سزا کیوں؟'' میں یوں ہی چلاتا رہا اور تب ہی
اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

سویرا ہونے کو تھا۔ کاش، کوئی سورج ایسا بھی اُبھرتا جو دلوں کے اندھیرے دُور کرپاتا۔ دن چڑھے بختیار
بھی آپہنچا۔ جانے کیوں آج اُسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ اُس نے آتے
ہی دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ ''آپ نے کیا فیصلہ کیا.....؟'' میں نے اُس سے پوچھ لیا ''کیا محبت خودغرض بھی
ہوسکتی ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت صرف قربان ہونا جانتی ہے۔ محبت صرف خود لٹ جانے کا نام ہے۔''

بختیار میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا اُٹھا۔ ''سب جھوٹ ہے۔ یہ سب بزدلوں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ محبت تو بس جیت لینے کا نام ہے۔ جو ہار جائیں، صرف وہی لٹ جانے کی دہائی دیتے پھرتے ہیں اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، جو اپنی محبت ہار جائے، اُسے جینے کا کوئی حق نہیں..... کہ محبت کے بنا بھی تو صرف فنا ہی اس کا نصیب ہے۔ میں ساری عمر روز مرتا آیا ہوں۔ اب اگر چند پل جینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اُسے کسی رقیب کی بھینٹ کیوں چڑھ جانے دوں۔ کچھ لوگوں کے لیے قدرت کی جھولی میں صرف ایک ہی موقع باقی ہوتا ہے اور میں یہ آخری موقع کسی کمزور جذباتی لمحے کی نذر ہو کر برباد نہیں کر سکتا۔ ہر بار نصیب مجھ ہی سے قربانی کیوں مانگے۔ اس بار قربانی میرے رقیب کو دینی ہوگی۔'' بختیار اپنی دُھن میں نہ جانے کچھ بولتا رہا اور میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔ ہاں، ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر بار قربانی ہمارا مقدر ہی کیوں.....؟ کہیں خرم کی یہ بیماری میرے لیے بھی قدرت کے کشکول میں بچا ہوا آخری موقع تو نہیں؟ اور اگر اس کا انجام اسی بیماری کے ہاتھوں لکھ دیا گیا ہے تو پھر میری دعا کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ بختیار اب بھی پُر اُمید نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ بختیار پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہوگئی، جیسے واقعی میری دعا ہی اُس کی محبت کے حصول کا آخری ذریعہ ہو۔ کاش محبتیں صرف دعاؤں سے حاصل ہو سکتیں، تو آج سارے زمانے میں کوئی نامراد نہ ہوتا۔ میں نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو بختیار سے رہا نہ گیا۔ ''آپ نے میرے لیے کیا مانگا۔'' مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔ ''میں نے اللہ سے تمہارے رقیب کی قربانی مانگی ہے..... اگر تمہاری محبت کا انجام تم دونوں میں سے کسی ایک کی قربانی ہی سے وابستہ ہے تو میں نے خدا سے التجا کی ہے کہ اس بار ایثار کا یہ پہاڑ تمہارے رقیب کے کاندھوں پر رکھ دے۔'' بختیار اس چھوٹے بچے کی طرح خوش ہوگیا، جو پرانا کھلونا ٹوٹ جانے پر کسی نئے کھلونے کے بہلاوے میں آ کر رونا بھول جاتا ہے لیکن میں اپنے اُس پاگل دل کا کیا کرتا، جو آخری بازی مات ہو جانے کے بعد بھی کسی ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا اور کسی بہلاوے میں آنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آج شام مجھے خرم کو نئی ویکسین کا ٹیکا لگائے جانے سے پہلے مغرب سے قبل اُس کے لیے دعا کرنے جانا تھا، لیکن میرے دل اور دماغ کی جنگ سہ پہر تک اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جسم بخار میں تپنے لگا۔ میرا دماغ مجھے خرم کے گھر جانے سے روکتا رہا اور دل اس بھرم کی دہائی دیتا رہا، جو خرم اور اُس کی ماں کو مجھ پر تھا، لیکن کیا دنیا کا کوئی بھی بھرم کوئی بھی مان اتنا اہم ہو سکتا تھا کہ جس کی خاطر میں زہر اگھول دیتا۔ اس کش مکش نے عصر سے پہلے ہی میری رگوں میں انگارے بھر دیئے اور جب میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا تو صحن میں وضو کرتے مولوی خضر میری حالت دیکھ کر فوراً میری جانب دوڑے۔ میرے ماتھے کو چھونے اور اُن کی تشویش بھرے لہجے میں کچھ بڑبڑانے کی حد تک تو میرے حواس نے ساتھ دیا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ مجھے ہوش تب آیا، جب میں نے اپنے ماتھے پر برف میں بھگوئی پٹیوں کی ٹھنڈک محسوس کی۔ میں درگاہ کے حجرے میں تھا اور کھڑکی سے باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر

اُٹھنے کی کوشش کی تو مولوی خضر نے مجھے روک دیا ''لیٹے رہو میاں، ابھی تمہاری حالت سنبھلی نہیں ہے۔'' میں کسمسایا۔ ''لیکن.....'' مولوی خضر میرا مدعا سمجھ گئے۔ ''اس کام کے لیے اب دیر ہو چکی۔ خرم کی والدہ تمہیں مغرب سے پہلے لینے کے لیے آئی تھیں لیکن تم اُس وقت ہذیانی حالت میں نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو وہ خود گھبرا گئیں اور پھر اُنہی کا ڈرائیور یہاں ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا تھا۔'' میں نے بوکھلا کر مولوی خضر کی جانب دیکھا۔ ''میں کچھ زیادہ ہذیان تو نہیں'' ''نہیں ..... وہ کچھ نہیں سمجھیں ..... انہیں خرم کی پریشانی میں کچھ یاد ہی کب تھا۔ بہر حال، وہ نامراد ہی واپس لوٹ گئیں کہ شاید اُن کے بیٹے کی قسمت میں دعا نہیں۔'' میں نے تھک کر تکیے سے سر ٹکا دیا۔ کچھ فیصلے قدرت خود اپنے ہاتھ سے لے لیتی ہے، کیوں کہ ہم کمزور انسانوں کا ظرف ان کا بوجھ برداشت نہیں کر پاتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پھر سے کوئی اَن ہونی میرے تعاقب میں ہو۔ مولوی خضر میری اندرونی کش مکش بھانپ گئے۔ ''خود سے اتنا نہ لڑا کرو عبداللہ میاں! دل پھٹ جائے گا تمہارا۔ سب اُوپر والے پر چھوڑ دو۔'' لیکن کاش، یہ کلیہ میرا دل بھی سمجھ پاتا۔ جب تک ہوش رہے، ہم خود ہی سے تو لڑتے رہتے ہیں۔ تب ہی قدرت ہم پر رحم کھا کر ہمیں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کسی کو نیند کی صورت اور کسی کو بے ہوشی کی شکل میں سکون بخش دیتی ہے۔ میں بھی شدید بخار کے زیر اثر تھک ہار کر پلکیں موند بیٹھا۔ جانے رات کے کس پہر مجھے درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز آئی اور پھر غنودگی کے عالم میں مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مولوی خضر حجرے سے نکل کر باہر گئے ہوں۔ کچھ قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ میرا ذہن پھر سے تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور پھر کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا ''ساحر۔'' مجھے یوں لگا جیسے کوئی روشنی کی تیز کرن اندھیرے سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی گہرے پانیوں کو کاٹتی، میرے دل و دماغ کو منور کر گئی ہو۔ اُس آواز کو میں لاکھوں کروڑوں کے ہجوم میں پہچان سکتا تھا۔ یہ زہرا کی آواز تھی۔ میں نے کچھ اس طرح ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں جیسے پلکوں کی ذرا سی تیز حرکت سے یہ سنہرا سپنا ٹوٹ نہ جائے۔ وہ میرے سرہانے کھڑی تھی..... ہاں..... وہ زہرا ہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے زمان و مکان کی ہر حرکت رُک سی گئی۔ میری نظر اُس کی بھیگی نظر سے ٹکرائی اور مقصد حیات تمام ہوا۔ اس کے یاقوت لب پھر سے ہلے۔ ''ساحر..... آپ ٹھیک تو ہیں.....؟'' میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کے سامنے ہوتا ہی کب تھا۔ اُس کی موجودگی تو ہمیشہ میرا اپنا آپ مٹا کر رکھ دیتی تھی۔ میرے سامنے اور خود مجھ میں بس وہ ہی وہ باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن اُس کی نظر ڈبڈبائی ہوئی کیوں تھی۔ اُس کے قریب ہی مولوی خضر بھی نہایت پریشان سے کھڑے تھے اور حجرے سے باہر درگاہ کے صحن میں بھی کسی عورت کی دبی دبی سی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ اَن ہونی پیش تو نہیں آ گئی۔ مولوی خضر کی لرزتی آواز نے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ''عبداللہ میاں..... زہرا بی تمہیں لینے کے لیے آئی ہیں۔ خرم کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ اُمید اپنے آخری دم پر ہے۔

باہر صحن میں خرم کے والدین بھی موجود ہیں۔ میں انہیں تمہاری شدید ناساز طبیعت کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مولوی خضر اپنی بات ختم کر کے مجھ سے نظریں ملائے بنا حجرے سے باہر نکل گئے۔ کیا آپ نے کبھی شدید پیاس سے دم توڑتے ایسے کسی بدنصیب گھائل کو دیکھا ہے، جو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں پانی کی بچی ہوئی، آخری چند بوندوں سے اپنے لب تر کرنے والا ہو اور تب ہی کوئی دوسرا اُس سے وہ پانی مانگ لے۔ میں نے اُسی جان بہ لب بدنصیب کی نظر سے زہرا کی جانب دیکھا۔ اُس کی لرزتی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو گرنے کو تھے۔ قاتل کا تقاضا تھا کہ مقتول خود اپنے ہاتھوں سے خنجر کی چمکتی دھار کو اپنے جگر کے پار کرے اور شرط یہ تھی کہ لبوں کی مسکان بھی نہ ٹوٹنے پائے۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن کراہ کر رہ گیا۔ زہرا کپکپاتی آواز میں بولی ''آپ اس حالت میں سفر نہیں کر پائیں گے۔ میں اُن سے کہتی ہوں کہ.....'' ''رُک جایئے..... قیدی اگر تختہ دار تک نہ جا سکے تو پھانسی ملتوی نہیں ہو جاتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' اندر سے آتی ہوئی آہٹوں کی آواز سن کر خرم کے والدین بھی مولوی خضر کے ساتھ حجرے میں آ گئے۔ نہ جانے کس طرح میں مولوی خضر کے شانے کا سہارا لے کر نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ مولوی خضر بھی میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر مجھے لٹا کر سہارا دینے کے لیے بیٹھ گئے اور میں آنکھیں بند کیے اپنی ہستی کو سمیٹے پڑا رہا۔ جب کہ میں جانتا تھا کہ یہ راہ رقیب کے گھر کو جاتی ہے اور مجھے وہاں پہنچ کر سدا کے لیے بکھر جانا ہے۔ پتا نہیں، یہ کیسا امتحان تھا۔ خرم کے دل میں یہ بات کیوں گڑ گئی تھی کہ اُسے میری دعا ہی سے مسیحائی نصیب ہوگی۔ یہ کیسا بھید تھا جو کھلتا نہیں تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے خرم کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ خرم کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں اور اُس کا چہرہ سورج مکھی کے پھول جیسا زرد پڑ چکا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔ خرم کے سرہانے پڑی چھوٹی میز پر درآمد شدہ ویکسین کے خالی خول (وائل) پڑے ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ اُسے دوا دی جا چکی تھی، تو پھر اُس کی نبض کیوں ڈوب رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُس کے پریشان کھڑے والدین کی طرف دیکھا۔ ''دیکھیں میں آپ لوگوں کے کہنے پر یہاں تک آ گیا ہوں اور اُوپر والے کی بارگاہ میں اپنی دعا کی عرضی بھی ڈال دوں گا، لیکن میری آپ لوگوں سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ آپ مزید دیر نہ کریں۔ خرم کو فوراً پہلی اڑان سے بیرون ملک لے جائیں۔ دعا کے ساتھ مناسب دوا بھی بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تک میری دعا کا بھرم ٹوٹے، تب تک بہت دیر ہو چکی ہو۔'' خرم کے والد نے ایک گہری سانس بھری ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پہلے کبھی ان باتوں پر اعتبار نہیں تھا، بلکہ میں تو اکثر خرم کی ماں سے لڑ پڑتا تھا کہ اس جدید سائنسی دور میں ان احمقانہ باتوں پر بھلا کون یقین کرے گا لیکن پھر خرم کے معاملے میں ہر وہ بات غلط ثابت ہوتی گئی جسے ہماری ظاہری سائنس صدیوں پہلے ثابت کر چکی ہے۔ اس کا آخری نمونہ آج شام ہی ہم سب نے دیکھا ہے۔ خرم کی حالت کے پیش نظر میں نے خود ہی دنیا کی سب سے بہترین

یکسین اور تمام قابل ڈاکٹروں کی ٹیم بلوالی تھی لیکن سرِشام دی جانے والی دوا کا اثر بھی تمہارے سامنے ہی ہے۔ سن لیے آج میں نے بھی خرم کی والدہ کے یقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُسے بہت پہلے کسی مجذوب نے یہ پیش گوئی کردی تھی کہ اگر خرم کی صحت یابی مقدور ہے تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف تمہاری دعا ہے۔ پورے خلوص اور سچے دل سے مانگی گئی ایک دعا ہی خرم کی نجات ہے۔'' مجھے سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کس مجذوب کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے دعا کے لیے اُٹھتے ہاتھ پھر سے نیچے گر گئے۔ ''مجذوب.....'' خرم کی والدہ جلدی سے آگے بڑھیں۔ ''ہاں..... وہ مجذوب وہیں ساحل پر ہی ملا تھا۔ ہم خرم کو گھمانے کے لیے ساحل کی سیر کو گئے تھے، وہیں ایک ٹوٹی دیوار کے پاس وہ مجذوب ریت اور مٹی میں اٹا بیٹھا تھا۔ اُس نے خرم کو دیکھتے ہی بنا اُس کی بیماری یا تکلیف جانے بغیر فوراً کہہ دیا تھا کہ تیری شفا درگاہ میں بیٹھے عبداللہ کی دعا ہی سے ہوگی۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ اُس وقت خرم گاڑی ہی میں بیٹھا تھا اور اس مجذوب نے اس کی ظاہری حالت بھی نہیں دیکھی تھی۔'' میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔ یہ کب کی بات ہے۔ آپ پہلی مرتبہ کب اُس مجذوب سے ملی تھیں؟'' ''یہ اُسی دن کی بات ہے، جب ہم پہلی مرتبہ درگاہ آئے تھے۔ اُس دن کے بعد وہ مجذوب کبھی دکھائی نہیں دیا۔'' میرے وجود میں بیک وقت بہت سی سوئیاں گڑ گئیں، تو گویا یہ کھیل بہت پرانا ہے۔ میں تو بس اُس شطرنج کی بساط کا ایک معمولی سا مہرہ تھا، جو قدرت نے خرم کی زندگی اور صحت یابی کے لیے بچھا رکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سمائی کہ سب کچھ یونہی چھوڑ چھاڑ، وہاں سے نکل جاؤں، لیکن ٹھیک اُسی لمحے خرم نے ایک ہچکی سی لی اور اُس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ مولوی خضر نے اپنی آنکھیں بند کر کے تسبیح ختم کردی۔ خرم کی ماں کی آنسو بھری نگاہیں، اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے اندر عبداللہ کی آواز گونجی ''اگر ساحر کے اس تمام سفر کا حاصل یہاں اس بیمار کے سرہانے آکر ایک دعا پر ہی ختم ہونا ہے تو پھر اپنی اس تمام تربیت کو بے مقصد نہ جانے دو۔ ساحر نے عبداللہ سے جُدائی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو جاتے جاتے عبداللہ کا یہ آخری قرض بھی ادا کرتے جاؤ۔'' میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر لیے۔ ''یا اللہ! آج پھر تیرے سامنے وہی کم ظرف، گناہ گار، کمزور اور ناشکرا بندہ ہاتھ جوڑے حاضر ہے۔ تو نے ان لوگوں کے دل میں اگر میری دعا کا یقین کامل پیدا کیا ہے تو اب تو ہی اس دعا کا پردہ رکھ لے۔ یا میرے اللہ..... میرے دل کے چور اور میری دعا کی بے توقیری اور میرے خلوص اور سچائی کی کمی پر نہ جا۔ تو میری کم ظرفی اور میرے اندر کے گناہوں سے بخوبی واقف ہے۔ تجھے تیرے پیارے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ، تجھے اس ستّر ماؤں سے زیادہ محبت کا واسطہ کہ خاص اپنی رحمت کے صدقے اس مجبور ماں کی بھی سن لے جو اپنے معذور بیٹے کی صحت یابی کے لیے یہاں وہاں سر ٹکراتی پھرتی ہے۔ اس محفل میں موجود اپنے سب سے عزیز بندے کی التجا کے صدقے مجھ جیسے عاصی کی دعا سن لے اور اس نوجوان کی بیماری دُور فرما کر اسے شفا عطا کردے۔ میں جانتا ہوں کہ آج اس وقت بھی، یہ دعا مانگتے وقت بھی میرے اندر کے دنیا پرست اور گناہوں سے لتھڑے انسان کی

تمام خامیاں اور کمزوریاں اپنے عروج پر ہیں اور میری اس دعا میں قبولیت لائق ایک احساس بھی شامل نہیں لیکن تیری رحمت اور تیری لازوال عطا کسی جذبے کی محتاج نہیں۔ ہمیں تیرا رحم چاہیے۔ تیرا فضل چاہیے، میرے مولا۔'' میں دل ہی دل میں گڑگڑاتا رہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، پھر نہ جانے کتنی دیر بعد مولوی خضر کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کاندھے پر محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ خرم کا رنگ بدستور زرد تھا۔ مولوی خضر نے پلٹ کر خرم کے والدین سے رُخصت طلب کی۔

ہمارے درگاہ پہنچتے پہنچتے سویرا جھلکنے لگا۔ میرا بخار ایک بار پھر زور پکڑ چکا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولوی خضر نے مجھے حجرے میں آرام کی تلقین کی اور پھر کمرے سے نکلتے نکلتے انہیں جانے کیا ہوا کہ ایک بار پھر پلٹ کر میری جانب آگئے اور اچانک مجھے اپنے سینے سے لگالیا'' مجھے تم پر فخر ہے میاں! میں تمہاری حالت سے بہ خوبی واقف ہوں۔ آج تم نے سلطان بابا کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا ظرف تو بس، عبداللہ، ہی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔ جیتے رہو، آباد رہو۔'' مولوی خضر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئے اور میں اس ہارے ہوئے جواری کی طرح بستر پر ڈھے گیا، جو اپنی آخری جمع پونجی جانتے بوجھتے خود ایسے داؤ کی بھینٹ چڑھا آیا ہو، جس بازی کی مات کا اُسے پہلے ہی سے یقین ہو۔ میں آنکھیں بند کیے حجرے ہی میں پڑا رہا، حتی کہ صبح کی تیز کرنوں نے حجرے کی کھڑکی سے دھوپ کی شکل اختیار کر کے میرے تاریک وجود پر روشنی کی ایک مستطیل چادر سی تان لی۔ دن چڑھے باہر سے مولوی خضر کی آواز اُبھری'' میاں! جاگ رہے ہو تو بختیار صاحب کو تمہارے پاس اندر بھیج دوں۔ وہ کافی دیر سے بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے قریب پڑا کھیس شانوں پر ڈالا اور خود ہی باہر نکل آیا۔ بختیار کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ لپک کر میرے قریب آگیا اور پریشانی سے بولا'' یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ ایک ہی دن میں برسوں کے بیمار دکھائی دینے لگے ہیں۔''

''ہاں..... شاید کچھ مرض ایک رات ہی میں برسوں کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ لیکن آج ماشاءاللہ آپ کا چہرہ خلاف معمول بہت کھلا ہوا لگتا ہے۔ آپ کی منت پوری ہوگئی ہے۔'' بختیار نے فرطِ عقیدت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔'' یہ سب آپ کی دعا کی بدولت ہوا ہے۔ اب کوئی مجھ سے میرے حصے کی نظر نہیں چھین پائے گا۔ سائرہ نے آپریشن کروانے سے انکار کر دیا ہے۔'' میں نے چونک کر بختیار کو دیکھا'' کیا.....؟ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ اُسے تو بصارت کی شدید خواہش تھی نا.....؟'' پتا نہیں۔ آپ شاید اسے میری شدید خودغرضی ہی سمجھیں، لیکن میں سمجھتا ہوں محبت سے زیادہ خودغرض جذبہ اس دنیا میں کوئی اور ہوگا بھی نہیں۔ اور پھر وہ محبت ہی کیا، جو خود اپنے لیے خودغرض نہ ہو۔ دراصل میں اس بات سے اس قدر پریشان تھا کہ جب سائرہ نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں آج کل اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہوں تو میں اُس کے سامنے خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رُو پڑا۔ وہ پریشان ہوگئی اور مجھے اسے بتانا ہی پڑا کہ میں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ بصارت ملنے کے بعد میں سائرہ کو کھو دوں گا، کیوں کہ میں انتہائی بدصورت ہوں۔ یہ سن کر تو وہ پہلے ہکا بکا سی رہ گئی اور پھر وہ بھی رُو پڑی کہ میں نے

اُس کی عقیدت کو اتنا ناتواں کیسے جانا۔ اُسے تو میرے اندر کے آدمی سے سروکار تھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور پھر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی بصارت کا آپریشن نہیں کروائے گی۔ اسے وہ نظر نہیں چاہیے جو میرے بقول اُس سے میرے حصے کی نظر چھین لے جائے گی۔ اس کے اس فیصلے نے جانے کیوں پر مجھے بہت رلایا۔ میں اور سائرہ بہت دیر تک روتے رہے۔ لیکن شاید وہ ہم دونوں کے آخری آنسو تھے۔'' بختیار نہ جانے کیا اور کیا کچھ بتاتا رہا مگر میرا ذہن کہیں اور ہی اٹک گیا تھا۔ محبت کو شاید اتنا ہی معصوم اور اتنا ہی خودغرض ہونا چاہیے تھا۔ مجھے بختیار پر رشک آ رہا تھا کہ اس کے اندر پلنے والی محبت وقت پڑنے پر خودغرض ہونا بھی جانتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خودغرضی بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ بختیار کے جانے کے بعد بھی میں وہیں درگاہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ڈھلنے لگی۔ اس دوران مولوی خضر نہ جانے کتنی بار کسی نہ کسی بہانے درگاہ کی سیڑھیوں تک جا کر واپس پلٹتے رہے۔ میں جانتا تھا انہیں کس نتیجے کا انتظار ہے۔ آخر کار مغرب سے کچھ دیر قبل درگاہ کے باہر چند گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سنائی دی اور مولوی خضر تیزی سے حجرے سے باہر نکلے۔ چند لمحوں بعد خرم کے والدین اپنے کئی نوکروں سمیت ڈھیر ساری نذر اور نیاز لیے درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ پتا چلا کہ فجر ہونے سے پہلے ہی خرم کی حالت سدھرنے لگی تھی اور دوپہر تک اُس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے درآمد شدہ ویکسین کا اثر سمجھتے تھے۔ لیکن خرم کے والدین کے نزدیک یہ دعا کا کرشمہ تھا۔ اور یہ ساری کہانی لکھنے والا لکھاری وہی ایک مجذوب تھا، جو پہلے مجھے اور پھر خرم کی ماں کو ملا تھا۔ کتنا شان دار پلاٹ بنایا تھا اُس نے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو، خرم کے والدین کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح میری ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ ''اب میں بہت جلد اپنے خرم کے سر پر سہرا سجاؤں گی اور آپ سب کو آنا ہوگا۔ اور عبداللہ تم بھی تو میرے بیٹے ہو نا، تو تمہیں خرم کا شہ بالا بننا ہوگا۔ ٹھیک ہے نا، دیکھو، میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔'' وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں اور میں اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ جانے یہ شہنائی اور ماتم کا رشتہ کتنا پرانا ہے۔ اُن کے لہجے میں شہنائی کی گونج تھی اور میری خاموشی میں ماتم رقصاں تھے۔ اُن کے جانے کے بعد میں مولوی خضر کی جانب پلٹا۔ ''میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید یہی میرے سفر کا آخری پڑاؤ تھا۔ آپ درگاہ کے لیے کسی نئے عبداللہ کو منتخب کر لیں۔'' میری آواز آنسوؤں سے رندھ سی گئی۔

مولوی خضر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا ''ٹھیک ہے اگر یہی رضائے خداوندی ہے تو یونہی سہی، مگر ایک آدھ دن تو ٹھہر جاؤ۔ جب تک میں بھی درگاہ کے انتظامات کسی کے سپرد کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔'' ''جو آپ کا حکم۔'' میں واپس پلٹ کر حجرے کی طرف بڑھا۔ ''اور ہاں عبداللہ! تمہارا آخری سوال اُدھار تھا مجھ پر۔ تم نے پوچھا تھا کہ ہمارا بسیرا ان درگاہوں اور ویرانوں ہی میں کیوں کر ہے، جب کہ خدا کی خدائی کو تو شہ رگ سے بھی قریب بیان کیا گیا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ خدا ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک رہتا ہے۔ اُس

کی کھوج میں ہمیں کسی بھی درگاہ، ویرانے میں بھٹکنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ تمہیں آج ایک اور بھید بھی بتانا ضروری ہوگیا ہے۔ میں ..... حاکم بابا، سلطان بابا اور تم ..... ہم سب ان درگاہوں پر اس لیے ہیں کیوں کہ ہماری تعیناتی کی جگہ یہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں کوئی اور عبداللہ، حاکم یا سلطان تعینات نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک غیر مرئی نظام رائج اور متحرک ہے۔ تم اتنا عرصہ خدا کی تلاش میں نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے بھٹک رہے تھے، تمہارا خدا تو اس تمام سفر میں تمہارے ساتھ ہی تھا۔ درگاہ سے پھانسی گھاٹ، پھریا قوط، جبل پور، کال گڑھ اور تحصیل ماہی سے لے کر لندن اور واپسی تک کے تمام سفر کا کوئی ایک مقصد ضرور تھا۔ جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا، تم سے ''خدا کا تعارف .....، اُس کے بندوں کے ذریعے۔ اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کے ذریعے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس تعارف کو بخوبی نبھایا۔ تم نے واپسی کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ ہر جگہ، ہر پل تمہارے ساتھ تھا، ساتھ ہے ..... اور ہمیشہ ساتھ رہے گا۔'' مولوی خضر پلٹ کر چل دیئے اور میں وہیں چبوترے پر ڈھے سا گیا۔ وہ اگر میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو پھر مجھے مل کیوں نہیں جاتا۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں پہنچ گیا، لیکن جسے میں نیند سمجھتا تھا۔ کیا واقعی وہ نیند تھی، میں تو اکثر نیند میں جاگنے سے زیادہ بیدار رہتا تھا۔

مجھے آج تک یہ معما ہی سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں جاگتے ہوئے سوتا ہوں یا سوتے ہوئے جاگ رہا ہوتا ہوں۔ اور پھر صدیوں بعد مجھے اپنے شانے پر وہی مہربان لمس محسوس ہوا جس کی تلاش میں نہ جانے کب سے میں اپنے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہاں! وہ سلطان بابا ہی تھے۔ وہی ملیح سی مسکراہٹ، وہی مہرباں احساس۔ میں رو پڑا ''کہاں چلے گئے ہیں آپ ..... آپ کو میری ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ عبداللہ سے پیار ہی نہیں کرتے۔'' وہ مسکائے ''اچھا تو گویا عبداللہ اپنے سلطان بابا سے رُوٹھ گیا ہے، لیکن میرا ساحر تو مجھ سے خفا نہیں نا۔ وہ تو مجھ سے بات کرے گا؟'' ''آپ جانتے ہیں کہ عبداللہ اور ساحر کی یہ تفریق مجھے کاٹ ڈالے گی۔ پھر آپ نے میرے اندر کے عبداللہ کو کیوں جگا دیا اور اگر عبداللہ کی حیات اتنی ہی ضروری تھی تو پھر ساحر کو پوری طرح ختم کیوں نہیں کر دیا گیا؟'' ''تمہیں ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ یا ساحر میں سے کسی ایک کی فنا ہی دوسرے کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ یہاں پر سب ہی کے اندر آدھا ساحر اور آدھا عبداللہ بستا ہے۔ کاملیت تو شاید صرف پیغمبر کا نصیب ہوتی ہے۔'' میں سسک پڑا ''تو پھر یہ دنیا والے ہم جیسے گناہ گاروں سے کاملیت کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ دل پر کسی کا زور نہیں۔'' سلطان بابا پھر سے مسکرائے ''بس ..... اتنی سی بات ہے۔ اپنی محبت پر شرمندہ ہو؟ مرد و زن کی آپسی کشش فطرت کی طے کردہ ہے۔ میں، تم ..... ہم سب ہی ایسے ہی کسی معاشرتی رشتے کی پیداوار اور نتیجہ ہیں۔ ہاں البتہ مذہب نے ایسے بندھن کی حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ محرم اور غیر محرم کی شرعی پابندی بھی طے شدہ ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی رشتہ طے ہوتا ہے تو اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ مذہب کا کوئی بھی کلیہ یہ نہیں کہتا کہ کسی درگاہ کے مجاور یا متولی کی

شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی پسند کی شادی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کا کیا ہے میاں، رہبانیت سے بچو گے تو دنیا پرستی کا الزام لگائے گی اور دنیاداری سے دامن چھڑاؤ گے تو رہبانیت کا داغ تمہارے ماتھے پر سجا دے گی۔ ویسے بھی مذہب اللہ کی رضامندی کے لیے اپنایا جاتا ہے، نہ کہ دنیا والوں کی خوشنودی کے لیے۔ بس حقوق العباد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اور ہاں، عبداللہ کو یہ بات سدا یاد رکھنی ہوگی کہ رشتے اور جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ سو، تمہارے نصیب کا جوڑ تم تک پہنچ کر رہے گا۔ اور جو تمہارا مقدر نہیں، اس پر کبھی افسوس نہ کرنا۔'' سلطان بابا کی آواز دھیرے دھیرے دُھند میں کھوگئی۔ اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سلطان بابا سے سنا تھا کہ قدرت نے نیند اور خواب کو بھی پیغام رسانی کے ذریعوں میں سے ''ایک'' مقرر کر رکھا ہے، تو گویا مجھے بھی آخری پیغام پہنچا دیا گیا تھا۔ ہمیشہ اپنے نصیب پر متشکر رہنے کا پیغام۔ چاہے وہ نصیب بنا زہرا ہی کے میرا مقدر کیوں نہ ہو۔

اگلی صبح مولوی خضر مجھے بہت مصروف دکھائی دیئے۔ شاید وہ تمام انتظامات کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ سہ پہر تک میرے بعد والا عبداللہ، نعمان بھی درگاہ پہنچ گیا، لیکن ابھی سب کو کسی اور کی سواری کا بھی انتظار تھا۔ میں صبح سے درگاہ کے صحن میں بیٹھا ان در و دیوار کو تک رہا تھا، جن سے شناسائی اب صدیوں پرانی لگتی تھی۔ ان دیواروں نے یہاں مجھے ساحر سے عبداللہ تک کا سفر طے کرتے دیکھا تھا اور آج وہ اس عبداللہ کی واپسی کا سفر بھی دیکھ رہی تھیں۔ تقدیریں کیسے پلٹ جاتی ہیں، یہ کوئی نہیں جان سکا۔ اور پھر عصر کے وقت وہ سواری بھی آپہنچی جس کا سب ہی کو انتظار تھا۔ وہ درگاہ کے صحن میں داخل ہوئے تو میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ ہاں، وہ حاکم بابا ہی تھے، اپنے مخصوص جلال اور غیض و غیظ کے ساتھ۔ لیکن آج اُن کے لبوں پر ایک عجیب ہی مسکراہٹ تھی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو مجھے گلے لگالیا۔ ''کیوں بھئی نوجوان ..... واپس چل دیئے۔ تم نے تو ہمیں یاد نہیں کیا۔ پر دیکھو..... ہم خود تمہیں رُخصت کرنے یہاں چلے آئے۔'' میں خاموش رہا لیکن نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ حاکم بابا نے اب سلطان بابا کے فرائض سنبھال لیے ہیں کیوں کہ اُن کا ہدایات دینے کا انداز اور اُن کی ہر معاملے پر گہری نظر اس بات کو ظاہر کر رہی تھی کہ اب وہ بطور سلطان تعینات ہو چکے ہیں۔ عصر کے بعد میں نے سب سے رُخصت ہ ہی، کیوں کہ میں مما اور پیا کو پہلے ہی اطلاع کر چکا تھا اور اُن کی آمد کسی بھی وقت متوقع تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ 'وداع بھی میرے لیے کسی خنجر کی دھار کی طرح تھا۔ رُوح میں پیوست ہونے والی دھار..... حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے ''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔'' ''جا رہے ہو میاں! چلو ٹھیک ہے، تمہارا استقبال کرنے والے بھی آپہنچے ہیں۔ اور ہاں ..... گھر پہنچ کر اس رقعے کو کھول کر پڑھ لینا۔'' انہوں نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہی لفافہ تھا، جس کے بارے میں مولوی خضر نے گزشتہ شام مجھ سے ذکر کیا تھا۔ میں تو حاکم بابا کے منہ سے سلطان بابا کا مخصوص جملہ سن کر ہی اپنی جگہ سن سا کھڑا تھا کہ اچانک عقب سے مما کی آواز اُبھری ''ہم آگئے ہیں بیٹا.....'' میں نے

میکانکی انداز میں گردن گھمائی اور پھر مما پپا کے ساتھ وہیل چیئر پر بیٹھے خرم اور اُس کے والدین کو ساتھ کھڑے دیکھ کر میں اپنے سارے الفاظ کھو بیٹھا۔ ''آپ سب یہاں .....؟'' تب خرم نے اپنی وہیل چیئر دھکیلی اور میرے قریب آ گیا۔ اُس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ''واہ میرے مسیحا! ساری مسیحائی کا اعجاز خود ہی سمیٹ لینا چاہتے ہو کیا؟ ویسے داد دینی پڑے گی تمہارے حوصلے کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو شاید کسی مرحلے پر میرا ظرف جواب دے ہی جاتا، لیکن تم شاید یہ بھول گئے کہ احسان جب حد سے بڑھ جائیں تو اُن کا بوجھ اگلے کو توڑ ڈالتا ہے۔ تم نے بھی مجھے توڑ ڈالا ساحر۔'' خرم کے منہ سے اپنا پہلا نام سن کر مجھے زوردار جھٹکا لگا اور میں نے مما پپا کو شکایت بھری نظر سے دیکھا۔ میں نے انہیں زہرا کے رشتے کے بارے میں بتاتے وقت سختی سے تلقین کی تھی کہ وہ کسی بھی حال میں خرم یا اُس کے والدین پر یہ بھید ہرگز نہیں کھولیں گے، لیکن شاید اس بار اُن میں سے کوئی ایک اپنا وعدہ نہیں نبھا پایا تھا۔ خرم میری نظروں کا مفہوم سمجھ گیا۔ ''نہیں ..... تمہارے والدین میں سے کسی نے مجھے تمہارا اصلی نام نہیں بتایا۔ تمہاری اور اُن کی مٹی جو مشترک ہے۔ شاید یہ راز مجھ پر بھی کبھی نہ کھلتا۔ اگر کل سہ پہر یہ تحریر میرے ہاتھ نہ لگتی۔'' خرم نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوئی کاغذ لہرایا اور میرے جسم سے رہی سہی جان بھی پرواز کر گئی۔ یہ تو وہی نظم تھی، جو میں نے پپا کے ہاتھ زہرا کو لکھ بھیجی تھی۔ خرم نے کاغذ کھولا اور زیرلب دہرایا۔ ''جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے .....'' پھر خرم نے کاغذ پلٹا اور آخر میں بے خیالی میں لکھے گئے، میرے نام پر اپنی اُنگلی رکھ دی۔ ''یہ نظم تمہاری ہے نا ساحر..... اتنا درد سہنا تمہارا خاصہ ہی ہو سکتا ہے۔ بولو ساحر ..... چپ کیوں ہو، جواب دو مجھے.....'' میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پتا یہ چلا کہ کل جب دوپہر کے وقت خرم کا بخار ٹوٹ گیا تو کئی دنوں کی اکتاہٹ آمیز تھکن اُتارنے کے لیے اُس نے اپنی ماں باپ سے کھلی فضا میں نکلنے کی ضد کی، لیکن خرم کے والدین کو منت پوری ہونے کی نیاز چڑھانے کے لیے درگاہ آنا تھا لہٰذا طے یہ پایا کہ راستے میں خرم کو کچھ دیر کے لیے زہرا کی حویلی میں اُتار دیا جائے تاکہ وہ زہرا کے والدین سے بھی ملاقات کر لے۔ خرم کا اُردو ادب سے ویسے تو کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا لیکن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُردو ادب زہرا کی شخصیت کا حصہ اور خاص طور پر نظم اور غزل تو اُس کی کمزوری ہے، لہٰذا اُس نے زہرا کی غیر موجودگی میں، یونہی بے خیالی میں کوئی کلیات اُٹھالی اور تب ہی اُس کے اندر سے یہ کاغذ اُس کی گود میں جا گرا۔ خرم نے جیسے ہی تحریر ختم کر کے آخر میں لکھا نام پڑھا، تب ہی زہرا کمرے میں داخل ہوئی اور خرم نے اُس سے پوچھ لیا کہ یہ ''ساحر'' کون ہے؟ یہ سوال زہرا کے لیے اس لمحے اس قدر اچانک اور ناگہانی تھا کہ وہ جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ نے خرم کے تجسس کو مہمیز دی اور ایک ایسی بات، جسے عام حالات میں کوئی بھی چھوٹا سا بہانہ کر کے ٹالا جا سکتا تھا، بڑھتی چلی گئی۔ زہرا نے خرم سے التجا کی کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مناسب وقت آنے پر وہ خود خرم کو ساحر کے بارے میں بتا دے گی۔ لیکن اگر بات ختم ہی ہونا تھی، تو شروع کیوں ہوتی۔ خرم وہ کتاب ہی کیوں اُٹھاتا، جس میں میری نظم رکھی تھی۔ خرم نے کوئی دوسری

کتاب کیوں نہ اُٹھائی؟ کچھ مسودے قدرت صرف خالص لمحوں کے لیے ہی لکھ رکھتی ہے۔ وہ بھی شاید ایک ایسا ہی پل تھا۔ آخر کار زہرا کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے خرم کو بتا دیا کہ ساحر وہی عبداللہ ہے، جو گزشتہ رات خرم کی مسیحائی کے لیے اپنی شدید ابتر حالت کے باوجود اُس کے سرہانے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ خرم کے حواس جواب دے گئے اور زہرا نے شروع سے لے کر آخر تک کی داستان جب ختم کی تو تب تک خرم اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگ چکا تھا۔ وہ رات اُس کی زندگی کی سب سے طویل رات ثابت ہوئی اور صبح کا اُجالا ہونے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں آج وہ اپنے والدین سمیت میرے سامنے موجود تھا۔ خرم نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں اس کرب کا مداوا تو نہیں کر سکتا، جس سے تم ہر پل گزرتے آئے ہو۔ لیکن یقین جانو..... کل سے میرے گھر میں بھی کسی کو ایک کروٹ آرام نصیب نہیں ہوا۔ شاید ہم سب تمہارے مجرم ہیں۔'' میں نے جلدی سے خرم کی آنکھیں پونچھیں ''ایسا کیوں کہہ رہے ہو، قدرت کا یہی فیصلہ تھا۔'' خرم کی والدہ آگے بڑھیں ''نہیں..... خرم کی طرح تم بھی میرے بیٹے ہو عبداللہ اور دنیا کی کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتی۔ زہرا تمہاری امانت تھی اور ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ بس، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میرے گھر سے خرم کی بارات جانی تھی اور اب عبداللہ کی جائے گی اور یہ حق میں تمہاری مما سے پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔ اب تم اپنی اس ماں کو انکار نہ کرنا۔'' انہوں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مما پپا میرے دائیں بائیں یوں کھڑے تھے، جیسے بچپن میں مجھے گرنے سے بچانے کے لیے میری پہلی بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ پل بھر میں یہ سب کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو جانے کب سے اپنے رُوٹھے ہوئے مقدر سے دوستی کر لی تھی۔ لیکن قدرت یوں اچانک مجھ پر اتنی مہربان ہو جائے گی۔ زہرا کا نام پھر سے میرے نام کے ساتھ جڑ جائے گا۔ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟ پپا نے میری نظروں کا مفہوم جان لیا۔ ''زہرا ہمارے ساتھ نہیں آئی بیٹا..... وہ نیچے ساحل پر ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے اپنے ہر فیصلے کو تمہارے فیصلے سے مشروط کر رکھا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک اُس نے جتنے بھی فیصلے کیے ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں تمہارے لیے کسی درد کا باعث رہے ہیں لہٰذا اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ کیا تم آج بھی زہرا کا ساتھ چاہتے ہو۔'' خرم نے مجھے جھنجھورا..... ''جاؤ عبداللہ..... دیر نہ کرو۔ اس بار اپنی تقدیر کو چوکنے نہ دینا۔ بہت زخم کھا لیے تم نے۔ بہت گھائل ہو چکے تم..... جاؤ تمہارا مرہم تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے.....''

میں ابھی تک وہیں اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا کہ اس بار حاکم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بے شک اللہ اپنے بندے کے لیے جو چنتا ہے، وہی اُس کا بہترین نصیب ہے۔ جاؤ عبداللہ..... تمہارا پہلا امتحان آج ختم ہوا۔ اگر تم اپنے قدموں سے چل کر اللہ کے اس بندے خرم کے لیے دعا کرنے نہ جاتے تو شاید یہ نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اس مجذوب نے تمہیں بددعا کے امتحان میں بھی اسی اللہ کی مرضی سے ڈالا اور آج اگر تم سرخرو

کھڑے ہو تو یہ بھی اُسی کی رضا ہے۔ جاؤ، تمہارا مقدر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' حاکم بابا کی گرج دار آواز نے جیسے مجھے پھر سے ہوش کی دنیا میں پہنچا دیا۔ میں تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ پیچھے مولوی خضر کی آواز سنائی دی ''ہم سے رُخصت ہو کر الوداع تو کہتے جاؤ میاں..... جانے پھر کب ملاقات ہو.....؟'' میں تڑپ کر پلٹا اور تیزی سے مولوی خضر کے پاس پہنچ کر اُن کے ہاتھ تھام لیے۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میری رُخصت کے فیصلے کے پیچھے بھی تو زہرا کے نام کا تقدس برقرار رکھنے کی آرزو ہی کارفرما تھی۔ میں آپ سب کو چھوڑ کر اب نہیں جاؤں گا۔'' حاکم بابا بولے۔ ''جانا تو طے ہو چکا ہے لڑکے..... اور تمہاری خواہش پر ہی یہ سارا انتظام کیا گیا ہے.....۔'' میں اُن کی بات سن کر روہانسا ہو گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھے میرے ہی گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہو۔ پھر نہ جانے کیوں ان سب ہی بزرگوں کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حاکم بابا بولے۔ ''مولوی صاحب..... بہت ستایا آپ کے شاگرد کو۔ اب اسے اپنا فیصلہ سنا دیں۔'' مولوی خضر نے میری جانب مسکرا کر دیکھا۔ ''عبداللہ میاں..... تمہارا فیصلہ تو جانے کب سے اس خالی لفافے میں لکھ کر بند کر دیا گیا تھا، وہی لفافہ جواب تمہاری جیب میں موجود ہے۔ تم چاہو تو اسے کھول کر پڑھ سکتے ہو.....'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عجلت میں اپنی جیب سے وہ لفافہ نکالا اور تیزی سے اس پر لگی مہر کھولی۔ اندر سے ویسی ہی کاغذ کی ایک سفید پرچی نکلی، جیسی مجھے پہلی مرتبہ عبداللہ کے نام سے درگاہ میں تعینات ہونے پر ملی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پرچی کھولی تو اس میں میرے ہی شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ صرف ایک نام..... اور کچھ نہیں۔ میں نے حیرت سے مولوی خضر اور حاکم بابا کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائے۔ ''تمہیں تمہارے ہی شہر میں تعینات کر دیا گیا ہے عبداللہ..... تمہارے فیصلے سے بہت پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا.....'' میں اپنی آواز سے چھلکتی خوشی چھپا نہیں پایا۔ ''گویا میں اب بھی عبداللہ ہوں..... مجھے بے دخل نہیں کیا جا رہا.....؟'' مولوی خضر نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''قدرت کے کیے گئے فیصلوں سے بے دخلی کا اختیار صرف قدرت ہی کو حاصل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ عبداللہ صرف درگاہوں اور ویرانوں ہی میں نہیں..... زمین کے ہر خطے میں موجود ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارا ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں تبادلہ ہو گیا ہے، البتہ تمہارا کام اب بھی وہی ہے۔ اللہ کے بندوں کو حتی المقدور خدمت اور اللہ کی بندگی اور یہ دونوں فرائض تم اپنے گھر میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے مقدر کے بندے وہاں بھی تم تک پہنچ جائیں گے اور تم سے جو ہو سکے، اُن کے لیے ضرور کرنا۔ جاؤ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جت جاؤ تاوقتیکہ تمہیں تمہاری کسی نئی تعیناتی کا مراسلہ مل جائے۔ ہم تمہاری کسی بھی مدد کے لیے ہمیشہ موجود رہیں گے.....'' حاکم بابا، مولوی خضر اور نعمان (عبداللہ) نے فرداً فرداً مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں لڑکھڑاتے قدموں سے تنہا ہی ساحل کی جانب چل پڑا۔ مما پپا، خرم اور اُس کے والدین جان بوجھ کر ایک خاص مقام پر رُک گئے اور میں لرزتی دھڑکن لیے دُور ڈوبتے سورج کے پیشِ نظر میں، اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑی زہرا کے قریب پہنچ کر کچھ

کے فاصلے پر رُک گیا۔ کہتے ہیں کچھ لمحے ایسے بھی وارد ہوتے ہیں جن کا انتظار خود ''وقت'' کرتا ہے۔
ے قدموں کی آہٹ سن کر اُس ''ماہ تاب منتظر'' کی پلکیں اُٹھیں اور پس منظر میں ڈوبتا سورج یک لخت
پڑ گیا۔ پتا نہیں، زندگی اس پل شروع ہوئی تھی یا میری فنا کے بعد بھی میری نبض چل رہی تھیں۔ میں نیند
تھا یا میرا سب سے خوب صورت خواب کھلی آنکھوں، میرے سامنے سج گیا تھا۔ زمین بہنے لگی تھی یا سمندر
ت ہو گیا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں زہرا کے کانوں کی بالیوں سے منعکس ہو کر اُس کے چہرے کو دمکا رہی
ا۔ یا یہ زہرا کے چہرے کا نور تھا جو ان کرنوں کو مزید اُجال رہا تھا۔ ہم دونوں چپ کھڑے رہے۔ سمندر کی
ں نے ہماری خاموشی کی زبان کو ایک دوسرے تک منتقل کرنے کا فریضہ اپنے سر لے لیا۔ آس پاس سرسراتی
نے اَن کہے لفظوں کو معنی پہنانا شروع کر دیئے۔ زہرا کی آنکھوں نے کہا۔ ''آپ آ گئے ساحر..... میں کب
آپ کی راہ دیکھ رہی تھی.....'' میں نے بند لبوں سے جواب دیا..... ''میں تو سدا آپ کے ساتھ تھا..... آپ
راہ کی دھول بن کر..... کبھی منزل نہ بننے والی راہوں کی دُھول۔'' اُس کی گھنیری پلکیں تڑپ کر جھپکیں
ں..... آپ میری راہوں کی دُھول بن کر نہیں، میری آنکھوں کے کاجل کی طرح میرے ساتھ تھے۔ میں
راہ بھی چلتی، میری منزل کا راستہ آپ ہی سے ہو کر گزرتا۔ کبھی کبھی منزلیں راستہ بھی تو بن جاتی ہیں۔'' ہم
ں بظاہر خاموش کھڑے تھے۔ گفتگو اضافی بن چکی تھی اور ہماری آنکھوں میں جھلملاتے سمندر کا عکس ہماری
پلکوں سے جھلک رہا تھا۔ کوئی ہمیں دُور سے یوں کھڑے دیکھتا تو اُسے یہی لگتا کہ شاید ہم دونوں کے پاس
کے لیے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ مگر یہ ہونٹوں اور زبان کی بولی سننے اور بولنے والے ظاہر پرست بھلا
ی کی باتیں کیا جانیں؟ زمانہ آج تک لوگوں کے طرزِ تکلم اور تخاطب کی خوبصورتی کی مثالیں دیتا آیا ہے،
لوئی نہیں جانتا کہ کچھ لوگ جب محوِ سماعت ہوں تو بھی کمال خوب صورت لگتے ہیں، جیسے ٹھیک اُس لمحے وہ
ں پری۔ اور سماعت کا واسطہ صرف کان سے تو نہیں ہوتا، کبھی کبھی کسی کی آنکھیں، جھکتی پلکیں، جبیں پر پسینے
ندیں، لرزتے بند لب اور کسی کی خم کھائی زلف کا بل بھی تو ہماری اَن کہی کو پوری طرح سن رہا ہوتا ہے۔
ور زہرا بھی اس وقت مجسم سماعت تھے، ہر اُس اقرار، ہر اُس پیمان کے لیے، جو ہم نے لبوں سے ادا نہیں
پھر بھی ہم دونوں نے سن لیا۔ اتنے میں دُور ٹیلے سے مما کی لہروں کے دوش پر آتی آواز سنائی دی۔ ''
ند..... ویر ہو رہی ہے بیٹا..... چلو گھر چلیں.....۔ میں نے زہرا سے کہا..... ''چلیں سب لوگ ہمارا انتظار
ہے ہیں.....'' اس ناز آفرین نے پہلا قدم اُٹھایا، لیکن میں رُک گیا۔ لیکن یہ جان کر اپنے قدم بڑھایئے گا
راللہ کی مسافتیں ابھی باقی ہیں۔ راستے دشوار اور منزلیں سراب ہیں..... تھک تو نہیں جائیں گی.....؟''
میرے سے مسکرائی۔ ''ڈرا رہے یا تنبیہ کر رہے ہیں.....'' میں بھی مسکا دیا۔ ''صرف اپنے نصیب کی
جھلیوں سے آگاہ کر رہا ہوں۔'' تب زندگی میں پہلی مرتبہ، زہرا نے بس اک لمحے کے لیے میری آنکھوں
جھانکا اور میں پہلی بار پتھر نہیں ہوا۔ ''اب جو عبداللہ کی راہ ہے..... وہی زہرا کا رستہ ہے..... جب مقدر جڑ

جائیں تو نصیب کی گرھیں اپنے آپ کھل جاتی ہیں۔ آپ زہرا کو ہمیشہ ثابت قدم پائیں گے۔"

دُور سمندر کے اس پار اُفق پر سورج ڈوب رہا تھا۔ میں نے قدم بڑھا دیئے اور زہرا میرے پیچھے چل پڑی۔ میرے نقشِ پا پر اپنے نازک قدم دھرتی..... پہلی مرتبہ عبداللہ اور زہرا کو ایک ساتھ اس ڈگر پر چلتے دیکھ کر لہریں مسکرائیں اور ڈوبتے سورج نے کہا۔ "نئی مسافتیں..... نئے سفر اور نیا ہم سفر مبارک ہو دوست..... آنے والی سحر کے ساتھ اک نئے آسمان کا سلام..... اور اس ڈھلتی شام کی جانب سے تمہیں الوداع..... الوداع عبداللہ..... الوداع....."

(ختم شد)


ہاشم ندیم
عبداللہ
3

عبداللہ

ہاشم ندیم

THANK YOU FOR YOUR ORDER
please join us Facebook and Instagram
@alquraishpublications
For Order call- whatsapp- SMS
0322 7446726

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور
فون: 37232336 37352332 فیکس: 3584
ww:ilmoirfanpublishers.com
il:ilmoirfanpublishers1@gmail.com

انتساب

عبداللہ کے نام

جو میرے، تمہارے اور ہم سب کے
اندر جانے کہاں چھپا بیٹھا رہتا ہے

دیباچہ

گھنیرے بادل..... سیلی بارشیں..... برفیلے راستے.....

خاموش گلیاں..... اندھے موڑ.....

اونچی حویلیاں..... پرانے دروازے.....

چک ڈھلی کھڑکیاں..... دھوپ میں نہائے روشن دان.....

طویل برآمدے..... اندھیری غلام گردشیں.....

اجنبی مکین... نازک لب، پری چہرے.....

دوڑتے تانگے..... بھاگتی مال گاڑیاں.....

دھند اور کہرے میں ڈوبے ویران اسٹیشن.....

حیران سناٹے..... نادان دوست..... دانا دشمن.....

سیاہ دل حبیب..... سفید رَو رقیب.....

اور کچھ مجھ سے سیاہ نصیب.....

لوگ سوال کرتے ہیں کہ میری کہانیاں اتنی بھیگی ہوئی کیوں ہوتی ہیں؟ کیا بتاؤں کہ یہ بارشیں باہر نہیں میرے دل کے اندر کہیں برستی ہیں..... ویرانے اور سناٹے میری روح کو عطا ہیں..... اور یہ برفباریاں میری جان پر گزرتی ہیں..... میری آخری گاڑی ایسے ہی کسی دھند میں ڈوبے ویران ریلوے اسٹیشن سے چھوٹی تھی اور میرا دل انہی حویلیوں کی کسی غلام گردش میں کھویا ہے..... میں کہانی بھلا کب لکھتا ہوں..... میں تو بس خود کو ڈھونڈتا ہوں..... اور میری خود کو پانے کی یہ کھوج ابدی ہے۔

ہاشم ندیم

فہرست

باب1.....9
باب2.....14
باب3.....21
باب4.....28
باب5.....35
باب6.....42
باب7.....49
باب8.....56
باب9.....63
باب10.....70
باب11.....76
باب12.....82
باب13.....88
باب14.....95
باب15.....102
باب16.....109
باب17.....116
باب18.....123
باب19.....130
باب20.....137
باب21.....144
باب22.....150
باب23.....156

باب24.....162
باب25.....169
باب26.....176
باب27.....183
باب28.....189
باب29.....196
باب30.....202
باب31.....208
باب32.....214
باب33.....220
باب34.....226
باب35.....232
باب36.....238
باب37.....244
باب38.....250
باب39.....256
باب40.....262
باب41.....268
باب42.....274
باب43.....280
باب44.....286
باب45.....292
باب46.....298
باب47.....303
باب48.....309
باب49.....315

باب 1

رومی نے کہا تھا کہ "میں نے بس اتنا جانا ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہوگا..... البتہ ان میں چند ہی زندہ وہ ہوں گے جو جینے کا لطف بھی محسوس کر پائیں گے....."

اب جانے میرا شمار کس قطار میں ہوتا..... ہاں..... صحرا میں کھڑی اس درگاہ کے دروازے پر لمبی لمبی قطاریں ہی تو بنی ہوئی تھیں، سائل پریشان حال، لٹے پٹے اپنی اپنی منتوں کی گٹھڑیاں اپنے کاندھوں پر اٹھائے جانے کب سے چلچلاتی دھوپ میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ درگاہ کے صحن میں اپنے آپ میں گم مجذوب نے جھٹکے سے سر اُٹھایا اور ہم سب پر ایک نگاہ بے نیاز ڈالی۔ تیز ہوا چلی تو درگاہ کے صحن میں گرے خشک پتے میری زرد سوچوں کی طرح بکھرنے لگے، لمبی لٹوں والے درویش نے سر اُٹھایا۔

"جانتی ہو..... دنیا میں ہوس کی بہت سی اقسام ہیں..... مگر ان میں سب سے زیادہ مہلک قسم وہ ہے جسے دونوں فریق آخر تک محبت سمجھتے رہتے ہیں....."

درویش کے قدموں میں بیٹھی لڑکی ہاتھ جوڑ کر رو پڑی "صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہوں صاحب..... مجھے یوں نہ دھتکارو" لڑکی کے جڑے ہاتھوں سے کنگن چھن کی آواز کے ساتھ اس کی نازک کلائیوں تک نیچے ڈھلک آئے۔ سنا تھا عشق گھائل کر کے ادھ مرا چھوڑ دیتا ہے، مگر ہجر ہمیں لاغر کرتے کرتے رگوں سے زندگی کی آخری بوند تک نچوڑ لیتا ہے، اس کے ڈھیلے کنگن اس کے ہجر کی داستان سنا رہے تھے، وہ پھر گڑگڑائی "اُسے پانے کے لئے میں ہر منت چڑھانے کو تیار ہوں..... کہو تو قونیا چلی جاؤں..... رُومی کے مزار پر..... یا سورج والے شمس تبریز کی زیارت کر آؤں..... جو تم کہو سائیں....." مجذوب نے لڑکی کی ڈوبتی آنکھوں میں جھانکا.....

"اس کائنات کی سب سے قدیم اور مقدس ترین درگاہ تو تم اپنے ساتھ لئے پھرتی ہو، جہاں یہ سارے رومی، شمس، مجدد اور ولی تمہیں جمع ملیں گے..... کہیں اور در بدر بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس دن میں ایک بار اسی درگاہ کی زیارت کر لیا کرو..... ساری منتیں پوری ہو جائیں گی....."

وہ حیرت سے بولی "ایسی کون سی درگاہ ہے صاحب....."

درویش کے لب سرسرائے..... "تمہارا دل....."

لڑکی روتی ہوئی وہاں سے پرے سمٹ گئی، اب میری باری تھی۔ ملنگ نے بے نیازی سے پوچھا۔

"ہاں بولو..... تم کیوں در بدر بھٹک رہے ہو.....؟ ..... تمہیں کسی ایک جگہ ٹِک کر چین کیوں نہیں آ جاتا۔"

میری آواز بلند ہوگئی" کیونکہ میں کسی کی تلاش میں ہوں..... وہ کہاں کھوگئی ہے..... کیا میرا جذبہ سچا نہیں ہے.....؟ یا پھر یہ بھی میری ہی بصارت کا قصور ہے.....؟"

مجذوب غصے سے چلایا" کس بصارت پر غرور کرتے ہو..... بس یہ دو آنکھیں.....؟..... جو چند گز پرے بنی اس دیوار کے پار بھی نہیں دیکھ سکتیں..... جو خود روشنی کی محتاج ہیں اور ذرا سے اندھیرے میں اندھی ہو جاتی ہیں..... بس..... یہی بصارت ہے تمہارے پاس.....؟..... عشق کھلی آنکھ والوں کا کھیل نہیں ہے..... آنکھیں تو بس جسم کو ہی کھوج سکتی ہیں..... اُس کو تلاشنا ہے تو آنکھیں بند کر کے ڈھونڈنا سیکھو..... بند آنکھ سے دیکھنے والے فلک سے سمندروں کے فرش تک سب دیکھ لیتے ہیں..... اُن کے سامنے دنیا کے یہ سب بینا..... نابینا ہیں..... تم بھی اسی ظاہری دنیا کے متوالے ہو..... جاؤ چلے جاؤ یہاں سے..... پہلے اپنی بصارت کا علاج کرواؤ" درویش نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں پھسل کر خشک کنویں کی منڈیر سے نیچے گہرائی میں گرتا چلا گیا:..... تبھی میری آنکھ کھل گئی۔

☆.....☆.....☆

سنٹرل جیل کے سنتری نے جیل کے گھنٹے پر چار ضربیں لگائیں" ٹن۔ٹن۔ٹن۔ٹن....."

مطلب جیل کے گجر نے چار بجنے کا اعلان کر دیا تھا۔ میں خواب سے جاگا تو جسم پسینے سے شرابور تھا۔ پچھلے سات سال سے میں اس جیل میں قید تھا اور ان سات سالوں میں شاید ہی کوئی بات ہو جب میں نے یہ خواب نہ دیکھا ہو..... اچانک پرلی طرف سزائے موت کے قیدیوں والی چار دیواری میں سے کسی قیدی نے تان لگائی۔

یارا عشق جنھاں نوں لگ جاندے.....
حال پُچھ نہ اونہاں دیوانیاں دے.....
قیدی عشق دے بگے نہیں چھٹ دے.....
قیدی چھٹ جاندے نے جیل خانیاں دے.....

جانے وہ کون تھا، عشق کا اسیر تھا یا صرف اس جیل کا قیدی؟ بس اتنا پتہ چل سکا تھا کہ کوئی بگھا نام کا قیدی تھا جسے گزشتہ سال ہی سزائے موت سنائی گئی تھی اور اب وہ اپنی پھانسی کے انتظار میں سزائے موت کی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک کوٹھڑی میں اپنی زندگی کے آخری دن کاٹ رہا تھا۔ کتنا عجیب انتظار تھا بھلا موت کا بھی کوئی انتظار کرتا ہے۔ یہ ہنر تو البتہ عاشقوں سے منسوب ہے، جو اپنے محبوب کی آمد کی آس میں ساری عمر سولی سے لٹکے رہتے ہیں۔ مجھے جیل میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ جیل کے دن برس اور رات صدیوں سے لمبی ہوتی ہے۔ پل جیسے گھنٹے، اور گھنٹے مہینوں کی طرح گزرتے ہیں۔ بیرک کی دیوار میں لوہے کی جالی اور سلاخیں لگے روشن دانوں سے اندر آنے والی قیدیوں کے حصے کی چار خانہ دھوپ دیوار سے سرکائے نہیں سرکتی شاید قیدی کے لیے وقت کا پیمانہ بھی بدل دیا جاتا ہے تاکہ اذیت اور تنہائی کا احساس دوگنا، چارگنا ہوتا رہے اور انتظار کا تو براہ راست تعلق ہی وقت سے جڑا ہے، پھر چاہے انتظار موت کا ہو یا کسی محبوب کا..... وقت، لمحے، پل، گھڑیاں سبھی جلاد کا روپ اختیار کر لیتے ہیں، ستم گر بن جاتے ہیں، قیدی کی سزا بھلا صرف قید ہی کب ہوتی ہے؟ ایسی کئی اَن دیکھی اذیتیں اور عذاب اُس کا مقدر بن جاتے ہیں۔

سارا زمانہ اور پوری قدرت اُس کی بیری ہو جاتی ہے۔

میں اس بڑی جیل تک کیسے پہنچا اور یہ جنگ میرا دشمن کب ہوا..... یہ بھی ایک لمبی کہانی تھی، کون جانتا تھا کہ وقت ایسی کروٹ لے گا اور سارے اپنے بچھڑ جائیں گے، مقدر ہمیشہ بے خبری میں ہی وار کرتا ہے، جب ہمیں لگ رہا ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہو چلا ہے۔ کہتے ہیں عقل مند دشمن یلغار کے لئے علی الصباح حریف فوجوں پر چڑھائی کرتے ہیں جب وہ ساری رات کی تھکن کے بعد ذرا دیر کو آنکھیں موند لیتے ہیں۔ میری بربادی کا آغاز بھی رات کے اُسی پہر سے ہوا تھا جب رات فجر سے ملنے کو تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی، وہی جسے میں نے ایک بار درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا اور اسی لمحے میرا دل خود ایک درگاہ میں تبدیل ہو گیا تھا، منتوں، مرادوں والی درگاہ، عرضیاں ڈالنے والا مزار، بھینٹ چڑھانے والی خانقاہ..... میرا دل بھی اسی زیارت کی بھینٹ چڑھ گیا اور میں نے سارے زمانے سے لڑ کر اسے جیت ہی لیا۔

جوگی بنا، بنجارہ ہوا، فقیر بنا، آوارہ ہوا مگر دل کو اُسی کی دھن پر سر دُھننا آتا تھا، اُس روز وہی میرے ساتھ تھی، ہاں..... وہی..... زہرہ..... ان چار حرفوں سے میرے دل کے اندر پل میں ہی ہزاروں چاند جانے کیسے اور کیوں روشن ہو جاتے تھے..... میں یہ راز کبھی جان نہیں پایا۔ میری اور زہرہ کی رخصتی طے ہو چکی تھی اور بس چند روز میں ہی اس کی ڈولی میرے آنگن میں اُترنے والی تھی، مجھے یاد ہے اُس 2 فروری کی شام میں درگاہ سے نکلنے لگا تو بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں گھر کے بجائے زیادہ تر درگاہ پر ہی وقت صرف کرتا تھا کیونکہ حاکم بابا اور مولوی خضر کے جانے کے بعد ساری ذمہ داریاں میرے ہی سر تھیں۔ جانے اس روز موسم کے تیور مجھے بدلے بدلے سے کیوں دکھائی دے رہے تھے، شاید "ان ہونیاں" موسم کے مزاج بھی بدل سکتی ہیں۔ میں نے درگاہ کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک گرج دار سی آواز سنائی دی "کہاں جا رہے ہو.....؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لمبی لٹوں اور دھول میں اٹا ایک مجذوب صحن میں جانے کب سے بیٹھا اپنے منکے اور مالائیں جھٹکا رہا تھا۔ "کسی سے ملنے کا وعدہ ہے آج رات..... وہاں جا رہا ہوں....."

میرا جواب سن کر اُسے جلال سا آ گیا "مت جاؤ..... وہ تمہارے تعاقب میں ہے..... ہر پل..... ہر گھڑی....." میں نے حیرت سے مجذوب کو دیکھا..... "کون ہے میرے تعاقب میں.....؟"..... "وہی..... جس سے دشمنی ادھوری چھوڑ آئے تھے پردیس میں..... ادھوری دشمنیاں پوری قضا بن کر لوٹ آیا کرتی ہیں کبھی۔"

میں جلدی میں تھا اس لئے سمجھ نہیں سکا۔ "لیکن میرا جانا ضروری ہے..... کسی سے وعدہ کر بیٹھا ہوں..... وہ میرا انتظار کرتی ہو گی..... اور میں وعدہ خلافی کر نہیں سکتا....."

مجذوب میری بات سن کر چپ رہا..... "تم اُس سے نہیں..... کسی کی موت سے کیا وعدہ نبھانے چلے ہو..... اچھا ضد کرتے ہو تو یونہی سہی..... جاؤ..... مگر ایک بات یاد رکھنا..... وہ جو پردیس میں چھپا بیٹھا ہے..... وہ بڑا مداری ہے..... اور مداری اپنا کھیل شروع کر چکا ہے....."

میں الجھن زدہ سا باہر نکل آیا، لیکن گھر جاتے وقت زہرہ سے ملنے کی خوشی نے میرے سارے وسوسے دھو ڈالے..... یہ محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے..... کوئی وسوسہ کوئی خدشہ، کوئی وہم اس کی سرشاری ختم نہیں کر سکتا۔ محبت سے بڑا

جادو اور کیا ہوگا بھلا.....؟

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شادی مرگ کسے کہتے ہوں گے..... کوئی بھلا خوشی سے بھی مر سکتا ہے؟ مارتا تو غم ہے، لیکن اُن دنوں مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ جیسے مجھے اِس لفظ کا مطلب سمجھ آنے لگا ہے اور میں بھی ڈرنے لگا تھا کہ کہیں اُس کے میرے ہو جانے سے پہلے ہی میرا دل خوشی سے پاٹ نہ جائے۔ جانے قدرت نے ہمارا دل اتنا نازک بنایا ہی کیوں تھا.....؟..... جن چیزوں پر سکت سے زیادہ بوجھ ڈالنا مقصود ہوا نہیں دوگنا مضبوط جوڑا جاتا ہے مگر میرا دل تو بیچارہ اکیلا تھا۔ اتنی خوشی کا بوجھ کیسے سہہ پاتا.....؟

ہم دونوں کے خاندان بھی بہت خوش تھے۔ مما پاپا کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ چاند اور تارے آسمان سے اُتار کر ہماری کوٹھی سجا دیں۔ زہرہ کے ماں باپ شادی اور رخصتی سے پہلے اس کے گھر سے زیادہ نکلنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خود زہرہ بھی کسی بدشگونی سے ڈرتی تھی۔ اور مجھ سے ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ اب ہم رخصت ہونے کے بعد ہی ملیں گے، لیکن میرا یہ نادان دل بھلا ایسی بدشگونیوں کو کب مانتا تھا۔ دل کے اپنے شگن ہوتے ہیں اور اپنی ہی رسمیں..... دھڑکنیں جب محبوب کا نام جپنا شروع کر دیں تو اُس جاپ کے سامنے سارے جنتر منتر ناکام ہو جاتے ہیں۔ سو میرا دل بھی ضد کر بیٹھا تھا کہ اپنی سالگرہ والی رات مجھے زہرہ سے ضرور ملنا ہے۔ جس کے لئے میرا جنم ہوا تھا..... اپنے جنم دن پر اسی سے ملاقات نہ ہوئی تو بھلا سالگرہ کیسی؟ زہرہ نے منع کیا، اس کی ماں نے ٹوکا اور اس کے ابا نے برا منایا، پر میری ضد کے آگے سبھی کو ہار ماننا ہی پڑی اور 2 فروری کی رات کو میں اُسے کیک کاٹنے کے لئے رات بارہ بجے اسی ساحل ہٹ میں لے آیا جہاں ہم پہلے بھی ایک آدھ بار آ چکے تھے۔ زہرہ کو یہاں کا سکون اور اونچائی سے سمندر کا نظارہ بہت پسند تھا۔ مجھے یاد ہے، اس رات اس نے میری فرمائش پر وہی دھانی ستاروں والی سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی، وہ میری جوگن تھی اور میں اس کا۔

مگر میرا یہ نادان دل یہ نہیں جانتا تھا کہ عشق ناگ کے جوڑے کو آج تک کوئی جوگی بھی قابو نہیں کر پایا تھا۔ جیسے ہی سپیرے کا دھیان ہٹتا ہے ٹھیک اسی لمحے یہ زہریلے ناگ اُسے ڈس لیتے ہیں۔ کیک کٹنے کے بعد ہم بہت دیر وہیں بیٹھے آنے والے دنوں کی باتیں کرتے رہے اور پھر زہرہ کو ہی اپنی نازک کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر گزرتے وقت کا خیال آیا۔ رات بہت بیت چکی تھی اور ہمیں یہاں سے گھر پہنچنے میں بھی کافی وقت مزید لگنا تھا۔ لہٰذا بادل نخواستہ میں نے بھی واپسی کی حامی بھر لی۔ یہ ہٹ پاپا کے کسی بزنس مین دوست کا تھا اور رات گئے تک سارا عملہ ہماری خدمت کے لئے وہیں موجود رہا۔ میں نے واپسی پر ہٹ کے کیئر ٹیکر اور باقی عملے کے لئے جیب میں موجود ساری رقم مینیجر کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ رات بہت ہو چکی ہے۔ ہٹ کے عملے کی گاڑی بھی وہ ہمارے ساتھ ہی روانہ کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ہمیں شہر کی حدود تک چھوڑ کر واپس لوٹ آئیں۔ لیکن میں نے منع کر دیا اور میں زہرہ کے ساتھ اپنی جیگوار میں وہاں سے نکل آیا میں نے کار کی رفتار بڑھائی تو زہرہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔"

کیا جلدی ہے صاحب؟" میں ہنس پڑا..... یہ لڑکیاں کبھی اپنے دل کی پوری بات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتیں۔ کہاں تو اسے گھر واپسی کی جلدی پڑی تھی..... اور کہاں یہ تھم کر چلنے کی فرمائش.....؟..... میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، سیاہ ساڑھی میں اس کے چہرے کا کندن دمک رہا تھا..... سچ ہے..... ماہتاب کو رات کی سیاہی نکھارتی

ہے۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی "کیا دیکھ رہے ہو..... آگے دیکھ کر گاڑی چلاؤ صاحب....."

اُسی لمحے زہرہ کی نظر سامنے پڑی اور وہ خوفزدہ ہو کر چلائی..... "دھیان سے ساحر....." سامنے سڑک پر تین چار موٹر سائیکل درمیان میں لگائے کچھ لڑکے راستہ بند کیے کھڑے تھے، جیسے اُنہیں رات کے اس پہر کسی شکار کا انتظار ہو۔ میں نے پوری قوت سے بریک دبا دی۔ گاڑی ایک زوردار سکریچ کے ساتھ تقریباً انہیں چھوتی ہوئی جا کر رُک گئی۔ ان میں سے دو ہماری طرف لپکے اور کوئی زور سے چلا کر بولا۔

"چپ چاپ نیچے اُتر جاؤ گاڑی سے..... ورنہ چھکی چھ سر میں اُتار دوں گا....." زہرہ نے گھبرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

..........*

باب 2

وہ تین لڑکے تھے۔ میری نظر فوراً ان کی بائیکس کی طرف گئی، ہارلے ڈیوڈسن؟..... ہایابوسا اور شوگن..... تینوں ہی قیمتی بائیکس تھیں۔ لڑکے حلیے سے بھی عام چور اچکوں سے مختلف لگ رہے تھے، جینز قیمتی اور ہاتھوں میں پکڑے سگریٹ کی مہک بازاری تمباکو سے جدا تھی۔ پھر یہ چوری ڈاکہ کیسا؟ میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ ان کا سرغنہ چلا کر بولا۔

''سنا نہیں..... نیچے اُترو..... چلو..... جلدی کرو.....''

زہرہ کا رنگ خوف کے مارے سفید پڑنے لگا کیونکہ اُس نے دوسری جانب کھڑے لڑکے کے ہاتھ میں 32 بور کا خوفناک پسٹل دیکھ لیا تھا۔

میں نے سکون جمع رکھتے ہوئے ان سے کہا ''تمہیں جو کچھ چاہیے، میں ویسے ہی تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں..... تم ہمیں جانے دو.....'' وہ غرا کر بولا۔ لگتا ہے تمہیں سیدھی زبان سمجھ نہیں آتی۔ چپ چاپ نیچے اتر جاؤ..... ہمیں جو کچھ چاہیے ہوگا ہم خود لے لیں گے.....''

زہرہ کپکپاتی آواز میں بولی ''ساحر..... ان سے بحث مت کرو..... جیسا کہتے ہیں پلیز ان کی بات مان لو.....''

''ٹھیک ہے..... لیکن تم اندر ہی بیٹھی رہنا۔ اپنی طرف کا دروازہ لاک کر لو..... اور کچھ بھی ہو جائے..... تم نیچے مت اترنا.....''

''میں زہرہ کو ہدایت دے کر دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ گاڑی کی چابی میں نے غیر محسوس طور پر کار بند کر کے زہرہ کے قدموں میں پھینک دی۔ لیکن وہ لڑکے شاید اناڑی اُچکے تھے، اس لئے میری یہ حرکت نوٹ نہیں کر سکے، میں نے اپنی جیب سے والٹ، اپنی گھڑی اور فون وغیرہ نکال کر گاڑی کے بونٹ پر رکھ دیئے.....

''میرے پاس یہی کچھ ہے۔ تم چاہو تو میری تلاشی لے سکتے ہو۔''

لڑکے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کمینی سی مسکراہٹ مسکائے ''اوئے سنی..... واٹ از دِس یار..... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی..... اس نے تو چپ چاپ سارا مال نکال دیا..... تھوڑا سا تھرل تو ہونا چاہیے تھا.....'' ان کا سرغنہ سنی جس کے ہاتھ میں پسٹل تھا، فلمی انداز میں پسٹل گھما کر بولا۔ ڈونٹ وری (Don't worry)..... ابھی تھرل کے لئے پوری رات باقی پڑی ہے بوائز.....'' سب لڑکے زور سے ہنس پڑے۔ تو میرا خیال ٹھیک تھا۔ یہ عام روایتی

چوراُچکے نہیں تھے۔

میں نے اپنے حواس بحال رکھے "تم لوگوں کو جو کچھ چاہیے تھا..... وہ میں نے پہلے ہی دے دیا ہے، چاہو تو میرے سارے کریڈٹ کارڈز اور اے۔ ٹی۔ ایم کا پن بھی لے لو..... لیکن اب ہمیں جانے دو....."

اس سارے عرصے میں ان تینوں کی نظر گاڑی کے اندر بیٹھی زہرہ کے سراپے کا طواف کرتی رہیں..... سنی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مڑ کر معنی خیز لہجے میں بولا "ڈیٹ سے آرہے ہو اس وقت.....؟ چیز تو بڑی کمال بٹھا رکھی ہے ڈوڈ (Dude)....." تینوں نے زور سے ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے اپنے حواس کو بمشکل قابو میں رکھا..... "وہ میری منگیتر ہے۔ تم مجھ سے بات کرو..... میں تمہاری ہر ڈیمانڈ پوری کروں گا۔ کتنا پیسہ چاہیے..... ملے گا تمہیں....."

سنی نے غور سے زہرہ کی طرف دیکھا..... "واہ بھئی..... یہ آدھی رات کو اس ویرانے میں اپنی منگیتر کو لے کر گھومنے والا پہلی مرتبہ دیکھا ہے میں نے..... کیوں سِڈ (SID)....." وہ پھر زور سے ہنسے۔

سنی نے غصے سے چلا کر کہا..... "اس محترمہ سے بھی کہو کہ نیچے اترے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں تمہاری اس منگیتر گرل فرینڈ کو....." سِڈ نام کا لڑکا زہرہ والی سائڈ کے دروازے کی طرف بڑھا، میں نے چلا کر اسے خبردار کیا..... وہیں رک جاؤ..... دروازے کو ہاتھ بھی مت لگانا....." زہرہ ڈر کر گاڑی میں ہی مزید سمٹ گئی۔ میں تیزی سے سِڈ SID کی طرف لپکا۔ انہیں شاید میری طرف سے ایسی کسی حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

سنی زور سے چلایا..... "اوئے کاشی پکڑو اس پاگل کو....." تیسرا لڑکا پسٹل نکال کر میری طرف لپکا، سِڈ نے اپنا پسٹل والا ہاتھ زور سے زہرہ والی سائڈ کے دروازے پر مارا اور فضا شیشہ ٹوٹنے کے چھناکے سے گونج اٹھی۔ سِڈ نے اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کا لاک کھولنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ سِڈ نے میری جانب پسٹل سیدھا کرنا چاہا لیکن تب تک میں اس کو دبوچ چکا تھا۔ کہتے ہیں بہت زیادہ بہادری اور حماقت میں بڑا فرق نہیں ہوتا، لیکن اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ زہرہ زور سے چلائی، سنی ہماری طرف لپکا۔ کاشی نے مجھے پیچھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن میں نے سِڈ کے پسٹل والے ہاتھ کی کلائی نہیں چھوڑی۔ ایک ہنگامہ سا مچ گیا، وہ تینوں واقعی اناڑی لگتے تھے ورنہ تین لوگوں کو مجھ پر قابو پانے میں زیادہ دیر نہ لگتی، اسی لمحے سِڈ مجھ سے بھڑ گیا۔ اور اس نے خود کو مجھ سے چھڑانے کے لئے ہر ممکن زور آزمائی شروع کر دی۔ سنی اور کاشی چلا رہے تھے اور پھر ٹھیک نیچے گرتے ہی فائر کی زوردار آواز نے سناٹے کو چیر دیا۔ سِڈ کا ہاتھ گرتے گرتے بہک گیا اور ایک اور فائر ہوا۔

کاشی زور سے چلایا۔ اوہ نو..... سنی....." میں نے اور سِڈ نے گھبرا کر سنی کی طرف دیکھا جو وہیں کھڑے کھڑے زمین پر گر چکا تھا اور خون کا ایک چھوٹا سا تالاب اس کے اردگرد اکٹھا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ سِڈ نے گھبرا کر پسٹل میرے ہاتھ میں ہی چھوڑ دیا۔ کاشی بھی حواس باختہ ہو کر سنی کی طرف لپکا، مجھے یاد آیا کہ آج شام مجذوب نے یہی تو کہا تھا مجھ سے کہ میں کسی اور کی موت کا وعدہ نبھانے جا رہا ہوں.....

ان دونوں کو میرا دھیان ہی نہیں رہا کہ اب پسٹل میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ سنی کی سانسیں تھم رہی تھیں۔ کاشی اور سِڈ نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دونوں اپنی اپنی بائیکس کی طرف لپکے، میں چلایا، "رُکو.....

اسے گاڑی میں ڈالنے میں میری مدد کرو..... شاید بچ جائے....."

لیکن وہ دونوں بائیکس کو کِک لگا کر یوں سرپٹ بھاگے کہ پیچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ زہرہ بہت ڈر گئی تھی، میں نے جلدی سے سنی کی نبض چیک کی، زندگی کے آثار معدوم تھے۔ میں نے فوراً اپنے پولیس محکمے کے ایک افسر دوست ایس پی SP کامران کو کال ملائی اور اسے ساری صورتحال بتائی۔ کامران نے سختی سے کہا "تم وہیں ٹھہرو..... اور دیکھو..... کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، میں ابھی ایمبولینس کے ساتھ وہاں پہنچتا ہوں....."

کامران کے آتے آتے دور ساحل پر صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی لیکن کون جانتا تھا کہ ٹھیک اسی وقت میری زندگی کی "طویل رات شروع ہونے والی ہے جس کا خاتمہ آخر کار سینٹرل جیل کی اس سیلن زدہ بیرک میں ہونا تھا۔ سنی کی میت کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور سورج نکلنے سے پہلے ہی سارے شہر میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ ملک کے سینئر وزیر سلمان دانش کا بیٹا سنی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ شہر میں جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ پاپا اور کامران ایس پی کی لاکھ کوششوں کے باوجود شام سے پہلے ہی پولیس ہمارے دروازے پر موجود تھی۔ اتنے بڑے سیاست دان کے بیٹے کا قتل کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ سلمان دانش نے حکومت کے سارے ایوان ہلا ڈالے تھے۔ پاپا کی پہنچ بھی بہت اوپر تک تھی مگر سلمان کا پلڑا بھاری رہا۔ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سنی اور اس کے دوست اُس رات سڑک پر لوٹ مار کے ارادے سے ہی کھڑے تھے۔ پولیس، عدالت، وکیل..... سبھی کا ایک ہی سوال تھا کہ اتنے بڑے گھر کے لڑکے کو کہ جس کا دن کا خرچہ لاکھوں میں تھا اسے کسی سے کچھ لوٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی یہ جان نہیں پایا کہ جب زندگی میں سب کچھ حاصل ہو جائے تو ایک چیز کھو جاتی ہے..... "اُمنگ"..... ان لڑکوں کے اندر اُمنگ ختم ہو رہی تھی، اور جسے جگانے اور کچھ تھرل یا ایڈونچر پانے کی غرض سے وہ وہاں مورچہ لگائے کھڑے تھے۔ پاپا نے ملک کے بہترین وکیلوں کا پینل میرے کیس کے لئے جمع کروا رکھا تھا مگر سلمان دانش کو اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ چاہیے تھا۔ کاشی اور سِڈ کے بیان بھی میرے خلاف تھے کہ میں نے زہرہ کے ساتھ ان لوگوں کا وہاں تک پیچھا کیا اور گاڑی سے اُترتے ہی دو فائر کیے جن میں سے ایک سنی کو جا لگا۔ ہر چیز میرے خلاف جا رہی تھی۔ مثلاً اتنی رات گئے میں اور زہرہ اس ویران سڑک پر کیا کر رہے تھے؟ اگر وہ لڑکے لوٹ مار کے ارادے سے کھڑے تھے تو گولی اُنہی کے سرغنہ کو کیوں لگی؟ اگر اتفاقیہ حادثہ تھا تو پھر دو گولیاں سنی کی سمت کیوں چلائی گئیں۔

کاشی اور سِڈ کے باپ بھی کھرب پتی تھے اور سچی گواہی کی صورت میں ان کے اپنے بیٹے پر قتل کا الزام آتا تھا۔ قتلِ عمد نہ سہی، قتل خطا ہی سہی..... لہٰذا ان دونوں خاندانوں نے بھی اپنا پورا اثر و رسوخ مجھے سزا دلوانے پر صرف کر دیا۔ پاپا تنہا ہوتے گئے۔ ھٹ (HUT) کے ملازمین کے بیانات میں تضادات پیدا کر کے انہیں بھی مشکوک کر دیا گیا تاکہ ان کی گواہی میرے حق میں نہ جا سکے۔ درپردہ میرے اپنے وکیلوں کو خرید کر میرے کیس (Case) کو کمزور کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی بھری عدالت میں گھڑ لی گئی کہ سنی دراصل خود زہرہ کو پسند کرتا تھا اور اس کے لئے رشتہ بھجوانے کی کوشش بھی کر چکا تھا۔ لہٰذا مجھے اس بات کا قلق تھا اور میں نے حسد میں آ کر سنی پر گولی چلائی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی، سچ کو سچ ثابت کرنا ان عدالت اور کچہریوں میں کتنا مشکل تھا، جبکہ جھوٹے گواہ، ثبوت اور الزام کتنی آسانی سے حق تسلیم کر لیے جاتے ہیں۔

مما اور پاپا ہر پیشی پر مجھے مزید کچھ نڈھال اور کمزور دکھائی دیتے تھے۔ زہرہ شروع میں اپنے ابا کے ساتھ چپ چاپ سیاہ شال لپیٹے کمرۂ عدالت میں پیچھے کے بینچوں پر بیٹھی مجھے تکا کرتی تھی۔ اس کی نم پلکیں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں مجھ سے بات کیا کرتی تھیں۔ امجد اسلام امجد نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ "تخلیئے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔"

میرے اور زہرہ کے درمیان بھی یہی معاملہ تھا، ہمیں باتیں اضافی لگتی تھیں، اور جب وہ میرے سامنے ہوتی تھی، تب بھرا ہجوم اور بھیڑ میں میرے لیے تخلیہ بن جایا کرتی تھی۔ مجھے پتہ ہی کب چلتا تھا کہ میں بھری عدالت یا بھانت بھانت کی بولیوں، وکیلوں اور لوگوں کے ہجوم سے بھری کسی کچہری سے گزر رہا ہوں۔ سبھی راہداریاں، عمارتیں، راستے اور کمرے میرے لئے ویران ہو جایا کرتے۔ صرف وہ اور اُس کی بنا سرمے کے کاجل بھری سیاہ آنکھیں میرے وجود کا احاطہ کیے رکھتی تھیں۔

لیکن جب سنی کے وکلاء نے بھری عدالت میں مجھے قصوروار ثابت کرنے کے لئے زہرہ کے کردار پر کیچڑ اُچھالنا شروع کیا تو میں نے زہرہ کے ابا کو پہلی مرتبہ بے چین دیکھا۔ وہ ایک شریف اور وضعدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کی پچھلی سات نسلوں نے بھی کبھی ان کورٹ کچہریوں کے معاملات نہیں برتے تھے۔ جہاں کسی عفت مآب کی عزت اُچھالنا کسی اچھے وکیل کے پینتروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ کیس جیتنے کے لئے کسی کی رُوح پر چاہے جتنے چرکے لگائیں، وہاں تماش بینوں کو صرف تالیاں بجانے سے غرض ہوتی ہے۔ گویا عدالت میں کیس نہیں لڑا جاتا، فقرہ بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اور میں زہرہ کے ابا کو اس فقرہ بازی سے اذیت میں مبتلا دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے انہیں زہرہ کے ساتھ کمرہ عدالت میں آنے سے منع کر دیا۔

مجھے یاد ہے اُس دن جب مجھے ہتھکڑیوں میں پیشی سے واپس جیل لے جایا جا رہا تھا وہ راہداری کے ایک ویران گوشے میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سنتری سے چند لمحے رُکنے کی درخواست کی، سنتری نے ایک پل میری طرف دیکھا، پھر نہ جانے اسے میرے چہرے پر وہ کون سی تحریر لکھی نظر آئی کہ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کون ہے یہ تمہاری سائیں.....؟ لگائی ہے یا ہونے والی ہے۔" اُس کے معصومانہ سوال پہ میں مسکرا دیا۔

"یہ سب کچھ ہے میری.....اور جس دن تمہارا قانون میری ہتھکڑیاں کھول دے گا.....لگائی بھی ہو جائے گی.....تم ضرور آنا جلد ہی میری شادی ہے....." سنتری نے قہقہہ لگایا اور اپنے دوسرے دو ساتھیوں کو لے کر ایک جانب ہو گیا۔

زہرہ کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ مما پاپا اور اُس کے ابا ذرا فاصلے پر کھڑے ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اتنے بہت سے ہفتوں کے بعد یہ ہماری پہلی براہ راست بات اور ملاقات تھی۔ اس کے کومل لب دھیرے سے کانپے "کیسے ہو صاحب.....؟"

"تم جیسا صاحب....." اُس کی مسکراہٹ شکستہ تھی۔

"پھر تو بہت اچھے ہو، لیکن بس اب یہ کھیل ختم کر دو..... میں ٹھیک نہیں ہوں..... ہر روز کسی معجزے کی دعا کرتی ہوں..... کسی کرامت کی آس میں یہاں آتی ہوں.....مگر مایوس لوٹ جاتی ہوں.....تم کوئی کرشمہ کیوں نہیں

دکھاتے۔" مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ اب گھر چلو واپس کہ ہمارے نکاح کے انتظار میں چاند تاروں نے چمکنا ماند کر دیا ہے۔ پھول بازار کے سارے گل فروش تمہارے سہرے میں پھول ٹانکنے کو دم سادھے بیٹھے ہیں..... کاریگر ریشم نہیں بن رہے کہ میرا عروسی جوڑا ہی طے نہیں ہوا..... وقت وہیں رُکا کھڑا ہے، تم آؤ تو گھڑیاں اپنی رفتار پکڑیں..... کیوں ستاتے ہو تم ان سب کو صاحب.....؟ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ آس پاس جیسے سب کچھ ڈھل سا گیا۔

میں نے مڑ کر اُسے روکا ....." کہتے ہیں مریض اور قیدی کے سامنے حوصلہ نہیں چھوڑنا چاہیے..... لڑکی..... کیسی طبیب اور ہمدرد ہو..... اپنے بیمار کو رُلاؤ گی کیا.....؟ میں کہیں بھی رہوں..... تمہاری آنکھوں کی قید میں ہی رہوں گا..... اور صیاد پر لازم ہے کہ اپنے صید کی پوری دیکھ بھال کرے..... جب تمہاری ان پیاری آنکھوں میں پانی آتا ہے تو تمہاری پلکوں کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا یہ قیدی بھی بھیگنے لگتا ہے۔ اور تم تو جانو کہ جاڑے میں بھیگنا مطلب کھانسی، نزلہ، زکام، بخار..... یعنی علاج کا خرچہ الگ....." وہ مسکرا دی۔

"باتیں خوب بنا لیتے ہو....." وہ مسکرائی اور بارش کے بعد جیسے دھوپ نکل آئی۔ میں نے اُسے تسلی دے کر رخصت کیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی لیا کہ اب وہ عدالت کی کارروائی دیکھنے نہیں آئے گی۔ میں جانتا تھا کہ اس نے کس بھاری دل سے میری یہ بات مانی ہوگی۔

"بہت ضدی ہو..... ہمیشہ اپنی ہی منواتے ہو..... مگر جب رہا ہو کر واپس آؤ گے تو تب صرف تمہاری صاحبہ کی ہی چلے گی..... یاد رکھنا....." جاتے جاتے اس نے راہداری میں دو تین بار مجھے پلٹ کر دیکھا، ہر بار اس کی پلکیں مجھے پہلے سے زیادہ نم اور چمکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

میں وہیں کھڑا اُسے اپنے ابا کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ راہداری کے کنارے پر وہ ایک پل کے لئے رُکی اور لمحہ بھر کے لیے میری اور اس کی نظر ملی، اس کی پلکوں کے موتیوں نے مجھے کہا "الوداع....." میرا دل چاہا میں دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اس کے پاس جاؤں اور اپنی ہتھیلیوں میں اس کی آنکھوں کے ستارے جمع کر لوں..... انہیں زمین پر نہ گرنے دوں اور اس کے ہاتھ تھام کر کہوں "پریشان کیوں ہوتی ہو..... میں ہوں ناں..... سب ٹھیک کر دوں گا....." لیکن میں کچھ بھی ٹھیک نہیں کر پایا..... کبھی کبھی ہم کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر معجزہ نہیں ہوتا..... ہم بھولے انسان یہ بھی نہیں جانتے کہ معجزے ہماری مرضی اور اختیار کے تابع نہیں ہوا کرتے۔ ویسے بھی بات جب معجزے کی آس تک پہنچ جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ انسانی اختیار اور ترکیب کی حدیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

پاپا کی ساری تدبیریں اور ترکیبیں بھی دھری کی دھری رہ گئیں اور چھ ماہ کی مسلسل بحث اور پیشیوں کے بعد آخر عدالت نے مجھے عمر قید کی سزا سنا دی۔ گویا اب جو عمر بچی تھی..... وہ قید میں بسر ہوگی۔ کیا خوب کہ "عمر دراز مانگ کر لائے تھے چار دن..... دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں....." میں یہ جیل اور قید کا نظام کبھی سمجھ نہیں پایا۔

ایک ہماری ہی طرح کا انسان، سیاہ چغہ پہن کر اور اپنے ہی جیسے کسی انسان کو عمر بھر کے لئے سلاخوں کے پیچھے قید رکھنے کا حکم کیسے دے سکتا ہے.....؟ صرف اس لئے کہ وہ منصف کی کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے؟ بات اگر سزا اور جزا کی ہے تو پھر انصاف کا معاملہ انسان اور فرشتے کے درمیان طے ہونا چاہیے..... انسان ہی انسان کو سزا کیسے دے سکتا

ہے.....؟ دونوں ہی کمزور مخلوق..... دونوں ہی مصلحتوں کے مارے..... مشکوک..... سزاوار..... کھوٹے..... گناہگار..... میری سزا سنتے ہی پاپا وہیں عدالت میں کرسی پر ڈھے سے گئے اور مما کچھ اس طرح بستر پر گریں کہ پھر کبھی اٹھ نہ پائیں۔

پاپا نے مجھے تسلی دی ''تم فکر نہ کرو..... میں ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ جاؤں گا..... ابھی دروازے بند نہیں ہوئے سارے.....'' میں نے انہیں تسلی دینے کے لئے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ لیکن میں انہیں یہ نہیں کہہ سکا کہ یہ اوپر کی عدالتیں سیٹھ سلمان کے لیے بھی اتنی ہی کھلی ہوئی تھیں اور وہ بھی میری عمر قید کی سزا سے مطمئن نہیں تھا۔ اس کی خواہش مجھے سولی پر لٹکتے ہوئے دیکھنے کی تھی۔ اور اُس نے عدالت کے باہر ہی جمع صحافیوں کے سامنے اعلان کر دیا تھا کہ وہ مجھے موت کی سزا دلوانے کے لئے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرے گا۔ مما پاپا عدالت سے جیل جاتے وقت روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے۔

زہرہ ابا کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی روتی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو ''بہت ستاتے ہو مجھے صاحب..... کہا تھا ناں..... بس کر دو..... اب واپس آ جاؤ.....'' لیکن میں اسے کیا بتاتا کہ سلطان بابا کے جانے کے بعد میری زندگی سے جیسے سبھی معجزے اور کرشمے کرامات مٹ سے گئے تھے۔ مجھے سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا..... سیٹھ سلمان دانش اور پاپا دونوں ہی میری سزا کے خلاف سپریم کورٹ چلے گئے۔

مما بستر پر جا گریں اور پاپا جب بھی مجھ سے ملنے آتے میں ان کی آنکھوں میں مما کے کرب اور اذیت کی ایک نئی کہانی پڑھ لیتا۔ ہفتے مہینے اور مہینے سال میں بدلتے گئے۔ پھر ایک روز خبر آئی کہ مما اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ مجھے چند گھنٹوں کے لیے پر ان کی تدفین میں شرکت کی اجازت ملی تھی۔ مجھے جیل سے سیدھے قبرستان پہنچایا گیا مما سکون سے لیٹی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جیسے ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی ہو..... مجھے تو ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکان بھی دکھائی دی جیسے انہیں پتہ ہو کہ ان کا لاڈلہ ساحر اُن سے ملنے کے لئے ضرور آئے گا۔

آس پاس لوگ کچھ عجیب وغریب سی باتیں کر رہے تھے ''صبر کرو بیٹا..... قسمت کو یہی منظور تھا۔ وہ یہاں سے بہت اچھی جگہ چلی گئی ہیں..... اب وہ تمہارا جنت میں انتظار کرتی تمہیں ملیں گی.....'' میرے ذہن میں ایک عجیب سا سوال اُبھرا..... اور اگر اُن کا مجھ جیسا ناخلف بیٹا اگلے جہاں میں جنت کا حق دار ہی نہ ٹھہرایا گیا تو.....؟ پھر میری ان کی ملاقات دوبارہ کیسے ہوگی؟ جن کی مائیں انہیں چھوڑ جاتی ہیں، ان بچوں کی سانس کی ڈوری کیسے جڑی رہ جاتی ہے؟ وہ جس کی کوکھ میں سانسوں کا یہ رشتہ جڑتا ہے، جب اُس کی سانسیں تھم جائیں تو اس کے وجود کا ٹکڑا اُسی جسم کا ایک حصہ اپنے پھیپھڑوں میں ہوا کی روانی کیسے برقرار رکھ سکتا ہے؟

اُس روز مجھے پتہ چلا کہ سانس لینا ایک الگ چیز..... اور جینا کچھ الگ بات ہے۔ وہ سبھی جو سانس لیتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ زندہ بھی ہوں..... جیسے اس وقت میں اور پاپا..... ہم دونوں کی صرف سانسیں ہی چل رہی تھیں۔ ہم بھلا زندہ کب تھے.....؟

تدفین کے بعد مجھے دوبارہ زندان میں پہنچا دیا گیا۔ پلٹتے وقت جب میں نے پاپا کو گلے لگایا تبھی میرے دل نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اب ان کا دل بھی اُن کے اس جسم ضعیف کا زیادہ عرصے تک ساتھ نہیں نبھا پائے گا۔

قبرستان سے لوٹتے وقت بارش شروع ہو چکی تھی اور دور ایک درخت کی چھتری سے ٹپکتی بوندوں سے پرے مجھے زہرہ سیاہ شال میں لپٹے کھڑی نظر آئی۔

وہ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ برستی بارش اور بھیگے چہروں نے ہم دونوں کے بہتے آنسوؤں کا بھرم قائم رکھا اور میں قیدیوں کی گاڑی میں چڑھ گیا۔ اب میں نے دن ہفتے اور مہینے کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر ایک روز سنتری میرے پاس آیا "کوئی نیا بندہ تم سے ملنے آیا ہے" میں ملاقاتی کمرے کی جالی سے پرے جا کھڑا ہوا۔ تبھی آنے والے کے قدموں کی گونج اُبھری۔ میں اس ملاقاتی کی آمد کا بہت پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر وہ لمحہ آ ہی گیا تھا، وہ دھیرے سے بولے "کیسے ہو.....؟"

..........*

باب 3

کچھ دیر ماحول پر گمبھیر سی خاموشی طاری رہی، کبھی کبھی سارے لفظ ہمارے اندر ہوتے ہوئے بھی ترتیب پانے میں بہت وقت لے لیتے ہیں۔ ویسے بھی کہتے ہیں غم، دُکھ یا نقصان کی خبر کو بہت ناپ تول کر بیان کرنا چاہیے۔ سو وہ بھی بہت دیر تک چپ نظریں جھکائے کھڑے ناپتے اور لفظ تولتے رہے اور میں سکون سے کھڑا زھرہ کے ابا کے بولنے کا انتظار کرتا رہا..... انہیں بات جوڑتے مشکل ہو رہی تھی۔ تیسری بار پوچھ بیٹھے۔

"اور میاں..... کیسے ہو.....؟" میرا دل چاہا ان سے کہوں "کئی سال سے قید ہوں..... بے بس ہوں..... بے چین ہوں..... بہت اذیت میں ہوں....." لیکن میری زبان سے وہی پرانا جھوٹ نکلا "ٹھیک ہوں..... آپ فرمائیں..... کیسے آنا ہوا..... وہ تو ٹھیک ہے ناں.....؟" جانے کیوں مگر میں اُن کے سامنے زھرہ کا نام نہیں لے پاتا تھا۔ شاید ہر ادب کے کچھ الگ تقاضے ہوتے ہیں۔

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ "تم جانتے ہو..... وہ ٹھیک نہیں ہے..... لیکن ایک جوان بیٹی کے باپ کو ہزار اطراف دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ میں کہنا نہیں چاہتا..... مگر اُس کا نام بہت رسوا ہو رہا ہے..... تمہارے نام کے ساتھ....." میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ بس یہی کسر باقی رہ گئی تھی میری رسوائی میں۔ "کبھی وہ باعثِ اعزاز تھے جن کے لئے..... آج وہی نام الزام بن کے آیا ہے....." وہ میری کیفیت سمجھ گئے۔

"میں جانتا ہوں..... تم بے قصور ہو..... لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمہیں عمر بھر کے لئے قید کی سزا دی گئی ہے۔ جانے یہاں سے باہر آتے تمہیں مزید کتنے سال لگ جائیں۔ تمہارے پاپا اپنی سی ہر ممکن کوشش کر چکے ہیں لیکن اُن کے تینوں حریف بہت زور آور اور مال دار ہیں..... وہ اپنی اولاد پر ہرگز کوئی الزام نہیں آنے دیں گے..... اور پتہ نہیں یہ خبر تم تک پہنچی ہے کہ نہیں کہ تمہارے والد..... اپنی ساری جائیداد، فیکٹریاں وغیرہ گروی رکھ چکے ہیں..... ان 6 سات سالوں میں، تمہارا کیس لڑنے اور تمہیں باہر لانے کی تگ و دو میں وہ اپنا سب کچھ لُٹا بیٹھے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ بہت کڑا اور زور والوں کے ساتھ ہے....."

میں چپ رہا، میں پاپا کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن جانے آج زھرہ کے ابا اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہے تھے۔ جو کہنے آئے تھے وہ کہہ کیوں نہیں رہے تھے۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا پھر بولے "میں جانتا ہوں تمہیں میری بات سن کر بہت دکھ ہوگا، لیکن میں جانتا ہوں تم اُسے بہت چاہتے ہو۔ اس کی اچھی زندگی اور بہتری کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو۔ اور وہ بھی

تمہارے انتظار میں ساری عمر گھر میں بیٹھ سکتی ہے۔ لیکن..... میں چاہتا ہوں کہ اب وہ اپنی نئی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کردے..... آخر ہم کب تک اس کے سر پر قائم رہیں گے۔ اکیلی لڑکی کے لئے یہ معاشرہ کسی جہنم سے کم نہیں ہوتا یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اور میری یا اس کی ماں کی مزید کتنی زندگی باقی ہے اس کی خبر کسی کو نہیں....." وہ بولتے بولتے پھر چپ ہو گئے۔

کیا ستم تھا، وہ میری موت کی تصدیق بھی خود مجھی سے کرانا چاہتے تھے۔

میرے لب ہلے "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... میں اُسے کبھی بھی زمانے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا..... وہ بہت معصوم، بڑی نازک ہے زمانے کے یہ تھپیڑے جھیلنے کے لئے....."

وہ جلدی سے شہہ پا کر بولے "یہی تو میں کہہ رہا ہوں..... تمہارے باہر آنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، تمہارے دشمن دن رات تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ وقت اُن کا ہے، دولت، اختیار اور طاقت اُن کے پاس ہے اور حکمران اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر چیز تمہارے خلاف ہے..... تم جانتے ہو ایسے میں ایک باپ اپنی بیٹی کے مستقبل کے لئے کس قدر پریشان ہو سکتا ہے.....؟"

میں نے ان کی جھکتی نظر سے نظر ملانے کی کوشش کی..... "جی..... میں سمجھ سکتا ہوں....." "اسی لئے میں آج یہاں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ تم اپنی محبت کا واسطہ دے کر اسے نئی زندگی کی شروعات پر مجبور کرو۔ وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتی۔ میں جانتا ہوں شروع میں تم دونوں کو بہت تکلیف ہوگی، لیکن دھیرے دھیرے قرار آ ہی جائے گا..... آخر لوگ مر بھی تو جاتے ہیں اس دنیا میں..... تم دونوں کو ایک دوسرے کے لئے اسی طرح فنا ہونا ہوگا..... ہمیشہ کے لئے....." وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے۔

کبھی کبھی تیر انداز کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کب اس کی ترکش کے سارے تیر ختم ہو چکے لیکن وہ لگاتار ایک ہی نشانے پر تاک تاک کر ٹھیک تیر چلائے جاتا ہے۔ اور یہ جانے بغیر کہ اس کا پہلا چلایا ہوا تیر ہی اُس کے شکار کے لئے جان لیوا ثابت ہو چکا۔

زہرہ کے ابا نے بھی اپنی کمان خالی کر کے ہی دم لیا۔ "آپ جانتے ہیں ایسے حالات اور مواقع پہلے بھی کئی بار پیدا ہو چکے لیکن وہ ہر بار ثابت قدم ہی رہی ہے..... پھر آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ اس بار وہ میری بات مان لے گی.....؟"

"پہلے کی بات اور تھی..... تب جیسا بھی تھا..... کبھی ہماری آس نہیں ٹوٹی تھی۔ ہر پل ایسا ہی لگتا تھا کہ تم لوٹ آؤ گے..... اور تب سلطان بابا کی دعائیں اور ان کے وجود کا سایہ بھی تو تم پر گھنی چھاؤں کیے رکھتا تھا۔ لیکن اب تو وہ بھی نہیں رہے تمہیں بچانے کے لئے....." وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میری ہر اُمید ہر آس سلطان بابا کے ساتھ ہی تو بندھی تھی۔ جب انہوں نے ہی میرا ساتھ چھوڑ دیا تو پھر کسی اور سے شکوہ کیسا.....؟

"آپ بے فکر رہیں..... اب اگر وہ مجھ سے ملنے آئے گی تو میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ وہ آپ کی بات مان لے....." وہ جاتے جاتے ایک لمحے کو رُکے، آنکھیں بھیگنے کو تھیں شاید؟

"جیتے رہو....." وہ دعا دے کر تیزی سے پلٹے اور تیز تیز قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گئے..... میں خالی

سلاخوں کی دیوار کے پرے کھڑا رہ گیا۔ کتنی عجیب دعا تھی یہ "جیتے رہو....." جیسے کوئی قاتل مقتول کے سینے میں خنجر اتارنے کے بعد اُسے تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے خنجر کی دھار سے خون صاف کرتے ہوئے جاتے جاتے اس سے کہتا جائے "جیتے رہو....." میں ٹوٹے قدموں اور ہارے دل کے ساتھ اپنی بیرک واپس پہنچا تو دیگر پانچ چھ قیدی ایک نئے قیدی کو گھیرے بیٹھے تھے۔ عجیب وغریب سا حلیہ تھا اس کا، لمبی جٹا دھاری زلفیں، بکھری لٹیں، بازو پر ایک گیروا رنگ کا دھاگا جس میں کئی تعویذ بندھے ہوئے تھے، گلے میں مالا، داڑھی مونچھیں بے تحاشہ بڑھی ہوئیں، سر پر پیچھے بالوں کی پونی بنائے وہ قیدی کی وردی میں کوئی سادھو دکھائی دے رہا تھا۔ قیدی مزہ لینے کے لئے اس سے مختلف سوال کر رہے تھے اور وہ بھی بے فکرا سا آنکھیں بند کیے چوکڑی مارے ایک خاص آسن میں بیٹھا سب کی اُلٹی سیدھی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ میں چپ چاپ دوسری جانب کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

نئے قیدی نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا، اور دیگر قیدیوں سے میرے بارے میں پوچھا۔ اسے بتایا گیا کہ میرا نام عبداللہ ہے اور میں قتل کے جرم میں یہاں عمر قید کاٹ رہا ہوں..... سادھو قیدی نے حیرت سے میری طرف دیکھا..... کمال ہے..... یہ کسی کی جان کیسے لے سکتا ہے.....؟" وہ سب دوبارہ اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے اور رات ڈھلتی گئی۔

جیل میں انسان کے پاس وہ دولت سب سے زیادہ ہوتی ہے جو باہر کے آزاد لوگوں کے لیے ناپید ہوتی جارہی ہے..... "وقت۔" لیکن یہ دولت قیدی کے لئے کتنا بڑا عذاب بن جاتی ہے۔ یہ کبھی کوئی نہیں جان پایا۔ سو وہ سارے مل کر اس وقت کے سنہری سکے کو باتوں کی آری سے رات بھر کاٹتے رہے۔ صبح ہونے تک نیا قیدی ساری جیل میں مشہور ہو چکا تھا۔ ویسے بھی کچھ لوگ اس فن میں یکتا ہوتے ہیں۔ فوراً لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اس کا نام اسلم تھا لیکن وہ خود کو یوگی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ہمیشہ کسی یوگا کہ آسن میں کھڑے، بیٹھے یا لیٹے رہنا اس کا شیوہ تھا۔ صبح سویرے قیدی اسے دیوار کے ساتھ سر کے بل کھڑے دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے مگر اسلم یوگی پر ان کی ہنسی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے اطمینان سے اپنی یوگا کی ساری مشقیں پوری کیں اور پھر میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"بولتے نہیں ہو؟"..... "کیا بولوں.....؟"..... "کچھ بھی بولتے رہا کرو..... ورنہ دھار تیز ہوتی رہے گی مَن کی..... کاٹ دار ہو جائے گا بہت زیادہ تمہارا اندر وقت کے ساتھ....." میں چپ چاپ اس کی مالائیں اور تعویذ دیکھتا رہا۔

وہ مجھے متوجہ دیکھ کر جلدی سے بولا "جیل کے بڑے صاحب سے خصوصی اجازت لی ہے پہننے کی..... ان کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہے۔ اسلم یوگی نام ہے میرا....." یوگی نے ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے عبداللہ کہتے ہیں..... اصل نام کچھ اور تھا تبھی وہ مسکرایا" نام سے فرق نہیں پڑتا..... مجھے بھی لوگ اب یوگی کہتے ہیں۔ ماں باپ نے کچھ اور نام رکھا تھا۔ ویسے میرا اپنا ماننا یہ ہے کہ ہمیں زندگی میں ایک بار ہوش سنبھالنے کے بعد اپنا نام اپنی مرضی سے رکھنے یا بدلنے کی اجازت ہونی چاہیے، تمام عمر ہم ماں باپ کے دیئے ہوئے نام کے ساتھ ہی کاٹ دیتے ہیں۔ چاہے وہ نام ہم پر جچتا ہو یا نہیں۔ یا پھر ہمارے دو نام ہونے چاہئیں۔ ایک وہ جو ماں باپ نے پیار میں رکھا..... اور دوسرا وہ جو ہم اپنے لیے پسند کریں....." میں نے سنا ہے تم قتل کے جرم میں عمر قید

ہو.....؟"

"ٹھیک سنا ہے..... کوئی گولی بھی چلی تھی..... اور قتل بھی ہوا تھا....." یوگی نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے پتہ تھا..... تم دلیل اور بہانے سے کام نہیں لو گے..... میرا جرم بھی کچھ ایسا ہی ہے....." یوگی نے بتایا کہ وہ بچپن سے طب اور حکمت سیکھنے کا شوقین تھا۔ گھر اور شہر سے زیادہ اس کا دل ویرانوں، بیابانوں اور جنگلوں میں لگتا تھا۔ اسکول سے بھاگ کر وہ کسی قریبی حکیم کے مطب جا پہنچتا اور پھر وہ اور بوڑھا حکیم دن بھر قریب کے جنگلوں میں جڑی بوٹیاں اور نایاب جھاڑیاں چھانتے رہتے تاکہ اُن سے دوائیں بنائی جائیں۔ وہیں اس کی ملاقات کسی سادھو سے ہوگئی جس نے یوگی کو یوگا کی مشقیں سکھا کر ریاضت کے سبق ازبر کرادیئے۔ اب حکیم بوٹیاں ڈھونڈتا اور یوگی کسی درخت سے لٹکے یوگا کرتا رہتا۔

ماں باپ نے بے زار ہو کر اُسے حکیم کے ہی سپرد کر دیا اور چند سالوں میں یوگی خود بھی ایک مستند حکیم بن گیا مگر اس کے پاس کوئی تعلیمی ڈگری یا سند نہیں تھی۔ لوگ اس کے علاج سے شفایاب ہونے لگے تو حسب معمول رش بڑھتا گیا۔ انسان بڑی مجبور مخلوق ہے ازل سے ابد تک اسے مسیحائی کی ہی تلاش رہتی ہے۔ پھر چاہے جہاں سے بھی ملے۔

مگر یوگی کے ستارے ابھی گردش میں آنا باقی تھے۔ ایک روز کسی سفوف کی پڑیا بناتے ہوئے اس سے اجزائے ترکیبی میں کچھ اُنیس بیس ہوگئی۔ مریض کا درد تو نیچے نہ گیا مریض اوپر چلا گیا۔ مریض کے رشتے دار عدالت کے باہر پہنچے تو یوگی کو سات سال کے لئے اندر پہنچا دیا گیا۔ یوگی کی قید کا یہ چھٹا سال تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے ہی ضلعے کی چھوٹی جیل میں قید تھا۔ پھر شاید جگہ کی کمی کی وجہ سے کچھ پرانے قیدیوں کو بڑی جیل بھیج دیا گیا اور انہی میں اسلم یوگی بھی شامل تھا۔ بیرک میں یوگی کے آجانے سے ایک رونق سی پیدا ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ اپنے وجود میں اک ہنگامہ لیے پھرتے ہیں۔ جلد ہی وہ سب کا دوست بن گیا، سوائے میرے..... شاید مجھے دشمن زیادہ بھاتے تھے۔ لیکن یوگی نے اس بات کا کبھی برا نہیں منایا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے مسکرا کر ہی ملتا اور دن بھر بیرک اور جیل کے دیگر قیدیوں کو مختلف طبی ٹوٹکے بتاتا رہتا تھا۔ اب تو جیل کے سنتری اور چھوٹا عملہ بھی اس سے مشورے لینے لگے تھے۔

اگلے روز وہ میرے سامنے آکر اپنے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ "کب سے ہو اس چھوٹی جیل میں.....؟" میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ ہمیں کچھ دیر کے لئے اپنے اپنے حصے کی دھوپ کھانے کے لئے بیرک سے جیل کے صحن میں لایا گیا تھا۔ جیل میں دھوپ بڑی مہنگی ملتی ہے..... یہ بھی میں نے یہیں آکر جانا تھا، میں نے یوگی کی طرف دیکھا۔

"چھوٹی جیل.....؟" "ہاں..... باہر شہر کی دنیا میں ایک بڑی جیل ہے۔ وہاں بھی کچھ اپنے بس میں نہیں..... پابندیاں، قانون..... سختیاں..... ڈراوے..... فرق بس یہ ہے کہ ہمیں اُس بڑی جیل سے دھکیل کر اس چھوٹی جیل میں بند کر دیا گیا ہے..... نہ وہاں اپنی مرضی چلتی تھی..... نہ یہاں ہمیں کوئی اختیار ہے..... بلکہ میں تو کہتا ہوں یہ چھوٹی جیل بڑے مزے کی جگہ ہے۔ باہر تو روزگار کے جھگڑے، معاش کی فکریں، دربدر کے دھکے..... عہدے، رتبے اور حاکم محکوم کا فرق..... جبکہ یہاں اندر خود وہی حاکم اور سرکار ہمارے قیام طعام کا انتظام کرتی پھرتی

ہے سب ایک برابر..... سب کا ایک ہی عہدہ یعنی قیدی..... کسی اونچ نیچ کے بنا.....'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر لوگ اس جیل اور قید سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں؟ یوگی بولا'' اُمراء اور شہزادوں کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ انہیں یہ سختیاں جھیلنے کی عادت نہیں ہوتی۔ مگر مجھ جیسے فٹ پاتھیے اور مزدور بندے کی تو ساری زندگی اس سنٹرل جیل سے بھی کسی چھوٹے مدار میں عمر بتاتے گزر جاتی ہے۔

گھر سے دفتر، دوکان، ورکشاپ، ٹھیلہ یا کوئی اور کام کی جگہ..... صبح سے شام یا رات تک کسی کولہو کے بیل کی طرح روزگار کی فکر میں جتے رہنا۔ کام اور مشقت کرنا اور رات گئے واپس جھونپڑے کو لوٹ جانا..... نہ کسی دوسرے راستے کا پتہ نہ شہر کی خبر..... ساری حیاتی یونہی بیت جاتی ہے چند کلومیٹر کے دائرے میں تو پھر یہاں کا محور بہتر نہیں؟

کم از کم کوئی ذمہ داری تو نہیں ہے سر پر..... بیرک کی کھڑکی سے خزاں، بہار، جاڑے اور بارش کی بوندیں تو دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی الزام، دُنیا کا کوئی طعنہ بھی روز سننے کو نہیں ملتا..... کوئی امیری غریبی کا جھنجھٹ نہ خزانے بھرنے کی دوڑ.....'' میں غور سے یوگی کا فلسفہ سنتا رہا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا..... جیل، قید، قفس یا پنجرہ..... سب اختیار ختم کرنے کی علامتیں ہوتی ہیں۔ لیکن جنہیں باہر کوئی اختیار نہ اندر کوئی حق حاصل۔ انہیں بھلا کیا فرق پڑتا ہوگا.....؟ میں بھی تو انہی بے اختیار لاچاروں میں سے ایک تھا، زہرہ کے ابا کے مجھ سے مل کر جانے کے بعد وہ بہت دن تک مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ اسے اب یہاں لانے والا کوئی تھا بھی تو نہیں۔ باپ نے ضرور گھر جا کر اس سے بھی وہی بات کی ہوگی جو وہ مجھے کہنے کے لئے آئے تھے۔ وہ بہت روئی اور تڑپی ہوگی، کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہوگا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھ گئی ہوگی۔ آنکھیں جاگ کر اور رو رو کر سُجالی ہوں گی، سب سے بات چیت بھی بند کر دی ہوگی، یہ محبت کرنے والوں کی سبھی عادتیں ایک سی کیوں ہوتی ہیں جانے.....؟

شاید ازل سے ابد تک محبت کی بنیادی درس گاہ اور تربیت ایک ہی رہی ہوگی، تبھی عشق مدرسے سے سارے طالب علم یکساں نکلتے ہیں یا شاید اس عشق اور پیار محبت کا خمیر ہی سارا ایک مٹی سے گوندھا گیا ہوگا.....؟ اگلے روز جیل کے قاصد سنتری نے پھر خبر دی۔

''چلو..... تمہاری ملاقات آئی ہے.....'' میں جانتا تھا، یہ آخری ملاقات طے تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ زندان کی جالیوں کے پاس پہنچا۔ وہی مخصوص خوشبو، وہی مہکتا سایہ، وہی ہالۂ نور اور وہی دو جان لیوا آنکھیں..... کپکپاتے لب ہلے۔'' کیسے ہو صاحب.....؟''

''تمہیں دیکھا ہے..... تو اب ہوں..... جانے ٹھیک ہوں یا خراب.....؟ تم سے پہلے تو ہونے نہ ہونے کا احساس ہی نہیں تھا..... اب خود سے پوچھ کر بتاؤں گا کہ کیسا ہوں.....؟'' اُس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

''بہت ستاتے ہو.....''

کچھ دیر تو ہم دونوں ایک دوسرے سے بنا لفظوں کے بات کرتے رہے، پھر اس نے دھیرے سے پوچھا'' ابا آئے تھے یہاں.....؟''

''ہاں..... حکم سنا گئے ہیں کہ عشق کی حد سے باز رہوں..... اور تمہیں بھی دیس نکالا سنا دوں۔''..... زہرہ

رو پڑی۔ پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے، پہلے تو ان کا دل اتنا سخت نہیں تھا کبھی.....''

''ان کا دل سخت نہیں ہے..... تبھی وہ تم سے یہ سب کہہ رہے ہیں صاحبہ..... محبت کا امتحان ہے۔ پورا تو اُترنا ہوگا.....'' اس نے سر اٹھا کر میری طرف بے یقینی سے دیکھا۔

''تم بھی یہی کہہ رہے ہو..... میں کب آتی ہوں بھلا تم سے ملنے..... صرف مہینے بھر میں ایک یا دو مرتبہ.....؟ اس سے بھی یہ سب لوگ روک رہے ہیں مجھے۔ آج میں کس مشکل سے ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں.....'' میں نے اس کا سوال سنا ''وہ مجھ سے ملنے سے نہیں روک رہے..... مجھے بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کا کہہ رہے ہیں تمہیں'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا ''جب زندگی ملتی ہی ایک بار ہے تو پھر اُسے نیا آغاز کیسے دیا جا سکتا ہے صاحب.....؟ جیون ہے..... کوئی مشین تو نہیں..... کہ ایک پرزہ خراب ہو جائے تو دوسرے سے بدل لیا جائے.....؟''

میں جانتا تھا کہ اسے میری کوئی بھی دلیل، وجہ یا عرض گذاشت سننے کی حد تک بھی متاثر نہیں کر پائے گی۔ آخر مجھے وہی کلیہ آزمانا پڑا جو محبت کرنے والے آخری حربے کے طور پر بچا رکھتے ہیں۔ ہمارے درمیان لوہے کی مضبوط جالی حائل تھی میں نے اس اپنی پردے پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے اوپر رکھنے کو کہا، اس کی طرف بھی ویسے ہی ایک جالی تھی مگر ہم دونوں کے ہاتھوں کے درمیان پھر بھی فٹ بھر کا فاصلہ تھا۔ لیکن اس کی انگلیوں کے پوروں کو چھونے کے لئے میرے ہاتھ کو یہ نیم گز کا فاصلہ بھلا کب حائل تھا؟ میں اُسے ہزاروں میل کے فاصلے سے بھی چھو سکتا تھا۔ وہ میرے ہاتھ کے مقابل ہاتھ رکھے مجھے دیکھتی رہی۔ ''کسی بڑے امتحان میں مت ڈالنا..... اب مجھ میں زیادہ سکت نہیں رہی.....''

اس کا وجود باقاعدہ لرز رہا تھا۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ میں اس سے کیا کہنے والا تھا ''تمہیں تمہارے عبداللہ کی قسم ہے..... جو گھر والے کہتے ہیں۔ وہ مان لو..... میں نے ہمیشہ اپنوں کو دُکھ ہی دیئے ہیں۔ میرے ماں باپ بھی سدا میری وجہ سے پریشان ہی رہے۔ تمہارے اپنوں کو بھی وہی دکھ دوں۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔''

اس نے تڑپ کر نظر اُٹھائی ''اور میں صاحب..... مجھے دُکھ دے سکتے ہو؟..... یہ گوارا ہوگا تمہیں..... اتنی بڑی قسم کیوں دے ڈالی مجھے.....؟ جانتے بھی ہو یہ ناممکن ہے.....''

''میں تمہارے ابا سے وعدہ کر چکا ہوں..... میرا حال ناشاد، اور مستقبل برباد ہے، کس آسرے پر میں تمہیں گھر بٹھائے رکھوں..... اور پھر جسم کی دوری بھی بھلا کوئی دوری ہے..... تم کہیں بھی رہو..... میرے پاس رہو گی..... نبھا لینے دو زمانے کو اپنی یہ چند رسمیں..... اگر اسی میں تمہارے اپنوں کو خوشی ملتی ہے تو یوں ہی سہی..... دے دو ان کو یہ مسرت بھی..... دُعا دیں گے تمہیں.....'' زہرہ چپ چاپ کھڑی سنتی رہی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے۔

جدائی کتنی اذیت ناک چیز ہوتی ہے چلنے والے یہ کبھی جان نہیں پاتے، جان لیتے تو سجدوں میں ہی جان دے دیتے، شکرانے کے سجدے..... جیون بھر کے نذرانوں کے سجدے..... لیکن ہمارے نصیب میں تو مقدر ہر بار فراق ہی لکھتا آیا تھا۔ سو وہ لمحہ فراق سر پر آ پہنچا تھا۔ وہ چپ چاپ پلٹی اور جاتے جاتے ذرا دیر رُک کر بولی ''بہت

ستاتے ہو صاحب..... آج تک تمہارا کوئی حکم نہیں ٹالا لہٰذا تعمیل کی کوشش کروں گی..... اگر سانس چلتی رہی تو.....''

میرا دل کٹ کر رہ گیا، جی چاہا اس کے کومل قدموں کی چاپ ختم ہونے سے پہلے میں خود ہی ختم ہو جاؤں مگر عشق والوں کے امتحان اتنے آسان نہیں ہوا کرتے، زہرہ چلی گئی۔ اور میں پھر بھی سانس لیتا رہا۔ پھر وہی بات سامنے آئی کہ زندہ رہنے کا تعلق ہمیشہ سانس لینے سے متصل نہیں ہوتا؟ میں واپس بیرک پہنچا تو یوگی کو میرے چہرے پر چھائی موت نظر آ گئی۔

''کیا ہوا تمہیں لگتا ہے کوئی بہت بری خبر سن کر آئے ہو.....'' میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ یوگی نے آس پاس دیکھا اور رازداری سے بولا.....

''اچھا سنو..... تمہیں ایک خوشی کی خبر سناتا ہوں..... تم جانتے ہو میں نے خود کو ڈسٹرکٹ جیل سے اس بڑی جیل تک پہنچانے کے لئے کتنی رشوتیں دی ہیں؟ اور اتنی تگ و دو کیوں کی ہے.....؟ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یوگی نے سرگوشی کی..... کیونکہ یہ جیل بہت جلد ٹوٹنے والی ہے..... میں یہاں سے سزائے موت کا ایک قیدی بھگانے کے لئے آیا ہوں..... اور تم جانتے ہو..... وہ قیدی کون ہے.....؟'' میری نظر یوگی کے چہرے پر گڑھ کر رہ گئی۔

✱.....✱.....✱

باب4

"ہم اتفاق رائے سے زندہ بچھڑ گئے
اک دُوسرے کو مر کے دکھانا نہیں پڑا....."

یوگی شعر پڑھ کر خود ہی زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور پھر خود ہی اپنے ماتھے کو پیٹ کر بولا "ہائے محبت..... وائے ری محبت....." میں نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ جیل توڑنے اور فرار کی بات کے درمیان محبت کہاں سے لے آئے ہو..... پہلے وہ بات ختم کرو..... جو تم نے شروع کی تھی....." یوگی پھر بھی مجھے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"محبت کو میں بھلا کب اپنے بیچ لایا ہوں..... محبت تو تمہارے ساتھ چلتی ہوئی اس بیرک میں آئی ہے۔ زخمی محبت..... گھائل محبت....." میں چپ ہو گیا۔ یوگی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عشق چہروں سے جھلکتا ہے..... چھپائے بھلا کب چھپتا ہے؟

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی "تم کچھ کہہ رہے تھے.....؟"

"ہاں..... لیکن تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اپنی زندگی کا اتنا بڑا راز اس بھری جیل میں مَیں نے صرف تمہی کو کیوں بتایا.....؟"

میں نے یوگی کی آنکھوں میں جھانکا "کیونکہ اس ساری جیل میں صرف ایک میں ہی تمہیں تمہارے کام کا بندہ دکھائی دیتا ہوں....."

یوگی زور سے ہنس پڑا "ٹھیک کہا..... اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو جو دکھائی دیتے ہو..... تمہاری یہ گہری خاموشی تمہارے اندر کی گہرائی کا پتہ دیتی ہے۔ اور مجھے تم جیسے کسی گہرے انسان کی ہی ضرورت تھی....."

"لیکن تم تو کہتے تھے کہ یہ چھوٹی جیل باہر کی بڑی جیل سے کہیں زیادہ بہتر ہے..... پھر تم اس جیل سے بھاگنا کیوں چاہتے ہو.....؟" یوگی نے میری بات سن کر زور سے سر ہلایا اس کے بالوں کی لٹیں کھل کر اس کے چہرے پر پھیل گئیں "نہیں..... میں نہیں بھاگنا چاہتا..... میں نے بہت پہلے حالات سے بھاگنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر مجھے اپنے ایک دوست کے لیے یہاں آنا پڑا..... اُسے موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ اور وہ اسی جیل کے دوسرے حصے کی کال کوٹھڑیوں میں بند ہے..... میں اسی کی مدد کے لئے یہاں آیا ہوں....."

میں نہ چاہتے ہوئے بھی یوگی پر طنز کر بیٹھا۔ ''تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ اس ملک کی سب سے مضبوط جیل ہے..... جسے کبھی اس کے محل وقوع اور جغرافیے کی سختی کی وجہ سے ''کالا پانی'' کہا جاتا تھا..... یہ کوئی معمولی تنکوں سے بنا گھروندا نہیں جسے توڑ کر تم اپنے دوست کو یہاں سے بھگا لے جاؤ گے۔'' یوگی اطمینان سے سنتا رہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... یہ انگریز کی بنائی سب سے پرانی جیل ہے اس ملک میں..... یہاں پر فرنگی دور کے باغی سرداروں کو قید رکھا جاتا تھا۔ شہر سے بہت دور مضافات میں بنی یہ جیل اندرونی حفاظتی حصاروں کے علاوہ بیرونی طور پر بھی چاروں طرف سے قدرتی پہروں میں گھری ہوئی ہے۔ پچھلی جانب پہاڑ ہے تو آگے کسی پرانی ندی کی کھائی۔ دائیں جانب تین میل کے فاصلے پر ایک پرانا ریلوے اسٹیشن اور ریل کی پٹڑی ہے اور بائیں جانب جہاں مرکزی گیٹ ہے، وہاں سنگینیوں کے سائے اور خونی پہرے دار..... جو اُڑتی چڑیا کے پر گن کر ٹھیک نشانہ اس کے دل پہ لگا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے دوست کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا..... اور جانتے ہو میرے یقین کی وجہ کیا ہے.....؟''

میں نے یوگی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ''کیا.....؟''

''اس جیل کا یہی آہنی پہرہ اور پہرے داروں کا یہ یقین کہ یہ جیل کبھی نہیں ٹوٹ سکتی..... یہی میرے بھروسے کی وجہ ہے..... جب کوئی بات انسان کے دل اور ذہن میں پختہ یقین کی طرح ثبت ہو جاتی ہے، وہ پھر کہیں نہ کہیں اس کی طرف سے غافل ہونے لگتا ہے۔ اُسے ایک معمول کی طرح لینے لگتا ہے اور یہی سب سے ٹھیک وقت ہوتا ہے کاری ضرب لگانے کا.....''

یوگی نے مجھے بتایا کہ وہ کافی حد تک جیل کے نچلے عملے کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اور اس نے ایک سنتری کے ذریعہ جیل کا نقشہ حاصل کرنے کی تگ و دو بھی شروع کر دی ہے۔ میں اس سنتری کو کئی بار آتے جاتے یوگی کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھ چکا تھا۔ ''ڈیڑھ حوالدار'' نامی اس سنتری کی کہانی بھی عجیب تھی۔ اس کا جنم اسی جیل میں ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں یہاں قید تھی، کس جرم میں..... یہ اب کسی کو یاد بھی نہیں تھا۔ بس سب اتنا جانتے تھے کہ ڈیڑھ حوالدار کے لڑکپن میں اس کی ماں جیل میں ہی چل بسی تھی۔ تب سے جانو نامی یہ جنم قیدی یہیں پلتا رہا۔ جیلر آتے جاتے رہے اور کسی نے اُسے جیل کی کینٹین پر ملازم رکھوا دیا۔ کسی اور مہربان کے دور میں جیل میں سنتری تعینات ہونے لگے تو ترس کھا کر جانو کو بھی سنتری لگا دیا گیا۔ پرائمری تو وہ جیل کے اسکول سے ہی پاس کر چکا تھا۔ آٹھویں اور دسویں بھی پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے مکمل کر لی تو اسی جیل میں ہی تعینات کر دیا گیا اور وہ جانو سے ''ڈیڑھ حوالدار'' بن گیا۔

ڈیڑھ اس لئے کہ وہ باقی حوالداروں سے نصف زیادہ واقف تھا اس جیل سے۔ سیدھا سادھا سا جانو یوگی کے ٹوٹکوں کی بدولت دائمی نزلے زکام کے پھیرے سے نکلا تو وہ یوگی کا مرید ہو گیا۔ یوگی کا ماننا تھا کہ انگریز اپنے دور کی بنائی ہر جیل سے باہر نکلنے کا کوئی نہ کوئی خفیہ راستہ ضرور بنا رکھتا تھا تاکہ کسی خونی بغاوت کی صورت میں انگریز افسر جیل سے باحفاظت باہر نکل سکیں۔

ہاں البتہ یہ اور بات ہے کہ ڈیڑھ دو صدی قبل بنائی جانے والی یہ جیلیں ٹوٹ پھوٹ اور نئے تعمیراتی کام کی

وجہ سے اپنی ہیئت کافی حد تک تبدیل کر چکی تھیں اور کبھی ویرانوں اور جنگل بیابانوں میں بنائی گئی یہ جیلیں اب شہروں کے اندر تک پہنچ گئی تھیں۔ آبادی اور شہر کے پھیلاؤ نے ان قید خانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہماری جیل البتہ ابھی تک مرکزی آبادی اور بڑے شہر سے تقریباً 40 میل دور تھی، کہتے ہیں کبھی یہ جیل سمندر کے درمیان بنے کسی جزیرے پر بنائی گئی تھی۔ تب چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ مگر اب انسانوں کی طرح سمندر بھی سمٹ کر اپنی حدیں بہت پیچھے مقرر کر چکے..... لہٰذا یہ جیل بھی پانی پیچھے ہٹ جانے کے بعد کسی ماہی بے آب کی طرح یہیں پڑی رہ گئی تھی۔ یوگی نے ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کیا کہ کہیں کوئی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا۔

"میں جانتا ہوں تم یہی سوچ رہے ہو گے کہ میں اپنے سارے راز تم پر کیوں کھول رہا ہوں۔ دراصل مجھے یہاں ایک ساتھی کی ضرورت ہے، میں اکیلے یہ سارا کام نہیں سنبھال سکتا..... ایک اور ایک مل جائیں تو گیارہ ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن اگر میں اس وقت جا کر جیل انتظامیہ کو تمہارا یہ سارا منصوبہ بتا دوں تو.....؟" جوگی مسکرایا۔

"نہیں..... تم میرا ساتھ دو یا نہ دو..... لیکن کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ اتنا چہرہ پڑھنا تو سیکھ ہی چکا ہوں میں..... اور میں نے آس پاس تمام قیدیوں سے تمہارے بارے میں ساری تحقیق کر کے ہی تمہیں یہ سب بتانے کا خطرہ مول لیا ہے۔ پچھلے سات سال سے تم اس جیل میں ہو..... اور اس تمام عرصے میں کبھی بھی تم نے کسی کو نقصان پہنچانا تو دور..... کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی برائی بھی نہیں کی..... خاموش رہتے ہو..... اپنے آپ میں گم..... خود سے باتیں کرتے رہتے ہو..... پچھلے کئی سال سے تمہارے دشمن تمہیں سولی پر لٹکانے کے لئے سپریم کورٹ میں جمے بیٹھے ہیں اور تمہارے بوڑھے والد صاحب تمہاری رہائی کی آس میں آج بھی عدالتوں کے دھکے کھا رہے ہیں۔ لیکن تم نے بس ایک چپ سادھ رکھی ہے....."

"میں نے یوگی کی چمکتی آنکھوں میں جھانکا، ذہین انسان کی پہلی پہچان اس کی آنکھیں ہی ہوتی ہیں۔ اندر روشنی کے کتنے الاؤ جل رہے ہیں، ان دو کھڑکیوں سے پھوٹتی کرنیں سب بتا دیتی ہیں۔"

اگر میرے بارے میں تم نے اتنی مکمل تحقیق کر ہی لی ہے تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ مجھے جیل توڑ کر بھاگنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ورنہ سات سال پہلے ہی یہ کوشش کر چکا ہوتا۔ جیل سے بھاگنے والے قیدی کے لئے باہر کی ساری دنیا جیل بن جاتی ہے۔ ہر آنکھ پہرے دار..... اور ہر اجنبی تھانے دار..... تمام عمر لوگوں سے چھپتے رہنے کے عذاب سے بہتر ہے کہ باقی بھی یہیں گزار دی جائے۔ آدھی کٹ گئی ہے، باقی آدھی بھی کٹ جائے گی..... میری مانو تو تم بھی یہ احمقانہ خیال اپنے دل سے نکال دو..... تمہارے دوست کے مقدر میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میرے ایک عزیز بزرگ ہمیشہ کہا کرتے تھے "جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے....."

یوگی نے گہری سانس لی "میں تمہیں یہاں سے بھاگنے کا مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ میں خود بھی جیل سے بھاگ کر کہیں جانے والا نہیں ہوں....." میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تو پھر.....؟"

یوگی نے سرگوشی کی "اس منصوبے کا سب سے کامیاب پہلو ہی یہی ہے..... کوئی ہم دونوں پر کبھی شک نہیں کر سکتا۔ میری قید کا یہ آخری سال ہے۔ عید، شب برأت کی معافیاں ملتی رہیں تو چار سے پانچ ماہ میں میں آزاد

ہو جاؤں گا۔ تم نے بھی جیل کے اندر بڑی شریفانہ قید کاٹی ہے۔ کسی پھڈے یا جھگڑے میں کبھی نام نہیں آیا تمہارا اتنے سالوں میں..... اس لئے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم دونوں یہاں بیٹھے یہ منصوبہ بنا رہے ہوں گے..... مجھے کوئی جلدی نہیں ہے..... تم اچھی طرح سوچ لو..... اگر دل مانے تو مجھے مثبت جواب ہی دینا....."

یوگی مجھے سوچ میں ڈوبا چھوڑ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ باہر رات ڈھل رہی تھی..... شاید چاندنی بھی چھنکی ہوئی تھی۔ جیل کی بیرک کی دیوار میں اونچائی پر بنے چھوٹے چھوٹے دو تین روشن دانوں کی فولادی جالی سے ہمارے حصے کی تھوڑی سی چاندنی آ رہی تھی۔ یہ کیسی ناانصافی تھی..... قیدی کو تو بس قید کی سزا ملنی چاہیے، اس کے حصے کی چاندنی، دھوپ، بارش، خزاں اور جاڑے کی سرد ہوا کاٹنے کی اجازت کس نے دی ہے ان صیادوں کو..... رات ڈھلتی رہی اور میرا دل پگھلتا رہا..... شاید وہ بھی کہیں بیٹھی اس وقت یہی چاند دیکھ رہی ہوگی.....؟ کون جانے یہی چاند مشترکہ گواہ ہو.....؟ یہ نادان پہرے بھلا میرے دل کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ میرا عشق تو صدیوں پر محیط تھا۔ مجھے ایک پرانی سنی ہوئی نظم بے تحاشہ یاد آنے لگی.....

"سو برسوں تک میں تمہیں بس یونہی دیکھا کروں..... سو برسوں کے بعد میں سو برسوں حیراں رہوں، پھر سو برسوں تک دنیا کی ہر بولی میں یہ کہوں..... صدیاں بیت گئی ہیں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"سو برسوں تک بن کے میں اک جوگی پھرتا رہوں، سو برسوں اک نام کی مالا میں جپتا رہوں..... پھر سو برسوں تک دُنیا کی ہر تختی پر یہ لکھوں، صدیاں بیت گئی ہیں میں..... تم سے محبت کرتا ہوں....."

میں ساری رات دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا، اُسی کو سوچتا رہا۔ میرے سامنے ہی رات نے صبح کے سامنے اپنے ہتھیار ڈالے اور دن کی فوج کے سپہ سالار سورج نے اپنی کمان سے کرنوں کے تیر نکال کر زمین پر چلانا شروع کر دیئے..... پھر تپتی شعاعوں کے جھانسے برسنے لگے، کچھ ہی دیر میں سورج پوری زمین کو فتح کر چکا تھا اور دھوپ نے صبح کے سارے سائے اپنے بندی بنا کر اجالے میں قید کر لیے۔ ہماری طرح جیسے ہم سب اس جیل کے قیدی تھے۔

روشنی ہوئی تو جیلر کا پیغام آیا کہ آج دوپہر کی نماز کے بعد کوئی تبلیغی جماعت درس دینے آئے گی، سب قیدی اپنی بیرکوں کے اندر موجود رہیں۔ سہ پہر جیل کے عملے کے ساتھ تبلیغی جماعت والے بھی آ گئے۔ پانچ کی ٹولی تھی، سفید شلوار کرتوں میں ملبوس، سر پر ٹوپی یا امامہ، اُجلے مسکراتے چہرے..... شاید انہیں یہ راز معلوم تھا کہ آدھی تبلیغ تو ان کی یہ مسکراہٹ ہی کر دیتی ہے..... ہم سب قیدی چپ چاپ ان کا درس سنتے رہے۔

جماعت کے امیر کا نام صوفی رحمت اللہ تھا۔ وہ زندگی کا کلیہ سمجھا رہے تھے۔ دیکھیں جناب یوں سمجھیں کہ زندگی ہمیں چند سکوں کی شکل میں ملتی ہے۔ پانچ سال کا ایک سکہ، مطلب ایک سکہ پانچ سال چلتا ہے، پانچ سال میں بچے کو اسکول میں داخل کرایا جاتا ہے۔ پھر پانچ سالوں میں وہ پرائمری پاس کر کے ہائی اسکول میں آتا ہے، پھر پانچ سال بعد میٹرک، پھر پانچ سال میں گریجوایشن..... اور اگلے پانچ سال میں نوکری، شادی گھر بار..... اور پھر اُس کی ہونے والی اولاد کے لئے پانچ سال کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ پانچ کے سکے کا آٹھواں گرتا ہے تو بندہ چالیس کا ہو چکا ہوتا ہے۔

اب اُس کے پاس بمشکل چار یا پانچ سکے ہی بچتے ہیں۔ اور انسان ان آخری سکوں کو بہت احتیاط سے

استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ زندگی کی اوسط یہاں 60 یا پینسٹھ 65 سال ہی تو ہے۔ وہ یہ سکے عبادت، حج، نماز روزے میں بھی لگا سکتا ہے اور کچھ ناداں یہ آخری سکے بھی فضولیات میں گنوا دیتے ہیں۔

کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بارہ سکے ضائع کرنے کے بعد ساٹھ کی عمر میں ہوش میں آتے ہیں مگر تب ان کے جیون کے کشکول میں صرف ایک آدھ آخری سکہ ہی پڑا ملتا ہے۔ تب ان کے ہاتھوں میں تسبیح اور زبان پر ورد ہوتا ہے۔ پر آخری سکے کی عبادت کا وہ مول نہیں ہوتا اوپر کے دربار میں، جو پانچویں، چھٹے یا ساتویں سکے کی ریاضت کا بدل ہو سکتا ہے۔

تو بھائیو..... میری آپ سب سے یہی درخواست ہے کہ جتنے سکے ضائع ہو چکے، وہ گئے، پر اب جو بچے ہیں.....اُن سے صحیح سودا اور سامان خریدنا۔"

ایک بوڑھا آدمی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور بول پڑا۔ "مگر مولانا صاحب.....ہم تو پہلے ہی جیل میں بند ہیں.....اب ہمارے لئے کیا حکم ہے.....؟ ہمارے تو سارے سکے یہیں خرچ ہو گئے....."

صوفی صاحب مسکرائے "کبھی تو آزادی ملے گی.....اور جب بھی ملے بس آج سے یہ نیت کر لو کہ جو سرمایہ بچا ہے ان سکوں کو اچھے اعمال میں صرف کرو گے.....خود جیل کے اندر بھی تو یہی سکہ چل رہا ہے..... یہاں اس کا استعمال ٹھیک کر لو تو یہی عبادت ہے.....میری دُعا ہے اللہ آپ سب کو قید سے نجات دے....."

جماعت اُٹھ کر جانے لگی۔ صوفی رحمت اللہ کی مجھ پر نظر پڑی اور وہ پتہ نہیں کیوں جاتے جاتے رُک گئے۔ "تم کوئی سوال نہیں کرو گے میاں.....؟" میں چونک سا گیا۔

"جناب میرے سارے سکے اور سوال ایک ساتھ ہی جانے کس اندھیری گلی میں میری پھٹی جیب سے گر گئے، کھو گئے ہیں کہیں..... میں ڈھونڈ رہا ہوں..... ملتے نہیں.....مل گئے تو آپ کے کلیے کے مطابق خرچ کرنے کی کوشش کروں گا....."

صوفی رحمت اللہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے، پھر ان کے منہ سے زور سے ایک ہی لفظ نکلا "ان شاء اللہ" اور میرا شانہ تھپتھپا کر وہ آگے بڑھ گئے۔

شام ڈھلتے ہی یوگی پھر سے نازل ہو گیا۔ آج اس کے انداز میں بہت جوش تھا۔ "جانتے ہو عبداللہ..... ڈیڑھ حوالدار نے پتہ کر لیا ہے کہ جیل کا پرانا نقشہ کس فائل میں جڑا ہے۔ وہ جلد اس کی نقل کرا کر مجھ تک پہنچانے کی کوشش کرے گا بولو اب کیا کہتے ہو.....؟"

"میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں..... مجھے یہاں سے فرار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے.....نہ ہی میں ایسے کسی احمقانہ منصوبے میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں.....بہتر ہوگا کہ تم اپنے لیے کوئی اور ساتھی تلاش کر لو..... میں تمہارے مطلب کا بندہ نہیں ہوں....." لیکن وہ یوگی ہی کیا جو اپنی دھن کا پکا نہ ہو۔

"جانتے ہو..... میرا دوست کوئی معمولی انسان نہیں ہے..... بہت پڑھا لکھا انسان ہے..... درجنوں تو ڈگریاں لے رکھی ہیں اس نے، ظہیر نام ہے اس کا.....انجینئرنگ پڑھی ہے اس نے.....اگر وہ اس تنظیم کے ہتھے نہ چڑھتا جس نے اسے جرم کے راستے پر ڈالا.....تو وہ ضرور آج ایک بہت بڑا سائنسدان ہوتا....." یوگی اپنی دھن میں

بتاتا رہا کہ کیسے اس نے کبھی ظہیر کے ایک خراب ہوتے زخم کا علاج کیا تھا، ظہیر پولیس سے چھپتا چھپاتا یوگی تک پہنچا تھا۔ پھر دونوں میں ایسی گاڑھی چھنی کہ لوگ ان کی دوستی کی مثال دینے لگے۔ جس وقت یوگی کو اس کے مریض کی ناگہانی موت کے جرم میں سزا ہونے والی تھی، ظہیر نے اپنی تنظیم کا پورا زور اور پیسہ یوگی کو چھڑانے میں صرف کر دیا تھا لیکن یوگی کے خلاف اتنے پکے اور ٹھوس ثبوت موجود تھے کہ اس کی خلاصی نہ ہو سکی۔

''عدالت نے تو مجھے چودہ سال کے لئے اندر کرنے کی پکی ٹھان رکھی تھی..... مگر یہ بھی ظہیر کا ہی کرشمہ تھا کہ اس نے راتوں رات جانے کون سا منتر پڑھا کہ اگلے روز دوسری پارٹی کا وکیل ہی ڈھیلا پڑ گیا اور مجھے صرف سات سال کی قید سنائی گئی۔'' تین سال بعد ظہیر خود کسی قتل کے مقدمے میں گرفتار ہو گیا۔ تنظیم کے بڑوں نے اس کے سر سے ہاتھ اٹھا لیا اور سارا کیا کرایا ظہیر کے سر منڈھ دیا گیا، اور یوں سال بھر پہلے ظہیر کو آخری عدالت سے بھی موت کی سزا سنا دی گئی۔ وہ اس وقت اسی جیل میں اپنی آخری اپیل کے فیصلے اور پھانسی کا انتظار کر رہا تھا۔ یوگی کی باتوں میں رات آدھی بیت چکی تھی۔ اتنے میں دور سناٹے میں ریل کی سیٹی کی آواز گونجی۔ یہ گاڑی روز رات کو اسی وقت جیل کے قریب ویرانے میں بچھی پٹڑی پر گزرتی تھی۔ یوگی ریل کی سیٹی کی آواز سن کر چونک سا گیا۔

''تم نے کبھی غور کیا ہے، یہ ٹرین روز رات کو کم و بیش اسی وقت جیل سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے سے گزرتی ہے؟''

''ہاں..... پچھلے کئی سالوں سے یہی معمول ہے۔ اب تو اس کی سیٹی کی عادت سی ہو گئی ہے.....'' یوگی نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''سوچو..... اگر یہ گاڑی کبھی پانچ منٹ پہلے یا پانچ منٹ بعد میں گزرے تو کیا ہو گا.....؟'' میں نے حیرت سے یوگی کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہ رہے ہو.....؟''

''بڑی سیدھی سی بات ہے اگر یہ گاڑی چار پانچ منٹ پہلے یا بعد میں گزرے گی تو اس روز اس ویران اسٹیشن اور ریلوے لائن کے اردگرد کا سارا معمول بدل جائے گا، ہو سکتا ہے کوئی گاڑی کے پرانے معمول کے حساب سے پٹڑی کراس کر رہا ہو تو اس کا حادثہ ہو جائے..... کوئی جانور گاڑی تلے آ جائے، کوئی کار، بس، ٹرک بنا پھاٹک کے پٹڑی پار کرنے لگے اور اچانک ٹرین اپنے وقت سے ہٹ کر چنگھاڑتی ہوئی نمودار ہو اور دوسری گاڑی سے ٹکرا جائے۔''

میں نے الجھ کر یوگی کی طرف دیکھا۔ ''ظاہر ہے..... جو چیز معمول سے ہٹ کر ہو، وہ کسی نہ کسی حادثے کا باعث ہی بنے گی.....'' یوگی نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''یہ بات..... یہی بات ظہیر کہتا ہے کہ یہ سب مینا فزکس ہے، وہ کیا کہتے ہیں اسے، مابعد الطبیعات..... یہ سب ٹائمنگ کا چکر ہے بابو۔ سوچو جس رات وہ لڑکا تمہارے یا اُس کے دوست کے ہاتھوں اتفاقیہ گولی چلنے سے مرا تھا۔ اگر وہ یا تم لوگ چار پانچ منٹ آگے پیچھے ہوتے تو شاید تم لوگوں کا آمنا سامنا ہی نہ ہوتا..... یا وہ مریض جو میرے سفوف کی پڑیا سے مارا گیا، اس روز وہ چند منٹ لیٹ میرے پاس پہنچتا تو میں مطب بند کر چکا ہوتا، کیونکہ اُس شام وہ میرا آخری مریض تھا۔ اور میں گھر جانے کے لئے کھڑا ہو چکا تھا..... ظہیر نے بڑی تحقیق کر رکھی ہے اس

ٹائمنگ کے معاملے پر..... اُس نے سزائے موت کے بہت سے قیدیوں سے بھی یہی سوال کیا کہ ان کے ہاتھوں وہ قتل کیسے ہوا جس جرم کی پاداش میں انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی اور سبھی قیدیوں نے یہی جواب دیا کہ اُس روز چند لمحوں کے فرق سے یہ خلاف معمول حرکت ان سے سرزد ہوگئی اگر چند سیکنڈز کا بھی فرق رہ جاتا تو شاید دوسرے شخص کی جان نہ جاتی۔ مطلب اس حادثے والے روز وقت کا معمول اُن کے خلاف رہا ہوگا۔ ورنہ آج میں اور تم بھی اس جیل میں قید نہ ہوتے، آزاد ہوتے....."

میں نے یوگی کا فلسفہ اطمینان سے سنا "اِس چیز کو ہم مذہب میں تقدیر کا نام دیتے ہیں..... جسے تم میٹافزکس کہہ رہے ہو....." یوگی نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"تو پھر تقدیر کے کیے کی سزا ہم انسانوں کو کیوں ملتی ہے۔ قدرت تو کبھی ناانصاف نہیں ہوتی..... تم میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔"

اس سے پہلے کہ یوگی کچھ اور کہتا باہر سے گزرتے ایک سنتری نے ہمیں باتیں کرتے دیکھ زور سے جھاڑ پلائی۔ یوگی مجبوراً اپنی جگہ جا کر لیٹ گیا۔ ویسے بھی رات تو قریباً ڈھل ہی چکی تھی۔

اگلے روز سویرے ہی جیلر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ایسا تبھی ہوتا تھا جب پاپا مجھ سے ملنے آتے تھے اور محکمہ داخلہ کے سیکرٹری جو پاپا کے گہرے دوست تھے، وہ جیلر سے ہماری ملاقات کی خصوصی سفارش کرتے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو پاپا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اُن کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر سوئے نہیں..... اور شاید روتے بھی رہے ہیں۔ میں نے انہیں گلے لگایا تو وہ سسک پڑے۔

"کیا ہوا پاپا.....؟" میں نے ان کے لاغر وجود کو سنبھالنے کی کوشش کی "مجھے معاف کر دینا ساحر بیٹا..... میں ہار گیا..... تمہارے دشمن جیت گئے..... میں تمہیں نہیں بچا سکا..... سپریم کورٹ نے تمہاری عمر قید کو سزائے موت میں تبدیل کر دیا ہے....."

"پاپا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ مجھے سارا کمرہ گھومتا..... محسوس ہونے لگا" مجھے مجذوب کی سات سال پہلے کہی بات یاد آ گئی۔ گویا موت کا وعدہ صرف سنی کے ساتھ ہی نہیں..... خود میرے ساتھ بھی طے ہو چکا تھا۔

..........*

باب5

''حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوا تھا۔ سب جن و انس، چرند پرند اور ہوا مؤدب اور ساکت کھڑے نئے حکم نامے کا انتظار کر رہے تھے، ہُد ہُد جو ملکہ صبا کے تخت کی خبر لایا تھا اُس نے کن اکھیوں سے مور راجہ کی طرف دیکھا۔ سامنے خوبصورت نقاشی والے اونچے عظیم ستونوں میں سے ایک پر دیمک کے کیڑے دم سادھے بیٹھے تھے کہ ابھی شہتیر کو کھانے کا حکم نہیں ملا تھا۔ اچانک دربانوں میں کچھ ہلچل سی ہوئی اور باہر کسی بحث کی آوازیں ابھریں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی رعب دار آواز گونجی ''فریادی کو آنے دیا جائے.....'' دربار میں داخل ہونے والا شخص سخت خوف زدہ تھا اور وحشت بھرے انداز میں بار بار باہر دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا..... حضرت کے استفسار پر وہ گڑگڑا کر بولا:

''حضور میں نے شاید ابھی ابھی آپ کے دروازے پر عزرائیل علیہ السلام کو دیکھا ہے اور مجھے شک ہے کہ وہ میری روح قبض کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ آپ کے تابع تو سارا جہاں ہے، یہ جن و انس، یہ سرسراتی ہوائیں..... آپ کسی کو حکم کیجئے کہ مجھے ابھی دنیا کے دوسرے پار پہنچا دیں۔ ہزاروں لاکھوں میل دور..... قطب شمالی یا قطب جنوبی کے کسی کرے پر..... کہیں بھی..... لیکن پلک جھپکتے..... کہ میں عزرائیل علیہ السلام کا سامنا نہیں کرنا چاہتا.....''

حضرت سلیمان علیہ السلام کے جلال کو فریادی پر رحم آ گیا اور ہوا کو حکم دیا کہ یہ جہاں خود کو محفوظ سمجھے اسے دنیا کے اُس خطے میں اُتار دیا جائے..... اور وہ شخص پلک جھپکتے ہی ہوا ہو گیا۔ دو لمحے بعد عزرائیل علیہ السلام دربار میں حاضر ہوئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسکرا کر پوچھا۔ ''یا عزرائیل..... کیا بات ہے.....؟ کسی الجھن میں دکھائی دیتے ہیں آپ.....''

عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا..... ''ہاں..... ازل سے لے کر آج تک کبھی الجھا نہیں تھا، پر آج دو لمحے پہلے آپ ہی کے دربار کے دروازے پر ایک شخص کو دیکھ کر پہلی بار مَن بھٹکا کہ کہیں مجھے روح قبض کیے جانے والوں کی کوئی غلط فہرست تو نہیں تھما دی گئی.....''

''سلیمان علیہ السلام نے چونک کر پوچھا'' کیوں.....؟ ایسا کیا ہوا.....؟''

عزرائیل علیہ السلام بولے'' کیونکہ میری فہرست کے مطابق میں نے اگلے لمحے جس شخص کی جان لینی تھی

اُسے شمار کے حساب سے اِس پل دنیا کے دوسرے سرے پر ہونا چاہیے تھا..... لیکن وہ آپ کے دروازے پر کھڑا نظر آیا تو میں بھی اُلجھ گیا..... لیکن کیا عجیب بات ہے کہ میں ٹھیک وقت پر جیسے ہی مقررہ مقام پر پہنچا تو میں نے اس شخص کو اُسی جگہ پایا جہاں اس کی جان لینا طے تھا..... سچ ہے..... میرا رب بڑی طاقت والا ہے....."

صوفی رحمت اللہ نے اپنی بات ختم کی تو قیدیوں کے مجمع پر سوئی گرنے کی آواز سن لینے والا سناٹا طاری تھا، آج بدھ کے روز پھر تبلیغی جماعت قیدیوں کو درس دینے آئی ہوئی تھی، صوفی صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"اس حکایت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر ذی روح کی موت کا ایک مقام مقرر ہے اور قدرت ٹھیک وقت پر اُسے وہاں پہنچانے کا ازخود انتظام کر دیتی ہے۔ یہ نادان انسان جتنا بھی دوڑنے، بھاگنے کی کوشش کرے..... موت اُسے اس کے مقررہ وقت اور مقام پر جا پکڑتی ہے..... اور تب تک موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے..... اگر اس ذی روح کا وقت مقررہ ابھی نہیں پہنچا تو اُسے دنیا بھر کی ساری طاقتیں مل کر بھی کوئی گزند یا ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔"

صوفی صاحب نے اپنی بات ختم کی تو میں نے قریب بیٹھے یوگی کی طرف دیکھا جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ کل ہی پاپا مجھے میری عمر قید کی سزا کو سزائے موت میں بدلے جانے کی خبر دینے آئے تھے۔ ایک باپ کے لئے اپنے بیٹے کو یہ خبر پہنچانا کس قدر اذیت ناک عمل رہا ہوگا یہ صرف ایک باپ کا دل ہی جان سکتا ہے۔ غالب نے شاید میرے لئے ہی یہ کہا تھا۔

"مجھے کیا برا تھا مرنا..... اگر ایک بار ہوتا....."

ہم ایک بار کب مرتے ہیں بھلا..... ایک بار تو صرف سانس رکتی ہے ہماری..... مرتے تو ہم روز ہیں، ہر پل مرتے ہیں..... ہر گھڑی فنا ہمارا مقدر ہے۔ کبھی وقت کے ہاتھوں کبھی حالات کے مارے۔ کبھی رشتے، کبھی لوگ اور کبھی دنیا ہمارے جان کے درپے ہو جاتی ہے۔ جیسے آج یہ قانون میری سانسوں کی گنتی ختم کرنے کا پروانہ جیلر کو پہنچا گیا تھا۔ میری بیرک میں یہ خبر پھیل چکی تھی اور اب مجھے سزائے موت کے قیدیوں والے حصے میں منتقل کیے جانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ صوفی رحمت اللہ کو بھی نہ جانے یہ خبر کیسے مل چکی تھی، شاید اسی لئے جاتے جاتے وہ دو گھڑی میرے پاس رک گئے۔ ان کی پلکیں مجھے کچھ نم سی محسوس ہوئیں۔

"عبداللہ نام ہے ناں تمہارا..... جانے کیوں کسی کا چہرہ دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ لوگ اُسے جس جرم سے منسلک کرتے ہیں..... وہ اُس سے سرزد ہوا ہے....." میں دھیرے سے مسکرایا۔

"شاید میری زندگی کا چھٹا اور آخری سکہ اسی قید میں خاتمے کے لئے مجھے ملا تھا۔" وہ اپنی آنکھیں پونچھتے آگے بڑھ گئے۔ یوگی اس رات میرے پاس آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ "کاش میں تمہاری سزا اپنے سر لے سکتا، عدالتوں کا نظام بھی عجیب ہے، جہاں دلیل اور ثبوت کی بنیاد پر فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ گویا انسان کا حق پر ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا ٹھیک وقت پر اس کے وکیل کے پاس مضبوط دلیل اور ثبوت کا ہونا ضروری ہے، نہ ہو تو بندہ صفر ہو جاتا ہے..... یہ کیا بات ہوئی یار.....؟" میں نے اس کی زندہ دلی بحال کرنے کے لئے اسے ایک پرانا چٹکلہ سنایا.....

"شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ تم جیسے نیم حکیموں سے کوئی غلطی ہو تو انسان زمین کے چھ فٹ اندر چلا جاتا ہے اور وکیل کی غلطی اُسی بندے کو زمین سے چھ فٹ اوپر ہوا میں معلق کر دیتی ہے یوگی صاحب....." لیکن یوگی مسکرانے کے بجائے میرے گلے لگ کر رو پڑا۔

اگلی صبح مجھے جیل کا عملہ کال کوٹھڑی میں منتقل کرنے کے لئے آن پہنچا۔ میری بیرک کے سارے ساتھی مجھے رخصت کرنے کے لئے قطار میں کھڑے تھے، وہ سبھی اپنی کوئی پسندیدہ اور عزیز چیز مجھے جاتے وقت تحفے کے طور پر دینے کے لئے اپنے ہاتھوں میں لیے افسردہ تھے، چھوٹا سا کنگھا، ایک ٹوٹا آئینہ، گڑ والی روٹی، تھوڑے سے چنے، بلوریں کنچے، تاش کی گڈی، دل کے نشان والا لاکٹ..... وہ نادان یہ جانتے بھی تھے کہ جس وقت مجھے سزائے موت کے قیدیوں کے احاطے میں بند کرنے کے لئے دروازے تک لے جایا جائے گا۔ اس وقت میری تلاشی کے دوران یہ سب کچھ مجھ سے چھین لیا جائے گا، لیکن پھر بھی ایک قیدی کا دوسرے قیدی سے محبت کا اظہار تھا، بے بس اور لاچار سا اظہار..... ایک محتاج کا دوسرے مجبور کو ایک خراج..... جو مجھے دنیا بھر کے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے خزانوں سے بڑھ کر تھا۔

میں سب سے مل کر دروازے کے قریب پہنچا تو یوگی سر جھکائے افسردہ سا کھڑا تھا۔

"کیوں یوگی صاحب..... تم مجھے کوئی تحفہ نہیں دو گے رخصت کرتے وقت..... شاید اب ہماری ملاقات نہ ہو کبھی دوبارہ....." یوگی نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

"بہت ظالم دوست ہو..... لیکن فکر مت کرو..... جہاں تمہیں یہ لوگ لے جا رہے ہیں، وہاں تمہیں یوگی سے بھی بڑھ کر ایک یاروں کا یار ملے گا جس کا نام ظہیر ہے، اُسے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ یوگی کو اپنا وعدہ یاد ہے....."

میں ان سب سے رخصت ہو کر چار سپاہیوں اور ایک حوالدار کے پہرے میں کالے چکر تک پہنچا۔ سزائے موت کے قیدیوں کا احاطہ اسی چوراہے کے سامنے تھا جسے یہاں عرف عام میں کالا چکر کہا جاتا تھا۔ میری تیسری مرتبہ مکمل تلاشی ہوئی اور مجھے ایک تکیے اور کمبل کے ساتھ اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں آہنی دروازے سے اندر داخل ہوا تو تقریباً چار بجے شام کا وقت تھا۔ یہ ایک چوکور بڑا سا صحن نما احاطہ تھا جس کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں اور ان کے آگے ٹین کی چھت والا ایک برآمدہ تھا جو چاروں اطراف سے جڑا ہوا تھا۔ یہ قیدیوں کی ٹہلائی کا وقت تھا۔ وہاں کل نو قیدی دکھائی دیئے جنہیں سر سے پیر تک بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر انتہائی کڑے پہرے میں شام کے اس وقت کوئی آدھے گھنٹے کے لئے باہر ٹہلانے کے لئے لایا جاتا تھا..... شاید قیدیوں کو آپس میں زیادہ بات کرنے کی بھی ممانعت تھی تبھی پہرے پر موجود سپاہی انہیں بار بار جھڑک کر خاموش رہنے کا کہہ رہے تھے۔

ماحول میں صرف ان کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار کی آواز تھی، قیدیوں کو باہر نکالنے سے پہلے ان کے پیروں میں آہنی بیڑیوں سے جڑی لمبی وی (V) شکل کی سلاخیں پہنا دی جاتی تھیں جنہیں یہاں کی زبان میں ڈنڈا ڈولی کہا جاتا تھا۔ ان سلاخوں کی وجہ سے اپنے گھٹنے نہیں موڑ سکتا تھا اور اسے سیدھی ٹانگ اٹھا کر چھوٹا سا قدم آگے رکھنے کی ہی سہولت مل سکتی تھی۔ یہ اہتمام اس لئے ضروری تھا کہ قیدی بھاگنے کی کوشش نہ کر سکے۔ مجھے دور ہی سے ان قیدیوں کی کلائیوں اور ٹخنوں میں..... پڑے بل اور زخموں کے گہرے نشان دکھائی دے گئے۔ ڈنڈا ڈولی کی

وجہ سے قیدی تکلیف اور بہت اذیت میں چل رہے تھے۔ کیونکہ لوہے کی وہ سلاخیں ذرا بھی غلط یا تیز قدم اُٹھنے پر ان کی رانوں کے اندرونی گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

انسان نے اپنے جیسے انسان کو ہی تڑپانے اور اذیت دینے کے کتنے حربے ایجاد کر رکھے تھے یہاں۔ میں اندر داخل ہوا تو سبھی قیدیوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ احاطے کے برآمدے اور چھت کے اطراف کے گارڈز اپنی بندوقیں قیدیوں کی طرف سیدھی کیے چوکنا کھڑے تھے تاکہ کسی غیر معمولی حرکت کی صورت میں وہ سیدھی گولی ان کے دل میں پیوست کر سکیں۔ احاطے میں کل اطراف اٹھائیس کوٹھڑیاں تھیں، یعنی ہر برآمدے تلے سات چھوٹی کھولیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ صحن کے درمیان میں ایک گول چبوترہ سا بنا ہوا تھا جس کے وسط میں لکڑی کا ایک پرانا سا بجلی کا کھمبا نصب تھا، جس کے اوپر کافی اونچائی پر لیمپ شیڈ کے نیچے کمزور پیلی روشنی والا ایک بلب جھول رہا تھا جسے سرِشام ہی جلا دیا گیا تھا، لیکن وہ پھر بھی مدھم لگ رہا تھا۔

''شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے۔ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا.....''

مجھے جو کال کوٹھڑی دی گئی اس کا نمبر 17 تھا، چارپائی جتنے کا ایک ناکافی سا ڈربہ، زنگ اور سیلن زدہ، باس والی کھولی، جہاں میری باقی ماندہ زندگی گزرنے والی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں شام ڈھل گئی۔ یہ آزاد کھلے شہروں اور آسمان تلے جینے والے جو کبھی کبھی اکتا کر شام کی اُداسی کا رونا روتے ہیں..... وہ اگر کبھی جیل کی ڈھلتی شام کی اُداسی کو اپنی روح کے اندر اترتا محسوس کر لیں تو شاید وہ عمر بھر کبھی دوبارہ اُداس شام کی شکایت نہ کریں۔ قیدی کی شام بھی کسی قید میں جکڑے کڑے پہر کی طرح اترتی ہے، قطرہ قطرہ زہر کے پیالے جیسی شام، سرمئی، سیاہی مائل..... دل کے اندر اندھیرا کر دینے والی شام۔

ہماری کوٹھڑیوں کے گرد بھی تاریک اندھیرا پھیلنے لگا تو برآمدے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے زرد بلب جلنے لگے۔ ہر قیدی کے حصے میں تھوڑی سی روشنی آئی۔ جسے سب نے مل بانٹ لیا۔ رات گہری ہو چکی تھی مگر میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ جانے کیوں آج مجھے سلطان بابا بہت یاد آ رہے تھے۔ کبھی ایسی ہی ایک کوٹھڑی میں ہم دونوں الگ الگ جبروت کی قید میں بند تھے۔ لیکن جب وہ میرے ساتھ ہوتے تھے تب مجھے کسی بات کی پرواہ ہی کب ہوتی تھی بھلا؟ میں تو جیسے سب ان کے سپرد کر کے خود اطمینان سے لمبی تان کر سو جایا کرتا تھا۔ وہ جاتے جاتے میری نیندیں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شاید آدھی رات بیت چکی تھی تبھی اچانک میری کوٹھی کی دیوار پر کسی نے لوہے یا سلور کی کسی چیز سے دستک دی۔

''جاگ رہے ہو..... یا اپنے نصیبوں کی طرح سو گئے ہو تم بھی.....'' بولنے والے کی آواز کی سرگوشی جیسی تھی۔

''جب نصیب سو جائیں تو نیند کسے آتی ہے بھلا.....؟''

دوسری جانب کوئی ہنسا..... ''میں ظہیر ہوں..... تمہارا نام کیا ہے..... میری کھولی کا نمبر پندرہ ہے.....'' گویا وہ مجھ سے ایک کوٹھڑی دور تھا۔ تبھی آواز بمشکل مجھ تک آ رہی تھی۔

''ان لوگوں نے ہر قیدی کے درمیان ایک کھولی کا فاصلہ رکھا ہے۔ تاکہ رابطے میں مشکل رہے..... ویسے

بھی ہر آدھے گھنٹے بعد دو سنتری یہاں سامنے سے مخالف سمت میں گزرتے ہیں۔ بات کرنے پر پابندی ہے یہاں..... جب میں زور سے دیوار پر یہ چمچ ماروں تو تم سوتے بن جانا.....'' یوگی کا دوست ظہیر اتفاق سے قریب ہی بند تھا۔ میں نے اسے یوگی کے بارے میں بتایا تو ظہیر کی آواز میں چھلکتا جوش صاف سنائی دیا۔

''یوگی یاروں کا یار ہے..... مجھے اس کا پیغام مل چکا ہے ایک سنتری کے ذریعے..... بس اب ہم یہاں سے نکلنے کے انتظار میں پل پل کاٹ رہے ہیں۔'' میں چونکا.....

''ہم کون..... مطلب تمہارے ساتھ دوسرے بھی کچھ قیدی شامل ہیں اس منصوبے میں.....'' ظہیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی قدموں کی چاپ اُبھری اور وہ خاموش ہوگیا۔

رات ڈھل گئی اور صبح کی روشنی ہوتے ہی نئے پہرے داروں اور دیگر عملے کا راؤنڈ شروع ہوگیا۔ ڈیڑھ حوالدار چائے کی بڑی سی چینک اور چند پتلی سلور کی گلاسیاں چھنکاتا ہوا آیا اور ہمیں جیل کے لنگر کی روٹیاں بانٹتا ہمارے گلاسوں میں چائے انڈیلتا گیا۔ اس کے سر پر بھی دو کرخت چہروں والے منکر نکیر نما سپاہی پورا وقت تنے کھڑے رہے۔

ڈیڑھ حوالدار کی نظر مجھ سے ملی تو وہ دھیرے سے مسکرایا۔ جیسے کہہ رہا ہو ''فکر مت کرنا..... میں ہوں یہاں۔''

کال کوٹھڑی کے احاطے میں وقت عام جیل کی دیگر چار دیواریوں سے بھی زیادہ سست گزر رہا تھا۔ پچھلی والی بیرک میں تو پھر بھی صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتی تھی۔ مگر یہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وقت کی سوئی ٹوٹ کر کہیں گر گئی ہے۔ تبھی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، وقت کے پیمانے کا تعلق ہمارے اندر کی کیفیت سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک ہی شہر میں ایک ہی زمان و مکان میں چلتے پھرتے لوگوں کے لیے وقت کی مقدار اور گزرنے کا دورانیہ مختلف ہوسکتا ہے۔

مثلاً اسی جیل کی بیرونی دیوار سے پرے گاؤں یا کچھ دور شہر میں چلتے پھرتے لوگوں کے لئے یہی وقت بہت نارمل اور اپنے معمول کے مطابق ہوگا۔ بلکہ گھروں میں کام کرتی عورتیں اور کھیتوں اور دفتروں میں کام کرتے مرد بار بار گھڑی کی طرف دیکھ کر ہاتھ مل رہے ہوں گے کہ اُف دن کتنی تیزی سے گزر گیا یا ''آج تو جیسے وقت کو پر لگ گئے ہیں۔'' ابھی کام آدھا بھی نہیں ہوا اور دن ڈھل گیا ہے.....

''کچھ لوگ جمعہ کی نماز پر ایک دوسرے سے کہتے ملیں گے ''ارے آپ۔ ابھی پچھلے جمعے کو ہی تو ملے تھے..... لگتا ہے بس کل ہی کی بات ہے۔ کچھ مہینوں اور کچھ سال کے پلک جھپکتے گزر جانے کا شکوہ کرتے ملیں گے'' ارے..... رمضان پھر سے آ گیا..... لگتا ہے جیسے پچھلے ماہ ہی تو عید ہوئی تھی.....'' لیکن ہم قیدیوں کے لئے یہی وقت اس چار دیواری کے اندر جم سا گیا تھا۔

صدیوں بعد شام کے 4 بجے تو مجھے بھی آہنی زیور پہنا کر باقی قیدیوں کے ساتھ باہر نکالا گیا۔ ایک جوان سے لڑکے قیدی نے مجھے نظروں نظروں میں سلام کیا، وہی ظہیر تھا، بمشکل تیس سال کا لگتا تھا۔ باقی قیدیوں میں سے چند کے نام مجھے سنتریوں کے انہیں پکارنے سے پتہ چلتے رہے..... ''سنتوش..... بات مت کرو.....''

''ظہیر..... تم سیدھی طرف ہو جاؤ.....''

''اوئے بگھے سنگھ..... بار بار بیٹھ کیوں جاتے ہو.....؟''

''اوئے کندن مسیح..... ادھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو..... چپ چاپ ٹہلتے رہو.....'' ان میں صرف ایک لمبی اور نیچے سے سیدھی کٹی لمبی لٹوں والا ایسا شخص تھا جو اپنے آپ میں گم اور چپ چاپ سنتریوں کی ہدایات پر چلتا رہا۔ بعد میں مجھے اس کا نام بخت خان پتہ چلا۔ شاید کسی قبائلی علاقے سے تعلق تھا اس کا۔ ٹہلنے کا وقت ختم ہوا تو ظہیر نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا کہ وہ گزشتہ رات کی طرح دیر گئے مجھ سے بات کرے گا۔

مغرب کے وقت قیدیوں کو رات کا کھانا بانٹ دیا گیا۔ جانے کھانا بدمزہ تھا یا پھر قید کی اس اذیت نے ہمارے اندر ہی ذائقے کی حس مار دی تھی..... گویا ذائقہ بھی زبان سے نہیں..... آس پاس کے ماحول سے جڑا ہوتا ہے۔

آدھی رات گزری تو ظہیر نے پھر اسی انداز میں رابطہ کیا۔ پتہ چلا کہ ظہیر نے یہاں دیگر چار قیدیوں کو اپنے منصوبے میں شامل کر رکھا ہے۔ سنتوش، بگھا، کندن اور بخت خان..... میں ان چاروں کو آج ہی کال کوٹھڑیوں کے احاطے میں دیکھ چکا تھا۔ ایک ہندو، دوسرا سکھ، تیسرا عیسائی اور چوتھا مسلمان۔ موت بھلا مذہب اور ذات پات کہاں دیکھتی ہے۔ وہ سبھی کے لئے یکساں اترتی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر تو صرف ہم وحشی انسان ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں۔

اگلے ایک ہفتے میں ظہیر نے مختلف وقفوں اور بات کرنے کے عجیب وغریب طریقوں سے مجھے جو کچھ بتایا وہ ازخود ایک لمبی کہانی تھی۔ ظہیر کو ان سب قیدیوں کو فرار کے لئے تیار کرنے میں دو سال کا وقت لگا تھا۔ اس دوران ان کے ایک چھٹے ساتھی کرم دار کو پھانسی بھی دی جا چکی تھی۔

مگر ظہیر اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے سپاہیوں اور پہرے داروں کے چوبیس گھنٹے کے پہرے اور بات کرنے کی پابندی کا یہ توڑ نکالا تھا کہ ان پانچوں نے اپنی ایک نئی زبان ایجاد کر لی تھی۔ جیسے کوئی مورس کوڈ، زنجیر اور بیڑیوں کی چھن چھن، ٹہلائی کا وقت، ایک چھن، مطلب ''سلام'' چھن چھن، مطلب ''کیسے ہو.....؟'' چھن چھن چھن..... ''سب ٹھیک ہے'' پھر وہ پانچوں اس زبان میں اتنے ماہر اور یکتا ہوئے کہ ماچس پر انگلیوں کی تھاپ، سلاخوں پر پانی کے گلاس یا پھر دیوار پر لوہے کی چمچ کی گھٹ گھٹ ان کی بولی بنتی گئی، دو سال کے اس عرصے میں کال کوٹھڑیوں کے چار قیدیوں کی پھانسی کا وقت آ پہنچا اور یکے بعد دیگرے آس پاس کی کھولیوں سے قیدی تختہ دار پر لٹکتے گئے۔

انہی میں ان سب کا چھٹا ساتھی کرم داد بھی شامل تھا جس کی دوری نے ان پانچوں کو مزید قریب کر دیا۔ ظہیر ان سب کا لیڈر تھا جس نے فزکس میں ماسٹرز کی ڈگری لے رکھی تھی۔ اسی لیے کسی ماہر انجینئر کی طرح اس نے جیل اور سزائے موت کے احاطے کی ہر روٹین کو ازبر یاد کر رکھا تھا۔ اس کا اندازہ گھڑی کی سوئیوں کی طرح کامل تھا۔

رات جیل کی چوبرجی پر سپاہی کتنے بجے تبدیل ہوتے تھے جیل کی فصیل پر بنی پہرے داروں کی برجیوں کے درمیان کتنے قدموں کا فاصلہ تھا۔ اور کتنی دیر میں دو سنتری ایک دوسرے کو کراس کر کے دوسری جانب چلے جاتے

تھے۔ کھانا لانے کے لئے صبح شام تین مرتبہ ٹھیک کس لمحے سزائے موت والا احاطہ کھولا جاتا تھا، کتنے سپاہی چھت اور فصیل پر کتنی دیر لنگر سے کھانا آنے کے دوران ہمارے سروں پر تعینات رہتے تھے۔ اور اگر انہیں کبھی گولی چلانی پڑے تو کتنی دیر میں وہ گولی چیمبر سے بدل کر دوسرے فائر کے لئے تیار ہو پائیں گے۔

غرض چھوٹی سے چھوٹی بات کی تمام تر تفصیلات اسے کسی ریاضی کے پروفیسر کی طرح ازبر ہو چکی تھیں۔ لیکن ظہیر کا اصل منصوبہ کیا تھا، یہ ان میں سے کسی کو ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ یوگی اور ڈیڑھ حوالدار ظہیر کے پلان کا بہت اہم حصہ تھے۔ ظہیر رات کے مخصوص حصے میں مجھے تفصیلات بتاتا رہتا۔ کبھی زبانی اور کبھی اپنی مخصوص کھٹ کھٹ یا ٹن ٹن کی زبان میں۔

مشرقی طرف کے برآمدے میں صرف میں اور ظہیر بند تھے، باقی پانچ کوٹھڑیاں خالی چھوڑی گئی تھیں۔ باقی مغربی، شمالی اور جنوبی برآمدوں میں دو، دو اور تین قیدی بند تھے۔ ظہیر کو یہاں پہلے اکیلے رکھا گیا تھا۔

انہیں ظہیر کے پس منظر سے واقفیت تھی تبھی جیل حکام نے اُسے باقی قیدیوں سے دور رکھا ہوا تھا اور مجھے شاید بے ضرر سمجھ کر ظہیر کے ساتھ ہی مشرقی برآمدے میں ایک کوٹھی چھوڑ کر قید کیا گیا تھا۔

ظہیر کا دماغ دن رات کسی کمپیوٹر کی طرح چلتا رہتا تھا۔ شاید اسی لئے اس کی تنظیم بھی اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اور مختلف طریقوں سے اسے چپ رہنے کے پیغامات بھجواتی رہتی تھی، مجھے یہاں آئے تین ہفتے بیت چکے تھے۔ اس عرصے میں پاپا کے ڈاکٹر کا ایک پیغام آیا تھا کہ پاپا بہت بیمار ہیں۔ اور دوسرا ایک خط میرے نام آیا، جس کے اوپر لکھی پتے کی تحریر دیکھ کر میرا دل اس زور سے دھڑکا کہ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

وہی مانوس مہکتی سی تحریر، میں نے بے تابی سے خط کھولا، اندر تہہ کیا ہوا کاغذ بالکل سادہ اور ورق کورا تھا۔ لیکن مجھے ہر سطر پر لکھے لفظ صاف نظر آرہے تھے۔ کچھ تحریریں الفاظ کی محتاج نہیں ہوا کرتیں۔ زہرہ کا بھیجا ہوا کورا ورق ہی پوری لغت سے بھرا پڑا تھا۔ محبت کی لغت، میں نے دن میں کئی بار اس کا وہ کورا خط پڑھا۔ بار بار اسے اپنی آنکھوں سے لگایا۔

رات ڈھلے ظہیر کی ٹھک ٹھک اور پھر سرگوشی اُبھری "جاگ رہے ہو مولانا؟ آج تمہیں اپنے فرار کا منصوبہ بتانا ہے مجھے..... اور ہاں..... ایک اور اہم بات..... ڈیڑھ حوالدار آج کھانے کے برتن تلے جیل کے نقشے کی نقل چپکا کر پہنچا گیا ہے مجھے تیار ہو جاؤ..... ہم یہاں سے بہت جلد "بکھر" ہو جانے والے ہیں.....

..........*

باب 6

اس کا نام ماں باپ نے بہت پیار سے ظہیر رکھا تھا۔ تین بیٹیوں کے بعد اکلوتا بیٹا ان بہنوں کا بھائی بن کر دُنیا میں آیا تو گھر میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے، ماں باپ اور بہنیں اسے چوم چوم نہ تھکتے، وہ تھا ہی تو ایسا پیارا، معصوم سا، بڑی بڑی آنکھوں والا جس کے کشادہ ماتھے سے ہی ذہانت چھلکتی دکھائی دیتی تھی۔

سکول، کالج اور یونیورسٹی میں ہر مضمون میں اول، کھیل ہو یا تقریری مقابلہ، ڈرامہ ہو یا مشاعرہ، ظہیر ہر محفل کی جان ہوتا تھا۔ انجینئرنگ مکمل کی اور پھر یونیورسٹی کے وظیفے پر ہی فزکس میں ماسٹرز بھی کرلیا۔ طبیعیات اور مابعد الطبیعیات اس کے پسندیدہ مضامین تھے اور اسے گولڈ میڈل بھی اسی مضمون میں دیا گیا تھا۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن گھر کا کرایہ چکانے کے لئے اسے وہی سونے کا تمغہ جوہری بازار لے جا کر بیچنا پڑے گا۔ یونیورسٹی ختم ہوجانے کے بعد باہر کی دنیا اور یہ گھٹیا فرسودہ نظام نہایت بے رحم ثابت ہوا۔ نوکری کے لئے دربدر دھکے کھاتے اس کے جوتے گھسنے لگے، لیکن ہر آسامی پر کسی وزیر یا بڑے افسر کا سفارشی چن لیا جاتا، اور جو جگہ ان سے بچتی، وہاں منہ پھاڑ کر رشوت مانگ لی جاتی۔

ظہیر کی لیاقت اور ڈگریاں کسی کام نہ آسکیں اور گھر میں تین جوان بہنوں کی سوال کرتی نگاہیں اُسے چبھنے لگیں۔ تبھی ان کی گلی میں ایک روز تنظیم والے چندہ مانگنے آئے۔ ظہیر تو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ تُو تکار ہوگئی اور شکایت تنظیم کے بڑوں تک چلی گئی۔ ظہیر کو سرزنش کے لئے طلب کیا گیا مگر ایک بڑے کو ظہیر کے اندر جلتے الاؤ کی روشنی دکھائی دے گئی۔ ظہیر کو تنظیم میں شامل کرلیا گیا اور اپنی صلاحیتوں کی بدولت ظہیر گلی سے محلے، اور اپنی سڑک سے ٹاؤن کے عہدے تک جا پہنچا۔

پھر ضلعی سطح پر اس کا چناؤ ہوگیا۔ گھر میں پیسہ آنے لگا۔ جن نوکریوں کے لئے پہلے ظہیر دھکے کھاتا پھرتا تھا اب وہی آسامیاں ظہیر کی ایک پرچی پر اس کی گلی محلے کے نوجوانوں اور رشتہ داروں میں بٹنے لگیں۔ ظہیر کی شعلہ بیانی نے پہلی ہڑتال میں 13 تیرہ بسوں کو آگ دکھا دی۔ پھر تو اس کی ایک آواز پر شہر بند ہونے لگا۔ تنظیم کے بڑوں نے اُسے کھلی آزادی دے رکھی تھی۔ اب ظہیر ایک بڑا لیڈر بن چکا تھا اور اس کی تنظیم میں مقبولیت عروج پر تھی۔

سب کو یقین تھا کہ ہونے والے چناؤ میں ظہیر صوبائی اسمبلی تک تو پہنچ ہی جائے گا۔ مگر تنظیم کے بڑوں کو اب ظہیر کی یہ مقبولیت کھٹکنے لگی تھی۔ کیونکہ اُن کے حساب سے ظہیر خودسر ہوتا جارہا تھا۔ لہٰذا ظہیر کا شکنجہ کسنے کی تیاری

شروع کر دی گئی۔ ظہیر کے ذریعے شہر میں دوسری پارٹی کے خلاف ہڑتال کی کال دلوائی گئی اور اُسی رات شہر میں گیارہ بندوں کو مختلف علاقوں میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ بلوے اور فساد کا سارا مدعا ظہیر کے سر آیا اور ایف۔ آئی۔ آر ظہیر کے نام پر کاٹی گئی۔ پولیس حرکت میں آئی تو ظہیر نے تنظیم کے بڑے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر اس بڑے نے کبھی ظہیر کی کال دوبارہ وصول ہی نہیں کی۔

ظہیر کو روپوش ہونا پڑا اور پھر یکے بعد دیگرے ایسے کئی دیگر اندھے خون اور قتل ظہیر کے کھاتے میں درج ہوتے گئے۔ تنظیم نے سرعام ظہیر سے لاتعلقی کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ درپردہ ظہیر کو ایک جگہ بلوا کر پولیس کے چھاپے کا انتظام بھی کروادیا۔

ظہیر گرفتار ہوگیا اور چھ ماہ کی سماعت کے بعد اُسے سزائے موت سنادی گئی۔ ظہیر سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ ہوا ہے مگر اپنے گھر والوں کی زندگی کی خاطر اسے چپ سادھنا پڑی۔

دو سال قبل ظہیر کو اس موت کی قید والے احاطے میں لایا گیا، تب یہاں تقریباً 16 سولہ قیدی قید تھے۔ ظہیر نے پہلے دن ہی طے کرلیا تھا کہ وہ ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرنے کے بجائے یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب کرے گا، باہر اب بھی اس کے کچھ جگری دوست تنظیم میں موجود تھے جو ظہیر کے احسان مند تھے اور آج بھی اس کے لئے جان لٹانے پر ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

ظہیر کا یہ ماننا تھا کہ دنیا کی کوئی جیل بھی ایسی نہیں بنی جسے توڑا نہ جاسکے۔ بس مناسب موقعے، باہر سے ٹھیک وقت پر مدد اور اندر ایک بہترین ٹیم بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ظہیر نے اندر آتے ہی اپنے کام کے بندے تلاش کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اُس کی عقابی نگاہوں نے پہلے دو ہفتوں میں ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ سزائے موت کے احاطے میں زیادہ تر قیدی موت کی سزا سننے سے پہلے ہی مر چکے تھے، اور اب صرف ان کے سانس لیتے لاشے ان کال کوٹھڑیوں میں بند تھے۔ زندہ صرف وہی رہتے ہیں جن کے اندر ولولے اور جوش کی کوئی رمق باقی رہ جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے ظہیر نے اپنا اعتماد باقی قیدیوں پر قائم کرنا شروع کیا اور پہلے تین ماہ کے دوران وہ بگھے، کندن مسیح، سنتوش، بخت خان اور کرم داد کو اپنی فہرست میں سب سے اوپر درج کر چکا تھا۔

ان سب قیدیوں کے اندر غصہ، جھنجھلاہٹ اور معاشرے سے شدید نفرت صاف جھلکتی دکھائی دیتی تھی اور نفرت کا آوہ اندر سلگ رہا ہو تو انسان بے چینی کی ایک عجیب طاقت کے زیر اثر جلتا بجھتا رہتا ہے۔ ظہیر نے اسی نفرت کی طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ باقی زیادہ تر قیدی اندر سے بجھے ہوئے اور مایوس تھے۔ اور جب انسان اندر سے بجھ جائے تو باہر جلتا کوئی بھی الاؤ اُسے زندہ رہنے کی تحریک نہیں دے سکتا۔

ظہیر نے ان پانچوں کے اندر سلگتی اُسی چنگاری کو ہوا دی اور اُنہیں یہ سمجھایا کہ کسی جج کے کاغذ پر فیصلہ لکھ کر قلم توڑ دینے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی گھریلو چوپائے کی طرح خود چلتے ہوئے جا کر پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈال کر سولی چڑھ جائیں۔ انہیں اس موت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہوگی، پھر چاہے اس کوشش کے

دوران اُن کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ مرنا تو بہرحال طے ہے، تو پھر زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کیوں نہ مرا جائے؟

اور پھر ان سبھی کے پاس زندہ رہنے کا ایک مقصد تھا۔ کیونکہ وہ چھ کے چھ اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ادھوری چھوڑ آئے تھے۔ ظہیر کو یہاں سے نکل کر تنظیم کے اس بڑے سے اپنا حساب کتاب برابر کرنا تھا تاکہ کل کو دیگر کئی ظہیر پیدا نہ ہو سکیں۔

اسی طرح کندن مسیح کی ایک نامکمل کہانی تھی، جیسے بھگے سنگھ اور سنتوش کی..... بخت خان کی آنکھوں میں بھی بہت نامکمل خواب ابھی باقی تھے۔ اور کرما بھی تو کئی ذمہ داریاں ادھوری چھوڑ کر آیا تھا پیچھے، ظہیر نے ان سب کے ادھورے خوابوں کی ایک گٹھڑی بنائی اور ان کے دلوں میں اُمید کی ایک نئی جوت جگا دی۔

پہرے کی زیادہ سختی شروع ہوئی تو سب سے پہلے آپس میں بات چیت کے لئے زبان ایجاد کی گئی۔ عملے اور جیل کے معمولات کی ساری تفصیل ظہیر پہلے ہی ازبر کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے دھوپ کے چڑھنے اور سائے ڈھلنے کے میزائیے کے حساب سے گھڑی کی سوئیوں کی طرح وقت کا حساب بھی ماپ رکھا تھا۔ جیل کا گھنٹہ تو صرف گھنٹے اور آدھے گھنٹے کے گزرنے کا گرج بجاتا تھا۔ ظہیر دھوپ، سایہ اور چاندنی دیکھ کر درمیان کا وقت بھی بتا سکتا تھا۔ مگر اسی عرصے میں ایک انہونی ہوگئی اور ان کے ساتھ کرم داد کی رحم کی اپیل صدر نے بھی مسترد کر دی۔

اس رات وہ سب مل کر روئے جب کرمے کو ان کے سامنے آدھی رات کو جیلر ڈاکٹر اور مجسٹریٹ اس کی کوٹھڑی سے نکال کر پچھلی جانب بنے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جانے کے لئے آئے تھے۔ پھانسی گھاٹ کا احاطہ کال کوٹھڑیوں کے بالکل پیچھے ہی بنایا گیا تھا اور جن قیدیوں کو زیادہ عبرت دینا مقصود ہوتی تھی انہیں اسی مشرقی برآمدے کی کال کوٹھڑی میں بند کیا جاتا تھا جس کے پچھلی دیوار میں بنے چھوٹے سے روشن دان سے پھانسی گھاٹ نظر آتا تھا۔

کرم داد کو لے جانے کے لئے کھولی سے نکالا گیا تو سبھی قیدی اسے آخری سلامی دینے کے لئے اپنی اپنی کوٹھڑی کی سلاخوں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ رات کے اندھیرے میں کلمے اور اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ سبھی قیدیوں نے اپنے سلور کے گلاس زور زور سے سلاخوں سے ٹکرانا شروع کر دیئے۔ ایک چیخ و پکار سی مچ گئی۔

کچھ قیدیوں نے زور زور سے ''اللہ ہُو..... اللہ ہُو'' کا ورد شروع کر دیا۔ کرما جاتے جاتے ایک پل کے لئے ظہیر کی کھولی کے پاس رُکا ''چلتا ہوں دوست..... ہو سکے تو تم میرا ادھورا کام پورا کر دینا..... میری سانسیں بس اتنی ہی لکھی تھیں.....''

ظہیر کرم داد کا بڑھا ہوا ہاتھ چھو نہ سکا اور اسے عملہ اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ ہی دیر میں پچھلی جانب سے کرم داد کے زور سے کلمہ پڑھنے اور تختے کا لیور کھینچے جانے کی آواز فضا میں گونجی..... ایسے لگا جیسے کوئی بوجھ ہوا میں گرتے ہوئے ایک جھٹکے سے فضا میں معلق رہ گیا ہو۔ قیدیوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''اللہ ہُو.....'' اور پھر فضا میں خاموشی چھا گئی..... موت کی خاموشی..... میری اور ظہیر کی کوٹھی بھی اسی مشرقی طرف والے برآمدے میں تھیں۔ جس کے پیچھے

وہ بے رحم پھانسی گھاٹ آج بھی اسی طرح ایستادہ دکھائی دے رہا تھا۔ رات آدھی بیت چکی تھی۔ اچانک فضا میں وہی تان ابھری جو پہلے بھی کئی بار اپنی پچھلی بیرک میں سن چکا تھا۔ بھگا اپنی درد بھری آواز میں گا رہا تھا۔

"یارا عشق جنھاں نوں لگ جاندے.....
حال بچھ نہ اوناں دیوانیاں دے.....
قیدی عشق دے بگھے نئیں چھٹ دے.....
قیدی چھٹ جاندے نے جیل خانیاں دے....."

ٹھیک اسی وقت ٹرین کی سناٹے میں کوکتی سیٹی کی آواز گونجی۔ مجھے یوگی کی کہی بات یاد آ گئی۔ ظہیر نے دوسری جانب سے دیوار پر دستک دی "جاگ رہے ہو مولانا.....؟"

"نہیں..... سو رہا ہوں..... اور مجھے سوتے میں بولنے کی عادت ہے....." ظہیر زور سے ہنس پڑا۔

"واہ..... بڑی زندگی ہے ابھی تمہارے اندر..... اس زندہ دلی کو بچا کر رکھنا..... یہی تمہیں زندہ رکھے گی باہر....." میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔

"مجھے یہاں سے باہر جانے کا کوئی ارمان نہیں ہے..... میرے لیے اندر باہر اب سبھی ایک برابر ہے....."

ظہیر چہک کر بولا "ایسے مت کہو.....

اپنی جوانی پر رحم کھاؤ..... تم بس ایک بار یہاں سے نکلنے کی حامی بھرو، پھر تمہیں ایران، ترکی کے راستے یونان تک پہنچانا میرے جان نثاروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کئی لوگوں کو تنظیم کے کہنے پر بارڈر پار کرایا ہے۔"

"جن کی روح قیدی ہو..... اُن کے جسم کتنی بھی سرحدیں پار بھیج دو۔ وہ سدا قیدی ہی رہتے ہیں، فاصلے کسی کی قید کب ختم کر سکتے ہیں بھلا.....؟" ظہیر میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔

"تم جانتے ہو مولانا..... تم جس 17 نمبر کھولی میں بند ہو..... یہاں کبھی ہمارا چھٹا دوست کرما بند ہوا کرتا تھا۔ اگر تم اس کوٹھڑی کی دیواروں پر چند مٹے ہوئے نام پڑھ سکو، تو تمہیں ہر دیوار پر ایک ہی نام لکھا نظر آئے گا..... پڑھ سکتے ہو تو بتاؤ....." میں نے چونک کر سامنے کی دیوار پر دیکھا..... کوٹھی میں دیواروں پر تازہ پیلا چونا پھیرا گیا تھا، لیکن ذرا سی کوشش کے بعد میں ہلکی چونے کی تہہ کے نیچے سیاہ کوئلے سے لگاتار کئی مرتبہ لکھا نام پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

"مہرو....." اور پھر مجھے احساس ہوا کہ ساری دیواروں پر قلعی کی تہہ کے نیچے یہی ایک نام بار بار لکھا نظر آیا۔ "یہ مہرو کون ہے.....؟" کرم داد کی بیٹی..... اس کی کل کائنات تھی مہرو..... اور جانتے ہو کرم داد نے پھانسی کے لئے جاتے وقت میرے کان میں کیا کہا تھا.....؟

"میں نے بے چینی سے پوچھا: "کیا.....؟" ظہیر کچھ دیر چپ رہا۔

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تو اس دنیا سے جا رہا ہوں..... مگر جب تک میری مہرو مل نہیں جاتی..... میری روح اسی جیل، پھانسی گھاٹ اور اسی کال کوٹھڑی میں بھٹکتی رہے گی۔ مجھے مر کر بھی چین نہیں آئے گا....." مجھ

سے ظہیر کی خاموشی برداشت نہیں ہوئی۔

''کیوں..... کہاں کھو گئی کرم داد کی مہرو.....؟''

''اٹھالی گئی تھی..... دو سال پہلے شادی کی رات رخصتی سے پہلے ہی کوئی اسے اٹھالے گیا تھا۔ کرم داد کی تو کل کائنات ہی اجڑ گئی سمجھو..... اس کی بیوی صدمے سے پاگل ہوگئی کیونکہ اکلوتی بیٹی کا جنازہ تو لوگ پھر بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اس معاشرے میں شادی کی رات ہی اگر جوان لڑکی گھر سے اٹھالی جائے..... یہ کوئی ماں باپ سہہ نہیں سکتے۔''

ظہیر نے مجھے بتایا کہ کرم داد جنوبی پنجاب کا ایک سیدھا سادھا سا چھوٹا موٹا زمین دار تھا اور اس نے اپنی مہرو کو ہتھیلی کے چھالے کی طرح سینت سینت کر پالا تھا۔ ذہین، خوبصورت اور مشرق کے رنگ میں رنگی مہرو میں ان دونوں میاں بیوی کی جان اٹکی رہتی تھی۔ مہرو نے بی۔ اے کیا تو باپ کو گوارا نہ ہوا کہ بیٹی اکیلے کسی قریبی بڑے شہر کی یونیورسٹی میں ہوسٹل جا کر رہے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دھوپ، بارش میں خوار ہو لہٰذا منت سماجت کر کے انہوں نے مہرو کو گھر پر ہی پڑھائی مکمل کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اور پھر خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ انہی دنوں قریبی گاؤں کے بہت بڑے زمین دار کے بیٹے کی نظر مہرو پر کسی تقریب میں آتے جاتے پڑ گئی۔ مہرو کی ناک کی کیل لمحے بھر کو جو چمکی تو وہ کوکا سیدھا احمد کے دل کے پار ہو گیا۔ اس نے شریف زادوں کی طرح سیدھے جا کر اپنی ماں کے کان میں یہ بات ڈال دی۔ اور اگلے ہفتے ہی وہ لوگ رشتہ لے کر مہرو کی چوکھٹ پر موجود کھڑے تھے۔ کرم داد کو اپنی بیٹی کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا اور مہینے بھر میں ہی مہرو کو منگنی کی نشانی ڈال دی گئی۔

نکاح اور رخصتی کی تاریخ بھی طے ہوگئی اور مہرو بابل کے گھر کی یادیں ساجن کے آنگن لے جانے کے لئے روزانہ یادوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی بنانے لگی کیونکہ پھر عمر بھر لڑکیوں کو اپنی سنہری یادوں کی اپنی ریشمی گٹھڑیوں کو ایک ایک کر کے کھولتے رہنا ہوتا ہے۔ اور پھر مہرو کی رخصتی سے پہلے مہندی کی رات بھی آ پہنچی۔ اسے اگلے روز اپنے آنگن سے دولہا کے سنگ رخصت ہو جانا تھا مگر مہندی کی رات ہی کرم داد کے گھر پر قیامت گزر گئی۔

مہرو چند لمحے کے لئے اپنے کمرے سے نکلی اور پھر کبھی پلٹ کر واپس نہیں آئی۔ صبح تک بات پولیس خانے اور کوتوالی تک بھی پہنچ گئی۔ سب نے مہرو کی تلاش میں زمین آسمان چھان مارے۔ مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ کرم داد کی دنیا اندھیر ہوگئی۔

دولہے والوں نے لڑکی کے کردار پر الزام لگا دیا کہ وہ پہلے سے ہی کسی اور کی محبت میں مبتلا تھی، اس لئے موقع ملتے ہی اپنے محبوب کے ساتھ گھر کی ناموس اور دہلیز دونوں کو پار کر گئی۔

کرم داد اپنی معصوم اور بھولی بھالی مہرو کے لئے گلی محلے میں یہ غلیظ سرگوشیاں سنتا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ایسے بدخواہوں کی زبان گدی سے کھینچ لے اور پھر ایسی ہی گرمی کی ایک تپتی دوپہر گھر لوٹتے وقت کسی اوباش نے کرم داد کے تانگے کے پیچھے سے مہرو کے لئے کوئی گندہ آوازہ کسا، کرم داد کے اندر جوش مارتا خون آنکھوں سے اُبل پڑا اور کچھ لمحے بعد ہی گالی بکنے والا شخص سڑک پر تڑپتا ہوا پایا گیا۔

تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھی گئی گھاس چارہ کاٹنے والی درانتی کرم داد نے اس طعنہ زن کے پیٹ میں ساری ہی بھونک ڈالی تھی۔ کرم داد کے کوچوان اور جدی پشتی ملازم نے کرم داد کو فوراً بھگا لے جانے کی پیشکش کی مگر وہ جاتا بھی تو کہاں..... سو اس نے اپنے کوچوان سے تانگہ سیدھا بڑے تھانے کی طرف موڑنے کا کہہ دیا۔

مرنے والے کے ورثاء نے بڑا وکیل کیا اور کرم داد اس چھوٹی سی کال کوٹھڑی میں آ پہنچا۔ بیوی جو پہلے ہی صدمے سے نیم پاگل تھی۔ شوہر کی جدائی نے اسے پورا دیوانہ کر دیا، کرم داد کی ہنستی بستی دُنیا چند ہفتوں میں ہی اندھیر ہوگئی اور اسے اسی جیل میں سولی چڑھا دیا گیا۔ مگر مہر و کے غائب ہو جانے کا راز راز ہی رہ گیا۔

کرم داد نے ظہیر کے ساتھ جیل سے بھاگنے کی رضامندی بھی اسی لئے ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی مہر و کو ڈھونڈ کر دوبارہ اُس کی ماں کی بے نور آنکھوں کو روشن کرنا چاہتا تھا مگر موت کے اندھیروں نے خود اسی کو ہمیشہ کے لئے نگل لیا۔

ظہیر بولتے بولتے کچھ دیر کے لئے خاموش ہوا تو مجھے اپنی کوٹھڑی کی ساری دیواروں پر لکھے مہر و کے نام سے کرم داد کی مجبور اُداس آنکھیں جھانکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور جانے مجھے پل بھر کے لئے ایسا لگا جیسے اس وقت کرم داد بھی وہیں کہیں آس پاس سر جھکائے بیٹھا اپنی بربادی کی یہ ساری داستان سن رہا ہے۔

ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی، باہر رات پوری بھیگ چکی تھی۔ ظہیر کی آواز ابھری "اور جانتے ہو مولانا..... ہم سب ساتھیوں نے آپس میں کیا طے کیا اور کرم داد سے اُس کی پھانسی والی رات سے پہلے کیا وعدہ کیا تھا.....؟"

"کیسا وعدہ.....؟" میں نے بے چینی سے پہلو بدلا، ظہیر کی آواز میں دکھ تھا۔

"ہم سب نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم میں سے جس کو بھی یہ کوٹھڑی نمبر 17 الاٹ ہوئی یا ہم میں سے جس کو بھی یہاں منتقل کیا گیا۔ وہ جیل سے فرار کی صورت میں سب سے پہلے کرم داد کی مہر و کو ڈھونڈے گا، لیکن بدقسمتی سے ہم پانچوں کو تین چار بار کھولیاں تبدیل کرنے کے باوجود آج تک کسی کو یہ کال کوٹھڑی نہیں ملی..... اور پھر ایک دن تم اس زندان میں آ گئے۔ اور اب شاید ہم میں سے کسی دوسرے کو یہ کھولی کبھی نہ ملے..... کیونکہ اسی مہینے کی سترہ تاریخ کو ہم سب نے یہاں سے فرار ہونے کی تیاری کر لی ہے..... جانے ہم میں سے کون زندہ باہر نکل پائے گا اور مہر و کی تلاش میں نکلنے کی مہلت ملے گی بھی یا پھر کرم داد کی روح یوں ہی سزا بھگتتی رہے گی..... تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تو نا سہی..... لیکن ہمارے لیے دعا تو کر سکتے ہو ناں..... دعا کرنا کہ ہم میں سے بچ جانے والا کوئی بھی کرم داد کی مہر و کو اس کی مجبور اور بے کس ماں کے پاس پہنچا سکے۔"

ظہیر خاموش ہوا تو صبح کی اذان بول پڑی۔ جیل میں اور خاص طور پر ان کال کوٹھڑیوں میں نماز کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔ جانے موت کی سزا مقرر ہو جانے کے بعد بھی توبہ کے دروازے کھلے رہتے ہوں گے؟ اور کیا ہماری دعاؤں کو عرش تک رسائی ملتی بھی ہے یا نہیں؟ مگر میں نے پھر بھی نماز ختم کی تو کرم داد کے لیے خود بخود میرے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے۔

ظہیر نے بتایا تھا کہ وہ اسی مہینے کی سترہ تاریخ کو یہاں سے فرار کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔ آج دس تاریخ تھی اور بدھ کا دن تھا، یعنی ٹھیک اگلے بدھ کی رات ان کی اس جیل یا دنیا میں آخری رات ثابت ہونے والی تھی۔ لیکن

میں ابھی تک ظہیر کے اصل منصوبے سے ناواقف تھا۔

شام کی ٹہلائی کے دوران وہ پانچوں اپنی زنجیریں کھنکا کر آپس میں جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ مگر اُن کے چہروں پر جوش اور شدید بے چینی کے آثار یہ صاف بتا رہے تھے کہ ان سب کو اپنے منصوبے پر پورا یقین ہے اور ان کا اعتماد اٹل تھا۔ اُس رات ظہیر جانے کیوں خاموش رہا تو مجبوراً مجھے دیوار پر دستک دینی پڑی۔

دوسری طرف سے ظہیر کی آواز آئی "جاگ رہے ہو مولانا..... آج تم سو جاؤ..... کیونکہ ڈیڑھ حوالدار نے نقشہ پہنچایا ہے، مجھے اس کی باریکیاں سمجھنے میں پوری رات لگ جائے گی....." میں نے پھر دیوار پر دستک دی۔

"کیوں..... کیا تم اپنے چھٹے ساتھی کو اپنے منصوبے میں شریک نہیں کرو گے؟" دوسری جانب ظہیر یقیناً اچھل پڑا ہوگا "کیا.....؟ تم سچ کہہ رہے ہو..... تم بھی ہمارے ساتھ؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "ہاں..... تم سب کو اپنا اپنا مقصد پورا کرنا ہے یہاں سے نکل کر۔ لیکن میرا صرف ایک ہی مقصد ہوگا۔ کرم داد کی مہرو کو تلاش کر کے اسے اس کی ماں تک پہنچانا....."

ظہیر زور سے چلایا..... "جیو میرے شیر....."

میں پرسکون رہا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے....."

✱.....✱.....✱

باب 7

کتنی عجیب بات ہے کہ قدرت ہمیں اس جہاں میں جینے اور زندہ رہنے کے لیے بھیجتی ہے مگر اس دنیا کا سارا نظام ہمیں موت اور مرجانے کے خوف پر قائم ملتا ہے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر جیون ملتے ہی مرجانے کا یہ خوف ہم انسانوں کے ساتھ نہ جڑتا تو یہ سارا سلسلہ اور یہ زندگی کیسی ہوتی.....؟ شاید ایک عذاب مسلسل کیونکہ موت ہی زندگی کا پردہ ہے۔

لیکن ہم چھ قیدی دوبارہ اسی زندگی کی طرف بھاگنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ظہیر نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی ٹیم کا انتخاب کیا تھا۔ جیل کی چھ برجیاں تھیں اور اسے ہر برجی پر تعینات پہرے داروں کے بندوبست کے لیے ایک ایک بندہ چاہیے تھا۔ بگھا سنگھ اور بخت خاں جسمانی طور پر اتنے مضبوط تھے کہ ان میں سے ہر ایک اکیلا ہی تین چار پر بھاری پڑ سکتا تھا۔ سنتوش کے ہاتھ میں آتے ہی ہر تالا کھل جاتا تھا اور کندن مسیح اونچی فصیلیں اور دیواریں کودنے کا فن جانتا تھا۔ اور ان سب کی ایک قدر مشترک تھی، جینے کی تمنا..... ظہیر نے 17 اکتوبر کا دن بھی بڑی عرق ریزی کے بعد فرار کے لیے چنا تھا اور اس کا منصوبہ بھی اس کی طرح انوکھا تھا۔

ظہیر کے پلان کا سارا دارومدار موسم پر تھا، اور وہ پچھلے تین ماہ سے اس تاریخ کا انتظار کر رہا تھا۔ ظہیر نے جو فرار کا منصوبہ بنایا تھا اس کے تین حصے تھے۔

نمبر ایک جیل کے اندر سے بغاوت یا بلوہ، جس کا مرکزی کردار یوگی تھا۔ یوگی کو 17 اکتوبر کی شام اپنی بیرک میں آگ لگا کر جیل میں افراتفری پیدا کرنا تھی تاکہ عملے کی ساری توجہ اس آگ کو بجھانے کی طرف بٹ جائے اور ظہیر اپنے ساتھیوں سمیت کال کوٹھڑی کے عملے پر قابو پا سکے۔

منصوبے کے دوسرے حصے کا اہم کردار ڈیڑھ حوالدار تھا جس نے نقشے کی مدد سے جیل کی پرانے دور کی ایک متروکہ اور ناکارہ نکاسی پائپ لائن کا سراغ لگانا تھا جو جیل سے باہر خشک ندی میں جا کر گرتی تھی۔ اور ڈیڑھ حوالدار اپنا یہ کام بخوبی نبھا چکا تھا۔ پائپ لائن کا راستہ پتہ چل چکا تھا جو کال کوٹھڑیوں کے احاطے کے بالکل پیچھے نیچے کی زمین سے گزر رہی تھی۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نکاسی کا یہ ایک صدی پرانا راستہ ابھی تک کھلا ہے یا پائپ کی ٹوٹ پھوٹ اور ٹنوں مٹی کے تودے گرنے کی وجہ سے آگے چل کر کہیں بند ہو چکا ہے؟ اس صورت میں وہ دیوہیکل اور بڑا سا پائپ ہی ہمارے لیے قبر ثابت ہونے والا تھا۔

ظہیر کے منصوبے کا تیسرا اور سب سے اہم حصہ موسم اور قدرت کی مہربانی سے جڑا ہوا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اگر

اس روز کسی موسمی تغیر اور تبدیلی کی وجہ سے وہ طوفان اور موسلا دھار آنے والی بارش ٹل جاتی تو ہمارے سارے خواب چکنا چور ہو سکتے تھے۔ ظہیر کو باہر سے اس کے دوستوں نے پہلے ہی سے آگاہ کر رکھا تھا کہ آنے والی 17 تاریخ کو اس علاقے میں شدید بارش، طوفان اور سیلاب کی پیشینگوئی ہے۔ انسان نے سائنس میں کتنی ترقی کر لی ہے اور یہ موسمیات کا محکمہ اور انٹرنیٹ یا گوگل پر آنے والے دنوں اور ہفتوں کے موسم کا حال کتنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہمیں یہاں ان کال کوٹھڑیوں میں بیٹھے ہو رہا تھا۔

ظہیر کے منصوبے کے مطابق شدید بارش اور سیلابی ریلے کی صورت میں اُس کے باہر بیٹھے جانثار جیل سے ملحقہ ندی کا باندھ ڈائنامائیٹ کے بلاسٹ سے اڑانے والے تھے جس کے نتیجے میں پانی کا بہت بڑا سیلابی ریلہ ٹھیک جیل کی چار دیواری کے اس حصے سے ٹکراتا جو سزائے موت کے بیرونی پھانسی گھاٹ والے حصے کو جوڑ رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ٹھیک اسی وقت ایک دوسری افتاد بھی جیل کے عملے اور گارڈز کے سر پر پڑنے والی تھی کیونکہ ظہیر کے ساتھیوں کا دوسرا گروپ جیل کے چاروں اطراف شدید فائرنگ اور کریکر دھماکے کر کے ان کا دھیان تیسری طرف بٹانے کے لیے پہنچ چکا ہوگا، یوں جیل کا عملہ، گارڈز اور دیگر پولیس تین محاذوں پر بٹ جاتی، جیل میں لگی آگ اور قیدیوں کی چیخ و پکار اور انہیں دیگر بیرکوں میں منتقل کرنے کی ہڑبڑاہٹ، سیلابی ریلے کا تیزی سے جیل کی چار دیواروں میں داخل ہونا اور سب کچھ تہس نہس کرتے ہوئے بیرکوں میں بربادی مچانا اور ٹھیک اسی وقت باہر چاروں طرف دھماکے اور جیل کی دیواروں پر بے تحاشہ فائرنگ جیل سٹاف کے حواس معطل کرنے کے لیے یہ عوامل کافی تھے۔

اس صورت میں لامحالہ سزائے موت کے قیدیوں کو بھی جلد بازی اور بوکھلاہٹ میں ضرور کسی اور طرف منتقل کرنا ضروری ہو جاتا کیونکہ سیلاب کا ٹھاٹھیں مارتا ریلا اگر اسی قوت سے جیل کی بیرونی دیوار سے ٹکراتا جو ظہیر نے ناپ رکھی تھی، تو جیل کی کئی دیواروں میں شگاف پڑنا لازمی تھا۔

سزائے موت کے قیدیوں کے احاطے کا وہ حصہ جہاں پھانسی گھاٹ بنایا گیا وہ براہ راست سیلابی طوفان کی زد میں آ رہا تھا اور اگر وہاں بڑا شگاف پڑتا تو کال کوٹھڑیوں کو پانی میں غرق ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ شگاف یا نقب ہی تو زندان کا متضاد ہوتی ہے۔ اور جس زندان میں نقب لگ جائے، وہ قید خانہ نہیں رہ پاتا، پنجرہ کھل جائے تو پنچھی اُڑ جاتے ہیں۔ ہم سب نے بھی اڑنے کی تیاری کر لی تھی۔ ظہیر کا یہ بھی ماننا تھا کہ قدرت اور میٹا فزکس دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ قدرت اپنے اصول میٹا فزکس کے پیمانے پر طے کرتی ہے۔ سارا کھیل وقت اور لمحوں کے پتے درست پڑنے کا ہے۔

اگر 17 تاریخ کو قدرت ہم پر مہربان ہوئی اور موسم کی پیشگوئی کرنے والے آلے درست ثابت ہوتے تو شدید تیز اور طوفانی بارش متوقع تھی۔ جس کے نتیجے میں ہمیشہ کی طرح جیل کے قریب سے گزرتی خشک ندی میں تیز سیلابی ریلا آنا تھا، یہ سب اس علاقے کا معمول تھا۔

مگر غیر معمولی بات یہ ہونا تھی کہ ہمیشہ کی طرح سیلابی ریلے کو روکنے والے باندھ کو اس بار دھماکے سے اُڑا دیا جانا تھا۔ جس کے نتیجے میں غضب ناک ریلے کا رخ جیل کی طرف ہو جاتا اور اس ایک خلاف معمول عمل سے آگے چل کر ایسے غیر معمولی اتفاقات کا ایک سلسلہ جڑا ہوا تھا۔ جس کی بنیاد پر ہمارے فرار کا سارا دارومدار تھا۔ مجھے یوگی کی

کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ دُنیا میں وقوع پذیر ہونے والا ہر حادثہ، موت، قتل، جنگ، آفت اور تباہی کسی خلافِ معمول وقت، گھڑی یا عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بس ذرا قدرت کے نظام یا میٹافزکس کو چھیڑ دینے کی ضرورت ہے۔ سب پلٹ جاتا ہے۔ مثلاً سانس سے ہماری زندگی چلتی ہے۔ ہم زندہ رہتے ہیں اور سانس لینا انسان کا معمول ہے۔ لیکن چند لمحوں کے لیے یہ چلتی ہوا رُک جائے یا ہم کسی بھی دوسرے انسان کا دم گھونٹ دیں تو وہ کچھ منٹوں میں ہی مر جائے گا۔ اور سانس کا رک جانا اس انسان یا ذی حس کے لئے خلاف معمول بات ہوگی۔

ایک لمحے کو اگر سوچا جائے تو یہ کتنی خطرناک بات ہے کہ صرف کسی کے منہ اور ناک پر چند لمحوں کے لئے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے ہم کسی کی یا کوئی بھی ہماری جان لے سکتا ہے۔ بس ذرا طاقت اور ہوش کی سرحد پار کرنے کی دیر ہے۔ انسان کسی کے بھی معمول کو خلاف معمول میں تبدیل کر سکتا ہے۔

ظہیر بھی 17 اکتوبر کی رات اس جیل کے معمول کو بیرونی قوتوں سے مل کر خلاف معمول میں بدلنا چاہتا تھا تاکہ اس کا منصوبہ کامیاب ہو سکے۔ لیکن میں نے اس کا منصوبہ سننے کے بعد صرف ایک شرط رکھی، ظہیر نے چونک کر پوچھا "شرط.....؟ کیسی شرط.....؟"

"ہاں..... میری بس ایک شرط ہے، ہمارے فرار کے اس سارے منصوبے میں کسی کی جان کو نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ مجھے عمر قید یا پھانسی قبول ہے، لیکن کسی کی جان لینا نہیں۔ اتنے بڑے بوجھ کے ساتھ میں ویسے بھی جی نہیں پاؤں گا....." ظہیر میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔

"میں جانتا تھا تم یہی کہو گے۔ اور یقین کرو کہ یہی بات اب ہم پانچوں کے دل میں بھی ہے۔ کسی بے گناہ کی جان لینا کتنا تکلیف دہ عمل ہے۔ یہ عذاب ہم نے اسی جیل کی ان کال کوٹھڑیوں میں دن رات سوتے جاگتے محسوس کیا ہے اور ہم سب نے پہلے دن ہی یہ طے کر لیا تھا کہ فرار کے دوران گھائل وار ہماری طرف سے نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ہم تو یہاں اندر رہتے ہیں۔ ہتھیار محافظوں کے پاس ہیں اور اسی لئے میں نے مہینوں کی محنت سے یہ افراتفری اور ہنگامہ پیدا کرنے والا منصوبہ بنایا ہے۔ ورنہ میں علاقہ غیر اور اپنے شہر کے ایسے چند کروہوں کو بھی جانتا ہوں جو بڑی رقم کے عوض سیدھا اس جیل پر حملہ کر کے ہمیں زندہ یا مردہ چھڑا کر لے جا سکتے ہیں۔ تم نے شاید ابھی کچھ عرصہ پہلے علاقہ غیر کے قریب ایک جیل ٹوٹنے کا احوال سنا ہوگا جس میں تین سو انتہائی خطرناک قیدی دن دہاڑے جیل توڑ کر بھگا لیے گئے تھے۔ اور پھر دوبارہ ان قیدیوں کا کوئی سراغ بھی نہیں مل سکا آج تک حکومت کو۔ یہ زور کی دنیا ہے پیارے، جو زور آور ہے، وہی سب سے زیادہ آزاد ہے۔ مگر تم بے فکر رہو۔ ہمارا ارادہ کسی کی جان لینے کا نہیں ہے۔ تبھی یہ تین طرفہ پلان ترتیب دیا ہے میں نے....."

ظہیر کے جواب نے میرے دل کا بوجھ تو ہلکا کر دیا مگر ایک انجانی سی الجھن اور پریشانی مجھے گھیرے بیٹھی رہی۔ اگلی شام ٹہلائی کے دوران ظہیر نے زنجیروں کی کھن کھن کے ذریعے باقی ساتھیوں کو میرے شامل ہونے کی اطلاع دی تو احاطے میں کچھ دیر کے لیے آہنی بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار نے ماحول کو شور سے جھنجھنا کر رکھ دیا۔ وہ سب مجھے اپنے گروہ میں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں وہ شور اٹھا کہ باہر سے بھی سنتری گھبرائے ہوئے انداز میں دوڑے چلے آئے کہ جانے اندر کیا طوفان آ گیا ہے۔

آخر پہرے داروں نے چیخ چیخ کر اور لاٹھیاں چلا کر ان سب کو خاموش کروایا۔ ورنہ ایسا لگ رہا تھا کہ آج وہ اپنی زنجیروں کی جھنکار سے ہی جیل کی دیواروں میں دراڑیں ڈال کر دم لیں گے۔

دن رینگتے رینگتے اب ٹھہر سے گئے تھے۔ ہم روز صبح اُٹھ کر سب سے پہلے آسمان کی طرف دیکھتے تھے جیسے اب وہاں سے ہمارے لئے کوئی من وسلویٰ اترنے والا ہو۔ زمین کے رزق کو تو ہم جیسے بھول ہی گئے تھے۔ لیکن آسمان پر کوئی بدلی یا بادل کا ٹکڑا نہ پا کر ہمارے چہرے لٹک جاتے تھے۔

موسم کے آثار کہیں سے بھی یہ نہیں بتا رہے تھے کہ اگلے دو چار دن میں ایسی طوفانی بارش بھی متوقع ہو سکتی ہے۔ ظہیر کے منصوبے کے مطابق جیل سے زندہ سلامت نکل جانے کی صورت میں ہم چھ میں سے ہر ایک کو کسی مختلف سمت میں دوڑنا تھا۔ جیل کے باہر ندی کے کنارے ظہیر کے ساتھیوں نے ہم سب کے لیے نئے لباس کا انتظام کرنا تھا اور ہم سب کو جیل کی وردی سے چھٹکارا پانے کے بعد مشرق، مغرب شمال جنوب میں پھیل جانا تھا۔

ظہیر مشرق میں سڑک کی طرف، بخت خان مغرب میں ندی کی جانب، بگھا شمالی پہاڑ کی سمت اور کندن مسیح کو جنوب میں جنگل کی طرف نکلنا تھا۔ میرے اور سنتوش کے حصے میں شمال مشرق اور جنوب مغرب آئے۔ شمال مشرق کی طرف وہ ویران ریلوے اسٹیشن تھا جہاں سے آدھی رات کو مال گاڑی گزرتی تھی اور جنوب مغرب میں جیل سے پرے کی آبادی اور پھر 40 چالیس پچاس میل دور بڑا شہر واقع تھا۔

یہ ساری سمتیں ایک خفیہ قرعہ اندازی کے نتیجے میں ہمارے حصے میں آئی تھیں جو دوسری طرف کی کال کوٹھڑیوں میں میرے آنے سے پہلے ہو چکی تھی۔ میرے حصے میں چھٹی سمت آئی جو کرم داد کے زندہ ہونے کی صورت میں اُسے ملنی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے پھر ایسے محسوس ہوا جیسے کرم داد اور مہرو کی نم آنکھیں مجھے کال کوٹھڑی کی دیوار کے اندر سے لگاتار گھور رہی ہیں۔ جانے کیا التجا بھری تھی ان اداس آنکھوں میں.....؟

آخر 17 اکتوبر کی صبح بھی آ گئی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس رات سو نہیں پایا اور صبح کی روشنی ہوتے ہی ہم سب نے اپنے رزق کی تلاش میں آسمان پر آنکھیں گاڑھ دیں۔ گہرا نیلا آسمان، جس میں ہمیں دور دور تک کہیں بھی سفید رنگ کی آمیزش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جانے قدرت کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ چمکتا سورج ہماری بے بسی پر کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

دن ڈھلا اور شام چار بجے ہمیں حسب معمول صحن میں ٹہلنے کے لیے نکالا گیا تو ان سب کے چہرے تنے ہوئے تھے اور وہ غصے میں زنجیریں جھنکا کر ظہیر سے سوال پوچھتے رہے لیکن ظہیر کے سپاٹ چہرے پر اُن کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

موسم سے بھلا کون لڑ سکتا ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ نیلا رنگ آنکھوں کو چبھنے لگا تھا۔ ہم سب کے دلوں کو اس وقت بس ایک ہی خدشہ ڈس رہا تھا کہ کہیں جیل سے باہر موجود ظہیر کی ٹیم سے موسم کی ٹھیک پیشگوئی جاننے میں کوئی غلطی نہ ہو گئی ہو۔ حالانکہ آج کل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ ہفتوں پہلے آنے والے موسم کے تغیر کا پتہ لگانا بچوں کا کھیل بن چکا تھا، لیکن پھر بھی کون جانے موسم کے تیور کب بدل جائیں۔

ہمیں ساڑھے چار بجے واپس ہماری کوٹھڑیوں میں پہنچا دیا گیا اور پہرے پر معمور سنتری جس وقت میری

بیڑیاں کھول رہا تھا ٹھیک اسی وقت کہیں دور سے بادل گرجنے کی آواز سنائی دی۔ ہماری ٹیم میں سے دوسرے برآمدے کی جانب سے کوئی زور سے چیخا ''حق.....''

گھنٹے بھر میں ہی سارا آسمان کالے گھنے بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور تیز طوفانی ہواؤں کے ساتھ ہی کہیں دور بجلی کی گرج چمک سنائی دینے لگی اور پھر اچانک ہی تیز بوچھاڑ کے ساتھ پانی کے بہت سے آوارہ چھینٹے میری کھولی کے چھوٹے سے روشن دان کی جالی سے اندر لپکے اور میرے چہرے کو بھگو گئے۔

بہت زمانے بعد ایسی بارش برسی تھی جو میرے صحن کو اندر سے بھگو رہی تھی..... ورنہ صرف تن گیلا کرنے والی جانے کتنی برساتیں مجھ پر بیت چکی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ہی سزائے موت کے قیدیوں کا احاطہ جل تھل ہوگیا۔ برآمدے میں ٹنی ٹین کی چھت پر بوندوں کا جلترنگ بجنے لگا، سامنے والے برآمدے سے بگھے نے نعرہ لگایا۔ ''واہو گُرو جی، واخالصہ، وہاہے گُرو جی دی فتح.....''

مغرب سے پہلے ہی برآمدے اور میری کوٹھڑی کی چھت ٹپکنے لگی تھی۔ ہم سب دم سادھے اپنی اپنی کھولی کی سلاخوں سے جڑے باہر برستے مینہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے یہ ہماری زندگی کی پہلی بارش ہو۔ ابھی شام کا اندھیرا پوری طرح چھایا نہیں تھا کہ اچانک عام قیدیوں کی بیرکس کی طرف سے پہلے کچھ ہلکے اور پھر گہرے دھویں کے بادل فضا میں بلند ہوتے نظر آئے اور پھر اچانک ہی چیخ و پکار مچ گئی۔

''آگ لگ گئی..... آگ..... بچاؤ.....''

میرے جسم میں خون تیزی سے میری کنپٹیوں کی طرف دوڑنے لگا۔ یوگی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ہمارے پہرے پر اوپر چھت پر کھڑے ایک محافظ نے چیخ کر دوسری برجی والے گارڈ سے پوچھا 'کیا ہوا منظورے.....؟''

''بیرکس میں آگ بھڑک گئی ہے، تین بیرکس جل رہی ہیں..... قیدیوں کو نکال رہے ہیں یار..... اللہ خیر کرے.....''

یوگی نے جیل میں اتنے ساتھی بنا لیے تھے کہ بیک وقت ان لوگوں نے تین جگہ آگ بھڑکا دی تھی۔ برستی بوچھاڑ میں دوسری جانب سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر اچانک ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ ایسا لگا جیسے کوئی زلزلہ آگیا ہو، جیل کے در و دیوار لرز سے گئے۔

اوپر کوئی چلایا ''یہ کیا ہوا..... یہ تو ندی کی طرف کوئی دھماکہ ہوا ہے.....'' بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں جیل کی چھت پر گونجیں اور مختلف لوگوں کی چلاتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔

''ندی کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ جلدی کرو..... پانی اسی طرف آرہا ہے.....'' ظہیر کے منصوبے کے مطابق جیل کا معمول خلاف معمول میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا تھا گویا حادثہ ہونے کو تھا۔ اور پھر اچانک جیل کے باہر شدید فائرنگ اور دھماکوں کی آواز نے ماحول کو لرزا دیا۔ باہر کسی برآمدے میں بخت خان کی چیخ گونجی..... ''حق ہے.....'' اور پھر جیل کی بجلی بند ہوگئی یا شاید اڑا دی گئی۔

فائرنگ، گارڈز کے چلانے کی آوازیں، بھاگتے قدم، برستی بارش میں آتے جاتے سپاہیوں کے ہاتھوں

میں جلتی ٹارچوں کی جگنو جیسی لرزتی روشنیاں۔ اور پھر یوں لگا جیسے بہت سے جنگلی بھینسوں کا ایک جنگلی ریوڑ تیزی سے دوڑتا ہوا آ کر جیل کے پچھلے پھانسی گھاٹ والے احاطے سے پوری قوت سے ٹکرایا ہو۔

تبھی اوپر کھڑا کوئی محافظ زور سے چلایا ''سیلاب کے پانی نے احاطے کی بیرونی دیوار میں شگاف ڈال دیا ہے، جیلر صاحب کو اطلاع دو جلدی.....''

باہر خطرے کے سائرن بجنا شروع ہو چکے تھے اور جیل میں ایک قیامت صغریٰ کا سماں تھا اور پھر پانی تیزی سے ہماری کوٹھڑیوں کے اندر داخل ہونا شروع ہو گیا اور ہم سب نے طے شدہ منصوبے کے تحت شور کر کے آسمان سر پر اٹھالیا۔ جیل کے عملے کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ جلتی آگ کو بجھائیں یا قیدیوں کی بیرکوں میں ٹھاٹھیں مارتے پانی کو روکنے کی فکر کریں۔ اوپر سے باہر مسلسل فائرنگ اور بجلی کی بندش۔ اچانک ہمیں بہت سے محافظوں کے دوڑ کر سزائے موت کے احاطے میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔

منصوبے کا آخری مرحلہ آ پہنچا تھا۔ محافظوں کے پاس ہمیں بیڑیاں ڈالنے اور ڈنڈا ڈولی کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ جلدی میں ساری کال کوٹھڑیاں کھولی گئیں اور اندھیرے میں ہی ہتھکڑیاں پہنا کر ایک قطار بنا کر ہمیں ایک جانب ہانک دیا گیا۔

تبھی میری نظر برساتی اوڑھے ڈیڑھ حوالدار پر پڑی جس نے کسی اندھیری راہداری میں ایک لمحے کے لیے اپنی ٹارچ جلائی اور بند کر دی۔ یہ بگھے اور بخت خاں کے لیے سگنل تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے آپس میں بھڑ گئے۔ اندھیرے میں سبھی قیدی گتھم گتھا ہو گئے۔ محافظ زور سے چلائے۔ لیکن اندھیرے میں بگھے اور بخت خان نے دو تین محافظوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ باقی ماندہ گارڈز نے بوکھلا کر اپنی بندوقیں نشانہ لینے کے لیے سیدھی کیں اور گالی دے کر ایک ہوائی فائر کیا۔

جانو زور سے چلایا ''گولی مت چلانا صاحب ہمارے اپنے بندے بھی ہیں درمیان میں۔'' اندھیرے میں کوئی زور سے چلایا ''ہوشیار۔ جیلر صاحب نے سارے گارڈز کو گیٹ کی برجی کا گھیرا ڈالنے کا کہا ہے'' باہر قیدیوں نے بغاوت کر دی ہے..... جلدی کرو..... سب پہنچو..... شیرو رحیم، شبیر، مختار..... کہاں مر گئے ہو سارے..... بیرونی دیوار پر پھر گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔

جیل کے محافظ بھی اوپر برجیوں سے فائر کر رہے تھے مگر گھپ اندھیرے میں ان جانا دشمن انہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں نیچے برستی بارش میں زمین پر گرے کیچڑ میں لت پت بگھے، بخت خان اور گارڈز کے درمیان جنگ جاری تھی اور اندھیرے میں پہچاننا مشکل تھا کہ ان میں سے کون قیدی ہے اور کون محافظ۔

ایک چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ دوسرے گارڈز بھی گھبرا کر اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے آگے بڑھے۔ ایک لمحے کو ان کا دھیان بٹا تو اچانک میری ہتھکڑی پر ظہیر کا ہاتھ پڑا اور وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے راہداری میں ایک جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے میں نے کندن اور سنتوش کو بھی دوسری سمت بھاگتے دیکھا۔

اندھیرے میں آسمانی بجلی کا ایک کوندا لپکا۔ ظہیر بھاگتے ہوئے زور زور سے اپنے قدم گن رہا تھا۔ 32,33,34۔ ''پچاس قدم بعد دائیں.....'' پہلے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن میں نے اندھیرے میں ظہیر کے ہیولے کو

دائیں طرف مڑتے دیکھا تو پیچھے بھاگتے ہوئے میں بھی مڑ گیا.....

70 قدم بعد بائیں..... تیز..... ہمارے پاس وقت نہیں ہے زیادہ....." ہم دونوں دیوانہ وار دوڑ رہے تھے۔ ظہیر نے جیل کا نقشہ گھول کر پی رکھا تھا۔ اور اسی دن کے لئے اس نے تمام برجیوں اور گارڈز کی تفصیلات اور اوقات ازبر کر رکھی تھیں۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے ایک نسبتاً کھلے میدان میں آ نکلے۔ ظہیر چلایا "ہم پندرہ 15 منٹ لیٹ ہیں۔ سرچ لائٹ سے بچنا" اتنے میں دور اوپر گلی کسی گھومتی ہوئی سرچ لائٹ کا دائرہ ہم پر روشنی ڈالتا گزر گیا۔

ظہیر کی وقت کی گنتی بالکل صحیح تھی، ٹھیک اسی وقت اوپر دیوار سے کوئی چلایا..... "خبردار..... کون ہو تم..... رک جاؤ....." ظہیر چلایا "بھاگتے رہو....." اور اگلے ہی لمحے گولی کی آواز فضا میں گونجی۔

میرے کان میں ایک سائیں کی سی آواز آئی جیسے زن سے کوئی تیز رفتار بلٹ ٹرین گزری ہو اور تبھی میری ناک نے جلتے بارود کی مہک کو محسوس کیا۔ نشانچی کی گولی مجھے تقریباً چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اگر بارش کی تیز بوچھاڑ اور اندھیرا نہ ہوتا تو ضرور اس کا نشانہ میری پیشانی کے درمیان پیوست ہوتا۔ مجھے لگا میرے آس پاس ہی کہیں موت کی دیوی مسکائی اور اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "نہیں..... ابھی نہیں..... اور جب تک وہ وقت نہیں آ جاتا۔ میں خود تمہاری حفاظت کروں گی....."

ہم کیچڑ میں لت پت اندھیرے میں بھاگتے ہوئے ایک اور احاطے میں جا نکلے جہاں پچھلی طرف آگ کے شعلے کہیں دور آسمان کی طرف بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ ظہیر کی مہینوں کی محنت ہمارے کام آ رہی تھی، وہ جیل کے پیچیدہ راستوں کو اپنی گلی محلے کی طرح سر کر رہا تھا۔ احاطے کے درمیان میں ایک گول چوبارہ سا بنا ہوا تھا جسے اوپر سے سیمنٹ اور مٹی سے پاٹ دیا گیا تھا۔

قریب ہی کچھ کدالیں اور بیلچے پڑے ہوئے تھے ظہیر نے نعرہ لگایا "جیو ڈیڑھ حوالدار....." ظہیر نے کدال اٹھائی اور چوبارے کے درمیان ضرب لگائی۔ میں بھی اس کی دیکھا دیکھی کدال لیے شریک ہو گیا کچھ ہی لمحوں میں نیچے سے لوہے کی ایک چارخانوں والی جالی نکل آئی۔ ظہیر چلایا "جلدی کرو..... گارڈز آتے ہی ہوں گے۔ یہی وہ پرانا متروکہ کنواں ہے جو نیچے پرانی نکاسی کی لائن سے جڑا ہوا ہے۔" اتنے میں اندھیرے میں دور سے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر پہلے بگھا اور بخت خان اور دوسری جانب سے کندن اور سنتوش بھاگتے دکھائی دیئے۔ ظہیر نے زور سے سیٹی بجائی کہ ہم یہاں ہیں۔ وہ چاروں ہماری طرف لپکے اور ٹھیک اسی وقت ایک زوردار فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں نے سنتوش کو زمین پر گرتے دیکھا۔ بارش کے پانی میں سنتوش کا خون مل کر بہنے لگا۔

..........*

باب 8

"کیویں ساکو یاد نہ رہسی، تیڈے گھر دا راستہ
ڈوتے سارے جنگل آندین، ترے تے سارے دریا"

ظہیر نے بھی اُن سب کو کسی محبوبہ کے گھر کے رستے کی طرح جیل کا سارا نقشہ ازبر کرا دیا تھا اور وہ چاروں اس جیل کے جنگل اور دریا پار کرتے دو مختلف سمتوں سے اُس پرانے بند کنویں والے متروکہ احاطے میں پہنچ گئے تھے جہاں شاید کبھی قیدیوں کے لیے والی بال یا ایسے ہی کسی دوسرے کھیل کا میدان بنایا ہوگا۔

کیونکہ پرانے جال اور بانس بھی وہیں میدان میں بارش کے پانی میں تیرتے نظر آ رہے تھے۔ ظہیر کی سیٹی سن کر وہ چاروں بے تابی سے ہماری طرف لپکے اور تبھی دُور کسی اونچے برج سے کسی محافظ نے نشانہ لگایا۔ سناٹے میں گولی کی آواز آس پاس کے پہاڑوں سے ٹکرائی اور سنتوش کے سینے میں خون کا فوارہ سا نکلا۔ کندن نے چلا کر اُسے پکارا "اویار..... سنتوش....."

اُسی لمحے کوئی دُور اونچے برج سے چلایا "ایک کو پرانے کھیل والے بند میدان میں گرا دیا ہے میں نے....." کسی کو ادھر بھیجو جلدی ظہیر نے پھر سیٹی بجائی۔ اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا، سنتوش کے منہ سے آخری جملہ نکلا "جے سنتوشی ماں....." اور پھر اُس کی سانس تھم گئی۔

بخت خان اور بگھے نے لمحے بھر میں زور لگا کر متروکہ کنویں کی جالی کو اکھاڑ پھینکا۔ کندن سمیت سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ظہیر نے انہیں سہارا دیا۔

"سنتوش کی بس اتنی ہی لکھی تھی..... جلدی کرو..... وہ لوگ یہاں پہنچتے ہی ہوں گے..... اور اگر ہم یہاں دھر لیے گئے تو سنتوش کی قربانی رائیگاں چلی جائے گی..... چلو..... شاباش....." ظہیر نے ہدایات دیں۔

وہ سب ایک ایک کر کے نیچے کودتے گئے، میرا نمبر آخری تھا۔ میری نظر کنویں میں اُترتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بے جان پڑے ہوئے سنتوش کی طرف اُٹھی تو مجھے لگا موت اس کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھی ہے اور اُسے تھپکتے ہوئے کہہ رہی ہے..... "تمہاری اور میری ملاقات یہاں طے تھی..... پھانسی گھاٹ کی سُولی پر نہیں..... خوش آمدید پیارے....."

برسوں سے بند کنویں میں گھٹن، حبس اور سیلن کی بُو تھی۔ ظہیر نے اُترتے ہی چلا کر سب کو حکم دیا "دائیں

جانب..... دوڑتے جاؤ.....'' اسی کنویں کے نیچے لوہے کا وہ قد آدم دیوہیکل پرانا اور زنگ زدہ پائپ تھا جو کبھی جیل کی نکاسی کی واحد لائن ہوا کرتی تھی۔ ہم اندھیرے میں تیزی سے ٹامک ٹوئیاں مارتے دوڑتے لڑکھڑا کر گرے تو ظہیر نے اپنے کرتے کی جیب سے چھوٹی سی بیٹری والی ٹارچ نکال لی جو جانے کب سے اس نے چھپا رکھی تھی۔ ہم سب ظہیر کے پیچھے بھاگتے رہے، اچانک پائپ میں سے عجیب سی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ جیسے دُور کہیں سیٹیاں سی بج رہی ہوں شاید جیل کے محافظ ہمارے تعاقب میں آپہنچے تھے اور پھر تیز ہوا کے ساتھ بانسری کی پھونک جیسے تیز سرسراتی ہوئی آواز گونجنے لگی اور پائپ لرزنے لگا، ہم سب گھبرا کر رک گئے۔

ظہیر نے پائپ کی دیوار سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔

''ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لو.....'' ظہیر نے چلا کر کہا ''بہت بڑا پانی کا ریلا آرہا ہے.....''

ہمارے ہوش اُڑ گئے، پیچھے جیل کے پہرے دار پائپ میں اُتر چکے تھے اور سامنے سے سیلابی پانی کا ریلہ تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید ندی کا بند ٹوٹنے کی وجہ سے پانی اس پرانی نکاس کی لائن میں بھی داخل ہوگیا تھا، ایسے لگا جیسے بہت سے وحشی جنگلی گھوڑے ہماری طرف دوڑتے ہوئے آرہے ہیں۔

ہم پانچوں نے اپنی ہتھکڑیوں والے ہاتھ ایک دوسرے کی ہتھکڑیوں میں اٹکا کر سختی سے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ پانی کے ریلے کے ساتھ ہی ایک بڑی سی لوہے کی ڈھکن نما جالی تیزی سے لڑھکتی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے ہمارے قریب سے گزری اگر ہم سب ہوشیار نہ ہوتے تو اتنے بڑے لوہے کے اوزار کی ایک ہی ضرب ہمیں شدید زخمی کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ ہم نے خود کو پائپ کی دیوار کے ساتھ تقریباً چپکا لیا تھا لیکن پھر بھی کھلے سریئے کا ایک کونا بخت خان کے ماتھے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔

بخت خان کے سر سے نکلتی خون کی پھوار نے کندن کی قمیص رنگین کر دی۔ لوہے کا دیوہیکل ڈھکن آگے جاکے پائپ کے ایک تنگ حصے میں اٹک گیا جس سے راستہ تقریباً بند ہوگیا لیکن فراٹے مارتا ندی کے ریلے کا پانی جس تیزی سے پائپ میں جمع ہو رہا تھا اُس سے یہی لگتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں ہم مکمل ڈوب جائیں گے۔

ظہیر زور سے چلایا'' جلدی آگے بڑھو..... یہ پانی کا ریلا آگے چل کر پائپ کے آخری سرے سے ٹکرائے گا اور دوگنی قوت سے واپس پلٹے گا..... شاباش..... بڑھتے رہو.....'' بخت خان کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بگھا اور کندن اُسے سہارا دیئے پانی میں آگے بڑھتے گئے۔ لیکن پائپ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک پائپ میں دور کہیں گارڈز کے چلانے اور فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ ظہیر نے پلٹ کر دیکھا، پانی ہماری کمر سے اوپر چڑھ چکا تھا'' لگتا ہے بڑی جالی نے اُن کا راستہ روک لیا ہے لیکن واپس پلٹنے والے پانی کا راستہ کوئی روک نہیں پائے گا..... ہمت کرو..... منزل بہت قریب ہے.....''

لیکن منزلیں اگر اتنی آسانی سے قریب آنے لگتیں تو پھر انہیں ''منزل'' کون کہتا.....؟ ہمارے بس میں صرف ''راستے'' ہوتے ہیں۔ ''منزلیں'' تو اپنی راہ خود چنتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ وہ راہ ہمارے راستے سے بھی جڑی ہوں۔

یکا یک پیچھے سے کچھ لوگوں کی ایک دوسرے کو خبردار کرنے کی مدھم سی آوازیں اُبھریں اور پھر کسی اژدھے کی طرح لہراتا، بل کھاتا، چنگھاڑتا ایک بڑا ریلہ پچھلی سمت سے پلٹ کر ہماری طرف لپکا، ہمارے قدم اُکھڑ گئے اور پانی ہمیں تنکوں کی طرح بہا کر پائپ کی دیواروں سے پٹختا، شور مچاتا اس تیزی سے آگے بڑھا کہ ہمارے حواس ہی معطل ہو گئے۔ تبھی سامنے سے چاند کی روشنی میں برستی بارش کی بوندیں دکھائی دیں اور ہم پانچوں پائپ کے باہر نکلتے کھلے حصے سے تقریباً اُڑتے ہوئے یوں باہر کھلی ندی کے بہتے پانی میں آ کر گرے جیسے توپ کے کھلے دھانے سے گولہ نکل کر کہیں دور جا گرتا ہے۔

ندی کے پانی نے ہمیں مزید پٹخنیاں دیں اور ایک تیز ریلے نے مختلف سمتوں میں ہمارے لڑھکتے گھائل جسم کناروں پر پٹخ دیئے۔ کچھ دیر ہم سب وہیں بے سدھ پڑے گہرے گہرے سانس لیتے رہے، ہماری حالت کچھ ایسی تھی جیسے چند بوسیدہ کپڑوں کو کسی نئی اور تیز واشنگ مشین میں ڈال کر پوری رفتار سے مشین چلا دی گئی ہو اور پھر نچوڑ کر انہی کپڑوں کو الگنی پر الگ الگ لٹکا دیا گیا ہو۔

پہلے ظہیر نے کراہ کر کروٹ بدلی اور اندھیرے میں سمت کا اندازہ لگا کر تین مرتبہ مخصوص انداز میں چھوٹی چھوٹی سیٹیاں بجائیں۔ کچھ دیر سناٹا سا طاری رہا۔ ظہیر نے پھر سیٹی بھائی۔ اُسی لمحے کہیں دور سے ویسی ہی سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اور چند جگنو سے بارش میں چمکتے ہوئے نظر آئے۔ شاید ان کے ہاتھ میں جلتی بجھتی ٹارچیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ظہیر کے ساتھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چند تھیلے تھے، کچھ ہی دیر میں ہمارے ہاتھ ہتھکڑیوں سے آزاد ہو چکے تھے۔

ایک بڑے سے لوہے کے کٹر نے آہنی چوڑیوں کو کانچ کی طرح ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ وہ ہمارے لئے چھ جوڑے کپڑے اور نئے جوتے بھی لے کر آئے تھے، مگر ہماری ضرورت اب پانچ کی تھی۔ چھٹا سنتوش دُنیا کی ہر ضرورت سے آزاد ہو چکا تھا۔ ظہیر نے ہم سب کی وردیاں اور ہتھکڑیاں پھینکنے کے بجائے ایک تھیلے میں جمع کر لیں ہمارے جیل والے سلیپر تو پہلے ہی پانی کے ریلے میں بہہ چکے تھے۔ کپڑے اور جوتے اندازے کے ناپ سے لائے گئے تھے لیکن اس وقت یہی غنیمت تھے۔

ظہیر نے ایک نمبر دہرایا "اسے تم سب اچھی طرح رٹ لو۔ یہ میرا نمبر رہے گا، لیکن شدید ضرورت کی صورت میں ہی رابطہ کرنا، اور ایک ضروری بات، اگلے تین چار مہینوں تک اپنے گھروں کا ہرگز رُخ نہ کرنا۔ یہ لوگ سب سے پہلے وہیں چھاپہ ماریں گے۔ اگر زندگی رہی تو ہم دوبارہ پھر ملیں گے۔ تب تک کے لیے الوداع ساتھیو....."

کہیں دور اندھیرے میں بجلی چمکی اور بادل چنگھاڑے۔ ہم سب تاریکی میں کھڑے ایک دوسرے کو شاید آخری بار دیکھ رہے تھے۔

پھر سب سے پہلے بگھے نے آگے بڑھ کر ظہیر کو گلے لگا لیا۔ "جیوندا رے جوانا..... تیری بڑی یاد آوے گی..... واہے گرو دی سوں....." پھر ہم سبھی ایک دوسرے سے گلے ملے، رشتے صرف خون کے نہیں ہوا کرتے۔ جن کے لئے خون بہایا جائے، وہی اصل خونی رشتے ہوتے ہیں، بخت خان کی مرحم پٹی کے بعد بھی وہ بے حد نڈھال لگ رہا تھا، کندن نے اسے پیشکش کی کہ وہ اس کو ساتھ لیے چلے گا۔ مگر بخت خان نے انکار کر دیا۔ ظہیر نے ہم سب کو اپنے

ساتھیوں کے ہاتھ سے ایک ایک موٹی بڑے نوٹوں کی گڈی تھمائی "یہ تم لوگوں کو آگے کام آئے گی..... اب چلنے کی کرو.....

کچھ گھنٹوں کے اندر پولیس اس سارے علاقے کی ناکہ بندی کر دے گی۔ ہم سب کو اپنی اپنی سمت روانہ ہونا ہوگا۔ میں بھی اکیلا جنگل کی طرف سے آگے بڑھوں گا۔ میرے ساتھی پکی سڑک سے جائیں گے لیکن ہم میں سے کوئی سڑک استعمال نہیں کرے گا۔ پہرے داروں کے پہرے سب سے پہلے پختہ سڑکوں پر ہی لگتے ہیں..... ہم جتنا زیادہ ویرانوں میں اور ایک دوسرے سے دور رہ کر دوڑیں گے اتنا ہی ہمارے بچنے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔

میرے ساتھی آج رات آرام سے انہیں اپنے پیچھے لگا کر اُلجھائے رکھیں گے، وہ یقیناً سمجھیں گے کہ ہم اپنے مددگاروں کے ساتھ کسی گاڑی میں فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور میرے ساتھی انہیں تاثر بھی یہی دیں گے ناکے توڑ کر بھی اور رفتار کی آخری حد تک جا کر بھی۔ لیکن جب تک یہ لوگ کسی ناکے پر دھر نہیں لیے جاتے یا پولیس کو بھتہ دے کر نکل نہیں جاتے، وہ اُنہی کے پیچھے لگے رہیں گے۔ اور یہی وقت ہوگا ہمارے لیے صبح سے پہلے کوئی محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈ کر دن بھر وہاں ستانے کا..... کوشش کرنا کہ دن کی روشنی میں کم سے کم سفر کرو۔ چلو پھر سب کو الوداع....."

ہم سب پلٹتے پلٹتے ایک لمحے کو پھر رکے اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کسی کمان سے چلائے گئے اندھے تیروں کی طرح چھ سمتوں میں بڑھ گئے، تیز بارش، اندھیرا، کیچڑ، پتھریلا راستہ اور جنگل..... قدم قدم پر ٹھوکریں اور دربدری..... میرا جیون بھی تو اس برستی رات کی طرح تھا۔ میں بھاگتا رہا۔ کبھی ایسی ہی دوڑ مجھے جبروت کے صحرا میں دوڑنی پڑی تھی۔ صرف وقت اور مقام بدل گیا تھا۔

اچانک بجلی کڑکی اور مجھے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں دو اسٹیل کی پٹڑیاں چمکتی نظر آئیں اور دور کہیں وہی مانوس سی سیٹی گونجی یہ مال گاڑی کے گزرنے کا وقت تھا، میں نے یہ سیٹی کتنے سال بندیر کوں اور کال کوٹھڑیوں میں گھٹ گھٹ کر سنی تھی۔ آج وہی مال گاڑی کسی پرانے دوست کی طرح بانہیں پھیلائے میری طرف دوڑی چلی آ رہی تھی۔ میری رفتار دوگنی ہوگئی اور میں چند لمحوں میں پٹڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

مال گاڑی کے آخر میں وہ چھوٹا سا بالکونی نما کھلا حصہ تھا جسے عام فہم میں تانگہ بوگی کہتے ہیں۔ میں نے لگاتار بھاگتے ہوئے بوگی کی ریلنگ پر ہاتھ ڈالا اور تیسری کوشش ہی میں مال گاڑی پہ سوار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا سانس دم نکلنے کی حد تک بپھرا اور پھولا ہوا تھا، مجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ کھلے حصے سے اُٹھ کر اندر جانے کا راستہ ڈھونڈوں۔

میں وہیں لیٹا اپنے سینے میں چلتی سانسوں کی ڈھونکنی کو معمول پر لانے کی کوشش کرتا رہا اور جانے کتنی دیر گزر گئی۔ آسمان نے آج شاید ایک ہی بار پورا برس جانے کی ٹھان لی تھی۔ بادل زور سے گرجے اور مجھے دور ویرانے میں کہیں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، گہرے سناٹے میں کچھ ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی اور پھر بجلی چمکی تو لمحہ بھر کے لیے سارا منظر واضح ہوگیا۔

نڈھال اور لڑکھڑاتا بخت خان دوڑا چلا آ رہا تھا اچانک فضا میں کچھ خونخوار کتوں کے بھونکنے کی آواز گونجی۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب یہ مال گاڑی چکر کاٹتی ہوئی اسی طرف آنکلی تھی جہاں بخت خاں کی سمت تھی۔ واقعی دنیا گول ہے اور یہ گولائی ہمیں بار بار کسی دائرے کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھینچتی رہتی ہے۔

بخت خان سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے پہلے ہی بہت نڈھال تھا اور شاید وہ اپنی کچھ آخری بچی ہوئی سانسیں جمع کر کے یہ جان کی بازی کھیل رہا تھا۔ جیل کے محافظ تو اس سے کافی دور تھے لیکن وہ شکاری کتے اندھیرے میں اپنے شکار کی بُو پر بجلی کی سی تیزی سے لپک رہے تھے اور مجھے دوڑتی ٹرین سے یہ منظر صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بخت خان زیادہ دیر اس آفت سے خود کو نہیں بچا پائے گا۔ میں نے چلا کر بخت خان کو اپنی جانب متوجہ کیا ''بخت خان..... اِدھر آؤ.....''

بخت خان نے چونک کر بھاگتی گاڑی سے مجھے لیٹ کر ہاتھ ہوا میں لٹکائے دیکھا اور وہ ایک نئے عزم سے میری طرف لپکا۔ یہ اُمید بھی کیسے کیسے کرشمے دکھاتی ہے۔ مرتے دم توڑتے کو پھر سے زندہ کر دیتی ہے۔ اگر زندگی میں امید نامی اس جذبے کی آمیزش نہ ہوتی تو ہمارے شہر کم اور قبرستان زیادہ آباد ہوتے۔

بخت خان کی اُمید بھی مجھے دیکھ کر جاگ چکی تھی۔ وہ سرپٹ میری طرف بھاگا، مگر ٹھوکر کھا کر زمین پر گرا، میں نے خود کو تقریباً پورا ہوا میں معلق کر کے ہاتھ مزید آگے پھیلا دیا۔ ایک ذرا سا بھی جھٹکا مجھے بوگی سے اٹھا کر نیچے لوہے کی پٹڑیوں پر پٹخ سکتا تھا۔ کتے غراتے اور بھونکتے ہوئے بخت خان کی طرف لپک رہے تھے تاکہ اس کا نرخرہ چبا کر اپنے مالکوں کو پیش کر سکیں۔

''بخت خان..... ہمت کرو.....'' میں چلایا۔

بخت اٹھ کر پھر بھاگا، فضا میں گولی کی آواز گونجی اور گولی کسی بوگی کے دروازے سے ٹکرائی..... ''ٹھن'' کی آواز آئی بخت خان چیخا ''تم اندر جاؤ..... مارا جائے گا.....'' ''میں نے ہاتھ آگے بڑھائے رکھا، تھوڑی سی ہمت کرو۔ میں تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔'' بخت خان نے آخری بار اپنے آپ کو بھاگتے ہوئے زور سے آگے دھکیلا اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی گرفت میں آ گیا۔ میں نے پل بھر میں خود کو سمیٹ کر اپنی پوری قوت سے اسے اوپر کھینچ لیا اور بخت خان تانگہ بوگی کے فرش پر ایسے آ کر گرا جیسے کوئی پرانا مضبوط شہتیر ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔

مال گاڑی کی رفتار بڑھتی رہی اور ہم وہیں کھلے آسمان تلے پڑے رہے۔ بخت خان کے سر سے بہتا خون پھر سے جاری ہو چکا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کی پٹی بنائی اور پھر سے اس کا سر باندھ دیا۔ بخت کو شدید بخار تھا اور اس کا جسم تپ رہا تھا۔ گاڑی ویرانے میں دوڑتی رہی اور بنا کسی اسٹیشن پر رکے صبح تڑکے کے آثار نمودار ہونے لگے۔

آسمان پر بادل کھلنا شروع ہو گئے تھے اس لیے سویرے کا ملگجا سا اُجالا زیادہ تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ اچانک گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی، بخت خان ابھی تک بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ میں نے دور ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو بخت خان کو جھنجھوڑا ''اٹھو..... بخت خان..... ہمت کرو..... ہمیں یہیں اُترنا ہوگا.....'' بخت خان کراہا۔

''تم اتر جاؤ یارا..... ہمارے ساتھ خود کو خوار مت کرو..... ورنہ تم بھی مارا جائے گا..... جاؤ..... خدائے پہ

امان....." لیکن میں نے بخت کی سنی اَن سنی کردی۔ انجن پلیٹ فارم پر داخل ہوا تو میں بخت خان کو شانوں سے تھامے پچھلی طرف پلیٹ فارم سے کافی فاصلے پر اُتر گیا۔ دور کہیں گاؤں سے فجر کی اذانیں سنائی دے رہی تھیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں نے اطمینان کیا کہ کوئی پلیٹ فارم پر موجود ہمیں جاتے دیکھ نہ لے۔

مگر پلیٹ فارم ویران پڑا تھا۔ انجن کے قریب ایک دو ریلوے اہلکار شاید ڈرائیور کے ساتھ کھڑے کچھ انتظامی معاملات پر بات کر رہے تھے۔ مگر پلیٹ فارم دُھند اور کہرے کی اتنی دبیز تہہ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ان کا ہماری طرف متوجہ ہونا مشکل تھا۔

بخت خان کی حالت بگڑتی جارہی تھی اور مجھے روشنی ہونے سے پہلے بخت سمیت خود کو کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچانا لازمی تھا۔ اچانک بخت لڑکھڑایا اور میری نظر سامنے اسٹیشن کی تقریباً مٹی ہوئی سیمنٹ کی تختی پر لکھے نام پر پڑی۔ "سہارن پور" میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ نام تو میں یوگی سے کئی بار سن چکا تھا۔ یہی یوگی کا آبائی گاؤں تھا..... اور یہیں اُس نے اپنے استاد حکیم کی زیرِ نگرانی حکمت کا آغاز کیا تھا۔

میرے ذہن میں بیک وقت کئی کوندے سے لپکے، اُف..... کیا نام بتایا تھا یوگی نے اپنے حکیم استاد کا..... میں بار بار ذہن جھٹک کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میرے ذہن سے وہ نام بالکل ہی محو ہو چکا تھا۔ میں بخت خان کو لیے اسٹیشن کی پرلی طرف لگی لوہے کی ایک پھاٹک نما جالی کے قدرے کھلے حصے سے باہر نکل آیا جو شاید کاہل آنے جانے والوں نے اپنی سہولت کے لیے زور لگا کر اور سلاخوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر کے بنا رکھا تھا۔

دور کہیں آبادی کے آثار تو نظر آرہے تھے مگر سامنے جاتی کچی پگڈنڈی نما سڑک اور راستہ ابھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے بہت قریب کسی کی آواز سن کر اچھل سا پڑا "کدھر جاؤ گے باؤ جی..... کیا رات والی گاڑی سے اُترے ہو.....؟"

کوئی پکی عمر کا تانگے والا ہاتھ میں چھانٹا لیے میرے قریب کھڑا تھا۔ وہ دھند میں دور کھڑے اپنے تانگے سے چل کر مجھ تک کب پہنچا، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ "ہاں..... آ تو ہم رات کو ہی گئے تھے پیسنجر گاڑی سے..... مگر میرے ساتھی کی طبیعت بہت خراب تھی اس لئے اسٹیشن کے مسافر خانے میں ہی رکنا پڑا۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر یا حکیم کو جانتے ہو اس علاقے میں تو ہمیں لے چلو وہاں..... دوا لینی ہے۔"

تانگے والے نے پریشانی سے بخت خان کی طرف دیکھا "ڈاکٹر اِدھر کہاں ملے گا باؤ جی.....؟ بس دو چار حکیم اور پرانے وید ہیں۔ بولو تو ان میں سے کسی کے پاس لے چلوں۔ اپنا وید نتھو رام ہے..... حکیم صابر ہے اور حکیم یعقوب..... پر وہ اب مریض نہیں دیکھتا....." میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا.....

"ہاں..... حکیم یعقوب..... تم ہمیں وہیں لے چلو..... بڑی شہرت سنی ہے ہم نے اس کی۔" یوگی نے اپنے استاد کا یہی نام بتایا تھا۔

"مگر جی میں نے بتایا ناں..... حکیم یعقوب اب مریض نہیں دیکھتا..... بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور چڑچڑا بھی..... میں تو کہتا ہوں شاید سٹھیا گیا ہے بیچارہ..... کہو تو حکیم اُلفت کے پاس لے چلوں..... اسے تھوڑی بہت انگریزی دواؤں کی بھی سمجھ ہے....."

''نہیں..... تم ہمیں حکیم یعقوب کے پاس ہی لے چلو..... ہمیں آج ہی اگلی گاڑی سے واپس لوٹنا بھی ہے۔ اب اتنی دُور آئے ہیں تو حکیم صاحب سے مل لیں گے.....'' تانگے والے نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''جیسے آپ کی مرضی جناب..... پر 50 روپے ہوں گے اگر پورا تانگہ کرائیں گے..... ورنہ ایک سواری کا مزید انتظار کرنا پڑے گا.....''

''نہیں..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم چلو..... تمہیں پورا کرایہ مل جائے گا.....'' تانگے والا خوش ہوگیا۔

''چلو پھر..... سوبسم اللہ جی.....'' کچھ ہی دیر میں ہم دھند اور کہر میں ڈوبی سڑک پر روانہ تھے۔ فضا میں کافی خنکی تھی۔ صبح سویرے وہ دور بسا گاؤں کسی پینٹنگ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ صبح کی ملاحت بہت سی چیزوں کی کرخنگی کو کم کردیتی ہے۔ دھوپ میں یہی راستے اور درودیوار چنگھاڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہوں گے۔ کچھ ہی دیر میں ہم چند تنگ گلیاں اور چوبارے طے کرنے کے بعد ایک پرانے سے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود تانگے والے نے دروازے پر خود اُتر کر دستک دے ڈالی۔

تیسری دستک کے بعد اندر سے جھنجھلائی ہوئی ایک کرخت آواز سنائی دی ''کس کو موت آئی ہے اتنی صبح سویرے..... آتا ہوں.....'' باہر سے تانگے والا ہنسا۔

''میں ہوں علمو حکیم جی..... تمہارے پروہنے لے کر آیا ہوں..... اب تو زکام والی پڑیا مفت میں دو گے ناں مجھے.....'' اندر قدموں کی آواز آئی اور پھر موٹا سا چشمہ آنکھوں پہ لگائے ایک کمزور اور نحیف سے شخص نے دروازہ کھولا ''کسے لائے ہو.....؟ میں اب مریض نہیں دیکھتا..... تم نے بتایا نہیں انہیں.....''

علمو کی جگہ میں نے جواب دیا ''اس نے بتایا تھا۔ مگر میرے دوست کی حالت بہت خراب ہے۔ اور ہم گھر سے یہی نیت کرکے نکلے تھے کہ حکیم یعقوب سے ہی علاج کرانا ہے بزرگو.....'' حکیم نے سر سے پیر تک ہم دونوں کو غور سے دیکھا اور پھر کچھ مشکوک سے لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم لوگ.....'' میں نے جواب دینے سے پہلے علمو کو پچاس روپے دے کر فارغ کیا، وہ مُصر تھا کہ وہی ہمیں واپس اسٹیشن چھوڑ دے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے جان خلاصی کی..... حکیم غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ خاص طور پر جب میں نے تانگے والے کو ادائیگی کے لئے ایک بڑا نوٹ تھمایا جس کی ریزگاری واپس کرنے میں علمو کی جیب خالی ہوگئی۔ تانگے کے جانے کے بعد میں حکیم یعقوب کی طرف مڑا۔ حکیم نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''تمہیں یہاں کا پتہ کس نے دیا ہے.....'' میں نے چند لمحے حکیم کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر دھیرے سے کہا ''آپ کے شاگرد..... اسلم یوکی نے.....'' میری زبان سے اسلم یوکی کا نام سنتے ہی حکیم اُچھل پڑا اور اس کی نظر سیدھی میری کائیوں پر پڑے جھکڑیوں کے داغوں پر گئی اور وہ گھبرا کر بولا ''تم.....''

✻.....✻.....✻

باب 9

حکیم یعقوب کی جہان دیدہ نظر نے لمحے بھر میں ہماری کلائیوں پر پڑے ہتھکڑیوں کے سیاہ نشان دیکھ لیے اور وہ گھبرا کر بولا "تم..... کون ہو تم..... کیا جیل سے بھاگ کر آئے ہو....." بخت خان کے جسم میں تناؤ سا پیدا ہوا جیسے وہ حکیم یعقوب کو شور مچانے سے پہلے ہی دبوچ کر اس کا منہ بند کر دینے کا ارادہ کر بیٹھا ہو مگر میں نے دھیرے سے بخت خان کا ہاتھ دبا کر اُسے تحمل قائم رکھنے کا اشارہ کیا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم اندر بیٹھ کر بات کریں..... میرے ساتھی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے گہری چوٹ لگی ہے اور پہلے ہی کافی خون ضائع ہو چکا ہے....."

حکیم کے اندر کی حکمت نے جوش مارا اور وہ بخت خان کا زخم دیکھ کر پل بھر کے لیے اپنی فکر اور اندیشے بھلا بیٹھا "ٹھیک ہے..... اندر آ جاؤ....."

گھر کے چھوٹے سے صحن میں پیپل کا ایک پیڑ اور سامنے کھلا برآمدہ تھا۔ جہاں قطار میں تین کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ حکیم نے اپنی بیٹھک میں ہمیں بٹھایا اور جلدی سے بخت خان کے زخم کو کھول کر دیکھا اور چند دواؤں کا لیپ الماری سے نکال کر بخت خان کی تازہ پٹی کر دی۔

"زخم بہت گہرا ہے..... اور میرے پاس زیادہ دوائیں نہیں ہیں..... پٹی روزانہ بدلنی ہوگی مگر میں نے اپنا مطب بہت پہلے بند کر دیا تھا..... اب میں حکمت نہیں کرتا....." بخت خان کو میں نے ایک جانب پڑے پرانے صوفے پر لٹا دیا۔ حکیم اب بھی ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا.....

"تم نے بتایا نہیں..... کون ہو تم دونوں..... اور اس نانجار اسلم کو کیسے جانتے ہو....." وہ ہم اسلم کے جیل کے ساتھی ہیں..... قانون کی نظر میں مجرم ہیں۔ ہمیں کچھ روز کے لیے پناہ چاہیے۔ میں آپ کو کبھی زحمت نہ دیتا اگر بخت خان کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی..... اس کی طبیعت ذرا سنبھلتے ہی ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے....." حکیم یعقوب نے ایک لمبا سانس لیا۔

"مطلب میرا شک صحیح تھا۔ تم دونوں جیل توڑ کر آئے ہو....." میں چپ رہا، حکیم کے چہرے پر خوف سے زیادہ پشیمانی کی پرچھائیاں تھیں۔

"تمہیں تانگے والے نے دیکھ لیا ہے..... یہ گاؤں اتنا بڑا نہیں جہاں لوگ چہرے جلدی بھول جائیں..... جلد یا بدیر یہ بات پھیل جائے گی....." میں نے بخت خان کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے لیٹا لمبے لمبے سانس لے

رہا تھا۔

''ہم بات پھیلنے سے پہلے یہاں سے دور جا چکے ہوں گے..... آپ بس اسلم اور اپنے رشتے کی خاطر دو چار دن ہمیں یہاں پناہ دے دیں.....'' حکیم یعقوب کچھ دیر تک ہم دونوں کی طرف سوچ بھری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔ تب تک تم بھی کچھ آرام کر لو.....'' حکیم بیٹھک سے باہر جانے لگا، تبھی بخت خان نے پیچھے سے آواز دے کر روکا، بخت خان کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔

''حکیم صاحب..... گھر میں اور کون کون ہے ادھر.....؟'' حکیم چونکا۔

''کوئی نہیں..... اب تو اکیلا رہتا ہوں میں..... بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور بال بچے اپنے گھروں کے ہو چکے.....'' بخت خان نے آنکھیں کھولیں۔

''گھر میں کوئی ہتھیار ہے..... کوئی طمنچہ وغیرہ..... رائفل..... دونالی ٹائپ چیز پڑا ہے.....'' حکیم پریشانی سے بولا:

''ہاں..... پرانے وقتوں کا ایک ریوالور پڑا ہے..... اور چند گولیاں..... جنہیں چلانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی..... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' بخت کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔

''ضرورت پڑ سکتا ہے حکیم صیب..... تم طمنچہ ہمارے حوالے کر دو.....'' حکیم کچھ ہچکچایا مگر پھر بنا کچھ کہے اس نے بیٹھک کی اندرونی دیوار میں بنی ایک پرانی لکڑی کی الماری کا تالہ کھولا اور اندر سے کچھ ٹٹول کر ایک پوٹلی سی باہر نکالی، کپڑے کی پوٹلی میں ایک پرانا امریکن ساختہ کولٹ ریوالور اور قریباً تیس پینتیس گولیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بخت خان نے کسی ماہر نشانے باز کی طرح ریوالور کی چرخی گھما کر اسے پانچ چھ مرتبہ جانچا اور پھر ریوالور کی پھرکی میں چھ گولیاں بھر لیں۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا:

''عبداللہ خاناں..... تم نے کبھی پستول چلایا ہے.....؟''

''نہیں..... کبھی ضرورت نہیں پڑی..... اور جو دو گولیاں میرے کھاتے میں ایف۔ آئی۔ آر میں درج ہیں..... وہ بھی کسی اور کے ہاتھ سے چلی تھیں.....''

بخت خان نے اطمینان سے کہا ''کوئی بات نہیں..... ہم تم کو سکھا دے گا.....'' اسی لمحے حکیم سلور کی ایک چینک میں ابلتی چائے، گرم پراٹھے اور ہاف فرائی انڈوں کا ناشتہ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اور پل بھر میں ہی میں اور بخت خان زمانے کی ہر فکر بھلا کر ناشتے میں ایسے مگن ہوئے جیسے ہم جیل سے بھاگے قیدی نہ ہوں، حکیم یعقوب کے گھر دعوت پر آئے کوئی خاص مہمان ہوں..... شاید دنیا میں انسان کی سب سے بڑی تحریک اور سب سے بڑی مجبوری دونوں ہی اس ایک لفظ میں پوشیدہ ہیں..... ''بھوک.....'' جیل کے لنگر سے کھاتے اور سالوں سے ایک ہی مستقل بدمزہ کھانا چکھتے شاید ہماری ذائقے کی حس مردہ ہو چکی تھی..... برسوں بعد ایک نیا ذائقہ چکھنے کو ملا تو جیسے ہماری ساری حسیات رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگیں۔

انسان اس نئے ذائقے کے پھیرے میں کیا کچھ نہیں کر جاتا، اس کی پہلی خطا سے لے کر آخری بربادی شاید

اس ذائقے کی مرہون منت ہے۔ معدہ بھرنے کے بعد غنودگی محسوس ہونے لگی مگر بخت خان نے مجھے ہوشیار کیا کہ ہم میں سے ایک کو ہر حال میں جاگنا ہوگا۔ شاید وہ حکیم یعقوب پر ابھی تک پورا بھروسہ نہیں کر پایا تھا۔ میں نے بخت خان کو سونے کا کہا اور خود اپنی آنکھوں سے نیند بھگانے کی ترکیبیں کرتا رہا۔ یہ نیند بھی کیسی عجیب دشمن ہے ہماری..... ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس مزاج رہتا ہے اس کا..... شام ڈھلنے سے پہلے حکیم نے بیٹھک میں جھانکا۔

''مجھے گھر سے باہر جانا ہوگا۔ کچھ راشن وغیرہ لینا ہے اور باہر کی خبر بھی رکھنی ہے..... میں آج پورا دن گھر سے نہیں نکلا..... یہ گلی محلے کے لیے خلاف معمول بات ہے.....'' بخت خان نے حکیم کی طرف دیکھا۔

''نہیں حکیم صیب..... اِس چار دیواری سے باہر جانا منع ہے..... ہمارا مجبوری سمجھو.....'' حکیم نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

''اس طرح تو لوگوں کو مزید شک ہو جائے گا..... اور گھر میں روزمرہ کی اشیاء کی بھی ضرورت ہے..... میں روز شام کو اسی وقت سودا سلف لینے گھر سے باہر جاتا ہوں..... کچھ پرانے دوستوں سے گپ شپ بھی ہو جاتی ہے، میں نہیں گیا تو وہ یہاں آ جائیں گے۔'' بخت خان کے سخت لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی صورت حکیم یعقوب کو گھر سے باہر جانے دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا، میں نے کچھ دیر صورتحال کو تولا اور پھر حکیم سے کہا:

''ٹھیک ہے..... آپ ہو آئیں بازار سے..... ہم آپ کے آنے کا انتظار کریں گے.....'' بخت خان نے پریشانی سے پہلو بدلا مگر میرے فیصلے کا اعلان سن کر چپ رہا۔ حکیم کے جانے کے بعد کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ صرف دیوار پر لگے پرانے گھڑیال کی ٹِک ٹِک اور دور کہیں کھیتوں میں چلتی بن چکی کی کوک کی آواز ماحول میں گونجتی رہی۔ جب حکیم یعقوب کو گھر سے نکلے دو گھنٹے سے بھی اوپر ہونے کو آئے تو بخت خان کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔

''تم نے اس کو اجازت دے کر غلطی کیا عبداللہ خاناں..... لگتا ہے پولیس کو لے کر ہی واپس لوٹے گا.....'' شک کا ناگ تو میرے ذہن میں بھی کلبلانے لگا تھا۔

ٹھیک اسی لمحے صحن کے دروازے کے باہر بہت سے لوگوں کی تیز آوازیں اور بھگدڑ جیسا شور مچا۔ بخت خان نے تڑپ کر ریوالور نکالا اور غیر ارادی طور پر اپنی بھری ہوئی گولیاں دوبارہ چیک کیں اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''دیکھا..... میں نے کہا تھا ناں کہ ایک اجنبی پر اتنا بھروسہ ٹھیک نہیں.....''

بخت خان نے لپک کر کمرے کے صحن میں نکلنے والی کھڑکی کھولی اور باہر صحن کے دروازے پر اپنا نشانہ جما دیا ''تم پچھلے دروازے سے نکل جاؤ عبداللہ..... ہم ان کو ادھری روکتا ہے.....'' آوازیں صحن کے دروازے کے باہر پہنچ چکی تھیں اور کسی نے زور زور سے صحن کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا جسے میں حکیم کے جانے کے بعد اندر سے بند کر چکا تھا۔

''نہیں..... اگر جائیں گے تو ہم دونوں جائیں گے.....'' ''ضد مت کرو..... ہم زیادہ تیز بھاگ نہیں سکتا..... دونوں مارا جائے گا.....'' میں نے بخت خان کی سنی ان سنی کر دی.....

''تم یہیں بیٹھو..... میں باہر دیکھتا ہوں.....'' میں بخت خان کا جواب سنے بغیر صحن میں نکل آیا۔ باہر والوں

کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے پلٹ کر کھڑکی کی اوٹ میں چھپے بخت خان کو دیکھا جس نے ریوالور کی لبلبی پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھا رکھا تھا اور اب اس کے ہتھیار کا کھٹکا ہوا میں بلند صرف ایک ہلکی سی جنبش کا منتظر تھا۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اپنے حواس یکجا کیے۔

''کون ہے.....'' باہر سے کسی کے دیہاتی لہجے میں بولنے کی آواز سنائی دی۔

''وہ طبی..... حکیم صاحب ہیں گھر پر..... ہم مریض لے کر آئے ہیں.....'' میں نے چند لمحے باہر ابھرنے والی سرگوشیوں کا جائزہ لیا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا، باہر چند دیہاتی ایک چارپائی پر کسی مریض کو ڈالے پریشان کھڑے تھے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔

''حکیم صاحب تو بازار گئے ہیں..... ہم ان کے مہمان ہیں.....'' اتنے میں پیچھے کہیں سے حکیم یعقوب کی آواز آئی۔

''اوے سلامے..... تو پھر اسے اٹھالایا..... کتنی بار کہا ہے میں نے کہ اپنے مریض کو شہر لے جا..... یہاں اس کا علاج ممکن نہیں ہے.....'' حکیم مجھے دروازے پر کھڑے دیکھ کر صورتحال سمجھ چکا تھا۔ تبھی اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا:

''اور ہاں..... احمد بیٹا..... میں نے بازار میں تانگے والے سے کہہ دیا ہے..... ابھی آتا ہی ہوگا..... تم لوگ تیاری کرلو..... رات والی گاڑی کی ٹکٹ کروادی ہے میں نے.....'' حکیم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ مریض کے رشتہ داروں کے سامنے اس نے یہ ظاہر کردیا تھا کہ ہم جو بھی تھے کچھ دیر میں وہاں سے رخصت ہونے والے تھے..... مریض کو اس نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے ایک پڑیا کھلائی اور ان لوگوں کو رخصت کردیا کیونکہ وہ اپنے مہمانوں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہونے کا عندیہ پہلے ہی دے چکا تھا یہی اس کے پرکنے کی نشانی تھی کیونکہ مریض کے ورثاء کے ذریعے یہ بات چھوٹے سے گاؤں میں جلد پھیل جانی تھی کہ حکیم کے مہمان رخصت ہورہے ہیں۔

میں نے اندر جا کر بخت خاں کو سب ٹھیک کا اشارہ کیا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب بھی معمول پر آگئے۔ حکیم نے اندر آکر ہمیں بتایا کہ جیل ٹوٹنے کی خبر ریڈیو کے ذریعے گاؤں کے بازار میں پھیل چکی ہے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ جلد یا بدیر پولیس اس علاقے کو چھاننے کے لئے یہاں آتی ہی ہوگی۔ اس سے پہلے گاؤں والوں کے سامنے ہمارا عام مہمانوں کی طرح حکیم کے گھر سے رخصت ہونا ضروری تھا تاکہ پولیس اگر کسی سے پوچھ گچھ کرے بھی تو کسی کو کوئی شک نہ ہو۔

حکیم یعقوب کے منصوبے کے مطابق کوئی دوسرا تانگے والا ہمیں رات آٹھ بجے لینے آگیا اور حکیم ہمارے ساتھ ہی ریلوے اسٹیشن کے لئے گھر سے نکل پڑا جیسے کوئی اپنے کسی عزیز مہمان کو ٹرین چڑھانے جاتا ہے۔ ہم نے اپنے چہرے ممکنہ حد تک چھپائے رکھے۔ بخت خان تو ویسے بھی بیماری کے بہانے منہ لپیٹے تانگے کی پچھلی سیٹ پر ڈھلک رہا اور میں اسے سنبھالنے کے بہانے اس پر جھکا بیٹھا رہا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی ہم نے ایک اندھیرے گوشے میں بچھا لکڑی کا سال خوردہ بینچ تلاش کیا۔ ٹرین چند لمحے کے لئے پلیٹ فارم پر رکی، تب تک حکیم یعقوب ہمارے انہی فرضی ناموں سے دو ٹکٹ خرید چکا تھا۔

ہم دونوں دور ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے جھانکتے ٹکٹ بابو کی نظروں کے سامنے سوار تو ہوئے مگر خاموشی سے دوسری طرف اندھیری پٹڑیوں پر اتر کر لمبے راستے سے اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آئے۔ جہاں دور اندھیرے میں حکیم یعقوب ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے وہیں کھیتوں سے باہر رات کے پوری طرح بھیگ جانے کا انتظار کیا اور پھر چپ چاپ خاموش پگڈنڈیوں پر چلتے کھیتوں کے راستے حکیم کے گھر کے عقب تک پہنچ گئے جہاں بیٹھک کا دروازہ پچھلی طرف کھلتا تھا۔ اور جسے حکیم نے پہلے ہی کھلا چھوڑ رکھا تھا۔

گھر میں داخل ہونے تک بخت خان کا بخار اتنی مشقت کے بعد پھر سے پوری طرح تازہ ہو چکا تھا۔ حکیم نے جلدی سے بخت خان کے لئے کوئی یخنی سی بنائی اور دوا دے کر بخت خاں کو آرام کرنے کا کہا۔ بخت خان نے غور سے حکیم یعقوب کی طرف دیکھا.....

''تم اچھا آدمی ہے حکیم صیب..... ہم کو معاف کردو۔ تم پر شک کیا.....'' حکیم نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ جاڑا آنے کو تھا لہٰذا گاؤں کی رات خنک ہو چکی تھی۔ میں وہیں زمین پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا رہا جہاں حکیم نے میرا بستر ڈال رکھا تھا۔ بخت خان جلد ہی سو گیا۔ حکیم نے کمرے میں جھانکا ''ابھی تک جاگ رہے ہو.....؟ سو جاؤ..... تم نے بھی بڑی بے آرامی کاٹی ہے.....''

میں نے حکیم کی طرف دیکھا ''آپ آرام کریں..... میرے مقدر میں شاید ابھی آرام نہیں ہے..... اور ہماری وجہ سے آپ کو زحمت اُٹھانا پڑ رہی ہے، میں اس کے لئے بہت شرمندہ ہوں.....'' حکیم کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔

''ایک بات پوچھوں.....؟ تم اپنی بول چال اور چہرے سے بھی..... قاتل تو نہیں لگتے..... میرا مطلب ہے آج بازار میں ہر طرف یہی بحث چل رہی تھی کہ جیل سے پانچ قاتل بھاگے ہیں جیل توڑ کر..... چھٹا وہیں مارا گیا..... کیا واقعی تمہارے ہاتھوں کوئی بندہ مارا گیا تھا.....؟'' میں نے حکیم یعقوب کو اس بھیانک رات کی ساری رُوداد من وعن سنا دی، حکیم چپ چاپ سنتا رہا۔

''جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تبھی مجھے ایسا لگا تھا کہ تم ایسا جرم نہیں کر سکتے۔ تقدیر بھی کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔ میں نے تم لوگوں کے یہاں سے جانے کا یہ سارا ڈرامہ اسی لئے کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں آنے والے دن تم دونوں کے لئے بہت سخت ہوں گے..... پولیس مفرور کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی۔ تم دونوں جس مال گاڑی پر بھاگے تھے اس کے راستے میں آنے والے ہر اسٹیشن اور بستی کی خاک چھانے گی اب پولیس.....''

حکیم کا دعویٰ بالکل سچ ثابت ہوا اور اگلی صبح ہی گاؤں میں دوسرے ضلعے کی پولیس پہنچ چکی تھی۔ گاؤں کے نمبردار کے ساتھ چوپال کے ڈیرے میں سبھی گاؤں کے معتبرین کو اکٹھا کر کے پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔ حکیم یعقوب کی حکمت کام کر گئی اور اس کے گھر آنے والے دو مہمانوں کا ذکر عام ہی رہا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ ہم اگلی رات وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ ہماری طرح کچھ اور لوگوں کے گھر بھی مہمان آئے یا گئے تھے۔ جو موجود تھے انہیں وہیں چوپال میں بلوا کر طریقے سے ان کی شناخت کر لی گئی اور پولیس اگلے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ مگر حکیم گھر آیا تو اس کے چہرے کی پریشانی بتا رہی تھی کہ معاملہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں ہے۔

''پولیس دوبارہ ضرور پلٹے گی..... کیونکہ اُنہیں آگے چل کر بھی کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوگی..... اور اس بار وہ لوگ گھر گھر تلاشی لینے سے باز نہیں آئیں گے.....''

بخت خان بولا'' ٹھیک ہے حکیم صیب..... پھر ہم لوگ بھی نکل جائے تو اچھا ہے..... آج رات.....''

''نہیں..... ابھی تمہارا زخم تازہ ہے..... اور پولیس کو بھی پانچ چھ دن تو لگ ہی جائیں گے پلٹنے میں..... یہ علاقہ بہت بڑا ہے..... فی الحال تمہارے لئے یہی پناہ گاہ بہتر ہے.....''

اس رات میں نے حکیم یعقوب کو اپنے جیل سے بھاگنے کا مقصد اور مہرو کی کہانی سنائی تو اس کی آنکھ بھر آئی۔

''ہاں..... میں نے اپنے بھتیجے سے یہ کہانی سن رکھی ہے۔ وہ وہیں کرم داد کے گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ سال چھ ماہ میں میرا بھی جانا ہوتا ہے وہاں..... یہاں سے 12 گھنٹے ٹرین کی مسافت پر ہے رحیم گڑھ..... مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے..... اب تو لوگ اس لڑکی کو بھول بھال چکے ہیں۔ اس کی پاگل ماں سارا دن گلیوں کی خاک چھانتی ہے اور رات گاؤں سے باہر بڑے پیر کے مزار پر جا کر تھک کر سو جاتی ہے..... تم اب اس لڑکی کو کہاں ڈھونڈو گے۔ تین 3 سال سے بھی زیادہ ہو چکے اُسے غائب ہوئے۔ اس کے منگیتر نے بھی اگلے برس ہی شادی رچالی تھی۔ سنا ہے اب تو بچہ بھی ہے اس کا.....''

حکیم یعقوب سارے قصے سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان چھوٹے گاؤں دیہاتوں میں بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی تھی اور پھر یادوں کا دھواں برسوں سلگتا رہتا تھا۔ ہم شہر والوں کی طرح کمزور یادداشت کے مالک نہیں تھے یہ لوگ..... جہاں اگلے دو چار دن میں ہی کسی دوسرے حادثے کا چھینٹا پچھلے حادثے کی سلگن کو بجھا دیتا ہے۔ جانے مجھے کیوں ایسا لگتا تھا کہ مہرو کی کہانی کا پہلا دھاگہ مجھے اس کے گھر کے آس پاس ہی ملے گا۔

اگلے تین چار دن میں بخت خان کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ پانچویں صبح گلی میں شور سا مچ گیا حکیم کے پوچھنے پر گلی میں کھیلتے بچوں میں سے ایک نے دوڑتے دوڑتے ادھورا سا پیغام دیا'' چاچو..... پولیس کی گاڑی آئی ہے بڑی سی..... تلاشی ہو رہی ہے.....'' میں نے بخت خان کی طرف دیکھا۔

ہمارے جانے کا وقت ہوگیا ہے..... بخت خان نے جیب سے بہت سے روپے نکال کر حکیم کی جیب میں ڈالنا چاہے مگر حکیم نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

''کیوں شرمندہ کر رہے ہو..... میرے پاس تمہیں دینے کے لئے اس پستول کے علاوہ اور کچھ نہیں..... ورنہ ضرور تمہارے حوالے کر دیتا.....'' میں نے حکیم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''آپ کی دعائیں اس وقت سب سے قیمتی سوغات ہیں۔ دعا کیجئے گا ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہیں.....''

حکیم سے گلے مل کر ہم پچھلے دروازے سے کھیتوں میں نکل آئے۔ دور کہیں سے پولیس کے بڑے ٹرک کی آواز سنائی دے رہی تھی، حکیم نے ہمیں گاؤں سے نکلنے کا راستہ ازبر کروا دیا تھا۔ ہم شام تک بناڑ کے کھیتوں کے اندر ہی اندر چلتے رہے۔ مگر ہم نے آبادیوں میں داخل ہونے سے پرہیز کیا۔ رات بھی ایسے ہی کسی ویرانے میں رُکے بغیر

گزار دی۔ اور اگلی صبح کسی قصبے کے ایک چھوٹے سے پلیٹ فارم پر رکی گاڑی میں ہم دونوں الگ الگ رحیم گڑھ کے دو ٹکٹ لے کر مختلف ڈبوں میں سوار ہو گئے۔

ٹرین تیزی سے دوڑتی اور چھوٹے اسٹیشنوں پر بنا رُکے آگے بڑھتی رہی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، جب ہم چھپنا چاہیں تو یہ پوری دنیا ہی چھوٹی پڑ جاتی ہے۔ ہر نظر مجھے اپنی جانب تکتی اور گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کیسی عجیب دنیا ہے یہ، جو ظاہر اور نمایاں ہونا چاہتے ہیں، انہیں ٹالتی ہے۔ ان سے گریز کرتی ہے۔ مگر جو خود کو چھپانا چاہیں اور خفیہ رکھنے کے خواہش مند ہوں، انہیں گھور گھور کر بے نقاب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اچانک گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ تبھی گاڑی رکتے ہی چند پولیس والے ڈبے میں چڑھ آئے۔

اُن میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں باقی لوگوں سے ذرا پرے ایک برتھ پر سوئے بزرگ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس والا سیدھا میری طرف آیا، میرا جسم اکڑ سا گیا۔

"کون ہو تم..... شناختی کارڈ دکھاؤ....."

..........*

باب 10

سپاہی کڑک کر بولا:

''شناختی کارڈ دکھاؤ اپنا.....'' میں نے گھبرا کر باہر پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔

''کارڈ تو نہیں ہے اس وقت میرے پاس.....'' سپاہی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ کہاں سے آرہے ہو..... کہاں جارہے ہو.....؟'' اسی وقت باہر پلیٹ فارم سے کوئی چلا کر بولا:

''رحمان پورے والی جماعت اُتر جائے جلدی..... یہاں سے آگے ہم بسوں میں جائیں گے..... چلو جلدی کرو..... مغرب کی جماعت کھڑی ہوچکی ہے.....'' سپاہی نے میری نظروں کے تعاقب میں باہر پلیٹ فارم پر اترتے بستر بند اور جماعت والوں کا سامان دیکھا۔

''اچھا تو یوں کہو ناں..... تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ ہو صوفی صاحب..... جاؤ جلدی جا کر نماز پڑھ لو..... گاڑی یہاں زیادہ دیر نہیں رُکے گی.....'' سپاہی اپنی ہی جانب سے سارے اندازے لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سلام پھیرتے وقت میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ امام نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میرے دل سے بس ایک ہی دعا نکلی..... ''میرے مالک..... جس مقصد کے لئے میں جیل سے باہر نکلا ہوں..... اس کے پورے ہونے تک میرا پردہ قائم رکھنا.....''

ٹرین چل پڑی۔ میں نے ڈبے میں چڑھتے وقت دور بخت خان کو کھڑے دیکھا جو میرے سوار ہونے کے انتظار میں اپنے ڈبے کے باہر کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ پھر رات بھر ٹرین کسی اسٹیشن پہ نہیں رُکی اور فجر سے پہلے رحیم گڑھ کے نام والی تختی لگے پلیٹ فارم پر گاڑی کے رُکتے ڈبے چرچرائے تو میں اور بخت خان خاموشی سے دھند میں ڈوبے اسٹیشن سے باہر آگئے۔ باہر چند تانگے والے اپنی اپنی سواری پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بخت خان نے ایک تانگے والے کا شانہ ہلایا تو وہ جلدی سے چھانٹا سنبھال کر اپنی گدی پر بیٹھ گیا۔

''کدھر جانا ہے بادشاہو.....'' بخت خان نے میری طرف دیکھا۔

''گاؤں سے پرے بڑے پیر کے مزار پر لے چلو.....'' باتونی تانگے والے نے اپنا چھانٹا ہوا میں لہرایا اور تانگہ چل پڑا۔

''اچھا..... تو منت مانگی ہے بڑے پیر کی حاضری کی..... ہاں..... اچھا کیا..... بڑے لوگوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں وہاں جناب..... آپ کی بھی ضرور ہوگی..... ویسے مسئلہ کیا ہے.....؟'' تانگے والا بولتا رہا اور تانگہ دھند

اور کہرے میں ڈوبی کچی سڑک پر دوڑتا رہا۔

تانگے والے کو جب ہماری طرف سے اس کے سوالوں کے جواب نہیں ملے تو اس نے اُکتا کر تانگے کے چھجے سے بندھا پرانا چھوٹا ریڈیو کا بٹن دبا کر چلا دیا۔ ریڈیو پر بھی اس نے تین چار طرح کے ریشمی غلاف اور موتیوں والی لڑیوں کی جھالریں سجا رکھی تھیں۔ جیسے ریڈیو نہ ہو..... اس کا کوئی محبوب ہو جسے وہ روز سجا سنورا دیکھنا چاہتا ہو۔ ریڈیو پر صبح کا خبرنامہ شروع ہو رہا تھا۔ وہی حکمرانوں کے جھوٹے وعدے، کھوکھلے دعوے اور وہی حزب اختلاف کے الزامات..... شاید کچھ چیزیں ہمیشہ ایک سی رہتی ہیں۔ اچانک خبر بدلی اور خبر پڑھنے والے نے نئی خبر سنائی "سنٹرل جیل سے فرار ہونے والے قیدی بگھا سنگھ کو پولیس نے ضلع مختار پور کچے کے علاقے سے زخمی حالت میں گرفتار کرلیا..... تفصیلات کے مطابق....."

ہم دونوں کے سر پر جیسے بم سا پھوٹا۔ تانگے والا تانگہ بھگاتے ہوئے اپنی دھن میں بولتا رہا۔

"بڑے خطرناک ملزم بھاگے تھے جی..... ایک تو سنا ہے جیل میں ہی مارا گیا اور دوسرا یہ پکڑا گیا..... دیکھو..... باقی کب مرتے ہیں اپنی موت....." تانگے والے نے بٹن گھمایا۔ ریڈیو پر کوئی قوالی چل پڑی.....

"اندھیرے میں دل کے..... چراغ محبت..... یہ کس نے جلایا سویرے سویرے....." مزار کی فنڈ پر بھی رات کا آخری جلایا ہوا چراغ ابھی تک پھڑ پھڑا رہا تھا، مگر بگھے سنگھ کی گرفتاری کی خبر سن کر ہم دونوں کے دل کے دیئے یکلخت بجھ سے گئے تھے۔ مزار پر فجر کے وقت کی معمول کی چہل پہل تھی اور اکا دُکا زائر اور کچھ مجاور پانی بھرنے اور مزار کے فرش پر جھاڑو لگانے میں مشغول تھے۔ ایک جانب پرندوں کے چارہ ڈالنے والی مخصوص جگہ پر چڑیوں کے غول دانہ چگنے کے لئے اتر رہے تھے۔ مزار کے احاطے میں لگے درختوں پر اگربتیاں جلا کر اٹکا دی گئی تھیں جن کی خوشبو سے مزار کا صحن مہک رہا تھا۔ شاید دنیا کی ہر درگاہ کا ایک جیسا ہی ماحول ہوتا ہے۔ صحن میں ادھر اُدھر کچھ لوگ چادریں اور کمبل اوڑھے سو رہے تھے اور دور بیٹھا ایک مجذوب تھوڑی تھوڑی دیر بعد زور سے حق کا نعرہ لگا کر پھر سے خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک جانب چینی کی بڑی سی چینک میں چائے بن رہی تھی۔ مزار کے بڑے مجاور نے مٹی کے کلہڑوں (پیالوں) میں ہمیں چائے پیش کی۔

"اس علاقے میں اجنبی لگتے ہو سرکار....."

"ہاں..... کسی کی تلاش یہاں کھینچ لائی ہے۔ کوئی عورت ہے..... جس کی بیٹی کھو گئی ہے کچھ عرصہ قبل..... سنا ہے وہ یہیں رہتی ہے اب....." مجاور نے چونک کر ہماری طرف دیکھا.....

"کون..... مائی بھاگی..... کرم داد کی بیوہ..... جسے وہ بھاگاں والی کہا کرتا تھا..... اور اب سب اسے مائی بھاگی کے نام سے جانتے ہیں....."

"ہاں وہی..... کیا تم اس سے ہمیں ملوا سکتے ہو....." مجاور نے ایک گہرا سانس لیا۔

"اس کا کوئی ایک مستقل ٹھکانہ نہیں ہے اب..... جی چاہے تو یہاں بھی آجاتی ہے..... تم ٹھہرو..... میں پچھلے حصے میں مزار کی خدمتگار عورتوں والے حصے میں جا کر پوچھتا ہوں....." مجاور چلا گیا۔ بخت خان وہیں مزار کے صحن میں کمر ٹکانے کے لئے دراز ہو گیا، میں نے آس پاس مزار کی چہل پہل دیکھی تو جانے کیوں اس لمحے مجھے

سلطان بابا کی شدید یاد آئی۔ کچھ ہی دیر میں مجاور نے پچھلے حصے کی جانب کھلتے دروازے سے مجھے آواز لگائی۔

"سرکار..... یہیں آ جائیں....." بخت خان آنکھیں موند چکا تھا۔ میں نے اسے وہیں لیٹے رہنے دیا اور خود مجاور کے پیچھے چلتے ہوئے اسی مزار کے ایک عقبی مگر چھوٹے صحن میں آ گیا۔ جہاں پیپل کے درخت کے گرد بنے ایک گول چبوترے پر ایک الجھے بالوں والی، مٹی اور گرد سے اَٹے کپڑوں میں ایک ادھیڑ عمر حواس باختہ سی عورت بیٹھی گھاس کے تنکوں سے کوئی آشیانہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجاور نے مجھے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"یہی ہے مائی بھاگی..... مگر اس کے بھاگ بہت پہلے سو گئے تھے۔ اب یہ کسی کو نہیں پہچانتی۔ تم چاہو تو مل لو....." میرا دل اس عورت کی حالت دیکھ کر دہل سا گیا۔ کل تک یہی عورت اپنی راج دھانی کی ملکہ ہوگی، پیار کرنے والا شوہر، چاند سی فرمانبردار بیٹی، زمین جائیداد، ملکیت، وراثت، اناج، خیرات، تہوار..... جانے کیا کچھ ہوتا ہوگا اس کے زیرِ انتظام..... وقت کی مار کتنی خطرناک اور بے رحم ہوتی ہے، ایک پل میں سب اُجڑ کر رہ جاتا ہے۔ میں کافی دیر بنا کچھ کہے مائی کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر وہ خود ہی میری جانب متوجہ ہوئی۔

"تُو نے میری مہرو کو دیکھا ہے.....؟ ابھی یہیں کھیل رہی تھی..... میری ذرا دیر کو آنکھ لگی تو..... نہ جانے کہاں چلی گئی ہے....."

"ہاں..... وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے گئی ہے۔ شام تک واپس آ جائے گی..... تم یہیں اس کا انتظار کرنا مائی....." وہ خوش ہو گئی۔

"اچھا..... اچھا..... پروین کی طرف گئی ہوگی..... دونوں کا دم ایک دوسرے میں اٹکا جو رہتا ہے..... چلو ٹھیک ہے..... آ جائے گی ناں شام تک..... تب تک میں اس کے لئے گڑ والی روٹی بنا لیتی ہوں..... تم شام کو لے آؤ گے نا اُسے..... وہ اندھیرے سے بہت ڈرتی ہے..... مغرب ڈھلنے کے بعد باہر نہیں جاتی کہیں....." پیچھے سے بخت خان کی آواز آئی۔

"ہاں ماں جی..... ہم اس کو مغرب سے پہلے لے آئے گا..... تم فکر مت کرو....." وہ نہ جانے کب سے ہمارے پیچھے کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ مائی بھاگی ہماری بات سن کر یوں مطمئن ہو گئی جیسے اس کے سارے بوجھ ہم دونوں نے اپنے کاندھے پر اُٹھا لئے ہوں۔ وہ اپنے آپ ہی خود سے باتیں کرتی، مسکراتی اور مستقبل کے منصوبے بناتی وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔ بخت خان نے میری طرف دیکھا "آگے کیا کرنا ہے عبداللہ خاناں....."

"شام ہونے کا انتظار، اندھیرا ہو جائے تو ہم ماجد چوہدری کے گھر جائیں گے..... تم جب تک آرام کرو....." ماجد چوہدری ہی نام بتایا تھا حکیم یعقوب نے اپنے بھتیجے کا..... میں دن کی روشنی میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر خدا نے رات نہ بنائی ہوتی تو مجھ جیسے گناہ گار خود کو کہاں جا کر چھپاتے۔ سچ ہے، اندھیرا بڑا پردہ ہے، میں اور بخت خان بھی اندھیرا ہوتے ہی مزار سے نکل پڑے اور مجاور کے بتائے رستوں پر چلتے عشاء کی نماز کے بعد حکیم یعقوب کے بھتیجے کے محلے پہنچ گئے۔

محلہ سنسان پڑا تھا۔ اکا دُکا آوارہ کتے اپنی پناہ گاہوں میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ گاؤں کی رات اور صبح جلد ہو جاتی ہے۔ میں نے اور بخت خان نے بڑی کھیس نما چادروں سے بظاہر خود کو ٹھنڈی اور سرد ہوا سے بچانے کے لئے

چہرہ لپیٹ کر بکل سی مار رکھی تھی۔ مقصد وہی تھا..... اپنی شناخت چھپانا..... تیسری دستک پر ایک چھوٹا بچہ باہر آیا۔ ''جی.....''

''ماجد چوہدری صاحب کا مکان یہی ہے.....؟'' بچے نے تجسس سے ہماری طرف دیکھا..... ''ہاں جی..... ابھی بلاتا ہوں ابے کو.....'' بچہ اندر بھاگ گیا۔ کچھ دیر میں تیس پینتیس سالہ گہرے سانولے رنگ اور مضبوط جسم کا ایک جوان مرد باہر آیا۔ ''جی..... میرا نام ماجد ہے..... آپ کون.....؟''

''ہمیں حکیم یعقوب صاحب نے آپ کا پتہ دیا ہے..... ہم کچھ دن ان کے مہمان تھے۔ شاید آپ سے بات ہوئی ہو اُن کی.....'' ماجد جلدی سے اندر پلٹ گیا۔ شاید حکیم نے اسے ہماری ساری حقیقت بتا رکھی تھی۔ تبھی اس نے عجلت میں ہمیں گلی میں کھلتے بیٹھک کے دروازے سے اندر بلا لیا۔ ''مجھے چاچے کا فون آ گیا تھا۔ شکر ہے آپ لوگ خیر خیریت سے رحیم گڑھ پہنچ گئے..... کہیے..... کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ لوگوں کی؟''

''مہرو کے اغواء کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' ماجد نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ ''بس اتنا ہی کہ وہ چاچے کرم داد کی انتہائی لاڈلی بیٹی تھی اور ہمارے چوہدری احمد کی محبت کی منگ..... پر سب برباد ہو گیا جی..... سب لٹ گیا ایک ہی رات میں.....'' مہرو کی کہانی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ ماجد نے بتایا کہ وہ چوہدری احمد کے پاس ہی منشی کی ملازمت کرتا ہے۔ اور اس کے مالک کو کرمے کی لاڈلی مہرو گاؤں کی کسی شادی بیاہ کی تقریب میں پہلی بار اتفاقیہ دکھائی دی تھی۔ مگر یہی اتفاق احمد کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن گیا۔ مہرو کی ایک ہی جھلک نے اس کے دن کا چین اور رات کی نیند غارت کر کے رکھ دی تھی۔ احمد نے مہرو سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے ایک نکا سا جواب ملا کہ جو بھی بات کرنی ہے، مہرو کے والدین سے کرے کیونکہ اُس کے دل کے صحن کے دروازے کی کنجی اس کے باپ کے پاس ہے اور کوئی اجنبی اس کے باپ کی اجازت کے بنا یہ دروازہ کبھی نہیں کھول پائے گا۔ احمد بھی دھن کا پکا تھا اس نے کرم داد تک اپنا مدعا پہنچانے میں دیر نہیں کی اور یوں مہرو کا رشتہ چوہدری احمد کے ساتھ طے ہو گیا۔

نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی اور شادی دو ماہ بعد طے کر دی گئی۔ وقت پر لگا کر اُڑنے لگا اور احمد اور مہرو پل گن گن کر اپنی ملن کی گھڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر شادی کی رسمیں بھی شروع ہو گئیں۔ مہرو پر خوب نکھار آیا۔ سارے مہمانوں کی نظریں ابٹن، مایوں اور مہندی کی رسموں کے دوران شرمیلی مہرو کو ہی نہارتی رہیں۔ مگر کسے خبر تھی کہ کبھی کبھی اپنوں کی نظر ہی غیروں سے بڑھ کر نظر بد ثابت ہوتی ہے۔ احمد اور مہرو کی خوشیوں کو بھی شاید ان کے کسی اپنے کی ہی نظر لگ گئی اور مہندی والی رات ہی مہرو کو چوہدری کرم داد کے پائیں باغ کے ایک ویران گوشے سے کوئی اٹھا کر لے گیا۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ شادی والا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ احمد کی تو دنیا ہی اُجڑ گئی اور وہ دیوانوں کی طرح مہرو کی تلاش میں نکل پڑا مگر کرم داد اور اس کی بیوی کی زندگی میں چھانے والی کالی رات پھر کبھی رخصت نہیں ہوئی۔ چاروں طرف ہرکارے دوڑائے گئے، پہرے لگائے گئے، راستے بند کر کے ایک ایک راہ گیر اور سواری کو چھانا گیا، تلاشیاں ہوئیں مگر جو ایک بار کھو جائیں وہ بھلا تلاشیوں سے کہاں ملتے ہیں۔ مہرو بھی ایسی کھوئی کہ پھر دوبارہ اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ماجد بولتے بولتے یکا یک چپ سا ہو گیا۔

''وہ جی..... کہتے ہیں کہ خود چوہدری احمد نے بھی مہینہ ڈیڑھ بعد دل چھوڑ دیا تھا مہرو کی تلاش سے..... لڑکی

جب رات بھر گھر سے باہر گزار دے پھر اسے کم ہی دل والے دل سے قبول کرتے ہیں۔ صرف کرم داد ہی تھا جو پاگلوں کی طرح اپنی بیٹی کو شہر شہر قریہ قریہ ڈھونڈتا رہا لیکن پھر وہ بھی قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ گیا۔ ماں پاگل ہو کر مزاروں ویرانوں میں رُل گئی اور مہرو کا قصہ لوگوں کے ذہن میں ایک بسری یاد بنتا گیا....." ماجد خاموش ہوا تو کمرے میں بھی گہری خاموشی چھا گئی۔ بخت خان بولا تو اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد تھا۔

"اور پھر..... اس کا کچھ پتہ نہیں چلایا کسی نے؟"

"نہ جی..... چوہدری احمد نے تو چھ مہینے بعد ہی پروین سے شادی کر لی..... اور اب وہ ہنسی خوشی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اب تو اس کا بیٹا بھی ایک سال کا ہونے والا ہے....." میں پروین کے نام پر چونک پڑا۔ یہ نام تو آج ہی میں نے مہرو کی ماں کی زبان سے سنا تھا..... ہاں..... مائی بھاگی نے مہرو کی سب سے عزیز اور گہری سہیلی کا نام پروین ہی تو بتایا تھا۔ میں نے ماجد سے تصدیق چاہی۔

"ہاں جی..... یہ وہی پروین ہے۔ سنا ہے خود چوہدری نے ہی اس کے گھر شادی کا نیوتا بھیجا تھا، کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چوہدری نے مہرو کی محبت کی یاد دل میں زندہ رکھنے کے لئے ہی اس کی سہیلی سے نکاح کر لیا تھا....."

میرے ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے پروین اور احمد کی شادی میں مہرو کی الجھی ہوئی گتھی کا کوئی سرا کھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ماجد سے پوچھا۔

"کیا تم ہماری ملاقات احمد سے کرا سکتے ہو..... ہماری شناخت بتائے بغیر....." ماجد سوچ میں پڑ گیا۔

"مشکل کام ہے جی..... مہرو کا نام درمیان میں آئے گا تو وہ آپ دونوں کی شناخت تو ضرور پوچھے گا۔ اور بنا شناخت جانے شاید وہ ملے بھی نہ....." پھر اچانک جیسے ماجد کو کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں..... مگر ایک چیز ہو سکتی ہے۔ کل چوہدری احمد کے بیٹے کی پہلی سالگرہ ہے..... وہ بڑے پیر کے مزار پر بیٹے اور بیوی کے ساتھ حاضری دینے آئے گا..... آپ چاہو تو وہاں کسی طریقے اُسے مل سکتے ہو..... کل چوہدری کی طرف سے سارے زائرین اور مزار کے عملے میں لنگر، نیاز اور تحائف بھی بانٹے جائیں گے....."

میں نے بخت خان کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم مزار پر واپس پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ مزار کی منڈیر پر جلتے آخری دیئے کی لو نے پھڑ پھڑا کر ہماری طرف دیکھا اور بجھ گیا۔ کچھ راتیں زمین پر نہیں، سیدھے ہمارے دل پر اترتی ہیں۔ میں اور بخت خان بھی اپنے اپنے دلوں کے اندر بسے تاریک اندھیرے لئے سر ٹکا کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

اگلی صبح مزار کے احاطے میں کچھ غیر معمولی چہل پہل تھی۔ صبح سے ہی بڑے لنگر والوں نے زردے پلاؤ کی دیگیں بیرونی صحن میں دھیمی آنچ پر چڑھا لی تھیں۔ صحن کو جھنڈیوں اور رنگین قمقموں سے سجایا گیا اور زائر اِدھر اُدھر بھاگتے پانی کے چھڑکاؤ کرتے اور صفائیاں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈھولیوں کی ٹولیاں اور دھمال ڈالنے والے مجذوب جمع ہونے لگے اور عصر کے بعد یکا یک احاطے میں شور سا مچ گیا۔ کسی حویلی کے بہت سے مزارعے رنگین رومالوں اور ریشمی چادروں سے ڈھکے خوان اور نیاز کی بڑی پراتیں ہاتھوں پر اٹھائے مزار میں داخل ہوئے تو حاجت مند قطاروں

میں بیٹھ گئے اور نذر نیاز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چوہدری احمد نے اپنے بیٹے کے جنم دن پر واقعی اپنے سارے خزانوں کے منہ کھول کر رکھ دیئے تھے۔

انسان کتنی مجبور مخلوق ہے اور اس کے پاس اپنی خوشی منانے کے ذرائع کتنے محدود ہوتے ہیں۔ اس بات کا احساس بھی مجھے اسی روز ہوا۔ جانے انسان خوشی میں لٹاتا کیوں ہے اور غم اور یاس میں چھپاتا کیوں ہے.....؟ جو بھی ہو، دونوں جذبے وقتی ہوتے ہیں۔ احمد اپنی چودھرائن بیوی پروین کے ساتھ اپنے بچے کو گود میں اٹھائے سب سائلوں اور مزارعوں میں کچھ بانٹتا ہوا، قطار میں بڑھتا ہوا میری اور بخت خان کی سمت چلا آرہا تھا۔

جہاں ہم دونوں خود کو کھلی چادروں اور لمبے کھیسوں میں لپیٹے اسی قطار کے آخر میں بیٹھے تھے۔ حلیہ بنانا کتنا مشکل اور بگاڑنا کتنا آسان ہوتا ہے انسان کے لئے۔ اور یہ سادہ لوح انسان ہی اس بگڑے حلیے، الجھی لٹوں اور شکن زدہ مٹی سے اٹی پوشاک میں پوشیدہ شخص کو کتنی آسانی سے ملنگ اور مجذوب مان لیتے ہیں۔ چوہدری کی بیوی پروین نے اپنے بیٹے کا سر میرے سامنے کیا۔

''اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کر دو سائیں لوگو..... شالا رب اسے لمبی حیاتی دیوے.....'' میں نے مہرو کی جگری سہیلی کی طرف دیکھا۔ دھوپ میں اس کا حسن اور ناک کا کوکا دونوں ہی دمک رہے تھے، میری زبان بے اختیار پھسل پڑی۔

''لائی بے قدراں نال یاری..... تے ٹٹ گئی تڑک کر کے.....'' پروین نے تڑپ کر میری طرف دیکھا، اتنے میں اس کا شوہر، مہرو کا محبوب بھی ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ بیوی کی عاجزی اور نیاز مندی دیکھ کر وہ بھی دو لمحے کے لیے ہمارے پاس رُکا۔

''کیا خدمت کروں آپ کی سائیں جی..... حکم تو کرو.....'' میں نے احمد کی طرف دیکھا..... ''تھوڑی سی وفا اُدھار دے سکتے ہو فقیر کو..... اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے..... مگر اس معاملے میں تو تم بھی میری طرح کے بھکاری ہی دکھائی دے رہے ہو..... جاؤ..... لے جاؤ اپنی یہ سوغاتیں..... تم سے کچھ نہیں چاہیے مجھے.....'' احمد کے چہرے پر پل بھر میں کئی رنگ آکر گزر گئے۔ پروین پہلے ہی نڈھال سی بیٹھی تھی۔

''اتنی جلدی نئی دنیا بسالی..... اور وہ بھی اُس کی ہم جولی کے ساتھ..... یہ بھی نہ سوچا کہ اس پر کیا گزرے گی..... اس کی وفاؤں کا اچھا مول دیا..... بڑا اچھا مول دیا تم نے۔'' میں بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ احمد بے چینی سے میرے پیچھے لپکا۔

مگر ضرورت مندوں اور فقراء کی بھیڑ نے اسے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ میں نے اندھیرے میں تیر تو چلا دیا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی گہرائی میں جا کر کسی کے دل میں پیوست ہو جائے گا۔ باہر کا ڈاکہ خاموشی سے ڈالا جاتا ہے۔ مگر من کے اندر کا چور خود ہی شور مچا کر سب کو اکٹھا کر لیتا ہے۔ بخت خان نا اُمید سا تھا مگر اگلی صبح وہ چوہدری کی بیوی کو مزار کے احاطے میں اپنی نوکرانیوں کے جھرمٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

''وہ آگیا ہے عبداللہ خاناں.....'' پروین اپنی نوکرانی اور خادماؤں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھی اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئی۔ ''آپ نے میرے بیٹے کو دعا نہیں دی سائیں..... کیا مجھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے.....؟''

باب 11

پروین کے چہرے پر انجانی فکروں اور اندیشوں کے سائے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم سارے زمانے سے خود کو چھپا لیتے ہیں مگر خود اپنی دو آنکھوں سے چھپ نہیں سکتے، آنکھیں سب بول دیتی ہیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم گناہ گار لوگ ہیں بی بی..... ہم کیا، ہماری دُعا کیا..... جاؤ اپنا وقت ضائع نہ کرو..... اپنی سہیلی کھو کر جسے پایا ہے اب اس خزانے کی حفاظت کرو.....'' میری بات نے پروین کے اندر جانے کیا آندھی چلائی کہ پل بھر میں ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''مجھے پتہ ہے..... سائیں جی..... آپ سب جانتے ہیں۔ مگر پھر یہ بھی تو جانتے ہوں گے کہ میں بے قصور ہوں.....'' میں چپ رہا۔ ماحول اور بھیس کا کتنا اثر ہوتا ہے۔ ہم جوگیوں فقیروں کے حلیے میں اس مزار کی چوکھٹ پر بیٹھے نہ ہوتے اور پروین میری زبان سے گزشتہ روز چند بھید بھاؤ کی باتیں نہ سن چکی ہوتی تو شاید مجھ جیسے پھٹے حال بوسیدہ لباس والے کو رُک کر بھیک بھی نہ دیتی۔ شاید انسان سدا سے کسی نہ کسی بھید، راز یا غیب کے علم کا متلاشی رہا ہے۔ تبھی تو ان نجومیوں اور ہاتھ دیکھنے والے پنڈتوں کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ مگر غیب کا حال تو صرف اوپر والا جانتا ہے، تو پھر یہ نیچے بسنے والے ہر وقت کس کھوج میں لگے رہتے ہیں؟

پروین کو بھی اس کے اندر کی کھوج وہاں دوبارہ کھینچ لائی تھی۔ مگر اسی لمحے اس کی کسی خاص نوکرانی نے اس کے کان میں آگے بڑھ کر کچھ کہا۔ پروین گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ ''کیا کہہ رہی ہے نوراں..... چوہدری جی..... اس وقت..... پر وہ تو صبح سویرے کچہری کے مقدمے کے لیے نکل گئے تھے۔'' نوراں پھر کچھ بڑبڑائی۔ پروین نے جلدی سے میری طرف دیکھا۔

''سائیں جی..... میرا گھر والا واپس آ گیا ہے..... میرے بڑے بھاگ ہوں گے اگر آپ آج شام میری حویلی کا پھیرا ڈال جاؤ..... دیکھیں انکار نہ کیجئے گا..... میرے دل پر بڑا بوجھ ہے..... آپ تو جانتے ہو.....'' پروین جلدی میں نذر چڑھا کر مزار سے باہر چلی گئی۔ بخت خان تھوڑے فاصلے پر بیٹھا حیرت سے یہ سارا معاملہ دیکھ رہا تھا۔

''یہ سب کیا تھا..... یہ عورت کیا بول کر گیا ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''کوئی گرہ کھولنے آئی تھی اپنی..... مگر موقع نہیں ملا اُسے.....'' بخت خان ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

''ہاں مگر یارا..... وہ تم کو اپنا راز کیوں دے گا مڑاں.....؟ ہم کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' میں نے اپنے بھولے

اور سیدھے سادھے دوست کی طرف دیکھا۔

''وہ کسی سزائے موت کے جیل سے بھاگے قیدی سے ملنے نہیں آئی تھی۔ اسے ہماری حقیقت معلوم ہوجائے تو خود اپنے مزارعوں کے ہاتھ ہمیں ہتھکڑیاں ڈلوا کر گھسیٹتے ہوئے کوتوالی کے حوالے کردے پل بھر میں..... مگر وہ ہمیں ہمارے فقیر کے بہروپ کی وجہ سے کوئی اللہ والا جان کر اتنی عزت دے رہی ہے کہ خود اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے چلی آئی۔ تم بس یہ دعا کرو کہ ہمیں اس کی زبانی مہرو کی گمشدہ ڈور کا کوئی اُلجھا سرا مل جائے.....'' بخت خان نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''تم کون ہے عبداللہ خاناں..... تم کو یہ سب بات کس نے سکھایا ہے.....؟'' میں چپ رہا اُسے کیا بتاتا کہ کبھی یہی مزار اور درگاہیں میری منزل کا پڑاؤ ہوا کرتی تھیں۔ کبھی میں نے زہرہ کو پانے کے لئے ایک مزار کی سیڑھیاں چڑھی تھیں اور پھر میں ایسی کئی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ جانے وہ اب کیسی ہوگی..... کہاں ہوگی..... مجھے یاد بھی کرتی ہوگی یا.....؟

اس سے آگے سوچ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ اور پھر میرے دل کی تقلید میں سورج نے بھی ڈوبنے کی تیاری کرلی۔ شام ڈھلنے سے پہلے بڑی حویلی سے سواری ہمیں لینے آگئی۔ مگر میں نے بگھی والے کو لوٹا دیا۔ بخت خان نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ بی بی جی کے گھر نہیں جائے گا کیا.....؟''

''نہیں..... فقیروں کا بھلا محلوں سے کیا واسطہ..... جسے آنا ہوگا..... وہ خود چل کر آئے گا.....'' اور پھر مغرب سے پہلے ہی چوہدری احمد کی بگھی چل کر مزار کے بڑے دروازے پر آ کر رُکی اور وہ بھاری قدموں سے چلتے ہوئے کچھ خوان نوکروں کے ہاتھ اُٹھوائے درگاہ کے صحن میں ہمارے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''میں نے پروین سے کہا تھا کہ سائیں لوگ نہیں آئیں گے..... مگر پھر بھی اس نے جانے کیا کچھ تیار کروالیا کھانے کے لئے..... میں آپ کا کھانا یہیں لے آیا ہوں..... ایک ایک نوالہ چکھ لیں گے تو خوش ہوجائے گی نیاڑیں.....'' میں نے بخت خان کو کھانا چکھنے کا اشارہ کیا اور دو نوالے احمد کی دل جوئی کے لئے خود بھی حلق سے نیچے اتار لئے۔ احمد بے چین سا بیٹھا رہا۔

''سائیں..... کل آپ کی بات ادھوری رہ گئی تھی.....''

''ہاں..... تم نے بھی تو ایک کہانی ادھوری چھوڑ دی تھی..... پھر یہ فقیر اپنی بات کیسے پوری کرے.....'' احمد نے بے تابی سے میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔

''بہت تلاش کیا تھا اسے سائیں..... کون سی گلی، محلہ، گاؤں یا شہر ہے جو میں نے نہیں کھنگالا..... پر وہ تو شاید خود مجھ سے کہیں جا کر چھپ گئی تھی..... ورنہ ایک بار پلٹ کر آواز تو دیتی..... ایسی بھی کیا مجبوری ہوسکتی تھی اُسے..... لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ خود کسی کے ساتھ.....'' احمد بولتے بولتے چپ ہوگیا۔

''اور تم نے لوگوں کی بات پر یقین کر کے اس کی تلاش ہی ختم کردی، اسی کی سہیلی سے بیاہ رچا کر آرام سے زندگی گزار رہے ہو..... تمہیں بھلا پھر کاہے کا غم.....؟'' احمد نے نظریں جھکا لیں۔

''اس سے بیاہ بھی اسی لئے کیا کہ اُسے دیکھ کر مہرو کی یاد آتی رہے گی..... کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہو تو کوئی

تو ہو جس سے میں اس کی باتیں کر سکوں۔ پروین پہلے راضی نہیں تھی اس رشتے کے لئے۔ میرے اصرار پر ہی اس نے حامی بھری تھی۔ اور سائیں مہرو واپس آ بھی جاتی تو میرا اُس سے رشتہ ناممکن تھا، ہمارے علاقے میں جوان لڑکی ایک رات باہر گزار آئے تو کوئی قبول نہیں کرتا اُسے..... مہرو کو غائب ہوئے تو مہینوں ہو چکے تھے۔'' احمد سر جھکائے بتا رہا تھا کہ اس کی علاقے میں کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ شادی کی تقریب کے ہنگامے میں اُس رات جانے مہرو حویلی کے پچھلے باغ کے سناٹے میں کیوں گئی تھی؟ جہاں دن کے وقت بھی درختوں کے گہرے سائے کی وجہ سے رات کا سا سماں رہتا ہے.....؟ وہاں مہرو کو کس نے بلایا تھا یا وہ کسی سے ملنے گئی تھی؟ اتنی رازداری سے کہ اس نے اپنی ماں یا سہیلی کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ اور وہاں کون تھا جس نے مہرو کو دوبارہ پلٹنے نہیں دیا یا جس کے ساتھ مہرو خود چل پڑی.....؟ اس جیسے جانے کتنے سوالات تھے جن کا جواب احمد بھی تلاش نہیں کر پایا۔

تبھی تو اکثر اس کے دل میں شک کا وہ زہریلا ناگ پھن اٹھا کر کھڑا ہو جاتا تھا جو اس سے بار بار یہ کہتا تھا کہ مہرو خود اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہے..... اسے اغواء نہیں کیا گیا۔ ورنہ علاقے کی پولیس کو تو اس کا کوئی سراغ مل ہی جاتا۔ مگر مہرو کو تو نہ جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا۔'' احمد نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اب آپ ہی بولو سائیں..... اس میں میری کیا خطا ہے.....؟ آپ تو اللہ والے ہو..... آپ کو تو سب پتہ ہوگا۔ اگر اس کی کوئی خبر ہے آپ کو تو مجھے بتاؤ..... ورنہ دعا کرو کہ میرے دل کو بھی آرام آ جائے.....'' میں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ مگر میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو آج خود میرا دل ایسا برباد کیوں ہوتا..... محبت کرنے والوں کو دعاؤں سے بھلا کب آرام ملتا ہے؟ احمد بھی بے چین اور بے قرار سا وہاں سے اُٹھ گیا اور جاتے جاتے ایک لمحے کے لئے رک کر بولا:

''پروین بھی بہت بے تاب ہے آپ سے ملنے کے بعد سائیں..... اس کے لئے بھی دعا کیجئے گا..... کل رات سے مسلسل رو رہی ہے..... کہتی ہے آپ سے مل کر اپنے ناکردہ گناہ کی معافی مانگے گی کہ اس نے اپنی سہیلی کے حق پر ڈاکہ نہیں ڈالا..... یہ سب ہم تینوں کے مقدر میں لکھا تھا.....'' ہم انسان کتنی آسانی سے اپنی ہر کمزوری، خامی یا عیب مقدر کے کھاتے میں ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ احمد پلٹ کر جانے لگا تو میں نے پیچھے سے آواز دی۔

''کل شام ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ اپنی گھر والی سے کہنا کہ جانے والے پلٹ کر نہیں آتے..... البتہ ان کی یاد پلٹ پلٹ کر ہمارے سلگے ہوئے زخم ادھیڑنے چلی آتی ہے..... گھاؤ کا مرہم تو مل جاتا ہے زمانے میں..... مگر یاد کا کوئی مرہم نہیں ملتا۔'' احمد چند لمحوں کے لئے ساکت کھڑا سوچتا رہا اور پھر تیز قدم اٹھاتے وہاں سے چلا گیا۔

رات حجرے میں بخت خان سے ملاقات ہوئی تو وہ الجھا ہوا بیٹھا تھا، مگر چپ رہا۔ کبھی کبھی فیصلے کسی اور کے ہاتھ میں دے دینے میں ہی نجات ہوتی ہے۔ اگلی صبح سورج نکلتے ہی پروین کی خاص خادمہ نوراں عجلت میں ہڑبڑائی ہوئی سی مزار کی دہلیز پر کھڑی ملی۔

''تُسی جارئے او سائیں جی.....؟ مالکن نے درخواست کی ہے کہ ان سے مل کر جائیں..... ورنہ انہیں ساری حیاتی کا پچھتاوا رہ جائے گا۔''

میں نے احمد کی زبانی پروین تک اپنے جانے کی خبر اسی لئے پہنچائی تھی کہ اس کے اندر کی گھٹن اسے اپنے

من کا ہر راز اُگل دینے پر مجبور کر دے۔ اور پھر اسی شام وہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ سورج عصر کے بعد مزار کی منڈیروں کو آخری سلامی دے رہا تھا۔ آج شاید وہ اپنے شوہر سے یہاں آنے کی اجازت لے کر آئی تھی اس لئے اس کے انداز میں کوئی عجلت نہیں تھی، لیکن لب تھے کہ بس کپکپا کر رہ جاتے تھے۔ جیسے اس کے اندر کی شدید کشمکش اُسے کچھ کہنے سے روک رہی ہو۔ آخر کار ایک لمبا سانس لے کر اس نے ایک ہی جھٹکے میں سارا بوجھ دل سے اتار دیا۔

"مہرو میری ہی وجہ سے اغواء ہوئی تھی سائیں جی..... اسے اٹھانے والا اُسے نہیں..... مجھے لینے وہاں آیا تھا..... مہرو کو میرے کیے کی سزا ملی سائیں جی..... میں جانتی ہوں آپ کو سب پتہ ہے۔ مگر جانے کس مصلحت کے تحت آپ نے میرے گھر والے کے سامنے میرا راز فاش نہیں کیا....." پروین اپنے اندر کے ناسور بنے زخم دکھاتے ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں ابھی تک سکتے میں کھڑا تھا۔

وہ بات جو آج تک اُس کی زبان تک نہیں آئی تھی، جس کی کھوج میں اس کا شوہر، علاقے کی پولیس اور مہرو کے گھر والے، دوست، رشتہ دار در بدر بھٹکتے رہے، خوار ہوتے رہے مگر پروین چپ رہی، آج وہ پچھتاوا اس نے ایک انجان فقیر، جوگی، بنجارے کے سامنے کھول کر بیان کر دیا۔ جانے کس اُمید پر..... کس آس میں.....؟ شاید ہر گناہ، ہر پچھتاوے، ہر کسک، ہر راز کو کسی نہ کسی جھروکے، کھڑکی یا روشن دان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے اندر کی گھٹن نکالنے کے لئے کبھی کسی آستانا تو کبھی کسی مندر، مسجد یا مزار کی چوکھٹ پر مجھ جیسے فقیر جوگیوں کے سامنے جا کر دل کی یہ کھڑکی کھولتے ہیں۔ پروین بولتی رہی اور میرے ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں۔ پروین اور مہرو بچپن کی پرانی بدل بہن ٹائپ سہیلیاں تھیں وہ جن کی سانس کی ڈور ایک دوجے سے بندھی ہوتی ہے۔ پل بھر کے لئے پہلی اگر دوسری کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو دم اٹک جاتا تھا دونوں کا۔

پرائمری سے ہائی اسکول اور پھر گاؤں سے پرے لڑکیوں کے اکلوتے کالج تک دونوں ہم جماعت ہی تھیں۔ مہرو کے مزاج میں سنجیدگی اور بردباری تھی جبکہ پروین گویا آفت کی پرکالہ تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس کی رگ رگ میں پارہ بھر دیا ہو کسی نے..... مہرو کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنی شوخی اور شرارت سے باز نہیں آتی تھی، کالج تک پہنچتے پہنچتے تو اس کی بے باک ادا پر گاؤں کے کئی نوجوان بھی آہیں بھرنے لگے تھے۔ دونوں صبح ایک ہی تانگے پر کالج کے لئے گھر سے نکلا کرتی تھیں اور جب ان کا تانگہ مختلف کھیت کھلیانوں کے درمیان بنی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا کچی اینٹ والی سڑک تک پہنچتا، تب تک آس پاس کھیتوں میں کام کرتے گبھرو یا چھتوں کی منڈیر پر انگڑائیاں لیتے کاہلوں کو پتہ چل جاتا کالج جانے کی اطلاع ہو چکی ہوتی، تب کوئی سائیکل کی ہوا بھرنے کے بہانے تو کوئی صبح کی ورزش کی ڈنڈا بیٹھک پیلتے کن انکھیوں سے پروین کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر اس کی راہ میں کسی درخت، ٹیلے کھیت یا پگڈنڈی پر بظاہر لاپرواہ کھڑا نظر آیا کرتا اور پروین سبھی کو یوں نظر بھر کر دیکھتی کہ پھر اگلے کئی دن وہ بیچارہ کسی بسمل کی طرح تڑپتا رہتا تھا۔

جبکہ سمٹی سمٹائی اور گھبرائی سی مہرو کی جان پر بنی رہتی تھی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، یا انہی عاشقوں میں سے کوئی قدم بڑھا کر پروین کی راہ ہی نہ روک لے مگر بھلا پروین کو ان باتوں کی کیا فکر تھی۔ وہ تو ان سے عاشق نامراد بے چاروں کی حالت پر دل کھول کر قہقہے لگاتی اور ان کی بے بسی کے بیان پر خوب ہنستی تھی۔ کئی بار مہرو نے پروین کی

انہی حرکتوں پر قطع تعلق کی دھمکی بھی دی اور گھر میں روٹھ کر بیٹھ گئی کہ اب کبھی پروین کی صورت بھی نہیں دیکھے گی۔ مگر پروین بھلا اپنی دل جانی سہیلی کو کب زیادہ دیر روٹھنے دیتی؟ اگلی شام ہی وہ مہرو کے گھر کھلے صحن میں اپنا دوپٹہ ڈال کر باقاعدہ دھرنا مار کر ہڑتال پر بیٹھ جاتی کہ جب تک مہرو اسے معاف کر کے گلے نہیں لگائے گی تب تک وہ یونہی وہاں پڑی رہے گی.....

اور پھر مہرو کا دل بھی پسیجنے میں زیادہ وقت نہیں لیتا تھا۔ وہ روتے ہوئے پروین کے گلے لگ جاتی اور ہر بار کی طرح پروین کے جھوٹے وعدوں پر یقین کر کے اُسے معاف کر دیتی تھی۔ چند دن پروین مہرو کی خاطر سدھری رہتی مگر پھر وہی دل لگی، یہاں کسی من چلے نے راہ چلتے سیٹی ماری یا پھر آہ بھر کر کوئی شعر پڑھا، وہیں پینو کی ''رگِ الفت'' جاگ اُٹھتی، ہاں..... ''رگ مزاح'' یا'' رگِ جان کی طرح کچھ دل پھینک رگ الفت بھی تو رکھتے ہیں۔ رومان پروری صرف مرد کا ہی تو شیوہ نہیں..... عورت بھی رومان پرور ہو سکتی ہے..... پروین کا رومان آوارگی کے زمرے میں نہیں آتا۔ مگر شاید ہمارے ہاں کچھ اصناف صرف مرد سے متصل کر دی گئی تھیں..... کوئی عورت یا لڑکی اگر اپنے اندر وہ صفت لے کر پیدا ہو تو زمانہ فوراً اسے آوارہ یا بدکار قرار دے کر اپنا فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ پروین کی شرارت بھی آوارگی نہ تھی۔ مہرو جانتی تھی کہ اس کی سہیلی اندر سے کتنی معصوم اور پاکیزہ ہے، ہاں مگر قدرت نے اس کی نسوں میں زندگی عام لوگوں سے اوسطاً کچھ زیادہ ہی بھر دی تھی، تبھی وہ وقت کی رگوں سے ہر لمحے ڈھیروں لطف نچوڑ لینا چاہتی تھی۔ مگر اس جیسے علاقے کے کسی پسماندہ گاؤں یا قصبے میں لڑکی کی ہنسی اور بے باک نظر کے افسانے عام ہونے لگیں تو پروانوں کے جھنڈ شمع کے گرد منڈلانے لگتے ہیں اور کچھ پروانے صرف شمع کی لو پر جل کر بھسم ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوتے۔ وہ خود بھی جلتے ہیں اور ساتھ میں دیپ کے شعلے کو بھی خاک کر دیتے ہیں۔

بالا بھی ایک ایسا ہی خودکش پروانہ تھا، دوسرے گاؤں کے نمبردار کا بیٹا چوہدری اقبال..... عرف بالا..... جس نے اتفاقاً اس روز کسی کام سے شہر کی طرف جاتے ہوئے شارٹ کٹ کے چکر میں اپنی پرانی ویلز جیپ پروین کے کالج کے رستے میں پڑتے کھیت کی کچی سڑک پر ڈال دی، تبھی سامنے سے جاتے تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی سیاہ چادروں میں لپٹی دو لڑکیوں میں سے ایک نے بالے کی جیپ اور ٹور دیکھ کر دھیرے سے شرارتاً سیٹی بجا کر اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور زور سے ہنس پڑی۔ کچھ ہنسی کی آوازیں کان نہیں، براہ راست دل سنتے ہیں، بالے کا دل بھی ڈھیر ساری چوڑیوں کے کھنک جانے جیسی وہ کھنک دار ہنسی سن کر ماہی بے آب کی طرح زور سے تڑپا اور پھر کبھی ٹھنڈا نہ ہو پایا۔ کون تھی وہ جو بالے کی جسامت، رعب اور سرخ آنکھیں دیکھ کر باقی تمام لڑکیوں کی طرح دبک جانے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ صرف زور سے ہنس پڑی تھی بلکہ نظروں نظروں میں بالے کی شان دار سواری کو سراہ بھی گئی تھی۔

بالا اپنے سارے کام بھول کر کڑی شکر دوپہری تک اُسی بل کھاتی سڑک پر جما کھڑا اس تانگے والی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا جو خود اس کے اپنے مزاج کے بھی خلاف بات تھی کیونکہ اس کے اپنے گاؤں میں ہر دوسری لڑکی یہ بات جانتی تھی یا بھگت چکی تھی کہ بالا کلی کلی منڈلانے والی ایک آوارہ بھنورا ہے۔ جسے کہیں ٹک کر بیٹھنا راس ہی نہیں آتا۔ صبح ایک پھول تو شام دوسری ڈالی..... اُس نے کسی ایک کے رس پر اکتفا کرنا سیکھا ہی نہیں تھا مگر جانے پروین کی

ایک مچلتی شرارت بھری نظر نے اس پر ایسا کیا جادو کیا کہ پھر وہ اُسی راستے کا ہو کر رہ گیا جو پروین اور مہرو کے کالج کی طرف جاتا تھا۔ مہرو کے لاکھ منع کرنے کے باوجود پیو اپنی دل سے باز نہ آئی اور راستے میں کھڑے بالے کی ایک ٹھنڈی آہ کے جواب میں وہ دوبارہ لمبی آہیں بھرتی اور بالے کی حیرت اور بوکھلاہٹ پر خوب قہقہے لگاتی۔ بالے کی آتش شوق بھڑک اٹھی تھی اور اب وہ کسی بھی حال میں پروین سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔

جتنا پروین اُسے ٹالتی اور نہ ملنے کے بہانے تراشتی اتنا وہ بے چین ہوا جاتا۔ دونوں میں رقعے بازی شروع ہوگئی اور بالے نے سونے کی انگوٹھی، مندریاں اور ٹیکہ وغیرہ یکے بعد دیگرے پروین کو تحفے کی شکل میں بھیجنا شروع کر دیئے۔ انہی دنوں دوسرے گاؤں کی کسی لڑکی کی زبانی بالے اور پٹواری کی بیٹی کی گزشتہ "عشق داستان" کالج میں پھیلی تو پروین کا ماتھا ٹھنکا کہ اس بار اس کا پالا کسی عام عاشق سے نہیں بلکہ ایک نامی لوفر آوارہ سے پڑا ہے۔

مہرو نے بھی پروین کو خوب کھری کھری سنائیں اور اسے حکم دیا کہ فوراً بالے کے تمام تحائف اور سوغاتیں اسے واپس لوٹا کر ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کا اعلان کر دے۔ مگر اب بالا پیچھے ہٹنے کے لئے تیار کیوں کر ہوتا۔ اس نے تو ایک طوفان برپا کر دیا اور پروین کو صاف دھمکی دے دی کہ اگر پروین بالے کی بتائی ہوئی مقررہ جگہ پر ٹھیک وقت پر ملنے نہ آئی تو وہ سارے علاقے میں پروین کو بدنام کر کے رکھ دے گا۔ پروین کے خط ابھی اس کی تحویل میں تھے اور بالے کے دیئے مہنگے تحفے اس کا ثبوت۔

پروین کو یہ ہڈی گلے میں اٹکتے نظر نہیں آ رہی تھی انہی دنوں مہرو کے لئے احمد کا رشتہ آ گیا اور ساتھ ہی مہرو اور اس کے گھر والوں نے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ پروین بالے کی دھمکیوں کی وجہ سے بہت پریشان اور افسردہ رہنے لگی تھی۔ مہرو سے اپنی سہیلی کی یہ پریشانی نہ دیکھی گئی لہٰذا اس نے پروین کو بھی رخصتی سے ہفتہ بھر پہلے اپنے ہی گھر ٹھہرنے کے لئے بلا لیا۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ وہ کم بخت بالا وہاں بھی پروین کی کھوج میں آ پہنچے گا۔ پروین مہرو کی حویلی کے باہر بالے کو اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ منڈلاتے دیکھ کر بہت ڈر گئی اور اس نے کسی طرح بالے کو پیغام بھجوایا کہ وہ یہاں کسی شریف گھرانے کی مہمان ہے لہٰذا بالا یہاں اس کی رسوائی کا سامان نہ کرے۔

جواب میں بالے نے اس شرط پر رضامندی ظاہر کی کہ اگر پروین یہیں کہیں موقع دیکھ کر بالے سے بس ایک آخری ملاقات کر لے تو وہ پروین کے خط اسے واپس لوٹا دے گا اور اپنے تحائف بھی واپس لے لے گا۔ پروین نے مجبوراً ہاں کر دی کیونکہ وہ مہرو کے شگن اور مایوں کے دنوں میں مہرو کے لئے کوئی بدمزگی یا پریشانی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بالے نے مہرو کی حویلی کے پیچھے بنے ویران اور اُجاڑ باغ کو ملاقات کی جگہ کے طور مقرر کر دیا اور مہندی والی رات کا وقت بھی طے ہو گیا۔

مگر جب پروین نے مہرو کو بتایا تو اس نے سختی سے پروین کو بالے سے یوں ملنے سے منع کر دیا۔ پروین مہرو کے سامنے رو پڑی کہ اگر وہ نہ گئی تو بالا اُسے سارے گاؤں میں رسوا کر دے گا اور پروین کا بیمار بوڑھا باپ یہ بدنامی سہہ نہیں پائے گا اور مر جائے گا۔ تب مہرو نے ایک عجیب فیصلہ کیا کہ پروین کی چیزیں لینے وہ خود بالے کے پاس جائے گی.....

..........*

باب12

جانے مہرو کی بائیں آنکھ اس روز صبح سے ہی کیوں لگاتار پھڑک رہی تھی۔ مگر جب پروین نے تنہائی پاتے ہی اُسے یہ بتایا کہ شام مغرب کا اندھیرا ڈھلنے کے بعد جب مہرو کی حویلی میں اس کی مہندی کی تقریب زوروں پر ہوگی اور ساری عورتوں کا دھیان مہندی کی رسم، شگن اور علاقائی گیت اور ٹپوں پر ہوگا، تب وہ سب سے نظر بچا کر چوری چھپے بالے کے سارے تحفے اور خط لے کر پچھلے باغ ملنے کے لئے جائے گی تو مہرو کا دل دھڑک سا گیا۔ وہ اپنی نازک سہیلی کو اس مشکل میں تنہا کیسے جانے دیتی۔ دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ مہرو بضد تھی کہ پروین کی جگہ وہ خود یہ ساری چیزیں بالے کو لوٹا آئے گی اور ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی عزت کا واسطہ دے کر اپنی چادر بھی اس کے قدموں میں ڈال آئے گی کہ بالا اب اس کی سہیلی کو مزید نہ ستائے۔ جبکہ پروین مہرو کو یوں اکیلے اس آگ میں کودنے کی اجازت دینے پر تیار نہ تھی۔ آخر کار لاکھ بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ پہلے مہرو باغ میں جائے گی اور پروین پیچھے کسی درخت تلے اس کا انتظار کرے گی۔ اگر مہرو بالے کو منانے میں کامیاب ہوگئی اور اسے صلح کی نیت نظر آئی تو وہ پروین کو بھی وہیں آواز دے کر بلا لے گی لیکن اگر بالے نے لڑائی جھگڑے اور پروین سے دوبارہ ملنے کی ضد نہ چھوڑی اور پروین کے خط واپس نہ کئے تو مہرو بات ختم کر کے واپس پلٹ آئے گی۔

اس شام عصر کے وقت سے ہی آسمان پر گھنے بادلوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا اور وقفے وقفے سے دور کہیں بجلی بھی چمک رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں سہیلیاں اس بات سے بے خبر تھیں کہ دور چمکتی بجلیوں کی یہ لپک آج اُن کے آشیانے کو بھی خاکستر کرنے کی سازش کیے بیٹھی ہے۔ مغرب سے پہلے ہلکی بارش بھی شروع ہوگئی اور پروین اور مہرو کو ایسا لگا کہ آندھی اور بارش کا یہ پردہ قدرت نے ان دونوں کے لئے ہی آج ترتیب دیا ہے تاکہ کسی بہانے سے جب وہ دونوں اُٹھ کر جائیں تو باقی عورتیں اُن کی غیر موجودگی محسوس نہ کر پائیں۔ منصوبے کے مطابق مہرو پروین کی چادر اوڑھ کر پہلے اندھیرے میں نکل پڑی اور اس کے پیچھے پروین نے باغ میں قدم رکھا۔ ٹھیک اسی لمحے کسی نے حویلی کی طرف جاتی بجلی کی تار باہر کھمبے سے کاٹ ڈالی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پروین نے گھبرا کر اندھیرے میں مہرو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور وہ مہرو کو آگے جانے سے روکنے کے لئے اس جانب لپکی جہاں اس نے آخری بار مہرو کو گھنے درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔ تبھی اس نے اندھیرے میں دو تین افراد کو منہ پر ڈاکوؤں جیسے سیاہ ڈھاٹے باندھے باغ کی دیوار کودتے ہوئے دیکھا اور خوف کے مارے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔ تبھی دور کہیں سناٹے میں مہرو کی دبی دبی سی چیخ گونجی۔

پروین تڑپ کر اس طرف دوڑی اور اس نے بارش اور کہیں دور گرتی بجلی کی چمک میں دیکھا کوئی مہرو کے منہ پر کپڑا باندھے اسے بے ہوش کیے اُٹھا کر بھاگ رہا ہے۔ وہ گنتی میں کل تین لوگ تھے جو پروین کے رونے چلانے سے پیشتر ہی پلک جھپکتے مہرو کو اٹھائے دیوار پھلانگ کر ویرانے میں اوجھل ہو چکے تھے۔ دوسری طرف شاید حویلی یا باغ کے چوکیداروں میں سے کسی نے ڈاکوؤں کو دیوار کر پھلانگتے دیکھ کر شور مچا دیا۔ حویلی میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ کچھ دیر تو سبھی یہ سمجھتے رہے کہ شاید کچھ اناڑی چور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر شادی والے گھر سے سونا چاندی لوٹنے کے لئے پچھلی جانب سے اندر ٹاپے ہوں گے اور پھر کسی کو خیال آیا کہ پہلے حویلی کی بجلی تو بحال کی جائے جو انہی چوروں نے اندر ٹاپنے سے پہلے باہر میدان میں لگے کھمبے سے کاٹ ڈالی تھی۔

پروین دوڑتی ہوئی دوبارہ تقریب میں پہنچی تو مہرو کی گمشدگی کا ڈھنڈورا پٹ چکا تھا، کسی کو پروین کے جانے اور آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔ ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کے لئے حویلی کے مرد آنکھوں میں خون لیے، گرجتے، گالیاں بکتے اور ہوائی فائر کرتے صحن میں جمع ہوئے تو ان کی وحشت اور سرخ آنکھیں دیکھ کر پروین ڈر گئی اور ہزار خواہش کے باوجود کسی کو بالے کے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔ کرم داد اپنے وفاداروں کے ساتھ اسی وقت مہرو کی تلاش میں نکل گیا۔

مہرو کی ماں کو غشی کے دورے پڑنے لگے اور پروین ساری رات روتے گڑگڑاتے خدا کے حضور یہی دعائیں کرتی رہی کہ احمد اور مہرو کا باپ کرم مہرو کو واپس لے کر ہی لوٹیں۔ اگلے روز شام کو وہ سب تھکے ہارے واپس آ گئے پر مہرو واپس نہ آئی۔ اسی اثناء میں ایک دوسری انہونی یہ ہوئی کہ پروین کے مہینوں پہلے سے بیمار باپ کو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ پروین کی ماں اسے لئے گاؤں کے واحد دو کمرے کے ہسپتال کی طرف دوڑی گئی اور اگلے دو ہفتے پروین بیمار باپ کے بستر کی پائنتی سے لگی دوا دارو کرتی رہی۔

ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا کہ اتنے شدید دورے کے بعد بھی پروین کے باپ کا بچ جانا سمجھو کوئی معجزہ ہو گیا ہے، مگر اب ہر لمحہ ان ماں بیٹی کو بیمار کا خیال رکھنا ہو گا اور کوئی بھی ایسی بات نہ ہو جس سے مریض کے ذہن یا دل پر کوئی بوجھ پڑے۔ پروین مہرو کے اغواء کی اگلی شام ماں کے ساتھ ہسپتال آئی تھی اور تب سے لگاتار اس کے کان مہرو کے بارے میں کسی اچھی خبر کو ترس رہے تھے۔ عیادت کو آنے والی عورتیں حیرت اور دکھ سے پروین سے مہرو کے بارے میں استفسار کرتیں کہ آخر اس اندھیری رات میں مہرو اس ویران باغ میں کیا لینے گئی تھی، اور ایسی رازداری کہ اپنی عزیز از جان سہیلی کو بھی خبر تک نہیں ہونے دی۔

گاؤں کی عورتوں کی آنکھوں میں مہرو کے لئے شک، تجسس اور کسی چٹ پٹی گھٹیا رومانی کہانی کے آثار بڑھتے دیکھ کر پروین کا دل کٹ کر رہ جاتا۔ وہ چیخ چیخ کر سارے زمانے کو مہرو کی معصومیت اور پاکیزگی کی گواہی دینا چاہتی تھی مگر جانے کتنی مصلحتوں کے خوف اور اندیشوں نے اس کی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے۔ پولیس بھی سر پٹخ پٹخ کر تھک چکی تھی اور اب تو خود مہرو کے محبوب احمد نے پروین کو یہ طعنہ دے مارا تھا کہ مہرو خود اپنی مرضی سے اس اندھیری رات اپنے کسی آشنا سے ملنے ویران باغ میں گئی تھی۔ اتنی رازداری نہ برتتی تو کم از کم پروین کو تو کچھ بتا کر جاتی۔ احمد اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے پروین کے گھر چلا آتا اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا۔ تبھی ایک دن یہ اندوہناک خبر آئی کہ مہرو کے باپ چاچے کرم داد نے مہرو پر طعنہ کسنے کی پاداش میں کسی شخص کو قتل کر دیا ہے۔

مہرو کا بچا کھچا خاندان رُل کر برباد ہوگیا۔ کرم داد کو پھانسی کی سزا ہوگئی اور مہرو کی ماں پاگل ہو کر گاؤں کی گلیوں کی خاک چھانتی رہی۔ کبھی کبھی پروین کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی اس داغ دار جوانی کا گلہ گھونٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو سولی دے دے۔ مگر جن کے ضمیر انہیں روزانہ دل کے گھاٹ پر پھانسی پر لٹکاتے ہوں، انہیں باہر کی سولیاں کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔

پروین بھی زندہ رہی۔ اور روز مہرو کو یاد کر کے مرتی رہی۔ اس کا بیمار باپ چارپائی پر جا پڑا اور اب اسے پروین کی رخصتی کی فکر ستانے لگی تھی۔ ایسے میں احمد ہی آگے بڑھا اور اس نے اپنی مہرو کی سہیلی کا ہاتھ اس کے گھر والوں سے مانگ لیا۔ پروین کے اندر کوئی آری سی چل گئی مگر اس کے گھر والوں پر تو شادیٔ مرگ طاری ہو چکی تھی۔ علاقے کے سب سے بڑے زمین دار نے ان کی بیٹی کے لئے رشتہ بھیجا تھا۔ خوشی تو ہونی تھی۔ پروین نے احمد کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مہرو کے ساتھ یہ بے وفائی کبھی نہیں کر پائے گی کیونکہ مہرو اس کے اندر بستی ہے۔ احمد نے جواب دیا کہ اُسی مہرو کی یادیں بانٹنے کے لئے تو وہ پروین کو ہمیشہ کے لئے مانگ رہا ہے کیونکہ صرف پروین ہی جانتی ہے کہ مہرو احمد کے لئے کیا تھی اور اب وہ کسی تیسری عورت کو بیاہ کر اپنے گھر نہیں لانا چاہتا۔

پروین نے لاکھ سر پٹخا مگر اس کے ماں باپ نے اپنی عمر بھر کی پرورش کا حق مانگ کر پروین کی زبان بند کر دی اور پروین احمد کی دلہن بن کر اس کے آنگن ڈولی اتر گئی۔ سال بھر بعد ایک بیٹا بھی گود میں آ گیا مگر حویلی میں پروین کی ایک بھی رات ایسی نہیں گزری جب وہ شوہر اور گھر والوں سے چھپ کر تنہائی میں روئی نہ ہو۔ پچھلے ماہ پروین کا بیمار باپ بھی چل بسا جس کی بیماری اور رسوائی کے خوف نے پروین کی زبان بند کر رکھی تھی۔ پروین کے دل پر اب یہ بوجھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے جو بھی ہو۔ اور چاہے کتنی ہی بڑی بربادی اور بدنامی اس کا مقدر نہ بن جائے، مگر اب وہ یہ راز اپنے اندر چھپا کر نہیں رکھے گی اور احمد کو سب بتا دے گی۔

اسے بس اپنے گڈو کی پہلی سالگرہ کا انتظار تھا کہ یہ دن خیر خیریت سے گزر جائے۔ کیونکہ وہ باپ بیٹے کی پہلی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ احمد کے دل میں کئی ارمان تھے یہ دن منانے کے لئے اس لئے پروین کسی رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ مگر تقریب کے اگلے روز ہی اس نے خود کو زمانے کی عدالت میں پیش کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ مگر پھر مزار میں اسے ایک جوگی مجذوب دکھائی دیا جس کی ایک بات نے ہی اس کا اندر باہر سب ہلا کر رکھ دیا۔ اسے لگا کہ یہ قدرت کی طرف سے ایک واضح اشارہ ہے کہ اب اسے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے کفارہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔ اسی لئے آج وہ اس جوگی کے سامنے کھڑی اپنے ہر جرم کا اقرار کر رہی تھی۔ اور یہاں سے جانے کے بعد وہ خود کو اپنے مجازی خدا کی عدالت میں پیش کرنے والی تھی.....

پروین نے اپنی بات ختم کی تو وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ مزار پر ڈھلتی شام کے سائے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ دلوں کے اندھیرے شاموں میں گھل جائیں تو شامیں مزید اُداس ہو جایا کرتی ہیں۔ پروین پلٹ کر جانے لگی تو میں نے اسے آواز دے کر روکا۔

''تمہارے فسانے میں دوبارہ مہرو کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اگر تمہیں واقعی اسے کھو دینے کا اتنا ہی پچھتاوا تھا تو تم نے اسے اپنے طور پر کھوجا کیوں نہیں.....؟ بالا مہرو کو اٹھا کر کہاں لے گیا تھا، اور اب مہرو کہاں ہے.....؟'' پروین

نے میری طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں ابھی تک نم تھیں۔

''یہی تو میں آپ سے پوچھنے آئی تھی سائیں جی کہ میری مہرو کہاں ہے.....؟ آپ تو اللہ والے سائیں لوگ ہو۔ آپ کو تو پتہ ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے اسے بڑا ڈھونڈا۔ پر وہ مجھے نہیں ملی.....'' میرے ذہن میں ایک تیز آندھی سی چلنے لگی۔ پروین نے بتایا کہ وہ اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے ہفتہ بھر تو ہسپتال سے ہی نہیں نکل پائی مگر وہ برابر احمد کی حویلی کی خبر رکھے ہوئی تھی۔ گاؤں کی عورتیں جو اس کی ماں سے ملنے آتیں تو ان سے اسے حویلی کی سن گن ملتی رہتی تھی۔ مہرو کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ آس پاس کے سارے علاقے چھان مارے گئے، احمد کے اندر جب تک غیرت کے ناگ نے پھن نہیں اٹھایا تھا وہ خود بھی مہرو کے باپ کے ساتھ چپہ چپہ، گلی گلی، قریہ قریہ اپنی محبوبہ کو تلاشتا رہا اور اس کے بعد بھی کرم داد اور پولیس مہرو کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ مگر مہرو کو تو جانے زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا تھا۔

پروین نے اپنی کالج کی اسی پرانی سہیلی سے مدد لینے کا فیصلہ کیا جو بالے کے گاؤں سے پڑھنے آیا کرتی تھی۔ باپ کے ہوش میں آتے ہی چھٹے یا ساتویں روز پروین کسی نہ کسی بہانے لپکتی جھپکتی کالج پہنچی تاکہ وہ اپنی دوست کے ذریعے بالے کے علاقے میں جا کر اس کے پاؤں پڑ جائے اور اس کی منت کرے کہ بالا پروین کی دل لگی کی سزا اُس کی معصوم سہیلی کو نہ دے۔ اور اسے رہا کر دے۔ مگر پروین کے سر پر ابھی کچھ اور آسمان ٹوٹنا باقی تھے۔ سہیلی نے یہ دل دہلا دینے والی خبر سنائی کہ بالے کو پانچ روز پہلے اُسی لڑکی کے بھائی نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ جو پچھلے دنوں بالے کی وجہ سے سارے گاؤں میں بدنام ہوگئی تھی۔ پٹواری کا بیٹا گزشتہ کئی دنوں سے بالے کی تاک میں تھا اور پھر موقع ملتے ہی اس نے اپنی غیرت کا سارا بارود بالے کے سینے میں چھ کی چھ گولیوں کی صورت اُتار کر ہی دم لیا۔

بالے کو تو تڑپنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی۔ پروین کی سانسیں رُک سی گئیں۔ بالے کی موت مہرو کے اغواء کے ٹھیک اگلے دن ہوئی تھی۔ مگر پھر مہرو کہاں گئی۔ بالے کے ساتھ دو اور لوگ بھی تو حویلی کے پچھلے باغ میں کودے تھے۔ وہ کون تھے؟ اور پھر کہاں غائب ہوگئے۔ پولیس نے قتل کی تفتیش کے دوران اسی رات پٹواری کے بیٹے اور مددگاروں سمیت بالے کے سارے دوست اور کارندوں کو بھی گرفتار کر لیا تھا کیونکہ اس فائر میں دونوں طرف کے کچھ فریقین زخمی ہوئے تھے اور علاقے میں نقصِ امن کا خدشہ بڑھ رہا تھا۔ ان سب کی ضمانتیں ہونے میں کئی ہفتے لگ گئے۔

پروین اس سارے عرصے میں اپنی استطاعت کے مطابق بھرپور کوشش کرتی رہی کہ اسے مہرو کی کوئی خبر مل جائے۔ مگر ایک کمزور اور انجان لڑکی بھلا کسی دوسرے گاؤں میں کتنی بھاگ دوڑ کر سکتی تھی، سو ناکام ہی رہی۔ وہ ہر دوسرے روز کسی نہ کسی بہانے اپنی سہیلی کے ساتھ چند گھنٹوں کے لئے اس کے گاؤں چلی آتی اور ہر گلی کوچے اور بازار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی شاید کہیں سے۔ اسے اپنی پیاری مہرو کی کوئی جھلک دکھائی دے جائے مگر کھونے والے اگر مل جائیں تو پھر کوئی انہیں گمشدہ ہی کیوں کہے؟ پروین کا پاگل پن اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ کئی بار لوگوں سے پوچھتے پاچھتے بالے کے ڈیرے تک جا پہنچی، مگر وہاں بھی ویرانی ہی اس کا مقدر بنی۔ مزارعوں نے بتایا کہ پولیس نے اسی رات ڈیرے پر جمع بالے کے سارے اوباش دوستوں اور بدمعاش ہرکاروں کو اٹھالیا تھا، اور اب یہاں دو چار

پرانے خاندانی نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ پروین نے بالے کی منہ بولی بہن اور دور کی رشتے دار ہونے کا جھوٹ بول کر کسی بہانے بالے کے ڈیرے کے کمروں اور کوٹھیوں کو بھی یکے بعد دیگرے چھان مارا۔ مگر وہاں مہرو کا سایہ بھی نہ ملا۔

ایک آدھ بار وہ اپنی دوست کے ساتھ پُرسہ دینے کے بہانے بالے کی کوٹھی کے پھیرے بھی ڈال آئی اور کرید کرید کر بالے کی ماں بہنوں سے بھی سوال جواب کر آئی تھی۔ اور اس دوران اس نے بالے کی حویلی میں موجود تمام عورتوں سے جان پہچان پیدا کرنے کے لئے صحن میں بیٹھ کر بالے کی جوان موت پر جھوٹے بین بھی ڈالے مگر جسے نہیں ملنا تھا، وہ آخر تک نہ ملی۔

کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خدشہ بھی جاگ اٹھتا کہ کہیں بالے نے پروین کی جگہ مہرو کو گھونگھٹ تلے دیکھ کر طیش میں آ کر اسے مار ہی نہ ڈالا ہو۔ اور وہیں کہیں اپنے ڈیرے کے آس پاس ہی دفنا دیا ہو۔ ایسے میں پروین کو آس پاس کے سارے کھیت کھلیانوں میں مہرو کی تازہ کھدی ہوئی قبر دکھائی دینے لگتی۔ پروین نے آس پاس کے سارے قبرستان بھی چھان مارے اور وہ ہر تازہ بنی ہوئی قبر کے بارے میں کرید کرید کر گورکنوں سے پوچھا کرتی مگر ہر قبر کا کوئی نہ کوئی وارث نکل آتا۔ آخر پروین کی ماں ہی بیٹی کے اس پاگل پن اور جنون کے آڑھے آئی۔ کیونکہ آس پاس علاقے کے لوگوں نے عجیب عجیب باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ پروین کی ماں بس اتنا جانتی تھی کہ اس کی بیٹی اپنی عزیز از جان سہیلی مہرو کی بازیابی کے لئے آس پاس کی مدد گاہوں اور مزاروں پر منتیں مانگتی اور چادریں چڑھاتی پھرتی ہے کہ مہرو خیریت سے گھر واپس لوٹ آئے۔ مگر جوان خوبصورت لڑکی کے ماں باپ بھلا اسے کب تک یوں ادھر اُدھر بھٹکنے دیتے۔ لہٰذا ایک روز اُس پر یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ اب وہ اپنی کسی کالج کی سہیلی یا گاؤں کی کسی کمی مزارن کے ساتھ تانگے میں ادھر اُدھر ٹھکل خوار نہیں ہوا کرے گی۔ پروین کی ماں کو تو یہ بھی شک ہو گیا تھا کہ پروین کے چہرے پر جو ہر وقت اداسی اور زردی سی چھائی رہتی ہے، یہ بھی کسی ایسے ہی ویران مزار یا خانقاہ کا سایہ ہے جو اس کی بیٹی کے حسن کو گھن بن کر چاٹ رہا ہے۔ اور اب وہ جلد از جلد اپنی بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر گھر سے رخصت کرنا چاہتی تھی۔ تبھی جب ایسے میں احمد کا رشتہ پروین کے لئے آیا تو اسے لگا جیسے خدا نے بس اسی کی سن لی ہے۔ لہٰذا جھٹ پٹ اور عجلت میں پروین کو احمد کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

پروین کی کہانی ختم ہو چکی تھی مگر مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب بھی کسی گہرے اندھے کنویں میں رستہ تلاش کرنے کی کوشش میں ہوں۔ مہرو کی گمشدگی اب بھی ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ پروین نے چادر سر پر ڈالی اور واپسی کی راہ لینے سے پہلے دھیرے سے بولی:

''میرے لیے دعا کریں گے سائیں جی.....؟ جانتی ہوں میں اس قابل نہیں ہوں..... مگر میں اندر سے بہت کمزور نکلی..... اپنے بوڑھے باپ کا سر کسی کے سامنے جھکنے نہیں دینا چاہتی تھی..... اسی ڈر سے میں نے سہیلی کو اپنے باپ کی عزت پر قربان کر دیا..... مگر آج میں اپنے جرم کی سزا بھگتنے جا رہی ہوں..... میری دعا ہے کہ احمد اپنے ہاتھوں سے میرا گلہ گھونٹ کر میرا قصہ مکا دے.....''

پروین روتے ہوئے پلٹی تو میں نے آواز دے کر اسے روکا ''جانے سے پہلے میری ایک بات سن لو۔ کچھ سچ

اگر اپنے وقت پر بول دیئے جائیں تو اُن کی افادیت تبھی قائم رہتی ہے مگر وقت گزر جانے کے بعد وہی سچ دوسروں کے لئے کسی ناکردہ گناہ کا عذاب بن جاتا ہے۔ تم انہیں کیوں سزا دینا چاہتی ہو جن کا تمہاری خطا یا قصور سے دور دور کا واسطہ بھی نہیں..... جو معصوم ہیں۔ وہ تمہارا گناہ کیوں بھگتیں بھلا.....؟'' تو پھر میں کیا کروں سائیں جی..... چپ رہتی ہوں تب بھی پچھتاوے کے ناگ مجھے مسلسل ڈستے ہیں کہ میں اُنہی اپنوں کے ساتھ مخلص نہیں..... دھوکہ دے رہی ہوں ان سب معصوموں کو..... جو اندر سے بہت اُجلے ہیں..... لیکن میرے اندر کی سیاہ کالک سے ناواقف ہیں..... اور مجھے بھی اپنے جیسا پاکیزہ اور معصوم سمجھتے ہیں..... وہ کیا جانیں میں اندر سے کتنی داغ دار، کتنی میلی ہوں.....''

''میں نے اس کی لرزتی اور پچھتاووں کے بوجھ تلے دبی پلکوں کو بھیگتے دیکھا.....'' کبھی کبھی اپنوں سے اپنا سچ چھپانا ہی ہماری سزا مقرر کر دی جاتی ہے۔ سچ بول دینے سے تو شاید ایک بار موت ملتی مگر اپنے اندر کا سچ کسی اور کی خاطر چھپانے والے ہر روز ایسی کئی موتیں مرتے ہیں۔ اور یہ سچ بول کر بوجھ اتار دینے سے کہیں بڑی سزا ہے کہ اپنے اس بوجھ کے ساتھ ہی عمر بھر جیا جائے اور روز خود کو آئینے میں دیکھ اور اپنی اصلیت پہچان کر اپنے آپ پر ہی تعزیر مقرر کی جائے۔ تمہیں بھی فی الحال اس سچ کو اپنے اندر ہی کسی دور تک چبھے کانٹے کی طرح پیوست رکھنا ہوگا۔ روز تڑپنا اور ہر روز فنا ہونا ہوگا۔ جب تک کہ قدرت خود تمہارا سچ تمہارے اپنوں پر ظاہر نہ کر دے ورنہ سمجھ لینا کہ ابھی تمہیں ان کی خوشیاں برباد کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔''

پروین آنکھیں پونچھتی چلی گئی۔ میں نے بخت خان کو یہ سارا ماجرا اسی رات سنا دیا۔ اس نے ایک ہی سوال پوچھا'' آگے کیا کرنا ہے عبداللہ خاناں.....؟''

''ہم کل صبح بالے کے گاؤں جا رہے ہیں..... اس ڈور کا اگلا سرا ہمیں اب وہیں سے ملے گا۔ قتل والی رات پولیس نے بالے کے ڈیرے پر چھاپہ مار کر اس کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ضرور سارے ڈیرے کی تلاشی بھی لی گئی ہوگی۔ اگر مہرو بالے کے ڈیرے پر ہوتی تو پولیس کو ضرور مل جاتی۔ مگر بالے نے اسے وہاں نہیں رکھا تھا۔ مطلب ڈیرے کے علاوہ بھی بالے کا کوئی نہ کوئی ایسا ٹھکانہ ضرور ہوگا جہاں وہ مہرو کو چھپا سکتا تھا..... ہمیں وہی ٹھکانہ تلاش کرنا ہوگا بخت خان.....''

اور پھر اگلی صبح منہ اندھیرے مزار سے گزرتی پگڈنڈی پر میں اور بخت خان دھند اور کہرے میں ڈوبے کھیتوں کے درمیان خود کو بڑی سیاہ شالوں میں لپیٹے، جوگی فقیروں کے بھیس میں بالے کے گاؤں کی طرف پیدل ہی نکل پڑے۔ کچھ فاصلے پر بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ سا اسی سمت جاتے ملا تو بیل گاڑی والوں نے ہمیں بھی پیچھے بٹھا لیا۔ دھوپ چڑھنے کے دو گھنٹے بعد ان میں سے ایک بولا'' اے لو بادشاہو..... آپ کی منزل آ گئی.....'' میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

..........*

باب 13

بیلی پور گاؤں بھی اس جیسے باقی سینکڑوں دیہاتوں جیسا عام پنڈ تھا۔ ویسے ہی محنتی جفاکش سیدھے سادھے لوگ، وہی صبح شام کے ایک جیسے معمولات، دُکھ، سکھ، غم اور خوشیاں..... کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ہم اس دنیا میں تمام عمر ایک ہی دائرے میں سفر کرنے کے لئے یہاں جنم لیتے ہیں۔ ہر جانب ایک جیسے ہی تو انسان بستے ہیں، جو ایک ہی طرح کی عمارتیں بنا کر ان میں یکساں رہن سہن لئے جیتے ہیں۔ ہاں بس جدید اور قدیم کا تھوڑا سا فرق رہتا ہے۔ مگر یہ جدت یا قدامت انسان سے انسان ہونے کی جبلت یا خصلت نہیں چھین سکتی۔

اندر سے ہم سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے خوش، تھوڑے سے دکھی، کچھ مطمئن، زیادہ بے چین..... بالے کے گاؤں کے لوگ بھی ویسے ہی تھے۔ اپنے آپ میں اُلجھے، اندر اپنی پریشانیوں سے لڑ کر باہر والوں سے خندہ پیشانی سے ملنے والے لوگ۔ میں اور بخت خان دو الگ بیل گاڑیوں پر سوار وہاں پہنچے تو آس پاس کے سادہ دیہاتیوں نے حسب معمول ہمارا جوگیوں والا حلیہ دیکھ ہمیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ سامنے ایک نکڑ کے ہوٹل پر گرم اُبلتی چائے کی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور چند کسان بڑے مزے سے دھوپ میں بچھے لکڑی کے بینچوں پر بیٹھے، گرم چائے پرچوں میں ڈالے، زوردار آواز کے ساتھ سُڑک رہے تھے۔ اُنہیں یوں چائے پیتے دیکھ مجھے یوگی یاد آ گیا۔ وہ بھی جیل میں صبح سویرے اپنی بیرک میں لنگر کی بدمزہ چائے یونہی زوردار سُڑکی لگا کر ایک ہی گھونٹ میں پی جایا کرتا تھا اور پھر شرارت سے میری طرف دیکھ کر کہتا:

"چائے کا اصل مزہ تو پرچ میں ڈال کر سُڑک جانے میں ہے پیارے..... کپ یا پیالہ ہونٹوں سے لگا کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینا تو لڑکیوں کا طریقہ ہے....."

یوگی کی یاد آتے ہی مجھے جیل کی فکر ستانے لگی۔ جانے ظہیر اور کندن اس وقت کہاں ہوں گے.....؟ اور بگھا سنگھ تو گرفتار ہو چکا ہے۔ پولیس نے ہمارا راز اگلوانے کے لئے بگھے پر بے تحاشہ تشدد بھی کیا ہوگا۔ مگر وہ بگھے کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلوا سکے ہوں گے۔ میں اپنی فکروں کے بھنور میں الجھا کچھ سوچ رہا تھا کہ سامنے والے ہوٹل کے مالک نے آواز لگائی۔

"چائے پیو گے سائیں جی.....؟ لگتا ہے بڑی دور سے آئے ہو....."

ہم دونوں کو ہی چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ مگر میں وہاں یوں کھلے میں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ "نہیں..... تمہارا شکریہ..... ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں بھائی....." میں نے جان چھڑا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی، حالانکہ اس

وقت میری اور بخت کی اندرونی جیب ظہیر کی دی ہوئی رقم سے بھری پڑی تھیں۔ مگر ہم دونوں ابھی تک ان بڑے نوٹوں کو کہیں بھنا نہیں پائے تھے۔ ہمیں موقع ہی کہاں ملا۔ مگر ان چھوٹے دیہات قصبوں کے سڑک کنارے ہوٹلوں پر اتنے بڑے نوٹ بھنانا کسی کو بھی ہمارے بارے میں شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔

فقیروں کی گڈریوں سے پرانے جھنجھناتے سکے برآمد ہونے چاہئیں نہ کہ نئے بینک کی سیل بند نوٹوں کی گڈیاں۔ امارت کا بھی تو اپنا ایک چلن ہوتا ہے۔ اور ہم مفلوک الحال مٹی سے اٹے فقیر اُس چلن پر پورے نہیں اترتے تھے۔ لیکن میری بات چھوٹے ہوٹل کے بڑے دل والے مالک کو جیسے کوئی تازیانہ بن کر لگی۔ وہ دوڑتے ہوئے کاؤنٹر چھوڑ کر باہر آ گیا اور ہمارے پیچھے لپکا۔

"پیسے کس کمینے نے مانگے ہیں سائیں جی؟ میرے دل کی خوشی کی خاطر دو گھڑی بیٹھ جاؤ۔ چائے تو بس ایک بہانہ ہے جناب۔"

میں نے مجبور نظروں سے بخت خان کو دیکھا۔ اب ہمارے پاس آگے بڑھنے کا مزید کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ وہ ہمیں چھپر اور ٹین کی چھت والے ہوٹل کے اندر لے آیا۔ میں نے نسبتاً ایک تاریک گوشہ بیٹھنے کے لئے چنا۔ کاؤنٹر پر پڑے پرانے ریڈیو سے نور جہاں کی آواز فضا میں سُر بکھیر رہی تھی۔

"سیوں نے میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا....."

یہ نغمے، یہ گانے یہ موسیقی ہمارے اندر جانے کیسے کیسے گوشے ٹٹول کر ان سُروں کو ہمارے حسب حال بنا بنا دیتی ہے ہوٹل کا مالک بھی ہم سے یہی کہہ رہا تھا کہ آج تو اس کے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں کیونکہ گزشتہ تین دن سے وہ خواب میں یہی دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی فقیر کو نذر نیاز دے رہا ہے اور اس کے کاروبار میں برکت ہو رہی ہے۔ اگر اُسے پتہ چل جاتا کہ میں اور بخت جیل توڑ کر بھاگے ہوئے سزائے موت کے دو قیدی ہیں اور بخت خان کے نیفے میں اس وقت بھی حکیم یعقوب کا دیا ہوا ریوالور چھ گولی سے بھرا ہوا ہے تو کیا تب بھی وہ ہمیں اپنے کسی ایسے بابرکت خواب کی تعبیر سمجھ کر یوں ہماری خدمت کر رہا ہوتا؟

لیکن اگر کل کلاں کو کسی وجہ سے یا اتفاقاً اس کے ہوٹل کے کاروبار میں واقعی اضافہ ہو گیا تو وہ تو تمام عمر اسے ہم دونوں کے قدموں کی برکت کا فیض ہی سمجھتا رہے گا۔ اچانک مجھے ایک عجیب سا خیال آیا، ہماری حقیقت چاہے جو بھی تھی، بشیر ہوٹل والے بشیرے کے لئے تو ہم ہی اس کے خواب کی اصل تعبیر تھے۔ کون جانے قدرت نے ہمیں صرف اسی کی خاطر ہی بالے کے گاؤں میں ٹھیک اس کے ہوٹل کے سامنے اتارا ہو۔ اور مقدر نے اس کا رزق بڑھانے کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا ہو، ہمارا آنا صرف ایک بہانہ، کوئی اتمام حجت بھی تو ہو سکتا تھا۔ صرف بشیرے کو مطمئن کرنے کے لئے.....؟ گویا ساری بحث کا مختصر حاصل اتنا تھا کہ قدرت کے اپنے اصول اور اپنے قاعدے ہوتے ہیں۔ پھر چاہے کسی کو نوازنا ہو یا پھر کچھ کمی کرنی ہو، وہ سبب بنانے کے لئے ہم جیسے بہروپیے بھی کسی کے در پر بھیج سکتی ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے کے گھونٹ لیتے رہے اور بشیرا نیاز مندی سے ہم سے کسی اور خدمت کا پوچھتا رہا۔ تبھی نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان پر مطلب کا ذکر آ گیا، البتہ میرے لفظ محتاط رہے۔

"اپنے علاقے کے کسی نیک بزرگ سے دُعا کرواؤ سارے بیلی پور کے لئے..... سنا ہے اب اس علاقے

میں بھی ذرا ذرا سی بات پر قتل ہونے لگے ہیں۔ جس مٹی پر خون گرتا ہے اپنا اثر رکھتا ہے..... تو پھر بے برکتی کیوں نہ ہو گھر اور کاروبار میں.....'' میری بات سن کر بشیرے کو ایک جھٹکا سا لگا اور اس نے جذب کے عالم میں میرے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

''دیکھا..... میرا دل کہتا تھا کہ آپ دونوں کی اوپر کہیں سے لو لگی ہوئی ہے۔ بالکل سچ کہا آپ نے جناب..... جس دن سے اُس منحوس بالے کے سینے میں پٹواری کے بیٹے نے چھ گولیاں اتاری ہیں اور بالے نے تڑپ تڑپ کر یہیں میرے ہوٹل کے سامنے ہی جان دے دی، ٹھیک اُسی دن سے میرے کاروبار میں مندا شروع ہو گیا تھا..... ٹھیک کہتے ہو آپ..... جس زمین پر خون گرے، وہاں اثرات تو پھر ہوتے ہیں..... بس آپ دعا کرو میرے لئے کہ.....'' بشیرا جانے کیا کچھ بول رہا تھا جبکہ میرے دل و دماغ میں طوفانی جھکڑ سے چل رہے تھے۔ قدرت نے ہمیں ٹھیک اُسی مقام پر پہنچایا تھا جہاں مہرو کا مجرم مارا گیا تھا۔

بشیرے نے بتایا کہ اس روز بالا اور اس کے دو ساتھی یہیں اس کے ہوٹل کے باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے جب پٹواری نذیر کا بیٹا اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ قہر بن کر بالے پر ٹوٹ پڑا اور اس نے بالے اور اس کے دوستوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور پلک جھپکتے اپنے پستول سے گولیاں چلا کر بالے کو یہیں ڈھیر کر دیا۔ بالے کے دوسرے ساتھی بھی پٹواری کے دوستوں کی فائرنگ سے معمولی زخمی ہوئے اور ان میں سے ایک شوکت عرف شوکا زخمی حالت میں فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ مارنے والوں کی دشمنی صاف بالے سے تھی لہٰذا اُنہوں نے بھی شوکے کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے اپنی آواز کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی ''تو اب کہاں ہوتا ہے یہ شوکت..... میرا مطلب ہے شوکا.....'' بشیرے نے برا سا منہ بنایا۔

''ہونا کہاں ہے جی اس نے۔ یہیں کہیں بھٹک رہا ہوگا اپنے ڈیرے کے اردگرد..... شروع کے دو چار مہینے تو وہ بالکل ہی غائب ہو گیا تھا، پھر پولیس نے رحمان پور سے پکڑ لیا۔ سال بھر کی قید ہوئی تھی جی اسے، ابھی کچھ ہفتے پہلے ہی باہر آیا ہے۔ کہتا ہے کہ اس نے پرانے سارے دھندے چھوڑ دیئے ہیں۔ مگر سائیں جی میرا دل نہیں مانتا، وہ کہتے ہیں ناں..... چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے..... پر میں نے تو سختی سے اپنے سارے نوکروں کو منع کر دیا ہے کہ ان لوفروں کو دوبارہ اس طرف نہ بھٹکنے دیں۔ ان کا سرغنہ بالا تو مارا گیا اب جانے کہاں لفنگری کرتے پھرتے ہیں یہ سارے لوفر.....''

میں نے چائے ختم کر کے بخت خان کو اشارہ کیا۔ اور ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ گاؤں کی آبادی کے راستے میں پولیس تھانہ بھی پڑتا تھا، جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدموں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ شاید تھانے کی دیوار پر اندر ہم دونوں کی تصویریں بھی کسی اشتہاری مجرم کے خانے میں ٹنگی ہوں گی۔

شوکے کا ٹھکانہ ڈھونڈنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ واقعی اس علاقے میں کافی بدنام تھا۔ اور بدنامی کی شہرت بڑی تیزی سے پھیلتی ہے۔ اس کا گھر تو گاؤں کے مرکزی محلے میں تھا مگر پتہ یہ چلا کہ وہ رات گئے تک گاؤں سے باہر اپنے ڈیرے پر اپنی زمینوں کا حساب کتاب دیکھتا ہے اور رات دیر ہو جانے پر عموماً وہاں رک بھی

جاتا ہے۔ ہم دونوں نے شوکے کے محلے والی پرچون کی دوکان سے باتوں باتوں میں یہ بھی پتہ کرلیا کہ شوکت نہ صرف شادی شدہ ہے، بلکہ اس کی ایک چھوٹی بیٹی رانی اور بیٹا ٹیپو بھی ہے۔ دونوں بچے گاؤں کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ شام ڈھلنے تک میں اور بخت خان گاؤں کی چھوٹی سی جامع مسجد میں ہی ٹکے رہے۔ نماز تو ہم دونوں جیل میں بھی پڑھتے تھے مگر وہاں نماز پڑھتے مجھے کبھی اتنی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے ہماری طرف دیکھا۔

''اگر آپ لوگ یہیں آرام کرنا چاہیں تو میں مسجد کا حجرہ کھلوا دیتا ہوں۔ دراصل مسجد رات کو بند ہوجاتی ہے.....''

بخت خان کے منہ سے بے خیالی میں نکل گیا ''اللہ کا گھر بھی کبھی بند ہوتا ہے ملا صیب.....؟'' مولوی صاحب مسکرا دیئے۔

''ہاں خان صاحب..... یہ وقت دیکھنا بھی لکھا تھا اپنی قسمت میں، جب مسجدیں رات کو بند ہونے لگیں تو میکدے سرِشام کھلنے لگتے ہیں..... پر کیا کریں جناب..... سرکاری مسجد ہے..... اور رات کو دروازے پر تالا ڈالنے کا حکم ہے۔ بڑی شرمندگی سے بتانا پڑ رہا ہے کہ کھلی مسجد میں کئی بار چوری ہوچکی ہے۔ کبھی دریاں تو کبھی چٹائی۔ کبھی مٹکے تو کبھی لوٹے، جو ہاتھ لگے نیک بختوں کے..... وہ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ لیکن آپ دونوں مسافر لگتے ہیں..... میں شب بسری کا انتظام کروا دیتا ہوں حجرے میں.....''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ''نہیں مولوی صاحب..... ہمیں تو رات کو ہی اپنے سفر پر نکلنا ہے۔ آپ کوئی زحمت نہ کریں۔'' بخت خان نے خاموشی سے مسجد کے چندے والے ڈبے میں چند نوٹ ڈالے اور ہم مسجد سے باہر نکل آئے۔ رات پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ دور کھیتوں سے جھینگر اور ٹڈیوں کے ترانے کی آوازیں ایک مخصوص ردھم کے ساتھ سناٹے میں گونج رہی تھیں۔ میں بچپن میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ یہ حشرات، پرندے اور جانور وغیرہ، یہ اپنی بولی میں نہ جانے کیا بولتے ہوں گے.....؟ شاید رات کا کوئی گیت گاتے ہوں اپنی اپنی زبان میں..... ورنہ اتنا تسلسل اور ردھم کیسے ہوسکتا ہے ان کی بولی میں۔ بخت خان مجھ سے آگے دھند میں لپٹے اندھیرے میں بڑے بڑے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ اور حسب معمول خاموش تھا۔ خاموش لوگوں کی خاموشی کتنا بولتی ہے۔ یہ مجھے بخت خان سے مل کر ہی معلوم ہوا۔

شوکے کا ڈیرہ ڈھونڈنے میں ہمیں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ وہ ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں دیواروں کے ساتھ گائے بھینس باندھنے کے لئے آدھی لمبائی کی دیوار والے کمرے بنے ہوئے تھے۔ احاطے کے وسط میں ایک لکڑی کے پول کے ساتھ کمزور سا پیلا بلب جل رہا تھا۔ اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ احاطے کا دروازہ بند تھا مگر دیواریں نصف بلند تھیں جس سے چار دیواری کے اندر کا منظر نظر آرہا تھا۔ دور بنے ایک برآمدے میں تین کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ باتوں کی آواز انہی میں سے ایک کمرے سے آرہی تھی۔ بخت خان نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیسری دستک پر اندر سے کسی نے جھڑک کر کہا۔

''آرہا ہوں..... آرہا ہوں..... چھری تلے دم تو لو.....'' اور پھر کسی نے دھڑ سے لکڑی کے بڑے دروازے

کا پٹ کھول کر ہمیں گھور کر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ "ہاں..... بولو....."

"ہمیں شوکت سے ملنا ہے..... وہ یہیں ہے ناں..... شوکا....."

"ہاں..... استاد اندر ہے..... پر تم لوگ کون ہو.....؟ اس وقت استاد اپنی ترنگ میں ہوتا ہے جوگیو..... وہ کسی سے نہیں ملتا..... تم صبح آنا..... آٹا راشن دلوا دوں گا تمہیں....." آنے والا شاید شوکے کا کوئی ملازم یا احاطے کا چوکیدار تھا جو حسب معمول ہمارے حلیے، بڑھی ہوئی داڑھی اور الجھی لٹیں دیکھ کر باقی سب کی طرح ہمیں کوئی فقیر ملنگ ہی سمجھا تھا۔ اس دنیا میں فقیر بننا کتنا آسان ہے اور بادشاہ بننا کتنا مشکل۔ میں نے دھیرے سے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"صبح تک تو شاید ہم یہاں سے کوچ کر جائیں چوہدری صاحب..... اگر ملوا سکتے ہو تو ابھی ملوا دو، دعا دیں گے۔" میری زبان سے اپنے لئے اتنی تکریم سن کر اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"اچھا..... تم رکو..... میں کوشش کرتا ہوں....." وہ اندر چلا گیا اور چند لمحے بعد اس نے وہیں دور برآمدے سے آواز لگائی۔ "اندر آ جاؤ جوگیو..... شوکے استاد نے بلایا ہے....."

میں اور بخت خان اندر داخل ہو گئے، بخت خان کی تیز نظر آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی، مگر ہمیں وہاں کوئی تیسرا شخص دکھائی نہیں دیا۔ مزارعے نے ہمیں کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا اور خود ہمارے پیچھے اندر آ گیا۔

کمرے میں دھوئیں کی تیز بو تھی۔ جیسے کوئی بوٹی جلائی گئی ہو، وسط میں ایک بان کی چارپائی پر لیٹا مضبوط بدن اور بڑی مونچھوں والا شوکا اپنی سرخ آنکھیں لیے اور ہاتھ میں بھرا ہوا سگریٹ سلگائے ہمیں کچھ دیر غور سے دیکھتا رہا۔ اس کا مضبوط بدن اور چہرے پر چاقو کے گھاؤ کے پرانے نشان بتا رہے تھے کہ وہ کس قماش کا بندہ رہا ہوگا۔ پھر اس نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے کارندے سے بولا:

"اوئے میدے حرام خور..... یہ کن فقیر جوگیوں کو اٹھا لایا ہے۔ اب کیا یہ آدھی رات کو مجھے سانپ کا تماشہ دکھائیں گے یہاں..... جا..... لے جا انہیں..... کوئی روٹی ٹکر کھلا اور گودام میں سے چاول اور گڑ دے کر چلتا کر..... میرا نشہ نہ توڑ اس وقت....."

میدے نے ہمیں ہانکا۔ "چلو جی..... تم دونوں کو روٹی کھلاتا ہوں....." میں نے غور سے آنکھیں بند کیے شوکے کی طرف دیکھا "شاید ہمارے پاس کوئی بڑھیا نشہ ہو تمہارے لئے..... بات سن لو ہماری....." شوکے نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر جانے کیا سوچ کر زور سے ہنس پڑا۔

"اچھا یہ بات ہے..... تو پہلے بتانا تھا ناں..... دکھاؤ..... کیا لائے ہو..... پر بوٹی کھری ہونی چاہیے..... ورنہ ایک ٹکہ نہیں دوں گا....." میں نے میدے کی طرف دیکھا۔ شوکے نے جلدی سے میدے کو کسی کام سے لگایا۔ "چل میدے..... تب تک تو ذرا ایک کڑک سی دودھ پتی تو بنا لا ہمارے لئے..... دروازہ بند کرتا جائیں۔" میدہ اشارہ سمجھ کر کمرے سے باہر کھسک گیا۔ میں نے بخت خان کو اشارہ کیا۔ وہ شوکے کی طرف بڑھا، شوکے نے شوق سے پوچھا "لگتا ہے کوئی نایاب شے لائے ہو جوگی جی....."

''ہاں..... بہت نایاب ہے..... لیکن پہلے تم یہ بتاؤ..... بالے کی موت سے ایک رات قبل ساتھ والے گاؤں سے جو لڑکی اٹھائی تھی..... وہ کہاں ہے.....؟'' میری بات سن کر شوکے کو جیسے کوئی بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور اس نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن تب تک بخت خان اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے شوکے کی کلائی پر ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے نیفے سے ریوالور نکال لیا۔ شوکے میں بڑی جان تھی۔ اس نے زور لگا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور بخت خان کے دوسرے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کے لئے اس کی کلائی توڑنے کی نیت سے پورا وزن ڈال دیا۔ بخت خان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ضرور اس حملے کی تکلیف سے گھبرا کر اپنا ہاتھ تڑوا بیٹھتا۔

مگر وہ بخت خان تھا جو جیل میں آٹھ دس قیدیوں کی مشقت کا بوجھ اکیلے اٹھا لیتا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے شوکے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے فولادی ریوالور کی ایک زوردار ضرب شوکے کی کن پٹی پر لگائی۔ شوکے کی چیخ نکل گئی اور خون کی ایک پتلی لکیر اس کے کان کے پیچھے سے بہہ نکلی۔ اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا پالا کسی عام شخص سے نہیں پڑا، وہ تکلیف سے کراہا۔

''کون ہو تم لوگ..... میں نے پرانے سارے دھندے چھوڑ دیئے ہیں۔ میری بات مان لو'' اتنے میں شور اور چیخ کی آواز سن کر گھبرایا ہوا میدا دوڑتے ہوئے اندر آیا اور بخت خان کو شوکے کے سر پہ پستول تانے دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے۔ بخت خان نے اسے وہیں دروازے کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میدا شوکے کی حالت دیکھ کر وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ بخت خان نے میری طرف دیکھا۔

''دروازہ اندر سے بند کر دو عبداللہ خاناں..... ان دونوں کا قبر ہم ادھری بنائے گا.....'' میں نے آگے بڑھ کر دروازے کو کنڈی لگا دی۔ شوکے کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔

''مجھے مار کر کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔ کوئی سودا کرنا ہے تو بولو.....''

میں نے شوکے کی طرف دیکھا۔ ''سودا تو ہم نے کر لیا ہے میرے دو ساتھی تمہارے گھر کے باہر ہیں اس وقت.....''

شوکا چلایا۔ ''نہیں..... میرے گھر والوں کو اگر کسی نے ہاتھ لگایا تو.....'' شوکے نے اٹھنے کی کوشش کی، بخت خان نے دوسرا کرارا ہاتھ اسے رسید کیا۔ مجھے شوکے کے شانے کی ہڈی چٹخنے کی آواز آئی۔ وہ کراہ کر دوبارہ بیٹھ گیا۔

بخت خان غصے سے بولا ''تمہارا بھی تو ایک لڑکی ہے ناں..... دوسروں کا لڑکی اٹھاتے وقت اس کا خیال نہیں آیا تم کو خدائی خوارا..... ابھی اگر تمہارا رانی کو ہمارا ساتھی اٹھا کر لے جائے تو..... تم کیا کرے گا.....'' شوکا ہمارے بھرم میں آ گیا تھا۔ اس نے واقعی یہ سمجھ لیا تھا کہ ہمارے گروہ کے کچھ دوسرے لوگ اس وقت اس کے گھر کے باہر کھڑے ہمارے اشارے کا انتظار کر رہے ہیں۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ، پیسہ، زیور، گہنے زمین..... سب کچھ نام کرتا ہوں ابھی..... بولو.....'' میں بخت خان کو ایک طرف ہٹا کر شوکے کے سامنے پڑے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''یہ سب کچھ میں تمہیں دے دوں گا، یہ بتا دو کہ تمہارے جگری دوست بالے نے مرنے سے ایک رات قبل

جو لڑکی اٹھائی تھی..... وہ اس وقت کہاں ہے..... ہم اسے لینے کے لئے آئے ہیں..... لے کر واپس چلے جائیں گے..... اور یہ بھی وعدہ ہے کہ تمہارا نام اس معاملے میں نہیں آئے گا۔ اگر تم نے واقعی برے کاموں سے توبہ کر لی ہے..... تو تمہارے لئے کفارے کا یہ آخری موقع ہے..... اسے ضائع مت کرو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمہارے گھر کے باہر کھڑے ہمارے ساتھی زیادہ انتظار نہیں کریں گے....."

ہم نے شوکے سے جو جھوٹ بولا تھا۔ اس پر مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی سچ اگلوانے کے لئے شاید کچھ جھوٹ ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ شوکے جیسا بندہ کبھی اتنی آسانی سے ہمارے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا اگر اسے اپنے گھر والوں کو نقصان پہنچنے کا خوف نہ ہوتا۔ انسان اپنی چوٹ برداشت کر لیتا ہے، اپنوں کی نہیں.....

"میں سچ کہہ رہا ہوں..... میں نے سارے پرانے دھندے چھوڑ دیئے ہیں....." بخت خان نے ریوالور کی لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھا کر آخری بار پوچھا۔

"وہ لڑکی کدھر ہے خانہ خراب..... ہم صرف تین تک گنے گا۔ پھر نہیں پوچھے گا کوئی سوال..... ایک..... دو..... تین....."

شوکا چلایا..... "ٹھہرو..... وہ لڑکی....." اسی وقت ساتھ والے کمرے میں کوئی آہٹ ہوئی۔ ہم سب نے گھبرا کر اس جانب دیکھا۔

..........*

باب14

شوکے نے کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی ہی تھی کہ اسی لمحے برآمدے کی جانب باہر کوئی آہٹ ہوئی۔ بخت خان نے ریوالور سے دروازے کے قریب بیٹھے میدے کو اشارہ کیا، میدے نے آواز لگائی۔

''اوئے کون ہے باہر؟'' باہر کوئی مزارع یا راکھا تھا۔ ''غلام نبی ہوں سرکار..... پانی لگا دوں جا کر کھیتوں کو..... باہر دوسرے راکھے بھی انتظار کر رہے ہیں.....''

میدے نے جھڑک کر جواب دیا ''ہاں ہاں..... لگا دو اور اب تنگ نہ کرنا..... استاد آرام کر رہا ہے.....'' باہر کھڑا بندہ واپس پلٹ گیا۔

میں نے شوکے سے پوچھا ''ہاں بولو..... مگر جلدی.....'' شوکے نے ایک گہری سانس لی۔ یہ سچ ہے کہ بالے نے اس رات رحیم گڑھ سے ایک لڑکی اٹھائی تھی۔ مگر بالے کے ڈیرے پر پہنچ کر پتہ چلا کہ اس کی معشوق نے اس کے ساتھ ہاتھ کر دیا..... اور اپنی جگہ کسی اور لڑکی کو بھیج دیا تھا۔ گڑبڑ تو وہ بھی بڑی سوہنڑی تھی پر بالا بڑے طیش میں تھا۔ وہ تو اسی رات دوبارہ وہی گھر ٹاپنے جا رہا تھا۔ ہم نے ہی بڑی مشکل سے اسے روکا کہ پہلے اس گڑبڑ کا تو کچھ فیصلہ کرے۔ پھر جب اس لڑکی نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار کی منگ ہے اور اس کا باپ بھی اچھا خاصا زمیندار ہے تو بالے کو چھاپے کی فکر پڑ گئی اور اس نے راتوں رات اپنے بندوں کے ذریعے لڑکی کو بڑے شہر پار کروا دیا..... وہاں اس کی پرانی طوائف سے جان پہچان تھی جہاں بالا کبھی کبھار گانا سننے جایا کرتا تھا۔ لڑکی کو وہیں پہنچایا تھا اس کے کارندوں نے..... چندا کہتے ہیں سب اسے اُس بازار میں..... بالے کا منصوبہ تھا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو پھر اس لڑکی کے کچھ اچھے دام وصول کریں گے چندا بائی سے..... مگر اگلے روز ہی پٹواری کے لڑکے نے بالے کو بھرے بازار میں پھڑکا دیا۔ میں بھی زخمی ہوا مگر مجھے فائر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، دو چار مہینے قریب ہی ایک دوست کے ڈیرے پر چھپا رہا تھا۔ پولیس نے اُسی رات ہمارے سارے گروہ کو بالے کے ڈیرے سے گرفتار کر لیا تھا۔ صرف میں ہی گرفتاری سے بچا تھا۔ پھر میں بھی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ مقدمہ چلا اور مجھے اٹھارہ مہینے کی قید لگ گئی۔ جیل میں ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ باہر نکل کر یہ سارے غلط دوست اور دھندے چھوڑ دوں گا۔ بس یہ بوٹی پینے کی لت نہیں چھوٹی۔ ورنہ اب پکی توبہ کر لی ہے میں نے.....'' ہم دم بخود شوکے کا بیان سنتے رہے۔

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ میرے اندر دُکھ کی ایک شدید لہر نے سر اٹھایا۔

''اور مہرو..... مطلب وہ لڑکی..... اس کا نہیں کیا تم میں سے کسی نے بعد میں.....'' شوکے نے نظریں

جھکا لیں۔

''باقیوں کا تو پتہ نہیں..... پر میں نے کبھی نہیں پوچھا کسی سے، کیونکہ چندا سے صرف بالے کا ہی رابطہ تھا۔ ہم سب تو اجنبی تھے اس کے لئے۔ چندا ہمیں کیوں منہ لگاتی بالے کی موت کے بعد..... اور پھر اس لڑکی کے پیچھے جانے کا مطلب تھا علاقے کے بڑے جاگیرداروں سے دشمنی مول لینا اور ایک اور کیس اپنے گلے میں ڈالنا..... پھر سال ڈیڑھ گزر چکا تھا ہم سب کو قید اور جیل سے باہر آئے..... بہت کچھ بدل چکا تھا اتنے عرصے میں.....''

شوکا اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا مگر میرے اندر کا شور بڑھتا گیا۔ بخت خان نے میری طرف دیکھا کہ اب ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟ شوکا اس کی آنکھوں میں چھپی وحشت کی تحریر پڑھ کر گھبرا گیا۔

''میرا یقین کرو..... اس لڑکی کے اغواء میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ یہ سب بالے کا کیا دھرا تھا جس کی اسے سزا بھی مل گئی۔ میں نے بھی جیل میں اپنے گناہوں کی سزا کاٹی ہے۔ اب میں اپنے بچوں کو پالنا چاہتا ہوں، مجھے بخش دو.....''

میں نے ایک گہری سانس لی اور شوکے کو دوبارہ چندا کا پتہ دہرانے کو کہا اور شہر، سڑک اور گلی کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر لیا اور جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

''ہم فی الحال یہاں سے جا رہے ہیں لیکن یاد رکھنا، اب تم، تمہارا گھر، ٹھکانہ اور ہر پتہ ہماری نظر میں رہے گا۔ اگر تمہاری بتائی ہوئی کوئی بھی بات جھوٹ نکلی تو اس بار کوئی رعایت نہیں ہو گی تمہارے ساتھ..... آج کے بعد جب بھی اپنی بیٹی رانی کو دیکھنا..... تو ہر بار اس باپ کی مالی کو ضرور یاد کرنا جو تم لوگوں کی وجہ سے در بدر اور رسوا ہو گئی.....''

میں نے بخت خان کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہم شوکے اور حمید ے کو وہیں کمرے میں ہکا بکا اور پشیمان چھوڑ کر ڈیرے سے باہر آ گئے۔ آسمان پر بادل جمع ہو کر برسنے کی تیاری میں تھے۔ بخت خان جانتا تھا کہ اب ہماری منزل چندا کا شہر ہے۔ لیکن اس مرتبہ اس کے لہجے سے بے تحاشہ الجھنیں جھلک رہی تھیں۔

''اب اس بدنصیب کو ادھر لانے کا کیا فائدہ عبداللہ خاناں..... وہ مل بھی گیا تو یہ لوگ زندہ درگور کر دے گا اس کو۔'' بخت خان کے خدشات درست تھے۔ ہمارا معاشرہ جرم کی نوعیت جانے بنا سزا دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ داغ دیکھتا ہے، داغ والی کی وجہ نہیں دیکھتا..... میں نے بخت کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ہم نے ایک ماں سے اس کی بیٹی کو ملانے کا وعدہ کیا ہے خان..... اور بیٹی ہر حال میں ماں کے لئے بیٹی ہوتی ہے۔ ماں، مگیتر، بیوی مجنبہ ہو تو شاید مرد کی نظر میں وہ کبھی اپنا رتبہ کھو بھی دے..... پر ایک ماں کے لئے اس کی بیٹی کا رتبہ ہمیشہ وہی رہتا ہے..... تم صرف ایک ماں کی کھوئی ہوئی بیٹی کے بارے میں سوچو.....'' بخت خان نے گہری سانس لی اور میرے پیچھے چل پڑا۔

اس بار ہم دونوں نے ایک دوسرے سے الگ ہو کر سفر کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ہم دونوں کو ایک ساتھ بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا اور اگر کسی مخبری کی نوبت آتی تو دو اشخاص کا ذکر کیا جاتا جو ایک ساتھ دیکھے گئے تھے۔ لہٰذا اب ہمارا ایک دوسرے سے فاصلے پر رہ کر چلنا ضروری تھا، گاؤں کے چھوٹے سے اور بدحال اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں اور یکا یک موسلا دھار بارش نے آس پاس سب کچھ جل تھل کر کے رکھ دیا۔ بخت

خان کی طرح میرا دل بھی اس سے جدا ہوتے ہوئے ڈوب رہا تھا۔ مگر منصوبے کے تحت اسے گاؤں کے بس اڈے سے بس پکڑ کر شہر پہنچنا ضروری تھا۔ ہم دونوں پلیٹ فارم سے پہلے پٹڑیوں کے ویران گوشے میں تھوڑی دیر کو رُکے۔ بارش کی تیز بوچھاڑ ہمارے چہرے بھگو رہی تھی، شاید بارش ہم دونوں کے آنسوؤں کا بھرم قائم رکھنے کے لئے ہی برسی تھی۔

"اپنا خیال رکھنا بخت خان..... بس ٹرین سے پہلے شہر پہنچے گی اور میں دو دن بعد پرسوں شام کو تمہیں شہر کے اسٹیشن کے باہر ملوں گا۔ کسی سے زیادہ بات مت کرنا اور بس میں بھی اندر بیٹھنے کے بجائے چھت پر کوئی جگہ پکڑ کر سفر کرنا، راستے میں شاید ایک آدھ جگہ پولیس کا ناکہ بھی آئے گا۔ مگر وہاں اپنے حواس اور غصے کو قابو میں رکھنا، فی امان اللہ....." میں نے بخت خان سے ہاتھ ملایا تو اس نے جھپٹ کر مجھے گلے لگا لیا۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا عبداللہ خاناں..... ٹرین میں زیادہ خطرہ ہے..... زندگی رہا اور مقدر میں ہوا تو پھر ملیں گے....." بخت خان نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی اور پھر ایک جھٹکے سے مجھ سے علیحدہ ہو کر نظر ملائے بغیر بارش میں بھیگی ریلوے لائن پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بوندوں کی جل تھل میں اوجھل ہو گیا۔ شاید زندگی کا دوسرا نام جدائی ہے۔ ہم صرف بچھڑنے کے لیے اس دنیا میں آتے ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی، بچے، دوست رشتے دار محبوب اور رقیب..... سب ایک ایک کر کے ہم سے بچھڑ جاتے ہیں۔ ہم کسی کو روک نہیں پاتے اور پھر جب قدرت کی طرف سے ملا بچھڑنے کا کوٹا پورا ہو چکتا ہے تو ہمارا بھی وقت رخصت آجاتا ہے۔ گویا زندگی کی تعریف کیا ہے.....؟ بس بچھڑنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ماریو یوزو اپنے ناول "گاڈ فادر" میں ایک جگہ کہتا ہے کہ "یہ دنیا جائے ذلت ہے..... یہاں عزت و تکریم کی اُمید اور خواہش مت کرو..... انسان اس دنیا میں صرف بے عزت ہونے کے لئے ہی آتا ہے....." لیکن میں اس تیز برسات میں کھڑا بخت خان کو دور جاتے ہوئے دیکھ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ دنیا جائے ذلت ہو یا نہ ہو مگر بچھڑنے کا پلیٹ فارم ضرور ہے۔ مسلسل جدائی، کرب، اذیت اور دکھوں کی آماجگاہ ہے یہ دنیا۔ دور کہیں اُفق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی، بارش کی رفتار مسلسل تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ جو صبحیں بارش میں طلوع ہوتی ہیں وہ "صبح تر" ہوتی ہیں۔ کچھ زیادہ دھلی، زیادہ نکھری، کچھ زیادہ ملائم..... یعنی کچھ زیادہ صبح..... میں انہی خیالات میں گم کھڑا تھا کہ دور بجتی کسی گاڑی کی سیٹی نے میری سوچیں منتشر کر دیں۔ ٹرین کی دو بڑی اور تیز زرد ہیڈ لائٹس دور پٹڑیوں پہ جیسے بارش میں تیرتی ہوئی بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے پلیٹ فارم کے کونے پر بنے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی طرف قدم بڑھائے۔ اندر بیٹھا ٹکٹ بابو آرام کرسی سے ٹیک لگائے مزے سے سو رہا تھا۔ جیسے ساری ٹرین کی بچی ٹکٹیں وہ رات کو ہی فروخت کر چکا ہو۔ شاید اسی کیفیت کو کبھی کسی نے گھوڑے بیچ کر سونے سے تشبیہ دی ہوگی۔

تیسری بار کھڑکی پر دستک ہوئی تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تب تک گاڑی بھی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ میں نے اسے فیض آباد کا ٹکٹ کاٹنے کا کہا مگر جب تک میں ٹکٹ لے کر گاڑی کی طرف پلٹا ٹرین نے سرکنا شروع کر دیا تھا۔ میرے پاس درجہ دوئم کا ٹکٹ تھا مگر تیز بارش اور رفتار پکڑتی ٹرین نے بوگیوں کی تخصیص مشکل بنا دی تھی۔ اوپر سے زیادہ تر ڈبوں کے مسافر دروازے اندر سے بند کیے پڑے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اور

کہتے ہیں صبح کی نیند تو کسی محبوبہ سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ میں تیز بھاگتا، پلیٹ فارم پر جمع بارش کے پانی میں چھپ چھپ کرتا، چھینٹے اڑاتا، دوڑتی ہوئی بھیگی ٹرین میں اپنا ڈبہ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا مگر سوائے ایک دروازے کے باقی سب دروازے مجھے بند ملے اور میں مجبوراً اسی آخری بوگی میں سوار ہوگیا۔

میرے سارے کپڑے اور جسم کو لپیٹنے والی سیاہ شال پانی سے بھیگ کر شرابور ہو چکی تھی۔ چند لمحے وہیں راہداری میں کھڑے رہ کر میں نے اپنے حواس بحال کئے اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں کسی اعلیٰ درجے کی فرسٹ کلاس A.C سلیپر بوگی ٹائپ ڈبے میں سوار ہوگیا ہوں۔ کمپارٹمنٹ کی سجاوٹ قدیم طرز کی مگر بہت نفیس تھی۔ راہداری میں پرانے طرز کی کھڑکیاں اور فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جبکہ راہداری کی چھت میں مناسب وقفوں سے روشنی کے لئے بنائے گئے بلب شیڈز میں سے جلتی مشعل کے طرز کے چھوٹے چھوٹے قمقمے پیلی روشنی کے دائرے بنا رہے تھے۔

سارے ڈبے میں ایک عجیب بھینی سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ایک جانب قطار میں پانچ یا چھ چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ بنے ہوئے تھے اور سبھی کے دروازے بند تھے۔ میں نے طے کیا کہ اگلا کوئی اسٹیشن آنے تک یہیں راہداری میں ہی بیٹھا رہوں گا اور جیسے ہی گاڑی آگے کہیں کچھ زیادہ دیر کے لئے رکی میں اپنے درجے کے ڈبے میں چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی میرا اس اعلیٰ درجے کی عمدہ سجاوٹ والے نفیس بوگی میں ہونا اس ڈبے کی شان کے خلاف تھا۔ ٹرین تیزی سے بارش میں دوڑی جا رہی تھی۔ میں قالین کو بھگونے کے خدشے سے پاؤں سکیڑ کر وہیں راہداری کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کمپارٹمنٹ میں ایک عجیب سی خاموشی تھی، بولتی خاموشی۔

وہ خاموشی جو ہمیشہ کچھ بتانے کی کوشش کرتی ہے اور وہ جو خاموشی کی بولی سن سکتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ شور خاموشی کا ہی ہوتا ہے۔ اچانک سامنے والے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور اندر سے تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ہونٹوں سے پائپ کا دھواں اُگلتے ایک بوڑھے شخص نے باہر جھانک کر میری طرف دیکھا۔ ''ہے لسن بوائے (Hey listen boy)..... یہ ڈائننگ کار والا لڑکا ابھی تک کافی لے کر کیوں نہیں آیا.....؟'' میں اچانک پڑی اس افتاد سے گھبرا سا گیا۔

''جی..... پتہ نہیں..... میں خود مسافر ہوں.....؟'' بوڑھے نے لمبا کش لیا۔

''مسافر ہو تو باہر کاریڈور میں کیوں بیٹھے ہو..... اندر آجاؤ..... تم تو پورے بھیگ چکے ہو.....'' میں نے جلدی سے عذر تراشا۔

''نہیں جناب..... دراصل میرے پاس کم تر درجے کا ٹکٹ ہے..... گاڑی چل پڑی تھی اس لئے میں جلدی میں اسی ڈبے میں چڑھ گیا۔'' بوڑھے نے لاپرواہی سے سر جھٹکا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میری اطلاع کے مطابق اب بہت دیر تک کوئی رُکنے والا اسٹیشن نہیں آنے والا..... یہاں بیٹھ کر ٹھٹھرنے سے بہتر ہے کہ تم ہمارے کمپارٹمنٹ میں آجاؤ جہاں معقول حدت ہے، اور میرے ساتھی پروفیسر فیضی بھی تمہیں کمپنی دینے کے لئے موجود ہیں..... چلو آجاؤ شاباش.....'' میں نے حیرت سے اس اعلیٰ لباس اور نفیس اطوار والے ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھا۔ اسے جیسے میرے فقیرانہ حلیے اور ظاہری حقیقت سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔

تیسری بار میں انکار نہیں کر پایا اور اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ بوگی میں صرف وہ دو ہی شخص تھے۔

''ان سے ملو..... یہ ہیں پروفیسر فیضی..... میرے یار غار اور مجھے لوگ پروفیسر صدیقی کے نام سے جانتے ہیں..... اکبر صدیقی.....'' میں سلام کر کے چپ چاپ ایک جانب سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میرا نام عبداللہ ہے..... اور مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے کہ میری وجہ سے آپ دونوں کو یہ زحمت اٹھانا پڑی.....'' صدیقی صاحب نے سنی اَن سنی کر کے شفقت سے کہا:

''ریلیکس..... فیک اِٹ ایزی.....'' پروفیسر فیضی نے بھی مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر سے اپنے انگریزی میگزین میں غرق ہو گئے۔ ان دونوں کے قیمتی لباس، سگار اور پائپ کے اعلیٰ تمباکو کی خوشبو، کمرے میں پھیلی دھیمی سی خواب ناک روشنی اور باہر برستی بارش کا شور..... یہ سب مل کر ماحول کو مزید دلفریب بنا رہے تھے۔ فیضی صاحب نے سر اُٹھایا۔

''بھئی صدیقی..... تمہاری کافی نہیں آئی ابھی تک..... اس خوبصورت بارش میں کافی بنا سفر گویا کوئی جرم مسلسل ہو.....'' صدیقی صاحب نے الجھن میں سر جھٹکا۔

''دس ریلوے وِل نیور اِمپروو..... This Railway will never improve..... پھر سے بزر دیتا ہوں ڈائننگ کار کو.....'' صدیقی نے ایک جانب لگا بٹن دبایا اور پھر فیضی صاحب کی طرف پلٹے۔

''ہاں..... تو تم کیا کہہ رہے تھے فیضی..... اس کائنات میں بھی ہر مخلوق کا اپنا ایک علیحدہ ٹائم زون یعنی (وقت کا دائرہ) ہے.....؟'' فیضی صاحب نے رسالہ رکھ دیا۔

''ہاں..... بالکل ..... اور میں یہ ثابت بھی کر سکتا ہوں کہ ایک ہی وقت میں پائی جانے والی الگ الگ مخلوقات الگ الگ وقت کے دائرے میں سفر کرتی ہوں..... یا زندہ ہیں..... اب جنات کو ہی لے لو، اس مخلوق کا ذکر تو ہماری الہامی کتاب قرآن میں بھی آیا ہے ناں ضروری تو نہیں کہ وقت کے جو اوقات ہم انسانوں کے لئے مقرر کیے گئے ہیں..... وہی پیمانہ جنات پر بھی لاگو ہوتا ہو.....؟ مثلاً وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ ہی لے لو۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ صبا کا تخت پیش کرنے کا حکم دیا تو ایک جن نے اسے پلک جھپکنے کے وقفے میں اٹھا لانے کا دعویٰ کیا اور لے بھی آیا۔ حالانکہ وہ تخت ہزاروں میل دور کسی اور سلطنت میں موجود تھا۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ جنات کسی الگ ٹائم زون Time zone میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور جو سفر انسان ہفتوں مہینوں میں طے کرتا ہے وہ پل بھر میں طے کر سکتے ہیں.....''

میں حیرت سے ان دو بزرگوں کی یہ بحث سن رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھے یہاں بلا کر اب میری موجودگی سے ہی بے خبر ہو گئے ہیں۔ صدیقی نے فیضی صاحب کے لئے نیا سیگار نکالا۔ اسے سامنے پڑے کٹر سے کاٹا اور بڑی تہذیب سے فیضی کو پیش کیا۔ فیضی صاحب نے سگار سلگایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنات روشنی کی رفتار سے خلا میں سفر کرتے ہیں۔ جبکہ انسان اپنے اس جسم کی معذوری کی وجہ سے قاصر ہیں کیونکہ یہ جسم اس رفتار کی حد سے بہت پہلے ہی جل چکا ہوگا.....'' صدیقی صاحب سوچ میں گم آواز میں بولے۔

''بجا فرمایا..... مگر انسانوں کے بارے میں بھی تو مختلف ٹائم زونز میں چلے جانے کی مثالیں قائم ہیں۔ مثلاً اصحاب کہف..... جن کے لئے اس غار کا ٹائم زون بدل دیا گیا جس میں وہ سو رہے تھے۔ ان کی چند گھنٹے کی نیند باقی زمانے پر قریباً ساڑھے تین سو برس بن کر گزری اور جب ان کا ایک ساتھی باہر کھانا لینے نکلا تو زمانہ بدل چکا تھا..... اسی طرح ایک پیغمبر علیہ السلام کے اپنے سو برس تک آرام کو چند گھڑی کا آرام سمجھ کر اُٹھنا اور قریب ہی اپنی سواری کا ڈھانچہ پڑے دیکھنا..... جبکہ ان کا کھانا ابھی گرم تھا۔ اور پھر سب سے بڑی مثال، واقعہ معراج..... یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ مختلف کائناتوں کے لئے مختلف ٹائم زون مقرر کیے گئے ہیں۔ کبھی ہمارے ہاں کے وقت کے حساب سے کچھ پل ہی گزرتے ہیں مگر انسان دوسرے زمانوں کی سیر کر کے پلٹ آتا ہے اور کبھی ہماری دنیا میں صدیاں بیت جاتی ہیں مگر دوسری کائنات یا ٹائم زون کے پیمانے پر صرف چند گھنٹے یا ایک رات گزری ہوتی ہے.....'' تبھی میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''شاید اسی لئے انسان برسوں سے کوئی ایسی مشین بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ جس میں بیٹھ کر وہ آسانی سے اپنے اس جسم بوسیدہ کو کسی دوسرے ٹائم زون یا زمانے میں لے جا سکے۔'' دونوں بوڑھوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''بہت خوب..... بڑی دُور کی کوڑی لائے ہو میاں..... ٹائم مشین کی ایجاد اَب زیادہ دور نہیں ہے..... مگر قدرت نے اس معاملے میں بھی انسان سے کوئی ناانصافی نہیں کی۔ ہر انسان کو ایک ٹائم مشین عطا کی گئی ہے جس میں وہ مختلف زمانوں کی سیر کرتا ہے، اجنبی وادیوں اور چہروں کو دیکھتا ہے..... ایک پل کے ہزارویں حصے میں دنیا کے کسی دوسرے سرے پر پہنچ سکتا ہے۔ نئے موسم جھیلتا ہے، نئے ذائقے چکھتا ہے..... اور جانتے ہو وہ ٹائم مشین کیا ہے..... تمہارے خواب..... تم خواب میں جو دنیا دیکھتے ہو..... وہ بھی کہیں وجود رکھتی ہوگی ناں..... کیونکہ جو موجود نہیں ہے..... اس کا خواب یا تصور بھی محال ہے.....'' اتنے میں کسی نے ڈبے کے دروازے پر دستک دی۔ صدیقی نے متانت سے آواز لگائی۔

''پلیز کم ان.....'' میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا تو گرم کافی، سینڈوچز اور سینکس والے انگریزی ناشتے کی مہک پورے ڈبے میں پھیل گئی، آنے والا شاید ڈائننگ کار کا کوئی ویٹر تھا۔ مگر اس کی یونیفارم مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی، ایسی وردیاں میں نے بہت پہلے کسی فلم پوسٹر پر دیکھی تھیں۔ اور شاید فلم کا نام ''اورینٹ ایکسپریس Orient Express'' تھا مگر وہ چمکیلی سجی سجائی وردی ویٹر کے جسم پر بہت جچ رہی تھی۔ اس کی کیپ بھی پرانے طرز پر سفید اور نیلے رنگوں سے بنی ہوئی تھی۔ ویٹر نے سر جھکا کر ہم تینوں کو سلام کیا اور کافی پیالوں میں ڈالنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے اس اعلیٰ درجے کے ڈبے میں ان امراء کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ضرور ناک بھوں چڑھائے گا۔ سوال کرے گا یا کم از کم اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تو نمایاں ہوں گے، مگر وہ بڑی تعظیم کے ساتھ مسلسل مسکراتا رہا۔ فیضی صاحب نے اسے روک دیا۔

''ٹھیک ہے..... تم جاؤ..... ہم کافی خود بنالیں گے..... اور ہاں..... اتنی اچھی کافی اور ناشتے کے لئے شکریہ.....'' بیرے نے سر جھکا کر ہمیں تعظیم دی اور ڈبے سے پلٹ گیا۔ میری حیرت بڑھتی گئی۔ پروفیسر فیضی نے کافی

بنائی اور سب سے پہلے مجھے پیش کی۔ برسوں کے بعد اتنی عمدہ گرم کافی کی مہک محسوس کرتے ہی میرے اعصاب بیدار ہونے لگے۔ میں نے اس کافی کی مہک پہلے بھی کہیں محسوس کی تھی، ہاں..... پاپا کے لئے ہمارا ہیڈ بٹلر کبھی کبھی پاپا کی خاص فرمائش پر یہ کافی بنایا کرتا تھا جو پاپا اپنے لئے کہیں باہر سے منگوایا کرتے تھے۔ مگر وہ بلینڈ تو پاپا کے کہنے کے مطابق بہت پرانا تھا اور دنیا میں شاید چند ہی جگہوں پر اس قدیم کافی کا ذخیرہ باقی بچا ہو۔ پھر اس لوکل ریل گاڑی کی ڈائننگ کار کے باورچی خانے میں اتنی عمدہ اور مہنگی کافی کہاں سے آئی ہوگی۔ ضرور بر ریضی یا صدیقی نے ویٹر کو خود اپنے سامان سے دی ہوگی کہ بنا لائے۔ میں نے کافی کا دوسرا سپ ہی لیا تھا کہ اچانک دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی..... صدیقی صاحب نے پوچھا:

''کون ہے بھئی.....'' باہر سے آواز اُبھری۔ ''پولیس.....'' میرے ہاتھ میں پکڑے مگ سے کافی چھلک گئی۔

..........*

باب 15

پروفیسر صدیقی اور فیضی صاحب نے پولیس کا نام سن کر حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''پولیس کا یہاں کیا کام.....؟''

میں نے آنے والے وقت کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا۔ مجھے یہ اطمینان تو تھا کہ اگر میں پکڑا بھی گیا تو بخت خان مہرو کی تلاش جاری رکھے گا۔ ہم دونوں نے اسی لئے ایک جگہ اور ایک ہی گاڑی سے سفر نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی ایک اگر اس لمبے سفر کے دوران پولیس کے ہتھے چڑھ بھی جائے تو دوسرا کسی اور سمت سے اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ فیضی صاحب نے ناگواری سے کہا:

''آجاؤ بھئی..... دروازہ کھلا ہے.....'' میں نے غیر محسوس طریقے سے خود کو چادر میں ڈھانپنے کی کوشش کی اور اسی لمحے دروازہ کھلا۔ ایک پولیس افسر اور ٹکٹ چیکر اندر داخل ہوئے۔ افسر نے پروفیسر حضرات کو خندہ پیشانی سے سلام کیا۔

''معذرت چاہتا ہوں، اس سہانی صبح میں آپ لوگوں کے ناشتے میں دخل اندازی کی۔ لیکن ہمیں خبر ملی ہے کہ کچھ جرائم پیشہ افراد اس گاڑی میں سفر کررہے ہیں..... چیک کرنا ضروری تھا.....''

صدیقی صاحب نے ہنس کر فیضی صاحب کی طرف دیکھا ''ہاں..... جرائم پیشہ سفر تو کررہے ہیں۔ مگر ہمارا جرم صرف اتنا ہے کہ ہم دونوں اپنی دنیا سے بنا کسی کو بتائے چند لمحے چرا کر اس سفر پر نکلے ہیں۔ یہ بارش، یہ گاڑی، یہ پٹڑیوں کی جھنکار، یہ سفر اور ہم تینوں..... آپ چاہیں تو اس جرم میں گرفتار کرسکتے ہیں ہمیں.....''

صدیقی کی بات پر پروفیسر فیضی بھی زور سے ہنس پڑے۔ ''ہاں بھئی..... جرم تو ہمارا واقعی بہت بڑا ہے.....''

پولیس افسر بھی ان کی زندہ دلی پر مسکرا دیا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میری سانسیں اٹکنے لگیں۔ افسر نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''آپ کی تعریف.....؟'' مجھ سے پہلے صدیقی صاحب بول پڑے۔ ''بھئی کہا ناں..... ہم تینوں ساتھ ہیں.....'' میں نے دھیرے سے جواب دیا ''میں عبداللہ ہوں.....'' ٹکٹ چیکر نے میرا ٹکٹ دیکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو پروفیسر فیضی بول اُٹھے ''بھئی ان کے پاس اس ڈبے کا ٹکٹ نہیں ہے عبداللہ میاں کو جلدی میں ٹرین پکڑنی پڑی..... تم یوں کرو..... ان کا اسی ڈبے کا ٹکٹ بنا دو..... میں اضافی رقم دے دیتا ہوں.....'' میں نے پروفیسر کے ہاتھ اس کی

جیب کی طرف بڑھتے دیکھ کر جلدی سے کہا "نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... پیسے ہیں میرے پاس....." میں نے جلدی سے گنے بغیر کچھ رقم ٹکٹ چیکر کے حوالے کردی۔ اس نے میرا نیا ٹکٹ بنا دیا اور ٹکٹ اور بقیہ رقم میرے حوالے کی جو میں نے بنا گنے جیب میں ڈال دی۔

پولیس والا جاتے جاتے پلٹا..... "دروازہ ٹھیک سے اندر کی طرف سے بند کر لیجئے گا۔ اور کوئی ایمرجنسی ہو تو یاد رکھیے گا کہ پولیس کی پوری پلاٹون آپ کی حفاظت کے لئے ساتھ سفر کر رہی ہے۔

ٹکٹ چیکر نے مڑتے وقت عجیب نظروں سے مجھے دیکھا "میں نے آپ کا ٹکٹ عبداللہ کے نام سے ہی بنایا ہے....." اور پھر وہ مسکرا کر پلٹا اور ڈبے سے نکل گیا۔ مجھے اس کی نظروں نے الجھن میں ڈال دیا۔ جیل کے ریکارڈ میں میرا نام ساحر درج تھا کیونکہ میرے تعلیمی ریکارڈ اور شناختی کارڈ میں یہی نام لکھوایا گیا تھا۔ مگر ٹکٹ چیکر کی نظروں میں چھپی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ جیسے اُسے میرے دونوں ناموں کا علم ہو۔ نہیں نہیں..... اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت اُس پولیس والے کو میری حقیقت بتا دیتا۔ مگر وہ چپ رہا، اور وہ افسر؟ اس پولیس والے نے بھی تو زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی مجھے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ نہ ہی اُس نے میری کوئی شناخت چیک کی اور نہ میرے حلیے اور بنا ٹکٹ سفر کرنے پر کوئی اعتراض کیا۔ شاید وہ پروفیسر فیضی اور صدیقی صاحب کی بارعب شخصیت سے متاثر ہو گیا ہو.....؟ میں خود اپنے ذہن میں سوال بُنتا اور پھر خود ہی اُن کے جواب گھڑتا رہا۔ باہر ابھی تک تیز بارش ہو رہی تھی اور کھڑکی سے باہر کے تمام منظر دھندلائے ہوئے سے تھے، جیسے کوئی خواب ہو۔

اندر کمپارٹمنٹ میں بلب کی پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ باہر راہداری سے لے کر یہاں اندر کمرے تک پوری بوگی کی سجاوٹ ہی قدیم طرز پر کی گئی تھی۔ جیسے کبھی پچاس یا ساٹھ کی دہائی میں یہ ٹرینیں چلتی ہوں گی۔ آج کل تو ویسے بھی نت نئے تجربوں کا دور ہے۔ شاید ٹرین کی انتظامیہ نے بھی اپنی کسی گولڈن جوبلی یا سو سال پورے ہونے پر اس ڈبے کو کسی قدیمی ٹرین گاڑی کی طرز پر سجا رکھا تھا..... انسان اندر سے ہمیشہ ماضی پرست رہا ہے۔ اسے گزرا ہوا وقت ہمیشہ سے دلکش لگتا ہے اور ماضی اسے اپنی جانب کھینچتا ہے۔ جانے یہ کیسا سحر ہے کہ لوگ اپنے ماضی یا کسی گزرے دور کا ذکر آتے ہی ٹھنڈی آہیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ شاید ہماری روح کو پچھلے زمانوں کا سفر پسند ہے۔ تبھی تو آج کل یہ بڑی کمپنیاں اور مشہور برانڈ ماضی کی کسی کلاسیکل تھیم یا موضوع کو لے کر اپنی تحریک یا مشہوری کی مہم چلاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی بنائی اشیاء کو پسند کریں اور خریدیں۔

پروفیسر فیضی نے تازہ کافی مگوں میں انڈیلی، پھر وہی مخصوص بھینی خوشبو ڈبے میں پھیل گئی۔ صدیقی صاحب نے مجھے کھوئے دیکھ کر جیسے میرے دل کا چور پکڑ لیا۔

"لگتا ہے تمہیں اس کافی کی خوشبو پسند ہے۔ دونوں مرتبہ تم نے گہرہ سانس لے کر اس مہک کو اپنے اندر اُتارنے کی کوشش کی....." اس بزرگ کی نظر اور مشاہدہ واقعی بہت تیز تھا۔

"جی..... مجھے یہ مہک میرے ماضی کی کسی سنہری وادی میں لے جاتی ہے..... کچھ میٹھی یادیں....." پروفیسر فیضی میری بات سن کر دھیرے سے مسکائے۔

"تم نے ٹائم مشین کا ذکر کیا تھا ناں..... تو دیکھو قدرت کی ایک اور ٹائم مشین..... یہ مہک، یہ خوشبو.....

ہمیں پل بھر میں ماضی کے اسی لمحے میں پہنچا دیتی ہیں..... جہاں ہماری حس کا پہلی مرتبہ ان سے پالا پڑا ہوتا ہے۔ بس ذرا دھیان ہی دینے کی ضرورت ہے۔ آپ خود کو ٹھیک اسی جگہ موجود پاتے ہیں۔ ٹھیک ایسی ہی کچھ صفت موسیقی میں بھی پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی پرانی یا ماضی کی سنی ہوئی دھن ایک لمحے میں زمانوں کے سفر طے کر کے آپ کو آپ کے ماضی میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسانی دماغ خود یہ سب یادیں، خوشبوئیں، پل اور دھنیں اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے اور وقت پڑنے پر ہمیں کسی پچھلے زمانے میں پہنچا دیتا ہے.....''

میں غور سے پروفیسر کی یہ مسحور کن گفتگو سن رہا تھا، وہ ٹھیک کہہ رہے تھے، اور میرے ساتھ کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ خاص طور پر جلتے ہوئے کوئلے کی مہک اور دھواں ہر بار مجھے میرے ماضی اور میرے بچپن کی گلابی وادیوں میں کھینچ لے جاتا تھا، جب ہمارے پہاڑ والے گھر کی چھت پر سردیوں میں ڈھیروں برف گرا کرتی اور چھت کی چمنی سے یہی دھواں اپنی ایک خاص مہک لئے ساری فضا میں پھیل جایا کرتا تھا۔ میں ان دونوں کی گفتگو سننے میں اس قدر مگن تھا کہ کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا کہ اس خواب انگیز ماحول، اس ڈبے اور باہر برستی بارش کے علاوہ بھی کچھ اور باقی ہے میری زندگی میں۔ اور وہ دونوں بھی کچھ عجب مردِ آزاد تھے کہ ان دونوں میں سے کسی کو میرے حلیے اور بدحال شخصیت یا فقیری سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ ایسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں کی کوئی پہچان ہو۔ اور میں بھی اس تمام عرصے میں خود کو جیل توڑ کر بھاگے ہوئے ایک سزائے موت کے قیدی کے بجائے ان کا کوئی ہمدم دیرینہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کسی کی اپنائیت محسوس کرنے کے لئے پرانی شناسائی کی شرط کا پورا ہونا ضروری تو نہیں..... کچھ اجنبی بھی ہمارے دیرینہ شناسا نکلتے ہیں۔ ہاں مگر قسمت میں ہمارا ایسے اجنبیوں سے سامنا ذرا کم ہی لکھا ہوتا ہے۔

ٹرین تیزی سے ویرانوں میں دوڑ رہی تھی، مگر باہر کا منظر ابھی تک کھڑکی کے شیشے پر جمی بھاپ کی وجہ سے واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں ابھی تک اُسی ''وقت میں سفر'' کرنے کی بحث میں مصروف تھے۔

صدیقی صاحب بولے ''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو انسان بہت جلد وقت میں سفر کرنے کے قابل ہو جائے گا.....؟''

''بالکل..... اس میں کوئی شک نہیں۔ ہاں البتہ کچھ پیچیدگی باقی رہے گی شروع میں..... مثلاً یہ کہ کچھ سیاروں کے وقت کا دورانیہ اس دنیا سے بہت تیز یا زیادہ ہوگا۔ جیسے وہاں کے چند لمحے کرہ ارض کے کئی سال کے برابر ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی وہاں تھوڑا سا وقت گزار کر واپس آئے گا تو یہاں زمین پر اس کے ہم عمر شاید اپنی عمر کی ایک دہائی پوری کر چکے ہوں گے..... اس فرق پر قابو پانے میں کچھ وقت لگے گا انسان کو.....''

صدیقی صاحب نے گہرا سانس لیا..... ''ہم م م..... اور یہ جو آج کل ٹائم ٹریولر Time Travellers یعنی وقت میں سفر کرنے والے انسانوں کے بارے میں مختلف تھیوریز Theories آ رہی ہیں۔ کیا تم ان پر یقین کرتے ہو فیضی.....؟''

''ہاں..... ایسا ممکن ہے کیونکہ ابھی کچھ مثالیں تو میں نے بیان کی تھیں۔ اصحاب کہف کا وہ ساتھی جو بازار کھانا لینے کے لئے اس زمانے کے لوگوں کے درمیان موجود تھا، وہ ان لوگوں کے لئے ایک ٹائم ٹریولر ہی تو تھا۔ جو

پرانے زمانے سے وقت کا سفر کرتے ہوئے صدیوں کی منزلیں طے کر کے آیا تھا۔ شرط بس پہچان کی ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے آس پاس بھی ایسا ہی کوئی وقت میں سفر کرنے والا موجود ہو۔ مگر ہم اسے پہچان ہی نہ پائے ہوں..... اور میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ خود اسی دنیا میں ابھی تک چند ایسے گوشے، جگہیں یا خطے موجود ہیں جہاں وقت رُکا ہوا ہے۔ معلق ہے یا پھر بہت سست یا پھر بہت تیز رفتار ہے..... اب یہ ہمارے نصیب یا ہماری جدوجہد پر منحصر ہے کہ ہم زمین کے اس خاص خطے یا ٹکڑے تک پہنچتے ہیں کہ نہیں..... ہوسکتا ہے وہ جگہ اصحاب کہف والا غار ہی ہو۔ یا کوئی اہرام مصر..... یا کسی سمندر کی تہہ میں چھپا کوئی کارویڈور..... یا برمودا کی تکون.....''

صدیقی صاحب پروفیسر کی بات سن کر عجیب انداز میں مسکرائے ''یا پھر کوئی ویران پلیٹ فارم یا پرانی ٹرین.....'' دونوں ہنس پڑے۔ میں نے ان کی ہنسی میں ایک عجیب سا تاثر محسوس کیا۔

اور پھر اچانک میرا سر بھاری ہونے لگا، مجھے لگا جیسے کافی میں کوئی نشہ آور دوا ملی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر مجھے سارا ڈبہ گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر ایک زوردار چکر نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ میں چکرا کر گرا اور پھر نہ جانے کب میری آنکھ کھلی تو ٹرین کسی پرہجوم اسٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ میرا سر ابھی تک بری طرح چکرا رہا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور پلیٹ فارم پر بنے ٹھیلوں پر گیس کے بڑے بڑے ہنڈولے روشن کر دیئے گئے تھے۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی مگر یہ کیا، یہ وہ ڈبہ تو نہیں تھا جس میں میری ملاقات پروفیسر فیضی اور صدیقی صاحب سے ہوئی تھی۔ یہ تو کوئی ڈاک کا ڈبہ لگتا تھا۔ چاروں طرف خاکی رنگ کی بوریاں بکھری پڑی تھیں جن میں خط بھرے ہوئے تھے۔ ڈبے کا فرش بوسیدہ اور گھاس پھونس اور تنکوں سے اٹا پڑا تھا۔ پرانے ڈبے کی کھڑکیاں لکڑی کے تختے لگا کر بند کر دی گئی تھیں لیکن درمیان میں کھلی درزیں تھیں جن سے باہر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ میں حیرت سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ جانے میں وہاں کیسے پہنچا تھا۔ میں تو کسی اور ڈبے میں سوار ہوا تھا جو بہت عالیشان تھا۔ جہاں وہ شائستہ اور نفیس طبیعت دو بزرگ مجھے ملے تھے۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میں چکر کھا کر گرا تھا۔ اور اس وقت بھی میرے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اچانک باہر سے کسی نے ڈاک ڈبے کا دروازہ کھولا اور دو اہل کار اندر داخل ہوئے۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''اوئے..... کون ہے تو..... اور ادھر کیا کر رہا ہے.....؟'' مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ دوسرا بولا۔ ''ضرور چوری کرنے آیا ہوگا.....''

''نہیں..... میں چور نہیں ہوں..... اور یہاں چوری کرنے لائق کچھ بھی نہیں.....'' وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

''پھر ضرور بنا ٹکٹ چھپ کر سفر کر رہا ہوگا..... ہے ناں؟''

''نہیں..... ٹکٹ بھی ہے میرے پاس.....'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر گزشتہ روز کا خریدا نچلے درجے کا ٹکٹ دکھایا۔ ٹکٹ دیکھ کر دونوں اچنبھے میں پڑ گئے ''اوئے بادشاہو ٹکٹ بھی ہے تو پھر اپنے ڈبے میں بیٹھنا تھا ناں.....

یہاں کہاں کھمل خوار ہو رہے ہو۔ یہ تو ڈاک کا پرانا ڈبہ ہے۔ اچھا اب چلو..... ٹلو ادھر سے..... یہ آخری اسٹیشن ہے..... ابھی اسٹیشن ماسٹر صاحب نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ہماری شامت آجائے گی....."

میں نے چکراتے سر کے ساتھ ڈبے کے در و دیوار پر آخری نظر ڈالی۔ تبھی مجھے کھڑکی کے قریب ڈبے کے اندرونی دیواروں پر کیا گیا سرخ رنگ کچھ اُکھڑا سا نظر آیا اور اس کے نیچے کوئی پرانا ہلکا سبز اور پیلا رنگ جھلکتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں..... میں نے پروفیسر فیضی اور صدیقی صاحب کے ساتھ جس ڈبے میں سفر کیا تھا اس کا رنگ بھی تو اندر سے کچھ ایسا ہی تھا۔ مگر مجھے یہ ماجرا کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں ڈبے سے نیچے اترا تو سامنے ہی ایک بزرگ بندہ اسٹیشن ماسٹر کی وردی میں کھڑا مجھے گھورتے ہوئے نظر آیا.....

"کون ہو تم..... اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی "غلطی سے اس ڈبے میں سوار ہو گیا تھا جناب..... مسافر ہوں....."

میں نے دو قدم آگے بڑھائے، پھر جانے کیا سوچ کر میں دوبارہ پلٹا۔ اسٹیشن ماسٹر ابھی وہیں کھڑا میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سینے پر لگی نام کی تختی پر انگریزی میں جاوید لکھا ہوا تھا۔

"جاوید صاحب..... اگر برا نہ مانیں تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ ڈاک کا ڈبہ کتنا پرانا ہے.....؟ میرا مطلب ہے کہ کیا یہ بوگی ہمیشہ سے ڈاک ڈبے کے طور پر استعمال ہوتی آئی ہے؟"

میرا سوال سن کر وہ چونک سا گیا۔

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو.....؟ ویسے پچھلے بائیس سال سے تو میں یہاں تعینات ہوں۔ جونیئر کلرک بھرتی ہوا تھا۔ تب سے لے کر آج تک میں نے تو اس بوگی کو اسی حال میں ڈاک ڈبے کے طور پر ہی دیکھا ہے۔ البتہ بہت پہلے یہ ڈبہ کئی سال تک شیڈ میں کھڑا رہتا تھا۔ سنا ہے کچھ دہائیاں قبل یہ کسی نئی شاندار ٹرین کے سلیپر کمپارٹمنٹ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بڑی شاہانہ تاریخ ہے اس ڈبے کی۔ مگر اب تو یہ بھی برباد ہو گیا۔ باقی اثاثوں کی طرح....."

اسٹیشن ماسٹر جانے کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرے دماغ میں اتنا سن کر ہی جھکڑ سے چلنے لگے۔ اس کا مطلب جو کچھ میں نے دیکھا وہ صرف ایک خواب نہیں تھا۔ کبھی یہ ڈبہ واقعی خوبصورت سلیپر بوگی ہوا کرتا تھا۔ مگر وہ دونوں خوش لباس بزرگ، وہ ڈائننگ کار کا بیرا، وہ ٹکٹ چیکر اور پولیس والا.....؟ وہ سب کون تھے.....؟ کیا وہ بھی صرف میرے تخیل کی اڑان تھے یا بس ایک واہمہ؟ مگر اتنا مکمل وہم.....؟ اتنا سچا ہوا تخیل..... پھر اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا..... فیضی اور صدیقی آپس میں جنات کے وقت میں سفر کرنے کی بات کر رہے تھے۔ تو کہیں وہ سارے کردار بھی جنات ہی تو نہ تھے..... جنہوں نے اپنے سحر سے اس ڈبے کو کچھ دیر کے لئے وہی پرانا عالیشان کمپارٹمنٹ بنا کر مجھے دکھا دیا جو کبھی اس بوگی کی شاندار تاریخ تھی.....؟

مطلب میں بھاگتے ہوئے عجلت میں اُسی پرانے ڈاک کے ڈبے میں چڑھا تھا، مگر چند گھنٹوں کے لئے میری نظر بندی کر دی گئی اور مجھے جنات نے ہی وہ خواب انگیز ماحول دکھایا تھا..... یہ سوچ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ مطلب وہ سب پہلے جانتے تھے کہ میں کون ہوں اور انہوں نے بس مجھے اپنے ایک کھیل کا

حصہ بننے کی اجازت دی تھی۔ جو وہ شاید میرے ٹرین پر سوار ہونے سے پہلے کھیل رہے تھے.....؟ مگر اتنی پر مغز گفتگو، اتنے درست اور علمی حوالے..... وہ کافی..... وہ خوشبو.....؟ اور پروفیسر فیضی نے تو وقت میں سفر کرنے والے کچھ خاص لوگوں کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔

تو کیا وہ سب ٹائم ٹریولر Time travelller تھے۔ جو وقت کی سرنگ میں سفر کرتے ہوئے اچانک مجھ سے ٹکرا گئے تھے۔ مگر یہ سب مجھے ہی کیوں دکھائی دیا۔ یا پھر میں نے واقعی کوئی انتہائی مکمل اور ہر لحاظ سے جڑا ہوا خواب دیکھا تھا.....؟ جب سلطان بابا میرے ساتھ سفر کرتے تھے تب ایسی ان ہونیاں روز میرے ساتھ ہوا کرتی تھیں مگر ان کے جانے کے بعد اور خاص طور پر جتنا عرصہ میں جیل میں قید رہا، یہ معاملات قریباً رُک سے گئے تھے۔ تو پھر اچانک یہ سب دوبارہ سے کیوں شروع ہو رہا تھا؟ میں اُس پر ہجوم اور بہت سے پلیٹ فارم والے بڑے اور جدید ریلوے اسٹیشن کے مرکزی پلیٹ فارم پر کھڑا اپنی سوچوں کے ہجوم میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ہی کسی بھاگتے قلی کے زوردار دھکے سے گرتے گرتے بچا۔ کسی دوسرے پلیٹ فارم پر کوئی گاڑی لگ رہی تھی اور سارے قلی اپنے اپنے حصے کے روزگار کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

ماتھے پر محنت کا پسینہ، اور بالوں میں وقت کی دھول..... شاید ان کے حصے کی روزی انہیں یوں دوڑ کر ہی ملنی تھی۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی روزی خود دوڑتی ہوئی ان کے پاس آتی ہے۔ اور کتنے بڑے ناشکرے ہوتے ہوں گے ان میں سے وہ، جو پھر بھی اپنے رب کا ٹھیک سے شکر ادا نہیں کر پاتے۔ اسٹیشن کے بیرونی دروازے پر ایک ریلوے اہلکار باہر جانے والوں سے اُن کے استعمال شدہ ٹکٹ لے کر جمع کر رہا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنا ٹکٹ تھمایا اور دو قدم آگے بڑھا تبھی مجھے ایک خیال آیا اور میں نے تیزی سے اپنی ساری جیبیں الٹ کر رکھ دیں۔

گزشتہ روز میں نے ڈبے میں ٹکٹ چیکر سے ٹکٹ خریدا تھا اور اس نے کچھ رقم بھی مجھے واپس کی تھی، مگر ہزار بار جیبیں دیکھ لینے کے باوجود مجھے نہ تو وہ ٹکٹ ملا اور نہ ہی وہ واپس کی ہوئی رقم۔ میری اپنی رقم ابھی تک اُسی طرح بڑے نوٹوں کی گڈی میں بندھی رکھی تھی۔ اور اس میں سے کوئی بھی نوٹ کم نہیں تھا۔ میرا سر ایک بار پھر چکرا گیا۔ پروفیسر فیضی نے کہا تھا کہ دنیا میں آج بھی چند مقامات ایسے پائے جاتے ہیں جہاں وقت کی گردش تھمی رہتی ہے۔ تو کیا میں کل رات یا گزشتہ روز تک کسی ایسے ہی ماضی میں ٹھہرے لمحے کا حصہ بنا رہا تھا۔ میں جتنا سوچتا، یہ گتھی اتنی ہی الجھتی جا رہی تھی۔

اسٹیشن سے نکلتے ہی بالکل سامنے کچھ فاصلے پر چند پولیس اہلکار ایک پک اپ گاڑی کے گرد جمع تھے اور آنے جانے والوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے چہرے کو غیر محسوس طریقے سے مزید چھپا لیا اور بخت خان کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ منصوبے کے مطابق اس کو یہیں مجھ سے ملنا تھا۔ لیکن مجھے آس پاس سڑک کے گرد وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کہیں کوئی اَن ہونی نہ ہو گئی ہو۔ کہیں بخت خان کو پولیس نے گرفتار نہ کر لیا ہو.....؟ میرا وہاں زیادہ دیر رُکنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ بناء سامان کے کسی مسافر کو پلیٹ فارم سے

نکلتے دیکھ کوئی بھی پولیس والا شک میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے خود کو مسافروں کی نکلتی بھیڑ کے دھارے میں چھپائے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی تاکہ میں پولیس کی گاڑی سے دور جاسکوں لیکن تبھی سامنے سے آتے ایک اجنبی شخص نے غور سے میری طرف دیکھا اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تم.....تم عبداللہ ہو ناں؟''

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

❋.....❋.....❋

باب 16

میں نے گھبرا کر پولیس والوں کی طرف دیکھا کہ شاید ان میں سے کوئی ہو مگر وہ سارے وہیں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا وہ کوئی ٹیکسی والا تھا۔

''تم کو خان صاحب ٹیکسی میں بلا رہے ہیں اُدھر.....'' میں نے دور کھڑی ٹیکسی کی طرف دیکھا جو ایک نسبتاً نیم تاریک حصے میں اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی۔ وہ بخت خان ہی تھا۔ دور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر خود کو چادر میں لپیٹے۔ اُس نے ایک لمحے کو اپنے چہرے کو پورا واضح کیا..... ہاں وہی تھا۔ میں تیزی سے ٹیکسی کی طرف یوں لپکا جیسے کوئی بچھڑا کسی اپنے کے ملنے پر لپکتا ہے۔ ٹیکسی چل پڑی اور بخت خان نے مجھے گول مول لفظوں میں بتایا کہ وہ سرِشام ہی شہر پہنچ گیا تھا اور اس نے بس اڈے سے ٹیکسی لے کر سیدھے اسے اسٹیشن چلنے کا کہا۔ مگر ٹرین پلیٹ فارم پر لگنے کے بعد بھی جب میں بہت دیر تک باہر نہیں نکلا تو اسے پریشانی ہونے لگی تھی اور اگر میں مزید کچھ دیر تک باہر نہ نکلتا تو وہ میری تلاش میں پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی کا ہر ڈبہ کھنگالنے نکل چکا ہوتا۔

مجھے نڈھال دیکھ کر بخت خان نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر بولا۔ ''تم کو تو بخار ہے.....''

''نہیں بس سفر کی تھکن ہے..... تم وقت ضائع مت کرو، ہمیں یہاں سے سیدھے چندا کے ٹھکانے کی طرف چلنا چاہیے.....'' بخت نے بادلِ نخواستہ ٹیکسی والے سے کچھ کہا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ قریباً گھنٹہ بھر شہر کی پر پیچ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ ہمیں ایک پرہجوم بازار میں لے آیا۔ موتیا گلاب، گجرے کی دوکانیں، چمکتے در و بام، روشن بالکنیاں، سستے اور مہنگے عطر کی خوشبوئیں، فضا میں لالی اڑاتے پنواڑی، گھنگھروؤں کی جھنکار، لے، تان، طبلے کی تھاپ، تنگ گلیاں راستہ روکتے مرد، جھروکوں سے جھانکتی بے باک عورتیں، وہ بازار اپنی کہانی خود سنا رہا تھا اور آگے بڑھتے بخت خان کی زبان سے بار بار ایک جملہ نکل جاتا ''لاحول حول ولا قوۃ.....''

چندا کا ٹھکانہ ڈھونڈنے میں ہمیں زیادہ مشکل نہیں ہوئی۔ مرکزی سڑک سے پرے ایک بڑی سی گلی میں نکڑ پر اس کا کشادہ حویلی نما مکان موجود تھا۔ مرکزی دروازے پر دو گارڈز بڑے اور جدید ہتھیار لیے چوکنا کھڑے تھے۔ اندر صحن اور اوپر کی بالکونیوں میں خوب چہل پہل اور ہنگامہ دکھائی دے رہا تھا، گانا سننے کے لئے آنے والے تماش بین آ جا رہے تھے۔ ہمیں دروازے پر کھڑے محافظوں نے روک لیا۔

''کدھر جا رہی ہیں سواریاں؟ پہلی بار فقیروں کو ان کوٹھوں پر دیکھا ہے.....'' وہ دونوں ہمارے حلیے دیکھ کر

ہنس پڑے اور ایک دوسرے کو کہنی مار کر متوجہ کیا۔

میں نے تخل سے گارڈ کی طرف دیکھا "ہمیں چندا جی سے ملنا ہے....." وہ دونوں مجھ فقیر کی زبان سے چندا کا نام سن کر زور سے ہنس پڑے۔

"دیکھ لے ظفری..... اب ہم پر یہ وقت آ گیا ہے کہ بھک منگے بھی یہاں گانا سننے آنے لگے ہیں۔ جاؤ بابا..... معاف کرو..... دھندے کا ٹائم ہے۔ خیرات چاہیے تو صبح کے وقت آنا..... باقی بھکاریوں کے ساتھ۔"

بخت خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اور اس کا ہاتھ نیفے کی طرف بڑھا "او خانہ خراب..... تم کو ہم....."

میں نے جلدی سے بخت کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اندر بھی بہت سے مسلح محافظ صحن اور برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اس وقت جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت تھی، ٹھیک اسی وقت ایک نئے ماڈل کی بڑی کروزنگ ٹائپ گاڑی حویلی کے گیٹ کے قریب آ کر رکی اور اس میں سے چند اونچے طبقے کے ادھیڑ عمر افراد نیچے اترے۔ گارڈز نے ان تینوں کو دیکھتے ہی ہمیں دھکا مار کر ایک طرف کیا اور آنے والوں کے استقبال میں بچھ بچھ گئے۔

"ارے سیٹھ جمیل صاحب آئے ہیں..... آئیں جناب آئیں..... چندا آپا آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں....."

بخت خان نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے وہاں سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے نکڑ پر اپنے کیبن میں بیٹھا پنواڑی شاید بہت دیر سے ہمارا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا اُس نے ہمیں جاتے دیکھ آواز لگائی۔

"فقیروں کو پان پیش کر سکتا ہوں..... گر قبول ہو....."

پان والے کے کھوکھے پر "دلبر پان والا" بورڈ پر لکھا ہوا تھا اور دوکان کے اُسی بورڈ پر نام کے آگے سرخ رنگ کا ایک دل بنا ہوا تھا جس میں ایک سیاہ تیر پیوست تھا جس کے نیچے خون کے کچھ قطرے دل سے ٹپکتے دکھائے گئے تھے۔ ہم کیبن کے پاس رک گئے۔ مقصد پان کھانا نہیں تھا، میں اس باتونی پان والے سے کچھ سن گن لینا چاہتا تھا۔ دلبر نے جلدی سے دو پان بنائے۔

"اس علاقے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تم لوگوں کو، کیا نئے آئے ہو؟" میں نے بخت خان کی طرف دیکھا جو پان کھانے کی مشکل میں مبتلا تھا۔ ضرور اس کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

"ہاں..... ہمیں کسی کی تلاش ہے، اسی وجہ سے چندا سے ملنا چاہتے تھے....."

دلبر نے لمبی آہ بھری۔ "جناب یہ چندا پہلے زیب النساء تھی۔ اس سے ملنا اتنا آسان کہاں۔ بڑے ٹھسے والی عورت ہے ایروں غیروں کو تو گھاس بھی نہیں ڈالتی۔ میں نے تو بڑے بڑے عاشق اس کے در پر پڑے دیکھے ہیں۔ وہ تم لوگوں سے بھلا کیوں ملے گی۔ یہاں تو ہر وقت مالدار سیٹھ اور حکومت کے وزیر پھیرا ڈالتے رہتے ہیں۔ چندا کے پاس تو ان سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔"

دلبر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہمارا یوں براہ راست ملنا ناممکن تھا..... اور اس کے اردگرد اتنے پہرے تھے کہ ہم زبردستی اندر گھس بھی جاتے تو تھوڑی دیر میں علاقے کی پولیس وہاں پہنچ چکی ہوتی۔ جو ہمارے حق میں بہت برا ثابت ہوتا۔ دلبر نے مشکوک لہجے میں دھیرے سے مجھ سے پوچھا۔ "ویسے تمہیں تلاش کس کی ہے.....؟ یہاں بھلا تم جیسوں

کا کیا کام.....؟"

"میں نے گہری سانس لی، بس یوں سمجھو کہ کوئی اپنا کھو گیا ہے۔ اور اس کا آخری سرا اس بدنام گلی تک ملتا ہے..... اُسی کو ڈھونڈ رہے ہیں....." دلبر نے یوں سر ہلایا جیسے نہ سمجھتے ہوئے بھی سب سمجھ گیا ہو۔

میں نے جیب سے ظہیر کی دی ہوئی کچھ رقم نکالی اور دلبر کے ہاتھ پر رکھ دی" کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو۔ کام نیکی کا ہے۔ اور ہماری نیت صاف ہے....." دلبر نوٹ دیکھ کر زور سے چونکا اور اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا اور مجھے رقم لوٹانے کی کوشش کی.....

"ارے نہیں نہیں..... میں تم سے بھلا پیسے کیسے لے سکتا ہوں..... مانا کہ پان بیچتا ہوں مگر دل بہت بڑا ہے میرا اس چھوٹی دوکان سے..... کبھی میں بھی تمہاری طرح دل کا بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ بہت روپیہ پیسہ کمایا..... مگر پھر ایک عشق میں سب برباد کر دیا..... انہی گلیوں میں اس کے پیچھے سب لٹا دیا۔ مگر اُسے کوئی اور امیر زادہ اپنے ساتھ لے اُڑا..... اور میں یہیں پان بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ ان گلیوں میں صرف ایک سکہ چلتا ہے سرکار..... سونے کا سکہ..... ہیرے جواہرات ہیں جیب میں تو ہر دروازہ کھلا ملے گا تمہیں..... ورنہ ہر در سے دھتکارے جاؤ گے....." دلبر بولتے بولتے جذباتی ہو گیا۔ جانے کب کا غبار اس کے اندر بھرا تھا جو آج ہمیں یوں چندا کے دروازے پر بے عزت ہوتے دیکھ کر باہر نکل آیا تھا۔ میں نے روپے دلبر کی جیب میں زبردستی ڈال دیئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔ مگر گلی سے نکلنے سے پہلے ہی دلبر دوڑتا ہوا ہمارے پیچھے آ گیا۔

"چندا کی ایک شاگرد ہے رقاصہ، اندر حویلی میں ہی رہتی ہے، خدمت گار ہے چندا کی۔ کبھی کبھار محفلوں کے لئے پان بنوانے آتی ہے میری دوکان پر نوکروں کے ساتھ..... فیروزہ نام ہے اُس کا۔ تم کہو تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں، اچھے دل کی لڑکی ہے۔ مگر شاید کسی مجبوری کی وجہ سے اس بازار میں آ بیٹھی ہے....." مجھے اُمید کی ایک کرن دکھائی دی۔

دلبر نے مجھ سے پوچھا" مگر تم لوگوں کو میں ڈھونڈوں گا کہاں.....؟ اگر اچانک وہ آ گئی دوکان پر پان لینے....." میں نے دلبر سے کہا۔ فی الحال تو ہمارا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ کہیں بھی رات بسر کر لیں گے۔ فقیروں کو بھلا آشیانے کی کیا ضرورت.....؟"

دلبر نے کچھ دیر سوچا" یہاں پچھلی سڑک پر ایک بزرگ کا مزار ہے۔ مزار کیا ہے، چھوٹی سی کٹیا اور ذرا سا صحن ہے۔ یہ عورتیں وہاں ہر جمعرات دیا جلانے جاتی ہیں۔ سنا ہے کہ وہ بزرگ انہی عورتوں کی اصلاح کے لئے کسی زمانے میں یہاں آ بیٹھے تھے۔ اگر تم لوگ چاہو تو اس خانقاہ میں ٹھہر سکتے ہو۔ وہاں لنگر بھی بٹتا ہے روزانہ، میں اس کے نگران کو جانتا ہوں۔ دو چار دن وہیں رک جاؤ۔ مجھے بھی آسانی ہو جائے گی تم لوگوں سے ٹھیک وقت پر رابطہ کرنے میں....."

مجھے اور بخت خان کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہمیں تو ویسے بھی سر چھپانے کے لئے ایسے ہی کسی مقام کی ضرورت تھی۔ دلبر نے ہماری رہنمائی کی اور دو گلیاں پار کر کے ہم اس پیپل کے گھنے درخت تلے بنی چھوٹی سی کٹیا نما خانقاہ کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ کٹیا کی منڈیر پر چند بوسیدہ سے چراغ جل رہے تھے۔ جانے لوگ ان خانقاہوں

اور درگاہوں پر آ کر یہ دیئے کیوں جلاتے ہیں؟ مجھے تو ایسی ہر درگاہ پر آ کر اپنا دل بجھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ شاید یہ نا اُمیدوں کے لیے اُمید کا کوئی اشارہ ہوا کرتا ہو؟ جن کے اپنے اندر دل کے چراغ بجھ گئے ہوں وہ آ کر یہاں منڈیروں پر رکھے دیئے جلایا کرتے ہوں گے.....؟

بخت خان صحن کے کچے فرش پر کمر ٹکائے ہی لمبی تان کر سو گیا۔ جبکہ حسب معمول مجھے ابھی ستاروں سے بہت سے سوال جواب کرنا باقی تھے۔ یہ آج کی بات تو نہیں تھی۔ ہمارا یہ حساب کا پیریڈ تو ہر رات چلتا تھا۔ جمع، تقسیم، ضرب اور نفی..... مگر حاصل ہمیشہ صفر..... ہر رات کی طرح میں اسے آسمان کے تاروں میں کھوجتا رہا اور وہ چاند میں بیٹھی مسکاتی رہی۔ جانے وہ کیسی ہوگی.....؟ کہاں ہوگی.....؟ اسے میرے جیل سے فرار کی خبر تو مل چکی ہوگی۔ اور شاید اسی طرح وہ ہر رات میرا انتظار بھی کرتی ہوگی..... مگر نہیں..... میں نے تو خود اسے اس کی نئی زندگی کی شروعات کرنے کی قسم دلائی تھی۔ اسے تو اس وقت اپنے ہم سفر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ وہ دونوں اس خنک رات میں اپنی بالکونی میں بیٹھے گرم کافی کی چسکیاں لیتے، انہی ستاروں کو دیکھ کر باتیں کر رہے ہوں گے..... فجر کی اذان کے ساتھ ہی اِکا دُکا لوگ خانقاہ پر آتے جاتے پھولوں کی چادر وغیرہ چڑھا گئے۔ ساتھ والی گلی میں ہی تو پھولوں کی بہت سی دوکانیں تھیں۔ حیرت ہے جو پھول رات کو کسی پری چہرہ کے قدموں میں نچھاور کیے جاتے ہوں گے، انہی پھولوں کی بچی ہوئی چادریں صبح ان مزاروں پر چڑھا دی جاتی ہیں۔ پھولوں کی مرضی البتہ کوئی نہیں پوچھتا.....

اگلے روز دلبر ہم سے ملنے آیا تو اُس کی آواز میں جوش تھا۔ ''میری فیروزہ سے بات ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے میں آج شام ہی اسے یہاں لے کر آؤں..... اسے ویسے بھی پیری فقیری پر بڑا یقین ہے، کہہ رہی تھی میں ضرور چلوں گی تمہارے ساتھ..... بس تم لوگ تیار رہنا اور کہیں یہاں وہاں نہ نکل جانا.....'' اور پھر شام کو واقعی دلبر ایک سیاہ برقعے والی لڑکی کے ساتھ خانقاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ لڑکی نے شاید اپنا چہرہ چھپانے کے لئے خود کو برقعے میں ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے قبر والے کمرے میں دعا پڑھی اور کچھ نذر چڑھائی۔ واپسی پر وہ اور دلبر میرے سامنے آ بیٹھے۔ لڑکی بولی تو آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... چندا آپا آرام کر رہی ہیں۔ میں بس ذرا دیر کے لئے ہی حویلی سے نکلی ہوں..... وہ اٹھتے ہی سب سے پہلے میرا نام پکاریں گی۔ کسی اور کے ہاتھ کا کام انہیں پسند نہیں آتا.....''

میں نے وقت ضائع کیے بغیر فیروزہ کی آنکھوں میں جھانکا ''کچھ عرصہ قبل بالے نامی تماش بین نے یہاں مہرو نام کی ایک لڑکی بھیجی تھی۔ وہ اب کہاں ہے..... کیا تم ہمیں ملوا سکتی ہو.....'' مہرو کا نام سنتے ہی فیروزہ کو جیسے کوئی کرنٹ سا لگا اور اس نے گھبرا کر اپنے پاؤں سمیٹے جیسے خانقاہ کی زمین سے کوئی بچھو نکل آیا ہو۔

''سائیں جی آپ..... آپ مہرو کو کیسے جانتے ہیں.....؟'' میں نے باہر کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں میں نے بخت خان کو پہرے پر بٹھا رکھا تھا۔ ''بس یوں سمجھو کہ میں بھائی ہوں اس کا..... اسے لینے کے لئے آیا ہوں..... اس کی ماں اس کے غم میں پاگل ہو چکی ہے اور باپ..... باپ دُنیا ہی چھوڑ کر چلا گیا.....''

فیروزہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی پلکیں بھیگ چکی تھیں'' اور اُس کا محبوب..... وہ کہاں ہے..... وہ مہرو کے غم میں دیوانہ نہیں ہوا ابھی تک؟'' میں زور سے چونکا، اس کا مطلب فیروزہ مہرو کے حالات سے اچھی طرح واقف

تھی۔

''جب تم نے مہرو کا نام لیا ناں سائیں جی..... تو میں سمجھی تھی کہ آخر کار وہ آ ہی گیا جس کا آخر تک مہرو کو انتظار تھا۔ مہرو کا جوئی، بنجارہ..... اس کا محبوب منگیتر..... بولو..... وہ کیوں نہیں آیا اپنی مہرو کو لینے کے لئے..... مہرو تو اس کا انتظار کرتی رہ گئی..... اور مہرو کا تو کوئی بھائی نہیں تھا..... تم کون ہو.....؟'' فیروزہ کی آنکھوں میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے۔ مجبوراً میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ مہرو کے باپ کرم داد سے پرانی جان پہچان تھی ہماری کی حوالے سے..... اور اسی نے جیل میں پھانسی لگتے وقت مہرو کو تلاش کرنے کی درخواست کی تھی ہم سے۔

فیروزہ نے اپنے آنسو پونچھنے کی ناکام کوشش کی ''مہرو اب یہاں نہیں ہے سائیں جی..... اسے کوئی اپنے ساتھ لے گیا ہے..... بہت دور.....'' مجھے لگا ہم صحرا میں چلتے چلتے کنارے سے پہلے ہی دوبارہ کوئی غلط موڑ مڑ گئے ہیں۔ فیروزہ نے بتایا کہ مہرو کو جس رات بالے کے کارندے چندا کے ٹھکانے پر چھوڑنے آئے تو اُس رات شدید بارش ہو رہی تھی اور چندا کے کچھ خاص مہمان بھی حویلی میں مدعو تھے۔ مہرو کو فیروزہ والے کمرے میں ہی پہنچایا گیا تھا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی اور لگاتار روئے جا رہی تھی۔ فیروزہ نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر مہرو کسی طرح ہاتھ چھڑا کر کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ شاید وہ وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر اس بیچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس حویلی کی بھول بھلیوں سے باہر نکلنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ فیروزہ مہرو کو روکنے کے لئے اس کے پیچھے لپکی مگر تب تک مہرو راہداریوں میں دوڑتی ہوئی مرکزی ہال میں پہنچ چکی تھی جہاں اس وقت چندا کے کچھ خاص..... مہمانوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔

مہرو روتی ہوئی محفل کے آداب کے خلاف اچانک ہی دھڑ سے دروازہ کھول جب سب مہمانوں کے درمیان پہنچی تو محفل میں سناٹا سا چھا گیا، سازندوں نے گھبرا کر اپنے ساز روک دیئے اور چندا کا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کی ایسی گستاخی معاف نہیں کی تھی اور اس کی جلاد خادمائیں ذرا ذرا سی بات پر گانے والی لڑکیوں کی کھال کھینچنے کے لئے چمڑے کے ہنٹر لیے تیار بیٹھی رہتی تھیں۔ مہرو کو بھی ایسی ہی ایک سفاک جلادن نے پکڑ کر باہر کھینچا مگر تب تک محفل میں بیٹھا ایک امیر زادہ، چندا کا مہمان خصوصی نواب زادہ تیمور مہرو کی بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں سے ٹپکتی وحشت کا اسیر ہو چکا تھا۔ اس پر خوف زدہ مہرو کے حسن کی بجلی یوں گری کہ پھر وہاں سے اٹھ ہی نہیں پایا۔ اس نے چندا کو اکیلے میں بلا کر خالی چیک بک دستخط کر کے سامنے رکھ دی کہ اب اس کے علاوہ کوئی اس لڑکی کو دوبارہ نہ دیکھے۔ چندا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لڑکی کسی کی امانت ہے مگر تیمور کا نوابی خون جوش کھا گیا اور اس نے چندا سے صاف کہہ دیا کہ ایک بار جس پر اس کی نظر پڑ جائے پھر وہاں کسی دوسرے کی مداخلت کی گنجائش نہیں رہتی۔

چندا اُلجھ کر رہ گئی کہ وہ نواب تیمور کو کیا جواب دے۔ مگر اگلے دن ہی بالے کی موت کی خبر نے خود ہر سوال کا جواب چندا کے سامنے رکھ دیا۔ چندا نے ہفتہ دس دن مزید انتظار کیا مگر چاروں طرف سے خاموشی پا کر اس نے چپکے سے مہرو کی رقم کھری کر لی۔ ویسے بھی وہ نواب تیمور جیسی مگرمچھ اسامی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے تیمور کو صاف بتا دیا کہ لڑکی کسی بڑے اور شریف گھرانے کی لگتی ہے لہٰذا وہ نواب کے ساتھ کہیں جانے پر راضی نہیں

ہوگی۔ ویسے بھی وہ فیروزہ کے کمرے میں خود کو سارا دن بند رکھتی ہے اور فیروزہ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود اپنے گھر والوں کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ نواب نے چندا سے کہا کہ وہ فیروزہ کے ذریعے مہرو کو سمجھائے کہ وہ باقاعدہ نکاح کر کے اور مہرو کو اپنی عزت بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ قسمت نے جس مقام پر مہرو کو لا پھینکا ہے اس ذلت بھری زندگی سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے کہ مہرو نواب کی پیشکش پر غور کرے اور ویسے بھی مہرو کو گھر سے نکلے کئی ہفتے ہو چکے ہیں اب بھلا اسے کوئی اپنا واپس کب قبول کرے گا۔ فیروزہ نے مہرو کو نواب تیمور کا پیغام پہنچانے کے ساتھ ساتھ اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ عقل مندی اسی میں ہے کہ وہ فی الحال چندا کے چنگل سے نکلنے کے لئے نواب کی پیشکش قبول کر لے مگر نواب سے کچھ دن مزید سوچنے کا وقت مانگ لے۔ اس عرصے میں موقع پاتے ہی وہ اپنے گھر والوں یا منگتر سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اور انہیں اپنے بارے میں اطلاع دے۔

فیروزہ نے بتایا کہ مہرو کو پورا یقین تھا کہ اس کے گھر والے اور احمد اس کی خبر پاتے ہی دوڑے آئیں گے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے۔ مگر وہ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ نواب کا گھر مہرو کے لئے ایک بڑا پنجرہ ثابت ہوگا۔ کچھ عرصے بعد نواب تیمور نے چندا کو چند رقاصاؤں سمیت نواب پور بلایا تو چندا فیروزہ کو بھی ساتھ لے گئی اور وہاں مہرو کی حالت دیکھ کر فیروزہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

نواب نے مہرو کو باقاعدہ قید کر رکھا تھا اور باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ کاٹ دیا گیا تھا۔ نواب کی ایک بیوی پہلے بھی تھی جس سے ایک نوجوان بیٹا بھی اس کے مکمل خاندان کا حصہ تھا۔ مگر نواب کی مہرو سے نکاح کی ضد اب تک ختم نہیں ہوئی تھی..... اور مہرو کسی نہ کسی بہانے نواب کو ٹالتی آ رہی تھی۔ یا شاید نواب ہی خود اسے اتنی ڈھیل دے رہا تھا کہ اس کی ہر اُمید اپنے گھر والوں اور منگیتر کی طرف سے ٹوٹ جائے، وہ تھک کر نواب کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور ہاں کر دے۔ پھر اس کے بعد فیروزہ کی مہرو سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مہرو نے فیروزہ کو کہا تھا کہ اسے پورا یقین ہے کہ اس کا رانجھا اس کا سانول احمد اس کے پیچھے ایک نہ ایک دن چندا کے ٹھکانے تک ضرور پہنچے گا اور جب وہ آئے تو فیروزہ اسے مہرو کا ایک پیغام ضرور دے دے..... فیروزہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہوگئی۔

خانقاہ کے صحن میں پھیلے دیوہیکل پیڑ پر شام کے بعد اکٹھے ہونے والے پرندے بھی یکلخت چپ سے ہو گئے۔ جیسے وہ بھی مہرو کا پیغام سننا چاہتے ہوں۔ پھر فیروزہ بولی تو مجھے اس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

مہرو نے یہ پیغام دیا تھا کہ احمد سے کہنا کہ "اس کی مہرو نے کہیں سے زہر ڈھونڈ کر اپنے گلے سے جڑے تعویذوں میں باندھ لیا ہے۔ مہرو صرف احمد کی تھی اور احمد کی ہی رہے گی۔ اور جس دن کسی نے زبردستی مہرو کو پانے یا حاصل کرنے کی کوشش کی، مہرو اسی دن وہ زہر چاٹ کر اپنی جان دے دے گی۔ تم دعا کرو سائیں جی..... مہرو ابھی تک زندہ ہو....." فیروزہ میری سماعتوں میں بھی ایک نیا زہر گھول کر واپس چلی گئی اور میں رات گئے تک کروٹیں بدلتے یہی سوچتا رہا کہ اتنا سفر طے کرنے کے باوجود ہم ابھی تک مہرو سے اُتنا ہی دور تھے۔ بخت خان کو میں نے بتا دیا تھا کہ ہمارا اگلا پڑاؤ اب "نواب پور" ہوگا۔ نواب تیمور کی جاگیر۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا کہ باہر گلی میں شور شرابے کی آوازوں نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ اچانک خانقاہ کا سرکاری رکھوالا گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔

''جلدی نکل چلو یہاں سے..... سنا ہے کوئی دو دہشت گرد گھس آئے ہیں اس علاقے میں اور پولیس اُن کے پیچھے علاقے کے سارے لاوارث فقیر اور آوارہ گردوں کو اٹھاتی پھر رہی ہے۔ یہاں بھی آتی ہوگی کہیں۔ دھر لئے گئے تو باہر نکلنے میں ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔ خواہ مخواہ خوار ہو جاؤ گے تم لوگ.....'' میں نے گھبرا کر بخت کی طرف دیکھا۔ موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ اسی وقت دو پولیس والے تیزی سے خانقاہ کے صحن میں داخل ہوئے اور ہم پر نظر پڑتے ہی کوئی چلائے ''وہ رہے دونوں.....''

✱.....✱.....✱

باب17

پولیس والے تیزی سے ہماری طرف لپکے۔ شاید ہماری کہانی کا اختتام قریب آ گیا تھا۔ خانقاہ کا سرکاری ملازم جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔ ''نہیں جناب..... یہ بیچارے تو جوگی فقیر ہیں۔ کل شام ہی یہاں آئے ہیں۔ میں خود اوقاف کے محکمے کا سرکاری ملازم ہوں۔ یہ رہا میرا کارڈ.....'' ایک پولیس والے نے کارڈ دیکھا۔ دونوں کچھ نرم پڑ گئے۔

''ٹھیک ہے..... مگر یہ تو تمہارا کارڈ ہے..... ان دونوں کا شناختی کارڈ کہاں ہے.....؟''

''ہمارے پاس تو شناختی کارڈ نہیں ہے۔ فقیر کی بھلا کیا شناخت.....؟ مفلس کا بھلا کیا ٹھکانہ..... اگر آپ کو ہمارے یہاں ٹھہرنے پر اعتراض ہے تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔'' میں نے بخت خان کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

پولیس والے نے کڑک کر ہمیں روکا ''ٹھہرو..... شناخت کیے بغیر تو تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ تھانے چلو..... اپنا اطمینان کر کے جلدی چھوڑ دیں گے..... بے فکر رہو.....''

ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ مگر تھانے جا کر اپنی شناخت کروانے کا صاف مطلب یہ تھا کہ پھر سے وہی سنٹرل جیل ہمارا مقدر بن جاتی۔ مجھے قید ہونے کی فکر نہیں تھی۔ یہاں باہر ہم کون سا آزاد تھے لیکن مہرو کی تلاش مکمل ہونے تک میں دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک بار مہرو کو اس کی ماں سے ملانے کے بعد میرا ارادہ خود کو دوبارہ قانون کے سپرد کر دینے کا ہی تھا۔ اگر میری قضا پھانسی گھاٹ کے پھندے پر ہی مقرر تھی تو اس سے فرار ناممکن تھا۔ مجھے تو بس اتنی مہلت چاہیے تھی کہ جس میں میں اپنا ادھورا کام پورا کر سکوں..... پولیس والے ہم دونوں کو دھکیلتے ہوئے باہر گلی میں لے آئے۔ ڈور گلی کے کونے پر پولیس کی چند گاڑیاں اور ایک بڑا ٹرک کھڑا تھا اور بہت سے پولیس والے آس پاس گھروں اور دوکانوں کی تلاشی لے رہے تھے اور آتے جاتے لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

ہمارے پہرے دار پولیس والے ہمیں بے ضرر جان کر کچھ لاپرواہ سے ہو گئے تھے اور ہمارے پیچھے باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ اچانک بخت خان ایک جھٹکے سے مڑا اور اس نے ایک ہی دھکے میں اپنی دھن میں چلتے دونوں پولیس والوں کو اس زور سے ٹکر ماری کہ دونوں لڑکھڑائے اور ایک سپاہی قریبی نالی میں پاؤں پھسلنے کی وجہ سے

گر پڑا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم کوئی ایسی حرکت کریں گے۔

بخت خان نے چلا کر مجھے ہوشیار کیا "بھاگو..... اور ہم دونوں گلی کی مخالف سمت سرپٹ دوڑ پڑے۔ چند لمحے کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے اور پھر پولیس والے چونکے تو پوری گلی پولیس کی سیٹیوں سے گونج اٹھی۔ چاروں طرف شور مچ گیا" پکڑو..... جانے نہ پائیں..... دہشت گرد..... بھاگ رہے ہیں....."

عام لوگ ہمیں اپنی طرف دوڑ کر آتے دیکھ کر بدحواس ہو کر ادھر اُدھر بھاگے اور پوری سڑک پر ایک افراتفری مچ گئی۔ سڑک پر کچھ گاڑیاں لوگوں کو بچاتے ہوئے آپس میں ٹکرائیں۔ اور مزید ہراسگی پھیل گئی۔ ہمارے لئے اتنا وقفہ کافی تھا۔ ہم دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اندھیری گلی میں مڑ گئے لیکن ہمیں راستے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ انجان راستوں پہ دوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کسی بھی لمحے، کچھ بھی سامنے آسکتا ہے۔ کوئی گڑھا، دیوار، سواری یا کوئی اندھی گلی..... پولیس لگاتار ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی اور کسی بھی لمحے وہ ہمارے سروں پر پہنچ سکتی تھی کیونکہ وہ ان گلیوں کے چپے چپے سے واقف تھی۔

اچانک سامنے دو گلیاں دائیں بائیں نکلتی نظر آئیں جو آگے چل کر اندھیرے میں گم ہو رہی تھیں۔ بخت خان نے چلا کر مجھے کہا "عبداللہ خاناں..... ایسے تو دونوں پکڑا جائے گا..... تم سیدھا ہاتھ مڑ جاؤ..... ہم الٹے ہاتھ جاتا ہے..... زندگی رہا تو پھر ملیں گے نواب پور میں....."

ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا، نہ ہی سوچنے کا وقت..... ہم ایک ہی کمان سے نکلے دو تیروں کی طرح گلی کے سرے تک پہنچے اور پھر دائیں بائیں مڑ گئے۔ کچھ لمحوں تک مجھے پیچھے سنسان گلی میں بخت خان کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی اور پھر پولیس کی چیخ وپکار میں سب گڈمڈ ہو گیا۔

یہ کوئی بہت گنجان آباد علاقہ تھا اور گلی در گلی، کوچہ در کوچہ راستے نکلتے ہی جا رہے تھے، میں پتہ نہیں کتنی دیر ان اندھیری گلیوں میں بھاگتا رہا اور پھر اچانک ایک گلی کے سرے سے باہر نکلتے ہی میں نے خود کو کسی بڑی سڑک پر کھڑے پایا۔ بڑے شہروں میں رات گئے تک سڑکوں پر چہل پہل اور ٹریفک کی روانی رہتی ہے۔ میں نے روشنی میں آتے ہی خود کو سمیٹا اور معمول کی رفتار سے ایک جانب چلنا شروع کر دیا۔ سڑک پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی، چند کھانے پینے کی دوکانیں اور اِکا دُکا میڈیکل اسٹور وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ بڑے شہروں کی ایک اور خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی کسی سے کسی بھی قسم کا سروکار یا واسطہ نہیں رکھتا۔ بھیڑ میں بھی سب اجنبی ہو جاتے ہیں۔ میں بھی انہی اجنبیوں کے درمیان چلتے اپنے دوست اپنے آشنا بخت خان کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑاتا رہا۔ مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میرے دل سے بے اختیار اس کے لئے دعا نکلی کہ کاش وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھے۔ اتنے دن ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے مگر ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے اپنی کہانی بیان نہیں کی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بخت خان کو اپنے علاقے، جسے لوگ علاقہ غیر کہتے ہیں۔ کوئی ادھوری کہانی پوری کرنے جانا تھا۔ کہانیاں ادھوری رہ جائیں تو بہت بے چین کرتی ہیں۔ میری اپنی کہانی بھی تو ادھوری تھی۔ کیا ستم ہے کہ ہماری کہانیاں ختم نہیں ہوتیں۔ ہم البتہ ختم ہو جاتے ہیں۔ تو پھر کیا کوئی دوسرا آ کر کبھی ہماری ادھوری کہانی پوری کرے گا؟

قدرت کبھی کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتی۔ ہم سب کی کہانیوں کو بھی ایک نہ ایک دن پورا ہونا ہی ہوگا۔ میں انہی سوچوں میں گم طویل سڑک پر چلتا رہا۔ رات بھیگ رہی تھی اور سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ اور ایسے رات کے سناٹے میں گھومنا بھی میرے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ کہیں بھی پولیس میرا راستہ روک سکتی تھی کیونکہ شریف شرفا راتوں کو گھر واپس پلٹ جاتے ہیں۔ پیدل چلنے والے مجھ جیسے تنہا کو ان کی لغت میں آوارہ گرد کہا جاتا ہے۔ سڑک پر تھوڑے وقفوں کے بعد بجلی کے کھمبوں سے لگی سٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ یوں وہ تنہا سڑک دور تک بچھی نظر آ رہی تھی۔ فضا میں اب صرف میرے قدموں کی آواز باقی رہ گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک پرانی غزل گونجنے لگی۔

"اجنبی شہر کے اجنبی راستے.....
تم بہت دور تک یاد آتے رہے....."

یاد تو وہ آتے ہیں جنہیں ہم وقت کے کسی درمیانی وقفے میں ذرا دیر کے لئے فراموش کر دیتے ہیں۔ مگر اُن کی یاد کو کیا کہا جائے جنہیں ہم کبھی بھولتے ہی نہیں؟ جو ایک لمحے کے لئے بھی ہمارے دل اور دماغ سے کہیں نہیں سرکتے..... ایسی کیفیت کے لئے "یاد" بہت معمولی اور چھوٹا لفظ ہے۔ پھر وہی انسانی ڈکشنری کی مجبوریاں، یہ بولیاں بنانے والے بھی کتنا ادھورا کام کر گئے ہیں۔ شاید مجھ جیسے دیوانوں کے لئے یہ لغت ہمیشہ ادھوری ہی رہے گی۔

میرے اندر شور بڑھتا جا رہا تھا اور رات خاموش تر تھی، لیکن مجھے بہت جلد رات گزارنے کے لئے کسی ٹھکانے پر پہنچنا ضروری تھا۔ مگر میں جاتا تو جاتا کہاں۔ اچانک موڑ مڑتے ہی دور مجھے کسی ہسپتال کا برقی نشان جگمگاتا نظر آیا۔ میرے ذہن میں جیل میں کہی ظہیر کی بات گونجی "کسی بھی شہر میں رات کو چھپنے کے دو ہی بہترین ٹھکانے ہوتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن یا کوئی ہسپتال..... دونوں ہی جگہ ساری رات لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور دونوں جگہوں پر کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی....."

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوگیا، یہ کوئی پرائیویٹ اور مہنگا ہسپتال دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے ہی ایمرجنسی میں کچھ ہلچل سی تھی۔ شاید کسی مریض کو لایا گیا تھا۔ ایک جانب راہداری میں کچھ پرائیویٹ گارڈز کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میں اُن کے دیکھنے سے پہلے ہی بائیں راہداری میں مڑ گیا۔ مجھے جنرل وارڈ یا کسی کینٹین نما کیفے ٹیریا کی تلاش تھی جہاں میں عیادت کرنے والے لوگوں کے درمیان خود کو چھپا سکوں..... مگر اس طرف بھی سناٹا تھا اور شاید اونچے طبقے والوں کے لئے پرائیویٹ کمرہ نما وارڈز بنائے گئے تھے۔ غریب اور امیر کی یہ تخصیص یہاں بھی واضح تھی۔ اور صرف اس ہسپتال پر کیا منحصر..... یہ فرق تو غریب اور امیر کی پیدائش سے لے کر قبر میں جانے تک روا رکھا جاتا ہے۔ مگر میرا حلیہ اُس چمکتی راہداری اور مہنگے کمروں سے میل نہیں کھاتا تھا اس لئے قریب سے گزرنے والی ایک دو نرسوں اور طبی عملے نے مجھے حیرانی اور غور سے دیکھا۔

میں نے پلٹ کر نکلنا چاہا مگر اسی وقت راہداری کے سرے پر دور وہی دو ہسپتال کے باوردی اور مسلح محافظ نمودار ہوئے جنہیں میں نے باہر دیکھا تھا۔ اچانک سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک نرس باہر آئی۔ ایک لمحے کے وقفے میں ہی میں نے دیکھ لیا کہ اندر نیم تاریک کمرے میں کوئی مریض لیٹا سو رہا ہے اور دوسرا کوئی اٹینڈنٹ کمرے میں

موجود نہیں ہے۔ نرس ایک جانب بڑھ گئی اور میں گارڈز سے بچنے کے لئے تیزی سے اسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں صرف ان گارڈز کے آگے نکل جانے کے وقفے تک اس کمرے کے دروازے کے پیچھے کھڑا انتظار کرنا چاہتا تھا تاکہ میں ان کے آگے جاتے ہی واپس اسی راستے پر چل پڑوں جو مجھے غلطی سے یہاں تک لے آیا تھا۔

مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اس مختصر عرصے میں وہ نرس واپس کمرے میں نہ آجائے ورنہ میرے لئے بہت بڑی مشکل کھڑی ہو جاتی مگر گارڈز کو راستے میں شاید کسی نے روک لیا تھا۔ اور وہ وہیں راہداری میں کھڑے کسی اسٹاف ممبر سے کوئی بات کرنے لگے۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے مریض کے کراہنے کی آواز سنائی دی اسے شاید پانی چاہیے تھا۔ میں اس کی دوسری آواز پر خود کو روک نہیں پایا اور میں نے ساتھ پڑی چھوٹی میز پر رکھی پانی کی بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلا اور تبھی مریض کا چہرہ دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے پانی چھلک گیا۔ میں اس کا چہرہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ حالانکہ میں اسے سات سال بعد دیکھ رہا تھا اور بیماری اور نقاہت نے اس کے خدوخال کو بہت لاغر کر دیا تھا۔

مگر پھر بھی اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہیں لگا وہ SID سِڈ تھا۔ ہاں..... وہی جس کے ہاتھ گولی چلنے سے خود اسی کا دوست سنی مارا گیا تھا۔ وہی سنی، جس کے قتل کے الزام میں مجھے پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی اور میرے سات سال جیل کی کال کوٹھڑی میں اپنی موت کا انتظار کرتے گزرے تھے۔ لیکن سڈ یہاں اس ہسپتال میں اس حالت تک کیسے پہنچا.....؟ میرے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میرے دل میں سلطان بابا کی وہی بات گونجی۔

''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے.....''

گویا میں راستہ بھول کر اس طرف نہیں آنکلا تھا۔ میرے لئے یہی راستہ طے کر دیا گیا تھا۔ جیل جانے سے لے کر پھانسی کی کال کوٹھڑی تک..... کرم داد کی کوٹھی میرے حصے میں آنے سے لے کر جیل سے فرار تک، حکیم یعقوب کے گھر سے مہرو کے گاؤں رحیم گڑھ تک..... یالے کے ڈیرے سے لے کر چندا کے ٹھکانے تک اور پھر اُس خانقاہ سے لے کر ہسپتال کے اس کمرے تک..... یہ سب پہلے سے طے ہی تو تھا۔ جانے میں مہرو کی تلاش میں ان راستوں پر بھٹکتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا، یا پھر مہرو کی تلاش کے بہانے یہ راستے مجھے چلاتے ہوئے یہاں تک لے کر آئے تھے جہاں سِڈ اس بستر پر نڈھال پڑا تھا۔

میں نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک اجنبی کو اپنے سرہانے کھڑے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''تم..... کون ہو.....؟ میرے کمرے کی اٹینڈنٹ کہاں ہے.....'' میں نے اطمینان سے اسے پانی پلایا۔

''مجھے بھی تم ایک اٹینڈنٹ ہی سمجھ لو۔ میرا ارادہ سات سال پہلے بھی تمہیں نقصان پہنچانے کا نہیں تھا۔ آج بھی نہیں ہے۔'' سِڈ میری بات سن کر زور سے چونکا۔

''کون ہو تم..... اور یہاں کیسے آئے.....؟'' اس نے بستر کے ساتھ لگی گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر میری صورت میں جانے کون سی آشنائی کی رمق دیکھ کر اس کا ہاتھ رک گیا۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی اور لمبی لٹوں کے

پیچھے چھپی میری آنکھیں شاید ابھی تک نہیں بدلی تھیں۔ SID سِڈ کی زبان سے بے اختیار نکلا "تم..... تم وہی ہو ناں..... ساحر....." اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہاں..... میں وہی ہوں..... جسے تم نے قتل کے جھوٹے مقدمے میں الجھا کر پھانسی کے تختے تک پہنچایا تھا....." سِڈ ہکلایا۔

"مگر تم..... تم یہاں کیسے.....؟ اوہ گاڈ..... میں تو سمجھا تھا کہ اُنہوں نے تمہیں پھانسی....."

"نہیں..... میں ابھی زندہ ہوں..... اور جب تک میری سانسیں باقی ہیں۔ کوئی قانون مجھے مار نہیں سکتا....." سِڈ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"تو کیا تم مجھ سے بدلہ لینے آئے ہو..... ہم نے واقعی تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ اُس رات جب ہاتھا پائی میں تم نے میرے ہاتھ سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی تھی اور میں تم پر گولی چلانے کے لئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ مجھے تبھی محسوس ہوگیا تھا کہ میری انگلی کے دباؤ سے ٹریگر دب گیا ہے۔ وہ فائر مجھی سے ہوا تھا جس نے سنی کی جان لی..... مگر اس وقت میں بہت ڈر گیا تھا..... سچ نہیں بول پایا، بولنا چاہتا بھی تو میرے ڈیڈ میرے گھر والے مجھے کبھی سچ نہ بولنے دیتے..... کیونکہ..... سنی کے پاپا بہت پاورفل اور اہم منسٹری کے چیف تھے..... میرا خاندان ان سے کسی قسم کی دشمنی افورڈ نہیں کرسکتا تھا..... لیکن آج تم آزاد ہو..... تم مجھ سے اپنا بدلہ لے سکتے ہو....."

"میں یہاں تم سے بدلہ لینے نہیں آیا..... قدرت نے مجھے یہاں جانے کس نیت سے پہنچادیا ہے..... مجھے بس کچھ دیر یہاں پناہ چاہیے..... صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا..... اگر تم پناہ دے سکو تو ٹھیک ورنہ میں کسی اور طرف نکل....." میری بات میرے لبوں میں ہی ادھوری رہ گئی اور ایک نازک سی لیڈی ڈاکٹر اسی نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بے دھیانی میں بولی۔

"واٹ از دس سِڈ..... یہ اسٹاف بتا رہی ہے کہ....." اور پھر مجھے سِڈ کے سرہانے کھڑے دیکھ وہ بالکل ہی حواس باختہ ہوگئی۔

"اوہ گاڈ..... ہو از دِس..... یہ کون ہے اسٹاف..... اور اندر کیسے آیا..... یہ ہاسپٹل ہے یا کوئی بیگر ہوم....." حسب توقع وہ مجھے کوئی بھکاری فقیر ہی سمجھی تھی۔ اسٹاف تیزی سے میری طرف بڑھی۔

"نکلو بابا تم ادھر سے..... تم کو اندر کس نے آنے دیا....."

لیڈی ڈاکٹر چلائی۔ "گارڈز کو بلاؤ..... ویئر آر دے سلیپنگ.....؟" میں خاموش کھڑا رہا۔ سِڈ نے ہاتھ اٹھا کر لیڈی ڈاکٹر سے کہا۔

"کام ڈاؤن سونیا..... ہی از مائی گیسٹ..... یہ میرا پرانا دوست اور کلاس فیلو ہے..... مجھ سے ملنے آیا ہے....." سونیا نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف یوں دیکھا جیسے اسے سِڈ کی دماغی حالت پر کوئی شبہ ہو۔

"واٹ..... آر یو ان یور سینسز..... یہ تمہارا دوست ہے..... اور کلاس فیلو..... شاید تم اپنے حواس میں نہیں ہو سِڈ....."

سِڈ نے سونیا کو ڈانٹا "میں نے کہا ناں..... یہ میرا دوست ہے..... اور پلیز..... اب تم دونوں جاؤ یہاں سے..... آئی ایم اوکے..... اور ہسپتال کے رُول (قاعدے) کے حساب سے میرے کمرے میں ایک اٹینڈنٹ رک سکتا ہے..... ٹھیک ہے ناں..... تو آج رات میرا یہ دوست یہیں میرے پاس رُکے گا..... آئی ہوپ تمہیں یا تمہاری ہاسپٹل مینیجمنٹ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا....." لیڈی ڈاکٹر نے غصے سے پہلے سِڈ اور پھر میری طرف دیکھا۔ اور پھر دوبارہ انگریزی میں سِڈ سے بولی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی بات کا مطلب سمجھوں۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو سِڈ..... کون ہے یہ بھکاری..... اور یہاں اتنی رات کو چھپ کر تمہارے کمرے میں کیوں آیا ہے.....؟ دیکھو اگر تمہیں اس سے کوئی خطرہ ہے یا اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے تو تم اُردو میں بس اتنا کہو کہ جاؤ ہم دونوں کے لئے اچھی سے کافی بھیج دو..... میں سمجھ جاؤں گی اور باہر جا کر گارڈز کو بتا دوں گی..... وہ خود آ کر اسے قابو کر لیں گے..... ٹھیک ہے ناں....." سونیا کی چالاکی پر سِڈ نے میری طرف دیکھا۔

"یہ میری کزن بھی ہے بدقسمتی سے..... یہ یوں نہیں مانے گی..... پلیز تم ہی اسے مطمئن کر دو....." اس بار میں نے سونیا کو انگلش میں جواب دیا۔

"میں اس طرح اچانک آنے کے لئے بہت معذرت خواہ ہوں..... میں کسی کی پرائیویسی میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ اگر آپ کو واقعی لگتا ہے کہ میں سِڈ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں تو میں چلا جاتا ہوں..... آپ خود کو کسی الجھن یا پریشانی میں نہ ڈالیں....." سونیا اور نرس دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور سونیا نے نرس کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پھر جاتے جاتے ایک لمحے کو رُک کر بولی۔ آپ دونوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بھجوا دوں گی.....

"نہیں..... آپ کا بہت شکریہ۔"

سونیا نے جاتے جاتے بھی پلٹ کر حیرت سے دو چار مرتبہ میری طرف دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد سِڈ نے میرے حلیے کو غور سے دیکھا "یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے..... مجھے تمہاری لگژری کار اور تمہاری نفاست ابھی تک یاد ہے، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہیں ہرگز نہ پہچانتا۔ مگر میں نے اس رات تمہاری یہ آنکھیں بہت قریب سے دیکھی تھیں، اور آج تک تمہاری یہ آنکھیں میں بھلا نہیں پایا۔ کئی راتوں تک جب میں سونے کے لئے اپنی آنکھیں بند کرنے لگتا تو تمہاری یہ دو آنکھیں میرے اندر کہیں کھل جایا کرتی تھیں۔ راتوں کو میرے خواب میں آ کر مجھے جگایا کرتی تھیں تمہاری یہ آنکھیں۔ مگر تم نے یہ جوگیوں والا بھیس کیوں بدل رکھا ہے.....؟ جیل سے کب چھوٹے تم....."

سِڈ کی لاعلمی بتا رہی تھی کہ اسے باہر کے حالات کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہے..... ویسے بھی یہ امراء کے امیر زادے بھلا اخبار وغیرہ کب پڑھتے ہوں گے..... نہ ہی انہیں خبریں سننے کا کوئی شوق ہوتا ہے۔

"میں چھوٹا نہیں..... فرار ہوا ہوں..... اور پولیس اس وقت میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے....." میرا جواب سن کر سِڈ اچھل پڑا۔

"اوہ گاڈ..... رئیلی..... معاف کرنا..... پچھلے کچھ مہینوں سے میں ساری دنیا سے کٹ کر رہ گیا ہوں۔ مجھے واقعی کسی بات کی خبر نہیں....." پھر کچھ سوچ کر اس نے پوچھا

''اور وہ لڑکی..... وہ جو اس رات تمہارے ساتھ تھی..... اس کا کیا ہوا.....؟'' وہ زہرہ کا پوچھ رہا تھا۔

''وہ بھی بچھڑ گئی مجھ سے..... اس کے گھر والے ایک قاتل اور پھانسی کے قیدی کے ساتھ مزید کوئی رشتہ قائم نہیں رکھنا چاہتے.....'' سِڈ نے دکھ سے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اوہ..... مطلب تمہاری زندگی کی ہر بربادی صرف ہماری وجہ سے اسی ایک رات میں ہوگئی..... کاش..... کاش میں وہ وقت واپس لاسکتا..... سنو..... ان سب کے باوجود تم مجھ سے بدلہ کیوں نہیں لے رہے..... میں بے بس اور لاچار تمہارے سامنے بستر پر پڑا ہوں..... مجھے ختم کر کے تم اپنے انتقام کی آگ بجھا سکتے ہو..... ابھی.....'' میں نے سِڈ کی طرف دیکھا۔

''اگر میں پہلے والا ساحر ہوتا تو شاید کچھ بھی کر جاتا، تمہیں بھی تباہ و برباد کر دیتا۔ لیکن ایک بزرگ نے میرے سوچنے کا انداز بدل دیا، وہ کہا کرتے تھے کہ اپنا ہر معاملہ ہر بدلہ اللہ پر چھوڑ دو..... وہ بہترین انصاف کرنے والا ہے..... لہٰذا اب میں نے بھی اپنا ہر معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے..... وہ جو کرے گا..... میرے لئے بہتر کرے گا.....'' میری بات سن کر سِڈ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''واقعی..... ٹھیک کہا تھا تمہارے بزرگ نے..... وہی بہترین انصاف کرنے والا ہے..... تمہارے ساتھ برا کرنے کے بعد میں اور کاشی بھی ایک پل چین سے نہیں رہے..... اس کے ڈیڈ نے اسے ملک سے باہر بھیج دیا تھا اس کیس سے بچنے کے لئے..... مگر کون سی رات ہے جب وہ مجھ سے فون پر بات کرتے ہوئے رویا نہیں ہو..... سنی بہت پیارا دوست تھا ہمارا..... سب کچھ بکھر گیا اس کے جانے کے بعد..... اور جانتے ہو..... میں آج اس ہسپتال کے بستر پر کیوں پڑا ہوں.....؟ بلڈ کینسر ڈائیگنوز ہوا ہے مجھے۔ میں اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا ہوں یہاں پڑے پڑے..... دیکھو..... کیسی بے بسی ہے میرے چاروں طرف..... ہم نے تمہیں کس میں پھنسا کر موت کے پھندے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر تم میرے سامنے سلامت کھڑے ہو..... اور میں تم سے پہلے جا رہا ہوں.....'' سِڈ کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی دروازے پر آہٹ ہوئی میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

✱.....✱.....✱

باب 18

سڈ کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سِڈ کی کزن ڈاکٹر سونیا دروازے پر کھڑی تھی لیکن اس بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"سِڈ تم اب کچھ آرام کرلو..... جانتے ہو ناں تمہارے لئے آرام کتنا ضروری ہے....."

سِڈ طنز سے مسکرایا "اب آگے آرام ہی آرام ہے..... کچھ دیر مجھے اپنے دوست سے باتیں کرلینے دو..... جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو....." سونیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں وہ ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح بڑی خوبصورتی سے چھپا گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے..... مگر صرف 5 منٹ اور..... میں یہیں باہر کھڑی ہوں..... اس سے زیادہ وقت نہیں دوں گی تمہیں....." سونیا باہر چلی گئی مگر مجھے لگا اس کی بھیگی پلکیں یہیں اندر کمرے میں رہ گئی ہیں۔ سِڈ نے گہرا سانس لیا۔

"سونیا میری منگیتر ہے۔ یہ بیماری تشخیص نہ ہوتی تو اگلے دو ماہ میں ہماری شادی ہونا طے تھی..... اور اس وقت ہم یورپ یا امریکہ میں کہیں ہنی مون پہ ہوتے..... بہت محبت کرتی ہے مجھ سے..... سچ پوچھو تو مجھے اپنی نہیں..... اس کی زیادہ فکر ہے....." میں سِڈ کی باتیں سن کر افسردہ ہوگیا۔ یہاں بھی ایک ادھوری کہانی بکھری پڑی تھی۔ پھر سِڈ فکرمندی سے بولا۔

"لیکن تم یہاں سے کہاں جاؤ گے..... تم چاہو تو میں ڈیڈ سے کہہ کر تمہیں دُنیا کے کسی بھی ملک کا بارڈر کراس کروا سکتا ہوں..... دوبئی میں تو ہمارا اپنا بزنس ہے..... لیکن فارن بھی دُور نہیں..... تم اب کب تک بھاگتے رہو گے.....؟"

"نہیں..... میں کہیں بھاگ نہیں رہا، کسی کی تلاش میں ہوں..... وہ مل جائے تو خود سرنڈر کردوں گا..... تم اب آرام کرو..... تمہاری آواز سے نقاہت چھلک رہی ہے....." سِڈ واقعی بولتے بولتے ہانپنے لگا تھا۔

"کیا.....؟ تم دوبارہ سرنڈر کردو گے خود کو پولیس کے سامنے..... مگر کیوں.....؟ تمہیں اس جرم کی سزا کیوں ملے جو تم نے کیا ہی نہیں ہے..... جسے سزا ملنی چاہیے تھی..... قدرت نے خود اس کے لئے سزا تجویز کردی ہے....."

میں نے اسے کمبل اوڑھا دیا..... "تم آرام کرو..... صبح تمہارے گھر والوں کے آنے سے پہلے میں یہاں

سے نکل جاؤں گا....."

میں نے ٹیبل لیمپ آف کر دیا اور کمرے سے ملحقہ باہر کی طرف بالکونی میں کھلتے دروازے کی طرف بڑھا۔ سِڈ نے مجھے آواز دی "سنو ساحر..... میں تمہارا مجرم ہوں لیکن میں چاہ کر بھی تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا..... میں ساری عمر ایک نافرمان بیٹا ثابت ہوا ہوں..... میں نے ہمیشہ اپنی مام اور ڈیڈ کو بہت دکھ دیئے ہیں..... میں نہیں چاہتا کہ جاتے جاتے بھی اپنے ڈیڈ کو کسی نئی مصیبت میں ڈال کر جاؤں..... اگر میں نے سچ بول دیا تو سنی کا باپ میرے ڈیڈ کو غصے میں برباد کر دے گا..... تم میری مجبوری سمجھ رہے ہو ناں؟ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا دوست....." سِڈ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں نے تمہیں معاف کیا۔ لیکن میرا یہ پختہ یقین ہے کہ کوئی کسی کو برباد نہیں کر سکتا۔ جب تک اوپر والا نہ چاہے۔ انسان کی بربادی اگر انسان کے ہاتھ میں ہوتی تو آج اس دنیا میں کوئی آباد نہ ہوتا....." میں کمرے سے نکل کر پچھلی جانب بنی بالکونی میں آ گیا، جہاں بید کی بنی ہوئی ایک آرام کرسی پڑی ہوئی تھی۔ کمرے کی پچھلی طرف ہسپتال کا وسیع و عریض لان تھا۔ یہ امیروں کے ہسپتال بھی کسی محل سے کم نہیں ہوتے۔ غریب بیچارہ تمام عمر قطاروں میں کھڑا سرکاری سٹور سے دوا ملنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ سِڈ نے اپنے پاپا کا ذکر کیا تو مجھے اپنے پاپا بھی یاد آ گئے میں نے بھی تو ہمیشہ انہیں دُکھ ہی دیئے تھے۔ میں بھی تو ایک برا بیٹا ہی ثابت ہوا تھا اُن کے لئے۔

انہیں میرے فرار کے بعد بھی پولیس نے پوچھ گچھ کے بہانے بہت تنگ کیا ہوگا۔ ہمارے گھر کا فون اور پاپا کا موبائل بھی ضرور ٹیپ کیا جا رہا ہوگا تاکہ اگر میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں تو پولیس کو میرے ٹھکانے کا سراغ مل سکے۔ اسی لئے میں نے ابھی تک پاپا سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل ان سے بات کرنے کے لئے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ بیٹے ہی تو باپ کا واحد سہارا ہوتے ہیں۔ لیکن میں کیسا بدنصیب اور بدبخت بیٹا تھا جو اپنے باپ کا سہارا بننے کے بجائے ہمیشہ انہیں بے سہارا کرتا آیا تھا۔ میں جانے کتنی دیر وہاں کھڑا ان سوچوں میں ڈوبا رہا۔ تبھی پیچھے گیلری کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ سونیا تھی۔

"معافی چاہتی ہوں..... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا....." وہ کچھ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... ڈسٹرب تو میں نے آپ سب کو کر دیا۔ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا....."

سونیا پشیمانی سے بولی "آئی ایم سوری..... میں نے آپ کی اور سِڈ SID کی ساری باتیں سن لی تھیں..... دراصل میں ڈر گئی تھی کہ شاید آپ سِڈ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اس لئے کمرے سے نکل کر بھی دروازے کے قریب ہی کھڑی رہی..... میں..... میں بہت شرمندہ ہوں..... میں نے آپ کو بہت غلط سمجھا....."

"کوئی بات نہیں..... ہمارے ہاں عموماً انسان کو اس کے لباس اور حلیے سے پہچانا جاتا ہے..... آپ نے مجھے وہی سمجھا..... جو میں نظر آتا ہوں..... اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں....." سونیا بے چین ہو گئی۔

"پلیز مجھے بتائیں..... کیا میں آپ کے لئے کچھ کر سکتی ہوں..... سِڈ نے مجھے یہ سچ بہت پہلے بتا دیا تھا کہ سنی غلطی سے اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا..... مگر میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ سے اس طرح میرا سامنا ہوگا۔

میں تو ہمیشہ ہی سوچ کر ڈرتی رہی کہ وہ شخص جو سِڈ اور کاشی کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے وہ جب کبھی سامنے آئے گا تو ہمارا سب کچھ تباہ و برباد کر دے گا..... مگر آپ..... آپ نے تو میرا یہ خیال غلط ثابت کر دیا..... کتنا غلط سوچتی تھی میں..... میں نے زندگی کا یہ رُخ پہلی مرتبہ دیکھا ہے....."

"آپ خود کو اتنا نہ الجھائیں..... جو ہوا..... وہ میرا نصیب تھا..... یا شاید میری آزمائش..... میری زندگی میں ایسی اور بہت آزمائشیں ابھی آنا باقی ہیں..... آپ سِڈ کا خیال رکھیں..... آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہے..... میں دعا کروں گا کہ اللہ اسے صحت دے....."

سونیا پلٹ کر جانے لگی مگر پھر رُکی "ہمارا ایک فارم ہاؤس ہے شہر سے باہر..... پہلے کبھی کبھار فیملی پکنک وغیرہ کے لئے ہم وہاں جاتے تھے۔ مگر جب سے سِڈ بیمار ہوا ہے..... اب مہینوں خالی پڑا رہتا ہے۔ آپ وہاں آرام سے رہ سکتے ہیں جب تک چاہیں..... وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا....."

"نہیں..... مجھے کسی کی تلاش میں نواب پور جانا ہے..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... میں صبح ہوتے ہی نکل جاؤں گا....."

سونیا نواب پور کا نام سن کر زور سے چونکی۔ "نواب پور..... وہاں تو ڈیڈی کی بہت سی زرعی زمین ہے..... میرے انکل بھی وہیں ہوتے ہیں زمینوں پہ..... وہاں کس سے کام ہے آپ کو....." مجھے لگا قدرت نے میرے نواب پور پہنچنے کا انتظام کر دیا ہے۔

"نواب تیمور سے..... لیکن میں ان کے لئے اجنبی ہوں..... کیا آپ مجھے نواب کی حویلی تک پہنچا سکتی ہیں....."

سونیا جوش سے بولی "سمجھیں آپ پہنچ گئے۔ ڈیڈ کا وہاں بہت اثر و رسوخ ہے۔ میں انکل سے صبح ہی بات کر لوں گی۔ میرا اپنا ڈرائیور آپ کو لے جائے گا وہاں..... صرف چھ گھنٹے کا ہی تو راستہ ہے..... میری دعا ہے کہ خدا آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے....." سونیا افسردہ سی واپس کمرے میں سِڈ کے پاس چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں صبح کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ سونیا نے شاید رات ہی کو اپنی گاڑی بلوا لی تھی اور دھوپ نکلنے سے کچھ دیر پہلے میں سونیا کی سلور ماڈل کی بڑی گاڑی میں ہسپتال سے نکل کر نواب پور کے راستے پر رواں دواں تھا۔

کل تک جن پولیس چوکیوں اور ناکوں سے میں چھپ اور بچ کر نکل رہا تھا، آج وہی پہرے دار مستعدی سے گاڑی کی نمبر پلیٹ پر نظر پڑتے ہی ہمارے لئے ہر راستہ کھولتے نظر آ رہے تھے۔ گاڑی کے شیشوں کو پردوں سے ڈھانک دیا گیا تھا اور میں بیک سیٹ پر بیٹھا قدرت کا یہ نیا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن میرا دھیان ابھی تک بخت خان کی طرف تھا۔ گزشتہ رات اس نے میری طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے جان بوجھ کر پولیس کی توجہ اس گلی کی طرف مبذول کروائے رکھی جہاں وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر بھاگتے ہوئے داخل ہوا تھا۔ جانے وہ اب کہاں ہوگا۔ میں نے صبح سب سے پہلے اخبار والے پر نظر پڑتے ہی ڈرائیور سے اخبار پکڑنے کو کہا۔ لیکن اخبار میں گزشتہ رات سے متعلق کوئی ایسی خبر نہیں چھپی تھی۔

میں نے دل سے دعا کی کہ بخت خان بھی میری طرح ان گلیوں سے بحفاظت نکل گیا ہو۔ ایسی صورت

میں اسے بھی اس وقت نواب پور کی طرف عازمِ سفر ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ کسی لوکل ٹرانسپورٹ یا ٹرین وغیرہ سے چھپ چھپا کر سفر کرے تب بھی اسے ایک سے دو دن کے اندر نواب پور پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم دونوں کے پاس ظہیر کی دی ہوئی رقم بھی کچھ زیادہ نہیں بچی تھی۔ صبح جب میں ہسپتال سے نکل رہا تھا تو سونیا نے سِڈ کو جگانے کا پوچھا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ سِڈ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اور میں اسے مزید بے آرام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انسان اس دنیا میں اپنی بے آرامی کاٹ لے، یہی اس کے لئے کافی ہے۔

ڈرائیور سارے رستے خاموش رہا۔ شاید اسے کوئی سوال نہ کرنے کی سختی سے تاکید کر دی گئی تھی۔ سڑک خراب ہونے کی وجہ سے ہمیں نواب پور پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ اور جب ہم نواب پور شہر کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو دورِ انگریزی دور کی بنی ہوئی گول گنبد والی محل نما عمارتوں اور حویلیوں کے پیچھے دھوپ ڈھلنے کی تیاری کر رہی تھی۔ نواب پور ایک چھوٹا ضلع تھا جو انگریز نے اپنی چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا اور یہاں ملکہ وکٹوریہ کے دور کی یادگاریں اور سنگ مرمر سے بنے مجسمے اور فوارے ابھی تک مختلف چوکوں اور سڑکوں پر ایستادہ تھے۔

تقریباً سارا ہی شہر سفید پتھر، چونے یا پھر سنگ مرمر سے تعمیر شدہ تھا اور آج بھی شہر کے مین چوراہے پر ٹیکسی اور رکشہ سمیت ٹم ٹم، تانگے اور بگھیاں بھی کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ جگہ جگہ پان کے کھوکھے اور تمباکو کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں جس سے پتہ چلتا تھا کہ شہر کے باسی پان اور تمباکو کے خاص شوقین ہیں۔ گاڑی چوڑی اور کشادہ سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک وسیع و عریض بنگلے میں داخل ہوگئی جس کے باہر کمال احمد کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

کمال صاحب ہی سونیا کے چچا تھے۔ ہارن کی آواز سن کر وہ دیگر نوکروں کے ساتھ خود بھی باہر پورچ میں آ گئے۔ دھان پان سے وضع دار شخص دکھائی دے رہے تھے جو سفید کرتے پاجامے پر سیاہ واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ ان کے چہرے پر بھی اُسی حیرت کے آثار نمایاں ہوئے جن کا اب میں عادی ہو چکا تھا۔ شاید انہیں بھی اپنی ماڈرن اور پڑھی لکھی ڈاکٹر بھتیجی کی طرف سے کسی ایسے مہمان کی آمد کی توقع نہیں تھی۔ مگر ایک باتہذیب فرد ہونے کے ناطے انہوں نے فوراً اپنے چہرے پر چھائی حیرت کو مسکراہٹ میں بدل دیا۔

''آؤ میاں آؤ..... ڈاکٹرنی صاحبہ نے مجھے صبح ہی فون پر سخت تاکید کر دی تھی کہ اس کے اور سِڈ کے بہت خاص مہمان ہو تم..... بھئی میں تو سچ پوچھو گھبرا ہی گیا تھا کہ جانے کون آ رہا ہے..... اور میں ٹھیک سے اس کی خاطر مدارت بھی کر پاؤں گا یا نہیں.....'' وہ باتیں کرتے کرتے مجھے لان کی طرف سے اندر کھلتے ایک شیشے کے کمرے میں لے آئے جس کی ساری دیواریں شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھیں تاکہ لان اور دور گرتے فوارے اور جھرنے کا منظر صاف دکھائی دے۔ سامنے والے حوض میں چند بطخیں بھی تیر رہی تھیں سارا لان اور باغیچہ بہت نفاست سے تراشا گیا تھا۔ یہ سن روم اس جانب اسی لیے بنایا گیا ہوگا تاکہ گھر کے مکین ڈھلتی شام میں اس لاؤنج میں آرام دہ صوفوں پر بیٹھ کر دھوپ ڈھلنے کا نظارہ کر سکیں۔ اور جب کبھی بارش ہوتی ہوگی تو بوندوں کا جلترنگ شیشے کی چھت پر کتنا بھلا محسوس ہوتا ہوگا۔

سچ ہے کہ اگر اوپر والا انسان کو اس کی یہ ''حسِ لطیف'' عطا نہ کرتا تو انسان انسان ہی نہ ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے خطوں میں کیسے اپنی اپنی جنتیں بسائے بیٹھا ہوتا ہے یہ انسان۔ کمال صاحب بولتے بولتے رُکے ''بھئی معاف

کرنا..... میں اپنی ہی بولے جا رہا ہوں..... تمہاری تعریف.....؟"

"تعریف کے لئے تو کچھ خاص نہیں ہے میرے پاس..... ہاں البتہ تعارف کے لئے نام عبداللہ ہے....." میری بات سن کر وہ چونکے پھر جلدی سے سنبھل کر بولے:

"اچھا اچھا..... عبداللہ..... بھئی بہت خوب..... بڑا اچھا نام ہے..... اچھا تو عبداللہ میاں..... پہلے چائے ہو جائے..... میں شام کی چائے کبھی قضا نہیں کرتا..... چاہے کوئی دوست قضا ہو جائے....."

وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسے اور پھر ذرا سی دیر میں کمرے کی درمیانی میز جو صوفوں کے درمیان پڑی تھی۔ چائے کے انواع واقسام کے لوازمات سے سج گئی۔ ان میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کی خوشبو بھی میں جیل میں رہتے رہتے فراموش کر بیٹھا تھا۔ میز پر جگہ ختم ہوگئی مگر نوکر اب بھی خوان اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ کمال صاحب نے واقعی بہت زیادہ تکلف کر رکھا تھا۔ مجبوراً مجھے ہی ٹوکنا پڑا۔

"آپ نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی..... میری حس ذائقہ اب اتنی فعال نہیں رہی..... اور جس انسان کے پاس ذائقہ محسوس کرنے کا فن نہ ہو..... اس کے سامنے اتنے لوازمات رکھنا اُن خوانوں کی توہین ہے..... آپ منع کر دیں نوکروں کو کہ مزید کوئی تکلف نہ کریں....." کمال صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"خوب کہا میاں..... مگر ذائقے کی شرط تو برتنے سے متصل ہوتی ہے..... جب تک چکھو گے نہیں۔ تب تک ذائقے کی حس فعال نہیں ہوگی....." اور پھر ان کے اصرار پر مجبوراً مجھے ہر چیز چکھنا پڑی۔ کمال صاحب کو میں نے ان کے ذوق اور باورچی کے انتخاب کی داد دی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"بس میاں کیا کروں..... اکیلا ہوتا ہوں یہاں..... شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں میں پڑا نہیں..... باہر سے فارمٹری پڑھ کر آیا تھا مگر سونیا کے ڈیڈی مطلب میرے بھائی جان نے مجھے یہاں کی جائیداد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہاں اور کوئی مشغلہ ہے نہیں..... اس لئے اپنی جنگلات کی تعلیم اس لان پر اور باقی وقت اچھے باورچی ڈھونڈنے میں لگا دیتا ہوں۔ وقت گزاری کے لئے کوئی تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے ناں..... تم اپنی بتاؤ..... کیا کرتے ہو..... اور نواب پور کیسے آنا ہوا.....؟ سونیا بتا رہی تھی کہ تمہیں یہاں کچھ ضروری کام ہے.....؟ کہو میں کیا مدد کر سکتا ہوں تمہاری.....؟"

"آپ یہاں کے نواب تیمور علی خان کو جانتے ہوں گے..... اُن سے کچھ واسطہ ہے میرا..... ایک چیز کھو گئی ہے..... سنا ہے وہ ان کے پاس ہے..... وہی واپس لینے آیا ہوں....." میری زبان سے نواب تیمور کا نام سن کر کمال صاحب بری طرح چونکے اور ان کے چہرے پر فکر اور پریشانی کی بہت سی لکیریں ایک پل ہی میں ابھر آئیں "مشکل کام بتا دیا ہے تم نے میاں..... وہ شخص تو اس پوری ریاست کا ہی مالک ہے۔ پاکستان میں شمولیت سے پہلے نواب تیمور کے آباؤ اجداد اس ساری سلطنت کے واحد وارث اور کفیل تھے۔ ریاست کے انضمام کے بعد بھی بڑا اثر ورسوخ ہے اس خاندان کا جس کے سربراہ اب خود نواب تیمور علی خان ہیں..... مگر صفتِ نوابی ابھی پورے جوبن پہ اور برقرار ہے۔ نہایت اکھڑ مزاج، غصیلے اور ضدی واقع ہوئے ہیں نواب صاحب..... کسی سے سیدھے منہ بات کرنا سیکھا نہیں اس شخص نے..... ظالم اور جابر بھی مشہور ہے..... کہتے ہیں ان کی محل نما حویلی کے پیچھے جو قبرستان ہے۔ وہ زیادہ تر

انہی کے دشمنوں اور مخالفین سے بھرا پڑا ہے..... دوسری طرف سنا ہے کہ حسِ لطیف بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے..... گانا سننے کے بھی شوقین ہیں اپنے نواب صاحب..... لیکن مجھے حیرت ہے کہ ایسے شخص سے تم جیسے انسان کا بھلا کیا کام.....؟"

شاید کمال صاحب یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ وہ بادشاہ اور تم فقیر..... تو بھلا تم دونوں کا آپس میں کیا جوڑ اور کیا تعلق.....؟

"دنیا میں بادشاہوں کا سب سے زیادہ پالا اور واسطہ فقیروں سے ہی پڑا ہے کمال صاحب..... اگر آپ غور کریں تو صرف میرا ہی جوڑ بنتا ہے نواب تیمور کے ساتھ..... کبھی کبھی متضاد یا اُلٹ ہی سب سے زیادہ منسلک ثابت ہوتا ہے۔" کمال صاحب نے اس بار نہایت غور سے میری طرف دیکھا۔

"تم وہی ہو ناں میاں..... جو نظر آتے ہو..... تمہاری باتیں بار بار چونکا دیتی ہیں مجھے..... لگتا ہے کسی نے خاص تربیت کی ہے تمہاری....."

"جی، مگر میں ان کی تربیت کی تھوڑی سی بھی لاج نہیں رکھ پایا..... بس ان سے سنی ہوئی باتیں دہرا رہا ہوں آپ کے سامنے..... کیا آپ کسی طرح میری ملاقات کروا سکتے ہیں نواب تیمور سے..... ان کی کوئی حسرت، کوئی پریشانی یا خواہش..... ہو جو آپ جانتے ہوں..... بادشاہ بھی اندر سے کبھی مکمل نہیں ہوتے..... کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا ہے پانے کو..... سارے خانے کبھی بھی نہیں بھرتے....." کمال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"میرا ایک آدھ بار ایک قریبی دوست کے ذریعے جانا ہوا ہے ان کے محل میں۔ کچھ باغبانی اور نئے درختوں کے بارے میں معلومات چاہیے تھیں ان کے مینیجر کو..... نواب صاحب کی کمزوری ہیں اچھے باغیچے اور نئی پیوندکاری کے پھول..... کافی دیر مجھ سے بات کرتے رہے تھے وہ اس دن اپنے اس پسندیدہ موضوع پر....." کچھ دیر کمال صاحب سوچ میں گم رہے اور پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔

"ارے ہاں..... یاد آیا..... اُسی دن میرے دوست نے ایک بات کا ذکر تو کیا تھا۔ نواب صاحب کا ایک بیٹا ہے۔ نوجوان انیس، بیس (19,20) سال کا..... سنا ہے اس کا ذہنی توازن کچھ ٹھیک نہیں ہے..... ساری دنیا کے مہنگے ترین ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں نواب تیمور اپنے بیٹے کو..... مگر کچھ بہتری کے آثار نمودار ہوتے دکھائی نہیں دیئے..... پیروں فقیروں کے چلے بھی کٹوا چکیں ان کی بیگم، طب، حکمت اور ہومیوپیتھی بھی آزما چکے وہ لوگ..... مگر کچھ بات بنی نہیں..... مگر اس محل کی باتیں باہر ذرا کم ہی آتی ہیں۔ پھر پتہ نہیں چلا کہ انہوں نے اس مسئلے کا کیا حل نکالا..... ویسے یہ بھی نصیب کی بات ہے کہ وہی بیٹا ہی نواب کا اکلوتا جان نشین اور واحد اولاد ہے..... مگر تم اس بارے میں کیا کر سکتے ہو.....؟ یہ خبر تمہارے کس کام کی ہے.....؟"

میں نے کمال صاحب کی آنکھوں میں کئی سوال اُبھرتے دیکھے۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ آپ کسی طرح نواب تیمور تک یہ خبر پہنچا دیں کہ وہ تنکا ایک جوگی فقیر ہو سکتا ہے جو کسی بہانے آج کل آپ کی طرف ٹھہرا ہوا ہے..... یہ کام آپ کے دوست کی زبانی بھی ہو سکتا ہے..... مگر بات کو مبہم رکھا جائے تو بہتر ہے..... شوق کے انگاروں کو جتنی تیز ہوا دی جائے وہ اس تیزی سے بھڑکتے ہیں....." کمال صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے میاں..... تمہاری خاطر یہ جوا بھی کھیل لیتا ہوں میں..... تم جس حوالے سے مجھ تک پہنچے

ہو..... وہ بہت عزیز ہے مجھے..... اور میں سونیا اور سِڈ کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا....." میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو میری وجہ سے کبھی کوئی پشیمانی یا شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی....."

کمال صاحب نے میری طرف دیکھا "ہاں..... میں جانتا ہوں..... کوئی ہنر تو ہے تمہارے پاس..... مگر کیا ہے۔ یہ میں جان نہیں پایا ابھی تک....." کچھ دیر میں نوکر نے رات کا کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ میں نے لاکھ معذرت کی کہ شام کی چائے کے بعد اب ذرا بھوک باقی نہیں ہے، مگر میزبان بھلا مہمانوں کی کب سنتے ہیں۔ میں کمال صاحب کا دل رکھنے کے لئے بڑے ہال کی ڈائننگ ٹیبل پر کچھ نہ کچھ ٹونگتا رہا اور پھر رات گئے مجھے میری خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔

ایک رات سے پہلے تک خانقاہ کے صحن کی سخت کھردری زمین میرا بستر تھی اور آج یہ ریشم و کم خواب سے بنا آرام دہ بستر..... نیند البتہ مجھے وہاں آئی تھی اور نہ یہاں آئی۔ اور میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند کا تعلق آرام دہ بستر اور خواب گاہ سے کب ہوتا ہے بھلا.....؟

اگلی صبح ناشتے پر مجھے کمال صاحب نے بتایا کہ وہ صبح کی نماز کے بعد اپنے اسی دوست کے ساتھ روزانہ چہل قدمی کرتے ہیں اور آج صبح ہی انہوں نے میری کہی ہوئی بات اپنے دوست کے کان میں ڈال دی ہے اور اسے یہ بھی تاکید کی ہے کہ کسی طرح یہ خبر نواب صاحب کے مینیجر تک پہنچا دے۔ مگر مجھے کمال صاحب کے لہجے میں خاص اُمید نظر نہیں آئی۔ شاید وہ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ پتہ نہیں مینیجر اس بات کو اہمیت دے گا یا نہیں..... اور پھر بات نواب تک آگے پہنچے گی بھی یا کسی راستے میں ہی دفن ہو جائے گی۔

دن ڈھل گیا اور شام سر پر آ گئی۔ مجھے کمال صاحب نے لان میں ہی بلا لیا۔ تبھی باہر سے ان کا نوکر اور گیٹ کا کوئی دربان ہڑبڑائے ہوئے سے اندر بھاگے چلے آئے "وہ جناب..... باہر نواب صاحب کے محل سے ان کی گاڑی آ کر رُکی ہے..... شاید کوئی مہمان آئے ہیں....." کمال صاحب یہ سنتے ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

✱.....✱.....✱

باب 19

کمال صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ''نواب تیمور کے گھر کی سواری..... اور یہاں..... ارے بھائی باہر کسی نے پوچھا بھی ہے..... سب خیر تو ہے ناں.....'' کمال صاحب تیزی سے باہر کی طرف لپکے، اور پھر کچھ دیر میں ہی وہ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ ہنستے ہوئے دوبارہ گھر کے باغیچے میں داخل ہوئے۔

''بھئی عبداللہ میاں..... ان سے ملو..... یہ اصغر صاحب ہیں..... نواب صاحب کے مینیجر..... وہی جس کا میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا.....'' اصغر صاحب نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''اچھا..... تو آپ ہیں..... عبداللہ..... خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....'' کمال صاحب نے مینیجر کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ مگر اُسے جانے کی جلدی تھی۔

''نہیں کمال صاحب..... کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے..... دراصل نواب صاحب نے آپ کو اور آپ کے مہمان کو آج رات کھانے پر مدعو کیا ہے..... دعوت قبول کیجئے..... ہماری عزت افزائی ہوگی.....'' کمال صاحب نے بڑی مشکل سے اپنے چہرے پر اُبھرتے حیرت کے تاثرات کو خوشی اور نیاز مندی کے قالب میں ڈھالا.....

''آج رات..... ضرور..... مگر..... یہ تکلف کیوں..... اس طرح اچانک اصغر صاحب نے رواداری کا مظاہرہ کیا.....'' بس یوں سمجھیے کہ اشتیاق ہے نواب صاحب کو اللہ والوں سے ملنے کا..... کہیں سے خبر ملی کہ آپ کے گھر بھی کوئی ایسا مہمان ٹھہرا ہوا ہے تو انہوں نے ملنے کی خواہش ظاہر کی..... باقی یہ دعوت وغیرہ تو بس مل بیٹھنے کا اک بہانہ ہے.....'' کمال صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اصغر صاحب نے رخصت لی اور یہ بھی بتا دیا کہ رات ساڑھے آٹھ بجے خود نواب صاحب کی خصوصی گاڑی ہمیں لینے دروازے پر موجود ہوگی۔

مینیجر کے جانے کے بعد کمال صاحب نے سینے میں دبی لمبی سانس آزاد کی ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نواب تیمور جیسا مغرور شخص یوں خود تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرے گا، تمہارا اندازہ بالکل درست تھا۔ آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے صرف کتابیں ہی پڑھی ہیں کورس کی آج تک..... تعلیم حاصل نہیں کی..... میں تو انسانی رویوں کے بارے میں قطعی طور پر ناواقف ہوں ابھی تک.....'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''ایسا نہیں ہے، یہ بلاوہ بھی آپ کی حیثیت اور مرتبے کی وجہ سے ہی آیا ہے۔ اگر نواب تیمور کو یہ نہ بتایا جاتا کہ میں آپ کے گھر مہمان ٹھہرا ہوا ہوں تو ایک انجان جوگی بنجارے کو کبھی یہ شرف ملاقات عطا نہیں ہوتا۔ بس یوں سمجھیں کہ میں نے ایک تکا چلایا تھا..... جیسے اندھیرے میں ایک تیر، جو اتفاق سے ٹھیک نشانے پر جا لگا.....'' کمال

صاحب چپ رہے۔ لیکن ان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ ابھی نواب تیمور کے گھر سے یوں اچانک اور اتنی جلدی بلاوے پر حیرت کے جھٹکے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ایک عالیشان گاڑی باوردی شوفر اور ایک مسلح محافظ کے ساتھ ہمیں لینے کے لئے پہنچ گئی۔

کمال صاحب نے میری پوشاک کی طرف دیکھا جسے آج صبح ہی ان کا دھوبی دھو کر مجھے واپس کر گیا تھا۔ ''تم کچھ اور پہننا چاہو تو میری الماری میں دیکھ لو..... ہمارا ناپ قریباً ایک جیسا ہی ہے.....'' میں مسکرا دیا۔

''نواب نے ایک فقیر کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہے..... کسی رئیس کو نہیں..... مجھے میرے فقیری چولے میں ہی رہنے دیں.....'' کچھ دیر بعد ہم نواب کی گاڑی میں اس کے محل کی طرف رواں تھے۔ میں راستے بھر اللہ سے گڑگڑا کر یہی دعا کرتا رہا کہ میری لاج رکھ لے..... اُسی کے ہاتھ میں عزت ہے اور ذلت بھی..... پس میرا معاملہ عزت والا ہی رہے۔ گو میں اس قابل تو نہیں.....'' گاڑی تیزی سے مختلف کشادہ اور دورویہ سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک عالیشان گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور میری آنکھیں روشنیوں سے چندھیا سی گئیں۔ وہ واقعی کوئی حویلی نہیں..... ایک شاندار محل تھا۔ جس کے ڈرائیوے سے پورچ تک پہنچنے کا راستہ اور لان بھی ایکڑوں میں پھیلا ہوا تھا۔ سنگِ مرمر کی پرشکوہ عمارت، بالکونیاں، دریچے، راہداریاں، چلمنیں، منزل در منزل غالیچے، فانوس، دبیز قالین اور پھولوں سے بھرے راستے..... وہ سبھی کچھ تھا جو کسی محل کو تاج محل بنانے کے لئے درکار ہوتا ہے

میرے ذہن میں ایک عجیب سی بات آئی۔ رحیم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے والی مہرو نے جب نواب کا یہ محل دیکھا ہوگا تو اس کے دل میں پہلا خیال کیا آیا ہوگا.....؟ مگر اُس کے دل میں تو اس کا محبوب احمد بستا تھا۔ تو پھر وہاں کسی دوسرے خیال کی گنجائش ہی کہاں ہوگی؟ اسے تو اپنے احمد کے ساتھ کسی کٹیا میں رہنا بھی قبول تھا۔ اور احمد کے بنا یہ محل بھی اس کے لئے کسی کٹیا جیسا ہی ہوگا۔ یہ محبت بھی کتنی عجیب شے ہوتی ہے۔ یہ چیزوں کی حقیقت پل بھر میں کیسے بدل کر رکھ دیتی ہے..... تاج محل کو جھونپڑی اور بوسیدہ سی کٹیا کو تاج محل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ محبت کا اپنا سکہ چلتا ہے۔

گاڑی پورچ میں رُکی تو مینیجر صاحب ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھے۔ ''آیئے آیئے..... زہے نصیب..... نواب صاحب آپ لوگوں کا بارہ دری میں انتظار کر رہے ہیں.....'' نواب کی نوابی خو نے اُسے ایک فقیر کے استقبال کے لئے گھر سے باہر پورچ میں آنے سے روکے رکھا تھا۔ ہم مختلف راہداریوں اور غلام گردشوں سے ہوتے بارہ دری کی طرف بڑھتے گئے۔ ہر چیز سے نفاست، امارت اور اعلیٰ ذوق کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند مجھے کہیں لگا دکھائی نہیں دیا۔ ایک بڑے ہال سے گزر کر ہم ایک بہت وسیع و عریض صحن میں جا نکلے۔ جہاں چار اطراف سے بارہ بڑے دروازے صحن میں کھلتے تھے۔ صحن کے وسط میں بہت بڑا تالاب تھا جسے آج کل کی زبان میں لوگ سوئمنگ پول کہتے ہیں۔ نواب صاحب وہیں کنارے پر بچھی کرسیوں کی جانب بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تالاب کے اندر روشنی کا انتظام یوں کیا گیا تھا کہ تالاب میں اٹھنے والی ہر لہر کا عکس باہر صحن کی دیواروں پر عجب چاندنی سی بکھیر رہا تھا۔ نواب نے غور سے ہماری طرف دیکھا، وہ پینتیس چالیس سال کا لمبے قد اور مضبوط کسرتی جسم والا ایک وجیہہ شخص تھا۔ جس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ وہ غالباً کمال صاحب کے ساتھ کسی

بزرگ یا عمر رسیدہ شخص کے آنے کی توقع میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اسے شاید مایوسی ہوئی جس کا اظہار اس نے ہم سے ہاتھ ملاتے ہی کر دیا۔

''معاف کیجئے گا، مگر میں سمجھا کہ کوئی بزرگ اللہ والے ہوں گے..... مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب نوجوان بھی تصوف کی راہ پر چل پڑے ہیں.....'' کمال صاحب نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میں نے ان سے پہلے تحمل سے نواب کو جواب دیا'' عمر انسان کے اندر گزرتی ہے صاحب..... باہر بیتنے والے تو بس کچھ دن، مہینے اور سال ہوتے ہیں.....'' نواب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''خوب..... بڑی گہری بات کہہ دی..... آیئے..... جب تک کھانا لگ جائے..... ہم یہیں کچھ دیر کھلی ہوا میں بیٹھتے ہیں.....'' تھوڑی دیر میں ہی کچھ نوکر ہاتھوں میں کوئی لذیذ مشروب اور چند میوہ جات کے خوان وغیرہ اٹھائے پہنچ گئے اور ایک ہیڈ بیرے یا بٹلر کی سربراہی میں انہوں نے ساری چیزیں میز پر نفاست سے چن دیں۔ اتنی دیر تک نواب اور کمال صاحب اپنے پسندیدہ موضوع باغ، باغبانی اور پیوند کاری کے نئے طریقوں پر گفتگو کرتے رہے۔ کمال صاحب کو واقعی اپنے فن پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ جنگلات اور باغبانی سے متعلق نواب صاحب کو مفید مشورے دیتے رہے۔ درمیان میں نواب نے ایک آدھ بار مجھ سے بھی کوئی بات کی جس کا میں نے مختصر سا جواب دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنی جلدی میرے بارے میں کوئی اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جائے۔ مجھے یہ کھیل یا یہ جنگ بہت دھیمے انداز میں لڑنی تھی۔

میں آس پاس در و دیوار کا جائزہ لیتا رہا اور یہ سوچ کر ہی میری نسوں میں خون کی گردش تیز ہوتی رہی کہ انہی دیواروں میں سے کسی دیوار کے پیچھے اس وقت شاید مہرو بھی بیٹھی ہو۔ یا شاید جن غلام گردشوں سے چل کر ہم اس بارہ دری تک پہنچے ہیں انہی میں سے کسی ایک غلام گردش کے عقب میں وہ کسی تہہ خانے یا زندان میں آج بھی قید ہو۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے بڑے بیرے یا کسی خادم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ نواب نے اُٹھنے سے پہلے اپنا مدعا بھی ظاہر کر دیا۔

''آپ لوگوں کو یوں اچانک زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں..... دراصل میری اپنی ایک غرض ہے اور مایوسی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جہاں سے بھی ذرا سی اُمید بندھتی ہے..... ہم سب اس در پر دستک دیتے ہیں۔ خاص طور پر میری اہلیہ نواب بیگم بہت شدید کرب اور اذیت میں مبتلا ہیں اس مسئلے کی وجہ سے۔ ہماری ایک ہی نرینہ اولاد ہے جو اس ساری جاگیر کا وارث بھی ہے۔ ہمارا بیٹا شہریار..... اس سال اُسے کالج کے آخری سال ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہ جانے اس کا ذہن کہاں بھٹکتا رہتا ہے۔ عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ سارا دن تصویریں بناتا ہے اور اپنے کمرے میں بند رہتا ہے۔ میں اب کیا بتاؤں..... مجھے تو اس کے پاگل پن بتاتے ہوئے بھی جھجک ہوتی ہے۔ پہلے پہل وہ ایسا نہیں تھا..... مگر ایک بار ہمارے ساتھ یورپ کے دورے پر گیا، وہاں لندن سے آگے ایک ویران قلعے کی سیر کو گئے تھے ہم سب لوگ، بس وہاں سے آنے کے بعد اس کی یہ حالت ہوگئی..... اس وقت وہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا..... بزرگ کہتے ہیں اس پر کسی آسیب وغیرہ کا سایہ ہوگیا وہاں پر..... کیونکہ سنا ہے کہ وہ صدیوں پرانے

قلعے زیادہ تر بدروحوں وغیرہ کا مسکن ہوتے ہیں۔ یا وہ جگہیں عام فہم کے مطابق بھاری کہلاتی ہیں۔ میں خود تو ان باتوں پر یقین نہیں کرتا کیونکہ یہ صرف توہمات ہیں میرے نزدیک۔ اسی لئے میں نے دنیا کے ہر بڑے ماہر نفسیات اور معالج کو دکھایا ہے نواب شہریار کو..... مگر کچھ خاص افاقہ نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں وقت کے ساتھ شہریار کی یہ حالت ٹھیک ہوجائے گی۔ مگر تین چار سال ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے تو بہتری کے کچھ آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ نواب بیگم نے آپ کے مہمان کے بارے میں سنا تو اصرار کر بیٹھیں کہ جہاں اتنے معالج آزمائے ہیں۔ وہاں ایک جوگی فقیر کی دعا لینے میں بھی کیا حرج ہے۔ بس اسی لئے آپ کو زحمت دی.....''

کھانے کی میز پر ہم تینوں کے علاوہ چوتھا نواب کا شرمیلا چپ چاپ سا بیٹا شہریار ہی تھا۔ 19 انیس 20 بیس سال کا نوجوان۔ جو سارے کھانے کے دوران خاموش نظریں جھکائے بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔ زمانے بھر کی سوغاتیں اُس کھانے کی میز پر موجود تھیں۔ مگر شہریار نے صرف دکھاوے کے لئے چند نوالے لیے۔ اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اوپر بہت جبر کر کے وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے ایک اور عجیب سا احساس ہوا جیسے کسی کی دو آنکھیں ہمیں پورے کھانے کے دوران مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ کمال صاحب نے بات جوڑنے کی خاطر شہریار سے اس کے مشاغل کے بارے میں پوچھا تو اس نے گول مول سا جواب دیا کہ وہ فارغ وقت میں پینٹنگ کرتا ہے۔ نواب صاحب یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ میں شہریار کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھوں گا یا اس کے لئے کوئی وظیفہ وغیرہ تجویز کروں گا۔ مگر شہریار نے جلدی میں کھانا ختم کیا اور باپ سے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت لے کر اٹھ گیا۔

''میں ذرا اپنی ادھوری پینٹنگ مکمل کرلوں.....'' شہریار جلدی میں کمرے سے نکل گیا۔ نواب نے ایک گہری سانس لی۔

''دیکھ لیا اس کا رویہ آپ نے..... سارا دن اپنے آپ کے ساتھ جانے کیا باتیں کرتا رہتا ہے۔ اپنی ماں کو عجیب وغریب کہانیاں سناتا ہے کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں، تب یہ شہر پھر سے جاگ اٹھتا ہے۔ یہاں لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اپنے گھر میں بھی اِسے لوگ بولتے، چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ راتوں کو باہر بالکونی تو کبھی چھت..... اور کبھی بارہ دری کی طرف نکل جاتا ہے۔ پڑھائی کی طرف سے دھیان ہٹ چکا ہے۔ جانے کس زمانے کی تصویریں بناتا رہتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں اس لڑکے کے پاگل پن کا۔ اچھا خاصا ذہین طالب علم تھا..... میں نے سوچا تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ یا ہارورڈ بھیجوں گا اِسے۔ میرا سہارا، میرا بازو بنے گا..... مگر..... لگتا ہے سارے خواب بس خواب ہی رہ جائیں گے.....''

نواب تیمور کی مایوسی اس کے چہرے سے صاف نظر آرہی تھی۔ یہ جاگیر، سلطنت، بادشاہت اور مملکت بھی کیا عجب عذاب ہوتی ہیں۔ جیتے جی اپنے بس میں رکھنے کے رنج، اور مرنے کے بعد وارث اور وراثت کے غم..... اس سے تو یہ فقیری بھلی..... نہ یہاں کی سوچ نہ وہاں کی فکر.....

نواب میری طرف سے کسی کرشمے کی اُمید بھی چھوڑ چکا تھا اور اب اس کی آواز میں ہلکی سی اُکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کمال صاحب نے فوراً اچھے مہمان کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے نواب سے رخصت چاہی۔ نواب بھی

ہمارے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تبھی میں نے خلاف توقع نواب سے ایک اجازت چاہی ''اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دیر کے لئے شہریار سے اُس کے کمرے میں مل آؤں.....'' نواب تیمور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''شہریار کے کمرے میں.....'' وہ کچھ ہچکچایا۔

''ہاں ہاں..... کیوں نہیں.....'' نواب نے کسی خادم کو آواز دی اور اُسے میری شہریار کے کمرے تک رہنمائی کرنے کو کہا۔ میں نوکر کے ساتھ محل کے رہائشی حصے کی طرف چل پڑا اور میرے قدم رُکنے لگے، ہر کمرے، ہر دروازے اور ہر دیوار پر یہی گمان ہوتا رہا کہ مہروانہی دیواروں کے پیچھے کہیں قید بیٹھی ہوگی..... اور میں ہر آہٹ اور ہر سرگوشی پر چونک پڑتا..... پتہ نہیں یہ دیواریں کس نے ایجاد کی ہوں گی..... اور پہلی بار تاریخ میں کس نے گھر یا پردے کے لئے یہ دیوار اٹھائی ہوگی.....؟ لیکن یہی دیواریں آج مجھے بہت کھل رہی تھیں۔ جیل زندان اور قید خانے بھی تو انہی دیواروں سے بنتے ہیں۔ نوکر مجھے لے کر ایک دروازے تک پہنچا اور دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔ اندر سے شہریار کی بے زار سی آواز اُبھری۔

''کون ہے..... کتنی بار کہا ہے کہ مجھے اس وقت تنگ نہ کیا جائے.....'' میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں.....؟'' شہریار مجھے دیکھ کر ہڑبڑا سا گیا۔

''جی جی..... آیئے پلیز.....'' میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ سارا کمرہ مختلف تازہ اور پرانی بنی ہوئی پینٹنگز سے بھرا ہوا تھا۔ تمام تصویروں میں گہرا سرخ رنگ اور اُلجھی ہوئی لکیریں نمایاں تھیں۔ جیسے شہریار کے اندر کی الجھنیں اور شدید بے چینی سمٹ کر ان تصویروں میں ابھر آئی ہو..... میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں جب میٹرک میں تھا تو مجھے بھی پینٹنگ کا بہت شوق تھا۔ میں باقاعدہ ایک آرٹ گیلری میں شام کی کلاس بھی لینے جایا کرتا تھا۔ مگر سچ بتاؤں..... میں تمہاری طرح کبھی اتنی اچھی تصویر نہیں بنا پایا..... خاص طور پر یہ پیرس میں ایفل ٹاور اور سامنے والی سڑک پر بارش کے پانی میں ٹاور کا یہ عکس..... بہت عمدہ..... مجھے لگا میں بھی کہیں اسی سڑک کے کنارے بچھے کسی بینچ پر بیٹھا ہوا ہوں.....''

شہریار نے پہلے حیرت اور پھر دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا واقعی..... آپ کو میری تصویریں پسند آئیں..... مگر آپ تو.....؟ میرا مطلب ہے کیا واقعی آپ کو بھی پینٹنگ کا شوق رہا ہے..... آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا نہیں.....'' میں مسکرا دیا۔

''ہاں..... اب تو مجھے دیکھ کر بالکل بھی ایسا نہیں لگتا ہوگا.....''

شہریار نے جھجکتے ہوئے مجھ سے پوچھا ''کیا آپ کوئی پیر ہیں؟ امی نے بتایا تھا کہ آج ڈنر پر کوئی پیر صاحب ہمارے گھر آرہے ہیں.....'' میں شہریار کی بات سن کر ہنس پڑا۔

''ارے نہیں..... پیر تو بڑی اعلیٰ ہستی ہوتی ہوگی..... میں تو بس عبداللہ ہوں..... ایک طالب علم کہہ سکتے ہو مجھے..... اچھا تم مجھے یہ بتاؤ..... تمہاری تصویروں میں بارش، بھیگی سڑکیں، لیمپ پوسٹ، بینچ اور شام سے ذرا پہلے کے وقت کی بہت عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً تم نے کمرہ، کھڑکی دریچہ یا بالکونی بھی اگر پینٹ کی ہے اندر کمرے کے زاویئے

سے تو باہر تم نے بھیگی سڑک، لڑکی چھتری اور بھیگا موسم ہی دکھایا ہے۔ کیا تمہیں بارشیں بہت پسند ہیں.....؟" شہریار کے چہرے پر چھایا تناؤ اب مکمل ڈھل چکا تھا اور وہ پہلی مرتبہ کھلے دل سے بولا:

"ہاں واقعی..... مجھے بارش، شام اور اندھیرا ہونے سے پہلے شام کی بھیگی روشنی میں جلتے لیمپ پوسٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں نے یہ سب ابا جان کے ساتھ یورپ کے ٹور پر دیکھا تھا۔ بس اُنہی یادوں کو پینٹ کرتا رہتا ہوں..... کیا آپ کبھی یورپ گئے ہیں۔ لندن یا پیرس.....؟ وہاں کی شامیں اور وہا ں بارشیں کتنی خوبصورت ہوتی ہیں ناں..... میرا دل کرتا ہے میں وہ سب منظر پینٹ کر کے اپنے کینوس میں قید کرلوں..... مگر پھر ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ منظر مجھ سے روٹھ نہ جائیں....."

میں نے چونک کر شہریار کی طرف دیکھا۔ ایک (20) بیس سالہ لڑکے کی زبان سے اتنی گہری بات سننے کی توقع نہیں تھی مجھے "تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ منظر روٹھ جائیں گے۔ آخر زمانے بھر کے یہ آرٹسٹ پینٹر ایسے ہی منظر تو پینٹ کرتے ہیں..... انہی لمحوں کو تو اپنے کینوس پر برش سے اُتارتے ہیں۔ تو کیا یہ منظر ان سے بھی روٹھے رہتے ہوں گے.....؟" شہریار نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"پتہ نہیں کیوں..... مگر مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ جب ہم کسی چیز کی تصویر بناتے ہیں اور اس میں وہی قدرت کے رنگ بھر کر وہ منظر کینوس پر پینٹ کر دیتے ہیں تو ہم اس بارش، شام، برفباری، سڑک، چلتی بس..... چھتری تانے گزرتی لڑکی اور لڑکے کو جیسے فریم میں قید کر لیتے ہیں، وہ لمحہ تو آگے گزر جاتا ہے مگر اُس کی روح ہمارے کمرے یا گیلری میں اس تصویر کے فریم میں قید بے چین تڑپتی رہتی ہے۔ اور سالوں بلکہ صدیوں بعد بھی وہ منظر اسی طرح تصویر میں زندہ رہتا ہے۔ پھر کبھی وہ کردار تصویر سے باہر جھانک کر ہم سے بات کرتے ہیں، یا کبھی کبھی ہم تنہائی میں غور سے اپنے یا کسی اور کے پینٹ کیے ہوئے منظر کو بیٹھ کر دیکھیں تو وہ تصویر ہمیں اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ ہمیں اُسی لمحے کی سیر کراتی ہے اور ہم وہی موسم، بارش سردی ہوا وہی سب کچھ محسوس بھی کر سکتے ہیں....." میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہ صرف یہ..... بلکہ کبھی کبھی تو ہم اس سڑک یا گلی سے ملحقہ آگے پیچھے کی گلیاں، مکان اور چہرے بھی دیکھ آتے ہیں۔ گویا وہ تصویر ہمارے لیے ایک دوسری دنیا کی کھڑکی یا دروازہ بن جاتی ہے..... اور ہم اُس عکس کی مکمل سیر کر لیتے ہیں....." شہریار نے خوشی اور حیرت میں زور سے کہا۔

"ہاں..... بالکل یہی..... کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے....."

"ہاں..... کئی بار کوئی خوبصورت اور گہری پینٹنگ دیکھتے ہوئے ایسا ہوا ہے..... شاید ساری بات احساس اور دھیان دینے کی ہے۔ زندہ لمحے تصویر میں بھی جیتے ہیں اور آئینے کا سا اثر رکھتے ہیں۔ ہر تصویر کے پیچھے اُس لمحے کی کہانی زندہ رہتی ہے۔ ہمیں بلاتی ہے دیکھنے کی دعوت دیتی ہے....." شہریار کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور نواب تیمور کمال صاحب کے ساتھ اندر آ گئے۔ کمال صاحب نے میری طرف دیکھا۔

"بھئی عبداللہ میاں..... رات بہت ہو چکی..... نواب صاحب کے آرام کا وقت ہے یہ..... تو ہمیں چلنا

چاہیے.....'' میں نے معذرت چاہی۔

''اوہ..... معاف کیجئے گا..... مجھے باتوں میں خیال ہی نہیں رہا..... ہمیں اجازت ہے نواب صاحب.....''

تبھی شہریار نے بے چینی سے باپ کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولا:

''ابا جان..... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ پیر صاحب آج رات یہیں رک جائیں.....'' نواب تیمور اور کمال صاحب دونوں نے ایک جھٹکے اور شدید حیرت کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

✻.....✻.....✻

باب20

میں خود بھی شہریار کی طرف سے ایسی کسی فرمائش کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دھیرے سے سرگوشی نما آواز میں مجھے کہا" آپ جایئے گا نہیں..... مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے..... بہت ضروری....." مگر تب تک نواب تیمور ہمارے قریب آچکا تھا۔ میں نے ان کے بیٹے سے کہا کہ" یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ میں کمال صاحب کا مہمان ہوں اور مجھے یقیناً اور بھی بہت سی مصروفیات درپیش ہوں گی۔" شہریار نے مایوسی سے میری طرف دیکھا میں نے اُسے تسلی دی۔

"میں ابھی یہیں ہوں کچھ روز اور..... تم سے پھر ملاقات ہوگی....." شہریار اپنے باپ کے ساتھ ہمیں باہر کار پورچ تک چھوڑنے کے لئے آیا اور مجھ سے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر واپس لوٹ گیا۔ نواب تیمور کے چہرے پر ابھی تک حیرت کے آثار نمایاں تھے۔

"اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ شہریار نے خود کسی کو گھر آنے کی دعوت دی ہے..... دعوت دینا تو دُور..... وہ تو اب کسی سے بات بھی نہیں کرتا..... لگتا ہے جو دم آپ نے اس پر ہمارے سامنے نہیں کیا۔ وہی دُعا آپ نے تنہا کمرے میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دی ہے..... اب آپ کو دوبارہ آنا ہوگا یہاں..... میں نے سالوں بعد اپنے بیٹے کے چہرے پر مسکراہٹ اور اطمینان دیکھا ہے..... اس کی ماں تو خوشی سے نہال ہو جائے گی یہ دیکھ کر....."

میں نے نواب سے وعدہ کیا کہ میں دوبارہ ضرور آؤں گا..... اُسے کیا خبر تھی کہ میں مہرو کے ملنے تک ہزار بار اس کے گھر کے چکر کاٹ سکتا تھا۔ ہمیں واپس بھی اسی گاڑی نے ہی گھر پہنچایا جس میں ہم گئے تھے۔ کمال صاحب راستے میں تو ڈرائیور اور محافظوں کی وجہ سے چپ رہے مگر گھر میں داخل ہوتے ہی انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھالیا" یہ کیا ماجرا ہے عبداللہ میاں..... کہ پتھر بھی تمہارے سامنے بول پڑتے ہیں۔ ایسا کیا جادو کر دیا تھا تم نے اس نواب زادے پر کہ چند لمحوں کی ملاقات میں ہی وہ تمہیں اپنی جاگیر پر ٹھہرانے کے لئے مچل بیٹھا..... اگر تہذیب کا تقاضہ نہ ہوتا تو نواب صاحب تمہیں واپس کبھی نہ آنے دیتے..... میں نے ان کے اندر اُمڈتا ہوا طوفان محسوس کر لیا تھا۔ انہیں برسوں بعد اُمید کی کوئی کرن دکھائی دے گئی ہے۔"

"میں نے کوئی جادو منتر نہیں پڑھا شہریار پر کمال صاحب..... بس اُس کے دل کی کچھ باتیں اپنے دل کے ساتھ بانٹی ہیں..... انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ ضرورت اس کے اندر پھیلے گھٹن اور غبار کو باتوں کی صورت میں سننے والے ایک اچھے سامع کی ہوتی ہے۔ میں بس کچھ دیر کے لئے وہی سامع بن گیا تھا۔ اور کچھ نہیں کیا میں

نے....." کمال صاحب کو جیسے یقین نہیں آیا۔

"جانے یہ ساعت کا کیسا ہنر ہے..... جو اُس کے ماں باپ اور آس پاس کے لوگوں کے پاس نہیں ہے.....؟ بہرحال..... تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں....." میں چپ رہا۔

میں انہیں کیا بتاتا کہ یہ ہنر میں نے سلطان بابا کے ساتھ میلوں میل سفر کے دوران بہت سیکھا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہر انسان کی ایک کنجی ہوتی ہے جس سے وہ جلد یا بدیر کھل جاتا ہے..... ہمارا کمال یہ ہے کہ ہم بہت سی کنجیوں کے گچھے میں سے وہ چابی ڈھونڈ نکالیں جس سے اس انسان کے دل پر لگا تالہ کھلتا ہے۔ اور دل کی بات عموماً وہی ماسٹر کی Master key ثابت ہوتی ہے۔ میں نے بھی صرف شہریار کی من پسند بات ہی تو کی تھی۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ اس نواب زادے پر ان باتوں کا اتنا گہرا اثر ہوگا کہ اگلی شام ہی محل سے میرے لئے دوسرا بلاوہ آجائے گا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا بخت خان کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ اب تک نواب پور کیوں نہیں پہنچا۔ خدانخواستہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہوگیا ہو۔ اچانک میرے دروازے پر دستک ہوئی اور کمال صاحب ہڑبڑائے ہوئے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

"لگتا ہے اب مجھے ان حیرتوں کی عادت ڈال لینی چاہیے عبداللہ میاں..... وہ محل سے تمہیں لینے کے لئے گاڑی آئی ہے۔ تمہیں نواب زادہ شہریار نے شام کی چائے کی دعوت بھیجی ہے..... اور اس بار میں بھی مدعو نہیں ہوں....." کمال صاحب کی معصومانہ شکایت سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔

"اچھا تو پھر آپ انہیں جا کر صاف منع کر دیں کہ میں اپنے میزبان کی اجازت اور انہیں ساتھ لیے بنا کہیں نہیں جاتا....." میرا قطعی فیصلہ سن کر کمال صاحب بھی ہنس پڑے۔

"ارے نہیں..... میں نے تو یونہی دل لگی کی خاطر شکایت کر دی۔ دراصل میں خود یہ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ اگلی بار اگر وہاں سے میرے لئے بلاوہ آیا بھی تو میں کسی بہانے سے انکار کر دوں گا۔ کیونکہ میری موجودگی میں وہ لوگ تم سے کھل کر کوئی بات نہیں کر پائیں گے۔ اس لیے تمہارا تنہا جانا ہی بہتر ہے۔" کمال صاحب اتنے وضعدار انسان تھے کہ انہوں نے آج تک کبھی مجھ سے یہ کریدنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ آخر میرا نواب تیمور سے ایسا واسطہ کیا ہے جس کے لئے میں یہ سارے پاپڑ بیل رہا ہوں، وہ جانتے تھے کہ وقت آنے پر میں انہیں خود سب کچھ بتا دوں گا۔

جب میں نواب کے محل میں داخل ہوا تو دور میناروں کے پیچھے کہیں دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس بار مجھے پورچ کے بجائے محل کے عقبی حصے میں اتارا گیا جہاں ایک وسیع و عریض پھولوں والے لان میں شہریار اپنا کیمرہ سجائے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ نواب تیمور مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ شہریار کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھل گیا۔ وہ جلدی سے میری طرف بڑھا اور سلام دعا کے بعد بولا "امی جان مجھ سے بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ مجھے خود آپ کو لینے جانا چاہیے تھا۔ مگر میں آپ کے آنے سے پہلے اپنی ایک پینٹنگ مکمل کر کے آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ کل رات سے اسی کو بس آخری ٹچ دے رہا ہوں..... اُمید ہے آپ کو میرا اس طرح اچانک بلانا برا نہیں لگا ہوگا....."

میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم فقیروں کو ایسے شاہانہ بلاووں اور استقبال کی عادت نہیں ہوتی۔ شہریار نے مجھے اپنی نئی پینٹنگ دکھائی۔ یہ اس کے اپنے محل کے کسی جھروکے یا بالکونی کی تصویر تھی جس

میں ایک خوبصورت مگر اُداس لمبے سیاہ بالوں والی لڑکی دور سبزہ زاروں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ تصویر کی جزئیات اس قدر مکمل تھیں کہ میں خود چند لمحوں کے لئے اس ڈھلتی شام، سرکتی دھوپ، جھروکہ اور وہاں ایستادہ لڑکی کے انتظار میں کھو سا گیا۔

''بہت خوب..... تم نے اس لڑکی کے انتظار کی شدت اور اُداسی پل بھر میں مجھے محسوس کروادی ہے لیکن شاید یہ تو تمہارے ہی اس محل کی کوئی کھڑکی یا چلمن ہے.....'' شہریار نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا۔

''میں جانتا تھا کہ صرف آپ ہی ہیں جو اس تصویر میں چھپے کرب کو محسوس کر پائیں گے..... ہاں یہ اسی محل کے ایک کمرے کی کھڑکی ہے جو یہیں پچھلی طرف اس باغ میں کھلتی ہے..... وہ دیکھیں..... وہ رہی.....'' شہریار نے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے اوپر دیکھا اور اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی نسوانی ہیولہ ایک جھٹکے سے اس کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے عجلت میں دور ہٹ گیا ہو۔ میں نے شہریار کی طرف دیکھا۔

''اور یہ لڑکی کون ہے.....؟ کیا اس گھر میں رہتی ہے یہ بھی.....؟'' شہریار نے ایک گہرا سانس لیا۔

''ہاں..... کبھی رہتی تھی..... شاید ڈیڑھ صدی قبل..... مگر مجھے اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی اس گھر کے پرانے مکین اپنے گمشدہ کمروں سے نکل آتے ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ اپنے معمولات نبٹاتے ہیں اور پھر صبح سے پہلے واپس پلٹ جاتے ہیں۔ آپ کو شاید میری باتوں پر یقین نہ آئے..... کوئی بھی یقین نہیں کرتا مجھ پر..... مجھے نیم پاگل سمجھتے ہیں یہ لوگ..... آپ سے بھی میرا یہی تعارف کروایا گیا ہوگا یہاں بلانے سے پہلے..... لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں..... میں یہ سب دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں..... اب آپ کی مرضی کہ آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح میری باتوں کو وہم اور پاگل پن سمجھ کر میرے علاج کی فکر میں پڑتے ہیں یا پھر.....''

اتنے میں نوکروں نے چائے کے لئے پوچھا۔ شہریار کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں نے اسے یہیں باہر چائے لگوانے کا کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس جگہ سے منتقل ہو کر کسی اور جگہ جا بیٹھیں۔ کبھی کبھی جگہ کی منتقلی بھی ہمارے خیالات کی رو کو منتشر کر دیتی ہے۔ ہمارا رویہ بدل جاتا ہے اور ہم وہ انسان نہیں رہتے جو کچھ دیر قبل کسی اور جگہ تھے۔ ماحول انسان کی شخصیت کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ میں نے شہریار کو بات جاری رکھنے کا کہا۔

''بس میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو بھی مجھ پر کوئی دم درود پڑھنے کے لئے بلایا گیا ہے تو میرے ماں باپ کو مایوس نہ کیجئے گا۔ انہیں جاتے جاتے تسلی ضرور دیتے جایئے گا کہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ وہ دونوں میری وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں اور میں انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بہت محبت کرتا ہوں میں ان سے۔ اور اگر واقعی مجھے وہم کی یا خواب دیکھنے کی کوئی بیماری ہے تو میرے لئے یہ دعا ضرور کیجئے گا کہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں.....''

شہریار نے بات ختم کی تو ہم دونوں کے پیالوں میں پڑی چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ آج نواب صاحب گھر پر نہیں تھے اور شہریار نے کسی نوکر کو بھی ہماری تنہائی میں مخل ہونے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس لئے وہاں ہمیں تازہ چائے پیش کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ شہریار اپنی بات ختم کر کے یوں خاموش بیٹھا تھا جیسے کوئی مجرم اپنے جرم کا اقرار کرنے کے بعد اپنی سزا سننے کے انتظار میں بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی دیوانگی کا اظہار کر چکا تھا اور اب مجھ سے کسی نصیحت، دعا یا تاسف نما حیرت کی توقع کر رہا تھا مگر میں نے اس سے صرف ایک سوال پوچھا۔

''اُس لڑکی کا نام کیا ہے.....؟''

شہریار حیرت سے اُچھل پڑا ''جی..... نام.....؟''

''ہاں بھئی..... جو تمہیں روز دکھائی دیتی ہے۔ تمہارے کمرے کی بالکنی میں کھڑی رہتی ہے۔ اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ کسی نے اُسے پکارا ہوگا کبھی.....؟''

''جی..... جی بالکل پکارا ہے.....'' شہریار بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یملا دیوی نام ہے اس کا..... وہ ہندو خاندان سے ہے..... اس کا منگیتر اشوک برٹش آرمی میں بھرتی ہو کر اپنی کسی پوسٹنگ پر گیا ہوا ہے مگر کافی عرصے سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ اسی لئے یملا اپنے کمرے کے جھروکے میں کھڑی اس کی راہ تکتی رہتی ہے۔''

شہریار نے بات ختم کر کے میری طرف چور نظروں سے یوں دیکھا جیسے اسے اب ایک بے ساختہ قہقہہ سننے کی اُمید ہو۔ لوگ ایسی باتیں سن کر عموماً زوردار قہقہہ ہی تو لگاتے ہیں۔

''اچھا یہ بتاؤ..... کیا یہ سب کردار جو تمہیں نظر آتے ہیں۔ یملا، اس کا خاندان وغیرہ۔ کیا ان میں سے کبھی کسی نے تم سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی ہے..... یا کبھی وہ تم کو دیکھ کر ٹھٹکے یا چونکے ہیں.....؟''

''نہیں..... وہ مجھ سے بالکل لاتعلق رہتے ہیں۔ جیسے میں وہاں ہوں ہی نہیں..... یا میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے.....'' میں شہریار کی بات سن کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ..... کیا واقعی میرا ذہنی توازن خراب ہو رہا ہے یا مجھ پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے.....؟'' میں نے غور سے شہریار کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تمہیں یہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے..... آدھی رات کو بیٹھے بٹھائے اس محل میں ان کرداروں کے لئے کبھی دن بھی نکل آتا ہوگا۔ اور رات میں بھی تمہیں ان کے دن، شام یا کسی بھی گزرے وقت کے لمحے دکھائی دیتے ہوں گے۔ اُس زمانے کی گاڑی یا بگھی آ کر دروازے پر رُکتی ہوگی۔ یملا کی ماں اسے آوازیں دیتی سیڑھیاں چڑھ کر آتی ہوگی۔ سامنے آنگن میں پیڑ کے نیچے بچے کھیلتے شور مچاتے ہوں گے۔ نوکر نوکرانیاں اِدھر اُدھر بھاگتے کام کرتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ گھر میں کبھی ہولی تو کبھی دیوالی کے تیوہار منائے جاتے ہوں گے، گراموفون پر اس زمانے کی کجن بائی کے گیت گونجتے ہوں گے، یملا کے کمرے میں کھڑکیوں پر پڑے ہلکے رنگ کے پردے ہوا سے لہراتے ہوں گے، اس کی بیاض اور اُس کی کتابیں میز اور ریک پر بکھری پڑی رہتی ہوں گی اور بالوں کو باندھنے والا کلپ تکیے کے سفید غلاف سے باہر جھانکتا پڑا ملتا ہوگا۔ یملا کو کمرے کے فرش پر ننگے پاؤں چلنے کی عادت ہوگی اور اس کے سلیپر ہمیشہ بستر تلے پڑے ہوتے ہوں گے.....''

یکا یک شہریار جلدی سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے تڑپ کر میرے ہاتھ پکڑ لئے ''ہاں ہاں بالکل صحیح..... سو فیصد درست..... یہی سب کچھ تو مجھے نظر آتا ہے۔ مگر..... مگر آپ کو یہ سب کیسے پتہ..... کیا..... کیا آپ کو بھی یہاں یہ سب نظر آ رہا ہے..... مطلب یہ میری نظر کا دھوکہ نہیں ہے..... آپ پہلے کہاں تھے..... کوئی تو ہوتا جو میری گواہی دیتا..... میری بات کو سمجھتا..... بتائیں ناں..... کیا آپ کو بھی یہ سب دکھائی دیا یہاں.....؟''

''نہیں..... میں نے خود ایسا کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن میں نے صرف اپنا تخیل بیان کیا ہے تم سے..... میں ایک عام انسان ہوں تب بھی صرف تمہاری باتیں سن کر میرے تخیل میں یہ سب آ گیا۔ تو تم تو پھر ایک آرٹسٹ ہو، تو سوچو تمہارے تخیل کی پرواز کتنی اونچی ہوگی.....'' شہریار نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔

''تو کیا یہ سب میرا تخیل ہے، یہ کردار میرے اپنے ذہن کے گھڑے ہوئے ہیں.....''

''نہیں..... میں نے یہ نہیں کہا۔ اور ایک بات اور، جو ہمارے تخیل میں آتا ہے..... وہ کہیں نہ کہیں وجود ضرور رکھتا ہے..... جس کا کوئی وجود نہیں..... اس کا تخیل بھی نہیں.....''

''لیکن اتنا مکمل اور جڑا ہوا تخیل..... کیسے.....؟'' شہریار ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ میں نے اسے مثال دی۔

'' کچھ سال پہلے امریکہ کے خلائی تحقیق کے ادارے ناسا NASA نے اپنی ایک خلاء کی تحقیق کے دوران چند انجانی آواز کی لہریں پکڑ کر ریکارڈ کر لی تھیں۔ ان آوازوں کی حقیقت جاننے کے لئے ماہرین لسانیات کی ایک پوری ٹیم بٹھا دی گئی جس نے مہینوں کی محنت اور تحقیق کے بعد اتنا راز پا لیا کہ یہ قدیم عبرانی زبان کی بولی کی آوازیں ہیں۔ مگر عبرانی زبان کے ماہرین نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ عبرانی بولی اب تقریباً متروک ہو چکی ہے۔ لہٰذا اسے ڈی کوڈ کرنے کے لئے ساری دنیا سے عبرانی زبان کے محقق جمع کیے گئے جنہوں نے دن رات کڑی جستجو اور ریسرچ کے بعد آخر کار وہ زبان سمجھ کر یہ اعلان کیا کہ یہ چند لوگوں کی آواز ہے جو آپس میں کسی جانور (غُر) کے مر کر زندہ ہونے کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور پھر مہینوں بعد جا کر عقدہ یہ کھلا کہ غالباً یہ آوازیں ہزاروں سال پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کی آوازیں ہیں جو کسی نبی کے معجزے کے بارے میں ہونے والی بات چیت پر مبنی ہیں۔ اس تحقیق سے یہ بات تو صاف ظاہر ہوگئی کہ آواز کی لہریں خلاء میں ہمیشہ کے لئے تیرتی رہتی ہیں۔ سائنس کہتی ہے کہ انرجی یا توانائی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اپنی اقسام بدلتی رہتی ہے۔ آواز کی لہر بھی ایک انرجی کی قسم ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔ تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ جس طرح آواز کی لہریں خلاء کے دوش پر تیرتی رہتی ہیں اسی طرح تصویر کی لہر بھی تو زندہ رہتی ہوگی۔ ہمارے چلنے پھرنے کی یہ متحرک تصویریں لمحہ گزر جانے کے بعد بھی قدرت کے کسی نہ کسی کیمرے یا کیمرے کی فلم میں قید ہو جاتی ہوں گی۔ اب تو انسانی دیدہ یونیکنالوجی نے بہت سی گرہیں کھول دی ہیں۔ آپ جب چاہیں تصویر کو آگے یا پیچھے (ریوائنڈ یا فارورڈ) کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ لائیو یا اسی لمحے کی تصویر بھی نشر ہوتی ہے اور ہم سے ہزاروں لاکھوں میل دور بیٹھے لوگ یا منظر ہمیں اسی لمحے جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ تو بس یہ سمجھ لو کہ جو گزر چکا ہے اس کی بھی پوری فلم بنی پڑی ہے۔ لیکن ہمارے پاس ابھی وہ ناسا کی آواز پکڑنے والی مشین جیسی ٹائم مشین نہیں ہے جو ان گزرے لمحوں کی فلم ہمیں دکھا سکے۔

مگر انسانی ذہن قدرت کی بہت بڑی ایجاد کردہ ٹائم مشین ہے۔ وہ بنا کسی بیرونی ایجاد کی مدد کے ہمیں ان ماضی کے لمحوں کی سیر کرا سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک جدید فلسفہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ انسانی تاریخ سے بھی پہلے یعنی ازل سے لے کر ابد تک کی پوری فلم قدرت نے بنا رکھی ہے اور ہم صرف اس وقت کی سرنگ سے گزرتے ہوئے اپنے اپنے کردار نبھا رہے ہیں۔ اسی لئے کبھی کبھی کچھ لوگوں کو آنے والے واقعے یا وقت کے لمحے کی جھلکیاں کسی خواب میں یا کھلی آنکھوں سے بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ یہ قدرت خدا کا بنایا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے جس کی تحقیق

اور کھوج کرنے کی ہمیں نہ صرف بار بار تلقین کی گئی ہے بلکہ حکم بھی دیا گیا ہے۔ مگر افسوس..... ہم خواب غفلت میں گھرے تمام عمر صرف دنیاوی جھمیلوں اور روٹی کپڑا اور مکان کی جستجو میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے جو تمہیں نظر آتا ہے۔ وہ اس حویلی کا کوئی ماضی کا لمحہ ہو۔ چند تصویریں فریم ہوں جو تمہارا ذہن پکڑ پا رہا ہے مگر ہم سب اس سے قاصر ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔ لہٰذا خود کو الجھانے کی کوشش مت کرو.....''

شہریار دم بخود سا بیٹھا میری ساری بات سنتا رہا۔ رات بیت رہی تھی۔ نوکر نے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ نواب صاحب واپس تشریف لا چکے ہیں اور کھانے کا وقت بھی گزر رہا ہے۔ میں نے شہریار سے اجازت چاہی مگر وہ نہ مانا۔ نواب صاحب کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

''لگتا ہے آج نواب شہریار نے آپ کو بہت مصروف رکھا ہے۔ سنا ہے کہ گزشتہ چار گھنٹے سے آپ دونوں پچھلے لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بھئی ہم سے تو شہریار نے پورے سال میں شاید چند منٹ ہی بات کی ہوگی۔''

اتنے میں ایک خادمہ سر جھکائے ہوئے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی۔

''حضور نواب بیگم آنے کی اجازت چاہتی ہیں.....'' نواب نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں..... ہم انہی کا انتظار کر رہے ہیں کھانے پر..... ان سے کہو آ کر مہمان سے مل لیں.....'' کچھ ہی دیر میں نواب کی بیگم ہال میں داخل ہوئیں۔ ایک پروقار، حسین اور مہذب خاتون، شہریار نے جلدی سے اُٹھ کر ماں کے لئے کرسی کھسکائی اور وہ سلام کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

''معذرت چاہتی ہوں..... آج شہریار نے آپ کا سارا وقت لے لیا۔ مگر آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے میزبان کو اطلاع کر دی گئی ہے کہ دیر ہونے کی صورت میں آپ شب یہیں بسر کریں گے..... سچ پوچھیں تو ہم سب کی یہی خواہش ہے کہ آپ ہمیں مزید خدمت کا موقع دیں.....'' شہریار ماں کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

''آپ رُک رہے ہیں ناں..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ رات زیادہ دیر آپ کے کان نہیں کھاؤں گا.....''

شہریار کے ماں باپ اپنے بیٹے کو یوں ہنستے مسکراتے دیکھ خوشی سے نہال ہو رہے تھے۔ کھانے کے بعد شہریار کچھ دیر کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نواب اور بیگم بیٹھے رہے۔ خاتون نے شکریہ ادا کرنا چاہا مگر ان کی آواز لرز سی گئی۔

''میرا بیٹا آپ کے آنے سے ایک بار پھر جی اُٹھا ہے۔ آپ نہیں جانتے آپ نے ہمیں کتنی بڑی خوشی دی ہے۔ خدا کرے کہ اس کے ہونٹوں سے یہ مسکراہٹ اب کبھی واپس نہ ہٹنے پائے.....'' نواب تیمور نے مجھ سے پوچھا:

''لیکن اسے ہوا کیا ہے..... آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں..... ہمارا بیٹا ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟''

''آپ کے بیٹے کو کچھ بھی نہیں ہوا..... کوئی ذہنی عارضہ یا نفسیاتی مرض لاحق نہیں ہے اُسے..... بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ شہریار عام لڑکوں کے مقابلے میں کچھ خاص ہے..... شاید اسے قدرت کی طرف سے کچھ عطا ہے..... اور اس جیسے ایسے کئی فرزانے ہیں جنہیں شاید دنیا آج بھی دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتی ہوگی..... یہاں اپنی اپنی عقل کے لحاظ اور حساب سے فیصلہ کرنے کا رواج ہے.....''

نواب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں.....''

''میں آپ کو تفصیل سے سب بتا دوں گا آپ فی الحال ایک کام کریں تقسیم ہند سے بھی بہت قبل عرصہ کی

تاریخ نکلوائیں کسی طرح اپنے اس محل کی۔ یہاں آپ کے آباؤ اجداد سے قبل کوئی ہندو خاندان رہتا تھا شاید.....؟ ہو سکے تو اس خاندان کی ساری تفصیلات معلوم کروائیں۔ اور یہ کام جتنا جلدی ہو..... اُتنا بہتر ہے....."

نواب نے رات ڈھلنے کی وجہ سے زیادہ بحث نہیں کی اور مجھے شب بسری کے لئے خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر میں وہ رات سو کر ضائع کرنے والا کب تھا بھلا۔ میں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ آدھی رات سب کے سو جانے کے بعد مہرو کی تلاش میں محل کو چھانوں گا۔ گھڑی نے رات کے تین بجائے تو میں آہستہ سے دروازہ کھول کر راہداری میں نکل آیا۔ یہ مہمان خانے کا خاص حصہ تھا اور راہداری میں کمروں کی ایک طویل قطار تھی مگر زیادہ تر کمرے بند تھے۔ میں ایک ایک کمرے کے دروازے کو چیک کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ تبھی مجھے ایک کمرے میں اور کوئی غیر معمولی آہٹ محسوس ہوئی۔ شاید کوئی اندر موجود تھا، میں نے بے چینی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میری سانسیں رُکنے لگیں۔ میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

✱.....✱.....✱

باب21

میں نے روشنی کرنے کی خاطر دیوار پر لگے بٹنوں کی تلاش میں ہاتھ سے ٹٹولا۔ تبھی باہر عقبی دیوار اور دالان کی طرف سے اچانک شور اور بہت سے لوگوں کے بھاگنے اور چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔

''پکڑو..... جانے نہ پائے..... مہمان خانے کی طرف بھاگا ہے..... ہاں..... اُدھر..... وہ رہا.....'' میں گھبرا کر واپس پلٹا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میرا محافظوں کے آنے سے پہلے اپنے کمرے تک پہنچنا ضروری تھا۔ تبھی اندھیرے میں دوڑتا ایک ہیولہ مجھ سے زور سے ٹکرایا۔ اور اپنی ہی جھونک میں زمین پر گر گیا۔ اس نے اُٹھ کر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال کہ جھٹکا دیا اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

بھاگنے والے نے خود کو چھڑانے کے لئے زور لگایا اور مجھے اندھیرے میں اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی چمکتی چیز نظر آئی۔ اگر میں آخری لمحے میں اس کا وار اپنے دوسرے ہاتھ سے نہ روک لیتا تو وہ خنجر سیدھا میرے سینے میں میرے دل کے آر پار ہو جاتا۔ حملہ آور کی طاقت غضبناک تھی اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے الجھے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ تبھی محافظ راہداری میں آن پہنچے اور کسی نے چلا کر ہمیں خبردار کیا۔

''رکو..... ورنہ گولی چلا دوں گا.....'' اور کسی دوسرے گارڈ نے جلدی سے راہداری کی بتی جلا دی۔ راہداری روشنی سے نہا گئی اور تبھی میں نے حملہ آور کو خود سے الجھتے ہوئے دیکھا۔ وہ بخت خان تھا۔ بخت خان ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ سے خنجر گرتے گرتے بچا۔

''گارڈز اپنی بندوقیں تان کر اُسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے چکے تھے۔ میں نے غلط فہمی میں اپنے یار کو پکڑوا دیا تھا۔ میں اور بخت خان دونوں ہی بری طرح ہانپ رہے تھے۔ بخت خان حیرت سے ششدر کچھ کہتے کہتے رکا ''عبداللہ خاناں..... تم.....'' میں نے نظروں نظروں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ تبھی نواب تیمور اپنے خاص محافظوں کے ساتھ اپنی بندوق اٹھائے غصے میں گرجتا برستا وہاں آن پہنچا۔ اُس کے پیچھے شہریار بھی دوڑا چلا آیا۔

''کس کی موت آئی ہے کہ اس نے نواب تیمور کی جاگیر کی سرحد پار کرنے کی کوشش کی ہے..... کہاں ہے وہ۔ میں اسے اپنے شکاری کتوں کے سامنے ڈلوا دوں گا..... ابھی..... اور تم سب حرام خوروں کی کھال نہ کھنچوائی تو میرا نام نواب تیمور نہیں..... یہ حفاظت ہے تمہاری..... یہ پہرہ دیتے ہو تم لوگ؟'' نواب کے ہونٹوں سے غصے کے مارے کف بہہ رہا تھا اور اس کا چہرہ طیش اور غضب سے لال بھبھوکا تھا۔ وہ بخت خان کو مارنے کے لئے اس کی طرف بڑھا۔ تبھی بخت خان نے اچانک پلٹ کر مجھے جھپٹ لیا اور اپنا خنجر میرے شہ رگ پر رکھ کر غرا کر بولا:

''خبردار..... اگر کوئی آگے آیا تو ہم اس کا گلہ کاٹ دے گا.....'' نواب ٹھٹک کر رک گیا۔ سارے محافظ بھی

گھبرا کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

نواب غصے سے چلایا ''تم نے اگر میرے مہمان کے جسم پر ایک خراش بھی ڈالی تو میں تمہارے اتنے ٹکڑے کرواؤں گا کہ تمہاری پہچان مشکل ہو جائے گی.....'' ماحول پر شدید تناؤ طاری ہو چکا تھا۔ میں اگر بخت خان کے سامنے نہ ہوتا محافظ اپنی ساری گولیاں بخت خان کے جسم کے پار کر چکے ہوتے۔ میں نے نواب سے کہا ''اس کی دشمنی مجھ سے ہے نواب صاحب..... یہ مجھے مارنے کے لئے ہی یہاں آیا ہے..... میں اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں..... آپ لوگ کچھ دیر کے لئے ہمیں تنہا چھوڑ دیں.....'' نواب نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ..... ایک ڈاکو لٹیرا آپ کی شہہ رگ پہ خنجر رکھے کھڑا ہے اور آپ ہمیں یہاں سے جانے کا کہہ رہے ہیں۔ یہ موقع پاتے ہی اپنا وار کر جائے گا..... میں اسے یہ موقع کبھی نہیں دوں گا.....'' میں نے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ دونوں صورتوں میں اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا۔ پلک جھپکتے میں یہ دھار میرے نرخرے کے پار ہو سکتی ہے، لیکن اگر میں بات کروں تو شاید اسے میری وضاحت سمجھ میں آجائے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں..... اپنے محافظوں کو لے کر چلے جائیں یہاں سے..... ویسے بھی اب یہ بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتا۔ باہر تو آپ سب کا پہرا لگا رہے گا.....'' شہریار پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ نواب کچھ دیر تک کھڑا غصے اور بے بسی سے تلملاتا رہا۔ پھر بادل نخواستہ اس نے اپنے عملے کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور پھر خود بھی شہریار سمیت بھاری دل اور تھکے قدموں کے ساتھ وہاں سے پلٹ گیا۔

بخت خان نے ان کے اوجھل ہوتے ہی اپنا ہاتھ میری گردن سے ہٹا کر مجھے گلے لگانا چاہا، مگر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے اُسی ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑ کر خنجر کو اس کی جگہ پر قائم رکھا۔ جس ہاتھ سے میں نے پہلے بظاہر اپنے بچاؤ کے لئے بخت خان کا ہاتھ روک رکھا تھا۔ میری آواز بہت دھیمی اور سرگوشی نما تھی۔

''اپنا ہاتھ ابھی مت ہٹانا بخت خان اور مجھے دھکیلتے ہوئے سامنے کمرے میں لے جاؤ۔'' بخت خان سمجھ گیا کہ میں یہ احتیاط کس لئے کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہاں سے جانے کے باوجود کوئی میری حفاظت کی خاطر ہی سہی..... پر ہماری نگرانی کر رہا ہو۔ بخت خان نے میری ہدایت پر عمل کیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے میرے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

''کیا کرتا ہے مڑاں عبداللہ خاناں..... ابھی ایک منٹ اور روشنی نہیں جلتا تو ہمارا خنجر..... خدانخواستہ..... مگر شاباش ہے تم کو..... تم نے بھی جوان کے بچہ کی طرح ہم کو زبردست قابو کیا..... بھاگنے نہیں دیا ہم کو.....'' ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔

بخت خان نے مجھے بتایا کہ دو دن پہلے مختلف بستیوں اور سواریاں بدل بدل کر نواب پور پہنچ گیا تھا اور دو روز سے نواب کے محل کے ارد گرد پھر کر علاقے کی ٹوہ بھی لیتا رہا اور میرا انتظار بھی کرتا رہا تھا مگر جب تیسری رات بھی میں وہاں نہیں پہنچا تو بخت خان نے محل کی دیوار عقب سے ٹاپنے کا ارادہ کر لیا۔ اس میں بہت خطرہ تھا مگر بخت خان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح نواب یا اس کے کسی اپنے کی خواب گاہ تک پہنچ کر وہ اس کی شہہ رگ پر یہ قضا کا خنجر رکھ دے گا اور اس کی جاں بخشی کے بدلے وہ مہرو کا پتہ پوچھ کر ہی دم لے گا پھر

چاہے بدلے میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

مگر اس سے چوک ہوگئی اور وہ اپنے اندازے کے برعکس غلط جگہ سے محل میں کود گیا۔ محافظوں کو خبر ہوگئی اور وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ شور مچ گیا اور بخت خان محل کے رہائشی حصے کے بجائے اس مہمان خانے کی طرف آنکلا اور یہاں اس کی مجھ سے ہی مڈبھیڑ ہوگئی۔ بخت خان نے آس پاس کمرے کو حیرت سے دیکھا اور میری سیاہ چادر ایک جانب پڑی دیکھ کر بولا:

''کمال ہے یارا..... ہم تم کو باہر ڈھونڈ رہا تھا..... اور تم اس نواب کے گھر میزمانی کر رہا ہے..... یہ چکر کیا ہے خاناں.....''

میں نے مختصر لفظوں میں بخت خان کو اپنی روئیداد سنائی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ بخت خان کو وہاں سے کیسے نکالا جائے۔ میں نے بخت خان سے کہا کہ وہ اپنا خنجر اور ریوالور میرے حوالے کردے اور میرے ساتھ باہر چلے۔ ہم دونوں آگے پیچھے محل کی اینکسی کی سیڑھیاں اتر کر پیچھے ملحقہ بڑے ہال میں آئے تو وہ سب ابھی وہیں جمع تھے۔ نواب اور شہریار تیزی سے میری طرف لپکے، محافظوں نے بخت خان پر بندوقیں سیدھی کرلیں۔ شہریار نے جلدی سے مجھ سے پوچھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ناں..... اس شخص نے آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا.....''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ آپ محافظوں کو یہاں سے جانے کا کہہ دیں نواب صاحب..... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے.....'' نواب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر بخت خان کا خنجر اور پستول دونوں نواب کے قدموں میں ڈال دیئے۔ بخت خان سر جھکائے کھڑا رہا۔ نواب حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

''مگر یہ تو..... یہ آپ کی جان لینے کے درپے تھا.....''

''یہ اب نہتا ہے نواب صاحب..... میری درخواست ہے کہ آپ یہ پہرہ ہٹا دیں.....'' نواب نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور اپنے گارڈز کو وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں ہم صرف چار شخص اس ہال میں باقی رہ گئے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور نواب کی طرف دیکھا ''میں نے اپنے مجرم کو معاف کردیا ہے نواب صاحب..... ہوسکے تو آپ بھی اسے معاف کردیں.....'' نواب یہ سن کر اُچھل پڑا۔

''کیا..... مگر..... یہ..... اس نے نواب تیمور کے گھر کی سرحد پار کی ہے۔ وہ سرحد جو آج تک کسی دشمن تو کیا کسی دوست اور اپنے نے بھی بنا میری اجازت پار کرنے کی جرأت نہیں کی..... بڑے بڑے سورماؤں کے پر جل جاتے ہیں اس محل کی دہلیز پار کرنے کا سوچ کر..... یہ سوچ بھی کسی کے لئے محال ہے۔ مگر آفرین ہے اس شخص پر کہ اس نے یہ حد بھی پار کرلی..... یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں..... اور میں اتنے خطرناک دشمن کو ایسے جانے نہیں دوں گا..... اس نے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے..... کل کلاں یہ اپنے جیسے دو چار اور ڈکیت لے کر میرے گھر میں آگھسا تو میں کیا کروں گا.....؟'' نواب کا ہر خدشہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور نپا تلا تھا۔

''آپ کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہے..... یہ کوئی عام انسان نہیں ہے۔ جان پر کھیل جانے والا دشمن ہے۔ ایسے انسان کو مارنے سے بہتر ہے کہ اسے زندہ رکھا جائے، ہوسکتا ہے وہ آپ کے کسی کام آجائے۔ بہادر اور وفادار غلام کی کسے ضرورت نہیں ہوتی، لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی کام کا بندہ نہیں ملتا کسی کو۔ آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔

تب تک چاہیں تو اسے یہیں کسی پرانے زندان یا قید خانے میں ڈلوا دیں..... قانون کے حوالے کریں گے تو بھی محل کی بدنامی ہوگی..... اسے اپنا قیدی بنا کر رکھیں اور پھر آرام سے دو چار روز سوچنے کے بعد اس کی تقدیر کا فیصلہ کیجئے گا....."

نواب کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے اپنے کسی خادم خاص کو آواز دی۔ وہ دوڑتا ہوا اندر آیا۔ نواب تیمور نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ کچھ ہی دیر میں چار پانچ محافظ آئے اور بخت خان کو دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ نواب نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"اب آپ بھی آرام کریں، رات بہت ہوگئی ہے..... ہم صبح اس مسئلے پر بات کریں گے....." میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا مگر میں نے یہ محسوس کر لیا کہ اب میری خواب گاہ کے گرد بھی پہرہ لگا دیا گیا ہے اب جانے یہ پہرہ میری حفاظت کے لئے تھا یا میری نگرانی کے لئے۔ صبح میرا ناشتہ مجھے میرے کمرے میں ہی پہنچا دیا گیا اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی ملا کہ نواب صاحب کسی ضروری کام سے جاگیر سے باہر گئے ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ ان کی واپسی تک میں یہیں قیام کروں۔ گویا میرا اندیشہ درست تھا۔

نواب کو مجھ پر بھی شک ہو گیا تھا اور اب وہ اپنا شک دور کیے بنا ہمیں وہاں سے جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ دن بھر شہریار میرے ساتھ اپنی تصویروں اور اپنے خوابوں کی باتیں کرتا رہا۔ اسے بس اس بات کی خوشی تھی کہ میں ابھی مزید کچھ روز کے لئے وہیں رکا ہوا تھا۔ میں نے شہریار سے بخت خان کے بارے میں پوچھا مگر وہ لاعلم تھا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا، ہوسکتا ہے نواب نے بخت خان کو بھی اسی تہہ خانے یا زندان میں قید کیا ہو جہاں کبھی مہرو قید تھی۔ اور کون جانے مہرو اب بھی انہی غلام گردشوں میں کہیں قید ہو اور بخت خان سے اس کی ملاقات ہو جائے۔

میں نے شہریار سے غیر محسوس طور پر یہ بات اچھی طرح کنفرم کر رکھی تھی کہ اس وقت گھر میں شہریار، اُس کی ماں اور نواب تیمور کے علاوہ گھر کا کوئی چوتھا فرد کم از کم زنان خانے میں موجود نہیں تھا۔ وہ دن بھی گزر گیا مگر نواب نے میری خبر نہیں لی۔ رات میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا تھا کہ بخت خان کو یہاں سے نکالنے کی کیا ترکیب کی جائے کہ اچانک باہر کوئی کھٹکا سا ہوا۔ میری ساری حسیات پل بھر میں جاگ گئیں۔ پھر کسی نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔ آنے والی کوئی بوڑھی خادمہ تھی۔ جس کی بات سن کر میرا سر چکرا گیا۔

"نواب خاتون کہتی ہیں کہ اس وقت نواب صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ آپ کو میں پچھلی طرف ایک خفیہ راستے سے محل سے نکالنے کے لئے آئی ہوں..... جلدی کیجئے..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... شاید آپ نہیں جانتے..... آپ کو یہاں قید کر لیا گیا ہے....." میں نے فوراً خادمہ سے پوچھا۔

"میرے علاوہ بھی تو یہاں ایک اور قیدی ہے۔ کیا آپ کو اس کا کچھ پتہ ہے۔" خادمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"محل کے کچھ حصے ایسے ہیں جہاں دن میں بھی کسی نوکر یا خادمہ کو جانے کی اجازت نہیں..... آپ بس نکلنے کی کریں..... پہرے میں یہ وقفہ بڑی مصیبت اور مشکل سے لایا گیا ہے۔ آپ کی جان کو یہاں خطرہ ہے....."

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ جا کر نواب خاتون سے میری طرف سے بہت شکریہ کہیے گا مگر میں یہاں سے نواب تیمور کی اجازت کے بنا کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور اگر میری جان جانا یہیں طے ہے تو میں اس سے بھاگ نہیں سکتا....." خادمہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ گویا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

اگلے دن ٹھیک وقت پر ناشتہ میرے کمرے میں پہنچا دیا گیا مگر مجھے بخت خان کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ نواب تیمور کے ظلم کے قصے مجھے کمال صاحب سنا چکے تھے۔ اور جانے کمال صاحب کو میری اتنی لمبی غیر حاضری کی کیا توجیہہ دی گئی ہوگی۔ وہ بھی ضرور میرے لئے پریشان ہوتے ہوں گے۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہونے کو آئی۔ میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تبھی مہمان خانے کے باہر کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی اور کچھ ہی دیر میں نواب کا مینیجر اصغر میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ کو بارہ دری کی جانب یاد کیا ہے نواب صاحب نے.....'' میں چپ چاپ اصغر کے پیچھے چل پڑا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میری اور نواب تیمور کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ نواب اپنی مخصوص جگہ کسی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مینیجر مجھے وہاں پہنچا کر پلٹ گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ نواب کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ میں ابھی تک وہیں کھڑا ہوں تو وہ گڑبڑا کر بولا۔

''تشریف رکھیے.....آپ بیٹھتے کیوں نہیں.....؟'' میں نے کھڑے کھڑے یہ جواب دیا۔

''قیدی کو بیٹھنے کے لئے کرسی پیش نہیں کی جاتی۔ بیڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔ ہتھکڑیاں ڈالی جاتی ہیں..... مجھے بھی اپنے قفس کا انتظار ہے.....''

نواب نے غور سے میری طرف دیکھا اور اُٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔'' کیسے قیدی ہیں آپ..... جسے رہائی کی پیشکش ہوتی ہے تو وہ قفس توڑ کر باہر نکلنے سے انکار کر دیتا ہے ''میں نے چونک کر نواب کی طرف دیکھا۔

''تو کیا رات آپ نے.....؟''

''ہاں..... اس خادمہ کو میں نے ہی بھیجا تھا کہ وہ آپ کو یہاں سے فرار کی ترغیب دے..... لیکن آپ کے پاس میرے لئے ایک اور حیرت کدہ موجود تھا۔ کل سے لگاتار سوچ رہا ہوں کہ آخر آپ ہیں کون؟ جس نے چار دن میں میرے بیٹے کی کایا پلٹ دی..... وہ ایک نیا انسان ہے۔ کل رات اس نے مجھ سے اور اپنی ماں سے اپنے گزشتہ رویئے کی معافی مانگی بلکہ آج سے اس نے ہمیں پورا وقت دینا شروع کر دیا ہے۔ آخر آپ نے اس سے ایسا کیا کہا ہے۔ سنا ہے کل وہ سارا دن آپ کے ساتھ ہی تھا.....؟''

''میں نے ایسا کچھ کمال نہیں کیا۔ بس صرف اُسے اتنا یقین دلایا ہے کہ اسے کوئی ذہنی عارضہ لاحق نہیں ہے، اس لئے اسے آپ لوگوں یا باقی سب سے چھپنے یا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں نواب صاحب اس دنیا میں آدھے سے زیادہ دیوانے صرف اس لئے دیوانے ہیں کیونکہ لوگ انہیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔ ورنہ کون جانے فرزانگی کے کس درجے پر فائز ملیں وہ آپ کو اگلے کسی جہاں میں..... آپ کا بیٹا بھی ایک کلاکار ہے..... آرٹسٹ ہے۔ آگے چل کر وہ آپ کی طرح ایک سخت گیر نواب یا کوئی اکھڑ جاگیردار تو شاید کبھی نہ بن پائے..... مگر ایک بات کا یقین رکھیے..... وہ ایک بہت اچھا انسان ضرور ثابت ہوگا..... اس معاشرے کا ایک مفید فرد..... اس لیے آپ کو اسے اپنے نوابی کے چشمے سے دیکھنے کی عادت کو ترک کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ اب آپ کو کرنا ہے کہ آپ کو اپنا وارث ایک بڑا نواب جاگیردار چاہیے..... یا آپ کا شہریار..... جو دل کا نواب ہے..... اپنے من کا شہزادہ.....''

میں خاموش ہوا تو نواب بھی بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھائیں تو ان سے کئی سوال جھلک رہے تھے'' آپ جانتے ہیں کل رات اگر آپ اس خادمہ کی بات مان کر کسی چور دروازے سے اس محل سے نکل

جاتے تو میں آپ کو جانے دیتا، لیکن اس دوسرے شخص کو ضرور قتل کروا دیتا۔ جس کی جان بخشی کی درخواست آپ نے کی تھی۔ آپ دونوں کے درمیان کچھ تو مشترک ضرور ہے، مگر یہ کیا بہروپ ہے..... میں سمجھ نہیں پایا..... آپ ہی اپنی حقیقت بتا دیجئے مجھے....."

میں نے ایک گہری سانس لی "آپ نے ٹھیک پہچانا..... ہم دونوں ہی بہروپیے ہیں..... جو روپ بدل کر آگے پیچھے آپ کے اس محل میں آئے تھے۔ مقصد البتہ ہم دونوں کا ایک ہی تھا....." نواب نے بے چینی سے سر ہلایا۔

"میں بھی پچھلے تین دن سے خود کو یہی تسلی دے کر بہلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آپ کوئی بہروپیے ہیں جو اپنی کسی غرض سے اس محل میں آئے ہیں۔ مگر آج شام میرا یہ بہلاوہ اور یہ بھرم بھی پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔ میں نے اس محل کی تاریخ اور اس کی تعمیر سے لے کر آج تک کے تمام مکینوں کی تفصیلات بھی نکلوالی ہیں باوثوق ذرائع اور تاریخ دانوں سے..... میرے دادا کو یہ محل ریاست کی طرف سے ایک فتح کے عوض تحفے کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ مختلف رئیس امراء کے زیر استعمال رہا ہے۔ انہی میں سے ایک وہ ہندو خاتون بھی ہے جس کی تفصیلات آپ نے مجھے اس دن بتائیں تھیں۔ اسی ہریش چند نے یہ محل اپنی لاڈلی بیٹی یملا کی محبت میں بنایا تھا کیونکہ اسے یہاں سے بالکونی میں کھڑے رہ کر دور بہتی نہر اور جنگل کا نظارہ بہت پسند تھا۔ اس کا محبوب منگیتر کسی جنگ میں مارا گیا اور پھر اسے کچھ سال کے بعد اس کی مرضی کے بنا مجبوراً کسی اور جاگیردار کے بیٹے کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ آپ نے جو کچھ اس خاندان کے بارے میں بتایا تھا، حرف بہ حرف وہ سب ویسا ہی سچ ثابت ہوا۔ اور آج میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ شہریار کے کمرے میں اس کی غیر موجودگی میں جا کر اس کی وہ بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں تو وہ انہی لمحوں کو پینٹ کرتا نظر آیا جو کبھی اس محل کا کربناک ماضی تھا۔ میں بہت الجھ کر رہ گیا ہوں..... یہ سب کیا ہے....."

"بات بہت لمبی ہے نواب صاحب..... بس اتنا جان لیجئے کہ آپ کے بیٹے کو قدرت نے سوچ، تخیل اور بصارت اوروں سے بڑھ کر دی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے یملا کی یہ کہانی آپ سے بھی پہلے بچپن میں محل کے کسی بزرگ نوکر یا نوکرانی سے سن رکھی ہو اور وہ اس کے لاشعور میں ایسی اٹکی ہو کہ اب وہ ان سب تخیلات کو اپنی تصویروں میں اتار کر سکون محسوس کرتا ہو..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعی اسے یہ سب کچھ کسی خاص لمحے میں دکھائی دیتا ہو۔ عام انسان اپنی ظاہری آنکھ سے جو دیکھتا ہے صرف اسی پر یقین کر بیٹھتا ہے۔ ہوسکتا ہے قدرت نے شہریار کی باطنی آنکھ کا پردہ بھی ہٹا دیا ہو۔ یہ کوئی انہونی نہیں ہے..... میں تو کیونکہ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا بیٹا نیک اور اتنا حساس ہے....." نواب کے چہرے پر چھایا تناؤ کم ہونے لگا۔

"اگر ایسا ہی ہے تو پھر میں آپ کا مقروض ہوں۔ ایک بیٹے کو اس کے ماں باپ سے ملانے کے عوض میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ وہ کیا غرض ہے جس کے لئے آپ اور وہ شخص یہاں آئے تھے..... ظاہر ہے سونا چاندی، ہیرے موتی یا زر جواہر تو آپ کا مقصد ہو نہیں سکتے کیونکہ آپ واقعی ایک جوگی فقیر ہیں..... پھر کیا چاہیے آپ کو مجھ سے..... آپ صرف نام لیں، میں پیش کر دوں گا چاہے دنیا کی کتنی ہی بڑی نعمت کیوں نہ ہو....." میں نے غور سے نواب کی طرف دیکھا۔

"مجھے رحیم گڑھ کی مہر و واپس کر دیں..... وہی مہر و جسے آپ چندا کے ٹھکانے سے اک روز خرید کر لائے تھے....." نواب نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

باب 22

میری زبان سے مہرو کا نام سن کر نواب یوں اُچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو.....

''آپ.....؟ آپ مہرو کو کیسے جانتے ہیں.....اور کیا تعلق ہے آپ کا مہرو سے؟''

''کچھ رشتوں کا نام یا تعارف نہیں ہوتا نواب صاحب.....بس یوں سمجھیے کہ اُس کے بوڑھے مرحوم باپ سے کسی نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن اس کی لاڈلی بیٹی کو ڈھونڈ نکال کر اس کی ماں سے ملوا دیں گے۔ وہ وعدہ منتقل ہوتے ہوتے میرے پیروں کی زنجیر بن گیا ہے۔ میں اور میرا وہ ساتھی جو اس وقت آپ کی قید میں ہے، ہم دونوں ہی مہرو کی تلاش میں یہاں تک پہنچے ہیں کیونکہ اس کا آخری نشان آپ کے اس محل تک آتا ہے.....اگر وہ آپ کے نکاح میں ہے تو آپ بھی اسے اس کی ماں سے ملانے ہمارے ساتھ چلیے.....اور اگر وہ آپ کی قید میں ہے تو اُسے ہمارے حوالے کر دیجیے..... کیونکہ اسے لیے بنا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے..... ہاں البتہ ہماری جان لینا آپ کے اختیار میں ہے.....صرف یہی ایک تیسری صورت ہے اس مسئلے کی آپ کے پاس۔''

میری بات ختم ہونے تک نواب کا جسم باقاعدہ لرزنے لگا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گا۔ وہ خود کو سنبھالنے کی خاطر بیٹھ گیا۔ ''مجھ سے بڑا گناہ ہو گیا..... کاش..... کاش..... یہ نہ ہوتا..... وہ آخر تک مجھ سے یہی کہتی رہی.....مگر.....مگر شاید میری عقل پر ہی پردہ پڑ گیا تھا.....'' میرا دم اٹکنے لگا۔

''کہیں نواب نے مہرو کو مار کر اسی محل کے کسی کونے میں دفنا تو نہیں دیا۔ میں نے خود پر قابو رکھنے کی کوشش کی مگر میری آواز پھر بھی کانپ رہی تھی۔ مہرو زندہ تو ہے ناں..... خدا کا واسطہ یہ نہ کہیے گا کہ آپ نے اُسے بھی.....'' نواب تلملایا۔

''مہرو اب یہاں نہیں ہے..... میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکل کر کسی اپنے کے پاس پہنچ گئی ہوگی۔ لیکن آج پتہ چلا کہ وہ تو کہیں کھو گئی ہے.....لیکن اگر وہ اپنے گھر میں نہیں گئی تو پھر گئی کہاں.....؟'' میں نے ایک بار پھر خود کو کسی تپتے صحرا کے درمیان کھڑا پایا۔ اور تھک کر وہیں بیٹھ گیا۔ نواب نے مجھے بتایا کہ مہرو چندا کے پاس قریباً تین ماہ تک اس کی امانت کے طور پر رہی۔ اور وہ ہر طرح سے اسے منانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اس سے نکاح کر لے مگر مہرو کا بس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کی امانت ہے اور اس امانت میں خیانت سے پہلے وہ زہر کھا کر مر جانا پسند کرے گی۔ نواب نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی اتنا عرصہ گھر سے باہر رہنے والی لڑکی کو یہ معاشرہ تو کیا، اس لڑکی کے اپنے بھی کسی صورت قبول نہیں کرتے لیکن مہرو کا اپنے محبوب پر یقین اتنا اٹل تھا کہ کبھی کبھی تو

نواب کا اپنا دل بھی دہل جاتا تھا کہ کہیں اس گہری سرمئی آنکھوں والی لڑکی کی بات سچ ہی نہ ہو اور کسی دن اُس کا رانجھا اپنی ہیر اپنی مہرو کو ڈھونڈتے ہوئے چندا کے ٹھکانے تک نہ آن پہنچے۔ لہٰذا اس نے چندا کی مدد سے ایک منصوبہ بنایا اور مہرو کو کسی طرح یہ آسرا دلایا کہ اگر مہرو نواب کے ساتھ اس کے گھر چلی جائے تو نواب تیمور مہرو کے گھر والوں کی خبر لینے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہاں مہرو کے لئے سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا مہرو نے سوچ رکھا ہے تو نواب مہرو کے گھر والوں کو خود اپنے محل میں بلوا کر مہرو کو ان کے حوالے کر دے گا۔

کسی بازار یا بدنام اڈے سے برآمد ہونے سے تو کہیں بہتر تھا کہ مہرو کسی عزت دار کے گھر سے اپنوں کو ملتی۔ مہرو آخر اس بات پر آمادہ ہوگئی اور نواب کے ساتھ نواب پور آ گئی۔ چند دن تک نواب نے اسے اپنے کسی دوست واقف کار کے پاس ٹھہرائے رکھا جہاں مہرو کی باقاعدہ نگرانی کی جاتی تھی۔ اور پھر نواب کوئی کہانی بنا کر مہرو کو اپنے محل میں لے آیا۔ نواب خاتون اپنے شوہر کی عیاشی سے اچھی طرح واقف تھی مگر وہ مجبور تھی کیونکہ مہرو کو محل میں بھی ایک الگ تھلگ مہمان خانے کے ویران حصے میں رکھا گیا تھا۔

مگر اس کا ماتھا تب ٹھنکا جب اس کے شوہر نواب تیمور نے دوسرے نکاح کی بات چھیڑی۔ وہاں نواب نے مہرو کا حوصلہ توڑنے کے لئے اسے اس کے باپ کے ہاتھوں کسی کے قتل اور باپ کی گرفتاری کی اطلاع پہنچا دی جو اس کے ہرکارے رحیم گڑھ سے لائے تھے جنہیں نواب نے مہرو کے گاؤں مہرو کے خاندان کی خبر لینے بھیجا تھا۔ اس وقت تک احمد بھی دیوانہ وار مہرو کی تلاش میں دور دراز علاقوں میں بھٹک رہا تھا۔ اور نواب کو ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ ٹھیک نشان نہ پکڑ لے۔ باپ کی گرفتاری اور ماں کے پاگل پن کی خبر مہرو پر بجلی بن کر گری اور وہ یوں بستر پر جا پڑی کہ پھر ہفتوں شدید بخار میں تپتی رہی۔ نواب بیگم کو حویلی کی اس خادمہ سے یہ خبریں ملتی رہتی تھیں جسے نواب نے مہرو کی خاص خدمت اور رکھوالی پر رکھا تھا۔ یہ وہی خادمہ تھی جو اس روز مجھے محل سے بھاگ جانے کی ترغیب دینے آئی تھی۔

مہرو کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی لہٰذا مجبوراً خادمہ کے مشورے پر نواب تیمور نے اپنی بیگم کو مہرو کے علاج اور تسلی پر معمور کر دیا۔ وہاں نواب خاتون نے مہرو کی حالت دیکھی تو وہ گھبرا گئی۔ اُسے ایک طرف سے معصوم اور من موہنی سی لڑکی پر ترس آتا جو اس کے شوہر کے چنگل میں پھنس کر رہ گئی تھی، تو دوسری طرف اُسے مہرو کے علاج کے دوران یہ سوچ سوچ کر غصہ بھی آتا رہتا کہ کل کلاں کو یہی لڑکی صحت یاب ہو کر اس کی سوکن بن جائے گی لہٰذا وہ لگاتار اپنے شوہر کی منت کرتی رہتی کہ وہ اس لڑکی کو آزاد کر دے کیونکہ اس کی روح کسی اور کے "قبضۂ محبت" میں ہے اور وہ اپنے جسم پر کسی کے تصرف سے پہلے ہی خود کو مار ڈالے گی۔ اس لیے یہ کوشش فضول ہے مگر نواب کی "نوابی ہٹ" بھی یہ فیصلہ اور ضد کیے بیٹھی تھی کہ اب تو وہ مہرو سے ہی دوسرا نکاح کرے گا۔ شاید اسے اس کیس میں مزہ بھی آنے لگا تھا کہ کسی کی مرضی سے اُسے "مائل بہ محبت" کرنے کو ہی تو اصل مردانگی سمجھا جاتا ہے۔

آخر کار نواب بیگم کی لگاتار توجہ اور وید طبیبوں کے بہترین علاج کی بدولت تیسرے ماہ سے مہرو کی حالت سنبھلنے لگی مگر اب اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ اس نے کسی سے بھی بول چال تقریباً بند کر دی تھی اور سارا دن اُداس اپنے کمرے کی بالکنی میں کھڑی کسی کا انتظار کرتی رہتی۔ اور پھر ایک دن نواب کو کسی ضروری نجی کام سے کسی دوسرے شہر جانا پڑا جہاں سے واپسی میں اسے تین چار دن لگ گئے۔ آتے ہوئے وہ مہرو کے لئے بہت سے قیمتی تحائف اور

سونے کے زیورات بھی اٹھالایا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ کسی بھی طرح وہ مہرو کو منا کر اگلے ہفتے ہی اس سے نکاح کرلے گا۔ مگر محل میں داخل ہوتے ہی اس کے سر پر آسمان گر پڑا جب اُسے یہ بتایا گیا کہ مہرو اسی رات سے محل سے غائب ہے جس دن نواب شہر سے باہر گیا تھا۔

نواب کی دُنیا اندھیر ہوگئی اور وہ نواب بیگم پر برس پڑا کہ اس کی مرضی کے بغیر وہ لڑکی اس محل سے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ مگر نواب بیگم نے اپنے سہاگ کی قسم اٹھائی کہ یہ سچ ہے کہ وہ نواب اور مہرو کے ہونے والے نکاح کے سخت خلاف تھی اور خلاف ہے کیونکہ وہ کسی کو بھی اپنی سوکن کا درجہ نہیں دے سکتی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مہرو کی گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور یہ کہ اگر نواب کو بیوی کی اتنی بڑی قسم پر بھی یقین نہیں ہے تو وہ یہی بات قرآن پر حلف لے کر بھی دہرا سکتی ہے۔

نواب کی دیوانگی عروج پر پہنچ چکی تھی اور اس نے آس پاس کا چپہ چپہ چھان مارا ہر طرف مہرو کی تلاش میں کھوجی دوڑائے گئے۔ مہرو کے گاؤں سے بھی پتہ کرایا گیا مگر مہرو کا گھر ویسے ہی ویران اور دروازے پر مہینوں پرانا زنگ لگا تالہ ہی پڑا تھا۔ نواب تیمور دن رات اپنا سر پیٹتا اور منہ نوچتا رہتا کہ اس کی سلطنت اور اس کی جاگیر سے عین اس کے ناک کے نیچے سے ایک سالم لڑکی کیسے نکل سکتی ہے مگر اس سوال کا جواب اسے آج تک نہیں ملا۔ بنا کسی ثبوت اور گواہ کے وہ اپنی بیوی کو بھی صرف شک کی بنیاد پر کوئی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ محل کے پہرے داروں اور متعلقہ نوکروں کی کھالیں کھنچوا کر انہیں زندانوں میں پھینک دیا گیا مگر ان میں سے بھی مہرو کی کوئی خبر نواب کو نہ مل سکی۔ اور مہرو پھر کبھی واپس نہیں آئی۔

ہزار طرح کی باتیں نواب کے ذہن میں آتیں کہ شاید مہرو دوبارہ اپنے بچے کھچے خاندان تک پہنچ گئی ہوگی اور انہوں نے زور آوروں کے خوف سے کسی دُور دراز علاقے میں اُسے منتقل کردیا ہوگا؟ یا شاید وہ راستے میں ہی کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہو اور اسے لاوارث سمجھ کر دفنا دیا گیا ہوگا؟ یا پھر وہ کسی بردہ فروش گروہ کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی جنہوں نے اسے کسی بازار میں فروخت کردیا ہو؟ مگر آس پاس کے تمام شہروں میں اس کے کارندے ایسے بازاروں اور ٹھکانوں پر بھی مہرو کو ڈھونڈ چکے تھے۔ نواب نے چندہ کی حویلی کی خبریں خفیہ طریقے سے جمع کر رکھی تھیں۔ مہرو وہاں بھی نہیں پہنچائی گئی تھی۔ غرض ایک معمہ تھا جو کبھی حل نہیں ہوا اور ایک الجھی گرہ تھی جو کبھی سلجھ نہیں پائی۔ اور نواب اپنے رستے زخم چاٹتا ہی رہ گیا۔ وہی زخم جو آج میں نے مہرو کے بارے میں سوال کر کے دوبارہ ادھیڑ ڈالے تھے۔ نواب کا شک اب بھی کبھی نواب بیگم پر ہی چلا جاتا تھا مگر بات پھر گواہ اور ثبوت کے ترازو پر آ کر رُک جاتی تھی۔

مہرو کی خدمت پر معمور بوڑھی خادمہ نواب کی برسوں کی آزمائی ہوئی وفادار تھی۔ نواب نے اس پر بھی سختی کی انتہا کردی مگر آخر کار اس کے خلاف بھی کچھ ثابت نہ ہوسکا۔ وہ آخری رات تک نواب کی ہدایت کے مطابق مہرو کو دوا دے کر اور کھانے کھلانے کے بعد اپنے ملحقہ چھوٹے برآمدے والے کمرے میں آ کر سوگئی تھی۔

گیٹ پر دربان اور محافظ رات بھر موجود بیٹھے رہے تھے اور کسی کی کوئی غفلت ثابت نہیں ہوسکی تھی۔ نواب تیمور نے ہر ہر طرح سے اپنی تسلی کرلی تھی۔ نوکروں کی طرف سے کوئی کوتاہی سامنے نہیں آئی تھی۔ نواب اپنی بات ختم کر کے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات ڈھل چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں صبح کے آثار نمودار ہونے کو تھے۔ کہیں دور سے فجر

کی اذانوں کی آواز آ رہی تھی۔ نواب کو اچانک میری بے آرامی کا خیال آیا۔

''معاف کیجئے گا..... اپنا دکھ سناتے سناتے مجھے وقت کا دھیان ہی نہیں رہا۔ آپ اب آرام کریں، آپ کا ساتھی بھی کچھ دیر بعد رہا ہو کر آپ سے آن ملے گا۔ آپ کو اگر میری کسی بات پر ابھی تک شبہ ہو تو آپ اسی وقت سارے محل کی تلاشی لے سکتے ہیں..... شاید آپ کو ہی مہرو کا کچھ سراغ مل جائے.....''

''نہیں..... مجھے آپ کی ہر بات پر پورا یقین ہے..... اور کبھی کبھی ہم باہر سارے زمانے کی تلاشی لے لیتے ہیں اپنی کسی عزیز شے کے گم ہونے پر..... بس اپنے دل کی تلاشی نہیں لیتے..... جو باہر کھو جائیں..... کبھی کبھی وہ دل میں چھپے ملتے ہیں۔'' نواب نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک کہتے ہیں آپ..... بس دل کو کھنگالنا باقی رہ گیا ہے۔''

جاتے جاتے میرے ذہن میں ایک خیال آیا ''نواب صاحب..... کیا آپ مجھے وہ کمرہ دکھا سکتے ہیں جہاں مہرو کو قید رکھا گیا تھا.....'' نواب نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ ''قید'' کا لفظ شاید انہیں گراں گزرا مگر قیدی کو قید میں نہ کہتا تو کیا کہتا.....؟'' نواب نے کسی خادم کو آواز دی اور اسے کچھ ہدایات دے کر میرے ساتھ روانہ کر دیا۔ ملازم مختلف راہداریوں اور خاموش راستوں سے لے کر مجھے محل کے ایک الگ تھلگ گوشے کی دوسری منزل پر لے گیا اور ایک لمبی اندھیری راہداری کے آخری سرے پر واقع ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے خود وہیں سیڑھیوں کے قریب جما کھڑا رہا۔

''وہ والا کمرہ ہے..... آپ دیکھ آئیں..... میں یہیں آپ کا انتظار کروں گا.....'' میں دھیرے دھیرے چھوٹے قدموں سے اس کمرے کی طرف بڑھا تو میرے دل اور دماغ میں ایک عجیب شور سا مچا ہوا تھا۔ پتہ نہیں قدرت نے کس مصلحت کے تحت مجھے اس انجان لڑکی کی کھوج پر معمور کر دیا تھا۔ جس کی صورت تو کیا، کبھی تصویر تک نہیں دیکھی تھی میں نے، اور قدم قدم پر شکست ہی کھائی تھی اب تک اس کی تلاش میں، مجھے پھر سلطان بابا کی بات یاد آئی ''جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے.....''

میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بہت کشادہ اور آراستہ کمرہ تھا۔ ایک جانب پرانے طرز کی بڑی سنگھار میز اور اس میں جڑا قدِ آدم آئینہ..... لکڑی کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور اونچے ہوادار روشن دان..... ریشمی لہراتے پردے اور بڑی سی مسہری..... جس کے چاروں طرف جالی دار پردے ٹنگے ہوئے تھے۔ کمرے میں بستر کے بالکل سامنے والی دیوار میں بالکنی کی طرف کھلتی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ جہاں سے باہر دور تک پھیلے باغات اور ان سے پیچھے کہیں دور کسی جھیل یا ندی کا نظارہ صبح کی ہلکی ملائم روشنی میں بہت بھلا لگ رہا تھا۔ آسمان پر ابھی تک چند ستارے حیرت سے جگمگا رہے تھے جیسے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہوں کہ ہمارے باقی دوست تارے کہاں چھپ گئے؟ میں نے آسمان پر دیکھا..... اس میں میرے اور زہرہ کے نام کا ستارہ موجود نہیں تھا..... میرا من ایک پل میں ہی گہری اداسی سے بھر گیا۔ کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے کمرے کے در و دیوار سے مہرو کے رونے اور سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگی تو میں گھبرا کر بالکنی کے سامنے کھلتا بڑا سا شیشے کا دروازہ کھول کر بالکونی میں نکل آیا۔ باہر ہوا یخ تھی، میں نے چار پانچ لمبے اور گہرے سانس لیے میں دوبارہ اندر کی طرف پلٹنے لگا ہی تھا کہ اچانک میری نظر نیچے دور باغ میں کسی چیز پر پڑی۔ اور یکا یک میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہوئے..... میں نے پھر غور

سے اس طرف دیکھ کر تصدیق کی، ہاں..... یہ وہی جگہ تھی جہاں میں پہلے بھی ایک بار آ چکا تھا۔ میرے اندر بیک وقت کئی طوفانی جھکڑ چلنے لگے، میں تیزی سے پلٹا اور کمرے سے باہر نکلا۔ خادم ابھی تک وہیں باادب کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے شہریار کے کمرے کی طرف چلنے کا کہا تو وہ چونک گیا مگر نواب کی طرف سے شاید اسے یہی ہدایت تھی کہ میں جہاں بھی کہوں مجھے پہنچا دیا جائے۔ ہم دوبارہ محل کے مرکزی حصے تک آئے تو شہریار گھڑ سواری کے لئے نکل رہا تھا۔ ہمیں آتے دیکھ اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔

''ارے آپ..... اتنی صبح..... چلیں گے میرے ساتھ رائیڈنگ کے لئے..... پتہ ہے دو سال بعد میں اپنے پسندیدہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا ہوں.....''

''نہیں ..... میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔ تم رائیڈنگ کر کے آ جاؤ۔ تب تک میں تمہارے کمرے میں تمہاری پینٹنگز دیکھ لیتا ہوں.....'' شہریار خوش ہو گیا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں نے رات ہی اپنی ایک بہت خاص تصویر مکمل کی ہے۔ آپ جا کر دیکھیں، میں بس نہر تک ایک چکر لگا کر ابھی لوٹا.....'' شہریار نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور اس کے پیچھے اس کے ٹرینر کا گھوڑا بھی دھول اُڑاتا گم ہو گیا۔ میں خادم کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ شہریار کا کمرہ ویسے ہی بے ترتیب پڑا تھا۔ کینوس، رنگ، ادھوری مکمل تصویریں..... میں ایک ایک تصویر کو اُٹھا کر غور سے دیکھتا اور اس کی جزئیات پر غور کرتا رہا۔ شہریار واقعی ایک بہت اچھا مصور تھا، اور اس کی پینٹنگز بھی بالکل کسی آئینے کے فریم میں قید مختلف لمحوں جیسی تصویریں تھیں۔ اس نے زیادہ تر یملا دیوی کے تصور کے زاویئے سے کینوس پر رنگ بکھیرے تھے۔ کچھ ہی دیر میں چاروں طرف صبح کی روشنی پھیل گئی اور خادم نے مجھے بتایا کہ نواب تیمور اور شہریار بڑے ہال میں ناشتے کی میز پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے بخت خان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ نواب صاحب کے حکم پر اُسے مہمان خانے میں میرے ہی کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اسی کی خواہش پر اسے وہیں کمرے میں ناشتہ پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو آج باپ بیٹا بہت خوش اور آپس میں ماضی کی طرح بے تکلف باتیں کرتے دکھائی دیئے۔ شہریار نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

''کیسی لگی آپ کو میری نئی تصویر.....؟ ابا جان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری تصویروں کی بہت بڑی نمائش رکھیں گے.....؟ یہاں بھی اور باہر فارن میں بھی.....''

''اچھا..... یہ تو بہت اچھی بات ہے..... ویسے تمہارا کوئی استاد کوئی ٹیچر بھی ہے یا بس اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہی یہ سارا ہنر سیکھا ہے تم نے.....'' شہریار کے بجائے نواب تیمور نے جواب دیا۔

''بہت اچھے استاد بلکہ اتالیق رہے ہیں نواب شہریار کے..... اکبر صاحب..... میں تو اُنہیں ان کا استادِ معظم ہی کہتا ہوں اب بھی.....'' بچپن سے شہریار کی تربیت کا ذمہ انہی کے سر رہا ہے..... مگر ضعیف ہو گئے تھے اب وہ بہت..... تو انہی کے درخواست پر انہیں ریٹائر کر دیا میں نے..... ابھی چند ماہ پہلے ہی وہ یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔ یہیں محل کے پچھلے حصے میں ہی باقی مینیجرز اور اسٹاف وغیرہ کے کوارٹرز کے ساتھ ہی رہائش گاہ تھی ان کی بھی.....'' میں نے سر ہلایا اور شہریار کی تصویروں کی تعریف کی۔

''واقعی تمہاری تصویریں ایک سے بڑھ کر ایک اور کمال ہیں۔ ویسے اگر میں تمہاری تصویری نمائش کا کوئی نام تجویز کرسکتا تو میں اس کا نام ''انتظار'' تجویز کرتا۔ تمہاری ہر تصویر میں انتظار کی کیفیت اور اس کی شدت محسوس کی جاسکتی ہے۔'' نواب تیمور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''گویا آپ کو بھی مصوری سے کچھ شغف ہے..... نام تو وہی تجویز کرسکتا ہے جسے تصویر کے اندر اتر کر اس کی روح کو چھو لینے کا فن آتا ہو.....'' میں بدستور شہریار کی طرف دیکھتا رہا۔

''نہیں نواب صاحب..... اتنا ماہر نہیں ہوں میں..... بس اچھی تصویر کی تھوڑی بہت پہچان رکھتا ہوں۔ ویسے شہریار میں نے تمہاری تصویروں میں یملا کے مختلف پورٹریٹس آج بڑے غور سے دیکھے ہیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ ایک نہیں..... دو مختلف لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔ کچھ تصویروں میں یملا نے ماتھے پر ہندو سنگھار والی بندیا لگا رکھی ہے اور کچھ میں نہیں..... کہیں اُس کے بال بندیا سمیت خاص انداز میں بندھے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں بال کھلے ہیں..... اب تم بتاؤ کیا میرا اندازہ صحیح ہے کہ یہ یملا کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی ہے یا نہیں.....'' میری بات سن کر شہریار کچھ بوکھلا سا گیا اور ہڑبڑا کر بولا:

''نہیں نہیں..... وہ ایک ہی لڑکی کی تصویریں ہیں..... مختلف زاویئے سے..... شاید اسی لئے آپ کو فرق محسوس ہوا.....'' میں نے غور سے شہریار کو دیکھا۔

''تو پھر دونوں کے سنگھار میں اتنا فرق کیوں ہے شہریار۔ ہاں البتہ آنکھوں میں اُداسی کی اذیت ایک جیسی ہے.....؟'' نواب تیمور نے الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے یہ میری ضد سمجھ نہ آئی ہو۔ میں نے اب براہ راست شہریار سے سوال کردیا۔

''تمہیں پتہ ہے شہریار وہ دوسری لڑکی جس کی تصویر تم نے بنائی ہے اس کا نام مہرو ہے..... مہرو کہاں ہے شہریار؟'' میری بات گویا کسی دھماکے کی طرح ان دونوں کے سر پر پھٹی اور شہریار کے ہاتھ میں پکڑا کانٹا زمین پر گر گیا۔

✱.....✱.....✱

باب 23

کچھ دیر کے لئے ہال پہ سناٹا سا چھایا رہا۔ نواب تیمور کا سر چکرا گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ شہریار..... کو کیسے..... پتہ..... کہ مہرو.....؟ نہیں نہیں..... آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے غور سے شہریار کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میں یہی بات شہریار کی زبان سے سننا پسند کروں گا.....'' شہریار نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ ''آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا، یہ آپ کا وہم ہے.....''

''ہاں..... میرا وہم بھی ہوسکتا ہے مگر آج میں نواب صاحب کی اجازت سے اُس کمرے میں گیا تھا جہاں مہرو نے اس محل میں کچھ ہفتے گزارے تھے..... سب سے پہلے مجھے اس کمرے میں بسی خوشبو کچھ مانوس سی محسوس ہوئی۔ جیسے رنگوں کی مخصوص بُو میں کسی پرفیوم کی ملاوٹ کر دی جائے۔ یہ احساس صرف چند لمحوں کے لئے ہوا کیونکہ کمرہ بہت دنوں سے بند تھا اور جیسے ہی میں نے باہر بالکونی کا دروازہ کھولا، باہر باغ سے آتی ہوا اس خوشبو کو فوراً اُڑا کر لے گئی۔ اور جب میں نے بالکونی سے باہر جھانکا تو دُور باغ میں مجھے ایک گوشے میں رکھا تمہارا پرانا کینوس اسٹینڈ دکھائی دیا۔ جو اَب بارشوں اور موسم کی سختیوں سے بے رنگ، بدنما اور بے کار ہوگیا ہے باہر پڑے پڑے..... تبھی مجھے یہ احساس ہوا کہ تم نے یملا کی تصور کو کسی روز اچانک ہی اپنے سامنے زندہ کھڑے دیکھ لیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں کبھی یملا رہتی تھی اور پھر مہرو کو بھی اسی کمرے میں رکھا گیا۔ جن تصویروں میں لڑکی کے ماتھے پر بندیا ہے وہ ساری یملا کی تصویریں ہیں لیکن جن چند تصویروں میں بندیا ماتھے پر نہیں ہے اور بال مخصوص انداز میں پیچھے چٹیا کی صورت باندھنے کے بجائے کھلے چھوڑے گئے ہیں، وہ مہرو کی تصویر ہے..... اور اس کے کمرے میں پائی جانے والی رنگ اور عطر کی ملی جلی خوشبو تمہارے کپڑوں سے آتی ہے۔ یہ تمہارا کوئی خاص پرفیوم ہے جو تم استعمال کرتے ہو اور جب بھی تمہیں موقع ملتا ہے، تم سب سے نظر بچا کر اس کمرے میں جاتے ہو..... چاہے ہفتوں بعد ہی سہی..... لیکن اگر تمہیں اب بھی اس بات سے انکار ہے تو میں دوبارہ اپنی بات نہیں دہراؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک سچا آرٹسٹ کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ نواب تیمور نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ کچھ لمحوں بعد شہریار نے سر اُٹھایا تو اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''آپ کا اندازہ درست ہے..... وہ دوسری لڑکی جو میری تصویروں میں کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مہرو ہی ہے.....'' نواب تیمور اپنے حواس کھو کر غصے میں زور سے چلایا.....

''کیا.....؟ شہریار.....تم.....؟'' میں نے نواب کو خود کو سنبھالنے کی التجا کی اور آنکھوں آنکھوں میں اسے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی درخواست کی، مگر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ شہریار کی کہانی مختصر تھی۔ اس نے بتایا کہ باپ کے آئے روز کے طعنوں اور ماں کی بے جا فکر اور پریشانیوں سے گھبرا کر اس نے سارا سارا دن خود کو کمرے میں بند رکھنا شروع کر دیا تھا تاکہ نہ وہ باپ کے سامنے آئے اور نہ ہی باپ اسے نفسیاتی مریض، ناکارہ اور نالائق وارث ہونے کے طعنے دے۔ اب اسے پینٹ بھی کرنا ہوتا تو وہ رات کے آخری پہر کمرے سے نکل کر اپنی بالکونی یا باغ وغیرہ کی طرف نکل جاتا اور صبح دھوپ نکلنے سے ذرا پہلے تک پینٹ کر کے اپنے کمرے میں واپس آ جایا کرتا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ اسی ذہنی دباؤ میں صبح سویرے محل کے اس ممنوعہ حصے کی طرف نکل آیا جہاں جانے پر آج کل سخت پابندیاں تھیں۔ مگر فجر سے کچھ دیر پہلے کا وقت تھا اور محافظ بھی تھک ہار کر پلکیں موندھ چلے تھے۔ ویسے بھی باغ کے ان درمیانی راستوں تک گھر والوں کے سوا کسی کی رسائی نہیں تھی اور گھر میں تھا ہی کون۔ نواب بیگم اور شہریار..... جو نواب تیمور کے خاص اپنے تھے اور اپنی حد میں رہنا خوب جانتے تھے۔ مگر اس روز شہریار نے وہ حد پار کر لی اور نواب کے خاص مہمان خانے کی پچھلی سمت والے باغ میں آ نکلا۔ ارادہ وہی پرانا تھا۔ یعنی تصویر کشی..... اُس نے ایک سنسان گوشہ چنا اور ایزل پر کینوس سجایا۔ صبح کی روشنی ابھی رات کے اندھیرے کی پکڑ میں تھی۔ ہوا ہلکی اور خوشگوار تھی۔ شہریار کو صبح کا یہ ابتدائی وقت تصویر بنانے کے لئے بہت زیادہ پسند تھا اس نے برش اٹھایا اور تبھی اس کی نظر دُور کھلتی مہمان خانے کے کسی کمرے کی بالکونی پر پڑی۔ شہریار کے ہاتھ سے برش گر گیا۔ یہ تو وہی تھی..... یملا..... مگر وہ اور اس کا خاندان تو رات کے وقت شہریار کو دکھائی دیتے تھے مگر اس وقت.....کیسے.....؟

شہریار نے تین چار پلکیں جھپکیں کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ یا اس کا تخیل اتنا زور آور ہو گیا ہے کہ اب صبح کے اُجالے میں بھی اُسے یہ ہیولے دکھائی دینے لگے ہیں۔ لیکن نہیں..... یہ کوئی واہمہ تو نہیں تھا۔ اس لڑکی کی اُداس نظریں کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اچانک شہریار پر پڑتی ہیں تو پہلے تو وہ گھبرا کر گھونگھٹ نکال کر فوراً اندر کمرے کی طرف لپک کر پلٹ جاتی ہے۔ اور تبھی شہریار بھی ہوش میں آتا ہے کہ یہ تو کوئی جیتی جاگتی لڑکی تھی جو اسے دیکھ کر گھبرا کر اندر بھاگ گئی۔ شہریار اسے دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے اور پھر اگلے روز وہ دانستہ اسی وقت اور اسی جگہ پر اس انجان لڑکی کا انتظار کرتا ہے۔ اور پھر یہ انتظار اس کا معمول بن جاتا ہے۔

پہلے پہل وہ لڑکی اس کے ڈر سے باہر نہیں آتی مگر پھر اس کی مجبوری بھی شہریار سے اشاروں کنایوں میں مدد مانگنے پر اُسے آمادہ کر ہی دیتی ہے۔ وہ شہریار کے لئے ایک کاغذ پر مختصر پیغام لکھ کر نیچے پھینکتی ہے کہ وہ یہاں قید ہے اور شہریار سے منت کرتی ہے کہ وہ یہاں سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ محل کے محافظ اور دیگر نوکر شہریار کی راتوں میں مٹرگشت اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے کی عادت سے تو پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ شہریار یوں آدھی رات کو اچانک بنا بتائے کس گوشے کی طرف نکل جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ لڑکی شہریار کے دل میں گھر کر جاتی ہے، مگر وہ تو کسی اور کے انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھی ہے۔ اور اس بیچاری کو تو یہ بھی نہیں پتہ کہ وہ جس ظالم کی قید میں ہے وہ کوئی اور نہیں..... خود شہریار کا اپنا باپ ہے۔

شہریار جانتا ہے کہ اس محل کی سنگین پہرے داری سے مہرو کو نکالنا تقریباً ناممکن ہے مگر وہ مہرو سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ اسے اس کی محبت سے ملوانے کے لئے جو ممکن ہو وہ کر گزرے گا..... شہریار بالکنی میں ڈالنے کے لئے رسی کا انتظام تو پہلے ہی کر چکا ہے مگر یہ کمند ڈال کر وہ اس قید شہزادی کو چھڑا بھی لے تو لے جائے گا کہاں.....؟ تبھی اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ چند دن کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ شہریار اسی دن کے انتظار میں رُکا ہوا تھا اور پھر اگلے روز فجر کی اذانوں سے پہلے محل کے پچھلے حصے میں اسٹاف کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر کے دروازے پر تین چار بار ہلکے انداز میں مگر عجلت اور گھبراہٹ میں کسی نے دستک دی۔

گھر کے مکین نے پریشانی میں دروازہ کھولا تو باہر اپنے شاگرد شہریار کو کسی گھبرائی ہوئی لڑکی کے ساتھ کھڑے دیکھ کر خود استاد اکبر کے ہوش اُڑ گئے۔ شہریار نے بنا کچھ کہے تیزی سے مہرو کو گھر کے صحن میں دھکیلا اور خود اندر آ کر اپنے اتالیق کو ساری بات الف سے ی تک سنا دی۔ اکبر نے بچپن سے لے کر آج تک شہریار کو اپنا شاگرد نہیں بیٹا جان کر اس کی پرورش اور تربیت کی تھی۔ مگر آج وہ اپنے استاد سے بہت بڑی قربانی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ استاد اکبر کو اچھی طرح پتہ تھا کہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دینے کا کیا انجام ہو سکتا تھا مگر شہریار کے اپنے سامنے بندھے ہاتھ وہ چاہ کر بھی نہیں کھول پایا۔ کیونکہ اس کا شاگرد اسے بہت پیارا تھا۔ ویسے بھی اب وہ ریٹائر ہو چکا تھا اور محل سے اس کی رخصتی کی تاریخ مہینہ بھر پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ وہ صرف نواب تیمور کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ آخری بار اس سے مل کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو کر اپنے آبائی قصبے میں منتقل ہو جائے جو نواب پور سے دو دن کی دُوری اور مسافت پر تھا۔

استاد اکبر کے گھر میں اس کی بیوی اور جوان بیٹی، بس کل یہی تین فرد تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس چوتھے رُکن یعنی مہرو کو کہاں چھپایا جائے اور محل سے کیسے نکالا جائے؟ اسٹاف کوارٹرز کے لئے محل کی پچھلی سمت بھی ایک چھوٹا سا گیٹ تھا جسے تمام اسٹاف خود اور ان کے آنے جانے والے ملاقاتی اور مہمان دن کے وقت استعمال کرتے تھے۔ رات کو یہ گیٹ بند کر دیا جاتا تھا۔ دن اور رات دونوں اوقات وہاں بھی محافظ عقبی دروازے کے ساتھ بنے ایک گارڈ روم میں ہمہ وقت موجود رہتے تھے، دن کو تو سرسری جائزہ لیا جاتا مگر رات کو عشاء کے بعد جب وہ چھوٹا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا تب اگر کسی کو محل کے اندر آنا یا جانا ہوتا تو اس کا باقاعدہ ایک رجسٹر میں اندراج کروانا ضروری تھا۔

استاد اکبر کی بیوی اور بیٹی دونوں گھر سے نکلتے وقت برقعے کا پردہ کیا کرتی تھیں۔ اور یہ بات سبھی کے علم میں تھی۔ اُسی دن دھوپ نکلتے ہی استاد کی بیوی اور بیٹی باقی آتی جاتی عورتوں کی کسی ٹولی میں بازار سے سودا سلف وغیرہ لینے کے لئے نکلیں لیکن کسی کو یہ خبر نہیں ہوئی کہ ان دو سیاہ برقعوں میں ملبوس عورتوں میں سے ایک مہرو ہے جسے اکبر کی بیٹی شائستہ کا برقعہ پہنا کر محل کے پچھلے حصے سے معمول کے مطابق آتی جاتی عورتوں کے جھرمٹ میں باہر نکالا گیا ہے۔ مہرو کو اکبر کی بیوی نے اپنی ایک منہ بولی بہن کے گھر پہنچایا جو قریبی بازار سے پرے ایک محلے میں تھا۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ..... مہرو اس کی دور پرے کی رشتہ دار ہے..... اور اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر بنا بتائے چلی آئی ہے۔ مگر شوہر کی ناراضگی کے ڈر سے وہ فی الحال مہرو کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتی۔ ایک آدھ دن میں اپنے گھر والے کو ساری صورت حال بتا کر اور اسے منا کر وہ مہرو کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔ محل واپسی کے لئے بھی اکبر کی بیوی نے

یہی طریقہ استعمال کیا اور چند محلے دار عورتوں کی دوسری ٹولی میں شامل ہو کر بازار سے چند چیزیں خرید انہی کے ساتھ واپس محل کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوگئی اور کسی کو یہ خبر نہیں ہو سکی کہ آتے وقت وہ دو نہیں ایک ہو کر واپس لوٹی ہے۔ ویسے بھی دن کی گہما گہمی میں اتنی باریکی کی طرف دھیان دینے والا کوئی نہیں تھا.....

دھوپ چڑھتے ہی جب نواب کی خادمہ نے تیسری چوتھی مرتبہ جا کر مہرو کے کمرے کے دروازے پر دستک دی جسے مہرو روزانہ رات کو سوتے وقت اندر سے کنڈی لگا دیتی تھی، مگر گھنٹہ بھر گزرنے کے بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو خادمہ نے شور مچا دیا۔ نوکروں نے دروازہ توڑ کر اندر دیکھا تو مہرو کا نام ونشان بھی نہیں ملا۔ چاروں طرف ہلچل سی مچ گئی۔ نواب بیگم کے اپنے ہوش اُڑ گئے اور فوراً مہرو کی تلاش میں کھوجی دوڑائے گئے۔ مگر مہرو تو جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو چکی تھی۔

تیسرے دن نواب بھی واپس محل پہنچ گیا اور یہ قیامت خیز خبر سنتے ہی محل میں بھونچال سا آ گیا۔ اندر ایک ایک گھر ایک ایک کمرہ کونہ کھدرا چھان لیا گیا۔ محلے کے کوارٹرز کی بھی بیسیوں مرتبہ تلاشیاں لی گئیں۔ پہرے پر موجود محافظوں کو قید خانے میں بند کر کے کوڑے مارے گئے، لہولہان کر دیا گیا مگر مہرو کی خبر نہ ملی۔

استاد اکبر نے تیسرے دن نواب سے رخصت چاہی مگر نواب کو اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ اکبر کو اجازت مل گئی اکبر کی بیوی اور بیٹی آخری بار نواب بیگم سے جا کر ملیں اور پھر وہ تینوں بازار سے منگائے گئے تانگے میں محل سے اپنے ساز وسامان کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے تب شہریار انہیں دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ استاد معظم نے جاتے جاتے شہریار سے صرف اتنا کہا کہ وہ اس کی امانت کی آخری دم تک حفاظت کرے گا۔ لیکن اُسے بھی قسم ہے کہ اب اس کا نیا پتہ جو وہ صرف شہریار کو بتا کر جا رہا ہے، اس کی خبر موت تک اب وہ کسی کو نہیں دے گا۔ کیونکہ اکبر نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے آبائی گھر واپس نہیں جائے گا۔ بلکہ اس لڑکی کو اس کی منزل پر پہنچا کر وہ تمام عمر اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے لئے کسی اور طرف نکل جائے گا۔ تاکہ اگر محل میں کبھی کسی کو اس بات کی خبر ہو بھی جائے کہ شہریار نے اکبر کی مدد سے مہرو کو محل پار کروایا تھا تو وہ لوگ کبھی اکبر اور اس کے خاندان تک نہ پہنچ سکیں۔

شہریار کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے خاموش ہونے کے بعد اس محل میں جانے کتنی کہانیاں جنم لینے والی تھیں۔ نواب اپنی جگہ یوں ڈھے کر بیٹھا کہ مجھے لگا اب وہ کبھی اُٹھ نہیں پائے گا..... اس کا چہرہ سرخ اور سانس بپھری ہوئی تھی۔ شہریار باپ کی طرف پلٹا "میں جانتا ہوں میں آپ کا مجرم ہوں۔ اور مجھے آپ کی دی ہر سزا قبول ہے..... مگر میں نے وہی کیا، جو میرے دل کو ٹھیک لگا....." ایک باپ کے سامنے اس کا جواں بیٹا ملزم بن کر سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور اس کا جرم بھی تو بہت بڑا تھا "جرم محبت۔"

کیا المیہ تھا کہ باپ اور بیٹا دونوں ہی محبت کر بیٹھے تھے، مگر ان میں سے ایک نے اپنی محبت کو عمر بھر کے لئے قید کیا تو دوسرے نے اُسے تاحیات رہائی دے دی۔ نواب تیمور کی آنکھیں سرخ اور جسم غصے اور پشیمانی سے لرز رہا تھا۔ دفعتہً وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور بنا ہم دونوں سے نظریں ملائے تیز قدم اٹھاتا ہال سے نکل گیا۔

تبھی مجھے دوسری جانب ہال سے جڑے کمرے اور ہال کی تقسیم کے لئے ڈالے گئے بڑے پردوں کے پیچھے کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی اور مجھے ہمیشہ اپنے اردگرد دو گھورتی آنکھوں کا بھید بھی مل گیا۔ وہ نواب کی بیوی تھی جو ہمہ

وقت ایک بے چین اور فکر مند ماں کی حیثیت سے اپنے لاڈلے شہریار پہ نظر رکھتی تھی۔ کاش وہ یہ پہرہ اس وقت بھی دیتی جب شہریار نصف شب محل کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نواب بیگم اپنے شوہر کی دلجوئی کے لئے اس کے پیچھے لپکی ہے۔ شہریار اسی طرح افسردہ اور پشیمان سا بیٹھا ہوا تھا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں..... میں کبھی ایک اچھا بیٹا ثابت نہیں ہوسکوں گا..... میں نے ایک بار پھر ان کا دل دکھادیا ہے..... جانے اب وہ کبھی مجھے معاف کر پائیں گے یا نہیں.....''

''تمہاری جگہ اگر میں بھی ہوتا تو یہی کرتا..... مگر تم نے جسے اس محل کی قید سے رہائی دلوائی تھی..... وہ واپس اپنی جھونپڑی تک نہیں پہنچ پائی..... میں اس مہرو کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا.....'' شہریار پریشانی سے کھڑا ہوگیا۔

''کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مہرو اپنے گھر نہیں پہنچی تو پھر کہاں گئی..... استاد معظم نے تو مجھ سے یہی وعدہ کیا تھا کہ وہ یہاں سے جاتے ہی سب سے پہلے مہرو کو اس کے ٹھکانے تک پہنچائیں گے.....'' میں نے شہریار کو مہرو کے گھر سے لے کر اپنے یہاں تک آنے کی ساری روداد سنادی۔ شہریار سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''تو پھر وہ لوگ کہاں گئے۔ مجھے میرے استاد نے جو پتہ لکھوایا تھا وہ وہاں بھی نہیں ہیں۔ میں نے کئی بار اپنے طور پر معلوم کروایا ہے۔ خط لکھے ہیں، تار بھیجے ہیں..... تحفے تحائف دینے کے بہانے یہاں سے قاصد بھی روانہ کیے ہیں۔ مگر ہر بار وہاں سے یہی جواب آیا ہے کہ اس پتے پر اب وہاں کوئی نہیں رہتا..... یا خدایا..... وہ لوگ کہاں چلے گئے..... کہیں کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو.....'' میں نے گہری سانس لی۔

''تم اگر مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو تو اپنے اتالیق کا پتہ مجھے ازبر کروادو..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور میرا مقصد صرف مہرو کو تلاش کر کے اس کے اپنوں تک اسے پہنچانا ہے..... اور تم اپنے والدین کو راضی رکھنے کی کوشش کرو..... دُنیا میں صرف اولاد سے نہیں، کبھی کبھار والدین سے بھی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ اولاد کا حسن سلوک انہیں راہ راست پر لاسکتا ہے۔ اس وقت ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے.....'' شہریار نے ایک کاپی پینسل منگوائی اور اس پر کچھ لکھ کر خاموشی سے میری جیب میں ڈال دیا۔

''ایک بات کا دھیان رکھیے گا، کوئی آپ کا پیچھا کرتے ہوئے استاد معظم تک نہ پہنچ جائے۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو میں خود کو یہاں مار ڈالوں گا۔'' اسی وقت ایک نوکر ہڑبڑایا ہوا سا اندر آیا..... وہ جناب..... آپ کے کمرے میں جو مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ محل کے ڈاکٹر صاحب کو بلوایا ہے مینیجر صاحب نے..... وہ آپ کو بھی بلا رہے ہیں۔ میں اور شہریار تیزی سے باہر لپکے۔

بخت خان کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے تھرمامیٹر دیکھا ''انہیں شدید بخار ہے۔ شاید رات بہت سردی لگی ہے..... مجھے تو نمونیا لگتا ہے..... بہرحال..... میں دوا تجویز کر دیتا ہوں.....''

بخت خان نے نقاہت سے آنکھیں کھولیں ''تم ٹھیک ہے ناں عبداللہ خاناں.....'' میں نے اسے تھپکی دی۔ ''فکر مت کرو..... سب ٹھیک ہے.....'' شام کو میں نے نواب تیمور سے واپسی کی اجازت چاہی تو وہ بے چین سا ہوگیا۔

''ایسی کیا جلدی ہے.....؟ ابھی تو آپ کی مہمان نوازی بھی نہیں کر پایا میں..... اور آپ کے ساتھی کی

حالت بھی تو ٹھیک نہیں ہے....."

"میرا جانا ضروری ہے نواب صاحب۔ اور کمال صاحب بھی تو پریشان ہوتے ہوں گے۔ آپ برائے مہربانی ہمیں ان کے گھر پہنچا دیں۔" نواب خاموش ہوگیا۔ اور بادل نخواستہ اگلی صبح ہمیں محل کی گاڑی میں کمال صاحب کے بنگلے پر پہنچا دیا گیا۔ کمال صاحب یوں گلے ملے جیسے میرے آنے کی اُمید ہی کھو بیٹھے ہوں۔

"سچ پوچھو میاں تو میں واقعی ڈر گیا تھا۔ نواب تیمور جیسے آدمی سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے....." میں نے بخت خان کو ان کے حوالے کیا۔ اسے بار بار غنودگی اور مدہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے اور بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ نواب کے زندان خانے میں گزاری شدید سرد راتوں کی ٹھنڈ اُس کی ہڈیوں میں اتر چکی تھی۔ میں دن رات اس کی تیمارداری میں الجھا رہا۔ کمال صاحب بھی میرے ساتھ مصروف رہے مگر انہوں نے بخت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ آخر ساتویں دن بخت خان نے نقاہت بھری آنکھیں کھولیں تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تمہیں کچھ دن یہیں آرام کرنا ہوگا بخت خان..... وعدہ کرو کہ میرے واپس آنے تک تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے....." وہ پریشانی سے بولا۔

"تم کدھر جارہا ہے عبداللہ خاناں....." میں نے اسے بتایا کہ میرا مہرو کے پیچھے جانا بہت ضروری ہے۔ شہریار نے استاد اکبر کا جو پتہ دیا تھا۔ مجھے اب اگلی کڑی وہیں سے مل سکتی تھی۔ بخت خان میری قسم کے آگے مجبور ہو کر رہ گیا اور میں اسے کمال صاحب کے حوالے کر کے رات کے اندھیرے میں نواب پور کے اسٹیشن پر آپہنچا۔ یہاں سے مجھے دو ٹرینیں بدل کر اکبر کے شہر پہنچنا تھا۔ میں نے خود کو پوری طرح چھپا رکھا تھا اور کمال صاحب کے گھر سے نکلتے وقت بھی پوری احتیاط کی تھی کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے ٹرین آچکی تھی۔ میں ٹکٹ لے کر اپنے ڈبے کی طرف بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی "ہم سے مل کر نہیں جائیں گے جناب....." میں گھبرا کر پلٹا۔

..........*

باب 24

میں نے ٹکٹ گھر سے ٹکٹ پکڑا اور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ میرا اتنی بھیڑ میں زیادہ دیر کھڑے رہنا بھی نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑا کر اپنا ڈبہ ڈھونڈا اور پائیدان پہ پاؤں رکھ کر اندر سوار ہونے کے لئے قدم بڑھائے تبھی پیچھے سے نواب تیمور کی بھاری آواز نے میرے قدم جکڑ لئے ''ہم سے مل کر نہیں جائیں گے جناب.....؟'' میں گھبرا کر پلٹا۔

شہریار کی کہی بات میرے ذہن میں گونجی ''اس کا دھیان رکھیے گا کہ کہیں کوئی آپ کا پیچھا کرتے ہوئے میرے استاد یا مہرو کے ٹھکانے تک نہ پہنچ جائے۔ اگر اُنہیں کوئی نقصان پہنچا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' میں نے کمال صاحب کے گھر سے نکلنے کا وقت بھی آدھی رات کے لگ بھگ اسی لئے رکھا تھا تاکہ اگر کوئی میری تاک میں یا میرے پہرے پر بیٹھا ہو تو اُس کی غفلت کے دوران میں نظر بچا کر گھر سے نکل سکوں۔

لیکن نواب تیمور کی یوں آدھی رات کے وقت اسٹیشن پر موجودگی کا یہی مطلب تھا کہ کوئی لگاتار اور مسلسل کمال صاحب کے گھر کے باہر بیٹھا ہماری نگرانی کر رہا تھا اور جیسے ہی میں رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلا اس نے نواب کو اطلاع کر دی اور میرے پیچھے پیچھے یہاں اسٹیشن تک اُسے میری ہر حرکت کی خبر دی جاتی رہی۔ نواب کو اسٹیشن پر دیکھ کر آس پاس سرکاری اہلکاروں اور عملے کے اندر تھرتھری سی مچی ہوئی تھی اور سبھی چوکنا اور چوکس دکھائی دینے کی کوشش میں مصروف تھے۔

نواب نے میری طرف قدم بڑھائے ''میں جانتا تھا کہ اب آپ مجھ پر اعتبار نہیں کریں گے..... جب میرے اپنے بیٹے نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا تو آپ سے کیا گلہ کرنا..... لیکن مجھے میری نظروں میں اتنا نہ گرائیں..... مانا میں نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں..... مگر شاید اب کفارے کا وقت آن پہنچا ہے..... مجھے کفارہ تو ادا کر لینے دیں عبداللہ صاحب.....''

''آپ کا پچھتاوا ہی آپ کا کفارہ ہے نواب صاحب..... اور رازداری سے مہرو کی تلاش میں نکلنے کی شرط بھی شہریار کی ہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا کہ آپ کے غصے اور غضب کے ہاتھوں اس کے استاد یا مہرو کو کوئی نقصان پہنچے..... اُمید ہے آپ میری مجبوری سمجھ گئے ہوں گے.....'' نواب نے گہری سانس لی۔

''مجھے اندازہ ہے..... اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر شرمندہ ہوں۔ کاش میں خود مہرو کو اس کے گھر والوں کے حوالے کر آتا تو آج میرے دل پر اتنا بوجھ نہ ہوتا۔ ایک باپ کے لئے سب سے مشکل اور بڑا

مدمقابل اس کا اپنا بیٹا اور اس کا وارث ہوتا ہے۔ شہریار نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ جس ہمت اور بہادری سے اس نے مہرو کو محل سے آزاد کروایا ہے، اس نے یہ بات بھی ثابت کردی ہے کہ شہریار سے متعلق میرے سارے خدشات غلط تھے۔ وقت آنے پر وہ اپنی ساری ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھائے گا۔ میں آج یہاں آپ سے صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ اگر مہرو آپ کو مل جائے تو میری طرف سے بھی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگیے گا۔ خدا آپ کا سفر بخیر کرے..... اور آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے..... ہو سکے تو آپ بھی مجھے معاف کر دیجئے گا.....''

نواب نے آگے بڑھ کر مجھے زور سے گلے لگایا اور اپنی نم آنکھیں چھپاتے ہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

گاڑی چل پڑی اور میں ایک گوشے میں خود کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپائے سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مختار پور میری منزل تھا مگر مختار پور کا قصبہ آنے میں ابھی پورا ایک دن اور ایک رات کا سفر باقی تھا۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ نواب پور کے پلیٹ فارم پر جب نواب تیمور مجھ سے مل رہے تھے تب دور کھڑا ایک سادہ لباس والا اہلکار مجھے بہت غور اور عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جانے وہ نواب صاحب کے عملے کا فرد تھا یا پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی کا کوئی اہلکار.....

مگر اس کی نظر بڑی چبھنے والی تھی۔ وہی بندہ مجھے اپنے ڈبے کے اندر بیٹھا نظر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا لیکن وہ لاتعلق سا اخبار سامنے پھیلائے خبریں پڑھنے میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے ذہن سے وسوسے جھٹکنے کی کوشش کی۔ ہوسکتا ہے یہ صرف ایک اتفاق ہو۔ اور وہ اپنی کسی منزل کی جانب روانہ ہو۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگلے آنے والے کسی بھی بڑے جنکشن پر اُتر کر خود کو پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم کردوں گا اور پھر مختار پور کے لئے کوئی دوسری گاڑی پکڑوں گا۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور شک کا سنپولیا کلبلایا۔ کہیں یہ نواب تیمور کی طرف سے ہی مقرر کردہ کوئی مخبر تو نہیں..... جسے میرے پیچھے لگا کر وہ مہرو تک پہنچنا چاہتا ہے۔

نہیں نہیں..... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ نواب میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کرسکتا۔ میں نے بے چینی سے کئی پہلو بدلے۔ مگر جب تک گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رُک نہیں جاتی تب تک میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً منہ سر ڈھانپے وہیں پڑا رہا۔ سامنے والی نشستوں پر چند بوڑھے بیٹھے زور شور سے بڑھتی مہنگائی پر کچھ بحث کر رہے تھے۔ ایک بڑے میاں اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو بار بار ڈانٹ رہے تھے کہ گھر سے نکلتے وقت سارا کھانا، قیمہ، پراٹھے، نان وغیرہ ٹھیک طرح سے گرم کر کے ٹفن میں پیک کیوں نہیں کیے گئے۔ اب وہ کہاں سے کھانا اور ناشتہ گرم کروائیں گے.....؟

ایک طرف چند نوجوانوں نے ٹرین چلتے ہی ڈبے کے فرش پر اپنی چادر بچھائی اور تاش کی بند گڈی کھول کر فوراً تاش کے پتے بانٹے اور رمی..... کھیلنا شروع کردی۔ کچھ حضرات نے جو پہلے سے اپنی اپنی برتھوں پر سوئے خراٹے لے رہے تھے، ٹرین کے دوبارہ چلنے پر اُٹھ کر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر سے منہ پر چادر ڈال کر لمبی تان کر دوبارہ سو گئے..... کچھ لوگ کتنی جلدی ٹرین کے عارضی سفر میں بھی خود کو اتنی سہولت سے کیسے بسا لیتے ہیں.....؟ اور کچھ لوگ تمام عمر اپنے مستقل ٹھکانوں اور گھروں میں بھی کتنے بے چین رہتے ہیں۔ شاید کہیں بس جانے کا تعلق جگہ، اور اُس مقام کے عارضی یا مستقل ہونے سے جڑا نہیں ہوتا۔ یہ سب ہمارے اندر کی بے چینیاں اور مختلف گرہیں ہوتی ہیں جو ہمیں تمام عمر کسی کسک یا بے چینی کے احساس میں جیتے رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ انسان کے اندر سکون ہو تو اُسے

پلیٹ فارم کے بینچ پر گاڑی کے انتظار کے دوران بھی نیند آجاتی ہے۔ اتنے میں دور کسی برتھ پر کسی منچلے نے اپنے ریڈیو کی سوئی گھمائی اور فضا میں کسی دل جلے نغمہ نگار کے بول گونج اُٹھے۔

"طبیعت ٹھیک تھی اور دل بھی بے قرار نہ تھا،
یہ تب کی بات ہے جب کسی سے پیار نہ تھا
جب سے پریت سپنوں میں سمائی مار گئی
من کے میٹھے درد کی گہرائی مار گئی
نینوں سے یہ نینوں کی سگائی مار گئی
اور باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی..... مہنگائی مار گئی"

ایک بڑے میاں نے غصے میں گلاس پٹخ دیا۔ "سچ ہی تو کہا ہے شاعر نے..... اس مہنگائی نے تو کمر توڑ کر رکھ دی ہے ہماری غضب خدا کا..... جینا مشکل کر دیا ہے۔ سبھی بوکھلائے پھرتے ہیں، نہ محبتوں کو لیلیٰ کی خبر ہو اور نہ زلیخا کو یوسف علیہ السلام کی۔ میں کہے دیتا ہوں..... یہ حکومت زیادہ نہیں چلنے کی..... خون کی ندیاں بہیں گی ندیاں..... سڑکیں لال ہوں گی..... تم دیکھ لینا"

کیسے وقت میں ہائے دل کو دل کی لگی بیماری
مہنگائی کے دور میں ہوگئی مہنگی یار کی یاری
دل کی لگی دل کو جب لگائی مار گئی
دل نے دی پیار کی دہائی مار گئی
دل کی بات دنیا کو بتائی مار گئی
اور دل کی بات دل میں جو چھپائی مار گئی
اور باقی ..... کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی
مہنگائی مار گئی.....

ایسا لگتا تھا جیسے ریڈیو پر بجتے اس نغمے نے سارے ڈبے کے مکینوں کے دل کے تار چھیڑ دیے ہیں۔ سبھی ٹھنڈی آہیں بھر بھر کے حکومت کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگے تھے۔ انسان انسان کے ہر دکھ درد کا درماں یا انتظام کب کر سکتا ہے بھلا.....! یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے..... مگر یہ بات کسی کو کم ہی سمجھ آتی ہے۔ اچانک ٹرین کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ مضافات بتا رہے تھے کہ کسی بڑے شہر کا اسٹیشن قریب آرہا ہے۔ میرے لئے یہ بہترین موقع تھا خود کو غائب کرنے کا۔ ٹرین سیٹیاں بجاتی پلیٹ فارم پر چڑھی اور آگے جا کر رک گئی۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر مجھ سے پہلے ہی وہ مشکوک شخص اپنا بریف کیس سنبھالے اُٹھا اور گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ میں نے کچھ پل انتظار کیا اور پھر اس کے پیچھے اتر کر اسے دیکھا تو وہ پلیٹ فارم سے باہر

نکلتے ہوئے کسی ٹیکسی یا رکشے والے سے اپنی منزل کے کرائے پر بحث کر رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی گویا وہ سب میرا وہم ہی تھا۔ اور جسے میں خفیہ پولیس کا یا نواب کا اہلکار سمجھ رہا تھا وہ اتفاقاً میرے ڈبے میں میرے ساتھ سوار ہو گیا تھا۔ ٹرین نے کچھ دیر بعد سیٹی بجائی اور میں اپنی جگہ پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ ایک دن یونہی بیت گیا اور پھر اگلے روز عصر کے وقت گاڑی مختار پور کے پلیٹ فارم پر آ لگی۔

نواب پور کی طرح یہ بھی ایک پرانی ریاست تھی جس کے ماحول اور در و . پر گلابی رنگ کی آمیزش زیادہ نظر آتی تھی۔ اسٹیشن پر کافی بھیڑ تھی۔ میں نے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے سے پہلے اچھی طرح اطمینان کیا کہ کہیں کوئی آس پاس میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ باہر بہت سے سائیکل رکشہ، تانگے اور بگھیوں والے مسافروں کو لے جانے کے لئے کھڑے آوازیں لگا رہے تھے، اکا دُکا مخصوص 70 ماڈل کی پرانی ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں، جن میں زیادہ تر بابو ٹائپ سرکاری ملازم ہی اپنا سامان رکھوا رہے تھے۔

میں نے ایک تانگے والے سے پوچھا "مومن نگر چلو گے....." تانگے والے نے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں بیڑی ہونٹوں میں لگائے جواب دیا۔

"ضرور چلیں گے صاحب..... تبھی تو کھڑے ہیں یہاں....." مختار پور کی شام گلابی تھی اور آسمان پر بھی چند گلابی بادل تیر رہے تھے۔ مگر جن کے دل اندر غم کے اندھیروں سے تاریک ہوں، انہیں باہر کے سارے موسم ایک جیسے لگتے ہیں۔

تانگہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک پرانے محلے میں داخل ہو گیا۔ جس کے باہر پرانی طرز کا لکڑی کا گیٹ ابھی تک قائم تھا اور اندر احاطے میں برطانوی طرز کے لیمپ پوسٹ اور کھمبے گلیوں کے سرے پہ کھڑے نظر آ رہے تھے، تانگے والے نے مجھ سے پوچھا۔

"مومن نگر آ گیا ہے جناب..... کہیے کس گلی میں اُتار دوں.....؟ کس کے گھر جانا ہے.....؟" میں نے اپنا عذر پیش کیا۔

"جانا تو مجھے تیسری گلی میں اکبر علی صاحب کے گھر ہے۔ مگر میں یہاں پہلے کبھی آیا نہیں..... پہلے کسی سے ان کا پتہ پوچھ لوں..... اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو تبھی مجھے دوبارہ اسٹیشن لے جانا..... میں وہیں آس پاس کسی مسافر خانے میں قیام کر کے ان کے آنے کا انتظار کروں گا....." تانگے والے نے سر ہلایا اور سامنے کسی پان کی دوکان والے سے چلا کر اکبر علی کا پتہ پوچھا۔

"سنیے جناب..... یہ اکبر علی صاحب کا مکان کہاں ہے..... اور وہ یہیں ہوتے ہیں آج کل کیا....." پنواڑی نے گلوری بنا کر سامنے کھڑے گاہک کے منہ میں رکھی۔

"ہاں کون سے اکبر صاحب..... میاں ہم نے تو نہیں سنا یہ نام کبھی اس محلے میں....." میرا دل ڈوب سا گیا۔ اس کا مطلب شہریار کے استاد معظم ابھی تک اپنے دیئے ہوئے پتے پر نہیں پہنچے تھے۔ تانگے والے نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک آخری کوشش کی۔

''معلم ہیں..... پہلے کسی اور ریاست میں تعلیم کے شعبے سے منسلک تھے، پھر وہاں سے نوکری ختم کر کے یہاں چلے آنے کا قصد کیا تھا انہوں نے..... گھر والے بھی ساتھ ہوں شاید..... ان کی زوجہ محترمہ اور دو بچیاں بھی ان کے ہمراہ تھیں.....'' گلوری چبانے والے گاہک نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ارے ہاں..... ایک صاحب ابھی پچھلے ہفتے کوچۂ صداقت علی میں منتقل تو ہوئے ہیں۔ سنا ہے اتنا ہی خاندان بھی ساتھ ہے ان کے..... ابھی کل ہی مولوی صاحب نے مسجد میں اعلان کیا ہے ان کے لئے کہ محلے میں اور اردگرد دیگر گلیوں میں کسی نے اپنے بچے کو ٹیوشن وغیرہ پڑھانی ہو شام کو تو ان سے رابطہ کریں..... بس نام میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ آپ کہیں تو چل کر پوچھ لیتے ہیں.....'' میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ ہو نہ ہو..... وہ اکبر صاحب ہی ہوں گے۔ میں نے جلدی سے تانگے والے کو فارغ کیا اور ان صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ دو تین گلیاں گزار کر ہم ایک کشادہ سے احاطے میں آ گئے۔ وہاں بیٹھے کسی بزرگ سے ان صاحب نے پوچھا۔

''چچا..... یہ نئے محلے دار جو آئے ہیں۔ ان بزرگوار کا نام کیا ہے.....'' بوڑھے نے سر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ''اکبر علی نام ہے ان کا..... کیوں کیا کسی بچے کو سپارہ وغیرہ پڑھوانا ہے کیا.....''

''نہیں..... ان کے مہمان آئے ہیں ملنے، چلیں جناب..... آپ کا کام تو ہو گیا..... وہ سامنے تازہ سفید قلعی والا دروازہ ہے ان کے مکان کا.....'' وہ صاحب مجھ سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے اکبر صاحب کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ مجھے یہاں تک پہنچانے والے رہبر نے مجھے یہی بتایا تھا کہ ان اکبر صاحب کی بھی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ شاید اسی گلی کے آس پاس کے مکین تھے تبھی انہیں نئے آنے والے ہمسائے کے بارے میں اتنی زیادہ تفصیلات کا علم تھا۔ اور اگر یہ وہی شہریار کے استاد اکبر تھے تو اس کا مطلب ہے کہ مہرو ابھی تک ان کے ساتھ ہی تھی، کیونکہ ان کی اپنی تو ایک ہی بیٹی تھی، دوسری لڑکی کے ساتھ ہونے کا یہی مطلب تھا کہ مہرو ابھی تک اسی خاندان کے ساتھ رہ رہی ہے۔ میں لرزتے قدموں کے ساتھ اس سامنے والے مکان کے دروازے تک پہنچا۔ محلے کے احاطے میں کچھ بچے شور مچاتے ''برف پانی'' کا کھیل کھیل رہے تھے، کوئی بچہ دوسرے بھاگتے بچے کو چھو کر ''برف'' کہتا اور دوسرا بچہ برف کی طرح اپنی جگہ اسی حالت میں ساکت کھڑا منجمد ہو جاتا اور پھر کوئی اور بھاگتے ہوئے اسے چھو کر ''پانی'' کہہ کر پھر سے رواں کر دیتا۔ میرے قدم بھی اس وقت میرے ساتھ برف پانی کا کھیل کھیل رہے تھے، کبھی منجمد..... تو کبھی رواں..... میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر اپنے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور دھڑکتے دل سے دروازے پر دستک دی۔ اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے دوسری بار کنڈی ہلائی۔ اندر سے کسی کے قدموں کی آواز دروازے کی جانب آتی محسوس ہوئی اور پھر کسی لڑکی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

''کون.....؟'' میری سانسیں اٹکنے لگیں اور میں بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں..... عبداللہ.....'' اور ٹھیک اسی وقت کوئی دور سے چلایا۔

''وہ رہا..... ہاں..... وہی ہے.....'' میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا تو میرے ہوش اُڑ گئے، وہی مشکوک شخص جو نواب پور سے میرے ساتھ ڈبے میں سوار ہوا تھا، چار پانچ مزید لوگوں کے ساتھ دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا

تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار بھی تھا۔ میں نے بوکھلا کر دوسری جانب دیکھا تو وہاں بھی کچھ لوگ مجھے اپنی جانب لپکتے نظر آئے۔ میرے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ میں نے تیزی سے خود کو سمیٹا اور چوبارے کی جانب سے باہر سڑک پر کھلتی گلی کی جانب لپکا کہ شاید باہر کی بھیڑ میں خود کو گم کر سکوں مگر وہ لوگ گلی کا سرا پہنچنے سے پہلے ہی میرے سر پر پہنچ چکے تھے اور تب مجھے احساس ہوا کہ گلی کے سرے پر بھی انہی کے پہرے دار موجود ہیں۔ ٹرین والے بندے نے مجھ پر پستول تان لیا۔

"اب مزید بھاگنا فضول ہے..... تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو..... میں نے اسی لئے اسٹیشن کی بھیڑ میں تم پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ تم ہجوم میں خود کو گم کر دو گے..... بہت بھگایا ہے تم نے ہمیں اپنے پیچھے..... لیکن بس..... اب بہت ہو گیا..... ہتھیار ڈال دو..... ورنہ میں تمہیں گولی مارنے میں ایک پل کی دیر بھی نہیں کروں گا....." میں نے ایک گہری سانس لی۔

"میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے..... تم تلاشی لے سکتے ہو....." اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور اپنے کسی نائب کو اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے میرے سارے جسم کو اچھی طرح ٹٹولا اور میرے جسم کو ڈھانپتی سیاہ چادر بھی اتار کر..... ایک جانب پھینک دی..... پھر ان میں سے کسی نے جیب سے ہتھکڑیاں نکالیں اور میرے ہاتھوں میں ڈال دیں۔

"تمہیں سزائے موت کے قیدی ہونے کی حیثیت سے اور جیل توڑ کر بھاگنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے ساحر..... میں تو تمہیں نواب پور کے اسٹیشن پر دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ تم وہی ہو..... حالانکہ تم نے حلیہ خوب بدلا ہے کسی جوگی فقیر کا..... لیکن میرا نام بھی اسد ہے اسد..... انسپکٹر..... کرائمز برانچ آف پولیس..... تم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے..... اچھا ہوا تم نے زیادہ مزاحمت نہیں کی..... ورنہ ہمیں تمہیں دیکھتے ہی سیدھے گولی مار دینے کا حکم ملا ہوا ہے....." میں نے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میری قسمت اس مومن نگر محلے کی اس گلی میں نہیں لکھی تھی..... ورنہ اس وقت ہم یہ سوال جواب نہ کر رہے ہوتے....." آس پاس لوگ ہراساں دور کھڑے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ مجھے دھکیل کر باہر سڑک پہ کھڑی ایک سرکاری جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ مجھے ایک بات کی تسلی تھی کہ نواب تیمور نے اپنا وعدہ نبھایا تھا اور اگر میرا پیچھا کرنے والے اس کے ہرکارے ہوتے تو شاید وہ اب تک استاد اکبر کے دروازے پر کھڑے ہوتے۔ پولیس کی گاڑی مختلف گلیوں سے گزرتی مجھے لے کر تھانے پہنچ گئی جہاں پولیس کا عملہ ایک سزائے موت کے بھاگے قیدی کو دیکھنے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔ مجھے گرفتار کرنے والے انسپکٹر کا نام اسد زمان تھا اور وہ شاید گزشتہ کئی ہفتوں سے ہم سب کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شاید میری کہانی میرا مقصد پورا ہونے سے قبل ہی ختم ہو گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ اگلے روز مجھے اسی جیل سے ایک ٹیم لینے کے لئے یہاں پہنچ جائے گی جہاں سے ہم سب فرار ہوئے تھے۔ مطلب پھر وہی کال کوٹھڑی اور پھر وہی بیڑیاں، رات کو میرے پہرے کا خصوصی بندوبست کیا گیا اور چار چوکنے سپاہی حوالات کے اردگرد بندوقیں تانیں کھڑے رہے..... اگلے دن کوئی بڑے افسر تشریف

لائے تو انہیں میری گرفتاری کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر سنایا گیا۔ اخبار والے آئے۔ مجھے پولیس کے قدموں میں بٹھا کر ساری ٹیم کی تصویریں بنائی گئیں۔ اگلے دن مجھے بڑے شہر کی جیل منتقل کیا جانا تھا۔ میں حوالات میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ باہر راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور آنے والا میری بیرک کی سلاخوں کے پاس آ کر رک گیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا" آپ..... یہاں.....؟"

❋.....❋.....❋

باب 25

اس سارے ہنگامے اور پولیس کی بھاگ دوڑ میں شام اُتر آئی۔ مجھے بہت سارے کاغذ بھرنے، مختلف رجسٹروں پر دستخط کرنے اور انگوٹھے لگوانے کے بعد حوالات میں دھکیل کر باہر سے تالا ڈال دیا گیا۔ لیکن کاش کوئی تالہ ایسا کسی نے ایجاد کیا ہوتا جو ہماری سوچوں کو بھی کسی جیل یا زندان میں قفل بند کر سکتا۔ کیا بلا ہے یہ انسانی سوچ، دنیا میں وارد ہونے کے بعد پہلے سانس کے ساتھ ہی یہ چرخی چلنا شروع ہو جاتی ہے اور سنا ہے آخری سانس سینے سے نکل جانے کے بعد بھی آٹھ نو منٹ لگتے ہیں اس سوچ کو پوری طرح رکنے میں.....؟ کبھی کسی نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ہم عمر بھر میں کتنا سوچتے ہیں.....؟ شاید تمام عمر کے منٹ، گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے اور سال مل کر بھی اس سوچ کا ذرا بھی احاطہ نہ کر سکیں۔ انسانی عمر کی لمبائی کا یہ پیمانہ بہت سطحی لگتا ہے مجھے کسی بھی انسان کی ساری زندگی کی سوچوں کو ناپنے کے لئے۔ شاید ہر انسان کی سوچ ازل سے لے کر ابد تک مختص ہوتی ہے، جو کچھ اس کائنات میں تھا، جو بھی ہے اور جو بھی ہوگا..... وہ سب قدرت نے پہلے سے ہی انسانی سوچ کو عطا کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے البتہ، کہ ہم اس سوچ کے خزانے کو صرف اپنی عمر بھر کی خوشیاں، غم اور پریشانیاں گننے تک ہی محدود رکھتے ہیں۔

اُس رات میں بھی گھٹنوں میں سر دیئے اپنی بیرک میں بیٹھا اپنی اسی سوچ کی گہرائیوں کو ناپ رہا تھا کہ حوالات سے باہر راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ آنے والا حوالات کی سلاخوں کے پاس آ کر رک گیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں.....

''آپ..... یہاں.....؟'' میں دوڑ کر سلاخوں تک پہنچا مگر اس سے پہلے ہی میری آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہو چکا تھا۔ ہاں..... وہ پاپا ہی تھے، کمزور..... لاغر..... پریشان حال سے..... وہ جن کی ڈریسنگ سینس (Dressing Sense) اور میچنگ کی کبھی سارا زمانہ مثالیں دیتا تھا۔ آج وہ ایک شکن زدہ سے کُرتے پاجامے میں بکھرے بالوں اور کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ میرے سامنے کھڑے تھے، لیکن کیسی عجب مجبوری تھی کہ سلاخوں کی دیوار کی وجہ سے میں اُنہیں جھپٹ کر گلے بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے اُن کے لرزتے کانپتے ہاتھ تھام لئے۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں..... آپ کی طبیعت مجھے کچھ ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی.....'' ان کی آواز میں بھی نقاہت تھی۔

''کیسے نہ آتا..... سارے میڈیا پر تمہاری گرفتاری کی خبر چل رہی ہے پچھلے تین دن سے..... مجھ سے رہا نہیں گیا۔ بڑی مشکل سے تم سے ملنے کی اجازت ملی ہے..... پھر نہ جانے ملاقات ہو..... نہ ہو.....'' ان کی آواز میں جھلکتی بے بسی نے مجھے بھی اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ کاش قدرت نے انہیں مجھ سا ناخلف بیٹا عطا نہ کیا ہوتا۔ کوئی ایسا وارث دیا ہوتا جو بڑھاپے میں ان کا سہارا بنتا۔ ان کا بوجھ اٹھاتا، انہیں ان کے آخری دنوں میں کوئی سکھ کوئی آرام دیتا۔ میری جھولی میں تو صرف دکھ ہی دکھ بھرے تھے، ہم دونوں بہت دیر چپ چاپ یونہی سلاخوں کے آر پار کھڑے رہے۔ تبھی اچانک باہر کی جانب کچھ ہلچل ہوئی۔

''ہوشیار، آسان باش.....'' کی صدائیں ابھریں۔ اور ایک سپاہی راہداری میں بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا ''ہوشیار ہو جاؤ..... بڑے جیلر صاحب آ رہے ہیں..... اور بزرگو آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو..... چلو جلدی خدا حافظی کرو قیدی سے..... جیلر صاحب کا دورہ آیا ہے اچانک..... یہ وقت ملاقات کا نہیں ہے.....'' پاپا نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں جیلر صاحب اپنے باقی عملے کے ساتھ راہداری میں داخل ہو چکے تھے، نچلا عملہ گھبرایا ہوا ان کے پیچھے لپکتا ہوا آ رہا تھا اور وہ سیدھے میری بیرک کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

''اچھا..... تو تم ہو ساحر..... بہت بھگایا ہے تم نے ہمیں..... لیکن دیکھ لو..... قیدی کو ایک نہ ایک دن سلاخوں کے پیچھے آنا ہی ہوتا ہے..... چاہے وہ کہیں بھی چلا جائے.....'' میں خاموش رہا۔ وہ پاپا کی طرف مڑے۔

''یہ آپ کا بیٹا ہے..... میرے لئے آپ دونوں کے لئے ایک اچھی خبر ہے..... آج صبح ہی سعد کامران عرف سِڈ نامی لڑکے نے سارے میڈیا اور پریس کے سامنے پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے کہ سنی کی موت ساحر کے ہاتھ نہیں بلکہ اس کی چلائی ہوئی گولی سے ہوئی تھی..... اس نے خود کو گرفتاری کے لئے بھی پیش کر دیا ہے۔ مگر اس کی بیماری اور بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر اسے فی الحال اسی ہسپتال میں رکھا گیا ہے جہاں اس کا علاج جاری تھا پہلے سے.....'' جیلر کی بات سن کر پاپا پر شادی مرگ سی کیفیت طاری ہو گئی۔

''کیا.....؟ آپ سچ کہہ رہے ہیں جیلر صاحب..... یعنی اب میرا ساحر رہا ہو جائے گا؟'' جیلر نے ان کا شانہ تھپتھپایا۔

''سزائے موت تو عدالت پہلی پیشی میں ہی ختم کر دے گی۔ کیونکہ اصل مجرم نے اقبال جرم کر لیا ہے، البتہ جیل توڑ کر بھاگنے کا کیس باقی رہے گا۔ مگر کوئی بھی اچھا وکیل جرم اور سزا کی بنیاد ختم ہو جانے کی دلیل پر آپ کے بیٹے کو جلد ضمانت پر رہا کروا لے گا۔ مجھے اُمید ہے عدالت ساحر پر قتل کا الزام ختم ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ روا رکھے گی.....'' پاپا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے زمانے میں میری بے گناہی کا ڈھنڈورا پیٹ کر مجھے اسی وقت جیل سے چھڑا کر لے جائیں۔ جیلر کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک میرا ہاتھ پکڑے روتے رہے۔ مگر آج یہ ان کے آنسو خوشی کے آنسو تھے، میں نے انہیں سِڈ کی بیماری کے بارے میں بتایا۔

''مجھے عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کروانا ہوگا پاپا..... سِڈ کے ہاتھوں گولی غلطی سے چل گئی تھی۔ وہ سنی کو

مارنا نہیں چاہتے تھے، یہ قتل عمد نہیں..... قتل خطا کا کیس ہے.....'' اور پھر جیسے جیلر صاحب نے بتایا تھا، ٹھیک تین ہفتے بعد عدالت نے مجھے ضمانت پر رہا کر دیا۔ مجھ پر جیل توڑ کر بھاگنے کا الزام ابھی باقی تھا مگر میرے وکیل کو یقین تھا کہ عدالت میرے جیل میں گزارے سالوں کو ہی میری قید میں شمار کر کے میرے جرم کی باقی سزا معاف کر دے گی۔ پاپا نے سلمان دانش کے گھر جا کر ان سے سنی کی موت کی تعزیت کے ساتھ ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ وہ سڈ کو معاف کر دیں۔ کوئی بھی ان کے بیٹے کی جان نہیں لینا چاہتا تھا۔ سڈ کی بیماری کا سن کر خود سنی کے ڈیڈ بھی اندر سے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

ایک اندھیری رات میں شروع ہونے والی سڈ، سنی اور میری کہانی کا انجام قریب تھا۔ مگر اس رات اور بھی بہت سی کہانیوں کا اختتام ہوا۔ میں اور پاپا سلمان دانش کے گھر سے واپس آئے تو وہ چپ چپ سے تھے۔ اور میں چاہ کر بھی اُن سے زہرہ کے بارے میں نہیں پوچھ سکا کہ وہ کیسی ہے.....؟ کہاں ہے.....؟ آخر انہوں نے رات گئے خود ہی بات چھیڑ دی۔

''وہ لوگ یہ شہر چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ زہرہ کے ابا جانے سے پہلے آخری مرتبہ ملنے آئے تھے مجھ سے..... بہت پریشان تھے زہرہ کی وجہ سے..... کہہ رہے تھے کہ جب تک وہ لوگ اس شہر میں رہیں گے، زہرہ کے ذہن سے میرا خیال نہیں نکل پائے گا۔ اس لئے وہ لوگ یہاں سے ساری جائیداد بیچ باچ اور اپنا کاروبار سمیٹ کر کسی دوسرے شہر جانے کا سوچ رہے ہیں..... شاید ملک سے ہی رخصت ہو گئے ہوں..... کیونکہ زہرہ کے ابا نے خود ایک بار مجھے بتایا تھا کہ امریکہ میں کچھ کاروبار شروع کیا ہے انہوں نے..... شاید نیویارک میں.....'' کمرے میں کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی پھر پاپا نے وہاں سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ تو گویا وہ میرے شہر سے جا چکی تھی۔

تبھی مجھے ان ڈھلتی شاموں کے رنگ کچھ پھیکے سے محسوس ہو رہے تھے۔ ہماری زندگی میں ملن کے کتنے مختصر لمحات ہوتے ہیں..... باقی تمام عمر تو جدائی کے غم ڈھوتے ہی بیت جاتی ہے۔ مگر یہ نادان لوگ بھلا کیا جانیں، جسموں کے دور جانے سے روحیں بھلا کب بچھڑتی ہیں؟ فاصلے اور راستے صرف جسمانی مجبوری ہوتے ہیں۔ روح سے روح کے ملن کی پرواز کو کوئی نہیں روک پایا آج تک۔ بس ایک ذرا پلکیں موندھ لینے کی دیر ہوتی ہے..... بچھڑا یار سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ میں نے بھی تھک کر اپنی پلکیں موند لیں۔

اگلے روز پھر صبح سے گھر میں پاپا کے ملاقاتیوں کا ایک ہجوم جمع تھا انہیں مبارک باد دینے کے لئے۔ مگر میرا مختار پور پہنچنا بہت ضروری تھا۔ مجھے شہریار کے اتالیق استاد اکبر کے گھر پہنچنا تھا تاکہ مہرو کی کہانی کا آخری سرا جوڑ سکوں..... پاپا نے میری بے چینی محسوس کر لی تھی اور وہ جانتے تھے کہ میرے پیروں میں قدرت نے ایک ایسا ان دیکھا چکر ڈال رکھا ہے جس سے میں خود بھی آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں مہرو اور کرمے کی ساری روداد پہلے ہی سنا دی تھی لیکن میں ان سے جانے کی اجازت لینے سے کترا رہا تھا۔ مگر وہ بھی میرے ہی پاپا تھے۔ شام کو خود میرے کمرے میں آئے اور مسکرا کر پوچھا۔

''تو پھر کب جا رہے ہو تم اس لڑکی کو ڈھونڈنے کے لئے..... بھئی وعدہ کیا ہے تو اب نبھانا تو پڑے گا تمہیں.....'' میں بنا کچھ کہے ان سے لپٹ گیا۔

''آپ پیچھے اُداس تو نہیں ہو جائیں گے..... میرا سفر تو لمبا ہے.....'' انہوں نے میرا سر تھپتھپایا۔

''سچ کہوں تو اُداسی تو ہوگی..... مگر میں ساحر کو تو شاید روک بھی لوں..... مگر عبداللہ کو بھلا کیسے روک پاؤں گا اس کا فرض ادا کرنے سے..... تم جاؤ اطمینان سے..... بس فون کرتے رہنا اور رابطے میں رہنا مجھ سے..... تاکہ میرا دل بھی مطمئن رہے۔ تب تک میں زہرہ کے خاندان کا اتا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں.....'' وہ مسکرا دیئے اور میں رو پڑا۔ دنیا میں باپ سے اچھا دوست اور کون ہو سکتا ہے۔ اور باپ بھی میرے پاپا جیسا، غم گسار، ہم درد اور ہم راز.....

اگلی صبح اسٹیشن سے پہلی گاڑی نے لمبی سیٹی کے بعد پلیٹ فارم چھوڑا تو وہ آخری وقت تک کھڑے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہتے رہے۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں ان کی بڑی گاڑی ڈرائیور سمیت ساتھ لے جاؤں مگر میں نے انہیں سمجھایا کہ اب یہ لوازمات اور تعیشات میری راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ میری صبحوں اور شاموں کا اب کوئی ٹھکانہ نہیں اور میرا گزر جن تنگ گلیوں اور ویرانوں سے ہوتا ہے، وہاں ایسی کروزنگ گاڑیوں اور جدید سواریوں کا کوئی کام نہیں.....

اگلی شام عصر کے بعد گاڑی استاد اکبر کے شہر میں داخل ہوئی تو پچھلی رات کے چند آدھ برسے بادلوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ پلیٹ فارم کے پکے اینٹوں والے فرش پر رکے پانی کے چند عارضی ٹکڑوں میں میرا شکستہ چہرہ نظر آیا تو گلابی بادل ہنس پڑے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ''یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے عبداللہ.....؟'' مگر مجھے اپنا حال سنوارنے کی فرصت ہی کب تھی بھلا.....؟ میں نے استاد اکبر کے گھر کے دروازے پر ٹھیک چار ہفتوں بعد دوبارہ دستک دی تو میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے آج وہ یہ پنجرہ توڑ ہی ڈالے گا۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک پندرہ سولہ سالہ نوجوان نے باہر جھانک کر دیکھا۔

''جی فرمایئے.....'' میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''استاد اکبر صاحب سے ملنا ہے مجھے..... وہ..... یہیں رہتے ہیں ناں.....'' نوجوان نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا.....

''آپ کون.....؟ اور کہاں سے آئے ہیں.....؟'' میرے الفاظ گڈمڈ ہونے لگے، اس لڑکے نے انکار نہیں کیا تھا کہ استاد اکبر وہاں نہیں رہتے۔

''میں..... عبداللہ..... ان کے پاس میری ایک امانت ہے دراصل..... میں وہی لینے آیا ہوں.....'' اس لڑکے کے تنے ہوئے اعصاب معمول پر آنے لگے ''اچھا..... آپ نظام آباد سے آئے ہیں۔ چچا جان نے تو آخری وقت تک آپ کا انتظار کیا..... مگر آپ نے دیر کر دی۔ وہ تو نکل پڑے گھنٹہ بھر پہلے۔ آج شام کی گاڑی سے وہ بھی

نظام آباد ہی جا رہے ہیں..... کہہ رہے تھے کہ آپ کی امانت بھی وہیں آپ کے سپرد کر دیں گے.....'' وہ لڑکا نہ جانے مجھے کون سمجھ رہا تھا مگر میرے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔ میں جس گاڑی سے مختار پور پہنچا تھا اسی پلیٹ فارم کے پچھلی جانب پلیٹ فارم نمبر 2 سے دوسری گاڑی نظام آباد جا رہی تھی۔ کون جانے اسٹیشن سے نکلتے وقت میں اور مہرو ایک دوسرے کے سامنے سے گزرے ہوں۔ استاد اکبر کے گھر سے نکلنے والے لڑکے کا نام جمال تھا اور وہ میری پریشانی دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اور ان کے گھر والے..... مطلب کیا کوئی پیچھے ہے ان کے گھر والوں میں سے جس سے میں کچھ بات کر سکوں؟''

''نہیں..... وہ سب لوگ چچا کے ساتھ ہی گئے ہیں۔ مگر اگر آپ کو ان سے ضروری ملنا ہے تو آپ کوشش کر دیکھیں..... ابھی شام کی گاڑی نکلنے میں کچھ وقت باقی ہے.....'' میں نے جمال سے عجلت میں التجا کی کہ میں اس شہر میں نیا ہوں۔ کسی عام رستے سے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کروں گا تو کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا وہ بھی میرے ساتھ چلے تو اس کی بڑی مہربانی ہوگی..... جمال نے کچھ سوچنے کے بعد سر اُٹھایا۔

''چلیں ٹھیک ہے..... مگر ہمیں ٹیکسی لینی ہوگی.....'' میں نے تقریباً بھاگتے ہوئے گلی پار کی اور خوش قسمتی سے نکڑ پر ہی ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں جمال پہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے آج تک استاد اکبر کو دیکھا ہی نہیں ہے تو پہچانوں گا کیسے؟ جمال ٹیکسی والے کو مختلف اندرونی گلیوں سے راستہ بتا رہا تھا اور میں سارے راستے یہ دعا کرتا رہا کہ کہیں نظام آباد کی گاڑی نکل نہ جائے۔ نظام آباد بہت بڑا شہر تھا اور وہاں استاد اکبر کو ڈھونڈنا ناممکن تھا میرے لئے۔ جمال کے بقول چچا نے گھر میں کسی کو اپنے نئے پتے کے بارے میں خبر بھی نہیں کی تھی۔ شاید استاد اکبر کو شک ہو چلا تھا کہ کوئی ان تک پہنچنے کی کوشش میں ہے۔ اسٹیشن پہنچتے ہی ہم یوں پلیٹ فارم کی طرف لپکے جیسے ہم دونوں کی اپنی آخری گاڑی چھوٹ رہی ہو۔ پلیٹ فارم نمبر 2 سے نظام آباد کی گاڑی کی روانگی کا آخری اعلان ہو رہا تھا۔ جمال بے تابی سے مختلف ڈبوں میں جھانک رہا تھا اور میں اس کا ساتھ دینے کے لئے قدم سے قدم ملائے بھاگتا رہا۔

اچانک جمال زور سے چلایا ''وہ رہے.....'' گاڑی نے سرکنا شروع کر دیا۔ جمال نے زور سے ان کا نام پکارا۔

''اکبر چچا..... آپ کے مہمان.....'' میں نے جمال کے اشارے کے تعاقب میں دیکھا۔ ایک باریش بزرگ برقعوں میں ملبوس تین عورتوں کے ساتھ عام درجے والی بوگی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے گھبرا کر جمال کی طرف دیکھا۔ میں سرکتی ٹرین کے دروازے سے اندر چڑھ گیا۔ جمال نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی محنت وصول ہو گئی تھی مگر استاد اکبر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، اور اگر گاڑی رفتار نہ پکڑ چکی ہوتی تو وہ ضرور اپنے اہل خانہ کو لے کر ٹرین سے اتر چکے ہوتے۔ میں نے دانستہ اس حصے میں بیٹھنے سے گریز کیا جہاں اُستاد نے کمپارٹمنٹ کے ایک

کونے میں کوئی کپڑے کی چادر باندھ کر عورتوں کے لئے ایک الگ پردے کی اوٹ بنا رکھی تھی۔

کچھ دیر تک وہ کچھ بدحواس اور نیم تلی نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بولے تو آواز بہت دھیمی تھی۔

''میں نے تمہیں پہچانا نہیں میاں.....؟'' میں نے براہ راست بات کی۔

''مجھے نواب شہریار نے آپ کا پتہ دیا ہے..... میں وہ امانت واپس لینے آیا ہوں جو شہریار نے آپ کو سونپی تھی.....'' استاد اکبر کو جیسے ایک زور کا جھٹکا لگا اور ان کی آواز کپکپا گئی۔

''تم..... کون ہو..... کیا نواب تیمور نے تمہیں بھیجا ہے؟''

''نہیں..... اور خدا کے لئے یہ مت کہیے گا کہ مہرو آپ کے پاس نہیں ہے..... میں صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں..... مہرو کی بوڑھی لاچار ماں اس کا رستہ دیکھ رہی ہے.....'' میری بات ختم ہوتے ہی بوگی کے درمیان ٹنگی چادر کے پیچھے سے کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی کے ضبط کا بندھن اسی لمحے ٹوٹا تھا۔ استاد اکبر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''کون مہرو..... میرا مطلب ہے اس کی ماں تو لاپتہ ہو گئی تھی..... اور پھر کسی نے خبر دی کہ وہ قضائے الٰہی سے.....'' میں نے بات کاٹی۔

''نہیں..... مہرو کی ماں زندہ ہے..... البتہ دربدر اور خوار ہے..... اپنے حواس کھو کر گاؤں گاؤں بھٹکتی پھر رہی ہے..... شاید مہرو کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ لے تو اسے بھی قرار آ جائے.....'' استاد اکبر نے شدید کشمکش کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے پردے کے پیچھے سے ابھی کوئی نکل آئے گا۔ پھر وہ ایک لمبی گہری سانس لے کر بولے:

''ہاں..... مہرو میرے پاس ہی ہے..... اب وہ میری دوسری بیٹی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم واقعی دوست ہو یا کوئی دشمن..... لیکن اتنا یاد رکھو کہ میری بوڑھی ہڈیوں میں ابھی اتنا دم باقی ہے کہ میں اپنی جان جانے تک اپنی بیٹی کی حفاظت کر سکوں۔ اگر تمہاری نیت غلط ہے تو تم مجھے مار کر ہی مہرو تک پہنچ سکتے ہو۔'' میں نے عقیدت مندانہ نظروں سے اس باہمت بزرگ کی طرف دیکھا۔

''میرا نام عبداللہ ہے..... اور چند روز پہلے تک میں سزائے موت کا ایک مفرور قیدی تھا.....'' میں نے اپنی ساری داستان استاد اکبر کو چلتی گاڑی کے شور میں سنا دی۔ میری ساری کہانی کے دوران وہ دم سادھے بیٹھے رہے اور میری بات ختم ہوئی تو ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا۔

''جزاک اللہ.....'' ہم گاڑی کے جس حصے میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں اکا دکا مسافر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنی نشستوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ استاد اکبر نے مجھے بتایا کہ وہ مہرو کو نواب تیمور کے چنگل سے نکالنے کے بعد کبھی ٹک کر ایک جگہ نہیں بیٹھے اور مستقل اپنے ٹھکانے بدلتے رہے۔ انہیں یہ اندازہ تھا کہ نواب سب سے پہلے مہرو کے گھر اور گاؤں پر پہرے بٹھائے گا۔ اس لئے انہوں نے دانستہ مہرو کے گاؤں کا رخ نہیں کیا۔ اور مہرو کو اپنے خاندان

سمیت لے کر مستقل روپوشی اختیار کیے رہے، آٹھ نو ماہ بعد ڈرتے ڈرتے اپنے کسی دوست کو مہرو کے گاؤں اس کے گھر والوں کی خبر لینے کے لئے بھیجا تو باپ کی پھانسی اور ماں کے صدمے میں چل بسنے کی اطلاع ملی۔ ادھ موئی مہرو یہ سن کر بالکل ہی بستر سے جا لگی اور استاد اکبر کی ذمہ داریاں بڑھتی چلی گئیں۔

نظام آباد کے سفر کا بھی یہ مقصد تھا کہ شہر کے کسی بڑے ہسپتال اور قابل ڈاکٹر تک اس کے علاج کے لئے رسائی ہو۔ استاد اکبر کچھ دیر اپنے لفظ جوڑتے رہے اور پھر کمزور سے لہجے میں پردے کی طرف منہ کر کے بولے:

''لے آؤ بھئی مہرو کو..... یہ تو محسن ہیں ہمارے.....'' میری نظریں جھک گئیں۔ اور کسی برقعہ پوش خاتون نے بوگی کے درمیان لگی پردے کی دیوار ہٹا دی۔ میرے اندر سلطان بابا کی آواز گونجی۔ ''جب جب جو جو ہوتا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے.....''

میری اور مہرو کی ملاقات اسی ٹرین کے ڈبے میں ملے تھی..... پردہ ہٹا اور سارے ڈبے میں جیسے زردی سی پھیل گئی۔ دفعتہً کوئی وجود لڑکھڑایا اور پردہ ہٹانے والی خاتون کے ہاتھوں سے پھسل کر کسی بے جان لاشے کی طرح نیچے گر گیا..... استاد اکبر کے منہ سے بے اختیار نکلا..... ''خدایا خیر.....''

✱.....✱.....✱

باب26

تُو انتخاب رنگ میں مصروف اور اِدھر
کوئی تیرے جنوں میں سیاہ پوش ہو گیا

مہینوں کی دربدری اور خاک بسری کے بعد آج وہ لڑکی میرے سامنے سمٹی سمٹائی سی بیٹھی تھی۔ لاغر، لرزتا، کپکپاتا اور سہما ہوا سا ایک زرد وجود، ہجر جس کے اندر سے پوری زندگی نچوڑ کر اُسے اَدھ موا چھوڑ گیا تھا۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا..... کوئی تسلی، دلاسہ..... یا تشفی..... لیکن میرے پاس حسب معمول لفظوں کی کمی تھی۔ جانے لوگ دوسرے کو دلاسہ کیسے دیتے ہیں؟ اور لفظ بھلا کسی کے درد کا درماں کب ہوتے ہیں..... سب دکھاوے کی رسمیں ہیں۔ مہرو چکرا کر بوگی کے فرش پر گری تو وہ بھی اُسے سنبھالنے کے لئے لپکے..... اور کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا بھی تو نقاہت کے مارے اس سے کچھ بولا نہیں گیا۔ مگر وہ چپ رہی اور سب کہہ گئی۔

بولی، زبان اور لفظ ایجاد ہونے سے پہلے بھی تو لوگ آپس میں بات کیا کرتے ہوں گے۔ اور مجھے تو ہمیشہ سے ہی یہ لفظ ''اضافی'' لگتے تھے۔ مہرو کے گاؤں کا اسٹیشن نظام آباد کے رستے میں ہی پڑتا تھا۔ ساری رات گاڑی کی طرح ہماری سوچیں بھی دوڑتی رہیں۔ ٹرین البتہ مختلف اسٹیشنوں پر رُکتی گئی۔ مہرو کی حالت ٹھیک نہیں تھی صبح فجر کے وقت ہم مہرو کے گاؤں اترے تو دھند نے چاروں جانب ڈیرے ڈال رکھے تھے، تانگے کے اگلے بم پر بندھی لالٹین کی پیلی روشنی نشان دہی نہ کرتی تو شاید ہمیں تانگہ نظر ہی نہ آتا۔

کچھ دیر بعد ہم گاؤں سے باہر والے مزار کی منڈیر کے سامنے کھڑے تھے۔ مہرو سارے راستے خاموش تھی مگر اپنی ماں کو بڑے پیپل کے پیڑ تلے چادر لپیٹے لیٹے دیکھ کر اس کے ضبط کے سارے بندھن جیسے ایک ہی لمحے میں ٹوٹ گئے۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر یوں روئی کہ اس کی چیخوں سے گھبرا کر آس پاس کے مجاور اور مجذوب دوڑے چلے آئے، استاد اکبر کی گھر والی اور بیٹی نے مہرو کو سنبھالا اور مہرو کا گھر آتے آتے سارے گاؤں کو پتہ چل چکا تھا کہ مہرو واپس آ گئی ہے۔ گاؤں کی عورتیں جوق در جوق مہرو سے ملنے کیلئے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ مگر جس کا مجھے انتظار تھا اس نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ شام ڈھلنے والی تھی۔ میں نے استاد اکبر سے اجازت چاہی۔ وہ بوکھلا کر بولے ''مگر..... کہاں؟ رات تو بسر کر لو۔ ابھی تو تم سے کھل کر بات ہی نہیں ہو سکی۔''

''رات میں گاؤں کے باہر والے اسٹیشن پر گزار لوں گا..... آپ مہرو کے ساتھ ہی رہیے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ وقت کے ساتھ مہرو کی ماں بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ زخم گہرا ہے..... مگر بھر جائے گا..... مگر مہرو کی زندگی کا آخری

طوفان ابھی باقی ہے..... دعا کیجئے گا کہ وہ اس امتحان میں بھی سرخرو رہے.....'' میں پلٹا اور ٹھیک اسی وقت مہرو کی حویلی کا بڑا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کے بیچوں بیچ بدحواس پریشان اور سرخ آنکھیں لیے پروین کھڑی دکھائی دی۔ اور پھر مجھے دیکھ کر بولی:

''سائیں جی..... کہانی شروع کی ہے تو اب اس کا انجام بھی دیکھتے جائیں۔ میرے جرم کی سزا ابھی باقی ہے..... اپنی سولی ساتھ لے کر آئی ہوں میں.....'' پروین کی آواز سن کر مہرو اندر سے لپک کر باہر نکلی۔ کچھ دیر تک دونوں سہیلیاں پھٹی پھٹی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں اور پھر پروین ایک چیخ مار کر زاروقطار روتی ہوئی مہرو سے لپٹ گئی۔ مہرو نے کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر پھر وہ بھی رو پڑی اور ایسی روئی کہ اندر بیٹھی مزاج پرسی کے لیے آئی عورتیں بوکھلا کر باہر نکل آئیں۔

استاد اکبر بھی اپنی بھیگی پلکیں پونچھتے نظر آئے۔ پھر یکا یک پروین نے اپنی چادر مہرو کے پیروں میں ڈال دی اور جھک کر مہرو کے قدم پکڑ لیے۔

''معاف کردے مجھے..... پہلے سچ نہیں بتا پائی میں کسی کو۔ پر آج تیرے آنے کی خبر سن کر سارے قرض چکا دیئے میں نے۔ تیرے احمد کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔ سب سچ بتا دیا ہے میں نے اُسے بھی، اور اس نے بھی میرا فیصلہ تیرے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے.....'' مہرو نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں احمد سر جھکائے کھڑا تھا۔

نظر ملاتا بھی تو کیسے؟ وفا کے کانٹے پر پورا نہ اترنے والے تمام عمر نظر جھکا کر ہی چلتے ہیں۔ مہرو کچھ دیر تک ڈبڈبائی نظروں سے اپنے گزشتہ محبوب کو دیکھتی رہی جو اب اس کی سہیلی کا سہاگ تھا۔ پھر اس نے اپنے قدموں سے لپٹی پروین کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

''پتہ ہے پاپو..... آج حساب برابر ہو گیا۔ بچپن میں کئی بار تیرے بستے سے میں نے اسکول میں املی چرا کر کھائی تھی۔ پر تجھے کبھی نہیں بتایا۔ آج میں نے تجھے معاف کیا اور تو بھی مجھے معاف کردے۔ تیرا مقدر..... میرا مقدر رب کے حوالے..... جو میرا نصیب.....'' پروین نے تڑپ کر مہرو کی طرف دیکھا۔

''نہیں..... اتنی بڑی سزا نہ دے..... اور تیرا نصیب تو وہ سامنے کھڑا ہے تیرے انتظار میں، تو نے خود کو پہلے بھی میری وجہ سے قربان کیا تھا۔ اب دوبارہ میں تیری تباہی کی ذمہ دار نہیں بنوں گی..... معاف کردے احمد کو اور اس کا ہاتھ تھام لے..... یہی تیرا مقدر ہے..... میں اپنی دنیا میں پلٹ جاؤں گی۔ کبھی تیرے راستے میں نہیں آؤں گی.....'' پروین نے جھپٹ کر ایک بار پھر مہرو کو گلے لگایا اور پلٹ کر جانے لگی۔ تبھی استاد اکبر کی آواز سنائی دی۔

''تم دونوں ہی میری بیٹیوں کی طرح ہو۔ یہ سچ ہے کہ مہرو نے بہت دُکھ سہے ہیں مگر اس کے باوجود یہ کبھی تمہارا ہنستا بستا گھر نہیں اجاڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ سہیلی کو سوتن بنالو۔ دنیا یہ بھی دیکھ لے کہ ایک ہی گھر میں دو عورتیں سہیلیاں بن کر بھی زندگی گزار سکتی ہیں..... سوتن بھی سہیلی ہو سکتی ہے..... تم دونوں عمر بھر کے لئے ایک دوسرے کا سہارا بن سکتی ہو..... دُکھ تو بانٹ لیے..... اب سکھ بانٹنے کا وقت آیا ہے تو جدا کیوں ہوتی ہو.....'' وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی روتی رہیں۔ میں نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے، تبھی پیچھے سے ایک سسکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''جا رہے ہو بھائی.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا، مہرو رو رہی تھی۔

"ہاں..... مجھے جانا ہوگا۔ بہت سی کہانیاں ادھوری چھوڑ آیا ہوں اپنے پیچھے۔ میرے لئے دعا کرنا....."
مہرو تڑپ کر بولی:

"آج کے بعد میری ہر آتی جاتی سانس سے صرف تمہارے لئے ہی دعا نکلے گی بھائی۔ تم نے میرے لئے جو کیا..... کوئی سگا بھی نہیں کر پائے گا....." وہ بلک اٹھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔ یہ جذبے بھی کسی بھاری بیڑی سے کم نہیں ہوتے۔ پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں پل بھر میں..... دروازے کے قریب کھڑے احمد نے پیشکش کی کہ وہ مجھے میری منزل تک چھوڑ آئے گا۔ مگر میں نے اسے صرف ایک تاکید کی۔

"اب مہرو کا خیال رکھنا....." اور میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر چلتا گیا۔ اس سارے ہنگامے میں نصف رات تو قریباً بیت ہی چکی تھی۔ لہٰذا میں نے ریلوے اسٹیشن کی راہ پکڑ لی۔ سویرے والی گاڑی دو گھنٹے بعد آنے والی تھی۔ میں وہیں پلیٹ فارم کے ایک بوسیدہ سے بینچ پر کمر ٹکا کر لیٹ گیا۔ آسمان کے کچھ تارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پلکیں موندھنے کے بعد ہمیں دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ میری آنکھوں میں بھی بہت سے تارے اُتر آئے۔ اور مجھے تب ہوش آیا جب گاڑی پلیٹ فارم سے لگ چکی تھی۔

اتفاق سے درجہ دوئم یا سوئم کی کوئی نشست خالی نہیں تھی لہٰذا مجھے ایک بار پھر مجبوراً درجہ اول کا ٹکٹ کٹانا پڑا۔ یہ چار چار افراد کے لئے الگ بنی چھوٹی سلیپر بوگیوں میں سے ایک کا ٹکٹ تھا۔ میں ڈبے میں داخل ہوا تو مجھے اپنا پچھلا سفر یاد آ گیا جو میں نے پروفیسر فیضی اور ان کے دوست کے ساتھ شاید کسی عالم خواب میں کیا تھا۔ میرے قدم ٹھٹک سے گئے۔ اندر پہلے سے تین جوان لڑکے محوِ سفر تھے اور میری توقع کے برعکس تینوں جاگ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان تینوں کے چہرے تن سے گئے جیسے انہیں میری آمد ناگوار گزری ہو۔ ان میں سے ایک انگریزی میں بولا:

"یار وسیم یہ کیا۔ تم نے تو کہا تھا کہ اب آخری اسٹیشن تک دوسرا کوئی ہمارے ڈبے میں سوار نہیں ہوگا..... مگر یہ تو....." وسیم نے بھی برا سا منہ بنایا۔

"پتہ نہیں یار..... میں نے ٹی ٹی سے کہا بھی تھا کہ ہم سے چوتھی سیٹ کے پیسے لے لے..... اور یہ سارا ڈبہ ہمارے نام پر بک کر دے....." تیسرے لڑکے نے لمبی سی انگڑائی لی اور برتھ پر چڑھ گیا۔ "اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ ٹرین پر سفر کرنے کا ایڈونچر مت کرو۔ بائی ایئر جاتے تو پچھلی شام ہی اپنے گھروں کو پہنچ گئے ہوتے۔ اب کرو مزے....." میں نے بیٹھ کر ان کی طرف دیکھا وہ سب انگلش بولی بول رہے تھے۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ میرے فقیرانہ حلیے سے حسبِ معمول ان تینوں نے بھی یہی اخذ کر لیا تھا کہ میں کوئی جاہل، ان پڑھ ہوں، پھر وہی انسان اور وہی ظاہر پرستی.....

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اسی وسیم نامی لڑکے نے مجھ سے اُردو میں پوچھا "مولانا..... کہاں جا رہے ہو..... یہ فرسٹ کلاس سلیپر کا ڈبہ ہے..... اس کا ٹکٹ ہے تمہارے پاس.....؟" میں نے ٹکٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"مجھے بس نواب پور تک جانا ہے..... نچلے درجے کا ٹکٹ نہیں تھا اس لئے مجھے اس ڈبے کا ٹکٹ لینا پڑا....." وسیم نے شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مگر مولانا..... ہم تو بہت بُرے لڑکے ہیں..... راستے بھر ہلہ گلہ کرتے رہیں گے..... کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ..... کیوں بلال....." تینوں لڑکے زور سے ہنس پڑے۔

"تم لوگ اطمینان سے اپنا شغل جاری رکھو..... میں مخل نہیں ہوں گا۔" اس پر اوپر برتھ پر بیٹھا بلال ہنس پڑا۔ "چلو بھائی وسیم اور فراز..... تم دونوں کو تو مولوی صاحب نے اجازت دے دی ہے مستی کی..... چلو پھر بناؤ میرے لئے بھی ایک لکیر....."

بلال نے یہ بات بھی انگریزی میں کہی تھی۔ میں انجان بنا بیٹھا رہا۔ اسے فراز نے جواب بھی انگریزی میں ہی دیا۔ "نہیں یار..... تم نے اس کا حلیہ نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ بڑے جنونی ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی مسئلہ ہی نہ کھڑا کر دے ہمارے لئے....." وسیم نے بے پرواہی سے سر ہلایا۔

"ڈونٹ وری..... یہ ایک ہے اور ہم تین..... زیادہ اکڑ دکھائی یا تبلیغ کرنے کی کوشش کی تو اٹھا کر باہر پھینک دیں گے اسے....." وہ تینوں پھر ہنسے..... وسیم نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی نکالی جس میں سفید نمک جیسے کچھ دانے یا کرسٹلز بھرے ہوئے تھے۔ فراز نے جلدی سے اپنی جیب سے ایک پلاسٹک کا اے۔ ٹی ایم کارڈ نما ٹکڑا نکالا اور وسیم نے سفید سفوف کے کچھ موٹے دانے سامنے کھلی چھوٹی میز پر بکھیر دیئے۔ فراز بڑی احتیاط اور مہارت سے ان دانوں کو کارڈ سے پیسنے لگا اور کچھ ہی دیر میں اس نے میز کے شیشے پر سفید سفوف کی ایک ڈھیری سی بنا دی۔ جسے وسیم نے اپنی جیب سے ایک ویسا ہی کارڈ نکال کر باریک لکیروں کی صورت میز پر بکھیر دیا۔ دروازہ وہ پہلے ہی اندر سے کنڈی لگا کر بند کر چکے تھے۔ وسیم نے میری طرف دیکھا۔

"صوفی صاحب..... کبھی سنِف SNIFF کیا ہے.....؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ فراز نے جیب سے پانچ ہزار کا ایک نیا اور کڑک نوٹ نکالا اور اسے گول لپیٹ کر ایک نلی کی پٹی سی بنالی اور پھر جھک کر اسے اپنے ایک نتھنے سے لگا کر ناک کا دوسرا نتھنا ہاتھ کے انگوٹھے سے بند کر دیا۔ اگلے ہی لمحے فراز نے اپنی ناک کے واحد کھلے نتھنے سے ایک طویل سانس اندر کھینچی اور باریک سفوف کی لکیر فراز کی ناک کے ذریعے لمحہ بھر میں اس کے دماغ میں منتقل ہوگئی۔ فراز نے دوسری لکیر کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور پھر وسیم اور بلال نے بھی دو دو کر کے سفید پاؤڈر کی باریک لکیریں پل بھر میں ہی اپنے خون میں شامل کر لیں۔ وسیم نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی گہری سانس لی اور ڈبڈبی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جانتے ہو..... یہ دنیا کی بہترین اور سب سے مہنگی کوکین ہے..... میں تو کہتا ہوں ایک لکیر تم بھی اپنے اندر اُتار لو..... سارے غم دور ہو جائیں گے.....

میری زبان بے اختیار پھسل پڑی "وہ غم ہی کیا جو نشے سے دور ہو جائے....." وسیم ہنس پڑا۔

"ہاں..... ویسے بھی تم جیسوں کو کیا غم ہو سکتا ہے بھلا؟ تمہارا جینا مرنا ایک برابر ہے....." میں نے اس کے تلخ لہجے اور طنز کو برداشت کیا۔

"مگر تمہیں کیا غم ہے.....؟ اور کیا یہ سفید پاؤڈر اس غم کی دوا کر رہا ہے.....؟" وسیم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"کوئی ایک ہو تو بتاؤں..... غموں کی بھرمار ہے جانی..... مثلاً تین دن پہلے ہی میری کار کسی نے ٹھوک

دی..... بمپر ٹوٹ گیا اور پاکستان میں اس کے سپیئر پارٹس ملتے نہیں ہیں..... پچھلے ہفتے میرا پالتو جیکی کھو گیا تھا، اب تک پولیس ڈھونڈ نہیں پائی کتے کو..... ڈیڈ نے میرے اکاؤنٹ میں پاکٹ منی ٹرانسفر نہیں کی اب تک میری..... بولو..... اور کتنے غم اور دُکھ بتاؤں اپنے....."

"واقعی..... تمہارے غموں کی قطار تو بہت لمبی ہے..... ویسے تم کرتے کیا ہو.....؟"

"میوزک بناتے ہیں..... بینڈ ہے ہمارا..... راکنگ اسٹارز..... میں گانے لکھتا ہوں..... بلال گٹار بجاتا ہے اور فراز گاتا ہے..... بہت جلد ہمارا البم آنے والا ہے۔ نام ہے "دنیا کی ایسی کی تیسی"..... ویسے تم کیا کرتے ہو..... ضرور کسی مسجد یا مدرسے کے طالب ہو گے.....؟"

"ہاں..... کچھ ایسا ہی سمجھ لو..... اپنے ایک دوست سے ملنے نواب پور جا رہا ہوں..... مگر تم نے بتایا نہیں..... کوکین تمہارا غم کیسے دور کرتی ہے؟"

وسیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ "تم نہیں سمجھو گے..... یہ مجھے سرور کے چوتھے آسمان تک لے جاتی ہے۔ "گلابی آسمان....." تم جانتے ہو..... بے خودی یا ایکس ٹیسی کی سات منزلیں ہوتی ہیں..... یا پھر سات بادل..... پہلا بادل سفید، دوسرا دودھیا، تیسرا ہلکا آسمانی، چوتھا گلابی، پانچواں دھانی، چھٹا سرخ اور ساتواں..... آہ..... میں کبھی ساتویں بادل تک پہنچ ہی نہیں پایا..... بلکہ سچ کہوں تو چوتھا بادل بھی کبھی پار نہیں کر پایا....." میں نے دلچسپی سے وسیم کا یہ سارا فلسفہ سنا۔

"کیسا محسوس ہوتا ہے ان بے خودی کے بادلوں کے سفر میں.....؟" لفظوں میں بتا نہیں سکتا..... یوں سمجھو جیسے میرے اندر بہت سی کھڑکیاں اور روشن دان درجہ بدرجہ کھلتے جاتے ہیں۔ سوالوں کے جواب ملتے ہیں..... میری تخلیقی صلاحیتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ مشکل سے مشکل گانے کا ردھم بنتا جاتا ہے۔ میں میں نہیں رہتا، کوئی اور ہو جاتا ہوں۔ بہت اعلیٰ انسان بن جاتا ہوں" میں نے غور سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ کوکین کا نشہ تم پر نہیں..... تمہارے اندر بیٹھے کسی پر اثر کرتا ہے۔ کیونکہ تم نے ابھی خود کہا کہ بے خودی کا ہر بادل گزرنے کے بعد تم تم نہیں رہتے، کوئی اور ہوتے جاتے ہو....." وسیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو....."

"میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہ نشہ ختم ہونے کے بعد بھی تم وہی اعلیٰ تخلیق کار رہتے ہو یا پھر سے وہی ایک عام انسان بن جاتے ہو....." وسیم نے بے اختیار اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر افسوس سے کہا:

"یہی تو دکھ ہے یار..... چوبیس سے اڑتالیس گھنٹے لگتے ہیں میری رگوں سے اس سرور کو ٹوٹنے میں..... اور پھر سب کچھ ویسا ہی عام ہو جاتا ہے۔"

"پھر تو یہ عارضی نشہ ہوا..... تمہیں کوئی دائمی نشہ تلاش کرنا چاہیے۔" فراز نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"کیا تم نے کبھی بھی نشہ نہیں کیا؟ سگریٹ، تمباکو، شیشہ بھی نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟"

"میں وہ نشہ چاہتا ہوں جو چڑھ کر پھر کبھی میری رگوں سے نہ اترے۔ کوئی ہے تو بتاؤ۔" بلال نے جھنجھلا کر میری طرف دیکھا "ایسا نشہ بھلا کہاں ملے گا؟"

''تم کیا سمجھتے ہو..... اگر نشہ انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے تو کیا قدرت اتنی ناانصاف ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو اس ضرورت یا نعمت سے محروم رکھتے ہوئے دنیا میں بھیج دے.....؟'' وسیم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا.....''

''بات بہت سیدھی سی ہے۔ قدرت نے انسان کو ہر نشے کی لذت دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ سارے نشے روز اول سے ہمارے اندر موجود ہیں..... ہمارے خون میں دوڑتے ہیں۔ باہر کا کوئی بھی نشہ صرف ہمارے اندر موجود پوشیدہ نشے کو ذرا سی تحریک تو دے سکتا ہے۔ مگر ہمیشہ کے لئے ہمارے خون میں شامل رہ کر وہ سرور نہیں دے سکتا۔ اسی لئے ہر دنیاوی نشہ ایک محدود مدت کے بعد اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ کوشش کرو کہ اپنے اندر موجود نشے کو پہچانو اور پھر اُسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لو.....'' وسیم کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''مگر..... کوئی انسان اپنے اندر موجود نشے کو کس طرح اور کیونکر پہچانے.....؟''

''ہاں..... یہ البتہ ایک سوال ہے؟ میرے ایک بہت محترم استاد اور بزرگ کہا کرتے تھے، ہر انسان کے اندر کا نشہ جدا ہے۔ کسی کو بت کا نشہ ہے تو کسی کو بت شکنی کا، کوئی جاگیر کے لئے دل گیر ہے تو کوئی روپ کا اسیر..... کسی کے اندر تخلیق کا نشہ ہے تو کسی میں تخریب کا..... مگر یہ سب ہمارے اندر ہی موجود ہے..... اب یا تو تم نے اپنے اندر کا نشہ پہچانا ہی نہیں..... یا پھر وقت سے پہلے ہی کشید کر کے سارا نچوڑ لیا ہے۔ ورنہ انسان جتنی عمر لکھوا کر لاتا ہے اُسے اتنا ہی نشہ عطا کر کے زمین پر بھیجا جاتا ہے۔ ہمیں بیرونی نشے کی ضرورت تبھی پڑتی ہے جب ہم وقت سے پہلے اپنے اندر سب بھسم کر بیٹھتے ہیں.....'' میں جب خاموش ہوا تو پھر ڈبے میں بہت دیر تک خاموشی طاری رہی۔ فراز اور بلال بھی اپنی اپنی برتھوں پر اوپر چپ چاپ لیٹے رہے۔ نواب پور آنے پر میں نے ان تینوں سے رخصت لی تو وہ میرے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر اتر آئے۔ میرے چلنے سے پہلے فراز بول اُٹھا۔

''مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ اتنے بہت سے نشوں میں تمہارے نزدیک سب سے بڑا نشہ کون سا ہے.....؟''

میں اک پل کو رُکا۔

''خود میں خود کی کھوج لگانے کا نشہ..... مجھے اس دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، اس تحقیق کا نشہ..... بندے کا اپنے رب سے کیا تعلق ہے؟ اس جستجو کا نشہ.....'' میں نے اپنی بات ختم کی اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا۔

نواب پور کی شام ویسے ہی گلابی تھی۔ اسٹیشن کے سامنے سے سیدھی سڑک جاتی تھی اور دور سے نواب تیمور کے محل کے سفید گنبد نظر آ رہے تھے۔ مگر میری منزل کہیں اور تھی۔ میں جلد از جلد بخت خان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ پچھلے چند دن اتنے ہنگامہ خیز گزرے تھے کہ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی خبر نہیں لے پایا تھا۔ کمال صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے میرے دل سے لگاتار بس ایک ہی دعا جاری رہی کہ بخت خان خیر خیریت سے ہو۔ کمال صاحب کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ دروازے تک دوڑے چلے آئے۔

''کہاں رہ گئے تھے میاں..... بڑی راہ دکھائی تم نے.....''

''معذرت چاہتا ہوں..... کچھ دھاگے ایسے الجھ گئے تھے جنہیں سلجھانے میں کئی ہفتے لگ گئے۔'' کمال صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''جانتا ہوں..... تمہیں قتل کے الزام سے باعزت بری کر دیا گیا ہے۔ ویسے

اگر وہ تمہیں بری نہ بھی کرتے تو میرا دل کبھی یہ نہیں مان سکتا تھا کہ تم قاتل ہو....." میں نے گہری سانس لی۔ گویا انہیں میری ساری حقیقت پتہ چل چکی تھی۔

"میں آپ کے پاس اپنے ایک ساتھی کو بطور امانت چھوڑ گیا تھا..... امید ہے اس کی حالت اب بہتر ہوگی.....؟"

"کون..... بخت خان..... وہ تو تمہاری گرفتاری کے اگلے روز ہی یہاں سے چلا گیا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی کہ وہ میری پناہ میں ہے اور اسے ہرگز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مگر وہ بڑا وضعدار بندہ تھا۔ اُسے میری عزت اور وقار کا اپنی جان سے زیادہ خیال تھا۔ تمہارے لئے ایک خط دے گیا ہے وہ....." کمال صاحب میز کی دراز کی طرف بڑھے، پھر انہیں اچانک ایک خیال آیا۔

"ارے ہاں..... تمہارے جانے کے بعد ایک بزرگ بھی تمہاری تلاش میں یہاں آئے تھے۔ کیا بھلا سا نام بتایا تھا..... ہاں..... یاد آیا..... سلطان بابا....." میرے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ گیا۔

✱.....✱.....✱

باب 27

کمال صاحب کی زبان سے سلطان بابا کا نام سن کر میرے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس گر کر ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ ''کیا..... سلطان بابا.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟'' کمال صاحب میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔

''ہاں..... یہی نام بتایا تھا انہوں نے..... عجب نورانی چہرہ تھا ان کا..... میں تو ابھی تک ان کی شخصیت کے سحر سے ہی نہیں نکل پایا۔ تم انہیں کیسے جانتے ہو.....؟'' میں چپ رہا۔ میں اب کمال صاحب کو کیا بتاتا کہ سلطان بابا کو مجھ سے بچھڑے اور اس دارفانی سے کوچ کیے کئی سال ہو چکے تھے۔ البتہ میری یادوں میں وہ آج بھی روز اول کی طرح جیتے جاگتے اور ہنستے مسکراتے موجود رہتے تھے۔ مگر وہ مجسم یہاں کمال صاحب کے دروازے پر کیونکر آسکتے ہیں؟ اور پھر اُنہیں میری تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت ہی کب تھی بھلا.....؟ وہ تو ہر لمحہ ہر پل میرے ساتھ ہی رہتے تھے۔ کمال صاحب نے جو حلیہ بتایا وہ سو فیصد سلطان بابا کے حلیے پر پورا اترتا تھا۔ میرے دل اور دماغ کی حالت بیان سے باہر تھی۔

''کوئی..... پیغام دیا..... میرے لئے..... سلطان بابا نے.....'' میرے لفظ ٹوٹ رہے تھے۔

''ہاں..... مگر کچھ زیادہ نہیں..... کہنے لگے کہ تم لوٹو تو تم سے کہوں کہ تم اپنا سفر جاری رکھو..... جلد ملاقات ہوگی..... سلطان پور میں.....'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''مگر یہ سلطان پور ہے کہاں.....؟ مجھے تو آس پاس اس نام کا کوئی قصبہ یا ضلع دکھائی نہیں دیا..... نا ہی میں نے کبھی اس علاقے کا نام سنا ہے.....''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم عبداللہ میاں..... میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہا کہ یہ علاقہ کہاں ہوسکتا ہے.....؟ پھر مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ گاؤں سرحد پار کے کسی علاقے میں ہو.....؟'' میں خاموش رہا۔ کمال صاحب نے میری ابتر حالت دیکھی تو مجھے آرام کا مشورہ دینے لگے۔ مگر میرے ذہن میں ابھی اور بہت سے سوالات باقی تھے۔ کمال صاحب نے مجھے بتایا کہ انہیں میری گرفتاری کی اطلاع اگلے روز ہی مل گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بخت خان سے کچھ پوچھتے، اس نے خود ہی اس رات کمال صاحب کو اپنی ساری حقیقت آکر بیان کردی۔ کمال صاحب نے اُسے یقین دلایا کہ جب تک وہ کمال صاحب کی پناہ میں ہے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر بخت خان کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ اس کا محسن اُس کی وجہ سے کسی پریشانی کا شکار ہو۔ اس لئے وہ اگلی رات ہی بنا کچھ بتائے کمال

صاحب کا گھر چھوڑ گیا۔ البتہ پہلی رات اسی آتش دان کے سامنے ساری رات بیٹھے آگ تاپتے اپنی زندگی کی کہانی سنادی تھی۔ آج ویسی ہی ایک سرد رات تھی۔ ہم دونوں اسی آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور باہر وقفے وقفے سے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک موسلا دھار برستی بارش کی خبر دے رہی تھی۔

جانے کیوں مگر مجھے ہمیشہ سے ایسا لگا تھا جیسے یہ بارش کی بوندیں بھی ہم سے بات کرتی ہیں۔ جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی نامعلوم بولی میں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ انجانی کہانیاں سناتی یہ ٹپ ٹپ کی بولیاں..... کمال صاحب نے جب بخت خان کی کہانی سنانا شروع کی تو باہر برستی بوندوں کا جلترنگ بھی دھیان سے یہ داستان سننے لگا۔ بخت خان علاقہ غیر کے قریب ایک دور دراز گاؤں میں پیدا ہوا جہاں برف گرتی تھی۔ بخت خان علاقے کے خان کا بیٹا تھا اس لئے علاقے میں اثر و رسوخ بھی حاصل تھا۔ وہ بچپن سے لے کر لڑکپن تک ناز و نعم میں پلا بڑھا مگر مدرسے سے لے کر ہائی اسکول تک اس کا بس ایک ہی دوست بن پایا، جس کا نام تھا رقیب خان۔ جو خود بھی علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔

ان دونوں کی دوستی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ سات گاؤں دور تک ان دونوں کی ٹکر کا کوئی تھا ہی نہیں۔ مدرسے سے لے کر ہائی اسکول تک دونوں کے ہم جماعت لڑکے ان کے رعب میں رہتے اور ان سے دبتے تھے۔ دباؤ اور امارت و رُتبے کے اثر تلے غلامی تو ہو سکتی ہے۔ مگر دوستی نہیں..... البتہ بول چال بظاہر سبھی ہم جماعتوں سے رہتی تھی اور وہ سب مل کر کھیل تماشوں میں حصہ بھی لیا کرتے تھے۔

لڑکپن بیتا اور جوانی آئی تو مشغلے بھی بدلنے لگے۔ بخت خان کو قدرت کی صناعی بھانے لگی اور وہ گھنٹوں گاؤں سے باہر شور مچاتے جھرنوں کے قریب بادلوں تلے بیٹھا، پہاڑوں کی سرگوشیاں سنتا رہتا تھا۔ رات ہوتی تو وہ اپنے ڈیرے کی چھت پر اپنا پسندیدہ ریڈیو ٹرانسزٹر لیے بان کی وسیع چارپائی پر گول تکیے سے ٹیک لگائے لیٹے گانے سنتا رہتا۔ ریڈیو سیلون سے فرمائشی گیت نشر ہوتے اور بخت خان رات گئے تک ان سریلی آوازوں کے سنگم میں کھویا رہتا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے تصویر سے بھی بڑا تخیل اس چھوٹے سے ایک بینڈ کے ریڈیو کے ڈبے میں بند تھا۔ بخت خان کے ریڈیو سے ابھرتے گیتوں کا سنگیت ہوا کے دوش پر پھیلتا تو رات کا سناٹا بھی کسی مدھر سر میں ڈوبا محسوس ہونے لگتا۔ البتہ اس کے جگری یار رقیب خان کے معمولات کچھ جدا تھے۔ اسے شکار کا شوق تھا۔ ہفتوں وہ علاقے کے سنگلاخ پہاڑوں اور جنگلوں میں بھڑکتا رہتا اور گھر واپسی پر اس کی پرانی دلعزیز جیپ بھیڑیئے کی کھالوں اور شکار کیے جانوروں کے سروں سے بھری ہوئی ملتی۔ دونوں کی دوستی البتہ اب بھی ویسی ہی مثالی تھی۔ ملاقات چاہے ہفتوں بعد ہوتی مگر جب بھی وہ دونوں ملتے، آس پاس کی فضا گھنٹوں ان کے قہقہوں سے گونجتی رہتی تھی۔ رقیب خان دوست کو طعنے دے کر اُکساتا کہ یہ کیا وہ چوبیس گھنٹے اپنا محبوب ریڈیو کانوں سے لگائے رکھتا ہے۔ اگر زندگی کا لطف اٹھانا ہے تو بخت خان بھی شکار پر نکلے۔ مردوں کے ہاتھ میں بندوق اچھی لگتی ہے، سازوں کا ڈبہ نہیں.....

مگر بخت خان ہنس کر رقیب خان کی باتوں کو ٹال دیا کرتا تھا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ یہ چھوٹا سا ریڈیو جسے رقیب خان سازوں کا ڈبہ کہتا تھا، بخت خان کو کتنے جہانوں کی سیر کروا دیتا ہے۔ باتیں، تبصرے، خبریں، سیریئن میں دنیا جہاں کے قصے، نغموں کی گیت مالا، فرمائشی خط، گانے اور جانے کیا کیا..... مگر بخت خان خود یہ نہیں جانتا تھا کہ

رات گئے اس کے ڈیرے کی چھت سے فضا میں بکھرتے یہ گیت اُسی کے گاؤں میں دور پہاڑوں کے دامن میں بسے ایک چھوٹے سے گھر کی مکین کے دل کو اتھل پتھل کر جاتے ہیں۔ اور پھر ایک دن جب بخت خان کا گزر گاؤں کے باہر پنگھٹ نما جھرنے کے قریب سے ہوا تو یہ بھید بھی کھل گیا۔ جب پلوشہ کی سہیلی نے پانی بھرتی پلوشہ کو کہنی مار کر متوجہ کیا "وہ جا رہا ہے خان کا بیٹا..... جو ساری رات ریڈیو پر سندرے (نغمے) سنتا ہے اور جھونگے میں تم بھی سن لیتی ہو۔"

کچھ سرگوشیاں صرف سرگوشی نہیں رہتیں دلوں کی آواز بن جاتی ہیں۔ بخت خان نے بھی دل کی اس آواز پر چونک کر پلٹتے ہوئے لمحہ بھر کو ان دو شرارتی لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پھر پتھر کا ہو گیا۔ پلوشہ اپنی شوخ سہیلی کو ڈانٹ رہی تھی مگر اس کی جھکی نظریں بھی وجیہہ بخت خان کے سراپے کی طرف اُٹھ اٹھ سی جاتی تھیں۔ پھر وہی صدیوں پرانی کہانی شروع ہو گئی۔ دُنیا کی ساری محبتیں ایک جیسی ہی تو ہوتی ہیں۔ اب بخت خان فرمائشی گانوں کا پروگرام سنتا تو رات کو ریڈیو جان بوجھ کر چھت کی اس منڈیر پر رکھتا جو پلوشہ کے گھر کی طرف بنی ہوئی تھی اور جس رات ہوا مخالف سمت کی ہوتی اور نغموں کی آواز پلوشہ کے گھر کی طرف نہیں جا پاتی تھی تب پلوشہ بے چینی سے ساری رات صحن میں ٹہلتے ہوئے ہی گزار دیتی۔ ان دونوں کا گاؤں چھوٹا سا تھا مگر محبت کی کہانیاں ہمیشہ ان سرحدوں سے بری ہوتی ہیں۔

دونوں میں پہلے پہل اس شوخ سہیلی کے توسط سے رُقعوں اور پھر لمبے لمبے خطوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ دن کے اُجالے میں پانی کے جھرنے پر آتے جاتے نظروں نظروں میں سلام دعا ہو جاتی تھی اور مہینے کی ہر پہلی اور پندرہ تاریخ کو چاند کے سفر کے حساب سے ملاقات کا وقت طے کیا جاتا۔ پلوشہ رات کو چھپتی چھپاتی دو گھڑی کے لئے بخت خان سے ملنے آ جاتی۔ مگر اس کا دم اٹکا رہتا، مگر ملاقات ختم ہو جانے کے بعد بھی دونوں کے خیال اور احساس کی ملاقات جاری رہتی۔

رقیب خان نے اپنے جگری دوست کی یہ غائب دماغی نوٹ کر لی اور بخت خان کو یار کے اصرار پر دل کی بات بتانا ہی پڑی۔ رقیب نے بخت کی حالت کا خوب مذاق اُڑایا کہ ایک معمولی لڑکی کی یادوں نے ایک کڑیل کا یہ کیا حال کر دیا ہے۔ ایسی لڑکیاں تو زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ بخت خان نے اسے اپنی مجبوری بتائی کہ دو گھڑی سکون سے مل بیٹھ کر بات کرنے کے لئے بھی کوئی جائے پناہ میسر نہیں ہے ان دونوں کو۔

رقیب خان نے بخت کو بتایا کہ اگلے ہفتے اس کے گھر والے کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے دوسرے گاؤں جا رہے ہیں جہاں سے واپسی میں انہیں تین چار دن لگ سکتے ہیں۔ ایسے میں رقیب کا گھر سے ملحقہ پچھلی طرف بنا حجرہ بھی خالی رہے گا۔ لہٰذا بخت چاہے تو وہ پلوشہ کو وہاں ملنے کے لئے بلوا سکتا ہے۔ اندھا کیا چاہے..... دو آنکھیں، بخت خان کے ڈول کی کلی کھل گئی۔ ویسے بھی وہ پلوشہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے بے چین تھا کہ اگلے ماہ وہ اپنے گھر والوں کو کسی طرح راضی کر کے پلوشہ کے گھر رشتہ لینے کے لئے بھجوانے والا ہے۔

سرما کا موسم تھا اور سردیوں کی شام تو عصر ڈھلنے سے پہلے ہی اترنے لگتی ہے۔ مگر آنے والی جمعرات جب پلوشہ کو بخت خان سے ملنے کے لئے آنا تھا اس روز صبح ہی سے آسمان پر گھنے گلابی بادلوں کی دھند چھا گئی اور دوپہر سے پہلے برف کے موٹے موٹے گالے آسمان سے گرنے لگے۔ بارہ بجے تک برف باری شدید ہو چکی تھی اور بخت خان پریشان اور اُداس بار بار رقیب کے مہمان خانے کے صحن میں نکل کر آسمان کو دیکھتا اور برف باری کے رکنے کی دعائیں

مانگتا رہا۔ مگر عاشقوں کی دعائیں اگر قبول ہونے لگیں تو پھر خدائی کے نام سے آج کون واقف ہوتا؟

دوپہر تک قریباً ایک فٹ برف پڑ چکی تھی۔ دوپہر ڈھلنے تک بخت خان پلوشہ کی آمد سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایسے طوفانی موسم میں پلوشہ کا گھر سے نکلنا ناممکن تھا۔ رقیب خان نے بخت کو روکنے کی بہت کوشش کی کہ اس طوفان میں اب گھر واپس جانے کا کیا فائدہ۔ مگر بخت خان کا دل محبوب کی جدائی میں بے قرار تھا۔ ایک جگہ ٹک کر کیسے بیٹھا رہتا؟ بخت نے رقیب سے کہا کہ وہ کسی بہانے پلوشہ کے گھر کی طرف پھیرا ڈال کر حالات کا جائزہ لینا چاہتا ہے۔ بخت خان کے جانے کے بعد رقیب نے دروازہ بند کیا اور اندر کمرے میں آ کر آتش دان کی بجھتی آگ سلگانے کے لئے اسی میں لکڑیاں ڈالنے لگا۔ برف باری رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

تبھی کچھ دیر بعد مہمان خانے کے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ رقیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بے چین دوست گھر جا کر بھی وہاں سکون سے ٹک نہیں پائے گا۔ رقیب طویل صحن میں گری تازہ برف کے اوپر قدموں کے نشان ثبت کرتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اس کے دروازہ کھولتے ہی سیاہ شال میں لپٹی کوئی ریشم کی گٹھڑی سی تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ اس کے لمبے پراندے کی جھنکار نے جیسے موسم میں ایک جلترنگ سا بکھیر دیا اور اس کے کومل وجود کی خوشبو سارے صحن میں پھیل گئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ رقیب نے اسے دیکھا تو نظریں ہٹانا مشکل ہوگیا۔ اُس کے چہرے کا نور اور سیاہ چادر میں لپٹے روپ کا چندن پل بھر میں رقیب کے گھر اور نظر کو خیرہ کر گیا۔ رقیب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے چھوٹے سے گاؤں میں حسن کا اتنا بڑا خزانہ کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ پلوشہ رقیب کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

''وہ..... میں..... بخت خان.....'' رقیب نے جلدی سے اسے تسلی دی۔

''ہاں..... تم اندر بیٹھو..... میں اسے بلاتا ہوں..... وہ تمہارے گھر کی طرف ہی گیا ہے.....'' پلوشہ نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ ''نہیں..... میں جاتی ہوں.....''

ٹھیک اسی لمحے بخت خان برف کے گالوں میں اٹا وہاں پہنچ گیا اور پلوشہ کو وہاں دیکھ کر اس کا مایوس چہرہ کھل اٹھا۔

''میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی.....'' پلوشہ شرما گئی۔ رقیب نے ان دونوں کو اندر بیٹھنے کا کہا اور خود چائے بنوانے کے بہانے وہاں سے نکل آیا۔ پلوشہ بخت کے پیچھے چھوٹے قدم اٹھاتی مہمان خانے کی طرف بڑھی تو اس کی پازیب کی دھیمی جھنکار نے رقیب کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہاں اندر آتش دان کے پاس بیٹھی پلوشہ کو گھر واپسی کی جلدی تھی اور وہ بخت کی منت کر رہی تھی کہ آج کی ملاقات بس اتنی ہی سہی..... دونوں نے ایک دوسرے کو جی بھر کر نہیں دیکھا تو کیا ہوا۔ وہ پھر ملیں گے اور بخت مسلسل اسے چند لمحے اور روکنے کی ترکیبیں کر رہا تھا اور ٹھیک اسی وقت باہر صحن کی پرلی طرف بنے برآمدے میں کھڑا رقیب اپنے اندر ابلتے جذبات کے طوفان کو سرد کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

اس نازک سی لڑکی کے ایک ہی جلوے نے پل بھر میں رقیب خان کا اندر جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکپن سے کر اب تک گاؤں کی بہت سی لڑکیاں بخت خان کو دیکھ کر آہیں بھرتی رہی ہیں اور ان میں سے چند ایک

کے خط اور جوابی رقعے تو ان دونوں نے مل کر لکھے اور پھر پڑھ کر زوردار قہقہے بھی لگائے تھے۔ رقیب کو اس عشق ومحبت کے کھیل سے کبھی زیادہ دلچسپی رہی نہیں تھی مگر آج اس کے اندر کا الاؤ پوری شدت سے بھڑک اٹھا تھا۔

اس کے قدم بار بار مہمان خانے کے آتش دان والے کمرے تک بڑھتے اور پھر وہ دوبارہ برستی برف میں اپنے قدموں کے انہی نشانوں پر واپس لوٹ آتا۔ بخت خان اور پلوشہ باہر کے طوفان سے بے خبر اندر گرم آگ کے قریب بیٹھے کسی اور دنیا میں گم تھے۔ بخت نے اپنی جیب سے چوڑیوں کا بنڈل نکالا اور پلوشہ کو پہنا دیں۔

''انہیں اپنی کلائیوں سے کبھی جدا مت کرنا۔''

تبھی حجرے کا دروازہ کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ رقیب خان اپنی وحشت زدہ سرخ آنکھوں کے پپوٹوں میں سفید برف کے گالے اٹکائے کھڑا دکھائی دیا۔ پلوشہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ ''میں اب چلتی ہوں بخت خاناں.....'' بخت نے گھور کر غصے سے دوست کی طرف دیکھا جس کے آنے سے ملن کے چند مزید حسین لمحے اس کے ہاتھوں سے پھسل گئے تھے۔

پلوشہ مسکرا کر پلٹی تو رقیب دروازے کے بیچوں بیچ تنا کھڑا تھا

''اس لڑکی کو آج یہیں روک لو بخت خاناں..... باہر برف کا شدید طوفان ہے..... یہ کیسے جائے گی.....؟''

بخت خان اپنے دوست کے لہجے پہچانتا تھا۔ اس نے تڑپ کر رقیب کی طرف دیکھا۔

''پاگل مت بنو رقیب خان..... یہ اب میری عزت ہے..... اور میں خود اسے گھر تک چھوڑ کر آؤں گا تم ہٹ جاؤ راستے سے.....'' مگر وہ رقیب ہی کیا جو راستے سے ہٹ جائے؟ پلوشہ کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا۔ اور وہ گھبرا کر بخت کے پیچھے جا چھپی۔ بخت خان نے کڑکتی آواز میں رقیب کو ہوشیار کیا۔

''بے غیرتی مت دکھاؤ رقیب خاناں..... جانے دو اسے..... ورنہ یہ زمانہ میری تمہاری یاری پر تھوکے گا.....تم جاؤ پلوشہ.....اس کو میں دیکھتا ہوں.....''

پلوشہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ بخت خان نے جھپٹ کر رقیب کو قابو کرنے کے لئے جکڑ لیا اور دونوں میں شدید زور آزمائی شروع ہوگئی۔ مگر پلوشہ کا راستہ ابھی تک بند تھا کیونکہ رقیب اور بخت کھلے دروازے کے سامنے ہی ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے تھے۔ بخت نے رقیب کو قابو کرنے کے لئے زور لگایا اور پلوشہ نے ذرا سی جگہ پا کر پیچھے سے نکلنے کی کوشش کی مگر ٹھیک اسی لمحے پلوشہ کی زلفوں میں بندھا لمبا پراندہ رقیب کے ہاتھ میں آ گیا۔ پلوشہ تکلیف سے کراہ اٹھی۔

اب صورتحال کچھ ایسی تھی کہ بخت خان نے رقیب کو جکڑ رکھا تھا اور رقیب نے پلوشہ کے پراندے کو۔ حجرے میں جیسے بھونچال سا آیا ہوا تھا اور دونوں کی زور آزمائی میں آس پاس پڑا سامان تخت وتاراج ہو رہا تھا۔ تکلیف کے مارے پلوشہ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

بخت خان کے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا۔ اس نے اپنی کمر سے باندھا خنجر کھولا اور پلوشہ کی طرف دیکھا۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے میں پلوشہ کی چوٹی نیچے سے پراندے سمیت کاٹ دی۔ پلوشہ آزاد ہو کر تیر کی طرح باہر کے دروازے کی طرف لپکی، رقیب خان کے اندر کا رقیب جنوں کی آخری حدیں پار کر چکا تھا۔ وہ

پلوشہ کو جھپٹنے کے لئے اس کی طرف بڑھا، پلوشہ نے آخری مرتبہ بھیگی پلکوں سے اپنے محبوب کو اس کی عزت بچانے کے لئے اپنے جگری یار سے خونی لڑائی لڑتے ہوئے دیکھا اور پھر وہ ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر نکل گئی۔

رقیب خان اپنی ہی جھونک میں تیزی سے باہر جھپٹنے کی کوشش میں بخت خان کے ہاتھ میں کھلے خنجر کے اوپر پورے وزن سے ایسا گرا کہ لمحے بھر میں تیز دھار فولاد اس کے دل کے آر پار ہو گیا۔ باہر صحن میں گرتی تیز برف نے بھاگتی پلوشہ کے نازک قدموں کے نشان چند لمحوں میں ہی دوبارہ بھر دیئے مگر بخت خان کے ہاتھوں پر اپنے ہی دوست رقیب خان کے بہہ کر جمے خون کے نشان عمر بھر کے لئے ثبت ہو کر رہ گئے۔ بخت خان کے ہاتھ میں ابھی تک پلوشہ کا کٹا ہوا آدھا پراندہ موجود تھا۔ جسے بخت خان نے وہیں حجرے کا کچا فرش کھود کر دبا دیا۔ وہ چاہتا تو خاموشی سے فرار ہو سکتا تھا مگر اس نے باہر نکل کر خود ہی اعلان کر دیا کہ اس کے ہاتھوں رقیب خان کا قتل ہو چکا ہے۔

کچھ ہی دیر میں سارے گاؤں میں یہ بات پھیل چکی تھی اور اس سے پہلے کہ دونوں گھرانوں کے مشتعل نوجوان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کی شروعات کرتے، علاقے کی پولیٹیکل انتظامیہ نے بخت خان کو حراست میں لے کر قریبی تھانے میں منتقل کروا دیا۔ کوئی بھی جان نہیں پایا کہ دو جگری یار آپس میں کس بات پر لڑے تھے۔ بخت خان کے گھر والوں نے رقیب کے خاندان کو خون بہا ادا کرنے کی بہت کوششیں کیں مگر وہ تو بخت خان کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔

معاملہ جرگے سے عدالت تک پہنچا اور بخت کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ بخت اور پلوشہ کی کبھی دوبارہ ملاقات نہیں ہو پائی اور لاکھ تفتیش، تشدد اور جان لیوا سختیوں کے باوجود بخت کی زبان پر کبھی دوران حراست پلوشہ کا نام نہیں آیا۔ کمال صاحب نے اپنی بات ختم کی تو باہر صبح کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ خط تمہارے لئے بخت خان دے گیا تھا، پڑھ لو.....'' میں نے کانپتے ہاتھوں سے تہہ کیا ہوا کاغذ کھولا.....

✱.....✱.....✱

باب28

بخت خان کے خط میں بس چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ نیچے ایک پتہ درج تھا جو سرحد کے قریب کسی علاقے میں بسے گاؤں کا تھا اور اوپر ایک پشتو زبان کا وہی شعر لکھا تھا، جس کا ترجمہ کبھی خود مجھے بخت خان نے راستے میں سنایا تھا۔

اگر میرا محبوب خفا ہو جائے
تو اُسے منانے کے لئے میرا دل
آسمان کے ستاروں کا جرگہ بھیجے
اور کاش کوئی اسے میری آنکھ سے دیکھے
تو پھر کبھی مجھے دیوانہ نہ کہے

میں نے کاغذ تہہ کیا تو میری پلکیں بھیگ چکی تھیں۔ یہ انسان کیا عجب مخلوق ہے.....اپنے اندر کتنی پرتیں کتنی تہیں لئے پھرتا ہے۔ جیسے سنگلاخ چٹانوں کے اندر بھی میٹھے پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ بخت خان کو دیکھ کر بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ اس فولاد کے اندر بھی کہیں پھول کھلے ہوں گے۔

دھوپ نکلتے ہی میں نے رختِ سفر باندھا تو کمال صاحب گھبرا گئے "ارے..... یہ کیا..... ابھی تو تم نے ٹھیک سے دو گھڑی کمر بھی نہیں ٹکائی۔ اور وہاں نواب صاحب روزانہ تمہاری آمد کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ شہریار بھی بہت بے چین ہے تم سے ملنے کے لئے.....اور تم نے سفر کی ٹھان لی....."

میں نے کمال صاحب کو سمجھایا کہ اب یہی سفر میرا آرام ہے۔ کہیں رُک جاؤں تو تھکن میرے اندر ڈیرے ڈالنے لگتی ہے۔ مجھے بخت خان تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ اُس نے میرے آنے کی اُمید پر ہی تو اپنا پتہ کمال صاحب کے پاس چھوڑا تھا۔ سفر لمبا تھا لہٰذا میں نے رخصت چاہی۔

"نواب صاحب اور شہریار سے میرا سلام کہیے گا۔ زندگی رہی تو ملاقات ضرور ہوگی۔" میری گاڑی نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا مگر میری سوچوں نے اب بھی میرے ذہن کو باندھ رکھا تھا۔ وہ کون بزرگ تھے جو کمال صاحب سے سلطان بابا بن کر ملنے آئے تھے اور انہوں نے یہ پیغام کیوں دیا تھا کہ میں سفر جاری رکھوں۔ ملاقات ہو جائے گی.....اور پھر یہ سلطان پور کہاں ہے جس کا اشارہ وہ کمال صاحب کو دے گئے تھے۔

دو دن کے سفر کے بعد گاڑی سرحدی صوبے کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی جہاں سے مجھے بخت خان کے علاقے تک جانے کے لئے ایک بس پکڑنا تھی۔ میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو لاری اڈہ سامنے ہی تھا۔ پرانی مزدا ٹرک نما بسیں، ان میں چلتے پرانے کیسٹ ریکارڈرز، باہر گرم مونگ پھلی بھنتے خوانچہ فروش، چلغوزے اور اخروٹ خوبانی کی مہک، سماواروں سے چھوٹے چینی کے پیالوں میں گرم انڈیلتی چائے۔ اور دور فلک بوس پہاڑوں پر چمکتی برف کی چاندی۔ کچھ علاقے کبھی نہیں بدلتے۔ ہمارے شہروں کی دنیا کتنی ہی کیوں نہ بدل جائے۔ یہ دور دراز کے گاؤں ہمیشہ اپنے اندر وہی ماضی کی خوشبو بسائے رکھتے ہیں۔

سنہرا ماضی، جس کی تصویریں دیکھ کر ہی ہمارے اندر سکون، اداسی اور یاسیت کی جانے کتنی لہریں سرایت کر جاتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے آسمانی جنت کے کسی نہ کسی گوشے کا تعلق ہمارے ماضی سے ضرور جڑا ہوگا۔ جھٹکے کھاتی اور ہچکولے لیتی بس نے شام ڈھلے مجھے کلی زرخیلاں پہنچا دیا۔ اسی جگہ کا پتہ مجھے بخت خان نے کاغذ پر لکھ کر دیا تھا۔ ملک اسفند یار کے ڈیرے پر پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی جس کا نام بخت خان نے پتے کے اوپر درج کیا تھا۔

نوکر مجھے ایک بڑے سے ہال میں بٹھا کر چلا گیا اور کچھ دیر بعد ہی ایک لحیم شحیم شخص سر پر پگڑی باندھے عجلت میں اندر داخل ہوا۔ کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑا سا کوئلوں سے جلنے والا اسٹوپ پوری شدت سے دہک رہا تھا۔ آنے والے کے چہرے کا رنگ اور اسٹوپ کے انگارہ بنے کناروں کی دمک ایک جیسی تھی۔ وہ ملک اسفند یار تھا جس نے آتے ہی مجھے زور سے گلے لگا لیا۔

''اچھا..... تو تم ہے عبداللہ خاناں..... زبردست مڑاں..... صحیح مردوں والا کام کیا ہے تم نے..... مرد کو دنیا کا کوئی جیل بند نہیں کر سکتا.....'' گویا ملک کو میری آدھی حقیقت معلوم تھی۔ ضرور بخت خان نے ہی بتائی ہوگی۔ ملک میرے چہرے پر لکھے سوالات پڑھ کر بولا۔

''بخت خان ہمارا چچازاد ہے۔ اس کو اطلاع دے دیا ہے۔ عشاء تک پہنچ جائے گا وہ اِدھر..... تم فکر مت کرو.....''

کچھ ہی دیر میں ملازم میری خاطر تواضع کے لئے تین چار خوانوں میں بھنا ہوا گوشت، علاقے کی کچھ خاص غذائیں اور گرم نان لیے حاضر ہو گئے۔ کھانے سے انکار کو ہمارے ہاں ہمیشہ تکلف کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ یا شاید مہمان نوازی کو بس ایک اسی صفت سے متصل کر دیا گیا ہے۔ مہمان کی بھوک اور مزاج کی ہماری مہمان داری میں کوئی شق نہیں رکھی گئی۔ لہٰذا میں بھی چپ چاپ انہیں دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ٹونگتا رہا۔ اِن دور دراز قصبوں میں وقت کی رفتار بہت دھیمی چال چلتی ہے۔ پتہ نہیں کتنا وقت یوں ہی بیٹھے بیٹھے گزر گیا اور پھر اچانک باہر کچھ ہلچل سی ہوئی اور مہمان خانے کا دروازہ کھلتے ہی تیز سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ بخت خان دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ناقابل یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے لگا لیا۔

''ہم جانتا تھا عبداللہ خاناں..... تم ضرور آئے گا.....''

باقی لوگوں نے ہمیں کمرے میں تنہا چھوڑ دیا۔ بخت خان نے مجھے بتایا کہ اسے میری گرفتاری کی خبر کمال صاحب کے ذریعے ملی تو پھر اس سے وہاں رکا نہیں گیا۔ اور وہاں سے نکلتے ہی سب سے پہلے اس نے استاد اکبر کے گھر کا رخ کیا جس کا پتہ میں کمال صاحب کے گھر سے نکلتے وقت اسے دے آیا تھا۔ مگر اس سارے علاقے میں پولیس کے بے تحاشہ پہرے اور ناکے لگے ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک پتے تک نہیں پہنچ پایا۔ لہٰذا مجبوراً اسے واپس پلٹنا پڑا۔

اگر میں آج یہاں نہ پہنچتا تو بخت خان نے ایک بار پھر وہاں جا کر قسمت آزمائی کا سوچ رکھا تھا۔ میں نے بخت خان کو مہرو کے مل جانے اور دوبارہ اپنے گھر جا کر بسنے کی اطلاع دی تو خوشی سے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے..... کرمے بھائی سے کیا وعدہ پورا ہوگیا..... جیو عبداللہ خاناں..... مگر تم جیل سے کیسے باہر نکل آیا اتنا جلدی....."

مجھے عدالت نے باعزت بری کر دیا ہے بخت خان..... میری جیل کی قید ختم ہو چکی ہے۔

بخت خان پر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ہم رات گئے تک وہیں گرم اسٹوپ کے گرد بیٹھے قہوہ پیتے اور باتیں کرتے رہے۔

"اب آگے کیا ارادہ ہے بخت خان..... مجھے کمال صاحب نے تمہاری کہانی سنا دی ہے..... کیا یہی وہ کہانی تھی جسے پورا کرنے کے لئے تم نے جیل توڑی تھی....." بخت خان خاموش سا ہوگیا۔

شاید کچھ کہانیاں ہمیشہ ادھوری رہنے کے لئے جنم لیتی ہیں۔ بخت خان نے مجھے بتایا کہ رقیب کے گھر والوں کو بھی اس کے فرار کی خبر ہو چکی ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بخت خان جیل سے نکلنے کے بعد اپنے علاقے کی طرف ضرور آئے گا۔ لہٰذا وہ ہر لمحہ اس کی گھات میں ہیں۔ میری زبان سے اچانک نکل گیا "اور پلوشہ.....؟"

بخت خان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ باہر چلتی تیز اور سرسراتی ہوا کے شور سے مہمان خانے کی کھڑکی زوردار کھڑاکے کے ساتھ کھل گئی جیسے یخ بستہ ہوا بھی پلوشہ کا ذکر سننا چاہتی ہو۔ سبھی خوبصورت سرگوشیاں اور آہٹیں ہمارے ایک محبوب کے نام سے ہی تو جڑی ہوتی ہیں۔ مگر پلوشہ کی زندگی اُس دن کے بعد کبھی خوبصورت نہیں رہ پائی۔ بخت خان کے جیل جانے کے بعد علاقے میں عجیب وغریب سی افواہیں پھیلنے لگیں کہ ضرور دونوں دوستوں میں کسی عورت کو لے کر ہی جھگڑا ہوا ہوگا۔ مگر وہ عورت یا لڑکی کون تھی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

پلوشہ اُس روز گھبرائی ہوئی اپنے گھر پہنچی اور خود کو اپنے کمرے میں بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہ کٹا ہوا پرانده تھا جو اس کی کٹی ہوئی چٹیا سے لٹک رہا تھا۔ ماں کے لاکھ دروازہ پیٹنے پر بھی وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی اور اگلے چند دن اس نے بیماری کے بہانے کسی نہ کسی طرح خود کو چادر میں لپیٹ کر اور دنیا سے چھپ کر گزار دیئے۔ بخت خان کی گرفتاری کی اطلاع نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور حالانکہ اس کے بال صرف نچلی لمبائی کی طرف سے کٹے تھے مگر ماں کی جہاندیدہ نظروں نے یہ بھانپ لیا۔ ایسے میں پلوشہ کی سہیلی نے ہی کوئی

بہانہ بنا کر پلوشہ کی ماں کا دھیان بٹانے کی کوشش کی مگر ماں کا دل ایک بار اولاد کی طرف سے کھٹک جائے تو پھر ذرا مشکل سے ہی سنبھلتا ہے۔

اسے پلوشہ کی گہری اداسی اور ہر وقت کی روئی سی آنکھوں کے پیچھے کچھ اور ہی کہانی نظر آ رہی تھی۔ لہٰذا پلوشہ کے لاکھ رونے پیٹنے کے باوجود تین چار ماہ میں پہلا مناسب رشتہ آتے ہی پلوشہ کے ہاتھ پیلے کر کے اُسے رخصت کر دیا گیا۔ پلوشہ کا شوہر عجب خان اچھا انسان تھا اور وہ پہلی رات پلوشہ کے سوگوار حسن کی ایک جھلک دیکھتے ہی اپنی بیوی کے شدید عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر پلوشہ کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی اور بخت خان کی سزائے موت کی خبر سن کر تو وہ بالکل ہی ڈھے سی گئی۔

اب اس کی یادوں کا واحد سہارا وہی ایک کٹا ہوا پرانہ تھا جو بخت خان سے اس کی آخری ملاقات کی نشانی تھی۔ عجب خان بیوی کے مزاج کا عادی ہو چکا تھا اور وہ یہی سوچ کر خود کو دلاسہ دیتا رہتا تھا کہ اس جیسے سادہ مزاج اور عام شکل وصورت کے مرد کو پلوشہ جیسی حسین شہزادی کا مل جانا ہی قدرت کے کسی انعام سے کم نہیں تھا۔ وہ پلوشہ کی اداسی کو اس کی کم سنی اور ماں باپ اور گھر سے دوری پر محمول کرتا رہا ایک دن کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے اسے پلوشہ کا وہ کٹا ہوا پرانہ بھی نظر آ گیا جو پلوشہ نے اپنے کپڑوں کے درمیان کسی بڑے صندوق یا پیٹی میں سنبھال کر چھپا رکھا تھا۔ عجب خان نے بیوی سے کہا کہ اگر اُسے پراندے پسند ہیں تو وہ بازار سے ساری دوکان لا کر پلوشہ کے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہے مگر پلوشہ نے مسکرا کر اسے ٹال دیا کہ یہ پرانہ اس کی سہیلی کی بچپن کی ایک شرارت کی نشانی ہے جسے وہ ایک سنہری یاد کی طرح سنبھال سنبھال رکھتی ہے۔

پلوشہ نے تو عجب کی بات ٹال دی تھی مگر قدرت کی کچھ ہونیاں کبھی نہیں ٹلا کرتیں۔ کچھ عرصہ بعد رقیب خان کے گھر والوں کو مکان میں کچھ نئی تعمیر کی ضرورت پیش آ گئی اور پرانے حجرے اور مہمان خانے کو گرا کر نئے طرز کے کمرے تعمیر کرنے کی ٹھان لی گئی۔ مہمان خانہ ڈھا دیا گیا اور فرش کی کھدائی کے دوران مزدوروں کو ایک کٹی ہوئی چٹیا اور اس کے ساتھ جڑا پراندے کا آخری حصہ نیچے دبا ملا۔ ذرا سی دیر میں آس پاس چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ رقیب اور بخت کی دشمنی کا خفیہ راز کھل گیا ہے۔ سبھی اپنے اپنے اندازے لگا رہے تھے کہ ضرور یہ اسی لڑکی کی چٹیا اور پرانہ ہے جو اس شام رقیب کے قتل کا باعث بنی ہوگی۔

سارے بازار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگ پرانہ اور چٹیا دیکھنے کے لئے رقیب خان کے حجرے کی طرف یوں لپکے جیسے کسی مقدس تبرک کی زیارت لازمی ہو جائے۔ عجب خان کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی تو اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ وہ بھی پہاڑی کے اوپر ٹیلے پر بنے رقیب کے حجرے کی طرف لپکا۔ اور پرانہ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس پراندے کا آخری حصہ وہ اپنی محبوب بیوی کے تکیے تلے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ مگر پلوشہ کو ختم کرنے سے پہلے وہ اس سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس روز وہاں رقیب سے ملنے گئی تھی یا بخت خان سے.....؟ عجب خان شدید غصے میں تیزی سے پلٹا اور گھر پہنچنے کی جلدی میں لمبے قدم اٹھاتا پہاڑی سے نیچے اترنے لگا

جہاں جاتی سردیوں کی خنکی کی وجہ سے جگہ جگہ پانی جم کر برف کے ٹکڑوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ وہاں پلوشہ کی سہیلی گھبرائی ہوئی پلوشہ کے صحن میں داخل ہوئی اور اس نے پلوشہ کو رقیب خان کے حجرے سے پراندہ ملنے کی کہانی سنا دی۔ ساتھ یہ بھی بتایا کہ عجب خان کو بھی اوپر حجرے کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔

سہیلی نے پلوشہ کی منت کی کہ عجب خان یہ راز پاتے ہی ضرور شدید طیش کے عالم میں گھر واپس پلٹے گا لہٰذا بہتر ہے کہ فی الحال پلوشہ اس کی نظروں سے دور رہنے کے لئے کچھ روز اپنے گھر منتقل ہو جائے۔ لیکن پلوشہ نے وہیں بیٹھ کر اپنی آنے والی موت کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ ویسے بھی وہ بخت خان کے جانے کے بعد زندہ کب تھی۔ بس سانس چل رہی تھی۔ اور اپنی ان سانسوں کو بند کرنے کا اختیار وہ بہت پہلے اپنے خاوند کو بخش چکی تھی۔

مگر دنیا کا سب سے بڑا لکھاری اپنے مسودوں کی بُنت اور ہماری تقدیر کے سکرپٹ کچھ اور ہی انداز سے لکھتا ہے۔ بڑے بڑے نجومی اور زائچہ گر اس سکرپٹ کی ان ہونیوں کی پیشین گوئی میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں پلوشہ گھر کے صحن میں اپنی چادر زمین پر بچھائے بیٹھی اپنی قضاء کا انتظار کر رہی تھی اور وہاں شدید غصے میں تیزی سے پہاڑی ڈھلوان اترتے عجب خان کا پاؤں جمی برف پر کچھ یوں پھسلا کہ وہ لمحہ بھر میں ہی توازن کھو کر سر کے بل اونچائی سے گہری کھائی میں جا گرا اور اسے دوسرا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی۔

قدرت نے ایک بار پھر پلوشہ کا پردہ رکھا اور کوئی نہ جان پایا کہ اس پراندے کا بقیہ حصہ عجب خان کی بیوی کے پلو سے بندھا ہوا ہے۔ تب سے پلوشہ اپنے میکے کے خاندان کے ساتھ ایک بیوہ کی زندگی جی رہی تھی۔ بخت خان کو یہ ساری کہانی پلوشہ کی اسی سہیلی کی زبانی پتہ چلی تھی جس کے پاس بخت خان نے اپنے علاقے میں پہنچتے ہی اپنے خاندان کی سب سے پرانی وفادار اور رازدار ملازمہ کو پلوشہ کی ٹوہ لینے بھیجا تھا۔ پلوشہ کو بھی بخت خان کے فرار کی خبر مل چکی تھی مگر اب اُن دونوں کے بیچ زمانے کے کئی ان دیکھے خاردار پہرے تھے۔ بخت خان پلوشہ کو ایک بار پھر اپنی عزت بنانا اور نکاح کے بعد وہ اسے لے کر یہاں سے کہیں بہت دور جا کر بس جانا چاہتا تھا۔ مگر یہ دنیا والے بھلا اتنی آسانی سے کسی کو کب بسنے دیتے ہیں۔ اور پھر بخت خان تو سزائے موت سے بھاگا ہوا ایک قیدی تھا جس کے اپنے کئی ذاتی دشمن اسی علاقے میں بخت کے خون کے پیاسے بنے پھرتے تھے۔

بخت خان نے مجھے بتایا کہ اس نے پلوشہ کی سہیلی کے ذریعے اسے پیغام تو بھجوا دیا ہے کہ وہ اس سے اسی پنگھٹ والے چشمے کے پیچھے ملنا چاہتا ہے، جہاں کبھی وہ پہلے ملا کرتے تھے۔ مگر جانے پلوشہ اب گھر سے نکل پائے گی یا نہیں.....؟ یہ فکر ہر دم بخت خان کو کھائے جا رہی تھی۔ مگر پھر اگلی صبح ہی بخت خان کے لیے زمانے بھر خوشی کی نوید لے کر آئی۔ وہ مہمان خانے میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''عبداللہ خان..... پلوشہ ہم سے ملنے آئے گا..... اور اگر وہ نکاح پر راضی ہو گیا..... تو ہم اس کو لے کر تمہارے ساتھ بڑے شہر چلا جائے گا..... سنا ہے بڑے شہروں میں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا..... تم ہم کو اپنے ساتھ لے جائے گا ناں.....؟'' میں نے مسکرا کر بخت خان کی طرف دیکھا۔

''ہاں..... مگر صرف ایک شرط پر..... کہ تم میرے گھر میں ہی رہو گے۔ اور میرے پاپا کو اپنے علاقے کی ساری کہانیاں سنایا کرو گے.....'' بخت خان نے مجھے گلے لگالیا۔ یہ خوشی بھی کیا عجب شے ہے۔ پل بھر میں کیسے مردہ کو زندہ کر کے اس کے چہرے پر گلابی رنگ بکھیر دیتی ہے۔ شاید دنیا کا سب سے طاقت ور دمکتا من پل بھر کی خوشی کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔

شام کو ہی ان دونوں کی ملاقات طے تھی۔ بخت خان نے جاتے ہوئے مجھے تاکید کی کہ میں تیار رہوں کیونکہ اگر پلوشہ اس سے نکاح کے لئے تیار ہوگئی تو وہ آج رات ہی دو گواہ پکڑ کر نکاح پڑھوالے گا اور ہم تینوں صبح سے پہلے اس علاقے سے ہمیشہ کے لئے نکل جائیں گے۔ بخت خان جانے لگا تو میں نے پیچھے سے اسے آواز دی۔

''اپنا خیال رکھنا بخت خان.....''

بخت خان نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنی کلاشن کوف کاندھے سے لٹکا کر نکل گیا۔ بخت اور پلوشہ کی ملاقات ایک بار پھر اسی کھڑکی کے توسط سے ہو رہی تھی۔

باہر شام ڈھل رہی تھی اور میں مہمان خانے کی کھڑکی کے قریب بیٹھا آسمان پر امڈتے بادلوں کو کسی کے استقبال کے لئے جمع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جب بھی دو پیار کرنے والے ملنے لگتے ہیں، جانے ان بادلوں کو کیسے خبر ہو جاتی ہے؟ شاید کیوپڈ بھی کسی گلابی بادل کے اوپر برستا ہوگا۔ میں چشم تصور سے بخت اور پلوشہ کی ملاقات کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد وہ جب بخت سے ملنے اپنے گھر سے نکلی ہوگی تو اس کا دل کتنی زور زور سے دھڑک رہا ہوگا؟ اس نے وہ پراندہ بھی اپنے پلو سے باندھ رکھا ہوگا جو اتنے سالوں سے بخت خان کی یاد بن کر اس کے ساتھ رہا تھا۔ اور بخت..... وہ تو پلوشہ کے جانے کے بعد بولنا ہی بھول گیا تھا۔ جانے آج لفظ کیسے ادا ہو جائیں گے اس کی زبان سے۔ اور پھر لفظوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خاموشی کی لغت سب سے بڑی ہوتی ہے ایسی ملاقاتوں میں..... میں اپنے خیالوں میں گم تھا کہ باہر کچھ شور اور ہلچل سی ہوئی اور اگلے ہی لمحے اسفند یار شدید گھبرایا سا اندر داخل ہوا۔

''جلدی چلو عبداللہ خان..... کسی نے دشمن کو بخت خان کا مخبری کر دیا ہے۔ وہ لوگ بخت خان کے پیچھے نکل پڑا ہے..... بخت ادھر اکیلا ہے.....''

میں گھبرا کر باہر لپکا جہاں تین چار بڑی گاڑیاں بہت سے مسلح افراد کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمارا رُخ اسی پہاڑی جھرنے کی طرف تھا جہاں بخت اور پلوشہ کی ملاقات طے تھی۔ مگر ہر بار محبت کے دشمنوں کو جانے ایسی جگہوں کی مخبری کیسے ہو جاتی ہے۔ شاید انہی بادلوں میں سے کوئی ایک یہ مخبری بھی کرتا ہوگا۔

ہم ٹیلے سے کچھ فاصلے پر تھے جب کلاشن کوف کی اندھا دھند فائرنگ کی آواز سے ساری وادی لرز اٹھی۔ میرے دل سے بے اختیار آواز آئی ''یااللہ خیر.....'' مگر کچھ دعائیں عرش پر ذرا دیر سے پہنچتی ہیں۔ اوپر سے کوئی چیخا.....

''ملک صاب غضب ہوگیا دشمن نے اپنا وار کر دیا ہے..... ہائے بخت خاناں.....'' میں دیوانوں کی طرح بھاگتا، ہانپتا اوپر پہنچا تو بخت خان اور پلوشہ کے بے جان لاشے ایک دوسرے کے قریب پڑے تھے۔ تبھی بادل زور سے گرجے اور برستی بوندوں میں ان دونوں کا خون مل کر بہنے لگا۔ جیتے جی تو وہ مل نہ پائے۔ مرنے کے بعد یہ بارش ان کی ڈولی اٹھانے آئی تھی شاید.....

پھر وہی بادلوں کی سازش..... اچانک تیز ہوا چلی اور مجھے لگا قضاء کی دیوی وہیں کہیں سیاہ لباس پہنے بیٹھی دور سے مجھے گھور رہی ہو۔ پھر دیوی نے دھیرے سے سرگوشی کی ''آؤ عبداللہ..... تمہارے دوست کی سانسیں یہاں قضاء کرنی تھیں مجھے..... تم خواہ مخواہ جیل سے بھگا کر لائے اِسے..... اس کی موت وہاں نہیں..... یہاں طے تھی.....'' اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا، میں نے پلٹ کر دیکھا۔

..........*

باب 29

میرے پیچھے ملک اسفندیار کھڑا تھا۔ ''صبر کرو عبداللہ خان..... بخت کا بس اتنا ہی بخت لکھا تھا'' ٹھیک کہہ رہا تھا ملک۔ نام رکھ لینے سے ہی کسی کے بخت جڑ جاتے تو پھر جھگڑا کس بات کا تھا۔ سوئم کے بعد میں نے بوجھل دل سے اپنے میزبانوں سے اجازت چاہی تو وہ سب ہی جذباتی ہو گئے۔ میں نے چلتے وقت اسفندیار سے درخواست کی کہ ہو سکے تو وہ اس خون ریزی کے کھیل کو یہیں ختم کر دے کیونکہ بخت خان زندہ رہتا تو اُس کی بھی یہی خواہش ہوتی۔

پرانی مزدا بس گہری کھائیوں اور اونچی گھاٹیوں کے بیچوں بیچ بنی سانپ سی بل کھاتی کچی پکی سڑک پر رواں تھی۔ ہم چھ قیدی جیل سے فرار ہوئے تھے۔ سنتوش کو سنتری کی گولی جیل کے اندر ہی کھا گئی۔ بخت خان بھی جدا ہو گیا۔ بگھے کو پولیس نے گرفتار کر کے پھر سے پھانسی گھاٹ پہنچا دیا۔ میری قید معاف ہو گئی اور باقی رہ گئے کندن اور ظہیر۔

جانے وہ کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔ کیسے ہوں گے..... شاید انہیں میری رہائی کی خبر بھی مل گئی ہو۔ وہ چاہے قانون کی نظر میں مجرم ہی کیوں نہ سہی..... مگر میرے ساتھ ان کا ایک ایسا ان مٹ رشتہ تھا جسے یہ دنیا والے شاید کبھی نہیں سمجھ پاتے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ایک زوردار جھٹکا لگا اور بس زور سے لہرائی۔ کمزور دل مسافروں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شاید بس کا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ مگر ڈرائیور ان راستوں کا ماہر تھا اس نے چابک دستی سے بس کو کنارے لگا کر روک لیا۔ سب مسافر نیچے اتر گئے۔

سامنے ہی ایک چائے کا ڈھابہ بنا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں جب کوئی کام نہ ہو تو چائے پینا سب سے ضروری کام ہو جاتا ہے۔ سبھی کو چائے کی طلب ستانے لگی۔ میں سڑک کی دوسری طرف دھوپ میں بچھے چند لکڑی کے بینچوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا۔ بخت خان کے جانے کے بعد میرا دماغ بالکل ہی سن ہو گیا تھا۔ دھیان ہر وقت پلوشہ اور بخت خان کی نامکمل محبت کے انجام کو سوچ کر بٹا سا رہتا تھا۔ اسی بے خیالی میں میری نظر مرکزی سڑک سے نیچے نکلتی ایک دوسری سڑک کے کنارے نصب کیے گئے سنگ میل پر پڑی جس کے اوپر پیلی روشنائی سے لکھے نام قریباً مٹ چکے تھے۔ کوٹ امداد 30 کلو میٹر، جھوک فقیراں 450 کلو میٹر، بختیار آباد 630 کلو میٹر..... میں نے بے خیالی میں دوبارہ نام پڑھے، بختیار آباد چھ سو تیس کلو میٹر..... بختیار آباد..... دفعتہً میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا بختیار آباد..... یہ نام تو میں نے ظہیر کی زبان سے سنا تھا۔

ہاں..... جیل سے فرار ہونے کے بعد جب ہم بچھڑ رہے تھے تب ظہیر نے بھی اسی جگہ کا نام لے کر کہا تھا کہ اگر زندگی رہی تو ٹھیک چھ ماہ بعد ہم سب بختیار آباد میں کسی جگہ ملیں گے..... شاید کسی ہوٹل کا نام لیا تھا اس نے..... ہمیں جیل سے بھاگے قریباً چھ ماہ ہی تو ہونے کو آئے تھے۔ مگر اس بس کا ٹائر ٹھیک اسی سنگ میل کے سامنے ہی کیوں برسٹ ہوا.....؟

''جب جب جو جو ہونا ہوتا ہے، تب تب، سو سو ہوتا ہے.....''

میں نے چائے والے سے پوچھا کہ بختیار آباد جانے والی بس یہاں سے کب گزرے گی۔ وہ بڑے پتیلے میں سے کھولتی چائے شیشے کے گلاسوں میں انڈیلتا رہا۔

''اب تو جی بہت کم سواری جاتی ہے اس طرف..... کبھی بڑا رش تھا اس میدانی علاقے کی جانب..... مسافر ٹوٹ گئے ہیں اس جگہ کے..... اور پھر وہاں اب دھرا ہی کیا ہے..... چند پرانے مزار، ایک صدیوں پرانا شہر اور چھوٹا سا بازار..... جنوبی علاقے کا آخری اسٹاپ ہے بختیار آباد..... اس کی بس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے..... دو چار دن میں ایک دفعہ گزرتی ہے یہاں سے..... کبھی کبھی تو پورا ہفتہ گزر جاتا ہے..... سواری نہیں ملتی..... اب دیکھو..... کب جاتی ہے اگلی بس۔''

میں چپ چاپ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سامان کی پوٹلی بس سے اتار کر اپنے پاس رکھ لی۔ بس کے کنڈیکٹر نے چلنے سے پہلے مجھے آواز لگائی ''آجاؤ صوفی صاب..... بس جا رہی ہے.....'' میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''نہیں..... تم جاؤ..... میری منزل بدل گئی ہے۔''

چائے والے نے چونک کر مجھے دیکھا۔ بس آگے بڑھ گئی۔ میں نے چائے والے سے پوچھا یہاں رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ مل جائے گی..... میں حاضر ہوں۔ ''چاہو تو میرے ڈھابے پر ہی رات گزار لینا۔ میرے ساتھ صرف کام کرنے والا ایک لڑکا رہتا ہے یہاں..... مگر تم چلتی بس سے کیوں اُتر گئے۔ کون رہتا ہے تمہارا بختیار آباد میں.....؟''

''کوئی نہیں..... مگر کسی اپنے سے ملنے کی آس میں جا رہا ہوں.....'' چائے والا ہنس پڑا۔

''سنا ہے وہاں چند بڑے جاگیرداروں کی آبائی حویلیاں ہی باقی بچی ہیں اب تو..... ان کی نئی نسل بڑے شہروں کو کوچ کر گئی۔ ضرور تم وہاں کسی مزار کی مجاوری کرنے جا رہے ہو گے..... میرے لئے بھی دعا کرنا..... کاروبار بڑا مندا جا رہا ہے میرا آج کل..... چینی پتی کی قیمتیں تو آسمان کو چڑھی ہی تھیں..... اب تو دودھ بھی سونے کے بھاؤ بکنے لگا ہے..... جانے کہاں جا کر رُکے گی یہ مہنگائی.....'' میں نے غور سے چائے والے کی طرف دیکھا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ اب بختیار آباد کی طرف سے برکت اُٹھ گئی ہے..... ایسا کیا ہوا تھا وہاں کہ رونق ہی ختم ہو گئی اس علاقے کی.....'' چائے والے رحمت اللہ نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو..... کبھی بڑا بارونق علاقہ ہوا کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی سیف اللہ کی نوکری تھی وہاں بڑے جاگیردار صاحب کی حویلی میں۔ سب خوش حال تھے۔ مگر پھر حویلی میں کسی کا قتل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب

اُجڑ گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جس زمین پر ناحق کسی کا خون گرے تو پھر وہاں کبھی سبزہ نہیں اُگا کرتا۔ شاید بختیار آباد کی ہریالی کو بھی کسی کی آہ کھا گئی....." چائے والا اپنی دھن میں اس علاقے کے قصے سناتا رہا۔

دھیرے دھیرے شام ڈھلنے لگی، سڑک پر اب ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ رحمت اللہ نے ایک بڑی سی لالٹین روشن کی اور ہوٹل کے باہر ایک اونچی جگہ پر ٹانگ دی۔

"تم نے بتایا نہیں..... تم کس سے ملنے جا رہے ہو بختیار آباد۔ جب میرا بھائی وہاں نوکری کرتا تھا تو میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کافی جان پہچان ہے وہاں میری..... کچھ کام ہے تو بتاؤ.....؟"

"نہیں..... میرے کچھ دوستوں کا عارضی گزر ہوگا وہاں سے..... بس انہی سے ملنے جا رہا ہوں..... کوئی خاص کام نہیں ہے۔" میں نے رحمت اللہ کو رات کے کھانے کے پیسے دینا چاہے مگر اس نے انکار کر دیا۔

"تمہارے حصے کا کچھ رزق یہاں میرے پاس لکھا تھا۔ اس کے پیسے نہیں لوں گا میں..... ویسے ہی یہاں ہفتوں مہینوں کوئی نہیں آتا مجھ سے ملنے..... اچھا ایک بات بتاؤ..... تم تو مجھے کوئی جوگی لگتے ہو۔ کیا نام بدلنے سے کبھی تقدیریں بھی بدل جایا کرتی ہیں.....؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تم سے کس نے کہا.....؟"

"بڑے سیانوں سے یہی سنا ہے صوفی صاب کہ نام کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اب دیکھو ناں..... بختیار آباد کے لئے بھی سب یہی کہتے ہیں کہ اُس پر پرانا نام ہی سجتا تھا۔ جب سے علاقے کے نواب سرداروں نے اسے بدل کر اپنے باپ دادا کے نام پر دوسرا نام رکھا، علاقہ ویران ہو گیا۔ میں سوچ رہا ہوں میں بھی اپنے ہوٹل کا نام "کڑک چائے والا" سے بدل کر "رحمت چائے والا" رکھ لوں..... تم کیا بولتے ہو.....؟"

میرا ذہن ابھی تک رحمت اللہ کی پچھلی بات میں ہی اٹکا ہوا تھا "اچھا خیال ہے..... مگر تم بختیار آباد کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے..... کیا پہلے اس علاقے کا کچھ اور نام تھا.....؟"

"ہاں جی..... ہمارے بچپن میں کچھ اور بھلا سا نام تھا....." رحمت اللہ نے ذہن پر زور دیا اور پھر یاد آنے پر جھٹ سے بولا "ہاں..... یاد آیا..... سلطان پور..... ہاں..... یہی نام تھا..... سلطان پور کہتے تھے اُس علاقے کو پہلے....." میں سلطان پور کا نام سنتے ہی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا..... سلطان پور.....؟ کیا تمہیں پورا یقین ہے..... سلطان پور ہی کہا ناں تم نے.....؟" رحمت میری حالت دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

"ہاں ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پر تمہارا رنگ کیوں بدل گیا اچانک یہ نام سن کر۔" اب میں اسے کیا بتاتا کہ کمال صاحب اور میں ساری رات شمالی اور جنوبی علاقوں کے نقشے کھول کر سلطان پور نام کا علاقہ کیوں تلاش کرتے رہے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ چھ ماہ پہلے ظہیر نے جس علاقے میں ملنے کا پلان بنایا تھا، کمال صاحب کے ہاں آنے والے بزرگ نے بھی مجھے وہیں ملاقات کا نیوتا دیا تھا۔ گویا یہ سب بھی پہلے سے طے شدہ تھا کہ میرا ایک بار بختیار آباد پہنچنا ضروری تھا۔ کمال صاحب کے بقول سلطان بابا نے مجھ سے سلطان پور یا بختیار آباد نامی قصبے میں ہی ملنے کی نوید سنائی تھی۔ ظہیر کے ذہن میں اس علاقے کا نام کیوں آیا؟ یہ سب کڑیاں کہاں جا کر ملتی تھیں۔ ساری رات

میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا اور رات کی سیاہی میری آنکھوں کے سامنے صبح کی سپیدی میں ڈھل گئی۔ تبھی رحمت میرے پاس دوڑتا ہوا آیا۔

"چلو..... تیار ہو جاؤ..... تمہاری قسمت اچھی ہے۔ ڈاک والوں کی گاڑی گزر رہی ہے ابھی یہاں سے..... بتا رہے تھے کہ بختیار آباد جانے والی بس بھی پیچھے آ رہی ہے۔"

میں نے جلدی سے چہرے پر پانی کے دو چھینٹے مارے اور کچھ ہی دیر بعد میں منزل کی طرف رواں تھا۔ اس بس کی حالت پچھلی بس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ مجھے نیویارک اور لندن کی بسیں، سب ویز (Subways) اور ٹرام کی یاد آ گئی۔ ایک ہی طرح کے گوشت پوست سے بنے انسان بیک وقت کتنی مختلف دنیاؤں میں جیتے ہیں۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ بس پہاڑی علاقوں سے نکل کر اب ریت کے میدانوں میں دوڑ رہی تھی۔ چاروں طرف حدِ نگاہ تک ایک وسیع ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ مجھے جیروت کا علاقہ جبل پور یاد آ گیا۔ وہیں پر تو سلطان بابا کو سر میں چوٹ آئی تھی جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی۔ مگر کمال صاحب کا کہنا تھا کہ وہی سلطان بابا میری تلاش میں نواب پور تک آئے تھے؟ شام ڈھلے بس ایک صحرائی شہر کی فصیل سے اندر داخل ہوئی تو کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

"چلو بھئی..... آخری اسٹاپ آ گیا ہے۔ بختیار آباد..... بختیار آباد....." اونگھتے ہوئے مسافر اپنے سامان کی تلاش میں اُٹھے اور کچھ دیر بعد میں بس اڈے کے وسیع پکی اینٹ والے احاطے میں تنہا کھڑا تھا۔

"پھر رات آئی تو وہ جن کے گھر تھے، وہ گھر کو گئے سو گئے....."

مگر میں کہاں جاتا۔ اڈے کے بکنگ کلرک نے ٹکٹ گھر کی کھڑکی بند کی اور بتی بجھا کر اپنا مفلر کانوں سے لپیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔

"تم کہاں جاؤ گے.....؟ یہاں بس اسٹینڈ پر رات گزارنے کی اجازت نہیں ہے کسی کو۔ اب صبح چھ بجے ہی یہ اسٹینڈ کھلے گا....." میں بھی کلرک کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ کلرک نے میرے حلیے کی طرف غور سے دیکھا اور پھر خود ہی دور کھڑے تانگہ بانوں میں سے کسی ایک کو آواز لگائی۔

"اوئے فقیرے..... بات سن ذرا....." فقیرا تیزی سے ہماری طرف لپکا۔

"حکم جناب.....؟"

کلرک نے میری طرف اشارہ کیا "مجاور لگتا ہے کوئی..... اسے شہر سے باہر والے بڑے مزار پر چھوڑ آ۔ اور وہاں کا منشی اگر جاگ رہا ہو تو کہنا کہ لنگر سے کھانا بھی کھلا دے..... کیا سمجھا.....؟"

فقیرے نے ہاتھ جوڑے "سمجھ گیا سرکار....."

کلرک نے پھر میری طرف دیکھا "فیض محمد نام ہے میرا..... تانگے کے کرائے کے پیسے ہیں تمہارے پاس یا میں دے دوں.....؟" میں نے اس نیک شخص کا شکریہ ادا کیا "نہیں..... پیسے ہیں میرے پاس..... رہنمائی کا شکریہ....." فیض محمد نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا۔ میرا لہجہ اور میرے لفظ شاید میرے حلیے کے لحاظ سے شستہ تھے۔ کبھی کبھی اپنے ہی بھیس کا بھید رکھنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں جلدی سے تانگے

میں سوار ہو گیا اور فقیرے نے چھانٹا ہوا میں لہرا کر ایک مخصوص آواز نکالی۔ تانگہ شہر کی گلیوں سے ہوتا ہوا باہر جانے والی سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ بختیار آباد ایک سرحدی شہر تھا جس کے چند کلومیٹر بعد دشمن ملک کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ ہمسایہ اگر دشمن ہو جائے تو زندگی کتنی اجیرن ہو جاتی ہے۔

شہر کا بازار قدیم طرز کا تھا اور دوکانوں کے باہر لکڑی کے پرت در پرت کھلنے والے بڑے بڑے دروازے نصب تھے۔ جن کی کنڈیاں بھی قدیم طرز کی زنجیر سے لٹکنے والی تھیں۔ تیز ہوا سے ریت شہر کے باہر والے ریگستان سے اُڑ اُڑ کر شہر کی گلیوں میں بکھری پڑی تھی۔ میری نظریں ''گل نُہر'' نامی ہوٹل کا بورڈ ڈھونڈتی رہیں۔ جس کا نام ظہیر نے ہمیں ازبر کروایا تھا۔ فقیرے نے مجھے خاموش دیکھ کر خود ہی بات جوڑنے کی کوشش کی۔

''آپ ضرور بڑے مزار کے سالانہ عرس میں شریک ہونے کے لئے آئے ہوں گے جوگیو۔ بہت دور سے لوگ آتے ہیں اس عرس میں شامل ہو کر برکت سمیٹنے کے لئے..... آہ..... اب تو بس یہ سالانہ عرس ہی باقی رہ گیا ہے جناب..... ورنہ..... مال یہ شہر سائیں سائیں کرتا رہتا ہے.....''

میں نے چونک کر تانگے والے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی وہی بات کہہ رہا تھا جو میں پہلے رحمت اللہ کی زبانی سن چکا تھا۔ ''کیوں..... ایسی کیا ان ہونی بیتی ہے اس علاقے پر.....؟''

تانگے والے نے تانگہ مرکزی سڑک پر ڈال دیا اور انہماک سے مجھے بتانے لگا کہ یہ شہر اس علاقے کے سب سے بڑے جاگیردار سائیں سکندر کے آباؤ اجداد نے بسایا تھا۔ پہلے اس کا نام سلطان پور تھا مگر پھر سکندر کے باپ سائیں معظم خان نے نام بدل کر اپنے دادا سردار بختیار کے نام پر رکھ دیا۔ مگر شاید یہ نام علاقے کو راس نہیں آیا اور اب کئی سالوں سے علاقے میں خون ریزی جاری تھی۔ صدیوں پرانی دشمنیاں پھر سے تازہ ہو کر کئی زندگیاں نگل چکی تھیں۔ اس وقت ساری جاگیر کا کرتا دھرتا سردار سکندر ہی تھا مگر اس خاندان پر بڑی نحوست کا سایہ پہلے اس کی جوان بیوی کو کھا گیا جو دو چھوٹے بچے چھوڑ کر چند دن کے اندر ہی کسی موذی بیماری کا شکار ہو کر چلتی بنی، سکندر کی بیوہ ماں جسے علاقے میں سارے مکین ''بڑی سرکار'' کے نام سے جانتے تھے، اپنی حویلی کی یہ ویرانی زیادہ دیر نہ دیکھ پائی اور اس نے بڑی چاہ سے اپنے چھوٹے بیٹے بابر کی بات کہیں چلائی اور بڑی منتوں مرادوں سے یہ رشتہ طے ہوا، مگر تقدیر کے کالے سائے ابھی بڑی سرکار کی حویلی کے تعاقب میں تھے، بارات دوسرے شہر سے سجاول کی جاگیر کی طرف آ رہی تھی کہ راستے میں گھات لگائے دشمنوں نے فائر کھول دیا اور گولی سیدھی سجاول کے دل کے پار ہو گئی۔ پل بھر میں یہی بارات کا جشن موت کے ماتم میں بدل گیا۔ نئی نویلی دلہن اپنے حجلۂ عروسی میں پہنچنے سے قبل ہی بیوہ ہو گئی۔ تب سے لے کر آج تک پورا سال گزرنے کے باوجود کسی نے کبھی بڑی سرکار کی حویلی سے ہنسی کی آواز نہیں سنی۔ البتہ بڑی سرکار کی حویلی سے ہی ہر برس علاقے کے سب سے بڑے مزار کی عرس کی تقریبات کا انتظام آج بھی پورے اہتمام کے ساتھ کیا جاتا تھا اور سارا خرچہ بڑی سرکار خود اٹھاتی تھیں۔

تانگے والے فقیرے کی باتوں میں سفر کا پتہ بھی نہیں چلا اور جانے کب ہم شہر سے باہر ریگستان میں کھڑے اونچے برجوں اور فصیلوں والے مزار کے مرکزی دروازے تک پہنچ گئے۔ آدھی رات کے وقت مزار کے اندر سناٹا چھایا ہوا تھا اور دن بھر کی مشقت سے تھکے مجذوب، مجاور اور خدمت گار صحن میں لمبے کھیس اور کمبل اوڑھے سو رہے تھے۔

ایک جانب درگاہ کا مرکزی ہال تھا۔ دوسری جانب صحن کے ایک سرے پر خدمت گاروں اور مزار کی سرائے کے بہت سے چھوٹے دروازوں والے کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ کبھی مجھے سلطان بابا نے ایسی ہی کسی درگاہ کے آدھے قد کے دروازوں کے بارے میں یہ رمز سمجھائی تھی کہ جھکنے والے ہی آگے چل کر سرفراز ہوتے ہیں۔ شاید یہ بھی ادب کے تقاضوں میں سے ایک تقاضہ تھا کہ جھک کر اندر داخل ہوا جائے.....

فقیرے نے لنگر کے منتظم کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر میں نے اسے منع کر دیا کہ مجھے بھوک نہیں ہے، لہٰذا وہ بھی جا کر آرام کرے۔ ''اب اتنی رات کو واپس جا کر گھر والوں کی نیند کیا خراب کروں سائیں جی..... میں یہیں کہیں پڑ کر سو جاتا ہوں..... ہوسکتا ہے صبح یہاں سے بازار جانے والی کوئی سواری بھی مل جائے۔''

فقیرے نے اپنی چادر سے درخت کے گرد بنا ایک پکا چوبارہ صاف کیا اور چند لمحوں بعد ہی اس کے بلند خراٹے فضا میں گونجنے لگے..... سنا ہے جن کے دلوں میں زیادہ گرہیں نہیں پڑی ہوتیں، نیند سے ان کی گہری دوستی ہوتی ہے جو پلکیں موندتے ہی اُنہیں گلے لگا لیتی ہے..... اور کچھ مجھ جیسے دشمن بھی ہوتے ہیں، جن سے اس رقیب کی کبھی نہیں بنتی.....

آنکھوں آنکھوں میں ہی صبح کی اذان ہوئی تو مزار کے باہر والے صحن میں بنی چھوٹی سی مسجد میں فجر کی جماعت بھی کھڑی ہوگئی۔ میں نے سلام پھیر کر امام صاحب کی اقتداء میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو پیچھے سے کسی مقتدی نے صدا لگائی.....

''مولوی صاحب..... سلطان بابا کے لئے بھی دعا کیجئے..... اس بار انہیں گئے بہت دن ہو گئے۔ اللہ انہیں صحت مند اور سلامت رکھے..... اور ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے.....'' سب نمازیوں نے زور سے آمین کہا مگر میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا جس نے دعا کی درخواست کی تھی۔

دعا ختم ہوئی تو میں اس کے پیچھے باہر لپکا اور اسے آواز دے کر روکا ''سنو..... تم سلطان بابا کو جانتے ہو.....؟ وہ کہاں ہیں اس وقت.....؟'' لڑکے نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''سلطان بابا استاد ہیں میرے..... کیا تمہیں کچھ کام ہے ان سے.....''

میں نے شدید الجھن میں لڑکے کی طرف دیکھ کر دوبارہ سوال کیا ''مگر تم کون ہو..... تمہاری تعریف.....؟''

لڑکے نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا ''تعریف کے قابل تو کچھ خاص نہیں ہے میرے پاس..... ہاں البتہ تعارف کے لئے نام ''عبداللہ'' ہے۔''

✱.....✱.....✱

باب30

مجھے اس کا نام سن کر ایک زور دار جھٹکا لگا۔ میرے سامنے ایک اور عبداللہ کھڑا تھا..... ایک پل میں مجھے اپنے ساحر سے لے کر عبداللہ بننے اور یہاں تک پہنچنے کی ساری داستان اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ابھی تک میرے سامنے کھڑا میرے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ ''تم نے اپنا نام نہیں بتایا..... اس علاقے میں نئے ہو شاید..... میں نے تمہیں پہلے یہاں نہیں دیکھا.....'' میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی.....

''میرا نام.....؟ میرا نام ساحر ہے..... میں سلطان بابا سے ملنے کے لئے یہاں آیا ہوں..... کیا تم بتا سکتے ہو ان کی واپسی کب تک ہوگی.....؟''

نئے عبداللہ نے لمبی سانس بھری ''اُن کا انتظار تو میں بھی جانے کتنے دنوں سے کر رہا ہوں۔ مگر اس بار انہوں نے آنے میں دیر کر دی۔ اوپر سے وہ اتنی بہت ساری ذمہ داریاں مجھ پر ڈال گئے ہیں مزار کی کہ مجھے ہر قدم پر ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''اگر تم چاہو تو میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے تجربہ ہے ایسے معاملات کا..... بہت پرانا مجاور رہ چکا ہوں میں بھی کبھی.....'' عبداللہ کی آنکھیں یہ سن کر خوشی سے چمک اُٹھیں۔

''اچھا..... یہ تو بہت اچھی بات ہے..... مجھے واقعی کسی مددگار کی ضرورت تھی..... دراصل سالانہ عرس ہے اگلے ہفتے۔ اور تمام انتظامات میرے ہی سپرد ہیں۔ اور تمہیں سچ بتاؤں..... مجھے کچھ زیادہ تجربہ بھی نہیں ہے ایسے معاملات کا۔ میں نے ابھی کچھ ماہ قبل ہی اس مزار کی خدمت سنبھالی ہے.....'' میں نے اُسے تسلی دی۔

''تم فکر نہ کرو۔ ہم دونوں مل کر سارا انتظام سنبھال لیں گے..... ویسے تم یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے.....''

''فائن آرٹس پڑھ رہا تھا۔ ڈگری مکمل کر لی تھی اور دنیا کا سب سے بڑا پینٹر آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ مگر نہ جانے میرے اندر کی بے چینی کیوں ختم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اچانک کہیں اتفاقاً سلطان بابا سے ملاقات ہوگئی تو ان کے پاس کچھ سکون ملا۔ انہوں نے مجھے پیشکش کی کہ میں چاہوں تو تجرباتی بنیادوں پر کچھ عرصہ مزار کی خدمت کر کے دیکھ لوں..... دل لگ جائے تو ٹھیک ورنہ واپسی کے راستے کھلے رہیں گے ہمیشہ..... تو اس طرح میں یہاں تک پہنچ گیا.....'' اُس کی داستان سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس راہِ عشق پر اُٹھے قدموں کے لئے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

کچھ دیر میں سارا مزار جاگ چکا تھا اور آنے والے عرس کی وجہ سے ہر شخص مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ سارا دن اس بھاگ دوڑ میں گزر گیا۔ عصر کے بعد مزار کے باہر چند بڑی گاڑیاں اور پیچھے ایک صحرائی ٹرک جسے یہاں کی مقامی بولی میں کیکڑا کہا جاتا تھا، آ کر رُکیں اور عملے نے باہر والے مزدوروں کی مدد سے پلاؤ، زردے اور قورمے کی دیگیں اتار کر مزار کے لنگر خانے میں پہنچانا شروع کر دیں۔ عبداللہ نے مجھے بتایا کہ یہ سارا انتظام اور روزانہ کے لنگر کا اہتمام بڑی سرکار کی حویلی کے نوکر کرتے ہیں۔ بڑی سرکار خود بھی وقتاً فوقتاً حاضری دیتی ہیں اور خود تمام کاموں کی نگرانی کرتی ہیں۔ مجھے فقیرے کی بات یاد آ گئی۔

''مگر مجھے تو پتہ چلا تھا کہ ان کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ کیا وہ یہ انتظامات سنبھالنے میں اپنی ماں کا ہاتھ نہیں بٹاتا.....؟''

''کون..... سکندر سائیں..... نہیں..... اُسے ان مزاروں اور درگاہوں سے کوئی دلچسپی نہیں..... بلکہ میں نے سنا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کو وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ اپنی ماں کو بھی کبھی یہاں نہ آنے دے۔ مگر تابعدار بیٹا ہے۔ ماں کے سامنے بولتا نہیں۔ کیونکہ شاید اسے ماں کے دکھ کا اندازہ ہے اور وہ جانتا ہے کہ چھوٹے بیٹے کی موت کے بعد اس کی ماں اندر سے بالکل ہی ٹوٹ چکی ہے.....''

مغرب سے پہلے مزار پر چراغاں روشن کر دیا گیا۔ سینکڑوں دیئے اور جلتے بجھتے برقی قمقمے روشن ہوئے تو صحرا کی ریتلی لہروں پر دور سے یہ مزار پانی پر بہتا کوئی شکارہ دکھائی دینے لگا۔ مجھے عبداللہ کو عبداللہ کہنے میں جانے کیوں جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس سے اجازت لے کر مزار سے باہر نکل آیا جہاں فقیرا تانگے والا پہلے سے میرے صبح کے بلاوے کی وجہ سے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔

''کہاں جاؤ گے سائیں لوگو..... بازار سے کچھ لانا ہے تو مجھے بتا دیا کرو۔ میرا ایک آدھ پھیرا تو لگ ہی جاتا ہے دن میں یہاں، میں لا دیا کروں گا سامان..... اس طرح تمہارا کرایہ بھی بچ جائے گا.....'' میں مسکرا دیا۔

''نہیں..... تمہیں کرایہ دینے کے لئے ہی تو بلایا ہے یہاں..... اب تو میں تمہارے تانگے پر ہی جایا کروں گا شہر.....'' فقیرا بھی میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔

''واہ..... دل کے بادشاہ لگے ہو سائیں جی..... چلو پھر ایک نرخ طے رہا۔ میری یہ تانگے کی سواری آج سے تمہاری..... اور تمہاری دعائیں میری۔ بولو..... کیا بولتے ہو.....''

تانگہ سڑک پر دوڑتا رہا اور کچھ ہی دیر میں ہم شہر کی فصیل سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے فقیرے سے ''گل مہر'' نامی ہوٹل چلنے کا کہا مگر وہ اس نام کی کسی جگہ سے واقف نہیں تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا مگر مجھے ظہیر کی زبان سے نکلا یہی نام یاد آ رہا تھا۔ فقیرے نے بازار میں ایک آدھ جگہ رُک کر دوکان داروں اور راہگیروں سے پتہ پوچھا اور پھر ہلکا سا اشارہ مل ہی گیا مگر بتانے والے کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر اُبھرتی حیرت کے آثار میں نے دور سے ہی نوٹ کر لیے۔ فقیرا بھی کچھ عجیب سی شکل بنائے تانگے پر سوار ہوا۔

''پرانے شہر کی طرف گلی میں تھا یہ ہوٹل۔ پر اب سنا ہے کہ بند ہو گیا۔ مگر وہ تو بڑا فسادی علاقہ ہے سائیں لوگو۔ ذرا ذرا سی بات پر چاقو چھریاں چل جاتی ہیں وہاں۔ ادھر تو دن میں بھی شریف آدمی جانے سے ڈرتا ہے۔

تمہیں یقین تو ہے ناں تمہارے دوست نے اسی جگہ کا پتہ دیا تھا تمہیں....."

میں نے فقیرے کو پیشکش کی کہ وہ چاہے تو مجھے دور سڑک کنارے ہی اتار دے۔ میں آگے خود جگہ تلاش کرلوں گا مگر فقیرے نے میری بات ان سنی کردی۔ وہ قصبے کا ایسا علاقہ تھا جہاں سے سرحد پار جانے والے انسانی اسمگلروں نے اپنے خودساختہ اڈے قائم کر رکھے تھے۔ اور وہ انتہائی شدید خطرہ مول لے کر غیر قانونی طور پر لوگوں کو سرحد پار کروایا کرتے تھے۔ پچانوے فیصد لوگ سرحدی باڑھ کے قریب ہی دوسری جانب سے کی گئی فورسز کی فائرنگ سے وہیں سرحد پر اپنی جان گنوا دیتے تھے اور سو میں سے بمشکل پانچ افراد بارڈر پار کر پاتے۔ مگر ان کا انجام بھی سدا نامعلوم ہی رہتا تھا۔

فقیرا مجھے یہ ساری اطلاعات دیتے ہوئے "تڑی پار" نامی اس علاقے میں داخل ہوگیا جہاں کبھی گل مہر نام کا ہوٹل موجود تھا۔ مجھے اب سمجھ آرہا تھا کہ ظہیر نے خاص طور پر اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا تھا ملنے کے لئے۔ شاید اس کے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی خیال ہوگا۔

گلی سنسان پڑی ہوئی تھی اور کچھ آوارہ کتے دونوں اطراف بنی دوکانوں کے نیچے بنے لکڑی کے تھڑوں تلے لیٹے اونگھ رہے تھے۔ تانگے کی ٹپ ٹپ سن کر ان میں سے ایک دو نے سر اٹھا کر بیزاری سے ہماری طرف دیکھا۔ اور کچھ نے رسم ملاقات کے طور پر بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ سڑک پر لگے اکا دکا لیمپ پوسٹ حیرت انگیز طور پر ابھی تک روشن تھے۔ کبھی کبھی کسی علاقے کا نظام بگڑتے بگڑتے بھی کافی وقت لیتا ہے۔ شاید انسان کو ماضی اس لئے بھی سنہرا دور محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس دور میں کم آباد علاقوں کے لئے بھی بہترین انتظامات کا سسٹم موجود تھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک سال خوردہ اور زنگ زدہ سا بورڈ لگا ہوا تھا جس کے اوپر ادھ مٹے "ہوٹل گل مہر" کے الفاظ جھلک رہے تھے۔ اس ویران صحرائی شہر میں ایسا نام جانے کس نے اور کیا سوچ کر رکھا ہوگا۔ شاید ہمارے رکھے گئے نام بھی کہیں نہ کہیں ہماری ناکام حسرتوں کا عکس ہوتے ہیں۔

میں نے فقیرے کو وہیں ٹھہرنے کا کہا اور خود آگے بڑھ کر عمارت کے قدیم دروازے پر دستک دی جس کی کھڑکیوں کے شیشے اخباری کاغذ لگا کر اندھے کیے جا چکے تھے۔ تیسری دستک پر کچھ ہلچل ہوئی اور کسی نے اندر سے پھٹے ہوئے اخبار کی درز سے باہر جھانکا۔

"کون ہو تم.....؟"

"میرا نام عبداللہ ہے۔ مجھے ظہیر نے یہاں کا پتہ دیا ہے....."

ظہیر کا نام سنتے ہی اندر سناٹا سا چھا گیا اور پھر کسی نے قلت میں لکڑی کا بنا پھاٹک نما دروازہ کھول دیا۔ "اندر آجاؤ....."

میں اندر داخل ہوا تو ایک ہال نما کمرے میں گول میزوں پر بہت سی کرسیاں اوندھی پڑی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹر پر لٹکے جالے اور چاروں طرف مٹی اور ریت میں اٹی ہوئی چیزیں اپنا فسانہ خود سنا رہی تھیں۔ اندر صرف وہی ایک شخص تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ پکی عمر اور پکے رنگ کا وہ شخص جس کے چہرے پر زخم کا ایک بڑا سا نشان تھا۔ ابھی تک شک کی نظر سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

''تم ظہیر کو کیسے جانتے ہو.....؟''

''ہم دونوں سنٹرل جیل میں سزائے موت کے قیدی تھے.....فرار ہوتے وقت ظہیر نے اس جگہ کا پتہ دیا تھا۔ اور تاریخ کے حساب سے اُسے آج کی رات یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔''

ہوٹل والے نے گہری سانس لی جیسے اس کی الجھن دور ہوگئی ہو۔''اچھا.....تم ان میں سے ایک ہو۔ میرا نام سارنگا ہے۔ ظہیر سے بہت پرانی یاری ہے.....دعا کرو وہ خیریت سے ہو.....''

میں نے گھبرا کر سارنگا کی طرف دیکھا''مگر وہ ہے کہاں.....آیا کیوں نہیں.....؟''

''میں خود بھی پچھلے تین دن سے ظہیر کا انتظار کر رہا ہوں یہاں۔ ورنہ یہ ٹھکانہ تو کب کا چھوڑ دیا ہے میں نے.....مخبری کر دی تھی کسی نے اور ایف۔ آئی۔ اے والے پیچھے پڑ گئے تھے.....'' سارنگا اپنی دھن میں بولتا رہا۔ میری توقعات کے مطابق وہ انسانوں کا اسمگلر ہی نکلا جسے وہ اپنا دھندہ کہتا تھا۔ ظہیر سے اس کی ملاقات ایسے ہی کسی جرم کی پاداش میں ملی جیل یاترا کے دوران ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ دوستی میں بدل گئی۔ ظہیر سارنگا کے ذریعے ہی اپنی تنظیم کے مفرور کارندوں اور ساتھیوں کو سرحد پار بھجوایا کرتا تھا.....سارنگا نے مجھے بتایا کہ ظہیر کئی مہینوں سے پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے اور اس کے جرائم کی فہرست میں ایک اور قتل کا اضافہ ہو چکا ہے۔

ظہیر نے جیل سے فرار کے بعد اپنے شہر پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنی تنظیم کے اس بڑے کے معمولات کی خفیہ نگرانی شروع کروادی جس کی وجہ سے خود ظہیر اور اس جیسے کئی دوسرے نوجوان قوم پرستی کے نام پر جرم کی دنیا میں دھکیل دیئے گئے تھے۔ ظہیر اپنے گھر واپس تو نہیں جا پایا کیونکہ اس طرف دن رات پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا مگر اس نے کسی طرح سے اپنے گھر والوں کے لئے گزر بسر کا مستقل انتظام کروادیا۔ اور اس کا واحد مقصد اب اپنی تنظیم کے بڑے کو اس کے گناہوں کی سزا دے کر اپنے جیسے اور کئی گھرانوں کے چراغ بجھنے سے بچانا تھا۔

تنظیم میں ظہیر کے وفاداروں کی اب کوئی کمی نہیں تھی جو ظہیر کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہتے تھے۔ ظہیر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جلد یا بدیر تنظیم کے بڑے یا پولیس کے اہلکار اس کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے لہٰذا اس کا جلد از جلد اپنا کام ختم کر کے اس شہر سے نکل جانا ضروری تھا۔ آخر کار ہفتوں نگرانی کے بعد ظہیر کے لیے چوبیس گھنٹوں میں سے اس لمحے کا انتخاب آسان ہوگیا جب وہ موت بن کر اپنے پرانے باس یا مالک کے سر پر نازل ہوسکتا تھا۔ ظہیر کے ساتھیوں نے بڑی ہوشیاری سے بڑے کے گھر صبح منہ اندھیرے دودھ پہنچانے والے گوالے کے بھیس میں ظہیر کو بنگلے کے اندر تک جانے کا راستہ دے دیا۔ اصل گوالہ اپنی موٹر سائیکل سمیت اس وقت تک ان کی تحویل میں رہا جب تک ظہیر اپنا کام ختم کر کے بڑے کے گھر سے نکل نہیں گیا۔

چند گھنٹوں میں ہی شہر میں کہرام مچ گیا کہ لسانی تنظیم کے عظیم لیڈر کو صبح سویرے کسی نے اسی کے گھر میں گھس کر اُسی کی خواب گاہ میں گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ظہیر کے وفاداروں نے اسی شام اسے شہر سے کسی اور جانب نکالنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ ظہیر نے سارنگا کو قریباً ایک ماہ قبل اطلاع دے دی تھی کہ وہ سرحد پار کرنے سے قبل اپنے جیل کے ساتھیوں سے سارنگا کے ہوٹل پر آ کر ملے گا مگر وہ اب تک یہاں نہیں پہنچا تھا۔ سارنگا کو بھی ظہیر کی فکر ستا رہی تھی مگر میرا دل ظہیر کے کھاتے میں ایک اور جرم کا بوجھ لکھے جانے پر بجھ سا گیا تھا۔ کسی ایک

بڑے کو ختم کر دینے سے تنظیمیں بھلا کب ختم ہوتی ہیں، پہلے کی جگہ دوسرا لیڈر آجاتا ہے۔ اور ان کا شیطانی کاروبار چلتا رہتا ہے۔ ظہیر نے اپنا ذاتی بدلہ تو لے لیا تھا مگر اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ انہی گلی محلوں کی فیکٹری سے تنظیم کو اس جیسے مزید کئی ظہیر نہیں مل جائیں گے کسی نئی آگ میں جھونکنے کے لئے۔ میں نے بھاری دل سے سارنگا کو اپنا پتہ ازبر کروادیا کہ وہ ظہیر یا کندن کسی کے بھی یہاں پہنچنے کی صورت میں مجھے اطلاع کر دے۔ سارنگا مزار کا پتہ سن کر زور سے ہنس پڑا۔

"اچھا..... تو مجذوب کا بہروپ بھر کر چھپتے پھر رہے ہو؟ چلو اچھا ہے..... یہاں شہر میں ملنگوں اور مجاوروں کی بھرمار ہے۔ کئی جوگی منڈلاتے پھرتے ہیں۔ تم پر کسی کو شک نہیں ہوگا....."

میں جواب میں چپ رہا۔ سارنگا کو یہ بتا کر حاصل بھی کیا ہوتا کہ قانون نے مجھے بری کر دیا ہے۔ اور وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ یہ مجذوبیت، یہ مجاوری اور یہ جوگ ایک بہروپ ایک سوانگ ہی تو تھا جو میں اپنے وجود پر طاری کیے نہ جانے کب سے بھٹک رہا تھا۔ اگر میرے اس حلیے میں ذرا سی بھی سچائی ہوتی تو مجھے کب کا دائمی سکون نصیب ہو چکا ہوتا۔ مگر میں تو آج بھی اتنا ہی دربدر اور خاک بسر تھا۔

فقیرے نے مجھے واپس مزار کے مرکزی دروازے پر اتارا تو نصف شب ڈھلنے کو تھی۔ حجرے میں میرا ہم نام میرے لئے پریشان سا بیٹھا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے۔ میں تو تمہاری تلاش میں خود شہر کی طرف نکلنے والا تھا۔ سب خیر تو ہے ناں ساحر؟ تمہاری ملاقات ہوگئی تمہارے دوست کے ساتھ.....؟"

میں نے اسے تسلی دی۔ "نہیں..... وہ ابھی یہاں نہیں پہنچا۔ تم آرام کرو..... رات بہت ہوگئی ہے....." وہ سمجھ گیا کہ میں اس وقت زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دونوں کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔

صبح سویرے پھر سے وہی بھاگ دوڑ اور چہل پہل شروع ہوگئی۔ مگر آج مجاوروں کے انداز میں کچھ افراتفری سی تھی۔ پتہ چلا کہ حویلی سے بڑی سرکار خود آرہی ہیں انتظامات دیکھنے کے لئے۔ اس لئے محکمہ اوقاف کے سرکاری ملازم بھی بڑھ چڑھ کر ہر کام میں حصہ لے رہے تھے۔ عصر سے پہلے باہر سے کوئی اہل کار بھاگتا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ بڑی سرکار کی سواری آچکی ہے۔ میں بھی دوسرے مجاوروں کے ساتھ ایک قطار میں بیٹھا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ آنے والی شخصیت کا رعب اور دبدبہ اس سے پہلے مزار کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ نذر و نیاز کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا اور مختلف خادم ادھر اُدھر لنگر بانٹتے پھر رہے تھے۔ بڑی سرکار نے خود کو ایک بڑی سی روایتی کڑھائی والی سیاہ چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شاید ان کے کچھ منشی بھی تھے جو رجسٹر پکڑے پیچھے بھاگے چلے آرہے تھے اور بڑی سرکار کی ہدایات نوٹ کر رہے تھے۔

وہ قریب بیٹھے عبداللہ کے قریب پہنچیں اور سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہی کیا "بڑے سائیں جی کب واپس لوٹیں گے جوگیو..... وہ مجھ سے وعدہ کر گئے ہیں کہ وہ میری بہو کو دعا دینے ضرور آئیں گے ایک بار میرے غریب خانے پر....." عبداللہ نے انہیں تسلی دی۔

"جی..... اگر سلطان بابا نے وعدہ کیا ہے تو پھر وہ ضرور آئیں گے....." بڑی سرکار مطمئن ہو کر پلٹنے لگیں

تبھی ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

''نئے لگتے ہو یہاں سائیں لوگ..... پہلے کبھی دیکھا نہیں.....؟''

میں نے جھکی نظروں سے جواب دیا ''جی..... قسمت یہاں لے آئی ہے..... شاید یہیں کا دانہ پانی لکھا ہے لکھنے والے نے کچھ دن کے لئے۔'' بڑی سرکار کی زبان سے بے ساختہ نکلا ''بسم اللہ'' اور پھر وہ آگے بڑھ گئیں۔

جس طرح پل بھر میں وہ میرے انجان چہرے سے پہچان گئیں کہ میں اس علاقے میں نوارد ہوں اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ مزارات اور درگاہوں کے انتظامات سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ اور یہی ایک اچھے منتظم کی نشانی ہوتی ہے۔ شام ڈھلنے سے پہلے سارا لنگر تقسیم ہو چکا تھا۔ تبھی عبداللہ میرے پاس آیا۔

''ساحر..... تم بھی دو گھڑی کہیں بیٹھ کر چند لقمے حلق سے نیچے اتار لو..... میں دیکھ رہا تھا..... تم نے سارا دن کچھ نہیں کھایا.....''

''میں کھا لوں گا..... تم فکر نہ کرو..... ویسے ایک بات پوچھوں..... اگر تمہیں برا نہ لگے.....'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں پوچھو..... میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہاں آنے سے پہلے تمہارا نام کیا تھا.....؟'' عبداللہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ عبداللہ سے پہلے بھی میرا کوئی اور نام رکھا تھا ماں باپ نے.....؟''

''بس یونہی..... ایک خیال سا آیا کہ جب سلطان بابا نے تمہیں اس نئی دنیا میں داخل ہونے کی دعوت دی تو ضرور تمہارا نام بھی بدل دیا ہوگا.....؟'' وہ ابھی تک مجھے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں..... تم ٹھیک سمجھے ہو..... یہاں آنے سے پہلے میرا نام وقاص تھا..... مگر اب عبداللہ ہی میرا نام ہے.....'' اتنے میں بیرونی دروازے کی طرف شور سا مچ گیا۔ مجذوب اور ملنگ تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

''کیا ہوا..... سب خیر تو ہے..... یہ شور شرابہ کیسا ہے.....؟'' تبھی کسی نے دور سے نعرہ لگایا۔ ''مبارک ہو..... سلطان بابا لوٹ آئے ہیں واپس.....'' سبھی کے چہروں پر رونق سی پھیل گئی اور سبھی مرکزی دروازے کی طرف استقبال کے لئے لپکے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑکا جیسے ابھی پسلیوں کا پنجر توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ اور پھر کسی کی مانوس آواز سنائی دی۔

''آ گئے تم..... اس بار بہت انتظار کروایا تم نے عبداللہ میاں.....'' میں نے گھبرا کر اُدھر دیکھا۔ یہ آواز تو میں پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔ بھیڑ چھٹی تو وہ میری نظروں کے سامنے کھڑے تھے۔

..........*

باب31

بھیڑ چھٹی تو وہ ٹھیک میرے سامنے کھڑے تھے" آ گئے تم..... اس بار بہت انتظار کروایا تم نے عبداللہ میاں....." وقاص نے ان کی زبان سے میرے لئے عبداللہ کا لفظ سنا تو وہ تڑپ کر میری طرف پلٹا" تم....." مگر میری نگاہیں تو اُسی شفق سراپے میں گڑھی ہوئی تھیں اور پھر یکا یک میرے صبر کے سارے بندھ ایسے ٹوٹے کہ سب جل تھل ہوگیا۔ میں تڑپ کر اُن کے سینے سے جالگا اور رو رو کر میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ سارے مجذوب اور مجاور ہکا بکا سے کھڑے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھے تسلی دیتے رہے۔

"چلو اب بس کرو رونا۔ سارے آنسو آج ہی بہا دو گے کیا؟ ابھی زندگی پڑی ہے، ان آنسوؤں کو آگے کے لئے سنبھال رکھو۔ کام آئیں گے تمہارے۔" وہ مجھے تھپکتے رہے۔

میں نے ان کی طرف دیکھا۔" آپ کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر حاکم بابا۔ سلطان بابا کے جانے کے بعد آپ نے پلٹ کر کبھی میری خبر ہی نہیں لی۔ میں کتنا تنہا ہوگیا تھا ان کے بغیر۔ آپ نے کبھی پوچھا تک نہیں....."

سب خبر تھی مجھے تمہاری۔ بہت لمبا جوگ کاٹ کر آرہے ہو تم۔ بڑی تکلیف اٹھائی ہے تم نے..... سات سال کا بن واس کم نہیں ہوتا۔ مگر تم نے نبھا ڈالا۔ اور میرا تمہارا یہیں ملنا طے تھا۔ وہ کیا کہتے تھے سلطان بابا" جب جب..... جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے..... اور تم سے زیادہ بھلا اس بات کو اور کون سمجھتا ہوگا۔ مگر یاد رکھو..... کھیل ابھی ختم نہیں ہوا..... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں....."

میں نے حاکم بابا کو کتنے سال بعد دیکھا یہ اب مجھے خود بھی یاد نہیں تھا۔ مگر وہ ہو بہو سلطان بابا کی طرح دکھائی دینے لگے تھے۔ اسی لئے جب کمال صاحب نے نواب پور میں مجھے ان کا حلیہ بتایا تو میں یہی سمجھا تھا کہ جیسے سلطان بابا ہی ہوں گے۔ اور یہاں وقاص اور دیگر مجاور بھی انہیں سلطان بابا کے نام سے ہی پکار رہے تھے۔ گویا سلطان بابا کے جانے کے بعد ان کا عہدہ اب حاکم بابا کو سونپ دیا گیا تھا۔ عبداللہ، ناظم، حاکم اور سلطان..... یہ سب اُس متوازی دنیا کے عہدے ہی تو تھے اور مجھ جیسے تو شاید اپنی پوری زندگی عبداللہ کے ابتدائی درجے کی رمز سمجھنے میں ہی بتا دیتے ہیں..... مگر پھر بھی عبداللہ نہیں بن پاتے۔

وقاص ابھی تک حیرت کے جھٹکے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ حاکم بابا نے اسے اور مجھے رات کے کھانے کے بعد حجرے میں بلالیا۔" بھئی اب تم دونوں بھی ایک دوسرے کے ساتھ اپنا مکمل تعارف کروا ہی دو۔ ساحر اور وقاص کی پہچان سے باہر نکل آؤ....."

پھر حاکم بابا نے خود وقاص کو میری کہانی مختصراً سنادی اور وہ دم سادھے بیٹھا سنتا رہا۔ حاکم بابا نے اپنی بات ختم کی تو کمرے میں بہت دیر تک سناٹا طاری رہا۔ پھر بابا نے ہی خاموشی توڑی اور وقاص سے کہا:

''میں نے تمہیں یہ آپ بیتی اس لئے سنائی ہے کہ تمہیں اس رستے کی مشکلات اور خاردار راہوں کی سختی کا اچھی طرح اندازہ ہوجائے۔ تمہارے پاس اب بھی وقت ہے۔ تم نے آزمائشی طور پر یہاں رہنا قبول کیا تھا، تمہاری آزمائش پوری ہوئی۔ تم چاہو تو واپس لوٹ جاؤ۔ آگے کا سفر اور بھی مشکل ہوگا۔'' وقاص نے بابا کے ہاتھ پکڑ کر چوم لئے۔

''نہیں سلطان بابا..... عبداللہ کی آپ بیتی سن کر میرے اندر کا یقین اور بھی پختہ ہوگیا ہے کہ یہی راستہ مجھے میری منزل تک لے کر جائے گا۔ آپ حکم کریں..... مجھے آگے کیا کرنا ہے.....'' حاکم بابا نے سامنے پڑی ایک کاغذ کی بند پرچی اٹھائی اور وقاص کے ہاتھ میں تھمادی۔

''اس پرچی پر تمہاری نئی تعیناتی کی جگہ کا نام درج ہے، تم صبح وہاں کے لئے رخت سفر باندھ لینا۔ یہاں بڑے عبداللہ کی تعیناتی ہوگئی ہے..... یعنی ساحر میاں کی.....'' میں نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا۔ گویا میں یہاں آیا نہیں تھا۔ بلایا گیا تھا، اور یہ بلاوہ جیل سے فرار کے وقت ظہیر کی زبانی مجھ تک پہنچا تھا۔ یا شاید کرمے کی بیرک میں بند ہوتے وقت..... یا شاید اس سے بھی پہلے جب سنی کے قتل کے الزام میں مجھے اس جیل میں ڈالا گیا تھا۔ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ یا بقول حاکم بابا یہ سارا سفر ایک آزمائش تھی جس سے مجھے ہر حال میں گزرنا ہی تھا۔ اور انہی کے بقول ابھی میرا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔

اگلی صبح وقاص ہم سب سے رخصت ہو کر اپنی نئی منزل کی طرف کوچ کر گیا اور اس کے حصے کی خدمت میرے ذمے آگئی۔ تبھی بڑی سرکار کا نمائندہ منشی ایک لمبی سی فہرست لیے میرے پاس چلا آیا ''وہ سائیں جی..... بڑی سرکار نے یہ لسٹ بھیجی ہے۔ آپ دیکھ لیں ذرا..... کوئی کمی بیشی ہو سامان میں تو ابھی بتا دیں تاکہ میں شام تک وہ بھی بھجوا دوں۔''

''ٹھیک ہے..... میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔'' میں یہ کہہ کر مڑنے لگا تبھی حاکم بابا بڑی سرکار کے دوسرے منشی سے باتیں کرتے دکھائی دیئے۔ ''اچھا ٹھیک ہے تم اپنی مالکن کو تسلی دینا اور یہ بھی کہہ دینا کہ دعا کے لئے کسی مقام تک پہنچنا ضروری نہیں ہوتا۔ میرا رب بڑا کریم ہے۔ دل سے مانگی دعا ہزاروں میل دور سے بھی اثر کرتی ہے۔ مگر ان کی یہی ضد ہے تو میں آجاؤں گا کسی دن..... بری کب ہے تمہارے چھوٹے مالک اور ان کے چھوٹے بیٹے کی۔''

منشی نے سر جھکا کر ادب سے جواب دیا ''اسی ہفتے..... جمعرات کے دن ہے سائیں جی.....'' حاکم بابا کے اطمینان دلانے پر بڑی حویلی کے ملازم سلام کر کے پلٹ گئے۔ میں جانے کس سوچ میں وہیں کھڑا خود سے حاکم بابا کی طرف دیکھتا رہا۔ تبھی ان کی نظر مجھ پر پڑی تو میں ہڑبڑا سا گیا۔

وہ میری چوری پکڑے جانے پر مسکرا دیئے ''کیا سوچ رہے ہو..... یہی ناں کہ میں حاکم سے سلطان ہوگیا اور تم وہیں پڑے عبداللہ ہی رہے..... بڑے نالائق نکلے..... ہے ناں.....'' مجھے ہنسی آگئی۔

''نہیں..... نہ آپ کے سلطان بننے پر شک ہے اور ناں ہی اپنے عبداللہ رہنے پر کوئی اعتراض..... بس

مجھے آپ کو دیکھ کر سلطان بابا کی بہت یاد آتی ہے..... بار بار میرا ذہن بھٹک جاتا ہے....." وہ میرے قریب آئے اور میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جانتا ہوں تمہاری ہر الجھن کو..... واقعی..... میرے اور تمہارے سلطان تو بس وہی ایک تھے۔ اور تم اپنے ذہن کو اتنا نہ الجھایا کرو، تمہارے لئے میں آج بھی وہی حاکم بابا ہوں اور تم مجھے اسی نام سے پکارا کرو....." وہ پلٹ کر جانے لگے مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گئے۔

"اور ہاں..... یاد رکھو..... یہ دنیاوی رتبے، عہدے اور اعزاز بس اسی دنیا تک محدود ہیں۔ اوپر والے کا ترازو تو صرف اس پلڑے کی طرف جھکتا ہے جہاں تقویٰ زیادہ ہو اور کون جانے اس کے نزدیک باہر دروازے پر بیٹھا وہ فقیر یا تپتی دوپہر میں سڑک کے پتھر کوٹتا کوئی مزدور زیادہ متقی ہو۔ دعا کرو وہ ہم سب کا پردہ رکھے۔"

مزار پر عرس کی تیاریاں آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھیں۔ رات تک تمام سجاوٹ کا سامان بھی ٹھیکیدار نے پچھلے احاطے میں اُتروا دیا۔ رات کو اچانک حاکم بابا کو جیسے کچھ خیال سا آیا۔ "ستو عبداللہ میاں..... صبح بڑی حویلی سے پانی بھیجا تھا ان کی مالکن نے دم کے لئے۔ میں رات کو پڑھ کر پھونک دوں گا۔ تم صبح کسی مجاور کے ساتھ جا کر دے آنا۔ میرا نکلنا کچھ مشکل ہے۔ پہلے یہ کام وقاص میاں کے ذمے تھا۔ اب کچھ عرصہ یہ ڈیوٹی تمہیں انجام دینی ہوگی....."

"جی بہتر..... میں فجر کے بعد لے جاؤں گا....." میں حجرے سے باہر صحن میں نکل آیا۔ آسمان پر کچھ شریر بادلوں کے ٹکڑے چاند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ پھر وہ لاکھ چاند سے چھپتے..... چاند کہیں نہ کہیں سے انہیں ڈھونڈ کر چھو ہی لیتا۔ پھر چاند کے چھپنے کی باری آتی وہ کسی سنگی ساتھی بادل کی اوٹ میں جا کر چھپ جاتا۔ مگر بھلا چاند اور چاندنی بھی کسی سے چھپ پائے ہیں۔ بادل شور مچاتے ہوئے آتے اور چاند کو دبوچ لیتے۔ میں بہت دیر تک یہ کھیل دیکھتا رہا۔ ہر آہٹ پر مجھے یوں محسوس ہوتا کہ شاید سارنگا کا کوئی پیغامبر ظہیر یا کندن کی کچھ خبر لے کر آیا ہوگا۔ یونہی سوتے جاگتے صبح ہوگئی اور فجر کی نماز کے بعد حاکم بابا نے پڑھا ہوا پانی دے کر دو فقیر میرے ساتھ بڑی حویلی تک رہنمائی کے لئے روانہ کر دیئے۔ ہم تینوں جب شہر کی فصیل سے اندر داخل ہوئے تو دھوپ کی پہلی کرنیں منڈیروں کو چوم رہی تھیں۔ بڑی سرکار کی حویلی بازار سے کچھ پرے اور رہائشی علاقوں سے ہٹ کر ایک بڑے عظیم الشان قلعے کی مانند وسیع و عریض میدان میں تنہا کھڑی تھی۔ اُونچی فصیلیں، چمکیلے برج، دیوہیکل چوبی دروازے، ڈیوڑھیاں اور غلام گردشیں۔ بیرونی دیواروں میں بنے اونچے روشن دان اور اندر صحن کی چار دیواری میں چنی بہت سی کھڑکیاں..... ایک جانب چھوٹے صحن میں کچھ مور پر پھیلائے کھڑے حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

میں دروازے سے ہی ان کی امانت پکڑا کر واپس لوٹ جانا چاہتا تھا مگر دربان کو جب پتہ چلا کہ ہمیں حاکم بابا نے بھیجا ہے تو وہ بنا کچھ بات کیے ہی اندر بھاگ گیا اور کچھ ہی دیر میں ہمیں اندر آنے کا حکم مل گیا۔ بیرونی احاطے سے ہم اندرونی صحن میں داخل ہوئے تو دائیں جانب ایک شاندار اصطبل بنا دکھائی دیا جہاں حویلی کے رکھوالے اور سائیس اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی نہلائی اور مالش میں مصروف تھے۔ صبح کی اجلی دھوپ گھوڑوں کی چمکیلی جلد سے ٹکرا کر مزید سنہری ہوئی جاتی تھی۔ اگلے ہی لمحے کچھ ٹرینر Trainer چند سدھائے ہوئے مگر خونخوار شکاری کتوں کی ایک ٹولی

کو صبح کی ٹہلائی کے بعد واپس لاتے دکھائی دیئے۔ کتوں کی لمبی زبانیں ہانپ لی وجہ سے باہر لٹک رہی تھیں۔ وہ اجنبیوں کو دیکھ کر شدید غرانے اور بھونکنے لگے اور ان کی رال ٹپکاتی تھوتھنیاں اور زہریلے لمبے دانت ہماری جلد میں پیوست ہونے کے لیے مچلنے لگے۔ قیمتی شاندار گھوڑے، اعلیٰ نسل کے کتے اور نئی امریکن شکاری بیچیں، اس احاطے کی ہر شے سے ''شوقِ امارت'' جھلک رہا تھا۔ اور نوکروں کی آپس میں بات چیت سے یہ بھی پتہ چل رہا تھا کہ یہ سب ان کے سائیں سکندر کے مشغلے تھے۔ رئیس اور جاگیردار گھڑ سواری نہ کریں اور دن بھر شکار نہ کھیلیں تو پھر وہ کیا کریں؟

وقت کاٹنے کے لئے بہرحال کچھ تو مشغلہ ضروری ہے اور اُس سے زیادہ امیر بھلا اور کون ہوگا جسے وقت کاٹنے کے لئے کسی مصروفیت یا دل پسند مشغلے کی ضرورت ہو اور وہ اُسے میسر بھی ہو۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے بتیس پینتیس برس کا ایک جوان شخص حویلی کے بیرونی احاطے میں عربی گھوڑے پر سوار آندھی طوفان کی طرح داخل ہوا۔ آس پاس خدمت گاروں کی فوج اور اسی طرح کے شکاری کتوں کی ایک ٹولی اور ان کے رکھے بھی ساتھ ساتھ دوڑتے، دھول اڑاتے آتے دکھائی دیئے۔ کسی نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''ایک طرف ہوجاؤ جوگیو..... سکندر سائیں آرہے ہیں.....'' ہم تینوں ایک جانب ہوگئے۔ سکندر کے چہرے پر نوکدار مونچھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں اور اس نے لمبے بوٹوں کے ساتھ کلف لگا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے اس نے ایک نخوت بھری نگاہ ہم پر ڈالی۔

''یہ فقیر یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں اتنی صبح.....؟ کچھ دے دلا کر رخصت کروائیں.....''

منشی نے جلدی سے آگے بڑھ کر ادب سے کہا۔ ''شالا جیویں سائیں..... وہ انہیں بڑی سرکار نے بلایا ہے..... بڑی درگاہ سے آئے ہیں یہ جوگی سائیں.....'' سکندر کا موڈ مزید خراب ہوگیا۔

''ایک تو یہ ماں جی بھی ناں..... پتہ نہیں کیوں ان بھکاری، ملنگوں اور فقیروں کے چکر میں الجھی رہتی ہیں ہر وقت یہ اتنے پہنچے ہوئے تو آج اس حال میں نہ ہوتے..... ان کو جو چاہیے یہیں سے دے کر فارغ کرو..... اور دوبارہ میں انہیں یہاں نہ دیکھوں.....'' منشی نے گڑبڑا کر ہماری طرف دیکھا۔ میرے ساتھ آیا ایک مجذوب یہ سن کر جلال میں آگیا اور زور سے بولا۔

''سچ ہے کہ درویش کا راستہ علت، قلت اور ذلت سے ہو کر گزرتا ہے..... لڑکے..... تمہارے پاس جو تھا وہ تم نے بانٹا..... جو ہمارا نصیب تھا..... وہ ہمیں ملا.....'' یہ کہہ کر فقیر ایک جھٹکے سے مڑا اور میں نے بھی ان دونوں کی تقلید میں قدم بڑھا دیئے..... سکندر کو شاید اپنی ہی جاگیر میں کسی مفلوک الحال فقیر سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ غصے میں تڑپ کر پلٹا مگر تب تک ہم احاطے سے باہر نکل چکے تھے۔ میں نے واپسی پر دم کیا ہوا پانی گیٹ کے دربان کو پکڑا دیا کہ وہ اسے اپنی مالکن تک پہنچا دے۔ مزار پہنچے تو حاکم بابا صحن میں ہی بیٹھے اپنے ہاتھ میں پکڑی لکڑی کی بڑی سی تسبیح پھیرتے نظر آئے۔ جلالی مجذوب کے تیور دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''بہت غصے میں ہو رجب علی..... اپنے اندر بڑھکتی اس دھونکنی کو کبھی سرد بھی پڑنے دیا کرو.....'' رجب علی نامی فقیر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ابھی بہت کچا ہوں مرشد سلطان..... کوئی باہر سے کوئلہ ڈالے تو تپ جاتا ہوں..... آپ کو سب خبر ہے..... لیکن پھر بھی چپ چاپ پلٹ آیا ہوں.....'' حاکم بابا مسکرائے۔

"جا کر ٹھنڈا پانی پی لو..... تمہاری جلد بازی نے آج کسی سے کسی کی ملاقات ٹال دی..... چلو خیر..... جو ہوا سو ہوا..... جاؤ جا کر آرام کرو....." میں ان دونوں کی اس مشکل گفتگو سے کچھ اخذ نہیں کر سکا۔ جانے حاکم بابا کس ملاقات کا ذکر کر رہے تھے۔ کہیں وہ ظہیر کی مجھ سے ملاقات کا اشارہ تو نہیں دے رہے تھے۔ میرے ذہن میں گرہیں بڑھتی گئیں۔ مگر اس سے پہلے کہ میں حاکم بابا سے کچھ پوچھتا، بیرونی دروازے پر ہلچل سی مچ گئی اور کچھ ہی دیر میں بڑی سرکار گھبرائی اور بڑبڑائی سی اپنی کچھ خاص نوکرانیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ پریشانی ان کے چہرے سے جھلکتی دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے آتے ہی حاکم بابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"معاف کرنا سائیں جی..... میرا بڑا بیٹا اب اتھرا ہے..... ضدی ہے اور منہ پھٹ ہے..... جیسے ہی مجھے پتہ چلا کہ اس نے گھر آئے جوگی سائیوں کے ساتھ زبان درازی اور بدتمیزی کی ہے..... میں دوڑی چلی آئی..... اس کی ماں کی خاطر اس کے بچے کو معاف کر دیں..... بہت سمجھاتی ہوں میں اُسے..... مگر اُسے ان سب معاملات پر یقین نہیں ہے..... دعا کریں کہ اس کا دل بھی بدل جائے..... تعظیم کا سلوک بھر جائے اس کے اندر بھی....."

حاکم بابا نے سر اُٹھا کر بڑی سرکار کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ..... اگر یہ جوگی فقیر اتنے ہی کرامت والے ہوتے تو خود اپنی حالت نہ بدل لیتے.....؟ یوں در بدر بھٹکتے پھرتے....." بڑی سرکار کا رنگ پیلا سا پڑ گیا۔

"آپ کو ہماری باتوں کا سب پتہ ہے سائیں جی..... اس کی گستاخی معاف کر دیں..... بہت ڈانٹا ہے میں نے اسے..... ناراض ہو کر آئی ہوں اس سے..... اور جب تک وہ درگاہ کے فقیروں سے معافی نہیں مانگے گا..... میں بھی اسے معاف نہیں کروں گی....." حاکم بابا مسکرائے۔

"ایک ماں اپنے بیٹے سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی..... جانتا ہوں..... تم بھی مجبور ہو..... چلو جانے دو..... بیٹے پر سختی نہ کرو..... عزت اور احترام دل سے ہوتا ہے..... زبان سے نہیں..... اور فقیر کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے..... یہ دنیا ہی فقیر سے ناراض رہتی ہے....." بڑی سرکار کچھ دیر پشیمان سی بیٹھی رہیں اور پھر واپس پلٹتے ہوئے دو لمحے کو رُکیں۔

"آتی جمعرات میرے چھوٹے بیٹے کی برسی ہے سائیں جی..... سکندر کی بدتہذیبی کے بعد اب تو میں شرم کے مارے آپ کو گھر بلاوے کا نیوتا بھی نہیں دے سکتی۔ مگر میں اپنی نُوں (بہو) کو لے کر آؤں گی مزار پر نذر نیاز کے لئے..... بڑی صبر والی اور شاکر بچی ہے وہ..... چاہتی تو عدت کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر واپس جا سکتی تھی۔ یہ حق بھی تھا اس کا اور اختیار بھی..... مگر صرف میری خدمت کے لئے وہ واپس نہیں پلٹی..... اب تو میرے سکندر کے دونوں بچے بھی اس کے بغیر ایک پل چین سے نہیں بیٹھتے..... آپ دعا دو گے اُسے تو میرا دل بھی ہلکا ہو جائے گا....." بڑی سرکار اپنی آنکھوں میں ابھرتے آنسو چھپا کر وہاں سے آگے بڑھ گئیں۔

میں سارنگا کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار ہی کرتا رہا اور جمعرات بھی آ گئی۔ ایک عجیب سی بے چینی میری رگوں میں یوں دوڑتی پھر رہی تھی جیسے کسی ان ہونی کا ظہور بالکل سر پر ہو۔ عصر کے بعد بڑی سرکار کی حویلی سے شاندار کھانا اور دیگر نذر بھی پہنچ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے آج بڑی حویلی والے اپنی تمام عمر کی نذر اور نیاز ایک ہی دن میں

لٹا دیں گے۔ کچھ دیر میں بڑی سرکار کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی۔ میں بھی دیگر فقیروں کے ساتھ حاکم بابا کی ہدایت کے مطابق ایک قطار میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ مزار کے صحن میں دو قطاریں آمنے سامنے بنائی گئیں تھیں جن میں بیٹھے جوگی ملنگوں کو بڑی سرکار اور ان کی بیوہ مگر باپردہ بہو کپڑے، لتے، راشن اور جانے کیا کیا بانٹ رہی تھیں۔ دونوں کے ساتھ کچھ نوکرانیاں اور منشی بھی تھے جو الگ الگ قطاروں میں تحائف تقسیم کر رہے تھے۔ بڑی سرکار میری قطار کے مخالف بنی قطار میں جب کسی کو کچھ دیتیں تو دعا کی درخواست بھی کرتیں جبکہ میری قطار ان کی بہو کے حصے میں تھی جو چپ چاپ یہی عمل جاری رکھے ہوئے تھی اور دھیرے دھیرے نذر نیاز کا عمل آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک تیز ہوا چلی اور مٹی کے ایک بگولے نے صحن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سامان بکھرنے سے بچانے کی کوشش میں افراتفری سی مچ گئی اور تبھی ایک ماموش سی خوشبو نے میرے اندر بھی ایک طوفان سا برپا کر دیا۔ میں نے گھبرا کر سر اٹھایا، بڑی سرکار کی بہو سیاہ شال میں خود کو لپیٹے اور چہرہ چھپائے مجھے کچھ بانٹنے کے لیے میرے قریب پہنچی تو ہماری نظر ملی اور پل بھر میں سب بھسم ہو گیا، میں حجاب سے جھانکتی وہ دو آنکھیں کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے سامنے زہرہ کھڑی تھی۔

..........*

باب32

باہر چلی آندھی کا بگولہ تو پل بھر میں صحن سے چھٹ کر کسی اور جانب نکل گیا تھا مگر میرے اندر چلتے طوفان پھر کبھی نہ رُک پائے۔ بڑی سرکار کی بیوہ بہو جب قطار میں بیٹھے ملنگ فقیروں کو نذر بانٹتی میری جانب بڑھ رہی تھی تبھی ایک مانوس خوشبو نے میرے سارے حواس معطل کر دیئے تھے اور جب میری نظر اُٹھی تو یکا یک سب بھسم ہو گیا۔ ایک بجلی سی گری جو میرے تن من کو جلا کر سُوا کر گئی۔

ہاں..... وہی تو تھی..... زہرہ..... بڑی سرکاری کی بیوہ بہو کے روپ میں سوگ کے سیاہ لباس میں ملبوس..... زہرہ کی نظر مجھ سے ٹکرائی تو اس کے اندر بھی شاید وہی برق گری اور مجھے دیکھ کر وہ اپنے حواس پر قابو نہ پا سکی اور دوسرے ہی لمحے لہرا کر زور سے زمین پر گر گئی۔ آس پاس نوکرانیوں اور جہاں دیدہ خادماؤں میں شور مچ گیا۔

''چھوٹی سرکار بے ہوش ہو گئیں..... شالا رب خیر کرے.....'' عورتیں زہرہ کو سنبھالنے کو لپکیں اور اس کے چاروں طرف فوراً پردے کے لئے چادروں اور دوپٹوں کی ایک دیوار سی بنا دی گئی۔ بڑی سرکار سب چھوڑ چھاڑ حواس باختہ سی دوڑی چلی آئیں۔ سب حیران تھے کہ یکا یک اُن کی چھوٹی ''رکو کیا ہو گیا ہے۔ دیگر مرد حضرات کے ساتھ میں بھی اُٹھ کر صحن کے ایک جانب چلا آیا مگر خود میری حالت بھی دگرگوں تھی۔

پچھلے چند دن میں کئی بار مجھے اس علاقے پر آئی ہر آفت کی خبر کے ساتھ یہ خبر بھی سنائی جاتی رہی کہ بڑی سرکار کی حویلی مصائب اور مشکلات کی زد میں رہتی ہے۔ مگر مجھے کیا پتہ تھا کہ زہرہ ہی اس حویلی کی وہ بدقسمت بہو ہے جو رخصتی کے بعد اپنے سسرال میں بارات کی واپسی سے پہلے بیوہ ہو چکی تھی۔ جس کے سہاگ کو راستے میں گھات لگائے دشمنوں نے ہمیشہ کی نیند سلا دیا تھا۔ میرے دل اور دماغ میں جھکڑ چلتے رہے۔ آس پاس کا شور خاموشی میں بدل گیا اور میرے اندر سناٹے چلانے لگے۔ بڑی حویلی کے مکین مزار سے جا چکے تھے مگر مجھے ابھی تک ہر طرف سے زہرہ کی دو آنکھیں جھانکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ گویا یہ بھید چھپا تھا میرے بختیار آباد کے بلاوے میں۔؟

میں تیزی سے حاکم بابا کے حجرے میں داخل ہوا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے جانے کس سوچ میں گم تھے۔ آہٹ ہوئی تو مجھے دیکھ کر بولے ''کیوں خود کو اتنا ہلکان کرتے ہو۔ دو گھڑی اس ذہن کی چرخی کو آرام بھی دے دیا کرو.....'' میرا جی چاہا کہ زور زور سے چلاؤں مگر میری آواز میں لرزش تھی۔

''آپ جانتے تھے کہ وہ بڑی حویلی کی مکین ہے..... یہیں رہتی ہے..... پھر بھی آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا..... کیوں بھیجا اس کے گھر پانی دے کر.....؟ اتنا مضبوط نہیں ہوں میں..... پھر مجھ پر اتنا بوجھ کیوں ڈالا گیا.....''

حاکم بابا نے ایک گہری سانس لی۔

''جو لکھا ہوتا ہے..... وہی ہوتا ہے..... تم کہیں بھی جاتے..... تمہیں یہیں آنا تھا۔ اور یہ طے تھا.....'' وہ آدھی بات کہہ کر خاموش ہوگئے اور ہمیشہ کی طرح باقی آدھے سوال میرے دماغ کی دیواروں سے ساری رات ٹکراتے رہے۔ صبح تک آس پاس چاروں طرف یہ بات پھیل چکی تھی کہ بڑی حویلی کی بہو کمزوری یا کسی ذہنی دباؤ کی وجہ سے مزار میں گر کر بے ہوش ہوگئی۔

ایک بار پھر سے سکندر کے چھوٹے بھائی بابر کی دھوم دھام سے ہوئی شادی اور بارات کے گھر واپس اترنے سے پہلے کے قصے زبان زدِ عام ہونے لگے۔ بڑی سرکار کے دو ہی بیٹے تھے سکندر اور بابر۔ اور دونوں ہی جیسے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سکندر خودسر، ضدی، غصیلا اور جاگیردارانہ صفات سے بھرپور ایک سخت گیر جوان تھا تو دوسری طرف اس سے پانچ سال چھوٹا بابر نرم دل، ہنس مکھ اور زندگی کی ہر خوبصورتی سے پیار کرنے والا لڑکا جس کی زیادہ تر تعلیم ملک سے باہر ہوئی تھی۔

سکندر کو شروع سے ہی باپ نے جاگیر کے معاملات اور زمین کے جھگڑوں میں الجھائے رکھا اس لئے اس کے مزاج پر بھی وہی رنگ غالب آگیا۔ باپ کی موت کے بعد بڑی سرکار نے ہی دونوں بیٹوں کو باپ بن کر پالا تھا اور دونوں بیٹے ماں کی بات کو دنیا کا آخری حکم سمجھ کر بجالاتے تھے۔ سکندر کی بیوی دو چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اگلے جہاں سدھاری تو حویلی سنسان سی ہوگئی۔ سکندر اپنے بچوں کے اوپر سوتیلی ماں کا سایہ پڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا بڑی سرکار نے کسی میلاد کی تقریب میں زہرہ کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئیں۔ وہ کسی ضروری کام سے بابر کے ساتھ بڑے شہر آئی ہوئی تھیں اور اسی روز ان کی واپسی بھی طے تھی۔ مگر زہرہ کو دیکھنے کے بعد ان کے سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بابر کے لئے اس سے بہتر کوئی اور لڑکی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چپ چاپ کسی سوچ میں ڈوبی اور خاموش سی زہرہ بڑی سرکار کے دل کو بھا گئی تھی۔

انہوں نے شہر میں اپنا قیام مزید بڑھایا اور اپنے میزبانوں کے توسط سے زہرہ کے گھر والوں تک رسائی حاصل کر کے ہی دم لیا۔ زہرہ کے ماں باپ نے بھی تھوڑی سوچ بچار کے بعد حامی بھر لی۔ مگر نہ جانے کیوں بڑی سرکار کو زہرہ کے چہرے پر کبھی خوشی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ انہوں نے بارہا بہانوں سے زہرہ سے اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش بھی کی مگر زہرہ کا ہمیشہ ایک سادہ اور چھوٹا سا جواب ہوتا تھا کہ جو اس کے ماں باپ کی مرضی..... وہی اس کی خوشی ہے۔ البتہ زہرہ کے ماں باپ نے صاف دلی سے بڑی سرکار کو یہ بات دوسری ہی ملاقات میں بتا دی تھی کہ اس سے پہلے بھی زہرہ کا رشتہ کہیں طے ہو چکا تھا مگر حالات کی کروٹ کی وجہ سے وہاں بات پکی نہیں ہو سکی۔ اسی لئے زہرہ آج تک اس صدمے کے اثر سے باہر نہیں نکل سکی۔

بڑی سرکار کو زہرہ کے گھر والوں کی یہ صاف گوئی بھی بہت پسند آئی اور اس نے زہرہ کے ماں باپ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اور اس کا بیٹا بابر زہرہ کو اتنا پیار اور خوشیاں دیں گے کہ اس کے ماضی کا ہر زخم چند دن میں ہی بھر جائے گا۔ مگر کون جانتا تھا کہ یہ رشتہ خود ان سب کے لئے عمر بھر کا ایک روگ بن جائے گا۔ یہاں ماں چھوٹے بیٹے کی شادی

کی تیاریوں میں مشغول تھی اور وہاں بڑا بیٹا سکندر علاقے میں اپنی خاندانی دشمنیاں بڑھانے میں مصروف تھا۔

کہتے ہیں زَن ہو زَر ہو یا زمین، تصرف کے لئے خراج مانگتی ہے۔ سکندر کو اپنی شکارگاہوں کے لئے مزید زمین کی ضرورت تھی اور وہ زمین کی جنگ میں سب جائز سمجھتا تھا۔ علاقے کے معمولی پٹواری سے لے کر اوپر اعلیٰ اہلکاروں تک سبھی سکندر کا دم بھرتے تھے کیونکہ سکندر نے انہیں نوازنے میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اور انہی دنوں صحرائی ہرن کی ایک نئی شکارگاہ سرکاری کاغذات میں اس کے نام منتقل ہوئی تھی۔ مگر جن زمینداروں سے یہ زمین چھین کر سکندر کے حوالے کی گئی تھی وہ اتنی آسانی سے اپنے علاقے میں سکندر کی اجارہ داری قبول کرنے والے نہیں تھے۔ بات زمین کے راکھوں کی مار پیٹ اور لڑائی جھگڑے سے بڑھتے بڑھتے جانی دشمنی میں بدل گئی۔ وہ لوگ سکندر سے زمین کا قبضہ تو نہیں چھڑا سکے مگر انہوں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی تھی۔ اور اب انہیں کسی مناسب موقعے کی تلاش تھی اور پھر وہ موقع آ ہی گیا جب سکندر اپنے دشمنوں کے وار سے کچھ لمحوں کے لئے غافل ہو گیا۔ چھوٹے بھائی کی شادی کا موقع ہی ایسا تھا کہ بڑے بھائی کو ہزار ذمہ داریاں نبھانا پڑتی ہیں۔ لیکن سکندر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا دشمن اتنا اوچھا وار کرے گا۔

سیانے کہتے ہیں کہ دشمنی کرو تو دشمن بھی ظرف والا چنو مگر سکندر کے دشمن بڑے کم ظرف نکلے اور انہوں نے بابر کی شادی والے دن وہاں گھات لگائی جہاں سے بارات کو واپس علاقے میں داخل ہونا تھا۔ نشانہ سکندر تھا مگر شکار بابر بنا۔ گولی سیدھی اس کے دل کے پار ہو گئی اور بڑی سرکار کی حویلی ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی۔

بہو بیوہ بن کر حویلی کے آنگن میں اُتری اور اس کی باقی تمام عمر عدت میں تبدیل ہو گئی۔ بڑی سرکار کے اس لاڈلے کی آج برسی منائی جا رہی تھی۔ جو پھر سے ایک نئے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مگر یہ حادثہ بھی کتنا عجیب تھا کہ جن پر بیتا وہی کچھ بتانے سے قاصر تھے، مجبور اور لاچار تھے۔ میں یہاں رات بھر جاگتا رہا اور وہاں اس کی جانے کیا حالت ہو گی۔ راستے، فاصلے، رشتوں کی دیواریں..... جانے کیا کچھ حائل تھا ہمارے درمیان۔ میں اگر اس کے بارے میں کچھ پوچھتا بھی تو کس سے پوچھتا.....؟ اور حاکم بابا..... وہ تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسے اطمینان سے اور انجان بنے بیٹھے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں بے چین سا حجرے سے صحن اور صحن سے دروازے تک چکر کاٹتا رہا۔

صبح سے دوپہر ہوئی اور دوپہر بھی سہ پہر میں ڈھل گئی۔ مگر بڑی حویلی سے کوئی خبر نہیں آئی، اور آتی بھی کیوں.....؟ بڑی حویلی والوں کو بھلا کیا خبر تھی کہ یہاں کوئی ہر آہٹ پر کان لگائے بیٹھا ہے۔ آخر عصر کے بعد میری وحشت نے بھی جواب دے دیا اور میں حاکم بابا کے پاس آ بیٹھا۔

''کیا آپ آج پانی دم کر کے نہیں بھیجیں گے وہاں.....؟'' وہ میری حالت پر مسکرا دیئے۔

''جسے آنا ہو گا..... وہ خود آئے گا..... جسے غرض ہو گی..... وہی دَر کھٹکھٹائے گا.....'' اب میں انہیں کیا بتاتا کہ غرض تو میری اپنی تھی۔ صرف اتنی سی خبر کی غرض کہ کیا وہ اب ٹھیک ہے؟ اس کی حالت سنبھل گئی ہے یا نہیں لیکن مجھے تو یہاں کوئی جھوٹی تسلی دینے والا بھی نہیں تھا۔ سو رات بھر میں خود ہی کو دلاسے دیتا رہا کہ جہاں اس نے اتنے

بڑے بڑے طوفانوں کا سامنا کیا ہے، حالات کی اس آندھی کو بھی وہ جھیل جائے گی، مگر وہ کتنی کمزور اور لاغر ہو چکی تھی۔ ہجر قحط بن کر ٹوٹے تو اس سے بڑا قحط دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔ فجر کی اذان ہوئی تو مجھے دعا کا خیال آیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم عام طور پر نماز کے بعد ہی بیٹھ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ جیسے کوئی مزدور مشقت کے بعد اپنی مزدوری مانگ رہا ہو۔ حالانکہ دینے والے نے تو کبھی بھی کسی خاص وقت کی شرط نہیں رکھی۔ میں نے بھی سلام پھیر کر کسی مزدور کی طرح معاوضے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔ مگر میرے سارے لفظ کہیں کھو گئے تھے۔

کبھی کبھی ہم چاہتے ہیں کہ بس نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھیں اور اوپر والا سب سمجھ جائے۔ خاموشی سے بڑی دُعا اور کیا ہوگی؟ اور اسے ہمارے لفظوں کی ضرورت ہی کب ہے بھلا؟ وہ تو دل کی بولیاں سمجھتا ہے..... مَن کی خاموش بولیاں..... تبھی کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''چلو عبداللہ..... کوئی تمہارا پوچھ رہا ہے.....'' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید چپ کی دعا لفظوں کی منت سے زیادہ تیز سفر کرتی ہے۔ میں لپک کر صحن میں پہنچا تو دور پیڑ تلے کوئی خود کو گرم کھیس کی بکل میں چھپائے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنے چہرے سے تھوڑی سی چادر ہٹائی۔

''مجھے سارنگا نے بھیجا ہے۔ تمہارے لئے اس کے پاس کوئی ضروری پیغام ہے۔ دوپہر کے بعد سارنگا کے اڈے پر آ جانا..... لیکن ذرا احتیاط سے..... آج کل بارڈر والی سائیڈ پر بڑا پہرہ ہے..... اور ہاں..... دھیان رہے..... تمہارے آنے جانے کی یہاں کسی کو خبر نہ ہو.....'' وہ اپنی بات ختم کر کے لپک جھپک وہاں سے نکل گیا۔ شاید سارنگا کے پاس ظہیر کی کوئی خبر آئی ہوگی۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

''یا میرے رب..... ظہیر اور کندن خیریت سے ہوں.....'' میرے دل نے پھر خدا سے بات کی۔ ہم اپنی تمام زندگی میں سب سے زیادہ باتیں خود سے کرتے ہیں یا پھر اپنے رب سے..... کیونکہ یہ دونوں ہی ہمارے اندر کہیں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔

دوپہر تک ہر آہٹ پر میری نظر مزار کے بیرونی دروازے کی طرف اُٹھتی رہی مگر مجھے جس کی خیریت درکار تھی، اس کی خبر نہ آئی۔ عصر کے بعد میں چپ چاپ مزار سے نکل آیا۔ باہر اترتی سیڑھیوں سے نیچے ریت کے میدان میں چند تانگے کھڑے تھے مگر فقیرا مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے ایک دوسرے تانگے والے کو بازار چلنے کا کہا۔ دور شہر کے برج اور پیلی عمارتوں کے چوبارے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اور تارکول کی پکی سڑک صحرا کے بیچوں بیچ یوں پڑی تھی جیسے کوئی بل کھاتی کالی ناگن سنہری ریت میں راستہ بناتی رینگ رہی ہو۔ کبھی کبھار دور فاصلے پر لگے اِکا دُکا درخت بھی اپنا ناکافی سایہ بکھیرے کھڑے تھے۔ جیسے کلاس میں سے کسی استاد نے چند شرارتی بچوں کو سزا کے طور پر جماعت سے باہر کھڑا کر رکھا ہو۔ میں نے تانگہ سرحدی بازار سے کافی پیچھے رکوالیا اور اُسے اُجرت دے کر واپس روانہ کر دیا کیونکہ میں ایک بار پھر اُنہی سوالات کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تانگے والے کے جانے کے بعد میں اس طرف بڑھا جہاں سے چند گلیاں پرے سارنگا کا ٹھکانہ تھا۔ عصر ڈھلنے کے بعد شام قریب آ رہی تھی۔ اِکا دُکا کھلی دوکانوں کے سامنے بیٹھے لوگوں نے کچھ حیرت سے میری طرف

دیکھا، میں چپ چاپ سر جھکائے آگے بڑھتا رہا۔ سامنے ہی ریت کا وہ بڑا سا میدان تھا جسے پار کرنے کے فوراً بعد گل مہر ہوٹل والی سڑک شروع ہو جاتی تھی۔ مگر میں ابھی ریت کے پہلے ٹیلے سے نیچے اترا ہی تھا کہ دور سے تین چار شکاری چرکی جیپیں ریت کا طوفان اڑاتی تیزی سے میری جانب لپکتی نظر آئیں۔

جیپوں کے پچھلے حصے کھلے تھے جہاں بندھے اپنی زنجیریں تڑواتے خونخوار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی قریب آتی گئیں۔ گاڑیاں میرے قریب تیزی سے آگے گزر گئیں مگر کچھ دور جا کر زوردار بریک کی آواز کے ساتھ رُکیں اور پھر سب سے اگلی جیپ کسی نے پچھلے گیئر میں ڈال کر ریورس کی۔ دوسری جیپوں سے بھی مسلح محافظ تیزی سے نیچے اترے جنہوں نے ریت اور گرد وغبار کے طوفان سے بچنے کے لئے چہروں پر اپنی سیاہ پگڑیوں سے ہی ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ پہلی جیپ میرے قریب آ کر رُکی تو میں بھی ٹھہر گیا، اندر سے کوئی چلایا۔

''جی سائیں جی..... یہ تو وہی فقیر ہے..... مگر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ ضرور یہ بھی ان لوگوں سے ملا ہوا ہے..... اور اب کارروائی کے بعد بارڈر پار کر کے بھاگنے کی تیاری میں ہے.....'' جیپ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے سکندر باہر نکلا اور میری طرف غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے جھڑک کر بولا:

''تم..... تم وہی ہو ناں جو اُس دن اِسی بھیس میں میری حویلی آئے تھے..... تمہارا اس علاقے میں کیا کام ہے.....؟ تمہیں تو مزار پر ہونا چاہیے تھا.....؟''

میں نے اس کا درشت لہجہ نظر انداز کیا۔ ''میں کسی کام سے آیا ہوں یہاں.....'' میں نے قدم بڑھانے کی کوشش کی تو سکندر کا ایک محافظ میرے راستے کی دیوار بن گیا۔

''سیدھی طرح بتاتے ہو یا کسی اور طریقے سے پوچھوں۔ یہاں صرف ان لوگوں کو کام پڑتا ہے جو یہاں سے فرار ہونے کی فکر میں ہوتے ہیں، ایک فقیر جوگی کا بھلا یہاں کیا کام۔ تم ضرور اسی گروہ میں سے ایک ہو جس نے کل رات میرے ذخیرے کے گوداموں میں آگ بھڑکائی تھی.....''

''نہیں..... تم غلط سمجھ رہے ہو..... میں ایسے کسی بھی گروہ کو نہیں جانتا.....'' میرے جواب پر سکندر مزید بھڑک گیا۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اُٹھا کر ڈالو اسے گاڑی میں اور لے چلو اپنے ٹھکانے پر..... باقی تفتیش اس سے وہیں ہوگی.....''

سکندر کا حکم سنتے ہی تین چار ہٹے کٹے محافظوں نے میری مشکیں کس دیں اور مجھے اٹھا کر ایک کھلی گاڑی کے پچھلے حصے میں پھینک دیا جہاں دو تین کتے بھی زنجیروں سے بندھے غرا رہے تھے۔ مجھے بندھا دیکھ وہ تیزی سے میری طرف لپکے اور ان کے خونخوار جبڑے میری شہ رگ بھنبھوڑنے کے لئے بے تاب ہو گئے مگر زنجیر کی لمبائی ختم ہو جانے کی وجہ سے انہیں بس چند انچ کے فاصلے پر ایک زوردار جھٹکے سے رکنا پڑا۔

میرے اوپر کسی نے کوئی پرانا ٹاٹ یا بوری نما کپڑا ڈال دیا اور مجھے واپسی کے سفر اور راستے کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد کسی بڑے گیٹ کے کھلنے کی آواز آئی اور گاڑی رُک گئی۔ باقی گاڑیاں شاید کسی اور جانب

مڑ چکی تھیں۔ مجھے کسی نے گھسیٹ کر نیچے اتارا اور کھینچتے ہوئے عمارت کے ویرانی حصے کی جانب لے جایا گیا۔ شاید یہ کسی حویلی کا عقبی حصہ یا مردانہ تھا۔ آس پاس چند دیگر محافظ بھی چوکنے کھڑے تھے۔ ایک جانب چند پرانے گیراج بنے ہوئے تھے۔

پھر مجھے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا اور ایک سال خوردہ کمرے سے نیچے جاتے زینے کے ذریعے کسی سیلن زدہ تہہ خانے میں دھکیل دیا گیا۔ تہہ خانے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں اندازے سے دیوار ٹٹول کر وہیں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک کسی گوشے سے ایک آواز اُبھری

''خوش آمدید..... بڑی راہ دکھائی میرے ہم قفس.....'' میں اُچھل پڑا اور میں نے گھبرا کر اس جانب دیکھا۔

..........*

باب33

حالانکہ آواز اتنی بلند نہیں تھی مگر پھر بھی اس اچانک جھٹکے نے میرے حواس معطل کر دیئے ''خوش آمدید..... بڑی راہ دکھائی میرے ''ہم قفس۔'' میں نے گھبرا کر اندھیرے میں جھانکنے کی ناکام کوشش کی ''کون ہو تم.....؟ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا.....'' دوسری جانب سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

''کوشش بے کار ہے۔ اندھیرے کی بصارت سے ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ویسے سوچو تو ایسی نکمی بصارت بھی بھلا کس کام کی جسے دیکھنے کے لئے ہمیشہ روشنی کی ضرورت پڑے..... اب تو دن نکلنے کے بعد ہی اس قید خانے میں روشنی کی کوئی کرن جھانکے گی۔ مغرب ڈھل چکی ہے۔ اور یہاں اس قفس میں قیدیوں کو چراغ کی سہولت مہیا نہیں کی گئی ہے.....'' میرے حواس دھیرے دھیرے بحال ہونے لگے۔

''آپ کون ہیں.....؟ اور یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟''

دوسری جانب پھر ہنسی کی آواز اُبھری۔

''قیدی ہوں تمہاری طرح..... کسی دعوت پر تو آیا نہیں یہاں..... نام مدثر ہے..... شعبہ مائنڈ سائنس (MIND SCIENCES)..... پچھلے کئی سال سے اس شعبے سے منسلک تھا..... البتہ گزشتہ تین مہینوں سے اس تہہ خانے کا مہمان ہوں..... مگر تم کون ہو..... کیا تمہیں بھی علاقے کے جاگیردار نے کسی حکم عدولی کی سزا کے طور پر یہاں لا پھینکا ہے.....''

میں نے ایک گہری سانس لی، گویا دوسرا قیدی بھی سکندر کے عتاب کا شکار بنا تھا۔ میں نے مختصراً مدثر صاحب کو اپنی روداد سنادی۔ تہہ خانے میں ڈھلتی رات کے ساتھ مزید تاریکی چھاتی گئی مدثر کی کہانی بھی مختصر تھی، وہ اپنی ٹیم کے ہمراہ اس صحرا میں سکون کی تلاش اور کسی ریسرچ کے سلسلے میں آیا تھا مگر غلطی سے بچھڑ کر سکندر کے ممنوعہ علاقے کی طرف آنکلا۔ سکندر کے محافظوں نے پکڑ کر اُسے سکندر کے دربار میں پیش کر دیا اور اس پر مخالف جاگیردار کے لئے جاسوسی کا الزام بھی لگا دیا۔ شقی القلب سکندر کے لئے اتنا کافی تھا۔ اس نے مدثر کو قید میں ڈلوا دیا اور کئی بار تشدد کروا کے مدثر سے اس کی حقیقت جاننے کی کوششیں جاری رکھیں مگر مدثر کے پاس بتانے کے لئے صرف ایک سچ ہی تھا جسے سکندر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ ان چھوٹے علاقوں میں اقتدار آج بھی انہی جاگیرداروں اور طاقت ور امراء کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ سینکڑوں ہزاروں میل دور کسی دارالحکومت میں کون حکمران ہے یا ملک اور صوبے کس قانون کے تحت چل رہے ہیں، یہ سب باتیں یہاں فضول اور بے معنی سمجھی جاتی ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی

بھینس والا کلیہ یہیں آ کر صحیح طور پر سمجھ آتا ہے۔ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہ نظام ایسے ہی چلے گا۔ کمزور کو بس ایک آسرا ہے۔ .... یوم حساب کا آسرا۔

ساری رات انہی سوچوں میں گزر گئی، فجر کی اذانوں کے بعد دھیرے دھیرے جب روشنی پھیلنے لگی تو میرا اپنے قفس اور ہم قفس کی صورت سے بھی تعارف ہونے لگا۔ یہ کسی قدیم حویلی کا زندان خانہ یا بڑا سا تہہ خانہ تھا جسے شاید خاص اسی مقصد سے بھی تعمیر کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ دیواروں میں فولادی کنڈے اور ان میں نصب لوہے کی مضبوط زنجیریں ابھی دکھائی دے رہی تھیں۔ انسان کو انسان قید کرنے کا شوق جانے کب پیدا ہوا ہوگا؟ قید کا تعلق تو سرکشی سے ہے، اور شاید "حاکم" کو "سرکش" کبھی نہیں بھاتے۔

تہہ خانے کے کمرے میں ایک جانب غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ پرلی دیوار کی جانب ایک ادھیڑ عمر شخص کسی پرانے بوسیدہ بستر پر لیٹا بے فکر سو رہا تھا۔ قریب ہی کھانے کے کچھ برتن پڑے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں قدرتی روشنی بھی بمشکل چند درزوں اور ایک بند چھوٹے روشن دان کی بدولت جھلکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں مدثر صاحب بھی جاگ گئے۔

"صبح بخیر..... قید خانے کی پہلی صبح مبارک....." میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"اچھی بات یہ ہے کہ قید اور حالات نے آپ کی حسِ مزاح پر کچھ زیادہ اثر نہیں کیا۔ آپ کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اب تک یقیناً اپنے حواس کھو چکا ہوتا....."

وہ بھی دھیرے سے مسکرا دیئے "سچ پوچھو تو یہ بھی حواس باختگی کی ایک نشانی ہے۔ انسان بہت زیادہ مجبور ہو جائے تو خود اپنے آپ سے انتقام لینے لگتا ہے۔ میری یہ حسِ مزاح بھی میرا اپنی بے بسی سے ایک بدلہ ہی تو ہے۔ خود اپنا مذاق اڑاتا ہوں اور خود ہی پر ہنستا ہوں..... ہاں البتہ اس قید نے تنہا بیٹھ کر سوچنے اور ذہن کی اُلجھی ہوئی گتھیوں پر ارتکاز کا اچھا خاصا موقع فراہم کر دیا۔ آزاد دنیا کی بھاگ دوڑ اور نفسا نفسی میں بہت سے اہم نکتے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے یا ہم اُنہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ قید بھی اب کسی جوگی کے جوگ کی طرح لگتی ہے جیسے کوئی سادھو سنت دنیا کی بھیڑ سے کٹ کر دور کسی جنگل بیابان میں تنہا بیٹھے اپنے اندر خود ہی کو تلاش کر رہا ہو....."

میں غور سے ان کی بات سن رہا تھا تبھی اچانک انہوں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی "تم بھی مجھے کوئی سادھو کوئی جوگی ہی لگتے ہو۔ کس کی تلاش میں ہو.....؟" میں ان کی بات کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اوپر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور دو سخت گیر اور خرانٹ قسم کے محافظ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔

"چلو..... تمہیں سکندر سائیں نے یاد کیا ہے....." ان کی گرفت مضبوط اور انداز ظالمانہ تھا۔ اوپر آ کر کمرے سے باہر نکلنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ تو وہی حویلی ہے جہاں میں دوسرے فقیروں کے ساتھ پہلے بھی آ چکا تھا پانی دینے کے لئے۔ دور ایک چھوٹے کھلے دروازے سے وہی اصطبل نظر آ رہا تھا۔

مطلب یہ سکندر کی حویلی کا ہی کوئی پچھلا صحن تھا جہاں تہہ خانے میں اس نے اپنا زندان آباد کر رکھا تھا۔ اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بھی تو اس حویلی کے کسی زنان خانے میں چند دیواروں کے فاصلے پر یہیں

کہیں موجود ہوگی۔ یہ سوچ کر ہی میرے سارے جسم میں ایک عجیب سی جھنجھناہٹ پیدا ہوگئی۔ یہ دیواریں کتنی بے رحم اور ظالم ہوتی ہیں اس کا صحیح اندازہ مجھے اس ایک پل میں ہوا۔ جانے دنیا کی پہلی دیوار کب اور کس نے اٹھائی ہوگی؟ پھر وہی میری ضعیف بصارت..... جو کچھ معمولی ریت اور سیمنٹ کی دیواروں کو چھید کر اس تک نہیں پہنچ پائی۔ کہنے کو ہم انسان کتنے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اوقات صرف اتنی کہ کوئی کھلی آنکھ پر ہاتھ کا پردہ بھی رکھ دے تو ہم نابینا ہو جاتے ہیں۔

سکندر دوسری جانب والے صحن میں شان سے کرسی ڈالے بیٹھا اپنے محبوب کتوں کو سہلا رہا تھا۔ چند محافظ اور نوکر آس پاس چوکنا کھڑے تھے۔ کتوں نے مجھے دیکھا تو ناپسندیدگی سے غرائے۔ جانے ان جانوروں کو اپنے مالک کی پسند ناپسند کا اتنی جلدی کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ سکندر کے ایک اشارے پر وہ میری تکا بوٹی کرنے کے لئے سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سکندر نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں..... اب بولو..... کون ہو تم..... اصلیت کیا ہے تمہاری..... اور وہاں اُس خطرناک علاقے میں کیا کر رہے تھے؟ کتنے بندے سرحد پار کروانے کے لئے لائے ہو تم اپنے ساتھ اس فقیروں کے بھیس میں.....؟'' سکندر نے ایک ہی سانس میں اپنے سارے خدشات بیان کر دیئے۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں اس سرحدی بازار میں اپنے کسی دوست کی تلاش میں گیا تھا۔ میرا نام عبداللہ ہے اور میں کسی غلط ارادے سے یہاں نہیں آیا..... نہ ہی میرا انسانی سمگلروں کے کسی گروہ سے کوئی تعلق ہے..... تم چاہو تو اپنے ذرائع سے تصدیق کروا سکتے ہو.....'' سکندر کو تو ایک فقیر کی زبان سے اتنے سیدھے جواب کی توقع نہیں تھی۔ شاید وہ یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ میں اس کے آگے کوئی منت زاری کروں گا یا معافی اور آزادی کی درخواست پیش کروں گا۔ وہ اس لہجے کا عادی نہیں تھا۔ غلام اور کمی کمین ہمیشہ ہاتھ جوڑے اور جھکے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ سیدھی کمر تو بس حاکموں کو چبھتی ہے۔ کمزور ہمیشہ کمر میں خم کے ساتھ ہی پیدا ہوتے اور اسی خم کے ساتھ مر جاتے ہیں۔ ورنہ یہی حاکم ان کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ سکندر کو بھی میری سیدھی کمر برداشت نہ ہوئی اور وہ غصے میں کڑک کر بولا:

''تصدیق تو میں ضرور کرواؤں گا..... اور یاد رکھو اگر میرا شک صحیح نکلا تو تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا کسی کو۔ یہ کتے دیکھ رہے ہو ناں..... ایک ساتھ یہ چاروں تم پر چھوڑ دوں گا تو چند منٹوں میں تمہاری ہستی ایسے فنا ہو جائے گی کہ جسم سے بہتا خون بھی زمین پر نظر نہیں آئے گا..... اُسے بھی یہ چاٹ چکے ہوں گے..... لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی اصلیت خود مجھے صاف صاف بتا دو..... شاید تمہیں معافی مل جائے۔ پرسوں رات میرے گودام میں آگ لگانے والے دشمن وہاں سے سرحد کی طرف ہی بھاگے تھے۔ مگر میں انہیں اتنی آسانی سے اپنے علاقے سے نکلنے نہیں دوں گا۔ شب کی قبریں یہیں بنیں گی۔ تم سمیت.....''

سکندر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی باہر سے کوئی منشی دوڑتا ہوا آیا ''سائیں جی..... مہمان پہنچ گئے ہیں۔ ابھی قادر ڈرائیور لے کر آیا ہے.....'' سکندر اس کی بات سن کر جلدی سے کھڑا ہو گیا اور جاتے جاتے جلدی میں بولا:

''اس بہروپیے کو ابھی اُس پاگل سائنسدان کے ساتھ بند رکھو۔ اُسے بھی ہماری روٹیاں توڑتے بہت دن ہو گئے ہیں۔ کل ایک ساتھ ان دونوں کا فیصلہ کر دیں گے..... اچھا ہے..... میرے مہمانوں کو بھی تھوڑی دیر تفریح سے

لطف اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا..... پچھلے قبرستان میں دو قبریں تیار کروالو.....'' سکندر کا لہجہ قطعی تھا اور اس کے محافظوں کا ردعمل بھی ایسا تھا جیسے یہ ان کے لئے معمول کی بات ہو۔ مجھے دور حویلی کی منڈیر پر موت کی وہی دیوی بال کھولے بیٹھی مسکاتی نظر آئی جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو۔ ''تمہیں اس صحرا کا بلاوہ میں نے ہی تو بھیجا تھا۔ ٹھیک وقت پر آئے ہو عبداللہ.....''

محافظ مجھے کھینچتے ہوئے دوبارہ اسی قید خانے تک لائے اور اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ مدثر صاحب کسی بڑی درز سے اندر آتی دھوپ کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھ کے پوروں سے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''بڑی جلدی تمہاری جان خلاصی ہوگئی اس جاہل کے دربار سے..... مجھے تو وہ گھنٹوں ایک پیر پر کھڑا رکھتا ہے جب بھی پیشی پر بلاتا ہے..... جانے اسے میری بات کیوں سمجھ میں نہیں آتی کہ میں وہ نہیں ہوں جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے.....''

میں چپ رہا کیونکہ مدثر صاحب کو یہ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا کہ سکندر نے آنے والے روز ہماری قضاء کا منصوبہ تیار کر رکھا ہے..... کبھی کبھی ''ہونی'' سے اچانک ''ان ہونی'' کا واقع ہونا بہتر ہوتا ہے۔ میں نے ان کا دھیان بٹانے کے لیے ان سے پوچھا۔

''آپ نے کل رات ''مصنوعی ذہانت'' کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ بھی ذہنی سائنس (Mind Sciences مائنڈ سائنسز) کی کوئی کڑی ہے۔''

مدثر صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا ''گویا پڑھے لکھے ہو.....؟ چلو اچھا ہے..... اب تم سے بات کرنے میں لطف رہے گا۔ دراصل میرا ماننا تو یہی ہے کہ اس صدی کے نصف یا اس کے ایک آدھ عشرے مزید گزرنے کے بعد مصنوعی ذہانت یا روبوٹ انسانی ذہانت پر فتح حاصل کر چکا ہوگا۔ انسان کا المیہ یہی ہے کہ اسے بے پناہ صلاحیت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ مگر عام انسان نے آج تک اپنے دماغ کا چند فیصد بھی ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ آئن سٹائن اور شاید کوئی ایک آدھ اور ایسا ہوگا جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُس نے دیگر کے مقابلے دو چار فیصد زیادہ اپنے دماغ کی دنیا کو کھنگالنے کی کوشش کی مگر بات تب بھی پانچ یا چھ فیصد سے زیادہ نہیں بڑھ پائی۔ گویا ہم سب اپنے اندر بسی دنیاؤں کا پچانوے 95% فیصد سے زیادہ بنا جانے، بنا کھوجے اور بنا دریافت یا تسخیر کیے اس جہان فانی سے کوچ کر جاتے ہیں۔ ذرا دھیان سے پوچھو تو یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔ ہم قدرت کے دیئے گئے اتنے عظیم خزانے میں سے ڈھنگ کا ایک موتی بھی نہیں چن پاتے اور واپس لوٹ جاتے ہیں..... اور رہی سہی کسر یہ مصنوعی ذہانت کا عفریت پوری کر دے گا۔ انسان پھر سے ایک ابدی غلامی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اور اس بار یہ غلامی خود اس کی اپنی بنائی ہوئی مشینوں کے زیر اثر ہوگی..... جو بہت جلد اس دنیا کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیں گی.....'' بختیار آباد کے اس ویران صحرا میں مدثر صاحب کی بات بہت دور کی کوڑی دکھائی دے رہی تھی لیکن میں ان سے پوچھے بنا نہیں رہ پایا۔

''فرض کریں اگر انسانی ذہن پر عام آدمی کی پوری رسائی ہو جائے اور وہ اپنے سو فیصد ذہن کو استعمال کرنے کے قابل ہو بھی جائے تو بدلے میں وہ کیا پا سکے گا.....؟ خاص طور پر وہ انسان جن کی دنیا ہی اتنی محدود

ہے..... جیسے اسی صحرا کے یہ غلام باسی..... جن کا جینا مرنا برابر ہے.....'' مدثر صاحب پرجوش آواز میں بولے:

''میں کسی مادی حصول کی بات نہیں کر رہا..... کہ وہ تو انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جائے گا۔ زمین کے اندر جو خزانے دفن ہیں اور دریاؤں اور سمندروں کی گہرائی میں کیا کیا چھپا ہے اس کا اندازہ تو وہ سطح پر کھڑے ہی لگا لے گا۔ مگر اُس صورت میں انسان کے لئے یہ سب خزانے اپنی اہمیت کھو چکے ہوں گے۔ تب معاش کی فکر سے انجان ہوگا یہ انسان۔ حیثیت، رُتبے کی دوڑ ہی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ تب اس کے سامنے کہکشاؤں اور دیگر جہانوں کی سیر کھوج اور مشغلہ ہوگا۔ یاد رکھو..... قدرت نے اس کائنات کی ہر حقیقت کا راز اسی انسانی ذہن کی بھول بھلیوں میں چھپا رکھا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک جو کچھ بھی ہے، اس دماغ میں قید ہے۔ جن باتوں کو کبھی الف لیلوی داستان کہا جاتا تھا، وہ اسی دماغ کے ذرا سے استعمال کی بدولت آج کے انسان کا معمول بن چکی ہیں۔ مثلاً وہ جادوئی آئینہ جو دوسرے جہانوں کی سیر کرواتا تھا، وہ اڑن قالین جو پل بھر میں دوسری دُنیا پہنچا دیتا تھا۔ وہ طلسمی چادر جسے اوڑھ کر عمرو عیار اپنے دشمن کی آنکھوں سے اوجھل ہو جایا کرتا تھا۔ وہ جن یا دیو جو کسی کے سینے میں ہاتھ ڈال کر اس کا دل نکال کر کسی کے سینے میں ڈال دیا کرتا تھا۔ یہ سب اور اس جیسی اور کئی ان ہونیاں جنہیں ہوش ربا کہا جاتا تھا آج کے انسان کے لئے بچوں کا کھیل ہی تو ہیں..... اور اگر انسان کبھی اپنے ذہن کی پوری دنیا تسخیر کر پایا تو اسے ان سارے لوازمات کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بات کرنے کا سوچے گا تو لاکھوں میل دُور بیٹھے انسان کے دماغ میں اس کی آواز بنا کسی آلے کے صرف سوچ کی لہروں کی مدد سے گونجنے لگے گی، زمین کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر پلک جھپکتے ہی طے کر لے گا اور وہ بھی بنا کسی سواری کے۔ (ENERGY توانائی کی شکل میں)۔ ذائقہ یا لذت محسوس کرنے کے لئے اسے زبان یا لمس کی ضرورت نہیں رہے گی، ہر ذائقہ اور ہر انسانی لذت صرف اس کی سوچ کے تابع ہوگی۔ طب اور اس جیسے بے شمار شعبے ختم ہو جائیں گے کیونکہ ہر انسان خود ہی بہترین ڈاکٹر، انجینئر، فزیشن، ریاضی دان، کیمسٹ اور سائنس دان ہوگا۔ سارے علم اس کے اندر موجود ہوں گے، زندگی سینکڑوں یا شاید ہزار برس کو تجاوز کر جائے گی۔ دوسرے سیارے انسان کی کالونیاں بن چکی ہوں گی جہاں چاند، مریخ یا زہرہ پر اس کے رشتہ دار رہتے ہوں گے۔ انسان تمام حیوانات اور جانداروں کی بولی بول اور سمجھ سکے گا۔ اور شاید نباتات کی زبان بھی..... بس میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیا سے کیا ہو جائے گا اور یہ جو کچھ میں نے تمہیں ابھی بتایا ہے۔ یہ بھی صرف دس فیصد ہے یا شاید اس سے بھی کم۔ مگر کیا ستم ہے کہ انسان اپنی اس معراج کو پہنچنے سے قبل ہی خود اپنی سہولت اور آرام کی غرض سے اپنی یہ ساری صلاحیتیں مصنوعی ذہانت کی شکل میں مختلف مشینوں کو منتقل کر دے گا اور پھر وہی مشینیں اس عروج کو پہنچ کر ہمیشہ کے لئے انسانوں پر راج کیا کریں گی۔''

مدثر صاحب بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ صبح سے دوپہر اور شام سے رات ہو گئی۔ مگر ہماری باتیں ختم نہ ہوئیں۔ کبھی کبھی کچھ اجنبی ہمیں اجنبی نہیں لگتے۔ بس یوں لگتا ہے کہ ہماری ان سے ملاقات ذرا دیر سے ہوئی ہے۔ رات ہوئی تو اسی گھپ اندھیرے نے تہہ خانے میں ڈیرے ڈال دیئے۔ مجھے مدثر صاحب کی بات یاد آئی کہ یہ اندھیرے بھی ہماری اپنی بصارت کی کمزوری کی وجہ سے ہم پر حاوی ہیں۔ ورنہ یہ لیزر اور نائٹ وژن ڈیوائس (Night Vision Devioces) بھی تو اسی انسانی ذہن کی ایجادات ہیں۔ اور ان دونوں میں استعمال ہونے

والے لینز Lens بھی تو انسانی آنکھ کے قرینے کی ساخت اور نقل پر بنائے جاتے ہیں۔

اگلی صبح ہمارے جلاد روشنی ہوتے ہی ہمارے سروں پر موجود تھے۔ مجھے اور مدثر صاحب کو اسی میدان میں پہنچا دیا گیا جہاں کل سکندر نے مجھے دھمکی دی تھی۔ سکندر اپنے خونخوار شکاری کتوں کے ساتھ وہیں موجود تھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ہم پر ڈالی اور اپنے محافظوں سے پوچھا" کچھ بتایا نہیں ابھی تک ان دونوں نے.....؟"

محافظ خاص نے نفی میں سر ہلایا" نہ سائیں....."

سکندر نے کتوں کی زنجیر ڈھیلی کر دی" کتے چھوڑ دو ان دونوں پر۔" کتے ہمیں دیکھ کر غرائے اور ہم پر جست لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مدثر صاحب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

✱.....✱.....✱

باب34

سکندر کے اشارے پر کتے زور سے غرائے اور ہم پر لپکنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب ہماری شہ رگ اور ان کے خونخوار جبڑوں کے درمیان صرف ایک جست کا فاصلہ تھا۔ مدثر صاحب دھیرے سے بڑبڑائے۔

''کلمہ پڑھ لو عبداللہ..... ہمارا اس دنیا کا سفر بس یہیں تک کا تھا'' میں نے آخری مرتبہ سکندر کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں اس کی آنکھوں میں مجھے قضا تیرتی نظر آئی۔ دفعتہً باہر کچھ ہلچل ہوئی اور کسی محافظ نے دور سے اطلاع دی۔ ''سائیں کے مہمان اس طرف آ رہے ہیں.....''

سکندر نے بھی وہیں سے چلا کر کہا ''ہاں ہاں..... آنے دو انہیں..... میں نے ہی بلایا ہے..... اچھا تماشہ رہے گا اُن کے لئے بھی.....''

اسی لمحے ایک ولیز جیپ دھول اڑاتی احاطے کے اندر داخل ہوئی۔ ریت کے طوفان میں کچھ دیر کے لئے سب اوجھل ہو گیا۔ میری نظر سب سے اگلے شکاری بل ٹیریل کتے کی خونخوار سرخ نظروں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے بھی ایک ایسے ہی صحرا میں چند ایسے ہی کتوں سے پالا پڑ چکا تھا جن کا زہر مہینوں میری شریانوں میں خون کے ساتھ مل کر دوڑتا رہا اور میں نے جنون اور دیوانگی کے جانے کتنے دریا سر کیے تھے۔ لیکن اُس وقت میرے ہاتھ کھلے اور میرے ساتھ میرا ایک ساتھی کالا بھی تھا، مگر آج میں تن تنہا یہاں کھڑا کسی ظالم کا اسیر تھا۔ جو ہمارے تڑپ تڑپ کر مرنے اور ہماری زبان سے بخشش اور معافی کی دہائیاں سننے کے انتظار میں یہ تماشہ سجائے بیٹھا ہنس رہا تھا۔ سکندر کی توجہ ذرا دیر کے لئے اپنے آنے والے مہمانوں کی طرف منتقل ہوئی اور تبھی کوئی حیرت سے چلایا۔

''ارے مولانا..... تم یہاں کھڑے ہو..... اور ہم تمہارے انتظار میں وہاں تین دن سے بیٹھے ہیں۔ کہاں رہ گئے تھے عبداللہ.....'' سکندر کے ساتھ ساتھ میں نے اور مدثر صاحب نے بھی چونک کر آنے والے دو افراد کی طرف دیکھا۔ وہ ظہیر اور سارنگا تھے۔ ظہیر تیزی سے میری طرف لپکا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

''عبداللہ..... میرے یار..... کتنا یاد کیا ہے میں نے تمہیں ان چھ مہینوں میں..... تمہیں بتا نہیں سکتا.....''

سکندر ابھی تک حیرت کے سمندر میں غرق تھا۔

''تم اسے جانتے ہو.....؟''

''ہاں..... یہی تو ہے وہ میرا دوست..... عبداللہ..... جس کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا..... ہماری ملاقات یہاں تمہارے علاقے میں طے تھی..... میں نے سوچا تھا کہ بارڈر پار کرنے سے پہلے میں ایک بار اپنے دوستوں سے

یہیں ملوں گا.....'' پھر ظہیر کو جیسے اچانک خیال آیا۔

''مگر تم یہاں سکندر کی حویلی میں کیا کر رہے ہو اس وقت.....؟''

''میں یہاں بھی ایک قیدی ہوں میرے دوست..... جسے ایک بار پھر سزائے موت سنا دی گئی ہے۔'' ظہیر کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور وہ تڑپ کر سکندر کی طرف پلٹا۔

''کیا.....؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں سکندر.....''

سکندر ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ظہیر بھائی..... یہ بندہ تو یہاں کے مزار میں ایک جوگی کا بھیس بدلے بیٹھا ہوا تھا اور مجھے شک ہے کہ پچھلی رات اسی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر میرے گودام جلائے ہیں.....''

ظہیر نے اپنا سر پیٹ لیا'' اوہ میرے خدا..... اگر مجھے یہاں آنے میں چند لمحے کی دیر ہو جاتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ یہ میرا دوست عبداللہ ہے اور اس نے کوئی بھیس نہیں بدلا..... یہ میرے ساتھ جیل توڑنے سے پہلے بھی ایسا ہی تھا..... اور جیل سے بھاگ نکلنے کے بعد ہم سب نے یہیں ملنے کا منصوبہ بنایا تھا.....'' سکندر پر جیسے حیرت کے نئے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

''کیا.....؟ تو کیا یہ بھی ان سزائے موت کے قیدیوں میں شامل تھا۔ بھئی واہ..... تم تو بڑے چھپے رستم نکلے یار..... سکندر تو جی داروں کا یار ہے..... مگر پھر تم یہ حلیہ بنائے کیوں پھر رہے ہو..... اور فقیروں کے ساتھ اس درگاہ میں کیوں پڑے ہوئے ہو یوں در بدر..... مجھے ذرا سا اشارہ تو کرتے کہ تم ظہیر کے ساتھیوں میں سے ہو..... میں خاص مہمان خانہ تمہارے لئے حاضر کر دیتا..... اور تم نے تو مجھے میرے جگری یار کے سامنے شرمندہ کروا دیا..... اب ساری عمر بھی جرمانہ بھروں تو کم ہوگا۔ ظہیر کے بڑے احسان ہیں مجھ پر.....'' مدثر صاحب حیرت سے منہ کھولے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے تھے۔ سارنگا بھی پریشان سا کھڑا تھا۔ سکندر نے فوراً اپنا مہمان خانہ کھلوانے کا حکم صادر کیا۔

''اچھا چلو اب اندر چل کر بیٹھتے ہیں..... اب ظہیر کی طرح تم بھی میرے خاص مہمان ہو..... جب تک جی چاہے اسی حویلی میں رہو..... تمہاری خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جائے گی عبداللہ.....''

میں نے قدم بڑھانے سے پہلے سکندر سے درخواست کی'' تم نے مدثر صاحب کو بھی بلاوجہ شک میں قید کر رکھا ہے..... میری درخواست ہے کہ انہیں بھی رہا کر دیا جائے..... ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر اور ضروری دواؤں اور خوراک کا بھی جلد از جلد انتظام کیا جائے..... ورنہ میں بھی ان کے ساتھ اسی قید میں رہنا پسند کروں گا.....''

میری بات سن کر ظہیر نے زوردار قہقہہ لگایا'' دیکھا تم نے سکندر..... ایسا ہی ہے یہ میرا یار..... اب یہ اپنے ساتھی کو لیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا..... بولو..... کیا بولتے ہو اب.....؟''

سکندر نے بھی مسکرا کر ہتھیار ڈال دیئے'' چلو تمہاری خاطر یہ بھی سہی..... ویسے مجھے حیرت ہے..... چوبیس گھنٹے میں ہی تم دونوں کے درمیان اتنا مضبوط رشتہ بھی جڑ گیا کہ تم تمام عمر کی قید برداشت کرنے کو تیار ہو گئے.....''

''رشتوں کی مضبوطی یا کمزوری کا تعلق وقت کی کمی یا زیادتی سے نہیں ہوتا۔ یہ تو دل سے دل کا دھاگہ جڑنے

کی بات ہے۔ کبھی پل بھر میں جڑ جاتا ہے اور کبھی تمام عمر ساتھ رہنے کے بعد بھی ٹوٹا رہتا ہے..... ویسے بھی یہ بات ظہیر بہتر جانتا ہے کہ قید اور زندان خانے کے رشتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں....."

سکندر نے مزید کوئی بحث نہیں کی اور ہم کچھ ہی دیر بعد اس کے پرتعیش مہمان خانے میں قیمتی آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وقت کب کیا کروٹ لے لے..... یہ کوئی نہیں جانتا۔ مدثر صاحب کو میں نے آرام کرنے کے لئے مہمان خانے کی خواب گاہ کے دروازے پر چھوڑا تو انہوں نے پل بھر کے لئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں نے زندگی میں بہت کم رشتے کمائے ہیں، تمام عمر پہلے ماں باپ اور پھر بعد میں بیوی بچوں کی تمام ذمہ داریوں سے مبرا اور لاتعلق ہو کر میں ان ویرانوں میں اپنا سکون ڈھونڈتا رہا مگر آج سے پہلے کبھی یہ طے نہیں کر پایا کہ اس سودے میں مجھے گھاٹا زیادہ ہوا یا منافع..... مگر آج اس سوال کا جواب بھی مل گیا ہے مجھے..... میرا ہر خسارہ پورا کر دیا ہے تمہاری دوستی کے اس ایک رشتے نے..... کتنی عجیب بات ہے کہ اڑتالیس گھنٹے قبل میں تمہیں جانتا بھی نہیں تھا مگر اب ایسا لگتا ہے جیسے اڑتالیس صدیوں کا ساتھ ہے میرا اور تمہارا....."

وہ جذباتی ہونے لگے۔ میں نے مسکرا کر انہیں تسلی دی۔ "آپ تو ہم سب سے کہیں زیادہ ذہن کی سلطنت کے بارے میں جانتے ہیں۔ دل اور دماغ کے اپنے قلیے اور اپنے ہی قانون ہوتے ہیں صاحب۔ خاص طور پر گزرتے وقت اور بنتے، جڑتے رشتوں کے بارے میں..... بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم نے اڑتالیس صدیاں ہی ساتھ گزاری ہیں..... جو اڑتالیس گھنٹوں میں ہم پر بیت گئیں۔ ہر آنے والا لمحہ اپنے لیے گزرتے وقت کا پیمانہ خود طے کرتا ہے۔ ایک گھڑی ہمارے دل کے اندر بھی تو نصب ہوتی ہے۔ جو ہمارے جذبوں کی مدت کا تعین کرتی ہے..... آپ اطمینان سے سو جائیں..... شام کو ہماری ملاقات ہوگی....."

میں مدثر صاحب کا ہاتھ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ مہمان خانے کے ڈرائنگ روم میں ظہیر، سارنگا اور سکندر جانے کس بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ سارنگا کی نظر مجھ پر پڑی "لو بھئی ظہیر..... آ گیا تمہارا جگری..... عبداللہ....."

سکندر نے بھی غور سے میری طرف دیکھا "ایک بات کی داد تو دینی پڑے گی تمہارے دوست کو ظہیر بھائی..... میں نے اس کی آنکھوں میں خوف نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی مجھ سے..... ورنہ یہیں اس صحن میں میں نے موت کے خوف سے لوگوں کو لرزتے اور کانپتے دیکھا ہے....." ظہیر نے میری آنکھوں میں جھانکتی بے چینی پڑھ لی اور سکندر اور سارنگا سے معذرت کر کے مجھے لے کر باہر صحن میں آ گیا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"بخت خان اب ہم میں نہیں رہا یار..... تمہیں بگھے کی گرفتاری کی خبر بھی مل چکی ہوگی..... لیکن مجھے کندن کا کچھ پتہ نہیں چلا..... کیا اس نے تم سے رابطہ کیا..... وہ آیا کیوں نہیں..... کہاں ہے وہ....." ظہیر بخت خان کے بارے میں سن کر وہیں صدمے سے ڈھے سا گیا۔ میں نے مختصر لفظوں میں اُسے مہرو کی کہانی اور بخت خان کی موت کے بارے میں بتا دیا۔ ظہیر بہت دیر خاموش رہا۔ پھر میں نے ہی خاموشی توڑی۔

"اب جیل سے باہر صرف ہم تین باقی ہیں۔ میں، تم اور کندن..... سنتوش اور بخت خان کا سفر ختم ہو چکا اور بگھا دوبارہ گرفتار ہو کر کال کوٹھڑی پہنچ چکا ہے..... جانے اب اس کہانی کا انجام کیا ہوگا..... ہم تینوں کی ملاقات کبھی

ہو پائے گی یا نہیں.....؟"

ظہیر نے ایک گہرا سانس لیا "تین نہیں..... دو..... اب یہ ملاقات صرف دو افراد کے درمیان طے تھی....."

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب.....؟" ظہیر کی آواز مجھے کسی کنویں سے ابھرتی محسوس ہوئی۔

"میرے پاس تمہارے لئے دو خبریں ہیں۔ ایک اچھی..... اور ایک بری..... بولو، پہلے کون سی خبر سننا پسند کرو گے.....؟"

"یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ بری پہلے سناؤ گے تو اچھی خبر کا اثر پہلے ہی زائل ہو جائے گا اور اچھی پہلے سناؤ گے تو بری خبر اگلے لمحے ہی سب بھلا دے گی..... غم ہمیشہ خوشی پر حاوی رہتا ہے....." ظہیر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد لب کھولے تو جیسے ماضی کی ایک فلم میری نظروں کے سامنے چلنے لگی.....

اندرون شہر کی تنگ گلیاں، جڑی ہوئی چھتیں اور پر پیچ گلی در گلی راستے۔ بھاگتے شور مچاتے بچے، آسمان پر ڈولتی پتنگیں اور ان میں سے کسی کٹی پتنگ کا بھگوان پورے کی چھتوں پر پھڑ پھڑاتے ہوئے کسی کھلے آنگن کے اونچے درخت کی خشک ٹہنیوں میں اٹکنا، الجھی ڈور کا فضا میں لہرانا اور کسی بچے کے کنڈے میں پھنس جانا۔ کڑاہی میں ابلتا دودھ اور بل کھاتی گرم جلیبیاں۔ مونگ پھلی اور جلتی ریت کی خوشبو اور تندور سے گرم کلچے لے جاتا وہ بچہ..... بگھے سنگھ کا سارا بچپن اس بستی کی انہی گلیوں میں، یہ نیلی، پیلی سرخ اور آسمانی پتنگیں لوٹنے میں گزرا تھا۔ پتنگ بازی ہی اس کا واحد جنون تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، بچپن سے وہ باپ کے ساتھ اس کی چھوٹی سی پتنگوں کی دکان پر ہی تو بیٹھتا آیا تھا۔ گڈی مانجھا، پنا اور ریل..... یہی اس کے بچپن کے کھلونے تھے۔ اسکول میں کبھی اس کا دل نہیں لگا اور چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی وہ تیر کی طرح اپنے باپ کی دوکان کی طرف لپکتا۔

بسنت کے دنوں میں تو جیسے اس کی عید ہو جاتی، دن بھر چھتوں پر ٹاپتے، پیچ لڑاتے اور گڈیاں لوٹتے رات ہو جاتی۔ بگھے کے ہاتھ مانجھے کی وجہ سے ہمیشہ کٹے پھٹے رہتے اور ماں اسے مرہم لگاتے لگاتے رو پڑتی۔ باپ کی موت کے بعد بگھے نے دوکان سنبھال لی اور پھر اس کا اوڑھنا بچھونا ہی پتنگ بازی ہو کر رہ گئی۔ علاقے میں اس جیسا گڈی باز کوئی نہیں تھا اور بگھے کے مانجھے اور فضا میں میلوں دور لگے لمبے پیچوں کی چاروں طرف دھوم مچی رہتی تھی..... ماں اسے گھر بسانے کے مشورے دے کر تھک چکی تھی مگر بگھے نے تو جیسے انہی رنگ برنگی پتنگوں سے اپنا لگن پڑھوا لیا تھا۔

کئی بار گردوارے کے سنت نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے لیے نہیں تو نہ سہی، ماں کی خدمت اور چاکری کے لئے ہی کسی بسنت کور یا کسی گر پریت کو بیاہ کر گھر بسا لے۔ مگر بگھا ہر بار نہیں کر کے ٹال دیتا کہ ماں کی خدمت کے لئے وہ خود ہی کافی ہے اور پھر اس کی ماں کی ضروریات تھیں ہی کتنی.....؟ دو وقت کی روٹی اور صبح شام اپنے پسندیدہ گڑ کی چائے۔ وہ گڑ جو بگھا ہر مہینے بوری دو بوری بخشو پرچون والے کی دوکان سے خصوصی طور پر اٹھوالاتا تھا۔ سرحد پار گاؤں کا بنا ہوا خالص دیسی گڑ۔ جو اس کی ماں کو اتنا پسند تھا کہ اس کے بغیر گھر میں چائے ہی نہیں بنتی تھی۔ بگھے کو بس مہینہ ختم ہونے سے پہلے یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں نئی بوری گودام میں ڈلوانے سے پہلے یہ گڑ ختم نہ ہو جائے۔ تبھی ان دنوں علاقے میں ایک نئے پتنگ باز کے نام کا چرچہ ہونے لگا۔ جو کسی دوسرے علاقے سے

اندرون شہر کی اس بستی میں آبسا تھا۔ جسے لوگ گڈی پہلوان کے نام سے جاننے لگے تھے۔ اُسے پتنگ اور مانجھے کی بڑی پہچان تھی اور اس کا سوتا ہوا مانجھا بھی بڑا سچا تھا۔ رفتہ رفتہ آس پاس گلیوں میں گڈی پہلوان کے گھنٹوں طویل پیچوں اور طنابوں پر اس کی گرفت کے قصے اتنے مشہور ہوئے کہ بگھے تک بھی اس نئے پتنگ باز کی شہرت پہنچ گئی۔

مگر ایک کچھار میں دو شیر اور ایک میان میں دو تلواریں بھلا کب سمائی ہیں۔ بگھے نے گڈی پہلوان کو پیچہ لڑانے کا چیلنج دے دیا اور ہر گلی محلے میں تانگے پر بیٹھے ڈھول والے نے چیخ چیخ کر منادی کرادی کہ آنے والی جمعرات بستی کے دو بڑے پتنگ بازوں میں سے کوئی ایک ہی پتنگ بازی کا سلطان بن کر اپنی چھت سے اترے گا۔ مقابلے کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور دن رات دونوں طرف کے کارکن مانجھا سوتنے، شیشہ کوٹنے، رنگ ابالنے اور پنے اور پھرکیاں لپیٹنے میں مصروف دکھائی دینے لگے۔ دونوں طرف کے ڈھولی سرِشام ہی ڈھول پیٹ پیٹ کر اپنے اپنے کھلاڑی کا جی بڑھانے پہنچ جاتے اور پورا ہفتہ محلے میں حلوہ پوری حلیم اور زردے کی دیگیں بانٹی جاتی رہیں۔ بگھے اور گڈی پہلوان نے جی کھول کر خرچہ کیا اور آخر کار مقابلے کا دن آپہنچا۔ اس روز آسمان پر اور کسی گڈی باز کی گڈی کو ہوا میں غوطے مارنے کی اجازت نہیں تھی اور ظہر کے بعد بگھے اور گڈو پہلوان کی پہلی پتنگ نے اڑان بھری تو ڈھول، سیٹیوں اور تالیوں کی آواز نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

مقابلہ تین پیچوں کا تھا پہلا پیچہ دو گھنٹے بعد بگھے نے سات پنے اور پھرکیاں ختم ہونے کے بعد جیت لیا۔ عصر سے پہلے دوسرا پیچہ گڈی پہلوان کی پتنگ نے ایک الٹا غوطہ کھا کر اور بگھے کی کنیاں کاٹ کر اپنے نام کرلیا۔ دونوں طرف سے داد تحسین اور نعروں کا ایسا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اب تیسرا اور آخری پیچہ شروع ہو چکا تھا۔ مگر پیچہ تھا کہ طویل سے طویل تر ہوتا جارہا تھا۔ دونوں کے دیو ہیکل بڑے گڈے آسمان میں اب صرف ایک چھوٹے نقطوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ڈور کے پنے ختم ہونے کو آئے، پھرکیاں خالی ہوگئیں مگر پیچہ تھا کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مغرب کا اندھیرا چھانے لگا۔ بڑے بوڑھوں نے دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مقابلہ اگلے روز پر ٹال دیا جائے مگر اب بات آر یا پار تک پہنچ چکی تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے والے بھی تیزی سے ادھر کی خبر اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر پہنچا رہے تھے۔

''گڈی پہلوان نے کہا ہے کہ بگھا ابھی بچہ ہے اِس کے سامنے.....''

''بگھے نے پیغام بھیجا ہے کہ گڈی پہلوان سے کہو چوڑیاں پہن لے، گڈی بازی اس کے بس کا روگ نہیں.....''

''گڈی کہہ رہا ہے کہ آج بگھے کی عزت کی ڈور بھی پتنگ کے ساتھ کاٹ دوں گا.....''

''بگھا سنگھ تو کہہ رہا ہے کہ آج پہلوان کی رسوائی کی رات ہے۔'' مانجھے کی دھار سے زیادہ تیز اور نوکیلے پیغامات کا سلسلہ بڑھتا گیا اور دونوں کی پتنگیں آسمان میں کہیں کھو گئیں۔ پھر جانے تیز ہوا نے ڈور کاٹی یا ایک کی کنی دوسری میں ایسی الجھی کہ دونوں پتنگ بازوں کے ہاتھ میں خالی ڈور لہرا گئی۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ اور دونوں ہی گروپ فتح کے نعرے لگانے لگے۔ ہار تسلیم کرنے کو کوئی تیار نہ ہوا اور رات تک بات اتنی بڑھ گئی کہ محلے میں باقاعدہ فساد شروع ہوگیا۔ ایک دوسرے کے کارکنوں کو گھیر کر مارا پیٹا جانے لگا۔ بگھا غصے میں اپنا پستول لے کر گھر سے نکلا اور

دوسری طرف گڈی پہلوان کے چمچوں نے اس کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ اچانک اندھیری گلی میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور بگھے نے گڈی کو دیکھتے ہی سیدھا دل میں فائر اتار دیا۔ گڈی وہیں گر کر سرد ہو گیا۔ بگھے کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور ماں دہائیاں دیتی رہ گئی۔ پھانسی کی سزا سننے کے بعد بگھے کو بس ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کی ماں کا پیچھے کون خیال رکھے گا۔ باقی معاملات تو شاید بگھے کے جگری دوست اور محلے دار مل جل کر سنبھال ہی لیں پر اس کی لاڈلی ماں کے لیے اس کا پسندیدہ گُڑ کون ہفتوں کی محنت کے بعد چن کر لایا کرے گا۔

بگھے کا بس چلتا تو وہ اڑ کر ماں کے پاس پہنچ جاتا اور اُس کی چائے کے لئے تمام عمر کا گُڑ ایک ہی بار ذخیرہ کروا دیتا۔ تبھی جیل میں بگھے کی ملاقات ظہیر سے ہوئی اور فرار کا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔ بگھا پہلے دو تین ہفتے کسی دوسرے علاقے میں دوست کے گھر چھپا رہا مگر پھر دل کے ہاتھوں تنگ ہو کر اس نے ظہیر کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور اپنے گھر کی گلی میں پہنچ گیا۔ مگر پولیس وہاں پہلے سے گھات لگائے بیٹھی تھی اور بگھا ماں کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی پولیس کی گرفت میں آ گیا۔ جسے پھر سے سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا جہاں اس کی پھانسی کی تاریخ بھی آ پہنچی۔ بگھا ساری رات روتا رہا، علی الصبح اسے پھانسی گھاٹ لے جانے کا حکم سنایا گیا۔ اس کی ماں بھی پچھلی کئی راتوں سے تڑپ رہی تھی اور گزشتہ تین دن سے تو وہ باہر جیل کی دیوار سے ہی لگی گریہ زاری کرتی رہی مگر اس کی یہاں کون سنتا۔ گڈی بادشاہ کے آگے پیچھے کوئی تھا نہیں جس کے پیروں پر گر کر وہ اپنے بیٹے کے لئے معافی مانگ لاتی۔ پھانسی گھاٹ پر بگھے سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے سرکار سے درخواست کی کہ اس کی لاش اس کی بوڑھی ماں کے سامنے نہ لائی جائے ورنہ وہ بھی وہیں دم چھوڑ دے گی۔ تختہ کے سر پر کالا کپڑا ڈال کر اس کے گلے میں پھندہ ڈال دیا گیا۔ جلاد نے تختہ کھینچنے کے لئے لیور پر ہاتھ رکھا اور اجازت طلب نظروں سے مجسٹریٹ کی طرف دیکھا۔ مجسٹریٹ نے گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی اور سر ہلا دیا۔ بگھے کی زبان سے سرگوشی بلند ہوئی "واہِ گرو جی دا خالصہ..... واہِ گرو جی دی فتح....."

..........*

باب 35

ظہیر بگھے سنگھ کی کہانی سناتے سناتے اچانک چپ سا ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''پھر کیا ہوا..... کیا بگھا بھی؟''

اتنے میں باہر سے ایک خادم تیزی سے صحن میں داخل ہوا۔ ''کوئی مہمان آیا ہے..... آپ کا پوچھ رہا ہے..... یہیں لے آؤں.....؟''

ظہیر نے لمبی سانس بھری ''ہاں..... لے آؤ..... مجھے اسی کا انتظار تھا..... بڑی دیر لگا دی اس نے آنے میں.....'' ملازم پلٹ گیا۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں دروازے کی جانب قدموں کی چاپ اُبھری اور آنے والے کو دیکھ کر میں حیرت کے جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازے سے یہی نعرہ لگایا ''واہو گرو جی دا خالصہ..... واہو گرو جی دی فتح.....'' ہاں وہی تو تھا، بگھا سنگھ۔ جو مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میری طرف لپکا اور یوں کس کر مجھے لپٹا لیا کہ میرا سانس رُکنے لگا۔

ظہیر ہمیں دیکھ کر ہنستا رہا اور بگھے کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

او یار عبداللہ..... کیسا ہے تو۔ میں نے اخبار میں تیری رہائی کی خبر پڑھ لی تھی۔ قسم بابا نانک دی..... رُوح کو سواد آ گیا آج تجھے یہاں دیکھ کر.....''

''ہم ابھی تمہاری ہی بات کر رہے تھے۔ وہ کیا کہتے ہیں ایسے موقعوں پر بگھے..... ہاں..... بڑی لمبی عمر ہے تمہاری.....'' ظہیر کی بات سن کر بگھا بھی ہنس پڑا۔

''ہاں یارا..... عمر کی ڈوری تو بس سمجھو کہ اُس دن جلاد نے کاٹ ہی دینی تھی۔ پر عین وقت پر رُکا ہوا کاغذ جیلر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میری رحم کی اپیل صدر صاحب نے منظور کر لی تھی۔ حالانکہ پہلے کسی نے غلط سرکاری لسٹ میں میرا نام ڈال دیا تھا جس میں دوسرے تین دہشت گردوں کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ میں تو آج بھی کہتا ہوں کہ یہ سب میری بے بے کی دعاؤں کا اثر ہے ورنہ مجھے تو پھانے لگا دیا تھا ان ظالموں نے.....''

ظہیر جانتا تھا کہ بگھا سنگھ ہم سے ملنے کے لیے طے شدہ مقام پر ضرور پہنچے گا۔ کچھ ہی دیر میں سکندر کا بلاوا بھی اندر سے آ گیا۔ مگر مجھے واپس مزار پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ میری غیر حاضری سے وہاں کے معمولات ضرور متاثر ہو رہے ہوں گے۔ اور پھر حاکم بابا بھی تو پریشان ہوں گے مگر سکندر اڑ گیا کہ جب تک ظہیر اور اس کے دوسرے مہمان یہاں ہیں وہ سکندر کی حویلی میں ہی قیام کریں گے۔ میں سکندر کو کیسے سمجھاتا کہ پہلے کی بات

اور تھی مگر اب تو اس حویلی کی ہر دیوار اور ہر جھروکے سے مجھے زہرہ کی وہ دو آنکھیں جھانکتی محسوس ہوتی ہیں۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ میں اُسی کی حویلی میں دو راتیں قید میں کاٹنے کے بعد اب یہیں ایک بڑے دیوان خانے میں دوپہر کے طعام کے بعد نفیس چھوٹے جام نما پیالوں میں سبز قہوہ پی رہا ہوں ہوسکتا ہے کہ انہی چاندی کے برتنوں، ٹرے یا ٹرالی کو کبھی اس نے بھی چھوا ہوا۔ ویسے تو حویلی میں درجنوں خادمائیں موجود تھیں مگر کون جانے چائے کے یہ لوازمات خشک میوے کی طشتریاں یا نفاست سے چھوٹی ڈلیوں کی شکل میں کٹی یہ قند اُسی کے ہاتھ سے ہو کر یہاں مردانے تک پہنچی ہوں۔ باقی سب اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے مگر میرے ذہن میں نہ جانے کتنے ایسے خیالات کا ریلہ چلتا رہا اور میں ایسی ہر سوچ پر برتنوں کو برتنے میں مزید محتاط اور با ادب ہو جاتا۔ وہ جو کسی کی محبت میں مبتلا ہوں وہ میرے اس ادب اور احتیاط کو بخوبی جانتے ہوں گے۔ محبت ایسی کتنی ہی چھوٹی اور بظاہر غیر اہم چیزوں کو ہمارے لیے کتنا اہم بنا دیتی ہے۔ تبھی تو محبت کرنے والے برسوں پرانی چیزیں دل سے لگا کر رکھتے ہیں، پرانے سینما کے ٹکٹ، ٹوٹے کنگن یا چوڑی کے ٹکڑے۔ نام کڑھے رومال، خشک گلاب کی پتیاں، پرانے پوسٹ کارڈ اور ایسی کتنی ہی نشانیاں سنبھال سنبھال رکھتے ہیں۔ لیکن میں اُس کے بارے میں اب ایسا کیوں سوچ رہا تھا۔ اب تو وہ کسی اور گھر کی عزت بن چکی تھی۔ کبھی میں اُس کا محرم تھا مگر آج وہ کسی اور کی بیوگی کی چادر اوڑھے اس چار دیواری کے اندر زندگی گزار رہی تھی۔

کاش وقت ایسی قیامت کی چال نہ چلتا۔ کاش ہم محرم سے نامحرم نہ ہوتے، کاش قدرت نے میری کہانی اتنی مشکل نہ لکھی ہوتی، میں انہی خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک سکندر نے میرا نام پکارا "کیا بات ہے صوفی صاحب..... کیا قید سے باہر آ کر دل نہیں لگ رہا....." سکندر کی بات پر باقی سب بھی ہنس پڑے۔ ظہیر نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"میں جانتا ہوں اس کا مسئلہ کیا ہے..... سکون اسے ہمیشہ بے آرام کرتا ہے..... یا شاید بے آرامی میں ہی اس کا سکون ہے۔ اسے واپس درگاہ پر جانے دو سکندر..... میں اس سے وہیں مل لوں گا جانے سے پہلے....." میں ظہیر اور بگھے سے کندن کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر شام ڈھلنے والی تھی اور میرا واپس مزار پہنچنا ضروری تھا۔ میں نکلنے لگا تو مدثر صاحب اور بگھا بھی میرے ساتھ چل پڑے، ظہیر کا اتنی بھیڑ میں جانا اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اس لئے میں نے اسے سکندر کی حویلی میں ہی رات گزارنے پر آمادہ کرلیا۔ مگر وہ اس شرط پر ہی مانا کہ میں جلد اُس سے دوبارہ ملوں گا۔ ظہیر نے سرحد پار کرنے کا بندوبست کرلیا تھا اور اب اُسے صرف اپنے ایجنٹ کا انتظار تھا۔ مزار کا خادم خاص چراغ جلا رہا تھا۔ اور حاکم بابا اپنے حجرے میں جا چکے تھے۔ بگھا سنگھ مزار کے صحن میں قدم رکھتے ہوئے ذرا سا ہچکچایا۔

"میں اندر آ جاؤں عبداللہ باؤ..... کہیں تیرے پیر جی ناراض نہ ہو جائیں کہ تو ایک خالصے کو پاک درگاہ کے اندر لے آیا ہے....."

"نہیں ہوں گے ناراض..... وہ مہمانوں کی آمد سے بہت خوش ہوتے ہیں..... آ جاؤ بلا جھجک....." مدثر صاحب حیرت سے وسیع و عریض صحن کو چاروں طرف پھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"تم یہاں رہتے ہو عبداللہ..... عجیب سی مقناطیسیت ہے اس جگہ میں..... جیسے کوئی حصار باندھ رکھا ہو کسی

نے .....'' میں ان دونوں کو لئے حاکم بابا کے حجرے میں داخل ہوگیا۔ وہ ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر دھیرے سے مسکرائے۔

''کہاں رہ گئے تھے۔ جانتے ہو پیچھے کتنے بکھیڑے بکھرے پڑے ہیں.....'' میرا جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ پھر یہ بکھیڑے ختم ہی کیوں نہیں کر دیتے۔ میرا اتنا طویل امتحان کس لئے.....؟'' میں نے بگھے اور مدثر صاحب کا تعارف ان سے کروایا تو بگھے نے آگے بڑھ کر عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

حاکم بابا نے مجھے ٹوکا'' بھئی کیسے میزبان ہو..... اپنے مہمانوں کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو..... جو روکھی سوکھی ہے..... وہی پیش کر دو۔ درویش کے مہمان کو بڑا صابر ہونا پڑتا ہے.....''

ان کی بات سن کر مدثر صاحب بھی مسکرا دیئے'' ہم نے بڑا چن کر اپنا میزبان طے کیا ہے عبداللہ کو۔ اب صبر تو کرنا ہی پڑے گا.....''

کچھ ہی دیر میں مزار کے لنگر کی دال اور تندور کی گرم روٹی حاضر کر دی گئی۔ حجرے میں حاکم بابا کے پاس لکڑی کے ایک چھوٹے سے مرتبان میں گڑ بھی رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے وہ گڑ بھی چھوٹی پیالیوں میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔

''یہ آپ مہمانوں کا رزق تھا جو اتنے دن سے میرے پاس بطور امانت پڑا تھا۔ نوش فرمایئے۔'' وہ تینوں آپس میں یوں گھل مل گئے تھے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ مدثر صاحب تو جانے فلسفے اور منطق کے کون کون سے مسئلے کھولے حاکم بابا سے بحث میں مصروف ہوگئے۔ میں اور بگھا خاموشی سے باہر صحن میں نکل آئے جہاں پورے چاند کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ قدرت نے ہم انسانوں کو بنا مانگے کتنی بے تحاشہ نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ اس کا اندازہ ہم کبھی نہیں لگا پاتے۔

جیسے یہ چاندنی..... یہ رات..... پروائی اور اس کی یاد..... یادیں بھی تو کسی نعمت سے کم نہیں ہوتیں۔ اور انسان برسوں کی زندگی جینے کے بعد آخر کیا پاتا ہے.....؟ صرف چند یادیں..... مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر بگھے نے غور سے میری طرف دیکھا۔'' کس خیال میں کھویا ہوا ہے باؤ..... کیا وہ تجھے ملی نہیں.....'' میں نے چونک کر بگھے کی طرف دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''ظہیر استاد نے جیل میں تیری کہانی سنائی تھی ہمیں..... میں تو سمجھا تھا کہ تو جیل سے رہا ہونے کے بعد سیدھا اُسی کے دوارے جا کھڑا ہوگا مگر لگتا ہے وہ ابھی تک تجھے نہیں ملی۔'' میں نے بگھے کو مختصر سا جواب دیا۔

''ملی تھی وہ مجھے..... پر اب وہ میری نہیں رہی..... کسی اور کی عزت بن چکی ہے.....''

میری بات سن کر بگھے کا چہرہ اتر گیا اور پھر اس سے کوئی بات نہ ہو پائی۔ صبح مدثر صاحب حجرے سے باہر آئے تو ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر سو نہیں پائے۔'' لگتا ہے آپ کو نیند نہیں آئی..... شاید قید خانے کی راتیں پیچھا نہیں چھوڑ رہیں.....''

وہ ہنس پڑے'' نہیں..... ایسی رغبت بھی نہیں رہی کبھی صیاد اور قفس کے ساتھ..... ہاں مگر حیرت اور تعجب نے بے خبر سونے نہیں دیا۔ میں برملا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک زندگی کا ایک ہی رخ دیکھ رکھا تھا۔ میرا یقین

شاید صرف ممکن، قابل عمل اور ہونی تک ہی محدود رہا۔ان ہونی اور ناممکن کی فہرست میں نے خود ہی گھڑ رکھی تھی۔مگر تم سے ملنے کے بعد اور کل یہاں آنے کے بعد تمہارے بزرگ سے ایک رات کی ملاقات نے ہی میرے اندر جانے کتنی کھڑکیاں اور نئے روشن دان کھول دیئے ہیں۔اور مجھے یہ احساس شدت سے ستانے لگا ہے کہ سائنس اور مادے کے وجود سے ہٹ کر بھی بہت سے ایسے حقائق ہیں جن تک میری کوتاہ نظری نے مجھے پہنچنے نہیں دیا۔مگر دیر آئد.....درست آئد.....زندگی آخری سانس تک مسلسل کھوج کا کام ہے اور میں اب اپنی باقی ماندہ عمر اس نظر نہ آنے والی متوازی دنیا کی تحقیق اور جستجو میں صرف کروں گا.....اور اس متوازی دنیا کی روحانیت کو کھوجنے کے لئے مجھے کسی خاص مقام یا منزل تک جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔کل رات سلطان بابا کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ یہ جستجو بھرے پڑے، شور مچاتے اور چنگھاڑتے شہروں کی آبادیوں کے اندر رہ کر بھی تکمیل پاسکتی ہے۔بات صرف ذرا سا نقطہ نظر تبدیل کرنے کی اور خود کو اندر سے ٹٹولنے کی ہے..... نئے دریچے وا ہوتے جائیں گے.....تمہارا شکریہ عبداللہ.....تم نے مجھے اپنی دنیا سے متعارف کروایا.....''

مدثر صاحب کچھ دن مزید ہمارے ساتھ رہنا چاہتے تھے مگر حاکم بابا نے احساس دلایا کہ ان کے اپنے ان کی غیر حاضری سے پریشان اور ہلکان ہو رہے ہوں گے لہٰذا اُن کی تسلی کے لئے ایک بار مدثر صاحب کا گھر جانا بہت ضروری ہے۔عصر کے وقت میں اور بگھا انہیں مزار کے دروازے تک رخصت کرنے آئے جہاں فقیرا تانگے والا پہلے سے ہی ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔مدثر صاحب جاتے جاتے ایک لمحے کو پلٹے''رابطے میں رہنا.....''

میں نے انہیں تسلی دی۔''اب یہ رابطہ بحال رہے گا ہمیشہ.....'' ہم بہت دیر تک سیڑھیوں پر کھڑے مدثر صاحب کے تانگے کو صحرا سے لپٹی کالی سڑک پر بڑھتے اور ریت کے ٹیلوں کے پیچھے گم ہوتے دیکھتے رہے۔تبھی نیچے ریت کے میدان میں کچھ سواریاں آ کر رکیں اور میں نے بڑی سرکار کو اپنی خادماؤں کے ساتھ پریشانی میں مزار کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔میرا دل زور سے دھڑکا، یا خدایا.....وہ خیریت سے ہو.....میں بگھے کے ساتھ خاموشی سے صحن میں بیٹھے حاکم بابا کے عقب میں بیٹھ گیا۔جہاں بڑی سرکار اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھیں۔

''بس سائیں جی.....پتہ نہیں کیا ہوگیا اچانک اسے.....بیوگی کا دُکھ تو اس نے بڑی بہادری سے برداشت کرلیا تھا، سچ بتاؤں تو پہلے پہل میرا اپنا رویہ اس ملوک جندڑی کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔خاندان کی کسی بڑی بوڑھی نے میرے دل میں یہ کھٹکا ڈال دیا تھا کہ ہونہ ہو.....یہ میری نئی نویلی بہو کی ہی نحوست ہے جو میرے جوان بچے کو عین اس کی بارات والے دن ہی کھا گئی۔میں نے اس لڑکی کو بڑا دھتکارا، بہت طعنے دیئے، آتے جاتے اپنی زبان سے اس کا نازک کلیجہ چھلنی کرتی رہی مگر آفرین ہے اس نیاڑیں پر.....کبھی پلٹ کر''اف'' تک نہیں کیا اس نے، بس میری خدمت کرتی رہی۔اور سکندر کے بچوں کو سنبھالتی رہی جو پہلے میرے بغیر ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارتے تھے۔پر میں تو بابر کی موت کی خبر سنتے ہی دل پکڑ کر بستر سے جا لگی تھی۔میں اسے پیار سے سجاول بھی کہتی تھی، میری تو سمجھو ساری کائنات ہی لٹ گئی۔مگر یہ زہرہ ہی تھی جس نے اس برے وقت میں حویلی کا سارا انتظام سنبھالا، سکندر کے بچوں کی پورے جی سے دیکھ بھال کی اور مجھے گرنے نہ دیا، میں آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے اُسے چرکے لگاتی رہتی، منحوس اور سبز قدم ہونے کے طعنے دیتی رہتی اور ہر لمحے اس کا جینا اجیرن کیے رکھتی مگر اس نے پلٹ کر کبھی جواب نہیں دیا، پتہ

نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہے یہ لڑکی۔ اس کے ماں باپ تو اسے بابر کے سوئم کے بعد ہی اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتے تھے، نازوں پلی بیٹی ہے ان کی اور پھر شرع میں بھی اس پر مکمل عدت نہیں بنتی تھی سائیں جی..... وہ تو سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو چکی تھی، مگر میری حالت اور سکندر کے بچوں کی تڑپ دیکھ کر اس نے اپنے گھر واپس جانے سے صاف انکار کر دیا کہ جب تک میں اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑی نہیں ہو جاتی وہ اپنے میکے نہیں پلٹے گی۔ مگر زہرہ کی ماں آتے جاتے میرے تیور دیکھ چکی تھی۔ میری آنکھوں میں سلگتی نفرت کی چنگاڑیاں تو سبھی کو دور سے نظر آ جاتی تھیں۔ زہرہ کی ماں نے اسے آنے والے طوفان اور مشکلات سے آگاہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر زہرہ نہ مانی۔ اس کے گھر والے مایوس لوٹ گئے اور سائیں جی پھر اس لڑکی نے واقعی وہ کر دکھایا جو شاید کسی سگی بیٹی کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے خود آدھی آدھی رات اُسے اپنے سرہانے ایک پاؤں پر کھڑے دیکھا ہے، کبھی دوا پلاتی ہے تو کبھی تکیہ بدلتی ہے۔ کبھی تازہ ہوا کے لئے کھڑکی روشن دان کھولنے میں تو کبھی سر پیر دبانے میں۔ وہ لڑکی میرے کمرے سے کبھی ٹلتی ہی نہیں تھی۔ سکندر تو سدا کا لاپرواہ اور بلا کا غصے والا ہے پر اس نے سکندر کے بچوں کی ساری ذمہ داریاں بھی ایسے نبھائیں کہ بچے بھی اس کے ہو کر رہ گئے۔ سائیں جی..... میں سوچتی تھی کہ میری نفرت کا پہاڑ اتنا اونچا ہے کہ یہ نازک اور کمزور سی لڑکی اُسے چڑھتے چڑھتے تھک ہار کر دم توڑ دے گی..... مگر اس نے نفرت اور غصے کی ہر چٹان سر کر لی..... سب پاش پاش کر ڈالا سائیں جی..... بڑا غرور تھا مجھے اپنے غصے پر اور اپنی انا پر..... مگر اس کمزور سی لڑکی نے سب ملیا میٹ کر دیا۔ مجھے بستر سے اٹھنے میں چار مہینے لگے، مگر جب میں کھڑی ہوئی تو اندر نفرت کی ساری گرد بیٹھ چکی تھی، تب وہ سب کچھ میرے حوالے کر کے جانے لگی تو میرا دل جیسے رُک سا گیا۔ چند ہفتوں میں صدیوں سے لمبے رشتے جوڑ گئی تھی وہ لڑکی۔ تب میں نے مزید بیماری کا بہانہ کر کے اسے کسی نہ کسی طرح روک لیا اپنے پاس، جان بوجھ کر دوبارہ بستر پر جا پڑی۔ خوب خدمتیں کروائیں پر اب مقصد کچھ اور ہی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائے..... بس میرے ساتھ ہی رہے....."

بڑی سرکار آج تفصیل سے حاکم بابا کو اپنی لاڈلی بہو زہرہ کی خوبیاں بتا رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اپنا دل کھول کر حاکم بابا کے سامنے رکھ دیں۔ مگر میں تو اس کی ہر خوبی بہت پہلے سے جانتا تھا۔ وہ ایسی ہی تو تھی۔ دل میں اندر تک گھر کر جانے والی..... اور پھر کبھی واپس نہ نکلنے والی..... کچھ مکین گھروں میں نہیں رہتے..... گھر بن جاتے ہیں۔ اور دل گھروندے کے باسی تو روح میں بستے ہیں۔ وہ بھی بڑی سرکار کے دل سے ہوتے ہوئے ان کی روح میں اتر گئی تھی..... ہمیشہ کی طرح..... تبھی تو وہ گھنٹہ بھر سے حاکم بابا کے سامنے زہرہ کی صفات بیان کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔

بڑی سرکار نے بابا سے اپنی بہو کی لمبی زندگی اور خوشیوں کے لئے دعا کی درخواست کی تو ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہاں صحن میں اس وقت صرف حاکم بابا اور ان کے عقب میں کچھ فاصلے پر میں بیٹھا بظاہر کسی ورد میں مصروف تھا۔ مگر میرا سارا دھیان بڑی سرکار کی طرف ہی تھا۔ اور پھر اس کا نام سنتے اور اس کا نام جپتے رہنے سے زیادہ بڑا ورد میرے لئے اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

حاکم بابا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو بڑی سرکار نے ایک نئی عرضی پیش کر دی "سائیں..... ایک اور

ارادہ باندھا ہے اس دکھیاری ماں نے اپنے خاندان کو پھر سے جوڑنے کے لئے..... پھر سے اپنے خاندان کو اس کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹانے کے لئے..... آپ سے عرضی ہے میری..... اس نئے رشتے کے لئے بھی دعا کریں اور باقی سارے سائیں لوگوں سے بھی دعا کروائیں..... میں نے سوچا ہے کہ اس بار زہرہ کے ماں باپ اسے لینے کے لئے آئیں گے تو میں ان کے قدموں میں اپنی چادر ڈال دوں گی..... ان کے پیروں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنے پکڑ لوں گی اور تب تک نہیں اٹھوں گی جب تک وہ اپنی لاڈلی زہرہ کا نصیب میرے سکندر کے ساتھ نہیں جوڑ دیتے۔ میں زہرہ کا بیاہ سکندر کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں..... آپ بھی دعا کریں سائیں جی..... میرے سکندر کا نصیب میری زہرہ کے ساتھ جڑ جائے..... وہ دونوں ایک ہو جائیں گے تو میری سونی حویلی پھر سے جی اٹھے گی..... اور پھر میں بھی سکون سے مر سکوں گی..... دعا کریں سائیں جی۔"

حاکم بابا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر حاکم بابا کے ہاتھ پکڑ لوں اور اس دعا کے لئے اُٹھنے نہ دوں۔ مگر اُن کے سامنے بیٹھا فریادی بھی کہاں ماننے والا تھا۔ حاکم بابا نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے تو ان کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا:

"جب جب جو جو ہوتا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے۔"

تمہارا کاجل نشانی چھوڑ گیا ہے
تمہاری پلکوں کے پیچھے کھوئے راستوں کی
کاجل
تمہاری آنکھوں کے کاجل گھر تلے
سرمئی شام سے کاجل لے کر
تیری پلکوں کے منڈیر پر رکھ دیئے
سرمئی شام سے کچھ کاجل لے کر
پلکوں کا کاجل ادھار دے دو
سرمئی شام کب سے دوارے بیٹھی ہے
تمہاری پلکوں سے کاجل ادھار لینے
تمہاری پلکوں سے کاجل ادھار لینے کو
سرمئی شام تمہاری پلکوں کے منڈیر پر بیٹھی ہے

✱.....✱.....✱

باب 36

حاکم بابا کے ہاتھ جتنی دیر دعا کے لئے ہوا میں بلند رہے۔ میرا دل جیسے کسی پست گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ بڑی سرکار بہت دیر تک حاکم بابا کے سامنے بیٹھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہیں اور میں دور پس منظر میں بیٹھا انگاروں پر لوٹتا رہا۔ اس روز مجھے ایک اور عجیب احساس کا ادراک بھی ہوا کہ کسی ایک کی دعا کبھی کبھی کسی دوسرے کے لئے بددعا بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ گویا ایک ہی وقت میں اگر کسی کی دعا رد ہو رہی ہوتی ہے تو ٹھیک اسی لمحے وہ کسی دوسرے کے لئے قبولیت کا لمحہ بھی ہوسکتا ہے۔

بڑی سرکار کے جانے کے بعد میں تڑپ کر بابا کے سامنے آ بیٹھا۔

''آپ نے ان کے لئے دعا کیوں کی.....؟''

حاکم بابا نے ایک گہری سانس لی ''صرف کسی کے دعا کر دینے سے تقدیریں نہیں بدلا کرتیں عبداللہ میاں..... مقدر کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔ اور پھر ہم فقیر بھی اگر سائلوں کو خالی ہاتھ واپس بھیجنے لگیں تو پھر ہم میں اور ان امراء میں کیا فرق رہ جائے گا.....''

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ''ٹھیک ہے..... تو پھر ایک دعا میرے لئے بھی کرنی ہوگی آج آپ کو..... کہ میرا یہ امتحان اب جلد ختم ہو جائے..... اتنا مضبوط نہیں ہوں میں.....''

حاکم بابا میری بات سن کر دھیمے سے مسکرائے ''زندگی کے امتحان بھلا کب ختم ہوتے ہیں۔ زندگی البتہ ختم ہو جاتی ہے..... تم اچھے شاگرد ہو سلطان بابا کے..... بڑی ہمت سے مقابلہ کیا ہے تم نے ان سب طوفانوں کا..... ایک آخری طوفان اور سہی..... تمہیں ہر حال میں ثابت قدم رہنا ہے عبداللہ..... اب کسی اور کی عزت وابستہ ہے تمہارے ہر عمل سے..... ہر بڑھتے قدم سے..... بہت سنبھل کر پاؤں دھرنا ہوں گے اب تمہیں.....''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ہمیشہ کی طرح مجھے کسی گہری کھائی کی چکنی ڈھلان پر چلنے کا حکم دے کر یہ تاکید بھی کی جا رہی تھی کہ ''خبردار..... کہیں پھسل نہ جانا۔'' بگھا حیرت زدہ سا دور بیٹھا یہ سارا ماجرا دیکھتا رہا اور شام ڈھلتے ہی وہ میرے قریب چلا آیا۔

''یہ کیا قصہ ہے باؤ..... تُو اس بابے سے یہ کیا باتیں کر رہا تھا.....؟ میرے پلے تو تم دونوں کی ایک بات بھی نہیں پڑی.....'' میں نے بگھے کو زیادہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی کبھی خاموشی ہی سب سے بہتر جواب ہوتی ہے۔ میں نے بگھے سے اپنے آخری ساتھی کندن کے بارے میں پوچھا مگر وہ خود بھی کندن کے حوالے سے بے خبر

تھا۔ ظہیر نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے پاس میرے لئے ایک اچھی اور ایک بری خبر ہے۔ اچھی خبر تو بگھے کے زندہ ہونے کی صورت میں سامنے آچکی تھی۔ تو کیا وہ دوسری خبر کندن سے متعلق تھی.....؟ میرا دل اندر ہی اندر یہ سوچ کر ڈوبنے لگا اور ساری رات اسی شش و پنج میں گزر گئی۔

صبح میں نے بگھے کو دوبارہ ظہیر کے پاس بھجوادیا اس وعدے کے ساتھ کہ میں بھی جلد ان سے آکر ملوں گا۔ ظہیر نے صبح سویرے پیغام بھجوایا تھا کہ سکندر ہم سب کو لے کر اپنی زمینیں دکھانے لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن میرا جانا فی الحال ممکن نہیں تھا۔ بگھے کا دل بھی مجھے چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا مگر سکندر کی بھیجی گاڑی مزار کے دروازے پر انتظار کر رہی تھی۔ وہ گاڑی پر سوار ہونے سے پہلے میری طرف پلٹا ''مجھے تھوڑا تھوڑا سب سمجھ آرہا ہے عبداللہ باؤ..... یہ جو تم سب یہاں بولتے ہو..... یہ ساری عشق کی بولیاں ہیں..... جو کوئی عاشق ہی سمجھ سکتا ہے، دعا کر باؤ..... مجھے بھی کسی سے عشق ہوجائے.....''

میں مسکرادیا ''لوگ عشق سے بچنے کی دعائیں مانگتے پھرتے ہیں..... اور تم عشق میں مبتلا ہونے کی خواہش میں ہو..... سوچ لو..... کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے.....''

بگھا بھی ہنس پڑا ''میں ان پڑھ جاہل سا بندہ ہوں باؤ..... پر مجھے ایک بات کی سمجھ لگ گئی ہے تجھے دیکھ کر..... عشق انسان کو بڑا ''بیبا'' بنادیتا ہے۔ انسان کے اندر کے سارے زنگ دھو کر اسے پھر سے پہلے جیسا چمکدار بنا دیتا ہے۔''

بگھا اپنے دل کی بات کہہ کر سکندر کی گاڑ' میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اور میں اسے کہتے کہتے رک گیا کہ عشق میں چمک تو کسی کسی کا نصیب ہوتی ہے۔ مجھ جیسے کئی تو اس رگڑ سے مزید دھندلے اور ماندہی پڑتے ہیں۔ جسم اور روح پر پڑی خراشیں اور گہری ہوتی جاتی ہیں۔ عشق سبھی کو بھلا کب راس آتا ہے؟

دوپہر تک میری بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جیسے زہرہ کو دیکھ کر میری حالت ابتر ہوئی تھی ٹھیک وہ بھی تو وہاں ایسے ہی کرب سے گزر رہی ہوگی۔ میں نے خود ہی اسے یہ کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھ جائے۔ تب میں جیل میں بند سزائے موت کا ایک قیدی تھا۔ جس کے آنے والے کل کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ زہرہ نے میری دی ہوئی اسی قسم کا بھرم رکھنے کے لئے بڑی سرکار کے چھوٹے بیٹے بابر سے نکاح کی حامی بھری ہوگی۔ وہ بھی تو جانے کتنی اذیتوں سے گزر کر بختیار آباد کے اس سرحدی قصبے کی حویلی میں دلہن بن کر اُتری ہوگی۔ مگر کون جانتا تھا کہ اس کا سہاگ بابر..... جسے اس کی ماں پیار سے سجاول کہتی تھی، اسی سجاول کی قضاء راستے میں ہی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اور قدرت کے لکھے مسودے تو ہمیشہ سے ہی کمال ہوا کرتے ہیں۔ تبھی تو ظہیر نے بھی چھ ماہ پہلے اُسی قصبے میں ملنے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی جہاں کے سب سے اونچے رئیس کی بلند چوباروں والی حویلی میں وہ زہرہ جبیں آج حسرت اور یاس کی ایک مکمل تصویر بنی بیٹھی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم سوچ کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا جب کسی نے حجرے کے دروازے پر اچانک دستک دی ''عبداللہ میاں..... بڑی سرکار کی حویلی سے ان کا منشی آیا ہے.....''

میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا جیسے دروازے کے باہر کھڑے مجاور نے میرے اندر کا شور سن لیا ہو۔ باہر نکل کر میں

نے حاکم بابا کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں پر وہ کہیں دکھائی نہ دیئے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ انہیں کوئی سائل اپنے ساتھ قصبے کی طرف لے گیا ہے کسی تقریب میں شرکت کے لئے جو بہت پہلے سے طے شدہ تھی۔ مجبوراً مجھے ہی حویلی کے اہلکار کی بات سننا پڑی۔

"چھوٹے سائیں جی..... بڑی سرکار نے بڑے پیر جی کو جلدی آنے کی درخواست بھیجی ہے۔ ان کی ٹوں کی طبیعت بہت خراب ہے....."

منشی کی بات سن کر میرا پہلے سے ڈولتا من بالکل ہی ڈوب گیا۔ "مگر حاکم بابا..... میرا مطلب ہے سلطان بابا تو قصبے کی طرف گئے ہیں۔ شاید رات دیر سے لوٹیں گے....."

منشی کی پریشانی بڑھ گئی "اوہو..... یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔ بڑی سرکار نے مجھے سختی سے تائید کی ہے کہ میں کسی کو دعا کے لئے ساتھ لے کر ہی لوٹوں....."

میں سٹپٹا کر بولا "دعا کے ساتھ دوا بھی بہت ضروری ہے منشی صاحب..... آپ کسی ڈاکٹر یا وید طبیب وغیرہ کو ساتھ لے جائیں....."

منشی نے گہری سانس بھری "ڈاکٹرنی تو صبح سے ان کے سرہانے ہی بیٹھی ہے سائیں جی..... جو دوا دارو اس سے ہوسکتی تھی..... وہ سب اس نے کیا ہے..... پر ہماری بڑی سرکار کا بہت مان ہے پیر جی کی دعا پر..... اللہ کے نیک بندے اپنے رب کے سامنے عاجزی سے مانگیں تو مرادیں جلدی برآتی ہیں..... آپ ایسا کریں..... جب تک بڑے پیر جی نہیں آجاتے..... آپ ہی میرے ساتھ چلے چلو..... کچھ تو تسلی ہوجائے گی میری مالکن کو....."

میں مزید ہڑبڑا گیا "میں..... مگر میں تو خود....."

منشی نے جلدی سے میری بات کاٹ دی "ہاں چھوٹے پیر جی..... آپ ہی ساتھ چلو میرے..... میں خالی ہاتھ وہاں گیا تو میری نوکری بھی جاسکتی ہے کیونکہ مجھے یہاں آتے آتے دیر ہوگئی تھی..... سکندر سائیں کے مہمانوں کو زمینوں کی سیر پر بھیجنے کے انتظامات کرنا تھے مجھے..... بس اسی مصروفیت میں کچھ غفلت ہوگئی مجھ سے....."

منشی کی پریشانی بتا رہی تھی کہ وہ مجھے وہاں سے لیے بنا ٹلنے والا نہیں ہے۔ اسے کیا پتہ تھا کہ وہ جس ناز آفریں کے پاس مجھے دعا کے لئے لے جانا چاہتا ہے خود میری ہر اُمید، ہر دعا اور ہر آس اُسی سے وابستہ ہے۔ منشی بڑی حویلی سے کار موٹر کی سواری لے کر آیا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی حویلی کے راستے پر دوڑتی گئی اور اس کا گھر قریب آتا گیا۔ خود میری حالت اندر سے بگڑتی چلی گئی۔ کبھی کبھی یہ بے جان راستے بھی کتنے جان لیوا ہوجاتے ہیں۔ محبوب کے گھر کا رستہ کسی کے لئے مسیحا..... تو کسی کے لئے جلاد ثابت ہوتا ہے۔

ساری بات ہمارے اندر کے موسم کی ہوتی ہے۔ اور یہی اندر کے موسم باہر کی کیفیات کے تغیر کا باعث ہوتے ہیں۔ کل تک جو میری محرم تھی اور جس کے گھر کا رستہ مجھے پھولوں کا کوئی راہگزر لگتا تھا، آج جب وہ نامحرم ہوئی تو آس پاس کے سارے منظر بدل چکے تھے۔ گاڑی صحرا میں دھول اور ریت کا طوفان اڑاتی، قصبے کی گلیوں میں داخل ہوئی تو بازار میں چلتے لوگ تعظیم سے سر جھکائے راستے سے ہٹنے لگے اور کچھ ہی دیر میں کار بڑے پھاٹک سے ہو کر

حویلی کے زنان خانے میں داخل ہوگئی اور ہمارے اترتے ہی اندر ڈیوڑھی سے پریشان اور بوکھلائی ہوئی سی بڑی سرکار تیزی میں چلتی ہمارے قریب آگئی۔

''کیا بڑے پیر جی تشریف نہیں لائے.....''

میں نے منشی کی طرف دیکھا''وہ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔آئیں گے تو آپ کا پیغام مل جائے گا انہیں.....''

بڑی سرکار پریشانی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولیں''شالا حیاتی دیوے.....آپ آئے..... یہ بھی مجھ نیازیں کے نصیب کی بات.....آجائیں چھوٹے سائیں.....اندر آجائیں.....''

میں نے جھجکتے ہوئے قدم بڑھائے۔میں پہلے جس حصے میں سکندر کے ساتھ آیا تھا یہ حصہ حویلی میں اس کی بالکل مخالف سمت میں تھا۔کھلے کھلے روشن برآمدے جن کے آگے دھوپ روکنے والی بڑی چکیں ڈالی گئی تھیں۔بڑے ہوادار روشن دان اور لکڑی کے کام سے منقش کھڑکیاں،جن پر اندر کی سمت ریشمی پردے سرسرا رہے تھے،برآمدے کے راستے آگے چلتے ہوئے ایک کے بعد ایک صحن کھلتا جارہا تھا اور ہر صحن کے بیچوں بیچ پانی کا ایک حوض یا تالاب بنا ہوا تھا جن میں سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔زنانہ حصے کی ہر چیز سے نسوانی ہاتھ کی نفاست ٹپک رہی تھی۔برآمدے سرخ فرش سے پاٹے گئے تھے جن کے وسط میں سفید پتھر سے مختلف پرندوں کی شبیہات نقش کی گئی تھیں۔انسان ازل سے لے کر ابد تک شاید کسی ایک خاص جستجو کی کھوج میں ر ' ہے.....اپنے اندر بسے فن کو زمانے کی نظر سے گزارنے کی کھوج..... مجھے اس نقش کاری کو دیکھ کر قدیم اہرام مصر کی دیواروں پر بنی شبیہات یاد آگئیں۔شاید انسان کے ذہن میں ابدی سکون کا جو تصور ہمیشہ سے قائم ہے اس میں درخت، پانی، سبزے اور چرند و پرند کی بھی ایک خاص حیثیت متعین ہے۔تبھی تو وہ اپنے ارتقاء کی پہلی پائیدان سے لے کر ترقی کی آخری انتہا تک پہنچنے کے باوجود ان شبیہات کو کبھی اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پایا۔

انہی سوچوں میں گم حویلی کی راہداریوں اور غلام گردشوں سے گزرتے اچانک ایک بڑی سی ہال نما بیٹھک کا دروازہ کھلا اور مجھے نوکرانی وہاں بٹھا کر چند لمحوں کی اجازت لے کر وہاں سے چلی گئی۔سارے راستے ان راہداریوں کو دیکھ میرے ذہن میں ایک ہی خیال کلبلاتا رہا کہ وہ بھی تو انہی راستوں پر چلتی ہوگی۔یہ وسیع و عریض صحن اور یہ پل کھاتے برآمدے اس کے قدموں کی چاپ سے آشنا ہوں گے۔ہماری آہٹوں کی بھی تو کچھ بولیاں ہوتی ہیں۔جنہیں یہ بے جان پتھر ہی سمجھتے ہوں گے۔یہی سوچ کر میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا رہا اور اب اس بڑے دیوان نما خاص کمرے میں بھی مجھے وہی سرگوشیاں سنائی دیتی رہیں۔وہ اس غالیچے پر وہاں کھڑی ہوتی ہوگی۔یہاں اس بڑی سنگھار میز کے آئینے میں اپنا روپ سنوارتی ہوگی.....وہاں آتش دان کے پاس پڑی آرام کرسی پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھا کرتی ہوگی.....اور یہاں بڑے فانوس کے پاس کھڑی شام ڈھلے چراغ جلاتی ہوگی.....؟

کمرے کی ہر چیز خود اپنی گواہی دے کر اس کی موجودگی ثابت کر رہی تھی،تبھی اچانک پردہ ہلا اور اندر سے کسی خادمہ کی آواز آئی''چھوٹے پیر جی.....آپ چھوٹی مالکن کے کمرے میں آجائیں۔بڑی سرکار آپ کو بلا رہی

ہیں....."

میرا دم اٹکنے لگا۔ میں دوبارہ اس کا سامنا کیسے کر پاؤں گا بھلا۔ جن لوگوں سے ہم اپنے تصورات میں دن رات باتیں کرتے ہیں، ان کے سامنے پر ہماری ساری گفتگو یکا یک ہی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔ میں لرزتے قدموں سے درمیانی راہداری عبور کر کے دوسری جانب بنے کمرے میں داخل ہوا تو میری سربراہی کرنے والی خادمہ دھیرے سے کھنکار کر واپس پلٹ گئی۔ بڑی سرکار کسی مسہری کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں بڑی ہوادار کھڑکیوں اور چھت میں بنے روشن دانوں سے ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں اُچٹ کر ایک ہلکی سنہری دھند کا سا منظر پیش کر رہی تھیں۔

مسہری پر پڑا پردہ ٹنگا ہوا تھا جس کی ریشمی دیوار سے پردے کی آڑھ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ سارے کمرے میں وہی جانی پہچانی مانوس سی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، مجھے یاد تھا، زہرہ کو فرانس کی بنی ہوئی یہ خوشبو بہت پسند تھی۔ اور اس کے کمرے، پرس اور گاڑی میں اسی پرفیوم کی مختلف اقسام موجود رہتی تھیں۔ خوشبو بھی تو ایک تعارف ہوتی ہے۔ زہرہ کی خواب گاہ میں داخل ہوتے وقت ایک بار پھر اسی خوشبو نے آج میرا استقبال کیا تھا، جو میرے حواس کے کسی کونے میں ہمیشہ ہی مہکتی رہتی تھی۔ بڑی سرکار نے جلدی سے مجھے دیکھتے ہی کہا" آ گئے چھوٹے سائیں جی..... دیکھو ناں..... اس نے کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ جب میں اسے یہاں سے جانے کا کہتی تھی تو یہ جاتی نہیں تھی..... اور اب جب میرا دل نیاڑاں جڑ گیا ہے اس سے تو یہ بیمار ہو کر بستر پر آ پڑی ہے....."

میں نے دھیرے سے سلام کیا تو پردے کے پیچھے لیٹے وجود میں میری آواز سن کر دھیرے سے ایک ہلچل سی ہوئی شاید وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔" آپ لیٹی رہیں خود کو بے آرام نہ کریں....." میں نے سر جھکائے دھیرے سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو خود اپنی آواز ہی اجنبی سی لگی۔ زہرہ پردے کے دوسرے جانب اوٹ میں تھی۔ جبکہ بڑی سرکار میرے سامنے ہی پریشان سی کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ہمت جمع کر کے پھر سے لفظ جوڑنے کی کوشش کی۔

"آپ کو بڑی سرکاری کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔ خود کو یوں نڈھال نہ کریں۔ آپ کے اپنے بھی بے آرام ہوتے ہیں آپ کی حالت دیکھ کر..... میں سلطان بابا کے حجرے سے دم کیا ہوا پانی لے کر آیا ہوں، اسے پیتی رہیے گا..... امید ہے جلد افاقہ ہوگا....."

دوسری جانب مکمل خاموشی طاری رہی۔ میں نے بڑی سرکار کی درخواست پر اپنے نڈھال سے ہاتھ دعا کے لئے بلند کر دیئے اور دعا ختم کر کے واپس پلٹنے کی ٹھانی۔ بڑی سرکار نے جلدی سے اپنا اگلا مدعا بھی بیان کر دیا۔

"سائیں جی..... یہ دعا بھی کریں ناں کہ میری سونی حویلی کی خوشیاں بھی دوبارہ لوٹ آئیں۔ میرے..... میرے سکندر کا گھر بھی پھر سے آباد ہو جائے....." میں نے تڑپ کر بڑی سرکار کی طرف دیکھا..... میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ یہی بات وہ حاکم بابا سے بھی کر چکی تھیں۔ میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل پایا۔

"اللہ آپ کے خاندان کی خوشیاں ہمیشہ برقرار رکھے....." زہرہ پردے کے دوسری جانب خاموش بیٹھی رہی۔ میں بھاری قدموں سے کمرے سے نکل آیا۔ بڑی سرکار بھی میرے پیچھے تیزی سے لپکیں اور انہوں نے قریب

کھڑی خادمہ کو کچھ اشارہ کیا، نوکرانی نے جلدی سے ایک کاغذ کا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ پیچھے سے بڑی سرکار کی آواز سنائی دی۔

"یہ نذرانہ قبول کریں چھوٹے سائیں جی..... آپ نے بڑی زحمت کی آج..... میں آؤں گی درگاہ پر بھی چڑھاوا چڑھانے....." میں نے لفافہ خادمہ کے ہاتھ میں ہی رہنے دیا جس میں شاید بہت سے نئے کرنسی نوٹ بند تھے۔

"دعاؤں کے بدلے پیسے نہیں لیے جاتے..... کسی کی دعا کو کاروبار میں نہ بدلیے..... بعض دعائیں انمول ہوتی ہیں....." بڑی سرکار نے چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

✱.....✱.....✱

باب 37

بڑی سرکار کی حویلی سے نکلتے ہوئے ایک لمحے کے لئے میرا دل بہت زور سے مچلا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گھڑی بھر پلٹ کر اوپر دوسری منزل پر بنے اس جھروکے کی طرف دیکھا جو اس کے کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ مگر زہرہ کے کمرے کی کھڑکی سنسان پڑی تھی۔ صرف شام کی چلتی تیز پروائی سے جھروکے میں بنی کھڑکی کے ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ سکندر والا مردانہ حصہ بھی سنسان پڑا تھا۔ شاید وہ لوگ ابھی زمینوں کی سیر سے واپس نہیں لوٹے تھے۔ سکندر مجھے زنانہ حصے سے یوں مزار کے خاص مجاور کے روپ میں نکلتے دیکھ لیتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ شاید بہت دیر تک ہنستا رہتا کیونکہ وہ پہلے ہی میرے اس حلیے کو کوئی بہروپ سمجھ بیٹھا تھا جو میں نے قانون کی نظروں سے بچنے کے لئے طاری کر رکھا تھا۔ ویسے اس کی سوچ کچھ زیادہ غلط بھی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو مجھے خود اپنا آپ ہی بہروپیا لگتا تھا۔ دو دنیاؤں کے بیچ بٹا ہوا ایک ڈھونگی۔ جو کسی بھی جگ کو پورا نبھا نہیں پایا۔

مزار تک واپس پہنچتے پہنچتے شام ڈھل چکی تھی۔ سورج کو بھی دن بھر کی مزدوری کے بعد تھوڑا آرام درکار ہوتا ہوگا شاید۔ ایک میرے ہی دل مضطرب کو کسی کروٹ چین نہیں تھا..... بڑے مجاور نے مجھے بتایا کہ حاکم بابا ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔ میں وہیں حجرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ صحرا کی راتیں زیادہ خاموش ہوتی ہیں اور تاروں کی چمک روشن تر، مجھے یاد آیا جب یونیورسٹی میں میرے فائن آرٹس کے کچھ دوست فلمساز بننے کے لئے بیرون ملک کی چند اچھی فلم پڑھانے والی یونیورسٹیوں سے ڈگری لے کر لوٹے تھے تو وہ گھنٹوں بیٹھ کر فلم کے سیٹ کو ڈسکس کیا کرتے تھے۔ اس مذاکرے میں اچھی فلم کے لئے بہترین منظر نامے اور اچھے سیٹ کی تیاری پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ آج یہ کھلا صحرا، یہ مزار اور تاروں بھرا آسمان مجھے کسی فلم کا بڑا سیٹ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ قدرت سے زیادہ اچھا سیٹ یا منظر بھلا کون تخلیق کر سکتا ہے.....؟

کبھی کبھی تو یہ دنیا اور آس پاس پھیلی ساری کائنات مجھے کسی بڑے شاندار فلم سیٹ کی طرح لگتی تھی۔ انسان یہ سارے گُر قدرت ہی کو دیکھ کر پھر مختلف فنونِ لطیفہ میں ڈھالتا ہے۔ یہ ساری سیکھ اسے قدرت سے ہی ملتی ہے۔ میں بہت دیر تک آسمان پر نظریں جمائے یہ سوچتا رہا کہ خدا نے آسمان کی یہ تاروں بھری زیبائش کس کے لئے کی ہوگی؟ جسے چند راتوں کیلئے کھلتی چاندنی ڈھک لیتی ہے۔ زہرہ بھی تو ایک چاند کا نام تھا جو مجھ جیسے کئی ٹوٹے تاروں کو پل بھر میں ماند کر دیتا ہے۔ مجھے یونہی بیٹھے جانے کتنی دیر گزر گئی تھی حاکم بابا اپنے دو مریدوں کے ساتھ مزار کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے دکھائی دیئے اور مجھے باہر صحن میں بیٹھے دیکھ میری طرف ہی چلے آئے۔

''معاف کرنا عبداللہ میاں..... مجھے واپس آنے میں کچھ دیر ہوگئی، امید ہے میرے پیچھے سب درست ہی رہا ہوگا.....'' مجھے حاکم بابا کے معصومانہ سوال کے پیچھے کئی کہانیاں چھپی نظر آئیں۔ کتنی سادگی سے وہ خود کو ہر انہونی سے بری الذمہ قرار دے کر ایسے پوچھ رہے تھے جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ میرا دل چاہا کہ ان سے کہہ دوں کہ وہ بھی سلطان بابا کی طرح مجھ سے دل لگی کرنے لگے ہیں۔

''جب آپ کو سب معلوم ہے تو پھر ہر بار مجھ سے یہ سوال کیوں کرتے ہیں؟ جو ملاقات طے تھی، وہ ہو کر بھی نہیں ہوئی..... آپ کو بڑی سرکار کے بلاوے کا بھی علم تھا پہلے سے، مگر آپ عین وقت پر کسی اور سائل کے ساتھ چل پڑے.....''

حاکم بابا دھیرے سے مسکرائے۔ ''آج تو بہت ناراض دکھائی دیتے ہو..... کیسے مناؤں میں اپنے عبداللہ میاں کو..... بتاؤ؟''

میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا ''سارے زمانے کی فکر ہے آپ کو..... نہیں ہے تو بس میری..... ٹھیک ہے..... یونہی سہی..... سلطان بابا بھی ہمیشہ میرے ساتھ یہی کیا کرتے تھے..... آگ کے دریا میں اُتار کر ڈوب کر پار کرنے کا حکم دیا جاتا تھا..... اور پھر خود کنارے پر کھڑے رہ کر میری بے بسی کا تماشہ دیکھتے رہتے تھے..... اور جب مجھے ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی..... وہ سب چھوڑ چھاڑ ابدی سفر پر چلتے بنے..... یہ بھی نہیں سوچا کہ میں کتنا تنہا ہو جاؤں گا ان کے جانے کے بعد.....''

میری آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی چھلک پڑیں۔ حاکم بابا نے میرا شانہ سہلایا ''وہ آج بھی تمہارے ساتھ ہی ہیں۔ صرف فانی جسم کے فنا ہو جانے سے روحوں کے دھاگے بھلا کب ٹوٹتے ہیں۔ ہر جسم کو ایک نہ ایک دن یہ دُنیا چھوڑنی ہے اور منوں مٹی تلے دفن ہونا ہی ہے۔ مگر انسان صرف جسم کا نام نہیں..... اور بھی بہت کچھ عطا ہوا ہے اُسے..... اچھا ہے..... کچھ دیر رو لو..... بہت زیادہ آنسو اندر جمع ہو جائیں تو کڑواہٹ بھر دیتے ہیں۔''

وہ مجھے بہت دیر تک تھپکتے رہے اور باقی ساری رات مجھے یہ بات اندر ہی اندر بے چین کرتی رہی کہ مجھے اپنے وجود کی تلخیص کو چھپا کر رکھنا چاہیے تھا۔ میرے ساتھ جو ہوا وہ میرا مقدر تھا، پھر میں اس کا الزام اپنے پیاروں پر کیوں دھروں؟ میں نے دل میں پکا ارادہ باندھ لیا کہ صبح ہوتے ہی حجرے میں جا کر حاکم بابا سے معافی مانگ لوں گا اور میں جانتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ میری اس خطا کو بھی نادانی سمجھ کر اپنی ایک میٹھی مسکراہٹ سے ٹال دیں گے۔ جانے اس میلی دنیا میں کچھ لوگ اپنے دل کا آئینہ اتنا صاف اور شفاف کیسے رکھ لیتے ہیں؟ مگر دن نکلتے ہی مزار کے باہر ریت کے میدان میں بہت سی گاڑیوں کے شور نے صحرا کے سکون میں ہلچل سی مچا دی۔ مجاور گھبرا کر باہر کی طرف لپکے اور تھوڑی ہی دیر میں بہت سارے پولیس والے دندناتے ہوئے مزار کے صحن میں داخل ہو گئے۔ اور بنا کسی اجازت اور اطلاع مزار کا چپہ چپہ یوں کھنگالنے لگے جیسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو انہیں۔ میں چپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

مجاوروں نے پولیس والوں کو حاکم بابا کے حجرے میں جھانکنے سے روکنا چاہا مگر حاکم بابا نے اندر سے ہی آواز دے کر مریدوں کو کسی بھی مزاحمت سے منع کر دیا۔ دو چھوٹے رینک کے افسر میری طرف بھی لپکے اور ان میں

سے ایک نے درشت لہجے میں مجھ سے پوچھا کیا ''نام ہے تمہارا..... اور کب سے یہاں رہتے ہو.....'' میں نے سکون سے جواب دیا۔ ''عبداللہ نام ہے میرا..... اور ابھی چند دن پہلے ہی یہاں آیا ہوں.....'' اتنے میں پیچھے سے کسی کی طنز زدہ اور کڑک آواز اُبھری۔

''عبداللہ..... یا ساحر..... کتنے نام ہیں تمہارے.....؟ یا پھر میں یہ سمجھوں کہ تمہیں نام بدلنے کا شوق ہے.....''

میں چونک کر پلٹا، میرے پیچھے وہی نوجوان پولیس افسر کھڑا تھا جس نے مجھے شہریار کے استاد کے دروازے سے گرفتار کیا تھا۔ اے۔ ایس۔ پی تیمور..... اسد تیمور..... میرا ماتھا اسے اس ویرانے میں دیکھ کر ٹھنکا، مگر میں نے حواس قابو میں رکھے۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ افسر میرے چہرے کے ہر تاثر کا بہت باریکی سے جائزہ لے رہا ہوگا۔ ''اوہ..... تو یہ تم ہو آفیسر..... کیا میری تلاش میں اس ویرانے میں بھٹک رہے ہو..... یا کوئی نیا جرم میرے کھاتے میں لکھنے آئے ہو.....'' اسد نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''شاید اس درگاہ کے کسی باسی کو یہ خبر نہیں ہوگی کہ ان کے درمیان اس جوگی بنجارے کے بھیس میں سزائے موت کا ایک پرانا سزا یافتہ قیدی ان کے درمیان موجود ہے..... جس نے اپنا نام بھی بدل رکھا ہے.....''

میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا ''کیا نام بدلنے کے جرم میں مجھے گرفتار کرنے آئے ہو آفیسر؟''

وہ ہنس پڑا ''نہیں..... ابھی یہ قابل تعزیرات جرم نہیں ہے اس ملک میں..... البتہ تلاش ایک دوسرے سزائے موت کے قیدی کی ہے..... اور تم بھی جانتے ہو اسے.....''

میرا دل اسد کی یہ بات سن کر بہت زور سے دھڑکا، کہیں اسے ظہیر کی اس سرحدی قصبے میں موجودگی کی اطلاع تو نہیں مل گئی۔ وہ بہت تیز پولیس والا تھا اور اس کی یہاں موجودگی کسی بڑے خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی۔ میں نے اپنی آواز کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کی ''اس ویرانے میں اتنی تیاری کر کے آئے ہو تو ضرور کسی بھروسے ہی آئے ہوگے.....''

اسد نے غور سے میری طرف دیکھا ''پولیس ہمیشہ اپنے شک کے بھروسے اپنی تفتیش آگے بڑھاتی ہے۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ساتھ جیل توڑ کر فرار ہونے والا قیدی کندن اسی طرف آیا ہے..... بولو..... کہاں چھپا رکھا ہے اُسے.....؟''

اسد کی زبان سے کندن کا نام سن کر میرے ذہن میں بہت سے جھماکے ہوئے۔ یعنی کندن ابھی زندہ ہے۔ ظہیر کے چہرے پر بری خبر کے ذکر پر مایوسی دیکھ کر میرا دل کندن کی طرف سے بہت خدشات کا شکار ہوگیا تھا۔ اسد کی نظریں ابھی تک میرے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے لہجے کا سکون برقرار رکھا۔ ''کندن یہاں نہیں آیا..... تم چاہو تو سارے مزار کی تلاشی لے سکتے ہو.....''

''تلاشی تو میں ضرور لوں گا..... مگر تمہارے چہرے کا اطمینان بتا رہا ہے کہ تمہارا ساتھی فی الحال کسی محفوظ مقام پر ہے۔ اور ہاں..... وہ تمہارے گروہ کا سرغنہ..... ظہیر..... ہم اس کی کھوج بھی لگا رہے ہیں۔ بہت ذہین ہے

وہ، ہر بار ہمیں چکمہ دے کر نکلتا رہا ہے وہ آج تک..... مگر وہ دن دور نہیں جب اس کی شہ رگ پر بھی قانون کا سخت ہاتھ ہوگا۔ آخری اطلاعات ملنے تک وہ بھی کسی سرحدی علاقے سے سرحد پار کرنے کی تگ و دو میں بھٹکتا دیکھا گیا تھا، مگر وہ ایک بار پھر ہماری گرفت سے دور نکل گیا۔

پھر کچھ سوچ کر اسد زور سے چونکا "اور یہ بھی تو ایک سرحدی قصبہ ہے ناں..... دوسرے ملک کی سرحد یہاں سے چند میل پرے ہی تو ہے..... تو کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے دونوں مفرور دوست اسی سرحد سے بیرونِ ملک فرار ہونے کے منصوبے سے یہاں پہنچنے والے ہوں۔ اور تم ان دونوں کی مدد کے لئے پہلے ہی یہاں کسی مجاور کا سوانگ بھرے بیٹھے ہوئے ہو۔" اے۔ ایس۔ پی خود ہی اپنے ذہن کی بند گرہیں کھولتا چلا گیا۔

"اندازے اچھے لگا لیتے ہو تم..... مگر قانون صرف اندازوں پر سزا نہیں سناتا۔ تمہیں اپنی اس تھیوری Theory کو ثابت کرنے کے لئے بہرحال ثبوت کی ضرورت تو ہوگی....."

"ثبوت بھی مل جائیں گے۔ فی الحال تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا..... مجھے تم سے کچھ ضروری تفتیش کرنی ہے....." اس ساری گفتگو کے دوران ہمارے اردگرد مزار کے مجاور اور دوسرے خدمت گار گول دائرے میں ایک ہجوم کی صورت جمع ہو چکے تھے۔ آس پاس کھڑے پولیس والے بھی ان کے بدلتے تیور دیکھ کر ہوشیار سے کھڑے تھے۔ شاید انہوں نے بھی کسی ہونے والے بلوے کی بو سونگھ لی تھی۔

میں حاکم بابا کا مرید خاص تھا اور ان سب کے لئے میری گرفتاری ہرگز قابلِ قبول نہ ہوتی، مجمعے میں بے چینی پھیلنے لگی اور سرگوشیاں کسی شور میں بدلنے لگیں جبھی حجرے سے حاکم بابا باہر نکلتے دکھائی دیئے "تم عبداللہ میاں کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جا سکتے ہو۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ یہ ہماری امانت ہے تمہارے پاس..... تمہاری تسلی ہو جائے تو خود ہی لوٹا دینا....." اسد نے غور سے حاکم بابا کی طرف دیکھا۔

"آپ کی تعریف..... بزرگوار....." ایک مرید نے غصے سے کہا۔

"یہ ہمارے سلطان بابا ہیں..... ہمارے مرشد....." اسد کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"خوب..... تو یہاں پیری مریدی کا یہ کھیل رچایا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے مجھے تم جیسے بیوقوف مریدین کو دیکھ کر..... زمانہ چاند سے ہو کر اب مریخ پر اترنے کی سوچ رہا ہے..... سائنس انسانیت کی معراج کو چھونے کو ہے..... دنیا خلائی نظام کا کاروبار سنبھالنے کے قریب ہے اور روبوٹس انسانوں کی جگہ لینے والے ہیں..... مگر یہاں تم سب ابھی تک اس ذہنی پستی کا شکار ہو..... دقیانوسیت کی انتہا ہے یہ..... میں پوچھتا ہوں کہاں لے جا رہے ہیں آپ اس قوم کو جو پہلے ہی ہزار توہمات کا شکار ہے۔ کیوں پھر سے اسے غاروں کے دور میں دھکیل رہے ہیں یہ جھوٹے دلاسے دے کر اور یہ خیالی دنیا دکھا کر..... کچھ تو خیال کرو بزرگو..... مت برباد کرو ان معصوم لوگوں کے ذہنوں کو جو پہلے ہی اندھی تقلید کی وجہ سے باقی دنیا سے سو سال پیچھے رہ گئے ہیں..... ورنہ یہ اپنی باقی زندگی بھی کسی ایسے معجزے کے انتظار میں گزار دیں گے جو کبھی رونما ہونے والا نہیں..... نکل آؤ تم سب بھی اس احمقانہ تصوراتی دنیا سے..... اور اپنی دنیا خود سنوارو....."

اسد کے اندر کی تلخی اس کے سخت لفظوں کی صورت باہر نکلی تو کچھ دیر ماحول پر عجیب سی خاموشی طاری رہی پھر حاکم بابا بولے تو لہجے کی ملائمت برقرار تھی "تمہاری کسی بات سے کوئی بھی ذی ہوش شخص انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ بحیثیت قوم ہم واقعی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اتنا کہ آگے بڑھنے والوں کی گرد کو بھی پہنچنا مشکل لگتا ہے۔ توہمات نے گھیرا ڈال رکھا ہے ہمارے اردگرد۔ سائنس اور باقی دنیاوی علوم سے دوری نے ہمیں دوبارہ غار کے دور میں دھکیلنے میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی..... مگر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ علم بنا عمل بھی جہالت کی ایک خاص قسم ہی ہوتا ہے..... اور تمہیں شاید کسی نے یہ غلط اطلاع دی ہے کہ ذکر اور افکار انسان کو سائنسی دنیا سے دور کرتا ہے..... اصل مسئلہ اُن لوگوں کا ہے جو اپنی سیدھی راہ سے بھٹک کر غیر اللہ کی منت اور منت میں پڑ کر شرک کے مرتکب ہوجاتے ہیں..... دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے اور مانگے جانا صرف اس کا حق....."

اے۔ ایس۔ پی حاکم بابا کی باتیں سن کر چونک سا گیا مگر ایک تربیت یافتہ پولیس والے کی طرح اس نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا "تو پھر یہ بات آپ ایسے گمراہوں کو سمجھاتے کیوں نہیں.....؟"

حاکم بابا مسکرائے "ہر کوئی تمہاری طرح سمجھدار نہیں ہوتا لڑکے..... انسان اندر سے ٹوٹا ہوا ہو تو معجزے کی اُمید اُسے یہاں کھینچ ہی لاتی ہے..... سبھی ایک برابر ہوتے تو سہ تمہاری طرح مقابلے کا امتحان دے کر افسری نہ کر رہے ہوتے کہیں..... مگر قدرت نے سبھی انسانوں کی ذہنی صلاحیت ایک جیسی نہیں رکھی..... یہ اونچ نیچ سدا سے ہے اور ہمیشہ رہے گی..... انہی کمزور ذہنی استعداد والوں میں سے کچھ بھٹک بھی جاتے ہیں....."

اسد نے مزید بحث کے بجائے اپنے قریب کھڑے اہلکاروں کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے لے چلیں۔ میں نے بھی چپ چاپ قدم بڑھا دیئے۔ پیچھے سے حاکم بابا کی آواز سنائی دی۔

"اور ہاں لڑکے..... کبھی موقع ملے تو طبعیات سے نکل کر مابعد الطبعیات پر بھی دھیان دینا..... جو نظر نہ آئے..... ضروری نہیں کہ وہ معدوم ہی ہو..... اور رہی بات ذکر اور افکار کی..... تو اس کے بارے میں تمہاری ماڈرن سائنس بھی آج یہ تسلیم کرتی ہے کہ خاص فریکوئنسی پر کوئی بھی ورد، یوگا یا میڈی ٹیشن (Meditation) کی ہی ایک قسم ہوتا ہے جو انسانی ذہن کو پرسکون کر کے اس کے اندر کی بند کھڑکیاں دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔ اور اب تو تمہارا قانون بھی ہپناٹزم کو تفتیش کے لئے استعمال کرنے پر غور کر رہا ہے..... یہ سارا معاملہ انسانی ذہن کی الجھی گتھیاں سلجھانے پر ہی تو منحصر ہے....."

اسد اس بار چاہ کر بھی اپنے اندر کی حیرت کو چہرے پر آنے سے روک نہیں پایا۔ اور کچھ دیر غور سے مجھے اور حاکم بابا کو دیکھتا رہا "لگتا ہے آپ سے ایک ملاقات اور ہوگی بزرگوار..... آپ کی اس گفتگو نے میرے ذہن میں اور کئی سوال کھڑے کردیئے ہیں۔ مگر پہلے میں آپ کے شاگرد عبداللہ سے چند باتیں کرلوں..... مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی عار نہیں کہ آپ دونوں نے آج مجھے حیران کیا ہے..... مگر یاد رکھئے..... ایک پولیس والے کا حیران ہونا اسے مزید مشکوک بنا دیتا ہے اندر سے..... دعا کریں کہ میرا کوئی شک اب حقیقت کا روپ نہ دھار لے....."

اسد اپنی بات ختم کر کے ایک جھٹکے سے پلٹا اور پولیس والے مجھے اپنے ساتھ لیے پیچھے کھڑی گاڑیوں میں

سے ایک میں بٹھا کر تھانے کی طرف چل پڑے۔ سارے راستے میرے دل و دماغ میں یہی خدشے قبضہ جمائے ڈنک مارتے رہے کہ کس طرح ظہیر کو یہ خبر پہنچائی جائے کہ قانون کا شکنجہ اس کا پیچھا کرتے کرتے اس صحرا تک بھی آپہنچا ہے۔ لہٰذا وہ کسی اور طرف نکل جائے..... مگر کندن..... کندن کا تو مجھے خود بھی کچھ اتہ پتہ نہیں تھا۔ کہیں کندن بے خبری میں ہی پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ ضرور وہ بھی ظہیر کے منصوبے کے مطابق میری طرح طے شدہ مدت پوری ہونے پر بختیار آباد کی طرف آیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ سارنگا کے گل مہر ہوٹل بھی پہنچ چکا ہو اور اب وہاں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہو۔ میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک پولیس کی پرانی جیپ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور گاڑی رک گئی۔ میں نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں اور سامنے دیکھا۔

✻.....✻.....✻

باب 38

پولیس کی گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تو میں نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ سامنے ہی پیلے پتھر سے بنی ایک خستہ حال عمارت کھڑی تھی۔ جس کے اوپر کچھ مٹے ہوئے سے سیاہ حرفوں میں ''تھانہ بختیار آباد'' لکھا ہوا تھا۔ عمارت کی تعمیر پرانے طرز کی کسی سرائے کے مانند تھی۔ لمبے برآمدے، اونچے ستون، کھلی جالی دار کھڑکیاں اور دیواروں میں بنے اونچے روشن دان۔ سنتری مجھے پکڑ کر ایک اُونچی چھت والے روشن کمرے میں لے آئے جہاں پرانا بوسیدہ فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ ایک میز، چار پانچ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور سامنے دیوار میں لگی سالا خوردہ لکڑی کی الماریاں۔ سائلین کے بیٹھنے کے لئے دیوار کے ساتھ لکڑی کے پرانے بینچ پڑے تھے۔ سنتری نے مجھے بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ان میں سے ایک دروازے پر پہرے کے لئے کھڑا رہا جبکہ باقی دو کمرے سے نکل گئے۔

کمرے کی دیوار پر ایک دیمک زدہ سی پرانی گھڑی جھول رہی تھی، جس کی سوئیوں کو بھی زنگ لگ گیا تھا۔ مگر پھر بھی دونوں سوئیاں حتی الامکان گزرتا وقت بتانے کی سعی کر رہی تھیں۔ دن کے 12 بجنے والے تھے۔ مجھے ظہیر اور کندن کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ تبھی باہر برآمدے میں چند بھاری قدموں کی چاپ اُبھری اور اگلے ہی لمحے اے۔ ایس۔ پی اسد میرے سامنے موجود تھا۔

''تمہاری ایک بات بہت اچھی ہے..... تم زیادہ سوال نہیں کرتے..... نہ ہی اپنا کوئی قانونی حق جتانے کی ناکام کوشش کرتے ہو۔ جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ قتل اور جیل توڑ کر بھاگنے کے جرم میں گرفتار کیا تھا، تب بھی تم نے اتنی ہی خاموشی سے پولیس والوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈلوا کر پولیس اسٹیشن چلے آئے تھے میرے ساتھ.....''

میں نے غور سے اسد کی طرف دیکھا ''تب تو مجھ پر قتل کا الزام تھا۔ آج کس الزام میں گرفتار کر لائے ہو تم مجھے.....؟ جرم بتا دو گے تو قیدی کو کچھ اطمینان ہو جائے گا.....''

''نہیں..... فی الحال تمہیں گرفتار نہیں کیا میں نے..... اور پرانے قتل والے جرم سے تو ویسے بھی تمہیں عدالت نے بری کر دیا ہے۔ ویسے تمہارا یہ اطمینان اور بنا کسی خوف کے یہ سکون بھرا لہجہ مجھے ہمیشہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ یا تو تمہیں ہم جیسے پولیس والوں سے نبٹنے کا بہت پرانا تجربہ ہے..... یا پھر واقعی تمہیں ان تہہ خانوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا.....؟''

میں نے اسد کے الجھن زدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ ''میرے ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہم انسان ہمہ

وقت ایک قید کا شکار ہیں۔ فرق صرف بڑے اور چھوٹے پنجرے کا ہے..... اور تمہاری یہ جیل باہر کی قید کے مقابلے میں صرف ایک چھوٹا سا پنجرہ ہی تو ہے.....''

اسد چونک سا گیا'' گویا اپنے پیر کی طرح تم بھی خاصے پڑھے لکھے ہو۔ حیرت زدہ ہوں میں..... اس ویران صحرا کی ایک پرانی بوسیدہ دیواروں والی ایک درگاہ میں بیٹھا ایک بوڑھا مجھے صبح سویرے میٹافزکس پر لیکچر دیتا ہے تو کچھ ہی دیر بعد اس کا شاگرد تصوف پر درس دیتے نظر آتا ہے۔ تمہی بتاؤ..... میں اس اتفاق کو کیا سمجھوں.....؟ کہیں یہ ساری کسی بڑی سازش کی نشانیاں تو نہیں ہیں عبداللہ.....''

''تم اتنے مشکوک کیوں ہو رہے ہو..... ہوسکتا ہے یہ صرف ایک اتفاق ہی ہو.....'' اسد کی آواز بلند ہوگئی۔ شک کرنے کی کئی وجوہات ہیں میرے پاس..... سرحد یہاں سے صرف تین چار کلومیٹر دور ہے..... اور سزائے موت کے دو مفرور قیدیوں کی اسی علاقے میں موجودگی کا قوی امکان ہے..... جبکہ اُنہی کا تیسرا جیل سے رہا شدہ ساتھی اسی سرحد کے قریب ایک درگاہ میں صوفی بنا بیٹھا ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اسی درگاہ میں ماڈرن دنیا سے سینکڑوں میل دور ایک ایسا بوڑھا درویش بھی موجود ہے جو فزکس اور میٹافزکس کے پیمانے بیان کر کے لوگوں کو متحیر کرسکتا ہے۔ کیا یہ سب چیزیں مل کر شک کے بہت بڑے پہاڑ کھڑے نہیں کر رہیں۔ کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ تم سب سرحد پار ملک کے کچھ جاسوس ہو جو کوئی بڑا منصوبہ بنائے ں اس کی تکمیل کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہو.....''

اے۔ ایس۔ پی اسد بولتا چلا گیا۔ میں نے سکون سے اس کی بات سنی''پولیس والے بن کر سوچو گے تو تمہارے یہ سب شکوک جائز ہیں، لیکن اگر سوچ کا زاویہ تھوڑا سا بدل کر غور کرو گے تو بات صرف اتنی ہے کہ تم خود بھی ایک روایتی توہم پرستی کا شکار ہو، جس دقیانوسی پن اور جہالت کا طعنہ تم نے درگاہ میں سلطان بابا کو دیا تھا، تم خود اپنے اندر ایسے کئی جالے بن کر بیٹھے ہوئے ہو جو تمہیں کسی دوسری جانب سوچ کا رُخ موڑنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تم ہمیں پسماندہ اور قنوطیت بھری سوچ کا طعنہ دیتے ہو اور مجھے تم میں ایک ضد، انا پرست اور گھمنڈی ماڈرن اور جدید دور کی سوچ گھیرے ڈالے نظر آتی ہے۔ جو اپنے سامنے باقی ہر سوچ اور ہر خیال کو کم تر سمجھتی ہے اور صرف تم ہی ایک ایسے نہیں ہو..... تم جیسے اور بہت سے خوف زدہ لوگ ہمارے آس پاس بستے ہیں جو ہر لمحہ جدیدیت کی تلوار لیے ہر اس شخص کے نظریے کا سر قلم کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں جو ان کی ٹھیک یا غلط سوچ سے ذرہ سا بھی اختلاف کرے.....''

اسد میری بات سن کر غصے میں آ گیا''میں خوف زدہ نہیں ہوں کسی کے بھی نظریے سے۔''

''اگر خوف زدہ نہیں ہو تو پھر اپنے مرضی کے فیصلے کیوں صادر کروانا چاہتے ہو۔ تم جس جدید سائنس اور نظریے کا پرچار کرتے رہتے ہو۔ کیا کبھی سوچا ہے کہ تم لوگ خود اپنی زندگی میں اس پر کتنا عمل کرتے ہو؟ بات صرف اتنی ہے کہ تم یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ کچھ پڑھے لکھے اور زندگی کے دیگر علوم سے آشنا لوگ بھی ان درگاہوں یا مزاروں کی چار دیواری میں موجود ہوسکتے ہیں جو اپنے کسی ذہنی سکون یا دل کے فیصلے کے تحت اپنے آپ کی کھوج میں وہاں تک پہنچتے ہیں۔ تم جیسوں کی ذہنیت صرف اسی روایتی دقیانوسی اور توہم پرست سوچ کے دائرے میں ہی قید ہے جو درگاہ کے ہر شخص کو ایک نکما، ناکارہ، جاہل اور پسماندہ فرد سمجھتی ہے۔ جو دنیا کی جدید دوڑ سے فرار حاصل کرنے کی

خاطر وہاں پناہ لیے بیٹھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ زیادہ تر ایسے کمزور عقیدہ ہی ان درگاہوں کا رُخ کرتے ہیں۔ مگر سب کو ایک ہی ترازو میں تولنا بھی ناانصافی ہے۔ پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں۔ قدرت نے درخت سے سیب نیچے گرایا تبھی نیوٹن کو نظریہ کشش ثقل کی سوچ آئی تھی۔ اور یہ سوچ کسی جدید سائنس کی لہر نے اس کے دماغ میں پیدا نہیں کی تھی اس وقت..... وہ سوچ کی تسبیح پڑھتا چلا گیا اور اس پر چیزیں واضح ہوتی چلی گئیں..... یہ تمہاری ماڈرن فزکس، کیمسٹری، بائیالوجی..... یہ ایٹم، نیوکلیئر سائنس اور یہ خلائی دنیا، جسے تم جیٹ ایج یا اسپیس ایج Space age کہتے ہو..... یہ تو ازل سے ہی اپنی جگہ موجود تھیں۔ بس انسانی سوچ کے ارتقاء نے دھیرے دھیرے انہیں جانا ہے۔ اور آج بھی ریت کے صحرا کے صرف ایک ذرے کی حد تک ہی انسان یہ سارے راز جان پایا ہے، کبھی سوچا ہے کہ قدرت کی عطا کی ہوئی سوچ نہ ہوتی اس کمزور انسان کے پاس تو کیا ہوتا.....؟ سائنس بھی صرف ایک علم ہی ہے دوسرے مادی علوم کی طرح..... اس کی تسخیر کو انسان کی تسخیر کا نام مت دو..... انسان نے سائنس کو تسخیر کیا ہے..... سائنس نے انسان کو نہیں..... اور جیسے سائنس ایک علم ہے..... اس طرح اور علوم اور اسرار بھی موجود ہیں اس کائنات میں..... جن میں سے ایک صوفی ازم بھی ہے۔

تمہیں اسٹیفن ہاکنگز کی باتیں متاثر کرتی ہیں تو مجھے ..می کی..... تم جیمس واٹسن James watson کی مالیکولر تھیوری سے متاثر ہو تو مجھے شمس تبریز کی حکایات سے..... تو پھر اس میں جھگڑا کس بات کا ہوا؟ اگر میں تمہیں تمہاری جدید سائنس کی دنیا سمیت تسلیم کر رہا ہوں تو تمہیں مجھے میری درگاہ کے ساتھ قبول کرنے میں کیا اعتراض درپیش ہے.....''

میں بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اسد خاموش بیٹھا میری بات سنتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ جذبات میں میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہوں۔ اسد کی آواز اس بار دھیمی تھی ''بولتے رہو..... چپ کیوں ہو گئے..... میں مانتا ہوں کہ میں اپنے نظریات میں آج تک بہت اٹل رہا ہوں اور میری نوکری ایسی ہے جس کی گھٹی میں ہی شک گھول کر پلا دیا جاتا ہے۔ مگر تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہم میں سے کسی کو بھی کوئی قطعی فیصلہ صادر کر کے اپنے اصول اور نظریئے کو دوسرے کے دماغ میں ٹھونسنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ جبکہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اب یہی غلط رسم ایک رواج بن چکی ہے۔ بہرحال..... وقتِ فراغت تمہاری باتوں پر غور ضرور کروں گا۔ حالانکہ یہ سب کچھ میرے لئے بہت نیا ہے۔ مگر سوچ کر سمجھنے اور غور کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ مگر پھر بھی..... تمہاری خاص اسی علاقے میں موجودگی کا کیا جواز ہے عبداللہ..... یہ بات تم نے ابھی تک واضح نہیں کی.....''

میں نے ایک گہرا سانس لیا'' کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا جواز ابھی مجھ سے نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ جھوٹ میں بولوں گا نہیں اور سچ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ تم چاہو تو مجھے گرفتار کر کے جیل میں یا اپنی اس حوالات میں قید میں ڈال سکتے ہو۔ تاکہ تم اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکو۔ میں یہاں قید میں تمہاری حوالات میں تمہارے عملے کی نگرانی میں اور تمہاری نظر کے سامنے رہوں گا تو تمہیں بھی اطمینان رہے گا کہ میں تمہارے فرائض کی ادائیگی میں کوئی دخل اندازی نہیں کر رہا۔ اور یہاں بیٹھ کر تو میں اپنے دوستوں کی کوئی مدد کرنے سے رہا..... لہٰذا تمہارا یہ شک بھی دور ہو جائے گا کہ میں کسی خاص منصوبے کے تحت اس سرحدی قصبے میں آیا ہوں.....''

اسد نے میری بات سن کر ایک گہری سانس لی۔ ''نہیں..... میں تمہیں قید نہیں کر سکتا..... تمہاری باتوں نے میرے ذہن میں لگے بہت سے جالے صاف کر دیئے ہیں..... شاید اس بار میرا واسطہ واقعی کچھ مختلف لوگوں سے پڑا ہے۔ لہٰذا میرا برتاؤ بھی روایتی پولیس سے کچھ ہٹ کر ہی ہونا چاہیے.....'' اسد نے اٹھ کر میز پر پڑی ایک پرانی فائل اٹھائی۔

''جانتے ہو..... یہ تمہارے جیل کے ساتھی کندن کی فائل ہے۔ تم چاہو تو اس فائل میں لکھی کندن کے ماضی کی کہانی پڑھ سکتے ہو..... تب تک میں کچھ ضروری دوسرے کام نبٹا کر آتا ہوں۔ اسد کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ فائل اٹھالی..... اور میرے ذہن میں کندن کے ماضی کی فلم سی چلنے لگی.....

پہاڑوں سے گھرے اس چھوٹے سے شہر کے باسیوں میں بہت ایکا تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی..... سب ہی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور مذہبی رواداری مثالی تھی۔ ایک جانب مسجد سے اذان کی آواز فضا میں سُر بکھیرتی تو دوسری جانب کسی گرجا گھر کی گھنٹی بجتی اور اتوار کی سروس میں کیرول گاتے بچے بڑے چرچ سے برآمد ہوتے۔ جوزف بھی شہر کے وسط میں قائم اسی گرجا گھر کا خدمت گار تھا اور چرچ کا پادری اس پر بہت اعتبار کرتا تھا۔ تبھی تو اس نے چرچ کی سروس اور باقی تمام معاملات جوزف پر ہی چھوڑ رکھے تھے۔

جوزف گرجا گھر سے منسلک ایک چھوٹی سی عیسائی کالونی میں رہتا تھا جہاں اس کا مختصر سا کنبہ، اس کی بیوی کیتھرین اور پانچ سالہ بیٹا کندن پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ جوزف کی خواہش تھی کہ کندن بھی جوان ہو کر کسی بڑے چرچ کا پادری بنے اور لوگ اسے عزت اور تکریم سے فادر پکاریں۔ مگر کمسن کندن کا ذہن تو لڑکپن سے ہی کسی دوسری افسانوی دنیا کی بھول بھلیوں میں کھویا رہتا تھا۔ گھر میں اُردو اخبار آتا جس میں ہفتہ وار رنگین فلمی صفحہ بھی ہوتا۔ کندن سادہ صفحے کے اوپر کونے میں چھپی ٹارزن اور اس کے دوست بھالو کی کہانی چھوڑ کر سارا دن رنگین فلم والے صفحے پر ہیرو ہیروئن کی تصویروں کو تکتا رہتا۔

سدھیر، احمد علی، ندیم اور وحید مراد اُسے بہت بھلے لگتے اور دوسری طرف زیبا، شبنم، نشو اور بابرہ شریف اس کے دل کو لبھاتی تھیں۔ وہ ماں باپ سے چھپ کر ان فلمی ستاروں کی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنی چوتھی اور پانچویں کی کتابوں میں سجائے رکھتا۔ گھر سے نکل کر اسکول جاتے رستے میں کئی جگہوں پر اگلی جمعرات کو ریلیز ہونے والی فلموں کے پوسٹر لگے دیکھ کر کندن کے قدم جم جاتے اور وہ بہت دیر تک سحر زدہ سا کھڑا اُن فلمی اشتہارات اور پوسٹروں کو دیکھا کرتا تھا۔ اس لئے اسے ساری نئی آنے والی فلموں کا پتہ ہوتا تھا کہ کس سینما میں کون سی فلم آنے والی کس تاریخ کو لگے گی۔

سدھیر کی ''ان داتا'' راحت ٹاکیز میں تو ندیم، شبنم کی ''آئینہ'' پیراڈائز سینما میں..... وحید مراد کی ''شبانہ'' ریگل میں تو محمد علی کی ''سلاخیں'' میلوڈی میں کب پردے پر آنے والی ہے یہ ساری خبریں کندن کو ازبر ہوا کرتی تھیں۔ وہ گھنٹوں سینما کے باہر لگے نئی آنے والی فلم کے فوٹو سیٹ دیکھا کرتا لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ اسکول سے تاخیر اس کا معمول بنتا گیا۔ شروع شروع میں استادوں نے زبان اور پھر ڈنڈے کی مار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر کندن کبھی فلمی تصویروں کے سحر سے باہر نہ نکل پایا۔

اُس نے پہلی فلم جو گھر والوں سے چھپ کر دیکھی وہ ندیم بابرہ کی ''زندگی'' تھی اور پھر فلم بینی اس کے خون میں شامل ہوتی گئی۔ اسکول سے بھاگ کر وہ مارننگ اور میٹنی شو دیکھنے پہنچ جاتا اور کئی بار اس کے استادوں نے اسے سینما دیکھتے یا سینما سے چھپ کر نکلتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بات مار پیٹ کی حد سے بہت آگے نکل چکی تھی ..... اور کندن اب باقاعدہ شہر کے سب سے بڑے سینما ہال کے باہر ٹکٹ بلیک کرنے لگا تھا۔ باپ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور کندن اب کسی بھی فلم کا پہلا شو مس نہیں کرتا تھا۔ شہر کے ہر سینما کے باہر اس کے گینگ کے لڑکے ٹکٹ بلیک کرتے اور ہر ماہ باقاعدہ متعلقہ تھانوں کو کندن کی طرف سے بھتہ جاتا تھا۔ مگر بڑے سینما کا مالک کندن کی آئے روز کی بلیک ٹکٹنگ اور جھگڑوں سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ اس نے باقاعدہ مسلح محافظ بھرتی کر لیے جو کندن کے کارندے لڑکوں کو ٹکٹ گھر کے آس پاس بھٹکنے نہیں دیتے تھے۔

کندن کی ساکھ خراب ہونے لگی تو اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ٹھانی اور بات بڑھتی گئی۔ آخر کار وہی ہوا جو ایسے معاملات میں ہوتا ہے۔ ایک روز جھگڑا اتنا بڑھا کہ ٹکٹ گھر کے باہر ہی گولیاں چل گئیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی کندن کے ہاتھ ایک گارڈ کے خون سے رنگے گئے۔ پھانسی کی سزا ہوئی اور جیل میں ظہیر سے ملاقات کے بعد وہ ظہیر کے گینگ میں شامل ہو گیا۔ جیل سے فرار کے بعد تین چار ماہ تو اس نے ظہیر کی ہدایات کے مطابق خود کو روپوش رکھا مگر اس کے خون میں دوڑتی فلم بینی اُسے بار بار اُکساتی رہی اور آخر ایک روز کسی نئی ریلیز ہونے والی فلم نے اُسے اتنا بے چین کیا کہ وہ رات کے آخری شو میں چہرہ چھپائے فلم دیکھنے پہنچ ہی گیا۔

شہر کی پولیس ان دنوں پے در پے دہشت گردی کے واقعات کی وجہ سے ویسے ہی غیر معمولی طور پر چوکنا تھی۔ شو ختم ہوا تو کندن چہرہ چھپائے دیگر تماشائیوں کے ساتھ سینما کے پچھلے دروازے سے باہر سڑک پر نکل آیا مگر سامنے ہی پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔ کندن نے کئی کترا کر نکل جانا چاہا مگر ناکے پر بیٹھے سنتریوں کی تیز نظر نے ایک تماش بین کو چہرہ چھپائے تیزی سے دوسری جانب بڑھتے دیکھ لیا اور کسی پولیس والے نے سیٹی بجا دی۔ بس پھر کیا تھا کچھ ہی دیر میں چاروں جانب پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔ تماشائیوں کی بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی۔ کندن کو اس ہجوم کا ہی تو سہارا تھا۔ اس نے جیب سے پسٹل نکال کر ایک ہوائی فائر کر دیا اور رات کے اندھیرے میں گولی کی تیز آواز یوں گونجی جیسے کسی نے توپ کا گولہ داغ دیا ہو۔ فلم بینوں کے رش میں سراسیمگی پھیل گئی اور لوگ رات کے اندھیرے میں گھبرا کر بھاگے تو سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔

فلم شو رات گئے آخری 9 سے 12 کا تھا مگر فلم بڑی کامیاب تھی اور کھڑکی توڑ ہفتہ چل رہا تھا۔ لہٰذا ڈھائی تین سو سے زیادہ کی بھیڑ تھی، کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے جن کے خاندان کے مرد دن کی گہما گہمی اور ٹکٹ گھر کی لمبی قطاروں سے بچنے کے لئے اپنے گھر والوں کو رات کا آخری شو دکھانے کے لئے لائے تھے..... عورتوں کی چیخ و پکار اور بچوں کے رونے کی آوازوں نے پولیس والوں کو مزید بدحواس کر دیا اور کندن اس ساری سراسیمگی اور بھگدڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تماشائیوں کی بھیڑ میں سینما کے مرکزی گیٹ سے باہر نکل آیا اور ایک اندھیری عقبی گلی میں داخل ہو کر سرپٹ بھاگنے لگا۔ بدقسمتی سے اس طرف بھی چند پولیس والے پہنچ چکے تھے اور ان میں سے ایک نے چلا کر کندن کو روکنے کی کوشش کی ''رُک جاؤ..... ورنہ میں گولی چلا دوں گا.....'' مگر کندن کو رُکنا ہوتا تو وہ بھاگتا ہی کیوں۔

پولیس والے نے اپنی تھری ناٹ تھری بندوق سیدھی کی اور کندن پر نشانہ لگایا۔ رات کے اندھیرے میں بندوق کی گرجدار آواز پھیلی اور کندن گولی کھا کر گلی میں زمین پر بکھرے کسی پرانی فلم کے پوسٹر پر جا گرا۔ پوسٹر پر فلم کا نام لکھا ہوا تھا "خاک اور خون۔" کندن زور سے کراہا اور اس کا خون گلی کی خاک میں مل کر بہنے لگا۔ کندن نے سر اٹھا کر دیکھا، موت کی دیوی سینما کی پچھلی دیوار پر بیٹھی مسکا رہی تھی "آ گئے تم کندن..... بڑا انتظار کروایا تم نے اس بار..... چلو..... اب چلیں....."

..........*

باب39

کندن کو گولی لگنے کی خبر فائل میں پڑھ کر میرے ہوش اُڑ گئے اور میں نے گھبرا کر جلدی میں فائل کا ورق پلٹا مگر فائل کا اگلا صفحہ سادہ تھا اور اسے پلٹتے ہی فائل ختم ہوگئی۔ میں نے گھبرا کر دوبارہ فائل کے سارے ورق شروع سے کھنگال ڈالے مگر فائل میں کندن کی کہانی نامکمل تھی۔ اتنے میں پیچھے سے اے۔ ایس۔ پی اسد کی آواز سنائی دی۔

''فائل ختم ہوچکی ہے عبداللہ..... یہ آخری سادہ صفحہ میں نے اس فائل میں اس لئے لگایا ہے کہ ابھی کندن کی کہانی کا آخری صفحہ لکھا جانا باقی ہے۔ تمہاری بے چینی بتا رہی ہے کہ تمہیں واقعی کندن کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی ہے ابھی تک..... ورنہ تم یوں بے تابی سے فائل کے صفحے بار بار نہ پھرولتے.....''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسد نے جان بوجھ کر وہ فائل میرے حوالے کی تھی اور وہ کسی خفیہ درز سے چھپ کر مجھے فائل پڑھتے دیکھتا رہا تھا۔ ''مگر کندن ٹھیک تو ہے ناں..... تمہاری فائل تو یہ بتاتی ہے کہ وہ سینما کی کسی عقبی گلی میں پولیس کی گولی کھا کر گرا بھی تو اس پرانے پوسٹر پر جو اُس کی اپنی کہانی بیان کر رہا تھا۔''

اسد نے ایک گہری سانس لی ''ہاں..... پولیس کی تفتیش تو یہی بتا رہی ہے کہ پوسٹر پر لکھے نام کی طرح کندن بھی ''خاک اور خون'' میں لتھڑا اس اندھیری گلی میں پڑا تھا۔ مگر اس کے پاس اس کا بھرا ہوا پسٹل ابھی موجود تھا جس میں پانچ گولیاں ابھی باقی تھیں۔ کندن نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اپنا پسٹل نکالا اور گلی کے اندھیرے سرے پر موجود پولیس والوں پر وقفے وقفے سے فائر کرتا رہا جس کی وجہ سے اس نے پولیس کو گلی کے نکڑ پر ہی روکے رکھا۔ پولیس والے جانتے تھے کہ کندن کے پاس پانچ گولیاں ابھی باقی ہیں۔ اور وہ پانچویں گولی کے چلنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ بارود کے خاتمے کے بعد وہ اطمینان سے گلی میں داخل ہو کر کندن کو گرفتار کر سکیں..... مگر.....''

اسد بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ''مگر کیا.....؟''

''مگر کندن کی طرف سے پانچویں گولی کبھی چلی ہی نہیں۔ وہ پولیس والوں کی سوچ سے کہیں زیادہ ہوشیار نکلا۔ کندن خود بھی جانتا تھا کہ پولیس اس کی آخری گولی خرچ ہوجانے کا انتظار کرے گی اور اس سے پہلے وہ کبھی گلی میں داخل نہیں ہوں گے اس لئے اس نے پولیس کو الجھائے اور روکے رکھنے کے پہلے چار فائر وقفے وقفے سے کیے اور پھر پولیس کو پانچویں گولی کے انتظار میں ہی چھوڑ کر قریبی دیوار پھلانگ کر اندھیرے میں نہ جانے کہاں فرار ہوگیا۔ جب بہت دیر تک پولیس کے فائر کے بدلے اندھیری گلی کے سرے سے کندن کی طرف سے کوئی جوابی فائر نہیں ہوا تو پولیس والوں کا ماتھا ٹھنکا اور وہ ایک دوسرے کو کور کیے گلی میں داخل ہوئے۔ مگر وہاں صرف ایک پوسٹر پر کندن کے

خون کے تازہ نشان باقی تھے، کندن کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ تمہارا ساتھی بہت چالاکی سے پولیس کو چکمہ دے کر وہاں سے رفو چکر ہو چکا تھا....." میرے سینے میں دبی ایک گہری سانس یوں نکلی جیسے کسی کا دم نکلتا ہے۔

"اس کا مطلب ہے کندن پولیس کے ہاتھوں مارا نہیں گیا۔" اسد نے مجھے غور سے دیکھا۔

"اور اب آخری اطلاعات آنے تک کندن کو زخمی حالت میں اس صحرا کی طرف سفر کرتے دیکھا گیا ہے۔ آج نہیں تو کل..... وہ یہاں ضرور آئے گا عبداللہ....." اور تم سے مجھے یہ توقع ہے کہ تم اپنے زخمی دوست کی اطلاع قانون کو ضرور دو گے..... یہی کندن کے لئے بھی بہتر ہے۔ ورنہ مرنا تو اس کا طے ہے۔ پھانسی کے پھندے پر نا سہی..... کسی ویرانے میں پولیس کی گولی سے ہی سہی..... میں نے بارڈر پر تمام سکیورٹی فورسز کو بھی ہوشیار کر دیا ہے کہ وہ چوکنا رہیں۔ سزائے موت کے دو قیدی کسی بھی وقت غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اور اگر ظہیر یا کندن نے ایسی کوئی بھی کوشش کی، تو یقین کرو سرحدی گارڈز کی رائفلو کی درجنوں گولیاں ان دونوں کے جسموں کے پار ہو جائیں گی۔ علاقے کی ساری پولیس کو بھی ہتھیار نہ ڈالنے کی صورت میں انہیں موقعے پر ہی گولی مار دینے کا حکم دیا جا چکا ہے۔"

اسد کے لہجے کی قطعیت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ میں پریشان بیٹھا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ "سزائے موت کا ایک مفرور قیدی جسے پہلے ہی یہ پتہ ہے کہ گرفتاری کی صورت میں اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا..... وہ کیونکر خود کو پولیس کے حوالے کرنے پر راضی ہو سکتا ہے اے۔ ایس۔ پی صاحب.....؟ اس کے لئے تو دونوں طرف موت ہی ت ہے....."

اسد نے گہری سانس لی "آنے والا دن کون سی بازی کس رُخ پلٹ دے..... یہ کون جانتا ہے البتہ جیل جانے کے بعد کچھ عرصہ زندگی کی گارنٹی تو ہے، ہو سکتا ہے انہی چند دنوں میں کوئی معجزہ ہو جائے۔ تم بھی تو گرفتار ہو گئے تھے..... مگر پھر وقت نے تمہارے لئے پلٹا کھایا اور تم رہا ہو گئے۔ کیا پتہ اُس کے دن بھی بدل جائیں۔ مگر یونہی بھاگتے رہے تو اس کا مارا جانا یقینی ہے....." میں خاموش بیٹھا رہا۔ اسد نے فائل میرے ہاتھ سے واپس لے لی۔

"تمہیں پولیس کی گاڑی واپس تمہارے ٹھکانے پر پہنچا دے گی تم آزاد ہو۔ مگر علاقہ چھوڑنے کی صورت میں تمہیں پولیس کو اطلاع دینی ہو گی۔"

میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا "میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ درگاہ کے دروازے پر بار بار یوں پولیس کی جیپ کا آنا بے چینی اور بد دلی پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے....." تھانے کے باہر تپتی سہ پہر میں سڑک سنسان پڑی تھی۔ دُور ایک ناکافی سائے میں کوئی تانگے والا لمبی تانے اوندھا لیٹا اونگھ رہا تھا۔ میری آواز پر سٹپٹا کر اٹھ بیٹھا۔

"کہاں جاؤ گے سائیں لوگو.....؟"

"مجھے قصبے سے باہر والے بڑے مزار تک چھوڑ دو....."

تانگہ سڑک پر دوڑنے لگا۔ میرا ذہن ابھی تک اے۔ ایس۔ پی کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بہت ذہین پولیس والا تھا اور اس کے ارادے صاف ظاہر تھے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ ایک سائیکل والا جو پہلے تھانے کے باہر کھڑا پمپ سے پہیے میں ہوا بھر رہا تھا، اب وہ لگاتار کچھ فاصلے سے تانگے کے پیچھے

ہی چلا آ رہا تھا۔ پھر کچھ فاصلے تک پیچھے آنے کے بعد وہ غیر محسوس طریقے سے کسی قریبی گلی میں مڑ گیا مگر ٹھیک اسی لمحے اس گلی سے ایک دوسرا تانگہ نکلا اور تانگے والے نے اپنی سواری ہمارے پیچھے لگا دی۔ مزار تک پہنچتے پہنچتے اسی طرح تین مختلف سواریوں پر سیاہ لباس والے سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہے۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسد نے مزار کی نگرانی پر بھی ضرور اپنے کچھ بندے لگا رکھے ہوں گے، میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ کاش سکندر ظہیر اور بچھے کو چند روز کے لیے اپنی آبائی زمینوں پر روک لے اور اسد کے یہاں سے ٹل جانے تک ان میں سے کوئی بھی وہاں واپس نہ آئے۔ مگر کندن.....؟ کندن کا سوچ کر میرا دل ایک بار پھر ڈوب سا گیا۔

مزار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے کچھ نامانوس چہرے بھی دکھائی دیئے۔ میرا شک صحیح نکلا۔ سادہ لباس میں پولیس اہلکاروں نے مزار پہ بھی اپنے پہرے دار بٹھا دیئے تھے۔ صیاد نے پھندا تیار کر لیا تھا اور اب اسے صرف شکار کے بے خبری میں کسے جانے کا انتظار تھا۔ میری سہ پہر کی مانگی دعا شام تک قبول ہوتی نظر آئی اور سارا نگا پاسکندر کا کوئی بھی کارندہ مجھ سے ملنے کے لئے وہاں نہیں آیا۔ ہم انسان بھی کتنے نادان ہوتے ہیں۔ کسی چھوٹی دعا کے اسی لمحے قبول ہو جانے پہ ہماری زبان سے اکثر یہی نکلتا ہے کہ کاش ہم اس کے بدلے کچھ اور مانگ لیتے، کچھ بڑا فائدہ، کوئی دوسرا مقصد..... مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ اُس قبولیت کے لمحے میں مانگی گئی وقتی سہولت یا عارضی فائدہ ہی اس وقت ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ سچ ہے، انسان بڑا ناشکرا ہے۔

مغرب کی نماز میں حاکم بابا کو غیر موجود پا کر میں نے ان کے بارے میں حجرے کے خدمت گار سے پوچھا۔ ''وہ تو بڑی سرکار کے بلاوے پر عصر سے پہلے چلے گئے تھے بڑی حویلی عبداللہ میاں..... جانے اتنی دیر کیوں ہو گئی انہیں واپسی میں.....''

میرا دل زور سے دھڑکا..... ''بڑی حویلی..... خدایا خیر..... بس وہ خیریت سے ہو.....'' تبھی میرے دل میں بھی ناشکرے پن کا ایک چھوٹا سا سنپولیا کلبلایا اور بول اُٹھا۔ جانے ہماری چھوٹی چھوٹی دعائیں فوراً اور بڑی دعائیں کبھی بھی قبول کیوں نہیں ہوتیں؟

عشاء سے کچھ پہلے حاکم بابا کی سواری بھی واپس آ گئی۔ میں تیزی سے ان کی طرف لپکا ''سب خیریت تو تھی وہاں.....''

حاکم بابا نے غور سے میری طرف دیکھا ''دعا کرو..... سب خیریت رہے..... اس گھرانے نے پہلے ہی بہت درد سہے ہیں اب اس بوڑھی عورت میں مزید غم سہنے کی تاب نہیں ہے..... وہ اپنی بہو کے لئے بہت پریشان ہے۔ اور ہم فقیر بدلے میں سوائے دعا دینے کے، اور بھلا کر بھی کیا سکتے ہیں.....'' حاکم بابا مجھے مزید الجھا کر اپنے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ جانے ان کی باتوں سے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ جیسے زہرہ کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ ورنہ حاکم بابا کے چہرے پر یہ فکر کی پرچھائیاں نہ ہوتیں۔ عشاء کے بعد مزار کے خدمت گاروں نے چراغ بجھانا شروع کر دیئے۔ اور مرکزی راستے اور داخلی دروازے کے علاوہ سارے جلتے چراغ بجھا کر سب اپنی آرام گاہوں میں آرام کرنے چلے گئے۔ صحن میں بس ایک میں ہی تنہا بیٹھا رہ گیا جسے کسی کروٹ، کوئی پل کہیں چین نہیں تھا۔ اچانک باہر صحرا میں دور بہت سے اونٹوں کے بھاگنے اور جرس کی گھنٹی جیسا شور اُٹھا۔ صحرا کے باسیوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں

تھی۔ یہاں رات کو ایسے قافلے گزرتے ہی رہتے تھے مگر اس قافلے کا پڑاؤ شاید ہمارا مزار تھا۔

کچھ ہی دیر میں باہر سے آتی آوازوں نے اس بات کی تصدیق کردی۔ میں نے مرکزی دروازے سے نیچے صحرا میں جھانکا تو قافلہ پڑاؤ ڈال چکا تھا اور قافلے کے منتظمین نوکروں کو اپنے اپنے جانور باندھنے اور انہیں چارہ پانی وغیرہ ڈالنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ شاید دن بھر کی لمبی مسافت اور تھکان کے بعد قافلے والوں نے شب بسری کے لئے اس وسیع وعریض صحن والے مزار کا انتخاب کیا تھا۔ آس پاس اونگھتے اور انگڑائیاں لیتے، آدھے جاگے اور آدھے سوتے خفیہ پولیس کے چند اہلکار بھی قافلے کی آوازوں سے ہڑبڑا کر جاگ چکے تھے اور ٹٹولنے والی نظروں سے صحرائیوں کے قافلے اور مسافروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں اطمینان ہوجانے کے بعد وہ دوبارہ اونگھنے لگے۔

سادہ لباس والے اسی علاقے کے مقامی تھے اور انہیں پتہ تھا کہ ایسے قافلے ہر ہفتہ، دس روز بعد اس صحرا سے گزرتے ہیں لہٰذا ان کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ میں بھی دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور کچھ ہی دیر میں پھر سے وہی خاموشی چھا گئی، دور پچھلی جانب بنے کچے برآمدوں سے کچھ دیر عورتوں اور بچوں کی دھیمی آوازیں آتی رہیں اور پھر وہ بھی معدوم ہوگئیں۔ میں نے تھک کر دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں تبھی میرے قریب ہی ایک سرگوشی سی اُبھری۔

''سونا نہیں مولوی صاب..... ابھی رات باقی ہے.....'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چاروں طرف وہی سناٹا طاری تھا، شاید میرا وہم ہوگا، یہ سوچ کر میں نے پھر سے اپنے خیالات کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی، مگر تبھی قریب ہی زمین پر آڑھے ترچھے پڑے چند سموں کے وجود سے پرے وہی آواز ابھری۔

''عبداللہ بابو..... وہیں بیٹھے رہو..... میں کروٹ لے کر تمہارے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ قسم سے..... بہت تھک گیا ہوں.....'' میرے حواس جھنجھنا اُٹھے، قریب سوئے لوگوں میں سے ایک شخص کروٹ لینے کے بہانے مجھ سے مزید قریب ہوا تو میری نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ اور میری آواز بے اختیار بلند ہوگئی۔

''کندن..... تم..... یہاں.....؟''

کندن نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کھسک کر میرے قریب آ گیا۔ اُس کی تمام احتیاط کے باوجود میں نے اسے پچھلے ستون کی اوٹ میں گھسیٹ لیا اور جھپٹ کر اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ کندن کے منہ سے تکلیف کے مارے ایک سسکی سی نکل گئی۔

''کیا ہوا..... تم ٹھیک تو ہو.....''

کندن کراہا ''گولی ماردی کم بختوں نے..... فلم کا سارا مزہ بھی کرکرا کر دیا..... زخم ٹھیک نہیں ہوا میرا ابھی تک.....'' میں نے بے تابی سے کندن کا جسم ٹٹولا..... اس نے خود کو بڑی سی سیاہ چادر میں لپیٹ رکھا تھا اور اس کا حلیہ بھی بالکل انہی صحرائی مسافروں جیسا تھا جن کے قافلے میں شامل ہو کر وہ بختیار آباد پہنچا تھا۔

''تم نے یہاں آ کر بڑی غلطی کردی میرے یار..... پولیس نے پہلے ہی یہاں تمہاری اور ظہیر کی تلاش میں چاروں طرف پہرے بٹھا رکھے ہیں۔'' کندن پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

''جانتا ہوں بابو..... مگر اپنے پاس اور کوئی دوسرا راستہ بچا بھی نہیں تھا۔ شہروں میں بھی چاروں طرف پھندے لگے ہوئے ہیں اور اپنے نام کی چاروں طرف منادی ہو چکی ہے۔ ادھر سے نہ بھاگتا تو وہاں بھی جلد ہی دھر لیا جاتا۔ سوچا آخری چانس لے لوں اور جا کر اپنے یاروں سے ہی مل لوں ایک بار..... پھر جانے کبھی ملاقات ہو نہ ہو.....''

کندن بولتے بولتے بار بار تکلیف سے کراہ اٹھتا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے جلد ہی کسی اچھے ماہر ڈاکٹر یا طبیب تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔ مگر اب یہ میرے لئے اتنا آسان بھی نہیں رہا تھا۔ پولیس والوں کی چوکنا نظریں چار سو ہمارا پیچھا کر رہی تھیں اور کندن کو مزار کے احاطے سے نکالنا تقریباً ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ کندن نے مجھے بتایا کہ اس رات وہ پولیس کی گولی کھا کر اندھیری گلی میں گرا تو اسے احساس ہوا کہ گولی اس کا بایاں شانہ چیر گئی ہے۔ مگر کندن کے پاس اس کے پسٹل میں ابھی پانچ گولیاں باقی تھیں، جو کچھ دیر تک گلی کے سرے پر موجود سنتریوں کو روکے رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ کندن نے دو منٹ کے وقفے سے چار گولیاں بنا نشانہ لیے اندھیرے میں داغ دیں اور جیسے ہی دوسری جانب پولیس والوں نے خود کو کسی آڑھ میں چھپانے کے لئے اپنا نشانہ چھوڑا، کندن دوسرے ہی لمحے قریبی دیوار پھلانگ کر دوبارہ اس سینما کے پچھلے احاطے میں کود گیا جہاں سے وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی جیمز بانڈ کی کوئی فلم دیکھ کر نکلا تھا، احاطہ سنسان پڑا تھا اور کندن نے وقت ضائع کیے بنا چھت پر جاتی سیڑھیوں کا رستہ پکڑا اور سینما کی چھت سے ہوتے ہوئے پہلے قریبی کینٹین اور پھر آس پاس کی ملحقہ دوکانوں کی چھتوں سے ہوتا ہوا چند گلیوں پرے مرکزی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں سے ایک رکشے والا اسے دس گنا زیادہ پیسے ملنے پر کسی عطائی حکیم کے مطب تک لے گیا۔ جس کا کام ہی ایسے مشکوک لوگوں کا علاج کرنا تھا جو کسی بھی وجہ سے کسی مستند ہسپتال یا کلینک سے اپنا علاج نہیں کروا سکتے تھے۔ حکیم نے اپنے طور پر مرہم پٹی کر کے کندن کا بہتا خون تو روک دیا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جلد یا بدیر کسی بڑے ڈاکٹر سے زخم کا علاج کروانا ہی ہوگا۔ ورنہ گولی کا زہر جسم میں پھیل بھی سکتا ہے۔ مگر کندن کو ظہیر کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ لہٰذا وہ کسی نہ کسی طرح ریل گاڑی پکڑ کر اس صحرائی قصبے سے ملحق شہر تک آنے میں کامیاب ہو گیا جہاں قریب سے گزرتے ایک قافلے میں شامل ہونے کے لئے اس نے صحرائی مسافر کا روپ دھارا اور ان کے کارواں میں شامل ہو کر آخر کار وہ بختیار آباد کے صحرائی علاقے تک پہنچ ہی گیا۔ میں نے کندن کو جب یہ بتایا کہ ظہیر اور بگھا بھی یہاں پہنچ چکے ہیں تو خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اور بخت خاں..... وہ..... وہ کہاں ہے..... وہ نہیں آیا ابھی تک.....''

میں بخت خان کا نام سن کر خاموش ہو گیا۔ کندن نے مجھے جھنجھوڑا ''بولتے کیوں نہیں بابو..... بختا کہاں ہے.....؟''

''بخت خان اب ہم میں نہیں رہا..... اُسے اپنی محبت سے ملنے کی بہت جلدی تھی..... مجھے یقین ہے اب وہ دونوں ضرور کسی آسمان میں یکجا ہوں گے.....'' کندن کے دل سے جیسے ایک آہ سی نکلی اور اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ پھر صبح کا اُجالا ہونے تک اس سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔

فجر کی نماز کے بعد سویرا ہوتے ہی مزار کے احاطے میں مخصوص گہما گہمی شروع ہوگئی۔ مزار کے لنگر سے قافلے والوں کے لئے ناشتے کی تیاری کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ میں کندن کو برآمدے میں ہی چھوڑ کر خود ایک جانب دوسرے مجاوروں کے ساتھ مل کر مسافروں میں چائے ناشتہ بانٹنے میں مصروف ہوگیا۔ کندن اپنے جسم پر سیاہ چادر ڈالے اور چہرہ ممکنہ حد تک چھپائے مسافروں کے درمیان ہی خود کو سمیٹے بیٹھا رہا۔ تبھی میری نظر باہر کے دروازے سے آتے کسی شخص پر پڑی اور میری آنکھیں جم سی گئیں۔ وہ ASP اسد تھا۔

..........*

باب 40

ہاں..... وہ اے۔ ایس۔ پی اسد ہی تھا جو اپنے چند اہلکاروں سمیت مزار کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر دُور برآمدے کی سمت دیکھا جہاں کندن باقی مسافروں کے درمیان بیٹھا چائے کے لمبے لمبے گھونٹ حلق سے نیچے اتار رہا تھا مگر اس کی نظر ابھی تک پولیس والوں پر نہیں پڑی تھی۔ اسد ادھر اُدھر قافلے کے مسافروں پر نظر ڈالتا میری طرف ہی بڑھ رہا تھا۔

میرا دل زور سے دھڑکا، کہیں اسے کسی نے کندن کے بارے میں اطلاع تو نہیں دے دی۔ میں نے خود کو لاتعلق رکھنے کی کوشش کی اور بظاہر مسافروں میں چائے ناشتہ تقسیم کرتا رہا۔

اسد نے دُور سے ہی آواز لگائی "ویسے مجھے ایک بات کی ہمیشہ حیرت رہتی ہے کہ تم لوگ مزار کا خرچہ کیسے پورا کر لیتے ہو۔ جبکہ بظاہر ان مزاروں کی کوئی باقاعدہ آمدنی بھی نہیں ہوتی۔ اب دیکھوں ناں..... اتنے بڑے قافلے کے لئے صبح کے ناشتے کا انتظام بھی کر ڈالا ہے تم نے..... ناسر ہے..... خرچہ تو ہوتا ہوگا ان سارے لوازمات پر....."

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "تمہیں پولیس کے بجائے انکم ٹیکس کا گروپ چننا چاہیے تھا۔ زیادہ کامیاب رہتے تم وہاں....." میری بات سن کر اسد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"مشورہ اچھا ہے، ویسے میری جگہ اگر تم مقابلہ کے امتحان میں بیٹھتے تو کون سا گروپ چنتے صوفی جی..... کیونکہ تمہارے مطلب کا کوئی شعبہ تو ہے نہیں وہاں....."

"نہیں..... ایسا نہیں ہے..... شعبہ تو ہے..... مجھے ریل گاڑی سے عشق ہے بڑا..... اگر میں امتحان پاس کرتا تو ضرور ریلوے جوائن کرتا....." اسد نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"تمہیں دیکھ کر کبھی کبھی مجھے تمہارے یہاں ہونے پر افسوس بھی ہوتا ہے..... لیکن میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم ایک ارب پتی باپ کی اولاد ہو..... پھر بھی تم نے وہ سارا عیش و آرام چھوڑ کر اگر یہ راستہ منتخب کیا ہے تو ضرور کوئی خاص بات رہی ہوگی..... کبھی وقت ملے تو مجھے بتانا ضرور..... تمہاری کہانی مجھے طلسم ہوش ربا جیسی کوئی داستان لگتی ہے عبداللہ....."

"میری چھوڑو..... تم یہ بتاؤ تم صبح سویرے یہاں کیسے..... کہیں پھر کسی نے کوئی مخبری تو نہیں کر دی..... ویسے تمہارے اہلکار بہت حاضر دماغ اور چوکنا رہتے ہیں....."

اسد میری بات سن کر چونکا "اوہ..... تو تمہیں ہمارے پہرے کا علم ہے..... خوب..... دراصل غلطی میری

ہے..... میں یہ بھول گیا تھا کہ میرا پالا ایک ذہین مقابل سے پڑا ہے، بہرحال جب مجھے یہ پتہ چلا کہ کسی قافلے نے یہاں پڑاؤ ڈالا ہے تو سوچا چل کر میں بھی یہ تماشہ دیکھوں۔ جانے پھر کب اس صحرا کی طرف آنا ہو۔ شہر کی گہما گہمی میں تو ایسے نظارے مفقود ہیں.....''

اسد نے بظاہر اپنے اس بے وقت چھاپے کا ایک کمزور سا عذر تو پیش کر دیا مگر ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ یہاں صرف اپنی تسلی کے لئے آیا ہے کہ کہیں قافلے کی بھیڑ میں ظہیر یا کندن اس علاقے میں داخل تو نہیں ہو گئے۔ اسد کچھ دیر وہیں کھڑا آس پاس نظریں دوڑاتا رہا اور پھر اس کے خاص سپاہی نے مزار کا چکر لگانے کے بعد قریب آ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ میں بظاہر مسافروں کی خدمت میں مصروف نظر آنے کی کوشش کرتا رہا مگر میرا سارا دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں باقی اہلکاروں نے بھی آ کر اسد کو رپورٹ دے دی اور وہ انہیں کچھ ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔ اور میرے سینے میں اٹکی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ کندن نے خود کو پولیس والوں کی نظروں سے بچانے کا پہلا مرحلہ کامیابی سے سر کر لیا تھا مگر خطرہ اب بھی اُسی طرح ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے کندن کی تلاش میں اندر جانے سے روکے رکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مزار کی نگرانی پر موجود پولیس کے پہرے دار ہر لمحہ مجھ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ آتے جاتے کئی بار میں نے سرسری نظروں سے مزار کے صحن میں موجود قافلے کے مسافروں پر نظر دوڑائی مگر کندن مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔

آخر مغرب کے بعد جب اندھیرا بڑھنے لگا تو مجھے اس کی فکر لاحق ہونے لگی۔ قافلہ کے منتظمین نے مجھے بتایا کہ ابھی وہ ایک آدھ دن مزید یہیں قیام کریں گے کیونکہ انہیں ایک دوسرے قافلے کی آمد کا انتظار ہے جس کے بختیار آباد پہنچتے ہی وہ لوگ اکٹھے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھ جائیں گے۔ میرے لئے یہ بات اطمینان بخش تھی کیونکہ قافلے کی روانگی کی صورت میں پیچھے رہ جانے والے کندن کا خود کو یہاں مزید روپوش رکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ جب تک یہ بھیڑ یہاں جمع رہتی، کندن کے لئے آسانی تھی۔ میں نے صحن کا ایک پورا چکر کاٹا اور تھک کر برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا جہاں اندھیرا نسبتاً زیادہ تھا۔ تبھی میری پشت کی جانب سے کندن کی آواز ابھری، وہ اسی ستون کے ساتھ پچھلی جانب رُخ کیے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔

''یہ پولیس والے تو جان کو آ گئے ہیں..... میں نے اس افسر کو تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس لئے پچھلی طرف درخت تلے سوئے لوگوں کے درمیان چہرے پر کپڑا ڈالے سوتا بنا لیٹا رہا، دو چار پولیسیے اس طرف بھی آئے تھے مگر مجھے مسافر جان کر آگے چلتے بنے.....''

میں نے پلٹے بنا جواب دیا ''ہاں..... مگر سادہ لباس والے ابھی یہیں موجود ہیں پہرے پر..... تمہیں بہت احتیاط کرنا ہوگی..... ظہیر اور بگھا بھی ابھی تک واپس نہیں لوٹے..... مجھے لگتا ہے انہیں بھی پولیس کے ناکے کی خبر مل چکی ہے، اور وہ وہیں اپنے دوست کی زمینوں پر رُک گئے ہیں.....''

کندن نے گہری سانس لی ''چلو..... یہ بھی اچھا ہوا۔ مجھے یقین ہے ظہیر اپنے ساتھ مجھے بھی یہاں سے سرحد پار کروا دے گا۔ اس کا دماغ بہت چلتا ہے..... وہ نہ ہوتا تو ہم سب کبھی بھی جیل سے باہر نہ آتے.....'' میں نے کندن کو یہ بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ سرحد کی طرف بھی پہرے لگ چکے ہیں اور صیاد ان کا انتظار کر رہا

ہے۔

''شاید تم دونوں کو سرحد پار کرنے کا منصوبہ کچھ دن مزید ٹالنا پڑ جائے کیونکہ احتیاط ضروری ہے۔ مگر تم مجھے یہ بتاؤ..... کیا تمہاری اپنے گھر والوں سے ملاقات ہوئی..... جیل سے نکلنے کے بعد تم اتنے دن کہاں رہے.....؟''

کندن نے میرا سوال سن کر ایک گہری سانس لی ''ہاں..... گیا تھا میں اپنے گھر چھپتے چھپاتے..... میرا گھر آج بھی اسی پرانے بڑے چرچ کے احاطے میں ہے۔ مگر میرے ابے نے مجھے گھر میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ کہتا ہے کہ چرچ کے پاک احاطے کو مجھ جیسا گناہ گار اپنے وجود سے میلا نہ کرے تو بہتر..... میں بہت گڑگڑایا، بڑی منت کی پر وہ نہیں مانا، کہتا تھا کہ پہلے خود کو قانون کے حوالے کر دیا پھر خود کو معافی دلاؤ تبھی میں تم سے ملوں گا ورنہ کبھی اس طرف اپنے قدم بڑھانے کی کوشش بھی نہ کرنا..... مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا، کیونکہ مجھے پشاور پہنچنا تھا۔ بہت ضروری کام سے.....''

میں چونکا ''پشاور.....؟ کیسا کام.....؟''

''اپنے یار سنتوش کے گھر والوں تک اس کا ایک ضروری پیغام پہنچانے کا کام.....''

سنتوش کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں سنٹرل جیل کے دن گھوم گئے۔ سنتوش ہمارا اچھا ساتھی تھا، جس کی کڑی جوانی کو وہیں جیل کے کسی پہرے دار کی گولی چاٹ گئی تھی۔ گورا چٹا، لمبا تڑنگا سا وجیہہ سنتوش۔ جس کا نام اس کے باپو نے ماضی کے مشہور اور خوبرو اداکار ''سنتوش کمار'' کے نام پر رکھا تھا۔ اور وہ تھا بھی کسی شہزادے جیسا ہی..... کندن نے مجھے بتایا کہ جیل میں اس کی سب سے پہلے دوستی سنتوش سے ہی ہوئی تھی۔ ایک متوسط ہندو گھرانے میں پیدا ہونے والا ذہین اور محنتی مگر غصیلہ سنتوش، جو چار بہنوں کے بعد ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ ماں باپ کا لاڈلہ اور بہنوں کی آنکھ کا تارا..... سنتوش..... کلاس میں ہمیشہ اول آنے والا اور کالج کا بہترین سپورٹس مین..... جو اپنے تعلیمی ادارے کو کئی کپ جیت کر دلوا چکا تھا۔ دو بہنوں کی شادی ہوئی تو اچانک ہی اس کے ماں باپ ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر اپنے بھگوان کے پاس چلے گئے۔ گھر میں دو بہنیں کنواری بیٹھی رہ گئیں اور ذمہ داریوں کا سارا بوجھ سنتوش کے شانوں پر آپڑا۔ مگر اس کی عمر ہی ابھی کیا تھی۔ ابھی تو وہ خود فورتھ ائیر کا طالب علم تھا۔ جس کی آنکھوں میں آنے والے سہانے مستقبل کے سپنے سجے تھے۔

مگر کبھی کبھی ہمارا حال ہمیں اپنے مستقبل کے سپنوں کو ماضی کی کسی پرانی تجوری میں گروی رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سنتوش کو بھی اپنی دو جوان بہنوں کی خاطر اپنے سنہرے سپنے اسی زنگ زدہ تجوری میں بند کرنا پڑے اور کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں در بدر بھٹکنے کے لئے تعلیم ادھوری چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ اس کی دونوں بہنیں سیما اور سمترا خوبصورت ہیں مگر سیما سے چھوٹی سمترا تو جیسے چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھی۔ گھر کے حالات دیکھ کر سیما نے یونیورسٹی چھوڑ دی اور گھر داری میں جٹ گئی مگر سنتوش کی خواہش تھی کہ کم از کم سمترا اپنی تعلیم ضرور مکمل کرے۔ اس کے ماسٹرز مکمل ہونے میں صرف دو سمسٹر ہی تو باقی رہ گئے تھے۔ سنتوش کو بھی اس کے باپو کے کسی مہربان دوست کے توسط سے مقامی پرائیویٹ دفتر میں آفس اسسٹنٹ کی نوکری مل گئی اور زندگی کی گاڑی ایک بار پھر دھکے سے ہی صحیح، پر اپنی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ سنتوش بھی اپنے طوفانی غصے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک جانے کی عادت کو ترک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں اس کے اندر کی یہ تلخی لاوا بن کر بہہ نکلتی تھی اس روز بھی دفتر میں کسی چھوٹی بات پر مینیجر کے ساتھ سنتوش کی ٹوٹو میں میں ہوتے ہوتے رہ گئی اور وہ غصے میں آدھے دن کی چھٹی لے کر بے وقت گھر کے لئے نکل پڑا۔ گلی کے نکڑ پر محلے کے لفنگے اور آوارہ لڑکوں کا گروپ کھڑا آتی جاتی عورتوں کو گھورتے ہوئے آوازیں کس رہا تھا اور بات بے بات قہقہے لگا رہا تھا۔ سنتوش نے انہیں جھاڑا اور ڈانٹ کر بھگا دیا۔ مگر گروہ کا سرغنہ ماجد کہاں باز آنے والا تھا۔ ویسے بھی اسے سنتوش کی یہ اکڑ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ مگر سارا محلہ سنتوش کا حمایتی تھا اور اس کی محنت اور ذہانت کا گواہ بھی، لہٰذا ہر بار ایسے کسی موقعے پر لفنگے ماجد کو ہی خون کے گھونٹ پی کر خاموشی سے پیچھے ہٹنا پڑتا تھا۔ وہاں سنتوش کو جانے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سمترا کچھ پریشان اور اُلجھی سی رہنے لگی ہے۔ سنتوش نے سمترا سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئی۔ بڑی بہن سیما سے بات کی تو وہ بھی بات ادھر اُدھر کر گئی۔

پہلے پہل تو سنتوش بھی اسے سمترا کی پڑھائی کی کوئی اُلجھن سمجھتا رہا۔ مگر پھر جب سمترا نے صبح ٹھیک وقت پر یونیورسٹی جانے سے ہی کترانا شروع کر دیا تو سنتوش کا ماتھا ٹھنکا۔ سمترا تو اپنی پڑھائی کے معاملے میں وقت کی اتنی پابند تھی کہ ٹھیک صبح سات بجے گھر سے یونیورسٹی کی بس پکڑنے کے لئے نکل جاتی تھی، چاہے آندھی آئے یا برسات، خراب سے خراب موسم میں بھی وہ اپنی کوئی کلاس نہیں چھوڑتی تھی۔ سنتوش کو دفتر کے لئے ساڑھے آٹھ بجے آفس کی ہی اسٹاف وین لینے کے لئے آتی تھی، اور سمترا اب بھائی کے ساتھ ہی بس اسٹاپ تک جایا کرتی تھی، اور سارے راستے اُلجھی ہوئی اور ڈری سہمی سی رہتی، جیسے کوئی انجانا خوف اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہو..... اور پھر سنتوش پر بہن کے خوف کا یہ راز بھی کھل ہی گیا۔

اس روز سنتوش سمترا کے ساتھ ہی گھر کے دروازے سے نکلا مگر اسے گلی میں اچانک یاد آیا کہ وہ کوئی ضروری فائل تو گھر میں اپنی میز پر ہی بھول آیا ہے۔ اس نے سمترا کو بس اسٹاپ کی طرف جانے کو کہا اور خود جلدی سے واپس گھر کی طرف لپکا مگر فائل اٹھا کر جب وہ گلی میں آیا تو اس نے سمترا کو پریشانی میں اُلٹے پاؤں گھر کی طرف تقریباً بھاگ کر آتے ہوئے دیکھا۔ کوئی لڑکا گلی سے ٹھیک اسے لمحے باہر کی طرف لپکتا نظر آیا مگر اس کی پشت سنتوش کی طرف تھی اس لئے سنتوش اُسے دیکھ نہیں سکا۔ سمترا نے بھائی کو دیکھ کر اپنے اوسان درست کرنے کی کوشش تو کی مگر سنتوش کی نظریں کافی کچھ بھانپ چکی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہنیں اس کے غصے سے پہلے ہی بہت ڈرتی ہیں اور وہ کبھی بھی سنتوش کو اصل بات نہیں بتائیں گی اس لئے اس نے خود چھپ کر بہن کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز اس نے دفتر سے جلدی چھٹی لے لی اور اپنی گلی کے قریب ہی ایک اندھے موڑ سے پرے نکڑ کے چوبارے پر آ کر بیٹھ گیا جہاں سے وہ اپنی گلی پر مکمل نظر رکھ سکتا تھا۔ قریب ہی ایک چاقو چھری تیز کرنے والا ایک بنجارہ اپنی سائیکل پر چھریاں تیز کرتے ہوئے لوہے کے پہیے سے نکلتی چنگاریوں سے قریب بیٹھے چند شرارتی بچوں کو محظوظ کر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سمترا کی بس آ کر رکی اور سمترا گھبرائی سی بس سے اتر کر اپنی گلی کی طرف بڑھنے لگی۔ تبھی ماجد کی سربراہی میں انہی تین چار لفنگوں کا گروپ قہقہے لگاتا گلی کے نکڑ پر آ کر جم گیا۔ سمترا کی انہیں دیکھ کر جیسے جان ہی نکل گئی اور اس نے کنی کترا کر ان لوفروں سے بچ کر نکلنا چاہا مگر ان کا سرغنہ ماجد تیزی سے اس کے راستے کی رکاوٹ بن گیا اور کچھ الٹی

سیدھی عاشقانہ باتیں کر کے سمترا کو تنگ کرنے لگا۔

سمترا روپڑی اور چوبارے کے پیچھے چھپ کر بیٹھے سنتوش کا خون جوش سے ابلنے لگا۔ اسے اپنی معصوم بہن کی ساری پریشانی سمجھ میں آ گئی۔ محلے کے یہ لفنگے پتہ نہیں کب سے سمترا کو آتے جاتے تنگ کر رہے تھے اور اس بے چاری نے ڈر کے مارے بھائی کو بتانے کی جرأت بھی نہیں کی۔ سنتوش نے کھولتے خون اور غصے کی شدید گرماہٹ میں آس پاس نظریں دوڑائیں تو اسے وہی چھریاں تیز کرنے والا بنجارہ اپنے قریب دکھائی دیا اور اگلے ہی لمحے سائیکل کے اسٹینڈ پر لگا سب سے بڑا اور تیز دھار والا چھرا سنتوش کے ہاتھ میں تھا۔

ماجد اور اس کے گروپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب سنتوش ان کے سروں پر پہنچ گیا ہے۔ باقی دو لڑکے تو ڈر کر بھاگے مگر ماجد کے راستے میں سنتوش اپنی خون بھری سرخ آنکھیں لیے کھڑا تھا اور اگلے ہی لمحے سنتوش کی آنکھوں میں بھرے خون کی سرخی ماجد کے سینے سے نکلتی خون کی دھار میں تبدیل ہو کر گلی میں بچھی پکی اینٹوں کے فرش کو لال کر رہی تھی۔ سمترا کی چیخوں سے ماحول گونج رہا تھا مگر ماجد کو تو چیخنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ خنجر ٹھیک اس کے دل میں پیوست ہوا تھا اور وہ چند لمحے تڑپنے کے بعد ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ سنتوش نے خود ہی تھانے جا کر گرم کمرے میں ہیٹر جلائے بیٹھے تھانے دار کو گرفتاری دے دی۔ ایک قیامت تھی..... جو سنتوش کی بہنوں پر گزر گئی۔ مقدمہ چلا اور سنتوش کو چند مہینوں کے بعد ہی سزائے موت سنا دی گئی۔

وہ بہنیں جن کی عزت کی خاطر سنتوش نے معاشرے کے ایک ناسور کو جہنم واصل کیا تھا اور جن بہنوں کے سر سے گھر میں بھی دوپٹہ ڈھلک جانے پر وہ بے چین ہو جایا کرتا تھا کہ کہیں اس کی عفت مآب اور پاکیزہ بہنوں کے ننگے سر پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ وہی معصوم بہنیں جب سنتوش سے ملنے جیل آیا کرتیں تو درجنوں لوگوں کی میلی نظریں راستے سے لے کر جیل کے اندر تک انہی بہنوں کے جسموں کے آر پار ہوتی دکھائی دیتیں تو سنتوش بے بسی سے تڑپ اُٹھتا۔ آخر کار اس نے اپنی بہنوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اب کوئی اس کے گھر سے اس سے ملنے نہیں آئے گا۔ کندن سنتوش کی کہانی سناتے سناتے رو پڑا اور اس کی آواز بھرا گئی۔

''عبداللہ بابو..... تم جانتے ہو ناں..... اُن غیرت مند بھائیوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی جب اُن کی معصوم بہنیں زمانے کے دھکے کھا کر ذلتی ہوئی، درجنوں ہوس بھری نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے لاڈلے بھائی سے ملنے آتی ہوں گی۔ اسی جیسی ہی ایک بہن سمترا کو زمانے کی گندی نظر سے بچانے کے لئے سنتوش نے یہ قتل کیا تھا۔ مگر سنتوش جیل میں اکثر یہ بات بتاتے بتاتے رو پڑتا تھا کہ جس غیرت کی خاطر اس نے ماجد کو چند لمحوں میں ہی جہنم واصل کر دیا تھا وہی غیرت اب روز عدالت کی پیشیوں اور جیل کی راہداریوں میں ملاقات کے نام پر کس طرح کچلی اور روندی جا رہی ہے۔ بہنوں نے سنتوش کے فیصلے پر بہت واویلا کیا۔ بہت آنسو بہائے مگر سنتوش نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ حتیٰ کہ اس کی ملاقات سزائے موت کے ایک دوسرے قیدی ظہیر سے ہو گئی جس نے سنتوش کے دل میں پھر سے آزادی کی جوت جگا دی۔

ظہیر کا منصوبہ شاندار اور ہر طرح سے مکمل تھا۔ مگر آخری پتہ تو قسمت ہمیشہ اپنے پلو میں چھپا کر رکھتی ہے اور سنتوش کے مقدر کے ترپ کا یہ پتہ الٹا پڑ گیا۔ ہمارے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں وہ جیل کے صحن میں ہی سینے پر

گولی کھا کر گرا اور ہم سب نے اپنی آنکھوں سے اس کے خواہشوں بھرے سینے سے خون کا فوارہ نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کندن تو پلٹ کر واپس اپنے دوست کی طرف جانا چاہتا تھا مگر خود سنتوش کی آنکھوں میں ہی اسے آگے بڑھ جانے کی التجا نظر آئی۔ سنتوش نے آخری آہ بھری اور اس کی زبان سے بس ایک ہی جملہ اس کے آخری لفظ بن کر نکلا۔ ''جے سنتوشی ماں.....'' اور سنتوش نے وہیں جان دے دی۔

سنتوش کی موت کی خبر اس کے گھر پہنچی تو بہنوں کو سکتہ ہو گیا۔ یہ سکتہ تو اُسی دن سے طاری تھا جب ان کے پیارے سنتوش کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ مگر پھر بھی انسان زندہ رہے تو اس کے چاہنے والوں کو بھی ایک اُمید، ایک آس زندہ رکھتی ہے۔ سنتوش کی موت کے ساتھ ہی اس کے گھر والوں نے بھی جیسے دم توڑ دیا۔ بہنیں زندہ لاش بن کر پھرتیں اور راتوں کو ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر تکیے میں منہ چھپا کر رویا کرتیں۔ کندن کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا، رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

''جانتے ہو عبداللہ..... فرار ہونے سے ایک رات پہلے سنتوش نے مجھ سے کیا کہا تھا.....؟''

میں نے تڑپ کر کندن کی طرف دیکھا..... ''کیا.....؟''

✱.....✱.....✱

باب 41

کندن کی بات سن کر میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہا تھا سنتوش نے فرار والی رات سے پہلے تمہیں.....؟"

کندن کی آواز دکھ میں بھیگی ہوئی تھی' اسے اپنی چھوٹی بہن سمترا کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہی ان سب کی لاڈلی بھی تھی۔ سنتوش کے جیل جانے کے بعد اس کا سب سے بڑا بہنوئی جے پال سمترا اور سیما کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا تھا۔ جے پال اچھا انسان تھا اور اس نے سمترا اور سیما کا خیال بھی اپنی سگی بہنوں جیسا ہی رکھا۔ مگر سنتوش جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی ایک سفید پوش انسان ہے اور اپنے گھر کے مسائل کے ساتھ ساتھ دو مزید جوان بہنوں کا بوجھ جلد ہی اس کی کمر توڑ دے گا۔

سنتوش نے کندن کو فرار سے ایک رات قبل ہی بتایا تھا کہ وہ اپنی بہنوں کے مستقبل کے لئے حد سے زیادہ پریشان ہے۔ اور وہ جیل سے فرار ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی دونوں بہنوں کا رشتہ طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ سمترا کے لئے تو اس نے بہت پہلے سے اپنے ہی ایک ہونہار دوست اور پرانے کلاس فیلو اشوک سے رشتہ طے کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اشوک اس کی بات کبھی نہیں ٹالے گا اور وہ سیما کے لئے بھی اپنے ہی خاندان میں کوئی لڑکا ڈھونڈ کر سیما کا لگن بھی ضرور کروا دے گا۔ فرار والی رات سے پہلے سنتوش نے کندن کو پابند کیا تھا کہ اگر اُسے کچھ ہو جائے تو کندن پشاور جا کر اس کی دونوں بہنوں کو یہ پیغام دے دے کہ وہ اُن کے مستقبل کے لئے سمترا کا ہاتھ اشوک کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اور سنتوش نے خود کو کسی نقصان پہنچنے کی صورت میں کندن کو اشوک تک بھی اپنی یہ وصیت پہنچانے کی ہدایت کی تھی۔ کون جانتا تھا کہ ایک رات پہلے کہی سنتوش کی یہ بات اس کی آخری وصیت ثابت ہوگی۔ اور چوبیس 24 گھنٹے کے اندر ہی سنتوش یہ دُنیا چھوڑ جائے گا۔

کندن کی آواز سے لگتا تھا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اسی اثناء میں دور قصبے کی کسی مسجد سے صبح کی اذان گونجی تو مجھے پتہ چلا کہ میری اور کندن کی باتوں میں ساری رات بیت چکی ہے۔ میں نے کندن کو پچھلے حصے میں بنے پرانے حجرے میں جا کر آرام کرنے کا کہا اور خود کو صبح کی پھیلتی روشنی کے ساتھ ایک نئے دن کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرنے لگا۔ کبھی کبھی ہر نیا آنے والا دن ایک نئے امتحان کی طرح ہم پر نازل ہوتا ہے۔ ایک مشکل امتحان..... جس کے سوالوں کے جواب ہم چاہ کر بھی نہیں دے پاتے۔

دن دھیرے دھیرے چڑھتا گیا اور میرا ذہن سنتوش کی کہانی میں الجھا رہا۔ پتہ نہیں کندن کی ملاقات

سنتوش کے گھر والوں کے ساتھ ہوئی..... اور کیا کندن اشوک تک اس کے بچپن کے دوست کی آخری خواہش پہنچا پایا کہ نہیں..... ساتھ ہی ساتھ زہرہ کا خیال بھی بار بار میرے دل کو تڑپا رہا تھا۔ میں تین دن پہلے اسے جس حالت میں بڑی حویلی میں چھوڑ کر آیا تھا، اس کے بعد اس کی کوئی خیر خبر کہیں سے مجھ تک نہیں پہنچی۔ میں جانتا تھا کہ زہرہ اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہے گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے بڑوں کی عزت اور مان کا بھرم ہمیشہ قائم رکھے گی.....

شاید میں خود ہی بار بار جانے انجانے اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتا تھا۔ ورنہ وہ بیچاری تو وہی کر رہی تھی جس کا حکم میں نے اُسے جیل کی آخری ملاقات میں بچھڑتے سمے دیا تھا۔ اچانک میرا دل اس زور سے تڑپا کہ جی چاہا اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ اُٹھ کر بڑی سرکار کے پاس چلا جاؤں اور ان کو ساری بات کھل کر بتا دوں کہ ان کی وہ لاڈلی بہو جس کا دوبارہ گھر بسانے کے لئے وہ جمعرات کی شام حاکم بابا کے پاس دعا کے لئے آتی ہیں، وہ میری زہرہ ہے۔ اور میں دنیا میں چاہے کہیں بھی جا بسوں..... میرے راستے پلٹ پلٹ کر مجھے اس کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ اس لئے میرے راستے اس سے جدا نہ کریں۔ قدرت نے اگر ہم دونوں کا سامنا پھر سے کروا ہی دیا ہے تو خدارا اب اسے میری نظروں سے دور نہ کریں.....

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ باہر کچھ شور کی آوازیں اُبھریں۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سکندر اپنے محافظوں کے ساتھ مزار کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ میرا دل زور سے دھڑکا، کہیں وہ ظہیر کو بھی تو اپنے ساتھ نہیں لے آیا۔ میری نظر بے اختیار مزار کے احاطے میں تعینات سادہ لباس والے پولیس اہلکاروں پہ پڑی۔ وہ بھی سکندر کو میری طرف بڑھتے دیکھ کر چوکنا سے ہو گئے تھے۔ مگر ظہیر کو سکندر کے ساتھ نہ پا کر میں نے سکون کی ایک لمبی سانس بھری۔ بگھا بھی سکندر کے ساتھ نہیں تھا۔ سکندر نے خلاف معمول پہلے مزار کے احاطے میں اپنے محافظوں سمیت کھڑے ہو کر دعا کی جیسے یہاں آنا جانا اس کا پرانا معمول رہا ہو، میں چونک گیا کیونکہ پہلے بڑی سرکار اور پھر سکندر نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ ان درگاہوں اور مزاروں کی حقیقت کو صرف ایک ڈھونگ اور دھوکے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا، بلکہ وہ تو اپنی ماں کو بھی بار بار یہاں آنے سے منع کرتا رہتا تھا۔ ایسے میں سکندر کا یوں درگاہ میں آنا اور فاتحہ پڑھنا نہایت خلاف معمول حرکت تھی۔ سکندر نے اطمینان سے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھے دیکھ کر یوں میری طرف بڑھا جیسے وہ مزار پر چڑھاوا چڑھانے یا کسی دوسری خدمت کے لئے مجھے پیسے دینا چاہتا ہے۔

اس نے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا اور پانچ ہزار کے چند بڑے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں بولا" کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بندوں نے زمینوں پر ہی مجھے اطلاع کر دی تھی کہ یہاں پولیس کی بھاری نفری پہنچ چکی ہے۔ سنا ہے کوئی بڑا افسر بھی ساتھ ہے۔ میں نے ظہیر اور بگھے کو اپنی حویلی میں پہنچا دیا ہے۔ تمہیں موقع ملے تو تم بھی نظر بچا کر وہیں پہنچ جانا....."

میں نے یوں پیسے پکڑے جیسے کوئی مجاور ممنونیت کا اظہار کر رہا ہو۔" میرا نکلنا فی الحال مشکل ہے۔ یہاں صحن میں بھی خفیہ پولیس والے مجاوروں کے روپ میں موجود ہیں اور ظہیر سے کہنا کہ کندن بھی یہاں پہنچ گیا ہے۔ مگر وہ زخمی ہے اور اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکے تو اسے بھی کسی طرح یہاں سے نکال کر اپنے ٹھکانے تک پہنچانے کی کوئی تدبیر کرو۔ وہ یہاں زیادہ دن چھپ نہیں سکے گا۔ قافلہ جاتے ہی اُس کی روپوشی کا پول کھل جائے گا سب

پر....."

سکندر نے یوں سر ہلایا جیسے میری ممنونیت کا اظہار قبول کر رہا ہو۔ "ٹھیک ہے..... میں سمجھ گیا..... تم کندن کو تسلی دو اور فی الحال اسے کسی بھی طرح اپنے پاس ہی پناہ میں رکھو..... میں جلد ہی اسے یہاں سے نکالنے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں....." سکندر نے اپنی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگایا اور وہاں سے پلٹ گیا۔ میں نے سکندر کے دیئے ہوئے پیسے قریب سے گزرتے ایک مجاور کے حوالے کیے اور اسے اونچی آواز میں ان پیسوں کی خیرات بانٹنے کی ہدایات دینے لگا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پہرے دار یہ سب سن کر مطمئن ہو کر اپنی مخصوص جگہوں پر پلٹ گئے ہیں۔ میں بھی نظر بچا کر پیچھے بنے پرانے حجروں کی طرف بڑھ گیا جو اَب زیادہ تر درگاہ کا پرانا سامان اور اناج رکھنے والے گوداموں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انہی پرانے گودام نما حجروں میں سے ایک کمرے میں کندن زمین پر بوریے کا بستر بچھائے لیٹا آرام کر رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا، میں نے اسے سکندر کے آنے کا بتایا اور یہ بھی کہ وہ تیار ہے سکندر کسی بھی وقت اسے یہاں سے نکالنے کے لئے اپنے کارندے بھیج سکتا ہے۔

مگر کندن کی حالت آج مجھے مزید ابتر لگ رہی تھی۔ اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا اور مسلسل ایک کپکپی سی طاری تھی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ لائی دوا کی خوراک پلائی اور کمبل اوڑھا کر آرام کرنے کا کہا۔ اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کندن نے ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔

"سنتوش کی آخری خواہش کے بارے میں نہیں پوچھو گے صوفی جی..... یہیں بیٹھ جاؤ..... باتیں کرو مجھ سے..... جانے کب سے چپ ہوں میں..... تم ملے ہو تو دل چاہتا ہے کہ چھ مہینے کی ساری باتیں چھ دنوں میں کرلوں....."

گودام کی دیوار میں بنے اونچے روشن دانوں سے سنہری دھوپ چھن چھن کر اندر پڑ رہی تھی۔ کندن بھی سرک کر نرم دھوپ کے زمین پر بنے ایک روشن ٹکڑے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے گہری سانس لی "تو کیا تم پشاور پہنچ گئے تھے، یا ابھی وہ کام ادھورا پڑا ہے.....؟" کندن نے آنکھیں بند کر کے دیوار سے ٹیک لگالی اور ماضی کی یاد میں کھو گیا۔

سینما کی اندھیری گلی میں پولیس والوں کو چکمہ دینے کے بعد کندن نے کسی پرانے محلے کے جرائم پیشہ عطائی سے اپنے زخم کی میرہم پٹی تو کروالی مگر اس کا زخم دن بہ دن بگڑنے لگا تھا۔ کندن کو پشاور پہنچنے کی جلدی تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح بسیں اور ریل گاڑیاں بدلتا، پولیس سے چھپتا چھپاتا پشاور کے اسٹیشن پر ایک روز اُتر ہی گیا۔ سنتوش نے اُسے اپنے بہنوئی جے پال کا پتہ اچھی طرح سمجھا رکھا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اُس گنجان آباد محلے تک پہنچنے کے لیے کندن کو پولیس کے بہت سے پہروں سے بچ کر نکلنا تھا۔ جگہ جگہ سڑکوں پر پولیس کے ناکے بھی لگے ہوئے تھے اور پہرے پر موجود اہلکار ہر آتے جاتے سے سرحدی تفتیش بھی کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک نئے اجنبی باسی کا بچ کر نکلنا محال تھا۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ زخمی بھی ہو۔ لیکن کندن کا قصہ خوانی بازار سے ہو کر اندرون شہر واقع محلہ خداداد تک پہنچنا ضروری تھا جہاں جے پال رہتا تھا۔ کسی مفرور کے لئے بہترین آڑ ہو لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن کے باہر دن کے مخصوص اوقات میں بہت زیادہ بھیڑ ہوا کرتی ہے۔ کندن نے بھی اسی بھیڑ کا فائدہ اُٹھایا اور کسی

جاہل دیہاتی کے بہروپ میں وہ تانگے بدل بدل کر سرشام الف لیلیٰ کی کسی کہانی میں سنے ہوئے پرانے بغداد کی کسی طویل گلی کے طرز پر بنے مشہور قصہ خوانی بازار کے پر پیچ کوچوں تک پہنچ ہی گیا۔

خوانچہ فروشوں کی بھیڑ، بھنے ہوئے گوشت کی تیز مہک اور پرانے گڑ کی خاص خوشبو، بھانت بھانت کی بولیاں، آواز لگاتے سوداگر اور لپکتے گاہک، ہوٹل سے فضا میں بکھرتی دودھ پتی چائے کا سوندھا پن اور دوکان پر بجتے کسی پرانے ریکارڈ سے نکلتی ناشناس کے گانے کی آواز..... ٹھیلوں پر لدے خشک میوے اور پرچون پر بکتے تیز مصالحہ جات..... حلوائی کی دوکان میں بنتی گرم جلیبیاں اور کڑاہی میں ابلتا تیز گرم دودھ..... بازار تھا یا کوئی میلہ تھا۔ مگر کندن کو ابھی اندھیرا ڈھلنے تک کسی مناسب جگہ پر چھپ کر انتظار کرنا تھا۔ تاکہ وہ رات ڈھلے جا کر جے پال کے پرانے سال خوردہ دروازے کی کنڈی ہلا سکے۔

قصہ خوانی بازار میں شام ڈیرے ڈالنے والی تھی اور مختلف ٹھیلوں پر لگے گیس کے ھنڈولے جلنا شروع ہو چکے تھے۔ کندن گرم مونگ پھلیاں اور چنے بھوننے والے ایک خوانچہ فروش کی آڑھ لے کر وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا تبھی اچانک ایک جانب سے پولیس کی تیز سیٹیوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ شاید بازار میں کوئی ہنگامہ ہو گیا تھا۔ کندن گھبرا کر کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ تبھی کسی راہ گیر نے بھاگتے ہوئے نعرہ لگایا۔

"چاقو چل گئے پچھلی گلی میں، قاتل بھاگتے ہوئے اسی طرف آ رہے ہیں..... جان بچاؤ اپنی....."

سارے بازار میں سراسیمگی سی پھیل گئی اور کندن بھی ہڑبڑا کر ایک جانب لپکا۔ جلدی میں اس نے کسی راہگیر سے محلہ خداداد کا پوچھا تو اس نے بھاگتے ہوئے گھبراہٹ میں ایک جانب اشارہ کر دیا۔ کندن نے عجلت میں اسی جانب قدم بڑھا دیئے مگر یہ دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے کہ اس گلی کو پولیس نے اگلی جانب سے ناکہ لگا کر بند کر دیا ہے۔ کندن گھبرا کر پلٹا مگر پچھلی جانب سے بھی اسے پولیس والے دوڑ کر آتے دکھائی دیئے۔ کندن کو جلدی میں اور کچھ نہیں سوجھا تو وہ نظر بچا کر قریبی ٹوٹی ہوئی دیوار سے گلی کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور ساتھ بنی اجاڑ، سنسان حویلی میں ٹاپ گیا جس کے پرانے لکڑی کے بند دروازے پر باہر پہلے ہی وہ بڑا سا پرانا تالہ پڑے دیکھ چکا تھا۔ یہ کوئی پرانا قدیم حویلی نما مکان تھا جو باہر گلی سے تو ایک عام سا گھر دکھائی دیتا تھا مگر اندر اُترتے ہی کندن کو احساس ہوا کہ یہ قدیم حویلی اندر سے بے حد کشادہ اور نفیس تعمیر کا ایک شاہکار تھی۔

پرانی کشادہ چلمنیں، لکڑی کے بنے جھروکے، صحن میں سرخ پتھر کی نقش کاری، پرانی قدیم ڈیوڑھیاں اور ان میں سے اوپر کے کمروں کو جاتی سیڑھیاں۔ چھت پر بنا ایک چھوٹا سا کبوتر خانہ، لکڑی کے ستونوں والے برآمدے اور ان میں کھلتی لکڑی کی جالی دار محراب والی کھڑکیاں۔ کندن کچھ دیر وہیں چھت پر نیچے جاتی تنگ سیڑھیوں کے ایک گوشے میں دبکا باہر گلی کا ہنگامہ ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے حویلی کے صحن میں آ گیا۔ جانے کیوں کندن کو اس انجان جگہ سے ایک عجیب سی انسیت محسوس ہونے لگی تھی۔ جیسے وہ پہلے بھی یہاں آ چکا ہو۔ یا جیسے اس کا کوئی بہت اپنا یہاں کبھی بستا ہو۔ کندن وقت گزاری کے لئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں یونہی بھٹکتا رہا۔

ساری حویلی سنسان اور ویران پڑی تھی۔ کسی کسی کمرے کی دیوار میں پرانا چوبی وال کلاک بھی نسب نظر آ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے سے جوں ہی کندن نکل کر کسی عقبی برآمدے میں نکلا تو دیوار پر لگی ایک تختی پر لکھی تحریر دیکھ کر کندن کے پاؤں زمین میں گڑھ کر رہ گئے۔ کندن نے عجلت میں اپنی آنکھیں مل کر دو چار بار وہ تحریر یوں پڑھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو اور پھر جیسے ہی کندن کا یقین بحال ہوا وہ وہیں برآمدے میں ہی ڈھے سا گیا جیسے اس کے قدموں نے جواب دے دیا ہو۔ یا جیسے کوئی پجاری اپنے دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ جاتا ہے۔

کندن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ سامنے لگی تختی پر ہدایات درج تھیں "خبردار..... حکومت وقت نے اس گھر کو قومی ورثہ قرار دے دیا ہے اور یوسف خان عرف دلیپ کمار کی یہ حویلی حکومتی نگہداشت میں دی جا رہی ہے۔ کوئی بھی فرد یا گروہ بنا اجازت اس قومی ورثے کی تزئین و آرائش کے کام میں دخل اندازی کرتا پایا گیا تو حسب ضابطہ کارروائی کی جائے گی۔ برصغیر کے عظیم فنکار یوسف خان عرف دلیپ کمار کی اس جائے پیدائش کی نگرانی اور حفاظت ہم سب کا فرض ہے....."

کندن کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ وہ اپنے من مندر کے اس دیوتا کے گھر کی دہلیز پر بیٹھا تھا جسے دیکھ کر وہ فلم بینی کے اس طلسم کدے میں داخل ہوا تھا۔ جس کی تصویریں اور پرانے پوسٹر اس کی اسکول کی کاپی کتابوں اور کمرے کی دیواروں پر ہمہ وقت چپکے رہتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنے شہر کے ریگل سینما تھیٹر کے مینیجر کے کمرے میں گھنٹوں اس لئے بیٹھا رہتا تھا کیونکہ اس کے پاس دلیپ کمار کی پرانی فلمی تصویروں کا ایک پورا خزانہ تھا جو اس نے اُس وقت سے سنبھال رکھا تھا جب یہاں بھی تقسیم سے پہلے اور بعد میں بھارتی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔ سینما کا مینیجر جسے سب خان چاچا کہتے تھے خود بھی دلیپ کمار کا بہت بڑا پرستار تھا اور وہ گھنٹوں کندن کو اپنی جوانی کے وہ قصے سنایا کرتا جب ریگل تھیٹر میں دلیپ کمار کی کوئی فلم لگتی تو کیسے پورے شہر کا شہر اپنے محبوب ہیرو کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اُمڈ آتا تھا۔ "جوار بھاٹا"، "میلہ"، "جگنو"، "داغ" اور "انداز....."

کیسی کیسی فلمیں دیکھی تھیں اس شہر کے فلم بینوں نے ماضی میں یہاں..... مدھومتی، نیا دور اور پھر مغل اعظم..... کون تھا جو دلیپ کمار کا دیوانہ نہیں تھا۔ سینما کے باہر دن چڑھتے ہی لمبی قطار بن جاتی تھی جبکہ ٹکٹ کھلنے میں ابھی گھنٹوں باقی ہوتے، مگر تین بجے کا میٹنی شو دیکھنے کے لئے فلم بین دن 12 بجے سے ہی ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے قریب منڈلانے لگتے اور پھر رات گئے تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔

وہ دلیپ کمار جس نے اپنے انداز سے ایک زمانے کو متاثر کیا اور آج بھی لاکھوں دلوں کے اندر بستا تھا، اسی دلیپ کمار کے گھر میں آج کندن بیٹھا تھا اور ہر چیز کو ٹٹول ٹٹول کر یہ تصور کر رہا تھا کہ اس کے محبوب اداکار کا لمس ابھی تک وہاں موجود ہوگا۔ وہ یہاں بیٹھتے ہوں گے..... یہاں ان کے قدموں کے نشان ہوں گے، یہاں اسکول جانے کے لئے تیار ہوتے ہوں گے..... یہاں کوٹھے پر گرمی کی دوپہروں میں ماں سے چھپ کر پتنگ اڑایا کرتے ہوں گے۔ اس بالکنی کے نیچے کھڑے ہو کر باہر برستی بارش کا نظارہ کرتے ہوں گے، اس دو چھتی تلے بیٹھ کر اسکول کا کام کرتے ہوں گے، آتے جاتے شرارت سے اس بھاری سی دیوار میں نصب لکڑی کی گھڑی کی سوئیوں کو چھیڑنے کی کوشش کرتے ہوں گے، اس جیسے جانے اور کتنے خیال کندن کے دل و دماغ کی دنیا اتھل پتھل کرتے رہے اور وہ

رُک رُک کر ہر ایک چیز کو نہایت غور سے دیکھتا رہا۔

ہم انسان کسی گھر سے جب چلے جاتے ہیں تو بھلا ہم پورا کب جاتے ہیں۔ ہمارے لمس، ہماری آہٹیں اور ہمارے ہنسنے، رونے کی آوازیں وہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ کندن کو بھی وہ ساری آہٹیں سنائی دے رہی تھیں، وہ منظر دکھائی دینے لگے تھے جب یہاں سے چھوٹا لالہ یوسف اسکول کے لئے تیار ہو کر چند گلیوں پرے اپنے دوست راج کپور کے ساتھ اسکول جایا کرتا تھا۔ کندن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جے پال سے ملنا تو صرف ایک بہانہ تھا، اس میں تو قدرت نے اس کے لئے یہ چند لمحے انعام کے طور پر یہاں اس شہر میں بچا رکھے تھے۔ ہم ساری زندگی میں پاتے ہی کیا ہیں اس بے درد زندگی سے.....؟ چند لمحے..... ہماری ساری عمر کی کمائی آخر میں کیا نکلتی ہے.....؟ یہی چند لمحے.....

کندن بھی اپنی ساری زندگی کے حاصل انہی چند لمحوں کو سمیٹتے سمیٹتے تھک کر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک اندھیرے میں ایک آہٹ ہوئی، کندن گھبرا کر اٹھ بیٹھا..... تبھی کوئی حویلی کی چھت پر کودا، کندن کی سانس رک سی گئی۔

..........*

باب42

کندن دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں دلیپ کی فلم بیوی کا ایک نغمہ اپنے دل میں دھرا رہا تھا۔

"یہ میرا دیوانہ پن ہے..... یا محبت کا سرور.....تو نہ پہچانے تو ہے یہ..... تیری نظروں کا قصور....."

تبھی اچانک پچھلی دیوار کی جانب ایک زوردار آہٹ ہوئی جیسے کوئی کوٹھے پر کودا ہو۔ کندن اچھل کر کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنے کان باہر کی آوازوں پر لگا دیئے۔

پھر کسی کی آواز ابھری۔ "کوئی نہیں ہے ادھر صاب.....سارا چھت دیکھ لیا ہے میں نے....." وہ شاید کوئی پولیس والا تھا جو نیچے گلی میں اپنے کسی افسر کو اطلاع دے رہا تھا۔ دور گلی میں سے کوئی دوسرا ہلکار چلایا۔

"اوئے نصیرے.....چل آجا..... وہ پچھلی گلی کی طرف بھاگتے دیکھے گئے ہیں....." چھت پر تیز دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی گلی میں کود گیا۔ کندن نے گہری سانس لی، تھوڑی دیر میں باہر گلی میں سناٹا ہوگیا۔ کندن نے دو گھنٹے مزید انتظار کیا اور وہیں دبک کر بیٹھا رہا، اس کا بس چلتا تو وہ اپنی باقی تمام عمر اُسی حویلی کو تکتے اور اس کے در و بام کو چھوتے اور محسوس کرتے گزار دیتا۔ مگر اُسے جے پال کے گھر پہنچنا تھا اس لیے جیسے ہی دور شہر میں نصب کسی گھڑیال نے رات کے بارہ بجنے کا اعلان کیا کندن بھاری دل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آخری بار اپنے دیوتا کی چوکھٹ کو چوما اور دہلیز پر ماتھا ٹیک کر دوبارہ اُسی چھت کے راستے ہوتا ہوا باہر گلی میں اتر آیا۔

گلی سنسان پڑی تھی۔ جے پال کا گھر اس گلی سے پرے تیسری گلی کے وسط میں تھا۔ کندن خود کو بڑی سیاہ پشاوری شال میں لپیٹے بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے جے پال کے دروازے تک پہنچ گیا اور اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دی۔ تیسری دستک پر اندر سے نکلنے والا ایک پکی عمر کا شخص جے پال ہی تھا جو پہلے تو اتنی رات گئے ایک اجنبی کو تقریباً اپنا چہرہ چھپائے دروازے پر کھڑے دیکھ کر پریشان ہوگیا مگر پھر جب کندن نے سنتوش کا حوالہ دیا تو جے پال نے جلدی سے اندر بلا لیا۔

گھر کی پرانی خستہ حال بیٹھک میں بچھے پرانے صوفے پر بیٹھا کندن جب جے پال کو سنتوش کی وصیت کے بارے میں بتا رہا تھا تب اسے محسوس ہوا کہ دوسرے کمرے میں کھلتے بیٹھک کے درمیانی دروازے سے پرے کھڑا کوئی سسک سسک کر رو رہا ہے۔ پھر جے پال نے آواز دے کر اسے اندر ہی بلا لیا۔ وہ سمترا ہی تھی، جس کے پیچھے پیچھے سیما اور پھر ان کی بڑی بہن پردا دیدی بھی چلی آئی جو اب جے پال کی بیوی تھی۔ اپنے لاڈلے بھائی کی

باتیں سن کر تینوں بہنوں کا زخم پھر سے تازہ ہوگیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر ایسا روئیں کہ خود کندن بھی آبدیدہ ہوگیا۔ خوشیاں ہماری زندگی میں بہت کم مدت کے لئے آ کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ مگر غم ہمارے اندر بسیرا کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی پلٹ کر واپس نہیں جاتے، اور آخری لمحوں میں جب کوئی انسان اپنی تمام عمر کا گوشوارہ نکال کر دیکھے تو سوائے دکھ اور غموں کے اسے کوئی دوسری مستقل یاد شاید ہی دکھائی دیتی ہو۔

جے پال نے کندن کو بتایا کہ وہ پہلے ہی اشوک سے رابطے میں ہے اور خود اشوک نے بھی سمترا سے رشتے میں دلچسپی ظاہر کر رکھی ہے۔ شاید اسے پہلے سے ہی اپنے یار سنتوش کی سوچ اور خواہش کا احساس ہوگیا تھا۔ سیما کے لیے بھی جے پال نے رشتہ دیکھ لیا تھا اور اس کا ارادہ یہی تھا کہ دونوں بہنوں کو ایک ساتھ ہی رخصت کر دے گا۔ کندن کچھ دیر بیٹھا رہا مگر پھر صبح کی اذانوں کی آواز نے اسے رخصت لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گلی محلے کے لوگ اسے صبح کی روشنی میں جے پال کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھیں کندن جانے کے لئے کھڑا ہوا تو سیما اور سمترا سسک پڑیں۔ شاید انہیں کندن کے روپ میں سنتوش کی کوئی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ کندن نے اپنی جیبوں میں موجود سارے پیسے نکالے اور سمترا کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

''تمہارے مجبور بھائی کے پاس آج تمہیں دینے کے لئے کچھ زیادہ نہیں ہے بہن..... جو ہے.....اسے قبول کرلو.....''

سیما اور سمترا دونوں رو پڑیں اور کندن ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر جے پال کے گھر سے نکل آیا۔ اِکا دُکا نمازی گھروں سے نکل چکے تھے۔ کندن کو گلی سے نکلتے دیکھ وہ بھی یہی سمجھے کہ کوئی نمازی گھر سے مسجد جانے کے لئے نکلا ہے۔ کندن نے پچھلی سڑک سے تانگہ پکڑا اور بیدھار ریلوے اسٹیشن پہنچ کر بختیار آباد کے قریب بڑے شہر تک کا ٹکٹ لے لیا۔ اور پھر وہاں سے قافلے میں شامل ہو کر وہ اس درگاہ تک آن پہنچا۔ کندن کی کہانی سنتے سنتے دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میرا اتنا زیادہ دیر تک پولیس والوں کی نظروں سے اوجھل رہنا انہیں کسی شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے کندن کو لٹا کر اُسے کمبل اوڑھا دیا اور خود پرانے حجرے سے باہر نکل آیا۔ باہر بہت گہما گہمی تھی۔ پوچھنے پر ایک مجاور نے بتایا کہ آج شام یا رات کے کسی پہر دوسرا قافلہ بھی یہاں پہنچنے والا ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ کل یا پرسوں یہاں سے دونوں قافلے کوچ کر جائیں گے۔ پھر کندن کا کیا ہوگا.....؟ وہ بھلا اس بھیڑ کے چھٹنے کے بعد پولیس اہلکاروں کی نظر سے کیسے بچ پائے گا۔

یہی سوچ سوچ کر میری پریشانی بڑھتی گئی اور شام کے سائے درگاہ کے در و دیوار پر منڈلانے لگے۔ میں بے چینی سے سکندر کی طرف سے بھیجے گئے کسی ہرکارے یا پیغام کا انتظار کر رہا تھا تاکہ کسی طرح سکندر کو یہ اطلاع پہنچا سکوں کہ وہ جلد از جلد کندن کو یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے مگر مغرب ڈھلنے تک بڑی حویلی سے کوئی پیامبر نہیں آیا۔

ایک آدھ بار میرے جی میں آیا کہ میں خود نظر بچا کر بڑی حویلی سکندر کے پاس چلا جاؤں اور اسے ساری صورتحال سے آگاہ کر دوں.....مگر میں جانتا تھا کہ درگاہ کے پہرے پر موجود سپاہیوں کی ہر پل مجھ پر نظر ہے اور میری بڑی حویلی کی یاترا انہیں اس گھر کی طرف سے بھی مشکوک کر دے گی۔ جہاں پہلے ہی ظہیر اور بگھا موجود تھے۔ لہٰذا

میں چاہ کر بھی درگاہ سے نہیں نکل پایا۔ وہاں کندن کی حالت لحہ بہ لحہ بگڑتی جارہی تھی۔ اور اس کے بخار کی حدت اور شدت بدستور بڑھ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خدشہ کسی کوندے کی طرح لپکا۔ کہیں اسد نے اپنے کسی شک کی بنیاد پر حویلی پر بھی پہرے تو نہیں بٹھا دیئے۔ اس کے اہلکاروں نے مجھے دن کو سکندر سے بات کرتے دیکھا تھا اور انہوں نے ضرور یہ خبر اپنے افسر تک بھی پہنچائی ہوگی۔ اسد جیسے ہوشیار اور زیرک پولیس افسر سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ضرور یہی بات ہوگی اور سکندر نے پہرہ محسوس کر کے احتیاط برتی ہوگی۔

میں رات بھر اسی شش و پنج میں مبتلا رہا حتیٰ کہ صبح کی اذان ہوگئی اور روشنی ہوتے ہی قافلے والوں نے اپنا ساز و سامان اکٹھا کر کے کوچ کی تیاری مکمل کرلی۔ میں پریشان سا کبھی کندن کے حجرے اور کبھی قافلے کے پڑاؤ کے چکر کاٹتا رہا اور آخر کار قافلے کے امیر نے کوچ کا اعلان کردیا۔ کچھ ہی دیر میں درگاہ کا صحن ویران ہوگیا اور صرف مزار کے چند مجاور اور اکا دکا سائل رہ گئے اور ان میں وہ سادہ لباس والے پولیس اہلکار بھی شامل تھے جنہیں اسد میری نگرانی کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ میری پریشانی بڑھتی چلی گئی کیونکہ اب کندن کا یہاں سے نکلنا مزید مشکل ہوگیا تھا۔ میں نے اسے گودام میں ہی اناج کی بوریوں کے پیچھے چھپے رہنے کی تاکید کی۔ میرا بار بار ان متروک حجروں کی طرف جانا بھی کسی کو شک میں ڈال سکتا تھا اس لئے میں نے کندن کو کھانا اور پانی پہلے ہی وافر مقدار میں پہنچا دیا تھا۔

یونہی صبح سے دوپہر اور دوپہر سے عصر ہوگئی۔ تبھی نیچے صحرا میں اترتی سیڑھیوں پر کچھ ہلچل سی ہوئی۔ آنے والا اسد ہی تھا جسے دیکھتے ہی آس پاس پولیس والے ہوشیار ہو کر اپنی جگہوں پہ کھڑے ہوگئے۔ اسد کے ساتھ کچھ اور پولیس والے بھی تھے، میرا دل زور سے دھڑکا، کہیں اسے کوئی مخبری تو نہیں ہوگئی۔ مگر وہ میری طرف آنے کے بجائے سامنے کھڑے اہلکاروں کی طرف بڑھ گیا اور ان سے کچھ بات کرنے لگا۔ میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

تبھی چند اور لوگوں کا ریلہ درگاہ میں داخل ہوا۔ میں نے گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو بڑی سرکار اپنی خادماؤں کے ساتھ آتی دکھائی دیں۔ اسد کی توجہ بھی اُن کی طرف بٹ گئی مگر بڑی سرکار کے پیچھے آنے والے جوڑے کو دیکھ کر میری سانسیں رُکنے لگیں۔ وہ زہرہ کے ماں باپ تھے، ہاں..... وہی تو تھے، حاجی صاحب اور زہرہ کی اماں..... مگر وہ دونوں یہاں.....؟ شاید زہرہ کو واپس لے جانے کے لئے آئے ہوں گے، مگر وہ مجھے یہاں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچیں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں سب سے نظر بچا کر وہاں سے کسی اور طرف نکل جاؤں۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں ملا اور بڑی سرکار سیدھی میری طرف چلی آئیں۔

"سلام چھوٹے سائیں جی..... دیکھیں تو بھلا آج میرے ساتھ کون آیا ہے، یہ میری نُوں زہرہ کے ماں پیو ہیں۔ اپنی لاڈلی سے ملنے آئے ہیں۔ اور پتہ ہے سائیں جی..... آپ کی اور بڑے پیر صاب کی دعاؤں کی برکت سے میری منت بھی قبول کرلی ہے اللہ سائیں نے..... یہ لوگ سکندر کے ہاتھ میں میری زہرہ کا ہاتھ دینے کے لئے مان گئے ہیں....."

میرے دل کے آشیانے پر ایک کڑکتی بجلی سی گری اور میں ساکت کھڑا رہ گیا۔ کچھ ایسی ہی حالت زہرہ کے والدین کی تھی جو مجھے وہاں دیکھ کر حیران اور پریشان سے کھڑے تھے۔ اسد دور کھڑا یہ سارا ماجرا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میری زبان سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔

''بہت مبارک ہو آپ کو.....''

تبھی پیچھے حجرے سے حاکم بابا باہر نکل آئے اور ان سب کی توجہ بٹ گئی۔ بڑی سرکار زہرہ کے اماں ابا کو لے کر تیزی سے حاکم بابا کی طرف لپکیں۔

''سلام پیر جی.....آج تو میرے بھاگ جاگ گئے.....''

میں اپنی جگہ کھڑا اپنے اندر چلتے جھگڑوں کا شور سن رہا تھا کہ پیچھے سے اسد کی آواز سنائی دی۔ ''یہ لوگ تو تمہیں بہت مانتے ہیں.....واہ..... مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم یہاں اتنے پاپولر ہو عبداللہ.....''

میں چپ رہا۔ اسد چلتے ہوئے میرے قریب آ گیا اور دور کھڑی بڑی سرکار اور باقی لوگوں کو حاکم بابا سے بات چیت کرتے دیکھ کر بولا۔

''یہ تو یہاں کی بڑی جاگیردارنی ہے ناں..... یہ سارا علاقہ انہی کی تو ملکیت ہے..... اور یہ بھی تمہاری مریدنی ہے واہ کیا بات ہے جناب کی..... کیا جادو ہے آخر تمہارے پاس..... کچھ بھید کھولو.....آج کچھ تو بتاؤ مجھے کہ آخر سب ماجرا کیا ہے۔ وہ کون سی کرامت ہے جو ان سیدھے سادھے دیہاتی لوگوں کو سزائے موت کے ایک سابقہ مجرم کے سامنے یوں فریاد پر مجبور کر دیتی ہے.....؟''

میں نے اسد کا طنز بہت اطمینان سے نظر انداز کر دیا۔ ''اپنی آنکھوں پر لگے شک کے چشمے کو اتار کر دیکھو اے۔ ایس۔ پی صاحب..... سب کچھ صاف نظر آنے لگے گا..... اور شاید تمہیں اپنے ملک کے عدالتی نظام پر بھروسہ نہیں ہے ورنہ بار بار سابقہ ملزم یا مجرم لفظ کی گردان نہ کرتے..... عدالت نے اپنے فیصلے میں صاف لکھا ہے کہ وہ ملزم ساحر کو جرم ثابت نہ ہونے پر اور اصل قاتل کا اقبالی بیان سننے کے بعد باعزت بری کرتی ہے۔ لیکن شاید تم جیسے پولیس والوں کی نظر میں ایک بار جیل سے ہو کر باہر آنے والا کبھی باعزت ہو ہی نہیں سکتا۔ اور شاید تمہاری یہی سوچ بہت سے دوسروں کو دوبارہ جرم پر اکساتی ہے..... قصور تمہارا نہیں..... تمہاری تنگ نظر سوچ کا ہے..... ورنہ کسی مہذب معاشرے میں تم پر ہتک عزت کا دعویٰ بھی دائر کیا جا سکتا تھا.....''

اسد میری زبان سے اتنی تلخ باتیں سن کر غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات تو ماننی پڑے گی.....تمہارے پاس دلیل کی طاقت ہوتی ہے ہر بار..... اسی لئے تمہیں چھیڑنے میں مزہ آتا ہے مجھے..... لاجواب کر دیتے ہو تم مجھے.....''

میرا دھیان دور کھڑی بڑی سرکار اور زہرہ کے والدین کی طرف تھا جو حاکم بابا کے سامنے بیٹھے نہ جانے کون سے قصے دہرا رہے تھے۔ میں نے اسد کو ٹالنے کے لئے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''میں یہیں موجود ہوں..... جب بھی تمہارا لاجواب ہونے کو دل چاہے..... چلے آنا..... فی الحال مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں.....'' میں نے بات ختم کر کے قدم آگے بڑھائے۔ پیچھے سے اسد نے لقمہ دیا۔

''اس جاگیردارنی کا بیٹا بھی آیا تھا ناں کل تم سے ملنے.....کیا بھلا سا نام تھا..... ہاں.....سکندر.....''

اسد کے منہ سے سکندر کا نام سن کر میرا دل زور سے دھڑکا۔ اسد بولتا رہا ''کل سے تین بار اسے پیغام بھجوا چکا ہوں کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں..... مگر ہر بار اس نے مصروفیت کا بہانہ کر کے مجھے ٹال دیا۔ اس وقت بھی

میرے دوسنتری وہیں بیٹھے ہیں اس کے گھر کے باہر کہ وہ شرفِ ملاقات بخشے تو میں جا کر مل آؤں اس سے....."

اسد کی بات سن کر مجھے سکندر کی طرف سے خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ضرور اسد نے کسی شک کی بنیاد پر سکندر کی حویلی کے گرد بھی پہرا بٹھا دیا ہوگا اس لئے اس نے کندن کو مزار سے نکالنے کے لئے اپنا کوئی کارندہ نہیں بھیجا تھا اب تک۔ میں نے سکون سے اسد کی طرف دیکھا۔

"کہو تو میں تمہاری سفارش کر دوں اس کی ماں ہے..... اتفاق سے وہ اس وقت یہیں موجود ہیں....."

میری بات سن کر وہ ہنس پڑا "اس کی ضرورت پڑی تو میں ضرور تم سے رابطہ کروں گا۔ مجھے ایک کوشش اور کر لینے دو..... دراصل اس کی حویلی سے میرے مخبروں نے ایک بدنام زمانہ مجرم سارنگا کو نکلتے دیکھا تھا۔ جو یہیں سرحد پر انسانی اسمگلنگ کا کام کرتا ہے۔ اب اگر سکندر تم سے ملنے آئے تو اس سے یہ ضرور کہنا کہ اس جیسے بڑے جاگیردار اور علاقے کے سب سے معزز شخص کا ایسے بدنام زمانہ مجرم سے تعلق بہت سے سوالوں کو جنم دیتا ہے..... میں پھر آؤں گا....."

اسد اپنی بات ختم کر کے پلٹ گیا مگر میرے ذہن کے سبھی کواڑ جھنجھوڑ دیئے تھے اس کی باتوں نے، اس کا مطلب ہے کہ وہ ہر گھڑی مجھ پر نظر کیے ہوئے تھا اور مجھ سے ملنے یا بات کرنے والا ہر شخص اس کے لیے مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ابھی تک اسد کو کندن یا ظہیر کی یہاں موجودگی کی بھنک نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اُن کی تلاشی کے لئے زمین آسمان ایک کر چکا ہوتا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ تبھی بڑی سرکار نے حاکم بابا سے واپسی کے لئے رخصت طلب کی اور وہ لوگ اٹھ گئے۔ وہ واپس جاتے ہوئے گھڑی بھر کو میرے قریب رکیں۔

"چھوٹے سائیں جی..... آپ نے بھی آنا ہے بڑی نیاز پر ہماری طرف..... آپ کو میں ہر وقت کسی سوچ میں اور فکر میں ڈوبا دیکھتی ہوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے اپنا بابر..... اپنا سانول یاد آ جاتا ہے..... اس کی آنکھیں بھی بالکل آپ کی طرح تھیں..... ہر پل کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی اداس آنکھیں....." بولتے بولتے خود بڑی سرکار کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اور وہ جلدی سے اپنی پلکیں پونچھ کر آگے بڑھ گئیں۔

زہرہ کی اماں نے پل بھر رک کر دکھ سے میری طرف دیکھا اور زیرِ لب دعا دیتی ہوئی قدم بڑھا گئیں مگر زہرہ کے ابا حاجی صاحب جاتے جاتے دو گھڑی رک گئے۔

"ساحر بیٹا..... بہت خوشی ہوئی تمہاری رہائی کا سن کر..... اللہ تمہاری منزل آسان کرے..... بہت کٹھن اور کانٹوں بھرا رستہ چنا ہے تم نے..... میں جانتا ہوں تمہاری اس علاقے میں موجودگی تمہاری اپنی منشا کے باعث نہیں ہوگی لیکن اگر قسمت کا پھیرا تمہیں یہاں لے ہی آیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم زہرہ کی عزت اور حرمت کا بہت خیال رکھو گے..... اس نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں ساحر..... خوشیاں تو جیسے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہیں اس سے..... اس لئے ہم نے سکندر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دینے کے لئے حامی بھر لی ہے۔ یہی بہتر ہے اس کے لئے۔ اس کی ساس اسے اس کی ماں کی طرح چاہتی ہے۔ اور سکندر کے بچے بھی اس سے بہت مانوس ہیں۔ دعا کرو ایک بار پھر اس کا گھر بس جائے..... بہت اونچا خاندان ہے سکندر کا..... اور وہ ایک بار پھر زہرہ کو اپنانا چاہتا ہے....."

میں نے تڑپ کر حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے میری ہی ابدی بربادی کی دعا کرنے کی فرمائش کر بیٹھے تھے۔ اور انہیں یہ توقع بھی مجھی سے تھی کہ میں مسکرا کر ان کی تمنا پوری کر دوں..... کیا کبھی کسی نے میرے دل خاکستر کے اندر جھانک کر بھی دیکھا.....؟ کسی نے مجھ سے میرے دل کی خوشی پوچھنے کی زحمت تک گوارہ نہیں کی..... کیوں.....؟ کیا یہی صلہ تھا میرے اس عشق لاحاصل کا.....؟

تبھی دور کہیں میرے اندر ہی کوئی بولا "عشق میں صلے کسے نصیب ہوتے ہیں بھلا..... یہ سودا دکھ کا سودا ہے..... میں نے دھیرے سے انہیں تسلی دی۔ "آپ مطمئن رہیں، زہرہ کی عزت میری عزت ہے..... میری وجہ سے کبھی اس کی عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا....."

انہوں نے سر ہلایا "جانتا ہوں میں..... اور یہی توقع ہے مجھے تم سے..... بس ایک اور درخواست ہے تم سے..... مجھے پتہ ہے یہ سب کہتے ہوئے میں بہت خودغرض اور مطلبی لگ رہا ہوں گا تمہیں..... مگر کیا کروں..... باپ ہوں..... ایک مجبور باپ جو اپنی بیٹی کا گھر بسانے کی ہر ممکن تگ و دو میں ہے..... میری درخواست ہے کہ زہرہ کا نکاح ہو جانے تک تم یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ....." میں نے کرب کی شدت سے گھبرا کر اُن کی طرف دیکھا۔

..........*

باب 43

حاجی صاحب کی بات سن کر میں نے گھڑی بھر ان کی طرف دیکھا۔ مگر وہ میری نظروں کا سامنا نہیں کر پائے اور جلدی سے بولے۔ ''میں جانتا ہوں میں تمہاری مشکلات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ زہرہ اور سکندر کا رشتہ طے ہوتے وقت تمہاری یہاں موجودگی بہت سی الجھنوں کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر کسی کو تمہارے اور زہرہ کے ماضی اور رشتے کے بارے میں پتہ چل گیا تو بہت مشکل ہو جائے گی اس کے لئے..... تم سمجھ رہے ہو ناں..... میں کیا کہہ رہا ہوں.....''

میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ ''جی..... میں سمجھ رہا ہوں..... آپ فکر نہ کریں..... میں بہت جلد یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا..... لیکن اس وقت میرے کسی دوست کو ضرورت ہے میری..... اس کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں رخت سفر باندھ لوں گا..... بس تھوڑی سی مہلت دے دیں آپ مجھے.....''

زہرہ کے ابا نے گہری سانس لی ''ٹھیک ہے..... تمہاری سعادت مندی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے۔ کاش..... کاش تم اور زہرہ ایک ہو جاتے..... مگر قسمت کو شاید کچھ اور ہی منظور ہے..... ویسے بھی تم نے اپنی زندگی کے لئے جو رستہ چنا ہے..... وہ تمہیں کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے نہیں دے گا..... شاید تم ہمیشہ ہی سفر میں رہو گے..... مگر میں ایک بیٹی کا باپ ہوں..... اور ایک باپ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی کا اپنا ایک ہنستا بستا گھر ہو جہاں وہ اور اس کا خاندان پھلے پھولے..... جہاں زندگی میں سکون ہو..... جہاں ہر وقت سفر کے وسوسے اور اندیشے نہ ہوں..... جہاں ہر شے اپنی جگہ ٹھکانے سے ہو..... تم..... تم سمجھ رہے ہو ناں ساحر..... میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں.....''

میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ ان سے یہ بھی نہیں کہہ پایا کہ اگر آپ کو اپنے مخاطب سے بار بار یہ پوچھنا پڑے کہ کیا وہ آپ کی کہی باتیں سمجھ رہا ہے کہ نہیں..... تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہی جانے والی بات بہت مشکل اور تکلیف دہ ہے..... میں ابھی اذیت میں تھا مگر میں نے اپنی تکلیف اپنے چہرے سے عیاں نہیں ہونے دی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے وہ، ہر ماں باپ اپنی بیٹی کی زندگی میں سکون دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی گود میں اپنی نسل کو پروان چڑھتے دیکھ کر اُن کا خون کتنا بڑھ جاتا ہوگا۔ یہ کون نہیں جانتا، مگر ایک جوگی بنجارے کی قسمت میں یہ سکون، چین اور اطمینان کہاں.....؟ اُسے تو ہر لمحے کوئی نیا اور انجان سفر درپیش رہتا ہے۔ بنجارہ کبھی گھر نہیں بسا سکتا کیونکہ اس کے پاؤں میں ہی چکر ہوتا ہے۔ اس کے قدم کہیں نہیں تھمتے۔ تو پھر ایسے مسافر کے ساتھ اپنی بیٹی کون بیاہنا چاہے گا؟

زہرہ کے ابا میرا شانہ تھپتھپا کر یوں آگے بڑھ گئے۔ جیسے زندگی کسی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

دوپہر سے سہ پہر اور سہ پہر کے بعد شام آ گئی۔ یہ دن کے پہر بھی اپنے معمولات کے کتنے پابند اور پکے ہوتے ہیں۔ کبھی تھکتے ہی نہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کبھی ایسا بھی تو ہو کہ دوپہر کے بعد سہ پہر نہ آئے..... یا کبھی تیسرا پہر ڈھلنے سے رک جائے اور شام نہ ہو..... ہم زندگی بھر ایک ہی پہر کو جیتے رہیں۔ وقت ہمارے بس میں ہو جائے۔ ہم اپنی مرضی سے اسے آہستہ یا تیز کر سکیں اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو شاید انسان اپنے مسرت بھرے لمحات کو کبھی گزرنے ہی نہ دے۔ بار بار ایک ہی پل کو جیتا رہے۔ جیسے میں ہمیشہ اُس پل کو جینا چاہتا تھا کہ جب میں نے پہلی بار زہرہ کو دیکھا تھا۔ بس وہی ایک پل کافی تھا مجھے عمر بھر جینے کے لئے۔ مگر وہ پل بھی ایک لمحے کے اندر ہی گزر گیا۔

کتنی مختصر زندگی تھی میری..... میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا مغرب ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا تا کہ مکمل اندھیرا ہوتے ہی میں جا کر کندن کو دیکھ سکوں۔ اُس کا مسلسل اور چڑھتا بخار مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ شاید اس کے زخم کے بگڑ جانے کی وجہ سے اس کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی کسی بھی طرح قصبے سے کوئی مستند حکیم یا طبیب بلوا کر میں کندن کو اسے دکھا دوں گا پھر چاہے جو بھی ہو۔ یہ خطرہ مجھے ہر حال میں مول لینا ہی تھا، ورنہ خدانخواستہ کندن کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

عشاء کے بعد جیسے ہی آس پاس پہرے داروں نے ذرا آرام کرنے کے لئے اپنی کمر ٹکائی میں خاموشی سے دبے پاؤں کندن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کندن اندھیرے میں بے سدھ پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے پانی پلایا اور اس کے چہرے پر بھی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے..... اس نے مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر تکلیف کے باوجود مسکرا دیا "عبداللہ یار..... لگتا ہے میری زندگی کی بھی آخری ریل آ گئی ہے..... کبھی کسی فلم کا فیتہ دیکھا ہے سینما کے چرخے پر چلتے ہوئے۔ اس فیتے کی آخری ریل بڑی تیزی سے گھومتی ہے اور پھر اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے جب اندر سینما کے پردے پر بڑا بڑا لکھا آ جاتا ہے "ختم شد"..... تو بس صوفی صاحب..... اپنا ختم شد بھی قریب آ رہا ہے....."

میں نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا "ایسی باتیں کیوں کرتے ہو..... ابھی تم نے زندگی میں اور بہت سی فلمیں دیکھنی ہیں جو تم نے کبھی سوچ رکھی تھیں اور کیا جانے قسمت نے جیسے تمہیں دلیپ کمار کا آبائی گھر دکھا دیا اچانک..... اسی طرح ایک دن وہ خود بھی تمہارے سامنے آ جائیں..... اور پوچھیں..... کیوں بھئی کندن..... کیسے ہو.....؟ نام تو سنا ہو گا میرا..... مجھے دلیپ کمار کہتے ہیں....."

کندن میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا "سچ یار..... کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے..... قسم سے..... میں بچ بھی گیا یہاں سے اگر تو ان کے سامنے آتے ہی مر جاؤں گا..... اتنی بڑی خوشی برداشت نہیں کر سکوں گا میں....." ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔ میں کندن کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گیا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ اس کے یہاں سے صحیح سلامت نکل جانے تک اس کا حوصلہ اور ہمت قائم رکھنا بہت ضروری تھا۔ یہ انسانی دماغ بھی کیا عجیب طلسم ہے..... تمام پستیاں اور ہر عروج سب اسی کے اندر قید ہو جیسے۔

کندن بہت دیر تک مجھے اپنے محبوب ہیرو کے مختلف کرداروں کی داستان سناتا رہا۔ کہ کیسے دلیپ کمار نے جب دیوداس فلم مکمل کی تو ان پر ڈیپریشن کا دور طاری ہو چکا تھا اور پھر ڈاکٹر کے کہنے پر مجبوراً انہیں چھ ماہ تمام المیہ

کردار ترک کر کے باقاعدہ یورپ جا کر اپنا علاج کروانا پڑا۔ اور یہ بھی کہ "گنگا جمنا" میں ڈاکو کے کردار میں ڈھلنے کے لئے دلیپ کمار نے کتنی محنت کی تھی۔ کندن فلم اور سینما کا بندہ تھا اور کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ایک سچا فلم بین تمام عمر فلم کے اندر ہی جیتا ہے اور فلم میں ہی مرتا ہے۔ رفتہ رفتہ نیند سے کندن کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ مگر وہ ابھی مزید باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے زبردستی اسے کمل اوڑھا کر لٹا دیا اور اس نے بھی اس شرط پر مجھے جانے دیا کہ میں اگلے روز کندن سے فلم "نیا دور" میں تانگے کی ریس سے جڑا پورا قصہ تفصیل سے سنوں گا۔ میں کندن کے حجرے سے باہر آیا تو نصف شب ڈھل چکی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی کندن کا پسندیدہ نغمہ گنگناؤں کہ "اے میرے دل کہیں اور چل..... غم کی دنیا سے دل بھر گیا..... ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا..... چل جہاں غم کے مارے نہ ہوں..... جھوٹی آشا کے تارے نہ ہوں..... ان بہاروں سے کیا فائدہ..... جس میں دل کی کلی جل گئی..... زخم پھر سے ہرا ہو گیا..... اے میرے دل کہیں اور چل..... غم کی دنیا سے دل بھر گیا..... ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا....."

مگر وہ کوئی اور خوش نصیب ہوتے ہوں گے جن کے مقدر میں غم سے چھٹکارا لکھا ہوگا۔ میرا واسطہ تو ہر گھڑی اسی دیرینہ دوست سے رہتا تھا..... جس کا نام کسی نے غم رکھا تھا۔ میں نے حاکم بابا کے حجرے میں جھانک کر دیکھا مگر وہاں خاموشی تھی اور چراغ بجھا ہوا تھا۔ میں چھپ کر باہر نکل آیا۔ ابھی فجر میں تین گھنٹے باقی تھے لہٰذا میں بھی کمر ٹکانے کی غرض سے وہیں برآمدے کے ایک گوشے میں پاؤں پسار کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاید مجھے کچھ دیر کے لئے اونگھ آ گئی تھی مگر تبھی بہت سے لوگوں کے شور اور چلانے کی آوازیں سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے پہل تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہنگامہ ہے مگر پھر یہ دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے کہ سارے مزار کے صحن میں پولیس والے پھیل چکے تھے اور ہر کونے کھدرے اور ہر کمرے کی سخت تلاشی لی جا رہی تھی۔ مزار کے مجاور اور خدمت گار غصے میں پولیس والوں سے الجھ رہے تھے مگر حاکم بابا ایک جانب سکون سے بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔

دور مجھے اسد اپنے چند اہلکاروں کے ساتھ کھڑا نظر آیا تو میں اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ "یہ سب کیا ہے آفیسر..... تم ہمیں چین سے جینے کیوں نہیں دیتے..... کیوں آ جاتے ہو بار بار یہاں....."

اسد نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔ "کیا کروں..... اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہوں..... مجھے میرے کسی مخبر نے بڑی پکی اطلاع دی ہے کہ سزائے موت کا مفرور قیدی کندن کسی قافلے میں شامل ہو کر اس صحرائی قصبے تک پہنچا ہے۔ اور دو قافلے تو کل ہی یہاں سے روانہ ہوئے ہیں..... اسی کی تلاش میں یوں آدھی رات کو آنا پڑا مجھے..... میں نے آگے بھی اطلاع کر دی ہے سارے علاقے میں کہ وہ قافلہ جہاں بھی پہنچا ہے..... اسے وہیں روک دیا جائے اور جب تک ایک ایک بندے کی شناخت مکمل نہ ہو جائے..... کسی کو آگے نہ جانے دیا جائے....."

اسد کی بات سن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پولیس کو کندن کی مخبری ہو چکی تھی۔ اور اب کسی بھی لمحے وہ پولیس کی گرفت میں آ سکتا تھا۔ حاکم بابا نے سکون سے تمام مجاوروں کو اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا کہا اور خود اپنے حجرے میں واپس چلے گئے جس کی تلاشی پہلے ہی لی جا چکی تھی۔ کچھ پولیس والے مزار کے پیچھے بنے حجروں کی طرف بھی لپکے جہاں کندن چھپا ہوا تھا۔ اسد نے مجھ سے پوچھا۔ "پیچھے کی طرف بنے یہ پرانے کمرے بھی کوئی استعمال کرتا ہے کیا.....؟"

''نہیں..... اب یہ اناج کے گوداموں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ کبھی ضرورت پڑے اور زائرین کا رش زیادہ ہو تو وہاں بھی لوگ ٹھہر جاتے ہیں۔''

اسد میرے ساتھ باتیں کرتے اور چلتے ہوئے خود بھی پچھلے صحن میں آ گیا جہاں اس کے اہلکار ایک ایک حجرے اور گودام کے دروازے کھول کھول کر اندر کی تلاشی لے رہے تھے۔ میں دم سادھے کھڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا تبھی دو اہلکار کندن کے کمرے میں گھس گئے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کھیل ختم ہونے کو تھا، ابھی اندر سے پولیس والوں کے چلانے کی آواز آئے گی کہ ''سر جی..... ہم نے مفرور کو گرفتار کر لیا ہے۔''

میرے سارے بدن میں جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اندر گھسے پولیس والوں کی طرف سے ابھی تک کوئی شور کیوں نہیں اُبھرا.....؟ کوئی چلایا کیوں نہیں..... اس جانب اتنی خاموشی کیوں طاری تھی۔؟ میرا جسم اینٹھنے لگا۔ تبھی وہ دونوں پولیس والے تیزی سے باہر نکلے۔

''ادھر بھی کوئی نہیں ہے صاب جی..... سارے کمرے کھنگال لیے ہیں ہم نے۔'' تبھی کچھ پولیس والے چھت سے چلائے ''سب Clear کلیئر ہے صاب..... کوئی نہیں ہے ادھر.....''

میں نے بڑی مشکل سے اپنی حیرت کو چہرے پر آنے سے روکا مگر میرا اٹکا دم بحال ہونے لگا۔ اسد کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

''معاف کرنا عبداللہ..... تم سب کو یوں آدھی رات کے وقت بے آرام کیا ہم لوگوں نے..... شاید مخبری پکی نہیں تھی.....'' وہ بھاری قدموں سے باہر کی جانب پلٹ گیا اور میں نے اس کے جانے تک خود کو نہ جانے کس اذیت میں ڈال کر کندن کے کمرے کی طرف جانے سے روکے رکھا مگر جیسے ہی پولیس کی جیپوں کی دور جاتی آوازیں کچھ معدوم ہوئیں میں اندھیرے میں چلائے کسی تیر کی طرح اڑتا ہوا پچھلے برآمدے کی طرف لپکا۔ اور دوڑتے ہوئے جا کر میں نے کندن کے حجرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر واقعی کوئی نہیں تھا۔ ایک جانب وہی پانی کا گھڑا اور پرانا سلور کا گلاس دھرا تھا جو میں کندن کے لیے چھوڑ گیا تھا مگر اس سامان کو پولیس والوں نے معمول کی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا۔ ویسے بھی پرانے گوداموں میں ایسی بہت سی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء پڑی رہتی ہیں لیکن کندن کہاں تھا۔ میں نے دیوانوں کی طرح سارا کمرہ چھان مارا، جیسے کندن کوئی چھلاوہ ہو اور اچانک ہی کسی کونے سے نمودار ہو جائے گا۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔

میرا دیا ہوا کمبل اور خشک غذا کا تھیلا بھی وہاں سے غائب تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کندن کو پولیس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی اور وہ اپنی کمین گاہ پر چھاپے سے قبل ہی وہاں سے نظر بچا کر کسی جانب نکل گیا تھا۔ مگر وہ گیا کہاں.....؟ اس کی حالت تو پہلے ہی بہت ابتر تھی۔ ایسے میں وہ کہاں مارا مارا بھٹکتا پھرے گا۔ کچھ ہی دیر میں فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میں نے سلام پھیرتے ہی دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور گڑگڑا کر اوپر والے سے التجا کی کہ کندن کو اپنی امان میں رکھے۔ حاکم بابا نے نماز ختم کر کے غور سے میری طرف دیکھا۔

''کیوں پریشان ہوتے ہو میاں..... جو ہونا ہے، وہ ہو کر رہے گا.....'' میں نے چونک کر انہیں دیکھا، مطلب انہیں سب خبر تھی میری پریشانی کی۔ مگر حسب معمول وہ مجھے تسلی دے کر خود دوبارہ دعا میں مشغول ہو گئے۔ کچھ

دیر میں ہی مزار کی منڈیروں پر دھوپ چڑھ آئی۔ لیکن میرے ذہن پر چھائے سوچ کے بادلوں کا سایہ تنا رہا۔

رفتہ رفتہ میرے دل کی بے چینی بڑھتی گئی اور میرا ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا محال ہو گیا۔ تبھی میں تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر اُٹھا اور مزار سے باہر نکل آیا۔ دور سیڑھیوں سے پرے نیچے سڑک کنارے خانو تانگے والا کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا۔

"سلام سائیں جی..... تم نے تو مزار کی چوکھٹ ہی پکڑ لی ہے..... بڑے دن بعد درشن ہوئے تمہارے۔"

میں نے خانو سے کہا کہ وہ مجھے پرانے بازار کی طرف لے چلے۔ یہ وہی بازار تھا جہاں سارنگا کا اڈہ تھا۔ خانو کے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے مگر وہ چپ رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس طرف کی سواری اٹھانے سے کتراتا تھا۔ اس نے تانگے کو چھانٹا لہرا کر آگے بڑھایا۔ تبھی دور سے ایک دوسرا تانگہ تیزی سے مزار کی طرف دوڑتا نظر آیا۔ خانو نے دور سے ہی آواز لگائی۔

"اوئے مرادے..... کدھر کی سواری ہے..... کدھر بھاگا جا رہا ہے....." وہ مراد تانگے والا تھا۔ میں نے قصبے کے مرکزی بازار میں دو چار بار اسے دیکھا تھا تانگہ اسٹینڈ پر۔ تانگے میں دو مسافر بیٹھے تھے۔ مراد نے بھی چلا کر جواب دیا۔

"مزار لے جا رہا ہوں سواریاں خانو چاچا..... ادھر پیچھے دو کوس دور کالے ٹیلے کے پیچھے کوئی زخمی پڑا ملا ہے قصبے والوں کو۔ بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے..... میں بھی یہاں سے فارغ ہو کر وہیں جاؤں گا....."

مراد تانگے والے کی بات سن کر میری دھڑکن رکنے لگی۔ "زخمی..... کون ہے.....؟ کسی نے حکیم صاحب کو بتایا کہ نہیں....."

"پتہ نہیں سائیں جی..... کوئی نیا بندہ ہے..... ہماری طرف کا تو نہیں لگتا....."

میں نے خانو کو تانگہ موڑ کر کالے ٹیلے کی سمت دوڑانے کا کہا۔ ابھی ہم قصبے کو جاتی مرکزی سڑک سے ذیلی سڑک کی طرف مڑے ہی تھے کہ دور سے پولیس کی چند گاڑیاں صحرا کی دھول اُڑاتیں اور اپنے پیچھے غبار کا ایک طوفان برپا کرتے ہوئے ہمارے تانگے کے قریب سے آگے نکل گئیں۔ یعنی پولیس کو بھی واقعے کی خبر ہو چکی تھی۔ میرے دل سے بے اختیار فریاد نکلی۔

"یا اللہ..... وہ زخمی کندن نہ ہو..... کوئی اور ہو....." میں نے خانو کو تانگہ مزید تیز دوڑانے کا کہا۔ مگر ہمارے کالے ٹیلے کے پیچھے پہنچتے پہنچتے وہاں کافی بڑا مجمع لگ چکا تھا۔ دور سے مجھے پولیس والے دیہاتیوں کو ڈانٹتے اور بھگاتے نظر آئے۔ انہی میں اسد کا خاص اہلکار وہ سب انسپکٹر بھی تھا جو مجھے مزار پر چھاپے کے دوران تمام ہدایات دیتے نظر آیا تھا۔ اس کے سینے پر لگی نام کی تختی پر مجھے جمیل لکھا نظر آیا۔ وہ مجھے تانگے سے اترتے دیکھ کر زور سے چونکا۔

"آپ یہاں کہاں سائیں لوگو.....؟"

"مجھے تانگے والے نے بتایا ہے کہ یہاں کوئی زخمی پڑا ہے۔ شاید میں اس کی تکلیف کچھ کم کر سکوں..... اگر تمہاری اجازت ہو تو....."

جمیل شش و پنج میں پڑ گیا "اے۔ ایس۔ پی صاحب ناراض نہ ہو جائیں کہیں سائیں جی..... میں خود ابھی

پہنچا ہوں..... کہیں یہ زخمی وہی مفرور نہ ہو جس کی ہمیں تلاش ہے.....'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''اگر یہ وہی مفرور ہے تو میرا جیل کا ساتھی ہے..... مجھے اس سے ملنے دو..... دوست ہے وہ میرا.....''

جمیل نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور پھر اس نے چلا کر بھیڑ کو ایک جانب ہٹ جانے کا کہا۔ دیہاتی گھبرا کر تتر بتر ہو گئے اور میں دھڑکتے دل سے چھٹتی بھیڑ کے دائرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی کوئی بندہ گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ اسے سیدھا کیا اور میری نظر زخمی کے چہرے سے ٹکرائی۔

★.....★.....★

باب 44

کبھی کبھی ہمارا دل کسی ان ہونی کو ٹالنے کے لئے کتنی تڑپ اور بے قراری سے فریاد کر بیٹھتا ہے..... یہ جانے بنا کہ ہونی کو بھلا کون ٹال سکتا ہے۔ ہونیاں تو ہو کر رہتی ہیں اور دل کی فریادیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وہ انہونی بھی طے شدہ تھی۔ میرے سامنے پڑا زخمی شخص کندن ہی تھا۔ جو بے ہوش تھا۔ اس کی سیاہ چادر جانے کہاں رہ گئی تھی اور پھٹی ہوئی قمیص کے شانے سے اس کے رستے زخم کا ناسور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کندن کو زور سے جھنجھوڑا مگر وہ بے سدھ پڑا گہرے سانس لیتا رہا۔ اتنے میں کوئی پولیس والا کہیں سے سلور کے پرانے جگ میں پانی لے کر دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے جلدی سے کندن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، وہ دھیرے سے کسمسایا۔ تبھی اے۔ ایس۔ پی اسد بھی بھیڑ کو چیرتا وہاں آ پہنچا اور مجھے وہاں دیکھ کر اس کے تیور بگڑنے لگے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو عبداللہ.....؟''

''مجھے تانگے والے نے بتایا کہ یہاں کوئی زخمی پڑا ہے۔ میں دیکھنے چلا آیا۔ یہ میرا جیل کا ساتھی کندن ہی ہے مگر اس کی حالت بہت خراب ہے آفیسر..... تم اسے فوراً ہسپتال لے چلو..... میں تمہاری منت کرتا ہوں.....''

''اسد تیزی سے آگے بڑھا، تبھی کندن نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ''عبداللہ بابو..... تم..... تم آ گئے..... اچھا کیا..... اپنی فلم ختم ہونے والی ہے یار..... مگر افسوس اس بات کا ہے کہ اپنی فلم کچھ زیادہ چلی نہیں..... ڈبہ ہو گئی سالی.....''

کندن مسکرایا..... میں نے تڑپ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا ''ایسا کیوں کہہ رہے ہو میرے یار..... کچھ نہیں ہو گا تمہیں..... سب ٹھیک ہو جائے گا.....'' اسد نے چلا کر کسی ماتحت کو زخمی کو کسی کھلی گاڑی میں ڈال کر ہسپتال پہنچانے کا کہا اور خود کندن کی طرف لپکا۔

''کیا تمہارے ساتھ تمہارا دوسرا ساتھی ظہیر بھی آیا تھا یہاں۔ دیکھو..... اب بھی وقت ہے..... کچھ نہ چھپاؤ مجھ سے..... سب بتا دو.....'' کندن نے ڈوبتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

''اگر ظہیر تمہیں کہیں ملے تو میرا سلام دینا..... اور اس سے کہنا کہ کندن نے اپنا وعدہ نبھانے کی بہت کوشش کی..... مگر زندگی کا فیتہ ہی ختم ہو گیا.....''

بولتے بولتے کندن کی سانسیں ڈوبنے لگیں اور اس کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔ میں نے زور سے چلا کر

اسے جھنجھوڑا" کندن..... چپ کیوں ہو گئے..... بولتے کیوں نہیں..... بولو..... بات کرو مجھ سے..... خدا کے لئے کچھ تو بولو، مگر اس طرح خاموش ہو جانے والے دوبارہ کم ہی بولتے ہیں۔ کندن کو بھی چپ لگ گئی تھی..... وہی ازلی چپ..... جو ایک دن ہم سب کا مقدر بن جائے گی۔ میں کندن کا سر گود میں لیے اسے جھنجھوڑتا، چیختا چلاتا رہ گیا لیکن وہ دوبارہ کبھی نہیں بولا۔

اے۔ ایس۔ پی اسد نے بے بسی سے سر جھکا لیا اور کچھ دیر تاسف سے کندن کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر اپنے اہلکاروں کی طرف پلٹ کر بولا" ڈیڈ باڈی کو شہر پہنچانے کا بندوبست کرو اور اوپر والوں کو اطلاع کرواؤ کہ دو مفروروں میں سے ایک جس کا نام کندن تھا وہ صحرا کے اندر اپنی طبعی موت مارا گیا....."

میں نے اسد کی بات سن کر چونک کر سامنے ریت کے کالے ٹیلے کی طرف دیکھا۔ موت کی دیوی سفید لباس پہنے اور اپنے کالے بال کھولے سامنے ٹیلے پر ہی بیٹھی کندن کی طرف دیکھ کر مسکا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ "آ گئے تم کندن..... بڑا انتظار کروایا تم نے اس بار..... پھانسی کے تختے سے بھاگے تو سینما کی گلی میں جا پھنسے..... مگر وہاں سے بھی جان بچا کر نکلے تو یہاں صحرا میں آن پہنچے۔ لیکن میرے نادان ظلم بین دوست..... تمہاری زندگی کی فلم ریل تو یہاں اس صحرائی ٹیلے کے پاس ختم ہونی تھی..... اب آ گئے ہو تو خوش آمدید..... تمہارا سفر یہاں تمام ہوتا ہے....."

موت کی دیوی نے کندن کا ہاتھ پکڑا اور آ۔ ن کی جانب پرواز کر گئی۔ اور میں وہیں ریت پر بنا روح کے بے جان پڑا کندن کا لاشہ اپنے بازوؤں میں سنبھالے بیٹھا رہ گیا۔ کچھ ہی دیر میں قصبے کے ہسپتال سے پرانی سی ایمبولینس نما گاڑی آ گئی اور کندن کو ڈسٹرکٹ ہسپتال کے مردہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے اسد سے درخواست کی کہ کندن کے گھر والوں کو خبر کر دی جائے تا کہ وہ چرچ کی تعلیمات کے مطابق اپنے پیارے کی آخری رسومات ادا کر سکیں۔ اس ہنگامے میں نہ جانے کب شام ڈھلی اور کب رات کی گہری سیاہی میں آنے والی صبح نے پیلی روشنائی کے قطرے انڈیلنا شروع کیے۔ میں گم سم سا تھانے میں ہی بیٹھا رہا۔ تمام انتظامات پورے ہو جانے کے بعد کندن کا جسم اس کے آبائی شہر روانہ کر دیا گیا۔ جاتے ہوئے میں نے اس کے کان میں دھیرے سے کہا:

"وہاں جا کر کرے، سنتوش اور بخت خان کو میرا سلام کہنا پیارے..... تمہاری نئی کہانی کا آغاز تمہیں مبارک ہو..... ہماری داستان ابھی کچھ باقی ہے۔ مگر ہم پھر ملیں گے، یہ یقین رکھنا۔"

اسد نے پولیس کی گاڑی کو اشارہ کیا اور وہ کندن کو لئے آگے بڑھ گئے۔ میں وہیں تھانے کے صحن میں اپنے ادھورے الوداع کے ساتھ کھڑا رہ گیا۔ اسد میری طرف پلٹا اور غور سے مجھے دیکھ کر بولا" تمہاری آنکھوں کے آنسو بتا رہے ہیں کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی بہت خاص تعلق تھا تمہارا.....؟"

"ہاں..... بہت خاص..... زندان کی دوستی سے زیادہ خاص بھلا کوئی اور تعلق کیا ہوگا.....؟ خون کے رشتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے یہ رشتہ اے۔ ایس۔ پی صاحب..... مگر تم یہ بات نہیں سمجھ پاؤ گے..... قید کرنے والے صیاد کو بھلا قفس والوں کے درد کا کیا اندازہ.....؟ بہر حال..... اس بات کو رہنے دو..... اگر مجھ پر کوئی تازہ حد نہیں لگانی

گئی اور کوئی نیا الزام نہیں ہے مجھ پر تو کیا میں مزار جاسکتا ہوں..... وہاں میرے لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے میرے لئے..... اور اگر مجھے دوبارہ قید کرنے کا ارادہ ہے تمہارا تو کسی اہلکار کے ذریعے درگاہ میں پیغام کروادو وہاں کے مجاور خاص کو..... تمہاری مہربانی ہوگی....."

اسد غور سے میری طرف دیکھتا رہا "تمہیں قید کیے جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا کبھی بھی..... یہ بات مجھے بہت کھٹکتی ہے اندر سے..... اور ساتھ ہی ساتھ کہیں نہ کہیں یہ مجھے میری بے بسی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ قیدی کو اگر قید کا خوف ہی نہ رہے تو پھر صیاد کی سزا کس کام کی۔ لیکن..... فی الحال تمہیں قید رکھنے کا ارادہ نہیں ہے میرا..... تمہارا کوئی جرم ثابت نہیں ہوا..... تمہارا دوست کھلے صحرا میں پڑا پایا گیا تھا اور میں نے اس بات کی بھی تصدیق کرلی ہے کہ تم پولیس کے وہاں پہنچنے کے بہت دیر بعد پہنچے تھے۔ ہوسکتا ہے تمہارا دوست تم سے ملنے کے لیے ہی اس صحرا تک آیا ہو مگر ہماری نظروں کے سامنے تم دونوں کی پہلے ملاقات نہیں ہوئی لہٰذا تم پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا تم جاسکتے ہو۔ ضرورت پڑی تو میں خود تمہیں بلوالوں گا....."

میں نے باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے تبھی اسد کی آواز نے دوبارہ میرے قدم روک لیے۔

"ایک بات سنتے جاؤ میری عبداللہ....." میں رک گیا۔ وہ اٹھ کر میرے پیچھے تھانے کے وسیع برآمدے میں نکل آیا۔

"میرا اندازہ کہتا ہے کہ تمہارا آخری ساتھی ظہیر بھی یا تو یہاں پہنچ چکا ہے یا پھر بہت جلد پہنچنے والا ہے..... کوئی تو چیز جڑی ہے تم سب کے جیل سے فرار میں اور اس صحرائی قصبے کی سرحد سے..... ورنہ تم ساری دنیا چھوڑ کر اس ویرانے کی ایک گمنام سی درگاہ میں نہ آن بیٹھتے۔ مجھے تم سب کی کہانی کے دھاگے آپس میں کہیں نہ کہیں جڑے نظر آتے ہیں۔ اور جانے کیوں مگر مجھے یہ دکھائی دے رہا ہے کہ تم سب کی کہانی کا انجام بھی اس سرحدی قصبے میں ہی لکھا ہے۔ میری ایک بات مانو گے عبداللہ....."

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا "ہاں..... بولو.....؟"

"میرا ایک مشورہ ہے تمہیں کہ اگر تمہارا جگری یار ظہیر تم سے رابطہ کرے تو اُسے یہی صلاح دینا کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کردے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ کیونکہ قانون اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں..... جلد یا بدیر..... اسے قانون کی گرفت میں آنا ہی ہے..... میں جانتا ہوں کہ تم پھر یہی کہو گے کہ اس کے لئے تو دونوں طرف ہی موت لکھی ہے۔ گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ جائے یا پھر پولیس سے بھاگتے بھاگتے کسی اندھی گولی کا شکار ہو کر اپنی جان دے دے..... جیسا کہ تمہارے دوست کندن کے ساتھ ہوا..... مگر تم ایک بات ذہن میں رکھو کہ ظہیر جیسے بڑے گروہ کے مجرم کے پاس بہت سے راز ہوتے ہیں جنہیں ٹھیک وقت پر بتا کر وہ قانون کی اب بھی مدد کرسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے قانون اس کی اس خدمت کے بدلے میں اس کی راہ کچھ آسان کردے۔ سلطانی گواہ بھی بنایا جاسکتا ہے اسے۔ ظہیر کی مدد سے ہم اس جیسے اور کئی دوسرے نوجوانوں کو گمراہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ اور اس بات کا صلہ ظہیر کو اس دنیا میں ملے یا نہ ملے..... اگلے جہاں میں وہ ضرور سرخرو ہوگا اپنی اس خدمت کی

وجہ سے..... میری بات پر ضرور غور کرنا عبداللہ..... تم چاہو تو اپنے دوست کو پولیس کے ہاتھوں اس صحرا میں مارے جانے سے تو روک ہی سکتے ہو....."

اسد خاموش ہوا تو میں بھاری قدموں کے ساتھ تھانے سے باہر نکل آیا۔ آس پاس کوئی سواری دکھائی نہ دی تو میں پیدل ہی درگاہ کو جاتی سڑک پر چل پڑا۔ یہ سڑکیں رات بھر کتنی خاموش اور چپ چاپ پڑی رہتی ہیں۔ جیسے دن بھر ہم انسانوں کے قدموں سے باتیں کرتے کرتے تھک چکی ہوں اور یہ بھی ہماری طرح گھڑی بھر کو آنکھیں موند کر خاموش پڑے رہنا چاہتی ہوں۔ مگر فجر کے سناٹے میں میرے قدموں کی چاپ جب سنسان سڑک کے ٹھنڈے کولتار پر گونجی تو سوئی ہوئی سڑک نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر حیرت سے بولی:

"عبداللہ..... تم ہو..... ہر بار تم کیوں ان سناٹوں کو چیر کر منہ اندھیرے ہمیں اپنے قدموں کی چاپ سے جگانے کے لئے آجاتے ہو.....؟ آخر تمہاری قسمت میں نیند کا آرام کیوں نہیں ہے..... جاؤ..... کچھ دیر کے لئے کہیں کر لو کہیں..... اور مجھے بھی سونے دو..... ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر باقی ہے....."

میں نے کالی زلفوں والی بل کھاتی سڑک سے کچھ نہیں کہا۔ بس قصبے سے نکلتے ہی سیاہ سڑک کا رستہ چھوڑ کر صحرا کی ریت والے رستے پر اپنے قدم ڈال دیئے۔ جو خود بے آرام ہوں..... انہیں دوسروں کے آرام کا خیال رکھنا چاہیے۔ اپنے ساتھ ساتھ اوروں کو بے آرام کرنے والے تو خود غرض ہوتے ہیں۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں خاموش صحرا میں درگاہ کی طرف بڑھتا گیا۔ مگر وہ کسی شاعر نے خوب ہی کہا ہے۔

"منزلیں اپنی جگہ ہیں..... راستے اپنی جگہ ....." ضروری نہیں کہ جہاں راستہ ختم ہو جائے، ہماری منزل بھی وہیں ملے ہو..... میرا رستہ بھی درگاہ کی سیڑھیوں تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ مگر میری منزل نہیں آئی، درگاہ میں سب کچھ اپنے معمول جیسا ہی تھا۔ مجھے مجاور نے بتایا کہ حاکم بابا دو تین بار میرے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ میں نے حجرے میں جھانکا تو انہوں نے تسبیح روک دی۔

"آجاؤ..... کہاں بھٹکتے رہتے ہو سارا دن..... دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرو....." میں چپ چاپ ان کے قریب آکر بیٹھ گیا اور وہ پھر سے آنکھیں بند کر کے تسبیح پھیرنے میں یوں مشغول ہو گئے جیسے مجھے جانتے ہی نہ ہوں۔ مجھے ساحلی درگاہ میں اپنے شروع کے دن یاد آگئے جب حاکم بابا سے میرا پہلا تعارف ہوا تھا اور وہ بھی سلطان کے عہدے پر فائز نہیں ہوئے تھے۔ تب ان کے مزاج میں بہت سختی تھی اور درگاہ کے مجاور اور ملازمین ان کے غصے سے بہت بدکتے تھے۔ تب مجھے سلطان بابا نے کچھ دن کے لئے حاکم بابا کے زیر تربیت رکھا تھا اور ہم نے ایک ساتھ سفر بھی کیا تھا۔ تب بھی وہ مجھے یوں ہی سامنے بیٹھے رہنے کا کہہ کر خود گھنٹوں آنکھیں بند کیے جانے کیا کیا وظائف پڑھتے رہتے تھے۔

لیکن اب میں ان کے مزاج سے واقف ہو چکا تھا لہٰذا چپ چاپ وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ حاکم بابا نے اپنی تسبیح ختم کر کے با آواز بلند درود شریف پڑھا اور مجھ پر بھی پھونک مار دی۔

"درود شریف پڑھتے رہا کرو..... اس سے غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور یاد رکھو..... اوپر والا کسی کو اس کی سکت

سے زیادہ دکھ نہیں دیتا۔ یہ اور بات ہے البتہ کہ انسان کے اندر دکھ اٹھانے کی سکت دھیرے دھیرے بڑھتی رہی ہے۔ مگر یہ ناشکرا انسان کبھی یہ حقیقت جان نہیں پاتا....."

میں خاموش رہا۔ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے "بڑی حویلی سے بلاوا آیا ہے نیاز میں شرکت کرنے کا۔ تمہیں بھی خاص طور پر بلایا ہے..... چلو گے.....؟"

پہلے تو میرا جی چاہا کہ صاف انکار کردوں کہ اب بھلا میرا وہاں کیا کام ہے۔ مگر پھر نہ جانے کیوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں زہرہ کے ابا کی خواہش کے بارے میں بتا دیا۔ وہ سن کر چپ سے ہوگئے۔ "اچھا..... تو یہ بات ہے....."

"جی..... وہ چاہتے ہیں کہ میں زہرہ کے رشتے سے قبل ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ کہیں ہمارا ماضی زہرہ کے آنے والے مستقبل پر کوئی خراش نہ ڈال دے۔ ایسے میں کیا میرا بڑی حویلی جانا مناسب ہوگا۔ اس کا فیصلہ تو اب آپ ہی کریں گے....." حاکم بابا نے آنکھیں بند کرلیں اور دھیرے سے بڑبڑائے "جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے....." وہ خاموش ہوگئے۔ میں بھی چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اپنے حجرے میں چلا آیا۔ مجھے رہ رہ کر کندن کا بے بسی سے میرے ہاتھوں میں جان دینا یاد آرہا تھا۔ اب تک تو شاید اس کے گھر والوں کو بھی کندن کی موت کی اطلاع مل چکی ہوگی۔ جانے ان سب پر کیا گزری ہوگی۔ اس بے چینی اور سوچ کے گہرے بھنور میں پہلے ظہر اور پھر عصر بھی سر پر آگئی میں، حجرے سے نماز کے لئے نکل ہی رہا تھا کہ مجاور خاص تیزی سے میرے کمرے میں آگیا۔

"عبداللہ سائیں..... نماز پڑھ کر سلطان بابا کے ساتھ بڑی حویلی چلنے کی تیاری کرلیں۔ انہوں نے آپ کے لئے پیغام بھیجا ہے۔" میں نے حیرت سے مجاور کی طرف دیکھا۔ ابھی صبح ہی تو میں نے حاکم بابا کو اپنی مجبوری اور زہرہ کے ابا کی خواہش بتائی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے بڑی حویلی لے جانے پر مصر تھے۔ آخر کیوں.....؟ میں نے عصر کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا تو وہ سب درگاہ کے صحن میں جانے کے لئے تیار کھڑے نظر آئے۔ حاکم بابا کے اردگرد مریدوں کا ہجوم تھا اس لئے اس وقت میرا ان سے بات کرنا ناممکن تھا۔ میں چپ چاپ حویلی جانے والی ٹولی کے ساتھ چل پڑا۔ مزار کے پہرے پہ موجود خفیہ پولیس کے اہلکار بھی چپ چاپ کھڑے یہ سارا ماجرا دیکھتے رہے جیسے ان کے لئے یہ کوئی خلاف معمول بات نہ ہو۔ کیونکہ بڑی درگاہ کی نیاز کی خبر تو سارے قصبے میں پھیل چکی تھی۔ اور سبھی جانتے تھے کہ بڑی حویلی سے ہر سال یہ بڑی نیاز سارے قصبے میں بٹتی ہے۔ سینکڑوں دیگوں کا لنگر بنتا ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے کہ سات نمکین اور سات میٹھے کے ذائقے کی بڑی پراتیں قصبے کے ہر چھوٹے بڑے گھر تک پہنچائی جاسکیں۔ حاکم بابا درگاہ کی سیڑھیاں اُترتے اُترتے دفعتہً ایک سادہ لباس والے اہلکار کے پاس رک گئے جو ہماری طرف ہی بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمیں یوں رکتے دیکھ بری طرح سے گڑبڑا گیا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کیوں میاں..... تم نہیں چلو گے ہمارے ساتھ بڑی حویلی نیاز کھانے کے لئے..... چلے چلو..... اللہ کے

نام پر بانٹے گئے رزق میں بڑی برکت ہوتی ہے....."

پولیس والے کے ماتھے پر شرمندگی کے پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں "نہیں بزرگو.....آپ جاؤ..... میں ابھی ڈیوٹی پر ہوں....."

بے خیالی میں وہ خود اپنا راز فاش کر گیا۔ حاکم بابا نے مسکرا کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "جیسے تمہاری مرضی....."

ہم سب حویلی پہنچے تو مردانے کے صحن میں دور سے ہی ہلچل دکھائی دینے لگی۔ واقعی عظیم الشان لنگر کا اہتمام تھا۔ لوگوں کا ہجوم ہمیں دیکھ کر ایک جانب چھپ گیا اور بڑی سرکار کے خاص مینیجر نے آگے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا۔ تبھی میری نظر دور کسی برآمدے سے نکلتے سکندر پر پڑی۔ وہ کہیں باہر جانے کی تیاری میں تھا۔ مگر مجھے درگاہ کے مجاور کے روپ میں وہاں کھڑے دیکھ کر اس کے قدم وہیں جم سے گئے۔

✱.....✱.....✱

باب45

سکندر شاید اپنے خاص ملازمین کے ساتھ حویلی سے کہیں باہر جا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک دبی دبی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ باہر جانے کے بجائے ہماری طرف ہی چلا آیا۔ حویلی کے نوکروں نے گھبرا کر سکندر کو دیکھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا مالک ان تقریبات اور نذر نیاز کے سلسلے کو بالکل پسند نہیں کرتا اور صرف بڑی سرکار کے احترام میں وہ ان جوگی فقیروں کو اپنی حویلی کے اندر آتے جاتے دیکھ برداشت کر لیتا ہے مگر آج یوں اچانک سکندر کو اس طرح خلاف معمول ہماری طرف بڑھتے دیکھ کر وہ سب گھبرا سے گئے کہ جانے سکندر درگاہ سے آئے مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔

حویلی کے نوکر اور مینیجر دم سادھے سکندر کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ سیدھا حاکم بابا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر بزرگو۔ رات کا کھانا کھا کر ہی جانا..... بس یہی گزارش ہے آپ سے۔"

حاکم بابا نے مسکرا کر سکندر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "اللہ نصیب اچھے کرے..... جیتے رہو....."۔

حویلی کے ملازمین حیرت زدہ اور بھونچکا سے کھڑے اپنے سنگ دل مالک کی یہ کایا پلٹ دیکھ رہے تھے..... ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سکندر کی زہر اگلتی زبان سے یوں اچانک ہی شہد ٹپکنے لگے گا۔ لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ سکندر کسی طرح مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اُس نے حاکم بابا سے بات کرنے کا یہ بہانہ تراشا ہے۔ شاید سکندر کی یہ احتیاط اس وجہ سے بھی ہو کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا اہلکار مزار کے مجاوروں کے ساتھ گھل مل کر حویلی کے اندر تک نہ آن پہنچا ہو۔ مغرب سے پہلے حاکم بابا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور بعد از نماز مغرب نیاز اور لنگر بٹنا شروع ہو گیا۔

دیو ہیکل نما بڑی دیگوں کے ڈھکن کھل گئے اور لمبی قطاروں میں کھڑے لوگوں میں نیاز بٹنی شروع ہو گئی۔ بڑی سرکار نے واقعی دل کھول کر ہر طرح کے پکوان بطور نیاز پورے قصبے میں خیرات کرنے کے لئے بنوائے تھے۔ ماہر باورچی اونچی آواز میں ہدایات دے کر اپنے ماتحتوں کو دیگیں اُتارنے اور چڑھانے کے احکامات جاری کر رہے تھے اور ساری فضاء میں پلاؤ، زردے، قورمے اور متنجن کی خوشبو پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ ایک جانب دودھ سے بنے میٹھے کی دیگیں کھل رہی تھیں اور پراتوں میں کھیر اور گجریلا انڈیلا جا رہا تھا، تو دوسری جانب بڑے بڑے آگ کے کھڈوں پر

ٹنگے بکروں کا گوشت بھونا جا رہا تھا۔ کہیں زردہ بٹ رہا تھا تو کہیں بریانی کے تھال.....

آج سارے بختیار آباد کے ہر مکین کو بڑی حویلی کی نیاز میں شرکت کی اجازت تھی لہٰذا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اتنے میں حاکم بابا کو اندر سے بڑی سرکار کا بلاوہ آ گیا کہ وہ حویلی کے زنانے میں پکتے پکوانوں پر بھی دعا کر کے پھونک دیں۔ حاکم بابا کے اندر جاتے ہی سکندر تیزی سے میری طرف لپکا۔ وہ اب تک ان تمام انتظامات کا جائزہ لینے کے بہانے وہیں لنگر کے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ میں ایک جانب ہو کر بھیڑ سے ذرہ پرے کھڑا رہا۔ سکندر بظاہر مجھے نیاز کی پرات پکڑاتے ہوئے دھیرے سے بولا:

"کوشش کرو کہ کسی طرح اس ہنگامے کے دوران پیچھے بنے مہمان خانے تک آ جاؤ۔ ظہیر اور بگھا تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں۔"

میں نے سکندر کو خبردار کیا۔ "تمہارے گھر نگرانی ہو رہی ہے۔ خفیہ پولیس کے بندے تمہاری حویلی کی نگرانی پر معمور کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں آنے والا پولیس افسر بہت زیرک اور ہوشیار ہے۔ اسے مجھ سمیت ہر اس بندے پر شک ہے جو کسی بھی حوالے سے ظہیر سے متعلق ہو سکتا ہے....."

سکندر نے سر ہلایا "ہاں..... مجھے میرے بندوں نے پہلے دن ہی اس پہرے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ سکندر کے علاقے میں سکندر سے نظر بچا کر کچھ بھی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے میں ابھی تک کندن کو درگاہ سے نکلوانے کا بندوبست نہیں کر سکا۔ جو بیس گھنٹے پہرہ لگا رکھا ہے اس افسر نے یہاں..... میں نے اوپر ہیڈ کوارٹر والوں سے بات کی ہے..... جلد اسے یہاں سے واپس بلوا لیا جائے گا..... تب تک تم کندن کو وہیں چھپائے رکھو....."

میری آواز بھرا سی گئی "کندن ہر پہرے ے، ہر خطرے سے آزاد ہو چکا ہے سکندر..... درگاہ پر پولیس نے چھاپہ مارا تھا گزشتہ رات کو۔ کندن صحرا پار کرتے ہوئے اپنے پرانے زخم کی تاب نہیں لا سکا اور اس نے وہیں جان دے دی....."

سکندر کو ایک زور کا جھٹکا لگا اور اس نے اپنا سر تھام لیا "اوہ میرے خدا..... یہ کیا غضب ہو گیا۔ میں ظہیر اور بگھے کو یہ افسوس ناک خبر کیسے سناؤں گا..... اچھا تم یہیں..... آس پاس رہنا..... عشاء کے بعد اسی احاطے میں قوالی اور محفل سماع کا اہتمام ہو گا۔ اس وقت سارا قصبہ یہاں اُمڈ آتا ہے..... بہت زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ میں تمہیں اُسی وقت یہاں سے نکال کر مہمان خانے کی طرف لے جاؤں گا....."

سکندر بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا تبھی اندر سے حویلی کا ایک ملازم میری طرف آتا دکھائی دیا "وہ چھوٹے سائیں جی..... آپ کو بڑی سرکار نے اندر بلایا ہے زنانے میں..... بڑے سائیں جی بھی وہیں ہیں....."

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور ابھی کوئی بہانہ تراشنے کی کوشش میں ہی تھا کہ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ڈگمگاتے قدم پیچھے بڑھا دیئے۔ میں دوبارہ زہرہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا یہ نادان دل سب کچھ بھول بھال کر پھر سے وہی پرانی ضد لے بیٹھتا تھا۔ وہی لاحاصل کی خواہش..... وہی..... اسے پانے کی ضد، زنانے میں بھی نیاز اور خیرات تقسیم کرتی خادماؤں اور وصول کرتی علاقے کی

عورتوں کا ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ بڑی سرکار باہر صحن میں ہی حاکم بابا کے سامنے بیٹھیں سارے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں اور مختلف احکامات جاری کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔

''لیں سائیں جی..... چھوٹے سائیں بھی آ گئے..... شالا جوانیاں سلامت ہوون.....'' میں چپ چاپ سر جھکائے حاکم بابا کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا جہاں پہلے سے ہی درگاہ کا مجاور خاص اور چند دوسرے مریدین بیٹھے ہوئے تھے۔ حاکم بابا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور بڑی سرکار اور ان کے خاندان کی خوشحالی کے لئے خاص دُعا کے ساتھ ہی اس بڑی نیاز اور خیرات کی قبولی اور ان کے رزق میں فراوانی کی دعا بھی کی۔ مگر میں سر جھکا کے بیٹھا بس یہی دعا کرتا رہا کہ زہرہ میرے سامنے نہ آئے۔ ورنہ صبر کے تنکوں سے بنایا ہوا میرے دل کا آشیانہ پھر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

بڑی سرکار کا اسرار تھا کہ حاکم بابا قوالی کی محفل میں بھی شریک ہوں مگر انہوں نے معذرت کر لی، لیکن ہماری خلاصی صرف اسی شرط پر ممکن ہوئی کہ حاکم بابا کی جگہ میں درگاہ کی نمائندگی کرنے کے لئے وہاں آخر تک موجود رہوں گا۔ تبھی اچانک بڑی سرکار کو کچھ خیال آیا اور انہوں نے قریب کھڑی کسی خادمہ کے کان میں کچھ کہا اور وہ تیزی سے اندر زنانے کی طرف لپک گئی۔ بڑی سرکار نے قریب کھڑے حویلی کے خدام کو درگاہ میں پیچھے رہ جانے والے زائرین اور مجاوروں کے لئے بھی کھانے کی دیگیں بھجوانے کا حکم دیا۔

حاکم بابا نے رخصت طلب کی تبھی اندر زنانے کی طرف جاتے راستے پر کچھ ہلچل سی ہوئی اور میں نے بے خیالی میں اس جانب نظر اُٹھائی مگر پھر نظر جھکانا بھول گیا۔ ہاں..... وہ زہرہ ہی تھی..... جو خود کو بڑی سی سفید شال میں چھپائے، نظریں جھکائے تین چار نوکرانیوں کے پہلو میں چلتے ہوئے ہماری طرف ہی چلی آ رہی تھی۔ میری نظریں بھی جھک گئیں۔ بڑی سرکار نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی بیوہ اور سوگوار بہو کا استقبال کیا۔

''بسم اللہ..... بڑے سائیں جی..... دیکھا آپ نے..... اب تو رب سائیں کی مہربانی سے چہرے پر سرخی آنے لگی ہے میری دھی رانی کے..... اور یہ سب آپ کے پڑھے ہوئے پانی کی برکت سے ہوا ہے.....''

حاکم بابا نے سر ہلایا ''استغفراللہ..... یوں کہو کہ سب اللہ کے کلام کی برکت ہے جسے پڑھ کر پانی پر دم کیا تھا.....''

حاکم بابا نے زہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعا دی ''جیتی رہو..... سدا آباد رہو.....''

اس کی نظریں زمین میں گڑھی رہیں اور میں بھی حاکم بابا کے پیچھے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس روز مجھے زندگی کا ایک اور فلسفہ سمجھ آ گیا۔ صرف نظریں ملانے سے ہی نظر نہیں ملا کرتی۔ کبھی کبھی دو فرد ایک دوسرے کی طرف دیکھے بنا بھی ایک دوجے کی نظر میں جھانک سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اُسی لمحے مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ بنا ملے جو نظریں چار ہو نہیں ہیں، وہ سیدھی دل کے پار ہوتی ہیں۔ زہرہ حاکم بابا کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہی، وہ خاموش تھی مگر میں اس کی بولی سن سکتا تھا۔ کچھ لوگوں کی خاموشی بھی کتنی باتیں کرتی ہے۔ اور جن کی خاموشی بولتی ہو، انہیں بھلا بات کرنے کی کیا ضرورت.....؟

حاکم بابا اُسے دعا دے کر آگے بڑھے تو ایک پل کے لئے میری نظر اُٹھی اور تبھی وہ بھی بے خیالی میں میری طرف دیکھ بیٹھی۔ ایک لمحے کے لئے سب ساکت ہوگیا۔ اگر حاکم بابا اُسی وقت مجھے آواز دے کر پھر برف سے پانی نہ کر دیتے تو شاید وقت یونہی تھما رہتا۔ میں بھی آگے بڑھ گیا۔ حاکم بابا ہم سے رخصت ہو کر درگاہ روانہ ہوگئے۔ حویلی کے مردانے والے حصے کے بڑے صحن میں قوالوں کی ٹولی اپنی جگہ سنبھال چکی تھی اور سازندے اپنے ساز جانچ رہے تھے۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی، سکندر کا خادم خاص کچھ فاصلے پر کھڑا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مرکزی قوال نے تان لگائی اور محفل سماع کا آغاز ہوگیا۔ رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا ہجوم بھی بڑھتا گیا۔ تبھی مجھے سکندر کے خاص ملازم مختارے نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔

ظہیر اور بگھا مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے اور پھر دونوں ہی میرے گلے لگ کر رو پڑے۔ بگھے کی تو ہچکیاں ہی بند ہوگئیں۔

"یہ کیا ہوگیا عبداللہ باؤ.....؟ میرا یار کندن مجھ سے ملے بنا ہی چلا گیا۔ تم نے اسے روکا کیوں نہیں..... کیوں جانے دیا اسے۔"

ظہیر کی آواز بھی مدھم تھی "اسے ہمیشہ ہر کام کی جلدی پڑی رہتی تھی۔ جانے میں بھی جلدی کر دی اُس نے..... کندن کی فلم کا پہلا حصہ ختم ہوگیا بگھے، اب ہم اس سے دوسرے حصے میں جا کر ملیں گے....."

ظہیر نے اپنی بات ختم کی تو ہم سب کی پلکیں بھی بھیگ چکی تھیں۔ بہت دیر تک ماحول پر خاموشی طاری رہی۔ بگھے نے ایک لمبی آہ بھری۔

"کندن چلا گیا یارو، بخت خان بھی پلٹ گیا اور سنتوش نے تو آزادی کی ایک سانس بھی نہیں لی..... سچ ہی تو کہا ہے کسی نے..... قیدی عشق دے بگھے نہیں چھٹ دے..... قیدی چھٹ جاندے نے جیل خانیاں دے....." ظہیر افسردگی سے بولا۔

"ہاں..... جیل خانے سے ہی نہیں..... زندگی کی قید سے بھی چھٹ جاتے ہیں کئی بدنصیب..... سچ پوچھو تو اب یاروں کے بنا جی بھی نہیں لگتا کہیں..... عبداللہ..... تم اور بگھا بھی میرے ساتھ چلو..... میں وہاں پہنچتے ہی تم دونوں کے ویزے کا انتظام کروانے کی کوشش کروں گا۔ ہم روم، اٹلی، فرانس، پیرس کہیں بھی جا کر بس سکتے ہیں..... یہاں اب رکھا بھی کیا ہے ہمارے لئے..... اور میں بھی بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں....."

میں نے غور سے ظہیر کی طرف دیکھا "تو پھر بھاگنا ترک کیوں نہیں کر دیتے..... ہم ساری خدائی سے بھاگ سکتے ہیں..... مگر اپنی تقدیر سے نہیں....."

ظہیر اور بگھے نے چونک کر میری طرف دیکھا "کیا مطلب..... میں سمجھا نہیں تمہاری بات.....؟"

میں نے اپنے لفظ جمع کرنے کی کوشش کی "کیا تم دونوں نے ایک بات پر کبھی غور کیا ہے۔ کرما، بخت خان، کندن اور سنتوش..... یہ سب لوگ سزائے موت سے بچنے کے لئے جیل سے فرار ہونا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی موت تختہ دار پر ان کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ کرمے کے علاوہ باقی سب کو موت نے وہاں بلایا جہاں ان کی قضاء لکھی ہوئی

تھی، سنتوش جیل کے بڑے میدان میں مارا گیا۔ بخت خان کی آخری سانس اس کی محبوب اور اپنی مٹی کی آغوش میں لکھی تھی اور کندن کی موت اسی صحرا کے ایک سیاہ ٹیلے پر بیٹھی اس کی منتظر تھی۔ جبکہ وہ تمام عمر ایک گنجان شہر میں فلم کے ٹکٹ بلیک کرتا رہا اور سینما کے پردے پر ماورائی دنیاؤں کی سیر کرتا رہا۔ اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ انہی سزائے موت کے قیدیوں کا چوتھا ساتھی بگھا سنگھ جیل توڑ کر بھاگنے کے باوجود گرفتار ہو جاتا ہے اور اسی جیل کی کال کوٹھڑی میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں سے وہ موت کے خوف سے بھاگا تھا۔ مگر آزاد پھرنے والے مارے جاتے ہیں اور گرفتار قیدی کو معافی مل جاتی ہے۔ گویا ایک بات تو طے ہے کہ کسی جج یا منصف کے لکھ دینے یا فیصلہ کرنے سے پھانسی گھاٹ کے تختہ دار پر آنے والی موت لازم نہیں ہو جاتی۔ موت اپنا وقت اور قضاء کی جگہ خود مقرر کرتی ہے۔ ہم چاہے لاکھ تدبیریں کر لیں، کتنا ہی پھندوں سے بچ کر دور نکل جائیں۔ موت اپنی مقررہ جگہ پر ہمارا انتظار کرتی رہتی ہے۔ یاد ہے وہ تبلیغی جماعت والوں نے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کا قصہ یا حکایت سنائی تھی؟ کہ بندہ خود وہاں جانے کی ضد کر بیٹھا جہاں عزرائیل علیہ السلام کو اس کی روح قبض کرنے کے لئے پہنچنا طے شدہ امر تھا۔ اور پھر کون جانے میں، بگھا اور تم جو اس وقت یہاں بظاہر آزاد بیٹھے ہیں۔ ہماری آخری سانس قدرت نے اسی سرحدی قصبے میں لکھ رکھی ہو۔ اور ہمارا چھ ماہ بعد یہاں ملنے کا منصوبہ دراصل ہمارے ذہن کی ایجاد نہ ہو..... کسی اور کے مسودے کا حصہ ہو.....؟ قدرت کے اسکرپٹ کو آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ جس موت سے بچ کر ہم جیل کے پھندے سے دور بھاگے تھے، وہ موت وہاں نہیں..... یہاں کسی سرحدی باڑھ کے پار، کسی سپاہی کی گولی کی صورت میں لکھی ہو.....؟"

میں چپ ہوا تو وہ دونوں بھی بہت دیر کچھ بول نہیں پائے۔ پھر بگھے نے ہی ڈوبتی آواز میں خاموشی توڑی "تیری بات ہے تو عجیب..... پر دل کو لگتی ہے..... واہے گرو دی سوں..... جب میں جیل سے بھاگا تھا تب قدم قدم پر مجھے اسی موت نے چھوا..... پر چکھ نہیں پائی..... اور جس رات میں اپنی ہی گلی میں گھر کے دروازے کے سامنے گرفتار ہوا تھا اس وقت تو بس یوں سمجھو کہ میری جند کسی نے اپنے قبضے میں ہی کر لی ہو۔ پر مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میری آنی کسی کال کوٹھڑی یا جیل کی چار دیوار میں بنے تختے پر نہیں لکھی تھی۔ قانون میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور پولیس مجھے گرفتار کر کے واپس اسی جیل لے گئی مگر اصل میں وہ مجھے موت سے باعزت رہائی دلوانے کے لئے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ باہر رہتا تو آج تک در بدر بھٹکتا پھر رہا ہوتا....."

ظہیر کے لہجے میں غصہ اور تلخی تھی "صاف صاف بولو..... تم دونوں مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"صاف بات یہ ہے کہ میں تمہیں یوں تمام عمر ایک موت کے خوف سے بھاگ کر روز ہزار موتیں مرتا نہیں دیکھ سکتا۔ تم جتنی سرحدیں بھی پار کر لو، جتنے بھیس بھی بدل لو۔ تمہاری قضا تمہیں پہچان ہی لے گی۔ اور وہ تبھی آئے گی جب اس کا وقت مقرر ہوگا۔ مقام کا یقین بھی تمہارے ہاتھ نہیں ہے۔ یہ سارے فیصلے طے شدہ ہیں۔ لہٰذا بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو اپنی مرضی سے قانون کے حوالے کر دو۔"

میری بات سن کر ظہیر کو جیسے کوئی کرنٹ سا لگا "کیا مطلب.....؟ گرفتاری دے دوں..... گویا خود کو موت کے حوالے کر دوں.....؟"

"نہیں..... خود کو موت کی حفاظت میں دے دو..... کیونکہ تمہاری آخری سانس تک موت خود تمہاری حفاظت کرے گی..... ابھی کچھ دن پہلے یہیں سکندر کے ٹھکانے پر سکندر نے اپنے تئیں ہماری جان لینے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اگر تمہیں آنے میں چند لمحوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید ہمارے چیتھڑے تمہارے سامنے پڑے ہوتے اور تم مجھے پہچان بھی نہ پاتے کہ میں وہی تمہارا دوست عبداللہ ہوں جس سے ملنے کے لئے تم اس ویرانے میں آئے تھے۔ جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے.....؟ اس کا یہی مطلب ہے کہ میری اور مدثر صاحب کی آخری سانس سکندر کے صحن میں نہیں لکھی تھی..... لہٰذا تم بھی قطعی طور پر اور یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہاری گرفتاری اور جیل ہی آگے چل کر تمہاری موت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ تمہارے پاس بہت سے ایسے راز ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر قانون کئی خطرناک گروہوں کی سرکوبی اور خاتمہ کر سکتا ہے، کون جانے تمہاری دی ہوئی معلومات ایسے کئی اور ظہیر جنم لینے سے روک دیں..... اور ہو سکتا ہے خود قانون تمہیں ان رازوں سے پردہ اٹھانے کے صلے کے طور پر اپنا "سلطانی گواہ" بنا لے۔ ظہیر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں نے یہ آزادی بہت بھاری قیمت دے کر خریدی ہے میرے دوست..... تم اسے پھر سے قید خانے کی جھولی میں کیوں ڈالنا چاہتے ہو.....؟"

✱.....✱.....✱

باب46

میں نے ظہیر کی بات سکون سے سنی" مجھے تمہاری آزادی سے نہیں..... اس آزادی سے جڑی انہونیوں سے ڈر لگتا ہے دوست..... میں نے بخت خان، کندن اور سنتوش کو کھو دیا ہے..... اب اور کسی کو کھونا نہیں چاہتا..... تمہاری راہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گا میں..... مگر جانے سے پہلے میری بات پر غور ضرور کرنا۔"

اتنے میں پیچھے سے سکندر کی آواز ابھری" کوئی کہیں نہیں جا رہا فی الحال یہاں سے..... بتایا تو تھا میں نے تم لوگوں کو کہ ماں جی میرے بیاہ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ بہت جلد اس حویلی میں پھر سے شہنائی بجنے والی ہے۔ ایسے میں میرے یار بھی میری خوشی میں شامل نہ ہوں تو کیا خاک مزہ آئے گا....."

سکندر کی بات سن کر میرے دل میں جیسے کوئی ٹھیس سی اُٹھی۔ کبھی کبھی شہنائی کا ماتم سے کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ظہیر اور بگھے نے گلے مل کر سکندر کو مبارکباد دی اور ظہیر مسکرایا۔" ہاں..... پتہ ہے مجھے سارا معاملہ..... بہت اچھا کر رہے ہو تم کہ اپنے چھوٹے بھائی کی بیوہ کے سر پر چادر ڈال رہے ہو..... گھر کی عزت گھر میں ہی رہے گی اور تمہاری ماں جی کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی....."

سکندر نے گہری سانس لی" ہاں یار..... پہلے پہل تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ لڑکی بہت معصوم، بہت شریف اور کسی نجب الطرفین خاندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اور مجھے اس کے ساتھ یہ بڑی ناانصافی لگتی تھی کیونکہ اسے اپنی زندگی جینے کا پورا حق ملنا چاہیے تھا۔ مگر پھر میرے دونوں بچے اس سے اتنے زیادہ مانوس ہو گئے کہ وہ اپنی اصل ماں کو بھی بھلا بیٹھے۔ اور ماں جی تو اس کی ایسی گرویدہ ہو گئی ہیں کہ چوبیس 24 گھنٹے ان کی زبان پر اب زہرہ کا ہی نام رہتا ہے۔ سچ ہے کہ اس نے چند مہینوں کے اندر ہی سب کو اپنا بنا لیا ہے۔ لہٰذا مجھے بھی اب اُن سب کی پسند کے آگے سر جھکانا ہی پڑا....."

ظہیر نے سکندر کو چھیڑا" اب یہ تو نہ کہو..... تمہاری آنکھیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم بھی اس کی محبت میں غرق ہو چکے ہو۔ اب یہ سارا مدعا اپنے گھر والوں پر نہ ڈالو....."

ظہیر کی بات سن کر بگھا اور سکندر دونوں ہنس پڑے..... میرے اندر جیسے کوئی تیز آندھی سیٹیاں بجاتی گزرتی رہی۔ اتنے میں کسی نوکر نے آ کر سکندر کو بتایا کہ سارنگا ظہیر سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ ظہیر نے سکندر سے درخواست کی کہ وہ ذرا باہر کا جائزہ بھی لیتا آئے اور سارنگے کو بھی اندر بھیج دے۔

سکندر میرے تنکوں سے بنے خرمن پر بجلیاں گرا کر واپس لوٹ گیا۔ اور میرا معصوم دل ایک بار پھر ڈوب سا

گیا۔ شاید میرے دل کو ڈوب ہی جانا تھا۔ کہ جو تیرنا نہیں جانتے، وہ کبھی پار نہیں لگا کرتے۔ وہ ساری رات میں نے جیسے کانٹوں پر گزار دی۔ سارنگا، ظہیر اور بگھا پولیس کی نظر سے بچ کر نکلنے کے منصوبے بناتے رہے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا مگر جانے ہمارے اندر کی سوچیں ہمارے چہرے پر کیوں اور کیسے اتنی تحریریں لکھ جاتی ہیں؟ انسان خود کو چھپائے بھی تو کہاں چھپائے۔ مجبوراً ہمیں اپنا چہرہ ہی دوسروں سے چھپانا پڑتا ہے۔

صبح ہونے لگی تو سکندر کا بندہ میرے لئے پیغام لے کر آ گیا کہ مجاور واپسی کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں نے بھی ظہیر سے واپسی کی اجازت چاہی۔ ظہیر کچھ بے چین سا تھا۔ ''پتہ نہیں میرا ایجنٹ کہاں پھنس گیا ہے۔ مجھے بہت جلد سرحد پار کرنی ہوگی۔ مخبری ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ویسے تو سکندر نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے اور میں جانتا ہوں وہ اپنے وعدوں سے نہیں پھرتا۔ مگر اس کے کارندے ابھی اس معاملے میں بہت ناتجربہ کار ہیں۔ ایک ذرا سی چوک ہمیں سرحدی محافظوں کی گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے لا کھڑا کر سکتی ہے.....''

سارنگا غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا ''میرے پاس ایک تجویز ہے..... یہاں سے اگلی جمعرات بہت سے زائرین اگلے ہفتے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے ڈپٹی کمشنر کی راہداری (اجازت نامے) کے کاغذ پر سرحد پار کریں گے۔ کیوں نہ ہم تمہیں بھی عبداللہ کے حلیے میں ان زائرین کے ساتھ سرحد پار کروا دیں.....؟ تھوڑا خرچہ بڑھ جائے گا۔ مگر اور کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں ہے ہمارے پاس.....''

ظہیر سارنگے کی بات پر چونک کر بولا ''خرچے کی پرواہ نہ کرو..... تم میری راہداری کا پروانہ حاصل کرنے کی کرو..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ سرحد پار والے بھی میرا انتظار کرتے کرتے اکتا چکے ہوں گے.....''

وہ دونوں دیر تک سر جوڑے مختلف منصوبوں پر غور کرتے رہے۔ ظہیر نے میرے چہرے پر اُڑتی گرد اور بنتے بگڑتے بھنور دیکھ لئے۔ ''کہاں کھوئے ہوئے ہو صوفی صاحب..... کوئی پریشانی ہے جو تمہیں لگاتار ڈس رہی ہے.....؟''

میں نے بات بنانے کی کوشش کی ''پریشانیوں سے ہی تو اپنا ازلی واسطہ اور رابطہ ہے انجینئر صاحب..... اب تو کوئی پریشانی نہ ہو تو پریشانی ہوتی ہے کہ کہیں روٹھ تو نہیں گئی ہم سے پریشانی.....'' میری بات سن کر وہ سب مسکرا پڑے۔ ظہیر نے سگریٹ سلگا کر میری طرف دیکھا۔

''میں جانتا ہوں تم میرے لئے فکر مند ہو، مگر یاد رکھو..... ہم نے جیل سے فرار کے وقت ہی جان کی بازی لگا دی تھی۔ اب یہ جتنی بھی زندگی باقی ہے، سمجھو ایک جوا ہی تو ہے۔ تو مجھے کھیل لینے دو جوا۔ اگر نصیب میں پولیس کی گولی ہی لکھی ہے تو آنے دو۔ دونوں صورتوں میں میرے لئے تو نجات ہی ہے..... آزادی ملے گی..... یا موت.....''

میں نے آگے بڑھ کر ظہیر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ''میں تمہیں تمہارا فیصلہ بدلنے پر تو مجبور نہیں کر سکتا، اور تمہارے ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ شامل رہوں گا۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوست دوسرے دوست کو سمجھانے سے کبھی باز نہیں آئے گا۔ کیونکہ دوست کا کام ہی دوسرے دوست کو خلوص اور نیک نیتی سے مشورہ دینا ہوتا ہے۔ فی الحال تو میں جا رہا ہوں کیونکہ روشنی ہونے سے پہلے ہمیں مزار پر پہنچ جانا چاہیے۔ لیکن میں پھر آؤں گا تم سے ملنے.....''

ظہیر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ باہر بڑے صحن میں درویش اور مجاور جمع تھے اور قوالی کی محفل ختم ہو چکی تھی۔ میں چپ چاپ ان کی ٹولی میں شامل ہو گیا اور ہم فجر کی روشنی سے قبل مزار پہنچ گئے۔ مجھے سارے رستے

سکندر کی کہی باتیں یاد آتی رہیں۔ کتنا خوش نصیب تھا وہ، کتنے مقدر والے ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں بن مانگے ہی سب کچھ مل جاتا ہے۔ اور کتنے بدنصیب ہوتے ہیں مجھ جیسے جو ہر بار اپنی منزل پا کر بھی اس کا نشان کھو دیتے ہیں۔ میں اپنے حجرے میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا میرا۔ جیسے سب کچھ ایک دم سے ہی بے معنی ہو گیا ہو میرے لئے۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے سہ پہر ہو گئی مگر میں یونہی خود کو حجرے میں بند کیے بیٹھا رہا۔ پہروں کا تو کام ہی ڈھلنا ہے، سو ڈھلتے رہے اور سہ پہر سے شام ہونے کو آئی۔ تبھی کسی مجاور نے باہر سے حجرے کا دروازہ کھٹکھٹایا "چھوٹے سائیں جی..... آپ سے باہر کوئی ملنے آیا ہے..... کوئی زنانی ہے، کہتی ہے آپ سے بات کرنا چاہتی ہے....."

میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا "کون ہے..... اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے....." کوئی نذر نیاز یا چڑھاوا لے کر آئی ہے وصول کر لو اور اسے رخصت کر دو....."

مجاور نے اپنی بات پوری کی "نہیں سائیں جی..... وہ کوئی سائل نہیں ہے۔ کہتی ہے بڑی حویلی سے آپ کے لئے پیغام لے کر آئی ہے۔ شاید بڑی سرکار نے کچھ کہلوا بھیجا ہو۔"

حویلی کا نام سن کر میں چونکا "اچھا ٹھیک ہے..... آتا ہوں....." میں مجاور کے پیچھے چلتے ہوئے درگاہ کے مرکزی صحن میں آیا تو وہ مجھے بڑے درخت کے نیچے کھڑی نظر آئی۔ اس نے اپنا چہرہ ڈھکا ہوا تھا مگر مجھے لگا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اور پھر اچانک ہی مجھے یاد آ گیا۔ یہ انہی تین چار خادماؤں میں سے ایک تھی جنہیں میں نے کل ہی زہرہ کو اندر زنانے سے باہر صحن میں لاتے دیکھا تھا۔ میری پریشانی مزید بڑھ گئی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی۔

"سلام چھوٹے سائیں جی..... میرا نام رحمتے ہے۔ میں چھوٹی بی بی جی کی خاص خدمتگار ہوں....."

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی "ہاں..... یاد ہے مجھے..... بولو..... کیا خاص بات ہے.....؟"

رحمتے نے اپنی آواز دھیمی کر لی "وہ جی..... مجھے "زہراں" بی بی نے بھیجا ہے یہاں۔ وہ کل چھوٹے ٹیلے کے پیچھے نیلے گنبد والی درگاہ پر جائیں گی دعا کرنے۔ آپ کو بلایا ہے بی بی جی نے وہاں....."

میں نے گھبرا کر رحمتے کی طرف دیکھا جیسے میری کوئی چوری پکڑی گئی ہو "مجھے بلایا ہے..... مگر..... کیوں.....؟ میرا مطلب ہے میرا یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ ہزار بکھیڑے بکھرے پڑے ہوتے ہیں میرے پیچھے....."

میں اسے کھل کر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ یہاں چاروں طرف مجھ پر پہرے لگے ہوئے ہیں اور ایسے میں میرا زہرہ سے یوں ملنا بہت سے نئے افسانوں کو جنم دے سکتا ہے۔ رحمتے نے اپنا سر ہلایا۔

"جی سائیں جی..... میرا تو بس پیغام پہنچانے کا کام ہے۔ شاید چھوٹی بی بی کسی خاص منت کے لئے وہاں جا رہی ہیں..... اب جیسے آپ حکم کرو..... میں پیغام پہنچا دوں گی چھوٹی بی بی کو..... وہ کل عصر سے پہلے جائیں گی نیلے گنبد والے مزار پر....."

میں عجیب سی کشمکش کا شکار ہو گیا۔ ایک پل کو دل کہتا کہ سارے پہرے توڑ کر ابھی سے وہاں جا بیٹھوں

جہاں اسے آنا ہے، مگر دوسرے ہی پل وہی دل زمانے کی مصلحتوں کا شکار ہو کر وسوسوں میں گھر جاتا۔ یہ وسوسے بھی انسان کے کتنے بڑے دشمن ہیں، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ بنانے والے وسوسے..... انسان کو کہیں کا نہ چھوڑنے والے یہ اندیشے۔ میں اپنے اندر چلتی جنگ لڑنے میں مصروف تھا اور رحمتے میرے جواب کے انتظار میں منتظر کھڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

''ٹھیک ہے..... تم اپنی چھوٹی بی بی کو جا کر کہہ دو۔ میں وقت پر نیلے گنبد والے مزار پر پہنچ جاؤں گا۔ شاید کوئی خاص دعا کروانی ہو انہیں.....''

رحمتے نے میرا جواب سن کر جلدی سے سر ہلایا ''ٹھیک ہے سائیں جی..... اب میں جاتی ہوں.....'' وہ تیزی سے پلٹ گئی اور پیچھے میرے لئے ان گنت سوالوں کا انبار چھوڑ گئی۔ زہرہ نے مجھے درگاہ سے باہر کسی جگہ ملنے کے لئے کیوں بلایا تھا.....؟ یقیناً کوئی خاص بات ہوگی جو وہ اس درگاہ میں سب کی موجودگی میں نہیں کر سکتی۔ مگر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے.....؟ شاید وہ بھی اپنے ابا والی بات دہرانا چاہتی ہو۔ شاید وہ بھی یہی چاہتی ہو کہ میں اس کے سکندر سے نکاح ہونے سے پہلے یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں۔ جانے لوگ جسم کے بت کو کہیں دور لے جا کر پھینک دینے کو دوری کا نام کیوں دیتے ہیں۔ فاصلے تو روح سے روح تک کے ہوتے ہیں۔ دوریاں بھلا جسم سے کب متصل ہوتی ہیں؟ ساری رات میں انہی سوچوں کے بھنور میں غوطے کھاتا رہا۔ اور جانے کب صبح ہوگئی۔ پھر وہی وقت کی رفتار..... جو ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس دوڑتی ہے۔ جب ہم اس کے تیز تر ہونے کی التجائیں کرتے نہیں تھکتے تب یہ وقت چیونٹی کی رفتار سے سرکتا ہے اور آج جب میں الجھنوں میں گھرا اُسی وقت سے کچھ دیر ٹھہر جانے کی منت کر رہا تھا تو یہ پر لگا کر اڑتا چلا گیا۔

فجر سے ظہر اور ظہر کے بعد سہ پہر بھی سر پر کھڑی ہوئی، اور میرے جانے کا وقت ہو گیا۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ درگاہ پر لگے پولیس کے پہرے داروں کی نظر سے بچ کر نکلنے کا تھا۔ مجھے باہر جاتے دیکھ یہ لوگ ضرور میرا پیچھا کرتے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر کوئی مجھے زہرہ سے بات کرتے ہوئے دیکھ لے۔ اچانک میرے ذہن میں سلطان بابا کی ایک بہت پہلے کی گئی نصیحت گونجی جو نہ جانے انہوں نے روانی میں کس موقعے پر کہی تھی۔ مگر میرے ذہن کے کسی گوشے میں آج بھی تازہ تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کبھی کبھی چھپنے کے لئے ظاہر ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور مزار کے مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا جہاں تپتی دوپہر کی وجہ سے صرف ایک ہی پہرے دار سادہ لباس میں کسی سائے کی اوٹ میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بنا کوئی لگی لپٹی رکھے بات جوڑی۔

''مجھے کسی ضروری منت کے سلسلے میں نیلے گنبد والے مزار تک جانا ہے سنتری صاب..... کیا آپ کسی سواری کا انتظام کروا سکتے ہو اپنے کسی ساتھی سے کہہ کر، میرا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔''

پولیس والا سٹپٹا کر بولا ''سواری..... میں..... نہیں..... میرا مطلب ہے ابھی تھانے کی گاڑی آئی نہیں۔ ورنہ اسے کہہ دیتا کہ تمہیں لے جائے..... ہاں البتہ نیچے والی سڑک پر اِکا دُکا تانگے موجود ہیں..... کہو تو اُن میں سے کسی کو کہہ دوں.....''

میں نے ممنونیت سے کہا" بڑی مہربانی ہوگی آپ کی....." پولیس والا میرے ساتھ ہی مزار کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں نے آس پاس دیکھا، کوئی دوسرا پولیس والا اس وقت پہرے پر نہیں تھا۔ شاید انہوں نے اپنے آرام کی وجہ سے اوقات بانٹ رکھے تھے۔ سنتری میرے ساتھ نیچے آیا اور دور ایک درخت تلے کھڑے کسی تانگے والے کو سیٹی بجا کر اشارہ کیا۔ تانگے والے نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اور مجھے لمحے بھر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی انہی سادہ لباس والوں کی خدمت کے لئے یہاں موجود ہے۔ سنتری نے تانگے والے کو تاکید کی کہ مجھے نیلے گنبد والے مزار تک لے جائے۔ میں نے لقمہ دیا کہ اگر ممکن ہو تو یہی تانگے والا مجھے واپس بھی لے آئے۔ سنتری کا نام رشید تھا۔ رشید میری بات سن کر مزید مطمئن ہوگیا اور اس نے آنکھوں آنکھوں میں تانگے والے کو کچھ اشارہ کیا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ درگاہ کے پہرے دار کو پورا اطمینان ہو جائے اور یہاں سے میرا پیچھا نہ کیا جائے۔ تانگے والا بھی پولیس والوں کا کوئی ساتھی معلوم ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ نیلے گنبد والے مزار کے باہر کھڑا رہ کر ہی دور سے میری نگرانی کرے گا اور میرا سایہ بن کر میرے ساتھ نہیں جڑا رہے گا۔ میں ایسے میں نظر بچا کر زہرہ سے بات کر سکتا تھا اور اگر مجھے دیکھے جانے کا خدشہ محسوس ہوتا بھی تو میں چپ چاپ وہاں سے پلٹ سکتا تھا۔ تانگے والے نے چابک لہرایا اور ہم آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد نیلے گنبد والے ٹیلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔

میں نے اترتے ہوئے تانگے والے سے کہا" تم بھی اندر ہی آجاؤ..... یہاں کہاں دھوپ میں کھڑے جلتے رہو گے....."

تانگے والے نے نفی میں سر ہلایا" نہ سائیں جی۔ اپنا تو کام ہی مسافروں کا انتظار کرنا ہے۔ آپ جاؤ اندر..... میں ادھر ہی کھڑا ملوں گا آپ کو واپسی پر....."

میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ایک جانب بڑی حویلی کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ اس کا مطلب ہے وہ اندر ہی موجود ہے۔ لرزتے قدموں سے ریت کے ٹیلے میں بنی اوپر جاتی سیڑھیاں چڑھ کر میں مزار کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا تو اندر زیادہ ہلچل نہیں تھی۔ میں چپ چاپ چلتا ہوا مرکزی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ تبھی اچانک کسی درخت کے پیچھے سے رحمتے نکل آئی۔

" آپ آگئے چھوٹے سائیں جی..... بی بی جی وہاں پچھلے برآمدے کی طرف گئی ہیں چادر چڑھانے۔ جلدی مل آئیں۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔ مغرب سے پہلے ہمارا حویلی پہنچنا ضروری ہے....."

میں دھڑکتے دل کے شور کو سنبھالتے ہوئے مرکزی صحن سے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ طویل برآمدے میں خاموشی طاری تھی۔ صرف مزار کے صحن میں لگے اکا دکا درختوں پر ستانے کے لئے بیٹھے پرندوں کی دھیمی چہچہاہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے برآمدے میں نظر دوڑائی مگر برآمدہ خالی تھا۔ میں پلٹنے لگا، تبھی وہ برآمدے کے کسی ستون کے پیچھے سے نکل آئی۔ ایک لرزتی سی مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"میں یہاں ہوں صاحب....."

میرے قدم اپنی جگہ جم سے گئے۔ زہرہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

..........*

باب47

کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی طاری رہی۔ مگر صرف زبان سے کوئی لفظ ادا نہ کرنا ہی تو خاموشی کی تعریف نہیں۔ کبھی کبھی دو انسانوں کے بیچ کی یہ خاموشی بھی تو باتیں کرتی ہے۔ جانے اس خاموشی کی بولی کے لئے ہماری لغت میں کوئی لفظ موجود کیوں نہیں ہے؟ انسان نے شاید اپنی ضرورت کے مطابق ہی لفظ اور بولیاں ایجاد کی ہوں گی۔ تبھی تو مجھے ہمیشہ سے ہی یہ انسانی لغت نامکمل محسوس ہوتی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اُسے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور اور لاغر سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔ پھر میں نے ہی ابتداء کی۔

''کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا..... لگتا ہے آئینے سے کوئی دشمنی پال لی ہے۔''

وہ دھیرے سے بولی'' آئینے سے تو پہلے بھی کچھ خاص دوستی نہیں تھی صاحب، مگر آئینے کے بنا ہی سب صاف دکھائی دینے لگا ہے اب.....''

میں چپ رہا۔ اُس نے لمحہ بھر کے لئے میری طرف دیکھا'' یہی سوال میرا بھی ہے تم سے..... کب ختم ہوگا یہ جوگ..... بس کر دو صاحب..... گھر واپس لوٹ جاؤ..... کب تک ان ویرانوں میں بھٹکتے رہو گے.....؟''

میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا'' یہ ویرانے تو اب میرے اندر بسیرا کرتے ہیں۔ ان سے بچ کر میں کہاں جاؤں گا زہرہ؟''

میری زبان سے اتنے سالوں بعد اپنا نام سن کر اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ جیسے ایک دم کسی نے بہت سے تار چھیڑ دیئے ہوں۔ اُس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور آنسو چھلکنے کے لئے بے تاب ہو گئے۔

''ابا نے بڑی سرکار کو زبان دے دی ہے۔ چند دن بعد میرا نکاح ہے سکندر کے ساتھ۔ میں تو اپنی ساری زندگی تمہارے ساتھ ہی تمہارے اندر بسے ان ویرانوں میں جینا چاہتی تھی صاحب..... مگر ہر بار وقت نے بازی پلٹ دی۔ ہم جب بھی ملے..... جدا ہونے کے لئے ملے..... جب بھی قریب آئے..... دوری ہم سے پہلے ہمارے درمیان آ کھڑی ہوئی..... اب میں نے ہار مان لی ہے ساحر..... بہت تھک گئی ہوں میں..... لیکن میں تمہیں اس طرح دربدر بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ میری ایک آخری بات مان لو..... تم بھی اپنا گھر بسا لو..... ختم کر دو یہ جوگ..... شاید اسی طرح میری روح کو کچھ سکون حاصل ہو جائے۔ مان لو میری بات..... دیکھو..... میں تمہاری منت کرتی ہوں..... مان رکھ لو میرا.....''

زہرہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں تڑپ سا گیا۔ میرا شدت سے جی

چاہا کہ میں اس کے لرزتے، کانپتے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لوں اور پھر کبھی نہ چھوڑوں۔ تبھی پچھلے صحن سے گھبرائی سٹپٹائی سی رحمتے لپکتے ہوئے ہماری طرف آتی دکھائی دی۔ زہرہ نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ..... وہ..... بی بی جی..... جلدی کریں..... سکندر سائیں کی گاڑی نیچے رکتی دیکھی ہے میں نے۔ وہ شاید ادھری آرہے ہیں۔"

سکندر کا نام سن کر زہرہ کے چہرے کا رنگ بھی اڑ گیا۔ "سکندر سائیں.....؟ یہاں....."

رحمتے ابھی تک ہڑبڑائی سی تھی۔ "جی بی بی جی..... میں نے خود انہیں نیچے رکتے دیکھا ہے آپ کی سواری کے پاس..... جلدی چلیں۔" زہرہ نے بے بسی سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "پھر وہی اُدھوری ملاقات....."

وہ پلٹتے ہوئے ایک پل کو رُکی "مجھے یقین ہے..... تم میرا مان ضرور رکھو گے صاحب..... چھوڑ دو اپنی یہ ضد....." ایک پل کے لئے اس نے میری نظروں میں جھانکا اور پھر تیزی سے پلٹ گئی۔

مجھے تو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اس نے..... ایسے آئی جیسے لمحہ بھر کے لئے کوئی بجلی کوندتی ہے اور بھری برسات میں اپنی ایک جھلک دکھا کر پھر سے معدوم ہو جاتی ہے۔ میں اسی طرح گم سم سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور وہ درگاہ کا صحن پار کر کے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کے آنچل کی وہ مانوس سی خوشبو بہت دیر تک میرے آس پاس بکھری رہی۔ کبھی کبھی ہم کسی ایک لمحے میں اتنا کھو جاتے ہیں کہ اس کے بعد کے پل ہمیں منوں بھاری لگنے لگتے ہیں۔ میرے قدم بھی واپسی کی راہ پر جیسے پتھر کے ہو گئے۔ میں اپنی ہی دھن میں گم مزار کے داخلی دروازے سے باہر نکلا تو کسی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"عبداللہ..... تم..... یہاں....."

میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ وہ سکندر ہی تھا، جس کے ماتھے پر مجھے نیلے گنبد والے مزار سے باہر نکلتے دیکھ بہت سے بل پڑ چکے تھے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ہاں..... میں..... کسی ضروری کام سے آیا تھا میں یہاں....." میرا جھوٹ سکندر کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس کے چہرے پر پھیلی فکر کی پرچھائیاں کم نہ ہوئیں۔ شاید میری حالت ہی اس وقت کچھ ایسی تھی کہ کوئی بھی ذی ہوش میری دیوانگی کو محسوس کر سکتا تھا۔

سکندر خاموش رہا، میں نے بات بدلی۔ "پولیس کے جاسوس میری تاک میں ہیں، میں تمہارے ساتھ یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ ظہیر سے کہنا میں جلد اس سے ملنے آؤں گا....."

میں نے عجلت میں اپنی بات ختم کی اور سکندر کی آنکھوں میں کئی چبھتے ہوئے سوالات چھوڑ کر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر دور کھڑے تانگے میں سوار ہو گیا۔ تانگے والے نے چابک لہرایا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد میں نے پلٹ کر مزار کی طرف دیکھا۔ سکندر ابھی تک وہیں کھڑا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی "یا میرے مالک..... سکندر کے دل میں زہرہ کے لئے کوئی شک نہ ڈالنا..... وہ پہلے ہی غموں سے چور اور بہت نڈھال ہے..... اسے مزید نہ آزمانا میرے مالک....."

میں دل ہی دل میں گڑگڑا رہا تھا تبھی تانگے والا بول پڑا "سائیں جی..... یہ بڑی سرکار کا بیٹا ملک سکندر تھا

ناں..... جو آپ سے ابھی مزار پر ملا تھا..... کوئی خاص کام تھا کیا.....''

میں تانگے والے کے اس اچانک سوال سے ہڑبڑا سا گیا۔ ضرور وہ میری ٹوہ لے رہا تھا۔ پولیس کے مخبروں کا تو کام ہی مشکوک لوگوں پر نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ نیلے گنبد پر سکندر سے ملاقات ہو جائے گی تو میں کبھی وہاں نہ آتا۔ اب پتہ نہیں پولیس والے اس ملاقات کو کیا رنگ دیں گے.....؟ میں نے بظاہر سرسری لہجے میں بے پرواہی سے تانگے والے کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''ہاں..... وہ سکندر سائیں ہی تھے۔ کہہ رہے تھے کبھی وقت ملے تو بڑی حویلی کا چکر بھی لگاتا جاؤں..... ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ناں وہاں۔ شاید کوئی نذر نیاز وغیرہ بانٹنی ہو؟''

تانگے والے کا دھیان بٹ گیا ''ہاں جی..... اس شادی کی دھوم تو آس پاس سات قصبوں تک پھیل چکی ہے۔ بڑی سرکار کے چھوٹے بیٹے کی موت کے بعد اس گھر کی یہ پہلی خوشی ہے۔ سارے علاقے کو دعوت دی ہے بڑی سرکار نے..... پورا ہفتہ لنگر بٹے گا.....''

تانگے والا نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور نہ جانے کب ہمارا سفر کٹ گیا۔ میں جب درگاہ کے صحن میں داخل ہوا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ حاکم بابا نے نماز ختم کر کے سلام پھیرا اور میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ ''کیا بات ہے عبداللہ میاں..... کہاں اپنے دھاگے الجھائے بیٹھے ہو.....''

میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا ''میرے دھاگے تو اسی دن الجھ گئے تھے جس دن پہلی مرتبہ میں نے ساحل والی سلطان بابا کی درگاہ میں اپنا پہلا قدم رکھا تھا۔ تب سے لے کر آج تک کبھی سلجھا نہیں پایا..... آپ ہی مدد کر دیں.....''

حاکم بابا دھیرے سے مسکرا ''اچھا..... تو شکایت کر رہے ہو..... تمہیں سلطان بابا نے بتایا تو تھا کہ یہ راستہ کانٹوں بھرا ہے۔ پھولوں کی خواہش ترک کرنا پڑتی ہے.....''

''ترک کر دی ہے میں نے ہر خواہش..... سبھی سے تیاگ لے لیا ہے۔ مگر مشکلیں ہیں کہ دامن ہی نہیں چھوڑتیں۔ آج تو اس نے بھی کہہ دیا ہے کہ یہ جوگ ختم کر کے واپس پلٹ جاؤں۔ کیونکہ کچھ حاصل نہیں ہوگا مجھے۔ ہمیشہ خالی ہاتھ ہی رہوں گا میں۔''

انہوں نے میری بات سن کر گہری سانس لی ''تو تم کیا چاہتے ہو۔ واپس پلٹ جانے کا اختیار تو ہمیشہ سے ہی تمہارے پاس ہے۔ جب چاہو اپنا یہ حق استعمال کر سکتے ہو.....''

میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے تسبیح پھیرتے رہے۔ ''میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرا تبادلہ کسی اور دُور دراز کی درگاہ میں کر دیں۔ یہاں رہوں گا تو اس کے لئے مشکلات کھڑی کرتا رہوں گا میں۔''

حاکم بابا نے تسبیح جاری رکھی اور دھیرے سے بولے ''جب جب جو جو ہونا ہے، تب تب سو سو ہوتا ہے.....''

میں سمجھ گیا کہ اب وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتے اس لئے چپ چاپ ان کے حجرے سے باہر نکل آیا۔ لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ ظہیر کو منانے کی ایک آخری کوشش کرنے کے بعد میں خود ہی یہ درگاہ چھوڑ دوں گا۔ سکندر کے دل میں اگر کسی شک و شبہے نے سر اٹھایا بھی ہوگا تو میرا یہ عمل اس شک کی دھند کو صاف کر دے گا۔ ساری

رات میں یہی منصوبے بناتا رہا کہ ظہیر سے ملنے کی کیا ترکیب نکالی جائے۔ اگلی صبح میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ انسانی جسم کی ایک حد مقرر ہے ہر معاملے میں۔ اور حد سے تجاوز کے اثرات بہرحال نمودار ہو کر رہتے ہیں۔

پچھلی کئی راتوں کے جگ راتے اپنا اثر دکھانے لگے اور دوپہر تک میرا جسم بخار میں پھنکنے لگا۔ درگاہ کے طبیب نے میری نبض دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ ''اسے فوراً قصبے کے ہسپتال لے جاؤ۔ بخار بہت تیز ہے اور بنا مناسب دوادارو نہیں اترے گا.....''

مجاوروں نے افراتفری میں کسی سواری کا انتظام کیا اور مجھے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ رات سے صبح اور صبح سے پھر شام ہو گئی۔ میرا ذہن تھوڑے اور لمبے وقفوں کے لئے سوتا اور جاگتا رہا۔ ہر دفعہ جب میری آنکھ کھلتی حاکم بابا ہاتھ میں تسبیح تھامے میرے سرہانے بیٹھے کچھ پڑھتے نظر آتے اور میں پھر سے نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ یہ نیند بھی کتنی بڑی نعمت عطا کی ہے اوپر والے نے ہم زمین والوں کو..... ہر غم سے آزاد اور ہر فکر سے بے فکر کر دینے والی نیند، سارے دکھ بھلا کر اپنی پناہ میں لے لینے والی نیند..... اور اسی سونے جاگنے کے وقفوں میں تین دن بیت گئے۔ تب جا کر کہیں میرے حواس بحال ہوئے، میں نے جاگتے ہی اٹھنے کی کوشش کی، تبھی قریب بیٹھے حاکم بابا کی شفقت بھری آواز اُبھری۔

''لیٹے رہو..... ابھی کمزوری اور نقاہت حاوی ہے تم پر..... کیا جلدی ہے تمہیں میاں؟''

میں نے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''مجھے کسی دوست سے ملنے جانا ہے..... ضروری ہے میرا جانا.....''

''چلے جانا..... پہلے چلنے کے قابل تو ہو جاؤ..... ویسے تمہاری بے ہوشی کے درمیان وہ پولیس والا تین بار پھیرا ڈال چکا ہے..... اور بڑی حویلی کی مالکن کا بیٹا بھی آیا تھا مگر کچھ عجلت میں لگ رہا تھا.....''

سکندر کے آنے کا سن کر میری بے چینی بڑھ گئی ''کیا کہہ رہا تھا سکندر..... کچھ بتایا اس نے.....''

حاکم بابا اسی سکون کے ساتھ اپنی تسبیح پھیرتے رہے ''بیمار سے کوئی کیوں ملنے آتا ہے بھلا؟ تیمارداری کے علاوہ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ہاں البتہ ایک بات نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبان سے نکل گئی تھی.....''

میں نے پریشانی سے کروٹ بدلی ''کون سی بات.....''

''یہی کہ تم یہاں بیمار پڑے ہو اور وہاں حویلی میں کوئی اور بخار میں تپ رہا ہے اسی روز سے..... آہ اللہ سب کو شفا عطا کرے.....''

حاکم بابا نے ایک لمبی سانس بھری اور پھر سے آنکھیں بند کر کے تسبیح پھیرنے میں مشغول ہو گئے۔ مگر میری فکریں بڑھتی چلی گئیں۔ آخر سکندر یہاں کیا کہنے آیا تھا۔ اور وہ کس کی بیماری کا ذکر کر رہا تھا، شام تک میرا دل اتنا اچاٹ ہوا کہ میں نے زبردستی ڈاکٹر سے کہلوا کر اگلی صبح کے لئے ہسپتال سے فراغت کا پروانہ لکھوا ہی لیا۔ لیکن اس نے اسی شرط پر مجھے اگلے روز چھٹی کی اجازت دی کہ وہ جاتے وقت ایک بار پھر میرا مکمل معائنہ کرے گا۔ میں ڈاکٹر کے پرانے اور دیواروں سے پلستر اترے کمرے سے باہر برآمدے میں نکلا تبھی ایک کمپاؤنڈر نما شخص سامنے بنی ڈسپنسری سے سفید کوٹ پہنے باہر نکلا اور بظاہر میری خیریت پوچھنے مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری صوفی جی..... اُمید ہے سب ٹھیک ہی ہوگا.....''

میں نے چونک کر اس کے مصافحے کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے بڑبڑایا" یہ رُقعہ تمہارے لئے کچھ دیر پہلے سارنگا کا ایک بندہ دے گیا تھا۔ ہسپتال کے باہر پولیس کا پہرہ ہے، وہ تم سے ملنے اندر نہیں آسکتے....."

میں نے جلدی سے ہاتھ ملانے کے بہانے اس کی مٹھی میں بند رقعہ اپنے ہاتھ میں منتقل کرلیا۔ کمپاؤنڈر آگے بڑھ گیا۔ میں نے وارڈ میں آتے ہی کاغذ کی تہہ کھولی۔ ظہیر کا مختصر سا خط تھا۔

"پیارے دوست..... آج رات میری روانگی ہے۔ میرے ایجنٹ نے زائرین کے بھیس میں میرے سرحد پار کرنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ جانے سے پہلے تم سے نہ ملنے کا افسوس ہمیشہ رہے گا مگر تمہارے اردگرد اُس پولیس والے نے 24 چوبیس گھنٹے کا پہرہ لگا رکھا ہے۔ میں ایران کے راستے یونان کی طرف نکل جاؤں گا اور کسی مناسب پناہ گاہ کے ملتے ہی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم اپنا اور بچے کا بہت خیال رکھنا۔ اُمید ہے ہم جلد دوبارہ ملیں گے..... کبھی نہ بچھڑنے کے لئے....."

ظہیر کا رقعہ پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وارڈ میں اکا دُکا مریض موجود تھے۔ جو اپنے اپنے بستر پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ حاکم بابا کو میں نے بڑی مشکل سے آج سہ پہر ہی درگاہ واپس بھیجا تھا تاکہ وہ بھی دو گھڑی آرام کرسکیں۔ ظہیر کے جانے کی خبر پڑھ کر میرا دل بہت بے چین ہوگیا تھا۔ جیسے پھر کوئی انہونی ہونے کو ہو۔ مغرب کے بعد اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ ہسپتال میں روشنی کا مناسب انتظام نہیں تھا۔ وارڈ میں لگے دو کمزور پیلے بلب اندھیرا ختم کرنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف تھے۔ اور پھر رات دس بجے کے قریب کسی وارڈ بوائے نے آکر وہ کمزور بلب بھی بجھا دیئے۔ جانے انسان کو آرام کرنے کے لئے اندھیرے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ دماغ کے اندر موجود کوئی تسکین آور مادہ تبھی پھوٹتا ہے جب بند آنکھوں کے پپوٹوں پر روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہ پڑنے پائے۔ قدرت کے اپنے خودکار اور وضع کردہ نظام ہیں یہ سارے۔ نیند بھی اسی خودکار نظام کا ایک حصہ ہی تو ہے۔

میں نے بھی پلکیں موندھ لیں اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خود کو اس خودکار نظام کے حوالے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جانے اسی ادھیڑ بن میں کتنی رات بیت گئی اور تبھی باہر ہسپتال کے احاطے میں بہت سی گاڑیوں اور ایمبولینس کے سائرن گونجنے لگے۔ میں نے گھبرا کر وارڈ کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باہر صحن میں پولیس والے تیزی سے اترتے اور ہسپتال کا عملہ عجلت میں ایمبولینس گاڑیوں سے زخمیوں کو اتارتے اور چیختے چلاتے دکھائی دیئے۔

سارے ہسپتال میں جیسے کوئی بھونچال سا آگیا تھا۔ میں گھبرا کر وارڈ سے باہر نکلا اور راہداری میں دوڑتے ایک وارڈ بوائے کو لپک کر پکڑ لیا" یہ شور کیسا ہے.....؟ کیا ہوا ہے..... یہ کن زخمیوں کو لے کر آئے ہیں پولیس والے.....؟"

وارڈ بوائے نے تاسف سے سر ہلایا" زخمی کہاں ہیں سائیں جی..... سبھی کا دم نکل گیا ہے بس سمجھو..... بے چارے..... مارے گئے سارے کے سارے..... یہاں تو صرف مردہ خانے میں جمع کروانے ہی لاتے ہیں یہ پولیس والے انہیں....."

میرے جسم سے جان نکلنے لگی۔" کک..... کون ہیں یہ لوگ؟"

''زائرین کے بھیس میں سرحد پار کر رہے تھے..... غیر قانونی طور پر..... یہاں کا تو یہ معمول ہے صوفی جی.....انسانوں کے اسمگلر معصوم لوگوں کو خواب دکھا کر غیر قانونی طور پر سرحد پار کروانے کے لئے دوسری جانب دھکیل دیتے ہیں۔ پھر یا تو یہ بیچارے اپنی پولیس اور رینجر کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں اور یا پھر سرحد پار کی سخت سکیورٹی فورس انہیں اپنے نشانے پر رکھ لیتی ہے۔ ہر ماہ ایسی پانچ چھ لاشیں آتی ہیں یہاں اس ہسپتال میں.....اب دیکھو..... آج کتنے لاشے آئے ہیں سرحد سے.....''

وارڈ بوائے اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ گیا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ مجھے لگا جیسے ایک دم ہی میری آنکھوں کا نور چھن گیا ہو۔ مجھے زور کا چکر آیا اور میں وہیں دیوار تھام کر ڈھے گیا۔

✱.....✱.....✱

باب48

قریب سے گزرتے کسی عملے کے فرد کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف لپکا ''آپ ادھر برآمدے میں کیا کر رہے ہیں سائیں جی، چلیں میں آپ کو آپ کے وارڈ تک پہنچا دوں.....''

''نہیں..... مجھے ہسپتال کے مردہ خانے لے چلو..... یہ جو ابھی پولیس اور بارڈر سکیورٹی فورسز کی گولیوں سے لوگ مارے گئے ہیں، مجھے ان کے پاس لے چلو.....مہربانی کرو.....''

اسے میری حالت پر ترس آ گیا اور وہ مجھے سہارا دے کر شعبۂ حادثات کے ایک نیم اندھیرے کمرے کی طرف لے گیا۔ وہاں پہلے سے چند پولیس والے کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے ان سے لاشوں کو دیکھنے کی درخواست کی تو ان میں سے ایک درشت لہجے میں بولا:

''تمہیں بھلا ان مردوں سے کیا لینا دینا سائیں لوکو..... جاؤ..... جا کر اپنا کام کرو.....''

اتنے میں پیچھے سے کسی کی آواز ابھری تو پولیس والوں نے گھبرا کر کڑک انداز میں سلیوٹ مار دیا ''جانے دو اِسے.....شاید اسے کسی اپنے کی تلاش ہے.....''

میں نے پلٹ کر دیکھا اے۔ ایس۔ پی اسد راہداری کے کنارے پر کھڑا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ پولیس والے مردہ خانے کے دروازے سے ہٹ گئے اور میں بے تابانہ اندر کی طرف لپکا۔ اندر بہت سے اسٹریچر پڑے تھے اور ان میں سے پانچ اسٹریچروں پر مرنے والوں کی لاشیں رکھی ہوئی تھیں جن کے جسم اور چہرے کو سفید چادروں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ کمرے میں فارملین نامی دوائی کی تیز اور ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور یہ بنیادی طور پر ایک سرد خانہ تھا جسے مناسب سہولیات نہ ہونے کے باعث عارضی طور پر برف کی سلیں رکھ کر چلایا جا رہا تھا۔ یہاں بھی وارڈ کی طرح دو چار کمزور پیلے بلب جلا کر روشنی کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں لرزتے قدموں سے لاشوں کی طرف بڑھا اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے پہلی لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا یہ کوئی بدقسمت ادھیڑ عمر شخص تھا جو اپنے خوابوں کی تلاش میں بے گور و کفن مارا گیا تھا۔

پھر میں دوسرے اسٹریچر کی طرف بڑھا۔ مگر وہاں بھی کسی دوسرے نوجوان کے ارمانوں کا خون چادر پر بکھرا پڑا ملا۔ اسی طرح تیسرے اور پھر چوتھے شخص کا چہرہ بھی میں نے دل پر پتھر رکھ کر دیکھ لیا مگر ان میں سے کوئی بھی ظہیر نہیں تھا۔ اب صرف آخری اسٹریچر باقی رہ گیا تھا لیکن میرے قدموں میں بچی جان بھی خرچ ہو چکی تھی۔ میں نہ جانے کس طرح لڑکھڑاتے ہوئے چادر اوڑھے اس بے جان لاشے تک پہنچ تو گیا مگر میرا سارا جسم جیسے شل ہو کر رہ گیا تھا۔

میرے ہاتھوں میں اتنی جان بھی نہیں رہی کہ میں اپنے سامنے پڑے جسم کے چہرے پر پڑا سفید کپڑا اُٹھا کر یہ دیکھ سکوں کہ وہ کون ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تو یہی سوچ کر بند ہو رہی تھی کہ اگر کپڑا ہٹانے کے بعد وہ چہرہ میرے یار ظہیر کا ہی نکلا تو.....؟

میں اسی شش و پنج میں کھڑا پسینے میں شرابور ہو گیا، حالانکہ کمرے میں ہڈیاں جما دینے والی خنکی تھی، تبھی میرے عقب سے اسد کی آواز گونجی "ڈر کیوں رہے ہو عبداللہ..... لاش کے چہرے سے کپڑا کیوں نہیں ہٹا رہے۔ تمہارا دوست جس راستے پر چل رہا تھا اس کا انجام تو آخر کار یہی ہونا تھا۔ میں نے تمہیں خبردار تو کیا تھا ناں۔ مگر لگتا ہے تمہارے دوست تک میری یہ بات پہنچ نہیں پائی۔ اُٹھاؤ کپڑا..... اور دیکھ لو اس کا چہرہ....."

میں گھبرا کر چلا اُٹھا "نہیں..... نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا..... ظہیر نہیں مر سکتا..... میں بخت خان، کندن اور سنتوش کو پہلے ہی کھو چکا ہوں..... اب اور نہیں....."

اسد ایک جھٹکے سے آگے بڑھا "کب تک حقیقت سے نظریں چراتے رہو گے عبداللہ..... چلو..... تم کپڑا نہیں ہٹا سکتے تو میں ہٹا دیتا ہوں....."

اسد نے اگلے ہی لمحے مردے کے چہرے سے سفید چادر جھپٹ کر ہٹا دی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر لمحے کی ہزارویں حصے میں مجھے محسوس ہوا کہ مرنے والا بدنصیب کوئی اور ہی ہے۔ میں نے نظریں چراتے ہوئے دیکھا۔ ہاں، وہ ظہیر نہیں کوئی اور تھا۔ اسد نے دھیرے سے کہا "یہ ظہیر نہیں ہے۔ لیکن آج نہیں تو کل یہاں ظہیر بھی ہو سکتا ہے۔ میرے مخبروں نے پکی خبر دی ہے کہ تمہارا دوست ظہیر اسی قصبے میں موجود ہے اور اس نے زائرین کے جعلی بھیس میں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ میری بات غور سے سنو عبداللہ، ظہیر بہت بڑی زیر زمین تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔ اس کے پاس ابھی تک بہت سے ایسے راز موجود ہیں جو اگر ٹھیک وقت پر قانون نافذ کرنے والے اداروں تک پہنچ جائیں تو ہم آج بھی بہت بڑی تباہی سے اپنے ملک کو بچا سکتے ہیں۔ ظہیر کو پھانسی ہونے سے قبل بھی بہت مرتبہ زبان کھولنے کی پیشکش کی گئی تھی مگر وہ شاید اپنی کسی مجبوری یا اندھی وفاداری کی وجہ سے کبھی نہیں بولا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر تم اسے مجبور کرو گے تو وہ ضرور خود کو قانون کے حوالے کر دے گا اور اگر اس نے موت سے پہلے قانون کے ساتھ تعاون کرنے کی حامی بھر لی تو میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے "سلطانی گواہ" بنا کر اس کی زندگی بچا لوں..... سوچ لو عبداللہ..... یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے..... اگر ظہیر مان جائے....."

میں چپ چاپ کھڑا اسد کی بات سنتا رہا۔ "اگر تم واقعی چاہتے ہو کہ ظہیر کو قائل کرنے کی کوشش کروں تو تمہیں چوبیس 24 گھنٹے کے لئے مجھ پر لگے اپنے سارے پہرے ہٹانا ہوں گے۔ اگر ظہیر نے سرحد پار نہیں کی تو مجھے اس تک پہنچنا ہو گا لیکن اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا کہ پولیس میرے تعاقب میں ہے تو وہ مجھ سے بھی دور چلا جائے گا۔ بولو آفیسر..... اتنا اعتماد کر سکتے ہو مجھ پر.....؟"

اسد میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ "ٹھیک ہے..... میں پہرہ ہٹا دیتا ہوں..... امید ہے تم میرے اعتماد کا مان رکھو گے عبداللہ....."

میں نے غور سے اسد کی طرف دیکھا۔ "مان اور بھرم تو تمہیں بھی اپنے وعدے کا رکھنا پڑے گا۔ اگر مجھے ذرا

سا بھی شک ہوا کہ تم نے اب بھی کسی کو میرے پیچھے لگا رکھا ہے تو شاید میں کبھی ظہیر کو ہتھیار ڈال کر گرفتاری دینے پہ آمادہ نہ کر سکوں۔ بولو ASP اسد..... اپنا وعدہ پورا کر پاؤ گے....."

اسد نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ میری طرف بڑھا دیا "ٹھیک ہے..... تو پھر طے رہا..... ہم دونوں ہی اپنے اپنے وعدے کا بھرم نبھائیں گے..... شاید اب ہم دونوں کے پاس کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں ہے..... تم بے فکر ہو جاؤ..... میں ابھی اسی وقت تمہارے اردگرد موجود ہر پہرہ ہٹا رہا ہوں....."

میں نے اسد کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا "اب کل شام مغرب کے وقت تم سے ملاقات ہوگی میری۔ وہیں..... صحرا والی بڑی درگاہ میں....."

اسد مجھ سے ہاتھ ملا کر تیزی سے پلٹا اور پیچھے برآمدے میں کھڑے کچھ پولیس والوں کو ساتھ لیے وہاں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا، راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسد نے جاتے ہوئے ہسپتال سے پہرہ ہٹا دیا ہے مگر پھر بھی میں نے ہسپتال سے نکلنے کے لئے مرکزی گیٹ کے بجائے عقبی دیوار کا راستہ اختیار کیا۔ پچھلی سڑک رات کے اندھیرے میں سنسان اور ویران سی تھی۔ ہسپتال سے سکندر کی حویلی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ مگر میں نے مرکزی سڑک کے بجائے اندھیری گلیوں کی راہ اختیار کی اور چند گلیاں پار کرنے کے بعد اندھیرے گوشے میں رک کر یہ اطمینان ضرور کر لیا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا میرا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ مگر میرے پیچھے آنے والا کوئی دکھائی نہیں دیا تو میں نے آخری گلی بھی پار کر لی اور اب بڑا میدان پار کر کے بڑی حویلی کے دروازے تک پہنچ گیا۔

دربان دروازے کے ساتھ ہی بنے کمرے میں موجود تھے اور گارڈ نے فوراً ہی باہر جھانکا۔ "کون ہو بھائی..... اور یوں آدھی رات کے وقت کیوں دستک دے رہے ہو۔ جاؤ صبح آنا۔"

وہ میرے حلیے کی وجہ سے مجھے کوئی بھکاری یا سائل ہی سمجھ رہے تھے۔ "مجھے سکندر سائیں نے بلایا ہے۔ ان کے مہمانوں کے لئے کوئی پیغام لایا ہوں....."

دربان نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "سکندر سائیں تو آج شام ہی کہیں نکلے ہیں۔ واپس نہیں لوٹے اب تک۔ تم ٹھہرو..... میں اندر مردانے میں اطلاع کرواتا ہوں....."

کچھ ہی دیر میں مجھے اسی صحن میں پہنچا دیا گیا جہاں میری پہلے ظہیر اور بگھے سے ملاقات ہو چکی تھی۔ تبھی سارنگا آنکھیں ملتے ہوئے صحن میں نکلا اور مجھے دیکھتے ہی واپس اندر لپک گیا مگر اگلے ہی لمحے بگھے کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا اور بگھا آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ "اوئے عبداللہ یار..... کہاں رہ گیا تھا۔ ہم کب سے تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "ظہیر کہاں ہے بگھے.....؟ وہ ٹھیک تو ہے ناں....."

"ہاں..... سب خیر ہے واہ گرو کی کرپا سے..... تو اندر آ جا..... یہاں کیوں کھڑا ہے....."

ہم تینوں کمرے میں داخل ہوئے تو ظہیر بھی اپنی خواب گاہ سے آ نکلا۔ میں اسے دیکھ کر یوں اس کی طرف لپکا جیسے پیاسا کسی کنویں کی طرف لپکتا ہے۔

"تم ٹھیک تو ہو ناں..... تم نے تو آج رات سرحد پار کرنے کا پیغام بھجوایا تھا مجھے..... پھر.....؟..... کیا ہوا....."

ظہیر نے گہری سانس لی "ہاں..... پروگرام تو یہی تھا میرا..... مگر عین وقت پر کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ میں تو چھپتے چھپاتے سرحد تک پہنچ ہی گیا تھا مگر اس بے وقوف ایجنٹ نے پہلے ہی پانچ بندے بک کر رکھے تھے سرحد پار کرنے کے لئے۔ میں چھٹا بندہ تھا اور دوسری طرف والے ایجنٹ اڑ گئے کہ آج رات صرف پانچ بندوں کو ہی وہ سرحد پار کروا سکتے ہیں۔ مجبوراً مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ اب کل رات دوبارہ جاؤں گا میں وہاں۔ کل میری باری ہے۔ اور اگر وہ احمق ایجنٹ لالچ میں آ کر پہلے ہی پانچ بندے اسمگل کرنے کا معاوضہ نہ پکڑ چکا ہوتا تو میں اس وقت اس ملک کی سرحد پار کر کے اپنے دوستوں کے پاس پہنچ چکا ہوتا۔"

ظہیر چپ ہوا تو میں بے اختیار بول اٹھا "نہیں..... اگر تم بھی ان پانچ زائرین کے ساتھ ہوتے تو اس وقت تم سرحد پار نہیں..... بلکہ اسی قصبے کے پرانے ہسپتال کے ایک بوسیدہ سے مردہ خانے میں پڑے ہوتے..... وہ پانچوں سرحد پار رینجرز کی گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی جان کی بازی ہار گئے..... اور اب ان کی لاشیں سرد خانے میں بے گور و کفن پڑی ہوئی ہیں۔"

میری بات سن کر کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ بگھے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "واہ گرو دی خیر..... او یہ تو بڑا غضب ہو گیا یارو..... اپنا یار ظہیر تو سمجھو بال بال بچ گیا آج....."

"ہاں..... مگر ہر بار ہی ظہیر کی قسمت ساتھ دے جائے..... یہ ضروری تو نہیں....."

ظہیر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو عبداللہ..... کھل کر بات کرو....."

"میں تم سے صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ خود کو یوں جانتے بوجھتے موت کے منہ میں مت دھکیلو میرے یار..... سوچو..... اگر آج تم بھی ان پانچوں کے ساتھ سرحد پار کرنے کی غلطی کر بیٹھتے تو کیا ہوتا.....؟ میری اس پولیس افسر سے بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم اپنی گزشتہ تنظیم کے سرکردہ رازوں سے پردہ ہٹا دو اور خود گرفتاری دے دو تو وہ سرکار سے تمہیں سلطانی گواہ بنانے کی درخواست ضرور کرے گا۔ میری بات مان لو میرے دوست..... خود کو قانون کے حوالے کر دو....."

ظہیر نے ایک تلخ قہقہہ لگایا "تم بہت سادہ اور بھولے ہو عبداللہ..... جیسے تمہارا دل صاف ہے اس طرح تم ساری دنیا کو بھی سچا اور صاف دل سمجھتے ہو..... مگر تم ان پولیس والوں کو ابھی ٹھیک طرح سے جانتے نہیں ہو..... یہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ اور ہیں۔ ہزار چہرے ہیں ان لوگوں کے..... مجھے یقین ہے میری گرفتاری ہوتے ہی پہلی فرصت میں وہ مجھے راستے میں ہی جعلی پولیس مقابلہ میں ختم کر دیں گے۔ مجھ سے جان چھڑا کر انعام اور شہرت بھی سمیٹیں گے اور سب کو ایک سزائے موت کے بھاگے ہوئے خطرناک قیدی کو مارنے کے صلے میں ترقیاں بھی ملیں گی۔ تو کیوں نہ میں ان کے ہاتھوں مرنے کے بجائے خود ایک چانس لے لوں۔ مارا بھی گیا تو کم از کم یہ دکھ تو نہیں ہوگا کہ میں نے بچ نکلنے کی کوشش نہیں کی....."

میں ظہیر کی بات سن کر چپ رہا۔ اس نے میری بے بسی محسوس کر لی "تم میری فکر چھوڑو۔ تم اور بگھا میرے

ساتھ دوسرے کمرے میں آؤ..... مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے....."

ہم اُٹھ کر ملحقہ بیٹھک میں آ گئے۔ ظہیر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "سکندر کچھ دنوں سے بہت بے چین ہے۔ بار بار کرید کرید کر تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ تم کون ہو۔ ہم تمہیں کب سے جانتے ہیں۔ اور جیل آنے سے پہلے تمہارا ماضی کیا تھا....."

میں نے گھبرا کر ظہیر کی طرف دیکھا "تو تم نے کیا بتایا اُسے.....؟"

"میں نے اتنا ہی بتایا جتنا مجھے معلوم تھا کہ تم ایک ارب پتی باپ کے بیٹے ہو اور کسی اندھے قتل کے جھوٹے الزام میں تمہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ تم صرف اپنی منگیتر کو ان لٹیروں سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے کہ گولی چل گئی۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں بتایا میں نے اسے۔ مگر وہ پلٹ کر ہر بار تمہارے ماضی کے بارے میں ہی کریدتا رہا۔ سب ٹھیک تو ہے ناں عبداللہ..... سکندر تمہارے بارے میں اتنا فکر مند کیوں ہو گیا ہے۔ کیا تعلق ہے تمہارے ماضی کا سکندر سے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سکندر کو مجھ پر شک ہو گیا تھا اور اب وہ میرے بارے میں چھان بین کرتا پھر رہا تھا۔ میں نے ظہیر کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ مگر اس کی آنکھوں میں چھپے سوالات سے بچنا اتنا آسان نہیں تھا۔

"بولو عبداللہ..... چپ کیوں ہو.....؟ میں نے سکندر کو اتنا بے چین کبھی نہیں دیکھا۔ دو ہفتے بعد اس کا نکاح طے ہو چکا ہے مگر وہ اپنی شادی کی تیاریاں کرنے کے بجائے جانے کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ آج بھی سرِ شام ہی نکل گیا بنا کچھ بتائے..... یہ سب کیا ماجرا ہے عبداللہ....."

"کوئی ماجرا نہیں ہے..... سب قسمت کا پھیر ہے میرے یار..... فی الحال مجھے صرف تمہاری فکر ہے۔ کیا تم اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟ کیا ایک دوست کا اپنے دوست پر اتنا حق بھی نہیں ہوتا؟ تمہاری طرف سے بے فکر ہو جاؤں تو میں یہ علاقہ ہی چھوڑ دوں گا۔ کہیں دور نکل جاؤں گا یہاں سے..... سب ٹھیک ہو جائے گا مجھے یقین ہے..... سکندر کی ہر پریشانی بھی ختم ہو جائے گی میرے جاتے ہی..... یہ سارے مسئلے ہی میری وجہ سے ہیں..... میں نہیں رہوں گا تو کسی کو کوئی مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔"

ظہیر اٹھ کر میرے قریب آ گیا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولا "تم اگر نہیں بتانا چاہتے تو میں بھی ضد نہیں کروں گا عبداللہ..... بس اتنا یاد رکھنا کہ میں اور بگھا ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ تم بہت پیارے ہو مجھے..... جب کبھی ضرورت پڑی، صرف ایک آواز دے دینا ہمیں..... ہمیں اپنے ساتھ ہی پاؤ گے....."

"جانتا ہوں..... اور یہی مان مجھے تم دونوں پر بھی ہے..... اور اسی مان کے بھروسے میں آج چل کر تمہارے پاس آیا ہوں ظہیر..... اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ پولیس کے معاملے میں تمہارا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے مگر کبھی کبھی ہمیں اپنے دل کی آواز بھی سننی چاہیے..... اور میرا دل کہتا ہے کہ اے۔ ایس۔ پی اسد جھوٹ نہیں بول رہا۔ پولیس کو تمہاری موت سے زیادہ تمہارے زندہ رہنے میں فائدہ ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے میرا واحد مقصد تمہاری جان بخشی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نے اتنی بار چوٹ کھائی ہے کہ اب تم کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرو گے۔ یہ

تمہاری زندگی ہے اور اس کا فیصلہ بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔ میں نے کل شام مغرب کے وقت اس پولیس افسر سے بڑی درگاہ میں ملاقات طے کر رکھی ہے۔ میں اسے دیر تک وہیں الجھائے رکھوں گا تاکہ تم سرحد پار کرنے کی آخری کوشش کر سکو۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ پولیس اور بارڈر سکیورٹی فورس والوں نے پہلے ہی تمہارے لئے وہاں کڑا پہرہ اور پھندہ تیار کر رکھا ہوگا۔ میری دعا ہے کہ سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا تم نے سوچ رکھا ہے۔ تمہارے نکل جانے کے بعد میں بھی کل رات یہ قصبہ چھوڑ جاؤں گا۔ زندگی رہی تو تم سے شاید پھر کبھی ملاقات بھی ہو جائے۔ یہ کہانی ہماری جیل میں ملاقات والی رات سے شروع ہوئی تھی۔ اور شاید ہماری اس کہانی کی یہ آخری رات ہے۔ کیوں نہ ہم ایک بار پھر اسی طرح گلے مل کر ایک دوجے کو رخصت کریں جیسے جیل سے فرار والی رات ہم رخصت ہوئے تھے۔"

ظہیر اور بگھا میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور لپک کر مجھ سے لپٹ گئے۔ میری زبان سے صرف ایک جملہ ہی نکلا "الوداع..... میرے یارو..... الوداع....."

❋.....❋.....❋

باب49

جب میں سکندر کی حویلی سے نکلا تو رات ڈھلنے والی تھی اور دُور کسی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوتی سنائی دے رہی تھی۔ حویلی سے نکلتے وقت میری نظر زنان خانے کی عمارت پر پڑی جسے چراغاں کرنے کے لئے لڑیوں سے سجایا گیا تھا اور چھوٹے چھوٹے سے ہزاروں رنگین بلب جل بجھ رہے تھے۔ ساری حویلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی جیسے کوئی بارات اترنے والی ہو۔ ہاں..... یہ اُس کی بارات کی تو سب تیاریاں تھیں۔

حویلی کو یوں جگمگاتے دیکھ میرا دل بجھ سا گیا۔ روشنی اور چکا چوند ہم سب پر بھلا اپنا ایک سا اثر کب چھوڑتی ہے۔ میں درگاہ پہنچا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ مگر چہل پہل کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ میں چپ چاپ اپنے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ آج میرا اس درگاہ میں آخری دن تھا۔ ظہیر کے روانہ ہوتے ہی میں نے بھی اسی رات یہ علاقہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دن چڑھ گیا مگر میں حجرے سے باہر نہیں نکلا، تبھی کسی نے دھیرے سے حجرے کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے یونہی بے خیالی میں آنکھیں بند کیے ہی اجازت دے دی۔ ''آجاؤ اندر.....'' ضرور کوئی مجاور ہوگا جو میری خیریت دریافت کرنے آیا ہوگا۔ مگر اندر آنے والے کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''تمہارے آرام میں مخل ہونے کی مدرت چاہتا ہوں۔ مگر میرا تم سے ملنا بہت ضروری تھا'' آنے والا سکندر تھا۔

''تم..... یہاں..... اس وقت.....''

سکندر خاموشی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا ''ہاں..... کبھی کبھی کچھ سوالات کے جواب لینے کے لئے ہمیں اپنی حدوں سے نکل کر بہت دور تک جانا پڑتا ہے.....''

''پوچھو..... کیا سوال پوچھنا چاہتے ہو۔''

سکندر نے میری آنکھوں میں جھانکا ''صرف اتنا بتا دو..... ایسی کون سی شفاء ہے تمہارے پاس..... کہ لوگ دور دور سے تمہارے پاس خود چل کر آتے ہیں.....''

میں نے سر جھکا دیا ''میں بھلا کسی کو کیا شفا دوں گا۔ میں تو خود شفا کی طلب میں در بدر بھٹک رہا ہوں۔ تم تو جانتے ہو..... یہ سب ایک بہروپ ہے، جیل کی سزا کاٹ کر آیا ہوا ایک سزا یافتہ ملزم ہوں میں..... بس دکھاوے کے لئے یہ سوانگ رچا رکھا ہے تاکہ کسی کی نظر میں نہ آسکوں.....''

سکندر نے ایک گہری سانس لی ''ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... خوب سوانگ بھرا ہے تم نے..... اسی لئے مجھے

اس عبداللہ کے پیچھے چھپے ماضی کو ڈھونڈنے کے لئے بہت دور جانا پڑا..... چلو اب تم خود ہی بتا دو..... کب تک خود کو یوں چھپائے پھرتے رہو گے ساحر....."

میں سکندر کی زبان سے اپنا دوسرا نام سن کر اُچھل ہی تو پڑا۔ "یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم..... ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے....."

سکندر نے ایک لمبی سانس بھری "غلط فہمی ہی دور کرنے کے لئے آج تمہارے پاس آیا ہوں۔ ماں جی نے مجھے بتایا تھا کہ زہرہ کی بیماری کی ابتداء اسی دن سے ہوئی تھی جب وہ پہلی مرتبہ ان کے ساتھ اس درگاہ کی زیارت کو آئی تھی اور تبھی وہ چکرا کر یہاں گر پڑی تھی۔ یقیناً اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تھا، اور پھر اس کے بعد جتنی بار بھی تم دونوں کا سامنا ہوا، اس کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ مگر میں یہ راز کبھی نہ جان پاتا اگر اس روز میں تمہیں بھی زہرہ کے پیچھے نیلے گنبد والی درگاہ سے نکلتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی عبداللہ....."

سکندر بولتا رہا اور میرے ذہن میں جھکڑ سے چلتے رہے۔ مجھے زہرہ کے ابا جی کی بات یاد آ گئی "اگر تم یہاں رہے تو تم دونوں کا ماضی کبھی نہ کبھی سامنے ضرور آ کر رہے گا....."

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی "ماضی کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے سکندر..... کاش ہمارا ماضی پوشیدہ ہی رہتا تو اچھا تھا۔ زہرہ میرا کل تھی..... اور تمہارا آج ہے..... اس کا تم سے نکاح طے ہو چکا ہے اور اس روز وہ مجھ سے یہی کہنے آئی تھی کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ جانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ ظہیر نے جیل سے فرار ہوتے وقت یہی علاقہ چھ ماہ بعد ملنے کے لئے طے کر لیا تھا۔ مجھے اگر ذرہ سا بھی شک ہوتا کہ زہرہ تمہارے بھائی سے بیاہ کر اسی قصبے میں آئی ہے تو میں کبھی اس طرف کا رُخ نہ کرتا۔ تم بس آج رات تک صبر کر لو..... میں ظہیر کے سرحد پار کرتے ہی یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ میرے پاؤں میں تو سدا کا چکر ہے، میری کوئی منزل کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے مگر زہرہ کو ایک گھر کی ایک چھت کی ضرورت ہے جو اسے صرف تم دے سکتے ہو۔ وہ بہت معصوم ہے، بہت پاکیزہ ہے سکندر..... اُمید ہے تم کبھی اسے اس کے ماضی میں مجھ سے جڑے کسی رشتے کا طعنہ نہیں دو گے..... تمہارے ظرف پر بڑا مان ہے مجھے....."

سکندر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا میری بات سنتا رہا۔ اور پھر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا "کاش یہی ظرف، یہی مان مجھ پر زہرہ اور اس کے خاندان نے بھی رکھا ہوتا تو خوشی ہوتی مجھے..... مگر انہوں نے مجھ سے اور ماں جی سے یہ بات چھپائے رکھی....."

سکندر حجرے سے نکل گیا اور جاتے جاتے میرے لئے پریشانیوں اور وسوسوں کے بہت سے نئے روا کر گیا۔ جانے یہ حقیقت جاننے کے بعد سکندر اور اس کے گھر والوں کا کیا رویہ ہونے والا تھا۔ میں اسی فکر میں بیٹھا گھلتا رہا اور شام ڈھلنے لگی۔ تبھی مجھے مجاور نے آ کر بتایا کہ باہر اے۔ ایس۔ پی اسد اور چند دوسرے پولیس والے صحن میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں ٹوٹے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اسد نے مجھے دیکھتے ہی دور سے کہا "دیکھو عبداللہ..... ہم وعدے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں۔ مغرب ڈھلنے والی ہے۔ مجھے اُمید ہے آج تم مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ گے....."

میں نے نظریں جھکالیں۔ ''کاش میں تمہیں کوئی اچھی خبر سنا پاتا آفیسر..... مگر مجرم کو پولیس پہ اعتبار کچھ کم ہی آتا ہے۔ ظہیر کو بھی ابھی تک یہی شک ہے کہ پولیس اسے گرفتار کرنے کی بجائے کسی جعلی پولیس مقابلے میں ختم کردے گی۔ میں اسے قائل نہیں کرسکا.....''

اسد نے ایک گہری سانس لی ''گویا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے..... اور ایک دوست نے دوسرے دوست کی بات کا بھرم نہیں رکھا، کاش وہ تمہاری بات مان جاتا عبداللہ..... میں تو آج بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں.....''

تبھی پیچھے سے ایک آواز ابھری ''وہ دوست ہی کیا جو دوسرے دوست کا بھرم نہ رکھے اے۔ ایس۔ پی صاحب..... ظہیر کبھی تم لوگوں کے ہاتھ زندہ نہ لگتا..... اگر یہ میرا دوست مجھے اپنی دوستی کا واسطہ نہ ڈال دیتا.....''

ہاں..... وہ ظہیر ہی تھا۔ جو بگھے کے ساتھ اپنی آنکھوں میں آنسو لئے مزار کے داخلی دروازے پر کھڑا تھا۔ میں تڑپ کر ظہیر کی طرف لپکا۔ پولیس والوں نے یوں ظہیر کو سامنے کھڑے دیکھا تو ان کے ہوش اُڑ گئے اور عملے نے ظہیر پر اسلحہ تان لیا۔ مگر اسد نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے اسٹاف کو پستول اور بندوقیں نیچے کرنے کا کہا۔ میں ظہیر اور بگھے سے لپٹ کر رو پڑا۔

''تم آگئے میرے یار..... میرا مان رکھ لیا تم نے..... یہ صرف تم ہی کرسکتے تھے میرے دوست.....''

اسد نے آگے بڑھ کر ظہیر کو غور سے دیکھا ''بہت بھگایا ہے تم نے ہمیں ظہیر..... بہت خواری کاٹی ہے ہم نے تمہارے پیچھے..... مگر آج تم نے اپنے دوست کی بات مان کر بہت عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ تم ہم سے بچ کر کبھی یہاں سے نکل نہ پاتے..... سرحد پر موت تمہارا انتظار کررہی تھی آج رات.....''

ظہیر نے مسکرا کر میرا ہاتھ تھام لیا ''موت سے کون ڈرتا ہے اے۔ ایس۔ پی صاحب..... موت تو مجھے پھانسی کے پھندے پر بھی آجانی تھی..... مگر میں اپنے یار عبداللہ کا دل توڑ کر نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اب لے چلو مجھے جس زندان میں لے جانا ہے۔ میں نے خود کو تمہارے حوالے کیا.....''

بگھا بھی قریب کھڑا رو رہا تھا۔ اسد نے اپنے کسی ماتحت کو اشارہ کیا۔ اس نے ہتھکڑی نکال کر ظہیر کے ہاتھوں میں ڈال دی۔ اسد نے میری طرف دیکھا ''تم فکر مت کرو عبداللہ..... میں پوری کوشش کروں گا ظہیر کو سلطانی گواہ بنوانے کی۔ اور تم نے جو قانون کی مدد کی ہے..... یہ بھی ہمیشہ یاد رہے گا مجھے.....''

ظہیر نے جاتے جاتے ایک بار پھر مجھے اور بگھے کو زور سے گلے لگایا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''ہم تم سے ملنے آتے رہیں گے۔ فکر مت کرنا، بگھا تمہارے ساتھ ہی ٹھہر جائے گا، تاکہ تمہارے گھر والوں کو بھی تسلی دے سکے۔ میں بھی صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل پڑوں گا۔ صرف آج رات حاکم بابا کی اجازت لینے کی مہلت درکار ہے مجھے۔''

ظہیر نے میرا شانہ تھپتھپایا ''تم میری فکر مت کرو۔ میں اب سکون میں ہوں۔ بہت بھاگ لیا میں نے..... بہت تھکا لیا خود کو..... اب آرام کرنا چاہتا ہوں..... اور جیل سے زیادہ آرام دہ جگہ اور کیا ہوگی بھلا.....''

ظہیر مسکرا کر مجھے تھپکتے ہوئے پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گیا، میری درخواست پر بگھے کو بھی انہوں نے ظہیر کے ساتھ ہی سوار کرلیا۔ اسد مجھ سے ہاتھ ملا کر پلٹا اور کچھ لمحوں میں ہی پولیس کی گاڑیاں صحرا کے اندھیرے میں گم ہوگئیں۔ میرے دل سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اسد اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ وہ بات کا

کھرا انسان لگا تھا مجھے۔

اسی لمحے میرے دل سے ظہیر کے لیے دعا نکلی کہ اللہ ہمیشہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ اب میرا بھی اس درگاہ میں مزید پڑے رہنے کا کوئی مقصد باقی نہیں بچا تھا۔ میں نے فجر کی نماز کے بعد شہر واپسی کا فیصلہ کر لیا اور عشاء کی نماز ختم ہوتے ہی اجازت لینے کے لئے حاکم بابا کے حجرے میں داخل ہو گیا۔ وہ مراقبے میں بیٹھے تھے۔ میں بھی چپ چاپ ایک جانب بیٹھ کر ان کے ارتکاز کے خاتمے کا انتظار کرنے لگا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں تو عبداللہ میاں..... رختِ سفر باندھ لیا تم نے....."

میں نے سر جھکا لیا "جی..... اگر آپ کی اجازت ہو تو....."

حاکم بابا نے ایک گہری سانس لی "ٹھیک ہے..... اگر تمہاری یہی مرضی ہے..... تو یونہی سہی..... مگر یاد رہے جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے....."

میں نے انہیں بتایا کہ میں فجر کی نماز کے بعد نکل جاؤں گا یہاں سے۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے سوچتے رہے اور پھر دھیرے سے بولے "صبح فجر کے بعد مجھے کسی ضروری کام سے قصبے جانا ہے۔ میری واپسی کا انتظار کرنا۔ ملے بغیر نہ چلے جانا۔ اُمید ہے شام ڈھلنے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ ہاں اگر عصر کے بعد بھی نہ لوٹوں تو پھر تم آزاد ہو پلٹ جانے کے لئے....."

میں چپ چاپ اُٹھ کر اپنے حجرے میں چلا آیا۔ رات بھر میرا دل عجیب سی بے یقینی اور اُداسی کا شکار رہا۔ کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ ایک آخری فیصلہ کر لینے کے بعد ہمارے اندر کی بے چینیوں کو آرام آ جائے گا۔ مگر یہ صرف ہماری ایک خوش فہمی ہی ثابت ہوتی ہے۔ میری ساری خوش فہمیاں بھی ایک رات میں ہی ہوا ہو گئیں اور صبح ہونے تک پھر سے وہی انجان سی بے کلی میرے دل کو تڑپانے لگی۔

کیسے کیسے کھیل کھیلتا ہے یہ دل ہمارے ساتھ، میں دن چڑھے تک حاکم بابا کے حکم کے مطابق ان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ واپس نہیں پلٹے آخر کار عصر کی نماز بھی ہو گئی۔ مجھے مغرب سے پہلے قصبے کے ریلوے اسٹیشن سے بڑے شہر کے لئے گاڑی پکڑنا تھی، ورنہ مجھے اگلی شام تک انتظار کرنا پڑتا کیونکہ دن میں صرف ایک گاڑی ہی اس چھوٹے سے اسٹیشن پر رکتی تھی۔ آخر کار حاکم بابا کی واپسی سے مایوس ہو کر میں نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور درگاہ کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ تبھی مجھے لاٹھی ٹیکتے، مسکراتے حاکم بابا اندر آتے دکھائی دیئے۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ.....؟ میں تو مایوس ہو کر بس جانے ہی والا تھا....."

وہ دھیرے سے مسکرائے "ہمیشہ کی طرح آج بھی جلد باز ہو..... مایوسی کفر ہے..... اور میں تو جلدی آ جاتا، مگر بڑی حویلی کی مالکن نے روک لیا۔ شادی کا گھر ہے ناں..... ہزار بکھیڑے ہوتے ہیں..... اور دیکھو..... وہ خود آئی ہیں تمہیں شادی کا دعوت نامہ دینے..... بھئی میں نے تو کہہ دیا تھا کہ عبداللہ میاں اب رُکنے والے نہیں ہیں۔ مگر میری ایک نہیں سنی..... خود ہی چلی آئیں یہاں....."

میں نے درد اور کرب سے تڑپ کر حاکم بابا کی طرف دیکھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ میرے

زخموں پر کیوں نمک چھڑک رہے تھے۔ تبھی پیچھے سے بڑی سرکار کی آواز اُبھری۔ ''چھوٹے سائیں جی..... میں نے تو آپ کو کہا بھی تھا کہ آپ بالکل میرے سانول جیسے لگتے ہو۔ تو اس ناطے تو میرا بھی آپ سے ماں والا رشتہ ہوا ناں..... تو پھر ایک ماں کی خوشی میں شریک ہوئے بغیر ہی چلے جاؤ گے کیا.....؟''

میں نے بات بنانے کی کوشش کی ''میں رک جاتا مگر کسی سے وعدہ کیا ہے۔ نہ گیا تو وعدہ خلافی ہو جائے گی۔ آپ کو اور سکندر کو بہت بہت مبارک ہو یہ نیا رشتہ.....''

وہ افسردہ سے لہجے میں بولیں ''اچھا..... اگر وعدہ نبھانے کی بات ہے تو پھر میں نہیں روکتی..... لیکن جس سے وعدہ کیا ہے..... اگر وہی تمہیں روک لے تو پھر.....؟ پھر تو رُکو گے ناں.....''

میں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ تبھی زہرہ اور سکندر ان کے پیچھے مزار کی سیڑھیاں چڑھتے نظر آئے اور ان کے عقب میں زہرہ کے ماں باپ بھی سر جھکائے یہیں آتے دکھائی دیئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ زہرہ کی نظر مجھ سے ٹکرائی تبھی سکندر بولا ''تم کیا سمجھتے تھے عبداللہ..... ایسے ہی بچ کر نکل جاؤ گے..... بہت سے سوالوں کے جواب ابھی ادھار ہیں تم پر..... ان کا جواب دیئے بغیر کیسے جا سکتے ہو تم.....''

میں نے گھبرائی ہوئی زہرہ کا چہرہ اور اس کے شرمندہ ماں باپ کے جھکے ہوئے سر دیکھے اور سکندر سے کہا ''یہ اب تمہارے گھر کی عزت بننے جا رہی ہے۔ اسے یوں سب کے سامنے رسوا نہ کرو سکندر..... زہرہ اور میرا رشتہ ماضی کی بات ہے جو ماضی کے ساتھ ہی دفن ہو چکا۔ یہ جب پہلی مرتبہ تمہاری حویلی میں ڈولی اتری تھی۔ تب سے یہ صرف تمہارے ہی خاندان کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہ تمہاری ناموس ہے..... اسے یوں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہ کرو سب کے سامنے.....''

سکندر چپ چاپ میرے لہجے کی تلخی برداشت کرتا رہا اور پھر اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا ''میں نے کہا تھا ناں ماں جی..... عبداللہ کبھی اپنی زہرہ کے نام پر کوئی حرف نہیں آنے دے گا.....''

بڑی سرکار نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''اگر زہرہ کو میرے گھر کی ناموس سمجھتے ہو تو ایک ماں کی خواہش پوری کر دو چھوٹے سائیں جی..... میری حویلی کی غیرت پر اپنی عزت کی چادر ڈال دو آج..... اپنا لو میری زہرہ کو.....''

میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ ''بڑے سائیں نے ہمیں سب بتا دیا ہے ورنہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو جاتا۔ مجھے اپنے سکندر کی خوشی بہت عزیز ہے مگر اس سے کہیں زیادہ مجھے میری زہرہ پیاری ہے۔ میں جانتی ہوں یہ اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہے گی۔ اور خود کو ہم سب کی خوشی پر قربان کر دے گی مگر میں نے صرف زبان سے ہی اسے اپنی بیٹی نہیں کہا..... دل سے بیٹی مانا ہے۔ اور چھوٹے سائیں جی..... آج میں اور میرا سکندر تمہارے پاس یہی درخواست لے کر آئے ہیں کہ ہماری یہ درخواست مان لو..... اسی میں ہم سب کی خوشی ہے..... ہم سب کا مان ہے.....''

مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا جسم لرز رہا ہے۔ اتنی بڑی کایا پلٹ ..... میری ذرہ سے دربدری کا اتنا بڑا انعام.....؟ سکندر نے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس..... ختم کرو اب اپنا یہ جوگ عبداللہ....."

میں نے بھیگی پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی رو رہے تھے۔ ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ صرف حاکم بابا ہی تھے جن کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکان تھی۔

"چلو تو پھر طے ہوا کہ عبداللہ میاں کا زہرہ بٹیا سے نکاح اسی تاریخ کو ہوگا جو تاریخ بڑی حویلی والے پہلے ہی طے کر چکے ہیں....."

بڑی سرکار بھی مسکرائیں "ٹھیک ہے بڑے سائیں جی..... پر شرط یہی ہے کہ یہ نکاح آپ ہی پڑھائیں گے....."

حاکم بابا نے مسکرا کر سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں "جب جب جو جو ہونا ہے..... تب تب سو سو ہوتا ہے....."

وہ سب مجھے اور زہرہ کو وہیں درگاہ کے صحن میں تنہا چھوڑ کر حاکم بابا کی دعوت پر ان کے حجرے کی طرف بڑھ گئے۔ ہم کچھ دیر چپ کھڑے رہے۔ بس ہمارے درمیان کی خاموشی بولتی رہی۔ کبھی کبھی شادی مرگ بھی کسی مرض کی طرح ہمارے لفظ چھین لینے کا سبب بن جاتی ہے۔ لمحے بھر میں ہماری دنیا بدل جاتی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، برسوں کا ضبط ختم ہونے کے بعد آج وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں نے قریب جا کر دھیرے سے کہا:

"آج جی بھر کے رو لو..... کیونکہ آج کے بعد مجھے تمہاری یہ آنکھیں صرف مسکراتی اور جگمگاتی ہی نظر آنی چاہئیں....."

اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا "یہ تو کسی کے ساتھ پر منحصر ہے..... کہ کوئی کتنا ساتھ دیتا ہے..... تم ساتھ رہو گے تو میری نظر بھی ہمیشہ جگمگاتی رہے گی ساحر....."

میں نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا "ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ تو کر سکتا ہوں..... ساتھ چلنے کا نہیں..... سوچ لو..... ایک جوگی کا ساتھ نبھا پاؤ گی عمر بھر..... جس کا کوئی گھر نہ کوئی ٹھکانہ....."

وہ بھی دھیرے سے مسکرا دی "مجھے اس جوگی کے گھر میں نہیں..... دل میں ٹھکانہ چاہیے..... اس بنجارے کو کیسے باندھنا ہے یہ میں خوب جانتی ہوں۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔"

وہ مسکرائی تو یوں لگا جیسے دھند کے سارے بادل، سارا کہر اچھٹ گیا ہو۔

"اچھا..... تو باندھ کر رکھنے کے ارادے ہیں جناب کے۔"

وہ ہنس پڑی "ہاں..... اب تو لگتا ہے جیسے پلو سے باندھ کر ہی رکھنا پڑے گا۔"

"اب کہیں نہیں جانے دوں گی تم کو صاحب..... اب تو جہاں تم..... وہاں ہم..... اور میرے بغیر کہیں جانے کی کوشش کی تو شکایت لگاؤں گی سلطان بابا سے....."

ہم دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔ فلک مسکرایا اور زمین بھی مسکائی۔ پیچھے غروب ہوتے سورج نے ہم دونوں سے کہا۔ "نیا ساتھ مبارک..... دل سے دل کی بات مبارک....."

اور ہم دونوں نے ایک ساتھ مسکرا کر کہا "خیر مبارک....."

..... ختم شد .....



E-mail-hashimnadeem@gmail.com

Pride of Performance
Urdu Literature 2011

ہاشم ندیم ملک کے مایہ ناز ڈرامہ نگار اور نوجوان نسل کے پسندیدہ ترین ناول نگار ہیں۔ جن کی ادبی خدمات پر انہیں 2011ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا ہے۔

ان کی جائے پیدائش کوئٹہ ہے ابتدائی تعلیم کے بعد کیڈٹ کالج پشاور سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ بولان میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم کے دوران ہی 1996ء میں سول سروس جوائن کی اور بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی نوکری کے فرائض سرانجام دیئے اور اس وقت حکومت بلوچستان میں بطور سیکرٹری تعینات ہیں۔

ہاشم ندیم کے ناول ''عبداللہ'' کو خاص طور پر ملک کی نوجوان نسل کو دوبارہ ناول کی صنف سے رغبت دلانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''خدا اور محبت''، ''بچپن کا دسمبر''، ''ایک محبت اور سہی'' ''مقدس''، ''پری زاد'' وغیرہ شامل ہیں۔

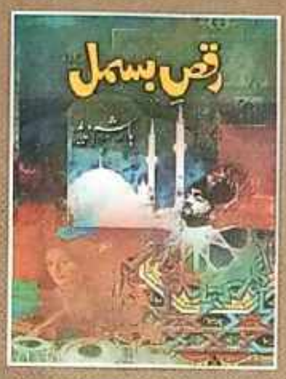





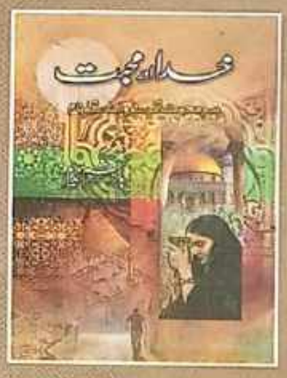



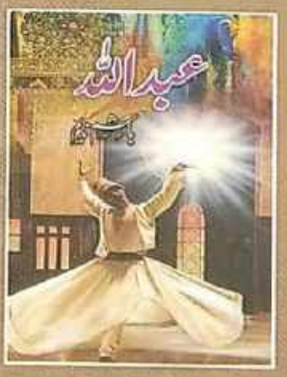





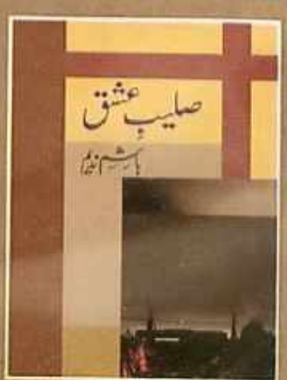



Rs: 1500/-

ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
37223584'37232336'37352332
www.ilmoirfanpublishers.com
ilmoirfanpublishers1@gmail.com
www.facebook.com/ilmoirfanpublishers

95-Y Block Commercial, Basement Phase-3 DHA Lahore
+92 331 41 99 827 | +92 336 4633908
www.lahorebookcity.com
yasirfaraz94@gmail.com

Design By: 0300-4529821
MUHAMMAD AHSUN Gull

صلیبِ عشق

ہاشم ندیم



فہرست

-1	رین کوٹ	(نظم)	9
-2	پری زاد	(افسانہ)	12
-3	لفظ گر	(افسانہ)	25
-4	لنڈا بازار	(نظم)	31
-5	صلیبِ عشق	(افسانہ)	36
-6	کیفِ فراق	(افسانہ)	42
-7	جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے	(نظم)	50
-8	میرا نیا دوست	(اداریہ)	54
-9	رانگ نمبر	(افسانہ)	59
-10	رین کوٹ	(افسانہ)	63
-11	21 مئی.....	(نظم)	68
-12	توبہ اور استغفار	(افسانہ)	70
-13	جلاد	(افسانہ)	78
-14	جان نشین	(افسانہ)	87
-15	محبتوں کے پگھلتے گلیشیئر	(نظم)	94

رین کوٹ (نظم)

(Rain Coat)

دیکھو پھر سے.....
خزاں کی پہلی جھڑی ہے.....
اور میں.....
اس ویران ریلوے اسٹیشن کے
تنہا بینچ پر گم سم بیٹھا.....
جانے کب سے بھیگ رہا ہوں
سرخ، زرد گرتے پتوں کی چادر
میرے وجود کو ڈھانپنے کی
ناکام کوشش میں.....
میرے قدموں میں بکھرتی جا رہی ہے

ٹھنڈی، بھیگی اور سرسراتی ہوا.....
میری نم آنکھوں کو چھو رہی ہے.....
میرے ہاتھ میں.....
خشک گلاب کی چند پتیاں ہیں
جو صبح رین کوٹ پہنتے ہوئے
میری جیب سے گر گئیں تھیں.....
تمہیں یاد تو ہو گا نا
چند سال پہلے.....
جب ہم ابھی بچھڑے نہ تھے.....اور
خزاں کی ایک ایسی ہی گلابی شام میں
جب برستی بوندوں نے ہمیں گھیر لیا تھا
تب تمہیں گھر چھوڑتے وقت، واپسی پر
میں نے یہ رین کوٹ
تمہارے لرزتے، کانپتے شانوں پر ڈال دیا تھا.....
اگلے دن تمہارا پیامبر
یہ رین کوٹ تو واپس کر گیا.....
پر جاتے جاتے یہ مژدہ بھی سنا گیا.....
کہ تم اس رین کوٹ کی جیب میں لگے
اس گلاب کی پتیاں خشک ہونے سے پہلے

لوٹ آؤ گی.....
تب سے خزاں کی یہ بھیگتی شام
میں یہ رین کوٹ، کاندھوں پر ڈالے
اور یہ چند خشک پتیاں ہاتھوں میں لیے
تمہارے انتظار میں.....
اس ٹھٹھرتے پلیٹ فارم پر آبیٹھتا ہوں
لیکن شاید تمہیں
یہ مرجھائی ہوئی چند خشک پتیاں
اب یاد بھی نہ ہوں گی.....
اور اس بھیگتی شام میں
تمہارے کومل ہاتھ
کسی اور کے رین کوٹ کے کالر میں
کوئی تازہ گلاب
سجا رہے ہوں گے.....

(ہاشم ندیم خان)

''پری زاد'' (افسانہ)

مائیں عام طور پر اپنے سب سے کم رو بچے کا سب سے زیادہ خوبصورت نام رکھتی ہیں۔ شاید وہ اس نام کے ذریعے اپنے جگر گوشے کی کمزوریاں چھپانے کی ایک آخری لیکن ناکام کوشش کرتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پری زاد کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ ایک غریب کلرک کے گھر میں پیدا ہونے والا ساتواں بچہ تھا۔ گہرے سانولے رنگ کا ایک کمزور سا مریل بچہ..... جو شروع کے سات آٹھ دن وارڈ کے انکیوبیٹر میں مشین کے سہارے زندہ رہا اور گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود پرانے بچوں کی گنتی میں صرف ایک اضافے کے طور پر گنا جاتا تھا۔ اُس کے ماں باپ اسے پیدا کرنے کے دو تین سال بعد اُسی طرح بھول گئے جیسے وہ اُس سے پہلے کے چھ بچوں کو بھلا چکے تھے۔ غریب کو ویسے بھی مہنگائی اپنے سوا مزید کوئی اور چیز یاد ہی کہاں رہنے دیتی ہے؟ سو پری زاد کا باپ بھی باقی سب کچھ بھلا کر اُن کے پیٹ کا جہنم بھرنے کی فکر میں لگا رہتا اور ماں عمر بھر بچوں کا بچا کھاتی .....اور چار جوڑوں کے کپڑے میں سے سات جوڑے بنانے کی دُھن میں جٹی رہی۔ اُسے بھلا بچوں کی تربیت کا خیال کہاں سے آتا؟ ویسے بھی غریب گھرانوں کے بچے اپنی تربیت خود آپ کرتے ہیں.....ان کی گلی، محلہ اور سڑک ان کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے اور ٹاٹ والا اسکول دوسری درس گاہ۔ پری زاد کو بھی پانچ سال کی عمر میں ایک ایسے ہی ٹاٹ والے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ وہاں اس کے ہم جماعت اور اساتذہ کو جب اس کا نام پتہ چلتا تو وہ زیرلب مسکرا دیتے، کچھ بدتمیز بچے باقاعدہ قہقہے لگا کر ہنستے لیکن پری زاد کے پاس اپنے نام کا کوئی نعم البدل موجود نہیں تھا۔ قدرت نے اُسے ایک غریب گھرانے میں اور کم شکل پیدا کر کے اتنا بڑا ظلم نہیں کیا کیونکہ ایسے ہزاروں لاکھوں بچے ایسے گھرانوں میں پیدا ہوتے اور پل کر

جوان ہوتے رہے ہیں۔ پری زاد کے ساتھ مقدر کا اصل مذاق اُس کے اندر پلتا اس کا انتہائی حساس اور نازک دل تھا۔ کاش انسان کے سینے میں دھڑکتا دل بھی اس کی حیثیت اور شکل وصورت کی مناسبت سے حساس یا بے حس ہوتا تو دنیا کتنی آسان جگہ ہو جاتی ہم سب کے رہنے کے لیے.....لیکن یہ جہاں کم ہی خوش نصیبوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور پری زاد اُن میں شامل نہیں تھا۔ ایک اور ستم یہ ہوا کہ پانچویں جماعت میں بداحتیاطی اور وقت پر ٹیکہ نہ لگانے کی وجہ سے اُسے چیچک ہوگئی اور جنم سے گہرا سانولا چہرہ چیچک کے داغوں سے مزید دھندلا گیا۔ وہ پہلے تنہا تھا، اب تنہا تر ہوتا چلا گیا۔ مقدر کے مذاق یہیں ختم نہیں ہوئے۔ لڑکپن آتے ہی پری زاد کو حقیقت کا ادراک ہونے لگا کہ نصیب نے اُسے ایک حسن پرست دل سینے کے پنجرے میں بند کر کے سونپ دیا ہے۔ عورت کی خوبصورتی اور حسن اس کے اندر ایک عجیب سا تلاطم پیدا کر دیتا تھا۔ اس کی نظریں غیر محسوس طور پر دل فریب چہروں کو اپنے آس پاس تلاشتی رہتیں اور نظر آجانے کی صورت میں وہ غیر شعوری طور پر اُسی دل کش چہرے کے گرد چکر کاٹتا رہتا تھا لیکن ایک بدصورت چیچک زدہ صورت کی موجودگی اپنے آس پاس بھلا کون محسوس کرنا چاہے گا؟ سو پری زاد بھی ایسی ہی محفل میں غیر محسوس شدہ رہتا اور اگر کبھی غلطی سے کسی کی نظر اس پر پڑ بھی جاتی تو سوائے چند معنی خیز مسکراہٹوں اور تضحیک آمیز فقروں کے اُس کے حصے اور کچھ نہ آتا۔ مگر پری زاد اپنے اندر دھڑکتے اُس من چلے کا کیا کرتا جو ہر بار پھر اُسی محفل میں جانے کی ضد کرتا جہاں سے ہمیشہ اسے صرف دھتکار ہی ملی تھی۔

پری زاد نے اپنے دل کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ حسن اور روپ کا یہ امرت اُس کا نصیب نہیں لیکن ''نادان'' بھلا کب سمجھے ہیں اور دل کس کا دوست ہوا ہے؟ دشمن اگر نادان بھی ہو تو دشمنی رسوا ہو جاتی ہے۔ پری زاد بھی اپنے دل کی دشمنی کو جھیل رہا تھا۔ دل تو شاید کبھی اس پر ترس کھا بھی لیتا مگر اس کے اندر چھپا بیٹھا وہ ایک موسیقار بڑا بے رحم تھا۔ لڑکپن شروع ہونے سے پہلے ہی پری زاد کو ایک عجیب سا ادراک ہوا کہ اس کی روح کے تار موسیقی کی مدھر تانوں سے بے تحاشہ بجنے لگتے ہیں۔ مختلف میلوڈیز اُسے ہر بار ایک نئے جہاں میں لے جاتیں اور وہ اپنی ظاہری بدصورتی کو بھول کر چند لمحوں کے لیے ان رس گھولتی ساعتوں کے دھاگے تھام کر شہزادہ بن جاتا ہے۔ اس کے آس پاس پریوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا اور وہ راجہ اندر بنے ان سب کے درمیان بے نیاز سا گھومتا رہتا ہے۔ موسیقی سن کر کبھی وہ اپنے اسکول کا بہترین مقرر بن جاتا اور سارا ہال اس کی جوشیلی تقریر سن کر تالیاں پیٹ پیٹ کر آسماں سر پر اٹھا لیتا۔ کبھی وہ کھلاڑی بن کہ آخری لمحوں میں اپنی ٹیم کو جیت دلا دیتا اور کبھی کسی جنگ کے میدان میں کشتوں کے پشتے لگاتا ہوا اپنی محبوبہ کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے جاتا.....لیکن جیسے ہی موسیقی یا نغمے کی وہ میٹھی تان ختم ہوتی، پری زاد اپنی حقیقت کی مکروہ دنیا میں واپس پہنچ جاتا۔ بچے زیادہ ہوں تو ماں باپ اُن کی حساسیت کے پیمانے غلط ملط کر بیٹھتے ہیں۔ اور صرف ان کی عقل کی

سکول پر نہیں پڑھنے لگتے ہیں۔ اور عموماً ان حالات میں سب سے بڑا بچہ اور پھر ترتیب وار اس کے بعد باقی چھوٹے بچے والدین کے حساب سے زیادہ عقل مند ٹھہرائے جاتے ہیں اور اسی ترتیب اور حساب سے گھر میں نہیں اہمیت بھی دی جاتی ہے۔ اس کلیے سے پری زاد اپنے ماں باپ کی اہمیت کی فہرست میں سب سے آخر میں آتا تھا بلکہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اہمیت عموماً ختم ہو جاتی تھی۔ پری زاد آٹھویں جماعت میں تھا جب اُس نے پہلی مرتبہ کسی کو پیانو بجاتے دیکھا۔ اسکول کی ایک تقریب میں ملی نغموں کے مقابلے کے لیے ان سب کو کسی انگریزی میڈیم اسکول لے جایا گیا اور وہاں ایک پیاری سی ٹیچر کو پری زاد نے پیانو کے تار چھیڑتے دیکھا تو اس کے من کے تار بھی بج اُٹھے۔ پری زاد کو پہلی نظر میں ہی اس ٹیچر سے محبت ہوگئی جس کا نام بھی اُسے معلوم نہیں تھا اور اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ دنیا میں صرف پیانو بجانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ تقریب ختم ہوگئی لیکن پری زاد کی روح کے اندر بجا پیانو کبھی بند نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ کبھی اُس من موہنی پیانو بجانے والی اُستاد کو نہیں دیکھا مگر وہ عمر بھر پری زاد کے اندر پیانو بجاتی رہی۔ دسویں کے بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنے باپ سے پیانو کی فرمائش کی تو اُسے زوردار ڈانٹ کے ساتھ بے ہودہ مشاغل سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی۔ حالانکہ اُس نے صرف شہر کے عیسائی محلے میں ایک اُستاد سے سارے دن میں صرف ایک گھنٹے کی کلاس لینے کی درخواست کی تھی۔ مجبوراً پری زاد کو اپنے اندر کی مدھر تانوں بھری دنیا سے ناطہ جوڑنا پڑا۔ ان دنوں اُس کے محلے کی ایک حسیں، ناہید کا بڑا چرچا تھا، جس کی لٹ کے ایک بل پر ہزار قدموں کی راہیں مڑ جاتی تھیں اور جس کے ابرو کا ایک خم ہزار دلوں کی دھڑکن پلٹ سکتا تھا۔ پری زاد بھی اُس کی ایک ترچھی نظر کا شکار مگر وہ اپنی کم مائیگی اور محدودیت سے واقف تھا لہٰذا اُس نے صرف اپنی نظر کو ناہید کے سراپے کو نہارنے کی اجازت دی لیکن اُس کی زبان ہمیشہ جبڑے کے پیچھے پابند سلاسل رہی۔ مگر ایک دن کچھ عجیب واقعہ ہوا۔ پری زاد کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کی بڑی بہن نے آکر اُسے بتایا کہ باہر صحن میں ناہید کھڑی اس کا پوچھ رہی ہے۔ پری زاد کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ جانے وہ کس طرح ہمت جتا کر ناہید کے سامنے پہنچا۔ ناہید کے ہاتھ میں میٹرک کی اُردو کی کتاب تھی اور وہ پری زاد سے اپنے آنے والے بورڈ کے امتحانات کی تیاری کے لیے چند غزلوں کی تشریح کروانے کے لیے آئی تھی۔ پری زاد کو زندگی میں پہلی مرتبہ اُردو زبان پر بے تحاشہ پیار آیا اور اپنی اُردو میڈیم پڑھائی کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اُس نے ناہید کو تو سمجھا دیا پر اپنے دل کی ساری غزلوں کی تشریح بھول گیا۔ کئی دن تک تو اُسے یقین ہی نہیں آیا کہ ناہید اس کے روبرو بیٹھی ہوئی اس سے باتیں کر رہی تھی اور اُس کی کہی سن رہی تھی۔ کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں ناہید کی، سرمئی جھیلوں جیسی..... چمکیلی..... روشنی بھری..... گلابی عارض پر ڈھلتی ارغوانی شام کی شفق جیسی ہلکورے لیتی ہوئی..... بولتی ہوئی آنکھیں..... ان چند لمحوں کا خمار کئی دن تک پری زاد کے حواس پر چھایا رہا..... لیکن پھر ایک دن محلے میں جنم لیتی ایک افواہ نے پری

زاد کے اندر کی تانوں کو پھر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ناہید کی چھت پر رات کے اندھیرے میں کسی ''چوکنے'' محلے دار نے ناہید کو محلے کے سب سے گبھرو اور گورے چٹے نوجوان ماجد کی بانہوں میں لپٹے دیکھ لیا تھا۔ محلے کے بزرگ اس حادثے پر سر پیٹ رہے تھے اور جوان سوگ مناتے رہے لیکن پری زاد کو ایک عجیب سی اُداسی نے آگھیرا۔ وہ دل ہی دل میں ناہید کو اپنے اندر کی دنیا کی شہزادی کا درجہ دے چکا تھا اور ناہید کی اس ''بے وفائی'' پر اس کا دل یوں ٹوٹا جیسے کوئی محبوبہ رقیب کے ساتھ چل دی ہو۔ اُس کا نادان دل کبھی سمجھ ہی نہیں پایا کہ حسینوں کو سدا حسین ہی بھاتے ہیں۔ اُس جیسے بدصورت کی وہاں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ پر مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ بیرونی دنیا کے آئینے کم ہی دیکھتا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کے اندر اس کے من کا آئینہ بھی تو لگا ہوتا ہے جس میں دنیا کی سب سے خوبصورت، پاک اور شفاف ہماری اپنی صورت اور ہماری ذات ہوتی ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے اسی من کے سندر آئینے میں خود کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ وہ آئینہ ہمیں ہمارا اپنا آپ بدصورت نہیں دکھاتا مگر افسوس بیرونی دنیا کے آئینے کا سچ ہمیشہ اندر کی صورت کے مخالف ہوتا ہے کاش بیرونی دُنیا کے یہ کرخت آئینے بھی ہمیں ہمارے اندر کے آئینوں جیسا روپ دکھاتے تو دنیا کتنی خوبصورت ہوتی۔ اپنے اندر کے آئینے نہارنے والوں کا باہر کے آئینوں سے سدا جھگڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ پری زاد کے ساتھ بھی تھا۔ لیکن اندر کی خوبصورت پرکھنے والی نظر یہاں کس کے پاس ہے.....؟ دنیا تو ظاہری روپ پر مرتی اور پری زاد جیسے گھائلوں کو ہمیشہ ''نرگسیت'' کے طعنے دیتی رہتی ہے۔ پری زاد جب بھی کبھی اپنے اندر کے آئینے کے سامنے سج سنور کر خوبصورت کپڑے پہن کر، سیدھی مانگ نکال کر اور اپنی آنکھوں میں روشنی بھر کے اپنے نام کی طرح پری زاد بن کر باہر کی دنیا میں نکلتا تو کسی نہ کسی کی نظر کا آئینہ اور لفظوں کے زہر میں بجھے تیر اُسے اس مکروہ حقیقت سے آشنا کر ہی دیتے کہ وہ باہر کی دنیا میں ایک قابل نفرت و حقارت، کرخت چہرے کا مالک ہے..... کاش، خدائی ہمارے اندر لگے یہ آئینے نہ بناتی..... یا پھر بیرونی دنیا کے یہ سبھی شیشے چکنا چور کر دیتی۔ پری زاد باہر کے آئینے تو نہ توڑ سکا پر اُس کے اندر کا کانچ روزانہ ٹوٹتا رہا۔ یہ نادان دنیا والے اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ باہر لگے سبھی آئینے ہم سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمیں ہمارے عکس کی اُلٹی شبیہہ دکھاتے ہیں۔ روشنی اور اندھیرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہم سب ان آئینوں میں نظر آنے والی تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دل کش ہوتے ہیں مگر ہماری مجبوری ہماری نظر میں جھلملاتا عکس ہوتا ہے اور ہم اُسی پر اعتبار کر کے خوبصورتی یا بدصورتی کے معیار کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

کالج ختم ہوا اور یونیورسٹی کی ابتدا ہوئی۔ پری زاد کے دل میں پلتا برسوں کا ایک خواب پورا ہو گیا اور وہ مخلوط تعلیمی ادارے تک پہنچ گیا۔ اس کی جماعت میں قریباً چالیس لڑکیاں پڑھتی تھیں جن میں کم سے کم نصف ایسی تھیں کہ جن کا شمار مہ رخوں میں کیا جا سکتا تھا، مگر لبنیٰ ان سب کی ملکہ تھی۔ پری زاد، ظاہری طور پر خود بد

صورت ہونے کے باوجود اپنے اردگرد معمولی سی بدصورتی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حسن پرستی صرف چہرے کی حد تک ہی نہیں تھی بلکہ اُسے ہر بدصورت چیز سے نفرت تھی اور ناہید کے تجربے نے پری زاد کو اتنا تو سکھا ہی دیا تھا کہ صنف نازک کی قربت کا ایک دروازہ شاعری اور ادب سے ہو کر بھی گزرتا ہے۔ لہٰذا اس نے یونیورسٹی کی بزم ادب کی صدارت حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ چھوٹے موٹے شعر تو وہ میٹرک کے زمانے ہی جوڑنے لگا تھا اب سنجیدگی سے اُس نے اس جانب توجہ دی تو جلد ہی اندھوں میں کانا راجہ ہو گیا۔ ویسے بھی اُردو کے مضمون میں وہ ہمیشہ سب سے زیادہ نمبر لیا کرتا تھا لہٰذا جلد ہی اُسے یونیورسٹی کی تمام ادبی سرگرمیوں کا لازمی حصہ سمجھا جانے لگا اور ایسے موقعوں پر جب کبھی لبنیٰ اس کے ساتھ اسٹیج یا کلاس کے ڈائس پر آ کر شانہ بشانہ کھڑی ہوتی اور جماعت کے دوسرے لڑکے حسرت بھری نظروں سے لبنیٰ کو گھورتے تو پری زاد کا سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا تھا۔ لبنیٰ کافی آزاد خیال اور ہنس مکھ لڑکی تھی اور اُسے اپنے حسن کی چکا چوند کا بھی خوب اندازہ تھا۔ اس لیے یونیورسٹی کا جب کوئی دل پھینک لڑکا اس کے قریب آنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ٹھنڈی آہیں بھرتا تو وہ خوب ہنستی اور پری زاد کو بھی ان ناکام عاشقوں کی کہانیاں مزے لے کر سناتی۔ اور جواب میں پری زاد صرف مسکرا کر رہ جاتا۔ اب وہ لبنیٰ کو کیا بتاتا کہ اُس کا سب سے بڑا ''عاشق نامراد'' تو وہ خود ہے۔ پری زاد کے ساتھ ایک ستم یہ بھی تھا کہ اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس کی جماعت کی سبھی لڑکیاں اُسے ''بے ضرر'' سمجھتی تھیں۔ وہ ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ان سب لڑکیوں کے لیے قابل احترام اور ہر دل عزیز دوست تو ضرور بن چکا تھا لیکن اُس کا درجہ لڑکیوں کے نزدیک صرف ایک ''کم رو سہیلی'' کا تھا، ایک ایسی سہیلی جو اچھی رازدار تو بن جاتی ہے مگر اپنی کم شکلی کی وجہ سے کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔ یوں پری زاد اُن مہ جبینوں کے قریب تو ہو گیا لیکن اس کے دل کا کنول سدا مرجھایا ہی رہا۔ یونیورسٹی کے آخری سال تک پری زاد نئی نسل کا ایک اچھا شاعر مانا جانے لگا تھا۔ لڑکیاں اُس کے شعر اپنی بیاض اور ڈائری میں نوٹ کر کے رکھا کرتی تھیں اور اس کا احترام بڑھ چکا تھا۔ لیکن ایک دن یہ بھرم بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرے کے اختتام پر جب ہال خالی ہو چکا تھا۔ پری زاد اسٹیج سیکرٹری سے اپنی کتاب واپس لینے کے لیے ہال کے اندر داخل ہوا تو پردے کے پیچھے کچھ لڑکیاں اُس شام کے کامیاب مشاعرے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ ان میں لبنیٰ کی آواز بھی شامل تھی۔ پری زاد کے قدم اپنا نام سن کر خود بخود رُک گئے۔ اس کی آمد پردے کے پیچھے والیوں سے پوشیدہ تھی۔ پہلی لڑکی بولی۔ ''واہ بھئی..... مزہ آ گیا..... آج کی شام ہمیشہ یاد رہے گی..... پری زاد کیا شعر کہتا ہے۔ لگتا ہے جگر ہاتھوں میں مچل رہا ہو.....'' دوسری نے تائید کی ''ہاں بھئی..... سچ ہے..... اس کے شعر دل میں آگ لگا دینے والے ہوتے ہیں..... خاص طور پر جب وہ لبنیٰ کے چہرے کی طرف دیکھ کر شعر کہتا ہے'' سب لڑکیاں زور سے ہنس پڑیں۔ جواب میں لبنیٰ کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی ''بکو مت..... وہ بے چارا اپنی

اوقات جانتا ہے..... میں اُس کے اندر کے شاعر کی قدر ضرور کرتی ہوں..... لیکن کاش یہ پھول انگلش ڈیپارٹمنٹ کے خالد کی زبان سے میری شان میں جھڑتے تو میں تو وہیں فدا ہو جاتی..... ہائے..... کیا شخصیت ہے..... میں حور ہوں تو وہ شہزادہ.....'' لبنیٰ کی بات پر سبھی سہیلیوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور اُن میں سے ایک بولی ''ہاں..... مگر جب وہ پری زاد اسٹیج پر تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پہلوئے حور میں لنگور'' ..... قہقہے بلند ہوتے چلے گئے اور پری زاد کو یوں لگا جیسے اس کے اندر بیٹھے شہزادے کے دل میں بیک وقت کئی خنجر گھونپ دیئے گئے ہوں۔ وہ مزید وہاں رُک نہ سکا اور پھر اُس نے کبھی دوبارہ یونیورسٹی کا رُخ نہ کیا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ماں باپ یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوگئے اور بہن بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں اور سبھی اپنی اپنی دُنیا میں مگن ہوگئے۔ پری زاد مزید تنہا ہوگیا۔ تنہائی صرف آس پاس کے لوگوں کے دور ہو جانے کا ہی تو نام نہیں..... کبھی کبھی شدید بھیڑ اور بہت بڑے ہجوم میں بھی ہم تنہا ہوتے ہیں۔ اصل تنہائی شاید ہمارے اندر پلتی ہے۔ پری زاد بھی اس دوہری تنہائی کے عذاب کا شکار تھا۔ بیرونی دنیا میں اس کا کوئی سچا دوست نہیں تھا اور اس کے اندر کا پری زاد کسی پری کی رفاقت کے لیے ترستا رہتا تھا۔ تب کسی نے اُسے خلیج جا کر قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔ ان دنوں دوبئی میں مزدور کی بڑی مانگ تھی۔ پری زاد بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیسہ کمانے کی دھن میں دوبئی آ گیا۔ مقصد اپنے اندر کی تنہائی سے چھٹکارا پانا بھی تھا۔ اور ساتھ ہی اس کے اندر کا پری زاد اب تک یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ شاید بے تحاشہ پیسہ اسکی ظاہری بدصورتی پر پردہ ڈال دے گا اور پھر نازنینائیں اس کی رفاقت میں شرمندگی محسوس نہیں کریں گی۔ تب وہ بھی کسی شہزادی کو چن کر اپنا گھر بسالے گا۔ پری زاد اپنی محنت اور ایمان داری کی بدولت جلد ہی فورمین کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس کا کمپنی کے ساتھ تین سال کا معاہدہ دس سال سے زیادہ پر محیط ہوگیا اور اس کے پاس پیسے کا انبار لگتا گیا لیکن پری زاد کے اندر کسی کا محبوب بننے کی پلتی خواہش کبھی نہ مر سکی۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کا محبوب بننا کتنا بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ ایک ایسی بادشاہی جس کے لیے شہنشاہ اپنا تخت و تاج لپیٹ کر چل دیتے ہیں کہ جو کسی کے محبوب کی مسند پر فائز ہو جائے پھر بھلا اُس کے لیے بادشاہی کا معمولی تخت کیا اہمیت رکھتا ہے؟ پر افسوس یہاں ایسے بھی کئی نادان ہیں جنہیں محبوبیت کے اعزاز کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو پاتا اور وہ تمام عمر خود کسی کا محبوب ہوتے ہوئے بھی اپنے لیے کسی دوسرے محبوب کی تلاش میں اپنی زندگی بتا دیتے ہیں۔ محبوب کو بھلا محبوب کی کیا ضرورت.....؟ ..... اصل المیہ تو اُن کا ہے جو نہ خود محبوب ہوتے ہیں اور نہ کوئی ان کا دلبر ہوتا ہے۔ جیسے پری زاد..... دوبئی میں پندرہ سال دن رات اپنا پسینہ بہانے کے بعد فورمین پری زاد، سیٹھ پری زاد بن کر وطن واپس لوٹا تو اس کے استقبال کے لیے پورا خاندان ائیر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ غیر اہم اور معمولی لڑکا اب پکی عمر کا دولت مند اور شہر کا معزز فرد بن چکا تھا۔ مگر اس کے دل کا کنگر اب بھی خالی تھا۔ اس نے ملک کے سب سے بڑے صنعتی شہر میں تعمیرات کی ایک

بہت بڑی کمپنی کھول لی اور اپنے اردگرد خوبصورت چہروں کا ایک ہجوم اپنے اسٹاف کی صورت جمع کر لیا۔ خوبصورت عورتیں اس کی کمزوری بنتی چلی گئیں لیکن خریدی ہوئی وفا کبھی محبت کی سرحد پار نہ کر سکی۔ پری زاد کے پیسے کی چمک نے بہت سے معشوق اس کے گرد جمع تو کر دیئے مگر اُس کی محبوب بننے کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ پری زاد کا مسئلہ کسی جسم کا حصول ہرگز نہیں تھا۔ اُسے تو بس دل سے چاہے جانے کی پیاس تھی مگر دولت کے پیچھے بھاگتی دل کش عورتیں کبھی یہ راز نہ جان سکیں۔ پری زاد کو ان کی چاہت کا کھوٹ پہلی نظر میں ہی دکھائی دے جاتا تھا۔ وہ بظاہر پری زاد کی شان میں قصیدے پڑھتی رہتی تھیں مگر تنہائی میں وہ اس کے سراپے کا مذاق اُڑاتیں۔ پری زاد کے اندر کا جھوٹا اور بناوٹی شاعر اب ایک سچا اور پکا شاعر بن چکا تھا مگر اب پری زاد اپنی شاعری کم ہی کسی سے بانٹتا تھا۔ بظاہر اس نے خود کو ادب کی دنیا سے جوڑے رکھنے کے لیے شہر کی تمام بڑی ادبی تنظیموں کی رُکنیت اختیار کر رکھی تھی اور ان میں سے کئی خود اس کی اپنی سرپرستی میں بھی چلتی تھیں۔ وہ بے تحاشہ اپنا پیسہ ان سرگرمیوں پر لٹاتا تھا۔ شاید اہم نظر آنے کی لت نے اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا مگر اب بھی وہ غیر محسوس طور پر صرف ان تقریبات میں ہی شرکت کی ہامی بھرتا تھا جن میں اُسے اچھے چہرے دکھائی دینے کی کچھ اُمید ہوتی اور پھر ایک ایسی ہی تقریب میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے آگے چل کر اس کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ کسی نئی شاعرہ کی کتاب کی تقریب رونمائی میں جب وہ بطور صدر محفل اپنی تقریر ختم کر کے واپس پلٹنے لگا تو میزبان محفل نے پری زاد سے اس کا کچھ ذاتی کلام سننے کی فرمائش کر دی۔ اور پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود تمام شرکاء اس فرمائش کے درپے ہو گئے۔ مجبوراً پری زاد کو اپنی ایک تازہ غزل سنانی پڑی جس میں ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے اندر کے پری زاد کی ازلی تنہائی اور اپنی روح پر لگے زخموں کا ذکر کیا تھا۔ سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا لیکن ایک تالی تھی جو سب کے خاموش ہو جانے کے بعد بہت دیر تک ہال میں گونجتی رہی۔ وہ گل رُخ تھی..... اپنے نام کی طرح تازہ گلاب کی کسی پنکھڑی جیسی کومل اور نازک..... پری زاد نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ چہرے پر گہرے سیاہ شیشوں والا چشمہ لگائے اور بالوں میں گلابی ربن باندھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ تقریب کے اختتام پر جب خود پری زاد کی نظریں اُسے بھیڑ میں تلاش کر رہی تھیں وہ اچانک اپنے آپ ہی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ''پری زاد سر..... پلیز آٹو گراف دے دیں.....'' پری زاد نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ نہ جانے کیا لکھ کر کاپی گل رخ کی طرف بڑھا دی۔ وہ اپنی دھن میں مگن کہتی رہی ''میں آپ کی شاعری کی بہت بڑی مداح ہوں..... لیکن آپ سے شکوہ یہ ہے کہ آپ بہت کم اپنی تخلیق کو عام قاری کی پہنچ تک رسائی دیتے ہیں۔ شاید آپ کو اپنے مداحوں کے ذوق پر اعتبار نہیں رہا.....'' آس پاس کھڑے دوسرے سب لوگ ہنس دیئے۔ گل رخ نہ جانے اور کیا کچھ کہتی رہی مگر پری زاد تو اس کے ملیح چہرے اور گلابی ہونٹوں کے خم میں ہی کھویا رہا۔ گل رخ نے پری زاد سے اس کا ذاتی فون نمبر بھی مانگ لیا اور پھر

پری زاد کو زیادہ انتظار کی اذیت سے بھی نہیں گزرنا پڑا اور اگلی شام ہی گل رخ کی کال آ گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پری زاد کو کسی چہرے پر مطلب اور مفاد پرستی کا غمازہ دکھائی نہ دیا۔ وہ معصوم سی لڑکی پری زاد کے ساتھ دنیا جہاں کی باتیں کرنے لگی۔ اُن کے فون کا دورانیہ بڑھنے لگا۔ پری زاد اپنے اندر کے زخم یوں رفتہ رفتہ بھرتے دیکھ کر خود ہی خوفزدہ ہو گیا۔ آخر گل رخ جیسی ماہ رو کو پری زاد جیسے بدہیت شخص میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ اپنا اتنا قیمتی وقت اس پر لٹاتی رہتی تھی۔ حالانکہ اس پہلی ملاقات کے بعد گل رخ کبھی دوبارہ اس سے ملنے آمنے سامنے نہیں آئی تھی مگر دن میں دو تین بار اُس کا فون ضرور آ جاتا تھا۔ پری زاد کے اندر کا مشکوک شاعر اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا کہ صرف اس کے کلام کا اثر بھی یہ معجزہ دکھا سکتا ہے۔

اس لیے جب بھی گل رخ کا فون آتا وہ لاشعوری طور پر اس بات کا انتظار کرتا رہتا کہ کب گل رخ اُس سے کسی مالی معاونت یا کسی دنیاوی فائدے کا تقاضہ کرتی ہے۔ لیکن پری زاد کے کان گل رخ کی جانب سے ایسے کسی مطالبے کا انتظار ہی کرتے رہے اور دن گزرتے چلے گئے۔ گل رخ نے پری زاد کو بتایا تھا کہ وہ شوقیہ طور پر ایک نجی فلاحی ادارے کے لیے مجسمہ سازی کرتی ہے اور ان مجسموں سے حاصل ہونے والی رقم بچوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جاتی ہے۔ ایک روز گل رخ نے پری زاد کو اپنے ادارے کے دورے کی دعوت دے دی۔ وہ پری زاد کو اپنے بنائے ہوئے مجسمے دکھانا چاہتی تھی۔ پری زاد گل رخ کا فن دیکھ کر واقعی دنگ رہ گیا۔ وہ مجسموں میں جان ڈالنے کا ہنر جانتی تھی لیکن پری زاد اُس کی دوسری فرمائش سن کر لرز گیا۔ وہ پری زاد کا مجسمہ بنانا چاہتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو پری زاد کو یوں لگا کہ جیسے گل رخ بھی باقی تمام دنیا کی طرح صرف اس کا مذاق اڑانا چاہتی ہے لیکن اس کے چہرے پر پھیلی معصومیت دیکھ کر پری زاد تحمسے میں پڑ گیا۔ یہ اس کی گل رخ کے ساتھ دوسری روبرو ملاقات تھی اور آج وہ پہلی ملاقات سے بھی زیادہ کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر سیاہ چشمے نے آج بھی اس کی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں۔ پری زاد نے آس پاس کسی کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر سکون کی ایک گہری سانس لی اور دھیرے سے گل رخ کو دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا کہ ''مجسمے تو خوبصورت چہروں اور شخصیات کے بنائے جاتے ہیں۔ گل رخ اس کے کریہہ چہرے کے لیے اپنی خوبصورت اور نازک انگلیوں کو کیوں زحمت دینا چاہتی ہے؟ ..... یا پھر اُسے بھی اور لوگوں کی طرح پری زاد کی بدصورتی کا تمسخر اُڑانے کا کوئی موقع چاہیے .....؟'' گل رخ پری زاد کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے سن ہو گئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کا مذاق اُڑانے کی گستاخی کر سکتی ہوں۔ ..... آپ وہ ہیں جن کے خیالات کی گہرائی اور لفظوں کے چناؤ کی خوبصورتی نے میرے اندر کی بے بس لڑکی کو کئی بار نکھارا ہے..... مجھے جلا بخشی ہے..... اور میں تو اپنی انگلیوں کی پوروں سے دنیا دیکھتی ہوں ..... میرے پاس عام دنیا والی بینائی نہیں ہے ..... میں پیدائشی اندھی ہوں .....'' گل رخ نے آنکھوں سے

چشمہ اتار دیا اور وہاں دو گہری نیلی جھیلوں کے بے نور کٹورے دیکھ کر پری زاد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اُس کے اندر کچھ ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ بہت کچھ کرچی کرچی ہو گیا۔ تو یہ وہ وجہ تھی کہ جس نے گل رخ کے ہونٹوں پر پری زاد کے لیے وہ تمسخر بھری مسکراہٹ نہیں آنے دی جس کا پری زاد اب تک عادی ہو چکا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہنسے یا روئے۔ گل رخ نے دوبارہ اس سے وہی درخواست کی کہ وہ اس کا مجسمہ بنانا چاہتی ہے۔ اس بار پری زاد انکار نہیں کر سکا۔ گل رخ نے پری زاد کو اپنے سامنے اسٹول پر بیٹھا لیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں سے پری زاد کا چہرہ ٹٹول کر اس کا مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ پری زاد خاموش بیٹھا رہا اور جب گل رخ نے اس کا مجسمہ مکمل کیا تو پری زاد اُسے دیکھ کر رو پڑا۔ اتنا بے داغ چہرہ اور اتنے خوبصورت نقش تو اس کے کبھی نہیں تھے۔ وہ چار دن سے لگاتار تین گھنٹوں کے لیے روزانہ گل رخ کے ادارے میں اپنے چہرے کا مجسمہ بنوانے کے لیے آ رہا تھا اور آج پانچویں دن جب گل رخ نے جھجکتے ہوئے اُسے اپنا کام دکھایا تو پری زاد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ گل رخ نے پری زاد کو روتے پایا تو وہ گھبرا گئی۔ ''کیا میں نے بہت برا مجسمہ بنایا ہے آپ کا.....؟'' ''نہیں تم نے میرے اندر کے پری زاد کو مجسمے میں ڈھال دیا ہے..... لیکن میں اتنا خوبصورت نہیں ہوں پیاری لڑکی..... میں تو بہت مکروہ.....'' گل رخ نے جلدی سے پری زاد کے ہونٹوں پر اپنا کومل ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں..... آپ پھر کبھی ایسا نہیں سوچیں گے..... کیونکہ جیسا میں آپ کو اپنے من کی آنکھ سے دیکھتی ہوں..... میں نے آپ کو ویسا ہی بنایا ہے.....'' پری زاد لاجواب ہو گیا اور اس کی زندگی میں گل رخ نام کی وہ بہار آ گئی جس کا انتظار کرتے کرتے اُسکی ساری عمر خزاں ہو چلی تھی۔ وہ دونوں روز ملنے لگے اور گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ہمیشہ اگلے روز کے لیے کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا..... پری زاد کے اندر کی جھجک بھی ختم ہونے لگی تھی کیونکہ گل رخ سے گھنٹوں بات کرتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی اُسے وہ مخصوص بے چینی نہیں ہوتی تھی جو عام حالات میں کسی نازنین کو اپنے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پری زاد محسوس کرتا تھا۔ گل رخ کی بے نور آنکھیں اُسے ٹٹول کر پریشان نہیں کرتی تھیں اور جب گل رخ اس سے شعر سننے کی فرمائش کرتی اور پھر پری زاد کے لفظوں کی جادوگری میں کھو جاتی تو شاعر کو کوئی بناوٹ نظر نہیں آتی تھی اور پری زاد گل رخ کی اس سچی اور پرخلوص داد پر نہال ہو جاتا تھا۔ پری زاد نے چند دن کے اندر ہی اپنا اندر گل رخ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایک روز وہ گل رخ کو اپنے گھر کے اس گوشے میں بھی لے گیا جو اس نے آج تک باقی دنیا سے چھپا رکھا تھا۔ یہ وہ ہال تھا جہاں پری زاد نے اپنے اندر کے موسیقار کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ اس روز پری زاد نے گل رخ کو پیانو پر بہت سی دھنیں سنائیں۔ وہ انمول ساز جو آج تک پری زاد کے من کے تار جھنجھناتے رہے تھے وہ سارے اس نے گل رخ کی سماعتوں کی نذر کر دیئے لیکن وہ گل رخ کو آج بھی یہ نہ بتا پایا کہ وہ اس کی محبت میں غرق ہو چکا ہے اور گل رخ جس جذبے کو صرف پری زاد کی دوستی کے عنوان سے جانتی ہے، وہ اصل

میں ایک جان لیوا عشق کا روپ دھار چکا ہے.....

پر زمانے کا عشق کہاں راس آتا ہے۔ دنیا کو سدا محبت سے بیر رہا ہے۔ لوگ ہمیشہ [illegible] ہوتے ہیں اور اگر کوئی محبت زمانے کے وار سے چوک جائے تو مقدر اپنی تلوار لیے اُس عشق کی جان قبض کرنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ماجرا پری زاد کے عشق کے ساتھ بھی ہوا۔ جس روز وہ اپنے دل میں یہ پختہ عزم لیے گل رخ کے پاس پہنچا کہ آج وہ اپنے دل کا حال اُسے بتا کر ہی رہے گا، اسی دن گل رخ نے خود اسے یہ خبر سنا کر پری زاد کے دل پر بجلی گرا دی کہ اسے آج ہی آنکھوں کے بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر شرجیل نے فون کر کے بتایا ہے کہ جلد ہی گل رخ کو آنکھیں ملنے والی ہیں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ پری زاد کے سامنے ڈاکٹر شرجیل کا ذکر کر چکی تھی کہ وہ ڈاکٹر بڑی تندہی سے گل رخ کی آنکھوں سے میل کھاتے قرینے کی تلاش میں جتا ہوا ہے مگر اس سے پہلے پری زاد نے کبھی شرجیل نامی اس ڈاکٹر کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن جب اس روز وہ پری زاد کی موجودگی میں گل رخ سے ملنے آیا تو پری زاد کی نس نس میں جیسے شرارے سے بھر گئے۔ شرجیل ایک خوش لباس دراز قامت اور خوبرو نوجوان تھا۔ وہ جتنی دیر بھی گل رخ کے پاس بیٹھا ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پری زاد کے رگ و روپ میں آگ سی بھڑکتی رہی۔ وہ زندگی میں آج تک جس جذبے سے نا واقف تھا ''رقابت'' کا وہ جذبہ پوری شدت سے پری زاد پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ ستم بالائے ستم شرجیل نے پری زاد کے سامنے ہی جب آپریشن کی بیش قیمتی کا ذکر بھی کر دیا تو بادل نخواستہ اُسے گل رخ کے سامنے ڈاکٹر کو یہ پیش کش بھی کرنی پڑی کہ لاکھوں کے اس آپریشن کا تمام خرچہ بھی پری زاد خود ہی اٹھانے کو تیار ہے۔ شرجیل نے خوش ہو کر چٹکی بجائی کہ پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا کیونکہ گل رخ کے آپریشن میں دیر صرف رقم کی کمی کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ پری زاد کے بس میں ہوتا تو وہ گل رخ کی آنکھوں کا یہ علاج عمر بھر نہ ہونے دیتا کیونکہ اس کے دل میں یہ خوف بری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ گل رخ بینائی واپس ملتے ہی جب اس پر پہلی نظر ڈالے گی، اسی وقت وہ اسے مسترد کر دے گی۔ خاص طور پر اب اس ڈاکٹر کی جاذب نظر شخصیت کے سامنے تو وہ اور بھی خود کو بد ہیت محسوس کرنے لگا تھا۔ پری زاد ٹوٹے قدموں سے گھر واپس آ گیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے دل میں کسی کو قتل کرنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔ رقیب کو قتل کرنے کے علاوہ ایک عاشق کے پاس دوسرا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوتا۔ اس رات پری زاد نے کئی سال بعد ایک بار پھر سجدے میں گر کر اپنے خدا کے سامنے فریاد کی کہ یا تو وہ اس کے اندر کے پری زاد کو مار ڈالے ..... یا پھر اس ڈاکٹر کا خاتمہ ہو جائے..... کیونکہ اب وہ اپنی اس جہد مسلسل سے تھک کر چور ہو چکا ہے۔ پری زاد کو اپنی اس حد درجہ خود غرضی پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ صرف اپنے مقصد کے حصول کے لیے رقیب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے منصوبے بھی بنا رہا ہے۔ پری زاد جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا جاتا اور آخر کار اس شدید کشمکش نے اسے بستر پر لا پھینکا۔ شدید بخار سے اس کا

جسم تپنے لگا اور وہ اگلے تین دن تک گل رخ سے ملنے کے لیے نہیں جا سکا تو گھبرا کر وہ خود پری زاد سے ملنے چلی آئی لیکن پری زاد نے دل پر بھاری پتھر رکھ کر نوکر کو گل رخ سے جھوٹ بولنے کا کہہ دیا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ پری زاد نے دل میں ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ وہ گل رخ کی آنکھوں کے آپریشن کی رقم ڈاکٹر شرجیل کے پاس جمع کروا کر خود ہمیشہ کے لیے یہ شہر چھوڑ دے گا۔ کیونکہ وہ کم از کم گل رخ کی آنکھوں میں اپنے لیے وہ حقارت و نفرت برداشت نہیں کر سکتا تھا جو آج تک ساری زندگی باقی دنیا والوں کی نگاہوں میں دیکھتا آیا تھا۔ اور پھر اُس نے یہی کیا۔ ایک خط میں اپنے منیجر کو تمام ضروری ہدایات اور ڈاکٹر شرجیل کے نام ایک بڑی رقم کا چیک چھوڑ کر پری زاد نے بنا کسی کو بتائے جنگلوں، صحراؤں اور ویرانوں کا رخ کر لیا۔ اسکی عمر بھر کی ریاضت رائیگاں چلی گئی تھی اس نے عمر بھر میں چاہا ہی کیا تھا؟ صرف ایک محبوب کا درجہ.....اور وہ اعزاز بھی کبھی اُس کا مقدر نہ بن سکا۔ لہٰذا اب پری زاد کے لیے یہ دولت، یہ شہرت، یہ جائیداد اور یہ کاروبار کے قصے سب بے فائدہ تھے۔ اس کا دل ان سب چیزوں سے اُچاٹ ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آپ سے عہد کر لیا تھا کہ اب وہ زندگی بھر اپنے نادان دل کے بہکاوے میں آ کر کسی خوبصورت چہرے، کسی نرم لمس کے جال میں نہیں پھنسے گا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن تو اس کا اپنا دل ہی تھا۔ لیکن اب پری زاد کو اپنے دشمن کی خوب پہچان ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے تمام ممکن احتیاطی تدابیر بھی کر لیں تھیں۔ اس نے کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا ہی ترک کر دیا۔ ویرانوں میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا حلیہ بھی کسی جوگی کی طرح ہوتا گیا۔ پھٹے پرانے کپڑے، بے ترتیب بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھیں۔ پیر سے پر زمانے بھر کی گرد اور ٹخنوں تک لٹوں کی طرح جھولتے ہوئے لمبے گیسو۔ پری زاد کی [illegible] عقیدت سے اس کے سامنے دوزانو ہو جاتے۔ وہ اُسے کوئی پہنچا ہوا [illegible] اپنی انتہائی اشد ضروریات کے لیے بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔ جسے [illegible] کے جواب میں صرف ایک ہاں یا ناں کرتا تھا۔ یہ ظاہر پرست دنیا [illegible] پری زاد پر بھی اس جہاں کا اعتماد بڑھتا گیا۔ اس کی دنیا سے بے رغبتی اور مخلوق کو وحشت سے جانے کے عمل کو بھی اس کی بزرگی کی نشانی سمجھ لیا گیا۔ [illegible] پری زاد کی زبان سے نکلی بے معنی باتوں کو خود ہی کوئی نہ کوئی اور اپنے مطلب کے معنی پہنا کر اپنی منتوں کی قبولیت کی وجہ سمجھ لیتے اور پری زاد کے قدموں میں نذر و نیاز کے ڈھیر لگاتے جاتے جنہیں وہ اپنی ٹھوکر سے دور پھینک دیتا تھا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سال بنتے چلے گئے۔ پری زاد کا سفر نہ ختم ہونے والا تھا۔ لیکن پھر اس سفر کا ایک ایسا پڑاؤ آیا جب ہفتوں کے فاقے اور موسم کی سختی رنگ لائی اور پری زاد بیہوش ہو کر کسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پڑ گیا۔ حسب معمول لوگوں نے اس کے حلیے کی وجہ سے اُسے تکریم سے اٹھا کر پلیٹ فارم پر لگے گھنے پیپل کے پیڑ کی چھاؤں میں لا کر ڈال دیا اور قلیوں نے دیگر عملے کی مدد سے

ایک تکیے اور بستر کا [illegible] دیکھتے دیکھتے وہیں ریلوے اسٹیشن پر ایک آستانہ بن گیا اور آتے جاتے مسافر پری زاد کے پاؤں چھو کر اور اگر بتیاں جلا کر آگے بڑھنے لگے۔ پری زاد وہیں پڑا رہتا۔ بیماری اور نقاہت نے اس کے قدم جکڑ رکھے تھے ورنہ وہ اس ہنگامے کے درمیان ایک دن بھی مزید نہ گزارتا۔ وہ ایک ایسی ہی لو برساتی شدید گرم دوپہر تھی جب پرندوں نے بھی اپنی پرواز کچھ دیر کے لیے موقوف کر دی تھی لیکن پری زاد کے لیے یہ گرم موسم بھی ایک نعمت تھا کیونکہ چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر لوگوں کی بھیڑ اور رش سے اُسے نجات مل گئی تھی۔ وہ آنکھیں موندھے یونہی چپ چاپ لیٹا ہوا تھا کہ اچانک ایک مانوس آواز نے اس کے روح کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیئے ''بابا..... میرے لیے دعا کیجئے..... میں بہت بے سکون ہوں.....'' پری زاد نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ کیا خواب اگر سماعتوں کی صورت بھی اترتے ہیں؟ وہ اپنی سماعت کا یہ حسیں خواب تمام عمر توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں..... وہ گل رخ ہی کی آواز تھی۔ پری زاد انجانے میں دربدر بھٹکتے دوبارہ اپنے شہر آ پہنچا تھا لیکن گل رخ اسے پہچان نہیں پائی تھی..... وہ اُسے پہچانتی بھی کیسے؟..... اُسے تو وہ بھی نہیں پہچان پاتے تھے جنہوں نے ایک عمر اس کے ساتھ گزاری تھی جبکہ گل رخ نے تو صرف اپنی سماعتوں سے اسے پہچانا اور ہاتھ کی پوروں سے دیکھا تھا۔ پری زاد نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ کر بند کر لیے۔ گل رخ کچھ دیر کی دعا کی آس میں اس کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ پری زاد میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ دو گھڑی کے لیے اس کی جانب دیکھ سکے۔ گل رخ مایوس ہو کر اٹھی۔ ''شاید آپ کے پاس بھی میرے لیے کوئی دعا نہیں..... میں تو اوروں سے آپ کے بارے میں سن کر یہاں تک چلی آئی تھی..... آپ کی تنہائی میں مخل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں.....'' گل رخ اٹھ کر چل دی۔ پری زاد نے اپنی بھیگی پلکیں کھول کر اُسے پلٹتے ہوئے دیکھا۔ دفعتہً گل رخ کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ پری زاد نے گھبرا کر بے اختیاری میں گل رخ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کی اور چند لمحوں کا یہ لمس ہی قیامت ڈھا گیا۔ گل رخ پری زاد کا ہاتھ چھوتے ہی سن ہو کر رہ گئی اور پھر اس کی آنکھیں برس گئیں۔ بمشکل اس کی زبان سے صرف ایک نام نکل سکا ''پری زاد.....'' پری زاد نے گھبرا کر اپنا ہاتھ یوں کھینچ لیا جیسے اس نے کسی انگارے کو چھو لیا ہو۔ گل رخ روتے ہوئے بولی ''آپ آج بھی میرے سامنے آنے سے خوف [illegible] ہے پری زاد..... میں آج بھی بینائی سے محروم ہوں.....'' پری [illegible] کر دور گرے ہوئے کالے چشمے کی طرف دیکھا اور زور سے گل رخ کا [illegible] ہاتھ جکڑ لیا۔ ''[illegible] کیوں.....؟ میں نے تو تمہارے علاج کی رقم سے بس گناہ زیادہ رقم ڈاکٹر [illegible] کیوں.....؟.....''

گل رخ رو پڑی ''مجھے بصارت چاہیے تھی پری [illegible] لیکن ایسی بصارت نہیں جو [illegible]

دور کر دے.....'' جب شرجیل نے مجھے بتایا کہ آپ نے علاج کی رقم کا چیک لکھ دینے کے بعد خود کو تمام دنیا کی بصارتوں سے دور کر لیا ہے تو میں سمجھ گئی کہ آپ اپنی ظاہری شکل وصورت کی وجہ سے میری بینائی سے خوف زدہ ہیں..... میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں پری زاد کہ میری بصارت آپ کو کبھی بدصورت نہیں دکھا سکتی تھی..... عام دنیا والے پہلے کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور پھر بعد میں اُسے چھو کر پہچاننے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں لیکن مجھے قدرت نے پہلے میری انگلیوں کی پوروں سے دنیا کو دیکھنے کی نعمت عطا کی تھی، میری بعد میں ملنے والی بصارت میری پہلی پہچان کو کیسے مٹا پاتی.....؟..... آپ کی دنیا کے خوبصورت اور بدصورتی کے معیار میرے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ پری زاد..... پر آپ میری بات سنے بغیر ہی چلے گئے..... میں تو آپ سے یہ بھی نہیں کہہ پائی کہ میں آپ کے لفظوں کی سیڑھی چڑھتے چڑھتے آپ کی محبت کے جزیرے میں آ پہنچی ہوں..... آپ نے حال دل سننے سے پہلے ہی مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ میں نے اور شرجیل نے مل کر آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر آپ نہ ملے۔ تب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اب سدا بے بینا ہی رہوں گی..... جو نظر پری زاد کو نہ نہار سکے..... اس سے میں اندھی ہی بھلی.....''

پری زاد کے دل و دماغ میں شدید تیز آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے اور اس کی آنکھیں جاڑے کی برسات کی طرح سارے کواڑ توڑ کر برس رہی تھیں۔ ''مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی گل رخ..... شدید اور بے تحاشہ محبت..... اور میں اپنی محبت کی نظر میں اپنے لیے حقارت نہیں دیکھ سکتا تھا..... اس لیے دنیا ہی تیاگ دی.....''

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زار و قطار رو رہے تھے۔ آس پاس گزرتے مسافر اور قلی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک اندھی عورت ان کے ''سائیں'' کے قدموں میں بیٹھی رو رہی ہے اور ان کا مرشد بھی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے..... دور کھڑے ایک قلی نے عقیدت سے دوسرے قلی سے کہا ''لگتا ہے آج مرشد کی بدولت اس عورت کی بھی کوئی دیرینہ مراد پوری ہو گئی ہے۔''

مگر وہاں کھڑے لوگوں میں سے یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آج صرف اس عورت کی ہی نہیں..... ان کے سائیں کی واحد مراد بھی پوری ہو گئی ہے..... کسی کا محبوب بننے کی مراد..... کسی کا دلبر بننے کی آرزو..... کسی پری کا پری زاد بننے کی تمنا.....

لفظ گر (افسانہ)

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی قصبے کے مرکزی چوک میں لگے قدم سالی خوردہ گھنٹہ گھر کی لرزتی ہوئی گھنٹی نے دو مرتبہ گونج کر قصبے کی گلیوں میں اونگھتے ہوئے آوارہ کتوں کو پھر سے چونک کر بھونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ باہر تیز ہوا کا شور اور پہاڑوں کے پیچھے کوندتی آسمانی بجلی کی لحہ بھر کی جھلک اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ موسم کے تیور کسی بھی لحہ برسنے والے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کو محفوظ دیواروں کے پیچھے اپنے نرم اور گرم بستروں میں محوِ خواب تھے لیکن اس قدیم قصبے کی مرکزی شاہراہ سے جڑی ایک گلی میں واقع اُس بڑے ادیب کے کمرے کی کھڑکی سے اب بھی مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ کی روشنی، مٹیالے شیشوں سے چھن چھن کر باہر سے گزرنے والے اکا دکا راہ گیروں کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی لیکن کوئی بھی اس قیامت سے واقف نہ تھا جو اس وقت اس بڑے ادیب کے دل پر گزر رہی تھی جو اپنے وسیع کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بے خیالی میں بار بار اپنی انگلیاں مسل رہا تھا۔ اس کی نظر بار ہا کمرے کی میز پر رکھے وقت پیما پر پڑ رہی تھی۔ جس کے اوپر کے حصے سے ریت اتنی ہی تیزی سے نچلے حصے میں پھسلتی جا رہی تھی۔ جس تیزی سے اس بڑے ادیب کے ہاتھوں سے وقت.....

اُسی میز پر لیمپ سے ذرا فاصلے پر وہ قلم اور دوات بھی دھرے تھے جن سے اب تک وہ بڑا ادیب نہ جانے کتنے شاہکار تصنیف کر چکا تھا تبھی تو پورے ملک میں اس کے فنِ تحریر کی دھوم تھی۔ وزیروں اور مشیروں کے ہاں دعوتوں میں اُسے خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا۔ شہر اور قصبے کے رئیس اور امراء اس کے ساتھ دوستی اور تعلق کو فخر سے بیان کرتے تھے اور اس کی رومانی داستانوں کو پڑھتے ہوئے نہ جانے کتنی پردہ نشینوں کا دل اس

کے نام پر دھڑکنا شروع کر دیتا تھا۔ پچاس کے پیٹے کو تقریباً گزار چکنے کے باوجود خواتین میں اس کی یہ مقبولیت اُسے ہمیشہ نازاں و فرحاں رکھتی تھی۔

لیکن آج کی یہ طوفانی رات اس بڑے ادیب پر بڑی بھاری تھی۔ حتیٰ کہ ان نازنینوں کے ہفتہ بھر کے جمع کیے ہوئے درجنوں خطوط بھی اس کی توجہ نہیں بٹا پا رہے تھے جو سامنے میز پر وقت پیا کے قریب ہی ایک مہکتے ہوئے انبار کی صورت میں جمع پڑے تھے۔ دفعتہً ادیب کی نظر ان مہکتے ہوئے محبت ناموں سے پھسل کر اُس مسودے پر جا پڑتی ہے جو نہ صرف آج کی رات بلکہ جانے پچھلی کتنی راتوں سے اس کی نیند اُڑانے کا باعث بنا ہوا تھا۔ بڑا ادیب ایک دم یوں چونکتا ہے جیسے میز پر عام سے کاغذ پر لکھا کوئی مسودہ نہیں بلکہ کوئی کالا ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہو۔

ابھی چند دن پہلے ہی کی تو بات ہے۔ اُس بڑے ادیب کی زندگی میں سکون اور چین کی روانی تھی۔ فخر اور غرور کا غلبہ تھا۔ عام لوگوں میں ایک منفرد اور سب سے ممتاز حیثیت حاصل ہونے کا اطمینان تھا۔ قصبے کے واحد اور بڑے، چوبی فرش والے ہال میں جب کسی تقریب میں بطور مہمان خصوصی اُسے بلایا جاتا اور مقرر اس کے فن کے حوالے سے اپنی تقاریر میں اس کی تعریف میں زمین و آسماں کے قلابے ملاتے تو وہ کس قدر فخر کے ساتھ ہال میں بیٹھے سامعین کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھا کرتا تھا۔ کس طرح خاص بالکونیوں میں بیٹھی اُمراء کی شریف زادیوں کی آنکھوں میں ستائشی پیغامات کو بظاہر لاپرواہی سے ٹال جایا کرتا تھا اور پھر ایک دن اسی ہال کے مرکز سے پچھلی نشستوں سے ایک نوجوان اُٹھ کر اسٹیج پر آیا تھا۔ ہاں، وہی ایک معمولی سا نوجوان، جو شہر کے ایک عام مزدور کا بیٹا تھا لیکن خوش قسمتی سے ایک دوسرے بڑے قصبے سے حکومت کے خرچ پر تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹا تھا۔ اس نوجوان نے اسٹیج پر آ کر بڑے ادیب کے تازہ ترین فن پارے پر نہایت موثر اور مدلل تجزیہ پیش کیا اور اعتراف کیا کہ وہ بچپن ہی سے بڑے ادیب کے فن کا بہت بڑا قدر دان اور مداح رہا ہے اور اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے کہ آج قدرت نے اُسے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے آئیڈیل کی مدح سرائی میں اسٹیج پر کھڑا ہے۔

بڑے ادیب کا اس نوجوان سے یہ پہلا تعارف تھا لیکن کون جانتا تھا کہ آئندہ چند مہینوں میں یہ تعارف ادیب کے لیے ایک چبھتے کانٹے کی صورت اختیار کر لے گا۔ نوجوان نے اُسی دن اسٹیج پر ادب کی دنیا میں اپنا پہلا قدم رکھنے کا عزم قصبے پر ظاہر کر دیا تھا اور بڑے ادیب سے رہنمائی حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ جواباً بڑے ادیب نے اپنی اختتامی تقریر میں اس نوجوان کے ادبی مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اپنی سرپرستی اور رہنمائی کے ہر لمحہ میسر ہونے کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ اس کے بعد قصبے کے واحد بڑے اخبار میں اس نوجوان کے افکار و خیالات اور افسانے چھپنے لگے جنہیں پڑھنے کا موقع

کبھی اس بڑے ادیب کو ملا ہی نہیں کیونکہ وہ اکثر تقاریب کے سلسلے میں قصبے سے باہر ہی رہتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بڑے ادیب کو اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا کہ قصبے کے نوجوان اس نوجوان کی تحریر میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ اس کی تحریروں سے کافی متاثر نظر آتا تھا کیونکہ شاید اس کی تحریر قصبے کے نوجوانوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔ بڑے ادیب کو [illegible] ایک دن بڑے ادیب کو اُس وقت چونکنا پڑا جب ایک تقریب [illegible] بڑے ادیب کے ساتھ مہمانانِ خصوصی کی فہرست میں [illegible] کی وضاحت تقریب کے دعوت نامے میں ہی کر دی تھی کہ تقریب کے مہمانِ خصوصی تو حضرت بڑے ادیب ہی ہوں گے اور دیگر شرکاء میں سے وہ نوجوان ادیب صرف نوجوان طبقے کی نمائندگی کے لیے اسٹیج پر موجود رہے گا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ بڑے ادیب کو اپنے اقتدار میں کسی دوسرے کی اتنی سی شرکت بھی گوارا نہیں تھی۔ بڑا ادیب اندر سے بہت جز بز ہوا لیکن اپنی اندرونی کشمکش کو تقریب کے دوران اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔ تقریب کے اختتام پر نوجوان ادیب نے اپنے نئے افسانے کا مسودہ بھی بڑے ادیب کی خدمت میں پیش کر دیا تاکہ بڑا ادیب اس کا تنقیدی جائزہ لیکر اپنی رائے سے مطلع کر سکے۔ بڑے ادیب نے محسوس کر لیا تھا کہ لوگ اب نوجوان کی تحریر کو سنجیدگی سے لینے لگے ہیں، لہٰذا اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس نوجوان کے مسودے سے چند صفحے پلٹے اور بے دلی سے نظر ڈالنے کے بعد وہیں اپنے مداحوں کی بھیڑ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ لگایا اور نوجوان کی تحریر میں بلاوجہ چند کیڑے نکالے اور اُسے مزید محنت کی تلقین کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اگر وہ نوجوان ادیب اُس بڑے ادیب کے مشوروں پر عمل کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ بڑا ادیب اُسے اپنے اخبار میں چھپنے کے لیے بھی زیرِ غور رکھے۔ نوجوان مصنف نے خندہ پیشانی سے بڑے ادیب کی تمام تنقید [illegible] بڑا ادیب [illegible] مصنف کو اس کی تحریر کی خامیوں سے آگاہ کر [illegible] اس نے نظر اٹھا کر دوبارہ [illegible] لیکن جب اسی درمیان میں نوجوان مصنف سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ کسی محفل میں نوجوان ادیب کی تحریر پر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دو چار فقرے ضرور کس دیتا تھا لیکن نوجوان ادیب نے ہمیشہ اسکی تنقید اور طنز کو سعادت مندی کے ساتھ ہی قبول کیا۔

اس دوران بڑے ادیب نے اس بات کا خاص اہتمام رکھا کہ نوجوان ادیب کی تحریریں اس کے زیرِ صدارت چلنے والے اخبار میں نہ چھپ سکیں پھر ایک دن اچانک، جب موسم کے تیور اس رات کی طرح ہی بھیانک تھے بڑے ادیب کو سرِ شام ہی کسی تقریب کے ملتوی ہو جانے کی وجہ سے قصبے کو لوٹنا پڑا۔ اس کی شاندار

بگھی جب قصبے کے مرکزی ہال کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اس نے وہاں پر جوش نوجوانوں کا ہجوم دیکھا جو دیوار پر لگے کسی اشتہار کے سامنے جمع تھا۔ بڑے ادیب کی بگھی کو آتا دیکھ کر لوگ جلدی سے اس کی جانب مڑے، مجبوراً ادیب کو کوچوان کو رُکنے کا کہنا پڑا۔ باہر ڈھلتی شام اور تیز بوندا باندی نے ہوا میں شدید خنکی بھر دی تھی لیکن خلاف دستور قصبے کے لوگ ابھی تک ہال کے سامنے جمع تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی خبر نے ان کے اندر ایسا جوش بھر دیا تھا جس سے انہیں اس شدید سردی کا احساس بھی نہ رہا ہو۔ لوگوں کا ہجوم کالی چھتریوں کے آسمان تلے مکھیوں کے کسی چھتے کی مانند اُس اشتہار سے چپکا ہوا تھا جو بڑے ہال کے چوبی دروازے پر چسپاں تھا۔ آخر کار عقدہ یہ کھلا کہ قصبے کے نوجوان مصنف کے کسی افسانے کو مرکزی حکومت نے اس فہرست میں شامل کر دیا ہے جنہیں ہر سال کے آخر میں تمغے کے لیے ایک جیوری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر جیوری کڑی جانچ اور فنی معیار کی تمام تر باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی ایک فن پارے کو اس سونے کے تمغے کے لیے چنتی تھی جو ہر سال کے آخر میں ایک بہت بڑی اور پروقار تقریب میں خود سربراہ مملکت کے ہاتھوں اس فن پارے کے تخلیق کار کے گلے میں پہنایا جاتا تھا۔

یہ خبر سنتے ہی جانے کیوں بڑے ادیب کو اپنے جسم کا سارا خون اپنی کن پٹیوں کی جانب دوڑتا محسوس ہونے لگا۔ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ اس سال کی جیوری میں خود اس بڑے ادیب کا نام بھی ملک کے دیگر ادیبوں کے ساتھ شامل تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے پل بھر میں اس کی برسوں کی ریاضت سے بنائی اور کمائی ہوئی سلطنت کا ایک اور حصہ دار پیدا ہو گیا ہو۔ بڑے ادیب کو یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگا کہ اب قصبے میں کوئی ادبی حوالہ دیا جائے گا تو اس کے نام کے ساتھ اس نوجوان ادیب کا نام بھی آئے گا۔ جب کبھی کسی تقریب میں اسے مدعو کیا جائے گا تب اس کی کرسی کے ساتھ ساتھ اس نوجوان ادیب کی کرسی بھی اس کے شانہ بشانہ لگائی جائے گی اور اگر خدانخواستہ وہ نوجوان خوش قسمتی سے اس تمغے کا حق دار بھی سمجھا گیا تو سمجھو بڑے ادیب کی تو پوری کی پوری ریاست ہی لوٹ لی جائے گی۔ قصبے کے لوگ اسے کوئی متروکہ شخصیت سمجھ کر رفتہ رفتہ بھول جائیں گے۔ لوگوں کی نظر سے اس کے لیے داد و تحسین اور رشک کی چمک رفتہ رفتہ معدوم ہو جائے گی۔ محفلوں میں نازنینوں کے جھرمٹ اُسے دیکھ کر اُس کی جانب لپکنے کے بجائے اس کے آتے ہی کسی اور جانب چھٹ جائیں گے۔ اور پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد آئندہ بڑے ادیب کو ایسی تقریبات میں مدعو ہی نہ کیا جائے؟؟؟ یہ سب سوچتے ہی بڑے ادیب کو ایک جھرجھری سی آ گئی اور اسے اپنا بدن شدید بخار سے تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

بڑے ادیب کی انا پر دوسری کاری ضرب اس وقت لگی جب اُسے یہ پتہ چلا کہ منتخب ہونے والا افسانہ نوجوان ادیب کی وہی کاوش ہے جو مہینوں پہلے اس نے بڑے ادیب کو فنی تجزیے کے لیے دی تھی اور جس کا بڑا ادیب اب تک ہر محفل میں جانے کتنی بار مذاق اڑا چکا تھا۔ اب یہ سوچ کر ہی اسے ''سرسام'' طاری

ہونے لگتا تھا کہ اگر جیوری نے اپنا فیصلہ اسی افسانے کے حق میں دے دیا تو اُس کی علمی اور فنی قابلیت قصبے کے لوگوں کی نظر میں کیا رہ جائے گی؟؟

جس افسانے کو پڑھے بغیر وہ آج تک شدید تنقید کرتا رہا تھا اُس دن جب پہلی مرتبہ اس نے اس کے ورق پلٹے تو بڑے ادیب کو محسوس ہوا کہ صفحے اس کا منہ چڑا رہے ہیں۔ ہر لفظ میں پختگی، ہر جملے میں اتنا گہرا پن..... سچ ہے کہ وہ افسانہ تو تھا ہی ایک ایسا شاہکار جسے کسی اعزاز ہی کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔ بڑے ادیب کے اندر کا لفظ گر اور فن کار چیخ چیخ کر اس افسانے کی ہر سطح پر داد دیتا رہا اور افسانہ ختم کرتے کرتے بڑا ادیب اس بری طرح سے ہانپنے لگا تھا جیسے وہ جانے کتنے میل کی دوری سے دوڑتا ہوا کسی بلند چوٹی تک پہنچا ہو۔

باہر کسی بگھی کے گزرنے اور گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز گونجتی ہے۔ بڑا ادیب کے خیالات کی رو ٹوٹ جاتی ہے اور وہ چونک کر میز پر پڑی اپنی جیبی گھڑی کو دیکھتا ہے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا ہے اور صبح اُسے ہر حال میں اپنا فیصلہ جیوری کے باقی ارکان کو منتقل کرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ اب مزید ٹال مٹول ممکن نہیں تھا اور کل تو فیصلے کا دن بھی تھا۔ اب تک کے نتائج سے یہ صاف ظاہر تھا کہ آخر کار بڑے ادیب کا ووٹ ہی فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ یعنی اگر وہ نوجوان ادیب کے حق میں فیصلہ دے گا تو تمغہ اس کا نصیب ہوگا اور اس کا فیصلہ اگر خلاف ہوا تو نوجوان ادیب ہمیشہ کے لیے اس اعزاز سے محروم ہو جائے گا۔ یہی وہ کش مکش تھی جس نے کئی ہفتوں سے بڑے ادیب کو ہلکان کر رکھا تھا۔ اسکے اندر کا حاسد خود پرست، خود غرض اور خود پسند آدمی اُسے نوجوان مصنف کے حق میں فیصلہ دینے سے روکتا تھا اور چیخ چیخ کر اُسے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے انجام سے باخبر کرتا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر نہ کھودے ورنہ کل اس قصبے میں کوئی اس کا نام لیوا بھی نہ ہوگا اور یہ تمام عزت، شہرت اور توقیر کسی اور کے نام ہو جائے گی۔ لیکن بڑے ادیب کے اندر کا سچا فنکار اسے اس بے ایمانی کے گناہ سے روکتا اور تنہائی میں اُسے نشتر چبھوتا تھا کہ کیا وہ اندر سے اتنا ہی بودا اور کمزور ہے کہ ایک نئے آنے والے کے لیے جگہ خالی کرنے سے بھی خوفزدہ ہے؟؟ ایسا تنگ نظر، کم ظرف تو وہ پہلے کبھی نہ تھا، کبھی کبھی تو اس کے اندر کے چھوٹے انسان اور ایک سچے فن کار کے اندر کی یہ جنگ اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ اسے اپنی روح دو حصوں میں کٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اسے یوں لگنے لگتا تھا کہ ضمیر کی آری اس کے اندر کے حقیقی لفظ گر اور اس کم ظرف انسان کو الگ کرنے کی تگ و دو میں اسے چیر پھاڑ کر علیحدہ کر رہی ہو۔ ظرف اور کم ظرفی کی اس کھینچا تانی میں اسے اپنی روح کے ریشے تک ادھڑتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور آج تو فیصلے کی رات اس قدر بھاری تھی کہ لمحے بھی صدیوں کی طرح سرک رہے تھے۔

اور پھر آخر کار ہر رات کی طرح اس رات کا انجام بھی ایک صبح ہی تھی۔ چاہے وہ صبح دوسری عام صبحوں کی طرح چمکیلی اور روشن نہ تھی لیکن پھر بھی رات کے اندھیرے کو ٹالنے کے لیے کافی تھی۔ رات کے آخری پہر

بادل دل کھول کر برسے تھے اور اب قصبے کی مرکزی سڑک کسی تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ آس پاس کے گھروں سے شریر بچے نکل کر اپنا پسندیدہ مشغلہ یعنی ''کاغذ کی کشتی اور بارش کا پانی'' میں مشغول ہو چکے تھے۔ آسمان اب بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گھروں کی چمنیوں سے کالے دھویں کے ساتھ چائے اور کافی کی مہک بھی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں لوگ ٹھٹھرتی ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے اپنے لمبے لمبے اوورکوٹ پہنے رفتہ رفتہ بڑے ادیب کے گھر کے باہر جمع ہونے لگ گئے کہ آج ان کے قصبے کے ہر دلعزیز نوجوان مصنف کی قسمت کا فیصلہ بڑے ادیب کے قلم سے طے جو ہونا تھا۔ لیکن اب رفتہ رفتہ اس ہجوم میں بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی کیونکہ دن چڑھنے کے باوجود خلاف معمول بڑا ادیب ابھی تک اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ قصبے کے لوگ تو آج اس ارادے سے اکٹھے ہوئے تھے کہ بڑے ادیب کو ایک جلوس کی صورت میں مرکزی ہال تک لے کر جائیں گے جہاں اسے اپنے اہم فیصلے کا اعلان کرنا تھا لیکن آخر اس تاخیر کی وجہ کیا تھی؟ لوگوں کی بے چینی اب اپنے عروج پر آ پہنچی تھی لہٰذا چند بڑے بوڑھوں نے خود آگے بڑھ کر بڑے ادیب کے گھر کا بڑا سا چوبی دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا لیکن کوئی جواب ندارد..... اب تو مجمعے میں تشویش بھری سرگوشیاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ آخر کار گھنٹہ بھر کے انتظار اور طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ پائیں باغ کے راستے سے کوئی ایک نوجوان اندر کود کر گھر کی پچھلی جانب سے اندر داخل ہو کر دروازہ کھولے گا۔

دروازہ کھلتے ہی ہجوم میں دھکم پیل شروع ہو گئی لیکن تین چار بزرگوں نے آگے بڑھ کر سب کو ڈانٹا اور وہیں ٹکے رہنے کا حکم دے کر خود محتاط قدموں سے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ بڑے ادیب کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور دور سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے افسانہ پڑھتے پڑھتے وہ تھک کر وہیں میز پر سر رکھے سو گیا ہے لیکن قریب جانے پر خون کی وہ پتلی سی دھار صاف دیکھی جا سکتی تھی جو بڑے ادیب کی کن پٹی سے ہوتی ہوئی میز سے نیچے ڈھلک کر ایک چھوٹے سے سرخ تالاب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ قریب ہی میز پر لکڑی کے دستے والا وہ لمبا سا ریوالور بھی پڑا تھا جو عام حالات میں ادیب کے کمرے کی انگیٹھی والے کارنس پر سجا رہتا تھا۔ سب سے پہلے داخل ہونے والے بوڑھے نے میز پر پڑی ہوئی فیصلے کی وہ فہرست اُٹھائی جس پر جیوری کے دیگر ممبران کے دستخط ثبت تھے۔ فہرست کے آخر میں بڑے ادیب کا فیصلہ بھی اسکی اپنی تحریر میں موجود تھا اور بڑے ادیب کے خون کے چند چھینٹوں نے خود اس کی اپنی تحریر کو گلنار کر رکھا تھا۔

بڑے ادیب نے نوجوان مصنف کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ شاید اس دنیا کا وہ پہلا گناہ تھا جس کے انجام کار عاصی نے گناہ کرتے ہی خود اپنی سزا کا تعین بھی کر لیا تھا۔ گناہ فیصلے کی فہرست پر موجود تھا اور سزا بڑے ادیب کی لاش کی صورت میں کمرے کی میز پر بکھری پڑی تھی۔

لنڈا بازار (نظم)

ہمیشہ کی طرح آج بھی
سرما کی ان سرد شاموں میں
دفتر سے واپس لوٹتے ہوئے
میرے بڑھتے قدم
اس لنڈا بازار کے نکڑ پر
رُک سے گئے ہیں
ہر سال سوچتا ہوں کہ
اس بار آتے جاڑوں میں
دھانی رنگ کی ایک اُونی شال
تمہیں تحفے میں ضرور دونگا
جسے اوڑھ کر تم جب کبھی

ڈھلتی شام میں گھر سے نکلو گی
تو تمہارے گلابی عارض کا دمکتا رنگ
اس ڈھلتی شفق کو ماند کر دیگا
اور جسے اوڑھ کر کسی سہہ پہر جب
بھاپ اڑاتی پیالی کے عقب سے تم
مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھو گی
تو میرے من میں نہ جانے کتنے کومل سپنے
اس دھنگ رنگ شام کی طرح اُتر آئیں گے
پر کیا کروں.....اے میری ہم نفس
میں ایک ادنیٰ سا کلرک ہوں
جو صرف خواب ہی بنتا رہتا ہے
کاش ان خوابوں کی اونی سلائیاں
تمہاری دھانی شال بھی بن پاتیں.....
لیکن نہیں.....
اب اور نہیں کہ
تم تو ہر سال آتی سردیوں میں
مجھے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیتی ہو
خود اپنے ہاتھوں سے بن کر
پورے سال کے پیسے جوڑ کر

مثلاً میرے گلے سے لپٹا
یہ نیا گرم مفلر، یہ سوئیٹر
اور میرے شانوں کو ڈھانپتا یہ کوٹ
یہ سب تمہی نے تو دیئے ہیں
تو کیا میں تمہارے لیے
ایک نئی شال بھی نہیں لے سکتا؟
نئی نہ سہی..... پرانی ہی سہی
ہاں یہ بھی سچ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے
لنڈا بازار سے کچھ بھی خرید کر
کسی کو تحفہ دینا بہت معیوب لگتا ہے
کہ جیسے کچھ استعمال شدہ پرانے جذبے
کسی نئے رشتے کے رنگین کاغذ میں لپیٹ کر
کوئی کسی اپنے کو سونپ آئے
پر ہم سفید پوشوں کی بھی کیسی
کالی سیاہ مجبوریاں ہوتی ہیں
سو آج دل پر پتھر رکھ کر
میں نے بھی اپنے جھجکتے قدم
پرانی شالوں والی دوکان کی جانب
بڑھا ہی دیئے ہیں.....

ماتھے پر ندامت کا پسینہ
آنکھیں جھکی ہوئی..... کہ
کوئی دیکھ نہ لے..... پہچان نہ لے
بس اسی گھبراہٹ میں میرا لرزتا جسم
ایک ریشمی وجود کی گٹھڑی سے ٹکرا گیا
بارش سے دھلی سڑک پر بہت سے
رنگ برنگے اون کے گولے
چند سوئیٹر، کچھ مفلر بکھر سے گئے
گھبرا کر اوپر دیکھا تو
دو مانوس سے نازک ہاتھ
جلدی میں سب سمیٹتے نظر آئے
وہی الجھی سی لٹ
وہی دل میں اُتر جانے والی خوشبو
وقت تھم گیا اور ہماری نظر ملی
تب میں نے یہ راز پا ہی لیا
کہ شاید یہ ساری دنیا ہی اپنے آپ میں
کچھ بوسیدہ رشتوں کا لنڈا بازار ہی تو ہے
جہاں ہم سب اپنے جذبوں کی
پرانی زنگ زدہ اُونی سلائیوں سے.....

رشتوں کے رنگین گولوں سے بنے سوئیٹر
ساری زندگی.....ادھیڑتے رہتے ہیں
پھر بُنتے ہیں.....اور بُن کر پھر سے
اُدھیڑ دیتے ہیں.....

(ہاشم ندیم خان)

صلیبِ عشق (افسانہ)

اس کی عمر ابھی صرف سولہ برس تھی۔ عام حالات میں اس کی عمر کے لڑکے کالج کی ابتدائی زندگی کی نئی رنگینیوں میں کھونے کی تیاری میں مشغول ہوتے ہیں لیکن وہ تو ''زندگی'' لفظ سے ہی نا آشنا تھا۔ صرف سانس لینا ہی تو جینا نہیں ہوتا۔ اُسے بھی جیئے جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ اب تو وہ صرف سانس لیتا ہوا ایک جسم تھا اور آج ہائی کمانڈ کی طرف سے اُسے خود اپنے ہاتھوں اپنی اس چلتی سانس کی ڈور کو بھی توڑ دینے کا حکم نامہ آچکا تھا۔ اُسے اپنی سانس کا اپنے اس بوسیدہ جسم سے ناطہ کب اور کہاں توڑنا تھا، صرف یہی طے ہونا باقی رہ گیا تھا۔ شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور اس کے ''بڑوں'' کی جلد بازی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ معاملہ بس اب چند گھنٹوں کا ہی رہ گیا ہے۔

لیکن زندگی ہمیشہ سے اس سے یوں ناراض تو نہ تھی۔ وہ بھی کبھی زندہ تھا۔ اُس کی کٹی پھٹی یاداشت میں ابھی تک اپنی ماں کا وہ فرشتوں جیسا پرنور سکارف میں لپٹا چہرہ کسی کوندے کی طرح لپک جاتا تھا۔ جس کی مہربان گود میں چھپ کر وہ اور اسکے دیگر دو بہن بھائی زمانے کے ہر سرد و گرم سے بیگانے ہو جاتے تھے۔ وہ سب سے بڑا بھائی ہونے کے ناطے باقی دونوں سے کچھ زیادہ ہی ماں پر حق جتاتا تھا اور باقاعدہ اپنی ماں سے لپٹ کر دوسرے دو چھوٹے بہن اور بھائی کو للکارتا رہتا کہ دیکھو امی مجھ سے تم دونوں سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں اور پھر جب چھوٹی بہن اور بھائی منہ بسورتے تو ماں ہنس کر سبھی کو اپنے ساتھ لپٹا لیتی تھی۔

زندگی ہمیشہ سے اتنی تاریک اور بے رنگ بھی تو نہ تھی۔ اُسے تو بچپن ہی سے خاکوں میں رنگ بھرنے کا جنون تھا۔ اسکول میں اور گھر واپسی کے بعد وہ ہمہ وقت رنگوں کے ہجوم میں ہی گھرا رہتا تھا۔ اس کی ماں جانے

کہاں کہاں سے اُس کے پسند کے رنگ جمع کرتی اور پھر ماں بیٹا مل کر سارے گھر میں رنگولی ڈالتے۔ کبھی اس کی ڈرائنگ کی کاپی پر، کبھی اس کے لیے خصوصی طور پر بنوائے گئے چھوٹے سے کینوس پر اور کبھی اس کے کمرے کی دیواروں پر اُس کی ماں نے کبھی بھی اسے رنگوں سے کھیلنے سے منع نہیں کیا تھا، شاید اس لیے بھی کہ خود اس کی ماں کی زندگی سے قسمت نے سارے رنگ بہت جلد ہی نچوڑ لیے تھے۔ بہت سال پہلے جب اس کا چھوٹا بھائی ابھی اس کی ماں کی گود میں ہی تھا کہ ایک دن اچانک اس کی نازک سماعتوں میں اس کے باپ کے چیخنے چلانے کی آوازیں گونجیں۔ اس کی ماں بے بس سی باپ کے سامنے کھڑی آنسو بہاتی رہی اور پھر اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے اور ان تینوں کو لیے دوسرے شہر چلی آئی تھی۔

اس کی ماں کے سارے گہنے تو رفتہ رفتہ بک ہی چکے تھے لیکن ایسے وقت میں تعلیم کا وہ انمول زیور ہی اس کی ماں کے کام آیا جو جتنا خرچ ہوتا گیا، اتنا ہی بڑھتا گیا اور جس دن اس نے ساتویں سال میں قدم رکھا تھا اسی دن اس کی ماں کو پی ایچ ڈی کی اعلیٰ سند سے سراہا گیا تھا۔ اس کی ماں سر پر سکارف اور ڈھے پاکیزگی کی مورت بنی جب گھر سے یونیورسٹی کے لیے نکلتی تو ان تینوں بہن بھائیوں کو بھی اسکول کے گیٹ پر چھوڑتی جاتی اور دوپہر کو چھٹی کے وقت دوبارہ وہ ان تینوں کو لینے کے لیے تپتی دھوپ میں ہاتھ کا چھاتہ بنائے باہر کھڑی ملتی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ تینوں ہی ماں کو دیکھتے ہی کس طرح چیختے چلاتے اور شور مچاتے اپنی مسکراتی ہوئی ماں کی جانب بھاگا کرتے تھے۔ تب ان تین معصوموں کو اس بات کا احساس ہی کہاں تھا کہ مائیں کتنی سایہ دار ہوتی ہیں اور اپنے مختصر سے وجود میں کتنا زیادہ اور گھنا سایہ سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔

گھر آنے کے بعد ماں ان کو کھانے کھلانے اور نہلانے دھلانے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ اکثر راتوں کو جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنی ماں کو اُس کی نیلی ڈائری میں کچھ لکھتے ہوئے پاتا۔ اسے یاد تھا کہ ایک رات جب اس کی ماں نے ان تینوں کو کہانی نہیں سنائی تھی اور ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے میں مصروف رہی تھی تو اگلے دن اس نے چڑ کر ماں کی وہ ڈائری کہیں چھپا دی تھی اور پھر اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جب اس کی ماں بالکل ہی ہلکان ہو کر گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی تھی تو اس نے جلدی سے اپنی بلی کے لیے بنائے گئے گھر کے پچھواڑے سے وہ ڈائری نکال کر اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ تب اس کی ماں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اس ڈائری میں اپنی تحقیق کے بارے میں مختصر نوٹس اور فارمولے اتارتی ہے تاکہ اگلی مرتبہ اسے وہ موٹی موٹی کتابیں دوبارہ نہ پڑھنا پڑیں جن سے دن رات کی عرق ریزی کے بعد اس نے یہ سارا مواد کشید کیا تھا۔ تب اس نے ایک سرسری سی نظر اس ڈائری کے اوراق پر ڈالی تھی۔ لیکن اس کے پلے خاک بھی نہیں پڑا تھا۔ بس چند دائرے اور چند لکیریں تھیں جو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس نے جلدی سے اپنی ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر پکا وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ کبھی بھی اپنی ماں کو اس طرح نہیں ستائے گا اور پھر

جلدی سے اس نے اپنی ننھی منی انگلیوں سے ماں کے بہتے آنسو بھی پونچھ ڈالے تھے۔ تب ماں اور بیٹا دونوں ہی ہنس دیئے تھے اور پوری کائنات مسکرادی تھی۔

لیکن تقدیر کو سب کا سدا مسکرانا کہاں بھاتا ہے۔ اگلے ہی سال جب وہ ابھی صرف آٹھ سال کا تھا اور اپنی ماں اور بہن بھائی کے ساتھ اپنی سالگرہ کا کھلونا لینے کے لیے ایک ٹیکسی میں سوار اپنے چھوٹے سے گھر سے ابھی نکلا ہی تھا کہ راستے میں چند کرخت چہرے والے لوگوں نے ہاتھ دے کر ان کی ٹیکسی رکوالی۔ دفعتہً سامنے کھڑی بڑی سی گاڑی میں سے گورے رنگ کی ایک لومڑی نما عورت نکلی اور اُس نے بڑی بدتمیزی سے اس کی ماں کو ٹیکسی میں سے کھینچ کر باہر اتار دیا۔ تینوں بچے سہم کر ایک دوسرے سے ہی لپٹ گئے۔ ان کی ماں نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی تو اس گوری لومڑی نے وہیں بھری سڑک پر اس کی ماں کے چہرے پر چانٹوں کی بوچھاڑ کر دی۔ تینوں بچے ڈر کر رونے لگے۔ اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنی بہن اور چھوٹے بھائی کو کیسے چپ کروائے کیونکہ خود اس کی آنکھوں سے خوف اور درد کے مارے آنسو لگاتار ٹپک رہے تھے۔ کوئی اس کی ماں کو تھپڑ مار رہا تھا اور آس پاس چلتی آتی جاتی ساری غلام روحیں صرف تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے ماں کی جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن ساتھ ہی کھڑے ہوئے ایک موٹے بھینسے نما شخص نے زور سے جھڑک کر اسے اپنی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا اور وہ سہم کر ٹھٹھک سا گیا۔ اس کے ننھے بہن بھائی جلدی سے اس کے پیچھے چھپ گئے۔ جس بچے کی ماں کے گالوں پر چانٹے پڑ رہے ہوں تو اس کا درد وہی بچہ محسوس کرسکتا ہے۔ اس نے زندگی میں اس کے بعد بھی بہت مار سہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی نازک جلد کو جلتے سگریٹ کے ذریعے بارہا داغا بھی گیا تھا..... لیکن اپنی ماں کے گالوں پر پڑنے والے ان تھپڑوں کی کاٹ، ان کی جلن اور ان کا بے رحم اور روح نچوڑ لینے والا درد وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ پھر اُس گوری لومڑی کے آس پاس کھڑے اس کے غلام محافظوں نے جھپٹ کر اس کی ماں کو ایک دوسری گاڑی میں اٹھا پٹخا اور اُسے اس کی بہن اور بھائی سمیت ایک دوسری گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا اور دونوں گاڑیاں مخالف سمتوں میں روانہ ہوگئی تھیں۔

وہ رات بھی اتنی ہی کالی اور بھیانک تھی جب اُسے یہ بتایا گیا کہ اس کی ماں ایک دہشت گرد ہے۔ بھلا کوئی ماں بھی کبھی دہشت گرد ہوسکتی ہے؟ اور پھر اس کا معصوم ذہن تو اس وقت اس لفظ سے ہی ناآشنا تھا۔ وہ تو بس پیر پٹخ پٹخ کر ساری رات روتا رہا تھا کہ کوئی اُسے اس کی ماں اور بہن بھائیوں کے پاس چھوڑ آئے۔ جنہیں دیکھے ہوئے اب اسے پورے چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اس کی بہن بھائیوں کو راستے ہی میں اس سے جدا کر دیا گیا تھا اور اب وہ اکیلا ہی اس اندھیری چھوٹی سی لوہے کی کال کوٹھری نما کمرے میں سکڑا سمٹا سا بیٹھا ہوا تھا۔ اب تو اس کے ننھے ننھے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو بھی رفتہ رفتہ جمنے لگے تھے لیکن آج اس کی

ماں کے مہربان ہاتھ اس کے پھٹے ہوئے گالوں سے یہ نمکین زہر پونچھنے کے لیے موجود نہیں تھے اور پھر ماں کی عافیہ ہستی رفتہ رفتہ اس کی یادوں سے محو ہوتی گئی۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ اُسے جو لوگ یہاں لیکر آئے تھے ان سے اُسے اپنی ماں کی صرف اتنی خبر ملتی رہتی کہ اب اس کی ماں باقاعدہ ایک قیدی ہے اور اس کا نام اب صرف قیدی نمبر 650 رہ گیا ہے۔ لوگ اُسے بتاتے تھے کہ اس کی ماں کا نام بین الاقوامی دہشت گردوں کی فہرست میں درج ہے اور دنیا کے امن کو بچانے والے ''ٹھیکے داروں'' نے اس کی عفت مآب ماں کو مردوں کے قید خانے میں ہی بند کر رکھا ہے۔ وہ جس کے محرم ناخن کو ایک جھلک بھی آج تک کسی نامحرم نے نہیں دیکھی تھی آج اسے مخلوط غسل خانوں والے ایک زنداں میں سینکڑوں بھیڑیئے دن رات آتے جاتے اپنی بھوکی نظروں سے گھورتے رہتے تھے۔

وہ پہروں بیٹھا سوچتا رہتا تھا کہ اس کی بھولی سی معصوم ماں جو گھر میں کسی چھپکلی کی موجودگی کا سن کر ہی سراسیمہ ہو جاتی تھی وہ بھلا ان درندوں کا وحشیانہ تشدد کیسے برداشت کرتی ہوگی۔ جب انہوں نے اس کی ماں کے نرم ملائم ہاتھوں اور پیروں کے ریشے سے اس کے ممتا بھرے ناخن علیحدہ کیے ہوں گے تو وہ درد کی انتہا سے کتنی بار بے ہوش ہوئی ہوگی؟ جب اس کے مقدس بدن پر جلتے ہوئے انگارے رکھے گئے ہوں گے تو وہ کس کرب سے کراہی ہوگی؟ جب اس کے نور بھرے ماتھے اور سر پر شدید کھولتے ہوئے پانی کی دھار انڈیلی گئی ہوگی تو وہ کس قدر چلائی ہوگی؟ جب اس کی کوٹھڑی میں رات کو اچانک اُس کے سوتے وقت زہریلے بچھو اور چھوٹے سنپولیے چھوڑ دیئے جاتے ہوں گے تو وہ کیسے ساری ساری رات لرزتی کانپتی ایک ٹانگ پر کوٹھڑی کے کونے میں سکڑی سمٹی کھڑی رہ کر پوری رات گزارتی ہوگی؟ اُسے تشدد کے یہ سارے طریقے اس لیے بھی پتہ تھے کیونکہ وہ جہاں قید تھا اس قید خانے میں اپنے آس پاس وہ اُن درندوں کو روزانہ یہ سارے حربے ان معصوم لوگوں پر آزماتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا جو نہ جانے کہاں کہاں سے اُٹھا کر ان بندی خانوں میں لا کر قید کر دیئے گئے تھے۔ اُس کی معصوم آنکھیں اور نازک احساسات جو ابھی ٹھیک طرح سے کھلے بھی نہیں تھے اپنے سامنے دن رات یہ تماشہ ہوتے دیکھتے اور رفتہ رفتہ اس کے اندر کا معصوم بچہ مرتا گیا اور وہ ایک مشین میں بدلتا گیا ایک ایسی مشین جو سب کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے لیکن کچھ محسوس نہیں کر سکتی۔

پھر ایک دن اُسے خبر ملی کہ اس کی ماں اپنے درد کی آخری حد سے بھی گزر گئی ہے اور اپنے ہوش و حواس سے بیگانی ہوگئی ہے۔ لیکن اپنے دشمنوں کے لیے شاید وہ ایک پاگل عورت کے روپ میں بھی اب تک اتنی ہی خطرناک تھی تبھی انہوں نے اُسے آزاد کرنے کے بجائے اسے مزید اندھیرے، سردی سے یخ ٹھٹھرتے چوہے کے بل نما پنجروں میں قید کر رکھا تھا جس کی تنگ راہداریوں میں دن کے وقت بھی رات رہتی تھی اور جن کی سکڑی سمٹی روشوں میں سے ایک اکیلا انسان بھی بنا دیواروں سے رگڑ کھائے نہیں گزر سکتا تھا۔

لیکن اسے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی کہ ماں تو سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ وہ اُن کے نزدیک چاہے کچھ بھی سہی، لیکن وہ اُس کی تو ماں تھی، کوئی بھی کسی کی ماں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ دنیا کا کوئی بھی قانون ماں کی ممتا اور بیٹے کے رشتے کو جدا نہیں کر سکتا پھر اُس کے معصوم بچپن کو کیوں روندا گیا؟ کیوں ایک بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا گیا؟ اگر اس کی ماں کو کسی نا کردہ گناہ کی سزا ہی دینا مقصود تھا تو پھر اُسے اور اُس کی ماں کے دوسرے دو بچوں کو اُن کی ماں کے ساتھ ہی کیوں نہیں قید کر دیا گیا؟ گوری لومڑی اور اس کے آقاؤں کے نزدیک اگر اس کی ماں مجرم تھی تو اس کی سزا انہوں نے اس ماں کے تین بچوں کو کیوں دی؟ کیا دنیا کی کوئی بھی عدالت اُن کے بچپن کا صرف ایک لمحہ بھی واپس لوٹا سکتی تھی؟ اور کیا آخرت ہی میں اس زیادتی کا کوئی بدل ممکن تھا؟

پھر ایک دن اچانک اُس قید خانے پر کسی گروہ نے ہلہ بول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کسی نقاب پوش نے اس کا ہاتھ تھاما اور وہ لوگ اُسے نکال کر لے گئے۔ لیکن اسی کے لیے یہ سارا ہنگامہ صرف آقاؤں کی تبدیلی کا مظہر ثابت ہوا۔ تب پتہ چلا کہ یہ لوگ اس کی ماں کے دشمنوں کے دشمن ہیں اور اس کی ماں پر انہی لوگوں کی معاونت کا الزام تھا۔ اب یہ نئے آقا دن رات اسے اس بات کا احساس دلاتے رہتے تھے کہ اس کی ماں کی زندگی برباد کرنے والے کسی رعایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اب اُسے انتقام کے لیے کمر کس لینی چاہیے۔ اس کی زندگی مذہب کی دی ہوئی ایک مقدس امانت ہے اور یہ جسم بھی عارضی طور پر مستعار دیا گیا ہے۔ اس کی یہ برین واشنگ دن رات جاری رہتی اور وہ لوگ ہی مختلف ذرائع سے اُسے اس کی ماں کے ساتھ ہونے والے بہیمانہ سلوک کی داستانیں سناتے رہتے۔ کبھی کبھی تو اُسے یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی ماں کے دشمن اور یہ نام نہاد نئے آقا ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ بھلا اس کی معصوم اور بھولی ماں کا ایسے انتہا پسندوں سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ اُسے تو غم روزگار نے کبھی اتنی فرصت بھی نہیں دی تھی کہ کبھی فرصت سے اپنے بچوں کو لوری ہی سنا دے۔

اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے آس پاس یہ سبھی روحیں خود اپنا سودا طے کر چکی ہیں اور اب ان جسموں میں قید یہ سبھی غلام روحیں ہیں جنہیں اپنے اوپر بیٹھے اس ہاتھ کا بھی پتہ نہیں جو ان سب کی ڈور ہلاتا رہتا ہے۔ وہ اپنے خیالات میں گم تھا کہ اچانک اس کے آہنی قید خانے کا دروازہ کھلا اور اس کے نئے آقاؤں میں سے ایک نے اُسے آ کر خوش خبری دی کہ آخر کار اس گناہوں بھرے جسم سے اس کا رابطہ ٹوٹنے کی سہانی گھڑی آ ہی گئی ہے اور اس کی خوش نصیبی ہے کہ اسے اپنی ماں کے دشمنوں میں سے ایک اہم ٹولے کو اپنے آپ سمیت ختم کرنے کا ایک سنہری موقع دیا جا رہا ہے۔ اسے ایک انجکشن لگایا گیا جس سے اس کے حواس بالکل ہی جامد ہو گئے اور وہ صرف ایک سننے اور عمل کرنے والی مشین میں تبدیل ہو گیا۔ انجکشن لگاتے وقت اُسے یہ بھی بتایا گیا

کہ یہ عمل اس لیے ضروری ہے کہ کہیں آخری وقت پر اس کے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ اسے بتایا گیا کہ اُسے صرف اس ہجوم کی جانب بڑھنا ہے جہاں اس کا رہبر اُسے اشارہ کرے گا اور پھر مناسب وقت پر ریموٹ کا بٹن دبانے کا فریضہ خود اس کا رہبر سرانجام دے گا۔ جس وقت اُس کا نیا آقا اُسے اس صراط مستقیم پر چلنے کے بعد حاصل ہونے والی لامحدود نعمتوں کا ذکر کر رہا تھا تب وہ سن سا ذہن لیے بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس کے بچھڑے ہوئے بہن اور بھائی بھی کہیں اسی طرح کے آقاؤں کے جھرمٹ میں بیٹھے اپنے سینے پر بیلٹ بندھوا رہے ہوں گے۔

اسے ٹھیک وقت پر اس علاقے میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ تقریب ہونی تھی۔ اُس کے رہبر نے دور سے اشارہ کر کے اُسے اس ہجوم کا ٹھکانہ بتایا اور اپنے آپ سے ایک خاص فاصلے پر رکھ کر اُسے روانہ کر دیا۔ ہجوم کی طرف بڑھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کبھی ایسی ہی بڑی بڑی تقریبات میں اس کی ماں کی لیاقت اور علم کو سراہا جاتا تھا۔ اسٹیج پر بیٹھی عورت بھی تو کسی کی ماں ہی ہوگی بلکہ چند لمحے کے لیے تو اُسے وہ بالکل اپنی ماں جیسی ہی دکھائی دی تھی۔ اس کے رہبر نے دور سے اسے اشارہ کیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے منہ سے اس کا آخری لفظ نکلا..... ماں..... ایک زوردار دھماکا ہوا اور نہ جانے کتنی ماؤں کے جسم ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اگلے دن اخبار کی شہ سرخی تھی۔

''سات سال کی گمشدگی اور قید کے بعد مشہور پی ایچ ڈی عالمہ ایک خودکش دھماکے میں شہید، شنید میں آیا ہے کہ وہ اپنی اس پہلی کانفرنس میں بہت سے اہم رازوں سے پردہ اٹھانے والی تھیں جبکہ حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ دہشت گردی سے آہنی ہاتھوں سے نپٹا جائے گا.....''

کیفے فراق (افسانہ)

ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد ہمارے ملک کے مختلف شہروں میں بہت سے ایرانی ہوٹل اور ریستوران کھل چکے تھے جن کی وجہ سے مقامی ریستوران والے کافی بھنائے ہوئے رہتے تھے کیونکہ ایرانی ہوٹل اور کیفے عام طور پر بے حد صاف ستھرے، رنگین شیشوں سے مزین اور بہتر خدمت کرنے والے عملے کے حامل تھے لہٰذا پرانے گاہکوں کی بہت بڑی تعداد ان ریستورانوں کی جانب متوجہ ہو چکی تھی اور مقامی کیفے اور ریستوران رفتہ رفتہ ویران ہوتے جا رہے تھے۔ ایسا ہی ایک ایرانی ''کیفے فراق'' ہمارے صدر کے علاقے میں بھی کھل چکا تھا اور جب صبح سویرے حمد و تلاوت کے بعد ریستوران کے پرانے دو بینڈ کے ریڈیو اور ریکارڈ سے ''ملا محمد جان'' اور گھوگھوش کا ''من آمدم'' نشر ہوتا تو آس پاس کے تمام دوکاندار بھی سر دھننے لگتے تھے۔ ان دنوں محلے کے نوجوانوں کے گروہ بھی پرانے نکڑ والے سلو کے ہوٹل کو چھوڑ کر نئے انڈین اور ایرانی ریکارڈ سننے کے شوق میں دن بھر کیفے فراق کی کرسیاں توڑتے رہتے اور دن بھر چائے اور پان کی فرمائش چلتی رہتی تھی۔ خاص طور پر شام چار بجے کے بعد تو کیفے کے ہال میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں بچتی تھی۔ چائے کیفے کا ایرانی بیرا ''فرہاد'' مہیا کرتا اور پان باہر فٹ پاتھ سے منسلک حاجی مصطفیٰ کے لکڑی والے کھوکھے سے سپلائی ہوتے رہتے تھے۔ فرہاد اپنے نام کی طرح رنگین اور عاشق مزاج نوجوان تھا جو انقلاب کے بعد پابندیوں سے گھبرا کر یہاں دوڑا چلا آیا تھا اور اب اس ایرانی ریستوران میں بیرا گیری کر کے گزر بسر کر رہا تھا۔ محلے کے لڑکے اُس کی فارسی آمیز اردو سے بہت لطف اندوز ہوتے اور اُن کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ کیفے کا مالک حاجی علی مشہدی جو خود کو فراق کے تخلص سے پکارا جانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ دن بھر رضا شاہ پہلوی کے ایرانی دور کو یاد کر کے آہیں بھرتا

رہتا اور گھوگھوش اور خانم نامی گلوکاراؤں کی تصاویر کو دیکھ کر پرانی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کی پچاس بہاریں ایران کے شہر مشہد میں گزار چکا تھا اور اب یہ ''یادِ ماضی'' اُس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو انقلاب میں گنوا چکا تھا اور اب صرف تنہائی اور یادیں اُس کا مقدر تھیں۔ وہ صبح سویرے کیفے کھولنے پہنچ جاتا جہاں فرہاد اس سے پہلے موجود ہوتا چونکہ وہ کیفے کی دوسری منزل پر بنی دو چھتی میں ہی رہتا تھا۔ یہ خصوصی اجازت اس کے مالک فراق نے اُسے تب دی تھی جب فرہاد نے ایران سے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ کیفے کی نوکری کے لیے علی مشہدی کے پاس آ کر درخواست گزاری کی تھی۔ صبح کیفے کے لکڑی کے پرانے دروازے کھلتے ہی فرہاد دوسرے دو بیروں کے ساتھ مل کر سب سے پہلے ریستوران کے فرش کو پانی سے دھلواتا اور تمام شیشوں کا رگڑ رگڑ کر صاف کرواتا تھا۔ اتنی دیر میں علی مشہدی اپنی تلاوت اور دعا سے فارغ ہو کر کاؤنٹر سنبھال چکا ہوتا اور تب فرہاد اپنے مالک کی اجازت سے صبح ناشتے کی تیاری کے دوران اپنی پسند کے ریکارڈ بدلتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ریڈیو پر ریڈیو تہران کی اردو سروس بھی چلتی رہتی۔ کچھ ہی دیر میں دودھ لانے والی گاڑی دودھ کی بوتلیں اتار جاتی اور شہر کی بڑی بیکری سے انڈے اور ڈبل روٹی کی ٹوکریاں بھی پہنچ جاتیں۔ کیفے کے بڑے پرانے ایرانی فرج میں رکھی مکھن کی ٹکیاں اور شیر مال ''بن مسکہ'' تلنے کے کام آئیں اور کچھ ہی دیر میں کیفے کی فضا چائے کی سوندھی اور ناشتے کی کراری خوشبو سے مہکنے لگتی اور آس پاس کے مکین ناشتے کی خریداری اور ایک پر لطف ناشتے کا مزہ لینے کے لیے ''کیفے فراق'' کے وسیع دروازوں سے اندر داخل ہونے لگتے تھے۔ مشہدی اپنے چہرے پر روایتی ایرانی خوش دل مسکراہٹ سجائے ان سب کا استقبال کرتا اور یوں ایک خوشگوار صبح سے دن کا آغاز ہو جاتا۔ محلے کے کچھ بوڑھے اپنی چھتریاں ٹیکتے کیفے میں آ کر بیٹھ جاتے اور ایرانی قہوے کے ساتھ مصری یا ایک ڈلی اپنے کلوں میں دبائے کئی کئی کپ قہوہ اُنڈیل جاتے۔ ساتھ ساتھ لتا اور مکیش یا رفیع کے پرانے نغموں کے ریکارڈ کی فرمائش بھی جاری تھی۔ اسی ہنگامے میں صبح دن میں ڈھل جاتی اور دوپہر کے کھانے کے وقت ہو جاتا۔ نرم گرم ایرانی کلچوں کے ساتھ کم مرچ اور مصالحے والی سبزی یا ترکاری پیش کی جاتی اور ایرانی چلو کباب اور سادہ چاولوں کی پلیٹیں میزوں پر سجنے لگتیں۔ آس پاس کے فلیٹوں اور مکانوں سے بچے ہاتھوں میں دسترخوان لیے گرم کلچے لینے کے لیے پہنچ جاتے اور زیادہ تر بچی ہوئی ریزگاری سے ایرانی ببل گم، شیک اور آفندی سے اپنی جیبیں بھر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد شام کی چائے کا وقت ہونے لگتا اور سہ پہر چار بجے تک کیفے کی خالی کرسیاں محلے کے فارغ اور من چلے نوجوانوں کی ٹولیوں سے پر ہو چکی ہوتیں۔ اس میں کچھ ہاتھ کیفے فراق کی مزیدار چائے اور ماحول کا تھا تو کافی زیادہ شام ساڑھے چار بجے روزانہ گھر کے ناشتے اور شام کی چائے کا سامان خریدنے آنے والی اُس مہ جبیں کا تھا جس کا نام بھی وہاں شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ یہ حادثہ ابھی چند روز پہلے ہی وقوع پذیر ہوا تھا جب صدر کی تیسری گلی میں یہ ایرانی خاندان ہجرت کے

بعد منتقل ہوا تھا۔ لڑکی اپنی کم عمر کی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ تھامے کیفے کے ہال میں داخل ہوتی تو بہت سوں کی نبض اور دل کی دھڑکن رک جاتی تھی۔ بوڑھے کھنکار کر خاموش ہو جاتے۔ جوانوں کی سانس بولنے لگتی اور سارے ماحول پر رنگینی سی چھا جاتی۔ سرگوشیاں تیز ہونے لگتیں اور خاموشیاں گنگنانے لگتیں۔ فرہاد کے بقول وہ چھوٹا لڑکا اس لڑکی کا بھائی تھا اور ان کا باپ ایران کے انقلاب میں قید ہو کر وہیں جان دے بیٹھا تھا۔ بڑا بھائی اور گھر کا واحد کفیل بیٹا بھی لاپتہ تھا لہٰذا لڑکی کی ماں گھر میں ایرانی کشیدہ کاری اور کشن تکیے وغیرہ سی کر گھر کا خرچہ اُٹھاتی تھی۔ لڑکی ایران کی تہران یونیورسٹی میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر آئی تھی اور فی الحال ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ فرہاد کی دھڑکنیں تو اُسی روز اتھل پتھل ہو چکی تھیں جس دن پہلی مرتبہ اس ماہ رو نے اپنے چہرے کا سیاہ نقاب اُلٹ کر اُس سے ایرانی مکھن کی ٹکیہ کی فرمائش کی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو سن کر فرہاد نے جلدی سے اُسے فارسی میں یہ اطلاع دی کہ وہ بھی اُسی کا ''ہم سایہ'' ہے اور وہ فارسی میں بات کر سکتی ہے۔ لڑکی کی ماں نے بہت دنوں بعد اپنی مادری زبان سنی تو وہ بھی اپنے آنسو نہ روک سکی اور شد فارسی میں سلام جواب سن کر علی مشہدی کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی تکلف کے سارے پردے اُٹھ گئے اور علی مشہدی نے مہمان نوازی کی انتہا کر دی۔ اس نے پہلے روز ماں بیٹی سے کسی بھی قسم کی قیمت وصول کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ یہ اس کی غیرت کے خلاف ہے۔ ماں نہ نہ ہی کرتی رہ گئی لیکن مشہدی نے فرہاد کے ہاتھ بہت سی کھانے پینے کی چیزیں لڑکی کے ہاتھ میں پکڑی پلاسٹک کی ایرانی ٹوکری میں رکھوا دیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس دوران مشہدی نے فرہاد کو بولنے کا ذرا بھی موقع نہ دیا بلکہ ایک آدھ بار اُسے ہلکی سی جھاڑ بھی پلا دی کہ وہ مہمانوں کے رتبے اور مرتبے کو مدنظر رکھتے ہوئے منہ کھولا کرے۔ لڑکی کی آنکھوں میں شکریے اور احسان مندی کی ایک جھلک نے ہی مشہدی کو نہال کر دیا۔ پھر یوں ہونے لگا کہ روز ساڑھے چار بجے شام پورا ''کیفے فراق'' سراپا انتظار ہو جاتا اور جب تک وہ گل رخ وہاں سے ہو کر واپس نہ چلی جاتی تب تک کیفے کی فضا پر ایک عجیب سی بے چینی طاری رہتی تھی۔ جیسے کوئی اہم فریضہ چھوٹ گیا ہو۔۔۔ اور پھر جب وہ آ کر چلی جاتی تو سب ہی کو اپنے بھولے ہوئے کام یاد آنے لگتے اور کیفے پھر سے جاگ اٹھتا تھا۔ شروع کے چند دن ماں بھی بیٹی کے ساتھ آتی رہی اور پھر راستوں اور لوگوں سے جان پہچان کے بعد بیٹی تنہا آنے لگی۔ چھوٹا بھائی البتہ اب بھی اس کی انگلی تھامے رہتا۔ محلے کے مٹر گشتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور اب رات کے آوارہ گرد بھی سہ پہر کو ہی شام کرنے لگے تھے۔ علی مشہدی کو اپنی ایران میں بتائی جوانی کی ہر سہانی شام بری طرح یاد آنے لگی تھی اور جس دن وہ نازک اندام اپنا پہلا قدم کیفے کے فرش پر دھرتی ٹھیک اُسی گھڑی اس کے اندر کے تمام گھنگھرو بجنے لگتے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال فرہاد کا بھی تھا مگر اس کا سخت گیر مالک اب ایسے مواقع پر اُسے کاؤنٹر کے گرد پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ شاید اسے بھی فرہاد کی آنکھوں میں پلتی وہ چمک نظر آ چکی تھی جو آگے چل کر کسی رقیب کی آنکھوں کی

روشنی ثابت ہوسکتی تھی۔ لیکن مشہدی اب مزید کوئی ''فراق'' سہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی اپنے دل کی بات وہ اس قاتل جاں کے گوش گزار کر دے گا۔ مشہدی کی صحت پچاس کے پیٹے میں بھی قابل رشک تھی اور اتنی بڑی جائیداد کا وہ تن تنہا مالک تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ پھر ایک روز اس نے موقع پا کر تنہائی میں لڑکی سے اس کی ماں کا حال پوچھنے کے بہانے اس کا نام بھی پوچھ لیا۔ لڑکی شرما سی گئی اور دھیرے سے بولی ''فرح خانم''..... مشہدی کے حلق میں شہد کی مٹھاس گھل گئی۔ ''فرح.....'' ہاں.....اس سبک اور نازک اندام کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہیے تھا۔ ''فرح''.....کتنا اچھا نام تھا اس کا.....

اب علی مشہدی گاہے بگاہے فرح کی ماں خانم ذکیہ کا حال احوال پوچھنے کے بہانے فرح سے بات چیت کا سلسلہ بڑھانے لگا تھا۔ فرح جب بھی شرماتے ہوئے مشہدی کے سوالوں کے جواب دیتی تو دور کھڑے کسی کام میں مصروفیت کا دکھاوا کرتے فرہاد کے سینے پر کئی سانپ لوٹ جاتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی غربت کو خوب کوستا اور رات بھر فٹافٹ امیر ہونے کے کئی منصوبے بنا کر توڑتا رہتا۔ اس کی نظر آج کل مشہدی کے گلے پر بھی لگی رہتی تھی جو کاؤنٹر کے پیچھے ایک خفیہ دراز بھی تھا جہاں کیفے کی مہینے بھر کی کمائی جمع رہتی تھی۔ مشہدی کا معمول تھا کہ وہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو سارے مہینے کی جمع شدہ کمائی میں سے اگلے ماہ کا خرچہ نکال کر باقی ماندہ پیسے قریبی بینک میں جمع کرا دیتا تھا۔ جب سے فرح ان کے کیفے آنے لگی تھی فرہاد کا کئی بار جی چاہا تھا کہ وہ چپکے سے گلے میں سے تمام روپے نکال کر فرح کے ہاتھ پر رکھ دے کہ ''یہ لو.....مگر اس عاشق مزاج بوڑھے سے دور رہا کرو.....'' یا پھر وہ یہ سوچتا رہتا تھا کہ کسی روز لمبا ہاتھ مارنے کے بعد وہ فرح اور اس کی ماں کو لے کر اس شہر ہی سے کہیں دور چلا جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ فرح اس کی پیش کش ضرور قبول کر لے گی۔ وہ ابھی نوجوان تھا، خوبرو تھا، پھر کیا ہوا کہ فی الحال غربت اس کے گلے کا طوق بنی ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اگر فرح جیسی دلبر کا ساتھ ہو تو وہ ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ خود اُسے کئی بار یہ شبہ ہوا تھا کہ فرح اُس کی جانب دیکھ کر مسکائی ہے۔ مگر مشہدی کی سخت گیر نظریں کبھی بھی جی بھر کر فرہاد کو فرح کا حسن نہارنے نہیں دیتی تھیں۔ اب تو وہ ہر روز کسی نہ کسی بہانے سے شام ساڑھے چار بجے کے قریب فرہاد کو کیفے سے باہر کسی کام سے بھجوانے لگا تھا اور یہ عمل فرہاد کے لیے کسی تازیانے سے کم نہ تھا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ اس کا مالک اُسے کسی بھی طور فرح سے دور رکھنا چاہتا ہے اور یہیں سے اس کے اور مشہدی سے انتقام کا جذبہ پنپنے لگا تھا..... ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ مشہدی کے احسانوں کا بوجھ اُسے سانپ بن کر ڈستا رہتا تھا۔ دن گزرتے گئے اور فرح کے عشق کا بھوت فرہاد اور مشہدی کے سروں پر ایک رنگین خواب بن کر ناچنے لگا۔ اس روز اتفاق سے کئی دن بعد علی مشہدی کو اچانک کسی ضروری کام سے شہر کی تحصیل تک جانا پڑ گیا اور فرہاد دوپہر ہونے سے پہلے ہی گڑگڑ کر خدا سے

دعا کرنے لگا کہ کسی بہانے اس کے مالک کی واپسی میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ وہ شام ساڑھے چار بجے تک واپس لوٹ کر نہ آسکے۔ آخر قدرت کو فرہاد پر رحم آ ہی گیا اور مشہدی کو دیر ہوگئی۔ فرح اپنے وقت پر سیاہ اسکارف لپیٹے، لمبے نیلے اسکرٹ میں ملبوس کیفے میں داخل ہوئی تو فرہاد کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور نظریں فرح کے نازک سراپے پر جم گئیں۔ واقعی، خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ وہ بھی نزاکت کا پیکر لگ رہی تھی۔ نرم و نازک گلابی پاؤں ایرانی سینڈلز سے جھانک رہے تھے اور ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں آج بھی اُسی نفاست سے مخصوص ٹوکری کو گرفت میں لیے ہوئے تھیں۔ ہال میں حسب معمول تیز سرگوشیوں کے بعد سناٹا سا چھا گیا۔ اُس نے اپنی گھنیری سیاہ پلکیں اٹھائیں۔ فرہاد اس کی سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں غوطہ زن ہوگیا۔ ''کیا آج آقائے مشہدی موجود نہیں ہیں.....؟'' فرہاد کو ہوش آیا..... ''نہیں..... وہ کسی ضروری کام سے باہر گئے ہیں.....'' فرح نے پلکیں جھپکیں..... ''اوہ..... اچھا..... میرا سامان باندھ دیں گے آپ.....'' فرہاد نے کسی خواب کے عالم میں جلدی جلدی بیکری اور ناشتے کا سامان باندھ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ فرح شکریہ ادا کر کے پلٹی۔ چھوٹے بھائی نے ہاتھ میں پکڑے پیسے فرہاد کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ فرہاد کو یوں لگا جیسے اس کی قسمت پلٹ کر واپس جا رہی ہو۔ اُس نے آخری بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا ''اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں خانم'' فرح نے پلٹ کر فرہاد کو دیکھا۔ اس کے پرنور چہرے پر سیاہ نقاب آفت ڈھا رہا تھا۔ فرہاد نے بات جوڑی۔ ''دراصل آپ کا روز یہاں آنا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ جانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ یہاں کے ماحول کے بارے میں تو آپ کو خوب علم ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں روزانہ شام کو یہاں سے فراغت کے بعد آپ کا سامان خود آپ کے گھر پہنچا دیا کروں گا، دراصل آپ میری ہم قوم ہیں فرح خانم .....اور میں آپ کی تعظیم کے بارے میں فکر مند رہتا ہوں.....'' فرح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ فرہاد کا دل چاہا کہ وہ اس کے گالوں میں پڑنے والے دو گڑھوں میں ڈوب جائے۔ ''تشکر..... بہت مہربانی..... آپ نے میرے بارے میں اتنا سوچا..... ٹھیک ہے میں مومو جان (والدہ) سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گی..... آپ کا بہت شکریہ.....'' فرح کی نظر ایک لمحے کے لیے فرہاد کی نظر سے ٹکرائی اور فرہاد نہال ہوگیا۔ اسے فرح کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ اپنے لیے تشکر کے وہ جذبات نظر آئے جو وہ ہمیشہ مشہدی کے لیے دیکھا کرتا تھا۔ آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اس دنیا میں کوئی مقام رکھتا ہے۔ فرح کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک اُسی کی آنکھوں کے خمار میں ڈوبا رہا۔ مشہدی کے چہرے پر بھی اس روز ایک عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فرہاد نے اُسے فٹ پاتھ والے پان ہاؤس کے حاجی مصطفیٰ سے بات کرتے ہوئے سنا کہ مشہدی آج فرح کے گھر سے ہو کر آ رہا ہے۔ اور یہی اس کی تاخیر کی وجہ تھی۔ مصطفیٰ سے مشہدی کافی بے تکلف تھا اور اس نے دبے لفظوں میں اس بات کا انکشاف کیا کہ وہ جلد ہی فرح کی ماں کو فرح کے رشتے کا باقاعدہ پیغام بھی

بجھوانے والا ہے۔ فرہاد کی دنیا اندھیر ہونے لگی۔ آج ہی تو اس کے اندر جینے کی ایک نئی امنگ جاگی تھی مگر قسمت اس قدر جلد اس کی تقدیر کے پتے اُلٹ دے گی، ایسا اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ فرہاد نے دل میں پکا عہد کر لیا کہ اب وہ مزید تاخیر کی غلطی نہیں کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ فرہاد کی ماں چاہے فرح کے رشتے کے لیے ہاں بھی کر دے لیکن فرح دل سے کبھی مشہدی کی نہیں ہو پائے گی۔ کیونکہ اس نے آج فرح کی آنکھوں میں اپنے لیے جلتے ہوئے دیئوں کی جوت دیکھ لی تھی اور اب وہ کسی بھی قیمت پر فرح کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اتفاق سے علی مشہدی نے کسی جائیداد کی خرید و فروخت کے سلسلے میں آج ہی تحصیل جاتے ہوئے ایک بڑی رقم بینک سے نکلوائی تھی جو اس نے فرہاد کے سامنے ہی گلے میں رکھ دی تھی۔ فرہاد نے اسے بھی قدرت کی جانب سے ایک غیبی مدد کا اشارہ سمجھا اور رات ہوتے ہی اس نے گلے کا صفایا کر دیا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے کیفے کی چابیاں اپنے ساتھی کے گھر چھوڑ کر خود کہیں رفو چکر ہو گیا۔ صبح مشہدی نے کیفے پہنچ کر جب فرہاد کی جگہ دوسرے نوکر کو ہال کی صفائی کرتے دیکھا تو اس نے اسے معمول کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ فرہاد پہلے بھی فلم اور تھیٹر دیکھنے کے لیے رات رات بھر کیفے سے غائب رہتا تھا اور واپس آ کر مشہدی سے اپنی بیماری کے وہی ہزار بہانے کرتا تھا جو اس وقت اس کا دوسرا نوکر بیان کر رہا تھا۔ مشہدی کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر چابیاں کسی دوسرے نوکر کے حوالے کر جاتا تھا۔ مشہدی نے سوچ رکھا تھا کہ آج وہ بارہ بجے دن سے پہلے ہی رقم جائیداد کے مالک کے حوالے کر آئے گا۔ دراصل اس نے یہ بات ابھی تک سب سے چھپا رکھی تھی کہ وہ فرح کی گلی میں ہی اس کی ماں اور بیٹی کے لیے ایک نیا مکان خرید رہا ہے جہاں وہ شادی کے بعد فرح کو رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا ہوا تھا کہ جس دن وہ فرح کی ماں سے ''ہاں'' سنے گا اسی لمحے گھر کی چابیاں فرح کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ مشہدی انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک فرح کو اپنے مخصوص سیاہ اسکارف میں لپٹے کیفے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس کی سانسیں بند ہونے لگیں۔ فرح آج حد سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ شاید فرح کی ماں نے اسے دبے لفظوں میں علی مشہدی کی جانب سے دیا گیا سندیسہ سنا ڈالا تھا۔ فرح مشہدی کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو اس کی نظریں جھکی ہوئی اور لب کانپ رہے تھے۔ ''آقائے مشہدی..... آپ کے ہمارے خاندان پر پہلے ہی بہت احسان ہیں..... میں کس طرح آپ سے اپنے تشکر کا اظہار کروں.....؟'' مشہدی کی سماعتوں میں رس گھل گیا۔ ''نہیں نہیں..... اس میں بھلا شکریے کی کیا بات ہے.....؟..... میں نے تو جو بھی کیا..... اپنا فرض سمجھ کر کیا..... اور میں اب آپ کے خاندان کو اپنا ہی خاندان سمجھتا ہوں..... اسی لیے تو کل.....'' فرح نے اس کی بات کاٹی ''جی..... مجھے مومو جان نے سب بتا دیا ہے..... کہ آپ نے کل دبے لفظوں میں ہمارے خاندان سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے..... میں اسی لیے یہاں آئی ہوں..... کیونکہ مومو جان خود یہ بات آپ کے سامنے نہیں دھرا سکتی تھیں..... مومو جان کو آپ کا رشتہ قبول ہے..... اور سچ تو یہ ہے

کہ ہم رات بھر آپس میں یہ ذکر کرتے رہے ہیں کہ آج کل کے اس دور نا پرسان میں آپ جیسا نیک اور شریف انسان بھلا کہاں ملتا ہے۔ مومو جان بھی بہت تنہا ہیں..... انہوں نے میری خاطر دوسری شادی نہیں کی لیکن اب میں اپنا بندوبست وگزارہ خود آپ کر سکتی ہوں..... آپ کا عقد مومو جان سے ہو جائے تو میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاؤں گی.....''

فرح اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ کہتی رہی لیکن علی مشہدی کے سپنوں کا محل اس زور سے ٹوٹ کر گرا تھا کہ اُس کے شور سے اس کی سماعتیں شل ہو چکی تھیں۔ اور دھول اور مٹی کے طوفان سے بصارت معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ فرح کی ماں نے مشہدی کے آدھے اشارے کو اپنے رشتے کا پیغام سمجھ کر ہامی بھر لی تھی اور مشہدی جاتی ہوئی فرح کو روک کر یہ بھی نہیں کہہ پایا کہ اس کا دل تو صرف فرح کے لیے دھڑکتا ہے اور یہ اشارہ فرح سے عقد کا تھا نہ کہ اُس کی ماں سے۔

مشہدی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ فرح کے جانے کے بعد بھی وہ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی گم سم بیٹھا رہا اور پھر بارہ بجے کا گھڑیال اسے دوبارہ ہوش کی دنیا میں لے آیا۔ اُس نے فرہاد کو آواز دی اور جواب نہ پا کر اپنے گلے کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کا ارادہ اپنی رقم کو واپس بینک میں جمع کرانے کا تھا مگر گلہ کھولتے ہی ایک دوسری قیامت اس کی منتظر تھی۔ گلہ خالی پڑا ہوا تھا اور تمام رقم غائب تھی۔ ایک لمحے میں ہی اُسے فرہاد کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آ گئی اور وہ زور سے چلاتا ہوا رپٹ درج کرانے کے لیے باہر کی جانب دوڑ گیا۔

فرہاد نے رات بھر خود کو کسی دوست کے ہاں روپوش رکھا مگر وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اس کی یہ چوری پکڑی جائے گی لہٰذا دھوپ نکلنے کے بعد وہ چوری چھپے فرح کی گلی میں پہنچ گیا۔ اس نے چہرہ چھپانے کے لیے خود کو مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اچانک اُسے دوسری جانب سے فرح تنہا گلی میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ فرہاد سوچ میں پڑ گیا کہ یوں اچانک صبح سویرے فرح کو کہاں جانا پڑا ہوگا.....؟..... فرح کے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد دروازہ کھلا تو ایک اجنبی نوجوان کاندھے پر فرح کے چھوٹے بھائی کو بٹھائے برآمد ہوا..... ''معاف کیجئے..... کیا فرح خانم یا ان کی والدہ گھر پر ہیں؟'' نوجوان سر ہلا کر واپس اندر چلا گیا۔ فرہاد نے جیب میں پڑی اُس رقم کو دھیرے سے تھپتھپایا جو آج وہ خاص طور پر فرح کے قدموں میں ڈالنے کے لیے مشہدی کے گلے سے چرا کر لایا تھا۔ کچھ ہی دیر میں فرح کی ماں دروازے پر آئی اور فرہاد کو دیکھ کر خوشی سے بولی ''اوہ..... یہ تم ہو..... خوب موقعے پر آئے ہو..... آج ہمارے گھر میں بھی برسوں بعد خوشی آئی ہے..... آؤ..... اندر آ جاؤ.....'' فرہاد کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ اندر برآمدے میں فرح اسی نوجوان کے ساتھ کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کے موتیوں جیسے

دانتوں کی چمک سے فرہاد کو اپنے دل کی دنیا خیرہ ہوتی محسوس ہوئی۔ فرح کی ماں بہت خوش تھی ''آؤ بیٹا آؤ..... میرے داماد سے ملو..... یہ فرح کا شوہر آغا کریم ہے..... آج ہی قید سے رہا ہو کر یہاں پہنچا ہے''..... فرہاد کے اندر بیک وقت بہت سے چھناکے ہوئے۔ ''آپ کا داماد؟..... مگر..... آپ نے تو.....؟''..... ''ہاں..... ہم ماں بیٹی نے دانستہ اس بات کا کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ لوگ جسے عموماً فرح کا چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں..... وہ فرح کا اکلوتا بیٹا ہے..... دراصل سات سال سے آغا کریم کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی اور ہم بھی اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر یہاں دیارِ غیر میں آ بیٹھے تھے..... لہٰذا ہم نے اسی بات میں مصلحت جانی کہ فی الحال فرح کے اس رشتے کے بارے میں کسی سے بھی ذکر نہ کیا جائے۔ لیکن اب خدائے بزرگوار نے آغا کریم کو صحیح سلامت واپس بھیج دیا ہے تو ہم بہت بڑی دعوت کرنے کا منصوبہ بنا بیٹھے ہیں۔ تم بھی ضرور آنا اور اپنے آقائے مشہدی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لانا.....'' علی مشہدی کے نام پر خانم ذکیہ کے چہرے پر ہلکا سا گلال چھلک آیا۔ فرہاد وہیں گم سم کھڑا رہ گیا۔ اس کی جیب میں پڑے نوٹ اسے کاغذ کی بجائے سنپولیے محسوس ہونے لگے جو لحہ بہ لحہ اُسے ڈس رہے تھے۔ فرہاد کو ایک زوردار چکر آیا اور وہ سر تھامے وہیں صحن میں گر گیا۔

جب تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے (نثری نظم)

سنو.....

تمہاری وفا پہ مجھ کو

پورا یقین ہے.....

پر زمانے کے وار کا

کچھ بھروسہ نہیں ہے

سو گر کبھی.....

تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے

اور میری رُوح کی کومل پتیاں

تمہیں کسی ببول کی مانند چبھنے لگیں

تو مجھے یاد نہ کرنا

کہ یادوں کا زہر

زخم بھرنے نہیں دیتا
ہاں مگر دیکھو.....
کبھی ان راہوں سے نفرت نہ کرنا
جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے
کہ راستے تو منزل کا پتہ دیتے ہیں
اور کسی کے قدموں کی بے ثباتی سے
ان راستوں کا کیا لینا دینا.....؟
کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا.....
جو مجھے اچھے لگتے تھے.....
کہ رنگ تو ضیا بکھیرتے ہیں.....
مگر کسی کی روح کے اندھیرے سے.....
ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟
کبھی اس دھن سے نفرت نہ کرنا
جو میری روح کے تار جوڑ دیتی تھی
کہ دھن تو سر کی ترتیب ہوتی ہے
اور کسی کے اندر کی بے ترتیبی سے
اس دھن کا کیا لینا دینا.....؟
کبھی اُن نظاروں سے نفرت نہ کرنا.....

جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے
کہ نظارے تو سدا خوب صورت ہوتے ہیں.....
اور کسی کے اندر کی بدصورتی سے.....
ان نظاروں کا کیا لینا دینا؟
کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا
جو ہم نے ایک دوسرے سے کی تھیں
کہ باتیں تو رابطہ ہوتی ہیں.....
اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے
ان باتوں کا کیا لینا دینا.....؟
بس مجھ سے
اور صرف مجھ سے نفرت کرنا
کہ میری روح کی سیاہی سے ہی
چار سو یہ اندھیرا ہے
میری بدصورتی سے ہی
ہر رنگ پھیکا ہے
ہر راہ بے راہ ہے
ہر منظر ویران ہے
ہر بات بے ربط ہے

سو.....مجھ سے

اور بس مجھ سے نفرت کرنا

کہ صرف میں ہی.....

تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں

(ہاشم ندیم خان)



میرا نیا دوست (اداریہ کالم)

کاشف میرے بچپن کا دوست اور پرائمری کا ''ٹاٹ فیلو'' ہے۔ ہم دونوں کی طبیعت اور مزاجوں میں بے پناہ فرق کے باوجود بچپن سے ہم دونوں کی دوستی مثالی رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ ہم دونوں کے اندر بسا ہوا وہ ''ٹاٹ زدہ'' انسان بھی ہے جسے ہم دونوں کبھی اپنے اندر سے نکال نہیں پائے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بچپن سے جوانی تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب ہم دونوں میں کسی نہ کسی بات پر بحث نہ ہوئی ہو اور ہم دونوں روٹھ کر اپنے اپنے راستوں پر نہ چل دیئے ہوں۔

کاشف پر بچپن سے مغربیت اور آج کل کی کہلائی جانے والی ''روشن خیالی'' کا غلبہ اس قدر طاری ہے کہ وہ اپنے اچھے بھلے نام کی جگہ امریکن لہجے میں صرف ''کیش'' کہلایا جانا پسند کرتا ہے۔ اس کے خیال میں ایم کاشف خان کچھ طبا اور کافی آؤٹ ڈیٹڈ (out-dated) قسم کا نام لگتا ہے۔

کیش اور میں بچپن میں جس سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے اس کی وردی ملیشیا (گرے) رنگ کی شلوار قمیض تھی۔ کیش کو بچپن سے ہی شلوار قمیض ''ٹائپ'' لباسوں سے شدید چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شلوار قمیض میں اچھا بھلا انسان خواہ مخواہ میں ''مشکوک'' سا لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا وہ اسکول سے واپسی پر ہی فوراً سب سے پہلے اس شلوار قمیض سے نجات حاصل کر کے اپنی پسندیدہ شرٹ اور نیکر یا پتلون زیب تن کر لیتا تھا۔ میرے پاس اس زمانے میں کوئی شرٹ یا پتلون نہیں تھی لہٰذا وہ اسکول کے بعد سارا وقت مجھے بدلباسی اور بے ذوقی کے طعنے دیتا رہتا تھا۔ گھر میں بھی ہر وقت وہ اپنے والدین سے جھگڑتا رہتا تھا کہ اُسے اس انگریزی اسکول میں داخل کروایا جائے جہاں محلے کے اعلیٰ طبقے کے بچے قمیض اور پتلون پہن کر تانگے میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتے

تھے۔ اُسے زیادہ اعتراض اس بات پر بھی تھا کہ ان شلوار قمیض والے سرکاری اسکولوں میں صرف لڑکے ہی پڑھنے آتے ہیں اور اسے ان میلے کچلے، سیاہی سے آلودہ ہاتھوں اور مٹی سے بھرے چہروں سے بھی سخت چڑ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر صبح سویرے اجلے نیلے اور سفید لباسوں میں ملبوس اور سروں پر سرخ ربن سے کس کر چٹیا گوندھی ہوئی یہ پری جیسی بچیاں اگر ہمارے ٹاٹ والے اسکول میں پڑھتی ہوتیں تو ہمارے یہ اُجڈ اور جنگلی اُردو میڈیم بچے بھی ان سے کچھ نہ کچھ تہذیب سیکھ ہی لیتے۔ روز صبح جب میں اسے اسکول جانے سے پہلے لینے کے لیے اس کے گھر، گلے میں اپنا بستہ ڈالے پہنچتا تو اسے اسی بحث میں اُلجھے اور ماں باپ سے تکرار کرتے پاتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے والد بھی میرے والد کی طرح ہی ایک سفید پوش سرکاری ملازم تھے لہٰذا وہ بھی پرائیویٹ انگریزی میڈیم اسکول کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ بھی اپنے لاڈلے بیٹے کو انہی طفلی تسلیوں سے بہلاتے رہتے تھے۔ جن سے متوسط طبقے کا ہر باپ اپنے بچے کو بہلاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی رویہ کیش مذہب کے بارے میں بھی رکھتا تھا۔ نماز وغیرہ سے اسے کوئی خاص ''رغبت'' نہیں تھی اور بچپن میں جب محلے کے بڑے بوڑھے ہم بچوں کو ہنکا کر مسجد کی طرف لیجاتے تھے تب کیش کسی پوشیدہ گلی میں کنچے یا ''کوکلا چھپاکی'' کھیلنے میں مصروف ہوتا۔ بڑے ہونے پر بھی اس کی زندگی سے برتاؤ ہمیشہ ایک خاص حد تک ''ماڈریٹ'' ہی رہا اور وہ ہمیشہ مذہب کو ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ کے طور پر گردانتا رہا۔

کیش ہمیشہ سے سول سروس جوائن کرنے کا خواہش مند تھا۔ اسے سفاری سوٹ پہنے اور فرنچ کٹ رکھے وہ بیوروکریٹس ہمیشہ سے مسحور کرتے تھے جو بات کرتے وقت بیچ میں رک رک کر منہ سے امپورٹڈ سگار یا پائپ کا دھواں بڑے اسٹائل سے فضا میں بکھراتے تھے۔ کیش کا بس چلتا تو وہ سرکاری دفاتر میں شلوار قمیض پہننے پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دیتا۔ خاص طور پر جب وہ کسی باریش یا مولانا ٹائپ کے کسی افسر کو اپنی شلوار شرعی حد تک اونچی کیے، کوئی ڈھیلا ڈھالا کرتا یا سر پر کوئی عمامہ زیب تن کیے دفتر آتے دیکھتا تو اُس دن کیش کا موڈ بے حد خراب رہتا۔ تب میری شامت آجاتی اور وہ سارا دن میرے سر پر کھڑے بڑبڑاتا رہتا کہ ''انہی لوگوں کی وجہ سے ہم ترقی نہیں کر پا رہے۔ دفتر کو بھی مسجد بنا رکھا ہے۔ دنیا ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ اگر کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا نمائندہ یا سفیر ایسے کسی دفتر میں چلا گیا تو اُن پر ہمارا کیا تاثر رہ جائے گا؟'' وہ سارا دن یونہی تلملاتا رہتا اور میں کانوں میں انگلیاں ڈالے چپ چاپ اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔ کیش میری خاموشی سے مزید سیخ پا ہو جاتا اور چلا کر کہتا ''تم جیسوں کی اسی خاموشی نے ہی ان لوگوں کو اپنے مذہب کو ''سرکاری رویے'' میں بدلنے کی جرأت دی ہے۔ تم سب ہی اس رویے کی وجہ اور بنیاد بھی ہو.....''

میں جانتا تھا کہ ایسے کسی بھی معاملے میں کیش سے کسی بھی قسم کی بحث بے سود ہوگی چنانچہ میں شام کو

اسے کوئی اچھی سی انگریزی فلم دکھانے لیجاتا تھا۔ کیش کا موڈ ٹھیک کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی تھی۔ سینما ہال میں کیش اپنا پسندیدہ سگار سلگا لیتا اور نیویارک، شکاگو یا لندن کی ان گلیوں میں گھومنے کے سپنے دیکھنے لگتا جو اس وقت سینما اسکرین پر دکھائی جارہی ہوتیں۔

پھر 9/11 کی قیامت آئی اور دنیا خودکش حملوں کی اک نئی جنگ میں مبتلا ہوگئی۔ ایسے میں بھی کیش کو مسلمانوں کے عمومی رویے اور دنیا کو دی جانے والی خودکش دھمکیوں سے شدید الجھن اور چڑ پیدا ہونے لگی تھی۔ وہ سارا دن میرا دماغ چاٹتا رہتا۔ ''تو یہ ہے وہ مذہب..... جس کا پرچار کرتے تمہارے نام نہاد علماء کی زبانیں نہیں تھکتیں.....؟..... جینا مشکل کر رکھا ہے مجھ جیسوں کا تمہاری اس جماعت نے۔ میں پوچھتا ہوں آخر ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے.....؟''

پھر لال مسجد کا قصہ شروع ہوا۔ کیش سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھا غازی برادران اور ان کے رویے کو کھری کھوٹی سناتا رہتا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی اس کے اندر کا غصہ ابل پڑتا۔

''خوب جگ ہنسائی کروا رہے ہیں تمہارے یہ غازی برادران۔ میرے غیر ملکی دوست مجھے دنیا بھر سے فون کر کے پوچھتے ہیں کہ یہ تمہارا کیسا اسلام ہے جسے پھیلانے کے لیے پردہ پوش خواتین کو باقاعدہ ڈنڈے لیکر سڑکوں پر نکلنا پڑتا ہے۔ اب تم ہی کہو..... میں انہیں کیا جواب دوں.....؟''

لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا معاملہ لحہ بہ لحہ اپنے منطقی انجام تک پہنچنا شروع ہوگیا اور کیش کی بڑبڑاہٹ بھی بتدریج بڑھتی گئی۔ کبھی وہ براہ راست مجھے انتہا پسند ہونے کے طعنے دیتا اور کبھی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنانے والے ''دہشت گردوں'' کا ساتھی کہتا کیونکہ روز اول سے وہ مجھ جیسوں کی خاموشی کو نیم رضا مندی کا الزام دیتا آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس دن پاکستان کی یہ خاموش اکثریت بول پڑے گی وہی دن انقلاب کا دن ہوگا۔ پھر وہ رات آئی جب تمام کاغذی معاہدوں، محفوظ راستہ دینے کے دعوؤں اور معصوم بچوں اور عورتوں کی حفاظت کو اولیت دینے کے وعدوں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ بھورے رنگ کے بارود کی بو میں سرخ رنگ کے لہو کی مہک رچ بس گئی۔ چند گھنٹے تک چیخوں، آہوں اور سسکیوں کا غلبہ رہا اور پھر چاروں طرف موت کی خاموشی چھا گئی۔ اس دن میں بوجھل دل کے ساتھ صبح سویرے کیش کے گھر جا پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ آج اس کے اندر کا ترقی پسند اور روشن خیال انسان بے حد خوش ہوگا۔ آج وہ اپنے پسندیدہ سگار کے لمبے اور بھرپور کش لیتے ہوئے اپنے دالان میں آرام کرسی پر بیٹھا چہرے پر اپنی مخصوص مسکراہٹ سجائے میرا استقبال کرے گا اور چٹکی بجا کر کہے گا

''دیکھا..... میں نہ کہتا تھا، انتہا پسندی کا انجام یہی ہونا تھا۔ میرا بس چلے تو میں تمام انتہا پسندوں کو ایک ساتھ ختم کردوں۔ لیکن یہ کیا؟ کیش کے چہرے پر تو جیسے برسوں کی زردی سی پھیلی ہوئی تھی۔ سگار اس کے

ہاتھ میں سلگتے سلگتے بجھ گیا تھا اور راکھ سے کیش کا قیمتی قالین اٹ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔

''میرا تو خیال تھا کہ آج تم کسی بھرپور جشن کی تیاری میں مصروف ہو گے۔ تمہاری خواہش کے مطابق انتہا پسندوں اور انتہا پسندی سے پوری طاقت کے ساتھ نپٹا گیا ہے۔ تو بتاؤ..... آج اس خوشی میں کہاں چلنے کا ارادہ ہے۔''

کیش نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرسراتی سی آواز میں بولا ''کیا تم جانتے تھے کہ ان لوگوں نے اندر سات دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اور حکومتی ترجمان آخری وقت میں ان سے تین سو افراد کے کھانے کے انتظام کا وعدہ کر گئے تھے۔''

میں نے حیرت سے کیش کو دیکھا ''ہاں..... میں جانتا ہوں، لیکن اس بات سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ انہیں کھانا کھلا کر مارا جاتا یا پھر بھوکے پیٹ ہی ختم کر دیا جاتا، تمہارا مقصد تو بہر حال حل ہو گیا نا۔''

کیش اب بھی گم سم تھا۔ وہ پھر اسی لہجے میں بولا۔

''کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ مدرسے کے صحن میں کوئی بارودی سرنگ کوئی تہ خانہ وغیرہ نہیں تھا اور باہر آنے والی طالبات میں سے کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ انہیں اندر کسی طور پر بھی یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا بلکہ وہ سب خود اندر رہنے پر بضد تھیں۔''

مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ یہ آج کیش کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے جھلا کر جواب دیا ''ہاں ہاں میں جانتا ہوں لیکن تم نے شاید ہمارے وزیر صاحب کا بیان نہیں پڑھا کہ ان معصوم طالبات کو خود اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اندر ''یرغمال'' بنا کر رکھا گیا ہے۔ یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہارے منہ سے یہ سوال کچھ اچھے نہیں لگ رہے مجھے اور پھر تم ان کلاشنکوف برداروں کو کیوں بھول رہے ہو جو بقول تمہارے پوری دنیا میں ٹی وی کے ذریعے ہمارے ملک اور مذہب کی بدنامی کا باعث بن رہے تھے۔ آخر ان سے نپٹنے کے لیے حکومت کو کوئی نہ کوئی ایکشن تو لینا ہی تھا نا۔'' آج لگتا تھا کہ میں کیش کی جگہ لے کر خود اسے تسلیاں دینے کے لیے یہاں آیا تھا۔ کیش بے چینی سے کھڑا ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے میں خود کو اپنی توجیہات سے بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن جانے کیوں ایسی ہر توجیہہ کے جواب میں میرے ذہن کے گوشوں میں ان برقعہ پوش اور عفت مآب طالبات اور معصوم بچوں کی بے یار و مددگار پڑی لاشیں ابھر آتی ہیں جنہیں شاید آخری وقت تک یہ یقین تھا کہ ان کے اپنے ان پر گولی نہیں چلائیں گے۔ چند لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا ان معصوم عورتوں اور بچوں کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔ جانے آج مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ غازی رشید کو محفوظ راستہ دے کر

چاہیے تھا۔ اگر وہ غلطی پر تھا تو اس سے اور اس کے محافظوں سے بعد میں قانون کے ذریعے نپٹا جا سکتا تھا ایک بے گناہ کی لاش گرانے سے کہیں بہتر تھا کہ سو گناہ گاروں کو (اگر وہ گناہ گار تھے) جانے دیا جاتا۔''

کیش کی آنکھیں زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے بھیگتی دیکھی تھیں۔ وہ دھیرے سے بولا'' آج جانے کیوں میرا دل غازی رشید اور ان طالبات اور بچوں کے لیے رو رہا ہے۔

کیش چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اندر چلا گیا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اپنے اس نئے دوست کو دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی کیش ہے جو ساری زندگی غازی رشید جیسے لوگوں سے الرجک رہا ہے؟ سچ ہے.....ہم مسلمان اپنے اوپر چاہے کتنے ہی ''کیش'' نما لبادے اوڑھ لیں لیکن ہمارے اندر کا محمد کاشف خان ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ہاں ..... یہ میرا نیا دوست ہے جسے ایک رات نے کیش سے دوبارہ کاشف بنا دیا۔ جانے اس رات اور کتنے ''کیشوں'' کا جھوٹا بھرم ٹوٹا ہوگا۔ جانے ہم سب کے کتنے نئے دوستوں نے جنم لیا ہوگا؟؟؟؟



رانگ نمبر (افسانہ)

(Wrong Number)

لڑکے کے موبائل فون پر ایک انجانا نمبر جگمگایا ''ھیلو'' دوسری جانب کوئی لڑکی تھی۔ ''آپ کون.....؟'' لڑکے نے چڑ کر کہا ''فون آپ نے ملایا ہے.....اپنا تعارف کروائیں.....'' لڑکی نے جلدی سے نمبر کاٹ دیا ''سوری.....رانگ نمبر.....'' لڑکے نے حیرت سے اپنے سیل فون کی جانب دیکھا ''کمال ہے.....خود ہی کال کی اور خود ہی رانگ نمبر کہہ کر کاٹ دیا..... حیرت ہے.....'' اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر یہی بات اس نسوانی آواز والے نمبر پر مختصر پیغام کی صورت میں لکھ کر بھیج دی.....کچھ دیر تک جواب نہیں آیا تو وہ بھی بھول بھال کر اپنی مصروفیت میں کھو گیا۔ رات کو سونے سے قبل اس نے فون بند کرنے سے پہلے یونہی ایک سرسری نظر ڈالی تو ایک پیغام کا نشان سکرین پر واضح تھا۔ اس نے پیغام کھولا ''معاف کیجئے.....میں اپنی سہیلی کا نمبر ملا رہی تھی..... جانے آپ کے نمبر سے کیسے مل گیا.....بہرحال .....ایک بار پھر معذرت'' لڑکے نے فراخ دلی سے جوابی پیغام لکھ ڈالا ''جائیں معاف کیا.....'' دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لڑکے نے فون بند کر دیا اور سو گیا۔

صبح اٹھ کر حسب عادت اس نے رات کے پیغامات پڑھنے کے لیے سیل آن کیا۔ رات گئے کسی وقت لڑکی نے جواب دیا تھا ''آپ کی معافی کی ضرورت نہیں.....زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہوگا.....'' لڑکے کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی اور اس نے پیغام لکھا ''کتنا فری ہوا جا سکتا ہے.....؟؟''

جواب بھیج کر وہ یونیورسٹی جانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا اور شام تک دوسری جانب سے خاموشی چھائی رہی۔ شام کو لڑکے نے کوئی جواب نہ پا کر ایک اور وار کیا۔ ''خاموشی نیم رضامندی ہے؟'' دوسری جانب سے جلا کٹا پیغام آیا ''اپنی حد میں رہیں.....'' لڑکے نے پھر شرارت کی ''میری حد بتائیں.....؟'' لڑکی نے ڈانٹا ''میں نے حد بتائی تو حد بھول جاؤ گے.....'' لڑکا مستقل مزاج تھا۔ ''چلو آپ سے تم پر تو آئیں..... ویسے یہ اچھا طریقہ ہے مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے سے رابطے بڑھانے کا..... پہلے خود ہی کسی طرح میرا نمبر معلوم کر کے ایک گمنام فون کیا اور پھر بہانہ بنا دیا کہ سہیلی کو فون کر رہی تھی۔ ذرا مجھے بھی تو اپنی اس سہیلی کا نمبر بھیجیں جو میرے نمبر کے اتنے قریب تر ہے کہ آپ غلطی سے میرا نمبر ملا بیٹھیں.....؟'' دوسری جانب سے کرارا جواب آیا ''یہ منہ اور مسور کی دال..... میری سہیلی آوارہ گرد لفنگوں سے بات نہیں کرتی''..... ''اوہ..... تو گویا میرے کردار کے بارے میں بھی کافی معلومات اکٹھی کر رکھی ہیں۔ شاید تم جلتی ہو کہ کہیں تمہاری سہیلی کی مجھ سے دوستی نہ ہو جائے..... یا پھر ایسی کسی سہیلی کا کوئی وجود ہی نہیں.....'' لڑکی زچ ہوگئی ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟.....'' لڑکے نے لطف لیتے ہوئے پیغام لکھا ''کچھ نہیں..... بس اتنا کہ غلط کال کرنے کا جرمانہ بھرا جائے.....'' جواب آیا ''جرمانہ بتاؤ.....؟''..... ''ہر صبح مجھے صبح بخیر کہنا ہوگا اور رات کو شب بخیر..... ٹھیک سات دن تک.....'' دوسری جانب سے احتجاج بلند ہوا ''نہیں..... صرف تین دن.....'' لڑکا مان گیا ''اوکے.....'' پھر اس رات لڑکی کا پیغام آیا ''پہلا شب بخیر.....'' لڑکا مسکرا کر سو گیا۔ صبح پیغام ملا ''پہلی صبح بخیر.....'' اور پھر یہ نوک جھونک تین دن تک چلتی رہی۔ تیسری رات لڑکی کا آخری پیغام آیا ''آج تین پورے ہوگئے ہیں۔ میں نے تمہاری سزا کی تعمیل کر دی ہے..... امید ہے اب مجھے تنگ نہیں کرو گے۔'' لڑکے نے منہ مسکرا کر جوابی پیغام لکھا ''ٹھیک ہے..... امید ہے تم بھی آئندہ دیکھ بھال کر کسی کا نمبر ملاؤ گی..... ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟'' کچھ وقفے کے بعد لڑکی کا جواب آیا۔ ''کیا یہ بتانا ضروری ہے.....؟'' لڑکے نے لکھا ''نہیں..... بس ایک تجسس سا تھا۔ بہرحال اپنا خیال رکھو..... خدا حافظ.....'' لڑکی کا جواب آیا ''شب بخیر..... خدا حافظ.....'' اگلی صبح لڑکے نے یونہی بے خیالی میں نیند سے جاگتے ہی پیغاموں کی فہرست جانچی۔ وہاں لڑکی کا پیغام نہیں تھا۔ لڑکا اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ ایک دن گزر گیا اور پھر یونہی دوسرا اور تیسرا دن بھی بیت گیا۔ لڑکا اس رانگ نمبر اور ان پیغامات کو بھولنے لگا تھا کہ اچانک چوتھے روز صبح فون کھولنے پر وہی پیغام ان باکس میں ملا ''صبح بخیر'' لڑکے نے پوچھا ''سزا تو پوری ہو چکی تھی، پھر یہ صبح بخیر کیسی.....؟'' دوسری جانب سے لڑکی کا پیغام آیا ''یہ بونس ہے۔'' لڑکا ہنس پڑا ''واہ کیا بات ہے..... سزا میں بھی بونس..... پہلی بار سنا ہے.....'' جواب آیا ''کیسے ہو.....؟..... میرے پیغامات کا انتظار تو رہتا ہوگا؟''..... لڑکے نے جواب دیا ''پیغام ملنے سے زیادہ پیغام بھیجنے والے کا زیادہ اشتیاق معلوم ہوتا ہے۔''..... لڑکی نے جواب دیا ''بس یونہی..... سوچا تم سے پیغام پر بات کر

لوں..... عجیب سی عادت پڑ گئی تھی ان تین دنوں میں..... مگر تم کہو تو آئندہ پیغام نہیں بھیجوں گی.....'' لڑکے نے شرارت کی ''ہمیں کیا خبر تھی کہ کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے سرکار مرے.....'' لڑکی نے جل کر جواب دیا ''خوش فہمی ہے تمہاری..... ٹھیک ہے..... اب پیغام نہیں بھیجوں گی.....'' لڑکے نے سوال دھرایا ''اچھا اپنا نام تو بتاتی جاؤ مس گم نام.....'' لڑکی نے کچھ وقفے کے بعد صرف ایک نام بھیجا ''آسیہ'' اور پھر دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لڑکے نے رات کو پیغام بھیجا ''میرا نام نہیں پوچھو گی آسیہ.....'' لڑکی کا جواب آیا ''حرکتوں سے تو تم کوئی خیر بخش یا الف دین نما کوئی شخصیت لگتے ہو.....'' لڑکا ہنس پڑا ''میں بھی تمہیں رحمت بی بی یا خیر النساء ٹائپ کی کوئی چیز سمجھتا ہوں.....'' ..... ''الف دین.....'' ..... ''خیر النساء'' دونوں نے ایک دوسرے کے نام ازبر کر لیے۔ صبح پھر لڑکی کا پیغام آیا ''صبح بخیر الف دین.....'' لڑکے نے جواب دیا ''جیتی رہو خیر النساء.....'' اور پھر ان پیغامات کا سلسلہ چل پڑا۔ مگر اب پہلے پیغام بھیجنے والی لڑکی ہوتی اور دیر سے جواب دینے والا لڑکا۔ الف دین نے ایک آدھ مرتبہ خیر النساء سے ملاقات کا کہا مگر خیر النساء کچھ محتاط تھی۔ نتیجہ الف دین کی دلچسپی خیر النساء کے پیغامات میں کم ہونے لگی۔ اب لڑکی لڑکے کو چھیڑنے کے لیے پیغام بھیجتی اور لڑکے کی جانب سے گھنٹوں بعد یا پھر اگلے دن ایک مختصر سا جواب آتا۔ مرد اور عورت کی ازلی خصلت رنگ دکھانے لگی۔ لڑکا اس آنکھ مچولی سے بے زار اور لڑکی چھپ کر اظہار کرنے کی حد تک آ پہنچی۔ لڑکی کا پیغام آیا ''کیا بات ہے..... آج کل کچھ اُکتائے سے رہتے ہو.....'' لڑکے نے جوابی پیغام بھیجا ''تم سامنے نہیں آتی ہو..... اور مجھے زیادہ تجسس پسند نہیں.....'' لڑکی کا پیغام آیا ''پہلے کسی اعتبار کا بھرم تو قائم ہو جانے دو..... اور پھر کیا ضروری ہے کہ ہماری ملاقات بھی ہو..... ہم یوں بھی تو اچھے دوست بن سکتے ہیں.....'' لڑکے نے جواب لکھا ''میں اجنبیوں سے دوستی نہیں کرتا..... اور ہم دونوں ابھی تک ایک دوسرے کے لیے صرف ایک رانگ نمبر ہیں..... میں اس رانگ نمبر کو ایک شناخت اور ایک رشتے کی پہچان دینا چاہتا ہوں۔'' لڑکی نے لاکھوں بار کا دہرایا ہوا جملہ لکھا ''میری کچھ مجبوریاں ہیں..... پہلے ہم ایک دوسرے کو ٹھیک سے سمجھ تو جائیں..... پھر ملاقات بھی ہو جائے گی.....'' لڑکے نے بے زار ہو کر لکھا ''کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک.....'' اگلے روز لڑکی نے ایک مختصر پیغام بھیجا ''کیا ہم صرف اچھے دوست نہیں بن سکتے.....؟'' لڑکے نے مختصر ترین جواب لکھا ''نہیں.....'' دو تین روز کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ انہی دنوں لڑکے کی کسی اور لڑکی سے ملاقات ہوئی اور فون نمبرز کے تبادلے کے بعد دونوں نے پیغامات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لڑکے کا پہلا پیغام تھا ''اس پہلی ملاقات کی شناخت اور دوستی کے رشتے کے لیے ہماری اگلی ملاقات ضروری ہے.....'' لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا ''میں سوچوں گی.....'' اسی ادھیڑ بن میں تین روز گزر گئے۔ نئی لڑکی اور لڑکے کے پیغامات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ آخر لڑکی نے ملنے کی ہامی بھر لی ''ٹھیک ہے..... لیکن میں اپنی سہیلی کے ساتھ آؤں گی..... اور ہم صرف پندرہ بیس منٹ

کے لیے ہی مل پائیں گے.....'' لڑکے نے خوش ہو کر جوابی پیغام بھیجا'' مجھے منظور ہے.....جگہ اور وقت بھی تم ہی چن لو.....'' لڑکا بے تابی سے نئی لڑکی کے جواب کا انتظار کرنے لگا اچانک اس کے فون پر نئے پیغام کا نشان جگمگایا۔لڑکے نے بے تابی سے پیغام کو کھولا لیکن وہ پرانی والی خیر النساء تھی'' ہیلو.....کیسے ہو.....؟'' لڑکے نے بے دلی سے پیغام مٹا دیا لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ اُسی آسیہ عرف خیر النساء کا پیغام آیا'' کیا بات ہے.....؟ ابھی تک ناراض ہو کیا.....؟'' لڑکے نے کچھ دیر سوچا اور اپنا آخری پیغام لکھ کر بھیج دیا

پرانی لڑکی (آسیہ) نے بے تابی سے پیغام کھولا وہاں صرف دو لفظ جگمگا رہے تھے'' سوری.....رانگ نمبر.....''

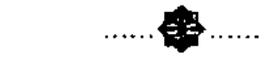

رین کوٹ (افسانہ)

(Rain Coat)

تیز برستی بارش میں جب کسی کی نئے ماڈل کی گاڑی ہچکولے لیتی ہوئی ایک جھٹکے سے رُک جائے تو اس کوفت کا اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جو اس گاڑی میں سوار ہو۔ نعمان کو بھی اسی اچانک افتاد کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ آج صبح وہ اپنی فیکٹری کے لیے نئی سائٹ دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تو ہلکی پھوار اسی وقت شروع ہو چکی تھی۔ مگر جلد ہی وہ بوندا باندی تیز برسات میں تبدیل ہوگئی اور شہر کے آخری بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر گاڑی نے چند ہچکیاں لیں اور رُک گئی ''کیا ہوا.....؟'' ڈرائیور نے پریشانی کے عالم میں بونٹ بند کیا۔ ''صاحب جی کچھ سمجھ نہیں آرہا..... یہ آٹو میٹک نئی گاڑیاں اپنی سمجھ سے باہر ہیں..... کسی مکینک کو بلوانا پڑے گا جناب.....'' نعمان نے بے زاری سے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم کسی مکینک کو بلالاؤ..... میں سامنے والے بس اسٹاپ کے شیڈ کے نیچے تمہارا انتظار کرتا ہوں..... بند گاڑی میں یوں سرِ راہ بیٹھے رہنا مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔'' نعمان نے گاڑی سے نکلنے سے پہلے رین کوٹ پہن لیا تا کہ اس کا قیمتی سوٹ خراب ہونے سے بچ جائے اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتا، خود کو بارش سے بچاتا، وہ سامنے نظر آتے بس اسٹاپ کی جانب بڑھ گیا۔ سڑک کے دونوں اطراف آنے اور جانے والوں بسوں کے لیے ٹین کے چھپر نما اسٹاپ بنائے گئے تھے۔ جس کی ٹین کی ہٹ نما چھت کے نیچے لکڑی کے بینچ پڑے ہوئے تھے۔ دونوں جانب کچھ مسافر بیٹھے اور کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ نعمان نے برساتی کے بٹن بند کرتے ہوئے سرسری نظر سڑک کی دوسری جانب بنے دوسرے اسٹاپ پر ڈالی اور پھر اس کی نظریں جیسے جم کر رہ گئیں۔ اس نے دو تین بار پلکیں جھپک کر اپنے گماں کو یقین کی حد تک

پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ سراب نہیں..... حقیقت تھی..... ہاں..... وہی تو تھی..... کاجل..... اس کے بالکل مخالف سمت والے اسٹاپ کے نیچے کھڑی، بارش سے بھیگی سی..... ہمیشہ کی طرح خود کو پہلے بے تحاشہ بھگو کر پھر کانپتے رہنے والی کاجل.....'' نعمان بے اختیار اس کی جانب بڑھنے کے لیے سڑک پر دو قدم چلا تو کسی گاڑی کے تیز ہارن نے اسے چونک کر واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ ہارن کی آواز سن کر کاجل نے بھی چونک کر اوپر دیکھا اور اس کی نظر نعمان سے ٹکرائی تو وہ بھی ہکا بکا سی رہ گئی۔ اب جانے وہ بارش کی بوندیں تھیں یا پھر اس کے آنسو جو اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اس کے گلابی عارض کے موتی بن گئے۔ دفعتہً نعمان کو احساس ہوا کہ کاجل کے ساتھ کوئی اور مرد بھی تھا۔ پرانی جینز اور ایک پتلی سی شرٹ میں ملبوس..... بار بار ہاتھوں کو رگڑ کر گرمانے کی کوشش میں مصروف..... اس نے ایک آدھ بار کاجل سے کوئی بات بھی کی اور کاجل نے سر جھکا کر اُسے زیر لب جواب دیا۔ شاید وہ کاجل کا شوہر ہوگا؟ نعمان اسی شش و پنج میں گرفتار کھڑا رہا۔ نعمان کے جانب آنے والی بس آ گئی اور مسافر جلدی میں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس میں سوار ہو کر اپنی منزل کو روانہ ہو گئے اور نعمان وہاں تنہا کھڑا رہ گیا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی باہر کچھ زیادہ بھگو نہ بھی پائیں پھر بھی ہمارے اندر جل تھل مچا دیتی ہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے اندر برستی وہ پھوار باہر کسی کو نظر نہیں آتی۔ لیکن کچھ بدنصیب ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کے اندر باہر برستے ساون کا ایک چھینٹا بھی نہیں پڑتا۔ ان کا اندر سدا صحرا ہی رہتا ہے۔ آج صبح نعمان نے جب گھر سے نکلتے ہوئے کھونٹی سے اپنے مخصوص نیلے رنگ کا رین کوٹ اتارا تو ایک لمحے کے لیے جیسے اس کا سارا ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے برق کی طرح گزر گیا تھا وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی بارش کا دن تھا جب پہلی مرتبہ اس کی ملاقات کاجل سے ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود شعبے علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے انجان تھے۔ لیکن اس روز کی شدید برسات نے ان دونوں کو ملوا دیا۔ وہ دونوں ہی کالج بس نکل جانے کے بعد ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں بارش رکنے کے انتظار میں کھڑے تھے لیکن کچھ بارشیں کبھی نہیں تھمتیں۔ بادل برس کر چلے جاتے ہیں مگر من کی پھوار کبھی نہیں رکتی۔ ان دونوں کے لیے بھی بارش کچھ ایسا ہی پیغام لے کر آئی تھی۔ ساون میں شامیں بہت جلد ڈھل جاتی ہیں۔ کاجل بھی تیزی سے ہوتی شام اور مزید کالی گھٹاؤں کی آمد سے پریشان کھڑی اپنی نازک کلائی پر بندھی گھڑی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ نعمان بھی ایک جانب کھڑا خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے آج اپنی بائیک لانے میں سستی کیوں کی؟ آخر جب بارش نے تھمنے کا نام نہیں لیا اور اندھیرا بڑھنے لگا تو گھبرائی سی کاجل نے کچھ فاصلے پر کھڑے نعمان کو پکارا ''سنیں..... پلیز آپ کیمپس کے باہر سے کوئی رکشہ پکڑ لائیں گے میرے لیے..... بہت دیر ہو گئی ہے..... گھر میں امی پریشان ہو رہی ہوں گی.....'' نعمان خود بھی یہ سوچ رہا تھا کہ اب یہاں کھڑے

رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لہٰذا مین گیٹ سے باہر جا کر کوئی سواری پکڑ لینی چاہیے کچھ ہی دیر میں بھیگا بھاگا سا نعمان ایک رکشے کے ساتھ کیمپس میں داخل ہوا۔ کاجل کو ڈیفنس کی طرف جانا تھا اور نعمان کو صدر..... دونوں کی سمت مخالف تھی لیکن موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ کچھ دیر بعد جب شام ڈھل جائے گی تب شاید واپسی کے لیے سڑک پر کوئی سواری بھی نہ ملے۔ ویسے بھی یونیورسٹی شہر سے دور مضافات میں واقع تھی۔ آخر کار طے یہ پایا کہ پہلے کاجل کو اُس کے گھر اتارا جائے اور پھر یہی رکشہ نعمان کو اُس کی منزل تک پہنچائے گا۔ راستے میں کاجل رکشے کے اندر سکڑی سمٹی سی بیٹھی رہی مگر یہ رکشہ بھی بڑی بدتمیز قسم کی سواری ہے ایک ذرا سا کنکر بھی پہیے کے نیچے آجائے تو پورا ''کانپ'' جاتا ہے۔ لہٰذا نعمان اور کاجل کو جمے رہنے کے لیے سامنے لگی لوہے کی راڈ کو نہایت مضبوطی سے تھام کر بیٹھنا پڑا۔ لیکن جھٹکے تھے کہ رُکنے میں ہی نہیں آرہے تھے اور پھر جب بے خیالی میں ان دونوں کی ایک دوسرے پر نظر پڑی تو اپنی اپنی حالت دیکھ کر وہ دونوں ہی بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ یہ ان کی دوستی کی ابتداء تھی۔ اور پھر کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو کھوجا کرتے اور بالآخر ان کی یہ کھوج محبت کے اس گم نام جزیرے پر جا کر ختم ہوئی جہاں داخل ہونے کے لیے تو ہزار راستے موجود ہیں مگر نکلنے کا ایک بھی دروازہ نہیں ہوتا۔ تب ایک دن ایسی ہی بھیگتی شام میں کاجل نے نعمان کو یہ رین کوٹ تحفے میں دیا تھا۔ ان کے شہر میں بارشیں بہت برستی تھیں لیکن کاجل کا یہ تحفہ اُس بھیگی شام کی یاد میں تھا جب اُن دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے بھی کاجل کو رین کوٹ پہنے مرد بہت سوبر لگتے تھے۔ اسے نعمان کو یہ نیلا رین کوٹ پہنے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن ان کے نصیب کا وہ آخری ساون ثابت ہوا۔ اگلے برس ہی اُن کی محبت کے چاند کو گرہن لگ گیا۔ کاجل کے بھائی نے اُسے کہیں باہر نعمان کے ساتھ یونیورسٹی اوقات میں گھومتے پھرتے دیکھ لیا اور کاجل کی تعلیم کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ نعمان نے اپنے طور پر ہر کوشش کر دیکھی مگر کاجل کی نظر بندی ختم نہ ہوسکی۔ گھر والوں نے کاجل کی سہیلیوں کو بھی زیرِ لب کاجل کے پہرے میں دخل نہ دینے کا پیغام دے دیا تھا۔ ایسے میں کاجل کی ہم جماعت نائلہ جو اس کی ہمسائی بھی تھی نعمان کا آخری سہارا ثابت ہوئی اور اُس نے کسی طور کاجل تک نعمان کا یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ دونوں نہ مل پائے تو نعمان مر جائے گا۔ مگر محبت کا زہر کسی کو پوری موت بھی کب مرنے دیتا ہے؟ سو نعمان بھی زندہ رہا مگر بہت سالوں تک مردوں سے بدتر زندگی گزارتا رہا۔ کاجل کے گھر والوں نے جلدی میں اُس کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی رسم ادا کر کے اپنی جان چھڑائی۔ کاجل نے نائلہ کے ذریعے ہی نعمان کو یہ آخری پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ لہٰذا اب نعمان بھی اُس کا خیال اپنے دل سے نکال کر گھر بسالے..... نعمان یہ سن کر اندر سے ہزار بار کٹ کر رہ گیا۔ یہ لڑکیاں اپنا گھر بستے ہی کس آسانی سے دوسروں کو گھر بستی کے مشورے دینا شروع کر دیتی ہیں۔ نائلہ کے بقول کاجل کا رشتہ بہت اچھے اور امیر

کبیر خاندان میں ہوا تھا اور اس کا شوہر کاجل کا بہت خیال رکھتا تھا۔

کاجل کی شادی کے بعد نعمان کا بھی اس شہر میں دل نہ لگا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی دوست کی وساطت سے امریکہ چلا گیا۔ وہاں اُس کے دل کے زخم تو نہ بھرے پر اُس کی جیب بھرتی چلی گئی۔ اُسے نیا کاروبار راس آ گیا اور پانچ سال میں ہی نعمان خود اپنے گھر اور فیکٹری کا مالک بن گیا۔ لیکن اب اس کا دل اس پردیس سے بھی اُچاٹ ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنا شہر اپنے دوست اور گھر والے یاد آنے لگے تھے۔ لہٰذا اس نے تین ماہ کی چھٹی لی اور اپنے ملک چلا آیا۔ اس کا شہر اب بھی ویسا ہی تھا۔ بارش کے بعد اب بھی ویسی ہی سوندھی مٹی کی خوشبو آتی تھی در و دیوار سے..... نعمان شہر سے باہر کوئی بڑی خالی جگہ دیکھ کر اپنی فیکٹری یہاں لگانا چاہتا تھا اور آج اسی سلسلے میں وہ اپنے ڈرائیور کو لے کر سائٹ ایریا کی طرف نکلا تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے آج وہ پھر دل کے اُس حادثے سے دوچار ہو گیا تھا جسے سنگین کہا جا سکتا تھا اور نہ حسین..... کاجل کی حالت بھی صاف بتا رہی تھی کہ وہ یوں اچانک نعمان کو اپنے سامنے پا کر کس قدر شدید اندرونی کشمکش کا شکار ہے۔ آخر کار نعمان نے ہی سڑک پار کر کے کاجل کی جانب قدم بڑھائے۔ دوسری جانب کے بس اسٹاپ پر بھی بس چند لوگ ہی بچے تھے اور ان میں سے کئی اس آخری آنے والی پرانی سی ویگن میں سوار ہو کر جا چکے تھے۔ نعمان کو یہی فکر تھی کہ کسی بھی لمحے کاجل کی بس بھی آتی ہی ہو گی اور وہ اس سے بات کیے بنا چلی گئی تو یہ کسک اس کے دل میں ہمیشہ کسی کانٹے کی طرح چبھتی رہے گی۔ مگر جب وہ تیز برستی بوندوں سے خود کو بچاتا ہوا سڑک کی دوسری جانب پہنچا تو کاجل کچھ گھبرا سی گئی۔ نعمان کو اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ایک ایسی التجا آمیز مجبوری کی پرچھائی نظر آئی جیسے وہ نعمان سے کہنا چاہ رہی ہو کہ ''خدا کے لیے میرے شوہر کے سامنے مجھے نہ پکارنا .....'' نعمان کے ہونٹ کھلنے سے پہلے ہی سل گئے۔ بارش کا رخ بدل چکا تھا اور اب تیز بوچھاڑ کی پھوار اُن سب کو بھگونے لگی تھی۔ اچانک کاجل کا شوہر غصے میں دھیرے سے بڑبڑایا۔ نعمان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کاجل کو ڈانٹ رہا تھا ''میں نے کہا بھی تھا کہ ذرا جلدی نکل پڑو گھر سے..... لیکن تم میری سنتی ہی کب ہو..... چھوٹ گئی ناں پہلی بس..... اب کھڑی بھیگتی رہو..... اپنے ساتھ مجھے بھی خوار کر دیا..... لعنت ہے ایسی زندگی پر.....'' نعمان کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا ہو۔ نائلہ تو کہہ رہی تھی کہ کاجل کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟ کاجل سر جھکائے اپنے شوہر کی صلواتیں سنتی رہی۔ جانے اس کے ماتھے پر چمکتے قطرے بارش کے تھے یا شرمندگی کے پسینے کے.....؟..... وہ پھولوں سی کومل لڑکی جس کی جبیں پر بل آتے ہی نعمان تڑپ اُٹھتا تھا اور جس کی راہوں کی دھول وہ اپنی پلکوں سے صاف کیا کرتا تھا آج وہ خود کسی کے تلخ اور تند و تیز لہجے کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ رہی تھی۔ کاجل کا شوہر اُسے سخت سست سنانے کے بعد قریب کھڑے خوانچے والے سے کسی سستے برانڈ کا سگریٹ خریدنے لگا۔ کاجل نے ایک

لمحے کے لیے نظر اُٹھا کر نعمان کی طرف دیکھا اور اس ایک نظر میں ہی اُس نے سب کہہ دیا۔ اپنی بے بسی، مجبوری، تڑپ اور اپنے درد کا ہر فسانہ بیان کر دیا۔ نعمان جس کے دل کو آج تک ہی سوچ کر ذرا سا قرار ملا تھا کہ کاجل اپنی دنیا میں خوش اور مگن ہے ایک بار پھر غم اور کسک کے اُسی پرانے سمندر میں اُتر گیا جس کے بھنور نے بڑی مشکل سے اُس کا پیچھا چھوڑا تھا۔ کاجل کا شوہر بارش میں بری طرح بھیگ چکا تھا اور سرد ہوا سے اس کا بدن دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ نعمان نے کاجل کے لباس کو غور سے دیکھا تو وہ بھی ایک سستے سے جوڑے میں ملبوس تھی۔ اُس نے دھیرے سے اپنے شوہر سے کہا ''آپ بھیگ گئے ہیں۔ چھجے کے نیچے آجائیں ورنہ سردی لگ جائے گی۔'' شوہر نے تلخی سے طنز کیا ''تو وہاں تم نے میرے لیے کون سی برساتی ٹانگ رکھی ہے..... وہاں بھی یہ پانی برسے گا مجھ پر.....'' کاجل چپ ہوگئی۔ اتنے میں نعمان کو اپنی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا ڈرائیور گاڑی ٹھیک کروا چکا تھا۔ نعمان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سے وہاں کھڑا ہے کاجل نے بھی نعمان کی گاڑی کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ کبھی اس نے نعمان کو کہا تھا کہ اسے سرخ رنگ کی کاریں بہت پسند ہیں اور آج نعمان کے پاس ویسی ہی ایک چمچماتی سرخ رنگ کی نئی کار تھی۔ نعمان نے اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلی کاجل پر ایک بھرائی ہوئی اور الوداعی نظر ڈالی۔ کاجل بھی اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ بارش نے نعمان کے آنسو چھپا لیے تھے۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کاجل اور نعمان کی نظر آخری بار ملی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ شاید یہ ان کے نصیب کی آخری نظر ہے۔ مگر جن کے مقدر پہلے ہی چوک گئے ہوں انہیں بھلا اس آخری نظر میں ایک دوسرے کو کیا نہار پاتے.....؟ گاڑی گزرنے کے بعد بھی کاجل بہت دیر تک اس جانب دیکھتی رہی جہاں بہت دور جا کر نعمان کی سرخ گاڑی کہرے میں گم ہو چکی تھی۔ اچانک اسے اپنے عقب میں اپنے شوہر کی ہیجانی آواز سنائی دی..... ''ارے..... یہ دیکھو..... وہ گاڑی والے صاحب اپنا رین کوٹ تو یہیں بھول گئے۔ واہ مولا..... آج ہی تجھ سے مانگا تھا''

کاجل چونک کر پلٹی اس کے شوہر کے ہاتھ میں وہی نیلا رین کوٹ تھا جو کبھی خود اس نے نعمان کو تحفے میں دیا تھا۔ نعمان جاتے ہوئے جان بوجھ کر وہ رین کوٹ بس اسٹاپ کی ریلنگ پر چھوڑ گیا تھا۔ کاجل نے دھیرے سے خود کلامی کی ''ہاں..... شاید وہ اسے آپ کے لیے ہی چھوڑ گئے ہیں..... اس رین کوٹ کا سفر بس یہیں کا تھا.....''

ریحان اپنی دھن میں مگن رین کوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب کاجل کی آنکھ سے دو آنسو ٹپک کر زمین پر بہتے بارش کے پانی میں مل کر امر ہو گئے۔

21 مئی ..... (نثری نظم)

جب تاروں کی چمک دگنی ہو جائے
اور سلگتے چاند کا ہر داغ دھل جائے .....
جب یہ بوجھل پلکیں کرنوں کو چھو لیں
اور یہ تپتا سورج تم پہ خود سایہ بن جائے
جب دنیا کا ہر سُر کسی دُھن میں ڈھلنے لگے
اور کائنات کی ہر دُھن، کسی ایک کے نام ہو جائے
جب تیز لمحے صدیوں میں بدلنے لگیں
اور دل کی ہر دھڑکن خود ایک لمحہ بن جائے .....
جب منزلیں آپ اپنے راستوں کو پکارنے لگیں
اور ہر رستہ تمہارے لیے، خود ایک منزل بن جائے .....
جب سارے موسم اک شام میں اُترنے لگیں

اور اس دل کا آنگن پانچواں موسم بن جائے.....
جب کسی کے کومل قدموں کی آہٹ کی سرگوشی ہو.....
اور تمہارے آس پاس کا شور اک نغمے میں ڈھل جائے
جب میرے سب لفظ خاموش ہونے لگیں
اور ہمارے درمیاں ہر گفتگو اضافی ہو جائے
اور پھر.....
جب ہر سرگوشی بس ایک ہی بات کہے.....
باہر کھلی دھوپ، پر من اندر برسات رہے
دن کو دن سمجھے.....رات کو نہ رات کہے
بھیڑ بھی تنہا لگے، اور تنہائی ملاقات رہے.....
تو میں جان لوں گا.....
ہاں.....میں جان لوں لگا.....
کہ آج تمہارا ''جنم دن'' ہے

(ہاشم ندیم خان)

توبہ اور استغفار (افسانہ)

آج صبح سویرے شوکت کی اپنی بیوی صغراں سے ایک بار پھر شدید جھڑپ ہوگئی تھی لہٰذا شام تک اس کا موڈ بگڑا رہا۔ وہ ریگل سینما کے باہر اپنے دوست بالے کی گنڈیریوں والی ریڑھی کے نزدیک لکڑی کے بنچ پر بیٹھا اندر ہال سے نکلتے فلم بینوں کے چہرے ٹٹول رہا تھا۔ دوسرا شو چھوٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور تماشائیوں کی بھیڑ بتا رہی تھی کہ یہ انگریزی فلم بھی سینما کے مالک کو کافی کما کر دے جائے گی۔ جبکہ سڑک کی دوسری جانب ناولٹی سینما میں لگی محمد علی، شبنم کی اُردو فلم کا ہال سنسان پڑا ہوا تھا۔ شوکت حیرت سے انگریزی فلم کے شائقین کے چہرے دیکھ رہا تھا جو اُسی کی طرح غربت کی تصویر اور کسی گلی محلے کے نتھو، خیرو، کرمو، گامے اور بھجے لگ رہے تھے۔ پھر نہ جانے انہیں اس انگریزی فلم کی اتنی سمجھ کیسے آجاتی تھی؟ دراصل ریگل سینما شہر کے وسطی علاقے میں غریبوں کی بستی سے ملحق تھا لہٰذا یہاں بابو ٹائپ لوگ فلم دیکھنے کے لیے ذرا کم ہی آتے تھے۔ لیکن پھر بھی انگریزی فلم کا رش کبھی نہیں ٹوٹتا۔

بالے کے ہاتھ تیزی سے گنا کاٹنے والی مشین پر چل رہے تھے اور اس سے کہیں تیز اس کی زبان چل رہی تھی۔ ''چل اب جانے بھی دے شوکی یار..... نہ لڑا کر بھابھی کے ساتھ..... وہ بے چاری تجھ سے کیا مانگتی ہے.....؟ بس اتنا ہی کہتی ہے نا کہ جوا کھیلنا چھوڑ دے..... تو ایسا کیا برا کرتی ہے وہ کرم جلی.....؟'' شوکت کو غصہ آگیا ''اگر تو نے بھی یہ وعظ کرنے ہیں تو میں چلتا ہوں.....'' بالے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا ''اوہو..... ایک تو تیرا غصہ بڑا تیز ہے..... اچھا چل رہن دے..... یہ لے ٹھنڈی میٹھی گنڈیریاں کھا..... شاید کچھ اثر ہو جائے''..... بالے نے ایک بڑی چھابڑی میں تازہ کٹی ہوئی گنڈیریاں شوکت کے

سامنے رکھ دیں۔ شوکت کا پارہ کچھ نیچے آنے لگا۔ اُس نے ایک بڑی سی گنڈیری اٹھا کر منہ میں ڈالی اور شکر بھرے رس نے اس کے اعصاب کا تناؤ کافی حد تک کم کر دیا۔ ''کیا کروں یار بالے..... ہزار بار توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بازی نہیں کھیلوں گا..... مگر تاش کے پتے سامنے آتے ہی ساری توبہ ٹوٹ جاتی ہے..... ہاتھ مچلنے لگتے ہیں اور میرے اندر کا جواری باہر نکل آتا ہے۔ تو تو جانتا ہے..... جواری کے لیے جوئے سے بڑا نشہ اور کوئی نہیں ہوتا..... تو خود بھی تو بڑا پتے باز تھا کسی زمانے میں .....'' بالے کی آنکھوں میں ماضی کے سائے لہرائے ''ٹھیک کہتا ہے یار..... مگر رب سوہنے کا لکھ شکر کہ اُس نے مجھے اس لت سے آزاد کر دیا۔ اب بڑا سکون ہے اس حلال کی کمائی میں۔ اسی لیے تو تجھے بھی کہتا ہوں چھوڑ دے یہ قمار بازی اس میں کمایا لاکھ بھی خاک ہے.....'' بالا پھر سے گنڈیریاں کاٹنے میں مشغول ہو گیا اور شوکت وہیں بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات گئے جب شوکت اپنے گھر پہنچا تو تینوں بچے سو چکے تھے۔ صغراں ماتھے پر پٹی باندھے بخار میں تپ رہی تھی۔ پڑوسی کی بیوی اُسے سرکاری ڈسپنسری کا شربت پلا گئی تھی لیکن صغراں کا بخار چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شوکت کچھ پریشان ہو گیا کیونکہ شہر میں ان دنوں ڈینگی کے مچھر کا بخار تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اُس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ وہ صبح پہلی فرصت میں صغراں کو بڑے سرکاری ہسپتال لے جا کر اس کا معائنہ کروائے گا۔ وہاں کرم دین وارڈ بوائے سے اس کی پرانی علیک سلیک تھی اور وہ ہسپتال کے اسٹور سے دوائیں دلوانے میں بھی کئی بار شوکت کی مدد کر چکا تھا۔ ورنہ آج کل بڑے سرکاری ہسپتالوں میں بھلا کون کسی کو پوچھتا ہے؟ شوکت کھانا کھائے بغیر ہی بان کی کھردری چارپائی پر ہاتھ سر کے نیچے دے کر لیٹ گیا۔ اسکی اور صغراں کی شادی کو دس سال ہونے کو آئے تھے۔ شروع میں شوکت ایک نجی بس کمپنی میں منشی گیری کا دھندا کرتا تھا اور صغراں کو بھی اس نے پہلی مرتبہ اپنے شہر کے بس اڈے پر ہی دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ پہلی نظر میں ہی صغراں شوکت کے دل میں کھب کر رہ گئی اور اس نے رشتہ بھجوانے میں دیر نہ کی۔ صغراں کے ماں باپ سیدھے سادھے اور شریف لوگ تھے اور انہوں نے لڑکے کو برسرِ روزگار اور اکیلا دیکھ کر ہامی بھرنے میں وقت نہیں لگایا۔ یوں تیسرے مہینے ہی صغراں اپنے گاؤں سے بیاہ کر شوکت کے شہر آ گئی۔ جہاں اس کے اپنے کچھ دور کے رشتہ دار بھی بستے تھے۔ شوکت نے ہر طرح سے صغراں کے ناز اُٹھائے اور مہینے میں ایک بار وہ خود صغراں کو اس کے میکے ضرور لے کر جاتا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب شوکت کو جوئے کی لت نہیں لگی تھی لیکن شادی کے چھ ماہ بعد ہی ایک شام جب اڈے کی ساری بسیں اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکی تھیں اور شوکت اپنا کام ختم کر کے سیٹھ کے پیسے دراز میں رکھ ہی رہا تھا کہ اس کا پرانا جگری یار بالا آ پہنچا۔ بالے نے شوکت کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈی دیکھی تو اس کی رال ٹپکنے لگی ''یار شوکی ..... اتنے پیسے یوں ہی اس تجوری میں پڑے سڑتے رہیں گے رات بھر.....؟ اور تو صبح ہوتے ہی جا کر انہیں بینک میں ڈال دے

گا..... پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی یار..... میری مان تو آج ان پیسوں سے اپنی قسمت آزماتے ہیں۔ جیت گئے تو آدھا آدھا..... اور ہارے تو سارا نقصان میرا..... بول..... کیا بولتا ہے.....'' شوکی بالے کی جوئے کی عادت سے خوب واقف تھا۔ ''نہیں بالے..... یہ کھیل میرے بس کا نہیں ہے..... وہ کہتے ہیں نا..... ''جوا کسی کا نہ ہوا'' میں کوئی نقصان کر بیٹھا تو اپنے سیٹھ کو کیا جواب دوں گا.....؟ مجھے غلط پٹیاں نہ پڑھا.....'' بالے نے اُسے رجھانے کی بھرپور کوشش کی ''اوہو..... تیرا کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا میں..... تو بس بازی لگانا..... جیت گئے تو اپنے وارے نیارے..... اور اگر تو ہارا بھی تو تیرے پیسے میں اُسی وقت تجھے جوڑ دوں گا..... چاہے مجھے خود کو ہی گروی کیوں نہ رکھنا پڑے..... تو جانتا ہے بالے کی بڑی ساکھ ہے اس ساقی خانے میں..... صبح ہونے سے پہلے تو اپنے سیٹھ کی رقم واپس رکھ دینا اس تجوری میں..... مجھے تو بس بازی میں لگانے کے لیے شروع کی رقم کی ضرورت ہے..... ایک بار بازی چل پڑی تو پھر چل سو چل..... سوچ..... یہ ہزاروں ہیں..... ایک ہاتھ بھی سیدھا پڑ گیا تو لاکھوں ہوں گے اپنے پاس..... اعتبار کر میرا.....'' شوکت سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے بہت دنوں سے صغراں کو سونے کی دو چوڑیاں بنوا کر دینے کا وعدہ کر رکھا تھا آخر کار اس نے اپنے اندر کے تمام وسوسوں کو دبا کر یہ بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا لیکن راستے بھر وہ بالے سے یہی وعدہ لیتا رہا کہ ہارنے کی صورت میں بالا اس کی پوری رقم واپس دلوانے کا ذمہ دار ہوگا اور بالا سر ہلا ہلا کر اسے یقین دلاتا رہا۔ کہتے ہیں جوا انسان کے ضمیر میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑنے کے لیے پہلی بازی سدا اس کنوارے جواری کے نام لکھتا ہے جس نے زندگی میں پہلی بار پانسہ ڈالا ہوتا ہے وہ رات بھی شوکت کے نام لکھ دی گئی تھی۔ ہارنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور وہ پانسہ پھینکتا اور جیتتا رہا۔ رات تین بجے جب وہ دونوں بادل نخواستہ جوئے خانے سے اٹھے تو ان دونوں کی جیبوں سے پیسے گر رہے تھے۔ شوکت نے گھر جانے سے پہلے سیٹھ کی رقم تجوری میں رکھ دی اور اگلے دو روز کی چھٹی کر لی۔ جوے کا پیسہ انسان کے قدم جوئے خانے کی طرف ہی کھینچتا ہے۔ اور اگلی شام شوکت اور بالے کے قدم بھی پر اُسی ساقی خانے کی ڈگر پر رواں دواں تھے۔ آج تو شوکت کو روپے پیسے کی کوئی فکر بھی نہیں تھی کیونکہ آج اس کے پاس اپنی رقم موجود تھی۔ لہٰذا اس نے دل کھول کر بازی لگائی۔ جواری کی جھجک جب ٹوٹ جائے اور دل بڑا ہو تو پھر اس کی قسمت بھی اس کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ وہ دوسری رات فجر کی روشنی ہونے تک ان پر مہربان رہی۔ بالے نے ایک مقام پر آ کر اپنے پیسے سمیٹ کر ہاتھ روک لیا اور نظروں نظروں میں شوکت کو بھی بازی لپیٹنے کا اشارہ کیا لیکن شوکت کا ہاتھ نہ رک سکا اور وہ پانسے پر پانسہ اور پتے پر پتہ پھینکتا رہا اور جیت سمیٹتا رہا۔ اور پھر یہ بازی دس سالوں پر محیط ہوتی چلی گئی۔ شوکت نے منشی کی نوکری چھوڑ دی اور اس کے شب و روز جوے کی نذر ہونے لگے۔ صغراں نے یکے بعد دیگر دو لڑکوں اور ایک لڑکی کو جنم دیا تو گھر کے خرچے بھی بڑھ گئے۔ لیکن قسمت نے دوبارہ کبھی پہلی دو راتوں کی طرح کھل کر شوکت کا ساتھ نہ دیا۔ وہ ایک بار ہارا تو پھر

ہارتا ہی چلا گیا۔ شاید ہر جواری کے نصیب کی ایک بازی ضرور ہوتی ہے۔ شوکت اپنے نصیب کی وہ بازی پہلی دو راتوں میں ہی بھگتا چکا تھا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اُس کے مقدر کی وہ بازی اُسے سول لائن کے ان پرانے بوسیدہ کوارٹروں کے ایک جوئے خانے میں ملی جہاں دس پندرہ ہزار سے اوپر کا پتا نہیں پھینکا جاتا تھا اور رات بھر میں صرف چالیس پچاس ہزار کا جوا ہوتا تھا۔ اگر یہی بازی شوکت کو شہر کے کسی پانچ ستارہ ہوٹل یا کسی ارب پتی کے بنگلے میں ملتی تو شاید وہ اپنی دو راتوں میں اپنی سات نسلوں کے لیے کما جاتا۔ لیکن سب سے بڑی بازی تو ہمارا نصیب خود ہمارے ساتھ کھیلتا ہے۔ لہٰذا شوکت بھی اپنی تقدیر کی بازیاں ہارتا چلا گیا اور نوبت صغراں کے زیور بیچنے تک آ گئی۔ صغراں اس سے لڑ لڑ کر ہار گئی اور تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد تو اُسے چپ ہی لگ گئی۔ اُس کی صحت گرتے گرتے آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی اور پھر ہر دوسرے تیسرے روز اُسے بخار آ گھیرتا تھا۔ شوکت بھی اُسے دوا کے پیسے دیتا بھی تو وہ بچوں کے لیے کچھ خرید لیتی تھی۔ لیکن اس مرتبہ کا بخار تو اُترے نہیں اُتر رہا تھا۔ اسی لیے شوکت نے اسے شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال میں دکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہی سوچوں میں صبح ہو گئی اور پڑوسی کے مرغے کی پہلی بانگ کے ساتھ ہی شوکت نے صغراں کو جگا دیا۔ وہ نہ نہ کرتی رہ گئی لیکن شوکت نکڑ سے تانگا پکڑ لایا اور تینوں بچوں سمیت صغراں کو لیے ہسپتال پہنچ گئے کرم دین اسے وارڈ کے باہر ہی مل گیا اور اس نے جلدی ہی دوڑ دھوپ کر کے او پی ڈی میں موجود بڑے ڈاکٹر سے صغراں کے لیے نمبر بھی لے لیا۔ ڈاکٹر نے صغراں کی حالت دیکھی تو وہ پریشان سا ہو گیا اور اس نے شوکت کو تاکید کی کہ چند ضروری ٹیسٹ کروانے تک وہ صغراں کو ہسپتال میں داخل کرا دے۔ ڈاکٹر نے تو وارڈ کی پرچی بھی بنا کر کرم دین کے حوالے کر دی تھی مگر صغراں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ گھر کے ہزار کام پیچھے چھوڑ آئی تھی اور پھر بچوں کو بھی تو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شوکت نے بہتیرا زور لگایا کہ وہ گھر اور بچوں کو سنبھال لے گا مگر صغراں نہ مانی۔ شوکت کو یہ پریشانی بھی لاحق تھی کہ اگر وہ گھر میں بچوں کے ساتھ رہے گا تو یہاں صغراں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ کرم دین نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ پانچ سو روزانہ والا پرائیویٹ کمرہ لے لے تو وہ ڈیوٹی والی نرس سے منت زاری کر کے شوکت کو بمع تین بچوں کے وہاں رات گزارنے کی اجازت دلوا دے گا۔ شوکت گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ صغراں کو اپنے شوہر کی جیب کی حالت خوب معلوم تھی لہٰذا اس نے شوکت کو واپس گھر چلنے کا کہا اور بہانہ یہ کیا کہ آج وہ اپنے دور کی کسی خالہ یا چچا زاد کو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بلوا لے گی اور اس صورت میں وہ کل ہسپتال آ کر داخل بھی ہو جائے گی دل میں صغراں کا خیال یہ تھا کہ وہ لوٹ پوٹ کر خود ہی ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہو جائے گی۔ شوکت بھی یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ کل تک کہیں نہ کہیں سے رقم کا کچھ بندوبست کرنے کے بعد ایک ہی بار صغراں کو علیحدہ کمرے والے وارڈ میں داخل کروا کر جم کر اس کا علاج کروائے گا۔ صغراں اور بچوں کو گھر واپس چھوڑ کر وہ بالے کی طرف چلا آیا۔ بالے کی کایا پلٹے تین سال ہونے کو

آئے تھے اور ان تین سالوں میں اس نے ایک بار بھی پتوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ لیکن اُسے ایک بات کا قلق ہمیشہ رہا تھا کہ شوکت کو اس راہ پر لگانے والا وہ خود ہی تھا۔ اس نے کئی بار شوکت کو پیش کش کی تھی کہ وہ اُسے بھی اس مولوی جی سے ملوانا چاہتا ہے جن کی باتیں سن کر اس کا من پلٹ گیا تھا لیکن شوکت ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ اس کا دل نماز اور مسجد میں کبھی نہیں لگتا تھا۔ شوکت دکھاوے کے لیے جمعے اور عید کی نماز پر تیار ہو کر تو پہنچ جاتا تھا مگر وہاں بھی وہ رکعتوں اور فرائض میں دھیان لگانے کے بجائے ذہن میں پتے ہی ترتیب دیتا رہتا تھا۔ صغراں کے کہنے پر اس نے کئی بار جوا کھیلنے سے توبہ بھی کی مگر پھر اگلے روز ہی یہ توبہ توڑ بیٹھتا تھا۔ بالے نے شوکت کو دیکھا تو اس کا چہرہ کھل گیا ''آ یار شوکی..... بڑی عمر ہے تیری..... میں ابھی مولوی صاحب سے تیرا ہی ذکر کر رہا تھا..... دیکھ..... آج قدرت نے تیری ملاقات کروا ہی دی نا مولوی جی سے.....'' شوکت نے چونک کر بالے کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ ٹھیلے کے ساتھ پڑے ہوئے بنچ کی جانب دیکھا جہاں ایک باریش اور ضعیف شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا سکون اور اطمینان تھا۔ سادہ سے پیوند لگے لیکن صاف ستھرے ڈھلے ہوئے مگر بنا استری کے کپڑوں میں ملبوس وہ شخص بالے کا ''مولوی معظم'' ہی تھا۔ شوکت جو آج بالے سے کچھ ادھار کی اُمید میں یہاں آیا تھا کچھ بددل سا ہو گیا۔ مولوی صاحب کی موجودگی میں بالے سے کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر مولوی کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا ''یار بالے..... آج میں ذرا جلدی میں ہوں..... تیری بھابھی کو بڑا سخت بخار ہے..... اسے ہسپتال میں داخل کروانا ہے میں نے سوچا کہ اگر تجھ سے کچھ رقم.....'' ''ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... سات آٹھ سو تو ہیں میرے پاس..... بول کتنے دوں.....؟''

شوکت کا موڈ خراب ہو گیا ''نہیں یار..... پانچ سو روپے روزانہ پر کمرہ کرائے پر لینا ہے..... دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے ہسپتال میں.....'' بالے نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''میرے پاس تو یہی آٹھ ایک سو ہوں گے..... تجھے تو پتہ ہے کہ میں روزانہ چار سو کمیٹی میں بھی ڈال دیتا ہوں.....'' شوکت مایوسی سے اُٹھ کھڑا ہوا ''اچھا..... چل خیر..... تو آٹھ سو ہی دے دے..... میں کہیں اور سے بھی پتا کرتا ہوں.....'' بالے نے بنڈی سے جیب سے آٹھ سو کی ریزگاری نکالی اور شوکت کے ہاتھ میں تھما دی۔ شوکت جانے لگا تو پیچھے سے مولوی معظم کی آواز سنائی دی ''یہ میرے پاس بھی کچھ پیسے ہیں بھیا..... یہ بھی رکھ لو.....'' شوکت چونک کر مڑا۔ مولوی معظم کے ہاتھ میں پانچ سو کے تین نوٹ تھے۔ ''مجھے آج ہی امامت کی تنخواہ ملی ہے محلے والوں سے..... میری ضروریات کچھ زیادہ نہیں ہیں..... تم ان سے اپنی بیوی کا علاج کروا لینا'' شوکت نے گھبرا کر انکار کیا ''نہ جی..... میں آپ کے پیسے بھلا کیسے لے سکتا ہوں..... آپ سے تو میری کوئی واقفیت بھی نہیں'' مولوی مسکرایا ''بھئی تم اقبال کے دوست ہو..... اس رشتے سے میرے بھی کچھ ہوئے ناں..... لو رکھ لو.....'' مولوی نے زبردستی پیسے شوکت کی جیب میں ڈال دیے۔ اقبال عرف بالے کی آنکھیں بھر آئیں ''مولوی جی..... آپ

میرے یار شوکی کے لیے بھی دعا کریں ناں..... یہ بہت بار جوئے سے توبہ کر کے توڑ چکا ہے..... آپ دعا کرو کہ اس بار اسکی توبہ قبول ہو جائے.....'' شوکت نے سر جھکا دیا۔ مولوی نے مسکرا کر شوکت کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''نہیں..... ابھی اس نے توبہ نہیں کی..... فی الحال تو یہ صرف استغفار کر رہا ہے..... جب کبھی دل سے توبہ کرے گا..... اسی دن جوئے کی لت چھوٹ جائے گی۔'' بالے نے حیرت سے مولوی معظم کی طرف دیکھا ''یہ کیا بات ہوئی مولوی جی..... بھلا توبہ اور استغفار میں بھی کوئی فرق ہوتا ہے.....؟'' ''ہاں..... بڑا فرق ہے..... توبہ گناہ سے پہلے کی جاتی ہے اور استغفار گناہ کے بعد..... یوں سمجھ لو کہ توبہ پرہیز ہے اور استغفار دوا..... ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بدپرہیزی ہماری روح کو بیمار کر دے گی..... گناہ کیے جاتے ہیں..... اور پھر جب گناہ کا احساس ہوتا ہے تو استغفار کی دوا سے اُس گناہ کی بیماری کا گھاؤ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گناہ سے پہلے ہی پرہیز والی توبہ کر لیں تو بعد میں دوا والی استغفار کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور جب ہم گناہ کے بعد معافی مانگتے ہیں تو ہمارا دل جانتا ہے کہ ہم گناہ سے ہمیشہ توبہ کر رہے ہیں یا بار بار کی استغفار طلب کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دل سے توبہ کی جائے تو پھر استغفار کی حاجت نہیں رہتی..... جس دن تمہارے دوست نے جوئے سے سچے دل سے توبہ کی..... یہ دوبارہ پلٹ کر اس ساقی خانے کی طرف نہیں جائے گا..... اور اسے ہر بار گناہ کے بعد کی استغفار کی شرمندگی سے بھی نجات مل جائے گی..... البتہ یاد رہے کہ توبہ اور استغفار دونوں ہی اللہ کو پسند ہیں.....''

شوکت مولوی معظم کی باتوں میں اُلجھا شام کو اپنے محلے میں داخل ہوا تو اسے نورے حلوائی کی دوکان کے پاس ہی کریم بخش مل گیا۔ اس نے جلدی سے شوکت کا ہاتھ پکڑ لیا ''اوئے شوکی..... کہاں غائب ہے تو تین دن سے..... چل جلدی کر..... آج پورے پچاس ہزار کی بازی لگے گی پچھلی گلی میں..... سب تیرے بنا بہت اداس ہیں وہاں.....'' شوکت نے انکار میں سر ہلایا ''نہیں کرمو..... آج نہیں..... گھر والی بیمار پڑی ہے..... پھر کبھی سہی.....'' کریم بخش نے شوکت کو جانے نہیں دیا ''بڑا بے مروت ہو گیا ہے تو..... دو گھڑی کے لیے تو چلا چل..... نہ لگانا بازی..... اب کیا یاروں کو اپنے دیدار سے بھی محروم رکھے گا.....؟'' شوکت نے ہتھیار ڈال دیے..... ٹھیک اسی لمحے اسکا بڑا دس سالہ بیٹا کامی گھر سے باہر نکلا اور باپ کو دروازے سے واپس پلٹتے دیکھ کر پوچھ بیٹھا ''کہاں جا رہا ہے ابا؟'' ''کہیں نہیں..... جا کر اپنی ماں کو بتا دے کہ میں پچھلی گلی میں دوستوں کے ساتھ گپ لگا رہا ہوں..... جلدی آ جاؤں گا..... کوئی ضروری کام ہو تو مجھے سکندر چاچے کی کچی کوٹھی سے آ کر بلوا لینا.....'' سکندر شوکت کے محلے میں ہی ہر ہفتے کی رات بازی لگواتا تھا اور خوب پتے چلتے تھے رات بھر، شوکت کرمو کے ساتھ سکندر کے اڈے پر داخل ہوا تو دھوئیں اور چرس کی باس نے سارے کمرے کا ماحول آلودہ کر رکھا تھا۔ لیکن جواریوں کے لیے یہی فضا تازہ آکسیجن کا کام کرتی تھی۔ سو شوکت بھی جلد ہی

اس ماحول میں گھل مل گیا کچھ دیر تک تو وہ صرف پتے پر پتا گرتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ اسکے اندر کا جواری بیدار ہونے لگا اسنے پہلی بازی میں بالے کے دیئے ہوئے آٹھ سو ایک ایک سو کر کے جھونک دیئے..... لیکن بازی لمبی ہوتی گئی اور جب پہلی مرتبہ اس کے بیٹے کامی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانک کر اپنے باپ کو آواز دی تب تک شوکت پانچ سو ہار چکا تھا کامی ہلکایا ''وہ ابا.....اماں بلاتی ہے.....'' شوکت نے اسے جھاڑ دیا ''آتا ہوں.....جا بھاگ جا یہاں سے.....'' کامی واپس دوڑ گیا۔ دوسری مرتبہ آنے میں کامی نے دو گھنٹے لیے ''ابا.....اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....وہ بلا رہی ہے.....'' اس بار شوکت پتے پھینٹنے میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے کامی کو کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بالے کے دیئے ہوئے آٹھ سو شوکت تیسری بازی میں ہار چکا تھا لیکن مولوی کے دیئے ہوئے پندرہ سو بڑے برکتی نکلے اور بازی پلٹنے لگی۔ تیسری مرتبہ کامی نے اندر جھانکا تو رات آدھی بیت چکی تھی۔ ''ابا.....وہ اماں.....'' جھلائے ہوئے شوکت نے پیر کا جوتا نکال کر اس کی طرف پھینکا ''تو جاتا ہے یا.....؟'' کامی ڈر کر بھاگ گیا۔ رات دو بجے کے بعد شوکت کی قسمت جاگنے لگی۔ مولوی کے روپے دوسرے جواریوں کے روپے کھینچنے لگ گئے تھے اور شوکت کے سامنے سو پچاس کے نوٹوں کی ڈھیری بڑھتی جا رہی تھی۔ چوتھی مرتبہ کامی روتا ہوا اندر آیا تو فجر ہونے والی تھی ''ابا وہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے.....تو جلدی سے گھر آجا.....'' شوکت دس ہزار داؤ پر لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے کامی کو دیکھے بنا جواب دیا ''تو چل.....بس یہ بازی ختم ہو تو آتا ہوں.....اور سن.....اپنی ماں کو انگیٹھی پر رکھی سرخ دوا پلا دینا.....'' لیکن شوکت بھی جانتا تھا کہ اُسے ابھی یہاں بہت دیر لگنے والی ہے کیونکہ جواری کی آخری بازی کبھی نہیں آتی۔ آخری سانس البتہ پہلے آجاتی ہے۔ سو شوکت کی آخری بازی نے رات کے سینے کو پھاڑ کر سورج کے باہر نکلنے تک کا وقت لے لیا۔ کامی اس کے بعد باپ کو بلانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ شوکت نے اپنی جیتی ہوئی رقم گنی نہیں تھی لیکن اسے یقین تھا کہ پینتیس چالیس ہزار ضرور ہوں گے۔ اس نے ایک لمبی اور آسودہ انگڑائی لی اور رقم اپنی جیبوں میں بھر کر جوا خانے سے باہر نکل آیا۔ دن چڑھ آیا تھا اور گھروں کے مرد اپنے کام کاج پر کب کے نکل چکے تھے۔ شوکت اپنی گلی میں داخل ہوا تو کچھ عجیب سی خاموشی تھی۔ کامی اپنے دونوں چھوٹے بھائی بہن کو لیے گلی کے کونے میں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ شوکت کے دروازے کے قریب کچھ محلے دار بزرگ خاموش کھڑے تھے۔ وہ سب شوکت کو دیکھ کر آپس میں زیرلب کچھ بڑبڑائے۔ شوکت جلدی سے آگے بڑھا ''کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے ناں.....'' ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ''تو ساری رات جوا کھیلتا رہا اور یہاں تیری صغراں زندگی کی بازی ہار گئی۔ تو نے آنے میں بہت دیر کر دی شوکی بیٹا.....'' شوکت کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ کر گر پڑا۔ وہ دیوانہ وار گھر کے دروازے کی جانب دوڑا۔ پیچھے سے کوئی پڑوسی چلایا ''وہ گھر میں نہیں ہے.....ڈاکٹر نے جلد دفنانے کی ہدایت کی تھی۔ بھاگنا ہے تو قبرستان کی طرف

بھاگ.....شاید آخری بار چہرہ دیکھنے کا موقع مل جائے.....'' شوکت ٹھوکر کھا کر گر گیا۔اس کے بچے اُسے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح قبرستان کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔شوکت کے کانوں میں مولوی معظم کے جملے گونج رہے تھے''نہیں.....ابھی اس نے سچے دل سے توبہ نہیں کی.....یہ تو صرف استغفار پر ہی گزارہ کر رہا ہے.....'' شوکت زاروقطار روتے ہوئے قبرستان کی طرف دوڑ رہا تھا اور اپنی جیبوں سے نوٹ ہوا میں اُچھالتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا''میں نے توبہ کی میرے مالک.....میں نے سچے دل سے توبہ کی.....مجھے معاف کر دے مولا.....میری توبہ قبول کر.....توبہ.....توبہ.....توبہ.....''

جلاد (افسانہ)

اندھیری گلی کے سرے پر ایک کم زور سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور تیز چلتی ہوا اس جھولتے ہوئے بلب کی مٹیالی سی پیلی پیلی روشنی کے دائرے کو گلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دھکیل رہی تھی۔ اکرم کو اس گلی کے نکڑ پر کھڑے قریباً دو گھنٹے ہونے والے تھے اور اب اُسے نکڑ کی بند دوکان کے لکڑی کے پرانے بوسیدہ دروازے کی کڑیاں اور جوڑ بھی گن گن کر زبانی یاد ہو چکے تھے۔ طوفانی رات تھی کہ ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور انتظار تھا کہ پل پل مزید طویل ہوتا جا رہا تھا۔

انتظار چاہے لمحاتی ہو تب بھی گھنٹوں کے برابر ہوتا ہے اور اکرم کو تو واقعی یہاں کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُس نے دور بجتے کسی گھنٹہ گھر سے دو بجے کا گجر سنا تو مایوس ہو کر واپسی کی ٹھانی۔ اور ٹھیک اُسی لمحے اندھیرے میں ایک ہلکی سی سرگوشی گونجی ''معاف کرنا..... مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی..... سارے شہر میں پولیس کے پہرے لگے ہیں..... راستہ بدلنا پڑا.....'' اکرم نے اندھیرے میں کھڑے شخص کا چہرہ پہچاننے کی ناکام کوشش کی ''اب آگے کیا کرنا ہے؟..... میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تم لوگوں کا کام کروں گا..... لیکن معاوضہ کچھ بڑھانا ہوگا.....'' اجنبی اندھیرے سے روشنی میں آگیا اس نے چہرہ سیاہ مفلر سے لپیٹ رکھا تھا۔ ''معاوضے کی تم فکر نہ کرو..... اتنا پیسہ ملے گا کہ تمہاری سات نسلیں گنتی پھریں گی..... لیکن پہلے تمہیں اپنا اعتماد قائم کرنا ہوگا۔ ہمیں یقین دلانا ہوگا کہ تم ہمارے وفادار ہو.....'' اکرم نے سر ہلایا ''میں تیار ہوں.....'' اجنبی نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اکرم کے ہاتھ میں تھمائے۔ ''ٹھیک ہے..... تو پھر کل شام یہیں ملنا مجھے..... کل تیرہ اگست ہے..... تمہیں ایک تیار کی گئی موٹر سائیکل دی جائے گی جسے 14 اگست کی صبح شہر کے مرکزی جلسے میں

لے جا کر کھڑا کرنا ہوگا۔ اگر تم نے یہ کام ٹھیک طرح سے کیا تو پھر اگلا کام بتاؤں گا تمہیں..... لیکن یاد رہے..... اگر کہیں کم زور پڑے یا پیٹھ دکھانے کی کوشش کی تو ہم غداروں سے نپٹنا خوب جانتے ہیں.....''

اجنبی اکرم کا جواب سنے بغیر وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ اکرم نے ہاتھ میں پکڑے پیسے گنے۔ اُسے بیعانے کے طور پر ملے پانچ ہزار کے کڑک نوٹ دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنے مہینوں کی بے روزگاری کے بعد اچانک اس کے ہاتھ میں اکٹھے پانچ ہزار کی رقم آگئی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ واپس جاتے ہوئے راستے سے اپنے 10 سالہ بیٹے گڈو کے لیے کوئی کھلونا اور گھر کے لیے کوئی کھانے کی چیز لیتا جائے۔ لیکن رات بہت بیت چکی تھی اور اسے سارے راستے سوائے ایک آدھ میڈیکل اسٹور کے اور کوئی دوکان کھلی دکھائی نہیں دی تو اس نے مزید تلاش کا سلسلہ کل پر موقوف کر دیا۔ ویسے بھی اس کا باپ اعظم بڑا شکی مزاج شخص تھا۔ اُسے حلال کے پیسے کی لت پڑی ہوئی تھی اور تیس سالہ سرکاری نوکری میں اُس نے اپنی اولاد اور اپنے خاندان کے حلق میں حرام کا ایک نوالہ بھی نہیں جانے دیا تھا۔ اعظم کی بیوی اکرم کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد خالق حقیقی سے جا ملی تھی اور اعظم نے ہی اپنی بڑی بیٹی رشیدہ اور اکرم کی پرورش کی تھی۔ رشیدہ بہت عرصہ پہلے بیاہ کر اپنے شوہر کے ساتھ دوسرے شہر جا چکی تھی۔ کبھی کبھار خط آجاتا تھا اُس کا جس میں اکرم کے لیے صرف یہی نصیحت ہوتی تھی کہ وہ بوڑھے باپ کا خیال رکھا کرے۔ رشیدہ کا شوہر پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا اور اس کا اپنا کنبہ چھ بچوں پر پھیل چکا تھا لہٰذا اس کا اپنا ہاتھ بھی تنگ رہتا تھا لیکن سال چھ مہینے میں باپ کے لیے گرم سویٹر یا اکرم اور اس کی بیوی کے لیے خالص گھی یا گھر کا بنا تازہ میوے والا گڑ بھیجتی رہتی تھی۔ اکرم کی شادی سکینہ سے ہوئی تو رشیدہ کو اپنے باپ اور بھائی کی جانب سے کچھ اطمینان نصیب ہوا کہ اب گھر میں عورت آگئی ہے تو وہ ان دو چھڑوں کا بھی کچھ سہارا ثابت ہوگی اور مکان کو گھر میں بدل دے گی۔ شروع کے چند سال سکینہ نے بھی خوب نبھائی لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا گڈو پانچ سال سے اوپر کا ہونے لگا اور اکرم کے تیور نہ بدلے تو وہ بھی چڑنے لگی۔ اکرم نے بمشکل آٹھویں پاس کی تھی اور اس کا کسی کام میں مستقل دل نہیں لگتا تھا۔ ہر تین ماہ بعد اُسے اپنا پرانا کام عذاب لگنے لگتا تھا اور وہ سب چھوڑ چھاڑ گھر میں پڑ جاتا۔ وہ اب تک ٹکٹ بلیک کرنے سے لے کر گنے کے رس کی مشین کا ٹھیہ لگانے تک ہر کام کر چکا تھا۔ کچھ عرصہ عطاری اور پھر پرچون کی دوکان بھی ڈالی مگر حسب معمول اس کا دل ان کاموں سے جلد بھر گیا۔ اعظم اپنی ساری جمع پونجی اور پینشن سمیت گریجویٹی کی ساری رقم اپنے بیٹے کے ان ناکام تجربوں کی نظر کر چکا تھا اور پھر جب نوبت فاقوں تک پہنچنے لگی تو سکینہ کے اپنے میکے کے چکر طویل ہونے لگے وہ شروع میں ایک آدھ دن کے لیے اور پھر دو تین رات کے لیے گھر جانے لگی۔ اُسے خود سے زیادہ اپنے لاڈلے گڈو کی خوراک کی فکر ستاتی رہتی تھی کیونکہ یہ اُس کے بڑھنے کے دن تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا رات کو پانی، نمک اور مرچ کے

جھوٹے شوربے میں باسی روٹیاں بھگو کر کھائے اور روتے روتے سو جائے لہٰذا وہ ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے اپنے میکے پہنچ جاتی تھی۔ اسکا سسر اعظم بھی بیٹے کی بے روزگاری اور غیر مستقل مزاجی سے بے حد پریشان رہتا تھا اور اس نے تنگ آ کر خود صدر بازار میں پرانی گھڑیوں کی مرمت کے لیے ایک کھوکھا کرائے پر لے لیا تھا یہ اس کا بچپن کا شوق تھا جواب بڑھاپے میں اس کے کام آ رہا تھا۔ کیسی اور کتنی بھی پرانی بند گھڑی ہو وہ اسے منٹوں میں کھول کر اس کے مرض تک پہنچ جاتا تھا لیکن آج کل کی نئی ڈیجیٹل اور نمبر والی گھڑیوں نے یہ پیشہ بھی زوال پذیر کر دیا تھا لہٰذا اعظم کبھی کبھی سارا دن کسی گاہک کے انتظار میں ہی گزار دیتا تھا۔ اسنے تیس سال تک بڑی ایمان داری سے جیل کی نوکری کی تھی لیکن جیل میں اُس کا کام کچھ ایسا تھا کہ لوگ عام طور پر اس کا پیشہ سنتے ہی اپنا راستہ بدل لیتے تھے اعظم اپنی ڈسٹرکٹ کے سنٹرل جیل میں جلاد کی نوکری پر فائز تھا اور ان تیس سالوں میں اس نے نہ جانے کتنے گناہ گاروں کو تختے کا لیور کھینچ کر موت کی وادی میں پہنچایا تھا کون جانے ان پھانسی پانے والوں میں سے کئی بے گناہ بھی ہوں لیکن یہ فیصلہ کرنا تو سرکار اور عدالت کا کام تھا۔ اعظم تو بس ایک جھٹکے سے پھانسی گھاٹ کا لیور کھینچنے پر معمور تھا۔ اب لٹکنے والا کون تھا اور کس جرم کی سزا اور پاداش میں سولی جھولتا تھا اس سے اعظم کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنا کام بڑی ایمانداری سے کرتا تھا۔ اسنے ایک مرتبہ جیل کے بڑے ڈاکٹر سے سنا تھا کہ ''بہترین پھانسی'' وہ ہوتی ہے جس سے پھندے پر لٹکنے والا زیادہ نہ تڑپے اور ایک جھٹکے سے اُس کی جان نکل جائے لیکن اس بہترین سولی کا سارا انتظام جیل کے جلاد یعنی اعظم کی ذمہ داری تھا۔ لہٰذا وہ ہر صبح اپنی ڈیوٹی پر آتے ہی سب سے پہلے پھانسی گھاٹ کے احاطے میں نصب اس قاتل چبوترے کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتا تھا کہ کہیں کسی پیچ، نٹ یا ہولے کے قبضے کو تیل کی ضرورت تو نہیں کہیں کھلنے والے دو تختوں میں کوئی درز چیخ تو نہیں رہی۔ لیور کی آہنی راڈ کو کہیں سے زنگ تو نہیں کھا رہا۔ لیور کہیں اٹکتا تو نہیں یا پھندے کی رسی کہیں سے ادھڑ تو نہیں رہی؟؟ اعظم روز صبح نماز کے بعد منہ اندھیرے گھاٹ پر پہنچ کر دن چڑھنے تک یہ سارے کام ایک نہ ختم ہونے والی دل جمعی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور باقی عملہ اکثر اس کا مذاق اڑاتا کہ وہ روزانہ صبح اس طرح پھانسی گھاٹ تیار کرتا ہے جیسے وہاں دن میں روزانہ ایک پھانسی بھگتائی جاتی ہو۔ جس کا جواب اعظم ہمیشہ مسکرا کر ہی دیتا کہ پھانسی چاہے سال بھر میں صرف ایک ہی کیوں نہ ہو.....اس کا فرض ہے کہ وہ قیدی کو زیادہ تکلیف سے بچانے کے لیے یہ سارے انتظامات دیکھتا رہے۔ جیلر اُسے چھیڑتا کہ جس قیدی نے چند لمحوں بعد مر ہی جانا ہے بھلا اس کی تکلیف کی کمی یا زیادتی کا کیا مطلب؟ لیکن اعظم کانوں کو ہاتھ لگا کر جواب دیتا کہ اگلے جہاں میں اُس سے اس بات کی پوچھ بھی ضرور ہوگی کہ اس کی ذرا سی لاپرواہی سے پھانسی جھولنے والے نے زیادہ تڑپ کر جان کیوں دی؟ جانے لوگوں کے ذہن میں جلاد کا نام آتے ہی ایک انتہائی خون خوار، سیاہ رنگت اور سرخ آنکھوں والے کالے حبشی کا تصور کیوں ابھر آتا تھا جو اپنے

کڑیل جسم پر خوب تیل ملے اور ہاتھ میں چمکتی تلوار لیے سزائے موت پانے والے قیدی کے جھکے ہوئے سر پر وار کرنے کے لیے تیار کھڑا ہو۔ شاید زمانہ قدیم کے جلاد ایسے ہی ہوتے ہوں مگر جب سے یہ پھانسی گھاٹ ''ایجاد'' ہوئے تھے پھانسی کافی حد تک ایک میکانکی عمل بن کر رہ گئی تھی اب اس کا تعلق خون کے چھینٹوں اور تڑپتے جسم کے ساتھ بھی تو نہیں رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ جلاد کا نام سنتے ہی اعظم سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ بہرحال اعظم نے کبھی ان باتوں کی پرواہ نہیں کی اور پورے تیس سال تک اپنا فرض نبھانے کے بعد وہ ریٹائر ہو کر باعزت اپنی ملازمت سے فارغ ہو کر گھر آ بیٹھا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ کے دن جیل میں باقاعدہ ایک تقریب ہوئی تھی جس میں جیلر صاحب نے اسے تعزیتی سند اور محکمہ جیل کی طرف سے انعام کے طور پر تیس بور کا ایک ریوالور بھی تحفے میں دیا تھا جسے آج تک اعظم نے بہت سنبھال کر رکھا تھا اور ہمیشہ اُسے اپنے تکیئے کے نیچے رکھ کر رات کو سویا کرتا تھا۔

اس رات بھی جب اکرم آدھی رات کو گھر پہنچا تو اعظم صحن میں چارپائی ڈالے اُسی کے انتظار میں آنکھیں موندھے لیٹا ہوا تھا۔ اکرم کا بیٹا گڈو آج پھر ضد کر کے اپنے دادا کے ساتھ کہانی سنتے سنتے لپٹ کر سو گیا تھا۔ اکرم نے بیٹے کو اُٹھا کر شانے سے لگا لیا ''یہ آج پھر یہیں سو گیا.....؟..... سکینہ کے پاس ڈال آتے اسے..... ساری رات تمہیں تنگ کرے گا.....'' اعظم نے دھیرے سے کہا ''تنگ تو تو نے بھی مجھے بہت کیا ہے بچپن میں..... آج پھر اتنی دیر سے گھر لوٹا ہے تو.....'' اکرم بات ٹال گیا۔ دوستوں کے ساتھ دیر ہوگئی..... کام مل گیا ہے..... کل سے کام پر جاؤں گا''..... اعظم نے ہاتھ اُٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اگلی صبح سکینہ کے میکے سے بلاوا آ گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں لیکن گڈو نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے دادا نے چودہ اگست کی صبح اُسے رنگ برنگی جھنڈیوں والے میدان میں میلہ دکھانے لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ ہر سال آزادی کے دن ان کے چھوٹے سے شہر کے باہر بڑے میدان میں میلہ لگتا تھا اور بڑے بڑے لوگ وہاں آ کر تقریریں کرتے تھے۔ گڈو تو جانے کتنے مہینوں سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا لہٰذا ماں کو مجبوراً اکیلے ہی میکے جانا پڑا۔

مغرب کے وقت اکرم دوبارہ اُسی گلی میں جا پہنچا جہاں اُسے گزشتہ رات اجنبی نے آنے کا کہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرے نے پھر سے ایک بھرپور دن کو مکمل شکست دے دی۔ لیکن آج اکرم کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اجنبی جلد ہی ایک موٹر سائیکل پر سوار وہاں آ پہنچا۔ شہر بھر میں جشن آزادی کی تیاریاں اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکی تھیں لیکن ڈبل سواری پر ابھی تک پابندی برقرار تھی۔ اجنبی نے موٹر سائیکل اکرم کے حوالے کی ''یہ لو..... خیال سے چلانا..... ریڈی ایٹر والی جگہ پر فلٹر کے خانے میں طاقت ور بم نصب ہے۔ زیادہ چھیڑ چھڑ نہ کرنا..... ورنہ ٹائمر رک جائے گا تو وہیں اڑ جاؤ گے..... کل صبح بڑے میدان کے جلسے میں اسے

کسی ایسی جگہ کھڑا کرنا جہاں آس پاس بھیڑ زیادہ ہو..... دھماکہ ہوتے ہی تمہاری رقم تمہاری جیب میں ہوگی..... لیکن دھیان رہے..... کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہے..... وہاں کافی چیکنگ ہوگی صبح..... کسی کے ہتھے نہ چڑھ جانا..... ورنہ ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے.....'' اکرم نے کچھ کہے بنا موٹر سائیکل اجنبی سے لے لی اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ راستے میں آتے ہلکے پھلکے گڑھے اور سپیڈ بریکر جنہیں وہ عام حالات میں کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا آج اس کی جان کا عذاب بنے ہوئے تھے۔ ایک معمولی کنکر بھی اگر ٹائر کے نیچے آجاتا تو اکرم کا دل اُچھل کر حلق میں آجاتا اور اس کی کن پٹیوں سے پسینے کی دھاریں بہہ نکلتیں۔ آج گھر کا راستہ بھی کس قدر طویل ہوگیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ اپنی گلی تک پہنچا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ دروازے سے کچھ پہلے وہ موٹر سائیکل کو بند کر کے نیچے اُتر گیا اور موٹر سائیکل کو دھکیلتے ہوئے اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اعظم اور گڈو کھانا کھا رہے تھے وہ صحن میں بچھی دوسری چارپائی پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اعظم نے بیٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا'' یہ موٹر سائیکل کس کی اٹھالائے ہو.....'' اکرم نے بظاہر لاپرواہی سے جواب دیا'' شوکی کی ہے..... پٹرول ختم ہوگیا تھا راستے میں..... کہہ رہا تھا کہ کل آکر لے جاؤں گا..... اب رات کو اسے کہاں گھسیٹتا پھروں گا.....'' شوکی اکرم کا لنگوٹیا تھا اور اکثر دونوں دوست ایک دوسرے کی اشیاء استعمال کرتے رہتے تھے۔ گڈو نے صحن میں نئی موٹر بائیک کھڑی دیکھی تو اس کا دل مچلنے لگا اور کسی نہ کسی بہانے سے بائیک کے گرد پھرکی کی طرح طواف کرنے لگا۔ اکرم نے اسے بائیک کے قریب جاتے دیکھا تو زور سے چلایا'' خبردار..... جو اسے ہاتھ بھی لگایا..... ابھی کل ہی شوکی نے لی ہے..... کہتا تھا ہزار پانچ سو زیادہ ملے تو آگے بیچ دوں گا..... لیکن اگر تو نے گاڑی پر کوئی خراش ڈال دی تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا..... لہٰذا دور ہی رہنا..... چل جا کر اپنے دادا ابا کے ساتھ سو جا''..... گڈو کچھ دیر وہیں صحن میں کھڑا منہ بسورتا رہا۔ اعظم جو صحن کے کونے میں لگے نلکے کے نیچے ہاتھ دھو رہا تھا اس نے اکرم کو ڈانٹا۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میرے گڈو کو نہ ڈانٹا کر..... کچھ دیر کے لیے سیٹ پر بیٹھ جائے گا تو تیرے دوست کی یہ پھپھی گھس تو نہیں جائے گی.....'' اعظم نے پوتے کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھا دیا اور اکرم کی جان نکل گئی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے باپ کو وہاں سے ہٹا دیا۔'' بچے کی ہر ضد پوری نہیں کرتے..... تم ہٹو..... میں اسے باہر سے چاکلیٹ دلا دیتا ہوں.....'' گڈو نے ہینڈل کو مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا لیکن اکرم نے ایک جھٹکے سے بیٹے کے ہاتھ چھڑا دیئے اور تقریباً گھسیٹتا ہوا اسے صحن سے باہر لے گیا۔ اعظم حیرت سے اکرم کی یہ پتھر دلی دیکھتا رہا اور بڑبڑایا'' جلاد کہیں کا.....'' اعظم نے کھنکارتے ہوئے اپنی جیب سے تسبیح نکالی اور صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ کر زیرِ لب تسبیح پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اکرم گڈو کا ہاتھ تھامے دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور گڈو لپک کر اپنے دادا کے پہلو میں جا پہنچا اور اُسے اکرم کی دلائی ہوئی چیزیں دکھانے لگا۔ اعظم گڈو کے

ہاتھوں میں چاکلیٹ اور بسکٹ کے بہت سے پیکٹوں سمیت چند کھلونے دیکھ کر چونک سا گیا ''اکو تو نے پھر کسی سے قرض پکڑ لیا ہے... کہاں سے آئے تیرے پاس اتنے پیسے.....؟'' اکرم جواب تک دوسری چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں موندھ چکا تھا اس نے بے زاری سے کروٹ بدلی۔ ''تجھے بتایا تو تھا... کام مل گیا ہے مجھے.....اُس کی پیشگی ملی تھی آج.....قرض نہیں لیا کسی سے.....'' اعظم نے حیرت سے پوتے کے ہاتھوں میں پکڑے تھیلوں کو دیکھا اور خود سے بولا ''ایسا کون سا کام مل گیا ہے اسے کہ جس کی پیشگی ہی اتنی بھاری ہے...'' اعظم کے دل میں شک کے سنپولیے نے سر ابھارا لیکن جب تک وہ اگلے سوال کے لیے بیٹے کی طرف پلٹا تب تک اکرم کروٹ پلٹ کر چہرہ موڑ چکا تھا لیکن سونے کا دکھاوا کرنے والے اکرم کی آنکھوں سے نیند اب بھی کوسوں دور تھی۔ اس کا سارا دھیان سامنے کچھ فاصلے پر کھڑی موٹر سائیکل کی طرف تھا جس کے فلٹر کے ڈبے میں سینکڑوں لوگوں کی چھپی موت گھڑی کی ٹائمر کی ٹک ٹک سے لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اچانک بے خیالی میں اُس کی نظر اپنی چھت پر لگے پاکستان کے جھنڈے پر پڑی۔ گڈو نے اپنے دادا سے ضد کر کے یہ جھنڈا آج ہی گلی کے نکڑ پر پھیری والے سے خریدا تھا جو پہلی اگست سے روزانہ ایسے بہت سے ننھے منے جھنڈے اور جھنڈیاں بیچنے کے لیے ان کی گلی میں آ رہا تھا۔ محلے کے سبھی بچے یہ جھنڈے خرید کر اپنے گھروں کی چھتوں پر لہراتے اور گلی اور صحن میں جھنڈے کے نشان والی سبز جھنڈیاں سجا کر فخر سے ایک دوسرے کو دکھایا کرتے تھے۔ اکرم کو یاد آیا کہ وہ بھی بچپن میں ایسے جھنڈے اُٹھا کر گلیوں میں دوڑتا اور سب دوستوں کے ساتھ مل کر زور زور سے نعرے لگایا کرتا تھا۔ ''جیوے جیوے... جیوے پاکستان.....''

ان یادوں سے گھبرا کر اکرم نے آنکھیں موند لیں۔ لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بھلا یادیں کب پیچھا چھوڑتی ہیں۔ بلکہ بعض تلخ یادیں تو شاید ہماری پلکوں کے پردے تلے ہی اس انتظار میں چھپی بیٹھی ہوتی ہیں کہ کب ہم پلکیں موندھیں اور کب وہ ہم پر حملہ آور ہوں۔ اکرم بھی ایسی ہی کچھ یادوں کے بھنور میں غوطے کھا رہا تھا کہ اچانک کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر اس کا دم نکلتے نکلتے رہ گیا کہ گڈو سوتے ہوئے دادا سے نظر بچا کر دوبارہ موٹر سائیکل کے قریب پہنچ کر اس کے مختلف حصوں کو چھو کر دیکھ رہا ہے۔ ایک نئی چمکتی دمکتی موٹر سائیکل نے اس کے اندر کے بچے کو للچا رکھا تھا اور گڈو چاروں جانب گھوم پھر کر موٹر سائیکل کے پچھلے پہیے کو گھما کر اور اس کی گدی کو تھپتھپا کر اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اکرم بجلی کی تیزی کے ساتھ گڈو کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے بنا کچھ کہے اپنے معصوم بیٹے کے گال پر ایک زوردار چانٹا جڑ دیا۔ ''تجھے منع کیا تھا ناں..... کہ اس عذاب کو ہاتھ نہ لگانا... بات سمجھ نہیں آتی تجھے...'' گڈو زور سے رو پڑا۔ اعظم پوتے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر جاگ گیا ''کیا ہوا.....؟.....سب خیر تو ہے.....'' گڈو بھاگ کر دادا سے لپٹ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ ''ابا نے تھپڑ مارا ہے.....'' اعظم نے پوتے کے گال پر چھپی انگلیوں کا

تازہ سرخ نشان دیکھا تو اس کا پارہ چڑھ گیا ''تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ... یہ کیا پاگل پن سوار ہوگیا ہے تجھ پر؟..... اٹھا اپنے دوست کی یہ پھٹ پٹھی اور ابھی لے کر نکل جا یہاں سے..... بچے نے ذرا سا ہاتھ کیا لگا: یا تو نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے..... آخر ایسے کون سے ہیرے جڑے ہیں اس موٹر سائیکل کے اندر.....؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں.....'' اعظم اُٹھ کر موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گیا اور اشتعال میں اُسے ایک زوردار لات رسید کر بیٹھا۔ موٹر سائیکل دھکے سے فضا میں تھوڑا سا جھولی اور اکرم نے برق سرعت سے اُسے گرنے سے پہلے ہی تھام لیا۔ ''دیکھ ابا..... اسے ہاتھ نہ لگا..... ورنہ برا ہو جائے گا.....'' اعظم بیٹے کی بات سن کر مزید طیش میں آ گیا ''کیوں..... کیوں نہ لگاؤں اسے ہاتھ..... تو نے اس میں کوئی خزانہ چھپا رکھا ہے ... جب سے گھر واپس آیا ہے چوروں کی طرح بول رہا ہے..... سچ بتا..... کیا معاملہ ہے..... موٹر سائیکل چوری کی ہے یا کسی واردات میں لوٹے پیسے اس کے کسی حصے میں دبا رکھے ہیں تو نے.....'' اعظم نے دوبارہ ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اکرم نے باپ کو زور سے جھڑکا ''نہ میں نے چوری کی ہے اور نہ کوئی واردات..... بس اب پیچھا چھوڑ دے میرا.....'' اچانک اعظم کی نظر موٹر سائیکل کی ٹینکی سے نکلتے پتلے سے پائپ پر پڑی جو اس کی لات لگنے سے شاید اپنے مرکز سے نکل گیا تھا اور اب ہوا میں جھول رہا تھا۔ پائپ میں سے پٹرول کی پتلی سے دھار نکل کر صحن کی کچی زمین میں جذب ہو رہی تھی اور فضا میں پٹرول کی تیز بو پھیل چکی تھی۔ اعظم چونکا ''تو نے تو کہا تھا کہ اس کا پٹرول ختم ہوگیا ہے اس لیے شوکی اسے یہیں چھوڑ گیا..... پر یہ تو پٹرول سے بھری ہوئی ہے..... تو نے جھوٹ کیوں بولا اکو..... سیدھی طرح بتاتا ہے یا میں تیلی لگا کر ابھی اس پھٹ پٹھیا کو جلا کر خاک کر ڈالوں''..... اکرم نے صحن میں سہمے سے کھڑے گڈو کو ڈپٹ کر اندر بھیج دیا ''تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے..... جا جا کر اپنی ماں کے کمرے میں سو جا..... اور خبردار جو صبح سے پہلے باہر نکلا تو..... چل بھاگ یہاں سے.....'' گڈو باپ کی ڈانٹ سن کر اندر کمرے کی جانب دوڑ گیا۔ اکرم اپنے باپ کی طرف پلٹا ''ابا..... تیرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑا..... میں نے کوئی چوری نہیں کی..... بس اپنا حق مانگا ہے زمانے سے.....'' اعظم مزید مشکوک ہوگیا ''کیسا حق..... اور اس موٹر سائیکل میں تو نے ایسا کیا چھپا رکھا ہے کہ ذرا سا ہاتھ لگنے پر تو بدک جاتا ہے..... مجھے دیکھنے دے.....'' اعظم آگے بڑھا لیکن اکرم نے اسے دھکے سے دور کر دیا ''نہیں ابا..... اسے ہاتھ نہ لگانا.....'' لیکن اعظم نے بھی ٹھان لی تھی اور وہ بیٹے سے گتھم گتھا ہوگیا۔ ''میں بھی دیکھ کر رہوں گا، ہٹ جا میرے آگے سے اکو.....'' دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کو دھکیلتے اور گرانے کی کوشش میں پورے صحن میں چکر کھا رہے تھے۔ اکرم کی پوری خواہش تھی کہ باپ کو موٹر سائیکل سے دور رکھ سکے۔ مگر اعظم کی بوڑھی ہڈیوں میں اب بھی ایک جلاد کی طاقت موجود تھی۔ نتیجہ اس نے لمبی دھینگا مشتی کے بعد بیٹے کو پچھاڑ کر زمین پر گرا دیا اور موٹر سائیکل کی جانب لپکا۔ اکرم چلایا ''اسے ہاتھ نہ لگانا ابا..... اس میں بم لگا ہوا ہے.....'' اعظم جو بالکل

قریب پہنچ چکا تھا زمین میں گڑ کر رہ گیا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو..... کیسا بم..'' اکرم زمین سے کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں نے کل کے جلسے میں اس موٹر سائیکل کو پہنچانے کے پیسے لے رکھے ہیں..... اور اب کوئی بھی مجھے اس کام سے نہیں روک سکتا.....'' اعظم کے سر پر جیسے خود ایک بڑا سا بم پھوٹ چکا تھا۔ ''تو نے دہشت گردی مچانے کے لیے پیسے لیے ہیں لعنت ہو تجھ پر اکو.. تو نے آزادی والے دن اپنی قوم والوں کو مارنے کا منصوبہ بنایا ہے.. تیرا بیٹا گھر کی چھت پر جھنڈے سجا رہا ہے اور قومی ترانے گاتا پھرتا ہے.. اور تو.. '' اکرم باپ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زور سے چلایا ''یہ جھنڈا اور یہ آزادی کا دن میرا اور تیرا پیٹ نہیں بھر سکتا ابا.. یہ سب بھرے پیٹ کی عیاشیاں ہیں.. جب میرا پیٹ بھرا ہوگا تو میں بھی جشن آزادی مناؤں گا.. اور کیا دیا ہے آج تک اس بے کار کی سوچ نے ہمیں؟.. تو تیس سال کی نوکری میں اپنے لیے ایک چھت نہ بنا سکا اور آج بھی کرائے کے گھر میں پڑا ہے.. کیا ملا تجھے یہ ایمان داری اور نیکی کی زندگی گزار کر.. خود اپنی بیماری کے لیے مہنگی دوا تک نہیں خرید سکتا.. تیرے ساتھ ریٹائر ہونے والے اس جیل کے کلرک نے چار سو گز پر اپنی کوٹھی ڈالی ہے.. وہ بھی تو تیری طرح گریڈ پانچ کا ملازم تھا ابا.. آج اس کی اور اس کی اولاد کی زمانے میں بڑی عزت ہے.. اور ایک ہم ہیں.. ساری عمریوں ہی جلتے کڑھتے اور سڑتے رہ گئے.. مجھے کچھ کما لینے دے ابا.. بس ایک بار یہ کڑوا گھونٹ پی لے.. پھر اس کے بعد ساری زندگی تیری طرح کی زندگی گزار دوں گا.. قسم لے لے مجھ سے..'' اعظم دکھ سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تو عمر بھر تجھے حلال کا نوالہ کھلایا تھا اکو.. پھر تیرے خون میں یہ شیطان کیسے بولنے لگا.....؟ کہاں غلطی ہوگئی مجھ سے.....؟ اس کمائی سے تو بہتر ہے کہ تو معذور ہو جائے اور میں ساری عمر تیرا اور تیرے بچوں کا پیٹ خود پالوں.. میں تجھے ایسی کوئی حرکت نہیں کرنے دوں گا.. جا.. جا کر یہ موٹر سائیکل کسی ویرانے میں کھڑی کر دے اور پولیس کو فون کر کہ وہ آ کر اسے ضبط کر لیں.. یوں تیرا نام بھی نہیں آئے گا اور تو ایک بڑے گناہ کبیرہ سے بھی بچ جائے گا.. جا میرا بیٹا.. باپ کی بات مان لے.. یہ پیسہ نہیں جہنم کی آگ ہے جسے تو اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہے.. '' اکرم غصے میں زور سے چیخا ''نہیں میں یہ موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا.. تجھے اگر ان پیسوں کا اتنا ہی خوف ہے تو میں کہیں اور جا کر بس جاؤں گا..... مگر میں یہ کام کر کے لاکھوں ضرور کماؤں گا.. ابا بھی تو نے خواب میں بھی پورے لاکھ روپے دیکھے ہیں..... تیری ساری زندگی کی کمائی سے بھی زیادہ.. اس لیے اب تو میرے راستے میں نہ آنا..... صبح ہونے والی ہے..... میں یہ موٹر سائیکل لے کر جا رہا ہوں.. دور کہیں سے صبح کی اذانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اعظم نے بیٹے کو موٹر سائیکل کی طرف بڑھتے دیکھا تو زور سے چلایا ''خبردار اکو.. میرے اندر کے جلاد کو جگانے کی کوشش نہ کر پتر.. جیسا میں کہتا ہوں.. جا کر ویسا ہی کر.. ورنہ میں تجھے یہ موٹر سائیکل یہاں سے

لے جانے نہیں دوں گا..... اور اب میں تجھے اکے لیے بھی نہیں بھیجوں گا..... چل دونوں باپ بیٹا اسے کسی ویرانے میں چھوڑ آتے ہیں ..... میری بات مان جا اکرم.....'' لیکن اکرم کہاں سننے والا تھا۔ اس نے بوڑھے اور ضدی باپ کو ایک زوردار دھکا دیا اور خود بائیک کی جانب لپکا۔ اعظم کا سر صحن میں پڑی چارپائی کے پائے سے ٹکرایا اور خون کی ایک تیز دھار اس کے چہرے کو بھگو گئی۔ اکرم تب تک موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اتار چکا تھا اور دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا اعظم کا ہاتھ اپنے تکیئے کے نیچے سرک گیا اور وہ زور سے چلایا ''رک جا اکو'' لیکن اکرم نے پلٹ کر باپ کی جانب نہیں دیکھا اور گلی میں کھلتا صحن کا بیرونی دروازہ کھول کر موٹر سائیکل کو باہر کی جانب دھکیلا۔ دفعتہً فضا میں سرکاری ریوالور کے ایک زوردار فائر کی آواز گونجی اور اکرم اوندھے منہ وہیں آدھا صحن اور آدھا گلی میں گر پڑا..... اسکے جسم سے نکلتی خون کی دھار گلی میں بہتی نالی تک جا پہنچی اور موٹر سائیکل اسکے ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد صحن کے دروازے سے ٹکی یوں کھڑی رہ گئی کہ اس کا اگلا پہیہ گلی میں اور پچھلا پہیہ ابھی تک گھر کے صحن میں اٹکا ہوا تھا اعظم کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور سے ہلکا سے دھواں اٹھ کر اس کی بھیگی پلکوں کو مزید سلگا رہا تھا۔ اور گھر کی چھت پر لگا پاکستان کا جھنڈا صبح کی تیز ہوا سے پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔

جانِ نشین (افسانہ)

اسپین کے شہر بارسلونا کی وہ سہ پہر بھی حسبِ معمول روشن اور چمکیلی تھی۔ آسمان پر چند آوارہ بادل دھوپ کی شہزادی کا راستہ کاٹنے کی کوشش میں مگن تھے۔ مگر شہزادیاں ایسے خانہ بدوش آوارہ گردوں کی باتوں میں بھلا کب آتی ہیں؟ بھینسے کی لڑائی والا اکھاڑا تماشائیوں سے کچھا کچھ بھر چکا تھا۔ اب اس دس ہزار نشستوں کی گنجائش والے ایرینا (Arena) میں تل دھرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ گول اکھاڑے کے درمیانے راستے جہاں نمکین گرم مونگ پھلیاں اور بھنے ہوئے دانے بیچنے والے لڑکے آوازے لگاتے تھے۔ وہاں بھی تماشائیوں کا قبضہ تھا اور ٹھنڈی بوتلیں اور آئس کریم کے تھرماس والے باکر ہجوم میں گھرے کھڑے وہیں دور سے اپنا مال بیچ رہے تھے۔ آج وہاں ان کے ہردل عزیز لڑاکا (Bull Fighter) انتونیو کا اس اکھاڑے کے سب سے خطرناک بھینسے کلر (Killer) کے ساتھ آخری مقابلہ تھا۔ اس مقابلے کے بعد انتونیو ہمیشہ کے لیے بل فائٹنگ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرنے والا تھا۔ انتونیو نے اس اکھاڑے میں لڑی جانے والی ہر جنگ جیتی تھی مگر اس لڑاکا بیل کلر نے بھی کبھی کسی مقابل کو اپنے سینگوں سے زخمی کیے بنا واپس گھر نہیں جانے دیا تھا۔ لیکن اتفاق سے اپنے وقت کے یہ دونوں بہترین لڑاکا کبھی ایک دوسرے کے آمنے سامنے نہیں آئے تھے۔ سنا تھا کہ اکھاڑے کی انتظامیہ کلر کو بھی اس مقابلے کے بعد مزید لڑانے سے دست بردار کروا رہی تھی کیونکہ کلر بھی اپنے لڑنے کی طبعی مدت پوری کر چکا تھا اور انتظامیہ اس شاندار لڑاکا جانباز کو ذلت کی موت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا طے یہ پایا تھا کہ اگر آج کے مقابلے کے بعد کلر انتونیو کی تلوار سے بچ گیا تو اسے پورے اعزاز کے ساتھ ریٹائرڈ جانوروں کے فارم ہاؤس بھجوا دیا جائے گا۔ شاید اسی وجہ سے پورا بارسلونا شہر یہ آخری

مقابلہ دیکھنے کے لیے اس ''بندارس'' نامی بل فائٹنگ کے اکھاڑے میں جمع ہو چکا تھا۔ ایک جانب انتونیو اپنے لباس کا آخری جائزہ لے رہا تھا اور اپنی تلوار کی دھار کو چھو کر اس کی کاٹ جانچ رہا تھا تو دوسری جانب کلر بند اندھیرے کمرے میں سر جھکائے کھڑا اپنے کھروں سے اکھاڑے کی ریتلی زمین کو کھرچ رہا تھا۔ شاید اس وقت ان دونوں لڑاکوں کے ذہن میں کچھ ایک جیسے ہی خیالات جنم لے رہے تھے۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اب وہ بوڑھے ہونے کو ہیں اور شاید یہ ان دونوں کی زندگی کا آخری کھیل ہو۔ بل فائیٹنگ میں بڑھاپا عمر سے بہت پہلے آجاتا ہے اور کبھی کبھی تو تیس پینتیس سال کی عمر میں ہی فائٹرز کو یہ کھیل خیر آباد کہنا پڑتا ہے کیونکہ بھینسے کی لڑائی دونوں جانب سے بیدار اعصاب اور تیز حسیات کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اور کسی بھی ایک مقابل کی ذرا سی لمحاتی چوک دونوں میں سے کسی ایک کی زندگی کا خاتمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ ان دونوں مدمقابل آنے والوں کے اعصاب کی بھی آخری لڑائی تھی اور شاید دونوں نے اپنے یہ اعصاب اس آخری جنگ کے لیے ہی بچا رکھے تھے۔ انتونیو نے اپنی سیاہ مخملی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لمبے مخصوص سیاہ جوتوں کے تسموں کو آخری گرہ لگائی۔ باہر اکھاڑے میں تماشائیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ کلر بھینسے نے چونک کر گردن اٹھائی اور لکڑی کے تختوں کی درز سے باہر جھانکنے کی کوشش کی وہ اب تک کئی بل فائٹرز کو اپنے مضبوط، نوکیلے اور جاندار سینگوں پر اچھال کر عمر بھر کے لیے معذور کر چکا تھا۔ اور اس کا سارا جسم فائیٹرز کی تیز دھار تلواروں کے زخموں کے نشان سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے کچھ زخم ایسے بھی تھے جنہیں بھرنے میں مہینوں لگے تھے مگر کلر ہر زخم کے بعد ایک نئے جوش ولولے اور غصے کے ساتھ دوبارہ اکھاڑے میں اُترا تھا۔ اُسے سرخ چادر لہراتا وہ سیاہ پوش ہمیشہ ایک ہدف کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ایک ایسا قاتل ہدف جو اپنے ہاتھوں میں اسکی سرخ موت کو جھٹکے دے کر لہرا رہا ہو۔ اور اب تک کلر اتنا جان چکا تھا کہ تصور اس مچلتے لہراتے سرخ لہو رنگ کپڑے کا نہیں بلکہ اُس کے پیچھے کھڑے اس دشمن کا ہے جو موقع پاتے ہی اپنی تیز دھار نوکیلی تلوار اس کی دو آنکھوں کے درمیان موجود نرم جلد میں گھونپ کر ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کرنے کی تاک میں ہوتا ہے۔ لہذا کلر کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ پہلے جھٹکے میں ہی سرخ کپڑے کے پیچھے چھپے اس قاتل کا جسم اپنے سینگوں سے ادھیڑ کر رکھ دے۔ ڈریسنگ روم میں تیار ہوتے انتونیو نے سرخ چادر لہرا کر دیکھی۔ اس سرخ مخمل کی آڑ میں ہی آج اُسے اپنا سوواں شکار کرنا تھا۔ آج سے پہلے وہ ننانوے مدمقابلوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا مگر اس کے گھائل جسم پر پڑے زخموں کی تعداد ننانوے سے کہیں زیادہ تھی۔ آج وہ اپنی سینکڑہ مکمل کر کے اس کھیل میں امر ہو جانا چاہتا تھا۔ تماشائیوں میں بیٹھی اس کی بیوی ... یا نے بے چینی سے اپنے سیاہ جالی دار نقاب کے پیچھے سے اپنے ہاتھ میں پکڑی سرخ گلاب کی کلی کو دیکھا۔ انتونیو اس کا شوہر ہی نہیں اُس کا محبوب بھی تھا۔ آج سے دس برس قبل اس نے انتونیو کو ایسے ہی ایک

اکھاڑے میں دیکھ کر پہلی مرتبہ اس کی جانب گلاب کی سرخ کلی اُچھالی تھی۔ تب وہ بھی شعلہ جوان تھی اور سیاہ لباس اور سیاہ سکارف میں ہلکے جالی دار نقاب کے ساتھ جب وہ اسپین کے کسی بازار سے گزرتی تو دل جلے گھنٹوں اپنا سینہ تھامے وہیں بیٹھے رہ جاتے تھے۔ یہ لباس وہ خاص اسی دن پہنا کرتی تھی جب اسے کوئی بل فائٹنگ کا مقابلہ دیکھنے کے لیے جانا ہوتا تھا۔ اور انتونیو نے بھی شادی سے قبل پہلی مرتبہ ماریا کو اسی لباس میں تماشائیوں کی بھیڑ میں بیٹھے دیکھ کر اپنا دل اس کے قدموں میں ہار دیا تھا۔ اب ان کا ایک نو سالہ بیٹا رومیرو بھی اس زندگی کے سفر میں دونوں کا ساتھی تھا لیکن ماریا کبھی اُسے اپنے باپ کا مقابلہ دکھانے کے لیے اکھاڑے میں اپنے ساتھ نہیں لاتی تھی۔ جو کھیل اُسے اس کے محبوب اور شوہر سے ملانے کا باعث بنا تھا اور جس کی وہ اتنی دیوانی تھی کہ ہزاروں کی رقم خرچ کر کے بھی وہ ہر حال میں مقابلہ دیکھنے آتی تھی اب وہی کھیل اُس کی وحشت کا باعث تھا۔ جب بھی کوئی بھینسا انتونیو کے جسم پر اپنے نوکیلے اور خونخوار سینگوں سے کوئی خون آلودہ خراش ڈالتا تو ماریا کا دل اُچھل کر حلق میں آجاتا تھا۔ آج اس کا محبوب اپنی زندگی کا آخری کھیل کھیلنے کے لیے اس اکھاڑے میں اترنے والا تھا۔ جہاں ایک طرف یہ ماریا کے لیے اطمینان کی بات تھی وہیں اُس کلر نامی بھینسے کی خون خواری اور بربریت کے قصے بھی اُسے پریشان کر رہے تھے کیونکہ اس کے انتونیو کی طرح کلر بھی آج تک کوئی مقابلہ نہیں ہارا تھا۔

وہاں بند تاریک کمرے میں کھڑے کلر نے زور سے اپنے نتھنوں کو سکیڑ کر ایک پھنکارنما سانس لی۔ اُسے مزید وحشی کرنے کے لیے گزشتہ تین دنوں سے بہت کم خوراک کھلائی جارہی تھی تاکہ اس پر بھرے پیٹ کی سستی طاری نہ ہو سکے۔ کلر جانتا تھا کہ آج ایک بار پھر جب وہ اپنے مقابل کا جسم ادھیڑ کر واپس اپنی آرام گاہ میں آئے گا تو حسب معمول اسے پیٹ بھر کھانا اور خوب سیر ہو کر پینے کو پانی اور شراب بھی ملے گی لہٰذا وہ اس مقابلے کا جلد از جلد آغاز چاہتا تھا کیونکہ اختتام پھر اس کے اپنے ہاتھوں ہی ہونا تھا۔ کلر نے بے چینی سے اپنے سینگ لکڑی کے مضبوط تختوں والی دیوار کے ساتھ رگڑے..... اندھیرے میں چند چنگاریاں اُچھل کر بجھ گئیں۔

انتونیو سر پر مخصوص پروالا ترچھا ہیٹ سجا کر اکھاڑے میں داخل ہوا تو چاروں جانب تیز سیٹیوں اور نعروں کا شور مچ گیا۔ اس نے ہیٹ اتار کر اور سر کو جھکا کر چاروں طرف کے تماشائیوں کو سلام پیش کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی نظر تیسری قطار میں بیٹھی ماریا پر پڑی جو اُسی کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ماریا آج بھی رومیرو کو اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ انتونیو رومیرو کو اپنا جان نشین بنانا چاہتا تھا مگر ماریا اس بات پر راضی نہیں تھی۔ انتونیو کو لگتا تھا کہ یہ فن اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان سے ختم ہو جائے گا حالانکہ اس کے آباؤ اجداد بھی بل فائٹر رہ چکے تھے لیکن یہ سلسلہ آج اختتام پذیر ہونے کو تھا۔ انتونیو نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مناسب وقت آنے پر اس بارے میں ماریا سے بات ضرور کرے گا۔ وہاں دوسری جانب اکھاڑے کی انتظامیہ بھی اس بات

سے پریشان تھی کہ بندارس (Bendras) نامی اکھاڑے کو لاکھوں کما کے دینے والا بھینسا کلر بنا کسی جان نشین کے آج اکھاڑہ چھوڑ جائے گا۔ کلر جیسا لوہے کا جسم رکھنے والا بل عشروں بعد جا کر پیدا ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے کلر کے بعد اس کا کوئی جان نشین بندارس کے اکھاڑے کے پاس نہیں تھا۔

انتونیو نے تماشائیوں سے اجازت طلب کر کے سامنے تختوں والے کمرے کے دو رکھوالوں کو کمرے کے دروازے پر لگی لوہے کی رکاوٹ کو ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ کلر نے یک دم روشنی ہو جانے پر چونک کر غصے میں سر اٹھایا۔ اسکے ٹھیک عین سامنے پانچ سو گز کی دوری پر اس کا حریف ہاتھ میں سرخ کپڑا لیے کھڑا تھا۔ کلر نے پھنکار کر اپنے کھروں سے زمین کو کھرچا اور اپنا جسم حملے کے لیے تولا۔ دوسری جانب کھڑے انتونیو نے دروازہ کھلنے کے بعد کلر کو غصے سے اپنی جانب گھورتے دیکھا تو اس نے اپنی سرخ چادر کو زور سے حرکت دی۔ یہ گویا دشمن کو حملے کی دعوت تھی۔ بھینسے نے ایک زقند بھری اور وہ کھلے میدان میں آ گیا۔ تماشائیوں کے شور نے آسمان سر پر اٹھا لیا لیکن کلر کی تمام توجہ اپنے ہدف پر تھی۔ اس نے غصے میں کھڑے کھڑے ایک چکر کاٹا اور پھر بے تحاشہ اپنے حریف کی طرف دوڑا۔ انتونیو کا جسم تن گیا اور اس نے جسم سے کچھ سینٹی میٹرز کے فاصلے پر چادر پکڑ کر دشمن کو حملے کا اشارہ دیا۔ ماریا نے پریشانی میں اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ بھینسا انتونیو کے جسم کو مس کرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ اگر انتونیو ہوشیار نہ ہوتا تو ضرور اس کے قدم اکھڑ جاتے کلر اپنے زور میں بہت آگے بڑھ چکا تھا اسنے خود کو روکا اور تیزی سے پلٹا تب تک انتونیو بھی پلٹ کر دوبارہ حملے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ بل فائٹنگ کے کھیل کے اصول کے مطابق انتونیو کو پہلے بھینسے کو ستا کر اور بھگا کر تھکن سے ادھ موا کرنا تھا اور پھر اس کے بعد تماشائیوں کی اجازت سے بھینسے کے سر میں اپنی تلوار گاڑ دینی تھی۔ لیکن آج اس کا حریف تھکنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ہر حملہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید اور جان لیوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسا وہ جانور انسانی دماغ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اب تک وہ ہر طرح سے انتونیو کو اپنے سینگوں سے چھلنی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انتونیو کے جسم پر کئی خراشیں ڈال چکا تھا۔ لیکن انتونیو اب بھی پورے اطمینان سے اپنے دشمن کا ہر حملہ ناکام بنا رہا تھا اسکے ہاتھوں میں پکڑی سرخ چادر دھیرے دھیرے چیتھڑوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ انتظامیہ کی اجازت کے بغیر یہ کھیل ختم نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ بھینسے کے سر میں تلوار گھونپنے سے قبل اُسے تماشائیوں کو جی بھر کر سنسنی اور تفریح کا لطف لینے دینا تھا۔ تماشائی بھی رفتہ رفتہ جنونی ہوتے جا رہے تھے۔ اب انتونیو نے ایک ہاتھ میں پکڑی تلوار کے ساتھ کلر کے جسم پر ہلکی پھلکی خراشیں ڈالنا بھی شروع کر دی تھیں اور ہر بار خون کی دھار اچھلنے پر تماشائیوں کے اندر کا جانور خوشی سے چیخیں مارتا اور بھینسا مزید غضب ناک ہوا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بار انتونیو کو جھکائی دینے میں ذرا سی تاخیر ہوگئی اور کلر کے تیز دھار سینگ نے اس کے پہلو میں مرچیں سی بھر دیں۔ انتونیو

نے اپنی سیاہ جیکٹ کو چھوا تو وہ خون میں تر بتر تھی۔ کلر نے پلٹ کر انتونیو پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے اس سے کہہ رہا ہو..... ''کہو..... مزہ آیا دشمن.....'' ماریا کے ہاتھ سے کلی گر گئی اور وہ زور سے چلائی ''یہ دیوانگی ہے..... اب اس وحشی کو ختم کر دو انتونیو'' تماشائی بھی چیخنے لگے..... ''ہاں ہاں..... ختم کر دو..... اب اس کے ماتھے میں آنکھوں کے عین درمیان اپنی تیز تلوار گھونپ دو..... قتل کر دو اسے.....'' انتونیو اور کلر دونوں کا جسم رفتہ رفتہ تھکن اور زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ اب آخری لمحات ہیں اور اس مرحلے پر ذرا سی چوک ان دونوں کو موت کی وادی میں دھکیل سکتی ہے۔ لہٰذا اب دونوں ہی محتاط ہو چکے تھے کلر نے بھی اندھا دھند پلٹ کر بھاگنے کے بجائے اب رک کر اور زمین کو اپنے مضبوط قدموں سے کھرچ کر تاک کر نشانہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ انتونیو کی تلوار کئی بار اس کے بھیجے میں پیوست ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ ان دونوں کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ کلر نے آخری بار اطمینان سے تمام اکھاڑے کا گھوم کر ایک لمبا چکر لگایا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی انتونیو کو زچ کرنا اور تھکانا چاہتا ہے۔ انتونیو اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کلر کے ساتھ گھومتا رہا۔ سورج ڈھلنے والا تھا اور اسے ہر حال میں شام ہونے سے قبل یہ مقابلہ ختم کرنا تھا ورنہ اندھیرے میں تیز مصنوعی روشنیوں کے باوجود وہ اپنے جسم کو مناسب حد تک جھکاؤ دینے میں ناکام رہ سکتا تھا کیونکہ اگر اندھیرے میں اسے بھینسے کے آخری وقت میں لی جانے والی جھکائی نظر نہ آتی تو اگلے لمحے وہ کلر کے سینگوں میں پرویا جا چکا ہوتا۔ کلر نے انتونیو کے سامنے کچھ فاصلے پر رک کر اپنے جسم کو تولا۔ انتونیو نے بھی اپنی تلوار سیدھی کر لی۔ اکھاڑے کا خوفناک شور اب دھیمی سرگوشیوں میں بدل چکا تھا۔ شاید وہ سب بھی آنے والے لمحات کو محسوس کر چکے تھے۔ ماریا زور سے چلائی۔ ''سنبھل کر انتونیو..... یاد رکھنا..... میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں.....'' انتونیو نے ماریا کی جانب دیکھ کر ایک ہوائی بوسہ فضا میں اچھال دیا۔ بھینسے نے اپنے نتھنوں کی ہوا سے زمین کی دھول اڑائی اور زور سے زمین پر قدم مار کر وہ تیزی سے انتونیو کی جانب دوڑا۔ انتونیو نے اس لمحے اپنے حریف کی آنکھوں میں جنون کی ایک ایسی لہر دیکھی جیسے کلر اس سے کہہ رہا ہو کہ تم بہادر دشمن ہو..... اور میں تمہیں موت بھی ایک بہادر دشمن والی ہی دوں گا۔ انتونیو نے ایک ہاتھ سے تلوار اچھال کر چابک دستی سے فوراً دوبارہ دستے کی جانب سے اسے اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے ایک بھالے کی طرح پکڑ لیا۔ کلر نے اچانک ہی بھاگتے بھاگتے برق رفتاری سے اپنے جسم کا جھکاؤ دائیں سے بائیں جانب کر لیا۔ یہ ایک وحشی جانور کی انسان کے ساتھ جنگ کا آخری وار تھا اور وہ دونوں ہی اپنا ہر آخری پینترا آزمانے کو تیار تھے۔ انتونیو کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دائیں ہاتھ سے تلوار کو بائیں ہاتھ میں منتقل کر سکے۔ انتونیو کا واسطہ آج تک جتنے بھی حریفوں سے پڑا تھا کلر ذہانت میں اُن سب پر بھاری تھا۔ انتونیو نے بھی اُس گولی کی رفتار سے اپنی جانب بڑھتے عفریت کو نظروں نظروں

میں سراہا ''واقعی..... تم ایک اعلیٰ دشمن ہو کلر..... تمہاری موت بھی بہت اعلیٰ ہونی چاہیے..... بالکل تمہارے شایانِ شان.....'' ماریا نے انتونیو کو یوں اطمینان سے کھڑے دیکھا تو وہ ہذیانی انداز میں چیخی ''سنبھل کر فائٹر.....'' لیکن انتونیو جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے اب اس کے پاس دو ہی راستے تھے کہ وہ پیچھے پلٹ کر بھاگے اور اکھاڑے کی دیوار میں بنی ہوئی درزوں میں پیر جماتے ہوئے اوپر چڑھ کر اپنی جان بچا لے یا پھر وہیں کھڑے رہ کر اس ترچھے طوفانی رفتار سے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دشمن کو جھکائی دے کر اپنی تلوار سے اس کا خاتمہ کرنے کی ایک آخری کوشش کرے حالانکہ اس میں کامیابی کے امکانات اب بہت کم تھے کیونکہ کلر کا زاویہ ناقابلِ شکست تھا اور بنا اس سے ٹکرائے اسے تلوار گھونپنا ناممکن تھا۔ مگر اتنی طاقت سے ٹکرا جانے کے بعد فائٹر کا اپنا سنبھلنا ہی محال ہوتا ہے۔ پھر ایسے میں تلوار کو سنبھالے رکھنا اور پورا تول کر وار کرنا تو دور کی بات ہے۔ کلر اور انتونیو کا فاصلہ لمحوں میں ختم ہوتا جا رہا تھا تماشائی بے چینی سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اکھاڑے کا منیجر چلایا ''یہ حماقت نہ کرو انتونیو..... پلٹ جاؤ.....'' مگر انتونیو اپنی جگہ پر جما کھڑا اپنے دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ کلر نے اپنے جسم کی ساری طاقت اپنے قاتل سینگوں میں سموئی اور عین انتونیو کے دل کا نشانہ لیا۔ انتونیو نے آخری لمحے میں اپنے جسم کو ایک سو اسی درجے پر انتہائی جھکائی دے کر بھینسے کے جسم سے دور رکھنے کی کوشش کی اور تاک کر اپنی تلوار کلر کی دو آنکھوں کے درمیان گاڑ دی۔ اس کے ہاتھوں کا سرخ کپڑا تو پہلے ہی ہوا میں اُڑ چکا تھا لہٰذا اس کا جسم بھی کلر سے پوشیدہ نہیں تھا۔ کلر نے تکلیف سے ایک زوردار چیخ ماری اور اس کا ٹنوں وزنی جسم انتونیو سے پوری قوت سے ٹکرایا۔ انتونیو اپنی جگہ سے اچھلا اور دوسرے ہی لمحے کلر نے اُسے اپنے سینگوں میں پرو کر دو چکر دیئے اور اچھال کر دور پھینک دیا۔ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ دونوں اکھاڑے کی کچی زمین پر خون میں لت پت پڑے تھے اور دونوں کی آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں کلر کے نتھنوں سے خون نکل کر مٹی کو رنگین کر رہا تھا اور انتونیو کی سانس بھی اکھاڑے کی دھول اڑا رہی تھی۔ ماریہ تڑپ کر انتونیو کی جانب دوڑی۔ انتونیو اور کلر کی آنکھیں اب بھی ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں۔ انتونیو کی نظر نے کہا الوداع..... عظیم دشمن..... تم آج خوب لڑے..... کلر نے اپنی آخری سانس سینے سے نکالی..... الوداع فائٹر..... تم واقعی ایک بہادر حریف تھے..... اور میں نے بھی کوشش کی کہ تمہیں تمہارے اعزاز کے مطابق موت دوں..... الوداع انتونیو..... دونوں کی آنکھیں ایک ہی وقت میں دھیرے دھیرے لرزتی پلکوں تلے ڈوبتی گئیں۔ دور اکھاڑے کی اونچی دیواروں کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا اور یہاں اکھاڑے میں ان دو عظیم لڑاکوں کی زندگیاں غروب ہو رہی تھیں۔ ان دونوں میں کتنی مماثلت تھی۔ وہ دونوں عمر بھر ایک شاندار زندگی جیئے۔ سر اُٹھا کر ہر دشمن کا مقابلہ کیا۔ اپنے جسموں پر لاتعداد زخموں کے تمغوں کے نشان سجائے۔ مگر کبھی ہار نہیں مانی۔ ہر جنگ کا ایک اعلیٰ اختتام کیا اور آج جب دونوں اس

اکھاڑ ے سمیت اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو ان دونوں کا کوئی جان نشین پیچھے ان کی سلطنت اور ان کے اعزازت کا دفاع کرنے کے لیے باقی اور موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی دونوں کے لاوراث یکتا شہنشاہ تھے کیونکہ عظمت کا کوئی جان نشین نہیں ہوتا۔

محبتوں کے پگھلتے گلیشیئر (نظم)

پھر سے رت بدل رہی ہے
پھر سے درد کا ایک پرانا موسم
ان رگوں سے چھوٹ رہا ہے
ساکت جھیلوں پر جمی برف
پھر یوں پگھل رہی ہے جیسے
کوئی چنچل کرن دھیرے سے چھو کر
انہیں ''پانی'' کہہ گئی ہو
جیسے ہم دونوں کے بچپن کا
وہ ''برف پانی'' کا کھیل.....
وہ بھاگتے بھاگتے اک دوجے کو چھو کر
''برف'' کہہ کر منجمد کر دینا

اور اچانک ''پانی'' کہہ کر
پھر سے رواں کر دینا
یونہی جانے کتنے موسم
قطرہ قطرہ بہتے رہے
اور وقت کی برف پگھلتی گئی
جب ایک دن چپکے سے
میری محبت کا گھائل راج ہنس
تمہاری آنکھوں کی ساکت جھیل پر
اپنے پر پھیلائے آ بیٹھا.....
اور تم نے اپنی آنکھیں موند ھ کر
اُس کا ہر زخم مندمل کر ڈالا تھا.....
لیکن سب ایک سا ہمیشہ
کب.....اور کہاں رہتا ہے
وقت کی تپش ایک نہ اک دن.....
ہر محبت کی ''برف'' کو
''پانی'' کر ہی دیتی ہے
محبت کے گھائل راج ہنس کو
زخم بھرنے کے بعد اُس جھیل سے
اپنی اُڑان بھر جانی ہوتی ہے

سو ہماری محبت کا راج ہنس بھی
اک انجانے دیس کی جانب اُڑ گیا.....
تب سے ہر جاتی رُت یونہی
میری نسوں میں زہر بھر جاتی ہے
اور میری بصارتوں کا ہر رنگ
پھیکا پڑنے لگتا ہے
پر دل تو سدا ہی نادان ٹھہرے.....
سو میرا دل بھی کبھی جان نہیں پایا
کہ محبتوں کے پگھلتے گلیشیئر
پھر کسی کے چھو کر کہنے سے
کبھی ''برف'' نہیں ہو پاتے

اور

محبتوں کے راج ہنس کبھی
واپس لوٹ کر نہیں آتے.....

(ہاشم ندیم خان)

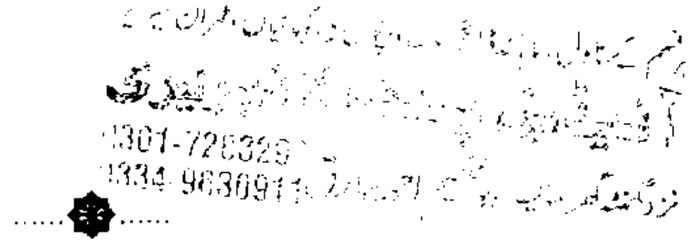

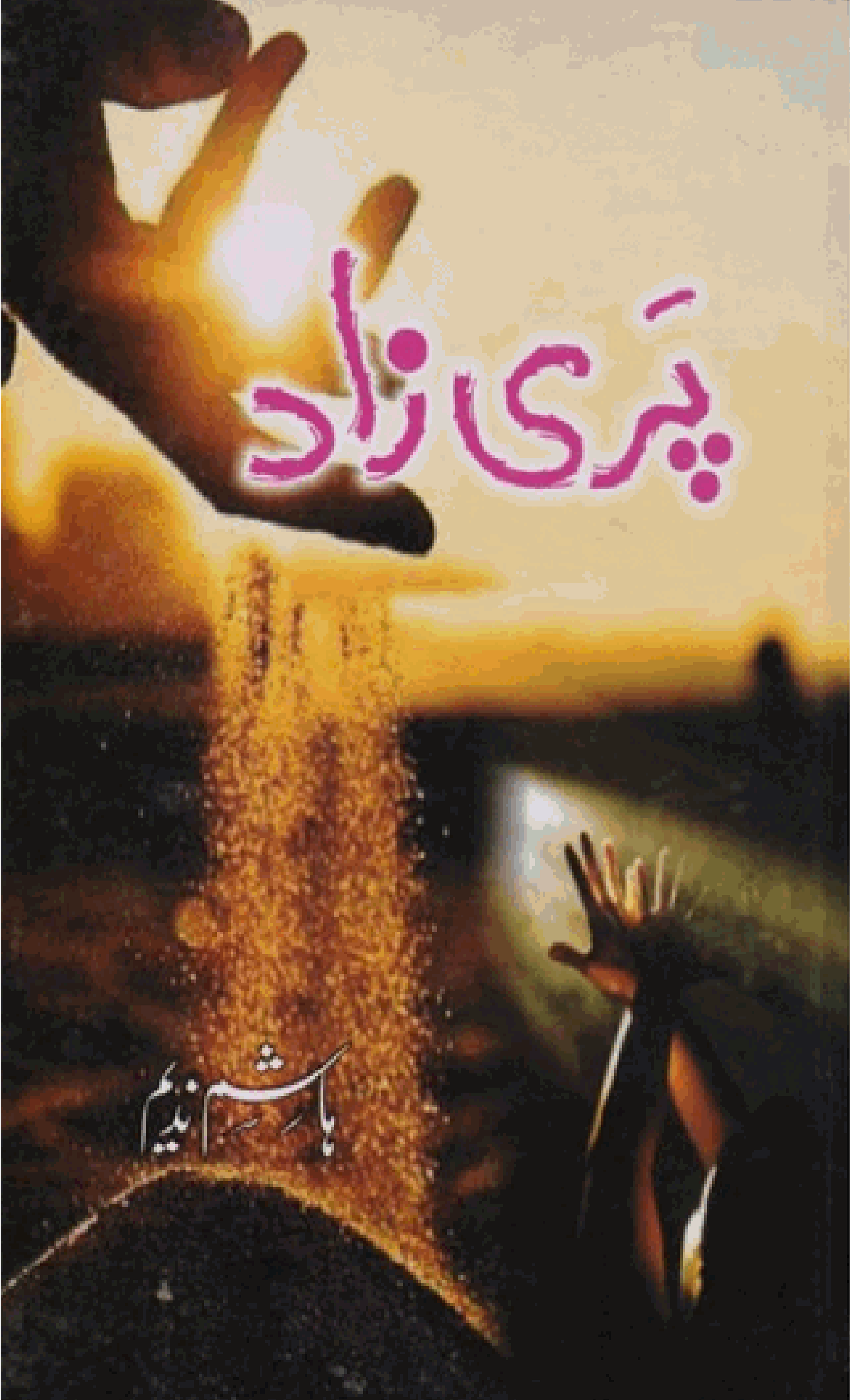
پَری زاد
ہاشم ندیم

باب 1

ایک سرائیکی کہاوت ہے کہ میرے محبوب ایسے یکبارگی جدائی بہت تکلیف دہ ہوگی۔ تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ..... اس بار کا موسم گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جتن کر رہا تھا۔ تیز گرم تپتی دھوپ میں کولتار کی لمبی سنسان سڑک کسی سیاہ گلیشئر سے پگھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جوتوں کا تلوا نیچے سے کئی جگہ کھل چکا تھا لہذا ابلتا ہوا کولتار میرے پیروں میں انگارے بھر رہا تھا۔

اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پل صراط مجھے ہر روز ہی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دبے لفظوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شمار کی حد سے نکلتے جا رہے تھے مگر نو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا تو میری عرضی کا چھٹا نمبر نکلتا تھا اور ابا کی تنخواہ بس اتنی تھی کہ وہ صرف اماں کی ہی سن سکتے تھے پھر بھی ہر پندرہ دن کے بعد گھر کے راشن کی کمی کا رونا شروع ہو جایا کرتا تھا۔ راستے میں گزرتے ہوئے مجھے حسب معمول چند لمحوں کے لیے باٹا جوتوں کی بڑی دوکان کے چھپر تلے ستانے کا موقع ملا میں نے ہمیشہ کی طرح مسرت بھرے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوکان کی شیشے کی دیوار سے پرے ہاتھوں کا کٹھورا بنا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر دوکان کا نوکر ایک میم صاب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کروا رہا تھا۔ کتنی پیاری تھی وہ گوری سی میم..... دودھ سی دھلی ہوئی..... آبشار کی جلترنگ کی مانند نکھری نکھری سی..... مگر میرے خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا کیونکہ شاید پہلے دوکان کے مالک اور پھر نوکر نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ نوکر تیزی سے دوکان سے باہر آیا اور مجھے حقارت بھرے لہجے میں جھڑکنے لگا۔

''اوئے لڑکے کتنی بار تجھ سے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر..... سارا شیشہ گندا کر دیا..... چل بھاگ یہاں سے..... ورنہ مار کھائے گا آج مجھ سے.....''

میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بستہ سنبھالتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت، یہ حقارت اور یہ رویہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بچپن سے ہوش سنبھالتے ہی مجھے ہر طرف سے ایسے ہی تحقیر

آمیز رویوں کا سامنا تھا۔ اور پھر لوگوں سے کیسا گلہ، شکوہ کیوں کر.....؟ میری صورت، میرا حلیہ ایسے ہی رویے، ایسی ہی حقارت اور نفرت کا متقاضی تھا۔

میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ ابا ایک شربت کی پیکنگ والی پرائیویٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گتے کے ڈبوں میں بند کر کے شام کو جب وہ گھر آتے تو ان کے غصے کا جن کھل چکا ہوتا..... اور ہم سب کہیں دبک کر باقی وقت گزارا کرتے تھے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اوپر سے نو بچوں کی فوج..... کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا تھا کہ یہ جو غریب ماں باپ ہوتے ہیں۔ یہ اپنی غربت کو بانٹنے کے لئے اپنا آنگن بچوں سے بھر لیتے ہیں..... یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی جب میرا جنم ہوا۔ دائی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسب معمول خوراک کی کمی کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجہ میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ میرے باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندمی، رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ پر نہ جانے قدرت نے یہ ساری سیاہی میرے مقدر کی دوات میں کیوں انڈیلی تھی؟ چھوٹی خالہ کی اماں سے ہمیشہ ہی کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی۔ لہٰذا انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا پھر سے طنز کے تیر چلانے کا، جھٹ سے بولیں" آئے ہائے باجی..... یہ اتنا کالا کلوٹا سا بچہ کس پر چلا گیا..... لگتا ہے جیسے اماوس کی رات آنگن میں اتر آئی ہو۔" آس پاس کھڑی سبھی عورتیں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، تلملا ہی تو گئیں اور جھٹ سے بولیں۔

"جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد..... اور بھئی مجھے تو تمہاری اس بھینگی بیٹی سے زیادہ ہی پیارا لگتا ہے....."

اب جلنے کی باری خالہ کی تھی، تڑپ کر بولیں۔" ہاں ہاں..... بڑا کوہ قاف کا شہزادہ جنا ہے تم نے....."

اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ پلٹ کر ترکی بہ ترکی حساب برابر کیا۔" ہاں..... میرے لیے تو کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے..... اور میں نے اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔" پری زاد"..... ہاں..... یہی نام ہوگا میرے بچے کا....."

"پری زاد" سبھی عورتیں زیر لب بڑبڑائیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتیں، اور معنی خیز مسکراہٹ لیے یہ کہتے باہر نکل گئیں۔

"پری پیکر سنا تھا..... یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا؟"

پس وہی دن تھا جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تمسخر، طنز اور حقارت لکھ

دی گئی تھی۔ کاش اس روز اماں چھوٹی خالہ کے طنز کے جواب میں خاموش رہتیں تو شاید میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی گھٹاؤں جیسی رنگت، لاغر جسم اور غیر دل کش نین نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو اگلا سننے والا قہقہہ مارنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچوں کو فرداً فرداً کھڑے کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔

میری باری آئی تو میں نے کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ ''پری زاد'' استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور حلیے کو دیکھتا رہا اور پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنس پڑا۔

''واہ شہزادے..... نام تو بڑا کمال رکھا ہے ماں باپ نے.....''

استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور سے ہنس پڑے۔ تب مجھے سمجھ نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اڑاتا ہے۔ مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے اس بات کا احساس ہوتا گیا کہ مسئلہ میرے نام کا نہیں..... میری صورت کا ہے۔ دھیرے دھیرے اسکول میں میرا نام بذات خود ایک مذاق بنتا چلا گیا اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازاروں میں جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچنبھے کا شکار ہو جاتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی یہ حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اس وقت ایک ناسمجھ بچہ اور معصوم تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس دوغلی دنیا میں انسان کا من چاہے جتنا بھی میلا ہو، اس کا تن ضرور اجلا ہونا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو اس کے چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے..... روح کے اجلے پن اور خوبصورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں.....؟

میری بدنصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ قدرت کے مذاق میرے ساتھ سنگین تر تب ہونے لگے جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر سے ہی میرے من میں چھپی خوبصورتی کی چاہ کو آس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اسی کی گود میں جا بیٹھتا جو اس محفل میں سب سے اجلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوبصورتی کی یہ چاہ صرف خوبصورت چہروں تک ہی محدود نہیں تھی۔ مجھے قدرت کی بنائی ہر خوبصورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا۔ پھر وہ چاہے پھول ہوں، رنگ ہوں، آسمان یا بادل، کوئی دھن ہو، بارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، مجھے یاد ہے، میں اسکول کے راستے میں پڑنے والی تصویروں کی دوکان کے باہر گھنٹوں کھڑا خوبصورت نظاروں والی تصاویر دور سے ہی دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ مگر مجھ جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر پلتی یہ حسن پرستی میرے لیے ایک دوہرا عذاب بنتی گئی۔ دنیا کی ہر خوبصورت چیز پر شاید صرف حسین لوگوں کا ہی حق ہوتا ہے۔ بدصورت لوگوں کے لیے معاشرے میں ہر طرف صرف بدصورتی ہی پنپتی ہے۔ سو میرے آس پاس بھی ہر لمحہ وہی بدصورتی ہی بھٹکتی رہتی تھی۔ چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اٹی گلیاں، دھول اڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر میرے لیے لوگوں

کی کرخت اور بدصورت سوچ اور نظر.....اس پر ایک طرفہ ستم یہ بھی ہوا کہ پانچویں جماعت میں جس دن اسکول میں چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آنی تھی۔ اس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول نہیں جا پایا۔ ان دنوں ملک میں چیچک بری طرح پھیل رہی تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ دانے ابھرتے دیکھ کر اماں نے چلا کر ابا سے کہا کہ ''پری زاد کے باوا..... یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو..... یہ کیسے دانے ہیں؟.....ابا بھاگم بھاگ مجھے لیے سرکاری ہسپتال ٹیکہ لگوانے پہنچ تو گئے مگر تب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور چند ہفتوں بعد ہی جب میرے چہرے سے زخموں کا کھرنڈ اترا تو ساری عمر کے لیے میرے چہرے پر چیچک کے بدنما داغوں کی نشانی چھوڑ چکا تھا مگر میرے دل پر ان داغوں سے کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم ان لوگوں کی باتوں نے لگائے جو بظاہر میری تیمارداری اور اماں سے ہمدردی جتانے کے لیے آتے تھے مگر ہنسی اور مذاق کی تہہ میں چھپے طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے تھے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل چھلنی ہو جاتا تھا۔ کون کہتا ہے کہ انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایجاد کر کے تباہی پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں کر سکتی ہے۔ اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ بھلا یہ نئے دور کے ہتھیار کیا کر پائیں گے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ایٹم بم بنانے والے سائنس دان کو شائد زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں تھا،..... ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے ماں باپ کا اس معاملے میں اتنا قصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں یکے بعد دیگرے اوپر نیچے نو(9) بچے پیدا ہو جائیں تو پھر ان بچوں میں کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بدقسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ بدصورت اگر حساس بھی ہو تو اسے سونے پر سہاگہ ہی کہا جائے گا۔ کاش انسان اس دنیا میں غریب ہی پیدا ہوتا۔ یا صرف نازک دل.....مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچے اس ملک کی انہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے ہوئے، رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے۔ مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خارزار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے چھپتا اتنا ہی ان کی نظر میں آتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک حسن پرست پری زاد جسے ہر خوبصورت چہرہ اپنی جانب لبھاتا تھا۔ کسی مہ جبیں کی ایک جھلک میرے دل میں اتھل پتھل مچا دیتی تھی۔ دھڑکن اتنی تیز ہو جاتی کہ لگتا تھا ابھی دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا.....مگر میں اس آفت روگ سے اس وقت تک نا آشنا رہا جب تک میں نے لڑکپن میں قدم نہیں رکھا تھا۔ بچپن تو یوں ہی مٹی کے صحن میں مٹی ہوتے گزرتا گیا۔

مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سبھی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔ کیونکہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا، شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن ہماری اپنی توقع ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں الجھا

دینے والی امیدیں گرم تپتی ریت پر چلنے پر مجبور کرنے والی تو قعات..... میں آٹھویں جماعت میں تھا جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی۔ گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے ہوئے باہر برآمدے اور صحن میں آ گئے۔ چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہٰذا دھیرے دھیرے ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیانہ ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔

بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکا دیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے صحن میں اور میں جو صحن میں سوتا تھا میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی بہن چونکہ چھوٹے ہیں، لہٰذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر ٹین اور مٹی کا بنا یہ چھوٹا سا کمرہ گھر کے کاٹھ کباڑ کو جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شئے کو فالتو کچرہ یا زائد سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ کر رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ گودام کی تمام ''قیمتی اشیاء'' ایک طرف سلیقے سے لگا کر اپنی پرانی چارپائی اس گودام میں ڈال دوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔

اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے ٹین کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں تو مجھے اس تنہائی میں سکون کا احساس ہونے لگا۔ تنہائی میرے وجود میں سرائیت کرنے لگی اور میری اس تنہائی سے دوستی سی ہو گئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا جسے کسی دوست یا ساتھی کا ساتھ میسر نہ ہو۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غنیمت تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ آہستہ آہستہ میری یہ تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بدصورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا۔ وہ میرے ساتھ مختلف دلچسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنا دیتی جو سارے ضلع میں اول پوزیشن لینے کے بعد کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ٹرافی وصول کر رہا ہے۔ کبھی میں اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا تو کبھی اپنی ٹیم کو آخری بال پہ چھکا لگا کر جتا دیتا۔ سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا اور میں سارے ضلع کے اسکولوں میں سے تقریری مقابلے میں اول آ کر اپنے ہم جماعتوں کے کندھوں پر سوار واپس اپنے اسکول پہنچ جاتا غرض میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب سچ کر دکھایا جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں میں ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا۔ جس نے غیر نصابی سرگرمیاں تو دور کبھی نصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی سوال پوچھ بھی لیتا تو میری ٹانگیں

کانپنے لگتی تھی۔ سانس پھول جاتی اور اگر کبھی خوش قسمتی سے مجھے اس سوال کا جواب آتا بھی ہو۔ تب بھی میرے منہ سے کچھ اور ہی نکلتا۔ اس لئے مجھ سے کسی بھی استاد نے کوئی توقع رکھنا ہی چھوڑ دی تھی۔ مجھ سے بڑے بھائیوں نے جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے کلرکی کی نوکری شروع کر دی تھی۔ اور اب وہ اپنی دنیا میں مگن تھے انہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا، میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہوگئی اور اس کے سسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ابا کو رخصتی کی ہامی بھرتے بنی۔ ہماری برسوں کی لگی بندھی زندگی کی روٹین میں ایک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی اور اماں نے آس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں بالیوں کو ڈھولکی کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی۔ ایسے موقعوں پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈربہ نما کمرے میں ہی قید رہتا تھا۔ حالانکہ میرا دل بہت چاہتا تھا کہ میں صحن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور وغل اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز اوپر کمرے تک آتی تو میں کئی بار چھت کی منڈیر تک آ کر واپس لوٹ جایا کرتا تھا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر جانا ہوتا تو میں چپ چاپ صحن کی پچھلی جانب سے نیچے اتر کر گھر کا کام پورا کر آتا۔ ان دنوں سر شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے ارد گرد منڈلانے لگے تھے۔ اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر ہمارے گھر کے کام یوں کرتے جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھید بہت دیر میں کھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ گلی یاترا کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔

''یار کیا ہوا.....؟ وہ آئی کہ نہیں.....؟ اس کا تو گھر سے نکلنا ہی عذاب ہو چلا ہے.....تو بتا..... تیری والی آئی کہ نہیں.....''

''ہاں..... آئی تو ہے..... پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل۔ اس پر سوچتا ہوں خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں.....''

میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سنتا رہتا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا تھا۔ میری نظر میں سب لوفر بہت عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے؟ عاشق تو لاکھ مل جائیں گے..... پر محبوب کے درجے پر شاذ و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے۔ آپ کی فکر کرتا ہے۔ آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان بکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کیونکہ مجھے محلے کی کسی لڑکی نے آج تک دیکھنا تو درکنار، مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں مجھ سے تو محلے کے خوبرو لڑکے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یا شاید میں ان کے لیے ''واقع'' ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکا تھا

کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ

''بھائی جاؤ جا کر اپنا کام کرو..... کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟.....''

ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اچٹتی نگاہ مجھ پر پڑ بھی جاتی تو وہ بے پروائی سے کہتا۔

''یار پری..... جلدی سے جا کر ایک ڈبیہ کیپٹن کی تو پکڑ لا.....''

یا دوسرا کہتا..... ''اچھا سن..... دو ماچسیں بھی لپک لیجیو..... کم بخت لائٹر تو ہفتہ بھر بھی نہیں چلا.....''

ہم سب عمر کے اس دور میں تھے جہاں گھر والوں سے چھپ کر سگریٹ پینا ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی ہی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں..... یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرر تھا۔ عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی ادنیٰ درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہو سکوں۔ ان دنوں محلے میں ناہید کا بڑا چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں اس پری چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھیڑ کی بنیادی وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیونکہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پر اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو صحن میں بیٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''ذرا سنیے.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس تھم گئی۔ مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

باب 2

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں رہا اور میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے میرے پیچھے یا صحن میں آس پاس کوئی اور موجود ہو۔ جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں میرے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا، دیگر لوگ اپنے اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ میری نظر ایک پل کے لیے اس کی جانب اُٹھی اور اس کی سیاہ گھنی پلکوں اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی پل زمین میں گڑھ گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یا رُعب، لحاظِ حُسن، یا رُعبِ حسن ہی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابلِ یقین اور اَن ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو تپتی دوپہروں میں گھنٹوں اسکول کے راستے میں جلتے کھڑے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلّے میں سے گذرتے ہوئے آنکھ اُٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھی تھی۔ مجال ہے جو آج تک کسی نے اسے ننگے سر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی مجھ سے براہِ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھر والے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ اگر میں کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب صفا چٹ کر چکے ہوتے تھے، اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ''ارے..... یہ تو یاد ہی نہیں رہا۔'' پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا جب اس نے میرا نام لے کر دوبارہ پوچھا۔

''آپ خالہ صغراں کے بیٹے ہیں ناں۔ پری زاد.....''

میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پری تو بس آپ ہیں میں تو صرف زاد ہی زاد ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب وغریب سی آواز نکلی۔ ''جی.....''

''آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہو لیں تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگا لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں.....''

وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا چکی تھی مگر میرے قدم تو جیسے وہیں صحن کی کچی زمین میں دھنس کر رہ گئے تھے۔ جانے کتنی دیر میں وہیں کھڑا ان چند گھڑیوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے

میں سوچتا رہا..... کیوں کہ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ وہ پل حقیقت بھی ہو سکتے ہیں جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ پھر نہ جانے کس نے مجھے آواز دی اور میرے خوابوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ کچھ لوگ آپ کا نام پکاریں تو نام بھی کتنا معتبر لگنے لگتا ہے۔ میں جیسے کسی طلسم کے زیر اثر باہر گلی میں نکلا تو حسبِ معمول لفنگوں کی ایک ٹولی گلی کے نکڑ پر جمع تھی، وہ سب اسی کی باتیں کر رہے تھے، ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خوبرو نوجوان، میرے ہم عمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلّے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے تو ماجد کی تیز بولنگ اور ہوا میں اڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم سبھی تماشائی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے تھے۔ میں چپ چاپ نکڑ پر کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر اپنی پسند کے حساب سے محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں کے ساتھ منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قرعہ اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ناہید کے نام نکلتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے وہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاناں جاری تھا۔

اکرم نے پوچھا۔ ''یار بتا تو سہی..... کچھ بات تو کی ہوگی اُس نے تجھ سے.....''

ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''کہاں یار..... اس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے..... جانے کب اپنے بھاگ کھلیں گے.....''

پھر اچانک ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا، ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''ابے پری زاد..... تو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے؟''

سب لڑکوں نے ماجد کی بات سن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ ہو کر بولا۔ ''میں نے..... نہیں تو.....''

ماجد سنجیدہ سی شکل بنا کر بولا۔ ''ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے..... عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے.....''

اکرم نے شرارت سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''صرف ایک بار..... ذرا پھر سوچ لے ماجد۔''

سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلّہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے میں بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج یہ بتا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی ہے بلکہ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔ مگر پھر میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ الٹا مزید مذاق بنے گا میرا۔ لہٰذا میں جیب جیاب

وہاں سے آگے گذر گیا۔ مگر میری زندگی کی وہ پہلی رات تھی جو مجھ سے گزارے نہیں گزری۔ پہلے تو میں اپنے کمرے کے اندر چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر تنگ آ کر میں نے اپنی چھلنگا سی چارپائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر کھلے آسمان تلے، تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس کے لیے اس ''ستارہ جبیں'' نے مجھے اپنے گھر آنے کا کہا ہے؟

کہتے ہیں دنیا میں یہ جادوگر اور بازی گر ہمیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازی گر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازی گر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چیچک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھامے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب کتنے خوبصورت ہوتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں ''خواب'' کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ سی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن کسی طرح گذارے اور رخصتی کے ٹھیک دوسرے دن میں نے جھجکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا جنہیں ہم سب مرزا چچا کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محلے میں مشہور تھا۔

''ہاں بھئی..... کیا بات ہے.....؟'' انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے بوکھلاہٹ میں سب بھول گیا، وہ دوبارہ گرجے۔

''اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی منہ میں سپیاں ڈالے کھڑے رہو گے.....؟''

میں گھگھیایا۔ ''جی..... وہ..... میں..... مجھے بلایا تھا خالہ نے.....''

انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ''اندر آ جاؤ.....''

میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آ گئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نویں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اُردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوبصورت حادثے پر میرا

ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدمے کا تعلق ہمیشہ غم سے ہی نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک مل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عمومی رویے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اس روز جب لگاتار تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گذرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا۔

''خیر تو ہے..... یہ کنگھی پٹی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے۔'' میں سٹ پٹا گیا۔ ''تمہارے دسویں کے امتحانات سر پر ہیں..... اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو۔ آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے.....''

میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ٹل گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی مجھ سے جیسے کوئی جنگ سی جاری تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوتی۔ شاید گذرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لمحوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف، ہمیشہ ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گذرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور التجا میں گڑگڑا رہے ہوتے ہیں، اسے پر لگ جاتے ہیں۔ تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں؟ بس اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش ٹٹول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک 4 بجے شام میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، شکر ہے اس وقت ماجد اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں مورچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوروں کی بیل کے نیچے بچھی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم پھول رہا تھا، دھڑکن بے قابو اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن سے ہی اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر تحقیر اور تمسخر دیکھا تھا کہ مجھے براہِ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔ لہٰذا جب ناہید اپنا سیاہ دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے آ کر بیٹھی تو تب بھی میری نظریں نیچے زمین میں ہی گڑھی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید جھکا لیں

اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔

''سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتے ہیں.....''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا جیسے کوئی غائب دماغ مقرر حاضرین سے کھچا کھچ بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر یک دم اپنے دماغ سے مٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتہ نہیں میں نے شعر کی تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کومل ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آ گئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گذر بھی گیا.....؟ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ.....؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا۔ مگر کبھی کبھی سرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے بھی ہوتے ہیں جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول میں ہی نشہ گھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو بن پیے، بنا کسی گناہ کے بوجھ تلے دبے اس سرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن بنا کسی نشے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خمار کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے، میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے سپنے پل بھر میں کرچی کرچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا تو ہم جیسے کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی.....؟ اس پل میرا جی چاہا کہ دنیا کے سارے خوبصورت اندھے ہو جائیں۔ جب بصارت صرف بدصورتوں کے پاس ہوگی تو کوئی کسی کو بدصورت یا بدنما نہیں کہے گا۔ یا پھر کاش اوپر والے نے دنیا میں صورت ایک سی ہی بنائی ہوتی۔ پھر تو شاید اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہر ہی مجھے ماجد نے دھر لیا۔ ''ہاں، شہزادے..... یہ کیا چکر ہے..... ہماری سجن کے گھر..... وہ بھی ہم سے چھپ چھپ کے.....؟''

میں نے ماجد کو ٹیوشن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''ہاں میاں..... یہی تو فائدے ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو۔ میری قسمت میں تو شاید ویسے بھی اُس ظالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں.....''

پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں..... یاد آیا..... یار ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام..... دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے۔ اور سنا ہے لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر پڑتا ہے.....''

کوئی اور وقت ہوتا تو میں شاید ماجد کو ٹال دیتا کیونکہ ہر ہفتے کسی نہ کسی کے قدموں میں پھینکنے

کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقعوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی مگر اس وقت چونکہ ٹیوشن کا وقت نکلا جا رہا تھا اس لیے میں نے بادلِ نخواستہ چند سطور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی اس نے خالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ''متاثر کن'' دستخط کر سکے۔ میں جیسے تیسے جان چھڑا کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور صحن میں بیٹھے اپنا حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ انہوں نے میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کون بتاتا کہ تصحیح ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جانیں؟ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ کیا کہ اسے شعر و شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سارے اچھے شعر بھی زبانی یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے 4 بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ پل پل کانٹوں پر کاٹ کر گذارا کرتا۔ مگر جیسے ہی ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے حسن کے نور کی پہلی کرن میری آنکھوں میں پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتی تھیں، مجھے ناہید کے گھر ٹیوشن پڑھانے کے لیے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان سات آٹھ دنوں میں مَیں نے شاید سات پل کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہِ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کا ہاتھ، اس کے کنگن، چوڑیوں کی کھن کھناہٹ..... اس کی آواز کا زیر و بم، اس کے بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریرلٹ جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اُسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی مخروطی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز..... بس یہی کچھ ان پلوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے چکر میں مَیں خود دل بھر اردو کے رٹّے لگاتا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوشن کے باب خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔ میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سینما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیانو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سنا رہا تھا۔ سفید سوٹ میں ملبوس وہ ہیرو پیانو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اُسی لمحے سے میرے اندر بھی پیانو سیکھنے اور بجانے کی خواہش ایک شدید کسک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیانو بجاتے دیکھا اور ناہید اُسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیانو کے پہلو سے جڑی میرے قریب کھڑی محویت سے میری دھن سن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاہی سے بالکل پاک صاف اور مُبرا تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سرایت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک ہمیں اداس اور بے چین رکھتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ

زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے۔ مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی انہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ بلکہ مرزا صاحب نے تو اب ہفتے میں صرف تین دن ٹیوشن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دہرائی کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوشن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید حسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوتی ہے جسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی یا شاید خوبصورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سموئے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں

ع تخلیئے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے

میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اُسی تخلیئے میں مقید رہتا تھا۔ اس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اُٹھا جیسے بہت سے لوگ کسی کا پیچھا کرتے چلاتے پیچھا کر رہے ہوں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں تو بھانت بھانت کی باتیں سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

''نہ میاں..... کوئی کسی کی چھت پر یونہی نہیں ٹاپتا..... ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا۔''

دوسرے بڑے میاں منمنائے۔ ''اس لڑکی نے تو مرزا صاحب کی عزت دو کوڑی کی کر دی۔''

کسی اور نے فتویٰ صادر کیا۔ ''ہاں بھئی..... یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بڑوں کی عزت اور غیرت کیا جانے.....''

پتہ چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے ان کے چھت پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر اپنے پیچھے افواہوں اور بدنامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا۔ کیونکہ اسی لمحے ناہید کو بھی چھت سے صحن میں اترتی سیڑھیوں سے نیچے آتا دیکھا گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور باکردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ابا جی اور پھر ان کے پیچھے دو بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی سن گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ

باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔

''یہ رہا..... یہاں گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھناؤنے کرتوت ہیں اس کلوے کے.....''

میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔''جی.....؟؟ مگر میں نے کیا کیا ہے.....؟''

''کیا کیا ہے تم نے.....؟ خوب..... ابھی بتاتا ہوں.....''

انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔''اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا..... تمہاری تحریر خوب پہچانتا ہوں میں لفنگے.....''

میں نے پہلی نظر میں ہی ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔''ہاں..... مگر یہ خط تو میں نے.....''

مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زناٹے دار چانٹا پڑ گیا۔

باب 3

سناٹے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونجی جیسے کسی بم کا دھماکہ ہو۔ مگر آواز کے اس دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجمعے کو بتانے لگے کہ گذشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کودا تھا، اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اس وقت ہوئی جب وہ چھت پر گیلے کپڑے ڈالنے کے لیے گئیں اور انہیں وہاں چھت پر ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑتڑا سا پڑا ہوا مل گیا۔ وہ سب گھر والے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے کیونکہ ناہید کا اردو کا رجسٹر میری تحریر سے بھرا پڑا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے، آس پاس گلی کے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں سے محلے کی عورتیں بھی جھانک جھانک کر ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین شق ہو اور میں اس کے اندر سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری چانٹے کے نشان اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے میرے گالوں سے مدھم پڑنے لگے۔ مگر میری روح پر لگے اس تھپڑ کے داغ عمر بھر مندمل نہ ہونے پائے۔ بھیڑ کے چھٹتے ہی ابا اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گھر کے اندر صحن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیل گوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر گھائل کا پورا جسم ہی سیاہ پڑ جائے تو ایسے نیل کو کیا کہا جائے؟ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں یہ بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا مگر میرا نہیں تھا۔ مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔

''اچھا..... تو یہ تھی تمہاری ٹیوشن.....''

''خوب عزت افزائی کرائی ہے آج ہماری''

''ڈوب مرو شرم سے''

''عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لیتی تھی۔''

جسم پر ہر چوٹ کے ساتھ میری روح پر بید کی طرح پڑنے والا ایک طعنہ بھی کسی تازیانے کی

طرح میرے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح لگاتار انڈیلا جاتا رہا۔

بہت دن تک تو میں شرم کے مارے اپنے چھت والے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا یہ سوچتا رہتا تھا کہ آخر ماجد کو دیا گیا وہ رقعہ ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ ضرور اس بدمعاش نے ناہید کو اکیلا جان کر اس کے گھر کودنے کا منصوبہ بنایا ہوگا، اور شور سے گھبرا کر وہ خط وہی پھینک کر فرار ہو گیا ہوگا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی.....؟ اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ٹاپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ پجاری کی پوجا کسی صلے کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی، پروانے کو شمع سے موم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے؟ اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ مگر اب ناہید سے ملنا تو درکنار، گھر والوں نے اس کے گھر کے دروازے کے سامنے سے گذرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ دسویں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بمشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دوکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ میں دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پٹرول پمپس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا تھا۔ ایسے ہی ایک دن میں شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر کسی ہوٹل والے سے ڈانٹ کھا کر نکلا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے، مگر میں نے آنکھیں مل کر غور سے دوبارہ دیکھا۔ ہاں..... وہ ناہید ہی تھی۔ جو کسی کے ساتھ شاید اسکول کی چھٹی کے بعد قریبی ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بریک میں گرما گرم سموسے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی، میرا دل زور سے دھڑکا۔ شاید آج ہی وہ موقعہ تھا جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہوں گی اور اگر کہیں ناہید نے برا منایا اور غصہ کیا تو پھر.....؟ ایک اور تماشہ نہ کھڑا ہو جائے کہیں اور اگر کہیں ناہید نے گھر جا کر اپنے والد کو اس بات کی شکایت کر دی تو.....؟ پھر تو میرے ابا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا۔ مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا؟ جانے پھر دوبارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آمنا سامنا بھی ہو پائے گا یا نہیں۔ مجھے ایک بار کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔ آخر ناہید نے خود بھی تو مہینہ بھر مجھ سے

پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا اتنے عرصے میں؟ میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اسے نہیں دیکھا۔

میں اپنے آپ سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر میں نے مزید کچھ سوچے بنا اس کیفے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اندر بہت رش تھا۔ کالج کی لڑکیاں لڑکے، عام لوگ کچھ مستقل قسم کے گاہک نما بوڑھے بھی کھڑکیوں کے پاس قبضہ جمائے بیٹھے ہوئے تھے اور حسب معمول ایسی ہی باتیں کر کے آہیں بھر رہے تھے کہ ان کا دور کیسا سنہرا زمانہ تھا۔ اب تو بس افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ہے۔ شاید انسان کی ازل سے ابد تک یہی ایک مجبوری اور کمزوری رہی ہے کہ وہ اپنے حال کو کبھی بھی دل سے برت نہیں پاتا، اپنے حال سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ اور وہی حال بیت کر جب اس کا ماضی بن جاتا ہے تو وہ اسے یاد کر کر کے آہیں بھرتے ہیں کہ ''آہ..... کیا زمانہ تھا.....'' کاش ہم اپنے حال میں بھی ماضی جیسی مٹھاس بھرنے کا کوئی جادو سیکھ پاتے۔ میں ماضی اور حال کی اس تکرار کے درمیان ہال میں کھڑا اِدھر اُدھر ناہید کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اور پھر وہ مجھے ایک کیبن کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، لہٰذا بات کرنے میں آسانی ہوگی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ بیرا کچھ دیر پہلے ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے ناہید کو سلام کیا۔ اس کی سہیلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی میری نظر سے اوجھل تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ جیسے اُڑ سا گیا۔ میں نے دلاسا دینے کے لیے قدم بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں مگر کیبن میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس ایک پل میں ہی کسی جھماکے سے بلب کی طرح فیوز ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے وہ رقعہ لکھوایا تھا اور جس کی وجہ سے سارے زمانے نے میرے نام اور وجود پر تھوتھو کی تھی۔ ماجد بھی پل بھر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کیفے سے نکل گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی میرے راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔

''معاف کر دے یار پری..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ بہت گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر تجھ سے بات کروں۔ ویسے شہزادے..... تو نے بھی بڑا مردوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔ احسان رہے گا یہ تیرا ہم دونوں پر.....''

میرا سر تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اس رات ماجد کودا تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپائے رکھی، مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رُسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشہ کیوں بننے دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے بمشکل ماجد سے سوال کیا۔

''تو کیا وہ خط تم نے ناہید کے لیے ہی لکھوایا تھا؟''

''ہاں یار..... اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اُس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کر دی تھی۔ میں نے بھی اس سے شرط لگالی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے اپنے لیے خط لکھوا کر اسے دوں گا۔''

میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ''مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے رہتے تھے کہ وہ تمہاری طرف دیکھتی تک نہیں..... کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی تمہیں.....''

ماجد نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''وہ سب بھی میں ناہید کے کہنے پر ہی بولتا تھا۔ تو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چلتا ہے ان کا ایسے معاملات میں۔ دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی میری طرف سے کسی کو شک میں مبتلا کر کے..... آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا..... پر تو نے آ کر سارا معاملہ بگاڑ دیا.....''

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کیفے کا ایک بیرا باہر آیا اور ماجد سے بولا۔ ''آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں..... ضروری بات کرنی ہے.....''

میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیفے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔

''امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی.....''

میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے تو سچ بتا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہ آ جائے، تب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا بھی شک ہو۔ آپ تو ابا جی کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا وہ رقعہ کب اور کیسے وہیں گھبراہٹ میں گر گیا۔''

ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جائیں تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گذر رہی تھی۔ ''دراصل میں بہت ڈر گئی

تھی، اس لیے جب ابا نے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا تو میں چپ رہی۔ کیونکہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہوسکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں۔ صرف ایک آپ ہی ایسے تھے جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہوسکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کرسکتی.....''

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ میرے اندر بیک وقت کئی شیشے چکنا چور ہوگئے اور میں ننگے پاؤں ان کرچیوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔ پتہ نہیں میں نے اس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کے کسے گئے آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاتعلق اور بیگانہ سا ان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں۔ ورنہ میری جو حالت اس وقت تھی، مجھے ضرور کسی ویرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن سے ہی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خودفریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے اپنی پیدائش سے لے کر اپنی موت تک انسان جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد کیسے ہوسکتا ہے۔ سارا محلّہ ماجد کے قصوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن سن ہوگیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخرکار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوبصورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یکسر غلط ثابت ہوگئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی تکرار مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ گورنمنٹ کے ایک کالج میں ہو چکا تھا مگر میرا دل کالج جانے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور میری صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بدصورتی کو کسی معمول کی طرح قبول کرلیا تھا مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہوگئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینٹین میں اور کالج کی راہداریوں میں مجھے پھر سے اُسی تجربے سے گذرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جملے اور حقارت بھری مثالیں..... میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھلنی سے بار بار چھلنا ہوگا۔ انہی دنوں میری ملاقات فورتھ ایئر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب وغریب تخلص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہداری سے گذر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا

نام پکارا۔

''ابے او ناساز..... تیری پھر سے تین سپلیاں آئی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لنگر کی روٹیاں توڑے گا۔ ناساز کے باقی دوست بھی ہنس پڑے۔ ناساز نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ایک بھرپور کش لے کر دھواں فضاء میں اڑا دیا۔

ع ''وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے.....''

پتہ چلا کہ گذشتہ تین چار سال سے ناساز چوتھے سال میں ہی اٹکا ہوا ہے۔ نا اُسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ، کیونکہ وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرافیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناساز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔

''بات سنو لڑکے.....''

میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔

''سگریٹ پیتے ہو.....؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔

''پھر کیا خاک جیتے ہو.....''

میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کینٹین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک ڈبیا اور ماچس لے کر دوبارہ ناساز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ سلگا کر دو چار بھرپور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ نکوٹین کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے۔ میں پلٹ کر جانے لگا، ناساز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر روکا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پیسے تھے تمہارے پاس؟''

''ہاں..... کرائے کے پیسے تھے جو آج تمہارے کام آ گئے.....''

وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''مجھے ناساز کہتے ہیں۔ میں اپنا تخلص ناشاد رکھنا چاہتا تھا مگر پتہ چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکہ ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے.....؟''

میں نے اٹکتے ہوئے اپنا نام بتایا: ''پری زاد.....''

ناساز نے زور سے ''واہ'' کہا۔ ''نام تو بڑا شاعرانہ رکھا ہے پیارے.....''

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لہجے اور نظر میں اپنا نام سن کر طنز اور تمسخر کی جھلک نہیں دکھائی

دی۔ یہ میری اور ناساز کی دوستی کی ابتداء تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑاتی نہیں تھی۔ نہ ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آتے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ناساز سگریٹ کو نہیں..... سگریٹ دھیرے دھیرے ناساز کو پی رہا ہو، نگل رہا ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا مگر اپنی باتوں سے وہ کوئی بوڑھی روح دکھائی دیتا تھا۔ چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتیٰ الامکان گریز کرتا تھا مگر وہ فائنل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں لگی ہوئی تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھا رہا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرما دیا مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پس پا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہِ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے۔

ناساز دھیرے سے مسکرایا۔ ''تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوئم نمبر سے نہیں ناپی جاتی۔''

پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد.....؟''

پل بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ''مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی.....؟''

''کیوں..... تم سے محبت کیوں نہیں کی جا سکتی.....؟''

میں چپ رہا۔ ناساز نے نصیحت کی۔ ''شعر یاد رکھا کرو۔ صنفِ نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا.....''

پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''منیر نیازی کو پڑھا کرو..... اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کر لو.....

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں
ضروری بات کہنی ہو
کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو
اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

کسی کو موت سے پہلے
کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ
اس کو جا کر بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں''

میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اُسی وقت اس کا رٹا بھی لگا لیا۔

''بس..... اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرانی ہے۔ میں تمہیں چند اور اثر انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کرا دوں گا۔ کیا سمجھے؟ میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعر و شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماجد کو بھی بہت سے شعر یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال میں شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔ اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کرا دیں۔ اور پھر جس دن میں نے بزمِ ادب کے پیریڈ میں کھڑے ہو کر

''محبت اب نہیں ہوگی
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی
گذر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہوگی''

سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں۔ میں نے سارے بڑے شاعروں کو تقریباً حفظ کر لیا اور مجھے کالج کی بزمِ ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا ہی سہی۔ مگر ایک چھوٹا موٹا شاعر پلنے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکنے لگا۔ ناساز کسی منجھے ہوئے استاد کی طرح میری ''شاعرانہ تربیت'' کر رہا تھا۔ وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔

''یہ کیا غالب اور میر کے رٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو۔ اور ہاں..... کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہو ناں..... میں پل دو پل کا شاعر ہوں..... پل دو پل میری کہانی ہے'' والا..... اور ہاں..... کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے ''میں اور میری تنہائی..... اکثر یہ باتیں کرتے ہیں..... تم ہوتیں تو کیسا ہوتا..... تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں.....''

میں دبے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کرا رہا ہے۔ اس ''ایک'' کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کباڑیئے کی دوکان کے مٹیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پیانو پڑا تھا۔ کباڑیئے نے میری دلچسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔

''خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے..... صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔''

میں نے اپنی جیب دیکھی، دو سو اسی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کباڑیئے سے کہا۔ ''ایک دن ضرور خریدوں گا.....'' ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

باب 4

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور امی کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔

''اے بہن آنا ضرور..... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضگیاں پالنے کی شوقین نہیں ہیں۔''

ان کے جانے کے بعد برا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہوگئی ہے۔ اپنی بیٹی کی منگنی کا پیغام دینے آئی تھیں۔ یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے محلے کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ تو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاد..... میں اماں کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتا ہوا اوپر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر میرا دل بجھ سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔

''کیا بات ہے پیارے؟ آج کچھ بجھے سے دکھائی دے رہے ہو؟'' میں نے قریب پڑا کنکر اٹھا کر دور تالاب کی طرف پھینکا۔

''تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جگمگاتے دیکھا ہے۔'' وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا ''جل تو رہے ہو۔ اور بڑی شدت سے جل رہے ہو۔ مگر یہ جلن جگمگانے والی نہیں ہے۔ اندر ہی اندر راکھ کر دینے والی ہے۔ بتاؤ گے نہیں کب سے سلگ رہے ہو؟'' میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتا دی۔

ناساز نے سن کر ایک سرد سی آہ بھری۔ ''منزلیں اپنی جگہ..... راستے اپنی جگہ..... جب قدم ہی ساتھ نہ دیں..... تو مسافر کیا کرے؟؟؟'' پھر کسی بڑے بزرگ کی طرح بیٹھ کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ''مجھ سے ایک وعدہ کرو..... آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے، یہ جیون بنا اس من کی نار کے صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگن سلگتی رہنی چاہیے۔ عام انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کروا جاتی ہے۔ یہ تڑپ ہے..... یہ جلن..... عام طور پر آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عمر سیلن سے بھری نم زندگی گزار دیتا ہے۔ مگر اسے جلن کے لیے ماچس کی رگڑ میسر نہیں آتی، اس لڑکی سے ناکام محبت نے تمہیں وہی رگڑ فراہم کر دی ہے۔ اب جل گئے ہو، تو خود کو بجھنے

مت دینا.....''

اس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب مقدر میں آخر کار فنا ہونا ہی لکھا ہوتا ہے تو پھر یہ بجھ بجھ کر اور سلگ سلگ کر جینا کیسا؟ تیز بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہو جانے میں ہی مزہ ہے۔ میں بھی اس روز کے بعد کچھ ایسا جلا کر میرے اندر سب کچھ بھسم ہو گیا۔ بس میں اور میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کچھ باقی رہ گیا تھا۔ میری زندگی میں۔ اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سند دے ہی دی اور وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔

''اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا۔''

میں بھیگی پلکوں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹتے ہوئے دیکھتا رہا اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ کالج کے فائنل ایئر سے قبل ہی پہلے ابا پھر اماں یکے بعد دیگرے چل بسے اور مجھے پہلی بار یتیمی کا احساس اس وقت ہوا جب بھائی بھائیوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کا حکم صادر کر دیا۔ ان سب کی خواہش یہ تھی کہ میں یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں کلرکی یا چپڑاسی کی سرکاری نوکری پکڑوں تا کہ میرا بوجھ ان کے کاندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر ہی لیا کہ..... کسی سرکاری نوکری کے ملتے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کر دوں گا۔ تب تک میں شام سے رات تک تین چار ٹیوشنز پڑھا کر گھر کا خرچہ بانٹ سکتا ہوں۔ میں اب وہ پہلے والا ناکام اور نالائق طالب علم نہیں رہا تھا۔ ناساز کی لگائی ہوئی آگ کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکا تھا۔ کالج میں بھی فائنل میں میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادبی پروگراموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا۔ لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی سے باز نہیں رہ پاتے تھے۔ ہاں اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر..... جسے کوئی نہیں چھپا سکتا تھا۔ البتہ اب لوگوں کے رویے میں اتنی منافقت ضرور آ گئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ پر ہی ہنس دیتے تھے۔ مگر اب بڑے ہونے کے بعد وہ قہقہہ میرے پلٹ جانے کے بعد ان کے حلق سے برآمد ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے دو ہفتوں میں بھی اردو ڈپارٹمنٹ کی راہداریوں میں یہ قہقہہ گونجتا رہا۔ جس کا میں اب عادی ہو چکا تھا۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں جب مجھے لیکچر ہال کے ڈائس پر بلایا گیا تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔

''ارے.....؟ یہ تو پری زاد..... آئے ہائے..... سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ شاعری تو غضب کی کرتا ہے مگر شخصیت..... توبہ توبہ.....''

''نہیں نہیں..... یہ پری زاد نہیں ہو سکتا..... یہ تو کسی فیکٹری کا فورمین لگتا ہے۔'' میں یہ ساری

سرگوشیاں اور فقرے سنتے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ہوا ڈائس پر آ گیا۔ کلاس پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف دو مصرعوں پر اکتفا کیا۔

قصّے مری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے
آ دیکھ ترے نام سے موسوم ہیں سارے
شاید یہ ظرف ہے جو خاموش ہوں اب تک
ورنہ تو ترے عیب بھی معلوم ہیں سارے
سب جرم مری ذات سے منسوب ہیں محسن
کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں سارے.....؟

میں اپنی بات ختم کر کے ڈائس سے اتر آیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے میری بدصورتی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پر میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو میرا من کرتا کہ کوئی تیز دار خنجر لے کر اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنا یہ روگی دل نکال کر اس کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دوں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا سینے میں جڑنے نہ پائے۔ مگر پھر میرا سدا کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا ہے کہ آخر اس کی خطا ہی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی پیار بھری اک نظر سے دیکھ لے۔ صرف ایک نظر، محبت سے بھری، خلوص سے پر..... صرف اک نظر جو صرف میرے لیے ہو۔ میرے دل میں ہوس یا بازاری پن کا کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس پاک تھا۔ بس ایک لمحہ ہی مجھے ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ بس ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے..... کیا یہ خواہش، یہ تمنا، یہ آس اسی قدر گراں، مشکل یا ناممکن اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے پر ساری زندگی خود کو ہی ملامت کرتا رہوں.....؟ خود کو مار ڈالوں.....؟ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر خوبصورتوں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے؟ کیا مجھ جیسوں کے لیے قدرت کے کشکول میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں تھی؟ میرے بس میں ہوتا تو میں اس دنیا کے تمام خوبرو مردوں کو کسی دور سات سمندر پار جزیرے میں قید کر دیتا۔ یا کاش ہمارے ہاں دیگر فیشنوں کی طرح خوبصورت ماسک چہرے پر چڑھا کر باہر نکلنے کا رواج ہوتا تو میں اپنے لیے اس دنیا کا سب سے پیارا اور خوبصورت ماسک بنوا لیتا اور پھر کبھی اسے اپنے چہرے سے نہ اتارتا..... اس روز بھی میں یونیورسٹی کی ایک سنسان راہداری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سروپا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ''مسٹر پری زاد..... میں نے رک کر دیکھا۔ انگریزی ڈپارٹمنٹ کا ایک ہینڈسم لڑکا حسام اپنے دو تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اسی گروپ میں ایک شعلہ جوالہ قسم کی لڑکی جینز اور کھلی شرٹ میں ملبوس ان کے ساتھ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ اردو ڈپارٹمنٹ کے پری زاد ہیں ناں؟ میرا نام حسام ہے۔ یہ باسط اور یہ ہماری

دوست لبنیٰ ہے۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔''

''جی فرمایئے.....''

حسام کے بجائے لبنیٰ بولی۔ ''دراصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم شیکسپیئر کا پلے اسٹیج پر پرفارم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمیں اجازت اسی صورت میں ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شو اردو زبان میں ترجمے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کردیں گے.....؟''

میں نے ان تینوں کے متجسس چہروں پر نظر ڈالی۔ ''کوشش کروں گا کہ ترجمہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے؟''

وہ تینوں خوش ہوگئے اور باسط جلدی سے بولا۔ ''اوتھیلو OTHELO''

''ٹھیک ہے۔ آپ لوگ مجھے تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کرکے آپ لوگوں کو اطلاع دے دوں گا۔''

ان تینوں نے خوش ہوکر نعرہ لگایا۔ ''گریٹ''

اور جاتے وقت تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ لبنیٰ سے ہاتھ ملاتے وقت بڑی مشکل سے میں نے اپنے ہاتھ کی لرزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حسام گروپ کی تلاش میں نکلا تو پتہ چلا کہ وہ سارا گروپ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہیں۔ میں چپ چاپ ہال میں داخل ہوکر آخری نشستوں پر بیٹھ کر ان کی ریہرسل دیکھنے لگا۔ ہال میں ملگجھجی سی نامکمل روشنی یا ادھورا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز روشنی رکھی گئی تھی۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے۔ مگر ان سب میں لبنیٰ کی اداکاری کی چھاپ ہی الگ تھی۔ وہ بہت ڈوب کر اپنے مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گروپ اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد خوب جم کر داد دے رہا تھا۔ خاص طور پر حسام کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے جوش اور خوشی کا اظہار کیسے کرے۔ لبنیٰ ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیروئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ اس نے جب آخری سانس لے کر سر ڈھلکایا تو میں بے اختیار اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر تالیاں بجانے پر مجبور ہوگیا۔ ان سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور سب زور سے چلائے۔

''ارے..... یہ تم ہو پری زاد..... آؤ..... اسٹیج پر آجاؤ.....''

حسام نے باقی انجان لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے انہیں یہ بتایا کہ میں ڈرامے کا اردو میں ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لبنیٰ کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

''نہیں..... ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں نہیں ڈھال پا رہی ہوں۔ ہاں مگر جب ہیروئن کی موت ہو تو اس وقت اس کے اوپر کچھ شعر، یا کوئی غمزدہ نظم اوور لیپ Over-Lap ہونی

چاہیے..... تب ہم پورے ہال کو رونے پر ضرور مجبور کر دیں گے۔''

انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلبہ ہو جو اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں دنیا کا کوئی آٹھواں عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیوم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں اور بریسلٹ اور ایک جانب بے پرواہی سے پھینکے گئے مہنگے، بیگز اور جین جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی پتلون سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل امارت کی اپنی ایک خاص چکا چوند ہوتی ہے جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور غربت..... سات پردوں میں بھی چھپی ہو تو اس کی شناخت چھپائے نہیں چھپتی۔ لبنیٰ کی کچھ انگریزی میڈیم ٹائپ سہیلیوں نے اسے کہنی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لبنیٰ نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے رویے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں جانتا تھا کہ ان الٹرا ماڈرن لڑکیوں نے میرے بارے میں لبنیٰ سے کیا سرگوشی کی ہوگی۔ میں نے لبنیٰ کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کرلیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل سے ہی اردو ڈرامے کی ریہرسل شروع کر سکتے ہیں۔ حسام نے مجھے بھی ریہرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تلفظ کی جانچ بھی کر سکوں۔ زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی تو باقی رہ جاتا ہے۔ ورنہ کچھ بچتا ہے تو صرف کمتری کا وہ احساس جو ہمیں ساری عمر قدم قدم پر اپنے کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہونے کا ادراک دیتا رہتا ہے۔

رات کو جب میں کھلی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے لبنیٰ کی بات یاد آئی کہ اگر لڑکی کی موت پر کوئی نظم پس منظر میں اس آخری سین کو بھرے تو تاثر دوبالا ہو سکتا ہے۔ ''اوتھیلو'' کے اختتام میں ہیرو کسی رقیب کی لگائی ہوئی شک کی آگ میں جھلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیروئن کو گلا دبا کر مار دیتا ہے۔ پل بھر کی نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو نگل جاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت ایک لمحہ بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں؟ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یکساں رہتا ہے؟ مگر جب کسی انسان کو دوسرے انسان سے نفرت ہو جاتی ہے تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، جگہوں، یادوں اور دوسرے سے جڑے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار کرنے والے ایک ساتھ چلے جاتے، وہ راستہ کیوں ممنوعہ بن جاتا ہے۔ وہ ایک بنچ جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ گرم چائے والا جس کے ایک کپ میں ان دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، صفحوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیوم کی خالی شیشی، اس کی دی ہوئی بچی وہ آدھی لپ اسٹک، ایک کھویا ہوا کف لنک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پتے جس پر کبھی

ساتھ چُرمراہٹ کی آواز سنی تھی وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی وہ کھٹارا سی بس..... درخت کے نیچے کھڑا وہ لیموں پانی والا..... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں ڈھلتی اس کڑواہٹ سے کیا تعلق.....؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں؟ انسان کتنا ظالم ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں رہتا۔

ڈرامے والے دن ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ساری یونیورسٹی اوتھیلو کو اردو میں جملے بولتے دیکھنے کے لیے جمع تھی۔ ہیروئن کی آخری سانس نکلنے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں:

سنو..... تمہاری وفا پر..... گرچہ پورا یقین ہے
مگر..... بدلتی رتوں کے وار کا..... کچھ بھروسہ نہیں
سو گر کبھی ایسا ہو
کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....
اور میری روح کی کومل پنکھڑیاں
تمہیں کسی ببول کے مانند چبھنے لگیں
تو بیتے دنوں کو یاد نہ کرنا
کہ یادوں کا زہر..... زخم کو بھرنے نہیں دیتا.....
ہاں مگر دیکھو.....
کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا
جو ہم نے گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں
کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں
اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے
ان باتوں کا کیا لینا دینا ہو..؟

ڈرامے کے منظر میں اوتھیلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن ڈیس ڈی مونا (DESDEMONA) سو رہی ہے۔ اوتھیلو اپنی محبوبہ کو جگاتا ہے اور سرد لہجے میں ڈیس ڈی مونا سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اوتھیلو کی محبوبہ کی آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں اور وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج رات جینے دے۔ اور چاہے تو صبح مار ڈالے..... مگر اوتھیلو کی آنکھوں پر شک کے کالے ناگ کس کر پٹی باندھ چکے ہیں وہ ہیروئن سے کہتا ہے کہ ''اب بہت دیر ہو چکی.....

پس منظر میں میری نظم کے بول اوور لیپ ہو رہے ہیں۔

اور سنو میرے محبوب.....
کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا

جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے
کہ رنگ تو روح کو اجالتے ہیں
اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے
ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟

ڈیس ڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب اوتھیلو کو بھیگی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوتھیلو کے بھاری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شہ رگ کو دبانا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس گھٹنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور بستر کی چادر نیچے گرتی ہے۔

اے میری وفا کے مالک
کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا
جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے
کہ نظارے تو قدرت کا حسن ہوتے ہیں
اور کسی حرماں نصیب کی بدصورت یادوں سے
ان نظاروں کا کیا لینا دینا.....؟

اوتھیلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم تیزی سے بند ہو رہا ہے اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اوتھیلو کی آنکھیں وحشت سے باہر کو ابل رہی ہیں اور وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیس ڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اوتھیلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں، لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔

میرے ہم نفس.....میری جان
بس مجھ سے
اور صرف مجھ سے نفرت کرنا
کہ میری روح کی سیاہی سے ہی
یہ چار سو اندھیرا ہے
میری بدصورتی سے ہی
ہر رنگ پھیکا ہے
ہر منظر ویران ہے
ہر بات بے ربط اور جھوٹی ہے
ہر بے وفائی.....میرے نام ہے

سو بس مجھ سے ہی نفرت کرنا
کہ صرف میں.....
اور فقط میں ہی.....
تمہاری اس نفرت کے قابل ہوں.....

اوتھیلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری ہچکی لیتی ہے اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کی بے جان کھلی آنکھیں اپنے پیارے اوتھیلو کو ہی دیکھ رہی ہیں، لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل اوتھیلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے، اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈرامہ ختم ہونے کے بعد چند لمحے تو سارے ہال میں سناٹا سا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج سے وہ شور مچا کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ لبنیٰ راتوں رات سارے شہر کی یونیورسٹیز میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کامیابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر میں ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور مجھے مجبوراً اس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا پورا محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ جس کے درمیان پریوں کے گھر جیسی ایک شاندار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سوئمنگ پول تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اہتمام بھی تھا اور جدید اصطلاح میں کہے جانے والی ڈی۔ جیز لڑکے لڑکیوں کی فرمائش پر دھنیں بدل بدل کر بجا رہے تھے۔

لبنیٰ کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑھی میں ملبوس، سونے اور ہیرے سے لدی پھندی اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''خوب.....تو یہ ہے پری زاد.....؟ انٹرسٹنگ Interesting''

میرا جی چاہا لبنیٰ کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلائی جاتی ہے۔ پھر مجھے خود اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بہکی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

''اخاہ.....تو یہ ہیں مسٹر پری زاد.....؟ جن کی شاعری ڈرامے میں ڈب کی گئی تھی۔ بھئی واہ لبنیٰ.....کیا اداکاری کی تھی تم نے.....''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پکی عمر کا موٹا سا شخص آہستہ آہستہ ڈگمگاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لبنیٰ نے تعارف کروایا کہ یہ سیٹھ عابد ہیں۔ ان کے خاندانی دوست۔ وہ شخص لبنیٰ سے کافی حد تک بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لبنیٰ کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر پلٹا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔

''اور جناب..... کیا مصروفیات ہیں آج کل..... دراصل میں خود بھی چھوٹا موٹا شاعر ہوں..... اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے..... مگر کیا کروں..... یہ کاروبار اور دھندا ہی جان نہیں چھوڑتا.....''

سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں مجھے سنائیں جنہیں سن کر میں نے شکر کیا کہ اس کی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی دھن میں مگن بولے جا رہا تھا۔

''لبنیٰ تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنوار کر اسے بھی ایسا بنا دو کہ وہ لبنیٰ کے معیار پر پوری اتر جائے۔''

میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کی کتاب کے لیے اسے دے دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''اور اس کام کے لیے میں تمہیں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لبنیٰ بتا رہی تھی کہ تم ٹیوشنز پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرتے ہو.....'' میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔

''معاف کیجئے گا عابد صاحب..... زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔.....''

عابد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''غلط..... آج کل سب بکاؤ مال ہے۔ اور جس محل میں آج تم کھڑے ہو۔ ان امراء کے لیے یہ شاعری، یہ خوبصورت لفظ ان کی ایک شام بہلانے کے کام آ سکتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ نہ ان کے پاس وقت ہوتا ہے نہ فرصت کہ وہ روزانہ تمہیں بلا کر تمہارے فن سے محظوظ ہو سکیں۔ میں تو پھر بھی تمہارے الفاظ تمہاری سوچ اور تمہارے خیالات کی بہت اچھی قیمت لگا رہا ہوں۔ وقت ملے تو ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے ردی کے بھاؤ بکتے دیکھے ہیں.....''

میں لبنیٰ سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑیا دوکاندار کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ سبھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لبنیٰ تو ان جیسی نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام..... دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بھٹکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اگلے دن لبنیٰ نے مجھے یونیورسٹی میں چپ اور اداس دیکھا تو اسے لگا کہ میں گزشتہ شام اس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی مگر میں نے اسے تسلی دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں۔ مگر لبنیٰ کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں اداسی اتر آئی۔ مجبوراً اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دھرانی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھر ایسی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ البتہ بس ایک کمی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا پیانو نہیں پڑا ہوا تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی سچوایشن میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سن کر لبنیٰ زور سے ہنس پڑی۔ یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی

ہو۔ مگر میں لبنیٰ سے چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں کہہ پایا کہ فلموں میں پیانو پر گانے والا ہیرو ہوتا ہے جو مردانہ وجاہت اور خوبصورتی سے مالا مال ہوتا ہے جبکہ میں اگر پیانو پر گانے کے لیے بیٹھ بھی جاتا تو میری وجہ سے سارا منظر دھندلا ہو جاتا۔ جب چہرہ ہی دھول سے اٹا ہو تو آئینہ کیا کرے؟ اور پھر چند دن بعد لبنیٰ نے اچانک یونیورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا مگر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے لبنیٰ کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سنگ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس لبنیٰ کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھٹکا مجھے لبنیٰ کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو دیکھ لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولی۔

''لبنیٰ سے ملنے آئے ہو.....''

میں نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔ ''جی''.....

لبنیٰ کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''محبت کرتے ہو میری بیٹی سے.....؟''

مجھے لگا جیسے کسی نے میری قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لبنیٰ کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم سے پار ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

باب 5

لبنیٰ کی ماں کی بات سن کر چند لمحے کے لیے میں گنگ ہی رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتی ہوئی بولیں۔ ''جواب دو..... کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟..... تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لبنیٰ سے محبت کرتے ہو..... اس کی شدید محبت میں مبتلا ہو.....''

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید انہی کو میری حالت پر ترس آ گیا۔ ''اندر چلے جاؤ..... وہ ڈرائنگ روم میں آ چکی ہوگی.....''

میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لبنیٰ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب اداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ مسکرائی۔

''آؤ پری زاد..... کیسے ہو.....؟''

میں نے چھوٹتے ہی سوال پوچھا۔ ''آپ اتنے دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں..... سب ٹھیک تو ہے ناں.....''

لبنیٰ نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ''ہاں..... میں نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے۔ مما نے میری شادی طے کر دی ہے.....''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''شادی.....؟ یوں اچانک.....؟ مگر کس کے ساتھ.....؟''

''سیٹھ عابد کے ساتھ..... میری شادی عابد کے ساتھ ہو رہی ہے.....'' یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔

''سیٹھ عابد کے ساتھ..... مگر..... آپ اور وہ.....؟ میرا مطلب ہے آپ کے لیے اس شخص سے کہیں زیادہ بہتر انتخاب موجود تھے۔ میں نے حسام کو بھی آپ کے بہت قریب دیکھا ہے..... پھر بھی یہ سیٹھ عابد.....؟''

لبنیٰ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ ''بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد..... اونچی بولی کی ہے۔ جو بھی میرے لیے اونچی بولی لگائے گا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ سیٹھ عابد کی بولی پندرہ

کروڑ کی تھی۔ میری نیلامی میں اس سے اونچی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔"

مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں بول پڑا۔ "بولی کسی اور نے نہیں دی..... بولی طوائفوں کی لگتی ہے لبنیٰ جی..... شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رخصت ہوتی ہیں۔ عزت کے ساتھ....."

لبنیٰ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ "ٹھیک کہہ رہی ہوں میں..... اب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد..... پندرہ دن کے بعد میری دنیا دکھاوے کے لیے وہ رسم بھی ہو جائے گی جسے یہاں رخصتی کہتے ہیں....."

لبنیٰ کی آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ "تم سوچ رہے ہو گے کہ یہ عالی شان گھر۔ یہ رہن سہن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم..... یہ سب کس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ سب دکھاوا ہے پری زاد..... ہماری شان و شوکت انہی سیٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے قائم ہے۔ جسے لوگ کبھی بازارِ حسن کہا کرتے تھے۔ اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پھیل کر شہروں کی ان اونچی اور اعلیٰ سطحوں تک پہنچ گیا ہے۔ جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں پتہ نہیں وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں..... یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا۔ یا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد نسخہ ہوگا۔ آخر سیٹھ عابد کا دل بھر جانے تک مجھے معاشرے میں اس کی بیوی کے طور پر ہی تو اس کے ساتھ چلنا ہوگا۔"

لبنیٰ بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ میں نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے تو عقب سے لبنیٰ کی آواز آئی۔ "میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کیونکہ تم ایک سچے دوست ہو....."

میں نے پلٹ کر سر جھکائے سیاہ لباس میں ملبوس، ڈھلتی سرمئی شام جیسی لبنیٰ کے وجود کو آخری بار اپنی دکھتی آنکھوں کے آئینے میں سمویا۔ اس کے گلابی عارض آنسوؤں سے ایسے دھل گئے تھے جیسے تیز بارش کے بعد اچانک شام کو جب بادل چھٹ جاتے ہیں تو افق پر لالی ایک آگ سی لگا دیتی ہے۔

"لبنیٰ..... کاش میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے..... وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیانو پر بیٹھ کر جدائی کا گانا ہی گا سکتا ہے....."

لبنیٰ کے ہونٹوں پر میری بات سن کر ذرا دیر کے لیے ایک ہلکی سی مسکان ابھری اور میں اس کی وہی آخری مدھ مسکان بھرا چہرہ اپنی آنکھوں میں لیے ایک جھٹکے سے وہاں سے نکل گیا۔ لان میں فوارے کے قریب کرسی ڈالے لبنیٰ کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ مجھے واپس جاتا دیکھ کر انہوں نے فون کاٹ دیا اور ان کی کاروباری آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔

"سنو لڑکے..... میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو..... تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھا کرو..... شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں کوئی بہت بری عورت ہوں مگر تمہیں ایک پتے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رتبہ اور عہدہ

پرکھتے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب پر خامی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔"

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں ملک کے معروف صنعت کار سیٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ خبر کا عنوان تھا۔

"ایم۔ اے انگلش کی لبنیٰ اور سیٹھ عابد کی ذہنی ہم آہنگی آخر کار خوبصورت رشتے میں تبدیل"

"نیا شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ روانہ....."

"لبنیٰ عابد نے ایئر پورٹ پر صحافیوں سے غیر رسمی بات چیت میں واپسی پر ایک میڈیا سٹی کے منصوبے کے آغاز کا اعلان کر دیا۔"

میں نے بے زاری سے اخبارات یونیورسٹی کی لائبریری کی میز پر پٹخ دیئے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لبنیٰ کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے۔ یہ سوچ، لفظ، اعلیٰ خیالات اور ادب وفن..... یہ سب کسی کام کے نہیں، جب تک انسان کی جیب میں دھیلا نہ ہو اور دمڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں اپنے خیالات میں الجھا ہوا چھت سے نیچے اترا تو گھر کے صحن میں دونوں بڑے بھائی اور بھابھیاں میرے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"ہاں میاں..... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی.....؟ گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں.....؟ اب تمہاری ان شام کی دو ٹیوشنوں میں گزارہ نہیں ہونے کا....."

دوسرے بولے۔ "میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تم نے کون سا کہیں کلکٹر لگ جانا ہے۔ وہی کلرکی ہوگی اور وہی مہینہ بھر کے پانچ سات ہزار....."

بھابھی نے مشورہ دیا۔ "میری مانو تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو..... بھئی سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے بچوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عمر کے محلے کے سب لڑکے نوکریوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے ہیں....."

میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیریل ضرور چلتا تھا مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہ سے رکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کر دوں۔ گھر سے نکلنے کے بعد میرے قدم یونیورسٹی کی بس پکڑنے کے لیے، بس اسٹاپ کی جانب بڑھنے کی بجائے کسی انجان سمت بڑھ گئے۔ گھر والے بھی ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جانے کتنے، نوکری کے لیے سالوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو..... جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا بھی کبھی کبھی شرط اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت.....؟ مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو

کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی ہنر بھی تو نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا شوکی بچپن ہی سے کسی ویلڈنگ گیراج پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لا کر رکھتا ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ فائنل کے ہونے والے امتحانات جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید یہ وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلٹوں گا۔ شوکی کے گیراج کا پتہ مجھے معلوم تھا میں نے گیراج کے گیٹ پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا، لڑکا شوکی کو بلانے اندر چلا گیا، میں نے آس پاس نظر دوڑائی، گیراج کے گیٹ کے اوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا ''استاد مستانہ ویلڈنگ گیراج'' لکھا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر مجھ سے ملا۔

''ارے..... پری زاد بھائی آپ..... یہاں..... سب خیر تو ہے.....؟''

میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ ''ہاں..... سب خیر ہے..... مجھے تمہارے گیراج میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا.....؟ مجھے کام کی تلاش ہے.....''

شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''آپ..... یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھے لکھے ہو پری بھائی.....''

میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں کرتے شلوار میں ملبوس اوپر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موتیے کا پھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا جس کے تیل میں چپڑے بال ایک جانب سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح دار مونچھیں، دونوں جانب سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے گنگناتے ہوئے بولا۔

''وہ آئے ہمارے گھر میں..... خدا کی قدرت ہے۔ میاں شوکی..... یہ حضرت کون ہیں۔''

شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ پری زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں.....''

استاد مستانے پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔

''اگر میری صورت اور میری تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں.....؟ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا.....''

استاد مستانہ میری بات سن کر ایک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔ ''معاف کرنا میاں..... شاید تم برا مان گئے..... میرا مقصد تمہارا دل دکھانا ہرگز نہیں تھا۔ کیا کرتے ہو.....؟''

میرے بولنے سے پہلے شو کی بول اٹھا۔ ''پری زاد بھائی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں استاد.....''

استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟''

''ہاں.....ایسا ہی سمجھ لیجئے.....''

مستانے استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''ٹھیک ہے میاں..... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو.....؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں.....''

میں نے آستین چڑھالیں۔ ''آج سے ہی استاد.....''

دیر گئے رات میں گھر واپس پہنچا تو حسب معمول میرا انتظار کئے بنا سب سو چکے تھے۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیئے اور صبح سویرے منہ اندھیرے پھر سے اٹھ کر گیراج چلا گیا۔ استاد مستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق اسے لڑکپن میں ہی اس کے گاؤں سے شہر تو کھینچ لایا تھا لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مستری بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کا فنکار ابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک ہر نئی فلم کا پہلا شو پہلے دن دیکھنے کا قائل تھا اور پھر فلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تبصرے جاری رہتے۔

''کیا خاک ایکٹنگ کی ہیرو نے..... ہاں ولن نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا.....''

''نہ میاں.....موسیقی کا تو بیڑہ غرق ہی کر دیا ہے ان نئے لڑکوں نے.....اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہوگئی ہے۔''

''تو فلانے کا باپ..... میں فلانے کا بیٹا..... بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے.....؟ شاعری تو تب ہوا کرتی تھی ''جایئے آپ کہاں جائیں گے..... یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی۔'' تیرے میرے سپنے اب ایک رنگ ہیں.....'' عجیب داستاں ہے یہ..... کہاں شروع کہاں ختم'' واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔''

استاد مستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد چپ چاپ اس کے تبصرے سنتے رہتے۔

مجھے استاد نے ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل لیکچر دیا۔

''دیکھو میاں..... یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور پھل جھڑیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن میں ہی تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے منھے شگاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے کھلے حصوں پر انگاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہوگی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت اور طلب پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگنوؤں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔''

اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر راکھ ہو چکے ہوں..... ان کا بھلا یہ بھڑکتی آگ

کیا بگاڑے گی؟ اور پھر جلن کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حسوں کے لیے کیا چنگاری اور کیا پھل جھڑی؟ یونیورسٹی کا فائنل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے ہی ڈالا، حالانکہ اب مجھے ڈگری لینے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگوالیا اور ایک دن گیراج میں بیٹھا میں اسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ کر اسی پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ارے واہ میاں..... تو تم شاعر بھی ہو..... بھئی کمال ہے..... بتایا کیوں نہیں پہلے.....؟''

میں نظریں چرا گیا۔ ''اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا.....؟''

''کیا مطلب..... تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو..... مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں..... واہ..... کیا رچاؤ ہے تمہارے لفظوں میں..... ہم وزن..... ہر مقطع مصرعے سے بڑھ کر.....''

استاد نے وہیں باہر سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈلوالی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر چکا تھا۔ میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پٹری نما ٹکڑے کو کاٹنے کی تگ ودو میں الجھا ہوا تھا مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا جیسے شعلے کو بھی مجھ سے کوئی بیر ہو گیا ہو۔ جب انسان کا وقت برا ہو تو ہر چیز اپنی تاثیر کھو دیتی ہے۔ شبنم آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری سے فولاد کاٹنے کی لاحاصل سعی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

''کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ پری زادی میاں..... کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو..... آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری.....''

میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''پیسہ..... مجھے لگتا ہے میری ہر کمزوری، ہر عیب اور ہر ناکامی کا علاج صرف پیسہ ہے استاد..... اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسہ کمانا ہے.....''

استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''پر اس روزانہ کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے..... دن رات محنت کرو، تب بھی مہینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہوگی اور تمہاری نظر جواب دے جائے گی، ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو چکا ہوگا اور انگلیاں جل کر کوئلہ ہو چکی ہوں گی.....''

میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ''تو پھر میں کیا کروں..... مجھے بہت پیسہ کمانا ہے استاد..... بہت زیادہ..... اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرا وجود کا ہر داغ، ہر عیب چھپ جائے..... اگر تم پیسہ کمانا چاہتے ہو تو دوبئی چلے جاؤ..... وہاں اس ہنر کی بہت مانگ ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کما لو گے..... کم از کم اپنا گیراج تو کھول سکو گے.....''

میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں..... یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔

''استاد..... کیا تم مجھے دوبئ بھجوا سکتے ہو کسی طرح.....؟''

''دوبئ جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ میاں۔ ویزہ، ٹکٹ اور قدم جمانے کے لیے تین چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپیہ تو لگ ہی جائے گا اور پھر آگے تمہاری قسمت کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں.....''

اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ ہماری زندگی کے ہر فیصلے کا مقدر کاغذ کے ان چند ٹکڑوں سے ہی کیوں جڑا رہتا ہے.....؟ لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈھتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کالج اور یونیورسٹی دور میں لکھی گئی میری شاعری کے رجسٹر پر پڑی، کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پذیرائی میں شہر کے دانش ور شامیں منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جمگھٹے میں سراہا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں بھیگنے لگیں کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضاء جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں تب یہ سوتیلا تنہا اور اداس کسی روٹھے بچے کی طرح دور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روٹھے ہوئے بچے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف کمپنیز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چوکیدار نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا۔ مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ وہ ایک بار اندر استقبالئے پر جا کر اسے اندر بھجوا دے۔ اگر انکار ہوا تو میں گیٹ سے ہی واپس لوٹ جاؤں گا۔ تو چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلا لیا گیا۔ اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیٹھ عابد نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔

''کیوں..... میں نے کہا تھا نا..... اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے۔ بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہئے۔ تو بولو..... کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی اس شاعری کی.....''

میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''مجھے دوبئ کا ٹکٹ اور ویزے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ دے سکیں تو.....''

سیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دوکان دار کی طرح اسے پہلے تولا اور پھر ورق گردانی کی۔ ''تم جانتے ہو کہ شاعری میری کمزوری ہے۔ مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے.....''

میں نے اس کباڑیئے کو غور سے دیکھا۔ ''آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ کی ہی رہے گی۔''

سیٹھ عابد کے ہونٹوں پر جمی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ ''واپس لوٹنا بھی سکو گے یا دوبئی جا کر غائب ہوجاؤ گے.....؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کی حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات پر دستخط کروالے گا..... تمہارا دوبئی کا ٹکٹ اور ویزہ میرے ذمے رہا.....''

میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''لبنیٰ اب کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہوگی.....''

میں نے دروازہ کا ہینڈل گھمایا۔ ''آپ بے فکر رہیں..... یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں..... اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی.....''

میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

مستانہ استاد حسب معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کانوں سے لگا کر کھڑا تھا اور عالمگیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ ''مجھے دل سے نہ بھلانا..... چاہے روکے یہ زمانہ.....''

مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔ ''آؤ میاں آؤ..... کہیں تم بھی اپنے استاد کو بھلا تو نہیں دو گے.....؟ دیکھ رہا ہوں کہ آج کل تمہارا دل گیراج کے کام میں نہیں لگتا۔ ناغے بھی بلا ناغہ کرنے لگے ہو.....''

میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بیٹھا لیا۔ ''استاد..... میرے دوبئی جانے کا بندوبست کردو۔ ٹکٹ اور ویزہ لگوالیا ہے میں نے..... وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو بتاؤ.....''

استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے جھپٹ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ''واہ..... خوش کر دیا پیارے..... میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے..... کب جانا ہے.....؟ میرا دور کا ایک برخوردار رہتا ہے وہاں..... میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں۔ تم اسی کے ساتھ رہو گے..... وہ بھی وہاں اکیلا ہے کئی سال سے..... رفیق نام ہے اس کا.....''

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے جیسے چار پل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا جس دن میں اپنا مختصر سا سامان باندھے ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا ٹرین سے بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حماقتیں سرزد ہوتی رہیں جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہوسکتی تھیں۔

جہاز نے دوبئی ایئر پورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا تو بہت انتظار کرنے کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ ایئر پورٹ سے باہر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔

''جعلی ویزے پر دوبئی آئے ہو۔ جانتے ہو..... اس کی سزا کیا ہے.....''

باب 6

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں گنگ ہی رہ گیا۔ پل بھر میں ہی آنے والے حالات کی ایک جھلک نے میرے ہوش اڑا کر رکھ دیئے۔ دیار غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل سے ہی دوبارہ سلاخوں کے پار نکل پاتے ہیں۔ سیٹھ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی ویزہ ہی لگوا کر دیا ہو؟ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی جو باقی سارے لوگ میری بدصورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے۔ یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں اپنا ویزہ لگا پاسپورٹ سیٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا تھا تو اس نے عجیب سے نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''لیٹی تمہاری شاعری کی بڑی عاشق ہے۔ سچ پوچھو تو اگر میں نے تمہیں دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کر لیتا.....''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی؟ مگر بہر حال سیٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید.....؟

میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔

''او یار تم سنجیدہ ہی ہوگئے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا دور کا بھانجا.....''

میں نے چونک کر غور سے دوبارہ اسے دیکھا استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یکسر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری الجھن سمجھ گیا۔

''ارے یار..... استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا جب میں فیکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کمزور لاغر اور ناکارہ سا منہ بسورتا لڑکا۔ مگر یہ دوبئی ہے پیارے۔ اچھے اچھوں کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔''

رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھینچی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد بھرا ہوا جسم اور رنگت، کون کہہ سکتا تھا کہ وہی پرانا فیکا ہے جو چند سال پہلے پاکستان سے دوبئ کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے اترا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔

''بہت اچھا استقبال کیا تم نے۔ جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔''

وہ زور سے ہنسا۔ ''معاف کرنا یار..... مذاق اپنی پرانی عادت ہے۔ ویسے تم ایئر پورٹ کے اس کونے میں جس طرح سہمے اور ڈرے ہوئے چھپے کھڑے تھے تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دوبئ آئے ہو.....''

ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دوبئ آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ملنے کے لیے طے ہوئی تھی۔ ایئر پورٹ پر ایک ناختم ہونے والی بھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد وزن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی انجانی منزل کی طرف رواں تھا۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کر دینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا ہجوم بھی خود کو کھو دینے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر ایئر پورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا مگر اس وقت وہ میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف نصیحتیں کر رہا تھا۔

''یہاں کے عربی لوگ بڑے مغرور، اجڈ اور جاہل ہوتے ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خبط ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہی کو خطاوار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بٹھا کر تمہیں واپس پاکستان روانہ کر دیں گے۔ مجھے بھی ایک عمر ہوگئی ہے ان کے یہ ناز نخرے اٹھاتے اور ان کا یہ خبط برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری سبھی اقوام کو یہ اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر پل ان کا غلام بن کر ہی یہاں گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا.....''

رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں بسے اس شہر کو دیکھتا رہا جیسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر کھیل تماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہو جائے گی تو وہ بدو اپنے خیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلتے بنیں گے، جیسے ساحل پر کھیلنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں تو وہ جاتے جاتے پیروں سے اپنا ہی بنایا شہر مسمار کر کے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دوبئ بھی ایسے چند شرارتی بچوں کا بنایا ہوا عارضی سا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے

چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جا رہا تھا۔ میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھیر کر رفیق سے کہا۔

'گاڑی تو بڑی کمال ہے.....اپنی ہے یا.....؟''

رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔''فی الحال نہیں.....مگر ایک دن اپنی بھی ہو جائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے پیارے.....ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کر کے روزی کماتے ہیں.....''

گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سارے چھوٹے فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا۔ ہم اس کے چھوٹے سے مگر صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہوئے تو اس نے فوراً چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔

''فریج میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کر کے کھا لینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات کو باقی باتیں ہوں گی۔''

رفیق لپک جھپک چائے کی پوری پیالی دو گھونٹ میں حلق سے اتار کر وہاں سے چلتا بنا۔ بہت کھلے دل کا لڑکا تھا رفیق، بالکل استاد مستانہ کی طرح.....

مجھے وہ سب یاد آئے تو میں ایک دم اداس ہوگیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دور وقت نہیں گزارا تھا، ہم انسان بھی کتنے زُود فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اسی ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون اسے اچھے دن دیکھے تھے۔ مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد ستانے لگی تھی جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے تو پھر ہم ان در و دیوار، راستہ، شجر اور آس پاس کے ماحول اور رشتوں سے اتنا جڑ کیوں جاتے ہیں کہ ذرا سی دوری خود ہمیں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی؟

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا، فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزہ تھا مگر رفیق نے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کروا دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمانداری سے اپنا کام جاری رکھا تو اس مدت میں سال بہ سال توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زیر تعمیر عمارت کی پندرھویں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے ہماری واپسی ہوتی تو عام طور پر ہم دونوں ہی تھکن سے اس قدر چور ہوتے کہ ہمیں بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا تھا۔ مہینہ بھر بعد جب مجھے میری پہلی تنخواہ ملی تو میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ

زیادہ روپے میری مٹھی میں بند تھے۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا.....؟ اس روز رفیق کو بھی تنخواہ ملی تھی لہذا شام کو اس خوشی میں وہ مجھے دوبئ دکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مانگ لایا۔ دوبئ کی ڈھلتی شام میں تبدیل ہوتی رات..... رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرا دھلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی..... چمکتے راستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، باہوں میں باہیں ڈالے، اس دلربا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام کشید کرتے ہوئے خوش نصیب لوگ..... زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں ہے، اس بات کا احساس مجھے اس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی نچوڑ لینے کو جینا کہتے ہیں۔

''مگر ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں.....؟'' رفیق نے مجھے یوں گم سم بیٹھے دیکھا تو چپ نہ رہ سکا۔

''کیا بات ہے شہزادے..... کہاں کھو گئے ہو..... دوبئ دیکھو، شہر کی رونقیں دیکھو.....''

میں نے چڑ کر اسے جواب دیا۔ ''ایک تو تم مجھے یہ شہزادہ نہ کہا کرو۔ مجھے لگتا ہے باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو.....''

رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم تو واقعی برا مان گئے..... اچھا چلو..... میں تمہارا دل بہلانے کے لیے دوبئ کے سب سے بڑے کلب میں لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ ٹکٹ ہی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا.....''

میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ''کیوں..... تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے.....؟''

رفیق زور سے ہنس پڑا۔ ''ارے نہیں..... وہ کلب بھی میرے مالک کا ہی ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹل ہیں میرے مالک کی کمپنی کے پاس..... کوئی حساب نہیں ہے اس کی دولت کا..... کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ جائے اور آئندہ ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اڑاتا رہے تب بھی اس کی نسلیں تا قیامت عیش کرتی رہیں گی.....''

رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کنارے دوڑتی ہوئی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہوگئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک طلسم جیسا تھا، کئی منزلہ عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پارکنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریستوران، سوئمنگ پول، گالف اور اسنوکر کلبس، شاپنگ پلازہ، سینما، تھیٹر، جوئے خانے، بار، رقص گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کچھ آباد تھا۔ کلب کیا تھا پورا ایک شہر تھا جیسے پچاس منزلہ عمارت میں سمو دیا گیا تھا۔ چھت پر فلکی نظام اور مختلف سیاروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا جہاں بڑی بڑی دیوہیکل دوربینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جا سکتا تھا، انسان کی ہوس بھی لامحدود ہے۔

ساری زمین تسخیر کرنے کے بعد اب اس کی نظر چاند اور ستاروں پر رہتی ہے۔ اچھا ہے قدرت نے ہر انسان کی طبعی زندگی اور موت کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے ورنہ اس حضرت انسان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ فلک اور فرش کو ملانے والی کوئی لفٹ ایجاد کر کے خود اپنا حساب کتاب کروانے عرش پر جا اترتا۔ کلب میں نوجوان جوڑوں کی بہتات تھی، پب اور بار اتنے پر ہجوم تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں ٹوکن لیے کھڑی تھیں، میں نے رفیق سے جب اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصہ نہیں لگ رہا تو رفیق نے حسب معمول ایک جاندار قہقہہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔

''اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے..... دوبئی ایک کاسموپولیٹن شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا، یہ اب اس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتتا ہے..... عابد اور زاہدوں کے لیے مسجدیں کھلی ہیں اور رندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں، رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی..... تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے.....''

کلب کی ہر منزل پر حسن کا جلوہ اس کثرت سے بکھرا ہوا تھا کہ اسے اپنی محدود بصارت میں سمیٹنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل پیل دیکھ کر چکرا ہی تو گیا۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اس عمل کو قدرت انسانوں کے لیے اسی قدر پرکشش کیوں بنا دیتی ہے؟ شاید یہی گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہے اور اسی جبر پر سزا جزا کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانسے پھینک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں مسرور سزا اور جزا کا ہر فلسفہ بھلا کر بس ان لمحوں کو جی رہے تھے جو انہیں میسر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کنجوسی کر جاتے اور کار ثواب بھی ڈر ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔ ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک کلب میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ سبھی عملہ ایک دم چاک و چوبند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں پتہ چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہروز کریم وہاں آ چکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہروز ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک دیدہ زیب شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس ہاتھ میں ہوانا کا قیمتی سگار، ہیرے سے جڑی ٹائی پن اور کف لنکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور میچنگ جوتے آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور اداسی، کھویا کھویا سا وہ شخص واقعی کسی عظیم سلطنت کا سلطان لگ رہا تھا، جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں جچتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدتر شخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا مگر بہروز کریم پر امارت ٹوٹ کر برستی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے اردگرد اسٹاف منیجرز اور محافظوں کا ایک ہجوم تھا مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس

رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا تھا وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شب برات بن جاتی تھی کیونکہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تن خواہ کے برابر بونس ملتا تھا اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود سبھی فرد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے تھے، ان کا ہر بل ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ بار میں جام کے جام لنڈھائے جاتے اور کیسینو میں ہر فرد کو ہزاروں ریال مالیت کے ٹوکن مفت فراہم کیے جاتے تھے۔ سبھی کے لیے دعوت عام ہوتی تھی۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب تو رفیق نے موقع غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔

''یہ میرا دوست پری زاد ہے مالک..... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کرنے کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے.....''

بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا نام بتایا تم نے.....؟''

میں چپ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ''پری زاد مالک.....''

بہروز کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''خوب..... اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے مینیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دینا.....''

بہروز مختصر سی بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ''تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے.....''

رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دوبئ میں سبھی عربی نہیں بولتے..... میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے ماں باپ یہاں دوبئ میں آ کر بس گئے تھے ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں ہی بات کرتے ہیں۔''

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کامیابی کی داستان سناتا رہا کہ کیسے کامیابی کی سیڑھیاں طے کرتے کرتے آج وہ دوبئ کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا تھا۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کامیابی سے متعلق بہت سی پراسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجیہہ چہرے کے پیچھے ایک سفاک شخص چھپا ہوا ہے جو اپنی کامیابی کی راہ میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ رفیق بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔

''دیکھ لو پری زادے پیارے..... تمہیں جس نام سے اتنی چڑ ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر دوبارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں ناں..... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو

بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے.....''

گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشہ دولت کا کیا کرتا ہوگا.....؟ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس 24 گھنٹے کے ہی ہوتے ہیں، وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں۔ تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کس کے پاس قارون کا خزانہ اور کس کے ہاتھ خالی کشکول کیوں ہوتا ہے.....؟

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری ایریا میں لے گیا۔ مینیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے پیر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی میں ہی میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے سے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''چل پیارے..... تیرا کام تو بن گیا۔ یہ مینیجر تھوڑا ٹیڑھا آدمی ہے مگر ہے مالک کا خاص بندہ، اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چٹکی بجانے میں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔''

اس دن مجھے ایک اور بات پتہ چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سینکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں جن میں سے ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد مجھے رفیق نے مصطفیٰ کے دستخطوں سے فیکٹری کا ایک حکم نامہ تھما دیا۔ مجھے خاصی معقول تنخواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگا دیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا تھا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے نیچے انڈیلتے اور میں سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگنے اور دن سونے لگے تھے۔ ان دنوں مجھے عجیب سا احساس ہوا..... کہ رات کو انسان کی شخصیت یکسر بدل جاتی ہے۔ دن کا اجالا ہماری بہت سی ان دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے۔ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں۔ یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے بھید کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا؟

میں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہر میں ہی مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صحرا کا تاروں بھرا آسمان میرے ساتھ رات بھر باتیں کرتا رہا۔ میں گھر سے آئے ہوئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم گھر ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی پیٹیاں ایک گودام میں سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا

چاہی تو فورمین نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر میں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے انہیں تنبیہہ کی کہ اگر انہوں نے میری بات نہ مانی تو میں صبح ہوتے ہی مینیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز گونجی۔ ''میں یہیں ہوں..... تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے..... اور آج تو تمہارا آف OFF تھا..... تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟''

ہم یہ ساری گفتگو انگریزی میں کر رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لاپرواہی میں ٹال دی۔

''ٹھیک ہے..... تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں یہ حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے صبح تک اپنی شفٹ ختم کر کے چپ چاپ واپس گھر چلے جانا۔''

مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ بہروز ہفتے میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا۔ اور پھر چھٹی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکواڈ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا تو میں تیزی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ جب وہ لوگ راہداری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہ راست مخاطب کر کے کہا ''مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے جناب.....'' بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے.....

باب 7

مصطفیٰ نے مجھے بری طرح جھاڑ دیا۔ ''تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں راستے کے بیچ نہیں ٹوکا۔ میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے، کل آ کر مہینے بھر کی تنخواہ لے جانا.....''

میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سنی۔ ''ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے۔ یہ بہت ضروری ہے.....''

آس پاس کا عملہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے مجھ سے بڑا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا سگار سلگایا۔ ''ہاں بولو لڑکے.....اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہیے ہیں تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا ہے۔ اکاؤنٹس والوں سے لے لو.....''

میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ''نہیں جناب..... مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری میں کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا.....''

میری بات سن کر مصطفیٰ نے مجھے ڈانٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ''فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر میں لے آؤ.....''

بہروز حسب معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز خان نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے سب سے قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے باڈی گارڈ پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر رات کو پہرہ بھی دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموش ہی پایا تھا۔ شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی شفٹ کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر دوبارہ اپنے اپنے کام میں جت گئے مگر ان سب کے

تاثرات سے صاف لگ رہا تھا کہ انہیں آج رات ہی میری نوکری کے خاتمے کا پورا یقین ہے۔ کچھ دیر بعد چپڑاسی نے آ کر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کریم کے جہازی سائز کے عالیشان دفتر میں داخل ہو گئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا۔ جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا؟ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سپاٹ سا تاثر تھا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''تم تو وہی ہو ناں جسے رفیق نے بھرتی کروایا تھا؟ ہاں کہو..... کیا کہنا چاہتے ہو.....؟''

میں نے اس رات کا پورا قصہ بہروز کو سنا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا سگار کے کش لیتا ہوا میری بات سنتا رہا۔ میری بات ختم ہوئی تو اس نے ایک گہرا کش لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔

''تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگایا ہوا یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی..... بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے..... آپ اپنے طور پر اس بات کی تصدیق بھی کروا سکتے ہیں.....''

بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عقب میں مؤدب کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ''کہو مصطفیٰ..... کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے.....؟''

مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ''جی مالک..... یہ سچ بول رہا ہے.....''

میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے بہروز کریم کا ردعمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے سگار کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے مصطفیٰ..... جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا بولتے جانا.....''

بہروز کو میرا خیال آیا۔ ''لڑکے..... تم کافی پیو گے.....''

میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا۔ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار، لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پرواہ کیے بنا اپنی وفاداری نبھائی۔ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا دلچسپ سا نام تھا.....؟''

بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرایا۔ ''پری زاد.....''

بہروز مسکرایا۔ ''ہاں..... پری زادی میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص

پسند نہیں ہے..... تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے.....؟''

میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ''نام بدل لینے سے میری قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک..... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلاتا رہتا ہے.....''

بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''مرد کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہئے..... دوبئی کس لیے آئے ہو.....؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''بہت سا پیسہ کمانے..... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے کے لیے.....''

بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ لمحے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہوئی۔ ''بڑا آدمی.....؟ جانتے ہو لڑکے..... یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر آج چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتہ چلا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے اس کی خبر دینے کی بجائے اس آلودہ نظام کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیا.....''

بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور باہر جاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے میرے پاس رکا۔ ''گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹنٹ سے ملتے جانا.....''

میں اپنی جگہ گم سم سا کھڑا رہ گیا اور بہروز کمرے سے نکلا گیا۔ صبح چھٹی سے پہلے فیکٹری کا خزانچی میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں تھما گیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ بہروز کریم کی اس سلطنت کا اصل دارومدار کچھ ایسے غیر قانونی دھندوں پر ہے جن کی خبر باہر والوں کو نہیں تھی۔ رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتہ چلا تو وہ مجھ پر بری طرح سے برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھا؟ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہروز نے مجھے معاف کر دیا مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس بہروز کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہفتے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کر دی گئی۔ مصطفیٰ سے اب بھی میرا گاہے بگاہے سامنا ہوتا رہتا تھا مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں بھی وہ پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کے ذریعے واپسی کا وقت نوٹ کروا رہا تھا تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا پیغام دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کا کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب صحرا میں بنے ایک شیڈ کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ مصطفیٰ نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد مجھے کنڈی لگانے کا اشارہ کیا اور اپنے مخصوص کرخت مصری

لہجے میں بولا۔

''جتنا کما رہے ہو، اسی پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو.....؟''

میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ''میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں.....''

مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس مجھے اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لانچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کر کے بہروز کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون بمع چار گاڑیوں اور ڈرائیور کے ہوں گے..... میں نے زیادہ تفصیل میں جائے بنا ہامی بھر لی۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔

''کام مشکل ہے۔ مگر یاد رکھو، کامیابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے.....''

میں نے سر ہلایا۔ ''آپ بے فکر رہیں..... میری زبان ہمیشہ بند رہے گی.....''

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی جیپوں میں سوار دور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا، ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لانچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نوجوان جوڑوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں بکھر جاتیں اور پھر وہی طویل سناٹا ہمیں گھیر لیتا تھا۔ آج 14 فروری کا دن تھا جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آج جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دوبئ کے در و دیوار، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے غباروں اور پھولوں سے سجے ہوئے دیکھا، نوجوان لڑکیاں سرخ لباس میں ادھر ادھر رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور نوجوان سیاہ لباس پہنے اور گلے میں سرخ اسکارف یا ٹائی پہنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش دنیا میں بدصورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور ہر تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوبصورت لوگوں کا قبضہ کیوں جما رہتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اگر خوبصورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ کچھ تو ایسا ہو جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کس الٹی سیدھی سوچوں کے بھنور میں گھرا ہوا تھا کہ اچانک دور سے چند لانچوں کی مخصوص جلتی بجھتی روشنیاں نظر

آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سگنل یا خاص اشارہ تھا جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پسٹل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا۔ کچھ دیر میں لانچیں ساحل کے قریب آ گئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لانچوں کی طرف بڑھے۔ لانچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ ویران حصہ بڑی بڑی دیو ہیکل سرچ لائٹس کی روشنیوں میں جگمگا سا گیا اور ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔

کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے انگریزی میں چلایا۔ ''کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔ تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔''

مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلایا۔ ''بھاگو'' اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف تین چار فائر ہوئے اور سرچ لائٹس چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ تیز روشنی کے بعد ایک دم چھانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا، لوہے کی ایک سرد نال میری کن پٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا، اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پتلیوں سے ہوتا ہوا میری دماغ کی رگوں میں اتر گیا۔ اور میرے سارے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا، بے ہوشی شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔ میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا جب شدید ٹھنڈے پانی کی ایک بوچھاڑ نے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتار پھینکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری رسی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تار جیسی رسی اپنے ہاتھوں کی کلائیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن بھی رسی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے وہ رسی میری گردن کے گوشت میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرہ شاید تہہ خانہ تھا۔

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر میری آواز میرے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آ کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور چلا کر عربی میں کچھ پوچھا۔ اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچہ میرے گال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلا کر انگریزی میں کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا لہٰذا جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر میرے سامنے آ

گئے۔ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بڑا سفاکانہ تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں دوبئی میں کب سے قیام پذیر ہوں اور میرا ان اسمگلروں سے کیا تعلق اور رشتہ ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں.....؟ میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرہ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑ کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص ہتھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب مجھے میری روح میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں کو اسی ہتھوڑی کی ضرب سے ایک ایک کر کے ناکارہ کر دیا گیا۔ میرے جسم کو جلتے سگریٹوں سے وقفے وقفے سے داغا جاتا رہا۔ اور اس تمام عرصے میں مجھے پنجوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رسی سے چھت پر ایک کنڈے کے ساتھ باندھے رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑتا رہے کہ میرے شانوں اور میری کہنیوں کے جوڑ کھل جائیں مگر میں وہیں جھولتا رہوں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں.....؟ اور میرے گروہ کو کون کنٹرول کرتا ہے؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سدھ ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جلادوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہیں میں مر ہی نہ جاؤں، لہٰذا ہمیں اسے سلطانی گواہ بنا لینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسٹامپ پیپر پر ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گروہ کے مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بنا کسی الزام کے ڈی پورٹ کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اتنے طویل ہونے لگے کہ اب مجھے دن اور رات کی ہر تمیز اور گنتی بھول چکی تھی۔ میرے جسم کے ایک ایک ریشے سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب یہ درد میرے بدن کی حدوں سے نکل کر میرے ارد گرد موجود ہر چیز میں منتقل ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ جانے میرے اندر وہ برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عمر زبان کے گھاؤ سہتے سہتے میری روح کو اذیت سہنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن ایک ایک کر کے میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوا لیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے کے لیے نیچے جھکا تو

دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی لی کہ آدھی رات تو بیت ہی ہو چکی ہے، تو کیوں نہ اس ''نیک کام'' کو اگلے روز صبح تک مؤخر کر دیا جائے، ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے علیحدہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ انسانی جسم کی رگیں اس درد کے پیغام کو دماغ کے ایک خاص حصے تک پہنچا کر جسم کو دوبارہ پیغام دیتی ہیں کہ وہ درد میں مبتلا ہے۔ مجھے اس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بیگانے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جھمیلا اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا.....

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگلی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ شاید جب وہ ستم گر میرے ہاتھ کھولنے کے لیے نیچے جھکا تو کوئی ایک آدھ گرہ اس سے کھلی رہ گئی تھی، میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دینے کی کوشش کی تو میرے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اذیت ،درد اور تکلیف کے دریاؤں کے بند کھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ کر نکلا جیسے شدید گرمی کی کڑی دوپہر میں پسینہ پھوٹتا ہے، کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اوندھے منہ گر گیا اور کچھ دیر کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد مجھے دوبارہ ہوش آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ کرسی کی ہتھی ٹوٹ چکی ہے اور میرے ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں، میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کرا لیے اور کانپتی زخمی، خون سے سن ہوئی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں اور خود کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچا اور چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا، خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کنڈی کی مدد سے باہر کی جانب سے بند تھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چٹخنی کھل گئی اور میں اپنے ہی زور میں باہر کھلے ہال میں جا گرا، میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کی بجائے ایک ویران سی نامکمل عمارت تھی ،جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار دوبارہ زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے جیسے میری ٹانگوں میں موجود ہر ہڈی کو پیس کر چکنا چور کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیر تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دور صحن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ میں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک صحن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا، صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکا چوند بھی ہمیں اندھا کر دیتی

ہے۔ میں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہوگیا اور پھر مجھے بہت سے سائے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے جست لگائی مگر مجھے راستے میں ہی کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سدھ سا زمین پر گر گیا جیسے سینکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگاتار دوڑنے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے چور ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی نہ اٹھنے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آخر کار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے میری پلکوں کے در پر اپنے سفید پنکھ پھیلائے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

''پری زاد..... اٹھو..... چلو بہت دیر ہوگئی.....''

میں نے غور سے آواز سننے کی کوشش کی۔ ہاں..... کوئی میرا نام پکار تو رہا تھا۔ مگر یہ آواز.....؟ ہاں میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا۔

''اسے ہوش میں لاؤ..... یہ مجھے زندہ چاہیے.....''

میرے ڈوبتے ذہن نے آواز پہچان لی..... یہ بہروز کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہروز کریم نے خود اغوا کروایا تھا؟

باب 8

بہروز کریم کی آواز سنتے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مگر پھر میں ہوش کی ان سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر ٹھیک ہی کہا تھا۔

''سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں..... سوچو تم نے اور میں نے کیا پایا انسان ہو کے.....؟''

میں بھی ایک ایسا ہی بدنصیب انسان تھا۔ پنچھی، ندیا یا پون کا جھونکا ہوتا تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا۔ مگر میرے پر تو بندھے تھے۔ جتنی بار مجھے ہوش آیا میں نے خود کو سفید پٹیوں میں بندھے ہوئے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔

''میں کہاں ہوں.....؟''

نرس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں بے خیالی میں اردو میں بات کر رہا ہوں۔ میں نے دوبارہ انگریزی میں پوچھا تو وہ مسکرا کر بولی۔ ''فکر مت کرو..... تم محفوظ ہاتھوں میں ہو تمہارے زخم دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں۔ تم بس آرام کرو.....''

نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھا۔ جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ مسیحائی کا مرہم ملتے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے یہ اسی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ عمر بھر ساتھ تو نبھاتے ہیں۔ کاش رشتے بھی داغ جیسے ہوا کرتے زخم بن کر عارضی ساتھ نہ دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ قریباً ہفتہ بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفیق کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا.....؟ کہیں اس نے پریشان ہو

کر میرے گھر والوں کو خبر نہ کر دی ہو؟ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ مجھے فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔

''یہ سب کیا ہے فیروز.....؟ میں کہاں ہوں.....؟ مجھے یہاں کون لایا ہے.....؟ مالک کہاں ہیں.....؟ کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا.....؟''

فیروز نے حسب معمول خاموشی سے میرے سارے تابڑ توڑ سوالات سنے اور پھر اطمینان کے ساتھ بولا۔ ''سب پتہ چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بڑے سخت جان نکلے..... ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچا لڑکا ایک جھٹکے میں ہی ٹوٹ جائے گا..... مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔''

میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا..... ''کیا مطلب..... تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے..... اور مجھے اغوا کر کے کہاں رکھا گیا ہے.....؟''

فیروز کے چہرے پر حسب معمول تاثر کا فقدان تھا۔ اس نے جیب سے اپنی مخصوص برانڈ کی بیڑی نکالی اور ہونٹوں میں داب کر سلگائی۔ ''ہاں..... نہ صرف جگہ کا پتہ تھا۔ بلکہ تمہیں یہاں پر اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے.....؟''

میرے دماغ کا تو جیسے فیوز ہی اڑ گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ''مگر کیوں.....؟ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا.....؟''

فیروز کا لہجہ اب بھی دھیما اور پرسکون تھا۔ ''تمہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت پیسہ کمانا ہے۔ یہ پیسہ کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں پسٹل تھما کر کروڑوں ریال کا مال لینے کے لیے ساحل پر بھیج دیں گے.....؟ تمہیں تو شاید ابھی تک گولی چلانا بھی نہیں آتی۔ پیسہ کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں..... کلیجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں۔ انہیں اس طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں..... مگر تمہاری باری پر نہ جانے مالک نے ہاتھ اتنا سخت کیوں رکھا.....''

میں منہ کھولے حیرت سے فیروز کی ساری بات سنتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرار کی کوشش تک سبھی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ کیونکہ جب کبھی میں ان کے لیے باقاعدہ کام شروع کرتا تو کسی بھی وقت گرفتاری کی صورت میں مجھے انہی حالات سے گزرنا پڑتا اور وہ لوگ یہی جاننا چاہتے تھے کہ کہیں میں تشدد اور اذیت سے ٹوٹ کر کسی مرحلے پر بھی بہروز کریم یا دیگر عملے کے نام افشاء تو نہیں کر دوں گا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول

دیتا تو اسی لمحے مجھے اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلائیٹ سے دوبارہ ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فرار کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ بہروز کریم یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس ساری کاروائی کی براہ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے کیوں کہ اسے اپنے اردگرد صرف ایسے خاص چنے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے جو اس کے ہر امتحان پر پورے اتر چکے ہوں۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے تسلی رکھنے کو کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتہ ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوظہبی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس عرصے میں وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں خود رفیق کو کسی نہ کسی کام کے بہانے اس سارے عرصے میں شہر سے دور ہی رکھا گیا تھا تاکہ وہ میری لمبی غیر حاضری محسوس نہ کر سکے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کروادی۔ میری آواز سن کر رفیق کھل سا گیا۔

''اوئے کہاں ہو تم یار..... ایسی بھی کیا نوکری..... یاروں کو ہی بھلا دیا.....''

میری آواز بھرا سی گئی اور میں نے اسے بتایا کہ میں جلد ہی واپس آ کر اس سے ملوں گا.....

بہروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، پیسہ، روپیہ سب کچھ کما لیتا ہے۔ مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے خلوص اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہروز کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ سلطنت بنا لینے سے کہیں زیادہ مشکل اس سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ بہت چھوٹے اور معمولی غداروں کے ہاتھ اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہروز کریم مجھے تاریخ کو یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہر وہی ہل چل سی مچ گئی جو بہروز کریم کی آمد کا خاصہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی بہروز میرے کمرے میں موجود تھا۔ فیروز خان بھی اس کے ہمراہ آیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو لڑکھڑا گیا۔ بہروز نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود میرے بستر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ کر مجھے بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔

''کچھ کہو گے نہیں مجھ سے؟ میری وجہ سے تم پر ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے۔ تمہاری پور پور اور نس نس میں درد کا زہر بھر دیا گیا۔ غصہ تو بہت آیا ہوگا مجھ پر۔''

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ براہِ راست بہروز کی طرف دیکھا۔ ''نہیں..... آپ نے وہی کیا جو دنیا میں کسی کی وفاداری جانچنے کے لیے رائج طریقہ ہے..... انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے تو اگر آپ نے بھی اسی کم زوری کو آزما کر وفاداری کی جانچ کی ہے تو آپ سے کیا گلہ شکوہ کرنا.....؟''

بہروز نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''خوب..... گویا وفاداری کو پرکھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا

ہے.....؟ میں بھی جاننا چاہوں گا۔''

''جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور درد کم زوری ہو اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درد سہنے اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہو..... اس کا امتحان کیا ہوگا؟ میں تو ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو لذت کے حصول کے لیے اذیت سے گزرتے ہیں۔ ان کی وفاداری کیسے ناپیں گے آپ.....؟''

بہروز چپ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے کہیں درد، کہیں دولت، کہیں حسن اور کہیں اقتدار..... آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزارا ہے..... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ میرے حصے کا امتحان ہی نہ ہو.....؟''

بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لڑکے..... مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں دیگر کسی چیز کی ہوس باقی نہیں رہتی۔ لیکن ایک بات تمہاری دل کو لگتی ہے۔ وفاداروں کی وفا ناپنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا کبھی..... انسان کے خون میں ہی وفا نہ ہو تو یہ صرف دل بہلاوے کی آزمائشیں ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری قوت برداشت کی داد بھی دینا پڑے گی۔ حالانکہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال..... اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصہ بن چکے ہو۔ مگر یاد رہے..... جس دنیا میں تم قدم رکھنے جا رہے ہو۔ وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو..... میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے تو پھر کبھی تمہاری واپسی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔''

''میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنی واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں جن کی واپسی کا کوئی منتظر ہو..... میرا کوئی آگے ہے نہ پیچھے..... آپ حکم کریں..... مجھے کیا کرنا ہوگا.....؟''

بہروز نے اطمینان سے میری ساری بات سنی اور پھر میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ..... پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے..... اور ہاں..... کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے.....''

بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔ فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رکا۔ ''تم واقعی بہت خوش قسمت ہو لڑکے..... مالک کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے

کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندرست ہو کر باہر آنا۔ تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے کا مزہ آئے گا۔"

فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پر پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ "اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔ مجھے مالک نے انچارج بنا کر ابوظہبی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا۔ میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلد ترقی دے کر میرے پاس بھجوا دے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ میں رہو گے۔"

میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے کے لیے ایئرپورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنج میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد ہی میں نے اسے زیادہ اپنے قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے ناطے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جبکہ اپنے جذبوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا چھان لیتے ہیں۔ مجھے تو ویسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیئے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے 24 چوبیس گھنٹے بھی اس کے فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کہلوا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل وغیرہ میں منتقل کروا دے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرنشڈ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہازی سائز کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قالین، ریشمی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر بنے ہوئے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا ٹیرس اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی.....

پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بنا میرا وہ گودام نما چھوٹا سا کمرہ یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھیگ بھیگ گئیں..... اس چھوٹے سے ڈربہ نما کمرے سے لے کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھویا بہت.....؟ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں جو قانون کی نظر سے چھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتہ چل گیا تھا کہ وہ لوگ درپردہ سونے کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ دولت کمانا بھی تو ایک خبط ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خبط اور جنون..... ورنہ بہروز کریم کو بھلا مزید روپیہ کمانے کی کیا ضرورت تھی؟ یا شاید یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کچھ لوگ خرچ کر کے اس نشے کا سرور محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے..... اس روز مجھے ایک اور ادراک بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے

لگتا ہے۔ اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے۔ وہ اتنا ہی بہادر اور لاپرواہ ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا۔ مجھے اپنی جھلنگا چارپائی پر بھی جھولتے جھولتے نیند آجاتی تھی۔ اور آج جب میرے پاس دوبئی کے سب سے پوش علاقے میں مہنگا ترین اپارٹمنٹ موجود تھا، تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسہری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آگیا کہ بہروز کریم کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جارہا ہے اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ کے لیے اپنے ساحل والے بنگلے پر بلایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرائیور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہروز کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہروز کو صرف کمانا نہیں، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کر خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کرختگی کو بیان کرتے ہیں۔ بہروز کریم کا یہ عالی شان محل اسی مثال کی غمازی کررہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہروز کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی جس سے پرے سبزے پر ایک وسیع وعریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے تھے۔ وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا۔ مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب عجوبوں کو پار کرتی ہوئی شیشے اور لکڑی کی ایک خوبصورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی جو شاید بہروز کے بنگلے کی انیکسی تھی۔ کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے متشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انیکسی میں داخل ہوئے تو بہروز اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہروز نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑرہا ہے اور اس کی واپسی ہفتہ بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں سبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی۔ فیروز نے سبھی کو مختلف ادھورے کام اور وہ سودے بتائے جو اس عرصے میں انہیں پایہ تکمیل کو پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف میں ہی وہاں کھڑا رہ گیا۔

بہروز کریم نے مسکرا کر فیروز سے پوچھا۔ ''کیوں فیروز خان..... پری زاد سے تمہاری بہت دوستی ہوگئی ہے کیا.....؟ اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے.....''

فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا۔ ''یہ ابھی نیا ہے مالک..... اور اس نے کوئی پرانا سودا ابھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتادیں.....''

بہروز کریم نے اپنا مخصوص سگار نکالا اور فیروز نے لائٹر سے اسے سلگایا۔ ''ہاں..... اس کے

لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے۔تم جانتے ہو پری زاد۔تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں....."

میں نے سر جھکا کر کہا۔"میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔"

بہروز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ محل اپنی چوتھی بیوی کے لیے تعمیر کروایا ہے جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔اس کی باقی دو بیگمات یہیں دوبئی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔وہ لندن اپنے اسی بیٹے کے لیے کسی نام ور تعلیمی ادارے میں داخلہ کرانے کی غرض سے جا رہا تھا۔ لیکن اسے اپنی اس نئی کم سن دلہن کی بہت زیادہ فکر لگی رہتی تھی اسے لیے بہروز نے اسی محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔اس کے دشمنوں کو ابھی بہروز کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔نہ ہی وہ کریم کی نئی نویلی دلہن کی صورت سے ہی واقف تھے۔مگر بہروز کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب چکی تھی لہٰذا وہ اپنی سہیلیوں اور اپنے خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔بہروز اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا کیونکہ بہروز کے پرانے وفاداروں کو تو پورا شہر جانتا تھا لہٰذا ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہروز کے خاندان کی نشاندہی تھا۔لہٰذا بہروز چاہتا تھا کہ اس کے غیر موجودگی میں اگر اس کی دلہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے ہمراہ جاؤں۔دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہروز کی دولہن کو کسی گارڈ کی موجودگی کی الجھن سے بھی بے خبر رکھنا تھا کیونکہ اسے اس زیرِ زمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہروز اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ہاں البتہ جس گاڑی میں میں ڈرائیور اور بہروز کی وہ لاڈلی گھر سے نکلا کرے گی۔اس کے تعاقب میں بہروز کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ہمارے پیچھے ہی رہے گی۔اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتہ ہوگا اور ان کمانڈوز سے فون پر میرا رابطہ رہے گا تاکہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ پلک جھپکتے ہی ہماری گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔

پوری بات کہنے کے بعد بہروز نے تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا۔"سب سمجھ گئے ناں.....کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو.....مگر یاد رکھنا۔لیلیٰ صبا میری جان ہے۔اسے ہلکی سی کھروچ بھی آئی تو غضب ہو جائے گا۔تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں پری زاد۔"

میں نے سر ہلایا۔"نہیں مالک.....میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔کوئی غلطی نہیں ہوگی....."

بہروز مسکرایا....."شاباش.....تم ظاہر نہیں کرتے.....مگر کافی ذہین ہو....."

میں چپ رہا۔مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی۔ جیسے بہروز نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص چھپا لیا ہو.....جیسے کوئی بڑا راز میرے آس

پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے مجھے کچھ بتانا چاہے۔ مگر بتا نہ پا رہا ہو۔ کچھ بھی تھا مگر میں بہت دیر تک اسی الجھن کی سولی پر لٹکا رہا۔ کچھ دیر میں فیروز خان نے آ کر بتایا کہ لیلیٰ صبا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی تھیں۔ فیروز کو بہروز نے ہماری باتوں کے درمیان کچھ کام سے اندر کوٹھی میں بھیج دیا تھا۔ بہروز کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''تم بھی وہیں آ جاؤ میں تمہارا تعارف بھی لیلیٰ سے کروا دیتا ہوں.....''

میں بہروز کریم اور فیروز کے نقش قدم پر چلتا ہوا اس محل کے ہال نما لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوبصورت سفید رنگ کے پیانو کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں میں بھی تو ایک پیانسٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیانو دکھایا بھی تو کہاں.....؟ اتنے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی سیڑھیوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے اتری تو بہروز نے مجھ سے کہا۔

''ان سے ملو پری زاد۔ یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیلیٰ صبا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک پل کے لئے بجلی سی گر گئی۔

باب 9

لیلیٰ صبا کو میں نے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے میں پتھر کا ہو گیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے کی دولت سے ہی نہیں نواز تھا۔ قدرت نے لیلیٰ صبا کی صورت میں اسے حسن کی ایسی انمول نعمت کا خزانہ سونپ رکھا تھا جو دنیا میں بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے۔ لیلیٰ حسن اور نزاکت کا ایک مکمل امتزاج تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس۔ سیاہ فلیپر کے اوپر میرون شرٹ اور گلے میں سیاہ اسکارف، کھلے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار..... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رخ کی حفاظت کے لیے سارے دوبئی کو بھی معمور کر دیا جاتا تو یہ کم ہوتا۔

کریم نے لیلیٰ سے میرا تعارف کروایا۔ ''اس سے ملو..... یہ پری زاد ہے..... میرا نیا اسسٹنٹ.....''

میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا۔ وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے تخوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا۔ ''اوہ کم آن آغا..... آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے.....''

بہروز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں ہی مجھے لاؤنج کے ساتھ ملحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کا کہا۔ شاید وہ لیلیٰ صبا کو یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل آیا مگر میرے جانے کے بعد بھی لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز کی بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلتے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہو گئی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا.....؟ اب یہ شخص میرا سایہ بنا رہے گا کیا.....؟ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بنے گا بازاروں میں..... اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکلوں.....''

بہروز کریم نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں بیوی کو سمجھایا کہ میرا اس کے ساتھ باہر جانا کیوں ناگزیر ہے اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے ورنہ وہ پردیس جا کر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہر حال ایک لمبی بحث اور تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معاملے کی نزاکت

سمجھانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا زنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فولاد کو بھی بھربھری مٹی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ مجھے نیا حکم یہ ملا کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انیکسی میں منتقل ہو جاؤں۔ تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بظاہر یہ سیدھا سادھا نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت ٹیڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تصدیق بھی جلد ہی ہوگئی جب ایئر پورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بلا کر سختی سے تاکید کہ کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینا ہوگی۔ بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیرز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معمہ بھی حل کر دیا کہ اصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل ہار بیٹھا تھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے'' یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا۔ مگر میں بدقسمتی سے پہلے روز ہی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک ناپسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا۔ کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے میرے پہرے سے شدید چڑ ہوگئی تھی اور اس کی جھنجھناہٹ کا سارا نزلہ مجھ پر گرنا تھا۔ لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماہ رخ کا مجھ جیسے بھدے شخص سے نفرت کرنا لازمی تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب اس شخص کی ہم سفری کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے، مگر ہر گھر میں ہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر پل میرا راستہ کاٹتے رہتے تھے اور گھر پر ہی کیا منحصر، باہر گلی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے، کہاں کہاں ان سے بچ جاتا میں.....؟

سارے شہر میں جابجا یہ میرا منہ چڑانے اور میرا مذاق اڑانے کے لیے مجھے کھڑے ملتے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو جہاں میں بنا کسی خوف اور جھجک کے صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔ اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آ کر حکم سنایا کہ مالکن لیلیٰ باہر جانا چاہتی ہیں اور ڈرائیور باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صبا غصے میں بھری کھڑی تھی۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے.....؟ کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا.....؟''

میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا ویسے ہی چلا آیا ہوں مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے اور مجھے جھڑک دیا۔

''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے اب گاڑی میں بیٹھو..... میں کسی فضول بحث کے موڈ میں نہیں ہوں.....''

میں چپ چاپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیور سے کہیں چلنے کا کہا۔ گاڑی دوبئی کی بارونق سڑکوں سے ہوتی ہوئی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہوگئی جہاں اونچے اونچے پرتعیش اپارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں ترتیب سے جڑی ہوئی تھیں۔ ہماری گاڑی ''جے J'' سیریز کے اپارٹمنٹ کی قطار کے سامنے آ کر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اتری تو میں بھی نیچے اتر آیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''تم کہاں اتر آئے..... یہیں نیچے میرا انتظار کرو..... میں اپنی سہیلی سے مل کر آتی ہوں.....''

۔میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''مجھے آپ کو اکیلا نہ چھوڑنے کا حکم ہے۔ میں آپ کی سہیلی کے اپارٹمنٹ تک آپ کے ساتھ چلوں گا.....''

لیلیٰ میری بات سنتے ہی آپے سے باہر ہوگئی۔ ''ہاؤ ڈیئر یو How dare you تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ.....''

اس بات پر مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔ ''معافی چاہتا ہوں..... مگر یہ مالک کا حکم ہے.....''

ہمارے تعاقب میں آنے والی گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہوچکی تھی اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے غصے سے دانت پیسے اور پیر پٹختی ہوئی اندر لفٹ کی جانب بڑھ گئی، پندرھویں منزل پر لیلیٰ کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہداری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے کے بنچ پر بیٹھ گیا، تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں، لیلیٰ نے قریبی سپر مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اس کی سہیلی کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اترتے ہی چیخ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انیکسی میں آ کر بستر پر دراز ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہوگیا۔

''تمہاری مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج.....؟''

''ہاں..... وہ اکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں۔ میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی.....''

فیروز نے ایک لمبی سانس بھری۔ ''آئندہ ایسی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے..... لیلیٰ مالکن مالک کی بہت چہیتی ہیں..... وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے..... یوں سمجھ لو کہ تم ایک دو دھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر بچائے رکھنا ہے..... ورنہ کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو کر گر پڑو گے.....''

فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہروز کریم کا حکم مانتا تو لیلیٰ کی ناراضگی یقینی تھی اور گر لیلیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دور رہتا اور مکمل نگرانی نہ کرتا تو بہروز

کی حکم عدولی ہوتی تھی اور دونوں صورتوں میں سزا میرے ہی مقدر میں تھی، شام ڈھلتے ہی گھر کے ہال سے پیانو کی مدھر تانیں ابھرنے لگیں۔ کوئی پیانو پر بہت خوبصورت دھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز استانی پیانوں بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیانو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنج کی کھڑکی سے ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو الٹے قدموں واپس چلا آیا، گویا لیلیٰ صبا کو پیانو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوبصورت اور بدصورت لوگوں کے اندر دل ایک سا ہی ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بدصورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک بہروز کریم کی ہدایت پہنچا دی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلتا تو وہ اکیلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف سے چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک مالز میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا اتنا خبط کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے اور یہ بھوک صرف بھرے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیانو کی اس خوبصورت دھن کی آس کرنے لگے۔ سماعت کو بھی کبھی کبھی بڑی شدید بھوک لگتی ہے..... خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت..... جو ساری عمر کسی زبان سے دو میٹھے بول سننے کے لیے ترستے رہتے ہیں.....

ہماری سماعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی بکھیری دیگر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بہتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراتی ہوا، جھرنوں اور ایسی میٹھی دھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنے جانب کھینچتی تھیں۔ سو جب پیانو کی لے چھڑی تو میں بے اختیار انیکسی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں لاؤنج کی کھڑکیوں کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آنا بند ہوئی اور بوڑھی پیانو ٹیچر سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہروز کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا دی۔ اس کا نام مارتھا تھا۔ میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیانو بجانا سکھا سکتی ہے.....؟ میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا۔ مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس پیانو نہیں ہے۔ وہ تو کرسچن کالونی میں رہتی ہے اور اسکول کے بچوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیانو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میری امیدوں پر بھی اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں چمکیں۔

''اگر میں کبھی اپنا پیانو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی.....؟''

مارتھا میرا سوال سن کر زور سے ہنس پڑی۔ ''ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... بلکہ تمہارے شوق کو دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدھی کر دوں گی.....''

مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیانو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق لوں گا۔ اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیانو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انیکسی میں پیانو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دبی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجیب ہے خواب دیکھے تو راتوں پر فریب اور جال بننے کا الزام لگا دیتا ہے اور خواب نہ آئیں تو اسے اسی رات کی طوالت سے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا تو سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ بستر چھوڑنے کا بالکل بھی من نہیں تھا مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو کچلنا بھی ہے کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار چھینٹے مارے اور سوجی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاک و چوبند اور تیار بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنج میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں الجھا ہوا سا لاؤنج ہال کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی۔ لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسہ نہیں تھا اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ خلل کثرت حسن کی وجہ سے تھا یا نفرت زر کی وجہ سے.....؟

کیونکہ یہ دونوں ہی اپنے اندر دماغی فتور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہال میں داخل ہوا تو خلاف معمول لیلیٰ بڑی پرسکون سی پیانو کے قریب بیٹھی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیانو کی کلوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا۔

''تمہیں پیانو بہت پسند ہے.....؟ بجانا سیکھنا چاہتے ہو؟''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرائی۔ ''میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سن لی تھی۔ تم چاہو تو اسی پیانو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو..... تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی..... وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے.....''

میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کرم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں میرا سوال پڑھ لیا۔

''ہاں..... مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا پڑے گا.....؟''

''کیسا تعاون.....؟ میں کچھ سمجھا نہیں.....''

وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''جب سے میں اس محل میں آئی ہوں..... مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی قید خانے میں آ گئی ہوں۔ بہروز مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں..... بہت خیال رکھتے ہیں میرا..... مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط کی انتہا کبھی کبھی میرا دم گھونٹنے لگتی ہے۔ جس سے سانس بند ہونے لگتا ہے

میرا۔ میں اپنی ہم عمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں۔ وہاں ترکی میں تو میں کسی تتلی کی طرح خوشی میں اڑتی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پہرے ہیں.....''

میں نے دھیرے سے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ سب آپ کی ہی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے..... مالک کے دشمن بہت ہیں۔ جو ہر پل انہیں نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں.....''

لیلیٰ نے اداسی سے ایک سرد آہ بھری۔ ''جانتی ہوں میں..... لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح پہروں میں نکلنے سے میں آغا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہو جاؤں گی.....؟ اگر میں اسکارف اور نقاب کے ساتھ سارا دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا.....''

میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں.....؟''

لیلیٰ نے غور سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود جھک گئی۔ ''میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دم چھلا بن کر میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑاتی ہیں میرا میں تمہیں بتا نہیں سکتی.....''

میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلیٰ نے جلدی سے بات جوڑی۔ ''میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں تو مذاق بن ہی جاتا ہے..... میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھاوے کے لیے میرے ساتھ گھر سے نکلا ضرور کرو۔ مگر کسی مال یا شاپنگ پلازہ میں اسکارف اور نقاب پہن کر اپنا حلیہ بدل لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کیفے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دوبارہ واپس آیا کروں گی اور ہم دونوں ایسے ہی معمول کے طور پر باہر نکل کر گھر آ جایا کریں گے۔ جیسے تم ہمہ وقت میرے ساتھ ہی تھے۔ آغا بہروز کو بھی اطمینان رہے گا کہ میری نگرانی کے لیے تم ساتھ تھے۔ تمہارا بھرم بھی سب پر قائم رہے گا اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے ان ساری زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی جی لیا کروں گی..... بولو..... میرا ساتھ دو گے پری زاد.....؟''

اپنا نام لیلیٰ صبا کی زبان سے سن کر میں زور سے چونکا۔ اس نے آج تک کبھی مجھے یوں براہ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ لہجے، کچھ بولیاں، کچھ تلفظ اور کچھ لبوں کی ایک جنبش سے ہی عام سے حرف، لفظ اور نام کتنے معتبر ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پاگل تھا، پل بھر میں ہی یہ بھول گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکارتی رہی ہے۔ مگر میں ابھی تک اس لہجہ بدلنے کے فن اور ہنر سے واقف نہیں تھا۔ لہٰذا میرا جواب بھی سیدھا سا تھا۔

''شاید مالک میرا یوں لاؤنج میں بیٹھ کر پیانو سیکھنا پسند نہ کریں۔ میری حدود اس لاؤنج سے باہر تک ہیں.....''

لیلیٰ نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ ''کوئی بات نہیں، تم اپنی انیکسی میں پیانو رکھوا سکتے ہو۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا..... میں آج ہی تمہارے لیے ایک نیا پیانو بک کروا دیتی ہوں۔

ویسے بھی میں بہت عرصے سے انیکسی کی نئی تزئین اور آرائش کا سوچ رہی تھی..... اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا.....''

جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔ اگلے دو دن کے اندر انیکسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا۔ نیا رنگ، نئے پردے، قالین، پینٹنگز، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا خوبصورت پیانو، جب کاریگر وہ پیانو انیکسی کے ہال میں رکھوا کر اس کی فٹنگ کر رہے تھے تو میں وہیں بیٹھا اپنے ایک دیرینہ خواب کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ خواب حقیقت میں ڈھلنے لگیں تب بھی بہت دیر تک ہمیں خواب ہی لگتے ہیں۔ شاید انسان سدا کا بے اعتبار ہے یا پھر مجھ جیسے، جن کے خواب ،سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ انہیں خوابوں کی تعبیر پر ذرہ دیر سے ہی یقین آتا ہے۔ اسی شام مارتھا نے مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں پیانو کی بنیادی کلوں اور سروں کے بارے میں پہلی کلاس دی اور تیسرے دن میری انگلیوں نے پہلی مرتبہ کسی دھن کو چھیڑا۔ اس درمیان لیلیٰ دو مرتبہ گھر سے باہر نکلی اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المنزلہ شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس نے اپنے منصوبے کے مطابق خود کو اسکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا، میں وہیں ایک کیفے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور وہ قریباً تین، چار گھنٹے کے درمیان واپس لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں اطراف آنے اور جانے کے راستے واقع تھے اور لیلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے راستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اس سہیلی سے ملنے کے لیے گئی جہاں میں پہلے بھی ایک بار اس کے ساتھ جا چکا تھا۔ مگر اس بار اس نے مجھے نچلے فلور پر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور خود لفٹ کے ذریعے اوپر چلی گئی۔ بہروز کے واپس آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے لیلیٰ کی بات مان تو لی تھی مگر میں اندر سے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں بہروز کا حکم نہ مان کر بہت برا کر رہا ہوں مگر لیلیٰ کی آزادی کی خواہش بھی مجھے اتنی ہی جائز لگ رہی تھی۔ عجیب کش مکش جاری تھی میرے دل اور دماغ کے درمیان..... دل کہتا تھا کہ لیلیٰ صبا کا ساتھ دے کر میں نے کچھ غلط نہیں کیا مگر دماغ کچھ الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ جانے یہ دل اور دماغ نامی دو سوکنوں کی آپس میں کبھی بنتی کیوں نہیں تھی.....؟ مگر یہ خوف مجھے بہر حال مستقل لاحق رہتا تھا کہ اگر لیلیٰ کو اس کی مٹر گشت کے دوران کوئی نقصان پہنچ گیا تو بہروز تو کیا..... میں خود بھی اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔ آخر کار اس شش و پنج نے جب مجھے پوری طرح نڈھال کر دیا تو تیسرے دن لیلیٰ کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیلیٰ جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی میں بھی کیفے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ نے خود کو ایک لمبی سی عبایا سے ڈھانپ رکھا تھا وہ سڑک پار کر کے دوسری جانب بنی ایک پارکنگ میں پہنچی جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کروزر ٹائپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ گاڑی میں پہلے بھی لیلیٰ کی دوست کے اپارٹمنٹ کے نیچے کھڑی دیکھ چکا تھا۔ مطلب لیلیٰ اپنی اسی دوست سے ملنے جا رہی تھی، یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی

تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اسے آگے جاتی سیاہ لینڈ کروزر کے پیچھے چلنے کا کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں لیلیٰ کو بتائے بغیر اس کی نگرانی جاری رکھوں گا۔ اس طرح میری الجھن کا حل بھی نکل آئے گا اور لیلیٰ کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ دوبئی کی سڑکوں کا ہجوم اور ٹیکسی کے لیے مقررہ رفتار کی حد ہماری گاڑی کی راہ میں حائل تھی مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے مگر پھر ایک سگنل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے لیلیٰ کی گاڑی ہماری نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوئی اوجھل ہوگئی کیونکہ وہ ہم سے پہلے ہی سگنل پار کر چکی تھی۔ سگنل کھلنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں مگر ناکام رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اسی مال کے باہر آ کر رک گئے جہاں سے میں نے ٹیکسی پکڑی تھی۔ مجھے کیفے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر لیلیٰ کی صورت دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ہم واپس گھر پہنچے تو لیلیٰ اتر کر اندر چلی گئی اور میں نے ٹیکسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے عقب میں ایک گرج دار آواز گونجی۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی تم لوگوں نے.....؟'' میں گھبرا کر واپس پلٹا۔ کچھ فاصلے پر بہروز کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

باب 10

بہروز کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہو گیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ نکلتا ہے مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری چھپائے نہیں چھپتی۔ میں نے پڑ بڑا کہ بہروز کو سلام کیا۔

''مالک آپ واپس آ گئے۔''

بہروز مسکرایا۔ ''تو کیا کچھ غلط کیا واپس آ کر..... مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے۔''

میں نے نظریں جھکائے صرف اتنا بتایا کہ مالکن کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی لہٰذا ہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انسان کے جسم اور اس کے دماغ کو سلانے اور سن کرنے کے لیے ہزاروں دوائیں بازار میں مل جاتی ہیں۔ مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کر پائے جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سلا دے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لیلیٰ نے باہر نکلنا کم کر دیا۔ اب وہ تین چار دن بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی اور زیادہ تر گھر میں رہتی تھی۔ ان دنوں میں مجھے مارتھا سے پیانو سیکھنے کا بھرپور وقت ملا اور مہینے بھر میں ہی میری انگلیاں پیانو پر خوب چلنے لگیں۔ خود مارتھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی، ایک شام میں تنہا بیٹھا پیانو پر کسی نئی دھن کی مشق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر مگن ہو گیا کہ مجھے انیکسی کے دروازے سے اندر ہال تک آتے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دی اور میں اس وقت چونکا جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔

''اچھا بجا لیتے ہو.....''

میں گھبرا کر چونک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''معاف کیجیے۔ مجھے آپ کے آنے کا پتہ نہیں چلا۔''

بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''انسان کو اپنے اندر اتنا مگن نہیں ہونا چاہیے کہ اسے اپنی

طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہ دے۔ آنے والا دشمن بھی ہوسکتا ہے۔''

میں نے دوبارہ بہروز سے معذرت کی، اس نے آگے بڑھ کر پیانو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔

''مجھے صبا نے بتایا تھا کہ اس نے انیکسی میں پیانو رکھوا دیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالکن کا اعتبار جیت لیا۔ حالانکہ لیلیٰ صبا جیسی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے۔ ایسا کیا جادو ہے تمہارے پاس پری زاد.....؟ کبھی ہمیں بھی تو بتاؤ.....''

میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر حسب معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں چپ رہا بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔ اگلے ہفتے کی ابتدا سے ہی محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہوگئی۔ پتہ چلا کہ دو دن بعد لیلیٰ صبا کی سالگرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لیلیٰ بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے لیلیٰ کے اس کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری اُداسی چھپی دکھائی دیتی تھی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نا معلوم سی اُداسی لے کر وارد ہوتے ہیں۔ یا پھر ساری بات توازن کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے۔ زندگی کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے، اگلے روز جب بہروز سالگرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بہروز کے قریب آیا، اور اس نے جھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کی، لیلیٰ بھی اُسی وقت وہاں پہنچی تھی۔ اُس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور کش مکش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔

''تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز یوں وقت بے وقت اپنے مالک کو پریشان مت کیا کرو۔''

فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایک آدھ دن آگے نہیں ہو سکتا یہ سودا.....؟''

''نہیں مالک وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں اتنا لمبا انتظار نہیں کریں گے ہمارا..... اُن کا زیادہ دیر جزیرے پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ''مگر فیروز خان..... تم جانتے ہو کل تمہاری مالکن کی سالگرہ ہے اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔''

لیلیٰ نے چلا کر پوچھا۔ ''کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے؟''

بہروز نے ٹھنڈے لہجے میں لیلیٰ کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سودے کے لیے اُسے دو راتوں

کے لیے ایک قریبی جزیرے پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تو تھا مگر فیروز خاں نے ابھی آ کر بتایا کہ انہیں آج شام ہی نکلنا ہوگا۔ لیلیٰ یہ سنتے ہی غصے سے کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے آغا تو پھر آپ جائیں اپنے ضروری سودے کے لیے۔ مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منانی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔''

لیلیٰ پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لیلیٰ کے جانے کے بعد بہروز نے غصے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔

''کر دیا نا اُسے ناراض فیروز خان..... تم کبھی موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتے جاؤ..... چلنے کی تیاری کرو۔ میں اُسے منا کر آتا ہوں۔''

بہروز بھی اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اُس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا۔ مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لیلیٰ صبا بھی اُسے پورچ تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ البتہ لیلیٰ کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ لیلیٰ بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدہ نبھانے کی زنجیر سے بندھا رہتا ہے۔ شاید ہم دوسروں سے کیے وعدے تو نبھا لیتے ہیں مگر ہمارے خود اپنے آپ سے کیے وعدے سدا وفا ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتادوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کرسکتا۔ ہاں یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کے دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع لیلیٰ نے سرِ شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں انہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سہیلی رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دبے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے کیونکہ مالک نے مجھے جاتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں کیونکہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے نکل رہا ہے، وہ سودا اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرسکتا ہے۔

لیلیٰ نے میری بات سن کر ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر واپس آجاؤں گی۔ میری دوست نے میری سال گرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔''

لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں نے اپنے ساتھ لیے ہوئے وعدے کی لاش اپنے کاندھوں پر اُٹھائے وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کھڑا رہ گیا۔ شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ

لائٹ میں لگی بتیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلنا شروع ہو چکی تھیں جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کر لیا اور میں نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکاف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔

''آپ نے بہت دیر کر دی۔ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق محافظوں کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔''

لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ''ہاں بس دیر ہو گئی۔ مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے۔ لہٰذا انہیں بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اس وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرد فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے جان آغا۔ دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آ پہنچے۔''

میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ دور اندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان آ کر ہماری جانب بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے۔ پس منظر میں ہمارے محافظوں کی وہ جیپ بھی نظر آئی جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چکما دے کر گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کانپنے جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کے ٹھوڑی اُٹھا کر لیلیٰ کا جھکا ہوا چہرہ بلند کیا۔

''یہ کیا بات ہوئی جان آغا۔ میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سہیلی بنا لی ہے تم نے یہاں ہمیں بھی تو اس سے ملواؤ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ رکھ پائیں۔''

لیلیٰ نے جلدی سے جھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''معاف کر دیں مجھے آغا بڑی بھول ہو گئی مجھ سے مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آ گئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہو گی۔''

بہروز کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ''میں تمہیں تو معاف کر دوں گا جان آغا..... مگر اسے کبھی معاف نہیں کروں گا جس نے تمہیں بہکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ کون ہے وہ بدنصیب.....؟''

لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اُٹھایا۔ ''کہا نا آغا۔ بڑی غلطی ہو گئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اُوب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ٹاپ فلور پر ایک بہت اچھا ریستوران ہے۔ سوچا کافی پی کر دل بہلا لوں گی اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔''

بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا۔ ''کون ہے وہ جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا؟''

لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اُٹھادی۔ ''یہ پری زاد یہی مجھے اس طرح کی اُلٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے۔ مجھے اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔ میں کوئی پنجرے میں قید قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر جیوں۔''

لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر میں ہی اپنے حواس کھو بیٹھا تھا مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے پل بھر نظر ملی اور مجھے لگا میرے سامنے لیلیٰ نہیں ناہید کھڑی ہے اور ہم دوبئی میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ صبا کی بات سنی اور میری طرف پلٹا۔

''اچھا تو یہ ہے وہ نمک حرام۔ اس سے مجھے ایسی اُمید ہرگز نہ تھی۔ مگر جان آغا! تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں، اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو۔ پھر میرا کیا ہوتا۔ تمہیں ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

لیلیٰ روتے ہوئے گڑگڑائی۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا۔ اس پری زاد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میرے راہ سے بھٹکا دیا۔ میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری کو بھڑکا دیا تھا اس نے آپ تو جانتے ہیں میں آپ کے بنا کتنی تنہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا۔ تبھی مجھے اکیلے گھر سے نکلنے پر اُکساتا رہتا تھا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔''

میں حیرت سے گنگ اور اپنی جگہ جما کھڑا لیلیٰ کی یہ ساری خرافات سنتا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔

''تم بتاؤ پری زاد کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے..... اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے۔ سزائے موت.....''

میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق سی کھڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلایا۔

''جواب دو لڑکے کیا یہ سچ ہے۔''

میں نے سر جھکا لیا۔ ''جی ہاں مالکن جو کہہ رہی ہیں۔ سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔''

ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو نارمل کر لیا۔ بہروز کریم نے سرسراتی آواز میں مجھے سے پوچھا۔

''کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ تمہاری گنتی کی چند سانس باقی رہ گئی ہیں۔''

میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ''جی مالک بس ایک آخری خواہش ہے مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کر دیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تیسے اس چہرے کے ساتھ گذار لی مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔''

بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصے سے زیادہ افسوس کا عزم محسوس ہوا۔

''جانتے ہو۔ مرد کی بربادی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ ٹھیک اس لمحے جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر برباد کر لیا پری زاد برا کیا۔ بہت برا کیا تم نے۔''

بہروز پلٹا اور زور سے چلایا۔ ''اُسے لے آؤ فیروز خاں۔''

بہروز کی آواز اس ویران تہہ خانے کی پارکنگ میں گونج کر رہ گئی۔ اس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لیلیٰ خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی۔ کیونکہ یہ پارکنگ تقریباً متروک ہو چکی تھی اور اپارٹمنٹ والے اب چھت پر بنی نئی پارکنگ کا استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے لیلیٰ کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرہ کم ہی تھا۔ مگر آج وہی ویرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں ہمارے لیے وبال جان بن گئی تھی۔ بہروز کے چلانے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو محافظوں کی مدد سے ایک خوبصورت اور ہینڈسم سے نوجوان کو سختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر ٹیپ لپیٹے ایک جانب سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا کیونکہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر لیلیٰ کے جسم سے تو جیسے خون کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں زور سے چلائی۔

''نہیں آغا نہیں اس میں ولید کا کوئی قصور نہیں بخش دیں اسے۔''

لیلیٰ دوڑتی ہوئی آئی اور بہروز کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بہروز نے کسی ان دیکھی اذیت کے احساس سے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں اور دھیرے سے یوں بڑبڑایا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

''کیوں جان آغا کیوں.....؟ کس چیز کی کمی تھی تمہیں.....؟ کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، عیش، آرام، دولت، جائداد، رتبہ، عزت آخر کس چیز کی کمی تھی میرے پاس تمہیں۔''

لیلیٰ زار و قطار رو رہی تھی اور وہ اجنبی نوجوان بہزاد کے محافظوں کے شکنجے میں تڑپ رہا تھا۔ بہزاد نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''یہ وہی ہے نا تمہارا گذشتہ منگیتر استنبول والا ولید؟''

لیلیٰ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ''ہاں آغا یہ وہی ہے۔ اسے میری محبت یہاں کھینچ لائی۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ پر میں اپنی پہلی محبت کبھی بھلا نہیں پائی۔ معاف کر دیں ہم دونوں کو میں آپ

کی منت کرتی ہوں۔ کم از کم اسے جانے دیں۔"

بہروز نے کرب سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ رقیب کو سامنے زندہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک اس کے لیے اپنے محبوب کی زبان سے تعریف سننا ہوتا ہے۔ بہروز نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

"واہ اے عورت واہ ساری کائنات کے سربستہ راز ایک جانب اور تیرے من کا گورکھ دھندا ایک طرف تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔"

بہروز ایک جھٹکے سے فیروز کی طرف مڑا۔ "میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز خان..... ہمارے پیچھے کچھ چکر چل رہا ہے اب دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے....."

فیروز خان نے سر جھکا لیا۔ اب مجھے بہروز کی منصوبہ بندی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے لیلیٰ کی نگرانی پر رکھا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لیلیٰ صبا میری نگرانی میں غیر محتاط ہو جائے گی اس کی سالگرہ والے دن جزیرے پر جانے کا پروگرام بھی ساری ڈرامے بازی تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے لیلیٰ کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس لیلیٰ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا سب مہرے بہروز نے بہت ناپ تول کر چنے تھے ساری بساط ہی بہروز کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور بازی بھی اُسی کے ہاتھ تھی۔ بہروز نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف دیکھا۔

"مجھے لیلیٰ صبا بہت پیاری ہے فیروز بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے میں نے لیلیٰ سے دھیان رہے اسے مرتے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو۔ اور ولید چونکہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہٰذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہروز کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام لچے لفنگے عاشقوں کی طرح مارا گیا تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ لے جاؤ ان دونوں کو۔"

لیلیٰ زور سے چلائی۔ "نہیں آغا نہیں۔"

فیروز نے محافظوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے لڑکے اور لیلیٰ کو لے جانے لیے کھینچا۔ بہروز دھیرے سے بڑبڑایا۔ "عشق بڑا ظالم ہوتا ہے۔ جان کا صدقہ لیے بنا کہاں ٹلتا ہے۔"

اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہروز کی طرف بڑھا۔ "انہیں معاف کر دیں مالک ان کا قصور بہت بڑا ہے۔ مگر آپ رحم کریں۔"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خودکار مشین گن کا دستہ پوری قوت کے ساتھ ٹکرایا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے تہہ خانے کے کسی کونے سے دو فائرز کی آواز سنی اور اُس سے زیادہ بلند لیلیٰ کی کرب ناک چیخ تھی پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنسدان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب انسانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) تھم جائے تو اسے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے اور روح نکل

جانے کے بعد انسانی جسم کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں جانے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شائد آخری پہر تھا میں کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ ضرور بہروز نے ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور اب میں کمرے میں نہیں۔ کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہروز نے زندگی کے کسی امتحان میں بھی پورا نہیں اتر پایا تھا میں چلو۔ جو ہوا اچھا ہوا قصہ تمام ہوا۔

شجر تو تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے
خود اپنے سائے میں چل کر سفر تمام کیا

مگر میرا سفر ابھی کچھ باقی تھا شاید اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی اور کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا۔

"پری زاد۔ ہوش میں آؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

باب 11

رومی کہتا ہے کہ ''تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکنا نہیں..... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔''

میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا، مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔

''پری زاد..... ہوش میں آؤ..... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں.....''

میری چندھائی ہوئی آنکھوں نے فیروز خان کا دھندلا سا ہیولا دیکھا جو مجھ پر جھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحوں کی غنودگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے کے بستر پر موجود تھا، فیروز نے میرا چہرہ تھپتھپایا۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں.....''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دوپہر کی تیز دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سدھ پڑا رہا تھا۔ میرے سر میں ابھی تک درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چکر آیا اور میں نے جلدی سے پلنگ کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سرخ اور سیاہ دائرے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں مکینوں کے بنا کتنی ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا جادو ٹونا ہے لوگوں کو تو اپنی عادی بناتا ہی ہے۔ یہ گھر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی فیروز نے گاری آگے بڑھا دی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

''مالک کہاں ہیں.....؟'' فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔

''وہ وہیں گھر پر رہیں گے تین دن..... مالکن کے سوئم کے بعد ہم بھی واپس چلے جائیں گے گھر.....''

میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھناکا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس جو میرے سینے میں کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی۔ فیروز نے ایک جھٹکے میں ہی اسے کھینچ کر باہر نکال دیا، کچھ تیر جن کے دو موہے سرے آگے کی جانب سے باہر کو مڑے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ جتنی اذیت اس تیر کو جسم سے باہر کھینچ کر نکالنے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امیدیں لگائے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور ہماری امیدیں اکثر دغا دے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو قریبی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ڈرائیور نے رپورٹ درج کرائی کہ جیسے ہی اس کی مالکن لفٹ سے باہر نکلی، ایک نوجوان نے اس کی مالکن پر حملہ کر دیا اور نوجوان کے پستول سے نکلی گولی لیلیٰ کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ ڈرائیور کی جوابی گولی سے نوجوان بھی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی جس پستول سے نکلی تھی وہ بنا لائسنس تھا اور نوجوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا پسٹل لائسنس والا تھا جو ڈرائیور نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھانے میں جمع کرا دیا تھا اور اس وقت ڈرائیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کروا دیا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آسکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی ہوئی تھی کہ آخر مرنے والے اس نوجوان کا مقصد کیا تھا؟ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہوسکتا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی۔ مگر میں ان سب باتوں سے لاتعلق اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا.....؟

یہ محبت انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنا دیتی ہے۔ آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو.....؟..... حسن، صورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت ..... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوا مانگتی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک ہفتے تک کسی اور کوٹھی میں منتقل بلکہ مقید رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے۔ مگر جیسے تیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزر ہی گیا۔ آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں موجود تھے۔ مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا۔ وہ چپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا ہوا دور خلا میں کچھ گھور رہا تھا۔

''آ گئے تم لوگ.....؟ اچھا کیا..... مگر کچھ دنوں تک اب ذرا محتاط رہنا..... معاملہ تازہ ہے۔''

فیروز سر ہلا کر باقی ساتھیوں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تنہائی پاتے ہی میں نے

براہِ راست پوچھ لیا۔ ''آپ نے انہیں مار کیوں دیا.....؟ آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے..... پھر.....؟''

بہروز اب بھی گم سم تھا۔ ''محبت کرتا تھا، تبھی تو مار ڈالا.....''

میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہوگئی۔ ''مگر کیوں.....؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے، جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی..... آپ کے ساتھ نہ سہی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں.....''

بہروز نے میری طرف دیکھا، میری نظر جھک گئی۔ ''اتنا ظرف نہیں تھا مجھ میں پری زاد..... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خودغرض..... بڑا کم ظرف بنا دیتی ہے..... جو لوگ محبت میں قربانی ایثار اور بانٹ دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں..... یہ سب بکواس ہے..... جھوٹ بولتے ہیں وہ سارے..... محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خودغرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خودغرضی اور سب کچھ پالینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھ لو ان کی محبت میں ہی نرا کھوٹ ہے.....''

بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں کھل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اسے دل کی بات سنانے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کر پاتے کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔

''پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ نے..... میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا..... مجھے بھی وہیں مار ڈالتے.....''

بہروز اب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ''ہاں..... تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت..... بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا..... کیوں خود سے اتنی نفرت کرتے ہو.....؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی..... یہ سب لوئر مڈل کلاس طبقے کی محرومیاں ہوتی ہیں، مرد دولت، اختیار، طاقت اور رتبے سے مکمل ہوتا ہے..... یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فلمی ستاروں کی ضرورت ہوتا ہے..... سپنوں کے شہزادے صرف ناولز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پری زاد.....''

میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لبنیٰ کی ماں نے بھی کہی تھی..... اب میں بہروز کو کیا بتاتا کہ دنیا خود چاہے کتنی بھی کرخت اور سفاک کیوں نہ ہو..... اسے بدلے میں ہمیشہ سپنوں کے شہزادے ہی درکار ہوتے ہیں۔ پھر اچانک بہروز کو کچھ یاد آ گیا۔

''ہاں..... مگر تمہیں خودکشی کا اتنا شوق کیوں ہے.....؟ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے درپے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آئی قضا تمہارے حصے منتقل کرنا چاہتی ہے..... پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ کیوں بولا.....؟''

''اس لیے کہ میں آپ کے نوکروں اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لیلیٰ مالکن نے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی سہیلی یا رشتہ داروں سے ملنے جاتی ہیں اپنی تنہائی سے گھبرا کر..... ورنہ میں کبھی آپ سے نہ چھپاتا.....''

بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں جانتا ہوں..... اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہر حال..... تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا..... میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمہ داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملتے جانا۔ اور ہاں اب تم انیکسی میں ہی رہو گے.....''

بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انیکسی میں واپس آ گیا۔ اگلے روز فیروز مجھے ایک آراستہ دفتر میں پہنچا دیا۔

''یہ آج سے تمہارا دفتر ہے۔ مالک نے تمہیں مینیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے..... باہر بیٹھا عملہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔''

میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا۔ ''تم بہت جذباتی ہو..... مگر وفادار ہو..... اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں..... تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہوگا کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا بکھیڑا نہ کھڑا کر دے..... لہٰذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ ویسے بھی دوبئی کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یکساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔''

فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی ہوئی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا، کل کی ایک غریب بستی کا پری زاد آج دوبئی کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا مینیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین مرتبہ اسے گھما کر بارھویں منزل پر واقع اپنے دفتر کی بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے دوبئی شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانا راز بھی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے حقیر اور کیڑے مکوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی بنا بتائے کسی کام سے دوبئی آ گیا اور عملے سے پوچھتے پاچھتے فیکٹری کے دفتر تک آ پہنچا۔ مجھے مینیجر کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چپڑاسی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔

''اب کچھ کہو گے بھی یا یونہی گم سم بیٹھے رہو گے.....؟''

رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے انڈیل لیا۔''پری زاد پیارے..... سچ بتاؤ تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے ہو جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتا نہیں سکتے.....''

میں نے گہری سانس بھری۔''نہیں..... میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ چھپانے کی ضرورت پیش آئے۔''

مگر میرے جواب سے رفیق کی تشفی نہیں ہوئی۔''دیکھو پری زاد..... میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جس کی ہمیں بھی خبر نہیں ہوتی۔ اگر خود کو کسی ایسی گرہ میں الجھا بیٹھے ہو تو ابھی بھی وقت ہے۔ میں تمہیں چپ چاپ دوبئی سے پار کروا سکتا ہوں۔ ایک دو دوست ہیں میرے لانچ والے..... کسی کو تمہارے فرار کی خبر نہیں ہوگی.....''

میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔''مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے..... بولو..... خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو.....؟ ہے کوئی ایسی لانچ، بحری جہاز یا اڑن کھٹولہ جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کروانے میں مدد کر سکے.....؟''

رفیق کی پلکیں نم ہو گئیں اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔ میرے دن اور رات پھر سے اسی یکسانیت کا شکار ہونے لگے۔ جس سے میں ہمیشہ ہی بہت بے زار رہتا تھا۔ البتہ پیانو سے میری دوستی پکی ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کی موت کے بعد مارتھا نے محل میں آنا بند کر دیا تھا مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی دھنیں بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھر پر ہی رہتا تھا، خاموش کھویا کھویا اور گم سم سا..... اس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں مالک.....؟''

''ہاں..... کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں..... حالانکہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا.....''

بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بھلا دیتے ہیں، رشتے، ناطے، دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی..... تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے..... کاش یہ مقدر انسان کو کوئی اور اختیار نہ دیتا..... صرف یادیں بھلانے کا مختار بنا دیتا۔ میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں رہ سکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد وہ واپس آ گیا۔ مگر اس کے واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی، یہ بعد میں پتہ چلا جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس ترک نوجوان ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دوبئی پہنچ کر پھر سے لیلیٰ صبا اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کروانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن

بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہوگئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے..... بہروز کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا، رات کو بہروز نے ہم سب کو محل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے لیے بلایا، اور پرسکون لہجے میں بتایا کہ دوبئ پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہوچکی تھی اسے بھی دوبارہ گرفتار کرلیا گیا ہے، لہٰذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد کھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں نکلنا چاہتا ہے نکل جائے..... اور ہوسکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں..... کیونکہ دوبئ پولیس بہت عرصے سے اس موقع کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی اکھاڑنا شروع کردیں۔ کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں رکے رہے، باقی تمام ممبران نے حسب توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سنادیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو..... واقعی، بہروز نے اپنے اردگرد بہت چن کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جاتے ہی دروازہ بند کیا اور پریشانی سے بولا۔

''ہم سب یہیں رہیں گے..... مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے..... ان حالات میں انڈیا یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروادیتا ہوں..... ابھی سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں ہوئی..... دو راتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے.....''

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سنی..... ''کبھی کبھی روپوشی انسان کو مزید ظاہر کردیتی ہے فیروز خان..... تم پری زاد کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ..... اس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں..... میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کے ساتھ نتھی کرکے دھر لیا جائے.....''

بہروز کریم کا لہجہ حتمی تھا۔ فیروز مایوس سا وہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔

''جب کوچ کرنے کا وقت آئے تو ضد مت کرنا..... چلے جانا.....''

میں نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''آپ جانتے ہیں آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں.....''

بہروز نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور ایک چیک میری جانب بڑھایا۔ ''اسے رکھ لو..... برے وقت میں کام آئے گا اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو..... یہ دنیا مرے ہوئے کو مزید مارتی ہے۔ مگر جو سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہوجائے اور اس دنیا کو للکارے اسی کو سلام کرتی ہے..... دنیا کو للکارنا سیکھ لو پری زاد..... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی، اور

تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بہلانے کو ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے جو محبت پا کر اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش تمہاری طرح میں بھی عمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا.....''

میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا.....''

لیلیٰ صبا کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دوبئی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو کیونکہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے اردگرد راستوں کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حتمی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے بمع بہروز دو بڑی لانچوں میں بنکاک یا کسی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر لکھا فیصلہ پڑھ کر بہروز سمجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی سنگینی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سال گرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ڈھونگ رچایا اور شہر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیئے گئے۔ طے یہ پایا کہ شام کا اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی۔ فیروز خان بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا، تب تک میں اور دیگر عملہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام سے ہی محل میں ہل چل سی مچ گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے۔ اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک ہمیشہ کی آزمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔

فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے..... یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں..... کوئی حرج نہیں ہے..... مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو.....''

بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ڈرائیور کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کا کہا اور گھر سے نکلتے ہوئے میں نے لاؤنج میں پڑے بہروز کے سگار کیس سے ایک سگار اٹھا لیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھے کہ کار میں بہروز بیٹھا کہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام جڑ دیئے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیا، اوقات کار اور عادات ہماری پہچان بن

جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلتے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی جیپ ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کا کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دوبئی کی سڑکوں پر ادھر سے ادھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیپ کو ہم نے برابر یہی تاثر دیے رکھا جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان چھڑانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں میں نے ایسے مناظر بار بار دیکھ لیے تھے مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں کبھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے۔ جہاں تک اس جہان ناتمام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہین جو کبھی ان کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو؟ یہ تخیل کیا بلا ہے؟ جو انہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔

مگر میرا پیچھا کرنے والی جیپ میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کا کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ نے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بمشکل ان سے معذرت کی کہ مالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشائیہ تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا۔ مگر مجھے بہرحال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سمیٹے رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نپٹا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں..... ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دلچسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے ہجوم میں تنہا کھڑا محفل کو برخاست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا تھا۔ پھر اچانک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور سا اٹھا۔ چند لمبے بعد دوبئی پولیس کا ایک بڑا افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ تحکمانہ تھا۔

''تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے.....؟''

''بس آتے ہی ہوں گے مالک.....''

افسر مخصوص عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔ ''ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔''

میں نے سادگی سے جواب دیا۔ ''جب وہ واپس آئیں تو گرفتار کر لیجیے گا.....''

مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھیرے دھیرے چھٹنے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا ماتحت باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی بھنویں تن گئیں اور وہ غصے سے میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے.....''

باب 12

میرا دل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا۔ ''میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں۔ تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال تم پر کوئی واضح الزام نہیں ہے مگر شک کی بنیاد پر تمہیں حراست میں لیا جاتا ہے.....''

کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں کرتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہ راست رشتہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے لاک اپ میں پہنچایا گیا تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حوالات نما کمروں میں بند پایا، بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا اور میں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اس وقت تک ہے جب تک اختیار اس کے اپنے ہاتھ میں رہتا ہے، جب ہمارے فیصلوں کے مختار دوسرے بن جائیں تو ایک ان جانا سا سکون اور ٹھہراؤ ہمارے وجود کی بے چینی کو گھیر لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھے بھلا کاہے کی فکر ہوتی.....؟

اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسب معمول سکون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''کہو پری زاد.....نیند کیسی رہی؟..... کہتے ہیں مشکلات سے دور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں..... مشکل ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلا نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا مگر وہ اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سناٹا چھا گیا تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی۔

''آپ سو تو نہیں گئے مالک.....؟''

کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی..... ''کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''معذرت چاہتا ہوں..... مالک..... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالکن کے قتل کا اعتراف کر کے جرم اپنے سر لے لوں گا..... اگر آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں تو مہربانی ہوگی.....''

بہروز نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر اسی کی ٹھہرتی ہوئی آواز ابھری..... ''بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لادتا ہے، جتنا وہ ڈھو سکے..... تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے پری زاد..... اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلیٰ سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیئے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد سچ کی تہہ تک پہنچ کر اسے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا..... میں نے زندگی میں بہت جرم کیے ہیں..... کسی نہ کسی مقام پر تو رسی کو تنگ ہونا ہی تھا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ..... مجھے اب بہت جاگنا ہے.....''

پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی آہنی کوٹھڑیوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ بظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے۔ لیکن ان دو قیدیوں میں کتنا فرق تھا ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھر کی نعمتیں سمیٹ کر اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو جبکہ دوسرا وہ بدنصیب تھا جس کی زندگی ہی عمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر میں پیدا ہونے والے اور میری کچی بستی میں جنم لینے والے کسی بھی دو بچوں کی تقدیر میں توازن کیسے رکھتی ہوگی یہ قدرت..... بادشاہ اور فقیر کے گناہ وثواب برابر کیسے تولے جاسکتے ہیں؟ پھر چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں؟ آخر اس فرق کی کوئی تو وجہ ہوگی..... کوئی تو صلہ یا انعام طے کر رکھا ہوگا اوپر والے نے..... کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا۔ یا پھر اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا؟ اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلا کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی بہروز کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب گم سم کھڑے بہروز کریم کا بیان سنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکزی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا، ہم سبھی کی پلکیں نم تھیں۔ بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں زندگی کا المیہ یہ نہیں ہے کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے جی بھر کے زندگی کو جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس تماشے سے اوب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک پل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں۔ تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناپتے ہیں؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں عمر بھر جیتا

رہا.....؟

ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سنادی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی..... چند کو عمر قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ اور نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کر دیے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے جو فوری ہو۔ ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف ہی سزا بن جاتا ہے۔ بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، جائیداد اور اثاثوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا حصہ اپنی بیوی اور بچوں میں بانٹ دیا اور آدھا اپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلاحی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے یکجا کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیر اہتمام کر دیئے جو کریم کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت سخی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایان شان تھا، شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی شدید خواہش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں مگر سزا اور جزا کا یہ نظام خود ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ میں بہروز کریم کے اثاثوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا..... اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیانو میرے نام لکھ دیا تھا اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں آگے تحریر تھا کہ چونکہ اس پیانو کا وزن بہت بھاری اور زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیانو محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل وہیت کھو نہ دے۔ لہٰذا وہ جائیداد جہاں وہ پیانو پڑا ہوا ہے، تمام تر محل اور انیکسی سمیت پری زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا جو ہم سب کی سات نسلوں کے لیے کافی تھا، اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چپڑاسی تک کو برابر بانٹا تھا۔ آخری ملاقات کی رات جب ہم سب کارکن اس سے آخری بار مل کر واپس لوٹ رہے تھے تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔

''تم مجھ سے نہیں ملو گے پری زاد.....''

مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود اعصاب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نم آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا..... آپ کے وکلاء اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از عمر قید میں تبدیل کروا دیتے..... میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے..... قاضی نے تو بس اپنے دستخط ثبت کیے ہیں آپ کے فیصلے پر.....''

بہروز نے سر اٹھایا..... ''شاید میں لیلیٰ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا پری زاد..... لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیمک کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے..... یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا..... میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے تجویز نہیں کی کیونکہ میں نے اسے مار ڈالا۔ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اسی کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری واپسی ناممکن ہے۔ یہ راز تب کھلا جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ تب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے بنا جی نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت تھی اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے سوائے منافقت کے.....''

اس نے مجھے آخری مرتبہ بھینچ کر گلے لگایا۔ ''اور اپنا خیال رکھنا..... بہت قیمتی ہو تم..... مگر نہ جانے کیوں..... خود کو اتنا ارزاں کر رکھا ہے.....''

میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا مگر سپاہی میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھڑی کے پاس رک گیا وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں نے نم پلکوں سے اس کا استقبال کیا۔

''جا رہے ہو فیروز.....؟''

وہ دکھ سے مسکرایا۔ ''ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی۔ دعا کرو کہ کل مجھے ان سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ورنہ میں اوپر جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا.....؟''

میں نے فیروز کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا نبھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم سب ہیں۔ جنہیں تم یہاں تنہا کسی آسرے کے بغیر چھوڑے جا رہے ہو..... کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست.....؟''

فیروز مسکرایا۔ ''پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان..... ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلا لینا..... ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے..... اب تم جاؤ پری زاد..... مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری سجدہ ہی وہاں کام آ جائے..... ورنہ عمر تو بس رائیگاں گئی.....''

میں آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا بہروز اور اس کے وفادار فیروز کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفنا دیا گیا جہاں انہوں نے عروج کی آخری منزل سر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ زوال پذیر ہو گئے۔ بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوت گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھنٹوں بڑے ہال میں گم سم بیٹھا اس بڑے سفید پیانوں کو دیکھتا رہتا تھا جسے کبھی لیلیٰ صبا بیٹھ کر بجایا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیانو کے سروں پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا

کر اس کے نشان مٹا دوں۔ پھر ایک شام مارتھا واپس آ گئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ انگلینڈ اپنی سوتیلی ماں کے پرسے کے لیے گئی ہوئی تھی جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے مارتھا کو پھر سے کام پر رکھ لیا اور اسے انیکسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور لیلیٰ صبا کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ دوبئی واپس بلوا لیا تھا۔ مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کر لی۔

''نہیں پیارے..... یہاں پر تو ہی سجتا ہے..... مالک یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں۔ مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے.....''

میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ ''ٹھیک ہے..... مگر ایک شرط تمہیں میری بھی ماننی ہوگی..... ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا.....''

''کیسی شرط.....؟''

میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ''تم ہمیشہ یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے تھے نا..... یہ تمہارے ریسٹورنٹ کی چابی ہے''

رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ ''تو صرف نام کا ہی نہیں..... دل کا بھی پری زاد ہے.....''

بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ دولت ایک ایسا مقناطیس ہے جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصے میں آئے تھے وہ پیسہ کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مقناطیس تھے۔ میرا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ میں اپنے مینیجرز کی بتائی ہوئی اسکیموں میں پیسے لگاؤں اور پھر ہفتوں بیٹھ کر ان سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استاد مستانہ کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امیروں کو بیٹھ کر یوں دولت گنتا بھی محنت ہی لگتی ہو..... لیکن میں اس جمع تفریق کے کھیل سے چند مہینوں میں ہی اکتانے لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ آنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سر درد بننے لگتی ہے۔ میرے مینیجرز مجھے روزانہ پیسہ کمانے کے نت نئے گر بتاتے اور پھر جب ان کے منصوبے کامیاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے اور جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی بہت حیرت ہوتی تھی کہ میں اب اکتاہٹ سے ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے سنتا تھا۔ انہی دنوں اسپین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا ٹینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کتراتا تھا اور میری حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں نہ جانا پڑے۔ مگر کچھ ایسی صورت حال بنی کہ مجھے بارسلونا جانا ہی پڑا۔ یہ پیسہ بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو پل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری فلائیٹ کا ٹکٹ عملے نے بزنس ایگزیکٹو کلاس

میں سب سے اونچی تقسیم کا بک کروایا تھا۔ لہٰذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا عملہ میرے آگے بچھا جارہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روٹ پر چلنے والی لوکل بس یاد آ گئی۔ جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک ان گنت سفر کیے تھے۔ کیونکہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر ترس کھا کر چند سکوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکنے کی اجازت دے دیتا تھا۔

اسپین کے جس سات ستارہ ہوٹل میں میرا قیام تھا اس کے صدارتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دور سفید پتھر اور لکڑی سے بنا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے مہربانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہوجانے کی خوشی میں مجھے اسی اکھاڑے میں بھینسے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر ڈالا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر میرے میزبان بضد تھے کہ کوئی اسپین آئے اور یہ تماشہ نہ دیکھے تو اسے کفران نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے سبھی بڑے شہر اب ایک جیسے لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ وہی نفسانفسی..... وہی سب کا ایک دوسرے کو اپنی سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر اپنے آپ کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا۔ مگر یہ شہر باقی بڑے شہروں سے کچھ جدا دکھائی دے رہا تھا۔ مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آنہ لائبریری سے کرائے پر لی گئی الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں وہی ستونوں کی قوس وقزاح اندرون شہر اینٹوں کی بنی گلیاں اور راستے۔ نئی تعمیر کا شاہکار الف لیلوی گھر اور عمارتیں..... مسلمان کیا تھے..... اور کیا سے کیا ہوگئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے۔ اتنا شاید کسی اور قوم اور مذہب نے نہ دیکھا ہو۔ شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کھچا کھچ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور اسے یہ وحشت بھرے تماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ بل فائٹنگ کے سوٹ پر سرخ جیکٹ اور سر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سرخ چادر لہراتا ہوا ہسپانوی بل فائٹر اکھاڑے میں داخل ہوا تو تماشائیوں نے تالیوں اور سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ کنواری لڑکیوں نے اس وجیہہ لڑاکے پر پھولوں کی بارش کردی۔ مگر بل فائٹر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے ساری روئداد کسی رواں تبصرے کی طرح سنا رہا تھا۔ یہ لڑاکا اسپین کے بہترین بل فائٹرز میں سے ایک تھا جسے لوگ انتونیو کے نام سے جانتے تھے۔ انتونیو آج تک اسپین کے ننانوے جنگلی بھینسوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ سوواں مقابلہ تھا اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سینکڑہ مکمل کرکے ماریا سے شادی کرلے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑا بھینسا (Bull) بھی آج اپنی سویں (100) لڑائی لڑنے جارہا تھا۔ لوگوں نے اس کی طاقت اور وحشیانہ طاقت کی وجہ سے اس کا نام کلر رکھ چھوڑا تھا اور کلر نے اپنے

ننانوے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی بل فائٹر کا جسم ادھیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑاکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مدمقابل آ رہے تھے۔ انتونیو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو چھو کر دیکھا اور کمرے میں بند کلر نے اپنے کھروں سے ریتلی زمین کو کھرچا۔ ماریا نے انتونیو سے وعدہ لیا تھا کہ اس آخری بھینسے کو زیر کرنے کے بعد وہ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے گا۔ کیونکہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نوکیلے سینگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انتونیو نے اپنی سیاہ مخملی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لمبے مخصوص چمڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی نوک زمین پر ٹیک کر ایک شان ادا سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشائیوں کی تالیوں' سیٹیوں اور شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر سجے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سرکا کر انتونیو کو سلام کیا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑا دوسرا سرخ گلاب اپنے محبوب پر نچھاور کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تعظیم سے سر جھکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اس پہلے کہیں دیکھا تھا مگر اس وقت میری پوری توجہ انتونیو اور کلر کے مقابلے پر تھی۔ کلر کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سویں شکار انتونیو کو اکھاڑے کے درمیان کھڑے سرخ کپڑا لہراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مگر کلر اتنی جنگوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سرخ کپڑا نہیں..... بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر اسے نڈھال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دو آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری گھونپ کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا..... مگر اسے یہ لمحہ آنے سے پہلے ہی اپنے اس دشمن کو اپنے نوکیلے سینگوں میں پرو کر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہوگا۔ بل فائٹنگ دراصل بھینسے اور لڑاکے (بل فائٹر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔ انتونیو نے سرخ مخملی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہو گئی۔ کلر کا پہلا وار خالی گیا اور انتونیو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر کلر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں داغوں میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ کلر غضب ناک ہو کر پلٹا اور دور سے بھاگتے ہوئے قریب آ کر اچانک اس نے اپنا زاویہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینگ کی نوک نے انتونیو کے پہلو میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں اور ماریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ انتونیو اور کلر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام حریف سے نہیں ہے۔ انتونیو کے ہاتھ میں پکڑی سرخ چادر اب دھیرے دھیرے چیتھڑوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں کلر کا جسم انتونیو کی تلوار کے چرکوں سے لہولہان تھا وہیں انتونیو کا بدن بھی بے حد مہارت

اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خونخوار قاتل بھینسے کے جسم سے مس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخ بلند ہو جاتی اس نے چلا کر انتونیو سے کہا۔

''انتونیو..... بس کر دو میرے فائٹر..... یہ دیوانگی ہے..... مقابلہ ختم کر دو.....''

مگر انتونیو نے مسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھینسے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے۔ مگر اس نے خود کو بھی کلر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تھا تا کہ بھینسا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انتونیو موقع ملتے ہی اسے ختم کر دے۔ تماشائیوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہو رہی تھیں اور وہ سب انتونیو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انتونیو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کلر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تولتے رہے اور پھر کلر غراتا اور منہ سے جھاگ بہاتا ہوا انتونیو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انتونیو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دستہ مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھے ہوئے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ کلر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تخت یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکائی دی تا کہ اپنے سر کی جانب لپکی تلوار کی نوک سے بچ سکے۔ مگر تلوار دستے تک اس کی سر میں اتر چکی تھی۔ مگر خود انتونیو بھی کلر کے ٹنوں وزنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب زمین کی طرف گر رہا تھا تو کلر کے نوکیلے سینگ اس کے گرتے جسم کا انتظار کر رہے تھے۔ انتونیو کے جسم میں کلر نے اپنے سینگ پرو دیئے۔ اور ایک لمحہ بعد ہی دونوں اکھاڑے کی ریتلی زمین پر گرے اپنے آخری سانس لے رہے تھے۔ دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا۔

''بہت خوب..... تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن.....''

ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سُدھ ہو گئی۔ سارے مجمعے کو جیسے سانپ چھو گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کلر اور انتونیو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشہ ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے تماشے میں اتنا محو تھا کہ بری طرح چونک گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا وہ پراسرار انداز میں مسکرایا۔

''بہت تلاش کیا ہے میں نے تمہیں..... آخر کار آج تم پکڑے گئے.....''

باب 13

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔

''کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں.....''

وہ مسکرایا۔ ''ہم دونوں نہیں .....صرف میں تمہیں جانتا ہوں.....تم پری زاد ہو نا..... بہروز کریم کے جان نشین.....''

''نہیں ..... میں صرف پری زاد ہوں ..... بہروز کا جان نشین بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں.....''

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''لوگ مجھے سیٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں..... بھارت کی شان بمبئی میں رہتا ہوں.....''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بمبئی.....''

''ہاں بھئی.....بمبئی..... یہ نیا نام ممبئی ہمیں تو بالکل نہیں جچتا..... جو بات بمبئی میں تھی وہ اس ممبئی میں کہاں ..... جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں.....کتنی یادیں جڑی ہوئی ہیں ہماری ان ناموں کے ساتھ.....اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمبکٹو کہہ کر بلانا شروع کر دے تو تمہیں کیسا لگے گا؟''

میں اس کے بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ''تم نے مجھے بتایا نہیں..... تم مجھے کیسے جانتے ہو.....؟''

سیٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آ چکا تھا۔ میرا میزبان مجھے مصروف دیکھ کر میرے لیے دوسری گاڑی منگوا چکا تھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو سیٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آ کر رک چکی تھی۔ سیٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارا مالک بہروز مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے..... باقی باتیں شام کو ہوں گی.....''

سیٹھ ابراہیم نے مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر کے چلا گیا۔ شام کو سوئمنگ پول کے کنارے بچھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مدعے کی بات کی۔

''ہاں بولو سیٹھ ابراہیم..... تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟''

سیٹھ دھیرے سے مسکرایا۔ ''تم نے شاید غور سے میرا نام نہیں سنا..... مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دم سے چلتی ہے..... میں زیادہ تر دوبئی میں ہی رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی یہیں مل گئے۔ شاید بہروز نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کا اربوں کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری میں ہی سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے..... کہو، کیا کہتے ہو.....؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں.....؟''

ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتارا۔ ''ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپیہ لگاتے ہیں..... ایک فلم ستر، اسی کروڑ تک چلی جاتی ہے..... فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے..... پٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں..... ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چت بھی میری اور پٹ بھی ہماری..... منافع تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہو تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں چھپ جاتا ہے..... بولو..... پیسہ لگاؤ گے فلم انڈسٹری میں.....''

''تمہاری پیش کش کا شکریہ..... مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے..... میرے پاس جو ہے وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے..... مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنبھلتا.....''

سیٹھ ابراہیم طنز سے مسکرایا۔ ''جانتا ہوں..... تم شاید پہلے بہروز کے خاص محافظ تھے..... مگر یاد رکھو..... اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے..... ہم ان کٹھ پتلیوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے یہ بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ تم نے اپنے ملک میں رہتے ہوئے کبھی یہ سوچا تھا کہ شاہ رخ یا سلمان..... کرینہ یا کترینہ تمہارے بیٹے، بھائی کی سال گرہ میں کیک کٹوانے چلے آئیں..... یا تمہارے خاندان کی کسی شادی میں آئٹم نمبر پیش کرنے کو دوڑے آئیں..... یہ سب ہماری زیر زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور سچ پوچھو تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے..... اور چونکہ بہروز کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عہدے دار تھا..... لہٰذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں..... آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے..... ویسے تم اتنا لیے دیے کیوں رہتے ہو.....؟''

''دوبئی میں بھی مَیں نے تمہیں کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سُنا ہے پیتے پلاتے بھی نہیں ہو؟

کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم نے؟''

میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے اور میں سچ کہہ رہا ہوں..... مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی خواہش نہیں ہے..... میں شاید ازلی غلام پیدا ہوا ہوں..... غلام ابن غلام..... ابن غلام .....اب یہ خوئے سلطانی مجھ میں پیدا ہونا بہت مشکل ہے..... یہ تم جیسوں پر ہی سجتی ہے.....''

سیٹھ ابراہیم میری بات سن کر سنجیدہ سا ہو گیا۔ ''اتنے کڑے سچ اتنی آسانی سے کیسے بول لیتے ہو تم.....؟ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے بہروز والے محل میں کسی عورت کا آنا جانا بھی نہیں ہے..... شراب، عورت اور جواء..... اگر یہ تمہاری زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتا تو پھر آخر اتنا پیسہ تمہارے کس کام کا.....؟ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری.....؟''

میں چپ رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے..... ہر آرزو سے سوا ہے..... مجھے تو بس اک نگاہ چاہیے..... اپنے نصیب کی ایک جھلک صرف ایک پیار بھری نظر..... جو صرف میرے لیے ہو..... بنا کسی تحقیر، طنز، حقارت اور ترحم کے جذبات لیے..... سیٹھ ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رکا۔

''اچھے لگے ہو تم مجھے..... لالچ نہیں ہے تمہارے اندر..... اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پالے..... وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے..... کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا اور ہاں..... تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی ہے مجھے..... دوبئی کی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر ان کی خاص توجہ ہے آج کل..... تم اسی لیے بچے ہوئے ہو کیوں کہ فی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں مل سکی..... مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے، وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔''

سیٹھ ابراہیم واپس پلٹ گیا۔ میں دوبئی واپس پہنچا تو میں نے پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے سیٹھ ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دوبئی ایئر پورٹ سے ہی میری نگرانی شروع ہو چکی تھی۔ ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح و شام آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چہروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہر اس جگہ کے آس پاس پایا جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھٹن چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی جیسے وہ شہر نہیں کوئی قید خانہ ہو۔ شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہنا کسی کھلے شہر میں قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور سیمنٹ سی بنی عمارتوں کے صحرا سے اکتانے لگا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے ملک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ رفیق نے یہ خبر سنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

''خوش کر دیا تو نے یار..... پتہ نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ تو چل..... میں بعد تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں..... ہماری مٹی اور ہمارا خمیر یہاں کا

نہیں ہے یار..... چاہے ساری عمر گزار لیں، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ..... پر اس انجانے پن سے تو نجات ملے گی.....''

میں نے اپنے باقی اسٹاف کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سنایا تو وہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبھالے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مہینے میں ایک دو بار چکر لگا جایا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہولتیں پیدا کر دی ہیں ان نت نئی ایجادات نے ..... انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو پر تصویر اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رابطے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے مارتھا کو کیئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کر دیئے۔ میں نے اسے دوبئی سے صرف بہروز کا سفید پیانو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔ میرے عملے نے دو ہفتے کی جان فشانی کے بعد میرے ہی شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کروا دیا تھا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آ گیا۔ میں نے رفیق کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو حتی الامکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روا رکھے اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان پھولوں کے گلدستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرے سبھی بہن بھائی اور ان کی اولادیں، میری بھابھیاں اور میری بھابیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں یہاں سے دوبئی جانے کے لیے ایک پرانے رکشے میں ایئر پورٹ پہنچا تھا اس دن میرے گھر کے صحن تک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا..... وقت بھی کیسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے..... پل میں بدل جاتے ہیں ..... یہ دنیا کے بدلتے رشتے..... ساری عمر جنہوں نے پری زاد پر سنگ باری کی آج وہی لوگ مجھ پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے برسائے پتھروں نے اتنی چوٹ نہیں پہنچائی تھی جتنا لہولہان مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا.....

بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں میں نے اپنے بہن بھائیوں کو اتنا روپیہ بھیجا تھا کہ وہ سب آج اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر پر گزاروں۔ بھابیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں وہ پوری تیاری کے ساتھ بن ٹھن کر آئی تھیں اور ہر بھابھی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں ایئر پورٹ پر ہی ان سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں حالانکہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آ رہی تھی کہ وہ خود پر کسی قدر جبر کر کے

خودکواس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے کسی بے حد فوری نوعیت کی کاروباری میٹنگ کے لیے جانا ہے اور میں موقع ملتے ہی ان سب کی طرف فرداً فرداً حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے مینیجرز نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایئر پورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرسڈیز گاڑیوں کا فلیٹ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے گلیاں مجھے اسی طرح خود پر مسکراتے نظر آئے جیسے میں انہیں سات سال پہلے مسکاتا ہوا چھوڑ گیا تھا نہ جانے ہم پردیس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہی راہیں جن پر میں جانے کتنے سال تک جوتیاں چٹخاتا رہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ در و دیوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں، ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں..... کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں..... مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سن نہیں پاتی..... شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا..... کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی۔ وہ شروع میں ہی اتنی بڑی ذمہ داری لینے سے کچھ ہچکچا رہا تھا۔ مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سیکورٹی انچارج بھی مقرر کر دیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنے جیب سے ایک غیر ممنوعہ پستول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔

''یہ دیکھو صاحب..... ہمارے پاس اسلحے کا لائسنس بھی ہے..... ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کسی فکر کا ضرورت نہیں ہے.....''

میں جانتا تھا کہ کبیر خان سچ کہہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے آج کل ذاتی محافظوں کی ایک فوج بھی لازمی درکار ہوتی ہے۔ مجھے بہروز کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ جیسا دیس ہو، بھیس بھی ویسا ہی ضروری ہے..... ورنہ یہ انسان عموماً دوسرے انسانوں کو کم تر سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔ اور میں نے پردیس میں اپنی زندگی کے اتنے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ ہفتے بھر میں ہی سارے شہر کے امراء کو خبر ہو چکی تھی کہ پی۔زیڈ (P.Z) نامی کوئی انتہائی بڑا صنعت کار شہر میں اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں پی۔زیڈ (P.Z) یہی نام تجویز کیا تھا میرے مینیجرز نے میری نئی کمپنی کے لیے..... اور وہ مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے اب میں ان کے لیے پی۔ زیڈ نامی ایک بڑا انڈسٹریلسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر

نجات مل گئی تھی جو پورا نام بتانے میں مجھے ہمیشہ اٹھانی پڑتی تھی۔ یہ دولت مند لوگ اندر سے کتنے تنہا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں میں ہی ہوگیا جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوتوں کے دعوت ناموں نے گھیر لیا۔ یہ شام کی پارٹیاں، رات کی دعوتیں، ظہرانے، عصرانے اور عشائیے..... آخر ان امیروں کو اپنے اردگرد ہر وقت اتنا ہجوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تنہا ہونے کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر میں تو ہمیشہ سے ہی ان پر ہجوم محفلوں سے کتراتا تھا، لوگوں کی تیز چبھتی نظریں اور طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باجود میں اس تجربے کو بار بار نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے چینیاں اور درد اس لیے بھی پال لیتے ہیں کیوں کہ ہمیں حقائق سے نظریں چرانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف مینیجر کمالی بہت تیز اور چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا۔ مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور اسے ٹال دیتا تھا۔ اگلے ہفتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم اپنے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام ابھی تک دوبئی آفس سے ہی ہوتا آ رہا تھا مگر کمالی نے یہاں بھی خاصہ عملہ بھرتی کر رکھا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی مرحلے کی اذیت سے گزرنا پڑا، ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفتروں میں اتنی بہت ساری خواتین کیوں بھرتی کر لی جاتی ہیں.....؟ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس صنف نازک کی موجودگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی ..... جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی..... جانے کمالی نے اتنے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی مینیجرز ٹائپ عہدوں پر ان نازک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر رکھا تھا؟ میرے استفسار پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''ساری بات حس لطافت کی ہے سر..... وہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sence (استھیٹک سینس) کہتے ہیں..... ویسے بھی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں..... وہاں کے مرد ورکرز زیادہ ذمہ داری کے ساتھ کام کرتے ہیں..... لباس اور اوقات کار کا بھی خیال رکھتے ہیں سر جی..... اور دفتر کا ماحول بھی خوشگوار رہتا ہے.....''

میرا جی چاہا کہ میں کمالی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقہ کار پر ہونے والی سینکڑوں تحقیقات میں سے صرف ایک اسی ریسرچ کو نافذ العمل کیوں سمجھا؟ مگر میں چپ رہا، دفتر میں کام کرنے والی خواتین اور لڑکیاں بھی پہلی بار مجھے دیکھ کر اسی تذبذب کا شکار ہوئیں جو میرے لیے ہر عورت کا خاصہ رہا تھا۔ مگر میں اس کمپنی کا مالک تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ جمی رہے۔ کمالی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طرار سی لیڈی سیکرٹری کا بندوبست کر رکھا تھا جسے میں نے پہلے دن ہی کسی ڈپٹی مینیجر کے سیکشن میں منتقل کر دیا اور کمالی کو ہی اپنا پی۔اے بھی مقرر کر دیا۔ جانے یہ کمالی کی ترقی تھی یا تنزلی تھی..... مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ کبیر خان میرے ساتھ ہی میری

گاڑی میں دفتر آتا اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں یا باہر گاڑی میں ہی میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں کمالی کی اس سے جان جاتی تھی۔ کمالی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لایا کروں کیونکہ بقول اس کے کبیر خان کا انداز ہی بڑا خوفناک تھا۔ خود کبیر خان کے بھی کمالی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔

''ہم کو یہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاحب..... یہ بڑا چاپلوس ہے..... اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا.....''

وہ دونوں میرے لحاظ کی وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے آ رہے تھے..... میں نے کبیر خان کو سمجھایا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامد کی وجہ سے اپنی جگہ اور عہدے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دنیا کا سب سے قدیم ہتھیار ہے جس کی دھار کسی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔ کچھ دن اسی ہنگامہ خیزی کی نظر ہو گئے مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور اس شہر کے وسط میں واقع ایک گنجان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ تنگ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک کھلے میدان میں آ نکلے، سامنے ابھی تک وہی پرانا ٹین کا بڑا سا نصف گولائی میں کٹا بورڈ گیٹ پر آویزاں تھا۔ ''مستانہ گیراج.....'' میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی دن پل بھر میں لہرا گئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی گیراج کے احاطے میں لے جانے کا کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈیلر اور گیراج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے مگر میں نے اس کی سنی ان سنی کر دی۔ گیراج کے برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا سا ریڈیو لٹکا ہوا تھا اور فضا استاد مستانے کے من بھاتے گانوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔

''جو درد دیا، اپنوں نے دیا..... غیروں سے شکایت کون کرے.....''

گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد بھاگتا ہوا ہماری کار کی طرف آیا۔ ''جی صاحب..... حکم کریں۔ سروس کرنی ہے یا آئل بدلوانا ہے..... ٹیوننگ بھی ہو جائے گی یہ آپ کی گاڑی کا انجن سیل بند ہے..... کچھ وقت لگے گا ہماری ورک شاپ پر.....''

یہ کوئی نیا لڑکا تھا۔ کچھ دور باقی لڑکے ویلڈنگ پلانٹ پر اسی طرح ویلڈنگ میں جتے ہوئے تھے جیسے کبھی میں وہاں سارا دن بیٹھ کر اپنا خون ویلڈنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا۔ ''تمہارا استاد کہاں ہے.....؟ اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا ہے..... ٹھیک سے کام کرنا نہیں آتا اسے..... جاؤ..... بلا کر لاؤ اسے.....''

شاگرد گھبرا کر اندر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی غصے میں بھری آواز سنائی دی۔

''ارے کون سا سیٹھ ہے میاں..... ہم بھی تو دیکھیں.....؟ استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیرا

پھیری نہیں کی ..... ہم محنت کرتے ہیں۔ چوری نہیں کرتے .....''

استاد مستانہ اپنے مخصوص حلیے میں سر پر دو پلی ٹوپی رکھے، واسکٹ پہنے اور منہ میں پان دبائے بڑبڑاتا ہوا برآمدے سے نکل کر گیراج کے صحن میں آیا اور ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی سے نکل کر گیراج کے اندر ہی بیٹھے رہنے کا کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا جسے میں نے اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ مستانہ استاد بے خیالی میں غصے میں بھرا میری طرف بڑھا۔ میں منہ دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔

''کیوں استاد مستانے ..... یہ گیراج ہے یا ہیرا پھیری کا اڈہ.....؟'' مستانے کے سارے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بھڑکیلا استاد سب کچھ بھول کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے تیور دیکھ کر کبیر خان کا ہاتھ ہولسٹر میں بندھے پسٹل کی جانب بڑھ گیا۔

باب 14

استاد مستانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اوزار بطور ہتھیار اٹھا لیے کیونکہ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ ان کا استاد اکیلا ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تبھی میں نے پلٹ کر بپھرے ہوئے استاد مستانے کی طرف دیکھا۔

''کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لیتے استاد..... اب تو اس کے اردو گانے بھی چائنیز میں سنائی دیتے ہیں۔''

استاد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہوگیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہوئی اور وہ دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ''اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی او بے وفا..... مجھے رفیق نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ تم واپس آ چکے ہو.....''

سارا گیراج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک جمگھٹا سا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لگا دیا مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد چکر کاٹتے رہے..... وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا مگر آج میں ان کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا، ہم کمزور اور بے بس انسان جنم سے لے کر فنا ہونے تک یہی تو کرتے رہتے ہیں اپنے خوابوں کا پیچھا، ان خوابوں کو سچ کرنے کی دھن..... مگر ہمارے حصے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں۔ وہ کوئی اور ہوتے ہوں گے جن کے خواب تعبیر پاتے ہیں۔ ہم تو ساری زندگی اپنی جھوٹے سچے خوابوں کے پیچھے بھاگتے گزار دیتے ہیں۔ یا پھر کسی دوسرے کی کامیابی میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر گیراج کے یہ معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ جو میں آج تھا..... وہ کبھی میرا خواب نہیں تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا خواب دیکھا تھا۔ بہت معصوم سا سپنا تھا میرا..... مگر اس کی تعبیر پانے کے لیے مجھے جانے کتنے طویل راستوں سے گزرنا باقی تھا۔ مگر منزل ابھی تک لاپتہ تھی۔ شاید ہر انسان کا مقدر اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کا اپنا خواب سدا خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد مستانے نے ٹکڑ کے ہوٹل سے میری پسندیدہ دودھ پتی چائے منگوائی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے..... ورنہ میرا تو معجزوں سے یقین ہی اٹھ چلا تھا..... جو تم نے چاہا..... تمہیں مل گیا..... اس دنیا میں کہاں ہوتا ہے.....''

میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ''صرف تھوڑی سی دولت آ گئی ہے میرے پاس..... باقی کچھ نہیں بدلا استاد..... میں ابھی تک وہی پری زاد ہوں.....''

استاد نے پینترا بدل کر کہا۔ ''کمال کرتے ہو میاں..... دولت سے بڑی تبدیلی بھی کچھ اور ہوتی ہے بھلا.....؟ لوگوں کی زندگیاں صرف ہو جاتی ہیں چند دھیلے کمانے میں..... اب مجھی کو دیکھ لو..... سدا کنگال ہی رہے..... اچھا یہ بتاؤ..... کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں..... یا ابھی تک وہی شرمیلے، کنوارے پری زاد ہو.....؟''

میں نے مزید چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ''مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد..... اور پھر شاگرد بیاہ کر لے اور اس کا استاد کنوارہ رہے..... یہ کہاں کا دستور ہے۔''

استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''کیوں اس عمر میں بھری لٹیا ڈبونے کی بات کرتے ہو پری زاد پیارے..... اور یہ کیا بات کر دی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی..... ذرا اعلان تو کر کے دیکھو نکاح کا..... پورا سو بمبر رچے گا تمہارا تو.....''

میں نے استاد کی بات کسی اور جانب موڑ دی..... ''میری شادی کی بات چھوڑو..... تم یہ بتاؤ کہ گیراج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کروایا۔ کام والی گاڑیاں بھی اکا دکا کھڑی نظر آ رہی ہیں صحن میں.....؟ یہ سب کیا ہے.....؟''

استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندا چلتا ہی رہتا ہے..... تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے.....؟''

اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سن کر راز کھول ہی دیا۔ ''یہ پری زاد بھائی..... گیراج تو گروی پڑا ہے ہمارا تین سال سے..... استاد غلط، بتا رہا ہے..... کوئی دھندا نہیں..... صرف مندا ہی مندا ہے آج کل یہاں.....''

استاد نے بُری طرح سے اس شاگرد کو جھاڑ پلائی۔ ''کم بخت..... تو باز نہیں آئے گا بزرگوں کی باتوں میں دخل دینے سے..... چل دفع ہو..... جا کر اس اٹھتر بیاسی کرولا کے ڈینٹ نکال..... شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری.....''

لڑکا منہ بسورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں استاد..... گیراج گروی پڑا ہے..... کیوں.....؟''

استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ''اب کیا بتائیں میاں..... پرانے مکینک اور گیراجوں کا کام ٹھپ ہو چکا ہے..... گاڑیوں کے انجن اب سیل بند آتے ہیں۔ ٹیوننگ اور مرمت کمپیوٹر مشینوں پر ہوتی ہے..... ٹائر بنا ٹیوب کے آ گئے ہیں اور خراد کا کام اب ماڈرن مشین کرتی ہے..... ہمارے پاس تو وہی چند پرانا کھٹارہ گاڑیاں آتی ہیں جن کا مزاج نئی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں..... خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے..... ایسے میں گیراج گروی نہ رکھتا تو کیا کرتا.....؟..... مجھے اپنی فکر نہیں ہے..... بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا نیلامی کے بعد نیا مالک کہیں ان بچوں کو یہاں سے بے دخل نہ کر دے..... تم تو جانتے ہو..... ان سب کے گھر ایک انہی کے دم سے چلتے ہیں..... کئی دفعہ ان سے کہا ہے کہ کم بختو..... جاؤ جا کر کوئی نیا دھندا ڈھونڈو..... پر یہ ہیں کہ یہاں سے ٹلتے ہی نہیں.....''

میں چپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سنتا رہا۔ ''کس کے پاس گروی رکھا ہے یہ گیراج تم نے.....؟''

استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''ہے اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ..... بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے تنگ نہیں کرے گا.....''

''مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتہ چاہیے استاد.....''

استاد نے نفی میں سر ہلایا..... ''نہیں پیارے..... استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ہے..... لیتا کچھ نہیں.....''

میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمالی کو فون کر کے گیراج پہنچنے کا کہا..... آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑبڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمالی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا جس کا پتہ گیراج کے سبھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد کمالی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے جائیداد کی آزادی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیئے ''یہ گیراج جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے استاد..... اگلے ہفتے تک نئی کمپیوٹرائزڈ مشینری بھی آ جائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی نگرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم ٹپ ٹاپ بنا دو..... اگلی دفعہ جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد مستانہ چاہیے..... ہاں..... مگر یہ ریڈیو نہ بدلنا..... اس کے بنا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا.....''

استاد مستانہ گم سم سا ہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے مڑا..... استاد نے مجھے پیچھے سے آواز دی..... ''پری زاد.....''

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع ہو چکے تھے۔ کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت بے

جان اور کھردرے کاغذ کے چند روپے اپنے اندر کتنی خوشیوں پر قبضہ جمار کھتے ہیں۔ کیسے جادو ٹونے کیسے کرشمے دکھاتا ہے یہ پیسہ۔ روتوں کو ہنسا دیتا ہے اور ہنستوں سے بچھڑ کر انہیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے اور یہ دولت مند کتنے انجان رہتے ہیں اس پیسے کے استعمال سے..... کاش ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا۔ خوشیوں کا کاروبار..... ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھاٹے کا سودا نہ ہوتا..... مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے۔ شاید اسی لیے یہ دنیا دل والوں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔

گیراج سے نکلتے نکلتے سہ پہر کے چار بج گئے، دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونیورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی رکوادی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے۔ اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دفنایا ہوا وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا آڈیٹوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دوبئی جاتے وقت اپنی ساری نظمیں اور کلام ٹین کے ایک بکسے میں بند کر کے اپنے پرانی گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دوبئی لے جاتا۔ میں انہیں خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔

''تم پری زاد ہو ناں.....''

میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے مجھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔

''جی..... میں پری زاد ہوں..... مگر آپ.....''

وہ میری طرف بڑھے۔ ''بھول گئے..... یادداشت کی کمزوری تو بڑھاپے سے مشروط ہوتی ہے..... مگر میں نے تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا.....''

میری زبان سے بے اختیار نکل پڑا۔ ''مجھے پہچاننے کے لیے شاید یادداشت شرط نہ ہو..... آپ شاید سر احمد ہیں.....؟ ہمارے لائبریری انچارج؟؟''

وہ مسکرائے۔ ''ٹھیک پہچانا..... تمہارے جانے کے بعد اردو بزم ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا..... تمہاری کہی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرچے میں چھپتی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ''گر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....'' بھئی واہ..... کیا بات ہے..... ہر سال جب بھی اوتھیلو اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور دہرائی جاتی ہے اور سچ پوچھو تو ہر بار سارا ہال مبہوت اور ساکت بیٹھا سنتا رہتا ہے.....''

میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سنتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ میں انہیں بتادوں کہ وہ شاعری بھی میں کسی خاص مقصد سے کرتا تھا۔ کالج کی چند مہ جبینوں میں توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا اور بس..... سچے شاعر ایسا بھلا کب کرتے ہیں.....؟ انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی..... تم اچانک یونیورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے.....؟ تعلیم مکمل کی یا نہیں تم نے.....؟"

میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "کچھ گھریلو مجبوریاں تھیں..... مجھے دوبئی جانا پڑا....."

احمد سر نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گارڈز کی طرف دیکھا۔ "لگتا ہے تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو..... اندر چلو..... بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے..... اردو شعبے میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے....."

میں نے طریقے سے معذرت کی۔ "نہیں سر..... آج نہیں..... یہ میرا کارڈ ہے..... کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائیے گا..... آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی....."

یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی میں بہت دیر تک یونیورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے نٹ کھٹ سی لبنیٰ بھی یاد آئی۔ جانے وہ کہاں ہوگی؟ سیٹھ عابد سے شادی کے بعد کبھی اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا..... لبنیٰ کی ماں کے ایک جملے نے میری زندگی کے کے تمام راستے بدل دیئے تھے۔ مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا مگن ہوا کہ میں نے اپنے اندر بسنے والے اس حساس اور نازک انسان کو بھی کچل کر رکھ دیا تھا جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ لیکن اس ساری تگ و دو میں مجھے کیا ملا؟ میں تو آج بھی اتنا ہی تنہا اور اکیلا تھا نہ کسی حرف دعا میں تھا نہ کسی کے دست طلب میں..... نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا نہ کسی کے دل کا قرار..... میں بھی بہادر شاہ ظفر کی غزل کے بولوں کی طرح وہ اک مشت غبار تھا جو کسی کے کام نہ آسکا..... مجھے ٹیرس پر بیٹھے جانے کتنی دیر ہو چکی تھی..... باہر اندھیرا پھیل کر شام کو رات کی سیاہ چادر میں لپیٹ چکا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی ضد کہتے ہیں مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے ہیں، پکے دوست تبھی تو جب دن شدید تھکن سے چُور ہو کر شام تک ہانپنے لگتا ہے، تب شام اپنی مہربان سہیلی رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندے دن کو سمیٹ کر اسے سلا دیتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھرپور دن آنکھیں موندھے سو رہا ہوتا ہے۔ بس ہمیں نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد نوکر نے آکر بتایا کہ کمالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمالی ٹیرس پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ پر تکلف لباس میں ملبوس تھا۔

"یہ کیا سر.....؟ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے..... ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس پر جانا ہے پارٹی میں..... شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جارہی ہے....."

میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی..... ''میرا موڈ نہیں ہے کمالی..... تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دینا.....''

کمالی گڑبڑا سا گیا۔ ''نہیں سر..... اچھا نہیں لگے گا..... سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے..... اور پھر ہمیں وہاں پر اپنے نئے آنے والے ٹینڈر کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر..... یہ میل جول رکھنا ضروری ہے.....''

میں نے بادل نخواستہ خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھنٹے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گامزن تھے۔ آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھر یا جائیداد ہونے کے باوجود کسی ویرانے میں سینکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے۔ جہاں ایسی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا اسٹیٹس سمبل status symbel بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پردے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکٹر گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت جس کے آس پاس مصنوعی نہر اور فواروں کے ذریعے پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے..... پانی اور سبزہ اس کی جبلت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں جنت کا تصور بھی تو بہتی نہروں ٹھنڈے چشموں اور گھنے سایوں سے مربوط ہے۔ سارا فارم ہاؤس برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ باربی کیو کا بندوبست بھی باہر سبزے میں ہی کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا مگر لگتا تھا کہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کروا رکھا تھا۔ تب ہی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے ہفتے ایک بہت بڑا آرڈر ٹینڈر کرنے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھیکہ دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود سبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیٹھ رحمان پچاس پچپن سالہ ایک گھاگ اور شوقین مزاج شخص تھا جسے باتیں بنانے کے فن سے کافی آگاہی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے فرداً فرداً سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے جتانے میں قطعاً عار محسوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دلچسپی رکھتا ہے، ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سیٹھ رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو بھی خوش کر رکھا ہے۔

''کیا بتاؤں سر جی..... یہ اپنے رحمٰن صاحب تو یاروں کے یار ہیں، بڑا حلہ گلہ رہتا ہے ان کے فارم ہاؤس پر..... صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس انہی کی دلدادہ ہے، آج بھی کافی منسٹرز اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں یہ انہی کا کمال ہے..... سبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمٰن صاحب سے سیکھے.....''

کمالی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی، اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا، اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیار ہر طبقے میں اپنے طور پر اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلمل کرتے لباسوں میں موجود خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور ''دوست'' اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجے، مہاراجوں اور نوابوں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور عورتیں الگ الگ حصوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ دولت اور پیسہ تو ان کے پاس آج کے ان نو دولتیوں سے کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے حجابی ہمارے معاشرے میں کہاں سے در آتی ہے.....؟

کہتے ہیں انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی اور شاید اس کا اختتام بھی دوبارہ پتھر کے دور پر ہی ہوگا۔ درمیانی مدت مکمل عروج اور پھر یکسر زوال کا محض ایک دورانیہ ہی تو ہے۔ کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوشگوار گزار سکے۔ مگر پھر شام ہوتے ہی ہم سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنویں میں اتار دیتے ہیں۔ میرے اردگرد بھی اس مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھوٹی بے خودی، وہ مدہوشی ہی کیا جو خمار میں بھی ہوش مند رہے؟ میں نے اکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا اتنی جلدی سر..... کھانا بس لگنے ہی والا ہے..... سیٹھ رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چن دیا جائے گا۔ میں نے اکتاہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔

''ہماری حاضری لگ گئی ہے تم اب یہاں سے نکلنے کی کرو.....''

کمالی نے سر ہلایا اور سیٹھ رحمان کو ہماری روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے بھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے سیٹھ رحمان کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔

''یہ کیا پی۔ زیڈ صاحب..... آپ ابھی سے چل دیئے..... ابھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے بھیگی بھی نہیں.....''

میں دھیرے سے مسکرایا..... میں شام کو دیر تک باہر اوس میں بھیگتا رہوں تو مجھے زکام ہو جاتا ہے..... بھیگنے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں.....''

رحمان میری بات سن کر زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا..... ''خوب..... بہت ہی خوب..... بھئی

میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں صرف ایک میں ہی بذلہ سنج باقی بچا ہوں..... مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی واپس نہیں جانے دوں گا۔ محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔''

میں نے جان نکالنے کی کوشش کی کہ مجھے اگلے دن کسی اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ اور مواد کی تیاری کرنی ہے مگر سیٹھ رحمان اڑ گیا۔ ''نہیں بھئی..... ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، شہہ پارہ بیگم..... چوٹی کی ایکٹریس ہیں..... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے فلم انڈسٹری میں..... ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیرینہ مراسم کا خیال ہے انہیں کہ آ رہی ہیں..... یہ لیں..... شاید یہ انہی کی گاڑی ہے..... وہ آ گئیں..... آپ بس دو لمحے انتظار کریں..... میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے ان سے..... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کے لیے..... سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے کے لیے آ رہی ہیں.....''

سیٹھ رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے من میں ہی مچل کر رہ گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سیٹھ رحمان ایک زرق برق اور ناز و ادا کے پیکر کو لیے میری طرف آتا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی اور مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام شہہ پارہ نہیں کچھ اور تھا۔ شہہ پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی اور وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم کر رہ گئی۔

باب 15

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لبنیٰ تھی۔ ہاں وہی میری یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت اور طرح دار لبنیٰ۔ جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کباڑیے سے ہوگئی تھی۔ سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کرانے میں مصروف تھا۔ ''شہہ پارہ بیگم..... ان سے ملیں..... یہی ہیں پی۔ زیڈ صاحب..... اور آج کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہہ پارہ..... ہمارے ملک کی نامور آرٹسٹ..... پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں..... آج ہم نے خاص آپ کے ساتھ ملاقات کے لئے انہیں مدعو کیا ہے۔''

لبنیٰ چپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ''ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے رحمان صاحب..... مگر تب یہ پی۔ زیڈ نہیں تھے اور نہ میں شہہ پارہ.....''

سیٹھ رحمان کو شہہ پارہ کی بات سن کر حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ''ارے..... واقعی..... بھئی پی۔ زیڈ صاحب..... آپ تو واقعی چھپے رستم نکلے..... جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہر نایاب سے دوستی کا شرف صرف ہمیں ہی حاصل ہے۔''

لبنیٰ عرف شہہ پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجئے رحمان صاحب..... پرانے بچھڑے ہوئے ملیں تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان.....''

سیٹھ رحمٰن لبنیٰ کی بات سن کر ہڑ بڑا کر بولا۔ ''ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... آپ لوگ باتیں کریں۔ میں کھانا لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

رحمٰن جاتے جاتے بھی ہمیں حیرت سے دیکھتا ہوا پلٹ گیا۔ لبنیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔ ''پری زاد..... یہ تمہیں ہو ناں..... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا..... تو تم ہو شہر کے وہ نئے بگ شاٹ.....؟ بڑے صنعت کار.....؟ میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے..... مگر ایسا میں نے صرف فلموں میں ہی ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فاتح ہو پری زاد.....''

میں نے لبنیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خوبصورت جاذب نظر تھی۔ بلکہ اس کے حسن

میں اب اداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھر دیا تھا۔ حسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔

''نہیں..... میں کبھی فاتح نہیں رہا..... بس ہارتا ہی آیا ہوں..... مگر تم اور یہ شہہ پارہ.....؟ یہ سب کیا ہے..... تمہارا شوہر کہاں ہے..... وہ سیٹھ عابد.....؟''

لبنیٰ دھیمے سے مسکائی۔ ''سیٹھ عابد ایک کامیاب سوداگر تھا۔ اسے جب تک اس شادی کے سودے میں اپنا فائدہ نظر آیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب سود سمیت سارا منافع وصول ہو چکا تو اس نے تین لفظ کہہ کر مجھے آزاد کر دیا..... تم نہیں جانتے پری زاد..... اسے سودے بازی خوب آتی تھی.....''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''نہیں..... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا.....''

لبنیٰ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''اوہ..... اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا.....؟ مجھے ہمیشہ اس کے نام سے چھپی اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھلک نظر آتی تھی۔ مگر میں خود کو یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دوکاندار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو.....؟''

میں نے لبنیٰ کی سیاہ غزالی آنکھوں میں چھپے سوال کا جواب دیا۔ ''ابھی تم نے خود ہی کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کامیاب سوداگر تھا۔ اسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا۔ سچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پری زاد سے پی۔ زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو..... اس کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے..... مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے.....؟ یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کائیاں شخص دکھائی دیتا ہے..... اور تم اس کی خاص مہمان ہو.....؟ یہ سب کیا ہے؟''

لبنیٰ نے دور کھڑے رحمان کی طرف دیکھا جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ''یہ سیٹھ بھی ایک کامیاب دوکاندار ہے..... اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے آج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصرف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے۔''

میں نے دکھ سے لبنیٰ کی طرف دیکھا۔ ''اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں..... پھر..... پھر کیا ہوتا.....؟ کچھ زیادہ نہیں..... میری بچی کھچی عزت نفس کو مجروح کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے مجھے پیش کر دیا جائے گا..... کیونکہ میری ماں دنیا سے جاتے جاتے اتنے ادھار میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی.....''

اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ''مخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے..... باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے..... اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہ پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدردان ہیں..... ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو یہ کسی سے نہیں کرتیں..... ہم تو بات

کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب.....''

میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔''نہیں سیٹھ صاحب.....اب میں چلوں گا.....آپ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے.....کل آپ اپنے مینیجر کو میرے دفتر بھیج دیجئے گا یہ ٹھیکہ آپ کو ہی ملے گا اور یہ کیا.....اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں میری طرف سے ہاں ہی سمجھئے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی آزادی درکار ہے.....مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا.....اگر منظور ہو تو اپنے مینیجر کو قیمت بتا کر بھیجئے گا.....''

میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا۔ سیٹھ رحمان وہیں ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ مڑتے وقت میں نے لبنیٰ کی آنکھوں کی نمی اپنی آنکھوں میں اترتی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری پلکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے اجلی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک لیے یہ دنیا اندر سے کبھی کبھی کتنی تاریک اور سیاہ نکلتی ہے۔ اگلے روز سیٹھ رحمان کا مینیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کامیاب سوداگر تھا، مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر بسی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمالی پچھلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا مگر اس روز سیٹھ رحمٰن کے مینیجر کے جانے کے بعد وہ اپنی چپ پر قابو نہیں رکھ پایا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں سر تو میں ایک بات کہنے کی جسارت کرنا چاہ رہا ہوں.....عہدے اور رتبے میں آپ مجھ سے بہت بلند ہیں مگر عمر میں آپ سے بڑا ہوں.....لہٰذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں.....''

میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سنی۔''جتنی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، تم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے.....''

کمالی میری بات سن کر سٹ پٹا سا گیا۔''جی سر.....میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں یہ آپ کا ذاتی پیسہ ہے اور اسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف آپ ہی کو ہے.....مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں آتی۔ میں جب آپ کو یوں بے دریغ دوسروں پر پیسہ لٹاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ عمریں لگ جاتی ہیں یہ پیسہ کمانے میں.....اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے.....اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں.....مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھا.....''

کمالی بات ختم کر کے چپ ہو گیا۔''تم نے ٹھیک کہا کمالی.....مجھے سودے بازی نہیں آتی.....اچھا سوداگر نہیں ہو میں.....انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں کی لگائی جاتی ہے.....انسان اور رشتوں کی نہیں.....اچھا میرے ایک سوال کا جواب دو.....عام طور پر انسان

پیسہ کس لیے کماتا ہے.....؟"

کمالی نے بلا تامل جواب دیا۔"اپنے خواب پورے کرنے کے لیے سر.....اپنے لیے آسائش اور آسانی پیدا کرنے کے لیے.....اور اپنے لیے خوشیاں خریدنے کے لیے.....عزت اور رتبے کے لیے....."

"ٹھیک کہا تم نے.....مگر کسی کا کوئی خواب ہی باقی نہ بچا ہو تب.....؟ آسائشیں اسے بوجھ لگتی ہوں اور اس کی خوشی کسی ایک لمحے میں جامد ہو کر رہ گئی ہو.....تب وہ شخص کیا کرے.....؟"

کمالی کچھ دیر خاموش رہا۔"پھر شاید وہ شخص اس دنیا کا ہی نہ ہو سر.....کیونکہ آسائش رتبے اور خوشی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے.....؟"

میں مسکرایا۔"ہاں.....کوئی دیوانہ ہی ہوگا جسے ان چیزوں سے انکار ہو.....مگر ابھی کچھ باقی ہیں دنیا میں.....مجھے سوداگر بننے میں ابھی کچھ وقت لگے گا کمالی.....خیر چھوڑو.....تم نہیں سمجھو گے کمالی اور تم نے بھی تو سیٹھ رحمان کے ساتھ ایک سودا کیا تھا.....تمہارا سودا کیسا رہا.....؟"

کمالی نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔"میں سمجھا نہیں سر.....کیسا سودا.....؟"

"ہاں.....وہی سودا.....جو کنٹریکٹ سیٹھ رحمٰن کو دلوانے کی صورت میں تمہیں پانچ لاکھ روپے منافع ملنے کے بدلے طے ہوا تھا....."

کمالی کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔"وہ سر.....وہ.....میرا مطلب ہے....."

میں نے غور سے کمالی کی طرف دیکھا۔"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کمالی.....میں نے ویسے ہی وہ ٹھیکہ سیٹھ رحمٰن کو ہی دینا تھا.....بس میری اتنی بات یاد رکھنا.....پیسہ کبھی عزت نفس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا.....وقت ملے تو میری بات پر غور کرنا.....اب تم جا سکتے ہو....."

کمالی سر جھکائے میرے کمرے سے نکل گیا۔اگلے دو ہفتے بہت مصروف گزرے،اس درمیان میں اپنے بھائیوں کے نئے گھر بھی ہو آیا،بہنوں کی طرف بھی چکر لگا لیا۔خوب آؤ بھگت ہوئی میری۔مگر ان میں سے کوئی بھی یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میں یوں تنہا اتنے بڑے گھر میں زندگی گزار دوں۔سبھی کو میرا گھر بسانے کی جلدی تھی۔مگر ان میں سے شاید یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب دل ہی جل جائیں تو گھر نہیں بسا کرتے۔میرا دل بھی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔اب کوئی امید کوئی آس باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کبھی کوئی نظر میری طرف بھی اٹھے گی۔بظاہر میرے اردگرد ایسی بہت سی نازنینائیں تھیں جن میں سے میں کسی ایک کی جانب بھی اشارہ کر دیتا تو اس کے گھر والے بہ صد خوشی اسے میرے ساتھ رخصت کر دیتے،مگر یہ میرا نہیں،میری ظاہری شان و شوکت اور اس دولت کا کمال ہوتا جسے ابھی تک خود میرے گھر والے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور چہ مگوئیاں ہوتی رہتی تھیں کہ آخر دس سال کے اندر اندر میرے ہاتھ الہ دین کا ایسا کون سا چراغ لگا ہوگا کہ جس نے میری کایا ہی پلٹ دی.....؟ ہمارا معاشرہ بھی کتنا دوغلا ہے۔جس شخص کی غیر موجودگی میں اس کے رتبے اور دولت پر ناجائز ہونے کے

شک میں ہزار باتیں بناتا ہے۔ اسی شخص کے آنے پر اس کو پوری تعظیم کے ساتھ کھڑے ہو کر ملتا ہے۔ اسے ہزار سفارشیں کرواتا ہے اور ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بہروز کریم ٹھیک ہی کہتا تھا، دولت ہزار عیبوں کا ایک پردہ ہے۔

کچھ روز بعد احمد صاحب چند طالب علموں کے ہمراہ میرے دفتر آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ اس سال کا یونیورسٹی کا سالانہ رسالہ بھی لائے تھے جس میں میری تین پرانی نظمیں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے لاکھ انکار کے باوجود یونیورسٹی کی بزم ادب کے لے سال بھر کا چندہ ان کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی میری کمپنی سے شہر کی تقریباً ہر بڑی ادبی تحریک اور تنظیم کو عطیات جاتے رہتے تھے۔ شہر میں میں کافی ادب دوست مشہور ہو چکا تھا مگر میں خود ان ادبی پروگراموں میں جانے سے گریز کرتا تھا کیونکہ اب میں شاید اپنے لفظوں اور اپنی شخصیت کے اس واضح تضاد سے اکتا چکا تھا۔

یا پھر اچھے لفظ اور اچھے خیالات صرف اچھی شخصیت کے ساتھ ہی جچتے ہیں..... مجھ جیسا کوئی کتنے ہی اونچے خیالات کو لفظوں کی خوبصورتی مالا میں پرو کر پیش کر دے، حرف بے وقعت ہی رہتے ہیں۔ میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دن بڑے بھیا کسی کی سفارش کے لیے دفتر آئے تو میں ان سے اپنے پرانے رجسٹر اور مسوّدوں کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی وہیں پرانے گھر کی دو چھتی والے ٹرنک میں ہی پڑے ہوں شاید کیوں کہ بہت سارا سامان نئے مکان میں منتقل ہونا باقی تھا۔ پرانے گھر کا سودا ہو چکا تھا اور کچھ دن میں وہاں سے سارا سامان بھی اٹھوانا تھا۔ جانے میرے دل میں اچانک ہی میرے پرانے گھر اور محلے کے لیے ایک دم ہوک سی کیوں اٹھی۔ میں نے کاغذات تلاش کرنے کے بہانے بھیا کے ساتھ ڈرائیور کو بھیج کر پرانے گھر کی چابی منگوالی اور اسی شام عصر کے وقت میری گاڑی میرے پرانے محلے کے سال خوردہ لکڑی والے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی محلے کے بڑے میدان سے پرے ہی رکوالی، سامنے بچے کینچے کھیل رہے تھے۔ میں بہت دیر وہیں کھڑا انہیں یہ کھیل کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ غریب محلے کے بچوں کے کھیل بھی سدا غریبانہ ہی رہتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنی گلیوں اور اسی میدان میں باقی بچوں کے ساتھ سارا دن کینچے اور گلی ڈنڈے کا کھیل کھیلا کرتا تھا اور شام کو چھپن چھپائی..... مگر زندگی میرے ساتھ ابھی تک چھپن چھپائی کا ہی کھیل کھیلتی آ رہی تھی۔ محلے کے پرانے مکینوں میں کوئی دکھائی نہیں دیا، زیادہ تر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ غربت البتہ وہی پرانی تھی۔ میں نے کبیر خان کو اپنے گھر کا دروازہ کھولنے کا کہا اور پھر اسے گاڑی کی جانب واپس بھیج دیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں اترتی نمی دیکھ سکے۔

ہمارے کچھ جذبات اور محسوسات بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے میں بہت دیر تک اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا ان بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا جب میں دنیا کے ہر غم سے آزاد، اپنے چھوٹے قدموں سے اس صحن میں دوڑتا پھرتا تھا۔ باورچی خانے سے اماں کی باجیوں

کو ڈانٹنے اور سگھڑاپے کے گر سکھانے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ابا صحن میں اپنا حقہ سنبھالے کھانستے اور اخبار پڑھتے رہتے۔ میں مٹی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلونا موٹر کار کے لیے راستے بناتا رہتا اور دن میں سو سو مرتبہ اس زنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چمکاتا رہتا۔ ایک لمحے میں ہی میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھرکوں سے باہر جھلکا کہ وہ سب لمحے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت ابا کے حقے کا کڑوا دھواں اور باورچی خانے سے آتی گرم پھلکوں کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا، کاش میں ساری زندگی وہی پانچ چھ سالہ پری زاد ہی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے پری زاد ہی تو ہوتا ہے۔ تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی پری زاد رکھ دیا تو ایسا کیا گناہ کیا.....؟ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے..... اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی آواز بھی گونجتی محسوس ہوئی۔

''پری زاد..... بیٹا تم پری زاد ہی ہونا.....''

میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابا کی آواز سمجھا تھا وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی۔ میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر گلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار گلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھیلا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور پرانی یادوں کے سب دریچے وا ہو گئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور پرانی باتیں یاد کر کے سبھی بیک وقت خوش اور غمگین سے ہو گئے تھے۔ گویا یاد ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی..... اور بھی بہت تھے جو اس عذاب سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر حیران اور دل سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی بڑے دلچسپ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں زیادہ تر ایک دوسرے سے خفا اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ مگر انہی میں جب کوئی ایک بچھڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہی اور عرصے بعد ملتا ہے تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اسے یاد کرتے ہوئے یوں استقبال کرتے ہیں جیسے وہ ہمسایہ نہیں..... کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر ہی خوبصورت کیوں بن جاتے ہیں؟ فاصلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ نکڑ والے منظور چچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔

''ارے ہاں پری زاد بیٹا..... وہ مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا..... بہت بیمار رہتے ہیں آج کل۔ ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں.....''

مرزا صاحب کا نام سنتے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگایا ہوا طمانچہ آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا۔ اور تبھی اچانک ہی وہ آفت جاں ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہو گی؟ محلے کے بچے گاڑی کے گرد جمع تھے اور ڈرائیور انہیں بھگانے

کے لیے مختلف طریقے آزما رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے تماشے ہیں۔

میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر مجھ سے پہلے دور کھڑی میری کار پر پڑی۔ اور پھر میری اس سے نظر ملی تو میری سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گڑبڑا سی گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

''آپ.....؟ آپ پری زاد ہیں ناں..... مجھے ہمسایوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں..... مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔''

ناہید کے بال الجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور پیروں میں پرانی چپل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فربہ لگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نٹ کھٹ لڑکی مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں بمشکل ڈھونڈنے سے حصے بخروں میں بٹی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پٹا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔

''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں..... ابا گھر پر ہی ہیں۔''

میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا یہ وہی صحن تھا جہاں میں کبھی شام کو گھنٹہ بھر کے لیے ناہید کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے انگور کی بیل کے سائے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی 23 گھنٹے اسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزار دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے بچے شور اور ادھم مچا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھڑے پر رکھا پیتل کا گلاس زور سے پکے فرش پر گرا دیا۔ شور مچ گیا۔ ناہید نے غصے میں اس بچے کو دو تھپڑ مارے اور غصے اور شرمندگی سے چلائی۔

''چپ کر جاؤ کم بختو..... دیکھ نہیں رہے گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو..... نکلو یہاں سے..... باہر جا کر کھیلو.....''

بچے منہ بسورتے صحن سے نکل گئے، اندر سے مرزا صاحب کھانستے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ''کون آیا ہے ناہید بیٹا.....''

ناہید نے جلدی سے صحن میں پڑی پرانی کرسی میرے لیے سیدھی کی۔ ''پری زاد آئے ہیں ابا جی..... ہمارے پرانے ہمسائے.....''

مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ''ارے..... پری زاد بیٹا..... کیسے ہو تم..... تمہارے بھائیوں سے پتہ چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو..... اچھا کیا آ گئے..... تمہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا.....''

مرزا صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت الجھی ہوئی اور بہت بے آرام سی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ''ارے ہاں..... یاد آیا..... میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کردی تھی میاں..... بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا.....''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے.....؟ دکھائی نہیں دے رہا.....''

مرزا صاحب نے برا سا منہ بنایا..... ''ارے ہوگا کہاں..... کہیں نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا ہوگا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ مہینوں اپنے بیوی بچوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے..... مگر کچھ جما نہیں..... آج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔''

ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ''بس کریں ابا جی..... یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے.....؟''

میں کن انکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا روپ کیوں بدل لیتی ہیں.....؟ یا پھر شاید ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے لیے ناہید اب بھی اتنی ہی دل کش اور خوبصورت ہو.....؟ کہتے ہیں حسن جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے تو عموماً اپنا اثر کھو دیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا اس لیے شاید میں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کیا محبوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ ہی میر کی غزل اور خیام کی رباعی کو اس کے سراپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ اتنے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں اٹا ایک تھکا ہارا سا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے ماتھے پر تیوریاں سی پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبرا سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی۔

''ارے ماجد..... تم آ گئے..... دیکھو..... پری زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پہچانا نہیں تم نے انہیں.....'' ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

باب 16

ماجد نے شدید غصے سے ناہید کی طرف گھور کر دیکھا۔ ناہید نے جلدی سے اُسے سرگوشی میں کچھ کہا۔ ماجد نے اس بار مجھے کچھ غور سے دیکھا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا:

''ارے پری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پری زاد ہی ہوناں..... معاف کرنا میں تھکن کے مارے پہچان نہیں سکا.....''

شاید ماجد بھی میرے قیمتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آ گیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو پیمانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہہ جما رہی تھی۔ بہت تھکا ماندہ سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سارے محلے کی سڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا، اور میں تو خود کو اس پر رشک کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اُس ہستی کا محبوب تھا جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے عمر بھر کے لیے خاکستر کر گیا۔ اور آج اتنے سالوں بعد وہ شعلۂ جوالہ میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی۔ اور اس کا وہ گل فام غمِ دوراں کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میری ایک فیکٹری کے مینیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا تب میں نے بیک ویو میرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر کیا بات کرتا میں اس سے؟ وہی معذرتیں..... وہی ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا.....'' ''میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی.....'' ''آپ کا دل کے بہت اچھے ہیں.....'' وغیرہ وغیرہ..... کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ، کچھ معذرتیں اور کچھ وضاحتیں پرانے گھاؤ مندمل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے یہ کھلے زخم لیے گھر واپس پہنچا تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوئمنگ پول کے پاس کچھ فائلیں گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں

نے کچھ ضروری کاغذات پر دستخط کر کے اسے فائل واپس کی۔

''صبح لے آتے کمالی..... زندگی کو اتنا بوجھ کیوں بنا رکھا ہے تم نے اپنے لیے.....؟ جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع اور نقصان کو ذہن سے نکال کر کام کیا کرو..... میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے..... میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا۔ باقی اللہ مالک ہے..... جاؤ..... جا کر آرام کرو۔''

کمالی سر جھکائے کھڑا رہا۔ ''میں نے آپ کو کچھ اور بھی بتانا تھا سر..... آج صبح میں نے میٹھ رحمٰن کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک جملے نے مجھے عزتِ نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگمگائیں گے..... آپ بھی میری اس خطا کو آخری خطا سمجھ کر معاف کر دیں.....''

میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''بھول جاؤ کمالی..... زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو..... یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے۔''

کمالی پلٹ کر جانے لگا میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا:

''کمالی..... تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....''

کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''ہاں سر..... بڑا زوردار عشق چلا تھا نوجوانی میں اپنا..... مگر انجام بہت برا ہوا آخر کار.....''

میں نے گھبرا کر پوچھا ''کیوں..... کیا ہوا تھا.....؟''

کمالی نے لمبی سی سانس بھری ''ہونا کیا تھا سر جی..... شادی ہوگئی میری اس کے ساتھ..... آج وہ میرے چار بچوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کر اُڑ گیا گھریلو روزمرہ خرچوں، بچوں کی فرمائشوں اور فیسوں نے کمر توڑ کر رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی.....''

کمالی اپنے دکھڑے سنا کر چلا گیا۔ اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اُس کا کھو جانا بڑا سانحہ.....؟ کیا شئے ہے یہ محبت..... ہم مبتلا ہوں یا غیر مبتلا، یہ محبت ہر پل ہمارے آس پاس کن سوئیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سنتی رہتی ہے۔ تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش رچا سکے۔ میری یہ حسن پرستی بھی تو اسی ستم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خوبصورت چہروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے عملے میں دوبئی کے دفاتر اور کمپنیوں میں۔ ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا۔ چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے دوبارہ کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو..... مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کو نازک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں اسی طرح میں حسن پسند

تھا، اور بس.....

اگلے روز مجھے سائٹ ایریا والی فیکٹری کے مینیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے حساب سے کسی دفتری کام پر لگا دیا گیا ہے اور تنخواہ بھی معقول طے کر دی گئی ہے، رات کو ایک میٹنگ سے واپسی پر گھر آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اجال کر ان کی شناخت ظاہر کرتا ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے لوگوں، جگہوں چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے میں ہی ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم FM ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا..... ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیئر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی، میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی میٹھی باتیں سن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سن کر زور سے چونک اُٹھا، میزبان کی آواز سناٹے میں گونج رہی تھی۔

''جی ہاں..... یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان.....

گر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے.....

تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا.....

جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے۔''

رات کے اندھیرے میں خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سن کر جانے کیوں میری اپنی ہی پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔

''جی سامعین..... یہ تھی میری سب سے پسندیدہ شاعر کی وہ نظم جسے میں اکثر گنگناتی ہوں۔ مگر مجھے اس شاعر سے ایک گلہ بھی ہے۔ میں اسی یونیورسٹی کی ایک جونیئر طالب علم ہوں جہاں میرے ایک محترم سینیئر پری زاد صاحب نے یہ ساری نظمیں لکھیں..... مگر پھر نہ جانے انہوں نے شاعری سے سنیاس کیوں لے لیا؟ اگر خوش قسمتی سے وہ اس وقت میرا پروگرام سن رہے ہیں تو ان سے میری اور میرے اس ادبی پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ لفظوں سے اپنا ناطہ نہ توڑیں..... اب آپ سے آپکی میزبان قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسندیدہ پروگرام ''بزمِ ادب'' کے ساتھ عینی حاضر ہوگی، تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے۔ شب بخیر۔''

میں پروگرام سننے میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچے۔ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے ان گنت سوچوں میں گذری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو

جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونیورسٹی کے سالانہ رسالے میں چھپ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت بنی رہیں گی۔ اگلے روز دفتر پہنچا تو یونیورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی خفا بھی نظر آ رہے تھے کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ٹالتا آیا تھا۔ اسی شام یونیورسٹی کی بزمِ ادب کی سالانہ انعامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردست کارڈ پر میرا نام بھی مہمانِ خصوصی کے طور پر درج کروا کر آدھی یونیورسٹی کو بانٹ بھی آئے تھے۔ میں نہ نہ ہی کرتا رہ گیا لیکن وہ دھمکی دے گئے کہ اگر آج بھی میں نے تقریب میں شرکت نہیں کی تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اتنے بہت سارے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال سے ہی میرے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ وہی چبھتی ہوئی نظریں جو مجھے اپنے چہرے کے آر پار ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دبی دبی سرگوشیاں، طنزیہ مسکراہٹیں.....

کاش احمد صاحب میرے اس دلِ ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے، مگر یہ ہو نہ سکا اور ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈائس پر میرا نام پکارا گیا تو میں نظریں جھکائے مائیک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں تماشائیوں کی جانب روشنی ملگجھی سی تھی اس لیے مجھے طلباء کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی رو کی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا۔ اپنا سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحے مزید لگ گئے۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلباء اور دیگر عملہ انہماک سے میری بات سن رہا تھا۔

''میں کوئی شاعر، مقرر یا لیڈر نہیں ہوں..... بس کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے، اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جو حق ہے وہ مجھے ہمیشہ اس چاردیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند پرانی نظمیں چھاپ کر میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا، یہ شعر دراصل شعر نہیں..... میرے دل کی نظر ہیں..... میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں جو کبھی صفحے پر آ جائیں تو آپ لوگوں سے بانٹ لیتا ہوں..... آپ لوگ اسے شاعری سمجھ لیتے ہیں تو یہ آپ سب کا حسنِ ظن اور ظرف ہے..... ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی..... بس خود کو نمایاں رکھنے کا بہانہ تھے یہ سب حرف..... جس میں مجھے ہمیشہ ناکامی ہوئی.....''

میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو دُور پہلی قطار میں بیٹھی، سیاہ چشمہ لگائے ایک تتلی سی لڑکی کھڑی ہو گئی اور ناظرین کے لیے پڑا مائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔

''سر میرا نام قرۃ العین ہے..... میں اسی یونیورسٹی میں فائنل ایئر کی طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر ڈی جے عینی کی بزمِ ادب کے نام سے ایک بہت مشہور پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے

سننے والوں کی ایک بڑی تعداد تک آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سننے کی خواہش رکھتے ہیں..... مگر آپ نے یونیورسٹی کے بعد تازہ کچھ کہا ہی نہیں..... کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا ناطہ [illegible] سے جوڑنے کی کوشش کریں گے.....؟"

میں نے مختصر جواب دیا۔

"جی ضرور..... اگر تم [illegible] کچھ مہلت دی....."

اسی کل رات ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی۔ کبھی کبھی وقت کی چالیں بڑی نپی تلی ہوتی ہیں۔ تقدیر کبھی کبھی اپنے سکرپٹ بہت اچھے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقدر کا یہ مسودہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر واپس روانہ ہوا تو کمالی سے رہا نہیں گیا۔

"سر..... آپ نے کبھی بتایا نہیں..... آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں..... ساری یونیورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی....."

میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے..... اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں..... مجھے خود بھی حیرت ہے....."

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے سر جی..... یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دلچسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون بھی ہر دم ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ میر، درد، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سر..... بظاہر بڑی لاابالی ہے یہ نئی نسل..... مگر اپنے مطلب کی چیز پڑھتی اور سنتی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح....."

میں چپ رہا۔ "ارے ہاں سر..... یاد آیا۔ وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا۔ رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہِ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھے بنا اسے نمبر تو دے دیا مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کر لے....."

اور پھر رات گئے میرے موبائل پر ایک اجنبی نمبر جگمگانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ "معاف کیجیے گا سر..... شاید آپ کے مینیجر نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی..... میں ڈی جے عینی ہوں..... میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں..... ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے..... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو....."

میں نے کچھ لمحے توقف کیا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ....."

وہ ممنونیت سے بولی۔ ''کچھ عام سے سوال..... آپ کی زندگی کے بارے میں..... آپ کی کامیابیوں کے بارے میں..... آپ کی ادب دوستی کے بارے میں..... سنا ہے شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں..... آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں..... عام طور پر ادب سے جڑے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دور سمجھتا ہے..... یہ ادیب، شاعر عموماً مفلوک الحال دکھائی دیتے ہیں..... مگر آپ نے صرف خیالی نہیں حقیقی دنیا کو بھی فتح کر کے دکھایا ہے..... میں یہ سب باتیں جاننا چاہتی ہوں.....''

میں اس کی باتیں سن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ ''مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتہ ہے.....''

وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں۔ ''احمد سر نے بتایا..... اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے..... سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا ہے..... سچ کہوں تو لوگ بہت متجسس رہتے ہیں آپکے بارے میں''

وہ اپنی دھن کی پکی لگتی تھی۔ میرے لاکھ ٹالنے کے باوجود وہ مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ اور میں اگلے دن تمام وقت اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ اس کے ساتھ رات کو کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شام تک یہ الجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو عینی کا وہی فون نمبر ملانے کا کہا جو گذشتہ رات میرے موبائل پر جگمگایا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھلکھلائی سی آواز سنائی دی۔

''ارے سر آپ.....؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے خود مجھے کال کی ہے۔ میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی.....''

میں نے دھیرے سے کہا۔ ''آپ سے ایک درخواست کرنی ہے..... کیا ہم گذشتہ رات کیے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں..... اگر ممکن ہو تو.....''

''جی سر..... کیوں نہیں..... مگر کوئی خاص وجہ.....؟''

''پتہ نہیں..... وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی..... دراصل میں بہت الجھن سی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا..... آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں..... ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہوگا.....''

دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔

''ٹھیک ہے سر..... جیسے آپ کو مناسب لگے..... مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ نے پروگرام سے کافی دیر پہلے خود فون کر کے معذرت کر لی۔ ورنہ عام طور پر بڑے لوگ ہمیں اطلاع دینا بھی پسند نہیں کرتے اپنی کسی غیر حاضری کی..... مگر آپ کو یہ وعدہ تو بہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ جب بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے.....''

میں ہنس پڑا۔ ''ہاں..... چلیں وعدہ نبھانے کا ایک اور وعدہ سہی..... میری مشکل سمجھنے کا شکریہ.....''

میں نے فون کاٹ دیا مگر کہیں دور کوئی دوسری لائن جڑ رہی تھی۔ میرا نادان دل سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے پرواہ پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صاف ایک ہی بات ساری رات سمجھاتا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بہتر کی گنتی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ جو اپنے دل کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تشبیہہ دیے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔ منہ زور، آزاد، وحشی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں؟..... میرا دل بھی بے لگام ہونے کو آیا تھا۔ اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر شام ڈھلے جب تھک ہار کر میرا بے چین مَن اپنی بے وقوفی پر مسکرا کر کچھ آرام پانے کو تھا۔ تبھی اچانک اس کا فون آ گیا۔ قسمت کی آنکھ مچولی وقت کا انتخاب خوب چن کر کرتی ہے۔ اور پھر ان ٹیلی فون کالز کا دورانیہ اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت کی، شام کی چائے کی، رات کی چہل قدمی کی..... مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی خاص تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اُس دن یونیورسٹی کی تقریب والی ملاقات کے بعد میری آج تک دوبارہ کبھی عینی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی میں نے دوبارہ کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ ٹیلی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی بالمشافہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوبارہ عینی کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے ہال میں مجھے کافی فاصلے سے اور ملگجے اندھیرے میں دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دن اور روشنی میں اس سے ملنے کی تمنا ہی بھلا کب تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے..... کیونکہ مجھے اجالے کبھی راس نہیں آتے تھے۔

اگلے روز میرے اسٹاف نے خوبصورت سجاوٹی کاغذ میں پیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بھیجنے والے پتے میں قراۃ العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد احتیاط سے کاغذ کی پرتیں کھولیں۔ اندر سے ایک خوبصورت سا نمائشی مجسمہ برآمد ہوا جسے کمرے میں کہیں بھی شوپیس کے طور پر رکھا جا سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے عینی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے اس کی کھنکتی ہوئی آواز اُبھری۔

''میں جانتی تھی سر..... آپ کا فون آتا ہی ہوگا۔ کہیے..... کیسا لگا تحفہ؟''

''بہت اچھا..... مگر موقع محل سمجھ نہیں سکا میں اس تحفے کا..... آپ نے تکلف کیا عینی.....''

وہ ہنسی۔

''ارے نہیں سر..... بالکل بھی تکلف نہیں ہے..... یہ میرا مشغلہ ہے۔ فارغ وقت میں میں مٹی اور پلاسٹر آف پیرس سے مجسمے بناتی ہوں..... میری اپنی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری ہے میرے گھر کے اندر..... بس وہیں یہ مشق جاری رہتی ہے..... کبھی آپ بھی آیئے ناں وقت نکال کر..... میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی.....''

میں بولتے بولتے اٹک سا گیا۔

''ہاں کیوں نہیں..... مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں.....؟..... ایک ہی بار اپنے سارے ہنر بتا دیں..... کبھی کبھی حیرت در حیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے.....''

میری بات سن کر وہ شرما سی گئی۔

''نہیں نہیں..... مجھ میں بھلا کیا ہنر ہوگا۔ بس وقت کاٹنے کے بہانے تلاشتی ہوں.....''

بات آئی گئی ہوگئی مگر میرا بھولا من اس لڑکی کے ہنر کا شکار ہوتا گیا۔ دل موہ لینا بھی تو ایک ہنر ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا ہنر..... اور میں اس کی اس کاریگری سے خود کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح بنتی بگڑنے لگی۔ شام سے ہی میری طبیعت عجیب سی بے چین اور اداس تھی، مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو چپ سی لگی ہوتی تھی کہ اچانک عینی کا فون آ گیا۔

''کہاں غائب رہتے ہیں سر آپ.....؟..... بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آڑے آ جاتا ہے.....''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میری مصروفیت بس ایک فرار ہے..... آپ کہیں..... کیا کہنا چاہتی ہیں.....''

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ''دراصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں اسے ساری دنیا کو دکھاؤں گی۔''

جانے کیوں پل بھر میں ہی میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اُڑانے کے موڈ میں ہے۔ اس نے مجھے دور سے ہی سہی..... مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے در پردہ میرے چہرے کی تضحیک کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

''مجسمے خوبصورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں مس عینی..... اور میں؟..... بہر حال..... مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی..... آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلیں۔''

میں نے فون پٹخ دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی مگر میں نے اگلے پورے ہفتے اس سے بات نہیں کی۔ دفتر کے نمبر پر فون آیا بھی تو اسٹاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا بہانہ کر دے۔ اس نے کچھ خط بھی بھیجے مگر میں نے پڑھے بنا ایک طرف رکھ دیے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آ گئی۔ میں آفس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گورے رنگ پر پہرہ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بولی تو اس کی آواز رُندھیا سی گئی جیسے وہ بہت دیر روتی رہی ہو۔

''آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں.....؟''

میں چلا اٹھا۔ ''آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صورت کا مذاق ہی اڑانا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا لیتیں..... مگر یہ مجسمہ.....''

وہ رو پڑی۔ ''میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی..... بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی..... آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں..... میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ اپنے من میں بنا رکھا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں.....؟''

اس نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتارا۔ ''میں دیکھ نہیں سکتی..... نابینا ہوں میں.....''

ایک زوردار جھماکا سا ہوا اور میرے اردگرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

باب 17

پیاس کہتی ہے اب، ریت نچوڑی جائے
اپنے حصے میں سمندر نہیں آنے والا

میں سکتہ زدہ سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور وہ روتی رہی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میرا بے وقوف دل مجھ سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ صدیوں بعد جس ایک نظر پر اُسے اپنے ہونے کا گمان ہوا تھا وہ نظر تو سدا کی بے نور تھی، اور میں نہ جانے کن خوش فہمیوں کا شکار ہو چلا تھا۔

''میں آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا..... جانے غصے میں کیا کچھ کہہ گیا۔ میرے اندر کا چور تھا جو چپ نہیں رہ سکا۔''

عینی نے سر اٹھایا۔ ''آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ میں نے آپ کو ہمیشہ آپ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھا ہے..... اور میں نہیں مانتی کہ اتنی خوبصورت سوچ رکھنے والا شخص بدصورت ہو سکتا ہے..... دوبارہ ایسی بات کبھی نہ کہیے گا.....'' میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے کہنے یا نہ کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ سچ وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس داغدار چہرے کا مجسمہ بنا تو جو بات آج تک صرف میرے اردگرد والوں کے علم میں ہے۔ کل سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ اور لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ پری زاد کو کیا سوجھی؟''

عینی نے اپنا چشمہ دوبارہ اپنی آنکھوں پر جمایا اور کھڑی ہو گئی۔

''میں دیکھ نہیں سکتی..... اپنی انگلیوں کی پوروں سے چیزیں چھو کر انہیں مٹی کے مجسموں کے قالب میں ڈھالتی ہوں..... مگر آپ کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنی پوروں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے پری زاد..... آپ کے لفظ خود آپ کا تعارف ہیں۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔

''دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

''مگر میری تم سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو قراۃ العین.....''

وہ پلٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رکی۔

''میں اپنی گیلری میں آپ کا انتظار کروں گی پری زاد.....''

وہ پلٹ کر چلی گئی اور میرے کمرے میں صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔ آج میں نے پہلی بار اسے آپ نہیں ''تم'' کہا۔ اور اُس نے پہلی بار مجھے سریا صاحب نہیں صرف پری زاد کہہ کر پکارا تھا۔ یہ طرزِ تخاطب اور القابات بھی تو ہمارے اندر کے بدلے رویوں اور رشتوں کا ایک اظہار ہوتے ہیں۔ دل کی میٹھی بولیاں اپنے القاب خود طے کرتی ہیں۔ اگلی شام میں جھجکتے قدموں کے ساتھ عینی کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گھر کے نچلے حصے میں عینی اور اس کی ماں رہتے تھے جبکہ اوپر والا حصہ انہوں نے کسی چھوٹے خاندان کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ عینی کے والد کافی عرصہ پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے اور اب یہی کرایہ اُن ماں بیٹی کی گذر بسر کا ذریعہ تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں عینی نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری بنا رکھی تھی۔ مجسمہ سازی شروع کرنے سے پہلے عینی نے اپنی نازک مہکتی انگلیوں سے میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ ٹھنڈک اور بے پناہ سکون کا ایک سمندر اس کے پوروں کے لمس سے میرے سارے وجود کی گہرائیوں تک سرایت کر گیا۔ میری جھلستی ہوئی تپتی روح کو جیسے خنک برف کا نخلستان سا مل گیا۔ میری تمام عمر کی ریاضتوں کا حاصل..... وہ اس کے ہاتھوں کا مہربان لمس..... عینی نے کام شروع کر دیا۔

میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجسمہ بنانے میں تین چار دن لگیں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس سے کہوں کہ تین چار صدیاں کیوں نہیں.....؟؟ میری زندگی میں وہ پہلی مہہ وش تھی کہ جس خوش ادا کی اتنی قربت اور نزدیکی مجھے شرمندہ اور پریشان نہیں کر رہی تھی، کیونکہ اتنے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی طرح اس کی نظریں میرے چہرے کے آر پار نہیں ہو رہی تھیں۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ اُبھری تھی، عام طور پر جیسے ہی کوئی میری طرف نظر بھر کر دیکھتا، میری نظر اگلے ہی پل خود بخود جھک جایا کرتی تھی لیکن عینی کے کومل چہرے کو گھنٹوں دیکھتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ مجھے اس سے نظر ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ کتنی بڑی آزادی تھی یہ میرے لیے۔ یہ کوئی مجھ جیسوں سے پوچھے.....

ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے میں اگلے دن اور پھر شام ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جب مجھے دوبارہ عینی کی گیلری پہنچنا تھا۔ صبح سے دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پہروں کی طوالت کا شبہ ہونے لگا۔ یہ دن کو چار پہروں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے؟ پہلا پہر، دوپہر، سہ پہر اور پھر شام۔ کیا ضرورت تھی بھلا وقت کو اتنے حصوں میں بانٹنے کی۔ بس صبح ہوتی اور شام ہو جایا کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مزید بے سر و پا خیالات میرے ذہن میں جالے بن رہے تھے جب اچانک پی اے نے انٹر کام پر مجھے بتایا کہ میڈم شہہ پارہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔ میں شہہ پارہ کو اپنے دفتر میں پا کر کچھ حیران سا

تھا، میرے لیے وہ آج بھی وہی پرانی لبنیٰ تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں پری زاد..... میرا فلمی کیریئر سیٹھ رحمٰن کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ کیا تم میری سفارش کسی بڑے پروڈیوسر سے کر سکتے ہو؟..... بڑی دھاک ہے تمہاری شہر میں..... تم کہو گے تو میں پھر سے اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو جاؤں گی.....''

میں نے الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن میں تو کسی بڑے پروڈیوسر سے واقف بھی نہیں ہوں لبنیٰ.....'' وہ مایوس ہو گئی۔

''ہاں..... یہ بھی ٹھیک ہے..... جانے میں کس پریشانی میں بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ تمہارا کاروبار اور فلمی دنیا بالکل جدا ہیں.....''

وہ واپس جانے کے لیے پلٹی..... میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''ٹھہرو لبنیٰ..... تم چاہو تو میں خود تمہاری فلم میں سرمایہ کاری کر سکتا ہوں..... کتنے میں بن جاتی ہے یہ ایک معیاری فلم.....؟''

وہ خوشی سے بے یقین ہو گئی۔

''سچ..... تم خود پروڈیوس کرو گے میری فلم..... واہ..... اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر اس کاروبار میں آج کل نقصان کا زیادہ خطرہ رہتا ہے پری زاد..... میں ڈرتی ہوں کہیں تمہاری رقم ہی نہ ڈوب جائے..... تمہیں کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے فلم پروڈکشن کا.....''

میں نے مسکرا کر اس کی زلفِ پریشان کے خم کو دیکھا۔

''چلو اس بہانے رقم ڈبونے کا قیمتی تجربہ تو حاصل ہو جائے گا نا..... تمہاری فلم کے بدلے یہ تجربہ بھی سہی..... ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ فلمیں دل سے بنائی جاتی ہیں۔ دماغ سے نہیں..... تو پھر دل کے سودوں میں نفع نقصان کی فکر بھلا کیسی؟ دل کا ملوث ہونا ہی خسارے کی نشانی ہے.....''

لبنیٰ کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فرطِ جذبات میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں..... میں تمہارا نقصان نہیں ہونے دوں گی پری زاد..... میں بہت محنت کروں گی۔ بے حد زیادہ..... میری زندگی کی سب سے یادگار پرفارمنس ہوگی یہ فلم۔ کہانی میں نے لکھوا لی ہے..... اگر تمہیں پسند ہو تو میں رائٹر سے اُسی کہانی پر کام کرنے کا کہہ دیتی ہوں۔ مگر تمہیں کچھ وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے..... میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کرتی ہوں.....''

لبنیٰ چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح عینی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مٹی گوندھتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بت بننے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اُس کا اندازِ بیاں کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ڈھلتی شاموں اور راتوں کے طلسم کا

ذکر کرتی تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں عینی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس نئے پری زاد کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ راستے میں ہی چند بوندوں نے ٹپک کر میری گاڑی کی وِنڈ سکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی، ہنستی ہوئی برستی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جا ملیں۔

کبیر خان حسبِ معمول چوکنا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا اردگرد پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتنے میں لبنیٰ کا نمبر میرے سیل فون پر جگمگانے لگا۔

''پری زاد..... کہاں ہو تم.....؟''

''اجنبی شہر کے اجنبی راستے..... اور میں''..... وہ ہنس پڑی۔

''اسٹوڈیو آ سکتے ہو ابھی..... مجھے تمہیں کسی سے ملانا ہے.....''

میں نے کبیر خان کو اسٹوڈیو چلنے کا کہا۔ ہم ویران سے فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے حلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومتے نظر آئے۔ عجیب سی اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر..... جیسے کوئی سوگ برپا ہو..... ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کبیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا پسٹل دیکھ کر وہ سب کچھ جز بز سے ہو گئے۔ میں نے کبیر کو باہر انتظار کرنے کا کہا۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جما کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لبنیٰ نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص ہارمونیم سامنے رکھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آڑ میں سمٹی سمٹائی ایک شرمیلی سی لڑکی چھوئی موئی سی بنی بیٹھی تھی۔ جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھا رہا تھا۔ باقی لوگوں کی چبھتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا۔ مگر ابھی تک وہ وہیں دبکی ہوئی تھی۔ لبنیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں سمٹی ہوئی لڑکی سنبل ہے، استاد بنے خان کی بیٹی۔ اور آج وہ دونوں لبنیٰ کی آنے والی فلم کی دھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک پکی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اُسے کھائے جا رہی تھی۔

''بس پری زاد صاحب..... کیا بتاؤں آپ کو..... کبھی یہی فلم اسٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی۔ کہیں ندیم صاحب تو کہیں محمد علی صاحب..... کہیں شاہد تو کہیں وحید مراد۔ کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوارہ آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں۔ یہاں تو بیک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا..... سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے اور اس کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا..... سینکڑوں کاریگر اور ان کا خاندان بے روزگار ہو گئے.....''

وہ مزید بولتا رہتا اگر لبنیٰ اسے اشارہ کر کے روک نہ دیتی۔ لبنیٰ ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر مرکوز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں میں سے جنم لیتی ہیں۔ اور مجھے یہ پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی تو بھی اس کائنات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی سچوایشن اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنے خان اپنا ہارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبل بھی استاد کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ چھیڑ دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی سریلی تھی اور گلے میں بلا کا لوچ تھا۔ وہ گانے کے دو بول دہراتی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہرنی جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی کہ میں دل چسپی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فن کو ہمیشہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور شاید فن کار کو اپنے قدر دانوں کی نظریں پڑھنے کا فن آتا ہے۔

''جب بارش کی پہلی بوند گرے
تم چلے آنا
میرا سندیسہ ملے نہ ملے
تم چلے آنا''

باہر برستی بارش کے جلترنگ کے ساتھ مل کر استاد بنے خان کے سُر اور سنبل کی رسیلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی اے کر لیا ہے مگر اب وہ اسے اپنے آبائی فن میں متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ بیگم نے انہیں اپنی نئی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے مگر یہ سب میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا جسے یقیناً کسی بہت بڑی مجبوری نے یوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے لجاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فن پسند آیا کہ نہیں..... تو میرے لب کپکپا سے گئے۔

''یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سننا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی جانچ کیسے کر سکتا ہے۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنر مند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے.....''

استاد بنے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لبنیٰ نے موضوع بدل دیا۔

''آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹر جی..... پری زاد صاحب کی یہ پہلی فلم ہے.....''

استاد بنے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔

''ہاں..... پرادب والے ہیں..... شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں.....''

میں نے لجاجت سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ ان تمام فیصلوں کی خودمختار ہے۔ مجھے ان بکھیڑوں سے دور ہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری بیٹھک رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنے اور سنبل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو پتہ چلا کہ رکشہ یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھا لیا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلنے تک وہیں کھڑے رہے۔ اگلی شام میں ٹھیک چار بجے عینی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ جیسے ایک پڑھاکو بچہ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے عینی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔

''فلم..... واہ..... پری زاد میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹر بنوں گی۔ ساری سجاوٹ میری طے کردہ ہوگی، ہر سیٹ پر میری بنائی ہوئی مورتیاں ہوں گی ٹھیک.....''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے..... مگر پہلے میرا مجسمہ تو مکمل کر دو..... کہیں اس فلم کے جھمیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے.....''

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑی۔ سناٹے میں یک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں سحرزدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا، زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹوڈیو کی رُخ موڑنے کا کہا تو کبیر اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پایا۔

''صاحب اجازت دو تو ایک بات بولے۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں بولو.....''

وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا کسمسایا۔

''صاحب فلم اسٹوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے..... ہزار دوست ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا.....''

میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ تبھی اپنی زبان کھولتا تھا جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا ٹینڈر میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا مقناطیس اپنے جوبن پر تھا جو مایا کا کوئی بھی ذرہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا

تھا اور یقیناً یہ بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسبِ معمول چند آوارہ کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد بنّے اور سنبل نے تیار کردہ دھنوں پر گیت گنگنائے۔ مگر شاعری کچھ عامیانہ سی لگی مجھے۔ لبنیٰ نے میری بے چینی بھانپ لی۔

''پری زاد..... تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے.....''

سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں نہیں..... مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے..... بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوالیں۔ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔

''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ دنیاداری سے ناطہ نہیں مگر ضرورت مند بھی ہیں۔ ہو سکے تو.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

ڈائریکٹر نے منہ بنایا۔ ''دیکھ لیں گے اسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری چھپا بیٹھا ہے اُس کے اندر.....''

لبنیٰ شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بنّے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لیتے ہیں اس شاعر سے..... ڈائریکٹر بوکھلا سا گیا۔

''ارے کیا بات کرتے ہیں سر جی..... آپ کیوں جائیں گے..... وہ خود آئے گا یہاں۔''

میں نے اُس کی سنی ان سنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک چند لوگ ''شاہ جی۔ شاہ جی'' کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے۔ استاد بنے نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوشی اور عزت سے بنّے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی تو بنّے خان نے مجھے بتایا۔

''یہ سید نور صاحب ہیں..... پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے..... آج کل بڑی اچھی فلم بنا رہے ہیں۔ ''مجاجن''

گاڑی بنے خان کے اندھیرے محلے میں پہنچی تو میں بھی باپ بیٹی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے رک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''اندر آجایئے صاحب..... مزار کے دروازے پر دستک نہیں دی جاتی.....''

میں، سنبل اور بنّے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لالٹین کی کم زور سی روشنی نے مٹیالا اجالا پھیلا رکھا تھا۔ بنّے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔

''کبھی ہم خود کو، کبھی گھر کو دیکھتے ہیں''

بان کی جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا وہ کم زور سا نوجوان اٹھ بیٹھا۔

''معاف کیجیے گا..... کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہٰذا.....''

وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چبھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہو گیا اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہو گئی اور وہ بے تابی سے کھڑا ہو گیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا۔

''پری زاد..... یہ..... یہ تم ہی ہو ناں.....''

میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''کیوں.....؟ یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانا کیا..... صرف لباس اور حلیہ بدلا ہے میرا..... مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں در بدر ناساز.....''

وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ ''کہاں چلا گیا تھا یار..... اپنے دوست کو بھی بھلا دیا.....''

بنے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشان سے ہم دونوں کو گلے مل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ ناساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست۔ جس نے میرے اندر چھپی شاعری کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے ناساز سے کہا۔

''آپ انہیں جانتے ہیں..... یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں پری زاد..... اور میں نے انہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کے لیے کہا تھا آپ کو.....''

ناساز حیرت سے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا۔

''یہ کیا انقلاب ہے پیارے..... سب فتح کر لیا کیا میرے شہہ سوار.....؟ تُو تو واقعی فاتح نکلا.....''

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں..... اب بھی ہار رہا ہوں..... بس سونا چاندی جمع ہوتا جا رہا ہے زادِ راہ کے طور پر..... دل اُتنا ہی ویران اور ناکارہ ہے اب تک.....''

وہ زور سے ہنسا۔ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت..... کہ وصالِ یار ہوتا.....''

بنے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ ناساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کم زور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سنتا رہا۔ اس کے آس پاس دواؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔

''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ناساز..... کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکا یوں بستر سے لگا پڑا ہے..... سب خیر تو ہے نا.....''

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یاد ہے..... کالج کے دور میں ہم نے چھپ کر ہاسٹل میں

وی سی آر پر فلم دیکھی تھی۔ ''نمک حرام.....'' اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنایا کرتے تھے۔ ''میں شاعر بدنام..... میں چلا..... محفل سے ناکام..... میں چلا.....'' تو بس یار..... یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں..... یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

اور یہ پھولوں جیسی لڑکی..... سنبل..... یہ اس شاعر ناکام کی کیا لگتی ہے.....؟''

اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''پگلی ہے..... مزاروں کے در کھٹکھٹاتی رہتی ہے..... اب دیکھو..... تمہیں پکڑ لائی ہے..... اور یہ تم ہی تھے کہ آ گئے..... کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا.....''

اتنے میں باہر صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ناساز کو لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات لیے کھڑی تھی۔

''آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل۔''

وہ رندھیائی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ اُسے بچالیں پری زاد صاحب..... آپ ہی اُسے بچا سکتے ہیں..... ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں.....''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں..... ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ.....؟ کیا ہوا ہے ناساز کو.....''

سنبل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''اُسے کینسر ہے..... اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اُس کا کینسر.....''

میرے پیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

باب 18

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے نکلی تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چلو میرے ساتھ..... اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمے داری ہے..... اٹھو..... جلدی کرو.....''

ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

''بہت دیر ہو چکی ہے پری زاد..... اب مجھے یہیں رہنے دو..... یہ کمرہ، یہ تنہائی..... اب یہی مری سنگت ہے، اور پھر یہاں وہ پگلی بھی تو ہے ناں..... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو.....''

میں نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ساری زندگی دوسروں کو جینے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو؟ ایسا کیوں کر رہے ہو میرے یار.....؟''

ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

''زندگی خود مجھ سے دامن چھڑانے کی فکر میں ہے پیارے..... میں ہی ڈھیٹوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں..... اب اگر مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں..... میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے نا پری زاد.....''

میں نے واپس پلٹنے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں..... میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام..... کل تیار رہنا..... تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔''

ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔

تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو اُن سے ملاقات مسلسل

اگلے روز عینی کی گیلری میں بھی میرا دھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ عینی نے حتمی طور پہ چند

زاویے درست کیے اور مجسمے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''بس جناب..... ہو گیا مکمل.....''

اس کی آواز سے جوش ٹپک رہا تھا۔

''بتائیں پری زاد..... کیسا بنا ہے آپ کا اسکلپچر .....''

میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر عینی کے بنائے ہوئے مجسمے پر پڑی تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، میں بے اختیار اٹھ کر مجسمے کے قریب آ گیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، اتنا بے داغ، خوبصورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ..... ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ عینی میری حالت سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

''میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پری زاد..... بتائیں ناں..... کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے؟..... آپ چپ کیوں ہیں.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟..... کیا میں نے بہت بُرا اسکلپچر بنایا ہے.....؟ کچھ تو بولیں پلیز.....''

وہ پریشان سی ہو گئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اجنبی تھی۔

''نہیں..... تم نے دنیا کا سب سے خوبصورت چہرہ تراشا ہے..... مگر میں ایسا نہیں ہوں پیاری لڑکی..... میں تو وہ ہوں جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوائیں گھبرا کر تھم جاتی ہیں..... سورج مدھم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی تپتی کرنیں برسانے لگتی ہیں.....''

وہ تڑپ کر میرے قریب آ گئی۔

''ایسا کیوں کہتے ہیں آپ..... میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں..... یہ میرے من کی تصویریں مٹی کے قالب میں ڈھالتی ہیں..... سچ بتائیں اس چہرے کے خدوخال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا.....''

میری آواز بھرا گئی۔

''ہاں خدوخال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہہ ہیں۔ مگر جو نور، جو وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاریگری نے اس مجسمے میں منتقل کر دیا ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی نہیں ہے.....''

وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کومل من کو آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ بڑے ظاہر پرست ہوتے ہیں یہ لوگ..... وہ جاننا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا اُداس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ وہ کس خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ عینی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اُس کے گھر سے واپسی پر اُسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے پرانے محلے والے گھر لے آیا۔ ناساز نے عینی کو میرے ساتھ دیکھا تو حسب عادت

مصرعہ اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

''سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں.....''

میں نے ان دونوں کو متعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا۔

''سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں''

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''باز آ جاؤ..... عینی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے..... دنیا کی کوئی بھی بیماری لاعلاج نہیں ہوتی..... کوشش کرنا ہمارا فرض ہے.....''

عینی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے ہوئے نغمے بھی عینی کو سنائے، کچھ دیر بعد سنبل بھی آ گئی اور حسبِ معمول دو لڑکیوں کے اکٹھے ہوتے ہی باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئیں۔ کہتے ہیں دو لڑکیاں جب آپس میں ملتی ہیں تو عموماً ڈھائی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے اُن کا پہلا سوال ''ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟'' ہوتا ہے۔ وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھیں شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔

ناساز سرک کر میرے قریب آ گیا۔

''تم تو بڑے چھپے رستم نکلے پری زاد پیارے..... ایسی پری اپنے ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دینے کا باعث بن جائے..... اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی ویران ہے.....''

میں نے دکھ سے باہر بیٹھی عینی کی طرف دیکھا۔ ''وہ دیکھ نہیں سکتی..... اس لیے میرے ساتھ ہے..... ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تضحیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا..... کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھوکا دے رہا ہوں..... اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم اور انجان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بنا رہا ہوں.....''

ناساز میری بات سن کر خاموش سا ہو گیا۔ ''میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے زخموں پر نمک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے..... لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبا نہیں سکتے تو پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو..... آخر کب تک خود کو اس ان دیکھے عذاب کی بھٹی میں جھونکے رکھو گے.....''

میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا۔ ''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں..... صرف جیب میں دمڑی ہونی چاہیے، جو ماشاء اللہ اب تمہارے پاس بہت ہے..... کہیں بھی بیرونِ ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروا لو..... آج کل تو ساری دنیا کو چہرے بدلنے کا خبط سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے

کے لیے پلاسٹک سرجری کروا لیتے ہیں..... ان میں سے کچھ مائیکل جیکسن جیسے جنونی بھی ہوتے ہیں..... جو ممنوعہ انجکشن لے کر اپنے سارے جسم کی جلد کا رنگ بھی تبدیل کر لیتے ہیں..... تو پھر اگر تم اپنی جون بدل لو گے تو اُس میں ایسی کون سی قیامت آ جائے گی.....''

اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔ رخصت ہوتے وقت ناساز نے عینی سے کہا۔ ''سنو لڑکی..... آج میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو..... تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خوبصورت آنکھیں ہیں..... اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی.....''

عینی کی پلکیں نم ہو گئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا دھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں الجھا رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن عذابوں کا سامنا رہا ہے وہ سب الجھنیں، کرب اور عذاب یوں ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر عمر بھر کی شناخت بدلنا بھی تو کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس پری زاد کو جانتے ہیں وہ ایک نئے اور اجلے چہرے والے پری زاد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری رات نہ جانے ایسے کتنے بے سر و پا خیالات میرے خالی دماغ میں کھنکھناتے رہے۔ جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمالی میرے ہی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔

''یہ کیا سر جی۔ آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی۔''

کمالی کے ہاتھ میں صبح کا اخبار دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو یہ خبر چھپ گئی..... یہ اخبار والے جانے اتنی جلدی کیسے اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ ابھی تو صرف منصوبہ ہی بنایا تھا۔''

کمالی نے جوش میں اندرونی صفحہ کھولا۔

''شہہ پارہ بیگم کا پورا انٹرویو چھپا ہے سر..... ساری فلم انڈسٹری ہلا کر رکھ دی ہے آپ نے..... کبھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا..... آہ..... مگر اب تو فلم دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی.....''

میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمالی اپنی دھن میں بولے گیا۔

''اس دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا سر..... کہ شادی کے اتنے سالوں بعد بچوں اور گھر بار کے مسائل کے ہجوم میں ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے؟..... بات صرف محبت کی نہیں ہے..... ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور خواہشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غم دوراں کی آندھی میں.....

اب یہی فلم ایکٹر بننے والی خواہش ہی لے لیں میری..... کاش میں شادی کے چکر میں اس

آرزو کا گلا نہ گھونٹنا.....''

کمالی باقاعدہ غمگین ہو گیا۔ میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔

''جانتے ہو کمالی..... دنیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے..... وہ..... جو اپنے ماضی کے کیے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حال میں خود کو کوسے..... تم نے اس وقت وہی فیصلہ کیا جو تمہارے دل نے بہتر جانا..... تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی..... اگر اس وقت تم فلم انڈسٹری جوائن کر لیتے تو شاید آج ایک نامور آرٹسٹ کہلاتے مگر یقین کرو..... اپنی محبت کو کھو دینے کی کسک تمہیں آج زیادہ غمگین رکھتی..... جسے تم نے پالیا..... بس وہی تمہارا نصیب ہے..... باقی سب سراب ہے.....''

کمالی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر..... مگر پھر یہ پایا ہوا نصیب اپنی کشش کیوں کھو دیتا ہے..... لاحاصل ہی ہمیشہ پرکشش کیوں رہتا ہے.....؟''

میں نے لمبی سانس بھری۔

''شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناشکرا ہے..... اور رہی بات محبت کی..... تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفتہ رفتہ ہماری محبت شفقت میں بدل جاتی ہے..... محبت، محبت نہیں رہتی..... ایک گہری شفقت بن جاتی ہے.....''

کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''شفقت؟..... میں سمجھا نہیں سر.....؟''

''ہاں کمالی..... شفقت..... ہماری محبت کہیں کھوتی نہیں ہے۔ بس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے..... اور ہم باقی ساری زندگی اسی شفقت کو محبت سمجھتے ہوئے گزار دیتے ہیں..... شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکہ ہمیشہ جاری رہتا ہے..... جاؤ کمالی..... اپنے بیوی بچوں کو اپنا پورا وقت دیا کرو..... کیونکہ کبھی کبھی شفقت کا قرض محبتوں کے ادھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے.....''

کمالی چپ چاپ دفتر سے نکل گیا۔ دوپہر کو لبنیٰ کا فون آیا تو میں نے اُسے خوش خبری سنائی کہ ناساز نے فلم کے سارے گیت لکھ کر استاد بنّے خان کے حوالے کر دیے ہیں۔ میوزک بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا لہٰذا اگلے ہفتے فلم کی ساری موسیقی ترتیب دے دی گئی۔ سنبل نے مجھے بتایا کہ اس نے مہینوں بعد ناساز کی آنکھوں میں خوشی کی سچی لہر دیکھی۔ جب اس نے اپنی شاعری پر سنبل کی آواز کا جادو جگتے ہوئے سنا۔ لبنیٰ کی خواہش تھی کہ فلم کے گانے کینیڈا یا یورپ کے کسی حسین مقام پر فلم بند کیے جائیں۔ فلم کی کاسٹنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب صرف شوٹنگ کا مرحلہ شروع ہونا باقی تھا۔ میں دن بھر غیر محسوس طور پر طب کے رسالوں اور انٹرنیٹ پر دنیا کے بہترین پلاسٹک سرجنز کی تفصیلات کھوجتا رہتا تھا۔ میرے دفتر کی

الماریوں اور میز کے خفیہ دراز اب ایسی معلومات سے بھرے رہتے تھے مگر یہ سب کچھ میں اس طرح چھپ کر کر رہا تھا جیسے کوئی چور چوری کرتا ہے۔ پہلے مجھے ہمیشہ یہ خوف اور فکر دامن گیر رہتی تھی کہ لوگ میری صورت کا مذاق اڑائیں گے اور اب ایک راستہ دکھائی دیا تھا تو یہ ڈر میرے دامن سے لپٹا رہتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے.....؟ ہماری زندگی کے نوے فیصد معاملات کی الجھن بس اسی ایک جملے میں ہی تو پنہاں ہے کہ ''زمانہ کیا کہے گا.....؟''

کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم اُنہی لوگوں کی باتوں کی فکر میں گھلے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ہماری زندگی اجیرن ہوتی ہے۔ اگلی شام میں عینی کے گھر پہنچا تو وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن کے لیے نکل چکی تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا تو اس کی ماں نے مجھے چائے کے لیے روک لیا، کمرے میں ہر جانب میڈیکل رپورٹس اور آنکھوں سے متعلق دنیا کے کچھ مشہور ہسپتالوں کے کتابچوں کا انبار سا لگا ہوا تھا۔ عینی کی ماں نے مجھے بتایا کہ عینی سات سال کی عمر تک بالکل ٹھیک تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کی بینائی جاتی رہی۔ اس وقت عینی کے ابو زندہ تھے اور انہوں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی مگر عینی کی بینائی واپس نہ آسکی۔ پھر کئی سال بعد بات یہاں تک پہنچی کہ اگر عینی کے گروپ سے مشابہت رکھتا ہوا لینز (قرینہ) مل جائے تو عینی کی بصارت واپس آسکتی ہے۔ عینی کی ماں نے دنیا بھر کے طبّی اداروں کو اپنی بیٹی کے کیس کی تفصیلات بھجوا رکھی تھیں اور اب مہینوں سے اس جواں ہمت خاتون کا کام بس یہی تھا کہ وہ عینی کی آنکھوں کے لیے قرینے کی تلاش کے لیے دنیا بھر میں خط و کتابت کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اُن کی تلاش رنگ لائے گی۔ عینی کے گھر سے نکلتے وقت میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر عینی کی بینائی میری سرجری سے پہلے واپس آ گئی تو وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی.....؟

اس کے مَن نے میری جو شبیہہ تراشی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گی۔ کاش اس ساری دنیا میں کسی کی آنکھیں ہی نہ ہوتیں اور ہم سب اپنی انگلیوں کی پوروں سے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر جہاں ''کاش'' آ جائے وہاں آخر میں صرف ایک ''آہ'' رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک لمبی آہ بھری۔ کچھ بھی ہو مجھے کسی بھی صورت میں عینی کی بصارت واپس آنے سے پہلے اپنی سرجری کروانی ہوگی۔ مجھے اپنے چہرے کو عینی کے بنائے ہوئے مجسمے کی شبیہہ میں ڈھالنا ہوگا۔ تاکہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھے تو میں اُسے اسی طرح نظر آؤں جیسا وہ مجھے محسوس کرتی ہے۔ گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میرے اندر میرے اپنے ہی متضاد خیالات کی ایک ایسی یلغار جاری تھی جس نے مجھے پوری طرح نڈھال کر کے رکھ دیا۔ وہ پوری رات عجیب کرب میں گذری اور تنگ آ کر میں نے انٹرنیٹ سے جمع شدہ معلومات کے مطابق پلاسٹک سرجری کے تمام اداروں کو ای میلز (Emails) کر دیں۔ جس میں مَیں نے اپنی تازہ ترین تصاویر اور باقی تمام

جزئیات تحریر کر دی تھیں۔ دوسرے دن ہی مجھے مختلف اداروں سے جوابات موصول ہونا شروع ہو گئے اور تین دن بعد ان جوابات کے انبار میں سے مجھے اپنے مطلب کے ادارے کا انتخاب کرنا آسان ہو گیا۔ ٹورنٹو کے ایک طبی ادارے نے پلاسٹک سرجری کے لیے جو لوگو ڈیزائن کیا تھا اس پر لکھی ایک سطر نے مجھے اسے چننے پر مجبور کر دیا، جس کی تحریر کچھ یوں تھی:

''ہم چاہے تقدیریں نہ بدل پائیں..... پر چہرے بدل دیتے ہیں.....''

میں نے پائن ہل Pine Hill نامی اس پلاسٹک سرجری کے ادارے کی تمام تفصیلات اکٹھی کر لیں اور پھر اس کے سربراہ پال جونز کو ساری تفصیل لکھ بھیجی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پال کا جواب آ گیا کہ اُن کا ادارہ بنیادی طور پر آگ میں جھلس جانے والوں یا کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے اصلی خدوخال کھو دینے والوں کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے، اور میرا کیس ان کے ادارے کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ میں نے پال کو دوسری میل بھیجی کہ ''کیا ان کا ادارہ محبت کرنے والوں کے خواب پورے نہیں کر سکتا؟ میں بھی تو تقدیر نہیں، صرف چہرہ بدلنے کے خواہش مندوں میں شامل ہوں..... اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کو جھلسا کر ان کے ادارے کی شرط پر پورا اترنے کو تیار ہوں.....''

میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موند لیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے اِن باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی:

''یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے..... ٹھیک ہے لڑکے..... اگر تمہاری یہی ضد ہے تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا۔ لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا، کیونکہ میرا ادارہ بہرحال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے ملک کے کسی مستند طبی ادارے سے یہ ابتدائی ٹیسٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص ڈاکٹر پال جونز.....''

میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہو چکی تھی، اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو..... سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے کے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھوتا ہے..... مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ کا، ہماری فکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لبنیٰ اور ڈائریکٹر پہلے سے

میرے انتظار میں بیٹھے تھے، لبنیٰ نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دلچسپی نہیں لے رہا ہوں جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ہم بہت جلدی کینیڈا میں فلم کے گانوں کی فلم بندی کے لیے روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گانوں کی فلم بندی کا بتا کر یونٹ کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں..... مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت چاہتے ہوئے بھی میں سرجری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور زود بین ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے ان کے اثرات سے نظریں چرانے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سرجری کروالوں..... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک دور دراز کے بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے طبی تجزیے بھی کروا لیے تھے اور اب مجھے ان کی رپورٹ آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد عینی کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں ہفتے میں ایک آدھ چکر اس کے گھر کا ضرور لگا لیتا تھا۔ کچھ گلیاں اور کوچے اپنی سمت بلانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ من موہنی سی لڑکی کس طرح چند دنوں میں ہی میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالانکہ میں نے تو اس دل کے کواڑ سدا کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی، یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی مخلص اور مہربان ساتھی کی دستک کا ہی انتظار کرتے رہتے ہیں؟ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آپ جلدی سے شوکت خانم ہسپتال پہنچیں، آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔''

میں سب چھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ ہسپتال کی طرف بھاگا۔ راہداری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں میں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سرسوں کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر خشک سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بمشکل مسکرایا۔

''رستہ روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی
جانے ٹوٹے دل میں، کیا ارمان ہے باقی
جانے بھی دے اے دل
سب کو میرا سلام
میں چلا..... میں شاعر بدنام
میں چلا..... محفل سے ناکام..... میں چلا.....''

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کہیں نہیں جا رہے ہو تم..... سنا تم نے..... میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا.....''

اس کے سرہانے کھڑی سنبل اور استاد بنّے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بمشکل آنکھیں کھول کر بولا۔

''دیکھا پری زاد پیارے..... یہ تو واقعی اسی فلم کا سین بن گیا یار..... لگتا ہے جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے فلما دی تھی، مگر یار..... میں بہت تکلیف میں ہوں..... یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے.....''

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چپ ہو جاؤ..... خود کو نڈھال مت کرو.....''

''نہیں پیارے..... بولنے دو مجھے..... بس آخری تھکن ہے اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے.....''

ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا۔

''یہ کہانی بھی ادھوری رہ گئی پری زاد..... میرے جانے کے بعد ان باپ بیٹی کا پورا خیال رکھنا..... اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو..... تو..... اس کے ٹائٹل میں میرا نام.....''

ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

''ناساز..... چپ کیوں ہو گئے..... بولتے کیوں نہیں..... تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکہ دے کر نہیں جا سکتے..... بولو..... دغاباز..... جھوٹے..... بات کرو۔''

میری چیخیں سارے ہسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بنّے نے ہسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے دور کر دیا۔ میں چیختا چلاتا رہ گیا۔ استاد بنّے نے دبوچ کر مجھے گلے لگا لیا۔

''چپ کر جاؤ۔ ناساز اب کبھی نہیں بولے گا۔ وہ مر چکا ہے۔''

باب 19

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا۔ کسی کام میں من نہیں لگ رہا تھا۔ میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف درد ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ سکھ کی سیاہی ان کی باری آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی ہے شاید؟ اور پھر ویسے ہی ایک اداس شام جب میں اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر کو سوچ رہا تھا تو عینی آ گئی۔ ''کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو..... ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا جانا طے تھا..... سو وہ چلا گیا..... مگر ہم سب ابھی یہیں ہیں ہماری خاطر ہی سہی..... مگر خود کو سنبھالیں.....''

میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑیں۔ ''اگر سب کا جانا طے ہی ہے تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے.....؟ یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں۔''

عینی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ''باریاں اس لیے لگائی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد اُن کے اپنوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں۔ سنبل اور استاد بنّے خان کی ذمہ داری آپ پر ڈال گیا ہے آپ کا دوست..... کیا انہیں یونہی تنہا چھوڑ دیں گے پری زاد.....''

کیا ستم ہے، ہوا کے سب راستے، سب دروازیں بند کر دینے کے بعد زندگی ہمیں سانس لینے کے لیے بھی مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ جینا تو ہے۔ ہاں..... جینا تو پڑے گا، مزید ستم سہنے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے..... اگلے ایک ہفتے میں شہر کی ایک نئی بستی میں استاد بنّے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمالی نے اس سارے معاملے میں بہت پھرتی دکھائی اور دو ہفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گذر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پاتی تھی۔ مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئینہ دیکھا تو مجھے ایک دم ہی ڈاکٹر پال کی یاد آ گئی۔ میں

نے اپنی ای میل کھولی تو ڈاکٹر پال کی تین میلز آ چکی تھیں جس میں اس نے میرے کرائے گئے طبی تجزیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اسے ای میل کر دی۔ کمالی اس عرصے میں فلم یونٹ سے مسلسل رابطے میں تھا اور وہ مجھے وقتاً فوقتاً پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل عینی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا..... میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے دہائی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی چھاؤں درکار ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری عمر بھر کی ہم سفر بننا قبول کرے گی.....؟..... کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے؟..... کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں ختم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے.....؟ میں نے راستے میں گاڑی رُکوا کر پھول والے سے عینی کے لیے ایک گلدستہ بنوانے کا سوچا۔ لیکن بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا۔ دنیا کے سارے پھول پنکھڑیوں سے جڑ کر بنتے ہیں۔ مگر جب خود کسی پنکھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چناؤ کیسے کرے؟ ہر پھول اس کے سامنے ہیچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ مدِ مقابل جب ''گلاب تر'' ہو تو پھولوں کو بھی ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔ میں بہت دیر اُس کے گھر کے دروازے پر کھڑے رہ کر اپنی الجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے حسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ ابھری اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ گلدستے پر میری گرفت سخت ہو گئی اور پھر دروازہ کھلا تو میرا ہاتھ ہوا میں ہی بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نوجوان میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

''جی فرمایئے..... کس سے ملنا ہے آپ کو.....''

میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کھلتی رنگت، بکھرے بکھرے سے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ خوبرو، بااعتماد اور مغرور سا وہ لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گلدستے والا ہاتھ میکانکی طور پر خود بخود پیچھے چھپ گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا:

''تم کون ہو.....''

وہ لڑکا ہنس پڑا۔

''لو وہ بھی ہم سے پوچھتے ہیں کہ میر کون ہے.....؟

جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں..... ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نازل ہوا ہوں..... اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟''

میں نے اپنے ڈولتے دل کو سنبھالا۔ ''میں عینی کا دوست ہوں..... پری زاد نام ہے میرا.....''

عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا۔

''اچھا..... تو آپ ہیں پری زاد..... گریٹ..... سر کھا لیا ہے اُس پاگل لڑکی نے صبح سے میرا آپ کا ذکر کر کے..... سچ بتاؤں تو میں آپ سے جیلس ہو رہا تھا.....''

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔

''بُرا مت مانیے گا۔ مذاق کی عادت ہے میری..... اندر آئیں ناں..... باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی اندر ہی ہیں.....''

میں چپ چاپ اس کھلنڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھوں میں پکڑا ہوا گلدستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آ گئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

''ارے آپ آ گئے پری زاد..... دیکھیں کون آیا ہے..... میرے بچپن کا ساتھی..... میرا سب سے بہترین دوست..... میرا کزن عدنان..... سچ بتائیں..... اس نالائق کو دیکھ کر ذرہ بھر بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا..... حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی۔''

عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں..... تمہاری گلی کا ایک آوارہ..... جو گھنٹوں دوپہر میں تمہاری کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا..... یاد ہے ناں بلّی.....''

وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اسی لمحے میں نے خود کو وہاں سے بے حد اجنبی سا محسوس کیا، کل تک یہی در و دیوار مجھے کتنے مانوس کتنے مہربان سے محسوس ہوتے تھے۔ اور آج ایک اجنبی کے آ جانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تندہی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں جُتا ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے۔ اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ عینی نے عدنان کو ٹوکا۔

''بس بس..... رہنے دو یہ تابعداری کی باتیں..... خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دوپہروں میں کس کے لیے دھوپ چاٹا کرتے تھے..... کیا نام تھا اُس عینکی کا..... ہاں..... نگہت..... اور وہ دوسری پھینی..... مہہ وش..... اور وہ تیسری.....''

عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔

''اوہو..... بس بھی کرو..... وہ بچپنا تھا میرا..... اور ایسی دو چار معاشقہ نما دوستیاں تو سبھی کرتے

ہیں لڑکپن میں..... کیوں پری زاد صاحب..... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں..... آپ نے بھی کی ہوں گی..... کچھ خواب تو پالے ہوں گے اُس عمر میں آپ نے بھی.....''

میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب..... خواب پالنے کے لیے، نیند کے کچھ خوبصورت ''پالنے'' بھی ضروری ہوتے ہیں..... میں تو آج تک نیند کا وہ ''پالنا'' ہی ڈھونڈ رہا ہوں..... نیند آ جائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں۔''

عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''واہ..... میری پیاری کزن یونہی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی..... بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے.....''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب میں اجازت چاہوں گا..... انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی.....''

وہ دونوں بوکھلا سے گئے۔ عینی جلدی سے بولی۔ ''ارے..... آپ کہاں چل دیے..... امی نے کھانا لگا دیا ہے..... اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر مجھے کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے..... بتائیں ناں.....؟''

عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی۔

''ارے ہاں..... یاد آیا..... فلم کا یونٹ کینیڈا جا رہا ہے..... شاید میں بھی جاؤں..... سوچا تم سے بھی پوچھ لوں.....''

عینی خوشی سے چلائی۔

''واہ..... زبردست..... کاش میں بھی ساتھ چل سکتی..... مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں..... میرے دشمنِ جاں..... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب.....''

میں نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا۔

''کیوں؟'' عدنان نے جلدی سے دخل دیا۔ ''پری زاد صاحب..... آپ ہی سمجھائیں اس لڑکی کو..... میں نے امریکہ کے بہت بڑے طبی ادارے سے عینی کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے..... وہ لوگ نوے فیصد پرامید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں..... اور انہیں مشابہت والا قرینہ بھی مل جائے گا کیونکہ آج کل باہر کے ملکوں میں سزائے موت کے قیدی یا بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریض عموماً اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے عینی کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قرینہ ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے..... میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں عینی کی

غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے.....''

عینی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''خواب دیکھنا چھوڑ دو مائی ڈیئر کزن ڈاکٹر عدنان..... پہلے تو یہاں سے امریکہ جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہئیں ہوں گے..... اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ الگ..... کہاں سے آئیں گے اتنے روپے.....؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم سے ہی اپنا آپریشن کرواؤں گی..... اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں..... سو نو مور بحث او کے.....''

وہ دونوں بچوں کی طرح بحث کرتے رہے۔ میں نے عینی سے اجازت چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔ سارے راستے ان دونوں کی نوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو عینی سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر خود عینی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں تھمنے لگتی ہے۔ کانٹوں جیسی چبھن اور کسک ہمارے وجود کو کیوں چھلنی کرنے لگتی ہے؟ کیا اسی کو رقابت کہتے ہیں؟..... ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے چند روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک چونک جاتا۔ مگر عینی تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی۔ اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ کیا مجھے کوئی پریشانی ہے؟..... میں اسے کیا بتاتا..... مجھے تو خود پتہ نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ مس قراۃ العین مجھ سے ملنے آئی ہیں تو ایک لمحے میں ساری بے چینیاں ساری بے تابیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں بے تابی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا۔ مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سنتے ہی وہ ناراضگی سے بولی۔

''کہاں غائب ہیں آپ تین دن سے..... نہ کوئی فون نہ کوئی خیر خبر..... میں آپ سے سخت ناراض ہوں..... جان لیں اچھی طرح.....''

میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا مگر وہ روٹھی رہی۔ عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر..... مجھ سے پوچھیئے.....''

میں نے گہری نظروں سے اُس حسنِ ناراض کو دیکھا۔ سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالہ لگ رہی تھی۔

''چلو کچھ جرمانہ طے کر دو، میری غیر حاضری کا.....''

آخر کار بات یوں بنی کہ مجھے ان دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور اوپن ایئر ریستوران میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت عینی کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ

عینی کے لیے میچنگ لینز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر عینی جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے دبے لفظوں میں مجھ سے رات کو عینی کو منانے کی درخواست کی۔ وہ اپنا آبائی گھر بیچ کر عینی کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی ہزار خدشے ہزار وسوسے..... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری محبت ریت کے ذروں کی طرح میری مٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو ریستوران کی ٹیبل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے دو ہنسوں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تینوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتا تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ عینی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔

''آپ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں پری زاد..... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم سم ہیں۔''

''نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں..... وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے.....''

عینی نے لمبی آہ بھری۔

''اچھا..... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا۔''

میں نے دھیرے سے کہا۔ ''ہاں..... وہ ہے ہی ایسا جادوگر..... آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے۔''

عینی ہنس دی۔ ''ہاں..... ٹھیک کہا آپ نے..... پتہ ہے پری زاد..... میں نے سات سال کی عمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا۔ جانے اب کیسا دکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اٹا رہتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اسے خالہ سے..... آپ کو ایک بات بتاؤں پری زاد..... میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب میری بینائی واپس آئے..... میں سب سے پہلے عدنان کو ہی دیکھنا چاہتی تھی..... ہاں مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے..... اور وہ آپ ہیں پری زاد..... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں ہیرے اور کوئلے کو ایک ہی فہرست میں درج کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

''جی پری زاد صاحب..... کچھ آیا اس پگلی کی عقل میں یا نہیں.....؟ اسے سمجھائیں کہ اپنوں کے خلوص کو یوں ٹھکرایا نہیں کرتے.....''

عینی نے احتجاج کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟..... اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اس گھر

سے..... میری نظر میں وہ سب یادیں میری بینائی سے بہت زیادہ اہم ہیں..... بس..... ہو گیا فیصلہ..... تم وہ گھر کبھی نہیں بیچو گے..... اور اگر کبھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا.....''

عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دخل اندازی کی۔

''تم دونوں خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہو۔ عینی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ عینی کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا۔ کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔''

''نہیں پری زاد..... ایسا مت کہیں..... میں آپ سے رقم نہیں لوں گی..... میں نے زندگی بھر ایک یہی خودداری کا بھرم ہی تو کمایا ہے..... کیا آپ دونوں مجھ سے میری عمر بھر کی یہ واحد کمائی بھی چھین لینا چاہتے ہیں..... کیا فائدہ ایسی بینائی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عمر جھکی رہے..... پلیز..... آپ ایسا نہ کریں.....''

میں نے ایک گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے..... اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یوں ہی سہی..... مگر پھر تمہیں میری ایک بات ماننا ہوگی۔ میں عمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے۔ لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر میں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا۔ لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر میرے پاس عدنان کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کر لے گا مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے۔''

عینی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''لیکن.....''

''کوئی اگر مگر لیکن نہیں سنوں گا میں بس طے ہو گیا..... تم لوگ جانے کی تیار کرو..... آج کل ویسے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ برس میں ہی اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا.....''

عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''یہ ہوئی نا بات..... مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے..... آپ واقعی کمال ہیں پری زاد صاحب.....''

اس وقت تو عینی خاموش رہی لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل پر جگمگانے لگا۔

''پری زادی..... میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں..... میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔''

میں نے بات مذاق میں ٹالی۔ ''نہیں بے وقوف لڑکی..... تمہیں نہیں پتہ کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ لینا..... عدنان رقم چکا نہ سکا تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے پری زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟''

وہ ہنس پڑی۔

''آپ ہمیشہ گھاٹے کے سودے ہی کرتے ہیں..... اچھا ٹھیک ہے..... لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں..... جب کبھی میں دنیا دوبارہ دیکھوں تو میری پہلی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں..... قبول ہے تو ٹھیک..... ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے.....''

میں نے جلدی سے ہامی بھرلی۔ ''ٹھیک ہے ضدی لڑکی..... مگر دیکھو..... اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو..... ویسا ہی ہوگا.....''

میں نے عینی کو تو تسلی دے دی مگر خود میرا چین وسکون ہمیشہ کے لیے ہوا ہوگیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر لان میں ٹہلتا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد عینی جب مجھے دیکھے گی تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنوا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''سنو عدنان.....'' وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ''یہ گھر تمہارا تھا..... اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا..... میں نے صرف عینی کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈرامہ کیا تھا۔ عینی کی آنکھیں واپس آ جائیں..... اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔ البتہ یہ مکان والا راز عینی کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا۔''

عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پری زاد صاحب..... میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔ یقین جانیئے..... یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی.....''

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہمارا ابھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب..... کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی.....''

عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا..... ''آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے ہفتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ مگر عینی کی آنکھوں کی پٹی کھلنے سے پہلے آپکو بھی امریکہ پہنچنا ہوگا۔ ورنہ وہ ضدی لڑکی آپریشن ہی نہیں کروائے گی..... بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو..... اس نے آپریشن کے لیے ''ہاں'' بھی صرف آپ کے کہنے پر ہی کی ہے.....''

میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جگمگاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیتے تھے جب وہ عینی کا ذکر کرتا تھا۔

''آپ جانتے ہیں پری زاد صاحب..... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن عینی پہلی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی..... اُسی دن میں اسے شادی کے لیے پرپوز کر دوں گا..... جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں میں.....''

میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کیا.....؟..... میرا مطلب ہے کیا عینی کو بھی اس بات کی خبر ہے۔''

عدنان نے خوابوں کی بستی سے جواب دیا۔ ''ہاں..... وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنی ہم سفر بنانا چاہتا ہوں..... مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پروپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ سے ہی یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے..... چلتا ہوں..... بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں.....''

عدنان پلٹ کر چلا گیا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا، میں وہیں کرسی پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمالی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں سر.....؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''کمالی..... میں گھر واپس جا رہا ہوں کمالی..... مجھے ڈسٹرب مت کرنا.....''

میں دروازے تک پہنچ کر رک گیا۔ کمالی ابھی تک گم سم سا کھڑا تھا۔

''کمالی..... تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی..... تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا۔''

کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''نہیں سر..... خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا..... مگر سنا ہے کہ محبت کی اصل روح تبھی ظاہر ہوتی ہے جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے.....''

میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمالی سے پوچھا۔

''رقیب کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے کمالی؟''

''رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر..... رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا.....''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے..... نہ کہ کوئی جنگ''

کمالی مسکرا دیا۔ ''محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بھلا اور کیا ہوگی اس دنیا میں سر..... اور آپ نے سنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے.....''

میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے پنجے گاڑھنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو تالا لگانے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔

''کبیر خان..... تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟''

کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاب.....''

باب 20

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا۔
"آپ حکم کرو صاب..... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے آپ کے لیے....."
میں اپنے خیالات سے چونکا۔ "ہاں..... فی الحال کچھ نہیں..... بس ایسے ہی کچھ خیال آ گیا تھا..... تم جاؤ..... رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھر والی راہ دیکھتی ہو گی تمہاری....."
کبیر کچھ کہتے کہتے رک گیا اور الجھن زدہ سا وہاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میرے اندر یہ کیسی عجیب سی ایک جنگ چھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا پری زاد جنم لینے لگا تھا جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھانے لگا تھا، وہ سارا دن میرے اندر بولتا رہتا تھا۔
"یہ کیا کرنے جا رہے ہو احمق انسان..... خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتظام خوب کیا ہے تم نے..... اب تمہاری رقم سے عدنان عینی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑے دیکھے گی تو فیصلہ کس کے حق میں ہو گا یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے..... مگر صرف مان..... عزت اور تعظیم اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس تبسم کو میں اپنے مقدر کی پھوار سمجھا تھا وہ تو اس کی عادت نکلا چار دن اس نے مجھ سے ہنس کر بات کیا کر لی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا میں تو اس کی محبت کا حقدار سمجھ بیٹھا تھا خود کو..... احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے..... میں وہ منافق تھا جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اس وقت تک روندتا رہوں جب تک کہ زندگی کی آخری رمق باقی رہے۔
اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر کسی ہوٹل کا بورڈ دیکھ میں نے ڈرائیور کو گاڑی اس طرف موڑنے کا کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا چاہتا تھا۔ اور کبھی کبھی تنہائی ہمیں صرف لوگوں کے ہجوم میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے، یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض

نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے مگر عموماً مسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور سا اُٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لبنیٰ اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شہہ پارہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لبنیٰ کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینت سنبھال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گذرنے کے بعد یہ یادیں بھی ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہوں گی۔ لبنیٰ کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی۔

''ارے پری زاد..... تم.....؟..... کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟''

''نہیں..... خود سے چھپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا.....'' میرا جواب سن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔

''کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو ہمیشہ.....؟ کب تک جلتے رہو گے..... یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو.....''

میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''گویا منافقت کا درس دے رہی ہو.....''

''نہیں پری زاد نہیں..... مگر یہ دوغلا پن ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمالی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں چل رہے ہو..... کیا کوئی پریشانی ہے.....؟''

میں نے بات ٹالی۔ ''نہیں..... تم لوگ پہنچو..... میں بعد میں آ جاؤں گا اور سنو..... مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی..... لیکن وعدہ کرو..... سپر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا.....''

وہ ہنستے ہنستے رو پڑی..... ''مت کیا کرو ایسی باتیں..... یہ سب تمہاری وجہ سے ہے..... اور اگر میرا بس چلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں..... میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پری زاد.....''

میں نے شکوہ کیا۔ ''پھر وہی احسان کی بات.....؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا.....''

لبنیٰ کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ''تم نہیں جانتے پری زاد..... مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں ان گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں، ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو عمر بھر کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے محسن کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے۔ اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے.....''

لبنیٰ کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل خاموش کر دیا تھا، بے خیالی میں میری نظر پڑی تو کمالی اور عینی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب نما شئے ہے یہ سیل فون بھی۔ ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط شکنجے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ عینی بی بی کا درجنوں بار فون آ چکا ہے۔ اس نے بنا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

''کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بنا بتائے..... چار پانچ دن بعد میری روانگی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے..... یاد رکھیں پری زاد..... اگر آپ وقت پر نیویارک نہ پہنچے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی..... اور اسے دھمکی مت سمجھئے گا.....''

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔ ''نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان..... مجھے جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو..... اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل.....''

عینی روہانسی ہو گئی۔ ''کیوں..... کیا مجھے آپکے لیے فکر کرنے کا اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے..... ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی.....''

اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود سے ہی روٹھا ہوا ہو تو اسے کسی دوسرے کو منانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے اس بات کا احساس مجھے اس روز ہوا، تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلٹا نیا پری زاد مجھے دن بھر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

''رقیب سے رقابت اور دشمن سے دشمنی کی جاتی ہے۔ اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پری زاد..... عینی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو..... پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو..... کاش عینی کو کبھی بینائی ہی نہ مل پائے۔ پری زاد کے لیے تو اس کی کومل روح کی چاندنی ہی کافی ہے عمر بھر اُجالا کرنے کے لیے..... اس کی بینائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے..... اور رقیب کی خواہش پورا کرنے والا احمق اس دنیا میں کون ہو گا.....؟''

میں نے اس تکرار کی گونج سے درد سے پھٹتے سر کو تھام لیا۔ اُسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔

''کیا ہوا صاب..... سب خیر تو ہے.....؟''

اور شاید ٹھیک وہی لمحہ تھا جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔

''کبیر خان..... اُدھر تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو.....؟''

''ہم اس کو قتل کر دے گا صاب..... ہمارا علاقے میں محبت اور غیرت کے نام پر مار دینا عام بات ہے.....''

میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ ''کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان..... اس کو بھی ختم کر دو.....''

کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ''تم صرف اس کا نام بولو صاب..... چوبیس گھنٹے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا.....''

میں نے ایک کاغذ کے رقعے پر عدنان کا نام اور پتہ لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔

''یہ لڑکا آج کل زیادہ تر عینی بی بی کے گھر پر ہی رہتا ہے۔ دھیان رہے..... یہ کام تب ہونا چاہیے جب وہ لڑکا تنہا ہو.....''

کبیر نے سر جھکایا۔ ''آپ فکر مت کرو صاب..... ہم سمجھ گیا.....''

کبیر کسی اچھے وفادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر ہٹا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اُس سے بھی بھاری سِل میرے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ دل کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ پل بھر میں سینکڑوں گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر کو رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آنگن آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہا تھا میں نے کہ ایسا ہو.....؟ مگر ایسا ہو رہا تھا۔ تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں، صرف گناہ کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے..... میں تو وہ بے ہنر تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح نبھا پایا، کیونکہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال ظرف کی ضرورت پڑتی ہے۔

شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرونِ ملک روانگی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہٰذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا جیسے عدنان کو راستے سے ہٹانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ عینی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں الجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کارفرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کمالی بھی دفتر سے عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ تقریب کا مہمان خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا مگر جھٹ فیتہ کاٹنے والی قینچی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیتہ کٹا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اُس کے بارے میں پوچھ سکوں۔

اس لڑکی کی انگلیوں کا ہنر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا تو میں نے کبیر خان کو

ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک بنی ٹھنی سی لڑکی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

''کیسے ہیں پری زاد صاحب..... کبھی ہم غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے تو شہہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں.....''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمالی نے جلدی سے تعارف کروایا۔

''سر یہ میڈم زارا ہیں شہہ پارہ کی ٹکر کی ہیروئن ہیں۔''

زارا نے انکساری سے سر جھکایا۔ ''کہاں جی..... شہہ پارہ کی ٹکر کی ہوتی تو آج میں بھی پری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی۔ مگر انہوں نے تو پلٹ کر پوچھا تک نہیں.....''

کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''اگر میں نے دوسری فلم اناؤنس کی تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور الجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا۔''

کمالی نے میرے ہٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس حسن بے پرواہ کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر کوئی فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمالی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔

''سر یہ زارا نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ''خاص'' ذاتی نمبر بھی لکھ دیا ہے اس نے۔ اس کی ماں نے بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی ان کے ساتھ ڈنر وغیرہ کریں۔''

میں نے کارڈ دیکھ کر بے پرواہی سے کمالی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔

''تم جانتے ہو کمالی..... مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا..... حسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر تُل جائے تو بیک وقت اس سے زیادہ گراں اور ارزاں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی.....''

کمالی مسکرایا۔ ''یہ آپ ہی ہیں جو اس جنس کو ارزاں سمجھ رہے ہیں سر..... ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امراء اسی زارا کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر ذرا سا وقت گذارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہوں گے۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب حسن اپنی قیمت لگانے پر آ جائے تو اس سے مہنگی چیز دنیا میں کوئی اور نہیں ہوتی.....''

میں نے سر جھٹکا۔ ''وہ حسن ہی کیا جو بک جائے.....''

''ٹھیک کہتے ہیں سر آپ..... مگر بات اگر سودے بازی کی ہو تو حسین کے پاس دان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ حسن ہی تو ہوتا ہے..... شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں..... زارا جیسی ادافروش کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے سر..... کسی کے لیے

دولت کے انبار ردّی کے کاغذ کے ٹکڑوں جیسے ہیں تو کسی کے لیے حسن اور ادا اسی ردّی کا نعم البدل.....''

اتنے میں دوسرے ہال سے سپیکر پر تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی رو میں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اس سے نظر ملی تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ ''آپ فکر نہ کریں صاحب..... آپ کا غلام موجود ہے یہیں.....'' میں نے عینی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آ کر کچھ کہنے کا نہیں کہے گی کیونکہ میری طبیعت اس وقت اجازت نہیں دے رہی۔ لہٰذا تقریب کے اناؤنسر نے سب سے پہلی میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود متعلقہ فن کے ماہرین کو ڈائس پر بلایا جاتا رہا اور وہ عینی کے فن کے بارے میں اپنی رائے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''کن خیالوں میں گم ہیں پری زاد صاحب''

میں عدنان کی آواز سن کر اچھل ہی تو پڑا۔ مجھے لگا جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔

''آپ جانتے ہیں پری زاد، عینی بہت خوش ہے، جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہتی ہے سارا دن، کہ جب اس کی بینائی واپس آ جائے گی تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کے اسکول، محلے، گلی، سڑکوں اور گھر کو دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ جہاں سے اس کی کوئی یاد جڑی ہے..... لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے..... اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب عینی کی بصارت واپس آ جائے گی تو اس کے نصیب کے ہر اندھیرے کو روشنی میں بدل دوں گا..... اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوگا پری زاد صاحب..... اصل میں یہ آپ ہی ہیں جو ہم دونوں کی زندگی میں ضیاء بن کر آئے ہیں.....''

میں گم سم سا عدنان کی باتیں سن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں عینی کا نام پکارا گیا۔ ہال میں تالیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈائس تک پہنچی تو سناٹا سا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے سُر بکھیرنے لگے۔

''آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے نامور فن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مدح سرائی تو مجھ جیسی ہر نئی آرٹسٹ کا خواب ہوتی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے، ایک اعزاز ہے میرے لیے کہ میرے محسن، میرے آئیڈیل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی

ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے۔ چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اس وقت مجھے اس سفید چھتری کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوگی اور یہ سب بھی میرے اس محسن کی دوستی کا کرشمہ ہوگا۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان..... جس نے ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے جینے کی راہ دکھائی۔ مگر اب کوئی اور بھی ہے جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بھٹک نہیں سکتا، کیونکہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے..... اور آج آپ لوگ جو میرے اردگرد یہ خوشیوں کی بہار دیکھ رہے ہیں، یہ سب اس عظیم ہستی کی دین ہے..... وہی جو میرے محسن، میرے آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے.....''

سارا ہال عینی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔ لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ و پکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پری زاد مجھ سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''تم ایک خودغرض انسان ہو پری زاد..... کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلہ گھونٹنے چلے ہو..... کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمہیں اتنا مان دیتی ہے..... مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں..... تم بھی وہی عام دنیادار نکلے پری زاد..... خودغرض اور مطلب پرست..... جتنا تمہارا تن میلا ہے اتنا ہی تمہارا من گندلا..... یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری زاد.....''

میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور ٹھیک اسی لمحے اس کی ملائم آواز سنائی دی۔

''پری زاد..... کہاں چھپے بیٹھے ہیں آپ.....؟ میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....''

میں نے گھبرا کر عینی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے عینی کو کامیاب نمائش پر مبارک باد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔

''ہاں..... ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونہی بس ذرا بھیڑ میں جی گھبرا رہا تھا۔ تم بتاؤ..... تم خوش تو ہو ناں..... آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا۔''

عینی ہنس پڑی۔ وہ بہت ہلکی پھلکی لگ رہی تھی۔ ''جناب یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ پتہ ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا لکی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا

کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں ''خوش نصیبی کا ستارہ''

عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

''مگر یہ عدنان ہے کہاں..... دکھائی نہیں دے رہا.....؟''

عینی مسکرائی۔ ''پتہ نہیں..... کہہ رہا تھا مجھے کوئی سرپرائز دینا چاہتا ہے..... شاید کسی کام سے اُسی سلسلے میں باہر گیا ہے..... بس آتا ہی ہوگا۔''

میرے ہوش اڑ گئے۔ عدنان تنہا باہر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے عینی کو وہیں رکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب لپکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہونا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔ ''کبیر خان کہاں ہے۔''

ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی ضروری کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تاکہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملایا۔ میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''فون اٹھاؤ کبیر خان..... ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہِ کبیرہ سرزد ہو جائے گا..... فون اٹھاؤ کبیر..... خدا کے لیے فون اٹھاؤ.....''

میں نے خود کلامی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔ میری آواز کانپ گئی۔

''تم کہاں ہو کبیر خان..... جلدی واپس لوٹ آؤ.....''

دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ ''ہم شکار کے پیچھے آیا ہے۔ صاب..... تم فکر مت کرو..... وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانے پر ہے.....''

میں نے چیخ کر کہا۔ ''نہیں کبیر خان..... ایسی غلطی مت کرنا..... میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آ جاؤ.....''

دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی..... ''بہت شور ہے صاب..... ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے..... وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانے پر ہے..... بس ایک منٹ اور.....''

کبیر کی آواز کٹ گئی۔ میں اتنی زور سے چلایا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔

''تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان..... یہ میرا حکم.....'' میری آواز درمیان میں ہی گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

باب 21

میں سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لمحوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے قریب پڑے میرے سیل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آ رہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا۔ دوسری طرف وہی تھا۔

''کیا ہوا صاب..... اُس طرف بہت شور تھا..... ابھی بولو.....''

میں نے چلا کر کبیر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے مار دیا کبیر.....''

''نہیں صاب..... ادھر سگنل پر وہ بالکل نشانے پر تھا..... مگر چوک پر کوئی حادثہ ہو گیا اس لیے رش جمع ہو گیا۔ مگر ہم اس کے پیچھے ہے..... کسی سنسان سڑک پر.....''

میری آواز بیٹھ گئی۔ ''نہیں کبیر خان..... تم واپس آ جاؤ''

کبیر نے احتجاج کیا۔ ''مگر صاب.....''

میں نے غصے میں چیخ کر کہا۔ ''یہ میرا حکم ہے..... فوراً واپس آؤ.....''

''ٹھیک ہے صاب.....'' کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ جیسے میلوں دور سے بھاگ کر آیا ہوں۔ پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا اور خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار کر آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس..... میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں تجوریوں میں بھری اپنی ساری دولت کو اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت جلا کر راکھ کر دوں۔ آگ لگا دوں اس ساری جائداد اور شان و شوکت کو..... کس کام کا تھا یہ سب کچھ میرے؟ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اُسی پری زاد کی طرح تہی دست اور خالی تھا جو کبھی اِسی شہر کے ایک کچے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی ویران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں..... اور میرے نصیب میں میرے من کی یہی سونی حویلی ہی لکھی تھی۔ لیکن اب میں اپنے اس دشمن دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت من مانیاں کر چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری

اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آ کر..... مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آ چکا تھا۔ اور مجھ جیسے دل جلے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف اٹارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیر اہتمام کر کے سب کے حصے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی ٹرسٹ کے زیر اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی:

''محترم ڈاکٹر پال..... میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کیونکہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست نکلی کہ چہرے بدلے جا سکتے ہیں، تقدیر نہیں..... اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرہ بدلنے سے کہیں زیادہ تھی۔ مگر افسوس..... میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم اُن لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں وہ ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا اسٹاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کروا دے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے۔ کیونکہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دوں گا۔ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوشنما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہمدردی کی وہ لہر پیدا ہو جو ازل سے میرا مقدر ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جھیل لیں مگر اُس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا..... دعا گو۔ پری زاد.....''

شام تک سارے کاغذ تیار ہو چکے تھے۔ کمالی سمیت چند دیگر سینئر اور وفادار عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتہ داروں اور عملے سمیت سبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اُسی طرح چلتا رہے۔ جب کمالی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم گھبرا گیا۔

''مگر سر..... آپ کہاں جا رہے ہیں.....؟ اور معاف کیجیے گا سر..... یہ پاور آف اٹارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا..... اسٹاف سے یہ سب کچھ

اکیلے نہیں سنبھلے گا سر....."

میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو..... سب یونہی چلتا رہے گا..... اور میں کہیں نہیں جا رہا..... بس اچانک کچھ ضروری مسائل درپیش آ گئے ہیں اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا۔ اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے....."

کمالی کی پلکیں بھیگ گئیں۔ "میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم نبھاؤں گا سر..... مگر یہ تو بتا دیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں.....؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے.....؟"

"فی الحال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمالی..... میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں..... اب تم جاؤ..... اور ہاں..... کبیر خان کا خاص خیال رکھنا..... ایسے وفادار بہت نایاب ہوتے ہیں....."

کمالی افسردہ سا دل میں بہت سی باتیں لیے واپس لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آ گیا۔ وہ کچھ چپ چپ سا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"مجھ سے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟"

کبیر نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "نہیں صاب..... ہم آپ کا غلام ہے..... مگر آپ نے اُس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا..... دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے..... کیونکہ جب اُس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان..... مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنا دیتی ہے..... کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں..... اور اس جنگل نما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے..... مار دو..... یا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ..... میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان....."

کبیر خان سر جھکائے واپس چلا گیا۔ اگلے دو دن بھی پر لگا کر اڑ گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکہ روانگی کا دن بھی آ گیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔

"میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں..... تین چار ہفتے میں سارے ٹیسٹ ہو جائیں گے..... اور پھر آپریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس آ جائیں گے..... کتنا مزہ آئے گا۔ جب ہم تینوں وہاں ایک ساتھ ہوں گے..... ورنہ یہ عدنان تو اپنی بورنگ باتوں سے میرا سر کھا جائے گا اتنے بہت سے دن....."

میں نے وعدہ کیا "تم لوگ پہنچو..... میں بھی جلد آنے کی کوشش کروں گا..... یہاں پیچھے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں....."

عدنان نے سر ہلایا۔ ''کوشش نہیں جناب..... آپ کو اس بلی کے آپریشن سے پہلے ہر حال میں پہنچنا ہی ہوگا، اسے اکیلے برداشت کرنا خود میرے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ ہاں البتہ آپ کی موجودگی میں کافی سوبر برتاؤ کرتی ہے۔''

عینی نے اسے گھورا۔ ''بکومت۔ پری زاد جانتے ہیں کہ میں کتنی سوبر اور ویل مینرڈ ہوں۔ تمہاری گواہی کی ضرورت نہیں۔''

اتنے میں اندر سے ان کی فلائیٹ کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے ان دونوں کو رخصت کیا۔

''ٹھیک ہے بابا..... تم دونوں ہی بہت اچھے ہو..... چلو اب دیر نہ کرو..... فلائیٹ کا اعلان ہو گیا ہے.....''

عینی جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے پلٹی، میرا دل بے قابو ہونے لگا، وہ میرا سب کچھ لوٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

''پری زاد..... وقت پر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ میں وہاں روزانہ آپ کو بہت یاد کروں گی..... اپنا بہت خیال رکھیے گا.....''

میری آواز کپکپا سی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بہت زور سے مَسل ڈالا ہو۔ ''تم بھی ہمیشہ میری یادوں میں رہو گی میری پیاری آر جے..... الوداع''

وہ ایک لمحہ رکی اور پلٹ کر اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گئی۔ میں بہت دیر تک اسے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ اپنی زندگی کو اپنے سے قدم بہ قدم دور جانے کا یہ نظارہ شاید دنیا میں مجھ سے پہلے کسی بدنصیب نے نہ کیا ہو۔ عینی چلی گئی۔ میں جہاز کی اُڑان بھرنے تک والی اناؤنسمنٹ تک وہیں بیٹھا رہا۔ لوہے اور چند دیگر دھاتوں کا بنا ہوا ایک دیوہیکل ہوائی جہاز مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر بہت دور اُڑان بھر گیا۔ میں گھر واپس لوٹا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیک دستخط کیے اور کمالی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل میں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو میں نے ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ عینی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سن سے ہو گئے تھے۔ میں چل پھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا مگر میں زندہ کب تھا۔ صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ جیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سوا ہے۔ ڈرائیور کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے بِنا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور درجہ بندی کے اہتمام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سیٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کب چھوڑتی ہیں۔

ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی ہوئی جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اترتے رہے۔ مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جنکشن پر آ کر کھڑی ہوگئی اور سبھی مسافر اتر گئے۔ پتہ چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن یہی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر اس ٹرین میں آ بیٹھا تھا، کہ میری بقیہ تمام عمر کا سفر اسی ٹرین میں کٹ جائے گا؟ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آ کر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بچھے لکڑی کے ایک پرانے سے بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ناساز ٹھیک ہی کہتا تھا، منزلیں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ، جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے.....؟

یہاں پر موجود سبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصدِ سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی۔ بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، بھیڑ ہجوم اور بھانت بھانت کی بولیاں، عجلت، زادِ راہ اور راستوں کی فکر..... سبھی کسی نہ کسی دھن میں مگن تھے۔ مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان آ چکا ہوگا۔ جب کئی گھنٹے انتظار کے بعد میں واپس نہیں لوٹا ہوں گا تو کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ڈرائیور سے رابطہ کیا ہوگا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہوگا۔ اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہوگا تو گھر میں کہرام مچ گیا ہوگا۔ کمالی کو تو میرے جانے کا تھوڑا بہت علم تھا مگر کبیر ٹک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہوگا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھوجتا ہوا یہاں تک بھی نہ آ پہنچے، میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گھر سے نکلتے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے بٹوے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح منہ اندھیرے اس گاڑی میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حماقتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی چڑ ہوگئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کھو دینے کا بہانہ بنا لیا۔ جہاں گاڑی رک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر بستی یا گاؤں کو نظر بھر دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہنا چاہتا تھا۔ میری شیو بڑھتے بڑھتے داڑھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے۔ مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس ستاتا وہیں اتر کر کسی پلیٹ فارم پر لگے نلکے سے پیاس بجھا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھا لیتا۔

مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھونٹ پانی اور چار لقموں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو عمر بھر نہ جانے کیسے کیسے عذاب اور جوکھم میں ڈالے رکھتے ہیں۔ جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گنوا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب میں ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکے آ گئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جیبیں دیکھ ڈالیں مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ دور ایک تانگے والا درخت کے سائے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میری جانب لپکا۔

''کہاں جاؤ گے بادشاہو..... اس علاقے کے تو نہیں لگتے.....''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''جہاں تک یہ سکے لے جا سکتے ہیں..... لے چلو..... اس بستی سے پرے..... کسی ویرانے میں.....''

تانگے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''بستی سے پرے تو قبرستان ہے..... اوہ اچھا..... اب سمجھا..... کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ..... میں پہنچا دیتا ہوں.....''

میں چپ چاپ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے نے قصبے کے باہر سے ہی ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چار دیواری کے باہر تانگہ روک دیا۔

''واپس جاؤ گے.....؟ میں یہیں انتظار کروں گا.....''

میں خالی ذہن لیے نیچے اتر آیا۔

''نہیں تم جاؤ..... میں دیر تک یہاں رکوں گا.....''

تانگے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال ابھرے مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کر تانگہ موڑ لیا اور کچھ دیر میں ہی ویران سڑک کے آس پاس بکھرے کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے لکڑی والے بڑے گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ دور دور تک نئی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سنِ وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگربتیوں کے جلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے، مرجھائے ہوئے خشک پھولوں کی پتیاں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اتنے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی میں ہی اُسے گلابوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ ایک عجیب سی خاموشی چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ انسان کی عمر بھر کی فریاد اور چیخ و پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت

قریب ایک کرخت سی آواز اُبھری۔

''کون ہے بھی تو..... اور یہاں کیا کر رہا ہے.....''

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا ہڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کمر پر ہاتھ رکھے تنا ہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔

''میں..... وہ..... دراصل.....'' اس نے کڑے تیوروں سے میری طرف دیکھا۔

''کوئی قبر کھدوانی ہے کیا.....؟''

''نہیں نہیں..... میں تو بس.....'' اس نے مجھے دوبارہ سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔

''اچھا..... میں سمجھا..... ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے پرانی قبروں سے ہڈیاں چرانے آیا ہے تو..... پر کان کھول کر سن لے۔ فقیرا نام ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے..... خبردار جو یہاں سے ایک ہڈی بھی ادھر اُدھر کی..... ہاں..... میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بیچ دوں گا.....''

مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ مجھے جو سمجھ رہا ہے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں..... میں یہاں مردوں کی ہڈیوں کی تلاش میں نہیں آیا..... تھک گیا تھا اس لیے کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے رک گیا.....''

فقیرے نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کہیں تو اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے کا ساتھی تو نہیں ہے..... سچ بتا..... کس ارادے سے یہاں آیا تھا.....''

مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیرے کو جھاڑ دیا۔ ''تمہیں ایک بار کی کہی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلامے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا تمہاری اس قبروں کی جاگیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں..... بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا شاید یہاں کچھ سکون ملے گا مگر یہاں بھی تم جیسے بیوپاری ٹھیکے دار ملیں گے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔''

میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ پیچھے سے فقیرے کی ڈھیلی سی آواز سنائی دی۔

''ذرا رک تو سہی.....'' میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ''معاف کردے..... دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گِدھ میرے قبرستان پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے..... اس لیے میں سمجھا کر پھر انہی کی کوئی شرارت ہے..... نام کیا ہے تیرا..... اس علاقے کا تو نہیں لگتا.....''

مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوجھا تو میں نے اپنے پرانے ڈرائیور کا نام بول دیا۔ ''اکبر

نام ہے میرا..... میں یہاں کا نہیں ہوں..... بلکہ میں کہیں کا نہیں ہوں..... نہ گھر بار ہے نہ کوئی رشتے دار..... بس یونہی بستی بستی بھٹکتا رہتا ہوں..... یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی آ گیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں.....''

فقیرا بالکل ہی نرم پڑ گیا۔ ''اوئیں نئیں..... بس ایسے ہی غصے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ تیرا جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا محسوس ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟''

میں نے اپنے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں الٹ دیا۔ ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' فقیرا زور سے ہنس پڑا۔

''اوئے جھلے..... پیسے کس نے مانگے ہیں تجھ سے..... چل آ جا..... میری کوٹھڑی یہیں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مردہ دفنایا تھا۔ اس کے گھر والے میٹھے چاولوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں.....'' میں چپ چاپ فقیرے کے پیچھے چل پڑا۔

اس کی چھوٹی سی کٹیا میں ایک جھلنگا سی چارپائی۔ کونے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ ایک جانب گینتی، بیلچہ، کدال رسّی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان پڑا ہوا تھا۔ فقیرے نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیرے کی کٹیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیرے سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''اب کہاں جائے گا.....''

''پتہ نہیں..... جہاں یہ رستہ لے جائے۔''

فقیرے نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''تو یہیں کیوں نہیں رہ جاتا..... تیرا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا اور میرا ہاتھ بانٹنے والا بھی مجھے مل جائے گا۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''مگر میں یہاں کیا کروں گا.....؟''

وہ زور سے ہنسا۔ ''میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا.....''

باب 22

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ''کیا.....؟؟ مگر میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی.....''

فقیرا زور سے ہنسا۔ ''جھوٹ بولتا ہے تُو..... ہم سب ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں..... فکر نہ کر..... میں تجھے سب سکھا دوں گا..... محنت سے جی تو نہیں چرائے گا.....؟''

میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''اب میرے پاس چرانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جی بھی نہیں.....''

فقیرے نے سنی ان سنی کر دی۔ ''ٹھیک ہے پھر آ جا..... اور ہاں..... تو نے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں۔ لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے چرا کر لایا ہے.....؟ یا پھر لنڈے بازار کا مال ہے..... گورکن ایسے کپڑے نہیں پہنتے..... چل کیا یاد کرے گا۔ میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کر لے..... صبح بڑا کام کرنا ہے۔''

ہم دونوں دوبارہ فقیرے کی جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کونے میں پڑے ایک بڑے ٹرنک سے ایک بستر نما گدیلا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔

''یہیں ایک طرف اپنا بستر ڈال لے..... اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں..... تیری آنکھ لگے تو بھلے سو جاتا.....''

فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص برانڈ کی بیڑی ٹٹولی اور اپنی چارپائی کے تکیے کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی اور کاغذ میں لپٹی بہت سردی بھورے رنگ کی راڈ نما تیلیوں میں سے ایک چن کر اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر رگڑنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس پتلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تمباکو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگا لی۔ جھونپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بُو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضاء میں پھیلا کر بولا۔

''کبھی چرس پی ہے اکبرے.....'' میں نے نفی میں سر ہلایا، وہ زور سے ہنسا۔

''اچھا ہے..... نہ پیا کر..... خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت..... پر میرا اس کے بنا گذارہ نہیں۔ قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں۔ سچ بتاؤں تو نوجوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے ہوئے بڑا ڈر لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی۔''

فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چپ چاپ اس کی رام کہانی سنتا رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سننے والا ملا تھا۔ پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا میرا دھیان بٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر چھپے کئی آسیب اور عفریت مجھے سالم نگلنے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کر دی ہوگی۔ وہاں نیویارک میں عینی کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہوگا۔ وہ مجھے عین وقت پر وہاں نہ پا کر کتنی مایوس ہوئی ہوگی۔ مگر یہ مایوسی یقیناً اس مایوسی سے کہیں کم ہوگی جو آنکھیں ملنے کے بعد اُسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا بجھا کر آپریشن پر راضی کر لیا ہوگا۔ کتنی خوش ہوگی وہ جب پہلی بار سالوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خوبصورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے ویرانے سے گیدڑ اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے سدھ پڑا خراٹے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا جسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کُٹیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کر نئی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گِدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعانہ پکڑا گئے۔ فقیرے نے اُن کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔

''واہ بھئی اکبرے تُو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے۔ پتہ ہے..... دو دن سے فارغ بیٹھا تھا میں..... کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آ جا شاباش..... ہمیں گھنٹے بھر میں قبر تیار کرنی ہوگی۔ وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آ جائیں گے۔''

میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا۔ جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹی اٹھواتا جاتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے دوبئی کے ابتدائی ایام میں اس سے کہیں زیادہ سخت مزدوری کی تھی مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی۔ لیکن میں فقیرے کے ساتھ جُتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ میرے جسم کی ٹوٹتی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آ گیا۔ مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سوگوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹی

ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لاتعلق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا۔ مگر یہ رات والی ''خاص'' بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے کہنی ماری۔

''ابھی دیکھنا کچھ دیر میں ان رونے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سرکنا شروع ہو جائیں گے اور ایک دو کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیڑی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں گے.....''

اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

''سالوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈرامہ..... سگریٹ ایسی بلا ہے جو موت بھی بھلا دیتی ہے۔ اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے..... میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں دُھت لوگوں کو آتے دیکھا ہے۔ کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آ جاتا ہے۔ بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں آخری منہ دکھائی کے لیے۔ مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح.....''

میں نے فقیرے کے ہاتھ میں پکڑی بیڑی غور سے دیکھی۔

''تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر انڈیلتے رہتے ہو..... میں نے سنا ہے اس سے کینسر ہو جاتا ہے.....''

فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔

''تُو بھی ان جاہلوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبر..... میری عمر ساٹھ سال سے اوپر کی ہے..... پندرہ سال کی عمر میں مَیں نے پہلا کش لگایا تھا..... یقین کر آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا مجھے..... جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس پینتیس سال کے جوان مردے بھی دفنائے ہیں جنہوں نے عمر بھر کبھی تمباکو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور ان کے ساتھ آنے والے اسی بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ پیتا تھا نہ شراب..... پھر اچانک ہی کیسے گذر گیا.....؟؟ اب بول..... کیا بولتا ہے..... تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مر جانا چاہیے تھا.....''

میں لاجواب ہو گیا۔

''تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پتے پر موت کا ڈراوہ کیوں لکھ دیتے ہیں.....؟''

فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا تا کہ اسکی آواز قبر پر مٹی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے..... ''مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دوکان داری لگتی ہے اکبرے..... یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ زہر ہے تو پھر بیچتے کیوں ہیں کھلے بازار میں.....؟ بند کر دیں فروخت تمباکو کی.....''

مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی پتیوں کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔

''اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رونق رہے گی۔ روزانہ کچھ لوگ آئیں گے..... پھر

دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی۔ سب اپنی اپنی دنیا داری میں الجھ کر یہاں سوئے شخص کو بھول جائیں گے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے.....''

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیرا بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سارا سامان اور تازہ بیڑی کے کچھ بنڈل تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''یہ لے..... یہ تیری مزدوری کا حصہ ہے..... آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں.....''

میں نے وہ روپے دوبارہ فقیرے کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''یہ تم ہی رکھو..... اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی.....''

فقیرے نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''تُو بھی پورا ملنگ ہے..... چل ٹھیک ہے..... میرے پاس ہی جمع رہنے دے۔''

رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی جنتر منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیرا جھونپڑی کے باہر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا۔

''یہ آوازیں کیسی ہیں.....؟''

فقیرے نے حسب عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ''کوئی عامل کسی زنانی کو بے وقوف بنانے کے لیے منتر پڑھ رہا ہے۔''

میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جعلی پیر نما شخص چغہ پہنے دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا ہوا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے فقیرے.....؟''

''یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سوکن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے..... یہ بیوقوف عورتیں گھر سے چھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونگی کو پکڑا کر واپس چل دیں گی.....''

میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ''مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈرامے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو.....؟''

''اوئے اکبرے..... تو واقعی بڑا بھولا ہے..... جھلے..... یہ عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے۔ آدھے پیسے میری جیب میں آئیں گے..... کبھی کبھی تو اُن جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوں تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیر صاحب کی ''کرامت'' کا یقین کر لیں..... یاد رکھ اکبرے..... قبرستان میں جو بھی دھندا ہوتا ہے..... اس کا آدھا حصہ قبرستان کے رکھوالے اور گورکن کو جاتا ہے.....''

میں حیرت سے منہ کھولے فقیرے کی باتیں سن رہا تھا۔ میں تو جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکر و فریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں مردوں کی بستی کے بکھیڑے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اس رات فقیرے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نشہ باز اور جواریوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں تاکہ وہ رات بھر اپنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصہ ملنے کے بعد یہاں کا رخ نہیں کرتا۔ جعلی عامل اور پیر اپنے نئے گراھکوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات میں ہی انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیرے کے قبرستان بھیج دیتے ہیں، کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو۔ تمہارے خلاف دبایا گیا تعویذ یا سفلی عمل وہیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارا بھاگا بھاگا قبرستان آتا ہے جہاں فقیرا پہلے سے ہی کسی کالی مرغی کا سر..... سڑے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبا چکا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی عمر بھر کی پونجی عامل پر لٹا دیتا ہے اور فقیرے کا حصہ اُسے مل جاتا ہے۔ میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیرے کی باتیں سنتا رہتا۔ ''ہر جا جہانِ دیگر'' کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گذر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تھکانے کے لیے فقیرے کے حصے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا۔ مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تھی، اچانک ہی کسی پہر وہ میری آنکھوں کے دریچے کھول کر میرے دل کے آنگن میں آ کر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چھپاتا، اپنی آنکھیں میچ لیتا مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں اور کدال اور بیلچہ چلانے سے کھردرے، چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں۔ پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور جھونپڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔ ایک ایسی ہی رات فقیرا بھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔

''کیا بات ہے اکبرے! تُو سوتا کیوں نہیں ہے۔ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتا..... جوان جہاں بندہ ہے تُو..... کہیں کوئی عشق وشق تو نہیں ہو گیا تجھے.....''

میں مسکرا دیا۔

''کیوں..... کیا وہ سارے جوراتوں کو جاگتے ہیں..... ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟''

فقیرا بھی ہنس پڑا۔ ''ہاں..... اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں..... تُو شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ کب تک یوں اکیلا در بہ در خوار ہوتا رہے گا.....؟''

''اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی فقیرے..... تو پھر.....''

فقیرے نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔

''اوئیں یار..... یہ زنانیاں بڑی مطلبی ہوتی ہیں..... ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے۔

میں نے تو دنیا میں آج تک جتنے مسئلے دیکھے ہیں وہ انہی کی وجہ سے ہیں..... اچھا خاصا مردان کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے..... نہ دنیا کا.....''

میں نے غور سے افسردہ فقیرے کو دیکھا۔

''پھر تو میرا شک سولہ آنے سچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیرے..... ورنہ یوں غمزدہ نہ بیٹھے ہوتے۔''

فقیرے نے تازہ بیڑی سلگائی۔

''کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے..... ہاں..... تھی جوانی میں کوئی..... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی..... جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ میں نے اس پر بڑا خرچہ کیا۔ ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اُسے مجھ سے بہتر بندہ ملا۔ دو بول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے..... بس اُسی دن میرا ان عورتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے..... میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے..... یہ زنانیاں کسی کی نہیں ہوتیں..... کبھی ان کے چکر میں نہ پڑنا.....''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ واردات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں، اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا۔ مگر آواز میں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کٹیا سے باہر نکلنے لگا تو فقیرے نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔

''باہر نہ جا اکبرے..... کوئی دکھیاری ہے..... قبر پر چلّہ کاٹنے آئی ہے اولاد کے لیے.....''

میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔

''مگر قبر پر چلّا کاٹنے سے بے اولادی کیسے دور ہوسکتی ہے.....''

فقیرے نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تُو سمجھتا کیوں نہیں ہے..... یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں۔ میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے..... بس جو ہو رہا ہے..... اُسے ہونے دے..... ہم ان کو یہاں آنے سے روکیں گے تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے..... تو چپ کر کے سو جا.....''

میں نے سر زمین پر ٹکا لیا مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔

''فقیرے..... کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں.....''

''ہاں..... بالکل دیکھی ہے..... ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے لوگ یہاں۔ پورے چالیس دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی۔ اور کبھی کبھی تو رات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بھی نورانی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، البتہ گناہ گاروں کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں کبھی کبھار..... دیکھ اکبرے..... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ ڈائریکٹ اس کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں

دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے..... سو جا چپ کر کے..... کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے..... تگڑی رقم ملے گی انشاء اللہ.....''

اگلے روز فقیرا کہیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ''چل بھئی اکبرے..... منڈوا دیکھنے چلتے ہیں.....''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''منڈوا.....''

''ہاں یار..... وہ کیا کہتے ہیں..... سینما یہ دیکھ..... بڑی زبردست پکچر لگی ہے بازار والے سینما میں.....''

میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لبنیٰ کی فلم ریلیز ہو چکی تھی۔ اور سپرہٹ ہو کر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی، میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ لبنیٰ عرف شہہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جا رہا تھا اسے، شہہ پارہ کا انٹرویو بھی چھپا تھا جس میں اس نے کھل کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زاد نہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہہ پارہ کا خواب پورا ہو گیا ہے..... اور اس نے پری زاد کو اپنا خواب گر اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیرے کو اکیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں وہ لوگ دیکھتے ہیں جو خواب دیکھنا جانتے ہوں۔ وہ اپنے کسی خواب کو سینما کے پردے پر جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا۔ سب سپنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیرے کے جانے کے بعد میں نے ساری اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کل کی بات ہو۔ وہی بزنس اور کاروباری خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی بیاہ، تقریبات وہی دنیا فتح کر لینے کے دعوے..... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا، ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں جو یہ سوچ لیے بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ رک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا..... سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے، گویا ہمارا ہونا یا نہ ہونا سب برابر ہے۔ تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زُعم کیوں؟..... اتنا گھمنڈ کس لیے.....؟ مجھے پھر اس دشمنِ جاں کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی بینائی واپس آ چکی ہوگی۔ جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہوگی کہ نہیں.....؟ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکنہ تصویر جلا کر وہاں سے نکلا تھا تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی مورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع سے ہی تصویریں کھچوانے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہوگی۔ اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھوجا بھی ضرور ہوگا۔ کیسی دِکھتی ہوں گی اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں۔ اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میری زیرِ استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہوگا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روتی رہی ہوگی۔ مگر عدنان نے اسے

سنبھال لیا ہوگا۔ اس کی کومل جبیں کو عدنان کا شانہ ہی جچتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اُس کی یادوں میں زندہ رہوں۔

میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں
مر ہی جاؤں جو تم سے فرصت ہو

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسر تھی، دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیرا صبح سویرے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا..... میں جھونپڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پرانی ولیز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اترے اور ان میں سے ایک نے حسب عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔

''اکبر تیرا ہی نام ہے.....؟''

میں کھڑا ہو گیا۔ ''ہاں..... سب خیر تو ہے؟''

''خیر تو نہیں ہے..... تیرے ساتھی فقیرے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے..... اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے..... جلدی چل..... وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں بوکھلایا سا اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتہ چلا کہ اُن دونوں کی بہت پرانی ٹسل چل رہی تھی قبرستان کی حد بندی پر۔ اور آج فقیرا سلامے اور اُس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم ہسپتال پہنچے تو فقیرا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''دیکھ لے اکبرے..... قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر تو ایسی غلطی نہ کریں..... بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے..... اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے.....''

فقیرا دھیرے دھیرے پھر سے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلاما اور اس کے ساتھی قتلِ عمد کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیرے کو اُسی کی جاگیر، قبرستان کی ایک چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اُچاٹ ہو گیا اور فقیرے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی۔ پھر سے وہی سفر اور وہی انجان راستے، مگر میری حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن تپنے لگا، اور پھر شاید تیز بخار نے مجھے آ گھیرا، مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اُترنا پڑا۔ فقیرا مجھے ملنگ کہہ کر چھیڑتا تھا مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا ہوا تھا۔

مجھے شدید سردی لگ رہی تھی لہٰذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بکل مار خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر بدنما سی لکھائی میں لکھا ہوا تھا۔

''خانو کی چائے..... ہر غم بھگائے.....''

ٹھیلے والے نے مجھے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آ گیا۔

''چائے پیو گے.....؟؟''

میں نے انکار کیا۔ ''نہیں..... مجھے طلب نہیں ہے.....''

ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''عجیب بھکاری ہو، بھئی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں تجھ سے پیسے نہیں مانگ رہا خانو''

میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بھکاری.....؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے..... میں بھکاری ہی ہوں..... بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی..... پر کچھ نہیں ملا..... اب کچھ چاہیے بھی نہیں..... جاؤ..... مجھے تنگ مت کرو.....''

خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہوگیا۔ ''معاف کرنا سائیں..... تم تو کوئی اللہ لوک ہو..... مجھ سے گستاخی ہوگئی۔''

میں نے اسے جھاڑ دیا۔ ''بے وقوفی کی باتیں مت کرو..... میں کوئی سائیں نہیں ہوں..... اکیلا چھوڑ دو مجھے.....''

خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا دیا، جس کے تنے کے اردگرد پکی اینٹوں اور سیمنٹ کا چوبارہ اُٹھا کر ایک گول پلیٹ فارم سا بنا دیا گیا تھا۔ پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے سُدھ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔ اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میرے اردگرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ''چلو بابا..... کیا بھیڑ لگا رکھی ہے..... جوگی بابا کو ہوش آ گیا ہے۔ شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے۔'' میں نے چونک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

باب 23

وہ سب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے اردگرد دائرے میں کھڑے تھے جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقاہت سے چکرا گیا۔ میرے ڈگمگاتے جسم کو تھامنے کے لیے کئی ہاتھ بیک وقت آگے بڑھے تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔

''تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا..... جاؤ یہاں سے..... مجھے تنہا چھوڑ دو.....''

خانو نے دوبارہ سب کو جھاڑا..... جیسے میرا نائب ہو۔

''سُنا نہیں بابا..... جاؤ یہاں سے ابھی..... سائیں جلال میں ہے.....''

لوگ عقیدت سے سلام کرتے ہوئے وہاں سے بادلِ نخواستہ چھٹنے لگے۔ خانو نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔

''کھانا کھاؤ گے سائیں.....''

میرا صبر جواب دے گیا۔

''آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے.....؟''

خانو منمنایا۔

''آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں۔ شاید آپ کی دعا سے خانو کے دن پھر جائیں..... پچھلے سال اڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا، اِدھر ٹرینوں کی بدحالی نے بھی دھندا مندا کر دیا ہے سائیں.....''

میں نے جھنجھلا کر اسے دھتکارا۔

''جاہل انسان..... تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے..... میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دعا میں اثر ہوتا تو آج میں خود یوں دربدر خوار نہ ہوتا.....''

مگر خانو ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی حلیے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے زہد و تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ سر اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے ہوئے بال، چہرے

اورلباس پر وقت کی ڈھول اور غم کی شکنیں، چادر پر درد کی سلوٹیں اور جھولی میں ناکامیوں کے کیکر اور کانٹے..... کیا کسی جوگی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟؟ میں نے جان چھڑانے کے لیے بے زاری سے کہا:

''اگر تمہاری تسلی میری دعا سے ہوتی ہے تو جاؤ میں نے تمہیں دعا دی.....''

خانو کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر جانے کیا کچھ منتیں مانگتا ہوا وہاں سے ٹل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات اور قصبوں کے لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں پھر شائد آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش انہیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں..... اُن سے زیادہ دُنیاداری کے داغوں سے اٹا برص کا مریض ہوں جو خود ''شفائے عشق'' کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ بمشکل ایک دن ہی سکون سے گزر پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کمبل میں لپیٹے درخت کے نیچے لپٹا ہوا تھا، تبھی اچانک وہی بے وقوف خانو دور سے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے اور اسے لہراتے ہوئے شور مچاتا میرے قدموں سے آ کر لپٹ گیا:

''تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں..... کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں..... جیو.....''

میں نے جلدی سے اپنے پیر لپیٹ کر اسے دھکا دیا۔

''ہٹو پیچھے..... یہ کیا کر رہے ہو.....؟''

خانو خوشی سے چلایا۔

''سائیں..... یہ دیکھو..... آپ کی دعا سے میرا دس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہے..... سارے دلدّر دور ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو..... مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔''

کچھ دیر میں ہی آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے عملے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے عذابوں کا ایک دور شروع ہو گیا..... میرے اردگرد قریب و دُور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک ہجوم جمع رہتا جو میرے قدموں میں، دس، بیس اور پچاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منتیں پوری کرنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھتکارتا اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کو لات مارتا وہ اُتنا ہی ان کی نظر میں معتبر ٹھہرتا، میرے بُخار اور نقاہت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات مُنہ اندھیرے چُپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں لیکن میں جاتا بھی تو کہاں جاتا.....؟ ہر طرف اِسی انسان کا سامنا تھا مجھے اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہانِ خراب میں.....؟ خانو جب مجھے اِس بھیڑ کے ہاتھوں بے حد آزار دیکھتا تو ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیتا مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی ہجوم..... پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں۔ کوئی عورت دُھائی دیتی۔

''سائیں میری بہو بیٹا نہیں جنتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ دل رہی ہیں، دُعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے۔''

کوئی دوسرا کہتا۔

''بیٹے کو نوکری نہیں ملتی جوگی سائیں..... بس ایک نوکری دِلا دو.....''

تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔

''بس ایک دوکان کا سوال ہے سائیں..... کاروبار جما دو.....''

میں آنکھیں بند کیے منہ لپیٹے پڑا رہتا اور وہ میری خاموشی کو ہی میری دعا سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اُٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب لکڑی کی ایک تختی پر جلی حروف میں ''آستانہ جوگی سائیں'' لکھوا کر لے آیا اور اِس تختی کو درخت کے ایک اونچے حصے پر کیل سے ٹھوک گیا۔ وہ لوگ میری نقاہت اور بیماری کو میرا روزہ یا فاقہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو میری پیری فقیری کی نشانی، اوپر سے قدرت بھی میرے ساتھ کھل کر مذاق کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ میرے اردگرد موجود لوگوں کے جمگھٹے میں سے کسی نہ کسی کی مُراد بر آتی تو وہ اُسے میری ''کرامات'' کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ سو میں سے باقی اُن ننانوے ناکام مُرادوں کو کوئی نہیں گنتا تھا جو کبھی پوری نہیں ہو پاتیں تھیں۔ کالی رات کے گھپ اندھیرے میں ایک معمولی دِیا سلائی بھی دور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چُپ چاپ اٹھ کر کوئی روز اسٹیشن سے گذرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار میں نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر نکل بھی گیا مگر یہ جوگی سائیں کا لقب اور حُلیہ آس پاس اور دور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا جیسے قیدی کے پیروں میں بیڑیاں، یا کسی پیدائشی غلام کے ماتھے پر کُھدی ہوئی کوئی سیاہ مُہر..... میں جہاں بھی جاتا میری پیشانی پر ثبت یہ غلامی کی مُہر لوگوں کو میرے اردگرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دور ہٹاتا، وہ میرے اور قریب آتے اور تھک ہار کر میں واپس اسی آستانے کی راہ لیتا جہاں سے یہ مُہرِ غلامی میری جبیں پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی ویرانے کی راہ بھی اپنائی مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو ویرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ تیزی سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی خلقت کی وجہ سے اس ویرانے کی حرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھتکارتے دھتکارتے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیسی عجیب ہے یہ دُنیا، جب انسان اسے اپنانا چاہتا ہے، یہ اُسے دھکے دے کر دور بھگاتی ہے خوار و آوازار کرتی ہے۔ ہر پل سسکا کر تڑپاتی ہے مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اُسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے تب یہی دُنیا خود اُس کے قدموں سے لپٹ کر اُسی انسان کی منتیں اور ترلے کرتی ہے کہ وہ اسے ٹھکرا کر نہ جائے اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا۔ میرے لیے تو سب علاقے، جگہیں، لوگ، موسم اور رویے..... سبھی ایک جیسے تھے، کم از کم خانو والے

ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک بھیس تو موجود تھا، لہٰذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا جس کی مٹی سے میرے اس نئے بہروپ کا خمیر اُٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر جشن سا برپا ہو گیا، اُداس بیٹھے خانو نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

''سائیں کیا بتاؤں تم کو..... جب سے تم رُوٹھ کر گئے ہو، سارا دھندا مندا ہو گیا ہے..... سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے۔ مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی..... بس سائیں..... اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے.....''

میں چُپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف کی داستان سُنتا رہا اور دور سے تکتی قدرت مجھ پر قہقہے لگاتی رہی۔ دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پُرانی ہنڈ ٹرین پھر سے رواں کر دی گئی۔ ہجوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ ڈالا تھا اس تقدیر نے مجھے۔ ٹھیک ہے..... یوں ہے تو پھر یوں ہی سہی..... مقدر سب سے بڑا بازی گر ہے، سو میں نے بھی قدرت کی ڈگڈگی پر ناچتے رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں سارا دن سر جھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے، ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پر سمیٹے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ پتہ چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمیندار کی تیسری نئی نویلی دُلہن اپنی خادماؤں اور خاص کارندوں کے جھرمٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نوکرانیوں نے نذر نیاز کی پراتیں میرے قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے اردگرد لگی بھیڑ کو جھڑک کر پرے بھگا دیا۔ لڑکی نوجوان تھی اور اس کو سب چھوٹی سرکار کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا اس کی چوڑیاں کھنکیں۔

''میرا نام گل ناز ہے جوگی سائیں..... رب کا دیا سب کچھ ہے..... پر گودا بھی سونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے.....''

اس کی نرم اور ملائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا واقعی وہ اسم با مسمیٰ تھی۔ اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سُنہری دمکتا رنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کا لونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی، پل بھر میں ہی مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبنیٰ، لیلیٰ صبا اور عینی کا چہرہ جھلکتا ہوا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

''نہیں..... اب اور نہیں..... بس..... عورت، چلی جا یہاں سے، جا..... پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے.....''

گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی تو خانو دور سے بھاگتا ہوا آیا۔

''جوگی سائیں جلال میں آ گیا ہے چھوٹی سرکار..... بس سمجھو آپ کی مراد پوری ہوئی.....''

لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔

''اچھا.....؟ میں تو سمجھی تھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے.....''

خانو نے بڑے زُعم سے جواب دیا۔

''یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی.....عورت اور پیسے کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا..... مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا.....اس کی نیا پار ہوئی.....''

گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اُٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جوگی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوبصورت عورت کے وجود سے ہی شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ حُسن کا یہی زہر تو ہے جو ازل سے میری رگ رگ میں سرایت کر کے میری رُوح کو تمام عمر جھلساتا رہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سہمے ہوئے لگتے تھے، لڑکے نے بند مٹھی کھولی اور پچاس روپے کا مُڑا تڑا سا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔

''ہمارے لیے دعا کریں سائیں جی..... کہ ہماری شادی ہو جائے، ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے.....''

میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔

''صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ.....؟''

لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

''میرے پاس تو فی الحال بس اتنے ہی ہیں.....''

میں نے نوٹ کو پرے کر دیا۔

''اتنے پیسوں میں جوگی سائیں شادی نہیں کرواتا.....''

لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

''لگتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اُٹھا لو لڑکی، محبت اگر سچی ہو تو بذاتِ خود دنیا کی سب سے بڑی دعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھر کو..... اور اس امید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دعا ہے، تمہاری منت اور تمہارا تعویذ ہے.....''

وہ دونوں یوں خوش باش سے اُٹھے جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُف یہ محبت کرنے والوں کی ''زُود فہمیاں.....''

محبت کرنے والے ہمیشہ ایک دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں.....؟

کاش یہ نادان، جان پاتے کی دُنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصل یا وصال سے، کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عقیدہ و مرتبہ ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے، مجھ جیسے تو اپنی تمام عمر اسی مسند پر ایک لمحہ بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے اور پھر میری طرح یہی ایک خواہش دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں، میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر ابتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مہینے اور سنہ سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دور کھڑے خانو کے ٹھیلے پر بدلتے ریلوے کے لائسنس سے اتنا پتہ چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا، اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کہرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے لحاف تلے بارش میں بھیگتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ چھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

''اوہو..... تمہیں تو شدید تیز تپ چڑھی ہے سائیں..... میں ابھی حکیم صاحب کو لے کر آتا ہوں.....''

خانو الٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا ویدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں..... خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فنا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو۔ میں نے خود کو تباہ اور برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ مگر یہ زندگی بھی اس دوغلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے بنی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو غور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا، حکیم نے چمڑے کے بکس میں سے چند سفوف نکالے اور یکجا کر کے تین چار پڑیاں سی بنا دیں۔

''یہ لو خانو میاں..... صبح دوپہر شام، دن میں تین مرتبہ سادے پانی میں گھول کر پلانی ہے یہ دوا..... سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو..... بہت احتیاط کی ضرورت ہے.....''

خانو نے کسی تجربہ کار اور مُستند تیماردار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات ازبر کر لیں۔

شاید غالب نے خانو جیسے ہمدردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ

پڑیئے گر بیمار
کوئی نہ ہو تیماردار

مگر میرا تیماردار کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں

پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعائیں بانٹتا پھرتا ہوں، خود اپنے لیے شفایابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ تھپتھپایا اور مُسکرا کر بولے۔

''فکر نہ کریں سائیں جی..... جلد ہی بھلے چنگے ہو جائیں گے.....''

میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔

''کچھ مزید بیمار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ.....؟''

حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''نہیں..... مجھے صرف شفاء دینے کا حکم ہے..... سو اپنی سی کوشش جاری رکھتا ہوں..... مگر لگتا ہے یہ ہُنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، مگر تقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی..... جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے..... اُسے اُتنی جینی ہیں..... خود کو سزا دینا مناسب نہیں.....''

خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سُن رہا تھا، حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

''دُنیا کی ہر طب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفایابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے..... جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو بیمار عضو کے خلیوں کے دروازے دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوائیں ناکام و نامراد واپس لوٹ جاتی ہیں..... اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجئے صاحب.....''

حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دارو کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جھانک لینا ہی اصل دانش و حکمت ہے..... اس چھوٹے سے قصبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی دانا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھنا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شدّ و مد سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیمارداری میں جُٹا رہا۔ تیسرے دن ڈھول، بتاشوں کے ساتھ ایک ہجوم نذر اور نیاز کی دیگیں، سبز چادریں، سنہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے ہوئے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ پہنچا۔ عقدہ کُھلا کہ زمیں دار صاحب کی خُدا نے سن لی ہے اور ان کی گل ناز نے اُنہیں خوش خبری سُنا دی ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی ان کے آنگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مؤدب سے کھڑے ہو گئے، پتہ چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لا رہے ہیں۔ زمیں دار پکی عمر کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میری قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دور سے ہی اشارہ کر کے اپنے سر کے سائیں کو میری نشان دہی کرا دی۔ زمیں دار مؤدب سا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

''میں پہلے اس جھلی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی..... بچہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا رہا، پر یہ چھپ چھپ کر پیروں فقیروں کے در پر منتیں مانگتی رہی اور

چڑھاوے چڑھاتی رہی۔ مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو یہیں اسی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو..... اور ہاں..... آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرنا.....''

میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ میرے لیے مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا رہا سہا چین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر جمے رہنا ان کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھٹکانے کا باعث ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے، میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر لگی تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیال نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خانو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک بھوسے پر نیم دراز ہو گیا۔ اگلی دوپہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سرکایا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی ریلوے اہلکار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تم کون ہو..... اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟.....''

میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

''فقیر ہوں..... ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو..... میں نے کچھ نہیں اُٹھایا۔''

ریلوے اہلکار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہو..... پر آپ کو کہاں جانا ہے؟..... یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جنکشن پر لگی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ.....''

''نہیں..... تمہاری مہربانی..... میں یہیں اُتر جاتا ہوں.....''

میں چُپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سُنسان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گذر کم ہی ہوتا ہوگا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بُرا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا لہٰذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ جمانے کے بجائے، قصبے سے دُور جاتی ایک پگڈنڈی کی راہ لی، سارا راستہ کیکر اور کانٹوں سے اٹا پڑا تھا اور دور دور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی ہوئی تھیں اور راستے بھر دھول اڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوہڑ سے پَرے ڈیرہ جمانے کا فیصلہ کیا

جہاں ایک بوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن سا بنا رکھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی لیکن اس ذرا سی مشقت نے ہی مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر ستا رہا تھا کہ دور سے ایک بوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچے کو بٹھائے خراماں خراماں پیڈل مارتے میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد.....؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔

''اس علاقے میں نئے آئے لگتے ہو جی..... میرا نام مہر دین ہے..... اور یہ میرا پوتا ہے کمالا..... کوئی روٹی ٹکر چاہیے ہو تو بتاؤ جی..... میں اس علاقے کا ڈاکیا ہوں۔''

میں نے دور کھڑی سرخ سائیکل کے پہیے سے کھیلتے بچے پر نظر ڈالی۔

''نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور گڑ موجود ہے..... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے..... تم جاؤ یہاں سے.....''

بوڑھے مہر دین پر میری کرختگی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دور تک پھیلی بنجر و بے آب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔

''صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں پر..... انسان اور جناور، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوہڑ سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر..... میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراحی صاف پانی لا دوں تمہیں۔''

بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔

''چل کمالے..... تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی.....''

مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دو پل کے لیے رکا.....

''جوگی اور سائیں لوگوں کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے..... ہمارے علاقے کے لیے بھی دو بول پڑھ دینا جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ.....''

میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ مگر سکون بھلا کب لکھا تھا لکھنے والے نے میری قسمت میں..... اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں ہی وہ زور کا مینہ برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور سا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک ہجوم کی قیادت کرتا ہوا میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

باب 24

خلیل جبران نے کہا تھا۔ ''جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سینچا، بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا۔''

مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد، غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے ہجوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ تیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا، پاؤں میں پرانے چپل اور سروں پر ناکافی اور چھید ڈلی برائے نام چھتریاں، وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترجم کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو ان سب کو بھی یہ خاموشی کھلنے لگی اور پھر مہر دین نے ہی سب سے پہلے ہمت کی اور ہلکے سے کھنکار کر بولا۔

''یہ سب یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لوکو..... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس بنجر اور خشک علاقے کی قسمت بھی کھلنے والی ہے، مگر تم نے تو ایک رات میں ہی کرشمہ کر دکھایا۔''

میں نے درشت لہجے میں ان سب کو دھتکارا۔ ''یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید..... اور تم سب بھی نرے بدھو ہو جو اس کی باتوں میں آ کر یہاں چلے آئے ہو.....؟ بارشیں اپنے وقت پر ہی برستی ہیں..... چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی..... جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو..... ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے.....''

پتہ نہیں انہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور پکی عمر کے چند لوگ آگے بڑھے۔ کسی نے چادر، کسی نے چاول، گڑ اور چنوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خالی کر دیئے۔ کوئی جیب میں چند سکے بھر کر لایا تھا تو کسی نے دودھ سے بھری گڑوی میرے سامنے دھر دی۔ مہر دین رو پڑا۔ ''ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لوکو..... اسے قبول کر لو اور وعدہ کرو اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر یہیں ڈیرہ ڈالے رہو گے.....''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانا بے فائدہ تھا۔ اس لمحے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں۔ انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے۔ اسے ہرا کر شکست دے سکتا ہی۔ اپنی ''فتح'' جیت سکتا ہے مگر قدرت ہی دشمن ہو جائے تو کوئی کیا کرے.....؟ تقدیر کے وار ہمیشہ سات پردوں میں چھپے اور خفیہ ہوتے ہیں۔ جیسے گھات میں چھپا کوئی دشمن اچانک گھائل کر جائے۔ میں مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بھیگتا رہا۔ مگر کچھ بارشیں صرف بنجر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے برستی ہیں، جو دل کے سلگتے آنگن کو بھگو دے، ایسا ساون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟.....اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی بستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا یا آس پاس کے علاقوں میں اس اتفاقیہ بارش کا خوامخواہ چرچا کیا تو میں چپ چاپ یہاں سے اٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ''گناہ'' کرے گا نہ کسی اور کو کرنے دے گا.....

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی بستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں بتانا اب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار یہ جوگی سائیں کا لقب اور ان بھولے بھالے لوگوں کی یہ ضعف اعتقادی کا بت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت مؤثر انداز میں بستی کے لوگوں تک پہنچا دی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد تک کے وقفے میں اکا دکا ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دور پگڈنڈی پر آ بیٹھتے اور دور ہی سے دعا کی التجا کر کے واپس پلٹ جاتے۔ انسان اور دعا کا بھی کتنا پرانا اور ازلی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دعا پہلے وارد ہوئی ہوگی یا انسان.....؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور پر صبح سے شام تو کر لیتا تھا مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتی تھیں۔ جانے وہ کیسی ہوگی۔ واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پروگرام شروع کیا ہوگا کہ نہیں.....؟ اب وہ کیسی دکھتی ہوگی؟ کچھ چہروں کا حسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے۔ کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دوگنی چوگنی دل کش حسین ہو چکی ہوگی۔ کاش دنیا کے کسی جراح کے پاس تو وہ نشتر ہوتا جو ایک ہی چرکے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا زہر نکال دیتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھنکارتے ہوئے عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ شکور دین ہے سائیں لوکو..... اپنا شکورا..... اس کی نواسی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے.....اگر آپ اجازت دو تو دعا کے لیے یہاں لے آئیں.....''

میں نے ناگواری سے مہر دین کی طرف دیکھا اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ''میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں پر یہ جھلا میری بات سمجھتا ہی نہیں۔ کہتا ہے سائیں کے روبرو دعا کی درخواست کر دیکھو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب..... دور کی دعا سے وہ

شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی.....''

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ میں دعا کردوں گا۔ اگر تین دن تک لڑکی کی طبیعت نہ سنبھلے تو اسے لے آنا۔ ان دور دراز کے علاقوں میں جوان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹیریا (Hysteriya) اور دیگر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شکورے کی نواسی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چنگی ہوجائے گی۔ مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہوگئی جب شکورا سیاہ چادر میں لپٹی ایک گم سم سی لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر آ پہنچا..... میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔ بادل نخواستہ میں نے دکھاوے کے طور پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیئے۔ گلابی شام کے ڈھلتے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگ پل بھر کے لیے چمکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ اف..... کس قدر ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح..... جس کا سب کچھ لوٹ کر جاتے ہوئے لٹیرے اسے تیل چھڑک کر آگ لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہورہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شکورا اپنی دھن میں بولے جارہا تھا۔

''کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنستی بولتی تھی، ساری سکھیوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا ان کی شیطانیوں سے..... باغوں میں جھولے جھولتی تھیں۔ ایک سہیلی کی چھت سے دوسری کی چھت پر کدکڑے لگاتی پھرتی تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی، ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہوگئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان کڑیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے اسے کوئی جن چمٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی..... اب تمہاری دعا کا ہی آسرا ہے۔ کچھ ایسا پڑھ کر پھونکو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جیسی ہوجائے۔''

اس تمام عرصے میں سکینہ ہم دونوں سے لاتعلق سی بیٹھی، کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی، ڈھلتی شام میں اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سرسوں سی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیئے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شکورے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھادیئے۔ خود اپنے لیے دعا مانگتی وہ مجھے بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکورے سے کہا۔

''اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو دکھاؤ۔ ہوسکے تو شہر لے جاکر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ..... دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔''

شکورے نے آہ بھری۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی..... پر یہ پگلی کسی کی سنتی کب ہے..... میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کردیا اس نے..... کہتی ہے اس کا جو ہونا ہے، ادھر ہی ہونا ہے.....''

میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا۔ ''کیوں لڑکی..... کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو..... بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی.....؟''

سکینہ میری ڈانٹ سے گھبرا سی گئی۔ ''جی..... وہ.....'' مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ کھل کر بات نہیں کر پا رہی۔ سر جھکا کر بس اتنا ہی بول پائی۔ ''ٹھیک ہے جی..... آپ کہتے ہیں تو مان لوں گی.....''

شکورا خوش ہو گیا۔ ''دیکھا سائیں..... میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا.....''

شکورا سکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا۔ مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاہ بڑی بڑی سی آنکھیں اپنے آس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج مکھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی.....؟ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا دکھ کرب کیسا تھا.....؟ اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شکورے کا ذکر چھیڑ دیا۔

''کل سے ذرا سکون ہے نیاڑیں کے گھر میں..... کیسی ہنستی بولتی چڑیا تھی اس بدنصیب کے گھر کی۔ اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے.....''

میں نے شکورے کی طرف دیکھا۔ ''اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے..... اور اس کی یہ حالت کب سے ہے.....؟''

''تین سال ہو گئے ہیں سرکار..... بہت علاج کروایا۔ بڑے پھیرے لگائے ہیں شکورے نے آس پاس کی ساری بستیوں کے..... کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی جہاں اس نے دعا نہ کی ہو..... علاقے کے سارے حکیم اور طبیب بھی تھک کر ہمت ہار چکے ہیں..... کسی نے شکورے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لڑکی کو لے کر کسی دور دراز کی بستی چلا جائے۔ شاید ماحول بدلنے سے کچھ بہتری ہو۔ مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا..... آخر کار شکورے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے جس رات تمہاری دعا سے علاقے میں بارش برسی تھی۔ اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکورا واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر.....''

میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا۔ ''کہاں لے گیا تھا شکور دین اپنی نواسی کو.....؟''

''شکر گڑھ..... وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے داماد کا.....''

میں چونک سا گیا۔ یہ تو وہی علاقہ تھا جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کیبن واقع تھا۔

''کتنا عرصہ رہی وہاں پر سکینہ.....؟ لگ بھگ چھ ماہ..... مگر وہاں بھی اس جھلی کا من نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو تکتی رہتی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اداس ہو گیا اور پتہ ہے سائیں جی..... کبھی کبھی تو بالکل جوگنوں جیسی حرکتیں کرتی ہے..... اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔''

مہر دین کی باتیں سن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکورے کو میرے پاس بھیج دے۔ سر شام ہی شکورا سکینہ سمیت آ گیا..... ''حکم سائیں''

''سکینہ کیسی ہے اب.....؟''

شکور دین نے گہرا سانس لیا۔ ''پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں.....ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر.....ڈاکٹرنی کا پتہ لگانے اور وقت لینے کے لیے.....''

میں نے اپنے اندر ابھرتے ایک عجیب سے موہوم خدشے کی تصدیق چاہی۔ ''جب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تو ماحول بدلنے کے لیے.....تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا.....؟''

شکورے نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالت زار بیان کی۔ ''وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی.....وہاں بھی سارا دن گم سم بیٹھی رہتی تھی۔''

سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لاتعلق سی بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک پکی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے منت کی۔

''سائیں جی.....ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے.....دعا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے.....بڑا تیز بخار ہے اسے تین دن سے.....''

میرا جی چاہا کہ میں انہیں بری طرح دھتکاروں میں نے مرد کو جھاڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے مگر بچے کی حالت نہیں سدھ رہی، تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلامی کی۔

''ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے.....بس آج کی رات کی سختی ہے.....''

شکورا گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ سرگوشی نہیں سنی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ٹلیں گے لہٰذا حسب معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا کشکول ہوا میں بلند کر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکورا اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکورے نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔ اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ جھلستی کرنوں کی صورت میں بن سایہ جانداروں پر برسانے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا۔

''میرے کاکے کا بخار اتر گیا ہے سائیں.....کل رات تو ہم سمجھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گا یہ بخار اس کی..... بڑا تڑپا ہے ساری رات بستر پر..... جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی

ہے..... سچ بتاؤں سائیں تو میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا..... مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا نکا بھلا چنگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامات ہے سائیں..... ساری تمہاری دعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں..... قربان جاؤں میں اپنے سوہنڑے رب کے..... اس نے تمہیں ہم غریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے اس بستی میں.....''

شکورا نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا مگر میرے تو سارے لفظ ہی نہ جانے کہاں کھو چکے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکورے کا بچہ رات بھر کی سختی کے بعد صحیح شفایاب ہو جائے گا۔ اور اس کی کہی ہوئی بات ہو بہو ٹھیک ثابت ہوئی تھی۔ یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے۔ سکینہ بھی اسی دن واپس اپنی بستی میں پہنچی تھی جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی میں کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی۔ وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت بستی میں سکینہ کے گھر چلا جاؤں۔ مگر لوگ میری..... اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے.....؟ میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور پگڈنڈی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے تپتی زمین سے اٹھتی سراب کی لہروں میں مجھے شکورے کا ہیولہ دھیرے دھیرے لاٹھی ٹیکتا ہوا شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سر جھکائے گٹھڑی سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہوگی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ اس قسم کے غیر تشکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ کاش میں اس وقت کچھ اور مانگ لیتا تو وہ خدا وہ بھی ضرور دے دیتا۔ مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کس کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکورا اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت پر دعا کا بدل نظر آ رہے تھے۔ شکورا میرا قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بری طرح ہانپ رہا تھا۔

''شہر کی بڑی ڈاکٹرنی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی..... اس نیاڑیں کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے..... اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دعا کرنا ہمارے لیے..... اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک واپسی ہوگی۔ ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا.....''

سکینہ حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں نے شکورے کو دو لمحے درخت کے نتیجے ستانے کا اشارہ کیا سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کم زور اور مضمحل سے وجود کو شکورے کے پیچھے چھپا لیا۔ شکورے نے سوالی نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے اسے تسلی دی۔

''کچھ دیر ستا لو.....شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب.....تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھوکھا لگانی والے خانو کو جانتے ہو.....؟''

شکورے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔''ہاں جی.....وہ میرے داماد کا ہمسایہ ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی تو کوارٹر ہے میری بیاہتا بیٹی کا.....اور اس علاقے کا چودھری.....؟ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاہ پر دعا کے لئے گیا تھا تب وہاں چودھری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دعا کرتے دیکھا تھا انہیں.....''

اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکورے کو ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور براہ راست سکینہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سمٹ گئی۔ میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی۔''کون ہو تم.....؟؟''

باب 25

میرا سوال سُن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کی چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے نانا کی طرف دیکھا جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ ''سائیں یہ میری نواسی ہے.....''

''سکینہ کو جواب دینے دو.....''

سکینہ مزید بوکھلا گئی..... ''وہ جی..... میں..... میں تو بس سکینہ ہوں.....''

''نہیں..... تم وہ نہیں ہو..... جو نظر آتی ہو۔ ساری دُنیا کو دُعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے ربّ سے مانگتی ہو۔ پھر خود کو اس جوگن کے بھیس میں کیوں ڈھال رکھا ہے؟ کیوں فقیرنی بنی پھرتی ہو.....؟ کیوں خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے.....؟ بولو۔ بولتی کیوں نہیں.....؟''

شکورا میرے غصے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل روہانسی سی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں چُھپا لیا پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا ہے۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریشم کی بنی ہوئی ہوتی ہیں لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے کو کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بلاؤں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اُٹھ کر جانے کا نہیں تھا مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادل نخواستہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ، اور آنکھوں میں اٹھتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کے معجزے کا ابھی تک علم نہیں تھا۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھی، جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق، مگر سچ یہی تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر یہ جوگی سائیں کی مُہر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی جہاں لوگ میری دُعا کی قبولیت کے حصول کے لیے بھٹکتے رہے تھے اور آج تک ان سب جگہوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دعا بھی قبول ہوئی۔ دراصل وہ سکینہ کی دعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادھے لوگ میرے مُرید بنتے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چلا کہ ان کی یہ

دعائیں ایک نڈھال اور لاغر سی لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں میں نے باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غریبی اور اپنی معاشی مشکلات کا رونا روتی رہتی تھی، اور خانو کا بانڈ کھلنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ کھل جائے تو ان کے دن پھر جائیں گے، ٹھیک اسی طرح سارے گاؤں کو پتہ تھا کہ چوہدری کو اولاد کی خواہش ہے، جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جوگی سائیں کے لقب نے، لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتہ کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو درکنار، خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی، ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیوں، بابوں اور جوگیوں کو ہی اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں۔ کوئی سائیکٹ جوگن یا بی بی ان کی نظر میں دُکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں، یہ دنیا مرد نے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رتبہ، کوئی عہدہ کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی اس نے حوا کی بیٹی کے لئے مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سنپولیئے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت اُسے اس مقام پر لے آئی تھی، جس کی نعلی مُہر اور شناخت نے مجھے علاقے بھر میں سائیں جوگی کے لقب سے مشہور کر رکھا تھا۔ اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پرے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب بسری کے لئے آگ کا الاؤ روشن کر لیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے کے لیے آئے کہ اگر مجھے ناگوار خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے۔ میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گویّے اس لت سے جان چھڑانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں کچھ خود کو نعتیہ اور حمدیہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں۔ کچھ صرف صوفیانہ کلام کی لے پکڑ لیتے ہیں۔ گویا جھگڑا سر سے نہیں، سنگیت سے ہے، لے کا نہیں جھگڑا صرف تال کا ہے۔ میں جب دوبئی میں تھا تو میں نے بہت خوبصورت اور سریلی اذان سُنی تھی۔ یہی حال میرا اسپین کی مسجد کے ایک مؤذن کی خوش الحانی سُن کر بھی ہوا تھا، ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے، انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے، کچھ ایسی ہی کیفیت دوبئی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورۂ رحمان کی تلاوت سن کر ہوئی تھی میری، شائد کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری رُوح کے کچھ دھاگوں، ہمارے خمیر کے کچھ ریشوں سے جُڑا ہوا ہوتا ہے، خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت سریلا تھا۔ بابا بلھے شاہ کا کلام گڑوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سر بکھیر رہا تھا۔

جاؤں دے دلبر ماہی نوں..... میکوں یار بھلا یا جاندائیں

سر رکھ کے یار دے قدماں وچ..... سر پھر اُٹھایا جاندا نئیں
میرا دل اِک اے، میری جان اِک اے..... میرا دین اک، میرا ایمان اِک اے
جدوں رب رسول قرآن اِک اے..... دو جا یار بنایا جاندا نئیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھائل روح ہمیشہ سے جانتی ہے کہ اُس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے..... مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے، دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور، کم زور اور بے بس انسانوں کو سدا دو حصوں میں تقسیم رکھتی ہے۔ ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے، مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں ایک بنجارہ..... جس کے لئے نہ کبھی زمین مہربان رہی اور نہ آسمان..... جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے، تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز اُبھری۔

''آپ رو رہے ہو سائیں جی۔''

میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے آس پاس نظر ڈالی۔ بستی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے جگ راتے میں شریک ہونے کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہر دین، اور شکورا بھی بیٹھے سر دُھنتے نظر آئے۔ ''ہاں..... کچھ یاد کر کے آنکھ بھر آئی..... تمہاری آنکھیں بھی تو ہر لمحہ چھلکنے کے لئے بے تاب رہتی ہیں..... کیا غم ہے تمہیں.....؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو۔''

سکینہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ شکورے نے اٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی تو مہر دین نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہر دین بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے نانا کے سامنے کھل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی..... میرے گھر والے تو بس ایسے ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ خود ہی رل کھل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے.....''

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا..... ''پھر ایک دم دُنیا کیوں تیاگ دی تم نے..... جوگن کیوں بن گئی.....''

سکینہ نے پل بھر کے لئے نظریں اٹھائیں۔ ''جوگ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی..... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا.....؟''

میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال میں ہی میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی، دُنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی ایک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوا ہوتا ہے، یہی عشق کارفرما رہتا ہے ہر عذاب کے در پردہ، اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کر داغ ملتا ہے ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنا دیتی ہے۔ جوگ میں ڈھال دیتی ہے، فقیر کے بہروپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی

محبت کے مارے بدنصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ لڑکی تھی جس کا دل بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لئے مچلنے لگتا تھا، ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گدگداتی تھیں، لمحہ بھر کے لئے ٹھہرا بادل کا سایہ جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسے ہی ایک کالی رات جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برف بھری ٹوکریوں میں باغ سے آم چُرا کر جمع کر رہی تھی۔ تبھی اسے علاقے کے ایک گھبرو سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا۔ جو شہر کی یونیورسٹی سے ایم۔ اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دُنیا کتنی ترقی کر گئی ہے۔ چاند ستاروں پر کمند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں، صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ ہر رابطہ مُیسّر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ ہیر رانجھا، سسی پُنّوں سوہنی مہینوال اور شیریں اور فرہاد الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے مگر یہ پہلی نظر..... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنسدان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا نظر کے زہر کا آج تک، ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لاکھ انکار کریں، لاکھ مذاق اڑائیں مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور پر ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے۔ یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار ملے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے، سماج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو یہاں بھی وہاں ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا۔ بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے باپ نمبردار کی انا ایک مزارع کے گھر رشتہ لے جانے کے آڑے آ گئی۔ ویسے بھی علاقے کا پٹواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رُخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رجو شکل وصورت میں بھی چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی، اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا وہ تو اس کی یونیورسٹی کی چھٹیوں کی دعائیں مانگتی پھرتی تھی تاکہ اس کے دل نگر کا شہزادہ واپس گھر لوٹ سکے، مگر جب اسے پتہ چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں تو اس کے سینے پر بیک وقت کئی سانپ لوٹ گئے۔ جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ ورنہ ہر دوسری آفت آ کے گزر بھی جائے، ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جسے لاڈ سے سارے گھر والے رجو کہتے تھے اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بستی بھر میں صرف وہی ایک اس کے جوڑ کی ہے، اس کے حسن کے

چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے روپ کا چراغ کیا جلے گا۔ مگر اس نے جو سوچا تھا، سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کمی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں سے اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکہ ڈالے آ گئی تھی۔ رجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے عمر بھر کے لیے داغ دار کر دے، جانے علاقے کے سب سے وجیہہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ جانے دُنیا میں محبت پہلے اتری تھی یا رقابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانسیں بند کر دینے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ رجو کا بھی یہی حال تھا اور پھر آخر کار اس کے دل کی مراد بر آئی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دوپٹہ ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور ماں کی خاطر وہ رجو سے بیاہ کر لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکہ یہ رشتوں کا ڈاکہ ہوتا ہے جو ہمارے ماں باپ بہن بھائی اپنی محبتوں اور خدمتوں کی دہائی دے کر کسی اپنے ہی جیتے کی محبت لُوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضِد، ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا۔ کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی باراتوں میں سے ایک بارات تھی نمبر دار کے بیٹے کی۔ سانول کی جنج کیا چڑھی، سکینہ کے دل کا دریا ہمیشہ کے لئے اتر گیا۔ شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے کے لئے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور اپنی مجبوریوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جسے سود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت عمر بھر کے لئے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ چُپ رہی محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس پر دُنیا بڑے سخت الزامات لگاتی ہے، بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طنز کئے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے تو اسے اپنے رشتوں کا وفا دار، زمانہ شناس اور مخلص کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رجو کی پلکوں کی ڈولی چڑھ گیا۔ سارا گاؤں ان دونوں کی خوبصورت اور سجیلی جوڑی دیکھنے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا تب ہی سے سانول کی ماں بہنیں رجو پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ نصف شب تک رسمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بارات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا، سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول تاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قہقہوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آنگن تک بھی آ رہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹتا اگر ان ہنسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے جس نے زندگی میں کبھی خود

محبت کی ہو۔ جگر کیسے چھلنی ہوتا ہے اور سینے میں جلتے دل کا دُھواں کیسے نکلتا ہے جب اپنا ہی سانول کسی اور سانوری کے ساتھ شب عروسی منا رہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اور پھر اسے ایسی چُپ لگی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے، جسم کے اندر بہتا خون سوکھتا چلا گیا، ہونٹوں سے مُسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکرانا ہی بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور بہتی نسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو تب وہی محبت روٹھ جانے پر لہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا، کبھی کبھی نسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دِن لاغر اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں۔ مگر مرض کا سرا نہیں ملتا۔ مریض سوکھ کا کانٹا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور وید اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر بنا کوئی چوٹ لگے بنا کسی بیماری کے اس مریض کا وزن دن بدن کم کیوں ہوتا جاتا رہا ہے۔ گالوں کی سرخی پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے۔ جسم کی شادابی خشک ہوتے پتے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔؟ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں مگن تھا۔ ایک آدھ بار قصبے کے بازار یا کسی درگاہ مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی تو وہ نظریں چُرا گیا۔ یا شائد وہ سکینہ کو پہچان ہی نا پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانکا اور سجیلا تھا اس کا محبوب۔ مگر رجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس ٹکراؤ کی خبر ملی تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سانول اب بھی چُھپ چُھپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلتے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بننے دیتے۔ رقیب نے چونکہ خود کسی کی محبت پر ڈاکہ مارا ہوتا ہے اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ڈستے رہتے ہیں۔ رجو بھی کسی ایسی ہی تپش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کی دنیا مثالیں دیا کرتی تھی۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے اپنی پرانی محبوبہ کی محبت جاگ اُٹھے۔ رجو سوچ سوچ کر ہلکان ہو گئی تو پھر آخر کار اسے وہ خوفناک فیصلہ کرنا ہی پڑا جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ فنا کر دینے کا فیصلہ، جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق منوں دودھ خرید کر ساری بستی میں تقسیم کروا دیا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئیں تھی۔ سکینہ کی ماں نے پیتل کی مٹکی سے دودھ نکال کر کٹوری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

باب 26

ماں چاہتی تھی اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے شائد اس تازہ اور میٹھے دودھ کی تاثیر سے ہی کچھ پل کے لئے اس کی نڈھال سی دُلاری توانائی محسوس کرے۔ سکینہ نے دودھ کی کٹوری اُٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ مگر دوسری آواز سن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجنا سی گئی یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں اسی سانول کی، جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے اُدھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ سکینہ کے ہاتھ میں کٹوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینہ نے کٹوری نیچے رکھ دی۔ اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سننے لگی۔ پتہ چلا کہ سانول کسی کام سے سکینہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینہ کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرانی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ گلے شکوے زبان تک آگئے۔ سانول نے سکینہ کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی ان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے خود کو۔ مگر سکینہ کا باپ بضد ہو گیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینہ کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں کچھ اور تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے سانول کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی میں سے ہی ایک کٹوری نکال کر سانول کو تھما دی جو اس نے ایک سانس میں حلق سے نیچے اتار لی۔ اور جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ شائد وہ سکینہ کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا۔ مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا۔ سبھی سانول کی جانب لپکے۔ سکینہ بھی ساری لاج شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گلال بکھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینہ کی نظر آخری بار ٹکرائی اُف دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی، سانول کو کچھ کہنے اور سکینہ کو کچھ سننے کی مہلت ہی نہ ملی، اور سانول نے وہیں سکینہ کے سامنے دم توڑ دیا۔ ایک قیامت

آ گئی۔ سکینہ کو سکتہ طاری ہو گیا۔ سکینہ کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔ رجو کو جب سانول کی موت کا پتہ چلا تو اس نے لمحے بھر میں ہی صحن میں بنے کنویں کی منڈیر ٹاپ کر گہرائی میں چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرانی نے بروقت اطلاع کر دی اور رجو کو زندہ کنویں سے نکال لیا گیا۔ مگر وہ زندہ کب تھی۔ چند اعضاء کے دھڑکنے اور سانس کی روانی کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ؟ سات دن بعد رجو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روئی۔ اسے پتہ چلا کہ سکینہ کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مار ڈالا ہے۔ ساری بستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینہ کی ہو سکتی ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ رجو نے اپنی عدّت کی پرواہ بھی نہیں کی اور اپنی سیاہ چادر اوڑھ کر سکینہ کے گھر پہنچ گئی۔ سکینہ اور رجو کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہے اور پھر رجو یوں لپک کر سکینہ کے سینے سے جا لگی جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں اور پھر رجو یوں ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ سیلاب آ گیا.....

صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتیں تھیں۔ ان دونوں کا محبوب ان سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا دکھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورۃً نہیں حقیقتاً دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا عذاب سے واقف تھیں۔ رجو نے پولیس کو اپنا سچا بیان ریکارڈ کروایا۔ سکینہ کے گھر والے رہا ہو گئے اور رجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔ مگر اس وقت کی بھٹی نے سکینہ کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ تپ کر کندن ہو گئی۔ ایک ایسا پارس بن گئی جس سے چھو کر لوہا تو لوہا مٹی بھی سونا بنتی گئی۔ سکینہ خود تو خاک ہوئی مگر اس کی خاک سے قدرت نے دوسروں کے تخت جوڑ دیئے۔ نصیب باندھ دیئے، سکینہ دوسروں کی دُعا کی قبولیت کا زینہ بن گئی۔ شائد اسے یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لئے دنیا ترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی کھلے، صرف اوروں کے لئے ہی کھلے، خود اپنے لئے کچھ بچا ہی کب تھا کہ وہ مانگتی، شائد ہم جب کسی دوسرے کے لئے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں جو دنیا کی ہر دعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی، خانہ بدوش بنجاروں کا جلایا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا، بنجارے نے آخری تان لگائی اور محفل برخاست کر دی۔ جانے اس لمحے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بنجارہ ہوں۔ اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بنجاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے روپ کا سونا کون بیچتا ہے؟..... روپ کے سودے صرف روپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے رُوپ، بدصورت ہوتے ہیں ان کے ہاتھ صرف خاک ہی

آتی ہے۔ خاک کے بدلے خاک، شکورا اور مہر دین سکینہ کو لے کر واپس جانے لگے تو میں نے شکورے سے کہا۔

''اتنا کچھ ہو چکا تھا اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نواسی ہنسے بولے اور پھر سے عام زندگی جیئے.....؟''

شکورا شرمندگی کے مارے سر جھکا کے کھڑا رہا۔ مہر دین نے اس کی مدد کی۔ ''یہ ساری بھلا بتانے کی باتیں ہیں سائیں جی.....؟ بڑی شرمندگی ہی شرمندگی ہے اور پھر تم سے کون سی بات چھپی ہے سائیں یہ نیاڑاں تو بس یہ چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے۔ اس کا بھی گھر بار ہو، بال بچے ہوں۔ یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی.....بس تم دعا کرو ہماری سکینہ کے لئے.....''

میں نے سر جھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ ''یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں۔ اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ خود اپنے لئے خوشحالی اور اچھے گھر بار کی دعا کرے۔ یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا.....''

مہر دین اور شکورا سر جھکائے چپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر میں ہی صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ سویرے سے انگڑائی اور انگڑائی سے زندگی جاگنے کا استعارہ جوڑ دیا گیا۔ سکینہ کی بستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ گھروں سے مرغوں کی بانگیں اور چھتوں کی چمنیوں سے زندگی کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے۔ شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی۔ سرکتی پھیلتی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ بستی کے در و بام اور آنگنوں میں اترنے والی، میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتہ پوچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑھی ترچھی لکیریں کھچی نظر آئیں۔ ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر ڈال رکھی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں ساری بستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنا دوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لئے کسی فقیر یا مجذوب کی ہدایت کی ضرورت نہیں۔ وہ دو ہاتھ جن کے اٹھنے کے بعد قدرت کوئی دعا رد نہیں کرتی، وہ ہتھیلیوں کا چاند تو خود ان کی بستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے ظاہر پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے۔ ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دعا کی قبولیت کے

لیے اپنے جیسے زندہ یا مردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں ہم اپنے رب سے براہ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھجکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کیسی بے یقینی ہے ہمارے اندر یا شائد یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے۔ مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں؟؟؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔ کیونکہ میں جب تک سکینہ کے آس پاس ٹھکانہ بنائے رہتا، اس کی برکت لوگ میری کرامت سمجھتے رہتے مگر میں اب اس ڈھونگ کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی ستانے کے لئے کمر ٹکائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی سرخ سائیکل دوڑاتے، ہانپتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''سب خیر تو ہے کاکے.....؟''

بچے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں..... ''کچھ نہیں سائیں جی..... دادا ابا نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں۔ بس اب میں چلا.....''

وہ جیسا آیا تھا ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملنگ ہی تو ہوتے ہیں۔ اپنی رمزیں خود ہی جانتے ہیں جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھتا تھا، مگر دوپہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ بڑبڑایا ہوا سا وہاں پہنچا۔ ان دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دور سے پڑھی جا سکتی تھیں۔

''سائیں جی..... سب خیری صلا ہے ناں.....؟''

''ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو.....''

ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے بُوجھ نہیں پائی.....

''وہ جی..... سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لئے بہت بُرا سفنہ دیکھا ہے.....''

میں ہنس پڑا..... ''بس۔ اتنی سی بات ہے۔ تم دونوں سکینہ کے بُرے سپنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے۔ میری زندگی پہلے ہی کسی بُرے خواب سے کم نہیں ہے۔ جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے لئے فکر مند نہ ہوا کرو تم لوگ..... کچھ نہیں ہو گا مجھے.....''

لیکن میری اس بے فکری کا ان دونوں پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکورا بولا۔ ''بات اتنی سادی نہیں ہے جی..... سکینہ کے خواب سچ ہوتے ہیں سارے..... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔ ''مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو..... آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں..... میرے پاس کھونے کے لئے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے.....''

شکورے نے گہری سانس لی..... ''سائیں جی! اب میں کیا بتاؤں تمہیں..... میری تو زبان جلتی ہے بولتے ہوئے سکینہ نے خدانخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے..... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہوگیا ہے اور ہم سب اس کے لئے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔''

مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکورا گھبرا کر خاموش ہوگیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتہ چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچی نکلتی ہے جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا ورنہ ان دونوں کا ارادہ اٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔ اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے اردگرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا..... سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا۔ ورنہ خود میں اس انجام کے لئے ہمیشہ سے تیار تھا۔ کہانی ختم ہونے کا وقت آپہنچا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موندھ لیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں۔ مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی، پرندوں کی چہچہاہٹ اک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورٹڈ گاڑی کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بونٹ پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جوہڑ سے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔

''اور کتنا دیر لگے گا کم بخت..... سارا دن لگائے گا کیا.....؟''

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بونٹ پر جھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں..... وہ کبیر ہی تھا۔ جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں کبیر سے خاصے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے حلیئے میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا مگر میں نے لاتعلقی سے منہ دوسری جانے پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔

''بابا جی..... ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے.....؟''

میں بظاہر لاپرواہی سے تصویر پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موندھ کر جواب دیا۔
''یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیئے سے..... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام..... کون ہے یہ آدمی.....''
محافظ نے گہری سانس لی۔ ''یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں..... بہت عرصہ پہلے چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر۔ ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔''
میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا۔ مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔ شاید کبیر یا کمالی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہوگا۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی تھا کبیر کسی لمحے میں میری طرف آسکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور لٹوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آسکتی تھی۔ لہٰذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی بہتری جانی۔ ''تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو..... یہاں آس پاس کی سبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں سبھی جگہ آنا جانا رہتا ہے۔ یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا..... جاؤ کہیں اور تلاش کرو..... میں ذرا ڈیرے کے لئے پانی بھرلوں.....''
محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔ میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے چھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے پھر وہ تینوں گاڑی میں سواری ہوگئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے۔ لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں تو کل وہ اس راستے پر ضرور پلٹتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے۔ اور پھر کبیر خان جیسا وفادار تو کبھی ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہوگی جہاں میری موجودگی کا ذرہ برابر بھی امکان رہا ہوگا۔ میرا دل ایک بار شدت سے مچلا کہ میں ایک لمحے کے لئے کبیر کو روک کر عینی کے بارے میں پوچھ لوں۔ پھر میں اُسے اپنی قسم دے کر منا لیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا۔ مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُبال پر قابو پالیا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لئے بنا کبھی واپس نہ جاتا یا پھر خود بھی عمر بھر کے لئے یہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں۔ سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہوگیا میرے دل و دماغ میں۔ یادیں کبھی پرانی ہوتیں، یادِ ماضی کو بھلانا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں۔ چاہے ہم ساری عمر بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں، ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لئے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہر دین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی۔ شاید شکورے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لئے کافی

فکرمند دکھائی دے رہی تھی میں نے اسے تسلی دی۔

''میری فکر نہ کرنا..... میں بہت پہلے مر گیا تھا۔ اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے..... ہو سکے تو اپنے ماں باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا جیون ساتھی چُن لینا۔ میں جانتا ہوں تمہارے لئے وہ دوہری زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوگا۔ مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے۔ سو جیسا دیس ہے ویسا بھیس اپنا لو۔''

میں نے شکورے اور مہر دین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ بستی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے، رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے..... جلد لوٹ آنے کے..... سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے..... جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں؟ جب کہ رُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا، بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں چپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر ٹِک گیا۔ بس دیہاتیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، گھنٹہ بھر ہچکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ آگے پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی، وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر زور سے چلایا۔

''یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔''

باب 27

پولیس والے کے اس طرح چلانے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی جنگلی بھینسا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑا کر دیا گیا مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کترا رہے تھے اور میری ہر جنبش پر اُن کی مسلسل اور کڑی نظریں جمی ہوئی تھیں، انہوں نے انتہائی سختی سے مجھے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر بعد میں اُن کا ایک افسر سرکاری جیپ میں وہاں نمودار ہوا اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا، اس کے کاندھوں پر سجے پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ انسپکٹر نے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا اور اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ''اس کی تلاشی لی ہے۔''

''نہیں صاحب جی۔ ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔''

انسپکٹر نے غصے سے اُنہیں جھاڑا۔ ''اوئے۔ اس ویرانے میں بارود کو جانچنے والا آلہ تمہارا ماما لے کر آئے گا؟ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خودکش ہے جس کی مخبری ہوئی تھی؟''

''صاحب جی۔ حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی لمبے بال، گھنی لٹوں جیسی بڑی ڈاڑھی، سُرخ آنکھیں، ملنگ کا بھیس..... یہ تصویر دیکھیں ذرا۔''

سب انسپکٹر نے جیب سے ایک سادہ کاغذ پر بنا خاکہ نکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا تو پتہ چل ہی چکا تھا کہ انسپکٹر علاقے کا تھانے دار ہے اور وہ کسی خودکش کی تلاش میں یہاں ناکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے تو میں نے تھانے دار کو پہلی بار مخاطب کیا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آ رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروا لیں، میں کوئی دہشت گرد نہیں ہوں۔''

میری آواز سن کر وہ سارے یوں اُچھل پڑے جیسے میں نے واقعی کوئی خودکش دھماکہ کر دیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لہجے اور سکون بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قمیض اتارنے کا کہا۔ میں نے اپنا پھٹا پُرانا جھولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے دُور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے۔ پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مُشکیں کس دیں اور میری پوری طرح جامع تلاشی لینے کے بعد اس نے اعلان کر دیا۔

''نہیں صاحب جی..... یہ بندہ تو نہتا ہے۔''

تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ میرے تھیلے میں اُنہیں صرف کچھ چنے اور گُڑ ملا۔ تھانے دار نے جیب کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قمیص پہننے کا حکم دیا۔ دُور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کیبن نُما کھوکھے والے نے تھانے دار کے لیے اُبلتی دودھ پتی چائے کی ایک چینک اور چند چھوٹے پرانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیئے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنا دیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیر اعظم سے زیادہ تھانے دار کا کروفر ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سدا غلام ہی رہے گا۔ کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے ازراہِ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

''جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی تم زیرِ حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمسایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں ہے اور تمہارے حلیئے سے میل بھی نہیں کھاتا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو.....؟''

میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسوں۔ کل تک جس حلیئے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیا میری راہ میں پلکیں بچھاتی تھی۔ میری عزت اور تکریم میں کھڑی ہو جاتی تھی، میری طرف پیٹھ کر چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حُلیہ اور جوگی کا بھیس مجھے ایک عادی مُجرم ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلتے ہی اس کی برکت اور اس کے نام کے فیض کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مُسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلہ تبلیغ یا دوسرے روحانی عوامل کے لئے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط ہو؟ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا۔

''یہاں سے ریاست پور کتنا دُور ہے.....؟''

تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''65 پینسٹھ میل..... کیوں.....؟ مگر تم فکر نہ کرو..... ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔''

تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی پرانی جیب میں بیٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے۔ ان میں کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے آج تک کوئی دہشت گرد یا خود کش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی عجوبے کے طرح برت رہے تھے۔ خود کش.....؟؟ ہم کتنے بد قسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے رہے ہیں۔ خود کش دہشت گرد..... درانداز..... انتہا پسند..... کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مُقدر میں ساری دُنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جُتا رہتا ہے، مگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لُغت میں دہشت گُش، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جینا کب سیکھیں گے؟ اور یہ خود کش؟؟..... ایک انسان خود کو فنا کر کے اپنی جیسی دوسری مخلوق کی جان لینے پر کیسے آمادہ ہوسکتا ہے.....؟ کاش ہم سب جانور ہی پیدا ہوتے تو شاید حیوانیت کا یہ الزام ہم پر نہ لگتا۔ اب تو شاید اگر جانوروں کو اگر ایک دوسرے کو الزام دینا ہو تو اُسے انسان کہہ کر پکارتے ہوں گے مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ خلافِ معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پرسکون اور خوبصورت تھی، تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہوگی۔ تھانے کے پس منظر میں دُور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا اینٹوں کا پل تھا جو تھانے کے مرکزی چوبی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی مگر انگریز دور کی ایک پرشکوہ عمارت ایستادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ پُل اور دیواریں ایک جیسے اجزا اور ساخت کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں مگر ''پُل'' ملاپ کا استعارہ ہوتے ہیں جبکہ دیواریں خفیہ جدائی کی علامت بن جاتی ہی۔ پُل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جُدائیاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے اور باقی دنیا کے درمیان جُدائی کی فصیل کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رخ میں بنا ہوا تھا۔ شائد یہ بھی قیدی کو اذیّت دینے کا طریقہ ہو۔ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔

راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سائلوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ زیادہ پانی والی پتلی سی چائے کا ایک مجھے پیالہ پکڑا دیا۔

''جانتے ہو..... دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہوگیا تو سیدھے سُولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟؟''

لمحے بھر میں ہی مجھے سکینہ کی پیشین گوئی یاد آگئی۔ تو میری فنا اس دہشت گردی کے الزام میں

سولی چڑھ جانے سے عبارت کرنے چلی تھی یہ قدرت؟ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے ورثاء کے طور پر ریاست پور سے شکورے اور مہر دین کو بلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے۔ کیونکہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان پہچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے قدرت اپنے مسودے مکمل اور کسی بھی غلطی یا بھول سے پاک لکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ قضا نے میرے گرد اپنا جال مکمل بُن لیا تھا۔ اب تو سکون ہی سکون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ ناز ادا چھم سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آ بیٹھی۔ کاش میں ایک بار اُسے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح مچل سا گیا۔

جیسے ننگے پاؤں
پھٹے پُرانے کپڑوں والے بچے
اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے دل کو اچھی لگنے والی
مہنگی چیزیں
کسی دُوکان کے بند شیشوں سے
پہروں لگ کر تکتے ہیں ناں
میں بھی تم کو یوں ہی محسن
اکثر تکتا رہتا ہوں

میں بھی اُسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اسے ایک بار تکنے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر خوابوں میں مُرادیں پا لیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پُوری ہو گئی۔ میں اُس کی آرٹ گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کومل ہاتھوں کی جادوگری سے میرے مجسمے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ دُنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظر ہی نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے، میں نہ جانے کتنی دیر اس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔

''چل بھئی ملنگ بادشاہ..... تھانے دار صاحب تجھے بلا رہے ہیں۔''

میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے ہتھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مؤدب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند

خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا۔ پھر ایک افسر نے جو عہدے میں ایس۔ پی تھا مجھ سے پہلی بار براہ راست بات کی۔

''ریاست پور سے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ تم نے کچھ مہینے وہاں بستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے.....؟''

میں دھیرے سے مُسکرایا۔ ''فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاحب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا میرا۔ اب آپ کی یہ حوالات ہے.....''

ایس پی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مگر تمہارا یہ لب ولہجہ..... یہ اعتماد..... یہ تمہارے حلیئے کو غلط ثابت کرتا ہے ہمیں الجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد..... میں جانتا ہوں جن جگہوں کا تم نے ابھی نام لیا تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہوگا۔ مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کا ریکارڈ دیکھا جا سکے۔''

میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''حیرت کی بات ہے..... کوئی اگر آپ جیسی کوتوالی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑا جائے۔ اس کی آواز کانپے تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی بنا گھبرائے اپنا مدّعا بیان کر دے تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلّی کریں.....''

میں خاموش ہوا تو ان سب کے تنے ہوئے چہروں پر مزید کئی شکنیں پڑ چکیں تھیں..... ''ایس۔ پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی جو میرے موجودہ حلیئے سے کافی حد تک مشابہہ تھی۔ ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک وہ معصوم لوگوں کے جان کے درپے ہے، تمہارا حلیہ اور تمہاری ادھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم یہی دہشت گرد ہو جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملنگ کے حلیئے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سینکڑوں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو۔ ورنہ ساری عمر انہی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے.....''

اس کا لہجہ اور ان سب کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے۔ مگر میں انہیں کیا بتاتا؟ میں جس شناخت سے ساری عمر بھاگتا رہا

وہ ایک بار پھر میرا مذاق اڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی ہونے کو تیار تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلع کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کروا دی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شبہے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آ کر پولیس سے ملے۔ اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شکورے اور مہر دین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل دیہاتی بوڑھے سمجھ کر دھتکار رہے تھے جبکہ وہ دہائی دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جوگی سائیں ہے۔ مگر وہاں کوئی ان کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیئے تھے۔ شکورے اور مہر دین کو تھوڑی دیر کے لئے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے.....

میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''شاید میں وہ نہیں ہوں جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو۔ اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینہ کا دیکھا ہوا ہر خواب سچ تعبیر ہوتا ہے۔ شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے.....''

وہ دونوں میرے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شکورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینہ نے وہ خواب دیکھا ہے، تبھی سے وہ دعا کے لئے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رو رو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو۔ سائیں جی کو ان سب کی عمر لگ جائے مگر سائیں کی آنے والی فنا ٹل جائے۔''

اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آ کر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑکائیں۔ ''اٹھ جاؤ ملنگ بادشاہ۔ تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔''

میں حیران حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ''معاف کرنا فقیرو..... ہم بھی انسان ہیں۔ ڈیوٹی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو ہلکی سی شکایت بھی نہیں کی۔''

تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے ناشتہ میز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ''تم نے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیا۔ اسی بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے اسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی بالکل کلیئر آئی

ہے۔اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جا سکتے ہو۔مگر پہلے ناشتہ کرلو.....''

میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا۔مگر تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔''کہاں جاؤ گے.....؟؟''

''کوئی منزل نہیں ہے میرے جہاں قدم اٹھیں گے اسی طرف نکل جاؤں گا۔آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ.....''

تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔''شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔چلو جیسے تمہاری مرضی۔اکرم خان نام ہے میرا.....کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا اور ہاں۔کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے۔اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں.....؟''

میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔''ان سے کہیے گا یہاں پر فنا ہونا میرے نصیب میں نہیں تھا۔ جہاں لکھی ہو گی.....وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں.....''

میں اکرم خان کو وہیں ہکا بکا چھوڑ کر تھانے دار کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔پھر وہی پُل اور وہی دیوار..... میں قصبے کی طرف جاتی پگڈنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چلتے دیکھ کر آپس میں کچھ سرگرشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گڑگڑا کر ہنس پڑے۔شریر بوندیں ایک بے گھر بیچارے کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے کے لیے بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکنے لگیں۔ بادلوں نے بنجارے کو بھیگتے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں بند ساری شرارتی بوند مجھ بنجارے پر برسا دیں۔موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سنے تو اُسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آجائے، وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے اٹھکیلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اوٹ کی پناہ تلاش کرلوں مگر میں نہیں رُکا۔ بھیگتا رہا، میں بہت دُور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اُس اجنبی ویرانے کے اجنبی راستے میری تنہائی پر مسکراتے رہے، یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تخیل کی کرشماتی دنیا سے زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے جُوے محسوس ہوتے ہیں۔گھنٹہ بھر بھیگنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔یہ کون سی جگہ تھی۔شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی بیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے آواز لگائی۔

''کہاں جا رہے ہو صوفیو۔میں پہنچا دوں۔''

میں نے اس دیہاتی سے پوچھا۔''یہ راستہ کہاں جاتا ہے۔''

وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ''راستہ تو کہیں نہیں جاتا۔ یہیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیرو..... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں.....''

مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے من کی الجھنیں بھلا کر لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے تو یقیناً وہ دل والا ہے۔ بیل گاڑی نے مجھے پکی سڑک تک پہنچا دیا۔ جہاں سے اِکا دُکا سواریاں گزر رہی تھیں مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے بگڑتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھا لیا اور بنا پوچھے ہی ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری سٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چپڑاسی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا، بخار نے میرے حواس اس بری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی تو مجھے کسی بڑے شہر جاتی ریل گاڑی پر سوار کروا دیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچتے ہی کسی قلی یا مزدور سے کہلوا کر شہر کے بڑے ہسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا، گاڑی رُکی تو میں بھی ٹی ٹی کو بتا بتائے لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا بُرا حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ چھٹی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے جلتے بجھتے برقی بورڈ پر پڑی جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اُٹھا، جیسے میری رُوح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھنا کر رکھ دیے ہوں۔ یہ تو میرا اپنا شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ وہی شہر جہاں وہ کوچۂ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر میں لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا ورنہ شاید میں ٹرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشہ کہیں بھی ہو، تماش بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشہ دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بُری طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خودکشی کے ارادے کے جُرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خودکشی بھی کتنا عجیب جُرم ہے، جُرم کا ارادہ ہو یا اگر جُرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اتنے میں کسی شناسا کی آواز ہجوم میں اُبھری۔

''ہٹو دور یہاں سے جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ.....''

میں نے گھبرا کر نظر اُٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

باب 28

کبھی کبھی ہمارے کچھ خدشات حقیقت کا رُوپ دھارنے میں کس قدر عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ہماری سوچ کی پرواز سے بھی تیز، جلد باز اندیشے، مجھے یہی خدشہ تھا کہ یہاں مجھے اپنا کوئی پُرانا جاننے والا نہ مل جائے اور ٹھیک اُسی وقت بھیڑ کو دھکیل کر اندر آنے والے نے میرا اندیشہ سچ کر دکھایا۔ آنے والا خانو تھا، کچھ دیر کے لیے تو وہ مجھے دیکھ کر گم سم ہی رہ گیا، خود میں بھی اُسے یہاں اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر دیکھ کر حیرت زدہ تھا۔ خانو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔

''کیوں ظلم کرتے ہو ہم غریبوں پر سائیں..... کیوں بار بار مجھے اکیلا چھوڑ جاتے ہو؟''

میں نے بڑی مشکل سے اُسے خود سے علیٰحدہ کیا۔ ''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' آس پاس کھڑے لوگ حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ خانو نے حسب عادت کسی حوالدار کی طرح سب کو ڈانٹا:

''جاؤ یہاں سے بابا..... کیا مصطفیٰ قریشی کی کوئی فلم چل رہی ہے جو تم سارے یوں مُنہ کھول کر کھڑے دیکھ رہے ہو..... جاؤ..... کام کرو اپنا..... شکر کرو سائیں جی اِدھر آ گیا ہے..... اب دیکھنا کیسے تم سب کی قسمت بدلتی ہے..... چلو اب بھاگو سارے یہاں سے.....''

دھیرے دھیرے بھیڑ چھٹنے لگی۔ خانو نے مجھے بتایا کہ اس کے حالات ذرا بہتر ہوئے تو بیوی نے ضِد کی کہ اب انہیں بچوں کی تعلیم کے لیے یہ چھوٹا قصبہ چھوڑ کر کسی بڑے شہر منتقل ہو جانا چاہیے، لہٰذا خانو نے کچھ عرصہ قبل کسی سے سفارش کروا کر یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر اپنا چھوٹا سا کیبن بنا لیا اور اب وہ اپنے بیوی بچوں سمیت اِسی شہر منتقل ہو چکا تھا۔ جانے میری قسمت کے خالی کشکول میں مُقدر بار بار وہی پُرانے سکے کیوں ڈال دیتا تھا، مجھے خانو کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادھا سا بے لوث انسان میرے لیے اپنی جان سے بھی گذر سکتا تھا مگر وہ میرا نادان دوست تھا..... اور مجھے شاید کسی دانا دشمن کی تلاش تھی۔ خانو کا کھوکھا یہاں بھی خوب چلتا تھا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی سب پر اپنا خواہ مخواہ کا رُعب جما رکھا تھا خانو نے تھوڑی دیر میں ہی پلیٹ فارم کے شیڈ سے پرے کھلے آسمان تلے ایک بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے میرا بسیرا بنا دیا۔ فقیر کا ٹھکانہ بھی بھلا کیا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ ایک پھٹا

پُرانا چھپر، جو نہ دھوپ روک سکتا ہے نہ بارش..... درخت کے نیچے یہاں بھی پکی اینٹ اور سیمنٹ سے بنے ایک گول چبوترے نے برگد کی جڑوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بالکل میرے غموں کی طرح..... جو ہر لمحہ میرے گرد اپنا گھیرا ڈالے رہتے تھے۔ رات کو گھر جانے سے پہلے خانو کچھ دیر میرے پاس رُکا اور میری خستہ حالی دیکھ کر گھبرا گیا۔

''تمہیں تو شدید بخار لگتا ہے جوگی سائیں.....''

''نہیں..... میں ٹھیک ہوں..... بس تھکن ہے بہت لمبے سفر کی..... تم جاؤ..... بیوی بچے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے..... مجھے ابھی بہت جاگنا ہے..... اس شہر کا آسمان اور یہ تارے میرے پُرانے دوست ہیں..... بہت سی باتیں کرنی ہیں ان سے آج رات۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی خانو مجبوراً وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مگر اس کے جاتے ہی جانے کیوں مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں اُسے کچھ دیر مزید روک لیتا تو اچھا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی بڑا جان لیوا تھا کہ میں اپنے ہی شہر میں تنہا ہوں۔ ریت، اینٹ اور سیمنٹ کی بنی چند عمارتوں اور سڑکوں سے پرے شاید وہ بھی اسی تاروں بھرے آسمان تلے جاگ رہی ہوگی؟ شاید اپنی آرٹ گیلری میں کوئی مجسمہ تراش رہی ہو..... یا پھر شاید اپنی چھت پر اپنی پسندیدہ زرد پھولوں والی نیوی بلیو شال پہنے ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے میری طرح ستاروں سے باتیں کر رہی ہوگی، یہ آسمان بھی تو اس کی شال کی طرح تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں تو مجھے اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب ہم خود اپنا سامنا کرنے سے ہی کتراتے ہیں۔ میں بھی ساری رات خود سے بھاگتا رہا۔ صبح تک میں مزید نڈھال ہو چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی جب دن کی روایتی بھیڑ اور چہل پہل کا دور شروع ہوا تو حسب معمول سب سے پہلے ضعیف العقیدہ لوگ میرے آس پاس جمع ہونے لگے۔ شاید اس میں میری پرانی شہرت کا بھی ضرور کچھ حصہ رہا ہوگا کیونکہ ریلوے کے جن اہل کاروں کی ٹرین ڈیوٹی کا رُوٹ شکر گڑھ رہا تھا وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے اور انہوں نے میری نام نہاد ''کرامات'' کے بہت قصے سُن رکھے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے آتے جاتے لوگوں کو یوں ٹھٹھک کر درخت کے قریب جمع ہوتے دیکھا تو وہ بھی اپنے دفتر سے باہر نکل آیا اور جھڑک کر پوچھنے لگا:

''یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے..... کون ہے یہ مجذوب.....؟''

اسٹیشن ماسٹر کی آواز سُن کر ریلوے کے چھوٹے موٹے اہل کار اِدھر اُدھر بدک گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے مجھے غور سے دیکھا:

''کون ہو تم.....؟ اور کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ریلوے کی سرکاری زمین پر کوئی بھی مستقل یا عارضی بسیرا ڈالنا ممنوع ہے.....''

میں بمشکل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا:

''بسیرے بھی بھلا کبھی ممنوع اور غیر ممنوع ہوتے ہیں جناب.....؟ شاید مکین ممنوعہ یا غیر ممنوعہ ہوتے ہوں.....''

میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر بخار کی تھکن اور نقاہت کی وجہ سے مجھے ایک زوردار چکر آیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر مجھے تھامنے کی کوشش کی۔

''ارے ارے..... سنبھل کے بھئی..... تمہاری طبیعت تو بہت ناساز لگتی ہے۔''

اسٹیشن ماسٹر کی آواز پر دو قلی دوڑے چلے آئے اور انہوں نے مجھے سہارا دے کر دوبارہ میرے مسکن پر بٹھا دیا۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر کو تسلی دی:

''نہیں..... میں ٹھیک ہوں..... میں خود بھی یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔ آپ فکر نہ کریں..... زیادہ دیر نہیں ٹکوں گا یہاں پر.....''

اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے:

''نہیں نہیں..... ایسی کوئی جلدی بھی نہیں ہے..... تم تو جانتے ہو..... کچھ لوگ اسی طرح چھپر ڈالتے ہیں اور پھر دھیرے دھیرے سرکاری زمین پر پہلے پکا جھونپڑا اور پھر چار دیواری کھڑی کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ بطور اسٹیشن ماسٹر میرا فرض ہے کہ میں پلیٹ فارم اور اسٹیشن کی حدود میں کسی بھی ناجائز تجاوز کو روکوں..... مگر تم اس وقت اس قابل نہیں ہو کہ اپنے بل بوتے پر ایک قدم بھی چل سکو..... کچھ دن آرام کر لو..... طبیعت سنبھل جائے تو چلے جانا۔''

میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں:

''آپ کی مہربانی کا بہت شکریہ..... مگر یہ شہر مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے..... آپ ایک احسان اور کر دیں مجھ پر..... یہاں سے کہیں بہت دور دراز جانے والی کسی گاڑی پر سوار کروا دیں مجھے.....''

اتنے میں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کا ایک ماتحت وہاں آ پہنچا:

''سپرنٹنڈنٹ آفس سے فون ہے آپ کا صاحب۔''

اسٹیشن ماسٹر نے سر ہلایا اور جانے سے پہلے ایک لمحے کے لیے میرے پاس رکا:

''اعجاز نام ہے میرا..... فی الحال تم آرام کرو..... میں ذرا دفتر کے معاملے نپٹا لوں..... تمہارے جانے کا انتظام بھی ہو جائے گا..... ذرا صبر سے کام لو.....''

اسٹیشن ماسٹر پلٹ گیا۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ مجھے زندگی میں کڑواہٹ کی اس قدر عادت ہو چکی ہے کہ اب میٹھے کی عادت ہی نہیں رہی۔ پھر چاہے وہ صبر کا پھل ہی کیوں نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ایک ریلوے اہل کار بخار کی شربت کی بوتل اور چند گولیاں مجھے تھما گیا۔

''یہ دوائیاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بھیجی ہیں..... جلدی سے یہ گولیاں اور شربت غٹک

جاؤ..... ہمارے اعجاز صاحب نے ڈسپنسر کورس بھی کر رکھا ہے..... یہاں سب کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج وہ خود کرتے ہیں..... شام کو بیٹھک میں خوب ہجوم رہتا ہے ان کی.....''

وہ باتونی نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور تب تک وہاں سے نہیں ٹلا جب تک میں نے دوا کی خوراک لے نہیں لی۔ کچھ لوگ اپنے لفظ اتنے بے دریغ کیوں لٹاتے رہتے ہیں۔ جانے مجھے ہمیشہ سے ایسا کیوں لگتا تھا کہ لفظ ادا ہونے کے بعد ہمیں خالی کر جاتے ہیں۔ کچھ دیر میں خانو آ گیا اور اپنا کیبن کھولنے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا:

''سائیں جی..... وہ کالو ٹھیلے والا بتا رہا تھا کہ اپنے اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے تھے تمہاری طرف..... سب خیر تو ہے ناں.....''

''ہاں..... سب خیر ہے..... وہ اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے..... اچھے انسان ہیں۔''

خانو کے چہرے پر چھائی فکرمندی کی لکیریں چھٹ گئیں اور وہ وہیں کھڑے کھڑے اعجاز صاحب کی شان میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگا کہ دیکھنے میں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب بہت سخت نظر آتے ہیں مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔ سب ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جانے یہ اُوپر سے سخت نظر آنے والے اکثر اندر سے نرم اور نیک دل کیوں ہوتے ہیں۔ شاید یہ ساری دنیا ہی ایسے تضادات کا مجموعہ ہے، میں دن بھر وہیں مُنہ ڈھانپے پڑا رہا۔ نقاہت اور بیماری بھی کتنی بڑی معذوری ہوتی ہے۔ یا تو ہمارے دل اور دماغ کو اتنی قوت پرواز نہ دی گئی ہوتی یا پھر ہمیں اس کم زور جسم اور قوت ارادی کے تابع نہ کیا گیا ہوتا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کی خواہش میں بس پھڑک کر ہی رہ جائیں۔ میں بھی سارا دن اسٹیشن چھوڑ کر کہیں دور نکل جانے کے اپنے کم زور ارادے سے لڑتا رہا مگر میرے لاغر جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔ شام کو اعجاز صاحب نے بھی دوسرا پھیرا ڈالا اور حال چال پوچھ کر جاتے جاتے کیا سوچ کر دوبارہ میری طرف پلٹ آئے:

''بات چیت سے تو تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو۔ پھر یہ جوگ کیوں لے رکھا ہے۔ بھئی معاف کرنا۔ میں اس پیری فقیری پر اعتبار نہیں کرتا، آج کل کے اس منافق دور میں اصل پیر فقیر بھلا کب پائے جاتے ہیں؟''

اعجاز صاحب کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے تائید کی:

''ٹھیک کہتے ہیں..... کاش یہ چھوٹی سی بات اس ظاہر پرست دنیا کو بھی سمجھ آ جائے کہ صرف حلیہ درویشی کی ضمانت نہیں ہوتا..... دیوانے اور مجذوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

اعجاز صاحب نے چونک کر میری طرف دیکھا:

''آدمی دلچسپ لگتے ہو..... موقع ملا تو کبھی تفصیلاً بات ہوگی..... تم آرام کرو.....''

اسٹیشن ماسٹر کے جاتے ہی ڈورا اپنے ٹھیلے پر بے چین کھڑا خانو لپک کر میرے قریب آ گیا۔

''کیا کہہ رہے تھے اسٹیشن ماسٹر صاحب..... میرے متعلق تو کچھ نہیں کہا.....؟''

''ہاں..... کہہ رہے تھے کہ یہ خانو سارا دن ادھر کی ادھر لگاتا رہتا ہے۔ دل لگا کر کام نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے..... سوچ رہے ہیں کہ تمہارے ٹھیکے کا لائسنس منسوخ کر دیں۔''

میری بات سن کر خانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''کیا بول رہے ہو جوگی سائیں..... میں تو سارا دن محنت کرتا ہوں۔''

''تم محنت کم..... باتیں زیادہ کرتے ہو..... آج سے کوشش کرو کہ انہیں دوبارہ تم سے شکایت نہ ہو.....''

خانو نے جلدی سے سر ہلایا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جلدی سے اپنے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا اور میں نے سکون سے سر ٹکا لیا، میں جانتا تھا اب رات گئے تک وہ کام میں جٹا رہے گا، میرا وہ نادان دوست..... اگلی شام آئی تو عصر کے بعد ایک تھالی خوان اٹھائے میری طرف چلا آیا۔

''اسٹیشن ماسٹر صاحب کے گھر میں نیاز ہے آج ختم قرآن کی..... تمہارا حصہ بھی بھیجا ہے.....''

میرا جی چاہا کہ میں کھانے کی ٹرے واپس لوٹا دوں کہ میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر نیاز کا سُن کر میں خاموش رہا۔ شام ڈھلی تو میرے دل کے اندھیرے بڑھ گئے اور اسٹیشن روشنیوں سے جگمگانے لگا۔ مگر جو میرے تاریک دل کو اُجال سکتا، وہ اجالا کہاں تھا میری قسمت میں؟ خانو بے چارہ دن بھر کام میں جتا رہا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے اسے بتا کر جاؤں گا کہ میں نے اس کی ناز برداری اور خدمت گزاری سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں وہ پتھر تھا جس سے سر ٹکرانے والا پجاری بدلے میں صرف زخم ہی پا سکتا تھا، رات ہوئی تو اسٹیشن ماسٹر صاحب حسب معمول اسٹیشن کا ایک آخری جائزہ لینے کے لیے پلیٹ فارم پر سارے موجود اہل کاروں کو ہدایات دیتے نظر آئے۔ مگر جانے کیوں اس رات مجھے اعجاز صاحب کی چال اور آواز میں وہ بانکپن اور کڑک مفقود محسوس ہوئی جوان کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ رُک گئے:

''تم سوتے نہیں ہو کیا.....؟ طبیعت اب کیسی ہے تمہاری؟''

''ٹھیک ہوں..... بس نیند آتے آتے آتی ہے.....''

وہ تھکے ہوئے انداز میں وہیں چبوترے پر میرے قریب بیٹھ گئے:

''ہاں..... ٹھیک کہا تم نے..... کبھی کبھی تو نیند بھی نخریلی شہزادی بن جاتی ہے۔''

''آپ آج کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں..... سب ٹھیک تو ہے.....؟''

انہوں نے ایک گہری سانس لی:

''ہاں..... اب تو ٹھیک ہی سمجھو..... وہ کہتے ہیں ناں..... درد کا حد سے گزر جانا ہی دوا ہو جاتا ہے..... تم یہاں نئے ہو اس لیے تمہیں نہیں پتہ کہ آج کا دن بڑا بھاری گزرتا ہے مجھ پر۔ پرانے ملازمین

سارے واقف ہیں اس کہانی سے....."

میں نے غور سے اس ٹوٹے ہوئے انسان کی طرف دیکھا۔ ہمارے آس پاس بکھرے ان ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ہر ایک اپنے اندر کتنا غم چھپائے، کتنا درد دبائے بیٹھا ہے، مگر ہم خود غرضوں کو اپنے سوا دوسرا کوئی نظر ہی کب آتا ہے بھلا؟

"اگر مناسب سمجھیں تو مجھے کچھ بتائیں۔"

اعجاز صاحب نے لمبی گہری سانس لی۔

"بس بیوی کی بیماری نے پریشان کر رکھا ہے اُس بدنصیب نے بھی کم دن ہی خوشی دیکھی۔ اب تو سارا دن بستر پر ہی پڑی رہتی ہے۔ ہماری ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی ثُریا..... بچپن سے ہی ہم دونوں کی جان..... لاڈ اور نازوں سے پلی..... اسکول کالج سے یونیورسٹی تک ہر مضمون ہر مقابلے میں اول..... چندے آفتاب..... چندے ماہتاب..... سچ پوچھو تو اُس کی خوب صورتی سے ہم دونوں میاں بیوی کبھی کبھی بے حد خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ اس لیے جلد ہی اس کے ہاتھ پیلے کر کے رخصت کرنے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ بہت سے رشتے آئے مگر مجھے خاص طور پر کسی ایسے رشتے کی تلاش تھی جہاں ساس نندوں کا جھمیلا بھی کم ہو اور لڑکا معاشی طور پر بھی کافی مضبوط ہو۔ ہم نے ثریا کو بہت نازوں سے پالا تھا اور ہمیں یہ ڈر تھا کہ وہ روایتی ساس نندوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی برداشت نہیں کر سکے گی۔ آخر کار رشتہ لانے والی نے ایسے ایک لڑکے کے بارے میں بتایا جو ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بیرونِ ملک سے کافی کچھ کما کر دوبارہ اپنے ملک منتقل ہوا تھا، اکیلا رہتا تھا اور یہاں رشتے کا بھی خواہش مند تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے قدرت نے یہ رشتہ میرے صبر کے بدلے ہی بھیجا ہے۔ ہم نے ہر طرح سے چھان پھٹک کر لی۔ لڑکا واقعی بہت شریف اور خاندانی تھا اور ثریا کی تصویر دیکھ کر تو اس نے رشتے والی کا در ہی پکڑ لیا تھا کہ اب وہ رشتہ کرے گا تو ہماری ثریا سے۔ ورنہ ساری عمر کنوارہ ہی رہے گا۔ لڑکے کا نام کلیم تھا مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا ہچکچا رہی تھی....."

میں نے حیرت سے اعجاز صاحب کی طرف دیکھا۔

"مگر کیوں.....؟"

اعجاز صاحب نے نظریں جُھکا لیں۔

"دراصل لڑکا کچھ کم صورت تھا، ہماری ثریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے کلیم کا گہرا سانولا رنگ اور نین نقوش بہت ہیچ محسوس ہوتے تھے۔"

اعجاز صاحب کی بات سن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا۔

ثریا نے کلیم کو دیکھا تھا.....؟ "میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں....."

"ثریا کا فیصلہ وہی تھا جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق

اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا..... بالآخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد قرعہ کلیم کے نام ہی کھلا اور ہماری لاڈلی ہماری دعاؤں اور آرزوؤں کے حصار میں کلیم کے ساتھ رخصت ہوگئی.....''

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا.....

''پھر آپ اتنے اُداس کیوں ہیں۔ سُنا ہے انسان کا اندر خوبصورت ہونا چاہیے..... بیرونی بدصورتی کی تو شاید پھر بھی عادت پڑ جاتی ہوگی.....؟''

مجھے لگا یہ سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں..... خود اپنے آپ سے کیا ہے..... اعجاز صاحب نے لمبی گہری آہ بھری.....

''ہاں..... میری ثریا نے پہلے دن سے ہی ہماری خوشی کے لیے کلیم کو پورے دل سے تسلیم کر لیا تھا..... کلیم تو پہلے ہی سے ثریا کے پیار میں دیوانہ تھا۔ مگر.....''

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا.....

''مگر کیا.....؟''

''مگر یہ دنیا والے بھلا کب کسی کو پھلتا پھولتا اور خوش دیکھ سکتے ہیں۔ کلیم اور ثریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، ان کی جوڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے، پہلوئے حور میں لنگور جیسے فقرے کسے جاتے..... تنگ آ کر کلیم نے ثریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا۔ مگر لوگوں کی زبان کو کون روک سکتا ہے۔ کلیم اپنی محرومیوں کا غصہ ثریا پر اُتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور ثریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہو گی ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی کلیم جیسے کم صورت کو قبول کیوں کرتی؟ کلیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور ثریا کی خوبصورتی نے اسے نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اُسے گلی محلے حتیٰ کہ شہر کا ہر بندہ اس کا مذاق اڑاتے محسوس ہونے لگا۔ ثریا کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ مجھ سے اور ثریا کی ماں سے ایک بڑی غلطی ہوگئی تھی رشتہ ہمیشہ جوڑ والوں میں کرنا چاہیے، پھر چاہے یہ جوڑ معاشی حالت کا ہو یا صورت کا..... بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ کلیم ثریا پر شک کرنے لگا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اُسے دُھن کر رکھ دیتا اور پھر ایک دن ثریا اس حالت میں گھر واپس آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نیل نیل تھا اور..... اور پھر.....''

اعجاز صاحب کی قوتِ گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا.....''

''پھر تیسرے روز کلیم نے ثریا کو طلاق بھجوا دی.....''

میری آواز حلق میں اٹک سی گئی۔

''طلاق.....''

''ہاں..... طلاق..... تین سال پہلے ہماری ثریا گھر واپس آ گئی تھی..... بہت صابر شاکر تھی

میری بیٹی..... کبھی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نفسیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی۔ مگر ثریا سہتی رہی..... اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی.....''

''ہاں..... آج اُس کی دوسری برسی تھی..... یہ نیاز اسی سلسلے میں بانٹی گئی تھی.....''

مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ اعجاز صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔ مجھے لگا وہ مجھے میری اپنی کہانی سُنا کر پلٹ گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان عذابوں کا شکار ہوں۔ مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک پری زاد کسی نئے روپ اور نئے نام کے ساتھ دھرنا دیئے بیٹھے ملتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا، جوڑے ہمیشہ جوڑ والوں کے بھلے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا میں عینی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں بھی تو اسی ظالم دنیا کے باسی تھے۔ عینی مجھے قبول کر بھی لیتی تو جگ والے ہمیں جینے نہ دیتے۔ یہاں رُوپ کا بدل صرف رُوپ ہے۔ ترازو کے ایک پلڑے میں حُسن ہو تو دوسرا پلڑا بھی اُسے متوازن کر سکتا ہے جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہوتی رہی..... جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر خانو کی ہلکی ہلکی آوازوں نے مجھے دوبارہ جگا دیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ خانو مجھے بتا رہا تھا کہ

''سائیں یہ بی بی کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے سائیں کا بڑا نام سُنا ہے۔ دعا لینے آئی ہے.....''

میں نے چونک کر سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان زمین پر ڈھے گیا اور زمین فلک سے جا ملی میرے سامنے عینی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں..... میری مجسمہ ساز..... وہی قراۃ العین..... مگر اس کی آنکھوں پر یہ سیاہ چشمہ کیوں لگا ہوا تھا ابھی تک.....؟ میں نے خانو کو اشارہ کیا کہ وہ لڑکی سے کہے چشمہ اتار دے۔ مگر خانو جا چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے بھاری آواز میں کہا.....

''بی بی..... اپنے چہرے سے اندھیرے کا یہ پردہ ہٹا دو..... تاکہ میں تمہاری آنکھوں میں جھانک کر تمہاری رُوح کے زخم دیکھ سکوں۔''

مگر وہ رو پڑی۔

''نہیں سائیں جی..... میری آنکھیں بے نور ہیں..... آپ ان میں جھانک کر بھی صرف اندھیرے ہی دیکھیں گے.....''

میں زور سے چلا اٹھا۔

''کیوں..... تمہاری آنکھیں اب تک بے نور کیوں ہیں.....؟ اگر دعا ہی کروانی ہے تو اپنی بینائی کی دعا کرواؤ.....''

عینی نظریں چُرا گئی۔

''نہیں سائیں..... جس کو دیکھنے کے لیے مجھے بصارت چاہیے تھی..... وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں بینائی کا کیا کروں گی.....''

میں اس کی بات سُن کر سسک اُٹھا، وہ بھی روتی رہی اور پھر اچانک میرے کانوں میں خانو کی آواز گونجی۔

''سائیں جی..... کیا ہوا..... سب خیر تو ہے ناں.....''

''تم رو کیوں رہے ہو..... کیا کوئی بُرا سپنا دیکھا ہے۔''

میں نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خانو مجھ پر جھکا ہوا میرے گالوں سے میرے آنسو پونچھ رہا تھا۔ گویا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خانو کو سمجھا بجھا کر کام پر بھیجا مگر خود میرا چین وسکون مزید برباد ہو گیا۔ کچھ خواب ہمیں کس قدر بے سکون کر جاتے ہیں۔ سینے کے پنجرے میں بند یہ دل ایک دم ہی ہر دیوار ہر رکاوٹ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا، مجھے لگا جیسے وہ خواب ادھورا رہ گیا ہو شاید عینی کی آنکھیں واپس مل چکی ہوں مگر میری آواز پہچان کر اور میرے چہرے کو دیکھ کر اس نے مجھے نہ پہچاننے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی ہو۔ مجھے خانو پر شدید غصہ آنے لگا جس نے درمیان میں میری نیند توڑ کر مجھے خواب کے آخری حصے اور انجام جاننے سے روک دیا، سکینہ نے کہا تھا کہ محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمارے خواب سچے ہونے لگتے ہیں، قدرت نے ایک ہی رات میں مجھے دو اشارے دیئے تھے۔ پہلا ثریا اور کلیم کی کہانی سُنا کر اور دوسرا یہ ادھورا خواب دکھا کر۔ یقیناً قدرت مجھے یہ جتانا چاہ رہی تھی کہ عینی اگر بینائی ملنے کے بعد مجھے دیکھ لیتی تو ضرور وہ رو رو کر خُدا سے یہی شکوہ کرتی کہ اِس چہرے کو دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ اسے دوبارہ بصارت ہی نہ ملتی۔ وہ اندھی ہی رہتی تو اچھا تھا، میرے اندر چلتے جھکڑ تیز ہونے لگے۔ جیسے واقعی عینی نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ میری حالت شام تک اتنی بگڑ گئی کہ مجھے سانس بھی اٹک اٹک کر آنے لگی۔ خانو نے مجھے یوں تڑپتے دیکھا تو بناء کچھ کہے ایک جانب بھاگ گیا۔

اور گھنٹہ بھر بعد شہر کے کسی مستند ڈاکٹر کی دواؤں کا بکسہ اٹھائے اس کے آگے آگے بھاگتا ہوا نمودار ہوا۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی اور تشویش سے خانو کی طرف دیکھا۔

''تمہارے سائیں کی حالت تو بڑی خراب ہے، میں دوا کی تین خوراکیں دیے تو جا رہا ہوں مگر ہو سکے تو سائیں کو شہر کے بڑے ہسپتال پہنچانے کی کوشش کرو۔''

خانو نے تیزی سے سر ہلایا، مگر وہ اندر سے جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے کہیں نہیں ٹلنے والا ہوں۔ اگلے روز بادل پھر ٹوٹ کر برسے میری سانس اکھڑنے لگی تھی جیسے سینے کی قید سے آزاد ہونے میں اُسے بہت سی سلاخوں سے ٹکرا کر باہر نکلنا پڑ رہا ہو۔ میری نظر دھیرے دھیرے پتھرانے لگی تو خانو نے روتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''چلو سائیں..... ایک بار میری بات بھی مان لو..... چلو کسی بڑے ہسپتال چلتے ہیں۔''

میں نے برستی بارش کی بوندوں میں خانو کے آنسو مل کر پانی ہوتے دیکھے اور مسکرا دیا۔ میری آواز رُک رُک کر نکل رہی تھی۔

''کیوں ڈھونگی کہیں کے..... ذرا سی بیماری نے ہی تمہارے سائیں کی کرامات پر تمہارا یقین اور اعتماد چٹخا دیا؟ ابھی کل تک تو تم سارے علاقے میں سب سے کہتے پھرتے تھے کہ تمہارا جوگی سائیں اپنی دعا سے ہر بیماری اور ہر روگ کا علاج کر سکتا ہے اور آج جب خود تمہارا سائیں بیمار پڑا، تم اُسے شہر کے بڑے اور تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضد کر رہے ہو۔ اگر میری دعاؤں میں باقی لوگوں کے لیے اتنا اثر ہوتا تو کیا آج میری اپنی بیماری ایک پھونک میں ہی ہوا نہ ہو جاتی؟''

خانو لاجواب سا وہیں بیٹھا روتا رہا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ تیز بارش میں بھیگتی ایکسپریس گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ مسافر اترے اور کچھ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میں نے دور اسٹیشن کے بیرونی گیٹ سے ایک نوجوان جوڑے کو اندر آتے دیکھا۔ مرد تیز بارش سے خود کو بچاتے ہوئے کسی کی تلاش میں برآمدے کی جانب بڑھ گیا، میری لمبی جٹا دھاری بالوں کی لٹیں بھیگ کر میرے چہرے کے گرد پھیل بکھی تھیں۔ میں سر جھکائے یوں مراقبے میں پڑا ہوا تھا جیسے اپنی آخری سانس نکلنے کا خود انتظار کر رہا ہوں۔ اچانک میرے قریب ہی سیاہ لباس میں کسی نازک سے سراپے کا ہیولا اُبھرا اور وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ خانو نے اُسے دبے لفظوں میں میری بیماری اور بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا مگر وہ برستی بارش میں یونہی دھرنا دیئے بیٹھی رہی۔ خانو کو مجبوراً وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے اپنی منت بیان کر سکے۔ نقاہت اور غنودگی سے میری آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ مگر جان یوں اٹکی ہوئی تھی جیسے ضد پر اڑی ہو اور پھر وہ ہلکا سا کھنکار کر بولی تو اس کی مترنم آواز نے میرے وجود میں چھپی سبھی خفیہ گھنٹیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اردگرد زلزلہ آ گیا ہو۔ میں اس میٹھی آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں..... یہ اُسی کی آواز تھی جس کی سانسوں کی آہٹ بھی میں سُن سکتا تھا۔

''میرا خواب سچ ہونے کا وقت آ گیا تھا.....''

''مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنے اردگرد خواتین کی موجودگی پسند نہیں کرتے، اور نہ ہی کسی عورت سے ہم کلام ہونا آپ کو اچھا لگتا ہے۔ مگر میں آج بڑی امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ کئی سال سے بھٹک رہی ہوں در بدر..... میرا کوئی اپنا کھو گیا ہے..... آپ کی دُعا کا بڑا چرچہ سُنا ہے..... میں آپ سے التجا کرتی ہوں..... میرے لیے بھی دُعا کریں.....''

میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری دعا میرے سامنے بیٹھی مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی تھی۔ وہ بے چینی اور پریشانی میں اپنی خوبصورت انگلیوں کو حسبِ عادت بار بار آپس میں جوڑ کر کھول رہی تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھے جنہوں نے کبھی میرا چہرہ چھو کر ایک مجسمہ تراشا تھا۔ میری جھکی نظر نے اس کے ہاتھ

میں پہنی انگوٹھی دیکھی۔ میں خاموش رہا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی، پہچانتی بھی کیسے؟ اس نے آج تک مجھے دیکھا ہی کب تھا؟ میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ میری رُکتی سانسوں کی آواز سُن کر وہ گھبرا کر میرے اور قریب آ گئی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں.....''

دفعتہً میری نظر اس کی آنکھوں پر لگے کالے چشمے پر پڑی تو میرے اندر بیک وقت کئی جھکڑ چلنے لگے۔ حسبِ توقع ایک چشمہ اُس کی خوبصورت سرمئی آنکھوں کا پہرے دار بنا بیٹھا تھا۔ کہیں خدانخواستہ عینی کی آنکھوں کا آپریشن واقعی ناکام تو نہیں ہو گیا تھا۔ تیز بارش اُس کا نازک وجود بھگو رہی تھی، میرا جی چاہا کہ میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر اس کے وجود کے لیے چھتری بن جاؤں، مگر میں تو خود کسی کم زور پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی دوزانو بیٹھی بھیگتی رہی اور پھر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو جیسے۔ اُسے آواز دے کر روک لینے کی خواہش کو میں نے نہ جانے کس طرح روکا بس زبان دانتوں تلے داب لی، مُڑتے ہوئے اچانک پانی میں اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ڈگمگائی، میں تڑپ کر اسے گرنے سے روکنے کی کوشش کے طور پر آگے بڑھا، اس کے ہاتھ کسی سہارے کی تلاش میں فضا میں لہرائے اور میرے چہرے کو چھو گئے، میں گھبرا کر پیچھے ہٹا، وہ کچھ لمحوں کے لیے حیرت اور صدمے سے ششدر رہ گئی اور پھر اس نے بے تابی سے دوبارہ میرے چہرے پر اپنی انگلیاں پھیریں اور زور سے چلائی

''پری زاد..... یہ آپ ہی ہیں ناں..... آپ چُپ کیوں ہیں.....؟ بولتے کیوں نہیں.....؟''

میں اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہاں سے اٹھ کر چند قدم بھاگا، لیکن مجھ میں بھاگنے کی ہمت اور طاقت ہوتی تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا، میں لڑکھڑا کر یوں گرا جیسے کوئی کسی کی نظر سے گرتا ہے مگر مجھے دُنیا کی نظر سے گرنے کی پرواہ ہی کب تھی۔ مجھے تو بس اس ایک نگاہ سے بچنا تھا کہ جس میں کبھی میرا ایک مقام تھا۔ مجھے زمانے کی ہر فنا قبول تھی مگر اُس کی نظر میں نفرت یا رحم اور ہمدردی کی جھلک میرے لیے دنیا کی ہر موت سے کہیں بڑھ کر قضاء تھی۔ میں نے خود کو پوری طرح سمیٹ کر چھپا لیا۔ اچانک میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز گونجی۔

''کہاں تک بھاگیں گے اور کب تک خود کو چھپائیں گے پری زاد صاحب..... میں آپ کو اتنا کم زور نہیں سمجھتا تھا.....''

ڈاکٹر عدنان میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا، آس پاس چلتے لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی..... عینی وہیں دور بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے عدنان سے منت کی۔

''مجھے جانے دو عدنان..... اس کی جس ایک نظر سے بچنے کے لیے میں نے ساری دنیا تیاگ دی، وہ نظر میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہے..... میں بہت نڈھال اور بڑا گھائل ہوں

عدنان..... مجھے اور زخمی نہ کرو..... میرا دم میرے اس آخری بھرم کے ساتھ نکل جانے دو.....''

عدنان کی آواز لرز رہی تھی۔

''اُس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی؟''

''نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... میں نے محبت نہیں کی.....''

عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔

''محبت نہیں کی تو پھر یہ تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمالی نے امریکہ واپسی پر ہی ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے..... اور پھر ہر گرہ خود کھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد؟ آخر کیوں..... ایسا کون کرتا ہے..... چھین لیتے اُسے مجھ سے..... اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا..... آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا..... صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی..... آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندگی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی..... اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا، اس کے کتنے بھرم آپ سے جُڑے تھے اور آپ اُسی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آئے..... یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی.....؟''

میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔

''میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا..... صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اسے چھوڑا تھا..... میں جانتا تھا..... اگر میں اُس کا ہاتھ مانگتا تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی..... کیونکہ اس کی روح میرے ان گنت احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی..... لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان..... میری منزل تو بس ایک نظر تھی اس کی پیار بھری ایک نظر.....''

عدنان نے حتمی لہجے میں کہا:

''ٹھیک ہے..... اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے تو آج یہ بھرم بھی آزما لیتے ہیں..... وہ آ رہی ہے..... دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے..... آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی..... جب آپ حسب وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے تو عینی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اس کا آپریشن تو کروا دیا مگر بینائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔''

میں چلا اُٹھا۔

''مگر کیوں..... تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے.....''

تبھی عینی کی آواز میرے قریب سے اُبھری۔

''وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد..... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا، اور جب روح کے رشتے جڑ جائیں تو چہرے بے معنی ہو جاتے ہیں..... آپ کو مجھ پر اتنا بھروسہ بھی نہیں تھا..... بس..... اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے.....''

خانو نے صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دو زانو بیٹھ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا، میری جلتی رُوح کسی ٹھنڈے پانی کی آبشار تلے آ گئی۔ اُس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا غم، ہر سیاہی دھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے چھوتے ہی کتنا خوبصورت ہو گیا تھا، پری زاد بن گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا۔ میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، تمسخر یا نفرت سے مبرا..... ایک پیار بھری نظر..... میرے مقدر کی نظر..... وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی اور برستی بارش کی بوندیں اُس کے پاک اور معطر آنسوؤں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر خود کو پاک کرتی رہیں۔

''میں بھی کتنی بدنصیب ہوں۔ آپ نے سب سے چھپا کر جس محبت کو اپنے من میں دبائے رکھا۔ اُس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی..... ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے..... تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں..... اتنا کم زور سمجھ رکھا تھا آپ نے قراۃ العین کو دور کھڑے قضاء کے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ انشاء جی اٹھو..... اب کوچ کرو.....''

میں نے چند سانسیں مزید ادھار مانگیں اور اس مہہ وش کے ہاتھوں کو تھام لیا.....

''نہیں عینی..... میں تم پر زندگی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دُنیا میں ایسی کون سی کمی ہو جاتی.....؟ میں تو یوں بھی تمہاری زندگی میں اضافی تھا.....''

اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے چہرے کو پاک کرتے رہے۔

''پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد..... مگر آپ سے دور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ سے ہی پوری ہوتی ہے..... آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکہ جا کر پتہ چلا کہ آپ اضافی نہیں..... لازمی ہیں.....''

میں نے عینی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں..... کبھی نہیں کہہ پایا..... مگر آج کہتا ہوں..... مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین..... شدید محبت ہے۔''

میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں قضاء دھیرے سے گنگنائی۔

''وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا.....؟''

آس پاس کا سارا شور مجھے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا، جانے لوگ

آپس میں کیا سرگوشیاں کر رہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پا رہی تھی، اتنی تیز آندھی کے باوجود حبس سے میرا دم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سر گود میں لیے زار و قطار رو رہی تھی۔ زندگی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آئی ہے جب عمر بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں..... آج میری عمر بھر کی تپسیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو جینے یا مرنے سے غرض تھی، کتنی صدیاں اس ایک پل میں جی لی تھیں میں نے..... زندگی نے ہر قرض چکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں تو آس پاس دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھرانے لگیں، کبھی سنا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمحے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر بین کر رہے ہوں۔ جانے سب رو کیوں رہے تھے، میری پتھرائی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جمی ہوئی تھیں، جس نے میری تکمیل کر دی تھی، خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے لپٹ کر میری طرف اشارے کر کے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا، عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں، اُس نے عینی کو تھام رکھا تھا، ہاں..... اب وہی تو اُس کا سہارا تھا، کسی نے آگے بڑھ کر میرے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا، مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رُک کر سارے جسم میں جامد ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اندھیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا: انا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہ راجعون۔ اور میرے پپوٹے بند کر دیئے، اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
ضروری بات کہنی ہو
کوئی وعدہ نبھانا ہو
اُسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو
مدد کرنی ہو اُس کی یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ، اسے جا کر بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں.....

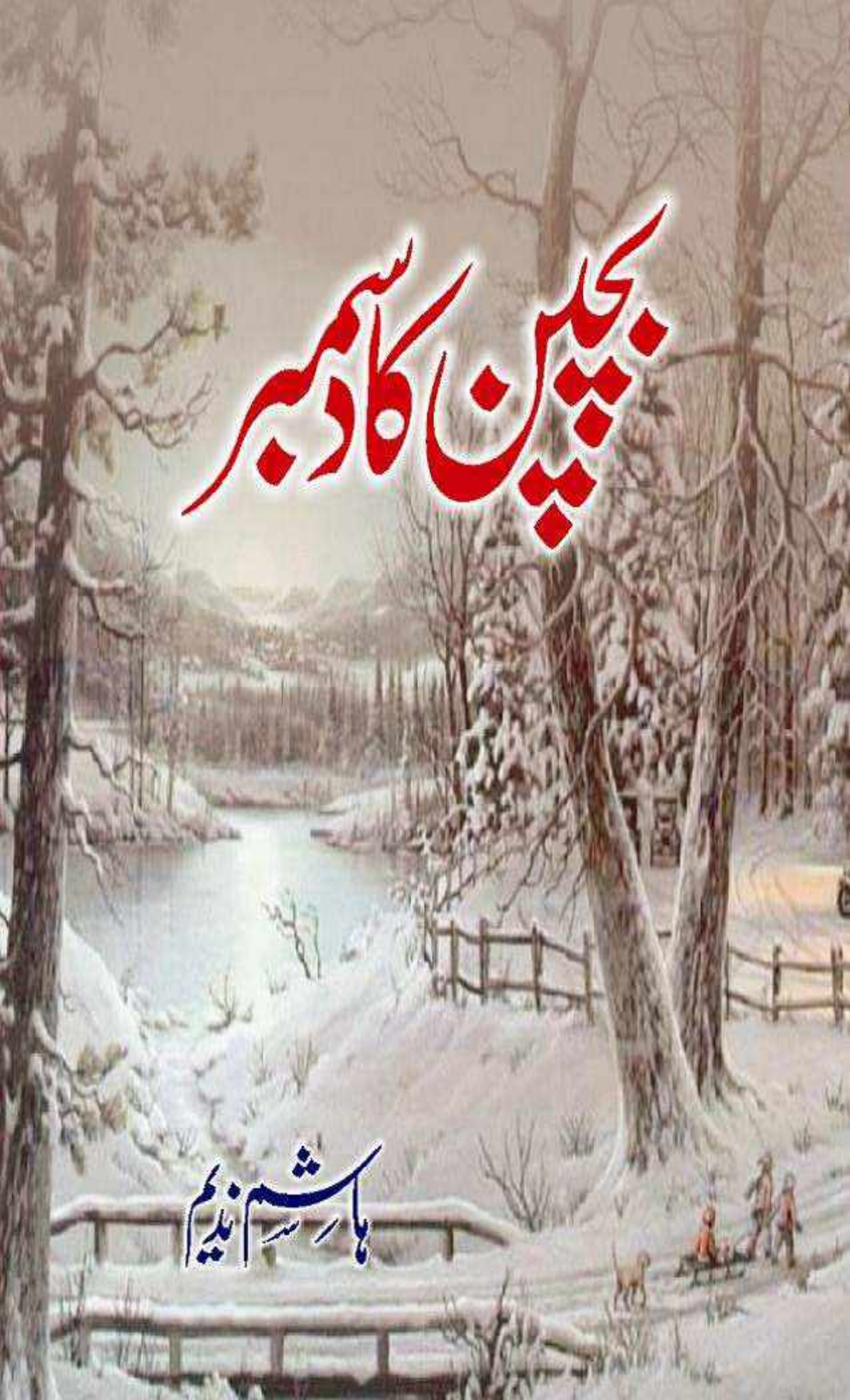
بچپن کا دسمبر
ہاشم ندیم

بچپن کا دسمبر.....دور حاضر کا مقبول ترین ناول.....نازک جذبوں میں گندھی.....بچپن سے جوانی تک کی محبت کی کہانی

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

بچپن کا دسمبر

ہاشم ندیم

علم وعرفان پبلشرز
40-اردو بازار لاہور
فون: 042-7352332-7232336

نوٹ:
اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز (علم وعرفان) محفوظ ہیں۔ادارہ علم وعرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔
(آخری صفحات میں ادارہ علم وعرفان کے شائع کردہ خوبصورت ناولوں کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	.....	بچپن کا دسمبر
مصنف	.....	ہاشم ندیم
ناشر	.....	گل فراز احمد علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
مطبع	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	.....	اگست 2010ء
قیمت	.....	-/500 روپے

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں: 0300-9450911

..... ملنے کے پتے .....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ

اُردو بازار، کراچی

انتساب!

عالیہ کے نام

جن کی وجہ سے میں آج تک اپنے

بچپن کے دسمبر کو جی رہا ہوں۔

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

☆.....کتابی شکل میں ملنے کے پتے.....☆

خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
کتاب گھر کمیٹی چوک، راولپنڈی
علی سٹیشنرز، حیدری چوک، لالہ موسیٰ
رحمٰن بک ہاؤس اُردو بازار، کراچی
احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد
مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار، راولپنڈی
گڈ بکس شاپ صدر بازار، راولپنڈی
بختیار سنز قصہ خوانی بازار، پشاور
بنگش بکڈپو اردو بازار، سیالکوٹ
ماڈرن بکڈپو سیالکوٹ کینٹ
کھوکھر بکسٹال مسلم بازار، گجرات
بلال بکڈپو، گجرات
کتاب مرکز امین پور بازار، فیصل آباد
کتب خانہ مقبول عام امین پور بازار، فیصل آباد
شریف سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد
کارواں بک سنٹر، ملتان کینٹ
دارالکتاب کالج روڈ، لیہ
الیاس کتاب محل کچہری بازار، جڑانوالہ
ڈار برادرز تحصیل بازار، جہلم
جالندھر بکڈپو، ڈسکہ
یونائیٹڈ بک ہاؤس، کچہری روڈ، منڈی بہاؤالدین
شاکلہ بک ایجنسی محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ
میاں ندیم مین بازار، جہلم
اسلامی کتب خانہ، حافظ آباد
کارواں بک سنٹر، بہاولپور
گلیکسی بکس، خان آرکیڈ، کچہری روڈ، سرگودھا
النور بک کارنر مجدی پلازہ، میرپور آزاد کشمیر
مکتبہ قابل اردو بازار، لاہور
کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور
فہیم بکڈپو، راجپوت مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی
فضلی سنز اردو بازار، کراچی
ویلکم بک پورٹ اُردو بازار، کراچی
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
سعید بک بنک اسلام آباد
کیپٹل بکڈپو، اردو بازار، راولپنڈی
سعید بک بنک، پشاور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار، پشاور
حافظ بک ایجنسی اقبال روڈ، سیالکوٹ
بک سنٹر اردو بازار، سیالکوٹ
پنجاب بکڈپو سرکلر روڈ، گجرات
سلطان بک پیلس، گجرات
فائن بکس امین پور بازار، فیصل آباد
نیو مکتبہ دانش امین پور بازار، فیصل آباد
مقبول بک ایجنسی چوک پاک گیٹ، ملتان
الکریم نیوز ایجنسی، اوکاڑہ
چوہدری بکڈپو مین بازار، دینہ
عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ، سرائے عالمگیر
شکیل بکڈپو، سمندری
مسلم بک لینڈ، ہینک روڈ، مظفر آباد
نیو ہاڑی کتاب گھر، جناح روڈ، وہاڑی
بلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ، میاں چنوں
نیو نفیس بکڈپو مین بازار، میانوالی
خالد کتاب محل، سیالکوٹ روڈ، اگوکی
پاکستان بکڈپو مین بازار، جلال پور جٹاں
جہلم بک کارنر، جہلم
منور بک ڈپو گجرات

بچپن کا دسمبر

ہاں مجھے یاد ہے
بچپن کا وہ دسمبر
ٹھٹھرتی ڈھلتی شاموں میں
آنگن کی دیوار سے سرکتی دھوپ
جلتے ہوئے کوئلے کی مہک
اور میرے پھٹے ہوئے گالوں پر
لکیریں بناتے
وہ جمے ہوئے آنسو.....
آسمان پر جمتی، وہ بادلوں کی دھند دیکھ کر
امی کا دروازے میں کھڑے ہو کر پکارنا
اور ہم سب کا مٹی بھرے کنچے سنبھال کر
اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا.....
رات بھر چھپ چھپ کر
آسماں کو دیکھ
برف گرنے کی دعائیں کرنا
اور پھر صبح پو پھٹتے ہی
صحن میں گرتی برف کے ستارے چُننا.....

اور برف گراتے آسماں کو دیکھ دیکھ
خُود کو بھی برف کے گالوں کے ساتھ
اڑتے ہوئے محسوس کرنا
پھر تم آ گئیں.....
اور بچپن کا دسمبر بیت گیا
تب پہروں اس سرکتی ٹھنڈی دھوپ تلے
اور ان ٹھٹھرتی ڈھلتی شاموں میں
میں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے
آسمان سے گرتی برف کی چاندی
اپنے وجود پر سجاتا رہا اور
زمین پر بچھی اس سفید چادر پر
میرے قدموں کا ہر نشان
تمہارے گھر کی دہلیز تک ہی جاتا رہا
پھر وہ دسمبر بھی بیت گیا
اور دیکھو.....
میں اب بھی گلی کے اسی نکڑ پر کھڑا ہوں
ٹھٹھرتی ڈھلتی شام بھی ہے
پر سنہری دھوپ نہیں سرکتی
وقت جیسے تھم سا گیا ہے
برف کے ستارے میرے بالوں میں
چاندی بکھیر تو رہے ہیں

پر انہیں بھگو نہیں پاتے
یہ کیسی برفیلی شام ہے
جس کی سردی میرے آنسو جما نہیں پا رہی
جلتے کوئلے کا دھواں
آنکھ تو جلاتا ہے
پر اس میں وہ مہک نہیں ہے
اور دیکھو میرے گھر کا دروازہ.....
پٹ کھولے کھڑا تو ہے لیکن
امی کی ڈانٹ نہ جانے کہاں کھو گئی ہے؟
تمہارے گھر کی طرف جاتے سبھی راستے
اس قدر سنسان کیوں پڑے ہیں؟
اس برفیلی شام میں
اور
میرے بچپن کے دسمبر میں
کتنا فرق ہے

ہاشم ندیم خان
۱۵ جنوری ۲۰۰۸ء
(کوئٹہ)
email: hashimnadeem@gmail.com

فہرست

پہلا دور

1۔ پہلی سہیلی 13
2۔ پہلا اسکول 17
3۔ پہلا ساون 21
4۔ پہلا دوست 26
5۔ پہلی برف باری 29
6۔ پہلا سجدہ 31
7۔ پہلی چوری 36
8۔ پہلی مار 41
9۔ پہلا ڈاکہ 45
10۔ پہلا ہائی سکوپ 50
11۔ پہلی جلن 58
12۔ پہلا کش 67
13۔ پہلا مجرم 73
14۔ پہلا چاند 77
15۔ پہلا جواء 82
16۔ پہلی قربانی 88
17۔ پہلا الوداع 97

فہرست

دوسرا دور

18۔ جنٹلمین بسم اللہ 105
19۔ راجہ کی کہانی 113
20۔ پہلی پریڈ 115
21۔ محافظ 119
22۔ پہلا چیلنج 121
23۔ پہرہ 127
24۔ پہلا چرچ 130
25۔ بوا کی افواہ 137
26۔ پہلی ٹیوشن 140
27۔ پابندی 143
28۔ پہلی جعلسازی اور جنٹلمین کیڈٹ عباد 146
29۔ معصوم انتقام 151
30۔ پہلی جیت 155
31۔ پہلی محبت کی جھلک 159
32۔ پہلی قیامت 165
33۔ پہلی بغاوت 178
34۔ اپیل 185
35۔ پہلا چھاپہ 187
36۔ رشتہ 191

فہرست

37۔ پہلی دیر 193
38۔ دوسرا الوداع 196
39۔ پہلی ٹرافی 200
40۔ دھوکہ 204
41۔ آخری بنک "Bunk" 208
42۔ رشتوں کی سُولی 211
43۔ پہلا انقلاب 217
44۔ دیر ہو جاتی ہے 220
45۔ تیسرا الوداع 225

تیسرا دور

46۔ دوسری قیامت 229
47۔ آخری بشتر 242
48۔ پہلی نظر 246
49۔ آخری کفارہ 250
50۔ پہلی تعبیر 255
51۔ بچپن کا دسمبر 260
52۔ آخری ٹیس 267
53۔ آخری بھرم 272
54۔ آخری دستک 277
55۔ آخری الوداع 283

پہلا دَور

پہلی سہیلی

۱۹۷۹ء کا دور تھا۔ ملک میں مارشل لاء کو لگے دوسرا سال پورا ہونے کو آیا تھا۔ مجھے اردو کا پہلا قاعدہ لا کر دے دیا گیا تھا تا کہ میں ابھی سے اسے رٹنا شروع کر دوں۔ میں یعنی عباد خان عرف آدی، اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور مجھ سے دو سال بڑی عمارہ اور پھر اس سے دو سال بڑے فاران بھیا تھے، جنہیں سب پیار سے فاری کہتے تھے لیکن میرے لیے وہ بڑے بھیا تھے۔ میرے ابا درجہ سوئم کے سرکاری ملازم تھے اور ہمارا سرکاری کوارٹر بھی اسی سرکاری کالونی کے درجہ سوئم کے کوارٹروں میں واقع تھا، جس کے درجہ اوّل کے بنگلہ نما مکانوں میں غیاث چچا کا گھر واقع تھا۔ دراصل ہمارا محلہ کافی وسیع تھا اور اس میں محکمے کی درجہ بندی کے حساب سے محکمے کے اعلیٰ درجے کے افسروں سے لے کر درجہ سوئم کے ملازمین تک مکانات کو بھی تین درجہ بندیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یوں ایک ہی کالونی کے وسیع کمپاؤنڈ کی چار دیواری کے اندر دراصل تین محلے آباد تھے۔ کالونی میں داخلے کا راستہ ایک واحد اور بڑے پھاٹک نما گیٹ سے ہو کر گزرتا تھا اور اس راستے پر پہلی تین قطاریں درجہ سوئم کے ملازمین کی تھیں، پھر درجہ دوئم اور پھر درجہ اوّل کے افسران کی باری آتی تھی۔

بہر حال ہم سارے محلے کے بچے ایسی کسی بھی درجہ بندی سے قطعاً آزاد تھے اور ہم سب بلا کسی روک ٹوک اور دھڑلے سے محلے کے سبھی گھروں میں کودا پھاندی کرتے پائے جاتے تھے۔ غیاث چچا، جن کا پورا نام غیاث الدین تھا، میرے ابا کے دور پار کے کسی رشتے سے چچا زاد بھی لگتے تھے اور وجیہہ ان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی کا نام تھا، جو ہم سب چھوٹے بچوں کی وجو آپی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن مجھے پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا تھا، اسی دن وجو آپی سفید فراک اور بالوں میں سرخ ربن باندھے آٹھویں جماعت میں بیٹھ چکی تھیں۔ غیاث چچا نے ان کا داخلہ شہر کے سب سے اعلیٰ اور مہنگے انگریزی میڈیم اسکول میں کروا رکھا تھا اور روز صبح سویرے کرم دین (کرمو) کا تانگہ انہیں اسکول لے جانے کے لیے ٹھیک ساڑھے سات بجے بھونپو بجاتا ہوا محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتا تھا۔

حالانکہ ہمارے محلے میں وجو آپی کی ہم عمر یا ان سے ایک آدھ سال بڑی یا چھوٹی اور بھی بہت سی ''آپیاں'' موجود تھیں لیکن ان سب میں میری سب سے پسندیدہ وجو آپی ہی تھیں اور میں صرف انہی کے کام بھاگ بھاگ کر کیا کرتا تھا۔ ہمارے محلے کے بڑے میدان میں جو دوسرے اور پہلے درجے کے مکانوں کے بیچ میں پڑتا تھا، سر شام ہی مختلف پھیری اور ٹھیلے والے جمع ہو جاتے تھے اور جیسے ہی وجو آپی کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی یا کچھ بھی منگوانا ہوتا تو آدی میاں یعنی میں ہی بھاگ کر انہیں وہ چیز مہیا کرنے میں سرفہرست ہوتا تھا۔ کبھی میں فالسے والے کی پتوں کی ٹوکری لیے وجو کے صحن میں پہنچا رہا ہوتا کہ وہ ٹوکری میں سے اچھے اور تازہ فالسے چھانٹ لیں تو کبھی برف ملائی والے سے قلفیاں یا گولے گنڈے والے سے برف

کے گولے پر اُن کے پسندیدہ رنگ دار شربت ڈلوا کر ان کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا ہوتا تھا، لیکن یہ سب کچھ تبھی ہوتا، جب غیاث چچا گھر پر نہیں ہوتے تھے یا اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر مطالعہ کر رہے ہوتے تھے، کیونکہ ان کی موجودگی میں ان تمام چیزوں کی "رسد" و "جو آپی تک پہنچانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیاث چچا کو یہ ٹھیلے والی چیزیں بالکل پسند نہیں تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں کو کھانے سے بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ (حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی بچہ آج تک ان چیزوں سے بیمار نہیں پڑا تھا)۔ لہٰذا وہ مجھے بھی ان ٹھیلے والوں سے ہمیشہ دور رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور میں معصوم سی صورت بنائے سر ہلاتا رہتا تھا لیکن جیسے ہی غیاث چچا نظروں سے اوجھل ہوتے، مجھے اور "جو آپی کو اپنی من مانی کا موقع مل جاتا۔ ایسے میں وجو آپی کی اماں، یعنی سکینہ خالہ ہم دونوں کو روکتی ہی رہ جاتیں اور ہم تب تک سارے فالسے، جامن، بیر یا رس بھری کی ٹوکری کی ٹوکری چٹ کر چکے ہوتے۔ ویسے بھی سکینہ خالہ بہت نرم دل تھیں اور وجو سے تو آج تک انہوں نے اونچے لہجے میں بھی کبھی کوئی بات نہ کی تھی لہٰذا ایسے میں اگر غیاث چچا کہیں سرکاری دورے پر دو چار دنوں کے لیے کہیں شہر سے باہر چلے جاتے تو میری اور وجو کی تو چاندی ہو جاتی۔ تب وجو میرے ذریعے ٹھیلے والے کو بالکل اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بلوا لیتیں اور اگر کوئی چھوٹی پھیری یا ٹوکری والا ہوتا تو وہ ٹوکری سمیت گھر کے بڑے صحن میں موجود ہوتا اور ہم دونوں اطمینان سے اور بڑے "شاہانہ" انداز میں اس کا مال اڑائے جاتے اور سکینہ خالہ "ارے، ارے....." کرتی رہ جاتیں۔ وجو آپی کے گھر کا ایک کردار فضلو بابا بھی تھے، جن کا اصل نام تو فضل دین تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فضلو بابا بن کر رہ گئے تھے۔ وہ غیاث چچا کے کنوارپنے کے دور کی یادگار تھے اور ان کی محکمے میں پہلی تعیناتی کے وقت سے ان کے ساتھ ہی تھے۔ تب غیاث چچا نے مجبوراً کسی دوسرے شہر میں تعینات ہونے کے بعد انہیں عارضی طور پر اپنے گھر کے کام کاج کے لیے بھرتی کیا تھا، لیکن تب سے وہ غیاث چچا ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ غیاث چچا پچھلے تیس سالوں سے جہاں بھی گئے، فضلو بابا ان کے ساتھ ہی رہے اور اب تو وہ ان کے گھر کا ایک مستقل حصہ بن چکے تھے اور گھر کی پچھلی جانب بنے سرونٹ کوارٹر میں ہی رہتے تھے۔ وجو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھیں اور وہی سب سے زیادہ ان کے لاڈ بھی اٹھاتے تھے، اس لیے اگر کبھی غلطی سے مجھ سے یا وجو سے کوئی ٹھیلے والا چھوٹ بھی جاتا تو وہ آ کر چپکے سے کبھی میرے اور کبھی وجو کے کان میں بتا دیتے کہ باہر "بھٹے والا گھوم رہا ہے" یا پھر "نمکین چنے اور میٹھے مرمرے والا کچھ ہی دیر میں محلے سے نکل جائے گا، جلدی کر لو جو بھی کرنا ہے" اور دوسرے ہی لمحے میں محلے کے پھاٹک کی طرف اڑا جا رہا ہوتا تھا۔

وجو آپی جب اسکول سے واپس آ جاتیں اور دوپہر کو اپنا اسکول کا کام لے کر برگد کے پیڑ کے نیچے اپنے صحن میں اپنا بستہ کھول کر اپنی کتابیں نکال لیتیں، تب میرا محبوب مشغلہ ان کی ڈرائنگ کی کاپی کے صفحے پلٹ پلٹ کر سینکڑوں مرتبہ پہلے کی دیکھی ہوئی وہ تصاویر دیکھنا ہوتا تھا، جو خود وجو آپی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوتی تھیں۔ ان کی ڈرائنگ بہت عمدہ تھی اور تصویروں میں رنگ بھرنا تو انہیں خوب آتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ ایک رنگ ذرا سا بھی دوسرے رنگ پر چڑھنے پائے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی قاعدے اور سلیقے کی قائل تھیں۔ ان کے بستے میں رکھی کتابوں کی ترتیب تک ان کی نفاست کی گواہ تھی۔

جب تک میں اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا، میرا تقریباً سارا دن ہی ان کے اسکول سے واپس آ جانے کے بعد انہی کے گھر میں گزرتا تھا، پھر شام ڈھلے فاری بھیا مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں آ پہنچتے اور گھر واپس لے جاتے وقت سارا راستہ ڈراتے رہتے کہ امی شدید غصے میں اور ہاتھ

میں باورچی خانے سے بڑا والا چمٹا لیے صحن ہی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہیں لیکن جیسے ہی میں صحن کا دروازہ کھولتا اور امی پر میری نظر پڑتی میں بھاگ کر جا کے ان سے لپٹ جاتا اور اس سے پہلے کہ امی مجھے کچھ کہیں میں فوراً فاری بھیا کی شکایتیں لگانا شروع کر دیتا کہ وہ مجھے سارے راستے ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے لے کر گھر آئے ہیں۔ امی بھی دوسرے ہی لمحے سب بھول بھال کر بڑے بھیا کو ڈانٹنے لگ جاتیں کہ "کتنی بار کہا ہے کہ چھوٹے بھائی کو یوں نہیں ڈرایا کرتے، اس طرح بچوں کے دل میں ہمیشہ کا ڈر بیٹھ جاتا ہے جو پھر کبھی نہیں نکلتا....." وغیرہ وغیرہ۔

یوں ہر بار میں امی کی ڈانٹ سے بچ جاتا اور ان کا سارا غصہ بڑے بھیا پر نکل جاتا، جو بے چارے پچھلے گھنٹہ بھر سے میری تلاش میں پورے محلے میں ہلکان ہو رہے ہوتے تھے۔

وجو آپی جب اپنے اسکول کا کام کر رہی ہوتی تھیں تو اس وقت میرا پسندیدہ مشغلہ اپنی بچی کچی بنائی ہوئی تصویروں میں وجو آپی سے ان کے پانی والے رنگ لے کر ان میں رنگ بھرنا ہوتا تھا۔ مجھے ان کے پانی والے رنگوں کی ڈبیا بہت پسند تھی، جس میں بارہ رنگوں کی ٹکیاں اور اس کے ساتھ ہی صاف اور استعمال شدہ پانی کی چھوٹی چھوٹی سلور کی دو پیالیاں ڈبیا کے اندر ہی لگی ہوتی تھیں۔ وجو ساتھ ساتھ مجھے رنگ بھرنا بھی سکھائے جاتیں اور اپنے اسکول کا کام بھی ختم کر لیتیں۔ مجھے رنگوں کا جنون تھا لیکن خود میں اپنے محدود جیب خرچ میں بمشکل پچاس پیسے میں دستیاب موی رنگوں کی وہ چھوٹی سی ڈبیا خرید پاتا تھا، جس کے اندر تین انچ کی لمبائی کے برابر، بارہ عدد رنگین موی پنسلیں ہوتی تھیں لیکن وہ رنگ بے حد نازک ہونے کی وجہ سے بہت جلد ٹوٹ جاتے تھے اور استعمال بھی بہت تیزی سے ہو جاتے تھے، لہٰذا وجو آپی کے ان قیمتی پانی والوں رنگوں سے اپنی تصویروں میں رنگ بھرنا میرے لیے ایک بہت بڑی عیاشی سے کم نہیں تھا۔ وجو آپکے لیے غیاث چچا ہر ماہ "ڈیئر برانڈ" کی بارہ رنگین پنسلوں کی ڈبیا بھی لے کر آتے تھے۔ ٹین کی بنی ہوئی اس ڈبیہ پر کالے ہرن کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی اور ہر ماہ ہی نئی ڈبیا ملنے پر وجو اپنی پرانی آدھی استعمال شدہ پنسلیں میرے حوالے کر دیتی تھیں اور اگلا پورا مہینہ میں ان کی دی ہوئی یہ پنسلیں عمارہ اور بڑے بھیا سے چھپا چھپا کر رکھنے میں صرف کر دیتا تھا کیونکہ وہ دونوں میرے رنگوں کے دشمن تھے، باقی رنگوں کی تو خیر تھی لیکن وجو کے دیئے ہوئے یہ رنگ میں کسی بھی قیمت پر کسی اور کو استعمال کرتا نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا عمارہ اور بھیا سے اس بات پر ہمیشہ میرا جھگڑا ہی ہوتا رہتا کہ "میرے سبز رنگ کی پنسل کس نے اٹھائی؟" "یہ دھانی رنگ کی پنسل زیادہ گھسی ہوئی کیوں ہے؟" "سرخ پنسل کی نوک کس نے توڑی، ابھی تو میں نے تازہ گھڑ کے رکھی تھی۔"

مجھے تو خود وجو آپی بھی کسی نازک رنگین پنسل جیسی ہی دکھتی تھیں۔ تیکھے اور نازک سے نقوش، گلابی رنگت، بڑی بڑی سی کالی آنکھیں، ستواں سی ناک اور گالوں میں پڑنے والے دو چھوٹے چھوٹے سے گلابی گڑھے گویا ہر نقش ایسا جیسے کسی مصور نے برسوں کی محنت کے بعد تیز نوک والی گلابی پنسل سے زندگی کے کورے سفید کاغذ پر کوئی مورت اتاری ہو اور پھر وہ ذہین بھی اتنی تھیں کہ پانچویں جماعت میں ہی ضلع بھر میں ان کی پہلی پوزیشن آئی تھی اور ان کو حکومت کی جانب سے وظیفہ بھی ملا تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز غیاث چچا نے وجو کی اتنی بڑی کامیابی پر پورے محلے کی دعوت کی تھی۔ تمام گھر کو اندر اور باہر قلعی پھیر کر سفیدی سے چمکایا گیا تھا۔ ماشکی دوپہر سے کئی مرتبہ گھر کے بیرونی راستوں پر چھڑکاؤ کر چکا تھا، تاکہ گرد مستقل بیٹھ جائے۔ نیلے پیلے، ہرے، سرخ اور اودے رنگوں کی بتیوں کی چمکتی لڑیوں سے سارے گھر کو سجایا گیا تھا۔ ہم سارے محلے کے بچوں کے لیے "میری

بسکٹ'' کے سرخ چمکتے ٹن منگوائے گئے تھے، جس پر ایک گھومتی ہوئی بچی کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ غیاث چچا کو نت نئے ریکارڈ جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا اور ان کے پاس ہر نئی پرانی انڈین فلم کے بہت سے ریکارڈ جمع تھے اور اس شام بھی انہوں نے خصوصی طور پر ہیم لتا کا مشہور ''اکھیوں کے جھروکے سے'' والا ریکارڈ اتنی زور سے لگا رکھا تھا کہ اس کی آواز ہمارے گھر تک بھی آ رہی تھی۔

اسی دن سے وجو آپی میری سہیلی کے طور پر مشہور ہو گئی تھیں کیونکہ محلے کے ایک بزرگ نے بھاگتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا تھا کہ ''آدی میاں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟'' میں نے جلدی سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ وجو آپی کے گھر دعوت پر جا رہا ہوں لیکن وہ بڑے میاں تو مجھے چھیڑنے کے موڈ میں تھے پھر پوچھنے لگے کہ ''بھلا یہ وجو آپی تمہاری کون ہیں؟'' مجھے جلدی سے اور کچھ رشتہ تو سوجھا نہیں اسی لیے بول پڑا ''میری سہیلی''.....بس جی پھر کیا تھا وہ بڑے میاں خود تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو ہی گئے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے فوراً ہی پورے محلے میں منادی کروا دی کہ ''وجو آدی کی سہیلی ہیں۔'' پھر تو جسے بھی دیکھو مجھے روک روک کر یہی پوچھتا کہ ''ہاں بھئی، آدی کی سہیلی کیسی ہے؟'' خدا بچائے ان بڑوں کی شرارتوں سے، ایک بار کسی بات کے پیچھے پڑ جائیں تو پھر اس کا بتنگڑ بنانے میں ان کا بھی جواب نہیں۔

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالبؔ ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ''انسان'' درحقیقت وہی ہے جس کا ''شر'' اس کے ''خیر'' کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ''خیر'' کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزر گئے** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلا اسکول

جو آپی کو روزانہ سفید فراک پہنے اور سر پر سرخ ربن سے پونی ٹیل باندھے بڑے کروفر سے اسکول جاتے دیکھ کر میرے دل میں بھی اسکول جانے کی خواہش مچلنے لگی تھی۔ درمیان میں ایک آدھ مرتبہ وجو خود بھی مجھے اپنے ساتھ اپنے اسکول لے کر گئی تھیں۔ اس روز ان کے اسکول میں ''مینا بازار'' لگا ہوا تھا اور سچ پوچھیے تو مجھے ان کا رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا ہوا اسکول بے حد پسند بھی آیا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس بہت سی گوری میم جیسی عورتیں سارے بچوں کو تحفے تحائف دے رہی تھیں جن میں چاکلیٹ اور خشک دودھ کے بسکٹ بھی شامل تھے۔ وجو نے مجھے اپنی ٹیچر سے بھی ملوایا، جنہیں سارے بچے سسٹر کیری کے نام سے پکار رہے تھے۔ مجھے تو وہ خود کسی بڑی کلاس کی طالبہ جیسی لگی تھیں۔ پیاری سی سسٹر کیری نے مجھے بہت ساری کھانے کی چیزیں دیں اور میرے گال بھی خوب کھینچے۔ اسی دن سے میرے ذہن میں اسکول کا خاکہ ایک ایسی ہری بھری اور خوب صورت پھولوں اور گلابوں سے اٹی ہوئی رنگ برنگی چار دیواری کا بن گیا تھا، جس میں خوب صورت پری جیسی میمیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، انہیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں دیتی تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر ''اوہ مائی لٹل چائلڈ'' کہہ کر ان کی طرف دوڑی ہوئی چلی آتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت انگریزی کے اس جملے کی مجھے ذرا بھی سمجھ نہیں تھی لیکن ان کے انداز سے اتنا تو میں سمجھ ہی سکتا تھا کہ یہ بھی ان کے پیار کا ایک انداز تھا، جیسے وجو آپی کبھی کبھی میری چھوٹی سی ناک کو اپنی انگلی سے زور سے دبا کر کہتیں ''چلو آدی، بلی بن کر دکھاؤ'' اور میں جلدی سے آنکھیں زور سے بھینچ کر بلی بن جایا کرتا تھا اور وجو آپی زور سے ہنس پڑتی تھیں۔

اسی لیے میں نے بھی ابا کا لایا ہوا اردو کا قاعدہ جلدی جلدی عمارہ کی مدد سے پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر آخر کار وہ دن آ ہی گیا، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروانے کے لیے تمام ''تیاریاں'' مکمل کر لی گئیں۔ اس سے ایک رات پہلے خوشی کے مارے مجھے نیند ہی نہیں آئی اور میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے بھاگ کر صحن کے دروازے سے باہر جھانکا کہ کہیں مجھے اسکول لے جانے کے لیے تانگہ آ تو نہیں گیا لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ میں جلدی سے بھاگ کر امی کے پاس باورچی خانے میں گیا، جو آج اپنے راجہ بیٹے آدی کے اسکول جانے کے پہلے دن کی خوشی میں اس کے لیے پراٹھا بنا رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے لینے کے لیے تانگہ کب آئے گا؟ امی میری بات سن کر زور سے ہنس پڑیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے لینے کے لیے تانگہ نہیں آئے گا بلکہ ابا مجھے اپنی سائیکل پر اسکول داخل کرانے لے جائیں گے۔ یہ سنتے ہی میرا آدھا مزہ تو وہیں کرکرا ہو گیا کہ بھلا بچے کب اپنے ابا کی سائیکل پر اسکول جاتے ہیں؟ اور سائیکل بھی کون سی.....؟ ابا کی وہ پرانی کھٹارا ''سہراب'' سائیکل.....؟ میں تو عام حالات میں بھی اس پر ابا کے ساتھ بیٹھنے سے گریز کرتا تھا تو یہ تو پھر بھی اسکول جانے کا معاملہ تھا۔ بھلا میرے اسکول کی میم

استانیاں مجھے ابا کی سائیکل کے ڈنڈے پر لگی اگلی چھوٹی سی گدی پر بیٹھے اسکول آتے دیکھ کر کیا سوچیں گی؟ اور ان کی نظروں میں میری بھلا کیا خاک عزت رہ جائے گی؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میں تانگے کے بنا اسکول نہیں جاؤں گا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ کہیں تانگے کو بہانہ بنا کر میرے گھر والے واقعی میرا اسکول جانا ہی منسوخ نہ کر دیں۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ ایک بار میرا اسکول میں پکا داخلہ ہو جائے، تب میں تانگے کے لیے بھوک ہڑتال ضرور کروں گا۔

خدا خدا کر کے ابا نے اپنی سائیکل گھر سے باہر نکالی اور میں امی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ملیشیا (کھدر) کے کپڑے کا بستہ گلے میں ڈال کر جلدی سے سائیکل پر بیٹھ گیا اور ابا مجھے لیے اسکول کی جانب روانہ ہو گئے لیکن یہ کیا؟ یہ تو کسی اور جانب ہی مڑ گئے تھے اور محلے کے پھاٹک سے نکل کر دائیں کے بجائے بائیں جانب چند ہی پیڈل مار کر سڑک کی دوسری جانب ایک عجیب سی بھدی اور بدنما پیلے رنگ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں سمجھا یہ ابا کا دفتر ہو گا لیکن میرے تو ہوش ہی اڑ گئے، جب انہوں نے سائیکل کو اس کے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور مجھے اتارتے ہوئے بولے "لو بھئی..... آ گیا ہمارے آدی کا اسکول۔" ابھی میں ان سے یہ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ ابا جی آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسی اثنا میں ایک سخت گیر قسم کے مولانا جن کی شکل و شباہت ہماری مسجد کے پیش امام سے ملتی جلتی تھی، سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ابا سے ہاتھ ملایا اور مجھے یوں دیکھا جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ ابا نے ان سے کہا کہ یہ میرا برخوردار عباد ہے اور آج سے یہ آپ کے حوالے ہوا۔ میں جلدی سے ابا کی ٹانگوں کے پیچھے چھپ گیا لیکن ابا تو بالکل ہی انجان بن گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے کھینچ کر مجھے آگے کر دیا۔ مولانا صاحب (جن کا نام بعد میں حافظ انور معلوم ہوا) نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا، جیسے ان کو اس قسم کے "الوداعی لمحات" کا پہلے سے ہی کافی تجربہ ہو۔ ابا بیگانوں کی طرح اپنی سائیکل پر بیٹھے اور پیڈل مارتے ہوئے یہ جا اور وہ جا۔ میں ان کے پیچھے چیختا چلاتا ہی رہ گیا اور میرے موٹے موٹے سے آنسو میرا دامن بھگوتے رہے اور ماسٹر جی مجھے کھینچتے کھانچتے میری جماعت میں لے آئے، جہاں پہلے سے زمین پر ٹاٹ بچھائے تیس پینتیس بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے وجو آپی کی کلاس میں خوب صورت ڈیسک پڑے ہوئے دیکھے تھے، جب کہ یہاں تو گرد سے اٹے ہوئے ٹاٹ پر مجھے زبردستی بٹھا دیا گیا تھا۔ باقی بچے بھی کافی سہمے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں نے ہم استانیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میرے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھے دوسرے بچے نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے دو دن پہلے سے یہاں آ رہا ہے اور اس نے یہاں کوئی میم نہیں دیکھی۔ بس اسی قسم کے ماسٹر پائے جاتے ہیں، جیسے ہمارے سامنے کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بچے کا نام راجہ تھا اور وہ ہمارے محلے میں تیسرے درجے کے کوارٹروں میں چند گھر چھوڑ کر رہتا تھا، پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو آس پاس بہت سے بچے ہمارے ہی محلے کے وہاں بیٹھے نظر آئے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ کیسا اسکول تھا جو اسکول کم اور کوئی جیل زیادہ لگ رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگے کہ اس "فضول جگہ" اب مجھے روزانہ آنا ہو گا۔ کچھ ہی دیر میں ماسٹر جی نے ہمیں اردو کا پہلا قاعدہ نکالنے کا کہا اور ایک کالے رنگ کے تختے پر پہلے "آ" اور پھر "م" جوڑ کر آم لکھ دیا اور اگلے ایک گھنٹے تک ہمیں بے وقوف سمجھ کر اسی ایک لفظ کی گردان کرواتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اسی ماسٹر نے اردو سے دینیات کے استاد کا روپ دھار لیا اور ہمیں عربی کی آیتیں پڑھانے لگے، ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے پھر چولا بدلا اور ریاضی کے ماسٹر بن کر دو کا پہاڑہ رٹانے لگ گئے۔ سچ پوچھیں تو میں اسی ایک استاد کا چہرہ دیکھ دیکھ کر بے حد بور ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس

طرح کے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں ہر جماعت کا بس ایک ہی ماسٹر ہوتا ہے، جو بیک وقت اردو دان، ریاضی دان، دینیات، معاشرتی علوم، سائنس اور املا سمیت تمام مضامین کا ''ماہر'' ہوتا تھا اور اگلا پورا ایک سال یہی صاحب ہمیں یہ سارے مضامین پڑھائیں گے۔ لاحول ولاقوۃ..... بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا.....؟ وہاں تو آپی کی جماعت میں تو میں نے خود دیکھا تھا کہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد استانی بدل جاتی تھی۔ چلو یہ بھی شکر ہے کہ پہلی جماعت میں صرف اردو قاعدہ اور دینیات کا سبق ہوتا تھا یا پھر ریاضی کے چند پہاڑے رٹا دیے جاتے تھے ورنہ ایک ہی ''صورت'' سے اتنے مضامین پڑھنا کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں تختی نکالنے کا حکم دیا گیا اور ایک جانب قاعدے سے الف ب دیکھ دیکھ کر اور دوسری جانب ایک سے لے کر دس تک گنتی لکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ آس پاس کے تمام بچے جاہلوں کی طرح اپنی اپنی دوات نکال کر اس میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھنے سے زیادہ ارد گرد چھینٹے اڑانے لگے۔ میرے اجلے کپڑوں پر بھی چھینٹے گرے اور مجھے بہت غصہ بھی آیا کیونکہ امی نے آج صبح ہی پورا ایک گھنٹہ لگا کر میرے یونیفارم کو اپنی جہیز والی کوکلوں کی بڑی استری سے رگڑ رگڑ کر اس کی شکنیں دور کی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں میں نے لوہے کی جالی والی کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک بوڑھے سے شخص کو ایک ہاتھ میں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ اٹھائے برآمدے میں لگی پیتل کی اس بڑی سے پلیٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا جو ایک تار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ اس نے وہ راڈ زور سے دو مرتبہ پیتل کی تھالی پر ماری۔ ٹن ٹن کی آواز گونجی اور بچوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ میں سمجھا کہ چھٹی ہو گئی ہے اور جلدی سے اپنا بستہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا لیکن ماسٹر جی نے مجھے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کے اشارے سے بستہ دوبارہ نیچے رکھ دینے کا اشارہ کیا۔ پتہ چلا کہ ابھی صرف آدھی چھٹی ہوئی ہے، جسے دبجو کے اسکول میں بریک کہتے تھے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ ابھی شاید کچھ دیر میں یہاں بھی دبجو کے اسکول کی طرح کوئی میم نہ سہی، کوئی ماسٹر ہی آ کر ہمیں کھانے کے پیکٹ دے کر جائے گا، جس میں بسکٹ، چاکلیٹ اور جام لگی ہوئی ڈبل روٹی ہو گی..... لیکن یہ کیا۔ یہاں تو ایسا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ وہی شخص جس نے آدھی چھٹی کے اعلان کے لیے گھنٹی بجائی تھی کچھ ہی دیر میں مختلف خوانچے سجائے برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور بچے اپنی اپنی جیبوں سے سکے نکال کر اس سے بھنے ہوئے چنے، مرمرے، بتاشے اور جانے کیا کیا الا بلا لے کر کھانے لگ گئے۔ اتنے میں اسکول کے گیٹ سے ایک اور بابا ٹھیلہ دھکیلتے ہوئے برآمد ہوا اور زور زور سے آواز لگانے لگا ''آلو چھولے..... املی والے چھولے..... چاول چھولے.....'' کچھ ندیدے قسم کے بچے اس کی آواز سن کر یوں اس کی جانب دوڑ پڑے، جیسے انہیں زندگی میں کبھی چاول چھولے کھانے کو ملے ہی نہ ہوں۔ کچھ بچے جو صبح سے رو رہے تھے اور جن کے ماں باپ نے انہیں اسکول جانے کی ''فیس'' کے طور پر چند بڑے سکے دیئے تھے وہ اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی بیر، فالسے، گڑ کے شیرے میں خشک کیے گئے چاولوں کے لڈو اور گڑ کی بنی لائی کی دعوت میں شریک کر رہے تھے۔ راجہ نے کوئی ایسی ہی اوٹ پٹانگ سی چیز بے دھیانی میں میرے ہاتھ میں پکڑا دی، جسے میں نے فوراً ہی نظر بچا کر کیاری میں پھینک دیا۔

آدھی چھٹی ختم ہوتے ہی ہمیں اپنی تختیاں پھر سے دھونے کا حکم دیا گیا اور ہم سب اسکول کے احاطے میں بنے تالاب پر اپنی تختیوں پر میٹ ملنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے آس پاس بہت دیکھا لیکن یہاں ''او مائی چائلڈ'' کہہ کر بچوں کے کام کرنے والی کوئی آیا دکھائی نہیں دی۔ کیا بے ہودہ اسکول تھا یہ بھی۔ تختیوں کو دھوپ میں خشک کرنے کے لیے رکھ کر ہم پھر سے جماعت میں آ گئے۔ ماسٹر جی نے ہمیں صبح کے سبق کی دہرائی

کا حکم دے دیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ ہی دیر میں کلاس کا ہر بچہ انہی کی طرح لمبی لمبی جمائیاں اور انگڑائیاں لینے لگ گیا۔ جماعت کی آخری رو میں بیٹھے چند بچوں میں سے ایک آدھ تو اپنی نیند کی جھونک میں زور سے سامنے زمین پر سجدے میں گر پڑا اور پھر جلدی سے اٹھ کر طوطے کی طرح اپنا سبق دوبارہ رٹنے لگ گیا۔

بالآخر پوری چھٹی کا گجر بھی بج ہی گیا اور سب بچے شور مچاتے ہوئے ایک ریوڑ کی مانند تیزی سے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل کر باہر کے گیٹ کی جانب بھاگے۔ گرد کا ایک ایسا طوفان اٹھا کہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ ہم میں سے کون محمود ہے اور کون ایاز.....؟

میں نے سب بچوں کے نکل جانے کا انتظار کیا اور پھر اپنا بستہ گلے میں ڈالے اور اپنی تختی تھام کر گھر کی راہ لی۔ ابا نے آتے ہوئے مجھے راستہ سمجھا دیا تھا اور ہمارا محلّہ دو سڑک پار ہی تو واقع تھا لیکن راستے میں پڑتی شہر کی بڑی سڑک پار کرنا میرے لیے ہمیشہ اور پہلے دن ہی کی طرح مشکل اور جان جوکھم میں ڈالنے والا کٹھن مرحلہ رہا۔ آخر کار میں نے اس خطرناک رش والی سڑک کو پار کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈ ہی لیا۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں ایک، دو، تین کہہ کر ادھر ادھر دیکھے بنا ہی دوڑ کر بند آنکھوں سے ہی سڑک پار کر جاتا تھا۔ اپنے ڈر اور خوف اور سڑک پر دوڑتی بڑی بڑی خوفناک گاڑیوں کے خطرات سے بچنے کا یہ ''تیر بہدف'' نسخہ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ بعد میں بھی زندگی میں کئی مرتبہ، جب مجھے کسی ایسے خوف اور ان جانے خطرے کا سامنا کرنا پڑا تب بھی میں نے یہی فارمولا آزمایا اور ہر مرتبہ میں اپنے خوف اور ڈر کی وہ خطرناک سڑک کامیابی سے پار کرتا گیا البتہ جب کبھی میں نے اس خوف سے چونک کر آنکھیں کھولنے کی غلطی کی اور ڈر کر رکا یا پلٹا، تو وہیں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔

گلدستہ اولیاء

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلم لودھی کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت شاہ قبول اولیاؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت سلطان باھوؒ، حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ (موہری شریف)، حضرت خواجہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد معصومؒ (موہری شریف)، حضرت شاہ کمالؒ بخاری، حضرت مخدوم حسامؒ الدین ملتانی، حضرت حافظ محمد اسحاقؒ قادری نقشبندی، حضرت سید سلطان احمدؒ سخی سرور، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلا ساون

بہر حال اسکول کے پہلے دن مجھ پر جو بھی گزری اس کے بعد میں نے گھر آتے ہی امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اسکول کے نام پر آج مجھے جہاں بھیجا گیا تھا میں دوبارہ اس جگہ ہرگز جانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ وہاں اسکول جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور سارے کے سارے بچے نالائق ہیں، کسی کو کچھ نہیں آتا جاتا اور بچوں کی تو بات ہی رہنے دیں وہاں تو ماسٹر بھی پورے دن میں صرف ایک لفظ ''آ.....م'' ہی ہمیں رٹا تا رہا تھا۔ میں تو سائیکل پر بیٹھ کر جانے کو رو رہا تھا جبکہ اس اسکول میں تو تانگے پر بیٹھ کر جانا خود تانگے کی توہین تھی۔

میں نے امی سے کہا کہ مجھے وجو آپی کے اسکول جیسے اسکول میں داخل کروا دیں پھر چاہے تانگہ نہ بھی لگا کر دیں تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں پیدل ہی چلا جایا کروں گا۔ امی نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور میرے بالوں میں اپنی انگلی سے کنگھی کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''آدی میرا پیارا راجہ بیٹا ہے نا.....''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ امی ایسی بات تبھی کرتی تھیں، جب انہوں نے مجھ سے اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تھی۔ امی نے دھیرے دھیرے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وجو آپی جیسے اسکول کی فیس بھرنا ابا کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر میرے بڑے بھیا اور عمارہ بھی تو اردو میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے، اس لیے مجھے بھی اب روزانہ اپنے اسی اسکول جانا ہوگا، جس میں پڑھنے کے لیے میں آج گیا تھا۔ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا اور پیر پٹخے کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ امیاں بھی نا..... فوراً ہی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لیتی ہیں اور پھر مجبوراً ہم بچوں کو ان کی ''ضد'' کے آگے ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔ سو ایک بار پھر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ امی نے خوش ہو کر اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

''تم دیکھنا..... میں اپنے راجہ بیٹے کے لیے کتنی اچھی گڑیا لے کر آؤں گی.....'' پتہ نہیں وہ گڑیا کب آنی تھی لیکن مجھے اگلے دن سے اسی اسکول کی یاترا شروع کرنی پڑی۔ وقت رفتہ رفتہ گزرنے لگا۔ پہلی جماعت خدا خدا کر کے ختم ہوئی اور میں باعزت طور پر دوسری جماعت میں آ گیا۔ اب اس پہلی عمارت میں رفتہ رفتہ میرا دل لگنے لگا تھا پھر ایک دن میری زندگی کا وہ پہلا ساون برسا، جس نے آگے چل کر میری زندگی میں بہت کچھ بھگو دیا۔

شاید مجھے وہ پہلی بارش یاد بھی نہ رہتی اگر اس روز وجو اسکول سے گھر واپسی پر اتنی دیر نہ کر دیتیں۔ ہلکے جاڑوں کا زمانہ تھا۔ وجو آپی اپنے نویں اور دسویں جماعت کے مشترکہ بورڈ کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھیں۔ غیاث چچا ان دنوں ہر لمحے وجو آپی کو نصیحتیں کرتے دکھائی دیتے کہ میٹرک کا امتحان زندگی کا سب سے اہم تعلیمی موڑ ہوتا ہے اور یہیں سے طالب علم کی مستقبل کی راہ متعین ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں

اور وہ جو آپی بظاہر غیاث چچا کی موٹی موٹی باتیں غور سے سن رہے ہوتے لیکن ان سے نظر بچا کر ہم یونہی جھکے سر ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرتے اور نمک لگا کر کچے باداموں کی پھلیاں کھانے کے منصوبے بنا رہے ہوتے۔

اس روز صبح ہی سے آسمان پر شریر بادلوں کے گورے چٹے اور سانولے سلونے جوڑے مغرب کی جانب سے امڈنے لگے تھے۔ بادلوں کی سہیلی ہوا انہیں آسمان کی گود میں اڑائے لیے پھرتی رہی، پھر دھیرے دھیرے یہ سارے شریر ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے تاکہ زمین والوں پر برسیں اور پھر ہم زمین والوں کو اس برستی بارش سے بچنے کے لیے یہاں وہاں بھاگتا دیکھ کر ہنستے رہیں اور خوشی سے تالیاں بجا بجا کر گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک پیدا کر سکیں۔

میری نانی اماں ہمیشہ مجھ سے کہتی تھیں کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کے ''دُنبے'' ہیں۔ سو مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اللہ میاں ایک بڑا سا گڈریا ہوگا، جس کے ہاتھ میں بڑی سی لاٹھی ہوگی اور وہ اس لاٹھی سے اپنی بھیڑوں اور دُنبوں کے اس ریوڑ کو ہانکتا پھرتا ہوگا۔ کبھی کبھی تو میرے ذہن میں خود اللہ میاں کی تصویر ایک بڑے سے بادل کی صورت میں ابھر آتی جو اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنی بڑی بڑی سی آنکھیں کھولے آسمان سے نیچے زمین پر اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز بھی ہم سب جماعت کے بچوں نے آسمان پر تیرتی بدلیاں دیکھ کر گڑگڑا کر اور باقاعدہ ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ ''یا خدا آج بارش برسا دے۔'' ہماری رقت آمیز دعائیں بارش کے رومانی موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں تھیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ہماری کلاس کی چھت بارش میں اس تیزی سے ٹپکتی تھی، جیسے کوئی چھلنی پانی سے بھری ہو اور نتیجتاً ماسٹر جی کو بادل نخواستہ ہمیں چھٹی دینی پڑتی تھی کیونکہ برسات کے دنوں میں ہمیں باقاعدہ چھتری لے کر جماعت میں بیٹھنا پڑتا تھا یا پھر ہم سب بچے اخبار کے کاغذ سے تکون چینی ٹوپیاں بنا کر سر پر رکھ لیتے اور بارش کی ٹپ ٹپ پڑتی بوندوں کو اپنے سر پر تال دیتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ یہ کلاسیکی موسیقی سننا یوں بھی ہماری مجبوری تھی کیونکہ تقریباً ہم سبھی بچوں کے گھروں میں ایک عدد چھتری ہی بمشکل میسر ہوتی تھی جس پر ہمارے اباؤں کا قبضہ رہتا تھا۔ جب کبھی دھوپ کے دنوں میں خوش قسمتی سے وہ چھتری ہماری پہنچ میں آتی تو میں اور میرے دوست اسے کھول کر اونچائی سے جمپ لگانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے لیکن ہماری چھتری کی اندرونی کڑیاں اکثر ہوا کے دباؤ کے باعث الٹی ہو کر چھتری کے پیالے کو آسمان کی جانب پلٹ دیتی تھیں، یوں چھتری کا رخ اوپر کی جانب ہوتا اور ہم سب زمین پر اوندھے منہ پڑے ہوتے تھے۔

آخر کار اس روز بھی ہماری دعائیں رنگ لے ہی آئیں اور آدھی چھٹی ہونے سے پہلے ہی موسلا دھار بارش برسنا شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب فوراً ایک تیز سی جھرجھری لے کر کھڑے ہو گئے کیونکہ عین ان کے سر کے اوپر سے پانی کا ایک تیز پرنالہ گرنا شروع ہو گیا تھا۔ سب بچے پنجوں کے بل بیٹھے انہیں اس طرح امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے کسی ریس کورس گراؤنڈ میں ریس کے انتظار میں گھوڑوں پر بیٹھے ''جوکی'' اس شخص کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں گھوڑوں کو آگے بڑھنے سے روکنے والے بانس کا لیور ہوتا ہے اور پھر جیسے ہی ہمارے ماسٹر جی نے بارش اور بادلوں کی شان میں کچھ بڑبڑا کر بچوں کو اشارہ کیا تو سبھی بچے واقعی کسی ریس کے میدان میں نکلے گھوڑوں کی طرح کودتے پھاندتے اور

آوازیں نکالتے ہوئے کلاس روم سے نکل بھاگے لیکن میں ایسے معاملات میں ہمیشہ سے کافی صابر و شاکر اور آخری فرد کے بھی باہر نکل جانے کا قائل رہا ہوں۔ سو آخری بچے کے نکل جانے کے بعد میں بھی برستی بوندوں سے بچنے کے لیے سر پر اپنی تختی رکھے گھر کی جانب چل پڑا۔ تختی پر ابھی کچھ دیر پہلے ہی ماسٹر جی نے اردو املا لکھوائی تھی لہٰذا کچی سیاہی کے لفظ بارش کی بوندوں سے دھل کر تختی سے ہوتے ہوئے میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ بڑی سڑک پر حسب معمول بارش کے پانی کا ریلہ آیا ہوا تھا۔ یہ پہاڑوں کی بارش کا پانی تھا، جو ہمارے شہر سے ہوتا ہوا گزرتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب لوگ کھڑے ہو کر اس ندی نما سڑک کو پار کرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ محلے کے دیگر بچے اس شور مچاتے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہاتے پانی کے اندر اخبار اور کاغذ کی بڑی بڑی سی کشتیاں بنا کر پھینک رہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا، آنکھیں بند کر کے ایک دو تین کہا اور بھاگتے ہوئے سڑک پار کر لی۔

محلے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر غیاث چچا کے گھر سے نکلتے فضلو بابا پر پڑی، جو آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر جانے کون سی دعائیں مانگ رہے تھے، میں بھاگ کر جلدی سے بارش سے پناہ لیتا ہوا ان تک جا پہنچا۔ فضلو بابا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ پتہ یہ چلا کہ ان کی چہیتی ''وجو بی'' صبح گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود شدید بارش میں تانگہ منگوا کر اسکول چلی گئی تھیں۔ ان کا ارادہ اسی اسکول والے تانگے میں واپسی کا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تانگے والے نے آ کر گھر پر اطلاع دی تھی کہ وجو بی نے تو انہیں اسکول کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ ان کی سہیلیوں کا اصرار تھا کہ وہ کچھ دیر اسکول میں ان کے ساتھ رہیں۔ اس وقت ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی لہٰذا طے یہ پایا کہ تانگے والا دن بارہ بجے کے قریب انہیں اسکول سے واپسی کے لیے لینے آ جائے گا لیکن گھنٹہ بھر پہلے شروع ہونے والی موسلا دھار جھڑی نے سارا شہر ہی اتھل پتھل کر دیا تھا اور اس وقت شہر کے لڑکیوں کے بڑے اسکول کی جانب جانے والا ہر راستہ پانی کے بڑے بڑے ریلوں نے ڈھانپ رکھا تھا لہٰذا تانگہ کسی بھی صورت وجو آپی کو لیتے ان کے اسکول تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ غیاث چچا بھی دورے پر اور شہر سے باہر تھے۔ ایسے میں اس وقت فضلو بابا کو کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اوپر سے یہ طوفانی بارش جس کا زور لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو بارش کے ساتھ ساتھ کچھ وقفوں سے بجلی کے کڑکنے کی آواز بھی اس طوفانی شور میں شامل ہوتی جا رہی تھی اور دن کے وقت بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا سا چھایا جاتا تھا۔ وجو آپی کی امی یعنی سکینہ خالہ بھی بے حد پریشان تھیں اور بار بار بے چینی سے گھر کے دروازے تک آتیں، اس راستے پر نظر ڈالتیں، جس جانب سے وجو آپی کا تانگہ آیا کرتا تھا اور پھر راستہ سنسان پا کر بے چینی اور مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے واپس اندر چلی جاتیں۔

بارش کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور دھیرے دھیرے محلے کا کمپاؤنڈ خالی ہوتا گیا اور دوپہر تین بجے تک میرے اور فضلو بابا کے علاوہ باقی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ درمیانی وقفے میں، میں چند لمحوں کے لیے بستہ رکھنے کے لیے گھر بھی گیا لیکن جیسے ہی امی کی نظر چوکی، میں پھر سے باہر بھاگ آیا تھا۔ امی مجھے آوازیں دیتی رہ گئیں پر وہ بھی جانتی تھیں کہ میں بارش کے موسم میں گھر میں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور پھر اس دن تو بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میرا گھر میں رہنا ناممکن تھا۔

ساڑھے تین بج چکے تھے اور اب فضلو بابا نے کسی بھی صورت خود وجو آپی کے اسکول تک پہنچنے کی ٹھان لی تھی۔ حالانکہ اس بڑھاپے میں ان

کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس طوفانی بارش کے تھپیڑوں اور ان سیلابی ریلوں کی طغیانی کو پار کر سکتے لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس دن خود مجھے اپنے چھوٹے اور کم زور ہونے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے دل میں پکا طے کر لیا تھا کہ جیسے ہی میں کچھ بڑا ہوا خود اپنے پیسے جمع کر کے ایک تانگہ خرید لوں گا تا کہ آئندہ کبھی ایسا ''موقع'' ملے تو میں خود جا کر وجو آپی کو گھر واپس لا سکوں اس دن فضلو بابا کے ساتھ کھڑے بارش میں بھیگتے ہوئے خیالوں میں جانے کتنی دیر میں وجو آپی کو اپنے تانگے پر بٹھائے سڑکوں پر گھومتا رہا۔

بالآخر فضلو بابا نے اپنی پرانی اور بوسیدہ برساتی کے بٹن کسے، سر پر برساتی کی ٹوپی اوڑھی اور چھتری اٹھا کر اللہ کا نام لیتے ہوئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ محلے کے بڑے اور سال خوردہ چوبی گیٹ سے طاہر بھائی اپنی نئی ''ریلے'' سائیکل تھامے اندر داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ بری طرح بھیگے ہوئے تھے اور سائیکل پر سوار بھی نہ تھے کیونکہ شاید اتنے تیز پانی میں سائیکل کی سواری ہی ناممکن تھی۔ طاہر بھائی ہمارے محلے کے ہونہار نوجوان تھے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے بارہویں کا امتحان نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ان کے ابو بھی میرے ابا کے ساتھ سرکاری ملازم تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ڈاکٹری پڑھ کر شہر کا نامور ڈاکٹر کہلائے۔ یہ نئی سائیکل بھی طاہر بھائی کے ابا نے ان کے بارہویں جماعت کے نتیجے کی خوشی میں انہیں دلوائی تھی۔

فضلو بابا کو یوں برستی بارش میں محلے سے باہر جاتے دیکھ کر انہوں نے وجہ پوچھی تو جواب میں فضلو بابا نے صبح سے لے کر اب تک کی تمام رام کہانی سنا دی کہ وجو آپی اب تک اسکول سے واپس نہیں آئیں اور سارا گھر ان کی وجہ سے کس قدر پریشان ہے۔ طاہر بھائی نے ایک نظر سڑک پر بہتے پانی کے بپھرے ہوئے ریلے پر اور دوسری نظر اب بھی چھاجوں برستے آسمان پر ڈالتے ہوئے پوچھا ''لیکن آپ اتنی دور کیسے جائیں گے؟ بڑے اسکول تک تو سارا راستہ پانی سے گھرا ہوا ہے؟''

فضلو بابا نے گہری سی سانس لی اور بے چارگی سے بولے ''جانا تو پڑے گا بیٹا، وہاں وجو بی بی ہماری راہ تک رہی ہوں گی۔ اب تو شام بھی سر پر ٹھہرنے کو ہے۔ چھوٹی بیگم کا گھر میں پریشانی سے برا حال ہے۔''

فضلو بابا جانے کیوں سکینہ خالہ کو چھوٹی بیگم کہا کرتے تھے۔ مجھے تو سکینہ خالہ بالکل بھی چھوٹی نہیں لگتی تھیں۔

فضلو بابا کی بات سن کر طاہر بھائی نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور پلٹ کر ریلے کی طغیانی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ناپا۔

''نہیں..... آپ اس طوفان میں اسکول تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ میں نے آتے ہوئے خود بہت سی جگہوں پر لوگوں کو رسہ پکڑ کر راستہ پار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ یہیں رکیں۔ وجو کو میں اسکول سے جا کر لے آؤں گا۔ آپ بس ذرا میرے گھر میں اطلاع کروا دیجیے گا۔ امی میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔''

فضلو بابا نے فوراً طاہر بھائی کو ہاتھ اٹھا کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ طاہر بھائی وہیں سے الٹے پیروں وجو آپی کو لینے کے لیے پلٹ گئے۔ میں جلدی سے بھاگ کر طاہر بھائی کے گھر میں اطلاع دے کر پلٹ آیا۔ اب میں اور فضلو بابا پلکیں جھپکائے بنا اسکول کی طرف سے آنے والی سڑک کو یوں گھور رہے تھے، جیسے کچھ ہی دیر میں وہاں سے قارون کا کوئی خزانہ نکلنے والا ہو۔ گھنٹہ بھر یونہی بیت گیا اور پھر وہ آخر کار دور سے اپنی سائیکل

تھامے خراماں خراماں آتے ہوئے نظر آئے۔ وجو آپی ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ڈری سہمی سی بھیگی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ جب طاہر بھائی انہیں لینے کے لیے اسکول پہنچے تو اسکول خالی ہو چکا تھا اور صرف اسکول کا بوڑھا چوکیدار وجو آپی کی وجہ سے وہاں رکا ہوا تھا۔ وجو آپی کا پریشانی اور خوف کے مارے برا حال تھا۔ طاہر بھائی کو آتا دیکھ کر ان کی جان میں جان تو آئی، پر ان کے ساتھ یوں اکیلے چل پڑنے میں بھی ان کی حیاء آڑے آ رہی تھی، وہ طاہر بھائی سے اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کی شرافت اور لیاقت کے قصے تو سارے محلے میں زبان زد عام تھے لیکن پھر بھی وہ ان کے لیے تو اجنبی ہی تھے لیکن اس وقت ان دونوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پہلے تو طاہر بھائی اور وجو آپی بہت دیر تک اسکول کے گیٹ پر ہی کسی تانگے یا سائیکل رکشہ کا انتظار کرتے رہے تاکہ وجو آپی کو اس پر سوار کروا کر طاہر بھائی خود اپنی سائیکل پر ان کے ساتھ ہی پیچھے پیچھے چل پڑیں لیکن جب آدھا گھنٹہ گزرنے کے باجود دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا تو مجبوراً ان دونوں کو پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ سائیکل پر سواری کا تو یوں بھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اول تو آج تک وجو آپی کبھی سائیکل پر سوار ہوئی ہی نہیں تھیں۔ غیاث چچا کے پاس سرخ رنگ کی اٹلی کی بنی ہوئی ایک ویسپا اسکوٹر تھی، جس پر کبھی کبھی وہ شام کو وجو آپی کو سیر کے لیے لے کر نکلتے تھے۔ اس وقت اگر میں بھی کہیں محلے میں انہیں دکھائی دیتا تو وہ مجھے بھی اسکوٹر کے اگلے حصے میں جہاں سامان رکھنے کی ایک ٹوکری سی بنی ہوتی ہے وہاں کھڑا کر لیتے تھے اور محلے کے گیٹ پر اتارتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے کیونکہ مجھے گیٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن وجو آپی کے ساتھ کی ہوئی اسکوٹر کی یہ چند لمحوں کی سواری بھی ہفتوں مجھے سرشار رکھتی تھی۔ طاہر بھائی کو اُمید تھی کہ شاید راستے میں سواری مل جائے لیکن اس برستی شام میں تو کوئی تانگہ بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا بالآخر طے یہی پایا کہ دونوں پیدل ہی ممکنہ راستوں سے اور پانی سے بچتے ہوئے گھر کی راہ پکڑ لیں کیونکہ شام دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی تھی اور اب وہاں کھڑے رہ کر مزید انتظار کرنا صرف اور صرف وقت برباد کرنے کے مترادف تھا۔ جب وہ دونوں محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو شام کے پانچ بج چکے تھے اور دونوں ہی سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور تھے۔ وجو آپی کو تو باقاعدہ چھینکیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور طاہر بھائی کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ فضلو بابا نے طاہر بھائی سے بہت کہا کہ سکینہ خالہ نے گھر میں ان دونوں کے لیے گرما گرم جوشاندہ تیار کر رکھا ہے، وہ پیتے جائیں لیکن طاہر بھائی مسکرا کر ٹال گئے۔

گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وجو آپی نے مڑ کر اک لمحے کو پلکیں اٹھائیں اور دھیرے سے طاہر بھائی سے ''شکریہ'' کہا۔ جواب میں طاہر بھائی صرف سر ہلا کر ہی رہ گئے۔

اگلا ایک ہفتہ دونوں ہی اپنے اپنے گھروں میں نزلے زکام اور بخار کی کیفیت میں بستر سے لگے رہے لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ وجو آپی اور طاہر بھائی کی یہ پہلی اور بھیگی سی ملاقات اگلے چند ہفتوں میں دونوں کو ایک ایسے جذبے سے بھگو کر شرابور کر دے گی، جس کی سیلن زندگی کی آخری سانس تک ان کے دلوں کے بند کمروں میں گھٹن پیدا کرتی رہے گی.....

پہلا دوست

رفتہ رفتہ محلے میں میرے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا لیکن میرا سب سے پہلا دوست راجہ ہی میرا سب سے گہرا اور راز دار دوست تھا۔ راجہ بھی میرے ساتھ ہی پرائمری اسکول میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس کا گھر میرے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہماری دوسری جماعت کے سالانہ امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ میرے پاس امتحانی گتہ (ہارڈ بورڈ) نہیں تھا لہٰذا میں تختی کے اوپر رکھ کر پرچہ دیتا تھا اور تختی کے سرے پر پرچہ جکڑنے کے لیے لوہے کا چھوٹا سا کلپ (چمٹی) لگا لیتا تھا جبکہ راجہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا اور بے حد لاڈلا بچہ تھا۔ اس کے ابا نے اس کے لیے بہت خوب صورت سا امتحانی گتہ خرید کر دے رکھا تھا جس پر سکس ملین ڈالرمین کی ایک بہت بڑی سی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔

ان دنوں ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں تھا۔ محلے میں صرف ایک ہی گھر میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا اور ہم سب بچے گھر والوں سے چھپ کر غفور چچا کے گھر ہفتے کی رات کو سکس ملین ڈالرمین دیکھنے کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جایا کرتے تھے۔ غفور چچا لاٹ صاحب کے دفتر میں کلرک تھے اور ان کے ٹھاٹ باٹ بھی کسی لاٹ صاحب سے کم نہ تھے۔ ہفتے کی رات غفور چچا اپنا ٹی وی گھر میں کسی ایسے مقام پر رکھ دیتے تھے، جہاں سے صحن اور گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے بچوں کی نظر بھی ٹی وی پر پڑ سکے۔ میں اپنے ابا کے ڈر سے سب سے آخر میں گھر سے نکلتا تھا لہٰذا راجہ کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ میرے لیے اس منی سینما گھر کے "اسٹال" یا "بالکونی" میں کوئی اچھی سی جگہ گھیرے رکھتا اور میرے دیر سے آنے پر ہمیشہ غصے سے مجھے گھورتا کہ مجھ سے پروگرام کی شروعات یا سکس ملین کی اونچی سے لگائی گئی ایک بہت عمدہ جمپ چوک گئی ہے۔ اگلی صبح راجہ مجھے وہ تمام کہانی پھر سے باقاعدہ پرفارم کر کے دکھاتا۔ ان دنوں اکثر میرے اور راجہ کے ہاتھوں پیروں یا سر پر پٹیاں بندھی دکھائی دیتی تھیں کیونکہ جب تک ٹی وی پر سکس ملین ڈالرمین چلتا رہا ہم دونوں نے ہر اونچائی سے اس کی طرح کودنے کی اور مختلف چیزوں کو ہاتھ پیر اور سر سے توڑنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ان دنوں ہم دونوں اپنی اپنی امیتوں کے ساتھ (جو آپس میں گہری سہیلیاں بھی تھیں) لنڈا بازار جا کر خاص طور پر ایسی جیکٹس اور دستانے وغیرہ چنتے تھے جیسے پچھلی قسط میں ہم نے سکس ملین صاحب کو پہنے دیکھا ہوتا تھا اور پھر میں اور راجہ ویسے کپڑے پہن کر محلے میں دوسرے بچوں کے درمیان اتراتے پھرا کرتے تھے۔

دوسری جماعت کے امتحان شروع ہو چکے تھے۔ میں صبح سویرے چائے کا ایک پیالہ گرم تندور کی آدھی روٹی کے ساتھ حلق سے اتار کر جلدی سے راجہ کے گھر پہنچ جاتا تھا لیکن راجہ ہمیشہ دیر کر دیتا تھا۔ اس کی امی اسے باورچی خانے میں اپنے سامنے چوکی پر بٹھائے گرم پراٹھے اور انڈوں کا ناشتہ کروا رہی ہوتی تھیں۔ مجھے سر پر کھڑے بڑبڑاتا دیکھ کر راجہ جلدی جلدی نوالے نگلنے کی کوشش کرتا تو اسے ماں کی جھاڑ سننا پڑتی کہ ٹھیک سے ناشتہ ختم کرے، خدا خدا کر کے راجہ کی تیاری ختم ہوتی اور اس کی ماں اس طرح دعائیں دیتے ہوئے میرے ساتھ روانہ کرتی، جیسے وہ اسکول کا

امتحان دینے نہیں بلکہ کسی جنگی محاذ پر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے لیٹنے جا رہا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ نکلنے پر عام طور پر راجہ کو بمشکل اعزازی نمبر دے کر ہی پاس کیا جاتا تھا۔ راجہ کا دھیان کبھی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ سردیوں کی نرم گلابی دھوپ میں جب ہم دونوں پرچہ دینے کے لیے اسکول کی طرف جا رہے ہوتے تو اس وقت بھی راجہ دیواروں اور دکانوں کی چھتوں پر لگے فلموں کے پوسٹروں پر زیادہ دھیان دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنا رٹا ہوا امتحانی سبق دہرا رہا ہوتا جبکہ وہ ان فلمی پوسٹروں پر رواں تبصرہ جاری رکھتا۔ ''یار سنا ہے محمد علی کی ''ان داتا'' بڑی زبردست پکچر ہے۔ یار تو نے سنا ''آئینہ'' میں ندیم شبنم نے غضب کام کیا ہے کل تو اس کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ کل شاہد کی ''بھروسہ'' ریگل میں لگ رہی ہے۔ وحید مراد کی ''پرکھ'' آ رہی ہے۔ تو اس اتوار کو میرے ساتھ رنگیلا کی ''کبڑا عاشق'' کا ٹریلر دیکھنے ضرور چلنا۔'' راجہ کے یہ تبصرے جاری رہتے اور ہم آخرکار اسکول میں داخل ہو جاتے۔ ہمارے پرائمری اسکول میں کوئی امتحانی ہال نہیں تھا لہٰذا ہم سب بچوں کو میدان میں ایک ایک قطار میں ان کی جماعت کے حساب سے بٹھا دیا جاتا تھا اور تختہ سیاہ پر آٹھ دس سوال لکھے جاتے، جنہیں ہم جلدی جلدی اپنی تختی یا پرچے پر اتار لیتے اور پھر ان میں سے پانچ سوالوں کے جواب ہمیں پرچے پر اتارنا ہوتے تھے۔ راجہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے میرے پیچھے یا دائیں بائیں کی جگہ پر قبضہ جما لیتا تھا اور میرا فرض تھا کہ میں اپنے پرچے کا رخ اس طرح سے رکھوں کہ راجہ کی نظر برابر اس پر پڑتی رہے اور وہ آسانی سے نقل کر سکے۔ اگر کسی پرچے میں بدقسمتی سے کسی استاد کی نظر راجہ پر پڑ جاتی تو اس کا وہ پرچہ ہمیشہ ادھورا ہی رہ جاتا۔ ایسی صورت میں امتحان کے نتیجے سے پہلے راجہ کے ابا کو ہمارے اسکول کا ایک ''خیر سگالی'' کا پھیرہ لگانا ضروری ہو جاتا تھا۔

البتہ راجہ کو میرا یوں دن بھر وجو آپی کے گھر کے پھیرے لگانا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے اس بات پر لڑتا تھا کہ میں بھرے کھیل کے میدان میں سے وجو آپی کی ایک آواز پر یوں دوڑ کر ان کی بات سننے چلا جاتا تھا، جیسے مجھ سے کوئی نماز قضا ہو رہی ہو۔

اس دن بھی مغرب سے کچھ پہلے ہم سب محلے کے بچے مل کر ''کھوہ کھوہ'' کھیل رہے تھے کہ اچانک دور سے میری نظر وجو آپی پر پڑی، جو اپنے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے مجھے بلانے کے لیے اشارے کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں کھیل کے تمام قواعد و ضوابط توڑتا ہوا، ملیح سی وجو آپی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس وقت گلابی لباس اور سفید دوپٹے میں خود بھی کوئی گلابی پری سی لگ رہی تھیں۔ دور راجہ کھڑا میری طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں میری شان میں کچھ بڑبڑا رہا تھا اور چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر مجھے خبردار کر رہا تھا کہ اگر میں کھیل چھوڑ کر کہیں گیا تو میری خیر نہیں لیکن اس وقت میری تمام تر توجہ وجو آپی کے گلابی چہرے کی طرف تھی، جس پر شام کے ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں کچھ اس طرح اجالا کر رہی تھیں کہ ان کی ناک میں اٹکا چھوٹا سا سنہری کوکا خود ایک چھوٹا سا سورج دکھنے لگا تھا۔

وجو آپی کے ہاتھ میں نیاز کی کھیر کی پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں گیارھویں کے کورس کی اردو کی کتاب تھی، جس کے شاعری والے حصے میں انہوں نے میر اور غالب کے چند اشعار کو نشان زدہ کر رکھا تھا۔ کھیر کی پلیٹ انہوں نے مجھے طاہر بھائی کی امی کے حوالے کرنے کی تاکید کی اور کتاب دیتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ طاہر بھائی سے کہوں کہ جو مشکل شعر انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تھے..... ان سب کو انہوں نے سرخ پنسل سے نشان لگا کر واضح کر دیا ہے۔ طاہر بھائی کو جب بھی وقت ملے ان کی تشریح لکھ کر وجو آپی کو بھجوا دیں۔

میں فوراً ہی الٹے قدموں طاہر بھائی کے گھر کی طرف بھاگا۔ طاہر بھائی کی امی صحن میں بیٹھیں انار دانہ سکھا رہی تھیں۔ میری آواز سن کر طاہر بھائی بھی کمرے سے نکل آئے۔ میں نے وجو آپی کی کتاب ان کے حوالے کی اور سارے راستے ان کا دیا ہوا جو پیغام رٹتے ہوئے آیا تھا، وہ میں نے انہیں فرفر سنا دیا۔ طاہر بھائی ہلکے سے مسکرائے اور بولے "یہ تمہاری وجو آپی کو پڑھائی لکھائی کے علاوہ دوسرا کوئی کام بھی ہے یا نہیں۔" مجھے ان کی اس بات پر شدید غصہ آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ کہتا خود طاہر بھائی کی امی نے انہیں جھڑک دیا۔

"ارے تو کیا ہوا؟ اگر بچی نے ذرا سی مدد مانگ ہی لی ہے پڑھائی میں تو کون سا آسمان گر گیا۔ تیری لیاقت تو نہ جھڑ جائے گی اسے کچھ بتانے سے؟"

طاہر بھائی جواب میں ہنستے ہوئے کتاب لیے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئے اور جاتے جاتے مجھے کہہ گئے کہ وہ رات کو تمام شعروں کی تشریح کر کے کتاب سمیت وجو آپی کو بھجوا دیں گے۔

میں نے واپسی پر کافی نمک مرچ لگا کر طاہر بھائی کی شکایت وجو آپی سے لگائی اور ان سے یہ بھی کہا کہ آئندہ وہ طاہر بھائی کو کوئی کام نہ کہا کریں۔ میں جب گیارھویں جماعت میں آجاؤں گا تو خود انہیں اردو پڑھا دیا کروں گا لیکن میری بات پر غصے میں آنے کی بجائے وہ ہلکے سے مُسکا دیں اور میرے گال پر زور سے چٹکی کاٹ کر اندر چلی گئیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ طاہر بھائی کو سخت سُست سنائیں گی کہ ان کی مجال کیسے ہوئی ایسی کوئی بات کہنے کی جبکہ کھیر کی پلیٹ تو کتنی جلدی طاہر بھائی کی اماں نے ہتھیالی تھی۔ بدلے میں دو چار شعروں کی تشریح ہی تو کرنا تھی ان کے ہونہار بیٹے کو؟ اس ذرا سے کام کے لیے اتنے نخرے؟ اور پھر یہ وجو آپی بھی نا..... بجائے غصے میں آنے کے، ان کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔ میں سخت کشمکش میں ان کے گھر سے واپس لوٹا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان لڑکیوں کے مزاج کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ.....

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشائیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آرہا ہے۔**

پہلی برف باری

بالآخر تیسری جماعت کے امتحانات کا نتیجہ بھی نکل آیا اور میں ''امتیازی'' اور راجہ ''اعزازی'' نمبروں سے باعزت پاس ہو گئے۔ اس دن صبح سے ہی آسمان پر گلابی بادلوں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہوا رک سی گئی تھی۔ خزاں میں خشک درختوں کے سنہری پتے زمین پر فرش کی صورت میں بچھے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ آج موسم کے تیور کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ صبح جب میں اسکول نتیجہ سننے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تھا تو امی نے اوپر تلے بہت سی سویٹریں مفلر اور اونی ٹوپی سے مجھے لیس کر کے بھیجا تھا، جب تک راجہ کے نام کا اعلان پاس شدہ لڑکوں میں نہیں ہوا وہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے اشاروں میں پوچھتا رہا کہ وہ پاس ہوا ہے یا فیل؟ بڑی مشکل سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے کانوں سے ہٹا کر اسے یقین دلایا کہ اتفاق سے وہ بھی پاس ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا اور جیب میں موجود تمام پیسوں سے راستے میں پڑتی پہلی پرچون کی دکان سے ڈھیر سارا گڑ خرید لیا۔ شدید سردی میں ہم سب بچوں کی ایک پسندیدہ تفریح یہ بھی تھی کہ ہم ایک بڑی سی کڑاہی میں گڑ کو خوب کوٹ کر پانی سے بھر کر اسے خوب ابالتے اور پھر جب وہ سارا گڑ حلوے کی سی شکل اختیار کر لیتا تو ہم اسے شدید سردی میں پڑتی برف میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے کڑاہی سمیت ڈھکن بند کر کے رکھ دیتے۔ گڑ کا حلوہ سردی میں جم کر برتن ہی کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ہم اسے چھری سے قاشوں کی صورت میں کاٹ کاٹ کر مزے سے دعوت اڑاتے۔

اس دن بھی ہمارے گھر پہنچتے پہنچتے برف کے گالوں سے ہماری اونی ٹوپیاں بھر چکی تھیں۔ محلے کے مرکزی کمپاؤنڈ میں بچے اور جوان مل کر برف کا پتلا بنانے کے مقابلے میں مشغول تھے۔ کچھ ہی دیر میں غفور چچا اپنا ''بیش قیمت'' کوڈیک کا کیمرہ گھر سے اٹھا لائے اور ہم سب بچوں اور بڑوں کی ایک ایک کر کے گروپ میں تصویریں اتارنے لگے۔ ہم سب بچے بڑے اہتمام سے سنجیدہ سی شکلیں بنائے تصویروں کے لیے رُخ دینے لگے۔ غفور چچا ہر سال اپنے اسی کیمرے سے ایسی برف باری کے موسم میں تمام محلے والوں کی تصویر بناتے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے کبھی ان تصویروں کو ڈھل کر آتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دل جلے نوجوانوں کا خیال تھا کہ ان کے کیمرے میں کبھی فلم کی ریل ہوتی تو تصویریں بھی ڈھل پاتیں.....؟ جب کیمرہ ہی خالی ہو گا تو تصویریں کیا خاک ڈھل کر باہر نکلیں گی؟

لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ ان تمام شکوک و شبہات کے باوجود جب کبھی غفور چچا اپنا کیمرہ لیے برستی برف میں گھر سے باہر نکلتے تو کیا بچے، کیا بوڑھے، سبھی فوراً اپنے بال سنوارتے، کپڑوں کی شکنیں دور کرتے فوراً محلے کے احاطے میں جمع ہونے لگ جاتے۔ ہم میں سے کسی میں بھی ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر غفور چچا کے کیمرے کو جانچ ہی لیں کہ اس کے اندر کچھ ہے بھی یا نہیں؟

لیکن اس برف باری میں قدرت نے میری تصویر کھچوانے کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ غیاث چچا کہیں سے ایک ''پولا رائیڈ'' کیمرہ اٹھا

لائے تھے۔ یہ ایک جادوئی ڈبہ تھا۔ یہاں تصویر کھینچی اور وہاں کیمرے کی دوسری جانب سے دھیرے سے چمکتی اور دھلی دھلائی سی تصویر نکل آتی۔

اس دن بھی میں نے وجو آپی کے صحن میں ان کے ساتھ مل کر برف کا ایک بہت پیارا سا پتلا بنایا اور پھر اس پتلے کے گلے میں بانہیں ڈال کر، گود میں بیٹھ کر اور اسے گلے لگا کر بہت سی تصویریں بنوائیں لیکن کون جانتا تھا کہ میری یہ خوشی بھی چند لمحوں کی اور ہمیشہ کی طرح ادھوری ثابت ہو گی۔ ابھی ہم صحن میں اس ہلے گلے میں مشغول ہی تھے کہ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو طاہر بھائی ہاتھ میں تھرموس پکڑے کھڑے دکھائی دیئے۔ غیاث چچا نے انہیں بھی اندر ہی بلوا لیا۔ پتہ یہ چلا کہ طاہر بھائی کی اماں نے وجو آپی کے لیے چوزوں کی خاص یخنی بنا کر بھیجی ہے۔ مجھے شدید غصہ آیا۔ راجہ پچھلے کئی دنوں سے مجھے اکسا رہا تھا کہ طاہر بھائی کے گھر کے باہر پھرتے ان چوزوں پر اپنا ہاتھ صاف کر لینا چاہیے پر مجھے مرغی کے ان معصوم بچوں پر ترس آتا تھا۔ کاش اس وقت میں نے راجہ کی بات مان لی ہوتی تو آج طاہر بھائی کی جگہ یخنی کا یہ تھرموس میں وجو آپی کے لیے لے کر آیا ہوتا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

طاہر بھائی زیادہ دیر وہاں نہیں رکے لیکن جتنی دیر بھی وہاں رہے وجو آپی اپنے باورچی خانے کی صحن کی جانب والی کھڑکی میں سے جلدی جلدی چائے بناتے ہوئے چپکے چپکے پلکیں اٹھا کر طاہر بھائی کو دیکھتی رہیں۔ سکینہ خالہ کے بے حد اصرار پر طاہر بھائی نے چائے کے دو گھونٹ لیے اور وہاں سے چل پڑے۔ اسی دوران انہوں نے غیاث چچا کے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا نام ڈاکٹری کے کالج کی فہرست میں آ چکا ہے اور مارچ سے ان کی کلاسیں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس بات پر غیاث چچا نے تو کچھ ایسی خوشی کا اظہار کیا، جیسے طاہر بھائی کو نہیں خود ان کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس میں اس قدر خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ بھلا ڈاکٹر بننے میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا اور پھر مجھے تو ویسے بھی ڈاکٹروں سے چڑ تھی۔ سارا دن بے چارے مُردوں کی چیر پھاڑ کرتے رہتے تھے اور پھر انہی ہاتھوں سے کھانا کھانے بھی بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے تو بڑے ہو کر مصور بننا تھا۔ سارے جہاں کی تصویریں بنانا تھیں یا پھر ایک بڑا سا پیانو خرید کر اس پر ساری دنیا کو پاگل کر دینے والی دھنیں سنانا تھیں۔ بھلا ڈاکٹری بھی کوئی پیشہ تھا؟..... ہونہہ..... ڈاکٹر کہیں کا.....

میں جانے کتنی دیر اپنے انہی خوابوں اور خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ہوش آیا تو طاہر بھائی جانے کب کے جا چکے تھے اور راجہ جانے کب سے گلی میں کھڑا مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ پتہ چلا کہ باہر محلے میں ایک دوسرے پر برف کے گولے برسانے کا مقابلہ شروع ہو چکا ہے اور ہماری ٹیم میری غیر موجودگی کی وجہ سے مسلسل گولے کھا رہی تھی اور ہار رہی تھی۔ ہم سب بچوں کا برف باری کے دوران یہ سب سے پسندیدہ کھیل تھا۔ ہم چھتوں پر چڑھ کر، درختوں کے پیچھے چھپ کر اور دیواروں کی منڈیروں سے ایک دوسرے کی ٹیم کو تاک تاک کر نشانے مارتے تھے لیکن جانے کیوں اس دن میرا ہر نشانہ خطا ہو رہا تھا۔ شاید اسی دن سے خود میں تقدیر کے نشانے کی تاک پر تھا اور کتنی ستم ظریفی کی بات تھی کہ ہم انسانوں کے نشانے تو چوک بھی جاتے ہیں لیکن اس بے رحم مقدر کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ اس سفاک تقدیر کا ہر وار کاری اور ہر نشانہ اٹل ہوتا ہے، جو ہم بے بس انسانوں کو ذرا سا تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ میرے بچپن کا دسمبر بھی قسمت کے ایک ایسے ہی وار کے نشانے پر تھا لیکن میں اس بے رحم وار سے بے خبر راجہ کے ساتھ مل کر دوسری ٹیم کے بچوں پر برف کے گولے برسا رہا تھا۔

پہلا سجدہ

چوتھی جماعت میں آتے ہی ابا کی طرف سے نماز کی پابندی اور سختی کی تاکید شروع ہوگئی۔ سپارہ تو اس سے بہت پہلے ہی ہم سب محلے کے بچے محلے کی ایک جگت خالہ کے ہاں پڑھنے جاتے تھے، جو ہم سب بچوں کو نہایت انہماک سے سپارہ پڑھاتی تھیں۔ شام کو ان کے گھر کے برآمدے میں محلے بھر کے بچے اور بچیاں اپنے سروں پر چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اور دوپٹے اوڑھے اپنے اپنے سپارے اور بغدادی قاعدے اپنے سینوں سے لگائے جمع ہو جاتے تھے اور اگلے گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ان کا گھر ہم سب بچوں کے سبق یاد کرنے کے شور سے گونجتا رہتا۔ سارے بچے گود میں سپارہ رکھے اور سر ہلا ہلا کر اپنا سبق انواع واقسام کی آوازوں میں یاد کرتے رہتے اور جس بچے کا سر جتنی تیزی سے ہلتا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اتنی ہی "شدت" سے اپنا سبق یاد کر رہا ہے اور جہاں کسی بچے کے سر ہلنے کی رفتار کم ہوتی، وہیں خالہ زور سے ایک ہنکارا بھر کر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتیں اور دوسرے ہی لمحے اس بچے کا سر دوبارہ اسی تیزی سے ہلنے لگ جاتا۔

محلے کے تقریباً سبھی نوجوان اپنی جگت خالہ کے ہاں سے اپنے اپنے ختم قرآن سے مستفید ہو چکے تھے کیونکہ خالہ گزشتہ بیس، پچیس سالوں سے اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو قرآن شریف کا درس دے رہی تھیں۔ ذوآپی بھی ان کی شاگردرہ چکی تھیں اور میرے لیے وہ دن عید کا دن ہوتا تھا، جب خالہ اپنے صحن میں لگے سرخ انگوروں کے خوشے پکنے پر ہم سب بچوں کو حکم دیتی تھیں کہ سب بچے مل کر احتیاط سے اور ایک ایک کر کے تمام انگوروں کے گچھے ڈالیوں سے توڑ کر اتار لیں پھر اس تمام انگور کے ڈھیر کے حصے بخرے کرنے کا مرحلہ آتا تھا۔ جگت خالہ پورے محلے میں اپنے گھر سے اُترے انگور بھجوایا کرتی تھیں۔ سب بچے بڑی بڑی پراتوں میں انگور لیے محلے کے مختلف گھروں میں بانٹنے کے لیے دوڑتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے موقعے پر خالہ محلے کی اپنی پرانی شاگرد لڑکیوں کی ٹولی کو بھی بلوالیا کرتی تھیں۔ بڑی لڑکیاں انگور توڑ توڑ کر پراتوں میں رکھتی جاتیں اور حساب سے محلے کے ہر گھر کو بھیجتی جاتیں لڑکیوں کی اسی ٹولی میں وہ جو آپی بھی شامل ہوتیں اور میں بھاگ بھاگ کر سب سے پہلے صرف انہی کے کام کیا کرتا۔

ایسے موقعوں پر راجہ عموماً یا تو کھسک جایا کرتا تھا یا پھر اس کے ہاتھ جس گھر کو انگور بھیجے گئے ہوتے۔ وہاں کبھی پہنچ نہیں پاتے تھے۔ آخر کار اس کا حل خالہ نے یہ نکالا کہ راجہ کے ہاتھ انگوروں کی پرات دے کر دو مزید ہٹے کٹے اور مشٹنڈے قسم کے بچوں کی گارڈ بطور نگرانی ساتھ بھیجنا شروع کر دی، جنہیں راجہ نے راستے میں کئی بار رجھانے اور جھانسہ دینے کی کئی کوششیں کیں لیکن اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

مجھے یاد ہے جس دن ابا نے مجھے پہلی مرتبہ سختی سے ڈانٹ کر نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا وہ بھی ایک ایسا ہی انگور اتارنے کا دن تھا۔ میرا موڈ پہلے ہی کافی خراب تھا کیونکہ اس روز ذوجو آپی بھی خالہ استانی کے گھر انگور اتروانے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میں نہایت انہماک سے انہیں اپنے نازک نازک

ہاتھوں سے انگوروں کو ان کے گچھوں سے علیحدہ کرتا دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت احتیاط اور نفاست سے بہترین گچھوں کا انتخاب کیا اور پھر اپنے گلابی ہاتھوں کی لمبی اور مخروطی انگلیوں سے انگوروں کو علیحدہ کر کے ایک پرات میں رکھ کر اس کے اوپر ململ کی جالی کا کپڑا ڈال دیا۔ میں جو ان کی ہر ہر حرکت کو نہایت غور سے بیٹھا تک رہا تھا ایک دم بڑبڑا سا گیا کیونکہ انہوں نے پلکیں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور دھیرے سے میرا نام لیا..... ''آدی''.....

پتہ نہیں کیوں جب کبھی ڈوآپی یوں میرا گھر کا نام دھیرے سے گنگناتی تھیں تو میرے وجود میں اچانک ہی ایک ساتھ اتنی بہت سی گھنٹیاں کیوں بجنے لگتی تھیں؟ میں جلدی سے اٹھا اور بھاگ کر ان کے پاس آیا۔ آس پاس دوسری لڑکیاں بھی انگور اتارنے اور آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ میں اور راجہ اکثر سبق یاد کرتے ہوئے ان لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ آخر وہ کون سی باتیں ہوتی ہیں، جنہیں یہ لڑکیاں ایک دوسرے کے کانوں میں گھنٹوں سرگوشیاں کر کے بے تحاشہ کھلکھلا کر ہنستی رہتی تھیں؟ لیکن اس سوال کا جواب ہم دونوں کو کبھی نہیں مل پایا۔ اس وقت بھی ڈوآپی کے آس پاس موجود لڑکیوں کی ٹولیاں آپس میں گھسر پھسر اور کھی کھی کرنے میں مشغول تھیں لیکن میں نے ڈوآپی کو کبھی ان دوسری اور ان کی ہم عمر لڑکیوں کی طرح خوامخواہ میں ہنسی مذاق یا قہقہے لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہوتا تو وہ ایسے موقعوں پر ہلکے سے مسکرا دیا کرتی تھیں اور ان کی اس ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کے گالوں پر پڑنے والے دو ہلکے سے گلابی گڑھے مجھے نہال کر جایا کرتے تھے لیکن اس روز ان کے یوں رازدارانہ انداز سے بلانے کے طریقے نے مجھے کچھ حیرت اور الجھن میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے انگوروں کی پرات اٹھائی اور اسے میرے حوالے کرتے ہوئے نہایت دھیرے سے پلکیں جھکا کر بولیں۔

''آدی..... یہ ٹرے شکور چچا کے ہاں دے آؤ۔'' شکور چچا کا نام سنتے ہی میرا جی چاہا کہ اسی لمحے وہ ٹرے وہیں پھینک کر کہیں بھاگ جاؤں۔ شکور چچا طاہر بھائی کے ابا کا نام تھا۔ تو گویا نفاست اور سلیقے سے یہ انگوروں کی پرات شکور چچا کے گھر بھیجنے کے لیے سجائی جا رہی تھی۔ غصے اور بے بسی سے میری آنکھوں میں اسی لمحے آنسو آ گئے، جنہیں میں نے بڑی مشکل سے ٹپکنے سے روکے رکھا لیکن کیا کرتا میں نے کبھی پہلے زندگی میں ڈو آپی کا کہا ٹالا تھا جو اس دن ٹال پاتا؟ میں خاموشی سے ان کے ہاتھوں سے ٹرے لیے باہر آ گیا۔ گھر کے باہر والے چھوٹے میدان میں راجہ محلے کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کنچے کھیلنے میں مشغول تھا۔ اس نے اپنا انگوٹھا زمین پر رکھا اور لمبی والی انگلی سے اپنا ہر البوری کنچہ دور پڑے مخالف کے کنچے کی طرف اچھال دیا۔ تخ سے کنچے ٹکرانے کی آواز ہوا میں گونجی اور دوسرا لڑکا اپنی ہار پر منہ بسورتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ راجہ کا نشانہ، جسے کنچوں کے کھیل میں ''اَیمنڈ'' کے نام سے پکارا جاتا تھا، ہمیشہ سے بے حد پکا تھا۔ وہ درجنوں گز دور پڑے ہوئے کسی بھی کنچے کو اپنا کنچہ ہوا میں اچھال کر نشانہ بنا سکتا تھا اور اس معاملے میں پورے محلے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے استانی خالہ کے ہاں سے نکلتے دیکھ کر اس نے وہیں سے چلا کر کہا ''اوئے آدی..... استانی خالہ سے مار کھا کر آیا ہے کیا.....؟ اور یہ ہاتھ میں کیا پکڑ رکھا ہے۔'' میں نے راجہ کو بتایا کہ یہ انگور شکور چچا کے ہاں دینے جا رہا ہوں۔ راجہ نے کپڑا اٹھا کر انگوروں کو اس لومڑی کی طرح للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، جس کے بارے میں ماسٹر جی ہمیں اسکول میں سبق پڑھایا کرتے تھے۔

''واہ پیارے..... انگور تو بڑے عمدہ دکھائی پڑتے ہیں۔ ضرور تمہاری ڈوآپی نے بیلوں سے اتارے ہوں گے..... ہے نا؟''

میں راجہ کی بات سن کر مزید چڑ گیا۔

''ہاں..... انہی نے اتارے ہیں..... تم کہو تو واپس بیلوں پر چڑھا آؤں؟'' راجہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔

''دوسروں کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہو یار۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ سارے محلے کے گھروں میں انگور پہنچانے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا نا ہم نے؟ انگور کھائیں کوے اور دکھ کہیں ہم.....''

راجہ نے حسب معمول اردو کے محاورے کی ٹانگ توڑتے ہوئے میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ راجہ نے محاورہ تو غلط بولا تھا لیکن اس کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ بھلا وجو آپی کے ہاتھوں سے توڑے ان انگوروں پر کسی اور کا حق کیسے ہو سکتا تھا.....؟

چند لمحوں بعد میں اور راجہ محلے میں اپنی سب سے پسندیدہ جگہ یعنی محلے کی چار دیواری کی منڈیر پر بیٹھے انگوروں کی پرات اپنی گود میں رکھے ان انگوروں سے انصاف کر رہے تھے، یہ وہ دیوار تھی، جو ہمارے محلے کے گرد چاروں طرف چار دیواری کے طور پر کھڑی کی گئی تھی۔ بڑے بوڑھے بتاتے تھے کہ یہ دیوار انگریز نے ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے بھی پہلے سرکاری کوارٹرز کی چار دیواری کے طور پر بنوائی تھی۔ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ہم بچے آرام سے چوکڑی مار کر بھی اس پر جا بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں انگور کھاتے جاتے اور پرلی جانب سڑک سے گزرتی گاڑیوں کو بھی گنتے جا رہے تھے۔ اس دیوار پر بیٹھ کر پرلی جانب کی سڑک پر گزرتی گاڑیاں گننا میرا اور راجہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب کوئی گم سم ڈرائیور کسی نئی ''فیاٹ کار'' میں یا پھر کسی پرانی شیورلیٹ میں اپنے خیالوں میں کھویا سڑک سے گزر رہا ہوتا تو راجہ اچانک ہی زور سے ''اوئے'' کی آواز لگاتا اور جب ڈرائیور گھبرا کر یا چونک کر اور ہڑبڑا کر آواز کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا تو میں اور راجہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے لیکن اس دن میں اس قدر اداس تھا کہ میرا من اپنے اس محبوب مشغلے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وجو آپی کے دیئے ہوئے انگور ہم دونوں نے ''انتقاماً'' آدھا گھنٹہ پہلے ہی ختم کر دیئے تھے۔ دھوپ بھی تیزی سے ڈھل رہی تھی اور شام کو چلنے والی برفیلی ہواؤں نے میرے پاؤں سُن کرنا شروع کر دیئے تھے لہٰذا میں نے خالی پرات راجہ کے حوالے کی اور سختی سے تاکید کی کہ اسے محلے میں آنے والے ٹین، بوری، بوتل خریدنے والے کباڑیئے کے ہاتھ فروخت کرنے کے بجائے سیدھے سجاؤ فوراً استانی خالہ کے ہاں واپس دے آئے۔ راجہ نے جلدی سے دل پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ راجہ جب بھی دل پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا، تب وہ صرف اور صرف سچ ہی بولتا تھا لہٰذا مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ اب یہ پرات حفاظت سے استانی خالہ کے ہاں واپس پہنچ جائے گی۔

راجہ سے رخصت ہو کر جب میں نے گھر کے دروازے سے اندر قدم رکھے ہی تھے کہ ابا کی گرجدار آواز نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

''کہاں سے آ رہے ہو اس وقت.....؟ دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہو..... کتنی مرتبہ کہا ہے کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس آ جایا کرو۔''

میں نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا کیونکہ ایسے کڑے وقت میں عموماً وہ ہی میری مدد کے لیے کوئی عمدہ سا بہانہ تراش کر ابا کا پارہ نیچے لانے کی کوئی ترکیب کرتی تھیں لیکن آج تو امی بھی آنکھیں چرا گئیں۔ پتہ یہ چلا کہ بڑے بھیا آج مغرب کی نماز پر مسجد سے غیر حاضر پائے گئے تھے اور ابھی تک ہوسٹل میں دوستوں کے ساتھ پڑھائی کے بہانے سے گھر سے باہر تھے لہٰذا ان کے حصے کا سارا نزلہ مجھ پر آن گرا تھا۔ ابھی میں ابا کے پہلے سوال کا ہی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پایا تھا کہ فوراً ہی گرج چمک کے ساتھ ان کا دوسرا حکم بھی نازل ہو گیا۔

''چلو.....اپنی امی سے کہو کہ تمہیں ٹھیک سے وضو کرنا سکھا دیں، وضو کرلو.....آج سے تم بھی اپنے بڑے بھائی سمیت میرے ساتھ نماز کے لیے مسجد جایا کرو گے.....''

کوئی اور وقت ہوتا تو میں تھوڑا بہت احتجاج تو ضرور درج کرواتا، چاہے اکیلے میں امی کے سامنے ہی سہی.....کہ بھلا ساڑھے آٹھ سال کی عمر بھی کوئی مسجد جانے کی ہوتی ہے لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ ذرا سی بھی ''آئیں بائیں'' کافی ''نقصان دہ'' ثابت ہو سکتی تھی۔ امی نے بھی اشاروں اشاروں میں مجھے سعادت مندی سے سر جھکانے کا مشورہ دیا۔ عمارہ باجی، جو ایسے موقعوں پر میری گت بنتے دیکھ کر ہمیشہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں انہوں نے ابا کو دکھانے کے لیے جلدی سے وضو کا بڑا سا چاندی کا لوٹا پانی سے بھر کر امی کے حوالے کر دیا اور امی نے مجھے ہاتھوں پیروں اور چہرے پر پانی ڈالنے کا طریقہ سکھلا دیا۔ باجی برآمدے کے ستون کے پیچھے کھڑی دانت نکالتی رہیں اور امی نے کنگھی کر کے اور میرے گال پر سرمے کا بڑا سا ٹیکہ لگا کر مجھے عشاء کی نماز کے لیے تیار کر دیا۔ شاید دنیا کی ہر ماں اپنے راج دلارے بیٹے کو ''نظر بندی'' کا ایسا ٹیکہ ضرور لگاتی ہو گی۔

لیکن میرا دھیان اس وقت کسی اور جانب ہی تھا۔ وہ جمعرات کی شام تھی اور آج رات ٹی وی پر میرے پسندیدہ ڈرامے ''انکل عرفی'' کی چوتھی قسط نشر ہونا تھی۔ راجہ کو میں پہلے ہی پابند کر چکا تھا کہ وہ غفور چچا کے صحن میں عین برگد کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر اپنے اور میرے لیے جگہ سنبھالے اور پکڑے رکھے۔ عشاء کی باجماعت نماز کا وقت عین وہی آٹھ بجے کا تھا، جس وقت ''انکل عرفی'' شروع ہوا کرتا تھا۔ جانے آج یہ ابا کو کہاں سے مجھے اپنے ساتھ مسجد لے جانے کا جنون سر پر سوار ہو گیا تھا۔ جبکہ فی الحال تو میرے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ میں نے فوری طور پر ذہن میں ان تمام بیماریوں کو یاد کرنے کی کوشش کی، جو ایسے موقعے پر اچانک کہیں سے بھی پیدا ہو کر مجھے اس ''مسجد یاترا'' سے بچا سکتی تھیں لیکن بدقسمتی سے اس ضرورت کے وقت میں اپنے چہرے پر بیماری سے پیدا ہونے والے ''سچے تاثرات'' بھی ٹھیک طرح سے نہیں ابھار سکا اور اسی کشمکش وبیچ میں عشاء کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ عین اسی لمحے راجہ کی مخصوص سیٹی باہر گلی میں گونجی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ غفور چچا کے ہاں جا رہا ہے اور کچھ دیر کے اندر میں بھی وہاں پہنچنے کی کروں، پر آج تو یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ میں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ جانے آج بینا کی انکل عرفی سے ملاقات ہو پائے گی یا نہیں.....؟ بینا اس ڈرامے کی ہیروئن کا نام تھا، جو قوآپی سے مماثلت کی وجہ سے مجھے اچھی لگتی تھی اور آج کی قسط میں تو بہت اہم فیصلے ہونے تھے لیکن یہاں گھر میں تو ابا نے پہلے ہی میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا تھا اور آج سے باجماعت نماز کی پابندی مجھ پر فرض کر دی گئی تھی۔

کچھ دیر میں ابا گھر سے مسجد کے لیے نکل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ایسی مجبوری کے عالم میں چل رہا تھا جیسے کوئی بکرا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ اسے قربان گاہ کی طرف لے کر جائے گی، اپنے مالک کے پیچھے وفاداری سے سر ہلاتے ہوئے چلتا رہتا ہے۔

میں اس سے پہلے بھی مولوی صاحب کو نیاز و نذر دینے کے لیے مسجد آتا رہتا تھا۔ ابھی تین مہینے پہلے ہی راجہ کی ممانی کے ہاں بیٹا ہوا تھا تو ہم لوگ اس کے کان میں اذان دلوانے کے لیے اسے یہاں مسجد میں لائے تھے۔ اس وقت یہ مسجد مجھے کافی مناسب سی جگہ محسوس ہوئی تھی لیکن آج تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابا مجھے کسی قید خانے میں لے کر آ گئے ہوں۔

مجھے دیگر بچوں کے ساتھ سب سے پچھلی صف میں بٹھا دیا گیا اور کچھ ہی دیر میں مولوی صاحب بڑے رعب اور دبدبے کے ساتھ جماعت

کروانے کے لیے تشریف لے آئے۔ان کے آتے ہی سب لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔میں بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔پتہ چلا کہ ان کے آتے ہی جماعت کھڑی ہوجاتی ہے اور نمازیوں میں یہ کھلبلی اسی وجہ سے مچی تھی۔ٹھیک آٹھ بجے مولوی صاحب نے زور سے تکبیر پڑھی اور اسی لمحے میرے ذہن میں ''انکل عرفی'' کی تعارفی موسیقی بجنا شروع ہوگئی۔میں اپنے خیالوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے رکوع میں جانا تب یاد آیا جب ساری جماعت رکوع سے سر اٹھا چکی تھی اور میری زندگی کا پہلا سجدہ ٹی وی ڈرامے کے خیالات کی نذر ہوگیا۔کیسا کچا پکا سا سجدہ تھا،ماتھا زمین پر،آنکھیں اردگرد اور ذہن ساتویں آسمان سے بھی کہیں دور اٹکا ہوا۔جب پہلے سجدے میں مولوی صاحب نے میری بساط سے کچھ زیادہ ہی دیر لگادی تو میں الجھن اور جلدی میں خود ہی اٹھ بیٹھا،تب ساتھ ہی نماز پڑھنے والے نسبتاً بڑی عمر کے لڑکے نے جلدی سے مجھے کھینچ کر دوبارہ سجدے میں ''پہنچا'' دیا۔

تب سے لے کر اب تک میری زندگی کا ہر سجدہ اتنا ہی نامکمل،اتنا ہی جلد بازی میں کیا گیا ادھورا اور بے دلی سے سر پٹخنے کے برابر ہے جتنا بے فائدہ،جھوٹا اور منافقت بھرا میرا پہلا سجدہ تھا۔میں لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایک سجدہ تو اس ریاکاری،اس جھوٹ،دکھاوے اور منافقت سے پاک ہو پائے۔کبھی تو میرا ماتھا زمین پر ٹکنے کے بعد اس کی رضا پا کر ہی واپس اٹھے.....لیکن افسوس میری یہ ادھوری خواہش آج تک ادھوری ہی رہی ہے۔

سی ٹاپ

سی ٹاپ، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا یورپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔گو یہ مجرم تنظیم عام بدمعاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔اس کے باوجود وہ اسے مزید رقومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ایسا کیوں ہوا۔کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہوگئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی،جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلی چوری

اُس رات پہلی باجماعت نماز کے بعد تو ابا نے اپنا وطیرہ ہی بنالیا کہ یہاں اذان ہوئی اور وہاں ان کا نماز کے لیے تیار ہو جانے کا حکم نامہ صادر ہوا۔ اس رات جب میں ابا کے ساتھ نماز ختم کر کے لشتم پشتم کسی نہ کسی طرح بھاگم بھاگ غفور چچا کے ہاں پہنچا تو آدھا ڈرامہ گزر چکا تھا اور میری جگہ پر بھی سلُّو کی تائی اماں قبضہ جما چکی تھیں۔ راجہ نے غصے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے کندھے اچکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ میرے پہنچنے کے بعد بینا کا بس ایک ہی منظر آیا۔ وہ بھی بس چند لمحوں کا ساری رات میں بے چینی اور افسوس سے بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح میں نے راجہ سے اس نئی ''افتاد'' کا ذکر کیا تو وہ بھی پریشانی سے سوچ میں پڑ گیا۔ باقی نمازوں کا اتنا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ فی الحال فجر کی نماز کی تو مجھے ابا کی طرف سے چھوٹ تھی البتہ باقی سب گھر والوں کو ان کی ایک ہی گرجدار آواز فجر کی پہلی اذان سے بھی کہیں پہلے جگا دیتی تھی۔ ظہر کا وقت تو اسکول سے آنے اور کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے کھانا کھانے میں نکل جاتا تھا۔ لہٰذا ظہر کی نماز گھر پر پڑھنے کی رعایت بھی حاصل تھی۔ اصل مسئلہ عصر، مغرب اور عشاء کا تھا۔ عصر کے وقت ہم لوگ کھیل کے میدان میں ہوتے تھے جو کہ مسجد سے اتنا دور تو نہ تھا کیونکہ محلے سے نکلتے ہی ایک سڑک پار کر کے ہم اس میدان تک پہنچ جاتے تھے لیکن بیچ کھیل میں نماز کا وقفہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ مغرب ہماری کھیل سے واپسی کا وقت تھا اور سب سے کٹھن وقت تو عشاء کا تھا۔ اس وقت تو ہمیں سکس ملین ڈالر مین، پلانیٹ آف ایپس (Planet of Apes)، شہہ زوری اور اپنے پسندیدہ ''جیدی انکل'' کا کھیل ''انتظار فرمایئے'' دیکھنے کے لیے غفور چچا کے ہاں جمع ہونا لازمی ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت عرصے تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ٹی وی پر شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ''اصل'' بچوں والے پروگرام جیسے کارٹون شو، الف لیلیٰ، ٹک ٹک کمپنی، سارے دوست ہمارے اور کلیاں بھی آتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے تو غفور چچا کا منی سینما گھر کھلتا ہی صرف آٹھ سے نو بجے کے لیے تھا۔ یوں ہم سب محلے کے بچوں کی ٹی وی بینی کی ابتداء ہی بڑوں کے پروگرام سے ہوئی۔ بہت عرصہ بعد جب راجہ کے ابا نے اس کی ضد پر ''توشیبا'' کا بڑا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی خریدا تو ہمیں پتہ چلا کہ اب سے پہلے تک ہم جو بھی دیکھتے رہے وہ بڑوں کے پروگرام تھے۔

میں اور راجہ کافی دن سر جوڑے بیٹھے سوچتے رہے کہ عشاء کی نماز سے چھٹکارے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ راجہ کا ذہن ایسے موقعوں پر خوب چلتا تھا لیکن یہ ایک ایسا گھمبیر مسئلہ تھا، جس کا توڑ اس کے ذہن میں بھی نہیں آ پا رہا تھا۔ مغرب کے وقت سے ہی ہمیں بخار چڑھنا شروع ہو جاتا تھا، خاص طور پر جب میرے دیر سے آنے پر راجہ مجھے بتاتا تھا کہ ''آخری چٹان'' کے چنگیز خان نے اپنے بیٹے جوجو اور قبلائی خان کے ساتھ مل کر امیر

خوارزم کے کتنے جان باز سپاہیوں کو شہید کر دیا ہے اور یہ سب کیا دھرا ہمارے ہی مسلمانوں کے امیر کے وزیر اعظم کا ہے تو میں غصے اور بے بسی سے یوں ہاتھ ملتا، جیسے اگر میں آٹھ بجے وقت پر آ جاتا تو ان سب کو بچا ہی تو لیتا.....

ہمارے محلے کے اندر ہی پرلی طرف چوتھے درجے کے ملازمین کی عیسائیوں کی ایک بستی بھی تھی، جن دنوں ٹی وی پر ''آخری چٹان'' آتا تھا ان عیسائیوں کے چھوٹے بچوں کی شامت آئی رہتی تھی کیونکہ جیسے ہی آخری چٹان ختم ہوتا ہم سب مسلمان بچے اپنی لکڑی کی تلواریں لے کر ''یلغار ہو'' کے نعرے لگاتے ہوئے ان عیسائی بچوں پر پل پڑتے۔ چنگیز خان کے بغداد کے مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کا حساب لینے کا کوئی اور طریقہ جو نہ تھا ہمارے پاس۔ یوں ہر ہفتے کسی نہ کسی عیسائی بچے کی آنکھ سوجی ملتی یا سر پھٹا ہوتا..... بالآخر عیسائی بستی کے بڑے بوڑھے ہاتھ باندھے ہمارے بزرگوں کے پاس ہماری شکایت لیے آن پہنچے کہ یسوع مسیح کے واسطے ہمیں ان چھوٹے ''مُسلوں'' کی روزانہ بلکہ ہفتہ وار یلغار سے بچایا جائے اور پھر ہمارے بڑوں کے ہاتھوں ہم سب کی جو درگت بنی وہ سب تقریباً ناقابل اشاعت ہے۔ مجھے اور راجہ کو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ہمارے بڑوں کو خود تو اسلام کی خدمت کی ''توفیق'' نہیں ہو پاتی اگر ہم بچے مل کر مسلمانوں کی ''بھلائی'' کے لیے کچھ کر ہی رہے تھے تو بجائے اس کے کہ وہ ہماری کچھ حوصلہ افزائی کرتے، وہ تو جوتا لے کر الٹا ہمارے ہی پیچھے پڑ گئے تھے۔

بہر حال ان دنوں اپنے بڑوں کی یہ ''قدر ناشناسی'' اور ''عیسائیت'' کے لیے ان کے دلوں میں موجود درد ہمیں اتنا نہیں کھٹکتا تھا جتنا عشاء کی نماز کا وقت اور میرے ابا کی نظر کی سختی۔ راجہ کا مسئلہ تو مجھ سے بھی بڑا تھا۔ اسے میرے بنا ٹی وی دیکھنے میں بالکل بھی مزہ نہیں آتا تھا کیونکہ اسے کوئی بھی پروگرام دیکھتے ہوئے رواں تبصرہ کرنے کی عادت تھی اور اس کی اس فضول بکواس کو میرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جھیل پاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خاص جذباتی مناظر پر خوب موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے کا بھی ماہر تھا اور اس کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ آدمی یعنی میرے علاوہ دوسرا کوئی اس کے یہ آنسو دیکھ پائے۔ لہٰذا مجھ سے زیادہ ان دنوں وہ مشکل کا شکار تھا۔

اس رات "Chips" چپس سیریز، جس میں ہمارے بے انتہا پسندیدہ موٹر سائیکل سوار سارجنٹ اپنے کمالات دکھاتے تھے، کی دوسری قسط آنا تھی۔ راجہ شام ہی سے میرے ساتھ ہی تھا اور ہم میرے ہی گھر کے صحن میں بیٹھے مختلف متبادل منصوبوں (Contigency Plans) پر غور کر رہے تھے کہ آج کی عشاء کی نماز سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ ہم اپنیکھسر پُھسر میں اس قدر غرق تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میرے ابا ہم دونوں کے سر پہ آن پہنچے ہیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے.....؟''

میں اور راجہ یوں اچھلے جیسے ہمارے سروں پر کوئی بم آ کر پھوٹا ہو۔ راجہ گھگھیایا۔

''وہ چچا..... دراصل میں آدمی سے کہہ رہا تھا کہ کل سے مجھے بھی اپنے ساتھ نماز کے لیے جاتے ہوئے آواز دے جایا کرے.....''

ابا کے چہرے پر سختی کچھ کم ہوئی۔

''ہوں..... اچھی بات ہے..... لیکن کل سے کیوں.....؟ آج سے کیوں نہیں.....؟ ابھی کچھ وقت ہے..... تم بھی یہیں آدمی کے ساتھ ہی

وضو کرلو..... آج سے تم بھی ہمارے ساتھ ہی نماز کے لیے جایا کرو گے..... خدا نے تمہارے ابا کو تو توفیق نہیں دی کہ زندگی میں کبھی عید کی نماز ہی پڑھ جائیں..... چلو اچھا ہے اسی بہانے کم از کم ان کا بیٹا ہی نمازی بن جائے گا۔"

میرے ابا کو جانے کیوں ہمیشہ ہی سے راجہ کے ابا سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی تھی۔ آج وہ ان کی نماز نہ پڑھنے کی عادت کا رونا لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ابا راجہ کے ابا کی شان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ان کے جاتے ہی میں نے ایک زوردار چپت راجہ کے سر پر رسید کی اور غصے سے سرگوشی میں کہا۔

"یہ کیا حماقت کی تم نے..... تم یہاں میری جان بچانے کے لیے آئے تھے یا خود کو پھنسانے.....؟"

"کیا کرتا یار..... تمہارے ابا یوں اچانک سر پر آن پہنچے تھے کہ جلدی میں اور کچھ سمجھ ہی نہیں آیا..... آدی یار..... اب کیا ہوگا..... مجھے تو نماز کی سورتیں بھی پوری طرح سے یاد نہیں ہیں....."

اتنے میں عمارہ ہمارے سر پر پہنچ گئی اور ہمیں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر مشکوک سے لہجے میں بولی۔

"یہ کیا تم دونوں سر جوڑے بیٹھے ہو.....؟ چلو جلدی سے وضو کرو..... ابا انتظار کرتے ہوں گے۔"

ہم دونوں نے دانت پیس کر عمارہ کی جانب دیکھا لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے اسے کچھ کہا تو وہ وہیں سے آواز لگا کر ابا کو سب بتا دے گی۔ پوری تھالی کی بینگن تھی وہ اور اس نازک مرحلے پر ہم دونوں ہی مزید کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا چپ چاپ عمارہ کی ہدایات پر عمل کرتے رہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ابا اپنی تسبیح گھماتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور میں اور راجہ کسی معمول کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے چل دیئے۔

راستے میں ابا کو چند اور محلے کے نمازی بھی مل گئے، جو محلے کے ساتھ ملحق مسجد کے مستقل نمازی تھے۔ ابا ان کے ساتھ باتوں میں مشغول آگے آگے روانہ تھے اور میں اور راجہ سب سے آخر میں ان کے پیچھے۔ ابا کا معمول کچھ یوں تھا کہ پونے آٹھ بجے ہم مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور آٹھ بجے عشاء کی جماعت کے بعد سوا آٹھ بجے تک باقی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل آتے۔

میں اپنی قسمت اور راجہ کی عقل کو کوستا ہوا جیسے ہی "ابا پارٹی" کے پیچھے مسجد میں داخل ہونے لگا تو یکا یک راجہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ تب تک ابا اور ان کے دو دوست مسجد کا صحن پار کر چکے تھے۔ میں نے حیرت سے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں ابا مسجد کے اندرونی حصے میں واقع ہال میں داخل ہو گئے۔ میں نے راجہ سے اپنا بازو چھڑایا۔

"اب اندر بھی چلو گے یا یہیں باہر کھڑے رہ کر پوری نماز پڑھنے کا ارادہ ہے؟"

راجہ نے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"یہاں سے اب نمازی کتنے بجے چھوٹیں گے.....؟"

میں نے راجہ کو ڈانٹا۔

''کیا مطلب..... یہ مسجد ہے کوئی سینما گھر نہیں، جہاں سے لوگ شو دیکھنے کے بعد چھوٹتے ہیں۔''

راجہ نے اپنا سر ہلایا۔''ارے یار کیا فرق پڑتا ہے..... ایک ہی بات ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اب تمہارے ابا یہاں سے کتنے بجے باہر نکلیں گے.....؟''

''سوا آٹھ بجے تک..... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی ہمارے پاس آدھا گھنٹہ موجود ہے؟ ہم ٹھیک سوا آٹھ بجے یہاں پر موجود ہوں گے۔ مسجد کے اندر تمہارے ابا کو اتنے نمازیوں کی موجودگی میں بھلا کیا پتہ چلے گا کہ ہم اندر ہیں یا باہر صحن یا برآمدے میں چلو جلدی کرو۔ کہیں موٹر سائیکلوں کے کرتب نہ چھوٹ جائیں ہم سے۔''

راجہ مجھے ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں سے غفور چچا کے گھر کی طرف لے دوڑا۔ دل تو میرا بھی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا لیکن منہ دکھاوے کے لیے میں کچھ حجتیں پیش کرتا گیا لیکن راجہ بھی مجھے خوب جانتا تھا کہ یہ تمام تاویلیں میں خود اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے گھڑ رہا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں ہم دونوں ٹی وی کے سامنے اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے ''چپس'' کی شروعات دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی آٹھ بج کر دس منٹ پر پہلا وقفہ آیا راجہ نے مجھے کہنی ماری اور ہم دونوں غیر محسوس طریقے سے غفور چچا کے ہاں سے یوں نکلے، جیسے عام طور پر پانی وغیرہ پینے کے لیے دیگر ''ناظرین'' اٹھ کر باہر جاتے تھے۔ یہ طریقہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا بچہ ہماری جگہ پر قبضہ نہ کر لے۔ غفور چچا کے گھر سے نکلتے ہی میں نے اور راجہ نے سرپٹ دوڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں ہم مسجد کے بیرونی دروازے پر موجود تھے۔ راجہ نے جلدی سے اندر جھانک کر اطمینان کر لیا کہ میرے ابا کے جوتے اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کچھ ہی دیر میں جب ابا اندر سے نکلے تو میں نے اور راجہ نے نہایت ''سعادت مندی'' سے ان کے جوتے سیدھے کیے۔ ابا نے ہمیں دعا دیتے ہوئے جوتے پہنے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے اسی سعادت مندی سے چل پڑے، جس طرح ہم یہاں تک آئے تھے اور جیسے ہی ابا ہمارے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے ویسے ہی ہم الٹے پاؤں کسی گولی کی سی رفتار کے ساتھ بھاگتے ہوئے دوبارہ غفور چچا کے گھر میں آن موجود ہوئے۔ وقفہ ختم ہوئے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے اور ہماری جگہ ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ میں اور راجہ لپک کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور چند لمحے تو ہم دونوں سے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لی گئی کیونکہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد ہمارا دم بری طرح سے پھول چکا تھا۔

بہر حال راجہ کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا اور ہم دونوں کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ ابا کو ذرا بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ ہم دونوں نماز کے دوران مسجد میں موجود ہی نہ تھے۔ فلم ختم ہوئی تو میں اور راجہ باہر نکل آئے۔ راجہ نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مارا اور فخریہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

''کیوں آدمی پیارے..... مانتے ہو راجہ کے دماغ کو یا نہیں؟''

میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر راجہ کے سر کی بلائیں لے لیں کیونکہ اس کا شیطانی دماغ اسی سر کے اندر موجود تھا۔

نماز کی یہ چوری میری زندگی کی پہلی چوری تھی۔ میں نے اس کے بعد بھی بہت سی چوریاں کیں، بڑے بھیا کے گلک میں سے چار آنے اور دس پیسے نکالنے کی چوری، عمارہ کے بستے میں سے اس کی پسندیدہ خوشبودار مٹانے والی ربڑ کی چوری، باورچی خانے میں امی کے مختلف ڈبوں میں

چھپائے ہوئے گڑ کی چوری، اُبال کر رکھے گئے ٹھنڈے ہوتے ہوئے دودھ کے اوپر سے بالائی کی چوری اور جانے ایسی کتنی چوریاں لیکن ہر چوری کسی نہ کسی ایک مقام پر آ کر مجھے چھوڑنی ہی پڑی یا پھر مجھ سے خود ہی چھوٹ گئی لیکن اپنی پہلی چوری کو میں آج تک نہیں چھوڑ پایا۔ یہ لت مجھے کچھ اس طرح سے چمٹی کہ میں آج تک اپنی نماز اور اپنے مذہب میں چوریاں کرتا پھرتا ہوں۔

جانے نماز اور مذہب میں چوری کرنے کی یہ لت میرا پیچھا کب چھوڑے گی۔ جانے خود اپنے ہی اندر کی جانے والی اس نقب زنی کی شرمندگی اور اس عذاب سے میری جان کب چھوٹے گی..... جانے کب.....؟

کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنسی نوٹ..... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یکلخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت.....

اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہو گئے..... یا.....؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف و دہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیانک جبڑوں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں عمران اور سیکرٹ سروس کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا.....

کاغذی قیامت کتاب گھر کے **جاسوسی ناول سیکشن** میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلی مار

راجہ کا فارمولا انتہائی کامیابی سے جاری تھا اور ہم عشاء کی نماز سے یونہی جان چھڑا کر بچتے رہے حالانکہ ان دنوں میں کئی مرتبہ نماز پر وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑے بھیا کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہو چکی تھی۔ ہم ٹھیک وقت پر ابا کے مسجد سے نکلنے سے پہلے مسجد کے دروازے پر پہنچ جایا کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ ہم سے وقت کے اندازے میں کچھ چوک ہو ہی گئی۔ ہم جیسے ہی مسجد کی طرف جانے والی سڑک کا موڑ مڑنے لگے تو ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ابا دیگر نمازیوں کے ساتھ دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

دراصل یہ سب راجہ کی حماقت کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ''پابندیٔ وقت'' کو مزید سخت کرنے کے لیے کلو کباڑیئے کے ٹھیلے سے ملی ایک پرانی سی ہاتھ پر باندھنے والی گھڑی بھی پانچ روپے میں اس کی منتیں ترلے کر کے خرید لی تھی اور راجہ نے خاص طور پر عصر کے وقت مسجد جا کر میرے سامنے مسجد کی گھڑی سے اپنی اس ہاتھ والی گھڑی کا وقت ملا لیا تھا لیکن ہمیں کیا پتہ تھا کہ اس کلو کباڑیئے کی طرح اس کی دی ہوئی یہ بوسیدہ گھڑی بھی یوں لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہوگی۔ اس رات میں اور راجہ ''سٹار ٹریک'' جسے ہم ستاروں والی فلم کہتے تھے، دیکھنے میں مگن تھے۔ میں نے دو مرتبہ راجہ سے وقت پوچھا اور دونوں مرتبہ بے دھیانی میں آٹھ بج کر پانچ منٹ بتایا۔ جب تیسری مرتبہ بھی میرے پوچھنے پر راجہ کے منہ سے آٹھ بج کر پانچ منٹ نکلا تو ہم دونوں ہی زور سے چونکے۔ راجہ نے کلائی پر بندھی گھڑی کو غور سے دیکھا اور زور سے چلایا۔

''ابے..... یار مارے گئے.....''

سب لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جلدی سے راجہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر بند گھڑی کی رکی ہوئی سوئیاں مجھے دکھائیں اور ہم دونوں اصطبل سے بھاگے ہوئے گھوڑوں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے غفور چچا کے گھر سے نکل کر مسجد کی جانب بھاگے۔ راستے میں راجہ اپنی بیٹی کے گھر سے واپس لوٹتی ہوئی مُحسن بوا سے زور سے ٹکرا بھی گیا۔ دراصل اس میں میرا اور راجہ کا اتنا قصور نہیں تھا جتنا مُحسن بوا کے بڑے سے شٹل کاک برقعے کا تھا، جس کا گھیرا اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ مشرق سے مغرب تک ہر سمت صرف ان کا برقعہ ہی بکھرا نظر آتا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے کالونی سے نکل رہے تھے اور مُحسن بوا سائیکل رکشہ والے کو صلواتیں سناتیں محلے میں داخل ہو رہی تھیں۔ موڑ مڑتے ہی وہ ہم دونوں کے سامنے آ گئیں۔ میں تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح جھکائی دے کر ان کے خیمہ نما برقعے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن راجہ پوری کوشش کے باوجود ان کے برقعے کی زد میں آ ہی گیا۔ مُحسن بوا کے منہ سے زور سے ایک لمبی اور اونچی ''ہائے'' کی آواز نکلی۔ پہلے ان کی چٹائی کی بنی ہوئی ٹوکری فضا میں بلند ہوئی، اس کے بعد ان کا سال خوردہ پلاسٹک والے فریم کا موٹا سا چشمہ اور پھر مجھے صرف اتنا ہی نظر آیا کہ راجہ ان کے برقعے میں کچھ اس طرح

سے گڈمڈ ہوا کہ کچھ دیر تک پتہ ہی نہیں چل پایا کہ ان میں سے مُحسن بوا کون سی ہے اور راجہ کدھر ہے؟ ایسا لگتا تھا، جیسے کسی بہت بڑے خیمے میں کوئی جنگلی بھینسا آن گھسا ہو۔ اگلے ہی لمحے راجہ مُحسن بوا سمیت سڑک پر الٹا ''دھرا'' ہوا تھا۔ مُحسن بوا کے منہ سے مغلظات کا ایک ریلہ تھا، جو نکلے جا رہا تھا لیکن چونکہ ان کا چشمہ بھی اتر کر سڑک کے درمیان کہیں پڑا ہوا تھا لہٰذا انہیں میں اور راجہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دے پائے۔ وہ ہائے ہائے کرتے ہوئے ہمیں صلواتیں سنائی جا رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کے برقعے کے اندر سے راجہ کو کسی طرح ڈھونڈ کر نکالا جو ابھی تک بدحواسی سے یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔ اسے کھڑا کر کے میں نے جلدی سے بوا کا چشمہ اٹھا کر انہیں پکڑایا اور اس سے پہلے کہ وہ چشمہ اپنی آنکھوں پر لگا کر ٹھیک سے ہمیں دیکھ پاتیں، ہم دونوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔

لیکن اسی تمام کش مکش میں الجھتے اور گرتے پڑتے جب ہم نے مسجد کا موڑ کاٹا تو ابا کو مسجد کے دیگر نمازیوں سمیت باہر نکلتے دیکھ کر میری تو سٹی ہی گم ہو گئی۔ ابا کی نظر ابھی تک ہم پر نہیں پڑی تھی۔ ان کے پیچھے بڑے بھیا بھی سر پر اونی ٹوپی پہنے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ میں اور راجہ اپنی جگہ پر جیسے جم کر ہی رہ گئے اور پھر اچانک ہی راجہ نے جلدی سے اپنا رخ اسی طرف پلٹ لیا اور میرے گلے میں بھی بانہیں ڈال کر مجھے بھی اسی جانب موڑ لیا جس طرف سے ہم بھاگتے ہوئے مسجد کی جانب آ رہے تھے۔ اب دور سے ابا کی نظر پڑی تو انہیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ان سے کچھ دیر پہلے ہی مسجد سے نکل کر اچھے دوستوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈالے واپس گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور چند لمحوں کے وقفے میں ہوا کہ خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ ابھی ہم نے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے ہم دونوں کا خون خشک کر دیا۔

''یہ تم دونوں کہاں بھاگے جا رہے ہو، کوئی ٹرین چھوٹ رہی ہے کیا۔ یہاں آؤ اور اپنے بھیا کے ساتھ ساتھ چلو.....''

میری اور راجہ کی سانس میں سانس آ گئی۔ مطلب ابا کو پتہ نہیں چلا تھا کہ ہم مسجد میں موجود نہیں تھے۔ جانے خدا کو ہماری کون سی نیکی یاد آ گئی تھی۔ بہرحال ہم دونوں بھاگتے ہوئے ابا کے پیچھے چلتے ہوئے بھیا سے قدم ملا کر چلنے لگے لیکن ایک دوسری مصیبت ہماری تاک میں بیٹھی تھی۔ قاری بھیا نے غور سے مجھے اور راجہ کو دیکھا اور مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''تم دونوں نے کب نماز پڑھی.....؟ میں نے تو تم لوگوں کو مسجد میں کہیں نہیں دیکھا.....؟''

میں نے گھبرا کر راجہ کی طرف دیکھا، یہ تو شکر تھا کہ ابا کسی اور نمازی سے باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے ورنہ بھیا کی آواز ان کے کانوں تک ضرور پہنچ جاتی۔

راجہ نے فوراً بھیا سے پوچھا۔

''آپ کہاں کھڑے تھے جماعت کے وقت؟''

بھیا راجہ کے جھانسے میں آ گئے اور بول پڑے ''تیسری صف میں، اندر۔''

''ہاں تو بھلا آپ ہمیں کیسے دیکھ پاتے۔ میں اور آدی تو باہر برآمدے میں کھڑے تھے۔''

اس وقت تو راجہ نے بھیا کو لاجواب کر دیا لیکن کاش ہم دونوں اسی لمحے یہ بھی جان پاتے کہ یہ مصیبت ابھی ٹلی نہیں ہے تو کتنا اچھا ہوتا۔

ابا کے گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی میں اور راجہ بھاگ کر غفور چچا کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ بھیا کے دل میں شک جڑ پکڑ چکا تھا اور اگلے چند دن تک ہماری باقاعدہ نگرانی کرنے کے بعد وہ میرے اور راجہ کے ''بے داغ'' منصوبے سے واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے عمارہ کو بھی بتا دیا تھا کہ عشاء کی نماز کے وقت میں اور راجہ کہاں پائے جاتے ہیں لیکن ابھی تک ان دونوں کو کوئی مناسب موقع نہیں مل پایا تھا کہ وہ ابا کے سامنے نمبر بنانے کے لیے میری شکایت لگا سکیں۔

لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی.....؟ ایک رات ابا کچھ پہلے ہی نماز کے لیے نکل پڑے۔ اتنے عرصے میں اب انہیں اس بات کا اطمینان ہو چکا تھا کہ میں راجہ کے ساتھ خود مسجد پہنچ جاؤں گا۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے اور راجہ کو جو گلی میں میرے ساتھ کھڑا کسی عیسائی بچے کا انتظار کر رہا تھا کہ ادھر سے گزرے تو ہم اس کی خبر لے سکیں، کچھ کہا لیکن ہم دونوں ابا کی بات پر دھیان نہیں دے سکے، صرف اتنا ہی سمجھ میں آیا کہ نماز کے لیے آ جانا۔

راجہ نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ میں اور راجہ ابا کے جانے کے بعد سیدھے غفور چچا کے ہاں پہنچ گئے۔ نیرہ نور کی مدھر آواز ''جلے تو جلاؤ گوری'' پر ہم کافی دیر تک سر دھنتے رہے لیکن ہم دونوں کو خبر نہ تھی کہ آج خود ہمارے پرسکون آشیانے کے پروں کے جلنے کا وقت آ چکا ہے۔ سوا آٹھ بجنے سے ایک منٹ پہلے میں اور راجہ بھاگتے ہوئے مسجد کے دروازے پر جا پہنچے لیکن یہ کیا؟ مسجد تو بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔ ایک نمازی بھی اندر موجود نہیں تھا۔ میرے اور راجہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اتنے میں مولوی صاحب اپنے حجرے سے کھنکارتے ہوئے باہر نکلے اور ہمیں یوں دروازے میں گم سم کھڑا دیکھ کر وہیں سے بولے۔ ''بچو..... تم لوگ دیر سے آئے ہو، نماز تو کب کی ہو چکی.....''

پتہ یہ چلا کہ بڑھتی سردیوں کے ساتھ ہی نماز کے اوقات میں پیچھے کی جانب تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور آج نماز پونے آٹھ بجے ہی ہو گئی تھی۔ مطلب یہ کہ ابا آٹھ بجے گھر واپس جا چکے تھے۔ مجھے مولوی صاحب پہ شدید غصہ آیا۔ اگر نماز کے اوقات تبدیل کرنا ہی تھے تو پہلے ہی کسی اونچی جگہ پر لکھ کر لگانا چاہیے تھا۔ ضرور انہوں نے کل رات جماعت ہونے کے بعد نماز کے اوقات تبدیل ہونے کا اعلان کیا ہوگا۔ ابا یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے کل ہونے والا اعلان سن لیا ہوگا اور شاید جاتے ہوئے گلی میں انہوں نے مجھ سے اور راجہ سے یہی کہا تھا کہ جلدی مسجد پہنچ جائیں۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ راجہ نے رقت بھری آواز میں مولوی صاحب سے درخواست کی کہ آئندہ جب کبھی نظام الاوقات بدلنے ہوں تو براہِ مہربانی مسجد کی بیرونی دیوار پر بھی لکھ کر لگوا دیا کریں تا کہ ہم جیسے ''گناہ گار'' نمازیوں کو بھی وقت کی اس تبدیلی کا پتہ چل سکے۔ جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مولوی صاحب سے کہوں کہ ہماری آج کی رات خیریت سے گزرنے کی دعا سب سے پہلے کریں کیونکہ میں جانتا تھا کہ آج کی رات کم از کم مجھ پر بے حد بھاری گزرنے والی تھی۔ سارے راستے راجہ مجھے تسلیاں دیتا رہا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی گلی کے نکڑ پر میں نے اسے گلے لگا کر اپنی آہوں اور سسکیوں میں رخصت کیا۔ آہیں راجہ کی تھیں اور سسکیاں میری، جو میرے منہ سے ابا کی مار کا سوچ کر ہی پہلے سے نکل رہی تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے برآمدے میں غصے سے ٹہلتے ہوئے ابا پہ میری نظر پڑی۔ انہوں نے غصے سے ہنکارا بھرا۔

''آ گئے جناب..... بڑی لمبی نماز پڑھی آج تو میرے لعل نے۔'' میں منہ ہی منہ میں بدبدایا۔

''جی.....وہ.....میں.....جی.....''

ابا گرجے۔''یہ کیا جی جی لگا رکھی ہے.....اور وہ دوسرا لوفر کہاں ہے، جو تمہارے ساتھ روزانہ گھر سے نماز کا کہہ کر نکلتا ہے۔''

مطلب یہ کہ اگر ابا نے راجہ کو دوسرا لوفر کہا تھا تو یقیناً انہوں نے پہلے لوفر کے درجے پر مجھے ہی فائز کر رکھا ہوگا۔ میں ابھی اپنے ذہن میں اس درجہ بندی میں مصروف ہی تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''میں پوچھتا ہوں کہاں تھے نماز کے وقت.....ذرا شرم نہیں آتی یوں اللہ کے گھر سے بھاگتے ہوئے تمہیں، کب سے دھول جھونک رہے ہو ہماری آنکھوں میں.....؟''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ عمار اور بھیا برآمدے کے ستونوں کے پیچھے سے نکل آئے اور عمارہ نے الف سے لے کر ی تک تمام داستان امیر حمزہ ابا کے گوش گزار کر دی۔ بھیا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے کہہ رہے ہوں'' دیکھ لیا نا بچو۔ یہ انجام ہوتا ہے میرے گلک سے پوچھے بنا پیسے نکالنے کا۔ اب بھگتو۔''

عمارہ بولتی گئی اور ابا کا پارہ آسمان کی آخری حدوں کو چھونے کے درجے کو پہنچتا گیا۔ ایسے موقعوں کے لیے خاص ''چھڑی'' بھیا نے پہلے ہی برآمدے میں لا کر رکھ دی تھی تاکہ بعد میں ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں ابا کی وہ چھڑی ٹوٹ کر مجھ پر برس رہی تھی۔ اس رات تو امی کی مداخلت بھی کام نہ آئی۔ بالآخر جب امی نے ابا کی چھڑی کی ضربیں خود اپنے ہاتھ پر سہنا شروع کر دیں اور اپنے ہاتھوں کو میرے جسم کی مستقل ڈھال بنا لیا تب ابا کو رکنا ہی پڑا۔

یہ پہلی مار تھی جو ابا کے ہاتھوں اس رات مجھے پڑی تھی۔ اس کے بعد بھی مجھے بہت بار مار پڑی۔ کبھی ابا کے ہاتھوں، کبھی اپنے درس دینے والے مولوی کے ہاتھوں، کبھی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے ہاتھوں لیکن ان میں سے سب سے بُری مار وہ تھی، جو اس زمانے اور وقت نے مجھے ماری۔ شاید اس دنیا میں سب سے بڑی مار اس زندگی کی مار ہوتی ہے۔ آگے چل کر زندگی نے مجھے بہت مارا۔ ہر موڑ پر اُٹھا اُٹھا کر پٹخا۔ میرا جسم میری روح جانے کتنی بار لہولہان ہوئی اس کی میں گنتی بھی بھولتا گیا۔ کاش زندگی، زمانے اور وقت کی مار بھی اُس رات ابا کی مار جیسی ہوا کرتی، جس سے بچانے کے لیے امی کے محافظ ہاتھ ہمیشہ میری ڈھال بن جایا کرتے تھے لیکن وقت کے ان بے رحم تھپیڑوں سے بچانے کے لیے امی کے مہربان ہاتھ ہمیشہ اور ہر جگہ میری ڈھال نہیں بن پائے۔ زخم پر زخم لگتا رہا اور میں اپنے مقدر کی مار سہتا چلا گیا۔

پہلا ڈاکہ

اُس رات کی ابا کی مار اور ان کی چھڑی کے نشانات بہت دنوں تک میرے جسم کی زینت بنے رہے۔ راجہ نے جب میری پیٹھ پہ یہ نشانات دیکھے تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ میں ابا کا سگا بیٹا نہیں ہوں اور ضرور انہیں کسی میلے وغیرہ سے ملا ہوں گا، جہاں اپنے اصل ماں باپ سے بچھڑ کر میں کسی جھولے میں ٹنگا رو رہا ہوں گا اور ابا کو مجھ پر رحم آ گیا ہو گا اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے ہوں گے۔ راجہ کے اس ''یقین کامل'' کی وجہ حال ہی میں ریگل سینما میں لگی محمد علی اور شاہد کی نئی فلم ''جوش'' تھی، جس میں ہیرو اپنے گھر والوں سے ٹھیک یوں ہی بچھڑ جاتا ہے اور پھر جوان ہونے کے بعد اسے اپنے اصلی ماں باپ واپس مل جاتے ہیں۔ راجہ نے کئی قسطوں میں چھپ کر یہ فلم دیکھی تھی اور اسے محمد علی کے تمام مکالمے زبانی یاد بھی تھے۔ راجہ کے بقول اسے تو میرے نازک انداز و اطوار دیکھ کر پہلے دن سے ہی پکا یقین تھا کہ میں کسی نہایت امیر و کبیر گھرانے کا چشم و چراغ ہوں جو نہ جانے کیسے اس غریب محلے میں آ پہنچا تھا۔

میں ابھی حیرت سے منہ کھولے راجہ کی یہ تھیوری سن رہا تھا کہ اچانک ہی راجہ نے زور سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انتہائی جذباتی لہجے میں اس نے مجھ سے یہ وعدہ کرنے کو کہا کہ جب کبھی میرے اصل ماں باپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ پہنچیں اور میں ان کی لمبی سی مرسڈیز گاڑی میں اس محلے سے رخصت ہونے لگوں تو جاتے جاتے راجہ کو بھی اپنے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر لیتا چلوں کیونکہ میرے بغیر اس کا دل بھلا اس جگہ پھر کیوں کر لگے گا؟

میں نے بھی فوراً اسی قدر جذباتی لہجے میں راجہ سے وعدہ کیا کہ میں ہرگز اسے لیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بھلا امی کے بناء میرا دل وہاں کیسے لگ پائے گا۔ لہٰذا میں نے امی کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عمارہ اور بڑے بھیا میرے ساتھ وہاں نہ ہوئے تو میں اپنی امارت کا رعب کس پر ڈالوں گا اور روزانہ میری لڑائی کس سے ہو گی؟ لہٰذا طے یہ پایا کہ عمارہ اور بڑے بھیا کو بھی شدید دشمنی کے باوجود ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ اگر ہم سب ہی یہاں سے چلے گئے تو پھر ابا اکیلے یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ ان کی سائیکل روزانہ کون صاف کرے گا؟ شام کو انہیں حقہ کون بھر کر دے گا؟ مانا کہ آج کل ان کا سلوک مجھ جیسے ''امیر گھرانے'' کے بچے کے کچھ شایان شان نہیں ہے لیکن کبھی کبھی شام کو وہ مجھے اپنی سائیکل کے ڈنڈے پر لگائی ہوئی چھوٹی والی گدی پر بٹھا کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو بھی تو لے جایا کرتے تھے اور ابھی پچھلے ہی مہینے انہوں نے مجھے سرخ اور پیلے رنگ کا بنا بڑا سا سیسنا جہاز کا کھلونا بھی تو خرید کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کے مقابلے میں اس ذرا سی مار کی حیثیت اب مجھے ٹانوی سی لگنے لگی تھی لہٰذا طے یہ پایا کہ میں، راجہ اور ابا سمیت اپنے تمام گھر والوں کو اپنے ''ہونے والے بنگلے'' میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے اصل اور امیر ماں باپ میری یہ ''معصوم سی خواہش''

کبھی رد نہیں کریں گے بلکہ میں نے اور راجہ نے تو پکا طے ہی کر لیا کہ اگر انہوں نے ابا یا راجہ کو ساتھ لے جانے میں ذرا بھی آنا کانی کی تو میں بھی ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گا۔

لیکن فی الحال مجھے اپنے اصلی ماں باپ کی تلاش سے بھی بڑی ایک اور فکر لاحق تھی اور وہ فکر تھی وہ جو آپی کا سامنا کرنے کی، جانے کب عمارہ نے میری مار کا تمام قصہ وہ آپی کے گوش گزار کر دیا تھا۔ دراصل عمارہ بھی میرے ساتھ ہی استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھنے جایا کرتی تھی اور مجھ سے چار سپارے آگے بھی تھی۔ ابا کی مار کے بعد میں ایک آدھ دن "انتقاماً" استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھنے نہیں گیا۔ تبھی ان دنوں میں بدقسمتی سے وہ آپی کسی کام سے استانی خالہ کے ہاں آئیں اور مجھے نہ پا کر عمارہ سے میرے بارے میں پوچھ بیٹھیں۔ بس پھر کیا تھا عمارہ کو تو ویسے بھی ہمیشہ میری "عزتِ نفس" دوسروں کے سامنے مجروح کرنے میں بے حد مزا آتا تھا اور اس دن تو وہ ویسے بھی مجھ سے لڑ کر گئی تھی کیونکہ میں نے اس کی کاپی پر "بے دھیانی" میں سیاہی الٹ دی تھی۔ عمارہ نے خوب نمک مرچ لگا کر وہ آپی کو اس رات کا سارا قصہ سنا دیا اور پھر واپس آ کر مجھے بھی بتانے لگی کہ وہ آپی مجھے اپنے گھر بلا رہی ہیں۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ہی ٹھنک گیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو پوری دال ہی کالی ہے۔ دو چار دن تو میں وہ آپی سے نظر بچا گیا لیکن پھر ایک دن جب ہم محلے کے بڑے میدان میں اسٹاپو کھیل رہے تھے اور کھیل میں اس قدر مگن تھے کہ ہمیں وہ آپی کے تانگے کے آنے تک کا پتہ نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا، جب مجھے فضلو بابا کی آواز سنائی دی، جو تانگے والے سے کرائے پر بحث کر رہے تھے۔ گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو وہ آپی بڑی سی چادر لپیٹے تانگے سے اتر رہی تھیں۔ میں فوراً وہاں سے رفو چکر ہونے کی نیت سے بھاگا لیکن دوسرے ہی لمحے میری کلائی وہ آپی کی نازک گرفت میں تھی۔

"آدی..... کہاں بھاگے جا رہے ہو..... میرے ساتھ گھر چلو..... اماں نہ جانے کتنے دن سے تمہارے لیے ماش کی دال کا حلوہ بنائے بیٹھی ہیں۔ روز تمہارا پوچھتی ہیں۔"

سکینہ خالہ ماش کی دال کا حلوہ واقعی بہت لذیذ بناتی تھیں لیکن اس وقت مجھے یہ ترغیب بھی لبھا نہیں سکتی تھی لیکن اب کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ آپی اسی طرح میرا ہاتھ تھامے مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے اپنی اماں کو آواز لگا کر مطلع کر دیا کہ میں یعنی جناب آدی صاب ان کے ساتھ ہی تشریف لے آیا ہوں لہٰذا میرے لیے بھی شام کی چائے بنائی جائے۔

سکینہ خالہ کو ہدایات دینے کے بعد وہ آپی نے مجھے اپنے سامنے پڑی چوکی پر بٹھا لیا اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے اچانک ہی پوچھ بیٹھیں۔

"آدی..... یہ میں تمہارے بارے میں کیا سن رہی ہوں.....؟ سچ کہوں تو تم سے ایسی امید مجھے ہرگز نہ تھی۔"

میں ان کے اس اچانک حملے سے گھبرا گیا اور پھر میرے دل کے دوسرے چور نے بھی اسی لمحے سر اٹھایا، کہیں انہیں طاہر بھائی نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ اس روز ان کے گھر انگوروں کی پرات نہیں پہنچی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ انگوروں والا ماجرا تو میں بھلائے ہی بیٹھا تھا اب جو وہ آپی سامنے آئیں تو اچانک ہی میری نظروں کے سامنے انگور کے گچھے لہرانے لگے تھے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ''جی..... کیا.....؟''

تب وجو آپی نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''مجھے تمہاری نماز چوری والے راز کے بارے میں سب پتہ ہے۔ کتنی بری بات ہے آدی۔ بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟ میں جانتی ہوں یہ ساری شرارت اس راجہ کی ہوگی۔ میری مانو تو اس راجہ سے دور ہی رہا کرو۔ وہ تو ہے ہی سدا کا شرارتی..... تمہیں بھی اپنی طرح کا بنا ڈالے گا جب کہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارا آدی بہت اچھا بچہ ہے۔''

کتنی عجیب بات تھی کہ دنیا میں ہر کسی کو اپنا بچہ ہی سب سے زیادہ شریف معصوم اور اللہ میاں کی گائے نظر آتا ہے۔ راجہ اکثر مجھے بتاتا تھا کہ اس کی اماں اسے پپو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ پپو کی امی کو گڈو سے شکایت تھی اور گڈو کے ابا اسے راجہ سے دور رہنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ان بڑوں کی آپس میں تو کبھی بنتی نہیں تھی الٹا یہ سب مل کر ہم بچوں کے اتحاد و اتفاق کو تباہ کرنے کے درپے رہتے تھے لیکن شکر ہے کہ ہم سب بچوں کو ان ''خرافات'' میں پڑنے کی بالکل بھی عادت نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے گھر والوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے لیکن آج بات ہمارے گھر والوں میں سے کسی بڑے کی نہ تھی۔ آج تو وجو آپی نے خود مجھ سے یہ بات کہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے انہوں نے بہت بڑے ''دھرم سنکھٹ'' میں ڈال دیا تھا۔ راجہ ویسے ہی میری وجو آپی کی جانب بے تحاشہ توجہ سے بہت چڑتا تھا۔ اگر اسے یہ بات پتہ چل جاتی کہ وجو آپی نے مجھے اس کے ساتھ کھیلنے سے منع بھی کر دیا ہے تو پھر تو بھونچال ہی آ جاتا۔ بہر حال اس وقت تو میں چپ ہی رہا کیونکہ میں فی الحال بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ سوچا کسی وقت فرصت میں وجو آپی کو تفصیل سے پوری بات اور راجہ کی خوبیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس وقت ان کے پوچھنے پر میں نے ان سے صرف اتنا ہی کہا کہ ''میرا دل نہیں لگتا نماز میں۔'' اتنے میں سکینہ خالہ چائے لے کر آ گئیں اور بات ٹل گئی۔

وجو آپی کے گھر سے باہر نکلا تو راجہ کو وہیں ٹہلتے پا کر میں کچھ گھبرا سا گیا۔ راجہ نے حسب معمول چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یار ایک تو جب تمہیں تمہاری یہ وجو آپی بلا لیتی ہیں تو تمہیں دنیا کی کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہہ رہی تھیں.....؟''

''کچھ نہیں..... عمارہ کی بچی نے نماز کی مار والا سارا قصہ انہیں بتا دیا ہے۔ اسی وجہ سے بلایا تھا۔ بڑی بے عزتی ہو گئی یار اپنی۔''

راجہ نے بھی یہ سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم دونوں نے اسی وقت عہد کیا کہ موقع ملتے ہی عمارہ سے ایسا بدلہ لیں گے کہ وہ بھی ساری زندگی یاد رکھے گی۔ عمارہ کو رینگنے والے کیڑوں مثلاً لال بیگ، چھپکلی وغیرہ سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ میں نے راجہ کو کہیں سے بھی ایک عدد موٹی تازی چھپکلی کا انتظام کرنے کو کہا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھتے ہوئے راجہ انگور کی بیل کے اوپر سے کسی طرح اس چھپکلی کو عمارہ کے اوپر گرائے گا۔ اس کے بعد عمارہ کا خوف کے مارے جو حشر ہوتا اس سے میں اور راجہ خوب واقف تھے۔ ہم کافی دیر تک وہیں کھڑے اس منصوبے کی جزئیات طے کرتے رہے اور ہمارے انتقامی جذبے اور خیالات کو کافی حد تک وہیں کھڑے کھڑے سوچ کر ہی کافی تسکین مل گئی۔ اتنے میں مغرب کی اذان سنائی دی تو ہم دونوں مسجد کی جانب دوڑ پڑے، کیونکہ آج کل ایک نئی افتاد ہم پر پڑی ہوئی تھی۔ ابا نے باقاعدہ ہماری مسجد میں حاضری لگانا شروع کر دی تھی۔ ان کے حاضری لگانے کا انداز بھی عجیب تھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد گھر میں گھستے ہی ان کا پہلا سوال ہوتا۔

''ہاں میاں.....نماز کے لیے آئے تھے یا نہیں.....؟''

میں منمنا تا ''جی آیا تھا۔''

ابا گھور کر پوچھتے ''کون سی صف میں کھڑے تھے۔''

''جی چوتھی صف میں۔''

''ہوں.....اور میں کہاں کھڑا تھا۔''

''جی آپ پہلی صف میں.....مولوی صاحب کے بائیں جانب۔''

''اچھا تو بتاؤ مولوی صاحب نے پہلی اور دوسری رکعت میں کون سی سورۃ پڑھائی تھی.....؟''

''جی پہلی رکعت میں سورۃ فیل اور دوسری میں قل ہواللہ۔''

یوں ابا مطمئن ہو کر ایک لمبا سا ''ہوں'' کرتے اور اس دن کے لیے میں اس پل صراط کو پار کر جاتا لیکن روز روز یہ مقابلے کا امتحان سے بھی بڑا امتحان پاس کرنا اب میرے لیے کافی کٹھن کام ثابت ہونے لگا تھا کیونکہ میرے اور راجہ کے دل کا چور اب بھی ہمیں نماز کی چوری پر اکساتا رہتا تھا۔ خاص طور پر جس دن ٹی وی پر ''بائیونک دومن'' یا غائب ہو جانے والے ''جمنی مین'' Gmni Man کا کھیل چلنا ہوتا اس دن تو ہمارے پیٹ میں گویا مستقل درد ہی رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ راجہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری تو مجبوری ہے کیونکہ میں رہتا ہی ابا کے گھر میں ہوں لہٰذا ان کا سامنا ہونا لازمی ہے لیکن اسے تو اس پیشی سے بچنے کے لیے صرف ابا کے سامنے آنے سے گریز کرنا ہوگا پھر وہ کیوں اپنی ساری تفریح کا بیڑہ غرق کر کے اپنا مزہ کرکرا کرتا ہے۔ چپ چاپ جا کر غفور چچا کے ہاں مزے سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ لیا کرے لیکن راجہ میری اس بات پر باقاعدہ مجھ سے روٹھ گیا کہ کیا وہ ''اس قدر گر گیا ہے کہ اب اکیلے ٹی وی دیکھنے جایا کرے گا؟'' بڑی مشکل سے میں نے راجہ کو منایا کہ میرا مطلب وہ نہیں تھا، جو وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ بہر حال ہمارا مسئلہ اپنی جگہ قائم تھا۔

اس شام بھی ہم دونوں سر جوڑے بیٹھے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی حل سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے سامنے سے مولوی سعید سائیکل پر اپنے بیٹے اختر کو بٹھائے گزرے۔ اختر کو بھی ہم بچے مولوی اختر کے نام سے ہی پکارتے تھے کیونکہ وہ ہر بات میں اپنے ابا کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولوی سعید صاحب نکاح خواں تھے اور باقاعدہ کسی مسجد کے مولوی نہ ہونے کے باوجود سب انہیں مولوی ہی کہتے تھے۔ میں نے اور راجہ نے اچانک سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاید ہم دونوں کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی بات کسی بجلی کی طرح کوندی تھی۔ میں نے فوراً اپنا جیب الٹا، میرے پاس آٹھ آنے اور راجہ کی جیب سے کوئی ایک روپے کے قریب سکے نکلے۔ ہم دونوں وہ ڈیڑھ روپیہ لیے کچھ ہی دیر میں مولوی سعید کے دروازے پر کھڑے تھے اور اختر ہمارے سامنے حیران پریشان سا کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

''میں سمجھا نہیں.....مجھے کرنا کیا ہوگا.....؟''

راجہ نے سکے اپنی مٹھی سے اس کی ہتھیلی میں منتقل کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''کوئی مشکل کام نہیں ہے پیارے، صرف مسجد میں اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ آدی کے ابا کون سی صف میں اور کس نمبر پر کھڑے ہوتے ہیں اور یہ کہ مولوی صاحب نماز کے دوران کون سی سورتیں پڑھاتے ہیں۔ نماز ختم ہوتے ہی ہم مسجد کے باہر تمہارا انتظار کرتے ملیں گے۔ تم یہ ساری معلومات ہمیں دینے کے بعد ہی گھر واپس آؤ گے..... کیا سمجھے.....؟''

مولوی اختر نے پیسے اپنے کُرتے کی جیب میں ڈالے اور دانت نکالتے ہوئے سر ہلا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے قدرت نے پھر ہماری اس نماز چوری کا بندوبست کروا دیا تھا۔ اب اختر مسجد سے باہر نکلتا تو میں اور راجہ کاغذ، پنسل لیے اس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ اختر جلدی جلدی ہمیں ابا کی پوزیشن اور باقی معلومات فراہم کرتا اور میں اور راجہ اسے رٹا لگاتے ہوئے گھر کی جانب بھاگتے۔ کبھی کبھی وہ کم بخت اختر سورتوں کی ترتیب بھول جاتا اور ہماری جان تب تک اٹکی رہتی، جب تک ہم ابا کے وائیوا Viva (زبانی امتحان) سے گزر نہ جاتے۔ بھیا نے بیچ میں ایک آدھ بار ہمیں پکڑوانے کی ناکام کوشش کی لیکن ہمیں یہ سب کیسے پتہ چلتا تھا یہ بات وہ بھی کبھی نہ جان پائے کیونکہ ہماری معلومات سو فیصد پکی ہوا کرتی تھیں۔ راجہ نے اس معاملے میں کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں ہم دونوں کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آسکی کہ ہم اس تمام عمل میں جس مشقت سے گزر رہے ہیں اور تو اور اپنا جیب خرچ بھی اس لالچی اختر کی جیبوں میں بھر رہے ہیں۔ اوپر سے ہر لمحہ ابا کا ڈر اور پکڑے جانے کا خوف الگ۔ اس تمام عذاب سے تو کہیں آسان تھا کہ ہم سیدھے سبھاؤ مسجد میں جا کر خود ہی نماز پڑھ لیتے کیونکہ اختر کو درمیان میں ''ملوّث'' کرنے کے بعد کبھی کبھی تو ہمارا اس سے بھی کہیں زیادہ وقت ضائع ہو جاتا تھا جتنا اس صورت میں ہوتا، جب ہم سیدھے مسجد جا کر خود نماز پڑھ کر نکل آتے لیکن ہمارے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ یہ چوری تو ہمیں کچھ دینے کے بجائے خود ہم سے ہمارا بہت کچھ چھین رہی تھی، الٹا ہماری اپنی جیبوں پر بھاری پڑ رہی تھی۔ دنیا میں کس چور نے ایسی چوری کی ہوگی جس کے بعد ہر بار وہ خود ہی لٹا ہو۔ شاید میں اب تک بھی یہ بات نہیں سمجھ پایا کہ بہت سی چوریاں ایسی ہوتی ہیں جو خود اپنے اندر ہی ڈاکہ مارنے کے مترادف ہوتی ہیں۔ میرا اپنے اندر کا یہ ڈاکہ، یہ فریب، یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ کبھی ایک صورت میں، تو کبھی کسی دوسری صورت میں..... چاہے کچھ ہو جائے پر میرے اندر کا ڈاکو، ڈاکہ مارنے سے باز نہیں آتا۔

اپالو

اپالو کہانی ہے حسن و عشق کے دیوتا اور تباہی و بربادی کی علامت اپالو کی..... ایک عالم اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا..... قدم قدم پہ موت اس کی راہ میں جال بچھائے بیٹھی تھی..... اپالو..... جسے خود اپنی تلاش تھی اور خود آگہی کی جدوجہد میں وہ ساری دُنیا گھوم گیا..... پراسرار حالات میں غیر معمولی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک **اپالو** کیا اپنی تلاش میں کامیاب ہوا؟

اپالو کتاب گھر کے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلا بائی سکوپ

جس دن سے راجہ نے یہ انکشاف کیا تھا کہ میرے امی ابا میرے سگے ماں باپ نہیں ہو سکتے اس دن سے محلے میں کوئی بھی کھیل کھیلتے ہوئے ہماری نظر جب بھی محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوتی ہوئی کسی لمبی چوڑی امپالا، شیورلے یا فیاٹ کار پر پڑتی تو میں اور راجہ کھیل چھوڑ چھاڑ کر اس گاڑی کا طواف کرنے لگ جاتے۔ ہم دونوں کو اب بھی پورا یقین تھا کہ ایسی ہی کسی بڑی گاڑی میں کسی دن ہماری قسمت کے مسیحا بھی ہمیں لینے آ جائیں گے۔ راجہ، صاحب لوگ اور میم صاحبہ کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی جلدی سے مجھے گاڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا اور میں انتہائی معصوم سی شکل بنا کر اس وقت تک ان کے سامنے پلکیں پٹ پٹاتا رہتا جب تک ان لوگوں کی مجھ پر نظر نہیں پڑ جاتی تھی۔ دراصل میں اور راجہ چاہتے تھے کہ اگر وہ بڑی گاڑی والے صاحب اور میم میری ہی تلاش میں ہمارے محلے میں آئے ہیں تو پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پہچان جائیں لیکن درجنوں جوڑوں کے دیکھنے کے باوجود میں کسی کا ''مطلوبہ کھویا ہوا بچہ'' ثابت نہ ہوا۔ کبھی کسی میم یا صاب کی نظر مجھ پر پڑ بھی جاتی تو ''ہاؤ سویٹ'' کہہ کر میرے گال کھینچ کر آگے بڑھ جاتے، ایک آدھ نے چاکلیٹ بھی تھما دی اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں اور راجہ ویسے تو محلے کے سب سے فیشن ایبل بچے تھے اور ہماری امیاں ہمیں خوب چمکا کر اور کنگھی پٹی کر کے گھر سے باہر نکالتی تھیں۔ میری امی کو تو ہمیشہ مجھے کسی کی نظر لگ جانے کا ڈر رہتا تھا لہٰذا وہ میرے ماتھے، ناک یا گال پر ایک آدھ کالا ٹیکہ لگا کر گھر سے باہر بھیجتی تھیں لیکن اس دن میں اور راجہ استانی خالہ کے ہاں سے سبق پڑھ کر سیدھے محلے کے بڑے میدان میں دھوپ گرم کھیلنے کے لیے آ گئے تھے لہٰذا ہمارے سروں پر ابھی تک گھر سے نکلتے وقت رکھی گئی سفید دو پلی ٹوپیاں بھی موجود تھیں۔ ابھی ہم نے کھیل شروع ہی کیا تھا کہ محلے میں سفید رنگ کی ایک بڑی سی کیڈلک داخل ہوئی۔ میں اور راجہ گاڑی دیکھتے ہی فوراً اس کے رکنے سے پہلے ہی عین اس کے اگلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے سوٹ پہنے ایک صاحب اور فیروزی رنگ کے بیل باٹم میں ملبوس ایک خوب صورت سی خاتون اتریں۔ راجہ نے فوراً مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک قدم آگے کھڑا کر دیا۔ میرے چہرے پر اس وقت وہی معصومیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور راجہ بھی اس طرح مؤدب کھڑا تھا، جیسے اس جوڑے سے کہنا چاہ رہا ہو کہ ''لیں جی..... سنبھالیں اپنی امانت..... بہت عرصہ حفاظت کر لی میں نے آپ کے بچے کی۔ اب ہم سے مزید نہیں ہوتا.....'' عورت ہم دونوں کو دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک ہلکی سی لہر ابھری۔ اس نے اپنے مرد سے ہلکے سے کچھ کہا۔ میرا اور راجہ کا دل زور سے دھڑکا۔ مرد نے بھی مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ راجہ نے پیچھے سے سرسراتی سی آواز میں ہلکے سے کہا۔

''اوئے آدی کے بچے..... لگتا ہے یہی تیرے اصلی امی ابا ہیں۔ تیار ہو جا۔ یہ لوگ تجھے ہی لینے آئے ہیں۔''

میں نے اپنے ذہن میں فوراً اپنی چیزوں کی فہرست ترتیب دے ڈالی کہ اپنے ''ترکے'' میں سے کیا کچھ مجھے ساتھ لے جانا تھا اور کون سی ایسی چیزیں تھیں، جنہیں میں جاتے ہوئے محلے کے ان غریب بچوں میں بانٹ جاؤں گا۔

عورت اور مرد دونوں ہی مسکراتے ہوئے میری اور راجہ کی جانب بڑھے، ہم دونوں نے اپنے دم سادھ لیے۔ دونوں ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میم صاحب نے میرے گال چھو لیے اور مرد نے راجہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے اور کوئی کاغذ نما چیز ان کے ہاتھوں سے ہمارے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی اور جوڑا آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر تک تو میں اور راجہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب ہم دونوں نے اپنی اپنی ہتھیلیاں کھولیں تو اس میں دس دس روپے کے دو نوٹ میری اور راجہ کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میم صاحب اور بڑے صاحب میرے اور راجہ کے حلیے اور ہمارے سر پر سجی سفید ٹوپیاں دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھے کہ ہمارے ہاتھوں میں پیسے تھما گئے تھے۔ بقول راجہ وہ ہمیں مدرسے کے لیے چندہ جمع کرنے والے بچے سمجھے تھے۔ اس قدر بے عزتی.....؟ غصے کے مارے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ میں وہیں پیسے پھینک کر اور پیر پٹختے ہوئے وہاں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ راجہ مجھے پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور بھاگتا ہوا گھر چلا گیا۔ مغرب کے وقت راجہ نے مجھے گھر کے باہر دھر ہی لیا لیکن میں اب بھی اس سے روٹھا روٹھا سا تھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ نہ وہ مجھے یہ قیمتی مشورے دیتا اور نہ آج یوں لوگ ہمیں مدرسے کے بچے سمجھ کر ہمارے ہاتھوں میں چندے کے پیسے تھماتے۔ میں نے تو راجہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اب مجھے اس کی کسی بات کا یقین ہی نہیں رہا۔ یہ سن کر راجہ غصے میں آ گیا اور اس نے تیسری جماعت کی اردو کی کتاب کے سبق میں موجود بابا قادر جیلانی کی قسم کھائی کہ اس نے خود سینما کے بائیسکوپ میں یہ سارا قصہ دیکھا ہے اور اگر مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تو پھر اس اتوار کو میں بھی اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلا چلوں۔

سچ تو یہ ہے کہ راجہ کے منہ سے فلم کی کہانیاں اور سینما کے ماحول کے بارے میں سن سن کر خود مجھے بھی سینما جانے کا بے حد شوق ہونے لگا تھا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ آج تک میں نے اکیلے کبھی محلے سے باہر والی سڑک پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ سینما تو بہت دور کی بات ہے، مجھے کبھی سڑک کے پار پرچون کی دکان سے اپنے لیے پنسل، شاپنر یا ربڑ وغیرہ لینے ہوتی تھی تو میں بڑے بھیا کے ساتھ سڑک پار دکان تک جاتا تھا۔ فلم کے نام پر میں نے آج تک صرف محلے میں ہر ہفتے آنے والے ایک بابا کا ٹین کا بڑا سا ڈبہ دیکھا تھا۔ اس ڈبے میں چاروں جانب اندر جھانکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے سے گول روشن دان سے بنے ہوتے تھے، جن کے منہ پر ٹین کے ڈھکن لگا کر انہیں بند کیا ہوا ہوتا تھا۔ ہم نے اس بابے کا نام ہی منڈوا بابا رکھ چھوڑا تھا اور جب کبھی وہ بابا ہمارے محلے میں اپنی سائیکل پر منڈوے کا بڑا سا ٹین کا بکسہ اٹھائے داخل ہوتا تو ہم سب بچے اپنی اپنی جیبوں سے ریزگاری نکال کر اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، جو جتنا بڑا سکہ اسے پیش کرتا اس بچے کو اتنی ہی زیادہ دیر کے لیے اس بکس میں جھانکنے کی اجازت ہوتی۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ اس چھوٹے سے بکس میں ندیم، شبنم، رانی، شاہد اور بابرہ شریف وغیرہ بھی کیسے ایک ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم سب کو یوں نادیدوں کی طرح اس بکس کے گرد طواف کرتے دیکھ کر راجہ ہم سب بچوں کا بہت مذاق اڑایا کرتا کہ بھلا یہ بھی کوئی فلم ہے؟ فلم دیکھنی ہے تو سینما کی فلم دیکھو، جس کے جہازی سائز کے پردے پر جب سندباد بحری قزاقوں سے لڑتا ہے یا ٹارزن جب شیر کی سواری کرتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ یہ ڈبہ بھلا کیا فلم دکھائے گا؟ یہ تو فلم کے نام پر دھبہ ہے۔ اسے تو بائیسکوپ کہنا بھی اصل بائیسکوپ کی توہین ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر جس دن سے میں نے راجہ کی لے پالک بچے والی تھیوری Theory پر شک کا اظہار کیا تھا اس دن سے تو وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ کچھ بھی ہو ایک بار تو مجھے اس کے ساتھ ریگل میں لگی ندیم شبنم کی ''دل لگی'' کا میٹنی شو تو دیکھنے جانا ہی ہوگا تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔

آخر کار ''راجہ کے اصرار'' کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ راجہ نے خوشی سے ایک لمبا ''اوئے ہوئے'' کا نعرہ لگایا۔ پتہ یہ چلا کہ محلے میں راجہ کے علاوہ تین اور بچے یعنی گڈو، منّی اور ننھو بھی فلم بینی کے شوقین تھے اور راجہ ہی کی قیادت میں اس سے پہلے چند مرتبہ گھر یا اسکول سے بھاگ کر مارننگ یا میٹنی شو دیکھ چکے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر قسطوں میں فلم دیکھتے تھے مثلاً ہمارے شہر میں ایک فلم عموماً دو ہفتے تو نکال ہی جاتی تھی۔ یہ لوگ کبھی فلم کا شروع کا آدھ گھنٹے کا حصہ، کبھی انٹرول کے بعد کا کچھ حصہ اور کبھی اختتام ہی پہلے دن دیکھ آتے تھے۔ اس طرح سے انہوں نے آج تک کوئی فلم پوری ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں یہ سب بچے مل بیٹھ کر آگے پیچھے کی کہانی جوڑ کر اپنے طور پر پوری فلم کی کہانی ''سمجھنے کی کوشش'' کرتے جو کہ عام طور پر اتنی گھمبیر ہوتی کہ کوئی ہدایت کار سن لیتا تو شاید اسی فلم میں سے چار پانچ مزید فلمیں اور کہانیاں نکال ڈالتا۔

سب سے پہلا مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میں نے راجہ سے کہا کہ میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں ہیں۔ راجہ نے دانت نکالے اور جیب سے بیس روپے نکال کر مجھے دکھائے ان میں سے ایک نوٹ وہ تھا، جو میں اس دن کار کے پاس پھینک کر بھاگ آیا تھا۔ راجہ نے تب مجھے سمجھایا کہ ''مایا'' یعنی پیسے روپے کی یوں ناقدری نہیں کرنی چاہیے ورنہ مایا دیوی روٹھ جاتی ہے۔ اسی خیال سے راجہ نے اس دن میرا پھینکا ہوا نوٹ بھی اٹھا لیا تھا کہ میرے کسی ''برے وقت'' میں کام آئے گا۔ میں نے گھور کر راجہ کو دیکھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت ہم پانچوں ہی برے حال میں تھے۔ فلم کا سب سے اگلی لائن کا ٹکٹ تین روپے کا ملتا تھا۔ مطلب ہم پانچ کے ہوئے پندرہ روپے، باقی پانچ روپے میں راجہ نے ہمیں انٹرول کے دوران عیاشی کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب ہمیں بے چینی سے اتوار کے دن کا انتظار تھا کیونکہ عام اسکول کے دنوں میں ہمارا گھر سے نکلنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر مجھ پر تو اتنے زیادہ پہرے لگے ہوئے تھے کہ اگر میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ گھر سے باہر رہ جاتا تو امی فوراً بھیا یا عمارہ کو باہر محلے میں مجھے دیکھنے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔ لہٰذا مجھے اس بات کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اتنی دیر تک میں گھر والوں کی نظر میں آئے بغیر گھر سے باہر کیسے رہ پاؤں گا؟

پہلے میں نے سوچا کہ ڈوآپی کے گھر کا کہہ کر گھر سے اجازت لے لوں اور ڈوآپی کو کسی بہانے منا لوں گا کہ اگر گھر سے کوئی پوچھنے آئے تو اسے کہہ دیں کہ وہیں کہیں ہوں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے ذہن کا بنایا یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ ڈوآپی میرے گھر والوں کو تو سنبھال لیں گی لیکن ان کو کون سنبھالے گا؟ وہ تو سوال پوچھ پوچھ کر مجھے ہی نڈھال کر دیں گی اور پھر اگر انہیں اس بات کی ذرا بھی بھنک پڑ گئی کہ میں راجہ کے ساتھ اتنی دیر کے لیے کہیں جا رہا ہوں تو پھر تو سمجھو قیامت ہی برپا کر دیں گی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ معمہ کیسے حل ہوگا؟

آخر کار اسی شش و پنج میں اتوار کا دن بھی آ گیا۔ اس دن میری کچھ ایسی حالت تھی کہ میں ہر آہٹ پر چونک ہی تو پڑتا تھا، جیسے میرے ماتھے پر لکھا ہوا ہو کہ آج میں فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ دو مرتبہ تو آتے جاتے صحن میں ابا سے ٹکرا گیا۔ ایک مرتبہ ٹھوکر سے ان کا حقہ الٹ گیا۔ ابا زور سے گرجے ''کیا ہو گیا ہے لڑکے؟'' وہاں سے گھبرا کر پلٹا تو برآمدے میں اسکول کا کام کرتے آڑھے ترچھے لیٹے بھیا کی کمر پر چڑھ گیا۔ ان کی ایک زور

دار چیخ گونجی اور اس سے پہلے کہ میں ان کے ہتھے چڑھتا میں بھاگ کر امی کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسے جیسے میٹنی شو کا وقت قریب آتا جا رہا تھا میری دل کی دھڑکنیں یوں بے ترتیب ہوئی جاتی تھیں، جیسے دل ابھی سینے کے پنجرے سے باہر نکل جائے گا۔ آخر کار قسمت کو مجھ پر کچھ رحم آ ہی گیا۔ میرے سب سے بڑے پہرے دار یعنی بڑے بھیا دوپہر دو بجے امی سے اجازت لے کر ہاکی کا میچ کھیلنے بڑے ہاکی گراؤنڈ چلے گئے۔ ان کے ٹلنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عمارہ کو ہمسائی شاہدہ اپنے گھر بلا لے گئی وہ عمارہ کے ساتھ مل کر پھر کسی بدمزہ ٹماٹر کی چٹنی بنانے کا کوئی نیا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا اور عمارہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان دونوں کی بنائی ہوئی چٹنیاں اور مربے عام طور پر محلے کی بلیوں اور مرغیوں کے آگے ڈالنے کے کام آتے تھے۔

ڈھائی بج چکے تھے اور تین بجے میٹنی شو کا وقت تھا۔ باہر سے راجہ کی مخصوص سیٹیوں کی آواز لگاتار آنا شروع ہو گئی تھی۔ ابا اتوار کے دن دادی سے ملنے جایا کرتے تھے، ان کی واپسی عصر سے پہلے ناممکن تھی۔ امی دوپہر کو ذرا دیر کے لیے کمر ٹکاتی تھیں۔ بس مجھے اسی موقعے کا انتظار تھا۔ کچھ ہی دیر میں امی باورچی خانے سے برتن وغیرہ سنبھال کر باہر نکلیں اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے بولیں۔

''آدی، وہاں صحن میں بیٹھے کیا کر رہے ہو چلو کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔ دیکھو دوپہر میں کہیں کھسک نہ جانا ورنہ بہت پٹائی کروں گی۔''

امی اندر چلی گئیں۔ ہم بچے عام طور پر اپنی اماؤں کی ایسی دھمکیوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ماؤں کی پٹائی کیسی ہوتی ہے۔ مارتے ہوئے بھی ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ خود ان کا ہاتھ دُکھتا ہے تو دکھ جائے پر ان کے جگر گوشے کو کوئی کاری ضرب نہ لگنے پائے اور پھر میری امی کے لیے تو میرے منہ سے نکلی ایک زور کی ''ہائے'' ہی کافی تھی۔ ساری مار پٹائی بھول کر درد والی جگہ پر پھونکیں مارنے لگتی تھیں۔ امی کے کمرے میں جاتے ہی میں دبے پاؤں اٹھا اور گلی میں نکلتے ہی میں نے محلے کی چار دیواری کی طرف دوڑ لگا دی جہاں راجہ دوسرے فلم بین بچوں سمیت میرا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ نے مجھے دیکھتے ہی جھاڑا کہ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟''

میں نے حیرت سے ان چاروں کے حلیے کو دیکھا۔ وہ سب کے سب بڑے چیک والی بوشرٹس پہنے، آنکھوں پر بڑے بڑے کالے چشمے لگائے، بالوں میں تیل ڈالے اور بڑے بڑے خانوں والی کھلے پائنچوں والے فلیپر پہنے کھڑے تھے۔ صرف ان کے کپڑوں کے رنگ ہی مختلف تھے ورنہ وہ چاروں اس وقت ایک ہی گھر کے چار جوکر لگ رہے تھے۔ نھوکا چشمہ تو اس کے چہرے سے بھی کافی بڑا تھا لہٰذا بار بار پھسل کر اس کی گردن تک آ جاتا تھا، جسے وہ جلدی سے پھر سے اپنی ناک پر ٹکانے کی کوشش میں اسے مزید لٹکا دیتا۔ پتہ چلا کہ راجہ نے ان سب کو ''بڑوں والے حلیے'' میں آنے کے لیے کہا تھا۔ راجہ چاہتا تھا کہ ہم سب ایسے حلیے میں فلم دیکھنے کے لیے جائیں جس میں اتوار والے دن شہر کی جینٹری جاتی تھی تاکہ ہم ان لوگوں سے الگ نہ دکھائی دیں۔ اسی ٹینشن میں گڈو، نھوا اور منشی کو جو چیز بھی گھر سے ہاتھ لگی وہ پہن کر اور ''ڈال'' کر آ گئے تھے۔ نھوا اپنے تایا کا چشمہ پہن آیا تھا، گڈو اپنے ابا کی واسکٹ اور منشی نے تو حد ہی کر دی تھی وہ اپنی بڑی بہن کا جامنی رنگ کا فلیپر میچنگ شرٹ کے ساتھ پہن آیا تھا۔ خود راجہ بھی کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے بال اپنے پسندیدہ ولن اسلم پرویز کے انداز میں اوپر بنا کر ماتھے پر ایک لٹ چاند کی صورت میں چپکا رکھی تھی۔ گلے میں رومال خاص لوفروں کے انداز میں باندھ رکھا تھا اور اپنی بشرٹ کے بٹن بھی آگے سے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ چند لمحوں تک میں انہیں اور وہ مجھے حیرت سے دیکھتے رہے اور پھر اس سے پہلے کہ میں ان کا مذاق اڑاتا وہ چاروں مجھے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے..... راجہ نے دور ہی سے نعرہ لگایا۔

''اوئے آدی.....استانی خالہ کے ہاں سبق لینے کے لیے آیا ہے کیا.....؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے سراپے پہ نظر ڈالی۔ میں حسب معمول گھر کے عام شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ سینے پر امی کا بنا ہوا سامنے سے کھلا سویٹر تھا اور سر پر گرم اونی ٹوپی جس کے سامنے کا بٹن ہمیشہ کس کر باندھ دیتی تھیں تاکہ کان ٹھنڈے نہ ہوں۔ مجھے تو اپنے حلیے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، جسے دیکھ کر کسی کو بھی کوئی خاص اعتراض ہو سکتا ہو۔ بہر حال اب ان باتوں پہ دھیان دینے کا وقت بھی کہاں بچا تھا۔ شو شروع ہونے میں چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔ ریگل سینما ہمارے محلے سے اتنا دور نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم سینما کے بیرونی گیٹ کے باہر موجود تھے لیکن یہ کیا؟ ٹکٹ والی کھڑکی پہ تو اس قدر بھیڑ تھی کہ لوگ باقاعدہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی، جسے جالی لگا کر مزید چھوٹا کر دیا گیا تھا اس کے اندر بنے ایک چھوٹے سے روشن دان میں بیک وقت درجنوں ہاتھ گھسے ہوئے تھے۔ لوگ لڑ رہے تھے، چیخ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ میں جلدی سے ڈر کر راجہ کے پیچھے چھپ گیا۔ راجہ انتارش دیکھتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔

''غضب ہو گیا.....آج تو لگتا ہے کھڑکی توڑ دن ہے پکچر کا۔''

میں راجہ کی بات سمجھ نہیں پایا۔ اگر کھڑکی ہی توڑنی تھی تو پہلے ہی سے توڑ کر رکھتے.....؟ خوامخواہ اتنے بہت سے لوگوں کو عذاب میں ڈال رکھا تھا۔

اتنے میں ایک اور عجیب بات ہوئی۔ کھڑکی کے گرد درجنوں لوگ شہد کے چھتے سے چمٹی مکھیوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان جو بہت دیر سے پیچھے والی قطار میں کھڑے تھے اور ان میں بے چینی اپنی انتہا کو پہنچتی جا رہی تھی، ان میں سے ایک نوجوان نے اچانک ایک زوردار نعرہ لگایا اور اپنی قمیص اتار کر ہوا میں اچھال دی، جسے اسی کے ایک ساتھی نے دبوچ لیا۔ اس نوجوان کے دوستوں نے اسے کمر اور پیروں سے پکڑ کر ہوا میں اونچا اچھال دیا، وہ نوجوان سیدھا جا کر کھڑکی کے گرد بھیڑ کے سروں پر جا گرا، بھیڑ میں سے کسی نے اس نوجوان کی ماں بہن کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ کہے لیکن وہ نوجوان کسی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے اور باقاعدہ تیرتے ہوئے لوگوں کے سروں کے دریا کو کسی ماہر پیراک کی طرح ہاتھ پیر چلاتے ہوئے ٹکٹ والی کھڑکی تک جا پہنچا اور وہیں لوگوں کے سروں پر لیٹے لیٹے اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے اندر ڈال دیا اور کچھ دیر میں چہرے اور ہاتھوں پر چند خراشیں، پھٹی ہوئی بنیان اور بکھرے ہوئے بالوں سمیت ہاتھوں میں ٹکٹ تھامے اپنے دوستوں کے پاس فخر سے اکڑتا ہوا واپس آن پہنچا۔ اس کے دوستوں نے خوشی میں زوردار نعرے لگائے اور اسے اسی طرح اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے اندرونی ہال کی جانب بڑھ گئے۔

میں نے مایوسی سے راجہ کی جانب دیکھا۔ اس طرح تو ہمیں ساری زندگی بھی اگر وہاں کھڑے رہنا پڑتا تو ٹکٹ ملنے کی امید نہیں تھی۔ راجہ نے ہم سب کو تسلی دی اور ہمیں سینما کی بالکونی کے باہر لگے فلم کے پوسٹر اور تصویریں دیکھنے کا مشورہ دیا اور خود کسی جانب چلا گیا۔ میں، منشی، گڈو اور ننھو بھیڑ بھاڑ سے دور ہٹ کر بالکونی میں گھوم پھر کر تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ تو خاصا بڑا سینما ہال لگ رہا تھا۔ بلکہ ہمارے پرائمری اسکول سے بھی بڑا تھا۔ دیواروں پر ہمارے قد سے بھی بڑی ندیم اور شبنم کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ایک بہت بڑے سے تختے پر اندر چلنے والی پکچر کی کہانی کی تصویریں بھی لگائی گئی تھیں۔ ہمارے لیے یہ سب بہت عجیب، خوب صورت اور خواب ناک تھا۔ کچھ ہی دیر میں شہر کی وہ ''جینٹری'' بھی آنا شروع ہو گئی جس کا ذکر

راجہ نے ہم سے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی سے ٹکٹ بک کروا رکھتے تھے یا پھر شہر کے اہم عہدوں پر فائز لوگوں کی فیملیز تھیں، جیسے کمشنر صاحب، ڈپٹی صاحب، بڑے لاٹ صاحب، ایس پی صاحب وغیرہ۔ جنہیں ہر نئی فلم کے رعایتی پاس پہلے ہی سے مہیا کر دیئے جاتے تھے۔ یہ سب لوگ بنا کسی بھیڑ میں بنی قطار میں لگے اور بنا اپنے کپڑے اور سنورے ہوئے بال خراب کیے ہاتھوں میں بیگم صاحبات کے ہاتھ تھامے اور نوکروں کو لیمن اور Limca لکایا فالسے کی ٹھنڈی بوتلوں کی ٹوکریاں تھمائے، چپس اور چیونگم چباتے ہوئے ہنستے مسکراتے سینما کے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ سب ان بچوں کو پیار کر رہے تھے اور ان کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اور خیال نے اسی لمحے جنم لیا کہ آئندہ میں تب ہی پکچر دیکھنے آؤں گا، جب میں خود لاٹ صاب بن جاؤں گا، بھلا یوں بھیڑ بھاڑ میں اور گرد میں لڑتے ہوئے ٹکٹ حاصل کر کے بائیسکوپ دیکھنے میں بھی کوئی مزہ ہے۔ مجھے تو باہر موجود سبھی لوگ لڑاکا مرغوں کا ایک بپھرا ہوا غول لگ رہے تھے۔

اب اندر سے زوردار اور گھن گرج کے ساتھ کچھ آوازیں بھی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ نھو جو پہلے بھی راجہ کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ پکچر دیکھنے آ چکا تھا اس نے بتایا کہ اندر "پاکستان کا تصویری خبرنامہ" شروع ہو چکا ہے اور اب کچھ ہی دیر میں جھنڈا دکھا کر ترانہ بجایا جائے گا اور پھر اصل فلم شروع ہو جائے گی۔

راجہ کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اب تو ہم سب کو اس کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ اچانک گیلری کے اختتام سے راجہ ایک عمر رسیدہ شخص کے ساتھ دکھائی دیا۔ اس شخص نے موٹا سا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہم سب کو اپنے چشمے کے پیچھے گھورتی دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے غور سے دیکھا اور راجہ سے پوچھا۔

"کیا یہی چاروں ہیں؟"

راجہ نے جلدی سے دانت نکالے۔

"جی جی..... ہم پانچوں کو ہی شاہ جی نے بھیجا ہے۔"

عمر رسیدہ شخص نے اپنے آپ سے بڑبڑاہٹ کی۔

"کمال کرتے ہیں شاہ جی بھی۔ اتنے کم عمر بچوں کو اکیلا بھیج دیا سینما ہال....." پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

"اچھا چلو آؤ میں تم لوگوں کو ہال میں بٹھا دوں۔ جب ٹکٹ چیکر آئے تو صرف اس سے اتنا کہہ دینا کہ تم شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہو۔ سمجھ گئے نا۔" راجہ نے جلدی سے سر ہلایا۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس شاہ جی کی بات ہو رہی ہے، جس نے ہمیں بھیجا ہے اور خود ہی کو خبر نہیں۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے راجہ کی طرف دیکھا لیکن اس نے چھپ کے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

وہ شخص ہمیں لیے ہوئے ایک بہت بڑے سے اندھیرے ہال میں داخل ہو گیا، جہاں ایک بہت بڑے پردے پر تصویریں چل رہی تھیں۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مشی کسی عورت کے پاؤں پر چڑھ گیا۔ وہ زور سے چلائی ہم سب سہم گئے۔ عورت کے

ساتھ بیٹھے ہوئے کمزور سے شخص نے کڑک کر کہا۔

''اجی دیکھ کر چلیے۔ ہماری بیگم کے پاؤں کا قیمہ کر دیا۔''

ہم سب جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ بعد میں راجہ سے پتہ چلا کہ اس جگہ کو اسٹال کہتے ہیں۔ یہ ہال کے سب سے آخر میں بنی ہوئی بہت سی بالکونیوں میں سے ایک بالکونی تھی۔ میں نے راجہ کو کہنی مار کر کہا کہ اتنی دور بیٹھ کر پکچر دیکھنے میں بھلا کیا خاک مزہ آئے گا۔ راجہ نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں سب سے اگلی قطار میں بٹھا کر فلم دکھائے گا۔ راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''ابے جاہل، میں تم لوگوں کو دس روپے والے اسٹال میں بٹھوا رہا ہوں اور تم لوگ بارہ آنے والے بینچ پر بیٹھنے کی ضد کر رہے ہو۔ چپ چاپ میرے پیچھے چلے آؤ۔''

اس دن پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ سینما کی جو سیٹ پردے سے جتنی دور ہوتی ہے اس کا کرایہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ عجیب بے وقوف لوگ تھے یہ سینما والے بھی۔ غفور چچا کے ہاں ٹوٹی وی کے قریب بیٹھنے کے لیے ہم بچوں میں باقاعدہ جنگ ہوا کرتی تھی اور یہاں یہ لوگ دور بیٹھنے کے لیے باقاعدہ زیادہ پیسے دینے کو تیار تھے۔

وہ عمر رسیدہ شخص ہمیں ہماری سیٹوں پر بٹھا کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ازراہِ مروت راجہ سے پوچھا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ چاہیے ہو تو بتا دیں۔ راجہ نے فوراً اس سے گرم مونگ پھلیاں، آئس کریم، بھنے ہوئے پاپ کارن اور لیمن سوڈے کی بوتلیں سب کے لیے بھجوانے کا کہہ دیا۔ میں شدید حیرت زدہ تھا کہ بیس روپے میں ہمیں سٹال میں سیٹ بھی مل گئی تھی اور اس کے باوجود بھی اتنے پیسے بچ گئے تھے کہ راجہ نے اتنا بہت کچھ آرڈر بھی کر دیا تھا۔

ہم ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ فلم شروع ہو گئی۔ ہیرو کے پردے پر آنے پر لوگوں نے زوردار سیٹیاں بجائیں اور کچھ لوگوں نے اسکرین پر سکے نچھاور کیے۔ نخو اور گڈو نے سکے اٹھانے کے لیے اٹھ کر لپکنا چاہا تو راجہ نے انہیں جھڑک کر منع کر دیا۔ واقعی اتنے بڑے پردے پر پکچر دیکھنے کا تو اپنا ہی کچھ الگ مزہ تھا۔ فلم میں گانے بھی تھے لیکن میوزک بجانے والے مجھے ڈھونڈنے پر بھی دکھائی نہ دیئے۔ پتہ نہیں جب ہیرو یا ہیروئن گانا گانے لگتے تو اچانک میوزک کہاں سے بجنا شروع ہو جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے بجانے والے ان درختوں یا پہاڑوں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہوں، جہاں ہیرو اور ہیروئن بانہوں میں بانہیں ڈالے سریلے گیت گنگنا رہے تھے۔ انٹرول میں ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں بھی آ گئیں۔

میں نے نوٹ کیا کہ چیزیں لانے والے شخص بھی ہم سب سے بہت عزت اور پیار سے پیش آئے۔ راجہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک کے بعد دوسرا آرڈر دیتا رہا اور کریٹوں اور پھلوں اور ڈرائی فروٹ سے بھری ٹوکریاں آتی رہیں۔

درمیان میں ایک مرتبہ ایک شخص ٹارچ لیے ٹکٹ چیک کرنے کے لیے بھی آیا تھا لیکن راجہ نے تحکمانہ لہجے میں اسے بتایا کہ سیٹ نمبر ایک سے لے کر پانچ تک سارے بچے شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ٹکٹ چیکر جلدی سے سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فلم کا ہیرو ندیم اس میں موٹر مکینک کا کردار ادا کر رہا تھا۔ گڈو اور نخو نے وہیں پر عہد کر لیا کہ وہ دونوں بھی بڑے ہو کر موٹر مکینک بنیں گے اور شبنم جیسی میم سے ہی شادی کریں گے۔

آخر کار تین گھنٹے کے بعد فلم ختم ہوگئی۔ فلم کے اختتام پر راجہ کچھ جلدی میں دکھائی دیا۔ اس نے ہم سب کو بھی جلد از جلد سینما سے نکل کر باہر جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی بھیڑ میں کودتا پھاندتا غائب ہوگیا۔

سینما سے نکلتے ہی مجھے گھر کی فکر دامن گیر ہوئی۔ مجھے جتنی سورتیں اور آیات یاد تھیں وہ سب پڑھتے ہوئے میں دل ہی دل میں خدا کے سامنے گڑگڑاتا رہا کہ خدا کرے میری اتنی لمبی غیر حاضری کا گھر والوں نے نوٹس نہ لیا ہو۔ ورنہ میری تو خیر ہی نہیں تھی۔

کانپتے ہاتھوں سے میں نے ٹھیک شام چھ بج کر پندرہ منٹ پر گھر کا دروازہ کھولا صحن میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں جھانکا تو امی پر نظر پڑی جو استانی خالہ کے ساتھ بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی غصے سے بولیں۔

''آدی..... کہاں آوارہ گردی کرتے رہے ہو دن بھر۔ ابھی تمہارے بھیا کو میں نے سکینہ کے ہاں بھیجا ہے تمہیں بلانے کے لیے۔ کہاں غائب تھے دن بھر.....؟'' مطلب امی کو خاص پتہ نہیں تھا کہ میں کب سے غائب ہوں۔ میں کچھ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ بڑے بھیا اندر داخل ہوئے اور وہیں سے بولے۔

''اے لو..... یہ جناب یہاں موجود ہیں اور میں ان کی تلاش میں سارے کا سارا محلّہ چھان کر آ رہا ہوں۔ اس کے لوفر دوستوں میں سے بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کہاں تھے تم سارے۔''

''یہیں تو تھے ہم سارے۔ راجہ کے ساتھ اسکول کا کام کر رہے تھے۔'' راجہ کے نام پر بھیا کچھ چونکے لیکن استانی خالہ کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھی اور امی نے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے بعد مجھے منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ ابا کہاں تھے، یہ میں نے پوچھنے کی جسارت ہی نہیں کی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا لاکھ شکر ادا کیا کہ کسی کو بھی میری اتنی بڑی واردات کی کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔ لگتا تھا اس دن قسمت واقعی مجھ پر مہربان تھی کیونکہ ابا بھی دادی کی طرف سے آنے کے بعد عمارہ کو لے کر بازار چلے گئے تھے۔ شام کو بھی میں جلد ہی بستر میں گھس گیا اور وہ شام میری ایسے سپنے دیکھتی گزری، جس میں سب کچھ ''دل لگی'' جیسا تھا سوائے ہیرو کے جس کی جگہ آدی نے لے لی تھی۔

داستان مجاہد

عظیم اسلامی ناول نگار نسیم حجازی کا ایک ایمان افروز ناول۔ مجاہدوں کی زندگی کی ایک مختصر سی جھلک۔ نسیم حجازی کے اسلامی ناولوں کی پہلی کڑی۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلی جلن

اگلے دن ہم سب جیسے ہی اکٹھے ہوئے تو میرے من میں اٹھتے سوال مجھ سے پہلے گڈو اور منّی نے کر ڈالے کہ آخر یہ شاہ جی تھا کون، جس کے صدقے ہمیں سینما ہال میں اس قدر عزت اور اہم شخصیات جیسا استقبال ملا تھا لیکن راجہ ہمیں ٹالتا رہا۔ آخر ہم سب نے بیک زبان چلا کر اس سے پوچھا۔

''بتاتے کیوں نہیں..... یہ شاہ جی آخر ہے کون.....؟''

راجہ بے پروائی سے چیونگم چباتے ہوئے بولا۔

''مجھے کیا پتہ.....؟ میں تو آج تک کبھی شاہ جی سے ملا ہوں نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔''

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے منہ سے نکلا۔

''کیا.....؟ تو پھر کل وہ سب کیا ڈرامہ تھا.....؟''

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے پیروں کے نیچے سے جیسے کسی نے زمین ہی کھینچ لی ہو۔ پتہ یہ چلا کہ راجہ نے اپنے طور پر ٹکٹ نکالنے کی تمام ترکیبیں آزما دیکھیں لیکن سینما پر فلم اتنا شدید رش لے رہی تھی کہ سب سے چھوٹا ٹکٹ بھی بلیک میں پانچ روپے سے اوپر کا ہی مل رہا تھا۔ قطار میں ٹکٹ لینے کے لیے راجہ نے تین مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار جب بھی کھڑکی کے قریب پہنچنے لگتا تو کوئی نہ کوئی منشنڈوں کا ٹولہ اسے اٹھا کر پھر وہیں کھڑا کر دیتا، جہاں سے قطار میں راجہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوتا تھا۔

آخر راجہ مایوس ہو کر ہمیں یہ اطلاع دینے کے لیے اوپر بالکونی کی طرف آنے لگا کہ ہم آج فلم دیکھنے کا خیال دل سے نکال دیں لیکن جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالکونی کی طرف آنے ہی لگا تھا کہ اسے نیچے یہ عمر رسیدہ شخص اور ایک دوسرا شخص باتیں کرتے سنائی دیئے۔ راجہ کے کان ان کے پہلے جملے پر ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ آپس میں کسی شاہ جی کا ذکر کر رہے تھے کہ جانے ان کے گھر والے اور بچے اب تک فلم شو پر کیوں نہیں پہنچے؟ راجہ وہیں کھڑے ہو کر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگ گیا۔

پہلا شخص کہنے لگا۔

''اب تک تو شاہ جی کے گھر والوں کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔'' عمر رسیدہ شخص نے بھی اپنی ہاتھ کی گھڑی کی جانب دیکھا۔

''واقعی شو تو سمجھو شروع ہوا ہی چاہتا ہے اور پھر آج مجھے بھی گھر جلدی واپس جانا ہوگا۔ تمہاری بھابی میکے گئی ہوئی ہے۔ نہ جانے بچوں نے پیچھے کیا اودھم مچایا ہوگا۔ میں تو شو شروع ہوتے ہی گھر کے لیے نکل جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہوسکتا ہے آج کا پروگرام منسوخ کر دیا ہو۔ بہر حال اگر وہ لوگ آ جاتے ہیں تو انہیں عزت کے ساتھ لے جا کر ہال میں بٹھا دیجئے گا اور ٹھنڈا گرم بھی پوچھ لیجیے گا۔ شاہ صاحب ہمارے بہت پرانے مہربان ہیں اور ان کے گھر سے کبھی کبھار ہی کوئی فلم دیکھنے کے لیے سینما ہال آتا ہے۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔''

پہلا شخص عمر رسیدہ شخص کو یہ ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ راجہ کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگ گئیں۔ لگتا تھا قدرت نے یہ موقع خود راجہ کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ راجہ اس ادھیڑ عمر چشمے والے شخص کی غیر محسوس طور پر نگرانی کرتا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ اب وہ شخص مایوس ہو کر سینما سے نکلنے ہی والا ہے تو راجہ اس شخص کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ اسے شاہ جی نے بھیجا ہے۔ باقی گھر والے تو کسی وجہ سے نہیں آ پائے صرف بچوں کو بھجوا دیا ہے۔ تبھی وہ شخص ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ تھا اور بڑبڑاتا رہا کہ شاہ جی نے اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اکیلا سینما کیسے بھیج دیا تھا.....؟

ہم سب نے راجہ کی بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ سینما کا سب کھایا پیا الٹا واپس منہ کو آنے لگا تھا۔ اگر اس دوران شاہ جی خود یا پھر اس کے گھر والے سینما پہنچ جاتے تو ہمارا جو حشر ہونا تھا اسے سوچ کر ہی ہمیں پسینے آنے لگے تھے۔

ہم سب نے راجہ کو سخت سُست سنائیں کہ آخر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے تو ہماری ''عزت اور جان'' دونوں کو ہی داؤ پر لگا دیا تھا لیکن راجہ بے فکری سے ہماری ساری کڑوی کسیلی باتیں سنتا رہا اور ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ جب ہم سب اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو اس نے آخر میں ایک ہی جملہ کہا۔

''ابے یار..... تم لوگ یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ کیا ہو سکتا تھا..... یہ سوچو کہ ہوا کیا ہے۔ ہم سب نے مزے سے فلم بھی دیکھی اور وقفے میں خوب عیاشی بھی کی..... کی یا نہیں.....؟ اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو تم سب کبھی فلم نہ دیکھ پاتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگلے اتوار پھر چلتے ہیں ریگل۔ انہیں کیا پتہ کہ شاہ جی کے گھر میں یا اس کے خاندان میں مزید کتنے بچے ہیں۔ نہ ہی انہیں شاہ جی کے خاندان کے ہر بچے کی شکل زبانی یاد ہو گی۔ اگلے ہفتے ہم اپنا حلیہ مزید بدل کر پہلے سے بالکل مختلف بنا کر چلیں گے۔''

راجہ کی یہ بات سن کر ہم سب اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں سے سرپٹ بھاگے کیونکہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ راجہ کے ساتھ مزید کھڑے رہنا اپنی زندگی مزید خطرے میں ڈالنے ہی کے مترادف تھا۔

لیکن راجہ نے اپنی یہ رٹ بعد میں بھی جاری رکھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے موقعوں سے منہ پھیرنا ''کفران نعمت'' کے زمرے میں آتا تھا۔

جس دن ہم فلم دیکھنے ریگل گئے تھے اس کے چوتھے دن ڈوآپی کی بارھویں جماعت کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ انہوں نے پورے ضلعے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ غیاث چچا اور سکینہ خالہ کا سر خوشی اور فخر سے یوں اونچا ہوا کہ انہوں نے پورے محلے میں خاص ملتان کے دیسی گھی سے بنے لڈو اور مٹھائی بانٹی۔ سارے محلے میں ڈوآپی کی کامیابی کی دھوم تھی۔ سنا ہے اگلے دن کے اخبار میں ڈوآپی کی تصویر بھی آئی تھی۔ افسوس مجھے اس وقت پتہ نہیں چل سکا کیونکہ اس وقت ہمارے گھر میں باقاعدگی سے اخبار نہیں آتا تھا۔ ورنہ میں ان کی تصویر کاٹ کر اپنی کاپی میں ضرور لگاتا۔

اس شام جب ان کی کامیابی کا چرچا پورے محلے میں پھیلا ہوا تھا میں بھی اپنی امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر

گیا تھا لیکن ان کے گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر طاہر بھائی اور ان کی امی پر پڑی، جو ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے صحن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ طاہر بھائی کی اماں نے اپنے ہاتھوں سے ڈوآ آپی کو مٹھائی کھلانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

سکینہ خالہ نے جلدی سے سر ہلا کر انہیں جواب دیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں..... وجیہہ کی کامیابی میں اپنے طاہر کی محنت اور وقت کا بھی تو سب سے زیادہ عمل دخل ہے اگر طاہر میاں اسے اپنا وقت دے کر اتنی دل جمعی سے نہ پڑھاتے تو بھلا ہماری ڈوآ آج اتنی کامیاب ہو پاتی.....؟ ابھی بلاتی ہوں اسے۔"

سکینہ خالہ نے جلدی سے ڈوآ آپی کو آواز دی جو اندر کمرے میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ان سے مبارک باد وصول کر رہی تھیں۔ ڈوآ آپی کمرے سے نکلیں تو میری اور طاہر بھائی کی بیک وقت ان پر نظر پڑی۔ مجھے ایسا لگا کہ آسمان سے کوئی پری اتر کر غیاث چچا کے صحن میں آ کھڑی ہوئی ہو۔ ڈوآ آپی نے مکمل سفید جوڑا پہن رکھا تھا، جس کے کناروں پر ہلکا سا فیروزی دھاگے کا کام کڑھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ غیاث چچا کا پورا صحن کسی نور کی بارات سے بھر گیا ہو۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت میرے دل نے شدت سے یہ خواہش کی کہ صحن میں موجود باقی سب لوگ وہاں سے ایک پل کے لیے کہیں اوجھل ہو جائیں اور ڈوآ آپی کی پوری توجہ صرف میری جانب رہے۔ خاص طور پر طاہر بھائی کی اس وقت وہاں موجودگی مجھے بہت بری طرح کھل رہی تھی کیونکہ جس وقت سے ڈوآ آپی کمرے سے باہر آئی تھیں تب سے مستقل طاہر بھائی کی نظر کسی نہ کسی بہانے ان کے سراپے ہی کا طواف کر رہی تھی اور ڈوآ آپی بھی مستقل شرمائے جا رہی تھیں اور دبی دبی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے پھوٹی جا رہی تھی۔

اوپر سے غیاث چچا اور سکینہ خالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح سے طاہر بھائی کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا لیں کیونکہ بقول ان کے ڈوآ آپی کی کامیابی میں طاہر بھائی کی محنت اور ان کا وقت بے وقت اپنی پڑھائی کے اوقات میں بھی آ کر ڈوآ آپی کو سبق دینے اور سکھانے کا بھی بہت دخل تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ ایک آنکھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ اگر طاہر بھائی نے ڈوآ آپی کو دو چار لفظ بتا ہی دیئے تھے تو اس میں ایسی کون سی خاص بات تھی؟ پتہ نہیں ڈوآ آپی کے گھر والوں کو کب عقل آئے گی؟ اور میں جو ہمیشہ بھاگ بھاگ کر ان کے سارے کام کرتا تھا ان کی پنسلیں گھڑتا تھا، ان کے G اور Z نب والے ہولڈر اور "ایگل" پین بھر کر ان کے لیے تیار کر کے رکھتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرا کوئی ذکر بھی نہیں کر رہا تھا اور یہ جو طاہر بھائی آج شان سے غیاث چچا کے برابر اکڑے ہوئے بیٹھے ہیں ان کے گھر سے بھی کتابیں اور پرانے حل شدہ پرچے کون ڈوآ آپی کو لا کر دیتا تھا۔ بارھویں کے امتحانات کے دوران جب ڈوآ آپی کے تانگے والے کو بخار ہو گیا تھا تو فضلو بابا کے ساتھ جا کر ان کے لیے باہر سڑک سے تانگہ یا سائیکل رکشہ کون لا کر دیتا تھا لیکن مجال ہے کہ کسی نے بھی میری ان "خدمات" کا ذرا سا بھی ذکر کیا ہو۔ سب کے سب اپنی دھن میں مگن تھے۔ باقیوں کی تو چلو خیر ہے نہ ہی مجھے ان سب کی ایسی کوئی خاص پروا بھی تھی لیکن کم از کم ڈوآ آپی کو تو دو لفظ میری تعریف میں ان سب کے سامنے بولنے چاہئیں تھے لیکن آج تو انہوں نے بھی حد ہی کر دی تھی۔ اپنی سہیلیوں اور دیگر مہمانوں کے ساتھ وہ اس قدر مگن تھیں کہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح ہاتھ ملانا اور شرارت سے میرے بال بکھیرنا بھی بھول گئیں۔ میں ان کے اس "بیگانگی" کے رویے سے شدید دل برداشتہ ہو گیا، کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا کہ وہ مجھ پر بھی توجہ دیں گی اور میں خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے رنگ بھر کر اُن کے لیے مبارک باد کا جو کارڈ بنا کر لے گیا تھا، خود اپنے ہاتھوں سے انہیں دوں گا اور انہیں یہ بھی

بتاؤں گا کہ میں نے کتنی محنت سے پورا ایک ہفتہ لگا کر اس کارڈ میں فوآپی کے پسند کے رنگ بھرے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اپنے رنگ تو تیسرے دن ہی ختم ہو گئے تھے، اس لیے مجبوراً مجھے غمارہ کے بستے سے اس کے رنگ چرا کر اور راتوں کو جاگ جاگ کر ان کے لیے یہ کارڈ مکمل کرنا پڑا تھا۔ راتوں کو جاگنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ غمارہ کے بستے سے کوئی چیز دن میں نکالنا تو گویا ناممکن ہی تھا اس لیے یہ ناخوشگوار فریضہ مجھے رات کے وقت ہی سرانجام دینا پڑا تھا۔

لیکن یوں لگتا تھا جیسے میری ساری محنت ہی رائیگاں چلی گئی ہو۔ میں اپنے ہاتھوں میں کارڈ تھامے فوآپی کی توجہ کا منتظر ہی رہ گیا اور ان کے گرد مبارک باد دینے والوں کا اور انہیں اور ان کی کامیابی کو سراہنے والوں کا ہجوم بڑھتا ہی چلا گیا۔ جن میں سرفہرست طاہر بھائی اور ان کی اماں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شخص سے جلن اور حسد محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے طاہر بھائی میرے حق پر ڈاکہ مار رہے ہوں۔ اگر آج اس وقت وہ وہاں موجود نہ ہوتے تو یقیناً فوآپی کی ساری توجہ کا حق دار صرف اور صرف میں ہی ہوتا۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بھی مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا کرتی تھیں پھر چاہے وہ گھنٹوں دوسروں کے ساتھ گفتگو میں مگن رہتیں لیکن میرے لیے ان کا ساتھ ہی بہت ہوتا تھا لیکن آج تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تک نہیں تھا۔ آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں اپنے ہاتھوں میں پکڑا کارڈ وہیں فوآپی کے صحن میں پھینک کر وہاں سے پیر پٹختا ہوا نکل آیا۔ امی، استانی خالہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں، اس لیے انہیں میرے باہر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا، بلکہ صرف ایک میری امی پہ کیا منحصر تھا وہاں تو پوری کی پوری محفل ہی اپنی دھن میں مست تھی، لہٰذا مجھ جیسے غیر اہم "شخص" کے محفل چھوڑ دینے سے کسی کو کیا فرق پڑتا تھا۔ بے بسی اور غصے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ فوآپی کے گھر کبھی نہیں آؤں گا۔

باہر نکلا تو محلے کے بڑے نیم کے پیڑ کے نیچے راجہ نھو، منشی اور گڈو کو پھر سے قائل کرنے میں مصروف تھا کہ شاہ جی کے نام کا سہارا لے کر ایک آدھ شو اور دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں چپ چاپ آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ راجہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

"لگتا ہے تمہاری فوآپی سے ملاقات نہیں ہو پائی۔"

جانے راجہ کو میرے اندر کی باتوں کی خبر اتنی جلدی کیسے ہو جاتی تھی۔ میں نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"نہ ہوا کرے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آئندہ ان کے گھر کبھی قدم بھی نہیں دھروں گا۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے وعدے اور ارادے تو تم تقریباً ہر ہفتے ہی کرتے ہو لیکن جیسے ہی تمہاری فوآپی تمہیں بلانے کے لیے صرف ایک آواز لگاتی ہیں تم سب کچھ بھول بھال کر پھر سے ان کے پاس دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہو۔" راجہ کی بات پر ان سب نے بھی دانت نکالے۔ مجھے مزید غصہ آ گیا۔

"تم لوگ دیکھ لینا..... اب ایسا نہیں ہوگا۔"

راجہ نے بات پلٹ دی۔

''اچھا چلو اب رہنے بھی دو۔ یہ بتاؤ چلو گے اس اتوار کو ریگل سینما؟ شاہد اور نشو کی ''بھروسہ'' لگ رہی ہے۔ تھوڑی سی ہمت کرو تو ایک بار پھر عیاشی کروا سکتا ہوں تم سب کو۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو میں راجہ کو صاف منع کر دیتا لیکن اس وقت میں وجو آپی کی وجہ سے اس قدر اُداس اور صدمے..... بلکہ غصے کے زیر اثر تھا کہ میں نے بنا سوچے سمجھے ہی ہاں کر دی۔ راجہ نے تو یہ سن کر خوشی کے مارے ''یاہو'' کا ایک لمبا سا نعرہ لگایا جبکہ باقی تینوں حیرت کے جھٹکے سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر میں دوبارہ اس طرح سینما جانے کی بے وقوفی نہیں کروں گا۔ گڈو نے مجھے کاندھے پکڑ کر زور زور سے ہلایا اور ٹھوٹو نے میرے گالوں پر ہلکے ہلکے کئی طمانچے بھی مارے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس اتوار کو دوبارہ ''شاہ جی کے مہمان'' بن کر فلم دیکھنے ضرور جائیں گے بلکہ ایک فلم دیکھنے کے لیے جانے پر ہی کیا منحصر تھا، میں اس وقت ہر وہ کام کرنا چاہتا تھا، جس سے مجھے وجو آپی نے منع کیا ہو۔ مُنی کا خیال تھا کہ مجھے سردی لگ گئی ہے جس کی وجہ سے میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے جبکہ گڈو اور ٹھوٹو تو مجھے مکمل دیوانہ ہی سمجھ رہے تھے۔ بہر حال فیصلہ ہو چکا تھا اور اب ہمیں صرف اتوار کا انتظار تھا۔

شام کو میں دیر سے گھر گیا تو امی وجو آپی کے گھر سے واپس آ چکی تھیں۔ انہوں نے سرسری طور پر مجھ سے دریافت بھی کیا کہ میں وہاں سے اٹھ کر کیوں چلا آیا تھا؟ بعد میں سب میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے امی کو کریدنے کی کوشش بھی کی کہ ''سب'' سے ان کی مراد کون کون ہے لیکن امی رات کا کھانا بنانے میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہیں میرا سوال ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں آیا اور انہوں نے مجھے ٹال کر باورچی خانے سے باہر بھیج دیا۔ بہر حال مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اب وجو آپی کی جانب سے کوئی آس لگاتا اور پھر انہیں بھلا فرصت ہی کہاں ملی ہو گی میرے بارے میں پوچھنے کی یا پھر میری غیر حاضری کو محسوس کرنے کی؟ راجہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا ''ان لڑکیوں کی طبیعت کا کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔''

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رات کو جانے کب میں نیند کی حسین وادیوں میں جا اترا۔ اگلے دن بارش کی وجہ سے ہمارے اسکول میں صبح سے ہی چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ میں، راجہ اور گڈو اپنے بستے گلے میں لٹکائے سڑک کے کنارے بہتے ہوئے نالے میں اپنی اپنی کاغذ کی کشتیوں کے ساتھ چلتے چلتے جب محلے کے گیٹ تک پہنچے تو وہیں ہماری فضلو بابا سے مڈبھیڑ ہو گئی جو سکینہ خالہ کی پرانی سلیقہ سلائی مشین کو مستری کے ہاں سے تیل ڈلوا کر واپس لا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے وہیں سے ہانک لگائی۔

''آدی میاں..... جاتے کہاں ہو..... وجو بی کل شام سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں، چلو میرے ساتھ ہی گھر چلو۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ آدی جہاں کہیں بھی دکھائی پڑے اسے ساتھ ہی لیتا آؤں۔''

راجہ اور گڈو دونوں نے میری طرف یوں چونک کر دیکھا، جیسے کوئی جج کسی عادی مجرم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ راجہ نے دھیرے سے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔

''اوئے آدی کے بچے..... آج اگر تو نے ہمت نہیں دکھائی تو پھر آئندہ ہمارے سامنے خوامخواہ کی بڑھکیں مارنے کی کوشش نہ کرنا۔''

سچ تو یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے خود میرا ایمان بھی ڈگمگا سا گیا تھا لیکن پھر میں نے ہمت کر کے فضلو بابا سے آخر کہہ ہی دیا۔

''خود آپی سے کہیے گا کہ آج کل میں کچھ مصروف ہوں۔ فرصت ملی تو میں خود آجاؤں گا۔''

یہ کہہ کر اور فضلو بابا کو حیرت زدہ کھڑا چھوڑ کر میں راجہ اور گڈو کے ساتھ پیر پٹختا آگے بڑھ گیا۔ راستے میں گڈو اور راجہ نے میری خوب پیٹھ ٹھونکی کہ آج میں نے واقعی مردوں والا جواب دیا ہے لیکن جانے کیوں خود میرا دل اندر سے بجھ سا گیا تھا۔ راجہ اور گڈو اگلے دن سینما جانے کا پرجوش منصوبہ بناتے رہے اور میں بے خیالی میں ہوں ہاں کر کے ان کے ساتھ شریک ہونے کا تاثر دیتا رہا۔ کبھی کبھی یہ دل کچھ فیصلے کرتے وقت کتنا خوش ہوتا ہے لیکن جانے کیوں چند لمحوں بعد ہی وہی دل اس فیصلے کا سوچ کر ہی ڈوبنے کیوں لگتا ہے؟ میری وہ رات میری زندگی کی چند ان راتوں میں سے تھی، جو میں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزاری تھیں اور خود آپی سے آئندہ بات نہ کرنے کا فیصلہ میرے دل میں کھٹکتا رہا۔

اگلی صبح ابھی میں ناشتہ ہی کر رہا تھا کہ باہر گلی میں راجہ کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اتنی سویرے.....؟ یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے چائے کا پورا پیالہ غڑاپ سے حلق کے اندر انڈیلا اور امی سے نظریں بچا کر باہر گلی میں نکل آیا۔ راجہ اور منشی باہر گلی میں کھڑے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج کے میٹنی شو کے وقت یعنی دوپہر تین بجے استانی خالہ نے محلے کے تمام بچوں کو اپنے گھر گٹھلیاں پڑھنے کے لیے بلایا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچوں کے ساتھ ان کی امائیں بھی ثواب حاصل کرنے کی خاطر گٹھلیاں پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ آج دوپہر اپنے گھر والوں سے نظر بچا کر سینما گھر تک پہنچنا ناممکن تھا لہٰذا راجہ نے میٹنی شو کے بجائے مارننگ شو پہ جانے کا پروگرام بنایا تھا، جو صبح گیارہ بجے شروع ہوتا تھا۔ مطلب ہمارے پاس اب بھی دو ڈھائی گھنٹے تھے تیاری کرنے کے لیے۔ میں نے راجہ کو ایک آخری مرتبہ سوچ لینے کا کہا لیکن بقول راجہ ''جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا؟''

اگلے دو گھنٹے میں ہم پانچوں کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر سینما کے باہر کھڑے اندرونی گیٹ پر رش چھٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ راجہ کو اس عمر رسیدہ شخص کی تلاش تھی، جس نے پچھلی بار ہمیں ہال میں بٹھایا تھا۔ یہاں پر سب لوگ اسے غفار صاحب کے نام سے جانتے تھے اور وہ سینما کی انتظامیہ کا حصہ تھا لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار راجہ نے سینما کی کینٹین کے پیچھے بنے اسسٹنٹ منیجر نام کی تختی لگے کمرے میں سے ایک شخص کو نکلتے دیکھا تو بھاگ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں آپس میں جانے کیا باتیں کرتے رہے اور ہم چاروں کا یہاں بے چینی اور گھبراہٹ سے برا حال ہو رہا تھا۔ نخو نے تو باقاعدہ پیشین گوئی بھی کر دی کہ آج صبح سے ہی اس کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی بری خبر ملنے والی ہے۔ گڈو نے اسی لمحے اسے جھڑک کر چپ کروا دیا کیونکہ اصل میں خود اس کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی وسوسے پل رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم چاروں یہاں تک راجہ کے ہمت دلانے پر آ تو گئے تھے لیکن اندر سے ہم سب کے دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے راجہ واپس پلٹا، اس کے ہاتھ میں کوئی پرچی پکڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ راجہ کے آتے ہی ہم سب نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''کیا ہوا.....؟ کون تھا وہ شخص.....؟ بات بنی یا نہیں.....؟ اسے شک تو نہیں ہوا.....؟''

راجہ نے ہاتھ اٹھا کر ہم سب کو خاموش کروایا۔

''ارے یار سب ٹھیک ہے..... دراصل آج غفار صاحب آئے نہیں ہیں..... یہ شخص جس سے میں بات کر رہا تھا یہ یہاں کا اسسٹنٹ منیجر ہے۔ میں نے اسے شاہ صاحب کا حوالہ دیا تو بے چارہ کافی مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے ہم سب کے لیے اسٹال کی یہ پرچی دے دی ہے، جو ہم گیٹ

والے کے حوالے کر دیں گے۔ اندر جب ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ہم سب کو صرف ایک جملہ کہنا ہے کہ ''ہم شاہ جی کے بندے ہیں اور بس..... چلو اب دیر نہ کرو۔ شو شروع ہو چکا ہے۔''

راجہ اپنی بات ختم کرتے ہی اسٹال کی جانب بھاگا اور ہم سب بھی راجہ کی تقلید کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے سینما ہال میں داخل ہو گئے۔ گیٹ کیپر نے اسسٹنٹ منیجر کی پرچی دیکھ کر ہمیں اسٹال کی سب سے پچھلی قطار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور ہال میں ہیروئن کی پردے پر آمد پر زوردار سیٹیاں بج رہی تھیں۔

ہم پانچوں بھی اندھیرے میں ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے اپنی سیٹوں تک پہنچ ہی گئے۔ راجہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک اسسٹنٹ منیجر نے ہمارا آرڈر لینے کے لیے کسی بیرے کو کیوں نہیں بھیجا؟ البتہ ہم چاروں کی توجہ مکمل پردے کی جانب تھی۔ مجھے فلم کی ہیروئن نشو بھی بہت اچھی لگی کیونکہ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں بھی بالکل ڈوآپی کی طرح دو گلابی گڑھے پڑ جاتے تھے۔ ہمارے بیٹھنے کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ میں بالکل درمیان میں تھا اور میری بائیں جانب دروازے کی طرف گڈو اور مشی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب راجہ اور نھو براجمان تھے۔ وقفے سے کچھ دیر پہلے ٹکٹ چیکر اندر آیا اور ہمیشہ کی طرح سینما کے بوائے لڑکا Limca کی بوتلیں، چائے کے بہت سے گلاس جو ایک گول اسٹینڈ میں پھنسے ہوتے تھے اور سوڈے کی بہت سی بوتلیں اٹھائے اندر داخل ہو گئے۔ ہال میں ذرا دیر کو ہلچل سی مچی اور لوگوں کی آوازیں ابھریں ''آئس کریم بوائے..... ذرا دو پولکا ادھر بھی..... سوڈا بوائے..... ایک لیمن سوڈا بیگم صاحب کے لیے..... اور میرے لیے دو پیکٹ گرم پینٹس (Peanuts).....''

یہ تو پیچھے کی جانب بیٹھی ہوئی جینٹری کی آوازیں تھیں جبکہ بہت دور ہال کی اگلی جانب سے مزدور اور چوتھے درجے کے ملازمین کی آوازیں اور لہجہ ان اسٹال کی آوازوں سے بالکل مختلف تھا۔

''ابے او چنے والے، آٹھ آنے کے گرم چنے دے ذرا مسالہ ڈال کر..... او گنڈیری والے بھائی، آدھ کلو گنڈیری لیکن میٹھی ایسی ہوں کہ شیرا ہاتھوں سے ٹپکے..... او سیون اپ کے شہزادے، دو سوڈا ادھر بھی..... اور خالی بوتل آخر میں لے جائیو، ہمارے سروں پہ منکر نکیر بن کر نہ ٹک جائیو.....''

غرض بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس وقت ہال میں گونج رہی تھیں لیکن مجھے ان سب آوازوں سے شدید الجھن ہو رہی تھی کیونکہ فلم کا باقاعدہ وقفہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہیروئن کے باپ اور ہیرو میں ایک بے حد جذباتی قسم کا مکالمہ اپنے اختتام کے قریب تھا۔ جانے یہ سینما والے درمیانی وقفے سے پہلے ہی ان چھابڑی والوں اور سینما بوائز کو اندر کیوں آنے دیتے تھے؟

اتنے میں ٹکٹ چیکر دروازے کی جانب سے ہماری قطار میں سب سے پہلے بیٹھے ہوئے گڈو کے پاس ٹارچ لے کر پہنچ گیا۔ گڈو فلم دیکھنے میں اس قدر مگن تھا کہ وہ شاہ جی کا نام بھول گیا اور اس نے جلدی سے نھو سے پوچھا۔

''یار ہم کس کے بندے ہیں.....؟''

نھو جلدی سے بولا ''اللہ جی کے۔'' میں نے زور سے اسے کہنی ماری، نھو ہکلایا ''مطلب ہے شاہ جی کے۔''

ٹکٹ چیکر نے سر ہلایا اور نھو کے چہرے پہ ٹارچ ماری۔ نھو نے بھی دہرایا۔

''ہم شاہ جی کے آدمی ہیں۔''

ٹکٹ چیکر نے میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔ میں نے بھی مخصوص کوڈ ورڈ دہرایا۔ میرے بعد گڈو نے بھی اسی اسم اعظم کا ورد کیا۔ ٹکٹ چیکر نے راجہ کا رخ کیا راجہ نے بھی انتہائی معتبر لہجے میں رعب سے کہا ''ہم پانچوں شاہ جی کے بندے ہیں۔''

ٹکٹ چیکر نے آخری مرتبہ تسلی کے لیے ایک بار پھر ہم پانچوں پر ٹارچ لہرائی اور راجہ سے پوچھا ''بس یہ پانچ کی نفری ہی ہے یا پھر ہال میں کوئی اور بھی شاہ جی کا بندہ بیٹھا ہے۔''

راجہ نے انکساری سے جواب دیا۔ ''نہیں جی..... بس ہمی پانچ ہیں شاہ جی کے خاص بندے۔''

راجہ کی بات ختم ہوتے ہی راجہ کے پیچھے سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی ''بہت خوب..... تم سب شاہ جی کے بندے ہو اور میں شاہ جی ہوں..... بقلم خود..... راجہ فیاض شاہ۔''

چند لمحوں تک تو ہمیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس شخص نے یہ کون سا انکشاف کیا ہے اور ہم پانچوں ہونقوں کی طرح اس شخص کو اور وہ ہمیں دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ غصے میں زور سے چلایا۔

'' پکڑلو ان پانچوں فراڈیوں کو۔''

راجہ نے ہم سب میں سے سب سے پہلے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ اچھل کر سیٹ سے اترا اور باہر کے دروازے کی جانب سرپٹ دوڑتے ہوئے زور سے چلایا۔

''بے وقوفوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، سارے اٹھ کر بھاگو۔''

راجہ کی چیخ کے ساتھ ہی جیسے ہم سب بھی کسی گہرے خواب سے چونک کر جاگے اور اپنی اپنی سیٹوں سے یوں اچھلے جیسے ہمیں کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اسٹال میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور نازک بیگمات تو باقاعدہ چیخنے چلانے لگ گئیں شاید وہ سمجھی تھیں کہ سینما میں کوئی بڑی ''واردات'' ہوگئی ہے۔

شاہ جی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی سے اسٹال کے بیرونی دروازے پر کوئی پہرے دار کھڑا نہیں کیا تھا اور صرف ٹکٹ چیکر کے بھروسے ہم پر چھاپہ مارنے آگئے تھے۔ ٹکٹ چیکر کو بھی ہم سے ایسی پھرتی کی امید ہرگز نہ تھی ورنہ کم از کم وہ دروازہ ہی بند کر آتا۔ ہم پانچوں کرسیاں پھلانگتے، بیگمات کے بیل باٹم اور شراروں غراروں میں الجھتے، گرتے پڑتے، اسٹال کے دروازے سے باہر نکلے۔ اسٹال میں کسی کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ ہمیں یوں دیوانہ وار باہر بھاگتے دیکھ کر کچھ جلد باز قسم کے ''پیروکاروں'' نے بھی بنا کچھ جانے یا بنا کسی سے کچھ پوچھے باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور ہمارے اور ٹکٹ چیکر اور شاہ جی کے درمیان میں دراصل یہی جلوس تھا جس کی وجہ سے ہم ٹکٹ چیکر کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے ورنہ گڈو کی نئی بشرٹ کا کالر تو اس کے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا لیکن افسوس کہ اس کے ہاتھ میں وہ کالر ہی دوبارہ گیا اور گڈو کو آئندہ وہ قمیص ہمیشہ بنا کالر کے پہننا پڑی۔ ہمارے پیچھے اسٹال میں عورتوں کی چیخوں اور مردوں کی ''پکڑو، لپکو، جانے نہ پائے'' کی آوازوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ اسٹال سے نکلتے ہی ہم سینما کی لمبی سے راہداری میں یوں دوڑے جیسے اسکول میں ہزار گز کی ریس میں دوڑتے ہیں۔ راہداری سے گزرتے ہی ہم اس حصے میں آپہنچے جہاں سے پہلے صحن اور پھر بیرونی گیٹ کا جنگلہ دور ہی سے نظر آرہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے پیچھے ہماری تقلید میں دوڑتے

ہوئے ہیروکاروں کا ہجوم، اس کے پیچھے چیختا چلاتا ٹکٹ چیکر اور اس کے پیچھے اور سب سے آخر میں ہانپتے کانپتے ہوئے شاہ جی سرپٹ بھاگتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ سینما کا بیرونی جنگلہ ابھی تک تالے سے بند تھا کیونکہ شاید فلم کے درمیانی وقفے میں بیرونی لوگوں کی آمد کو روکنے کے لیے اسے بند ہی رکھا جاتا تھا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم پانچوں ایک قطار میں دوڑتے ہوئے لوہے کے جنگلہ نما گیٹ کے پاس پہنچے اور اگلے ہی لمحے سب پہلے گڈو اور پھر اس کے پیچھے باقی چار بھی کسی "اسپائیڈر مین" کی طرح بنا ایک پل ضائع کیے جنگلہ پار کر گئے لیکن اس کوشش میں نھو کے لمبے کالروں والی قمیص نے دھوکہ دیا اور اس کی قمیص کا آدھا حصہ نشانی کے طور پر جنگلے میں ہی اٹکا رہ گیا۔ مشی کا فیشن ایبل چشمہ اور میرا مفلر بھی اسی بھاگ دوڑ کی نذر ہو چکا تھا لیکن اس وقت ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی، جنگلے سے دوسری جانب اترتے ہی ہم نے بنا ئر کے سڑک پار کی اور اپنے پیچھے بھاگتے اور چیختے چلاتے "دیوانہ وار" ہجوم کو دور چھوڑ آئے۔ چند ہی لمحوں میں ہم ہانپتے کانپتے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے اور راستہ بھر دوڑتے ہوئے ہم اپنے پیچھے بھی نظر ڈالتے آئے کہ کہیں کوئی جوشیلا تماش بین ہمارے پیچھے ہمارے گھروں تک نہ پہنچ جائے لیکن یہ دیکھ کر ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس ریس میں ہم پانچوں نے ان سب کو پچھاڑ دیا تھا۔

اس کے بعد ہم سب نے مل کر راجہ کی جو گت بنائی اور ہمارے حلیوں کو دیکھ کر ہمارے گھر والوں کے ہاتھوں خود ہم سب کی جو درگت بنی..... وہ داستان "ناقابلِ اشاعت" ہے۔ بہت دن بعد راجہ نے سینما کے کسی چھوٹے اہل کار سے معلومات کروائیں تو پتہ چلا کہ شاہ جی کے گھر والے تو پچھلے ہفتے بھی سینما آئے تھے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ان کے نام کے پاسز پر تو چند بچے نہ صرف فلم دیکھ گئے ہیں بلکہ اپنی طرف سے خوب عیاشی بھی کر گئے ہیں۔ بات شاہ جی تک پہنچی تو انہوں نے سینما انتظامیہ کو چوکس کر دیا کہ اب اگر وہ "گروہ" فلم دیکھنے آئے تو انہیں اطلاع کر دی جائے اور سینما والوں نے وہی کیا۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم اس دن ان کے ہتھے نہیں چڑھے، ورنہ وہ ہماری ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔

لیکن زندگی کی اس پہلی بے ایمانی سے سبق لینے کے بجائے یہ بے ایمانی ہمارے دلوں کے کسی کونے میں ہمیشہ کے لیے چھپ کر بیٹھ گئی۔ ہم سب کے دلوں نے کہیں نہ کہیں اپنے اندر اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ بے ایمانی جو پکڑی نہ جا سکے، جائز ہوتی ہے۔ بس ایک ذرا سی ہمت ہی کی تو بات ہے اور جب کبھی بھی میں نے وہ ایک ذرا سی ہمت کر دکھائی تبھی میرے اندر کا راجہ فوراً باہر نکل کر میرے سامنے آبیٹھتا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے پوچھتا۔

"ہاں پیارے..... عیاشی کرنی ہے تو بولو.....؟ لیکن یاد رکھو عیاشی کرنے کے لیے خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ تو کہو..... ہے ہمت خطرے میں کودنے کی.....؟"

میں سہم کر نفی میں سر ہلاتا "نہیں نہیں..... اگر پکڑے گئے تو.....؟"

میرے اندر کی بے ایمانی مجھے بچپن کے دوست راجہ کی طرح پچکارتی ہے "ارے یار..... اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو اب موسلوں کا کیا ڈر.....؟"

میں کچھ دیر سوچتا ہوں اور پھر چپ چاپ اپنا سر اوکھلی میں ڈال دیتا ہوں۔

پہلا گش

اُس دن سینما والے واقعے کے بعد ہم سب نے بہت دن تک ڈر کے مارے محلے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ میں وجو آپی سے بھی کترایا کترایا سا پھرتا رہا حالانکہ ان کے درجنوں پیغامات آتے رہے کہ آ کر مل جاؤ لیکن میں نے بھی جیسے کانوں میں سیسہ ہی بھر لیا تھا لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب تک عمارہ، فضلو بابا، بڑے بھیا یا امی میں سے کوئی بھی مجھے ان کے پیغامات پہنچاتا رہتا، میرے دل کو ایک اطمینان سا رہتا اور جس دن ان کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملتا میرے دل کو ایک عجیب سی بے چینی لاحق ہو جاتی۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دل کے بیچوں بیچ کسی نے کوئی سوئی سی گاڑھ دی ہو اور میری یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی، جب تک کسی جانب سے وجو آپی کا پھر سے بلاوا نہ آ جاتا۔

اور پھر یہ کش مکش بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ وجو آپی کو میرے سبھی ٹھکانوں اور نظام الاوقات کا اچھی طرح پتہ تھا۔ اس روز استانی خالہ نے جانے کیوں مجھے سب سے آخر میں سبق سنانے کا کہہ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ آج کل میں کچھ دیر سے سبق لینے کے لیے جا رہا تھا۔ معمول کے مطابق پہلے سب بچے اپنا سبق یاد کر لیتے اور پھر جس ترتیب سے بچے سبق لینے کے لیے آئے ہوتے تھے، اسی ترتیب سے ایک ایک کر کے وہ استانی خالہ کو سبق سناتے جاتے اور ان کو چھٹی ملتی جاتی۔

تقریباً سبھی بچے اپنا سبق سنا کر جا چکے تھے۔ صرف میں اور محلے کی دو لڑکیاں رہ گئی تھیں جن کا سبق سنانا ابھی باقی تھا۔ ان میں سے ایک آمنہ تھی، جسے ہم سب لڑکے بھوری چڑیل کہہ کر چڑاتے تھے۔ دراصل اس کے بھورے بال ہمیشہ مٹی سے بھرے ہوتے اور کچھ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے تھے جیسے کوئی ان میں ہوا بھر گیا ہو یا پھر کسی شریر بچے نے اس کے بالوں کے بیچ میں پٹاخہ پھوڑ دیا ہو۔ دوسری پٹر پٹر بولنے والی پروین تھی جس کے بال اس کی اماں اس قدر کس کے باندھتی تھی کہ اس کی بھویں تک کھچ جاتی تھیں اور ماتھے تک جا پہنچتی تھیں۔ ہم سب اسے ''چالاکو ماسی'' کہہ کر پکارتے تھے۔

استانی خالہ جانے کن کاموں میں الجھی ہوئی تھیں کہ انہیں ہم سے سبق سننے کا وقت ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ دراصل اندر کمرے میں ان کے چند مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان کی مہمان داری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آواز کے منتظر تھے کہ کب وہ ہمیں چھٹی کرنے کی نوید سناتی ہیں۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی نازک سی آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو میرا سانس اور میری دھڑکنیں جیسی رک سی گئیں۔ وجو آپی اب باقاعدہ بڑی چادر لے کر گھر سے نکلتی تھیں اور اس وقت وہ اسی بڑی سی کالی چادر کو اوڑھے ہوئے تھیں جس کے کناروں پر سفید لیس دار پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس کالے نقاب میں ان کا چہرہ نور سے یوں دمک رہا تھا جیسے کسی نے ماہتاب کا کوئی ٹکڑا اس کالی عبا کے اندر چھپا رکھا ہو۔ سچ پوچھیے تو میں واقعی اپنی سُدھ بُدھ ہی کھو بیٹھا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے اور دبے پاؤں ہمارے سر پر آ پہنچی تھیں کہ آمنہ اور

پروین کو بھی ان کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ وہیں میرے پاس ہی زمین پر پڑی استانی خالہ کی چوکی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے سر جھکا لیا اور یوں ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا، جیسے میں سبق یاد کرنے میں بے حد مگن ہوں۔ وہ آپی کچھ دیر تک یونہی میری جانب دیکھتی رہیں اور پھر ہولے سے بولیں۔

''آدی..... ابھی تک ناراض ہو.....؟''

میں نے مزید سر جھکا لیا۔ دراصل میرے اندر ہمیشہ سے ایک کم زوری تھی اگر کوئی مجھے منانے کی کوشش کرتا یا جس کسی سے مجھے بہت شکایت ہوتی اور وہ مجھے منانے کی کوشش کرتا تو فوراً میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور مجھے ان دو موٹے موٹے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہمیشہ لوگوں سے اپنا چہرہ چھپانا پڑتا تھا کیونکہ مجھے کسی کے سامنے رونے سے بھی بہت شرم آتی تھی۔ اس وقت بھی میری جان کے دشمن، وہی دو آنسو، ایک ہی لمحے میں میری آنکھوں میں چھلک آئے اور وجو آپی سے اپنی حالت چھپانے کے لیے مجھے مستقل سر جھکائے رکھنا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے پھر دھیرے سے پوچھا۔

''مجھ سے بات نہیں کرو گے آدی؟''

جانے کیسے بے حد ضبط کے باوجود میری ہلکی سی مدھم سسکی نکل ہی گئی اور وجو آپی نے جلدی سے اپنی ہتھیلی سے میرا چہرہ اوپر کر دیا۔ وہ میرے آنسو دیکھ کر خود بھی پریشان ہو کر روہانسی سی ہو گئیں اور جلدی سے اپنے دوپٹے سے میری آنکھیں پونچھ کر بولیں۔

''ارے ارے..... یہ کیا.....؟ ایسے نہیں روتے..... آدی تو بہت بہادر ہے نا۔''

میں نے جلدی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ پروین اور آمنہ کے سامنے میں رونا نہیں چاہتا تھا لیکن وجو آپی سے میں نے ابھی تک بھی نظر نہیں ملائی تھی۔ وجو آپی نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور دھیرے سے پوچھا۔

''اپنی دوست کو معاف نہیں کرو گے آدی۔''

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اتنی معصوم اور اپنی الماری پر رکھی اس گڑیا کی طرح شکل بنا کر اپنی آنکھیں پٹ پٹاتی تھیں، جسے دیکھ کر ہمیشہ میری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ وجو آپی کو اچھی طرح سے پتہ تھا کہ چاہے میں کتنا ہی اداس کیوں نہ ہوا کروں، مجھے ہنسانے کا یہی سب سے کارآمد اور آزمودہ نسخہ ہوتا تھا۔ سو اس وقت بھی یہی ہوا اور وہ اپنے حربے میں کامیاب رہیں۔ میں بھیگی پلکوں کے ساتھ ہی ہنس پڑا اور وجو آپی کے چہرے پر چھایا غبار بھی چھٹ گیا۔ وہ بھی ہنس دیں۔ وہ جب بھی ہنسی تھیں مجھے لگتا تھا جیسے سارا جہاں ہنس پڑا ہو۔

''یہ ہوئی نا بات۔ دیکھو میرے پاس کیا ہے اپنے آدی کے لیے۔''

انہوں نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا، جو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس میں رنگ بھرے تھے۔ میں نے خوشی اور حیرت سے ''شکریہ'' کے اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر چاروں جانب سے دیکھا۔ وجو آپی کے ہاتھوں میں اب ایک اور کارڈ بھی نظر آ رہا تھا، انہوں نے کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرایا۔ یہ وہی کارڈ تھا، جو میں ان کے نتیجے والے دن ان کے لیے بنا کر لے گیا تھا لیکن پھر ان کی بے توجہی کے باعث غصے میں وہیں پھینک آیا تھا۔ میں اپنا کارڈ ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر اپنی ساری ناراضگی اور شکایات بھول کر حیرت سے چلایا۔

''ارے..... یہ آپ کو کہاں سے ملا.....؟''

وجو آپی مسکرائیں۔ ''وہیں سے..... جہاں تم اسے پھینک آئے تھے۔''

وجو آپی نے مجھے بتایا کہ اس شام جب میں ناراض ہو کر ان کے گھر سے نکل آیا تھا تب کچھ ہی دیر بعد انہیں وہاں پر میری غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے میری امی سے بھی میرے بارے میں پوچھا اور فضلو بابا کو بھی میرے پیچھے دوڑایا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں خاص انہی کی خاطر اس شام امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے وہاں آیا تھا لیکن سب ہی میری تلاش میں ناکام ہو گئے۔ تبھی ان کی نظر اس کرسی کے نیچے پڑی، جہاں میں پہلے بیٹھا ہوا تھا وہاں پر انہیں یہ مڑا تڑا سا کارڈ پڑا دکھائی دیا۔ وجو آپی نے آگے بڑھ کر یہ کارڈ اٹھا لیا اور بقول ان کے اس شام انہیں ملنے والا یہ سب سے پیارا کارڈ اور سب سے پیارا تحفہ تھا۔ وہ تبھی سمجھ گئی تھیں کہ میں ان سے ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا ہوں۔ پر وہ بے چاری بھی کیا کرتیں؟ اتنے بہت سے مہمان جو گھر میں جمع تھے اور پھر ان سب کی خاطر داری اور ہزار دوسرے کام جو ان کی جان کو آئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ نہ ہی میرے پاس بیٹھ سکیں اور نہ ہی انہیں اتنا ہی موقع ملا کہ وہ خود مجھے ہی اپنے پاس بلا لیتیں۔ وجو آپی نے اتنی تفصیل سے اور اتنی اچھی طرح مجھے اپنی اس شام کی مجبوری بتائی کہ خود مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں نے کارڈ وہاں پھینک کر ان کا کتنا دل دُکھایا ہے؟ اور وجو آپی کا دل کتنا بڑا ہے کہ اس کے باوجود خود مجھے منانے چلی آئیں۔ وجو آپی تو تھیں ہی ایسی..... وہ کسی کو خود سے ناراض ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ چاہے غلطی خود دوسرے کی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ خود چل کر اسے منانے، اس کے پاس پہنچ جاتیں اور پھر اسے منا کر ہی دم لیتیں۔ ان کے دل اور روح کی یہی پاکیزگی تو تھی جو ان کے چہرے اور آنکھوں سے نور بن کر ٹپکتی تھی۔ وہ شام میری زندگی کی حسین ترین شاموں میں سے ایک تھی۔ وجو آپی بہت دیر تک میرے ساتھ وہیں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔ پروین اور آمنہ کو انہوں نے سبق سن کر چھٹی دے دی تھی۔ وہ استانی خالہ کے ساتھ مہمان داری میں بھی ہاتھ بٹاتی رہیں اور خود میرے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے چائے بھی پی۔

راجہ کو میں نے دوسرے روز یہ سارا ماجرا بتایا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''تبھی میں کہوں..... یہ اپنے آدی پیارے کا چہرا اتنا روشن اور کھلا کھلا سا کیوں ہے۔ چلو یار..... ہم تو یاروں کی خوشی میں خوش رہنے والے ہیں۔ جاؤ تمہیں معاف کیا۔''

راجہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میری جان وجو آپی میں اٹکی رہتی ہے اور میں زیادہ عرصے تک اپنے اس کچے وعدے پر قائم نہیں رہ سکوں گا، جو میں نے اپنے سارے دوستوں کے سامنے وجو آپی سے نہ ملنے کے بارے میں کیا تھا لیکن راجہ کی سب سے اچھی عادت یہی تھی کہ وہ مجھے میرے ٹوٹے ہوئے ارادے اور توڑے ہوئے وعدے یاد دلا کر کبھی شرمندہ نہیں کرتا تھا۔

وجو آپی بارھویں پاس کر کے تیرھویں میں لڑکیوں کے بڑے کالج میں پہنچ گئیں اور ہم سب چوتھی سے پانچویں میں آ گئے۔

وجو آپی کو اب سکینہ خالہ نے باقاعدہ ایک کالے رنگ کا برقعہ سلا کر دے دیا تھا، جسے اوڑھ کر وہ بڑے کالج جایا کرتی تھیں۔ فضلو بابا اب مزید جھک کر چلنے لگے تھے لیکن اپنی وجو بی کی خدمت میں وہ اب بھی اسی پرانی پھرتی سے کام لیتے تھے۔ انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نیا خاندان تازہ تازہ آ کر بسا تھا۔ اسی میں ہماری عمر کا ایک لڑکا بھی شامل تھا جس کا نام تو اقبال تھا لیکن سب اسے پیار سے بالا کہتے تھے۔ بالے کے ابا کا پنجاب سے یہاں تبادلہ ہوا تھا اور ان کی ڈیوٹی بھی میرے اور راجہ کے ابا کے محکمے میں انہی کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ بالے کے ابا کریم نے بالے کو بھی ہمارے

ہی اسکول میں پانچویں میں داخلہ دلا دیا تھا۔ بالا دیکھنے میں ہم سب سے بہت بڑا لگتا تھا بعد میں پتہ چلا کہ اسے ایک کلاس میں دو سال لگانے کی عادت ہے لہٰذا وہ اب تک آٹھویں کے بجائے پانچویں میں ہی اٹکا ہوا ہے۔ بالے کا ایک بڑا بھائی اکرم اور ایک بڑی بہن گڈی بھی تھی جسے ڈوآپی کے ساتھ لڑکیوں کے بڑے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اکرم جسے گھر میں سب اکّو کہتے تھے، بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور نکما ہونے کے باعث بمشکل دسویں ہی کچی پکی پاس کر پایا تھا۔ بقول میرے ابا کے اس کے انداز ہی خاص لوفروں والے تھے۔ اکّو سارا دن محلے میں کھڑا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہتا تھا اور آتی جاتی لڑکیوں کو غور غور سے دیکھتا اور زیرلب مسکائے جاتا۔ پنجاب سے تبادلے سے پہلے اس کے ابا نے اسے کسی فرنیچر والے کی دکان پر کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا تھا اور اب تو اسے فرنیچر کا کام کرتے اور رندہ چلاتے ہوئے بھی پانچ سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا۔ چھوٹی عمر سے آری اور رندے چلا چلا کر اس کے ہاتھ بھی کسی بڑی اور بھدی قسم کی سخت لکڑی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ آج کل یہاں ہمارے شہر میں بھی اپنے لکڑی کا کام بڑھانے کے لیے کسی دکان کی تلاش میں تھا لیکن فی الحال اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

طاہر بھائی کی ڈاکٹری کی پڑھائی اپنے تیسرے سال میں تھی اور اب انہیں مکمل ڈاکٹر بننے کے لیے صرف دو سال مزید درکار تھے جب ہم صبح سویرے اپنے بستے اپنے گلوں میں لٹکائے گھر سے اسکول کے لیے نکل رہے ہوتے تھے تب اکثر طاہر بھائی پر میری نظر پڑتی تھی۔ وہ اپنے گلے میں ڈاکٹروں والا آلہ لٹکائے اور بازو پر اپنا سفید کوٹ ڈالے بابوؤں والی پینٹ شرٹ پہنے اپنے میڈیکل کالج کے بس کے انتظار میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کچھ ٹھیک یہی وہ صبح کا وقت تھا جب ڈوآپی فضلو بابا کے ساتھ اپنے گھر سے تانگے کا ہارن سن کر نکلا کرتی تھیں۔ فضلو بابا ڈوآپی کو تانگے میں سوار کروا کر اور ان کا خوب صورت سا بیگ جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا، ان کے حوالے کر کے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے تانگے کو گیٹ تک رخصت کرنے آتے تھے۔ ایسے میں عام طور پر ان کی طاہر بھائی سے بھی ملاقات ہو جاتی، جنہیں اب فضلو بابا احترام سے ''ڈاکٹر صاب'' کے نام سے بلاتے تھے۔ یہاں ڈوآپی کا تانگہ محلے کے گیٹ سے نکلتا وہاں طاہر بھائی کی بس بڑی سڑک کا موڑ کاٹ کر ہمارے گیٹ کے پاس رکتی اور یہاں ہم محلے کے بچے شور مچاتے اور کودتے پھاندتے محلے کے گیٹ سے اپنے اسکول کے لیے باہر نکلتے۔ میرا وہ دن انتہائی بے چین اور افسردہ گزرتا، جب کبھی میں گیٹ سے نکلتے ہوئے ڈوآپی کی چہرے کے آدھے نقاب سے جھانکتی بڑی بڑی کالی اور جھکی نگاہوں کو طاہر بھائی کی اٹھتی ہوئی آنکھوں سے ملتے پاتا۔ ساری رات میری یہی دعا مانگتے گزر جاتی کہ خدا کرے کہ کل طاہر بھائی کی بس جلدی آ جائے یا پھر ڈوآپی کا تانگہ طاہر بھائی کے گیٹ پر آنے سے پہلے ہی وہاں سے گزر جائے لیکن ظاہر ہے کہ ہر روز میری دعا قبولیت کا شرف بھی نہیں پا سکتی تھی اور ہر تیسرے چوتھے روز ڈوآپی اور طاہر بھائی کی نظروں کے ملاپ کا یہ ''اتفاق'' سرزد ہو ہی جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ طاہر بھائی کی بس کے اوقات بھی ڈوآپی کے تانگے کی روانگی سے متصل ہیں۔ بہت عرصے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میڈیکل کالج والوں کی ایک ہی رنگ اور ایک ہی حلیے کی تین چار بسیں ہوتی ہیں جو مختلف اوقات میں چلا کرتی ہیں۔ بہرحال اس وقت مجھے بس کے اوقات کار سے زیادہ اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ صبح سویرے میرے دل پہ بجلی گرانے والا نظروں کا یہ تصادم کسی نہ کسی طور ٹل جائے۔

وہ بھی میرے لیے ایک ایسا ہی بوجھل اور بے حد اداس دن تھا کیونکہ صبح اسکول کے لیے آتے ہوئے محلے کے گیٹ پر میں نے یہ تصادم ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ڈوآپی کی نگاہ جیسے ہی طاہر بھائی سے ٹکرائی انہوں نے فوراً اپنی نظریں جھکا لی تھیں لیکن طاہر بھائی کی نگاہوں نے ڈوآپی کی

نظروں کا تا حد نگاہ تعاقب کیا۔ میں نے طاہر بھائی کو اپنا کالر ٹھیک کرنے کے بہانے دھیرے سے اپنا ہاتھ اٹھاتے بھی دیکھا اور اگر میں نے راجہ سے ان ''معاملات'' کے بارے میں مکمل تفصیلات نہ لے رکھی ہوتیں تو مجھے کبھی پتہ نہ چلتا کہ یہ سلام پیش کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ طاہر بھائی کے ہاتھ کالر تک لے جاتے ہی وہ آپی نے فوراً اپنی پلکیں جھکالی تھیں لیکن ان کے جسم کا سارا خون گلابی رنگ میں تبدیل ہو کر ان کے چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔ جبکہ یہ سارا ماجرا دیکھنے کے بعد خود میرے اپنے چہرے کا ہر رنگ صرف اسی ایک لمحے کے وقفے میں ہی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔

''ہوں..... تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے..... اب تو اس کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔''

اس دن میرا من کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اسکول میں بھی سارا دن دل بوجھل سا رہا۔ راجہ نے کئی بار مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن میں اسے بھی ٹال گیا۔ شام کو ہم دونوں استانی خالہ کے گھر سے باہر نکلے تو بالے سے ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ کچھ جلدی میں لگ رہا تھا۔ راجہ نے اسے آواز لگائی تو اس نے ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے محلے کے چھوٹے میدان کے پچھواڑے بنے کوارٹرز کی پچھلی جانب بڑھ گیا۔ دور محلے کے کچھ بچے شام کی سردی سے بچنے کے لیے ٹین کے ایک کنستر میں جس کے اطراف اور کناروں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے سوراخ کیے گئے تھے، سلگتے ہوئے انگارے ڈال کر اس ڈبے کو ایک مضبوط بندھی تار سے پکڑ کر ہوا میں خوب زور زور سے گول چکر دے رہے تھے۔ ان سوراخوں سے ہوا ٹین کے کنستر میں داخل ہوتی تو انگارے سلگ کر آگ پکڑ لیتے تھے اور بچے جلدی سے ٹین کے کنستر کے گرد جمع ہو کر اس آگ سے اپنے ہاتھ سینکنے لگتے تھے۔

بالا ان بچوں کے ہجوم سے ذرا ایک طرف ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور مجھے اور راجہ کو بھی اس نے وہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بالے کے اس مشکوک انداز نے ہمیں بھی تجسس میں ڈال دیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سرگوشی میں ہم سے پوچھا۔

''کبھی کش لگایا ہے.....؟''

میں نے اور راجہ نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر حیرت سے پوچھا۔

''کیسا کش.....؟''

بالے نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا سا سگریٹ نکال کر ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''اس کا کش.....''

میں اور راجہ سگریٹ دیکھ کر یوں اچھلے جیسے بالے کے ہاتھ میں سگریٹ نہ ہو کوئی سپنولیا ہو، جسے وہ اچانک ہمارے سامنے لہرا بیٹھا ہو۔

ہم دونوں بے اختیار چلائے۔

''سگریٹ.....''

بالے نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں غصے سے گھورا اور آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

''چپ..... مَر واؤ گے کیا..... کیا اس سے پہلے کبھی سگریٹ نہیں دیکھا.....؟''

راجہ نے حیرت سے بالے کی جانب ایسے دیکھا، جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔

''تم سگریٹ پیتے ہو.....؟''

بالے نے حسرت سے ایک آہ بھری۔

''روز ایسی عیاشی کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے یار۔ کبھی کبھار اگو بھائی کی ڈبیا میں سے اڑا لیتا ہوں۔ آج بھی ان کی ڈبیا میں آخری یہی بچی تھی۔ وہ صبح گھر پہ بھول گئے تھے۔ مجھے موقع ملا تو میں اڑا لایا۔''

بالے نے جیب سے کیمل سگریٹ کی ایک ڈبیا نکالی جو سگریٹ کے ادھ جلے ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سگریٹ ماچس نکال کے سلگایا اور خاص ''لوفروں'' کے انداز میں اس نے ایک لمبا سا کش لیا اور دھواں ہمارے چہروں پہ بکھیر دیا۔ میری تو آنکھیں جلنے لگ گئیں۔ بالے نے ایک دو اور کش لیے۔ میں اور راجہ اس کے سامنے بیٹھے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے جیل میں عادی اور چھوٹے موٹے مجرم اپنے گرو اور بڑے استاد کو دیکھتے ہیں۔ بالے نے سگریٹ ہماری طرف بڑھایا۔

''کش لگاؤ گے.....؟''

میں نے اور راجہ نے ہچکچاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ بالے نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔

''لگا لو یار.....ایک کش سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ مردوں کے پینے کی چیز ہے۔''

پہلے راجہ نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہاتھ میں اس طرح پکڑا جیسے وہ سگریٹ نہیں بلکہ پورے کا پورا ایک جلتا انگارہ ہو۔ بالے نے ایک دوسرا ٹوٹا سلگا کر میرے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ میں نے اور راجہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر ایک، دو تین کہا اور سگریٹ ہونٹوں سے لگا لی۔ جیسے ہی دھواں میرے حلق سے نیچے گیا مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے حلق میں کانٹوں سے بھرا تلخ اور شدید چبھتا ہوا کوئی گولہ آن پھنسا ہو۔ میرے اور راجہ دونوں کے گلے میں دھویں کا پھندا اٹک گیا اور ہم دونوں کا کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا۔ میری آنکھوں سے تو یوں پانی بہہ رہا تھا، جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ راجہ کا حال بھی بہت برا تھا۔ بالا ہم دونوں کی حالت دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ یہ میری اور راجہ کی زندگی کا پہلا کش تھا۔ مجھے اسی دن سے سگریٹ سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ وہ چیز ہے، جسے یہ سارے بڑے مزے لے لے کر پیتے تھے۔ اس کش کی کڑواہٹ، تلخی اور عجیب سی جلتی ہوئی بو نے میری روح تک دھویں سے بھر دی تھی لیکن راجہ پر اس کش کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے شاید اپنے حلق سے اترتے اور خون میں شامل ہوتے نکوٹین کے نشے اور اُس مزے کو محسوس کر لیا تھا جس کا ہر سگریٹ پینے والا دیوانہ ہوتا ہے۔ سگریٹ کچھ سالوں میں ہی راجہ کی انگلیوں کا مستقل حصہ بن گیا جس کے بغیر کبھی کبھی راجہ کی اپنی شخصیت ادھوری لگنے لگتی تھی۔ میں نے بہت بعد میں کہیں پڑھا تھا کہ ''سگریٹ کے ایک کونے پر ایک سلگتا ہوا انگارہ اور دوسرے کونے پر ایک احمق ہوتا ہے .....'' سو میرا دوست راجہ بھی اسی دن سے ان احمقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا، افسوس میں یہ حماقت دوبارہ کبھی نہ کر سکا۔

پہلا بھرم

اُس دن کیمل سگریٹ کے ایک ہی کش نے میری حالت ابتر کر دی تھی۔ بالے نے سگریٹ ختم کرنے کے بعد جیب سے ہرے پودینے (Mint) کی خوشبو والی گولیاں نکال کر خود بھی زبان کے نیچے رکھ لیں اور مجھے اور راجہ کو بھی ایک ایک میٹھی گولی چوسنے کے لیے دے دی۔ راجہ سے ہی ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ منہ سے سگریٹ کی مہک کو ختم کرنے کا یہ سب سے تیر بہدف نسخہ ہے۔

اگلے چند دن میں رمضان شروع ہو گیا اور میری اُداسی مزید بڑھ گئی۔ پتہ نہیں بھوک سے ان دنوں میری اُداسی کا کیسا عجیب سا تعلق تھا۔ جتنی زیادہ بھوک لگتی اتنا زیادہ میں اُداس ہوتا جاتا۔ ابا کی طرف سے مجھے باقاعدہ روزے رکھنے کا حکم نامہ مل چکا تھا۔ لہٰذا امی سحری کو باقی لوگوں کے ساتھ مجھے بھی جگا دیتی تھیں۔ شروع کے چند روزے تو میں نے سحری بھی بند آنکھوں سے ہی کی۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روزہ اتنی صبح سے بلکہ منہ اندھیرے ہی کیوں شروع ہو جاتا ہے۔ ہم صبح کے ناشتے کے بعد سے لے کر رات تک بھی تو روزہ رکھ سکتے تھے؟

بہر حال دو چار روزوں کے بعد ایک سحری کو، جب میں ذرا جلدی نیند سے جاگ گیا تھا اور امی کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھا انہیں پراٹھے بناتے ہوئے اپنے لیے عمارہ اور بڑے بھیا سے بڑا پراٹھا بنانے کے لیے تنگ کر رہا تھا تب اچانک ہی باہر گلی سے راجہ کی مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں حیرت اور خوشی کے عالم میں جلدی سے باہر بھاگا، گلی میں راجہ، گڈو اور بالے لیمپ پوسٹ کی روشنی سے ذرا ہٹ کر بڑی بڑی کالی چادریں اوڑھے کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ آج سے ان سب نے محلے میں اُن سب گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے جو دن میں ہمیں اپنے گھر کے سامنے کھیلنے سے ڈانٹتے تھے۔ گڈو اپنے گھر سے چپکنے والی سفید ٹیپ لینے کے لیے گیا ہوا تھا کیونکہ کچھ دروازوں کی گھنٹیوں پر مستقل بجانے کے لیے یہ ٹیپ بھی جوڑی جانی تھی۔

راجہ نے مجھے کہا کہ میں جلدی سے سحری کر کے نماز کے بہانے اپنے ابا سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آؤں کیونکہ ہمیں آدھے گھنٹے کے وقفے میں پورے محلے کی ''خدمت'' کرنا تھی۔

کچھ ہی دیر میں میں الٹے سیدھے نوالے نگل کر، گھر والوں کو دکھانے کے لیے سر پہ سفید ٹوپی اوڑھ کر، پکے نمازیوں کی طرح سنجیدہ سی صورت بنا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر پوری ٹولی تیار کھڑی تھی۔ کچھ گھر جن میں گھنٹی کی سہولت موجود نہیں تھی ان کے بیرونی دروازوں کی بڑی بڑی کنڈیوں سے کالا دھاگا باندھ کر، کسی دور جگہ پہ چھپ کر اسے ہلانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا جن گھروں کے صحن اور دالان بہت لمبے چوڑے تھے جہاں تک کمرے سے نکل کر آنے میں مکینوں کو کچھ وقت لگتا تھا ان کے دروازے کی گھنٹی پر ہم مضبوط ٹیپ اس طرح چپکا دیتے کہ گھنٹی مستقل بجتی ہی

رہے جبکہ کچھ گھروں کے دروازوں پر گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی ہمیں تیزی سے بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑتی تھی۔ اس کھیل کے اصول کچھ یوں تھے کہ ہر بچے کو اپنی باری ملتی تھی اور باقی بچے اس کی مدد کچھ فاصلے سے کرتے تھے، سب ہی کو ایک ایک بار کسی نہ کسی دروازے پر جانا ہی ہوتا تھا۔ مجھے، رابعہ، بالے، گڈو اور ننھو کو ملا کر ہم سب پانچ بنتے تھے، لہٰذا ہر پانچویں گھر کے بعد پہلے بچے کی باری دوبارہ آ جاتی تھی۔ اگلے دو تین دن میں مشی اور پپو نے بھی ہمارا ''گروہ'' جوائن کر لیا اور یوں ہم سات ہو گئے اور سارا محلہ سحری کے وقت گھنٹیوں اور کنڈیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سے گونجنے لگا۔ روزہ دار گھرانوں کی تو خیر تھی کیونکہ وہاں تو عموماً سبھی جاگ ہی رہے ہوتے تھے لیکن سب سے زیادہ پریشانی ان گھرانوں کے لیے تھی جہاں روزہ رکھنے والا کوئی ایک آدھ یا بالکل ہی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں چند ہندو گھرانے بھی گھنٹی والے گھروں میں شامل تھے۔ ان سب کی تو جان پر ہی بن آئی تھی۔ ہم گھنٹی بجا کر یوں سرپٹ بھاگتے کہ دروازہ کھولنے والے کو ہمارا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ دن کو ہم سب معصوم صورت بنائے جب انہی گھروں کے سامنے کھیل رہے ہوتے اور آس پاس کے محلے داروں کو آپس میں ان سحری کی وارداتوں کے بارے میں بات کرتے سنتے تو ہمیں بے حد مزہ آتا۔

صدیقی صاحب غصے سے تلملا کر مرزا صاحب سے کہتے۔

''ارے جناب..... یہ زمانہ تو شرافت کا ہے ہی نہیں..... آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے ان لونڈوں نے..... جانے کون آدھی رات کو گھنٹی پر ٹیپ چپکا جاتا ہے۔ میرے ہاتھ لگے تو ایسی خبر لوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے.....

وہاں سے دبلے پتلے قدوس صاحب اپنی باریک آواز میں منمناتے۔

''اجی شرافت کی کیا بات کرتے ہیں آپ..... یہ تو محلہ ہی غنڈوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔ پچھلی سحری تو اس قدر زور سے میری کنڈی کھڑکائی کم بختوں نے کہ میرے ہاتھ سے تو دودھ پھینی کا پیالہ پھسل کر منے کی اماں کے سر پہ جا گرا۔ مجبوراً آج کا روزہ قضا کرنا پڑ گیا انہیں۔''

کچھ ''کم زور دل حضرات'' جو پہلے ہی سے صبح کی نماز مسجد سے قضا کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوتے تھے، اپنے وسوسے یوں بیان کرتے۔

''نہیں یار مرزا..... مجھے تو یہ کوئی آسیب کا چکر لگتا ہے۔ جس لمحے میری کنڈی کھڑکی تھی، تبھی میں چھلانگ لگا کر دروازے کے باہر آ موجود ہوا پر دور دور تک ایسا سناٹا تھا کہ میرا تو دل ہی ہول کھانے لگا..... جلدی سے چار قل پڑھ کر میں دوبارہ بستر میں جا گھسا۔ بڑے بوڑھوں نے ہمیں تو یہی سکھایا ہے کہ میاں ایسی مخلوقات سے ماتھا بھڑانا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔''

غرض کوئی اسے بین الاقوامی چوروں کے کسی گروہ کی سازش قرار دیتا اور کوئی اپنے ہمسائے کی نیت پر شک کرتے ہوئے اس سے لڑ بیٹھتا اور ہم ساتوں دور کھڑے معصومیت سے یہ تماشہ دیکھتے اور تنہائی ملتے ہی ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

انہی متاثرین میں سیٹھ گردھاری مل کا گھرانہ بھی شامل تھا جو پہلے ہی اپنے موٹاپے کے ہاتھوں بے حد پریشان تھے اوپر سے روزانہ صبح چار ساڑھے چار بجے کی اس دوڑ پریڈ نے ان کا بلڈ پریشر اتنا ہائی کر دیا تھا کہ ان کا جینا حرام ہو گیا تھا۔ گردھاری مل کی چار نازک اور خوب صورت سی بیٹیاں بھی تھیں جنہیں جب ان کی ''ماتا'' محلے سے کسی کام کے لیے باہر جانے کے لیے لے کر نکلتی تھیں تو ان کی زبان پر زیر لب صرف ''رام رام'' کا

درد ہوتا تھا تا کہ یہ مشٹنڈے ''مُسلے'' ان کی بیٹیوں پر نظر نہ ڈال سکیں۔

وہ غالباً تیرھواں روزہ تھا۔ ہم حسب معمول سحری کو کامیابی سے محلے والوں کی نیند حرام کرنے میں مشغول تھے، گردھاری مل کا دروازہ آنے پر راجہ کی باری آ گئی۔ ہم سب اصول کے مطابق دروازے سے دس بارہ گز دور ہی رک گئے اور ہم نے راجہ کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ کر گھنٹی بجائے جبکہ ہم سب نے گھنٹی بجتے ہی واپسی کے لیے سرپٹ بھاگنے کے لیے پر تول لیے۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بچے کے لیے ہوتا تھا جو گھنٹی بجانے کے لیے دروازے کے پاس جاتا تھا کیونکہ باقی لوگ تو اتنی دور کھڑے ہوتے تھے کہ انہیں بھاگنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ راجہ دبے پاؤں گردھاری مل کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم سب دم سادھے بھاگنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ راجہ نے آخری بار پلٹ کر ہماری جانب دیکھا اور بالے نے دھیرے سے گنتی پڑھنی شروع کی۔

''ایک..... دو..... تین.....'' کہتے ہی راجہ نے گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا اور ہم دیوانہ بھار بھاگے لیکن یہ کیا.....؟ راجہ کے گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک موٹا اور کالا سا آدمی زوردار آواز میں ''جے بجرنگ بلی..... توڑ دشمن کی نلی.....'' کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر آ کودا اور سیدھے اپنا ہاتھ راجہ کی کلائی پر ڈال دیا۔ راجہ بدحواسی میں چلایا ''بھاگو.....'' لیکن اس وقت اس کی ہدایت پر عمل کرنے والے ہم سبھی تو پہلے ہی خوف زدہ جانوروں کی طرح سرپٹ بھاگ ہی رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اس ''کالی بلا'' کا ہاتھ ٹھیک طرح سے راجہ کی کلائی پر نہیں پڑا تھا اور راجہ کا بازو اس کی گرفت سے پھسل کر نکل گیا۔ راجہ بھی کسی ریس کے بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح اس شخص کی گرفت سے نکل کر وہاں سے ایسا بھاگا کہ کچھ ہی دیر میں ہمیں بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بھاگتے ہوئے راجہ نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''مسجد کی طرف..... مسجد کی طرف۔'' شاید راجہ کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ گردھاری مل کے گھر سے برآمد ہونے والی یہ مصیبت مسجد کی طرف آنے کی جرأت نہ کرے۔ اس شخص کے پیچھے دو نوجوان مزید سیٹھ کے گھر سے نکلے اور وہ بھی ہمارے پیچھے بھاگے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہم میں سب سے آگے راجہ، اس کے پیچھے ہم، ہمارے پیچھے وہ کالی بلا اور سب سے پیچھے دو نوجوان ہمارے تعاقب میں بگٹٹ دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ہم ساتوں ان کی پہنچ سے کافی دور نکل گئے اور بھاگتے ہوئے سڑک کراس کر کے مسجد میں جا گھسے، جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ ہم بھی جلدی سے باقی نمازیوں کے ساتھ صفوں میں رل مل گئے۔ راجہ کے کہنے کے مطابق ان لوگوں نے ہمیں مسجد میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا لہٰذا نماز ختم ہونے کے بعد ہمیں اپنی نمازیوں کی ٹولیوں کے ساتھ ہی محلے میں واپس داخل ہونا لازمی تھا تا کہ سیٹھ گردھاری مل اینڈ کمپنی ہمیں پکڑ نہ سکے۔

لیکن جیسے ہی ہم مسجد سے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہ تینوں بمع سیٹھ گردھاری مل، مسجد کے باہر موجود ہیں اور مسجد سے نکلنے والے نمازیوں سے بمع میرے ابا کے، ہماری شکایت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور تھا لیکن سوائے راجہ کے وہ اور کسی کو نہیں پہچانتے تھے کیونکہ ہم سب ان سے دور تھے، مسجد سے اور بھی کافی بچے جو ہماری ہی عمر اور سائز کے تھے، برآمد ہو رہے تھے۔ لہٰذا بڑوں نے وہیں مسجد کے سامنے والے میدان میں ہماری ''شناخت پریڈ'' کا بندوبست کرتے ہوئے سبھی بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سیٹھ گردھاری مل کو اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ملزم پہچاننے کا کہا گیا۔

گردھاری مل اینڈ کمپنی نے راجہ کو تو دور ہی سے پہچان لیا اور اسے ''ملزمان'' سے نکال کر مجرموں کی لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ راجہ کے بعد انہوں نے بالے کو اس کے نمایاں قد کاٹھ کی وجہ سے شناخت کر لیا گیا۔ بالے کے ساتھ ہی میں کھڑا تھا۔ گردھاری مل نے ہانپتے ہوئے بغور میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنے چہرے پر نہ صرف اپنی بلکہ آس پاس کی بھی تمام معصومیت کو یوں یکجا کیا ہوا تھا کہ خود گردھاری مل کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ بہر حال انہیں سات ملزمان کی گنتی تو پوری کرنی ہی تھی لہٰذا میرا نزلہ میرے ساتھ کھڑے ''پڑھاکو'' رفاقت پر گرا اور اس کے لاکھ چیخنے چلانے کے باوجود اسے گھسیٹ کر راجہ اور بالے کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پپو، ٹھٹھو اور منشی بھی پکڑے گئے جبکہ گڈو کی جگہ انہوں نے غلطی سے مولوی سعید کے بیٹے نعیم کو دھر لیا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ مجرمان کی قطار میں رفاقت ''پڑھاکو'' اور ''چھوٹا مولوی'' نعیم زار و قطار رو رہے تھے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنے گلے کا پورا زور لگا کر چیخ چلا کر قسمیں کھا رہے تھے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فرد جرم سنائی جا چکی تھی اور اب صرف ان کی سزا کا فیصلہ باقی تھا اور یہ فیصلہ ہمارے بڑوں نے ایمان دار اور عظیم مسلمان حکمرانوں کی طرح سیٹھ گردھاری مل پر چھوڑ دیا کہ ''بول ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے.....؟''

سیٹھ گردھاری مل کی خواہش پہ ان سبھی کو وہیں آدھے گھنٹے کے لیے مرغا بنا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان ساتوں کے گھر والوں سے یہ درخواست بھی کی کہ گھر جا کر بھی ان سب کی ''قند مکرر'' کے طور پر ٹھیک ٹھاک خبر لی جائے یوں ہمارا اچھا خاصہ اور مزے سے گزرتا ہوا رمضان اس سیٹھ گردھاری مل کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ آئندہ کے لیے ہم سب بچوں پر سحری کے دوران پہرہ بہت سخت کر دیا گیا۔ سو اب ہم بچوں کا رمضان میں صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے گھڑی کی طرف دیکھتے رہتے کہ وقت کب گزرے گا۔ افطار کے وقت جب ہم سب محلے کے بڑے میدان میں جمع ہوتے اور کسی بھی کھیل میں مشغول ہوتے تو زوردار آواز میں جنگی سائرن جیسا ایک بھونپو پورے ایک منٹ کے لیے بجتا تھا جو اس بات کا اشارہ ہوتا کہ روزہ بس کھلنے کو ہے۔ ہم سب بچے اس سائرن کی آواز پر اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ جاتے۔

ڈوآپی تک بھی یہ گھنٹی بجانے کی واردات کی شہرت اور تذکرہ کسی طور پہنچ گیا تھا اور پہلے تو وہ بہت دیر تک ہنستی رہیں پھر انہوں نے مجھے قریب بیٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آدی.....تم تو ان شرارتی بچوں کے ساتھ اس شرارت میں شامل نہیں تھے نا؟''

نہ چاہنے کے باوجود مجھے اپنی گردن فوراً نفی میں ہلانا پڑ گئی۔ جانے کیوں میں ڈوآپی کو چاہ کر بھی یہ بتا نہیں پایا کہ اس روز میری جگہ کسی اور کو سزا بھگتنی پڑی تھی۔ حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس دن میں بھی ان بچوں میں شامل تھا جو اس گھنٹی بجانے کی واردات میں ملوث تھے لیکن مجھ سے سوال کرتے وقت ڈوآپی کی آنکھوں میں ایک ایسا یقین اور میرے اوپر ایک ایسا اعتماد اور بھرم تھا کہ میں ان سے سچ بولنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کا بھرم توڑ نہیں پایا۔ یہ میری زندگی میں مجھ پر کسی کا پہلا مان تھا جو میں نے اپنے جھوٹ کے ذریعے قائم رکھا۔ تب سے اب تک میں صرف لوگوں کے بھرم ان کا مان ہی قائم رکھتا آ رہا ہوں۔ سچ یا جھوٹ، غلط یا صحیح بس کسی نہ کسی طور میں لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہی رہا ہوں لیکن میں یہ بات شاید آج تک نہیں سمجھ پایا کہ یہ جھوٹے بھرم جب ٹوٹیں گے تو میری حیثیت میرے اپنوں کے سامنے شاید کاغذ کے پرزے جتنی بھی باقی نہ رہے۔ کاش میں اسی روز ڈوآپی کا وہ پہلا بھرم سچ بول کر توڑ دیتا۔ کاش میں اسی روز پورا سچ بولنا سیکھ جاتا۔

پہلا چاند

یوں روتے پیٹتے دن بھر بھوک اور پیاس سے نڈھال اور سارا دن اپنے لیے افطاری کے وقت کے لیے کھانے کی چیزیں جمع کرتے میرا وہ پہلا رمضان بھی بیت گیا جس میں میں نے اپنی زندگی کے پہلے تیس (۳۰) روزے پورے کیے۔ میں ہر دوپہر اپنے آپ سے پکا وعدہ کرتا کہ کل کا روزہ تو کسی صورت نہیں رکھوں گا اور اگر ابا نے زبردستی رکھوا بھی دیا تو اسکول جا کر یا پھر بالے اور راجہ کے ساتھ مل کر توڑ دوں گا لیکن ہر صبح، سحری کے وقت امی مجھے کوئی نہ کوئی نیا لالچ دے کر مجھے اپنا روزہ افطار تک "کھینچنے" کی ترغیب مہیا کر ہی دیتی تھیں۔ سیٹھ گردھاری مل والے واقعے کے بعد ہم سب بچوں کی ساکھ کالونی میں کافی خراب ہو چکی تھی اور ہمیں کوئی نیا گل کھلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ پچیسویں روزے کے بعد ابا مجھے عمارہ اور بڑے بھائی کو بازار لے جا کر ہمیں نئے جوتے بھی دلا لائے۔ کپڑے تو پہلے ہی محلے کے درزی سے سل کر آ چکے تھے اور کپڑے خریدنے سے پہلے میں خاص طور پر ڈھو آپی کے گھر جا کر ہمیشہ کی طرح ان سے پوچھ آیا تھا کہ اس بار میں عید پر کون سے رنگ کے کپڑے بنواؤں۔ اس طرح کے معاملوں میں میں ہمیشہ ڈھو آپی کے مشورے کو ہی ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

رمضان میں دن کے وقت بالے کا بڑا بھائی اٹو گھر سے کم ہی باہر نکلتا تھا کیونکہ بالے کی طرح وہ بھی روزے نہیں رکھتا تھا اور ایک بار محلے کے بزرگوں نے اسے سرعام سگریٹ پینے پہ سخت سست سنائیں تو وہ ان سے الجھ پڑا۔ جس پر اس کے باپ نے اٹو کا دن میں گھر سے نکلنا کم کرا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اٹو خود اپنے گھر والوں کے قابو میں بھی نہیں تھا اور یہ بھی اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ اپنے باپ کے کہنے میں آ کر جھوٹے منہ ہی سہی لیکن لوگوں کے سامنے روزے میں سرعام سگریٹ پینے سے باز آ گیا تھا۔ میں جب بالے سے اس کے بڑے بھائی اٹو کے کارنامے سنتا تو میرے دل میں اٹو کا خوف مزید گہرا ہوتا جاتا۔ بالے نے جب مجھے اور راجہ کو یہ بتایا کہ اٹو کے نیفے میں چوبیس گھنٹے گراری والا چاقو اڑسا رہتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ کئی مرتبہ جھگڑے کے دوران یہ آٹھ گراری والا چاقو استعمال بھی کر چکا ہے تو ہم دونوں کی آنکھیں خوف اور اٹو کی مرعوبیت سے پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے خود ایک آدھ مرتبہ اٹو کو اپنی مکہ (کلپ) اپنے پنجے پر چڑھائے اور دیوار پر مکہ بازی کی مشق کرتے دیکھا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے تیس (۳۰) روزے بیتے اور چاند رات آ گئی۔ پورے محلے کے بزرگ، جوان اور بچے بڑے میدان میں عید کا چاند دیکھنے کے لیے سرِشام ہی جمع ہو گئے تھے اور ہر بزرگ کو کسی الگ ہی ٹہنی کے پیچھے سے عید کا چاند ابھرتا دکھائی دے رہا تھا جو بعد میں باقی سب کچھ ثابت ہو جاتا سوائے چاند کے۔ غفور چچا تو اپنے آباؤ اجداد کی پرانی کاربین کی بندوق نما دوربین بھی اٹھا لائے تھے جس کا شیشہ وقت کی دھول سے اس قدر دھندلا گیا تھا کہ اس سے سامنے بیٹھی چیز بھی بمشکل دکھائی دیتی تھی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جب تیس روزے پورے ہو ہی چکے ہیں تو پھر

اس چاند دیکھنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کا فائدہ کیا تھا؟ ابھی کل شام ہی تو یہ سارے عید کا چاند دیکھنے جمع ہوئے تھے لیکن بسیار کوشش کے بعد بھی جب چاند نظر نہیں آیا تو پتہ چلا کہ کل بھی روزہ رکھنا ہوگا۔ یہ سنتے ہی کل شام ہم سب بچوں کے منہ لٹک گئے تھے۔ حالانکہ راجہ نے قسمیں کھا کھا کر سب کو یقین دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ خود اس نے اپنی ''گناہ گار'' آنکھوں سے انصاری صاحب کے چھت کی چمنی کی اوٹ سے جھلکتی، چاند کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی لیکن حسب معمول راجہ کی بات پہ کسی نے یقین نہیں کیا اور آج ہمیں یہ تیسواں روزہ بھی رکھنا پڑا تھا اور جب آج بھی ان بزرگوں کو چاند دکھائی نہیں دے رہا تھا تو ہم سب بچوں کے دلوں میں یہ خوف کہیں جڑ پکڑ رہا تھا کہ کہیں اب کل اکتیسواں (۳۱) روزہ بھی نہ رکھنا پڑ جائے۔ باقی بچوں کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن خود میرے دل سے اس اکتیسویں روزے کا خوف ساری زندگی نہیں نکل پایا۔ میں نے باقی ساری عمر جتنی بھی نیکی کی صرف فرض کی حد تک ہی کی، کبھی مجھے خود اپنے آپ کوئی نیکی کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ جہاں فرض کی حد پوری ہوئی وہیں میں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی اس حد سے بڑھنے کی چاہ نہیں کی۔ ساری زندگی بس تیس (۳۰) روزوں پر ہی اکار رہا۔ کبھی اکتیسویں (۳۱) روزے کی سیڑھی خود سے پار نہیں کر پایا۔ یوں میری جھولی خود میری مرضی کی کی ہوئی نیکی سے سدا خالی ہی رہی۔

آخر خدا خدا کر کے کسی ایک کونے سے ایک بزرگ کی لرزتی کانپتی سی چیخ ابھری ''وہ رہا..... وہ رہا چاند.....'' ہم سب نے فوراً ان کی شہادت کی اٹھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں اور پھر کسی نہ کسی طرح سب ہی کی وہ دھات کی پتلی سی تار جیسا پہلی کا چاند نظر آ ہی گیا۔ سب نے گلے مل مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ چند ہی لمحوں بعد شہر کی میونسپلٹی سے دور فوجی میدان میں توپیں داغے جانے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حکومت کی طرف سے بھی باقاعدہ عید کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہم سب بچوں نے خلوص دل سے اللہ میاں کا شکر ادا کیا کیونکہ اندر سے ہم سب ہی کی جان نکلی ہوئی تھی کہ چاند نظر نہ آیا تو کیا ہوگا؟

یہاں میدان میں سارے ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دے رہے تھے اور میں ڈوآپی کو مبارک دینے کے لیے ان کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا تھا۔ ڈوآپی گھر کے برآمدے میں بیٹھیں سکینہ خالہ کے ساتھ مہندی گیلی کروا رہی تھیں۔ غیاث چچا فضلو بابا کے ساتھ مل کر چند مزدوروں سے گھر کے خراب شدہ حصوں پر دوبارہ سے قلعی کے چھینٹے پڑوا رہے تھے۔ ڈوآپی نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ میں نے انہیں چھت پر چلنے کا اشارہ کیا تاکہ میں انہیں چاند دکھا سکوں۔

عید کا چاند ویسے بھی تو چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے لہٰذا ہم دونوں تیزی سے صحن کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جا پہنچے۔ میں نے چاند نکلنے کی جگہ اچھی طرح یاد کر رکھی تھی لہٰذا مجھے ڈوآپی کو اسے ڈھونڈ کر دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ڈوآپی نے چاند دیکھتے ہی جلدی سے سر پہ دوپٹہ درست کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پتہ نہیں وہ آنکھیں بند کیے اتنے جذب کے عالم میں کون سی دعا مانگ رہی ہوں گی؟ میں ڈوآپی کے چاند چہرے کو دیکھتے ہوئے یہی سوچتا رہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں اللہ میاں ہوتا تو ڈوآپی کی ہر دعا بن مانگے ہی قبول کر لیتا لیکن مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ ''اصلی'' اللہ میاں بھی ان کی ہر دعا سب سے پہلے سنتا ہوگا۔ ڈوآپی نے دعا ختم کر کے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنی جانب یوں پٹ پٹ گھورتے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''کیا دیکھ رہے ہو آدی.....؟'' ڈوآپی میرے بالکل مقابل یوں کھڑی تھیں کہ ان کے چہرے کے پیچھے ہی عید کا وہ باریک

سا چاند بھی جھلک رہا تھا۔ میں ابھی انہیں کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ یکا یک ڈوآپی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یوں لگا جیسے چاند کو اچانک ہی پریشانی اور غصے کے بدل نے ڈھانپ لیا ہو۔ میں نے چونک کر ان کی نظروں کے تعاقب میں نیچے میدان کی طرف جھانکا۔ میدان اب تقریباً سنسان ہو چکا تھا کیونکہ کچھ دیر پہلے چاند دیکھنے کے لیے جمع ہوا ہجوم اب عید کی تیاریاں کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی جانب چھٹ چکا تھا لہٰذا میری سیدھی نظر میدان میں تنہا کھڑے اگو پر جا پڑی جس کا ڈوآپی کی جانب سلام کرنے والا ہاتھ ابھی تک اس کے ماتھے سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ لگاتار اور بناء کسی خوف کے نیچے کھڑا مسلسل جانے کب سے ڈوآپی کو گھورے جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم کا تمام خون ایک دم ہی میری کن پٹیوں کی جانب بہنا شروع ہو گیا ہو۔ ڈو آپی نے پریشانی میں جلدی سے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے ہوئے نیچے اتر آئیں۔ راستے میں سیڑھیوں پر انہوں نے مجھے منع کیا کہ میں غیاث چچا کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں کیونکہ غیاث چچا کو یوں تو غصہ کچھ کم ہی آتا تھا لیکن اگر کبھی آ جاتا تو پھر پورا محلہ اس سے پناہ مانگتا تھا اور ڈوآپی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کی بھی عید بدمزہ ہو۔

لیکن آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اسی وقت اگر غیاث چچا کو نہیں تو کم از کم سکینہ خالہ کو تو اگو کی وہ بے ہودہ حرکت چپکے سے بتا دیتا تو شاید آگے چل کر وہ سب نہ ہوتا جس نے ہم سب کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔ بہرحال اس وقت میں ڈوآپی کی وجہ سے چپ ہی رہا۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ پہلی بار نہیں تھی جب اگو نے ڈوآپی کو تنگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ وہ پہلے بھی آتے جاتے کئی بار کالونی میں ان کا راستہ کاٹ چکا تھا۔ بلکہ اب تو اس کی وجہ سے ڈوآپی نے بلاضرورت گھر سے باہر قدم نکالنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اگو ہر لمحے ڈوآپی کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب غیاث چچا گھر پر نہیں ہوتے تھے اور جیسے ہی ڈوآپی کو کہیں باہر آتے جاتے دیکھتا فوراً ان سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگتا۔ ویسے تو ڈوآپی فضلو بابا کے ساتھ ہی گھر سے باہر کہیں آتی جاتی تھیں لیکن فضلو بابا اب اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ انہیں اگو جیسوں کی آوارہ نظر کی خبر بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ بے چارے تو اپنی لاٹھی ٹیکتے آگے آگے چلے جاتے اور ڈوآپی نظریں جھکائے ان کے پیچھے پیچھے، لیکن اگو کی مجال کی حد تو دیکھئے کہ وہ ایک آدھ بار موقع پا کر فضلو بابا کی موجودگی میں بھی ان کے اور ڈوآپی کی راہ کے درمیان آ کھڑا ہوا اور ڈوآپی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔ آگے چلتے فضلو بابا کو اس لمحے کے ہزارویں حصے میں ہوئی واردات کی خبر تک نہ ہوئی۔

پھر تو اگو نے اپنا وطیرہ ہی بنا لیا کہ جب بھی ڈوآپی کہیں بھی نظر آتیں وہ ان کے پیچھے ہی پڑ جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے راستے میں انہیں رقعہ دینے کی بھی کوشش کی جو ہمیشہ گھبرا کر تیز تیز چلتی ہوئی ڈوآپی کے قدموں میں ہی پڑا رہ گیا۔ ان سب باتوں سے تنگ آ کر ڈوآپی نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تبھی وہ اتنے دنوں سے ہمارے گھر بھی نہیں آئیں تھیں اور جب استانی خالہ نے ستائیسویں رمضان کو اپنے گھر میں ختم قرآن پر پورے محلے کو دعوت دی تھی تب بھی صرف سکینہ خالہ ہی تنہا وہاں آئیں تھیں۔ اب مجھے دھیرے دھیرے ہر بات کی سمجھ آنے لگی تھی لیکن پھر بھی انہیں دن میں دو مرتبہ کالج آنے اور جانے کے وقت تو محلے کے میدان سے گزرنا ہی پڑتا تھا جہاں وہ لفنگا اگو ان کی راہ میں ہمیشہ کانٹا بنے کھڑا ملتا۔ کالج جاتے ہوئے تو پھر بھی فضلو بابا ان کے ساتھ گیٹ تک جاتے تھے لیکن واپسی پر تو وہ محلے کے چھوٹے چھانک پر تانگے سے اترنے کے بعد اپنے گھر تک انہیں تنہا ہی یہ پل صراط پار کرنا ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ڈوآپی پڑھائی کے لیے اتنی دیوانی نہ ہوتیں تو وہ اس کم بخت اگو کے ہاتھوں بے زار ہو کر کب

کی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ گئیں ہوتیں۔ اوپر سے وہ خواب جو غیاث چچا نے ان کے مستقبل کے بارے میں ان کے بچپن سے ہی دیکھ رکھے تھے؟ ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے بھی تو وجو آپی کو اس کڑوے زہر کا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔ جانے وہ معصوم اور نازک سی لڑکی کب سے یہ اذیت سہہ رہی تھی اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا بھی نہیں تھا۔ غصے میں میرا تن من کھول اٹھا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر اگو کے نیفے میں اڑسا چاقو نکال کر خود اسی کے پیٹ میں گھونپ دوں۔ یوں چاند رات کو میرا موڈ بہت خراب تھا۔ میں نے دیگر بچوں کے ساتھ مل کر رات کو آتش بازی میں بھی حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ راجہ میرے لیے بھی بہت سی شرشریاں اور انار والے پٹاخے لے کر آیا تھا لیکن میں نے سبھی عمارہ کو دے دیئے۔ امی عید کی رات ہی شیر خرما اور کھیر تیار کر دیتی تھیں اور میں باورچی خانے میں رات کو دیر تک اور پھر صبح تازہ پوریاں تلتے وقت ان کی مدد کیا کرتا تھا حالانکہ عمارہ اس بات سے بے حد چڑتی بھی تھی کہ امی مجھے اس سے زیادہ دیر تک چولھے کے پاس کیوں بیٹھنے دیتی تھیں اور میں اس سے زیادہ خشک میوہ چھیل کر امی کو کیوں دیتا تھا جسے امی کھیر اور شیر خرما کے اوپر پروتی جاتیں تھیں، لیکن اس رات میرا دل اپنے اس محبوب مشغلے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اگو کا مکروہ چہرہ اور اس کا ماتھے تک اٹھا ہوا ہاتھ آ جاتا تھا۔

چاند رات کو یہی ماجرا مجھے خواب میں بھی نظر آتا رہا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وجو آپی اور میں کہیں جا رہے ہیں کہ اچانک اگو کہیں سے ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور وجو آپی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں اگو کا ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیتا ہوں کہ وہ دور جا گرتا ہے اور اس کا چاقو بھی میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ ابھی میں چاقو کی چار گراریاں ہی کھول پایا ہوتا ہوں کہ اگو ڈر کر بھاگ جاتا ہے اور وجو آپی خوشی کے مارے حسب عادت میرے گال زور سے کھینچ کر مجھے خوب پیار کرتی ہیں۔

اگلی صبح عید کی نماز پڑھ کر حسب معمول ابا مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا کو لے کر دادی اماں اور نانی اماں کے گھر سلام کے لیے لے گئے۔ دادی اور نانی اماں ہمیشہ مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا سے زیادہ عیدی دیا کرتی تھیں۔ دادی اماں کے کمرے میں دیوار کے اندر بنی دو بڑی بڑی کھڑکی نما الماریاں بھی تھیں جن کے اندر دادی اماں اپنی جوانی کے برتن اب تک سنبھال کر رکھتی تھیں۔ انہی سبز رنگ سے پینٹ شدہ الماریوں کے کچھ برتنوں میں وہ ہمیشہ میرے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ چھپا کر رکھتی تھیں جو ایسے کسی موقعے پر سب سے چھپ کر میرے حوالے کر دیتیں۔ ہم سب خاندان کے بچوں کی عید ہمیشہ دادی اماں کے صحن میں کھیلتے ہی گزرتی تھی۔ میری چچازادوں میں عالیہ بھی تھی جو تھی تو بہت نخریلی لیکن جانے کیوں وہی مجھے سب کزنز میں سب سے زیادہ اچھی بھی لگتی تھی۔ ہم دونوں میں ہمیشہ اس بات کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا کہ دادی اماں ہم دونوں میں سے سب سے زیادہ پیار کس سے کرتی ہیں۔ کھیل کے دوران بھی میں ہمیشہ اسی کو اپنی ساتھی بنایا کرتا تھا۔ اس عید کے روز بھی حسب معمول عابد، ساجد، روبی، فوزیہ اور باقی سبھی چچازاد دادی کے صحن میں اچھل کود میں مصروف تھے اور دادی اور نانی اماں اندر کمرے میں مل کر عید کا دسترخوان سجا رہی تھیں کیونکہ عید کے روز ہمارا پورا خاندان ایک ہی دسترخوان پہ اکٹھے ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ عالیہ نے مجھے یوں گم سم بیٹھے دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آئی وہ سبھی میرے پاس عیدی کم جمع ہوئی ہے اس لیے میں اداس بیٹھا ہوں۔ میں نے اسے وجو آپی کی پریشانی کے بارے میں بتایا کہ انہیں کوئی غنڈہ تنگ کرتا ہے جس کے پاس گراری والا چاقو بھی ہے۔ وہ وجو آپی کے بارے میں پہلے ہی سے جانتی تھی کیونکہ جب وہ ہمارے گھر آتی تھی تو کئی بار اس کی وجو آپی سے ملاقات ہوئی تھی بلکہ وجو آپی نے کئی بار اس

کی گڑیا کے لیے کپڑے اور گڈے کے لیے گھر بھی بنا کر دیا تھا۔ میری سبھی چچازادوں میں وہی وجو آپی کی بھی پسندیدہ تھی۔ عالیہ میری بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے یوں چٹکی بجائی جیسے مسئلے کا حل اسے سمجھ آ گیا ہو۔ وہ بھاگ کر دادی کے کمرے میں گئی اور کچھ ہی دیر میں واپس آئی تو ہاتھ میں ایک تعویز تھامے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کی گلی میں ایک بہت "پہنچی ہوئی بُزرگنی" آئیں تھیں جنہوں نے اسے یہ تعویذ دو روپے میں دیا تھا۔ اس تعویذ کی خاصیت یہ تھی کہ جس کسی نے اسے گلے میں پہن رکھا ہوتا تھا اس پر کسی قسم کا "لوہا" اثر نہیں کرتا تھا اور چاقو بھی ظاہر ہے لوہے سے ہی بنا ہوتا ہے لہٰذا اگر وجو آپی اس تعویذ کو گلے میں ڈالے رکھتیں تو ان پر اُلو کا چاقو کبھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ شام کو واپس کالونی پہنچ کر رکشے سے اترتے ہی میں امی کے ساتھ گھر جانے کی بجائے وجو آپی کے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر ہی اپنی عید ملنے کے لیے آنے والی سہیلیوں کو رخصت کرتی مل گئیں اور مجھے اس دن ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ لڑکیاں کبھی آرام سے کمرے میں بیٹھ کر اتنی دیر بات نہیں کر سکتیں جتنی دیر وہ دروازے پر رخصت ہوتے وقت پٹر پٹر بولتی رہتی ہیں۔ خدا خدا کر کے ایک وجو آپی کے گلے لگتی کہ نکلتے وقت دوسری کو کوئی بات یاد آ جاتی۔ دوسری کی رام کہانی ختم ہوتی تو تیسری کو مڑتے مڑتے کوئی چٹکلہ یاد آ جاتا۔ میں بے چینی سے ان کے صحن میں ٹہلتا رہا اور پورے آدھے گھنٹے بعد ان کی وہ تینوں سہیلیاں "وقت کی کمی" کا رونا روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

وجو آپی میری جانب پلٹیں تو میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تعویذ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ارے..... یہ تعویذ کیسا ہے آدی..... اور تم صبح سے کہاں غائب ہو۔ میں نے تمہاری پسند کی میٹھی پوریاں اور سویاں بنا کر رکھی ہیں۔ چلو جلدی سے اندر چلو۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "وجو آپی..... پہلے یہ تعویذ تو گلے میں ڈالیں..... میں اتنی دور سے آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔"

وجو آپی میری بے تابی پہ ہنس دیں۔ "اچھا بابا..... یہ لو..... پہن لیا..... اب ٹھیک ہے..... اب تو بتا دو یہ تعویذ کس لیے پہنایا ہے مجھے؟"

میں نے عالیہ کے دیے ہوئے تعویذ کو وجو آپی کے گلے میں پڑے دیکھ کر ایک عجیب سا اطمینان اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ پھر جب میں نے وجو آپی کو اس تعویذ کی تاثیر بتائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ انہوں نے پیار سے میرے بال سنوارے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے لیے اتنا فکرمند نہ ہوا کروں کیونکہ جس لڑکی کا مجھ جیسا پیارا اور خیال رکھنے والا دوست موجود ہو اسے دنیا کا کوئی بھی غنڈہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بہرحال میں نے پوریوں اور سویوں کا ایک نوالہ بھی اس وقت منہ میں نہیں رکھا جب تک وجو آپی نے مجھ سے "پکا والا" وعدہ نہیں کر لیا کہ وہ اس تعویذ کو اپنے گلے سے تب تک جدا نہیں کریں گی جب تک اس کم بخت اُلو کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہو جاتا۔

اس وقت میں کتنا معصوم تھا کہ اتنی سی بات بھی نہیں جانتا تھا کہ بے رحم تقدیر کے لکھے ایسے تعویذوں سے نہیں مٹا کرتے ورنہ دنیا کا ہر شخص اپنے گلے میں ایسے سینکڑوں تعویذ ڈالے پھرتا دکھائی دیتا لیکن یہ بے خبری بھی کتنی بڑی نعمت دی ہے خدا نے اپنے بندوں کو۔ ہمیں آخری لمحے تک یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارے مقدر کا کون سا وار اگلے ہی لمحے ہماری زندگیاں تلپٹ کرنے والا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اس وقت مجھے اور وجو آپی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ تقدیر ہماری قسمت کی تختی پر کون سی سیاہی پھیرنے والی ہے۔

پہلا جواء

عید گزر گئی۔ ابا نہ جانے کہاں سے کسی بورڈنگ اسکول کے فارم لے آئے تھے اور سارا دن انہیں پڑھتے رہتے اور اپنے رجسٹر میں کچھ نوٹ کرتے رہتے۔ شاید ان کا ارادہ بڑے بھیا کو بورڈنگ اسکول میں بھجوانے کا تھا۔ ہماری پانچویں کے سالانہ امتحانات کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں اور راجہ چھٹی جماعت میں ہائی اسکول پہنچ گئے۔ یہ اسکول ہمارے پرانے پرائمری اسکول سے بہت بڑا تھا اور اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس اسکول میں بچوں کے بیٹھنے کے لیے ڈیسک بھی تھے اور اس کی چھت بھی نہیں ٹپکتی تھی اور اس کے تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) بھی پکی دیواروں میں نصب تھے، ورنہ ہمارے پچھلے پرائمری اسکول میں تو ہر کلاس میں بلیک بورڈ دو بانسوں کے اسٹینڈ پر کھڑے رہتے اور جماعت کی جگہ اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کبھی باہر صحن میں، کبھی شہتوت کے پیڑ کے نیچے اور کبھی برآمدے میں پڑے ملتے تھے۔ سردیوں کی چھٹیوں میں ابا نے مجھے انگریزی کا پہلا قاعدہ بھی دلوا دیا تھا جس میں میں اے فار ایپل اور بی فار بیٹ پڑھتا رہتا تھا۔ چھٹی جماعت سے ہمیں یہ انگریزی کا قاعدہ بھی شروع کرنا تھا جبکہ راجہ نے تو ابھی سے "انگلش" بولنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ بالا بھی "کسی نہ کسی طرح" چھٹی جماعت میں پہنچ گیا تھا اور ہم تینوں کی جماعت بھی ایک ہی تھی یعنی ششم الف (6th A) جبکہ گڈو، ننھو اور پپو ششم ب اور ج (B&C) میں تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم سب بچے ڈیسک پر بیٹھ کر خود کو کافی باعزت محسوس کرنے لگے تھے حالانکہ سب جماعتوں میں ڈیسکوں کی کمی کے باعث دو ڈیسک جوڑ کر تین تین بچوں کی ٹولیاں بٹھائی گئی تھیں لیکن ہمارے لیے یہ بھی کم غنیمت نہ تھا۔ کم از کم یخ ٹھنڈی یا گرم تپتی زمین پر بیٹھنے سے تو بدرجہا بہتر تھا۔ میں بالا اور راجہ ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ راجہ سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف بیٹھتا تھا لہٰذا اس کی نظریں سارا دن باہر سڑک پر رہتی تھیں اور وہ ہمیں رواں کمنٹری کے ذریعے باہر کی خبریں سناتا رہتا تھا۔ بالا درمیان میں بیٹھتا تھا بلکہ ڈیسک کے درمیان میں سر رکھ کر سوتا تھا کیونکہ اس کا محبوب مشغلہ کلاس میں سونا ہی تو تھا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ ٹیچر کے آتے ہی اسے کہنی مار کر جگا دیتا۔ بالا چند لمحوں تک آنکھیں کھلی رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتا اور پھر کتاب نکالتے ہی کچھ ہی دیر میں اس کا سر دوبارہ آہستہ آہستہ رکوع میں جھکتا چلا جاتا۔ میں اپنی کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے صفحے بھی پلٹتا جاتا اور جیسے ہی اس کی سبق پڑھنے کی باری آتی میں اس خاص سطر پر انگلی رکھ کر فوراً اسے جگا دیتا اور بالا تیزی سے ہنڑ کے وہیں سے پڑھائی جاری رکھتا جہاں سے پچھلے بچے نے چھوڑی ہوتی۔ مجھے بالے کی اس مہارت پر ہمیشہ رشک آتا تھا کیونکہ جیسے ہی بالا سبق ختم کرتا فوراً بیٹھ کر نیند کا سلسلہ بھی دوبارہ وہیں سے جوڑ دیتا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں نے بالے سے اس کے بڑے بھائی اٹو کی اس چاندرات والی حرکت کا ذکر بھی کیا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ خود بالا بھی اس

معاملے میں کچھ بھی کرنے سے معذور ہے کیونکہ اس کی اپنی جان اکّو کے ڈر سے نکلتی تھی۔ البتہ اس نے مجھ سے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اکّو کا گراری دار چاقو کہیں غائب کر دے گا۔ ڈوآپی اس شام کے بعد مزید محتاط ہو گئی تھیں اور انہوں نے چھت پر جانا بھی ختم کر دیا تھا۔ طاہر بھائی اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب ان کی پڑھائی اتنی کٹھن ہو گئی تھی کہ انہیں ڈو آپی کو پڑھانے یا ان کی مدد کرنے کا وقت بھی ذرا کم ہی ملتا تھا۔ البتہ اس بات سے خود ڈوآپی کچھ الجھی الجھی سی رہتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے کسی کتاب پر سرخ پنسل سے نشان لگا کر مجھے بھی طاہر بھائی کے ہاں بھیجا کہ ان سے کہوں کہ ذرا ان سطروں کا مطلب سمجھا دیں یا تشریح لکھ دیں لیکن میں یونہی باہر سے ایک چکر لگا کر واپس آ گیا کہ طاہر بھائی تو جانے کن موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپائے بیٹھے ہیں اور میری طرف تو دیکھتے بھی نہیں۔ یہ سنتے ہی ڈوآپی کے گلاب چہرے کا رنگ کچھ بدل سا جاتا اور ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی آ جاتی جسے اس وقت صرف میں ہی محسوس کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہی بے حد غصہ آ جاتا کہ آخر میں نے ان سے جھوٹ کیوں بولا..... کیا تھا اگر میں واقعی طاہر بھائی کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر ان سے دو لائنوں کی تشریح لکھوا ہی لاتا لیکن اسی لمحے میرا ذہن میرے دل کو زوردار جھاڑ پلاتا کہ ”زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں ہے، بھول گئے وہ دن جب اسی طاہر بھائی کی وجہ سے تم اپنا کارڈ ڈوآپی تک نہیں پہنچا پائے تھے۔ خبردار..... ان دونوں کے دور رہنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔“

لیکن اگر ایسے فیصلے ہمارے ذہن یا دل کی مرضی کے تابع ہوتے تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ابھی میرے چند دن ہی سکون سے گزرے ہوتے کہ پھر ان دونوں کا کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ہو ہی جاتا اور پھر سے چند گلے شکووں کے بعد وہ دونوں ہنس کر سبھی رنجشیں بھلا دیتے اور میں پھر سے کانٹوں پر لوٹنے لگ جاتا۔

اس دن بھی ایسا ہی کچھ واقعہ ہوا۔ ہم بچے بڑے میدان میں جمع تھے۔ راجہ ہمیں پتے کھیلنا سکھا رہا تھا۔ یہ تاش کے پتوں والا کھیل نہیں تھا بلکہ اس کھیل میں سگریٹ کی خالی ڈبیاں پتوں کا کام دیتی تھیں۔ ہر سگریٹ کے برانڈ کا ایک مختلف نمبر ہوتا تھا مثلاً کے۔ ٹو سگریٹ کا پتہ ایک نمبر کا تھا۔ ”بگلا مارکہ“ سگریٹ دو نمبر کا تھا۔ ”ولز اور ریڈ اینڈ وائٹ“ پانچ نمبر کے پتے تھے۔ ”کیپسٹن“ کے دس نمبر تھے۔ اسی طرح پچاس نمبر والی ڈبیا بھی ہوتی تھی۔ ”ایمپی“ کے سو نمبر تھے اور ”کیمل“ کے پانچ سو۔

یہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں ان دنوں ہمارے لیے جیسے باقاعدہ کرنسی کی حیثیت ہی تو رکھتی تھیں۔ ہم سارا دن اپنے محلے اور اس کے آس پاس سے یہ پتے جمع کر کے اپنے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہتے۔ جس بچے کے پاس جتنے زیادہ اور بڑے پتے ہوتے وہ اتنا ہی امیر کہلاتا۔ ہم بچے بڑے لوگوں کی طرح ان پتوں کو کرنسی نوٹوں کی طرح بھناتے بھی تھے مثلاً راجہ سو نمبر کی ایمپی سگریٹ کی ڈبیا بالے کی طرف پھینکتا اور کہتا ”بالے یار میں ذرا جلدی میں ہوں۔ داؤ لگا ہوا ہے، ذرا لپک کے کسی سے کیپسٹن کی دس پتیاں پکڑ لا۔“ بالا فوراً ”مارکیٹ“ سے سو کا پتہ بھنا لاتا۔ غریب قسم کے بچے ہاتھوں میں کے ٹو اور بگلا سگریٹ کی ڈبیوں کی ”ریزگاری“ لیے ادھر ادھر چھوٹے داؤ لگاتے نظر آتے اور اگر خوش قسمتی سے کسی بچے کے ہاتھ پانچ سو والی کیمل کی پتی یا ایک ہزاری والی ڈائمنڈ سگریٹ کی ڈبیا لگ جاتی تو وہ تو گویا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ان پتیوں کی ”بازار“ میں ایسی قلت پڑ جاتی کہ پانچ سو یا ہزاری پتی رکھنے والے ریزگاری کے لیے ہی ترس جاتے اور انہیں مجبوراً کھلے بازار میں اپنا بڑا پتہ اونے پونے بیچنا پڑتا۔ ان دنوں ہم سب بچوں کی

جیبیں سگریٹ کی ایسی درجنوں خالی ڈبیوں سے بھری رہتی تھیں اور کچھ بچوں نے تو بڑوں کی دیکھا دیکھی یہ پتے پھینٹنا بھی سیکھ لیے تھے۔ وہ بڑی مہارت سے گلی میں آتے جاتے یا بڑے میدان سے گزرتے ہوئے ان پتوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کا کرتب دکھاتے جاتے۔

کھیل کا طریقہ یہ تھا کہ سب بچے دو یا تین کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور ایک بچہ اپنی جیب سے پانچ یا دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اسے ہوا میں اچھالتا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنی ہتھیلی میں دبوچ کر اسے یوں زمین پر رکھتا کہ باقی کسی کی نظر سکے کے اس رخ پر نہ پڑ سکے جو ہتھیلی کے نیچے لیکن اوپر کی جانب ہوتا تھا۔ اب باقی بچوں میں سے کوئی ایک اپنی پتوں کی رقم مثلاً بیس، پچاسی یا کوئی چھوٹا پتہ اٹھا کر دوسرے بچے کے اس ہاتھ کی پشت پر رکھ کر داؤ لگاتا جس کے نیچے سکہ چھپا ہوتا تھا۔ داؤ لگانے والا بچہ دوسرے بچے کو اس کی ہتھیلی کے نیچے چھپے سکے کا رخ بتاتا مثلاً چاند تارہ یا مینار پاکستان، مسجد یا ۱۰ کا ہندسہ (Head or Tails) اور اگر نیچے چھپے سکے کا رخ وہی ہوتا جو پتے لگانے والے بچے نے بتایا ہوتا تو سکہ چھپانے والے بچے کو اتنی ہی مالیت کے پتے داؤ لگانے والے بچے کو دینے پڑتے تھے اور اگر بوجھنے والا سکے کا رخ غلط بوجھتا تو اس کے لگائے ہوئے پتے سکہ چھپانے والے بچے کے ہو جاتے۔

محلے کے بڑے میدان میں ہمارا پتوں کا کھیل جاری تھا۔ راجہ اس دن کافی "رقم" ہار چکا تھا اور اب تقریباً قلاش ہونے کے بعد اس نے مجھے اپنے پتے نکالنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا لیکن ہم سب اس بات سے بے خبر تھے کہ کافی دیر سے کچھ فاصلے پر اگو اور اس کے چند دوست جن کا حلیہ بالکل فلمی بدمعاشوں کی طرح تھا ہمارے کھیل کو وہیں سے کھڑے کھڑے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اگو اور اس کے دونوں دوست آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے سروں پہ کب آ کھڑے ہوئے اس کی ہمیں خبر ہی نہ ہوئی اور ہم سب تب اچھلے جب اگو کی کرخت آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"ابے داؤ لگانا تو سیکھ گیا ہے اب اگلے کی آنکھیں پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اگلے کی آنکھوں میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ نیچے چاند تارہ چھپا ہے یا مینار پاکستان۔" ہم سبھی کا تو جیسے سارے جسم کا خون ہی سوکھ گیا ہو۔ ہمارے منہ سے آواز تک نہیں نکل پائی۔ اگو نے گڈو کے ہاتھ سے سکہ لے کر ہوا میں اچھالا اور پھر ہتھیلی میں دبوچ کر اپنی دوسری ہتھیلی کی پشت پر جما کر چھپا دیا اور پھر اپنے دوست سے پوچھا۔

"کیوں بے سینڈو..... بتا کیا ہے..... چاند یا مینار.....؟"

سینڈو نے اپنے دانتوں کی نمائش کی اور جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر اگو کی ہتھیلی کی پشت پر رکھا اور بولی لگائی۔

"چاند ہے..... خدا قسم۔"

اگو نے ہتھیلی اٹھائی..... نیچے سے سکہ مینار کے رخ پر پڑا ملا۔ اگو نے ایک قہقہہ لگایا اور دو روپے اپنی جیب میں ڈال لیے پھر اس نے دوسری بار سکہ ہوا میں اچھالا اور دوبارہ چھپا کر اپنے دوسرے دوست سے پوچھا۔

"چل بھئی سلطانے..... اب تیری باری ہے..... چاند یا مینار....."

سلطانے نے کچھ وقت لیا اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اگو کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"سلطانے نے بھی کچی گوٹی نہیں کھیلی..... مینارہ ہے..... چل ہاتھ کھول۔"

اگو نے ہتھیلی ہٹائی تو نیچے سے چاند جھلک رہا تھا۔ اگو نے پھر زوردار قہقہہ لگایا اور پانچ کا نوٹ سلطانے کی انگلیوں سے اچک لیا۔ سلطانہ غصے میں بڑبڑایا.....

''دھت تیرے کی..... پر لگتا ہے تو نے یاروں کے ساتھ کوئی گیم کی ہے اگو جانی۔'' اگو نے سکہ دوبارہ گڈو کی طرف اچھال دیا۔

''نئیں میری جان..... کوئی گیم نہیں کھیلی میں نے..... صرف تھوڑا سا دماغ چلایا ہے اپنا اور بس..... یہ سارا پیسے کا ہی تو کھیل ہے۔''

پھر اگو نے راجہ سے کہا کہ وہ سکہ ہوا میں اچھال کر زمین پر اپنی ہتھیلی کے نیچے چھپالے۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ اب ان تین دوستوں نے راجہ کے ہاتھ کے نیچے چھپے سکے پر داؤ لگانا شروع کر دیا۔ کبھی اگو جیت جاتا اور کبھی اس کے دوست۔ ہم سب بچے دم سادھے لیکن دل چسپی سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے اور ہم سب میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم سب ان جانے میں اگو اور اس کے دوستوں کے ساتھ اس جوے میں شریک ہو چکے ہیں کیونکہ وہ لوگ رقم بھی ہمارے ہاتھ میں دے کر بولی دیتے۔ اگو پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ میں دے کر کہتا ''چل بھئی منّے..... لگا دے یہ پنجی چاند تارے پر۔''

وہاں سے اک کا دوست ننھو کے ہاتھ پر پیسے رکھتا۔

''جانی..... تو بھی دل بڑا کر کے چپکا دے مینارے پر۔''

یہ میری زندگی کا پہلا جوا تھا جو اس روز میں نے انجانے میں کھیلا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے زندگی میں کئی جوئے کھیلے اور ہمیشہ مات ہی میرے مقدر کا حصہ بنی۔ میں شاید پیدا ہی ہارنے کے لیے ہوا تھا لہٰذا زندگی کا ہر جوا ہارتا ہی چلا آیا لیکن شاید سب سے بڑی مات ابھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

ہم اپنے کھیل میں مشغول تھے کہ اچانک سینڈو نے اگو کو کہنی مار کر کہا۔

''اوئے اگو..... تیری تانگے والی.....''

سلطانے نے بھی ٹھنڈی سی آہ بھری۔

''قسم شاہ جی کے مزار کی..... یہ تو پٹاخہ ہے پٹاخہ..... پوری کی پوری نشو ہے۔ اپنا تو دل آ گیا ہے اس پر.....''

ہم بچوں نے بھی چونک کر آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ جو آپی اپنے تانگے سے محلے کے پھاٹک پر اتر کر پیدل گھر کی جانب سر جھکائے روانہ تھیں۔ اگو اور اس کے دوست ہم بچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اس بیچ رستے میں کھڑے ہو گئے جہاں سے وہ جو آپی نے گزرنا تھا۔ وہ جو آپی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں سر جھکائے بے خبر چلی آ رہی تھیں۔ سینڈو نے انگلی منہ میں ڈال کر ایک زوردار سیٹی بجائی۔ وہ جو آپی نے بے خبری میں سر اٹھایا اور ان تینوں کو اپنی راہ میں یوں قدم گاڑے کھڑے دیکھ کر خود ان کے قدم ڈگمگا سے گئے۔ وہ شاید اپنے کالج سے واپس لوٹ رہی تھیں کیونکہ ان کے کاندھے پر ان کا بیگ ابھی تک لٹکا ہوا تھا۔ کبھی کبھار جب ان کا پریکٹیکل ہوتا تھا تو وہ یونہی کالج سے دیر سے لوٹتی تھیں۔

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میدان دور دور تک سنسان تھا اور کوئی بڑا بوڑھا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جو آپی نے کنی کاٹ کر نکل جانا چاہا لیکن اگو قدم بڑھا کر ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور سرسراتے لہجے میں بولا۔

"دو گھڑی کبھی ہماری طرف بھی دیکھ لیا کرو سرکار.....ہم میں کیا کانٹے جڑے ہیں.....؟ ساری مہربانیاں کیا اس اکیلے پڑھاکو ڈاکٹر کے لیے ہیں۔"

غالباً اگو طاہر بھائی کا طعنہ دے رہا تھا۔ سینڈو اور سلطانہ زور سے ہنسے۔ وہ دونوں دزدیدہ نظروں سے ڈو آپی کے سراپے کو سر سے پیر تک مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ غصے سے میری کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں اور میں نے انجانے میں اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں۔ ڈو آپی نے دھیرے سے لیکن شدید غصے اور نفرت بھری آواز میں کہا۔

"راستہ چھوڑ و میرا....."

سلطانے نے دانت نکالے۔

"ارے استاد.....خدا قسم.....یہ تو بولتی بھی ہے.....قربان جاؤں۔"

اب میری برداشت کی حد جواب دے چکی تھی، میں بھول چکا تھا کہ میں ایک کم زور سا بچہ ہوں اور ڈو آپی کے سامنے تین ہٹے کٹے جوان مشٹنڈے سینہ تانے کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک کے نیفے میں چاقو بھی ہے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے گڈو کو زور سے دھکا دیا اور بے تحاشہ ان تینوں کی جانب سرپٹ بھاگا۔ میرا ارادہ تھا کہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے جا کر اگو کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکر ماروں گا۔ میری ٹکر سے وہ اپنی جگہ سے وہ کم از کم ایک پل کے لیے ہی سہی پر ہل تو جائے گا اور اتنی دیر ڈو آپی کے لیے وہاں سے آگے نکل جانے کے لیے بہت ہوگی پھر آگے جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ راجہ میرا ارادہ بھانپ کر زور سے چلایا۔ "رک جا آدی۔"

لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اب رکنے والا نہیں ہوں لہٰذا وہ بھی پتے پھینک کر میرے پیچھے دوڑا۔ وہ کبھی بھی مجھے خطرے میں دیکھ کر پیچھے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ راجہ کو میرے پیچھے بھاگتے دیکھ کر گڈو، ننھو اور پپو بھی خود کو روک نہیں پائے اور سبھی شور مچاتے راجہ کے پیچھے بھاگے لیکن میں ان سب سے کافی آگے تھا، میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کو بے قرار تھے، ان غنڈوں کی یہ مجال کہ وہ میری دو جو آپی کا راستہ روکیں؟ میری رفتار تیز ہوگئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں، پیچھے سے مجھے راجہ اور باقی دوستوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں پکڑ کر ہوا میں معلق کر دیا ہو۔ میں خلا میں معلق اپنی ٹانگیں ہی چلاتا رہ گیا اور کسی نے چند لمحوں کے بعد مجھے واپس زمین پر رکھ دیا۔ میرے پیچھے بھاگنے والے راجہ اینڈ کمپنی کا شور بھی یک دم ہی بند ہوگیا۔ میں نے جلدی سے حیرت کے مارے آنکھیں کھول دیں۔ اگو اب بھی وہیں اپنی جگہ اپنے دوستوں سمیت کھڑا تھا اور ڈو جو آپی بھی اپنی جگہ موجود تھیں۔ میں فوراً پلٹا اور طاہر بھائی کو اپنے پیچھے چٹان کی طرح سیدھا ایستادہ پایا۔ طاہر بھائی نے ہی مجھے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے پکڑ کر اٹھا لیا تھا۔ کچھ فاصلے پر میرے باقی دوست بھی اس طرح رک گئے تھے جیسے ہم "برف پانی" کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو چھو کر "برف" کہہ کر جما دیتے تھے۔ لگتا تھا طاہر بھائی نے ان سب کو بھی چھو کر برف کہہ دیا ہے۔

چند لمحے طاہر بھائی اور اگو گینگ ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تولتا رہا۔ اتنے میں ڈو آپی کے گھر کی جانب سے فضلو بابا اپنی لاٹھی ٹیکتے اور کھانستے ہوئے آتے نظر آئے اور ڈو آپی کو دور سے ہی دیکھ کر چلائے۔

"ارے ڈو بی.....اتنی دیر کہاں لگا دی.....چھوٹی دلہن آپ کے لیے پریشان ہوئی جاتی ہیں۔"

تھو آپی جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ فضلو بابا پورا ماجرا سمجھ ہی نہیں پائے اور ان کو لیے آگے چل پڑے۔ اگو گینگ نے اپنے دانت پیسے اور طاہر بھائی کے جانب بڑھ کر ان کے آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ مجھے طاہر بھائی نے پہلے ہی میرا بازو پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔ اگو نے طاہر بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''تو اپنی حکمت چلانے کی سوچ بابو..... اگو کے ساتھ ماتھا بھڑائے گا تو ساری ڈاکٹری بھلا دوں گا۔''

طاہر بھائی نے سکون سے جواب دیا۔

''تم اس محلے میں نئے آئے ہو اس لیے شاید یہاں کے ریت رواج سے واقف نہیں ہو۔ آئندہ اس محلے کی کسی لڑکی کا راستہ کاٹنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ.....''

سینڈو نے طاہر بھائی کی بات آدھے میں ہی کاٹ دی اور آگے بڑھ کر ان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور جھٹکا دے کر بولا۔

''ورنہ..... ورنہ کیا اوئے..... دھمکی دیتا ہے ہم کو۔''

طاہر بھائی نے اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے علیحدہ کیا اور گریبان جھٹک کر بولے۔

''ورنہ بہت برا ہوگا۔''

وہ تینوں شدید طیش میں آ چکے تھے اور قریب تھا کہ تینوں ہی طاہر بھائی سے بھڑ جائیں کہ اتنے میں غیاث چچا اور محلے کے چند اور بزرگ عصر کی نماز کے لیے مسجد جانے کے لیے گلی سے میدان کی جانب نکل آئے اور انہوں نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ سب جلدی سے ہماری جانب بڑھ آئے اور غیاث چچا نے وہیں سے آواز بھی لگا دی۔

''کیا بات ہے طاہر میاں..... سب خیر تو ہے نا.....؟''

اگو اور اس کے ساتھ محلے کے بڑوں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر بدک گئے لیکن جاتے جاتے بھی اگو نے دھیمی آواز میں طاہر بھائی کو دھمکی دے دی۔

''تجھے تو دیکھ لوں گا سالے حکیم کہیں کے.....''

غیاث چچا اور باقی لوگوں کے ہم لوگوں تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔ طاہر بھائی نے غیاث چچا کو ٹال دیا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی بس یونہی ایک چھوٹی سی بحث ہو گئی تھی اگو سے، لیکن غیاث چچا کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ طاہر بھائی کی بات سے مکمل مطمئن نہیں ہو پائے تھے اس لیے وہ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک طاہر بھائی اپنے گھر کے دروازے تک نہیں پہنچ گئے۔

اگو اور طاہر بھائی کی یہ پہلی باقاعدہ جھڑپ تھی لیکن اس وقت ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑائی آگے چل کر ایک ایسا رخ اختیار کر لے گی کہ ہم سب کی زندگیوں میں طوفان آ جائے گا۔ اس روز محلے والوں کو تو خبر نہ ہو سکی لیکن میں یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ تھو آپی اور طاہر بھائی کی نظروں میں چھپے پیغامات کو صرف میں نے ہی محسوس نہیں کیا، اگو بھی اس راز سے اچھی طرح واقف ہے اور اس روز اگو کے تیوروں نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اب یہ راز زیادہ دنوں تک راز نہیں رہ پائے گا۔

پہلی قربانی

اگلے دن اسکول میں راجہ نے مجھے زبردست جھاڑ پلائی کہ میں کل شام کیا کرنے چلا تھا۔ میں چپ چاپ اس کی اور بالے کی ڈانٹ سنتا رہا لیکن میں کرتا بھی کیا؟ کوئی ڈھو آپی کو تنگ کرے اور میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہوں.....؟ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا تھا۔ بالے نے بھی اپنے بڑے بھائی کو خوب سُست سنائیں کہ جانے کب ان کی اس مصیبت سے جان چھوٹے گی۔ بالے کا کہنا تھا کہ کل اگر اسے وقت پر اطلاع مل جاتی تو وہ کم از کم سینڈو اور سلطانے میں سے کسی ایک کو تو گرا ہی لیتا۔ بالا کل شام اس ''جائے وقوعہ'' پر موجود نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اسے اگر ہم سب کے ساتھ اپنے بھائی سے بھی لڑنا پڑتا تو وہ کبھی نہ چوکتا۔ اس نے مجھے اور راجہ کو مشورہ دیا کہ اب ہم تینوں کو بھی ایک ایک چاقو خرید کر اپنے بستوں میں رکھ لینا چاہیے تاکہ اگلی بار ایسا کچھ ہو تو ہم بھی پوری طرح ''مسلح'' ہوں۔ ہم تینوں یہی باتیں کرتے ہوئے اسکول سے واپسی پر محلے میں داخل ہوئے تو فضلو بابا نظر آئے جو مجھے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ وجو آپی کا حکم ہے کہ کھانا کھا کر سیدھا ان کے گھر حاضری دوں۔ میں نے بستہ وہیں پر راجہ کے حوالے کر دیا اور خود اسی وقت وجو آپی کے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔

ڈھو آپی گھر کے صحن میں ہی پھولوں کی کیاری میں اپنے پسندیدہ کالے گلاب کے پودے کے پاس آرام کرسی ڈالے متفکر سی بیٹھی تھیں۔ وہ گھر کے عام کپڑوں میں ملبوس تھیں، اس کا مطلب تھا کہ وہ آج کالج بھی نہیں گئی ہوں گی؟ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے اٹھیں اور جلدی سے میری جانب لپکیں۔

''آدی..... تم ٹھیک تو ہو نا.....''

میں ان کی فکر دیکھ کر ہنس پڑا۔

''ارے..... مجھے کیا ہونا ہے..... بھلا چنگا تو ہوں.....''

پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور تقریباً رو دینے والے لہجے میں بولیں۔

''کل کیا ہو گیا تھا تمہیں..... یہ کیا بے وقوفی تھی ہاں..... جانتے نہیں وہ کتنے گندے لوگ ہیں..... تمہیں کچھ ہو جاتا تو.....؟''

مجھے غصہ آ گیا ''جو کوئی بھی میری ڈھو آپی کو ستائے گا..... میں اس سے بھڑ جاؤں گا..... پھر چاہے جو بھی ہو.....''

ڈھو آپی کی آنکھوں میں اب باقاعدہ آنسو آ گئے۔

''نہیں آدی نہیں..... ابھی تم بہت چھوٹے ہو..... تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے..... تم پہلے خوب پڑھ لکھ کر بڑے ہو جاؤ پھر تمہاری ڈھو آپی کو

کوئی تنگ نہیں کرے گا لیکن تب تک آدی صرف پڑھائی کرے گا..... اور کچھ نہیں..... بولو وعدہ....."

ڈوآپی نے حسب عادت مجھ سے وعدہ لینے کے لیے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ میں کچھ ہچکچایا۔ ڈوآپی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آدی کی دوست اس سے وعدہ مانگ رہی ہے لیکن وہ وعدہ نہیں کر رہا....."

مجبوراً میں نے بھی ان کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھا وعدہ....."

ڈوآپی مسکرائیں۔

"پکا والا۔"

"ہاں..... پکا..... پورا پکا۔"

پھر جب میں نے ڈو آپی کو بتایا کہ ان کی مدد کے لیے صرف میں ہی نہیں بلکہ راجہ، گڈو، ننھو، پپو بھی یکے بعد دیگرے میرے پیچھے بھاگے تھے تو وہ ہلکے سے ہنس دیں اور انہوں نے مجھ سے میرے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کو کہا اور ان سب کے لیے بہت سی ایرانی "ٹھیک" ببل گم بھی دیں۔ میں نے انہیں ان کے جانے کے بعد اگو اور طاہر بھائی کے درمیان ہوئی مختصر سی جھڑپ کے بارے میں بھی بتایا۔ اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود ان کے سامنے طاہر بھائی کا ذکر کیا تھا۔ جانے کیوں جب طاہر بھائی نے مجھے دوڑتے ہوئے اچک لیا تھا اور خود اگو کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اسی لمحے سے میرے دل میں ان کے لیے ایک ان جانی سی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ اس دن میں نے شاید یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ ڈو آپی کی حفاظت کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور جب تک میں بڑا ہو کر خود ڈوآپی کی ڈھال نہیں بن جاتا تب تک کے لیے مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ طاہر بھائی ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

لیکن ڈو آپی طاہر بھائی اور اگو کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن کر جانے کیوں بہت زیادہ پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے پہلے مجھے زبانی طاہر بھائی کو پیغام دینے کا کہا کہ وہ اپنی حفاظت کریں اور اگو کی جانب سے ہوشیار رہنے کی کوشش کریں لیکن پھر انہیں زبانی پیغام پر بھی اطمینان نہیں ہوا تو جلدی سے اندر کمرے سے اپنی کاپی اور پین اٹھا لائیں اور سفید ورق پر تیزی سے دو سطریں لکھ دیں۔

"آپ ان لوگوں سے دُور ہی رہیے گا۔ دو ماہ بعد آپ کے فائنل ائیر کے امتحانات ہیں۔ خدا کے لیے کسی جھگڑے میں خود کو ملوث نہ کیجیے گا، یہی میری آپ سے التجا ہے..... آپ کی شاگرد۔"

ڈو آپی نے جلدی سے وہ صفحہ کاپی سے علیحدہ کیا اور میرے حوالے کر کے تاکید کی کہ میں گھر جانے سے پہلے خود طاہر بھائی کے ہاتھ میں یہ رقعہ تھما کر جاؤں اور میری زندگی میں یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں نے ڈوآپی کا پیغام ٹھیک ٹھیک طاہر بھائی تک پہنچا دیا تھا۔ طاہر بھائی نے رقعہ کھول کر پڑھا اور ہلکے سے مسکرا کر میرے گال کھینچے۔

"اپنی ڈوآپی سے کہنا کہ جس کا تم جیسا بہادر دوست موجود ہو اسے دنیا میں کسی سے بھی ڈرنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان

سے کہہ دینا کہ میں احتیاط کروں گا۔''

طاہر بھائی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میرے کندھے فخر سے چوڑے ہو گئے۔ طاہر بھائی اتنے بُرے بھی نہیں تھے جتنا میں آج تک انہیں سمجھتا رہا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس دن وہ مجھے کافی ''معقول'' شخص نظر آئے۔

''جو آپی نے اس دن کے بعد گھر سے اکیلے یا فضلو بابا کے ساتھ نکلنا بالکل ختم کر دیا۔ پتہ نہیں انہوں نے گھر میں کیا عذر پیش کیا ہوگا لیکن اب وہ کالج کے وقت اور کالج سے واپسی پر بھی غیاث چچا کے ساتھ ہی نکلتیں۔ یوں اُگو کا ان کے گھر کے اردگرد منڈلانا بھی کافی حد تک کم ہو گیا کیونکہ غیاث چچا کے غصے سے سبھی واقف تھے۔ وہ تو محلے کے عام نوجوانوں کو بھی گھر کے پاس یا میدان میں خالی اور خوامخواہ کھڑا دیکھ کر خود ان سے پوچھ بیٹھتے تھے۔

''کیوں میاں..... خیر سے کھڑے ہو یہاں.....؟ کوئی کام وغیرہ نہیں ہے کیا کرنے کو.....؟''

اس لیے سبھی ''فارغ'' قسم کے نوجوان انہیں گھر سے نکلتے یا محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر خود ہی یہاں وہاں کھسک جاتے تھے۔

بہت سے دن یونہی گزر گئے۔ ہمارے ششماہی امتحان ہو چلے تھے اور طاہر بھائی کی ڈاکٹری کا فائنل امتحان چل رہا تھا۔ اُگو بھی بہت دن سے محلے میں آوارہ گردی کرتے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے ہم نے بھی کچھ اطمینان کی سانس لی..... لیکن اگلے دن ہی پتہ چلا کہ ہمارا یہ اطمینان عارضی ہے۔

اس شام بالا مجھے اور راجہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیٹھ گردھاری مل کی درمیانی بیٹی کلپنا دیوی بُری طرح سے اس پر عاشق ہو چکی ہے لیکن چونکہ وہ ایک انتہائی ''مشرقی'' لڑکی ہے اس لیے وہ خود اپنے منہ سے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس وقت مجھے اور راجہ کو اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں کیونکہ اس وقت میں اور راجہ دونوں ہی ''مشرقی'' لڑکیوں کے اوصاف سے ناواقف تھے۔ بالے نے اس دن میرے متعلق بھی یہ فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ میں آگے چل کر انتہائی سچا عاشق ثابت ہوؤں گا کیونکہ اسے میرے اندر وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی تھیں جو اس ''منصب شاہی'' کے لیے ضروری ہو سکتی ہیں۔ ابھی ہم بالے سے ''علم و دانائی'' کا یہ عظیم خزانہ سمیٹنے میں مصروف تھے کہ اُگو اپنے دوستوں سمیت محلے میں داخل ہوا۔ ہم تینوں نے اُگو کو یوں آتے دیکھ کر گھبرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا لیکن اُگو گینگ نے ہم بچوں پر کوئی خاص توجہ ہی نہیں دی۔ بس ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ سچ پوچھیے تو یہ دیکھ کر مجھے اور راجہ کو ذرا سی سبکی کا احساس بھی ہوا، گویا اُگو اور اس کے دوست ہمیں کسی کھاتے میں شمار ہی نہیں کرتے تھے؟ اور کچھ نہیں تو انہیں ایک لمحے کے لیے رک کر مجھ سے اور راجہ سے یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ اس دن ہم ان کی طرف کیوں بھاگے تھے۔

ہم نے بالے کو ان کی ٹوہ لینے کے لیے بھیجا۔ بالا پچھلی جانب سے دیوار ٹاپ کر ان کے بالکل پچھلی جانب کی دیوار کے پیچھے جا چھپا اور واپس آ کر اس نے جو کچھ ہمیں بتایا اسے سن کر میرے اور راجہ کے ہوش اڑ گئے۔

وہ تینوں طاہر بھائی سے لڑنے کے ارادے سے محلے میں آئے تھے۔ اُگو کا ارادہ یہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہی طاہر بھائی کو وہ تینوں بے خبری میں دھر لیں گے اور ان کو اچھی طرح سبق سکھانے کے بعد وہ تینوں شہر سے باہر جانے والی کوئی بھی بس یا ٹرین پکڑ کر کچھ دن کے لیے روپوش ہو جائیں گے۔

ہم تینوں دم سادھے بیٹھے طاہر بھائی کے گھر کے دروازے کی جانب دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے رہے کہ طاہر

بھائی گھر سے نہ نکلیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی نے بھی خود جا کر طاہر بھائی کو گھر سے نکلنے سے منع کیا تو وہ ضرور باہر آئیں گے لہٰذا اس وقت ہم سوائے دعا مانگنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

آخر ہماری دعائیں رنگ لائیں اور طاہر بھائی شاید اپنے اگلے دن کے پرچے کی تیاری میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اگو اور اس کے دوست پہلے تو اکتا کر سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے رہے پھر تنگ آ کر وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چل پڑے لیکن ان کے ارادوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع ملنے پر دوبارہ یہ کوشش ضرور کریں گے۔

راجہ نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے یہ سب کچھ ڈوآپی کو بتا دینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی بہتر ترکیب ہو اس مصیبت سے نپٹنے کی۔ ڈوآپی کے نام پر بالے نے مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر راجہ سے کہنے لگا ''میری باتوں پہ تو تم دونوں خوب ہنستے ہو۔ پر یہ آدی خود جو بھی کرتا پھرے، اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔''

میں نے حیرت سے بالے کو دیکھا ''کیوں.....؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

بالے نے ٹھنڈی سی آہ بھری اور راجہ کی طرف دیکھا۔

''لو جی..... یہ ہم سے پوچھ رہا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے..... سچ بول راجہ..... کیا تجھے بھی نہیں پتہ.....؟''

راجہ کی سمجھ میں شاید بالے کی بات کچھ کچھ آ گئی تھی لہٰذا اس نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''جانے دے یار بالے..... یہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے.....'' لیکن اب میں اڑ گیا۔

''نہیں نہیں..... مجھے بھی تو پتہ چلے میں نے کیا کیا ہے.....؟''

راجہ نے بات ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن میں بالے کی جان کو آ گیا کہ جب تک وہ بات نہیں بتائے گا ہم تینوں میں سے کوئی بھی گھر واپس نہیں جائے گا، ورنہ دوستی ختم۔ آخر کار بالے نے دھیرے سے بات کھول ہی دی۔

''سچ بتا آدی..... تجھے تیری ڈوآپی کیسی لگتی ہے.....؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''بہت اچھی.....''

راجہ اور بالا دونوں ہی میرے انداز پر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

بالے نے راجہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بس..... ہم بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ تجھے تیری ڈوآپی دنیا میں سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اتنی کہ تو اس کی خاطر تین جوان کڑیل بندوں سے لڑنے کو بھی تیار ہو گیا تھا تو پھر جا کر اپنی ڈو آپی کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہیں.....؟''

میں بالے کی بات سن کر جھینپ سا گیا۔

''ارے.....اس میں بتانے کی کیا بات ہے.....؟ وہ تو خود پہلے ہی سے جانتی ہیں کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔''

بالے نے زور سے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

''اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بے وقوف جب کوئی لڑکی اچھی لگتی ہے تو اسے خاص طور پر بتانا پڑتا ہے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ اس دن ''کہرا عاشق'' دیکھی تھی نا راحت ٹاکیز میں.....رنگیلا بے چارہ صرف اس لیے مارا جاتا ہے کہ وہ وقت پر شہزادی کو بتا نہیں پاتا کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔''

اب مجھے بالے کی بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن اب بھی میں پوری طرح اس کا مطلب سمجھ نہیں پایا تھا۔ بالا ابھی مجھے یہ ''اہم نکتہ'' سمجھانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں بڑے بھیا فاران مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئے اور مجھے فوراً اپنے ساتھ گھر چلنے کو کہا کیونکہ ابا مجھے کوئی بڑی خوش خبری دینا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے اٹھ کر ان کے ساتھ چلنا پڑا۔ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ ایسی کون سی خوش خبری ہے جو ابا مجھے دینا چاہتے تھے۔ نئی سائیکل دلوانے سے تو انہیں نے پچھلے مہینے ہی منع کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مجھے ان کی سہراب سائیکل پر ہی اپنا ہاتھ صاف کرنا چاہیے جبکہ مجھے ان کی پرانی سائیکل محلے میں نکالنے سے ہی بڑی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی سائیکل اتنی اونچی تھی کہ میں اس کی گدی پر بمشکل ہی پہنچ پاتا تھا اور گدی پر بیٹھنے کے بعد پاؤں پیڈل تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس سائیکل کو چلا کر محلے میں سب کے مذاق کا نشانہ بننے سے بہتر تھا کہ میں بنا سائیکل ہی گزارہ کر لوں۔ انہی سوچوں میں گم میں اور بھیا گھر میں داخل ہوئے تو ابا صحن میں ہی انگور کی بیل کے نیچے ٹہلتے ہوئے مل گئے۔ ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی جا رہی تھی اور ہاتھوں میں چند کاغذ تھے جنہیں وہ بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے امی کی جانب پلٹ کر خوشی سے کہا۔

''لو بھئی.....آ گیا تمہارا فوجی بیٹا۔''

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن صحن میں تو اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں شک نے پیر پھیلائے۔ ''ہوں.....اس کا مطلب ہے اتنے دن تک ان سب نے مجھ سے یہ بات چھپا کر رکھی تھی کہ ابا کا ایک بیٹا اور بھی ہے جو فوجی بھی ہے.....''

لیکن کچھ ہی لمحوں میں یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ ابا نے فوراً مجھے پیار سے گلے لگا لیا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کیونکہ ابا نے کبھی یوں ''کھل'' کر مجھے پیار نہیں کیا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ میرا داخلہ کسی فوجی کالج (کیڈٹ کالج) میں ہو گیا ہے۔ اتنے ہفتوں سے ان کی جس بھاگ دوڑ کو میں بڑے بھیا کے لیے سمجھ رہا تھا وہ دراصل ان کے لیے نہیں بلکہ میرے داخلے کے سلسلے میں تھی۔ عمارہ، بڑے بھیا اور امی سب ہی مجھے مبارکباد دے رہے تھے، پیار کر رہے تھے، خوشی سے شور مچا رہے تھے لیکن میں گم سم سا کھڑا ابا کے ہاتھ میں پکڑے اپنے داخلے کے کاغذ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ میری قید کا پروانہ ہو لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے مجھے خود بھی کیڈٹ کالج کی بورڈنگ میں جانے، فوجی لباس پہننے اور پریڈ کرتے ہوئے سلیوٹ کر کے گزرنے کا جنون تھا۔ میں اخباروں سے ایسے کیڈٹس کی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنی کاپیوں پر چپکاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر لڑاکا جہاز اور پائلٹ تو میری کمزوری تھے۔ ابا نے میرے اسی شوق کو دیکھتے ہوئے مختلف جگہوں پر درخواستوں کے انبار بھجوا رکھے تھے اور آج دو سال بعد ان کی محنت رنگ لے ہی آئی تھی۔ ابا کی اپنی تنخواہ تو اتنی نہیں تھی کہ وہ میرے بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے لیکن میرا داخلہ حکومت کے

خرچے پر منظور ہو گیا تھا۔ ابا کی بے تحاشا خوشی کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں اپنے خاندان کا پہلا بچہ تھا جسے اتنا بڑا ''اعزاز'' حاصل ہوا تھا۔ سب خوش تھے، میری دھوم دھام سے ''رخصتی'' کے منصوبے بنا رہے تھے لیکن جانے کیوں خود میرا اپنا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی سوہان روح تھا کہ مجھے اپنے گھر، امی اپنے دوستوں اور اپنے محلے کو چھوڑ کر سینکڑوں میل دور ایک انجانی جگہ پر رہنا پڑے گا۔ اس لمحے میری اداسی کا یہ عالم تھا کہ مجھے عمارہ اور بڑے بھیا سے دور جانا بھی عذاب لگ رہا تھا۔ مجھے ان دونوں پر بھی ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی تو صرف ایک بار یہ ابا کے سامنے کہہ دے کہ ''نہیں ہم اپنے آدی کو اتنی دور پڑھنے کے لیے نہیں بھیجیں گے۔ ہم اس کے بغیر اداس ہو جائیں گے'' لیکن افسوس ان میں سے کسی تک بھی میرے دل کا یہ پیغام نہیں پہنچ سکا۔

اور پھر وہ آپی.....؟ وہ بھی تو یہیں رہ جائیں گی۔ میں ان کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا وہاں.....؟ اور پھر آج کل تو انہیں سب سے زیادہ میری ''ضرورت'' بھی تو تھی۔ اگر میرے پیچھے اس بدمعاش اکو نے پھر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو.....؟ نہیں نہیں..... میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے ذہن نے اسی لمحے اس ''کیڈٹ کالج کی مصیبت'' سے جان چھڑانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ راجہ کو ''اچانک بیمار پڑنے'' کے بہت سے نسخے معلوم تھے۔ میں نے سوچا کہ راجہ سے کہوں گا کہ کوئی ایسا نسخہ بتائے جس سے میں کم از کم تین چار ہفتوں کے لیے بستر پر جا پڑوں۔ پھر مجھے دادی جان کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ان کے سامنے جا کر خوب رونا دھونا ڈالوں گا کہ یہ سب مل کر آپ کے سب سے لاڈلے پوتے کو آپ سے دور کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ دادی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں وہ تو میری جدائی تو بالکل برداشت نہیں کر پائیں گی.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے کل ہی دادی کے گھر جا کر انہیں اپنی مظلومیت کی داستان سنا دینی چاہیے۔

میرا ذہن ساری رات اسی قسم کے منصوبے بناتا رہا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے اپنے گھر کی اور آس پاس کی ہر چیز پہ اتنا ٹوٹ کے پیار آنے لگا تھا کہ میں نے آدھی رات کو دو مرتبہ اٹھ کر اپنے پرانے بستے کو چوم کر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

صبح ہوئی تو سارے محلے میں یہ چرچا عام تھا کہ آدی کا داخلہ ملک کے سب سے بڑے اور اعلیٰ کیڈٹ کالج میں ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے استانی خالہ امی کو مبارکباد دینے آئیں اور پھر تو محلے داروں اور ابا کے جاننے والوں کا ہمارے رشتہ داروں سمیت تانتا بھی بندھ گیا۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دادی کے گھر جاتے ہی ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ٹسوے بہانا شروع کر دیے کہ ''اب تو آپ کے آدی کو دیکھنے کو آپ کی آنکھیں ہی ترس جائیں گی۔ خوب جی بھر کے مجھے دیکھ لیں کیونکہ چند دنوں میں مجھے یہاں سے بہت دور چلے جانا ہے۔''

دادی نے ہڑبڑا کر جلدی سے اپنا پاندان بند کیا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے تو آدی..... کہاں جا رہا ہے تو اپنی دادی کو چھوڑ کر۔'' میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً اپنے چہرے پر ازلی معصومیت اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کر دادی کو اپنے داخلے کے بارے میں بتایا کہ کس طرح گھر میں میری روانگی کی پرجوش تیاریاں بھی شروع ہو چکی ہیں اور تو اور میرے لیے تو انہوں نے ایک نیا سوٹ کیس بھی خرید لیا ہے جس میں میری وہ ضرورت کی چیزیں بھری جا رہی ہیں جو بورڈنگ والوں نے اپنے خط میں لانے کو لکھی تھیں۔ دادی کا پارہ حسب توقع فوراً ہی آسمان کو چھونے لگا۔ انہوں نے فوراً ماشکی کو حکم دیا کہ جا کر میرے ابا کو دادی کے حضور

فوراً پیش ہونے کا حکم سنا آئے۔ چند ہی لمحوں بعد ابا بھی اپنی سائیکل گھسیٹتے ہوئے دادی کے گھر آ پہنچے۔ دادی نے انہیں دیکھتے ہی واویلا شروع کر دیا کہ ''انہیں ذرا خیال نہ آیا مجھ معصوم کو گھر سے اتنی دور بھیجنے کا سوچتے ہوئے.....؟'' اور یہ کہ ''خبردار جو کسی نے آدی کو فوجیوں کے اسکول بھیجنے کی بات بھی کی تو، پتہ نہیں وہاں فوجی بچوں سے کیسی مشقت کرواتے ہوں گے؟ اور ہمارا آدی تو پہلے ہی اتنا نازک سا ہے۔ وہاں اس کے کھانے پینے کا دھیان کون رکھے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔''

ابا خاموشی سے دادی کی تمام تقریر سنتے رہے پھر انہوں نے دادی کو دھیرے دھیرے بورڈنگ کی تمام خصوصیات گنوانا شروع کیں تو لگاتار آدھا گھنٹہ بولتے ہی چلے گئے اور پھر آخر میں انہوں نے وہ ترپ کا پتہ پھینکا جو ہمیشہ سے دادی کی کمزوری تھا۔ انہوں نے انتہائی جذباتی لہجے میں دادی کو یہ بات یاد دلائی کہ آج اگر مرحوم دادا زندہ ہوتے تو وہ اپنے پوتے آدی کو اتنے بڑے ادارے میں داخلہ ملنے پر پورے شہر کا منہ میٹھا کروا دیتے اور ایک دادی ہیں کہ بجائے فخر کرنے کے خود اپنے ہاتھوں ہمارے خاندان کو ملنے والے اتنے بڑے اعزاز سے محروم کرنا چاہتی ہیں۔

دادا کا ذکر آتے ہی دادی کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ابا کو یاد دلانے لگیں کہ دوسری جنگ عظیم کے وقت جب لوگ گاؤں میں چھپتے پھرتے تھے کہ گورے انہیں ''لام'' پر نہ بھیج دیں، دادا نے خود اپنے آپ کو بھرتی کے لیے پیش کر دیا تھا۔

میں دور بیٹھا کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور دکھاوے کے طور پر ابا کی سائیکل کی چین ٹھیک کر رہا تھا۔ دادی کی رام کہانی سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ میں انہیں کیا سمجھا کر آیا تھا اور وہ کس زمانے کے قصے لے کر بیٹھ گئیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں دادی خود ابا کو مشورے دے رہی تھیں کہ آدی کے لیے آم کا اچار تو وہ خود اپنے ہاتھ سے بنا کر بھیجا کریں گی۔ جانے وہاں اسکول میں فوجیوں کو آم کا اچار بنانا آتا بھی ہوگا یا نہیں.....؟ اور باقی تمام مقوی مربّے وغیرہ تو ہمیشہ ان کی الماری میں پہلے سے تیار ہی پڑے ہوتے تھے۔ وہ سب تھوڑے تھوڑے پیک کر دیں گی جنہیں ابا میرے جانے سے پہلے ضرور اٹھاتے جائیں۔

دادی سے مزید کوئی امید باندھے رکھنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ پوری طرح ابا کے ''جھانسے'' میں آ چکی تھیں اور اب میری آخری امید راجہ کے کارآمد نسخے تھے۔ راجہ نے میری کیڈٹ کالج جانے کی بات سن رکھی تھی اور وہ پہلے ہی سے حواس باختہ تھا۔ بالے اور ننھو ایک طرف بیٹھے میری عقل کا ماتم کر رہے تھے کہ انہوں نے مجھ سا بے وقوف آج تک نہیں دیکھا جو خود اپنی آزادی کا دشمن ہو۔ گڈو اور پپو نے ایک دوسری ہوش ربا خبر سنا کر میری رہی سہی سانس بھی کھینچ لی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ''باذوق'' ذرائع سے پکی خبر ملی ہے کہ ایسے بورڈنگز میں غلطی کرنے والے بچوں کو آدھی رات کو صرف ایک نیکر میں میدان میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

میں نے فوراً راجہ کو زور سے گلے لگا کر بھینچ لیا اور بھیگی آنکھوں سے اپنے تمام دوستوں سے التجا کی کہ خدا کے لیے مجھے ان ''وحشیوں اور جنگلیوں'' کے چنگل میں نہ جانے دیں۔ ان سب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور ان سب نے مل کر مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مرتے مر جائیں گے لیکن میرا ''مستقبل'' یوں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ راجہ نے جلدی جلدی مجھے فوری بخار چڑھنے کے چند آزمودہ نسخے بتائے جو وہ اسکول سے چھٹی کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا مثلاً برف کا بڑا سا ٹکڑا دس منٹ تک سر پہ رکھنا۔ آدھی رات کو اٹھ کر یخ ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اپنے اوپر انڈیلنا، گھر والوں سے

چھپ کر رات کو نیم گرم پانی سے نہا کر جلدی سے کمرے میں آ کر پوری رفتار سے پنکھا چلا کر اس کے نیچے صرف ایک تولیہ لپیٹ کر سو جانا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے یکے بعد دیگرے یہ تمام نسخے آزما لیے لیکن ایک دو دن بخار میں تپنے کے بعد میں بھلا چنگا ہو جاتا اور اب تو ویسے بھی امی ایک دو مرتبہ بخار چڑھنے کے بعد میری خصوصی دیکھ بھال کرنے لگی تھیں لہٰذا چھپ کر یہ سب کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے مستقل بیمار رہنے کا طریقہ نہیں مل پا رہا تھا اور دن تھے کہ پر لگا کر اڑے جا رہے تھے۔ میرے سامان کا سوٹ کیس بھرتا جا رہا تھا۔ میرے لیے نئے کپڑے بنوائے جا رہے تھے۔ نئے جوتے، نیا ٹوتھ برش، نیا ٹوتھ پیسٹ اور وہ بھی صرف میرے لیے جبکہ اس سے پہلے میری، عمارہ اور بڑے بھیا کی ایک ہی ٹیوب ہوتی تھی اور ہماری اس پر خوب لڑائی ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ ٹیوب رات ہی کو چھپا دیا کرتا تھا۔ نئی کنگھی، نیا شیشہ، نیا جوتا پالش کرنے والا برش اور پتہ نہیں کیا کیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں خوشی سے پھٹ ہی جاتا اور ساری رات اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے جاگتا رہتا کہ کہیں عمارہ اس میں سے کوئی چیز چرا نہ لے لیکن ان دنوں میری راتوں کی نیند جدائی کے احساس سے ہی اڑی ہوئی تھی۔ ساری رات میں بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔ لمحہ بھر کو آنکھ لگ بھی جاتی تو خواب میں میں اپنے آپ کو صرف ایک نیکر میں ایک بڑے سے میدان میں کھڑے پاتا اور فوراً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ یہاں میرا پریشانی اور اداسی سے یہ حال تھا کہ میری بھوک، پیاس اور نیند سبھی اڑ چکے تھے اور دوسری جانب ڈوآپی تھیں کہ انہیں جب میرے بورڈنگ میں داخلے کا پتہ چلا تو اسی لمحے ہمارے گھر دوڑی چلی آئیں۔ غیاث چچا بھی ان کے ہم راہ تھے جنہوں نے ابا کو بہت مبارک باد دی اور مجھے بھی خوب پیار کیا۔

ڈوآپی مجھے اپنے ساتھ ہی واپسی پر اپنے گھر لے گئیں۔ شاید انہوں نے میرا اترا ہوا چہرہ اور اداسی محسوس کر لی تھی۔ وہاں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیڈٹ کالج جانے پر دل سے خوش نہیں ہوں اور میں یہیں رہ کر پڑھنا چاہتا ہوں اپنے سب دوستوں کے ساتھ اور ڈوآپی کے پاس..... میری بات سن کر ڈوآپی کسی گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے انہیں وہ سب کچھ سن کر شدید صدمہ ہوا ہو۔ کچھ دیر ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر ڈوآپی دھیرے سے بولیں۔

''آدی..... تم جانتے ہو کیڈٹ کالج میں پڑھنے کا موقع پورے ملک میں سے صرف چند بچوں کو ہی ملتا ہے۔ مجھے اپنے لڑکا نہ ہونے کا افسوس صرف ایک اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ میں لڑکی ہونے کی وجہ سے کیڈٹ کالج نہیں جا پائی۔ اگر میں لڑکا ہوتی تو کیڈٹ بننے کے لیے کچھ بھی کر جاتی کیونکہ مجھے کیڈٹس بے حد پسند ہیں جب مجھے پتہ چلا تھا کہ میرا دوست آدی کیڈٹ کالج جا رہا ہے کیڈٹ بننے کے لیے تو تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر خوش ہوئی تھی صرف یہ سوچ کر کہ اب میرا آدی کیڈٹ یونیفارم میں اپنی بڑی سی تصویر مجھے بھیجے گا جسے میں اپنے کمرے میں لگاؤں گی اور اپنی سب دوستوں پر رعب جماؤں گی کہ دیکھو..... یہ پیارا سا اسمارٹ کیڈٹ میرا دوست آدی ہے..... لیکن تم نے تو میرے سارے خواب ہی توڑ دیئے..... چلو خیر ہے..... میں نے تو سوچا تھا کہ آدی کیڈٹ بن جائے گا تو محلے کے ان بدمعاشوں کی کبھی ہمت نہیں ہوگی اس کی ڈوآپی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی..... لیکن..... اب اور کیا کہوں..... بس جس میں تمہاری خوشی.....''

ڈوآپی تو یہ سب کچھ کہہ کر چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں لیکن مجھے ایک بہت بڑی مشکل میں چھوڑ گئیں۔ قدرت نے مجھے کیڈٹ بن کر ڈوآپی کے قریب آنے کا ایک بہترین موقع فراہم کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ کیڈٹ بن کر میں طاہر بھائی کا پتہ آرام سے

کاٹ سکوں گا لیکن ان سب کو چھوڑ کر جانا بھی تو ایک بہت بڑا اور سب سے کڑا امتحان تھا۔ میں وہیں وجّو آپی کے برآمدے میں سر جھکائے جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ برآمدے کی ساری دھوپ سِرک کر چھت کی منڈیر تک چلی گئی تھی اور شام کو اپنے گھروں کی جانب لوٹتے ہوئے پرندوں کی چہکار سے آنگن گونجنے لگا تھا۔ میرا جسم شام کی سردی سے کپکپانے لگا تھا۔ وجّو آپی اپنے کمرے سے کسی کام سے باہر نکلیں تو مجھے ابھی تک وہیں بیٹھے دیکھ کر چونک سی گئیں۔

''ارے آدی.....تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو.....گھر کیوں نہیں گئے.....؟''

میں نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ وجّو آپی نے بڑی سی کالی شال لپیٹ رکھی تھی جس میں حسب معمول ان کا گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے.....میں کیڈٹ کالج جاؤں گا پڑھنے کے لیے۔''

خوشی سے وجّو آپی کا چہرہ کھل اٹھا اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے سارے بال بکھیر دیئے اور زوردار نعرہ لگایا ''آدی زندہ باد۔'' میں اور وجّو آپی دونوں ہی زور سے ہنس دیئے۔ ساری کائنات ہمارے ساتھ ہی ہنس پڑی۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول.....مقیّدِ خاک.....سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیّر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا..... یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... بیوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسد خاکی میں مُقیّد تھی..... شیلندر رائے ہریجن:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی..... مہرجی:-

پہلا الوداع

راجہ، بالا، گڈو، ننھو اور پپو، سب ہی دم سادھے کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نے کیڈٹ کالج جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم سب کالونی کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب کھڑے قادر ماما کے آلو چھولے کے ٹھیلے کے ساتھ لگے لکڑی کے بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ان کی پلیٹیں اور چمچ یونہی ساکت رہ گئے تھے۔ ٹھیلے پہ لگے ریڈیو سے عالمگیر کی آواز فضا میں تان بکھیر رہی تھی۔

"یہ شام اور تیرا نام..... دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں.....

تیرا نام نہیں لوں گا..... بس تجھ کو شام کہوں گا....."

لیکن یہ شام میرے دوستوں کے مزاج سے بالکل مختلف ثابت ہو رہی تھی۔ شام بہت خوب صورت تھی لیکن ان سب کے چہرے اترتے جا رہے تھے۔ خود میرے دل کے اندر بھی اداسی کا طوفان اُمڈ رہا تھا لیکن میں نے بڑی مشکل سے اس طوفان کو اپنے چہرے تک آنے سے روکا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو یہ سب میری جان کو آ جائیں گے۔ بالآخر پپو کے منہ سے خرخراتی سی آواز نکلی۔

"لیکن..... یہاں پیچھے ہمارا کیا ہوگا۔ سالانہ امتحانات میں بالے اور راجہ کو نقل کون کروائے گا.....؟ اور ابھی جو نئی کرکٹ ٹیم بنائی ہے اس کو کون سنبھالے گا۔ سائیکل کی ریس کس سے لگائیں گے۔"

میرے پاس ان کے ان سب سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس میں انہیں اتنا ہی بتا پایا کہ دو دن بعد ابا مجھے شام کی گاڑی سے لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ کل اسکول میں میرا آخری دن تھا۔ مجھے اپنے ہیڈ ماسٹر سے ایک سرٹیفکیٹ لینا تھا کہ میری اپنی چھٹی جماعت میں پوزیشن اتنی اچھی تھی کہ میں با آسانی سالانہ امتحانات پاس کر کے ساتویں جماعت میں جا سکتا تھا۔ کیڈٹ کالج میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا تھا۔

میں سر جھکائے ان سب کی جھاڑ سنتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں بھیگتی گئیں اور پھر سب سے پہلے راجہ نے میرے آنسو دیکھے اور وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پھینک کر اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

"اوئے آدی..... گدھے..... رو کیوں رہا ہے؟"

راجہ کی بات سنتے ہی میرے اندر کے سیلاب کا باندھ ٹوٹ گیا اور میں اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ بس پھر کیا تھا پھر تو یکے بعد دیگرے راجہ اور باقی سب بھی میرے ساتھ ہی رونے لگے۔ قادر ماما نے ہم سب کو یوں کورس میں روتے دیکھا تو وہ گھبرا کر جلدی سے بھاگتے ہوئے ہماری جانب آیا۔

''اوئے کھوتو.....رو کیوں رہے ہو..... پیسے نہیں ہیں تو خیر ہے.....موجاں کرو..... پیسے تم کھوتوں سے اچھے تھوڑی ہیں.....؟''

قادرے کی بات سن کر ہم سب ٹپکتے آنسوؤں سمیت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دور پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبتا سورج بادل کی اوٹ سے نکل کر ہمیں دیکھ ذرا سا مسکایا اور پھر غروب ہو گیا۔

اگلے دن میں اسکول میں اپنے تمام ہم جماعتوں اور اساتذہ سے فرداً فرداً مل کر ان سے رخصت لیتا رہا۔ میرے سارے استاد میرے داخلے سے بے حد خوش تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے توصیع ترانے کے بعد اسمبلی میں مجھے اسٹیج پر بلا کر سب کے سامنے شاباش دی کہ میں نے ان کے اسکول کا نام روشن کر کے ان سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ سچ ہے کہ ہم اپنا سر کٹا کر ہی اپنوں کا سر اونچا کر سکتے ہیں۔ اسکول میں ہی میں نے آخری مرتبہ اپنے پیارے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے ڈھو آپی کے لیے ایک کارڈ بھی بنایا جس میں ایک کیڈٹ جھنڈے کو سلامی دے رہا ہوتا ہے۔ اسی کارڈ کے نیچے میں نے صرف دو جملے لکھے ''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں.....آپ کا آدی۔''

یہ مشورہ راجہ کا ہی تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج سے روانگی سے پہلے وجو آپی کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دینا چاہیے تاکہ میری غیر موجودگی میں اور میرے واپس آنے تک طاہر بھائی یا کوئی اور انہیں رجھانے کی کوشش کرے بھی تو کامیاب نہ ہو سکے۔ ویسے تو وجو آپی نے آج دیر شام کو مجھے اپنے گھر آنے کا کہا تھا تاکہ وہ مجھے وہ ساری چیزیں اور تحفے دے سکیں جو انہوں نے میرے کیڈٹ کالج جانے کے سلسلے میں جمع کر رکھی تھیں مثلاً ''انکل سرگم'' اور ''دھیگے'' والے کٹ آؤٹ، ''ٹونی پا'' کی شکل والی جیومیٹری، رنگوں کا بڑا سا ڈبہ، شیک چیونگم کا پورا پیکٹ اور پتہ نہیں ایسی کتنی اور بہت سی چیزیں لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی وجو آپی سے جا کر مل کر اپنے ''دل کی بات'' انہیں سنا دوں گا کیونکہ راجہ کہتا تھا کہ ایسے معاملات میں دیر اچھی نہیں ہوتی لیکن مجھے دیر ہو ہی گئی۔ گھر پہنچا تو تمام محلے کی عورتیں ''میری بلائیں'' لینے کے لیے ہمارے صحن میں جمع تھیں۔ سبھی کچھ نہ کچھ میرے لیے لے کر ہی آئیں تھیں۔ ان سب سے نپٹتے نپٹتے اور اپنی ''بلائیں'' دیتے دیتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ گھر میں ایک ہنگامہ سا مچا ہوا تھا۔ میرے کل کے جانے کے سلسلے میں اور سفر کے لیے پکوان بنائے جا رہے تھے۔ امی نے شروع میں تو کافی ہمت دکھائی تھی لیکن اب جب میرے جانے کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی تو ان کی آنکھیں بات بے بات بھیگنے لگی تھیں۔ صبح سے جانے کتنی مرتبہ چھپ کر رو چکی تھیں۔ انہوں نے آج تک کبھی مجھے اپنے آپ سے ایک رات کے لیے بھی جدا نہیں کیا تھا اور کہاں آج انہیں پورے چھ سال کے لیے مجھے بورڈنگ بھیجنا پڑ رہا تھا۔ ابا آتے جاتے انہیں ان کی ہمت بندھی رکھنے کی تاکید کر رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں کسی نہ کسی بہانے چھلک ہی پڑتی تھیں کیونکہ میں ان کا سب سے نازک مزاج بچہ تھا اور وہ جانتی تھیں کہ جس جگہ مجھے بھیجا جا رہا ہے وہاں کی زندگی اس قدر سخت اور کھردری ہے کہ مجھ جیسا ناز و نعم میں پلا ان کا ''شہزادہ'' وہاں جا کر بالکل ہی کملا جائے گا۔ ان کا بس چلتا تو شاید آخری وقت میں مجھے روک ہی لیتیں لیکن ابا کے غصے کے خوف سے وہ دل پر پتھر رکھ کر چپ تھیں۔

خدا خدا کر کے مبارکباد دینے اور مجھے الوداع کہنے والوں کا ہجوم چھٹا تو میں نے جلدی سے اپنے بستے سے ڈھو آپی کے لیے بنایا ہوا کارڈ نکالا اور سب سے نظر بچا کر گھر سے نکل آیا۔ شام کا ملگجا اندھیرا چھا چکا تھا اور محلے کے میدان کا اکلوتا لیمپ پوسٹ بھی جل چکا تھا۔ بڑا میدان سنسان پڑا تھا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ڈھو آپی کے گھر تک جا پہنچا۔ دو تین مرتبہ دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا کیونکہ خلاف معمول دروازہ بند تھا۔ شاید سکینہ

خالہ لوگ گھر میں نہیں تھے۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں شدید مایوسی کے عالم میں پلٹنا ہی تھا کہ اچانک چھت کے اوپر کسی کے ہلکے سے ہنسنے کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ اوہ مطلب گھر والے چھت پر تھے، اسی لیے دروازے کی دستک اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند لمحوں میں دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ ڈو آپی صحن میں ہوتیں تو مجھے میرے اس ''کرتب'' پر بہت ڈانٹتیں کیونکہ انہیں مجھے چوٹ لگنے کا خوف لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں انہیں ڈرانے کے لیے ان کی دیوار پر چڑھ بیٹھتا اور جمپ لگانے کی دھمکیاں دے کر انہیں تنگ کیا کرتا تھا لیکن اس وقت صحن بھی بالکل سنسان تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ آج یہ سارے کے سارے چھت پر کیا کر رہے تھے؟ باہر برآمدے کی روشنی بھی نہیں جلائی ہوئی تھی۔ اوپر سے اب بھی کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے صحن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت کی جانب بڑھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر ڈو آپی بھی اوپر ہوئیں تو انہیں پیچھے سے اچانک جا کر ڈراؤں گا۔ وہ اس طرح پہلے تو بہت ڈر جاتیں تھیں لیکن بعد میں ہم دونوں ایسی باتیں یاد کر کے خوب ہنستے تھے۔ میرے ہونٹوں پہ آنے والے لمحات کو سوچ کر خود ہی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اب بالکل چھت کی منڈیر تک پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر ڈو آپی پر ہی پڑی جو کسی سے مسکراتے ہوئے بات کر رہی تھیں۔ ڈو آپی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ میں نے ان کے لبوں سے نکلتے جملے کے آخری چند لفظ ہی سنے۔

''.....میں کیا کہہ سکتی ہوں، یہ سارے فیصلے تو والدین کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ فی الحال تو آپ مجھے اپنے پاس ہونے کی خوشی منانے دیں۔ ایسے پیغامات بڑوں کے ہاتھ بھیجے جاتے ہیں۔ نہ کہ کوئی خود لے کر آتا ہے۔'' ڈو آپی کے چہرے اور آنکھوں میں شرارت تھی۔

لیکن ان کے مقابل کون تھا اس کی واضح جھلک مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈو آپی کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا اور وہ اٹھ کر وہاں سے جانے لگیں۔

''آپ بیٹھیں.....امی جاتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کرنے کا کہہ گئیں تھیں۔ واپس آ کر سب سے پہلے پوچھیں گی کہ آپ کو چائے کا بھی پوچھا یا نہیں، میں دروازہ بھی دیکھ آؤں اور آپ کے لیے چائے بھی لیتی آؤں گی۔''

ڈو آپی نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ کسی کے ہاتھ نے ان کا گلابی ہاتھ جکڑ لیا اور آواز ابھری۔

''ایسے تو ہم نہیں جانے دیں گے آپ کو..... پہلے میرے سوال کا جواب دیتی جائیں۔ اگر میرے گھر والے آپ کا رشتہ مانگنے آئیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا اور مجھے صرف وجیہہ کا جواب سننا ہے۔ اس کے ماں باپ کا جواب تو میرے والدین سن ہی لیں گے۔''

ڈو آپی لہرا کر شرم سے بل کھا کر رہ گئیں۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ہاتھ پکڑنے والا شخص بھی کھڑا ہو چکا تھا اور اب اس کا رخ بھی میری طرف ہی تھا اور وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود طاہر بھائی ہی تھے۔ میرے اندر اچانک ہی بہت کچھ چھناکے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ ڈو آپی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہی تھیں۔

''طاہر.....خدا کے لیے میرا ہاتھ تو چھوڑیں.....میں نے کہا نا امی ابا جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔''

''اور میں نے بھی کہا نا کہ مجھے صرف وجیہہ کا فیصلہ سننا ہے۔''

وہاں ان دونوں میں ہاتھ پکڑے رکھنے اور چھڑانے کی کش مکش جاری تھی اور یہاں میرے ذہن و دل میں طوفانوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آخر طاہر بھائی نے میری پسند پہ ڈاکہ مار ہی دیا تھا لیکن مجھے فوزیہ آپی سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ وہ بھی ان سے مل چکی تھیں۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے کیڈٹ بن جانے کے بعد ان کی حفاظت کا ذمہ صرف میرا ہوگا۔ میری آخری امید اب بھی فوزیہ آپی کے جواب سے بندھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ طاہر بھائی سے صاف کہہ دیں گی کہ وہ آدی سے ہمیشہ کی دوستی کا وعدہ کر چکی ہیں لیکن اگلے ہی لمحے میرا یہ آخری بھرم بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی ہمیشہ کے لیے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وجیہہ آپی کا گلابی چہرہ جو طاہر بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے کرتے شرم سے سرخ انگارہ بن چکا تھا جھکا ہوا تھا، انہوں نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں اور آہستہ سے لب کھولے۔

"وجیہہ کی طرف سے ہاں ہے....."

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زمین مجھ پر پلٹ دی ہو یا پھر آسمان خود میرے سر پہ آ گرا ہو۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چیخوں کہ یہ زمین یہ آسمان سب پھٹ جائے۔ میرے ہاتھ سے میرا کارڈ جانے کب کا گر چکا تھا۔ میں جلدی سے منڈیر سے پلٹا اور ایک ہی جست میں تین چار سیڑھیاں اترتا ہوا، تیزی سے دوڑتا ہوا وہاں سے باہر کی جانب بھاگا۔ میری آنکھیں میرے بہتے آنسوؤں سے دھندلائی جا رہی تھیں اور مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے میں نے صحن کا دروازہ کھولا اور کس طرح میں باہر نکلا۔ میں دوڑتا جا رہا تھا اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر میرے دامن کو بھگوتے جا رہے تھے۔ پتہ نہیں راستے میں کس کس نے مجھے یوں روتے ہوئے دیوانہ وار دوڑتے ہوئے دیکھا ہوگا لیکن اس وقت مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور سیدھا جا کر اپنے بستر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ ساری رات میرے آنسو میرے تکیے کو بھگوتے رہے۔ جس لڑکی کی خاطر میں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائی، اپنا گھر، اپنے سارے دوست چھوڑ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا آج اسی نے میرے دل کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ساری رات میں بستر میں منہ چھپائے ہڑکتا رہا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن وقت یوں پر لگا کر اڑا کہ پتہ ہی نہیں چلا اور سہ پہر کے تین بج گئے۔ ابا نے میرا سوٹ کیس اور اپنا بیگ سنبھالا۔ امی صحن میں برآمدے کے قریب کھڑی اپنے آنسو ہم سب سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی اماں، نانی اماں سب کزنز صحن میں جمع تھے۔ گلی میں میرے دوست یوں افسردہ سی شکل بنائے کھڑے تھے جیسے کوتوالی سے کوئی حوالدار میری گرفتاری کے لیے آیا کھڑا ہو۔ امی نے مجھے گلے لگا کر آخری بار پیار کیا اور ہزار دفعہ کی کی ہوئی نصیحتیں پھر سے دوبارہ دہرائیں کہ وہاں تمیز سے رہنا، کسی سے جھگڑنا نہیں، کھانا وقت پر کھا لینا، اداس نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس وقت وہ خود سب سے زیادہ اُداس تھیں۔ آخر میں ضبط نہیں کر سکا اور جب انہوں نے مجھ کو خود سے جدا کرنا چاہا تو میں ہلک کر رو پڑا۔ امی ارے ارے کرتیں اور میرے آنسو صاف کرتے کرتے خود بھی رو پڑیں ساتھ کھڑی عمارہ بھی جو جانے کب سے میرا ہاتھ تھامے کھڑی تھی وہ بھی رو پڑی۔ بڑے بھیا بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور وہ بھی سسکنے لگے۔ اب منظر یہ تھا کہ امی مجھے لپٹائے رو رہی تھی اور عمارہ اور فاری بھیا مجھ سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے عمارہ اور فاری بھیا سے اور انہیں مجھ سے کس قدر پیار تھا۔ ہم تینوں تو ایک جسم کی طرح تھے اور قدرت

ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہی تھی، وہ اس جسم کا ایک حصہ ان سے دور کیوں لے جانا چاہتی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں قیامت تک کسی بھی بچے کو اس کے بہن بھائیوں سے جدا نہ کرنے دیتا اس بے رحم تقدیر کو، لیکن افسوس قسمت کی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہی کب ہیں۔ انہیں ہلانے والا تو کہیں اور بیٹھا ہوتا ہے اور شاید اسے ہمارے بہن بھائیوں، دوستوں اور ماں کے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

بڑی مشکل سے ابا نے مجھے امی سے علیحدہ کیا۔ عمارہ اور بھیا نے ضد پکڑ لی کہ وہ دونوں بھی مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے جائیں گے۔ گلی میں تانگہ آ چکا تھا لہٰذا ابا نے میرا سامان تانگے پر رکھوایا۔ محلے کے چند بڑے پہلے ہی ریلوے پر بوگی میں میری اور ابا کی نشست پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ راجہ، بالے، گڈو، پپو اور ننھو وغیرہ اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالے گلی میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ امی نے دروازے میں کھڑے کھڑے میری جانب الوداع کا ہاتھ ہلایا۔ ان کی آنکھوں سے اب بھی آنسوؤں کی بوچھاڑ جاری تھی جسے وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ تانگہ مڑنے سے پہلے میں نے گلی کے نکڑ سے آخری مرتبہ امی کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر امی میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اسٹیشن پر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی میرے دوستوں کا ہجوم پہنچ چکا تھا۔ ٹرین جانے کو تیار تھی اور اسٹیشن پر ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ راجہ اور باقی سبھی اپنے اوپر بہت ضبط کر کے کھڑے تھے لیکن جب میں ان سے گلے مل کر ٹرین پر چڑھنے لگا تو ان میں سے کوئی بھی اپنی آنکھیں خشک نہ رکھ سکا۔ راجہ نے آخری دفعہ میرے کان میں کہا۔

''مت جایار آدی، چل ہم سب یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔''

میں نے دھیرے سے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔ بالے کو میں نے دھیرے سے کہا کہ جب بھی کوئی نیا برا انڈین کرکٹر لگائے تو مجھے ضرور یاد کرے۔ پپو اور گڈو کو تسلی دی کہ میں وہاں سے بھی ان کے لیے نقل کے ''پھرّے'' بنا کر بھیجتا رہوں گا۔ ننھو ان سب میں سب سے زیادہ کم زور دل تھا اور باقاعدہ سوں سوں کر کے رو رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھ سے وعدہ کرے کہ آئندہ جب غفور چچا کی ''مرغیاں اڑائے گا'' تو کبھی چھوٹے چوزوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ننھو نے روتے روتے وعدہ کیا۔ عمارہ نے آگے بڑھ کر اپنی مٹھی کھولی اور اپنا سپرمین کی شکل والا سب سے پیارا شاپنر میری جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہ پنسل تراش تھا جسے عمارہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ اسے پار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کامیابی نصیب نہیں ہو سکی تھی اور آج عمارہ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ شارپنر میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پلکیں پونچھ ڈالیں۔ فاری بھیا بھی میرے لیے اپنا پسندیدہ مفلر لے کر آئے تھے۔ سرخ اور نیلے رنگ کی دھاریوں والا یہ مفلر مجھے اس لیے بہت پسند تھا کیونکہ ایک مرتبہ جب میں فاری بھیا سے چھپ کر یہ مفلر پہن کر دو جوآپی کے گھر گیا تھا تو انہیں میرے گلے میں پڑا یہ مفلر بہت اچھا لگا تھا اور انہوں نے خاص طور پر مجھے کہا تھا کہ ''آدی تم اس مفلر میں بہت پیارے لگ رہے ہو۔''

لیکن فاری بھیا نے دوبارہ مجھے اس مفلر کو چھونے تک نہیں دیا تھا اور آج انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر یہ مفلر میرے گلے میں ڈال دیا تھا۔ میرے سارے دوست بھی میرے لیے بہت سی چیزیں لائے تھے جسے راجہ نے کاغذ کے ایک بڑے سے تھیلے میں ڈال کر میرے حوالے کر دیا تھا۔ اتنے میں ٹرین نے آخری سیٹی بجائی۔ ٹرین پہ چڑھنے سے پہلے فاری بھائی کا دیا ہوا مفلر گلے میں ڈالتے ہی مجھے جوآپی کی یاد اس بری طرح سے

آئی کہ میرے قدم ڈگمگا سے گئے۔ میں کل رات ان کے گھر سے آنے کے بعد دوبارہ ان کی طرف نہیں گیا تھا۔ راجہ کے لاکھ کہنے پر بھی میں نے آج آنے سے پہلے ان کے گھر کی جانب رخ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب جاتے جاتے جانے کیوں دل ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے مچلا جا رہا تھا..... کٹ رہا تھا۔

ٹرین کو ہلکا سا دھکا لگا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم میری نظروں کے سامنے سے سرکنے لگا۔ ابا بھی اوپر چڑھ آئے۔ سب لوگ پلیٹ فارم پہ کھڑے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ٹرین دھیرے دھیرے کھسک رہی تھی۔ میں اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میری آنکھوں کو کوئی دھوکا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے دن میں بھی خواب دیکھنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے لیکن نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔ اسٹیشن کے داخلی راستے سے ڈوآپی اپنی کالی شال لپیٹے تیزی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ ہاں..... وہی تو تھیں، میں نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ ہاں ہاں..... وہ ڈوآپی ہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے غیاث چچا بھی ہڑبڑائے اور سٹپٹائے ہوئے سے تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں شاید اس سامان کا تھیلا تھا جو ڈوآپی نے میرے لیے خرید خرید کر جمع کیا تھا۔ ڈوآپی کی اب تک مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سامنے کھڑے راجہ کے پاس پہنچیں جو اب باقاعدہ رو رہا تھا، انہوں نے راجہ سے غالباً میرے بارے میں پوچھا۔ راجہ نے جواب میں صرف اپنی انگلی اس ڈبے کی جانب اٹھا دی جس کی کھڑکی میں سے میں سر باہر نکالے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ ڈوآپی سے پہلے غیاث چچا ساری صورت حال کو سمجھ گئے اور انہوں نے بھاگ کر بوگی کے دروازے میں کھڑے ابا کو اپنے ہاتھ میں پکڑا تھیلا تھما دیا اور تیزی سے چلتے چلتے ابا کو چند رخصتی کلمات کہہ دیئے۔ ڈوآپی کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بے چینی سے میری جانب لپکیں لیکن تب تک ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور ان کے نازک قدم اس بڑھتی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے میری جانب دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا اور دور ہی سے خیالی طور پر میرے بال بکھیر کر اپنی ناک اس طرح دبائی جیسے وہ میری دباتی تھیں۔ میرے لیے آج وہ خود بلی بن گئی تھیں۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے لیکن میں ڈوآپی کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ ان کی جانب ہلا دیا۔ ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم چھوڑتے جا رہی تھی۔ ڈوآپی دور کھڑی ہاتھ ہلاتیں میری نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے دوستوں کا گروپ، عمارہ اور بھیا مزید پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ سب بھی دیوانوں کی طرح میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا الوداع تھا جس نے پہلی مرتبہ ہی میں میری روح کو کاٹ کر جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میری زندگی میں بہت سے ''الوداع'' آئے اور ہر الوداع نے میری پہلے سے تقسیم روح کے مزید پرزے کر دیئے لیکن اس پہلے الوداع کی کاٹ ساری زندگی میرا پیچھا کرتی رہی جیسے کسی بے رحم شکاری کا اندھا تیر کسی گھائل غزال کا پیچھا کرتا ہے۔

ڈوآپی کی آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں میں شام کے ڈوبتے سورج کی آخری کرن لمحہ بھر کو چمکی۔ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا۔ ڈوآپی کا ہاتھ ہلاتا سراپا دھیرے دھیرے ایک نقطے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تیز ہوا میرے چہرے کو چھو کر میرے بہتے آنسوؤں کو بھی اڑا کر لے جا رہی تھی اور اس کے تھپیڑے شاید میرے آنسوؤں کو واپس اسی سمت لے کر اڑے جا رہے تھے جہاں میرا دل اب بھی اٹکا ہوا تھا۔ ڈوآپی کا سراپا اب مکمل

غائب ہو چکا تھا لیکن جانے کیوں مجھے آس پاس ہر چہرے میں انہی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر آنکھ ان کی بھیگی آنکھوں کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی

میری آنکھیں ہوں گی

جتنے چہرے اچھے ہوں گے

میرے چہرے ہوں گے

اتنی آنکھیں

اتنے چہرے

کیسے یاد رکھو گے.....؟

ٹرین تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے چھوٹے سے شہر کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔

طاہر جاوید مغل کے قلم سے جہانی استاد
کی ہنگامہ خیز سرگزشت
پندرھواں حصہ شائع ہو گیا ہے
تاوان
قیمت فی حصہ 60/- روپے
مکمل ایک تا پندرہ حصے دستیاب ہیں

﴿اُردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540
ای میل: harfcomposers@yahoo.com

دُوسرا دور

جنٹلمین بسم اللہ

ابا جب مجھے لیے کیڈٹ کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔ بورڈنگ کیا تھا پورا ایک شہر ہی تو تھا، صرف داخلے والی عمارت ہی اتنی بڑی تھی کہ اس میں ہمارے ہائی اسکول جیسے تین اسکول آ جائیں۔ بڑی بڑی لمبی اور کشادہ سڑکیں جس کے دونوں اطراف لمبے لمبے درخت اس طرح ایستادہ تھے کہ دھوپ زمین تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ ہمارے محلے سے بھی بڑے کئی گھاس کے میدان جن میں بیک وقت کئی مالی کام کر رہے تھے۔ سچ پوچھیں تو ایسی جگہ اس دن سے پہلے میں نے صرف ریگل سینما میں چھپ کر دیکھی گئی انگریزی فلموں میں دیکھی تھی۔ بڑی بڑی سی لمبی لمبی چمکدار راہداریاں جن کے سنگ مرمر کے فرش پر کوئی اپنا چہرہ بھی دیکھنا چاہتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی۔ بہت سے لوگ فوجی لباس میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ گھاس کے میدانوں سے گزرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک جانب بہت بڑا سا تالاب تھا جس کا نیلا پانی دور ہی سے جگمگا رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ اسے سوئمنگ پول کہتے ہیں۔ دور ایک میدان میں بہت سے گھڑ سوار گھوڑے دوڑانے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ یہاں گھڑ سواری سکھانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ سب سے پہلے ہمیں پرنسپل صاحب کے کمرے میں لے جایا گیا۔ پرنسپل نے ابا کو بہت مبارکباد دی کہ ان کے بیٹے کو ملک کے سب سے اعلیٰ ادارے میں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے ابا کو یقین دلایا کہ یہاں ان کا لاڈلا بیٹا بہت آرام سے اپنے گھر کی طرح رہے گا۔ کاش مجھے اس وقت پتہ ہوتا کہ پرنسپل صاحب کا ''آرام'' سے کیا مطلب ہے تو میں اسی وقت وہاں سے دوڑ لگا دیتا لیکن اس وقت تو میں پرنسپل کے عالی شان آفس کی چیزوں کو دیکھنے میں ہی اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے ان کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ پھر ہمیں کالج کی انتظامیہ اور ہماری ''ہونے والی'' جماعت کا حصہ بھی دکھایا گیا۔ اسمبلی ہال اور اپنی جماعت دیکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی ہی رہ گئیں۔ کلاس روم کیا تھا پورا ایک چھوٹا سا سینما ہال ہی تو تھا۔ جس میں کرسیاں بھی سینما کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک بڑا سا اسٹیج تھا جس کی دیوار پر بلیک بورڈ اور ٹیچر کے کھڑے ہونے کے لیے لکڑی کا ایک بڑا سا ڈبہ (روسٹرم) پڑا ہوا تھا۔

اتنی دیر میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ پتہ چلا یہاں کھانے والے کمرے کو میس کہتے ہیں۔ کچھ اور بچوں کے والدین بھی ہمارے ساتھ ہی میس کی جانب چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ میس بھی کوئی بڑا سا کمرہ ہو گا جس میں بڑا سا دسترخوان ڈلا ہوا ہو گا جہاں ہم سب گھر کی طرح بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور شکر ادا کر کے اٹھ جائیں گے۔

لیکن میس میں داخل ہوتے ہی ایک ساتھ بہت سے جلتے ہوئے فانوسوں کی روشنی سے میری آنکھیں چند لمحوں کے لیے یوں چندھیا سی

گئیں کہ پہلے تو مجھے کچھ نظر ہی نہیں آیا پھر جب چند لمحوں کے بعد میری بینائی بحال ہوئی تو مجھے یوں لگا کہ میں رنگ و نور کے کسی سمندر میں کھڑا ہوں، وہ اتنا عظیم الشان ہال تھا کہ اس کی چھت دیکھنے کے لیے مجھے اپنا پورے کا پورا سر آسمان کی جانب اٹھانا پڑتا تھا۔ ہال کی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے آخری میز نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ چاروں طرف باوردی بیرے سفید لباس پہنے اور سر پر سرخ پگڑیاں سجائے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے لیے ادھر ادھر مستعدی سے بھاگے پھر رہے تھے لیکن چاروں طرف میز کرسیاں ہی لگی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے؟ حالانکہ میس کا سفید فرش دھلے پانی کی طرح شفاف تھا لیکن وہاں دسترخوان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ یہاں میز کرسی پر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا جاتا ہے۔ مجھے الجھن تو بہت ہوئی لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ میں نے آج تک کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ ایک مرتبہ میں اور عمارہ ہوٹل ہوٹل کھیل رہے تھے تو امی نے ہم دونوں کو کھڑے ہو کر دانتوں سے روٹی چبانے پر ایک ایک زوردار دھپ بھی جڑ دی تھی کہ اس طرح کھانا رزق کی توہین ہوتی ہے لیکن یہاں تو سبھی رزق کی پوری نہیں تو کم از کم آدھی توہین تو کر ہی رہے تھے، کیونکہ ان اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنا مجھے ''آدھے کھڑے ہونے'' کے برابر ہی لگ رہا تھا۔ اوپر سے ایک اور مصیبت میرے سر پر آ کھڑی ہوئی جیسے ہی میں نے پہلا نوالہ توڑا ایک باوردی بیرا میرے بالکل سر کے قریب آ کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میں کسی چیز کی جانب ہاتھ بڑھاتا وہ جلدی سے مجھ سے پہلے اسے اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیتا پھر مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگتا۔ میں سمجھا شاید یہ بے چارہ بھی بھوکا ہے اور خود اپنے منہ کچھ مانگنے سے شرماتا ہے لہٰذا میں نے خود آدھی روٹی توڑ کر اور تھوڑا سا سالن رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا لیکن اس نے نہ جانے کیوں گھبرا کر منع کر دیا حالانکہ میں نے اسے اشارہ بھی کیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چپ چاپ یہیں میز کے نیچے بیٹھ کر جلدی سے کھا لے لیکن وہ بے چارہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے جلدی سے روٹی واپس پلیٹ میں رکھ دی اور مجھ سے کہنے لگا کہ ''سر میں یہاں آپ کی ہیلپ کرنے کے لیے کھڑا ہوں۔'' لو بھلا.....؟ کھانے میں بھی کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؟ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ بہرحال خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور میں بھاگ کر ابا کے پاس آ گیا جو دوسری میز پر والدین والے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ابا سے بھی اس شخص کی شکایت کی کہ وہ سارا وقت میرے سر پہ کھڑا رہا اور اس کی وجہ سے میں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ میں نے ابا سے کہا کہ مجھے باہر کسی ٹھیلے سے کچھ کھانے کو دلوا دیں کیونکہ میری بھوک نہیں مٹی تھی لیکن ابا کا جواب سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ٹھیلے نہیں ہوتے صرف ایک بڑی سی کینٹین ہے کیڈٹس کے لیے جو صرف شام کو کھلتی ہے اور یہ جو شخص میرے سر پر منکر نکیر کی طرح کھڑا تھا اس قسم کے لوگ ہمیشہ کھانا کھاتے وقت میرے سر پر کھڑے رہیں گے کیونکہ یہاں ہر کیڈٹ کے لیے ایک ایسا بیرا مخصوص ہے جو کھانے کے وقت کیڈٹ کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ میں نے وہیں اپنا سر پیٹ لیا، کیونکہ میں شروع سے کسی کے سامنے کچھ بھی کھانے میں بہت شرم محسوس کرتا تھا۔ وجو آپی بھی جب کبھی میرے لیے کچھ خاص بناتی تھیں تو میں پہلے ان سے آنکھیں بند کرنے کا کہتا اور پھر جلدی سے کھا لیتا۔

کھانے کے بعد ہم سب کو بتایا گیا کہ کچھ ہی دیر میں ہمیں ہمارے ہاسٹلز میں لے جایا جائے گا جہاں ہمیں ہمارے ''کٹ نمبر'' اور ''کٹ بیگ'' جاری (Issue) کیے جائیں گے۔ گویا یہاں کا یہ بھی ایک دستور تھا کہ ہر کیڈٹ کا کسی جیل کے قیدی کی طرح مخصوص ایک نمبر ہوتا ہے جو اگلے چھ سال تک اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے اور اسے اس کے نام سے نہیں بلکہ اس کٹ نمبر سے پکارا اور بلایا جاتا ہے۔ کیا بے ہودہ رواج تھا یہ بھی.....

بہر حال کٹ نمبر تو سمجھ میں آ گیا پر یہ ''کٹ بیگ'' کیا ہوتا ہے؟

کچھ ہی دیر میں ہم اپنے اپنے ہاسٹلز میں موجود تھے۔ مجھے ''محمد بن قاسم'' ونگ الاٹ کیا گیا تھا جہاں میری سب سے پہلی ملاقات ایک جابر طبیعت ہاؤس ماسٹر فہد صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے میرے ساتھ آنے والے چند اور کیڈٹس کو جھاڑ کر ایک جانب بٹھا دیا اور خود ہمارے والدین کے ساتھ ضروری کارروائی کے لیے اپنے دفتر چلے گئے۔ ہمیں جس لمبے سے کمرے میں بٹھایا گیا تھا اس میں بارہ بستر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ ہر بستر کے ساتھ ایک میز اور کرسی بھی لگی ہوئی تھی اور بارہ الماریاں بھی دیوار میں نصب تھیں۔ اس لمبے کمرے کو وہاں ''ڈارمیٹری Dormetry'' کہتے تھے۔ ہمیں ہمارے بستر الاٹ کر دیے گئے اور کچھ ہی دیر میں ہماری ڈارمیٹری کا خاص خدمت گار (بٹ مین) کچھ ہی دیر میں ہر لڑکے کے لیے ایک بوری میں بہت سا سامان بھر کے لے آیا۔ پتہ چلا کہ اسی بوری کو کٹ بیگ کہتے ہیں۔ اس کے اندر سے ہمارے فوجی بڑے جوتے، پی ٹی شوز، ہمارے یونیفارم، بیجز، بیلٹ، پی ٹی اور پریڈ کا لباس، بنیانیں، نیکر اور جانے کیا کیا الم غلم برآمد ہوا۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی مزید لباس بھی ملیں گے جن میں شام کو باہر جانے کا لباس (Evening Walking Out) اور رات کو کھانے کے لباس (Dinner Out) اور سونے کے لباس بھی شامل ہیں۔ میری تو یہ سن کر ہی جان نکل گئی تھی کہ یہاں صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے کے وقت تک تقریباً آٹھ لباس بدلنے پڑتے ہیں۔ کالج نہ ہوا گویا کسی ورزی کی دوکان ہو گیا۔ وہاں گھر میں تو ہم بمشکل اسکول کی وردی ہی امی کی لاکھ منتوں کے بعد تبدیل کرتے تھے اور وہ بھی تب اگر جی مانتا تو، ورنہ اگلے دن اسکول جانے تک اسی وردی کو چڑھائے رکھتے تھے۔ یہاں کی سب سے بُری بات یہ پتہ چلی کہ یہاں پر اپنے سارے جوتے خود ہی پالش کرنا پڑیں گے۔ میں نے آج تک کبھی خود اپنے جوتے پالش نہیں کیے تھے۔ گھر میں تو امی میرے جوتے پالش کر دیا کرتی تھیں یا پھر عمارہ یا بڑے بھیا کو ڈانٹ ڈپٹ کر میرے جوتے بھی پالش کروا دیا کرتی تھیں۔ میں اپنا سر پکڑے اپنے سامنے پڑے کالے، سفید جوتوں کے انبار کو دیکھ رہا تھا۔ ہمارے بٹ مین جس کا نام جمعہ خان تھا، نے ہمیں یہ بات بتا کر مزید ڈرا دیا کہ یہاں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے سینئرز کے جوتے بھی پالش کرنے پڑتے ہیں اور نہ کرنے پر ٹھیک ٹھاک سزا ملتی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً جھما کا ہوا اور گڈو کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ یہاں سزا کے طور پر صرف نیکر پہنا کر باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کٹ بیگ میں سے اپنا سفید نیکر نکال کر دیکھا۔ خاصہ ڈھیلا ڈھالا تھا، اس میں تو مجھ جیسے دو مزید آدمی آ سکتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں ہر بچے کو اپنا بستر خود ہی لگانا اور اٹھانا پڑتا ہے۔ کیسی واہیات جگہ تھی یہ؟ گھر میں تو صبح اٹھ کر میں ایک لات مار کر اپنی رضائی یا کمبل کو ہوا میں اچھال دیتا تھا اور پھر امی بے چاری سارا دن میری بکھرائی ہوئی چیزیں سنبھالتی رہ جاتیں۔

اب شام ڈھلنے کو تھی، میری بیرک کے گیارہ بچے پورے ہو چکے تھے لیکن ایک بستر ابھی تک خالی تھا، بتایا گیا کہ یہ ہمارے پریفیکٹ Prefact کا بستر ہے یعنی وہ سینئر اور اگلی کلاس کا بچہ جو ہم سب گیارہ بچوں کا مانیٹر انچارج ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا ''لو جی..... اب یہ ایک اور نئی مصیبت ابھی باقی ہے۔ پتہ نہیں اب یہ کون سا نمونہ ہوگا۔''

اتنے میں ہاؤس ماسٹر نے آ کر ہم سب کو حکم دیا کہ ہمارے والدین نے ضروری کاغذات اور فارم وغیرہ بھر دیے ہیں اور اب ان کے جانے کا وقت ہو چکا ہے لہٰذا ہم سب باہر والے لان میں آ کر اپنے والدین اور پیاروں سے مل جائیں کیونکہ اب ان کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ

سنتے ہی میرا دل ڈوب سا گیا۔ صبح سے اب تک میں ان ہنگاموں میں الجھا یہ بھول ہی گیا تھا کہ ابا نے واپس بھی جانا ہوگا۔

سب بچوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور سب سے پہلے میں باہر کی جانب دوڑا۔ ابا ہوسٹل کے باہر گھاس کے ٹکڑے پر بچھے لکڑی کے بنچوں میں سے ایک پر بیٹھے جانے کس سوچ میں گم تھے۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔ جانے کیوں اس لمحے وہ مجھے بالکل ایک "نئے ابا" دکھائی دیئے۔ شاید وہ میری آنکھوں کا واہمہ ہی ہو، پر چند لمحوں کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے مجھے میرے ہاتھوں سے تھام کر وہیں بنچ پر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ کچھ دیر ہم باپ بیٹا خاموشی سے بیٹھے رہے پھر ابا نے ہلکے سے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولے۔

"آدی بیٹا.....اب مجھے واپس جانا ہوگا۔"

حالانکہ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ جانے والے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو، آنسو میرے حلق میں کڑواہٹ بھرنے لگے۔ ابا نے مجھے بہت سی باتیں سمجھائیں کہ اب مجھے انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہوگا۔ میں وہاں واحد بچہ تھا جو حکومت کے خرچے پر پڑھنے آیا تھا ورنہ باقی سبھی بچے امیر کبیر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ میری طرح اس بوسیدہ ٹرین کی بجائے اپنی اپنی شان دار اور عالی شان گاڑیوں میں وہاں آئے تھے۔ ابا مجھے یہی سمجھانا چاہ رہے تھے کہ میری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور مجھے یہاں رہ کر اپنے آپ کو اتنے مہنگے ادارے میں پڑھنے کا حق دار ثابت کرنا ہوگا کیونکہ اگر میں فیل ہو گیا تو حکومت مجھے واپس گھر بھجوا دے گی۔ وہ سب انگریزی میڈیم اسکولوں کے بچے تھے اور ان میں واحد میں ہی ایسا بچہ تھا جو اردو میڈیم اسکول سے آیا تھا اور شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ شاید ابا وہاں آ کر میری اور دوسرے بچوں کی حیثیت دیکھ کر اداس ہو گئے تھے۔ میں ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھتا تھا جبکہ وہ سارے بچے بڑے بڑے شہروں سے آئے تھے، بلکہ دو بچے تو ایسے بھی تھے جنہیں بیرون ملک سے یہاں داخلہ دیا گیا تھا۔ ایسی ہی کتنی باتیں اس روز ابا نے جاتے جاتے مجھے سمجھائیں لیکن میرا ذہن تو ان کی روانگی میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو رکھا ہوا تھا لیکن جب وہ حتمی طور پر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میری آنکھیں بھیگنے لگیں، میں نے جلدی سے اپنی قمیص کے کف سے اپنی آنکھیں رگڑ لیں تا کہ ابا کو میرے آنسو نظر نہ آ سکیں۔ ابا نے آخری بار میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر مجھے پیار کیا اور جانے کے لیے پلٹے اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ خود ابا بھی مجھ سے اپنی آنکھیں چھپا رہے ہیں۔ میں نے آج تک انہیں ایک سخت گیر باپ کے روپ میں دیکھا تھا جن کے گھر میں گھستے ہی ہم بچے اپنی آواز دھیمی کر لیا کرتے تھے لیکن اس روز مجھے پتہ چلا کہ ان کے اس سخت خول کے اندر کتنا نرم دل باپ سانس لے رہا ہے۔ ہم بچے اپنے والدین اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو جانتے جانتے جان لیتے ہیں..... پر افسوس تب تک بہت سا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

جاتے جاتے ابا نے ہوسٹل کے ٹکڑ پر رک کر مجھے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا، بس یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور جیسے ہی ابا ہاتھ ہلا کر اوجھل ہوئے میں بلک بلک کر رو پڑا۔ ابا کے مڑتے ہی میں بھاگ کر اس موڑ تک گیا جہاں سے ابا اوجھل ہوئے تھے اور چھپ کر انہیں دیکھنے لگا، ابا بوجھل سے قدموں سے واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان کے سامنے نہ رونے کا بھرم تو کسی نہ کسی طور

جوڑے رکھا لیکن اب مجھے رونے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں نے آس پاس دیکھا تو ساتویں جماعت میں داخل ہونے والے سبھی بچے اپنے ماں باپ کو جاتا دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان انگلش میڈیم بچوں کو یوں روتا دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ چلو کم از کم کسی ایک جگہ تو ہم سب برابر تھے۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس طرح سوز میں صرف ہم اردو میڈیم بچے ہی روتے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ سبھی بچوں کے والدین کسی نہ کسی ''بہانے'' وہاں سے چلے گئے اور پیچھے ہم سب بچوں کو کورس میں رونے کے لیے چھوڑ گئے۔ ہر بچے نے اپنے رونے کے لیے اپنی پسند کی جگہ منتخب کر لی تھی اور اب کوئی درخت سے لیٹ کر، کوئی بنچ کے اوپر، کوئی بنچ کے نیچے لیٹ کر اپنی اپنی تان میں رو رہے تھے، کچھ بے شرم قسم کے بچوں نے تو وہیں سڑک پر لیٹ کر ٹانگیں چلانا شروع کر دیں تھیں۔ اکیڈمی کے احاطے میں چھ ہاسٹل تھے اور سبھی کے سامنے اس وقت ''قیامت'' کا سماں تھا۔ تمام ہاسٹل کے بیرے، بٹ مین اور انتظامیہ جو پہلے ہی سے اس قسم کے حالات کے لیے تیار رہتے تھے ان بچوں کو بہلانے کی کوشش کر کے انہیں اندر لے جا رہے تھے۔ میں بھی اپنے بہتے آنسو سمیٹنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ ایک بچہ کہیں سے دوڑتا ہوا آیا اور کسی اور کو سامنے نہ پا کر مجھی سے لپٹ گیا اور زور زور سے دھاڑیں مارنے لگا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے خود سے علیحدہ کیا اور اسے بتایا کہ میں تو خود متاثرین میں سے ایک ہوں اور ابھی تک تو خود میرا ''رونا پروگرام'' ختم نہیں ہوا۔ وہ اسفر تھا۔ بیرک میں میرے بستر کے ساتھ والا بستر اسی کا تھا۔ بہر حال اس وقت ہم دونوں کا درد مشترک تھا اور اسی درد مشترک نے ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جو آگے چل کر ہماری لازوال دوستی کی صورت میں نمودار ہونے والا تھا۔

کچھ ہی دیر میں رات بھی ہو گئی۔ اب ہمارے سینئرز بھی آ چکے تھے۔ ہر ہاسٹل میں ساتویں سے لے کر بارھویں جماعت تک کے سبھی کیڈٹس کے لیے الگ الگ ڈارمیٹریاں (بیرکیں) موجود تھیں اور بارھویں جماعت کے کیڈٹس کے علاوہ باقی سبھی جماعتوں کی بیرک میں ایک سینئر کیڈٹ بطور پریفیکٹ بھی رہتا تھا۔ مثلاً ساتویں جماعت کے لیے آٹھویں جماعت کا کیڈٹ، آٹھویں کے لیے نویں کا اور نویں جماعت کے لیے دسویں جماعت کا کیڈٹ بطور انچارج رہتا تھا۔ ہمارے انچارج پریفیکٹ کا نام اسرار تھا اور وہ آٹھویں جماعت کا کیڈٹ تھا، اس نے آتے ہی ہم سب کے سب گیارہ بچوں کو ایک لائن میں کھڑا کروا دیا اور سب کے نام پوچھے، کچھ دیر خوامخواہ کا رعب ڈالنے کی کوشش کی اور ہمیں اکیڈمی کے ''رہنما اصول'' وغیرہ بتائے کہ سینئرز کو سر کہنا ہے اور سب کا حکم ماننا ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی اٹھنا ہوگا اور پریڈ پی ٹی کے لیے میدان کی طرف دوڑ لگانا ہوگی، کوئی بچہ لیٹ نہیں ہوگا نہ ہی سوتا رہے گا ورنہ اسے سزا ملے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم سب بچے اکتائے ہوئے سے پریفیکٹ سر کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ بچے ابھی تک سوں سوں کر کے سُڑک رہے تھے۔ اس وقت اگر ہم گیارہ بچوں کا بس چلتا تو ہم سب مل کر اس ''پریفیکٹ کے بچے'' کو ایسا سبق سکھاتے کہ وہ یاد رکھتا۔ اتنی دیر میں رات کے کھانے کی گھنٹی بج گئی اور ہم سب بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے میس کی جانب چلنے کا ''حکم'' دے دیا گیا۔

اس بار میس کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ تمام میس کیڈٹس سے بھرا ہوا تھا اور ہر جانب ڈنر سوٹ میں ملبوس سینئر اور جونیئر کیڈٹس اپنی اپنی کرسیوں کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھ سمیت کچھ بچے جو کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ان کے پریفیکٹس نے انہیں گھور کر کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور

ہم ہڑبڑا کر واپس کھڑے ہو گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی سب سے سینئر کیڈٹ جنہیں وہاں ایس۔ یو۔ او (S.U.O) سینئر انڈر آفیسر کہا جاتا ہے اور جو بارہویں جماعت کے کیڈٹ ہوتے ہیں، وہ تشریف لائیں گے اور باقاعدہ کھانے کا اعلان کریں گے تب ہم کھانا شروع کر سکیں گے۔

آخر کار ایس۔ یو۔ او صاحب تشریف لائے جن کی کرسی چند اور کرسیوں کے ساتھ ہال کے درمیان ایک اونچے اسٹیج پر لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے آ کر میز پر پڑا مائیک اٹھایا اور زور سے کہا۔ ''جنٹلمین بسم اللہ.....'' پتہ نہیں ان جادوئی الفاظ میں ایسا کیا اثر تھا کہ سبھی کیڈٹ فوراً کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہو گیا۔

یہ کھانا میرے لیے ایک نیا امتحان تھا۔ میز پر چھری، کانٹے، لکڑی کی پتلی ڈنڈیاں (اسٹک) لمبی لمبی نلیاں (اسٹرا) اور جانے کون کون سے ''اوزار'' پڑے ہوئے تھے اور سبھی کیڈٹس کو انہی ''اوزاروں'' کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ باقی کیڈٹس نے تو بڑی سہولت سے اپنے لیے کھانا نکال لیا اور چھری کانٹوں سے کھانے لگے لیکن مجھے تو ان چیزوں کا استعمال تو دور، انہیں ٹھیک طرح سے پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں تو ہم سب زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ میں ابھی ان چھری کانٹوں اور دیگر سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ وہی سینئر کیڈٹ دوبارہ کھڑا ہوا اور اس نے مائیک پر آ کر صرف دو لفظ کہے ''جنٹلمین الحمدللہ.....'' اور یہ سنتے ہی سبھی کیڈٹس اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بیٹھا رہا کیونکہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ میرے پریفیکٹ نے دوبارہ مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ یہ جنٹلمین کون تھا جس کی پہلے بسم اللہ اور پھر الحمدللہ بھی ہو گئی تھی۔ میں تو ابھی تک بھوکا ہی تھا۔ جنٹلمین کو اگر جانا تھا تو چلا جائے پر یہ لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں گھسیٹے لیے جا رہے تھے؟

میں لاکھ چیخا چلایا کہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا ہے لیکن ان ظالموں نے میری ایک بھی نہیں سنی اور مجھے دیگر کیڈٹس کی طرح قطار میں کھڑا کر کے دوبارہ ہاسٹل کی جانب ''ہنکا'' دیا گیا۔

ایک تو گھر سے اتنی دوری اور پھر بھوکے پیٹ کی یہ مصیبت.....؟ غصے اور بے بسی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ واپسی پر پریفیکٹ نے مجھے خوب جھاڑا کہ جب جنٹلمین الحمدللہ کا اعلان ہو گیا تھا تب بھی میں کیوں بیٹھا رہا۔ میں نے غصے میں پریفیکٹ کو دیکھا اور چلایا۔

''جن ٹلمین کی ایسی کی تیسی..... اگر اس کی الحمدللہ ہو گئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ مجھے تو ابھی کھانا کھانا تھا۔''

میری بات سن کر پریفیکٹ غصے کے باوجود ہنس پڑا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ میں بھی انہی جنٹلمینوں میں سے اب ایک ہوں اور میس میں کھانے کے لیے صرف بیس منٹ دیے جاتے ہیں اور ہم سب جنٹلمین کیڈٹس کو انہی بیس منٹوں میں اپنا کھانا ختم کر کے الحمدللہ سنتے ہی اٹھ جانا لازم ہے۔ آج تو پہلا دن تھا اس لیے سینئر کیڈٹ نے رعایت برتی تھی لیکن آئندہ اگر میں الحمدللہ کے بعد بھی نہ اٹھا تو مجھے سزا بھی مل سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے اس بے ہودہ نظام پر لعنت بھیجی۔ یہ ابا مجھے کس مصیبت میں ڈال گئے تھے۔ ان کی تو کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھا اپنے آنے والے برے دنوں کو رو رہا تھا کہ اچانک پھر سے وہی تیز اور منحوس سیٹی کی آواز سنائی دی۔ تمام سینئر کیڈٹس میں کھلبلی سی مچ گئی اور سب باہر کی جانب بھاگے۔ پتہ چلا کہ اب سب کیڈٹس اپنے اپنے ہاسٹلز کے باہر جمع ہوں گے اور ان کی رات سونے سے قبل آخری گنتی جسے وہاں ''نائٹ فالن'' (Night Fallen) کہتے ہیں، کی جائے گی۔ سو بادل نخواستہ ہم چھوٹے کیڈٹس بھی گرتے پڑتے ہاسٹل کے باہر والی سڑک پر آ کھڑے

ہوئے۔ ہر ہاؤس (ہاسٹل) کا اپنا ایک سینئر کیڈٹ بھی ہوتا تھا جسے جونیئر انڈر آفیسر کہا جاتا تھا۔ وہی سب کی گنتی کرتا تھا۔ سب کیڈٹس کے کٹ نمبر پکارے جاتے اور وہ با آواز بلند اپنی حاضری ''یس سر'' کہہ کر لگا دیتے۔ گنتی ختم ہونے کے بعد ہمیں واپس اندر ہاؤس کی جانب دھکیل دیا گیا اور اپنی اپنی بیرکس میں جانے کا حکم نامہ دے دیا گیا۔ ٹھیک رات ساڑھے دس بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی تمام ہاؤس کی بتیاں بجھا دی گئیں۔ ہماری بیرک میں بھی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ہم سب بچے اپنے اپنے بستروں میں خوف کے مارے سکڑے سمٹے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں اپنے گھر والوں سے ہزاروں میل دور، اس انجان جگہ پر، اجنبی لوگوں کے درمیان گزار رہا تھا۔ اس رات مجھے اندھیرے سے جتنا ڈر محسوس ہوا، اتنا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ گھر میں میں اور بھیا مل کر اندھیرے میں عمارہ کو ڈرایا کرتے تھے اور پھر جب عمارہ ڈر کر خوف سے چیختی تھی تو میں اور بھیا خوب زور زور سے ہنستے تھے لیکن آج یہاں خود میرا دل اس اندھیرے کے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنا سر اچھی طرح کمبل کے اندر چھپا لیا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جیسے میں اپنے گھر کے بستر پہ ہی موجود تھا جہاں آس پاس امی ابا وغیرہ بھی میری حفاظت کے لیے موجود تھے۔ ابھی اس کوشش میں مجھے پوری طرح کامیابی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ اچانک میں ہلکی سی سوں سوں کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے گھبرا کر سر کمبل سے باہر نکالا تو پتہ چلا کہ اسفر میاں اپنے پسندیدہ مشغلے یعنی آنسو بہانے میں مصروف ہیں۔ اسفر بستر پر اپنے گھٹنوں کے درمیان سر دیئے بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا.....؟ سوتے کیوں نہیں۔'' اسفر نے سر اٹھایا ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میری امی کو بلوا دو۔''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ خود میرا بھی خوف کے مارے برا حال ہے۔ میرے ساتھ والے دوسرے بستر پر فیصل کا بستر تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس نے بھی آہستہ سے کمبل سے سر باہر نکال دیا۔ اس کے آنسو بھی ٹپکنے کے لیے تیار تھے۔ تیسرے بستر پر سندھی وڈیرے کا بیٹا مجید تھا، پھر موٹا اشتیاق، پھر خالد لمبا، پھر عمر، نثار، الطاف، جن کے بستر ہمارے سامنے والی قطار میں چھ بستروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے سبھی دھیرے دھیرے اٹھ بیٹھے، صرف ہمارے پریفیکٹ کے خراٹے اس لمبی بیرک میں گونج رہے تھے، باقی سبھی بچے خاموشی سے ایک ہی سر میں ٹسوے بہا رہے تھے۔ ہم سبھی گیارہ کے گیارہ بچے اس رات خوف اور ڈر کے ایسے سانجھے درد میں بندھے ہوئے تھے جس کی کاٹ ساری زندگی میرے خون کے اندر موجود رہے گی۔ اس لمحے ہم سب کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بھری دنیا میں ہمارا اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہمیں ساری عمر اسی انجانی اور ویران جگہ میں انہی اجنبی لوگوں کے درمیان رہنا ہوگا۔ غالباً یہی وہ پہلی رات تھی جس نے میری شخصیت کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کا ایک حصہ وہ آدمی تھا جسے میں اپنے پرانے محلے میں چھوڑ آیا تھا اور دوسرا حصہ یہ آدمی تھا جو دنیا کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا کیڈٹ تھا لیکن جس کے اندر پلتے خوف اور درد کو کبھی کوئی محسوس نہیں کر سکا۔ مجھے یاد آیا کہ ایسی اندھیری راتوں میں چپ چاپ امی کے پاس جا کر چھپ جاتا تھا اور وہ تھپک تھپک کر مجھے سلا دیتی تھیں.....

رات اندھیری، جنگل گھنا ہے
چھوڑ کے مجھ کو، نہ جا ماں
شام ڈھلے کیوں گھر سے نکالا

کیا اتنا بُرا ہوں؟ بتاؤ ماں
سُوکھ چکے ہیں سارے آنسو
اب تو چُپ کراؤ..... ماں
ہاں ڈر بہت اندھیرے کا ہے
کیسے تمہیں بتاؤں..... ماں
کیوں دُور کیا ہے خود سے اتنا
گھر لوٹ بھی نہ پاؤں..... ماں
سب جگ چھوٹا، تم بھی رُوٹھیں
کیسے تمہیں مناؤں..... ماں



ادب اور ادیب کا ترجمان، ادب کی روشن کرن
ادبی قلمکار
نئے ادیبوں کا رہنما ادارہ جو آپ کی صلاحیتوں کو
مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتا ہے۔
مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔
ڈاکٹر صابر علی ہاشمی
ادبی قلمکار کراچی
0333 222 1689
qalamkar_club@yahoo.com

رابطہ ادبی فورم
پوری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کا مشترکہ پلیٹ فارم
رکنیت سازی اور معلومات کے لیے رابطہ کریں۔
ڈاکٹر صابر علی ہاشمی
ادبی رابطہ انٹرنیشنل کراچی
00 92 333 222 1689
raabtapk@yahoo.com

راجہ کی کہانی

آدی کو گئے آج دوسری رات تھی۔ راجہ اب بھی بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کل جب وہ باقی تمام دوستوں کے ساتھ آدی کو اسٹیشن پر الوداع کہنے گیا تھا تب ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ آدی کے ساتھ ہی اس کے جسم اور روح کا آدھا حصہ بھی اسی ٹرین میں کہیں دور جا رہا تھا۔ راجہ سوچ رہا تھا کہ آج کی رات آدی کی کیڈٹ کالج میں پہلی رات ہوگی۔ جانے آدی کو تکیہ کیسا ملا ہوگا.....؟ جانے اس کا بستر آرام دہ ہوگا یا فوجیوں نے اسے بھی اپنی طرح بان کی کھری چارپائی پر سلایا ہوگا۔ آدی کو تو اپنے پسندیدہ پروں والے تکیے پر سر رکھے بغیر نیند بھی نہیں آتی تھی، جانے وہ اپنے تکیے کے بنا رات کیسے گزارے گا۔ آدی نے راجہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب بھی عمارہ اور فاری بھیا دادی جان کے گھر رات رہنے کے لیے چلے جاتے ہیں تو اسے اس کی امی اندھیرے کمرے میں تنہا نہیں چھوڑتیں اور اپنے کمرے میں سلاتی ہیں۔

راجہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ نجانے آج آدی کو وہاں کیڈٹ کالج میں تنہا نیند آ بھی رہی ہوگی یا نہیں..... جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا یہ اس کی زندگی کی دوسری رات تھی جب وہ آدی سے ملے بغیر اور اگلے دن کا کوئی منصوبہ بنائے بغیر سونے کے لیے بستر پہ آیا ہو۔ ایک کل کی رات جب آدی ٹرین میں سفر میں تھا اور دوسری آج کی رات۔ ورنہ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ وہ دونوں رات کو اپنے اپنے گھر جانے سے پہلے کسی گلی کے نکڑ پر محلے کے بڑے میدان میں یا کالونی کے پھاٹک پر دیگر دوستوں سمیت نہ ملے ہوں یا انہوں نے اگلے دن کی کسی شرارت کا پروگرام نہ بنایا ہو۔ آج رات بھی گڈو، پپو، نھو، بالا سبھی تو رات تک اکٹھے ہی تھے لیکن آج ان سب کا من کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ نھو تو آدی کے ذکر پہ دو مرتبہ رو بھی چکا تھا۔ آدی کے بنا انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس شام آسمان کے تیور بھی کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ راجہ کو یاد آیا کہ برستی برف کی راتوں میں بھی وہ سب کسی نہ کسی طور آدی کو اس کے سخت مزاج ابا کی نظر سے بچا کر باہر بلا ہی لیا کرتے تھے اور پھر وہ سب دوست مل کر محلے کے بڑے میدان میں بڑا سا برف کا پتلا بنا کر اسے کسی گلی میں ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیتے تھے جہاں آتے جاتے راہ گیر رات کو اچانک اپنے سامنے کسی شخص کو سر پہ ٹوپی اور ہاتھ میں پسٹل (جو کہ اصل میں راجہ کا کھلونا پستول ہوتا تھا) پکڑے دیکھ کر ایک لمحے کو تو سراسیمہ ہی ہو جاتے تھے۔ کئی ایک تو چیختے چلاتے الٹے پیروں بھاگ جاتے، انہی میں سے ایک سیٹھ گردھاری مل بھی تھے جو ایک رات ایک ایسے ہی برف سے پتلے سے ڈر کر یوں بھاگے تھے کہ انہیں اپنی بڑی سی دھوتی سنبھالنا بھی مشکل ہو گئی تھی اور دُور درخت کے پیچھے چھپے ان سب دوستوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے تھے۔

یہ سب کچھ یاد کر کے راجہ کے لبوں پر ہنسی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کل شام جب آدی کی ٹرین پلیٹ فارم سے چھوٹ رہی تھی تب سے لے کر اب تک اس کا دل کٹا جا رہا تھا اور کل پلیٹ فارم پر تو خود تو آپی بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں تھیں جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچیں تو گاڑی چل پڑی

تھی۔ سب سے پہلے راجہ ہی کی نظر ان پر پڑی تھی اور وہ بھاگ کر راجہ کے پاس ہی آئیں تھیں۔ تب راجہ کے منہ سے تو کوئی لفظ نہیں نکل پایا تھا لیکن اس نے انگلی اٹھا کر ڈوآپی کو اس بوگی کی نشان دہی کروادی تھی جس کی کھڑکی میں سے راجہ سر باہر نکالے بیٹھا ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ڈوآپی تو بے چاری ٹھیک طرح سے آدی کی جانب دیکھ کر ہاتھ بھی نہیں ہلا پائی تھیں کہ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ تبھی ڈوآپی نڈھال سی ہو کر وہیں پلیٹ فارم کی کرسی پر جیسے ڈھے سی گئی تھیں اور ان کی آنکھوں سے برکھا کی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ وہ راجہ سے اور آدی کے باقی دوستوں سے بس ایک ہی سوال پوچھ رہی تھیں کہ آدی ان سے ملے بنا ہی کیوں چلا گیا؟ لیکن اس سوال کا جواب تو خود راجہ سمیت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ڈوآپی کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ آدی ان سے ملے بنا اتنی دور چلا گیا ہے۔ انہوں نے راجہ کو بتایا کہ وہ کالج سے واپس آئیں تو آتے ہی انہوں نے آدی کے لیے جوڑا سامان اور اس کے تحفے جمع کر کے رکھ دیے تھے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ آدی کی ٹرین شام چار بجے ہے اور ڈوآپی تو ساڑھے بارہ بجے دن ہی کو لوٹ آئیں تھیں لیکن وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا پھر ڈوآپی یہ سمجھیں کہ آدی گھر والوں سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن کے لیے نکلتے وقت ان سے ملتا جائے گا لیکن جب تین بج گئے تو انہیں تشویش ہوئی اور انہوں نے فضلو بابا کو آدی کے گھر کی جانب دوڑایا کہ خیر خبر پوچھ آئیں۔ فضلو بابا چند ہی لمحوں میں الٹے پاؤں دوڑے چلے آئے اور خبر دی کہ آدی تو چند لمحے پہلے ہی اسٹیشن کے لیے نکل چکا ہے اور گاڑی کا وقت بھی چار نہیں بلکہ ساڑھے تین بجے کا ہے۔ یہ سن کر ڈوآپی کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے کہ اب کیا کریں۔ تبھی غیاث چچا گھر میں کہیں باہر سے داخل ہوئے تو ڈو آپی نے انہیں تمام ماجرا سنایا اور تبھی غیاث چچا انہیں بھاگم بھاگ اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر اسٹیشن لے آئے تھے پر تب تک آدی کی ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔

غیاث چچا نے بڑی مشکل سے ڈوآپی کو چپ کروایا اور انہیں باقی محلے والوں سمیت لے کر واپس آ گئے تھے لیکن ڈوآپی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں آدی کے یوں بنا ملے چلے جانے کا بہت افسوس ہے۔ راجہ خود بھی پوری بات نہیں جانتا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ آدی ان سے ملے بنا ہی اتنی دور چلا گیا تھا جبکہ یہی آدی تھا جو محلے سے باہر جانے سے پہلے بھی دس بار ڈوآپی سے پوچھتا تھا۔ آدی ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ ڈوآپی کو بھی یہی ایک سوال پریشان کیے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی ایک ہستی پر کس قدر حق جتا کر جی رہے ہوتے ہیں کہ اس ہستی کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، چلنا پھرنا..... سب کچھ ہمارے ایک ان جانے اختیار میں ہوتا ہے۔ ایک ایسا اختیار جس کا احساس شاید خود ہمیں بھی تب تک نہیں ہوتا جب تک اچانک کسی ایک دن ہم سے وہ اختیار چھن جاتا ہے تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی انمول نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ شاید ڈوآپی کو بھی اس لمحے یہی سب کچھ محسوس ہوا ہو جس نے ان کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں برکھا کی پھوار بھر دی تھی۔

بہر حال اس رات کی اس گھڑی راجہ کے لیے آدی کا یوں ڈوآپی سے ملے بنا چلے جانا ایک سربستہ راز ہی تھا لیکن راجہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ آدی کے نازک دل کو ضرور کسی بات سے ٹھیس لگی ہو گی، ویسے بھی وہ ڈوآپی کے لیے بے حد حساس تھا، انہی سوچوں میں غلطاں راجہ کی نظر دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ باہر بادل زور سے گرجے، راجہ نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

پہلی پریڈ

رات کے جانے کس پہر ہماری بیرک کے سبھی بچوں کا رونے کا کورس مکمل ہوا اور چند گھڑیوں کے لیے ہی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک یوں لگا جیسے اکیڈمی میں بھونچال آ گیا ہو۔ ہر جانب سے تیز سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور چاروں جانب ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ صبح کے ٹھیک ساڑھے چار بج رہے تھے، کچھ دیر تو مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں پر ہوں اور یہ جیل کی بارک نما لمبا سا کمرہ کس کا ہے۔ پھر اچانک ہی ذہن میں جھماکا ہوا۔ میں کیڈٹ کالج میں تھا اور یہ ہماری اس اکیڈمی میں پہلی صبح تھی۔ صبح خاک تھی، ابھی تو آدھی رات ہی تھی اور باہر اندھیرا تھا۔ باہر ہمارے انسٹرکٹر سیٹیاں بجا بجا کر ہمیں جگا رہے تھے اور اندر ہمارا پریفیکٹ اسرار چلا چلا کر ہم سب کو ڈانٹ کر اٹھا رہا تھا کہ باہر پریڈ کے لیے فالن (Fall in) ہو رہا ہے۔ بی کوئیک (Be Quick)۔ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو میں کہیں سے بڑا سا کوئی کپڑا لے کر پریفیکٹ کے منہ میں ٹھونس دیتا تاکہ اس کی کرخت آواز ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑتی۔

ہمارے بٹ مینوں نے رات ہی کو ہم سب بچوں کی یونیفارم ہماری الماریوں میں کلف لگا کر لٹکا دیں تھیں، اب یہاں ایک دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں ایک تولیہ باندھ کر کپڑے بدلنا تھے کیونکہ یہاں کپڑے بدلنے کا کوئی الگ کمرہ تو تھا نہیں لیکن اس بھگدڑ میں کسی کو کسی کی خبر ہی کہاں تھی۔ کچھ بچوں کے تولیے پتلون چڑھانے سے پہلے ہی گر گئے اور کچھ نے جلدی میں الٹی سیدھی یونیفارم پہن تو لی پر کوئی زپ بند کرنا بھول گیا اور کسی کی بیلٹ اتنی ڈھیلی تھی کہ باہر کی جانب بھاگتے ہوئے پینٹ بیلٹ سمیت زمین پر پیچھے پڑی رہ گئی۔ میرے لیے تو یہ پینٹ شرٹ کا یونیفارم ویسے بھی عذاب تھا کیونکہ گھر میں میں نے کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تھی۔ میں تو وہاں ہمیشہ کرتا شلوار ہی پہنتا تھا۔ بہرحال میں نے بھی آس پاس فیصل اور اسفر کی دیکھا دیکھی خود کو کسی نہ کسی طرح اس کلف لگے اکڑے ہوئے خاکی یونیفارم میں کھینچ کھانچ کر فٹ کر ہی لیا۔ سر پہ ٹوپی جمائی اور باہر کی جانب بھاگا۔ ہمارے انسٹرکٹر جنہیں وہاں پی۔او (پٹی آفیسر) کہتے تھے، نے مجھے تیزی سے ہاسٹل سے باہر کی جانب بھاگتے دیکھا تو وہیں سے زور سے چلایا۔

''جوان..... ڈاکخانہ بند کرو اپنا۔''

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ ''یہ اب کس ڈاکخانے کی بات کر رہا ہے۔'' وہ پھر چلایا۔ ''جوان..... کلوز یور پوسٹ آفس۔'' Close your post office۔ جلدی کرو۔''

اب کی بار میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو میں اپنے پتلون کی زپ جلدی میں بند کرنا بھول گیا تھا۔ ''اوہ.....'' میں نے جلدی سے بھاگتے بھاگتے ہی زپ چڑھا لی۔

ہم ساتویں کے چھوٹے بچوں کے لیے علیحدہ پریڈ سکھانے کا انتظام موجود تھا۔ ہمیں دوڑاتے ہوئے اُسی مُنہ اندھیرے اور ''آدھی رات'' کے وقت پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا جہاں باقی سینئرز ایک جانب پریڈ کر رہے تھے اور سی۔ پی۔ او (چیف پیٹی آفیسر) کو سلامی دے رہے تھے۔ ساری فضا ''چپ، راس، چپ، راس (Left, right, left, right) کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ ہم میں سے آدھے جونیئر کیڈٹس کی آنکھیں اب تلک نیند کے اثر سے بند تھیں اور وہ خواب میں چلنے کی سی کیفیت میں پریڈ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری پیٹی آفیسر کا نام طالب تھا (جسے بعد میں ہم نے چونسا آم کا خطاب دے دیا تھا)۔ طالب نے ہم سب جونیئر کیڈٹس کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سب سے پہلے ہمارے یونیفارم چیک کیے جن بچوں کے بیلٹ ڈھیلے تھے ان کے بیلٹ کو زور زور سے کھینچ کر ان بچوں کو جھٹکے دیے۔ چند ایک بچوں نے رونے کی کوشش کی تو انہیں زوردار کاشن (Caution) کی آواز نکال کر ڈرا کر چپ کروا دیا۔ پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر میں چیف پیٹی آفیسر محمد بخش صاحب خطاب کریں گے۔ سی۔ پی۔ او ایک انتہائی ڈراؤنا اور کرخت قسم کا انسان تھا جسے ہم کیڈٹس نے کچھ عرصہ بعد بخشو کا خطاب دے دیا تھا۔ محمد بخش صاحب نے اسٹیج پر چڑھ کر پہلے چند عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالیں اور پھر کڑک دار آواز میں ہم سب ''معصوموں'' کو یاد دلایا کہ اب ہم ملک کی سب سے بہترین اکیڈمی میں ہیں لہٰذا اپنی ماؤں کی گود کا خیال ذہن و دل سے نکال دیں اور سخت دل اور سخت جان بن کر جئیں پھر انہوں نے جونیئر کیڈٹس کے پیٹی آفیسرز کو صرف پندرہ دن کا وقت دیا کہ وہ ہمیں ڈرل میں اس قدر طاق کر دیں کہ دو ہفتے کے بعد ہم نئے کیڈٹس بھی اپنے سینئرز کے ساتھ مل کر پوری کمپنی کے ساتھ پریڈ کر سکیں۔ سی۔ پی۔ او (C.P.O) نے یہ دھمکی بھی دی کہ جس بچے نے پریڈ سیکھنے میں زیادہ وقت لیا تو وہ اسے الٹا ٹانگ دے گا۔ ہم سب بچوں نے گھبرا کر پریڈ گراؤنڈ میں ادھر ادھر دیکھا لیکن ہمیں وہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں ہمیں الٹا ٹانگا جا سکتا۔ مجھے فوراً اپنے گھر کی بقرعید یاد آ گئی جب قصائی آ کر ہمارے بکروں کی قربانی کے بعد ان کی کھال اتارنے کے لیے انہیں باہر گلی میں لگے ایک بڑے سے لوہے کے کنڈے سے الٹا ٹانگ دیتا تھا۔ مجھے اس لمحے بخشو ایک سفاک قصائی کے روپ میں دکھائی دیا جو ہم بچوں کو بکروں کی طرح الٹا ٹانگ کر ان کی کھال اتارنے کے لیے اپنی چھریاں تیز کر رہا ہو۔

کچھ ہی دیر میں طالب ہم سب جونیئر کیڈٹس کو ہانک کر مرکزی پریڈ گراؤنڈ سے ملحق ایک اور چھوٹے گراؤنڈ میں لے آیا۔ وہاں ایک عجیب سا شخص لمبا سا کوٹ پہنے سامنے ایک کالا بکس (صندوق) رکھے بیٹھا تھا۔ قریب ہی ایک لمبا سا اسٹول پڑا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے سے فیصل سے پوچھا جو میرے ساتھ ہی بے زار سا کھڑا تھا۔

''یہ کیا بلا ہے؟''

فیصل نے ایک لمبی سی جمائی لی۔

''مجھے تو یہ کوئی جگولر (Jaggular) دکھائی پڑتا ہے۔ ہمارے پرانے سکول میں اس قسم کے نمونے مہینے میں ایک آدھ مرتبہ آ کر تماشہ دکھا جاتے ہیں۔ تم دیکھنا یہ اب ہم سب بچوں سے پیسے مانگے گا.....''

لیکن ہماری توقعات کے برعکس اس شخص نے اپنا اسٹول سیدھا کیا اور اپنے صندوق میں سے ایک بڑا سا کالا کپڑا نکالا۔ طالب پی۔ او اچانک زور سے دھاڑا۔

''کیڈٹ ٹوپی اتارے گا..... کیڈٹ ٹوپی..... ی ی..... ی ی ی..... اتار۔''

اس نے ٹوپی..... ی ی ی..... پر اس قدر زور دیا اور لفظ کو اتنا کھینچا کہ ہم سب نے گھبرا کر ٹوپیاں اتار کر باقاعدہ اس کے قدموں میں پھینک دیں کہ ''لو بھئی اپنی ٹوپی، ہم نے کب کہا تھا کہ ہمیں چاہیے؟''

پٹی آفیسر دوبارہ چیخا۔ ''ٹوپی اٹھا۔''

یا اللہ یہ کیا ڈرامہ ہے؟ کبھی کہتا ہے ٹوپی اتار کبھی کہتا ہے ٹوپی اٹھا۔ پھر پی۔ او نے ہمیں خود ڈیمانسٹریٹ (Demonstrate) کر کے بتایا کہ ٹوپی کو کس طرح کندھے پر لگے بکل میں پھنسایا جاتا ہے۔ ہم میں سب سے دائیں جانب اسفر کھڑا تھا۔ پی۔ او نے اس کو دو قدم آگے آنے کا کہا۔ اسفر گھبرا کر کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ طالب نے اسے جھاڑ کر دو قدم پیچھے جانے کا کہا۔ اس بار اسفر ہم سے بھی پیچھے چلا گیا۔ پی۔ او نے جھنجھلا کر اسے اس کے بیلٹ سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے اسٹول تک لے گیا اور اسٹول پر بٹھا دیا۔ جادوگر نے اپنے صندوق میں سے اپنے ''اوزار'' نکالے اور تب ہمیں سمجھ آیا کہ یہ تو حجام ہے۔ میں نے گھور کر فیصل کو دیکھا۔ فیصل آہستہ سے بڑبڑایا ''کمال ہے..... میں تو سمجھا تھا کہ اب یہ کرتب دکھائے گا۔''

اور پھر اس حجام نے واقعی کرتب دکھانا شروع کر دیے۔ گیارہ بچے تو صرف ہم ''قاسم ہاؤس'' والے تھے جبکہ اسی طرح باقی ہر ہاؤس کے ساتویں کلاس کے گیارہ گیارہ بچے یعنی کل ملا کر چھ ہاسٹلز کے چھیاسٹھ (۶۶) بچے تھے جن کے سر سے بال اتارنے میں اس کم بخت نے کل چھیاسٹھ (۶۶) منٹ بھی نہیں لیے۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا پیالہ لے کر آیا تھا جو بدقسمتی سے ہم سب بچوں کے سر پر مکمل فٹ آتا تھا۔ وہ پیالہ ہمارے سر پر رکھ کر آس پاس مشین پھیر دیتا اور پھر پیالہ اتار کر ''باقی ماندہ'' سر پر اپنی بے رحم قینچی اس طرح چلاتا کہ کچھ ہی دیر میں ہم سب کی شکلیں بھی پہچانی نہیں جا رہی تھیں پھر طالب پی۔ او نے ہم سب کے سینوں پر ہمارے کٹ نمبرز کی پلیٹیں لگا دیں اور بتایا کہ آج سے ہماری پہچان یہی نمبرز ہیں۔ میرا کٹ نمبر 8336 تھا جسے ہمارا پی۔ او بڑی لے میں ''تراسی چھتی'' کہتا تھا۔ اب اگلے چھ سال کے لیے میں تراسی چھتی تھا۔ میں نے حجام کے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا شیشہ دیکھا جسے وہ ظالم حجام بال کاٹنے کے بعد ہم بچوں کو دکھا کر ڈرانے کا کام لیتا تھا۔ میرے دل نے ہلکے سے مجھ سے سرگوشی کی۔ ''آدی بیٹا..... یہ کن وحشیوں کے ٹولے میں آن پھنسے ہو۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر انہوں نے اگر تمہارا یہ حال کر دیا ہے تو نہ جانے آگے چل کر کیا کیا نہ ہوگا۔''

دفعتہً پھر سے وہی منحوس سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پتہ چلا کہ پریڈ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر سے بھگاتے ہوئے پی۔ او کی معیت میں ناشتے کے لیے میس بھجوا دیا گیا۔ ناشتے کی میز پر پھر سے وہی مسئلہ۔ اپنے گھر میں تو امی تندور کی خشک روٹی پر مجھے تھوڑا سا مکھن یا اصلی گھی لگا کر دے دیتی تھیں اور میں چائے کے پیالے کے ساتھ ناشتہ کر لیتا تھا۔ سردیوں میں ہم سب بچے کمرے میں کوئلے کے اسٹوپ کے گرد جمع ہو کر بیٹھ جاتے اور اس کے چمنی کی طرف جاتے پائپ کے اوپر اپنی اپنی روٹی رکھ کر گرم کر کے اور مکھن لگا کر مزے سے کھاتے جاتے اور اوپر سے امی کے ہاتھ کی بنی گرم گرم چائے کے گھونٹ..... آہ..... تب زندگی کتنی حسین تھی لیکن یہاں تو میز پر ہی چھری کانٹے، بوائل انڈوں کے مخصوص کپ، مارجرین، مایونیز، توس، فرنچ ٹوسٹ اور ان سب کو کھانے کے لیے سب ہی اپنے گلے میں رومال باندھے چھری کانٹے اٹھائے بڑی نفاست سے کاٹ پیٹ کر اور کانٹوں میں پرو پرو کر حلق سے اتار رہے تھے۔ میں نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے جلدی سے ڈبل روٹی توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو

اسرار پریفیکٹ نے (جو ہماری میز کا انچارج تھا) گھور کر مجھے دیکھا اور چھری کانٹے کا استعمال کرنے کا کہا۔ میرا دل چاہا کہ وہیں سے ایک ابلا ہوا انڈہ اٹھاؤں اور اس کے سر پر دے ماروں۔ فیصل جو گزشتہ رات بھی میری مصیبت کا مشاہدہ کر چکا تھا اب سمجھ گیا تھا کہ مجھے ان اوزاروں کی کٹلری کے ساتھ کھانے کی عادت نہیں ہے۔ اس نے تیزی سے جام اور مکھن لگا کر ایک توس بنایا اور درمیان میں آملیٹ کا بڑا سا ٹکڑا رکھ کر میز کے نیچے ہی سے کہنی مار کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بناء کسی توقف کے فوراً توس حلق سے پار کر دیا اور فیصل کو اشارہ کیا کہ خدا کے لیے یہ "بیرونی امداد" جاری رکھے۔ وہاں کی چائے کا انتظام بھی انتہائی بے ہودہ تھا۔ گرم پانی الگ تھا، پتی کے پیکٹ الگ دھرے تھے اور دودھ اور چینی کسی تیسرے کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ پہلے پہل تو میں نے تھرماس سے جب کپ میں اپنی جانب سے چائے انڈیلی تو اس میں سے صرف گرم پانی نکلتے دیکھ کر میری تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔ "بڑے مہذب بنے پھرتے ہیں اور اپنا حال یہ ہے کہ تھرماس میں چائے کی بجائے بھول کر صرف گرم پانی ڈال کر بھیج دیا ہے۔" میں نے اپنے سر پر کھڑے منکر نکیر سے کہا کہ یہ گرم پانی لے جا کر کہیں پھینک دے اور مجھے اس میں چائے لا دے۔ منکر نکیر نے سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔ "سر میں آپ کے لیے چائے بنا دوں؟"

میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے آس پاس کہیں کوئی چولہا نظر نہیں آیا جس پہ وہ میرے لیے چائے بنا سکتا۔ بہر حال میں چپ ہی رہا۔ تب اس بٹلر نے میرے سامنے ہی یہ ساری چیزیں ادھر ادھر سے جمع کر کے میرے کپ میں ڈال دیں اور کچھ دیر ہلانے کے بعد وہ چائے نما چیز میرے سامنے رکھ دی اور انتہائی مؤدب انداز میں "ٹی سر....." (Tea Sir) کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے حیرت سے اپنے کپ کی جانب دیکھا۔ لگتی تو چائے ہی تھی لیکن نہ تو اس نے پتی چینی اور دودھ ڈال کر اسے امی کی طرح تین چار ابالیاں دیں تھیں اور نہ ہی اس پر جھاگ بننے دی تھی جس سے چائے کی اصل خوشبو فضا میں بکھرتی ہے۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ارے یہ کیا؟ مجھے زور کی ایک ابکائی آئی اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے سامنے ہی بیٹھے اسفر کا چہرہ چائے سے رنگین ہونے سے بچایا۔

یہ چائے تھی یا کاڑھا.....؟ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ بدمزہ چائے آج تک نہیں پی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باقی کیڈٹس مزے لے لے کر یہی کاڑھا اپنے حلق سے اتارے جا رہے تھے۔ میں نے غصے سے چائے کے کپ کی جانب دیکھا۔ گویا اب یہی چیز چائے کے نام پر مجھے یہاں پینی پڑے گی؟ لعنت ہو ایسی زندگی پر جس میں انسان کو ڈھنگ کی چائے بھی پینے کو نہ ملے۔ اس لمحے مجھے امی کے ہاتھ کی چائے بے تحاشا اور اس قدر شدت سے یاد آئی کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں تب چونکا جب فیصل نے پھر سے مجھے کہنی ماری اور توس میز کے نیچے سے میرے حوالے کیا۔ اس مرتبہ توس کے میٹھے جام کے ساتھ میرے آنسوؤں کی کڑواہٹ بھی میرے حلق سے نیچے اتر گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہی سینئر کیڈٹ اٹھا اور اس نے اپنا پیٹ بھر جانے کے بعد بنا یہ دیکھے کہ ہم معصوم بچوں نے ابھی تک اپنا ناشتہ ختم نہیں کیا۔ زبردستی مائیک پر آ کر جنظلمینوں کی الحمدللہ کروا دی۔ پریفیکٹس اپنی پلیٹوں سے ابھی تک چپکے ہوئے جونیئر کیڈٹس کو کھینچ کھانچ کر کھڑا کرنے لگے۔ اب یہاں سے ہم سب کو اپنی اپنی کلاس کی جانب جانا تھا۔ میں نے میس کی گھڑی کی جانب دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

محافظ

راجہ کی اماں زور سے چلائیں۔

''لڑکے تو آج میری بات کیوں نہیں سنتا۔ صبح کے آٹھ بج گئے ہیں۔ تجھے اسکول نہیں جانا آج۔ اب آدی نہیں آئے گا تجھے اپنے ساتھ لے جانے۔ چل جلدی کر۔''

راجہ نے ماں کی مسلسل چھٹی مرتبہ ڈانٹ سنی اور برا سا منہ بناتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر ماں کے پاس باورچی خانے میں آ گیا۔

''اماں..... آج میرا من نہیں ہے اسکول جانے کو۔''

اس کی ماں نے جلدی جلدی راجہ کا پراٹھا توے سے اتارا اور انڈے کی پلیٹ راجہ کی جانب بڑھائی۔

''جانتی ہوں تیرا من آدی کے بغیر کہیں نہیں لگے گا اب۔ کاش تو آدی سے ہی کچھ عقل ادھار لے لیتا۔ کیسا ہونہار بیٹا نکلا وہ اپنے اماں بادا کا۔ کتنے بڑے فوجی اسکول میں داخلہ ہو گیا اس کا۔ کل کو بڑا افسر بن کر آئے گا تو پورے محلے کی شان بڑھائے گا اور تو اور تیرے باقی نکمے دوست بیٹھے رہنا یونہی۔ ارے تم لوگوں کو تو آدی تب اپنا چپڑاسی بھی نہ لگائے گا۔''

راجہ کی ماں جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ ناشتہ کرتے ہوئے راجہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی آدی بڑا افسر بننے کے بعد اپنے دوستوں سے منہ پھیر لے گا؟ پھر خود ہی اس نے اپنی سوچ کو زور سے سر جھٹک کر پرے کر دیا۔ ''نہیں نہیں۔ آدی ایسا کبھی نہیں کرے گا بلکہ راجہ کو پورا یقین تھا کہ آدی بڑا افسر بننے کے بعد اپنے سارے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ ہی اپنے بنگلے میں رکھ لے گا۔'' اتنے میں باہر وجو آپی کے تانگے کے بھونپو کی آواز گونجی۔ دفعتہ یہ آواز سن کر راجہ کے ذہن میں زور سے ایک جھماکا ہوا۔ آدی نے جانے سے پہلے راجہ کو سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ ہمیشہ وجو آپی کے کالج جانے اور واپس آنے کے وقت محلے کے پھاٹک پر یا بڑے میدان میں موجود رہے تاکہ کوئی دوبارہ وجو آپی کو تنگ نہ کر سکے۔ راجہ نے اپنی بھلکڑ طبیعت کو کوسا اور بستہ اٹھا کر باہر کی جانب بھاگا۔ اس کی ماں اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی کہ اپنا ناشتہ تو ختم کرتا جائے لیکن اب راجہ کو کسی اور بات کا ہوش ہی کہاں رہ گیا تھا۔

راجہ تیزی سے دوڑتے ہوئے بڑے میدان تک پہنچا اور یہ دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑے میدان میں وجو آپی کے گھر کے باہر ان کا تانگہ ابھی تک کھڑا تھا جس کا مطلب تھا کہ وجو آپی ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلی ہیں۔

راجہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ آس پاس کوئی مشکوک شخص تو موجود نہیں لیکن میدان سنسان تھا۔ اتنے میں طاہر بھائی دور سے اپنے

گھر سے اپنے مخصوص انداز میں اپنا سفید کوٹ اور کانوں کو لگانے والا آلہ اپنے ہاتھ میں پکڑے نکلے اور ایک اچٹتی سی نگاہ ڈوآپی کے تانگے پر ڈالتے ہوئے محلے کے پھاٹک کی جانب بڑھ گئے۔ پتہ نہیں کیوں راجہ کو آدی کے جانے والے دن سے ہی اندر ہی اندر کہیں یہ یقین ضرور تھا کہ آدی کے یوں ڈوآپی سے ملے بنا چلے جانے کی وجہ طاہر بھائی ہی ہیں۔ اتفاق سے طاہر بھائی کے پھاٹک تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بس محلے کے گیٹ پر آ کھڑی ہوئی اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔ طاہر بھائی نے ایک لمحے کو پلٹ کر دیکھا اور پھر جلدی سے بس میں سوار ہو گئے۔ بس کے آگے بڑھتے ہی ڈوآپی کے گھر سے فضلو بابا نکلے اور کھانستے کھانستے ڈوآپی کا بیگ وغیرہ تانگے پر رکھوانے لگے۔ اچانک اسی وقت کسی گلی کے نکڑ سے اگُو گلے میں اپنا مخصوص رومال باندھے برآمد ہوا، شاید وہ فضلو بابا کے نکلنے کا ہی انتظار کر رہا تھا اور اس نے طاہر بھائی کو محلے سے نکلتے دیکھا ہی نہیں تھا ورنہ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ان کی راہ نہ روکتا لیکن اس کی ساری توجہ اس وقت گھر سے سر جھکائے نکلتی ڈوآپی کی جانب تھی۔ راجہ کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ اگُو تو جان ہی کو آ گیا تھا۔ راجہ نے آس پاس کسی بڑی اینٹ یا پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اگُو نے آج ڈوآپی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ بنا کچھ مزید سوچے اسی پتھر سے اگُو کا سر پھوڑ دے گا۔ راجہ نے اپنی پوزیشن سنبھالی۔ اگُو نے ڈوآپی کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اتنے میں ڈوآپی کے پیچھے ہی گھر سے غیاث چچا بھی برآمد ہوئے۔ وہ اپنے اسکوٹر پر تھے۔ راجہ اور اگُو دونوں کو ہی بیک وقت ہی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ڈوآپی تانگے پر بیٹھ گئیں۔ غیاث چچا تانگے کے پیچھے پیچھے گیٹ تک اپنے اسکوٹر پر چل دیئے۔ پھر تانگہ ایک جانب اور غیاث چچا دوسری جانب مڑ گئے۔ راجہ نے ایک گہری سی سانس لے کر پتھر پھینک دیا۔ اگُو جو دور کھڑا راجہ کی اس تمام کارستانی سے بے خبر تھا، وہ بھی بے زاری سے واپس گلی میں مڑ گیا۔ راجہ نے اپنا بستہ اٹھایا اور اسکول کی جانب بھاگ گیا۔

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایبل کا جسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

پہلا چیلنج

مجھے فیصل اور اسفر کو ساتویں الف (7th A) میں جانے کو کہا گیا تھا لہٰذا ہم سب اس وقت اپنی جماعت کے ڈیسک Desk سنبھال چکے تھے۔ ہماری کتابیں پہلے ہی سے ہمارے ڈیسک میں موجود تھیں۔ میں نے کتابیں دیکھیں۔ سبھی بالکل نئی تھیں۔ جبکہ گھر میں ہمیشہ مجھے عمارہ کی پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں لیکن یہاں پھر ان کیڈٹ کالج والوں سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے ساری کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ لی تھیں لیکن ان میں سوائے "اردو کی ساتویں کتاب" کے دوسری کوئی کتاب اردو کی تھی ہی نہیں۔ نہ ہی معاشرتی علوم، نہ سائنس، نہ ہی ریاضی اور دینیات کی کتاب موجود تھی۔ پتہ نہیں کس کس کی کتابیں اٹھا کر میرے ڈیسک میں بھر دی گئی تھیں۔ یہ تو سب کی سب انگریزی میں تھیں اور انگریزی بھی ایسی کہ میرے پلے تو ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ ہم نے اپنے پرانے اسکول میں ابھی زیڈ فار زیبرا Z for Zebra ختم کیا تھا اور جملے بنانا سیکھ رہے تھے بلکہ میں تو باقی جماعت سے کافی آگے تھا اور میں نے تھرسٹی کرو "Thirsty Crow" بھی شروع کر رکھی تھی لیکن ان ساری کتابوں میں میری والی انگلش گرائمر کی کتاب تو کہیں دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کس سے کہوں کہ میرے پاس غلط کتابیں آ گئی ہیں کہ ایک صاحب بڑا سا کالا چغہ (گاؤن) پہنے اندر داخل ہوئے، سب کیڈٹس ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ پتہ چلا کہ یہ صاحب انوار شاہ ہیں اور یہی ہمارے ٹیچر بھی ہیں۔

انوار صاحب نے اپنے موٹے سے چشمے کے پیچھے سے ہم سب کیڈٹس کو بغور دیکھا اور سب کو اٹھ کر فرداً فرداً اپنا تعارف کروانے کا کہا۔ تعارف کے بعد سبق دھرائی کا مرحلہ شروع ہوا۔ انوار صاحب خاص انگریزی کے استاد تھے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں ہر مضمون پڑھانے کے لیے ہر پیریڈ میں ایک الگ استاد آئے گا۔ مجھے تو یہ انوار صاحب بھی کافی لائق فائق نظر آ رہے تھے، کوئی حرج نہ ہوتا اگر یہی ہمیں سارے مضمون پڑھا دیتے، خوامخواہ اکیڈمی والوں نے اتنی "فضول خرچی" کی۔ کیڈٹ مطیع کے بعد میرا نمبر آ گیا اور مجھے ٹیچر نے انگلش کی کتاب نکالنے کا کہا۔ میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ یہاں تو ساری کتابیں ہی انگلش کی ہیں، کون سی والی نکالوں، میں اپنے ڈیسک کو کھنگال ہی رہا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے اسفر نے جلدی سے ایک کتاب ورق پلٹ کر میرے حوالے کر دی۔ چلو پہلا مرحلہ تو سر ہو گیا پر اب آگے کیا کروں.....؟

انوار صاحب نے دوبارہ ذرا جھڑک کر کہا کہ "ہوائے.....فرسٹ لیسن (First Lesson) سے شروع کرو۔" اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی یہ بھی نہیں پتہ کہ L.E.S.S.O.N کیا ہوتا ہے.....؟ اس موقعے پر پھر اسفر نے میری مدد کی اور جلدی سے اٹھ کر صفحہ پلٹ کر میری انگلی تیسرے صفحے پر ایک سبق پر رکھ دی۔ میں نے ہجے جوڑ کر شروع کرنے کی کوشش کی لیکن بہت کوشش کے بعد بھی لفظ نہیں جوڑ پایا۔ انوار صاحب اور پوری کلاس مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اب انوار صاحب زور سے گرجے۔

''تم پڑھنا شروع کیوں نہیں کر رہے۔ وائے ڈونٹ یو اسٹارٹ ریڈنگ؟'' میری سمجھ میں اس وقت اور کچھ نہیں آیا اور میں نے فوراً رونا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے چھوڑ کر اگلے بچے کی جانب بڑھ جائیں گے۔ مجھے روتا دیکھ کر اگلی لائن میں بیٹھے اشتیاق موٹے اور عمر نے بھی رونا شروع کر دیا۔ شاید انہیں بھی میری طرح سبق نہیں آتا تھا۔

انوار صاحب ہمیں روتا دیکھ کر بوکھلا سے گئے اور انہوں نے حیرت سے مجھ سے پوچھا کہ میں رو کیوں رہا ہوں؟ کیا میں ہوم سکنس (Home Sickness) فیل کر رہا ہوں؟ اس وقت میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ ہوم سکنس کیا بلا ہوتی ہے۔ میں نے انہیں روتے روتے بتایا کہ یہ کتابیں میری سمجھ سے بالکل باہر ہیں اور میں نے آج تک کبھی اتنی ساری انگریزی کی کتابیں اکٹھی نہیں دیکھیں۔ ہماری تو انگلش کی کتاب میں بھی سامنے اردو میں اس انگریزی لفظ کے ہجے لکھے ہوتے تھے جبکہ یہاں تو صفحے کے صفحے انگریزی میں کالے کئے ہوئے تھے۔ یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ٹیچر حیرت زدہ سے میری داستان سنتے رہے اور پھر انہوں نے فوری طور پر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے لیتے ہوئے اکیڈمی کے دوسرے حصے میں لے آئے اور تب میں نے دیکھا کہ ہم پرنسپل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں کل بھی ابا کے ساتھ اس کمرے میں آ چکا تھا۔ اس پر کل بھی وہی کمانڈر علی احمد اسرار کی تختی لگی ہوئی تھی۔ انوار صاحب نے کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر اندر بھیجا اور چند لمحوں میں ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ پرنسپل صاحب اپنی بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور ٹیچر سے پوچھا۔

''یس مسٹر انوار..... اینی پرابلم Yes Mr. Anwar, Any Problem۔'' انوار صاحب نے پرنسپل کو ہیجان خیز انداز میں بتایا کہ یہ بچہ غلطی سے ہماری اکیڈمی میں آ گیا ہے۔ یہ تو اردو میڈیم ہے اور اس نے ابھی اے۔ بی۔ سی ختم کی ہے جبکہ یہاں تو ساتویں جماعت میں آکسفورڈ سٹینڈرڈ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور تو اور یہ تو ابھی معاشرتی علوم، دینیات اور ریاضی کے پھیر سے ہی باہر نہیں نکلا۔ اسے تو ان مضامین کے انگریزی ناموں کا بھی پتہ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان مضامین کو انگریزی میں پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھنا؟ انوار صاحب نے پرنسپل کو پورے یقین سے کہا کہ یہ بچہ باقی کلاس کے ساتھ نہیں چل پائے گا۔ انہیں تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ مجھے اس اکیڈمی میں داخلہ کیسے مل گیا کیونکہ یہاں داخلے کے لیے ہر بچے کو ایک بہت سخت امتحانی ٹیسٹ اور زبانی سوال جواب (انٹرویو) سے گزرنا پڑتا تھا۔

پرنسپل نے بڑے غور سے ان کی ساری بات سنی۔ مجھے ان دونوں کی گفتگو کا صرف وہی حصہ سمجھ میں آیا جو انہوں نے درمیان میں کہیں کہیں اردو میں بولا تھا لیکن میں ان دونوں کی گفتگو کا لب لباب سمجھ گیا تھا۔

پرنسپل نے ٹیچر کو بتایا کہ میرا چناؤ فیڈرل گورنمنٹ نے بطور فیڈرل سکیم کے امیدوار کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مرکزی حکومت ملک کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں سے ہر سال چند ایسے بچوں کو چنتی تھی جن کا اپنے اسکول میں تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہو لیکن وہ ایسے مہنگے اور دور دراز کے کیڈٹ کالج اور اکیڈمیز کی پڑھائی کا خرچہ خود برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ حکومت کی ایک خاص ٹیم ہر علاقے میں جا کر خود ایسے بچوں کا چناؤ کر کے ان بچوں کو اپنے خرچے پر ان دور دراز کے کیڈٹ کالجوں میں بھجواتی تھی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ آکسفورڈ کے معیار کی کتاب

نہ پڑھ سکتا ہو لیکن بہر حال اپنے اسکول کا ایک ہونہار طالب علم ہو گا تبھی اسے اس کیڈٹ کالج میں بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس بچے کو باقی بچوں کے معیار کے برابر لایا جائے۔

انوار صاحب نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ناممکنات میں سے تھا۔ مجھ جیسے اردو میڈیم بچے کو چند دنوں میں آکسفورڈ یول کی تعلیم دلا کر سب کے برابر لانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں خود بھی اس وقت انوار صاحب کی بات سے متفق تھا۔ بھلا مجھ جیسے گنوار کے لیے چند دنوں میں ان انگریزی کتابوں کے انبار کو گھول کر پی جانا ناممکن نہیں تو اور کیا تھا؟

پرنسپل نے انوار صاحب کو مجھے ایک ہفتہ "انڈر آبزرویشن" رکھنے کا کہا اور چلتے چلتے انہوں نے انوار صاحب کو انگریزی میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب میں اس وقت تو نہیں سمجھ پایا لیکن آگے چل کر میری زندگی کی کئی نئی راہیں متعین کرنے میں اس جملے نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو پیچھے سے پرنسپل صاحب کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر انوار..... ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے بی ویری کیئر فل اباؤٹ دا سیلف ریسپیکٹ آف دا کڈ"

"Be very carefull about the self respect of the kid."

مجھے اس لمحے ان کی انگریزی میں کہی ہوئی یہ بات سمجھ نہیں آئی اور جب بہت عرصے بعد میں کمانڈر صاحب کا یہ جملہ سمجھنے کے قابل ہوا تب مجھے احساس ہوا کہ ان کا یہ جملہ ہی آگے چل کر کہیں نہ کہیں میرے کردار کی بنیاد بن چکا تھا۔

انوار صاحب نے پرنسپل کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور مجھے پرنسپل کے آفس سے لے کر نکل آئے۔ اس دن کلاس میں مجھ سے پھر کسی دوسرے ٹیچر نے کچھ نہیں پوچھا نہ ہی کچھ پڑھنے کو کہا۔ بس سب ہی ٹیچر مجھے یہ سمجھاتے رہے کہ میں دوسرے کیڈٹس کو دھیان سے پڑھتا ہوا دیکھوں اور سنوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سارے استاد کلاس میں بچوں سے انگریزی میں بات کرتے تھے اور ان کی باتیں میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ اس مرحلے پر بھی اسفر اور فیصل میرے کام آئے اور ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی مجھے اردو میں ان باتوں کا ترجمہ ٹیچر سے نظر بچا کر بتا ہی دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے پہلے دن کی کلاس ختم ہوئی اور ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے میس جانے کا موقع مل گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے آس پاس موجود فیصل اور اسفر کی مدد سے کسی نہ کسی طور زہر مار کر ہی لیا۔ اب دو گھنٹے کی بریک تھی اور پھر شام ساڑھے چار بجے ہمیں کھیل کے میدان میں پہنچنا تھا۔ عجیب زبردستی تھی۔ میرا دل سونے کو چاہ رہا تھا لیکن پھر سے وہی منحوس سیٹیوں کا عذاب اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ بار بار لباس تبدیل کرنے کی فٹیگ (Fatigue) بھلا اس عذر میں کس بچے کا دل کھیلنے کو چاہ رہا ہو گا؟ لیکن نہیں جناب، زبردستی سب کو کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں میں تقسیم کر کے کھیلنے کا حکم دے دیا گیا۔ کھیل کے فوراً بعد سب بچوں کو شاور لینے کی ہدایت کی گئی اور پھر شام کی "چہل قدمی" کا لباس پہننے کا حکم دیا گیا۔ پتہ چلا کہ اب شام کی چائے پیش کی جائے گی۔ چائے.....؟ ہونہہ..... چائے کے نام پر پھر وہی بدمزہ محلول ہمیں پینے کے لیے دے دیا گیا۔ ابھی اس محلول کی کڑواہٹ حلق میں موجود تھی کہ ساڑھے چھ بجے کے قریب پھر سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ یا خدا اب کیا مصیبت آ گئی؟ بتایا گیا کہ اب ہر بچہ اپنی اپنی میز کرسی پر بیٹھ کر ایک گھنٹہ پڑھے گا اور اسکول کا کام کرے گا۔ اس مرحلے کو ایوننگ پریپ (Evening Prep) کا نام دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد

دوسری سیٹی بجی اور ہمیں ڈنر سوٹ پہن کر میس جا کر رات کا کھانا کھانے کا حکم دے دیا گیا۔ کیا بے ہودہ نظام تھا۔ بھلا رات آٹھ بجے بھی کوئی رات کا کھانا کھاتا ہے؟ مجھے شدت سے اس وقت راجہ اور غفور چچا کی ٹی وی کی یاد آئی۔ میں نے سوچا اس وقت راجہ، نھو، پپو، گڈو، بالا اور منشی، میرے سارے دوست غفور چچا کے گھر بیٹھ کر مزے سے ڈرامہ دیکھ رہے ہوں گے اور ایک میں بدقسمت ہوں کہ یہاں یہ عجیب قسم کا لباس پہنے ان جوکروں کے درمیان پھنسا رات کا کھانا کھانے ''لے جایا'' جا رہا ہوں۔ رات کو کھانے کے لباس میں مجھے سب سے زیادہ مشکل ٹائی باندھتے ہوئے ہوئی۔ مجھے ہرگز پتہ نہیں تھا کہ بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا یہ گلے کا رومال، اس قدر مشکل سے باندھا جاتا ہوگا۔ اس کا حل مجھے لندن سے آنے والے بچے آصف نے نکال کر دیا اور میرے گلے میں یہ پھندا بنا کر ڈال دیا اور مجھے سکھایا کہ میں اتارتے وقت اسے پورا نہ کھولوں اور ذرا سا ڈھیلا کر کے گلے سے اتار لوں اور جب کبھی دوبارہ پہننی ہو تو گلے میں ڈال کر اس کی گرہ کھینچ لوں۔ چلو..... فی الحال یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ فیصل کے پاس اس کا اور بھی آسان حل موجود تھا۔ اس کے پاس ایسی دو ٹائیاں تھیں جن کی گرہ پہلے سے بنی ہوئی تھی اور پہننے کے لیے ان میں الاسٹک کی ربڑ جڑی ہوئی تھی۔ نہ گرہ بنانے کی زحمت نہ بار بار اتارنے کی۔ بس گلے میں ربڑ کا ہار ڈال کر کالر کے پیچھے چھپا لو لیکن فیصل نے مجھے بنی بنائی ٹائی دیتے وقت خاص تاکید کی کہ اس پر یفیکٹ نامی مصیبت سے اسے بچا کر ہی پہنوں کیونکہ یہاں اکیڈمی میں ایسی ٹائیاں پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ گویا ان اکیڈمی والوں نے طے کر لیا تھا کہ ہم بچوں کو ایک سانس بھی سکون سے نہیں لینے دیں گے۔ رات کے کھانے سے پہلے بھی کچھ بچوں نے اپنے اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رونے کا فریضہ پورا کیا کیونکہ سارا دن تو ان بے رحم اکیڈمی والوں نے ہمیں اس قدر مصروف رکھا تھا کہ ہم میں سے کسی کو بھی رونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ اب جو چند لمحے ملے تو ہم سب نے ہی تھوڑے تھوڑے آنسو بہا کر اپنے سنہرے دنوں کو یاد کیا اور اپنی اپنی ''امیوں'' کی یاد میں کچھ آہیں بھر کر رات کے کھانے کے لیے چل دیئے۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ تھا جس میں چند کیڈٹ نماز وغیرہ پڑھنے اور چند ہاسٹل میں موجود تفریح کے کمرے میں ٹی۔ وی دیکھنے یا ٹیبل ٹینس اور کیرم وغیرہ کھیلنے کے لیے چلے گئے لیکن میرا دل نہ نماز پڑھنے کو چاہ رہا تھا اور نہ ہی کسی تفریح میں حصہ لینے کو۔

مجھے راجہ کی یاد بری طرح ستا رہی تھی لہٰذا میں ہاسٹل کی راہداری میں لگی جالی کے سامنے کھڑا باہر آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھنے لگا اور یہ سوچتا رہا کہ کیا یہی چاند اس وقت ہمارے محلے کے اوپر بھی چمک رہا ہوگا۔ پھر اچانک ہی چاند کو دیکھتے دیکھتے مجھے ؒ آپی کی یاد آ گئی۔ یہی چاند تو وہ جو آپی کی چھت پر بھی اپنی چاندنی پھیلا رہا ہوگا۔ میں اور ؒ آپی اکثر ایسی چاندنی راتوں میں ان کے چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر شمالی ستارہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ مجھے ہر بار وہ شمالی ستارہ جنوب یا مشرق میں کہیں ملتا اور میرا ہمیشہ ؒ آپی سے اس بات پر جھگڑا ہو جاتا کہ وہ ہر بار کسی نئے تارے کو شمالی ستارہ بتاتی تھیں۔ ؒ آپی کی یاد نے تو مجھے اداسی سے نڈھال ہی کر دیا۔ میں نے بہت بُرا کیا۔ کیا ہوتا اگر میں ان سے مل کر آ جاتا؟ ساری شرارت تو طاہر بھائی کی تھی۔ وہ تو بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ آپ میرے ماں باپ سے بات کر لیں۔ وہی ان کی جان نہیں چھوڑ رہے تھے اس لیے مجبوراً انہیں ہاں تو کہنا ہی تھی اور پھر اسٹیشن پر انہیں یوں بھاگم بھاگ اپنی تلاش میں آتے دیکھ کر تو میرا دل بالکل ہی پسیج گیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اب تو میں ان سے اتنا دور تھا کہ یہاں تک آنے میں ٹرین نے بھی پورا ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کیا تھا۔ پتہ نہیں اگر پیدل جانا ہو تو شاید مہینے بھر سے زیادہ لگ جائے چلتے چلتے.....

میں انہی سوچوں میں گھرا، رو دینے کی حد تک اداس سا کھڑا راہداری کے جنگلے سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں وہاں سے دو سینئر کیڈٹ

گزرے۔ میں نے صبح بھی انہیں پریڈ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دونوں دسویں جماعت والی قطار میں کھڑے تھے۔ ان دونوں نے مجھے وہاں کھڑا دیکھا تو میری جانب آ گئے۔ ان میں سے ایک دھاڑا۔

''ہے یو بگر.....Hey you buggr کم ہیئر Come here۔''

ہاتھ کے اشارے سے میں سمجھ یا کہ وہ مجھی کو بلا رہے تھے۔ میں ان کے قریب آیا۔

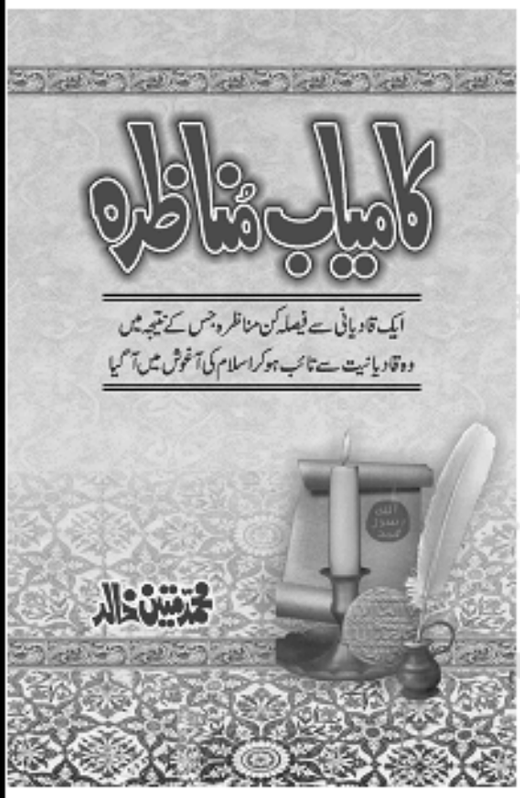

دوسرے نے پوچھا۔

''وئیر آر یو فرام Where are you from۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جی۔''

وہ پھر چیخا۔

''بات سمجھ میں نہیں آتی؟ کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے سہم کر جواب دیا۔

''جی شال کوٹ سے۔''

پہلے نے دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا۔

''شال کوٹ.....وئیر از اٹ؟ Where is it۔''

دوسرے نے تمسخر سے میری جانب دیکھ کر اپنے دوست سے کہا۔

''ہی سیمز ٹو بی این اردو میڈیم چک۔'' "He seems to be an urdu medium chick."

پہلا پھر زور سے چیخا۔

''نیل ڈاؤن Kneel down۔''

میں روہانسا ہو گیا۔

''اردو میں بات کریں جناب۔''

وہ دونوں زور سے ہنسے۔ پہلا زور سے چلایا۔

"I said kneel down & start front rolls." آئی سیڈ نیل ڈاؤن اینڈ سٹارٹ فرنٹ رولز۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان میں سے ایک نے باہر کی پکی سڑک کی طرف مجھے اشارہ کر کے کچھ دیکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے باہر کی جانب دیکھا تو ایک سینئر کیڈٹ کسی جونیئر کیڈٹ کو خالی سڑک پر اچھے بھلے صاف ستھرے کپڑوں میں قلابازیاں دلوا رہا تھا۔ جونیئر کیڈٹ کی حالت بری تھی

اور اس کے سارے کپڑے سڑک کی گرد سے اٹ چکے تھے۔ اب میں سمجھا "فرنٹ رولز" یہاں کی زبان میں قلابازی کھانے کو کہتے تھے۔ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے مجبوراً میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اگر یہ دو نمونے میرے محلے میں کہیں مجھے ملے ہوتے تو میں ان دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا۔ جب میں نے اٹو جیسے غنڈے کی کوئی پرواہ نہیں کی تو پھر بھلا یہ دو چوزے کس کھیت کی مولی تھے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس وقت ان کی سلطنت میں اور اس اکیڈمی میں تھا جہاں کا ہر اصول ہی نرالا تھا لیکن ابھی میں گھٹنوں کے بل جھکا ہی تھا کہ زور سے سیٹی بجنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں مجھے یوں ہی گھٹنوں کے بل بیٹھا چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گئے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں کیڈٹس بھاگتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں اپنی میز پر جا بیٹھے۔ کہیں سے فیصل بھاگتا ہوا آیا اور مجھے بھی راہداری میں رکوع میں جھکے جھکے ہی کھینچتا ہوا اپنی ڈارمیٹری میں لے گیا۔ پتہ چلا کہ یہ رات کی دوسری پڑھائی یعنی 2nd Prep کا وقت ہے جب ہاؤس ماسٹر صاحب ہر بیرک کا خود انسپیکشن کرتے ہیں اور ہر بچے کو پڑھتا ہوا دیکھنے کے لیے فرداً فرداً سب کے پاس جاتے ہیں۔ وہ دونوں سینئر کیڈٹس بھی اسی لیے مجھے پوری سزا دیے بنا ہی بھاگ گئے تھے کیونکہ انہیں ہاؤس ماسٹر کے آنے کا ڈر تھا۔

رات کی پڑھائی کا دورانیہ بھی ایک گھنٹہ تھا اور ہاؤس ماسٹر نے سرسری طور پر ہر بیرک کو چیک کیا کہ کیڈٹ پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ ہماری ساتویں جماعت والی بیرک میں زیادہ تر کیڈٹ میز پر سر رکھے سو رہے تھے اور ان میں سے کچھ کی نیند میں بند آنکھوں کے کناروں سے بھی جگمگاتے آنسوؤں کی لڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ سیکنڈ پریپ کے ختم ہوتے ہی دوبارہ سیٹی بجی اور ہم سب کیڈٹس کو دوبارہ رات کی گنتی کے لیے نیچے جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ گنتی کے بعد ہمیں کل صبح کے لیے یونیفارم وغیرہ تیار کرنے کے لیے اور جوتے پالش کرنے کے لیے پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ ہمیں "جو کچھ" بھی کرنا تھا اسی پندرہ منٹ کے وقفے میں کرنا تھا کیونکہ ٹھیک ساڑھے دس بجے یعنی پندرہ منٹ کے بعد بتیاں بجھانے کی سیٹی بج جانی تھی اور پھر مکمل اندھیرا چھا جانا تھا۔

یوں ہمارا اکیڈمی کا پہلا دن اپنے اختتام کو پہنچا۔ ہم سب بچوں کے جسم درد اور تھکن سے ٹوٹ رہے تھے لیکن ابھی آگے پہاڑ جیسی ایک اور رات منہ کھولے ہمارا راستہ دیکھ رہی تھی کیونکہ نیند ہم میں سے کسی کی بھی آنکھوں میں دور دور تک نہ تھی۔ آخر ٹھیک ساڑھے دس بجے ہمارے پریفیکٹ صاحب کہیں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے زوردار کاشن میں ہم سب بچوں کو اپنے اپنے بستروں میں دبک جانے کا حکم دیا۔ ہم سب اپنے بستروں کی جانب یوں بھاگے جیسے فوجی حملے کے وقت خندق کی جانب بھاگتے ہیں۔ چند لمحے تک پریفیکٹ نے بجلی کے سوئچ کے پاس کھڑے ہو کر اطمینان کیا کہ ہم سب بستروں میں گھس چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سوئچ آف کر دیا۔ چاروں جانب یکا یک گھپ اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ ہم سب کے دلوں کے اندر چھپا خوف پھر سے اچھل کر باہر آ گیا اور ڈارمیٹری کی چھت اور دیواروں پر عجیب و غریب ڈراؤنی شکلیں بنا بنا کر ہماری جان نکالنے لگا۔ میں نے کمبل پوری طرح اپنے اوپر لے کر اپنے آپ کو اس اندھیرے سے بچانے کی کوشش کی لیکن اس کمبل کے اندر دبکے ہوئے بھی میں آس پاس کے بچوں کے رونے کی آواز اور سسکیاں سن سکتا تھا۔ خود میری آنکھیں بھی امی، عمارہ اور بھیا کو یاد کر کے بھیگتی گئیں اور میں نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔

پہرہ

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی اور اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ اور بالے سمیت باقی سارے دوست بڑے میدان میں برگد کے پیڑ کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔ ان کا ارادہ ''چھپن چھپائی'' کھیلنے کا تھا لیکن راجہ نے سب سے پہلے انہیں صبح کی ''ہوتے ہوتے رہ گئی واردات'' کے بارے میں بتایا کہ آج اکّو نے پھر صبح سویرے ہی ڈھوآپی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی لیکن غیاث چچا کو دیکھ کر وہ بدک گیا۔ گڈو اور پپو نے مشورہ دیا کہ ان سب کو فوراً مل کے ایک خط لکھ کر آدی کے نام بھیج دینا چاہیے تاکہ وہ فوراً واپس لوٹ آئے لیکن راجہ نے سختی سے اس بات کی مخالفت کی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ آدی وہاں نہ جانے ''ظالم فوجیوں'' کے گھیرے میں پھنسا عذاب جھیل رہا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گا کہ اس کے دوستوں سے اک ذرا سا کام بھی نہ ہو سکا؟ جو کچھ بھی کرنا تھا خود ان لوگوں نے کرنا تھا اور یہیں کرنا تھا۔ طے یہ پایا کہ کل سے، صبح سے لے کر رات تک اسکول کے اوقات کو چھوڑ کر باری باری سبھی ڈھوآپی کے گھر کے باہر پہرہ دیں گے اور کسی صورت میں بھی ڈھوآپی کے دروازے کو بالکل خالی نہیں چھوڑا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی بچہ وہاں آس پاس ضرور موجود رہے گا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ سیٹی بجا کر اپنے باقی دوستوں کو بھی خبردار کر دے گا۔ انہوں نے اسی وقت مل کر اس مخصوص سیٹی کی دھن بھی منتخب کر لی۔ یہ اس سیٹی سے کافی مختلف تھی جو وہ عام طور پر ایک دوسرے کو گھر سے بلانے کے لیے بجاتے تھے۔ یہ خاص سیٹی تھی جو انہیں صرف خطرے کے وقت تین مرتبہ بجانی تھی۔ راجہ نے ان سب کو یہ تاکید بھی کی کہ ایسی تین سیٹیوں کی صورت میں ہر گھر سے آتے وقت اپنی ہاکی، بلا یا جو چیز بھی ہاتھ لگے اٹھاتے لائیں کیونکہ آگے معاملہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مل کر بالے کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ چونکہ اس معاملے میں براہ راست اس کا بڑا بھائی ملوث ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ بالا اس جھگڑے سے دور ہی رہے لیکن بالے نے زور سے نفی میں سر ہلایا، بلکہ وہ تو ان سب سے باقاعدہ روٹھ ہی گیا۔ بالے کی آنکھیں ان سب کو یہ بتاتے ہوئے بھیگ گئیں کہ اس سے آج تک اس کے گھر میں بھی کبھی کسی نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ جتنا پیار اسے آدی اور ان سب دوستوں سے ملا ہے اس کا تو اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اب اس مشکل مرحلے پر ان کا ساتھ چھوڑ کر گھر میں چھپا بیٹھا رہے؟

اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہے، نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام گھر والے بھی شدید نالاں ہیں۔ وہ لوگ اکّو کی حرکتوں کی وجہ سے پہلے بھی مختلف محلوں سے نکالے جا چکے تھے اور اس بار تو اکّو کے ابا نے اکّو کو آخری وارننگ دے دی تھی کہ اگر یہاں بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے گھر بدر کر دیں گے۔ آخر کار ان سب کو ہی بالے سے معافی مانگنی پڑی اور اسے منانا پڑا۔ کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ بالا اپنی ضد کا کتنا پکا ہے۔ ایک بار روٹھ جائے تو پھر روٹھ ہی جاتا ہے۔ لہٰذا طے ہو گیا کہ ڈھوآپی کو کسی بھی

خطرے کی صورت میں وہ سارے کے سارے مل کر ان کے لیے لڑیں گے۔

اگلے دو دن تک وہ سب مکمل پہرہ دیتے رہے لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ بالے نے بتایا کہ پچھلے دو دن سے اگو گھر بھی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے گھر والوں کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ اسی طرح کام کے بہانے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا تھا لیکن تیسرے دن وہ انہونی ہو کر ہی رہی جس کی تدبیر وہ سارے دوست جانے کب سے کر رہے تھے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس بار اس کا نشانہ وجو آپی نہیں بلکہ طاہر بھائی ہوں گے۔ وجو آپی کالج سے اپنے وقت پر ہی آ گئی تھیں۔ غیاث چچا بھی ان کے ہم راہ تھے لہٰذا راجہ جو اس وقت پہرے پر وہاں بڑے میدان میں موجود تھا، بے فکر ہو کر گھر کے لیے پلٹ گیا لیکن ابھی وہ اپنے گھر میں داخل ہو کر اپنی اماں کے سامنے سر میں تیل ڈلوانے کے لیے دو گھڑی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک باہر محلے میں ہلہ مچ گیا۔ راجہ کی اماں تیل سے چپڑے ہاتھ لیے چلاتی رہ گئیں لیکن راجہ دوسرے ہی لمحے ان سے دامن چھڑا کر بڑے میدان کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور سبھی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔

پتہ چلا کہ اگو اور طاہر بھائی آپس میں بھڑ گئے اور طاہر بھائی کو کافی چوٹ بھی آئی ہے۔ راجہ بدحواس ہو کر طاہر بھائی کے گھر کی جانب دوڑا، راستے میں کانوں میں پڑتی خبروں سے اسے پتہ چلا کہ جیسے ہی وجو آپی گھر میں داخل ہوئیں تبھی طاہر بھائی بھی محلے میں داخل ہوئے تھے اور اپنے گھر کی جانب بڑھ ہی رہے تھے کہ اگو ان کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر دونوں میں کسی بات پر تکرار ہوئی پھر اچانک اگو نے اپنے داہنی ہاتھ میں پہنے ہوئے آہنی کڑے سے طاہر بھائی پر حملہ کر دیا۔ طاہر بھائی نے جھکائی دے کر اپنا چہرہ تو اس آہنی کڑے کی ضرب سے بچا لیا لیکن اگو کا ترچھا وار سیدھے ان کے سر پر جا لگا اور اگلے لمحے ہی خون کا فوارہ ان کے سر سے ابل کر ساتھ والی دیوار کو رنگین کر گیا۔ طاہر بھائی کا اپنے بچاؤ میں اٹھا ہاتھ کچھ اس طرح سے اگو کے چہرے پر پڑا کہ اگو کی بھی نکسیر پھوٹ گئی۔ اس کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے لیکن اتنی دیر میں آس پاس سے گزرتے محلہ دار لپک کر دونوں کی جانب بھاگے اور انہیں علیحدہ کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن تب تک دونوں ہی کے کپڑے خون سے تر بتر ہو چکے تھے۔ اگو تو دوسرے ہی لمحے وہاں سے کہیں چمپت ہو گیا اور طاہر بھائی کو لوگوں نے ان کے گھر پہنچا دیا۔ محلے کے لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ان میں سے کسی نے اگو کے منہ سے وجو بی کا نام بھی سنا تھا۔ سب ہی پریشان تھے کہ خدا جانے کیا ماجرا ہو گیا؟ لیکن راجہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی۔

راجہ جب طاہر بھائی کے صحن میں داخل ہوا تو اس وقت تک طاہر بھائی کے ابا اور اماں ان کا سر دھلوا کر اس پر پٹی وغیرہ باندھ چکے تھے اور طاہر بھائی صحن میں ہی پڑی کرسی پر بیٹھے اپنے اماں ابا کو تسلی دے رہے تھے کہ صرف سر کی جلد پھٹی ہے اس لیے اب اتنا گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آخر وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں اپنے زخم کے بارے میں جانتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں غیاث چچا اور محلے کے دیگر بزرگ بھی طاہر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ غیاث چچا کی وجہ سے محلے والوں نے کھل کر طاہر بھائی سے جھگڑے کی اصل وجہ نہیں پوچھی لیکن خود غیاث چچا بھی کچھ الجھے الجھے سے نظر آ رہے تھے۔ طاہر بھائی نے سب کو یہی بتایا کہ غالباً اگو کو ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی لہٰذا اس نے ان کا جواب سنے بغیر ہی ان پر حملہ کر دیا۔ انہیں خود نہیں پتہ کہ اگو کے ذہن میں کیا خناس سمایا ہوا ہے لیکن محلے کے سارے بزرگ اس بات پر مصر تھے کہ اب وہ اگو کو مزید اس محلے میں برداشت

نہیں کریں گے۔غفور چچا نے بنا کسی کو بتائے اپنا ''اثر ورسوخ'' استعمال کرتے ہوئے علاقہ ایس ایچ او کو بھی اطلاع کر دی تھی۔طاہر بھائی نے بڑی مشکل سے سب کو کسی نہ کسی طور مطمئن تو کر دیا لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ بات اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔وہ اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ لوگ اسے معمول کا ایک واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں اور اس کے اثرات کے چھینٹے وجوآپی کے پاک دامن تک نہ پہنچنے پائیں لیکن بات اب شاید ان کے بس سے بھی باہر ہو چکی تھی۔

http://kitaabghar.com

پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضامین کا مجموعہ.....جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی و بیرونی خطرات و سازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی نوجوانوں کو باشعور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش.....درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر دہشت گردوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، وطن کی فکر کر نادان!، پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں، حکمتِ عملی یا سازش، طالبان آ رہے ہیں؟، محلاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک واٹر آرمی، اکتوبر سرپرائز اور ''کشمیری دہشت گرد''، سازشی متحرک ہو گئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف ''گریٹ گیم''، حمیت نام تھا جس کا.....، آئی ایم ایف کا پھندہ اور لائن آف کامرس، آئی ایس آئی اور ہمارے اربابِ اختیار، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا اغواء، کمانڈو جرنیل بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہو گیا، انجامِ گلستاں کیا ہو گا؟، خون آشام بھیڑیے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر!APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہو گا؟، الیکشن2008ء اور تلخ زمینی حقائق، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا ''کھیل'' کھیل رہے ہیں! نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!، خوراک کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنا گئی درویش کو تاجِ سرِ دارا، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمہ، بے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواخذہ، صدر کو اہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر! پاکستانیوں پر بھی اعتماد کیجئے!، نیا صدر..... نئے چیلنج اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزائم اور ہماری بے بسی، پاکستانی اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقتِ دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیرِ اعظم کے دورے، عالمی منظر نامہ بدل رہا ہے، باراک اوباما، ممبئی لرز اٹھا، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلا چرچ

اگلا ایک ہفتہ بھی اکیڈمی میں اسی قسم کے مختلف عذابوں سے نبرد آزما ہوتے گزر گیا۔ ہماری روٹین میں تھوڑی بہت تبدیلی اُس دن آئی جب ہمیں شام کو کھیل کے میدان کی بجائے سوئمنگ پول تیراکی سکھانے کے لیے لے جایا جاتا۔ ہفتے کے چھ دنوں میں سے ہر دن ایک ہاؤس کے لیے مخصوص تھا۔ قاسم ہاؤس کی باری جمعرات کو آیا کرتی تھی۔ پہلے دن جب ہمارے انسٹرکٹر نے ہمیں پانی میں اتارنے کی کوشش کی تو ہم گیارہ کے گیارہ اس طرح رسیاں تڑا کر بھاگے جیسے کوئی قربانی کا بکرا قصائی کے ہاتھوں سے نکل کر بھاگتا ہے لیکن آس پاس موجود دیگر سینئر کیڈٹس نے ہمیں اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نیچے سے اوپر آ ہی نہیں پاؤں گا۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ پانی کے اندر رہتے ہوئے چلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بہر حال رفتہ رفتہ ہمارا پانی سے ڈر ختم ہونے لگا۔ ہماری پریڈ بھی اب کافی بہتر ہو گئی تھی اور اب راستے میں کسی جونیئر کیڈٹ کی پتلون بھی شاذ و نادر ہی اترا کرتی تھی۔ اب ہفتے میں دو مرتبہ ہمیں گھڑ سواری سکھانے کے لیے بھی لے جایا جاتا۔ اسفر کو گھوڑوں سے بہت ڈر لگتا تھا لہٰذا گھوڑوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ جب بھی موقع ملے وہ اسفر کو زمین پر ضرور پٹخیں گے جبکہ مجھے اور فیصل کو ایک مرتبہ گھوڑے لے کر ''بھاگ'' گئے تھے نہ جانے اچانک ہم دونوں کے گھوڑوں کو کیا ہوا اور وہ جنگلا پھلانگ کر اچھلے اور ہمارے لاکھ چیخنے چلانے کے باوجود وہ دور گھاس کے میدانوں کی جانب بھاگتے چلے گئے۔ ہمارے پیچھے ہمارے انسٹرکٹروں نے گھوڑے دوڑائے اور جانے کتنی دور سے ہمیں گھوڑوں سمیت پکڑ کر واپس لائے۔ بعد میں کلاس کے دوران مجھے فیصل نے بتایا کہ اس نے گھوڑے کے کان میں کچھ ''ایسا'' کہا تھا جس سے وہ ناراض ہو کر بھاگ اٹھا تھا اور میرا گھوڑا اسے دیکھ کر خود پہ قابو چھوڑ بیٹھا تھا۔

پرنسپل صاحب نے انوار صاحب کو مجھے انڈر آبزرویشن رکھنے کے لیے جو ایک ہفتہ دیا تھا وہ بھی گزر چکا تھا۔ لہٰذا اگلے روز کلاس لگتے ہی وہ مجھے پرنسپل کے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پرنسپل کے سامنے میری مایوس کن رپورٹ رکھ دی۔ میں اب تک اکیڈمی میں استعمال ہونے والے بیشتر انگریزی کے لفظ سمجھ چکا تھا اور بول بھی سکتا تھا۔ مثلاً پریڈ کے تمام کاشن، سینئرز کی ڈانٹ، پٹی آفیسرز کے مخصوص جملے، بیروں اور بٹلرز کی باتیں لیکن مجھے ابھی تک کورس کی کتابوں میں سے ایک لفظ بھی پڑھنا نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر خود بھی ہر طرح کی کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن اتنا مشکل کورس اتنے کم عرصے میں سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔

پرنسپل صاحب نے میری رپورٹ غور سے پڑھی۔ سچ پوچھیں تو میں دل ہی دل میں کہیں اندر اس بات سے خوش بھی تھا کہ یہ لوگ آخر کار خود ہی مجھے اکیڈمی سے نکال دیں گے کیونکہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ کمانڈر صاحب نے انوار صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ان کے دفتر

میں ہی بیٹھا رہنے دیں اور خود جا کر اپنی کلاس اٹینڈ کریں۔ انوار صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی میز کی دراز سے بسکٹ کا ایک ڈبہ نکالا اور اس میں سے مجھے بسکٹ نکال کر کھانے کو دیئے۔ میں سب سمجھ رہا تھا اب کچھ ہی دیر میں کمانڈر صاحب مجھے یہ خوش خبری سنائیں گے کہ مجھے اکیڈمی سے نکالا جا رہا ہے اسی لیے وہ پہلے مجھے خوش کرنے کے لیے یہ بسکٹ وغیرہ کھلا رہے ہیں تا کہ مجھے زیادہ ''صدمہ'' نہ ہو۔ میں مزے سے بسکٹ کھاتا رہا۔ پرنسپل صاحب میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میری رپورٹ اٹھائی اور بغور اسے دیکھا اور بولے۔

''ہاں بھئی کیڈٹ نمبر 8336 یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ تم نے پچھلے ایک ہفتے میں محنت تو بڑی کی لیکن کلاس میں امپروو (Improve) نہیں کر پائے۔ البتہ تمہاری پریڈ کی، رائیڈنگ اور سوئمنگ کے علاوہ گیمز کی رپورٹ اے ون ہے۔ ڈیٹس گڈ That's good۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنی جانب سے پوری کوشش کر دیکھی ہے لیکن میں خود بھی اس معاملے میں بے بس ہوں۔ پرنسپل صاحب نے گہری سی سانس لی اور بولے۔

''تمہارے ابو نے مجھے تمہاری تعلیم اور اسکول کے مضامین کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دم سے اردو میڈیم سے انگلش میں سوئچ اور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال اب تم بتاؤ آدی، تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

میں ان کی بات سمجھا نہیں۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں خود اپنی زبان سے انہیں کہہ دوں کہ مجھے یہاں سے فارغ کر دیا جائے۔ چلو یونہی سہی۔ مقصد تو اس جیل سے چھٹکارا ہی ہے نا۔ چاہے میں خود کہوں یا وہ مجھے جانے کو کہیں۔

میں نے انہیں کہا کہ میں اپنی کلاس میں بہت شرمندگی محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں ان سب کی طرح انگریزی نہیں بول سکتا۔ اپنا سبق یاد نہیں کر سکتا۔ کاپی پر ہوم ورک نوٹ نہیں کر سکتا۔ سارے سینئرز کیڈٹ بھی میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرے سامنے ہی مجھے انگریزی میں جانے کیا کچھ سناتے رہتے ہیں لیکن میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ان سب باتوں کی بھی خیر ہوتی اگر میں اپنی کلاس میں ہی کم از کم اتنا تو بہتر ہوتا کہ اگلے آنے والے امتحانات میں پاس ہی ہو جاتا لیکن یہاں تو یہ بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب کو یہ بھی بتایا کہ میں آج تک اپنے اسکول میں کبھی فیل نہیں ہوا تھا بلکہ ہر بار اول یا دوئم ہی آتا تھا۔ اب یہ میرے لیے مکمل ''ڈوب مرنے'' کا مقام ہو گا اگر میں اکیڈمی میں فیل ہو جاتا میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس بے عزتی سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ مجھے واپس شال کوٹ بھیج دیں۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے میں با آسانی واپس جا کر اپنا ہائی اسکول پھر سے جوائن کر سکتا تھا۔ ہاں البتہ اتنے دن تک جو اکیڈمی والوں نے میری ''مہمان داری'' کی ہے اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار رہوں گا۔

پرنسپل نے دلچسپی سے میری ساری باتیں سنیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ پڑھائی کے علاوہ مجھے اور کوئی دوسرا مسئلہ تو وہاں درپیش نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اور تو کوئی خاص مشکل نہیں لیکن مجھے میس میں کھانا کھاتے وقت جس عذاب سے گزرنا پڑتا تھا اس کی ساری تفصیل میں نے انہیں الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اب جب میری یہاں سے واپسی کا فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو برائے مہربانی میرے گھر واپس جانے تک میرے ''کھانے پینے'' کا بندوبست کہیں اور کر دیا جائے کیونکہ گزشتہ ایک ہفتے سے میں میس کے ان سخت اصولوں کی وجہ

سے پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھا سکا تھا۔ پرنسپل صاحب میری بات سن کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔ مجھے اس لمحے وہ بہت بھلے انسان محسوس ہوئے۔ ویسے تو اکیڈمی میں ان کا بہت رعب داب تھا اور چہرے مُہرے سے وہ کافی سخت گیر انسان محسوس ہوتے تھے لیکن آج مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی میرے ابا کی طرح اوپر سے انتہائی سخت گیر جبکہ اندر سے ایک ہمدرد اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ کمانڈر صاحب نے مجھ سے میرا فائنل فیصلہ پوچھا۔

''اوکے..... تو کیڈٹ عباد تم واپس اپنے گھر جانا چاہتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے لیکن سب سے پہلے تمہارے ابا جان کو خبر کرنا ضروری ہے کہ وہ خود آ کر تمہیں لے جائیں گے یا پھر ہم خود تمہیں یہاں سے بھجوانے کا کوئی بندوبست کریں۔''

پرنسپل صاحب گھوم کر اپنی کرسی کی جانب آئے اور میز پر پڑے ٹیلی فون سے انہوں نے کوئی نمبر ملایا۔ کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ میرا یہاں بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا کہ جانے ابا پر یہ خبر سن کر کیا اثر ہوگا؟ لیکن پرنسپل صاحب انہیں یہ بھی تو ضرور بتائیں گے کہ میں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں رکھ چھوڑی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ دوسری طرف سے لائن مل گئی۔ پرنسپل صاحب نے کھنکار کر کہا۔

''جی..... میں کمانڈر اسرار اللہ بول رہا ہوں۔ جی کیا میں رفیع اللہ صاحب سے بات کر سکتا ہوں..... جی جی..... بہتر ہے.....''

کچھ دیر تک پرنسپل صاحب انتظار کرتے رہے اور پھر دوسری جانب ابا کے آ جانے پر انہوں نے ساری صورت حال ان پر واضح کر دی۔ مجھے ان کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ وہ ہر جملے کے بعد یہ ضرور کہتے کہ ''نہیں نہیں..... عباد تو اپنی جانب سے بہت محنت کر رہا ہے لیکن یہاں کا کورس ہی اتنا مشکل ہے کہ اس بے چارے سے کچھ بن نہیں پا رہا.....'' جی..... جی جی..... اچھا..... اوہ..... یہ تو بہت بری بات ہے..... اچھا.....؟ انہوں نے ایسا کہا..... یہ تو بہت بری بات ہے..... اچھا..... چلیں آپ کہتے ہیں تو یوں ہی سہی.....''

پرنسپل صاحب جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے اور یہاں میرا بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا۔ آخر یہ دونوں کن لمبی چوڑی کہانیوں میں پڑ گئے تھے۔ جلدی سے فیصلہ کر کے بات ختم کرنی چاہیے تھی۔ آخر خدا خدا کر کے پرنسپل صاحب نے فون رکھا اور میری طرف پلٹے۔

''تمہارے ابا جان راضی ہو گئے ہیں۔''

خوشی کے مارے میرے ہاتھوں سے بسکٹ کا ڈبہ نیچے گر گیا جسے میں نے جلدی سے اٹھا کر واپس میز پر رکھا اور جلدی سے پرنسپل صاحب سے پوچھا۔

''وہ ناراض تو نہیں تھے نا مجھ سے.....؟ وہ آپ کی بات تو سمجھ گئے تھے نا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے؟''

''نہیں نہیں..... ناراض تو وہ بالکل نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی ایک الجھن بتائی ہے جسے سن کر میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ تمہیں واپس بھجوانے سے پہلے تمہارے کزنز اور چچا زادوں سے کیا بہانہ کیا جائے.....؟''

میں پرنسپل صاحب کی بات سن کر چونک گیا۔ میرے چچا زادوں کا کیا ذکر نکل آیا تھا اس وقت؟

پرنسپل صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے کیڈٹ کالج آنے کے بعد میرے کزنز نے بہت سی باتیں بنائی تھیں کہ دیکھ لینا آدی ہفتہ دس دن بھی کیڈٹ کالج میں نہیں نکال پائے گا اور انہوں نے میرے بہن بھائیوں سے شرط بھی لگائی تھی کہ آدی دوسرے ہفتے ہی واپس نہ لوٹ آیا تو جو چور کی

سزا وہ ان کی سزا۔ غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ وہ سب مجھ سے جلتے ہیں۔ یہ ضرور عابد، ساجد اور روبی وغیرہ ہوں گے۔ انہی کو میرے کیڈٹ کالج آنے سے بہت زیادہ تکلیف تھی۔ میں نے جلدی سے پرنسپل صاحب سے پوچھا کہ کیا ابا نے یہی تین نام بتائے ہیں۔ کمانڈر صاحب نے جلدی سے سر ہلایا اور کہا کہ میرے ابا تک بھی یہ بات پہنچ چکی ہے لہٰذا اب وہ صرف اس بات سے پریشان ہیں کہ آدی صاحب جب واپس آئے گا تو ان سب خاندان والوں کا سامنا کیسے کرے گا۔ یہ سن کر تو میں خود بھی گہری سوچ میں پڑ گیا کیونکہ واقعی معاملہ سنگین تھا۔ مجھے عابد وغیرہ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ میرے پیچھے وہ خاندان بھر میں ایسی باتیں کر کے مجھے بدنام کریں گے۔ پرنسپل صاحب نے مجھے گہری سوچ میں ڈوبے دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر خود ہی بولے۔

"ویسے میرے ذہن میں تمہاری اس مشکل کا ایک حل موجود ہے اگر تمہیں قبول ہو تو.....؟"

میں نے جلدی سے سر ہلایا کیونکہ اس وقت میرے آس پاس وہی ایک میرے مسیحا تھے۔

"میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے کزنز کا منہ بند کرنے کے لیے چند ہفتے یہاں مزید ٹھہر جاؤ۔ ایک دم سے واپس جاؤ گے تو وہ سب تمہارا بہت مذاق اڑائیں گے۔ تم یہاں مزے سے رہو اور پڑھائی وغیرہ کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی چاہے تو کلاس آیا کرو۔ جی نہ چاہے تو نہ سہی۔ البتہ تمہارے واپس جانے تک تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہونی چاہیے کہ تم وہاں انگریزی بول کر سب کا منہ بند کر سکو۔ ورنہ انہیں شک ہو جائے گا کہ تم کیڈٹ کالج گئے بھی تھے یا نہیں۔"

میں نے ان کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کیونکہ اصل مسئلہ ہی تو انگریزی کا تھا۔ پرنسپل صاحب نے تفصیل سے مجھے بتایا کہ میرے باقی ماندہ دنوں کے لیے انہوں نے سوچا ہے کہ مجھے اکیڈمی کے پچھلے حصے میں ٹیچرز اور باقی اسٹاف کے چھوٹے بچوں کے لیے جو گرائمر اسکول ہے۔ وہاں کی نرز (Nuns) کے حوالے کر دیا جائے۔ وہاں کی بڑی مدر اور باقی نن سسٹرز مجھے میرے فارغ وقت میں انگریزی زبان اور انگریزی رکھ رکھاؤ اور کھانے پینے کے طریقے بھی اچھی طرح سکھا دیں گی۔ اس طرح جب میں واپس شال کوٹ جاؤں تو وہاں سارے خاندان کے سامنے میری سبکی نہ ہو سکے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی کیونکہ اب اتنی دور آ ہی گیا تھا تو کچھ سیکھ کر جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں ٹھیک طرح سے یہاں کی انگریزی سیکھ لوں گا تو دو جوآپی کو بھی واپس جا کر پڑھا دیا کروں گا پھر ہم دونوں کو طاہر بھائی کی 'محتاجی' سے بھی نجات مل جائے گی۔

میں نے پرنسپل صاحب کو کہا کہ مجھے ان کی تجویز منظور ہے۔ انہوں نے خوشی سے چٹکی بجائی۔

"ڈیٹس گڈ That's Good..... میں جانتا ہوں تم ایک بہادر کیڈٹ ہو....."

پرنسپل نے فون اٹھا کر کسی کو چند ہدایات دیں اور جب میں جانے لگا تو انہوں نے مجھے نصیحت کرنے کے انداز میں کہا کہ انگریزی بھی باقی زبانوں کی طرح صرف ایک زبان ہے۔ میرے آس پاس جو بچے انگریزی لکھ اور بول سکتے ہیں اس کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آس پاس اور اسکول میں سب کو یہ زبان بولتے سنا تھا اس لیے وہ یہ زبان سیکھ گئے اور اگر میں آج سے دل لگا کر یہ زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ چند ہفتوں میں میں بھی یہ سب کچھ نہ سیکھ سکوں۔ شرط صرف ان تھک محنت اور زبان سے لگاؤ ہے۔ میں نے ان سے

وعدہ کیا کہ اب جب ہماری ملاقات ہوگی تو وہ مجھ میں واضح تبدیلی محسوس کریں گے۔

پرنسپل کے کمرے سے نکل کر میں واپس اپنی کلاس میں آ گیا۔ فیصل اور اسفر کو مجھ سے سب کچھ جان لینے کی شدید بے چینی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری آزادی کا پروانہ آ گیا ہے اور اب بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب میں یہاں سے ''پھُر'' ہو جاؤں گا۔ ان دونوں نے وجہ سن کر اپنے سر پیٹ لیے کہ کاش وہ بھی اردو میڈیم ہوتے۔ خوامخواہ انہوں نے اپنا سارا بچپن اس فضول زبان کو سیکھنے میں برباد کر دیا اور آج وہی زبان ان کے گلے پڑ گئی ہے۔ اس دن اتنے دنوں کے بعد پہلی مرتبہ دوپہر کے کھانے کے بعد میری اتنی ہمت ہوئی کہ میں نے گھر سے لائے اپنے سامان اور سوٹ کیس کو کھول کر تفصیل سے دیکھا ورنہ پہلے دن ضرورت کی چیزیں نکالنے کے بعد میں نے اپنے سامان کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ کیونکہ جانے کیوں جیسے ہی میں ان چیزوں کو دیکھتا تھا مجھے شدت سے گھر کی یاد ستانے لگتی تھی۔ تبھی میرے بڑے سوٹ کیس کے اندر رکھے اس تھیلے پر بھی میری نظر پڑ گئی جو غیاث چچا نے اسٹیشن پر بھاگ دوڑ میں ابا کے حوالے کیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس تھیلے کو کھولا۔ سب سے اوپر وجو آپی نے میرے لیے مبارکباد کا ایک کارڈ رکھا تھا جس میں اپنے ہاتھ سے انہوں نے میرے لیے بہت سی دعائیں لکھی تھی۔ میری آنکھیں ایک دم ہی بھیگنے لگی تھیں۔ میں نے جانے کتنی بار اس کارڈ کو پڑھا ہوگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وجو آپی یہیں کہیں میرے آس پاس ہی موجود ہیں۔ ویسے بھی جب میں نے ان کا دیا ہوا تھیلا کھولا تھا تو ان کی خوشبو میرے آس پاس ساری ڈارمیٹری میں بکھر گئی تھی۔ کارڈ کے نیچے میری پسندیدہ چاکلیٹس تھیں پھر کچھ کہانیوں کی کتابیں، جیومیٹری بکس، میرے پسندیدہ کارٹونز کے بہت سے اسٹکرز، وجو آپی کا وہ پین جو مجھے بہت پسند تھا اور بہت سے نئے پین، رنگین پنسلیں اور جانے کیا کیا۔ میری حالت بری تھی۔ میں سامان دیکھتا جاتا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس وقت باقی سارے بچے نیچے گراؤنڈ میں سینئر کیڈٹس کا فٹ بال میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے اور بیرک خالی تھی۔ ورنہ ان سب کے سامنے مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں وجو آپی کی دی ہوئی یہ چیزیں اس کیڈٹ کالج جیسی فضول جگہ پر استعمال کر کے کبھی ان کی ''توہین'' نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ انہیں سنبھال کر اپنے پاس رکھوں گا۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اپنے گھر کے سامان کو دیکھ کر بھی ہوا۔ امی، بھیا، عمارہ اور ابا کی دی ہوئی چیزوں کو میں نے نہایت عقیدت سے فرداً فرداً اپنی آنکھوں سے لگا کر چوما اور سنبھال سنبھال کر واپس رکھتا گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میرے ابا نے کتنی محنت سے پائی پائی جوڑ کر میرے لیے یہ سامان خریدا ہوگا۔ نئی پینٹ شرٹس کے کئی جوڑے، نئے شلوار کرتے، نئے جوتے، نیا کوٹ، نئے سویٹر، نئے بنیان، نئے رومال، نیا شیشہ، غرض ہر چیز نئی تھی۔ حتیٰ کہ نیل کٹر (ناخن تراش) تک انہوں نے نیا لے کر سوٹ کیس میں رکھوایا تھا۔ مجھے خوامخواہ اپنے آپ پر ہی غصہ آنے لگا کہ مجھ جیسے ناکارہ اور فضول لڑکے پر انہیں اس قدر خرچہ کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر اوپر سے ٹرین کے آنے جانے کے ٹکٹس کا خرچہ الگ، میں نے تبھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان میں سے حتیٰ الامکان نئی چیزیں بچا کر رکھوں گا اور گھر واپس جاتے ہی امی کے حوالے کر دوں گا کہ انہیں بازار میں واپس دے کر ابا کے پیسے واپس لے آئیں۔

ابھی میں اپنے انہی مستقبل کے سپنوں میں کھویا ہوا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب دبے پاؤں چلتے ہوئے ہماری بیرک میں داخل ہو گئے۔ میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے اپنا سوٹ کیس بند کر دیا۔ وہ اپنی آنکھوں پر لگے موٹے سے چشمے کے عقب سے میری

جانب مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ باقی کیڈٹس کے ساتھ میچ دیکھنے کیوں نہیں گئے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے لیکن ہاؤس ماسٹرز پر عموماً اس قسم کی باتوں کا اثر کچھ کم ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے گیمز ڈریس پہن کر باقی کیڈٹس کو جوائن کرنے کا حکم دیا اور جب تک وہیں کھڑے رہے جب تک میں ہاؤس سے نکل نہیں گیا۔

اسی دن شام کو ہمارا ہاؤس بٹلر جمعہ مجھے اکیڈمی کے اس حصے میں لے گیا جہاں ٹیچرز اور اسٹاف کے بنگلے بنے ہوئے تھے اور جہاں ان کے بچوں کا گرائمر اسکول اور جونیئر سیکشن موجود تھا۔ یہاں پر باقی تمام کیڈٹس کا داخلہ ممنوع تھا اور میں نے دیکھا کہ یہ تو ایک الگ ہی دنیا تھی۔ بڑے بڑے خوب صورت بنگلے، پارک، کھانے پینے کی دوکانیں، دیگر ضرورت کی چیزوں کے لیے ایک خوب صورت سی چھوٹی مارکیٹ، بچوں کے لیے پلے لینڈ، جھولے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا خوب صورت سا چرچ اور کانونٹ اسکول کی عمارت۔ مجھے تو جگہ کسی پرستان کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں نہ تو پیٹی آفیسرز کے کرخت چہرے تھے نہ سینئر کیڈٹس کی بک بک اور سزا کا ڈر۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ جمعہ میرا ہاتھ تھامے اس سڑک پر چل رہا تھا جس کے دونوں اطراف سرو کے اونچے اونچے درخت موجود تھے۔ ان درختوں کے عقب میں دور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور پرندے اپنے گھروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ہر درخت کی ایک شاخ پر ان پرندوں کے لیے لکڑی کا ایک خوب صورت چھوٹا سا گھر بھی بنا کر رکھا گیا تھا اور ایسے ہر گھر پر ایک نمبر بھی لگا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم بل کھاتی سڑک سے ہوتے ہوئے اوپر پہاڑی پر بنے کانونٹ کی عمارت کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چرچ کے سامنے ایک بہت بڑا سا صحن تھا جس میں ترتیب وار اینٹیں یوں لگی ہوئی تھیں کہ دور سے سورج مکھی کا بڑا سا پھول محسوس ہوتی تھیں اسی مناسبت سے اینٹوں پر پیلا اور بھورا رنگ بھی کیا گیا تھا۔

جمعہ نے آگے بڑھ کر چرچ کے دروازے پر لگی بڑی سے گھنٹی ہلائی اور دور کہیں چرچ میں اندر بھی ویسی ہی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس گھنٹی کی ڈوری اندر بھی کسی ایسی ہی چھوٹی لوہے کی گھنٹی سے بندھی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں سفید لباس میں ملبوس ایک مہربان سے چہرے والی عورت نے دروازہ کھولا۔ جمعہ نے اسے بتایا کہ میرا نام کیڈٹ عباد ہے اور ہمیں کمانڈر صاحب نے یہاں بھیجا ہے۔ عورت نے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں چرچ کی عمارت میں بنی ایک راہداری سے گزار کر اس جانب لے آئی جہاں دفاتر بنے ہوئے تھے۔ ایک دفتر میں ہمیں بٹھا کر وہ چند لمحوں کے لیے معذرت کر کے چلی گئی اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک ملیح سے چہرے والی بہت گورے رنگ کی ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔ پتہ چلا کہ یہی بڑی مدر کہلاتی ہیں جو یہاں کی انچارج ہیں۔ مجھے تو وہ انگریز ہی لگ رہی تھیں لیکن جب ان کے منہ سے میں نے اردو سنی تو میں حیران ہی رہ گیا۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام وغیرہ پوچھا اور میرے لیے چائے بسکٹ بھی منگوائے۔ انہوں نے جمعہ سے کہا کہ پرنسپل صاحب کا پیغام انہیں مل چکا ہے اور وہ کیڈٹ عباد کو اپنے کانونٹ میں خوش آمدید کہتی ہیں۔ انہوں نے جمعہ کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ روزانہ شام چار بجے مجھے یہاں چھوڑ جایا کرے اور رات آٹھ نو بجے یعنی سیکنڈ پریپ سے پہلے مجھے واپس لے جایا کرے۔ گویا کل سے روزانہ چار گھنٹے مجھے یہاں گزارنا تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ

ان چار گھنٹوں میں دو گھنٹے میری انگلش اور دیگر مضامین کی ٹیوشن ہوا کرے گی اور باقی دو گھنٹے مجھے اکیڈمی کے دیگر طور اطوار چلنا پھرنا، کھانا پینا اور مختلف مواقع کے مختلف لباس اور رواجوں وغیرہ کے بارے میں سکھایا جائے گا۔

چائے کے بعد انہوں نے جمعہ کو تو واپس بھیج دیا اور خود مجھے لیے کانونٹ اور چرچ کے مختلف حصوں کی سیر کرواتی رہیں۔ پانچ بجے کے قریب انہی کی طرح سفید لباس پہنے ایک خوب صورت سی جونیئر نن ھیلن آ گئی۔ مدر کیتھرین نے مجھے بتایا کہ ھیلن ہی میرے تمام مضامین کی ٹیوشن لیجر ہوگی۔ انہوں نے ھیلن سے پوچھا کہ شیرل کہاں ہے۔ ھیلن نے بتایا کہ شیرل آج اپنے پاپا کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہے البتہ کل سے وہ بھی اپنے وقت پر آ جائے گی۔ پھر ھیلن نے خود ہی مجھے بتایا کہ شیرل پڑھائی کے علاوہ دیگر امور کے لیے میری ٹیچر مقرر کی گئی ہے۔ چرچ میں سبھی لوگ اس قدر ہنس مکھ تھے کہ کچھ دیر کے لیے تو میں اکیڈمی کے کرخت اور بے زار کن ماحول کو بھول ہی گیا تھا۔ مدر کیتھی نے مجھے ھیلن کے حوالے کر دیا اور خود عبادت کے لیے اندر چرچ کی مرکزی عمارت کی جانب بڑھ گئیں۔ ھیلن بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور اس نے مجھ سے میرا مکمل تعارف بھی حاصل کر لیا تھا، لہٰذا اب طے یہ ہوا کہ کل سے میں اپنی تمام کتابیں بھی آتے ہوئے ساتھ لے کر آیا کروں گا۔ اس کے علاوہ جب شیرل ٹیچر کل سے آ جائیں گی تو جو کچھ وہ بتائیں مثلاً میرے لباس وغیرہ میں سے کوئی لباس تو وہ بھی مجھے پہن کر آنا ہوگا یا ساتھ لے کر آنا ہوگا۔ مجھے اس شام وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا اور رات کے آٹھ بھی بج گئے۔ میں اس وقت چونکا جب ہمارا ہاؤس بٹلر جمعہ مجھے لینے کے لیے واپس آ پہنچا۔ میں ھیلن سے رخصت ہو کر جیسے ہی کانونٹ اور چرچ کے رہائشی علاقے سے باہر نکلا اور میں نے اکیڈمی کی طرف جاتی سڑک پر قدم رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گہرے خواب سے جاگ کر اٹھا ہوں۔ میرے ہاؤس تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے سارے ہم جماعتوں کو میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ سبھی مجھ سے اکیڈمی کی اونچی لمبی اور خاردار تاروں سے ڈھکی ہوئی چار دیواری کے باہر کی دنیا کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ جبکہ چند میٹرک اور فرسٹ ایئر کے کیڈٹس بھی ہاسٹل کے دروازے پر مجھ سے یہ پوچھنے کے لیے کھڑے تھے کہ میں نے وہاں کانونٹ میں کتنی لڑکیوں کو موجود پایا۔ ان کے نام کیا تھے اور کیا انہوں نے مجھ سے ''قاسم ہاؤس'' کے سینئر کیڈٹس کے بارے میں پوچھا تھا یا نہیں..... اس دن مجھے پتہ چلا کہ اکیڈمی کی چار دیواری کے باہر چرچ والی یہ دوسری چار دیواری تو واقعی سینئر کیڈٹس کے سپنوں کی دنیا ہے، کیونکہ وہ سب صبح پریڈ کے وقت اس چار دیواری سے لڑکیوں کی کالج بس کو نکلتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے اور انہوں نے کئی مہہ رُخوں کو اس بس میں بیٹھے جاتے دیکھا تھا۔ میں پہلا کیڈٹ تھا جسے انتظامیہ نے خود اس چار دیواری تک رسائی کی اجازت دی تھی ورنہ کئی کیڈٹس تو اس چار دیواری کے آس پاس پھٹکنے کی پاداش میں ہی ہفتوں سزا کھاتے رہے تھے۔ تمام سینئر کیڈٹس نے مجھے کسی نہ کسی لنچ، نائلہ، ٹینا، عینی، پنکی یا ناہید وغیرہ کا اتہ پتہ معلوم کرنے کی ''مہمیں'' کیں۔ یوں اس دن کا اختتام نائٹ فالن کے بعد یوں ہوا کہ آدی ''محمد بن قاسم ہاؤس'' کا سب سے اہم کیڈٹ بن چکا تھا۔

بوا کی افواہ

کہتے ہیں کچھ سرگوشیوں کی رفتار چیخوں سے بھی تیز ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ طاہر بھائی اور اگو کے جھگڑے سے بھی منسلک تھا۔ لوگ تو شاید کسی طور اس واقعے کو بھلا بھی دیتے لیکن شکورن بوا کی کھسر پھسر نے محلے داروں کی یادداشت سے یہ انہونی کبھی مٹنے نہ دی۔ نام تو ان کا شکورن تھا لیکن آج تک کسی نے انہیں کبھی خدا کا شکر ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شکورن بوا آدی کے محلے کی سب سے قدیم شے تھیں۔ جب آدی کے ابا دور دراز کے علاقے سے ٹرانسفر ہو کر اس شہر میں تعینات ہوئے تھے اور اس کالونی میں آ کر بسے تھے، شکورن بوا تب سے بھی پہلے کی یہیں آباد تھیں۔ محلے کی جانے کتنی نسلیں ان کے سامنے ہی جوان ہو کر اب بڑھاپے کی دہلیز پہ دستک دے رہی تھیں لیکن شکورن بوا اب بھی ویسی کی ویسی ہی تھیں۔ لگائی بجھائی اور ادھر کی ادھر لگانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، گزر بسر کے لیے انہوں نے گھر ہی میں بچوں کے لیے میٹھی گولیوں، کھٹے میٹھے چورن، پیکٹ میں بند املی، خشک شہتوت اور بیر اور ایسی ہی جانے اور کتنی الم غلم چیزوں کی دوکان سجا رکھی تھی۔ جب اسکول کی چھٹیاں ہوتیں تو محلے کے بچوں کا پسندیدہ مشغلہ صبح اٹھنے کے فوراً بعد جیب میں چونی اٹھنی ڈال کر شکورن بوا کے "ڈیپارٹمنٹل سٹور" کا رخ کرنا ہی ہوتا تھا۔ راجہ اور آدی بھی شکورن بوا کے مستقل گاہکوں میں شامل تھے۔

اب یہ راجہ کی بدقسمتی تھی کہ وہ طاہر بھائی اور اگو کے جھگڑے کے وقت وہاں موجود نہیں تھا یا پھر شکورن بوا کی خوش قسمتی کہ وہ عین اسی وقت اپنے شٹل کاک برقعے سمیت اپنی دوکان کے لیے خریدا ہوا سامان اٹھائے گزر رہی تھیں جب اگو نے طاہر بھائی کے سر پر آہنی مکے سے وار کیا تھا۔ طاہر بھائی کے سر سے نکلتی خون کی پھوار دیکھ کر حواس باختہ ہو کر جب وہ چیخیں تھیں تب ہی باقی راہ گیر اس جانب متوجہ ہوئے تھے۔ یہ انکشاف انہوں نے ہی سب سے پہلے کیا تھا کہ دونوں لڑکوں میں ہاتھا پائی سے پہلے انہوں نے کسی ایک کے منہ سے وجیہہ کا نام خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ یہ تو غیاث چچا کا رعب داب بھی ایسا تھا کہ انہیں "کھل" کر اپنے زریں خیالات کے اظہار کا موقع نہیں مل سکا ورنہ اب تک وہ محلے کے ہر گھر میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ چکی ہوتیں۔ کچھ لوگ خود بھی شکورن بوا کی عادات سے واقف تھے اور کچھ غیاث چچا اور ان کے معزز خاندان کا بھی لوگوں کو دھیان تھا اس لیے مردوں نے تو اگر اسے کچھ کہتے سنا بھی تو وہیں جھڑک کر چپ کروا دیا۔ رہی بات محلے کی عورتوں کی تو جو آپی ان کے سامنے ہی بچی سے جوان ہوئی تھیں۔ وہ سب ان کے کردار سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود شکورن بوا کی زبان کو مستقل لگام دینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اب جانے یہ سرگوشیاں غیاث چچا کے خاندان تک اس وقت پہنچ پائی تھیں یا ابھی وہ لوگ ان افواہوں سے لاعلم تھے کہ جب سکینہ خالہ اور وجو آپی نے طاہر بھائی کی عیادت کے لیے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ محلے میں ایک دستور عام تھا کہ کسی کے گھر مہمان بن کر جانے سے پہلے کسی

بچے کو بھیج کر اطلاع کروا دی جاتی تھی تا کہ اچانک جانے سے کسی کو زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جھگڑے کے دوسرے دن ڈوآپی نے اپنے گھر کے دروازے سے باہر جھانکا تو راجہ اور گڈو پہلے سے ان کے ''پہرے'' پر موجود تھے۔ دونوں نے چونک کر ڈوآپی کو دیکھا۔ آپی نے اشارے سے ان دونوں کو پاس بلایا اور انہیں طاہر بھائی کے گھر ان کی اماں کو پیغام دینے کا کہا کہ سکینہ خالہ اور وجیہہ ان کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ راجہ نے گڈو کو وہیں آپی کے گھر کے باہر چھوڑا اور خود بھاگتے ہوئے طاہر بھائی کے گھر آ پہنچا اور عزیزہ خالہ (طاہر بھائی کی اماں) کو آپی کا پیغام دیا۔ انہوں نے حسب معمول ''سو بار آئیں، ان کا اپنا گھر ہے'' کا جواب راجہ ہی کے ہاتھ بھجوا دیا جسے راجہ نے دوسرے ہی لمحے ڈوآپی کے گھر جا کر انہیں منتقل بھی کر دیا اور پھر جب ڈوآپی اور سکینہ خالہ طاہر بھائی کے گھر کے لیے نکلیں تو راجہ نے ہوشیاری سے گڈو کو بھی ان کے پیچھے طاہر بھائی کے گھر بھیج دیا۔ تبھی شکورن بوا بھی اپنے دروازے پر پڑی چک اٹھا کر باہر نکل آئیں اور انہوں نے راجہ سے پوچھا۔

''ہے بچے..... ادھر آ..... یہ کون دو (۲) ابھی طاہر میاں کے گھر گھسی ہیں۔'' راجہ نے انہیں بتایا کہ ڈوآپی اور سکینہ خالہ ہیں۔ یہ سن کر بوا چمک کر بولی۔

''ہاں ہاں..... وہ کیوں نہ جائیں گی مزاج پرسی کو..... سب ہی جانتے ہیں کہ دونوں لونڈے اپنی وجیہہ بی کی لگائی ہوئی لڑائی ہی تو لڑ رہے تھے۔''

راجہ کو ان کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ شکورن بوا کا پہلے ہی اتنا مقروض تھا اور ان کے ہاں سے ادھار کی اتنی چیزیں لے کر کھا چکا تھا کہ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شکورن بوا جس طرح پشتم پشتم باہر نکلیں تھیں ویسے ہی فوراً واپس اندر بھی چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر میں گڈو نے آ کر راجہ کو رپورٹ دی کہ گھر میں طاہر بھائی سمیت سبھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو سکینہ خالہ نے جاتے ہی طاہر بھائی کی بلائیں لیں کیونکہ طاہر بھائی نے ہمیشہ ان کی بیٹی کو بہترین نمبروں سے پاس کروانے کے لیے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھیں پھر انہوں نے بھی چھوٹتے ہی وہی سوال کیا جو سارے محلے کی زبان پہ تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ معاملہ اس قدر بڑھ گیا؟ گڈو نے بتایا کہ اس سوال پہ ڈوآپی نے جواب تک سر جھکائے بیٹھی تھیں، نظر اٹھا کر طاہر بھائی کی جانب دیکھا، ان کی نظر میں طاہر بھائی کے نام ایک التجا تھی کہ اب مناسب یہی ہوگا کہ طاہر بھائی پوری بات کھل کر سب کو بتا دیں لیکن طاہر بھائی نے ڈوآپی کی نظروں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے وہی مخصوص جواب دیا کہ اگو تو بس خوامخواہ ہی ان سے الجھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے، ورنہ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ سکینہ خالہ نے طاہر بھائی کو مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں سے دور رہنا ہی شریف زادوں کے لیے بہتر ہے۔ آئندہ طاہر بھائی اس راستے سے ہی نہ گزریں جہاں وہ مُوا اگو ان کا راستہ کاٹنے کے لیے کھڑا ہو۔

اب سکینہ خالہ کو یہ بات کون سمجھاتا کہ راستہ تو وہ ان کی لاڈلی وجو کا کاٹنا چاہتا ہے لیکن ہر بار طاہر بھائی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اگو نے پہلے اس رکاوٹ کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن طاہر بھائی کے سر کی پٹی اتر گئی اور اُس سے اگلے دن ٹانکے بھی کھل گئے۔ علاقہ ایس ایچ او نے دو مرتبہ ان کے گھر کے چکر مزید لگائے تا کہ طاہر بھائی اگو کے خلاف رپورٹ کروانا چاہیں تو وہ درج کرنے کو تیار ہے لیکن طاہر بھائی نے اسے ٹال دیا کہ یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے اور اب وہ غلط فہمی بھی دور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اگو ان سے لڑ پڑا تھا لہٰذا ایف آئی آر

درج کروانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بالے نے اگلے روز راجہ کو بتایا کہ اگو رات کے اندھیرے میں کل گھر کے اندر کودا تھا لیکن اس کے ابا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اگو کو بہت بے عزت اور ذلیل کرنے کے بعد اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اگو اسی وقت ان کے ساتھ چل کر طاہر بھائی اور اس کے گھر والوں سے معافی مانگے لیکن اگو نے صاف انکار کر دیا کہ وہ مرتے مر جائے گا لیکن کبھی طاہر سے معافی نہیں مانگے گا۔ اس بات پر بالے کے ابا مزید بھڑک گئے اور انہوں نے اگو کو اسی وقت گھر سے نکل جانے کا کہا ورنہ دوسری صورت میں انہوں نے پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ اس پر اگو نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ باپ کو درمیان میں ہی ٹوک دیا کہ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ وہ نیم حکیم (مطلب طاہر بھائی) بھی آج کل پولیس کے ساتھ بہت راہ و رسم بڑھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو بھی جا کر خبر کر دے کہ اگو نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اگر اس نے پولیس میں رپٹ درج کروانے کی غلطی کی تو اگو بھی چپ نہیں بیٹھے گا اور سارے شہر میں طاہر کے معاشقے کی خبر پھیلا دے گا۔ بالے نے راجہ کو بتایا کہ شاید اس کے ابا کو تو اگو کی دی ہوئی اس دھمکی کی اتنی سمجھ نہ آئی ہو لیکن بالے کے کان اگو کی بات سنتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگو کا اشارہ کس طرف ہے لیکن تب تک اگو کے ابا اس حد تک بپھر گئے تھے کہ انہوں نے خود اگو کو ہاتھ سے پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیا۔ بالے نے راجہ کو یہ بھی بتایا کہ گھر سے نکلتے ہی اگو بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے طاہر بھائی سمیت خود اپنے گھر والوں کو بھی سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں کہ اب وہ بھی چین سے نہیں بیٹھے گا اور نہ اپنے گھر والوں کو اور نہ ہی اسے چین سے بیٹھنے دے گا جس کی وجہ سے آج اسے گھر بدر کیا گیا ہے۔ اگو بہت دیر تک وہیں دروازے پر کھڑا بکتا جھکتا رہا اور پھر دیگر محلے داروں کے گلی میں جھانکنے اور دروازے کھلنے کی آوازیں سن کر وہاں سے کہیں چلا گیا۔

بالے کی زبانی یہ سارا ماجرا سن کر راجہ اور باقی سارے دوست گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں تو صرف اگو آپی کی فکر ہی کھائے جا رہی تھی لیکن یہاں تو طاہر بھائی کی جان کے بھی لالے پڑتے نظر آ رہے تھے۔ اب وہ کیا کریں؟ بس یہی اک سوال ان سب کے ذہنوں میں کلبلا رہا تھا۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر راجہ کو آدی کی یاد بہت ستاتی تھی کیونکہ جب ان سب کے دماغ ہتھیار ڈال دیتے تھے تب ایک آدی ہی تھا جس کی عقل ایسے میں کوئی دور کی کوڑی لے کر آتی تھی لیکن آدی تو اس وقت یہاں سے ہزاروں میل دور جانے کن ظالموں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ کاش آدی یہاں ہوتا..... کاش..... کاش..... راجہ کا ذہن اسی ایک کاش کا ورد کرتا رہا لیکن اسے کون سمجھاتا کہ ہماری زندگیاں ایسے بہت سے "کاش" کا مجموعہ ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک کاش بھی اگر اپنی جگہ سے مٹ پاتا تو شاید ہم سب خود اپنی تقدیر لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں تھا..... کاش یہ ممکن ہو پاتا۔

پہلی ٹیوشن

اگلے دن ٹھیک وقت پر جمعہ (ہاؤس ہیرا) مجھے کانونٹ کے احاطے میں چھوڑ آیا۔ مدر کیتھرین وہیں چرچ کے احاطے میں بنے چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھیں خود اپنے ہاتھوں سے پودوں کو پانی وغیرہ دے رہی تھیں، پاس ہی ان کا باغبانی کا سامان بھی پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دور ہی سے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا اور مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ آج میں اپنی کتابیں بھی ساتھ لے کر آیا تھا اور جمعہ پہلے ہی میری یونیفارم اور دیگر ضروری لباس لکڑی کے بڑے بڑے ہینگرز میں لٹکائے وہاں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مدر کیتھی نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے گھر میں کس نام سے بلاتے ہیں۔ میں نے بتایا آدی، تو وہ مسکرا کر بولیں کہ میں بھی تمہیں تمہارے گھر والے نام سے پکاروں گی اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ میں ہنس پڑا۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی میرے کان کیڈٹ عباد، کیڈٹ عباد سن سن کر پک گئے تھے اور پٹی آفیسرز کا اپنے کرخت لہجے میں "ہے یو کٹ نمبر 8336 کہنا یا پھر طالب پی او کا تراسی چھتی کہنا تو ویسے ہی مجھے سخت ناپسند تھا۔

اس دن کافی دیر تک مدر کیتھی مجھ سے میرے گھر بار اور تعلیم کے بارے میں پوچھتی رہیں اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس بورڈنگ میں آنے سے پہلے آج تک کبھی پتلون نہیں پہنی تھی تو وہ یہ سن کر بہت دیر تک مسکراتی رہیں۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس میں ایسی کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ لباس اور زبان انسان ضرورت کے لحاظ سے اختیار کرتا اور چھوڑتا رہتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی مثال دی کہ انہوں نے جو یہ سفید عبا پہن رکھی تھی جو چرچ کی نن کا مخصوص لباس ہوتا ہے، اسے انہوں نے اپنی عمر کے انیسویں سال تک چھوا بھی نہیں تھا لیکن جب ضرورت پڑی تو انہوں نے پہن لی اور پہلے دن انہیں بھی اس لباس میں بہت بے آرامی اور الجھن محسوس ہوئی تھی لیکن اب یہی لباس انہیں دنیا کا سب سے بہترین لباس لگتا ہے۔

اتنے میں ھیلن بھی آ گئی۔ مدر کیتھی نے اسے میرے گھریلو نام سے آگاہ کیا اور مجھے ھیلن کے حوالے کر کے خود عبادت کے لیے چرچ کے اندر چلی گئیں۔ ھیلن نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور پوچھا۔

"ہاں تو مسٹر آدی..... کہاں سے شروع کریں.....؟"

اس نے کے منہ سے اپنا نام مسٹر کے اضافے کے ساتھ سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اپنی کتابیں ھیلن کی طرف بڑھا دیں۔ ھیلن نے چھان پھٹک کے بعد سب سے پہلے انگریزی کو ہی منتخب کیا اور پہلے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے پچھلے اسکول میں کہاں تک انگلش پڑھی ہے۔ میں نے فوراً انہیں اپنی گزشتہ "انگریزی کی استعداد" کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ ھیلن نے اسی حساب سے میرے لیے روزمرہ کا ایک چارٹ تیار کر لیا اور اس میں ہر ہفتے کے لیے مختلف اہداف مقرر کر دیئے اور ٹھیک وہیں سے ابتدا کی جہاں سے میں چھوڑ کر آیا تھا۔

پھر اس نے دیگر مضامین کے بارے میں مجھے مختصراً اتنا بتایا کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں پہلے اپنے پرانے اسکول میں پڑھ چکا ہوں۔ صرف زبان ہی کا فرق ہے۔ مثلاً ھیلن نے ریاضی کی کتاب نکال کر مجھے سوالات دکھائے۔ میں ہندسوں کو تو فوراً سمجھ گیا لیکن ان کے نیچے دی گئی انگریزی کی عبارت کو نہیں سمجھ پایا۔ اس نے مجھے ''جذر'' کے دو سوالات حل کرنے کو دیئے جو میں نے فوراً حل کر دیئے۔ تب ھیلن نے مجھے بہت شاباش دی اور وہی حل شدہ سوالات مجھے میری ہی کتاب کی مشق والے حصے میں دکھائے۔ سب کچھ ہو بہو ویسے ہی حل کیا گیا تھا جسے میں نے کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دائیں ہاتھ سے شروع کیا تھا اور عبارت اردو میں لکھی تھی جبکہ وہاں کتاب میں وہی سوال بائیں جانب سے حل کیا گیا تھا اور عبارت انگریزی میں تھی۔ ھیلن نے مجھے بتایا کہ یہ انگریزی میں وہی عبارت ہے جسے میں نے ابھی ابھی اردو میں لکھا ہے بلکہ وہ یہ بتاتے ہوئے تو زور سے ہنس دی کہ اسے تو اردو میں ریاضی بہت ہی مشکل لگتی ہے اور وہ کبھی اردو میں سوال حل بھی نہیں کر پاتی۔ مجھے ھیلن کی باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ تو کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والی بات ہو گئی۔ میں خوامخواہ اتنے دن سے ان کتابوں سے ڈر رہا تھا۔ ھیلن نے یکے بعد دیگرے اسی طرح مجھے معاشرتی علوم جسے وہاں سوشل اسٹڈیز کا نام دیا گیا تھا۔ دینیات جسے وہاں اسلامک اسٹڈی کہتے تھے اور سائنس وغیرہ کے بارے میں بڑی سہولت سے بتا دیا کہ آکسیجن کو انگریز بھی آکسیجن ہی کہتے ہیں، صرف لکھتے Oxygen ہیں۔ مجھے یہ جان کر کافی اطمینان ہوا کہ انگریز بھی ہم جیسے ہی ''مسلمان'' ہوتے ہیں اور ان سے خوامخواہ مرعوب ہونے کی مجھے قطعی ضرورت نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ انگریز بھی ہماری طرح ہی اردو لکھتے اور بولتے بھی..... پھر تو یہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ ھیلن نے ان پہلے دو گھنٹوں میں ہی میرے اندر سے انگریزی اور انگریزی پڑھائے جانے والے تمام مضامین کا وہ خوف یوں دور کر دیا جیسے وہ خوف میرے اندر کبھی تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس نے میرے اندر آہستہ آہستہ ایک تجسس کی لہر بیدار کر دی تھی کہ جو چیز میرے لیے اردو میں ''سبق'' ہے وہ انگریزی میں Lesson کیسے بن جاتی ہے لہٰذا مجھے اب اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔

اتنے میں چرچ کے گھنٹہ گھر نے شام کے چھ بجنے کا اعلان کر دیا۔ ھیلن نے مجھے بتایا کہ آج کے لیے میری ٹیوشن ختم اور اب آگے شیرل مجھے یہاں کے رہن سہن کے بارے میں تعلیم دے گی۔ ھیلن پوری ٹیوشن کے دوران مجھے ٹوکتی رہی کہ میں اسے سسٹر ھیلن یا صرف سسٹر کہوں لیکن میرے منہ سے ھیلن ہی نکلتا اور جب وہ گھور کر مجھے دیکھتی تو میں جلدی سے اس کے نام کے آگے سسٹر کا لاحقہ جوڑ دیتا اور وہ ہنس دیتی۔ پہلی ٹیوشن ختم ہونے سے پہلے ہی ہم دونوں کے درمیان پکی دوستی ہو گئی تھی۔ ہم چرچ کی مرکزی عمارت کے اندر ہی موجود ایک بہت کھلے اور اونچی چھت والے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔ چھ بجنے کے بعد ھیلن مجھے لیے چرچ کی مرکزی عمارت سے باہر آئی تو سامنے والے باغیچے میں نوکر چائے لگا چکا تھا اور کوئی لڑکی رنگین کپڑے پہنے ہماری جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ھیلن اور میرے قدموں کی آواز سن کر وہ پلٹی اور میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ہو بہو ھیلن کی دوسری نقل تھی۔ وہ ناک نقشہ، وہی روپ، وہی ہنسی..... دونوں میں اگر فرق تھا تو صرف ان کے لباس کا، ھیلن نن کے سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھی جبکہ اس نے رنگین لباس پہنا ہوا تھا اور لمبے سے فیروزی رنگ کے اسکرٹ اور کالی دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ ھیلن اور وہ لڑکی میری حیرت دیکھ کر ایک ساتھ ہنس پڑیں۔ ھیلن نے میرا تعارف کروایا۔

''یہ ہے کیڈٹ عباد اور یہ ہے میری چھوٹی بہن شیرل.....'' شیرل نے اپنا ہاتھ ملانے کے لیے میری طرف بڑھایا۔

''چھوٹی ضرور ہوں لیکن اتنی نہیں کہ ھیلن کے رعب میں آ جاؤں۔ صرف چار منٹ ہی چھوٹی ہوں۔''

میں حیران سا کبھی حمیلن اور کبھی شیرل کی طرف دیکھتا رہا۔ تب حمیلن نے مجھے بتایا کہ وہ اور شیرل دراصل جڑواں بہنیں ہیں۔ حمیلن نے میٹرک کے بعد چرچ کی راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی جبکہ شیرل اب بھی اپنے باپ کے ساتھ کانونٹ کے پچھلے حصے میں موجود رہائشی کالونی میں رہتی تھی جبکہ ان کی ماں کا انتقال چار سال پہلے اس وقت ہو گیا تھا جب شیرل اور حمیلن اپنے میٹرک کے امتحانات سے صرف دو دن پہلے ہی فارغ ہو کر بورڈنگ سے گھر آئیں تھیں۔ ان کی والدہ خود بھی بے حد مذہبی خیالات کی حامی اور روزانہ چرچ سروس میں شرکت کرنے والی تھیں۔ حمیلن کو چرچ سے بہت محبت ماں سے ہی ورثے میں ملی تھی جبکہ شیرل شروع ہی سے بے حد شرارتی اور چلبلی طبیعت کی حامل تھی لیکن مزاج کے اس تضاد کے باوجود دونوں بہنوں میں مثالی پیار تھا۔ حمیلن مجھے شیرل کے حوالے کر کے اور مجھ سے کل تک کے لیے رخصت لے کر اپنے دیگر امور نپٹانے چلی گئی لیکن جاتے جاتے اپنی بہن کو انگریزی میں بتا گئی کہ مجھے آدی پکارے جانا اچھا لگتا ہے، تبھی شاید شیرل نے اس کے جانے کے بعد جب مجھے کیڈٹ آدی کہہ کر پکارا تو اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج ہم یہیں چرچ کے باغیچے میں بیٹھ کر ''گپ شپ'' کریں گے جبکہ کل سے مجھے حمیلن سے ٹیوشن کے بعد فارغ ہو کر شیرل کے پاس ان کے گھر آنا ہو گا لیکن کچھ ہی دیر میں مجھے شیرل کی اس ''گپ شپ'' کا مقصد بھی سمجھ آ گیا۔ اس نے اپنے کام کا آغاز اسی دن شام کی چائے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات میں چرچ کی بیکری سے بنی ہوئی پیسٹری اور کیک وغیرہ بھی موجود تھے اور شیرل نے سب سے پہلے مجھے کانٹا اور چھری اٹھا کے کیک اور پیسٹری کاٹ کر اپنے لیے پلیٹ میں الگ کرنے کو کہا۔ مجھے جس طرح بھی سمجھ میں آیا میں نے یہ دشوار فریضہ سرانجام دے ہی دیا۔ پھر شیرل نے بنا کچھ کہے خود پہلے کیک کا ایک حصہ چھری اور کانٹے سے اپنے لیے علیحدہ کیا اور پھر دیگر چیزوں کو کانٹے سے بڑی نفاست سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے میرے سامنے بھی کھانے کے لیے رکھتی گئی، میں بہت غور سے شیرل کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دن مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کانٹے کے صحیح طریقہ استعمال کے بارے میں پتہ چلا۔ شیرل نے خود اپنے منہ سے مجھے نہ کسی بات پر ٹوکا اور نہ ہی خود سے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ بس وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اور کچھ میرے بارے میں پوچھتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے مجھے سب کچھ سکھاتی رہی۔ شاید اگر وہ شعوری طور پر مجھے سکھانے کی کوشش کرتی تو میں وہ آداب اتنی جلدی نہ سیکھ پاتا۔ حمیلن اپنے انداز و اطوار میں جس قدر سنجیدہ اور مدبر دکھائی دیتی تھی شیرل اتنی ہی زندگی سے بھرپور اور ہر بات کو ہنسی میں اڑا دینے والی شوخ و چنچل تھی۔ پہلی ہی شام اس نے مجھے چائے پینے کے انگریزی آداب سے اچھی طرح روشناس کروا دیا تھا۔ میرے اور انگریزوں کے چائے پینے میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا، بلکہ مجھے اس روز انگریزوں پہ بہت ترس بھی آیا کہ چائے جیسی نعمت کو وہ کس قدر احتیاط اور خود کو پابندیوں میں جکڑ کر پیتے ہیں۔ وہاں ہمارے محلے میں تو میرے اور راجہ کے درمیان باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا کہ کون ایک ہی گھونٹ میں چائے کا بھرا پیالہ ایک زوردار ''سڑڑ.....'' کی آواز کے ساتھ سب سے جلدی ختم کر سکتا ہے۔ جب کہ یہاں شیرل مجھے یوں نفاست سے دھیرے دھیرے اور چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے کر چائے ختم کرنے کا درس دے رہی تھی جیسے وہ چائے کا کپ نہ ہو ''آب زم زم'' ہو۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس طرح چائے پینے میں ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ پر مرتا کیا نہ کرتا۔ آدی کو کیڈٹ عباد کی طرح برتاؤ کرنے کے لیے یہ سب سیکھنا بے حد ضروری تھا۔ میں شیرل کو دیکھ دیکھ کر اس کی طرح سب کچھ دھراتا رہا اور دل ہی دل میں اس دن کو کوستا رہا جب میں نے دو سال قبل خود ابا کے سامنے ''فوجی کالج'' میں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

پابندی

اُس رات اگُو کو گھر سے تو نکال دیا گیا تھا لیکن دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے جو دھمکیاں دیں تھیں اور طاہر بھائی اور ڈوآپی کے بارے میں جو زہر افشانی کی تھی اسے محلے دار بہت دن تک اپنے ذہن سے نہیں نکال پائے تھے۔ رہی سہی کسر شکورن بوا کی قینچی کی طرح چلتی زبان نے پوری کر دی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی بیٹھتی کسی نہ کسی بہانے طاہر بھائی اور اگُو کے جھگڑے کو زیر بحث لے ہی آتی۔ رفتہ رفتہ اب سبھی محلے کو اتنی خبر تو ہو ہی گئی تھی کہ اگُو اور طاہر کے جھگڑے کی در پردہ وجہ کچھ اور ہی ہے لیکن پورا محلہ غیاث چچا اور ان کے گھرانے سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھا اور اگُو کے کرتوت بھی سبھی کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ راجہ اور بالے نے چند ایک دفعہ خود شکورن بوا کی اس افواہ سازی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا تھا اور ہر دفعہ راجہ، بالے، گڈو، پپو یا کسی بھی دوست کے ذریعے انہوں نے شکورن بوا کی بات پلٹنے کی کامیاب کوشش کر کے بوا کو اس منظر سے ہٹا بھی دیا تھا مثلاً ایک مرتبہ وہ جمن خالہ کے ہاں دروازے سے باہر بنے چبوترے پر دھوپ سینکتے ہوئے جب انہوں نے طاہر اور اگُو کا ذکر شروع کیا راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے جلدی سے بالے کو اشارہ کیا۔ بالے نے موقعے کی نزاکت کو سمجھ لیا اور بھاگتے ہوئے بوا سے جا کر کہا کہ آپ کے گھر کے باہر منّی آپا دا دا ویلا کر رہی ہیں کہ آپ شاید دودھ چولہے پر ہی ابلتا چھوڑ آئی ہیں اور اب بس دودھ چھلکنے کو ہی ہے۔ یہ سنتے ہی شکورن بوا اپنا شٹل کاک خیمہ نما برقع سنبھالتے ہوئے بنا یہ سوچے گھر کی طرف دوڑیں کہ دودھ تو انہوں نے آج لیا بھی نہیں تھا کیونکہ ابھی تک دودھ والے کے آنے کا وقت ہی کہاں ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ جب راہ چلتے انہوں نے غفور چچا کو روک کر ان سے پولیس میں جھگڑے کی شکایت کا ذکر چھیڑا تو ٹھو نے جو قریب ہی راجہ اور دیگر دوستوں کے ساتھ پٹھو گرم کھیل رہا تھا، جان بوجھ کر اس زور سے گیند شکورن بوا کی کمر میں دے ماری کہ شکورن بوا سب بھول بھال اور سب چھوڑ چھاڑ کر لاٹھی لے کر ان سب کے پیچھے دوڑ پڑیں۔ ٹھو پارٹی میں سے تو کوئی ان کے ہاتھ نہیں آیا البتہ شکورن بوا اپنی کمر کی سکائی اگلے تین دن تک لگا تار کرواتی رہیں لیکن باز پھر بھی نہیں آئیں۔ جانے انہیں طاہر بھائی اور ڈوآپی کے گھرانے سے خدا واسطے کا بیر کیوں تھا؟ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں سارے زمانے سے ہی شکایت تھی۔ محلے کی کچھ بڑی بوڑھیاں اس کی وجہ یہ بتاتی تھیں کہ شکورن بوا گھر میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ماں باپ کی یکے بعد دیگرے ناگہانی موت کے بعد انہوں نے ہی ساتوں بہن بھائیوں کی پرورش کچھ اس طرح سے کی کہ ان کی فکر میں اپنی ساری جوانی ہی جلا کر راکھ کر دی اور جب تک شکورن بوا اپنے فرائض سے فارغ ہوئیں اور سب سے چھوٹی بہن کی ڈولی رخصت کروائی تب تک خود ان کی ڈولی اٹھنے کی عمر کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ سبھی بہن بھائی اپنی اپنی زندگی اور گھرانوں کے پھیر میں یوں الجھے کہ شکورن بوا کی طرف سے ان کا دھیان ہٹتا گیا اور شکورن بوا چڑچڑی ہوتی گئیں پھر ایک دن انہوں نے خود ہی سبھی کنبے سے قطع تعلق کر لیا اور

اپنے دروازے کبھی پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیے۔ تب سے لے کر آج تک انہیں محلے میں جوان ہوئی ہر لڑکی سے بیر رہتا تھا۔ وہ کسی کی بھی ڈولی اٹھتے دیکھتیں تو خود ان کے دل میں ایک ایسی ہوک اٹھتی جو ان کے اندر کا سارا زہر ان کی زبان تک لے آتی اور اب تو پورا محلہ ہی ان کی اس زہر اگلتی زبان کا عادی ہو چکا تھا لیکن راجہ، بالے اور دیگر دوستوں کو اور تو سب کچھ منظور تھا لیکن وہ اپنے آدی کی چہیتی ڈوآپی کے خلاف کچھ برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آدی جاتے ہوئے ان کی ذمہ داری ان سب دوستوں پر ڈال گیا تھا لہٰذا وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان کی موجودگی میں ڈوآپی کے پاکیزہ کردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش بھی کرے لیکن کہتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں دیواروں کے بھی کان نکل آتے ہیں اور کبھی کبھی ہلکی سی آواز میں کی گئی سرگوشی کسی دھماکے کی آواز سے بھی پہلے ان دیواروں میں سرایت کر کے دوسری طرف پہنچ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈوآپی اور طاہر بھائی کے بارے میں بھی ہو رہا تھا۔

رہی سہی کسر اس ایک واقعے نے پوری کر دی۔ علاقے کا ایس ایچ او بازار میں گشت کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اگو اور اس کے دو دوستوں پر پڑ گئی۔ اگو کے خلاف باقاعدہ کوئی ایف آئی آر تو کسی نے درج نہیں کروائی تھی اور طاہر بھائی نے خود ایس ایچ او کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو پولیس میں نہیں لے جانا چاہتے لیکن پھر بھی ایس ایچ او نے سوچا کہ اگو کو بلا کر وہیں بازار میں ذرا سختی سے تنبیہ کر دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ وہ طاہر بھائی اور ان کے گھرانے کی شرافت سے اچھی طرح واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اگو دوبارہ طاہر بھائی سے الجھے یا کوئی اور شرارت کرے۔ ایس ایچ او ملک ریشم خان نے زوردار آواز میں اگو کو پکارا۔ اگو اور اس کے دوستوں نے ایس ایچ او کو دیکھا تو جانے کیا سمجھے اور بدک گئے۔ ملک ریشم نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو پکڑ کر حاضر کیا جائے پھر کیا تھا پورے بازار میں اگو گروپ اور سپاہیوں کی دوڑیں لگ گئیں اور آخر کار اگو اور اس کا ایک دوست پولیس کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ملک ریشم نے پہلے تو وہیں بازار میں ان دونوں کی خاطر تواضع کی کہ وہ بھاگے کیوں تھے؟ اگو سمجھا کہ طاہر بھائی نے ایس ایچ او کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور وہیں بھرے بازار میں چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی اور طاہر اور ڈوآپی کی "محبت" کی داستان پورے زمانے کو سنانے لگا۔ بھیڑ جمع ہو چکی تھی اور ملک ریشم نے جب تک معاملے کی نزاکت کو سمجھا تب تک اگو کافی بکواس کر چکا تھا۔ ملک کے اشارے پر سپاہیوں نے اگو کا منہ کپڑے سے باندھ کر اسے پولیس کی ولیز (willes) جیپ میں لاپھینکا اور تھانے لا کر اسے کافی دیر تک الٹے ٹانگے رکھا۔ ایس ایچ او نے اس سے ایک سادہ کاغذ پر حلفیہ بیان بھی لیا کہ آئندہ اگر اگو یا اس کے دوستوں نے کالونی کا رخ بھی کیا تو جو چور کی سزا وہ ان کی اور شام تک اگو کو ڈرا دھمکا کر رہا بھی کر دیا۔ کیونکہ ایس ایچ او کا تو پہلے ہی اسے گرفتار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر اگو بازار میں چپ چاپ آ کر ملک ریشم کی بات سن جاتا تو اسے اتنی مار بھی نہ سہنی پڑتی لیکن بات بگڑتی ہی گئی۔

ملک ریشم خود بھی بیٹیوں کا باپ تھا اور ایسے معاملات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے شام ہی کو پولیس لائن سے ایک تانگہ پکڑا اور غیاث چچا کے گھر چلنے کو کہا۔ اپنی پولیس کی جیپ میں وہ اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا تاکہ لوگ اسے وردی میں یا سرکاری جیپ میں دیکھ کر چونک نہ اٹھیں۔ غیاث چچا کو گھر سے باہر بلا کر اس نے نہ جانے کیا بات چچا سے کہی کہ غیاث چچا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا۔ ملک ریشم وہیں دروازے سے ہی بنا کچھ کھائے پیے پلٹ گیا لیکن جاتے جاتے وہ غیاث چچا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں یہ کہنا نہیں بھولا کہ غیاث چچا اگو کی زبان سے اگلے

زہر اور اس کی تمام بکواس کا ذرہ بھر بھی ملال نہ کریں کیونکہ وہ ایسے گلی کے معمولی غنڈوں اور لوفروں کی کھال کھینچنا خوب جانتا ہے۔ غیاث چچا ایس ایچ او کی بات سن کر اس قدر جھٹکے میں تھے کہ وہ اسے ٹھیک طرح سے خدا حافظ بھی نہیں کہہ پائے اور اس وقت چونکے جب مؤذن نے مغرب کی اذان کی تکبیر بلند کی۔ غیاث چچا ابھی تک اپنے دروازے پر ہی بت بنے کھڑے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے سکینہ خالہ کی ان پر نظر پڑی اور وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ غیاث چچا نے ان کے لائے ہوئے پانی کے گلاس کو پکڑنے کی بجائے ان سے پوچھا کہ ''وجیہہ کہاں ہے.....؟''

''اندر اپنے کمرے میں ہوگی۔ صبح کالج جانے کے لیے اپنا یونیفارم استری کر رہی ہے۔'' سکینہ خالہ نے حیرت سے جواب دیا کیونکہ انہیں غیاث چچا کے لہجے میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس ہوگئی تھی۔ غیاث چچا نے چند لمحے تک خلاء میں گھورنے کے بعد سرد سی آواز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''اب اس کی کوئی ضرورت نہیں..... وجیہہ سے جا کر کہہ دو کہ وہ کل سے کالج نہیں جائے گی۔ میں نے اس کی پڑھائی ختم کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' سکینہ خالہ کے ہاتھوں سے کانچ کا گلاس زمین پر گرا اور چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجّال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجّال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

پہلی جعل سازی اور جنٹلمین کیڈٹ عباد

کچھ ہی دنوں میں ھیلن اور شیرل کی مدد سے میں رفتہ رفتہ انگریزی زبان اور انگریزی طور واطوار میں شدھ بدھ حاصل کرنے لگا تھا۔ سارا دن میں شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا اور مقررہ وقت پر اب میں خود ہی بھاگتے ہوئے چرچ کے احاطے میں جا پہنچتا۔ میرے لیے اکیڈمی کے پچھلے حصے کے گیٹ پر گارڈز کو تاکید کر دی گئی تھی اور مجھے ایک کاغذی پاس بھی بنا کر دے دیا گیا تھا۔ واپسی پر البتہ چرچ کی انتظامیہ یا جمعہ مجھے لینے کے لیے آ جاتا اور میں شیرل سے رخصت ہو کر واپس ہوسٹل آ جاتا۔ ھیلن مجھے چرچ میں میری کلاس کے مضامین کی ٹیوشن دیتی اور شیرل مجھے کبھی چرچ یا کانونٹ کے احاطے میں اور کبھی اپنے گھر پہ جنٹلمین کیڈٹ بننے کی تربیت دیتی۔ شیرل کے گھر پہ میری اس کے ابا سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کا نام ولسن Wilson تھا اور شیرل کی طرح میں بھی انہیں ''سر'' یا ولسن سر Wilson Sir کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ بھاری بدن کے ایک فربہ اندام شخص تھے لیکن سر پہ ہیٹ جمائے منہ میں پائپ دبائے، بڑے گیلس والی پینٹ پہن کر جب وہ اپنے لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے اپنی آرام کرسی پر جھولتے تو مجھے بالکل ایک بڑے بچے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر نے زیادہ میٹھا کھانے سے منع کیا ہوا تھا لیکن وہ شیرل سے چھپ کر اور کبھی کبھار میری مدد سے بھی کچھ نہ کچھ اپنی پسند کا میٹھا حلق سے اتار ہی لیتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دور سے ہی فوجی انداز میں سلیوٹ کرتے اور چلا کر شیرل کو مطلع کر دیتے کہ

''ہے شیرل..... تمہارا جنٹلمین کیڈٹ عباد آیا ہے۔ اب ہم سب مل کر خوب ہنگامہ کریں گے.....''

اور پھر واقعی خوب ہنگامہ ہوتا۔ شیرل انہیں میٹھا کھانے سے روکتی رہ جاتی اور وہ بڑے مزے سے کبھی ریفریجریٹر سے اور کبھی باورچی خانے سے کسی نہ کسی ڈبے سے کچھ نہ کچھ نکال نکال کر منہ چلاتے رہتے۔ ہفتے کے شام ھیلن بھی اس ہنگامے میں شریک ہو جاتی کیونکہ اتوار کے روز چرچ سروس تک اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ سر ولسن شیرل کے قابو میں تو کم ہی آتے لیکن ھیلن کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی بات منواتی تھی۔ شیرل نے مجھے تمام لباس ٹھیک طرح سے پہننے اور ان کے تمام آداب کے طور طریقے بھی سکھا دیئے تھے اور اب تو میں خود ہی ٹائی بھی باندھ لیتا تھا۔ ہمارے یونیفارم میں ہیٹ کہیں بھی شامل نہیں تھا لیکن ولسن سر نے مجھے یکے بعد دیگرے اپنے سارے اقسام کے ہیٹ اور ان کے پہننے کے طریقے بھی سکھا دیئے۔ میں جب بھی کوئی نیا لباس پہن کر باہر آتا تو وہ جھٹ سے اپنے کوڈک کیمرے سے میری ایک تصویر بنا لیتے۔

اب مجھے میس میں بھی فیصل یا اسفر کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور میں بڑے اعتماد سے باقی سب کیڈٹس کی طرح چھری کانٹے اور لکڑی کی اسٹکس کی مدد سے نوڈلز، اسٹیک اور دیگر کھانے کھا سکتا تھا۔ شیرل نے مجھے رفتہ رفتہ مختلف تعداد کے کورس کے کھانوں (ڈنر) وغیرہ کے آداب کے

بارے میں بتا دیا اور ہر کھانے اور ہر تقریب کے لحاظ سے، لباس کی مناسبت اور رنگوں کے امتزاج کے بارے میں بھی سکھایا تھا کہ کب اور کس موقعے پر کون سا انگریزی لباس اور کون سا رنگ جچے گا۔ کبھی کبھی تو میں ان انگریزی طور اطوار سے سخت اکتا جاتا اور ہیلن اور شیرل کے سامنے انگریزوں کو خوب کوستا کہ وہ بھی ہماری طرح سارا دن ایک ہی شلوار کرتے میں کیوں نہیں گزار سکتے تھے۔ اکیڈمی میں ہمیں صرف جمعے کی نماز کے وقت ہی جناح کیپ اور کرتا پاجامہ پہننے کا موقع ملتا تھا ورنہ سارا دن ہم اسی طرح کے "اوٹ پٹانگ" لباسوں میں ملبوس رہتے جو گئے انگریزوں کی دین تھی۔

مجھے رفتہ رفتہ اکیڈمی میں کچھ سکون آنے ہی لگا تھا کہ ایک دن اچانک ڈاکیے نے آ کر گیٹ پر حسب معمول اپنی سائیکل کی گھنٹی زور سے بجائی اور میرا نام پکارا۔ میں نے چونک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے خط کی جانب دیکھا کیونکہ گھر میں سے صرف ابا خط لکھتے تھے اور ان کا خط ابھی دو دن پہلے ہی تو آیا تھا جس میں انہوں نے چار سطروں میں مجھے اپنی پڑھائی پر دھیان دینے اور اپنی صحت کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ ویسے بھی ابا کے خط بہت مختصر ہوتے تھے اور سب ہی کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ کہیں ابا نے ایک ہی خط لکھ کر اس کی بہت ساری نقول تو تیار نہیں کروالیں؟ جنہیں وہ ہر ہفتے مجھے پوسٹ کر دیتے تھے اور جن کا آغاز ہمیشہ برخوردار عباد سے ہو کر اختتام ہمیشہ "تمہاری امی، فاران اور عمارہ تمہیں پیار کہتے ہیں" پر ہوتا تھا۔

لیکن یہ خط ابا کی جانب سے نہیں تھا۔ یہ خط راجہ اور میرے باقی دوستوں نے مل کر مجھے لکھا تھا۔ راجہ کی تحریر دیکھتے ہی میرے اندر کا تمام دکھ اور وہ شدید اداسی جس پر میں نے اس اکیڈمی میں گزرے اپنے گزشتہ تین ہفتوں کی مٹی ڈال رکھی تھی، ایک دم سے مجھ پر یوں حاوی ہوئے کہ خط کھولتے ہی میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ راجہ نے میرے اکیڈمی کے لیے روانہ ہونے والے دن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات خط میں تفصیل سے لکھے تھے۔ پانچ صفحوں کے اس خط کو میں نے جانے کتنی بار پڑھا اور ہر بار مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنے محلے میں، اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں۔ راجہ نے طاہر بھائی اور اٹو کے جھگڑے اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ اس کا اور میرے باقی سب دوستوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ میں جیسے ہی بڑا افسر بن کر واپس اپنے محلے میں پہنچوں تو سب سے پہلے مجھے اٹو کو بمعہ اس کے تمام غنڈے دوستوں کے گرفتار کروانا ہوگا۔ فجو آپی کے ذکر پر تو میری وہ حالت ہوئی کہ بس جیسے ہچکیاں ہی بندھ گئیں۔ یہ میرے کیڈٹ کالج آتے ہی کیا کچھ ہو گیا تھا۔ وہ کتنی پریشان ہوں گی وہ تو اتنی نازک ہیں کہ ان سے کسی کی سخت نظر بھی برداشت نہیں ہوتی تھی پھر اتنی سخت باتیں اور جھوٹے الزامات انہوں نے کیسے برداشت کیے ہوں گے؟ کون انہیں دلاسہ دیتا ہوگا؟ جب بات کرتے کرتے اور اچانک ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی آ جاتی ہو گی تو کون جا کر ان کی بھیگی پلکیں پونچھتا ہوگا؟ ایسے جانے کتنے ہی سوال میرے ذہن میں یوں گردش کرنے لگے کہ شام سے پہلے ہی مجھے کپکپی سے طاری ہو گئی اور جب پہلی پریپ کے وقت پر ٹیکٹ نے آ کر میرا ماتھا چھو کر دیکھا تو الٹے پاؤں بھاگا اور چند ہی لمحوں میں مجھے اکیڈمی کے چھوٹے سے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک "ڈاکٹر نما" شخص کانوں سے آلہ لگائے نمودار ہوا۔ میرے ذہن میں ابھی تک ڈاکٹر کا خاکہ طاہر بھائی سے ملتا جلتا تھا۔ کلین شیو، صاف ستھری پینٹ شرٹ، سلیقے سے بال بنے ہوئے اور کپڑوں سے اٹھتی مخصوص کلون یا پرفیوم کی خوشبو لیکن یہ تو سراجاڑ، منہ پھاڑ ٹائپ کا کوئی ڈاکٹر تھا جو دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ابھی سیدھا سو کر بستر سے اٹھا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی انہی خصوصیات کی وجہ سے کیڈٹس

نے اس کا نام ''ڈاکٹر نو'' رکھ چھوڑا ہے۔ کیونکہ وہ ہر اس بات کو ''نو'' کر دیتا تھا جس کی فرمائش کیڈٹ کرتے تھے۔ اس نے میرے دل کی دھڑکن سنی اور پھر جلدی سے کہا ''نو..... ہی از پرفیکٹلی آل رائٹ'' He is prefectly all right. پھر میری طرف مڑ کر کہا ''تم بالکل ٹھیک ہو۔ میں یہ گولیاں دے رہا ہوں۔ صبح تک ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑتے پھرو گے.....''

ڈاکٹر نو نے مجھے کچھ گولیاں کھانے کو دیں اور چند گھونٹ کسی کڑوی شربت کے پلائے اور پھر جاتے جاتے مجھ سے کہا ''آں ہاں..... خبردار..... مجھ سے ریسٹ لینے کی قطعی توقع نہ رکھنا۔ میں ایسے معاملوں میں بہت سٹرکٹ Strict ہوں۔''

میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا کیونکہ میں نے تو کسی ریسٹ کی بات بھی نہیں کی تھی اور مجھے ریسٹ یا آرام دوا سے ملنا تھا نہ کہ ڈاکٹر نو کی ذات سے۔ تبھی میرے بٹ مین نے جو اس روز ہاؤس ڈیوٹی پر تھا اور مجھے ہسپتال لے کر آیا تھا، ڈاکٹر نو سے گڑگڑا کر درخواست کی۔

''سر کیڈٹ عباد نے تو آج تک کبھی ریسٹ نہیں لیا لیکن آج واقعی انہیں بہت تیز بخار ہے۔ برائے مہربانی ایک دن پریڈ سے ریسٹ لکھ دیں۔'' ڈاکٹر نے چند لمحے اس کی درخواست پر غور کیا پھر میری دواؤں کی پرچی پر نیچے ''ون ڈے پریڈ ریسٹ'' (ایک دن کے لیے پریڈ سے آرام) لکھ کر بٹ مین کے حوالے کر دی اور یہ جا اور وہ جا۔ اکرم (بٹ مین) نے پرچی میرے حوالے کی اور چہک کر بولا۔

''یہ لیں سر جی..... کل صبح آرام سے سوئیں اور عیش کریں..... کل آپ کو صبح سویرے پریڈ کے لیے نہیں اٹھنا پڑے گا.....''

میں نے حیرت سے اس جادوئی پرچی کی جانب دیکھا جس میں میری کل کی پریڈ سے چھٹکارے کا پروانہ تھا۔ اوہ..... تو ڈاکٹر نو اس ریسٹ کی بات کر رہا تھا۔ مطلب کیڈٹس بیمار ہو کر اس کے پاس آتے ہوں گے اور اس سے ہاؤس ریسٹ کی ضد کرتے ہوں گے تبھی وہ پہلے ہی سے مجھے انکار کر رہا تھا۔ اگلی صبح جب میری ساری ڈارمیٹری اس منحوس سیٹی کی آواز پر بستروں سے گر گر کر اٹھتی اور باہر کی جانب بھاگتی نظر آ رہی تھی۔ میں آرام سے اپنے گرم بستر میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔ ناشتے سے کچھ پہلے مجھے ہاؤس بیرا جمعہ نے آ کر اٹھا دیا اور میں نے مکمل سہولت اور آرام سے گرم پانی کے شاور سے غسل بھی کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان غسل خانوں میں کیڈٹس کی اس قدر بھیڑ ہوتی تھی کہ کئی بار ایک ہی شاور کے نیچے تین تین کیڈٹ جانگیہ پہنے نہا رہے ہوتے تھے۔ میں آرام سے تیار ہو کر اپنی کتابیں اکٹھی کر رہا تھا جب باقی کیڈٹس پریڈ گراؤنڈ سے بھاگتے دوڑتے اور ہانپتے کانپتے ہاسٹل آ پہنچے اور جلدی جلدی تولیے باندھ کر غسل خانوں کی جانب بھاگے۔ میرا بخار تو اتر چکا تھا لیکن میری پرچی ابھی میرے پاس ہی پڑی تھی۔ سب سے پہلے نہا کر واپس آئے فیصل کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے پرچی اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور دھیرے سے میرے کان میں کہا کہ اگر ہم 01 کو 07 بنا دیں تو میرا ریسٹ سات دن کا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے چونک کر فیصل کو دیکھا.....؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ابھی ہم دونوں اسی سوچ میں تھے کہ میس میں ناشتے کی گھنٹی بج گئی اور باہر سے سینئر کیڈٹ کی دھاڑ سنائی دی کہ تمام کیڈٹس فوراً ناشتے کے لیے میس کی جانب مارچ پاسٹ کریں۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ پرچی مجھ سے اور فیصل سے وہیں بیرک کے فرش پر گر گئی اور جب ہم کلاس سے واپس آئے تو سویپر صفائی کے دوران وہ کاغذ بھی فرش سے اٹھا چکا تھا۔ میں نے اور فیصل نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتفاق سے تیسرے ہی دن اسفر کی طبیعت بھی بگڑ گئی اور اسے بھی ڈاکٹر نو کے پاس ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسفر کو ریسٹ تو نہیں دیا لیکن ہسپتال کی دواؤں کی پرچی اس کے ہمراہ ہم تک پہنچ گئی۔ اکیڈمی کا دستور یہ تھا کہ جن

کیڈٹس کو ڈاکٹر ریسٹ دیا کرتا تھا ان کے نام کے آگے سینئر کیڈٹ ''آن ریسٹ On Rest'' لکھ کر آرام کے دن لکھ دیتا تھا۔ یہ سب کاغذ کی ایک شیٹ پر تحریر ہوتا تھا جسے ''پریڈ اسٹیٹمنٹ Prade Statement'' کہا جاتا تھا جس کیڈٹ کو ڈاکٹر نے جتنے دن کے لیے پریڈ ریسٹ یا کلاس ریسٹ یا گیمز ریسٹ دیا ہوتا تھا وہ اپنی پرچی اپنے پریفیکٹ کو دے دیتا جو رات کی گنتی کے وقت اسے سینئر کیڈٹ آفیسر کے پاس لے جا کر اور اسے دکھا کر اس کا اندراج پریڈ اسٹیٹمنٹ میں کروا لیتا تھا۔ یوں اگلے دن صبح پریڈ کے دوران پی او اس کی غیر حاضری نہیں لگاتا تھا اور اس کیڈٹ کو ''سِک لیو'' (Sick Leave) یعنی بیماری کی رخصت پر شمار کیا جاتا تھا۔ فیصل کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ ہم سرِشام ہی پہلی پریپ کے دوران ڈاکٹر نو کی لکھائی کو غور سے دیکھ دیکھ کر اس کی مشق کی پریکٹس کرتے رہے۔ اسفرات کے کھانے تک ہماری مشقیں کرتا رہا کہ ہم ایسی غلطی نہ کریں اگر ڈاکٹر نو کی تحریر سے ہماری تحریر مل نہیں پائی تو ہم دونوں کا تو پتہ نہیں لیکن ہاؤس ماسٹر اسفر کو زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن فیصل کا کہنا تھا کہ ساتویں کے کیڈٹس پر کسی کا شک بھی نہیں جائے گا۔ اس لیے یہ جوا کھیل لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ہم تینوں انٹرٹینمنٹ روم کے بجائے واپس اپنی ڈارمیٹری میں آ گئے اور آخری بار ہم نے ڈاکٹر نو کی تحریر کی مشق کی۔ ڈاکٹر نو کے دستخط بہت آسان تھے لیکن میں اس کے انگریزی میں لکھے الفاظ کو نقل نہیں کر پا رہا تھا جبکہ فیصل لفظ تو لکھ لیتا لیکن دستخط کرتے وقت اس کا ہاتھ بہک جاتا تھا، لہٰذا طے یہ پایا کہ آرام Rest کرنے کے دن فیصل لکھے گا اور میں نیچے ڈاکٹر کے دستخط کر دوں گا۔ ہم نے آخری بار بسم اللہ پڑھی اور اسی نیلی روشنائی والے پین سے فیصل نے ''تین دن کے لیے پریڈ سے آرام'' کا جملہ انگریزی میں پرچی پر لکھ دیا۔ کچھ فرق تو آیا تحریر میں لیکن یہ بہت زیادہ غور سے دیکھنے کے بعد ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اب میں نے دل ہی دل میں چند سورتیں پڑھیں اور اسی پین سے نیچے ڈاکٹر نو جیسے دستخط بنا دیئے۔ کچھ دیر تک ہم تینوں دم سادھے اسی پرچی کو دیکھتے رہے جس پر ابھی تک ہماری تحریر کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی۔ فیصل نے اگلے دس منٹ تک ہر طرح سے الٹا، سیدھا، دور اور نزدیک سے اس پرچی کو پکڑ کر دیکھا اور بالآخر فیصلہ دے دیا کہ ہماری اس جعل سازی کو شاید خود ڈاکٹر نو بھی نہ پکڑ پائے۔ اسفر کا ابھی تک برا حال تھا اور خوف کے مارے اسے واقعی بخار سا چڑھنے لگا تھا۔ ہم دونوں نے کسی نہ کسی طرح دلاسہ دے کر رات کی گنتی کے وقت تک اس کے حواس بحال رکھے اور نائٹ فالن کے وقت جب سینئر کیڈٹ نے ہر جماعت کے پریفیکٹ کو سب بیمار کیڈٹس کی سک رپورٹ (Sick Report) لانے کے لیے کہا تو فیصل نے تقریباً دھکا دے کر اسفر کو پریفیکٹ کی جانب دھکیل دیا۔ ورنہ وہ تو خوف کے مارے اپنی جگہ جما ہوا کھڑا تھا۔ پریفیکٹ نے ڈانٹ کر اس سے پوچھا ''کیا ہے.....؟'' اسفر نے جلدی سے تھوک اپنے حلق سے نگلا اور ہاتھ میں پکڑی اپنی پرچی پریفیکٹ کی جانب بڑھا دی۔ پریفیکٹ نے اسفر کی پرچی کھولی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم سب کے دل یوں دھڑک رہے تھے جیسے ابھی اچھل کر حلق سے باہر آ گریں گے۔ پریفیکٹ نے نظریں اٹھا کر اسفر کو دیکھا۔ اسفر کا رنگ مزید پیلا ہو گیا اور وہ لڑکھڑا کر تقریباً گرنے کو ہی تھا کہ پریفیکٹ نے پرچی باقی پرچیوں کے ساتھ نتھی کی اور پریڈ کرتے ہوئے سینئر کیڈٹ کی جانب اپنی کلاس کی گنتی جمع کروانے چلا گیا۔ سینئر کیڈٹ آفیسر نے سرسری طور پر تمام پرچیوں کا جائزہ لیا اور اسفر کا نام پریڈ اسٹیٹمنٹ میں ''تین دن کے لیے پریڈ آرام Three days rest from prade'' میں لکھ کر رجسٹر بند کر دیا۔ میرے اور فیصل کے منہ سے ایک زوردار خوشی کا نعرہ نکلتے نکلتے رہ گیا اور اسفر کی جان میں بھی جان آئی۔ اوپر ڈارمیٹری میں پہنچتے ہی ہم تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو گلے لگا لیا اور اپنی اس پہلی جعل سازی کی

کامیابی پر دل کھول کر ایک دوسرے کو داد اور مبارک باد دی۔

اگلے تین دن تک اسفر مزے سے صبح سوتا رہا اور میں اور فیصل اسے سوتا دیکھ کر ہی خوش ہوتے رہے۔ اصل میں یہ ہمارا وہ انتقام تھا جو ہم سب جونیئر کیڈٹ اس سیٹی سے لینا چاہتے تھے جو منہ اندھیرے ہمیں زبردستی جگانے کے لیے بجائے جاتی تھی۔ ہم سب ہی کو اس سیٹی سے اور یوں سحری کے وقت جگائے جانے سے شدید نفرت تھی لیکن ہم سبھی بے بس تھے۔ مجھے اور فیصل کو اب کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب ہمارے پاس اس بے بسی کے توڑ کے لیے ایک ہتھیار موجود تھا اور ہم تینوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہتھیار کو باری باری استعمال کرتے رہیں گے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور.....شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ.....یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے.....ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے تساؤ کے آدم خور.....جنہوں نے یوگنڈا میں بچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم "Ghost & The Darkness" بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب (The Man-Eaters of Tsavo) کا اُردو ترجمہ **کتاب گھر** پر **شکاریات** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گلریا کا آدم خور

گلریا کا آدم خور برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈیئر جمشید ارجاسپ خان کیانی کی آپ بیتی ہے، جسے عبیدہ اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ **گلریا کا آدم خور** ۴۰ کی دہائی کی ایک شکاری مہم ہے جو ایک طرف اُس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان دیکھی قوتوں کی پس پردہ سازشوں سے نقاب اُٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو کسی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول **شکاریات سیکشن** میں پڑھا جا سکتا ہے۔

معصوم انتقام

غیاث چچا کے اس فیصلے سے کہ وہ وجو آپی کو مزید نہیں پڑھانا چاہتے، خاندان بھر میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ کہاں وہ دن تھے کہ غیاث چچا خود زمانے بھر کی لائبریریوں سے وجو آپی کی پسند کی کتابیں چن چن کر لاتے نہ تھکتے تھے اور کہاں یہ دن کہ خود انہوں نے وجو آپی پر تعلیم کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وجو آپی کی خالائیں، چچا، ماموں، پھپھی اور پھپھا سبھی تو اچنبھے میں تھے کہ آخر ایسا کیا ماجرا ہو گیا ہے کہ غیاث چچا نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا؟ وہ تو اپنی وجیہہ کو مقابلے کے امتحان کی تیاری کروانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی وجو بی اپنے خاندان کی پہلی سی ایس پی افسر بنے پھر اچانک یہ کایا پلٹ کیسی.....؟

سکینہ خالہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا اور پھر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ غصے میں یا پھر انتہائی سنجیدہ ہوتے تو وجو آپی کو وجو بی کی بجائے ان کے پورے نام "وجیہہ" سے پکارتے تھے۔ اس شام بھی انہوں نے صحن میں بیٹھے بیٹھے وجو آپی کو اسی انداز میں آواز دی۔

"وجیہہ..... میری بات سنتی جاؤ۔"

وجو آپی جو نہ جانے کب سے اندر اپنے کمرے میں بیٹھیں، رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کر چکی تھیں، جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئیں۔ غیاث چچا نے غور سے ان کی سوجی ہوئی آنکھوں اور بھیگی پلکوں کی جانب دیکھا اور یوں بولے جیسے کوئی گہرے کنویں سے دور سے بول رہا ہو۔

"کیا تمہیں میرے فیصلے سے کوئی اختلاف ہے.....؟"

"نہیں ابا..... آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے میری ہی بھلائی کی خاطر کیا ہو گا....."

غیاث ابا کے چہرے پر چھایا تکدر کسی حد تک کم ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں تمہیں پڑھنے کا کس قدر جنون ہے۔ تم چاہو تو امتحانات کا وقت آنے پر پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے بی اے کے پرچے دے سکتی ہو لیکن اب ان حالات میں میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تم روزانہ کالج کے لیے نکلا کرو۔ فضلو بابا بھی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور میں تمہیں خود روزانہ کالج چھوڑنے اور لینے کے لیے آ بھی جاؤں تب بھی سارا دن میرا دھیان تمہاری جانب ہی لگا رہے گا اور پھر دیر سویر تو زندگی کے ساتھ ہی لگی ہے اور اس الجھن میں نہ تم اپنی پڑھائی پر دھیان دے پاؤ گی اور نہ ہی میں ٹھیک طرح سے اپنا کوئی کام کر پاؤں گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تمہاری ریگولر پڑھائی ختم کر دی جائے۔ تم گھر میں ہی بیٹھ کر بی اے کر لو پھر بعد میں آگے کی سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" وجو آپی نے پھر وہی جملہ دہرایا کہ انہیں غیاث

چچا کی ہر بات ہر حکم دل و جان سے منظور ہے۔ غیاث چچا نے اٹھ کر وجو آپی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سکینہ خالہ جو دور برآمدے میں بیٹھیں یہ سارا ماجرا چپ چاپ دیکھ رہی تھیں انہوں نے جب باپ بیٹی کو یوں ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپاتے دیکھا تو خود بھی اپنے پلو کی اوٹ میں رو پڑیں لیکن کاش کوئی ان باپ بیٹی اور ماں کو بتا پاتا کہ آنسوؤں سے کبھی مقدر کی کالک نہیں دھل پاتی اور مقدر کے گہرے کالے عفریت کا سایہ اب دھیرے دھیرے اس گھرانے کے حصے کی دھوپ کو چاٹنے لگ پڑا تھا۔

اگلے دن راجہ صبح سویرے پہرے پہ ہی موجود تھا جب کرموتانگے والے نے صبح کالج کے وقت حسب معمول اپنا بھونپو بجایا، وہ اسی وقت چونک پڑا تھا جب اس نے روزانہ کی طرح فضلو بابا کو وجو آپی کا بیگ لیے باہر نکلتے نہیں دیکھا اور ان کی جگہ خود غیاث چچا گھر سے باہر نکل آئے۔ راجہ کا ماتھا ٹھنکا اور وہ جلدی سے گھوڑے کے گلے میں بندھے گھنگھرو دیکھنے کے لیے تانگے کے قریب جا پہنچا۔ غیاث چچا کرمو کو بتا رہے تھے کہ آج سے وجو بی کالج نہیں جائیں گی لہٰذا کل سے اسے تانگہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ آنے والی پہلی پر آ کر اپنا حساب کتاب کر جائے۔ کرمو فوراً بوکھلا گیا اور اس نے غیاث چچا سے کہا کہ پیسوں کی اسے کوئی پرواہ نہیں پر خدانخواستہ وجو بی کی طبیعت تو خراب نہیں۔ سب ''خیری صلا'' تو ہے نا۔ غیاث چچا نے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ بس آج کل کالج میں پڑھائی برائے نام ہی ہوتی ہے اس لیے وجو آپی نے گھر پر ہی بیٹھ کر اپنی مزید تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کرمو تانگے والے کو غیاث چچا کی بات سے اطمینان ہوا یا نہیں، راجہ یہ تو نہیں جان پایا لیکن وہ اپنے مخصوص دیہاتی لہجے میں وجو آپی کو ڈھیروں دعائیں دیتا ہوا وہاں سے واپس لوٹ گیا لیکن جاتے جاتے غیاث چچا سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ جب کبھی انہیں کرم دین کی ضرورت پڑی وہ اسے ضرور یاد کریں گے۔ اس کی اداسی بھی اپنی جگہ بجا تھی کیونکہ وجو آپی جب وجو بی بھی نہیں بنی تھیں اور ننھی وجو تھیں تب سے کرمو تانگے والا ہی انہیں اپنے تانگے میں بٹھا کر نرسری سے لے کر اب تک اسکول اور کالج لاتا لے جاتا رہا تھا اور وجو آپی بالکل اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پیاری تھیں۔ تانگے والا تو چلا گیا اور غیاث چچا بھی واپس اپنے گھر جا چکے تھے لیکن راجہ کے ذہن میں ان گنت سوال کلبلانے لگے تھے۔ آخر اچانک ایسی کیا بات ہو گئی کہ وجو آپی نے کالج جانا ترک کر دیا تھا۔ اسے غیاث چچا کی اس بات پر بھی بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ خود وجو آپی نے اپنی تعلیم ترک کر کے گھر پر بیٹھ جانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ بات ضرور کچھ اور ہی تھی..... لیکن کیا؟ اسی بات کا پتہ اب راجہ کو لگانا تھا۔ شام کو جب باقی سارے دوست بھی جمع ہوئے تو مسلسل ایک گھنٹے کی بحث کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ ہو نہ ہو یہ شکورن بوا کی لگائی بجھائی اور کڑوی زبان ہی کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے غیاث چچا نے آخر تنگ آ کر وجو آپی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کروا دیا۔ بالے نے اسی وقت غصے کے مارے شکورن بوا سے ''انتقام'' لینے کا اعلان کر دیا تھا اور اب سارے سر جوڑے بیٹھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ آخر شکورن بوا کو سبق کیسے سکھایا جائے۔ مختلف قسم کی تجاویز سامنے آتی گئیں لیکن پھر وہ خود ہی انہیں رد بھی کرتے گئے مثلاً ننھو نے کہا کہ ان کی ساری مرغیوں کا صفایا کر دینا چاہیے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اتنی بہت سی مرغیوں کے لشکر کو مکمل ہضم کرنے تک چھپا کر کہاں رکھیں گے؟ پپو نے مشورہ دیا کہ ان کے دودھ کی پتیلی میں بھرے دودھ کے اندر مردہ چھپکلی ڈال دی جائے لیکن اتنی بڑی خطا کے لیے اتنی چھوٹی سزا؟ نہیں نہیں..... پھر کیا کریں.....؟ بالے نے تجویز دی کہ محلے کے برگد کے پیڑ پر غلیل لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے ان کے گھر تمام شیشے توڑ ڈالتے ہیں لیکن اس میں بھی رنگے ہاتھ پکڑے جانے کا شدید خدشہ تھا کیونکہ راجہ پہلے بھی کئی مرتبہ اسی برگد کے پیڑ

سے نشانہ بازی کرتے ہوئے دھرا جا چکا تھا۔

یہاں راجہ گینگ بیٹھا یہ منصوبے بنا رہا تھا اور وہاں سامنے بڑے میدان میں ان سے چھوٹے بچوں کی ''نئی نسل'' آنے والی شب برات کے استقبال کے لیے ابھی پٹاخے بجانے اور رسی کی سُوتر والے ''بم'' پھوڑنے میں مشغول تھی۔ سوتر بم ایک ایسی پتلی رسی سے جڑا ہوتا تھا جسے عام فہم میں سُتلی یا سُوتر کہا جاتا تھا لمبی سُوتر کے آخری سرے پر ایک بڑا سا گیند نما گول پٹاخہ جڑا ہوتا تھا جس میں بچوں کے پٹاخوں والا مصالحہ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھی خاصی گونج دار ہوتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ لمبی سوتر والے حصے کو کوئی بچہ آگ لگا کر بھاگ جاتا اور باقی بچے دور کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے۔ سوتر کے آخری حصے پر لگی آگ پلک جھپکتے میں مصالحے والے حصے تک پہنچ جاتی اور بم ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹ جاتا۔ ایسے ہی منصوبے بناتے بناتے اچانک بے خیالی میں راجہ کی نظر سامنے میدان میں بچوں کے اس پسندیدہ شغل پر پڑی اور اچانک اس کے دماغ میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہوئے۔ اس نے فوراً ننھو کو اپنی جیب میں پڑا آٹھ آنے کا سکہ دیا اور اس سے کہا کہ وہ بھاگ کر محلے میں ہی نکڑ پر موجود مجید پرچون والے سے ایسے چند بم اٹھا لائے۔ کچھ ہی دیر میں ننھو ایسے تین سوتر بم اٹھائے بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔ راجہ نے جلدی جلدی تینوں بموں کی سوتر کو کاٹ کر ایک لمبی سے رسی بنالی اور اسے تیسرے بم کی سوتر سے جوڑ دیا۔ یوں ایک لمبی سی سوتر والا بم بن گیا جس کا پھٹنے والا حصہ، اس لمبی سوتر سے بہت فاصلے پر تھا اتنا فاصلہ کہ سوتر کو سلگانے والا بچہ تین چار گز دور بیٹھ کر بھی یہ فریضہ ''سرانجام'' دے سکتا تھا۔ شکورن بوا روزانہ عصر کے وقت روزمرہ کی اشیائے ضرورت لینے کے لیے بازار اور سبزی منڈی جایا کرتی تھیں اور مغرب سے کچھ پہلے یا پھر مغرب کے وقت واپس لوٹا کرتی تھیں۔ یہ ان کی واپسی کا وقت تھا۔ راجہ نے سب دوستوں کو منصوبہ سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور سبھی اپنے اپنے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں شکورن بوا کا سائیکل رکشہ محلے کے پھاٹک پر آ کر رکا اور اس میں سے حسب معمول لدی پھندی سی شکورن بوا اپنے خیمہ نما شٹل کاک برقعے سمیت برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں سبزی کی الگ اور دوسرے سامان کی الگ ٹوکریاں موجود تھیں۔ عام حالات میں محلے کے سارے بچے انہیں محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً کہیں رفو چکر ہو جاتے تھے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ اپنا سارا سامان بچوں کے حوالے کر دیتیں اور انہیں قلیوں کی طرح اپنے سامان کی ڈھلائی پر لگا کر خود مزے سے ستاتی ہوئی گھر تک جایا کرتیں اور جو بچہ ذرا سی آنا کانی کرتا تو اسے وہیں کھڑے کھڑے خوب صلواتیں سنایا کرتی تھیں۔ لہٰذا بچے اپنی عافیت اسی میں جانتے کہ ان کے محلے میں گھستے ہی سبھی جس کا جس طرف منہ ہوتا، بھاگ اٹھتے لیکن اس دن راجہ اور اس کے دوست دکھاوے کے لیے اپنے کھیل میں مشغول رہے۔ شکورن بوا نے بھی موقع غنیمت جانا اور جلدی سے راجہ اور بالے کو آواز لگائی کہ ذرا اس کا ہاتھ تو بٹاتے جائیں۔ منصوبے کے مطابق بالے اور راجہ سے پہلے ہی پپو اور ننھو بھاگتے ہوئے گئے اور شکورن بوا کے ہاتھ سے ٹوکریاں لے کر اس کے آگے آگے چل پڑے۔ بڑے میدان کے وسط میں آتے ہی ننھو یوں لڑکھڑایا جیسے اسے ٹھوکر لگی ہو اور دوسرے ہی لمحے سبزی کی ٹوکری میں سے آلو ٹماٹر زمین پر لڑھکتے نظر آئے۔ شکورن بوا وہیں سے چلائیں۔

''اے ہے کم بخت..... یہ کیا کر دیا.....؟ دیکھ کر نہیں چلا جاتا تجھ سے۔''

پپو اور ننھو جلدی سے ٹوکریاں زمین پر رکھ کر سامان چننے میں مصروف ہو گئے۔ شکورن بوا خود بھی اپنا برقعہ پھیلا کر وہیں بیٹھ گئیں اور سبزی اٹھا

اٹھا کر واپس ٹوکری میں ڈالنے لگ گئیں۔اب منصوبے کے آخری حصے کو انجام دینے کا وقت آ گیا تھا۔ بالے نے نہایت آہستگی سے سوتر بم کا گیند نما حصہ ان کے شٹل کاک خیمے میں رکھ دیا۔ راجہ جو چند گز دور بیٹھا تھا اس نے آہستگی سے رسی کی سوتر کو تیلی دکھا دی۔ شکورن بوا اپنے ہی دھیان میں غرق پپو اور ننھو کو کوستی ہوئی اپنی سبزی جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ دفعتہً راجہ نے ایک، دو، تین کہا اور پپو، ننھو، گڈو، راجہ اور بالے سرپٹ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شکورن بوا نے سر اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھا لیکن ان کی یہ حیرت صرف چند لمحوں کی ہی ثابت ہوئی۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور یوں لگا جیسے شکورن بوا کے شٹل کاک برقعے میں کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ شکورن بوا زور سے چلا کر اچھلیں اور دوڑ پڑیں۔ ان کے برقعے میں آگ لگ گئی تھی اور وہ بڑے میدان میں یوں گول چکر میں دوڑ رہیں تھیں جیسے کوئی آگ کا گولہ سرکس میں گول دائرے میں لڑھکتا پھرتا ہے۔ وہ دوڑے جاتیں اور چلا چلا کر لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارے جاتیں۔ کچھ ہی دیر میں سامنے والے مکان سے غفور چچا جلدی سے پانی کی بھری بالٹی لیے دوڑتے نظر آئے اور انہوں نے پوری بالٹی شکورن بوا پر بلکہ ان کے شٹل کاک برقعے پر انڈیل دی۔ شکورن بوا کے برقعے کی آگ تو بجھ گئی لیکن ان کی زبان نے جو شعلے اگلنا شروع کیے تو ان کی تپش کئی ہفتوں تک ٹھنڈی نہیں ہو پائی۔ ان کا سفید شٹل کاک برقعہ جگہ جگہ سے جل کر چھلنی ہو چکا تھا اور اس کا رنگ بھی دھوئیں کی وجہ سے سفید سے گہرا سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ وہ اسی حالت میں بکتی جھکتی سب سے پہلے راجہ اور پھر بالے، پپو، ننھو اور گڈو سبھی کے گھروں میں فریاد لے کر گئیں اور سب ہی گھروں سے انہوں نے نئے برقعے کی رقم وصول کی۔ راجہ کے گھر والوں سمیت باقی سبھی بچوں کے گھر والے رات گئے تک اپنے ''ملزمان'' کو تلاش کرتے رہے اور رات کو جب آخر کار وہ سڑک پار پان والے کے کیبن کے عقب میں بچھے بنچوں پر چھپ کر بیٹھے مل گئے تو ان سب کو گھر لا کر فرداً فرداً سبھی کے والدین نے اپنے اپنے گھروں میں ان کے جسموں کی وہ سینکائی کی کہ کئی دن تک وہ سبھی اپنے انگ سہلاتے رہے لیکن اس کے باوجود وہ سب خوش تھے کیونکہ انہوں نے شکورن بوا سے اپنی دھوآپی کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد تین چار دن تک شکورن بوا گھر سے نکلتے کسی کو دکھائی نہ دیں۔ پانچویں دن جب وہ گھر سے برآمد ہوئیں تو ان کے تن پر وہی پرانا، مگر دھلا ہوا شٹل کاک برقعہ موجود تھا البتہ اب اس میں بڑے بڑے اور بالشت بھر سفید اور مٹیالے رنگ کے پیوند جڑے نظر آ رہے تھے۔ شاید شکورن بوا نے اس ''عظیم سانحے'' کی یاد کو اپنے دل میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اس برقعے کو خود سے کبھی جدا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

قصّہ نصف صدی کا

لاکھوں دلوں کی دھڑکن **محی الدین نواب** کے جادُو قلم سے ایک خوبصورت ناول..... تقسیم ہند (قیامِ پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی ایک پر اثر تحریر..... آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان..... جہاں حالات اور مسائل ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

پہلی جیت

میں نے جب اس ''سانحہ برقعہ'' کی تمام واردات راجہ کے اگلے خط میں پڑھی تو ہنس ہنس کر میرا برا حال ہو گیا۔ میں نے شام کو ھیلن اور شیرل کو بھی اپنے دوستوں کی اس انتظامی واردات کے بارے میں بتایا اور وہ دونوں بھی بہت محظوظ ہوئیں۔ شیرل تو اس قدر ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس دن میں نے انہیں ڈوآپی کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بتایا۔ ھیلن نے بہت غور سے ڈوآپی کے بارے میں میری ساری باتیں سنیں اور جب میں نے شیرل کو یہ بتایا کہ مجھے اصل میں کیڈٹ کالج جانے پر راضی کرنے والی ڈوآپی ہی تھیں اور میں نے یہ دن یہاں اسی لیے گزارے ہیں کیونکہ میں واپس جانے سے پہلے ساری انگریزی سیکھ لینا چاہتا ہوں تا کہ مستقبل میں میری انگریزی ان کے کام آ سکے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ شیرل اور ھیلن دونوں نے اس شام مجھے مزید محنت کرنے کی نصیحت کی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جانب سے ذرا سی بھی کسر نہیں رکھ چھوڑیں گی اور واقعی ان دونوں نے میری تربیت اور تعلیم میں کبھی کوئی رتی برابر کسر بھی نہیں چھوڑی اور چند ہفتوں کے بعد ہی ساری کلاس اس وقت دنگ رہ گئی جب انگلش ریڈنگ کی کلاس کے دوران جب انوار صاحب نے Tense (جملے) پڑھاتے ہوئے بچوں سے ایک سوال پوچھا تو سب ہی چپ بیٹھے رہے۔ تب میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھا دیا۔ اتنے ہفتوں میں نہ تو مجھ سے کلاس میں کسی نہ کچھ پوچھا تھا نہ ہی میں نے کبھی خود سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں پرنسپل صاحب کی ہدایت کے مطابق کلاس میں آ تو جاتا تھا لیکن چپ چاپ بیٹھ کر اپنے آس پاس ہوتے سوال جواب سنتا رہتا یا پھر فیصل اور اسفر کے ساتھ مل کر خالی پیریڈز میں کاغذ کے جہاز بنا کر اڑاتا رہتا تھا اس لیے پوری کلاس کے علاوہ خود انوار صاحب کو بھی قطعی مجھ سے یہ امید نہ تھی کہ میں اس مشکل سوال کا جواب دے پاؤں گا لیکن ھیلن نے مجھے پچھلے ڈیڑھ مہینے میں تمام Tenses اتنی اچھی طرح ازبر کروا دیئے تھے کہ میں نے جھٹ سے ایک لمحے میں انوار صاحب کے سوال کا جواب دے دیا۔ ساری کلاس پہلے تو ہکا بکا ہی رہ گئی اور پھر سب اٹھ اٹھ کر مجھے یوں مبارکباد دینے لگے جیسے میں کوئی جج کر کے آیا ہوں۔ انوار صاحب نے سب کو ڈانٹ کر اپنی جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے مجھ سے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام ٹینس یکے بعد دیگرے سنے۔ میں نے فر فر انہیں سارے سنا دیئے۔ ان کا حیرت کے مارے اتنا برا حال تھا کہ پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بھی انہیں نہیں سنائی دی۔ اس پیریڈ کے بعد آدھی چھٹی یعنی مڈ بریک Mid Break تھی اور تمام کیڈٹس بریک فوڈ کھانے کے لیے کینٹین کی طرف دوڑ جاتے تھے لیکن انوار صاحب مجھے لے کر پرنسپل صاحب کے دفتر کی جانب بڑھ گئے اور حاضری کا پروانہ ملتے ہی انہوں نے پرنسپل کو انتہائی حیرت کے ساتھ میری بہتری کے بارے میں بتایا۔ پرنسپل صاحب نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے ان کے اس ''انکشاف'' کو سنا کہ میں نے آج کلاس میں اس سوال کا جواب خود اپنی مرضی سے ہاتھ اٹھا کر دیا ہے جس سوال پر ساری کلاس خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔ پرنسپل صاحب نے مسکرا کر انوار

صاحب کو شاباش دی کہ یہ سب ان کی ہی ''محنت'' کا نتیجہ ہے۔ انوار صاحب حیرت اور فخر کے ملے جلے تاثرات لیے دفتر سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد کمانڈر صاحب نے میری پیٹھ تھپکی اور ہنس کر بولے۔

''ویری ویل کیڈٹ عباد..... تم واقعی اپنی دُھن کے پکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آنے والے مڈٹرم امتحان جو اگلے مہینے شروع ہو رہے ہیں اس میں تم سب کو دکھا دو کہ اردو میڈیم اسکول سے تعلق رکھنا کوئی شرم کی بات نہیں ہے اور اردو میڈیم اسکول کے بچے بھی اتنے ہی ہونہار اور ذہین ہوتے ہیں جتنے کسی بھی بڑے انگلش میڈیم اسکول سے تعلق رکھنے والے بچے ہو سکتے ہیں۔''

میرا دل ان کی بات سن کر کچھ بُجھ سا گیا کیونکہ میرا تو خیال تھا کہ آج وہ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے کیونکہ میں نے ان کی اور ابا کی شرط پوری کر دی تھی لیکن وہ تو مزید پورا ایک مہینہ مجھے یہاں رکھنے پر مصر نظر آتے تھے۔ کمانڈر صاحب نے میرے اندر چلنے والی جنگ شاید میرے چہرے سے پڑھ لی تھی اسی لیے انہوں نے مجھے آرام سے بیٹھ جانے کو کہا اور پھر مجھے سمجھایا کہ یہ بھی اصل میں میرے ابا کی ہی خواہش تھی کہ میں کیڈٹ کالج سے ایک امتحان پاس کر کے اس کا سرٹیفکیٹ اپنے ساتھ لے کر آؤں کیونکہ میرے شہر میں تو اب سالانہ امتحانات سر پر تھے اور جب تک میں یہاں سے واپس جاتا تب تک میرے ہم جماعت آٹھویں کلاس میں جا چکے ہوتے، لہٰذا ضروری تھا کہ میرے پاس یہاں کی ''پاس شدہ'' والی سند موجود ہوتا کہ وہاں مجھے داخلے میں آسانی رہے۔ مجھے پرنسپل صاحب کی بات سمجھ میں آ گئی اور میں نے بادل نخواستہ مزید دو مہینے اس ''قید خانے'' میں رہنا منظور کر لیا تا کہ امتحان کے بعد اپنا نتیجہ لے کر ہی گھر جاؤں۔

اس وقت میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی اور نہ ہی میں پرنسپل صاحب سے یہ پوچھ سکا کہ ان کی میرے ابا سے اس دن پہلی مرتبہ میرے سامنے اور بعد میں میری غیر موجودگی میں آخر کس فون نمبر پر بات ہوتی ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں تو کبھی ٹیلی فون تھا ہی نہیں..... نہ ہی ابا کے دفتر میں ان کی میز یا اس کے آس پاس کوئی ٹیلی فون میں نے پڑا دیکھا تھا.....؟ پھر آخر پرنسپل صاحب کو پہلی ہی گھنٹی پر ابا کیسے فون کی دوسری جانب جواب دینے کے لیے حاضر مل جاتے تھے؟

اس وقت میرے چھوٹے سے ذہن کے لیے یہی بات کافی تھی کہ پرنسپل صاحب لگاتار میرے ابا سے رابطے میں ہیں اور میری رفتار سے میرے ابا مطمئن ہیں۔ ہاں البتہ مجھ کو اس بات پر حیرت ضرور ہوتی تھی کہ ابا نے کبھی اپنے خطوں میں بھی پرنسپل صاحب سے اپنے رابطے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی توجیہہ اپنے دل میں کچھ یوں سوچ رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے ابا نے گھر میں امی اور بھیا وغیرہ کو اس بات سے آگاہ نہ کیا ہو اور وہ نہ چاہتے ہوں کہ ان کے خط میں لکھی ہوئی ایسی کوئی بات کوئی دوسرا پڑھ لے یا بات خاندان میں پھیل جائے؟ اسی لیے انہوں نے کبھی اپنے اور کمانڈر صاحب کے رابطوں کا ذکر بھی اپنے کسی خط میں نہیں کیا تھا۔

دن گزرتے گئے اور ہم سب ہی جونیئر کیڈٹ پیراکی اور گھڑ سواری میں ماہر ہوتے گئے۔ ہماری پریڈ بھی اب اس قابل ہو گئی تھی کہ ہم باقی پورے ہاؤس کے سینئر کیڈٹس کے ساتھ مل کر پریڈ کرنے لگے تھے۔ پہلا مڈٹرم امتحان بھی گزر گیا اور میں نے کسی نہ کسی طور اسے پاس بھی کر لیا تھا لیکن بقول پرنسپل صاحب میرا رزلٹ اس قدر ''قابل فخر'' نہ تھا کہ جس کے بل پر میں دوبارہ اپنے اسکول جا کر ''باعزت'' داخلہ لے سکتا۔ واقعی نمبر تو اتنے

خاص نہ تھے لیکن میں کبھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر میں اول یا دوئم بھی آ جاتا تو کمانڈر صاحب پھر بھی کسی نہ کسی بہانے مجھے روک ہی لیتے۔ جیسا کہ انہوں نے اب "میرے ابا کے ساتھ مل کر" یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اب ساتویں جماعت کے مزید تین مہینے ہی تو رہ گئے ہیں تو پھر کیوں نہ میں سالانہ امتحانات دے کر ایک ہی مرتبہ گرمیوں کی لمبی چھٹیوں میں "ہمیشہ" کے لیے گھر واپس چلا جاؤں۔

اسی اثناء میں ایک دن فیصل کی سزا کے طور پر "ایکسٹرا ڈرل" آ گئی۔ پہلے تو میں اور اسفر ڈر ہی گئے کہ شاید ہماری "پرچی" پکڑی گئی ہے کیونکہ ابھی پچھلے ہی ہفتے فیصل دو دن کے لیے آرام پر تھا لیکن پھر پتہ چلا کہ یہ کوئی اور ہی بات ہے۔ اس روز ہم سب کو طالب پی او نے پریڈ کے دوران مسلسل دو گھنٹے رائفل اٹھا کر دوڑایا تھا لہٰذا دوپہر کو ہم سب ہی کھانے کے بعد اپنے اپنے بستروں پر یوں گرے کہ پھر ہمیں اٹھانے کے لیے پریفیکٹ کو باقاعدہ دھمکیاں دینی پڑیں تھیں۔ ہم سب تو اٹھ کر اور کھیل کا لباس پہن کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل ہی گئے لیکن نہ جانے فیصل نیند میں تھا یا پھر اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی کہ وہ دوبارہ آ کر اپنے بستر کے نیچے لیٹ کر لمبی تان کر سو گیا۔ وہاں کھیل کے میدان میں جب گنتی ہوئی تو فیصل غائب تھا لہٰذا اس کی غیر حاضری لگ گئی اور اگلے دن "ڈیلی آرڈر" Daily Order کی رپورٹ میں فیصل کا نام ایکسٹرا ڈرل کی سزا کے خانے میں جگمگا رہا تھا۔ یہ ڈرل سزا کے طور پر دوپہر کو ان کیڈٹس کو دی جاتی تھی جو کسی روٹین سے غیر حاضر رہتے یا پھر کوئی غلطی کرتے تھے۔ ہماری بیرک میں فیصل پہلا کیڈٹ تھا جسے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا ورنہ عام طور پر گیارہویں اور بارہویں جماعت کے کیڈٹس کو یہ سزا ملتی تھی۔ ہم سب نے پورے اعزاز کے ساتھ دوپہر تین بجے فیصل کو رخصت کیا اور ٹھیک شام 5 پانچ بجے بخشو پی او کے ہاتھوں سے اسے "وصول" کیا کیونکہ فیصل کی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر اپنے بستر تک جا سکتا، لہٰذا اسے وصول ہی کیا جا سکتا تھا۔ فیصل نے حواس درست ہونے کے بعد بتایا کہ ان ظالموں نے تپتی دوپہر میں اسے ہزار بار ڈنڈ لگوائے، فرنٹ رول دیئے۔ رائفل اٹھا کر ایک پاؤں پر کھڑا رکھا اور گورکھا پوزیشن جس میں پاؤں دیوار پر اور جسم دو بازوؤں کے سہارے زمین پر ٹکا رہتا ہے پورے آدھے گھنٹے تک ٹانگے رکھا۔ ہم فیصل کی زبانی یہ سب سن کر دل ہی دل میں لرزتے رہے لیکن پھر یکے بعد دیگرے پہلے اسفر اور پھر مجھے بھی یہ شرف حاصل ہو ہی گیا۔ ہم دونوں کے جوتے اور بیلٹ اسمبلی کے وقت ٹھیک طرح سے چمکتے ہوئے نہیں پائے گئے تھے لہٰذا ہمیں بھی اس "کالا پانی" کی یاترا کرنی ہی پڑی۔ ایکسٹرا ڈرل کے لیے اکیڈمی میں ہی موجود دوسری جنگ عظیم میں استعمال شدہ ایک رن وے کو بطور گراؤنڈ استعمال کیا جاتا تھا اور وہیں پر کیڈٹس کو سزا دینے کے تمام لوازمات موجود تھے۔

عجیب بے ہودہ اور ہولناک قسم کی جگہ تھی۔ اوپر سے بخشو (سی۔پی۔او) کے ہولناک نعرے اور کاشن..... آدھے گھنٹے میں ہی میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور ٹانگیں لرزنے لگ گئی تھیں لیکن بخشو نے پورے دو گھنٹے مجھ سمیت باقی کیڈٹس کے جسم کا سارا تیل نکل جانے کے بعد ہی ہمیں وہاں سے جانے دیا۔ واقعی پہلی ایکسٹرا ڈرل کی سزا کے بعد انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ "اسٹریچر" کہلاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب بات اور بھی ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہمارے دلوں سے اس سزا کا خوف بھی جاتا رہا۔ شاید انسان کو جس چیز سے جتنا ڈرایا جائے اس چیز کا سامنا ہو جانے کے بعد اس کا خوف اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اکیڈمی کی انتظامیہ ہمیں سزا دینے کے بجائے صرف سزا کا ڈر ہمارے دل میں بنائے رکھتی تو شاید ہم کبھی اپنی حدیں پار نہ کرتے۔ جونیئر کیڈٹس میں سے جو بھی ایکسٹرا ڈرل کی سزا کا

تمغہ سینے پر سجائے گرتا پڑتا ڈارمیٹری میں داخل ہوتا، وہ دیگر کیڈٹس کی نظر میں ہیرو بن جاتا۔ ہیرو کے درجے پر قائم رہنے کے لیے اس کیڈٹ کو مزید ایکسٹرا ڈرل جھیلنی پڑتی اور یوں رفتہ رفتہ اس کی کھال سخت اور اتنی موٹی ہوتی جاتی کہ اس پر کسی سزا، کسی تکلیف کا کوئی اثر بھی نہ ہو پاتا۔ میری کھال بھی موٹی ہوتی جا رہی تھی اور سزا کا خوف میرے دل سے بھی نکلتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں ہمارے ٹرمینل ایگزام بھی گزر گئے اور ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔ جب میں ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا تو میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ مجھے ڈو آپی کو دیکھے اور ان سے ملے ہوئے پورے آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔

سونا گھاٹ کا پجاری

سونا گھاٹ کا پجاری..... بے پنار پراسرار قوتوں اور کالی طاقتوں کا مالک جو اپنی موت کے بعد بھی زندہ تھا۔ افضل بیگ..... ایک مسلمان فارسٹ آفیسر جو سونا گھاٹ کے قہر کا نشانہ بنا..... پھر وہ انتقام لینے کے جوش میں اندھا ہو گیا اور اپنا مذہب ترک کر کے جادوٹونے کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ایک ایسا ناول جو پراسرار کہانیوں کے شائقین کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ **سونا گھاٹ کا پجاری** اپنے انجام تک کیسے پہنچا۔ افضل بیگ گناہ اور غلاظت کی دُنیا سے کیسے لوٹا؟ ہندو دھرم، دیوی دیوتاؤں، کالے جادو، بیروں کے خوفناک تصادم سے مزین یہ داستان آپ **کتاب گھر** کے **پراسرار خوفناک ناول** سیکشن میں پڑھ سکتے ہیں۔

اقابلا

اقابلا..... تاریک اور پراسرار برِ اعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد ایک غیر مہذب قبیلہ..... جو اقابلا نامی دیوی کے پجاری تھے۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد مہذب دُنیا کے چند افراد اس قبیلے کے چنگل میں جا پھنسے۔ شوالا..... جنگلی قبیلے کا ایک سردار جسے دیوی اقابلا نے تمام حشرات الاراض کا مختار بنا دیا تھا۔ کالاری..... جنگلی قبیلے کا دوسرا سردار جس کی تمام درندوں پر حکمرانی تھی۔ کیا مہذب انسانوں کی اس جنگلی خونخوار قبیلے سے واپسی ممکن ہو سکی؟ انور صدیقی کے جادوں بیاں قلم کی یہ طویل اور دلچسپ داستان آپ جلد ہی **کتاب گھر** کے **ایکشن ایڈونچر ناول** سیکشن میں پڑھ سکیں گے۔

پہلی محبت کی جونک

مجھے کالونی میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سارے پاگل ہی تو ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے بالے کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ محلے کے نکڑ پر کھڑا شکاپوری قلفی والے کے ٹھیلے سے قلفیاں لے کر کھا رہا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ ہمیشہ جلدی جلدی قلفیاں نگلتا رہتا اور ایک وقت آتا کہ قلفی والے کو یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ اس نے بارہ قلفیاں کھائی تھیں یا پندرہ؟ پھر ایک لمبی بحث ہوتی جس میں آخر کار قلفی والے کو بالے کی تصدیق کردہ گنتی پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ بالا پہلے بھاگ کر میری طرف آیا اور اس نے مجھے ٹٹول ٹٹول کر میرے ہونے کا یقین کیا اور پھر بھاگ کر اس نے باقی سب کو بھی اطلاع کر دی اور میرے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی رابہ، گڈو، نھو، پپو اور منشی نے مجھے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے ان سب کو یقین دلایا کہ امی اور باقی گھر والوں سے مل کر میں خود ہی برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاؤں گا۔

میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا تو پہلی نظر صحن میں بیٹھی امی اور عمارہ پر پڑی جو بڑی سی تھالوں والی پرات میں رکھے چاول صاف کر رہی تھیں۔ پاس ہی بہت سا گڑ بھی پڑا ہوا تھا جسے ابھی پیسنا باقی تھا یعنی گڑ والے چاول پکانے کی تیاری تھی لیکن امی کو کیسے پتہ چلا کہ میں آ رہا ہوں۔ گڑ والے چاول تو ہمیشہ امی میری فرمائش پر پکاتی تھیں اور میرے آنے کی تو یہاں کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے دھیرے سے اپنا بیگ دروازے پر چھوڑا اور بھاگ کر دبے پاؤں امی سے ان کی بے خبری میں لپٹ گیا جیسے میں پہلے اپنے اسکول سے آ کر اور اپنا بستہ دروازے پر ہی پھینک کر ان سے چمٹ جاتا تھا۔ ان کے منہ سے بھی اتفاقاً وہی جملہ نکلا جو وہ ایسے موقعوں پر مجھے ڈانٹنے کے لیے کہتی تھیں۔

''آدی اب ہٹ بھی جا..... ماں کی ہڈیاں توڑے گا کیا.....؟ پورا گدھا ہو گیا ہے تو بھی.....''

پھر وہ اچانک چونکیں کیونکہ انہوں نے میری گرفت کو محسوس کر لیا تھا۔ عمارہ بھی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ امی کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ میں ہی ہوں۔ وہ میرے چہرے اور باقی جسم کو چھو کر اپنا شک دور کرتی رہیں اور ان کی آنکھیں نم ہوتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے خود ہی اپنے آپ سے دور جانے کا کہتی ہیں اور پھر خود ہی چھپ چھپ کر روتی رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ابا اور بڑے بھیا بھی آ گئے اور سبھی مجھے گھر میں یوں اچانک پا کر بے حد خوش ہوئے۔ میں نے ابا کو بتایا کہ دور دراز کے کیڈٹس کو انتظامیہ خصوصی طور پر ٹرین کے گارڈ کے حوالے کر دیتی ہے تاکہ وہ لمبے سفر کے دوران ان کا خیال رکھ سکیں اور حفاظت سے انہیں گھر پہنچا دیں۔ میں بھی اسی طریقے سے یہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ ابا نے میرے رزلٹ کا پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے نتیجہ گھر بھجوا دیا جائے گا۔ صرف انہی کیڈٹس کو واپس بلایا جاتا تھا جو سالانہ امتحانات میں کامیابی حاصل کر پاتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ابا کے دل میں ابھی تک میرے فیل ہو جانے کا خوف موجود ہے اسی لیے وہ پرنسپل صاحب

سے ہوئے اپنے معاہدے کا ذکر میرے یا دیگر گھر والوں کے سامنے نہیں کر رہے تھے۔ بہر حال میں نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ نتیجہ آنے پر سب کچھ خود بخود واضح ہو جانا تھا۔

عمارہ اور بڑے بھیا جو اب میٹرک کا امتحان دے چکے تھے، بہت دیر تک مجھ سے اکیڈمی کی باتیں پوچھتے رہے اور امی مجھے دیکھ دیکھ کر یہ غم کھائے جاتی رہیں کہ میں کس قدر کم زور ہو گیا ہوں۔ انہوں نے فوراً میری گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے ایک ''منصوبہ صحت'' (Health Plan) تشکیل دے دیا اور اسی اثناء میں شام بھی ڈھلنے لگ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میرے دوستوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور باہر گلی سے ان کی سیٹیوں کی آواز چھوٹے چھوٹے وقفوں سے مستقل سنائی دینے لگی۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ امی کو بھی ان سیٹیوں کی حقیقت معلوم ہے کیونکہ کچھ دیر تک وہ میری بے چینی کو نوٹ کرتی رہیں پھر دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

''آدی..... جا..... جا کر مل آ ان لفنگوں سے..... ورنہ یونہی سر کھاتے رہیں گے گلی میں کھڑے کھڑے..... پر جلدی آ جانا..... میں تیرے لیے گڑ والے چاول بنا رہی ہوں.....''

میں فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جانے ان ماؤں کو ہم بچوں کی ہر بات، ہر راز کا بن بولے ہی کیسے پتہ چل جاتا ہے؟

برگد کے پیڑ تک پہنچتے پہنچتے تقریباً سارے محلے کو ہی میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی لہٰذا سب ہی سے فرداً فرداً ملنا پڑا جبکہ راجہ اور میرے باقی دوست بار بار یوں کسی کے راہ میں روک لینے سے چڑ کر برے برے منہ بناتے رہے اور مجھے اشارے کرتے رہے کہ میں جلدی ان سب سے جان چھڑاؤں۔

تنہائی ملتے ہی راجہ نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ میری فوجی وردی اور ڈرائیور والی گاڑی کہاں ہے؟ اور میرے مسلح محافظ کہاں ہیں اور یہ کہ میری ڈیوٹی کہاں لگی ہے.....؟

میں اس کی باتیں سن کر ہنس پڑا اور اسے بتایا کہ ابھی وہ مرحلہ آنے میں کافی سال باقی ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب میں ''بہ خیریت'' اکیڈمی سے بارہویں کر کے پاس آؤٹ ہو جاؤں اور فوج میں بھرتی ہو جاؤں تب جب کہ میرا تو فی الحال واپس جانے کا ہی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہم سب بہت دیر تک صدیوں سے بچھڑے دوستوں کی طرح جانے کون کون سی بھولی بسری باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ مغرب کا وقت سر پر تھا۔ اتنے میں میری نظر محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتی ایک جانی پہچانی سی صورت پر پڑی۔ قریب آنے پر میں حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ ارے..... یہ تو اپنے طاہر بھائی تھے..... انہیں کیا ہو گیا تھا۔ چند مہینوں میں ہی وہ اتنے کم زور اور نڈھال سے کیوں دکھنے لگے تھے؟ انہوں نے مجھے دیکھا تو پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ارے..... آدی آیا ہے..... کیسے ہو میرے چھوٹے فوجی آفیسر؟''

''اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں..... ذوآپی کیسی ہیں.....؟''

میرے منہ سے اچانک ہی ذوآپی کا نام نکل گیا اور پھر بعد میں طاہر بھائی کے چہرے پر چھایا سایہ دیکھ کر میں خود ہی پچھتانے لگا۔ انہوں

نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ سب اچھے ہیں اور وجو آپی ہمیشہ مجھے بہت یاد کرتی ہیں۔ میں پہلی فرصت میں ان سے جا کر مل لوں۔ طاہر بھائی مجھے پیار کر کے آگے بڑھ گئے اور میں نے سوالیہ نظروں سے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے بتایا کہ طاہر بھائی کی شوخی اور مسکراہٹ تو اسی دن ان کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی جس دن انہیں پتہ چلا تھا کہ غیاث چچا نے وجو آپی کی کالج کی پڑھائی بند کروا دی ہے۔ ''لیکن پھر بھی..... انہیں ہو کیا گیا ہے.....؟'' میں نے زور دے کر راجہ سے پوچھا۔

راجہ نے بتایا کہ اس دن وہ اور بالے فضلو بابا کے ساتھ مل کر وجو آپی کے کبوتروں کا ڈربہ رنگ کروا رہے تھے کہ شام چار بجے کے قریب طاہر بھائی یہ خبر سن کر کہ وجو آپی کا کالج ختم کروا دیا گیا ہے، غیاث چچا کے گھر کی جانب دوڑے چلے آئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ راجہ نے ہی قریب ہونے کی وجہ سے کھولا تھا۔ ابھی راجہ طاہر بھائی سے بات کر ہی رہا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے غیاث چچا بھی دروازے پر آ گئے۔ راجہ اندر چلا گیا اور ڈربے کے لیے مزید رنگ گھولنے لگا لیکن دروازے کی ادھ کھلی جھری سے اسے غیاث چچا اور طاہر بھائی کی باتوں کی آواز دھیمی سی سنائی دے رہی تھی۔ طاہر بھائی کو تبدیلی کا پہلا احساس تو اسی وقت ہو گیا تھا جب غیاث چچا نے حسب معمول انہیں گرم جوشی سے اندر مدعو کرنے کے بجائے وہیں گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنے کو ترجیح دی تھی۔ طاہر بھائی نے غیاث چچا سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ یوں اچانک وجو بی کا کالج جانا بند کروا دیا گیا؟

غیاث چچا ہمیشہ سے بہت صاف اور کھلی بات کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کو ایس ایچ او کی زبانی ملنے والے پیغام کی ساری تفصیل بتا دی کہ کس طرح اکو وجو آپی کو طاہر بھائی کے نام کے ساتھ جوڑ کر بدنام کرنے کے لیے سارے شہر میں افسانے جوڑتا پھر رہا ہے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ طاہر ایک بہت شریف اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والا لڑکا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اکو کی پھیلائی ہوئی بے سروپا قسم کی بکواس کا حقیقت سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ وجو آپی کے نام پر کوئی دھبہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی ایک ہی ایک بیٹی تھی جس کے لیے انہوں نے جانے کتنے سپنے دیکھ رکھے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اکو جیسے کسی فضول غنڈے یا کسی بھی اور وجہ سے ان کے سپنے تعبیر پانے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو جائیں اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ فی الحال وجو کو کالج سے اٹھا لیں۔

طاہر بھائی سر جھکائے غیاث چچا کی ساری بات سنتے رہے اور آخر میں صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ ''جیسی غیاث چچا کی منشاء..... کیونکہ یہ سب بھلا برا وہی بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔'' طاہر بھائی واپس پلٹنے لگے تو غیاث چچا نے انہیں آواز دے کر روک لیا۔ طاہر بھائی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ غیاث چچا بھاری قدموں سے طاہر بھائی کے قریب پہنچے اور چند لمحے رک کر بولے۔

''طاہر میاں..... میں نے تمام باتیں اتنی تفصیل سے تمہیں اس لیے بتا دی ہیں کہ تم میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ جاؤ اور اپنے دل پہ کوئی بوجھ لے کر واپس نہ جاؤ۔ تمہارے وجو پر ہی نہیں میرے پورے گھرانے پر بہت سے احسانات ہیں اور وجو اپنے تعلیمی میدان میں اتنی آگے تمہاری مدد کی بدولت ہی پہنچ پائی ہے لیکن میری تم سے اب یہی درخواست ہے کہ وجو کی آئندہ زندگی کی خاطر اس سے دوبارہ کبھی نہ ملنا۔ لوگوں کی زبانیں کوئی

نہیں روک سکتا لیکن تم اپنے قدم تو روک سکتے ہو۔ امید ہے تم ہمیشہ کی طرح اپنے غیاث چچا کی یہ درخواست بھی رد نہیں کرو گے.....''

غیاث چچا تو اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئے لیکن طاہر بھائی کے چہرے سے اڑتے رنگ شاید انہیں نظر نہیں آئے لیکن راجہ دروازے کی جھری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ طاہر بھائی نے جلدی سے اپنے اندر چلنے والے طوفانوں پر پردہ ڈال کر غیاث چچا سے وعدہ کیا کہ وہ جو کی عزت انہیں غیاث چچا کی طرح ہی عزیز ہے اور یہ کہ غیاث چچا اس بات کا اطمینان رکھیں کہ طاہر بھائی کی وجہ سے کبھی وہ جو کی جانب کوئی گندی انگلی اٹھانے کی وجہ تلاش نہیں کر پائے گا۔ طاہر بھائی غیاث چچا سے رخصت ہو کر اس دن دروازے سے ایسے پلٹے کہ پھر اس کے بعد آج تک ان کے قدم غلطی سے بھی اس در کی جانب نہیں اٹھے لیکن راجہ کے بقول غیاث چچا اور طاہر بھائی دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ جو آپی جو اس وقت چھت پر اپنے کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں انہوں نے غیاث چچا اور طاہر بھائی کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ راجہ نے اپنی آنکھوں سے ان کا پلو لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بات کو تو اب تین ماہ سے بھی زیادہ ہونے کو آئے تھے لیکن اس عرصے میں نہ تو کبھی وہ جو آپی گھر سے باہر نکلیں نہ ہی طاہر بھائی کو کسی نے بلا ضرورت محلے میں پھرتے دیکھا تھا۔ ان کا ہاؤس جاب شروع ہو چکا تھا اور وہ صبح اپنی ڈیوٹی پر جاتے اور رات گئے واپس لوٹا کرتے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً اگو کے لیے سوال کلبلایا لیکن میرے پوچھنے سے پہلے ہی بالے نے بتایا کہ اگو کو تو پولیس نے اس کی ایس ایچ او سے مڈبھیڑ کے تیسرے دن ہی گرفتار کر لیا تھا کیونکہ اگو نے کسی فرنیچر کے شوروم کے گلے سے پیسے چرائے تھے۔ مالک دوکان نے چند دن پہلے ہی اگو کو مزدوری پر رکھا تھا اور اگو نے موقع ملتے ہی شوروم کی تجوری سے پانچ ہزار کے بڑے نوٹ اڑا لیے۔ وہ شہر چھوڑنے کے لیے ٹرین پکڑنے ہی والا تھا کہ ملک ریشم کے آہنی پنجے کی گرفت میں آ گیا۔ اگو ابھی تک جیل میں ہی تھا اور عدالت کی پیشیاں بھگتا رہا تھا۔

ابھی ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ فضلو بابا مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئے کہ ''چلو میاں، وہ جو بی ناراض ہو رہی ہیں کہ آدی اب تک ان سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آیا.....''

جانے کیوں میرا دل وہ جو آپی کے نام سے ہی بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے ان سب سے رات کے کھانے کے بعد پان والے کے کیبن کے سامنے ملنے کے لیے کہا اور خود فضلو بابا کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ جو آپی صحن میں ہی اپنے پھول پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ صحن میں قدم رکھا تو وہ پانی کا فوارہ پھینک کر جلدی سے میری جانب دوڑی آئیں۔ ان کے لہجے میں اب بھی وہی کھنک تھی جو میرے آس پاس کے تمام شور کو میری سماعت سے مٹا دیتی تھی۔

''ارے آدی..... کہاں ہو بھئی..... کتنی بری بات ہے نا..... دوپہر سے آئے ہوئے ہو اور اپنی وہ جو آپی کے پاس آنے کی اب فرصت ملی ہے تمہیں۔''

میں سر جھکائے ان کے سارے شکوے سنتا رہا۔ جانے کیوں ان کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہا تھا میں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کے اندر کمرے میں لے گئیں جہاں غیاث چچا اور سکینہ خالہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ غیاث چچا نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور سکینہ خالہ نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ غیاث چچا نے اسی دن میرے آرمی کٹ بال دیکھ کر میرا نام ''سولجر'' رکھ چھوڑا۔ وہ جو آپی نے کچھ ہی دیر میں میرے سامنے میری پسند کی

کھانے کی چیزوں کے انبار لگا دیا۔ میں چور نظروں سے غیاث چچا کو اکیڈمی کے بارے میں بتاتے ہوئے "جو آپی کو یہ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان کے گلابی رنگ میں ہلدی جیسی پیلاہٹ کی آمیزش مجھے دور ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ غیاث چچا کافی دیر میرے ساتھ بیٹھنے کے بعد کسی کام سے باہر نکل گئے اور سکینہ خالہ بھی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں تو "جو آپی نے وہ شکوہ کر ہی ڈالا جس سے میں اب تک اپنا آپ چُرا رہا تھا۔

"اچھا آدمی صاحب..... اب آپ یہ بتائیں کہ جاتے ہوئے مجھ سے مل کر کیوں نہیں گئے تھے..... تمہیں پتہ ہے کتنا روئی تھی میں اس دن پلیٹ فارم پر وہیں بیٹھ کر....."

میں چپ رہا پھر انہوں نے اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر میری نظروں کے سامنے لہرائی۔ میں زور سے چونک گیا۔ یہ تو وہی کارڈ تھا جو اس شام میں کیڈٹ کالج جانے سے پہلے جو آپی کو دینے کے لیے ان کے گھر آیا تھا لیکن یہ کارڈ..... یہ تو.....

پھر جو آپی نے خود میری الجھن دور کر دی کہ انہیں تیسرے دن سیڑھیوں کے نیچے صفائی کے دوران یہ کارڈ پڑا ملا تھا۔ مطلب اس دن جب میں روتے ہوئے سیڑھیاں اتر کر بھاگا تھا تو میرے ہاتھوں سے یہ کارڈ وہیں کہیں سیڑھیوں کے نیچے گر گیا تھا۔ جو آپی نے مجھے بتایا کہ وہ یہ کارڈ دیکھ کر بہت حیران ہوئیں تھیں کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ میں اس دن ان سے ملنے کے لیے آیا تھا تو پھر ملے بنا ہی کیوں واپس چلا گیا تھا؟ میں نے جو آپی کو مزید اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں بتا دیا کہ میں آیا تو تھا لیکن جب میں نے طاہر بھائی کو بھی چھت پر دیکھا تو میں کارڈ وہیں رکھ کر واپس چلا آیا تھا۔ طاہر بھائی کے نام پر جو آپی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور میں نے فوراً ہی ان کی آنکھوں میں نمی کی ایک ہلکی سی چمک دیکھی جسے جو آپی نے دوسرے ہی لمحے بڑی خوب صورتی سے چہرہ دوسری جانب کر کے چھپا لیا پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ کچھ سمجھ گئیں تھیں کہ میں شاید طاہر بھائی کی وجہ سے ہی چھت پر نہیں آیا لیکن وہ پھر بھی مجھ سے ناراض تھیں کہ طاہر بھائی تھے تو بھی کیا تھا۔ مجھے ان سے مل کر جانا چاہیے تھا پھر انہوں نے خود ہی مجھے بتایا کہ طاہر بھائی اب یہاں نہیں آتے کیوں کہ اُنو کی وجہ سے غیاث چچا نے ان کا کالج جانا بند کروا دیا ہے لہٰذا اب طاہر بھائی کے یہاں آنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ تب ہی بے اختیار ان سے ایک عجیب سا سوال پوچھ بیٹھا۔

"تو کیا آپ اسی وجہ سے اتنی اداس ہیں کیونکہ اب طاہر بھائی یہاں نہیں آتے.....؟"

جو آپی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر شاید انہیں میرے چہرے پر وہ جواب بھی نظر آ گیا جسے سن کر میں خوش ہو سکتا تھا وہ دھیرے سے ہنس دیں اور حسب معمول انہوں نے میری ناک دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں..... میں اس لیے اداس تھی کہ میرا پیارا دوست آدی جو یہاں نہیں تھا اب تم آ گئے ہو نا..... تو دیکھو کیسے کھلکھلا کر ہنس رہی ہوں....."

اور پھر واقعی ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اس شام تو جو آپی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اداسی کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے راجہ کے ساتھ آج تک جتنی فلمیں بھی چھپ کر دیکھی تھیں ان سب میں ہیرو ہیروئن "محبت" نامی چیز کے ہوتے ہی اچانک ہر طرف سے دکھوں، پریشانیوں اور مختلف قسم

کی مصیبتوں میں گھر جاتے تھے۔ دوست دُشمن بن جاتے تھے اور وہ باقی فلم میں پھر اسی طرح اداس رہتے تھے جیسے اس شام میں نے طاہر بھائی اور و جو آپی کو دیکھا تھا۔ تو کیا ان دونوں پر بھی اسی ''محبت'' نامی بلا کا سایہ آن پڑا تھا.....؟ اور اگر یہ محبت ہی تھی تو پھر اس عذاب میں اپنی جان پھنسانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھے یوں لگا جیسے محبت کسی بہت بڑی سی ایک جونک کا نام ہوگا جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہوگی۔ اس کے پیاسے ہونٹ اس وقت تک ان معصوم انسانوں کی شہ رگ سے پیوست رہتے ہوں گے جب تک ان کے جسم کا آخری قطرہ بھی نہ نکل جاتا ہو تبھی تو جو آپی اور طاہر بھائی کے چہرے اتنے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ محبت کی جونک دھیرے دھیرے ان کا خون چوس رہی تھی اور وہ دونوں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔

یتّی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک **یتّی (برفانی انسان)** کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

دوسری فصل

اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو نیند میں اس کی بھولے ہوئے ماضی بلکہ مستقبل کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ خواب میں وہ ماضی میں گم شدہ اپنی شخصیت کی شناخت بھی کر سکتا ہے۔ قدرت کبھی کبھی انسان کو ایسے موقع فراہم کرتی ہے۔ علیم الحق حقی نے ایک بار پھر ایک نہایت منفرد موضوع پر قلم اُٹھایا اور تخلیق پائی یہ کہانی.....دوسری فصل، جسکی بُنیاد ہندوؤں کے عقیدہ آواگون (دوسرا جنم) پر رکھی گئی ہے۔ ناول دوسری فصل کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلی قیامت

میری چھٹیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ ہم سب کا پسندیدہ مشغلہ سارا دن آوارہ گردی اور شرارتیں کرنا تھا۔ ایسے میں محلے کی مخصوص فضا میں تھوڑی بہت تبدیلی اس وقت پیدا ہوتی جب محلے میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی۔ اس شام بھی غفور چچا کی منجھلی بیٹی شنو کی منگنی کی تقریب تھی اور غفور چچا خود جا کر اور بہت اصرار کے ساتھ سکینہ خالہ اور وجو آپی کو ڈھولک کی تقریب میں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے ورنہ وجو آپی نے تو بالکل ہی گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وجو آپی تو آج بھی گھر میں ہی چھپی بیٹھی رہتیں اگر غیاث چچا خود ان کے کمرے میں جا کر ان سے تیار ہونے کا نہ کہتے۔ غفور چچا محلے کے سبھی دکھ درد میں ہمیشہ سب سے آگے ہوتے تھے پھر ایسے خوشی کے موقعے پر انہیں نہ کہنا غیاث چچا کو بالکل بھلا نہ لگا اور یوں سکینہ خالہ کے ساتھ مہینوں بعد وجو آپی بھی گھر سے نکل آئیں۔

اب یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی..... لیکن سب سے پہلی ملاقات ہی لڑکے والوں کے استقبال کے لیے دروازے پر وہاں کھڑے، اجڑے اجڑے سے طاہر بھائی سے ہوگئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سکینہ خالہ کو آداب کہا سکینہ خالہ نے حسب معمول ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ وجو آپی سکڑی سمٹی سی سکینہ خالہ کے پیچھے کھڑی تھیں۔ طاہر بھائی نے اخلاقاً ان سے بھی ان کا حال پوچھا۔ میں اور راجہ اس وقت شنو کے دیئے ہوئے موتیے کے گجرے پانی کی پراتوں میں ڈالنے کے لیے دروازے سے نکل ہی رہے تھے۔ طاہر بھائی کے حال پوچھنے پر وجو آپی نے اپنی زخمی نگاہیں اٹھائیں۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی دو لوگوں کی نظر ملتے ہی چنگاریاں سی اڑتی محسوس کی تھیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان چنگاریوں کو شاید میرے، طاہر بھائی اور وجو آپی کے علاوہ اور کوئی نہیں دیکھ پایا۔ چند لمحوں کے لیے میرے قدم وہیں زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ یا خدا یہ کیا ماجرا تھا۔ آس پاس پھرتے یہ سبھی لوگ اس آگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اگر انہیں یہ سب کچھ نظر نہیں آ رہا تو پھر ان دونوں کے درمیان اس سلگتی تپش کا صرف مجھے کیوں احساس ہو رہا تھا.....؟

دوسرے ہی لمحے راجہ نے میرا ہاتھ کھینچا اور مجھے وہاں سے دور لے گیا لیکن ساری تقریب میں میرا دھیان انہی دونوں کی جانب ہی رہا۔ طاہر بھائی کو غفور چچا نے کچھ ایسے کام سونپ رکھے تھے کہ انہیں بار بار زنانے کی طرف آنا جانا پڑتا تھا اور جتنی بار بھی وہ اس جانب گئے ان کی نظر، آنکھیں جھکائے بیٹھی وجو آپی پر ضرور پڑ جاتی تھی۔ اس شام وجو آپی کا روپ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ اس پر کسی کی بھی نظر ٹھہر سکتی تھی۔ وہ کالے دوپٹے اور کالے سفید مکس رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس تھیں۔ لڑکے والوں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی لیکن جب وہ لوگ آ گئے تو ان کی ہر عورت ایک دوسرے سے وجو آپی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ یہ پری کون ہے۔ لڑکے والوں کے ساتھ مہندی لے کر آئے لڑکے بھی کسی نہ کسی بہانے وجو آپی کی

ایک جھلک دیکھنے کے لیے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ہم سب ہی دوست تقریب میں ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ صرف بالا ہی نہیں تھا جو گزشتہ شام اپنی اماں کے ساتھ اپنی خالہ کی طرف رات رہنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ کاش اس روز بالا اپنی خالہ کے گھر نہ جاتا تو ہمیں یہ پتہ چل جاتا کہ اگو گزشتہ رات ہی جیل سے چھوٹ کر گھر آ چکا ہے۔ بالے کے ابا سرکاری دورے پر افسروں کے ساتھ تین دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ورنہ وہ کبھی اگو کو گھر میں قدم نہ دھرنے دیتے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے، لہٰذا بالے کی اماں کا دل بھی اگو کی برباد حالت، بڑھی ہوئی شیو اور میلے کپڑے دیکھ کر پسیج گیا اور انہوں نے اگو کو گھر میں بلا لیا۔ اکو کل سے اپنے گھر میں ہی پڑا تھا اور ہم سب دوست اس آفت ناگہانی سے بے خبر تھے۔ رات کے جانے کس پہر ڈھول ڈھماکے اور موسیقی کی آواز سن کر اگو بھی گھر سے باہر نکل آیا اور اس نے دور سے ہی کھڑے کھڑے غفور چچا کے گھر کی تقریب کا جائزہ لیا۔ تبھی شاید اس کی نظر بار بار گھر کے اندر جاتے طاہر بھائی پر بھی پڑ گئی ہوگی۔ میں اندھیرے میں ٹھیک طرح سے پہچان تو نہیں سکا لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے بالے کی چھت پر کسی کو تیزی سے منڈیر کی طرف آتے اور پھر غفور چچا کے صحن کی جانب جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ بالے کے ابا ہیں جو چھت پر کھڑے منگنی کی تقریب کا نظارہ کر رہے ہیں لیکن مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ اگو ہے۔ کاش..... کاش مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتا کہ وہ اگو تھا جو اپنی چھت پر کھڑا اندر اس وقت صحن میں بیٹھی وجو آپی پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور بار بار صحن میں آتے جاتے طاہر بھائی کو دیکھ کر اس کے اندر کا خون جانے کتنے ابال کھا رہا تھا۔

تقریب ختم ہوتے ہوتے بہت دیر ہو گئی، سکینہ خالہ اور وجو آپی غفور چچا سے اجازت لے کر گھر لوٹنے لگیں تو غفور چچا نے انہیں پیش کش کی کہ رات کافی بیت چکی ہے، وہ کہیں تو غفور چچا خود انہیں گھر کے دروازے تک چھوڑ آئیں لیکن سکینہ خالہ نے انہیں روک دیا کہ اپنا محلہ ہی تو ہے اور پھر انہیں کون سا سات کوس پار جانا ہے۔ بس یہی دو گلیاں تو پار کرنی ہیں لہٰذا وہ دونوں خود ہی چلی جائیں گی لیکن غفور چچا نے باہر کھڑے نوجوانوں کو آواز دی کہ ان میں سے کوئی بھی سکینہ خالہ کو گھر تک چھوڑ آئے۔ طاہر بھائی دانستہ پیچھے ہٹ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا جانا قطعی مناسب نہیں ہوگا میں اور راجہ بھی دور کھڑے بچی کھچی شرشریوں کے فیتے کو آگ دکھا رہے تھے ورنہ ہم میں سے ہی کوئی ان کے ساتھ چلا جاتا لہٰذا سامنے کھڑے مولوی سعید کے بڑے بیٹے کمال نے ہامی بھر لی۔ کمال بڑے بھیا کا کلاس فیلو تھا اور اس نے بھی ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بھیا کے ساتھ ہی میٹرک پاس کیا تھا لہٰذا اس کا شمار محلے کے نوجوانوں میں کیا جا سکتا تھا۔ کمال وجو آپی اور سکینہ خالہ کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔ باقی سب لوگ بھی غفور چچا سے رخصت ہو کر پہلے ہی اپنے گھروں کو پلٹ چکے تھے۔ میں اور راجہ بھی آخری فیتے کو آگ دکھا کر پلٹے اور پھر اچانک ہی فضا میں ایک دلخراش چیخ گونجی۔ میں لاکھوں آوازوں میں یہ آواز پہچان سکتا تھا۔ یہ وجو آپی کی آواز تھی لیکن میرے علاوہ وہاں ایک شخص اور بھی تھا جس کی نبض اسی آواز کی لے پر دھڑکتی تھی..... ہاں..... طاہر بھائی..... جیسے ہی چیخ کی آواز گونجی طاہر بھائی نے سراسیمہ ہو کر سر اٹھایا اور پھر مجھ سے اور راجہ سے بھی پہلے اس طرف دوڑ پڑے جہاں سے آواز آئی تھی۔ دوسرے نمبر پر میں اور راجہ بھاگے لیکن ہم ایک تو پہلے ہی ان سے بہت پیچھے کھڑے تھے اور پھر طاہر بھائی کی رفتار بھی ہم سے سوگنا زیادہ تھی لہٰذا وہ چند ہی لمحوں میں اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور پھر ہم ابھی آدھے راستے میں ہی تھے کہ وجو آپی اور سکینہ خالہ کی ہذیانی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ محلے کے ہر گھر کا دروازہ کھلا اور کوئی نہ کوئی اس میں سے نکل کر چیخوں کی آواز کی جانب دوڑا لیکن

سب سے پہلے میں اور راجہ اس گلی کے نکڑ پر پہنچے جہاں طاہر بھائی سینے سے ابلتے خون کے فوارے کو ہاتھوں سے دبا کر روکنے کی کوشش میں اوندھے منہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پہلی جھلک میں ہی ڈوآپی کو آخری چیخ مارتے اور پھر چکرا کر بے ہوش ہو کر گرتے دیکھا۔ سکینہ خالہ ابھی تک ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں اور لوگوں کو بلا رہی تھیں تا کہ کوئی آگے بڑھ کر طاہر بھائی کی مدد کرے۔ چند ہی لمحوں میں یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں اور راجہ سخت سراسیمہ ہو گئے اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی آس پاس قریب کے مکانوں سے قدوسی صاحب، شاکر چچا اور جانے کتنے اور لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ چند ہی لمحوں میں طاہر بھائی کو مہندی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئی اس آخری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا جو چند لمحوں کی مزید تاخیر کی صورت میں محلے کے پھاٹک کو کراس کر گئی ہوگی۔ ڈوآپی کو بھی محلے کی عورتوں کی مدد سے اسی بے ہوشی کے عالم میں ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ جب میں اور راجہ وہاں بھاگتے ہوئے پہنچے تھے تو ہمیں کمال بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لوگ ہانپتے کانپتے کمال کو بھی نہ جانے کس گلی سے اٹھا لائے۔ تب اس پہیلی کی پہلی گرہ کھلی کہ کمال سکینہ خالہ اور وجو آپی کو لیے ہوئے جیسے ہی بڑے میدان کو نکلتی گلی کے نکڑ تک پہنچا تو اچانک ہی کسی نقاب پوش نے گلی کے کونے سے نکل کر ڈوآپی کا ہاتھ اس تیزی سے جھپٹ کر پکڑا کہ بے اختیار خوف کے مارے ڈوآپی کے منہ سے چیخ نکل گئی کیونکہ نقاب پوش نے انہیں باقاعدہ کھینچ کر اندھیرے میں غائب ہونے کی کوشش کی تھی۔ کمال گھبرا کر پلٹا اور اس نے چلا کر نقاب پوش کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نقاب پوش میں کچھ ایسی بجلی بھری تھی کہ اس نے دوسرے ہی لمحے کمال کا سر پکڑ کر اس زور سے دیوار میں مارا کہ چند لمحوں کے لیے تو کمال زمین پر پڑا ہی رہ گیا اور جب اس کے حواس سنبھلے تو اس نے اسی شخص کا ہیولہ اندھیری گلی کے کونے پر غائب ہوتے دیکھا، دوسری نظر اس کی زمین پر پڑے تڑپتے طاہر بھائی پر پڑی اور وہ بدحواس ہو کر چلاتے ہوئے اس نقاب پوش کے پیچھے بھاگا جس کا نقاب اسی گلی کے کونے پر پڑا رہ گیا تھا۔ کمال نے لاکھ کوشش کی لیکن سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ پہلے ہی چکرا رہا تھا لہٰذا چند ہی لمحوں میں حملہ آور کسی چھلاوے کی طرح محلے کی اندھیری گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

درمیان کی کہانی سکینہ خالہ نے یوں بتائی کہ جیسے ہی نقاب پوش نے ڈوآپی کو اپنی جانب کھینچا تو ڈوآپی اس زور سے سکینہ خالہ سے ٹکرائیں کہ خالہ کی نظر کا چشمہ زمین پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ دھندلی نظر سے انہیں رات کے اندھیرے میں بس اتنا ہی نظر آیا کہ ڈوآپی کو کوئی اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے اور پہلے تو کمال اس سے بھڑ گیا ہے لیکن پھر انہوں نے کمال کو چلا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ اس اثنا میں حملہ آور کی ڈوآپی کے ساتھ کھینچا تانی جاری تھی اور ڈوآپی زور زور سے چلا رہی تھیں۔ حملہ آور نے سکینہ خالہ کو بھی زور سے دھکا دیا اور وہ ڈوآپی پر قابو پانے میں تقریباً کامیاب ہو ہی چکا تھا کہ دور سے طاہر بھائی للکارتے اور چلاتے ہوئے دوڑتے نظر آئے۔ انہوں نے آتے ہی حملہ آور نقاب پوش پر دھاوا بول دیا۔ شاید انہی کے ساتھ دھینگا مشتی میں حملہ آور کا نقاب اس کے چہرے سے کھل کر گر گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں کوئی دھار پل بھر کو چمکی اور اگلے ہی سیکنڈ طاہر بھائی سینہ تھامے زمین پر گر کر تڑپتے نظر آئے۔ خنجر عین ان کے سینے میں دستے تک گڑ چکا تھا اور ڈوآپی کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اتنی دیر میں آس پاس کے لوگوں کے بیدار ہونے کے شور اور شاید پہچان لیے جانے کے خوف نے حملہ آور کو ڈوآپی کا ہاتھ چھوڑ کر اندھیرے میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے کمال کو بھی ہوش آ گیا اور وہ بھاگتے ہوئے حملہ آور کے تعاقب میں سرپٹ دوڑ پڑا لیکن اسے پکڑنے میں کامیابی حاصل نہ کر

سکا۔ چند ہی لمحوں میں ہمارا وہ محلّہ جہاں کچھ دیر پہلے خوشی کے شادیانے بج رہے تھے اب وہاں چاروں جانب سوگ نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ سبھی کے ذہنوں میں بس ایک ہی سوال ڈنک مار رہا تھا کہ آخر ایسی گھناؤنی واردات کا ارتکاب کرنے والا کون ہوسکتا ہے اور واردات بھی کیسی.....؟ چاقو گھونپنے کی.....؟ اور وہ بھی ہمارے محلے میں.....؟ جہاں گزشتہ تیس پینتیس سالوں سے سبھی محلے دار ایک جڑے ہوئے گھرانے کی طرح رہ رہے تھے۔ جہاں آپس میں اس قدر لگاؤ اور اپنا پن تھا کہ ہم بچے رات پڑنے پر کسی بھی آنگن میں پڑ کر سو جاتے تھے اور ہمارے ماں باپ کو ذرہ برابر بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ان کے بچے سارا دن اور ساری رات کس گھر کے صحن میں دھما چوکڑی مچاتے رہے ہیں.....

ڈاکٹروں نے طاہر بھائی کو فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کروادیا۔ یہاں وہ "جو آپی ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ بڑی لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ انہیں خوف اور دہشت کے مارے شدید صدمہ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ شاک میں چلی گئی ہیں۔ طاہر بھائی کے گھائل ہونے کی خبر ان کے ڈاکٹر دوستوں اور باقی ہسپتال کے عملے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سینئر اور جونیئر ڈاکٹروں اور میڈیکل کالج کے طالب علموں کا ہجوم پورے ہسپتال میں جمع ہوگیا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کی جیپ بھی محلے میں تفتیش کے لیے پہنچ گئی اور انہوں نے سب سے پہلے کمال کا بیان لیا۔ ملک ریشم ایس ایچ او نے معمول کی کارروائی اور روزنامچہ تیار کروایا۔ اسی اثنا میں صبح کی اذانیں بھی شروع ہوگئیں۔ وہاں آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کررہے تھے اور یہاں پورا محلّہ ان کی جان کی سلامتی مانگنے کے لیے سجدے میں پڑا ہوا تھا لیکن شاید کچھ سجدے ہمیشہ رائیگاں ہی جاتے ہیں۔ یہاں وہ "جو آپی نے پوری رات کی بے ہوشی کے بعد چند لمحوں کے لیے پلکیں کھولیں اور وہاں طاہر بھائی نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ ہم سب کو یہ خبر سن کر جیسے سکتہ سا ہوگیا۔ طاہر بھائی کی اماں، خالہ عزیزہ یہ سنتے ہی آپریشن تھیٹر کے باہر یوں گریں کہ الٹا انہیں دل کے دورے سے بچانے کے لالے پڑ گئے۔ طاہر بھائی کے ابا، چچا شکور نے وہیں اپنا سر دیوار میں دے مارا۔ پورے ہسپتال پر چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا جیسے سبھی کی روح چند لمحوں کے لیے قبض ہوگئی ہو۔ محلے کی مسجد سے اعلان نشر ہوا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون....." اور پھر چند لمحوں بعد ہی ہسپتال عملے اور ڈاکٹروں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کچھ ہی دیر میں سارے شہر کے ڈاکٹر ہسپتال کے سامنے والی بڑی سڑک پر جمع ہو چکے تھے اور ان کے نعروں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ وہ سب قاتل کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کررہے تھے ورنہ اڑتالیس گھنٹے بعد انہوں نے شہر کے ہر ہسپتال میں ہڑتال کرنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ محلے داروں کو سمجھ نہیں آرہا کہ وہ طاہر بھائی کا ماتم کریں، خالہ عزیزہ کی دل کے وارڈ میں دیکھ بھال کریں یا پھر شکور چچا کو قابو میں رکھیں جو پہلے ہی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو چکے تھے۔ غیاث چچا بھی ایک جانب یوں گم سم سے بیٹھے تھے جیسے ان کی قوت گویائی عرصہ قبل چھن چکی ہو۔ اب یہ ایک باقاعدہ قتل کا کیس تھا جس کی شنوائی کے لیے ان کی لاڈلی بیٹی اور رفیق حیات کی گواہی اور بیان بھی لازمی بنتا تھا کیونکہ کمال کے بیان کے مطابق اس نے قاتل کو پہلے نقاب میں اور پھر بھاگتے ہوئے پشت کی جانب سے دیکھا تھا۔ سکینہ خالہ کا بیان ہو بھی جاتا، تب بھی ان کی گواہی کافی نہ ہوتی کیونکہ وہ بھی قاتل کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پائی تھیں۔ سو اب لے دے کر آخر میں وہ "جو آپی ہی بچتی تھیں جن کی گواہی پر سارا دارومدار تھا۔

لیکن اس سے پہلے ابھی اور بہت سے عذاب ہم سب کو اپنی جان پر جھیلنے تھے۔ طاہر بھائی کی میت محلے میں پہنچادی گئی تھی۔ ان کے ماں

باپ میں سے کوئی بھی اس وقت اس قابل نہیں تھا کہ وہ ان کے کفن دفن کے انتظامات کروا سکتا، آس پاس کے قریبی رشتہ داروں اور خالو خالاؤں نے یہ فریضہ سنبھال لیا۔ شام تک قبر کشائی کے علاوہ دیگر انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے لیکن اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جب تک ماں باپ طاہر بھائی کا آخری دیدار نہ کر لیں انہیں منوں مٹی تلے کیسے دفن کیا جائے؟

پھر اچانک ہی خبر ملی کہ طاہر بھائی کی اماں نے بے ہوشی سے آنکھیں کھول دی ہیں، جانے یہ ماں کی ممتا کے کرشماتی سحر کا اثر تھا یا کچھ اور جس نے اس بے ہوشی میں بھی انہیں یہ احساس دلا دیا کہ ان کا لاڈلا بیٹا ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کے انتظار میں ان کے صحن میں سفید لباس میں لپٹا پڑا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہسپتال کی ہی گاڑی میں شکور چچا، عزیزہ خالہ کو لیے کالونی میں داخل ہوئے۔ دونوں بدنصیبوں نے آخری بار بیٹے کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا اور طاہر بھائی کا کارواں انہیں اپنے کندھوں پر اٹھائے چل پڑا۔ میرے ہوش وحواس میں آنے کے بعد ہمارے محلے میں یہ کسی کی پہلی موت تھی اور ہم سب دوستوں نے اس موت کو پل پل خود پر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس دن مجھے یہ پتہ چلا کہ سو سال کی خوشی پر ایک دن کا غم زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ شاید ہم انسانوں کے خمیر میں ہی غم کی مٹی شامل ہوتی ہے تبھی غم پلٹ پلٹ کر ہمارے پاس آتا ہے۔ طاہر بھائی کی موت والے دن سے ہی میری غم سے دوستی ہو گئی تھی۔ خوشی مجھے بے چین کر دیتی تھی جبکہ غم میں مجھے سکون کا احساس ہوتا تھا۔

لوگ جب طاہر بھائی کو دفنا کر واپس لوٹے تو رات بیت چکی تھی۔ پورے محلے کے کسی بھی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا پھر سب سے پہلے غفور چچا کو ہی حسب معمول دنیاداری کی رسم یاد آئی اور رات گئے نہ جانے کہاں سے وہ نمکین اور میٹھے چاولوں کی چند دیگیں اٹھا لائے لیکن اس وقت کسی کو کچھ کھانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ غفور چچا کے بے حد اصرار پر بمشکل سبھی نے ایک آدھ نوالہ لیا اور ساری دیگیں یتیم خانے کو بھیج دی گئیں۔ فوآپی ابھی تک مکمل ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ملک ریشم دو مرتبہ غیاث چچا کے گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا معاملہ سنگین ہوتا جا رہا تھا کیونکہ صبح کے اخبارات اس واردات کی خبروں سے بھرے پڑے تھے اور ہر خبر میں ڈاکٹروں کے الٹی میٹم کا ذکر تھا جو انہوں نے ہڑتال کے لیے دے رکھا تھا۔ معاملہ حکومت کے بڑوں تک پہنچ گیا تھا اور پولیس کے اعلیٰ حکام کو خصوصی طور پر جلدی اور نہایت احتیاط سے تفتیش مکمل کرنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ ایس ایچ او کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی کہ گھوم پھر کر سارا دباؤ اس کے اوپر آ رہا تھا کیونکہ علاقہ براہ راست اس کے زیر انتظام تھا اور وہی تفتیشی افسر بھی تھا لیکن ظاہر ہے جب تک وہ فوآپی کو مکمل ہوش نہیں آ جاتا تب تک علاقہ ایس ایچ او بھی مکمل بے بس تھا۔

غیاث چچا مسلسل کل رات سے فوآپی کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اور کسی کو بھی فوآپی کے کمرے میں آنے سے منع کر رکھا تھا اور بھیڑ بھاڑ کو بھی ان کے کمرے سے بہت دور روک رکھا تھا۔ اسی لیے جب فوآپی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر دوسری مرتبہ ہوش وحواس کا دامن تھاما تو صرف وہاں غیاث چچا ہی تھے جن کو یہ خبر تھی کہ فوآپی مکمل ہوش میں آ چکی ہیں۔ انہوں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور خوف سے آنکھیں پٹ پٹاتی فوآپی کو پانی کا گلاس تھما کر تسلی دی کہ وہ محفوظ ہیں اور اپنے ہی گھر میں ہیں۔

فوآپی نے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق سے نیچے اتار لیا اور گھبرا کر غیاث چچا کی جانب دیکھا اور ایک دم اٹھ بیٹھیں۔

"ابا..... وہ طاہر بھائی..... وہ..... وہ ٹھیک تو ہیں نا....."

غیاث چچا نے دھیرے سے انہیں بتایا۔

''اس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے.....ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں تم مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا.....؟''

وجو آپی نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دو آنسو ان کی بھینچی ہوئی آنکھوں سے نکل کر ٹپک گئے۔ انہوں نے زیر لب ہی کوئی دعا پڑھی لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ وہ جس کے لیے یہ دعا پڑھ رہی ہیں انہیں اب زندگی دینے والی کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی۔ غیاث چچا غور سے وجو آپی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے گزر جانے کی اطلاع وجو آپی کو اسی لیے ایک دم سے نہیں سنائی تھی کیونکہ اس طرح سے وجو آپی کی حالت دوبارہ بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ وجو آپی کو اپنا آپ سمیٹنے میں بہت دیر لگی۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے غیاث چچا کو اس منحوس رات میں ہوئی اس گھناؤنی واردات کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کس طرح کمال انہیں لیے ان کے آگے آگے چل رہا تھا کہ اچانک گلی کے نکڑ سے ایک نقاب پوش کود کر ان کے سامنے آ گیا اور آتے ہی اس نے وجو آپی کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کمال تو بچہ ہی تھا ابھی، اس نے روکنے کی کوشش کی تو ایک ہی وار میں نقاب پوش نے اس کا سر دیوار میں دے مارا اور اسی اثناء میں طاہر بھائی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی نقاب پوش ایک دم ہی بپھر گیا اور وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دفعتہً چھینا جھپٹی میں نقاب پوش کے چہرے سے نقاب اتر گیا۔ پہچان لیے جانے کے خوف اور طیش نے حملہ آور کو دیوانہ کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے نیفے سے اپنا چمکدار دھار والا چاقو نکالا اور طاہر بھائی کے سینے میں گھونپ دیا اور اپنا آپ چھڑا کر وہاں سے بھاگ گیا.....

وجو آپی اتنا سا ہی سنانے کے بعد یوں ہانپنے لگی تھیں جیسے جانے کتنے میل کا فاصلہ بھاگ کر طے کر کے آئی تھیں۔

غیاث چچا کی آواز بھی بیٹھنے لگی تھی۔ انہوں نے وجو آپی سے یوں پوچھا جیسے انہیں اپنے سوال کا جواب پہلے ہی معلوم ہو۔

''کون تھا وہ نقاب پوش.....؟''

وجو آپی کے منہ سے سسکتی ہوئی آواز نکلی۔

''اگو.....''

اور غیاث چچا نے یوں سر تھام لیا جیسے ڈوبتے کا آخری سہارا تنکا بھی اس کی نظروں کے سامنے بہہ جائے۔ ساری صورت حال سمجھ لینے کے باوجود ان کے دل میں ابھی تک کہیں نہ کہیں امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی کہ شاید حملہ آور اگو نہ ہو..... یا پھر..... یا پھر وجو آپی ہی نے کم از کم اسے نہ دیکھا ہو۔ ان کے اندر کا باپ اپنی لاڈلی بیٹی کو مزید مشکلات سے بچانے کے لئے ایسی باتیں سوچ رہا تھا تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔

وجو آپی نے پھر بے قراری سے غیاث چچا سے سوال کیا۔

''ابا..... طاہر تو ٹھیک ہیں نا..... اگو کے وار سے وہ بری طرح زخمی ہو گئے تھے..... ان کا تو بہت سارا خون بہہ گیا ہو گا..... آپ انہیں دیکھنے ہسپتال گئے تھے.....؟'' غیاث چچا نے پھر ٹوٹے دل سے وجو آپی کو تسلی دی کہ انہیں امید ہے کہ ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے وجو آپی کے سرہانے بیٹھ کر بڑی مشکل سے ٹوٹے لفظوں میں وجو آپی کو یہ بتایا کہ شاید کچھ دیر میں ایس ایچ او ان کا بیان لینے کے لیے آ جائے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ وجو آپی ایس ایچ او کے سامنے اپنے بیان میں اگو کا ذکر نہ کریں، بس اتنا ہی کہہ دیں کہ اندھیرے کی وجہ

سے وہ حملہ آور کو پہچان نہیں سکیں اور ویسے بھی ان کے بے ہوش ہونے تک حملہ آور نقاب کی اوٹ میں تھا لہٰذا وہ کچھ نہیں بتا سکتیں کہ طاہر بھائی پر حملہ کرنے والا نقاب پوش کون تھا۔

ڈوآپی حیرت سے اپنے ابا کو دیکھتی رہیں کیونکہ آج تک غیاث چچا نے ہمیشہ اور زندگی کی ہر مشکل میں انہیں سچ بولنے کا ہی درس دیا تھا پھر وہی باپ آج اچانک انہیں جھوٹ بولنے کا مشورہ کیوں دے رہا ہے؟ اور پھر جھوٹ بھی ایک ایسے معاملے کے بارے میں جس میں ان کا محسن اپنی زندگی اور موت کے درمیان سرحد پر پڑا اپنی سانسوں کی جنگ لڑ رہا تھا۔

غیاث چچا نے ڈوآپی کے اندر امڈتے سوالوں کے طوفان کو محسوس کر لیا اور سر جھکائے ڈوآپی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ پولیس کیس ہے اور معاملہ جانے آگے کب تک کورٹ کچہری اور وکیلوں کی بحث میں کھنچے گا۔ بات اگر ان کی اپنی ہوتی یا پھر ڈوآپی کی جگہ اگر ان کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ خود جا کر پولیس میں انگو کے خلاف رپٹ درج کروا آتے لیکن ڈوآپی ان کی بیٹی تھیں اور کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو عدالتوں کے چکر لگاتا نہیں دیکھ سکتا اور خاص طور پر تب جب بیٹی کنواری بھی ہو۔

پتہ نہیں ڈوآپی کو غیاث چچا کی بات پوری طرح سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ اپنے پیارے ابا کے چہرے پر پریشانی کی ایک لکیر بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں لہٰذا انہوں نے غیاث چچا کی خاطر ہامی بھر لی اور جب تک ملک ریشم اور ان کے منشی کی آہٹیں برآمدے میں گونجیں تب تک وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس جھوٹ کے لیے تیار کر چکی تھیں۔ غیاث چچا نے پہلے ہی ایس ایچ او سے درخواست کر رکھی تھی کہ ڈوآپی کی حالت کے پیش نظر فی الحال انہیں طاہر کی موت کے بارے میں نہیں بتایا گیا ہے لہٰذا وہ بھی اگر اپنے سوالات کی ترتیب یوں رکھیں کہ جس سے طاہر کی موت کا ذکر نہ نکلے تو ان پر بڑا احسان ہوگا کیونکہ وہ ڈوآپی کو اس حالت میں مزید صدمہ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے۔

ملک ریشم کمرے میں داخل ہوا تو ڈوآپی نے جلدی سے انہیں سلام کر کے سر پہ دوپٹہ درست کیا۔ ملک کی نظریں ڈوآپی کے مضمحل سراپے سے ہوتی ہوئی ان کے ملیح چہرے پر جم گئیں۔ وہ پولیس والا تھا لیکن ایک باپ بھی تو تھا۔ اس کے گھر میں بھی ایسی ہی ایک نازک اور کانچ کی گڑیا جیسی ڈوآپی تھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے۔ اپنی نوکری بچانے کے لیے اس لڑکی پر سختی کرے اور ڈائنٹ ڈپٹ کر کے مجرم کا نام اگلوا لے اور اپنی نوکری بچا لے جو گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران اعلیٰ حکام کے بے انتہا دباؤ کی وجہ سے شدید خطرے میں پڑ چکی تھی یا پھر چپ چاپ اپنی طرح کے ایک دوسرے باپ کی کی ہوئی درخواست پر عمل کرتے ہوئے لڑکی کا سیدھا سادھا بیان لے کر معاملہ داخل دفتر کر دے۔ اس کی زندگی ایسے مقدمات کی تفتیش میں گزری تھی اور وہ غیاث چچا کی پریشانی دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کی بیٹی نے اصل مجرم کو پہچان لیا تھا لیکن ایک باپ نے اپنی بیٹی کو رسوائی سے بچانے کے لیے اسے غلط بیانی پر مجبور کر دیا ہے۔

ایس ایچ او کے اندر کا پولیس افسر جاگ چکا تھا لیکن وہ اس کے اندر موجود ایک باپ کی روح سے زیادہ بیدار نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کی ہی سنی اور چپ چاپ ڈوآپی سے بیان لے کر اور چند ضمنی سوالات کر کے کاغذ کے نیچے ڈوآپی کے دستخط لے لیے۔ منشی محرر نے حیرت سے اپنے سخت گیر افسر کو دیکھا جو ایسے معاملات میں بال کی کھال نکالنے کے لیے مشہور تھا لیکن اس دھان پان سی لڑکی کے سامنے یوں سر جھکائے بیان لے رہا تھا

جیسے اسے تفتیش کی الف، ب سے بھی واقفیت نہ ہو۔

ملک ریشم بوآپی کے کمرے سے باہر نکلا تو غیاث چچا نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ملک نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور انہیں کہا کہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ کیونکہ آج نہیں تو کل اسے یہ حقیقت پتہ چل ہی جائے گی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ محکمہ یہ تفتیش صرف علاقہ ایس ایچ او پر ہی چھوڑ دے۔ ان کی ناکامی کی صورت میں معاملہ کسی دوسرے افسر کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے جو شاید ان کی طرح نرمی نہ برتے۔

ایس ایچ او چلا گیا لیکن اپنے پیچھے غیاث چچا کے لیے ان گنت سوچیں چھوڑ گیا۔ آنے والے دنوں کا تصور ہی ان کا سارا سکھ چین لوٹ لینے کے لیے کافی تھا۔ شام تک بوآپی کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی اور ان کی آنکھوں کی بے چینی سے صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ سکینہ خالہ یا خود غیاث چچا انہیں طاہر بھائی کے گھر پُرسہ دینے کے لیے چلنے کا کہیں تو وہ جلدی سے اپنی چادر اوڑھ کر ان کے ساتھ نکل پڑیں کیونکہ اگر ہسپتال نہیں تو کم از کم انہیں طاہر بھائی کے گھر تو جانا ہی چاہیے تھا لیکن ان کی توقعات کے برعکس شام سے رات ہو گئی لیکن ان کے ماں باپ میں سے کسی نے بھی انہیں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے اماں ابا کے عجیب سے رویے نے بھی شدید الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ہی بوآپی سے کچھ چھپا رہے ہوں۔ نظریں نہ ملا پا رہے ہوں۔ دوسری طرف ملک ریشم نے بوآپی کا پہلا بیان شامل تفتیش تو کر لیا تھا لیکن اس نے احتیاطاً شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کروا دی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے پر بھی پولیس کے اہل کار سادہ لباس میں تعینات کروا دیے تھے کیونکہ اس کی پولیس والی حس کسی بھی قسم کے حالات میں اپنے فرض سے غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لہٰذا وہ ایسے میں کسی قسم کی بھی کوتاہی مول نہیں لے سکتا تھا۔

آخر دوسری صبح بوآپی کا صبر جواب دے ہی گیا اور انہوں نے خود سکینہ خالہ سے طاہر بھائی کے گھر چلنے کے لیے کہہ دیا۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ جس کی مزاج پرسی اور عیادت کے لیے چلنے کو کہہ رہی ہیں اس بدنصیب کے گھر میں آج اس کا سوئم ہوگا اور اس کے قل پڑھے جا رہے ہوں گے۔

سکینہ خالہ نے بمشکل اپنی آنکھوں کو بوآپی کے سامنے بھیگنے سے روکے رکھا اور انہیں سہ پہر تک کے لیے ٹال دیا کیونکہ وہ غیاث چچا کی غیر موجودگی میں خود کچھ بھی کہنے سے بالکل قاصر ہی تو تھیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کچھ فیصلے تقدیر، تدبیر سے پہلے ہی کر رکھتی ہے۔ ابھی دوپہر کا سورج سوا نیزے پر ہی تھا کہ اچانک دھڑ سے صحن کا دروازہ کھلا اور شکورن بوا ہڑبڑائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں اور آتے ہی بنا سوچے سمجھے وہیں صحن میں کھڑے کھڑے سکینہ خالہ کو آوازیں دینے لگیں۔

"اے بہو..... سنتی ہو..... چلنا نہیں ہے کیا اپنی عزیزہ کی طرف.....؟ پچھلے دو دنوں سے سبھی تمہارا پوچھ رہی ہیں..... اے میں تو کہتی ہوں کہ انسان شادی بیاہ میں کسی کی خوشی میں شریک ہو یا نہ ہو پر موت کے غم میں اسے سب سے پہلے پہنچنا چاہیے..... اور پھر آج تو سوئم بھی ہے نا اپنے طاہر میاں کا....."

شکورن بوا حسب معمول نان اسٹاپ ٹرین کی طرح بولتی جا رہی تھیں اور سکینہ خالہ کے دوڑ کر ان تک پہنچنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھنے سے قبل

ہی وہ اتنا کچھ بول چکی تھیں کہ برآمدے میں سے کچے چاولوں کی چھلنی ہاتھ میں لیے گزرتی وجو آپی کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل گئیں۔ وجو آپی نے صرف ایک لمحے میں موت کا تذکرہ اور سکینہ خالہ کو شکورن بوا کے ہاتھ جوڑ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ان کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ ان کے ہاتھ سے چاولوں کی پرات چھوٹی اور وہ خود بھی کسی کچے چاول ہی کی طرح لہرا کر زمین پر گر گئیں۔ سکینہ خالہ اور شکورن بوا دونوں ہی بوکھلا کر ان کی طرف دوڑیں لیکن وجو آپی اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھیں۔ سکینہ خالہ تو بالکل ہی حواس باختہ ہو کر دھاڑیں مار کر رونے لگیں لیکن شکورن بوا نے اپنے ہوش وحواس کا دامن تھامے رکھا اور بھاگ کر باہر موجود کسی محلے دار کو بڑے ہسپتال کے لیے رکشہ لانے کا کہا۔ جانے ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ خود انہوں نے ہی آپی کو اٹھا کر رکشے میں ڈالا اور ہسپتال کی ایمرجنسی تک پہنچا کر ہی دم لیا، ورنہ ڈاکٹروں کے بقول کچھ دیر مزید ہو جاتی تو وجو آپی کومہ میں چلی جاتیں۔ تین دن اور تین راتیں ڈاکٹر صبح شام ان کے سرہانے کھڑے انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتے رہے جب شکورن بوا وجو آپی کو لے کر ہسپتال کی جانب دوڑ پڑیں تھیں تبھی غیاث چچا کے لیے بھی پیغام بر دوڑا دیا گیا تھا اور چند ہی لمحوں میں غیاث چچا بھی ایمرجنسی میں آن موجود ہوئے تھے اور تب سے لے کر اگلے تین دن تک وہ اور سکینہ خالہ بنا پلک جھپکے ان کے کمرے کے باہر بیٹھے رہے۔ میں اور رابعہ اپنے تمام دوستوں سمیت تینوں دن صبح سے شام تک وہیں ان کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر بھاگ کر کوئی کام کر سکیں۔ ایک وقت درمیان میں ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا کہ اب کوئی دوا اثر نہیں کر سکتی لیکن جہاں دوا کا اثر ختم ہو رہا ہوتا ہے وہیں سے دعا اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے اور پھر وجو آپی کے لیے دعاؤں کی کون سی کمی تھی۔ محلے کے ہر گھر میں چھوٹے، بڑے، بوڑھے سبھی ان کے لیے جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے اور آخر کار اس بار تقدیر کو ہماری بے بسی پر رحم آ ہی گیا، تیسری رات ساڑھے گیارہ بجے وجو آپی نے آنکھیں کھول دیں پر لگتا تھا کہ سکتے نے ان کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی ہے۔ ان کے منہ سے صرف ایک ہی جملہ نکلا کہ وہ پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروانا چاہتی ہیں اور اس مرتبہ ان کے لہجے میں اور لفظوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ غیاث چچا بھی صرف ایک لمبی سی سانس لے کر رہ گئے۔ ویسے بھی پچھلے پورے ایک ہفتے سے ان کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ جتنی مرتبہ بھی انہوں نے طاہر بھائی کے بوڑھے باپ کی مزید جھکی ہوئی کمر دیکھی یا بوڑھی ماں کی آہیں اور سسکیاں سنیں، ہر بار انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ طاہر بھائی کے ان بے بس والدین کے مجرم ہیں، ایک ایسا مجرم جو اپنی اولاد کی بہتری کے لیے خود غرض بن چکا ہو۔ اتنے دن سے وہ ٹھیک طرح سے طاہر بھائی کے ابا سے نظر بھی نہیں ملا پائے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ملک ریشم اپنے عملے سمیت ہسپتال میں موجود تھا۔ اس نے غیاث چچا کو بتایا کہ کل صبح سے اعلیٰ حکام کے سامنے اپنی فائنل رپورٹ اور اس جواب طلبی کا جواب داخل کروانا ہے جو اتنے دن تک تفتیش آگے نہ بڑھنے کے سبب محکمے کی طرف سے اسے جاری کی گئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کل محکمہ دباؤ کے تحت اسے ملازمت سے عارضی طور پر معطل بھی کر دے۔ غیاث چچا نے انہیں بتایا کہ اب اس بات کی نوبت نہیں آئے گی۔ ان کی بیٹی اپنا بیان دوبارہ سے ریکارڈ کروانا چاہتی ہے، انہوں نے ملک ریشم سے اس بات کی معافی بھی مانگی کہ اس سے پہلے انہوں نے خود وجو کو پولیس کو ٹھیک بیان دینے سے منع کیا تھا۔ ملک ریشم نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی کہ وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ گیا تھا لیکن اگر وہ بھی غیاث چچا کی جگہ ہوتا تو بالکل وہی کرتا جو غیاث چچا نے کیا تھا۔

اس نے فوراً ہی منشی کو اشارہ کیا کہ وہ آپی کے بیان سے پہلے چند سطریں احتیاطاً مزید جوڑ لے کہ پہلا والا بیان چونکہ صدمے کی حالت میں دیا گیا تھا لہٰذا اس وقت ذہنی دباؤ کے تحت کچھ اہم باتیں رہ گئی تھیں جن کا اندراج بے حد ضروری تھا لہٰذا جو اس دوسرے بیان میں شامل کی جا رہی ہیں۔ ملک ریشم نے اپنی نظروں کا زاویہ کچھ ایسا رکھا کہ وہ آپی کو اپنی گزشتہ غلط بیانی پر زیادہ شرمندگی نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں بیان درج ہو گیا اور ملک ریشم نے وہ پوری رات اگو کے مکنہ ٹھکانوں پر چھاپے مارتے ہوئے گزاری۔

وہ آپی کا وہ بیان شاید ان کی زندگی میں آخری ایسا موقع تھا جب انہوں نے ایک ساتھ اتنی ساری باتیں کرنے کے لیے اپنے لب کھولے تھے۔ اس کے بعد وہ آپی کو ایسی چپ لگی کہ لوگ ان کی آواز سننے کو ترس بھی جاتے تب بھی ان کے منہ سے ہاں یا نہ کے علاوہ کچھ نہ نکلتا۔ غیاث چچا اور سکینہ خالہ یوں جوان اور اکلوتی بیٹی کو دھیرے دھیرے اور پل پل مرتے دیکھ، خون کے گھونٹ پیتے لیکن کچھ کر نہ پاتے۔

وہ آپی کے بیان کے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر ہی ملک ریشم نے اگو کو ریلوے اسٹیشن کے ڈاکیارڈ میں پرانی اور متروکہ بوگیوں کے گودام میں ایک پرانی بوگی میں چھپے ہوئے گرفتار کر لیا۔ اس جگہ کی مخبری اگو کے پرانے فرنیچر کی دوکان والے ایک کاریگر نے کی تھی۔ آگے کی کہانی بہت سیدھی سی تھی۔ پولیس نے کیس مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا اور جس روز وہ آپی کی گواہی تھی اس روز پورا محلہ عدالت کے کھچا کھچ بھرے ہوئے احاطے میں موجود تھا۔ اگو نے حوالات اور جیل کے درمیانی عرصے میں بھی غیاث چچا کو دھمکانے کے لیے کچھ حربے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور گمنام خطوط وغیرہ کے ذریعے اس نے غیاث چچا کو پیغام بھجوایا تھا کہ اگر وہ آپی نے اسے عدالت میں شناخت کرنے کی ''غلطی'' کی تو ان کے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا لیکن غیاث چچا نے اس کی بکواس پر مزید کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ پہلے ہی جو کچھ بھگت رہے تھے اس سے زیادہ قسمت کی ان پر مزید ستم ظریفی کیا ہو سکتی تھی۔ ان کی سات پردوں میں پلی بڑھی، لاڈلی شہزادی آج عدالتوں کی خاک چھانتی پھر رہی تھی وہ جس کی جھلک جوان ہونے کے بعد کسی غیر نے نہیں دیکھی تھی آج اس کی خبریں شہر کے سارے اخبارات میں چھپ رہی تھیں۔ عدالت کے احاطے میں بھی اخباری فوٹو گرافروں اور رپورٹروں کا ہجوم موجود تھا۔ ایک جانب ڈاکٹروں کا جلوس کیس کی شنوائی کے لئے نعرے لگاتا عدالت کی جانب بڑھ رہا تھا اور دوسری جانب اگو کو قیدیوں کی گاڑی میں سے احاطے میں اتارا جا رہا تھا۔ اگو نے گاڑی سے قدم باہر رکھے تو اس کی پہلی نظر دور برآمدے میں کھڑی وہ آپی اور غیاث چچا پر پڑی جو ہم سب دیگر محلے داروں کے ساتھ ہی عدالت آئے تھے۔ اگو کی نظروں سے ہی اس کے ارادے صاف ظاہر ہو رہے تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک وہ آپی کو گھر نہیں پایا کیونکہ سنتری نے اس کی ہتھکڑی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اسے کھینچتے ہوئے عدالت کے اندر لے گئے۔ کچھ ہی دیر میں کیس لگ گیا اور دفتری نے عدالت کے دروازے سے دربان کو آواز لگانے کا اشارہ کر دیا۔

وہ آپی عدالت میں داخل ہوئیں تو وہ لڑکھڑا رہی تھیں اور غیاث چچا نے انہیں تھام رکھا تھا۔ غیاث چچا کا کوئی بھی سگا یا رشتہ دار عدالت ان کی ہمت بندھانے نہیں آیا تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان کی ''عزت'' کو یوں عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے اور رلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنی بیٹیوں کا ''مستقبل'' بچانے کے لیے غیاث چچا کے گھرانے کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔

مخالف وکیل نے جرح شروع کی تو وہ آپی نے بڑے اطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب دیا۔ وکیل نے انہیں پریشان کرنے کے لیے

ان پر کچھ غلیظ قسم کے الزامات بھی لگائے کہ ان کا دراصل پہلے ہی سے طاہر بھائی سے کوئی چکر چل رہا تھا جبکہ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اگو سے بھی ''دوستی'' گانٹھ رکھی تھی لہٰذا اس بات پر دونوں کا پہلے بھی جھگڑا ہوا تھا اور پھر دوسرے جھگڑے میں بات اتنی بڑھ گئی کہ اگو نے طیش میں آ کر چاقو نکال لیا اور پھر جو کچھ بھی ہوا وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

مجھے اس اگو کی دم وکیل پر اس کی یہ سب بکواس سن کر شدید غصہ آیا۔ میں اور راجہ ہجوم کی وجہ سے اندر عدالت کے ہال میں گھس نہیں پائے تھے لہٰذا ہم دونوں دروازے پر ہی لوگوں کی ٹانگوں میں سے سر نکالے کھڑے تھے۔ میں نے راجہ کو دھیرے سے کہا کہ اس وکیل کے بچے کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا پڑے گا جو انہوں نے شکورن بوا کے ساتھ کیا تھا لہٰذا اگلی پیشی پر وہ نتھو سے کہہ کر رسی بم ساتھ ہی لیتا آئے۔

اس سے پہلے وکیل نے ڈوآپی کو اس طرح گھیرنے کی کوشش کی تھی کہ دراصل اگو تو اس رات وہاں تھا ہی نہیں اور انہیں اندھیرے کی وجہ سے مغالطہ ہوا ہوگا کہ وہ اگو ہے لیکن ڈوآپی نے بڑے سکون اور اعتماد سے بھری عدالت میں اگو کی طرف ہاتھ اٹھا کر جج کو بتا دیا تھا کہ وہ حملہ آور کے اتنے نزدیک کھڑی تھیں کہ رات کے اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اگو کو طاہر بھائی پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ لہٰذا عدالت کو ماننا ہی پڑا کیونکہ چشم دید گواہ کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مخالف وکیل نے جب یہ پینترا چلتے نہیں دیکھا تو پھر اس نے بھری عدالت میں ڈوآپی کے کردار پر کیچڑ اچھال کر عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ غیاث چچا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے اور وہ اپنی لاڈلی کی رسوائی کا تماشہ دیکھتے رہے لیکن ڈوآپی کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ بڑی ہمت سے وکیل کے ہر حملے کا جواب دیتی رہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ اگو کے لفنگے دوستوں نے اپنی اور اگو کی حرام کی کمائی سے یہ بوڑھا ''گدھ نما'' وکیل کیا تھا جس کی وجہ شہرت ہی اس کی بدنامی تھی۔

اس وکیل نے محلے میں گھوم پھر کر کہیں نہ کہیں سے الٹی سیدھی خبریں بھی جمع کر لی تھیں اور اس نے اگلی پیشی پر شکورن بوا کو بھی گواہی کے کٹہرے میں بلا لیا۔ سارے محلے دار حیرت سے اچھل ہی تو پڑے کیونکہ سب جانتے تھے کہ شکورن بوا کی زبان پر خود ان کا اپنا کنٹرول نہیں رہتا لہٰذا اب تو کیس بگڑا کہ بگڑا..... گدھ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ اگو اور طاہر بھائی کی پہلے بھی ایک لڑائی ڈوآپی کی وجہ سے ہو چکی تھی، جس میں طاہر اور اگو دونوں ہی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس وقت قریب سے گزرتے ہوئے شکورن بوا نے ان کی کیا باتیں سنی تھیں۔ ہم سب دم سادھے شکورن بوا کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ شکورن بوا کی ذرہ سی بھی غلطی سے پورے کیس کا رخ پلٹ سکتا تھا۔

شکورن بوا نے اطمینان سے کلے میں رکھا پان لگایا اور پھر جو انہوں نے گدھ وکیل کے لتے لینے شروع کیے تو جج بھی انہیں خاموش نہیں کروا سکا۔ انہوں نے وکیل سے کہا کہ اسے شرم آنی چاہیے ایک شریف زادی پر یوں کیچڑ اچھالتے ہوئے۔ کیا اس کے گھر میں اس کی اپنی ماں بہنیں نہیں ہیں؟ جو وہ دوسروں کی بیٹیوں کے لیے ایسی باتیں کرتا پھرتا ہے.....؟ بوا نے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہ سنی نہ دیکھی کیونکہ ڈو آپی کی پاکیزگی کی گواہی زمین تو کیا سورج، چاند، ستارے بھی دے سکتے ہیں اور رہی بات اگو کی تو وہ ڈوآپی کے علاوہ محلے کے ہر آتی جاتی لڑکی اور عورت کی تمیز کیے بغیر ان پر فقرے کستا رہتا تھا اور اس کی وجہ سے محلے کی ہر شریف زادی کا جینا محال ہو چکا تھا۔ انہوں نے جج سے درخواست کی بلکہ

اسے حکم دیا کہ اُگو جیسے موذی جانور کو تو ایک بار نہیں، سو بار پھانسی کی سزا دینی چاہیے۔

بڑی مشکل سے جج کے اشارے پر عدالت کے ہرکارے انہیں گواہی کے کٹہرے سے اتار کر نیچے لے گئے ورنہ شکورن بوا نے تو طے کر ہی لیا تھا کہ آج ہی جج سے فیصلہ لے کر واپس گھر جائیں گی۔ سارے محلے کی آنکھوں میں شکورن بوا کے لیے محبت کے آنسو تھے۔ جانے ان کی یہ کایا پلٹ کب کیوں اور کیسے ہوگئی تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے اس ایک بیان پر محلے والوں نے ان کی پچھلی ساری زندگی کی خطائیں معاف کر دی تھیں۔ چند پیشیاں اور چلیں، گدھ وکیل نے اپنی جانب سے پورا زور لگایا لیکن آخر کار عدالت نے اپنا فیصلہ اُگو کے خلاف سنا دیا۔ اُگو کو عدالت کی جانب سے موت کی سزا سنا دی گئی۔ آخری دن تک اُگو عدالت میں اکڑے کھڑا رہا تھا لیکن جج کے منہ سے اپنے لیے موت کی سزا کے الفاظ سن کر آخر کار اس کے قدم بھی ڈگمگا ہی گئے۔ اسے شاید ڈھوآپی کی جانب سے اتنی ہمت اور بہادری کی توقع نہیں تھی نہ ہی کبھی اس نے محلے داروں کی جانب سے اس قدر استقامت کی امید کی ہوگی۔ بہر حال عدالت نے انصاف کے پلڑے میں اس کی موت ڈال کر طاہر کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا جب تک یہ کیس عدالت میں چلتا رہا اور ڈھوآپی کی عدالت میں پیشیاں ہوتی رہیں وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹی رہیں اور کسی نے کبھی انہیں پریشان یا اف تک کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جس دن عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اس دن گھر آتے ہی وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہ روئی ہوں گی۔ سکینہ خالہ، شکورن بوا، میری امی خالہ عزیزہ اور استانی خالہ سبھی انہیں تسلی دیتے دیتے خود بھی ایک ساتھ ہی رو پڑیں۔ ہم باہر کھڑے بچوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے طاہر بھائی کی آج ہی موت ہوئی ہو۔

اس کے بعد ہم سب نے ڈھوآپی کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ میری چھٹیاں ختم ہونے میں بس چند دن ہی رہ گئے تھے، میں گھنٹوں ان کے پاس ان کے کمرے میں یا شام کو چھت پر زبردستی اپنے ساتھ لے جا کر بیٹھا رہتا۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اکیڈمی کے جھوٹے سچے قصے سناتا رہتا اور وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی ہوں ہاں کرتی جاتیں۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ میں انہیں بتا پاتا کہ اس دفعہ میرا واپس اکیڈمی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اب میں ان کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اوپر سے ابا نے بھی جیسے چپ رہنے کی قسم ہی تو کھا رکھی تھی۔ بھول کر بھی انہوں نے اپنے اور پرنسپل صاحب کے درمیان مجھے گھر واپس بھجوانے کے معاہدے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے نتیجے کو دیکھ کر وہ پھسل گئے تھے جو گزشتہ ہفتے ہی بند لفافے میں اکیڈمی سے موصول ہوا تھا۔ میں ٹھیک ٹھاک نمبروں سے پاس ہو گیا تھا اور کوئی موقع ہوتا تو میں اپنی اس کامیابی پر اپنا سر پیٹ لیتا کیونکہ مجھے پوری امید تھی کہ میں فیل ہو جاؤں گا اور اکیڈمی سے ایک سرخ لفافہ ابا کے نام آئے گا جس میں درخواست کی گئی ہوگی کہ خدا کے لیے اپنے لاڈلے کو وہیں گھر پر روک لیں کیونکہ آپ کا صاحب زادہ کلاس میں فیل ہو گیا ہے لیکن میری امیدوں کے برعکس میں پاس ہو گیا تھا لہٰذا میں اب اگلی کلاس میں جانے کا حق دار تھا اور میرے پاس اکیڈمی واپس نہ جانے کا کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ اس وقت مجھے پرنسپل صاحب کی ''تمام سازش'' سمجھ میں آنے لگی تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے مجھے ایک سال اکیڈمی میں گزارنے پر نہ صرف راضی کیے رکھا تھا بلکہ جمیلن اور شیرل کی مدد سے مجھے اس قابل بھی بنا دیا تھا کہ اس چھوٹے سے شہر کے ایک اردو میڈیم سکول کا طالب علم اکیڈمی کے آکسفورڈ سٹینڈرڈ کے مشکل ترین کورس کے امتحان کو نہ صرف پاس کر گیا تھا بلکہ اس نے اپنے پہلے بڑے امتحان میں اچھے خاصے کیڈٹس کو پیچھے بھی چھوڑ دیا تھا۔ میرے

رزلٹ کے ساتھ پرنسپل صاحب کی طرف سے ابا کے لیے ایک مبارکباد کا خط بھی تھا۔ جس کے بارے میں ابا نے مجھے اس وقت نہیں بتایا تھا۔ بہر حال اس وقت جب ابا نے میرا رزلٹ مجھے لا کر دیا تو میرے ذہن میں تب یہ ساری کھچڑی پکنا شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور رزلٹ ملتے ہی میرے ذہن میں صرف ایک ہی دھن سوار ہو گئی تھی کہ کس طرح جلد از جلد جا کر فخو آپی کو اپنے پاس ہونے کی خبر سنا سکوں اور انہیں اپنا رزلٹ کارڈ دکھا کر ان کے چہرے سے صدیوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کی ایک جھلک پانے میں کامیاب ہو سکوں۔

لہٰذا دوسرے ہی لمحے میں اپنے رزلٹ سمیت فخو آپی کے گھر ان کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ اپنی پرانی کتابوں میں سے کوئی رجسٹر نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ وہی نارنجی رنگ کا بڑا سا رجسٹر تھا جس میں طاہر بھائی انہیں ٹیوشن دیتے وقت مختلف نوٹس لکھا کرتے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے رجسٹر دوبارہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور مجھے اندر داخل ہونے میں جھجکتا دیکھ کر انہوں نے خود آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے جلدی سے اپنا رزلٹ کارڈ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور پھر واقعی قدرت نے اپنا کرشمہ کر دکھایا۔ ہفتوں بعد میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کی ہلکی سی چمک دیکھی اور انہوں نے رزلٹ پڑھتے ہی مجھے ڈھیروں مبارکباد بھی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اکیڈمی کی ایک سال کی سختیاں اور صعوبتیں جھیلنے کا صلہ قدرت نے مجھے ایک پل میں ہی دے دیا ہو۔ اس لمحے انہوں نے مجھ سے ایک ایسی فرمائش بھی کر ڈالی جس نے میرے اکیڈمی واپس جانے پر ہمیشہ کے لیے مہر ہی ثبت کر دی۔ وہ جو آپی نے میرا رزلٹ کارڈ بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولیں۔

"آدی..... میرے لیے اکیڈمی سے اپنی یونیفارم میں سلامی والی بڑی سی تصویر بھیجو گے نا....."

میں نے جلدی سے یوں سر ہلایا جیسے مجھے اگر کچھ دیر ہو گئی تو وہ جو آپی پھر سے بولنا بھول جائیں گی۔ جانے کتنے ہفتوں بعد آج ان کے منہ سے میں نے کوئی بات کوئی فرمائش سنی تھی میرے بس میں ہوتا تو وہیں محلے میں ہی یونیفارم میں تصویر کھچوا کر انہیں دے جاتا۔

اگلے ہی ہفتے جب میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں ٹرین میں بیٹھا ایک مرتبہ پھر اپنے شہر اپنے صوبے سے ہزاروں میل دور واقع اکیڈمی جوائن کرنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ ہم انسان اپنے آنے والے دنوں اور مستقبل کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنا رکھتے ہیں، صدیوں کی منصوبہ بندی کر کے بیٹھے رہتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے اگلے پل کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے ہمارا اٹھنے والا قدم ہمیں کس جانب لے کر جائے گا۔ میں نے کیا سوچا تھا کہ اکیڈمی کا دوبارہ کبھی رخ بھی نہیں کروں گا لیکن آج میں اپنی مرضی سے گاڑی میں بیٹھا یہ سفر طے کر رہا تھا۔ کس کے لیے.....؟ جی ہاں..... پھر اپنی فخو آپی کے لیے جنہیں اکیڈمی کے ماحول میں میری یونیفارم میں سلامی والی ایک بڑی سی تصویر چاہیے تھی۔

پہلی بغاوت

اکیڈمی میں میرا پہلا سال جتنا مشکل اور دھیمی رفتار سے گزرا تھا، اگلا سال اسی قدر تیز لیکن سہل گزر رہا تھا۔ اب ہم سب کیڈٹس ایک کلاس سینئر ہو گئے تھے اور ہم نے کورس میں رونا چھوڑ دیا تھا لیکن اکیلے میں کبھی کبھی "دل" ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ میرے اندر بغاوت کے جراثیم پلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر لمحے وجوآپی کا دھیان لگا رہتا تھا کہ وہ کیسی ہوں گی؟ کیا کر رہی ہوں گی؟ ایسے میں کیڈٹ کالج کی روٹین اور ڈسپلن مجھے بہت گھلتا تھا، ایک ایسی ہی اداس شام میں ڈارمیٹری میں بیٹھا اپنے لانگ پریڈ شوز پالش کر رہا تھا کہ مجھ سے ایک جماعت سینئر، نویں جماعت کا ایک کیڈٹ وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے اپنے جوتے پالش کرتے دیکھا تو کچھ ہی دیر میں اپنے پریڈ شوز بھی اٹھا لایا اور میرے سامنے پھینک دیے کہ ان پر بھی دو ہاتھ مار دوں۔ پچھلے سال ہم سب نے ایسی بہت سی مشقیں ہنسی خوشی سرانجام دی تھیں لیکن اس وقت ایک تو میرا موڈ بہت خراب تھا اور میں وجوآپی کی یاد میں اداس بھی بہت تھا لہٰذا میں نے اسے جواب دیا کہ میں اس وقت اپنے جوتے ہی پالش کر لوں تو میرے لیے بہت ہو گا لیکن وہ اپنے جوتے چھوڑ جائے میں شام تک انہیں بھی پالش کر دوں گا لیکن ان جناب کا تو پارہ ہی آسمان پر چڑھ گیا۔ فوراً تڑک کر بولا۔

"How dare you refuse me?" اور بڑی نخوت سے اپنے سینئر ہونے کا رعب جھاڑتے ہوئے یہ کہتے ہوئے مڑ گیا کہ دس منٹ میں اگر اس کے جوتے پالش نہ ہوئے تو پھر میں خود ہی باہر میدان میں قلابازیاں کھانے کے لیے حاضر ہو جاؤں۔ جانے اس ایک لمحے میں مجھے کیا ہوا۔ میرا خود پر سے قابو ایک دم سے ختم ہو گیا۔ وہ لڑکا ابھی ڈارمیٹری کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا۔ میرے ہاتھ میں جوتے پالش کرنے کا جو برش پکڑا ہوا تھا میں نے پوری قوت سے وہی برش اس کا نشانہ لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار "کھٹ" کی آواز سنائی دی اور برش سیدھا جا کر اس کی گدی پر لگا اور دوسرے لمحے ہی وہ کیڈٹ بھائیں بھائیں کر کے روتا ہوا ہاؤس ماسٹر کے گھر کی جانب بھاگ رہا تھا۔

اسفر اور فیصل جو باہر راہداری میں ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے، اس نویں جماعت کے کیڈٹ کو یوں روتے ہوئے بھاگتے دیکھ کر جلدی سے اندر میری جانب بھاگے اور مجھ سے ماجرا پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اسے برش دے مارا ہے۔ فیصل اور اسفر کا رنگ اڑ گیا اور انہوں نے فوراً مجھے مشورہ دیا کہ میں اس "قاتلانہ حملے" کے اثرات سے بچ نہیں پاؤں گا لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن بھاگ کر جاتا کہاں؟ چاروں طرف تو ان کے پہرے لگے ہوئے تھے۔ ابھی میں فرار کے امکانی طریقوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں ہاؤس ماسٹر صاحب سینئر کیڈٹ سمیت بدحواس سے ڈارمیٹری میں داخل ہوئے۔ نویں جماعت کے کیڈٹ نے دور ہی مجھے دیکھ کر یوں اپنی انگلی اٹھائی جیسے کہہ رہا ہو کہ "یہی ہے مجھ پر قاتلانہ حملے کا ملزم....." کچھ ہی دیر میں مجھ پہ فرد جرم لگائی جا چکی تھی اور میری سزا بھی سنا دی گئی۔ رات کو نائٹ فالن کے وقت تمام

ہاؤس کے سامنے مجھے تین بار کیننگ Caning کی سزا سنائی گئی۔ ہاؤس ماسٹر کے جانے کے بعد میری ساری ڈارمیٹری نے فرداً فرداً مجھ سے تعزیت کی۔ رات کو نائٹ فالن کے وقت ہاؤس ماسٹر صاحب ایک نازک سا بید اٹھائے تشریف لے آئے۔ ایسے بید میں نے اور راجہ نے پرائمری اسکول میں شرارتوں پر بہت بار کھائے تھے۔ یہ بید تو ان بیدوں کی "بہن" لگ رہا تھا۔ تمام ہاؤس کے سامنے عبرت کے لیے میری فرد جرم پڑھ کر سنائی گئی اور پھر ہاؤس ماسٹر صاحب نے میری پشت کے نیچے تین بید رسید کیے اور میری سالانہ رپورٹ میں بھی میری اس "کھلی بدمعاشی" کا ذکر کرنے کا حکم صادر کیا۔

اس تمام "تقریب" کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ نویں جماعت کے کیڈٹس نے مجھ پر رعب جمانے کی کوششیں بالکل ہی ترک کر دیں۔

جونیئرز نے اور میری کلاس نے مجھے "بھائی" کیڈٹ کا خطاب دے دیا۔ "بھائی" ان کیڈٹس کو اعزازی طور پر کہا جاتا تھا جو اس قسم کے کارنامے سرانجام دے کر پی۔ ٹی آفیسرز کی بلیک لسٹ میں شامل ہو جاتے تھے۔ ایسے کیڈٹس کے لیے خاصی مراعات بھی غیر اعلانیہ طور پر میسر کر دی جاتی تھیں مثلاً کلاس کی ڈبریک میں کوئی دوسرا کیڈٹ ان کے لیے لائن میں لگ کر بریک فوڈ لے آتا۔ میس کی لائن میں بھی اس کے ہم جماعت اسے جہاں وہ کھڑا ہونا چاہتا وہاں اسے جگہ فراہم کر دیتے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہیلن کو جب میری اس حرکت کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور اس نے مجھے اس سینئر کیڈٹ سے سوری کرنے کا بھی کہا۔ شیرل نے کہا "بہت اچھا کیا....." حالانکہ اب میری کانونٹ کے احاطے والی تربیت ختم ہو گئی تھی لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی بہانے سے ہفتے میں ایک بار اپنی ان دونوں "سہیلیوں" سے ملنے چلا ہی جاتا تھا۔ ہیلن اور شیرل کو میں نے وجو آپی پر بیتنے والی آفت کی ساری تفصیلات بھی بتائی تھیں جسے سن کر وہ دونوں بہت افسردہ ہو گئی تھیں۔ ہیلن کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے رومال سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھتی رہی۔

اکیڈمی آتے ہی دوسرے روز میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے ہاؤس کے فوٹو گرافر سے کہہ کر اپنی پریڈ کی سلامی کے دوران ایک تصویر کھچوا کر اسے خوب بڑا کروایا اور کیڈٹ کالج کے چھوٹے سے پوسٹ آفس میں جا کر اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کر آیا۔ دوسرا خط اسی دن میں نے راجہ اور اپنے دوستوں کے نام پوسٹ کیا جس میں میں نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ہر لمحے وجو آپی کا دھیان رکھیں گے اور پل پل کی خبر مجھے خطوط کے ذریعے پہنچاتے رہیں گے۔ راجہ کے خطوط آتے رہتے تھے جن سے وجو آپی کے بارے میں صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا ہے اگو کو جس دن عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی اس دن کے بعد سے کسی نے بھی وجو آپی کو گھر کے باہر کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور ان کی وہ مدھری مسکان بھی طاہر بھائی کے ساتھ ہی شاید منوں مٹی تلے دفن ہو گئی تھی۔ اب ہر لمحے ان کی پلکیں بھیگی بھیگی سی رہتی تھیں اور انہوں نے بول چال بھی تقریباً ترک کر دی تھی۔ بس سارا دن اپنے کمرے میں خود کو بند رکھتی تھیں اور گھر آنے والے مہمانوں سے بھی ملنے سے احتراز کرتی تھیں۔ راجہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ پورے محلے میں اس بات کے چرچے بھی ہو رہے ہیں کہ اگو کے وکیل نے اس کی سزا کے خلاف بڑی عدالت میں اپیل دائر کر دی ہے۔ اگو کے گھر والوں نے خصوصی طور پر طاہر بھائی کے گھر جا کر ان کے ماں باپ سے اپنے بیٹے کے گناہ عظیم کی معافی مانگی اور غیاث چچا کے گھر بھی گئے تھے اور پھر انہوں نے ہمارا محلہ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ لوگ شہر کی پرلی جانب چھاؤنی کی آخری حد کے قریب بنے ہوئے کوارٹرز میں رہتے تھے لیکن بالا اب بھی روزانہ شام کو اپنے دوستوں سے ملنے اپنے ابا کی پرانی سائیکل پر آتا تھا۔ بالے نے بتایا کہ اس کی

ماں بھی اب مستقل بستر سے لگ چکی تھی اور اس کی بہن کا رشتہ بھی اگو کی سزا کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے سسرال والوں نے ایک غنڈے اور قاتل کی بہن سے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ پڑھ کر مجھے بالے کی بہن گڈی پر بے حد ترس آیا۔ وہ فوآپی ہی کی ہم عمر اور ہم جماعت بھی تھی اور ہم سب دوستوں کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ ان کے گھر میں جب بھی لسی بنتی تھی تو وہ ہمیشہ میرے لیے سلور کا ایک بہت بڑا سا گلاس بالے سے بھی چھپا کر رکھ دیتی تھی اور جب میں شام کو بالے کو کھیل کے لیے بلانے جاتا تو تب مجھے چپکے سے وہ گلاس پکڑا دیتی۔ جانے اتنے اچھے گھرانے میں اگو جیسا شیطان صفت انسان کیسے پیدا ہو گیا تھا جس کے کرموں کا پھل اس کے تمام گھر والوں کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ آصف بھٹی جسے ہم "پیٹ کی بھٹی" بھی کہتے تھے کیونکہ اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا تھا، منہ لٹکائے ہوئے ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔ فیصل نے اس سے تکلیف پوچھی تو پتہ چلا کہ آج چونکہ منگل ہے اور گوشت کا ناغہ ہے لہٰذا ہمیں رات کو میس میں سبزی اور دال کھانے کو ملے گی۔ بھٹی کو دونوں چیزیں سخت ناپسند تھیں اور اس سے رات کو بھوک بھی بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اسفر جو دور بیٹھا اس کی ساری رام کہانی سن رہا تھا اس نے چٹکی بجا کر کہا کہ اس کے پاس اس پریشانی کا ایک حل موجود تو ہے لیکن اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ بھٹی نے کہا کہ وہ بہتر کھانا کھانے کے لیے بڑی سے بڑی ہمت دکھانے کے لیے تیار ہے، تب اسفر نے سرگوشیوں میں ہمیں بتایا کہ اکیڈمی سے باہر مرکزی گیٹ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھپر ہوٹل موجود ہے جو کچھ ہی دیر میں تازہ مرغی ذبح کر کے چند منٹوں میں اسے فرائی کر کے دے سکتا ہے۔ اسفر نے اس مرتبہ چھٹیوں سے واپسی پر اپنی گاڑی میں آتے ہوئے چند لمحے وہاں رک کر ٹھنڈا پینے کے بہانے ہوٹل والے سے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ چھپر ہوٹل کے مالک نے ہی اسفر کو بتایا تھا کہ سینئر کیڈٹس کبھی کبھار چھپ چھپا کر رات کو وہاں کھانا کھانے آ جاتے ہیں۔ مرغی فرائی کا نام سنتے ہی بھٹی کے منہ سے لگاتار رال بہنا شروع ہو چکی تھی اور وہ ہم سب کو ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ہم سب بھی بنا ذبح کیے ہوئے مرغے ہوں لیکن واقعی اس کام کے لیے بے حد ہمت کی ضرورت تھی کیونکہ چاروں طرف پیٹی آفیسرز اور حفاظتی عملے کا پہرا لگا ہوتا تھا اور پھر رات کو اکیڈمی سے نکلنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں ہم سب کے ہاتھوں میں ہمارے بیگ ہوتے اور ہمیں باعزت طور پر گھر کے لیے رخصتی کا پروانہ ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا۔

لیکن اسفر کے نمکین اور چٹ پٹی مرغی فرائی کا نقشہ کچھ اس خوب صورتی سے اور مرچ مصالحے لگا کر ہمارے سامنے پیش کیا تھا کہ ہم چاروں ہی کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ بالآخر فرض اور محبت میں جیت مرغی کی محبت کی ہی ہوئی اور ہم نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے پاس کل ایک گھنٹہ بیس منٹ کا وقت تھا۔ اگر ہم رات کے کھانے پر میس کی طرف جانے کی بجائے چھپر ہوٹل کی جانب دوڑ لگاتے تو رات کے کھانے کے بیس منٹ اور پھر اس کے بعد رات کی دوسری پریپ کی سیٹی بجنے تک اور رات کے کھانے کے بعد کا درمیانی وقت جوتی۔ وی وغیرہ دیکھنے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ بنتا تھا..... اس وقت کے ختم ہونے سے پہلے ہمیں ہر حال میں واپس اپنے کمرے میں موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ پریپ کی سیٹی بجتے ہی ہاؤس ماسٹر صاحب بذات خود ہر بیرک کا دورہ کرتے تھے اور کیڈٹس کو پڑھتے ہوئے دیکھ کر ہی واپس جاتے تھے۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ وہاں بیٹھ کر کھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم مرغی "پارسل" کروا لیں گے اور رات کو لائٹ آف کے بعد اپنا "ڈنر" کریں گے۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی اپنی جگہ قائم تھا یعنی چار دیواری کا پہرہ.....اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ تھا کہ دو گاڑیاں جن میں ڈیوٹی پی۔او اور دوسرا عملہ سوار ہوتا ہے۔ مغرب کے بعد سے ہی کیڈٹ کالج کی چار دیواری کے گرد گشت (Petroling) شروع کر دیتی ہیں، چار دیواری کے گرد کھڑے محافظوں کے علاوہ ہمیں ان گاڑیوں کی روشنی کے دائرے میں آنے سے بھی بچنا تھا لیکن اس وقت آصف بھٹی کے ساتھ ساتھ ہمارے پیٹوں کی بھٹی بھی صرف بھنی ہوئی مرغی مانگ رہی تھی اور ہمارے ذہن کسی بھی قسم کے خطرے کو محسوس کرنے سے قاصر تھے۔

آخر خدا خدا کر کے پہلی پریپ ختم ہونے کی سیٹی بجی اور کیڈٹس اپنے ہاسٹلز سے نکل کر قطاروں میں میس کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم چاروں دانستہ پیچھے رہ گئے۔ میس میں ماشاءاللہ اس قدر ''رونق'' اور بھیڑ ہوتی تھی کہ کسی کا ہم چاروں کی غیر حاضری کو نوٹس کرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ویسے بھی کیڈٹس اور کہیں غیر حاضر ہوں تو ہوں پر میس سے غیر حاضر ہونے کی غلطی کوئی نہیں کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میس کے سامنے والے گھاس کے بڑے سے فٹبال گراؤنڈ میں صرف میں، اسفر، فیصل اور آصف بھٹی کھڑے رہ گئے۔ ہم چاروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر پوری رفتار سے پریڈ گراؤنڈ کی جانب دوڑ لگا دی۔ فیصل نے بتایا تھا کہ پریڈ گراؤنڈ کے گرد لگی اونچی خاردار تار اس نے چند جگہوں سے اندر کی جانب مڑی ہوئی دیکھی ہے اور ایک آدھ جگہ تو باقاعدہ ایسا لگتا ہے کہ وہاں پر ہم سے پہلے بھی کیڈٹس نے قسمت آزمائی کی ہے، کچھ ہی دیر بعد ہم کیمپس کی جگمگاتی روشنیوں سے دور نکل آئے اور اب پہلی مرتبہ ہمیں آنے والے خطرے کے خوف نے چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی ہم اندھیرے میں کچھ دور ہی چلے تھے کہ اچانک ہی بھٹی زور سے چلایا۔ ''کون ہے.....؟'' ہم تینوں بھی خوف سے اچھل پڑے۔ پتہ چلا کہ بھٹی اپنے ہی سائے کے اچانک سامنے آنے سے ڈر گیا تھا۔ فیصل نے ایک زوردار چپت بھٹی کے سر پر رسید کی اور اسے چپ چاپ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں ہم خاردار تار کے قریب لگی بڑی بڑی جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے چند لمحے اپنا سانس درست کیا۔ اسفر جس نے بھنی ہوئی مرغی کا سپنا سب سے پہلے ہمیں دکھایا تھا، اس مرحلے پر خود اس کے اپنے حواس جواب دے گئے اور وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا ''یار میری تو ساری بھوک ہی اڑ گئی ہے، میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں۔'' اس بار چپت کھانے کی باری اسفر کی تھی اور مارنے والا ہاتھ میرا تھا۔ کچھ دیر ہم چاروں دم سادھے بیٹھے حالات کا جائزہ لیتے رہے، چند لمحوں بعد پہلے دائیں جانب سے اور پھر بائیں جانب سے دو گاڑیاں مخالف سمتوں میں گزر گئیں۔ پہلی گاڑی کے اندر بخشو سی۔پی۔او کو ہم سب نے خود اپنی آنکھوں سے بیٹھے دیکھا اور ہمارا رہا سہا دم بھی جاتا رہا۔ اتنے میں اچانک کسی دوسری جانب سے کسی محافظ نے زوردار سیٹی بجائی اور ہم سب کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ میں نے اس وقت پر اور اس گھڑی پر لعنت بھیجی جب ہم نے اسفر کی باتوں میں آ کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے کہ آس پاس کوئی محافظ تو نظر نہیں آ رہا۔ کافی دیر تک ہم دور کھڑے جس ہیولے کو گارڈ سمجھ کر دیکھتے رہے بعد میں وہ کسی سوکھے درخت کا تنا نکلا۔ وقت دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا لہٰذا ہم نے بسم اللہ پڑھی اور سب سے پہلے فیصل نے خاردار تار کا پل صراط اس کے نیچے سے گزر کر پار کر لیا۔ ہم میں سے ایک نے تار کو کھینچ کر پکڑے رکھا اور باقی تین دوسری جانب سرک آئے۔ اب اس جانب صرف آصف بھٹی رہ گیا تھا۔ اس نے جب تار کے نیچے سے سرکنے کی کوشش کی تو درمیان میں ہی اٹک گیا کیونکہ وہ خود تو شاید نیچے سے نکل بھی آتا لیکن اس کی موٹی توند نے وہاں سے سرکنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہم تینوں نے کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کے اسے دوسری جانب گھسیٹ ہی لیا لیکن اس کوشش کے دوران ہمارے ہاتھوں میں اور بھٹی کی توند میں خاردار تار کے جانے کتنے کانٹے پیوست ہو گئے۔ بھٹی کو گھسیٹنے کے بعد کئی منٹ ہم چاروں ہی زمین پر لیٹے ہانپتے ہوئے اپنا سانس درست کرتے رہے۔

دور کولتار کی پکی سڑک پر رات کو گزرنے والے ٹرکوں کا قافلہ گزرتا نظر آ رہا تھا۔ ہمارا کیڈٹ کالج ایک ایسے ویرانے میں واقع تھا جہاں رات تو کیا، دن کے وقت بھی ٹرک یا بس ڈرائیور تنہا گزرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ اسفر نے جس چھپر ہوٹل کا ذکر کیا تھا وہ دو صوبوں کو آگے چل کر ملانے والی اسی مرکزی شاہراہ پر کہیں واقع تھا۔

کچھ دیر تک تو ہمیں خود بھی یقین نہیں آیا کہ ہم چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ سہی لیکن کیمپس کی سخت گیر فضا سے باہر کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ اس سرشاری کے نشے میں ہم چند لمحوں کے لیے تمام خطرات کو بھلا بیٹھے اور ہم نے آس پاس کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتے ہوئے سڑک کی جانب سرپٹ دوڑ لگا دی کچھ دیر بعد ہم روڈ پر تو پہنچ گئے لیکن یہ کیا؟ وہاں تو دور دور تک نہ تو کوئی چھپر تھا اور نہ ہوٹل۔ ہم سب نے قہر آلود نظروں سے اسفر کی جانب دیکھا۔ اسفر ڈر کر قسمیں کھانے لگا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے وہ ہوٹل یہیں کہیں دیکھا تھا۔ قریب تھا کہ ہم تینوں اپنے جوتے اتار کر اس کی تواضع شروع کر دیتے کہ اچانک کہیں دور سے ریڈیو پر گانے بجنے کی آواز سنائی دی۔ ہم چاروں کے کان کھڑے ہو گئے اور ہم نے آواز کی جانب نظریں دوڑائیں۔ پہلے ہوا بند تھی اور اب اس سمت میں چلنے لگی تھی شاید اسی لیے ہمیں دور بجتے ریڈیو کی آواز سنائی دے گئی۔ دور ہلکی سی روشنی چمکتی نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے کسی بانس وغیرہ کے اوپر لالٹین ٹانگ رکھی ہو۔ ہم نے اس طرف چلنا شروع کر دیا لیکن ہم مرکزی سڑک سے ہٹ کر کچے میں چلتے رہے کیونکہ سڑک پر کوئی بھی کیمپس کی طرف جاتی ہوئی گاڑی سے ہمیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں جب ہم روشنی کے قریب پہنچے تو اسفر کی جان میں جان آئی۔ یہی وہ چھپر ہوٹل تھا جس کے بارے میں اسفر نے ہمیں بتایا تھا۔ ہوٹل کے مالک کا نام جانو تھا اور ہم نے اسی دن اس چھپر ہوٹل کا نام "جانو شیرٹن" رکھ دیا تھا۔ جانو نے ہمیں دیکھ کر ریڈیو کی آواز کم کی اور چھپر کے باہر بچھی ہوئی چارپائی سے اتر آیا۔ ریڈیو پر نیرہ نور دعوے کر رہی تھی کہ

"اے جذبہ دل گر میں چاہوں..... ہر چیز مقابل آ جائے....."

لیکن شاید ہمارے جذبوں میں ہی کچھ کمی تھی۔ جانو نے ہمیں بتایا کہ آج تو شہر سے مرغیاں سپلائی کرنے والے ٹرک ہی نہیں آیا لہٰذا اس کے ہوٹل کے برتن خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک پل میں ہی ہمیں یوں لگا کہ ہمارے سارے سپنے کرچی کرچی ہو گئے ہیں۔ ہمارے لٹکے چہرے دیکھ کر جانو سے رہا نہیں گیا اور وہ جلدی سے بولا۔

"لیکن کیڈٹ سائیں..... انڈے تو پڑے ہیں، آپ کہو تو ابھی پیاز ٹماٹر ڈال کر زبردست کالی مرچ والے تین چار آملیٹ بنا دوں.....؟"

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ چلو مرغی نہ سہی، مرغی کے انڈے ہی سہی۔ کچھ ہی دیر میں جانو نے آملیٹ تیار کر کے فرائنگ پین (فرائی پان) ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں تندور والا تندور گرم کر کے گرم گرم پھلکے نکالنا شروع کر چکا تھا۔ ہم نے جانو سے کہا کہ ہمارے پاس یہاں

کھانے کا وقت نہیں ہے لہٰذا وہ ہمارا کھانا ''پارسل'' میں بنا دے۔ پہلے تو جانو نے وہیں انکار کر دیا کہ اس کے اس پارسل نامی کوئی ڈش ہے ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کسی چیز میں کھانے دے دے جسے ہم اپنے ساتھ کیمپس لے جا سکیں لیکن اس نے کہا۔

''سائیں..... ابھی تم ادھر سے اتنی دور یہ انڈہ فرائی لے کر جائے گا تو اس کا تو سارا مزہ کرکرا ہو جائیں گا۔ وری ادھری بیٹھ کر ''ہنٹ'' کرو نہ..... ہم نے تو روٹی بھی لگوا دیا ہے۔''

اس کے کہنے کی دیر ہی تھی کہ اگلے ہی لمحے ہم چاروں چارپائی پر بیٹھے آملیٹ پر ٹوٹ پڑے تھے، کیونکہ خود ہمارا بھوک سے بے حد برا حال تھا۔ جانو نے ہمیں ساتھ کھانے کے لیے اچار اور دو پہر کی بنی ہوئی لسی بھی دی۔ ہم کھانے پر اس طرح ٹوٹے ہوئے تھے کہ ہمیں آس پاس کا بھی کوئی ہوش نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں بھٹی نے اپنے آخری نوالے سے پورا فرائی پین صاف کرتے ہوئے وہیں چارپائی پر اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ وہ اتنا کھا چکا تھا کہ اب اس سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پیٹ کی بھوک مٹی تو ہمیں کیمپس کا خیال آیا۔ ہم نے جانو کو پیسے پکڑائے اور اپنے کیمپس کی چار دیواری کی جانب دوڑ لگائی۔ بھٹی بار بار پیچھے رہ جاتا اور ہمیں آوازیں دے کر رکنے کی دھائیاں دیتا لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اس کے بوجھ کو بھی اپنے ساتھ ڈھوتے ہوئے خاردار تار تک پہنچ ہی گئے لیکن اندھیرے میں ہم سے اندازہ غلط ہو گیا تھا اور یہاں جس جگہ ہم پہنچے تھے، تار بری طرح آپس میں جڑی ہوئی تھی جس کے اندر سے ہمارا پار کر جانا ناممکن تھا۔ ہم چاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم نے جلدی سے خاردار تار کی باڑھ کے ساتھ ساتھ دوڑ لگا دی تا کہ کہیں سے تھوڑی سی بھی اندر جانے کی گنجائش نظر آئے تو ہم کراس کر جائیں۔ اتنی دیر میں دور سے پہرے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی نظر آئیں اور پچھلی جانب سے دور کہیں اندھیرے میں دوسری جانب کے گارڈ نے شاید گاڑی کی روشنی دیکھ کر زوردار سیٹی بجائی۔ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ اب ہمارا گاڑی کی روشنی سے بچنا ناممکن تھا۔ آس پاس کوئی اوٹ بھی نہیں تھی اور اگر پچھلی جانب بھاگتے تو وہاں کے گارڈ بھی روشنی دیکھ کر چوکنے ہو چکے تھے لہٰذا ان کی ہم پر نظر پڑنا لازمی تھی۔ بھاگ کر میدان کی پرلی جانب بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ درمیانی فاصلے کو پار کرنے سے پہلے ہی ہم کوئی آڑھ نہ ہونے کی وجہ سے پہرے والی گاڑی کی روشنی تلے یا پھر پیچھے دور کہیں موجود گارڈز کی نظروں میں آ جاتے۔ ہمارے پسینے بری طرح سے چھوٹ رہے تھے اور اپنی گرفتاری ہمیں صاف نظر آ رہی تھی کہ اتنے میں اچانک فیصل زور سے چلایا۔

''وہ رہا باڑھ کا سوراخ.....''

دراصل کٹی ہوئی باڑھ کے آگے پیچھے کسی نے اسے عملے کی نظر سے بچانے کے لیے جھاڑیاں اس طرح کاٹ کر رکھی ہوئی تھیں کہ پہلے ہم اس کے سامنے سے ہی گزر گئے تھے لیکن ہماری اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سب سے پہلے بھٹی کو اس کی توند سمیت پار کروا دیا، دوسرے ہی لمحے اسفر پھر میں اور آخر میں فیصل باڑھ کی دوسری جانب سرک چکے تھے اور جیسے ہی بھٹی نے تار اپنے ہاتھ سے چھوڑی اس لمحے پہرے والی گاڑی (جسے بعد میں ہم نے ''چاند گاڑی'' کا خطاب دے دیا تھا) ہمارے سامنے سے دھیرے دھیرے سیٹیاں بجاتی گزر گئی۔ ہم چاروں بنا وقت ضائع کیے اگلے ہی لمحے کیمپس کی جانب اڑے جا رہے تھے اور جس وقت ہم کیمپس کی کھمبوں سے چھلکتی روشنیوں کے نیچے آئے تب ہم نے اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ اسی وقت دور کہیں رات کی دوسری پریڈ شروع ہونے کی سیٹی سنائی دی۔ ہم سراسیمہ ہو کر ہوسٹل کی جانب دوڑے اور یہ دیکھ کر ہماری تو جان ہی نکل گئی کہ ہمارے

ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کھڑے کسی بات پر چند سینئر کیڈٹس کو ڈانٹ رہے تھے۔ ہم چاروں نے ایک ایک کر کے ان کی پشت سے اندر کھسکنے کی کوشش کی۔ سفر اور فیصل تو کامیاب ہو گئے لیکن تیسرے نمبر پر جب بھٹی گزرنے کی کوشش میں تھا تو وہ ہاسٹل کے گرد بنے جنگلے کے اوپر رکھے گملے سے ٹکرا گیا اور اس کے پیچھے میں جو سر جھکائے اپنی جھونک میں بڑھا چلا آ رہا تھا، بذات خود بھٹی سے زور سے ٹکرایا۔ فہد صاحب چونک کر پلٹے اور غصے میں گرجے۔

''یہ کیا جوکروں والی حرکتیں کر رہے ہو تم دونوں..... اور اتنی دیر ہاؤس سے باہر کر کیا رہے ہو..... ادھر آؤ فوراً.....''

میں نے قہر آلود نظروں سے اس موٹے بھٹی کو دیکھا جس کی وجہ سے ہم دونوں کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ ہم دونوں سر جھکائے، معصوم سی صورت بنائے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

''کہاں سے آ رہے ہو اس وقت..... اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے.....؟''

بھٹی کے منہ سے کچھ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ ''جی وہ دراصل شیرٹن..... وہ جانو.....''

میں نے دل ہی دل میں اناللہ پڑھ لی۔ اس موٹے نے تو ایک ہی جھاڑ میں سارے کا سارا بھانڈا پھوڑ دینے کی ٹھان لی تھی۔ فہد صاحب زور سے گرجے۔

''کیا اول فول بک رہے ہو.....؟ یہ جانو کون ہے.....؟''

اتنے میں سامنے کھڑے دسویں جماعت کے سینئر کیڈٹس میں سے ایک منمنایا۔

''سر ہم جائیں.....''

فہد صاحب ہمیں بھول کر ان کی جانب پلٹے۔

''ہاں جاؤ لیکن یاد رکھو کہ خبردار آئندہ اگر کسی نے گیمز ٹائم میں دیر سے پہنچنے کی کوشش بھی کی تو ایجوڈنٹ سے کہہ کر سات دن کے لیے گرم دھوپ میں مرغا بنوا دوں گا۔ چلو اندر جا کر پڑھو.....''

سینئر کیڈٹ دم دبا کر اندر بھاگ گئے۔ فہد صاحب ہماری جانب پلٹے، ہمارا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ وہ زور سے گرجے۔

''اور تم دونوں ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو..... چلو اندر جاؤ..... پریپ شروع ہو چکی ہے اور خبردار جو آئندہ کسی جانو کے ساتھ اتنی دیر ٹی۔ وی روم میں بیٹھے..... میں تم لوگوں کا ٹی۔ وی دیکھنا بند کروا دوں گا.....''

ہم دونوں جو جانے کب سے دل میں جل تو جلال تو کا ورد کر رہے تھے اس تیزی سے اندر کو دوڑے جیسے ریس میں گھوڑے فائر کی آواز پر دوڑتے ہیں اور اپنی اپنی کرسیوں پر ہی بیٹھ کر ہم نے دوسرا دم لیا۔

یہ ہماری زندگی کا پہلا ''بنک Bunk'' تھا۔ اس بنک نے ہمیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے چند ایسے گر بتا دیے تھے جو زندگی میں ہمیشہ ہمیں دال سبزی سے نظریں چرا کر فرائی مرغی کی آس میں بنک پر مجبور کرتے رہے۔ ہمارے یہ بنک آج بھی جاری ہیں اور شاید ہم چاروں ہی آج تک زندگی کی حقیقت سے نظریں چرا رہے ہیں۔

اپیل

طاہر بھائی کے قتل کو چھ مہینے گزر چکے تھے لیکن راجہ کو ابھی کل کی بات ہی لگتی تھی۔ ایسے لگتا تھا اس ایک موت کے ساتھ ہی سارے محلے کی خوشیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں۔ آدی بھی اپنے فوجی کالج جا کر پھنس ہی گیا تھا۔ راجہ اسے ہر ہفتے لمبے لمبے خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی جب بوجھ زیادہ ہی بڑھ جاتا تو وہ ریگل سینما جا کر کوئی انگلش فلم دیکھ آتا یا پھر بالے کے ساتھ مل کر اپنی یا اس کے گھر کی چھت پر بیٹھ کر کسی نئے برانڈ کا کوئی سگریٹ آزما لیتا۔ لیکن عادی کے بغیر اُسے کہیں بھی مزہ نہیں آتا تھا۔ اس دن بھی اس نے وقت گزاری کے لیے اپنے گھر کے گودام سے وہ سارے لکڑی کے بڑے بڑے ڈبے نکال کر صحن میں لا کر رکھ دیئے جس میں وہ اور آدی مل کر سردیوں کی چھٹیوں میں کہانیاں خرید خرید کر جمع کرتے تھے تاکہ پھر سارا سال وہ دونوں مل کر وہ کہانیاں پڑھ سکیں۔ ان لکڑی کے بکسوں میں ان دونوں کی پہلی جماعت سے لے کر اب تک کی تمام جمع کردہ کہانیاں پڑی ہوئی تھیں۔

راجہ سب بکس ایک ایک کر کے کھول رہا تھا اور پرانے دن یاد کر رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دھیان اپنے پیچھے برآمدے میں بیٹھیں سکینہ خالہ اور اپنی اماں کی باتوں کی جانب بٹتا چلا گیا۔ سکینہ خالہ آج پورے تین مہینے بعد اس کی اماں کے بے حد اصرار پر چند لمحوں کے لیے اپنے گھر سے نکل کر راجہ کے ہاں آئی تھیں اور راجہ کی اماں کو بتا رہی تھیں کہ وجو آپی کی پڑھائی تقریباً بالکل ہی چھوٹ چکی ہے، لاکھ پڑھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ یہاں پڑھنے بیٹھتی ہیں اور وہ آنسو ٹپ ٹپ اُن کی آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ غیاث چچا کے سارے خواب ایک ایک کر کے مٹی میں ملتے جا رہے ہیں۔ اب تو انہوں نے بھی باقی ہر آس چھوڑ دی ہے۔ ان کی اب بس ایک ہی حسرت ہے کہ ان کی بیٹی خوش رہے۔ سکینہ خالہ نے یہ بھی بتایا کہ خاندان والوں نے ابھی تک ان کے گھرانے کا بائیکاٹ ختم نہیں کیا۔ وہ اس سارے واقعے کا ذمہ دار وجو آپی کی ذات کو سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے اس پورے خاندان کی عزت عدالتوں میں اُچھالی گئی تھی۔

اٹو کا کیس ابھی تک عدالت میں اپیل کے لیے لگا ہوا تھا۔ سکینہ خالہ دراصل آج راجہ کی اماں کے پاس غیاث چچا اور وجو آپی سے چھپ کر کچھ اور درخواست کرنے بھی آئی تھیں۔ انہوں نے راجہ کی اماں سے کہا کہ اب انہیں خاندان سے وجو آپی کے لیے کسی مناسب رشتے کے آنے کی اُمید ذرا کم ہی رہ گئی تھی۔ لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ اگر راجہ کی اماں کی نظر سے کوئی بھی اچھا خاندان یا اچھا لڑکا گزرے تو وجو آپی کو ضرور اپنے دھیان میں رکھیں۔ یہ سب کہتے ہوئے سکینہ خالہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ راجہ کی اماں نے جلدی سے اٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں تسلی دی کہ وجو صرف خالہ کی ہی نہیں، ان کی بھی بیٹی ہے۔ لہٰذا سکینہ خالہ کو یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سکینہ خالہ کو اس بات کا بھی بے حد قلق تھا کہ عدالت اٹو

کے کیس میں نہ جانے اپیلوں پر اتنا وقت کیوں لگا رہی تھی۔ کیونکہ ہر پیشی پر افواہوں کا ایک طوفان پھر سے برپا ہو جاتا تھا اور اخبارات اس کیس کو پھر سے اس طرح اُچھالتے تھے کہ پہلے سے ہی رِستے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ عدالت نے جو بھی فیصلہ دینا ہے اب دے دے تاکہ یہ روز روز کی سولی جس پر ان کے پورے خاندان کو ہر پیشی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اُس سے تو ان کی جان چھوٹے..... لیکن افسوس قدرت کے فیصلے صرف انسانوں کے چاہنے اور نہ چاہنے کی بنیاد پر ہی ہونے لگتے تو پھر رونا ہی کس بات کا رہ جاتا؟

وجو آپی کے رشتے کی تلاش کی بات سن کر راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اُس نے سوچا کہ آج رات ہی بیٹھ کر وہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھے گا کہ وجو آپی کی اماں کے کیا ارادے ہیں۔

شام ہوتے ہی تمام دوستوں کی برگد کے پیڑ کے نیچے ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں مستقبل کے لائحہ عمل طے کیا گیا اور سب نے یہی طے کیا کہ پہلی فرصت میں راجہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھ کر تمام صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔ لہٰذا رات ہوتے ہی راجہ نے کاغذ قلم سنبھالا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔

"پیارے آدی.....

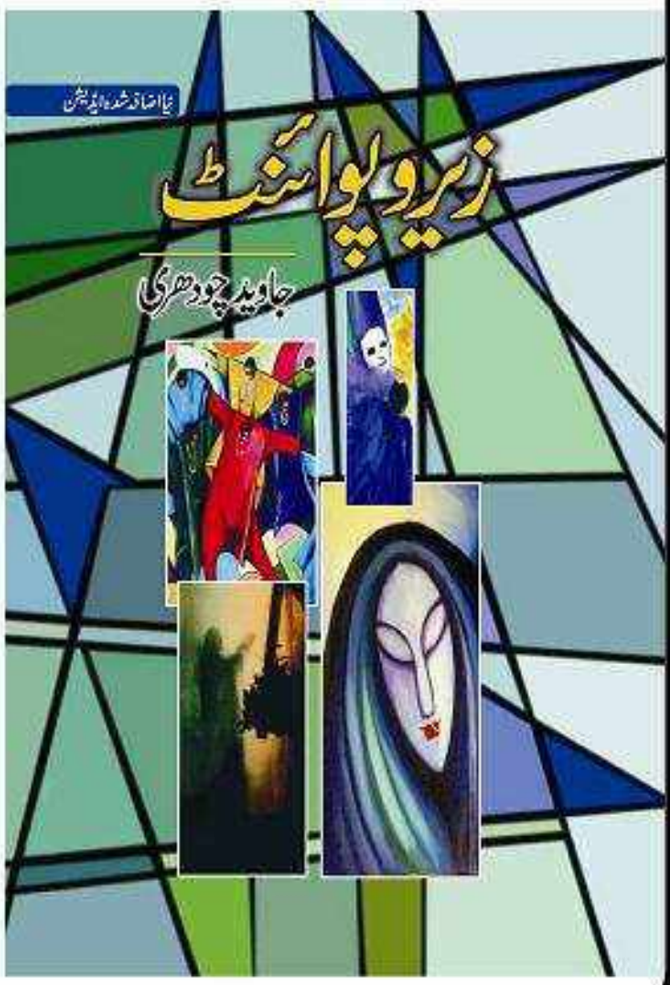

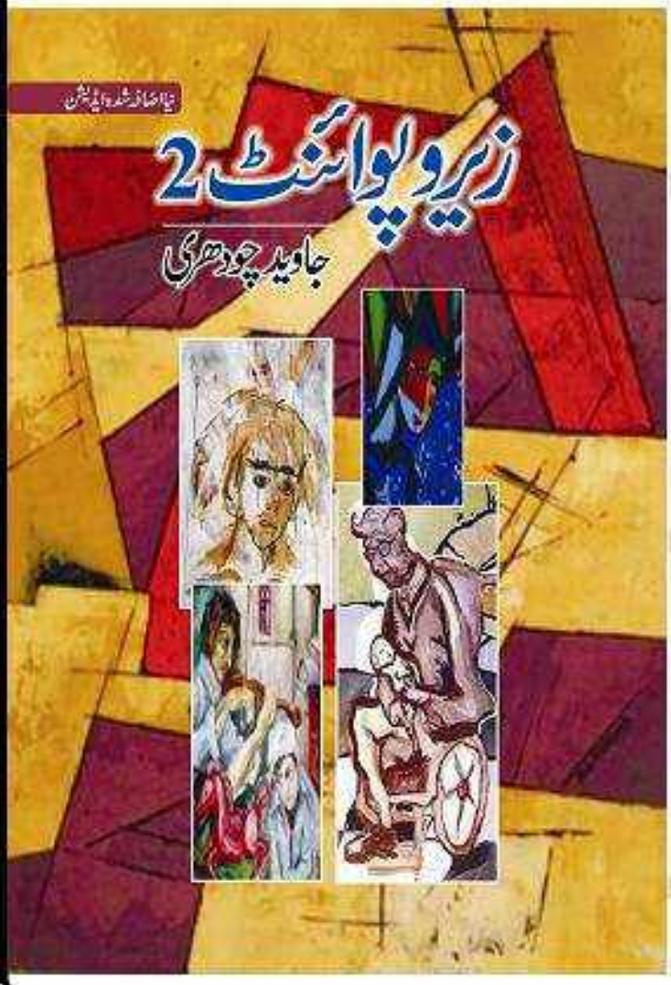

پہلا چھاپہ

اگلے ہفتے جب راجہ کا خط مجھے ملا جس میں اس نے ڈوآپی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے والی بات لکھی تھی تو نہ جانے کیوں میرا دل ڈوب سا گیا۔ تو کیا اب ڈوآپی ہمیشہ کے لیے ہمارے محلے سے دُور چلی جائیں گی۔ کیا ان پر میرا ''حق'' ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

نہ جانے ان کا ہونے والا میاں کیسا شخص ہو.....؟ جانے وہ مجھے ان سے ملنے دے یا نہیں.....؟ اس طرح کے جانے کتنے سوال اور جانے کتنے خیال میرے دل و دماغ میں چبھتے رہے اور پھر اس کے بعد راجہ کا جب بھی کوئی نیا خط آتا تو اُسے کھولتے ہوئے میرے ہاتھ لرزنے لگتے کہ اس میں کہیں ڈوآپی کی شادی کی خبر نہ ہو۔

لیکن وہ خبر کبھی نہ آئی ہم آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات سے گزر کر نویں جماعت میں آ چکے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر کی بجائے ہماری پوری کلاس کو شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے بھیج دیا گیا۔ نویں جماعت کے پہلے چھ مہینے مضامین ایک دم سے بدل جانے کی وجہ سے مجھے بہت مشکل ہوئی لیکن اس بار میں اکیلا نہیں تھا۔ پوری جماعت ہی فزکس، کیمسٹری اور بائنی، زولوجی کے پھیرے میں پڑی ہوئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ مضامین بھی ہماری گرفت میں آتے گئے۔ درمیان میں ہمارے اِکا دُکا ''بنک'' اور ڈاکٹر نو کی جعلی پرچی بھی خیریت سے ہی چل رہی تھی، لیکن وہ کسی نے کہا ہے نا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔'' لہٰذا ہمارے بُرے دن بھی قریب تھے۔ اور ایک بار پھر ہمارا بھانڈا پھوڑنے والوں میں بھٹی سرفہرست تھا۔

ہماری پرچی اس وقت تک کرارے نوٹ کی طرح چلتی رہی جب تک یہ راز میرے، اسفر اور فیصل کے درمیان رہا۔ ہم سب اُس دن کو کوستے تھے جب اسفر نے فیصل اور مجھ سے پوچھے بنا آصف بھٹی پر ''ترس'' کھا کر اسے اپنے راز میں صرف مبلغ دس روپے کے عوض شامل کر لیا تھا۔

اس شام میں، اسفر اور فیصل، گیمز Games پیریڈ کے بعد ہاسٹل کی پہلی منزل پر واقع اپنی ڈارمیٹری کے باہر راہداری میں کھڑے ہو کر نیچے سڑک پر آتے جاتے کیڈٹس کو بیر کھا کر اس کی گٹھلیاں مار رہے تھے۔ اتنے میں ہماری نظر نیچے سے لنگڑا کر گزرتے بھٹی پر پڑی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ فٹ بال کھیلتے ہوئے پیر میں موچ آ گئی ہے اس لیے ڈاکٹر نو کے پاس گیا تھا لیکن اُس ظالم ڈاکٹر نے صرف درد کی دو گولیاں دے کر بھٹی کو ٹرخا دیا تھا۔ بھٹی اس بات کو رو رہا تھا کہ صبح وہ پریڈ پر کیسے جا پائے گا؟؟

اسفر نے بھٹی کو پیش کش کی کہ اگر وہ دس روپے ابھی نقد ہمیں ادا کرے اور کینٹین لے جا کر چائے سموسے سے ہماری تواضع کرے تو ہم اس کی یہ مشکل پل بھر میں ختم کر سکتے ہیں۔ فیصل نے اسفر کو کہنی مار کر کئی مرتبہ چپ کروانے کی کوشش کی لیکن اُس نے ہماری ایک نہیں سُنی اور آخرکار

ہم پندرہ منٹ بعد کینٹین میں بیٹھے سموسے اور چائے ''زہر مار'' کر رہے تھے۔ اور اگلے دن موٹا بھٹی پریڈ پر جانے کی بجائے اپنے بستر پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسفر کے دل میں لالچ سما گیا تھا۔ اگلے تین دن میں اُس نے ایک دن کے ریسٹ Rest کا بھاؤ دس روپے مقرر کر دیا۔ ہماری نویں جماعت کے کیڈٹ ''جوق در جوق'' ہمارے عطائی کلینک سے پریڈ ریسٹ، گیم ریسٹ اور کلاس ریسٹ کی پرچی لینے کے لیے آنا شروع ہو چکے تھے اور ہماری شہرت ہمارے ہاسٹل سے نکل کر باقی ہاؤسز میں بھی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ فیصل کو ڈاکٹر نو کی تحریر اور مجھے اُس کے دستخط کی اتنی پریکٹس ہو چکی تھی کہ اب ہم آنکھیں بند کر کے ریسٹ (آرام) کی پرچی بنا سکتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ہم ''مالا مال'' ہو چکے تھے اور اب ہم شیرٹن والے جانو سے اُدھار مرغیاں کھانے کے بجائے اس کے پاس اپنا باقاعدہ اکاؤنٹ کھلوا چکے تھے جس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پیسے ضرورت سے زیادہ ہی پڑے رہتے تھے۔ زندگی کتنے چین سے کٹ رہی تھی لیکن پھر ایک دن اچانک ہماری ''خوشیوں'' کو کسی کی نظر لگ ہی گئی۔

ہم نے شروع میں ہی طے کر لیا تھا کہ ایک وقت میں پانچ پرچیوں سے زیادہ نہیں بنائیں گے تاکہ پیٹی آفیسرز کو شک نہ ہو، کیونکہ پریڈ پر گنتی کر کے رپورٹ سی۔ پی۔ او کے پاس جمع کروانا پی۔ او کی بھی ڈیوٹی میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن جب ہماری جیبیں دس دس روپے کے نوٹوں سے بھرنے لگیں اور آس پاس کے دیگر ہاسٹلز کے کیڈٹس بھی ہم سے ''تعویذ'' لینے آنے لگے تو ہماری احتیاط بھی دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھوں سے اپنا دامن چھڑانے لگی۔ اور رفتہ رفتہ ہم نے گنتی یاد رکھنا بھی چھوڑ دی کہ ایک دن میں کتنے تعویز بانٹے تھے۔

اسفر اور بھٹی ''کیس'' ڈھونڈ کر لاتے تھے اور میں اور فیصل کلینک سے تعویز جاری کر دیتے تھے۔ اپنے چلتے پھرتے کلینک کا نام ہم نے ''دلدار کلینک'' رکھ لیا تھا اور یہ ان کیڈٹس کی دلداری کے لیے تھا جنہیں ڈاکٹر نو کی چوکھٹ سے ہمیشہ دُھتکار ہی ملتی تھی۔

جس صبح چھاپہ پڑا، اس دن صرف ہماری بیرک میں ہی مجھ سمیت چار اور کیڈٹس خراٹے لے رہے تھے۔ جن میں موٹے بھٹی کے علاوہ اسفر، مجید چھوٹو اور نثار روندو بھی شامل تھے۔ اچانک ہی ایسا لگا جیسے ہاسٹل میں بھونچال آ گیا ہو، دروازے کھلنے لگے، شور مچ گیا۔ فہد صاحب کے چیخنے چلانے اور دروازے دھڑ دھڑانے کی مخصوص آوازوں سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ اسفر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بستر سے کود کر ڈارمیٹری کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا اُسی لمحے دروازہ کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ فہد صاحب اور سی۔ پی۔ او بخشو چند دیگر پی۔ او ز کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔

ہم سب سے پوچھا گیا کہ ہم پریڈ پر کیوں نہیں گئے۔ ہم سب نے بیک وقت اور بیک زبان بتا دیا کہ ہمیں ڈاکٹر نے ریسٹ دیا ہے۔ ہم سب کی پرچیاں ضبط کر کے ہمیں پریڈ گراؤنڈ پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ فہد صاحب جس دروازے کے سامنے کھڑے احکامات صادر کر رہے تھے، عین اُسی کے پیچھے اسفر چھپا ہوا تھا۔ فہد صاحب پلٹ کر نکلنے ہی والے تھے کہ اسفر کے دائیں نزلے نے کام دکھایا، اس نے اپنی چھینک کو تو کسی نہ کسی طرح گھونٹ دیا لیکن اس کوشش میں دروازہ ہلکا سا ہل گیا۔ فہد صاحب کے بائیونک کان فوراً کھڑے ہو گئے اور انہوں نے چلا کر کہا کہ دروازے کے پیچھے جو بھی چھپا ہے فوراً باہر نکل آئے لیکن کوئی ہلچل نہیں ہوئی، فہد صاحب دوسری بار چلائے لیکن اسفر پھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، فہد صاحب شدید غصے میں آگے بڑھے اور انہوں نے دروازہ کھولے بغیر اسے اسی جانب زور سے دھکا دیا جہاں پیچھے اسفر چھپا ہوا تھا اور تین چار مرتبہ دروازے کو زور سے دبا کر ایک دم سے اپنی جانب کھولا تو اسفر دروازے کے پیچھے سے یوں سیدھے میدھے زمین پر گرا جیسے کوئی درخت کٹنے کے بعد زمین پر گرتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں ہمیں پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا جہاں ہم سے پہلے ہی ہماری ہی پرچی دیئے ہوئے تقریباً اٹھارہ کیڈٹ موجود سر جھکائے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نو کو ایک جانب ایجوٹنٹ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہمارے ہوش پہلے ہی اُڑ چکے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ہماری ''کاریگری'' پکڑی گئی ہے۔ ڈاکٹر نو کو اپنی میڈیکل سلپس Medical Slips کی تصدیق کے لیے بلایا گیا تھا۔

پتہ یہ چلا کہ جب اچانک ہی کچھ دنوں سے کیڈٹس کچھ زیادہ ہی 'بیمار' پڑنے لگے اور خاص طور پر نویں جماعت کے بیک وقت دو دو درجن کیڈٹ پریڈ ریسٹ، پر جانے لگے تو انتظامیہ کو تشویش ہوئی اور ڈاکٹر سے دریافت کیا گیا کہ نویں جماعت کے کیڈٹس کے اتنے زیادہ کیڈٹس کو ریسٹ دینے کی وجہ کیا ہے تو ڈاکٹر نو نے بڑی حیرت سے جواب دیا کہ اس نے تو صرف تین کیڈٹس کو پچھلے ایک ہفتے میں پریڈ سے ریسٹ Rest دیا ہے اور ان کے نام بھی ڈاکٹر کے اپنے رجسٹر کے ریکارڈ میں درج تھے۔ انتظامیہ نے اسی وقت ڈاکٹر کو پریڈ گراؤنڈ پہنچنے کا حکم دیا اور تمام چھ کے چھ ہاسٹلز سے نویں جماعت کے تمام بیمار کیڈٹس کو اٹھا کر شناخت پریڈ کے لیے پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہماری پرچیاں ڈاکٹر نو کے سامنے رکھ دی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو ڈاکٹر نو خود بھی چکرا کر رہ گیا کہ یہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرچیاں ہیں یا پھر کسی کی بنائی ہوئی نقل۔ وہ کافی دیر تک محدب عدسے کی مدد سے ہماری بنائی ہوئی اور اپنے ہاتھ کی تازہ لکھی ہوئی تحریر کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور چکرائے ہوئے لہجے میں بولا کہ اگر اس کے اپنے ریکارڈ کے رجسٹر میں اندراج نہ ہوتا تو وہ ان سب پرچیوں کو ہی اصلی قرار دیتا، لیکن بہرحال اس کے اپنے ریکارڈ کے حساب سے جناح کے دو اور لیاقت ہاؤس کے ایک کیڈٹ کے علاوہ باقی تمام نویں جماعت کے کیڈٹس کے ریسٹ کی پرچیاں جعلی ہیں۔ ہماری فوجی تربیت کے حصے کا تمام تر کنٹرول آرمی کے کسی سینئر کپتان یا میجر رینک کے افسر کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ جسے ایجوٹینٹ Adjutent کہا جاتا تھا اور جس کے نیچے سی پی او اور پھر مزید نیچے پی اوز (s)PO کی ایک فوج ہوتی تھی جو فوجی تربیت مثلاً پریڈ پی ٹی، ایکسٹرا ڈرل، پریڈ یونیفارم، رائیڈنگ، سوئمنگ اور دیگر روٹین کی نگرانی کرتے تھے۔ عام طور پر کوئی معاملہ سی پی او تک بھی بمشکل ہی پہنچتا تھا کیونکہ پٹی آفیسر خود ہی کیڈٹس سے نبٹ لیتے تھے لہٰذا ایجوٹینٹ کے پاس تو کوئی شکایت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہمارا معاملہ سیدھے سبھاؤ ایجوٹینٹ کی عدالت میں بھیج دیا گیا کیونکہ سی۔ پی۔ او اور پی۔ او زکی عقل نے ہی جواب دے دیا تھا۔ لہٰذا اس وقت ہم 23 تیئس نویں جماعت کے کیڈٹ ایجوٹینٹ کے سامنے کھڑے تھے اور وہ ہم پر بُری طرح برس رہا تھا کہ اگر ہم نے اگلے پانچ منٹ میں یہ نہیں بتایا کہ یہ کس کی کاریگری ہے تو وہ ہم سب کو اُلٹا ٹانگ دے گا جہاں سے پھر ہمارے گھر والے ہی آ کر ہمیں نیچے اُتاریں گے۔ ہم سب خاموش کھڑے اس کی دھمکیاں سنتے رہے۔

پھر اس نے ہم سب کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذ اور قلم پکڑوا دیا اور ہم سب سے کچھ لکھنے کو کہا۔ سی۔ پی۔ او نے ایجوٹینٹ کے کان میں کچھ کہا۔ ایجوٹینٹ نے سر ہلایا۔ سی۔ پی۔ او نے جھڑک کر ہم سے کہا کہ ہم تیزی سے دس دس مرتبہ اپنے کاغذ پر یہ جملہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیں۔ جملہ تھا۔

''کیڈٹ..... کو بیماری کی وجہ سے 3 دن کا پریڈ ریسٹ دیا جاتا ہے۔'' ہم سب نے فوراً یہ جملہ لکھ کر سی۔ پی۔ او کے حوالے کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ہماری تحریر کا جائزہ لینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے فیصل اس چھاپے میں نہیں پکڑا گیا تھا جس کے ہاتھ کی یہ تحریر ہر پرچی پر موجود تھی۔ میں تو ڈاکٹر نو کے دستخط ثبت کرنے میں ماہر تھا اور اس وقت ان لوگوں کا سارا دھیان صرف تحریر کی جانب تھا۔ کچھ دیر تک

ایجوٹینٹ اورسی۔پی۔او ہماری تحریروں کا جائزہ لیتے رہے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ایجوٹینٹ کو غصہ آ گیا اور اُس نے سی۔پی۔او کو حکم دیا گیا کہ ہم ساروں کو روزانہ دوپہر تین سے پانچ بجے تک تپتی دھوپ میں اسی پریڈ گراؤنڈ میں رائفل اور کمر پر بندھے بوجھ کے ساتھ اس وقت تک دوڑایا جائے جب تک ہم یہ بتا نہ دیں کہ یہ پرچیاں کس نے جاری کی ہیں۔اس نے ہمیں یہ لالچ بھی دی کہ جس کیڈٹ نے یہ اطلاع دے دی اس کی سزا معاف کر دی جائے گی۔کیڈٹس میں سے اگر کوئی چاہے تو وہ خفیہ طور پر سی۔پی۔او کے دفتر میں آ کر مُخبری کر سکتا ہے۔

اگلے تین ہفتے شاید ہماری زندگی کے سخت ترین مشقت بھرے دن تھے،ہم سب کو لنچ کے بعد ایکسٹرا ڈرل کی ڈانگریاں پہنا کر پریڈ گراؤنڈ کے سخت پتھریلے گراؤنڈ میں پہنچا دیا جاتا جو پچاس ڈگری گرم دھوپ سے تپ کر تندور بن چکا ہوتا تھا۔پٹی آفیسرز کی فوج ہمیں ''رگڑا'' دینے کے لیے وہاں موجود ہوتی،لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی سخت سزاؤں کے باوجود تمام کیڈٹس میں سے کسی نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ہمارے رنگ دوسرے ہی ہفتے 'پک کر' کندن' ہو چکے تھے اور پتھریلے فرش پر قلابازیاں کھانے کی وجہ سے جسم کا کوئی حصہ باقی نہیں بچا تھا جہاں پتھروں کے ریزے چُبھنے کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہنے والے نشان نہ بنے ہوں۔میں نے اور اسفر نے دوسرے ہفتے فیصلہ کر لیا کہ ہم خود ہی جا کر ایجوٹینٹ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ ساری کارستانی صرف ہم دونوں کی تھی،لہٰذا باقی کیڈٹس کو ہمارے جُرم کی سزا نہ دی جائے لیکن جب ہم جانے لگے تو موٹے بھٹی نے باقی کیڈٹس کو بتا دیا کہ ہم جُرم کا اقرار کر کے سزا اپنے سر لینے جا رہے ہیں تو ان سب نے ہم دونوں کو گھیر لیا اور یہ وعدہ لے کر ہی چھوڑا کہ چھوٹیں گے تو سب ایک ہی ساتھ چھوٹیں گے ورنہ جب تک یہ سزا ملتی رہے گی سب ایک ساتھ ہی برداشت کریں گے۔تیسرے ہفتے کالج انتظامیہ کو ہم پر رحم آ ہی گیا اور ایک سخت وارننگ کے بعد ہماری سزا ختم کر دی گئی۔لیکن ان تین ہفتوں نے ہم 23 تئیس کیڈٹس کو دوستی کے ایک ایسے اٹوٹ رشتے میں باندھ دیا کہ آئندہ آنے والی زندگی میں جب کبھی ہم میں سے کسی پہ بھی کوئی مشکل وقت آیا تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی دوسرا اس کی مدد کو ضرور پہنچا۔ان تین ہفتوں میں ہم نے اپنی کمر پر اتنا بوجھ اٹھایا اور بھاری رائفلز کندھوں سے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہم اتنا بھاگے کہ آئندہ زندگی میں ہم آپس میں کسی بھی بھاری سے بھاری بوجھ کو بانٹنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔اس سزا نے کیڈٹ کالج میں دی جانے والی ہر سزا کا خوف ہمارے دِلوں سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ.....رشتوں کے ریشم.....جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت،اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں،ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر پر دستیاب ہے،جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

رشتہ

بالآخر اگو کی آخری اپیل بھی سب سے بڑی عدالت سے مُسترد ہوگئی۔ یہ خبر سب سے پہلے غفور چچا نے آکر محلے میں سب کو سنائی۔ صدیقی صاحب نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے "چلو اچھا ہوا..... خس کم جہاں پاک".....

یہ سُن کر قریب کھڑے راجہ اور گڈو کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ اپنا کرکٹ کا کھیل چھوڑ کر سر کتے ہوئے بڑوں کے جمگھٹے کے قریب ہو گئے۔ غفور چچا نے لمبی سی سانس بھری "ہاں..... بڑا ظلم کیا اس کم بخت نے..... لیکن ابھی اس کی چند سانسیں باقی ہیں۔ کیونکہ آخری عدالت کے بعد اب صرف صدر مملکت صاحب ہی اس کی سزا معاف کر سکتے ہیں۔ اگو اپیل لگوانے کی درخواست ضرور دے گا..... لیکن ایسے مجرموں کو صدر بھی کبھی معاف نہیں کرتے..... ہاں البتہ کچھ دن مزید ٹل جائیں گے....." بڑے اپنی بحث میں مصروف ہوگئے۔ راجہ اور گڈو وہاں سے دُور چلے آئے۔

راجہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، ابھی کل رات ہی اس کی اماں راجہ کے ابا کو بتا رہی تھیں کہ وہ آپی کے خاندان سے تو خیر کی کوئی اُمید تھی بھی نہیں..... البتہ باہر سے جو دو چار رشتے آئے تھے وہ بھی طاہر بھائی کی موت کی کہانی سن کر باہر ہی سے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ وہ آپی کے ماں باپ اندر ہی اندر دن بدن گھلتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو پا رہی تھی۔ آج کل محلے کی رشتے کروانے والی خالہ اپنی سر توڑ کوشش میں مصروف تھیں کہ کسی نہ کسی طرح کوئی اچھا بر ہاتھ آئے تو اس خاندان کی مشکلات کا کچھ ازالہ ہو۔ اُسی رشتے والی خالہ نے آج کل کسی دوسری رشتہ کروانے والی عورت کی نشان دہی پر کسی لڑکے سے بات چلائی تھی۔ سنا تھا کہ لڑکا بالکل اکیلا تھا اور بہت بڑے کاروبار کا مالک بھی۔ سب کچھ اپنی محنت سے بنایا تھا اُس نے۔ ماں باپ بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے لہٰذا گیراجوں میں صبح شام محنت کر کر کے اُس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو ہی گیا۔ اب تو سنا ہے کہ کاروں کا بہت بڑا شوروم کھول رکھا ہے اس نے شہر کے مرکزی علاقے میں اور صبح شام نئی گاڑی میں گھومتا پھرتا ہے۔ رشتے والی خالہ نے سکینہ خالہ سے کہا ہے کہ غیاث چچا کے کان میں بات ڈالیں تو بات بڑھے، لیکن سکینہ خالہ نے فی الحال رشتے والی خالہ سے کہا ہے کہ کچھ ہفتے مزید ٹال جائیں، پہلے یہ اگو والا معاملہ تو کسی صورت ٹل جائے پھر غیاث چچا سے کسی مناسب موقعے پر بات کر کے لڑکے کو دکھانے کے لیے کچھ ترکیب بھی ڈھونڈ ہی لیں گی۔ لیکن رشتے والی خالہ نے جو عذر پیش کیا وہ بھی بے جا نہیں تھا بھلا اتنا اچھا رشتہ بنا کسی وجہ کے کیونکر ان کی بیٹی کے انتظار میں ٹھہرا رہے گا۔ اور آج کل تو ویسے بھی اچھے لڑکوں کا سمجھو کال ہی پڑ گیا ہے۔ لہٰذا لڑکے کو روکنے کے لیے کچھ آسرا تو دینا ہی ہوگا۔ سکینہ خالہ کو اور تو کچھ سوجھا نہیں، بس وہ اور غیاث چچا سے چھپ کر وہ کی ایک تصویر رشتے والی خالہ کو دے دی کہ کسی بہانے لڑکے کو دکھا دیں۔ رشتے والی خالہ نے واپس آکر بتایا کہ لڑکے کی تو نظریں ہی تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور اُس نے خود رشتے والی خالہ کے

پاؤں پکڑ لیے کہ کسی طرح سے بھی یہیں بات چلوا دیں تو وہ ان کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ مطلب یہ کہ لڑکا تو اب سال بھر انتظار کرنے کے لیے بھی تیار تھا لیکن مسئلہ غیاث چچا اور فوج کی آمادگی کا بھی تو تھا۔

سکینہ خالہ نے رشتے والی خالہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیں گی، اتنے دن بعد خالہ سکینہ نے کچھ پل کے لیے رات کو سکون سے آنکھیں موندھی تھیں۔

سکینہ خالہ کو تو چین آ گیا تھا لیکن راجہ کی نیند یہ سب کچھ سن کر ایک مرتبہ پھر اُڑ چکی تھی۔ ایک مصیبت ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری اس کی جگہ لینے کو تیار کھڑی ملتی تھی۔ اوپر سے یہ آدی کی فوجی پڑھائی، جانے کب ختم ہوگی۔ راجہ نے اس رات آنکھیں بند کر کے اللہ سے خوب گڑگڑا کر دعا مانگی کہ راجہ جلد از جلد فوجی کالج سے کامیاب ہو کر اپنے محلے میں واپس آ جائے کیونکہ وجو آپی کی حفاظت اب اُس کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

آپریشن بلیو سٹار

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا دوسرا ناول **آپریشن بلیو سٹار** کہانی ہے ایسے سرپھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کو کچلنے کے لیے کیا گیا بدنام زمانہ فوجی ایکشن جسے آپریشن بلیو سٹار کا نام دیا گیا تھا، اسی آپریشن کے بعد ہندوستان کی سابقہ وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کو اسکے اپنے سکھ باڈی گارڈز نے گولیوں سے اُڑا دیا۔ ہندوں اور سکھوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

عشق کا شین (I)

کتاب گھر پر **عشق کا عین** پیش کرنے کے بعد اب پیش کرتے ہیں **عشق کا شین** ۔ عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد..... علیم الحق حقی کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

پہلی دیر

دسویں جماعت میں آتے ہی ہمارا شمار سینئر کیڈٹس میں ہونے لگ گیا تھا۔ ہماری ڈارمیٹری بھی اب اوپر گیارہویں اور بارہویں جماعت کے سینئر کیڈٹس کے ساتھ دوسری منزل پر شفٹ ہوگئی تھی، لیکن اس ''اونچائی'' کا ہمیں بے حد نقصان ہوا تھا۔ جب تک ہم زمینی منزل پر تھے، تب تک رات کو جانو کے شیرٹن ہوٹل آنے جانے میں ہمیں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ہم کھڑکی کی جالی ہٹا کر بھی بیرک کے پیچھے کود جاتے تھے اور اگر زیادہ دیر ہو جاتی تو اُسی راستے سے واپس بھی آسکتے تھے لیکن اب دوسری منزل پر ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے کھڑکی سے کودنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور پھر دوسری مصیبت اوپر کی منزل پہ باقی تمام سینئر کیڈٹس کا ہونا بھی تھا۔ ہر وقت جے۔ یو۔ او (J.U.O) کی پہرے دار نگاہوں کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن آصف بھٹی کی پیٹ کی بھٹی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور دہکتی تھی لہٰذا ہمیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی تھا۔

دسویں جماعت میں کالج کے اندر موجود سینما گھر بھی کیڈٹس کے لیے کھول دیا گیا تھا جس میں ہر ویک اینڈ پر رات کو اُردو اور اگلے چھٹی کے دن صبح انگلش فلم دکھائی جاتی تھی۔ جس رات ہم پہلی مرتبہ کالج کے آڈیٹوریم میں فلم دیکھنے کے لیے قطاروں میں اندر داخل ہو رہے تھے تو مجھے راجہ اور اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے شہر میں دیکھی پہلی فلم یاد آگئی۔

اس سینما کے ماحول میں اور کیمپس کے اس آڈیٹوریم میں کس قدر فرق تھا۔ یہاں تو مجھے اس نظم وضبط اور خاموشی سے یوں لگنے لگا تھا کہ جیسے ہم فلم دیکھنے کے لیے نہیں کسی کے ''نفل'' پڑھنے کے لیے اس ہال میں جمع ہوئے تھے۔ نہ ہی گانوں پر سیٹیاں بجانے کی اجازت تھی اور نہ ہی ہیروئن کے رقص پر سکے سکرین کی جانب اُچھالے جاسکتے تھے۔ اور تو اور اندر ہال میں نہ تو گنڈیریاں کھائی جاسکتی تھیں اور نہ ہی پھیری لگانے والے بوائز آئس کریم اور سوڈا بیچتے دکھائی دے رہے تھے۔ سارے کیڈٹس یوں اٹینشن بیٹھے ہوئے تھے جیسے ابھی کاشن ملتے ہی ہال کے اندر ہی پریڈ شروع کر دیں گے۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس طرح فلم دیکھنے سے شدید اُلجھن محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اسفر اور فیصل مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے ہی جاتے تھے۔

ہیلن اور شیرل سے اب بمشکل ہی ملاقات ہو پاتی تھی کیونکہ سینئر کیڈٹس کا رہائشی علاقے میں جانا بہت سختی سے منع تھا۔ لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی طور بنک کر کے ہیلن اور شیرل سے مل ہی آتا۔ ہیلن مجھے بنک کرنے پر بہت ڈانٹتی تھی اور شیرل مجھے اس بہادری پر بہت شاباش دیتی۔ مجھے چرچ کے بڑے سے ہال میں پڑے اس پیانو کی کشش بھی ہر ہفتے کھینچ کر چرچ لے ہی جاتی تھی جسے ہیلن بہت سوز میں بجایا کرتی تھی۔ مجھے پیانو سیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن میری کیمپس کی روٹین اس قدر سخت تھی کہ میں بمشکل آدھ گھنٹے کے بنک Bunk کا ہی متحمل ہو سکتا تھا اور اتنی دیر میں بھی کئی مرتبہ ہاؤس ماسٹر صاحب ہاسٹل میں میری تلاش اور پوچھ گچھ کر چکے ہوتے تھے۔ لہٰذا اتنی سی دیر میں میں صرف ہیلن سے فرمائش کر کے اسے پیانو

بجاتے ہوئے ہی سُن سکتا تھا لیکن میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ زندگی میں جب کبھی بھی مجھے موقع ملا میں پیانو بجانا ضرور سیکھوں گا۔

دسویں جماعت کے امتحانات بورڈ لیتا تھا اور وہ جلدی ہو جاتے تھے۔ باقی جماعتیں مئی اور جون میں سالانہ امتحان میں بیٹھتی تھیں لیکن دسویں جماعت مارچ میں ہی بورڈ کے امتحان سے فارغ ہو کر پانچ ماہ کی چھٹی پر چلی جاتی تھی۔ کالج کی انتظامیہ ان پانچ ماہ میں دسویں جماعت کے کیڈٹس کو تمام ملک کے کیڈٹ کالج کے دورے پر بھجواتی تھی لہٰذا ہمارے دورے کے انتظامات بھی مکمل کئے جا رہے تھے۔ لیکن جانے کیوں پچھلے چند ہفتوں سے راجہ کے جتنے بھی خط مجھے آتے تھے ان میں اس کی بس ایک ہی رٹ ہوتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں۔ حالانکہ میں بیسیوں بار اُسے جواب دے چکا تھا کہ ہمیں چاروں صوبوں کے کیڈٹ کالجز کو دیکھنے جانا ہے لہٰذا چھٹیاں شروع ہونے کے بعد تقریباً ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا کیونکہ یہ ٹور تمام دسویں جماعت کے کیڈٹس کے لیے لازمی ہوتا تھا اور کالج کی بڑی والی بس میں تمام کیڈٹس کو پورے ملک میں گھمایا جاتا تھا۔

آخر امتحانات ختم ہو گئے اور اگلے ہی دن صبح سویرے کیمپس کے بڑے گھاس کے میدان میں بڑی والی سرخ بس کا ہارن بجنے لگا۔ ہم سب اپنے اپنے بیگ اٹھائے بھاگم بھاگ بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں بس چل پڑی اور اگلے ایک ماہ کے لیے ہمارا رابطہ ساری دنیا سے کٹ گیا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد جب میں نے ٹرین سے اُتر کر اپنے شہر کے ریلوے پلیٹ فارم پر قدم رکھے تو خلافِ معمول مجھے گھر سے کوئی بھی لینے نہیں آیا ہوا تھا۔ شاید ٹرین کے پانچ چھ گھنٹے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگ واپس چلے گئے ہوں۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا میں نے انتظار کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ اسٹیشن کے باہر سے تانگہ پکڑ کر خود ہی گھر پہنچ جاؤں۔

میں جب محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوا تو ایک عجیب سا سناٹا میرے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ دُور کہیں سے ڈھولکی بجنے کی آواز آ رہی تھی لیکن آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو ابا صحن میں بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ امی اور عمارہ کا پوچھا تو بولے "بھئی وہ تو تقریب میں گئی ہوئی ہیں تمہارے بڑے بھیا کے ساتھ، تم نہا دھو لو تو وہیں جا کر ان سے مل لینا۔"

میں نے بیگ رکھا "کیسی تقریب.....؟"

"بھئی وہ اپنی وجیہہ ہے نا..... آج اُس کی مہندی کی رسم ہے..... اچھا ہوا تم بھی آ گئے، جا کر مل آنا اپنی بُوا سے..... ہمیشہ تمہارا پوچھتی رہتی ہے....."

ابا اپنی بات ختم کر کے اُٹھ چکے تھے لیکن میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ زمین اور آسمان ایک ساتھ گھوم رہے ہوں۔ اُسی وقت چند لمحوں کے لیے محلے کی بجلی بھی چلی گئی، اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ روشنی رہتی تو ابا میرے چہرے پہ چھائے میری تقدیر کے اس اندھیرے کو دیکھ لیتے جسے میں باوجود بسیار کوشش اس وقت چھپا نہیں پا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں بجلی تو واپس آ گئی لیکن میرے اندر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو روشن نہ کر پائی۔

میں کافی دیر وہیں بیٹھا اس حقیقت پر یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آج وجو آپی کی مہندی ہے۔ اور ایک دن بعد وہ ہمیشہ کے لیے اس محلے سے رُخصت ہو جائیں گی، لیکن جتنا میں سوچتا، اتنا ہی میرے اندر کا طوفان بڑھتا جاتا۔ اتنے میں ابا کسی کام سے کمرے سے باہر نکلے اور مجھے

ابھی تک یوں صحن میں گُم صُم بیٹھا دیکھ کر چونکے۔

''ارے.....تم ابھی تک گئے نہیں.....من نہیں چاہ رہا تو صبح مل لینا.....تمہارے غیاث چچا بھی تمہیں بہت پوچھتے ہیں۔''

میں ابا سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ تھوڑا سا ستانے کے لیے رُک گیا تھا۔بس اب جا ہی رہا ہوں۔میں ٹوٹے ہوئے قدموں کے ساتھ اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

باسکرولی کا آتشی کتا

کتاب گھر آپ کے لئے لایا ہے مشہور سراغ رساں شرلاک ہومز کا ناول ''باسکرولی کا آتشی کتا''۔ یہ ناول مشہور رائٹر سر آرتھر کونن ڈائل کی شہرہ آفاق کتاب "The Hound of Baskervilles" کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۲ء میں تحریر کئے گئے اس ناول پر اب تک ہالی وڈ کی کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔سر آرتھر نے شرلاک ہومز کا کردار اٹھارویں صدی میں متعارف کروایا تھا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کرلیں کے ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار جاسوسی ناول پڑھنے والوں میں آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس ناول کو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم سفر

ہم سفر.....فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر لکھی جانے والی تحریر.....زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔اگر یہ اعتماد ڈگمگا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں،لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفروں کو بچھڑنے نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے.....اولاد.....**ہم سفر** کتاب گھر کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

دوسرا الوداع

دجو آپی کا گھر اُسی طرح سجا ہوا تھا جیسے کسی بھی ڈولی اُٹھنے والے گھر کو سجا ہونا چاہیے۔ ڈھولکی بجنے کی وہ آواز جو میں نے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے سنی تھی وہ دراصل یہیں دجو آپی کے گھر سے ہی آ رہی تھی۔ سب سے پہلے میری نظر غفور چچا پر پڑی جو گھر کے باہر میدان میں لگے شامیانے کے پاس کھڑے، محلے کے چھوٹے بچوں کو شامیانے کے سوراخوں سے اندر سر ڈال کر جھانکنے سے منع کر رہے تھے اور انہیں وہاں سے بھگا رہے تھے۔ میں آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکا اور وہیں دُور سے کھڑا ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ ایک آدھ بار غیاث چچا پر بھی نظر پڑی جو بہت جلدی میں اور کچھ بوکھلائے سے اندر آتے جاتے دکھائی دیئے۔ پھر میری نظر راجہ اور نھو پر پڑی جو خشک میوے کے بڑے بڑے تھال اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔

اچانک غفور چچا کی مجھ پر اندھیرے میں نظر پڑی اور وہ مجھے محلے کا کوئی دوسرا لڑکا سمجھ کر چلائے۔

''اوئے لڑکے ..... وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ اندر جا کر پوچھو کہ شیشے کے چار درجن گلاس کہے تھے، لیکن یہاں مردانے میں تو صرف دو درجن ہی بھجوائے ہیں..... اتنے سے تو کام نہیں چلے گا.....'' میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آیا تب مجھے پہچان کر وہ وہیں سے چلائے۔

''ارے..... یہ تو اپنا آدمی ہے..... اچھا ہوا تو بھی آ گیا..... تیری سہیلی تجھے بہت پوچھتی تھی..... رخصتی سے پہلے مل ضرور لینا اس سے.....'' غفور چچا ہمیشہ دجو آپی کو میری سہیلی کہتے تھے کیونکہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو جب کبھی وہ مجھے دجو آپی کے کام بھاگ بھاگ کر کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو مجھے چھیڑنے کے لیے پوچھتے کہ ''ہاں بھئی..... کس کے لیے برف کے میٹھے گولے بنوائے جا رہے ہیں۔''..... میں جلدی جلدی گولے گنڈے والے کے ہاتھ میں پیسے تھماتے ہوئے کہا ''دجو آپی کے لیے.....'' وہ پھر مجھے چھیڑتے ''بھئی یہ دجو آپی کون ہے.....؟'' میں جلدی سے جواب دیتا ''میری سہیلی.....'' اور میرا جواب سُن کر وہ دیر تک ہنستے رہتے۔

آج میری وہی سہیلی اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے، مجھ سے..... ہم سب سے رخصت ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی تھی اور میں اُسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اندر گھر میں سبھی کو میری آمد کی خبر ہو گئی اور سب سے پہلے راجہ اندر سے بھاگتا ہوا نکلا اور آ کر میرے گلے لگ گیا۔ اُسے میری اندرونی حالت کا اچھی طرح پتہ تھا اور وہ بار بار مجھ سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کہ میں نے گذشتہ ایک مہینے کے دوران اس کے لکھے ہوئے خطوط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ راجہ کا لکھا ہر خط واپس اُسی کو مل چکا تھا اور ان خطوط کا پلندہ ابھی تک اس کی جیب میں موجود تھا جس میں راجہ نے دجو آپی کے اس ہونے والے رشتے کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ لیکن چونکہ میں اپنی جماعت کے ساتھ ٹور پہ تھا اس لیے

میرے پتے پہ اس خط کو وصول کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا لہٰذا ڈاک والوں نے سب ہی خط یکے بعد دیگرے راجہ کو واپس لوٹا دیئے تھے۔ میرے پاس راجہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور پھر اگر مجھے وقت سے پہلے ہی وہ جو آپی کے اس رشتے کے بارے میں پتہ چل جاتا تو بھی میں کیا کر سکتا تھا؟؟

میں، امی اور باقی گھر والوں سے ڈھو آپی کے صحن میں مل کر واپس باہر آ گیا کیونکہ ڈھو آپی کو جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا وہاں جانے کی مجھ میں ذرہ برابر بھی ہمت نہیں تھی لیکن کچھ ہی دیر میں عمارہ اندر سے عجلت میں باہر نکلی اور کہا کہ ڈھو آپی مجھے بلا رہی ہیں۔ میں بیٹھا رہا لیکن راجہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھا دیا اور زبردستی اندر دھکیل آیا۔ ڈھو آپی پیلے جوڑے میں ملبوس، سر جھکائے اپنی سہیلیوں اور رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں یوں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کے چہرے کے رنگ اور اس پیلے دوپٹے میں فرق کرنا ناممکن تھا، جو اس وقت ان کے سر پر ڈلا ہوا تھا۔ میں دروازے میں ہی رُک گیا۔ پیچھے کارنس پر میری یونیفارم والی تصویر اب تک اپنی اُسی پرانی جگہ پر سجی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عورتوں نے دعائیں دیں اور ڈھو آپی کی کسی سہیلی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ ڈھو آپی نے نظر اٹھائی اور مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائیں۔ ان کی اس زخمی سی مسکراہٹ کے پیچھے کتنے درد چھپے تھے یہ صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ جانے کیوں اس پل مجھے طاہر بھائی کی بہت شدت سے یاد آئی، اور ایک پل کے لیے میرے دل نے سب کچھ بھلا کر خدا سے یہ شکوہ کر ڈالا کہ اگر اس شہزادی کو کسی کے ساتھ رخصت ہونا ہی تھا تو پھر طاہر بھائی ہی کیوں نہیں.....؟ کیوں خدا نے اتنی جلدی اُنہیں اپنے پاس بُلا لیا۔ ڈھو آپی اگر آج ان کے ساتھ رُخصت ہو رہی ہوتیں تو ان کے چہرے پر اس پیلاہٹ کی جگہ کیسی چاندنی بکھری ہوئی ہوتی؟.....دنیا میں ہمیشہ سب کچھ ویسا ہی کیوں ہوتا ہے جیسا ہم نہیں چاہتے؟؟

میں پلکیں جھپکے بنا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے شور اٹھا کہ لڑکے والے مہندی لے کر آ گئے ہیں۔ سبھی عورتیں اور لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر باہر کی جانب لپکیں اور کچھ ہی دیر میں، میں اور ڈھو آپی کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اندر اُن سے ملنے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اُداس سا بیٹھا رہا انہوں نے حسب معمول اپنی انگلی سے میری ناک کو پھسا دیا، لیکن آج میرے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ان کے بنا بہت اُداس ہو جاؤں گا۔ وہ کیوں ہم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جواب میں انہوں نے اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے بڑی مشکل سے روکا اور مجھے تسلی دی کہ ایک نہ ایک دن تو انہیں اس محلے سے جانا ہی تھا، اور پھر وہ کون سا سو کوس دُور یہ شہر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ انہیں تو اسی شہر میں ہی رہنا تھا اور یہ کہ میں جب چاہوں ان سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں۔ وہ جو آپی نہ جانے کتنی دیر تک ایسی ہی کئی تسلیاں دے کر مجھے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے خوب دل لگا کر پڑھنے کی بھی تلقین کی اور اپنی الماری کی دراز میں سے مجھے وہ سب چیزیں بھی اٹھانے کو کہا جو وہ ہمیشہ کی طرح میرے لیے، میری غیر موجودگی میں جمع کر کے رکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج ان سے جی بھر کر باتیں کر لوں کیونکہ کل سے تو وہ پرائی ہونے والی تھیں لیکن یہ خواہش بھی میرے دل میں حسرت بن کر ہی رہ گئی اور کچھ ہی دیر میں لڑکے والیاں مہندی لے کر اندر کمرے میں آ گئیں اور اتنا رش ہو گیا کہ مجھے مجبوراً کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔

باہر راجہ پہلے سے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں مہندی کے گیتوں کے اس شور شرابے سے دُور ہٹ کر بیٹھ گئے اور راجہ نے مجھے شروع سے ساری بات بتائی کہ کس طرح رشتے کرانے والی خالہ نے سکینہ خالہ کو یہ رشتہ بتایا تھا اور پھر جواب میں ڈھو آپی کی تصویر اس لڑکے کو دکھائی تھی

جو تصویر دیکھتے ہی اپنے ہوش وحواس گنوا بیٹھا تھا۔

لڑکے کا نام ظفر تھا اور وہ گاڑیوں کے شوروم کا کاروبار کرتا تھا۔ بقول رشتے والی خالہ "ظفر میاں تو ہر روز ایک گاڑی بیچتے اور دوسری خریدتے ہیں"..... اس وقت بھی مہندی لگانے والی خواتین نئے ماڈل کی تین چار کاروں اور ایک بڑی بس میں بھر کر آئی تھیں۔

ظفر کو اب خود اس رشتے کی اس قدر جلدی تھی کہ وہ جلد از جلد اس معاملے کو نپٹانا چاہتا تھا۔ وہاں اُنو کا معاملہ بھی دن بہ دن لمبا ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور صدر کی جانب سے اُس کی درخواست کا کوئی جواب بھی تین ماہ گزرنے کے باوجود اب تک نہیں آیا تھا لہٰذا رشتے والی خالہ کے اصرار پر کہ لڑکا اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ سکینہ خالہ نے سر ہتھیلی پہ رکھ کر غیاث چچا کے سامنے رشتے کی بات چھیڑ ہی دی۔ شروع میں تو غیاث چچا نے انتہائی سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال انہیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے اور یہ کہ ان کی بیٹی ان پر بوجھ تو نہیں کہ اُسے یوں جلد بازی میں گھر سے رخصت کر دیں لیکن پھر دھیرے دھیرے جیسے جیسے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینے میں بدلتے گئے تو رفتہ رفتہ غیاث چچا کے لہجے کی سختی بھی دم توڑنے لگی البتہ ڈوآپی کا جواب اب بھی وہی پہلے دن والا ہی تھا اور انہوں نے ایسے کسی موضوع پر بات کرنے سے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

سکینہ خالہ نے ہزار کوششوں کے بعد غیاث چچا کو کم از کم اس بات پر تو راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ ایک بار لڑکے سے مل تو لیں۔ اس کی چھان پھٹک کروالیں کیونکہ آج نہیں تو کل، آخر کبھی نہ کبھی تو انہیں اپنی بیٹی سے رخصت کرنا ہی ہوگا تو پھر اس کام کی ابتدا کرنے میں کیا حرج ہے؟؟ اُنو کے کیس کی وجہ سے جو بدنامی ہو چکی تھی اس کے بعد تو اتنے اچھے رشتے کا آنا ہی کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھا لہٰذا سکینہ خالہ کی نظر میں اب مزید دیر کرنا خود اپنی جگ ہنسائی کو سُلانے کے مترادف ہوتا۔ آخر کار چوتھے ماہ جا کر غیاث چچا نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ وہ خود کسی بہانے بازار سے گزرتے ہوئے لڑکے کے شوروم پر دو گھڑی رُک کر اس کا آگا پیچھا دیکھ آئیں گے اور اگر انہیں لڑکا مناسب لگا تو پھر اس کے بعد آس پاس سے اس کے متعلق خبر لینے کی کوشش بھی کریں گے کیونکہ لڑکے کا اپنا کوئی بزرگ تو تھا نہیں جس سے بات کی جا سکتی ہو۔

دراصل غیاث چچا معاملے کو اتنے دن تک اس لیے بھی لٹکاتے آ رہے تھے کیونکہ انہیں اب بھی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے جاوید کی طرف سے کچھ امید تھی۔ جاوید دواؤں کی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور غیاث چچا کی عزت بھی بہت کرتا تھا لیکن جب انہوں نے اپنے بھائی محمود سے و نجو کے لیے آئے رشتے کا سرسری سا تذکرہ کیا تا کہ وہ محمود اور جاوید کی مرضی جان سکیں تو دونوں نے بیک وقت غیاث چچا کو مشورہ دیا کہ اگر رشتہ مناسب ہے تو دیر نہ کریں۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ ان کے بھائی کا گھرانہ ڈوآپی کو اپنانے کی مزید کوئی خواہش نہیں رکھتا، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب اسی بھائی کے غیاث چچا کے گھر چکر لگاتے ہوئے جوتے نہ گھستے تھے۔ لیکن اب وہی ڈوآپی ان کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ اتنے واضح اشارے کے بعد غیاث چچا کی کمر بھی ٹوٹ ہی گئی اور انہوں نے سکینہ خالہ کو اختیار دے دیا کہ وہ جیسے مناسب سمجھیں، پیش رفت کر گزریں البتہ واحد شرط انہوں نے ڈوآپی کی رضامندی سے مشروط رکھی کیونکہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی مرضی کے خلاف اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔

ڈوآپی کچھ عرصہ تو خون کے گھونٹ پی پی کر اپنی ماں کی پریشانی اور باپ کی دن بدن جھکتی ہوئی کمر کو دیکھتی رہیں لیکن پھر ایک دن جب انہوں نے اپنے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں وہ نمی دیکھ لی جس کا باعث وہ صرف اپنی ذات کو ہی سمجھتی تھیں تو اُسی لمحے انہوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ

کرلیا اور چپ چاپ سکینہ خالہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ غیاث چچا نے اپنے طور پر لڑکے کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل کرنا تھیں وہ پہلے ہی کر چکے تھے اور بظاہر لڑکے کے بارے میں سب اچھا ہی کی رپورٹ تھی۔ لہٰذا اب مزید دیر کرنے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی جواز۔ لڑکے کو ہری جھنڈی دکھا دی گئی اور ظفر نے اگلے ہی مہینے بارات لانے کی خواہش ظاہر کر دی اور یوں جس کے نتیجے میں آج اس کے نام کی مہندی وجو آپی کے ہاتھوں میں سج رہی تھی۔

راجہ یہ تمام داستان سنانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ آس پاس سبھی منظر، ہر ذی روح ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہو۔

اگلے دن بارات بھی اپنے وقت پر آ گئی۔ میں نے دُور ہی سے ظفر کو دیکھا۔ کوئی بات بھی تو خاص نہیں تھی اس کی، عام سی شکل وصورت کا ایک تیز طرار سا مرد..... جسے وہاں سب ''لڑکا'' قرار دینے کی اپنی سی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سی لٹکتی مونچھوں نے اسے میرے نزدیک مزید پُراسرار بنا دیا تھا۔ لیکن جانے وہاں سب عورتیں اس کے واری صدقے کیوں ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر وجو آپی کے مقابلے میں تو بالکل ہی چمار دکھائی دیتا تھا۔ کہاں وجو آپی کا چاند سا مکھڑا اور کھلتا گلابی رنگ اور کہاں یہ گہرے سانولے رنگ کا کاروباری سا شخص.....؟

بہرحال وجو آپی کی قسمت کا دھاگہ اب ظفر سے بندھ چکا تھا اور رُخصتی کے وقت پورے محلے نے فرداً فرداً وجو آپی کو دعائیں دے کر رُخصت کیا۔ سکینہ خالہ قرآن شریف سے نیچے گزارتے وقت وجو آپی سے مل کر جو پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو سارے محلے کو آبدیدہ کر گئیں۔ غیاث چچا و جو آپی کو تھامے دولہے کی گاڑی تک یوں چلتے ہوئے گئے کہ مجھے خود ان کے گر جانے کا دھڑکا لگا رہا۔ میں دُور کھڑا رہا کیونکہ اس الوداع کی ہمت میرے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ وجو آپی نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر ہم سب کی طرف دیکھا۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ گیا۔ وجو آپی کی مجھ سے نظر ٹکرائی۔ میں نے روتے روتے اپنی ناک کو اپنی اُنگلی سے دبا دیا۔ آنسوؤں کا ایک فوارہ وجو آپی کی آنکھوں سے بہہ کر ان کے پورے چہرے کو بھگو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ گاڑی چل پڑی، اندر عورتوں کے درمیان بیٹھی وجو آپی نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ یہ میری زندگی کا دوسرا الوداع تھا جو مجھے خون کے آنسو رُلا رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے دل میں کہا۔

''الوداع اے شہزادی..... الوداع.....''

اک دیا جلائے رکھنا

جو چلے تو جاں سے گزر گئے اور میرے خواب ریزہ ریزہ جیسے خوبصورت ناولوں کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ شہرہ آفاق ناول ایک دیا جلائے رکھنا کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

پہلی ٹرافی

اسفر جو فل بیک پر کھڑا تھا، اس کی زوردار کِک نے فٹ بال کو ہوا میں سینکڑوں فٹ اڑاتے ہوئے میرے قدموں میں لا پھینکا۔ میں سنٹر آؤٹ کی جگہ سے فٹ بال کو لیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ پیچھے سے ہمارے گول کیپر موٹے آصف بھٹی کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ”آدی..... دائیں کو پھینک..... دائیں کو پھینک دے..... جلدی کر۔“ دائیں پر مجید چھوٹو چیخ کر آگے بڑھا، میں نے لیفٹ آؤٹ پر فیصل کی طرف بال پھینکنے کا جھکا دیا اور جب مخالف ٹیم کا سنٹر آؤٹ فیصل کی جانب لپکا تو میں نے فٹ بال مجید چھوٹو کی جانب پھینک دیا۔ مجید چھوٹو نے بال سنبھالا اور تیزی سے ڈی کی طرف دوڑا۔ میں نے چلا کر اسے بال دوبارہ سنٹر کی طرف پھینکنے کا کہا لیکن اتنے میں لیاقت ہاؤس کے فل بیک نے تاک کر فٹ بال کی جگہ مجید چھوٹو کو گھما کر پوری قوت سے لات ماری اور مجید چھوٹو اگلے ہی لمحے فضا میں کسی جہاز کی طرح اڑتے ہوئے گراؤنڈ سے ہی باہر جا گرا۔ ہم نے چلا کر ریفری سے احتجاج کیا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ ہمارا کوئی بھی کھلاڑی گیند گول پوسٹ کے قریب لے کر پہنچتا تو لیاقت ہاؤس کے کیڈٹس کوئی نہ کوئی فاؤل کر کے ہمارے کھلاڑی کو روک لیتے تھے۔ مجید چھوٹو پھوٹا سا گراؤنڈ کے باہر پڑا ہوا تھا۔ ہمارے کیپٹن صفدر نے اسے مسل کرا اور مالش کر کے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور کھیل پھر سے شروع ہو گیا۔

آج بارہویں جماعت کے کیڈٹس کے درمیان انٹر ہاؤس فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل تھا اور فائنل میں محمد بن قاسم ہاؤس کی بارہویں جماعت یعنی ہماری ٹیم اور لیاقت ہاؤس کی ٹیم کے درمیان آخری معرکہ شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پہلے پندرہ منٹ میں ہی لیاقت ہاؤس کی ٹیم نے ہمارے تین کھلاڑی زخمی کر کے گراؤنڈ سے باہر بھیج دیئے تھے۔ ہمارا کیپٹن صفدر ان کا چوتھا شکار بنا اور اب ہم بنا کیپٹن کے گراؤنڈ میں موجود تھے۔ صفدر کی گھٹنے سے نیچے کی ہڈی چیخ گئی تھی اور سوجن کے مارے اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ گراؤنڈ کے باہر کیڈٹس کی بھیڑ میں قاسم ہاؤس کے کیڈٹس کے چہرے پر مایوسی چھا رہی تھی میں، فیصل اور اسفر اپنے فل بیک خالد لمبے اور نثار روندو کے پاس بھاگتے ہوئے آئے۔ ہم پانچوں نے سر جوڑے اور میں نے دھیرے سے فیصلہ دے دیا۔ یہ میرا یعنی واکس کپتان کا حتمی فیصلہ تھا۔ ”اب لیاقت ہاؤس کی ٹیم میں سے کوئی بھی ہماری ڈی تک صحیح سلامت نہیں پہنچنا چاہیے..... مار دیا مر جاؤ.....“

ریفری نے تیزی سے سیٹیاں بجا کر ہمیں اپنی اپنی جگہ پر واپس جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے موٹے بھٹی کو آنکھ مار کر گول پوسٹ میں ڈٹے رہنے کا اشارہ کیا اور کھیل ایک بار پھر سے شروع ہو گیا۔ لیکن اس بار صورت حال مختلف تھی۔ اب لیاقت ہاؤس کے کھلاڑی اڑتے ہوئے گراؤنڈ سے باہر جاتے دکھائی دے رہے تھے، کچھ ہی دیر میں ان کا کپتان میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ اس کا نام بابر تھا اور ایک زمانے میں وہ بھی ان 23 تئیس کیڈٹس

میں شامل تھا جو "ڈاکٹر نو پرچی کیس" میں ہمارے ساتھ تین ہفتے تک رگڑا کھاتے رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے سرگوشی میں کہا۔

"ہے آدی..... کیا ہماری ساری ٹیم کو آج کی ڈاکٹر نو کے ہسپتال پہنچانے کا ارادہ کر کے آئے ہو..... اب بس کر دو یار....."

"ٹھیک ہے..... اپنی ٹیم سے بھی کہہ دو کہ کِک فٹ بال کو ماریں..... میرے کھلاڑیوں کو نہیں۔"

بابر مسکرایا "او کے..... سیز فائر....."

"رائٹ..... سیز فائر....." میں نے بھی انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کر دیا۔ اگلے ہاف میں صاف کھیل ہوا اور بات پنالٹی ککس تک پہنچ گئی۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا گول کیپر بھٹی سب سے آگے تھا۔ اس نے پانچ میں سے تین پنالٹی ککس روک لیں اور دوسری جانب میری، فیصل، اسفر اور نثار روندو کی پنالٹی سیدھی ان کے گول میں گئی۔ ہم نے ایک گول کے مارجن سے فائنل جیت لیا تھا اور قاسم ہاؤس کی پچھلے دس سال میں یہ پہلی فٹ بال فائنل کی ٹرافی تھی جو آج ہم اپنے ہاتھوں میں اٹھائے پورے گراؤنڈ کا چکر لگا رہے تھے۔

صرف فٹ بال ہی نہیں بلکہ ہم جب سے بارہویں جماعت میں آئے تھے ہم نے رائیڈنگ، سوئمنگ، ہیس بال، باسکٹ بال، جیولن تھرو اور نہ جانے کون کون سی ٹرافی سے فہد صاحب کا آفس بھر دیا تھا۔ ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کو ہمیشہ ہم سے شکایت رہی تھی کہ ہمارا بیچ ان کے ہاؤس میں آنے والا سب سے زیادہ شرارتی اور نظم وضبط توڑنے والا بیچ (Badge) تھا لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم نے نظم وضبط میں اور ڈسپلن میں نہ سہی، لیکن دیگر ہر شعبے میں وہ کارکردگی دکھائی کہ جو پچھلے کئی سالوں میں ہمارے سینئر نہیں دکھا سکے تھے۔ اب ہم ساتویں جماعت کے لاغر اور کم زور بدن والے ڈرے سہمے کیڈٹس نہیں تھے بلکہ اونچے، لمبے اور مضبوط جسموں والے کیڈٹ آفیسرز تھے۔ جن کے بدن ایکسٹرا ڈرل کی مشقتوں اور مہینوں تک بوجھ اٹھا اٹھا کر بھاگنے کی وجہ سے پک کر فولاد بن چکے تھے۔ گیارہویں جماعت تک ہم سزائیں کھا کھا کر اس حد تک ماہر ہو چکے تھے کہ اب پیٹی آفیسرز (پی۔اوز) کو ہمیں سزا دیتے دیتے پسینہ آجاتا تھا۔

کئی مرتبہ ہماری شکایت کمانڈر صاحب تک بھی پہنچی لیکن ان کا ایسے معاملوں میں ایک بہت سیدھا اور واضح اصول تھا کہ چاہے شرارت کیسی بھی کیوں نہ ہو، وہ صرف ہماری پڑھائی کے رزلٹ اور کلاس ٹیسٹ کے نتیجے کو سامنے رکھ کر کسی بھی سزا کا فیصلہ کرتے تھے۔ ویسے بھی فوجی تربیت کے معاملات انہوں نے ایجوکیٹ کے حوالے کر رکھے تھے۔ انہیں صرف ہماری پڑھائی سے غرض ہوتی تھی اور ہماری پوری ڈارمیٹری میں سے صرف ایک بار موٹا بھٹی دسویں کے مڈٹرم ٹیسٹ میں بیماری کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پوری کلاس کا رزلٹ ہمیشہ بہترین آتا تھا، لہٰذا کمانڈر صاحب کو کبھی ہمارے خلاف حتمی فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ پرنسپل صاحب کالج سے باہر بنک کے شدید مخالف تھے اور ایسی غلطی وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے لہٰذا اب تک یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم کبھی جانو کے شیرٹن ہوٹل سے رنگے ہاتھ نہیں پکڑے گئے تھے، حالانکہ سی۔پی۔او کو پکا یقین تھا کہ ہم ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت اڑانے کے لیے کیمپس سے بنک Bunk ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے درجنوں چھاپوں کے باوجود ہم کبھی اس کے ہتھے نہیں چڑھے اور کئی بار تو بال بال بچے۔

(گیارہویں) فرسٹ ائیر کے دوران زندگی اپنے معمول پر ہی رہی تھی اور سوائے شیرل کی شادی کے، دیگر کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔ شیرل، ہیری کے ساتھ بیاہ کر پیا دیس سدھار گئی۔ مجھے شیرل کے خاندان کی طرف سے شادی میں شرکت کی خاص دعوت تھی اور میں چرچ میں سوٹ

میں ملبوس ہیری کو دیکھ کر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ اس لڑکے کو تو میں نے کئی مرتبہ ٹیوشن کے دوران آتے جاتے چرچ کے احاطے کے پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ وہ گیٹ پر آ کر کسی دوسری نن (سسٹر) کے ذریعے ہیلن کو پیغام بھی بھجوایا کرتا تھا لیکن ہیلن اس سے ملنے نہیں جاتی تھی، کبھی کبھی جب میں ہاؤس ماسٹر سے نظر بچا کر اتوار کے روز چرچ سروس میں ہیلن سے ملنے جایا کرتا تو تب بھی یہی لڑکا ہمیشہ مجھے پیانو کے قریب سب سے پہلی رو میں بیٹھا نظر آتا تھا اور جب کبھی ہیلن کوائر سروس، Quire Service کے دوران پیانو بجاتی تو وہ نہایت انہماک سے ہیلن کو دیکھا کرتا تھا۔ شیرل ہمیشہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی اور کئی مرتبہ وہ دونوں ساتھ ہی واپس اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے لیکن جاتے جاتے بھی ہیری کی نظریں ہیلن ہی کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ اسی لئے جب میں نے اسے چرچ کے ڈائس پر سفید دُلہنوں والے لباس میں ملبوس شیرل کے ساتھ کھڑے اور شیرل کو انگوٹھی پہناتے دیکھا تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ہیلن نے میری آنکھوں میں جھانکتے سوال کو محسوس کر لیا اور نظروں ہی نظروں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رات کو جوزف نے ہیری اور شیرل کے اعزاز میں ایک بہت شاندار پارٹی کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ خوب ہلہ گلا ہوا اور سب ہی نے جوزف کے بجائے ہوئے واکمن اور پھر اکارڈین کی دُھن پر خوب رقص کیا۔ ایک ایسے ہی موقعے پر جب سب ہی شور شرابے اور کھانے پینے میں مشغول تھے، میں ہیلن کو ہال میں موجود نہ پا کر خود بھی اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر باغیچے کی جانب چلا آیا جہاں ہیلن سنگترے کے پیڑوں کے پاس بچھے جھولے کے قریب خاموش سی کھڑی آسمان کو تک رہی تھی۔ شاید وہ بھی ان ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہی ہوگی۔ میری آہٹ پا کر وہ چونک کر مُڑی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''کوئی سوال مت کرنا آدی..... میرے پاس تمہارے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے.....''

میں چپ ہی رہا اور ہیلن کے قریب ہی جھولے پر بیٹھ گیا اور میں نے ہیلن کو آسمان پر اپنا ستارہ دکھایا، سب سے واضح اور چمکدار..... اور ہیلن سے اس کے ستارے کے بارے میں پوچھا۔ ہیلن کچھ دیر آسمان کو دیکھتی رہی اور پھر اُس نے دُکھ بھرے لہجے میں بتایا کہ اس کا ستارہ کہیں کھو گیا ہے۔ اب ڈھونڈے سے بھی نہیں مل پا رہا۔ اس رات ہم دونوں چپ چاپ آسمان کو دیکھتے رہے۔ شیرل بیاہ کر ہیری کے ساتھ کینیڈا چلی گئی اور پھر بہت دنوں بعد ایک دن ہیلن نے اپنے لب کھول ہی دیے.....

ہیری بہت عرصے سے ہیلن کو چاہتا تھا۔ لیکن ہیلن نے اپنے لیے خدائی راہ اور مذہب کا راستہ اُس کی چاہت سے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا۔ ہیری نے بہت پاپڑ بیلے اور بہت سر پٹخے لیکن ہیلن کے دل کا پتھر پگھلنا تھا نہ پگھلا۔ ہاں البتہ شیرل ہر اتوار چرچ سروس کے بعد ہیری کے ساتھ گھر آتے جاتے اس کی باتوں میں اس قدر کھوئی کہ کچھ ہی ہفتوں میں اُسے چاروں طرف صرف ہیری ہی ہیری دکھائی دینے لگا۔ اور حسبِ معمول اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے یہ راز اپنی سب سے بڑی رازداں ہیلن کو ہی بتایا۔ ہیلن نے نہایت سکون سے اپنی ہم نفس اور پیاری بہن کی بات سنی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے وعدہ کیا کہ ہیری اگر دنیا میں کسی کا ہوگا تو صرف شیرل ہی کا ہوگا۔ یہی وہ دن تھا، جب ہیلن نے پہلی مرتبہ ہیری کو شام کے وقت چرچ کے احاطے کے باہر گھومتے ہوئے خود گیٹ پر بلایا۔ پہلے تو ہیری کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت آج خود اس پر اتنی مہربان ہے، لیکن جب ہیلن نے اُس سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ ہیری سے یہ پوچھے کہ وہ اس کے لیے اپنی کسی قیمتی چیز کی قربانی دے سکتا ہے تو ہیری کا

جواب کیا ہوگا؟

ہیری نے جواباً کہا کہ اس کی ملکیت میں اس کی سانسوں سمیت جو کچھ بھی ہے وہ ہیلن ہی کا تو ہے، لہٰذا یہ سوال ہی قطعی بے معنی ہے۔ لیکن ہیلن نے اس سے پھر کہا کہ جواب دینے سے پہلے وہ ایک بار پھر اچھی طرح سے سوچ لے کہ بعض دعوے صرف دعوے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہیری نے پھر یہی کہا کہ آزمائش شرط ہے۔ تب ہیلن نے اسے شیرل کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام لینے کی استدعا کی تو کچھ دیر تک تو ہیری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔ ہیلن نے اسے خاموش دیکھ کر کہا کہ اگر ہیری چاہے تو وہ اپنا سوال واپس لے سکتی ہے کیونکہ یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ لیکن ہاں کرنے کی صورت میں ہیری کو ساری عمر کے لیے شیرل کو خوشیاں دینے کا وعدہ بھی نبھانا پڑے گا البتہ ''نہ'' کرنے کی صورت میں ہیلن اور ہیری کو وہاں سے اٹھنے کے بعد اس ملاقات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔

ہیری کے لیے شاید یہ زندگی کا سب سے بڑا امتحان تھا لیکن وہ بھی اپنے لفظوں کا پکا نکلا۔ اس وقت تو وہ چُپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا لیکن اگلے ہی ہفتے شیرل اپنے چہرے پر قوس وقزح کے سارے رنگ لیے بھاگتی ہوئی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور آتے ہی ہیلن سے لپٹ گئی۔ ہیری کے گھر والے اسی شام اس کا ہاتھ مانگنے آ رہے تھے۔ شیرل جانتی تھی کہ اس معجزے کے پیچھے ہیلن ہی کا ہاتھ ہوگا لیکن وہ یہ کبھی نہیں جان پائی کہ ہیری نے ہیلن کی محبت کے سنگھاسن پر شیرل کی مُورت خود ہیلن ہی کے کہنے پر سجائی تھی۔

میں ہیلن کی زبانی یہ ساری کہانی سن کر بہت حیران تھا۔ یہ محبت آخر کس بلا کا نام تھا۔ یہ انسان سے کیا کچھ کروا لیتی ہے۔

شیرل چلی گئی۔ ہم گیارہویں سے بارہویں جماعت میں آ گئے۔ اب ہم سینئر کیڈٹ آفیسر بن چکے تھے اور اکیڈمی میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔ راجہ کے خط اب بھی باقاعدگی سے مجھے آتے تھے لیکن میرا دل وجو آپی کی رُخصتی کے بعد کبھی محلے میں نہیں لگ پایا۔ بات صرف وجو آپی کی رخصتی تک ہی رہتی تو شاید مجھے دھیرے دھیرے صبر آ ہی جاتا۔ لیکن ایسے لگتا تھا جیسے تقدیر کو ابھی وجو آپی اور ان کے خاندان کے مزید کچھ امتحان لینا مقصود تھے۔ وجو آپی کی رخصتی کو ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ صبح سویرے ایک نئی اُفتاد ان کے گھر کے آنگن میں ڈیرہ ڈال چکی تھی۔

آتش پرست

وجیہہ سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی ممی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی ممی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی دُنیا کو اس منحوس ممی سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے..... **آتش پرست**

جسے جلد ہی کتاب گھر پر **ایکشن ایڈونچر مھم جوئی ناول** سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

دھوکہ

ڈوآپی کی رُخصتی کو آج تیسرا دن تھا اور تیسرے دن تو ویسے بھی دُلہن کو ولیمے کے بعد رات کو گھر چھوڑنے کے لیے ظفر کو خود آنا تھا لیکن وہ صبح سویرے ہی ڈوکو ان کے گھر چھوڑ کر باہر سے ہی واپس لوٹ گیا۔ لڑکی کو یوں اکیلا گھر کے صحن میں کھڑے دیکھ کر ماں باپ کے تو حواس ہی گم ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں عقدہ یہ کھلا کہ ظفر میاں نے ولیمے کا سارا بندوبست تو کر رکھا تھا اور اُنہیں اب صرف اپنی ایک بڑی رقم کی وصولی کا انتظار تھا جو ایک سودے کے سلسلے میں اُنہیں آج ہی ہونی تھی، لیکن ''اتفاق'' سے آج پارٹی نے کچھ ایسی مجبوری اور عذر پیش کر دیا تھا کہ خود ظفر بھی ان کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال ولیمہ تو کرنا تھا۔ ظفر کے تمام دوست، برادری اور خود ڈو کے تمام خاندان کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے۔ اب ایسے وقت میں ولیمہ منسوخ بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا، لہٰذا ظفر نے ڈوآپی کو غیاث چچا کے پاس جانے کا کہا تا کہ وہ غیاث چچا سے ولیمے کی رقم ''ادھار'' دلوا سکے۔ ظفر نے ڈوآپی سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے سودے کی رقم ملی وہ غیاث چچا کے پیسے لوٹا دے گا۔ ڈوآپی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ جا کر اپنے ابا کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ڈوآپی جیسی خوددار لڑکی کے لیے یہ سب کچھ کس قدر مشکل ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ میں خوب لگا سکتا تھا۔

غیاث چچا نے بنا کوئی دوسرا سوال کیے رقم ڈوآپی کے ہاتھ پر رکھ دی اور فضلو بابا سے کہہ کر تانگہ منگوایا اور ڈوآپی کو فضلو بابا کے ساتھ ان کے گھر واپس بھجوا دیا۔ یوں ڈوآپی کا ولیمہ تو خوب شان و شوکت سے ہو گیا لیکن غیاث چچا کا ماتھا اُسی دن ٹھنک گیا کہ شاید اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں ان سے کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔ ظفر کے چہرے پر ولیمے والی رات بھی کسی قسم کے خجالت کے کوئی آثار نہ تھے جیسے اُسے اس بات کی ذرہ برابر بھی شرمندگی نہ ہوئی ہو کہ اس کے ولیمے کی دعوت کا خرچ بھی اُس کے سُسرال کو ہی اٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا قہقہے لگاتا رہا اور ولیمے کے شاندار ''انتظام'' پر سب کی مبارکباد اور داد وصول کرتا رہا۔ رات گئے جب دعوت ختم ہوئی تو اُس نے خود اپنے دوستوں کے ساتھ رُکنے کا عذر کر کے ڈو کو وہیں سے ان کے ماں باپ کے ساتھ مکلاوے پر تین دن کے لیے گھر بھیج دیا۔

اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ ظفر میاں کی اتفاقاً پڑنے والی مجبوریوں کی فہرست لمبی ہی ہوتی گئی، اور غیاث چچا سے ہر بار قرض کے نام پر بٹوری گئی رقم کبھی واپس نہ ملی۔ بلکہ کچھ عرصے بعد تو ظفر نے یہ قرض نام کی دُم لگانے کا تکلف ہی ختم کر دیا اور اب تو وہ اپنے حق کے طور پر ڈوآپی کے ذریعے یا پھر خود ہی باتوں باتوں میں رقم مانگ لیا کرتا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ڈو اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ آخر ان کے پاس جو کچھ بھی ہے، ان کی بیٹی کا ہی تو ہے بھلا وہ یہ سب اپنے ساتھ تو لے کر نہیں جائیں گے نا.....؟

غیاث چچا ایک وضع دار شخص تھے اور چپ چاپ اپنے غلط فیصلے کی قیمت چکاتے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ظفر کے کاروبار کی اصلیت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ گاڑیوں کا وہ شوروم اس کی ملکیت نہیں تھا بلکہ اس کا ایک دوست جو سال ڈیڑھ کے لیے اپنی قسمت آزمانے دوبئی گیا ہوا تھا، وہ اس شوروم کا مالک تھا۔ اس کی قسمت دوبئی میں نہیں کھلی اور وہ جلد ہی یہاں باقی سب کی قسمت پھوڑنے کے لیے واپس آن موجود ہوا۔ ظفر اس کے شوروم پر صرف ایک ڈیلر کا کام کرتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں وہ شوروم کا انتظام سنبھالتا تھا۔ انتظام سنبھالتے سنبھالتے ظفر میاں نے یہاں بھی اپنے ہاتھ دکھا ہی دیئے تھے لہٰذا دوست نے آ کر جب حساب کتاب کیا تو تقریباً پچاس ہزار روپے کا گھپلا نکلا۔ ظفر کی ملازمت تو جانی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیاث چچا نے اچھے وقتوں میں زمین کا ایک ٹکڑا جو اپنے بڑھاپے کے لیے لے کر سنبھال رکھا تھا وہ بھی بک گیا کیونکہ اب غیاث چچا کے پاس ظفر کو دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

اب ظفر بے روزگار تھا لیکن ٹھاٹ اس کے اب بھی وہی شاہانہ تھے۔ محنت کر کے روزی کمانا اس نے کبھی سیکھا نہیں تھا اور اُسے ہمیشہ سے شارٹ کٹ استعمال کر کے ایک ہی رات میں لکھ پتی بننے کا جنون تھا۔ اسی ذہن کے خناس کی وجہ سے وہ مختلف جگہوں پر قسمت آزماتا رہتا تھا اور جو کچھ کماتا اس سے زیادہ لٹا دیتا تھا۔ مثلاً کبھی پرائز بانڈ کی پرچیوں کے نمبر کا دھندہ شروع کیا تو کبھی مختلف لاٹریوں کے ٹکٹ اس کے گھر میں بکھرے نظر آتے۔ کبھی خلیج کے ممالک کے بروکرز سے مل کر ویزے کا کام شروع کیا تو کبھی جیولرز کے ساتھ مل کر سونے کے بھاؤ لگاتا نظر آتا۔ غرض دنیا کا ایسا کوئی مختصر راستہ باقی نہیں بچا تھا، جو ظفر نے جلد دولت حاصل کرنے کے لیے نہ آزمایا ہو۔ لیکن ظاہر ہے، ایسے طریقوں سے اگر کوئی دولت مند بن سکتا تو دنیا اس وقت اُس جیسے کنگلوں سے خالی ہوتی۔ اس بے روزگاری نے اُسے مزید چڑچڑا کر دیا تھا اور اب وہ باقاعدہ ڈوآپی پر چلانے بھی لگا تھا۔ ڈو ناز و نعم کی پلی ہوئی ایک ایسی لڑکی تھیں، جن کی پرورش میں تہذیب اور ادب و آداب کا لحاظ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ظفر کے اس رویے سے سہم جاتیں اور چپ کر کے گھر کے کسی کونے میں سکڑی سمٹی سی بیٹھی رہتیں۔ لیکن ظفر کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلتی اور تیسرے دن پھر وہ غیاث چچا کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی ہوتیں۔ گیارہویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد میں جب چند دن کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ان دنوں انہیں وہاں آتے جاتے اکثر دیکھتا رہتا۔ اب ہم بڑے ہو چکے تھے لہٰذا اب ہمارا اُس بے تکلفی سے سبھی کے گھروں میں گھس جانا، خود ہمیں ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن ہم سب محلے کے بڑے میدان میں وکٹیں گاڑے کرکٹ کھیل رہے تھے، میں بیٹنگ کر رہا تھا جب میں نے ڈوآپی کو فضلو بابا سمیت تانگے پر سوار محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ڈوآپی تانگے سے اتریں تو نہ جانے کیوں مجھے بہت کم زور دکھائی دیں۔ میں نے دُور ہی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا تو وہ ہلکے سے مُسکرا دیں۔ وہی گلابی مسکراہٹ، جس کا میں بچپن سے ہی دیوانہ تھا۔

ان کے گھر میں جاتے ہی راجہ نے، جو وکٹ کیپنگ کر رہا تھا، ظفر کو ایک موٹی سی گالی دی اور مجھ سے کہا کہ ضرور اُس ظفر نے کوئی نیا مطالبہ دے کر انہیں گھر بھیجا ہوگا۔ ڈوآپی کی ساری کہانی اب کوئی راز نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ ایک آدھ بار جب غیاث چچا وقت پر ظفر کو پیسے نہیں ادا کر پائے تھے تو اس نے ان کے دروازے پر آ کر انہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ اور بہت سی اُلٹی سیدھی باتیں اس زوردار آواز میں کی تھیں کہ پورے محلے کو پتہ چل گیا کہ غیاث چچا جیسا شریف انسان کس غلط انسان کے چُنگل میں پھنس چکا ہے۔

کچھ ہی دیر میں فضلو بابا اندر سے لاٹھی ٹیکتے نکلے اور مجھے آ کر کہا کہ ”وجیہہ بی کہتی ہیں کہ آدی شام کی چائے ہمارے ہاں پئیں گے۔“.....
یہ فضلو بابا کا مخصوص انداز تھا، وہ وجیہہ بی کی بات کو باقاعدہ حکم کی طرح آ کر سُنا جاتے اور جواب کا انتظار کیے بنا ہی پلٹ بھی جاتے۔ نخوان کی بہت اچھی نقالی کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر فضلو بابا ہوتے تو وہ لاٹھی لے کر نخو کے پیچھے بھاگتے اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

میں ڈوآپی کے گھر میں داخل ہوا تو وہ صحن میں ہی چائے کی میز سجائے بیٹھی تھیں، ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جسے وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہی تھیں۔ میرے دل میں درد کی ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ تقدیر نے اس میر کی غزل اور خیام کی رُباعی جیسی گل اندام لڑکی کو یہ کس جاہل جلاد کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔ اُسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ درد اور غالب شاعر تھے یا کسی لاٹری کمپنی کے ٹکٹ فروخت کرنے والے بروکر۔ پتہ نہیں ظفر نے ڈوآپی کی نثر اور شاعری کی کتابیں بھی باقی رہنے دی تھیں یا پھر انہیں بھی بیچ کر کھا گیا تھا؟

ڈوآپی نے مجھے دروازے میں کھڑے دیکھا تو آواز دی۔

”اندر آ جاؤ آدی..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....؟“

میں کچھ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور ان کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا انہوں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اتنے دن سے..... ڈوآپی کی یاد نہیں آتی اب کیا.....؟“

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے..... آپ سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، پر..... کچھ جھجک سی ہوتی ہے۔“

وہ حیرت سے نظریں اٹھا کر بولیں۔

”جھجک..... کیسی جھجک.....؟“

”وہ..... میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا..... اس لیے.....“

میرا جواب سُن کر ڈوآپی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے..... ہمارا آدی اب بڑا ہو گیا ہے..... واقعی بھئی..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا..... اماں..... اماں بات سنیں نا..... آدی کیا کہہ رہا ہے۔“

انہوں نے آوازیں دے کر سکینہ خالہ کو بھی باورچی خانے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور ہنستے ہنستے انہیں بھی میری کہی ہوئی بات بتائی۔ سکینہ خالہ بھی زور سے ہنس پڑیں۔ میں دم بہ خود انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا..... کتنے دنوں کے بعد اس گھر میں ڈوآپی کی ہنسی کی آواز گونجی تھی۔ مجھے انہیں ہنستے دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا اور میں نے اُسی لمحے اپنے دل میں خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ یا میرے مولا! اس معصوم لڑکی کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی سدا کے لیے دان کر دے۔

اس شام انہوں نے بہت دیر تک مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ کیڈٹ کالج کے بارے میں بھی پوچھتی رہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگلا سال ہمارا اکیڈمی کا آخری سال ہو گا اور میری بہت خواہش ہے کہ کاش وہ بھی میری پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھنے کے لیے میرے کالج آئیں۔ اس دن میں

نے انہیں یہ بھی بتادیا کہ میں صرف انہی کے کہنے پر واپس کیڈٹ کالج گیا تھا لہٰذا میری پاسنگ آؤٹ سلامی پریڈ کی اصل حق دار بھی وہی ہوں گی۔

یہ سُن کر ان کے ملیح چہرے پر اُداسی کا ایک ہلکا سا بادل چھایا پھر وہ جلدی سے مسکرا کر بولیں کہ وہ پوری کوشش کریں گی کہ کسی طرح وہاں آ سکیں۔لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ان کا میری پاسنگ آؤٹ پر اتنی دُور آنا ناممکن ہے۔لیکن وہ ڈوآپی ہی کیا جو کسی کا دل توڑ دیں.....؟ یہ ہُنر تو انہوں نے ساری زندگی سیکھا ہی نہ تھا۔سوا اُس لمحے میرے دل کو بھی انہوں نے اُسی خوبصورتی سے بہلا دیا۔

میری چھٹیاں ختم ہوگئیں اور میں کالج چلا آیا۔لیکن ڈوآپی کی اس شام کی باتیں اور بارہویں جماعت کے بارے میں کی ہوئی نصیحتیں بھی میرے سنگ سنگ تھیں۔ جب کبھی میں ذرا سی دیر کے لیے بھی تھکن دُور کرنے کے لیے آنکھیں موندھ لیتا تب وہی گلابی شام کی ملاقات میرے ذہن کے کسی گوشے سے چھم سے میری آنکھوں میں اتر آتی تھی۔

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔جرم وسزا اور جاسوسی وسراغرسانی پر ایک منفرد تحریر۔ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغرساں کا دلچسپ قصہ،ایک مجرم اس پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب وغریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔سراغرساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے.....**ریشمی خطرہ**.....جو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دُنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابنِ صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

آخری بنک "Bunk"

فہد صاحب کو شک ہو گیا تھا کہ ہم رات کو کہیں نہ کہیں غائب ضرور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ہاسٹل کے بیرونی جنگلے کے تالے بدل دیئے تھے۔ ہم ویسے بھی اوپر والی منزل پر تھے اور اس کی راہداری کے آخری جنگلے کی ہم نے جمعہ بیرے کی مدد سے چابیوں کی نقل بنوا رکھی تھی۔ لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ جنگلہ ہی ختم کر کے وہاں مستقل دروازہ لگا کر گارڈ بٹھا دیا گیا ہے۔ اب ہمارے پاس واحد راستہ چھت سے نیچے اُترتے ہوئے پانی کے پائپ تھے، جن سے لٹک کر ہم رات کو نائٹ فالن کے بعد نیچے اتر آتے اور جلّو کے شیرٹن ہوٹل سے کبھی کھانا، کبھی چائے اور کبھی کبھار لسی کے گلاس غٹا غٹ چڑھا کر واپس انہی پائپوں کے ذریعے چھت تک پہنچ جاتے اور چھت کی سیڑھیوں سے اندر دوسری منزل کی راہداری تک پہنچ کر سو جاتے۔

ہمارے سالانہ امتحانات قریب آ رہے تھے اور ہم آج کل رات کو بہت دیر تک پڑھتے تھے کیونکہ بارہویں جماعت کے لیے لائٹ آف کی پابندی ان کے امتحانات کے قریب ختم کر دی جاتی تھی۔ ایسے میں موٹے بھٹی کو رات بارہ بجے کے بعد بھوک کا ایک آدھ دورہ ضرور پڑتا تھا، اور وہ ہماری جان کے درپے ہو جاتا کہ کچھ کھانے کے لیے چلا جائے۔

اس رات بھی میں اسفر اور فیصل کیمسٹری کے فارمولے رٹ کر ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے کہ اچانک بھٹی کے پیٹ کی بھٹی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی اور وہ ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا کہ اُسے فوراً مرغ چھولے کھانے کو چاہئیں۔ کچھ دیر تو ہم اس کی بک بک نظر انداز کرتے رہے پھر اسفر نے تنگ آ کر کتاب پٹخ دی۔

''یار پہلے اس موٹے کا کچھ کرو..... اس کی باتیں سُن سُن کر تو مجھے بھی بھوک لگنے لگ گئی ہے۔''

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اصل میں ہم سب کا دل بنک کے لیے مچل رہا ہوتا تھا لیکن ہم سب بھٹی کے بولنے کا انتظار کرتے رہتے تا کہ کسی مصیبت کی صورت میں ہمیں الزام دینے کے لیے کسی کا کندھا دستیاب ہو۔

ہم نے مجید چھوٹو سے بھی پوچھا کہ کیا ارادہ ہے۔ وہ پہلے ہی سے چھت پر بیٹھا چاند کی روشنی میں ریاضی کے تھیورم اپنی موٹی کھوپڑی میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فوراً کتاب دُور پھینک دی کہ جب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں جائے گا، وہ کچھ بھی رٹ نہیں پائے گا۔

ہمارا اصول یہ تھا کہ ہم ایک ایک کر کے چھت سے نیچے اترتے تھے۔ سب سے پہلا لڑکا اترنے کے بعد کچھ دیر آس پاس کا جائزہ لیتا اور پھر ہلکی سی سیٹی بجا کر اشارہ کرتا تب دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا اور چوتھا لڑکا پائپ سے لٹکتے ہوئے نیچے اتر جاتا۔ سب سے پہلے مجید چھوٹو نے

آستینیں اوپر کیں اور چھت کی منڈیر پر پاؤں نیچے لٹکا کر پائپ ہاتھوں سے تھام لیا اور نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک اُس کے سگنل کا انتظار کرتے رہے لیکن نیچے سے سوائے ایک 'دھپ' کی آواز جو شاید مجید چھوٹو کے کودنے کی آواز تھی، دوسری کوئی آواز نہیں آئی۔ آصف بھٹی جس کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اس نے مجید کو کئی صلواتیں سناتے ہوئے کہا کہ وہ پھر سیٹی بجانا بھول گیا ہو گا لہٰذا بھٹی نے پائپ تھاما اور وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم نے پھر چند ہی لمحوں میں بھٹی کے اترنے کی آواز تو سنی لیکن اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اب میں، فیصل اور اسفر چھت پر رہ گئے تھے۔ ہم شدید اُلجھن میں تھے کیونکہ اگر نیچے کسی پٹی آفیسر وغیرہ نے انہیں بھاگتے ہوئے پکڑ بھی لیا ہوتا تو شور شرابہ تو ہوتا۔ یہ دونوں تو نیچے جا کر بالکل ہی چپ ہو گئے تھے۔ اب فیصل کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ضرور یہ دونوں کسی شرارت کے چکر میں ہیں۔ لہٰذا وہ خود جا کر دیکھتا ہے۔ فیصل اترا اور پھر وہی خاموشی..... میں اور اسفر اوپر چند لمحے انتظار کرتے رہے اور پھر میں نے اسفر سے کہا کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ میں نیچے جا رہا ہوں لیکن اگر اگلے پانچ منٹ تک میری سیٹی کی آواز اُسے سنائی نہ دے تو وہ نیچے نہ اُترے بلکہ وہیں چھت پر ہمارا انتظار کرے یا پھر نیچے ڈارمیٹری میں جا کر ہمارے لیے ''کمک'' کا بندوبست کرے۔

میں نے دل ہی دل میں ان تینوں کو سخت سناتے ہوئے پائپ کو تھاما اور چھت کی منڈیر سے نیچے اتر کر پائپ سے لٹکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ ابھی تین چار فٹ ہی نیچے اترا ہوں گا کہ اچانک مجھے یوں لگا کہ جیسے میں خلا میں تیر رہا ہوں۔ پائپ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں کسی نرم اور لجلجی سی چیز پر آ کر گرا، زوردار دھپ کی آواز آئی اور کسی کی 'ہائے' کی آواز کے ساتھ ہی میرا ذہن ڈوب گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے اوپر کوئی بوری آ کر گری اور اس بار 'ہائے' کی آواز نکالنے کی باری میری تھی۔ کچھ دیر تک ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ میرے بازو میں، جو نیچے ٹکرایا تھا شدید درد ہو رہا تھا۔

پھر سب سے پہلے میرے حواس اس وقت یکجا ہوئے جب بھٹی نے زور سے 'ہائے مر گیا' کا فریادی نعرہ لگایا۔

ہم پانچوں نیچے زمین پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے اور میرے اوپر گرنے والا بوجھ کسی بوری کا نہیں تھا بلکہ اس احمق اسفر کا تھا جو میری ہدایت کے باوجود چھت سے اترنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ پائپ جس سے لٹک کر ہم نیچے اترتے تھے، چھت سے تین فٹ کی لمبائی تک نیچے آنے کے بعد یک دم ہی غائب ہو چکا تھا، لہٰذا خلاء میں تیرنے کا جو تجربہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم سب ہی کو ہوا تھا وہ اسی پائپ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ ہم پانچوں دوسری منزل سے پائپ ختم ہونے کے بعد ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے سیدھے نیچے زمین پر ''دھپ دھپ'' گرتے رہے اور ہم سب میں سب سے زیادہ بُری حالت مجید چھوٹو کی تھی۔ جو سب سے پہلے چھت سے اُترا تھا۔ اُترا کیا تھا کسی ٹوٹے جہاز کی طرح رن وے پر گرا تھا۔ ہم نے بمشکل اِدھر اُدھر ہو کر اپنے نیچے سے مجید چھوٹو کو ڈھونڈ کر نکالا۔ وہ بالکل ہی بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم سب نیچے گھدی ہوئی کیاریوں میں سے ایک کے اندر آ کر گرے تھے، ورنہ اگر زمین سخت ہوتی تو شاید ہماری ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ لیکن اس وقت بھی ہم سب کی حالت انتہائی مخدوش تھی۔ مجید چھوٹو اور بھٹی تو باقاعدہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ جنہیں ہم بڑی مشکل سے گھسیٹ گھسیٹ کر کیاریوں کو پانی دینے والے فوارے سے منہ پر پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لائے۔

ابھی ہم اپنے ہواس بحال بھی نہ کر پائے تھے کہ اچانک ہی چاند گاڑی کی روشنی براہ راست ہمارے اوپر آ کر پڑی۔ ہم میں اس وقت اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر بھاگ ہی جاتے یا کسی درخت یا جھاڑی کے پیچھے چھپ جاتے۔ کچھ ہی دیر میں بخشوسی۔ پی۔او ہمارے سر پر ٹارچ تانے کھڑا حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ یہ آدھی رات ہم پانچوں ان کیاریوں میں لیٹ کر کون سی باغبانی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ رات کو سبزے میں لیٹ کر پڑھنے سے سبق جلدی ذہن نشین ہوتا ہے لیکن اس نے ہماری ایک نہیں سنی اور ہمیں اٹھ کر اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم اٹھ کر چل سکتے تو اب تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے جہاں سی۔ پی۔او کے فرشتے بھی ہماری خبر نہ پا سکتے۔ سب سے پہلے اسفر نے اٹھ کر ''چلنے'' کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر دوسری کیاری میں زمین بوس ہو گیا۔ اب بخشو کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور کچھ ہی لمحوں بعد ہم سب کو چاند گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر نو کے ہسپتال کی جانب لیجایا جا رہا تھا۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اگلے دن ہم پانچوں ہاتھوں اور پیروں پر پلاسٹر چڑھائے ہسپتال کے وارڈ میں ایک لائن سے بستروں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ پلاسٹر اگلے چار ہفتے کے لیے ہمارے جسموں پر منڈھا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ گزشتہ شام ہی مزدوروں نے فہد صاحب کے کہنے پر وہ پائپ کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ دوسری جانب نئے پائپ ڈال دیئے گئے تھے اور اب وہ پرانے پائپ متروک ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ ہمارا آخری بنک ثابت ہوا کیونکہ چار ہفتے بعد جب وہ پلستر ہمارے جسموں سے اترا تو دو دن بعد ہمارے سالانہ امتحانات کے پرچے شروع ہونے کی تاریخ تھی اور سالانہ امتحان کے بعد ہماری آخری پاسنگ آؤٹ پریڈ ہونا تھی۔ اس رات کے زخموں کے نشان ایک میٹھی یاد بن کر ہمیشہ کے لیے ہمارے جسموں پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے، جو ہمیشہ ہم پانچوں کو اس آخری اور نامکمل بنک کی یاد دلاتے رہے۔

حُسنہ اور حُسن آراء

حُسنہ اور حُسن آراء ادور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کی 4 تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ایک کہانی حسنہ اور حُسن آراء پہلی بار آپ کے سامنے آرہی ہے۔ عمیرہ احمد کا TV کے لئے یہ پہلا منی سیریل بھی تھا اور یہ TV کی تاریخ کے مہنگے ترین منی سیریلز میں سے ایک تھا..... اپنی تھیم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متنازعہ لگے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ حیران کُن اور متنازعہ ہے۔

حُسنہ اور حُسن آراء کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

رشتوں کی سُولی

وجو آپی کے غموں کی داستان ظفر کی بے روزگاری سے شروع ہوئی تھی یا پھر یہ ان کے درد کی آخری حد تھی۔ اس کا فیصلہ کبھی کوئی نہیں کر پایا۔ تابوت میں آخری کیل اسی روز ٹھونک دی گئی تھی جب ظفر نے جوئے کی پہلی بازی دوستوں کے کہنے پر اس امید پر کھیلی کہ شاید جس دولت کے انبار کی کھوج وہ باہر بازار میں کر رہا تھا، وہ یہاں اس بند کمرے کے دھوئیں بھرے ماحول میں لگی اس بازی کے ذریعے اس کے قدموں میں اپنا ماتھا ٹیک دے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا "جواء..... کسی کا نہ ہوا....." تو پھر وہی جواء ظفر پر کیسے مہربان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ جیب میں تھا وہ ہاتھ کی گھڑی اور سسرال کی جانب سے پہنائی گئی انگوٹھی سمیت وہیں کمرے کی میز پر چھوڑ کر نکلنا پڑا، ساتھ ہی ساتھ گلے میں اچھے خاصے قرض کا طوق بھی پڑ چکا تھا۔

ظفر نے حسب معمول یہ سارا بوجھ گھر آ کر وجو آپی کے نازک کندھوں پر دے ڈالا اور پھر سے انہیں ایک لمبی رقم کی وصولی کے لیے غیاث چچا کے پاس جانے کے لیے کہا، لیکن وجو آپی جانتی تھیں کہ اب ان کے میکے کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اپنا زیور اور چند قیمتی چیزیں جو وہ اپنے جہیز میں لائی تھیں، وہ سب کا سب پہلے ہی ظفر کے حوالے کر چکی تھیں۔ لہٰذا پہلی بار انہیں ظفر کو ناں کہنا پڑا اور یہی ناں ظفر کو آگ بگولہ کرنے کا باعث بن گئی۔ اس نازک سی چھٹانک بھر لڑکی کی یہ مجال کہ وہ اس کو ناں کہے۔ وحشی پن میں وہ رشتوں کا احترام بھی بھلا بیٹھا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ وجو کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا۔

راجہ کے خط مجھے اب بھی اُسی تسلسل سے آتے تھے۔ اور وہ آس پاس کی سنی سنائی اور اپنی آنکھوں دیکھی ہر اہم خبر کی تفصیل مجھے لکھ کر بھیجتا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ایک خط نے میرے بہت سے پرانے زخم ادھیڑ کر رکھ دیئے۔ راجہ نے لکھا تھا کہ بالآخر طاہر بھائی کے قتل کے پانچ سال بعد اگو کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہو ہی گئی اور اس بار یہ حتمی تاریخ تھی۔ کیونکہ اس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی تھیں۔ ہمارے سالانہ امتحانات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل یعنی بائیس (22) اپریل اس کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔

حالانکہ محلے کے ہر فرد نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا لیکن کوئی ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کا چین اور سکون اس خبر نے لوٹ لیا تھا..... اور وہ بدنصیب تھی اگو کی ماں..... جب تک کیس چلتا رہا اور لوگ اس کے بیٹے کے ظلم کی داستانیں بیان کرتے رہے، وہ خود جھولی آسمان کی جانب اٹھا اٹھا کر اگو کو بددعائیں دیتی رہی، لیکن جب حکومت نے اس کی موت کی تاریخ مقرر کر دی تو ماں کا صبر و قرار اچانک ہی لٹ گیا۔ کچھ بھی ہو..... ماں آخر ماں ہی تو ہوتی ہے اُس نے جس اگو کو نو ماہ پیٹ میں اور پھر اپنے ہاتھوں کے پالنے میں جھولا جھلا کر بڑا کیا تھا، اسے سُولی پر لٹکتا کیسے دیکھ سکتی تھی.....؟

بالے نے راجے کو بتایا تھا کہ جس دن سے اس کی ماں کو اگو کی پھانسی کا پتہ چلا تھا، اسی دن سے وہ راتوں کو اچانک ہی جاگ اٹھتی اور صحن کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس کے اندر کا اضطراب اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اور کوئی اس سے بات کرے تو وہ یوں چونک پڑتی تھی، جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہر گزرتا دن اگو کی پھانسی کی تاریخ کو قریب لاتا جا رہا تھا اور اگو کی ماں کے چہرے سے خون کا رنگ گھٹتا جاتا اور وہ روز بروز پیلی پڑتی جاتی تھی۔

اور پھر آخر کار وہی ہوا جس کے لیے مائیں مشہور ہیں، اگو کی ماں بھی اپنے دل سے ہار گئی اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بالے کے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ اس کے ساتھ طاہر بھائی کے اماں ابا کے گھر جا کر ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیں کہ ان کے بیٹے کے اس گناہِ عظیم کو بخش دیا جائے۔ اگو کے باپ نے یکسر انکار کر دیا کہ آخر وہ کس منہ سے ایک مقتول بیٹے کے غم زدہ ماں باپ کے زخموں پر مزید نمک چھڑکنے جائے گا۔ ماں نے وہاں بات بنتی نہ دیکھی تو خود ہی اپنی بیٹی کو لیکر عزیزہ خالہ کے در پر جا کر بیٹھ گئی، اس روز سارا محلہ اس کی آہ و بکا سے لرزتا رہا، سبھی محلے داروں کو اگو کی ماں سے ہمدردی بھی تھی لیکن اگو کا جرم ہی ایسا تھا کہ اس ظلم کے آگے ہر ہمدردی ہیچ تھی۔

اگو کی ماں نے اب اپنا یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ صبح سویرے طاہر بھائی کے گھر کے باہر آ کر بیٹھ جاتی اور رات گئے تک چپ چاپ بنا کچھ کھائے پیئے وہاں پڑی رہتی اور گھر سے باہر آتے جاتے ہر شخص سے اگو کو معافی دلوانے کی فریاد کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کی اپنی حالت بھی لمبے فاقوں کی وجہ سے بگڑنے لگ گئی تھی اور کئی مرتبہ وہ وہیں دروازے کے پاس بے ہوش پڑی ملتی۔ تب اگو کے ابا یا کوئی اور ہمدرد اسے اٹھوا کر گھر بھجوا دیتے۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ پھر اُسی در پر ماتھا ٹیکے ہوئی نظر آتی۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ طاہر بھائی کے ابا شکور چچا خود ایک روز اُس پر غصے سے برستے برستے رو پڑے کہ وہ کیوں روزانہ ان کے خاندان کے زخمی دلوں کو مزید گھائل کرنے کے لیے یہاں آ جاتی ہے۔ جب ایک بار اُس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی صورت اگو کو معاف نہیں کر سکتے اور اسے پھندے پر لٹکتا دیکھ کر ہی ان کے زخم کچھ مندمل ہو سکتے ہیں تو پھر روزانہ کی اس بحث سے کیا حاصل.....؟

لیکن یہاں مسئلہ صرف اگو کی سولی کا نہ تھا۔ وہ تو سولی پہ لٹک کر ہمیشہ کے لیے نجات پا جاتا اور اگلے جہاں میں اپنے گناہوں کا حساب دیتا پھرتا لیکن اس کے پھندے پر لٹکنے کے بعد یہاں دنیا میں اس کے اپنوں کو مرتے دم تک جس سولی پر ٹنگا رہنا تھا اس کا حساب دینے والا کوئی نہ تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ اگو کے ماں باپ کس قدر بھلے لوگ تھے اور سبھی کا دل ان کی اس اذیت سے کٹا جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی جس نے جرم کیا تھا وہ تو چند لمحے پھندے پر جھولنے کے بعد بری ہو جائے گا لیکن جو بے قصور ہیں وہ ساری عمر اُسی سولی پر جھولتے رہیں گے۔ یہ کیسا انصاف تھا؟؟

پھر سب سے پہلے یہ بات طاہر بھائی کے ابا کی سمجھ میں آ گئی کہ پھندہ صرف اگو کے گلے میں نہیں، بلکہ نہ جانے اور کتنی جانوں کو لگے گا، اور شاید ان میں اگو کے خاندان کو عمر بھر پھانسی پر لٹکتے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا ایک ڈھلتی شام جب اگو کی ماں اپنی ویران آنکھیں لئے ان کے دروازے کے سامنے، مٹی میں خاک ہوئی پڑی تھی، انہوں نے گھر سے چادر لا کر اس پر ڈال دی اور اسے اٹھا کر اپنے گھر کے صحن میں لے آئے۔

عزیزہ خالہ نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور اپنے میاں کو دھمکی دے دی کہ اگر انہوں نے ان کے بیٹے کے قاتل کو معاف کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو وہ ان کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔ اگو کی ماں عزیزہ خالہ کے کمرے کے دروازے سے سر پٹخ پٹخ کر

لہولہان ہوگئی لیکن وہ دروازہ اُس پر کبھی نہ کھلا۔

شکور چچا نے بالے کے ابا کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے اپنے خدا کے لیے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا ہے لیکن وہ اُس کی ماں کے ہاتھوں مجبور ہیں، جس کا دل اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھنے کے بعد پتھر ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ اس دوسری ماں کو آ کر سنبھالیں جو اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے خود اپنا آپ گنوائے دے رہی ہے، اور وہ چاہ کر بھی اُس کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے کیونکہ اگر وہ دوسری ماں کا ساتھ دیتے ہیں تو اپنی آخری عمر کے سہارے یعنی اپنی شریکِ حیات کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔

بالے کے ابا بالے کے ساتھ آئے اور نیم بے ہوش سی اٹو کی ماں کو وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ یہ بھی اُنہی کا ظرف ہے کہ اپنے بیٹے کے قاتل کی ماں کو انہوں نے اس قدر عزت دی۔ اگلی صبح اٹو کی پھانسی کی تاریخ مقرر تھی اور وہ رات بالے کے گھرانے پر کس قیامت کی طرح اتری تھی، شاید اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اگلی صبح چار بجے جیل کے معمول کے مطابق، گاڑی طاہر بھائی کے دروازے پر ان کے اماں ابا کو بطور وارث پھانسی گھاٹ پر پھانسی کی شہادت کے لیے لینے آ چکی تھی۔ خالہ عزیزہ اور شکور چچا چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر جیل کی جانب روانہ ہو گئے جیل کے باہر اندھیرے میں انہیں اٹو کے ماں باپ بھی کھڑے نظر آئے جو اپنے بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے وہاں خود لاش بنے کھڑے تھے۔ اٹو کی ماں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب وہ خالی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ جیلر شکور چچا اور خالہ کو لے کر پھانسی گھاٹ پہنچ گیا تھا اور ڈاکٹر، مجسٹریٹ اور جلاد بھی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں اٹو کو کمر پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ دو محافظ لے آئے۔ اٹو کے پیروں میں جان بالکل بھی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنے محافظوں کے کاندھوں پر بوجھ ڈالے تقریباً لٹکتا ہوا پھانسی گھاٹ تک لایا گیا تھا۔ اس کا سڈول جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور آنکھوں کی روشنی بجھ چکی تھی۔

شکور چچا اور خالہ عزیزہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جلاد کو اٹو کے چہرے پر سیاہ کپڑا ڈھانپتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں ڈال کر جلاد لکڑی کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے اپنی جگہ پر جا پہنچا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر ان کی گھڑی پر تھی تاکہ وہ ایک سیکنڈ کی بھی جلدی یا تاخیر کیے بنا جلاد کو لیور کھینچنے کا اشارہ کریں۔

جیلر نے آخری مرتبہ عزیزہ خالہ اور شکور چچا کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی اور دونوں کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے مجسٹریٹ سے اجازت کی درخواست کی۔ مجسٹریٹ نے وقت پورا ہوتے ہی جلاد کو اشارہ کیا اور جلاد نے لیور کھینچنے کے لیے اپنی طاقت مجتمع کر کے لیور پکڑ لیا۔ مجسٹریٹ نے اپنا رومال ہلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک کرب ناک چیخ اُبھری اور دم توڑ گئی۔

عزیزہ خالہ کو آخری لمحے میں جیسے کسی نے نیند سے ٹھنڈے برف پانی کی پوری بالٹی پھینک کر جگا دیا ہو۔ وہ ایک جھرجھری لے کر جاگیں اور زور سے چیخ پڑی تھیں۔

"معاف کر دیا..... میں نے اسے معاف کر دیا..... میں نے اسے اپنے اللہ کے واسطے اور اپنے طاہر کے صدقے معاف کر دیا..... معاف کر دیا....."

عزیزہ خالہ روتی جاتیں اور یہی گردان کیے جاتیں..... جلاد نے جلدی سے اُگو کے چہرے سے غلاف ہٹایا۔ پھانسی کا قیدی ویسے ہی ادھ مرا ہوتا ہے اور پھر جو قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر پھندہ بھی گلے میں ڈلوا چکا ہو، اس کے حواس تو بالکل ہی غائب ہوتے ہیں۔ اس لیے اُگو کو بھی ہوش میں آنے اور یہ یقین کرنے میں بہت دیر لگی کہ اُسے طاہر بھائی کے ماں باپ نے بخش دیا ہے۔ چند لمحے تو وہ اجنبی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان سب کو دیکھتا رہا اور پھر جو وہ پھر ٹوٹ کر رویا تو یوں برسا کہ اُس نے اپنے آس پاس کی ہر آنکھ کو ڈبو دیا۔ اُگو کی فلک شگاف چیخوں سے ساری جیل گونج رہی تھی اور وہ یوں بچوں کی طرح زار و قطار رو رہا تھا کہ جیسے اپنی عمر بھر کے آنسو آج ہی بہا دے گا۔ اس نے اپنا سر عزیزہ خالہ کے قدموں میں رکھ دیا اور اپنا سر زمین پر پٹخ پٹخ کر لہولہان کر دیا۔ اُس کے اندر کا انسان جاگا لیکن بہت دیر کے بعد.....

باہر جب اُگو کے ماں باپ کو اس کی زندگی کی نوید ملی تو انہیں سجدۂ شکر ادا کرنا بھی یاد نہیں رہا، وہ دونوں سجدے میں تو گرے لیکن تسبیح تک بھول گئے۔ یہ ایک ایسی شادیٔ مرگ کی کیفیت تھی جسے انسانی لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کا اپنا کوئی جگر کا ٹکڑا موت کی دہلیز کو چھو کر واپس پلٹا ہو۔

عزیزہ خالہ نے اُگو کی جان بخشی کر دی، لوگ ان کی عظمت کے ایسے قائل ہوئے کہ ان کی محبت عقیدت میں بدل گئی۔ چند دن بعد اُگو کو بھی اس راضی نامے اور معافی نامے کے بدلے جیل سے رہائی مل گئی کیونکہ اپنی قید کی سزا وہ پہلے ہی ان پانچ سالوں میں پوری کر چکا تھا، لیکن جیل سے باہر آنے والا اُگو وہ اُگو نہیں تھا جو اندر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایسا بدلا ہوا انسان تھا، جس نے اسی دنیا میں اپنی ہر غلطی کے مداوے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

اُگو کو تو قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن اُس کی کرنی کی وجہ سے وڈو آپی جس قفس میں جا گری تھیں اس قید سے وہ کبھی رہائی نہیں پا سکیں۔ ظفر کے مطالبے دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے اور ان کے بوڑھے ماں باپ کے پاس اب ایسا کچھ نہیں بچا تھا جو وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی نذر کر سکتے۔ حتیٰ کہ غیاث چچا نے اپنا جی۔ پی فنڈ بھی دفتر سے نکلوا کر ظفر کی فرمائشوں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایک بے کار اور گھر میں چارپائی توڑتے ہوئے شخص جس کی جھوٹی شان اور دوستوں کے دکھاوے کے لیے لٹانے کی کوئی حد نہ ہو اس کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ہو تو کم پڑتا تھا، لہٰذا اس کی وڈو آپی سے تکرار بھی دن بہ دن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب تو اس کا ہاتھ بھی کھل چکا تھا لہٰذا وہ گاہے بگاہے وڈو آپی پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن وڈو آپی کو خدا نے جس مٹی سے بنایا تھا اس میں شکایت یا اُف تک کرنے کا خمیر شامل نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی انہوں نے اپنے ماں باپ ہی کو اس بات کی کبھی بھنک بھی پڑنے دی کہ ان کی وہ بیٹی جسے اپنے گھر میں گرم ہوا نے بھی کبھی نہیں چھوا تھا اور جس کی زبان سے اُف نکلنے سے پہلے ہی ہر کوئی اپنی پلکیں اس کی راہ میں بچھا دیتا تھا وہ اب کس حال میں ہے۔ لیکن وہ نہ بھی بتاتیں تو کیا ہوتا؟..... غیاث چچا کی جہاندیدہ نظریں کیا ایسا ہر راز پانے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں؟ اور کیا ان کی چہیتی اماں، جو ماں ہونے سے زیادہ ان کی سہیلی بھی تھیں، کیا انہیں اپنی بیٹی اور سہیلی کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دکھائی نہ دیتا ہوگا؟

ظفر کی چڑچڑاہٹ بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے اب اندازہ ہو چلا تھا کہ وڈو آپی کے میکے پاس انہیں دینے کے لیے اب کچھ نہیں بچا تھا، ان تلوں میں جتنا بھی تیل تھا وہ پہلے ہی نچوڑ چکا تھا۔ اُگو کا معاملہ اس کی پھانسی ٹلنے سے ایک بار پھر اٹھا تو اس کے ہاتھ وڈو کو طنز اور طعنوں سے چھلنی

کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا، اب وہ بہانے بہانے سے اگو اور طاہر بھائی کے جھگڑے اور قتل کا ذکر چھیڑ دیتا اور وجو کو گھائل کرنے کے لیے لفظوں کے ایسے ایسے تیر چلاتا کہ اس معصوم لڑکی کی سانس ہی رُکنے لگتی۔ کبھی کہتا کہ غیاث چچا نے اُسے دھوکے میں رکھ کر یہ شادی کروائی ہے۔ کبھی کہتا کہ اگر اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ وجو کا قصہ طاہر بھائی کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ کبھی اس گڑھے میں نہ گرتا۔ ظفر کمینگی کی اس حد تک گر چکا تھا کہ اس نے اگو کے ساتھ بھی وجو کا نام جوڑ دیا اور اس کو عزیزہ خالہ کی طرف سے جو معافی ملی تھی، اُسے بھی اُس نے وجو کی کوششوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ ضرور انہوں نے محلے جا کر طاہر بھائی کے ماں باپ کو مجبور کیا ہوگا کہ اگو کو معاف کر دیں، تاکہ ان کا ایک عاشق تو دنیا میں انہیں سراہنے کو زندہ باقی رہے۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی جب ظفر نے باقاعدہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر باہر کے دروازے پر لا کھڑا کیا کہ یا تو گھر سے کچھ رقم لے کر آئیں یا پھر ہمیشہ کے لیے اُس کے گھر سے نکل جائیں۔ اور گھر بھی اس کا کہاں تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے مالک مکان روزانہ کرائے کے تقاضے کے لیے دروازے پر صبح سویرے ہی آن موجود ہوتا۔ ظفر خود تو اُس سے جان چھڑانے کے لیے اب باہر نکلتا ہی نہیں تھا اور بے چاری وجو کو شرمندہ ہونے کے لیے دروازے پر بھیج دیتا۔ وجو نے بھلا آج تک اپنی پوری زندگی میں ایسے معاملات کہاں جھیلے تھے۔ انہیں تو کسی غیر مرد سے بات کرنے کا کبھی کوئی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ گھر میں تو فضلو بابا اور ان کے ابا ساری بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کا ذریعہ تھے اور پھر میں بھی تو تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی ٹھیلے والے سے یا سائیکل رکشہ والے سے بھی کبھی بات نہیں کرنے دی تھی۔ جہاں کہیں رابطے کی ضرورت ہوتی میں، فضلو بابا یا غیاث چچا ہمیشہ ان کی مدد کو موجود ہوتے۔ پتہ نہیں مجھے کبھی بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ وجو کسی بھی ایرے غیرے مرد سے بات کریں۔ اس کام کے لیے ہم سب جو موجود تھے۔ خود وجو کو بھی میری اس عادت کا پتہ تھا اور جب کبھی رکشے یا تانگے والے کو کرایہ دینا ہوتا یا پھر محلے میں پھیری والے سے کچھ منگوانا ہوتا تو وہ پہلی آواز مجھے ہی دیتیں اور اگر میں اس وقت نہ بھی ہوتا تو کسی اور بچے یا فضلو بابا کے ذریعے کہلوا بھیجتیں۔

اب ایسے میں جب انہیں مالک مکان کو کرایہ نہ دینے کی تاویلیں پیش کرنا پڑتی ہوں گی تو وہ کس اذیت سے گزرتی ہوں گی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ مالک مکان اچھے خاندان سے تھا اور وہ ظفر کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایک شریف گھرانے کی عفت مآب بیٹی اُس کم ظرف کے گھر آ پھنسی ہے، اس لیے وجو کو دروازے پر دیکھ کر وہ زیادہ بحث کیے بنا ہی وہاں سے پلٹ جاتا تھا۔

لیکن گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کر لے تو پھر کھائے کیا.....؟ آخر کار پانچویں مہینے اُسے وجو آپی سے کہنا ہی پڑا کہ ان حالات میں تو اُس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ظفر کے نام وکیل سے کہہ کر نوٹس نکال دے کہ اگلی پہلی سے مجھے مکان خالی کر دے، ورنہ معاملہ پولیس میں دے دیا جائے گا۔ پولیس کا نام سن کر وجو آپی سراسیمہ ہو گئیں اور انہوں نے دروازے کی اوٹ سے پہلی مرتبہ مالک مکان، جنہیں وہ سب خان صاحب کہتے تھے، سے درخواست کی کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے، کچھ دن کی مزید مہلت دے دیں، وہ کوشش کریں گے کہ جلد از جلد کرایہ اُتار دیں۔ خان صاحب نے جواباً کہا کہ وہ صرف وجو آپی کے کہنے پر ظفر کو مزید کچھ وقت دے رہا ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہے کہ ظفر کبھی ان کا کرایہ نہیں چکائے گا۔ اُس نے وجو آپی سے کہا کہ اُسے ان پر ترس آتا ہے کہ ایک عزت دار خاندان کی لڑکی یہ

کس ذلت کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ اس نے ڈوآپی کے سامنے ایک پیش کش رکھی جس سے اس کا کرایہ بھی ادا ہو جاتا اور خود ڈوآپی کا ہاتھ بھی کچھ کھلنے کا آسرا ہونے کی امید تھی۔ ڈوآپی نے کہا کہ وہ خان صاحب کی بات غور سے سن رہی ہیں۔ وہ کھل کر بات کریں۔ خان صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک جاننے والے پشاور سے اس شہر میں اپنی تعیناتی پر آئے ہیں۔ عہدے میں ریل کے بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، دس سال کا ایک بیٹا اور آٹھ سال کی ایک بیٹی، دوسرے صوبے سے ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم درمیان میں ہی منقطع ہو گئی تھی اور جب تک انہیں اس شہر کے اسکول میں داخل کروایا گیا تو تب تک دونوں بچے اصل کورس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ خان صاحب نے ڈو سے کہا کہ اُن کے دوست نے انہیں کسی ٹیوٹر کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ اگر ڈو مناسب سمجھیں تو دن میں دو گھنٹے ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں۔ اس طرح سے جو رقم انہیں فیس کے طور پر ملے گی اس کا آدھا وہ خان صاحب کو کرائے کے طور پر ادا کر دیا کریں اور آدھی رقم سے اپنا گھر چلا لیا کریں۔ خان صاحب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر ڈو کا معاوضہ بھی دوسرے کسی ٹیوٹر سے کافی زیادہ مقرر کروا دیں گے۔ شاید مالک مکان بہت پہلے ہی ڈوآپی کے لب و لہجے اور ان کے تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے اطوار سے یہ بات جان چکا تھا کہ ڈوآپی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ تبھی اس نے یہ پیش کش کی تھی۔ ڈوآپی نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنے میاں سے بات کر کے انہیں بتائیں گی۔ خان صاحب انہیں دعا دے کر واپس پلٹ گئے اور ڈوآپی واپس پلٹی تو ان کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ظفر جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑا ان کی اور خان صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ دراصل جب ڈو کچھ دیر دروازے سے نہیں پلٹیں تو اس کی شکی مزاج طبیعت نے فوراً اس کے ذہن میں کھد بد شروع کر دی اور وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے دجو کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے دجو کی اور مالک مکان کی ساری باتیں سُن لی تھیں۔ ڈو کو اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں، اسے اور کیا چاہیے تھا۔ گھر میں پڑے پڑے بیوی کی کمائی کھانے کا موقع مل رہا تھا۔ اُس نے ڈوآپی کو حکم دیا کہ وہ کل سے ہی ٹیوشن پڑھانے کے لیے جانا شروع کر دیں اور کوشش کریں کہ دو تین ماہ کا معاوضہ ایڈوانس ہی مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ اگلے دن خان صاحب آئے تو ڈو نے ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے اکیلے جانے سے معذوری کا اظہار بھی کر دیا کہ انہوں نے کبھی اپنے میکے سے بھی اکیلے باہر قدم نہیں رکھا لہٰذا اگر ہو سکے تو بچوں کو شام یہیں ان کے گھر بھجوا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ خان صاحب نے بتایا کہ بچوں کا تو یہاں آنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ دونوں بہت ضدی ہیں، اور بمشکل ٹیوشن پڑھنے پر ہی رضامند ہوئے ہیں۔ اب ایسے میں ان پر مزید کوئی شرط رکھی گئی تو بالکل ہی بدک جائیں گے ہاں البتہ ریحان صاحب (خان صاحب کے دوست) ہر روز شام چار بجے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت بھجوا دیا کریں گے جو دو گھنٹے بعد انہیں گھر واپس چھوڑ جایا کرے گی۔ ڈوآپی کیا کہہ سکتی تھیں۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے چپ ہو رہیں۔

غیاث چچا اور سکینہ خالہ کو جب ڈوآپی کی نوکری کا پتہ چلا تو ان دونوں کے دل میں جیسے تیر سا گڑھ گیا۔ غیاث چچا تو ویسے بھی تقریباً بستر ہی سے لگ چکے تھے اور اب ان کی طبیعت زیادہ تر نڈھال ہی رہتی تھی۔ سکینہ خالہ بھی بہت دن تک چھپ کر روتی رہیں۔ جانے ان کی وجیہہ کی قسمت میں ابھی مزید کتنے عذاب جھیلنے لکھے تھے۔

پہلا انقلاب

چار ہفتے بعد ہم پانچوں کے پلستر کھل گئے اور دو دن کے بعد ہمارے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ یہ ہمارے اس کالج میں آخری امتحانات تھے۔ آج سے چھ سال پہلے جب میں اس کالج میں داخل ہوا تھا اس وقت کے پہلے امتحانات میں اور بارہویں جماعت کے ان امتحانوں میں کس قدر فرق تھا۔ اس وقت مجھے ٹھیک طرح سے یہ پارکر قلم بھی پکڑنا نہیں آتا تھا اور آج چھ سال بعد میں ہر مضمون کے سادہ جوابی پرچوں کی نہ جانے کتنی فاضل کاپیاں بھرتا جا رہا ہوتا تھا کہ کبھی کبھی تو میری سیٹ کے اردگرد کاغذوں کا اتنا بڑا انبار جمع ہو جاتا جسے پرچہ ختم ہونے کے بعد باندھنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا اور ہم ممتحن کی منتیں کر کر کے اپنی فاضل کاپیاں (extra sheets) جلدی جلدی دھاگے سے باندھ کر اس کے حوالے کر دیتے۔

ہماری ساری ڈارمیٹری پڑھائی میں جُت چکی تھی، اور تو اور موٹے بھٹی کو بھی کھانے کی سُدھ بدھ تک نہیں رہتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہمارے پرچے ختم ہو رہے تھے، امتحانات کے بعد پریکٹیکل ہونا تھے اور اس کے بعد آخر میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ، جس کے لیے ابھی سے کالج کی انتظامیہ نے ہمارے والدین اور گھر والوں کو دعوتی کارڈ بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ صوبے کے گورنر صاحب مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لا رہے تھے، اور ہماری آخری پریڈ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

پرچوں کے بعد ہمیں حسب معمول چھوٹی کلاسوں نے الوداعی رات کے کھانے دینا شروع کر دیئے۔ چھ سال پہلے جب ہم نے ساتویں جماعت کی طرف سے اس وقت کی بارہویں جماعت کے کیڈٹس کو الوداعی ڈنر دیا تھا تو ہم سب بچوں کے دل میں کتنی حسرت تھی کہ جانے یہ دن ہماری زندگیوں میں کب آئے گا جب ہمیں بھی کوئی الوداعی ڈنر دے کر رخصت کرے گا۔ کیڈٹ کالج کی ایک ریت یہ بھی تھی کہ الوداعی کھانے کی رات جونیئر کیڈٹس سینئر کیڈٹس بن جاتے اور کچھ دیر کے لیے سینئر کیڈٹ جونیئر بن کر ان کا ہر حکم مانتے تھے۔ چاہے وہ کچھ بھی کہیں۔ آصف بھٹی کو کہا گیا کہ ایک وقت میں چار روٹیاں اکٹھی کھا کر دکھائے۔ مجید چھوٹو کو ہیل والے جوتے پہن کر ڈانس کا کہا گیا۔ نثار روندو کو اس طرح رونے کا کہا گیا جیسے وہ سی پی او کے سامنے ایکسٹرا ڈرل کے دوران ٹسوے بہایا کرتا تھا۔ مجھے اور فیصل کو چھت پر چڑھ کر اس طرح اُترنے کا کہا گیا، جیسے ہم بنک کرتے وقت اُترا کرتے تھے، اسفر کو وہ مخصوص سیٹی بجانے کا کہا گیا جو ہم خطرے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ ہم نے جونیئر کیڈٹس کی یہ ساری باتیں کسی حکم کی طرح بجا لائیں۔ تقریب ختم ہوئی تو سارے جونیئر کیڈٹس ہمارے گلے لگ گئے۔ سب ہی نے ایک ہی بات کہی کہ ہماری کلاس ان کے لیے ایک آئیڈیل کی سی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے یہاں جینے کا طریقہ ہم سے ہی سیکھا ہے۔ ہم نے سینئر ہونے کے باوجود کبھی جونیئرز کو تنگ نہیں کیا تھا۔ ہمیں اپنے ہی دھندوں سے فرصت کہاں تھی کہ کسی مظلوم جونیئر کیڈٹ کو تنگ کرتے۔ لیکن اس دن ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے جونیئر کیڈٹس کو ہم سے

کس قدر عقیدت تھی۔ فیصل اسٹیج پر آخری تقریر کے لیے آیا تو کچھ بولنے سے پہلے ہی رو پڑا۔ اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اپنی الوداعی تقریر نہیں کر سکا۔ وہ اُترا تو میں بھی بھیگی آنکھیں لیے اسٹیج پر آیا اور کچھ ہی دیر میں ہمارا پورا ہاؤس رو رہا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی جب ہم یہاں آئے تھے تو تب بھی رو رہے تھے اور اب جو جانے کا وقت آیا تھا تب بھی ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے دو مرتبہ اپنی ہچکی روک کر بات جوڑنے کی کوشش کی۔

"ڈیئر فیلو کیڈٹس Dear Fellow Cadet's.....آئی فیل پراؤڈ ٹو بی I feel proud 2b.....آئی.....ان فیکٹ....."

لیکن پھر اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں تیزی سے اسٹیج سے اتر آیا راستے میں فرسٹ ائیر کے کیڈٹس نے مجھے روک لیا اور سبھی میری آنکھیں پونچھتے پونچھتے خود بھی رونے لگ گئے۔ یہ کیسا رشتہ تھا جو آنسوؤں سے شروع ہوا تھا اور آج آنسوؤں پر ہی ایک نئے موڑ پر جدا ہو رہا تھا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیڈٹ کالج کے ان چھ سالوں میں میں نے پایا زیادہ تھا یا پھر کھویا زیادہ.....؟ میرا بچپن انہی راہداریوں میں، گھاس کے میدانوں میں اور پریڈ گراؤنڈ کے پتھریلے فرش پر بھاگتے دوڑتے گزر گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو ایک چھوٹا بچہ تھا اور آج جب میں یہاں سے واپس جانے کے قریب تھا تو ایک نوخیز اور نوجوان تھا، جسے اپنے بھلے بُرے کا اچھی طرح پتہ تھا۔

پرنسپل صاحب نے بھی ہمارے اعزاز میں الوداعی کھانا دیا اور اس میں انہوں نے اسٹیج پر آ کر خاص طور پر اُس بات کا ذکر کیا جب ساتویں جماعت میں انہیں مجھے روکنے کے لیے مختلف ڈرامے کرنا پڑے تھے۔ ہماری شرارتوں پر انہوں نے اس رات ہم سب کے کان بھی کھینچے ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہر وہ بات جو ہم اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے چھپا لی ہے، انہیں اس ہر بات کا پتہ تھا۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اُسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے اسفر کی جانب اپنے سگار کا پیکٹ بڑھایا۔ اسفر نے کسرِ نفسی سے کام لیا۔

"نو سر آئی ڈونٹ اسموک "No Sir I don't smoke"

انہوں نے مسکرا کر بخشوی پی او کو اشارہ کیا جو کھانے کی میز کی پرلی طرف کھڑا تھا۔ اُس نے جیب سے گولڈ لیف کا آدھا پیکٹ نکال کر اسفر کے حوالے کر دیا جو شاید کسی چھاپے میں اسفر کی الماری سے نکلا ہوگا۔ انہوں نے آہستہ سے اسفر سے کہا۔

"سگریٹ پینا بُری بات نہیں۔ صرف عمر اور برانڈ کا دھیان رکھنا چاہیے۔"

اسفر کا کندھا ٹھونک کر وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسری جانب ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور دھیرے سے بولے۔

"کیڈٹ عباد.....تمہارے جونیئر سیکشن کی ٹیچر شیرل آج کل چھٹیوں پر اپنے گھر آئی ہوئی ہے.....تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ نائس گرل شی از..... "Nice girl she is" غرض اس دن ہم میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جسے کمانڈر صاحب نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں چھیڑا نہ ہو۔ اُس دن ہم سب کو احساس ہوا کہ ہم سب کیڈٹس کی ٹریننگ میں کمانڈر صاحب کی خاموش تربیت کا کس قدر بڑا اور مرکزی حصہ شامل تھا۔ اس رات

میں نے کمانڈر صاحب سے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا سبق سیکھا اور وہ یہ کہ تربیت صرف چیخنے چلانے اور سزا دینے یا سزا کا خوف دل میں پیدا کرنے کا نام نہیں ہوتا۔ تربیت تو ایک خاموش انقلاب کا نام ہوتی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو آپ کی رُوح سے شروع ہو کر آپ کے جسم پر ختم ہوتی ہے، نہ کہ اُسے جسم کے رؤیں کے ذریعے روح میں ٹھونسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کمانڈر صاحب نے یہ خاموش انقلاب ہماری روحوں کے ذریعے ہمارے جسموں پر لاگو کر دیا تھا۔ اب اگر ہمارے فانی جسم مٹ بھی جاتے تو یہ انقلاب ہماری روحوں سے آگے منتقل ہو جاتا۔

ہمارے پریکٹیکل ختم ہو چکے تھے اور دو دن کے آرام کے بعد ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ ہماری آخری پریڈ.....

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو مُلک کے معروف پبلشرز ''علم و عرفان پبلشرز'' کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک..... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے.....

خواتین کے لیے سنہری موقع.....سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق.....

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	تنزیلہ ریاض	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
وصی شاہ	سعید واثق	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، 40۔الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور (042-37352332 & 0300-9450911)

دیر ہو جاتی ہے.....

اگلے دن سے ڈوآپی کو حسبِ وعدہ ریحان صاحب کا ڈرائیور مقررہ وقت پر اپنی لمبی سی موٹر کار میں لینے کے لیے آنے لگا۔ پہلے دن تو ڈو آپی کو یوں اکیلے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ظفر سے کہا بھی کہ پہلے دن وہ ان کے ساتھ چلے چلیں لیکن ظفر نے ایک ٹکا سا جواب دے دیا کہ اس کے سر میں صبح سے درد ہے لہٰذا وہ نہیں جا سکتا۔ البتہ اس نے اپنا دوسرا فریضہ یعنی طنز کے تیر چلانے کا کام بخوبی انجام دیا اور ڈوآپی کو سینکڑوں مرتبہ یہ جتایا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کی نظریں ڈوآپی کا تعاقب نہیں کر رہیں اور ڈوآپی اس کی غیر موجودگی کا کوئی ''غلط فائدہ'' اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور سیدھے ٹیوشن پڑھا کر گھر واپس آ جائیں۔ وجو آپی سر جھکائے ظفر کی ہدایات سنتی رہیں۔ ظفر نے سختی سے انہیں منع کیا کہ کسی بھی مرد سے گھریا باہر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی دو گھنٹے سے ایک لمحہ بھی زیادہ باہر گزارنے کی انہیں اجازت ہے۔ جاتے جاتے اُس نے یہ دُہرانا بھی ضروری سمجھا کہ ڈوآپی کو آج ہی اپنے معاوضے اور ایڈوانس کی بات بھی بچوں کے گھر والوں سے حتمی طور پر طے کرنی ہے۔ اس کی بک بک ابھی جاری ہی تھی کہ باہر گلی میں تیسری بار گاڑی کا ہارن بجنے کی آواز آئی اور مجبوراً ظفر کو اپنا ہدایت نامہ ختم کر کے وجو کو جانے کی اجازت دینی پڑی۔

ریحان صاحب کا بنگلہ ریلوے افسران کے بنگلوں کی قطار میں تیسرا تھا اور اُس کی لمبی سی روش سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک بڑے سے پورچ میں رُک گئی۔ ڈوآپی کو نوکر نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب جو ایک پکی عمر کے سنجیدہ سے مرد تھے، اپنے دونوں بچوں شارق اور فائزہ سمیت آن موجود ہوئے، ڈوکو دیکھ کر انہیں کچھ حیرت سی ہوئی کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھ بیٹھے تھے کہ خان صاحب نے کسی عمر رسیدہ یا پھر کم از کم کسی تجربہ کار اُستانی کا بندوبست کیا ہوگا لیکن یہاں تو دھان پان سی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جسے اگر کالج کا یونیفارم پہنا دیا جاتا تو وہ خود بھی اسٹوڈنٹ ہی دِکھتی۔ ریحان صاحب نے اپنا اور دونوں بچوں کا تعارف کروایا اور پھر جب ڈوآپی نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ریحان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کریں گی کہ جتنی جلدی ہو سکے، دونوں بچوں کو ان کی باقی کلاس کے برابر لا کھڑا کریں، تو ان کے لفظوں کے چناؤ اور ان کی تہذیب و شائستگی نے ریحان صاحب کا ڈو کے بارے میں پہلا تاثر یکسر زائل کر دیا۔ خان صاحب نے شاید اشارۃً ریحان صاحب کو ڈو کے گھریلو پس منظر کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا، اسی لیے انہوں نے پہلے سے دو چیک کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چیک خان صاحب کے نام تھا اور دوسرا ڈوآپی کے نام، ڈو کا طالب علمی کے دور کا وظیفوں والا بینک کا کھاتہ اب بھی چل رہا تھا اور غیاث چچا ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم اپنی تنخواہ میں سے اس کھاتے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شادی کے بعد ظفر نے کبھی ان کے کاٹے گئے چیکوں کے

بدلے ایک دھڑی بھی ان کی ہتھیلی پہ لا کر نہیں رکھی تھی۔ ظفر نے جب آدھی رقم کا چیک خان صاحب کے نام پر دیکھا تو وہ بہت تلملایا اور اس نے مالک مکان کو اس کی غیر موجودگی میں سخت سُست سنائیں لیکن شام کو جب خان صاحب کرائے کے تقاضے کے لیے آئے تو اس نے چپ چاپ چیک ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

یوں ڈھوکی لگی بندھی زندگی میں دو گھنٹے کی یہ تبدیلی ایسی آئی کہ انہیں بھی دو گھڑی کے لیے اس زندان سے چھٹکارا مل جاتا، بچے تو دو دن میں ہی ان سے یوں گھل مل گئے جیسے ان کی برسوں سے ڈھو سے دوستی ہو۔ دراصل بچے ان کے آنے سے پہلے اس لیے بھی سہمے ہوئے تھے کہ انہیں کسی عمر رسیدہ، موٹی موٹی عینکوں والی کسی ایسی سخت گیر استانی کی آمد متوقع تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ چھڑی یا لکڑی کا فٹ (اسکیل) دکھائی دیتا ہوگا، لیکن جب انہوں نے اس من موہنی سی، نازک سراپے والی ٹیچر کو دیکھا تو خود بہ خود اُس کی جانب کھچے چلے آئے۔ اور پھر ڈھو آپی کے پڑھانے کا انداز بھی تو کچھ ایسا تھا کہ اب دونوں بچے خود ٹیوشن کے وقت کا انتظار کرتے رہتے اور ایک اتوار کی چھٹی بھی انہیں اس قدر گراں گزرتی کہ وہ سوال کر کر کے اپنے پاپا کی ناک میں دم کر دیتے۔

ظفر کی جیب میں ڈھو کی نوکری سے پھر سے پیسے آنے لگے تو اُس نے بھی پھر سے اپنے پَر پُرزے نکالنا شروع کر دیئے۔ ڈھو آپی کو واپسی میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ باہر گلی میں نکل کر ٹہلنا شروع کر دیتا اور جیسے ہی ریحان صاحب کی گاڑی گلی میں داخل ہوتی وہ ڈھو آپی کے گاڑی میں سے اترنے سے پہلے ہی لپک کر قریب جا پہنچتا اور ڈرائیور اور آس پاس سے گزرتے راہ گیروں اور ہمسایوں کی پروا کیے بنا ہی اپنے ذہن کا گند اپنی زبان کے زہر کے ذریعے اُگلنا شروع کر دیتا۔ ''کہاں رہ گئی تھی.....؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ گھر واپس آنے کو تمہارا دل نہیں کرتا؟ کس کے ساتھ گپ لگانے کے لیے رُک گئی تھیں؟'' اور جب ڈرائیور گاڑی موڑ لیتا تو اس کے جاتے جاتے اس پر بھی فقرہ چست ہو جاتا۔

''کہیں یہ حضرت ڈرائیور ہی تو لمبے راستے سے گھمائے لیے نہیں پھرتے تمہیں.....؟ اسی لیے ڈھو آپی کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی وہ گھر واپس پہنچ جائیں چاہے اس کے لیے انہیں ٹیوشن کچھ دیر پہلے ہی ختم کیوں نہ کرنی پڑے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ریحان صاحب کو بھی کہلوا بھیجا تھا کہ ان کے میاں کو ان کے دیر سے گھر پہنچنے پر تشویش ہوتی ہے لہٰذا اگر وہ چاہیں تو پیسوں میں سے کچھ کٹوتی کر لیا کریں لیکن انہیں گھر دس پندرہ منٹ پہلے ہی جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ریحان صاحب خود بھی صورت شناس تھے اور کچھ ڈرائیور نے بھی انہیں دفتر لاتے لے جاتے ظفر کے اس بُرے رویّے کی شکایت اپنے مالک سے کر رکھی تھی لہٰذا خود ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈرائیور وہ کو گھر واپس پہنچا آئے۔ حالانکہ بعض مرتبہ بچوں کی صورتیں ان کے یوں بیچ میں چلے جانے سے رونی سی بن جاتیں کیونکہ وہ اپنی معصوم سی خوشیوں میں اپنی ٹیچر کو بھی شامل کرنا چاہ رہے ہوتے لیکن اُن کی ٹیچر تو لپکتے جھپکتے آتیں اور ان کی پڑھائی ختم کروا کر پلک جھپکنے میں ہی واپس چلی جاتیں۔ اس دن بھی جب فائزہ کی سال گرہ تھی تو ان کو سب نے کتنا رُکنے کا کہا لیکن وہ نہیں رُکیں اور چند دن پہلے جب شارق کو اسکول میں اس کے مضمون پر پہلا انعام ملا تھا، جس کی تیاری اس کی وجیہہ ٹیچر نے ہی کروائی تھی، تو ان دونوں نے کس طرح منہ بسور بسور کر ٹیچر کو بھی اپنے ساتھ اپنے پاپا کی جانب سے انعام میں دی گئی آئس کریم پارٹی میں چلنے کی منتیں کی تھیں، لیکن پھر بھی وہ مسکرا کر اور دونوں کے گال پر پیار کر کے واپس چلی گئی تھیں۔

لیکن اتنی احتیاط کے باوجود قدرت کی جانب سے آئی ہوئی رکاوٹیں تو اپنی جگہ موجود رہتی تھیں، کبھی ٹریفک کا رش، کبھی موسم کی خرابی، کبھی مشین کے کل پرزوں کی مجبوری، اُس دن بھی بھری دوپہر میں ہی اچانک کالے بادل یوں آناً فاناً آسمان پر چھائے کہ چند ہی لمحوں میں دن میں اندھیرا سا چھا گیا۔ فخو آپی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کسی طرح آج ڈرائیور سے کہلوا دیں کہ آج انہیں لینے نہ آئے، لیکن اُسی لمحے گلی میں گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔ ڈرائیور نے دونوں بچوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی فخو آپی کو تھما دی جس میں ان دونوں نے اپنے کل کے ٹیسٹ کے بارے میں لکھا تھا، جس کی تیاری آج ضروری تھی۔ مجبوراً فخو آپی کو گھر سے نکلنا ہی پڑا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، راستے میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور فخو آپی کے ریحان کے گھر سے نکلتے نکلتے سڑکیں ندیاں بن چکی تھیں۔ ڈرائیور بیچارہ نہ جانے کن گلیوں کے بیچ اور آڑھے ترچھے راستوں سے گاڑی نکالتا ہوا کسی نہ کسی طرح انہیں گھر تک پہنچا تو لایا لیکن اس اثناء میں وجو کے مقررہ وقت سے تقریباً آدھا گھنٹہ زیادہ ہو چکا تھا اور ظفر اپنے لال بھبھوکا چہرے سمیت گلی میں ہی برستی بارش میں ٹہل رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے ڈرائیور کو ہی روک لیا اور اس پر برس پڑا کہ وہ ان کی بیوی کو لے کر کہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور فخو آپی نے ظفر کے لاکھ ہاتھ جوڑے، منتیں کیں کہ یوں گلی میں سر بازار تماشہ نہ بنائے لیکن اس دن ظفر بھی اپنی کرنی پر آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو تو اُس نے بسیار کوشش کے بعد جانے دیا لیکن فخو آپی کے ساتھ اُس نے اس شام جو برتاؤ کیا اُس کے نشان ان کی روح سے تاعمر نہیں مٹ پائے۔

مصیبت یہ بھی تو تھی کہ اگر فخو آپی ظفر کی خوشی کے لیے ٹیوشن چھوڑنا بھی چاہتیں تو یہ بھی ظفر کو گوارہ نہیں تھا کیونکہ اُسے گھر بیٹھے ہر مہینے ایک معقول رقم سے جو ہاتھ دھونا پڑ جاتے، اور وہ یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو اسے مالک مکان کی دھمکیوں کا بھی روزانہ سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ فخو کی تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ بھی آسانی سے، چاہے قسطوں میں ہی سہی، پرا دا ہو رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے فخو نے مزید احتیاط شروع کر دی اور موسم ذرا بھی خراب ہونے کا احتمال ہوتا وہ یکسر جانے سے ہی انکار کر دیتی تھیں۔ لیکن ظفر کے پاس انہیں ستانے کے لیے بہانے اور بہت تھے۔ دراصل ظفر کے اندر کا انسان ایک ایسی عجیب احساسِ کمتری کا شکار تھا، جس میں انسان اپنے مخالف کی خاموشی کو بھی طنز سمجھتا ہے۔ اُسے اس بات کا احساس تو پہلے دن ہی سے تھا کہ فخو آپی شکل وصورت، تعلیم وتہذیب اور آداب واطوار میں اس سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن فخو آپی نے آج تک کبھی اُس کے سامنے کبھی کوئی ایسی حرکت یا بات نہیں کی تھی جس سے ظفر کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہو۔ لیکن ظفر کے اندر کے خناس نے اسے فخو آپی کی اس خاموشی کو بھی کچھ اور ہی معنی دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ یوں چپ رہ کر فخو اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ جیسے اُس کے وجود کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اس بات سے اور اس احساس سے اس کی انا کو مزید ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر مزید انتقامی کارروائیاں کر کے اپنی زخمی انا کو سہلانے کی کوشش کرتا۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اور زندگی دن بدن یونہی فخو آپی پر تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ بیچ میں ایک آدھ مرتبہ ظفر نے ایک اور عجیب حرکت بھی کی۔ فخو آپی کے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہی وہ بنا بتائے خود ہی کچھ دیر بعد ریحان صاحب کے بنگلے پر آن دھمکا۔ ایک مرتبہ تو گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا اور صرف مالی ہی باہر کے باغیچے میں کام کر رہا تھا جس سے اُس نے ٹوہ لے لی کہ فخو ہیں اندر ہیں اور بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ ایک آدھ

مرتبہ ڈرائیور نے خود اسے بنگلے کے باہر ٹہلتے ہوئے دیکھ لیا لیکن ڈرائیور کے باہر نکلنے سے پہلے ہی ظفر اِدھر اُدھر ہو گیا۔ جبکہ ایک مرتبہ اس کے گھنٹی بجانے پر خود ریحان صاحب گیٹ پر آ گئے کیونکہ وہ قریب ہی لان میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ظفر انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا لیکن جب اس نے ڈوآپی کے شوہر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا تو ریحان صاحب نے بڑی عزت سے انہیں اندر بلا کر بٹھایا اور چائے وغیرہ کا پوچھا۔ ظفر کو اور تو کچھ سوجھا نہیں لہٰذا اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ یہاں سے گزر رہا تھا تو اس نے سوچا کہ ڈوکو ساتھ ہی لیتا جائے۔ ریحان صاحب نے ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر واپس بھجوایا اور نہ صرف یہ بلکہ جاتے ہوئے گھر کی ملازمہ کو یہ تاکید بھی کی کہ انہیں خالی ہاتھ نہ جانے دے اور فریج میں پڑا تازہ کیک بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

اس دن ظفر کو پہلی بار یہ پتہ چلا کہ ریحان صاحب کی بیوی تو انہیں پانچ سال پہلے ہی داغ مفارقت دے چلی ہیں اور اب اس گھر میں ڈرائیور اور مالی کی بیوی کے علاوہ تیسری کوئی عورت نہیں رہتی۔ ظفر نے گھر آ کر اس بات پر بھی بے حد ہنگامہ کیا کہ ڈو نے یہ بات انہیں پہلے کیوں نہیں بتائی۔ ڈوآپی نے اُسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھلا اس بات سے ان کا کیا تعلق کہ بچوں کی ماں زندہ اور گھر میں ہے یا نہیں۔ ان کی تو ریحان صاحب سے بھی شاذ و نادر ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی ورنہ ان کا تعلق تو اصل میں ان کے بچوں کے ساتھ تھا، لیکن وہ ظفر ہی کیا جو ڈوآپی کی سُن لے..... کئی دن تک یہ تکرار چلتی رہی اور کئی دن تک روزانہ ڈوآپی کو ایک نئی سُولی پر ٹنگنا پڑتا۔

اور پھر آخر کار ایک دن اس تکرار کی جلتی پر تیل چھڑکنے کا موقع قدرت نے خود ہی ظفر کو فراہم کر دیا۔ ڈوآپی بچوں کو پڑھا کر اپنے مقررہ وقت ساڑھے پانچ بجے پورچ میں نکلیں تاکہ حسب معمول ڈرائیور انہیں چھ بجنے تک گھر پہنچا دے تو یہ دیکھ کر ان کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی کہ پورچ میں نہ تو ڈرائیور تھا اور نہ ہی گاڑی کا کچھ اتہ پتہ تھا۔ مالی اور گھر کے دوسرے نوکروں کو ادھر ادھر دوڑایا گیا تاکہ وہ ڈرائیور کی کچھ خبر نکال کر لائیں لیکن ڈرائیور کا دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈو کا رنگ پیلا پڑتا گیا۔ بالآخر شام چھ بجے کے قریب ڈرائیور تو نہیں پلٹا لیکن ریحان صاحب اپنی سرکاری جیپ میں دوسرے ڈرائیور سمیت گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظر راہداری میں بے چین اور نڈھال سی ٹہلتی ڈو پر پڑی۔ اسی اثنا میں ڈرائیور بھی نہ جانے کہاں سے ہڑبڑایا ہوا سا گولی کی سی تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ ریحان صاحب سارا معاملہ خود ہی سمجھ گئے اور انہوں نے ڈرائیور کو سخت جھاڑا کہ جب اُسے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جب تک بچوں کی ٹیچر کو واپس اپنے گھر نہ پہنچا دیا جائے تب تک وہ بھول کر بھی اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش نہ کرے پھر وہ کار لے کر باہر کیوں گیا۔ ڈرائیور وہیں ریحان صاحب کے پیروں میں گر گیا کہ اچانک ہی اسے خبر ملی کہ اس کی بہن کا بیٹا پتنگ لوٹتے ہوئے سڑک پر کسی موٹر سائیکل سوار سے ٹکرا گیا ہے اور اس کے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا ہے تو وہ رُک نہیں پایا اور بہن کے گھر کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قریبی ہسپتال سے بچے کی پٹی کروا کر ساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے گا لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا اور بچے کے سر میں ٹانکے لگنے کی وجہ سے اُسے دیر ہو گئی۔

بہر حال وجہ جو بھی تھی، دیر تو ہو ہی گئی تھی۔ ریحان صاحب نے ڈرائیور کا معاملہ تو بعد پر اُٹھا رکھا، فی الحال انہیں ڈوآپی کو گھر پہنچانے کی جلدی تھی۔ سو انہوں نے ڈرائیور کو جلدی سے فوراً گاڑی نکالنے کا کہا اور خود بھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آگے بیٹھ گئے کیوں کہ انہیں معاملے کی سنگینی کا

احساس تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ خود جا کر ظفر کو اس صورتِ حال سے آگاہ کریں تا کہ وہ خوآپی پر برہم نہ ہو۔ وہیں بے چاری خوآپی تو ان کے جسم کا خون تو ویسے ہی خشک ہو چکا تھا لہٰذا چپ چاپ بیٹھی اپنے مقدر کا سامنا کرنے کی تیاری کرتی رہیں۔

جب ریحان صاحب کی گاڑی ظفر کی گلی میں مڑی تو اس وقت شام کے سات سے کچھ اوپر ہی وقت ہوا ہوگا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور سردیوں کے دن ہونے کی وجہ سے شام بھی گہری رات ہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ خوآپی کو درود شریف سمیت اور جتنی بھی دعائیں آتی تھیں، انہیں وہ سینکڑوں مرتبہ دل میں دُہرا چکی تھیں۔ ریحان صاحب نے ان سے کہا کہ وہ یہیں باہر گلی میں گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں، تب تک وہ جا کر اندر سے اپنے میاں کو باہر بھیج دیں۔ خوآپی نے ایک مرتبہ پھر اُن سے اصرار کیا کہ انہوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے، یہی بہت ہے، اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ اپنے گھر خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔ دراصل خوآپی کے ذہن میں یہ خوف بھی کہیں نہ کہیں پل رہا تھا کہ ظفر ریحان صاحب کے سامنے ہی کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے لہٰذا اس لیے بھی وہ ان دونوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن ریحان صاحب نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ظفر سے مل کر ہی گھر واپس جائیں گے۔ انہیں اس پریشان سی کومل لڑکی کو یوں اکیلے چھوڑ کر واپس جانا کسی طور بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

مجبوراً وجوآپی ہی کو ہار ماننا پڑی اور وہ گاڑی سے اتر کر اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئیں، لیکن یہ کیا.....؟ دروازے پر ایک موٹا سا تالا پہلے سے لٹکا وجوآپی کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ تو کے تو ہوش ہی اڑ گئے ظفر اس وقت کہاں چلا گیا تھا؟ جبکہ اسے پتہ بھی تھا کہ وجو کے پاس چابی بھی نہیں ہے، پھر اس اندھیری رات میں وہ گھر کو تالا کیوں لگا گیا تھا؟ وجو کی پریشانی دیکھ کر ریحان صاحب بھی نیچے اتر آئے اور وہ بھی تالا دیکھ کر حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ وجوآپی کو تو ظفر نے آج تک آس پاس کسی ہمسائے کے گھر بھی آنے جانے نہیں دیا تھا نہ ہی وہ گلی میں کسی سے واقف تھیں۔ اس لیے ریحان صاحب نے طے کیا کہ ظفر کے آنے تک وہ سب یہیں گاڑی میں اس کا انتظار کریں گے، کیونکہ وجوآپی کو یوں دروازے پر تنہا بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

لیکن انہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جب مزید دو گھنٹے گزر گئے تو ریحان صاحب نے خوکو ان کے اپنے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی کیونکہ ظفر کا تو دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہمسایوں کے ہاں رات بھر انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ خوآپی اپنے گھر میں ہی انتظار کریں بعد میں غیاث چچا خود ہی ظفر کا پتہ لگا کر انہیں گھر چھوڑ آتے۔ خوآپی کے پاس ہاں کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ لہٰذا وہ چپ چاپ سر جھکائے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں اور ریحان صاحب انہیں ان کے میکے چھوڑ آئے۔ غیاث چچا کو انہوں نے باہر بلا کر پوری بات سمجھا دی تھی۔ وہ بے چارے بھی کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ ساری رات ظفر کے مختلف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرتے رہے۔ وہ رات اور بہت سی راتوں کی طرح خوآپی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی اور تبھی آدی کی تصویر کے نیچے رکھے کارڈ (Invitation) پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ یہ آدی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کا دعوت نامہ تھا۔ کل صبح آدی کی پاسنگ آؤٹ تھی اور کل کیا؟ صبح تو ہو ہی چکی تھی..... گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی۔

تیسرا الوداع

صبح کے چار بجتے ہی سی۔ پی۔ او نے بگل بجوا دیا۔ لیکن ہم سب کی آنکھوں میں نیند پہلے ہی کہاں تھی، یہ صبح کیڈٹ کالج کی دوسری صبحوں سے کتنی مختلف اور کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ صرف ہم پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹ ہی لگا سکتے تھے۔ ہمارے کلف لگے کڑک خاکی یونیفارم اور ہماری کیپ بیرٹس، پر لگے رنگیں پَروں (پلومز) کے ساتھ جُوی ہماری الماریوں میں رات ہی کو ٹانگ دی گئی تھیں، ہمارے لانگ پریڈ شوز چم چم کرتے شوریکس پر سجے ہوئے تھے۔ باہر پریڈ گراؤنڈ میں الوداعی ترانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ آج ہمارا ناشتہ صبح چھ بجے ہی پیش کر دیا جانا تھا تا کہ ہم واپس آ کر اپنے یونیفارم پہنیں اور اپنی آخری تیاری کر کے پریڈ گراؤنڈ جا پہنچیں۔ ہم سب بیک وقت اُداس بھی تھے اور خوش بھی..... ہم ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کی آنکھ میں نمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا، سارے کیڈٹس ایک دوسرے کے ہاسٹلز جا کر اپنے گھر کے پتوں اور ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر رہے تھے تا کہ مستقبل میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارے گھر والوں میں سے کون کون ہماری پاسنگ پریڈ دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں پہنچ چکا ہوگا کیونکہ مہمان پریڈ سے صرف دو گھنٹہ پہلے ہی کالج آ سکتے تھے اور انہیں وہیں گیٹ سے ان کے کارڈز کے حساب سے باعزت طور پر پریڈ گراؤنڈ میں ان کی کرسی تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ مجھے تو گھر سے کسی کے آنے کی کچھ کم ہی اُمید تھی کیونکہ ابا اور امی اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتے تھے اور عمارہ اور فاران بھیا اکیلے آ نہیں سکتے تھے۔ لیکن باقی کیڈٹس اور میرے دوستوں کے گھر سے سبھی آ رہے تھے۔ اور اب اُنہی کے خاندان میرے خاندان بھی تو تھے۔ چھ سال سے ویک اینڈز پر اور دو چار دن کی کم چھٹیوں میں میں کبھی فیصل کے گھر تو کبھی اسفر کے گھر جاتا رہا تھا، کبھی آصف موٹے کی امی کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے تو کبھی نثار روندو کے گنے کے کھیتوں سے گنے توڑ کر کھاتے کھاتے میرا بچپن میرے انہی دوستوں کے گھر والوں کے ساتھ بیت گیا تھا۔ اور ان سب کی ''امیاں'' اور ابا مجھے بھی اپنا ''ریڈی میڈ'' بیٹا ہی تو سمجھتے تھے۔ اسفر کے ڈیڈی سے تو میں اسفر سے بھی زیادہ جیب خرچ اینٹھ لیتا تھا اور فیصل کی ممی چھٹیوں میں فیصل کی نہیں بلکہ میری مرضی کا کھانا بنایا کرتی تھیں۔ آصف بھٹی کے ''بابے'' نے مجھے کبڈی اور داؤ لگانا سکھایا تھا اور نثار روندو کے ابا سائیں نے مجھے گاؤں کے کھیتوں میں شکار کھیلنے کے جانے کتنے گُر بتائے تھے، میں ان سب کا لاڈلا آدی تھا، جسے انہوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے دور ہے۔ اور میرے لیے میرے یہ رشتے، کسی بھی خون کے رشتے سے کم نہیں تھے۔

آخری بگل بج چکا تھا اور اب ہم سارے سینئر پاسنگ آؤٹ کیڈٹس لمبی لمبی قطاروں میں اپنے اپنے ہاسٹل سے نکل کر پریڈ گراؤنڈ جانے کے لیے باہر فالن کی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ ہاسٹل کے دونوں طرف راستوں میں ہمارے جونیئرز ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اور الوداعی

کارڈ لیے ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے جانے کب سے تیار کھڑے تھے، انہی میں ساتویں جماعت کے وہ چنو، منو، بلو، پپو، سونو، مونو قسم کے کیڈٹس بھی تھے، جو آنکھوں میں وہی حیرت اور فخر آمیزی روشنی لیے کھڑے ہمیں تک رہے تھے جو کبھی ساتویں جماعت میں ہماری آنکھوں میں اپنے سینئرز کو یوں سجے سنورے آخری پریڈ پر جاتے ہوئے دیکھ کر لہرائی تھی۔ انہی میں سے ایک ننھا سا تارہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ میری طرف بڑھا دیا۔

"This is for you ..... دس از فار یو ..... آدی سر"

میں نے اس معصوم تارے سے گلدستہ لے لیا اور پھر اُسے ایڑیاں بجا کر ایک کڑک دار سا سیلوٹ کیا۔ سبھی ننھے تارے کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ اُس نے اپنی آٹوگراف بک آگے کر دی اور میں نے اپنی زندگی کے پہلے آٹوگراف کاغذ پر ثبت کر دیئے۔

"جیتے رہو ہمیشہ....."

ہم سب پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ سی۔ پی۔ او نے وسل بجائی اور ہم نے پریڈ کی فارمیشن ترتیب دے دی۔ مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اور بینڈ والے نے اپنے پورے 72 بہتر اوزاروں سمیت اپنی فوج کو دھن شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ بینڈ پر چوٹ لگی اور ایجوٹینٹ نے سی۔ پی۔ او کو اجازت دینے کے لیے اپنی اسٹک لہرائی۔ پریڈ شروع ہو گئی۔ ہم سارے پاسنگ آؤٹ کیڈٹ اپنے اپنے ہاؤس کے جھنڈے تلے اپنے پی۔ او۔ سمیت پریڈ کرتے ہوئے اس چبوترے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں گورنر صاحب، پرنسپل اور ایجوٹینٹ سمیت کھڑے ہم سے سلامی لینے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم گھوم کر اب اس قطار میں چل رہے تھے جس کے بالکل سامنے مہمانوں کا پنڈال تھا۔ تمام کیڈٹس کے گھر والے انہیں پہچان کر ان کی جانب دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے کہ آج ان کے جگر کا ٹکڑا زندگی کے ایک بہت بڑے امتحان میں سُرخرو ہو کر ان کا مان بڑھا رہا تھا۔ ہم نے ڈائس کی طرف گھوم کر سلامی کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ یہ سلامی دراصل تمام کیڈٹس کی اپنے گھر والوں اور پیاروں کے لیے بھی تھی جو دُور سے انہیں دیکھ کر خوشی سے نعرے لگا رہے تھے، ان کے نام پکار رہے تھے۔ دفعتہً میرے کانوں میں بھی ایک آواز اُبھری "آدی..... آدی....."

میں نے سلامی دیتے ہوئے بھیڑ میں نظریں دوڑائیں اور کچھ پل کے لیے میرا خود اپنی آنکھوں سے اعتبار اٹھ گیا۔ دُور تیسری قطار میں امی کھڑی تھیں۔ ہاں ہاں..... وہ میری امی ہی تھیں۔ میری پیاری امی..... جو اس وقت بھی اپنے مخصوص کالے برقعے میں ملبوس تھیں اور اتنے بہت سارے غیر مردوں کی موجودگی کی وجہ سے صرف اپنی بھیگی آنکھوں سے پلو ہٹائے کھڑی تھیں اور ان کا ایک ہاتھ میری جانب یوں اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ اتنی دور سے بھی اپنے راجہ بیٹے کو بھیڑ میں ٹھوکر کھا کے گرنے سے روک لینا چاہتی ہوں..... یا اللہ یہ کیسا معجزہ ہے۔ پھر میری نظر امی کے ساتھ کھڑے فاری بھیا پر پڑی۔ مجھے آواز دینے والی آواز اُنہی کی تھی۔ ارے..... یہ کیا..... ان کے ساتھ عمارہ بھی کھڑی پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اور پھر میری نظر عمارہ کے ساتھ کھڑے چوتھے شخص پر پڑی۔ مجھے اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ اگر میں فوراً اپنے قدم سنبھال نہ لیتا تو ضرور پوری کی پوری پریڈ کے قدم توڑ کر سب کی پریڈ برباد کر دیتا۔ عمارہ کے ساتھ ابا کھڑے تھے..... ہاں ہاں..... میرے ابا..... وہ کیسے یہاں تک آ پہنچے۔ اتنا لمبا سفر، امی کی بیماری، عمارہ کے امتحانات، کوئی وجہ بھی تو ان کے قدم روک نہیں پائی تھی۔ کون کہتا ہے کہ میرے ابا مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ دیکھو..... وہ کھڑے ہیں

میرے ابا..... وہ رہیں میری پیاری امی جو اپنے آدی کی سلامی لینے یہاں تک آ پہنچی تھیں۔ شاید اپنی زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کر کے۔ ابا نے مجھے دیکھ کر ہلکے سے ہاتھ ہلایا۔ ان کی آنکھوں کی نمی میں یہاں سے بھی محسوس کر سکتا تھا، لیکن یہ نمی خوشی کی نمی تھی۔ ان کے آدی نے آج وہ کر دکھایا تھا جو ان کا خواب تھا۔ لوگ بیٹوں سے بھلا اور کیا چاہتے ہوں گے.....؟ فخر کا یہی کچھ لمحوں کا احساس، غرور کی چند گھڑیاں..... جو ان کی ساری زندگی پر بھاری ثابت ہوتی ہیں..... میری اور ابا کی آنکھیں ملیں۔ میری آنکھوں سے صدیوں کا رُکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ میرے قدم پریڈ کی بیٹ پر اٹھ رہے تھے، میرا ہاتھ ماتھے پر سلامی کے لیے جما ہوا تھا لیکن میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں کہ آج ہی اندر کا ہر دریا نکال کر ہی دم لیں گی۔ امی نے دور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں نہ روؤں پر وہ۔ خود بھی تو رُو رہی تھیں۔ عمارہ مجھے دیکھ کر منہ چڑا رہی تھی لیکن وہ بھی تو رَو رہی تھی۔ فاری بھیا جو ایسے موقعوں پر بہت بہادر بنتے تھے، آج تو وہ بھی بنا چہرہ چھپائے یوں رَو رہے تھے کہ ان کے گالوں پر بہتے آنسو مجھے اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

سی۔ پی۔ او زور سے چیخا ''کیڈٹ آخری سلامی دے گا''..... سلاآآآآم فن۔''

ہمارے ہاتھ تیزی سے ہوا میں لہرائے، ماتھے تک گئے اور نیچے گر گئے۔ میرے دل نے سرگوشی کی۔

''الوداع اے میری رہنما..... اے میری تربیت گاہ..... الوداع.....''

﴿اُردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

تیسرا دَور

دوسری قیامت

پاسنگ آؤٹ کے بعد کیڈٹ کالج کو الوداع کہہ کر جب میں اپنے گھر والوں سمیت اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو سب سے پہلی خبر جس نے میرا یوں استقبال کیا کہ میرے ہوش وحواس ہی چھین لیے، میں نے راجہ کی زبانی وہیں پلیٹ فارم پر سُنی۔

"فوزیہ آپی کو طلاق ہوگئی....."

مجھے یوں لگا کہ جیسے پورا ریلوے اسٹیشن ہی گھوم رہا ہے اور ابھی چند لمحوں میں میرے سر پر آگرے گا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ راجہ بول کیا رہا ہے۔ امّی بھی محلے میں داخل ہوتے ہی تانگے سے اتر کر جلدی سے غیاث چچا کے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔ اسٹیشن پر راجہ کے ساتھ منّی، ننھو، گڈو، بالے اور پپو بھی مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ سب ہاتھوں میں ہار لیے یوں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے جیسے میں اکیڈمی سے نہیں، مکہ مکرمہ سے حج کر کے آیا ہوں۔ بہرحال میری ساری خوشی اور دوستوں سے ملنے کی مسرت اس خبر سے غائب ہو چکی تھی اور ہم سب راجہ کے گھر کی بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے۔ میں بالکل خاموش تھا اس لیے وہ سارے بھی چُپ تھے۔ پھر راجہ نے ہی پہل کی اور مجھے تین دن پہلے کی شام کا وہ سارا قصہ بتایا جب وجو آپی کو ریحان صاحب کے ڈرائیور کی وجہ سے گھر لوٹنے میں دیر ہوگئی تھی اور ریحان صاحب خود انہیں گھر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ظفر کے گھر پر نہ ہونے اور دروازے پر تالا پڑے ہونے کی وجہ سے آخرکار دیر رات انہیں وجو کو ان کے اپنے گھر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ غیاث چچا ریحان صاحب کے جاتے ہی ظفر کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رات دو بجے وہ ظفر کی گلی میں پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں سے ہو کر گزرے تھے لیکن تب دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ظفر کے ایک آدھ ٹھکانے کا پتہ وہ جانتے تھے، لگے ہاتھوں انہوں نے اس کے پرانے شوروم کا بھی چکر لگا لیا لیکن سب طرف سے ایک ہی جواب ملا کہ ظفر وہاں نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹنے سے پہلے انہوں نے آخری امید کے طور پر دوبارہ ظفر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور جیسے ہی ان کا اسکوٹر گلی میں مڑا انہوں نے ظفر کا دروازہ کھلا دیکھ لیا۔

غیاث چچا جلدی سے اسکوٹر لاک کر کے اترے اور دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد ظفر نے اندر سے دروازہ کھولا اور سر نکال کر باہر جھانکا اور غیاث چچا کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں بنا کسی سلام دعا کے بولا۔

"اوہ..... تو آپ ہیں..... کیا آپ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں..... میرے خیال میں تو اسے اب تک آپ کے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

غیاث چچا کچھ حیران بھی ہوئے کہ جب ظفر کو پتہ بھی ہے کہ وجو اپنے گھر میں ہیں تو یہ انہیں لینے کیوں نہیں آیا۔

''ہاں بیٹا..... وہ تو کب سے گھر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ دراصل ٹیوشن سے واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچی تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، اس لیے ریحان صاحب اُسے ہماری جانب چھوڑے چلے آئے..... چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں..... وجیہہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

ظفر کے چہرے پہ ایک زہر خندی مسکراہٹ ابھری۔

''اوہ..... ریحان صاحب..... تو وجیہہ کو لانے لیجانے کا فریضہ اب بڑے صاحب نے خود سنبھال لیا ہے..... بہتر ہوتا وہ اسے آپ کے گھر چھوڑنے کے بجائے واپس اپنے گھر ہی لیجاتے.....''

غیاث چچا کا صبر اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے گرجے۔

''ظفر..... تمہیں شرم آنی چاہیے خود اپنی بیوی کے متعلق ایسی بات کرتے ہوئے..... وہ بے چاری تو.....''

ظفر نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''بس..... بہت ہو چکا یہ ڈرامہ..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے اس افسر کے ساتھ یہاں آتے اور واپس جاتے دیکھا ہے۔ کیا شریف زادیوں کے یہی لچھن ہوتے ہیں کہ شام ڈھلے دیر تک اندھیرا ہونے کے بعد بھی گاڑیوں میں افسروں کے ساتھ گھومتی پھریں.....؟'' غیاث چچا نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ ظفر پر اٹھنے سے روکا، لیکن اپنی زبان کا کوڑا لہرانے سے خود کو نہ روک سکے۔

''شریف زادیاں ایسا کرنے پر تب مجبور ہو جاتی ہیں جب ان کے میاں گھر میں چارپائی پر پڑ کر بیوی کی کمائی کی روٹیاں توڑنے لگیں..... ایسے میں انہیں خود اپنا اور میاں کا پیٹ پالنے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔''

ظفر کے تن بدن میں غیاث چچا کی یہ بات ایسی آگ لگا گئی کہ وہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھا اور اس کی زبان سے غیاث چچا اور وجو آپی کے لیے مغلظات کا ایک ایسا ریلا بہہ نکلا کہ جس کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ دراصل ظفر کو توقع یہ تھی کہ غیاث چچا وجو آپی کی وجہ سے اس کے سامنے گڑگڑائیں گے، فریاد کریں گے کہ وہ آ کر ان کی بیٹی کو ان کے گھر سے واپس لے جائے اور وہ ان کی بات مان تو لے گا لیکن کچھ نہ کچھ مزید غیاث چچا سے اینٹھنے کے بعد۔ کافی دنوں سے اس کی نظر غیاث چچا کے لمبریٹا (Lumbrita) اسکوٹر پر تھی اور وہ دو تین مرتبہ وجو کے سامنے اس بات کا عذر بھی پیش کر چکا تھا کہ شہر کے فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بندہ گھر سے کام کی تلاش میں نکلے بھی تو کیسے۔ آدھا دن تو بس یا تانگے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی سواری ہوتی تو کم از کم اُسے لوگوں کے پاس کام مانگنے کے لیے جانے میں تو آسانی ہو جاتی۔

وجو آپی نے اس سے جواباً کہا بھی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ٹیوشن کے پیسوں سے کچھ رقم جوڑ کر قسطوں پر ظفر کے لیے اپنے ابا سے کہہ کر کوئی سواری دلوا دیں گی لیکن ظفر کو بھلا اتنا صبر کہاں سے آتا.....؟

وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اُسے اپنی سواری کی ضرورت کہاں سے پوری کرنی ہے اور وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا کہ جب اسے وجو آپی کے گھر والوں پر دباؤ ڈالنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آ جائے اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر کے ان سے اپنی بات منوا سکے۔ اور پھر قدرت نے

اُسے وہ موقع فراہم کر ہی دیا اور بدقسمتی سے ڈجو کو ٹیوشن سے واپسی پر دیر ہو گئی۔ جس وقت ریحان صاحب ڈجو کو لے کر گلی میں داخل ہوئے تھے، تب ظفر وہیں گلی کے نکڑ پر ہی کھڑا چھپ کر یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اُس وقت بھی آگے بڑھ کر تالا کھول کر ڈجو آپی کو گھر میں بلا سکتا تھا لیکن اذیت پسندی کا مارا، یہ شخص ایسے کھیل کھیلنے میں بہت لطف حاصل کرتا تھا اور پھر اُسے تو ویسے بھی ڈجو آپی اور ان کے گھر والوں کی تذلیل کا کوئی نہ کوئی موقع چاہیے ہوتا تھا۔ اور یہاں تو ایک تیر سے دو شکار ہو رہے تھے۔ تذلیل کی تذلیل ہو جاتی اور معاوضے میں اسکوٹر کا مطالبہ بھی دُہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن غیاث چچا کی ایک ہی کھری بات نے اُسے انگاروں پر لوٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ظفر کے شور شرابے سے سامنے کے مکان سے اُس کے ہمسائے کاظمی صاحب بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے بھی ظفر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظفر کا خون تو اُبال کھا رہا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کے مجبور باپ کی یہ مجال کہ اُسے طعنے دے..... غیاث چچا بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر کنٹرول کر کے دوبارہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی بیٹی اب ظفر کی بیوی ہے لہٰذا اس کے کردار پر کیچڑ اُچھالنا خود ظفر کی اپنی بے عزتی کے مترادف ہے لیکن ظفر کی شعلے اُگلتی زبان کو اب لگام دینا ناممکن تھا۔ وہ چلا کر بولا۔

''خوب جانتا ہوں میں کہ کس کا کردار کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی لاڈلی کو اب اپنے گھر میں ہی رکھیں۔ میں اس بدنامی کا بوجھ مزید نہیں سہہ سکتا۔ اس گلی محلے میں میری بھی کوئی عزت ہے۔ لیکن جب یہی آس پاس والے اُسے بڑی بڑی گاڑیوں میں صاحب لوگوں کے ساتھ آتے جاتے دیکھیں گے تو میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

غیاث چچا ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور دھیرے سے بولے۔

''میاں اس کا آسان حل تو یہی ہے کہ تم اپنی بیوی کو گھر میں بیٹھنے کا کہو اور کل سے خود روزگار ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑو۔ نہ وہ گھر سے باہر نکلے گی نہ تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے گا۔''

ظفر غرّایا۔ ''خوب..... ایک تو چوری..... اوپر سے سینہ زوری..... گویا آپ تمام الزام پھر مجھی کو دے رہے ہیں..... بڑا گھمنڈ ہے نا آپ کو اپنی لائق فائق بیٹی کی کمائی پر، تو پھر ٹھیک ہے۔ رکھیں اپنی اُس کماؤ بیٹی کو اپنے گھر پر۔ نہ مجھے اُس کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کمائی کی، میری طرف سے آج سے وہ فارغ ہے۔''

غیاث چچا نے اُس کی زبان روکنے کی کوشش کی اور وہ سراسیمہ ہو کر چلائے۔

''ظفر..... اپنی زبان پر قابو رکھو..... میرا مطلب وہ نہیں جو تم..... لیکن ظفر کی زبان سے جو نکلنا تھا وہ نکل کر ہی رہا.....

''میں نے اسے طلاق دی..... طلاق دی..... طلاق دی.....''

غیاث چچا وہیں کھڑے کھڑے زور سے چکرائے اور زمین پر آ گرے، ظفر نہ جانے کب کا دروازہ بند کر کے اندر جا چکا تھا۔ کاظمی صاحب نے چلا کر آس پاس کے محلے داروں کو اکٹھا کیا اور غیاث چچا کو فوراً رکشہ میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دل کا دورہ تشخیص کیا اور رات بھر غیاث چچا انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پڑے رہے۔ سکینہ خالہ اور ڈجو آپی کو گھر پر خبر ملی تو وہ سول ہسپتال دوڑی چلی آئیں۔ صبح کے پچھلے پہر جب

غیاث چچا کو کچھ ہوش آیا تو غنودگی کے عالم میں بھی وہ یہی بڑبڑاتے رہے..... نہیں نہیں..... خدا کے لیے ایسا نہ کرو..... اُسے طلاق نہ دو.....'' تب ساتھ آئے کاظمی صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی سکینہ خالہ اور ڈوآپی کو تنہائی میں لے جا کر وہ رُوح فرسا خبر سنا ہی دی جو غیاث چچا کی اس حالت کی ذمہ دار بنی تھی۔ کہتے ہیں انسان کو شدید صدمے کی حالت میں اگر کوئی دوسری اور اس سے بھی بڑی صدمے کی خبر سنائی جائے تو پہلا صدمہ ہی کبھی کبھی دوسرے صدمے کے جھٹکے اور شاک کو برداشت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ وجو آپی اور سکینہ خالہ پہلے ہی غیاث چچا کی ڈوبتی سانسوں کی وجہ سے اپنے ہوش وحواس گنوا چکے تھے لہٰذا یہ دوسرا بڑا صدمہ انہیں مزید گُم سُم کرنے کا باعث تو بنا لیکن فی الحال انہیں اپنی خبر بھی نہیں تھی لہٰذا ان کے ذہن یہ صدمہ وقتی طور پر تو جھیل گئے کیونکہ وہ پہلے ہی ایک بڑے صدمے سے گزر رہے تھے۔ البتہ اس دوسرے صدمے کے اثرات دیرپا تھے اور یہ غم اور یہ کرب دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ زہر بن کر ان کی رگوں میں اُترنا ابھی باقی تھا۔

جس وقت راجہ مجھے یہ المناک داستان سنا رہا تھا اُس وقت بھی غیاث چچا دل کے وارڈ میں ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر سیدھے ہسپتال ہی چلے گئے۔ وارڈ میں شور شرابے سے بچنے کی غرض سے ایک وقت میں صرف دو فرد ہی مریض کو دیکھنے اندر جا سکتے تھے لہٰذا باقی سب راہداری میں ہی رُک گئے اور میں اور راجہ اندر گئے۔ سکینہ خالہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وجو وہاں نہیں تھیں، شائد گھر گئی ہوں کچھ دیر کے لیے غیاث چچا کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے اور چپ چاپ پڑے چھت کو گھورے جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کا ہاتھ تھام لیا، انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور دھیرے سے دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت اور اُس سہارے کے طور پر قبول کیا ہے جو ایسے میں کوئی بھی ٹوٹا ہوا شخص کسی اپنے سے اُمید کر سکتا ہے۔

ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پکی عمر کا ایک باوقار اور سنجیدہ سا شخص ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لیے اندر داخل ہوا۔ اُس نے بہترین تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر خوبصورت سے ہلکے سنہری فریم کی عینک تھی جو اس کے وجیہہ چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ راجہ نے آہستہ سے میرے کان میں بتایا کہ یہی ریحان صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ سٹاف نرس بھی غیاث چچا کے پردوں سے الگ کر کے بنائے گئے کیبن میں داخل ہوئی۔ کیبن میں اتنے لوگوں کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا میں اور راجہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر راہداری میں ریحان صاحب کا باوردی ڈرائیور بھی ایک جانب کھڑا نظر آیا اور راجہ سے انتہائی پُرتپاک طریقے سے ملا۔ راجہ نے بتایا کہ گزشتہ تین چار دن سے ریحان صاحب کا ڈرائیور روزانہ انہیں ڈوآپی کے گھر اور ہسپتال لاتا رہا ہے لہٰذا محلے میں اور پھر یہاں ہسپتال میں روزانہ ہی راجہ سے ملاقات کی وجہ سے دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی ہے۔ بالے اور نخود وغیرہ بھی راہداری میں پڑے بینچوں پر ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لمحے میں غور سے اپنے بچپن کے ان ساتھیوں کو دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیوں اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے بچپن کے چلے جانے کا احساس۔ وہ سب بھی اب نوجوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ باقاعدہ شیو بنانے لگے تھے اور ان کے جسم بھی میرے جسم کی طرح سخت اور ٹھوس سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ہاں..... اگر کچھ نہیں بدلی تھی تو وہ تھی ان کے چہروں کی معصومیت..... شاید ہماری عمر کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے اور ہم کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں لیکن اپنے والدین کے لیے اور اپنے بچپن کے دوستوں کے لیے ہم ہمیشہ عمر کے اُسی حصے میں رہتے ہیں، جسے بچپن کہتے ہیں۔ ایسے رشتوں

کے درمیان بچپن کا یہ دسمبر کبھی ختم نہیں ہوتا..... جوانی کی دھوپ کے مصائب اُنہیں کبھی چھو بھی نہیں پاتے۔

غیاث چچا کو مزید ایک ہفتہ وہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا اور پھر بہت سی احتیاطیں بتا کر انہیں اگلے ہفتے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ گھر واپس آ گئے لیکن ان کی زبان کو لگی چپ نہ ٹوٹ سکی۔ سکینہ خالہ اور وجو نے اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ وہ ان کے سامنے ایسی کوئی بات یا اپنی اُداسی اور دُکھ کا اظہار نہ کریں جو غیاث چچا کو مزید دکھی کرنے کا سبب بن سکے۔ لیکن کیا ان کے اس طرح چھپانے سے ان دونوں کا دکھ غیاث چچا سے چھپ سکتا تھا.....؟

اُن کی بیٹی دو سال بعد ہی طلاق کا ٹیکہ لگا کر گھر واپس آ بیٹھی تھی اور اس سب کا ذمے دار وہ کہیں نہ کہیں خود اپنے آپ کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ہر وقت بس ایک اسی ''کاش'' کی گردان ہوتی رہتی کہ کاش وہ اس رات ظفر کے سامنے نہ بولتے، کاش وہ اپنی تلخی پر قابو پا لیتے، کاش وہ چند لمحے مزید خون کے گھونٹ پیتے رہتے اور ظفر کو اس کی شرطوں پر گھر منا لاتے، کاش وہ اس کم ظرف انسان کو خود اُسی کے سامنے، آئینہ دکھا کر کھڑا نہ کر دیتے..... کاش..... کاش..... کاش لیکن یہ کاش کی گردان اب سوائے اُن کے خون کے فشار کو بڑھانے کے، مزید اور کچھ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

بہت دن تک میں خود بھی وجو سے، جانے کیوں نظر ملا نہیں پایا۔ جب کبھی وہ ہسپتال میں یا پھر بعد میں، اپنے گھر میں میرے سامنے آ جاتیں تو میں نظریں جھکا لیتا تھا۔ شاید میرے اندر کہیں نہ کہیں یہ شرمندگی بھی پل رہی تھی کہ میں کبھی ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی ہمیشہ ہی سے جانے کتنے طوفانوں کا سامنا اکیلے ہی کرتی آئی تھی۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی.....؟ مجھ سے صرف سات آٹھ برس ہی تو بڑی تھیں وہ..... میں جب کبھی عمر کے اس فرق کو ہٹا کر یا پھر انہیں اپنی جگہ رکھ کر سات برس کا یہ میزان کرتا تو حوصلے، صبر اور طاقت میں میں انہیں اپنے آپ سے کہیں آگے پاتا تھا۔ یا پھر شاید کسی کا یہ کہا بھی ٹھیک ہی تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ کم از کم وجو آپی کی حد تک تو یہ بات بالکل اور سو فیصد درست تھی۔ پہلے اگو کا معاملہ، پھر طاہر بھائی کی موت، پھر پڑھائی ادھوری رہ جانا، پھر اس کم ظرف سے شادی اور اب یہ طلاق..... کیا کچھ نہیں سہا تھا انہوں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں.....

اُس دن بھی میں ان کے صحن میں پڑی آرام کرسی پر بیٹھا انہیں دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں غیاث چچا کو ٹہلانے کے لیے باہر لے کر گیا تھا اور چند لمحے پہلے ہماری واپسی ہوئی تو انہوں نے وجو سے قہوہ پینے کی فرمائش کی تھی۔ وجو سامنے باورچی خانے میں سے قہوے کی پیالیاں ٹرے میں اٹھائے میری طرف ہی آ رہی تھیں، غیاث چچا شاید کچھ لمحے ستانے کے لیے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ وجو اب بہت کم بولتی تھیں یا پھر بالکل ہی خاموش رہتی تھیں۔ ہم دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی شام کو غیاث چچا کو کچھ دور تک ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹہلانے کے لیے لے جاتا تھا۔ ریحان صاحب نے بھی اس موقعے پر اپنا بڑا پن دکھایا تھا اور وہ بھی تقریباً ہر دوسرے روز غیاث چچا کو دیکھنے کے لیے آ جاتے تھے، وجو سے انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بچے اب کسی بھی دوسری ٹیچر سے ٹیوشن لینے کے لیے تیار نہیں ہیں لہٰذا چاہے مہینہ بھر کے بعد ہی کیوں نہ سہی، وہ وجو ہی سے دوبارہ ٹیوشن جاری رکھنے کی استدعا کریں گے۔ مجھے اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوئے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور دو چار دن

میں میرا رزلٹ بھی نکلنے والا تھا۔ اتنے بہت سے دنوں میں اگر وجو نے مجھ سے کوئی بات کی تھی تو یہی کہ میرے پرچے کیسے ہوئے ہیں؟ اور میرا رزلٹ کب تک آئے گا؟ یا یہ کہ اب آگے میرا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ وہ جانتی تھیں کہ مجھ سے ڈسپلن اور نظم وضبط کچھ کم ہی برداشت ہوتا ہے لہٰذا میں فوج تو قطعی جوائن نہیں کروں گا۔ اس لیے انہیں میرے مستقبل کے شعبے کی ہمیشہ ہی فکر لگی رہتی تھی۔ خود میرے ذہن میں بھی ابھی تک اس بارے میں کوئی حتمی خاکہ تشکیل نہیں پا سکا تھا۔

اس دن بھی وجو نے بیٹھتے ہی مجھ سے یہی سوال کیا کہ اب تو رزلٹ بھی ہفتے بھر میں آ ہی جائے گا تو اب تک میں کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر سکا؟ میں ابھی انہیں جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک نے میری توجہ بٹا دی، میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے چلا گیا۔ وجو اندر برآمدے کو ڈھانکتی جافری کی اوٹ میں چلی گئیں۔ باہر ریحان صاحب کھڑے تھے لیکن ان سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے سارے جسم کا خون لمحہ بھر میں میری کن پٹیوں کی جانب سمٹ آیا اور میرے چہرے پر نفرت کے کچھ ایسے آثار پیدا ہوئے کہ لمحہ بھر کو ریحان صاحب بھی سٹپٹا سے گئے۔ وہ ظفر تھا، ہاں..... وہ ظفر ہی تو تھا۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ وجو کی رخصتی کے موقع پر دو سال پہلے اُسے دیکھا تھا لیکن میں اس کی صورت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ریحان صاحب صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ گئے اور انہوں نے آہستہ سے کھنکار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ میرا نام جانتے تھے۔

''عباد میاں..... ہو سکے تو اندر کسی طرح وجیہہ کی امی کو خبر کروا دیجیے کہ ظفر ان سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ غیاث صاحب کو اس کی خبر نہ ہو۔ میں اسے یہاں کبھی لے کر نہ آتا لیکن یہ میرے گھر پر آ کر بہت گڑگڑایا اور بہت معافی مانگی ہے اس نے اپنی غلطی اور اپنے بُرے سلوک کی، اسی لیے یہ اپنی غلطی کے ازالے کی خاطر وجیہہ اور ان کی امی سے ملنا چاہتا ہے۔''

میں نے حیرت سے ریحان صاحب کی طرف دیکھا۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے عقل والے اور سمجھ دار لگتے تھے۔ پھر آج وہ کس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ظفر نے وجو کو آخر کار طلاق ہی دے دی تھی تو پھر اب بھلا کیسا ازالہ اور کون سا مرہم؟؟..... اب تو قصہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ شاید ریحان صاحب نے بھی میری آنکھوں میں سے جھانکتی حیرت اور چہرے پہ لکھے سوالوں کو پڑھ لیا تھا، تبھی انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ اس رات ظفر سے غصے کے عالم میں جو کچھ بھی ہوا، صبح تک اپنی اُس غلطی پر وہ بے حد نادم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی اس نے غیاث چچا کو بقول اس کے، جو بھی کہا تھا، وہ غصے میں کہا تھا اور غصہ تو ہے ہی ایسی لعنت کہ انسان کو حیوان بنانے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ دوڑا ہوا اپنی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا اور ان سے گول مول سا ذکر کیا کہ اُس نے اپنے سُسر کے سامنے اپنی بیوی کو فارغ کیے جانے کے الفاظ غصے میں کہہ دیے ہیں لہٰذا وہ بتائیں کہ اس کا کیا حل ہے۔ پیش امام صاحب نے اس سے کہا کہ طلاق تو دی ہی غصے کی حالت میں جاتی ہے، لہٰذا اگر اس نے اپنی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہا ہے تو طلاق واقع ہو چکی۔ ہاں البتہ اس نے غصے میں صرف ایک مرتبہ کہا ہے کہ وہ میری جانب سے فارغ ہے اور نیت اس کی تب بھی طلاق ہی کی تھی تو پھر تین طلاقوں میں سے ایک طلاق تو ہو گئی لیکن اب بھی وہ اپنی بیوی کو گھر لا سکتا ہے۔ لیکن یہ دھیان میں رہے کہ اب اس کے پاس صرف دو طلاق ہی کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ لہٰذا ظفر کا دعویٰ اب یہ تھا کہ اس نے وجو کو صرف ایک ہی طلاق دی تھی اور وہ بھی لفظ طلاق سے نہیں..... بلکہ اس جملے

سے کہ "اب وہ میری طرف سے فارغ ہے....."

ریحان صاحب صاف دل انسان تھے، انہوں نے ظفر کی یہ فریاد سنی اور اسے بظاہر اپنے کیے پر شرمندہ دیکھا تو وہ اسے یہاں لے آئے تھے۔ ظفر اسی طرح دُور سر جھکائے اور مسکین سا بنا کھڑا تھا۔ مجھے ظفر کی کسی بات کا رتی بھر بھی بھروسہ نہیں تھا لیکن چونکہ ریحان صاحب خود کافی دیر سے دروازے پر کھڑے تھے لہٰذا میں نے کسی طور اندر یہ اطلاع پہنچا دی کہ ریحان صاحب کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے فی الحال غیاث چچا کی موجودگی، ان کی ابتر صحت کی وجہ سے کچھ مناسب نہیں ہوگی۔ میں نے جان بوجھ کر سکینہ خالہ کو ظفر کی باہر موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ خود بھی سوچ میں پڑ گئیں کہ اس وقت غیاث چچا کی موجودگی میں بھلا وہ کیونکر اور کیسے ریحان صاحب کی بات سن سکتی تھیں، میں نے انہیں تجویز دی کہ میں جا کر رابعہ لوگوں کی بیٹھک کھلوا دیتا ہوں وہ چاہیں تو وہاں جا کر بات کر لیں کیونکہ اگر وہ اتنی دیر دروازے پر کھڑی ہو کر بھی ریحان صاحب کی بات سنیں گی تو غیاث چچا کو شک تو ضرور ہو جائے گا۔ ہم ابھی اسی کش مکش میں تھے کہ قدرت نے ہمارا مسئلہ خود حل کر دیا۔ فجو نے غیاث چچا کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دھیرے سے آ کر ہمیں آہستہ بات کرنے کا کہا کیونکہ غیاث چچا کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بچو کو ابھی تک اس سارے ماجرے کا یکسر پتہ نہ تھا۔ سکینہ خالہ نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں یہیں ان کے مہمانوں کے کمرے میں لے آؤں۔ باہر آ کر میں نے ریحان صاحب سے کہا کہ انہیں سکینہ خالہ نے اندر آنے کا کہا ہے لیکن فی الحال وہ اکیلے ہی بات کر آئیں تو بہتر ہوگا۔ ریحان صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے اور انہوں نے ظفر کو ان کی گاڑی میں ہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا اور خود اندر چلے گئے۔ میں وہیں دروازے پر جما کھڑا رہا کیونکہ مجھے ظفر سے کوئی اچھی اُمید بالکل بھی نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب واپس باہر آ گئے اور میں نے ان کے چہرے پر لکھی تحریر سے ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ سکینہ خالہ نے اُن سے کیا کہا ہوگا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئے، چند قدم دُور جا کر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ واپس میری جانب پلٹ آئے۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ قریب آ کر بولے۔

"عباد میاں..... میں نہیں جانتا کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے یا جھوٹ، کیونکہ اس واقعے کے عینی گواہ خود غیاث صاحب ہیں اور وہی بہتر جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس وقت ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ان سے بھی یہ حقیقت جان نہیں سکتے..... میں اسے یہاں صرف اس خیال سے لے کر آیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح میری کسی بھی کوشش سے اس دُکھی گھرانے اور اس مظلوم لڑکی کے غموں کا کچھ مداوا ہو سکے، تو کر گزروں..... لیکن وجیہہ کی امی بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ وقت اس سارے قصے کو چھیڑنے کا ہے ہی نہیں..... ابھی بمشکل غیاث صاحب کی ذرا سی طبیعت سنبھلی ہے۔ ان کے سامنے اس وقت ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جو انہیں ذہنی یا دلی اذیت دینے کا باعث بن سکتی ہو۔ میں اس شخص کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فی الحال چند ہفتے اس بات کو بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ لیکن جانے اسے میری بات سمجھ بھی آئے یا نہیں.....؟ لہٰذا اب تم کو یہاں بہت ہوشیار اور بیدار رہنا ہوگا تاکہ یہ موقع پا کر کوئی نیا فتنہ کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے....."

میں نے ریحان صاحب کی بات توجہ سے سنی اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں۔ سکینہ خالہ کی مرضی کے بغیر ظفر ان کے

دروازے پر تو کیا اس محلے کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ ریحان صاحب میرا کندھا تھپتھپا کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے جہاں ظفر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ریحان صاحب نے اس سے کچھ بات کی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُن کی بات سے پوری طرح متفق نہیں ہے لیکن ریحان صاحب نے پھر بھی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

دراصل ظفر کو اُسی رات اپنی اس گھناؤنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس میں بھی اس کی طرف سے کسی نیک نیتی کا عمل دخل نہیں تھا، نہ ہی اسے اپنے کیے پر کوئی پشیمانی تھی۔ اُسے تو صرف ایک بات کی ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس نے وقتی جوش اور غصے میں آ کر ڈھو کو طلاق تو دے دی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ختم کر بیٹھا تھا اور پھر ایک اچھی خاصی گھر کی نوکرانی سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے، نوکرانی بھی کیسی؟ جو صبح سے لے کر رات تک نہ صرف اس کے گھر کے کام کاج اور بنانے سنوارنے میں جُتی رہتی تھی بلکہ شام کو دوسروں کے گھر جا کر ان کے بچے پڑھا کر اتنی کمائی بھی کر لاتی تھی، جس سے ظفر کے پیٹ کا غار بھر جائے..... لہٰذا اگلے ایک ہفتے میں ہی ظفر کو اپنی حماقت کا شدید احساس ہونا شروع ہو گیا۔ پچھلے دو سالوں میں تو اُس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی تک خود نہیں پیا تھا۔ اب جو گھر کے مختلف کام اور کھانے پینے کی مجبوری نے اس کے سامنے منہ کھولا اور اسے اپنی عیاشی اور چوئے کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو اُسے ڈھو بُری طرح یاد آئیں۔ اس کا شاطر ذہن پہلے دس بارہ دن تو مختلف قسم کے منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا رہا، لیکن پھر جب اُسے کسی دوست نے کسی عالم سے مشورہ کرنے کی صلح دی اور وہ محلے کی مسجد کے امام کے پاس زندگی میں پہلی مرتبہ، اپنی اس مجبوری کی وجہ سے مسجد کی سرحد پار کر گیا تب مولوی صاحب کی باتوں نے اُسے یہ راستہ سُجھا دیا کہ وہ مکمل طلاق دینے سے ہی یکسر انکار کر دے گا۔ دوسرا منصوبہ اُس نے یہ بنایا کہ براہِ راست غیاث چچا کے گھر جانے کے بجائے وہ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بڑے افسر تھے اور ڈھو کے خیر خواہوں میں سے ایک تھے، اور ڈھو کی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ انہیں ہمیشہ ڈھو جیسی احساسات کی پڑھی لکھی لڑکی کا ایسے جنگلی اور اُجڈ شخص سے رشتہ ہونے پر بھی دل ہی دل میں بہت افسوس ہوتا تھا لیکن ظاہر ہے یہ قدرت کے کھیل تھے اور اس میں بھلا ریحان صاحب کیا کر سکتے تھے۔ لہٰذا وہ ظفر کی باتوں پر اعتبار کر بیٹھے تھے، صرف اس لیے کہ اگر ظفر سچ بول رہا ہو گا تو ڈھو کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ دراصل وہ خود کو بھی ڈھو کے ساتھ ہوئے اس ظلم کا کہیں نہ کہیں ذمہ دار ٹھہراتے تھے نہ اس شام اُن کا ڈرائیور ڈھو کو چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر جاتا، نہ ڈھو لیٹ ہوتیں اور نہ ہی انہیں آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ ڈرائیور کو تو انہوں نے اگلے دن ہی نوکری سے فارغ کر دیا تھا لیکن وہ بے چارہ روتا دھوتا کچھ دن بعد ڈھو کے گھر آن پہنچا کہ اُس سے جو بھی غلطی ہوئی انجانے میں ہوئی اور اس کی بے روزگاری سے بچے گھر میں فاقوں پر مجبور ہیں۔ لہٰذا ڈھو نے خود ہی ریحان صاحب سے کہہ کر اُسے دوبارہ نوکری پر لگوا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس بات پر ڈھو کا اس قدر احسان مند تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں دعائیں دیتا رہتا تھا، لیکن شاید اُسے بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کچھ لوگوں پر قدرت دعاؤں کے در بھی بند کر دیتی ہے۔ شاید وہ بدقسمت، بہت خاص لوگ ہوتے ہوں گے کہ جن کے لیے اتنا کڑا نصیب لکھ کر انہیں زمین پر بھیجا جاتا ہو گا۔

ڈھو بھی انہی میں سے ایک تھیں کہ جن کے مقدر کی کنجیاں قدرت تالا لگا کر نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی؟ ظفر نے دو چار دن تو ریحان صاحب یا ڈھو کے گھر والوں کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا اور پھر کوئی پیش رفت ہوتی نہ دیکھ کر اس نے پھر غیاث چچا کے گھر کا رُخ کیا، لیکن اس بار وہ اکیلا تھا۔ میں پہلے ہی راجہ اور بالے کو بتا چکا تھا کہ اب ہمیں چوبیس گھنٹے اس بات کا دھیان رکھنا ہو گا کہ ظفر کسی بھی طرح غیاث چچا کے گھر

تک نہ پہنچ پائے، ہم میں سے کوئی نہ کوئی وہاں آس پاس موجود ہی رہتا تھا لیکن یہ ظفر کی بدقسمتی تھی کہ جس شام وہ ہمارے محلے میں گھسا، اس وقت ہم سارے ہی دوست بڑے میدان میں موجود تھے۔

راجہ نے مجھے کہنی مار کر ظفر کی جانب متوجہ کیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے "گزشتہ سسرال" کی جانب جا رہا تھا۔ بالے نے سیٹی بجا کر اُسے آواز دی۔

"میں نے کہا ظفر بابو..... جاتے کہاں ہو..... دو گھڑی ہماری بات تو سُن لو۔"

ظفر ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر کچھ ٹھٹکا، مجھے تو وہ پہلے بھی وجو کے دروازے پر اس دن دیکھ ہی چکا تھا لہٰذا اُسے ہمارا مقصد سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ ہم نے آگے بڑھ کر ظفر کے گرد یوں گھیرا بنا لیا کہ اس کے آگے بڑھنے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنی ذات کا ایک ہی کایاں شخص تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اکڑ کر بولا "تم لوگ یوں میرا راستہ نہیں روک سکتے..... مجھے غیاث چچا سے ملنا ہے۔ میں اپنی بیوی کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔"

میں نے بہت مشکل سے اُسے تمیز سے جواب دیا۔

"غیاث چچا کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کچھ دن بعد تشریف لائیں۔"

ظفر کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔

"نہیں..... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا..... اور خبردار جو تم میں سے کسی نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو..... تم لوگ ابھی ظفر سے واقف نہیں ہو۔"

ظفر نے قدم آگے بڑھائے۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے۔ ظفر نے اسے اپنی فتح جانتے ہوئے فخر سے سر اونچا کیا لیکن دوسرے ہی لمحے بالے کی اڑائی ہوئی ٹانگ کے جھٹکے سے وہ زمین بوس ہوتے ہوتے بچا۔ ظفر غرا کر ہماری جانب پلٹا، اب راجہ اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ راجہ نے ظفر کی کلائی پکڑ لی اور جھٹکا دے کر بولا۔

"یہ مت سمجھنا کہ یہ باقی سارے تم سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ تم اس محلے سے باہر جا کر لوگوں سے یہ کہتے پھرو کہ یہاں تمہارے ایک کے مقابلے میں پانچ پانچ آ گئے تھے لہٰذا تم کچھ کر نہ پائے۔ تمہارے لیے صرف میں ہی کافی ہوں..... بولو کیا ارادہ ہے پیارے.....؟"

ظفر نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے دو چار بار زور لگایا لیکن میں راجہ کی گرفت کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، بچپن میں جب ہم زور کا مقابلہ کرتے تو راجہ کی پکڑ کو ہم تین تین مل کر بھی نہیں کھول پاتے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں ظفر بھی پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم سب کو کسی طرح کچا ہی چبا جائے۔ اس نے آخری حربہ آزمایا۔

"ٹھیک ہے..... تو تم لوگ اس غنڈہ گردی سے باز نہیں آؤ گے۔ میں ابھی واپس جا کر پولیس کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ پھر دیکھنا پولیس تم لوگوں کا کیا حشر کرتی ہے۔"

بالے نے اُس کی بات سنی تو زور سے ہنس کر بولا۔

"یہ تکلیف کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے ظفر بابو..... پولیس کو ہم خود بلا لیتے ہیں۔ سُنا ہے اپنا پرانا علاقہ تھا نیدار ملک ریشم ترقی پا کر ڈی۔ ایس۔ پی ہو گیا ہے اور آج کل اس کی ڈیوٹی بھی دوبارہ یہیں ہمارے علاقے میں لگا دی گئی ہے۔ بڑا ظالم افسر ہے۔ جھوٹے کو تو قبر تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے ..... ابے او نتھو..... جا جا کر ملک صاحب کو یہیں بلا کر لے آ..... تب تک ہم ظفر بابو کی یہیں خاطر مدارات کرتے ہیں۔"

نتھو نے جلدی سے دانت نکالے اور ظفر کی جانب دیکھ کر بولا۔

"قسم خدا کی..... بلا لاؤں کیا.....؟؟"

ظفر کو اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہماری موجودگی میں اس کا مقصد حل ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں لہٰذا وہ پلٹ کر بکتے جھکتے ہوئے محلے سے واپس چلا گیا۔ میں نے احتیاطاً اسی وقت محلے کے باہر بنے پی۔ سی۔ او سے ریحان صاحب کے نمبر پر انہیں فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ہمارے علاقے کا ایس۔ پی ان کا کورس میٹ ہے لہٰذا ایس۔ ایچ۔ او یا کوئی بھی دوسرا پولیس افسر ظفر کی کسی بھی شکایت پر ایس۔ پی کو اطلاع کیے بنا نہ تو کوئی کاغذی کارروائی کرے گا اور نہ ہی ظفر کے ساتھ کہیں جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ ظفر ٹِک کر بیٹھنے والی ہڈی نہیں ہے لہٰذا ہم لوگوں نے فوزیہ کے گھر کے گرد پہرہ مزید سخت کر دیا۔ ظفر نے ایک آدھ بار اور کوشش کی لیکن محلے کے باہر سے ہی ہمیں دیکھ کر اُلٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔ ہم نے رات والے محلے کے چوکیدار کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ باہر کا پھاٹک بند ہونے کے بعد کسی بھی باہر کے آدمی کو اندر داخل ہونے نہ دے، اور اگر کوئی اُسے مجبور کرے بھی تو ہم دوستوں میں سے کسی بھی ایک کو آ کر اس بات کی اطلاع دے دے۔ لیکن ظفر نے رات کے اندھیرے میں محلے میں گھسنے کی جرأت نہیں کی۔ شاید اسے اس شام ہماری آنکھوں میں چھپے غصے سے ہمارے ارادوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم رات کی تنہائی میں اسے اپنے سامنے پا کر اس کی کیا گت بنا سکتے ہیں۔

لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود میرے اندر کوئی چیز ایسی تھی، جو ہر لمحہ مجھے بے چین کیے رکھتی تھی۔ اور پھر مجھے میری بے چینی کا جواب بھی مل ہی گیا۔ تیسرے ہفتے کے آخر کی بات ہے، ڈاکیہ ایک رجسٹری لے کر محلے میں داخل ہوا اور اُس نے سیدھے جا کر غیاث چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فضلو بابا نے رجسٹری وصول کر کے دستخط کر دیئے۔ اور چند لمحوں بعد ہی میرے اندر کی بے چینی اور واہموں نے باہر نکل کر حقیقت کا رُخ اختیار کر لیا۔ ظفر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کو اس کی مرضی کے بغیر اس کے گھر والوں نے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے لہٰذا اس نے عدالت سے شنوائی کی درخواست کی تھی۔ فوزیہ آپی کے خاندان پر ایک اور دُکھ اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا پہلے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ غیاث چچا کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے۔ فوزیہ آپی نے مجھے ریحان صاحب سے بات کرنے کا کہا۔ ریحان صاحب نے کہیں سے کہلوا کر ایک وکیلنی کا انتظام کروا دیا جو ایسے معاملات میں مہارت کی شہرت رکھتی تھی۔ وہ گھر پر سکینہ خالہ کی دور کی جان پہچان والی بن کر آتی رہی اور معلومات حاصل کر کے کیس آگے بڑھاتی رہی۔ ایک بار فوزیہ کا بیان بھی عدالت میں ہوا اور انہوں نے کھل کر جج کو بتا دیا کہ وہ کسی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ خود اپنے گھر میں اور اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ کیونکہ درخواست گزار اب ان کا شوہر نہیں رہا اور انہیں طلاق دے چکا ہے۔ کیس نے اپنا رُخ پلٹ لیا اور اب اس بات کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا کہ آیا طلاق ہوئی بھی ہے یا نہیں.....؟ اور ایسے موڑ پر غیاث چچا کی گواہی لازمی ہو گئی تھی لہٰذا اس موقع پر بھی ریحان صاحب نے ہی یہ

معرکہ سرانجام دینے کا فیصلہ کیا اور ایک شام اپنی موٹر خود چلاتے ہوئے غیاث چچا کے گھر آئے اور انہیں قریبی پارک تک گھمانے کے بہانے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ غیاث چچا جب تین گھنٹے بعد گھر واپس لوٹے اور ریحان صاحب کی گاڑی سے اترے تو ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو دو جو صحن میں ہی بیٹھیں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے کھوئی کھوئی نظروں سے ڈھو کو دیکھتے رہے، ڈھو ان کے اس طرح دیکھنے سے کچھ گھبرا سی گئیں، اور جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں۔

''ابا..... کیا ہوا.....؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟؟''

غیاث چچا کی داہنی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ ان کی لاڈلی آج بھی اپنے سارے دُکھ بھلا کر صرف انہی کی وجہ سے پریشان تھی..... انہی کی تکلیف کا مداوا چاہتی تھی، انہوں نے ڈھو کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پھر جیسے ضبط کے سارے دامن چھوٹ گئے۔ وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ سارا جل تھل ہو گیا۔ ڈھو کی بھی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ باپ کے گلے سے یوں لگیں کہ اب دوبارہ کبھی علیحدہ نہیں ہوں گی، سکینہ خالہ اندر سے ہڑبڑائی ہوئی بھاگی آئیں اور باپ بیٹی کو یوں گلے ملے روتے دیکھ کر بنا کچھ پوچھے ہی رو پڑیں۔ ویسے بھی اس بدقسمت خاندان کے پاس رونے کی وجوہات کی کبھی کمی نہیں رہی تھی۔

لیکن یہ آنسو بھی کتنی عجیب چیز ہوتے ہیں، کھل کر بہہ جائیں تو کم از کم وقتی طور پر ہی سہی، لیکن دل کا بوجھ کچھ نہ کچھ ہلکا ضرور کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیسی کمال کی تاثیر ہوتی ہے اس بے ضرر سے مائع کے اندر.....؟

ریحان صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے انداز سے غیاث چچا کو دھیرے دھیرے ظفر کے نوٹس کی تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ دنیا میں ہر بات اور ہر راز کھولنے کا ایک سلیقہ ضرور ہوتا ہے، ایک ایسا سلیقہ جو کڑوے سے کڑوے سچ کو بھی گھونٹ گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیسا کڑوا زہر اپنے اندر اتار چکا ہے۔ ریحان صاحب اس سلیقے سے بخوبی واقف دکھائی دیتے تھے، انہوں نے غیاث چچا کو پورا سچ بتا دیا تو ضرور، لیکن کچھ ایسے انداز سے کہ اس سچ کی کڑواہٹ نے ان کے پہلے سے زخمی اور بیمار دل کو وہ جھٹکا نہیں دیا جو کسی اور صورت انہیں یہ بات پتہ چلنے کی صورت میں لگ سکتا تھا۔

کہتے ہیں تمہید بات کا اثر بڑھا بھی سکتی ہے اور ایسی ہی کوئی لمبی تمہید اپنی بات کا اثر زائل بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ریحان صاحب نے لمبی تمہید تو باندھی لیکن اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے..... بہرحال اب غیاث چچا کو بھی آنے والے دنوں کی مشکلات کے بارے میں اعتماد میں لیا جا چکا تھا۔ غیاث چچا نے ریحان صاحب کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے خود اپنے کانوں سے ظفر کی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سنا تھا اور انہیں اس بات میں ذرّہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ لہٰذا صاف ظاہر تھا کہ ظفر جھوٹ بول رہا ہے ورنہ کوئی بھی باپ خود اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کا گھر کیوں توڑنا چاہے گا؟..... وہ تو خود ظفر کو یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ ان کے گھر آ کر اپنی امانت کو واپس لے جائے۔ لیکن اس کم بخت نے وہیں دروازے پر ہی یہ کفر کر ڈالا، تبھی تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ خود ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

ریحان صاحب کو تو ظفر کا سچ پتہ چل چکا تھا لیکن ابھی یہ سچ عدالت کو پتہ چلنا باقی تھا اور ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ اگلی ہی پیشی پر غیاث چچا کو بھی عدالت میں حاضری دینی پڑی اور انہوں نے اس رات جو بھی بیتی تھی، حرف بہ حرف عدالت کے سامنے بیان کر دی۔ لیکن

ظفر بھری عدالت میں اس بات سے مکر گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے کسی مولوی کا دیا ہوا فتویٰ بھی عدالت کے رُوبرو رکھ دیا کہ ایک طلاق دینے سے مکمل طلاق واقع نہیں ہوتی اور چونکہ اس نے ایک طلاق ہی دی تھی لہٰذا اس کا اپنی بیوی سے تعلق اب بھی برقرار تھا اس لیے اُس نے عدالت سے استدعا کی کہ قانون اور مذہب کی رُو سے اسے اپنی بیوی کو گھر لیجانے کی اجازت دی جائے۔ غیاث چچا کے تین طلاق کے دعوے کو اس نے یکسر یہ کہہ کر جھوٹ قرار دے دیا کہ چونکہ اس کا سُسر اس رشتے سے خوش نہیں تھا لہٰذا اس رات وہ ظفر کو یہی دھمکانے آیا تھا کہ اگر ظفر نے اس کی بیٹی کو طلاق نہیں دی تو وہ ظفر کا نام و نشان تک اس دنیا سے مٹا دے گا لہٰذا ظفر نے ڈر کر ایک طلاق تو دے دی تھی لیکن اس نے منہ سے تین طلاق کا لفظ نہیں نکالا تھا۔

کیس پیچیدہ ہو گیا تھا۔ کیس کا واحد عینی گواہ خود لڑکی کا باپ تھا اور مدّعی نے پہلے ہی لڑکی کے باپ پر اپنے شک و شبے کا اظہار کر دیا تھا لہٰذا عدالت بھی سوچ میں پڑ گئی اور اُس نے مختلف مذہبی علماء سے مشورے تک اگلی تاریخ دے دی اور اس دن کیس مؤخر ہو گیا۔

اگلی پیشی تک ہم سب پھر سے اُسی سولی پر ٹنگ چکے تھے، جو ہمارے مقدروں نے جانے کیوں جیون کی ہر راہ پر اور ہر نئے آنے والے موڑ پر ہم سب کے لیے ٹانگ رکھی تھی۔ اگلی پیشی پر عدالت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف نظروں کی برچھیاں تھیں جو اس مہ رخ کی موم جلد میں گڑی جاتی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس پری رُو کی کومل سماعتوں کو چھیل رہی تھیں۔ عدالت نے قاضی صاحب کو بھی معاونت کے لیے طلب کیا ہوا تھا۔ ظفر بے حد مطمئن دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس نے اپنے تئیں عدالت کو شک میں ڈال کر آدھی جنگ تو جیت ہی لی تھی۔ اب اس کا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا تھا۔ وہ اس معاملے کو اسی طرح کھینچتے رہنا چاہتا تھا تاکہ وہ اور ان کے سارے خاندان کی ہمت کچھ اس طرح ٹوٹے کہ وہ سب اُس کے قدموں میں آ گریں۔ کیس کی شنوائی شروع ہوئی تو ظفر کے وکیل نے پھر وہی اعتراض کیا کہ مقدمے کا واحد اور عینی گواہ جس کا دعویٰ ہے کہ ظفر نے زبان سے تین طلاق کہا تھا، دراصل خود بیٹی کا رشتہ توڑنا چاہتا ہے لہٰذا اس کی گواہی معتبر نہیں مانی جا سکتی، نہ ہی اس کے حلفیہ بیان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اور لڑکی بھی اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے ورنہ دل سے وہ اب بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ عدالت نے ہماری وکیلنی سے پوچھا کہ کیا اس دعوے کے بارے میں مزید کوئی شہادت اس کے پاس ہے۔ میں نے راجہ کو اشارہ کیا جو میرے ساتھ ہی عدالت کے ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے پیچھے پلٹ کر اپنے بالکل پیچھے بیٹھے ایک عمر رسیدہ شخص کے کان میں کچھ کہا اور اس شخص نے اچانک ہی بھری عدالت میں کھڑے ہو کر آواز لگا دی۔

"جی..... دوسری شہادت میری ہے....."

یکا یک عدالت میں پہلے گھمبیر سناٹا چھا گیا اور پھر اچانک ہی سبھی لوگ بیک وقت بولنے لگ گئے۔ جج نے اپنے لکڑی کے ہتھوڑے کو تین بار زمین پر مارا، آہستہ آہستہ سب چپ ہو گئے۔ عدالت نے اس بوڑھے شخص کو کٹہرے میں آنے کے لیے کہا اور وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ظفر کے چہرے پر اسے دیکھ کر بے چینی کے تاثرات پیدا ہونے لگے تھے۔

بوڑھے شخص نے عدالت کو بتایا کہ اس کا نام جہانگیر کاظمی ہے اور وہ ظفر کا ہمسایہ ہے اور جس رات غیاث چچا ظفر کو بلانے کے لیے اس کے گھر آئے تھے، وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھا اور اچانک اس نے گلی میں ظفر کے زور زور سے چلانے اور کسی سے لڑنے کی آوازیں سنیں۔ حالانکہ یہ ساری گلی کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ ظفر کے قرض خواہ ہر روز ہی اس کے دروازے پر آ کر کوئی نہ کوئی تماشہ کر کے جاتے تھے لیکن پھر جب بات

طول پکڑنے لگی تو وہ باہر نکل آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ غیاث چچا ظفر کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ گھر چل کر اپنی بیوی کو واپس لے آئے لیکن ظفر نے ان کی ایک نہیں سنی اور دوسرے ہی لمحے اپنے منہ سے طلاق کے تین لفظ نکال کر ہمیشہ کے لیے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ یہ سنتے ہی غیاث چچا کو دل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں ظفر کے دروازے پر ہی گر گئے، جنہیں اٹھا کر وہ لوگ قریبی ہسپتال پہنچا آئے۔ کاظمی صاحب کا بیان ختم ہونے تک عدالت میں چہ میگوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جسے جج نے بڑی مشکل سے خاموش کرایا۔ عدالت نے تین مرتبہ کاظمی صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنے کانوں سے طلاق کے لفظ سُنے تھے اور یہ تین مرتبہ کہے گئے تھے۔ کاظمی صاحب نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ انہوں نے مقدس کتاب کا حلف لیا ہے لہٰذا وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول سکتے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے واضح طور پر یہ لفظ سُنے تھے۔ جج نے قاضی صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے کاغذ پر کچھ لکھ کر جج کی جانب بھجوا دیا۔ جج نے بغور کاغذ کو دیکھا اور آدھے گھنٹے کے وقفے کے بعد فیصلہ سُنا دیا۔

''معتبر گواہوں کی شہادت اور تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مدعی ظفر کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ خود اپنی مرضی سے، اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنی بیوی وجیہہ بنت غیاث الدین کو طلاق دے چکا ہے لہٰذا عدالت اس کا دعویٰ خارج کرتی ہے اور وجیہہ بنت غیاث الدین کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔''

عدالت میں ایک شور سا مچ گیا۔ عدالت نے ظفر کی غلط بیانی کے خلاف بھی سرکاری وکیل کو درخواست دائر کرنے کی ہدایت کی کہ کیوں نہ اس کے غلط بیان پر عدالت اس کے خلاف کارروائی کرے؟ عدالت میں ہی لوگوں نے ظفر کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیئے تھے لہٰذا وہ بڑی مشکل سے پیچھے کے دروازے سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔

اس شام بہت عرصے کے بعد میں نے غیاث چچا کے چہرے پر چھائے غبار کو بڑی حد تک ڈھلے ہوئے دیکھا۔ انسان کے اندر غم سہنے کا بھی قدرت نے کچھ عجیب سا نظام جوڑ رکھا ہے۔ شاید یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا ہے۔ اور انسانی اعصاب پل پل اپنے آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، تبھی ہم ایک غم کو سہہ کر اپنا اگلا دن پھر سے شروع کر سکتے ہیں۔ ورنہ شاید ہم سب ہی اپنے پہلے غم کے ساتھ ہی خاک ہو چکے ہوتے۔ کاظمی صاحب کو عدالت میں لانے کا ہم نے اُسی دن فیصلہ کر لیا تھا جب عدالت نے دوسری گواہی طلب کی تھی۔ ظفر کا قصہ ختم ہوا تو زندگی دھیرے دھیرے پھر سے اپنے معمول کی جانب پلٹنے لگی۔

میرا انٹر کا رزلٹ بھی نکل چکا تھا اور حسبِ توقع میری پہلی پانچ پوزیشنز میں نامزدگی ہوئی تھی۔ چونکہ ہم سب کیڈٹس اپنی اکیڈمی سے ہی آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی (ISSB) کلیئر کر چکے ہوتے تھے لہٰذا فوج میں کمیشن لینے کا راستہ بھی فی الحال میرے لیے کھلا تھا لیکن جانے کیوں میری طبیعت پھر سے اتنے نظم و ضبط کے پھیرے میں پڑنے کی طرف مائل نہیں تھی۔ خو مجھ سے روزانہ میری مستقبل کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتی تھیں اور میں روزانہ انہیں ایک ہی جواب دیتا کہ فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ مزید پڑھائی کس شعبے کے لیے اختیار کروں۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے، اور پھر ایک دن قدرت نے خود ہی اس بات کا فیصلہ بھی کر ہی دیا کہ مجھے آگے کے لیے کون سی لکیر اختیار کر کے چلنا ہوگا۔

آخری نشتر

اُس دن فضلو بابا نے صبح سویرے مجھے ایک رجسٹری لا کر دی کہ غیاث چچا نے دی ہے اور کہا ہے کہ اسے پوسٹ بھی کر دوں اور اُس کی ایک نقل کروا کر دستی اُن کے دفتر دے آؤں۔ یہ ان کی مزید چھٹی کی درخواست تھی جس کے ساتھ اُن کا ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی منسلک تھا۔ میں رجسٹری پوسٹ کروا کر اور اس کی نقل ان کے دفتر میں وصول کروا کر شام کو انہیں کاغذ واپس کرنے کے لیے گیا تو وہ چھت پر کبوتروں کے ڈربے کے پاس بیٹھے آس پاس ٹہلتے کبوتروں کو دانہ ڈالتے ڈالتے جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے تھے کہ ان کا کبوتروں کو دانہ ڈالنے والا ہاتھ بھی ویسے ہی ہوا میں ٹھہرا رہ گیا تھا، میں نے کچھ دیر ان کی توجہ کا انتظار کیا اور پھر وہیں چھت کی منڈیر سے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ہلکے سے کھنکار کر انہیں متوجہ کیا۔ وہ چونک سے گئے اور پھر مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

''ارے آدی بیٹا..... تم کب آئے..... آجاؤ..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....'' میں نے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کاغذات رجسٹری کی رسید سمیت ان کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''چائے پیو گے.....''

''جی خالہ نے مجھے اوپر آتے دیکھ لیا تھا، وہ بھجواتی ہی ہوں گی..... آپ کن سوچوں میں گم بیٹھے تھے ..... ڈاکٹرز نے آپ کو دل پر زیادہ بوجھ لینے سے منع کیا ہے۔''

وہ مسکرائے ''ارے میاں..... یہ ڈاکٹر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں..... بوجھ لینے سے منع تو کرتے ہیں، لیکن بوجھ نہ لینے کا طریقہ نہیں بتاتے..... اور بھلا سوچوں پر کس کا اختیار ہے، کاش یہ ڈاکٹر کوئی ایسی دوا بھی ایجاد کر پاتے جس کو کھانے کے بعد یہ سوچیں اور یہ واہمے ہمیشہ کے لیے ہمارے دماغوں سے نکل جاتے۔''

میں نے دھیرے سے ان سے پوچھا۔

''اب آپ کو کون سا واہمہ پریشان کر رہا ہے۔ ہر تلخ اور ڈراؤنا واہمہ حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ بھی چکا اور جانے کب سے ماضی کا حصہ بھی بن گیا، تو اب ان واہموں سے کیسا خوف؟..... اور ان کی فکر کیسی.....؟''

غیاث چچا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید انہیں میری زبان سے ایسی باتیں سن کر کچھ حیرت ہوئی ہو کیونکہ میں نے آج تک کبھی اس طرح بیٹھ کر ان سے زندگی کے کسی فلسفے پر بات نہیں کی تھی۔

''ہاں میاں..... کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو، ہر ڈراؤنا خواب حقیقت بن کر سامنے تو آ چکا..... اب اس سے زیادہ اور مزید کیا بُرا ہو گا؟ لیکن پھر

بھی انسان اپنے ماضی کو بھی 'کاش' کے نشتر سے بار بار کریدتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے زخم کبھی بھر نہیں پاتے۔ میں بھی ایسے کئی 'کاش' کے نشتر اپنے آپ کو چبھونے کے لیے لیے بیٹھا رہتا ہوں....."

"مثلاً کیا.....؟ یہی نا کہ کاش آپ ڈھوکا ظفر سے رشتہ طے کرنے سے پہلے مزید چھان بین کر لیتے..... یا پھر یہ کہ رشتہ ہو ہی گیا تھا تو آپ کسی نہ کسی طرح اس رشتے کو پنپتے رہنے کا مزید اہتمام کرتے اور اسے اتنی آسانی سے ٹوٹنے نہ دیتے.....؟؟"

غیاث چچا نے غور سے میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

"ہمارا آدی اب واقعی بڑا ہو گیا ہے..... اُسے اب بولے گئے لفظوں کے پس منظر کو پڑھنا بھی خوب آ گیا ہے....."

میں بھی مسکرا دیا۔

"چلیں اب تو بتا دیں..... یہی چندوا ہے گھیرے رکھتے ہیں نا آپ کو۔"

غیاث چچا نے لمبی سی سانس بھری۔

"ہاں میاں..... ہر لمحہ بس یہی خیال کاٹتا رہتا ہے کہ اپنی بیٹی کی بربادی کا کہیں نہ کہیں میں خود بھی ذمہ دار ہوں۔ اگر اُس رات میں ظفر سے بحث نہ کرتا تو....."

"تو کیا ہوتا..... یہی کہ ڈھو چند سال مزید اس جہنم میں اور گزار دیتیں..... یونہی ان کی وفاداری اور انا کو روزانہ کچلا جاتا اور یونہی وہ روز جیتی اور روز مرتی رہتیں، ظفر ان کو ڈھال بنا کر مزید آپ کو اور سکینہ خالہ کو خون کے آنسو رُلاتا رہتا، روز اسی طرح کے مزید تماشے ہوتے اور ڈھو کی روح ہر پل مزید زخمی ہوتی رہتی....."

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور پھر مجھے خیال آیا تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا، لیکن غیاث چچا میری بات سن کر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

"یہ سب دلیلیں میں خود کو دیتا رہتا ہوں۔ بات صرف میری اور سکینہ کی ہی ہوتی تو ہم خود و جیہہ کو جا کر اس عذاب سے نکال کر لے آتے، لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرے کے ساتھ چلنا اور رُکنا پڑتا ہے۔ یہاں طلاق یافتہ لڑکی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی بے قصور کیوں نہ ہو..... الزام ہمیشہ اس کے سر ہی آتا ہے میاں....."

"اگر یہ سارا معاشرہ ایک جانب اکٹھا ہو جائے اور آپ سے یہ کہے کہ آپ دوسری جانب کھڑی ڈھو کو خود اُنہی کی مرضی سے کسی اندھے کنویں میں دھکیل آئیں تو کیا آپ ایسا کریں گے؟ میں مانتا ہوں کہ عام حالات میں ہمیں اسی معاشرے کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا پڑتا ہے، اور اسی کی پرکھی ہوئی عزت اور بے عزتی کی کسوٹی کو اپنے لیے بھی سچ ماننا پڑتا ہے، لیکن میں نے کہا نا..... یہ صرف عام حالات میں ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ڈھو پر بیتی اسے صرف ڈھو یا آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اُن کے اپنے ہیں، آپ پر اُس عام معاشرے کے اصول لاگو نہیں ہوتے، اور پھر ان سب باتوں کے باوجود، آپ نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن نبھانے کی کوشش بھی تو کی۔ لیکن اگر اس کے باوجود نتیجہ اگر آپ کی توقعات کے برعکس نکلا ہے تو آپ

اسے قدرت کی جانب سے کوئی غیبی مدد کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ وہ اس ظالم اور کم ظرف شخص کے چنگل سے نکل آئیں؟ کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ ساری زندگی اس جھوٹے اور دوغلے معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کی بھینٹ چڑھتی رہتیں اور ان کی باقی عمر بھی اسی دوزخ میں جل جاتی.....؟؟"

غیاث چچا کے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، اتنے میں وجو کے کھنکارنے کی آواز آئی اور وہ چائے کی ٹرے اٹھائے آتیں نظر آئیں۔ ہماری باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غیاث چچا نے اٹھتے ہوئے وجو سے کہا۔

"چلو بھئی تم دونوں چائے پیو۔ میں کچھ ضروری کاغذات اپنی دراز سے چھانٹ لوں۔"

غیاث چچا دو قدم بڑھے اور پھر جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری جانب پلٹے۔ اور قریب آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولے۔

"تمہارا زندگی کو دیکھنے کا نظریہ اچھا لگا مجھے..... کوشش کروں گا کہ آئندہ میں بھی تمہارے نظریے سے زندگی کو دیکھ سکوں، کیونکہ مجھے تمہاری کہی ہوئی ہر بات سے اتفاق ہے۔"

غیاث چچا میرے بال سہلا کر مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ میری نظر وجو پر پڑی، وہ سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھیں اور ان کا سوگوار سا حُسن جانے کیوں مجھے اس ڈھلتی شام کی طرح لگ رہا تھا، لیکن اس وقت وہ بے حد حیرت سے اور کچھ عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے مخصوص انداز میں چھیڑا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں ایسے..... نظر لگائیں گی کیا.....؟"

وہ چونک کر بولیں۔

"نظر ہی لگ جانے کا خدشہ ہے آج مجھے۔ میں کافی دیر سے سیڑھیوں پر کھڑی تمہاری اور ابا کی باتیں سُن رہی تھی، ایسا کرنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن تم جس طرح ابا کو سمجھا رہے تھے، اُسے سُن کر مجھے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہیں لگا۔ تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں آدی.....؟ میں تو اب تک حیران ہوں۔ کتنی خوبصورتی سے تم نے ابا کو ان کے دُکھوں کو برتنے کا ایک نیا نظریہ دے دیا۔ کیا یہ میرا وہی ننھا منا سا دوست بول رہا تھا..... مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا....."

میں ان کی یہ لمبی تمہید سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

"جہاں آپ نے مجھے بھیجا تھا وہیں سے سیکھ کر آیا ہوں، اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اب میں پرائمری اسکول میں منہ بسور بسور کر جانے والا آدی نہیں رہا، آپ کے سامنے کیڈٹ کالج کا پاس شدہ کیڈٹ عباد بیٹھا ہوا ہے۔ جو اس کے امی کے بقول اپنے ابا سے بھی قد میں آگے نکل گیا ہے....."

وجو زور سے ہنسیں۔ جل ترنگ سے بج گئے۔

"ہاں بھئی..... یہ تو میں بھول ہی گئی کہ ہمارا آدی اب کیڈٹ عباد بن کر واپس لوٹ آیا ہے، سوری سر کیڈٹ عباد۔"

ڈوئے ہنستے ہوئے سلیوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھا دیا۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا اور وہ ناراضگی سے بولیں۔

''ارے ہاں..... یاد آیا..... یہ تم ابا کے سامنے مجھے صرف ڈوئے کہہ کر کیوں پکار رہے تھے، پورا ڈوآپی کیوں نہیں کہا.....''

''ڈوآپی کہنے سے ایسا لگتا ہے، جیسے میں شکورن بواء کی عمر کی کسی بڑھیا کا ذکر کر رہا ہوں، اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ ابھی سے آپ کی عمر کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔''

اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی اور ڈوئے چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن سچ یہی تھا کہ جب سے میں اکیڈمی سے واپس آیا تھا، چاہے انجانے میں ہی سہی، لیکن جانے کیوں میرے لبوں سے ان کے لیے وہ جو آپی کی جگہ صرف ڈوئے ہی نکلتا تھا۔

اُس شام کے بعد سے میری اور ڈوئے کی ازلی دوستی نے ایک نیا رخ پلٹا۔ وہ اب مجھ سے اپنی ہر وہ بات بھی بانٹنے لگ پڑی تھیں جو پہلے وہ مجھے چھوٹا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر جایا کرتی تھیں۔ موسموں کی باتیں، شاعری کی باتیں، خزاں میں گرتے پتوں کی باتیں، نیلے گگن کے آوارہ بادلوں کی باتیں، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ زیادہ تر بلکہ تقریباً سبھی معاملوں میں ہماری پسند یکساں ہی تھیں، انہیں بھی میری طرح برستی بوندیں بارش اور سب کچھ دودھیا کر دینے والی برف باری پسند تھی۔ وہ بھی خزاں کے پتوں کے گرنے کی آہٹ کو خوب محسوس کرتی تھیں اور انہیں بھی آسمان پر بکھرے بادلوں کو کسی رنگین شیشے سے دیکھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ ہماری پسند کے بھی موسم ایک جیسے ہی تھے۔ وہ بھی غالب کی دیوانی تھیں اور میرؔ اور خیامؔ ان کے شیلف میں سجے رہتے تھے۔ وہ بھی میری طرح ہر منظر کو ایک الگ نظر اور نظریے سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ سخت سردیوں میں لوگ جب آگ کے گرد ٹھٹھر رہے ہوتے تب ہم دونوں گولہ گنڈہ یا برف ملائی کی قلفیاں کھا رہے ہوتے تھے۔ انہیں بھی میری طرح پیانو اور وائلن پر بجائی گئی دھنیں بے حد پسند تھیں۔ اور میں بھی ان کی طرح گہرے سیاہ اور شفاف سفید رنگ کا دیوانہ تھا۔ اردو ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مضمون تھا اور دونوں کو ہی ریاضی سے شدید چڑ تھی۔ دونوں کو ہی ذرا سی مرچ کھاتے ہی ہچکیاں لگ جاتی تھیں اور دونوں کو ناریل پانی اور انناس کا رس بہت مزے کا لگتا تھا۔ ڈھلتی دھوپ کے زاویوں کو تکنا اور آسمان پر بکھرے بادلوں سے مختلف خاکے جوڑنا اور ذہن میں ان کی تصویریں بنانا ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ غرض کون سی ایسی بات تھی، جس میں مماثلت نہ ہو؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے ڈوئے کی ہر پسند کو محسوس کیا تھا اور اُسے اپنے اندر اتارا تھا۔ اور پھر ایک ایسے ہی دن ڈوئے باتیں کرتے کرتے اچانک مجھ سے کہا۔

''آدی..... تم مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے..... میں جانتی ہوں تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔''

بس وہی دن تھا، جب میں نے آخر کار طے کر لیا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ غیاث چچا کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ڈوئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور سول آفیسر بنیں۔ قسمت نے پلٹا کھایا اور اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی، اب وہی ذمہ داری ڈوئے نے میرے کاندھوں پر ڈال دی تھی، اور میں جانتا تھا کہ مجھے ہر حال میں ڈوئے کا یہ ٹوٹا خواب پھر سے جوڑنا ہے اور مجھے سول آفیسر بننا ہے۔

پہلی نظر

مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے چھ ماہ سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پرائیویٹ بی۔اے کا امتحان دیتے ہی مقابلے کے امتحان کے فارم بھی بھر دوں گا تا کہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کیے بنا امتحان میں شریک ہو سکوں۔ فوکی مدد سے میں نے مضامین بھی وہی منتخب کیے تھے، جو بیک وقت بی۔اے اور سول سروس کے امتحان میں مشترک تھے اور ظاہر ہے کہ اردو ان میں سرِ فہرست مضمون تھا۔ یہ سارے مضامین وہی تھے، جن میں فو پہلے ہی گریجویشن کر چکی تھیں اس لیے میری رہنمائی کرنے میں انہیں کوئی مشکل نہیں ہوئی اور ان کی آنکھوں کا سپنا میری پلکوں تلے منتقل ہو گیا۔ کبھی کبھی تو غیاث چچا ہم دونوں کی گھنٹوں کی بحث اور مضامین کے متعلق خیالات کی کھینچا تانی دیکھ کر مسکرا دیتے کہ ''یوں لگتا ہے کہ جیسے مقابلے کے امتحان میں آدی نے نہیں، فو نے بیٹھنا ہے۔'' اور سچ یہی تھا کہ وجو نے کوئی کسر بھی نہیں چھوڑ رکھی تھی ہر مضمون کو گھول کر مجھے پلانے میں۔ ویسے بھی وہ زندگی کے اس معاملے میں کاملیت پسند (Perfectionist) تھیں اور وہ کوئی بھی وجہ یا بہانہ قسمت یا مقدر کے لیے ایسا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، جس کی بنا پر کل ہمیں یہ کہنا پڑتا کہ کاش یوں کر لیتے..... کاش وہ کتاب بھی دیکھ ہی لیتے..... کاش یہ باب بھی زیر بحث لے ہی آتے..... وغیرہ وغیرہ، لہٰذا ہم دونوں ہی اُس امتحان کی تیاری کے لیے یوں جُتے ہوئے رہتے جیسے کل ہی ہمارا پہلا پرچہ ہو۔

لیکن اس طوفانی تیاری کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو پورا وقت نہیں دے پاتا تھا جس پر راجہ کی ہر وقت کی بک بک اور باقیوں کی نان اسٹاپ کمنٹری جاری ہی رہتی تھی۔ آخر کار بے حد لمبی بحث اور درجنوں جھگڑوں کے بعد طے ہوا کہ باقی پورا ہفتہ چاہے میں کچھ بھی کروں کہیں بھی غائب رہوں لیکن جمعرات کی شام سے لے کر رات دیر گئے تک میرا وقت میرا نہیں بلکہ ان سب ''لوفروں'' کا ہو گا۔ ایسے میں ہماری ابتدائی بیٹھک ہمیشہ بالے کے گیراج پر ہوتی تھی۔ بالے نے میٹرک کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا اور پرائیویٹ ایف۔اے کیا تھا کیونکہ میٹرک کے بعد اس کے ابا نے اسے گھر کے حالات کی وجہ سے ایک چھوٹا سا گیراج کھلوا دیا تھا، جس میں ان کی تمام پینشن اور گریجویٹی کی رقم صرف تو ہو چکی تھی لیکن کم از کم ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بھی میسر آ گیا تھا۔ بالے کو اسکول کے دور سے ہی موٹر گاڑیوں اور اس کی مشینری میں بے حد دلچسپی تھی۔ پانچویں میں آنے تک وہ آدھے گھنٹے میں ہمارے دینیات کے ماسٹر حافظ صاحب کی ٹرائف موٹر سائیکل کھول کر پُرزہ پُرزہ کر دیتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اسے دوبارہ جوڑنے میں اسے ہفتہ لگ جاتا تھا اور تب تک حافظ صاحب پیدل آتے جاتے اس گھڑی کو کوستے رہتے کہ انہوں نے بالے کو موٹر سائیکل کی خرابی دیکھنے کا کہا ہی کیوں تھا۔ لیکن اب بالا گاڑیوں کے کام کا ایسا ماہر تھا، جو انجن کی آواز سُن کر ہی اس کی بیماری کوس بھر کے فاصلے سے بتا دیتا تھا۔

راجہ اور فو کی ''تعلیم'' جاری تھی اور دونوں ہی تیسری مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ مُنی اور گڈو نے انٹرمیڈیٹ

تو جیسے تیسے کر ہی لیا تھا لیکن وہ بھی اب پرائیویٹ تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ دونوں ہی کسی سرکاری محکمے میں بابو بھرتی ہو چکے تھے۔ لیکن ان سب باتوں نے ہماری ازلی بچپن کی دوستی پر ذرہ برابر فرق بھی نہیں ڈالا تھا۔ جب ہم سب ملتے تھے تب صرف ہم ہی ہوتے تھے اور ہمارے ساتھ صرف ہمارے بچپن کا دسمبر.....

سچ ہے کہ سچی دوستی ایسے کسی بھی بھید بھاؤ یا ذہنی استطاعت کے فرق سے بہت بلند ہوتی ہے۔ ہمارے قہقہے آج بھی روزِ اول کی طرح خالص تھے اور ہماری ایک دوسرے کے لیے فکر اور پریشانی کا وہی عالم تھا، جو پہلی دوسری جماعت کے وقت ہوتا تھا۔

ہم جمعرات کی شام سب کچھ بھول کر مناتے تھے۔ ایسے میں زیادہ تر پروگرام راجہ کے ترتیب دیے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی وہ ہمیں کوئی نئی فلم دکھانے کے لیے لے جاتا، اس کے ٹکٹ لینے کے طریقے ابھی تک وہی بچپن والے تھے۔ اور کوئی نہ کوئی ''شاہ صاحب'' قسم کی شخصیت یا بہانہ اس کو مل ہی جاتا تھا۔ حالانکہ اب ہم سبھی اپنے تمام دوستوں کے لیے سب سے مہنگا ٹکٹ خرید کر فلم دیکھ سکتے تھے لیکن ایسی فلم کا مزہ کیا.....؟ لہٰذا فلم کا موضوع ہم نے راجہ کے ہی سپرد کر رکھا تھا، کبھی ہم شہر سے باہر جھیل پر پکنک کے لیے چلے جاتے اور خوب ہلہ گلہ کرتے۔ جھیل کے کنارے لکڑی کے وہ پرانے خستہ حال بینچ اور تختے ابھی تک موجود تھے، جن پر ہمارے بچپن کے کُھدے ہوئے نشان آج بھی باقی تھے۔ کبھی گیراج ہی میں رات کی دعوت کا پروگرام بن جاتا اور ہم سب گیراج کے ہی چھوٹے سے باورچی خانے میں مل کر مختلف تجربے کرتے رات بتا دیتے۔

جمعرات کی اس شام کی چھٹی مجھے خصوصی طور پر ڈھو کی طرف سے بھی تھی۔ میں انہیں اکثر اپنے دوستوں کی شرارتوں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور وہ یہ سُن کر مسکراتی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن جب میں نے انہیں تفصیل سے راجہ، بالے، نھو اور گڈو کی ان باتوں اور کوششوں کے بارے میں بتایا جو وہ میری غیر موجودگی میں ڈھو کی حفاظت کی غرض سے اپنے طور پر ہی کرتے رہے تھے اور جن معصومانہ کوششوں اور منصوبوں کا ڈھو کو کبھی پتہ ہی نہیں چل پایا تھا، تو وہ سب سن کر بہت دیر تک ڈھو کی آنکھیں نم رہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس جمعرات کی شام کو میں اپنے سارے دوستوں کو اُن کے گھر اُن کی طرف سے چائے کی دعوت پر بُلا لاؤں۔ جب ان سب نے میری زبانی یہ خبر سنی تو سارے کے سارے ہکا بکا رہ گئے۔ کیونکہ ان سب کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات موجود تھی کہ ڈھو انہیں نکما اور آوارہ سمجھتی تھیں، اور میں جانتا تھا کہ بچپن میں کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ ڈھو جب مجھے سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ محلے کے بڑے میدان میں دھما چوکڑی مچاتے ہوئے دیکھتی تھیں تو مجھے ان سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی کہ سارا دن اپنے ''آوارہ'' دوستوں کے ساتھ ضائع نہ کیا کروں۔

ڈھو کی دعوت کا سُن کر پہلے تو سبھی شاک اور سکتے میں آ گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد سب کو اپنے اپنے لباس کی فکر پڑ گئی کہ انہیں کیا پہن کر ڈھو کے گھر جانا چاہیے۔ آخر یہ سب کی 'عزت' کا سوال تھا۔ ڈھو کی نظر میں اچھا بننے کا ایک موقع قدرت نے دے ہی دیا تھا تو پھر ان میں سے کوئی بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا بھی ڈھو سے ایک عجیب سا رشتہ تھا، بچپن سے وہ میرے ذریعے اس رشتے سے جُڑے ہوئے تھے، ڈھو ان سب کو عزیز تھیں کیونکہ وہ ان کے سب سے پیارے آدمی کی ڈھو تھیں۔ وہ سب انہیں یوں سنبھال سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے، جیسے وہ اپنے دوست آدمی کا سب سے قیمتی کھلونا سنبھال رہے ہوں جو آدمی ان کو کچھ لمحوں کے لیے بطور امانت دے کر ذرا سی دیر کے لیے کہیں گیا ہو.....

ہم سب میں بچپن سے راجہ ہی سب سے زیادہ ''خوش لباس'' تھا اور وہ ہر نیا فیشن ٹرائی ضرور کرتا تھا لہٰذا اس موقع پر بھی اس کی الماری ہی ان سب کے کام آئی، اور کچھ ہی دیر میں وہ سب خاصے معقول نظر آنے لگے، راجہ میرے لیے بھی اپنا پسندیدہ گرے کوٹ لے کر آیا تھا لیکن میں نے ان کے ہاتھ جوڑے کہ میں اسی جین شرٹ میں ٹھیک ہوں، لہٰذا اب وہ سب چلنے کی کریں کیونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

ڈھو کے دروازے پر غیاث چچا نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بتایا کہ ڈھو نے چھت پر چائے کا بندوبست کیا ہے، لہٰذا ہم سب بھی چھت پر ہی چلے جائیں۔ چھت پر تو ڈھو نے واقعی پوری چھوٹی موٹی دعوت کا انتظام کر رکھا تھا اور میز پر چائے کے ساتھ جتنے لوازمات ہو سکتے تھے وہ سبھی موجود تھے۔ اور اس میں بھی آدھی سے زیادہ چیزیں خود ڈھو کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ ڈھو کا چہرہ ہم سب کو آتے دیکھ کر کھل سا گیا۔ وہ میرے سارے دوستوں کو اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ ہم سب اسی محلے میں ان کے سامنے ہی تو بڑے ہوئے تھے لیکن اس شام انہوں نے سب سے فرداً فرداً سب سے خصوصی طور پر ہاتھ ملایا اور سب سے پوچھا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ سبھی شرما شرما کر جواب دیتے رہے اور پھر جب ڈھو نے تعارف کے وقت راجہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بالے کے بال بکھیر دیئے تو وہ دونوں ہی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، بالے کی آنکھوں سے تو باقاعدہ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگ گئے۔ ڈھو آپی ''ارے ارے'' ہی کرتی رہ گئیں اور وہ سبھی اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ پھر ایسے میں بھلا ڈھو کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ اگلے ہی لمحے خود وہ بھی بھل بھل رو رہی تھیں کیونکہ انہیں تو ویسے بھی رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ آنسوؤں کی کمی تو کبھی نہیں رہی تھی ان کے پاس اور میں بے چارہ ان سب سے دور چھت کی منڈیر پر اپنا سر تھامے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ دیر بعد غیاث چچا اوپر آ گئے اور انہیں آتا دیکھ کر وہ سارا ''گروپ مقابلہ'' ختم ہوا ورنہ چائے کی خیالی پیالیاں ان سب کے بہتے آنسوؤں سے ہی بھر جاتیں۔ غیاث چچا نے مجھ سے اشاروں میں پوچھا کہ ہوا کیا ہے؟ میں نے بے چارگی سے سر ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ ان سب کو اللہ ہی سمجھائے۔ غیاث چچا دھیرے سے مسکرا دیئے اور ہمیں اطلاع دی کہ ریحان صاحب اپنے دونوں بچوں کے ساتھ نیچے آئے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ انہیں بھی یہیں چھت پر لے آئیں۔ ہم سب نے کہا ''بڑی خوشی سے'' اور کچھ لمحوں بعد ہی ریحان صاحب بھی اپنے بچوں سمیت ہماری ''ٹی پارٹی'' میں شامل ہو چکے تھے۔ ڈھو نے میرے سارے دوستوں کا فرداً فرداً خصوصی طور پر ریحان صاحب سے بھی تعارف کروایا، اور وہ مسکرا مسکرا کر سبھی سے ملتے رہے۔

ڈھو آپی نے بہت عرصہ پہلے ہی کیس کے ختم ہونے کے بعد ریحان صاحب کے گھر ٹیوشن کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب ان کا من کہیں آنے جانے کا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اب انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت تھی، البتہ دونوں بچے اب بھی تقریباً ہر ہفتے ڈرائیور کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اپنی کتابیں اٹھائے وجو کے پاس ضرور آ جاتے تھے اور ان سے ضروری ٹیوشن لے لیتے تھے۔ اس شام بھی ریحان صاحب نے وجو سے دوبارہ درخواست کی کہ یہ سال تو اب خاتمے پر ہے لیکن اگلے سال بچوں کو دو ماہ بعد ان کی مدد کی شدید ضرورت ہو گی کیونکہ تب ان کی نئی کلاس شروع ہو چکی ہو گی۔ لہٰذا تب انہیں ان کے بچوں کا باقاعدہ ٹیوشن پڑھانا ہی ہو گی۔ وجو نے انہیں تسلی دی کہ فی الحال نئی کلاس شروع ہونے میں کافی دیر ہے وہ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ میں جانتا تھا کہ وجو نے صرف میری پڑھائی کی وجہ سے خود کو اس مصروفیت سے باز رکھا ہوا ہے، کیونکہ وہ اپنی

پوری توجہ میرے مقابلے کے امتحان کی تیاری پر دینا چاہتی تھیں۔

رات کو جب ہم گیراج واپس آئے تو سبھی رات گئے تک صرف ڈوکی ہی باتیں کرتے رہے۔ سبھی کا بس یہی کہنا تھا کہ یہ اُنہی کی ہمت ہے جو اتنے بڑے دُکھوں کے ساگر سے گزر کر بھی ابھی تک اپنے آپ کو مجتمع رکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کسی بھی خوشی یا بڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ماشاء اللہ ضرور کہنا چاہیے۔ ورنہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہو اُسے نظر لگ جاتی ہے۔ لیکن شاید اس روز ہم سب ڈوآپی کے ذکر پر ماشااللہ کہنا بھول گئے تھے۔ لہٰذا شاید اس بار ہماری ہی نظر ڈوکی خدا خدا کر کے پُرسکون ہوتی زندگی کو لگ گئی۔ لیکن ہم کیا جانتے تھے کہ اس کانچ کی شہزادی کی قسمت کا پیراہن بھی اتنے ہی نازک کانچ کا بنا ہوا ہوگا کہ ہماری ایک ذرا سی ماشاءاللہ نہ کہنے کی بھول بھی اسے ٹھیس لگانے کا سبب بن جائے گی۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

چور بازار

بعض لوگ سیاست کا سہارا لے کر کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، **چور بازار** پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ جرم و سراغرسانی کی دلچسپ کہانی۔ ایک سپر مارکیٹ میں ہونے والی عجیب وغریب چوریوں کا احوال جہاں دکانوں کا ساز و سامان تالا توڑے اور نقب لگائے بغیر غائب ہو رہا تھا۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **چور بازار** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

ہیرے کے آنسو

ہیرے کے آنسو ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کوئلے کی کانوں کو قیمتی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لالچ اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے بُنی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **ہیرے کے آنسو** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

آخری کفارہ

اگلے دن جمعہ تھا اور راجہ مجھے لے کر جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے بالے کے محلے چلا گیا کیونکہ اُسے بالے کو اپنے ابا کی فوکسی کار دِکھانا تھی جس کی عمر راجہ کی عمر سے دو چار سال زیادہ ہی ہوگی البتہ راجہ کے ابا نے یہ مصیبت ابھی پچھلے سال ہی خریدی تھی۔ ہم سب دوستوں نے اس فوکسی کا نام بلیلہ رکھ چھوڑا تھا اور بلیلہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی سڑک پر کھانستی ہوئی کھڑی ملتی تھی۔

بالے نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہم جمعے کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے باہر ہی اس کا انتظار کریں پھر ہم ایک ساتھ ہی گیراج چلیں گے۔ میں اور راجہ مسجد کے باہر کھڑے بالے کا انتظار کر رہے تھے، راجہ نے اُکتا کر کہا۔

''یار آدی..... لگتا ہے اس بالے کے بچے نے بھی آج ہی اپنے سارے گناہ بخشوانے کی ٹھان رکھی ہے۔ اب تو ساری مسجد خالی ہوگئی ہے۔ جانے وہ کہاں رہ گیا ہے۔'' میں نے راجہ کو تسلی دی اور خود مسجد کی طرف بالے کو ڈھونڈنے کی غرض سے چل پڑا۔ مسجد کا صحن تقریباً خالی پڑا ہوا تھا اور وسیع صحن میں دور ایک باریش شخص سر پہ سفید ٹوپی رکھے ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دفعتہً میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص دعا مانگتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے اور اس کا چہرہ دُور سے بھی آنسوؤں کی چمک سے دُھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور شانوں تک تھے اور داڑھی بھی شرعی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک میری توجہ بالے کی جانب مبذول ہوگئی جو اندر سے مولوی صاحب کے ساتھ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ بالے نے مجھے دیکھا تو جلدی سے مولوی سے رخصت ہو کر میری جانب چلا آیا۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر کہاں لگا دی۔ بالے نے بتایا کہ وہ نکل ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے روک لیا اور صحن کی پچھلی جانب مسجد کی پانی کی موٹر دکھانے کے لیے لے گئے جو پچھلے چند دنوں سے گڑبڑ کر رہی تھی اور آج تو بالکل رُک ہی گئی تھی۔ اسی موٹر کو چلانے میں کچھ دیر لگ گئی تھی اُسے۔ بالا آگے بڑھنے لگا تو میں نے اسے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا اور اسے صحن میں بیٹھے باریش شخص کی جانب متوجہ کیا کہ جانے اُسے کیا مسئلہ کیا تکلیف ہے؟ میں نے بالے سے کہا کہ جا کر اس شخص سے پوچھ آئے کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ بالے نے میری جانب حیرت سے دیکھا۔ ''ارے یار..... تو نے انہیں پہچانا نہیں..... یہ اٹو بھائی ہیں۔''

''اٹو''..... میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہوئے۔ اٹو کی صحت تو قابلِ رشک تھی لیکن یہ شخص تو ہڈیوں کا پنجر دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر اس کا حلیہ تو بالکل ملنگوں جیسا تھا جبکہ اٹو تو ہمیشہ بہترین کپڑے پہنتا تھا جانے اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو..... اور پھر اس شخص کا چہرہ..... مجھے یہ بات خود اٹو کے سگے بھائی کے منہ سے نہ پتہ چلتی تو میں کبھی اس بات پر اعتبار نہ کرتا، بالے نے مجھے بتایا کہ اب اٹو کا ہر نماز کے بعد

دعا مانگنے کا یہی طریقہ ہے، اور وہ گھنٹوں اسی جذب کے عالم میں مسجد میں بیٹھا اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہے۔ گزر بسر کے لیے اُگو نے کرائے پر ایک ٹیکسی لے رکھی تھی اور وہ صبح سے رات تک وہ ٹیکسی چلاتا تھا، اور اس پرانی ٹیکسی سے دن بھر جو بھی کماتا، وہ سیدھے رات کو اپنی ماں کے قدموں لے جا کر ڈال دیتا تھا۔ اُسی نے اپنے سیٹھ سے کہلوا کر اپنی بہن گڈی کے لیے سیٹھ کے منشی کے بیٹے کا رشتہ بھی طے کروا دیا تھا۔ لڑکا کسی سرکاری محکمے میں سپرنٹنڈنٹ بھرتی تھا اور اچھے شریف لوگ تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی انسان کی اتنی بڑی کایا پلٹ ہوتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُگو کا حلیہ بھی اس قدر بدل چکا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے سے بھی گزرتا تو شاید میں بالے کے بتائے بنا اُسے پہچان نہ پاتا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ چند روز بعد جب وجو اور سکینہ خالہ فضلو بابا کے ساتھ محلے سے برگدوالے پیر بابا کے مزار پر منت کا چڑھاوا چڑھانے نکلیں اور فضلو بابا نے ایک پرانی سی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا تو ان تینوں میں سے کوئی بھی اُگو کو نہیں پہچان سکا۔ ایک تو ویسے بھی شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا اور مغرب قریب تھی اور دوسرے یوں بھی عورتوں کی نظر جھکی ہوئی تھی۔ رہے فضلو بابا تو اب تو وہ ہم کو بھی بمشکل پہچان پاتے تھے۔ وجو نے غیاث چچا کی صحت یابی کے لیے جانے کب سے نذر کی منت مانگ رکھی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کا جانا مؤخر ہو ہی جاتا تھا۔ وجو نے مجھے بھی میری پڑھائی کا وقت ضائع ہونے کے خدشے سے نہیں بتایا تھا کہ وہ مزار جائیں گی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ سڑک سے ٹیکسی لے کر اُسی ٹیکسی میں مزار کے احاطے کے باہر اُتر کر اُسے رُکنے کا کہہ دیں گی اور چند لمحوں میں ہی چادر چڑھا کر اور نیاز بانٹ کر اُسی ٹیکسی میں واپس آ جائیں گی۔ نیاز کا وقت بھی مغرب کی نماز کے بعد کا مقرر ہوتا تھا اور مزار کے احاطے میں بھی سبھی نیازی مغرب کے بعد ہی نیاز بانٹتے تھے۔

ان تینوں میں سے تو کوئی بھی اُگو کو نہیں پہچان پایا لیکن اُگو بھلا وجو اور سکینہ خالہ کی صورت کو کیسے بھلا سکتا تھا؟ ان سب کی زندگی اُگو کے جُرم کی وجہ سے برباد ہو گئی تھی۔ اُگو نظریں سڑک پر جمائے ٹیکسی چلاتا رہا اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلتی رہیں۔ بالے کی زبانی اُسے وجو کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اور ہر بار وہ خود کو اُسی شرمندگی اور احساسِ جُرم کے گڑھے میں گرا محسوس کرتا تھا، جس کی تپش سے بچنے کے لیے اُس نے خود اپنا آپ بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

اُگو کی ٹیکسی مزار کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اُگو یا ان تینوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نوٹ نہیں کی تھی کہ ان کے محلے سے نکلتے ہی ایک اور پرانی فیاٹ کار ان کی ٹیکسی کے پیچھے ہی فوراً روانہ ہو گئی تھی اور اب تک لگاتار اُن کا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھی۔ اُگو نے اپنی ٹیکسی مزار کے احاطے کے باہر روک دی اور فضلو بابا دونوں عورتوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ اُگو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سکینہ خالہ اور وجو کے پاؤں پکڑ لے اور تب تک اپنا سر اُن دونوں کے قدموں میں پٹخ رہے جب تک وہ اسے دل سے معاف نہ کر دیں۔

اُگو بھی ٹیکسی سے باہر نکل آیا اور اُس نے مغرب کی نماز وہیں احاطے کے باہر ہی کپڑا ڈال کر پڑھ لی۔ اتنے میں اندر سے وجو لوگ بھی باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ اُگو نے جلدی سے عورتوں کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا اور خود انتظار کرنے لگا کہ وہ بیٹھ جائیں تو دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کرے۔ سکینہ خالہ ایک طرف سے اور وجو دوسری طرف سے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے آگے بڑھیں، اسی اثنا میں اچانک اُگو کی ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر کھڑی اُسی فیاٹ کار میں سے ایک شخص، خود کو کالی چادر میں لپیٹے، تیزی سے نکلا اور وجو کی طرف لپکا، اس کے ہاتھ میں کوئی شیشے کی بوتل تھی،

جس کا ڈھکنا اس نے پہلے ہی سے کھول رکھا تھا، وجو اس کے سراپے سے سراسیمہ سی ہو کر پیچھے کو ہٹیں لیکن پیچھے ٹیکسی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وجو نے اس شخص کے چادر سے جھلکتے آدھے چہرے کو پہچان لیا۔ وہ ظفر تھا جو اپنے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل لئے ان کی جانب لپکا تھا۔ وجو آپی گھبرا کر چلائیں۔ اگو بوکھلا کر پلٹا اور اس نے کسی چادر بردار شخص کو وجو کی جانب کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا، اس شخص کا ہاتھ ابھی پوری طرح ہوا میں ہی تھا کہ اگو نے ایک ثانیے کی تاخیر کئے بنا جھپٹ کر اس شخص کا ہاتھ دبوچ لینا چاہا، لیکن تب تک وہ آتشی سیال بوتل سے پوری طرح چھلک چکا تھا، لیکن تب تک اگو، وجو اور اُس سیال مادے کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ اگو کے منہ سے کرب کے مارے ایک زوردار کراہ نکل گئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ اور سینے پر انگارے ڈال دیئے ہوں۔ گردن کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا اور تیزاب کے چھینٹے اس کے چہرے تک آئے تھے لیکن شدید تکلیف نے اسے آنکھیں میچ لینے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اس کی آنکھیں ان چھینٹوں سے بچ گئیں۔ لمحہ بھر میں ہی مزار کے باہر بھگدڑ مچ گئی۔ ظفر اگلے ہی لمحے لپک کر بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا اور وہ پرانی فیاٹ بھی اُسی لمحے ریورس ہو کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ اگو کا تکلیف کے مارے برا حال تھا۔ وجو کو خراش تک نہیں آئی تھی آس پاس چند دوسرے رکشہ اور ٹیکسی والے بھی تھے، جن میں سے کوئی ایک آدھ شاید اگو کو جانتا بھی تھا اسی لیے وہ لپک کر بھیڑ میں سے نکلا اور زور سے چلایا۔ ''ارے..... یہ تو اپنا اگو اُستاد ہے یار..... جلدی کرو، اسے اپنی ٹیکسی میں ڈالو..... یہ تو بُری طرح سے جل گیا ہے۔''

اگو کا نام سن کر وجو اور سکینہ خالہ دونوں ہی بُری طرح سے چونکے اور اب انہوں نے غور سے ٹیکسی والے کی جانب دیکھا تو بیچ میں سے اگو کے خدوخال اُبھر آئے۔ لیکن اس وقت وہاں ایک بلا مچا ہوا تھا۔ اگو نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن پھر بھی اُس نے کسی دوسرے ٹیکسی والے کو ہدایت کی کہ یہ بیبیاں اس کے پرانے محلے کی سواری ہیں لہٰذا وہ انہیں سیدھے اور بہت حفاظت سے ان کے گھر چھوڑ آئے۔ فضلو بابا نے اگو کے ساتھ جانے کی کوشش کی لیکن اگو نے انہیں منع کر دیا کہ اس وقت وہ وجو اور خالہ کو لے کر سیدھے گھر پہنچیں۔ دوسرے ہی لمحے ایک ٹیکسی اگو کو لے کر ہسپتال کی جانب اور دوسری وجو لوگوں کو لے کر محلے کی جانب دوڑ پڑی۔

وجو گھر میں داخل ہوئیں تو زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں جو کافی دیر سے کتابیں لیے وہیں ان کے گھر میں غیاث چچا کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا انہیں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا۔ غیاث چچا بھی بوکھلائے ہوئے سے انہیں تسلیاں دینے کی کوشش کرتے رہے، پھر سکینہ خالہ نے ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور سارا ماجرا اور اگو کے اس طرح جل کر زخمی ہونے کا واقعہ سنایا۔ میں راجہ کو لے کر ہسپتال کی طرف دوڑا جہاں بالے اپنے ابا کے ساتھ ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اگو کی جلد بُری طرح سے جھلس گئی تھی اور وہ پٹیوں میں جکڑا ہوا بستر پر نہایت تکلیف کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

ظفر بہت دنوں سے وجو کے ہاتھوں عدالت میں ملی بے عزتی اور شرمندگی کا بدلہ چکانے کی تاک میں تھا اور اِسی لیے وہ پچھلے کئی ہفتوں سے محلے کے آس پاس کسی دوست کی گاڑی میں چہرہ چھپائے ٹوہ لیتا رہتا تھا کہ اگر کبھی وجو باہر نکلیں تو وہ ان کے چہرے کو ہمیشہ کے لیے داغدار کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکے، وہ جانتا تھا کہ وجو کا گھر سے اکیلے نکلنا تو ناممکن ہی ہے لیکن پھر بھی وہ اُسی مستقل مزاجی سے محلے کے چکر کاٹتا رہا کیونکہ یہ انتقام ہی اب اس کی زندگی کا واحد اور آخری مقصد رہ گیا تھا۔ وجو کی وجہ سے شارے شہر میں اس پر تھوتھو ہوئی تھی اور اب تو اس کے آوارہ اور

بدچلن ناری دوست بھی اُسے طعنے دے دے کر ہنستے تھے کہ جس بیوی کو بھگی بلی بتاتا تھا، وہ تو ایسی شیرنی نکلی کہ بھری عدالت میں ظفر کی عزت اتار گئی۔ اور یہ طعنے رات بھر ظفر کا خون اُبالتے رہتے تھے۔ اسی لیے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ جہاں کہیں بھی ڈو دِکھیں، وہ ان کا چہرہ بگاڑ دے گا اور اسی نیت سے وہ یہ تیزاب کی بوتل بھی ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ لیکن قدرت ایک بار پھر اس کے آڑے آئی اور تیزاب اُگو کا مقدر بن گیا، ظفر نے جب ڈو کی طرف تیزاب اُچھالا تھا تو اسے بیک وقت دو چیخیں سنائی دی تھیں۔ ایک تو اس ٹیکسی والے کی جو نہ جانے بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا تھا اور دوسری ڈو کی۔ لہٰذا اسے مکمل یقین نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے زیادہ نقصان کسے ہوا ہے کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

اُگو کا بیان لینے کے لیے پولیس تو گھنٹہ بھر بعد ہی ہسپتال پہنچ گئی تھی لیکن اُگو کو اگلے دن ہی ہوش آیا۔ ملک ریشم جو اب ہمارے علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی ہو چکا تھا اس نے اُگو کا بیان تو لے لیا لیکن ظفر کی تلاش میں چھاپے وہ گذشتہ آدھی رات سے ہی مار رہا تھا۔ غیاث چچا نے خود تھانے جا کر اسے ساری تفصیل بتا دی تھی لیکن ان کی درخواست پر ڈو کا نام کیس کی تفصیل میں درج نہیں کیا گیا تھا، غیاث چچا اب مزید عدالتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے ملک ریشم خان نے صرف اُگو کے بیان پر ہی انحصار کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ ایک دفعہ ظفر اس کے قابو آ جائے تو پھر عدالت کے سامنے اُسے اُگو سے شناخت کروا کر اس کا کچھ بندوبست کرے گا۔ کیونکہ خوش قسمتی سے ڈو کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی اور مقدمے کا مدعی خود اُگو بھی بن سکتا تھا۔ لیکن ظفر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ پایا تھا۔ ملک نے اس کے ہر ممکن ٹھکانے پر خفیہ کے بندے بھی لگا دیئے تھے اور اس کے کچھ دوستوں کو گرفتار بھی کیا تھا لیکن ان سب کا ایک ہی بیان تھا کہ ظفر گذشتہ شام سے ہی غائب تھا۔ کچھ جواریوں نے یہ شکایت بھی کی کہ کل شام ظفر انتہائی جلدی میں ان سب کے پاس آیا اور سبھی سے ہزاروں روپے کی رقم دو دن کے لیے ادھار کے نام پر لے گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ظفر لمبے عرصے کے لیے شہر سے غائب ہونے کے ارادے سے جتنی رقم دوستوں سے اینٹھ سکتا تھا، وہ ساری سمیٹ کر بھاگ گیا تھا۔

اُگو کو ہسپتال کے وارڈ میں پڑے 24 چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے، وہ آنکھیں بند کیے اپنے جسم پر گزرتی اس بے انتہا اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس کے روئیں روئیں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ دفعتہً اسے اپنے چہرے پر کسی قطرے جیسی چیز کے گرنے اور پھر نمی کا احساس ہوا، اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پھر سکتے اور حیرت سے آنکھیں بند نہیں کر پایا، غیاث چچا اس کے سرہانے کھڑے تھے اور ان کی آنکھ سے نکلتا پانی اُگو کے چہرے کو دھو رہا تھا۔ چہرے کو ہی کیا..... اُگو کو تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے غیاث چچا کے آنسوؤں کے وضو سے ہی آج اس کے تن اور من پر لگی گناہوں کی ساری کالک ڈھل جائے گی۔

اُگو ان سے کچھ کہہ نہیں پایا اور اس مجبور باپ کے آنسوؤں نے اُسے بھی اپنی آنکھوں کا نمکین پانی بہانے پر مجبور کر دیا۔ کیسی عجیب بات تھی، وہ دونوں شخص آج مل کر رو رہے تھے، جن میں سے ایک دوسرے کی زندگی کی بربادی کا سارا سامان کر گیا تھا۔ دوسرا اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا اور آج اسی پہلے لٹیرے کے غم اور تکلیف میں آنسو بہا رہا تھا جس نے کل اس کی متاعِ حیات کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ کیسا لٹیرا تھا اور یہ لُٹ جانے والا بھی کیا کمال تھا۔

اُگو کو ہسپتال سے فارغ ہونے میں تقریباً تین ماہ سے بھی کچھ زیادہ کا عرصہ لگ گیا لیکن تیزاب کے وہ داغ اس کے جسم سے کبھی نہیں مٹ پائے۔ لیکن داغ کب تھے، یہ تو اس کے لیے وہ چمکتی مہریں تھیں، جنہیں وہ اپنے بازوؤں اور سینے پر..... کسی جنگ میں ملے تمغوں کی طرح سجائے

اب ساری دنیا کے سامنے فخریہ جا سکتا تھا کہ دیکھ لو یہ ایک گناہ گار شخص کا وہ کفارہ ہے جسے تقدیر نے اسی جہاں میں اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔

ظفر کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل پایا تھا۔ وہ آپی کا گھر سے کہیں باہر آنا جانا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میرے بی اے کا نتیجہ نکل آیا اور میں مقابلے کے امتحان کے فارم بھی جمع کروا کر آ گیا۔ جس دن میرا پہلا پرچہ تھا اس دن صبح سویرے میں وہ سے ملنے گیا۔ وہ صحن میں ہی جائے نماز پر بیٹھیں دعا کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا کہ ''اگر صرف دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہونا ہوتے تو ہماری مسجد کے مولانا صاحب کے چاروں لڑکے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے۔'' انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا اور مجھے نظروں نظروں میں ہی گھور کر دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بنا کچھ بولے دعا ختم کر کے مجھ پر زور سے پھونک دیا۔ لیکن میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میرے لیے تو سب سے بڑی دعا خود وہ تھیں، ان کا چہرہ تھا، جسے دیکھ کر میں اپنی زندگی کے ہر امتحان کا سامنا کرتا تھا اور اپنی اسی ''دعا'' کی بدولت ہی میں آج تک زندگی کے ہر امتحان میں سُرخرو بھی ہوا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ دنیا کی ہر دُعا رَد ہو سکتی ہے لیکن میری یہ ''دُعا'' کبھی نامراد پلٹ کر واپس نہیں آ سکتی۔

http://kitaabghar.com
http://kitaabghar.com

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغرسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغرساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغرساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطرہ**..... جو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دُنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابنِ صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

پہلی تعبیر

ٹرین تیزی سے بل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور ایک زوردار سیٹی بجا کر دھیرے دھیرے جھٹکے لیتی ہوئی رُک گئی۔ ائیر کنڈیشنڈ سلیپر کی بوگی کے سٹاپ پر ایک سپاہی حوالدار اور ایک ڈرائیور مستعد کھڑے اپنے افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر آوارہ سے لڑکوں کا ایک پورا گروہ کا گروہ ہاتھ میں موچھے، گیندے اور گلاب کے ہار لیے انتظار کر رہا تھا اور انہوں نے اس قدر دھما چوکڑی مچا رکھی تھی کہ حوالدار نے انہیں کئی بار خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا لیکن مجال ہے کہ اُن پر اُس کی اس ''گھوری'' کا کوئی اثر ہوا ہو۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی حوالدار اور ڈرائیور مستعد ہو گئے۔ بوگی کا دروازہ کھلا اور دونوں نے کھٹ سے نئے آنے والے صاحب کو پولیس والوں کا کڑک سلیوٹ پیش کیا اور اس کی جانب بڑھے لیکن یہ کیا اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر سے ملتے، اسی لوفر لڑکوں کے گروہ نے ان کے صاحب پر ہلہ بول دیا اور چیختے چلاتے ان کے صاحب کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن اُن کا صاحب تو خود ہی بڑھ کر ان سے لپٹ گیا تھا۔ حوالدار اور ڈرائیور دونوں ہی کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا تھا۔

سب سے پہلے راجہ نے زوردار نعرہ لگایا تھا۔ ''وہ رہا آدی'' پھر بالے چلایا۔ ''وہ آیا ہمارا شہزادہ'' پھر نھو کی پتلی سی آواز اُبھری۔ ''ارے یار خدا قسم..... یہ تو اپنا آدی ہے۔'' کچھ ہی دیر میں وہ سارے ٹرین سے نیچے اترنے سے پہلے ہی مجھ سے شہد کی مکھیوں کی طرح چپک چکے تھے۔ میں سول سروس اکیڈمی سے اپنی ٹریننگ ختم کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تھا جہاں میری انڈر ٹریننگ آفیسر کی حیثیت سے پہلی پوسٹنگ ہوئی تھی۔

اچانک میری نظر اپنے اسٹاف کے دو جوانوں پر نظر پڑی۔ میں نے ان سب کو خاموش کروا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ دونوں نے مجھے سلیوٹ کیا، اور بتایا کہ انہیں (S.P) ایس۔ پی ملک ریشم خان صاحب نے بھیجا ہے تا کہ وہ میرا استقبال کر سکیں اور ان کے دفتر تک میری رہنمائی کر سکیں۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ میرا اپنا شہر ہے اور ایس۔ پی صاحب کے دفتر کے بارے میں میں جانتا ہوں لہٰذا وہ بے فکر ہو کر واپس جائیں میں کچھ دیر میں خود ہی ایس۔ پی آفس پہنچ جاؤں گا۔ وہ دونوں مجھے سلیوٹ کر کے پلٹ گئے۔ بالے نے انہیں میرا سامان بھی نہیں اٹھانے دیا اور خود ہی میرا سامان اٹھائے وہ سب میرے ساتھ ہی اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

امی اور ابا سے مل کر میں دو گھڑی کے لیے ڈھو کے گھر کی جانب دوڑا۔ وہ صحن میں ہی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں، جتنے عرصے میں اکیڈمی میں ٹریننگ کر رہا تھا وہ راجہ سے میری لحہ بہ لحہ کی خبر لیتی رہتی تھیں اور راجہ کے خطوط میں ان کی جانب سے کہی ہوئی باتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

انہیں پتہ تھا کہ آج میں فیلڈ ٹریننگ کے لیے اپنے ہی شہر میں تعینات ہو کر آ رہا ہوں۔ اسی لیے ان کے ساتھ ساتھ سکینہ خالہ اور غیاث چچا

بھی میری راہ تک رہے تھے۔ان سبھی نے میرا استقبال اسی طرح کیا جیسے کوئی اپنا کسی اپنے کا کر سکتا ہے۔غیاث چچا مجھے بہت دیر تک گلے لگا کر میری کمر تھپکاتے رہے اور پھر جب مجھ سے جدا ہوئے تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔میں ان کے احساسات سمجھ سکتا تھا۔انہوں نے بھی ایسی ہی کسی کامیابی کا خواب اپنی وجیہہ کے لیے بھی دیکھا تھا۔لیکن افسوس مقدر نے وجو کا ساتھ نہیں دیا،لیکن آج اُنہی کی بیٹی کا دیکھا ہوا سپنا میں نے پورا کر دکھایا تھا۔ان کی آنکھوں میں آج خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری یہ کامیابی بھی تو وجو کی محنت کے بدولت ممکن ہوئی تھی۔میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی کہ آج یہ مان صرف میرا نہیں،ان کا اور وجو کا بھی تو ہے۔

اس دن میں نے وجو کے ملیح چہرے پر ایک عرصے کے بعد مکمل سکون کی لہر دیکھی۔ایسا سکون جو کسی ناخدا کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنی ڈوبتی کشتی کو طوفانوں سے بچا کر مسافروں سمیت خیریت سے ساحل پر لگا دیتا ہے۔سکینہ خالہ اور غیاث چچا ایک طرف ہوئے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

"ہاں تو اے۔ایس۔پی عباد خان صاحب.....کیا کہا تھا آپ نے.....اگر دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہوا کرتے تو ہماری مسجد کے مولانا کے تمام بچے سی۔ایس۔پی آفیسر ہوتے.....ہاں.....؟۔تو اب کیا کہتے ہو؟ میری مانو تو جاتے ہوئے مولانا صاحب سے ملتے ہوئے انہیں بھی اپنا یہ سدا بہار مشورہ دیتے جانا....."اچھا ہے کچھ اور لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔"

وجو کی اس بات پر ہم سبھی بے اختیار ہنس پڑے۔ان کے گھر سے نکلتے نکلتے میں نے پھر ان سے کہا کہ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں لیکن شرط صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنے بچوں کے لیے وجو سے ہی دعا کروائیں۔وجو مسکرا کر بولیں کہ "بسر و چشم۔لیکن محنت انہیں بھی آدی جیسی ہی کرنی ہوگی۔"

کچھ دیر بعد میں ایس۔پی ملک ریشم خان کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا اپنی جوائننگ رپورٹ انہیں پیش کر رہا تھا۔میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا اور میرے سامنے ہی وہ ترقی کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے انسپکٹر سے ایس۔پی کے عہدے تک پہنچے تھے۔جب ان کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے انہیں سلیوٹ کر کے "اے۔ایس۔پی انڈر ٹریننگ عباد خان رپورٹنگ سر" کہا تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرے سلام کا جواب دیا اور اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔وہ مجھے بھی اچھی طرح پہچانتے تھے اور وجو کے کیس کے دوران محلے میں آتے جاتے انہوں نے کئی بار مجھے دیکھا تھا۔جب میں نے انہیں بتایا کہ بچپن میں ہم سب محلے کے بچے ان کا نام سُن کر ہی بھاگ جایا کرتے تھے تو وہ بہت ہنسے۔اس دن مجھے پتہ چلا کہ وہ اوپر سے جس قدر سخت گیر دکھائی دیتے تھے،اندر سے اُسی قدر شفیق تھے،لیکن مجرموں کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا،اور جُرم کے معاملے میں وہ کوئی نرمی برتنے کے قائل نہ تھے۔انہوں نے تفصیل سے مجھے میرے زیرِ اختیار علاقے اور ان کیسوں کی تفصیل بتائی،جس میں مجھے ان کی معاونت کرنا تھی،آخر میں اشتہاری ملزمان کی فہرست کی باری آئی اور میں تیسرے ہی نام پر اس زور سے چونکا کہ میرے ہاتھ میں پکڑے کافی کے مگ سے کافی چھلکتے چھلکتے بچی۔وہ ظفر کا نام تھا۔ایس۔پی صاحب نے بھی میری اس بدلتی کیفیت کو محسوس کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس نام سے ہم سب کا پرانا تعلق ہے۔انہوں نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی سُنائی کہ ان کی مخبری کے مطابق ظفر گزشتہ ایک ہفتے سے اسی شہر میں موجود ہے۔لیکن اُس نے اپنا ٹھکانہ

بدل لیا ہے اور فی الحال اس کے نئے ٹھکانے کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہمارے مخبروں میں بھانت بھانت کے لوگ شامل ہوتے تھے اور یہ تازہ مخبری بھی ایک پرانے جواری نے کی تھی جو گزشتہ ہفتے ہی ظفر کے ہاتھوں اپنی ایک لمبی رقم سے جوئے کے دوران محروم ہو چکا تھا۔

ظفر کی شہر میں آمد کی اطلاع نے جہاں ایک جانب میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر دی تھیں، وہیں مجھے کافی متفکر بھی کر دیا تھا۔ میں نے اُسی دن ایس۔ پی صاحب سے درخواست کر کے ایک دو سادہ لباس والے محلے کے اردگرد تعینات کروا دیئے تاکہ اگر ظفر اُس جانب آنے کی کوشش کرے تو وہیں دھر لیا جائے۔

میں نے غیاث چچا کو بھی احتیاطاً فون کر دیا کہ وہ جو کہیں آنا جانا ہو تو وہ مجھے بتا دیا کریں۔ غیاث چچا نے مجھ سے تفصیل نہیں پوچھی لیکن شاید وہ بھی کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ اور فکر کے یہ رنگ شام کو مجھے تب نظر آئے جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ میں نے انہیں شہر میں ظفر کی آمد کے بارے میں تو نہیں بتایا بس یونہی سرسری سا تذکرہ کر دیا کہ یہ روزمرہ کی احتیاط ہے اور کچھ نہیں۔ پتہ نہیں میری اس بات سے ان کی تسلی ہوئی یا نہیں لیکن سکینہ خالہ کی فکر اور بڑھ گئی اور انہوں نے وجو کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے دل کی بات پھر غیاث چچا کے سامنے رکھ دی کہ اس طرح وہ اپنی جوان بیٹی کی پل پل حفاظت کب تک کر پائیں گے؟ انہیں یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ وجو تیس ۳۰ کے ہندسے کو چھونے لگی ہیں اور ایک آدھ سال اور گزرا تو شاید لوگ اُن کے گھر کا راستہ ہی بھول جائیں۔ آج کل کنواریوں کو پلٹ کر کوئی نہیں پوچھتا اور وجو تو پھر ....." لیکن غیاث چچا نے سکینہ خالہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں جھڑک کر روک دیا۔ لیکن یہ بات غیاث چچا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ سکینہ خالہ کے خدشات بے جا نہیں ہیں۔ لیکن ایک بار وہ اپنی ایسی ہی ایک جلد بازی کی وجہ سے اپنی بیٹی کے دامن میں انگارے بھر کر اسے ظفر جیسے شخص کے جہنم میں جھونک چکے تھے لہٰذا دوبارہ وہ اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہتے تھے۔ اور پھر بات صرف انہی کی مرضی اور اجازت کی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی، اب تو وجو سے ایسی کسی بات کا تذکرہ کرنا بھی محال تھا۔ اور ان کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کے دل کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچانا چاہتا ہو یا ایسی کوئی بات کر کے ان کے پرانے زخم ادھیڑنا چاہتا ہو۔ لیکن سکینہ خالہ کے اندر وجو کی ایک بہت گہری اور سب سے پکی سہیلی بھی تو رہتی تھی، اس لیے جو بات ماں کی زبان سے نہیں نکل پاتی تھی، اسے اس وقت وہ سہیلی وجو کو منتقل کر دیتی تھی، جب کبھی دونوں سہیلیاں سر جوڑ کر بیٹھا کرتیں لیکن ایسے میں وجو کا اپنی اس سہیلی کو دیا گیا جواب بھی صرف ایک لمبی چپ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وجو اپنی اس سہیلی کی ہر تشویش اور ہر خدشے سے آگاہ تھیں لیکن وہ شاید اپنے دل اور ذہن کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس موضوع پر بند کر چکی تھیں۔ کیونکہ اس عمر میں ہی وہ یکے بعد دیگرے اتنے زیادہ تلخ تجربوں سے گزر چکی تھیں کہ یہ بھی انہی کی ہمت تھی کہ وہ ابھی تک اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ ظفر کی شہر میں موجودگی کی خبر سنا کر انہیں مزید پریشان کروں۔ لیکن پریشانیوں سے تو ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا، ہم ایک کھڑکی بند کرتے تھے تو وہ دوسرے روشن دان سے اندر جھانکنے لگتی تھیں۔ ایک درز پر قفل لگاتے تھے تو وہ دوسری جھری کھول کر ہمارے من کے اندر کود پڑتی تھیں۔ اُس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ریحان صاحب کی چھوٹی بیٹی فائزہ کی سالگرہ تھی اور دونوں بچے خود اپنے پاپا کے ساتھ خصوصی طور پر اپنی اُستانی کی ساری فیملی کو مدعو کرنے کے لیے ان کے گھر آئے تھے۔ غیاث چچا نے وجو کے سامنے تو ان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ریحان

صاحب کو میری ہدایت کے بارے میں بتا دیا کہ میں نے انہیں وجوہ کی نقل و حرکت محدود رکھنے کے لیے کہا ہے۔ ریحان صاحب نے فوراً اس کا حل بھی غیاث چچا کو بتا دیا۔ انہوں نے غیاث چچا ہی کے ہاں میرے نام کا دعوت نامہ بھی لکھ کر چھوڑ دیا کہ ''جس نے نقل و حرکت محدود کرنے کی ہدایت کی ہے، وہ خود ہی آپ سب کو لے کر ٹھیک چار بجے میرے غریب خانے پہ حاضر ہو جائیں۔''

غیاث چچا نے مجھے دفتر فون کر کے ساری تفصیل بتا دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جمعرات کو فاری بھیا اپنے آسٹریلیا والے پڑھائی کے وظیفے کے سلسلے میں دو سال کے لیے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے آسٹریلیا بذریعہ ہوائی جہاز سفر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں لہٰذا میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر وہاں سے سیدھا ریحان صاحب کے گھر آ جاؤں گا۔ البتہ انہیں لیجانے کے لیے میں اپنی سرکاری گاڑی بھیج دوں گا لہٰذا وہ اُسی میں ریحان صاحب کے گھر پہنچ جائیں۔

جمعرات کو میں نے فاری بھیا کو بمشکل گھر سے نکالا ورنہ ان کی فلائٹ ہی رہ جاتی۔ امی کی دُھونیاں اور عمارہ کے امام ضامن ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ امی کا بس چلتا تو وہ بھیا کے ساتھ ہی ایک مستقل دُھونی ان کے گلے میں ڈال کر بھیج دیتیں تاکہ ہوائی جہاز میں بھی انہیں مناسب دھواں ملتا رہے البتہ خود بھیا کا کھانس کھانس کر بُرا حال ہو چکا تھا۔ اُن کا وظیفہ بائی میں ریسرچ کے لیے ہوا تھا اور دو سال میں انہیں صرف دو مرتبہ عید پر ہی چھٹی مل سکتی تھی اس لیے ان کے گھر سے نکلتے نکلتے ماحول کافی افسردہ سا ہو گیا تھا۔ عمارہ کی منگنی خاندان میں ہی طے ہو چکی تھی لیکن رُخصتی کے لیے اس نے شرط یہی رکھی تھی کہ فاری بھیا کی واپسی کا انتظار کیا جائے گا، وہ بھی بھیا کے نکلتے نکلتے رو پڑی۔ مجھے تو ویسے بھی ایسے الوداع ہمیشہ روح کے اندر تک کاٹ دیتے تھے، میرا سارا بچپن ایسے الوداعی لمحوں اور آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ بھلا اس اذیت اور کرب کو کون محسوس کر سکتا تھا، جس سے اس وقت فاری بھیا گزر رہے تھے۔ ویسے بھی وہ کبھی گھر سے اتنے عرصے کے لیے دُور نہیں گئے تھے۔ وہ صرف امی کی وجہ سے خود پر قابو کیے ہوئے تھے ورنہ وہ تو عمارہ سے پہلے ہی رونے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ تو شکر ہوا ابا کا کہ ان کی ایک زوردار کھنکار نے عمارہ، بھیا اور امی تینوں کو ہی آخری ''وارننگ'' سنا دی ورنہ ان لوگوں کا صحن کے دروازے سے ہلنے کا کوئی پروگرام بنتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایئر پورٹ پر بھیا مجھ سے مل کر پلٹنے لگے تو میں نے پیچھے سے انہیں ہم دونوں کے بچپن کے انداز میں آواز دی۔ ''فاری بھیا.....'' وہ چونک کر پلٹے۔ میرے ہاتھ میں ہم دونوں کے بچپن کی وہی پسندیدہ ٹینس بال تھی، جو انہوں نے میرے کیڈٹ کالج جاتے ہوئے، ریلوے اسٹیشن پر میرے سامان میں رکھ دی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھیگی نمی اُتر آئی۔ وہ پلٹ کر واپس آئے اور انہوں نے مجھ سے بال لے لی اور پھر اچانک ہی زور سے مجھے گلے لگا لیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلے رونے والے نہیں تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ ہم بھی کتنے عجیب بھائی تھے۔ جب بھی ساتھ ہوتے تو لڑ لڑ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتے تھے اور آج جب ایک بار پھر جُدا ہو رہے تھے تو ہمارے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہاز ہوا میں بلند ہو گیا اور میں بوجھل دل کے ساتھ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں تو خاصا اہتمام نظر آ رہا تھا۔ کافی مہمان آ چکے تھے اور اب بھی مزید آمد جاری تھی۔ شارق اور فائزہ اپنے دوستوں سے اپنی پیاری ٹیچر کا تعارف کروا کروا کر تھک نہیں رہے تھے۔ میں

نے اچانک وجو کو برآمدے میں نکلتے دیکھا تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ برآمدے میں ڈھلتی شام کے ملگجے اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی رنگین بتیوں کی لڑیاں جگمگا رہی تھیں اور ان روشنیوں کے درمیان وجو خود بھی ایک چمکدار ستارہ ہی تو دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور کانوں میں اُسی مناسبت سے ہلکے سے فیروزی موتیوں والے ٹاپس ڈال رکھے تھے۔ ضرور یہ سارا اہتمام ان کی سہیلی سکینہ خالہ نے کروایا ہو گا، ورنہ وجو کو میں نے کبھی اتنا اہتمام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سادگی ہی اتنی دلفریب اور پُر وقار تھی کہ انہیں ایسے کسی مصنوعی سہارے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہوں نے برآمدے سے ہی مجھے دیکھ کر دُور سے ہاتھ ہلایا۔ وہ حسبِ معمول بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر دور ہی سے ان کے لباس کو اور ان کے ہلکے سے میک اپ کی اشارے سے تعریف کی اور بچپن کی طرح فضا میں ۱۰۰ میں سے پورے سو یعنی ۱۰۰/۱۰۰ سو بٹہ سو کا نشان بنایا۔ وجو جھینپ سی گئیں اور ہنس پڑیں۔ بہت پہلے جب میں کیڈٹ کالج بھی نہیں گیا تھا اور اپنے اردو میڈیم پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو جب کبھی میں اپنی تختی بہت اہتمام سے لکھ کر وجو کو لے جا کر دکھاتا تو وہ یونہی فضا میں ۱۰۰/۱۰۰ کا نشان بنا کر میری خوش خطی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ اور آج تو اگر میرا بس چلتا تو میں ہزار میں سے ہزار نمبر بھی انہیں دینے سے نہ چوکتا۔

اتنے میں ریحان صاحب کی امی اپنے پوتے پوتیوں سمیت باہر برآمدے میں نکل آئیں اور انہوں نے پیار سے وجو کے سر پر ہاتھ پھیرا، شاید بچے اُن کا دادی سے تعارف کروا رہے تھے، لیکن جب میں ان سب کے قریب پہنچا تو میرے کان میں فائزہ کا صرف آخری جملہ ہی پڑ سکا۔ وہ اپنی دادی سے لپٹ کر کہہ رہی تھی۔

"دادو آپ ٹیچر سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ ہماری ممّی بن جائیں۔" میں نے وجو اور وجو نے مجھے بوکھلا کر دیکھا۔

ہم سفر

ہم سفر.....فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر لکھی جانے والی تحریر.....

زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتماد ڈگمگا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفروں کو بچھڑنے نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے.....اولاد..... **ہم سفر** کتاب گھر کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

بچپن کا دسمبر

اب جانے بچوں کے دل میں یہ بات کہیں پہلے سے ہی دبی تھی یا پھر اُسی محفل کے ہنگامے میں ان کے دلوں میں یہ خواہش گھر بنا گئی تھی، لیکن ان کی اس بات پر ڈھوایک دم سے ہی خاموش ہو کر اندر چلی گئیں، دادی نے بچوں کو جھڑکا کہ ایسا نہیں کہتے، آس پاس کچھ دیر چہ مگوئیاں ہوئیں پھر سب لوگ بھول بھال کر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن ڈھو آپی کو پھر کسی نے محفل میں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ریحان صاحب نے بھی ان کی اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن انہیں اس چپ کی وجہ سمجھ نہیں آسکی اور وہ پارٹی ختم ہونے تک کبھی غیاث چچا اور کبھی خالہ سے پوچھتے رہے کہ وہ جو اتنی سنجیدہ کیوں بیٹھی ہیں؟ لیکن کوئی بھی انہیں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کے دل سے نکلی وہ بات نہیں بتا سکا۔

پارٹی ختم ہوئی تو ریحان صاحب ہمیں گیٹ پر رُخصت کرنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے وہاں آ کر ان کا مان بڑھایا۔ پھر انہوں نے خاص طور پر ڈھو کی جانب مڑ کر ان سے کہا کہ وہ خصوصی طور پر وجو کے ممنون ہیں کیونکہ شاید ڈھو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تب بھی وہ بچوں کی خوشی کے لیے یہاں تک آئیں۔ ہم سب ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر جلدی سے گاڑی ریورس کی۔ اتنے میں سڑک سے گزرتا ایک تانگہ جس نے ابھی ابھی ہمیں کراس کیا تھا، آگے جا کر یک دم رُکا جیسے کسی نے گھوڑے کی لگامیں اچانک ہی دوڑتے دوڑتے کھینچ لی ہوں۔

میں ایک دم ہوشیار ہو گیا اور ڈھو کے سامنے آ گیا، تانگے سے کوئی شخص کودا اور شور مچاتا ہوا ہماری جانب بھاگا، میری ساری حسیں ایک دم ہی بیدار ہو گئیں، پھر غیاث چچا کی آواز میرے پیچھے سے اُبھری ''ارے..... یہ تو اپنا کرمو ہے۔'' غیاث چچا ہنستے ہوئے آگے بڑھے اور کرمو کو گلے لگا لیا۔ ہاں، وہ کرمو بابا ہی تھا۔ ڈھو آپی کے بچپن سے لے کر جوانی تک انہیں اپنے تانگے میں اسکول اور کالج تک چھوڑنے والا کرم دین۔

ہم سب کو دیکھ کر کرمو بابا کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ میں ہی وہ چھوٹا سا آدمی ہوں جو روزانہ اس کے تانگے کے پائیدان پر لٹک کر ڈھو کے گھر سے لے کر محلے کے پھاٹک تک بطور فیس جھولا لیا کرتا تھا۔ ڈھو بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پہ چھایا تمام تکدر بالکل ہی چھٹ گیا تھا۔ کرمو نے ڈھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بے شمار دعائیں دیں۔ اور ڈھو کے بچپن کو یاد کرتا رہا کہ وہ کتنی نفاست پسند تھیں کہ اگر تانگے کی سیٹ پر ذرا بھی گرد ہوتی تھی تو وہ بیٹھنے سے یکسر انکاری ہو جاتی تھیں اور جب تک خود کرمو یا فضلو بابا اس گرد کو کسی کپڑے سے صاف نہ کر دیتے تب تک وہ ''میم صاحب'' بنیں نیچے ہی ٹہلتی رہتی تھیں۔ غیاث چچا نے کرمو سے کہا کہ کبھی کبھار گھر کا چکر لگا جایا کرے، وہ بھی اس کا اپنا ہی گھر ہے۔ کرمو نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے غیاث چچا سے کہا کہ وہ سکینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں گھر چلے جائیں۔ میں اور فجو آج بچپن کی طرح کرمو کے تانگے پر گھر جائیں گے۔ سب نے حیران ہو کر میری جانب دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ فجو کے دل پر چھائے غبار کو دھونے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کرمو نے خوشی سے وہی فقرہ لگایا، جو وہ ہمارے بچپن میں تانگے کو تیز دوڑانے کے لیے لگاتا تھا۔ غیاث چچا نے بھی ہتھیار ڈال دیئے اور مسکراتے ہوئے سکینہ خالہ کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے فجو کو اشارہ کیا اور شاہی ادب و آداب کے ساتھ بولا۔

''آیئے شہزادی صاحبہ بگھی تیار ہے اور کوچوان کرمو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔'' فجو نے مسکرا کر سر جھٹکا اور تانگے کی طرف چل دیں۔

''آدی..... تم بھی نا..... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی ہاں.....؟''

''ارے بھئی آپ ٹھہریں اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی..... آپ کا تو سارا بچپن ہی اس شاہی بگھی کی سواری میں گزرا ہے۔ جبکہ مجھ غریب کی کمر ابا کی پرانی سائیکل کی جمپوں اور اُچھل کود نے توڑ کر رکھ دی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو ذرا ہم بھی اس سواری کا لطف اٹھا لیں۔'' فجو کچھ دیر مجھے مصنوعی غصے سے گھور کر دیکھتی رہیں اور پھر ہنس کر تانگے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے وہی نو دس سال کی فجو بن چکی تھیں جو اپنے کرمو بابا سے سارے راستے ضد کرتی تھی کہ تانگہ اور تیز چلائے، فجو سب بھول کر اب بھی کرمو سے وہی جملہ دُہرا کر ضد کر رہی تھیں۔

''اور تیز..... اور تیز نا کرمو بابا..... بھلا کوئی ایسے تانگہ چلاتا ہے۔''

اور کرمو بھی وہی پرانا کرمو بن چکا تھا جو اپنی فجو کے کہنے پر گھوڑے کو اور تیز دوڑائے جاتا تھا اور راستے میں زور زور سے ''ہو..... ہو۔'' کے نعرے بھی مارتا جاتا۔ تانگہ سڑک پر سرپٹ دوڑا جا رہا تھا اور آس پاس کے لوگ حیرت سے تانگے اور اس میں بیٹھی سواریوں کو دیکھ رہے تھے۔

تانگہ اب شہر کی دو رویہ درختوں سے گھری ٹھنڈی سڑک کی جانب مُڑ چکا تھا راستے میں ایک ٹھیلے پر گرم مونگ پھلیاں بھنتے دیکھ کر فجو پہلے کی طرح زور سے چلائیں۔

''آدی..... گرم مونگ پھلی۔''

میں بھی بچپن کی طرح ان کے حکم کی تعمیل میں تانگے سے کودا اور بھاگ کر اخبار کی بڑی بڑی کُپی نما پُڑیوں میں گرم مونگ پھلی کے بھنے دانے، اُن کے اوپر بہت سا چٹ پٹا مصالحہ اور نیبو چھڑک کر بھاگتا ہوا دوبارہ تانگے میں آ بیٹھا، کرمو نے پھر ہنس کر زوردار نعرہ مارا ''ہو..... ہو۔'' پھر تو راستے میں جو بھی پھیری والا یا ٹھیلا آتا گیا، فجو یونہی چلاتی رہیں۔ ''آدی گزک والا۔'' ''آدی..... بُھٹہ.....'' ''آدی..... قلفی.....'' اور میں ہر بار اُسی چھوٹے آدی کی طرح بھاگ کر ان کو یہ سب لا کر دیتا رہا۔ جانے کتنی صدیوں بعد میں نے فجو کو یوں کھل کر ہنستے، قہقہے لگاتے سُنا تھا، ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وقت کو وہیں روک دیتا۔ زمانے کی ہر ساعت کو اپنے اور فجو کے بچپن کے دسمبر میں ساکت کر دیتا۔

ہمیں یوں بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے دیکھ کر کرمو نے بھی تانگے کو سڑکوں پر ڈالے رکھا، اس روز تانگے پر بیٹھے بیٹھے میں نے اور فجو نے اپنے بچپن کو پھر سے جی لیا۔ ہمیں تب ہوش آیا جب دُور کسی شہر کے گھڑیال نے رات کے نو بجنے کا اعلان کیا۔ فجو نے کرمو سے کہا کہ تانگہ گھر کی طرف موڑ

لے کیونکہ غیاث چچا اور سکینہ خالہ پریشان ہوتے ہوں گے۔ میں نے سڑک کنارے بنے پی سی او سے غیاث چچا کو فون کیا اور کہا کہ ان کی لاڈلی میرے ساتھ ہے، پریشان نہ ہوں، وہ ہنس کر بولے "میں جانتا تھا تم دونوں جب تانگے پر بیٹھ جاؤ تو پھر جب تک گھوڑا خود تھک کر نہ گر جائے، تب تک تم لوگ نیچے اُترنے کے نہیں۔" میں نے اُن سے کہا کہ ہم ذرا دیر سے لوٹیں گے۔ وہ بولے "صبح بھی ہو جائے تو کچھ پروا نہیں۔" میں نے ہنس کر فون بند کرنا چاہا تو ان کی آواز کچھ بھرّائی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو ان سے کچھ بولا نہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے بولے "آدی بیٹا..... شکریہ۔" میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، کیا یہ خوشی میری ذمہ داری نہیں ہے؟ اگر میں چند لمحوں کے لیے ان کے لبوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا یہ میری جیت نہیں ہوگی.....؟ جواب میں ان سے مزید کچھ نہیں کہا گیا اور انہوں نے "جیتے رہو" کہہ کر فون رکھ دیا۔

جب میں نے ڈوکو بتایا کہ ہم گھر نہیں کھانا کھانے جا رہے ہیں، اور پھر کھانے کے بعد ریگل چوک سے ان کی پسندیدہ ہاتھ والی مشین سے بنی "پولکا" کون آئس کریم کھا کر گھر واپس جائیں گے تو وہ سراسیمہ سی ہو گئیں کہ گھر میں سبھی پریشان ہوں گے، پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ کچھ دیر تو میں انہیں ستاتا رہا کہ غیاث چچا سمجھیں گے کہ میں ان کی لاڈلی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہوں، یا پھر کرمو کا گھوڑا ہی ہم دونوں کو اتنے سال بعد اپنے پیچھے بیٹھے پا کر کہیں رفو چکر ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ بہت زیادہ ہلکان ہونے لگیں تو میں نے انہیں سچائی بتا دی کہ غیاث چچا نے پہلے ہی اجازت دے دی ہے۔ لہٰذا اب وہ چپ کی بیٹھی رہیں اور مجھے اور کرمو کو فیصلہ کرنے دیں کہ ہمیں کھانے کے لیے کہاں جانا چاہیے۔ کرمو نے کہا کہ جگہ ہے تو سہی..... پر ذرا دُور ہے، لیکن وہاں پر رش اور بھیڑ نہیں ہوگی اور کھانا بھی بہت عمدہ ملے گا۔ میں نے کرمو سے کہا کہ تانگہ اُسی جانب موڑ لے، کرمو نے شہر سے باہر جانے والی اس سڑک پر اپنا تانگہ دوڑا دیا اور کچھ ہی دیر بعد ہم جھیل کی طرف جانے والی اس سڑک پر اُڑے جا رہے تھے، جس کے دونوں اطراف شہتوت کے بڑے بڑے پیڑ، آسمان پر چمکتی چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ "دیکھو آج کون اُن کی مہمان ہے؟" ڈو حیرت اور دلچسپی سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے تاثرات بالکل اس شہزادی جیسے تھے جسے عمر بھر کبھی اپنے محل سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی، لہٰذا ایک رات وہ اپنی خادمہ کے کپڑے لے کر اور ایک نوکرانی کا بھیس بدل کر دنیا دیکھنے نکل پڑتی ہے اور صبح تک سارا شہر گھوم کر واپس اپنے محل جا پہنچتی ہے۔

میں نے شاید دسویں کی انگریزی کی کتاب میں اس شہزادی کا یہ قصہ پڑھا تھا اور آج میں خود اس شہزادی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، کیا میری قسمت مجھ پر کبھی اتنی مہربان بھی ہوگی.....؟ ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم جھیل کے کنارے بنے اس چھوٹے سے خوبصورت مگر خاموش اور پُرسکون ریسٹورنٹ تک پہنچ گئے جہاں پچھلی جانب لکڑی کے تختوں کا ایک پلیٹ فارم جھیل کے اندر تک لکڑی کے بڑے بڑے ستونوں کے ذریعے اس طرح کھڑا کر دیا گیا تھا کہ وہ دُور سے پانی پر تیرتا ایک بڑا سا شکارا دکھائی دیتا تھا اور جھیل کے پانی کی لہریں جب دھیرے سے اُس سے ٹکراتیں تو وہ آہستہ آہستہ ہلکورے سے لینے لگ جاتا تھا۔ ڈو نے بیٹھنے کے لیے اُسی تختے کا سب سے آخری حصہ منتخب کیا تھا۔ آسمان پر چاندنی اس طرح سے چٹکی ہوئی تھی کہ باہر کی فضا سے زیادہ جھیل کے پانی کے

اندر اُجالا پھیلا ہوا تھا، ایک چاند آسمان پر اور دوسرا پانی کے اندر جھیل کی لہروں پر تیر رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور ان پر پھیلی سفید دُودھیا برف ہمیں حیرت سے تک رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ''دیکھو تو..... کون آیا ہے آج ان کی گود میں دو گھڑی بیٹھنے کے لیے.....؟''

کرموڈور ریسٹورنٹ میں کھلی فضا میں باربی کیو بناتے اسٹاف سے جھگڑ رہا تھا کہ ''آدی صاحب'' آئے ہوئے ہیں۔ کھانا ٹھیک نہ ہوا تو کسی کی خیر نہیں، اور ریسٹورنٹ والے بے چارے حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون سے لاٹ صاحب ہیں جو اس پرانے تانگے پر اتنی رات کو شہر سے اتنی دور کھانا کھانے آئے ہیں۔ ان سے نپٹنے کے بعد کرموا اپنے گھوڑے کو کھول کر دُور جھیل کے کنارے سے پانی پلانے کے لیے اس کی لگام تھام کر بڑھ گیا۔ فو نے چاند کی روشنی میں دُور کرمو کے گھوڑے کو جھیل کے کنارے پانی پیتے دیکھا تو انہوں نے مجھے فوراً اس جانب متوجہ کیا۔

''آدی..... وہ دیکھو..... Robert Frost کی اسٹاپنگ بائے وُوڈز ان اے سنوئی ایوننگ

"Stoping by woods in a snowy evening"

''لیکن یہاں برف کہاں ہے؟..... صرف گھوڑا اور جنگل ہی دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ارے تو پھر کیا ہوا۔ ہم اسے ''اسٹاپنگ بائے کرموبابا ایٹ لیک سائڈ

(Stoping by karmoo baba at lake side) بھی تو کہہ سکتے ہیں نا۔''

فو کی اس اچانک اور برمحل تشبیہ پر ہم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے میں نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''یونہی ہنستی رہا کریں..... آپ ہنستی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔''

انہوں نے جھیل سے نظریں ہٹا کر مجھ پہ ڈالیں۔

''جانتی ہوں..... آج میرا دوست مجھے ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے ہی شام سے لیے گھوم رہا ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے شہر سے اتنی دُور بھی لے کر آیا ہے۔''

''آپ کی خوشی اور یہ ہنسی دیکھنے کے لیے مجھے اگر آپ کو چاند پر بھی لیجانا پڑے تو لے کر جاؤں گا..... پکا.....''

''لیکن..... آدی..... کیا ضروری ہے کہ دنیا کا ہر شخص خوش ہی رہے..... سدا ہنستا ہی رہے..... آخر کسی کو تو اس غم اور یاس سے بھی دوستی کرنا ہوگی نا.....''

''مجھے باقی دنیا کا نہیں پتہ..... مجھے صرف آپ سے غرض ہے اور میں کبھی کسی غم اور یاس کو ہمیشہ کے لیے آپ کا مقدر نہیں بننے دوں گا.....''

انہوں نے اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹکا کر مجھے چھیڑنے کے لیے کہا۔

''اچھا جی..... تو بتاؤ بھلا آدی کیا کرے گا ایسے موقعے پر۔'' میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور عزم سے کہا۔

''اپنی جان بھی دے دوں گا..... اپنی آخری سانس تک لڑے گا آدی آپ کے لیے..... فنا ہو جائے گا.....''

فو نے ایک دم سے ''شش'' کہہ کر مجھے چپ کروا دیا اور بے حد سنجیدگی سے بولیں۔

"نہیں آدی..... ایسا نہیں کہتے..... دوبارہ ایسی بات ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی....."

میں ان کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

"اگر بات نہ کرنے کی قسم پر لوگ چپ ہونے لگتے تو آج راجہ گونگا ہوتا۔" ڈھو کو کچھ دیر تو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ پھر جب سمجھیں تو زور سے ہنس پڑیں۔

"کیوں.....؟ کیا راجہ ہر وقت بات نہ کرنے کی قسمیں کھاتا رہتا ہے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ راجہ تو دوستوں میں چٹے بٹے وقت کم چٹے ملنے پر بھی آئندہ ہم سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لیتا تھا۔ ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ کھانا بھی آ گیا۔ کھانا واقعی بہت عمدہ اور لذیذ تھا۔ میں نے کرموکا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں وہاں جھیل کنارے کھانا کھا رہے ہیں۔

وہ کچھ پل میری زندگی کے سب سے حسین اور سب سے زیادہ یادگار لمحے تھے۔ کھانے کے بعد بھی میرا وہاں سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اِسی جھیل کے کنارے اسی رات میں ڈھو کے ساتھ یونہی بیٹھے بیٹھے اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ اور شاید اگر مجھے کرموکا خیال نہ ہوتا تو میں صبح تک انہیں یونہی اپنے سامنے بٹھائے رکھتا۔

واپسی پر میں نے ڈھو سے پوچھا کہ انہوں نے ریحان صاحب کے گھر میں بچوں کی بات کا اتنا زیادہ اثر کیوں لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بچوں کی بات کا اتنا قلق نہیں تھا، جتنا اپنے آس پاس بکھرے لوگوں کی سوچ سے تھا۔

"آدی..... یہ لوگ آخر عورت کو صرف ایک رشتے کے ترازو پر رکھ کر ہی کیوں تولتے ہیں؟ کیا عورت کی ذات خود اپنے اندر مکمل نہیں ہوتی؟ کیوں اس کے آس پاس ہمیشہ اس کی زندگی کے کسی مرد مالک کو ہی ڈھونڈا جاتا ہے؟ اور اگر ایسا کوئی رشتہ ساتھ نہ ہو تو سب اُس کے ساتھ عجیب سا برتاؤ شروع کر دیتے ہیں۔ اُسے یا تو مظلوم سمجھنے لگتے ہیں اور یا پھر طرح طرح کے الزام اُس کی ذات پر منڈھ دیے جاتے ہیں۔ کیا میری ذات خود میرے اپنے ساتھ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتی؟ کیا وجیہہ صرف وجیہہ نہیں ہو سکتی؟ کیا اُس کے نام کے ساتھ کسی لاحقے کا ہونا اتنا ضروری ہے کہ لوگ اس کے بنا وجیہہ کو ہی بھول جاتے ہیں.....؟"

بولتے بولتے ڈھو کی آواز بھرّانے لگی۔ وہ چپ ہو گئیں۔

کچھ دیر تک فضا میں گمبھیر سی خاموشی چھا گئی۔ صرف پکی سڑک پر دوڑتے تانگے کی ٹِک ٹِک اور تیزی سے چلتی ہواؤں کا شور سنائی دیتا رہا۔ پھر میں نے اپنے لفظ جمع کیے اور دھیرے سے بولا۔

"آج میری ایک بات غور سے سُن لیں اور پھر کبھی بھی اس بات کو دُہرایئے گا نہیں..... وجیہہ اپنے اندر ہی خود ایک مکمل کائنات ہے، اُسے اپنے ساتھ کسی سابقے یا لاحقے کی کبھی ضرورت تھی..... اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ ہاں البتہ وہ بڑی خوش نصیب ہستی ہو گی، جس کو وجیہہ کے نام کا سابقہ مل جائے کیونکہ یہ سابقہ کسی بھی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے مکمل کر سکتا ہے۔ وجیہہ اپنے اندر مکمل ہے اور اس کے بنا اس کے ساتھ جُڑنے والا کوئی

بھی نام، چاہے وہ سابقہ ہو چاہے لاحقہ..... ہمیشہ نامکمل ہی رہے گا....."

میں جانے کیا کچھ بولتا رہا اور وہ خاموشی سے سر جھکائے میری بات سنتی رہیں۔

"اور ایک اور بات بھی ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ آپ کے بارے میں میری یہ رائے اس لیے نہیں کیونکہ خوش قسمتی سے میں آپ کے دوستوں میں شامل ہوں۔ میری رائے آپ کے بارے میں تب بھی یہی ہوتی اگر میں آپ سے زندگی میں آج پہلی اور آخری بار ملا ہوتا..... کیونکہ آپ سے ایک ملاقات بھی انسان کو اپنے اندر مکمل کرنے کے لیے بہت ہے۔"

وہ نے چونک کر میری جانب دیکھا، اتنے میں تانگے نے موڑ کاٹا اور محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔ کرموکو رخصت کرنے سے پہلے میں نے جیب میں جتنے روپے تھے وہ زبردستی اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیئے، جنہیں لوٹانے کے لیے وہ تین بار پلٹا لیکن جب وہ نے بھی اس سے کہا کہ یہ اس کے لیے نہیں بلکہ اس کی وہ کی ہم عمر بیٹی رانی کے لیے ہیں تو بادل نخواستہ اُسے وہ رقم قبول کرنی ہی پڑی اور وہ ہم دونوں کو دعائیں دیتے ہوئے تانگہ موڑ کر چلا گیا۔ میں نے بھی وہ کو دروازے تک پہنچا کر واپسی کی راہ لی۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے سے وہ کی آواز سنائی دی۔

"آدی....."

میں پلٹا۔

"میرے چھوٹے دوست آدی کا شکریہ ادا کر دینا۔"

میں مسکرایا۔

"شکریہ..... کس بات کا؟"

"آج کی شام ان چند گھڑیوں میں مجھے میرا بچپن لوٹا دینے کا شکریہ..... اور کچھ دیر کے لیے مجھے میرا اپنا آپ واپس دینے کا شکریہ....."

میں نے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر اور جھک کر کہا۔

"اس خدمت کے لیے یہ بندہ ہمیشہ حاضر ہے....."

وہ ہنس پڑیں۔ میں نے اپنی ناک پر اُنگلی رکھ کر ان کے انداز میں اسے دبایا۔ اور انہیں یونہی مجھے دیکھ کر ہنستے چھوڑ کر، ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن ابھی میں اپنی گلی میں مڑنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری سرکاری جیپ تیزی سے محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھٹھک کر وہیں رُک گیا۔ رات کی ڈیوٹی والا اشرف ڈرائیور اور دو سپاہی بھی موجود تھے۔ پتہ چلا کہ ایس۔ پی کا پیغام آیا ہے کہ شہر کی ایک متروکہ عمارت کے تہہ خانے میں کچھ لوگوں کے جھگڑنے کی اطلاع آئی ہے اور آس پاس لوگوں نے دو فائروں کی آواز بھی سُنی ہے۔ میں اُسی وقت ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

ہمارے موقع واردات پر پہنچنے سے پہلے وہاں باقی نفری بھی پہنچ چکی تھی اور انہوں نے عمارت کو گھیرے میں بھی لے رکھا تھا۔ مجسٹریٹ

صاحب بھی تشریف لا چکے تھے، سو ہم نے مزید وقت ضائع کئے بنا تہہ خانے میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ آس پاس مکینوں سے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ جھگڑے اور فائر کی آواز کے چند لمحوں بعد ہی دو تین افراد کو انہوں نے تیزی سے عمارت سے باہر نکلتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان تھا کہ اندر کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ لیکن جیسے ہی ہم نے آدھی سیڑھیاں طے کیں، اندر تہہ خانے میں ابتری کے آثار نمایاں ہونے لگے، ایسے لگتا تھا جیسے یہاں شدید دھینگا مُشتی ہوئی ہو۔ اندر لائٹ نہیں تھی، یا کٹ چکی تھی، اس لیے میں نے گارڈ کو ٹارچ روشن کرنے کا کہا۔ ایک ساتھ کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں اور زمین پر اوندھے منہ پڑی میز کے پیچھے کوئی شخص اُلٹا گرا ہوا دکھائی دیا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا اور ہلانے جلانے کی کوشش کی، لیکن وہ بالکل بے سُدھ پڑا تھا۔ سپاہی نے جلدی سے کہا۔

''جناب یہ تو لگتا ہے مر گیا ہے.....''

میں نے دوسرے سپاہی کو اس شخص کے چہرے پر روشنی مارنے کو کہا۔ طاقتور ٹارچ کے ہالے نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے مجھے ڈنک مارا ہو۔ وہ شخص ظفر تھا، جواب لاش کی صورت میں اس تہہ خانے میں بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ ظفر مر چکا تھا۔

شہر تمنّا

خواتین کی پسندیدہ مصنفہ..... **سائرہ عارف** کا بہت خوبصورت اور اچھوتا انداز تحریر..... زندگی کے تمام رنگوں سے سجا..... دکھوں کے بحر بیکراں اور خوشیوں کے نخلستانوں سے آباد..... ایک دلچسپ اور طویل ناول..... **شہر تمنا**.....

کتاب گھر کے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

ایمان کا سفر

محی الدین نواب کی نشتر سے تیز معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ..... **ایمان کا سفر**..... خوبصورت نقابوں کے پیچھے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کرتی..... ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں کی کہانیاں..... کہانیوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے معاشرتی کہانیاں/ افسانے سیکشن میں دستیاب ہے۔

آخری ٹیس

میرے اگلے تین دن بے حد مصروف گزرے۔ شہر کی ناکہ بندی تو ہم نے اسی لمحے کروادی تھی جب ظفر کی لاش ہمیں ملی تھی، اور تیسرے دن چند مشکوک پرانے جواریوں کو چھپ کر مال گاڑی کے ذریعے شہر سے باہر جاتے ہوئے ہم نے گرفتار بھی کرلیا۔ تفتیش کے دوران اُن میں سے کوئی ظفر کا قاتل تو ثابت نہ ہوا لیکن یہ پتہ ضرور چل گیا کہ ظفر کا جھگڑا کن لوگوں سے ہوا تھا۔ وہ اُس کے وہی پرانے قرض خواہ تھے جن سے رقم اینٹھ کر وہ شہر سے فرار ہوگیا تھا۔ انہیں جب اطلاع ملی کہ ظفر اسی شہر میں ہے اور اس پرانی عمارت کے تہہ خانے میں چار مزید جواریوں کے ساتھ بازی جمائے بیٹھا ہے تو وہ اُس سے اپنی رقم کا تقاضا کرنے پہنچ گئے۔ ظفر نے پہلے تو بہانے تراشنے کی کوشش کی کہ اس وقت اس کا ہاتھ تنگ ہے، لہٰذا فی الحال وہ رقم کی ادائیگی سے معذور ہے لیکن جب اس کے پرانے ساتھیوں نے اس کی ایک نہیں مانی اور اس سے بازی پر لگی رقم بھی چھیننے کی کوشش کی تو معاملہ بگڑ گیا اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں ان میں سے کسی ایک نے ریوالور نکال لیا اور پیسے لے کر بھاگتے ہوئے ظفر پر پیچھے سے دو فائر کردیے۔ ظفر وہیں گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ گولی مارنے والے بھی رقم اٹھا کر بھاگ گئے اور یوں ظفر کی کہانی کا عبرت ناک انجام ہوا۔

غیاث چچا کو میں نے اگلے دن اخبار کا وہ صفحہ صبح سویرے ہی بھجوا دیا تھا، جس میں ظفر کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ میں خود بے پناہ مصروفیت اور دن رات کے چھاپوں کی وجہ سے ان سے بات نہیں کرسکا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے اور فجو کے زخموں میں آخری بار ٹیس اُٹھے گی تو ضرور لیکن اس کے بعد زخم خود ہی مندمل بھی ہوجائیں گے اور اس بدنصیب خاندان کو سکون بھی مل جائے گا۔ شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

قتل کے چھٹے دن ہم نے اصل قاتلوں کو بھی ایک پرانے قبرستان کے گورکن کی کوٹھڑی سے گرفتار کرلیا، جو خود بھی کبھی ان جواریوں کا ساتھی تھا اور اپنی کوٹھڑی میں ہی انہیں جوا بھی کھلاتا تھا۔ ملک صاحب نے میری زندگی کے پہلے کیس میں ہی کامیابی پر مجھے مبارکباد دی لیکن مجھے اصل خوشی اس بات کی تھی کہ آخرکار غیاث چچا کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے لیکن اندر ہی اندر ظفر کی جانب سے مزید کسی انتقامی کاروائی کی فکر اور غم ہمیشہ کھائے جاتا تھا۔

پچھلی جمعرات کو میں ریحان صاحب کے گھر پارٹی کی وجہ سے بالے کے گیراج نہیں جاسکا تھا لہٰذا اگلی جمعرات سے پہلے ہی راجہ کا پیغام آ گیا کہ اگر اس ہفتے بھی میں نے ناغہ کیا تو ''وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گا.....''

لہٰذا جمعرات کا دن آتے ہی میں ٹھیک چار بجے خود گیراج کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ سارے لوفر اندر ہی موجود تھے اور جانے کس بات پر زوروں کی بحث چل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بالے نے خوشی سے چلا کر کہا۔

''تھا جس کا انتظار، لو آ گیا وہ شاہکار.....''

راجہ نے گھور کر مجھے دیکھا۔

''آ گئے آپ اے۔ ایس۔ پی صاحب..... مل گئی فرصت ہم غریبوں سے ملنے کی..... ہاں بھئی..... اب بھلا ہمیں کون پوچھے گا۔ اب تو تانگے کی سیر کو جانے لگے ہیں لوگ.....'' ''کبھی اپنے دن بھی پھریں گے پیارے.....''

اس کا مطلب تھا کہ اس چنڈال چوکڑی کو بھی میری بُھو کے ساتھ سیر کو جانے کی خبر مل چکی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ایک پرانے کشن پر قبضہ جما کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جلنے والے جلا کریں..... قسمت ہمارے ساتھ ہے.....''

نھو نے وہیں سے ٹکڑا جوڑا۔

''حسرت اُن ''گُل'' غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے۔''

نھو کی پرانی عادت تھی کہ وہ ہر شعر میں ایک آدھ لفظ اپنی جانب سے بڑھایا گھٹا کر اُس کے وزن کا بیڑہ غرق کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

راجہ نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

''کوئی بات نہیں پیارے اپنے ساتھ بھی ماں کی دعا، جنت کی ہوا ہے۔''

بہت پہلے جب ہم سب پانچویں جماعت میں تھے تو ہم نے ایک انوکھا کھیل ایجاد کیا تھا۔ ہم نے سڑک پر چلتی بسوں، ٹرکوں اور رکشوں کی پُشت پر لکھے اشعار اور ''اقوال زریں'' میں بات کرنے کی شرط لگا لی اور طے کیا کہ جو کوئی بھی ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کرے گا تو اُسے جرمانے کے طور پر سب کو قادر ماما کی ریڑھی سے نان چھولے کھلانے پڑیں گے۔ لہٰذا ہم نے سینکڑوں ایسے اشعار اور اقوال یاد کر لیے تھے۔ یہاں سے راجہ چلّاتا

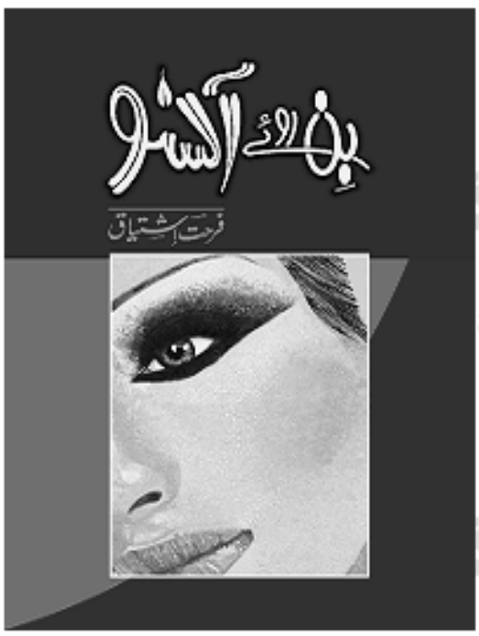

''او پپو یار تنگ نہ کر، پیسے لے جنگ نہ کر۔''

وہاں سے بالے کہتا۔

''ہارن دو، راستہ لو۔''

یہاں سے میں چھیڑتا۔

''اپنا تو وقت ہی خراب ہے پیارے۔''

نھو آہ بھرتا۔ سچ کہا ''وقت وقت کی بات ہے۔''

مُشی وہاں سے فریاد کرتا۔ ''ماں کی دُعا..... جا بیٹا تانگہ چلا.....''

گڈو وہاں سے دھمکی دیتا۔ ''وقت کا شہزادہ..... پھر لوٹ کر آئے گا۔''

غرض اِسی فضولیات میں ہمارا سارا دن کٹ جاتا تھا۔ آج بھی جب بالے نے مجھے دیکھتے ہی مخصوص بس والا نعرہ لگایا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ بہر حال بڑی مشکل سے اور مختلف ''تراغیب'' دے کر میں نے انہیں منایا۔ پھر راجہ نے ہی سب سے پہلے ایک ٹھنڈی سی آہ

بھری اور بولا۔

''یار کوئی میری بھی ''لو میرج'' کرواؤ..... میری اماں کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ ہر وقت نوکری کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔''

میں نے اسے ٹوکا کہ ''لو میرج'' کی سب سے پہلی شرط ایک عدد لڑکی اور دوسری انتہائی بنیادی شرط اس لڑکی سے محبت کا ہونا اشد ضروری ہے اور بدقسمتی سے راجہ کے معاملے میں یہ دونوں شرائط پوری نہیں ہوتی تھیں۔ ''ویسے بھی لو میرج کروائی نہیں جاتی، عموماً بھاگ کر کی جاتی ہے۔''

راجہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ تھوڑے دُور سے دانت نکالے۔

''خدا قسم آدی یار..... راجہ نہ سہی..... پر تیرے کیس میں تو یہ دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں..... پھر تُو کیوں نہیں کر لیتا شادی..... میرا مطلب ہے لو میرج۔''

''کیا مطلب.....؟''

بالے اُچھل کرنا کارہ جیپ کے بونٹ سے نیچے اُتر آیا۔

''مطلب یہ کہ لڑکی بھی موجود ہے اور تُو اُس سے شدید محبت بھی کرتا ہے، پھر انتظار کس بات کا ہے۔''

راجہ نے وہیں گیراج کے پرانے صوفے پر لیٹے لیٹے آواز لگائی۔

''اسے اس بات کا انتظار ہے کہ ایک بار پھر کوئی اور اُس کا ہاتھ مانگ کر لے جائے، اور یہ جناب پھر سے دیوداس بنے ادھر ادھر پھرا کریں۔''

میں نے ان سب کو گھورا۔

''تم سب ہوش میں تو ہو..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

راجہ نے تکیہ اُٹھا کر زور سے میری طرف مارنے کے لیے پھینکا۔

''تو تُو کیا چاہتا ہے کہ وہ یونہی بنا کسی رشتے کے تیرے انتظار میں گھر میں بیٹھی رہیں..... اور تو مہینے میں ایک آدھ بار انہیں گھمانے کے لیے کہیں لے جایا کرے، اور کوئی اگلا تجھ سے پوچھے کہ میاں، بتاؤ تو رشتہ کیا ہے تم دونوں کے درمیان، تو تُو ہنس کر کہہ دے کہ ''صرف دوستی''.....''

''ہاں تو دوستی کے رشتے میں بُرائی کیا ہے؟ وہ میری دوست تھیں، میری دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گی..... کسی کو اس میں کوئی شک ہے؟''

''کوئی شک نہیں..... کم از کم ہمیں یا پورے محلے کو تو تم دونوں کی دوستی پر اپنے ایمان سے بھی زیادہ یقین ہے۔ لیکن آدی میری جان..... یہ دنیا صرف ہم یا ہمارا محلہ ہی نہیں ہے، اپنے آپ کو اُن کی جگہ پر رکھ کر سوچ..... سب سمجھ میں آ جائے گا۔ اگر تُو چاہتا ہے کہ وہ یونہی ہمیشہ تیری دوست رہیں تو اس کا حل صرف اور صرف یہ رشتہ ہے۔ ورنہ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی آئے گا اور انہیں تجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ پھر وہ خود چاہیں بھی تو ان کی زندگی میں آنے والا تیرے اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اور انہیں بھی آخر کار تجھ میں اور اس نئے آنے والے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی ہوگا.....'' میں نے حیرت سے اپنے دوستوں کو دیکھا۔ یہ سب آج کیسی باتیں کر رہے تھے؟ بقول فضلو بابا ''یہ سب آج کون سی بوٹی ٹاپ کر آئے تھے؟'' سچ یہی تھا کہ میں نے آج تک اپنے اور تجو کے رشتے کو سوائے دوستی کے، کسی اور نام سے پکارنے کا اپنے خواب میں بھی نہیں

سوچا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اس رشتے کو کوئی بھی اور نام دینے سے ہمارے درمیان موجود اس دوستی کے عظیم ترین رشتے پر حرف آجائے گا، جو مجھے دیگر کسی بھی رشتے سے زیادہ عزیز تھا۔ اسی لیے میں اسے محبت کا وہ نام دینے سے بھی گریز کرتا تھا، جو آج بالے نے شاید انجانے میں دے دیا تھا۔

ہاں..... مجھے ان سے محبت تو تھی پر یہ محبت تو ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے اندر موجود پائی تھی۔ اُس وقت تو کبھی کسی نے اس محبت کو کسی رشتے یا کسی نام سے پکارنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی..... تو پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آج اس معاشرے کو یہ ضرورت کیوں پڑ گئی تھی.....؟

لیکن بات تو راجہ کی بھی ٹھیک ہی تھی، کوئی دوسرا اگر وجو کی زندگی کا مالک بن جائے تو وہ بھلا میری اس دوستی کو کیوں قبول کرے گا۔ چاہے میرے اور وجو کے درمیان کا یہ رشتہ کتنا ہی پاک، کتنا ہی معصوم کیوں نہ ہو، وہ تو اسے اپنے اور موجودہ زمانے کے پیمانے پر ہی ناپے اور تولے گا، اور زمانے کا ترازو تو سدا یہی صدا دیتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان دوستی کا کوئی رشتہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت یا تو بہن ہو سکتی ہے، یا ماں یا بیوی یا بیٹی..... اور بس..... اس کے آگے رشتوں کی ڈکشنری میں ہمارے ہاں عورت کے نام کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرا ہر رشتہ بس ایک سوالیہ نشان ہی بن جاتا ہے۔ اور میں بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک وہ اپنے گھر میں ہیں۔ ہم دونوں اس سوالیہ نشان سے کسی حد تک بچے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے کسی دوسرے گھر میں قدم رکھا، یہ سوالیہ نشان پوری شدت سے ہم دونوں کے درمیان آ کھڑا ہوگا۔

کہتے ہیں کبھی کبھی ہماری سوچ ہی حالات کی صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے سیانے ہمیشہ اچھا سوچنے کی صلاح دیتے ہیں۔ لیکن ان دنوں میرے دوستوں سمیت ہم میں سے شاید کوئی اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ اسی لیے اگلی ہی شام جب غیاث چچا کا پیغام آیا کہ شام کی چائے ان کے ساتھ پیئوں تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں صورت حال کچھ ایسا رُخ اختیار کر لے گی۔

میں جب شام کو غیاث چچا کے گھر پہنچا تو ریحان صاحب کی گاڑی پہلے ہی سے باہر کھڑی نظر آئی۔ وہ بہت گرم جوشی سے مجھ سے ملے۔ وجو مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیں۔ غیاث چچا نے خود ہی چائے ڈال کر مجھے بھی کپ تھما دیا اور ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھیں۔ آدی ان کے گھر کے فرد جیسا ہی ہے۔ ریحان صاحب نے کھنکار کر اپنی اس ادھوری بات کو پھر سے جوڑا جو میرے اندر آنے سے پہلے وہ آدھی مکمل کر چکے تھے۔

''جی تو میں کہہ رہا تھا کہ اسی لیے میں نے امی کو روک دیا کہ پہلے مجھے بات کر لینے دیں۔ پھر اگر آپ لوگ اور وجیہہ اجازت دیں گی تو امی باقاعدہ وجیہہ کا رشتہ مانگنے کے لیے یہاں آئیں گی.....''

میرے ہاتھوں میں چائے کا کپ اس زور سے لرزا کہ مجھے اس کو جلدی سے دوبارہ میز پر رکھ دینا پڑا۔ گویا راجہ کے خدشات نے چوبیس گھنٹے کے اندر ہی حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ریحان صاحب کی امی۔ جو کسی اور شہر میں رہتی تھیں اور ریحان صاحب کی بیٹی کی سال گرہ کی تقریب کے سلسلے میں چند دن کے لیے ریحان صاحب کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جب وجو کو دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں اور اسی لمحے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ وجو کو اپنی بہو بنانے کی پوری اور سر توڑ کوشش کریں گی۔ لیکن ریحان صاحب نے انہیں حتمی رشتہ لے کر جانے سے اس وقت تک کے لیے روک دیا تھا جب تک کہ وہ خود پہلے غیاث چچا کی مرضی معلوم نہ کر لیں۔

غیاث چچا نے ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملے میں فی الحال کوئی بھی قطعی رائے دینے سے قاصر ہیں کیونکہ یہ وجیہہ کی زندگی کا

اپنا فیصلہ ہے اور وہ خود ہی اس سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کی مختار ہیں۔ لہٰذا وہ صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ریحان صاحب کا یہ رشتہ وجو کے سامنے رکھ دیں۔ اب مجھے وہاں وجو اور سکینہ خالہ کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی کہ ضرور خود ریحان صاحب نے پہلے تنہائی میں غیاث چچا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی تاکہ اگر غیاث چچا ہی کو کوئی اعتراض ہو تو بات وہیں ختم ہو جائے۔ کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب نے چائے ختم کر کے اُٹھنے اور رخصت لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

غیاث چچا نے مجھے انہیں گاڑی تک چھوڑنے کا اشارہ کیا اور میں ریحان صاحب کے ساتھ ہی باہر ان کی گاڑی تک چلا آیا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے اچانک رُک کر پلٹے اور کہا۔

''عباد..... جہاں تک میں جانتا ہوں..... وجیہہ کے گھرانے کے باہر والوں میں سے، آپ ان سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور وجیہہ آپ ہی پر سب سے زیادہ اعتماد بھی کرتی ہیں۔ کیا آپ انہیں میرا ایک پیغام دے دیں گے.....؟''

میں ہڑبڑا سا گیا ''جی..... جی ضرور.....''

''اُن سے کہیے گا کہ اس رشتے کی خواہش صرف امی کے دل میں ہی نہیں جاگی۔ خود مجھے بھی کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اُن کی ضرورت ہے۔ لیکن اپنی اور وجیہہ کے عمر کے فرق کی وجہ سے یہ بات زبان پر نہیں لا سکا۔ آپ وجیہہ سے یہ ضرور کہہ دیجئے گا کہ انہی کا فیصلہ اب بھی آخری اور حتمی ہوگا۔ اور خدارا ابھی بھی اس پروپوزل کو ''نہ'' کرنے کی صورت میں بھی وہ اسے اپنے اور میرے خاندان کے بیچ میں کسی دیوار کی صورت میں محسوس نہ کریں۔ وہ ہر حال میں میرے لیے محترم تھیں اور محترم رہیں گی.....''

ریحان صاحب مجھ سے ہاتھ ملا کر جانے کب کے وہاں سے جا چکے تھے لیکن میں اب بھی اس ملاح کی طرح بے بس سا وہاں کھڑا تھا، جسے بیچ بھنور میں اس بات کا پتہ چل جائے کہ اس کی کشتی میں ایک ایسا شگاف ہے، جسے بھرنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

راجہ کو جب میں نے یہ بات بتائی تو وہ غصے سے چلا اٹھا۔

''دیکھا..... میں نہ کہتا تھا..... ہوگئی چھٹی..... یہ ریلوے کے سارے بابو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ چلنے میں پسنجر جیسے دھیمے..... لیکن مستقل مزاج اتنے کہ دھیرے دھیرے اور سرک سرک کر اپنی منزل کے پلیٹ فارم تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا آدی..... جا کر وجو سے اپنے دل کا حال کہہ دے..... آج اور ابھی..... اس سے پہلے کہ وہ ریلوے بابو انہیں لے اُڑے.....''

لیکن جس بات کو راجہ اتنی آسانی سے کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ دنیا کی سب سے مشکل ترین کسوٹی تھی۔ میں نے ساری زندگی میں صرف یہی ایک وجو کی دوستی ہی تو کمائی تھی باقی عمر بھر کے گوشوارے میں صرف اور صرف خسارہ ہی تو تھا۔ کہیں یہ دوستی، یہ رشتہ بھی مجھ سے چھن گیا تو.....؟ اس سے آگے سوچنے کی نہ مجھ میں ہمت تھی اور نہ ہی سکت.....

ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور آخر کار صبح ہونے تک میں ایک فیصلے تک پہنچ چکا تھا۔ مجھے کوئی ایک بھرم تو داؤ پر لگانا ہی تھا۔ لہٰذا میں نے بھی یہ بازی اپنے طور پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

آخری بھرم

غیاث چچا میری بات سُن کر بہت دیر تک گُم سُم بیٹھے رہے، اور میں اُن کے سامنے بیٹھا سُولی پہ ٹنگا رہا۔ میں نے انہیں گاڑی بھیج کر اپنے ہی دفتر بلوالیا تھا اور وہ اس وقت میز کی دوسری جانب بیٹھے کسی گہری سوچ میں گُم تھے۔ میں لفظوں کے معاملے میں ہمیشہ ہی سے بہت محتاط واقع ہوا تھا اور اس روز تو میں نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اپنی احتیاط کی ہر حد کو ہی پار کر لیا تھا تاکہ غیاث چچا کے آبگینہ دل کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ لگنے پائے۔ لیکن یہ بھی تو ٹھیک ہی تھا کہ ہر کہی بات اپنے ایک معنی تو ضرور رکھتی ہے۔ پھر چاہے بات کو کتنے ہی اچھے اور خوبصورت ڈھنگ سے کیوں نہ پیش کیا جائے، اس کا آخری اثر تو وہی ہوتا ہے جو دوسرے سُننے والے شخص تک اس بات کے وہ اصل معنی پہنچا پاتے ہیں۔ میری تشویش بھی یہی تھی کہ غیاث چچا تک کہیں میری بات، میرے کسی غلط لفظ کے استعمال سے کوئی اور معنی نہ پہنچا دے۔

بہت دیر خاموش رہنے کے بعد آخر کار غیاث چچا نے سر اُٹھایا اور اپنے سَلب لب کھولے۔

''اگر میں تمہیں بچپن سے نہ جانتا ہوتا تو آج تمہاری اس بات کو میں ایک جذباتی نوجوان کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھ کر تم دونوں کی عمر کے فرق کا احساس دلاتا یا تمہیں یہ نصیحت کرتا کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو جُڑنے سے پہلے ہی بہت کچھ توڑ جاتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں آدی، اور تمہارے زندگی گزارنے کے نظریے سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ڈو کا رشتہ طلب کرنے کے پیچھے تمہارے دل میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ فیصلہ کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔''

میں نے غیاث چچا کو اپنے دفتر بلا کر سر جھکائے ہوئے ان سے یہی درخواست کی تھی کہ اگر ریحان صاحب نے ڈو کی مرضی معلوم کرنے کے لیے غیاث چچا کی زبان کو اپنا پیامبر بنایا ہے اور بات آخر کار اگر ڈو کو اس گھر سے رُخصت کر کے سُرخرو ہونے پر ہی ختم ہونی ہے تو پھر انہیں ڈو کے سامنے ایک نہیں دو نام رکھنے ہوں گے۔ اور وہ دوسرا نام میرا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میرے گھر والے میرے اس فیصلے پر چونکیں گے تو ضرور لیکن انہیں زیادہ حیرت بھی نہیں ہوگی۔ امی تو کبھی کبھی مجھے ڈو کے اردگرد چکر کاٹتے دیکھ کر مجھے چھیڑنے کے لیے عمارہ کو با آواز بلند کہہ بھی دیا کرتی تھیں۔

''ارے یہ گھر میں ٹِک کر کیسے بیٹھے گا۔ اس کی جان جو وہاں اٹکی رہتی ہے..... میں تو کہتی ہوں بھائی کو گھر میں دیکھنا چاہتی ہو تو پہلے ڈو کو اس گھر میں لے آؤ۔''

کون جانتا تھا کہ ایک دن واقعی ایسی نوبت آجائے گی۔

غیاث چچا واپسی کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں ان کے ساتھ دفتر کے دروازے تک آیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے میرے کاندھے پر

اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''آدی..... میں تمہاری ایمانداری اور سچائی کی قدر کرتا ہوں..... آج مجھے اس بات کا پوری طرح احساس اور یقین ہو گیا ہے کہ تم زندگی کی ہر سچائی کا سامنا کرنا خوب جانتے ہو..... کاش..... کاش یہ چناؤ اگر میرے ہاتھ ہوتا تو میری پہلی اور آخری پسند تم ہی ہوتے۔''

وہ میرا کندھا تھپتھپا کر کمرے سے نکل گئے۔ اور میں اپنی آخری بازی کھیل کر کسی ڈرے ہوئے جواری کی طرح تقدیر کے پتے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن میری قسمت کے بازیگر کا جواب بہت دیر سے آیا۔ غیاث چچا کے چلے جانے کے بعد اس روز دیر تک میں لاشعوری طور پر کسی کے بلاوے کا انتظار کرتا رہا لیکن ہر آہٹ پر چونک پڑنے کے باوجود وہ دستک میرے لیے نہیں ہوتی تھی۔ اور یوں دھیرے دھیرے پورا دن گزر گیا اور بالآخر رات بھی ڈھل گئی۔ یونہی دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی ڈھل گیا۔ اب اس انتظار نے مجھے رفتہ رفتہ اندر سے گھلانا شروع کر دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں لمحہ بہ لمحہ اندر سے گھلتا جا رہا ہوں، چوتھے دن تک تو میرا کچھ ایسا حال ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ سیدھے جا کر دیجو کے سامنے کھڑا ہو جاؤں کہ جو فیصلہ بھی اُنہیں سنانا ہے، جو سزا بھی میرے لیے مقرر کرنی ہے۔ بس ابھی کر دیں لیکن اس انتظار کی صلیب پر مجھے مزید نہ لٹکائیں۔ لیکن بے بسی کی یہ کیسی انتہا تھی کہ میں خود چل کر اُن کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے اُن کا سامنا کرنے کی ہمت ہی مجھ میں نہیں رہی۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن، لمحے اور پلوں کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ وقت کو یاد رکھ کے کاٹنا شاید دنیا کا سب سے اذیت ناک عذاب ہوتا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے نامہ بر میرا حکم سیاہ لے کر آ ہی گیا۔ دیجو کی جانب سے فضلو بابا پیغام لے کر آ گئے کہ مجھے شام کو طلب کیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے حواس رکھتے ہوں گے اُن کے لیے تو شاید چار پانچ دن ہی گزرے ہوں گے، پر میرے لیے تو نہ جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ شام تک میرے دل میں عجیب عجیب سے وسوسے آتے رہے اور چند گھنٹوں کا وہ وقت کیسے گزرا یہ میں ہی جانتا ہوں۔

شام ڈھلے جب میں دیجو کے گھر پہنچا تو فضلو بابا جو صحن میں لگے انگور کی بیلوں کی شاخیں تراش رہے تھے، نے دُور ہی سے مجھے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیجو چھت پر ہیں۔ سورج ڈھل چکا تھا لیکن اس کی سنہری گلابی روشنی ابھی کچھ فضا میں باقی تھی۔ میں دھیرے دھیرے یوں سیڑھیاں چڑھنے لگا، جیسے کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔

دیجو منڈیر کے قریب ہی کرسی پر خاموش سی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی سوجی ہوئی آنکھیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ پچھلے چند دنوں میں بس لگاتار روتی رہی ہیں۔

میں چپ چاپ خاموشی سے ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں، پھر انہوں نے سر اٹھایا اور میں نے نظریں جھکا لیں۔ ان کی آواز مجھے کسی دُور کے صحرا سے آتی محسوس ہوئی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا آدی..... میرے پاس ایک ہی تو مان بچا تھا۔ تمہاری دوستی کا مان اور تم نے میرا یہ آخری بھرم، آخری مان بھی توڑ دیا..... کیوں کیا تم نے ایسا.....؟''

میں نے یونہی جھکی نظر سے جواب دیا۔

''میں آپ کو ایک مرتبہ پھر کھونے سے ڈرتا ہوں۔ میرے پاس بھی آپ کی اس دوستی کے مان کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا ہے..... اور کوئی بھی غیر آ کر اس بھرم کو مجھ سے چھین کر لے جائے، یہ مجھے گوارہ نہیں ہے.....''

''تم سے کس نے کہا کہ کوئی تم سے میری دوستی، میرے اعتماد، میرے خلوص کا بھرم چھین سکتا ہے؟ اور تم نے تو اس دن خود مجھ سے کہا تھا نا، کہ وجیہہ اپنے اندر خود ایک مکمل کائنات ہے؟ پھر کیوں اُسی وجیہہ کو نامکمل سمجھتے ہوئے غیروں کے ساتھ تم بھی اُسے نام کا لاحقہ پیش کرنے چلے آئے..... تم آدی..... تم.....؟.....''

''آپ شاید بھول رہی ہیں۔ اُسی دن میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ جس کسی بھی خوش قسمت کے نام کے ساتھ آپ کے نام کا سابقہ جڑے گا، اس کا نام، اس کی شخصیت، اس کی کائنات ہمیشہ کے لیے مکمل ہو جائے گی۔ اور پھر اگر اس پوری کائنات میں کسی کو اس نام کے جُوتے سے اپنے آپ کو مکمل کرنے کا حق ہے، تو وہ پہلا حق دار میں کیوں نہیں ہو سکتا..... کیا آپ مجھے ہمیشہ نامکمل ہی دیکھنا چاہتی ہیں؟..... یا پھر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کو کھو دینے کی تلوار ہمیشہ میرے سر پر لٹکتی ہی رہے.....؟..... اگر آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس روک لینے کا صرف یہی ایک رشتہ ہی واحد ذریعہ ہے تو پھر یونہی سہی.....''

''نہیں..... یہ ناممکن ہے.....''

''کیوں..... کیا صرف اس لیے کہ آپ عمر میں مجھ سے صرف سات آٹھ سال بڑی ہیں..... یا اس لیے کہ اس رشتے سے پہلے ہی آپ کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور اب آپ اپنے آپ کو سراہنے والوں کو صرف ہمدردوں کی قطار میں شمار کرتی ہیں یا پھر صرف اس لیے کہ آپ کے ذہن میں بھی وہ صدیوں پرانا اور گھسا پٹا جملہ گردش کرتا رہتا ہے کہ ''لوگ کیا کہیں گے.....؟''

تو نے دُکھ کی اذیت سی ڈوبی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''نہیں نہ تو مجھے اپنی اور تمہاری عمر کے فرق کا کچھ ایسا شدید احساس ہے، نہ ہی میں ماضی کے کسی رشتے کی وجہ سے خود کو کسی ہمدردی کا شکار محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی مجھے زمانے کی پروا ہے..... مجھے اگر فکر ہے تو صرف اور صرف اُس رشتے کی جو میرے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ لوگوں کی نظر کی پروا تو میں تب کرتی جب خود اپنے آپ سے نظر ملا پاتی۔ تم نے تو خود مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا آدی..... میں تو اتنے دن سے خود اپنا ہی سامنا نہیں کر پا رہی۔ اتنے خوبصورت اور انمول رشتے کو تم نے دنیا کے ایک عام سے رشتے میں بدلنے کا سوچا بھی تو کیسے؟ دوستی کی سیپ میں سے موتی نکال کر اُسے کیچڑ میں پھینک دیا..... کیوں؟

''مجھے ایسا کرنا پڑا، اس رشتے کی کیچڑ سے اس انمول رشتے کی چمک کو جان بوجھ کر دُھندلانا ہی پڑا کیونکہ اس کی چمک ہی لوگوں کو قبول نہ تھی، اور یہی چمک آپ کو مجھ سے ایک بار پھر دُور لے جانے کا باعث بن رہی تھی۔ کیونکہ وجیہہ خود ایک ایسا چمکدار ہیرا ہے جس کی چمک اور جس کی کشش بار بار لوگوں کو اس کی جانب کھینچتی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایک دن کوئی نہ کوئی اس رتن کو مجھ سے چُرا لے جائے گا..... آپ ہی بتائیں..... پھر آدی

کیا کرے گا.....؟"

وہ بے بسی سے رو پڑیں۔

"میرے لیے یہ زندگی پہلے ہی بہت کٹھن ہے آدی..... اسے میرے لیے اور مشکل نہ بناؤ..... مجھے اپنے اور تمہارے رشتے سے بہت محبت ہے آدی..... خدا کے لیے اس محبت کو میرے دل میں زندہ رہنے دو..... اسے کسی اور رشتے کا الزام نہ دو..... دنیا کا اور کوئی بھی رشتہ اس کی حُرمت کو چھو بھی نہیں سکتا..... مجھے میری محبت واپس لوٹا دو آدی..... واپس لوٹا دو....."

"مجھے بھی اس رشتے سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو..... اور مجھے آپ سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی ہم دونوں کو اس رشتے سے..... اور یہ محبت مجھے آج یا کل سے نہیں ہے..... جس لمحے میں نے ہوش سنبھالا اور آپ کو دیکھا تھا..... تب ہی سے یہ محبت میرے خون میں شامل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ریحان صاحب کا رشتہ آنے تک میں نے بھی کبھی اس روحانی محبت کو کسی دنیاوی رشتے میں ڈھالنے کا نہیں سوچا تھا۔ مجھے بھی اس رشتے کی حُرمت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا آپ کو ہے..... اور یقین مانیے کہ ہمیشہ رہے گا..... آپ میرے لیے سدا "آپ" ہی رہیں گی۔ مجھے اس پوری کائنات میں سے صرف آپ کا ساتھ چاہیے..... صرف یہ اعتماد چاہیے کہ آپ صرف میری ہیں اور اب کوئی آپ کو مجھ سے چھین کر دُور لیجانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کو کہیں بھی چلنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا..... حتیٰ کہ آپ کو آپ کا گھر چھوڑنے تک کا بھی نہیں کہوں گا۔ آپ ہمیشہ اتنی ہی آزاد، اتنی ہی خودمختار رہیں گی جتنی آپ آج ہیں۔ بولیے..... کیا صرف اتنا سا احساس بھی آپ مجھے نہیں دے سکتیں.....؟ کیا میرا آپ پر اتنا سا بھی حق نہیں ہے.....؟..... میں جانتا ہوں آج نہیں تو کل غیاث چچا اور سکینہ خالہ کے آنسو آپ کو اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی فیصلہ لینے پر مجبور کر ہی دیں گے کیونکہ آپ کی اس زندگی پر اُن کا بھی آپ جتنا ہی حق ہے۔ اور ایک وقت آئے گا کہ آپ صرف ان کے حق کی خاطر ہی سہی، لیکن ہار مان ہی لیں گی۔ تو پھر میرے حق میں ہار جانے میں کیا حرج ہے.....؟ یقین کیجیے..... آپ ہار کر بھی سب جیت جائیں گی..... ہمارے درمیان کے رشتے کی حُرمت سدا برقرار رہے گی..... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے....."

بولتے بولتے میں ہانپنے سا لگ گیا تھا۔ شاید میرے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ لفظ بھی تو آپ کو سانس دینے کا کام کرتے ہیں..... لفظ بھی کبھی کبھی ہوا کی طرح آپ کی زندگی کے لیے اشد ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اچانک لفظ ختم ہو جائیں تو انسان کا دم اُکھڑنے لگتا ہے..... جیسے اس وقت میرا دم اُکھڑ رہا تھا، وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں اور اُن کے بہتے آنسو ان کے گالوں سے ہو کر ان کے دامن کو بھگو رہے تھے۔ میں واپس جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر آپ سمجھتی ہیں کہ اب بھی میرا آپ پر میرا کچھ حق باقی ہے..... اور اگر ابھی تک آپ کی اعتماد کی دیوار میں حتمی شگاف نہیں پڑا اور آپ کا مجھ پر بھروسہ باقی ہے..... تو مجھے آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا..... آپ کے آدی کی آخری اُمید اب آپ ہی سے بندھی ہے..... اور یہ سدا بندھی رہے گی....."

میں وہاں سے پلٹا اور اس اندھے تیر کی طرح وہاں سے چلا آیا جسے کمان سے چھوٹتے وقت خود اپنی منزل کا پتہ نہیں ہوتا۔ میری منزل بھی

نہ جانے کہاں تھی۔ مجھے یہ بات کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری زندگی کے نوے فیصد سے بھی زیادہ اور بیشتر فیصلوں پر دوسروں کا اختیار کیوں ہوتا ہے؟ ہم اتنے بے بس کیوں ہوتے ہیں کہ اپنے حصے کی سانسیں بھی دوسروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟ میں بھی اُس روز اپنے حصے کی تمام سانسیں ہُو کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ صرف سانسوں کی ہی کیا بات تھی، میں تو اپنی تمام ساعتیں، تمام ساعتیں اور ساری بینائی بھی وہیں گروی رکھ آیا تھا اور اب مجھے صرف ان کے فیصلے کا انتظار تھا۔

اور پھر ٹھیک سات دن بعد ہُو کا فیصلہ بھی آ ہی گیا۔ ہُو نے ریحان صاحب کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا۔ اگلے ماہ ہُو کی ریحان صاحب کے ساتھ رُخصتی تھی۔

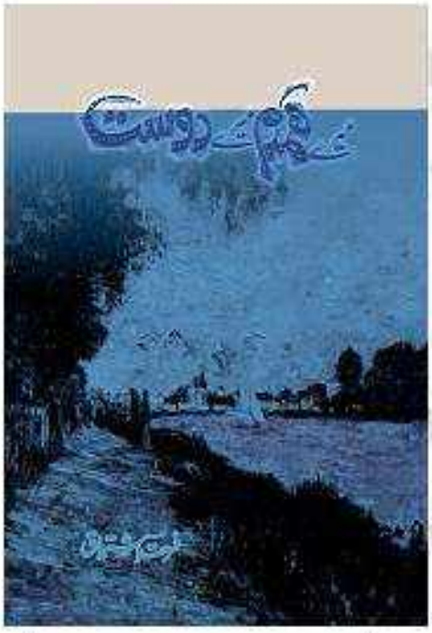

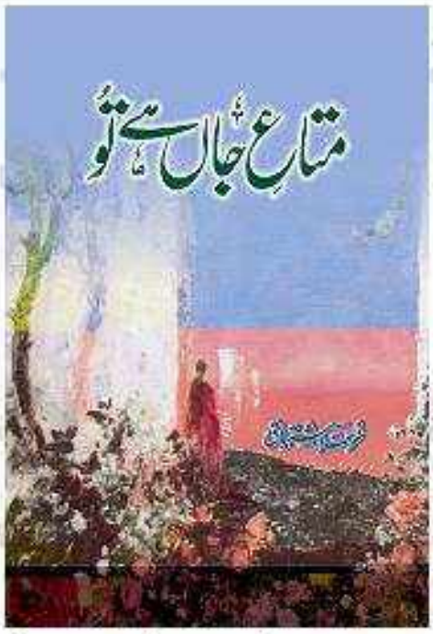

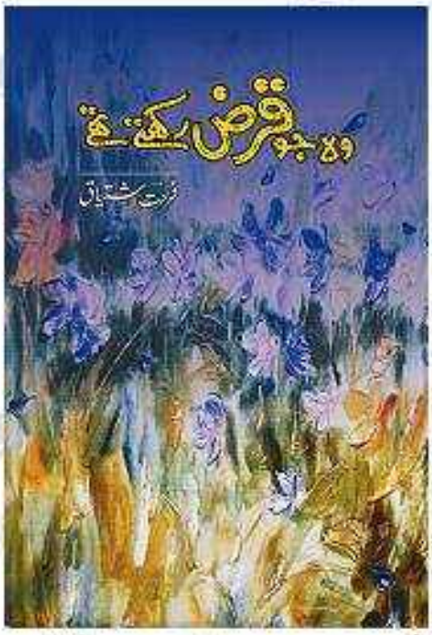

علم و عرفان پبلشرز پیش کرتے ہیں.....محترمہ فرحت اشتیاق کے 8 خوبصورت ناول



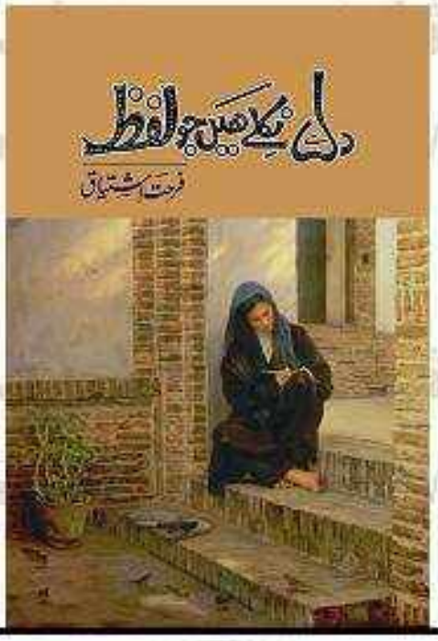



آخری دستک

اس روز جب دفتر کے فون کی گھنٹی بجی تو میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگلے چند لمحوں کے بعد میری زندگی سے ہر خوشی، ہر روشنی یوں پل بھر میں غائب ہو جائے گی کہ اس کے بعد صرف اور صرف اندھیرا ہی ہمیشہ کے لیے میرا مقدر ٹھہرے گا۔

میں نے فون اٹھایا، دوسری جانب غیاث چچا تھے جو ایک ہلکی سی ہیلو کے بعد بالکل ہی خاموش ہو گئے تھے۔ مجبوراً مجھے ہی پوچھنا پڑا۔

''آپ چپ کیوں ہیں..... سب خیریت تو ہے نا.....؟''

دوسری جانب سے ان کی لرزتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

''آدی..... وجیہہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے..... وہ ریحان صاحب کے رشتے کے لیے مان گئی ہے..... مجھے..... مجھے بہت افسوس ہے بیٹا..... میں تمہیں تمہاری خوشیاں نہیں دلا سکا.....''

غیاث چچا اس کے بعد بھی نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے لیکن میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے..... میری تمام حسیات نے یک دم ہی اور بالکل جواب دے دیا تھا۔ پتہ نہیں انہوں نے بات کس طرح ختم کی اور میں نے انہیں کیا جواب دے کر فون بند کیا، مجھے کچھ یاد نہیں۔

میں اُس وقت چونکا جب میرے اردلی نے آ کر اندر کمرے کی روشنی جلائی۔ تب میری گھڑی پر نظر پڑی۔ اوہ..... تو گویا باہر شام ڈھل چکی تھی۔ غیاث چچا کا فون صبح گیارہ، سوا گیارہ کے بیچ آیا تھا اور تب سے میں یہیں ساکت بیٹھا ہوا تھا۔

اس دن کے بعد مجھے ایک دم ہی یوں لگنے لگا تھا، جیسے میرے اندر سے جینے کی ہر خواہش ہی مٹ گئی ہو۔ میں جہاں بیٹھ جاتا، بس وہیں بیٹھا رہتا اور جہاں کوئی مجھے کھڑا کر جاتا، میں ساکت سا وہیں کھڑا رہ جاتا۔ دفتر سے میں نے بہت سے دنوں کی چھٹی لے لی تھی لیکن گھر میں ٹکنے کے بجائے میں صبح سویرے ہی نکل جاتا اور کسی بھی سنسان سڑک کی راہ پکڑ کر پیدل چلتا رہتا، دھوپ اور سائے کا احساس بھی میرے لیے جیسے ختم ہو گیا تھا اور میرا کسی سے بھی کچھ بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے دوستوں سے بھی کترانا شروع کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ میرے لیے اذیت میں ہوں گے مگر میں ان کے سامنے آ کر اُن کی اذیت مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

گھر میں آتے جاتے آس پاس سے ہی یہ خبر سننے کو ملی تھی کہ اگلے ماہ فجو کی رخصتی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ عمارہ کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ خود فجو نے ریحان صاحب کے آگے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ ڈولی اٹھانا چاہتے ہیں تو پھر رخصتی میں تاخیر نہ کریں۔ ریحان صاحب یا ان کی امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو خود کل کی جگہ آج کے قائل تھے اس معاملے میں..... لہٰذا رخصتی کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع ہو چکی تھیں اور سکینہ

خالہ اپنی بیٹی کے نصیب ایک بار پھر سے جاگ جانے پر بے حد شاداں و فرحاں تھیں۔ اور وہ ہی کیا، پورا محلہ ہی اس رشتے سے بے حد خوش تھا۔ وہ سب اُس خاندان پر گزری تمام آفتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اب خدا خدا کر کے ان پر قسمت نے خوشی کا ایک دروازہ کھولا تھا تو سبھی کی یہ خواہش تھی کہ وہ خیر سے اپنے آنگن سے نندھاریں اور خدا ان کے نصیب اچھے کرے۔ میں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا کہ میں صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا تھا تا کہ راجہ یا بالے یا کسی بھی دوسرے دوست کا سامنا ہونے سے بچ سکوں۔ گھر میں امی وغیرہ کو میں نے ڈیوٹی کا کہہ رکھا تھا اس لیے انہیں مجھ پر کچھ زیادہ شک نہیں ہوا کیونکہ میری ڈیوٹی کے اوقات ہمیشہ سے کچھ ایسے ہی اوٹ پٹانگ تھے۔

عمارہ نے البتہ شاید میری آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھ لی تھی لیکن وہ بھی مصلحتاً خاموش ہی رہی۔ اس روز میں منہ اندھیرے گھر سے باہر نکلا تو وہ سارے کے سارے بالے کی پرانی جیپ میں گلی میں ہی میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کی کوشش کی، ہزار بہانے کیے لیکن انہوں نے مجھے دبوچ ہی لیا اور سیدھے بالے کے گیراج لے آئے۔ میں چپ چاپ زمین پر پڑے گشن پر بیٹھ گیا۔ نھو اور منّی چائے بنانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ راجہ میرے بالکل سامنے آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور میری ٹھوڑی اپنی اُنگلی سے ذرا سی اُٹھا کر بہت دیر تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا..... میری آنکھیں جلنے لگیں۔ راجہ کی آواز بھی بھرا سی گئی۔

''تو اپنے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے آدی..... کیوں اپنے آپ کو جلا کر بھسم کر رہا ہے..... ارے یار اپنا نہیں تو کچھ ہمارا ہی خیال کر لے.....''

میں چپ رہا..... دُور بیٹھے بالے نے کہا۔

''جانتا ہے تو تیری وجہ سے کس قدر پریشان ہیں۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ ہم میں سے ہر کسی کو، ہر روز تیری خبر لینے بھیجتی ہیں..... لیکن تیرا تو کوئی اتہ پتہ ہی نہیں ملتا..... دفتر سے تو نے چھٹی لے رکھی ہے، گھر پر تو ملتا نہیں..... ہم سے ملتا نہیں..... تو پھر بتا ہم کیا کریں..... تجھے ڈھونڈنے کہاں جائیں.....''

''ڈھونڈا اُن کو جاتا ہے جو کہیں کھو چکے ہوں..... میں تو یہیں ہوں..... تمہارے سامنے۔''

راجہ نے مجھے ڈانٹا۔

''نہیں..... یہ تم نہیں ہو..... یہ کوئی اور ہے..... یہ ہمارا آدی نہیں ہے۔''

''وہم ہے تمہارا..... مجھے کچھ نہیں ہوا..... اور بھلا تجھ کو میرے لیے پریشان ہونے کی یا میری تلاش میں تم لوگوں کو کہیں بھیجنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ سُنا ہے ان کی رُخصتی ہونے والی ہے..... ان کے پاس تو نمٹانے کے اور بہت سے کام ہوں گے.....؟ ان سے کہنا کہ میری فکر چھوڑ دیں..... اپنی آنے والی زندگی کی فکر کریں.....''

بالے نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

''آدی..... یہ تو بول رہا ہے..... اپنی جُو کے لیے..... کیا ہو گیا ہے تجھے..... اتنا زہر تو تیرے لہجے میں پہلے کبھی نہ تھا.....''

میں نے اُسی زہر خند لہجے میں اسے جواب دیا۔

''زہر نگلنے والوں سے امرت اُگلنے کی توقع کرنا ہی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔'' راجہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

''ایسا مت بول آدی..... یقین کر تو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تم دونوں کا رشتہ ہم سب کی بلکہ اس پوری دنیا کی سوچ سے بھی اونچا ہے۔ تجھے میری قسم..... وجو کی نیت پہ کبھی شک نہ کرنا۔''

میں ان سب کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ تو گویا اب یہ بھی انہی کی سکھائی بولی بولنے لگ گئے ہیں۔ اس میں ان بے چاروں کا قصور بھی کیا تھا.....؟ وہ تو تھیں ہی ایسی..... کہ جس سے ایک بار زندگی میں مل لیں تو پھر وہ ساری عمر اُنہی کے گُن گاتا رہے اور انہی کی زبان بولتا رہے۔ راجہ نے جلدی سے اپنی جیب سے ایک بند لفافہ نکالا۔

''وجو نے دیا ہے تیرے لیے اور ہمیں سختی سے تاکید کی ہے کہ تو اِسے یہیں ہمارے سامنے پڑھے گا۔ ورنہ وہ تیری ضد سے اچھی طرح واقف ہیں کہ باہر جاتے ہی اسے پھاڑ دے گا۔''

راجہ نے لفافہ میرے حوالے کر دیا اور وہ اور بالے میرے دائیں بائیں یوں بیٹھ گئے، جیسے اگر میں واقعی وجو کا خط پھاڑنے لگوں تو دونوں مجھ سے خط ہی دوبارہ چھین لیں گے۔ مجھے ان کی اس بے اعتباری پہ پیار بھی بہت آیا اور غصہ بھی بہت، میں نے ان دونوں کو ڈانٹ کر اپنے سے دُور بیٹھنے کا کہا اور دھمکی دی کہ اگر وہ لوگ مجھ سے یونہی چپکے رہے تو میں خط پڑھوں گا ہی۔ بڑی مشکل سے دونوں بچپن کی تمام قسمیں دے کر مجھ سے دُور ہوئے کہ میں خط نہیں پھاڑوں گا۔ اتنے میں نھو اور منشی چائے بھی لے آئے تھے اور وہ سب چائے پیتے پیتے مجھے خط پڑھتے ہوئے یوں دیکھتے رہے جیسے ابھی کچھ دیر میں میں انہیں کسی لاٹری کا نتیجہ بتانے والا ہوں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ وہی وجو کی دل میں اُتر جانے والی سُبک اور رواں تحریر تھی۔

''ناراض ہو.....؟..... اب کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گے؟ کبھی اپنی وجو کی صورت بھی نہیں دیکھو گے؟ شاید میں تمہاری جگہ ہوتی تو بالکل ایسا ہی سوچتی..... لیکن یقین کرو آدی..... اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا..... میں یہ فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ کرتی اور شاید کچھ عرصہ مزید ابا اور اماں کی یاس بھری صورتیں، دل پر پتھر رکھ کر برداشت کر ہی لیتی مگر تم نے مجھے یہ فیصلہ اس قدر جلد لینے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل میں ریحان صاحب کے لیے بے پناہ احترام اور عزت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، لیکن تم نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ جلد یا بدیر مجھے ابا اور اماں کی خوشی کے لیے سر جھکانا ہی پڑتا، تو پھر اُس شخص کے لیے ہی سہی جس کے لیے میرے دل میں احترام تو ہے..... اور جو مجھے کسی حوالے سے محترم تو سمجھتا ہے۔

مجھے تمہارے جذبے کی سچائی اور تمہارے خلوص پر شاید تم سے بھی زیادہ یقین ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا دوست اپنے وعدے نبھانا بھی خوب جانتا ہے۔ لیکن کچھ جذبے آبگینوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں اور کسی نئے رشتے کا صرف نام ملنے پر بھی اپنی شناخت کھو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بھی ویسے ہی جذبے سے گُندھا ہوا ہے آدی..... اسے کسی دوسرے رشتے کا نام دینے سے بھی یہ نازک سا رشتہ، جس تارِ عنکبوت سے بندھا ہوا ہے..... وہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا، چاہے دوسرا کوئی اُسے محسوس نہ بھی کر پائے..... لیکن خود ہمارے اندر اُس کے ریزے ساری عمر اک خلش کی کاٹ اور چُبھن پیدا کرتے رہیں گے۔ اور مجھے یہ رشتہ بہت عزیز ہے آدی..... شاید دنیا کے ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز..... اس لیے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے اس جذبے اور اپنے اس رشتے کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا، لیکن ایک بات کا یقین اپنے دل سے کبھی مٹنے نہ دینا کہ تمہاری وجو اپنے آس پاس بکھرے ان دنیاوی رشتوں میں بٹ کر اپنے

اس ازلی روحانی رشتے سے کبھی غافل نہیں ہوگی، چاہے تمہارا ساتھ رہے یا نہ رہے..... چاہے تم سامنے رہو، چاہے نظروں سے اوجھل، تمہاری ذکو ہمیشہ تمہارے بچپن کے دسمبر میں تمہارے ساتھ رہے گی۔

آدی..... دنیا میں کچھ رشتے ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جنہیں بات یا ملاقات کی مجبوری نہیں ہوتی۔ وہ انسان کی ہر بات اور اُس کی ہر ملاقات میں ہمیشہ شامل رہتے ہیں..... مانتے ہو نا کہ لفظ اور تصویر ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ جہاں یہ سب کچھ ختم ہوتا ہے وہاں سے تصور کا رشتہ شروع ہوتا ہے۔

تمہاری ذکو نے صرف اُسی رشتے کو بچانے کے لیے ایک اجنبی شخص کا ساتھ ساری عمر کے لیے قبول کیا ہے، تو بولو..... اپنی ذکو کا ہمیشہ کی طرح مان رکھو گے نا..... میری بارات میں آؤ گے نا..... اور کان کھول کر سُن لو..... اگر تم نہیں آئے تو میں سچ مچ بقول راجہ، اُس ''ریلوے بابو'' کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گی۔ ''پکا''..... اور آدی جانتا ہے کہ ذکو جب کسی بات پر پکا کہہ دے تو وہ بات پھر پتھر پر لکیر ہو جاتی ہے۔

اپنا بہت خیال رکھنا اور خاص طور پر اپنی اُس چھوٹی سی ناک کو سردی سے بچائے رکھنا۔

تمہاری ذکو.....

خط ختم ہونے تک اپنے آس پاس کا مجھے کچھ احساس نہیں رہا تھا۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو راجہ، بالا، نخو اور منشی چاروں مجھے اپنے سامنے ایک قطار میں یوں بیٹھے دکھائی دیئے کہ چاروں کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو رواں تھے، میں نے حیرت سے اُن سے پوچھا کہ وہ رو کیوں رہے ہیں؟ راجہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے روتا دیکھ کر ان کے آنسو بھی نہیں رُک پائے۔ لیکن میں کب رو رہا تھا؟ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے بھیگا ہوا محسوس ہوا..... اوہ..... میں نے جلدی سے ذکو کا خط دوبارہ کھول کر دیکھا تو پورے خط پر ہی نمکین پانی کے دھبے یوں پھیل چکے تھے کہ خط کی روشنائی اور حرف دُھندلے پڑ گئے تھے۔ جانے میں کب سے اور کس سطر سے اپنی آنکھیں بھگو رہا تھا۔ میں نے اُسی وقت بالے کے کان پر اٹکا ہوا قلم نکالا اور وہیں گیراج کے رجسٹر میں سے ایک صفحہ پھاڑ کر جلدی میں اس کے اوپر چند سطریں گھسیٹ ڈالیں۔

''شاید آپ کا نظریہ ہی صحیح ہو..... یا شاید میرے اندر ہی اتنی روشنی نہ ہو کہ میں نئے رشتوں کے اندھیرے روشن کر سکوں۔ بہر حال مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، نہ ہی کبھی ہوگی..... آپ رُخصت ہو جائیں اُس ریلوے بابو کے ساتھ اور ہمیشہ خوش رہیں، لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ ہے نہ ظرف..... کہ آپ کو ان کے ساتھ رُخصت ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔ لہٰذا اس معاملے میں میری معذرت قبول کر لیں۔ کہیں میری کوئی حرکت آپ کے اس نئے رشتے میں کوئی دراڑ نہ ڈال دے.....

اور ہاں..... ہمیشہ کی طرح آج بھی میرا یہی دعویٰ ہے کہ آپ کی ناک زیادہ چھوٹی ہے اور سردی بھی آپ ہی کو ہمیشہ زیادہ لگتی ہے لہٰذا آپ بھی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آدی.....

صفحہ پھاڑ کر میں نے راجہ کے حوالے کیا کہ اسے آج ہی ذکو دے آئے۔ تیسرے دن میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بے انتہا مصروفیت میرے درد کا کچھ درماں کر دے گی لیکن یہ بھی میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ ہمارے اندر کے کچھ

درد، ہر قسم کی مصروفیت، خوشی یا صدمے سے ماورا ہوتے ہیں اور ان پر ہماری اندرونی یا بیرونی کسی بھی قسم کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر مجھے تو اب سدا اسی درد کے ساتھ جینا تھا، تو پھر اس سے فرار کیسا؟

چھٹی ختم ہونے کے بعد دفتر میں میرا وہ دوسرا ہی دن تھا، جب چپڑاسی نے آ کر بتایا کہ کوئی ملاقاتی ملنا چاہتا ہے، میں کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا اس لیے ملاقاتی کے کارڈ پر نظر ڈالے بغیر ہی میں نے سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر انہیں دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں ریحان صاحب کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں اندر آنے کا کہا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کارڈ کا لفافہ بھی تھا۔ شاید ان کی شادی کا ہی کارڈ ہوگا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حال احوال کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں کیونکہ ریحان صاحب بھی ایک دم ہی خاموش سے ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہی سکوت توڑا اور ان سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے چونک کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا جیسے کسی گہری سوچ سے واپس پلٹے ہوں۔

''معافی چاہتا ہوں..... کبھی کبھی کچھ سوچیں اس بُری طرح سر پر سوار ہو جاتی ہیں کہ جا بے جا آپ کو بھٹکا دیتی ہیں۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا، سب کچھ تو حاصل کر لیا ہے انہوں نے، پھر ایک جہان پا کر بھی ابھی تک یہ کس سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ریحان صاحب نے میرے چہرے کے سوالیہ نشان کو محسوس کر لیا اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ میز پر رکھ کر بولے۔

''یہ میری اور وجیہہ کی شادی کا کارڈ ہے۔ بس یہی تمہیں دینے آیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک درخواست بھی کرنی تھی۔''

کارڈ دیکھ کر میرا دل کچھ یوں ڈوبا کہ میں اُن سے کچھ کہنا ہی بھول گیا۔

مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ سامنے میز پر پڑا کارڈ اٹھا کر پڑھ ہی لوں۔ مبارکباد کے رسمی جملے بولنا تو بہت دور کی بات تھی۔ آخر کچھ دیر بعد ریحان صاحب نے خود ہی سلسلہ تکلم جوڑا۔

''یہ ایک ایسا عجیب شادی کا کارڈ ہے، جس پر ہونے والی شادی کی تاریخ ابھی تک درج نہیں کی گئی..... اس لیے تاریخ کی جگہ ابھی خالی ہے.....''

مجھے جھٹکا سا لگا۔

''جی..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟''

ریحان صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''وجیہہ نے پوری دنیا میں سے یہ اختیار صرف تمہیں دیا ہے عباد..... تم جو تاریخ اس کارڈ میں بھرو گے..... اسی تاریخ کو ہماری شادی ہو گی..... اور اگر تم چاہو تو یہ جگہ ہمیشہ خالی بھی رہ سکتی ہے..... تمہارے تاریخ نہ بھرنے کی صورت میں یہ شادی کبھی نہیں ہو گی..... تم چاہو تو اس کارڈ میں لکھے نام کو کاٹ کر کوئی اور نام بھی لکھ سکتے ہو۔''

مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا سارا کمرہ ہی گھوم رہا ہو، ریحان صاحب یہ کیا کہہ رہے تھے، وہ آخر میرا اتنا بڑا امتحان کیوں لینا چاہتی تھیں.....؟ یہ کیسی آزمائش تھی.....؟

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں..... میں بھلا کیسے.....؟ میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں کے رشتے کی تاریخ مقرر کرنے کا بھلا مجھے کیا حق ہے.....؟''

ریحان صاحب دھیرے سے مسکرائے۔

''حق دینے والے نے دے دیا ہے، کیونکہ میں نے اس سلسلے میں ہر اختیار وجیہہ کو دے رکھا تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہوگا۔ ہاں یا نہ..... کچھ بھی..... لیکن انہوں نے اپنی ہاں کو تمہاری ہی ہاں سے مشروط کر دیا ہے۔ ایسا اختیار تو بہت قسمت والوں کو ملتا ہے عباد یہ حق اور یہ اختیار تو وجیہہ نے کبھی مجھے بھی نہیں دیا.....''

''لیکن میں خود کو اس اختیار کے قابل نہیں سمجھتا..... آپ جا کر وجو سے کہہ دیں کہ.....''

لیکن میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی گئی۔

''صرف تم ہی اس پوری دنیا میں اس اختیار کے حق دار ہو عباد.....''

''وجیہہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، تمہارے اور اس کے رشتے کے بارے میں تمہارے پروپوزل کے بارے میں اور تم دونوں کے بچپن سے جڑے اُس ماورائی تعلق کے بارے میں، جسے محسوس کرنے کے لیے اگلے انسان کے پاس بھی ویسا ہی دل ہونا چاہیے جیسا تم دونوں کے سینوں میں دھڑک رہا ہے، میں نے کبھی اس قدر اعلیٰ ظرف اور صاحب دل ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا، نہ ہی مجھے ایسے کسی احساس کی پرکھ کا فخر حاصل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جس رشتے کے لیے وجیہہ جیسی لڑکی اپنا ہر اختیار، ہر حق تیاگ دے، وہ ضرور سب سے خاص ہی ہوگا۔ ورنہ اس دنیا میں تمہاری وجو جیسی دوسری کون ہوگی جو چند دن بعد اپنے ہونے والے شوہر کو بُلا کر خود اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ پہلے اُس شخص سے جا کر نام اور تاریخ ڈلوا لائے جس کا میرے ہر ہونے والے رشتے پر سب سے زیادہ حق ہے..... وہ شخص تو ضرور دنیا میں سب سے الگ، سب سے خاص ہی ہو گا..... اور مجھے خوشی ہے کہ میں چاہے کسی طور ہی سہی..... پر دنیا کے اس سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ مضبوط رشتے کا گواہ تو بنا..... اب چاہے وجیہہ سے میرا رشتہ ہو یا نہ ہو..... تم اس کارڈ پر کوئی تاریخ ڈالو یا اسے پھاڑ کر اپنی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دو..... لیکن مجھ سے تم دونوں کے اس احساس کے گواہ ہونے کا فخر اب کوئی نہیں چھین سکتا، اور میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ سدا کے لیے رہیں گی.....''

ریحان صاحب اپنی بات ختم کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنی کرسی پر یونہی ساکت بیٹھا رہ گیا۔ ریحان صاحب دروازے کے پاس جا کر کچھ پل کے لیے رُکے۔

''تم ایک خاص لڑکے ہو عباد..... بہت خاص..... اور مجھے خوشی ہوگی اگر ہم مستقبل میں بھی دوست رہیں..... کسی بھی رشتے کسی بھی حوالے سے۔''

ریحان صاحب دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے اپنا گھومتا ہوا سر میز پر ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میری قسمت شاید آخری بار خود چل کر میرے در پر آخری دستک دینے کے لیے آئی تھی۔

آخری الوداع

شام ڈھلتے ہی غیاث چچا کا گھر رنگین برقی قمقموں سے جھلملانے لگا تھا۔ محلے کی چھوٹی بچیوں نے اپنی ذکو آپی کی شادی کے لیے گھروں میں جو گھی کے ٹھے مٹی سے سینکڑوں چراغ بنائے تھے۔ وہ انہیں گھر کی دیواروں اور چھت کی مُنڈیر پر سجا سجا کر قطاروں میں رکھ رہی تھیں، شہنائی والا سرِ شام ہی آ گیا تھا اور غفور چچا باہر شامیانے میں ہی کرسی ڈالے جانے کب سے اپنی اور غیاث چچا کی پسند کے فرمائشی گیت بجوا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بینڈ والوں کی ٹولی بھی سرخ وردیاں زیب تن کیے اور سر پر بڑی بڑی سنہری پگڑیاں سجائے آن پہنچی۔ یہ شہر کا خاص بینڈ تھا، جسے غفور چچا کی خصوصی ہدایت پر وہاں بلایا گیا تھا۔ صدیقی صاحب ہانپتے کانپتے آتش بازی کے سامان کے ٹوکرے اتروا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ محلے کے بچوں کو بھی دُور بھگاتے جاتے، جو صدیقی صاحب سے نظر بچا کر ایک آدھ انار یا پٹاخہ لے کر رفو چکر ہو ہی جاتے۔ کچھ ہی فاصلے پر شکور چچا قورمے، زردے اور پلاؤ کی دیگوں کی رکھوالی اور حساب پر بیٹھے، باورچیوں کو آگ تیز یا دھیمی کرنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ اتنے میں کرموتانگے پر دودھ اور روح افزا کے سکنجبیں اور شربت کی بوتلوں کے ٹھنڈے کریٹ لے کر آن پہنچا اور لگا ''ہو ہو'' کرنے..... شکورن بوا اندر اُستانی خالہ کے ساتھ مل کر مہندی کے تھال سجوا رہی تھیں اور ان کی آواز باہر بڑے میدان تک آ رہی تھی۔

''ارے یہ لال اور ہری پتی پھر کم پڑ گئی..... اور یہ سنہری اور چاندی کی چم چم کے ڈبے کہاں رکھ دیے ہیں..... اب مہندی سُوکھ گئی تو پھر مجھ سے نہ کہنا ہاں..... اور یہ گھوڑ ماری مہندی لایا کون تھا.....؟..... آدھی مٹی آدھی مہندی.....''

گردھاری مَل کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ چھوہاروں اور میوے کے ٹوکروں کو بچوں کی نظر سے کہاں بچا کر رکھے تاکہ نکاح سے پہلے کوئی بچہ ان میں ''نقب'' نہ لگا سکے۔ وہاں ماشکی قطار میں رکھے تقریباً تمام حمام بھر چکا تھا اور اب اسے صرف پیٹرومیکس کے ڈیوؤں کا انتظار تھا تاکہ وہ گرم پانی والے حماموں کے نیچے آگ روشن کر سکے۔ غرض ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا، سبھی کو اپنی پڑی ہوئی تھی، کسی کی سینڈل گم تھی تو کسی کی شیروانی کے بٹن نہیں مل رہے تھے۔ کوئی دُلہن کے جوڑے کے دوپٹے کی تلاش میں تھا تو کسی کو دیگ میں ڈالی جانے والی اشرفیوں کی تھیلی نہیں مل رہی تھی۔ کوئی کیمرے میں فلم ڈلوانا بھول گیا تھا تو کسی کے پاس کیمرے کی فلم تو تھی پر کیمرہ ندارد۔ بارات پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے والیاں پتیوں کی کمی کی شکایت کر رہی تھیں اور غیاث چچا ایک جانب کھڑے راجہ اور بالے کو ہدایات دے رہے تھے کہ بارات آتے ہی انہیں مردانے اور زنانے کے راستے کس طرح جُدا کروانے ہیں۔ غرض سبھی کسی نہ کسی تیاری میں تھے لیکن جن گھرانوں میں باراتیں اُترتی ہوں گی، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ تیاریاں کبھی مکمل نہیں ہو پاتیں اور بارات آ جاتی ہے۔ اُس روز بھی یہی ہوا، بارات آ گئی اور سبھی اپنی آدھی اور ادھوری تیاریوں سمیت ہی بارات

کے استقبال کو دوڑ پڑے، راجہ، بالا، منشی اور نھو باراتیوں کا استقبال کر رہے تھے، گڑ واور پیو دودھ اور شربت سے ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے، اور کیوں نہ کرتے..... آج ان کی زندگی کا سب سے خاص دن جو تھا۔ کچھ دیر بعد ہی شور مچا کہ قاضی صاحب آ گئے اور گردھاری مل نے اطمینان کی لمبی سانس بھری کہ اس کی جان چھوہاروں اور میوے کی حفاظت سے چھوٹی۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ اور نکاح ہونے کی خوشی میں باراتیوں پر چھوہارے اور بتاشے پہلے نچھاور کیے گئے اور پھر مخمل کی خوبصورت تھیلیوں میں بانٹے گئے۔ میرے ابا غیاث چچا کے ساتھ کھڑے ان کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے، غیاث چچا مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ سکینہ خالہ نے میری امی کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر مردانے میں پیغام دینے چلی گئیں، کچھ ہی دیر میں مجھے غیاث چچا نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زنانے میں لے آئے۔ عورتوں نے مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے مسکرا کر سرگوشیاں کیں اور ڈھو کے آس پاس بیٹھی سہیلیوں نے کھلکھلا کر میرے لیے ڈھو کے ساتھ والی جگہ خالی کر دی۔ اور ہر کوئی بھانت بھانت کی بولی بولنے لگی اور مجھے چھیڑنے لگی۔ ڈھو جانتی تھیں کہ ایسے موقعوں پر مجھے بہت گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے، اس لیے انہوں نے گھونگھٹ کے نیچے ہی سے سہیلیوں کو گھور کر آنکھیں دکھائیں اور انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ڈھو گلابی کامدانی شرارے میں دلہن بنی بیٹھی تھیں اور آج اگر آسمان سے فرشتے بھی اتر آتے تو ان کی نظر بھی ڈھو کے روپ پر نہ ٹھہر پاتی، میں تو پھر بھی ایک انسان تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اتنی بھیڑ کے درمیان بھی میری ڈھو پر چپکے سے نظر پڑ ہی جاتی اور گھونگھٹ تلے سے جب بھی ان کی نظر پلٹ کر میری طرف آجاتی تو میں جلدی سے نظریں چرا لیتا تھا۔

پھر اچانک ہی شور اٹھا کہ ''دُولہا کو لے آئے.....'' ''دُولہا میاں آ گئے۔'' ''وہ دیکھو دُولہا آ گیا'' میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ ریحان صاحب کو اُن کی امی اور خاندان کی دیگر عورتیں دوپٹے کے سائے میں نکاح کے بعد ڈھو کے ساتھ بٹھانے کے لیے لے کر آ رہی تھیں۔ ڈھو نے نظریں نیچی رکھ کر ہی مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا لیکن میں ڈھو کے بائیں سے ہٹ گیا اور ریحان صاحب کو ڈھو کے دائیں بٹھا دیا گیا۔ ہر جانب ایک شور سے مچا ہوا تھا۔ رسمیں پوری کی جا رہی تھیں۔ ڈھو تا چھپائی، منہ دکھائی، دودھ پلائی اور جانے کیا کیا۔

میں بھیڑ میں سے نکل کر باہر آ گیا اور کسی ایسے گوشے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، جہاں مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اُس دن ریحان صاحب میرے دفتر میں مجھے جس آزمائش میں ڈال گئے تھے اور ڈھو نے مجھے جو حق دیا تھا اُس کے تقاضے میں نے اُسی شام پورے کر کے کارڈ شام ہی کو غیاث چچا کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ میں نے کارڈ پر تاریخ بھی وہی ڈالی تھی، جو مجھے پہلے ہی اپنے گھر والوں اور راجہ سے ڈھو کی رُخصتی کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔ میں شاید دنیا کی تاریخ میں سزائے موت کا وہ پہلا قیدی تھا، جس نے اپنی سُولی کی تاریخ خود مقرر کی تھی۔

کچھ ہی دیر میں شامیانوں اور قناتوں میں مہمانوں کے لیے کھانا بھی لگا دیا گیا اور کھانے کے بعد رُخصتی کا وقت بھی سر پر آن پہنچا۔

سکینہ خالہ جو اب تک جانے کس طرح خود پر قابو پائے ہوئے تھیں، ڈھو کے سر پر قرآن رکھ کر انہیں نیچے سے گزارتے وقت یوں بلک بلک کر روئیں کہ انہیں چپ کراتے کراتے محلے کی ہر آنکھ اشک بار ہو گئی، سبھی رو رہے تھے۔ ان سب کی وجیہہ ایک بار پھر انہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ غفور چچا کی آنکھیں یوں بھیگیں کہ ان میں تو ڈھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ہٹانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ غیاث چچا دوسری جانب سے ڈھو کو تھامے یوں چل رہے تھے کہ جیسے ابھی خود بھی ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں گے۔ امی نے دُور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سنبھالوں، پر مجھے کون

سنبھالتا؟ میں دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجود پتھر کا ہو چکا ہو۔ ابا نے آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سہارا دیا اور میرے دونوں ہاتھ دونوں جانب سے راجہ اور بالے نے زور سے تھام لیے۔ شاید انہوں نے دُور سے ہی میرے لرزتے اور کانپتے وجود کو محسوس کر لیا تھا۔ محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے آگے بڑھتیں اور ڈھو کی بلائیں اپنے سر لے کر پیچھے ہٹ جاتیں، لیکن شکورن بوا آگے بڑھیں تو پھر بہت دیر تک ہٹ نہ پائیں۔ انہوں نے ڈھو کے ہاتھ تھام کر ان کی پشت اپنی آنکھوں سے لگائی تو پھر دیر تک ہُوک ہُوک کر روتی رہیں۔ ڈھو تو پہلے ہی سے ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ یا خدا..... یہ ایک لڑکی اتنے سینکڑوں لوگوں سے اندر ہی اندر کیسے رشتے بنا گئی تھی؟ یہ کیسا الوداع تھا، جو انجانوں کو بھی اپنوں کے ساتھ مل کر رُلا رہا تھا؟..... عمارہ نے دو چار بار اُچک اُچک کر مجھے بھیڑ میں سے اشارے کیے کہ میں بھی آگے بڑھ کر ڈھو سے رُخصت ہو لوں، لیکن میرے تو پاؤں ہی پتھر کے ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ ڈھو ریحان صاحب کی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں اور ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ریحان صاحب کو آگے بٹھا دیا گیا تھا اور ڈھو کو ریحان صاحب کی امی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ میں پتھر بنا وہیں دُور کھڑا اُنہیں رخصت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ الوداع تھا جو میری زندگی پر سب سے بھاری تھا۔ میں نہیں جانتا کہ روح کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہو گی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری روح کے دھاگے اُدھڑ رہے ہوں، اس کا ریشہ ریشہ الگ ہو رہا ہو، کاش یہ میری زندگی کا آخری الوداع ہو..... کاش اس آخری الوداع کے ساتھ ہی میں بھی مٹ جاؤں کیونکہ اب مجھ میں مزید کوئی اور الوداع جھیلنے کی اک ذرا سی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس آخری الوداع نے مجھے ریت کا بنا کر رکھ دیا تھا..... خشک ریت کا..... جسے ہلکی سی ہوا کا جھونکا بھی ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن وہ جو دروازے کے پاس پہنچ کر رُک سی گئی تھیں۔ اُن کی پُتلو تلے جُھکی نظریں نہ جانے کسے تلاش کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مطلوبہ ہستی کو قریب نہ پا کر گھونگٹ کے نیچے سے ہی نظریں اُٹھائیں۔ میری نظر تو انہی پر جمی ہوئی تھی۔ ہماری نظریں ٹکرائیں اور میں پل بھر میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ اُن کی بھیگی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور تیر کی طرح میرے دل کی زمین میں پیوست ہو گیا۔ میرے دل سے اپنی عمر بھر کی دعاؤں کے بدلے صرف ایک ہی دُعا نکلی کہ "یارب..... اس پھولوں جیسی لڑکی کی یہ قربانی رائیگاں نہ جانے دینا..... اب اس کے ہر دُکھ کا خاتمہ کر دے....."

میں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر اُنہیں الوداع کہا..... وہ ویسے ہی اپنی جگہ جمی ہوئی کھڑی رہیں اور میری جانب دیکھتی رہیں۔ سب مجھے دُور سے اشارہ کر کے اور آوازیں دے کر ڈھو کے قریب آنے کا کہہ رہے تھے، راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

"آدی وہ تیری وجہ سے رُکی ہوئی ہیں۔"

ڈھو کی نظر اب بھی مجھی پہ گڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی اُنگلی سے اپنی ناک دبائی، جیسے بچپن میں وہ دباتی تھیں، اور اپنی آنکھیں زور سے میچ کر کھول دیں۔ آنسوؤں کا ایک ریلہ ڈھو کی آنکھوں سے تمام بند توڑ کر نکلا اور اس کے بعد وہ مزید نہ رُک پائیں۔ عورتوں نے گھیر گھار کر اُنہیں گاڑی میں بٹھا دیا۔ سارے محلے کے ہاتھ لہراتے رہ گئے اور گاڑی دھیرے دھیرے چل پڑی۔ غیاث چچا سمیت چند محلے دار بھی بے اختیاری میں گاڑی کے ساتھ ہی چل پڑے۔ گاڑی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی محلے کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔ لوگ پیچھے رہ چکے تھے، میری بہتی آنکھیں اب بھی گاڑی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ گاڑی نے محلے سے باہر جانے والی سڑک پر اترنے کے لیے ایک لمبا سا موڑ کاٹا۔ پچھلے دروازے کی کھڑکی سے اندر بیٹھی ڈھو کی اک

آخری جھلک دکھائی دی۔ مجھے اتنی دُور سے بھی یوں محسوس ہوا کہ ان کی نظریں اب بھی میری ہی جانب اُٹھی ہوئی ہوں، انہوں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر اپنے محلے، اپنے میکے اور مجھے الوداع کہا اور گاڑی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہوتی چلی گئی۔

رُخصت ہوا تو ہاتھ ملا کر نہیں گیا
وہ کیوں گیا ہے یہ بھی بتا کر نہیں گیا
یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی لوٹ آئے گا
جاتے ہوئے چراغ بجھا کر نہیں گیا
شاید وہ مل ہی جائے.....مگر جُستجو ہے شرط
وہ اپنے نقشِ پا کو مٹا کر نہیں گیا
ہر بار مجھ کو چھوڑ گیا اِضطراب میں
لوٹے گا کب؟ کبھی وہ بتا کر نہیں گیا
رہنے دیا نہ اُس نے کسی کام کا مجھے
اور خاک میں بھی مجھ کو ملا کر نہیں گیا

ہاشم ندیم

1947ء کے مظالم کی کہانی
خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب وجگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پرنم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیار کیا۔

تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ.....کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش.....نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

اس کتاب کو کتاب گھر کے **تاریخ پاکستان** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ادارہ علم وعرفان پبلشرز کی دیگر کتب

34- اُردو بازار لاہور (فون 7352332-7232336-042)

کتب کی خریداری کے وقت کتاب گھر کا حوالہ دیجئے اور خصوصی ڈسکاؤنٹ حاصل کیجئے۔

اسلامی کتب

1	تفسیر ابن کثیر (اعلیٰ)	علامہ عماد الدین ابن کثیر	2200/-
2	تفسیر ابن کثیر	علامہ عماد الدین ابن کثیر	1800/-
3	قرآنی موضوعات	محمد شریف بقاء	600/-
4	Quranic Topics(Vol:1)	محمد شریف بقاء	600/-
5	Quranic Topics (Vol:2)	محمد شریف بقاء	600/-
6	قرآن کی 20 سورتیں	محمد شریف بقاء	70/-
7	قرآن کی 2 عظیم سورتیں	محمد شریف بقاء	70/-
8	قرآن اور ہماری زندگی	مولانا الیاس قادری	300/-
9	قرآن، بائبل اور سائنس	موریس بوکائے/مترجم: مسعود منتی	250/-
10	قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	160/-
11	منہاج القرآن	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	150/-
12	جانات قرآن	ڈاکٹر اقتدار احمد فاروقی	80/-
13	ہدایات قرآنی	مترجم: مولانا فتح محمد جالندھری	100/-
14	کعبہ پر پڑی جو پہلی نظر	پروفیسر محمد جاوید	300/-
15	قرآن حکیم اردو منظومات کے آئینے میں	مرتب: پروفیسر محمد جاوید اقبال	150/-
16	ربنا (قرآن میں مذکور انبیاء کرام کی دعائیں)	خواجہ انیس اقبال	60/-
17	قرآنی دعاؤں کا انسائیکلوپیڈیا	محمد شریف بقاء	120/-
18	قرآنی معجزات کا انسائیکلوپیڈیا	محمد شریف بقاء	120/-
19	سیرت النبیؐ اعلان نبوت سے پہلے	مسعود منتی، منصور احمد بٹ	400/-
20	بخاری شریف	ترجمہ و تشریح: مولانا ظہور الباری اعظمی	1660/-
21	حیات محمد ﷺ محمد حسین ہیکل	مترجم: ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	500/-
22	سیرت النبیؐ	شبلی نعمانی	850/-

23	معجزات محمدیؐ مکمل انسائیکلوپیڈیا	مسعود مفتی	600/-
24	انوار سماء الحسنیٰ	قیصر حیات	500/-
25	سیرت ہادی برحقؐ	گوہر ملسیانی	400/-
26	حضرت محمد ﷺ بطور ماہر معاشیات	حکیم ایم۔اے قاسم	300/-
27	طبیب اعظم ﷺ	حکیم ایم۔اے قاسم	300/-
28	سیرت سید البشر ﷺ	چوہدری غلام رسول چیمہ	500/-
29	مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ	چوہدری غلام رسول چیمہ	550/-
30	اسلام کا عمرانی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
31	اسلام کا سیاسی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
32	اسلامی کا معاشی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
33	اسلامی ریاست کے خدوخال	انور صدیقی	150/-
34	عشق مصطفیٰ ﷺ	کرنل سید سلیمان سرور گیلانی	100/-
35	آخرت کا خزانہ	کرنل سید سلیمان سرور گیلانی	150/-
36	طب نبویؐ اور اکیسویں صدی (جلد اوّل)	سیف اللہ سیکھو	250/-
37	طب نبویؐ اور اکیسویں صدی (جلد دوم)	سیف اللہ سیکھو	250/-
38	احادیث میں مذکورہ نباتات، ادویہ اور غذائیں	ڈاکٹر اقتدار احمد فاروقی	100/-
39	منتخب احادیث	مولانا محمد یوسف کاندھلوی	300/-
40	شمائل ترمذی	حضرت مولانا زکریا صاحب	250/-
41	درود لامحدود (حضور ﷺ کی شان میں پیش کیے گئے درود و سلام کا انسائیکلوپیڈیا)	خواجہ محمد انیس بھیروی	300/-
42	لاشریک (حمدیہ کلام)	مظفر وارثی	130/-
43	صاحب التاج (نیا نعتیہ مجموعہ)	مظفر وارثی	150/-
44	سیدنا ﷺ (نیا نعتیہ مجموعہ)	سلیم گیلانی	130/-
45	میٹھا میٹھا ہے میرے محمد ﷺ کا نام (نعتیہ انتخاب)	عمران چوہدری	150/-
46	صل علی کہتے کہتے	عبدالرزاق	100/-
47	تاجدار حرم ﷺ (نعتیہ مجموعہ)	فرحت عباس شاہ	120/-
48	میرے آقا آئے جھوموں	فرحان قادری	150/-
49	سبز گنبد کے سائے تلے	اویس رضا قادری	150/-
50	سبز گنبد کے سائے تلے (پیپر بیک)	اویس رضا قادری	100/-
51	تخلیق کائنات	محمد اسلم لودھی	200/-

52	کارگل سے واپسی کیوں	محمد اسلم لودھی	120/-
53	رفیق پیغمبر صدیق اکبرؓ	ساجد الرحمٰن اکمل	100/-
54	حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ	محمد حسین ریکل	250/-
55	حضرت عمر فاروق اعظمؓ	محمد حسین ریکل	330/-
56	فقہ عمرؓ	مترجم: ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	300/-
57	حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے	ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	150/-
58	زندگی کے نمونے	ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	75/-
59	مکالمات نبوی ﷺ	ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	70/-
60	الفاروق (حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح حیات)	علامہ شبلی نعمانی	200/-
61	تفہیم اسلام	سلیم گیلانی	150/-
62	حضرت بلال رضی اللہ عنہ	سلیم گیلانی	300/-
63	سیرت عائشہؓ	سید سلمان ندوی	200/-
64	خطبات ذاکر نائیک		300/-
65	غازی علم الدین شہید	خولہ متین	150/-
66	عشرہ مبشرہؓ	عبدالرشید عراقی	400/-
67	زیردستوں کی آقائی	مولانا عبدالرحمٰن	100/-
68	صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈ لیم	350/-
69	سکندر اعظم	مقصود شیخ	250/-
70	چنگیز خان	مقصود شیخ	180/-
71	ہٹلر	مقصود شیخ	250/-
72	دہشت زدہ گرد (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
73	نمیل (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
74	کالک (ناول)	(علی نواز شاہ)	150/-
75	مجاہد اسلام ٹیپو سلطان	شمیم علی خان	120/-
76	احمد شاہ ابدالی	قیصر علی آغا	80/-
77	محسن پاکستان نا کردہ گناہوں کا قیدی	فضل حسین اعوان	250/-
78	محسن پاکستان۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان	عمران چوہدری	300/-
79	ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال	گورڈن کوریرا مترجم: قاضی اختر جونا گڑھی	150/-
80	عزم کے کوہ گراں	فضل حسین اعوان	250/-
81	نپولین بوناپارٹ	روبینہ ناز	150/-

82	اکبر بادشاہ اور بیربل کی داستانیں	امیر علی خان	300/-
83	اکبر بادشاہ کے 9 رتن	امیر علی خان	300
84	اکبر نامہ	مسعود مفتی	200/-
85	پنجاب کے آثار قدیمہ	ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ	200/-
86	لاہور اور خطاطی (5 کلر آرٹ پیپر)	ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ	2500/-
87	جھوٹے نبیوں کا انجام	سید ارتضیٰ علی کرمانی	300/-
88	20 صدی کی 100 اہم مسلم شخصیات	عمران چوہدری	150/-
89	اسلام، سائنس اور مسلمان	ابو علی عبدالوکیل	250/-
90	داستان سرائے کا مسافر (اشفاق احمد)	ابو عبدالوکیل	100/-
91	100 عہد ساز شخصیات	حمیر ہاشمی/اسلم انصاری	250/-
92	حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا تصور توحید	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	60/-
93	مولانا مودودی سے مولانا نعمانی کے اختلافات کا علمی جائزہ	اختر حجازی	120/-
94	برصغیر پاک و ہند میں علماء اہلحدیث کے علمی کارنامے	عبدالرشید عراقی	100/-
95	مولانا رومی کا نظریہ عشق	موسیٰ خان جلال زئی	220/-
96	فلسفۂ روح انسانی	موسیٰ خان جلال زئی	100/-
97	خطبات ڈاکٹر ذاکر نائیک	ڈاکر نائیک (مترجم سید امتیاز احمد)	400/-
98	نجومیوں کی کارستانیاں	حافظ محمد یحییٰ	150/-
99	کشف المحجوب	حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ مولانا میاں محمد رمضان علی	280/-
100	تذکرہ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ	(حکیم سید امین الدین دہلوی)	36/-
101	پنجاب کے عظیم صوفی شعراء	خالد پرویز ملک	150/-
102	پنجاب اور اہل پنجاب	خالد پرویز ملک	200/-
103	ذکر وارث شاہ	خالد پرویز ملک	180/-
104	حیات و تعلیمات اور کلام باہو رحمۃ اللہ علیہ	خالد پرویز ملک	100/-
105	حیات و تعلیمات اور کلام فرید رحمۃ اللہ علیہ	خالد پرویز ملک	100/-
106	حیات و تعلیمات اور کلام وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ	خالد پرویز ملک	100/-
107	حیات و تعلیمات اور کلام بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ	خالد پرویز ملک	100/-
108	حیات و تعلیمات اور کلام محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ	خالد پرویز ملک	100/-
109	حقیقت تصوف اور حضرت بوعلی قلندر	علامہ محمد جاوید	80/-
110	روحانیت کے تاجدار	پروفیسر اویس لطیف عبداللہ	120/-
111	شان اولیاء	احمد مصطفیٰ صدیقی	120/-

112	اڑھائی قلندر	حکیم لیاقت علی سہروردی	200/-
113	درویش	حکیم لیاقت علی سہروردی	160/-
114	اللہ کی نیک بیبیاں	عبدالرب درویش	160/-
115	حسین بن منصور حلاج حیات و کلام	ثمینا مجید	280/-
116	حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا	مسعود مفتی	120/-
117	آثار زندگی	قلب حسین وڑائچ	150/-
118	ریزہ فکر	قلب حسین وڑائچ	200/-
119	افکار صداقت	قلب حسین وڑائچ	200/-
120	زندہ لمحوں کا احساس	قلب حسین وڑائچ	250/-
121	انسان اور حقیقت	قلب حسین وڑائچ	350/-
122	ضمیر شب کا سفر	قلب حسین وڑائچ	300/-
123	نوید صبح	میاں عبدالحمید	300/-
124	تربیت اولاد کا اسلامی نظام	السید عبداللہ ناصح علوان	250/-
125	تحفہ خواتین (اعلیٰ)	مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری	250/-
126	نایاب ذخیرہ		120/-
127	تاریخ اسلام (2 جلد مکمل سیٹ)	شاہ معین الدین ندوی رحمۃ اللہ علیہ	550/-
128	تاریخ اسلام (3 جلد مکمل سیٹ)	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	600/-
129	بہشتی زیور (مدلل)	مولانا اشرف علی تھانوی	380/-
130	تاریخ اندلس	حافظ مختار مدراح پوری	300/-
131	تاریخ ایران قدیم	محمد حیات خان	150/-
132	تاریخ ملت اسلامیہ	محمد حیات خان	500/-
133	فضائل اعمال	مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ	250/-
134	غنیۃ الطالبین (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ)	ترجمہ: علامہ ظہیر الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ	280/-
135	تعبیر الرویا	علامہ ابن سیرین	250/-
136	لبیک	ممتاز مفتی	180/-
137	حج و عمرہ پاکٹ	امتیاز علوی	45/-
138	سرزمین آسمان میں چند روز	جمیل احمد عدیل (سفرنامہ عمرہ)	126/-
139	رواداری اور مغرب؟	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	200/-
140	رواداری اور پاکستان	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	200/-
141	قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں	مولانا حضرت عبدالکریم پاریکھ	200/-

142	پاکستان کی اسلامی اساس اور جدید تقاضے	کے۔ایم۔اعظم	400/-
143	قومی ہیروز (حصہ اول)	محمد اسلم لودھی	250/-
144	قومی ہیروز (حصہ دوم)	محمد اسلم لودھی	250/-
145	افواج پاکستان	محمد اسلم لودھی	300/-
146	رشتے محبتوں کے	محمد اسلم لودھی	200/-
147	وطن کے پاسبان	محمد اسلم لودھی	150/-
148	محترمہ فاطمہ جناح حیات وافکار	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	200/-
149	محترمہ فاطمہ جناح حیات وافکار (کارڈ)	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	15/-
150	بلوچ تاریخ کے آئینے میں	مظہر علی لاشاری	150/-
151	پارلیمنٹ میں قادیانی شکست	مولانا اللہ وسایا	300/-
152	نگاہ عشق دل زندہ	مہر نگاری مصطفوی	100/-
153	نزول مسیح آخر کیوں؟	نور محمد قریشی ایڈووکیٹ	60/-
154	تعلیم الاسلام	مولانا مفتی کفایت اللہ	60/-
155	کامیابی کیا ہے؟	مولانا محمد عمر پالنپوری	24/-
156	مجموعہ علم وحکمت	سید مسعود رحمن شاہ	100/-
157	تحفۃ العروس	علامہ محمود مہدی	250/-
158	تحفہ برائے دلہن	مولانا حافظ محمد اسلم زاہد	250/-
159	A Pound of Flesh	S-Hamgah Saleem Gilan	80/-
160	اسمائے الحسنیٰ واسمائے نبیؐ (بڑی)	فور کلر آرٹ پیپر	180/-
161	اسمائے النبی ﷺ	فور کلر آرٹ پیپر	60/-
162	اسمائے الحسنیٰ واسمائے نبیؐ (اکٹھی)	فور کلر آرٹ پیپر	60/-
163	کامیاب زندگی کا تصور	پروفیسر انور دل	100/-
164	گھریلو آزمودہ نسخوں کا انسائیکلوپیڈیا	مرتب: سید امتیاز علی تاج	150/-
165	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مولانا سعید الرحمن علوی	120/-
166	فیض غوث (مجموعہ افادات مولانا ہزاروی)	مولانا غلام غوث ہزاروی	80/-
167	انوار خطابت	پروفیسر مولانا ہارون الرشید	150/-
168	سفر حج وعمرہ مع اہم فتاویٰ	حافظ مظفر محسن	150/-
169	مسلمان خواتین کے بیس سبق	مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب	24/-
160	تحفۃ النکاح	حضرت مولانا ابراہیم صاحب بالن پوری	120/-
161	آداب مباشرت	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ	20/-

162	سجدہ سہو کے مسائل	مفتی حبیب الرحمٰن مرادآبادی	20/-
163	خطبات بمبئی	مولانا محمد منظور نعمانی	100/-
164	روشنی	مولانا محمد متین ہاشمی	250/-
165	مشاہیر اسلام کی نصیحتیں (وصایا)	افتخار فریدی	70/-
166	اسلام میں غلامی کی حقیقت	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	200/-
167	1857ء پہلی جنگ آزادی	میاں محمد شفیع	250/-
168	ہزارہ گزیٹئر	ڈی۔ایچ۔دانسن/ پروفیسر افتخار احمد	250/-
169	تاریخ ہزارہ	ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی	250/-
170	دولت غزنویہ	مولانا محمود الرحمٰن ندوی	250/-
171	نبی کریم ﷺ کی مبارک سنتیں	مولانا ابوالمظفر ظفر احمد قادری	120/-
172	بہار شباب	حکیم غلام محمود خاں	120/-
173	قرب الٰہی (عبادات کی روشنی میں)	مسز جوہر	150/-
174	وادی کاغان	منصف خان سحاب	200/-
175	مشرق کا سوئٹزرلینڈ.....وادی سوات	محمد پرویش شاہین	80/-
176	کافرستان کے رسم ورواج	محمد پرویش شاہین	80/-
177	سوات.....کوہستان	محمد پرویش شاہین	80/-
178	دیر.....کوہستان	محمد پرویش شاہین	100/-
179	وادی چترال	محمد پرویش شاہین	100/-
180	ہماری حقیقت (سائنس انسان اور کائنات)	محمد آفتاب	200/-
181	شیخ اکبر۔محی الدین ابن عربی	محمد شفیع بلوچ	300/-
182	پرفیشنل پیومیشن بینئے	آسیہ آرزو	130/-
183	فضائل درود شریف	مولانا محمد زکریا ؒ	120/-
184	آداب الدعا	مولانا محمد اجمل خان	150/-
185	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مولانا سعید الرحمٰن علوی	150/-
186	فضائل رمضان	مولانا محمد زکریا ؒ	80/-
187	آئینہ سلوک (یعنی شرح سیف الملوک)	میاں محمد بخش/ محمد خلیل ثاقب	350/-
188	مجموعہ مسائل، علم شریعت وعلم تصوف	خوشی محمد عاصی	500/-
189	قلم خدا کے لئے (ایک بھیانک سازش)	رضوان یوسف	150/-

مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب

☆ لسان القرآن (3 جلد)	480/-	☆عقلیات ابن تیمیہ	200/-
☆ مطالعہ قرآن	180/-	☆ چہرۂ نبوت قرآن کے آئینے میں	150/-
☆ مطالعہ حدیث	200/-	☆مسلمانوں کے عقائد وافکار (مکمل سیٹ)	400/-
☆ افکار ابن خلدون	200/-	☆ تعلیمات غزالی	300/-
☆ افکار غزالی	250/-	☆ سرگزشت غزالی	100/-
☆ مسئلہ اجتہاد	200/-	☆ تہافتہ الفلاسفہ	140/-

حکیم محمد طارق محمود چغتائی کی شہرہ آفاق کتب

1947ء کے مظالم خود مظلوموں کی زبانی	250/-	☆ مشاہیر کی آپ بیتیاں	150/-
☆ جذبات اور خیالات کے روگ نبوی ﷺ طریقے اور جدید سائنس	120/-	☆ پرسکون زندگی کی تلاش نبوی ﷺ طریقے اور جدید سائنس	120/-
☆ پرکشش زندگی گذارنے کے گر علاج نبویؐ اور جدید سائنس	120/-	☆ نوجوانوں کی جنسی الجھنیں علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-
☆ قدرتی ٹانک اور علاج نبویؐ	120/-	معالجات نبویؐ اور جدید سائنس (جلد اوّل تا چہارم)	800/-
☆ کینسر کو شکست	140/-	☆ جادو جنات، اسلام اور جدید سائنس	200/-
☆ آسان نیکیوں کے حیرت انگیز فضائل (انگلش)	200/-	☆ہیپاٹائٹس کا سائنسی اور روحانی علاج	80/-
☆ شوگر کا سائنس اور روحانی علاج	120/-	☆ شگفتہ باتیں، بکھرے موتی، انمول یادیں	120/-
مہلک عادات نبویؐ طریقے اور جدید سائنس	90/-	صحت مند عادات نبویؐ طریقے اور جدید سائنس	90/-
مہلک غذائیں نبویؐ غذائیں اور جدید سائنس	90/-	مہلک دوائیں نبویؐ دوائیں اور جدید سائنس	80/-
ہائی بلڈ پریشر کا سائنسی اور روحانی علاج		☆ جنید جمشید گلوکاری سے پرہیز گاری تک	70/-
☆نوجوانوں کے جنسی مسائل علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-	☆ازدواجی مسائل علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-
☆ شاداب زندگی کے راز		☆بدترین خصلتوں کا بہترین علاج	120/-
☆امراض معدہ علاج نبوی اور جدید سائنس	200/-	☆ شوگر کا کامیاب علاج	80/-
☆روحانی پاکیزگی	200/-	کولیسٹرول کا سائنسی اور روحانی علاج	120/-
☆ گھریلو الجھنوں کا روحانی علاج	120/-	☆موٹاپے سے نجات علاج نبویؐ اور جدید سائنس	120/-
☆بدترین خصلتوں کا بہترین علاج	120/-	☆ کمالات اولیاء	120/-
☆روحانی عامل کی خفیہ ڈائری	150/-	☆خواتین کے حسن و جمال کے قیمتی راز	200/-
☆آداب معرفت	120/-	☆شاداب زندگی کے راز	120/-
☆ہارٹ اٹیک سے بچاؤ کی سائنسی اور روحانی ترکیب	120/.		

محمد متین خالد کی ایمان افروز کتب

☆احمدی دوستو تمہیں اسلام بلاتا ہے۔	250/-	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے (انگلش)	
☆ مرا پیمبر ﷺ عظیم تر ہے (نعتیہ انتخاب)	180/-	☆ شہیدان ناموس رسالت ﷺ	250/-
☆ معرفت اسم محمد ﷺ	150/-	☆ جب حضور ﷺ آئے	180/-
☆ ثبوت حاضر ہیں؟	400/-	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے	200/-
☆اسلام کا سفیر (قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ)	250/-	☆ قادیانیت سے اسلام تک	200/-
☆ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ قادیانیت	400/-	☆مولانا وحید الدین خاں۔اسلام دشمن شخصیت	200/-
☆ غازی عامر چیمہ (رحمۃ اللہ علیہ)	200/-	☆ قادیانیت اُس بازار میں	180/-

مسعود مفتی کی بصیرت افروز کتب

☆خواتین کا مکمل اسلامی انسائیکلوپیڈیا	350/-	☆ غزوۃ النبی ﷺ	500/-
☆ صلح حدیبیہ	100/-	☆ غزوہ خندق	100/-
☆ غزوہ موتہ	100/-	☆ غزوہ اُحد	100/-
☆ جنگ بدر	100/-	☆ فتح مکہ	150/-
☆ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اسلام دشمنی	150/-	☆سورہ توبہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆سورہ بقرہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆سورہ آل عمران سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆سورہ فاتح سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ہمارے بچوں کے پیارے نام	150/-
☆سیرت نبی کا انسائیکلوپیڈیا (سوالاً جواباً)	300/-	☆ زندہ اقوال	250/-
☆ برجوں پر مکمل کتاب	120/-	☆ دنیا کے تمام ممالک کا انسائیکلوپیڈیا	500/-
☆ اسلامی ناموں کی ڈکشنری	240/-	☆ بیوی محبت کیوں کرے!	60/-
☆ صلی علیٰ کہتے کہتے (نعتیہ مجموعہ)	75/-	☆تاریخ کی کرپٹ ترین عورتیں	150/-
☆ اسلامی ناموں کا گلدستہ	150/-	☆ برجوں کا مکمل انسائیکلوپیڈیا	250/-
☆ اسلامی ناموں کا انسائیکلوپیڈیا	100/-		

روحانی کتب سیّد علی حسین شاہ

☆	بچوں اور بڑوں کے برکت والے نام	240/-	مفیض العملیات وتعویذات	250/-
☆	جادو کا آسان اور شرطیہ علاج (حصہ اوّل)	200/-	جادو کا آسان اور شرطیہ علاج (حصہ دوم)	200/-
☆	سورۃ الکافرون سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورۃ یٰسین سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	75/-
☆	شرائط چلہ	60/-	سورۃ اخلاص سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	بسم اللہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورۃ الفلق سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورۃ الناس سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورۃ یٰسین آرٹ پیپر (مجلد)	80/-

روحانی کتب علامہ محمد جاوید

☆	جنات آسیب جادو کا توڑ	-/200	
☆	سورہ جن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ مریم سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورۃ الکوثر سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ رحمٰن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	آیت الکرسی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ جن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	اسمائے محمد ﷺ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ یوسف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	حقیقت تصوف اور حضرت بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ	-/80	
☆	سورہ حم السجدہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورۃ فاتحہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	درود شریف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ مزمل سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	نفلی نمازوں سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	سورہ ملک سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	اسمائے الٰہی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	
☆	مختصر کلمات سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	-/60	

روحانی کتب خواجہ انیس اقبال

-1	درود لامحدود	خواجہ انیس اقبال	-/300
-2	دعائیں (قرآن میں مذکور انبیاء کرام کی دعائیں)	خواجہ انیس اقبال	-/60
-3	دل کے تجربے میں	خواجہ انیس اقبال	-/60
-4	فقیر کی دنیا	خواجہ انیس اقبال	-/50
-5	فقیر کی حاضری	خواجہ انیس اقبال	-/60
-6	دعائے سیفی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	خواجہ انیس اقبال	-/60
-7	اللہ اللہ کرتے رہیے	خواجہ انیس اقبال	-/60
-8	استخارہ اور بدنظری کا علاج	خواجہ انیس اقبال	-/120

ضمنی و روحانی کتب

-1	روحانی تعویذات کی ڈائری	صوفی محمد ندیم	-/250
-2	پنج سورۃ وظیفہ مفتی	امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ	-/70
-3	قرآنی دعاؤں سے روحانی علاج	امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ	-/50
-4	سورہ یٰسین (معمرا) بڑی -/10	سورہ یٰسین (معمرا) چھوٹی	-/8
-5	جواہرات ستارے اور طبی علاج	حکیم اقبال	-/120
-6	ہومیو میڈیسن اور صحت	ڈاکٹر آر اے امتیاز	-/80
-7	امراض اور ہومیو ادویات	ڈاکٹر آر اے امتیاز	-/80
-8	طبیب اعظم	حکیم ایم اے قاسم	-/250
-9	بلڈ پریشر	حکیم ایم۔اے قاسم	-/40
-10	شوگر کا علاج خود کریں	حکیم ایم۔اے قاسم	-/36

-11	کشنج کا علاج خود کریں	حکیم ایم۔اے قاسم	40/-
-12	ہیپاٹائٹس میں آپ تنہا نہیں	حکیم ایم اے قاسم	50/-
-13	نوجوانوں کے جنسی و نفسیاتی مسائل (علاج مردانہ)	ہومیو ڈاکٹر محمد اشرف قریشی	100/-
-14	اپنا پرائز بانڈ خود نکالیں	عابد خاں	100/-
-15	دوا غذا اور شفا	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	300/-
16	زلزلہ زیارت اور زندگی	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	250/-
17	میرج گائیڈ	ڈاکٹر جاوید اقبال	300/-
18	نسوانی حسن	ڈاکٹر جاوید اقبال	200/-
19	آزادی نسواں زوال نسواں	ڈاکٹر جاوید اقبال	150/-
20	خطرناک بیماریوں کا قدرتی علاج	الحاج مسعود احمد خان دُرانی	300/-
21	قدرتی غذاؤں کا انسائیکلوپیڈیا	الحاج مسعود احمد خان دُرانی	300/-
22	ماورائی علوم کا خلاصہ اور عمل	اے عہد مسافر	200/-
23	ڈپریشن کا جدید طریقہ علاج (یوگا مراقبہ)	اے عہد مسافر	120/-
24	سمر ہیلنگ انرجی	اے عہد مسافر	100/-
25	ڈیل سائنسز	اے عہد مسافر	120/-
26	مخزن المفردات	حکیم کبیر الدین	170/-

اقبالیات پر بہترین کتب

☆ کامیابی کے سات اصول (مفکر اسلام علامہ اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں) حسن رازی			40/-
☆ اسلامی فکر کی نئی تشکیل (خطبات اقبال) مترجم: شہزاد احمد			150/-
The Reconstruction of Religious thought In Islam (علامہ اقبال کے 7 مشہور و معروف خطبات)			150/-
☆ اقبال کا نور بصیرت از علامہ اقبال۔ شرح: محمد شریف بقاء (اقبال کی تین طویل نظمیں مسجد قرطبہ، ابلیس کی مجلس شوریٰ، پیر و مرید)			300/-
☆ کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ)	700/-	☆ کلیات اقبال (کلاں)	300/-
☆ کلیات اقبال (پاکٹ)	200/-	☆ بانگ درا	150/-
☆ ضرب کلیم	120/-	☆ بال جبریل	120/-
☆ شکوہ جواب شکوہ (فرہنگ اور شرح کے ساتھ) از علامہ اقبال۔ شرح: محمد شریف بقاء			180/-
☆ شکوہ جواب شکوہ	15/-	☆ کلیات اقبال (عوامی ایڈیشن)	200/-
☆ ذکر حسینؓ اور اقبال (محمد شریف بقاء)	100/-	☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ اوّل)	40/-
☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ دوم)	60/-	☆ " " (حصہ دوم) از: حسن رازی	40/-

نثر، شاعری، افسانہ			
-1	گلاب سے ہونٹ (آرٹ پیپر+فورکلر)	علوینہ فیصل	150/-
-2	دل جسے اپنا کہتا ہے	علوینہ فیصل	150/-
-3	کاجل تیری آنکھوں کا	علوینہ فیصل	150/-
-4	پیار کا پہلا سال (فورکلر)	علوینہ فیصل	150/-
-5	خوشبو اُداس کرتی ہے	علوینہ فیصل	150/-
6	ہونٹ غزل کے دو مصرعے	علوینہ فیصل	140/-
7	میرے ہو کے رہو	وسی شاہ	250/-
8	میرے ہو کے رہو (نعتیہ)	وسی شاہ	300/-
9	چاہتوں کی بارش	حنا نیخ	150/-
10	ابھی یہ خواب مت دیکھو (شعری مجموعہ)	خالد بن حامد	150/-
11	رنگ حنا (شعری مجموعہ)	حنا نیخ	150/-
12	کچ رہا ایسا ہو جائے	خالدہ رشید	150/-
13	پہلی سانس محبت کی	ضیاء اللہ قریشی	130/-
14	شرح دیوان غالب	ناصر دہلوی	250/-
15	دیوان غالب	مرزا اسد اللہ خاں غالب	200/-
16	دیوان غالب (پاکٹ)	مرزا اسد اللہ خاں غالب	100/-
17	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	ساغر صدیقی	250/-
18	کلیات ساغر صدیقی	ساغر صدیقی	180/-
19	کلیات ساحر لدھیانوی	ساحر لدھیانوی	220/-
20	نیم کو صندل کر دو	انتخاب: ندیم رضا	150/-
21	اِقامت چاہو اُسے	بشیر بدر	150/-
22	ٹاپ 10 شاعر	معاذ حسن	300/-
23	ٹاپ 10 شاعرات (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)	معاذ حسن	300/-
24	ٹاپ 20 کلاسک شاعر	مسعود مفتی	200/-
25	100 مشہور و معروف غزلیں	معاذ حسن	150/-
26	شاہکار شاعری (نظمیں، غزلیں، گیت)	علیم اقبال	120/-
27	تیرے پیار کا موسم (انتخاب غزلیات)	ایمان علی	120/-
28	کہو تو اک شام چرا لوں	انتخاب شہباز اشرف	150.-
29	دو چار دن کا ساتھ	ایم۔ نعیم	150/-

34- اُردو بازار لاہور (فون 042-7352332-7232336)

30	بیسویں صدی کی مشتہیر غزلیں	عاصمہ مشتاق	120/-
31	دیوان میر تقی میر	علامہ اقبال	75/-
32	التباس	شہاور اسحاق	150/-
33	جلتے ہاتھ	محمد جمیل پرواز	160/-
34	موسم ابر آلودہ تھا (غزلیات)	افتخار احمد عاطر	150/-
35	کچھ دیر پہلے سحر سے (غزلیات)	افتخار احمد عاطر	180/-
36	گلاب آغوش	افتخار احمد عاطر	
37	تیرے وجود کی ٹھنڈی چھاؤں	افتخار احمد عاطر	
38	میٹھے بول میں جادو	ڈیل کارنیگی	250/-
39	تتلیوں کے شہر میں	فیصل محمود	130/-
40	پل دو پل کی چاہت میں	صابر ظفر	250/-
41	پھول میرے گلشن کا	سلیم احمد صدیقی	120/-
42	محبت جب سے وہ کرنے لگے ہیں	شہزاد احمد۔انتخاب گلفراز احمد	150/-
43	آپ سا نہیں کوئی (شعری مجموعہ)	اختر شمار	130/-
44	دیکھا جو تیر کھا کے (شعری مجموعہ)	مظفر وارثی	120/-
45	اردو افسانے میں رومانی رجحانات	ڈاکٹر محمد عالم خان	200/-
46	مقالات اجمل	ڈاکٹر محمد اجمل	200/-
47	ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتوح	400/-
48	مقالات محمد حسن عسکری (حصہ اول)	مرتبہ: شیما مجید	300/-
49	مقالات محمد حسن عسکری (حصہ دوم)	مرتبہ: شیما مجید	300/-
50	مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	90/-
51	باغ و بہار (فرہنگ کے ساتھ)	میر امن دہلوی	180/-
52	فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	80/-
53	مسدس حالی (جدید ایڈیشن)	مولانا الطاف حسین حالی	100/-
54	مضامین شورش	مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال	250/-
55	وحدت علی		80/-
56	خون جگر ہونے تک	صاحبزادہ خورشید گیلانی	250/-
57	محاکمہ دیوان غالب نسخہ لاہور مسروقہ	پروفیسر جعفر بلوچ/رفاقت علی شاہد	200/-
58	آج کی بات	توصیف احمد خان	150/-
59	برجستہ (کالم)	جمیل احمد عدیل	200/-

60	حرفِ ملاقات (نامور ادیبوں کے انٹرویوز)	عمران نقوی	200/-
61	اک ہجر جو ہم کو لاحق ہے (لازوال عشقیہ خطوط)	جواز جعفری	150/-
62	اپنے چاند کے لئے	اشتیاق احمد ناصح	150.-
63	تنہا مسافر	امیر حمزہ لون	175/-
64	شامِ تنہائی	محمد زاہد نواز ددھاوا	150
65	زمانے کی ٹھوکریں	اصغر شاہ اصغر	200/-
66	جب بھی دیکھا اداس دیکھا	حافظ مظفر محسن	120/-
67	پیار کے دھیکے دو پل	حافظ مظفر محسن	180-
68	محبت مر نہیں سکتی	ندیم گیلانی	140/-
69	میرے لفظ	حسن ساحل	200/-
70	تذکرہ الشعراء	عبدالرشید عراقی	200/-

پاکستان کے نامور کالم نگار جاوید چوہدری کی کتب

☆	زیرو پوائنٹ نمبر 3	350/- زیرو پوائنٹ نمبر 4	350/-

نوجوان نسل کے شاعر سعید واثق کی کتب

☆	دل میں تم مہکتے ہو (نیا شعری مجموعہ)	150/- ☆ محبت ہو گئی تم سے	150/-

منفرد لہجے کے شاعر اعتبار ساجد کی کتب

☆	مجھے اس قدر نہ چاہو (نیا شعری مجموعہ)	180/-	☆ روز زیارت کرتے ہیں	150/-
☆	سُرخ گلابوں کا موسم	180/-	☆ اک عشق ضروری ہے	120/-
☆	محبت ہو تو ایسی	150/-	☆ ترے انتظار کے شہر میں (کلیات)	600/-
☆	یہ موسم یونہی بیت گیا	150/-	☆ تمہیں کتنا چاہتے ہیں	150/-
☆	یہ شام تمہارے نام	180/-	☆ کوئی بات کرنی ہے چاند سے	150/-
☆	وہی اک زخم گلاب سا	150/-	☆ یہ تنہائی مجھے دے دو	180/-
☆	مجھے کوئی شام اُدھار دو	200/-	☆ دل کی دہلیز پر	150/-
☆	وہ سنہری دھوپ کہاں گئی	150/-	محبت پھول جیسی ہے	150/-
☆	گلوب پر دستک	180/-	ابھی آگ سرد نہیں ہوئی	150/-
☆	مرے خط مجھے واپس کر دو	130/-	شاعری کیسے کریں؟	150/-

پاکستان کے مقبول ترین شاعر منان قدیر کی کتب			
☆	ہم نہ ملتے تو اچھا تھا -/150	تم اداس مت ہونا	150/-
☆	کب آؤ گے -/180	مجھے تم سے محبت ہے	150/-
☆	تم اکثر یاد آتے ہو -/150	میری آنکھیں نیند سے بھر دو	180/-
☆	تمہیں کیسے مناؤں؟ -/150	کیا ہے پیار پتھر سے	200/-

طنز و مزاح

1	واہ بھئی واہ	اعتبار ساجد	150/-
2	ہاؤس فل	اعتبار ساجد	150/-
3	اُردو کی درمیانی کتاب	ڈاکٹر مشتاق احمد سحر	200/-
4	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	60/-
5	چکن فالودہ (بہترین مزاحیہ شاعری کا انتخاب)	انتخاب: گل فراز احمد	150/-
6	لطیف A (دنیا بھر کے انعام یافتہ لطیفے)	گل فراز احمد	150/-
7	ٹاپ 10 مزاح گو شاعر	گل فراز احمد	250/-
8	مکمل مزاحیات	معاذ حسن	250/-
9	مزاح نگار حاضر ہوں	پروفیسر جمیل احمد عدیل	250/-
10	شرطیہ میٹھے (دنیا بھر کے انعام یافتہ لطیفے)	ایم۔ایم۔خالد	200/-
11	خوبصورت لطائف	ستار طاہر	80/-
12	منتخب لطائف	ستار طاہر	80/-
13	دل کے آس پاس (طنز و مزاح)	انجم انصار	150/-
14	خوبصورت مسکراہٹیں (لطائف)	محمد قیصر چوہان	70/-
15	قلمی دشمنی (طنز و مزاح)	اشفاق احمد ورک	120/-
16	مابدولت (طنز و مزاح)	عارفہ صبح خان	150/-
17	شٹ اَپ (طنز و مزاح)	عارفہ صبح خان	120/-
18	کرکرے کردار (طنز و مزاح)	عارفہ صبح خان	120/-
19	تجاہل عارفانہ	عارفانہ صبح خان	300/-
20	بوٹا مائی فرینڈ	حافظ مظفر محسن	120/-
21	ہلمٹ لفافہ اور سیاسی آلودگی	حافظ مظفر محسن	150/-
22	چڑیا گھر (مزاحیہ شاعری)	مجذب چشتی	100/-

معلومات عامہ، اقوال زریں

1	Management & People In Banking	Ch. Mushtaq Ahmad (بینکنگ کے امتحان کیلئے رہنما کتاب)	200/-
2	PLEASING VOICES (انگریزی تقاریر)	Prof. Muhammad Akram Tahir	150/-
3	علم الاعداد کا مکمل انسائیکلوپیڈیا	منصور احمد بھٹی	180/-
4	دست شناسی کا انسائیکلوپیڈیا	محمد زاہد گوگی	250/-
5	بہترین انعامی تقریریں		120/-
6	اپنا انٹرویو خود کیجئے!	خان اکبر علی خان	100/-
7	اقوال محبت کا انسائیکلوپیڈیا	خان اکبر علی خان	100/-
8	اسرار النجوم	ملک زاہد محمود اعوان	200/-
9	حقیقتوں کا سفر (اقوال زریں)	پروفیسر محمد نصیر خان	200/-
10	عالمی معلومات کا انسائیکلوپیڈیا	فیصل بٹ	200/-
11	دنیا کے 70 عجوبے (4 کلر)	شاہد لطیف	600/-
12	100 عظیم مہمات	قیصر چوہان	300/-
13	سٹارز (12 کتب کا سیٹ برج)	کامران امجد	40/-
14	فلمی دنیا پر حکمرانی کرنے والے خوبصورت چہرے	زاہد گوگی	300/-
15	بیسویں صدی کا انسائیکلوپیڈیا	اعظم شیخ	400/-
16	ناگاپربت کے حضور (سفرنامہ)	اجمل سعید پراچہ	200/-
17	گنز بک آف ورلڈ ریکارڈ 2002 (اُردو)	مترجم: اعظم شیخ	400/-
18	کون، کب اور کیا؟	قیصر علی آغا	150/-
19	کون بنے گا کروڑ پتی!	یاسر فراز	40/-
20	عقلوں کا نچوڑ	مترجم: مقصود شیخ	200/-
21	انسانی و قدرتی وسائل کا استعمال	اورنگزیب تنویر سہروردی	100/-
22	علمی تقریریں	عمران چوہدری	150/-
23	فن خطابت	نجمہ منصور	120/-
24	ستارے اپنی اپنی قسمت کے	حافظ مظفر محسن	90/-
25	بیت بازی	فرحت عباس، نجمہ منصور	120/-
26	ضرب المثل اشعار	حافظ مظفر محسن	130/-
27	جدید تقریریں	اشتیاق الرحمٰن چوہدری	120/-
28	عقل والوں کے لیے حکایات	ابوعلی عبدالوکیل	300/-

عالمی شہرت یافتہ پامسٹ ایم۔اے ملک کی کتب

	اسرار دست شناسی	ایم۔اے ملک	350/-
	بیسوی صدی کی پیشین گوئی	ایم۔اے ملک	150/-

سعادت حسن منٹو کی کتب

1-	کلیات منٹو 1۔ (افسانے)	سعادت حسن منٹو	600/-
2-	کلیات منٹو 2۔ (افسانے)	سعادت حسن منٹو	600/-
3-	کلیات منٹو 3۔ (کہانیاں)	سعادت حسن منٹو	600/-
4-	کلیات منٹو 4۔ (ڈرامے)	سعادت حسن منٹو	600/-
5-	کلیات منٹو 5۔ (ڈرامے)	سعادت حسن منٹو	600/-
6-	ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو	50/-
7-	نور جہاں سرور جاں	سعادت حسن منٹو	15/-
8-	کھچ فرشتے	سعادت حسن منٹو	100/-
9-	منٹو کے 10 بہترین افسانے	سعادت حسن منٹو	200/-

تاریخی و رومانوی ناول

1	حجاج بن یوسف	الماس ایم۔اے	250/-
2	سلطان شہاب الدین غوری	الماس ایم۔اے	200/-
3	پنجاب کی رومانوی داستانیں	الماس ایم۔اے	140/-
4	رومیو جولیٹ	شیکسپیئر	150/-
5	سلطان محمود غزنوی	مبین رشید	250/-
6	بہادر شاہ ظفر کے شب و روز	ضیاء الدین لاہوری	200/-
7	1857ء کے چند اہم کردار	ضیاء الدین لاہور	120/-
8	نادانِ عشق	محمد فیاض مای	250/-
9	کاغذ کی کشتی	محمد فیاض مای	250/-
10	شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	400/-
11	تم آخری جزیرہ ہو	آمنہ ریاض	150/-
12	خدا دور نہیں ہے	محمد عرفان رامے	150/-
13	راجکماری	ڈاکٹر کرم حسین شاہ رای	300/-
14	دلّی	خشونت سنگھ، مترجم: عرفان احمد خان	225/-
15	مدہوش	عرفان احمد خان	100/-

16	اجل کا روپ	شاہد رزاق کوہلر	120/-
17	سکندر اعظم	مقصود شیخ	300/-
18	خواب جوانی	ایم۔اسلم	150/-
19	تیر نگاہ	ایم۔اسلم	150/-
20	اشک ندامت	ایم۔اسلم	120/-
21	امر جیت	غلام سرور	250/-
22	کاشانہ نور	اے۔زیڈ سید	200/-
23	کانچ کلیاں اور بھنورے	اکرم خان نیازی	100/-
24	تیرے پاس ہے اک حصہ	عمران چوہدری	100/-
25	سایہ	عرفان نوید	60/-
26	شیطانوں کی جنت	شیخ الیاس	120/-
27	عشق اور آزادی	ایم۔انور صدیقی	80/-
28	خزاں کے بعد	ایم۔انور صدیقی	120/-
29	بے ساختہ	بشریٰ رحمٰن	400/-
30	شہزاد	شکیلہ شرارت	100/-

مشہور ناول نگار علیم الحق حقی کے ناول

1	عشق کا عین	180/-	دو بوندیں ساون کی	250/-
2	عشق کا شین	500/-	سائبان	120/-
3	عشق کا شین پارٹ ■	400/-	تیل کی آگ	120/-
4	دجال (اول)	250/-	شب اضطراب	100/-
5	دجال (حصہ دوم)	250/-	سنگ حیات	200/-
6	دجال (حصہ سوم)	250/-	سلطانی جمہور	150/-
7	قصہ ایک دامادکا	120/-	اماوس کا دیا	150/-
8	پاتال کی بلائیں	150/-	بساط	250/-
9	ضمیر کے اسیر	150/-	ضمیر کے اسیر	120/-
10	ملک برائے فروخت	120/-	زندگی 40 کلومیٹر	120/-
11	مٹی سے عشق	150/-	دوسری فصل	140/-

پاکستان کی نامور ناول نگار عمیرہ احمد کی بہترین کتب			
1	من وسلویٰ	عمیرہ احمد	600/-
2	امر بیل	عمیرہ احمد	600/-
3	تھوڑا سا آسماں	عمیرہ احمد	700/-
4	حسنہ اور حسن آراء	عمیرہ احمد	250/-
5	دربارِ دل	عمیرہ احمد	250/-
6	ہم کہاں کے سچے تھے	عمیرہ احمد	250/-
7	میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	عمیرہ احمد	250/-
8	سحر اک استعارہ ہے	عمیرہ احمد	250/-
9	میری ذات ذرہ بے نشاں	عمیرہ احمد	250/-
10	لاحاصل	عمیرہ احمد	250/-
11	زندگی گلزار ہے	عمیرہ احمد	250/-
12	واپسی	عمیرہ احمد	300/-
13	میرے پچاس پسندیدہ سین	عمیرہ احمد	150/-
14	حرف سے لفظ تک	عمیرہ احمد	100/-
15	حاصل	عمیرہ احمد	200/-
16	ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
نگہت عبداللہ کے نئے ناول			
1	محبت کا حصار	نگہت عبداللہ	200/-
2	محبتوں کے ہی درمیاں	نگہت عبداللہ	250/-
3	دل پھولوں کی بستی	نگہت عبداللہ	400/-
4	انتظار فصلِ گل	نگہت عبداللہ	150/-
5	مجھے روٹھنے نہ دینا	نگہت عبداللہ	250/-
6	بس تم لوٹ آنا	نگہت عبداللہ	200/-
7	کوئی لمحہ گلاب ہو	نگہت عبداللہ	400/-
شاہدہ لطیف کی خوبصورت کتب			
1	7 قدیم عشق (ناول)	شاہدہ لطیف	350/-
2	محبت نہ ہو جائے	شاہدہ لطیف	200/-
3	دنیا کے 70 عجوبے	شاہدہ لطیف	600/-

قیصرہ حیات کی خوبصورت کتب			
1	انوار اسمائے الٰہی (تفصیلی شرح)	قیصرہ حیات	500/-
2	ذات کا سفر (ناول)	قیصرہ حیات	200/-
3	سایہ دیوار بھی نہیں (ناول)	قیصرہ حیات	300/-
4	گلاب چاہتیں	قیصرہ حیات	220/-
5	وقت جو ٹھہر گیا	قیصرہ حیات	200/-
رفعت سراج کی خوبصورت کتب			
1	رشتوں کے ریشم	رفعت سراج	250/-
2	ایک گلاب	رفعت سراج	200/-
ملک کی مشہور ناول نگار ماہا ملک کی کتب			
1	جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	150/-
2	یہ بلبلیں یہ تتلیاں	ماہا ملک	250/-
3	اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	350/-
4	میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
خواتین کی مقبول ترین رائٹرز رخسانہ نگار			
1	دل آئینوں کا شہر	رخسانہ نگار عدنان	200/-
2	خوشبو کا گھر کوئی نہیں	رخسانہ نگار عدنان	180/-
3	دیوار سنگ سے آگے	رخسانہ نگار عدنان	200/-
4	میرے چارہ گر	رخسانہ نگار عدنان	300/-
5	پارس (نیا ناول)	رخسانہ نگار عدنان	250/-
6	زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
7	گر مجھ سے محبت ہے	رخسانہ نگار عدنان	200/-
تنزیلہ ریاض کی مشہور کتب			
1	خواب گھروندہ ٹوٹ نہ جائے	تنزیلہ ریاض	200/-
2	اھدنا الصراط المستقیم	تنزیلہ ریاض	200/-
عصمت چغتائی کی کتب			
1	ایک قطرہ خون (واقعہ کربلا پر ایک شاہکار تحریر)	عصمت چغتائی	200/-
2	ضدی	عصمت چغتائی	100/-
3	لحاف	عصمت چغتائی	80/-

34- اُردو بازار لاہور (فون 042-7352332-7232336)

نگہت سیما کے بہترین ناول			
1	زخم سفر ہے محترم	نگہت سیما	250/-
2	روشنی کے عذاب	نگہت سیما	250/-
3	کتنا سہل جانا تھا	نگہت سیما	200/-
4	محبت ابر کی صورت	نگہت سیما	200/-
5	راہ جنون	نگہت سیما	
نازیہ کنول نازی کی بہترین کتب			
1	جو ریگ دشت فراق ہے (ناول)	نازیہ کنول نازی	600/-
2	خواب نگر کی مسافتیں (ناول)	نازیہ کنول نازی	250/-
3	اے مژگان محبت	نازیہ کنول نازی	170/-
4	تنہا چاند (شاعری)	نازیہ کنول نازی	150/-
میمونہ خورشید علی کے مشہور ناول			
1	اے جنوں دشت ہے کہ منزل ہے	میمونہ خورشید	250/-
2	تیری راہ میں رُل گئی وے	میمونہ خورشید	180/-
سباس گل کے نئے ناول			
1	میں محبت اور تم	سباس گل	200/-
2	تم ایسی شرارت مت کرنا	سباگل	250/-
عائشہ سحر مرتضی کے نئے ناول			
1	مجھے بکھرنے مت دینا	عائشہ سحر مرتضی	200/-
2	تیری چاہ میں	عائشہ سحر مرتضی	250/-
نازیہ فرحت مایہ کے ناول			
1	مجھ بکھر کر حیری آنکھیں	نازیہ فرحت مایہ	150/-
2	ہوں درد عشق سے جہاں بالب	نازیہ فرحت مایہ	200/-
روشانے سبعین کے نئے ناول			
1	کیسی یہ رسم دنیا.....!	روشانے سبعین	200/-
مقبول ترین رائٹر امجد جاوید کی کتب			
1	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	امجد جاوید	200/-
2	چہرہ	امجد جاوید	150/-

3	عشق کاشین (حصہ دوم)	امجد جاوید	400/-
4	عشق کاشین (حصہ سوم)	امجد جاوید	400/-
5	عشق کا قاف	امجد جاوید	250/-
6	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	امجد جاوید	200/-
7	تاج محل	امجد جاوید	250/-
8	لکھاری کیسے بنتا ہے	امجد جاوید	120/-
9	انقلابی شاعری	انتخاب: امجد جاوید	150/-
10	تمہیں چاہوں گا شدت سے (نیا شعری مجموعہ)	امجد جاوید	150/-
11	کامیابی 30 دنوں میں (ترجمہ)	مترجم: امجد جاوید	150/-

صحت و تندرستی

1	دل توانا رکھنے کے 50 طریقے	مترجم: مقصود شیخ	250/-
2	فیملی ہیلتھ	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	150/-
3	ٹین ایج گائیڈ (اُردو)	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	200/-
4	TEENAGE TINGLING	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	200/-
5	زلزلہ، زخم اور زندگی	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	150/-
6	زلزلہ زیارت اور زندگی	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	250/-
7	دواء، غذا اور شفاء	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	300/-
8	دانتوں کی حفاظت و علاج	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	120/-
9	قیام حمل سے پرورش تک	خواجہ سلطان عارف	100/-
10	لمبی زندگی اور آسان یوگا	اعظم شیخ	150/-
11	ہیوٹیشن گائیڈ	ماجد رسول طاہر	100/-
12	کامیاب گھریلو ٹوٹکوں کا انسائیکلو پیڈیا	حنا شیخ	120/-

کھانا پکانا

1	اوون کے کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا	زیب النساء	400/-
2	کھانے پکانے کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	ساجد حسین قریشی	600/-
3	آرٹ آف مغل کزین (بہترین کھانے)	ساجد حسین قریشی	250/-
4	آرٹ آف سب کانٹینینٹل (بہترین کھانے)	ساجد حسین قریشی	200/-
5	Art of Mughal Cuisine (بہترین کھانے)	ساجد حسین قریشی	250/-
6	Art of sub continental	ساجد حسین قریشی	200/-

7	سبزیاں اور پھل کا انسائیکلوپیڈیا	ساجد حسین قریشی	100/-
8	انسائیکلوپیڈیا آف پاستہ (مائیکرو ویو اور اوون کے کھانے)	ساجد حسین قریشی	300/-
9	شیف ذاکر کا دسترخوان	شیف ذاکر	220/-
10	راحت کا دسترخوان	راحت بیگم	300/-
11	ڈالڈا کھانوں کا انسائیکلوپیڈیا		600/-
12	منفرد چائنیز کھانے	ثمینہ سہیل نذر	130/-
13	ڈالڈا کا نعمت خواں	سعدیہ عابد	150/-
14	کچن بک	(کچن کے خوبصورت ڈیزائن)	380/-
15	مچھلی کے پکوان	نمل مسعود	150/-
16	شوگر فری کھانوں کا مکمل انسائیکلوپیڈیا	جویریہ کامران	150/-
17	تکے کباب چانپیں، کوفتے، پسندے	نمل مسعود	150/-
18	منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں	روبینہ شاہ	150/-
19	بیکری کا انسائیکلوپیڈیا	روبینہ شاہ	150/-
20	200 ذائقوں میں مچھلی پکائیں معہ چائنیز کھانے	روبینہ شاہ	150/-
21	نئے چائنیز کھانے	بیگم سید	120/-
22	سبزیوں کے پکوان	ثمینہ شاہ	150/-
23	چاول کے پکوان	ثمینہ شاہ	80/-
24	بیکری گائیڈ (اردو انگلش)	اعجاز شیخ	150/-

فرحت عباس شاہ

☆	شام کے بعد (جلد اوّل)	165/-	☆ شام کے بعد (جلد دوم) 165/-
☆	شام کے بعد (جلد سوم)	165/-	☆ یاد آؤں اگر اداسی میں 120/-
☆	ہم اکیلے ہیں بہت	120/-	☆ محبت خوبصورت ہے 150/-
☆	تم اُداس مت ہونا	300/-	☆ مرا انتظار قدیم ہے 120/-
☆	آوارہ مزاج	150/-	☆ دُکھ بولتے ہیں 150/-
☆	جم گیا صبر مری آنکھوں میں	120/-	☆ کہاں ہو تم 120/-
☆	خطوں میں دفنایا ہوا جیون	120/-	☆ میرے ویران کمرے میں 120/-
☆	ملو ہم سے	120/-	☆ 350/-
☆	محبت کی آخری ادھوری نظم	120/-	☆ اُداس شامیں اجاڑ رستے 120/-
☆	مت بول پیا کے لہجے میں	120/-	☆ مت بول پیا کے لہجے میں 120/-
☆	آ کسی روز کسی دکھ دیکھ پہ اکٹھے روئیں	120/-	☆ اک بار کہو تم میری ہو 120/-

☆ Sarabi	300/-	☆ اکیسویں صدی کی پہلی نظم	120/-
☆ After Evening	150/-	☆ Love	300/-
☆ America My Friend	150/-	☆ الوداع پاکستان	110/-
☆ موت زدہ	110/-	☆ تیرے دکھ نے رستہ بنا دیا	90/-
☆ باغی شاعر	90/-	☆ بارشوں کے موسم میں	120/-
☆ اور تم آؤ	120/-	☆ میرے ساتھ چل	100/-
☆ روگ	150/-	☆ من پنچھی بے چین	120/-
☆ محبت ذات ہوتی ہے	200/-	☆ آنگا جنگل در و دیوار سے	120/-
☆ چاند پر زور نہیں	120/-	☆ ساتھ دینا ہے تو دے	120/-
☆ روز ہوں گی ملاقاتیں	120/-	☆ سرابی	150/-
☆ محبت گمشدہ میری	120/-	☆ آنکھوں کے پار چاند	120/-
☆ اے عشق ہمیں آزاد کرو	120/-	☆ ابھی خواب ہے	120/-
☆ سوال درد کا ہے	200/-	☆ دن نکلتا نہیں	150/-
☆ ہم جیسے آوارہ دل	200/-	☆ یہ عجیب میری محبتیں	450/-

کمپیوٹر و درسی کتب

-1	جاوا2 (سرٹیفکیشن گائیڈ)	اعجاز احمد	240/-
-2	اِنفارمیشن ٹیکنالوجی	ارشد محمود	180/-
-3	C++ اوروژیول Ver.6	ارشد محمود	300/-
-4	A+ اے پلس مکمل ہارڈ ویئر گائیڈ	ارشد محمود	300/-
-5	پریکٹیکل نوٹ بک (23 دنوں میں ICS)	محمد متین خالد۔ محمد ارشد عرشی	180/-
-6	پرنسپلز آف کمپیوٹر سائنس (21 دنوں میں ICS)	محمد متین خالد۔ رضوان احمد شاہ	60/-
-7	کمپیوٹر وائرس	محمد متین خالد۔ ارشد محمود شاہ	70/-
-8	کمپیوٹر خود سیکھیں	محمد متین خالد	100/-
-9	کمپیوٹر کے مسائل اور ان کا حل	محمد متین خالد۔ مقصود شیخ	150/-
-10	مائیکروسافٹ ونڈوز انسٹالیشن گائیڈ	ارشد محمود شاہ	60/-
-11	مائیکروسافٹ ونڈوز نیٹ ورکنگ	ارشد محمود شاہ	60/-
-12	فراز آسان ونڈوز 98	ارشد محمود شاہ	60/-
-13	فراز آفس 4-2003	ارشد محمود شاہ	140/-
-14	فراز آٹو کیڈ 2004	ارشد محمود شاہ	60/-
-15	فراز ایکسل 4-2003	ارشد محمود شاہ	60/-

-16	عالمی انٹرنیٹ ڈائریکٹری	ارشد محمود شاہ	75/-
-17	انٹرنیٹ گائیڈ مع ویب ڈیزائننگ	اعظم شیخ	100/-
-18	انٹرنیٹ ڈائریکٹری (بڑی)	اعظم شیخ۔ محمد متین خالد	130/-
-19	انٹرنیٹ ڈائریکٹری (پاکٹ سائز)	اعظم شیخ۔ محمد متین خالد	60/-
-20	اسلام انٹرنیٹ پر	محمد متین خالد	120/-
-21	پاکستان انٹرنیٹ پر	اعظم شیخ۔ محمد متین خالد	120/-
-22	SCIENCE ON NET	اعظم شیخ۔ محمد متین خالد	100/-
-23	ای کامرس (مکمل گائیڈ)	مقصود شیخ	180/-
-24	ان پیج 2000	فرحان ڈار	100/-
-25	فلیش 5	اعظم شیخ	120/-
-26	انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی جدید ڈکشنری (اردو اور انگریزی میں)	محمد متین خالد۔ مقصود شیخ	300/-
-27	فوٹوشاپ 7	رابعہ ارم شاہ۔ ڈاکٹر بشیر احمد شاہ	180/-
-28	کورل ڈرا 11 مکمل گائیڈ	ارشد محمود شاہ	150/-
-29	کورل ڈرا 12 مکمل گائیڈ	ارشد محمود شاہ	150/-
-30	فراز آسان کمپیوٹر گائیڈ	ارشد محمود شاہ	160/-
-31	مائیکروسافٹ ورڈ XP	ارشد محمود شاہ	60/-
-32	مائیکرومیڈیا ڈریم ویور 2004	ارشد محمود شاہ	130/-
-33	مائیکروسافٹ ایکسس ڈیٹا بیس	رضوان احمد شاہ۔ نعمان احمد شاہ	150/-
-34	انٹرنیٹ ڈائریکٹری	مقصود خالد	120/-
-35	آٹو میکنیشن	مقصود خالد	120/-
-36	اپنا موبائل فون خود مرمت کریں	سمیرا شاہ	150/-
-37	3/D سٹوڈیو میکس 6	سمیرا شاہ	120/-
-38	ڈاس مکمل گائیڈ	سمیرا شاہ	60/-
-39	ENCYCLOPEDIA OF FAQ COMPUTER / INTERNET PROBLEMS & SOLUTIONS	M.MATEEN KHALID	150/-
-40	Visual Basic 6.0	Noman A. Shah,Rizwan A.Shah	130/-
-41	Window XP *Professional*	Noman A. Shah,Rizwan A.Shah	150/-
-42	British English Grammar & Composition	نوید سہیل (ForB.A,B.Com,B.Sc,BCS)	120/-

-43	S.Q.L(برائے M.C.S)	اعجاز احمد	210/-
-44	PL/S.Q.L (Oracle 6i)	اعجاز احمد	225/-
-45	Introduction to Information Technology (C,C++, Java, ASP)	M.Rizwan Jameel Qureshi	210/-
-46	Self Paced Training	Khalid Mahmood Mughal	210/-
-47	Introduction to Numerical Analysis	ڈاکٹر سکندر حیات خیات	80/-
-48	اولیول اُردو (مکمل سیلبس اے پیپر II)	محمد سہیل	150/-
-49	مطالعہ معاشیات (برائے ڈی کام O ڈی بی اے)	میاں عصمت اللہ	120/-

سیاسی کتب

1	کل جمہوریت	چوہدری غلام رسول چیمہ	250/-
2	اورز نجیر ٹوٹ گئی	رائے نواز کھرل	250/-
3	ذوالفقار علی بھٹو (ایٹمی پاکستان کا بانی)	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
4	سقوط بغداد	مقدر اقبال	600/-
5	طالبان کی واپسی	مقدر اقبال	500/-
6	شہید جمہوریت کا قاتل کون	فضل حسین اعوان	200/-
7	لندن پلان	ستار چوہدری	200/-
8	پاکستان کی کہانی (حضور پاکؐ کے سپاہی کی زبانی)	میجر (ر) امیر افضل خاں	500/-
9	اگر ایران پر حملہ ہوا.....؟	مبین رشید	200/-
10	پارلیمنٹ کے خوبصورت چہرے	کامران راجپوت	250/-
11	دُنیا کی نامور شخصیات کے معاشقے	اعظیم شیخ	200/-
12	پاکستان لوٹنے والے ہاتھ	قیصر چوہان	400/-
13	ناموں کا گلدستہ	قیصر چوہان	200/-
14	SMS بڑا سائز (6 ٹائٹل)	قیصر چوہان	40/-
15	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارٹ I	قیصر چوہان	300/-
16	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارٹ II		300/-
17	اماں حوا سے اماں کونڈولیزا تک	عارف صبح خان	250/-
18	نواز شریف جیتی بازی ہار گیا	حافظ شفیق الرحمان	200/-
19	پاکستان میں جمہوری حکومتیں قیام سے انجام تک	ظہیر احمد بابر	250/-

20	بیسویں صدی کے فوجی حکمران	مرتضیٰ انجم	200/-
21	متنازعہ ترین شخصیت پروفیسر طاہر القادری کی شخصیت کا تنقیدی جائزہ	محمد نواز کھرل	300/-
22	پاک امریکہ تعلقات	محمد جاوید	200/-
23	سیاست آئین اور عدالت	مرتضیٰ انجم	200/-
24	ادیبوں اور دانشوروں کے معاشقے	زاہد گوگی	200/-
25	یہ ہیں ہمارے حکمران؟	طاہر انجم	150/-
26	پاکستان تباہی کے دہانے پر	طاہر انجم	120/-
27	سیاستدانوں کے معاشقے	خالد چوہدری	200/-
28	خفیہ رپورٹیں	مقبول ارشد	250/-
29	جنسی لذت	مظفر علی چوہدری	100/-
30	شرافت کا ستون (میاں محمد شریف)	نواز کھرل	150/-
31	کچی نوکری؟	میاں علاؤالدین	180/-
32	میری زندگی	بل کلنٹن (مترجم: زاہد گوگی)	350/-
33	مائیکل جیکسن پاپ یا پاپی گلوکار	لئیق احمد	150/-
34	بدمعاش امریکہ	سید ناصر علی	220/-
35	پاکستان میں امریکی سازشیں	سید ناصر علی	220/-
36	صدام حسین	ڈاکٹر ندیم احمد	160/-
37	چیف جسٹس کی معطلی	ڈاکٹر ندیم احمد	160/-
38	انقلابی شاعری	انتخاب: امجد جاوید	150/-

ملک کے نامور قانون دان ایس۔ایم۔ظفر کی بہترین کتب

1	میرے مشہور مقدمے	ایس۔ایم ظفر	650/-
2	پاکستان بنام کرپشن عوام کی عدالت میں	ایس۔ایم ظفر	150/-
3	ڈکٹیٹر کون	ایس۔ایم ظفر	200/-
4	عوام پارلیمنٹ اسلام	ایس۔ایم ظفر	250/-
5	عدالت میں سیاست	ایس۔ایم ظفر	175/-

34- اُردو بازار لاہور (فون 042-7352332-7232336)

انگریزی کتب

-1	Quranic Topics(Vol:1)	Muhammad Sharif Baqa	500/-
-2	Quranic Topics (Vol:2)	Muhammad Sharif Baqa	500/-
-3	Quranic Advices	Fateh Muhammed Jallendhri	60/-
-4	A Pound of Flesh	S-Hamgah Saleem Gilani	80/-
-5	The Reconstruction of Religious thought In Islam	Allama Muhammad Iqhal (کے 7 مشہور و معروف خطبات)	150/-
-6	Hijra of Christian Calendars	Zia-ud-Din Lahori	220/-
-7	Management & People in Banking	Ch. Mushtaq Ahmad (بنکنگ کے امتحان کیلئے رہنما کتاب)	200/-
-8	TEENAGE TINGLINGS	Dr. Asif Mahmood Jah	120/-
-9	British English Grammar & Composition	Naveed Abdullah Khan Sumbal (For B.A, B.Com, B.Sc, BCS)	120/-

مکتبہ جمال

1	ذکر آزاد (مولانا ابوالکلام کی رفاقت میں ۳۸ سال)	مولانا عبدالرازق ملیح آبادی	250/-
2	تصورات قرآن (مولانا ابوالکلام آزاد)	مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللطیف	100/-
3	دیوان غالب (پاکٹ)	مرزا اسد اللہ خاں غالب	100/-
4	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	مرزا اسد اللہ خاں غالب	250/-
5	کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ)	علامہ محمد اقبال	700/-
6	عصر حاضر میں اسوہ رسول اکرم کی معنویت	پروفیسر ڈاکٹر محمود مسعود عالم قاسم	200/-
7	خطبات بمبئی	مولانا محمد منظور نعمانی	100/-
8	اسلام میں غلامی کی حقیقت	مولانا سعید احمد اکبری آبادی	200/-
9	اسلام کا نظریہ تاریخ	محمد مظہر الدین صدیقی	200/-
10	1857ء کی پہلی جنگ آزادی (واقعات حقائق)	میاں محمد شفیع	250/-
11	ہزارہ گزیٹیر	ڈی۔ ایچ۔ وانس/ پروفیسر افتخار احمد	300/-
12	تاریخ ہزارہ	ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی	250/-
13	دولت غزنویہ (سلطان محمود غزنوی اور ان کے جانشین)	مولانا محمود الرحمن ندوی	200/-
14	کشمیر تاریخ کے آئینے میں	پروفیسر محمد عارف	200/-

15	پاکستان سے اقبالستان تک	پروفیسر محمد عارف	250/-
16	نبی کریم ﷺ کی مبارک سنتیں	مولانا ابوالمظفر ظفر احمد قادری	120/-
17	فضائل درود شریف	مولانا محمد زکریا	100/-
18	فضائل رمضان	مولانا محمد زکریا	60/-
19	آداب الدعاء	مولانا محمد اجمل خان	150/-
20	کامیاب زندگی کا تصور	پروفیسر انور دل	100/-
21	اسلام کی دنیا	ایلمار تھ ہارڈر/ بشریٰ سہیل	100/-
22	گھریلو آزمودہ نسخوں کا انسائیکلوپیڈیا (قدیم حکماء کی تحقیقات کا نچوڑ)	سید امتیاز علی تاج	150/-
23	پروفیشنل ہیومینیشن بنیے	آسیہ آرزو	130/-
24	بہار شباب	حکیم غلام محمود خان	120/-
25	وادی کاغان (تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت)	منصب خان سحاب	200/-
26	مشرق کا سوئٹزرلینڈ (وادی سوات)	محمد پرویش شاہین	80/-
27	کافرستان کے رسم و رواج	محمد پرویش شاہین	80/-
28	سوات (کوہستان)	محمد پرویش شاہین	80/-
29	وادی دیر.....کوہستان (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	محمد پرویش شاہین	100/-
30	وادی چترال (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	محمد پرویش شاہین	100/-
31	جہاں تین سلطنتیں بنتیں ہیں	ای ایف نائٹ/ ظفر حیات پال	500/-
32	بروشو قبائل اور بروشال	سید محمد یحییٰ شاہ الحسینی	300/-
33	ہماری حقیقت (سائنس، انسان اور کائنات)	محمد آفتاب	200/-
34	چھل بلے	محمد صدیق نقیا	250/-
35	پہلا قدم	ڈاکٹر سائرہ محبوب	100/-

کتب مولانا ابوالکلام آزاد

☆ تذکرہ	250/- ☆	مسلمان عورت	120/-
☆ قول فیصل	120/- ☆	قرآن کا قانون عروج و زوال	100/-
☆ انسانیت موت کے دروازے پر	120/- ☆	صدائے حق	90/-
☆ رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے آخری لمحات	70/- ☆	اُم الکتاب	180/-
☆ غبار خاطر	250/- ☆	حقیقت الصلوٰۃ	80/-
☆ فیضان آزاد (منتخبات ابوالکلام آزاد)	70/- ☆	شہادت حسین رضی اللہ عنہ	120/-

34- اُردو بازار لاہور (فون 042-7352332-7232336)

☆ مولانا آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا	100/- ☆	آزادی ہند	300/-
☆ مسئلہ خلافت	140/- ☆	ولادت نبوی ﷺ	90/-
☆ مقام دعوت	70/- ☆	فسانہ ہجر وصال	50/-
☆ قرآن حکیم کی تین سورتیں (ترجمہ و تفسیر)	70/- ☆	اسلام میں آزادی کا تصور (الحریۃ فی الاسلام)	100/-
☆ ارکان اسلام	250/- ☆	اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج	120/-

کلاسیک شعراء کے دیوان

☆ دیوان حسرت (حسرت موہانی)	50/-	☆ دیوان سودا (مرزا محمد رفیع سودا)	50/-
☆ دیوان غالب (میرزا اسد اللہ خاں غالب)	50/-	☆ دیوان آتش (خواجہ حیدر علی آتش)	50/-
☆ دیوان صحفی (غلام ہمدانی صحفی)	50/-	☆ دیوان ذوق (شیخ محمد ابراہیم ذوق)	50/-
☆ دیوان جوش (جوش آبادی)	50/-	☆ دیوان میر (میر تقی میر)	75/-
☆ دیوان مومن (حکیم مومن خان مومن دہلوی)	50/-	☆ دیوان حالی (خواجہ الطاف حسین حالی)	50/-
☆ دیوان داغ (فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی)	50/-	☆ تلخیاں (ساحر لدھیانوی)	50/-

صفہ فاؤنڈیشن

-1	مسلمان خواتین کے نام اہم پیغام	محمد حیات قادری	20/-
-2	جرم توہین رسالت (فقہ حنفی کی روشنی میں)	مفتی محمد اقبال سعیدی	35/-
-3	قرآن اور روحانی علوم	حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ: مفتی محمد خان قادری	18/-
-4	وسعت علم نبوی	تصنیف: شیخ عبداللہ سراج الدین شامی ترجمہ: مفتی محمد خان قادری	25/-
-5	مسائل توسل وزیارت	تصنیف: شیخ زینی دحلان شافعی رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ: مولانا یٰسین اختر مصباحی	35/-
-6	خواب میں دیدار مصطفی ﷺ کی بہاریں قیامت تک جاری ہیں	مصنف: ڈاکٹر عیسیٰ ابن عبداللہ مانع الحمیری ترجمہ: حضرت مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری	25/-

متفرق کتب

1	قصص الانبیاء مجلد	الحاج سراج احمد عادل	150/-
2	قصص الانبیاء مجلد		150/-
3	شہد حسن وصحت کیلئے	(مصنف: سیسل ٹونسلے) (مترجم: آغا اشرف)	24/-
4	شہد سے علاج	ڈاکٹر اقبال کاردار	24/-
5	طب نبوی	حافظ اکرام الدین صاحب داعظ	25/-

6	رسول ﷺ کے تین سو معجزات	سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی	28/-
7	خزینہ مشکل کشا	محمد حبیب قادری	200/-
8	چہار قل سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	سید آفاق حسین	60/-
9	کلمہ طیبہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	سید آفاق حسین	60/-
10	آیت کریمہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	سید آفاق حسین	60/-
11	موت کا منظر	خواجہ محمد اسلام	100/-
12	الصلوٰۃ والرسول	مولانا امتیاز احمد علوی	120/-
13	کتاب الشفا	مسعود مفتی	60/-
14	منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں	روبینہ شاہ	150/-
15	بیکری کا انسائیکلوپیڈیا	روبینہ شاہ	150/-
16	200 ذائقوں میں مچھلی پکائیں معہ چائنیز کھانے	روبینہ شاہ	180/-
17	گھریلو ٹوٹکے	ثمینہ شاہ	130/-
18	بیوٹی کوئیکشن	ثمینہ شاہ	120/-
19	بوڑھا اور سمندر (ناول)	ارنسٹ ہیمنگو کا مشہور عالم ناول	90/-
20	جادو اور سحر کا قرآنی علاج	ڈاکٹر گلزار احمد	90/-
21	نئے چائنیز کھانے	مولفین: بیگم سید	120/-
22	سبزیوں کے پکوان	ثمینہ شاہ	150/-
23	چاول کے پکوان	ثمینہ شاہ	80/-
24	ستارے اپنے اپنی قسمت کے	حافظ مظفر محسن	100/-
25	دہشت زدہ گرد (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
26	ٹیمیل (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
27	خوشگوار زندگی کے اصول	کاشف فراز احمد	100/-
28	اپنا علاج خود کریں	کاشف فراز احمد	120/-
29	کامیاب مستقبل کے راز	کاشف فراز احمد	150/-
30	شعر اور فن شعر	نثار اکبر آبادی	120/-
31	وارث لیکھا	پیر فقیر دیر پاہی	150/-
32	تاریخ کا سفر	ذوالفقار ارشد گیلانی	250/-
33	حکایات کا انسائیکلوپیڈیا	منصور بٹ	300/-
34	اسلام میں عورت کا مقام	ڈاکٹر ذاکر نائیک مترجم: سہیل بابر بیگ	120/-
35	خواتین کی اسلامی زندگی کے سائنسی حقائق	حکیم محمد طارق محمود چغتائی	200/-

36	تاریخ سندھ	عبدالحلیم شرر	300/-
37	مہاتما گاندھی	کے آر کرپلانی	200/-
38	قدیم تاریخ	ضیاءالدین اصلی	180/-
39	قرآن اور تصوف	ڈاکٹر میر ولی الدین	180/-
40	شہنشاہ اکبر	کرنل ہملن	180/-
41	تساوو کے آدم خور	کرنل جے ایچ پیٹرسن ترجمہ: سید علاؤالدین	150/
42	خدا اور سائنس	آصف حسن	200/-
43	روحانیت اور علم الاعداد	ایس ایچ علوی	200/-
44	بہترین مزاحیہ شاعری	محسن اسحاق ورک	130/-
45	حضرت سلیمان کا خزانہ	ایچ رائیڈر ہیگرڈ ترجمہ: سید علاؤالدین	200/-
46	روح کا سفر	ایس ایچ علوی	200/-
47	قرآن اور جدید سائنس	ڈاکٹر حشمت جاہ	250/-
48	ذکر جب چھیڑا گیا	زخمی کانپوری	300/-
49	ہندوستان پر مغلیہ حکومت	مفتی شوکت علی فہمی	300/-
50	اولیاء سندھ	اقبال احمد	120/-
51	ہندوستان پر اسلامی حکومت	مفتی شوکت علی فہمی	300/-
52	ارواح الکبر	مرزا محمود علی	300/-
53	مہاراجہ رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا ترجمہ: کیلاش چندر چوہدری	180/-
54	سرخ سفید سیاہ	شفیع عقیل	300/-
55	بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب	ڈاکٹر محمد اسماعیل دشتی الیشہری	450/-
56	محمد شاہ رنگیلا	قمر قریشی	200/-
57	داستان کہتے کہتے	زخمی کانپوری	300/-
58	خوش رہنے کا فن	ہز ہولینس دلائی لامہ ترجمہ: سید علاؤالدین	250/-
59	خطابات (والیم 1) ڈاکر نائیک	ڈاکٹر ڈاکر نائیک ترجمہ: سہیل بابر بیگ	350/-
60	کالک (ناول)	علی نواز شاہ	150/-
	مکتبہ داستان کے تاریخی ناول		
1	داستان ایمان فروشوں کی (تین جلد)	عنایت اللہ	840/-
2	شمشیر بے نیام (دو جلد)	عنایت اللہ	440/-
3	ایک اور بت شکن پیدا ہوا (اول)	عنایت اللہ	280/-
4	ایک اور بت شکن پیدا ہوا (دوم)	عنایت اللہ	200/-

5	ستارہ جو ٹوٹ گیا	عنایت اللہ	220/-
6	حجاز کی آندھی	عنایت اللہ	250/-
7	چار دیواری کی دنیا	عنایت اللہ	150/-
8	کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس	عنایت اللہ	150/-
9	دمشق کے قید خانے میں	عنایت اللہ	200/-
10	کار، شلوار اور دوپٹہ	احمد یار خان	170/-
11	ایک رات کی شادی	احمد یار خان	170/-
12	داستان ایک داماد کی	احمد یار خان	170/-
13	لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ	عنایت اللہ	160/-
14	لہو جو ہم بہا کے آئے	عنایت اللہ	150/-
15	استانی اور ٹیکسی ڈرائیور	عنایت اللہ	180/-
16	جب میں تخلیق ہوئی	عنایت اللہ	170/-
17	دو پلو کی کہانی	عنایت اللہ	170/-
18	ہماری شکست کی کہانی	عنایت اللہ	180/-
19	لاہور کی دہلیز پر	عنایت اللہ	170/-
20	روحانی مسرت جسمانی قوت	شبیر حسین	120/-
21	زندہ رہو جوان رہو	کیپٹن ڈاکٹر نصیر اے۔ شیخ	120/-
22	میں کسی کی بیٹی نہیں	عنایت اللہ	180/-
23	ہیرے کا جگر	عنایت اللہ	170/-
24	الجھے راستے	عنایت اللہ	170/-
25	طاہرہ	عنایت اللہ	200/-
26	خاکی وردی لال لہو (اول)	عنایت اللہ	150/-
27	خاکی وردی لال لہو (دوم)	عنایت اللہ	150/-
28	بی آر بی بہتی رہے گی	عنایت اللہ	180/-
29	ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ	عنایت اللہ	270/-
30	پرچم اڑتا رہا	عنایت اللہ	180/-

طارق اسماعیل ساگر

☆ میں ایک جاسوس تھا	300/-	☆ بے نام سی عقیدت	250/-
☆ وطن کی مٹی گواہ رہنا	300/-	☆ چناروں کے آنسو	250/-
☆ کمانڈو	250/-	☆ کریک ڈاؤن	250/-

☆ کفارہ	250/-	☆ فالکن کون تھا	200/-
☆ ڈبل کراس	250/-	☆ گرفت	250/-
☆ را	250/-	☆ سازش	250/-
☆ آپریشن بلیوسٹار	180/-	☆ دھویں کی دیوار	200/-
☆ ریڈالرٹ	200/-	☆ جب دشمن نے للکارا	100/-
☆ ٹارگٹ پاکستان تھا	250/-	☆ بیس کیمپ	200/-
☆ شیری کانت	200/-	☆ کورٹ مارشل	250/-
☆ محاصرہ	250/-	☆ الاؤ	200/-
☆ اے راہ حق کے شہیدوں	300/-	☆ مسافت	250/-
☆ جاسوس کیسے بنتا ہے	300/-	☆ اسامہ بن لادن	200/-
☆ وادی لہورنگ	250/-	☆ حمود الرحمن کمیشن رپورٹ	300/-
☆ کارگل کرائسس	250/-	☆ کٹ آؤٹ	200/-
☆ کراس فائر	250/-	☆ ڈرگ مافیا	250/-
☆ بھارت ٹوٹ جائے گا	200/-	☆ وادی لہورنگ	250/-
☆ ٹارگٹ کہوٹہ	200/-	☆ پھندہ	200/-
☆ اور حصار ٹوٹ گیا	250/-	☆ بھٹکا ہوا راہی	250/-
☆ دہشت گرد	250/-	☆ شکنجہ	250/-
☆ دیوتا کی موت	120/-	☆ پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں	300/-

نامور ناول نگار ایم۔اے۔راحت

1	گرین فورس	ایم۔اے۔راحت	
2	بھید	ایم۔اے۔راحت	
3	آتش زدہ	ایم۔اے۔راحت	
4	دیوتا کی واپسی	ایم۔اے۔راحت	
5	نشیب	ایم۔اے۔راحت	250/-
6	زہر	ایم۔اے۔راحت	

مطبوعات 7SKY پبلی کیشنز

1	میری زندگی	بل کلنٹن (زاہد گولی)	350/-
2	بابا گرونانک (تعلیمات، کلام اور حالات زندگی)	سردار جی سنگھ (مترجم: امیر علی خان)	250/-
3	مشہور عالمی شخصیات	کامران امجد۔اورنگزیب	250/-

4	کباب پسندے چاپ	مکمل مسعود	150/-
5	بہت یاد آنے لگے ہو	نجمہ مسعود	150/-
6	روحانیت اور جنسی لذت	گرو دشو	120/-
7	تمہارے اداس ہونے کے دن نہیں	نجمہ منصور	200/-
8	تاریخ فرعون	خواجہ حسن نظامی	250/-
9	SMS پاکٹ سائز (12 ٹائٹل)	محمد قیصر چوہان	25/-
10	قصص الانبیاء	حاجی سراج احمد عادل	130/-
11	سچا خواب نامہ	شیخ محمد حسین آزادی اجمیری	80/-
12	سیرت عائشہؓ	علامہ سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	120/-
13	پاکستان ٹریول گائیڈ	مسعود مفتی	200/-
14	منفرد ہمدرد سائکل	نادیہ عامر	150/-
15	ناموں کا گلدستہ	محمد قیصر چوہان	200/-
16	SMS بڑا سائز (6 ٹائٹل)	محمد قیصر چوہان	40/-
17	تذکرہ الاولیاء	حضرت شیخ فریدالدین عطاء	150/-
18	کتاب الحج وعمرہ	الحاج اویس عمر	150/-
19	عورت کی حکمرانی اسلام کے آئینہ میں	علامہ فلک شیر	
20	لندن پلان	ستار طاہر	200/-
21	حج وعمرہ پاکٹ سائز	علامہ امتیاز احمد علوی	40/-
22	انسائیکلوپیڈیا آف اسلام	نجمہ منصور۔ مسعود مفتی	300/-
23	بیوٹی کیئر	صائمہ خالد	120/-
24	عورت اور مرد میری زندگی میں	خشونت سنگھ۔ زاہد گوگی	160/-
25	لبیک	ممتاز مفتی	120/-
26	مسائل بہشتی زیور	مولانا اشرف علی تھانوی	70/-
27	سلام قائداعظم (سوالاً جواباً)	نجمہ منصور	60/-
28	تحفۃ العروس	علامہ محمود مہدی استنبولی	180/-
29	نظر	مقصود شیخ	250/-
30	پاکستانی کھانوں کا انسائیکلوپیڈیا	نفیسہ بیگم	150/-
31	قدیم ترین، مجموعہ روحانی تعویذات	مسعود مفتی	200/-
32	ایس۔ ایم۔ ایس (چار بکس)	ادارہ	20/-

کتب ابلاغ پبلشرز

1	سیرت ابن ہشام		350/-
2	بزرگ شہری		200/-
3	دیوان غالب		150/-
4	چادر اور چہار دیواری		150/-
5	جلال و جمال		350/-

عالمی شہرت یافتہ کتب کے مترجم

	کامیابی اور روحانی مسرت (ڈورس پوزی)	مترجم: حافظ مظفر محسن	250/-
	الفاظ کا جادو (جے۔ وی۔ سرفی)	مترجم: حافظ مظفر محسن	250/-
	ٹال مٹول کی عادات سے نجات (ربٹا ایسٹ)	مترجم: حافظ مظفر محسن	200/-
	ہندومت (شلنتلا جگن ناتھ)	مترجم: حافظ مظفر محسن	150/-
	چارلی چیپلن کی آپ بیتی	قیصر چوہان	300/-
	بااصول لیڈر شپ (سٹیفن آر۔ کووے)	مترجم: حافظ مظفر محسن	250/-
	اعتماد کی قوت (سٹیفن آر۔ کووے)	مترجم: حافظ مظفر محسن	200/-
	اہم کام پہلے (سٹیفن آر۔ کووے)	مترجم: حافظ مظفر محسن	250/-
	اپنے گھر کا جم خانہ	مترجم: حافظ مظفر محسن	190/-
	مینار کی پکار	کیتھ گریگ مترجم: مسعود مفتی	150/-
	اسلامی معاشروں کی تاریخ	مترجم: مسعود مفتی	
	راہول ڈریوڈ (آپ بیتی)	مترجم: قیصر چوہان	
	کامیابی 30 دنوں میں	اے۔ ایل۔ پریرا مترجم: امجد جاوید	150/-
	شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے	شیما مجید	300/-
	مثالی کوچنگ	مترجم: حافظ مظفر محسن	300/-
	گڈ بزنس	مترجم: حافظ مظفر محسن 0	300/-
	انسانی تخلیق	ہارون یحییٰ	

راحیل ارشد مغل
0300-6461375

DUB
diamond
Urdu books

رقصِ بسمل

ہاشم ندیم

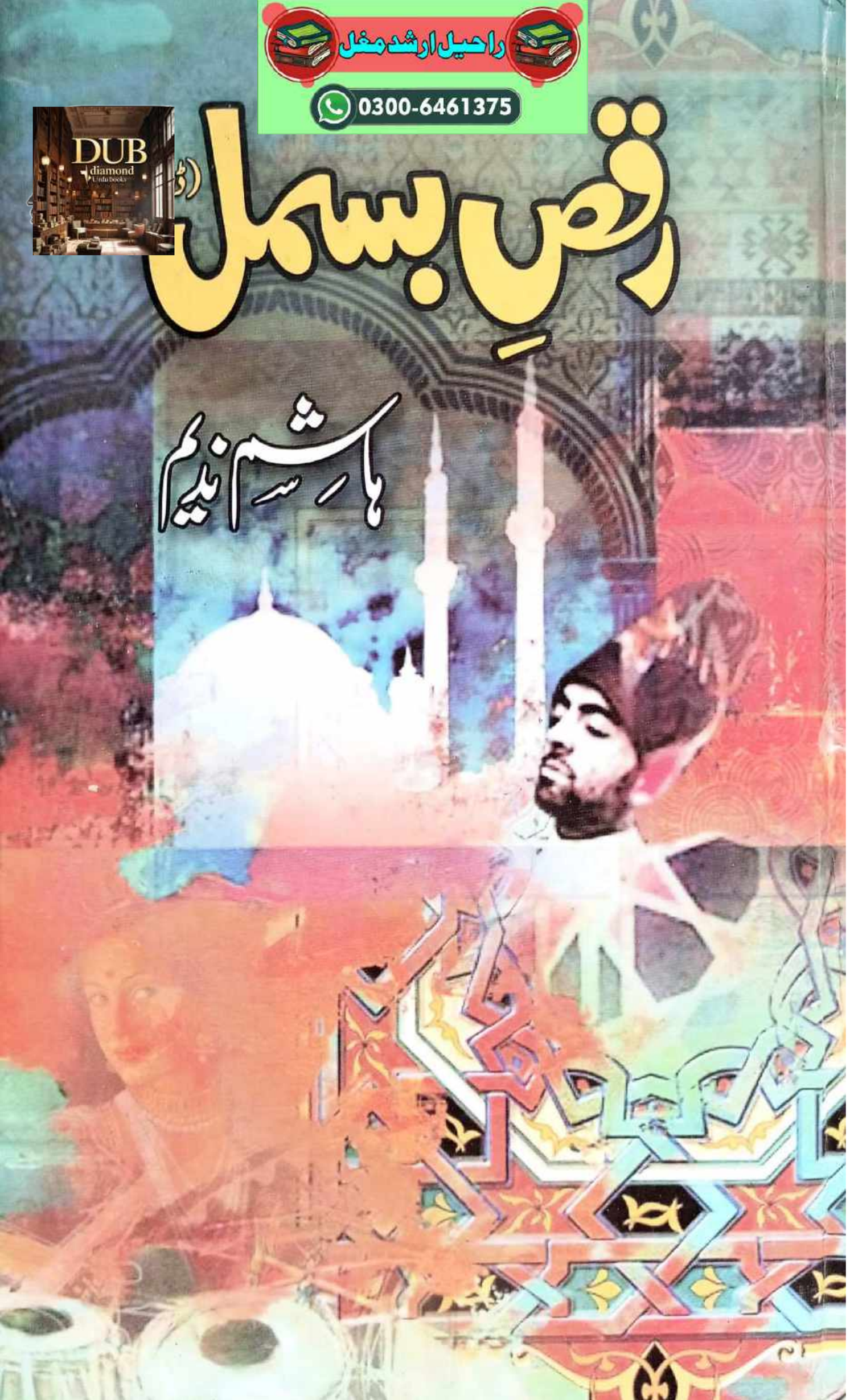

رقصِ بسمل

ہاشم ندیم

شاہ زر خان
03176699066

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail:ilmoirfanpublishers1@gmail.com

عرض ناشر

علم و عرفان پبلشرز لاہور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سب سے زیادہ ناول اُردو نگاروں کی کتب کو شائع کیا اور خاص طور پر نئے لکھنے والوں کو ایک بہترین پلیٹ فارم مہیا کر کے ان کی رہنمائی بھی کی۔

علم و عرفان پبلشرز کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان شائع کردہ کے ناولز پر سب سے زیادہ ٹی وی ڈرامے بنائے گئے۔

ہاشم ندیم صاحب سے ہم نے خصوصی طور پر ان کے لکھے گئے ڈرامے ''رقص بسمل'' کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے کہا۔ جس پر انہوں نے بخوشی ہمیں اسے شائع کرنے کی اجازت دے دی اور یہ آج قارئین کے لیے کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم قارئین سے اُمید کرتے ہیں کہ اس ڈرامے ''رقص بسمل'' کو پڑھ کر ہمیں اپنی قیمتی رائے سے نوازیں گے۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

گلفراز احمد

ناشر

رقصِ بسمل

قسط نمبر 1

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

کیمرہ حویلی کے باہر لگی تختی پر لکھے گئے "کاشانہ پیراں" کے الفاظ کو فوکس کرتا ہے۔

پیر قدرت اللہ شاہ کے گھر کی بیٹھک/مجلس/آستانہ.....کوئی بڑا ہال نما کمرہ۔

عقیدت مند پیر قدرت اللہ کے سامنے سر جھکائے عقیدت سے پیر قدرت اللہ کی باتیں سن رہے ہیں۔انہیں میں اس کا بڑا بیٹا موسیٰ بھی شامل ہے۔محفل میں اگربتی اور لوبان کا دھواں پھیلا ہوا ہے اور پیر قدرت کے ہاتھ میں پکڑی لکڑی کی بڑی تسبیح کے دانوں کے کھٹ کھٹ گرنے کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی۔

پیر قدرت: مسرتیں کب پوری ہوتی ہیں.....؟ کوئی نہ کوئی گھاٹا باقی رہ جاتا ہے..... یہ سدا کا خسارہ ہے.....ایک سکھ ہمارے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے تو دوسرا کھڑکی سے رخصت ہو جاتا ہے.....شاید انسان کا ظرف ہی مسرت اور خوشی سمیٹنے کے لئے بہت کم ہے.....غور سے سنو..... یہ دُنیا ملنے کی جگہ نہیں ہے..... یہاں سب کھونا ہی انسان کا مقدر ہے.....انسان صرف کھونے کے لئے ہی تو دنیا میں وارد ہوا ہے.....

حجرے میں بیٹھے سب عقیدت مند غور سے پیر قدرت کی باتیں سن رہے ہیں۔اتنے میں پیر کا چھوٹا بیٹا عیسیٰ تیزی سے ہال میں داخل ہوتا ہے اور اپنے بڑے بھائی موسیٰ کی طرف بڑھتا ہے، پیر کا درس جاری رہتا ہے،عیسیٰ موسیٰ کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ موسیٰ کے چہرے کا رنگ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ محفل کے آداب توڑتے ہوئے دھیرے سے سر جھکا کر اٹھتے ہوئے باپ سے جانے کی اجازت چاہتا ہے۔پیر قدرت ناگواری سے اس کی جانب دیکھتا ہے مگر سر ہلا کر اجازت دے دیتا ہے۔موسیٰ کاندھے پر اپنا رومال ڈالتے ہوئے تیزی سے اُٹھ کر ہال سے باہر نکل جاتا ہے۔پیر بولتے بولتے پریشانی سے اپنے بیٹوں کو باہر جاتا دیکھتا رہتا ہے۔

پیر قدرت: جو پایا ہے.....وہ سب کھو کر واپس پلٹ جانا ہے.....تو پلٹنے کے لئے تیار رہو.....یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

موسیٰ کی چچازاد (کزن) سکینہ پریشانی سے کسی ویران مکان کے برآمدے میں ٹہل رہی ہے۔اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی ہیں،اتنے میں باہر دروازے پر آہٹ ہوتی ہے۔وہ گھبرا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے، باہر سے کامران اپنے دو دوستوں کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔دوست سلام کر کے ایک جانب نکل جاتے ہیں۔

سکینہ: اتنی دیر کہاں لگادی..... میرا خون خشک ہوگیا یہاں ڈر کے مارے.....

کامران: بس کچھ دیر ہوگئی..... آج کل قاضی ایسے معاملات سے بہت گھبرانے اور کترانے لگے ہیں..... آگے چل کر عدالت کی پیشیاں بھگتنے سے بھی ڈرتے ہیں سارے..... بڑی مشکل سے ایک قاضی کو راضی کیا ہے نکاح پڑھوانے کے لئے.....

سکینہ بے چینی سے باہر دیکھتی ہے۔

سکینہ: تو کہاں ہے قاضی..... آیا کیوں نہیں تم لوگوں کے ساتھ.....

کامران: نومی اسے لے کر آتا ہی ہوگا..... قاضی کی شرط یہی تھی کہ پہلے دو گواہوں کا انتظام کرلیا جائے..... اسی لئے میں دوستوں کو بھی لے آیا ہوں.....

سکینہ: مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے..... اب تک تو گھر میں بھی سب کو پتہ چل گیا ہوگا..... قیامت آچکی ہوگی وہاں.....

کامران: اوہو..... تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو اتنا..... گھنٹہ بھر کی بات ہے..... تب ہم دونوں قانونی اور شرعی طور پر میاں بیوی ہوں گے..... پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا.....

سکینہ: تم موسیٰ کو نہیں جانتے..... بہت سنگدل ہے..... جنگلی ہے..... جاہل ہے..... پیار محبت کے نام سے ہی نفرت ہے اُسے..... اور پھر ہمارے ہاں غیر سیّدوں میں بیاہا جانا بھی جرم ہی سمجھا جاتا ہے..... اور اگر موسیٰ کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرے اور تمہارے جسم کے اتنے ٹکڑے کرے گا کہ شاید کوئی ہمیں پہچان بھی نہ پائے..... وہ میرا چچازاد بھائی نہیں..... قصاب ہے.....

سکینہ کی باتیں سن کر کامران کا دل بھی بیٹھ جاتا ہے۔ وہ جلدی سے فون نکال کر نومی کو فون کرتا ہے۔

کامران: ہاں نومی..... کہاں رہ گئے ہو یار..... جلدی پہنچو.....

کامران فون کاٹ دیتا ہے۔ سکینہ ویسے ہی پریشان اور خوف زدہ کھڑی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: سڑک

موسیٰ اور عیسیٰ ایک جیپ/ ولیز پرانی اسٹائل کی جیپ میں کسی سڑک پر تیزی سے کہیں جارہے ہیں۔ موسیٰ غصّے میں گاڑی کا گیئر بدلتا ہے اور گاڑی کی رفتار بڑھا دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: پرانا ویران مکان/صحن

نومی دروازے سے قاضی کو لیے اندر داخل ہوتا ہے۔ برآمدے میں ٹہلتا کامران تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہے۔

کامران: کہاں رہ گئے تھے..... اتنی دیر لگادی۔

نومی: یہ قاضی صاحب سے پوچھو..... دو نکاح نپٹا کر ہمارے ساتھ آئے ہیں.....

قاضی حیرت سے ویران گھر کو دیکھ رہا ہے۔

کامران: اوہو..... اچھا چلیں اب آپ قاضی صاحب..... مزید دیر نہ کریں.....

قاضی: گواہوں کا انتظام ہوگیا ہے..... دیکھو میاں..... میں دو بالغ گواہوں اور علاقہ معتبرین کی شمولیت کے بغیر ہرگز یہ نکاح

نہیں پڑھاؤں گا.....،.....شروع سب سے پہلے اور مقدم ہے قاضی یونس کے ہاں.....

کامران: جی جی.....آپ بے فکر رہیں.....گواہ بھی موجود ہیں اور ان کے شناختی کارڈ بھی.....بس اب آپ مزید دیر نہ کریں.....

قاضی: ہاں تو چلو.....میں نے بھلا کب انکار کیا ہے.....

کامران جھلا کر تیزی سے قاضی کو لیے آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کوئی پرانا محلہ

موسیٰ کی گاڑی کسی اندرون شہر کے مضافاتی محلے میں داخل ہوتی ہے اور ایک گلی میں آ کر رُک جاتی ہے۔عیسیٰ اپنے بڑے بھائی کو ایک دُور بنے گھر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عیسیٰ: وہ لوگ قاضی کو اسی گھر کی طرف لائے ہیں موسیٰ بھائی.....

موسیٰ: غصے سے گھر کی طرف دیکھتا ہے اور گاڑی سے اُتر جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: ویران گھر

قاضی دو گواہوں اور نومی سمیت کامران اور سکینہ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔قاضی فارم بھر کر کامران کی طرف بڑھاتا ہے سکینہ نے گھونگھٹ اوڑھ رکھا ہے۔

قاضی: ہاں تو پھر شروع کریں.....مگر پہلے ذرا یہ ضروری لکھت پڑھت ہو جائے.....قانونی تقاضے بھی ضروری ہوتے ہیں میاں۔

کامران بے چین ہے۔

کامران: بس کردیں قاضی صاحب.....اور کتنے فارم بھرنا باقی ہیں ابھی.....آپ نکاح شروع کریں.....فارم بعد میں بھرتے رہیے گا.....

قاضی: ارے بھائی اتنے اُتاؤلے کیوں ہو رہے ہو.....یہ سب بھی نکاح خوانی کے ہی لوازمات ہیں.....اچھا تم یہاں دستخط کرو.....اور لڑکی کی طرف سے وکیل کسے مقرر کیا ہے تم لوگوں نے.....

اتنے میں کمرے کا دروازہ موسیٰ کی زوردار ٹھوکر سے دھڑ سے کھلتا ہے اور سب گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ جہاں بیچوں بیچ موسیٰ اپنی سرخ آنکھیں لیے غصے میں بپھرا کھڑا ہے۔سکینہ کی جان نکل جاتی ہے اور کامران گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

کامران: موسیٰ بھائی.....آپ؟

موسیٰ کے پیچھے عیسیٰ بھی دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہو جاتا ہے.....موسیٰ آگے بڑھ کر سیدھا سکینہ کی کلائی پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہے،قاضی گھبرا کر کہتا ہے،

قاضی: کیا کرتے ہو میاں.....یہ کیسی زبردستی ہے.....لڑکی لڑکا اپنی مرضی سے نکاح کر رہے ہیں.....اور دونوں بالغ بھی ہیں.....

موسیٰ کچھ کہے بغیر چیختی چلاتی سکینہ کو کھینچتا ہے۔موسیٰ کی جگہ عیسیٰ قاضی اور لڑکوں کو دھمکاتا ہے۔

عیسیٰ: شکر کرو زندہ لے جا رہے ہیں اسے.....پیروں کے خاندان کی لڑکی کا ناجائز نکاح پڑھانے کی سزا جانتے ہو قاضی جی.....،.....ساری عمر جیل میں سڑتے رہو گے.....

قاضی گھبرا جاتا ہے۔کامران ہمت کر کے کچھ بولنے کی کوشش کرتا ہے۔

کامران: موسیٰ بھائی..... میری بات تو سنیں..... میں اور سکینہ ایک دوسرے سے محبت.....

کامران کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی موسیٰ تڑپ کر پلٹتا ہے اور اس کا ہاتھ سیدھے کامران کے نرخرے پر جم جاتا ہے۔کامران کی دم گھٹنے کی وجہ سے آنکھیں باہر نکلنے لگتی ہیں.....

موسیٰ: تم کو میں بعد میں دیکھوں گا..... اس وقت میں یہاں کوئی تماشہ کرنا نہیں چاہتا..... ہمارے گھر کی لڑکی کا معاملہ ہے..... پہلے اسے لے جا کر اپنے گھر کے صحن میں دفن کرنا ہے مجھے..... تمہارا نمبر اس کے بعد آئے گا.....

موسیٰ سکینہ کو کھینچ کر باہر کی طرف بڑھتا ہے۔کامران کے دوست آگے بڑھ کر کچھ مداخلت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عیسیٰ انہیں ڈپٹ کر اپنے نیفے میں لگے پستول کی اپنی قمیض اٹھا کر ذرا سی جھلک دکھاتا ہے۔لڑکے وہیں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

عیسیٰ: زیادہ ہیرو بننے کی کوشش کی تو ایمبولینس بھی نہیں آئے گی تم لوگوں کی لاشیں اٹھانے..... چپ چاپ کھڑے رہو وہیں.....

موسیٰ ان سب باتوں سے بے نیاز سکینہ کو کلائی سے پکڑے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے جاتا ہے۔عیسیٰ وہیں کھڑے رہ کر کمرے میں موجود لڑکوں وغیرہ کو روکے رکھتا ہے۔قاضی یونس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی ہیں۔

قاضی: یہ کیا ماجرا ہے میاں..... شکل اور حلیے سے تو تم دونوں کسی دیندار گھرانے کے لگتے ہو..... مگر یہ تشدد پسندی کیوں.....

عیسیٰ: پیر گھرانے کی لڑکی باہر نہیں بیاہی جاتی قاضی جی..... شکر کرو بھائی نے تم سب کے لیے یہیں عدالت نہیں لگائی..... اب چپ چاپ بیٹھے رہو..... اور ہمارے جانے تک کسی کی آواز نہ نکلے..... کیا سمجھے.....

عیسیٰ بھی نکل جاتا ہے..... سب بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت اللہ کی حویلی/صحن

موسیٰ اسی طرح سکینہ کو ہاتھ سے پکڑے کھینچتے ہوئے حویلی کے صحن میں داخل ہوتا ہے۔سکینہ کی چیخیں سن کر پیر قدرت، اس کی بیوی پیرنی جی اور سکینہ کی بیوہ ماں خدیجہ گھبرائے ہوئے سے باہر نکل آتے ہیں۔موسیٰ سکینہ کو لا کر صحن کے درمیان میں پٹخ دیتا ہے۔موسیٰ کے پیچھے عیسیٰ بھی آتا ہے۔

پیر قدرت: (غصے سے) یہ کیا تماشہ بنا رکھا ہے موسیٰ..... کیا ہنگامہ ہے؟

کچھ نوکر اور خادمائیں شور سن کر باہر نکلتی ہیں مگر موسیٰ انہیں وہیں سے پلٹ جانے کا اشارہ کرتا ہے۔

موسیٰ: کوئی باہر نہیں آئے گا..... اندر جاؤ تم سب لوگ..... اور تماشہ میں نہیں آپ کی اس لاڈلی بھتیجی نے لگایا ہے ابا جی..... گھر سے بھاگ کر نکاح کرنے چلی تھی..... اگر میں چند لمحے اور دیر سے پہنچتا تو آپ کی اوپر اور نیچے کی آنے والی سات نسلوں کے دامن میں یہ داغ کوئی نہیں دھو سکتا تھا.....

پیر قدرت دکھ، صدمے، غصے اور بے یقینی کی کیفیت میں چلاتا ہے۔

پیر قدرت: سکینہ..... تم..... یہ کیا کہہ رہا ہے موسیٰ..... جواب دو..... خاموش کیوں ہو.....

سکینہ زمین پر پڑی رو رہی ہے۔خدیجہ جلدی سے روتے ہوئے آگے بڑھ کر زمین پر گری بیٹی کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔موسیٰ غصے سے چلاتا ہے۔

موسیٰ: یہ کیا جواب دے گی اب..... یہ چکر تو پتہ نہیں کب سے چل رہا تھا..... اگر ٹھیک وقت پر قاضی کے دفتر سے میرا بندہ

فون کر کے خبر نہ دیتا تو آج اس کی بارات بنا ڈولی کے نکل چکی ہوتی..... (موسیٰ سکینہ کی ماں سے کہتا ہے) اور چھوٹی ماں آپ..... آپ نے بھی اس پر نظر نہیں رکھی..... اتنا بڑا فیصلہ اس نے اکیلے ہی کر لیا..... (موسیٰ غصے سے چلا رہا ہے) آپ کی اجازت کے بنا یہ گھر سے نکلی کیسے..... پوچھئے گا ذرا اس سے.....

خدیجہ: (خدیجہ کے ہوش اُڑے ہوئے ہیں) مجھے تو یہ یونیورسٹی جانے کا کہہ کر نکلی تھی.....

پیر قدرت اپنی بیوہ بھابھی کی طرف پلٹتا ہے۔

قدرت: خدیجہ..... یہ موسیٰ کیا کہہ رہا ہے..... کیا..... یہ سچ ہے..... یہ کسی غیر سید کے ساتھ.....؟

خدیجہ شرمندگی سے سر جھکا لیتی ہے۔ لیکن خدیجہ کی جگہ سکینہ چلا کر بول اٹھتی ہے..... اور روتے ہوئے کہتی ہے۔

سکینہ: ہاں ہاں..... سچ ہے یہ..... میں اپنی مرضی سے گھر سے گئی تھی..... محبت کرتی ہوں میں کامران سے..... اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں..... دم گھٹتا ہے میرا یہاں..... ان پرانی دقیانوسی روایتوں میں..... اور کوئی گناہ نہیں کیا میں نے..... مجھے یہ حق میرے مذہب نے دیا ہے۔

پیر قدرت اپنا سر پیٹ لیتا ہے، پیرنی اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔

پیر قدرت: یا خدایا..... بس..... یہی کسر باقی رہ گئی تھی..... یہی سننا باقی رہ گیا تھا..... اسی لئے کہا تھا..... نہ پڑھاؤ اسے یونیورسٹی کالج میں زیادہ..... ایک بار لڑکی کے قدم گھر سے باہر پڑ جائیں تو پھر اسے بدنامی کے انجان راہوں پر آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا..... اب بھگتو سب مل کر.....

موسیٰ غصے سے آگے بڑھتا ہے اور سکینہ کو مارنے لگتا ہے، پیرنی (موسیٰ کی ماں) جلدی سے آگے بڑھ کر بچاتی ہے..... پیرنی موسیٰ..... بہن پر ہاتھ اٹھاؤ گے کیا.....

موسیٰ: ابھی کاشانۂ پیراں کے مرد اتنے بے غیرت نہیں ہوئے اماں..... اس کا فیصلہ آج اسی صحن میں ہوگا..... اور میرے اور اس کے درمیان آج کوئی آیا تو وہ بھی جان سے جائے گا.....

موسیٰ آگے بڑھتا ہے اور سکینہ کو گھسیٹتے ہوئے صحن کے وسط میں لے جاتا ہے۔ باقی سب لوگ دم بخود اُسے دیکھ رہے ہیں۔ خدیجہ قدرت اللہ اور اس کی بیوی کے پیروں میں گری معافیاں مانگ رہی ہے، پیرنی یہ سب دیکھ کر بے چین اور غم زدہ سی دکھائی دے رہی ہے۔

//Cut No # 1//

Scene No # 8

CONTINUE

خدیجہ: آپ کو آپ کے مرحوم بھائی کا واسطہ پیر جی..... معاف کر دیں میری اس نادان بیٹی کو..... میں آئندہ گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی..... بس آخری خطا سمجھ کر معاف کر دیں..... میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں..... میری عزت آپ کے قدموں میں پڑی ہے.....

خدیجہ اپنی شال/ڈوپٹہ اُتار کر پیر قدرت کے پیروں میں ڈال دیتی ہے، مگر پیر قدرت ویسے ہی بت بنا کھڑا رہتا ہے۔

پیر: ہمارے خالص خون میں ملاوٹ کرنے کی سزا جانتی ہو ناں تم..... ماضی میں ایسی ہی غلطی کی پاداش میں اس حویلی کے پچھلے قبرستان میں کئی انجان قبریں آباد ہو چکی ہیں..... ایک قبر اور سہی.....

خدیجہ تڑپ کر پیرنی کے قدموں میں گر جاتی ہے۔

خدیجہ: بھابھی..... آپ تو میری سکینہ کو جانتی ہیں ناں..... گودوں کھلایا ہے آپ نے اُسے..... کیا آپ بھی آج اس بیوہ کی مدد نہیں کریں گی.....

پیرنی (ھاجرہ) بے بسی سے خدیجہ کو پکڑ کر اُٹھاتی ہے اور ڈرتے ڈرتے شوہر سے کہتی ہے۔

بڑی پیرنی / ہاجرہ: پیر جی..... وہ..... میں نے کہا۔

پیر قدرت غصے میں بنا بیوی کی طرف دیکھ ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں بلند کرتا ہے۔ اس کی بیوی وہیں گھبرا کر چپ ہو جاتی ہے۔ خدیجہ پیرنی کو بھی بے بس پا کر تیزی سے موسیٰ کی طرف بڑھتی ہے جو سکینہ کو کھینچ کر صحن کے وسط میں لگے درخت سے باندھنے کی تیاری میں ہے۔ خدیجہ بھاگتی ہوئی جاتی ہے اور اپنا دوپٹہ موسیٰ کے قدموں میں ڈال دیتی ہے

سکینہ کی ماں / خدیجہ: موسیٰ..... میرا تم پر بھی ایک احسان ہے..... یاد ہے ناں..... میں تمہاری بھی رضاعی ماں ہوں..... بچپن میں جب تمہاری ماں شدید بیماری میں بستر پر پڑی تھی اور تم بھوک سے بلک رہے تھے، تب میں نے ہی تمہیں اپنا دودھ پلایا تھا..... آج میں تمہیں اُسی رشتے سے اپنے احسان کا واسطہ دیتی ہوں..... میری سکینہ کو بخش دو..... ورنہ میں تمہیں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی.....

بپھرا ہوا موسیٰ خدیجہ کی بات سن کر اپنی جگہ جم سا جاتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ رک جاتے ہیں، خدیجہ اپنی بیٹی کے گلے لگ کر رو پڑتی ہے جو ابھی وہیں گھر کے صحن کے بیچ بے بس اور لاچار سی گری پڑی ہے۔ موسیٰ اپنا رومال اپنے کاندھے پر ڈالتا ہے۔

موسیٰ: بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے چھوٹی ماں..... میں بھی وہی کر رہا تھا جو ایک بڑے بھائی کا فرض بنتا ہے..... بہرحال..... اب اگر یہ مجھے گھر کے باہر نظر آئی تو میرا ہاتھ نہیں رُکے گا..... میں نے آپ کے دودھ کا قرض ادا کر دیا ہے آج.....

موسیٰ اپنی بات ختم کر کے پیر پٹختا وہاں سے چلا جاتا ہے۔ پیر قدرت بھی تسبیح پھیرتا پلٹ جاتا ہے..... عیسیٰ اور پیرنی بھی چلے جاتے ہیں۔ خدیجہ اپنی نڈھال بیٹی جس کے ماتھے سے خون بہہ رہا ہے کو ساتھ لپٹائے روتی رہتی ہے۔

//Cut//

مونتاج

رات ہونے کا مونتاج۔

کاشانہ پیراں پر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: کاشانہ پیراں

کھانے کا کمرہ

کمرے میں زمین پر دسترخوان بچھا ہوا ہے (طویل دسترخوان)۔ پیر قدرت اللہ کے انتظار میں اس کے دونوں بیٹے، بیوی اور خدیجہ دسترخوان کے کنارے کھڑے ہیں۔ قدرت اللہ اندر داخل ہوتا ہے اور بسم اللہ کہہ کر بیٹھ جاتا ہے، سب اس کے بیٹھنے کے بعد ہی زمین پر دسترخوان کے گرد بیٹھتے ہیں۔ پیر قدرت سکینہ کی غیر موجودگی محسوس کرتا ہے۔

پیر قدرت: سکینہ کہاں ہے.....؟..... کیا اُسے کھانا نہیں کھانا.....؟

سکینہ کی ماں خدیجہ گھبرا کر جواب دیتی ہے۔

خدیجہ: جی بھائی جان..... اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے..... میں نے اسے نیند کی گولی دے کر سلا دیا ہے.....

پیر قدرت خدیجہ کی بات سن کر چپ رہتا ہے اور پیرنی سب کو کھانا سرو کرتی ہے۔ ایک آدھ نوکرانی بھی اُس کی مدد کے لئے ساتھ موجود رہتی ہے۔

پیر قدرت: میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں اب جلد از جلد کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر کسی سید گھرانے میں سکینہ کا نکاح کر دینا چاہیے..... لڑکی کے قدم ایک بار باہر پڑ جائیں تو پھر وہ گھر میں کم ہی ٹکتی ہے.....

خدیجہ پریشانی سے ہاجرہ (پیرنی) کی طرف دیکھتی ہے۔

پیرنی: لیکن پیر صاب..... اتنی جلدی..... میرا مطلب ہے اتنی عجلت میں کوئی اچھا رشتہ بھلا کیسے مل پائے گا.....

قدرت: یہ سوچنا تم لوگوں کا دردِ سر نہیں ہے..... رشتہ ہے میری نظر میں..... ویسے بھی ابھی یہ بدنامی والی بات گھر سے باہر نہیں نکلی..... گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو بہتر ہے..... اس گھرانے کی حرمت کا خیال رکھنا ہم مردوں کا ہی فرض ہے۔

سب چونک کر قدرت کی طرف دیکھتے ہیں۔ قدرت کھانا کھانے میں مگن ہے.....

خدیجہ دوبارہ گھبرا کر پیر کی طرف دیکھتی ہے۔

خدیجہ: آپ کس رشتے کی بات کر رہے ہیں بھائی جان..... آس پاس تو سکینہ کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں ہے.....

پیر: اگر موسیٰ تمہارا رضاعی بیٹا نہ ہوتا تو میں یہ ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ڈال دیتا..... ایسی سرکش گھوڑی کو لگام دینا اسی کے ہاتھ کا کھیل ہے..... مگر موسیٰ نہ سہی..... تو عیسیٰ ہی سہی..... مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کو قابو میں اور خوش بھی رکھے گا.....

عیسیٰ چونک کر باپ کی طرف دیکھتا ہے۔ خدیجہ کے ہاتھ سے نوالہ گر جاتا ہے۔

خدیجہ: عیسیٰ..... مگر..... بھائی جان.....

پیر قدرت گھور کر خدیجہ اور پھر عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

پیر قدرت: ہاں..... عیسیٰ..... گھر میں اس سے بہتر کوئی اور رشتہ نہیں ہے..... کیوں عیسیٰ..... کیا تمہیں اپنے باپ کے فیصلے پر کوئی اعتراض ہے.....

عیسیٰ سٹپٹا کر جواب دیتا ہے۔

عیسیٰ: مجھے..... نہیں..... نہیں ابا جان..... آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر.....

قدرت فخر سے خدیجہ کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: دیکھا..... یہ ہوتی ہے تربیت..... میرا بیٹا ہی تمہاری اس بدنامی کی گٹھڑی پر اپنی عزت کی چادر ڈالے گا..... تیاری کر لو جو بھی کرنی ہے..... اگلی جمعرات کو عیسیٰ اور سکینہ کا نکاح ہوگا.....

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ غصے، دکھ اور پریشانی سے چلا اُٹھتی ہے۔

سکینہ: یہ ناممکن ہے..... میں..... اور عیسیٰ..... نہیں اماں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... اور پھر عیسیٰ تو شاید مجھ سے دو چار ماہ چھوٹا ہی ہوگا..... میں یہ فیصلہ ماننے سے انکار کرتی ہوں..... میں کسی کو اپنی زندگی برباد کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی..... زہر کھا کر مر جاؤں گی مگر عیسیٰ کے ساتھ نکاح نہیں کروں گی.....

خدیجہ بیٹی کی باتیں سن کر رو پڑتی ہے۔

خدیجہ: تو پھر تھوڑا سا زہر مجھے بھی لا دو..... تم سے پہلے میں اپنی اس بے بس اور لاچار زندگی کا خاتمہ کر لوں تو بہتر ہے..... بدنامی کی ایک کالک تو تم نے پہلے ہی میرے چہرے پر مل دی ہے..... خودکشی کر کے مجھے مزید ذلت اور دکھوں کے سمندر میں

دھکا دینے سے بہتر ہے کہ میں بھی اب اپنی آنکھیں بند کرلوں..... مزید کوئی الزام، طعنہ اور طنز برداشت نہیں کرسکتی میں تمہاری تربیت کے حوالے سے.....

سکینہ بھی رو پڑتی ہے۔

سکینہ: کیسی ماں ہیں آپ؟ اس بے جوڑ رشتے پر تایا سے میرے حق میں لڑنے کے بجائے آپ مجھی کو کوس رہی ہیں..... کیا اپنی مرضی سے اپنی زندگی جینا کوئی جرم ہے..... ایسا کون سا گناہ کر دیا میں نے اپنے دل کی پسند حاصل کرنے کی کوشش کر کے..... اس بات کی اتنی بڑی سزا..... اس جاہل عیسیٰ کے ساتھ میرا نکاح پڑھوایا جارہا ہے اور آپ چپ چاپ اپنی بیٹی کو برباد ہوتے دیکھ رہی ہیں..... مائیں ایسی ہوتی ہیں کیا.....؟

بیٹی کے طعنے سن کر خدیجہ بھی پھٹ پڑتی ہے۔

خدیجہ: نہیں..... مائیں ایسی نہیں ہوتیں..... مائیں بیٹیوں کی ڈھال ہوتی ہیں..... مگر وہ مائیں تمہاری ماں کی طرح بے بس، لاچار اور کسی اور کے در پر پڑی ان کے ٹکڑوں کی محتاج نہیں ہوتیں..... تمہارا باپ آج زندہ ہوتا تو تمہارے لیے ان سب سے لڑ جاتا..... مگر تمہاری بیوہ ماں کو اب صرف ایک اسی چھت کا سہارا ہے..... تم چاہو تو اپنی مرضی کر کے یہ سہارا، یہ چھت بھی چھین لو اپنی ماں سے..... میں اُف بھی نہیں کروں گی..... لیکن اپنے پیچھے مجھے عمر بھر کے طعنے اور طنز کے تیر سہنے کے لئے زندہ نہ چھوڑنا..... دعا کرنا کہ میری رُوح اور تمہارے قدم ایک ساتھ ہی اس گھر کی دہلیز پار کریں.....

خدیجہ روتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ سکینہ غصے، بے بسی اور دُکھ سے وہیں کھڑی اپنے ہونٹ کاٹتی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن نکل رہا ہے۔

جگہ: کاشانہ پیراں

رات سے صبح ہونے کا مونتاج۔

عیسیٰ یا اس کی ماں، بڑی پیرنی کا کمرہ۔

عیسیٰ ماں کے سامنے بیٹھا ہے، ماں اس کے سر میں تیل کی مالش کر رہی ہے۔

عیسیٰ: سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کب دیا ابا نے..... بس حکم صادر کر دیا..... اور اماں تم نے ہی تو سمجھایا ہے بچپن سے..... کہ باپ کے حکم کے آگے سر جھکانا ہی عین عبادت ہے.....

ماں بیٹے کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتی ہے۔

ماں: ہاں..... آیا بڑا فرمانبردار..... سب جانتی ہوں میں..... دل ہی دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے تیرے..... ماں ہوں تیری..... ایک ایک رگ پہچانتی ہوں بچپن سے.....

عیسیٰ: کیا اماں..... تم بھی دل کا چور خوب پکڑتی ہو..... پر سچ کہوں تو مجھے سکینہ پر ترس بھی آرہا ہے..... کہاں میں..... کہاں وہ..... میں نے تو ساری پڑھائی مدرسوں میں کی ہے اور وہ انگریزی یونیورسٹی تک پہنچ گئی تھی..... سچ تو یہی ہے کہ ہمارا کوئی جوڑ بنتا نہیں ہے..... اور پھر وہ کسی اور کو پسند بھی کر بیٹھی۔

ماں: اپنے باپ کے سامنے ایسی بات منہ سے نہ نکالنا..... سکینہ مجھے بھی بہت پیاری ہے..... اور رہی جوڑ کی بات تو میرا عیسیٰ بھی کسی شہزادے سے کم نہیں ہے..... اب اگر سکینہ کو اپنی عزت بنانے کے لئے ہاں کر ہی دی ہے تو پھر مردوں کی طرح نبھانا بھی اُسے..... میں تیری زبان سے اس کے ماضی کا کوئی طعنہ نہ سنوں کبھی.....

اتنے میں موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ماں بیٹے کو راز و نیاز کرتے دیکھ کر برا سا منہ بناتا ہے۔

موسیٰ: تم ابھی تک یہیں اماں کے گھٹنے سے لگے بیٹھے ہو..... باہر ہزار کام باقی پڑے ہیں.....

عیسیٰ: بس آیا بھائی..... تمہیں تو پتہ ہے اماں سے سر کی مالش کروائے بنا میرا دماغ ٹھکانے نہیں رہتا دن بھر۔

ماں پیار سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

ماں: تم بھی آجاؤ موسیٰ..... تمہارے سر کی مالش بھی کر دوں..... شاید اسی بہانے تمہارے سر کی گرمی کچھ دور ہو جائے..... نہ کیا کروا اتنا غصہ..... تمہارے چہرے پر مسکراہٹ ہی بھلی لگتی تھی مجھے ہمیشہ سے..... مگر تم نے تو جیسے مسکرانا ہی چھوڑ دیا ہے.....

موسیٰ: (موسیٰ ماں کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔) اب ہر وقت اس نالائق کی طرح دانت نکالنے سے تو رہا میں..... اور کچھ عقل، کوئی اچھی مت دیں اپنے اس لاڈلے بیٹے کو..... شادی ہونے جا رہی ہے اس کی..... ویسے عیسیٰ تم نے بڑا ظرف دکھایا کل رات..... تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی یہ کڑوا گھونٹ نہ پیتا..... اب سنبھال لینا اُسے..... باغی ہو چکی ہے وہ.....

ماں بڑے بیٹے کو گھورتی ہے۔

ماں: موسیٰ..... کیا ہو گیا ہے تمہیں.....؟..... میرا بیٹا اتنا پتھر دل اور اکھڑ تو نہیں تھا کبھی۔

عیسیٰ ماں کو چھیڑتا ہے۔

عیسیٰ: بھائی آج کل ابا کے درس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے اماں..... آخر آگے چل کر اسی کو گدی سنبھالنی ہے خاندان کی..... ابھی سے پتھر دلی نہ دکھائی تو ابا اسے اپنا جانشین بھلا کیوں بنانے لگے.....

موسیٰ ڈپٹ کر کہتا ہے۔

موسیٰ: بکو مت..... اور شکر کرو کل میرے ہاتھ سے بچ گئے وہ لڑکے..... مگر ابھی میرا حساب پورا نہیں ہوا ہے..... تم تیار ہو جاؤ..... ہمیں ابھی باہر نکلنا ہے۔

ماں موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیتی ہے۔

ماں: موسیٰ..... خیر دار جو تم نے مزید کوئی لڑائی جھگڑا یا ہنگامہ کیا..... تمہیں میری قسم..... ورنہ میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے.....

موسیٰ: یہ کیا مسئلہ ہے آپ عورتوں کے ساتھ اماں..... آپ نے بھی چچی کی طرح فٹ اپنی قسم دے ڈالی۔

ماں: سکینہ اب اس گھر کی اور تمہارے چھوٹے بھائی کی عزت ہے..... تم نے اگر کوئی قدم اُٹھایا تو عزت ہماری ہی اُچھلے گی بازاروں میں..... بس..... میں نے کہہ دیا ہے ناں..... بھول جاؤ سب کچھ..... اپنی ماں کی اتنی بھی نہیں سنو گے۔

موسیٰ بیچارگی سے پہلے ماں اور پھر عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

خدیجہ کے ساتھ سکینہ اپنے کمرے میں اُداس، بے چین اور بے بس سی بیٹھی ہوئی ہے۔ پیرنی اس کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ پیرنی کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹہ ہے۔ سکینہ پیرنی کو دیکھ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتی ہے۔ خدیجہ بھی چونک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

پیرنی: رو رہی ہو.....؟..... میرا خدا جانتا ہے کہ میں ہمیشہ سے تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی تھی..... مگر اس طرح سے نہیں..... اور تم پر زور زبردستی اور جبر کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... میں تو پہلے اپنے موسیٰ کی دلہن اس حویلی میں لانا چاہتی

تھی..... وہ عیسیٰ سے بڑا ہے..... اصولاً تو اس کا رشتہ پہلے ہونا چاہیے تھا..... مگر پھر یہ سب ہو گیا..... ان سب کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں.....

سکینہ: یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں تائی جان..... مجھے آپ سے تو کوئی گلہ نہیں..... میں جانتی ہوں میری ماں کی طرح آپ بھی اس حویلی کی ان اونچی دیواروں کی ایک قیدی ہیں..... بس فرق یہ ہے کہ آپ دونوں کے پیروں میں بھی میری طرح لوہے کی کوئی بیڑی ابھی ڈالی نہیں گئی۔

پیرنی: ایسی باتیں نہیں کرتے..... عیسیٰ دل کا بہت اچھا بچہ ہے..... اور مجھے یقین ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا.....

سکینہ چڑ کر کہتی ہے۔

سکینہ: لیکن میں عیسیٰ سے محبت نہیں کرتی تائی اماں..... میں نے کبھی اس کے بارے میں ایسا سوچا ہی نہیں.....

خدیجہ بیٹی کو جھاڑتی ہے۔

خدیجہ: سکینہ..... یہ کیا طریقہ ہے..... لڑکیاں ایسے بات کرتی ہیں بھلا.....

پیرنی خدیجہ کو مزید کچھ کہنے سے روک دیتی ہے۔

پیرنی: کہنے دو اسے خدیجہ..... یہ سکینہ اور اس کی تائی اماں کے درمیان کی بات ہے..... اور ہاں..... رہی بات محبت کی..... تو اصل محبت لڑکی کو شادی کے بعد اس کے خاوند سے ہی ہوتی ہے۔ اس سے پہلے زندگی میں آنے والی محبتوں کی کوئی اوقات نہیں ہوتی..... تمہیں بھی یہ بات دھیرے دھیرے سمجھ میں آ جائے گی..... اچھا چلو..... اب موڈ ٹھیک کرو اپنا..... دیکھو..... کتنے کم دن رہ گئے ہیں نکاح میں..... میرا تو یہ ارمان بھی پورا نہ ہوا کہ اپنے بیٹے کی بارات لے کر اُتروں کسی آنگن میں..... مگر پھر بھی دل کے ارمان بہت ہیں..... دیکھو..... میں آج تمہارے لیے یہ شگن کا پیلا دوپٹہ لے کر آئی ہوں..... یہ اوڑھ لو اور میرے عیسیٰ کو قبول کر لو.....

خدیجہ رو پڑتی ہے اور پیرنی سکینہ کے سر پر دوپٹہ اوڑھا دیتی ہے۔ سکینہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران گھبرایا ہوا سا کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کے بوڑھے ماں باپ ایک پارسل سامنے رکھے بیٹھے ہیں جس کے اندر سے کسی سفید کپڑے کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے۔

کامران: کیا ہوا.....؟ اتنی جلدی میں آنے کا پیغام کیوں بھیجا آپ لوگوں نے مجھے..... سب خیر تو ہے ناں۔

کامران کا باپ اس کو پارسل کی طرف اشارہ کر کے لرزتی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

باپ: پیغام ہم نے نہیں..... تمہارے دشمنوں نے بھیجا ہے بڑی حویلی سے..... اور یہ پیغام کیا ہے..... سمجھو ایک تحفہ بھیجا ہے انہوں نے.....

کامران: کیسا تحفہ.....

ماں: کفن..... سفید کپڑا بھیجا ہے کفن کا..... جانتے ہو ناں..... اس کا کیا مطلب ہے..... ایک ماں کا دل کیسے دہلا ہو گا یہ کفن دیکھ کر.....

کامران: یہ تو سراسر بدمعاشی ہے ان کی..... ناانصافی ہے..... میں سکینہ کو بھگا کر نہیں لے گیا تھا نکاح کرنے..... اس کی مرضی سے گئے تھے ہم دونوں.....

کامران کا باپ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑتا ہے۔

باپ: وہ بہت بڑے گدی نشین ہیں..... مجھے تو یہ بھی ان کی مہربانی لگتی ہے کہ انہوں نے تمہیں کفن پہنا کر بھیجنے کے بجائے ہمیں صرف اشارہ بھیجا ہے فی الحال..... میں نے تمہاری سکھر کی ٹکٹ کروادی ہے ٹرین کی..... گھنٹہ بھر میں گاڑی چھوٹ جائے گی..... تمہاری ماں نے سارا ضروری سامان باندھ دیا ہے..... تم ابھی سکھر کے لئے نکل رہے ہو۔

کامران: میں سکینہ کو اس حال میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں..... جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا انہوں نے.....

ماں رو پڑتی ہے اور کامران کے ہاتھ پکڑ کر التجا کرتی ہے۔

ماں: تمہاری بھی دو جوان بہنیں ہیں..... ہم کب تک انہیں دوسروں کے گھروں میں چھپائے رکھیں گے..... اپنا نہیں تو انہی کا سوچو..... تم نہ رہے تو پیچھے تمہاری بہنوں کا کیا ہوگا..... کون انہیں بیاہ کر لے جائے گا..... خود پر نہیں تو ہم پر رحم کرو..... محبت ہم غریبوں کے بس کی بات نہیں..... ہمیں صرف رشتے نبھانے ہوتے ہیں..... تمہیں بھی نبھانے ہوں گے۔

کامران بے بسی سے باپ کی طرف دیکھتا ہے۔ باپ دکھ سے آنکھیں میچ کر ہاں میں سر ہلاتا ہے۔

کامران: مگر ابا..... میں.....

باپ: تم تیار ہو جاؤ..... میں تمہیں اسٹیشن چھوڑنے ساتھ چلوں گا.....

بے بس کامران ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اور سر جھکا لیتا ہے۔

//Cut # 1//

A- مونتاج: اداس سکینہ پیلا دوپٹہ اوڑھے کمرے میں بیٹھی ہے۔

//Cut # 2//

B- مونتاج: کوئی ٹرین تیزی سے کسی بڑے پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہوئے سیٹیاں بجا کر تیز رفتار پکڑ رہی ہے۔

//Cut # 3//

C- مونتاج: دن۔

کاشانہ پیراں کو جھنڈیوں اور رنگین قمقموں سے سجایا جا رہا ہے۔

//Cut # 4//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ دلہن بنی بیٹھی ہے..... کمرے میں پیرنی اور خدیجہ کے علاوہ کچھ دوسری لڑکیاں اور عورتیں بھی موجود ہیں۔ موسیٰ ہاتھ میں رجسٹر وغیرہ لیے کمرے میں آتا ہے تو باقی عورتیں باہر نکل جاتی ہیں..... خدیجہ سکینہ کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ سکینہ سر اٹھا کر نفرت سے موسیٰ کو دیکھتی ہے..... موسیٰ سکینہ کے قریب آتا ہے۔

موسیٰ: مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا گیا ہے..... قاضی صاحب بھی آتے ہوں گے..... تمہاری رضامندی پوچھنے.....

سکینہ تڑپ کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

سکینہ: میری رضامندی بھائی..... کیا اب بھی ضرورت ہے اس منافقت کی.....

موسیٰ: بڑا ہوں تم سے..... اور تم جانتی ہو بچپن سے میں ہی تمہاری حفاظت کرتا آیا ہوں..... درجنوں لڑائیاں لڑی ہیں میں نے محلے کے بچوں سے تمہارے کھلونوں کے لئے..... سب بھول گئیں کیا.....؟

سکینہ: نہیں..... سب یاد ہے..... بڑے فخر سے میں اپنی ساری سہیلیوں کو بتاتی تھی کہ یہ ہے میرا بڑا بھائی..... موسیٰ..... اس کے

ہوتے کس کی مجال ہے جو میری طرف نظر بھی ڈال سکے..... اور تم سے مار بھی بہت کھائی ہے میں نے بچپن میں بھائی..... اسکول نہ جانے پر..... لمبی دوپہروں میں گھر سے چھپ کر باہر نکلنے پر..... تمہارے پین اور مار کر توڑنے پر..... مگر اس بار جو مار تم نے مجھے ماری ہے اس کی چوٹ بڑی گہری ہے..... کبھی نہیں بھولوں گی میں اس مار کو.....

موسیٰ: میں قاضی کو بلا کر لاتا ہوں..... تم یہ کوسنے مجھے بعد میں بھی دے سکتی ہو.....

موسیٰ جانے لگتا ہے۔ سکینہ پیچھے سے اُسے آواز دیتی ہے۔

سکینہ: کوسنا نہیں ہے بھائی..... بس جاتے جاتے ایک آخری بددُعا سنتے جاؤ میری..... خدا کرے کہ تمہیں بھی کسی سے محبت ہو اور وہ تمہیں نہ ملے..... خدا کرے کہ تم بھی کبھی کسی کے لئے پل پل تڑپو..... جلو اور مرو مگر وہ تمہاری دسترس سے باہر رہے..... خدا کرے کہ تمہارے ارمانوں کا خون بھی میری طرح تمہاری سیج پر ہی ہو..... خدا کرے.....

سکینہ کچھ اور کہنے لگتی ہے مگر پیرنی جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیتی ہے۔

پیرنی: بس بھی کرو..... وہ تمہارا دشمن نہیں ہے.....

موسیٰ ایک نگاہِ غلط سکینہ پر ڈالتا ہے اور کمرے سے نکل جاتا ہے..... سکینہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No #15

مونتاج: قاضی موسیٰ کی موجودگی میں سکینہ اور عیسیٰ سے تین بار قبول قبول کہلوا کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتا ہے۔ سب مبارکباد دیتے ہیں۔ عیسیٰ پہلے باپ کے گلے لگتا ہے اور پھر بھائی کی طرف مڑتا ہے۔ موسیٰ مسکرا کر چھوٹے بھائی کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: ہاں بھئی..... خاصے احمق لگ رہے ہو دولہا بن کر.....

عیسیٰ ہنس کر بھائی کے گلے لگ جاتا ہے۔

عیسیٰ: بھائی..... میری دعا ہے تم بھی جلد ہی ان احمقوں میں شامل ہو جاؤ۔

سب ہنستے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا آستانہ/ حجرہ وغیرہ

موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

موسیٰ: آپ نے یاد کیا تھا ابا.....؟

پیر قدرت: ہاں بھئی..... وہ محکمۂ اوقاف کے ڈائریکٹر صاحب کا فون آیا تھا..... وہ کہہ رہے ہیں کہ آج اندرون شہر والی املاک کا معائنہ کرنے ان کی ٹیم جا رہی ہے ہماری درخواست پر..... تم ایسے کرو عیسیٰ کے ساتھ وہاں چلے جاؤ..... آج ہی وہ اس پرانے مزار کی فائنل رپورٹ جاری کریں گے کہ اُسے اوقاف کا محکمہ اپنی نگرانی میں لے رہا ہے کہ نہیں.....

موسیٰ: ٹھیک ہے ابا..... میں چلا جاتا ہوں..... عیسیٰ کو رہنے دیں.....

قدرت اللہ کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔

پیر قدرت: کیوں..... عیسیٰ کہاں ہے..... کمرے سے باہر نہیں آیا کیا..... کب تک بیوی کے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہے گا..... اس سے کہو تمہارے ساتھ جائے..... ایک سے بھلے دو رہتے ہیں۔

موسیٰ: جی ابا.....

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: سڑک/ پاسنگ

موسیٰ اور عیسیٰ پرانی ولیز جیپ میں اندرون شہر کی طرف جا رہے ہیں..... اچانک گاڑی کو دو چار جھٹکے لگتے ہیں اور جیپ رُک جاتی ہے۔ موسیٰ ایک دو سیلف مار کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر گھور کر بھائی کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: کل تم لے کر گئے تھے ناں گاڑی..... پیٹرول ڈلوایا تھا۔

عیسیٰ گڑبڑا جاتا ہے۔

عیسیٰ: پیٹرول..... نہیں..... مگر سوئی تو ابھی بھی آدھا ٹینک بھرا دکھا رہی ہے.....

موسیٰ ڈانٹتا ہے۔

موسیٰ: بتایا تھا تم کو پہلے بھی..... سوئی خراب ہے..... اب یہاں میں کہاں سے ڈھونڈوں پیٹرول پمپ.....

عیسیٰ: تم فکر نہ کرو بھائی..... میں کوئی رکشہ پکڑ کر لے آتا ہوں۔

موسیٰ: اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس..... پہلے ہی تمہارے چکر میں دیر ہو گئی گھر سے نکلتے وقت..... سرکاری محکمہ ہمارے لئے اتنا انتظار نہیں کرے گا۔

عیسیٰ: پھر کیا کریں بھائی.....

موسیٰ آس پاس نظر دوڑاتا ہے۔ سامنے بس اسٹاپ پر بس آ کر رُکتی ہے۔

موسیٰ: تم گاڑی لے کر وہاں پہنچو..... میں بس لے کر نکلتا ہوں..... ویسے بھی یہ بس سیدھی پرانے مزار تک ہی جائے گی..... وقت بچ جائے گا ہمارا..... مگر دیر مت کرنا۔

موسیٰ عیسیٰ کو وہیں چھوڑ کر بس کی طرف لپک جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کوئی لوکل بس

موسیٰ بس میں سوار ہوتا ہے۔ اسے بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ اُسی لمحے بس میں عورتوں والے حصے میں نقاب اوڑھے اور برقعہ پہنے ایک لڑکی (زہرہ) داخل ہوتی ہے اور ایک جانب خالی سیٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔ بس میں عورتوں کی سیٹ کے بالکل پیچھے دو لڑکے بیٹھے ہوئے ہیں/ جن میں ایک سامنے/ اگلی سیٹ پر بیٹھی کالج کی کسی لڑکی کو تنگ کرنے کی نیت سے اس کی پیچھے لٹکتی بالوں کی لٹ کو کسی بہانے ہاتھ لگا رہا ہے۔ لڑکی Irritle ہو رہی ہے مگر چپ ہے اور پیچھے نہیں دیکھتی۔ اتنے میں اسٹاپ آ جاتا ہے اور وہ لڑکے اتر جاتے ہیں۔ موسیٰ کو ٹھیک اسی کالج والی (یونیفارم میں) بیٹھی لڑکی کے پیچھے بیٹھنے کی جگہ مل جاتی ہے۔ زہرہ ان لڑکوں کی حرکت نوٹ کر چکی ہے۔ موسیٰ کے بیٹھتے ہی بس چل پڑتی ہے اور لڑکی کو لگتا ہے کہ جیسے کسی نے پھر پیچھے سے اُسے Touch کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب کالج والی لڑکی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور وہ چلا کر موسیٰ کو ڈانٹتی ہے۔

لڑکی: بس روکیں پلیز..... یہ غنڈہ کب سے مجھے بہانے بہانے سے چھیڑنے کی کوشش کر رہا ہے.....

بس میں ہلچل سی مچ جاتی ہے اور بہت سے خدائی خدمت گار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ موسیٰ ہکا بکا سا بیٹھا ہوا ہے۔ ایک دو

بزرگ اور جوان موسیٰ کی طرف لپکتے ہیں بس چلتی رہتی ہے۔

بزرگ: شرم نہیں آتی..... بھری بس میں لڑکی کو چھیڑ رہے ہو.....

موسیٰ اطمینان سے جواب دیتا ہے۔

موسیٰ: بس بھری ہو یا خالی..... دونوں صورتوں میں اکیلی لڑکی کو چھیڑنا بری بات ہے..... مگر میں نے ان محترمہ کو نہیں چھیڑا..... کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اسے۔

لڑکا: تمہاری غلط فہمی تو ہم دور کرتے ہیں..... روکو اوئے بس.....

لڑکا موسیٰ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ موسیٰ ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر لڑکے کو ایک ہاتھ رسید کرتا ہے۔ بس میں ہلچل سی پڑ جاتی ہے۔ تبھی برقعہ/نقاب میں بیٹھی لڑکی دھیرے سے کہتی ہے۔

زہرہ: رُک جائیں سب..... یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... اس اسٹوڈنٹ کو چھیڑنے والے تو پچھلے سٹاپ پر ہی اُتر چکے ہیں..... یہ بے قصور ہیں.....

موسیٰ چونک کر لڑکی کی طرف دیکھتا ہے جس کی صرف دو سیاہ آنکھیں نقاب سے باہر جھانک رہی ہیں۔ لڑکی کی نظر بھی موسیٰ سے ملتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 2

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: سڑک

عیسیٰ کسی بوتل یا کین وغیرہ میں پیٹرول لے کر آتا ہے اور جیپ کی ٹینکی کھول کر اندر انڈیل دیتا ہے۔ اور پھر جیپ کو سیلف مار کر اسٹارٹ کرتا ہے۔ جیپ چل پڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: بس/ پاسنگ

بس چل رہی ہے۔ زہرہ ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی ونڈ سکرین سے باہر دیکھ رہی ہے۔ موسیٰ کن اکھیوں سے ایک دو بار اُسے دیکھتا ہے مگر زہرہ کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے۔ اتنے میں بس کا کنڈکٹر مڑکا اسٹاپ آنے کا شور مچاتا ہے۔

کنڈکٹر: نیلا گنبد مزار..... نیلا گنبد مزار.....

موسیٰ اور زہرہ دونوں ایک ساتھ اُٹھتے ہیں اور ایک آدھ دیگر مسافر سمیت نیلا گنبد مزار کے اسٹاپ پر اُتر جاتے ہیں۔ زہرہ ایک دو قدم آگے بڑھتی ہے اسے موسیٰ پیچھے سے آواز دے کر روکتا ہے۔

موسیٰ: سنیے.....

زہرہ پلٹ کر موسیٰ کو دیکھتی ہے۔

موسیٰ: آپ کا بہت شکریہ.....

زہرہ دھیرے سے پوچھتی ہے۔

زہرہ: کس بات کا.....؟

موسیٰ: میرے حق میں گواہی دینے کے لئے..... شکریہ.....

زہرہ: کوئی بات نہیں..... ویسے تم عجیب لڑکے ہو..... اپنی صفائی دینے کے بجائے تم نے اُلٹا انہی سے جھگڑا شروع کر دیا..... زندگی میں دلیل بھی کوئی چیز ہوتی ہے..... کس کس سے لڑو گے.....؟

زہرہ بولتے بولتے اپنی مسکراہٹ چھپا جاتی ہے اور پلٹ کر وہاں سے چل پڑتی ہے۔ موسیٰ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے..... زہرہ کسی گلی کے نکڑ سے مڑ کر غائب ہو جاتی ہے مگر موسیٰ ابھی بھی وہیں کھڑا ہے۔ اچانک پیچھے سے آنے والی کوئی گاڑی/ بائیک وغیرہ زور سے ہارن بجا کر اسے راستہ خالی کرنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ہارن کی آواز سے موسیٰ چونک کر اپنے خیالات کی رو سے باہر آ جاتا ہے۔ آس پاس ٹریفک رواں ہے۔ موسیٰ گم سم اور کچھ ہکا بکا پریشان سا اپنی راہ چل پڑتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: نیلے گنبد والا مزار

محکمہ اوقاف کی سرکاری ٹیم مزار کا معائنہ کر رہی ہے۔ موسیٰ دُور مزار کے صحن میں بنی چھوٹی سی مُنڈیر کی دیوار پر بیٹھا ہے جبکہ عیسیٰ افسران سے بات کر رہا ہے۔

افسر: ٹھیک ہے ہم نے ساری عمارت کا جائزہ لے لیا ہے..... واقعی فوری مرمت اور Renovation کی ضرورت تو ہے اسے..... آپ پیر صاحب کو ہمارا پیغام دیجئے گا کہ محکمے سے جو ممکن ہوا وہ ہم کریں گے..... آپ کے آباؤ اجداد کا پرانا مزار ہے یہ..... ہم اس کی اہمیت سمجھتے ہیں..... اور جلد ہی اسے اوقاف محکمے کی نگرانی تلے بھی لایا جائے گا.....

عیسیٰ: جی ٹھیک ہے مختار صاحب..... بڑی مہربانی آپ کی..... زحمت دی آپ کو.....

ٹیم کا سربراہ عیسیٰ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ عیسیٰ پلٹ کر دور بیٹھے اپنے بھائی کو دیکھتا ہے۔ جو اس سارے معاملے سے لاتعلق ہاتھ میں پکڑی کنکریاں ایک ایک کر کے فضا میں اچھال رہا ہے۔ عیسیٰ بھائی کی طرف بڑھتا ہے۔

عیسیٰ: کیا موسیٰ بھائی..... میں تو سمجھا تھا کہ جب تک میں یہاں پہنچوں گا..... تم سارے معاملات طے کر چکے ہو گے..... مگر تم تو ایسے لاتعلق بیٹھے ہو جیسے کسی دعوت پر بلایا ہو تمہیں کسی نے.....

موسیٰ بیزاری سے بھائی کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: بات ہو گئی ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ.....

عیسیٰ: ہاں..... اگلے ہفتے تک رپورٹ جمع کروا دیں گے وہ اوپر والوں کو..... کام بن جائے گا.....

موسیٰ: تو پھر چلیں.....

موسیٰ کھڑا ہو جاتا ہے اور آگے چل پڑتا ہے۔ عیسیٰ حیرت سے بھائی کو دیکھتا ہے اور پیچھے لپکتا ہے مگر موسیٰ چلا جاتا ہے۔

عیسیٰ: یہ کیا بھائی..... اتنی محنت کی ہے میں نے..... کچھ کھلا ہی دو..... اچھا کھانا نہ سہی..... کہیں سے اچھی چائے ہی پلوا دو..... پیسٹری سموسے کے ساتھ.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن۔شام

جگہ: سڑک/پاسنگ

موسیٰ کی جیپ واپس گھر کی طرف روانہ ہے۔ موسیٰ چپ چاپ کسی سوچ میں گم ہے۔ عیسیٰ بھائی کی خاموشی محسوس کرتا ہے۔

عیسیٰ: کوئی بات ہوئی ہے کیا بھائی..... بس میں کسی سے جھگڑا تو نہیں ہوا.....

بس کا ذکر آتے ہی موسیٰ کے خیال میں زہرہ کی دو بڑی سیاہ آنکھیں نقاب میں چھپی، سامنے آ جاتی ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے سر جھٹک کر اپنے آپ کو نارمل کرتا ہے اور بات بدلنے کے لئے کہتا ہے۔

موسیٰ: مجھ سے جھگڑ کر کسی نے ہسپتال جانا ہے کیا..... ویسے ہی..... آج سر میں کچھ درد ہے صبح سے..... اچھا چھوڑو..... تم یہ بتاؤ..... سکینہ کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ..... اب تو ہفتہ ہو گیا تمہارے نکاح کو.....

عیسیٰ: رویہ کیا بھائی..... وہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرتی سیدھے مُنہ.....

موسیٰ ڈانٹتا ہے۔

موسیٰ: کیا.....؟.....سیدھے منہ بات نہیں کرتی.....تو تم سارا سارا دن کمرے میں گھسے کیا کرتے رہتے ہو.....؟.....آج تین دن بعد تمہاری شکل دیکھی ہے میں نے.....

عیسیٰ شرمندہ سا جواب دیتا ہے۔

عیسیٰ: اب گلے باندھ دی ہے تو نبھانی تو پڑے گی ناں.....میں نے پہلے ہی اماں ابا سے کہا تھا کہ میں سکینہ کے قابل نہیں ہوں۔

موسیٰ اُسے ڈانٹتا ہے۔

موسیٰ: فضول باتیں مت کرو.....اب وہ غیرت ہے تمہاری.....بے غیرتی مت دکھانا.....مرد بنو.....

عیسیٰ چپ رہتا ہے۔موسیٰ گاڑی چلاتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

کاشانۂ پیراں۔

سکینہ کا کمرہ

سکینہ اور اُس کی ماں خدیجہ موجود ہیں۔سکینہ چڑی ہوئی ہے۔

سکینہ: تو اب اور کیا چاہتے ہیں آپ سب لوگ مجھ سے.....کر تو لی شادی.....اب اور کیا کروں.....ہر وقت پھولوں کے ہار ہاتھ میں پکڑے اس کا انتظار کرتی رہوں.....

خدیجہ: پھولوں کے ہار ڈالنے کا تم سے کون کہہ رہا ہے.....مگر تم تو ڈھنگ اور سلیقے سے بات بھی نہیں کرتیں عیسیٰ کے ساتھ.....شوہر ہے وہ تمہارا.....کیا میں نے تمہیں یہی تربیت دی تھی.....،کیوں میری ناک کٹوانے پر تلی رہتی ہو ہر وقت.....

سکینہ غصے سے جواب دیتی ہے۔

سکینہ: ایک تو تمہاری اس موم کی ناک سے میں بہت تنگ آ چکی ہوں اماں.....جو ہر موقع بے موقع کٹنے کے لئے تیار رہتی ہے۔

خدیجہ: جب خود کسی بیٹی کی ماں بنو گی ناں.....تو پھر تمہیں یہ سارے طنز اور طعنے یاد آئیں گے جو آج تم تیروں کی صورت مجھ پر برسا رہی ہو.....

سکینہ: عیسیٰ نے آپ سے شکایت کی ہے میری.....

خدیجہ: نہیں.....لیکن میری اپنی آنکھیں بھی ابھی تک کھلی ہیں.....سب نظر آتا ہے مجھے.....بس.....میں نے کہہ دیا ہے.....اب دوبارہ میں یہ سب نہ دیکھوں.....ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا.....

خدیجہ بیٹی کو ڈانٹ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔سکینہ غصے میں قریب پڑی کوئی چیز/تکیہ وغیرہ اُٹھا کر دور پھینکتی ہے اور خود سے بڑبڑاہٹ میں کہتی ہے۔

سکینہ: کامران.....کاش تم اتنے بزدل نہ ہوتے.....،.....ڈرپوک.....بھگوڑے کہیں کے.....

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں۔

موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے آنکھوں پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں گم ہے.....اُسے آج بس میں ملنے والی لڑکی کی آنکھیں، مسکراتی نظر اور کہی ہوئی بات یاد آ رہی ہے۔

(فلیش بیک) زہرہ: دلیل بھی کوئی چیز ہوتی ہے..... آخر کس کس سے لڑو گے.....

موسیٰ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے..... اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے اور اس کی ماں (پیرنی جی) کمرے میں پریشان سی داخل ہوتی ہے۔

پیرنی: فضلو بتا رہا تھا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... کیا ہوا میرے شہزادے کو..... سر میں درد ہے تو میں دبا دوں.....

موسیٰ: نہیں اماں..... بس طبیعت کچھ بوجھل سی ہوگئی ہے..... صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا..... آپ میری اتنی فکر نہ کیا کریں.....

پیرنی: فکر کیوں نہ کروں..... اور تم اب میری مانتے ہی کب ہو..... جانے کہاں دن بھر بھٹکتے رہتے ہو..... بات بے بات لوگوں پر غصہ ہوتے رہتے ہو..... سر میں درد تو ہونا ہی تھا ناں.....

ماں زبردستی بیٹے کا سر گود میں رکھ کر دبانا شروع کر دیتی ہے۔

پیرنی: پتہ ہے..... میری بڑی خواہش تھی کہ تم دو بھائیوں کے بعد اگر کوئی میری اولاد نصیب میں لکھی ہو تو خدا کرے کہ بیٹی ہو..... جن بھائیوں کی کوئی بہن ہوتی ہے وہ اکھڑ اور بدمزاج نہیں رہتے..... بڑا نرم دل ہو جاتا ہے اُن کا.....

موسیٰ بیزاری سے کہتا ہے۔

موسیٰ: تو بیٹی کی جگہ اب آپ کی لاڈلی بہو جو آ گئی ہے..... اسی پر اپنے سارے ارمان پورے کریں اب۔

پیرنی: ہاں..... وہ تو کروں گی ہی..... پر میری خواہش تھی کہ عیسیٰ سے پہلے تمہارا گھر بس جائے..... کوئی تمہاری بھی پہرے دارنی آئے جو راتوں کو باہر مٹر گشتی کرنے پر تم سے روٹھے..... سوال کرے..... اب دیکھنا..... میں تمہاری بھی بہت جلد شادی کروا دوں گی..... عیسیٰ کی طرح تمہارے پیروں میں بھی بیڑیاں ڈال دوں گی۔

موسیٰ: میں عیسیٰ کی طرح کسی بدتمیز، بدمزاج اور آزاد خیال لڑکی سے بیاہ نہیں کروں گا..... ،

پیرنی: اچھا..... چلو یوں ہی سہی..... پھر تم اپنی پسند بھی بتا دو.....

موسیٰ: پسند وسند مجھے کوئی نہیں..... ہاں بس لڑکی ہو تو پوری دیندار، سر سے پاؤں تک باحجاب، پردے دار اور روایات میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہیے..... جس کے ہاتھ بھی کسی نے نہ دیکھے ہوں۔

ہاتھوں کا ذکر کرتے ہوئے موسیٰ کے ذہن میں زہرہ کا سراپا ابھرتا ہے۔ کیونکہ زہرہ نے ہاتھوں میں بھی سیاہ باریک ریشمی دستانے پہن رکھے تھے۔ ماں غور سے موسیٰ کی کیفیت دیکھ رہی ہے۔

پیرنی: اچھا..... تو یہ بات ہے..... مگر بڑی سخت شرائط ہیں بھئی یہ تو..... آج کل ایسی لڑکی کا ملنا محال ہے..... ،..... زمانہ بدل چکا ہے..... ،..... اب تو بڑے دیندار گھرانوں کی لڑکیاں بھی ضروری تعلیم کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہیں اور چادر اور برقعہ بھی سمٹ کر حجاب تک آ پہنچا ہے.....

موسیٰ: ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے اماں..... بس یہ یاد رکھنا کہ میں شادی کروں گا تو ایسی ہی لڑکی سے..... ورنہ کنوارہ ہی بھلا.....

پیرنی: اچھا بابا اچھا..... ،..... شروع کرتی ہوں تمہارے لئے ایسی کسی نیک پروین کی تلاش..... لیکن تمہیں بھی اس تلاش میں میری مدد کرنی ہوگی..... تمہاری ماں اب بوڑھی ہوگئی ہے..... زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کر پاؤں گی تمہاری اس گوہر نایاب کو ڈھونڈنے میں.....

موسیٰ: اگر قسمت میں لکھی ہوگی تو مل جائے گی..... آپ خود کو پریشان نہ کریں زیادہ..... میری شادی کے علاوہ بھی اور بہت سے اہم کام باقی پڑے ہیں ابھی..... وقت آنے پر سب ہو جائے گا.....

موسیٰ آنکھیں موند لیتا ہے۔ ماں سر دباتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

عیسیٰ اور سکینہ کا کمرہ

سکینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے/ یا ڈریسنگ روم سے باہر نکلتی ہے تو کمرے میں بستر کی مسہری پر تکیے کے اوپر دو موتیے کے گجرے اور پان کی پُڑیا پڑی دیکھتی ہے۔ اسی لمحے عیسیٰ بھی اندر آتا ہے۔

سکینہ: یہ سب کیا ہے.....

عیسیٰ گڑبڑا کر جواب دیتا ہے۔

عیسیٰ: وہ..... میں باہر گیا تھا تو گلی کے نکڑ پر گجرے والا گجرے بیچ رہا تھا..... تو میں نے سوچا تمہارے لئے بھی لیتا آؤں..... اور پان تو تمہیں ویسے بھی پسند ہے ناں..... یاد ہے تم ہمیشہ مجھی سے پان لانے کی فرمائش کرتی تھیں جب بھی میں گھر سے باہر جایا کرتا تھا.....

سکینہ تکیہ جھٹک کر دونوں چیزیں نیچے گرا دیتی ہے۔

سکینہ: وہ پہلے کی بات تھی..... اب مجھے پان کھانے سے ہی نفرت ہو چلی ہے..... دوبارہ یہ زحمت مت کرنا میرے لئے.....

سکینہ چادر جھاڑ کر بستر پر لیٹ جاتی ہے اور سر تک چادر تان لیتی ہے۔ عیسیٰ دُکھ سے اپنے تحفے کی ناقدری دیکھتا ہے اور زمین سے اُٹھاتا ہے۔

عیسیٰ: میں بہت پیار سے لایا تھا تمہارے لئے.....

سکینہ منہ سے چادر ہٹاتی ہے۔

سکینہ: پلیز..... مجھ پر اپنا یہ سستا پیار جتانے کی کوششیں کرنا چھوڑ دو..... ہم دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شادی کن حالات میں ہوئی ہے..... مجبوری کا تعلق ہے..... مجبوری کی طرح ہی نبھانے دو.....

عیسیٰ: لیکن ایسے کب تک چلے گا..... تمہیں اگر اتنا ہی ناپسند تھا میں تو انکار کر دیتیں اسی وقت..... نکاح نامے پر دستخط ہی کیوں کیے۔

سکینہ: کہا ناں..... وہ میری مجبوری تھی..... لیکن تم تو مجبور نہیں ہو..... چاہو تو ابھی دو لفظ بول کر فارغ کر دو مجھے..... ورنہ اور بھی بڑے طریقے ہوتے ہیں تم مردوں کے پاس..... مجھ پر چلاؤ..... ہاتھ اٹھاؤ..... مارو مجھے..... تاکہ میری یہ گھٹی چیخیں باہر سارا زمانہ سن سکے.....

عیسیٰ: یہی سب کرنا ہوتا تو میں تمہیں اپنے نکاح میں قبول ہی کیوں کرتا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو.....

سکینہ پھٹ پڑتی ہے۔

سکینہ: ہاں تو کیوں کیا نکاح میرے ساتھ..... موسیٰ کے ساتھ مل کر وہیں اسی صحن میں مجھے زندہ گاڑھ کیوں نہیں دیا..... یہ تو کر سکتے تھے ناں تم..... کیوں مجھے زندہ رہنے دیا.....

عیسیٰ: کیونکہ تم مجھے اچھی لگتی ہو..... ہمیشہ سے.....

سکینہ عیسیٰ کے منہ سے یہ بے ساختہ جواب سن کر لاجواب سی ہو جاتی ہے اور غصے میں دوبارہ منہ تک چادر لپیٹ کر خود کو جیسے عیسیٰ سے چھپا لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن نکلنے کا موسماج

جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت کا آستانہ/مجلس

پیر قدرت لوگوں سے/ اپنے عقیدت مندوں سے خطاب کر رہا ہے۔ موسیٰ اور عیسیٰ بھی موجود ہیں۔ لیکن آج موسیٰ کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ پیر قدرت بیٹے کی یہ ذہنی غیر موجودگی محسوس کر لیتا ہے۔

پیر قدرت: اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اوقاف اور زیارتوں کے محکمے نے نیلے گنبد والے مزار کو اپنی تحویل میں لینے کا وعدہ کر لیا ہے..... کیوں موسیٰ..... کیا بات ہوئی تھی کل..... سب حاضرین کو بتاؤ.....

موسیٰ اپنے خیالات میں گم بیٹھا ہوا ہے۔ عیسیٰ موسیٰ کو خاموش پا کر پہلے کھنکارتا ہے اور پھر کوئی رسپانس نہ پا کر کہنی مار کر بھائی کو متوجہ کرتا ہے۔ قدرت اللہ بیٹے کی غیر دماغی پر گھور کر اسے دیکھتا ہے۔

موسیٰ: جی..... کیا.....؟

قدرت: دھیان کہاں ہے تمہارا موسیٰ..... اتنی اہم بات ہو رہی ہے محفل میں..... اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری تو گھر جا کر آرام کرو.....

موسیٰ شرمندگی سے سر جھکا لیتا ہے۔ پیر قدرت اپنی بات جاری رکھتا ہے۔

قدرت: ہمیں وقتاً فوقتاً اپنے گدی نشین بھائیوں کی املاک کو اسی طرح تحفظ دینا ہوگا..... ورنہ زمانہ تو قیامت کی چال چل ہی چکا ہے..... یہ نئی نسل بھلا اب ان باتوں کو اہمیت کب دیتی ہے..... ہمیں اپنے اسلاف کی تاریخ خود محفوظ کرنی ہوگی۔

پیر قدرت اپنا درس جاری رکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

موسیٰ تیزی سے کاشانہ پیراں کے آستانے/ مردانے کی عمارت سے باہر نکلتا ہے اور اپنی جیپ کی طرف بڑھتا ہے۔ عیسیٰ بھی اس کے پیچھے باہر آتا ہے۔

عیسیٰ: کہاں چل پڑے بڑے بھائی..... ابا کا موڈ پہلے ہی سے خراب ہے آج..... پوچھیں گے تو کیا کہوں.....

موسیٰ: پتہ نہیں..... بس کہہ دینا کہ اچانک کہیں نکل پڑا ہوں.....

موسیٰ جیپ سٹارٹ کرتا ہے۔ عیسیٰ حیرت سے پوچھتا ہے۔

عیسیٰ: لیکن مجھے تو بتاتے جاؤ..... کہاں جا رہے ہو..... پھر کسی سے جھگڑنے تو نہیں جا رہے۔

موسیٰ: کہاں ناں مجھے خود پتہ نہیں ہے..... ایک الجھن میں گرفتار ہوں..... اُسی کا حل ڈھونڈنے جا رہا ہوں..... بس مزید کوئی سوال مت کرنا مجھ سے..... اور سنبھال لینا پیچھے.....

موسیٰ جیپ کو گیئر ڈالتا ہے اور عیسیٰ کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے تیزی سے جیپ بھگا لے جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: سڑک/ پاسنگ

موسیٰ گاڑی میں کہیں جا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار ہیں۔

//Cut # 1//

موسیٰ گاڑی اسی بس اسٹاپ کے سامنے پارک کرتا ہے جہاں اس نے پہلی مرتبہ زہرہ کو دیکھا تھا۔

//Cut # 2//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: بس اسٹاپ

بس رُکی ہوئی ہے

موسیٰ بس میں چڑھتا ہے اور اسے پچھلی جانب کونے میں سیٹ ملتی ہے۔ وہ بے چینی سے بس میں زنانے والے حصے میں نظریں دوڑاتا ہے مگر وہاں زہرہ موجود نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر واپس اُترنے لگتا ہے تبھی اگلے دروازے سے زہرہ اپنے مخصوص حلئے میں کسی دوسری اسٹوڈنٹ لڑکی کے ساتھ باتیں کرتی اندر داخل ہوتی ہے۔ موسیٰ اپنی جگہ پر جم سا جاتا ہے۔ زہرہ بیٹھ جاتی ہے اور بس چل پڑتی ہے۔ موسیٰ کی نظریں زہرہ کے باپردہ چہرے سے نظر آتی دو نگاہوں کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ مگر زہرہ اس سارے معاملے سے بے خبر ہے، کیونکہ (موسیٰ اور زہرہ کی سیٹ کے درمیان فاصلہ بھی زیادہ ہے) بات کرتے کرتے ایک آدھ بار زہرہ کے چہرے سے نقاب کھل جاتا ہے۔ موسیٰ زہرہ کو دیکھتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد/ بس اسٹاپ

بس نیلا گنبد بس اسٹاپ پر آ کر رُکتی ہے۔ زہرہ اپنی ساتھی سے الوداع کہہ کر اسٹاپ پر اُتر جاتی ہے۔ موسیٰ بھی جلدی سے بس سے اُترتا ہے۔ زہرہ سڑک سے ملحق ایک گلی میں مُڑ جاتی ہے۔ موسیٰ اس کے پیچھے اس گلی میں داخل ہوتا ہے۔ زہرہ سر جھکائے جا رہی ہے۔ موسیٰ کچھ قدم کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ تبھی اسکول کے بچوں کا ایک ریلہ چھٹی کے بعد تیزی سے گلی میں بنے کسی گھر نما اسکول سے نکلتا ہے۔ بچوں کے ہاتھ میں تختیاں اور بستے گلے سے لٹکے ہیں، موسیٰ بچوں میں گھر کر دو لمحے اپنی توجہ کھو دیتا ہے۔ اور جیسے ہی وہ سر اُٹھا کر اوپر دیکھتا ہے۔ زہرہ دُور کسی دوسری گلی کے نکڑ سے مڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔ موسیٰ تیزی سے لپک کر اس گلی کے کونے تک پہنچتا ہے مگر وہ گلی اب سنسان پڑی ہے۔ موسیٰ جھنجھلا کر آس پاس تیزی سے نظریں دوڑاتا ہے۔ مگر زہرہ کہیں نہیں نظر آتی۔

موسیٰ اپنا غصہ خود اپنے اوپر نکالتا ہے اور زور سے دیوار میں ہاتھ مارتا ہے۔ اور پھر بے بس سا واپس پلٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں/

پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت اور بیوی کمرے میں موجود ہیں۔

قدرت: گھر نہیں آیا..... تو پھر کہاں چلا گیا ہے وہ..... عیسیٰ کو بھی کچھ پتہ نہیں ہے.....

پیرنی: اچھا..... مگر موسیٰ تو آپ کو بتائے بنا کبھی گھر سے قدم باہر نہیں رکھتا..... ورنہ بھائی کو تو ضرور بتا کر جاتا ہے۔

قدرت: یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ نظر رکھو اپنے بڑے بیٹے پر.....آج کل جانے کن خیالوں میں گم رہتا ہے.....کام پر بھی دھیان نہیں ہے اس کا.....

پیرنی مسکراتی ہے۔

پیرنی: یہ تو اچھی بات ہے.....؟ شاید دھیان کسی اور طرف لگ جائے اس کا.....میں تو دعائیں کرتے نہیں تھکتی ہوں.....

قدرت اللہ حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: کیا مطلب.....گویا تمہیں اپنے جوان بیٹے کے حواس باختہ ہو جانے کی تمنا ہے.....

پیرنی: خدانخواستہ.....حواس باختہ ہوں موسیٰ کے دشمن.....میں تو اس کا دھیان بٹنے کی بات کر رہی تھی.....پہلے تو شادی بیاہ کے نام سے ہی بدک جاتا تھا.....جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو.....مگر عیسیٰ کے نکاح کے بعد مجھے لگتا ہے موسیٰ کو بھی نکاح کے لئے راضی کرنا اب زیادہ مشکل نہیں ہوگا.....

قدرت چونک کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: شادی.....اور وہ بھی موسیٰ کی.....کیا اس نے تم سے ایسی کسی خواہش کا اظہار کیا ہے.....؟

پیرنی: نہیں.....کھل کر تو کوئی بات نہیں کی.....مگر اپنی پسند بتا دی ہے.....باپردہ، باحیا.....دیندار اور کسی مذہبی گھرانے کی سلجھی ہوئی لڑکی کا رشتہ چاہیے اُسے.....

قدرت اللہ بیٹے کی پسند سن کر فخریہ انداز میں مسکراتا ہے۔

قدرت اللہ: ظاہر ہے.....کاشانۂ پیراں کے وارث اور مستقبل کے گدی نشین کو ایسی ہی کسی لڑکی کی خواہش کرنی چاہیے.....ٹھیک ہے.....تم موسیٰ کے لئے کوئی ایسا ہی رشتہ ڈھونڈ لو.....جلد ہی ہم اس کا بیاہ کر دیں گے.....

پیرنی بھی مسکراتی رہتی ہے۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آتا ہے۔

پیرنی: ان شاء اللہ.....ارے ہاں.....وہ آپ نے ذکر کیا تھا ناں ایک بار، اپنے پرانے دوست پیر فضل شاہ کے گھرانے کا.....کیا بھلا سا نام تھا ان کی بیٹی کا.....ہاں.....ستارہ.....

قدرت: ارے ہاں.....خوب یاد دلایا.....پیر فضل شاہ کے گھرانے سے بہتر بھلا اور کون سا گھرانہ ہو سکتا ہے موسیٰ کے سسرال کے لئے.....

پیرنی: تو پھر میں انہیں بلا لوں دعوت پر کھانے کی.....آخر کہیں سے تو ابتداء کرنی ہوگی ناں.....

قدرت: ہاں ہاں.....کوئی حرج نہیں اس میں.....میں خود دعوت بھجوا دیتا ہوں انہیں کہ جمعرات کی رات کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں.....مع اہل وعیال.....

پیرنی بیٹے کی شادی کے سپنوں میں کھو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: کوئی بارونق سی گلی

فضاء میں کہیں دور طبلے اور گھنگھروؤں کی تھاپ ہے۔ زہرہ خود کو پردے میں چھپائے گلی سے گزر جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

پس منظر کی شاعری/Vocal

اے دل تو انہیں دیکھ کر کچھ ایسے تڑپنا
آ جائے ہنسی ان کو جو بیٹھے ہیں خفا سے.....
سنتے ہیں کہ مل جاتی ہے ہر چیز دعا سے
اک روز تمہیں مانگ کے دیکھیں گے خدا سے.....

موسیٰ کی جیپ کہیں سے آ کر رُکتی ہے اور وہ تھک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیتا ہے۔ //Cut//

Scene No # 16

وقت: رات
جگہ: موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ اور عیسیٰ موجود ہیں۔

موسیٰ: کیا..... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔

عیسیٰ: افسوس ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی..... کیونکہ میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے اور مجھے خود اماں نے بتایا ہے..... گھر میں تمہارے رشتے کی باتیں چل رہی ہیں..... اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کی فرمائش تم نے خود اماں کے سامنے کی تھی۔

موسیٰ سر پیٹ لیتا ہے۔

موسیٰ: یار..... یہ اماں بھی ناں..... بات کا بتنگڑ بنانا کوئی ان سے سیکھے..... میں نے صرف یونہی برسبیل تذکرہ ایک بات کر دی تھی..... کہ شادی کروں گا تو کسی دیندار گھرانے میں کروں گا..... اماں نے تو بات ہی پکڑ لی.....

اتنے میں باہر سکینہ دروازے پر آتی ہے اور دونوں بھائیوں کو بات کرتے سن چھپ کر سننے لگتی ہے۔

عیسیٰ: ہاں تو اس میں برائی کیا ہے..... ویسے بھی میں تو خواہ مخواہ ہی درمیان میں آ گیا..... نمبر تو اصل میں تمہارا بنتا تھا.....

موسیٰ: خدا کے لئے اب تم بھی یہ راگ الاپنا شروع مت کر دینا..... میں پہلے ہی بہت الجھن میں ہوں کسی کی وجہ سے..... مجھے زندگی میں ایسی الجھن کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑا.....

عیسیٰ: کیسی الجھن..... دیکھو بھائی..... اب یہ مت کہہ دینا کہ تمہاری اس الجھن کا تعلق بھی کہیں کسی لڑکی.....

باہر کھڑی سکینہ چونک جاتی ہے..... موسیٰ عیسیٰ کو جھڑک دیتا ہے۔

موسیٰ: بکو مت..... اور اماں کو روکو..... یہ بکھیڑہ کھڑا نہ کریں ابھی۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: رات
جگہ: موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ زہرہ کے خیال میں ڈوبا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن نکلنے کا مونتاج
جگہ: نامراد کی دوکان/
موسیٰ باہر رکھے بینچ پر بیٹھا ہے

اس بار موسیٰ اپنی جیپ پر پہلے ہی نیلا گنبد کے اسٹاپ پر آ کر رُکتا ہے۔ اور جیپ ایک جانب کھڑی کر کے زہرہ کی راہ

تکنے لگتا ہے۔اور اسی گلی کے نکڑ پر بیٹھ جاتا ہے جہاں زہرہ سڑک سے اُتر کر اندر گئی تھی۔ وقت گزر رہا ہے مگر موسیٰ کے لئے جیسے وقت رُک سا گیا ہے۔ وہ بار بار اپنے ہاتھ کی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ تبھی دور سے بس آتی دکھائی دیتی ہے۔ موسیٰ جلدی سے سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے۔ بس رکتی ہے اور اس میں سے ایک دو سواریوں کے بعد زہرہ نیچے اترتی ہے۔ موسیٰ کے حلق میں جیسے پیاس کے مارے کانٹے سے اُبھر آتے ہیں۔ اور وہ جلدی سے قریب رکھی نامراد کی دوکان کی کریٹ میں سے پانی کی پوری بوتل حلق سے نیچے انڈیل لیتا ہے۔ زہرہ حسب معمول سر جھکائے اپنی راہ چلتی ہوئی موسیٰ کے قریب سے گزرتی ہے۔ موسیٰ جلدی سے دوکاندار نامراد کو نوٹ پکڑا کر زہرہ کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ اس کے ماتھے پر پسینہ اُبھر آتا ہے اور وہ کسی سنسان گوشے کے تلاش میں ہے جہاں وہ زہرہ سے بات کر سکے۔ آخر ایسی جگہ آجاتی ہے اور موسیٰ جلدی سے آگے بڑھ کر زہرہ کو آواز دیتا ہے۔

موسیٰ: سُنیں.....، میری بات سنیے.....

زہرہ ٹھٹھک کر رُکتی ہے اور حیرت سے پلٹ کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: جی.....مجھ سے کچھ کہا.....؟

موسیٰ زہرہ کے پوچھنے پر سٹپٹا سا جاتا ہے۔

موسیٰ: جی.....وہ.....میں.....

زہرہ کو جیسے کچھ یاد آجاتا ہے۔

زہرہ: ارے.....تم.....تم تو وہی ہو ناں.....اُس دن بس میں۔

موسیٰ: ہاں.....مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے.....میرا مطلب ہے.....میں.....

زہرہ حیرت سے موسیٰ کو دیکھتی ہے پھر مسکرا دیتی ہے۔

زہرہ: مولوی صاحب.....آپ بھی.....میں تو تمہیں کافی شریف لڑکا سمجھتی تھی.....مگر تم.....تم بھی اوروں جیسے ہی نکلے.....،

موسیٰ: نہیں.....نہیں.....ایسی کوئی بات نہیں.....میں نے کبھی کسی لڑکی کو زندگی میں ایسے روک کر بات نہیں کی.....بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی لڑکی سے بات ہی نہیں کی.....مگر.....تم.....تم.....

زہرہ غور سے اُسے دیکھتی ہے.....

زہرہ: ہاں میں.....کیا.....ویسے یہ بہت پرانا طریقہ ہو گیا ہے کسی سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے کا.....

موسیٰ: نہیں نہیں.....تم پھر غلط سمجھ رہی ہو.....میں تو بس یہ کہنا چاہتا ہوں.....کہ.....کیا تم مجھ سے شادی کرو گی.....میری نیت غلط نہیں ہے بالکل.....

زہرہ موسیٰ کے منہ سے اچانک شادی کا ذکر سن کر ہکا بکا سی رہ جاتی ہے اور سختی سے موسیٰ سے کہتی ہے۔

زہرہ: ہوش کریں مولوی صاحب.....اور گھر جائیں اپنے.....آتے جاتے لوگ ہمیں شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں.....شریف گھرانے کے لگتے ہو.....اپنی عزت کا کچھ خیال کرو.....

زہرہ موسیٰ کو جھاڑ پلا کر بڑھ جاتی ہے۔ موسیٰ کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر بول نہیں پاتا۔

//Cut//

Scene No # 18-A

کوئی آؤٹ ڈور سمندر کنارے سڑک، جیپ پیچھے کھڑی ہے۔

موسیٰ کسی خیال میں گم ساحل کنارے کھڑا کچھ سوچ رہا ہے۔ اسے کچھ دیر پہلے زہرہ سے ہوئی بات اور زہرہ کی ڈانٹ یاد آتی ہے۔ موسیٰ غصے میں ہاتھ میں پکڑا پتھر دور پانی میں پھینکتا ہے اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ تبھی دوسری جانب سے عیسیٰ کسی پرانی سی بائیک پر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اور بھائی کو دیکھ کر کہتا ہے۔

عیسیٰ: مجھے پتہ تھا بھائی..... تم یہیں ملو گے..... اپنے پسندیدہ مقام پر..... تھک گیا ہوں تمہیں تلاش کرتے کرتے۔

موسیٰ بے زاری سے کہتا ہے۔

موسیٰ: تم مجھے کیوں تلاش کر رہے ہو..... کبھی میری جان چھوڑ بھی دیا کرو.....

عیسیٰ: میں تو شاید جان چھوڑ بھی دوں..... مگر ظل سبحانی کبھی نہیں چھوڑیں گے..... تمہیں فوراً یاد کیا ہے ابا جان نے.....

موسیٰ: ایسی کیا آفت آ گئی ہے.....؟

عیسیٰ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے۔

عیسیٰ: آفتیں پوچھ کر نہیں آیا کرتیں بھائی..... جلدی چلو..... ورنہ میری بھی پیشی ہو جائے گی..... دو گھنٹے کے لئے کسی دوست سے یہ پھٹیچر سا موٹر سائیکل مانگ کر لایا تھا میں..... یہ بھی واپس لوٹانی ہے.....

موسیٰ: تم جاؤ..... میں آ جاؤں گا.....

عیسیٰ: ناں..... نہ نہ..... مجھے اوپر سے سخت آرڈر ہے کہ تمہارے ساتھ ہی گھر لوٹوں..... کیونکہ تمہارا پرانا ریکارڈ بہت خراب ہے بھائی، ایسے موقعوں پر رفو چکر ہو جانے کا.....

موسیٰ غصے سے چھوٹے بھائی کو دیکھتا ہے مگر کچھ کہتا نہیں اور چپ کر کے جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑتا ہے۔ عیسیٰ اس کے پیچھے بائیک لگا دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

گاڑی پیر قدرت کے گھر/ حویلی کے احاطے میں داخل ہوتی ہے۔ اندر سے پیر فضل، اس کی بیوی اور ستارہ اترتے ہیں۔ باہر پیر قدرت اور اس کی بیوی استقبال کے لئے موجود ہیں۔ سکینہ بھی بے زاری کھڑی ہے۔ پیرنی ستارہ کو پیار کرتی ہے۔ اور قدرت پیر فضل کو لیے ایک جانب بڑھ جاتا ہے.....

//Cut//

Scene No # 20

جگہ: کاشانۂ پیراں/ زنانہ

عورتیں زنانے میں دسترخوان پر بیٹھی کھانا کھا رہی ہیں۔ خادمائیں سرو کر رہی ہیں۔ پیرنی سب کی میزبانی کر رہی ہے۔ وہ ستارہ سے اصرار کرتی ہے۔

پیرنی: ارے..... ستارہ بیٹی تم نے تو کچھ لیا ہی نہیں..... اچھا نہیں بنا کیا..... بھئی خدیجہ تم سب کو دو ناں۔

خدیجہ جلدی سے سر ہلاتی ہے اور ستارہ کی پلیٹ میں کچھ ڈالتی ہے۔

ستارہ: نہیں نہیں آنٹی..... سب بہت اچھا بنا ہے..... میں لے رہی ہوں.....

ستارہ کی ماں: اور بہن..... چھوٹے بیٹے کی شادی پہلے کروا دی..... ماشاء اللہ بہو بہت پیاری ہے آپ کی..... مگر موسیٰ ہے کہاں.....؟ میں نے تو سالوں سے اُسے دیکھا نہیں..... بچپن میں ہی ایک آدھ بار پیر صاحب کے ساتھ آیا تھا ہماری طرف..... مجھے یاد ہے بڑا شرمیلا تھا تب بھی.....

پیرنی ہنستی ہے۔

پیرنی: وہ اب بھی ایسا ہی ہے..... پیغام بھجوایا ہے میں نے اُسے..... آئے گا آپ لوگوں سے ملنے۔

سب کھانا کھانے میں مصروف رہتے ہیں۔سکینہ برا سا منہ بنا کر ستارہ کو دیکھتی ہے جو مشرقی لباس میں خوب دمک رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: رات

پیر فضل اور پیر قدرت مردانے میں کھانے سے فارغ ہو چکے ہیں۔عیسیٰ سب کے ہاتھ دھلاتا ہے اور تولیہ پیش کرتا ہے۔ موسیٰ بھی موجود ہے۔پیر فضل قدرت کے بیٹوں کی سعادت مندی کو غور سے نوٹ کرتا ہے۔

فضل: بھئی قدرت اللہ.....ایک بات کی تعریف کرنا تو بنتی ہے.....درجنوں نوکر آس پاس موجود ہیں۔مگر کھانا شروع ہونے سے آخر تک ہر خدمت تمہارے دونوں بیٹوں نے ہی سرانجام دی ہے.....ماشاءاللہ تربیت بولتی ہے.....اپنی روایات کو زندہ رکھا ہے تم نے.....ہمارے ہاں تو انگریزی میز لگ گئی ہے کھانے کی.....اور فرنگیوں کی طرح میز کرسی پر کھانا ملتا ہے اب۔

قدرت ہنستا ہے۔

قدرت: میز کرسی میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔شاہ جی.....یہ بھی نئے دور کے تقاضے ہیں.....بس روایت زندہ رہنی چاہیے.....اور تمہیں تو پتہ ہے کہ مجھے شروع سے ہی زمین پر بیٹھ کر کھانا پسند ہے.....ہاں مگر کچھ مہمانوں کے لئے میز کرسی پر کھانے کا انتظام والا کمرہ بھی بنا رکھا ہے.....

فضل: اور موسیٰ بیٹا.....جامعۃ الازھر سے سند لینے کے بعد پڑھائی ترک کیوں کر دی تم نے.....کیا جی اٹھ گیا تھا پڑھائی سے۔

موسیٰ: نہیں.....بس کچھ مصروفیات آڑے آ گئی تھیں.....اور ابا نے کچھ ذمہ داریاں ڈال دی تھیں میرے ذمے.....

فضل: اچھا اچھا.....ماشاءاللہ.....ہاں بھئی.....اتنی بڑی گدی کی جان نشینی تو اب تمہی کو سنبھالنی ہے.....بھئی قدرت اللہ.....میں تو کہتا ہوں کہ اب ہم دونوں کو ریٹائر ہو کر اپنی ذمہ داریاں ان نوجوانوں کو سونپ دینی چاہئیں۔

قدرت: ہاں.....ارادہ برا نہیں ہے.....مگر پھر ہم دونوں کیا کریں گے.....

قدرت کی بات پر دونوں ہنس پڑتے ہیں۔قدرت فضل کو لئے کمرے سے باہر آ جاتا ہے۔

قدرت: سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے آج ایک خاص مقصد کے لئے تمہیں آنے کی زحمت دی ہے.....دراصل ہم موسیٰ کے رشتے کے بارے میں سوچ رہے ہیں.....اور ہماری سب سے پہلی نظر تمہاری ستارہ کی طرف ہی گئی ہے.....اگر تم نے پہلے ہی کہیں اس کے لئے کچھ سوچ نہ رکھا ہو.....

فضل خوش ہو جاتا ہے۔

فضل: یہ تو میرے خاندان کی خوش نصیبی ہوگی قدرت اللہ.....برسوں کی دوستی رشتہ داری میں بدل جائے گی.....میں گھر جاتے ہی ستارہ کی ماں سے بات کرتا ہوں.....ان شاءاللہ اچھی خبر ہی سنائیں گے ہم تمہیں ایک آدھ دن میں.....

قدرت اللہ مسکراتا ہے۔

قدرت: ان شاءاللہ.....مجھے انتظار رہے گا.....

//Cut//

Scene No # 22

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں/زنانہ

موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سلام کرتا ہے۔ستارہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتی ہے۔ستارہ مشرقی لباس میں اور

سر پر ٹھیک طرح سے دوپٹہ لئے بیٹھی ہے۔

پیرنی: لو آ گیا بچپن سے تمہارا لاڈلہ..... موسیٰ بیٹا..... کہاں رہ گئے تھے..... تمہاری شائستہ آنٹی کب سے تمہارا پوچھ رہی ہیں۔

موسیٰ جھجکتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور فضل کی بیوی شائستہ سے دعا لیتا ہے۔ ستارہ کن انکھیوں سے موسیٰ کو اور سکینہ غور سے موسیٰ اور ستارہ کو دیکھ رہی ہے۔ موسیٰ ستارہ کو بھی بنا دیکھے سلام کرتا ہے۔

شائستہ: جیتے رہو..... ماشاءاللہ..... خوب قد کاٹھ نکالا ہے..... بھئی ہاجرہ..... میں تو کہتی ہوں کہ اب اسے بھی کسی خوبصورت کھونٹی سے باندھ دو..... زمانہ بڑا خراب ہے.....

پیرنی بھی ہنستی ہے۔

پیرنی: ہاں..... اس کے لئے کچھ بندوبست سوچ رہے ہیں..... بس دعا کرو موسیٰ کے لئے جو لڑکی میری نظر میں ہے وہی اس کا مقدر بنے.....

پیرنی معنی خیز نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھتی ہے۔

شائستہ: ان شاءاللہ..... اللہ تمہاری مراد پوری کرے۔

پیرنی: ارے موسیٰ..... تم نے ستارہ سے اس کا حال چال بھی نہیں پوچھا..... یاد نہیں..... بچپن میں تو گھنٹوں ساتھ کھیلتے تھے تم دونوں..... گھر آنے سے انکاری ہو جاتے تھے تم.....

موسیٰ ستارہ کی طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہے، ستارہ شرما جاتی ہے۔

موسیٰ: ہاں..... یاد ہے مجھے..... کیسی ہو ستارہ.....

ستارہ: جی ٹھیک ہوں..... آپ کا بہت ذکر رہتا ہے گھر میں..... امی بہت یاد کرتی ہیں آپ کو.....

شائستہ: کسی دن آؤ نا موسیٰ بیٹا، اپنی اماں کو لے کر ہماری طرف.....

موسیٰ: جی ضرور..... اچھا اب اجازت چاہوں گا.....

شائستہ: جیتے رہو..... آنا ضرور.....

موسیٰ ستارہ کو بھی آداب کہتا ہے۔ ستارہ دھیرے سے سر ہلاتی ہے..... موسیٰ باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ اپنے کمرے میں زہرہ سے ہوئی گلی میں ملاقات کی یاد میں گم ہے۔ اسے زہرہ کا بس میں دکھا چہرہ اور گلی میں اسے ڈانٹنا یاد آ رہا ہے..... وہ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

پیرنی اور خدیجہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

خدیجہ: ہاں..... ستارہ تو بہت پیاری بچی ہے..... اور بہت سعادت مند بھی۔

پیرنی: اور بالکل ویسی ہی تہذیب اور اقدار والی جیسی میرے موسیٰ کو پسند ہے.....

سکینہ اسی لمحے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور ناک چڑھا کر کہتی ہے، اس کے لہجے میں سازش ہے۔ خدیجہ چونک کر بیٹی کی طرف دیکھتی ہے۔

سکینہ: تو پھر مانگ لیں اس کو موسیٰ بھائی کے لئے..... ویسے بھی دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں..... صاف لگ رہا تھا کل رات.....

پیرنی: کیا واقعی.....؟..... مگر موسیٰ نے تو کبھی ستارہ کا نام لے کر مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کہی.....

سکینہ: اپنی زبان سے نہ بھی کہے وہ..... مگر میں نے ان دونوں کی نظروں میں وہی چمک دیکھی ہے کل رات.....

پیرنی: تمہارے منہ میں گھی شکر..... پھر تو سمجھو گھر والی ہی بات ہے..... مجھے یقین ہے فضل بھائی کا گھرانہ کبھی موسیٰ کے رشتے کے لیے ناں نہیں کرے گا.....

سکینہ: بس تو پھر دیر کس بات کی ہے..... چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی تیاری کر لیں تائی جان..... کہیں دیر نہ ہو جائے.....

سکینہ عیاری سے کہتی ہے۔ پیرنی خوش ہو جاتی ہے۔ خدیجہ خاموش سی ہے۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: دن

جگہ: اندرون شہر

گھر کی چھت سے دور نیلے گنبد والا مزار نظر آ رہا ہے۔ کیمرہ چھت سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں سے گزر کر پیچھے صحن میں آتا ہے۔ جہاں دو طبلچی بیٹھے اپنے طبلے کی طنابیں کس رہے ہیں اور اسے ٹھوک بجا کر آواز چیک کر رہے ہیں۔ ایک جانب کوئی نائکہ نما عورت بیٹھی گھنگھرو جھٹکا کر اُس کے موتی ٹھیک کر رہی ہے۔ دُور کوئی استاد نما بیٹھا کسی لڑکی کو رقص کے بنیادی اسٹیپ سکھا رہا ہے۔

اُستاد: تھا..... تک..... تھئی..... تک..... تھئی..... تھا..... تھئی..... تک..... تھا..... تھاء..... تھا.....

لڑکی استاد کی بیٹ پر پاؤں مار رہی ہے اور اس کے پیروں میں بندھے گھنگھرو جھنک رہے ہیں۔ یہ لڑکی چندا ہے۔

چندا: یہ کیا گرو جی..... پچھلے تین ہفتوں سے ہم، تھا..... تک..... تھئی سے ہی آگے نہیں بڑھ رہے..... کیا اتنا مشکل ہوتا ہے..... کلاسیکل ڈانس..... اس سے تو میرے اپنے Step ہی بھلے.....

گرو/اُستاد: ہونہہ..... بھلا انگریزی رقص بھی کوئی رقص ہوتا ہے..... بے ہنگم..... بیہودہ..... ہیجان خیز..... رقص تو بس کلاسیکل ہی ہے..... شانت..... سلجھا ہوا..... جیسے اونچائی سے کوئی پانی کی آبشار گر رہی ہو۔

چندا: مگر ہمیں تو ماڈرن ڈانس پارٹیوں میں جانا ہوتا ہے گرو جی..... وہاں بھلا یہ امراؤ جان کے زمانے کے ناز و ادا اور سلیقے کون دیکھتا ہے..... وہاں تو تیز انگلش بیٹ پر ناچنا پڑتا ہے..... پتہ نہیں اُنا جی کو کس نے یہ غلط مشورہ دے دیا ہے ہمیں کلاسیکل سکھوانے کا..... سچ ہے..... میری تو ہڈیاں بھی چیں بول اٹھی ہیں.....

اتنے میں اندر سے زہرہ نکلتی ہے جو برقعہ پہن کر اوپر چہرے پر نقاب باندھنے کی تیاری میں ہے چندا اُسے دیکھ کر چھیڑتی ہے۔

چندا: پھر چل دیں تم یونیورسٹی یہ Ninja بجا عرف قاتل حسینہ بن کر..... تم اچھی ہو بھئی ہے جان تو چھوٹی ہوئی ہے اس روز کی ایکسرسائز سے.....

تبھی اندر سے ان سب کی بڑی نائکہ ''اُنا جی'' باہر نکلتی ہے جس کے پیچھے اس کی دو خاص نوکرانیاں پاندان اور حقہ وغیرہ اٹھائے ہوئے باہر آتی ہیں اور تخت پر رکھتی ہیں۔ اُنا ہنستی ہے۔

اُنا جی: اس کی عیاشی کے دن بھی تھوڑے ہی بچے ہیں..... بس آخری پرچہ ہو جائے تو اسے بھی گرو جی کے حوالے کروں گی.....

اچھا ہے زہرہ بھی کلاسیکل سیکھ لے..... کبھی کبھار کسی بڑے راج مہاراجے کے محل سے بھی بلاوہ آجاتا ہے..... وہاں یہ تم لوگوں کے انگریزی لٹکے جھٹکے نہیں چلا کرتے.....

زہرہ انا جی کے پیر چھوتی ہے۔

زہرہ: دعا دیں مجھے..... آج کا پرچہ بھی اچھا ہو جائے.....

چندا قریب آتی ہے۔

چندا: ہاں مگر اس طرح حلیہ بدل کر جانے کی وجہ نہیں بتائی تم نے آج بھی.....

زہرہ: وجہ کیا ہونی ہے..... بس میں نہیں چاہتی کوئی مجھے وہاں پہچان لے اور بات کا بتنگڑ بنا لے..... میسیوں جگہ آنا جانا رہتا ہے ہمارا شام کی پارٹیوں میں..... کوئی لڑکی پہچان لیتی تو میرا یونیورسٹی جانا محال ہو جاتا..... بس یوں سمجھو تمہاری زہرہ نے بڑی قربانی دی ہے یہ ماسٹرز پورا کرنے کے لئے۔

زہرہ اور چندا دونوں ہنستی ہیں۔ انا جی ان دونوں کی بلائیں لیتی ہے۔

انا جی: ٹو پہلی ہے یہاں سے..... جس نے اتنی تعلیم لی ہے۔ ورنہ انا کسی دوسری کو کبھی اتنی ڈھیل نہیں دیتی..... اب اسی چندا کو لے لے..... اس نے تو دس بھی بڑی مشکل سے پاس کی ہیں.....

زہرہ انا کے گال پر پیار کرتی ہے۔ انا جی ہنس پڑتی ہے۔

زہرہ: ہاں تو زہرہ آپ کے جگر کا ٹکڑا بھی تو ہے ناں..... اچھا میں چلی..... دیر ہو جائے گی مجھے.....

زہرہ نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 26

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور

موسیٰ اور عیسیٰ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ عیسیٰ حیرت سے چلاتا ہے۔

عیسیٰ: کیا.....؟ بھائی تم..... اور لڑکی.....

موسیٰ: کیوں..... میں انسان نہیں ہوں کیا.....

عیسیٰ کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے۔

عیسیٰ: نہیں..... میرا مطلب ہے نہیں نہیں..... ایسی بات نہیں..... مگر..... یوں..... اچانک..... اور پہلی دفعہ بات کرتے ہی تم نے اُسے شادی کا بھی کہہ ڈالا..... کمال ہو تم بھی.....

موسیٰ: تو اور کیا کرتا..... میری نیت اُسے تنگ کرنے یا اس کے پیچھے لوفروں کی طرح چکر لگانے کی نہیں تھی..... نہ ہی مجھے کسی عشق محبت کے چکروں میں پڑنا ہے..... میرے دل میں اُسے پہلی مرتبہ دیکھتے ہی جو خیال آیا..... وہ میں نے کہہ ڈالا.....

عیسیٰ کے منہ سے پھر بے ساختہ نکلتا ہے۔

عیسیٰ: ماشاءاللہ..... کیا انداز ہے..... جس لڑکی کا نام تک تمہیں معلوم نہیں ہے..... اسے پہلی ہی ملاقات میں شادی کا سندیسہ بھی دے آئے ہو..... تم تو ہم سب سے تیز نکلے بھائی.....

موسیٰ: بکو مت..... میں نے کہا ناں..... میرے دل میں اور کوئی بات نہیں آئی..... کوئی گھماؤ پھیراؤ نہیں آتا مجھے.....

عیسیٰ: اب آگے کیا کرنا ہے.....؟

موسیٰ: پتہ نہیں..... شاید وہ لڑکی مجھے کچھ غلط سمجھ رہی ہے..... اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیا.....

عیسیٰ: اور یہ گھر میں تمہارے اور ستارا کے رشتے کے بارے میں جو باتیں چل رہی ہیں..... ان کا کیا ہوگا۔

موسیٰ: اسی لئے تو میں نے تمہیں بتائی ہے یہ ساری رام کہانی..... جب تک میں اس لڑکی سے واضح جواب نہیں لے لیتا..... تمہیں ہی کوئی چکر چلانا ہوگا..... میں پہلے ہی کافی الجھا ہوا ہوں..... مجھے مزید مت الجھاؤ۔

موسیٰ اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ عیسیٰ اپنا سر کھجاتا ہے اور دھیرے سے خود سے کہتا ہے۔

عیسیٰ: تم مانو نہ مانو بھائی..... چکر تو چل پڑا ہے..... بس اب خدا ہی خیر کرے..... مطلب حد ہے..... ڈائریکٹ شادی.....

//Cut//

Scene No # 27

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد بس اسٹاپ

بس رُکتی ہے اور زہرہ اپنے مخصوص حلیے میں بس سے نیچے اُترتی ہے۔ اسے کچھ فاصلے پر وہیں گلی کے نکڑ پر موسیٰ بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ زہرہ کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنا غصہ کنٹرول کر کے اور موسیٰ کو اگنور کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر موسیٰ اس کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ ایک آدھ گلی کراس کرنے کے بعد اس سے پہلے کہ موسیٰ زہرہ کو روکے، زہرہ خود ہی غصے سے پلٹ کر موسیٰ کا راستہ روک لیتی ہے۔ موسیٰ سٹپٹا سا جاتا ہے۔

زہرہ: مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ..... کیوں روز میرا راستہ کاٹتے ہو تم..... آخر چاہتے کیا ہو..... بولو.....

موسیٰ کے الفاظ حسب معمول کھو جاتے ہیں۔ زہرہ غصے سے کہتی ہے۔

زہرہ: لگتا ہے تم یوں نہیں مانو گے..... تمہارا علاج اب یہ گلی والے ہی کریں گے..... ٹھہرو ذرا.....

موسیٰ گھبرا کر زہرہ کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 3

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: اندرون شہر/گلی

زہرہ غصے سے پلٹ کر آس پاس گلی میں سے گزرتے چند راہگیروں کو آواز دینے کے لئے پلٹتی ہے جیسے وہ لوگوں کو اکٹھا کر کے موسیٰ کو سبق سکھانا چاہتی ہو۔

زہرہ: بھائی..... ذرا بات سنیں.....

موسیٰ ویسے ہی اٹل سا کھڑا رہتا ہے۔

موسیٰ: موسیٰ نام ہے میرا..... باپ کا نام پیر قدرت اللہ..... سات نسلوں سے گدی نشینی ہے ہمارے خاندان کے پاس..... ہزاروں، لاکھوں مرید ہیں میرے آباؤ اجداد کے آج بھی..... ''کاشانہ پیراں'' کے نام سے حویلی ہے ہماری شہر کے بیچوں بیچ..... کیا اتنا تعارف کافی ہے میرا تمہیں یہ سمجھانے کے لئے کہ میں کوئی غنڈہ، لوفر یا گلی کا اُچکا نہیں ہوں جو تمہیں چھیڑنے کے لئے روزانہ تمہاری راہ میں بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہتا ہے۔

زہرہ پلٹ کر حیرت سے موسیٰ کو دیکھتی ہے۔

زہرہ: چلیے اور بات چیت سے بھی تم کسی بڑے اور معزز گھرانے کے لگتے ہو..... پھر یہ سب کیا ہے..... کیوں اپنے خاندان کا نام اور وقار ان گلیوں کی خاک میں رونمدر رہے ہو پیر جی..... یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا.....

موسیٰ: میں بس اپنے ایک سوال کا جواب لینے کے لئے روزانہ یہاں آتا ہوں..... تم مجھے جواب دے دو..... میں پلٹ جاؤں گا۔

زہرہ زچ ہو جاتی ہے.....

زہرہ: تم کوئی دیوانے تو نہیں ہو..... اچھا پوچھو.....

موسیٰ: کیا تم مجھ سے شادی کرو گی.....؟

زہرہ: بس یہی سوال ہے تمہارا.....؟ تو جواب بھی سن لو..... ''نہیں.....''

موسیٰ: کوئی معقول وجہ بھی بتا دو..... حسب نسب، دولت، جائیداد اور نام عزت سب ہے، ہمارے ہاں سے باقاعدہ رشتہ آئے گا۔

زہرہ: کوئی وجہ نہیں..... ضروری تو نہیں کہ میں تمہیں جواب بھی دوں بس میرا جواب ''نہ'' ہے..... اتنا کافی ہے۔

موسیٰ: بس اتنا بتا دو کہ تم کسی اور کو پسند تو نہیں کرتی ہو..... میرا مطلب ہے کوئی اور.....

زہرہ: یہ دوسرا سوال کر ڈالا ہے تم نے..... وعدہ ایک سوال کا تھا.....

موسیٰ: جواب دے دو گی تو مجھے اطمینان ہو جائے گا.....

زہرہ: ''نہیں.....''

زہرہ جواب دے کر ایک جھٹکے سے پلٹتی ہے اور وہاں سے چلی جاتی ہے۔ موسیٰ وہیں کھڑا رہ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ زہرہ جاتے جاتے نکڑ پر ایک لمحے کے لئے رُکتی ہے اور غیر ارادی طور پر پیچھے دیکھتی ہے کہ موسیٰ گیا ہے کہ نہیں، مگر موسیٰ اسے دیکھ رہا ہے زہرہ جلدی سے مڑ جاتی ہے۔ موسیٰ بھی پلٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر/ زہرہ کا کمرہ

چندا بے تحاشہ ہنس رہی ہے اور زہرہ غصے میں بھری بیٹھی ہے۔

زہرہ: تمہیں ہنسی آ رہی ہے..... اور میرا یہاں خون جل رہا ہے..... اُجڈ، جاہل کہیں کا.....

چندا: یار مجھے تو یہ بندہ واقعی کمال کا لگا ہے..... مطلب ہیلو نہ ہائے..... سیدھا یہ ہے.....

چندا پھر ہنستی ہے زہرہ اسے ڈانٹتی ہے۔

زہرہ: زہر لگ رہی ہے تمہاری یہ ہنسی مجھے..... اور اس کا تذکرہ بھی..... شادی کا پرپوزل یوں دے گیا جیسے پھیری والا گلی میں آلو بینگن کی آوازیں لگاتا پھر رہا ہو.....

چندا پھر اُسے چھیڑتی ہے۔

چندا: اوہو..... مطلب اگر کچھ ڈھنگ سے بات کرتا تو تم ہاں کر دیتیں.....

زہرہ: اب بس بھی کرو..... کسی اچھے گھر کا لگ رہا تھا وہ مجھے..... مگر شاید ذہنی توازن کچھ ٹھیک نہیں ہے اس کا..... دُعا کرو وہ مجھے دوبارہ میرے راستے میں بیٹھا نظر نہ آئے..... ورنہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت بے عزتی کر بیٹھوں گی میں اس کی.....

چندا: اچھا چلو اب تم تو موڈ ٹھیک کرو..... انا جی بھی واپس آتی ہوں گی..... آج شام چلنا ہے تم نے ریاض مہر کی پارٹی پر.....

زہرہ: نہیں..... ابھی کچھ پیپر باقی ہیں میرے..... بس ایک بار خیریت سے گزر جائیں پرچے..... سچ..... بہت تھک گئی ہوں..... ذرا سر تو دبا دو۔

زہرہ چندا کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/

پیر قدرت کا آستانہ

قدرت اللہ کا درس ختم ہوتا ہے اور لوگ اُٹھ کر جانے لگتے ہیں۔ تبھی پیچھے کے دروازے سے موسیٰ داخل ہوتا ہے اور باپ سے نظریں چراتے ہوئے ایک جانب بیٹھ جاتا ہے۔ عیسیٰ بھائی کو کچھ اشارہ کرتا ہے کہ باپ کو اس کی غیر حاضری کا پتہ چل چکا ہے۔ پیر قدرت چند آخری جاتے لوگوں سے مصافحہ کرتا ہے اور پھر بیٹوں کی طرف پلٹتا ہے۔ اور موسیٰ سے کہتا ہے۔

قدرت: موسیٰ..... کہاں رہتے ہو تم آج کل..... کوئی خبر نہیں ہے تمہاری..... ہزار کام باقی ہیں..... بڑی سرکار کا عرس سر پر آ گیا ہے..... یہ سارے انتظامات کون دیکھے گا..... تم جانتے ہو صرف عیسیٰ کے بس کی بات نہیں ہے یہ..... بہت سے ایسے کام اور ایسے فیصلے ہیں جو یہ خود نہیں کر سکتا..... اسی لئے کئی برس سے یہ ذمہ داری میں نے تمہارے سپرد کر رکھی ہے۔

موسیٰ: جی..... جانتا ہوں میں..... آپ فکر نہ کریں..... میں دیکھ لوں گا سب۔

قدرت: فکر کیسے نہ کروں..... تم نے تو مزار کا چکر بھی نہیں لگایا ہے..... کچھ پتہ بھی ہے تمہیں کہ عرس کے انتظامات کہاں تک پہنچے ہیں۔

موسیٰ: جی..... میں کل ہی چلا جاؤں گا..... ویسے بیچ میں بھی میں نیلا گنبد جا چکا ہوں ایک آدھ بار.....

عیسیٰ کن انکھیوں سے بھائی کی طرف دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: جی جی ابا.....آج کل تو بھائی زیادہ تر اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں.....

قدرت اپنی دھن میں ہی بولتا رہتا ہے۔

قدرت اللہ: بہرحال.....اب مجھے عرس کمیٹی کی طرف سے مزید کوئی شکایت موصول نہ ہو.....

موسیٰ: جی بہتر.....

قدرت اللہ پلٹ کر جانے لگتا ہے۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آتا ہے۔

قدرت: ارے ہاں.....یاد آیا.....وہ تمہاری اماں پیر فضل کی طرف جانے کا کہہ رہی ہیں.....دراصل ہم نے تمہاری اور ستارہ کی بات پکی کرنے کا سوچ رکھا ہے.....تمہیں بتا تو دیا ہے ناں تمہاری ماں نے۔

موسیٰ گڑبڑا جاتا ہے۔

موسیٰ: جی.....نہیں.....اماں نے تو.....

قدرت: اچھا چلو خیر.....اب تو پتہ چل گیا ناں تمہیں.....کوئی اعتراض تو نہیں ہے تمہیں.....

موسیٰ: نہیں.....میرا مطلب ہے ابا میں.....ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا.....

قدرت غصے سے بیٹے کو دیکھتا ہے۔

قدرت: تو کیا بڑھاپے میں کرو گے.....؟.....ویسے بھی ابھی شاید نشانی کی رسم ہی کریں وہ لوگ.....تین چار ماہ بعد ستارہ کے امتحانات ہیں فائنل.....یاد رکھو.....تم ہمارے اگلے گدی نشین ہو.....اور پیر فضل شاہ کی گدی بھی سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی ہے.....یہ رشتہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ویسے بھی لڑکی میں وہ تمام گن اور صفات ہیں جن کی تمہیں تلاش ہے۔ دیندار ہے، باحیا پردہ دار ہے اور حسب نسب میں بھی کسی سے کم نہیں ہے.....

موسیٰ سر جھکائے باپ کی بات سنتا رہتا ہے۔

موسیٰ: جی.....مگر.....

قدرت سختی سے اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔

قدرت: تمہارے لئے اس سے بہتر رشتہ ملنا ممکن نہیں ہے.....اس لئے اپنے ذہن کو تیار کر لو.....مجھے اُمید ہے تم ہماری اُمیدوں پر پورے اُترو گے ہمیشہ کی طرح.....

موسیٰ بیچارگی سے عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔ قدرت پلٹ کر جانے لگتا ہے پھر اُسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔

قدرت اللہ: عیسیٰ تم میری بات سنو ذرا.....تم یوں کرو مولوی کریم صاحب کے مدرسے چلے جاؤ ذرا.....کل کی میٹنگ.....

قدرت اللہ عیسیٰ کو کچھ بتاتے ہوئے وہاں سے فریم آؤٹ ہو جاتا ہے۔ موسیٰ غصے میں اپنا رومال کاندھے سے اُتار کر زور سے جھٹکتا ہے اور دوسری جانب نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: پیر فضل کا گھر

پیرنی، خدیجہ اور سکینہ رسم کرنے کے لئے پیر فضل کے گھر آئی ہوئی ہیں۔ شائستہ سب کو خوش آمدید کہتی ہے۔ عورتیں ہنستی باتیں کرتیں زنانے میں داخل ہوتی ہیں۔ جہاں ستارہ پہلے سے مناسب تیاری کیے چند سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہے۔ پیرنی اس کے سر پر پیار سے دوپٹہ چادر وغیرہ ڈالتی ہے۔ ستارہ کی سہیلی اس کے کان میں کچھ کہتی ہے۔ ستارہ شرما سی جاتی ہے۔ پیرنی ستارہ کی انگلی میں کوئی ہیرے کی انگوٹھی پہنا دیتی ہے اور اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اسے پیار کرتی ہے۔ ستارہ کی خوشی اس کی آنکھوں

سے جھلک رہی ہے۔ سب ہنس بول رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

موسیٰ اور عیسیٰ میں بات چیت.....

موسیٰ غصے میں بھائی سے لڑ رہا ہے۔

موسیٰ: بس..... تم تو رہنے ہی دو..... ایک چھوٹا سا کام کہا تھا تم سے..... وہ بھی تم سے نہ ہوا..... تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔

عیسیٰ: میں کیا کرتا بھائی..... دو چار بار بہانے سے میں نے ابا کے سامنے بات چھیڑنے کی کوشش بھی کی تھی مگر انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا..... اصل میں اس سارے گھر بلکہ ہمارے پورے خاندان میں تمہارے بارے میں کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا..... کسی کو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ تم بھی کسی لڑکی کو پسند کر سکتے ہو.....

موسیٰ بھڑک کر کہتا ہے۔

موسیٰ: پسند نہیں کرتا میں اُسے..... بس..... وہ مجھے اچھی لگی ہے.....

پھر خود ہی بات توڑ دیتا ہے۔ عیسیٰ بھائی کی بات سن کر سر پیٹ لیتا ہے۔

عیسیٰ: پہلے تو بھائی تم یہ فیصلہ کر لو کہ وہ تمہیں پسند ہے، اچھی لگتی ہے..... صرف اچھی لگتی ہے..... یا پھر بھلی لگی ہے.....

موسیٰ ڈانٹتا ہے۔

موسیٰ: اس ساری بکواس کا کیا مطلب ہے.....

عیسیٰ: مطلب یہ ہے بھائی کہ یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف نام ہیں..... تم تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ تم اسے چاہنے لگے ہو..... کسی سے محبت کرنا کوئی گناہ تو نہیں..... کیوں تم نے خود ہی اپنے دل اور دماغ پر اتنے پہرے بٹھا رکھے ہیں کہ خود تمہارا دل یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکاری ہے..... تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا.....

موسیٰ: بکو مت..... پتہ نہیں کیا بولے جا رہے ہو..... بات بس اتنی سی ہے کہ..... کچھ خاص بات ہے اس میں..... اگر وہ کہہ دیتی کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے تو میں کبھی پلٹ کر اس کے بارے میں نہ سوچتا..... مگر..... اگر اس کی زندگی میں دوسرا کوئی نہیں ہے..... تو کیا مجھے ایک موقع نہیں مل سکتا.....

عیسیٰ سر پیٹ لیتا ہے۔

عیسیٰ: ہائے میرے پیارے بھولے بھیا..... مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ وہی موسیٰ بول رہا ہے جس کی آواز سن کر ہی اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جایا کرتا ہے..... چلو تمہارے بے حد اصرار پر مان لیتا ہوں کہ تمہیں اس سے محبت نہیں ہوئی..... بس ہلکی سی پسندیدگی..... بھی نہیں ہے.....

عیسیٰ بھائی کو گھورنے پر بات بدل دیتا ہے۔

مگر اس کا نام کیا ہے.....؟ کہاں رہتی ہے..... کس خاندان سے ہے..... اس کے بڑے کون ہیں جن سے رابطہ کیا جا سکے..... بات بڑھانے کے لئے ان باتوں کا جاننا ضروری ہے کہ نہیں میرے بھائی.....؟

موسیٰ کسی سوچ میں گم ہے۔

موسیٰ: ہاں..... ٹھیک کہتے ہو..... مگر کسی کے اچھا لگنے کے لئے اس کا نام جاننا ضروری تو نہیں.....

موسیٰ کی بات سن کر عیسیٰ ایک لمبی آہ بھر کر اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

پیر قدرت اور بیوی کا کمرہ

پیر قدرت: ہاں..... نشانی تو پہنا آئی ہو مگر اپنے اس لاڈلے موسیٰ کی طرف بھی اپنا دھیان بٹائے رکھو..... مجھے آج کل اس کے تیور کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں.....

پیرنی: ایسا کچھ نہیں ہے..... بس ذرا شرمیلا ہے میرا بیٹا..... نئے رشتے کی نزاکتوں کو سمجھنے میں وقت تو لگتا ہے.....

قدرت اللہ بیزاری سے کہتا ہے۔

قدرت اللہ: کیسی نزاکتیں..... موسیٰ دنیا کا پہلا لڑکا تو ہے نہیں جس کی منگنی ہوئی ہے کسی لڑکی سے..... ایسی کیا انوکھی بات ہو گئی ہے جسے وہ دینی طور پر قبول نہیں کر پا رہا.....

پیرنی: اچھا میں سمجھا دوں گی اُسے..... آپ جانتے تو ہیں، اسے بچپن سے ہی عورت اور لڑکی کا سامنا ہوتے ہی پسینے آنے لگتے تھے..... اب وہ ہے ہی ایسا تو کیا کریں.....

قدرت اللہ: عجیب ہی لڑکا جنا ہے تم نے..... بہر حال..... اس سے کہو کہ اب میری ناک نہ کٹا دینا..... پیر فضل نے دعوت پر بلایا ہے ہم سب کو کل رات..... پھر غائب نہ ہو جائے وہ اس دن کہیں.....

//Cut//

Scene No # 7

وقت: اگلا دن۔ صبح ہونے کا موسم تاج

جگہ: شہر کی ہلچل

زہرہ کا گھر: انا جی اور چندا باقی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھیں مہندی گھول رہی ہیں..... زہرہ بھی آتی ہے، اور قریب بیٹھ جاتی ہے۔

چندا: آؤ..... تمہیں بھی مہندی لگا دوں زہرہ.....

زہرہ: نہیں..... سوکھنے میں وقت لے گی..... میرا آج آخری پرچہ ہے..... پھر اطمینان سے رات کو لگواؤں گی..... کوئی اچھا سا ڈیزائن ڈھونڈ رکھنا میرے لئے.....

انا زہرہ کو تاکید کرتی ہے۔

انا: دستانے پہن کر جانا بھولنا..... دھوپ میں ہاتھوں کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے۔

چندا انا کی بات پر ہنستی ہے۔

چندا: اس کی فکر نہ کریں انا جی..... یہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے لئے ہم سب سے زیادہ فکر مند رہتی ہے..... اس کا بس چلے تو گھر میں بھی دستانے پہنے رکھے.....

زہرہ: ہاں..... تو کیوں نہ فکر کروں..... مجھے بھدے ہاتھ پیروں سے چڑ ہوتی ہے بڑی..... اور یاد نہیں..... وہ ہوم منسٹر کا بیٹا اس تقریب میں کیسے گھورتا رہا تھا تمام وقت میرے ہاتھوں کو۔

زہرہ اور چندا دونوں زور سے ہنس پڑتی ہیں۔

چندا: ہاں..... صحیح کہا..... وہ تو جیسے تمہارے ہاتھوں پر ہی دل ہار بیٹھا تھا.....

انا زہرہ کے ہاتھ پکڑ کر چوم لیتی ہے۔ تینوں ہنستی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: عیسیٰ اور سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ کمرے میں لگی ڈریسنگ/آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال سنوارتا ہے اور اپنی داڑھی میں بھی کنگھی پھیرتا ہے۔ سکینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے اور عیسیٰ کی یہ تیاریاں دیکھتی ہے اور طنز کرتی ہے۔

سکینہ: کہاں کی تیاریاں ہو رہی ہیں..... کہیں جا رہے ہو کیا.....

عیسیٰ پلٹ کر بیوی کو دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: میں نے کہاں جانا ہے اب تمہیں چھوڑ کر..... ابا نے کچھ کام کہا ہے..... فکر نہ کرو..... جلد واپس لوٹ آؤں گا.....

سکینہ: فکر کرتی ہے میری جوتی..... میں نے صرف اس لئے پوچھا کہ کہیں زیادہ دیر کے لئے باہر جا رہے ہو تو مجھے بھی سکھ کا سانس ملے..... سارا دن کمرے میں گھسے رہتے ہو..... عیسیٰ برداشت کرتا ہے۔

عیسیٰ: تو میں نے کون سا تمہارے گلے پر اپنا پاؤں رکھا ہوا ہے کہ تمہیں سکھ کا سانس نہیں آ رہا..... شکر کرو کہ تمہارا نکاح عیسیٰ جیسے شریف بندے سے ہوا ہے..... کوئی موسیٰ بھائی جیسا ہوتا تو اب تک چوٹی سے پکڑ کر تمہیں صحن میں دھکیل چکا ہوتا اور سارے گھر کے سامنے تمہارا مقدمہ کھل چکا ہوتا.....

سکینہ: تو تم بھی کھول دو ناں میرا مقدمہ..... یہی تو چاہتی ہوں میں..... تنگ نہیں آ گئے تم اس روز کی کل کل سے..... ختم کرو یہ جھگڑا..... سارے گھر کے سامنے عدالت لگاؤ اور فیصلہ سنا دو اپنا..... تمہاری بھی جان چھوٹ جائے اور میری بھی.....

عیسیٰ غور سے بیوی کو دیکھتا ہے۔

مر مرا کے پہنچے آں
انج نہ بچاں ہُوا ٹوہ
میرے کول نے گلاں دو
اپنا کر..... یا میرا ہو

عیسیٰ: کاش یہ اتنا آسان ہوتا میرے لئے..... میں اگر چاہوں بھی تو ابا کا مان اور چچی کے آنسو میرا راستہ روک لیتے ہیں.....

سکینہ بھڑک کر کہتی ہے۔

سکینہ: صاف کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری اپنی نیت نہیں ہے مجھے چھوڑنے کی..... بڑوں کا بہانہ کیوں کرتے ہو..... اور کیا تمہیں بالکل بھی غیرت نہیں آتی ایک ایسی لڑکی کو اپنے نکاح میں رکھ کر جسے تم خود کسی اور کے لئے دلہن بنا دیکھ چکے ہو..... خون نہیں کھولتا تمہارا۔

عیسیٰ ضبط کی حدوں پر پہنچ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ایک گہرا سانس لے کر پھر برداشت کرتا ہے۔

عیسیٰ: کھولتا ہے خون..... بہت کھولتا ہے..... مگر اماں ابا سے کیا وعدہ یاد آ جاتا ہے کہ میں کبھی اپنے خاندان کے نام اور حرمت پر حرف نہیں آنے دوں گا..... لیکن تم تو آزاد ہو..... یہ اعلان تم خود جا کر کیوں نہیں کر دیتیں زمانے کے سامنے..... تمہیں کیا چیز روک رہی ہے..... میری محبت.....

اب عیسیٰ سکینہ پر جھپٹ کرتا ہے اور مسکراتا ہے، سکینہ تڑپ جاتی ہے۔

سکینہ: خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب مجھے تم سے محبت ہو..... مگر تم جانتے ہو..... میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں..... میری ماں تم لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہی ہے یہاں۔

اتنے میں خدیجہ دروازے پر آتی ہے اور ان دونوں کی بات سن لیتی ہے۔

عیسیٰ: بہت سطحی سوچ ہے تمہاری..... لگتا ہے کالج یونیورسٹی میں وقت ہی ضائع کیا ہے تم نے آج تک..... خدیجہ چچی میرے لئے بھی ماں جیسی ہی ہیں..... اور سچ ہے کہ میں تمہیں نہیں..... انہیں دیکھ کر ہی ہر بار چپ ہو جاتا ہوں.....

عیسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے پھر کچھ سوچ کر رُکتا ہے۔

عیسیٰ: اور ہاں..... میری غیرت تو یہ ہے کہ میں نے تمہارے سر پر چادر ڈال کر اور تمہیں عزت و احترام دے کر نکاح میں اس چھت تلے رکھا ہے، جہاں تمہاری ناموس محفوظ ہے..... مگر تمہیں جس کی محبت پر اتنا مان ہے وہ تمہیں یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر کہاں بھاگ گیا ہے..... اُسے تو تمہاری خاطر جان سے گزر کر تم تک پہنچ جانا چاہیے تھا..... اس کی غیرت کو کیا ہوا جو تمہیں کسی اور کے نکاح میں جاتا دیکھ کر بھی دُم دبا کر بھاگ گیا..... میرا تم سے وعدہ ہے..... جس دن وہ تمہارے لئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میرے سامنے کھڑا ہوا..... میں اسی روز تمہیں طلاق دے کر خود اس کے ساتھ رخصت کر دوں گا..... لیکن اگر وہ واپس نہ آیا..... تو تم خود ہی سمجھ جانا کہ کون غیرت مند ہے اور کون بے غیرت.....

عیسیٰ بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ سکینہ لاجواب سی کھڑی رہ جاتی ہے اور پھر اپنا غصہ قریب پڑی کسی چیز کو پٹخ کر نکالتی ہے۔ باہر اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ہیں.....

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد اسٹاپ

موسیٰ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ سامنے ایک پان کا کھوکھا ہے۔ پان والے کی دوکان پر نامراد پان والا لکھا ہے۔ وہ موسیٰ کو دیکھ کر دھیرے سے مسکراتا ہے۔

نامراد: پان کھاؤ گے صوفی صاب..... لگا دوں۔

موسیٰ بے زاری سے کہتا ہے۔

موسیٰ: نہیں..... میں پان نہیں کھاتا.....

نامراد: پان کھایا کرو صوفی جی..... تمہارے لئے بہت ضروری ہے..... پان..... دل والوں کی سوغات ہے یہ..... نامراد پان والا کہتے ہیں سب مجھے۔

موسیٰ غصے سے کہتا ہے۔

موسیٰ: تمہیں کس نے کہا کہ میں دل والا ہوں کوئی.....

نامراد مسکراتا ہے۔

نامراد: یہ بھلا کوئی بتانے کی بات ہے..... ساری گلی جانتی ہے.....

موسیٰ گھبرا جاتا ہے۔

موسیٰ: کیا..... کیا جانتی ہے ساری گلی.....

نامراد: یہی کہ کوئی دل والا ہے جو یہاں روز بیٹھا کسی کا انتظار کرتا ہے.....

شرمندگی سے موسیٰ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے ہیں۔

موسیٰ: میں..... میں تو یہاں..... کسی کام سے آتا ہوں.....

نامراد: گھبرانے کی بات نہیں ہے صوفی جی..... عشق میں اپنی حالت کی خبر خود اپنے آپ کو سب سے آخر میں ہوتی ہے..... پہلے پہل یہ زمانہ ہی پہچانتا ہے ایسے دلبر کو.....

موسیٰ پریشانی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جانے کی تیاری کرتا ہے۔

موسیٰ: پتہ نہیں تم کیا اول فول بکے جا رہے ہو..... مجھے اب جانا ہوگا.....

نامراد: ایک شعر سناؤں صوفی جی.....

مَر مَر کے پہنچے آں
اینج نہ جاناں بُوا ٹوہ
میرے کول نے گلاں دو
اپنا کر..... یا میرا ہو.....

موسیٰ شعر سن کر غصے سے پلٹتا ہے مگر نامراد کو کچھ کہہ نہیں پاتا اور لمبے لمبے قدم اُٹھا کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ نامراد مسکراتا ہے اور ایک ٹھنڈی لمبی آہ بھر کر خود سے کہتا ہے۔

نامراد: آہ مُرشد..... کیا خوب کہا ہے "عشق نہ پچھے ذات"

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

سکینہ کی ماں خدیجہ کا کمرہ۔

خدیجہ کا ہاتھ گھومتا ہے اور ایک زوردار چانٹا پوری قوت سے سکینہ کے گال پر پڑتا ہے۔ خدیجہ غصے میں بپھری ہوئی ہے مگر اپنی آواز دبا کر کہتی ہے۔

خدیجہ: شرم آتی ہے مجھے تمہیں اپنی بیٹی کہتے ہوئے..... جانے کس منحوس گھڑی میں تم نے میری کوکھ میں جنم لیا تھا..... کاش مجھے پہلے تمہاری خباثت کا پتہ چلتا تو پیدا ہوتے ہی تمہارا گلا گھونٹ کر قصہ ختم کر دیتی میں تمہارا.....

سکینہ: آخر میں نے کیا کیا ہے اب.....

خدیجہ: خود اپنے منہ سے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرتے ہوئے تمہاری زبان کیوں نہیں جل گئی.....

سکینہ طنز سے کہتی ہے۔

سکینہ: اوہ..... تو آخر کار اس صبر کے بُت کا بھرم پاش پاش ہو ہی گیا..... بڑا صابر شاکر بنا پھرتا تھا۔ کر ہی دی ناں آخر اس نے تم سے میری شکایت.....

خدیجہ: کاش وہ خود آ کر کہتا تو میں اپنی نظروں میں اتنا نہ گرتی جتنا آج تم دونوں کی باتیں اتفاقیہ سن کر ریزہ ریزہ ہوئی ہوں..... تم ایک کام کیوں نہیں کرتیں..... تھوڑا سا زہر لا دو مجھے کہیں سے..... میری آنکھیں بند ہو جائیں تو پھر جو دل چاہے کھل کر وہ کھیل کھیلنا.....

سکینہ غصے میں غراتی ہے۔

سکینہ: کھیل تو ان سب نے مل کر میرے ساتھ کھیلا ہے اماں..... اور جب تک میں ان سب سے اپنا بدلہ نہیں لے لیتی..... نہ میں خود چین سے بیٹھوں گی..... نہ ہی انہیں بیٹھنے دوں گی..... اور مجھے تو تم سب نے بنا زہر کے ہی مار کر زندہ درگور

کر ڈالا ہے.....تو میں کسی اور کو کیوں جینے دوں.....خود بھی جلوں گی.....اور اس ساری حویلی کو بھی پھونک دوں گی.....

سکینہ غصے میں پیر پٹختی وہاں سے چلی جاتی ہے۔لاچار خدیجہ وہیں اپنا سر پکڑے بیٹھی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد مزار

زہرہ بس سے اُترتی ہے اور اس مرتبہ غیر ارادی طور پر اس جانب دیکھتی ہے جہاں موسیٰ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ جگہ خالی ہے۔زہرہ لمبا سا سکون کا سانس لیتی ہے اور اپنی راہ چل پڑتی ہے۔مگر موڑ مڑتے ہی اس کی نظر پریشان اور اپنے آپ میں اُلجھے ہوئے موسیٰ پر پڑتی ہے جو زہرہ کی راہ میں بیٹھا ہے۔زہرہ کا چہرہ غصے سے لال ہو جاتا ہے اور وہ تیز تیز چلتی ہوئی موسیٰ کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔مگر آج موسیٰ اُس کے پیچھے نہیں آتا۔زہرہ چند قدم آگے بڑھ کر گلی کے نکڑ سے مڑ جاتی ہے مگر موسیٰ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے۔زہرہ آگے بڑھنے لگتی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر غصے میں واپس پلٹتی ہے موسیٰ ابھی تک اپنی اسی جگہ پر سر جھکائے بیٹھا ہے۔زہرہ غصے سے اسے کہتی ہے۔

زہرہ: میں نے تم سے کہا تھا ناں.....کہ اب میرا راستہ نہ کاٹنا.....تم کو ایک بار میں بات سمجھ نہیں آتی کیا.....؟

آس پاس گزرتے ایک دو راہگیر انہیں عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔

موسیٰ: مجھے نہیں پتہ میں کب اور کیسے یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہوں روزانہ.....مگر.....میں تمہارے پیچھے تو نہیں آیا اب.....تم خود چل کر آئی ہو واپس.....

زہرہ: ظاہر ہے.....اُلجھن ہوتی ہے مجھے تمہیں روز یہاں بیٹھے دیکھ کر.....آخر تم چاہتے کیا ہو.....

موسیٰ: تم سے بات کرنا چاہتا ہوں.....

زہرہ ہتک کر کہتی ہے۔

زہرہ: ٹھیک ہے.....بولو.....آج جو کہنا چاہتے ہو کھل کر بولو.....اس کے بعد میں بولوں گی.....

موسیٰ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔

موسیٰ: مگر یہاں.....میرا مطلب ہے کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے.....یہاں آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں ہمیں۔

زہرہ طنز کرتی ہے۔

زہرہ: اوہ.....تو تمہیں بھی لوگوں کی نظروں کی فکر ہے.....اچھا چلو.....یہاں قریب گلی میں ایک ایرانی ہوٹل ہے.....اسکول کالج سے چھپ کر جوڑے وہیں ملتے ہیں.....تم بھی وہیں چلو.....

ایرانی ہوٹل کا نام سن کر موسیٰ کچھ سٹپٹا سا جاتا ہے۔

موسیٰ: ہوٹل.....

زہرہ طنز کرتی ہے اور غصے میں کہتی ہے۔

زہرہ: تو کیا پھر تمہیں گھر چلنے کی دعوت دوں.....سوچ لو.....یہ آخری موقع ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: ایرانی ہوٹل

ہوٹل میں کوئی پرانا ایرانی گانا (گوگوش سنگر کا) لگا ہوا ہے۔ ہلچل سی مچی ہے۔ زہرہ کے پیچھے سر جھکائے پسینے میں شرابور سا موسیٰ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ زہرہ کے انداز سے لگتا ہے کہ وہ پہلے بھی یہاں آ چکی ہے۔ لہٰذا وہ بیرے سے کچھ پوچھتی ہے۔ بیرہ دانت نکال کر سر ہلاتا ہے اور زہرہ اور موسیٰ کو کسی خالی کیبن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ زہرہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ موسیٰ اب بھی ہچکچایا سا اپنی جگہ کھڑا ہے۔

زہرہ: آ جاؤ..... کیا اب یہیں کھڑے رہو گے۔

موسیٰ زہرہ کے پیچھے کیبن میں آتا ہے۔ آس پاس کے کیبنز میں جوان لڑکے لڑکیاں اسکول کالج کی یونیفارم میں بیٹھے ہنس بول رہے ہیں، چائے پی رہے ہیں اور پیسٹریاں کھا رہے ہیں۔ موسیٰ حیرت سے سب دیکھتا، جھجکتا سا زہرہ کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ زہرہ نقاب کے پیچھے سے اسے غور سے دیکھتی ہے۔

زہرہ: اب بولو بھی..... کیا سارا دن یہیں بیٹھنا ہے۔

موسیٰ: میں پہلے کبھی کسی لڑکی کے ساتھ یوں تنہائی میں نہیں بیٹھا..... مجھے ذرا نارمل ہو جانے دو.....

زہرہ حیرت سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ موسیٰ چند گہرے گہرے سانس لیتا ہے اور پھر زہرہ کی طرف براہ راست دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے بولنے کی کوشش کرتا ہے۔

موسیٰ: میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میرا مقصد کچھ غلط نہیں ہے..... میں باقاعدہ تمہارے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہوں..... آخر تمہیں کبھی نہ کبھی شادی تو کرنا ہی ہوگی..... اور تم نے تو خود ہی مجھے بتایا ہے کہ تم کسی اور کو پسند بھی نہیں کرتی تو پھر..... میں..... میرا مطلب ہے مجھ میں کیا برائی ہے..... تم کہو تو میں انتظار بھی کر سکتا ہوں.....

زہرہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔

زہرہ: ویسے تمہاری ہمت اور کانفی ڈینس کی داد تو دینی ہی پڑے گی..... تمہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم جیسا کوئی مولانا ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے..... بات کرنے سے پہلے ذرا بھی نہیں سوچا تم نے.....

موسیٰ: تم نے تیسری مرتبہ مجھے حلیے اور ظاہری شخصیت کا طعنہ دیا ہے..... کیا مذہبی اور شرعی حلیے والے کسی شخص کو اپنی پسند بتانے کا کوئی حق نہیں ہوتا..... یا یہ سہولت صرف کلین شیو اور ماڈرن لڑکوں کو حاصل ہوتی ہے، کسی کی ذرا سی داڑھی بڑھ جائے یا شلوار ٹخنوں سے تھوڑی اونچی ہو تو یہ سارا معاشرہ ایک خصوصی برتاؤ کیوں کرنے لگتا ہے اس کے ساتھ.....

زہرہ موسیٰ کی بات سن کر گڑبڑا سی جاتی ہے۔

زہرہ: یہ تو ہر کسی کی پسند ناپسند پر منحصر ہے..... ہو سکتا ہے مجھے تمہارا حلیہ ہی پسند نہ ہو.....

موسیٰ: تو پھر تم سیدھے سیدھے یہ کہہ دو کہ تمہیں اس حلیے سے کوئی مسئلہ ہے..... میں پلٹ جاؤں گا..... ویسے کتنی عجیب بات ہے، تم خود بھی ایسے ہی کسی تہذیب یافتہ گھرانے کے حلیے میں میرے سامنے بیٹھی ہو..... اور تمہارے اسی حلیے نے ہی مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا ہے.....

زہرہ: اوہو..... عجیب ڈھیٹ آدمی ہو تم..... آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... یہ دل کے فیصلے ہوتے ہیں..... ان میں کسی کی زبردستی نہیں چلا کرتی..... اور تم ہو کہ زبردستی جوتوں سمیت گھسے چلے آ رہے ہو.....

موسیٰ: میں نے تم سے کوئی غلط بات تو نہیں کی..... تمہیں چھپ کر ملنے کا نہیں کہا..... تمہارا نمبر نہیں مانگا..... کبھی تمہارا پیچھا کر کے تمہارا پتہ جاننے کی کوشش نہیں کی..... میں نے تو صرف اتنی اجازت مانگی تھی کہ تم میرے گھر والوں کو اپنے گھر آنے کی

اجازت دے دو..... میں خود کو تمہارے قابل ثابت کرنا چاہتا ہوں.....

اب زہرہ کے صبر کا پیمانہ جواب دے جاتا ہے۔ وہ کھڑی ہو جاتی ہے۔

زہرہ: ہوگئی تمہاری بات پوری.....

موسیٰ: ہاں..... مگر تمہارا جواب ابھی باقی ہے..... تم کھڑی کیوں ہوگئی.....

زہرہ: کیونکہ میں مزید تمہاری یہ عجیب و غریب باتیں نہیں سن سکتی..... اور تم میرے گھرانے کے بارے میں جاننا چاہتے ہو ناں..... تو اگلے ویک اینڈ پر رات ٹھیک 9 بجے اس پتے پر آجانا..... ساری جان پہچان ہو جائے گی مجھ سے..... اور اگر کچھ دیر وہاں رک سکو تو پھر مجھے بتانا کہ کب اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیجو گے.....

زہرہ ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر موسیٰ کو دیتی ہے۔

زہرہ تیزی سے اس کیبن سے نکل جاتی ہے۔ موسیٰ چند لمحے بیٹھا اپنے حواس درست کرتا رہتا ہے اور پھر زہرہ کا لکھا ہوا کاغذ اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

سکینہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی ہے، اسے عیسیٰ کا دیا ہوا (کامران کو) بے غیرتی کا طعنہ یاد آتا ہے۔

Audio

عیسیٰ

Overlap

"تو پھر مجھے بتانا کہ بے غیرت کون ہے..... اگر وہ سینہ تان کر میرے سامنے کھڑے ہو کر تمہیں مانگے..... میں خود تمہیں اُس کے ساتھ رخصت کر دوں گا....."

سکینہ غصے میں نیلی پیلی ہوتی بل کھاتی رہتی ہے اور پھر خود کلامی کرتی ہے۔

سکینہ: تمہارے اس طعنے کا جواب تو میں ضرور دوں گی عیسیٰ..... تمہاری غیرت کا جنازہ نہ نکالا اس حویلی سے پوری دھوم دھام سے تو میرا نام بھی سکینہ نہیں ہے.....

سکینہ کچھ دیر سوچتی رہتی ہے اور پھر بستر کے نیچے سے ایک کاغذ اور پین نکالتی ہے اور کچھ سوچ کر تیزی سے چند لائنیں کاغذ پر گھسیٹتی ہے.....

سکینہ: کوکب..... اب تمہارا ہی آسرا ہے مجھے.....

سکینہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور جلدی سے کاغذ تہہ کر کے سنبھال لیتی ہے اور کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

وقت: شام ڈھلنے کا موقع

جگہ: زہرہ کی حویلی/

ساز اور طبلے کی آوازیں

//Cut//

Scene No # 14

وقت: شام

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا موجود ہیں

زہرہ ابھی تک غصے سے پیچ وتاب کھا رہی ہے۔

زہرہ: خون کھول رہا ہے ابھی تک اس کی ڈھٹائی کا سوچ سوچ کر میرا..... نظر جھکا کر بات کرتا ہے..... مگر پھر بھی اس کی نظریں مجھے اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوتی ہیں ہر بار.....

چندا افسوس سے کہتی ہے۔

چندا: ہائے..... سچ مجھے تو بہت ہی معصوم لگا ہے وہ آج..... اتنی سیدھی اور سچی باتیں تو کوئی صاف دل والا ہی کر سکتا ہے..... جو تمہیں واقعی دل وجان سے چاہتا ہو.....

زہرہ: بڑا گھُنا ہے وہ..... چاہنے اور محبت کرنے کی بات تو ایک بار بھی نہیں کی اس نے..... بڑا ناز ہے اسے اپنے خاندان اور حسب نسب پر..... سمجھتا ہے کہ میں اس کا خاندان اور پیری مریدی دیکھ کر سمجھ جاؤں گی..... لیکن وہ ابھی زہرہ کو جانتا نہیں ہے..... ساری اکڑ نکال کر ہاتھ پر نہ رکھ دوں تو زہرہ نام نہیں ہے میرا.....

چندا: کیا ضرورت تھی تمہیں اُسے پارٹی میں بلانے کی..... تمہیں اس سے بات کرنا نہیں پسند تو سیدھی طرح اسے بتا دیتیں کہ ہم گانے بجانے والے ہیں..... مجرے اور ڈانس پارٹیوں میں بلاتے ہیں لوگ ہمیں، اپنی شامیں رنگین کرنے کے لئے..... یہ سن کر خود ہی منہ لپیٹ کر واپس چلا جاتا بے چارہ..... مگر تم نے تو اس کا ہارٹ فیل کرنے کا پورا بندوبست ہی کر دیا ہے.....

زہرہ: میں اسے کچھ بھی کہتی..... وہ ثبوت اور دلیل کے بناء میری کسی بات پر یقین نہیں کرتا..... ہر بات کا جواب ہوتا ہے اس کے پاس..... لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لے..... کہتا ہے میرے پردے اور حیا نے ہی اسے میری طرف متوجہ کیا ہے..... اب یہ جادو ختم کرنے کے لئے اسے اپنا اصل جلوہ دکھانا ہی پڑے گا.....

چندا افسوس میں سر ہلاتی ہے۔

چندا: پتہ نہیں..... مگر میرا دل اُس کے لئے بڑا افسردہ سا ہو گیا ہے زہرہ.....

زہرہ کوئی جواب نہیں دیتی۔

مونتاج: شام سے رات ہونے کا مونتاج۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

گھر کے سارے افراد کھانے پر بیٹھے ہوئے ہیں، پیر قدرت سنجیدگی سے سکینہ کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: ہاں..... پیرنی بھی بتا رہی تھیں کہ تم اپنی کسی پرانی سہیلی کی طرف جانا چاہتی ہو..... کون ہے وہ.....

سکینہ خود کو سنبھالتی ہے۔

سکینہ: جی..... کالج کی پرانی دوست ہے..... شادی کے بعد دوسرے شہر چلی جائے گی..... اسی نے پیغام بھیجا ہے ملنے کے لئے.....

پیرقدرت: یہ اسکول کالج کی دوستیاں اسکول کالج کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں تو اچھا ہوتا ہے.....

خدیجہ دیور کا سخت لہجہ محسوس کر کے جلدی سے کہتی ہے۔

خدیجہ: ہاں.....ٹھیک ہے.....میں نے بھی اس کو یہی کہا ہے بھائی صاحب.....کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سہیلی سے ملنے کے لئے جانے کی.....جسے تم سے ملنا ہے.....وہ خود آ جائے یہاں.....کیوں ٹھیک ہے ناں بھابھی.....

پیرنی بے چارگی سے سر ہلاتی ہے۔ پیرقدرت سر اُٹھا کر سب کو دیکھتا ہے۔

پیرقدرت: نہیں.....اب اس کی سہیلی نے پیغام بھیج ہی دیا ہے تو جا کر مل آئے ایک بار.....عیسیٰ.....تم سکینہ کو چھوڑ آنا.....اور پھر تم ہی شام کو اسے واپس لے کر آؤ گے.....

عیسیٰ: جی ابا جان.....ٹھیک ہے.....میں لے جاؤں گا.....

قدرت: ہاں.....مگر یاد رہے.....یہ خصوصی اجازت ہر بار نہیں ملے گی.....

موسیٰ چپ چاپ اپنی دھن میں بیٹھا نوالے گن رہا ہے۔

قدرت: موسیٰ.....تم کیوں ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہے ہو.....کن سوچوں میں گم ہو.....کھانے کو عزت دیا کرو.....ورنہ رزق تمہیں اہمیت نہیں دے گا.....

موسیٰ سٹپٹا جاتا ہے۔

موسیٰ: جی ابا.....کھا رہا ہوں میں.....

پیرقدرت: اور ہاں.....وہ پیر فضل شاہ نے بلایا ہے تمہیں جمعرات کو گھر پر.....وقت سے چلے جانا.....اور دھیان رہے.....خالی ہاتھ مت جانا.....منگنی کے بعد پہلی مرتبہ جاؤ گے تم وہاں.....اپنی اماں کے ساتھ جانا.....

موسیٰ: جی ابا.....

موسیٰ بادل نخواستہ ماں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن۔صبح ہونے کا موقتاج

جگہ: کاشانۂ پیراں

موسیٰ اور ماں میں بات چیت۔

پیرنی: موسیٰ.....کیوں اپنے ابا کی مزید ڈانٹ سننا چاہتا ہے.....جب انہوں نے کہہ دیا ہے تو بس پھر مزید بحث کی کوئی گنجائش نہیں.....چلنا ہوگا تمہیں میرے ساتھ.....

موسیٰ: عجیب زبردستی ہے اماں.....پتہ بھی ہے کہ مجھے اُلجھن ہوتی ہے ایسی تقریبات میں جانے سے.....پھر آپ لوگ زبردستی کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ.....

پیرنی: یہ لو.....بھئی سسرال ہے تمہارا ہونے والا.....اب تو کسی نہ کسی بہانے آنا جانا لگا ہی رہے گا.....ہزار بہانے ہیں.....سو طرح کی رسم و رواج اور تہوار آتے ہیں.....اب اپنے دل کو پکا کر لو بس.....

موسیٰ: منگنی بھی تو اپنی مرضی سے ہی طے کر دی ابا نے اور تم نے مل کر.....مجھ سے تو کسی نے جھوٹے منہ بھی پوچھا نہیں.....اب خود ہی پورے کریں یہ رسم و رواج بھی.....مجھے کوئی دلچسپی نہیں وہاں جانے میں۔

پیرنی کے ہوش اُڑ جاتے ہیں اور وہ جلدی سے موسیٰ کا چہرہ اپنی طرف کرتی ہے۔

پیرنی: موسیٰ.....موسیٰ.....کیوں اپنی ماں کا دل ہولائے جا رہا ہے.....کیوں کہتا ہے ایسی باتیں.....تیری بات پکی کر آئی ہوں

میں یہاں..... لڑکی کو تیرے نام کی انگوٹھی بھی ڈال دی ہے میں نے..... اب خدا کے لئے کوئی اُلٹی سیدھی بات یا حرکت نہ کر بیٹھنا..... ویسے بھی میرا دل تیری طرف سے ہر وقت پریشان رہتا ہے.....

موسیٰ ہمت کر کے ماں سے دل کی بات کہہ ڈالتا ہے۔

موسیٰ: اماں..... مجھے کوئی اور لڑکی اچھی لگتی ہے..... میں اسی سے شادی کروں گا.....

ماں کے سر پر بم سا پھوٹتا ہے، وہ سر پکڑ لیتی ہے۔

پیرنی: موسیٰ..... کیا دل کی حرکت بند کرائے گا میری..... یہ کیا بول رہا ہے..... خبردار جو ایسی بات نکالی بھی اپنی زبان سے.....

موسیٰ: میرے چپ رہنے سے یہ حقیقت مٹ تو نہیں جائے گی اماں.....

پیرنی: خدا کے لئے چپ ہو جا..... کسی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا..... آخر کون ہے وہ.....

موسیٰ: بس ہے کوئی..... وقت آنے پر سب بتا دوں گا..... اسی لئے بتا رہا ہوں کہ زیادہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں آپ لوگ.....

موسیٰ اُٹھ کر چلا جاتا ہے، پیرنی سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

موسیٰ اور عیسیٰ میں بات چیت۔

عیسیٰ کاغذ پر لکھا ایڈریس پڑھتا ہے۔

عیسیٰ: پتہ تو کسی اونچے طبقے کی سوسائٹی کا ہے..... تو پھر وہ لڑکی نیلے گنبد کے آس پاس گلیوں میں بس سے روزانہ کیوں اُترتی ہے.....

موسیٰ: یہ پہیلی بھی شام کو سلجھ جائے گی.....

عیسیٰ: میں چلوں تمہارے ساتھ بھائی..... کہیں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے.....

موسیٰ: نہیں..... اس نے مجھے تنہا بلایا ہے تو تنہا ہی جاؤں گا..... تم بس پیچھے سنبھال لینا اگر ابا نے پوچھ لیا تو.....

عیسیٰ: تم بے فکر ہو کر جاؤ بھائی..... میں ہوں ناں۔

موسیٰ کسی گہری سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: شام/رات

جگہ: پاسنگ/سڑک

موسیٰ اپنی جیپ پر شہر کی مصروف سڑکوں سے گزرتے ہوئے زہرہ کے بتائے ہوئے پتے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے کانوں میں زہرہ کا کہا جملہ گونجتا ہے۔

آڈیو، زہرہ اور لیپ

"زہرہ نام ہے میرا..... تم یہ نام گیٹ پر لو گے تو تمہیں اندر آنے دیا جائے گا....."

موسیٰ ایک بہت بڑی سی کوٹھی/ ماڈرن طرز کے نئے بنگلے کے سامنے گاڑی روکتا ہے اور جیب سے پتہ نکال کر چیک کرتا ہے۔ ایک گارڈ باہر آتا ہے..... موسیٰ اس سے کچھ کہتا ہے۔ گارڈ حیرت سے سر سے پاؤں تک موسیٰ کو دیکھتا ہے اور پھر اندر جانے کا

اشارہ کرتا ہے۔موسیٰ اندر چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

کوئی بڑا سا ہال/جس کے ایک سرے پر ڈانس فلور بنا ہوا ہے۔ ہال میں میوزک کا تیز شور ہے اور انگریزی بیٹ پر جوڑے رقص کر رہے ہیں۔موسیٰ ہال کے اندر گھستے ہی شاکڈ سا اِدھر اُدھر دیکھتا رہ جاتا ہے۔اس کے آؤٹ ڈیٹڈ حلیے کو دیکھ کر سرو کرتے بیرے اور قریب جھومتے جوڑے عجیب نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں۔قریب سے گزرتی کوئی لڑکی کرسٹل کے نشے میں مدہوش اس سے ٹکراتی ہے اور پھر خود ہی ہنس کر کہتی ہے۔

لڑکی: دیکھ کر چلا کرو مولوی صاب.....

ایک جانب کچھ لڑکے لڑکیاں بیٹھے کرسٹل/کوک کی پتلی لکیریں لگائے شیشے کی میز سے Sniff کر رہے ہیں۔موسیٰ حیرت سے یہ سب دیکھتے ہوئے ہجوم میں رستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے۔پھر قریب سے گزرتے ایک بیرے پر اس کی نظر پڑتی ہے اور وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر روک لیتا ہے اور کچھ پوچھتا ہے۔ بیرا اُسے ایک جانب اشارہ کر کے کچھ بتاتا ہے،موسیٰ ڈانس فلور کی طرف بڑھ جاتا ہے۔دُھواں ملگجا سا اندھیرا، نیلی پیلی سرخ روشنیوں کی چکاچوند، تیز انگریزی بیٹ اور کان پھاڑ دینے والے میوزک پر تھرکتے نوجوان جوڑے،موسیٰ لوگوں سے ٹکراتا،لڑکیوں سے بچتا آگے بڑھتا رہتا ہے اور تبھی اُس کی نظر میں سامنے ڈانس فلور پر تھرکتی چند نوجوان لڑکیوں پر پڑتی ہے،انہی میں سے ایک لڑکی کسی بڑی عمر کے Politician وغیرہ کے ساتھ ناچ رہی ہے۔وہ پلٹتی ہے اور موسیٰ کو حیرت اور صدمے کا ایک شدید جھٹکا لگتا ہے۔سامنے تھرکنے والی زہرہ ہے،زہرہ کی نظر بھی موسیٰ پر پڑتی ہے اور وہ دُور ہی سے اُسے وِش کرتی ہے۔موسیٰ کو زمیں اور آسماں گھومتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اس کی نظر زہرہ کی نظر سے ملتی ہے۔موسیٰ کی نظر میں غصہ،شکایت،درد اور شدید کرب کے تاثرات ہیں۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 4

//Cut//

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: ڈانس پارٹی

زہرہ موسیٰ کو دیکھتی ہے موسیٰ کی آنکھوں سے غصے کے مارے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔اچانک وہ آگے بڑھتا ہے اور زہرہ کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے جانے کے لئے کھینچتا ہے۔زہرہ چلاتی ہے۔ڈانس فلور پر ایک بھگدڑ مچ جاتی ہے۔فلور پر موجود ایک آدھ نشے میں جھومتا مرد/یا لڑکا موسیٰ کو روکنے کے لئے آگے بڑھتا ہے مگر موسیٰ کا ایک ہی دھکا اُسے دوبارہ ہجوم کے قدموں تک پہنچا دیتا ہے۔کوئی لڑکی پیچھے سے چیختی ہے۔

لڑکی: اوہ گاڈ.....ھی از فینا ٹک.....Oh God.....he is Finatic

کوئی دوسرا چلاتا ہے۔

لڑکا: سوسائیڈل بامبر Suicidal Bomber لگتا ہے.....سب لوگ ہٹ جاؤ پیچھے.....

ڈانس فلور پر مزید بھگدڑ اور ہراسگی پھیل جاتی ہے۔لڑکیاں چیخیں مارتی ہوئی بھاگتی ہیں اور لڑکے ڈر کر موسیٰ کے لئے راستہ خالی کرتے جاتے ہیں،زہرہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوششیں کر رہی ہے۔

زہرہ: چھوڑ میرا ہاتھ.....جنگلی.....جانور.....

مگر موسیٰ اُسے اُسی طرح گھسیٹتا/کھینچتا ہوا ہال سے باہر لے جا رہا ہے اور لوگ خود بخود اُسے راستہ دے کر پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔موسیٰ زہرہ کو لئے ہال سے باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

ڈانس کلب کے باہر/تیز بارش شروع ہو چکی ہے،موسیٰ زہرہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لاتا ہے اور زور سے دھکیل کر پھینک دیتا ہے۔زہرہ جا کر زمین پر گرتی ہے اور غصے میں بپھر کر وہیں گرے گرے موسیٰ سے کہتی ہے۔

زہرہ: تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے یوں گھسیٹ کر باہر لا پھینکنے کی.....ابھی کچھ دیر میں ہی پولیس آتی ہوگی.....تم جانتے نہیں ہو.....شہر کے سبھی رئیسوں کی اولادیں اندر موجود ہیں.....بس ذرا انتظار کرو.....تمہیں یہ مذاق بہت مہنگا پڑے گا۔

موسیٰ اور زہرہ دونوں بھیگ رہے ہیں۔

موسیٰ: مذاق.....مذاق تو تم نے کیا ہے میرے ساتھ.....کون ہو تم.....اور اپنی حقیقت کیوں چھپائی تم نے مجھ سے.....

زہرہ: اپنی حقیقت بتانے کے لئے ہی تو تمہیں یہاں بلایا تھا آج.....تمہیں بڑا شوق تھا ناں میرا گھر،خاندان اور پتہ جاننے کا.....تو پتہ چل گیا.....طوائف زادی ہوں میں.....یہی میری حقیقت ہے.....اور بھی کچھ جاننا ہے میرے بارے میں یا اتنا کافی ہے.....

موسیٰ کے سر پر دوسرا بم گرتا ہے۔موسیٰ چلاتا ہے۔

موسیٰ: نہیں.....یہ نہیں ہو سکتا.....میرا دل مجھے اتنا بڑا دھوکہ نہیں دے سکتا.....

زہرہ طنز سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: کیوں.....؟.....دھوکہ کیوں نہیں ہوسکتا تمہیں.....تم کون سے اتنے بڑے ولی یا دیوتا ہو.....

موسیٰ کہیں کھویا ہوا سا کہتا ہے۔

موسیٰ: مگر محبت ولی بنا دیتی ہے.....میں نے سُنا ہے.....

زہرہ ہنستی ہے۔

زہرہ: اوہ.....تو آخر تمہاری زبان پر بھی یہ فرسودہ نام اور بہانہ آ ہی گیا.....تم نے بھی مجھ سے محبت کا دعویٰ کر ہی ڈالا.....تو پھر کیا ہوا تمہاری محبت کو.....ایک ہی جھٹکے میں ہوا ہوگئی ناں.....بس یہی حقیقت ہے تم مردوں کی محبت کی اس دنیا میں.....

تیز بارش کی بوچھاڑیں دونوں کو بھگو رہی ہیں۔

موسیٰ: تو پھر تم نے یہ نیک اور پارسائی کا ڈھونگ کیوں رچا رکھا ہے.....دن میں ایسی عفیفہ اور نیک پروین بنی کیوں پھرتی ہو جس کے ہاتھ تک پر کسی غیر مرد کی نظر نہیں پڑ سکتی.....اور رات کو.....؟

زہرہ: سچ پوچھو تو وہ روپ بھی تم جیسوں سے بچنے کے لئے ہے.....ورنہ دن میں ہم جیسوں کا چلنا پھرنا اجیرن کر دیں یہ لوگ.....میرا خیال ہے اب تم اپنا یہ محبت نام کے ڈھکوسلے کی ٹوکری لے کر یہاں سے نکل جاؤ تو بہتر ہوگا.....مجھے یقین ہے اب تک تمہاری محبت کا سارا خمار اُتر چکا ہوگا.....ویسے کتنی عجیب بات ہے ناں.....تم جیسوں کی محبت بھی حسب نسب اور حلیے سے جڑی ہوتی ہے.....اگلی تمہاری شرائط پر پوری نہ اُترے تو محبت ختم.....محبت نا ہوئی آن آف ہونے والا کسی فیوز کا بٹن ہوگیا.....

زہرہ اپنی بات پر خود ہی طنزیہ ہنسی ہنستی ہے۔موسیٰ اُسی طرح گم سم سا کھڑا ہے۔اتنے میں ایک پولیس موبائل شور مچاتی ہوئی بنگلے کے اندر داخل ہوتی ہے۔اندر سے ڈانس فلور کا مینیجر گھبرایا ہوا سا باہر نکلتا ہے اور پولیس والوں کی طرف دیکھ کر چلّا کر موسیٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مینیجر: وہ رہا دہشتگرد.....SHO صاحب.....گرفتار کرلیں اسے.....سارے ماحول میں تھرتھری مچادی ہے اس نے.....

پولیس والے تیزی سے بھاگتے ہوئے موسیٰ کی طرف آتے ہیں جو موسلا دھار بارش میں گم سم ساز زہرہ کے سامنے کھڑا ہے۔پولیس والے موسیٰ کو ہتھکڑی ڈال کر پولیس وین کی جانب گھسیٹتے ہیں۔زہرہ موسیٰ کی طرف دیکھ رہی ہے۔موسیٰ کچھ بولے بنا پولیس وین میں بیٹھ جاتا ہے۔پولیس والوں نے موسیٰ کو اپنے نرغے میں لے رکھا ہے۔گاڑی چل پڑتی ہے۔مگر موسیٰ کی نظریں لگاتار زہرہ کو ہی دیکھ رہی ہیں۔زہرہ بھی اس کی جانب دیکھتی رہتی ہے.....حتیٰ کہ وین نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے۔زہرہ وہیں کھڑی بارش میں بھیگتی رہتی ہے۔

//Cut//

وقت: موہناج۔رات

جگہ: لاک اپ

موسیٰ کو لاک اپ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

پیر قدرت اللہ کے کمرے کا دروازہ کوئی دھڑ دھڑا رہا ہے.....پیر قدرت نیند سے بیزاری میں کہتا ہے۔

قدرت: آرہا ہوں بھئی..... ٹھہری تلے دم تو لو.....

بیوی/ پیرنی بھی جاگ چکی ہے اور پریشانی سے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ قدرت اللہ آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ باہر عیسیٰ پریشان حال کھڑا ہے۔

قدرت: عیسیٰ..... تم..... اس وقت..... کیا ہوا..... سب خیر تو ہے ناں.....

عیسیٰ: خیر نہیں ہے ابا جان..... وہ..... موسیٰ بھائی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔

قدرت اور بیوی کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔

قدرت: کیا.....؟.....

بیوی: یا اللہ.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: رات

جگہ: تھانہ

باہر کی تیز بارش کی آواز اندر تک آرہی ہے۔ کھڑکی سے بجلی چمکنے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ SHO کے کمرے میں خاموشی طاری ہے۔ پیر قدرت کرسی پر خاموش سا بیٹھا ہوا ہے۔ عیسیٰ اُس کے پیچھے چپ چاپ کھڑا ہے، چند لمحوں بعد دروازے کی چک ہٹتی ہے اور بارش میں بھیگا ہوا ایس۔ ایچ۔ او کمرے میں بوکھلایا ہوا سا اندر داخل ہوتا ہے۔

SHO: پیر صاحب..... آپ نے کیوں زحمت کی..... مجھے بلا لیا ہوتا..... قسم سے شرمندہ کر دیا آپ نے تو آج مجھے..... جب آئی۔ جی صاحب کی کال آئی..... میں تو سو گیا تھا گھر جا کر..... بس اسی حالت میں اُٹھا اور بھاگا چلا آیا تھانے کی طرف..... آپ حکم کریں.....، کیا خدمت کروں آپ کی..... ایسی اچانک کیا ایمرجنسی ہوئی کہ آپ کو خود چل کر آنا پڑا اتنی رات کو.....

پیر قدرت: آپ جس موسیٰ کو اُٹھا کر لائے ہیں..... وہ میرا بیٹا ہے.....

ایس ایچ او کو اپنے کانوں پر جیسے یقین نہیں آتا۔

SHO: موسیٰ..... وہ لڑکا جسے ہم نے غنڈہ گردی کے کیس میں..... نہیں نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... قسم سے پیر صاب اس نے ایک بار بھی اپنی زبان سے آپ کا نام تک نہیں لیا..... نام لینا تو دُور..... اگر وہ آپ سے ذرا سی جان پہچان بھی ظاہر کر دیتا تو میری کیا مجال تھی کہ میں اُسے بند کرتا.....، یہ تو بڑی زیادتی کر دی آپ کے بیٹے نے ہمارے ساتھ.....

قدرت: میں جانتا ہوں..... اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے..... بس درخواست یہ ہے کہ اس قصے کی خبر باہر نہ نکلے.....

SHO: جی..... جی جی پیر صاب..... میں بالکل سمجھتا ہوں ایسی نزاکتوں کو..... آپ بے فکر رہیں۔

ایس۔ ایچ۔ او قریب کھڑے پولیس والے کو جھاڑتا ہے۔

SHO: یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو..... جاؤ جا کر پیر صاب کے بیٹے کو لے کر آؤ.....

قدرت جانے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

قدرت: میں گھر واپس جا رہا ہوں..... اس کا بھائی یہاں موجود ہے..... وہ موسیٰ کو لے کر آئے گا..... اگر کوئی قانونی تقاضہ پورا کرنا ہو تو عیسیٰ یہاں موجود رہے گا.....

SHO: کیوں شرمندہ کرتے ہیں پیر صاب..... اب کیا ہم آپ جیسے جدی پشتی شرفاء سے بھی قانونی تقاضے پورے کروائیں گے.....؟..... مجھے آئی۔ جی صاحب کی واضح ہدایات مل چکی ہیں..... آپ لے جائیں بیٹے کو.....، ویسے بھی ہم نے

ابھی تک پکی ایف۔آئی۔آر نہیں کاٹی تھی.....

پیر قدرت سر ہلاتا ہے اور کمرے سے نکل جاتا ہے۔عیسیٰ باپ کے ٹوٹے قدم جاتے دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں.....بارش

سکینہ اپنے کمرے میں بے چین سی ٹہل رہی ہے اور بار بار دروازے کی طرف لپک کر باہر کی کچھ سُن گن لینے کی کوشش کرتی ہے۔مگر پھر کچھ نہ پا کر مایوسی سے پلٹ آتی ہے۔اسی اثناء میں اس کی ماں خدیجہ باہر سے پریشان سی اندر آتی ہے۔سکینہ جھپٹ کر ماں سے پوچھتی ہے۔

سکینہ: کہاں رہ گئی تھیں اماں.....میں نے تمہیں خبر لینے بھیجا تھا مردانے کی.....آخر ہو کیا رہا ہے وہاں۔

خدیجہ: پتہ نہیں..... بھائی صاحب تو واپس آ گئے ہیں مگر عیسیٰ اور موسیٰ ابھی تک واپس نہیں لوٹے.....آخر ہوا کیا تھا.....عیسیٰ اچانک یوں آدھی رات کو اُٹھ کر تمہیں بنا بتائے کہاں چلا گیا۔

سکینہ غصے سے ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہے۔

سکینہ: میں نے کہا تھا ناں..... بڑے گھُنے ہیں اس حویلی کے لوگ.....اور سب سے بڑا گھُنا میرا اپنا شوہر ہے.....مجھے بتا کر جاتا تو مجھے پتہ ہوتا ناں.....بس اچانک کوئی فون آیا اور وہ بھاگا ہوا تایا کے کمرے تک گیا اور پھر دونوں باپ بیٹا جانے کہاں چلے گئے.....

خدیجہ پریشانی سے کہتی ہے۔

خدیجہ: خدا خیر کرے.....کہیں موسیٰ کسی مصیبت میں نہ ہو.....

سکینہ: تمہارے منہ میں گھی شکر اماں.....اسی دن کا تو مجھے انتظار ہے.....اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میری مُراد بر آنے کے دن قریب آتے جا رہے ہیں.....میری آہ سے بچ کر کہاں جائے گا یہ موسیٰ.....

خدیجہ اُسے ڈانٹتی ہے۔

خدیجہ: خدانخواستہ.....توبہ کرو..... بھائی ہے وہ تمہارا.....اور اُس نے جو کیا تمہارے بھلے کے لئے ہی کیا.....

سکینہ برا سا منہ بناتی ہے۔

سکینہ: ہونہہ.....میرا بھلا تو اس دن ہو گا جب.....

اتنے میں باہر موسیٰ کی جیپ کی آواز سنائی دیتی ہے۔خدیجہ جلدی سے کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر باہر جھانکتی ہے۔

خدیجہ: شکر ہے.....عیسیٰ اور موسیٰ دونوں واپس آ گئے ہیں.....اب سو جاؤ تم بھی.....آدھی رات ہو گئی ہے۔

خدیجہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔سکینہ بڑبڑاتی ہے۔

سکینہ: میری نیندیں تو اب اسی دن پوری ہوں گی جب میرا مقصد پورا ہو جائے گا اماں.....

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ/

باہر بارش کی تیز آواز ہے

باپ نے کمرے میں ہی عدالت لگا رکھی ہے۔عیسیٰ اور ماں پریشان سے ایک جانب کھڑے ہیں باپ موسیٰ کے سامنے کھڑا ہے۔

قدرت: موسیٰ کی ماں..... کمرے کا دروازہ بند کردو..... میں نہیں چاہتا کہ میری اونچی آواز باہر جائے.....اور اچھی طرح اطمینان کرلو کہ اس کمرے کی دیواروں کے کان تو نہیں ہیں.....، یہ رسوائی اسی کمرے کی بنیاد میں دفن ہو جائے تو بہتر ہے۔

پیرنی جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کھڑکیاں وغیرہ بند کر دیتی ہے۔ باہر سے آتی بارش کی آواز کم ہو جاتی ہے۔گھن گرج البتہ جاری رہتی ہے، موسیٰ سر جھکائے کھڑا ہے۔قدرت اس کا چہرہ اپنے ہاتھ کی انگلی سے اُوپر اٹھاتا ہے۔

قدرت: مجھے دیکھ کر بات کرو موسیٰ..... میں چاہتا ہوں جب میں تم سے سوال کروں تو جواب تمہاری آنکھوں سے ہی پڑھتا جاؤں.....

پیرنی پریشانی سے کہتی ہے۔

پیرنی: رات بہت ہوگئی ہے پیر صاحب.....کل صبح ہی ساری باتیں.....

قدرت اللہ ہاتھ اُٹھا کر اُسے وہیں خاموش کروا دیتا ہے۔

قدرت: درمیان میں کوئی نہیں بولے گا.....آج ایک باپ اور اُس کا جانشین آپس میں بات کر رہے ہیں.....، تیسرا بیچ میں کوئی نہ بولے.....

پیرنی سہم کر چپ ہو جاتی ہے۔

قدرت اللہ: ہاں.....تو میں یہ پوچھ رہا تھا کہ جو کہانی مجھے آئی۔ جی صاحب نے سنائی..... یا بدنامی کی جو داستان وہاں تھانے کے رجسٹر میں درج ہے.....اس میں سے سچ کتنا ہے.....اور فسانہ کتنا.....

موسیٰ سر جھکائے کہتا ہے۔

موسیٰ: میں نے ساری حقیقت پولیس والوں کو بتا دی تھی۔

قدرت: گویا تم وہاں گئے تھے.....کیا میں پوچھ سکتا ہوں اس فحاشی کے اڈے پر تمہارا اتنی رات گئے کیا کام نکل آیا تھا.....؟.....

موسیٰ: مجھے پہلے اس جگہ کا نہیں پتہ تھا.....مجھے کسی نے وہاں بلایا تھا.....

قدرت: چلو مان لیتا ہوں تم ان جانے میں وہاں چلے گئے.....مگر جب تمہیں اس جگہ کی حقیقت کا پتہ چلا تو تم اُلٹے پاؤں واپس کیوں نہیں لوٹ آئے.....

موسیٰ دھیرے سے کہتا ہے۔

موسیٰ: کیونکہ میں بہت آگے بڑھ چکا تھا.....واپس لوٹنا ممکن نہیں تھا.....

قدرت: خوب.....چلو اب یہ بھی بتا دو کہ تمہیں وہاں آنے کی دعوت کس نے دی تھی.....،

موسیٰ: زہرہ نے.....

زہرہ کا نام سن کر قدرت اللہ اتنی زور سے چلاتا ہے کہ اس کی بیوی کو ڈر کے مارے جھرجھری آجاتی ہے۔

قدرت: کون ہے یہ زہرہ.....اور کیسے جانتے ہو تم ایسی کسی لڑکی کو جو تمہیں ایسی دعوتوں میں مدعو کرتی پھرتی ہے.....

موسیٰ: زیادہ کچھ نہیں جانتا اس کے بارے میں.....بس دو تین بار ہی ملاقات ہوئی ہے.....

قدرت اللہ طنز کرتا ہے۔

قدرت: بس دو تین بار.....سن رہی ہو تم عیسیٰ کی ماں.....دو تین بار ملاقات بھی ہو چکی ہے صاحبزادے کی.....اور تم سارے زمانے میں ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتی ہو کہ تمہارا یہ نیک، پرہیزگار اور پارسا بیٹا اتنا شرمیلا اور اتنی حیا والا ہے کہ فرشتے بھی اس کے دامن سے ٹپکنے والے پانی سے وضو کر سکتے ہیں.....، واہ.....آفرین ہے تم پر اور تمہاری گواہی پر.....کیا بیٹا پیدا کیا ہے تم

نے.....،.....قربان جاؤں میں تمہاری سادگی پر عیسیٰ کی ماں.....

پیرنی گڑگڑاتی ہے۔

پیرنی: ضرور کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی موسیٰ کو.....ورنہ یہ تو.....

قدرت: بس.....،.....مزید اس کی صفائی میں کچھ مت کہنا اب.....اس کا جرم اتنا بڑا ہے کہ جس کی سزا کے لئے خود مجھے بھی وقت درکار ہے ابھی.....

پیرنی: آپ موسیٰ کی بات تو سُن لیں.....،یہ آپ کا وہی بیٹا ہے جس نے آج تک آپ کا دیا ہر قول نبھایا ہے.....صرف ایک غلطی پر آپ اُس کا سارا ماضی کیسے بھول سکتے ہیں۔

قدرت: ٹھیک کہتی ہو تم.....،.....اور شاید اسی لئے یہ ابھی تک اپنے پیروں پر میرے سامنے کھڑا ہے.....ٹھیک ہے.....تم اس سے اس کی آوارگی کا یہ قصہ خود سن کر مجھے بتا دینا.....،.....مگر میرا فیصلہ ابھی باقی ہے.....اور خبردار.....گھر میں کسی تیسرے فرد کو یہ بدنامی کی داستان نہ پہنچنے پائے.....

موسیٰ کچھ کہنے کے لئے زبان کھولتا ہے۔

موسیٰ: مجھے اپنا جرم قبول ہے ابا.....اور میں کسی بھی.....

مگر ماں جلدی سے آگے بڑھتی ہے اور موسیٰ کو کھینچ کر وہاں سے باہر لے جاتی ہے۔

پیرنی: سنا نہیں تم نے موسیٰ.....تمہارے ابا کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تم جا سکتے ہو.....جا کر آرام کرو.....جانے کب سے بارش میں بھیگتے رہے ہو.....جاؤ جا کر کپڑے بدل لو.....ورنہ بیمار پڑ جاؤ گے.....چلو.....میں تمہیں نیا جوڑا نکال دیتی ہوں۔

ماں بہانے سے موسیٰ کو کمرے سے باہر لے جاتی ہے۔باپ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: کاشانۂ پیراں.....سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ نیند سے جاگتا ہے۔بیوی جیسے اس کے جاگنے کے انتظار میں ہی بیٹھی ہوتی ہے۔

سکینہ: رات کہاں غائب ہو گئے تھے تم.....اتنی دیر سے آئے بھی تو تایا جان کے کمرے میں چلے گئے.....سب خیر تو تھی ناں.....

عیسیٰ ٹالتا ہے۔

عیسیٰ: ہاں.....سب خیر تھی.....

سکینہ: خیر لگ تو نہیں رہی تھی.....آدھی رات کو موسیٰ بھائی تمہارے ساتھ گھر واپس آئے اور آتے ہی تم سب ایک کمرے میں بند ہو گئے.....کیا معاملہ تھا.....،.....آخر میں بھی اس گھر کی ایک فرد ہوں.....مجھے بھی تو پتہ چلنا چاہیے.....

عیسیٰ: کوئی خاص بات نہیں تھی بابا.....بس ابا جان موسیٰ بھائی کے دیر سے گھر آنے پر خفا ہو رہے تھے.....جھاڑ پڑ رہی تھی ہم دونوں کو.....

سکینہ: اچھا.....مگر اس سے پہلے تم اور تایا جان بھی تو بڑی عجلت میں باہر نکلے تھے گھر سے.....

عیسیٰ: وہ ہاں.....،.....کسی مرید کی پریشانی کی اطلاع آئی تھی.....میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا.....

عیسیٰ اُٹھ جاتا ہے۔سکینہ اندر ہی اندر دانت پیستی ہے۔

سکینہ: خیر تمہاری مرضی.....نہیں بتانا تو نہ بتاؤ.....میں تو صرف اسی لئے پوچھ رہی تھی کہ خدانخواستہ کوئی پریشانی کی بات نہ ہو.....مگر تم لوگ اپنی کسی ذاتی بات میں مجھے شامل نہیں کرنا چاہتے تو تمہاری مرضی.....

عیسیٰ بات سنبھالتا ہے۔

عیسیٰ: کہاناں..... ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی.....

سکینہ: اچھا وہ آج تم نے مجھے میری سہیلی کی طرف بھی چھوڑنے جانا ہے..... میں نے اجازت لے رکھی ہے..... یاد ہے ناں.....

عیسیٰ: ہاں..... یاد ہے..... تم وقت پر تیار ہو جانا..... میں تمہیں چھوڑ آؤں گا.....

عیسیٰ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ سکینہ غصے میں دانت پیستی ہے۔

سکینہ: سب ایک سے بڑھ کر ایک گھٹنے ہیں یہاں..... پر تم بھی دیکھ لینا عیسیٰ صاحب..... سکینہ بھی ہر راز کا پتہ لگا کر ہی رہے گی۔

سکینہ بھی غصے میں اُٹھ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: صبح

جگہ: زہرہ کا کمرہ

چندا زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر چیک کرتی ہے۔

چندا: شکر ہے بخار اُتر گیا..... ورنہ رات کو تم جس حالت میں بھیگی ہوئی لوٹی تھیں..... میری تو جان ہی نکل گئی تھی تمہیں دیکھ کر۔

زہرہ بے پروائی سے کہتی ہے۔

زہرہ: کچھ نہیں ہوتا مجھے..... بس تم انا جی سے تذکرہ مت کرنا رات والی بات کا..... وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔

چندا: نہیں کروں گی..... مگر سچ بتاؤں تو میرا دل بہت خراب ہوا ہے اس لڑکے کی حالت کا سن کر..... تمہیں اس کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا..... اُلٹا اُسے پولیس بھی پکڑ کر لے گی دہشت گرد سمجھ کر.....

زہرہ: میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سیدھا سادھا خاموش اور چپ چاپ نظر آنے والا موسیٰ اندر سے اتنا شدید جذباتی نکلے گا..... اور ڈر اور خوف نام کی کوئی چیز تو ہے ہی نہیں اس کے اندر..... میں رات کو کچھ زیادہ ہی بول گئی اس کے سامنے..... بعد میں احساس ہوا کہ اس کی ذات پر اتنے تیر چلانے کی ضرورت نہیں تھی مجھے..... مگر پتہ نہیں..... اس وقت غصے میں پاگل ہو رہی تھی میں.....

چندا: تو اب کیا جیل میں ہی پڑا سڑتا رہے گا وہ تمہارے 'جرمِ عشق' میں.....

زہرہ: نہیں..... میرا خیال ہے اس کے گھر والے نکال لے جائیں گے اُسے..... پولیس بھی ایسے واقعات کا پکا پرچہ کب کاٹتی ہے بھلا..... ورنہ انہیں خود عدالت میں جواب دینا مشکل ہو جائے گا کہ اس تھانے کی حدود میں پرائیویٹ ڈانس پارٹیاں کیسے چل رہی ہیں.....

چندا: پتہ نہیں کیوں..... مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ معاملہ ختم نہیں ہوا..... بلکہ ابھی شروع ہوا ہے..... وہ اگر واقعی اتنا جنونی ہے..... تو اتنی آسانی سے باز بھی نہیں آئے گا.....

زہرہ کوئی جواب نہیں دیتی اور کچھ سوچتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں۔ موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ کی ماں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔

ماں/ پیرنی: یہ دیکھ موسیٰ..... تیری ماں نے ہاتھ جوڑ دیئے ہیں تیرے سامنے.....، ..... باز آجا اپنی اس ضد سے بیٹا..... ورنہ سب تباہ و برباد ہو جائے گا.....

موسیٰ ماں کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

موسیٰ: میرے اختیار میں اب کچھ نہیں ہے اماں..... میں اتنا مجبور اور لاچار پہلے کبھی نہیں تھا۔

ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ماں: کیا وہ تجھے تیری ماں سے بھی پیاری ہے.....

(موسیٰ ٹوٹی مسکراہٹ کے ساتھ)

موسیٰ: نہیں..... میری ماں تو دنیا کی سب سے پیاری ہے اور مجھے دنیا میں سب سے پیاری ہے.....

ماں: تو پھر بھول جا اُسے..... اور پھر تُو نے خود ہی تو بتایا ہے کہ وہ.....،.....

ماں کچھ بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے۔

ماں: ستارہ بہت اچھی لڑکی ہے..... وہ تجھے بہت خوش رکھے گی..... ہر یاد بھلا دے گی.....

موسیٰ مسکراتا ہے۔

موسیٰ: ابھی میں نے اسے یاد کرنا شروع کب کیا ہے اماں..... ابھی کل رات تک تو وہ میرے سامنے تھی.....،.....اور پتہ ہے اس نے مجھے کیا طعنہ دیا.....

ماں: کیا.....؟

موسیٰ: کہتی ہے کہ اس کے اچھے یا بُرے ہونے سے میری محبت کا کیا تعلق..... میری محبت کو تو وہیں قائم رہنا چاہیے تھا..... اچھائی برائی دیکھ کر ہونے والی محبت..... محبت نہیں سودے بازی ہوتی ہے..... یعنی میں بھی ایک سودا گر نکلا.....

پیرنی حیرت سے بیٹے کی باتیں سن رہی ہے۔

پیرنی: تجھے اس سے چار دن میں محبت بھی ہو گئی.....؟ جادو گرنی ہے کیا.....،..... جو جانے تیری ماں بچپن سے جوانی تک تیرے دل میں نہ جگا سکی..... وہ اس انجانی نے چار دن میں تیرے اندر بسا دیا.....؟

موسیٰ: نہیں..... محبت کا طعنہ تو پہلے اس نے دیا تھا..... میں نے تو اس سے صرف یہ کہا تھا کہ محبت ہوتی تو دل بنا دیتی.....

پیرنی کو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگتا ہے۔

پیرنی: یہ بات تجھے کس نے بتائی.....

موسیٰ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔

موسیٰ: پتہ نہیں..... خود ہی میری زبان سے نکل پڑی..... کیا مجھے واقعی اس سے محبت ہو گئی ہے اماں.....

پیرنی دکھ سے بیٹے کی طرف دیکھتی ہے۔

پیرنی: تیرا دل کیا کہتا ہے.....

موسیٰ: دل چپ ہے..... مگر میں کل رات سے بہت بے چین ہوں اماں..... ایک پل کے لئے آنکھ نہیں لگی میری.....، بہت درد ہے میرے اندر..... بڑی تکلیف میں ہوں..... کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا.....،..... شاید اس درد، بے چینی اور تکلیف کا نام محبت ہو گا اماں..... پر تو دعا کرنا..... کہ مجھ کو کبھی کسی سے محبت نہ ہو..... محبت میں بڑا درد ہے اماں..... بڑی تکلیف ہے۔

موسیٰ ماں کی گود میں لیٹے لیٹے جیسے رو پڑتا ہے۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔ وہ بیٹے کا سر تھپکتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

عیسیٰ سکینہ کے ساتھ کسی ہنڈوین ٹائپ گاڑی میں، جس کے پردے بھی نیچے گرے ہوئے ہیں۔اسے ڈراپ کرنے کے لئے اس کی سہیلی کوکب کے گھر کے باہر آ کر رکتا ہے۔

عیسیٰ: یہی گھر ہے.....؟.....

سکینہ پردہ ہٹا کر دیکھتی ہے۔

سکینہ: ہاں یہی ہے.....شام 4 بجے تک مجھے آ کر لے جانا۔

عیسیٰ: ٹھیک ہے.....آ جاؤں گا.....

سکینہ پھر غصے میں طنز کرتی ہے۔

سکینہ: اور خدا کے لئے یہ پردے تو ہٹا دو وین کے اندر سے.....لگتا ہے گھر کی نہیں کسی قید خانے کی جیل گاڑی ہے.....کہیں سے تو تازہ ہوا آنے دو۔

عیسیٰ بیوی کے غصے پر مسکراتا ہے۔

عیسیٰ: ابھی صبح کے دس بجے ہیں.....شام 4 بجے تک جتنی تازہ ہوا کھانی ہے کھا لو.....ہمارے ہاں روشن دانوں پر ہمیشہ پردے پڑے ملیں گے تمہیں.....پرانی روایت ہے۔

سکینہ برا سا منہ بناتی ہے اور اُتر جاتی ہے۔

سکینہ: ہونہہ.....پرانی روایت.....

عیسیٰ مسکرا کر گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: پیرنی کا کمرہ

پیرنی بے چین سی اپنے کمرے میں ٹہل رہی ہے، اس کے کانوں میں موسیٰ کی کہی باتیں گونج رہی ہیں۔

آڈیو/موسیٰ/اور لیپ

''کیا یہی محبت ہوتی ہے اماں.....بڑا درد ہے.....تو دعا کرنا مجھے کبھی محبت نہ ہو.....''

پیرنی کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

پیرنی: محبت تو تجھے کب کی ہو چکی ہے میرے لعل.....بس اب محبت کا خراج باقی ہے.....جانے کس کس کو ادا کرنا پڑے گا یہ خراج

پیرنی کی پریشانی بڑھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

جگہ: زہرہ کی کوٹھی/حویلی

انا کے پاس زہرہ اور چندا بیٹھی ہوئی ہیں۔انا فون پر کسی سے بات کر رہی ہے۔آس پاس کچھ نوکر خادمائیں وغیرہ بھی کام میں مصروف ہیں۔انا حقہ پی رہی ہے اور بات کر رہی ہے۔

انا: نہیں سیٹھ صاحب.....ہماری لڑکی رات باہر نہیں ٹھہرتی.....کتنی بھی دیر کیوں نہ ہو جائے اسے واپس لوٹنا ہوتا

ہے..... کچھ اصول ہیں انا کے..... جو سب جانتے ہیں..... لڑکی کے ساتھ گارڈز ہوں گے دو..... اور ڈانس پارٹی کے بعد وہ سیدھا گھر واپس آئے گی..... تن فروشی کا دھندہ نہیں ہوتا انا کے ہاں.....

انا دوسری طرف کی بات سنتی ہے۔

انا: ٹھیک ہے..... تو پھر سو بسم اللہ..... وقت پر گاڑی بھیج دیجئے گا.....

انا فون رکھ دیتی ہے۔ چندا انا سے پوچھتی ہے۔

چندا: آپ کو ہر روز یہ ایک ہی جیسی باتیں کیوں کرنا پڑتی ہیں ہر نئے مہمان سے انا جی.....

انا: ضروری ہے..... تاکہ ان کو اپنی اور ہماری اوقات یاد رہے.....

زہرہ تلخ لہجے میں کہتی ہے۔

زہرہ: لیکن ایک نہ ایک دن تو بولی لگنی ہی ہوتی ہے سب کی یہاں انا جی..... پھر یاد دہانی کیسی.....؟

انا غور سے اُسے دیکھتی ہے۔

انا: ٹھیک کہتی ہو..... مگر خریدار اور بولی کا معیار بھی تو میری شہزادی جیسا ہو..... ہر للو پنجو کے آگے بچھا نہیں جاتا..... زندگی بھر کا سودا ہے یہ..... سستے میں نہیں کیا جاتا..... اور پھر آج کل تو ویسے بھی یہ سیاستدان اور نو دولتیے چھپ کر تین تین کر لیتے ہیں..... رہنے کو عالیشان چھت اور عمر بھر کا نان نفقہ..... اتنا تو حق بنتا ہے تم سب لڑکیوں کا.....

چندا: ہاں مگر انا جی..... مستقل کون رکھتا ہے..... کبھی خاندان کے ڈر سے اور کبھی جی اوب جانے کے بعد جان چھڑا ہی لیتا ہے ہماری زندگی میں آنے والا مرد.....

انا: ہاں..... یہ بھی سچ ہے..... مگر جاتے جاتے بھی تمہاری انا ان سے تم لوگوں کے لئے اتنا لے لیتی ہے کہ پھر عمر بھر کسی کی محتاجی کی ضرورت نہیں پڑتی..... اور پھر یہ بھی تو سچ ہے کہ سب ہی مرد ایک جیسے نہیں ہوتے..... کوئی ایک آدھ وفادار بھی نکل آتا ہے.....

زہرہ اُٹھ کر جانے لگتی ہے۔ انا اسے روکتی ہے۔

انا: زہرہ..... تم رکو ذرا..... تم سے کچھ بات کرنی ہے..... اور لڑکیو..... جاؤ تم لوگ اپنا کام کاج کرو..... شاباش..... چندا..... تم لے جاؤ انہیں..... ماسٹر جی بھی آتے ہوں گے.....

چندا اور باقی لڑکیاں اُٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ زہرہ پریشانی سے انا کی طرف دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/

موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ بے چین سا اپنے کمرے میں بیٹھا ہے۔ اسے تیز بارش میں کھڑی بھیگتی زہرہ کی وہ دو آنکھیں یاد آ رہی ہیں جن کی وجہ سے وہ در بدر ہوا تھا۔ آخر کار موسیٰ کی بے چینی اتنی بڑھتی ہے کہ وہ کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

انا اور زہرہ میں بات چیت

انا سختی سے پوچھتی ہے۔

انا: تو کیا یہ سچ ہے.....کون تھا وہ لڑکا جو تمہیں بھری محفل سے کھینچ کر لے گیا.....اور تم نے مجھے آ کر کیوں نہیں بتائی یہ بات.....

زہرہ: جی.....سچ ہے.....تھا ایک جنونی.....اور آپ کو اس لئے نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ پریشان نہ ہو جائیں.....

انا: تو تمہارے گارڈ کہاں مر گئے تھے۔

زہرہ: اُسے میں نے خود ہی چھٹی دے دی تھی.....بیٹا بیمار تھا اُس کا.....

انا سر پیٹ لیتی ہے۔

انا: دوبارہ ایسی حماقت نہ ہو.....وہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا تھا.....

زہرہ: ہاں.....مگر نہیں پہنچایا.....جانے کیوں.....؟

انا چونک کر زہرہ کو دیکھتی ہے۔

انا: تو کیا تم چاہتی تھیں کہ ایسا ہو.....دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا لڑکی۔

زہرہ: پتہ نہیں انا.....مگر اسے بہت غرور تھا اپنی پارسائی، اپنی نیک نامی اور اپنے حسب نسب پر.....اور شاید زندگی میں پہلی مرتبہ کسی پر اپنی حقیقت ظاہر کرتے ہوئے مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی.....میں اس سے اس کا یہ غرور چھین لینا چاہتی تھی.....اسے بھی بدلے میں عام کم تر مردوں کی طرح مجھے ننگی گالیاں اور بددعائیں دیتا دیکھنا چاہتی تھی.....تاکہ مجھے تسکین ملے کہ وہ بھی میری طرح عام سا ہے مگر اُس نے ایسا کچھ نہیں کیا.....بس چپ چاپ پولیس کی گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔

انا: شکر ہے کوئی نقصان نہیں پہنچایا اس نے تمہیں.....ایسے مرد بڑے جنونی ہوتے ہیں.....جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے.....عورت کو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے.....کیا سمجھیں.....

زہرہ: جی سمجھ گئی.....اب احتیاط کروں گی۔

زہرہ اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔انا پریشانی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: کوکب کا گھر

سکینہ کوکب کے ساتھ بیٹھی راز و نیاز کر رہی ہے۔کوکب کانوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔

کوکب: کیوں اپنی جان کی دشمن بنی پھرتی ہو.....ایک بار اُنہوں نے تمہاری غلطی معاف کر کے جان بخشی کر دی تھی.....دوسری بار زندہ نہیں چھوڑیں گے تمہیں۔

سکینہ: جان کی کسے پرواہ ہے.....مگر ان سب کا جھوٹا بھرم اور اکڑ توڑ کر دکھائے گی سکینہ.....

کوکب: مگر اب تمہاری شادی ہو گئی ہے.....اور کامران بھلا تمہارے بلاوے پر کیوں آنے لگا.....اسے آنا ہوتا تو وہ جاتا ہی کیوں.....

سکینہ: اسی بات پر تو مجھے آگ لگتی ہے.....دعوے تو آسمان سے چاند تارے توڑ کر لانے کے کرتا تھا.....اور وقت پڑنے پر خود کسی آسمان کے گمشدہ تارے کی طرح غائب ہو گیا.....بہرحال تم بس میرا یہ کام کر دو اور کامران تک میرا یہ پیغام پہنچا دو.....کسی کی غیرت کا جھوٹا بت توڑنا ہے مجھے.....اور مجھے یقین ہے کہ کامران میرے بلانے پر ضرور آئے گا.....وہ تو ان بھائیوں نے بے بس کر دیا تھا عین وقت پر اُسے.....ورنہ اتنا گیا گزرا وہ بھی نہیں ہے.....

کوکب: سوچ لو..... آر یا پار.....

سکینہ: سوچ لیا..... اب چاہے آر ہو یا پار..... مجھے اس منجدھار سے گزرنا ہی ہوگا..... ڈوبنے کا ڈر میں بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔

سکینہ پورے عزم سے کہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

موسیٰ کی جیپ نامراد پان والے کے کیبن کے پاس آ کر رُکتی ہے۔ اور موسیٰ غصے میں اُتر کر پان والے کی طرف بڑھتا ہے۔

موسیٰ: تمہیں پتہ تھا ناں کہ وہ کون ہے..... تم پہلے دن سے ہی اس کی حقیقت جانتے تھے.....

پان والا سامنے کھڑے گاہک کو جلدی سے فارغ کرتا ہے اور اطمینان سے موسیٰ کو جواب دیتا ہے۔

نامراد: سارے علاقے کو پتہ ہے..... سب جانتے ہیں.....

موسیٰ: (غصے سے چلا کر) تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا..... کیوں میرا تماشہ بننے دیا ساری دنیا کے سامنے.....

نامراد: عشق تو اپنے تماشے دکھاتا ہے صوفی جی..... ؟ ایک تماشہ تو میں خود تمہارے سامنے بیٹھا ہوں..... نامراد..... کبھی میرے نام کے ساتھ یہ "نا" نہیں لگا ہوا تھا..... مراد علی نام تھا میرا..... پر مقدر ایسا رُوٹھا کہ مراد سے نامراد بنتے دیر ہی نہیں لگی.....

موسیٰ: مگر میرے نام کے ساتھ کچھ لوگوں کا نام جڑا ہے..... مجھے اپنی رسوائی کا ڈر نہیں ہے..... اپنوں کی بدنامی کی فکر ہے.....

نامراد: عشق کی رسوائی بھلا اپنا پرایا کب دیکھتی ہے صوفی جی..... نام ور ہی بدنام ہوتے ہیں..... یہ کسی ایرے غیرے کے بس کی بات بھی نہیں ہے.....

موسیٰ: تو کیا اس گلی کے سب رہنے والے یہ بات جانتے ہیں کہ میں..... میرا مطلب ہے.....

نامراد: زہرہ نام ہے اس کا..... یہی نیلے گنبد والے مزار کے پیچھے والی گلی میں حویلی ہے اس کی..... کبھی کبھار شام کی محفلوں کے لئے میری دوکان سے ہی پان بن کر جاتے ہیں وہاں..... تم نے شاید کبھی اس علاقے پر دھیان سے غور نہیں کیا..... ہر تیسرے گھر یا کوٹھی سے تمہیں گھنگھرو اور طبلے کی تھاپ سنائی دے گی..... عام شرفاء کے مکان بھی ہیں بیچوں بیچ..... مگر ان پر باہر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ یہ شریفوں کا مکان ہے.....

موسیٰ: حیرت ہے..... میں تین چار بار یہاں آیا ہوں..... مگر میرا دھیان کبھی ان باتوں کی طرف گیا ہی نہیں.....

نامراد مسکراتا ہے۔

نامراد: دھیان ہوتا..... تو کسی طرف جاتا ناں..... ویسے تم ہو بڑے جی دار..... عشق کی پہلی چوٹ سہہ گئے ہو..... بہت درد ہوا ہوگا..... جان جلی ہوگی مگر پھر بھی گرے نہیں ہو.....

موسیٰ: بہت گر گیا ہوں..... اپنوں کی نظر میں.....

نامراد: اپنوں کی چھوڑو..... اپنی نظر کا بتاؤ.....

موسیٰ: اسی سوال کا جواب لینے تو آیا ہوں یہاں..... اس کی حقیقت جان لینے کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہو جانی چاہیے تھی..... مگر میرے دل میں آج بھی اس کے لئے نفرت نہیں ہے..... ایسے لگتا ہے کہ جیسے اس کا تعارف ایک رسمی سی بات تھی..... سو ہو گیا..... اصل کہانی ابھی باقی ہے.....

نامراد غور سے موسیٰ کو دیکھتا ہے۔

نامراد: ٹھیک کہہ رہے ہو وہ مست..... کہانی تو ابھی شروع ہوئی ہے..... موسیٰ اور زہرہ کی کہانی.....

موسیٰ چونک کر نامراد کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

پیر قدرت غصے سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: کہاں ہے وہ..... میں نے اسے پیر فضل شاہ کی طرف جانے کا کہا تھا..... دو مرتبہ پوچھ چکے ہیں وہ.....

پیرنی: ابھی تو یہیں تھا..... شاید دل گھبرا رہا ہو اس کا..... تبھی باہر نکل گیا.....

قدرت: تم نے اس سے پوچھا..... وہ اس بدنام زمانہ جگہ کیوں گیا تھا کل رات..... اور اتنا ہنگامہ کیوں کھڑا کیا اس نے وہاں.....

پیرنی بات گول کر جاتی ہے۔

پیرنی: جوان اولاد ہے..... ہو جاتی ہے غلطی..... اگر ہم اس کی اسی غلطی کو اس کے سامنے بار بار دہراتے رہیں گے تو ایک وقت آئے گا کہ پلٹ کر جواب دے دے گا..... میں سمجھا دوں گی اُسے.....

قدرت غور سے بیوی کی جھکی نظر میں دیکھتا ہے۔

قدرت: مگر یہ تمہاری جھکی ہوئی نظر تو کچھ اور ہی بول رہی ہے موسیٰ کی ماں..... بیٹے کے عیبوں پر پردہ مت ڈالو..... اگر کوئی بات ہے ایسی ویسی تو مجھے ابھی بتا دو..... ابھی پیر قدرت اللہ شاہ کی ہڈیوں میں اتنا دم ہے کہ بیٹے کی چال کا خم نکال سکے.....

پیرنی: خم گہرا ہو جائے تو سیدھ کی خواہش ٹہنیاں توڑ دیا کرتی ہے..... آپ بس فضل بھائی سے کہہ کر ستارہ کی رخصتی کا اہتمام کریں جلدی..... بیوی آئے تو خود ہی سارے بٹے دھیان سمٹ کر ایک جانب ہو جایا کرتے ہیں.....

پیر قدرت بیوی کی بات سن کر ایک زور کا ہنکارہ بھرتا ہے مگر چپ رہتا ہے اور کسی سوچ میں گم بیٹھا تسبیح پھیرتا رہتا ہے۔

قدرت: ہم م م م.....

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

قدرت اپنے آستانے/حجرے/ڈیرے کے بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ عیسیٰ کے لئے کسی مرید کو بلانے کا کہتا ہے۔

قدرت: عیسیٰ کہاں ہے..... اسے پیغام دو کہ میں نے بلایا ہے..... فوراً.....

مرید: جی شاہ جی.....

مرید اُلٹے قدموں بھاگ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: نامراد کا پان کا کیبن

موسیٰ کسی گہری سوچ میں ہے۔

نامراد: کہاں پھنس گئے صوفی صاب.....

موسیٰ: تم مجھے اس کا پتہ بتا سکتے ہو.....؟

نامراد: سوچ لو..... کچھ قدم ایک بار اُٹھ جائیں تو پھر پیچھے پلٹتے نہیں.....

موسیٰ: سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں..... مزید سوچا تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی..... مگر میرے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

نامراد: ٹھیک ہے..... گویا تم نے فیصلہ کر لیا ہے..... پتہ بہت آسان ہے اس کا.....

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا آستانہ

عیسیٰ باپ کے سامنے پریشان سا سر جھکائے کھڑا ہے۔ قدرت بیٹے کی آنکھوں میں دیکھتا ہے۔

قدرت: گویا تم بھی اپنی ماں کی طرح یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں کچھ نہیں پتہ.....

عیسیٰ: جی ابا جان.....

قدرت: ایسا کیسے ہو سکتا ہے..... سارا دن تم دونوں بھائی ایک ساتھ ہوتے ہو..... موسیٰ نے ساری زندگی تمہارے علاوہ کسی کو دوست بھی نہیں بنایا..... ہر راز کے شریک دار ہو تم دونوں ایک دوسرے کے..... پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس بار موسیٰ کے ارادوں کی خبر نہ ہوئی ہو.....

عیسیٰ: مجھے کچھ پتہ چلا تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا.....

قدرت: (غصے سے) اُمید نہیں ہے مجھے اس کی..... مگر تم اور تمہاری ماں اگر موسیٰ کے خیر خواہ ہو تو مجھے وقت سے پہلے ضرور مطلع کرو گے..... ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے گزرنے کے بعد تم صرف ڈوب جانے کی دہائیاں دیتے پھرو.....

عیسیٰ: جی ابا جان.....

قدرت: آج سے تم موسیٰ پر ہر پل نظر رکھو گے اور مجھے اس کی پل پل کی رپورٹ دیا کرو گے..... کیا سمجھے.....

عیسیٰ پریشانی سے باپ کو دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: جی ابا..... سمجھ گیا.....

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

زہرہ کی حویلی کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ بند پڑا ہے۔ موسیٰ گلی میں نمودار ہوتا ہے اور جھجکتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی حویلی/زہرہ کا کمرہ

زہرہ اپنے کمرے میں سنگھار میز کے سامنے ہاتھ میں کنگھا لئے بیٹھی جانے کن خیالوں میں گم ہے۔ اچانک باہر کچھ ہلچل سی ہوتی ہے اور چندا بوکھلائی، ہڑبڑائی سی اندر آتی ہے۔ چندا کا سانس پھولا ہوا ہے۔

زہرہ: کیا ہوگیا ہے تمہیں.....؟

چندا: وہ.....وہ آ گیا ہے زہرہ.....

زہرہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

زہرہ: کون.....؟.....کون آ گیا ہے.....

چندا: وہی.....موسیٰ.....

زہرہ کے ہاتھ سے لکڑی کا بڑا کنگھا گر جاتا ہے۔

زہرہ: کیا.....؟.....نہیں.....وہ.....یہاں.....؟ کہاں ہے وہ.....

چندا: انا کے سامنے کھڑا ہے.....وہی اب سوال جواب کریں گی اس سے.....

زہرہ پریشانی سے کہتی ہے۔

زہرہ: افوہ.....اسے اندر ہی کیوں آنے دیا ان لوگوں نے۔

چندا: وہ روکنے سے رُکنے والا کب تھا بھلا.....انا نے اسی لئے اندر بلا لیا کہ دروازے پر تماشہ نہ بنے.....

زہرہ باہر لپکتی ہے۔ چندا اُس کے پیچھے بھاگتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی حویلی/صحن

موسیٰ انا کے سامنے کھڑا ہے۔ انا اپنے تخت پر صحن میں بڑے ٹھسّے اور غرور سے تنی بیٹھی حقہ پی رہی ہے۔ ایک آدھ خادمہ اس کے پاؤں دبا رہی ہے۔ دُور زہرہ کا گروہ کسی نو آموز رقاصہ کو توڑے سکھا رہا ہے مگر اب اس کا دھیان بھی موسیٰ کی طرف ہے۔ موسیٰ غور سے سارے ماحول کا جائزہ لیتا ہے۔ زہرہ اور چندا دور برآمدے میں بھاگتی ہوئی آتی ہیں۔ زہرہ اونچے ستونوں والے لمبے برآمدے کے کسی بڑے ستون کی آڑ میں کھڑی ہو جاتی ہے اور موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔ انا حقے کا دھواں یوں فضا میں اُچھالتی ہے جیسے موسیٰ کے چہرے پر پھینک رہی ہو۔

انا غصے سے پوچھتی ہے۔

انا: لڑکے.....کیا نام بتایا تھا تو نے.....

موسیٰ: موسیٰ.....

انا: کسی دیندار گھرانے کا لگتا ہے.....پھر یہاں کیا لینے آیا ہے.....

موسیٰ: مجھے زہرہ سے کچھ بات کرنی ہے.....

انا: پرچون کی دوکان سمجھ رکھا ہے کیا.....یہ انا جی کی کوٹھی ہے.....پیسے ہیں تیرے پاس.....

انا کی بات پر زہرہ کچھ بے چین ہوتی ہے۔

موسیٰ: ہاں..... ہیں.....

انا: دکھا..... کتنا مال ہے تیرے پاس.....

موسیٰ اپنے کرتے کی ساری جیبیں الٹ کر انا کے سامنے ڈال دیتا ہے، پانچ پانچ ہزار کے چند بڑے اور ہزار کے چند چھوٹے نوٹ موسیٰ کی جیب سے نکلتے ہیں۔ جنہیں انا ناک سکیڑ کر یوں انگلی سے اٹھاتی ہے جیسے کسی مرے ہوئے چوہے کو کوئی انگلی سے پکڑ کر اُٹھاتا ہے۔

انا: بس..... یہی ریزگاری ہے..... اتنا میں روز صبح زہرہ کی جوتیوں کے اوپر وار کر بانٹ دیتی ہوں..... انا پیسے صدقہ کرنے کے انداز میں دور کھڑی زہرہ پر وار کر نوکرانی کے پیروں میں پھینک دیتی ہے۔

موسیٰ اپنے پیسوں کی ناقدری دیکھتا ہے۔

موسیٰ: اس وقت یہی ہیں میرے پاس..... اور بھی لاسکتا ہوں..... جتنے آپ کہیں..... مگر پہلے آپ زہرہ کے لفظوں کی قیمت کا تعین تو کرلیں..... مجھے یقین ہے آپ کچھ کم ہی لگائیں گی.....

انا موسیٰ کی بات پر چونک سی جاتی ہے۔ زہرہ بے چینی سے ان دونوں کو دیکھ رہی ہے۔ انا مسکراتی ہے۔

انا: اچھا..... سودا کرنا جانتے ہو.....

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 5

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی کوٹھی

انا پلٹ کر ستون کے پیچھے سے نکل کر باہر آتی زہرہ کو دیکھتی ہے۔ انا اسے ڈانٹتی ہے۔

زہرہ: ایک بات میری بھی سنتے جاؤ موسیٰ.....

انا: (ڈانٹ کر) زہرہ..... تم اس معاملے میں چپ ہی رہو تو بہتر ہے.....

زہرہ: مجھے بات کر لینے دیں اس سے ایک بار انا جی.....، ورنہ یہ پھر پلٹ کر آئے گا.....

انا گہری نظروں سے موسیٰ کو دیکھتی ہے پھر زہرہ سے کہتی ہے۔

انا: ٹھیک ہے..... کر لو بات.....، مگر بات کو آج ختم کر دینا.....، کہیں بات سے بات چل پڑی تو.....،.....

انا اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اُٹھ جاتی ہے۔ صحن میں کھڑی لڑکیاں یہ سب دیکھ رہی ہیں۔ نوکرانی انا کا حقہ وغیرہ اُٹھا کر جلدی سے اس کے پیچھے لپکتی ہے۔ انا اپنا پرانے فیشن کا بڑا سا شرارہ سنبھالے برآمدے میں کہیں اوجھل ہو جاتی ہے۔ زہرہ خاموش کھڑے موسیٰ سے کہتی ہے۔

زہرہ: اندر آؤ..... میں یہاں مزید کوئی تماشہ نہیں لگانا چاہتی۔

زہرہ پلٹ کر چل پڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی کوٹھی/

کوئی بڑا، سجا ہوا ہال نما کمرہ

موسیٰ سر جھکائے زہرہ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے..... زہرہ غصے سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: کیوں آئے ہو یہاں.....

موسیٰ: پتہ نہیں..... بہت بے چین تھا..... تمہارا طعنہ کل رات سے مسلسل کاٹ رہا تھا مجھے..... قدم خود بخود تمہارے گھر کی طرف اُٹھ آئے..... ہوش آیا تو یہاں کھڑا تھا.....

زہرہ غور سے اُسے دیکھتی ہے۔

زہرہ: ہم جیسوں سے واسطہ رکھو گے تو طعنے سننے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا ہوگا اور تم جیل سے کیسے چھوٹ گئے اتنی جلدی.....

موسیٰ سادگی سے کہتا ہے۔

موسیٰ: میرے ابا کو پسند نہیں آیا میرا جیل جانا..... نکال لائے تھے رات کو ہی.....

زہرہ: اپنا نہیں تو اپنے ماں باپ اور خاندان کا ہی خیال کر لو کچھ.....، یہ جگہ تمہارے اونچے دیندار گھرانے کے لئے بدنامی کا ٹیکہ ثابت ہو سکتی ہے..... کیوں ان کے نام پر بٹہ لگانا چاہتے ہو.....

موسیٰ: یہی بات اگر میں تم سے پوچھوں..... کیا تمہیں کسی بدنامی کا خوف نہیں رہا کبھی.....اور جو بات تمہارے لئے بدنامی یا رسوائی کا باعث نہیں بن رہی وہ میرے نام کو داغ دار کیسے کر سکتی ہے.....؟

زہرہ زچ ہو جاتی ہے۔

زہرہ: تم اتنے مشکل سوال کیوں کرتے ہو..... جن کا جواب میں تمہارے جانے کے بعد بھی گھنٹوں تلاش کرتی رہتی ہوں.....

موسیٰ: سوال تو تم نے کیا تھا مجھ سے کہ تمہارے پیشے، حلیے، رہن سہن، نام یا بدنامی سے میرے جذبے یا میری محبت پر کیا فرق پڑتا ہے.....؟.....اسے تو ہر حال میں اپنی جگہ قائم و دائم رہنا چاہیے تھا.....

زہرہ بات ٹالتی ہے۔

زہرہ: میں رات بہت غصے میں تھی..... کچھ زیادہ بول گئی شاید.....تم دھیان نہ دو.....

موسیٰ: نہیں.....تم نے ٹھیک کہا تھا.....جذبوں میں سوداگری نہیں چلتی.....اور میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری حقیقت جاننے کے باوجود مجھے تم سے نفرت نہیں ہوئی.....کیوں.....؟.....ایسا کیوں ہے.....میرا جذبہ آج بھی ویسا ہی ہے.....میں تکلیف میں ہوں.....درد میں تڑپ رہا ہوں.....قدرت کی ستم ظریفی پر میرا دل رو رہا ہے.....لیکن پھر بھی میرے قدم تمہارے دروازے کی طرف کیوں اُٹھ آئے ہیں.....؟؟.....یہ سب کیا ہے.....

موسیٰ سر جھکائے اپنے دل کی حالت بیان کر رہا ہے۔اتنے میں دروازے پر انا آتی ہے اور موسیٰ کی بات سنتی ہے۔

زہرہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتی ہے۔

زہرہ: دیکھو.....تم.....

اتنے میں انا اندر داخل ہوتی ہے۔ساتھ حسب معمول ایک نوکرانی انا کا چھوٹا سا حقہ اُٹھائے چل رہی ہے۔

انا: چلو لڑکے.....تمہارا وقت پورا ہو گیا ہے.....اتنا وقت تو آج تک انا نے کسی کو نہیں دیا.....خوش نصیب ہو تم.....کچھ بانٹ دینا باہر جا کر غریبوں میں.....چلو شاباش.....زہرہ کے رقص کی مشق کا وقت ہو گیا ہے.....چلو زہرہ.....تمہارے گرو جی باہر انتظار کر رہے ہیں۔

موسیٰ بے بسی سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی کوٹھی/صحن

موسیٰ کمرے سے باہر صحن میں آتا ہے۔اس کے پیچھے انا اور زہرہ بھی باہر نکلتی ہیں۔صحن میں گرو کھڑا ہے۔دور کچھ فاصلے پر کچھ لڑکیاں جو رقص کے Steps کر رہی ہیں موسیٰ کو باہر آتے دیکھ کر رُک جاتی ہیں۔موسیٰ چند لمحے رک کر اُن سب کو دیکھتا ہے۔اور جانے کے لئے قدم بڑھاتا ہے۔پیچھے سے انا اسے آواز دے کر روکتی ہے۔

انا: سنو لڑکے.....

موسیٰ رُکتا ہے۔

انا: دوبارہ یہاں مت آنا.....ہماری لڑکیاں اپنے ٹھکانے پر کسی سے نہیں ملا کرتیں.....یہ گھر ہے ہمارا.....

موسیٰ: اور اگر میں دوبارہ ملنا چاہوں تو.....

انا: اپنے گھر پر یا باہر کوئی تقریب رکھو.....کوئی بھی لڑکی ناچنے کے لئے آ جائے گی وہاں.....ویسے کتنا کما لیتے ہو.....؟

موسیٰ سادگی سے کہتا ہے۔

موسیٰ: کچھ نہیں..... ساری جائیداد جاگیر اور آمدنی ابا کے پاس جاتی ہے.....

لتا موسیٰ کے جواب پر ہنس پڑتی ہے۔

لتا: گھر میں نہیں ہیں دانے..... اماں چلیں بھنانے..... جب تمہاری جیب میں تمہاری اپنی کمائی کے لاکھوں ہوں تب بات کرنا..... یہ کنگلوں کا کھیل نہیں ہے.....

موسیٰ غور سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور جواب لتا کو دیتا ہے۔

موسیٰ: میں نے کئی ایسے کنگلے دیکھے ہیں جو جیب میں لاکھوں کروڑوں لئے پھرتے ہیں..... مگر ان کا دل بھکاری ہوتا ہے..... آپ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ آپ لوگ دل والے ہیں..... مگر دل والوں کا امیری غریبی کا پیمانہ تو کچھ اور ہوتا ہے..... سونے کے سکے نہیں.....

لتا موسیٰ کا جواب سن کر لاجواب ہو جاتی ہے۔

لتا: دیکھو لڑکے تم.....

موسیٰ: بہرحال..... آپ فکر نہ کریں..... کروڑوں کی جاگیر ہے میرے نام پر.....، ..... آپ کو دُہرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی.....

موسیٰ قدم آگے بڑھاتا ہے، راستے میں گرو کھڑا ہے۔ اچانک گرو موسیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دے دیتا ہے۔

گرو: جیتے رہو.....،.....

زہرہ اور لتا دونوں چونک کر موسیٰ اور گرو کی طرف دیکھتی ہیں، موسیٰ آگے بڑھ جاتا ہے۔ زہرہ موسیٰ کو جاتے دیکھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی گلی

موسیٰ گلی میں نکل کر واپسی کی راہ لیتا ہے۔ نامراد اپنے پان کے کیبن پر بیٹھا موسیٰ کا ہی انتظار کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے موسیٰ کو آواز دے کر روکتا ہے۔ اور باہر آتا ہے۔

نامراد: ہوگئی ملاقات.....،.....

موسیٰ: ادھوری ملاقات.....،.....

نامراد: محبت میں ملاقاتیں ہمیشہ ادھوری رہتی ہیں۔

موسیٰ چونک کر نامراد کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے.....

نامراد: بتایا تو تھا..... میری بربادی کی داستان بھی انہی گلیوں کی دیواروں پر لکھی ہے..... بہت بڑا ٹرانسپورٹر ہوا کرتا تھا میں کبھی.....،..... بارہ پندرہ ٹیکسیاں چلا کرتی تھیں میری اسی شہر میں..... تین بسیں بھی لے رکھی تھیں..... سب کچھ تھا میرے پاس..... مگر میرا انجام اسی گلی کے اس پان کے کیبن میں لکھا تھا..... سو طے پایا.....

موسیٰ غور سے نامراد کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: اب کہاں ہے وہ.....؟

(نامراد مسکراتا ہے)

نامراد: کسی ارب پتی کے ساتھ دوبئی سدھار گئی.....،..... یہاں صرف ایک ہی سکہ چلتا ہے پیارے..... دولت کا سکہ..... سکہ ختم

تو کھیل ختم..... میری ایک بات مانو گے.....

موسیٰ: بولو.....

نامراد: یہاں مت آیا کرو..... یہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے..... تمہارے پیر گھرانے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ جانتے ہیں تمہیں..... نیلے گنبد والے مزار پر ہر سال جو عرس لگتا ہے، یہاں کے زیادہ تر مکین وہاں چادر چڑھانے جاتے ہیں..... یہاں کی عورتیں بھی پیری مریدی کو بہت مانتی ہیں..... کہیں نہ کہیں تم سے آمنا سامنا ہو ہی جائے گا کسی کا۔

موسیٰ: حیرت ہے..... تم بھی مجھ سے وہی بات کر رہے ہو جو سارا زمانہ کہتا ہے..... جبکہ تم خود نامراد..... ہاں میں خود اپنا سب کچھ انہی گلیوں میں لٹا چکا ہوں..... مگر تب بھی میرے ماتھے پر نیک نامی اور خاندان کی وہ مہر نہیں تھی جو تمہاری پیشانی پر دور سے نظر آجاتی ہے..... یہ دنیا بڑی ظاہر شناس ہے۔ پیرزادے..... یہ دل نہیں دیکھتی..... انسان کا حلیہ دیکھ کر فیصلہ سنا دیتی ہے..... یا پھر حلیہ بدل ڈالو.....

موسیٰ نامراد کی بات پر چونک کر اسے دیکھتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

موسیٰ گھر واپس آتا ہے اور اپنی جیپ پارک کرتا ہے تبھی عیسیٰ ایک جانب سے گھبرایا ہوا سا برآمد ہوتا ہے۔

عیسیٰ: کہاں رہ گئے تھے بھائی..... ابا جان سخت غصے میں ہیں..... کم از کم مجھے تو بتا کر جاتے.....

موسیٰ: کیوں کیا ہوا.....؟.....

عیسیٰ: بھول گئے ناں..... آج تمہارے ہونے والے سسر محترم نے تمہیں گھر پر بلایا تھا..... شاید کوئی رسم وغیرہ ہو یہ بھی.....

موسیٰ: اب کیا.....؟

عیسیٰ: اب کیا ہونا ہے..... تم ان کے گھر نہیں پہنچے تو وہ خود تمہاری خیریت پوچھنے یہاں پہنچ گئے..... اندر بیٹھے ہیں مردانے میں ابا کے ساتھ..... اب کوئی اچھا سا بہانہ سوچ کر اندر جانا.....

موسیٰ چابی عیسیٰ کے ہاتھ پر رکھتا ہے اور اندر کی جانب بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: مردانہ

موسیٰ مردانے میں بیٹھک/ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔ پیر فضل اور پیر قدرت دونوں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں..... موسیٰ سلام کرتا ہے تو دونوں چونک جاتے ہیں۔ موسیٰ کا باپ بڑی مشکل سے اپنے ماتھے پر آنے والی غصے کی تیوریاں چھپاتا ہے۔

پیر فضل: یہ لو..... موسیٰ میاں بھی آ گئے..... بھئی بڑی راہ دکھائی آج تم نے.....

قدرت سخت لہجے میں پوچھتا ہے۔

قدرت: کہاں رہ گئے تھے..... پیر صاحب کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں.....

موسیٰ: معاف کیجئے گا..... میں نیلا گنبد کی طرف گیا تھا..... وہیں دیر ہو گئی.....

پیر فضل: اوہ اچھا..... عرس کی تیاریاں چل رہی ہیں..... چلو یہ بھی ضروری کام ہے..... مگر وہاں گھر کی عورتیں تمہارے انتظار میں جانے کیا کچھ پکوان بنائے بیٹھی رہ گئیں..... جرمانہ بنتا ہے تم پر.....

قدرت بات سنبھالتا ہے۔

قدرت: کیوں نہیں..... سارے جرمانے ادا کریں گے ہم..... اور موسیٰ کل اسی وقت پر اپنی اماں کے ساتھ حاضر ہو جائے گا.....

پیر فضل: (مسکرا کر) ہاں..... یہ ٹھیک رہے گا..... جرمانے کی پہلی قسط تو یونہی ادا ہو جائے گی..... اچھا تو پیر صاحب آپ کیا بتا رہے تھے..... اوقاف والوں کے سروے کا کیا بنا.....؟

قدرت: بھئی یہ سرکاری محکموں کی چال تو ہمیشہ سے ہی نرالی ہے..... ایک کاغذ پورا ہو جائے تو دوسرا صفحہ لئے تیار کھڑے ہوتے ہیں..... میں نے سیکٹری صاحب سے ملاقات کا وقت لیا ہے..... اب یہ ذمہ انہی کے سر ڈالوں گا میں.....

قدرت اور فضل بات کرتے رہتے ہیں۔ موسیٰ بے زار سا بیٹھا سنتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

کامران اور ایک دوست (جو شادی/ نکاح کے لئے بھی آیا تھا) آپس میں بات کر رہے ہیں۔

کامران کے لہجے میں غرور ہے۔

کامران: میں جانتا تھا..... سکینہ مجھ سے رابطہ کیے بنا رہ نہیں پائے گی.....

دوست: ہاں..... مگر اب وہ کسی کی بیوی ہے..... بیوہ نہیں ہوئی ابھی تک.....

کامران تلملا کر کہتا ہے۔

کامران: کاش بیوہ بھی ہو جائے.....

دوست: بے وقوفی کی باتیں مت کرو..... جن مجبوریوں کی وجہ سے تم نے پہلے اُسے چھوڑا تھا..... وہ آج بھی اسی طرح برقرار ہیں..... کوئی دنیا نہیں بدل گئی تمہاری.....

کامران غصے سے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔

کامران: جانتا ہوں..... اسی لئے ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا ہوں یہاں..... ورنہ کب کا سکینہ کے پاس پہنچ چکا ہوتا.....

دوست: بہر حال..... اب ارادہ کیا ہے تمہارا.....

کامران: کچھ سمجھ نہیں آ رہا..... مگر میں اس سے ملے بنا رہ بھی تو نہیں سکتا.....

دوست: اس کا شوہر اور بھائی یاد ہیں ناں تمہیں..... جو بھی فیصلہ کرنا..... ان دونوں کو ذہن میں رکھ کر کرنا.....

دوست اُٹھ کر چلا جاتا ہے کامران کسی سوچ میں گم رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا میں بات چیت۔

چندا: ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا..... بہت سے کروڑ پتی بھی اندر من سے کنگلے ہی نکلتے ہیں..... اور یہ بات ہم سے زیادہ کون جانتا

ہے..... مجھے کم از کم وہ دل کا کنگلا دکھائی نہیں دیا.....

(زہرہ جیسے خود کو سمجھاتی ہے)

زہرہ: مجھے کسی کے دل سے کیا لینا دینا..... یہاں کی جس لڑکی نے بھی آج تک دل کی بات مانی ہے..... بدلے میں دھوکہ، ذلت اور رسوائی ہی پائی ہے.....

چندا: مگر سب مرد ایک سے نہیں ہوتے.....

زہر سختی سے کہتی ہے۔

زہرہ: ایک جیسے ہی ہوتے ہیں سب مرد..... میں نے تو آج تک یہاں آتے جاتے ہر مرد کی محبت کا بس ایک ہی روپ دیکھا ہے..... چھپ کر ملتا ہے..... تنہائی میں ہم پر اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتا ہے..... دل و جان سے واری جاتا ہے..... مگر وقت پڑنے پر زمانے کے سامنے ایک پل میں ہی انجان بن کر یوں منہ پھیر لیتا ہے جیسے کبھی جانتا ہی نہ ہو.....

چندا: تم شاید ماہ پارہ کے تجربے سے بہت ڈر گئی ہو..... ضروری تو نہیں کہ جو اُس کے ساتھ ہوا.....

زہرہ بات کاٹ دیتی ہے،

زہرہ: بات کسی اور پر گزرے تجربے یا سانحے کی نہیں ہے..... بات صرف ایک یقینی سچ کی ہے..... اور وہ سچ یہی ہے کہ مرد اور وفا دو مختلف چیزوں کے نام ہیں جو کبھی یک جا نہیں ہو سکتیں..... اسی لئے اتا جی بالکل صحیح کہتی ہیں کہ ان عشق محبت کے چکروں میں پڑنے سے بہت پہلے عورت کو اپنی سکیورٹی، چھت اور اپنے مستقبل کو محفوظ کر لینا چاہیے..... مرد کی محبت کا بخار اُترتے ہی در بدر کی خواری، عمر بھر کی مفلسی اور ذلت ہم جیسی لڑکیوں کا مقدر ہوتی ہے.....

چندا ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔

چندا: اُف..... تم سے بات کر کے تو انسان خود ڈیپریشن میں چلا جاتا ہے..... اچھا..... اب سو جاؤ بڑی بی..... میرے آج کے لیکچر کا کوٹہ پورا ہوا۔

لیمپ بند کر کے چندا کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ بھی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک موسیٰ کا یوں اچانک گھر آنا، زہرہ سے ملنے کے لئے اتا سے کہنا اور پھر کمرے میں ان دونوں کی ملاقات کے مناظر گھومتے رہتے ہیں، زہرہ کو موسیٰ کی کہی کوئی بات یاد آتی ہے۔

آڈیو موسیٰ / اور لیپ

"جو بات تمہارے لئے بدنامی کا باعث نہیں بن رہی..... وہ میرے نام کو داغ دار کیسے کر سکتی ہے....."

زہرہ بے چینی سے کروٹ بدلتی ہے لیکن اس کی آنکھوں سے نیند ابھی دور ہے باہر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا کمرہ

دوسری جانب موسیٰ بھی زہرہ سے ہوئی آج کی ملاقات کی یادوں میں کھویا ہوا ہے۔ اسے زہرہ کی باتیں یاد آ رہی ہیں اور وہ بھی بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے رات یونہی آنکھوں آنکھوں میں گزار دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: اگلا دن/صبح ہونے کا موقع

پیر نی موسیٰ کو لئے پیر فضل کے گھر پہنچتی ہے شائستہ/فضل کی بیوی (سیدانی) ان کا استقبال کرتی ہے۔ موسیٰ کچھ ہچکچایا اور سٹپٹایا سا ہوا ہے۔

ستارہ اپنی کسی کزن یا سہیلی کے ساتھ کسی پردے/چلمن کی اوٹ سے چھپ کر موسیٰ کو دیکھتی ہے (مریم) کزن ستارہ سے کہتی ہے۔

مریم/کزن: یہ اتنا پریشان اور ہونق سا کیوں کھڑا ہے..... جیسے کوئی زبردستی پکڑ کر لایا ہوا سے یہاں.....

ستارہ اپنی کزن/مریم کو جھاڑتی ہے۔

ستارہ: زیادہ بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... یہ بچپن سے ہی ایسا ہے..... خواہ مخواہ دانت نکالنے اور گھلنے ملنے کی عادت نہیں ہے اسے.....

مریم/کزن: واہ بھئی واہ..... پھر تو ماموں جان نے بالکل تمہاری ٹائپ کا منگیتر ڈھونڈا ہے تمہارے لئے..... اچھا تم پچھلی بیٹھک میں پہنچو..... میں ماموں فضل کے آنے سے پہلے تمہارے دل کی مراد پوری کرنے کی کوشش کرتی ہوں..... چلو..... جلدی کرو.....

دونوں ہنستی ہوئیں وہاں سے ہٹ جاتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: پیر فضل کا گھر/کمرہ۔یا۔ بیٹھک

موسیٰ کسی کمرے میں اکیلا بیٹھا ہے۔ اتنے میں ستارہ کی کزن (مریم) دھیرے سے کھنکارتی ہوئی اندر آتی ہے۔ موسیٰ مریم کو دیکھ کر احتراماً اور کچھ گڑبڑا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مریم کے انداز میں شرارت ہے۔

مریم: آداب..... ارے آپ یہاں بیٹھے ہیں..... آپ کو تو مردانے میں ہونا چاہئے تھا اس وقت.....

موسیٰ سٹپٹا سا جاتا ہے۔

موسیٰ: مگر..... مجھے تو یہی پیغام ملا تھا کہ بڑے شاہ صاحب یہاں میرا انتظار کر رہے ہیں.....

مریم انجان سی بن جاتی ہے اور شرارت سے کہتی ہے۔

مریم: اچھا.....؟ یہ گھر کے نوکر بھی ناں..... کبھی دھیان سے پوری بات سنتے نہیں..... ویسے مجھے مریم کہتے ہیں..... میں ستارہ کی کزن ہوں..... ماموں زاد.....

موسیٰ جلدی میں ہے۔

موسیٰ: اوہ اچھا..... تو پھر میں مردانے کی طرف جاتا ہوں.....

مریم: ٹھہر جائیں..... ٹھہر جائیں جناب..... ایسی بھی کیا جلدی ہے..... کوئی اور بھی ہے یہاں..... جو آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے جانے کب سے.....

موسیٰ حیرت سے مریم کی طرف دیکھتا ہے۔ مریم دروازے کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

مریم: ارے آجاؤ بھئی..... کب تک دروازے کے پیچھے کھڑی ہماری باتیں سنتی رہو گی.....

مریم کے کہنے پر پردے کے پیچھے سے جھجکتی، شرماتی ستارہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

ستارہ: آداب.....

مریم دونوں کو شرارت سے دیکھتی ہے۔

مریم: چلیں جناب..... میرا کام ختم ہوا..... اب جلدی سے بات کر لیں آپ دونوں..... میں تب تک باہر ہی پہرہ دے رہی ہوں..... مگر جلدی..... پلیز..... ماموں جان آتے ہی ہوں گے.....

مریم شرارت سے ستارہ کو کہنی مار کر باہر چلی جاتی ہے۔ ستارہ اور موسیٰ چند لمحے ویسے ہی چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔ پھر ستارہ ہی پہل کرتی ہے۔

ستارہ: کیسے ہیں آپ.....؟

موسیٰ: میں..... میں ٹھیک ہوں..... مگر یہ سب.....

ستارہ مسکراتی ہے۔

ستارہ: میں نے ہی مریم سے کہا تھا یہ دو گھڑی کی ملاقات کروانے کے لئے..... ویسے تو آپ ملتے ہی نہیں..... اور ہمارے گھر بھی آئے تو خدا خدا کر کے..... کیا کوئی ناراضگی ہے ہم سے.....

موسیٰ: ناراضگی..... نہیں..... نہیں تو..... بس کچھ مصروفیات ہی ایسی ہیں..... وقت نہیں ملتا.....

ستارہ: وقت نکالنا پڑتا ہے جناب..... اور امی کب سے آپ کے جوڑے کا ناپ مانگ رہی ہیں..... کچھ سلوانا ہے آپ کے لئے..... انگوٹھی بھی ابھی یہیں پڑی ہے آپ کی۔

موسیٰ اُلجھن زدہ سا ہے۔

موسیٰ: ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے بھلا..... تم امی کو منع کر دو..... مجھے اُلجھن ہوتی ہے ان لوازمات سے.....

ستارہ سر جھکا کر کہتی ہے۔

ستارہ: لیکن..... یہ میرے دل کی خواہش بھی ہے..... اور اس میں بھلا تکلف کی کیا بات ہے..... یہ تو رسم ہے۔

موسیٰ: ہاں..... مگر آج کل بھلا کون نبھاتا ہے ایسی رسمیں.....

ستارہ کے منہ سے بے اختیار بات نکل جاتی ہے، موسیٰ چونک کر اُسے دیکھتا ہے۔

ستارہ: رسمیں ہی تو محبت کی نشانی ہوتی ہیں..... میرا مطلب ہے..... یہی رسمیں تو رشتوں کی خوبصورتی ہوتی ہیں..... اور ہم تمام عمر یہ رسمیں ہی تو نبھاتے ہیں..... رشتوں کی طرح۔

موسیٰ ستارہ کی بات اور آنکھوں کی گہرائی کو محسوس کر کے کچھ ہچکچا کر کہتا ہے۔

موسیٰ: دیکھو ستارہ..... مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے..... دراصل میں.....

ستارہ: باتیں تو مجھے بھی آپ سے بہت ساری کرنی ہیں..... مگر آج نہیں..... یہاں کسی بھی لمحے کوئی آ سکتا ہے مردانے کی طرف سے..... میں آپ کو کسی طرح پیغام کروا دوں گی کہ ہمیں کب اور کہاں ملنا ہے..... بس تیار رہیے گا.....

اتنے میں باہر سے مریم اندر جھانکتی ہے۔

مریم: ذرا جلدی جناب..... ممانی دو مرتبہ تمہارا پوچھ چکی ہیں ستارہ..... مروا مت دینا اپنی اس معصوم کزن کو.....

ستارہ جانے کے لئے پلٹتی ہے۔

ستارہ: مجھے اب جانا ہوگا..... جلد آپ سے دوسری ملاقات ہوگی.....

ستارہ پلٹ کر جانے لگتی ہے۔ پھر دو گھڑی کے لئے رُکتی ہے.....

ستارہ: اور ہاں..... آپ کی زبان سے آج برسوں بعد اپنا نام اتنی اپنائیت سے سن کر مجھے بہت اچھا لگا..... چلتی ہوں..... آداب.....

ستارہ ہنستی ہوئی پلٹ کر چلی جاتی ہے۔جبکہ موسیٰ وہاں اسی طرح سے گم سم سا کھڑا رہ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

مونتاج۔MONTAGE

جگہ: ستارہ کی حویلی

ستارہ کی ماں سیدانی، پیرنی، چند خادمائیں/نوکرانیاں وغیرہ بیٹھی ہیں اور ان کے جھرمٹ میں موسیٰ کو انگوٹھی پہنا دی جاتی ہے۔عورتیں ہنس بول رہی ہیں۔موسیٰ گم سم سا ہے.....پیرنی بیٹے کی یہ غائب دماغی نوٹ کرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

جگہ: کوئی ڈانس پارٹی/ڈانس فلور

کسی ڈانس فلور پر تیز میوزک کی بیٹ پر ڈانس پارٹی کا ہلہ گلہ جاری ہے۔شہر کا مشہور انڈسٹریالسٹ Industralist اور کسینو Casanova ملک شہریار ہال میں داخل ہوتا ہے۔اور کاؤنٹر پر آتا ہے۔اس کے ساتھ گارڈز وغیرہ ہیں جنہیں ملک شہریار ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج کر Relax رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ملک شہریار پکی عمر کا ایک ہینڈسم مرد ہے اور فلور اور کاؤنٹر کا عملہ اس کے آگے پیچھے جا رہا ہے۔ملک شہریار کو کوئی ڈرنک Serve کیا جاتا ہے۔شہریار کی نظر ڈانس فلور پر تھرکتی لڑکیوں پر پڑتی ہے۔انہی میں زہرہ بھی موجود ہے۔ملک کی نظریں زہرہ پر جم سی جاتی ہیں۔وہ کچھ دیر اسے ڈانس کرتے دیکھتا رہتا ہے اور پھر قریب سے گزرتے کسی بیرے کو روک کر اُسے زہرہ کی اشارہ دے کر کچھ کہتا ہے۔بیرہ ادب سے سر ہلاتا ہے اور فلور کی طرف بڑھ جاتا ہے۔شہریار اسی جانب دیکھ رہا ہے۔بیرہ جا کر زہرہ کے کان میں کچھ کہتا ہے۔زہرہ کاؤنٹر کی طرف دیکھتی ہے۔شہریار اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہے، زہرہ کچھ بیزاری سے اُسکے وِش Wish کا جواب دیتی ہے، ملک شہریار اس کی جانب دیکھتا رہتا ہے۔اور زہرہ پہلے جس گروپ وغیرہ کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی انہی کے ساتھ جاری رکھتی ہے.....

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

موسیٰ اپنے کمرے میں کسی سوچ میں گم لیٹا ہے۔اسے انا کی کہی بات یاد آتی ہے۔

انا: کتنا کما لیتے ہو.....؟

ہونہہ.....گھر میں نہیں ہیں دانے.....اور اماں چلیں بھنانے.....

موسیٰ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے، اور کچھ سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: کسی نئے طرز کے بنگلے کا پورچ/پارکنگ وغیرہ

پارٹی ختم ہو چکی ہے.....

گاڑیاں مہمانوں کو لے کر ایک ایک کر کے واپس جا رہی ہیں۔ زہرہ بھی اپنی گاڑی کے انتظار میں کھڑی ہے۔ اتنے میں ملک شہریار اپنی بڑی کروزنگ کی طرف بڑھتا ہے جو ابھی ابھی اسے لینے آئی ہے۔ اس کا گارڈ جلدی سے اس کے لئے دروازہ کھولتا ہے، ملک اندر بیٹھنے لگتا ہے تبھی اس کی نظر ایک جانب کھڑی زہرہ پر پڑتی ہے۔ وہ اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اس کی جانب بڑھتا ہے۔

ملک: ہائے..... آئی ایم ملک شہریار..... فرام شہریار انڈسٹریز.....

زہرہ غلط نام بتاتی ہے۔

زہرہ: میں سونیا.....

ملک: اوہ..... نائس..... Oh Nice..... میں دراصل اس شہر میں کچھ نیا ہوں..... زیادہ تر وقت ابراڈ ہی گزرا ہے میرا..... اسی لئے کوئی کمپنی نہیں ہے فی الحال ساتھ میرے.....

زہرہ ٹالتی ہے۔

زہرہ: اچھا..... آئی سی.....

ملک: اگر آپ کو برا نہ لگے تو کیا میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں..... جہاں آپ چاہیں.....

زہرہ: نہیں..... میری گاڑی آ رہی ہے بس.....

ملک اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالتا ہے اور زہرہ کو دیتا ہے۔

ملک: یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے..... میں اس شہر میں کسی اچھے دوست کی تلاش میں ہوں..... آئی ہوپ ہم دوبارہ ملیں گے..... ویسے مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے..... ایک دوست نے ریفر Raffer کیا تھا..... میں دوبارہ آؤں گا یہاں.....

زہرہ لاتعلقی سے کہتی ہے۔

زہرہ: اچھی بات ہے.....

ملک ذرا بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

ملک: ویسے کیا تم بھی یہاں آتی جاتی رہتی ہو..... میرا مطلب دوبارہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی.....

زہرہ: ہو سکتا ہے یہیں ہو جائے.....

زہرہ کی گاڑی آ جاتی ہے..... زہرہ بیٹھنے لگتی ہے، ملک پیچھے سے کہتا ہے۔

ملک: ویسے میں بری کمپنی نہیں ہوں..... I m not a bad company

زہرہ جواب نہیں دیتی اور گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ ملک مسکرا کر سگار سلگاتا ہے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ زہرہ گاڑی میں بیٹھتے ہی ملک کا وزیٹنگ کارڈ پھاڑ کر پرزے کھڑکی سے باہر ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ ملک گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے یہ دیکھ لیتا ہے۔ زہرہ کی گاڑی چلی جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں/لاؤنج وغیرہ

موسیٰ اور عیسیٰ بات کر رہے ہیں۔ سکینہ کہیں سے چلتی ہوئی آتی ہے اور موسیٰ/عیسیٰ کو بات کرتے سن کر ٹوہ لینے کے لئے وہیں کسی اوٹ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگتی ہے۔

عیسیٰ: دو ڈھائی لاکھ..... نہیں بھائی..... اتنے پیسے تو نہیں ہیں کیش میرے پاس..... ویسے تم نے کیا کرنی ہے اتنی

رقم.....؟.....خیر تو ہے.....

موسیٰ: بس.....کہاناں.....ضرورت ہے.....تم ابا سے مانگ لو.....مگر میرا نام مت لینا.....

عیسیٰ: مانگ لوں گا.....، ویسے ابا نے کبھی تمہیں بھی پیسے دینے سے منع تو نہیں کیا.....، بلکہ مجھ سے شاید کچھ سوال جواب بھی کرلیں.....تمہیں تو آنکھیں بند کر کے دے دیتے ہیں.....جتنے بھی تم مانگو.....

موسیٰ چڑ کر کہتا ہے۔

موسیٰ: لمبی بحث مت کرو.....اور جا کر ابا سے پیسے لا کر مجھے دو.....

عیسیٰ: ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے.....مگر پوچھیں تو کیا کہوں.....

موسیٰ: کچھ بھی کہہ دینا.....شادی ہوئی ہے تمہاری ابھی.....لاکھ ضروریات ہوسکتی ہیں.....

سکینہ چونکتی ہے۔

عیسیٰ: ٹھیک ہے.....جاتا ہوں.....مگر بھائی تم نے بتایا نہیں.....پیسے کس لئے چاہئیں تمہیں.....کہیں پھر اس کی طرف تو نہیں جارہے.....دیکھو بھائی.....اگر ابا کو پتہ چلا تو بہت ناراض ہوں گے.....پہلے ہی اس رات.....

موسیٰ: میرا خیال ہے نصیحتوں کا کوٹہ اس گھر میں ابا کے پاس ہی رہنے دو تم.....تمہاری زبان سے کچھ عجیب سی لگتی ہیں.....اب جاؤ گے بھی یا یہیں کھڑے رہ کر میرا سر کھاتے رہو گے.....

عیسیٰ: جارہا ہوں بابا.....، ہمیشہ مجھے ہی بھوکے شیر کے آگے ڈال دیتے ہو.....خدا کسی کو کتا بنا دے.....چھوٹا بھائی نہ بنائے.....

عیسیٰ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا جاتا ہے۔

موسیٰ ویسا ہی پریشان سا کسی گہری سوچ میں گم کھڑا رہتا ہے۔ دوسری جانب سکینہ کسی نئی سازش کے تانے بانے بن رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: عیسیٰ باپ کے سامنے گھبرایا سا کھڑا ہے

قدرت غصے سے پوچھتا ہے۔

قدرت: یہ تمہیں اچانک ایسی کیا ضرورت پڑ گئی.....

عیسیٰ گڑبڑا سا جاتا ہے۔

عیسیٰ: وہ ابا.....شادی ہوئی ہے میری.....

قدرت: ہاں.....تو.....

عیسیٰ مزید سٹپٹا جاتا ہے۔

عیسیٰ: وہ.....میرا مطلب ہے.....، بس یہی بتانا تھا۔

قدرت غور سے بیٹے کو دیکھتا ہے۔

قدرت: بیوی کو کہیں لے جانا چاہتے ہو.....؟

عیسیٰ: جی.....وہ.....ہاں.....نہیں.....

قدرت: اچھا ٹھیک ہے.....میں منیجر کو بتا دوں گا.....لے لینا جتنے پیسے چاہئے ہوں.....

قدرت اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے، عیسیٰ سکون کا گہرا سانس لے کر جلدی سے وہاں سے کھسک جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

سکینہ اپنے کمرے میں کسی سوچ میں گم بیٹھی ہے، اسے موسیٰ اور عیسیٰ کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

Audio / Overlap

موسیٰ: ابا سے مانگ لو.....

عیسیٰ/آڈیو: دیکھو بھائی.....کہیں تم پھر.....ابا کو پتہ چلا تو.....

سکینہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہے اور اندر ہی اندر سوچتی ہے۔

سکینہ Audio اور لیپ: یہ موسیٰ کس کے لئے اتنے پیسے مانگ رہا تھا.....وہ بھی تایا جان سے چھپ کر..... یہ چکر کیا چل رہا ہے ان دونوں بھائیوں کے اندر ہی اندر.....ضرور کچھ دال میں کالا ہے.....مجھے کسی بھی حال میں اس راز کا پتہ لگانا ہی ہوگا.....

سکینہ بے چینی سے ٹہلتی رہتی ہے اور تانے بانے بنتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور۔

چھپر ہوٹل ٹائپ

موسیٰ اور نامراد پان والا آپس میں بات کر رہے ہیں۔

موسیٰ نامراد کے سامنے اخبار میں لپٹا پیسوں کا بنڈل رکھتا ہے۔

موسیٰ: یہ لو.....چار لاکھ سے کچھ اوپر ہی ہوں گے۔

نامراد کی آنکھیں اتنا پیسہ دیکھ کر پھیل جاتی ہیں.....

نامراد: اتنا پیسہ کہاں سے اٹھا لائے صوفی صاب.....؟ کیا گھر کی تجوری خالی کر آئے ہو.....

موسیٰ: نہیں.....میرے بھائی نے دیئے ہیں ابا سے چھپ کر.....تم زہرہ سے میری ملاقات کروا دو بس.....

نامراد: کوئی اور ہوتا تمہاری جگہ تو اتنا اس سے آدھی رقم میں بھی مان جاتی زہرہ کو بھیجنے کے لئے.....مگر تمہارا معاملہ کچھ اور ہے.....ایسے لوگ تم جیسے عاشقوں سے ڈرتے ہیں.....اور لڑکی خود بھی تم سے نہیں ملنا چاہتی.....اور تم کو شاید پتہ نہیں کہ عشق میں زبردستی نہیں چلتی پیارے.....

موسیٰ غور سے نامراد کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: عشق میں ہی تو زبردستی چلتی ہے.....جنون میں التجا نہیں ہوتی.....اور محبت میں بھیک نہیں مانگی جاتی.....

نامراد موسیٰ کی زبان سے یہ بات سن کر دنگ سا رہ جاتا ہے۔

نامراد: کبھی کبھی تو مجھے تم سے ڈر لگنے لگتا ہے.....کون ہے تیرے اندر جو یہ سب بولتا ہے.....نہ کیا کرا ایسی باتیں.....دل دھل جاتا ہے میرا.....

موسیٰ: یہ ساری باتیں اس سے ملنے کے بعد میرے اندر سے نکلنے لگی ہیں.....اسی لئے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں.....

نامراد اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

نامراد: پھر کیا ہوگا.....وہ ملاقات بھی ختم ہو جائے گی.....تم سمجھتے کیوں نہیں.....تم جتنی بار اس سے ملو گے.....اتنی ہی یہ پیاس بڑھے گی.....اور وہ اور زیادہ تمہارے دل اور دماغ پر طاری ہوتی جائے گی.....

موسیٰ: اس کا حل بھی ہے میرے پاس.....اگر تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو.....

نامراد: (چونک کر) کیسا حل.....

موسیٰ: تم زہرہ کو اس قید خانے سے نکال کر لے آؤ ایک بار میرے پاس.....میں اسی دن زہرہ سے نکاح کر لوں گا.....

نامراد گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

نامراد: کیا.....نکاح.....؟

موسیٰ: ہاں.....ایک بار نکاح ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُسے مجھ سے جدا نہیں کر پائے گی.....میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا.....

نامراد: تم ہوش میں تو ہو موسیٰ.....جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو.....کتنا بڑا طوفان آئے گا اس کے بعد.....اس کا تمہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہے.....

موسیٰ سختی سے کہتا ہے۔

موسیٰ: میں طوفانوں سے گھبرانے والا نہیں ہوں.....تم یہ بتاؤ کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں.....؟

نامراد گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے.....

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن۔

جگہ: ملک شہریار کا گھر

سوئمنگ پول ایریا.....مینیجر اور شہریار

شہریار گاؤن میں ملبوس بیٹھا اپنے مینیجر سے بات کر رہا ہے۔مینیجر سامنے مؤدب کھڑا ہے۔

شہریار: ہاں.....مگر دھیان رہے.....ساری معلومات بہت خفیہ طریقے سے لینی ہیں.....میں نہیں چاہتا اس لڑکی کا مکمل بائیو ڈیٹا ملنے تک یہ بات کہیں باہر لیک Leak ہو.....

جاوید/مینیجر: جی سر.....میں سمجھ گیا۔

شہریار: نام تو اس نے سونیا بتایا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ یہ نام غلط ہوگا.....تمہیں اس کی گاڑی کے نمبر سے ساری ڈیٹیلز نکلوانی ہوں گی.....جو نمبر میں نے تمہیں دیا ہے.....

جاوید: رائٹ سر.....میں جلد ہی آپ کو رپورٹ کرتا ہوں دوبارہ.....

شہریار سر ہلاتا ہے۔جاوید پلٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

موسیٰ اور نامراد میں بات چیت جاری ہے۔

نامراد: بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے پیارے.....اس کی انا دیکھنے میں بڑی سیدھی سادھی لگتی ہے.....مگر یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی پہنچ ہے اوپر والوں میں اس کی.....اس کے بعد وہ مجھے تباہ کرنے میں ذرا نہیں ہچکچائے گی.....میرا آخری ٹھکانہ

بھی اسی کے ہاتھوں برباد ہوگا شاید.....

موسیٰ اس کا شانہ تھپتھپاتا ہے۔

موسیٰ: اگر ایسی بات ہے تو میں یاروں کو امتحان میں نہیں ڈالوں گا.....تم دور رہو اس معاملے سے..... میں کوئی اور طریقہ نکالتا ہوں.....

موسیٰ جانے لگتا ہے، نامراد اُسے آواز دے کر پیچھے سے روکتا ہے۔

نامراد: ٹھہر جاؤ صوفی صاحب..... یار بھی کہتے ہو اور بیگانے بھی بنتے ہو..... میں جاؤں گا تمہارا پیغام لے کر اس کی انا کے پاس.....

موسیٰ: کیا وہ مان جائے گی.....؟

نامراد: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا.....مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اسے لے جاؤ گے کہاں.....

موسیٰ: اس کا انتظام میں کرلوں گا.....اور نکاح کے بعد میں اسے سیدھا اپنے گھر میں لے جاؤں گا.....اُسے در بدر بھٹکنے نہیں دوں گا.....

نامراد: واہ پیارے.....دُھن کے پکے ہو.....لاؤ یہ پیسے میرے حوالے کرو..... جاتے ہیں تمہاری پری کے گھر.....

نامراد پیسوں کی گڈی اُٹھالیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

جگہ زہرہ کا گھر۔ زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا میں بات چیت

زہرہ غصے میں تلملا رہی ہے۔

زہرہ: کیا.....وہ پان والا پھر آ گیا ہے اس کا پیغام لے کر.....آخر اسے ایک بات سمجھ کیوں نہیں آ جاتی.....کیوں برباد ہونا چاہتا ہے وہ میرے ہاتھوں.....

چندا: ہائے ہائے.....بے چارہ.....

زہرہ: میں بہت غصے میں ہوں چندا.....

چندا غور سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔

چندا: مگر تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے.....ہوتا ہے تو ہو جانے دو اُسے برباد.....تمہیں کیا پڑی ہے.....؟

زہرہ: بس.....میں نہیں چاہتی.....اگر وہ کوئی عام دل پھینک امیر زادہ یا عاشق ہوتا تو میری جوتی کو بھی نہ ہوتی پرواہ.....مگر میں اس کی بدنامی نہیں چاہتی.....جانے کس منحوس گھڑی میں آمنا سامنا ہوا تھا میرا اُس سے.....

چندا اُسے پھر چھیڑتی ہے۔

چندا: مطلب اتنا تو مانتی ہو تم بھی کہ وہ کوئی عام دل پھینک لوفر عاشق ٹائپ کی چیز نہیں ہے.....

زہرہ: ہاں.....مگر میں تمہارے دماغ کے فتور بھی اچھی طرح جانتی ہوں.....ایسی کوئی بات نہیں ہے.....بس مجھے اپنی زندگی میں سکون چاہئے.....یہ ہر وقت کی اُلجھن اور بے چینی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے.....

چندا دھیرے سے گنگناتی ہے۔

چندا: کبھی نہ سکون آیا.....

کبھی نہ قرار آیا.....

جب سے ہے تم پہ.....
مجھے پیار آیا.....
زہرہ گھور کر چندا کو دیکھتی ہے۔ چندا جلدی سے کمرے سے نکل جاتی ہے۔ زہرہ ویسے ہی بیٹھی پیچ وتاب کھاتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن
جگہ: انا کا گھر

انا اور نامراد میں بات چیت۔

انا: ارے او نامراد..... تو پھر یہ پیسے اٹھالایا..... کہا بھی تھا..... پھر اس چیرزادے کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی.....؟..... کیوں اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے وہ.....؟

نامراد: میری خاطر مان لو انا جی..... برسوں سے تعلق ہے میرا تمہاری کوٹھی سے..... اور پھر وہ بے چارہ بھلا اور چاہتا ہی کیا ہے..... صرف ایک ملاقات.....

انا بھڑک اٹھتی ہے۔

انا: مگر کیوں..... کیوں ملنا چاہتا ہے وہ پھر زہرہ سے..... ایک بار ملا تو دیا..... اب یہ بار بار کی فرمائش کیوں.....

نامراد: پوچھا تھا میں نے بھی اس سے یہ سوال..... مگر کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس..... یا پھر وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتا..... ابھی اس کا اندر خود تسلیم نہیں کر پایا..... غلط جواز ڈھونڈتا رہتا ہے اُسے بہلانے کے لئے..... مگر سچ کیا ہے..... یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو..... دل آ گیا ہے اس کا زہرہ پر.....

انا: دیکھ نامراد..... وہ کسی کٹر گھرانے کا لگتا ہے..... میں کسی نئی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی..... بڑی مشکل سے یہ چھت بنائی ہے میں نے ان سب کے لئے..... میں کسی کے دماغی فتور کے لئے اپنی سب لڑکیوں کو دربدر نہیں کرنا چاہتی..... جا کر کہہ دے اُسے.....

انا سختی سے کہتی ہے۔

نامراد: تم شاید بھول رہی ہو انا جی..... ایسے لوگوں کے دماغی فتوروں سے ہی تمہاری دوکان چل رہی ہے..... وہ چاہتا ہی کیا ہے..... صرف ایک ملاقات..... اور اُس کے لئے اتنی بڑی رقم دے رہا ہے، دل والا ہے..... ورنہ لوگ تو ہزار پانچ سو پر بھاؤ تاؤ کرتے رہتے ہیں.....

انا نامراد کی بات سن کر ذرا شش وپنج میں پڑ جاتی ہے۔

انا: ہاں..... کہتے تو تم ٹھیک ہو..... مگر پتہ نہیں کیوں..... ڈر لگتا ہے مجھے اس لڑکے کی دیوانگی سے.....

نامراد: ڈرنے کی کیا بات ہے..... میں خود جاؤں گا زہرہ کے ساتھ..... تم بس رقم پکڑو اور شکر ادا کرو کہ ابھی دنیا میں ایسے دیوانے باقی ہیں.....

انا ابھی تک کنفیوژن کا شکار ہے۔ مگر نامراد زبردستی اس کے ہاتھ پر نوٹوں کا بنڈل رکھ دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا موجود ہیں۔

زہرہ: کیا.....انا مان گئیں..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....

چندا: ہاں.....اور تم بھی اب تیار ہو جاؤ اپنے اس دیوانے سے ملنے کے لئے.....

زہرہ: میں کہیں نہیں جا رہی.....نہ ہی مجھے اُس سے ملنا ہے.....اور یہ انا کو اچانک کیا ہو گیا.....ابھی کل تک تو وہ خود مجھے اس سے دور رہنے کے مشورے دے رہی تھیں.....پھر اچانک یہ کایا پلٹ.....کیوں.....؟

چندا: یہ تو میں نہیں جانتی.....مگر انا کا حکم یہی ہے کہ تم تیار ہو جاؤ.....وہ تمہیں لینے کے لئے آ رہا ہے.....

زہرہ غصے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

زہرہ: مگر.....

چندا: اگر مگر کچھ نہیں.....اور پھر تم خود بھی تو اُس کے مزاج درست کرنا چاہتی تھیں.....تو اس سے اچھا موقع بھلا کب ملے گا.....آخری بار دل کر دل کی ساری بھڑاس نکال لو.....اس طرح کہ دوبارہ پھر کبھی تمہارا نام لینے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

زہرہ چندا کی بات سن کر سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن

جگہ: آؤٹ ڈور

موسیٰ اپنی جیپ لے کر آتا ہے۔

زہرہ اسی طرح باہر کھڑی ہے اور چہرہ حجاب میں چھپایا ہوا ہے۔ موسیٰ اس کے قریب جیپ لا کر کھڑی کرتا ہے۔ زہرہ چپ چاپ جیپ میں بیٹھ جاتی ہے۔ موسیٰ گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے۔

//Cut # 1//

جیپ سڑکوں سے ہوتی ہوئی کسی مضافاتی علاقے میں داخل ہو رہی ہے۔ دونوں کے درمیان خاموشی طاری ہے۔ زہرہ ایک آدھ بار موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے مگر موسیٰ کی توجہ سامنے سڑک پر ہی رہتی ہے۔ گاڑی آگے بڑھتی رہتی ہے۔

//Cut # 2//

جگہ: کوئی ویران گودام/
کوٹھی چار دیواری وغیرہ

موسیٰ کی جیپ گیٹ سے اندر ویران چار دیواری میں داخل ہوتی ہے۔ زہرہ حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔

موسیٰ گاڑی روکتا ہے۔

زہرہ: یہ تم مجھے کہاں لے کر آئے ہو.....کون سی جگہ ہے یہ.....

موسیٰ: نیچے اُترو.....سب بتاتا ہوں.....

زہرہ پھر پوچھتی ہے۔

زہرہ: مگر.....یہ سب کیا ہے موسیٰ.....؟

موسیٰ: اندر آ جاؤ.....مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔

زہرہ گاڑی سے اُتر جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 26

وقت: دن

جگہ: نامراد کا کیبن/ دوکان

نامرادا پنے سیل فون سے بار بار کوئی نمبر ڈائل کر رہا ہے مگر دوسری طرف سے نمبر بند آ رہا ہے۔

کمپیوٹرڈائس Computer Voice

آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے..... براہِ مہربانی.....

نامراد پریشانی سے بڑبڑاتا ہے۔

نامراد: صوفی صاب.....فون کیوں بند کر دیا.....زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس.....کوئی خیر خبر تو دے جاتے.....یا اللہ.....مدد کرنا اس دیوانے کی.....

نامراد دوبارہ فون ملانے کی کوشش کرتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 27

وقت: دن

جگہ: ویران کوٹھی/ گودام

موسیٰ زہرہ کو ساتھ لئے کسی کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں عیسیٰ اپنے کسی دوست اور ایک قاضی کے ساتھ موجود ہے۔

زہرہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔عیسیٰ کا چہرہ بھائی کو دیکھ کر کھل جاتا ہے اور وہ غور سے زہرہ کو دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: یہ لیں قاضی صاب.....آ گئے موسیٰ بھائی.....

قاضی: یہی لڑکی ہے.....؟

زہرہ گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: یہ سب کون ہیں..... یہاں کیا ہو رہا ہے موسیٰ.....؟.....

موسیٰ زہرہ کو نظر انداز کرتے ہوئے قاضی سے کہتا ہے۔

موسیٰ: جی قاضی صاحب.....میں لڑکی کو لے آیا ہوں.....آپ کی شرط کے مطابق دو گواہ بھی موجود ہیں.....آپ بسم اللہ کریں.....ہم تیار ہیں۔

زہرہ چلاتی ہے۔

زہرہ: کیسی تیاری.....؟.....کیسی بسم اللہ.....

موسیٰ: میرے اور تمہارے نکاح کی تیاری۔

زہرہ کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔اور وہ گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 6

//Cut//

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: ویران کوٹھی/کمرہ

موسیٰ، عیسیٰ۔ دوست، قاضی اور زہرہ۔ موسیٰ قاضی کی طرف دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں کہتا ہے۔

عیسیٰ زہرہ کو نقاب میں ہی دیکھتا ہے۔ پورا چہرہ نہیں نظر آ رہا۔

موسیٰ: قاضی صاحب..... آپ شرع کے مطابق نکاح کی تیاری کریں.....

زہرہ غصے سے چلاتی ہے۔

زہرہ: تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو موسیٰ.....

موسیٰ: میں تمہیں اپنے گھر کی عزت بنا رہا ہوں..... عزت سے تمہیں نکاح کر کے اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں.....، کچھ غلط تو نہیں کر رہا.....

زہرہ غصے سے چلاتی ہے۔

زہرہ: مگر یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں بھی تم سے نکاح کرنا چاہتی ہوں..... اتنا آسان سمجھ رکھا ہے کیا.....؟..... نکاح کے لئے دونوں افراد کی رضامندی ضروری ہوتی ہے..... اور تم مجھے یہاں.....

موسیٰ زہرہ کی بات کاٹ دیتا ہے اور قاضی سے کہتا ہے۔

موسیٰ: قاضی صاحب..... آپ لوگ کچھ دیر کے لئے دوسرے کمرے میں بیٹھیں..... میں زہرہ سے بات کرنا چاہتا ہوں.....، نکاح آج ہی ہوگا.....

عیسیٰ موقعے کی نزاکت دیکھ کر جلدی سے قاضی اور اپنے دوست کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔

عیسیٰ: چلیں قاضی صاحب..... میں آپ کو اچھی سی چائے پلواتا ہوں تب تک.....

قاضی جاتے ہوئے ایک لمحے کے لئے موسیٰ کے قریب رُکتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔

قاضی: شرع میں نکاح کی قبولیت کے لئے لڑکی کا راضی ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے شاہ جی..... دھیان رکھیے گا.....

موسیٰ چپ رہتا ہے..... قاضی آگے بڑھ جاتا ہے۔ عیسیٰ بھائی کے قریب گزرتے ہوئے دھیرے سے اس کے کان میں کہتا ہے۔

عیسیٰ: بھابھی تو بڑی زبردست پٹی ہے بھائی..... مگر غصے میں تم سے بھی دو ہاتھ آگے لگتی ہے..... ذرا دھیان سے.....

موسیٰ عیسیٰ کو گھورتا ہے۔ عیسیٰ گھبرا کر جلدی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ زہرہ موسیٰ کی طرف غصے سے دیکھتی ہے۔

زہرہ: مجھے ابھی اور اسی وقت واپس گھر جانا ہے موسیٰ..... تم جانتے نہیں ہوا بھی میری امّا کو.....، میں اگر ٹھیک وقت پر گھر نہیں پہنچی تو طوفان آ جائے گا..... طوفان.....

موسیٰ غور سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔

موسیٰ: جس طوفان نے آنا تھا..... وہ کب کا آ چکا زہرہ.....، اور میں یہاں آنے سے پہلے اپنی ساری کشتیاں جلا کر آیا

ہوں.....اب میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا.....

زہرہ گھبرا کر موسیٰ کو دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: سہ پہر

جگہ: انا کا گھر

باہر بارش شروع ہو چکی ہے۔موسم خراب ہے،انا پریشان سی بیٹھی ہوئی ہے۔چندا کمرے میں آتی ہے۔

چندا: جی انا جی.....آپ نے بلایا تھا۔

باہر بادل گرجتے ہیں۔

انا: دن ڈھل رہا ہے.....وہ لڑکا ابھی تک زہرہ کو واپس چھوڑنے نہیں آیا.....اجازت تو صرف دو گھنٹے کے لئے دی تھی میں نے.....

چندا: آپ پریشان نہ ہوں.....آتی ہی ہوگی زہرہ.....ویسے وہ موسیٰ کے ساتھ جانے پر دل سے راضی نہیں تھی.....

چندا بھی کچھ پریشان سی ہے۔

انا: فون لگاؤ اُسے.....میرا دل گھبرا رہا ہے.....

چندا فون ملانے کی کوشش کرتی ہے مگر نمبر بند ملتا ہے۔

چندا: رابطہ نہیں ہو رہا اُس سے.....آپ اس نامراد سے پوچھیں ناں.....اسی نے تو گارنٹی دی تھی موسیٰ کی.....اُسے ضرور پتہ ہوگا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں.....

انا: بلوایا ہے میں نے اُس موئے کو بھی.....پتہ نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں اس کی باتوں میں آ گئی.....اب کبھی دوبارہ نہیں بھیجوں گی زہرہ کو ایسے کسی دیوانے کے ساتھ.....ایک بار خیر سے واپس آ جائے۔

اتنے میں نامراد کسی نوکرانی وغیرہ کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے اور انا کی بات سن لیتا ہے انا اُسے دیکھ کر غصے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

انا: کہاں ہے تمہارا دوست.....زہرہ کیوں واپس نہیں آئی اب تک.....

نامراد چند لمحے رُک کر کہتا ہے۔

نامراد: زہرہ اب واپس نہیں آئے گی انا جی.....آج موسیٰ کے ساتھ اُس کا نکاح ہے.....

انا کے سر پر بجلی سی گرتی ہے۔چندا کے ہاتھ میں پکڑی کوئی چیز چھپاکے سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: تیز بارش/بجلی کا چمکنا

زہرہ اور موسیٰ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔زہرہ شدید غصے میں تلملا رہی ہے۔

زہرہ: تو یہ ہے تمہاری حقیقت.....شکل سے تو بڑے معصوم اور دیندار نظر آنے کی کوشش کرتے ہو مگر تمہارا اندر بھی اتنا ہی بھیانک ہے.....اچھا ہے میں نے ایک بار پھر مرد کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی.....تم سب ایک جیسے ہوتے ہو.....کبھی انسان اور کبھی شیطان کا روپ بدل کر ڈاکہ ڈالنے والے.....تم بھی ایک ڈاکو ہو.....

موسیٰ اطمینان سے کھڑا زہرہ کی بات سنتا رہتا ہے۔

موسیٰ: میں نے ڈاکہ ڈالنا ہوتا تو تمہیں نکاح کی پیشکش نہ کرتا..... میں تمہیں اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں..... کھلے عام رشتہ بنانا چاہتا ہوں کیونکہ چھپ چھپ کر ملنا مجھے اپنی محبت کی توہین لگتی ہے.....

زہرہ طنز کرتی ہے۔

زہرہ: اوہ تو یہ محبت ہے؟ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں..... زبردستی یوں اُٹھالانے کو تم محبت کہتے ہو..... سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری بھی وہی غرض ہے جو سارے زمانے.....

موسیٰ غصے سے جلّا کر بات کاٹتا ہے۔

موسیٰ: زہرہ..... بار بار ایک ہی بات کیوں دہرا رہی ہو..... تمہیں ایک بار سمجھ نہیں آتی..... میں تمہیں اس ذلت کی دنیا سے باہر نکالنا چاہتا ہوں..... دنیا کی کوئی عورت ایسے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتی..... اور کون سی ایسی عورت ہوگی جو اپنا گھر بار اور عزت کی زندگی نہیں چاہتی ہوگی.....

زہرہ کو مزید غصہ آجاتا ہے۔

زہرہ: آ گیا نا پھر تمہارا وہی غرور سامنے..... وہی عزت دار ہونے کا بھرم..... دوسروں کو چھوٹا اور بے عزت سمجھنے کا گھمنڈ..... یہ میری زندگی ہے اور میں اسے کیسے اور کس کے ساتھ گزاروں گی اس کا فیصلہ بھی مجھے خود کرنا ہے..... تمہاری عزت کی بھیک نہیں چاہیے مجھے..... اور بھی کئی عزت دار پڑے ہیں یہاں.....

باہر تیز بارش کا شور ہے۔

موسیٰ: لیکن میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں..... مجھ میں کیا برائی ہے..... یا میری محبت میں کیا کمی ہے.....؟

زہرہ: محبت شرطوں پر نہیں کی جاتی موسیٰ صاحب..... محبت میں جو ہے، جہاں ہے کی بنیاد پر قبول کیا جاتا ہے..... یہ کیسی محبت ہے تمہاری جو مجھے بدل دینا چاہتی ہے تم میں ہمت ہوتی تو مجھے میری حقیقت کے ساتھ قبول کرتے سارے زمانے کے سامنے..... مگر تم یہ کبھی نہیں کر پاؤ گے..... کیونکہ جسے تم محبت کہتے ہو..... وہ دراصل تمہاری انا ہے..... اور مجھے تم جیسے سوکالڈ پارسا لوگوں سے شدید چڑ ہے..... نفرت کرتی ہوں میں ایسے منافقوں سے.....

موسیٰ منافق نام پر غصے اور دکھ سے ایک جھٹکے سے پلٹ کر زہرہ کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: تم نے مجھے منافق کہا..... کہاں دیکھی ہے تم نے میری منافقت..... بولو..... اتنا بڑا الزام کیوں دیا تم نے مجھے.....

زہرہ طعنہ دیتی ہے۔

زہرہ: یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے.....؟ زمانے سے چھپ کر زبردستی نکاح کا ڈھونگ رچانا..... جبکہ نکاح کے لئے دونوں فریقین کی رضامندی ضروری قرار دی گئی ہے..... تم تو مذہب میں بھی اپنا مطلب نکالتے ہو..... اگر تم میں ہمت ہے اور اور عشق کا دعویٰ بھی ہے تو اپنے بڑوں سے کہو کہ میرے گھر بارات لے کر آئیں..... تبھی میں تمہاری سچائی پر یقین کروں گی.....

موسیٰ تڑپ کر اُسے دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: شام۔ تیز بارش

ایک پولیس موبائل زہرہ کی گلی میں آ کر رُکتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: شام

جگہ: انا کا گھر۔ کمرہ یا صحن

باہر بارش ہو رہی ہے۔ انا غم اور غصے سے نڈھال ہے۔ چندا اُسے سنبھال رہی ہے۔ دو چار پولیس والے نامراد کو ہتھکڑیاں ڈالے گھسیٹ کر باہر لے جا رہے ہیں۔ انا جاتے جاتے ایک بار پھر نامراد سے پوچھتی ہے۔

انا: دیکھ نامراد..... میں پھر پوچھ رہی ہوں..... سچ سچ بتا دے وہ کہاں لے گیا ہے میری زہرہ کو..... شاید مجھے تیری حالت پر رحم آ جائے..... ورنہ تو جانتا نہیں ہے..... تیری چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیں گے یہ پولیس والے حوالات میں.....

نامراد مسکرا کر انا کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے چہرے پر کچھ نیل وغیرہ کے نشانات نظر آ رہے ہیں جیسے پولیس نے پہلے ہی اس کی کافی خاطر تواضع کر رکھی ہو۔

نامراد: شکر مناؤ انا جی..... تمہاری زہرہ کو سچا عاشق ملا ہے..... اس دنیا میں موسیٰ سے بڑا قدردان نہیں ملے گا تمہاری بیٹی کو.....، بہت عزت..... بڑا مان دے گا وہ زہرہ کو..... اور میں نے زہرہ کو موسیٰ کے ساتھ بھیج کر کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں کیا.....، اب جو سزا ملے قبول ہے.....

(یہ دوسرا SHO ہے)

(تیا) SHO نامراد کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتا ہے۔

SHO: چل بے شاعر..... تیری ساری مستی تو آج میں نکالتا ہوں..... سارا عشق ایک رات میں ہی نہ جھڑ گیا تو میرا نام بھی تھانے دار معشوق علی نہیں.....

نامراد معشوق علی کا نام سن کر ہنس پڑتا ہے۔

نامراد: واہ تھانے دار صاحب..... نام تو بڑا عاشقانہ رکھا ہے.....، مگر اندر سے پکے پولیس والے ہو.....، میری مانو تو میری طرح عشق نہ سہی..... تھوڑی سی ''معاونتِ عشق'' ہی کر لو میرے دوست کی خاطر..... قسم سے سیدھے جنت جاؤ گے.....

ایس۔ ایچ۔ او غصے سے چلّا کر پولیس والوں سے کہتا ہے۔

SHO: لے جاؤ اسے..... اور اتنی مرمت کرو کہ سارا عشق اور معاونتِ عشق بھول جائے صبح تک.....

پولیس والے کھینچ کر نامراد کو لے جاتے ہیں۔ SHO انا سے کہتا ہے۔

SHO: آپ فکر نہ کرو انا جی..... بہت اوپر سے فون آیا ہے مجھے آپ کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے..... ہم بہت جلد اس لڑکے کو ڈھونڈ نکالیں گے..... وہ کہیں بھی ہو ہم سے بھاگ نہیں سکتا.....

انا: وہ بہت جنونی بندہ ہے تھانے دار صاحب..... کہیں میری زہرہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے..... آپ جلدی کچھ کریں..... اس لڑکے کے گھر پر چھاپہ ماریں..... شاید وہاں سے کچھ خبر ملے.....

SHO: ہم کوئی کونا نہیں چھوڑیں گے..... آپ بے فکر ہو جائیں.....، لڑکے کا گھرانہ بھی بڑا اثر و رسوخ والا ہے..... مگر مجھے یقین ہے کہ وہ گھر نہیں گیا ہوگا..... لیکن ہم اس کا سر اڈھونڈ نکالیں گے..... چلتا ہوں..... جلد اچھی خبر دوں گا.....

SHO چلا جاتا ہے..... انا پریشان بیٹھی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: شام۔ بارش

جگہ: ویران کوٹھی

موسیٰ ٹوٹا ہوا ساز زہرہ کے سامنے کھڑا ہے۔

موسیٰ: مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری زندگی میں کوئی دوسرا نہیں ہے.....

زہرہ: ہاں.....مگر اس کا یہ مطلب کب سے ہو گیا کہ میں تمہیں یا کسی کو بھی قبول کر لوں گی..... مجھے تم سے محبت نہیں ہے موسیٰ..... نہ ہی میں تمہاری اس ضد اور جنون کو محبت مانتی ہوں.....محبت محبوب کو بدلنے کا نام نہیں ہے.....تم مجھے اپنی دنیا میں اس لئے لے جانا چاہتے ہو کیونکہ تم مجھے اور میری دنیا کو کم تر سمجھتے ہو.....اور مجھے یہ برتری کا سودا قبول نہیں ہے.....

موسیٰ دُکھ سے زہرہ کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: تو تمہیں یہ برتری اور کم تری کا سودا لگتا ہے.....میرا جنون دکھائی نہیں دے رہا تمہیں.....

زہرہ: ہاں.....یہ سودا ہی تو ہے.....ورنہ تم اپنی عزت اور اونچے خاندان کی سیڑھی سے اتر کر میری دنیا میں آنے اور پھر میرا دل جیتنے کی کوشش کرتے.....محبت میں ذات پات، اونچ نیچ، نیک نامی یا بدنامی کا ڈر نہیں ہوتا.....

موسیٰ: مگر تم بھی تو شرط رکھ رہی ہو.....اگر میں تم سے نیک نامی اور عزت دار زندگی کا سودا کرنا چاہتا ہوں تو بدلے میں تم مجھے بدنامی اور رسوائی کی آزمائش سے گزارنا چاہتی ہو.....سودا گر تو تم بھی ہو.....مجھ میں اور تم میں پھر فرق کیا ہے.....؟

زہرہ: فرق ہے.....میں سودا کر سکتی ہوں کیونکہ مجھے تم سے محبت کا دعویٰ نہیں ہے.....تمہاری طرح میں اونچے اونچے دعوے نہیں کر رہی.....ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں.....مجبور ہوں اور میری مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر تم کچھ بھی کر سکتے ہو.....مگر ایک بات یاد رکھنا.....میں تمہارے جنون کو تب مانوں گی جب تم ہر فیصلے کا اختیار میرے ہاتھ سونپ کر مجھ سے اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے حق میں کرواؤ گے.....بولو.....ہے اتنی ہمت تمہارے اندر موسیٰ.....

موسیٰ زہرہ کی باتوں سے نڈھال ہو چکا ہے۔ وہ تڑپ کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اندھیرا ڈھل چکا ہے.....باہر برستی بارش کا شور تیز ہو چکا ہے اور دور کہیں اندھیرے میں بجلی چمکتی ہے.....موسیٰ دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے جو رات کے آٹھ بجے کا وقت دکھا رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: مونتاج/رات/بارش

جگہ: کاشانۂ پیراں۔آؤٹر

موسیٰ کے گھر کے باہر پولیس کی چند نیلی بتیوں والی گاڑیاں کھڑی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات آٹھ بجے

جگہ: موسیٰ کا گھر/ڈرائنگ روم وغیرہ

(مردانہ حصہ) ایس۔ایچ۔او پیر قدرت کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ پیر قدرت غصے میں کھڑا ہو جاتا ہے اور چلا کر کہتا ہے۔

قدرت: آپ ہوش میں تو ہیں SHO صاحب.....جانتے ہیں آپ پیر قدرت اللہ کے گھر میں بیٹھ کر اسی خاندان پر الزام لگا رہے ہیں.....وہ بھی کسی بازاری عورت کی شکایت پر.....

SHO: میں معذرت چاہتا ہوں پیر صاحب.....مگر بات صرف اس عورت کی شکایت کی نہیں ہے.....بہت اوپر سے آرڈر آئے ہیں.....مگر پھر بھی میں نے ابھی تک ایف۔آئی۔آر درج نہیں کی ہے.....سوچا آپ کے پاس آؤں اور پہلے آپ کے بیٹے موسیٰ کا بیان لے لوں.....کیا وہ گھر میں ہے.....؟

اسی لمحے اندر والے دروازے پر سکینہ چہرہ چادر میں لپیٹے، چھپتے چھپاتے کسی پردے وغیرہ کی آڑ میں کھڑی ہو جاتی ہے

اور چھپ کر اندر ہونے والی باتیں سننے لگتی ہے۔

قدرت: موسیٰ گھر پر نہیں ہے..... مگر میں اسے بلوا لیتا ہوں..... دونوں بھائی مجھے بتا کر ہی صبح کسی کام سے گھر سے باہر نکلے تھے.....

قدرت اپنی جیب سے فون نکالتا ہے اور کوئی نمبر ڈائل کرتا ہے مگر دوسری طرف سے نمبر بند ملتا ہے۔ قدرت دوسری اور تیسری بار ٹرائی کرتا ہے مگر کامیابی نہیں ملتی۔ وہ پریشانی سے SHO کی طرف دیکھتا ہے۔

SHO: میں صبح تک پرچہ روک سکتا ہوں پیر صاحب، مگر روشنی ہونے سے پہلے موسیٰ خود اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچا دے تو بہتر ہے..... ورنہ بات میرے ہاتھ سے بھی نکل جائے گی..... اور کل تک سارا میڈیا چلا چلا کر اس بات کا اعلان کر رہا ہوگا کہ کاشانہ پیراں کا وارث اور سپوت موسیٰ کسی لڑکی کے اغواء میں ملوث ہے..... میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسے خود تلاش کریں اور جتنی جلدی ممکن ہو معاملے کو ختم کریں..... مجھے آپ کی کال کا انتظار رہے گا.....

باہر کھڑی سکینہ یہ سن کر اپنی خوشی کے تاثرات چھپا نہیں پاتی۔

SHO اُٹھ کر جانے لگتا ہے، پیر قدرت اُسے آواز دے کر روکتا ہے۔

قدرت: سنیں SHO صاحب.....

SHO رُکتا ہے۔

قدرت: اگر تلاشی کے دوران موسیٰ اور وہ لڑکی آپ کے سامنے آجائیں تو آپ کے ہاتھ میری تعلق داری کی وجہ سے بہکنے نہ پائیں..... موسیٰ مزاحمت کرے تو گولی سینے کے پار ہو جانی چاہیے..... میں کوئی گلہ نہیں کروں گا آپ سے.....

SHO گڑبڑا کر حیرت سے قدرت اللہ کے اٹل فیصلے اور چہرے پر آئی سختی کو دیکھتا ہے اور پھر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

باہر تیز بارش کی آواز ابھی تک آ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات۔ بارش

جگہ: ویران کوٹھی

موسیٰ چپ چاپ کھڑا ہے۔ زہرہ ایک جانب خاموش بیٹھی ہوئی ہے۔ عیسیٰ پریشان سا کمرے میں آتا ہے۔

عیسیٰ: بہت دیر ہو گئی ہے بھائی..... قاضی صاحب اور گواہ بھی پریشان ہو رہے ہیں کہ نکاح کب ہوگا..... انہیں گھر واپس بھی جانا ہے..... رات ڈھل رہی ہے.....

زہرہ چونک کر اوپر دیکھتی ہے۔ موسیٰ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

موسیٰ: ہاں..... کیا کہا تم نے.....؟

عیسیٰ: بھائی میں پوچھ رہا ہوں کہ نکاح کب ہوگا..... بہت دیر ہو گئی ہے.....

موسیٰ: نکاح نہیں ہوگا عیسیٰ..... تم قاضی صاحب اور گواہوں کو واپس چھوڑ آؤ عزت سے.....

زہرہ حیرت زدہ ہے۔

عیسیٰ: کیا.....؟ نکاح نہیں ہوگا..... مگر بھائی.....؟

موسیٰ: میں نے کہا ناں..... واپس چھوڑ آؤ مہمانوں کو..... اور قاضی صاحب کو ان کی پوری ادائیگی کر دینا..... ان کا سارا دن آج ہماری وجہ سے برباد ہو گیا.....

عیسیٰ: یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی..... اگر آج یہ نکاح نہیں ہوا تو پھر شاید کبھی نہ ہو..... تم جانتے ہو کہ تم اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئے ہو یہاں..... اب یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے تمہارے پاس.....

موسیٰ: ہاں..... سب جانتا ہوں..... مگر کسی نے سوداگر ہونے کا طعنہ دیا ہے آج مجھے..... اور تم جانتے ہو کہ میں نے جذبوں میں سودا کرنا سیکھا نہیں.....

عیسیٰ: ایک بار پھر سوچ لو بھائی..... کہیں ایسا نہ ہو کہ.....

موسیٰ: نہیں..... فیصلہ ہو چکا..... تم وہ کرو جو میں تم سے کہہ رہا ہوں.....

موسیٰ زہرہ کی طرف پلٹتا ہے۔

موسیٰ: چلو..... میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں.....

زہرہ حیرت سے موسیٰ کو دیکھتی ہے۔

زہرہ: کیا تم واقعی مجھے چھوڑ رہے ہو.....

موسیٰ غصے اور اذیت سے کہتا ہے۔

موسیٰ: دیر مت کرو..... اس سے پہلے کہ میں واقعی وہ بن جاؤں جو تم مجھے سمجھتی ہو یا میرا ارادہ کمزور پڑ جائے..... چلو میرے ساتھ.....

عیسیٰ حیرت اور دکھ سے بھائی کو دیکھ رہا ہے۔ زہرہ کھڑی ہو کر جھجکتے ہوئے موسیٰ کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: مونتاج۔ رات

جگہ: سڑک/ پاسنگ

بارش ہو رہی ہے

موسیٰ زہرہ کو اپنی جیپ میں بٹھائے تیزی سے اس کے گھر کی طرف رواں ہے، موسیٰ اور زہرہ دونوں خاموش اور کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ زہرہ ایک آدھ بار موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے مگر موسیٰ اپنے ہی کسی دھیان میں گم ہے۔ گاڑی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا گھر/ آؤٹر

تیز بارش میں موسیٰ کی جیپ زہرہ کی گلی میں داخل ہوتی ہے اور زہرہ کے گھر کے باہر آ کر رُکتی ہے۔ زہرہ گاڑی سے اُتر جاتی ہے اور موسیٰ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی ہے مگر موسیٰ بنا کچھ کہے گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے۔ زہرہ اسے جاتا دیکھتی رہتی ہے اور پھر اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: رات

جگہ: انا کا کمرہ

انا پریشان سی بیٹھی ہے، اتنے میں باہر سے چندا خوشی میں ہڑبڑائی بھاگتی ہوئی اندر آتی ہے۔

چندا: انا جی.....زہرہ آ گئی ہے۔

انا ہڑبڑا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اسی وقت زہرہ بھیگی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے۔ انا اُسے دیکھ کر اُس کی جانب لپکتی ہے۔

انا: میری بچی.....

زہرہ بھی بھاگ کر انا کے گلے لگ جاتی ہے اور دونوں رو پڑتی ہیں۔

انا: تم ٹھیک تو ہو ناں.....فکر نہ کرو.....دیکھ لوں گی میں ان سب کو.....بس کرو.....چپ ہو جاؤ.....ابھی تمہاری انا زندہ ہے.....میرے ہوتے ہوئے کوئی تم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.....

انا اور چندا بھی زہرہ کے ساتھ رو رہی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا گھر

بارش رُک چکی ہے۔ موسیٰ کی گاڑی گھر کے پورچ میں آ کر رُکتی ہے اور موسیٰ جیپ سے اُترتا ہے۔ عیسیٰ جو پہلے ہی پریشانی میں وہاں ٹہل رہا ہے تیزی سے بھائی کی طرف لپکتا ہے۔

عیسیٰ: بڑی دیر کر دی.....میں تو گھبرا گیا تھا کہ کہیں زہرہ کے گھر والوں نے پولیس نہ بلوا رکھی ہو.....

موسیٰ: نہیں.....مگر بلوا رکھی ہوتی تو بھی کیا فرق پڑ جاتا.....میں پہلے ہی کب آزاد تھا.....

موسیٰ آگے بڑھنے لگتا ہے۔ عیسیٰ جلدی سے اُسے روکتا ہے۔

عیسیٰ: تم فی الحال یہاں سے چلے جاؤ بھائی.....ابا بہت شدید غصے میں ہیں.....انہیں سب پتہ چل چکا ہے.....وہاں تو نہیں مگر یہاں پولیس آ چکی ہے دو بار.....تم فی الحال کہیں روپوش ہو جاؤ.....ابا کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو میں خود تمہیں بلا دوں گا.....

موسیٰ: آج نہیں تو کل.....کل نہیں تو پرسوں.....یہ مقام تو آنا ہی ہے ہماری زندگی میں.....تو پھر روپوش ہونے سے کیا فائدہ.....اچھا ہے یہ فیصلہ بھی آج ہی ہو جائے.....چلو اندر.....

عیسیٰ: مگر بھائی.....میری بات تو سنو۔

مگر موسیٰ بھائی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ عیسیٰ پریشانی میں بھائی کے پیچھے لپکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا گھر/لاؤنج

موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں پہلے سے ہی غصے میں بپھرا ہوا پیر قدرت اللہ، اس کی بیوی، سکینہ اور سکینہ کی ماں

موجود ہیں۔موسیٰ کو اندر آتے دیکھ کر سب چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہیں۔قدرت غصے میں طنز سے پھنکارتا ہے۔

قدرت: لو آ گیا تمہارا ہونہار بیٹا.....آؤ بیٹا آؤ.....تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا میں.....جاؤ ہاجرہ.....جا کر وہ پھولوں کے ہار لے کر آؤ جو میں نے اس کے گلے میں ڈالنے کے لئے منگوا رکھے ہیں.....آخر اتنا بڑا چاند چڑھا کر گھر واپس لوٹا ہے تمہارا یہ ناخلف بیٹا.....

سکینہ طنز سے مسکراتی ہے۔خوفزدہ ہاجرہ شوہر کا غصہ کم کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔

ہاجرہ: میں کہتی ہوں اس وقت جانے دیں.....رات بہت ہوگئی ہے.....صبح آرام سے بات کریں گے.....جاؤ موسیٰ تم جا کر.....

قدرت اللہ غصے میں زور سے چلاتا ہے۔

قدرت: بات ابھی ہوگی اور یہیں سب کے سامنے ہوگی.....کہاں سے آ رہے ہو تم اس وقت.....

موسیٰ سر جھکا کر جواب دیتا ہے۔

موسیٰ: ایک ضروری کام تھا.....وہی پورا کرنے گیا تھا۔

قدرت شدید غصے میں طنز کرتا ہے۔

قدرت: ماشاءاللہ.....ماشاءاللہ.....جان سکتا ہوں کیا ضروری کام تھا.....وہی.....جس کی وجہ سے شہر کی پولیس تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے.....تمہاری وجہ سے پہلی بار اس گھر کی دہلیز پار کی ہے وردی والوں نے.....ڈوب مرو شرم سے.....میں یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ ہی کیوں رہا.....

پیرنی پھر بات سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے۔

ہاجرہ: جوان اولاد ہے.....ہوگئی غلطی.....میں آپ کو یقین دلاتی ہوں یہ پھر ایسی غلطی نہیں کرے گا.....چلو موسیٰ.....معافی مانگو اپنے ابا سے.....

پیر قدرت زور سے دھاڑتا ہے، بیوی گھبرا کر خاموش ہو جاتی ہے۔

قدرت: پیر قدرت اللہ کا بیٹا ایک طوائف زادی سے عشق کر بیٹھا ہے.....لعنت ہے ایسے بیٹے کے جنم پر جس نے اپنے خاندان کی صدیوں پرانی ناموس پر بٹہ لگا کر کالک مل دی ہم سب کے چہروں پر.....سارا زمانہ ہنس رہا ہے میری تربیت پر اور تھوتھو کر رہا ہے تمہاری اس ناخلف اولاد پر.....میں پوچھتا ہوں کہاں ہے وہ لڑکی.....

موسیٰ: وہ اپنے گھر پر ہے.....

قدرت اللہ طنز کے تیر چلا رہا ہے۔

قدرت: بہت خوب.....تو تم یہاں کیا کر رہے ہو.....رات اس کے ٹھکانے پر نہیں گزارو گے.....ابھی تو صبح ہونے میں بہت وقت پڑا ہے.....تم اتنی جلدی گھر کیسے لوٹ آئے.....

ہاجرہ: میں کہہ رہی ہوں کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ان لوگوں کو.....آپ پتہ کروالیں.....

قدرت: مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی.....اس سے کہو کہ اپنے ناپاک قدم میرے گھر کے اندر نہ دھرے.....پولیس اس کی تلاش میں ہے.....عیسیٰ.....جاؤ اسے لے جا کر اسی تھانیدار کے حوالے کر دو جو اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آیا تھا.....اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دینا کہ اب اس کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے.....مگر سزا پھانسی سے کم ہوئی تو میں اسے سزا نہیں سمجھوں گا.....

ماں پریشانی سے آگے بڑھتی ہے۔

ہاجرہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی..... بیٹا ہے یہ ہمارا.....اور کہہ تو رہا ہے کہ وہ لڑکی اپنے گھر پہنچ گئی ہے پھر بھی آپ نے یہ عدالت لگالی.....

اتنے میں سکینہ بول پڑتی ہے۔

سکینہ: عدالت تو اس روز بھی لگی تھی تائی جان جب میں کسی غیر خاندان میں بیاہ کرنا چاہتی تھی.....تب یہیں اسی گھر میں مجھے سنگسار کرنے کی سزا سنائی گئی تھی.....میں تو پھر بھی ایک شریف النسل خاندان کے لڑکے کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتی تھی مگر آپ کے بیٹے نے تو بدنامی کی ساری حدیں ہی پار کرلیں.....

خدیجہ بیٹی کو روکنے کی کوشش کرتی ہے۔

خدیجہ: تم چپ رہو سکینہ..... یہ بڑوں کی باتیں ہیں۔

سکینہ: میں چپ نہیں رہوں گی اماں.....آج میں تایا جان کا انصاف دیکھنا چاہتی ہوں.....میری خطا اگر بڑی تھی تو موسیٰ بھائی کا جرم تو مجھ سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہے.....کیا تایا جان آج موسیٰ بھائی کو سزا نہیں دیں گے.....کیا ان کا انصاف صرف اس لئے چپ رہے گا کیونکہ میں ایک یتیم بے سہارا لڑکی تھی اور آج ان کے سامنے ان کا اپنا بیٹا.....اپنا وارث کھڑا ہے.....

پیر قدرت سکینہ کے طنز اور طعنے سن کر تلملا رہا ہے۔ سکینہ طاق طاق کر وار کر رہی ہے۔

خدیجہ ہاتھ جوڑتی ہے۔

خدیجہ: خدا کے لئے چپ کر جاؤ.....میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے سامنے.....

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا گھر

اقا، زہرہ اور چندا کمرے میں موجود ہیں۔

چندا حیرت زدہ ہے۔

چندا: کیا.....؟.....وہ تمہیں خود یہاں چھوڑ کر گیا ہے.....مگر اقا جی نے تو اس کے خلاف اغواء اور جبس بے جا کا پرچہ کٹوا دیا ہے.....پولیس اس کے دوست نامراد کو بھی پکڑ کر لے گئی ہے.....اب تک تو انہوں نے مار مار کر اُس نامراد کا برا حال کر دیا ہوگا.....اور تم کہہ رہی ہو کہ.....

زہرہ چندا کی بات کاٹ دیتی ہے۔

زہرہ: ہاں.....میں ٹھیک کہہ رہی ہوں.....اس نے مجھے واپس گھر پہنچا دیا.....سو بات ختم ہوگئی.....اب کسی پرچے کی ضرورت نہیں ہے.....

اقا غصے میں ہے۔

اقا: ضرورت کیوں نہیں ہے.....وہ لڑکا پورا دیوانہ ہے.....آج تمہیں چھوڑ گیا ہے.....کیا پتہ کل پھر اُس کا دماغ پھر جائے اور تمہیں اُٹھا لے جائے..... پکی ضمانت لئے بغیر تو میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔

زہرہ: تو پھر آپ مجھ سے ضمانت لے لیں.....وہ اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا دوبارہ.....وہ مجھ سے نکاح کرنا چاہتا تھا.....

مگر میں نے اُسے منع کر دیا ہے کہ میں اپنے گھر سے رخصت ہوئے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی..... اس لئے اگر اسے نکاح کرنا ہے تو سیدوں کی بارات میرے گھر آئے گی..... اور ہم سب جانتے ہیں یہ انہونی اس دنیا میں ناممکن ہی رہے گی.....

انا بارات کی بات اور نکاح کا سن کر تڑپ کر زہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ اپنی بات ختم کر کے وہاں سے چلی جاتی ہے۔ چندا اور انا گم سم بیٹھی رہتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

موسیٰ سب کے درمیان مجرم کھڑا ہے۔ سکینہ اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی ہے۔

سکینہ: بولیں تایا جان..... سیدوں کی لڑکی خطا کرے تو سزا فٹ سے سنائی جاتی ہے اور کوئی لڑکا اپنی حدیں پار کرے تو کیا بخش دیا جائے گا.....

قدرت اللہ غصے سے چلاتا ہے۔

قدرت اللہ: نہیں..... ہرگز نہیں..... سزا ضرور ملے گی..... میرے اصول اٹل ہیں اور میرا قانون سب کے لئے برابر ہے..... میں اسی وقت موسیٰ کو اپنے پرکھوں کی گدی اور جان نشینی کے مذہب سے عاق کرتا ہوں..... آج کے بعد موسیٰ نہیں..... عیسیٰ سیدوں کے خاندان کا جان نشین اور اصل وارث ہوگا..... اور میری نسل بھی اب عیسیٰ کے ذریعے ہی آگے بڑھے گی..... موسیٰ کا اس مذہب، جائیداد اور وراثت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا.....

سکینہ اپنا تیر نشانے پر لگتے دیکھ خوش ہوتی ہے۔

ہاجرہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... ایسا ظلم نہ کریں..... موسیٰ آپ کا بڑا بیٹا ہے.....

قدرت: فیصلہ ہو چکا..... اب مزید کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے.....

سکینہ: لیکن میرے نزدیک ابھی انصاف پورا نہیں ہوا تایا جان..... موسیٰ بھائی نے سارے خاندان کے منہ پر جو طمانچہ مارا ہے..... اس کا حساب کون دے گا.....؟ ابھی.....؟ یہیں.....؟ اسی وقت.....؟

قدرت: اس کا حساب بھی ابھی ہو جائے گا..... عیسیٰ آگے بڑھو اور موسیٰ کے چہرے پر وہی زوردار طمانچہ لوٹا دو جو اس نے اپنے خاندان کی عزت پر رسید کیا ہے..... چلو..... آگے بڑھو۔

عیسیٰ بھائی کو تھپڑ مارنے کی بات پر گھبرا جاتا ہے۔

عیسیٰ: لیکن..... ابا جان..... میں..... میں یہ نہیں کر سکتا..... میں اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا.....

قدرت چلاتا ہے۔

قدرت: آگے بڑھو عیسیٰ..... یہ میرا حکم ہے.....

عیسیٰ سر جھکا دیتا ہے۔

عیسیٰ: آپ چاہیں تو مجھے سزا سنا دیں..... مگر میں.....

سکینہ جلدی سے بول پڑتی ہے۔

سکینہ: میرے جرم کی سزا بھائی نے دی تھی تایا جان..... اب انہیں سزا دینے کا حق میرا ہے.....

خدیجہ بیٹی پر چلاتی ہے۔

خدیجہ: سکینہ.....بکواس مت کرو.....

قدرت: ٹھیک ہے.....تمہیں اجازت ہے.....

سارے ماحول پر سناٹا چھا جاتا ہے۔سکینہ کے اندر جلتی انتقام کی آگ اس کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی موسیٰ کی طرف بڑھتی ہے۔ہاجرہ اور خدیجہ کے چہرے زرد پڑ چکے ہیں۔عیسیٰ غصے اور نفرت سے سکینہ پر نظر ڈال کر اُسے اُس عمل سے روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر سکینہ سب کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتی رہتی ہے اور موسیٰ کے قریب پہنچ کر چند لمحے اُسے دیکھتی رہتی ہے اور پھر دھیرے سے کہتی ہے۔

سکینہ: آج میں وہ تھپڑ آپ کو لوٹا رہی ہوں بھائی جو آپ نے کبھی میری روح پر چانٹے کی صورت مارا تھا.....درد کو محسوس کیجئے گا.....

موسیٰ چپ چاپ کھڑا رہتا ہے اور پھر دفعتہً سکینہ کا ہاتھ گھومتا ہے اور ایک زوردار چانٹا موسیٰ کے چہرے پر پڑتا ہے۔ماحول چانٹے کی آواز سے گونج اُٹھتا ہے۔ماں (ہاجرہ) کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔خدیجہ اذیت سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔عیسیٰ غصے اور نفرت سے بمشکل خود کو کنٹرول کرتا ہے۔قدرت بیٹے سے کہتا ہے۔

قدرت: اگر تم میں ذرا سی بھی شرم اور حیا باقی ہوئی.....تو یہ چانٹا تم عمر بھر یاد رکھو گے.....

قدرت غصے میں وہاں سے چلا جاتا ہے۔

سکینہ باقی سب کو فخریہ انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھتی کمرے سے نکل جاتی ہے۔خدیجہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: صبح ہو رہی ہے/دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: حوالات

نامراد اپنے گھٹنوں میں سر دیئے حوالات میں نڈھال سا بیٹھا ہے۔اس کی حالت بتا رہی ہے کہ پولیس نے رات بھر اسے خوب مارا پیٹا ہے۔نامراد سر اُٹھاتا ہے اور غالب کا شعر پڑھتا ہے (کراہتے ہوئے)

نامراد:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟
شب غم بُری بلا ہے.....
مجھے کیا بُرا تھا مرنا.....
اگر ایک بار ہوتا.....

اتنے میں کوئی سنتری حوالات کی سلاخوں کے قریب آتا ہے۔

سنتری: چل بھئی.....نامراد.....تیری ضمانت ہو گئی ہے.....اب تو آزاد ہے.....

نامراد حیرت اور خوشی سے سنتری کی طرف دیکھتا ہے۔

نامراد: جیو سنتری بادشاہ.....میں تو سمجھا تھا کہ اب مر کر ہی چھوٹوں گا یہاں سے.....

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

SHO قدرت اللہ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

SHO: آپ کے بیٹے نے بڑی عقل مندی کی شاہ صاحب کہ خود ہی لڑکی کو اُس کے ٹھکانے پر چھوڑ آیا..... ضرور آپ نے ہی اُس پر یہ دباؤ ڈالا ہوگا ورنہ بات بہت بڑھ جاتی.....

قدرت غصے اور نفرت سے کہتا ہے۔

قدرت: میرا اَب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تھانے دار صاحب..... آپ چاہیں تو اُسے گرفتار کر کے لے جا سکتے ہیں..... میں اُسے بلواتا ہوں۔

SHO: نہیں شاہ صاحب..... اب اس کی ضرورت نہیں ہے..... لڑکی والوں نے کیس واپس لے لیا ہے..... موسیٰ کے دوست کی بھی ضمانت ہوگئی ہے۔

(حیرت زدہ) قدرت: کیا.....؟ اُنہوں نے کیس واپس لے لیا..... مگر کیسے.....؟

SHO: ان لوگوں کو اپنی لڑکی کی واپسی سے غرض تھی شاہ جی..... باقی رہی لڑکی کی دیر سویر پر یا رات بھر غائب رہنا، تو یہ سب ایسے لوگوں کے لئے معمول کی بات ہوتی ہے..... لڑکی خیریت سے گھر پہنچ گئی ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے..... (لڑکی کے بارے میں قدرت کے چہرے پر نفرت کے آثار) شاید اسی لئے وہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہتے..... ہاں البتہ بھاری ضمانت نامہ جمع کروانا ہوگا موسیٰ کو کہ وہ دوبارہ انہیں پریشان نہیں کرے گا..... ایسے لوگوں کی پہنچ بہت اوپر تک ہوتی ہے شاہ صاحب..... شکر کریں کہ آپ کے بیٹے کی بہت سستے میں خلاصی ہوگئی..... میں بس یہی خبر دینے آیا تھا آپ کو.....

قدرت ایس۔ ایچ۔ او کی بات سن کر جواب نہیں دیتا اور غصے میں بیٹھا کچھ سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

سوئمنگ پول ایریا..... گاؤن میں ملبوس ملک شہریار کسی دوست/تو قیر جاوید سے فون پر بات کر رہا ہے اور ہنس کر کہتا ہے۔

شہریار: ہاں..... ٹھیک کہہ رہے ہو تم یار تو قیر..... صرف بزنس ہی کا رشتہ نہیں ہے ہمارا..... مگر سچ پوچھیں تو نیویارک کی تیز رفتار اور رنگین شاموں کے بعد اب یہاں کی یہ ڈل Dull اور لیزی شامیں بہت بھاری گزر رہی ہیں مجھ پر.....

تو قیر جاوید بھی ہنستا ہے۔

تو قیر جاوید: اسی لئے تو کہا تھا کہ بھابھی کو بھی ساتھ یہیں لے آتے..... کچھ تو تنہائی کا احساس کم ہو جاتا..... کب تک گاؤں کی جاگیر میں بیٹھی رہیں گی۔

شہریار: نہیں..... لیکن یہاں بالکل ایڈجسٹ نہیں کر پاتی..... یہاں کا ویدر Weather اسے سوٹ Suit نہیں کرتا ذرہ بھی.....

جاوید پھر ہنستا ہے اور معنی خیز لہجے میں کہتا ہے۔

تو قیر جاوید: بس یہی بات ہے ملک صاحب یا پھر کوئی دوسری اینگلز کھیلنے کا پلان ہے اس مرتبہ۔

ملک بھی ہنستا ہے۔

شہریار ملک: ناٹ اے بیڈ آئیڈیا Not a bad idea..... مگر اب یہاں وہ کلاس رہی نہیں..... چند دن کے ساتھ کے لئے تو بہت پڑی ہیں..... مگر لانگ ٹائم ریلیشنز Long time relation کے لئے سوچنا پڑے گا..... ویسے اُس رات ڈانس پارٹی میں دیکھا ایک چہرہ ذہن سے چپک سا گیا ہے..... ذرا پتہ کرواؤ..... کون ہے.....؟ کہاں کی ہے..... میرا اسٹاف تو نکما ہے..... ان سے کچھ نہیں ہونے والا.....

تو قیر جاوید: جو حکم ملک صاحب..... میں Details نکلوا لیتا ہوں پارٹی کی..... ویسے اگر آپ کی Choice ہے تو پھر ضرور کچھ خاص ہی بات ہوگی..... ورنہ آپ کی نظر ایسے ویسوں پر ٹکتی ہی کب ہے بھلا.....

ملک کسی گہری سوچ میں کہتا ہے۔

ملک: ہاں..... کچھ خاص تو ہے اس میں..... ، ..... جسے جاننے کو دل کرتا ہے..... میں انتظار کروں گا آپ کی کال کا..... میری اس سے جلد ملاقات بہت ضروری ہوگئی ہے اب۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/عیسیٰ کا کمرہ

عیسیٰ اور سکینہ میں جھڑپ ہو رہی ہے۔

سکینہ: (سکینہ عیاری سے کہتی ہے) تم مجھ پر کیوں بگڑ رہے ہو..... یہی بات جا کر تم تایا جان سے کیوں نہیں کہتے..... سزا تو اُنہوں نے سنائی تھی..... میں نے تو صرف اس پر عمل کیا ہے..... ، اب میں بھی انکار کر دیتی تو کیا یہ اپنے بڑوں کی حکم عدولی نہ ہوتی..... پھر تم ہی مجھ سے گلہ کرتے کہ میں نے تمہارے ابا جان کی بات نہیں رکھی.....

عیسیٰ تلملاتا ہے۔

عیسیٰ: اچھی طرح جانتا ہوں میں کہ تم کتنی فرمانبردار اور تابعدار ہو ابا جان کی..... تمہارے دل میں پہلے دن سے موسیٰ بھائی کے خلاف بغض اور کینہ بھرا ہوا ہے..... اور کل رات تم نے اس بغض اور اپنے چھوٹے پن کا اظہار کیا ہے ہم سب کے سامنے..... کاش بھائی پر ہاتھ اُٹھانے سے پہلے تمہارے ہاتھ ہی ٹوٹ جاتے.....

سکینہ: (سکینہ کمینگی سے مسکراتی ہے) خواہش تو اچھی ہے تمہاری..... مگر وہ کیا ہے ناں کہ قدرت ہماری خواہشات پر اپنے فیصلے صادر نہیں کرتی..... ایسا ہوتا تو آج میں تمہاری بیوی بن کر اس قید خانے میں نہ بیٹھی ہوتی..... ،.....

عیسیٰ نفرت اور غصے سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: شدید نفرت ہو رہی ہے مجھے اس وقت تمہارے اس بظاہر معصوم نظر آنے والے چہرے سے..... اور انتہائی افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں دل سے چاہا.....

سکینہ ہنس پڑتی ہے۔

سکینہ: اب بھی زیادہ وقت نہیں گزرا..... تم چاہو تو اپنی غلطی سدھار بھی سکتے ہو..... ویسے وہ ایک بہت اچھا محاورہ ہے ناں..... کہ خدا نے ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ پیدا کر رکھا ہے..... اسے اُلٹ کر لو تو تم یوں سمجھو کہ تمہارے موسیٰ بھائی کے لئے مجھے قدرت نے فرعون بنا کر بھیجا ہے..... ، ..... جس شخص نے میری زندگی برباد کی ہے..... میں اُسے کبھی ہنستے نہیں دوں

گی..... چاہے میرا انجام کچھ بھی ہو.....

عیسیٰ غصے میں اُٹھ کر جانے لگتا ہے۔ اور پھر ایک لمحے کے لئے رُکتا ہے۔

عیسیٰ: میں جانتا ہوں تم موسیٰ بھائی سے انتقام لے رہی ہو..... لیکن شاید تم یہ بات نہیں جانتیں کہ جس شخص کے گال پر تم نے رات تھپڑ مارا تھا..... وہ موسیٰ نہیں..... کوئی اور تھا.....، جس موسیٰ کو میں اور تم جانتے تھے..... وہ تو کب کا فنا ہو چکا..... اور اب یہ جو ہمارے درمیان موجود ہے..... یہ کوئی دوسرا انسان ہے..... ایک ایسا انسان کہ اگر تم پہچان لیتیں تو شاید وہی تھپڑ خود اپنے منہ پر مارتیں..... لیکن مجھے یقین ہے..... ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ یہی چانٹا پلٹ کر تمہاری روح پر پڑے گا..... اور میں اس دن کا انتظار کروں گا.....

عیسیٰ غصے میں کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

ہاجرہ/قدرت کا کمرہ

خدیجہ بھی کمرے میں موجود ہے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔

قدرت: خدیجہ..... تم مجھے مجبور کرنے کی کوشش مت کرو..... تم جانتی ہو میں نے تمہیں کبھی اپنی بھابھی یا مرحوم بھائی کی بیوہ نہیں سمجھا..... ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن ہی سمجھا اور جانا ہے.....، لیکن میں اُس نانجار کی یہ خطا معاف نہیں کر سکتا..... یہ ہمارے اونچے اور عزت دار خاندان کی ناموس کا معاملہ ہے..... میں اب اس گھر میں اُس کا وجود برداشت نہیں کر سکتا.....

خدیجہ: میں نے آج تک اپنے لئے آپ سے کچھ نہیں مانگا بڑے شاہ صاحب..... لیکن موسیٰ صرف آپ کا ہی نہیں..... میرا بھی بیٹا ہے..... رضاعی اولاد ہے وہ میری..... سکینہ کا بھائی ہے اور خدا جانتا ہے موسیٰ مجھے سکینہ سے بھی بڑھ کر پیارا ہے..... آج ایک ماں اپنے اسی بیٹے کے لئے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے..... آپ نے وراثت اور جان نشینی سے تو اسے عاق کر ہی دیا ہے..... مگر اس گھر سے عاق نہ کریں..... اسے گھر سے نہ نکالیں..... ورنہ میں بھی اس کے ساتھ یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی..... میرا بیٹا در بدر پھرے گا تو میں بھی آرام سے اس چھت تلے نہیں رہ پاؤں گی..... جہاں وہ جائے گا..... میں بھی وہیں چل پڑوں گی اس کے ساتھ.....

خدیجہ اور ہاجرہ دونوں رو رہی ہیں۔

قدرت اللہ مجبور اور لاچار سا ہو جاتا ہے مگر اس کا غصہ ختم نہیں ہوتا۔

قدرت: میں جانتا ہوں کہ یہ ساری پٹی تمہیں ہاجرہ نے پڑھائی ہے..... ایک بیوی اپنے شوہر کے سامنے اپنے بیٹے کے حق میں کھڑی نہیں ہو سکی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے..... اس لئے اس نے اپنی حمایتی میرے سامنے کھڑی کر دی ہے.....

ہاجرہ: ہاں..... میں تو مجبور ہوں کیونکہ میں موسیٰ کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی زوجہ بھی ہوں.....، مجازی خدا کا حکم نہیں ٹال سکتی..... مگر ایک بہن تو اپنے بھائی کے آگے چادر پھیلا سکتی ہے.....، کسی کی فریاد سے تو آپ کا دل پگھلے گا آخر.....

قدرت: میں تم عورتوں سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا..... ٹھیک ہے..... اگر خدیجہ نے اپنا حق مجھ سے مانگ ہی لیا ہے تو میں نے دیا اُسے اس کا حق..... مگر اس ناخلف سے کہنا کہ اب اس کا اس گھر کے معمولات میں کوئی حصہ نہیں ہوگا..... اور کوشش کرے کہ بلاضرورت میرے سامنے نہ آئے..... خون کھول اُٹھتا ہے میرا اسے دیکھ کر.....

قدرت غصے میں پیر پٹختا وہاں سے چلا جاتا ہے۔ خدیجہ ہاجرہ کے گلے لگ کر رو پڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: نامراد کی دوکان/
یا کوئی قریبی آؤٹ ڈور

موسیٰ نامراد کے ساتھ بات کر رہا ہے اور اس کے چہرے کے نیل دیکھ کر کہتا ہے۔

موسیٰ: میرے حصے کے یہ زخم اور نیل تمہارے چہرے اور جسم پر دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے یار..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا..... میں تمہارا گناہ گار ہوں.....

موسیٰ نامراد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہے۔ نامراد تڑپ کر اُس کے ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیتا ہے۔

نامراد: مجھے کیوں گناہ گار کر رہے ہو..... یہ زخم نہیں تمغوں کے نشانات ہیں..... دوست کی دوستی میں جان بھی جائے تو غم نہیں..... مگر یہ تم نے کیا کر دیا..... جیت کر بھی بازی ہار دی..... لڑکی تمہارے قبضے میں تھی مگر پھر بھی تم نے نکاح کے بغیر اُسے واپس جانے دیا..... کیوں؟ اب اس کی ماں کبھی اسے تمہارے قابو میں نہیں آنے دے گی..... بڑے پہرے اور کانٹے بچھا دے گی تمہاری راہ میں.....

موسیٰ: عشق کسی پہرے سے کب ڈرا ہے اور کسی رکاوٹ سے کب رُکا ہے بھلا.....؟ ..... مگر عشق یکطرفہ ہو تو خود اپنے آپ کے لئے ہی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے..... وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی اور میرے عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اس نے بہت کڑی شرط لگا دی ہے..... اب وہ شرط پوری کروں گا..... تبھی اس پر حق جتاؤں گا اپنا، ورنہ وہ کہتی ہے محبت میں زبردستی وہ کرتے ہیں جو صرف جسم پانے کی تمنا رکھتے ہیں..... روح کا وصل چاہیے ہو تو دل جیتنا پڑتا ہے..... اور اس نے دل جیتنے کی شرط لگا دی ہے موسیٰ..... اب تو یہ دریا سر کرنا ہی پڑے گا میرے نامراد.....

نامراد حیرت اور عقیدت سے موسیٰ کو دیکھ رہا ہے، اس کی پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔

نامراد: تم اس دنیا کے نہیں ہو میرے دوست..... مگر یہ دنیا تمہارے جذبے کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ پائے گی..... یہ ناقدروں کی دنیا ہے پیارے..... جھوٹے، دغاباز اور منافق لوگوں کا کاروبار چلتا ہے یہاں..... تمہارے سچے عشق کا سکہ کھوٹا ہی رہے گا اس بازار میں..... کون سنے گا تمہاری داستان اور کون مانے گا تمہاری اس سچائی کو.....؟ کاش اس لڑکی کو یہ سب دکھائی دے جاتا تو اسے پتہ چلتا کہ واپس جا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کر دی ہے.....

موسیٰ: اگر میرے عشق میں سچائی ہے تو ایک روز اُسے یہ سب ماننا ہی پڑے گا..... اور اگر میں ہار گیا تو یہی سمجھوں گا کہ میرے جذبے میں ہی کوئی کمی تھی..... بس تم دعا کرنا میرے لئے..... بہت بے چین ہوں میں..... بڑی آگ جلا دی ہے اس نے میرے اندر.....

موسیٰ کسی خیال میں گم کہتا ہے۔ موسیٰ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگتی ہیں اور نامراد آگے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت اللہ کا حجرہ۔ محفل

محفل جمی ہوئی ہے جہاں پیر فضل اور محفل میں دیگر لوگ بھی عقیدت سے سر جھکائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ہی عیسیٰ بیٹھا ہے مگر وہ بہت بے چین اور کرب کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ موسیٰ بھی ہال/حجرے میں داخل ہوتا ہے مگر پیر قدرت اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیتا ہے۔ موسیٰ ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر اپنی جگہ بیٹھنے کی بجائے۔ باپ کی نظر اندازی محسوس کرتے ہوئے محفل میں سب سے پیچھے جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ عیسیٰ بھائی کو یوں سب سے آخر میں بیٹھے دیکھ کر نظر کے اشارے سے آگے آنے کا کہتا ہے مگر موسیٰ ہاتھ اُٹھا کر اسے تسلی دیتا ہے کہ وہ یہیں ٹھیک ہے۔ قدرت اپنی بات جاری رکھتا ہے۔

قدرت: جی..... دراصل آپ سب کو ایک نہایت ضروری اعلان کے لئے زحمت دی ہے..... آپ سب جانتے ہیں کہ ہر سال کی طرح اس بار بھی عرس کی تقریبات ہوں گی مگر اہم بات یہ ہے کہ میں آج اپنی خاندانی گدی اور جدی پشتی وارثت کے جان نشین کے انتخاب کا اعلان بھی کرنے والا ہوں۔ میں نے بہت سوچ بچار اور بزرگوں کے مشورے سے اپنے چھوٹے بیٹے عیسیٰ کو اپنی گدی کا جان نشین مقرر کیا ہے..... آج کے بعد ہماری اس روحانی ملکیت اور سلسلے کا جان نشین عیسیٰ ہوگا..... دستار بندی کے لئے آگے آجاؤ.....

پیر قدرت کے اعلان پر پیر فضل اور دیگر حیرت زدہ سے چونک پڑتے ہیں۔ عیسیٰ ویسے ہی شش و پنج میں سر جھکائے بیٹھا پریشان ہو رہا ہے۔ قدرت اللہ سخت لہجے میں عیسیٰ کو پکارتا ہے۔

قدرت: عیسیٰ..... تم نے سنا نہیں..... دستار بندی کے لئے اُٹھو.....

عیسیٰ دور بیٹھے موسیٰ پر نظر ڈالتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 7

پچھلے فریز سے جاری ہے

//Cut//

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت اللہ کی محفل/ دستار بندی کی تقریب

پیر قدرت کڑک کر عیسیٰ کو کہتا ہے۔

قدرت: سُنا نہیں..... آگے بڑھو..... مرشد محترم انتظار کر رہے ہیں.....

عیسیٰ پریشانی سے دور بیٹھے موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے..... قدرت اللہ ایک سفید ریش بزرگ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں ایک سفید پگڑی (دستار) پکڑی ہوئی ہے۔ محفل میں بیٹھا پیر فضل بے چین ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کچھ کہہ نہیں پاتا۔ عیسیٰ بادلِ نخواستہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اور باپ اور دوسرے بوڑھے بزرگ کے سامنے آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بوڑھا بزرگ پگڑی/ دستار عیسیٰ کے سر پر رکھ دیتا ہے۔ محفل میں مبارک باد کا شور سا اُٹھتا ہے اور بوڑھا بزرگ دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیتا ہے۔ ساری محفل دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتی ہے۔ بزرگ کچھ دعائیں پڑھتا ہے اور چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ سب اُٹھ اُٹھ کر قدرت اللہ اور عیسیٰ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ موسیٰ بھی آگے بڑھتا ہے اور بھائی کو گلے لگاتا ہے۔ عیسیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی آنکھوں میں سرمالگا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خوشی میں کچھ گنگنا بھی رہی ہے۔ اس کی ماں خدیجہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ ماں بیٹی کو یوں خوش اور بنا سنورا دیکھ کر جل بھُن سی جاتی ہے۔

خدیجہ: کسی کی بربادی پر خوش ہونے والے بہت زیادہ دن تک یہ خوشی پال نہیں سکتے..... قدرت بہت جلد ان کا کیا سامنے لا کر رہتی ہے۔

سکینہ مسکرا کر پلٹتی ہے اور ماں کو دیکھتی ہے۔

سکینہ: کیسی ماں ہو تم بھی اماں..... بیٹی کی خوشی پر اسے بددعائیں دے رہی ہو..... ارے مائیں تو بیٹیوں کو خوش دیکھنے کے لئے مری جاتی ہیں..... اور ایک تم ہو کہ مجھے مرنے کی بددعائیں دے رہی ہو..... کوئی سنے گا تو کیا کہے گا.....؟

خدیجہ: مت چلو اس آگ سے بھرے رستے پر..... یہاں تمہیں صرف انگارے ملیں گے..... سکون کی ٹھنڈی چھاؤں نہیں.....

سکینہ: اب یہ کیا بات ہوئی بھلا..... آج تمہارے چہیتے داماد کی دستار بندی ہونے جا رہی ہے..... اتنی بڑی گدی کا جان نشین بنا رہے ہیں اُسے تایا جان..... اور میں تھوڑا سا خوش بھی نہ ہوں..... تم خود ہی تو کہتی ہو کہ مجھے عیسیٰ کے لئے بن سنور کر رہنا چاہیے..... نہ کہ یوں سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتی رہوں..... تو آج ذرا بناؤ سنگھار کیا کر لیا تم تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہو.....

خدیجہ: موسیٰ میرا بیٹا ہے..... اور میں اس کے ساتھ اس گھر میں کوئی ناانصافی نہیں ہونے دوں گی..... تمہاری یہ چالیں زیادہ عرصہ چلنے والی نہیں ہیں..... یہ بات لکھ کر رکھ لو اپنے پاس.....

خدیجہ تلملاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ سکینہ ماں کی بے بسی پر زور سے ہنستی ہے اور خود سے کہتی ہے۔

Audio Overlap

سکینہ: ابھی تو تم تیل دیکھو..... اور تیل کی دھار دیکھو اماں..... ابھی تو اس گھرانے کی بربادی کا آغاز ہوا ہے..... انجام تک بھی میں ہی پہنچاؤں گی ان سب کے جھوٹے غرور کے بھرم کو..... بس ایک بار میرا کامران سے رابطہ ہو جانے دو..... اصل کہانی تو تب شروع ہوگی ان کی اس بدنامی کی داستان کی.....

سکینہ پھر سے بناؤ سنگھار میں مصروف ہو جاتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ گنگناتی رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر وہی کمینی سی مسکراہٹ ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا آستانہ/محفل۔

پیر قدرت کے مرید دستار بندی کی تقریب ختم ہونے کے بعد رخصت ہو رہے ہیں۔ سب کے جانے کے بعد پیر فضل اللہ (موسیٰ کا ہونے والا سسر) قدرت کے قریب آتا ہے۔ اس کے چہرے پر بیک وقت پریشانی، حیرت اور کسی قدر ناگواری کے تاثرات ہیں۔

پیر فضل: سمجھ نہیں آ رہا شاہ صاحب کہ آپ کو عیسیٰ کی دستار بندی کی مبارک باد دوں یا اس اچانک کایا پلٹ پر حیرت اور ناراضگی کا اظہار کروں.....

قدرت: کبھی کبھی کچھ فیصلے بہت ناگزیر ہو جاتے ہیں پیر صاحب..... مجھے آپ کی پریشانی کا بہت اچھی طرح اندازہ ہے اور مجھے یہ بات شاید آپ سے پہلے ہی کر لینی چاہیے تھی..... مگر حالات نے موقع ہی نہیں دیا.....

پیر فضل: مگر اچانک یہ فیصلے کی اتنی بڑی تبدیلی کیوں..... آج کی یہ دستار بندی تو مہینہ بھر پہلے سے ہی طے شدہ تھی..... اور ساری برادری کو یہی بتایا گیا تھا کہ آج موسیٰ کو آپ کا جانشین اور مستقبل میں آپ کی گدی کا حقدار اور وارث مقرر کیا جائے گا..... مگر آپ نے اچانک اپنے چھوٹے بیٹے کو یہ عہدہ اور فضیلت سونپ دی.....؟ ..... میرا سوال کرنا تو بنتا ہے..... بہت نازک رشتہ ہے ہمارا.....

قدرت سر جھکائے پیر فضل کی ساری بات سنتا رہتا ہے۔

قدرت: میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں..... ستارہ صرف آپ کی نہیں..... میری بھی بیٹی ہے..... اور میں اس کے ساتھ کبھی کوئی ناانصافی نہیں ہونے دوں گا..... کچھ باتیں ایسی ہیں جن کا آپ کے علم میں ہونا بہت ضروری ہے..... لیکن اس سے پہلے میں اپنی تحقیق مکمل کر لینا چاہتا ہوں تاکہ میرے انصاف میں کوئی کمی نہ رہ جائے..... مجھے صرف چند دن کا وقت دے دیجیے..... آپ کو کھل کر تفصیل سے ساری بات پتہ چل جائے گی.....

پیر فضل کے چہرے پر کشمکش کے آثار ہیں جیسے اس کے اندر کئی سوالات مچل رہے ہوں۔ مگر وہ مصلحتاً خاموش رہتا ہے۔

فضل اللہ: ٹھیک ہے شاہ صاحب..... میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا..... کیونکہ ستارہ کا مستقبل بھی آپ کے جواب سے ہی وابستہ ہے..... موسیٰ کی حیثیت سے ہی میری بیٹی کے مستقبل اور آپ کے خاندان میں اس کے مقام کا تعین ہوگا..... مجھے اُمید ہے کہ مجھے آپ کے جواب ملنے کا بہت زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا.....

چلتا ہوں..... فی امان اللہ.....

پیر فضل قدرت سے ہاتھ ملا کر واپس پلٹ جاتا ہے۔ پیر قدرت کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ اپنے کمرے میں کسی خیال میں گم بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سامنے کوئی کتاب کھلی ہوئی ہے۔ جس کے صفحے ہوا سے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ مگر زہرہ کا دھیان کسی اور جانب ہے۔ اتنے میں چندا کمرے میں داخل ہوتی ہے اور باہر سے ہی مستقل کچھ بڑبڑا رہی ہے جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو۔

چندا: ایک تو مجھے یہ انا جی کی بالکل سمجھ نہیں آتی..... گھڑی میں تولہ..... گھڑی میں ماشہ..... ابھی صبح خود کہہ رہی تھیں کہ جا کر درزی کو اپنے اور زہرہ کے نئے جوڑے سلنے کے لئے دے آؤ..... اور اب جانے کی تیاری کر لی ہے میں نے پوری تو حکم آ گیا ہے کہ فی الحال کوئی گھر سے باہر نہیں جائے گا..... لو بھلا..... اب یہ بھی کوئی بات ہوئی..... بندہ پوچھے کہ.....

زہرہ ویسے ہی گم سم اپنے خیالوں میں بیٹھی رہتی ہے۔ چندا بولتے بولتے چونک کر زہرہ کی طرف دیکھتی ہے اور پھر اس کی بے خیالی محسوس کر کے حیرت سے اُسے ٹوکتی ہے۔

چندا: زہرہ..... زہرہ..... سنتی ہو..... تم سے کہہ رہی ہوں.....

زہرہ چندا کے دور سے پکارنے پر چونک کر اپنے خیالات سے باہر آتی ہے۔

زہرہ: کیا..... مجھ سے کچھ کہا.....

چندا: کہاں کھوئی ہوئی ہو..... واپس آ جاؤ..... اب اس کے خیالات سے.....

زہرہ: کس کے خیالات سے.....؟..... کس کی بات کر رہی ہو.....؟

چندا: اور کون ہوگا.....؟..... وہی موسیٰ.....

زہرہ: (غصے سے) بکو مت..... میں کیوں اس کے خیالات میں کھونے لگی..... نام مت لو اس کا میرے سامنے.....

چندا: پتہ نہیں..... جب سے وہ کل تمہیں گھر واپس چھوڑ کر گیا ہے..... تم اسی طرح گم سم سی بیٹھی ہو..... مجھے لگا کہ اس کو یاد کر رہی ہوگی.....

زہرہ: میں کیوں اسے یاد کرنے لگی..... ہاں..... البتہ اس کے گھر والوں کا خیال ضرور آ جاتا ہے مجھے..... اچھے بھلے شریف گھرانے کا لگتا ہے..... مگر کل جب اس کے گھر پولیس گئی ہوگی میری تلاش میں چھاپہ مارنے کے لئے تو اس کے گھر والوں کی کتنی بے عزتی ہوئی ہوگی.....

چندا: تو تمہاری بلا سے..... ہونے دو بے عزتی..... تم بھی تو اس کو سزا دینا چاہتی تھیں ناں..... ہاں البتہ مجھے اس نامراد پر بڑا ترس آ رہا ہے..... وہ بُھتنا بوا بتا رہی تھیں کہ سارا جسم نیل نیل کر دیا ہے پولیس والوں نے اس کا..... صبح نظر آیا تھا وہ بوا کو گلی میں.....

زہرہ چندا کی بات سن کر کچھ پریشان سی ہو جاتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔ چندا کسی کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ زہرہ بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت اللہ کے آستانے کے باہر

(یا کسی مسجد کے باہر/آؤٹر۔جوتے رکھنے والی جگہ)

قدرت اللہ موسیٰ اور عیسیٰ آستانے/مزار/یا کسی روحانی محفل سے باہر نکلتے ہیں۔رسم/تعظیم کے مطابق موسیٰ، جلدی سے باپ قدرت کے جوتے سیدھے کر کے رکھنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔مگر قدرت اللہ ناگواری سے ہاتھ اُٹھا کر موسیٰ کو جوتے سیدھے کرنے سے روک دیتا ہے عیسیٰ اور دیگر مرید وغیرہ حیرت سے قدرت کی یہ ناگواری دیکھتے ہیں۔موسیٰ جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ معاملہ سنبھالنے کی غرض سے قدرت کا چھوٹا بیٹا عیسیٰ آگے بڑھ کر باپ کے جوتے سیدھے کرتا ہے۔قدرت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا ہے جیسے وہ کبھی موسیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دیا کرتا تھا۔اب رسم کے حساب سے چھوٹے عیسیٰ کو بڑے بھائی کے جوتے سیدھے کرنے چاہئیں تھے مگر قدرت عیسیٰ کو ایسا کرنے سے روک دیتا ہے اور بڑے بیٹے موسیٰ کو آگے بڑھ کر اپنے چھوٹے بھائی عیسیٰ کے جوتے سیدھے کرنے کا اشارہ کرتا ہے۔عیسیٰ بڑے بھائی کی اس بے عزتی پر تڑپ سا جاتا ہے مگر قدرت اسے ڈانٹتا ہے۔

قدرت: تم آج سے میرے جان نشین ہو.....اور رواج کے مطابق آج سے تم مجھے اور موسیٰ تمہیں جوتا پہنایا کرے گا.....یہ میرا حکم ہے.....

موسیٰ چپ چاپ آگے بڑھتا ہے اور چھوٹے بھائی کے جوتے سیدھے کر کے اسے پہناتا ہے۔سب لوگ دم بخود کھڑے ہیں۔چھوٹے بھائی (عیسیٰ) کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔موسیٰ اسے جوتے پہنا کر اشارہ کرتا ہے کہ اب عیسیٰ اسے بڑوں کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دے.....عیسیٰ رو پڑتا ہے.....قدرت اللہ بے رُخی سے آگے بڑھ جاتا ہے،عیسیٰ کو فلیش بیک میں ماضی کی وہ بات یاد آتی ہے جب اسی طرح وہ اپنے بڑے بھائی موسیٰ اور باپ پیر قدرت کے ساتھ جب آستانے سے باہر نکلتے تھے۔سب سے پہلے موسیٰ جلدی سے باپ کے جوتے سیدھے کرتا تھا اور پھر باپ بڑے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا تھا اور پھر عیسیٰ جلدی سے آگے بڑھ کر بڑے بھائی موسیٰ کے جوتے سیدھے کرتا تھا اور تب موسیٰ بھی بڑے بزرگوں کی طرح چھوٹے بھائی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دعا دیتا تو دونوں باپ سے نظر بچا کر زور سے ہنس پڑتے تھے۔مگر آج وہی باپ سنگدلی سے موسیٰ کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا ہے۔عیسیٰ ماضی کی یادوں سے باہر نکلتا ہے اور باپ اور بھائی کے پیچھے دور کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

جگہ: کاشانۂ پیراں/موسیٰ کا گھر

گاڑی گھر میں داخل ہوتی ہے۔اوپر کسی کمرے کی بالکونی یا گیلری میں سکینہ کھڑی دیکھ رہی ہے۔وہ دیکھتی ہے کہ آج موسیٰ کی جگہ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر باپ کے ساتھ اس کا شوہر عیسیٰ بیٹھا ہوا ہے جبکہ موسیٰ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔گاڑی رکنے پر حویلی کے نوکر جلدی سے قدرت اور عیسیٰ کی سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہیں اور موسیٰ کی جگہ باپ کے ساتھ پیچھے عیسیٰ کو دیکھ کر حیرت زدہ سے رہ جاتے ہیں۔سکینہ اوپر سے یہ دیکھ کر خوشی سے ہنس پڑتی ہے۔

سکینہ: واہ.....یہ ہوئی ناں بات.....آج باپ کے ساتھ بڑا بیٹا نہیں نیا جان نشین بیٹھا ہوا ہے.....اب مزہ آئے گا.....لگتا ہے کھیل شروع ہو چکا ہے.....موسیٰ بھائی کی بربادی کا کھیل.....

سکینہ ہنستی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر/ لاؤنج

موسیٰ کی ماں اندر کھڑی شوہر کے آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اس نے بھی گاڑی سے نکلتے ہوئے یہ سارا تماشہ دیکھ لیا ہے کہ آج اس کے بڑے بیٹے کی جگہ چھوٹے عیسیٰ کو یہ ساری عزت اور پروٹوکول دیا گیا ہے جو کبھی موسیٰ کے لئے ہوتا تھا۔ ماں کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اتنے میں کمرے میں پیر قدرت اور اس کے پیچھے عیسیٰ اندر داخل ہوتا ہے۔ پیر قدرت عیسیٰ کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔

قدرت: ہاں/ وہ مذہبی امور کے منسٹر صاحب کا دعوت نامہ ضرور یاد رکھنا..... ان کا تقریب میں آنا بہت ضروری ہے..... اور اس بات کا بھی دھیان رہے کہ یہ ہمارا علاقہ انہی کا حلقہ ہے..... لوگوں کی اچھی خاصی تعداد جلسے میں موجود ہونی چاہیے..... مگر خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی بدنظمی یا بدمزگی نہ ہونے پائے.....

ماں جلدی سے پانی کا گلاس شوہر کو پکڑاتی ہے۔ قدرت پانی کا گھونٹ بھرتا ہے۔

عیسیٰ: جی ابا..... میں دھیان رکھوں گا..... ویسے بھی موسیٰ بھائی یہ سارے انتظامات پہلے دیکھتے رہے ہیں..... اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں.....

قدرت شدید غصے میں گھور کر بیٹے کو دیکھتا ہے اور گرج کر اس کی بات کاٹ دیتا ہے۔

قدرت: موسیٰ کا اب ان تقریبات یا انتظامات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ نہ ہی میں اُسے جلسے میں یا کسی ایسی تقریب میں دیکھنا چاہتا ہوں..... اب یہ سب کچھ تمہی کو دیکھنا ہوگا..... سمجھ گئے ہو یا آخری بار پھر تمہیں سمجھاؤں.....

عیسیٰ سر جھکا لیتا ہے۔

عیسیٰ: جی ابا..... سمجھ گیا ہوں اچھی طرح.....

قدرت: دوبارہ ایسی غلطی نہ ہونے پائے..... یہ سارے کام کرو اور رات تک مجھے تفصیلاً ساری رپورٹ دو واپس آ کر..... اگر کوئی مشکل ہو تو کریم صاحب سے رابطہ کرو اور موسیٰ سے چابیاں بھی لے لینا مزار کی..... سارے رجسٹر اور کھاتے بھی اٹھا لو اس سے..... کل سے سارا دفتر تمہی کو چلانا ہے.....

قدرت اپنی بات ختم کر کے لمبے لمبے قدم اٹھاتا وہاں سے چلا جاتا ہے۔ بیوی ہاجرہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتی ہے مگر قدرت اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ ہاجرہ شوہر کے پیچھے لپکتی ہے۔ عیسیٰ کا موڈ بھی آف ہو چکا ہے اور وہ غصے میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے فریم آؤٹ ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: پیر فضل کا گھر

ستارہ کسی کمرے کے دروازے سے لگی اندر ہونے والی ماں باپ کی بات سن رہی ہے۔ ستارہ کی ماں پریشانی سے شوہر کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

ستارہ کی ماں/ شائستہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پیر صاحب..... قدرت اللہ بھائی نے موسیٰ کی جگہ اپنی آبائی اور جدی پشتی گدی عیسیٰ کے حوالے کر دی..... یہ سب کیسے ہو گیا اچانک..... کل تک تو موسیٰ ہی اس خاندان کا بڑا بیٹا اور جان نشین تھا..... یہ حق تو اُسی کا ہے.....

پیر فضل کے چہرے پر بھی پریشانی ہے۔

فضل: اسی بات کی تو مجھے بھی پریشانی ہے..... وہ جو کل تک جان نشین تھا..... ہر چیز کا وارث اور حق دار تھا..... آج وہی بیٹا دستار بندی کی محفل میں سب سے آخری صف میں سر جھکائے بیٹھا تھا..... شاہ صاحب نے تو پلٹ کر اسے دیکھا تک نہیں..... جیسے کوئی اجنبی ہو یا پھر کوئی معمولی غلام.....

شائستہ: تو آپ نے بات نہیں کی قدرت اللہ بھائی سے..... یہ تو سراسر ناانصافی ہے..... وہ ایک دم سے سارا نظام کیسے پلٹ سکتے ہیں..... موسیٰ ہمارا ہونے والا داماد ہے اب..... انہیں کم سے کم پہلے ہم سے تو بات کرنی چاہیے تھی.....

فضل: بات تو اب بہت تفصیل سے ہوگی شاہ جی کے ساتھ..... آج ان کے آس پاس لوگ بہت جمع تھے تقریب کی وجہ سے..... لیکن میں زیادہ دن انتظار نہیں کروں گا اپنے سوالوں کے جواب کے لئے..... ہماری بیٹی ابھی اپنے ہی گھر میں بیٹھی ہے..... ہمیں زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شائستہ: کیسی بات کر رہے ہیں آپ..... پرواہ کیوں نہ کریں پیر جی..... ساری برادری میں ستارہ اور موسیٰ کی منگنی کی بات پھیل چکی ہے..... خاندان والیاں بار بار نکاح کی تاریخ کے بارے میں پوچھتی ہیں..... اگر خدانخواستہ کوئی انہونی ہوئی تو ہم بھلا کس کس کو جواب دیتے پھریں گے.....

فضل: ابھی جواب دینا بہت زیادہ مشکل نہیں ہوگا ستارہ کی ماں..... موسیٰ کو گدی نشینی سے ہٹانا ہی ہمارے لئے بہت بڑا جواز بن سکتا ہے..... لیکن فی الحال میں قدرت اللہ کے وعدے کی سچائی تک انتظار کر سکتا ہوں..... لیکن یہ بات طے ہے کہ میری بیٹی ایسے شخص کے نکاح میں اس گھر سے رخصت نہیں ہوگی جسے اس کے چھوٹے بھائی کے مقابلے میں باپ نے دھتکار دیا ہو..... عیسیٰ شادی شدہ ہے اور اگر ستارہ اس حال میں موسیٰ کے ساتھ رخصت ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے عیسیٰ کی بیوی کی برتری اور حکومت بھی تسلیم کرنی ہوگی..... گھر کی بڑی بہو ستارہ نہیں بلکہ سکینہ کہلائی جائے گی۔ اور گدی نشینی بھی اسی کی اولاد کو منتقل ہو جائے گی مستقبل میں مگر میں اپنی بیٹی کو کسی دوسری کی تابعداری اور خدمت گزاری نہیں کرنے دوں گا۔

فضل غصے میں آ جاتا ہے۔

دروازے کے پیچھے کھڑی ستارہ باپ کی یہ سخت باتیں سن کر مزید پریشان ہو رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

ڈرائنگ روم/سنوکر روم

چودھری توقیر جاوید اور شہریار سنوکر کھیل رہے ہیں۔ شہریار خوشی سے جاوید کی طرف دیکھتا ہے۔ شہریار شارٹ کھیلتا ہے۔

شہریار: کیا خوش خبری ہے چودھری صاحب..... اب بتا بھی دیں..... آپ جانتے ہیں کہ مجھے انتظار بالکل پسند نہیں ہے۔

توقیر جاوید: (مسکرا کر) چلو زیادہ سسپنس نہیں کری ایٹ کرتا میں..... آپ نے جس لڑکی کا پتہ لگانے کا کہا تھا اس کی ساری انفارمیشن مل گئی ہے مجھے.....

شہریار خوشی سے Excited ہو جاتا ہے۔

شہریار: رئیلی..... اوہ واؤ..... دیٹس گریٹ..... کون ہے..... کیا نام ہے..... کہاں رہتی ہے..... جلدی بتائیں.....

توقیر جاوید: زہرہ نام ہے اس کا..... اسی شہر میں رہتی ہے..... بہت مخصوص ڈانس پارٹیز میں آنا جانا ہے اس کا..... اس کے

وارثوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہے اُسے..... ماسٹرز کر رہی ہے ایک مہنگی اور بڑی یونیورسٹی سے..... اور ابھی زمانے کی دھوپ نے چھوا نہیں ہے اُسے۔

شہریار: زبردست..... وہ ہے بھی ایسی ہی کومل..... کانچ کی بنی ہوئی..... دیکھتے ہی لگتا ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے گی..... اب تو بس جلد از جلد ملاقات ہونی چاہیے اس کے ساتھ.....

توقیر جاوید: ہاں..... مگر ایک چیز اور بھی ہے بتانے لائق..... اور وہ یہ کہ وہ صرف کارپوریٹ سیکٹر کی تقریبات اور پارٹیز میں ہی آتی ہے..... آئی مین کسی کی پرسنل پارٹی میں نہیں..... اور اس کے ساتھ اس کا گارڈ بھی ہوتا ہے..... اسے بلانا ہے تو پوری تقریب منعقد کرنی پڑے گی..... وہ بھی کسی گھریا بڑے کلب میں..... یہی اس کا پروٹوکول ہے فی الحال.....

شہریار: انٹرسٹنگ..... Intersting..... اس جیسی Princes پرنسز کا ایسا ہی پروٹوکول ہونا چاہیے..... تو پھر انتظار کس بات کا ہے..... فوراً ایک بڑی پارٹی ارینج کریں گرینڈ لیول کی..... شہریار کی ساری ایلیٹ Elliet وہاں موجود ہونی چاہیے..... اور میری Special Guest وہی ہوگی..... زہرہ جبیں..... زہرہ.....

توقیر جاوید: جو حکم جناب..... اسی ویک اینڈ پر گرینڈ پارٹی ہوگی.....

دونوں زور سے ہنستے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ: کاشانہ پیراں۔ چھت

موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیان بحث جاری ہے۔

موسیٰ: بے وقوفی کی باتیں مت کرو..... ابا نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تمہیں یہ ساری ذمہ داری سونپی ہوگی..... ان کا مان اور بھرم مت توڑو اب..... میں نے پہلے ہی انہیں بہت دُکھ دیئے ہیں..... ان کی کسی اُمید پر پورا نہیں اُتر پایا میں..... اب کم از کم تم تو ان کی اُمید مت توڑو.....

عیسیٰ: نہیں بھائی..... مجھ سے اتنا بڑا امتحان مت لو..... میں تمہاری جگہ کبھی نہیں لے سکتا..... تم نہیں جانتے میں کس اذیت سے گزر رہا ہوں..... لوگوں کی آنکھوں میں چھپی حیرت اور سوال مجھے تیر کی طرح لگ رہے ہیں..... میں ابھی جا کر ابا سے کہہ دیتا ہوں کہ یہ جانشینی یہ گدی سنبھالنا میرے بس کی بات نہیں ہے.....

عیسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے، موسیٰ اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

موسیٰ: پاگل مت بنو عیسیٰ..... ابا پہلے ہی میری وجہ سے بہت پریشان ہیں..... اور اس وقت انہیں تمہاری ضرورت ہے..... ورنہ یہ سارے انتظامات ادھورے رہ جائیں گے..... اور گدی کا کیا ہے..... تمہارے پاس رہے یا میرے پاس..... ایک ہی بات ہے..... ویسے بھی تم جانتے ہو کہ میری راہ اب الگ ہے..... مجھ سے یہ سب سنبھالا نہیں جائے گا.....

عیسیٰ: ایک ہی بات نہیں ہے بھائی..... تم جانتے ہو میں ساری عمر تمہاری انگلی پکڑ کر چلا ہوں ہر راستے پر..... تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں..... اور ابا آج کل بہت غصے میں ہیں..... وقت گزرنے کے ساتھ اُن کا غصہ بھی اُتر جائے گا..... وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا ہر فیصلہ تمہارے بغیر نامکمل ہے..... وقت گزرنے کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا بھائی..... تم دل چھوٹا مت کرو.....

موسیٰ دھیرے سے مسکراتا ہے۔

موسیٰ: دل رہا ہی کب میرے پاس..... سب اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے یار..... اس وقت میں کسی اور مسئلے میں خود کو نہیں اُلجھانا

چاہتا..... میرا خود پر کنٹرول نہیں رہا..... ابا کے سامنے آتا جاتا رہوں گا تو میرے اندر کا حال مزید ان پہ کھلتا جائے گا اور ان کا پارہ مزید اوپر چڑھتا رہے گا.....

عیسیٰ: مگر بھائی.....

موسیٰ: اگر مگر کچھ نہیں..... جیسا وہ کہہ رہے ہیں تم بس ان کا حکم مانتے جاؤ..... اب تمہیں ہی ان کا وہ بیٹا بن کر دکھانا ہے جو وہ موسیٰ کے اندر دیکھنا چاہتے تھے..... بس..... اب آگے کوئی بحث نہ کرنا مجھ سے۔

عیسیٰ بے بسی سے چپ ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت اور بیوی کا کمرہ

پیر قدرت وضو کر کے واش روم سے باہر آتا ہے۔ بیوی اسے تولیہ پکڑاتی ہے۔ پیر قدرت اس کا بجھا ہوا چہرہ غور سے دیکھتا ہے۔

قدرت: تم ابھی تک بڑے بیٹے کا غم منا رہی ہو..... میں تو سب کچھ اپنی دستار کے ساتھ ہی آج دفن کر چکا۔

بیوی تڑپ کر شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

ہاجرہ: خدانخواستہ..... دفن ہوں اس کے دشمن..... یہ کیسی بدفال منہ سے نکال رہے ہیں آپ.....

قدرت: مجھے اپنی عزت اور ناموس سے زیادہ بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے..... یہ تو تم نے اور خدیجہ نے مل کر اور سازش کر کے اسے اس چھت تلے روک لیا ہے..... ورنہ کب کا گھر سے بھی بے دخل کر چکا ہوتا..... ایسے بدنام آوارہ اور لوفر کا پیر قدرت کے گھر میں ٹھکانہ نہیں ہو سکتا.....

ہاجرہ: مانتی ہوں..... بہت بڑی غلطی ہوئی ہے موسیٰ سے..... مگر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ فرشتہ نہیں ہے..... ایک انسان ہی تو ہے..... اور انسانوں سے خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں..... آپ بھی اسے ایک انسان سمجھ کر اس کی خطا معاف کر دیں..... بہت بڑی سزا دی ہے آپ نے اس کی غلطی کی.....

قدرت: سزا دی ہی کب ہے میں نے ابھی اُسے..... بس تم ایک مہربانی کرو کہ اس سے کہہ دو میرے سامنے نہ آیا کرے.....

ہاجرہ: (ہاجرہ پھٹ پڑتی ہے) چھوٹے بھائی کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا ہے آپ نے..... اس کا رتبہ، حیثیت، تعظیم سب ختم کر دی ہے آپ نے..... گھر کے نوکر تک حیران ہیں اور باہر گلی محلے میں لوگ ہزار باتیں بنا رہے ہیں..... کل تک جو اس خاندان کا وارث تھا..... آج خود لاوارثوں کی طرح بھٹکتا پھر رہا ہے..... اور سزا کیا ہوتی ہے پیر صاحب.....؟

قدرت: (قدرت غصے میں پلٹتا ہے) میرا بس چلے تو.....؟ میرا منہ نہ کھلواؤ ہاجرہ..... تم چپ ہی رہو تو بہتر ہے..... یہ جو میرے پرکھوں کے نام کی کھلی اُڑائی جا رہی ہے آج تھانے کچہری میں..... یہ سب تمہارے اس لاڈلے موسیٰ کی وجہ سے ہے..... اور کہیں نہ کہیں تم بھی اس بے عزتی کی وجہ ہو..... اس کے عیبوں پر تمہی نے پردے ڈال رکھے تھے ہمیشہ سے..... تمہارے لاڈ پیار نے ہی اسے یہ شہہ دی ہے اور آج ہمیں یہ دن دکھایا ہے..... میں اب اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا..... کل کے اخباروں میں بھی عیسیٰ کی دستار بندی کی خبر چھپ جائے گی..... لوگ جتنی جلدی موسیٰ کو بھول جائیں..... اتنا ہی بہتر ہے.....

قدرت غصے میں تلملاتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: زہرہ کی حویلی۔صبح

زہرہ یونیورسٹی جانے کے لئے تیار ہو کر نکلنے لگتی ہے، انّا لاؤنج میں بیٹھی ہے۔ وہ زہرہ کو جاتے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو جاتی ہے اور گھبرا کر کہتی ہے۔

انّا: آئے ہائے..... یہ صبح صبح تیار ہو کر کہاں چل دیں..... کہاں کا ارادہ ہے..... کوئی خبر تو دو.....

زہرہ: یونیورسٹی جا رہی ہوں انّا جی..... اور اتنی صبح کہاں جاؤں گی بھلا.....؟..... ایڈمن ڈیپارٹمنٹ میں کچھ کام ہے ضروری.....

انّا: مگر اتنی جلدی کیا ہے.....؟..... دو چار دن گھر میں بیٹھی رہو..... جانتی نہیں ہو..... وہ دیوانہ ابھی باہر گلیوں میں آزاد پھر رہا ہے.....

زہرہ: آپ کس کس کے ڈر سے گھر میں چھپا کر رکھیں گی مجھے انّا جی.....؟..... اور بے فکر رہیں..... موسیٰ اب میرا راستہ نہیں کاٹے گا کبھی.....

انّا: پھر بھی..... میں کہتی ہوں کہ چندا کو لے جاتی اپنے ساتھ..... میرے دل کو اطمینان رہے گا..... اور بس میں نہ جانا آج.....

زہرہ چڑ جاتی ہے۔

زہرہ: اوہو..... میں اس لئے یونیورسٹی گاڑی سے نہیں جاتی انّا کہ خواہ مخواہ کسی کو باڈی گارڈ بنا کر نہ لے جانا پڑے.....

انّا: بس..... میں نے کہہ جو دیا ہے..... گاڑی منگواؤ اور چندا کو لے کر جانا.....

زہرہ بے بسی سے پیر پٹختی پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: صبح

جگہ: نامراد کا کیبن۔گلی

نامراد اپنے کیبن/ دوکان میں بیٹھا کسی اخبار کا صفحہ پلٹتا ہے اور اندر کوئی خبر پڑھ کر زور سے چونکتا ہے۔ اور خبر دہراتا ہے۔

نامراد: آستانہ پیراں کے جان نشین کی دستار بندی، شہر کے معزز روحانی سلسلے سے تعلق رکھنے والے پیر قدرت اللہ کے چھوٹے بیٹے عیسیٰ کی دستار بندی کی تقریب..... تقریب میں شہر کے علماء اور معززین کی شرکت..... مستقبل کے جان نشین کی دستار بندی کے بعد دعائیہ تقریب.....

نامراد دکھ اور غصے سے اخبار پٹخ دیتا ہے۔

نامراد: سنا تھا کہ تاج اور تخت لٹ جاتے ہیں عشق کی بازی میں..... پر تم نے تو کر دکھایا صوفی صاب..... بڑا جگرا ہے تمہارے اندر..... مگر بڑے چھوٹے دل کے لوگ بستے ہیں تمہارے آس پاس.....

اتنے میں نامراد کی نظر گلی میں گھر سے نکل کر کسی کار میں بیٹھتی زہرہ اور چندا پر پڑتی ہے۔ وہ چونک کر جلدی سے نیچے اترتا ہے اور گلی میں گاڑی کے راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

کار گزرنے لگتی ہے تو وہ گاڑی کے سامنے آ کر اُسے روکتا ہے۔ اندر بیٹھی زہرہ اور چندا دونوں گھبرا کر اُسے دیکھتی ہیں۔

چندا: ارے..... یہ تو نامراد ہے..... مگر یہ نامراد ہمارا راستہ روکے کیوں کھڑا ہے..... اب کیا چاہتا ہے یہ..... لگتا ہے پولیس کی مار نے اثر کیا ہے بے چارے کے دماغ پر.....

نامراد آگے بڑھتا ہے اور زہرہ کی کھڑکی والی طرف آ کر اخبار زہرہ کی گود میں پھینک دیتا ہے۔

نامراد: یہ لو..... تمہاری ایک اور خواہش پوری ہوگئی آج اسے برباد کرنے کی..... اس کے باپ نے اسے ساری جائیداد اور خاندانی وراثت سے محروم کر دیا ہے..... کچھ بھی باقی نہیں رہا اس کے پاس..... یہی چاہتی تھیں ناں تم کہ وہ شہزادے سے فقیر ہو جائے..... تو ہو گیا..... جاؤ جا کر مٹھائی بانٹو.....

زہرہ غصے سے ڈرائیور سے کہتی ہے۔

زہرہ: ڈرائیور..... رک کیوں گئے ہو..... آگے بڑھو.....

ڈرائیور گاڑی بڑھانے لگتا ہے۔ نامراد جاتے جاتے بھی پیچھے سے کہتا ہے۔

نامراد: لیکن ایک بات یاد رکھنا..... وہ اپنی دل کی سلطنت کا شہزادہ ہے..... کوئی اسے فقیر نہیں کر سکتا..... ہاں شاید اس نے محبت کرنے میں غلطی کر دی ہے..... غلط جگہ دل لگایا ہے اس نے..... اس کی قدر تم جیسے سوداگر کیا جانیں.....

گاڑی آگے بڑھ جاتی ہے۔ زہرہ غصے میں تلملاتی ہے۔ چندا اخبار اُٹھا کر خبر پڑھتی ہے۔ زہرہ کی نظر بھی اخبار پر پڑتی ہے۔ مگر وہ چندا پر ظاہر نہیں کرتی۔ چندا لمبی آہ بھرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/ لاؤنج وغیرہ

سکینہ کسی کام میں مصروف ہے۔ اتنے میں اندر سے موسیٰ نکل کر باہر کی طرف جانے لگتا ہے۔ سکینہ جلدی سے اسے جاتا دیکھ آواز دے کر روکتی ہے اس کی آواز میں طنز ہے۔

سکینہ: کہاں جا رہے ہیں موسیٰ بھائی..... اتنی صبح سویرے.....

موسیٰ: میں..... وہ ابا کے لئے.....

سکینہ: (طنزیہ) تایا جان اور عیسیٰ تو کب کے نکل گئے گھر سے..... شاید کسی اہم میٹنگ میں جانا تھا..... آپ کو لے کر نہیں گئے..... اوہو..... افسوس..... شاید بھول گئے آپ کو لے جانا.....

موسیٰ خاموشی سے سکینہ کی کڑوی باتیں سنتا ہے..... موسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے مگر سکینہ کے ترکش میں ابھی تیر ختم نہیں ہوئے۔

سکینہ: کیسا محسوس ہو رہا ہے یوں اپنوں کی نظر میں گرنا موسیٰ بھائی..... اور کیسا لگ رہا ہے سب کے سامنے یوں بے وقعت اور ہر لمحہ بے عزت ہونا..... میں نے کہا تھا ناں کہ آپ کو ایسی جگہ لا کر ماروں گی جہاں پینے کے لئے ایک گھونٹ بھی میسر نہ ہو.....

موسیٰ خاموشی سے سکینہ کی باتیں سنتا رہتا ہے مگر پلٹ کر کوئی جواب نہیں دیتا۔ سکینہ طنز کے تیر چلاتی رہتی ہے۔

سکینہ: مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری آپ کے لئے دی گئی بددعا اتنی جلدی پوری ہو جائے گی..... مگر ابھی تو بہت تڑپنا باقی ہے آپ کا موسیٰ بھائی..... ابھی تو میں نے صرف آپ سے آپ کی گدی اور وراثت چھینی ہے..... آپ کو اپنوں کے سامنے رسوا کیا ہے ابھی بس ذرا سا..... مگر یہ سب مل کر بھی اس ایک لمحے کا حساب برابر نہیں کر سکتے جس میں آپ نے میرا سب کچھ برباد کر دیا تھا..... میں بھی آپ کی مکمل بربادی تک آرام سے نہیں بیٹھوں گی..... میرا اندر تب تک جلتا رہے گا جب تک میں آپ کو اسی طرح پل پل تڑپتے ہوئے نہ دیکھوں..... دیکھ لیں..... آج آپ کے پاس کیا بچا ہے؟ سب کچھ تو میں نے چھین لیا ایک ہی جھٹکے میں آپ سے..... وراثت سے لاوارث کر دیا آپ کو.....

موسیٰ خاموشی سے سکینہ کی ساری بات سنتا ہے۔

موسیٰ: ٹھیک کہہ رہی ہو تم..... میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا..... اور جو تمہیں ملا..... وہ تم کو مبارک..... خوش رہو.....

موسیٰ اپنی بات ختم کر کے وہاں سے پلٹ جاتا ہے، سکینہ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر لئے مسکراتی رہتی ہے۔ دروازے کے قریب کھڑی سکینہ کی ماں خدیجہ یہ ساری باتیں سن لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر بیٹی کے لئے غصہ اور پریشانی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی کوٹھی

شہریار کا مینجر انا کے گھر آتا ہے۔ انا کے سامنے کوئی سفاری سوٹ/ پینٹ کوٹ میں ملبوس پکی عمر کا شخص کھڑا ہے۔ انا کے ہاتھ میں کوئی چیک/ رقم ہے، جسے وہ اپنی تجوری وغیرہ میں رکھتی ہے۔

انا: چودھری تو قیر جاوید سے بہت پرانی جان پہچان ہے..... انہیں انکار نہیں کر سکتی میں..... ورنہ نئی جگہ اور نئی تقریب میں میں کسی لڑکی کو بھیجنے سے اجتناب ہی کرتی ہوں.....

مینیجر: اسی لئے ملک شہریار صاحب نے مجھے خصوصی طور پر آپ کے پاس پیغام دے کر بھیجا ہے..... کل ان کے ہاں خصوصی تقریب ہے..... سارے انتظامات چودھری صاحب نے کئے ہیں..... آپ مطمئن رہیں..... شہر کے اعلیٰ اور شرفاء کی Gathring ہے وہاں..... کوئی نچلے درجے کا غل غپاڑہ نہیں ہوگا وہاں.....

انا: ہاں..... اس کا مجھے اطمینان ہو گیا ہے..... ٹھیک ہے مینیجر صاب..... ملک شہریار سے کہیے گا کہ زہرہ اور چند وقت پر پہنچ جائیں گی..... گاڑی بھجوا دیجئے گا آپ۔

مینیجر: آپ بے فکر رہیں..... ڈرائیور وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ جائے گا.....

مینیجر پلٹ کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ انا کسی نوکرانی کو آواز دیتی ہے۔

انا: چنبیلی..... اری او چنبیلی..... بات سن ذرا۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر/ کمرہ

ستارہ اور اس کی کزن کے درمیان بات چیت۔ ستارہ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہے..... اس کی کزن اُسے تسلی دیتی ہے۔

مریم/کزن: اوہو..... تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو..... پہلے پوری بات تو پتہ چل جانے دو..... آخر تمہاری مرضی بھی تو پوچھی جائے گی ناں..... شادی تم نے موسیٰ سے کرنی ہے یا کسی جاگیر یا وراثت سے.....

ستارہ: یہ تمہاری اور میری سوچ ہے..... مگر ہمارے بڑے اس طرح نہیں سوچتے..... ابا مجھے موسیٰ کے گھر اس خاندان کی با اختیار اور بڑی بہو بنا کر بھیجنا چاہتے ہیں..... مجھے تو فرق نہیں پڑتا مگر سکینہ کو یہ رُتبہ دیا گیا تو یہاں میرے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی..... ابا مجھے کسی دوسری حیثیت میں یہاں سے ہرگز رخصت نہیں کریں گے.....

مریم/کزن: مگر تمہاری منگنی ہو چکی ہے موسیٰ سے..... تم نے اس کے نام کی انگوٹھی پہنی ہے..... اب اتنی آسانی سے یہ رشتہ نہیں توڑا جا سکتا.....

ستارہ پریشانی سے اُسے دیکھتی ہے.....اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ستارہ: پتہ نہیں کیوں.....مگر میرا دل بہت پریشان ہے.....جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے یہاں.....جو میرا سب کچھ بہا کر لے جائے گا.....

//Cut//

Scene No # 17

وقت: شام

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ غصے میں کمرے میں داخل ہوتی ہے اور ہاتھ میں پکڑی کوئی کتاب/ اخبار وغیرہ زور سے پٹختی ہے۔اس کے پیچھے چندا بھی جلدی میں اندر داخل ہوتی ہے۔

چندا: اب بس بھی کرو.....غصہ تھوک دو.....اس نے ایسی کون سی نئی بات کہہ دی ہے کہ صبح سے تم انگاروں پر لوٹ رہی ہو.....

زہرہ: (غصے سے) وہ نامراد خود کو سمجھتا کیا ہے.....؟.....اور کیا میں نے اس کے دوست سے کہا تھا کہ میرا پیچھا کرے اور خود کو رُسوا کرے.....اب اگر اس کے خاندان نے اسے عاق کر دیا ہے اس کی حماقتوں کی وجہ سے تو اس بات کا الزام بھی یہ لوگ میرے سر ڈال رہے ہیں.....

چندا: (چندا سمجھاتی ہے) تو ڈالتے رہیں.....تمہاری بلا سے.....تم اتنا سیریس کیوں لے رہی ہو اس بات کو.....ہم جیسوں پر ہی تو یہ الزام سجتے ہیں.....جانے کتنے راجے مہاراجے مٹ گئے ان گلیوں میں.....نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ان کا.....ایک یہ موسیٰ بھی سہی.....

زہرہ: تم نہیں سمجھو گی.....یہاں بھی اس کے خاندان نے وہی عزت، بے عزتی اور بدنامی کے طوق کا سہارا لیا ہے.....موسیٰ کو اس کے باپ نے اس لئے عاق کر دیا کہ وہ ایک گانے والی کی بیٹی کے پیچھے پھیرے ڈالتا تھا.....یہ عزت اور غیرت کے ٹھیکے دار خود کو سمجھتے کیا ہیں.....؟.....موسیٰ ایک عزت دار اور دین دار خاندان میں پیدا ہوا تو اس میں اس کا کیا کمال تھا؟ اور میری ماں انا کی حویلی میں ایک گانے والی کے طور پر مجھے جنم دے کر مر گئی تو اس میں میرا کیا قصور ہے.....؟ نہ میں اپنی مرضی سے ان گلیوں میں پیدا ہوئی نا اُس کا جنم اس کی مرضی سے ہوا.....یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں.....یا پھر ایک اتفاق ہے.....تو پھر اس اتفاق سے ملنے والی اس نیک نامی، عزت اور غیرت پر اتنا گھمنڈ کیوں.....؟.....یہ اونچی پگڑی اور شملے والے ہمیں ہر قدم یہ احساس دلانے کے لئے سامنے کھڑے کیوں ہو جاتے ہیں کہ ہم کوئی ذلیل، گری ہوئی اور کم تر مخلوق ہیں.....

زہرہ غصے میں بولے جا رہی ہے.....چندا حیرت سے سن رہی ہے۔

چندا: لیکن موسیٰ تو ایسا نہیں سوچتا.....پھر تم نے اسے عزت دار ہونے کی سزا کیوں دی.....؟

زہرہ: کیونکہ وہ بھی انہی سو کالڑ معاشرے کے ٹھیکیداروں میں سے ایک خاندان کا فرد ہے.....اس کے اندر بھی وہی گھمنڈی خون دوڑ رہا ہے جو آج نہیں تو کل کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور دکھائے گا.....

چندا: تم سارے معاشرے کا انتقام اس ایک شخص سے کیوں لے رہی ہو جو تمہاری خاطر اپنا خاندان، وہ سب عزت، رتبہ اور مقام چھوڑنے کے لئے تیار ہے جو تمہارے بقول اسے ایک قدرتی اتفاق یا حادثاتی پیدائش کے بدلے ملا ہے.....

زہرہ: کیونکہ میں ان سارے برائے نام عزت داروں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ٹھکرانے کا حق صرف انہی کو حاصل نہیں ہے.....ہم جیسے بھی انہیں دھتکار سکتے ہیں.....ٹھوکر مار سکتے ہیں.....

بات ختم کر کے زہرہ غصے میں کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔چندا ایک گہرا سانس لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: اگلا دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ کی سہیلی کوکب اس سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ سکینہ جلدی سے کوکب کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لاتی ہے اور تیزی سے پلٹ کر کمرے کی کنڈی لگاتی ہے۔

کوکب: اوہو..... کیا مصیبت ہے..... دو گھڑی ٹک کر بیٹھنے تو دو مجھے..... اور نہیں تو کم از کم ٹھنڈا شربت ہی پلا دو..... پیاس سے میرے حلق میں کانٹے اگ آئے ہیں۔

سکینہ: پلا دوں گی شربت بھی..... مری کیوں جا رہی ہو..... مگر پہلے مجھے ساری خبر سناؤ.....

کوکب: خبر زبردست ہے..... تمہارے اس نہ ہونے والے کا مران کا پتہ چل گیا ہے.....

سکینہ: کیا..... واقعی.....؟..... کہاں ہے وہ بے وفا.....

کوکب: سکھر میں چھپ کر بیٹھا ہے..... سنا ہے کوئی نوکری بھی مل گئی ہے اسے وہاں..... اس کی گلی میں پرانی ہمسائی سے ساری خبر نکلوائی ہے میں نے..... اور تمہارا پیغام بھی پہنچ گیا ہے اس تک..... اب دیکھو اس کے بجھے ہوئے عشق کی چنگاری کب سلگتی ہے دوبارہ..... یا پھر وقت کی راکھ میں دب کر ہمیشہ کے لئے کوئلہ ہو چکی ہے۔

سکینہ: بکو مت..... مجھے یقین ہے وہ میرا پیغام پا کر چین اور اطمینان سے نہیں رہ پائے گا..... وہ اپنے ماں باپ کے دباؤ میں آ کر یہاں سے چلا تو گیا ہے مگر ہر پل میری یاد اسے تڑپاتی ہوگی..... سکینہ کو بھول جانا اتنا آسان نہیں ہے.....

کوکب: تھوڑی سی حیا کر لو..... شادی شدہ ہو اب تم..... اور محبوبہ کسی اور کی بیوی بن جائے تو مرد کے عشق کے شعلوں کو برف بنتے دیر نہیں لگتی..... کیا پتہ اب تک سکھر میں اُسے.....

سکینہ: (بات کاٹتی ہے) ہرگز نہیں..... کامران ایسا نہیں ہے..... اور میری شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی..... وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے جبراً اس کھونٹے سے کسی بھیڑ بکری کی طرح باندھا گیا ہے..... تم بس کسی طرح اس کا نمبر مجھے لا دو..... میں خود بات کروں گی اس سے..... اسے میری خاطر واپس آنا ہی ہوگا..... میں اپنے دشمنوں کی بربادی کے بعد زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹکوں گی..... عیسیٰ کو مجھے چھوڑنا ہی ہوگا..... یہ میرا اٹل فیصلہ ہے.....

//Cut//

Scene No # 19

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

زمین پر دسترخوان بچھا ہوا ہے اور سارے گھر والے رات کے کھانے کے لئے جمع ہیں۔ قدرت اللہ تولیے سے ہاتھ پونچھ کر نوکرانی کے حوالے کرتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ بیوی اور خدیجہ بھی اس کے بیٹھنے کے بعد اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ سکینہ بھی آتی ہے، پیر قدرت اللہ سکینہ سے پوچھتا ہے۔

قدرت اللہ: عیسیٰ کہاں ہے.....؟..... کھانے کے لئے کیوں نہیں آیا.....

سکینہ: وہ بس آ رہے ہیں تایا جان.....

اتنے میں عیسیٰ اور موسیٰ دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ موسیٰ بے دھیانی میں اپنی پرانی جگہ یعنی باپ کے داہنے ہاتھ کے طرف بڑھنے لگتا ہے۔ مگر قدرت اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی کڑک دار آواز میں چھوٹے بیٹے کو پکارتا ہے۔

قدرت: عیسیٰ.....کہاں رہ گئے ہو تم.....کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں میں.....آ کر کھانا شروع کرو.....

موسیٰ جھجک کر رُک جاتا ہے اور وہاں سے ہٹ کر پچھلی جانب جا کر بیٹھ جاتا ہے۔عیسیٰ کرب سے یہ سب دیکھتا ہے اور چپ چاپ موسیٰ کی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ خدیجہ اور ہاجرہ دُکھ سے موسیٰ کی یہ بے عزتی دیکھتی ہیں۔ جبکہ سکینہ کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔جیسے یہ سب دیکھ کر اُسے دلی سکون مل رہا ہو۔قدرت سب کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے زور سے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔

قدرت: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.....

باقی سب بھی بادلِ نخواستہ کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کی پارٹی/
سوئمنگ پول سائڈ

پارٹی زوروں سے جاری ہے۔سوئمنگ پول سائیڈ پر سارا انتظام کیا گیا ہے۔ چودھری جاوید اور ملک شہریار مہمانوں کو اٹینڈ کر رہے ہیں۔چاروں طرف زرق برق لباسوں میں اعلیٰ طبقے کی خواتین اور ہائی کلاس جنتری کے مردوں کی چہل پہل ہے۔مگر شہریار کی نظریں ابھی تک آنے والے راستے پر گڑھی ہوئی ہیں۔اور وہ بے چین دکھائی دے رہا ہے۔

شہریار: آپ نے اچھی طرح اطمینان تو کر لیا تھا ناں چودھری صاحب.....وہ آ تو رہی ہیں ناں.....مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہو رہا۔

جاوید ہنستا ہے۔

جاوید: جی بالکل ملک صاحب.....میں نے کبھی کوئی کچا کام نہیں کیا.....عشق میں انتظار کا ہی تو اصل مزہ ہے.....تھوڑا صبر سے کام لیں.....

(اتنے میں جاوید کی نظر دوسری طرف پڑتی ہے۔) یہ لیں.....وہ آ گئی آپ کی زہرہ جبیں.....

شہریار تڑپ کر اُس جانب دیکھتا ہے۔زہرہ سیاہ لباس (ماڈرن جینز/شرٹ وغیرہ) میں اندر داخل ہو رہی ہے۔شہریار کی نظریں زہرہ کے حسن پر جم جاتی ہیں۔زہرہ کی نظر شہریار سے ملتی ہے۔اُسے حیرت کا جھٹکا لگتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 8

//Cut//

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کا گھر/
پول سائیڈ پارٹی

سوئمنگ پول سائیڈ پر پارٹی زوروں سے جاری ہے۔شہریار بے چینی سے اندر آنے والے راستے پر نظر ڈالتا ہے جہاں ماڈرن سیاہ لباس میں ملبوس زہرہ اندر داخل ہو رہی ہے۔شہریار کی نظریں زہرہ کے ملکوتی حسن پر جم سی جاتی ہیں۔زہرہ کی نظر شہریار پر پڑتی ہے تو وہ چونک سی جاتی ہے۔شہریار جلدی سے زہرہ کی طرف لپکتا ہے۔چند ابھی کہیں پس منظر میں نظر آ رہی ہے۔

شہریار: آیئے آیئے..... بڑی راہ دکھائی..... کب سے میری نظریں آپ کی راہ میں پلکیں بچھائے منتظر تھیں.....

زہرہ: اچھا..... تو یہ آپ کی پارٹی ہے..... تو اتنی رازداری برتنے کی کیا ضرورت تھی.....

شہریار: دراصل مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ انکار نہ کر دیں..... میٹ ونس اگین Meet once again..... ملک شہریار.....

شہریار زہرہ کے آگے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

زہرہ ایک لمحے کو اس کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھتی ہے اور پھر ہاتھ ملا لیتی ہے۔

زہرہ: زہرہ.....

شہریار مسکراتا ہے۔

شہریار: شکر ہے آج آپ نے صحیح نام بتایا..... ویسے میں نے آپ کا نام پتہ کروا لیا تھا.....

زہرہ: مطلب آپ میری ٹوہ میں لگے ہوئے تھے۔

شہریار: جی ہاں..... معاف کیجئے گا..... میں بندہ ذرا سٹریٹ ٹائپ ہوں..... جو چیز مجھے اچھی لگے میں اس کا پتہ لگا کر ہی رہتا ہوں.....

زہرہ: گویا انسانوں کو بھی آپ چیزوں میں شمار کرتے ہیں.....

شہریار: اوہ نہیں نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا..... جسٹ اے سلپ آف ٹنگ Just a slip of tounge..... آپ تو بہت نایاب ہیں میرے لئے.....

زہرہ: تبھی آپ نے صرف ایک ملاقات کے لئے اتنی بڑی پارٹی کا انتظام کیا ہوا ہے.....

شہریار: ہاں..... یہ سب کچھ پسا ہی کے اعزاز میں ہے..... مجھے اپنی پارسائی کا دعویٰ نہیں ہے..... نہ ہی میں کوئی نیک شخص ہوں..... بہت لڑکیاں زندگی میں آئی اور گئیں..... کچھ سے دوستی رہی اور کچھ بعد میں دشمن بن گئیں..... مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں ہو رہی کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے قریب سے بھی نہیں گزری ہو گی..... ایک لمحے میں سب کو میرے لئے بہت عام کر دیا آپ نے۔

شہریار کہتا رہتا ہے..... زہرہ ہنستی رہتی ہے۔زہرہ غور سے شہریار کو دیکھتی ہے۔

زہرہ: باتیں اچھی کر لیتے ہیں آپ..... اور مجھے یقین ہے کہ باقی سبھی لڑکیوں کے ساتھ بھی یہی بات کرتے ہوں گے آپ.....

شہریار ہنس پڑتا ہے۔

شہریار: ارے نہیں..... بخدا یہ کلام صرف آپ کے لئے ہے..... میں برا ہوں..... مگر اتنا برا بھی نہیں کہ حسن کی اصلی تعظیم نہ کروں..... آپ کو اپنے مہمانوں سے ملواتا ہوں.....

شہریار زہرہ کو لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ساتھ آئی چند ادور کھڑی مرعوب نظروں سے شاندار گھر، امارت اور پارٹی کی شان دیکھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں/موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ اپنے کمرے میں بستر پر آدھا لیٹا ہوا ہے اور تکیے سے ٹیک لگائے کسی خیال میں گم ہے۔ اُسے زہرہ سے ہوئی آخری ملاقات کے دوران زہرہ کی کہی ہوئی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

Audio Flash Back

زہرہ: ہمت ہے تو..... پارسائی کا دعویٰ چھوڑ کر..... میرا دل جیت کر دکھاؤ..... میرے گھر بارات لا کر دکھاؤ.....

زہرہ کے زہر بھرے جملے موسیٰ کے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں اور وہ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔ مگر زہرہ کی باتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں.....

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: شہریار ولاز/ پارٹی۔ ڈانس فلور

Slow میوزک اور جلتی بجھتی روشنیوں کے ہجوم میں مختلف جوڑے انگریزی بیٹ پر تھرک رہے ہیں۔ انہی میں شہریار اور زہرہ بھی ہیں۔ شہریار زہرہ کی نفاست اور Steps دیکھ کر متاثر ہو کر کہتا ہے۔

شہریار: یو ڈانس ویری ویل. You dance very well..... سچ کہوں تو میں یہاں یہ سب Execpt ایکس پیکٹ نہیں کر رہا تھا..... مگر سچ کہتے ہیں لوگ..... ہمارے ملک نے کافی ترقی کر لی ہے.....

زہرہ: سب آپ جیسے مہربانوں کی مہربانی ہے..... نہ آپ لوگ اتنی ہائی کلاس پارٹیز ارینج کریں..... نہ ہم جیسوں کو یہ اونچے کلچر کے آداب سیکھنے کے لئے یہ جتن کرنا پڑیں..... ویسے اب اس شہر میں ویسٹرن ڈانس کے اچھے انسٹرکٹرز بھی با آسانی مل جاتے ہیں..... جو دوبئی کے پوش علاقوں میں بھی ڈانس کلاسز دیتے ہیں۔

شہریار: واؤ wow..... ویری امپریسو..... اور بتاؤ اپنے بارے میں..... کیا کرتی ہو دن بھر..... تمہاری پسند..... ناپسند.....

شہریار بے تکلف ہونے کے لئے آپ سے تم پر آ جاتا ہے۔

زہرہ: میرے پاس بتانے کے لئے کچھ خاص نہیں ہے..... نام آپ جانتے ہیں..... یہاں آپ کے بلاوے پر آپ کے سامنے موجود ہوں..... صبح ہونے سے پہلے جب یہ پارٹی ختم ہو گی تو پھر سے اجنبی ہو جاؤں گی..... آپ کے لئے اتنا ہی جاننا کافی ہے.....

شہریار غور سے اُسے دیکھتا ہے۔

شہریار: لیکن اگر میں تمہیں مزید جاننا چاہوں تو.....؟.....

زہرہ: آپ نے قیمت یہاں میری موجودگی اور کچھ دیر کے لئے اچھی کمپنی کے لئے ادا کی ہے.....اس میں پرسنل انفارمیشن دینے کی کوئی شرط شامل نہیں ہے.....ویسے بھی ہم جیسوں کے بارے میں کچھ خاص پتا نہیں ہوتا.....نام بدل بدل کر ہی چند چہرے ٹکرائیں گے آپ کو یہاں.....بس نام یاد کرلیں.....

شہریار: اور اگر میں دوبارہ ملنا چاہوں تو.....

زہرہ: تو دوبارہ ایسی کوئی ہائی فائی پارٹی رکھ لیجئے گا.....ویسے میری انا دوسری بار ایک ہی شخص کے بلاوے پر ذرا مشکوک اور محتاط ہو جاتی ہیں.....ہوسکتا ہے دوسری بار کوئی دوسری لڑکی آجائے.....

شہریار: تو کیا تم خود بھی مجھ سے دوبارہ نہیں ملنا چاہو گی۔

زہرہ: (زہرہ بات بناتی ہے) میں نے آپ کو بتایا ناں.....یہ میرا اختیار نہیں ہے.....یہ تھارٹی انا جی کے پاس ہے.....اور میری مرضی کی بات ہے تو میں کبھی ایسی کسی محفل میں آنا جانا نہیں چاہتی.....لیکن ضروری نہیں کہ ہم جیسا چاہیں.....سب کچھ ویسا ہی ہو.....

زہرہ خاموش ہو جاتی ہے.....شہریار اُسے غور سے دیکھ رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: رات

جگہ: شہریار ملک کا بنگلہ

پارٹی ختم ہو چکی ہے اور مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ ملک شہریار خصوصی طور پر زہرہ کو رخصت کرنے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے۔ زہرہ بیٹھ جاتی ہے اور دوسری جانب سے چند انبیٹھتی ہے۔ چند اغور سے شہریار کی یہ وارفتگی دیکھ رہی ہے۔

شہریار: بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی.....Thanks for coming.....

گاڑی چل پڑتی ہے۔شہریار کا دوست چودھری توقیر جاوید شہریار کی حرکت نوٹ کر رہا ہے کہ وہ جاتی ہوئی گاڑی کو بھی دیر تک دیکھ رہا ہے۔

توقیر جاوید: کیا بات ہے ملک صاحب.....لگتا ہے کچھ زیادہ ہی دل آ گیا ہے لڑکی پر.....

شہریار: ہاں.....کچھ خاص ہے اس میں.....،اس دنیا کی ہوتے ہوئے بھی اس دنیا کی نہیں لگتی.....نہ ہی اسے ایسی پارٹیز کا اسکارٹ Escort بننے کا شوق ہے.....،.....کسی مجبوری کے تحت برداشت کر رہی ہے یہ سب کچھ.....

توقیر جاوید: اور مجبوری کیا ہوتی ہے ملک صاحب.....اچھے اسٹیٹس اور بڑے کنکشنز کی آس میں بھیج دیتے ہیں انہیں ان کے گھر والے کیونکہ اب وہ پرانے لکھنوی دور کے بازاروں کا تصور تو رہا نہیں.....پوش ایریاز میں شفٹ ہو گئی ہیں ایسی پرانی Families.....اور پھر اوپر سے ان کی اولادیں بھی اونچی اور مہنگی یونیورسٹیز سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں.....میں بہت سی ایسی Families کو بھی جانتا ہوں کہ جن کی اولاد کو آج اپنے آباؤ اجداد کے اس پرانے پیشے کا بھی نہیں پتہ.....عجیب مشکل میں ہیں اس وقت یہ لوگ.....جو شرفاء میں شمار نہیں ہوتے مگر ان کی نئی نسل اس پرانے ناچ گانے کے پیشے کو اپنانے پر ہرگز تیار نہیں.....لہٰذا وہ خاندان، شریف اور پیشہ ور کی تکرار میں پس رہے ہیں.....

شہریار جاوید کی بات غور سے سنتا رہتا ہے مگر جواب میں کچھ نہیں کہتا۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: رات

جگہ: سڑک۔کار پارکنگ

کار کسی سڑک سے گزر رہی ہے۔اندر زہرہ اور چندا اگلی سیٹ پر خاموش بیٹھی ہیں۔مگر چندا سے زیادہ دیر خاموش نہیں رہا جاتا۔

چندا: کچھ تو بولو..... جب سے ہم پارٹی سے نکلے ہیں.....تم بالکل خاموش ہو.....

زہرہ: کیا بولوں.....اور ایسی کیا خاص بات تھی اس پارٹی میں جس کا ذکر کیا جائے.....وہی نو دولتیے.....وہی پیسے کی نمائش..... وہی بظاہر مہذب اور پڑھے لکھے شائستہ لوگ مگر وہی بھوکی اور ننگی نظریں جو ہر شریف اور ہم جیسی عورتوں کے سراپے کے آر پار ہوتی رہتی ہیں سارا وقت.....وہ موٹا سیٹھ تو اپنی بیٹی کی عمر کی گرل فرینڈ کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کتنی گندی نگاہوں سے گھور رہا تھا تمہیں اور مجھے.....،.....

چندا: ہاں بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو.....مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ ملک شہریار ذرا دیکھی ٹائپ کا بندہ ہے.....کتنی عزت سے بات کر رہا تھا.....اور تم پر تو ہزار دل وجان سے فدا تھا.....کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی اُس نے.....،.....ورنہ تم تو جانتی ہو ان سیٹھ لوگوں کو.....،.....لاکھ تہذیب کا چولا اوڑھ لیں مگر موقع ملتے ہی ٹھرک جھاڑنے سے ہرگز باز نہیں آتے.....وہ اسلم کنٹریکٹر یاد ہے ناں.....

زہرہ: (زہرہ ہنستی ہے) ہاں.....سب یاد ہے.....یہ سب کے سب اندر سے ایک جیسے بھیڑیے ہوتے ہیں.....آس پاس ان کی فرینڈز زیادہ تر بزنس کولیگز وغیرہ نہ ہوں تو وہیں ہمیں چیر پھاڑ کھائیں.....اس لئے انا جی نے کبھی ہمیں اکیلے کسی مردانہ تقریب میں بھی نہیں جانے دیا.....اور اگر انا جی کا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی ان گیدڑ رنگز Gathrings میں نہ آتی.....، تھک گئی ہوں میں اس چوہے بلی کے کھیل سے.....

زہرہ تھک کر آنکھیں بند کر لیتی ہے اور سیٹ سے ٹیک لگا لیتی ہے۔چندا کچھ کہنے لگتی ہے مگر زہرہ کو یوں تھکا ہارا دیکھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔کار سڑک پر دوڑتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن ہونے کا مونتاج

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت کہیں جانے کی تیاری میں ہے۔قریب کھڑی بیوی پریشانی سے پوچھتی ہے۔

ہاجرہ: میں تو کہتی ہوں ابھی یہ سب بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے موسیٰ کے سسرال والوں کو.....،.....تھوڑا وقت گزر جانے دیں.....حالات بہتر ہو جائیں تو میں خود مناسب موقع دیکھ کر شائستہ بہن سے بات کروں گی.....

قدرت: (تلخی سے) تمہارے لاڈلے سپوت نے بات کرنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے ہمیں.....اور پھر یہ بات تو ان سب کو بھی پتہ چل گئی ہے کہ میں نے موسیٰ کو عاق کر دیا ہے.....،.....اب وجہ جانے بغیر وہ سکون سے نہیں بیٹھیں گے.....اور یہ ان کا حق بھی ہے۔

ہاجرہ: اسی لئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ اتنی جلد بازی نہ کریں فیصلہ کرنے میں.....،..... جانے وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے.....

قدرت: تو تم کیا چاہتی ہو کہ پہلے میں سارے زمانے کو تمہارے بیٹے کی رسوائی کی خبر ہو جانے دیتا.....تب اسے عاق کرتا.....میں

نے جو کیا..... ٹھیک کیا..... اور اب موسیٰ کے سسرال والے بھی جو فیصلہ کریں..... ہمیں قبول کرنا ہوگا.....

پیر قدرت بات ختم کر کے غصے میں کمرے سے نکل جاتا ہے۔ اسی لمحے خدیجہ کمرے میں داخل ہوتی ہے جو قدرت کا آخری جملہ سن چکی ہے۔ وہ پریشانی سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: چندا اور زہرہ کا کمرہ

چندا ٹھنڈی آہ بھرتی ہے۔

چندا: کس سوچ میں پڑی ہو پیاری..... اچھا چلو اب تو اس نے تمہارا پیچھا چھوڑ ہی دینا ہے..... اتنی کڑی شرط جو رکھ دی ہے تم نے..... اس کے گھر والے کبھی راضی نہیں ہوں گے اس بات پر.....

زہرہ: (غصے سے) میں اس کے بارے میں نہیں سوچ رہی..... اور مجھ سے زیادہ تو تم اس کو یاد کر کے آہیں بھرتی ہو..... پتہ نہیں تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے.....

چندا: میں یاد کیسے نہ کروں..... اب تو ہر وقت کسی نہ کسی بہانے گھر میں اسی کا ذکر چلتا رہتا ہے..... اس کا نام سنائی دیتا ہے۔

زہرہ چندا کی بات سن کر چونکتی ہے۔

زہرہ: کیوں..... اب کیا کر دیا اس نے..... کون ذکر کر رہا تھا اُس کا.....

چندا: تھانے دار نے سپاہی بھیجا تھا..... آج پھر اسے ضمانت نامہ بھرنے اور پیشی کے لئے بلوایا ہے تھانے۔ انا جی کے لئے تھانے دار نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ تصدیق کریں کہ اس دن کے بعد سے موسیٰ نے دوبارہ ضمانت نامے کی خلاف ورزی تو نہیں کی کوئی..... ورنہ اسے خلاف ورزی کی صورت میں دوبارہ گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے.....

زہرہ: تو انا نے کیا کیا.....

چندا: کہنا کیا ہے.....؟ بس اتنا ہی کہلا بھیجا ہے کہ فی الحال موسیٰ نے دوبارہ کوئی خلاف ضمانت حرکت نہیں کی..... نہ ہی تمہاری راہ روکی ہے اس نے..... اس لئے اُمید ہے کہ آج موسیٰ کی ضمانت کی توثیق ہو جائے گی.....

//Cut//

Scene No # 8

جگہ: پولیس اسٹیشن

موسیٰ اور نامراد تھانے میں SHO کے سامنے کھڑے ہیں۔

نامراد: میں نے موسیٰ کی ضمانت تو بھر دی تھی تھانے دار صاحب..... پھر آپ نے اسے کیوں بلوایا ہے۔

SHO: یہ حفظ امن کی ضمانت ہے کوئی مذاق نہیں..... جب تک شکایت کنندہ کو اطمینان نہیں ہو جاتا اسے ہر ہفتے یہاں حاضری لگوانی ہو گی.....

نامراد: تو کیا انہوں نے دوبارہ کوئی شکایت کی ہے..... اب تو میرے دوست نے کوئی خلاف ورزی نہیں کی قانون کی.....

SHO: اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ دوبارہ ایسی حرکت نہ ہو..... ورنہ اب کی بار خلاصی نہیں ہو گی اس کی۔

موسیٰ ایس۔ ایچ۔ او کی طرف دیکھ کر بول پڑتا ہے۔

موسیٰ: خلاصی چاہتا کون ہے تھانے دار صاحب..... آپ کا بلاوہ بھی کسی کی یاد کے لئے کافی ہے..... آپ ہر ہفتے ان سے بھی تو پوچھتے ہوں گے ناں کہ میں نے پھر کوئی دست درازی تو نہیں کی.....

SHO حیرت سے موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

SHO: ہاں..... ظاہر ہے..... اس بات کی تصدیق کے لئے تو انہی سے پوچھنا پڑے گا.....

موسیٰ: تو پھر تو آپ یوں سمجھیں کہ میرا ہی بھلا کرتے ہیں آپ.....،..... اسے بھی مجھے بھولنے نہیں دیتے..... میرا ذکر بھی رہتا ہے اس کے ہاں..... آپ جیسا پیا مبر بھلا ہر کسی کو کب نصیب ہوتا ہے.....

SHO موسیٰ کی بات پر غصے سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کی بیٹھک یا
پیر فضل کا کوئی ٹھکانہ

پیر قدرت اور فضل میں بات چیت۔ فضل پریشان سا کھڑا سن رہا ہے۔

قدرت: بس..... یہ بات تھی جو اس ناخلف اولاد کی شرم میں اتنے دن تک میں نے چھپائے رکھی..... سوچا پہلے اپنی تسلی کرلوں کیونکہ اپنی تربیت پر بڑا مان تھا مجھے..... دل نہیں مانتا تھا کہ میرا خون ایسی غلطی کر بیٹھے گا اور کیچڑ میں ہاتھ ڈال دے گا..... مگر اب تو خود اس لڑکی کے گھر والوں نے باقاعدہ پولیس میں شکایت درج کروادی ہے..... اب آپ ہی بتائیں میں اسے عاق نہ کرتا تو کیا کرتا شاہ جی..... اور میری جگہ آپ ہوتے تو کیا کرتے.....؟.....

فضل: میرے تو ہوش اُڑا دیئے ہیں آپ نے یہ سب بتا کر..... موسیٰ سے تو ایسی توقع مجھے ہرگز نہ تھی..... اور پھر آپ کی تربیت..... اس پر تو کوئی بے ایمان بھی شک نہیں کرسکتا..... مگر پھر یہ سب کیسے ہوگیا.....

قدرت: انہونی کو کون ٹال سکتا ہے شاہ صاحب..... قدرت نے یہ کالک ہمارے ماتھے مَلنا تھی سو مَل دی.....،..... ستارہ میری بھی بیٹی ہے اور میں بھی اس کا برا نہیں چاہوں گا..... اب آپ کا جو فیصلہ ہوگا..... وہ ہم سب کو قبول ہوگا.....

فضل: سمجھ میں نہیں آرہا کیا کہوں..... فی الحال تو میرے حواس ہی معطل ہوگئے ہیں..... میں ستارہ کی ماں سے مشورہ کر کے کوئی جواب دوں گا..... ستارہ اور موسیٰ کی منگنی کی بات دونوں خاندانوں میں پھیل چکی ہے..... دونوں صورتوں میں بدنامی ہماری ہی ہے..... رشتہ رکھیں تو الجھن..... رشتہ توڑیں تو ہزار سوال.....

قدرت: میں خود بھی بہت الجھن کا شکار ہوں..... اور بہت شرمندہ ہوں آپ سب سے..... میں تو اسے گھر سے بھی باہر نکال پھینکتا..... مگر اس کی ماں اور چچی آڑے آگئیں..... وہ صرف ہمارا ہی نہیں..... آپ کا بھی مجرم ہے..... جو سزا تجویز کریں گے قبول ہوگی.....

فضل قدرت کی بات سن کر جواباً خاموش کھڑا پریشانی سے کچھ سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر

سکینہ کسی کام سے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی ماں خدیجہ وہاں پہلے سے کسی کام میں مصروف ہے، وہ بیٹی کو آتے دیکھ نفرت سے منہ سکیڑ کر وہاں سے اٹھ جاتی ہے۔ اور باہر جانے لگتی ہے، سکینہ ماں کی اس بے رخی پر اندر سے جل بھن سی جاتی ہے۔

سکینہ: کہاں چل دیں اماں..... میں بہت دن سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے اب بہت کترانے لگی ہو..... یہاں میں کمرے

میں داخل ہوتی ہوں..... وہاں تم اُٹھ کر چل پڑتی ہو..... ایسی بھی کیا بے رخی..... بیٹی ہوں تمہاری..... تمہی نے جنم دیا ہے مجھ کو.....

خدیجہ دھیرے سے بڑبڑاتی ہے۔

خدیجہ: کاش نہ دیا ہوتا یہ جنم میں نے..... اسی بات کا افسوس رہے گا عمر بھر..... کہ تم نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے..... پتہ ہوتا کہ آگے چل کر یہ گل کھلاؤ گی..... تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی تمہارا.....

سکینہ: (سکینہ طنز کرتی ہے) ایسا بھی کیا غصہ اماں..... اور جس کے لئے تم مجھ پر غصہ کر رہی ہو..... وہ تو کچھ بولتا ہی نہیں اب..... لگتا ہے بولتی بند ہوگئی ہے اس کی..... (سکینہ ہنستی ہے) ایک ہی جھٹکے میں ساری اکڑ نکل گئی تمہارے بھتیجے موسیٰ کی.....

خدیجہ تڑپ کر غصے میں پلٹتی ہے۔

خدیجہ: اللہ کی پکڑ سے ڈر دلڑکی..... موسیٰ اگر چپ ہے تو اس کا خدا تو دیکھ رہا ہے..... کہیں سب کچھ الٹا نہ پڑ جائے اور تمہیں معافی مانگنے کی مہلت بھی نہ ملے.....

سکینہ: (سکینہ چلاتی ہے) اور جن لوگوں نے میری زندگی برباد کی..... ان کے لئے کیا کہیں گی..... ان پر خدا کا قہر نازل نہیں ہوگا کیا.....؟..... انہیں اس وقت یہ خوفِ خدا یاد کیوں نہیں دلایا آپ نے.....،..... تب آپ کی یہ بددعائیں کیوں زبان پر نہیں آئیں..... منہ کیوں بند رہا اس وقت آپ کا جب زبردستی میرا نکاح عیسیٰ سے پڑھایا جا رہا تھا.....، ویسے سچ بتاؤ اماں..... تم میری سگی ماں ہی ہو ناں..... کہیں کسی یتیم خانے سے تو نہیں اٹھا لائیں تھی مجھے..... شک ہوتا ہے مجھے کئی بار.....

خدیجہ بیٹی کی جلی کٹی سن کر غصے میں بڑبڑاتی اور پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ سکینہ غصے میں کچھ اُٹھا کر پٹخ دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر

عیسیٰ پریشانی سے بھائی کو دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی.....؟ اماں اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوں گی..... وہ تمہاری بات ستارہ سے طے کر چکی ہیں.....

موسیٰ: یہ لوگ سمجھتے کیوں نہیں.....؟..... کیوں اس معصوم لڑکی کی زندگی بھی برباد کر دینا چاہتے ہیں اُسے میرے پلے باندھ کر.....

عیسیٰ: تم جسے بربادی کہہ رہے ہو بھائی..... انہیں شاید اسی میں تمہاری آبادی نظر آتی ہے..... اور اماں کبھی تمہاری بات کرنے زہرہ کی طرف نہیں جائیں گی..... یہ بات تو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مرتے مر جائیں گی مگر ابا کے فیصلے کے خلاف کبھی نہیں جائیں گی..... اور پھر زہرہ کے گھر..... تمہاری سوچ ہے.....؟..... ناممکن.....

موسیٰ: اسی ناممکن کو تو ممکن بنانا ہے مجھے..... اور مجھے کچھ نہیں چاہیے اماں ابا سے..... عاق تو وہ مجھے پہلے ہی کر چکے ہیں..... اگر انہیں مزید کوئی شرمندگی ہوتی ہے میرے وجود سے تو میں خود کو کہیں گم کر دوں گا..... کوئی مجھے ان کے نام سے نہیں پہچانے گا..... اپنی ہر شناخت مٹا دوں گا میں..... ختم کر لوں گا اپنی ہر پہچان.....

عیسیٰ حیرت سے بھائی کی یہ دیوانگی دیکھ رہا ہے۔

عیسیٰ: یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے بھائی..... تم اُس لڑکی کے لئے اپنا آپ مٹا دینا چاہتے ہو..... وہ جو تمہارا نام بھی نہیں سننا چاہتی..... جس نے ہر قدم پر تمہیں دھتکارا ہے.....

موسیٰ: اس نے مجھے نہیں..... میرے نام کے ساتھ جڑے اس معاشرے کے بھرم اور اونچ نیچ کے جھوٹے درجے کو دھتکارا ہے جو اس کے خیال میں مجھے عزت دار اور معتبر اور اسے نیچ اور کم تر بناتا ہے..... وہ یہ سب صرف اس لئے کر رہی ہے کہ خود کو میرے برابر ثابت کر سکے اور اگر اس کی یہی خواہش ہے تو کچھ غلط بھی نہیں ہے..... وہ چاہتی ہے کہ اگر کوئی اسے اپنائے تو سرعام اور پورے خاندان کے ساتھ مل کر اپنائے.....

عیسیٰ: اور یہ سب اتنا آسان ہے کیا.....؟ ..... بھائی تم سمجھتے کیوں نہیں..... یہ اونچ نیچ اور یہ عزت بے عزتی کے معیار ہم نے خود نہیں بنائے..... یہی صدیوں کا رواج اور چلن ہے..... یہی سکہ رائج ہے اس دنیا میں.....

موسیٰ: جانتا ہوں..... مگر وہ اس سکے کو نہیں مانتی..... دل کے بازار میں یہ سکہ کھوٹا ہے..... اور دل والے کسی رواج کو کب مانتے ہیں..... مجھے یہ آگ کا دریا پار کرنا ہی ہوگا..... تم بس دُعا کرنا میرے لئے.....

موسیٰ چلا جاتا ہے۔ عیسیٰ پریشانی سے بھائی کو دیکھتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر کمرہ/ لاؤنج وغیرہ

کزن اور ستارہ دروازے سے لگی اندر ہونے والی بات چھپ کر سن رہی ہیں۔ اندر ستارہ کے ماں باپ آپس میں بات کر رہے ہیں۔ شائستہ گھبرا کر پریشانی سے بول اُٹھتی ہے۔

شائستہ: یا اللہ..... یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ شاہ جی..... موسیٰ..... اور ایک طوائف زادی..... نہیں نہیں..... میرا دل نہیں مانتا..... موسیٰ تو بہت نیک تابعدار اور فرمانبردار بچہ ہے..... وہ بھلا ایسی حرکت کیسے کر سکتا ہے.....؟.....؟..... نہیں نہیں.....

پیر فضل: میرے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جب مجھے پیر قدرت اللہ نے یہ خبر سنائی تھی..... مگر یہی سچ ہے..... ایک باپ اپنے بیٹے کو یونہی بلاوجہ عاق نہیں کرتا..... اس کے پیچھے ضرور ایسی ہی کوئی بدنامی کی داستان ہوتی ہے۔

شائستہ: میرا تو دل دہل رہا ہے..... ہماری بیٹی کا نام جڑ چکا ہے موسیٰ کے نام کے ساتھ..... اب کیا ہوگا پیر صاحب.....

فضل: کچھ سمجھ نہیں آ رہا..... شکر کرو ابھی تک نکاح یا رخصتی تک بات نہیں پہنچی تھی..... یہ بھی قدرت اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے خود ہی بنا کچھ لگی لپٹی رکھے ہمیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا.....

شائستہ: میں ہاجرہ سے بات کروں گی..... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا..... وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے گی تو وہ ضرور مان جائے گا..... موسیٰ اپنی ماں کی کوئی بات نہیں ٹالتا..... بہت محبت کرتا ہے وہ اپنی ماں سے.....

فضل: تم بات کر کے دیکھو..... مگر ایک بات تو طے شدہ ہے کہ موسیٰ کو اب اس گھر میں وہ مقام اور عزت ملنا محال ہے جو پہلے خاندان کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے اُسے حاصل تھی..... سارے انتظامات وہ پہلے ہی عیسیٰ کے حوالے کر چکے ہیں..... اب ہمیں صرف یہ طے کرنا باقی ہے کہ ہم موسیٰ کے پلٹ آنے کی صورت میں بھی کیا اپنی بیٹی کو ایسے شخص کے ساتھ رخصت کرنا چاہیں گے جس کو خود اس کا باپ قبول کرنے پر تیار نہیں ہے..... ایسے میں ایک بے چاری ماں بھلا کر بھی کیا سکتی ہے.....

شائستہ پریشانی سے سر پکڑ لیتی ہے۔ دروازے کے ساتھ لگی ستارہ بھی پریشان ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر/ ماں کا کمرہ

موسیٰ اور ماں کے درمیان بات چیت

ماں موسیٰ کی بات سن کر گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ماں: میں کچھ نہیں کر سکتی موسیٰ..... تیرا تو دماغ چل گیا ہے..... کیوں اس بڑھاپے میں اپنی ماں کو گھر سے نکلوانا چاہتا ہے..... تیرے ابا نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا..... پھر نہ میں رہوں گی باقی..... نہ تُو..... مت امتحان لے اپنی ماں کا بار بار..... میری بات مان..... نکال دے اس لڑکی کا خیال اپنے دل سے.....

موسیٰ: (موسیٰ دھیرے سے مسکراتا ہے) دل کوئی ابا جان کا کمرہ تو ہے نہیں اماں..... جہاں سے جب جی چاہا..... جسے چاہا..... نکال دیا گیا..... یہ نکالنے اور بے دخل کرنے کا ہنر تو پیر قدرت اللہ کو ہی بہت اچھی طرح آتا ہے.....

ماں: (ماں ڈانٹتی ہے) موسیٰ..... ذرا لحاظ کر..... باپ کا نام ایسے لیتا ہے کوئی..... یاد رکھ..... بیٹے اور شوہر میں سے کسی ایک کو چننے کا موقع آیا تو تیری ماں اپنے سر کے سائیں کے آگے ہار جائے گی.....

موسیٰ: جانتا ہوں اماں..... ابا کے سامنے تیرے نزدیک تیرے بیٹے کی کوئی اہمیت نہیں ہے..... مگر میں اس وقت پیر قدرت اللہ کی گھر والی سے نہیں..... اپنی ماں سے کچھ مانگنے آیا ہوں..... میری یہ درخواست مان لے اماں..... پھر کبھی زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگوں گا..... تیری قسم.....

موسیٰ ماں کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے..... ماں بیٹے کی التجا پر روہانسی ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

ہاجرہ: ساری عمر تُو نے کبھی کسی کھلونے کی بھی فرمائش نہیں کی تو آج کیوں ایسی فرمائش کر رہا ہے جو تیری ماں کے بس میں ہی نہیں..... میرا دل کٹ رہا ہے تیرے لئے موسیٰ..... کاش تو مجھ سے میرا سارا جہاں مانگ لیتا..... پر یہ نہ مانگتا جو تو مانگ بیٹھا ہے.....

موسیٰ: بچپن سے لے کر آج تک میں نے شاید اسی لئے تجھ سے یا ابا سے کچھ مانگا نہیں تھا اماں..... کہ شاید مجھے آج کے دن اپنی ہر پسند کے کھلونے کے بدلے یہ دل کی خوشی مانگنا تھی تم دونوں سے..... اب تو دے..... یا نہ دے..... یہ تیری مرضی ہے..... تجھ سے پھر بھی کبھی گلہ نہیں کروں گا.....

موسیٰ دکھی اور پریشان سا وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہے..... ماں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کا ہوا میں اُٹھا ہاتھ اُٹھا ہی رہ جاتا ہے۔ موسیٰ چلا جاتا ہے۔ ماں بیٹھی روتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: شام سے رات ڈھلنے کا مونتاج

جگہ: ستارہ کا گھر/ چھت

ستارہ اپنی چھت پر پریشان سی ٹہل رہی ہے۔ اس کے کانوں میں آج دن میں اس کے باپ اور ماں کے درمیان ہوئی بات چیت کے جملے گونج رہے ہیں۔

F/B/ Audio

پیر فضل: ایک باپ اپنے بیٹے کو یونہی عاق نہیں کرتا.....

ستارہ پریشانی سے ٹہلتی رہتی ہے۔

دوسرا جملہ پیر فضل Audio: اب ہم نے یہ طے کرنا ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو ایسے شخص کے ساتھ رخصت.....

ستارہ کی پریشانی بڑھتی جارہی ہے۔اتنے میں اس کی کزن مریم.....اوپر چھت پر اسے تلاش کرتی ہوئی آجاتی ہے۔

مریم/کزن: یہ لو.....تم یہاں چھپی رہی ہو.....اور میں نے تمہاری تلاش میں سارا گھر چھان مارا ہے.....

ستارہ: اندر کمرے میں بہت گھٹن محسوس ہورہی تھی.....اس لئے اوپر چلی آئی.....مگر لگتا ہے آج فضا میں بھی وہی حبس ہے۔

کزن مریم: حبس فضا میں یا کمرے میں نہیں..... یہ گھٹن یہ حبس اپنے اندر جمع کرلیا ہے تم نے.....آخر یوں پریشان ہونے اور خود کو ہلکان کرنے کا کیا فائدہ ہے.....کیا اس سے مسئلہ حل ہوجائے گا.....

ستارہ: (ستارہ پھٹ پڑتی ہے) تو پھر تم ہی بتاؤ.....میں کیا کروں.....میں تو اتنی بے بس ہوں کہ میرے دل میں جو کچھ ہے اسے اماں ابا کے سامنے زبان پر بھی نہیں لاسکتی.....کتنی مجبور اور کتنی بے اختیار ہوں میں.....

مریم جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے گلے لگالیتی ہے۔

مریم: اوہو.....تم رو کیوں رہی ہو.....تمہیں پتہ ہے ناں، میں بچپن سے تمہارے آنسو دیکھ کر خود بھی رو پڑتی ہوں.....تمہاری ماموں زاد نہیں بلکہ تمہاری سگی بہن سے بھی بڑھ کر ہوں میں.....چپ ہوجاؤ پلیز.....سب ٹھیک ہوجائے گا.....

ستارہ: میرا دل بہت گھبرا رہا ہے مریم.....کسی طرح میری موسیٰ سے ایک ملاقات کروادو.....میں خود اس سے یہ بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ میرے اتنی سالوں کی عبادت، ریاضت اور دعاؤں کا یہ صلہ ہے کیا.....؟.....اس کے دل میں کوئی اور کیسے گھر کرسکتی ہے.....اس کے دل پر تو صرف میرا اختیار ہے.....وہ مجھے کیسے اگنور کرسکتا ہے.....میری تڑپ اور میری آہیں اتنی بے کار تو نہیں ہوسکتیں.....کبھی تو کوئی آہ اس کے دل تک بھی پہنچی ہوگی.....کبھی تو وہ بھی تڑپا ہوگا میرے لئے.....

ستارہ روتی رہتی ہے۔مریم بھی روہانسی ہوجاتی ہے۔

مریم: میں کچھ کرتی ہوں تمہاری ملاقات کے لئے.....مگر پہلے چپ ہوجاؤ خدا کے لئے.....یہ آنسو بچا کر رکھو.....انہیں یوں ضائع نہ کرو.....سب ٹھیک ہوجائے گا.....پلیز.....

ستارہ روتی رہتی ہے.....مریم اسے تسلیاں دیتے دیتے خود بھی رو پڑتی ہے۔

//Cut//

وقت: دن ہونے کا مونتاج

جگہ: پیر قدرت/موسیٰ کا گھر

کاشانہ پیراں۔آؤٹر

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن/صبح

جگہ: ہاجرہ کا کمرہ

ہاجرہ اپنے کمرے میں جائے نماز بچھائے اس پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے۔وہ نماز پڑھ کر سلام پھیرتی ہے اور اپنی بڑی سی لکڑی کی تسبیح اُٹھا کر تسبیح پھیرنا شروع کردیتی ہے۔عیسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ماں کو دعا پڑھتا دیکھ گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر واپس پلٹنے لگتا ہے۔ماں اُسے آواز دے کر روکتی ہے۔

ہاجرہ: عیسیٰ.....رُک.....میری بات سن کر جانا.....

عیسیٰ رُک جاتا ہے۔ہاجرہ تسبیح/دعا ختم کرکے بیٹے پر پھونکتی ہے اور جائے نماز کا کونہ موڑ کر بیٹے کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے۔اور اسے دیکھتی رہتی ہے۔

عیسیٰ: کیا بات ہے اماں..... میری آنکھوں میں کیا تلاش کر رہی ہو.....

ماں: آنکھوں میں نہیں..... تیرے دل کے اندر جھانک رہی ہوں..... تجھے سب پتہ تھا ناں..... پہلے دن سے.....

عیسیٰ: (عیسیٰ نظر چراتا ہے) پتہ تو تمہیں بھی تھا اماں..... مگر تم بھی اسی وجہ سے چپ رہیں..... جس وجہ سے میں نے اپنی زبان بند رکھی..... اور ہم دونوں کی خاموشی کی وجہ ایک ہی ہے..... موسیٰ بھائی کی محبت.....

ماں: ہاں..... مگر آج وہی بیٹے کی محبت ایک ماں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو گئی ہے عیسیٰ..... موسیٰ نے بڑی کٹھن فرمائش کر دی ہے اپنی ماں سے.....

عیسیٰ: بھائی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے اماں..... تم اسے ہمیشہ تنگ کرتی تھیں ناں کہ وہ لڑکی کے نام سے بھی دور بھاگتا ہے..... شرماتا ہے..... اور دعا دیتی تھیں کہ کوئی تو ہو جو موسیٰ بھائی کے دل میں اتر جائے..... تو دیکھو..... آج تمہاری وہی دعا قبول ہو گئی.....

ماں: دعا نہ کہو اُسے..... میری دعا تو میرے ہی بیٹے کے حق میں بددعا بن گئی..... مجھے کیا پتہ تھا کہ کبھی کبھی دعائیں یوں پلٹ کر بھی رنگ لاتی ہیں..... مجھے بتا عیسیٰ..... کیا وہ لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ اس نے میرے موسیٰ کی زندگی سے باقی ہر رنگ دھو ڈالا ہے.....؟ کیسے کیا اس نے یہ سب کچھ..... میرا موسیٰ تو کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتا تھا.....

عیسیٰ: بس اماں..... اُٹھ گئی بھائی کی نظر..... اور ایسی اُٹھی کہ بھائی کو ہی اندر سے جلا کر خاک کر ڈالا.....

ماں: یہی تو میں دیکھنا چاہتی ہوں..... کیسی چنگاری سلگائی ہے اس نے میرے بیٹے کی زندگی میں..... مجھے بتا عیسیٰ..... رہتی کہاں ہے وہ..... ٹھکانہ کہاں ہے اُس کا.....

عیسیٰ ماں کی بات پر گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: تم اس کا پتہ کیا کرو گی اماں.....

ماں: تم نہ گھبراؤ..... یہ پتہ ایک ماں پوچھ رہی ہے..... ایک پیرنی نہیں.....

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر۔ انا کا کمرہ

زہرہ کچھ اُلجھن زدہ، کچھ غصے میں انا کے کمرے میں داخل ہوتی ہے جہاں چندا پہلے سے انا کے پاؤں دبا رہی ہے۔

زہرہ: یہ ملک شہریار کا مینیجر پھر کیوں آیا تھا انا..... تم اسے منع کیوں نہیں کرتیں..... تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایک دو بار سے زیادہ ایک ہی جگہ سے بلاوے آنے لگ جائیں تو سمجھو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے.....

انا غصے سے چندا کو دیکھتی ہے جو جلدی سے نظر چرا لیتی ہے، انا اُسے ڈانٹتی ہے۔

انا: تیرے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہ پڑے گی.....

چندا: قسم لے لو انا جی جو میری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا ہو..... زہرہ نے خود دیکھ لیا ہوگا اسے جاتے ہوئے..... وہ آتا بھی تو کسی زلزلے کی طرح ہے..... سارے زمانے کو خبر ہو جاتی ہے پل بھر میں.....

زہرہ: انا جی..... یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے..... وہ کس لئے آیا تھا یہاں.....

انا: اے لڑکی..... اب ہم کسی کو آنے جانے سے تو نہیں روک سکتے..... آیا تھا کوئی غرض لے کر.....

زہرہ: مگر میں اب ملک شہریار کے کسی بلاوے پر نہیں جاؤں گی.....

انا: اس بار وہ تمہیں نہیں بلا رہا..... خود آنا چاہتا ہے یہاں.....

زہرہ: (حیرت زدہ) ملک شہریار..... خود آنا چاہتا ہے..... یہاں.....

انا: ہاں..... یہی بتانے کے لئے آیا تھا اس کا مینیجر.....

زہرہ: مگر کس لئے.....

انا: یہ تو اب اس کے آنے پر ہی پتہ چلے گا.....

زہرہ: مگر کیوں..... اور تم نے ہاں بھی کر دی.....

انا: نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی..... شہر کا اتنا بڑا ارب پتی بزنس مین ہماری اس کٹیا میں آنا چاہے تو کون روک سکتا ہے اُسے..... اور پھر یہ تو ہماری عزت افزائی ہے..... ویسے بھی میں نے بڑی تعریف سنی ہے اس کی آس پاس سے..... کہ بہت پڑھا لکھا سلجھا ہوا اور تمیز دار بندہ ہے..... آنے دو اُسے..... مدعا بھی پتہ چل جائے گا.....

زہرہ انا کی بات سن کر مزید اُلجھن میں پڑ جاتی ہے اور گھور کر چندا کی طرف دیکھتی ہے۔

چندا: مجھے کیا دیکھ رہی ہو..... میں نے یہ ساری تعریفیں نہیں کی ہیں ملک صاحب کی انا جی کے سامنے..... یہ تو وہ چودھری صاب اور یاسین صاب کی بات کر رہی ہیں جنہوں نے حوالہ دیا تھا شہریار صاب کا..... میں نے تو بس یہ کہا ہے کہ اس کا بنگلہ بڑا شاندار ہے..... کسی محل جیسا..... جس میں ملک شہریار خود کسی بادشاہ کی طرح رہتا ہے..... بس..... اتنا ہی کہا ہے قسم سے.....

زہرہ غصے میں وہاں سے پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

جگہ: ریلوے اسٹیشن۔کراچی/
لاہور یا کوئی بڑا شہر

کسی بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی آ کر لگتی ہے اور اس میں سے سکینہ کا پرانا/ ایکس کامران نکلتا ہے۔ پلیٹ فارم پر پہلے سے اس کا دوست اس کا انتظار کر رہا ہے۔ کامران کو دیکھ کر وہ آگے بڑھ کر جلدی سے اس سے ملتا ہے۔

دوست: تو تم نے فیصلہ کر ہی لیا واپس آنے کا.....

کامران: ہاں..... آنا تو تھا ہی..... میں نے سوچا کہ وقت گزرنے سے پہلے لوٹ آؤں.....

دوست: مگر تمہارے گھر والے..... کیا وہ بھی تمہارے آنے پر خوش اور رضامند ہیں.....

کامران: گھر والوں کو بھی منا لوں گا..... لیکن اگر اب بھی میں نہ آتا تو خود کو کبھی منہ نہ دکھا پاتا..... سکینہ نے بڑے مان سے مجھے آواز دی ہے.....

دوست: بہت احتیاط سے میرے دوست..... وہ اب کسی کی بیوی ہے..... تمہارا اس پر نہ کوئی حق ہے..... اور نہ اختیار..... کہیں خود کو کسی بڑی مشکل میں نہ پھنسا لینا.....

کامران: اچھا تم کیا یہ ساری باتیں اسی پلیٹ فارم پر ہی کر لو گے..... چلو نکلو اب یہاں سے..... گھر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں.....

دوست: چلو ٹھیک ہے..... اب آ ہی گئے ہو تو خوش آمدید.....

دوست کامران کا بیگ اٹھا لیتا ہے۔ دونوں ہنس کر چل پڑتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں/موسیٰ کا گھر

پیر قدرت کہیں جانے کی تیاری میں ہے۔ بیوی کسی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے۔

ہاجرہ: آپ کی واپسی کب تک ہو جائے گی پیر صاب.....

قدرت چونک کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: کیوں..... خیر تو ہے.....؟ کوشش کروں گا کہ رات ہونے سے پہلے وہاں سے نکل آئیں..... دو تین گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے..... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو.....؟

ہاجرہ: ویسے ہی..... میں نے سوچا تھا کہ آج پیر بخاری کے مزار پر جا کر منت کی چادر چڑھاؤں عصر کے بعد..... اس گھر پر آئی آفتوں کا صدقہ بھی دیتی آؤں گی.....

قدرت: اگر اپنے بیٹے کے کرتوتوں کے لئے کوئی منت مانگی ہے تو نہ جاؤ..... کچھ ناخلف منتوں سے بھی نہیں سنبھلتے.....

ہاجرہ: جلدی آ جاؤں گی..... اگر آپ کی اجازت ہو تو۔

قدرت: ٹھیک ہے..... چلی جانا..... مگر موسیٰ کے ساتھ نہیں..... میں نہیں چاہتا کہ اس کے قدم بھی ایسی عظیم ہستیوں کے صحن میں پڑیں..... تم عیسیٰ کو ساتھ لے جانا..... ویسے بھی آج میں یہاں نہیں ہوں گا تو وہ فارغ ہوگا.....

ہاجرہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر قدرت سنی ان سنی کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

عیسیٰ اور ماں میں بات چیت..... عیسیٰ کی ماں عیسیٰ سے کہتی ہے۔

ہاجرہ: چلو..... میں تیار ہوں.....

عیسیٰ: ایک بار پھر سوچ لو اماں..... وہ جگہ تمہارے جانے کی نہیں ہے.....

ہاجرہ: سوچ میں پڑ گئی تو قدم اُٹھ نہیں پائیں گے..... مجھے مزید کسی سوچ کے امتحان میں مت ڈال عیسیٰ..... لے چل مجھے..... تیرے ابا کے آنے سے پہلے ہمیں واپس بھی لوٹنا ہے..... میں نے مزار پر منت چڑھانے کا بہانہ کیا ہے تیرے ابا سے۔

عیسیٰ: ابا سے ڈرتی بھی ہو..... اور اتنا بڑا فیصلہ بھی کر لیا.....

ہاجرہ: ڈر اور پیار میں جیت ہمیشہ پیار کی ہوتی ہے پگلے..... اور موسیٰ سے مجھے زیادہ پیار ہے شاید..... میں جانتی ہوں..... میرے بچے کی تڑپ کا علاج اسی کے پاس ہے..... چل کر علاج ڈھونڈوں گی اس کا.....

عیسیٰ ماں کی بات پر خاموش ہو جاتا ہے اور دونوں باہر کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ ان کے فریم آؤٹ ہونے کے بعد سکینہ فریم ان ہوتی ہے اور انہیں یوں چھپ کر جاتے دیکھ خود ہی سے بڑبڑا کر کہتی ہے۔

سکینہ: یہ ماں بیٹا آج کہاں چل دیئے..... تائی جان کو تو کسی منت کے چڑھانے پر جانا تھا..... مگر چراغ جلنے سے پہلے یہ کون سا مزار ہے جہاں منت کا چڑھاوا چڑھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی گلی

عیسیٰ کسی بڑی کار میں ماں کو لیے زہرہ کی گلی میں داخل ہوتا ہے۔کار کے پردے شیشوں کو ڈھکے ہوئے ہیں۔گلی والے حیرت سے اس گاڑی کو دیکھتے ہیں۔ہاجرہ کار کے اندر بیٹھی پردے کی اوٹ سے گلی کا ماحول دیکھتی ہے۔اور اس کے سینے سے ایک لمبی آہ نکل جاتی ہے۔خود ہاجرہ نے بھی سفید عبایا اور سفید نقاب سے خود کو چھپا رکھا ہے۔گاڑی زہرہ کے دروازے پر جا کر رک جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

گرو(زہرہ کا ڈانس انسٹرکٹر) گھبرایا ہوا دوڑتا لتا جی کے کمرے میں آتا ہے۔

گرو: وہ.....وہ آئی ہیں.....

لتا: کون آیا ہے گرو جی.....اور آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں.....

اتنے میں ہاجرہ پورے پردے میں کمرے کے دروازے پر آ کر آواز لگاتی ہے۔

ہاجرہ: کیا میں حاضر ہو سکتی ہوں۔

لتا چونک کر پیرنی کو دیکھتی ہے اور گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔مگر اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ کچھ سوچ رہی ہے۔اتنے میں چندا گھبرائی ہوئی اور بوکھلائی سی تیز تیز سانسیں لئے اندر کمرے میں آتی ہے۔زہرہ چونک کر اُسے دیکھتی ہے۔

زہرہ: تمہاری ہوائیاں کیوں اُڑی ہوئی ہیں.....

چندا: تم سنو گی تو تمہارے ہاتھوں کے طوطے بھی اُڑ جائیں گے.....صرف طوطے کیا، کبوتر مینا، فاختہ.....کچھ بھی نہیں بچے گا.....

زہرہ: کیا اول فول بک رہی ہو.....سیدھی طرح کیوں نہیں کہتی کیا بات ہے.....

چندا: تو سیدھی طرح کہتی ہوں.....باہر وہ آئی ہیں.....

زہرہ: وہ کون.....

چندا: موسیٰ کی ماں جی.....

یہ سنتے ہی زہرہ کے ہاتھ سے کنگھا نیچے گر جاتا ہے اور وہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 9

//Cut//

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

چندا زہرہ کو آ کر بتاتی ہے کہ موسیٰ کی ماں ان کے گھر آئی ہے تو یہ سن کر گھبراہٹ میں زہرہ کے ہاتھ سے کنگھا نیچے گر جاتا ہے اور وہ ڈر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

زہرہ: کیا.....تم اپنے ہوش میں تو ہو.....وہ یہاں کیسے آ سکتی ہیں.....

چندا: ہوش تو انہوں نے ہم سب کے اُڑا کر رکھ دیئے ہیں۔ یہ بڑی لمبی کار میں آئی ہیں.....ساری گلی میں چرچا ہے.....

زہرہ: ساتھ کون آیا ہے ان کے.....؟.....موسیٰ.....

چندا: پتہ نہیں.....مگر جو بھی آیا ہے وہ اندر نہیں آیا.....یار یہ موسیٰ تو واقعی اپنی دھن کا پکا نکلا.....کیا کمال بندہ ہے یار.....دبنگ.....فنٹاسٹک.....

زہرہ پریشانی سے چندا کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: ابھی کہاں ہیں وہ لوگ.....

چندا: انا خاطر داری کر رہی ہیں.....ویسے سچ ہے.....ہوش تو انا جی کے بھی اُڑ گئے ہیں.....کیا بارعب خاتون ہیں.....کیا نورانی چہرہ ہے قسم سے.....

زہرہ پریشان کھڑی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: ڈرائنگ روم وغیرہ

انا کچھ پریشان اور الجھن زدہ سی ابھی تک ویسے ہی اپنی جگہ کھڑی ہے۔

انا: مجھے کہنا تو نہیں چاہیے.....مگر یہ جگہ آپ کے آنے کے قابل نہیں.....ہم سیاہ پوش لوگ ہیں.....کوئی سفید براق حجاب والی اس دہلیز کو پار کرے تو پوشاک پر داغ لگتے دیر نہیں لگتی.....

ہاجرہ: آنا پڑا.....شرط ہی ایسی لگا دی تھی کسی نے.....ہمارے پیارے جب کوئی شرط رکھ دیں تو شرطوں پر پورا اُترنا ہی پڑتا ہے.....

انا: (انا حیرت سے دیکھتی ہے) کس نے شرط رکھی؟

ہاجرہ: ایک بیٹے نے ماں کے لئے شرط رکھ دی ہے.....ماما کی کسوٹی کو پرکھنے کی شرط لگا دی ہے.....اور یہاں ایک ماں اس کسوٹی پر پورا اُترنے آئی ہے.....

انا: اب یہاں تک آ ہی گئی ہیں تو اپنا مقصد بھی بیان کر دیں.....

ہاجرہ: دیکھنا چاہتی ہوں اُسے..... جس نے میرے بیٹے کو سب کچھ بھلا دیا ہے..... ہم مائیں بیس (20) پچیس سال بڑا کر کے اپنے بیٹوں کو جانے کتنے سبق سکھاتی ہیں..... مگر کوئی ایک ایسی آتی ہے جو بیس پچیس دن کے اندر ان بیٹوں کو ہمارے سارے سبق بھلا دیتی ہیں..... میں بھی اسے دیکھنے آئی ہوں جس نے میرے بیٹے کو مجھی سے سیکھے وفا کے سارے سبق بھلا دیئے ہیں.....

اتنے میں زہرہ کمرے میں داخل ہوتی ہے، اس کے پیچھے چندا بھی ہے۔

زہرہ: انا جی..... آپ نے مجھے بلایا تھا.....

ہاجرہ کی زہرہ پر نظر پڑتی ہے۔ وہ چند لمحے غور سے زہرہ کو دیکھتی رہتی ہے اور پھر قریب آ کر پوچھتی ہے۔

ہاجرہ: تو تم ہو زہرہ..... موسیٰ نے جو کچھ کہا تھا..... تم اس سے بڑھ کر ہو..... موسیٰ کا تصور نہیں۔ تم کسی کی بھی یادداشت بھلا سکتی ہو.....

زہرہ: (زہرہ حیرت سے دیکھتی ہے) جی.....

ہاجرہ: میں موسیٰ کی ماں ہوں..... تمہارا دم بھرنے سے پہلے اس کا دم مجھی میں اٹکا رہتا تھا.....

زہرہ سرد لہجے میں پوچھتی ہے۔

زہرہ: جی فرمائیں..... کیا کر سکتی ہوں میں آپ کے لئے.....

ہاجرہ: میرے لئے نہیں..... میرے بیٹے کے لئے کچھ کر دو.....

زہرہ: (حیرت سے) کیا.....؟ میں کیا کر سکتی ہوں موسیٰ کے لئے.....

ہاجرہ: (ہاجرہ غور سے زہرہ کو دیکھتی ہے) اُس کے دل سے نکل جاؤ.....

زہرہ: (حیرت سے) جی.....

ہاجرہ: ہاں..... بولو..... کر سکتی ہو میرا یہ کام..... میں جانتی ہوں کہ تمہارا پیشہ دلربائی ہے..... دلوں کو مٹھی میں کرنے کا فن سکھایا گیا ہے تمہیں..... دل توڑنا تمہارا شیوہ نہیں ہے..... مگر اس بار دل توڑنے کے لئے تمہیں زیادہ بڑا انعام ملے گا..... جتنا سوچ سکتی ہو اس سے بھی زیادہ.....

زہرہ ہاجرہ کی اس کڑوی بات پر غصے سے اسے دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران اپنے گھر میں ماں باپ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ بہن چائے لا کر دیتی ہے۔

باپ: پھر بھی تمہیں اتنی لمبی چھٹی لے کر نہیں آنا چاہئے تھا..... ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو تمہاری نوکری پکی ہوئی تھی سکھر میں..... شروع میں ہی اتنی چھٹیاں کرو گے تو اگلے زیادہ عرصہ تمہیں کام پر نہیں رکھیں گے.....

کامران کی ماں بیٹے کی طرف داری کرتی ہے۔

کامران: کیا ہو گیا ہے آپ کو..... اس کو سانس تو لینے دیں..... آتے ہی آپ نے سوالوں کی بھرمار کر دی ہے..... جاؤ بیٹا تم جا کر نہا لو..... میں تمہارے لئے تازہ چائے بھجواتی ہوں..... جا سلمیٰ..... بھائی کے کپڑے استری کر دے.....

کامران اُٹھ کر چلا جاتا ہے۔ باپ پریشانی سے اُسے دیکھ رہا ہے۔

سلمیٰ: (بہن بھائی سے کہتی ہے) چلو بھائی..... بتاؤ کون سا جوڑا استری کرنا ہے.....

ماں: کمال کرتے ہیں آپ کامران کے ابا..... جوان بیٹے کا یوں استقبال کرتا ہے کوئی..... وہ کیا سوچے گا کہ اس کے ماں باپ ہی اس کے گھر آنے پر خوش نہیں ہیں.....

باپ غصے اور پریشانی سے کہتا ہے۔

باپ: ہاں..... یہی سچ ہے..... میں خوش نہیں ہوں اس کے گھر آنے پر..... کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ کیوں واپس آیا ہے..... لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے..... مجھے اس کی زندگی پیاری ہے..... اسی لئے پریشان ہوں اس کے آنے پر.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر/انا کا کمرہ

زہرہ اور ہاجرہ میں بات جاری ہے۔انا غصے سے ہاجرہ سے کہتی ہے۔

انا: کوئی بھی بولی لگانے سے پہلے اس بات کا دھیان رکھیں پیرنی جی کہ زہرہ چل کر آپ کے بیٹے کے پاس نہیں گئی تھی..... آپ کا بیٹا آیا تھا میری زہرہ کے پیچھے..... وہ تو اس سے نکاح کے درپے تھا..... اغواء کر کے لے گیا تھا وہ اسے..... زہرہ ہی تیار نہ ہوئی ورنہ.....

ہاجرہ: (ہاجرہ بات کاٹ دیتی ہے) جی..... سب جانتی ہوں..... اور مانتی ہوں کہ غلطی میرے موسیٰ کی ہے..... سارا قصور ہی اس کا ہے..... اور آپ کی زہرہ کو دیکھنے کے بعد مجھے موسیٰ کی یہ حالت کچھ بے جا بھی محسوس نہیں ہوتی..... اسی لئے تو آئی ہوں یہاں..... سوالی بن کر..... مجھے میرا موسیٰ لوٹا دو..... منت کرتی ہوں میں تمہاری.....

ہاجرہ زہرہ کی طرف پلٹ کر کہتی ہے۔زہرہ تلخ لہجے میں جواب دیتی ہے۔

زہرہ: میں نے کب اسے باندھ رکھا ہے..... میری طرف سے تو اسے ہمیشہ دھتکار ہی ملی ہے.....

ہاجرہ: باندھ ہی تو رکھا ہے کسی ان دیکھی زنجیر سے..... موسیٰ کبھی تمہاری پہلی جھلک سے ہی نہیں نکل پایا..... کتنی حیرت کی بات ہے..... عام لوگ روپ، چہرے کی چمک اور حسن دیکھ کر کسی پر ریجھتے ہیں..... مگر میرا بیٹا تمہارے پردے، نقاب اور حجاب پر مرمٹا..... وہ تمہارے پیچھے نہیں..... بلکہ اس باپردہ زہرہ کے پیچھے آتا ہے جسے اس نے پہلی بار بس میں دیکھا تھا..... مجھے اس کے چھوٹے بھائی نے بتائی ہے پوری کہانی.....

زہرہ: (زہرہ کا لہجہ مزید تلخ ہو جاتا ہے) تو اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں..... اب تو آپ کے بیٹے کو میری ساری حقیقت پتہ چل چکی ہے کہ میں اس کی طرح کسی عزت دار خاندان سے نہیں ہوں..... اب تو اس کی آنکھوں سے پٹی اُتر جانی چاہیے.....

ہاجرہ: عشق کی پٹی اتارے نہیں اُترتی..... موسیٰ اپنی دھن کا بہت پکا ہے..... ایک بار جنون سر پر چڑھ جائے تو پھر وہ کسی کی نہیں سنتا..... مگر تمہاری سنے گا..... ہم نے اس کے پلے کی لڑکی سے رشتہ طے کر دیا ہے اس کا..... تم اگر مجھے ذرہ بھی مان دے سکتی ہو تو ایک آخری بار موسیٰ سے مل کر اسے قائل کر دو کہ اس لڑکی سے نکاح کر لے اور تمہیں ہمیشہ کے لئے بھول جائے.....

زہرہ کو پھر ایک جھٹکا لگتا ہے۔

زہرہ: میں.....؟ مگر میں اسے کیسے قائل کر سکتی ہوں..... اگر وہ اپنی ماں کی نہیں سن رہا تو میری بات کیوں مانے گا بھلا.....؟ مجھے کوئی حق حاصل نہیں.....

ہاجرہ زہرہ کی بات کاٹ دیتی ہے۔

ہاجرہ: وہ سارے حق تمہیں سونپ چکا ہے..... اسی لئے تو میں تمہارے پاس آئی ہوں..... صرف ایک تمہی ہو جس کی وہ سنے گا.....

زہرہ: لیکن میں.....

ہاجرہ: ایک ماں تمہارے در پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر آئی ہے..... خالی ہاتھ لوٹا دو گی مجھے تو عورت پر سے عورت کا اعتماد مٹ جائے گا..... چاہو تو بدلے میں میری جان مانگ لو..... ایک لمحہ دیر نہیں کروں گی.....

اتا ہاجرہ کی بات پر چونکتی ہے۔ ہاجرہ کی بات پر زہرہ پریشانی سے اتا کی طرف دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور/

پرانا ایرانی ٹائپ جگہ

موسیٰ ہوٹل کے کیبن میں بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے چائے کا کپ پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ڈور کاؤنٹر پر کچھ چہل پہل ہے۔ موسیٰ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتا ہے اور اُٹھنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتنے میں سیاہ برقعے میں ملبوس، ایک لڑکی اندر داخل ہوتی ہے اور کاؤنٹر پر کچھ پوچھتی ہے۔ کاؤنٹر والا دور بیٹھے موسیٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برقعے والی موسیٰ کی طرف بڑھتی ہے اور قریب پہنچ کر سلام کرتی ہے اور اپنے چہرے سے نقاب اُتارتی ہے۔ یہ لڑکی مریم ہے۔

مریم: معذرت چاہتی ہوں..... مجھے کالج سے نکلنے میں کچھ دیر ہو گئی..... میں مریم ہوں..... اُمید ہے پہچان لیا ہو گا آپ نے.....

موسیٰ: ہاں..... مگر تم..... یہاں..... سب خیر تو ہے..... اور مجھے کیوں بلایا ہے.....

مریم: مجھے اور کوئی جگہ سمجھ ہی نہیں آئی..... کالج کے قریب یہی ٹھکانہ ایسا ہے جہاں ہم سہیلیاں کبھی کبھار کچھ دیر کے لئے چائے یا آئسکریم کے لئے آ جاتی ہیں..... سوچا آپ کو بھی یہیں آنے کا کہہ دوں.....

موسیٰ: ہاں مگر ایسی کیا ایمرجنسی تھی.....

مریم غور سے موسیٰ کو دیکھتی ہے۔

مریم: ایمرجنسی ہی تو پیدا کر دی ہے آپ نے..... سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے.....

موسیٰ چونک کر مریم کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: میں نے ایسا کیا کر دیا ہے.....

مریم: آپ کے ابا نے فضل ماموں کو سب بتا دیا ہے..... اور ستارہ بھی اب سب جانتی ہے..... وہ بہت پریشان ہے یہ سن کر.....

موسیٰ چونکتا ہے۔

موسیٰ: چلو اچھا ہے..... وقت سے پہلے ہی ابا نے اپنا فرض پورا کر دیا..... میں ستارہ کو بھی دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا..... وہ بہت اچھی لڑکی ہے..... تم اسے سمجھاؤ کہ میرا خیال اپنے دل سے نکال دے.....

مریم: دلوں سے خیال اتنے آسانی سے نہیں نکلتے موسیٰ بھائی..... یہ بات آپ سے زیادہ بھلا کون جان سکتا ہے.....

موسیٰ: (موسیٰ بات بدل دیتا ہے) تمہیں کوئی کام تھا مجھ سے.....

مریم: ہاں..... ستارہ آپ سے ملنا چاہتی ہوں.....

موسیٰ: مگر میں.....

مریم: دیکھیں انکار مت کیجئے گا..... محبت کرنے والے کسی کا دل نہیں توڑا کرتے..... اور وہ تو بہت معصوم ہے..... بہت نازک ہے..... ایک بار مل لیں اس سے..... جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو.....

موسیٰ مریم کی بات پر چونک کر اُسے دیکھتا ہے۔

مریم: وقت اور جگہ طے کر کے میں آپ کو خبر کر دوں گی..... آپ بس وقت پر پہنچ جایئے گا..... اور یہ یاد رکھئے گا کہ ستارہ جیسی لڑکیوں کو یوں چھپ کر گھر سے نکلنے کے لئے آگ کے کئی دریا پار کرنے پڑتے ہیں..... لہٰذا دیر نہ کیجئے گا..... پلیز.....

مریم موسیٰ کی منت کرتی ہے۔ موسیٰ شش و پنج میں مبتلا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

اتا، زہرہ اور موسیٰ کی ماں ہاجرہ۔

اتا: مجھے افسوس ہے پیرنی جی..... یہاں ایسے سودے نہیں ہوا کرتے..... اور میری دعا ہے کہ آپ کا بیٹا خود ہی اس راہ پر آ جائے..... جسے آپ راہ راست کہتی ہیں..... مگر یہاں سے آپ کو خالی ہاتھ ہی واپس جانا ہوگا.....

ہاجرہ مایوسی سے اتا کی طرف دیکھتی ہے اور جانے کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔

ہاجرہ: مائیں ہمیشہ خالی ہاتھ ہی رہ جایا کرتی ہیں آخر میں..... آپ نے تحمل سے میری بات سنی..... اس کا شکریہ.....

ہاجرہ پلٹ کر جانے لگتی ہے۔ زہرہ بے چین سی کھڑی اُسے جاتے دیکھ رہی ہے اور پھر اچانک بول پڑتی ہے۔

زہرہ: ٹھہریں..... رُک جائیں.....

ہاجرہ پلٹ کر دیکھتی ہے۔

زہرہ: بات اگر ایک ماں کے بھرم کی ہے تو چلیں یوں ہی سہی..... میں آپ کا یقین نہیں توڑوں گی..... میں موسیٰ سے ایک آخری بار ملنے کے لئے تیار ہوں.....

اتا: (اتا اُٹھتی ہے) زہرہ.....

زہرہ: جانتی ہوں اتا جی..... یہ ہمارا دستور نہیں ہے..... مگر آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ ظرف ہمیشہ بلند رکھنا چاہیے..... اگر کوئی چل کر ہماری دہلیز تک آ ہی گیا ہے تو اسے خالی ہاتھ بھیجنا کم ظرفی ہوگی.....

ہاجرہ: میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی..... تم چاہو تو.....

زہرہ: کوئی قیمت مت لگایئے گا اس شرط کی..... مجھے کچھ نہیں چاہیے..... میں خود بھی چاہتی ہوں کہ موسیٰ سب بھول کر اپنی نئی زندگی شروع کرے.....

ہاجرہ: ایک اور اعلیٰ ظرفی کی اُمید بھی رکھتی ہوں میں تم سے.....

زہرہ: جی..... بولیں.....

ہاجرہ: موسیٰ کو یہ بات کبھی پتہ نہیں چلنی چاہیے کہ میں یہاں کس مقصد کے لئے آئی تھی..... وہ بہت اکھڑ ہے..... اگر اسے پتہ چلا تو وہ مزید بھڑک جائے گا اپنی ضد میں.....

زہرہ تلخی اور طنز سے مسکراتی ہے۔

زہرہ: نہیں پتہ چلے گا اُسے..... ہم آپ عزت داروں کی مجبوریاں اچھی طرح جانتے ہیں..... آپ مطمئن ہو کر پلٹ جایئے.....

ہاجرہ ممنون نظروں سے زہرہ کو دیکھتی ہے اور پھر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ انا ناراض سی بیٹھی زہرہ کو دیکھتی رہتی ہے۔ زہرہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر/ لاؤنج وغیرہ

سکینہ بے چین سی لاؤنج میں ٹہل رہی ہے، اس کی ماں خدیجہ کمرے میں آتی ہے۔

خدیجہ: تمہیں کس بات کی بے چینی لگی ہوئی ہے..... کبھی دو گھڑی ٹک کر آرام سے بیٹھ بھی جایا کرو.....

سکینہ: اس گھر میں مجھے کبھی آرام نہیں ملنے والا اماں..... تمہاری بیٹی سدا بے چین ہی رہے گی ان سب کے ہاتھوں.....

خدیجہ: اب کیا ہو گیا ہے ایسا.....؟..... تم یہ الزام تراشی بند کیوں نہیں کر دیتیں آخر.....

سکینہ: کیوں نہ کروں الزام تراشی.....؟..... کہنے کو تو میں اس گھر کی اکلوتی بہو ہوں..... اور تمہارے بقول بڑا مان اور بڑا درجہ ہے بہو ہونے کے ناطے میرا اس خاندان میں، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود میرا شوہر اور میری ساس مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں۔

خدیجہ: (خدیجہ طنز کرتی ہے) تم نے کبھی اپنے شوہر اور ساس کو درجہ دیا ہے شوہر اور ساس کا.....؟..... اور ایسا کیا راز تم سے چھپایا گیا ہے جس کا تم اتنا واویلہ مچا رہی ہو.....؟

سکینہ: رازداری تو اس خاندان پر ختم ہے اماں..... اب دیکھ لو..... تین گھنٹے سے عیسیٰ تائی جان کو اپنے ساتھ لے کر جانے کہاں گیا ہوا ہے..... اور مجال ہے ان ماں بیٹے نے مجھے کچھ خبر لگنے دی ہو اپنے ارادوں کی.....

خدیجہ: (خدیجہ غصے سے کہتی ہے) تو تم کیوں جی جلا رہی ہو..... تمہاری بلا سے..... کوئی آئے یا جائے..... تم نے کب کسی کی پرواہ کی ہے..... تم بھی تو وہی کرتی ہو جو تمہارا جی چاہتا ہے..... تم نے بھی تو کبھی اپنے ارادوں کی ہوا نہیں لگنے دی کسی کو.....

سکینہ چڑ کر ماں کی طرف دیکھتی ہے۔

سکینہ: کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے اماں..... میں واقعی تمہاری سگی بیٹی ہوں یا کسی کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر لائی تھیں تم مجھے..... تبھی نے مجھے پیدا کیا ہے ناں.....

خدیجہ: (خدیجہ کو غصہ آ جاتا ہے) کوڑے کے ڈھیر سے اُٹھا کر تو نہیں لائی..... مگر تم نے اپنی حرکتیں نہ چھوڑیں اور اپنا چلن نہ بدلا تو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک ضرور آؤں گی تمہیں ایک دن.....

خدیجہ غصے میں کمرے سے نکل جاتی ہے۔ سکینہ بھی ماں کی بات پر تلملا رہی ہے۔

سکینہ: یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا اماں..... کہ اب کون رُلتا ہے عمر بھر کسی کوڑے کے ڈھیر پر..... سکینہ نام نہیں میرا اگر ان سب کو سکون کی ایک سانس بھی لینے دوں تو.....

سکینہ بھی غصے میں کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر

مریم اور ستارہ میں بات چیت/ ستارہ بے چینی سے پوچھتی ہے۔

ستارہ: کیا کہا اس نے.....؟..... میرا حال تو پوچھا ہو گا.....

مریم: وہ خود بہت برے حالوں میں ہے..... تمہارے لئے بس اتنا پیغام دیا ہے کہ تم اسے بھول کر اپنی نئی زندگی شروع کر لو..... وہ اب پلٹ کر آنے والا نہیں ہے.....

ستارہ: زندگی بس ایک ہی ملتی ہے..... اور اسے ایک ہی بار جیا جاتا ہے..... دوبارہ اور سہ بارہ شروع کرنے کو میں منافقت سمجھتی ہوں..... تم نے یہ کیوں نہیں بتایا اُسے.....

مریم: سب بتایا ہے..... تمہاری حالت بھی اور تمہاری بے قراری بھی..... ورنہ تو اس کی طرف سے صاف انکار تھا..... کہتا ہے میں ستارہ کو دھوکہ نہیں دے سکتا..... وہ بہت اچھی ہے.....

ستارہ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

ستارہ: کاش میں اچھی نہ ہوتی..... صرف اُسے پیاری ہوتی..... کاش..... کاش وہ بھی میرے دل میں جھانک سکتا.....

مریم: یک طرفہ محبت کی تڑپ بڑی جان لیوا ہوتی ہے ستارہ..... خود کو روک لو..... اب بھی وقت ہے..... اپنے آپ کو فنا مت کرو

ستارہ مریم کے گلے لگ کر رو پڑتی ہے۔ مریم بھی رونے لگتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: چھت یا موسیٰ کا کمرہ وغیرہ

موسیٰ اور عیسیٰ میں بات چیت۔

موسیٰ: مگر اس نے کیا کہا..... کچھ تو بتاؤ..... اماں نے تو چپ سادھ رکھی ہے آنے کے بعد..... ابا کے ڈر سے کھل کر بات بھی نہیں کر پا رہی ہیں وہ.....

عیسیٰ: میں تو اندر گیا نہیں..... سارا وقت باہر ہی بیٹھا رہا گاڑی میں.....

موسیٰ: پھر بھی..... کچھ تو بتایا ہوگا انہوں نے تمہیں.....

عیسیٰ: بس اتنا کہا کہ زہرہ نے کہا ہے کہ وہ اپنے فیصلے سے جلد آگاہ کر دے گی..... ہو سکتا ہے تم سے ہی بات کرے اب وہ.....

موسیٰ: (موسیٰ بے چین ہے) میں نے اس کی شرط پوری کر دی ہے..... اب کیا اعتراض ہو سکتا ہے اُسے.....

عیسیٰ: تم بھول رہے ہو..... اس کی شرط اسی گھر سے اس کی بارات اُٹھنے اور یہیں پر اس کی ڈولی اترنے کی ہے..... اماں تو تمہاری محبت میں چلی گئیں وہاں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر..... مگر بات ابھی ادھوری ہے..... فیصلہ تو اب بھی زہرہ کے ہاتھ میں ہے۔

موسیٰ: مگر میری نیت اور ارادے کا تو پتہ چل گیا ہے ناں اُسے..... میں اسے وہی عزت اور مقام دوں گا جو وہ چاہتی ہے..... اماں نے یہ تو بتایا ہوگا اُسے۔

عیسیٰ: ابا واپس آ چکے ہیں اب تم خدا کے لئے اماں سے مزید کوئی تفتیش مت کرنا..... وقت آنے پر وہ خود تمہیں بتا دیں گی.....

موسیٰ ویسے ہی بے چین ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا گھر/کھانے کا کمرہ

پیر قدرت اللہ، ہاجرہ اور خدیجہ/سکینہ کھانے کے لئے دسترخوان کے گرد جمع ہیں۔ موسیٰ اور عیسیٰ باہر سے اندر آتے ہیں

اور سلام کر کے چپ چاپ زمین پر بچھے دسترخوان کے گرد اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پیر قدرت زور سے بسم اللہ پڑھتا ہے اور سارا خاندان پیر قدرت کے کھانا ڈالنے کے بعد حسب معمول کھانا شروع کرتا ہے۔ وہ ڈونگا جو پہلے پیر قدرت کھانا نکالنے کے بعد موسیٰ کے آگے بڑھاتا تھا اب وہ ڈونگا عیسیٰ کی طرف بڑھایا جاتا ہے۔ سکینہ یہ دیکھ کر دھیرے سے طنزیہ مسکراہٹ دباتی ہے۔ موسیٰ کے پاس ڈونگا سب سے آخر میں آتا ہے۔ پیر قدرت اچانک بیوی سے پوچھتا ہے۔

پیر قدرت: ہاں پیرنی جی..... تم ہو آئیں بڑے پیر کے مزار سے..... چڑھادی تھی چادر.....

ہاجرہ شوہر کے اس اچانک سوال سے گڑبڑا سی جاتی ہے۔

ہاجرہ: ہاں..... جی جی..... ہو آئی تھی میں..... چڑھا دیا تھا چڑھاوا.....

سکینہ ساس کی گھبراہٹ نوٹ کرتی ہے۔

پیر قدرت: میری آج بات ہوئی تھی وہاں کے متولی سے..... کیا بھلا سا نام ہے اس کا..... ہاں..... قدیر..... بتایا تھا اسے میں نے کہ تم اور موسیٰ آؤ گے وہاں..... مگر پھر اس کا فون ہی نہیں آیا..... ملاقات ہوئی تھی اس سے تمہاری عیسیٰ.....

عیسیٰ بھی باپ کی بات سن کر گڑبڑا جاتا ہے۔

عیسیٰ: نہیں ابا..... قدیر صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی میری..... آپ مجھے بتا دیتے تو میں ان سے مل لیتا.....

قدرت: عجیب بھلکڑ بندہ ہے بھئی یہ قدیر بھی..... لگتا ہے اوقاف والوں سے شکایت کرنی پڑے گی اس کی.....

پیر قدرت کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ سکینہ غور سے شوہر اور ساس کے چہرے کے اُڑے رنگ دیکھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: ستارہ کا گھر/ستارہ کا کمرہ

ستارہ اور اُس کی ماں کے درمیان بات چیت۔

شائستہ: لیکن اب تو یہ رسوائی کی داستان سارے شہر میں پھیلنے کو ہے..... اگر اسے تمہاری قدر نہیں ہے تو تم اس کی فکر کیوں کرتی ہو..... تمہارے ابا جو بھی فیصلہ کریں گے وہ تمہاری بہتری کے لئے ہی ہوگا.....

ستارہ پریشان اور روہانسی ہے۔

ستارہ: کاش یہ بہتری میرا نام موسیٰ کے نام کے ساتھ جوڑنے سے پہلے سوچی گئی ہوتی اماں..... میری آس بندھ چکی ہے اس کے نام کے ساتھ..... اُسی کے نام کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں پڑی ہے..... اب میں کسی اور کو اپنے دل میں جگہ کیسے دے سکتی ہوں..... دل ہے..... کوئی مشین تو نہیں کہ ایک پرزہ خراب ہو گیا تو دوسرے سے بدل دیا.....

شائستہ حیرت سے بیٹی کو دیکھتی ہے۔

شائستہ: یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟ یہ جاننے کے بعد بھی کہ موسیٰ کسی بازاری لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر در بدر بھٹک رہا ہے اور اس جرم کی پاداش میں خود اس کے اپنے خاندان نے اسے عاق کر دیا ہے..... تم آج بھی اسی موسیٰ کا دم بھر رہی ہو.....

ستارہ: آپ میری ہر پسند کو بچپن سے اچھی طرح جانتی ہیں اماں..... مجھے بڑی مشکل سے کچھ پسند آتا ہے..... یہ آپ کو بھی پتہ ہے..... مگر ایک بار جب کوئی دل میں گھر کر جائے تو میری پسند بدلا نہیں کرتی..... اور آپ نے ہی تو ہمیشہ مجھے موسیٰ کے ساتھ میری تقدیر جڑنے کے خواب دکھائے ہیں..... اب آپ خود ہی ان خوابوں کو توڑنے چلی ہیں.....

شائستہ: جن خوابوں کی تعبیر بھیانک نکلے ان کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے..... مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ سیدھا سادھا فرمانبردار سا لڑکا اتنا باغی نکلے گا..... ارے وہ تو اپنے باپ کے سامنے ہی تن کر کھڑا ہو گیا ہے..... دل بدل گیا ہے اس کا.....

ستارہ: اگر موسیٰ کا دل بدل بھی گیا ہے تو اس سے میری چاہت کا کیا واسطہ..... میں نے کسی شرط پر تو دل کا یہ سودا نہیں کیا تھا..... نہ ہی موسیٰ نے کبھی مجھ سے کوئی وعدہ یا اقرار کیا..... میں تو اپنے من کی مرضی پر چلی ہوں یہاں تک.....

شائستہ: تمہاری باتیں مجھے ہولائے دے رہی ہیں..... آخر تم چاہتی کیا ہو.....

ستارہ: میری تقدیر کا فیصلہ خود وقت کو کرنے دیں..... اگر وہ میرے مقدر میں ہوگا تو مجھے مل جائے گا..... مگر آپ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے یہ دھاگا نہ توڑیں..... بندھا رہنے دیں مجھے اس نازک رشتے سے..... جب تک کہ موسیٰ اسے خود نہ توڑ دے.....

ستارہ اُٹھ کر چلی جاتی ہے..... شائستہ پریشانی سے بیٹی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: صبح ہونے کا مونتاج/
شہر میں دن نکل رہا ہے

جیپ میں موسیٰ نامراد کے کیبن کے قریب آ کر رُکتا ہے۔ نامراد اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف پلٹتا ہے۔

نامراد: کہاں رہ گئے تھے..... کب سے تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں.....

موسیٰ: سب خیر تو ہے.....

نامراد: (نامراد مسکراتا ہے) پتھروں کا سینہ چیرنے کا فن جانتے ہو..... وہ کیا کہا ہے شاعر نے.....
"پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر..... تو سمجھو کاٹ ہی ڈالا تم نے کسی کے جگر کا ہیرا..... مانا پڑے گا اُستاد.....

موسیٰ: (موسیٰ بے زار ہے) تم نے صبح سویرے مجھے یہ شاعری سنانے کے لئے بلایا ہے.....؟ مطلب کی بات کرو.....

نامراد: (نامراد مسکراتا ہے) تمہارے ہی مطلب کی بات ہے پیارے..... صبح سویرے اس نے پیغام بھجوایا ہے تمہارے لئے..... ملنا چاہتی ہے وہ تم سے.....

موسیٰ: (موسیٰ چونکتا ہے) کیا.....؟..... زہرہ..... ملنا چاہتی ہے مجھ سے.....

نامراد: ہاں..... یہی کہا ہے میں نے..... فارسی نہیں بول رہا.....

موسیٰ: یہ بات تو تم فارسی میں بھی کہتے تو مجھے سمجھ آ جاتی..... فارسی ہی کیا..... دنیا کی کسی زبان میں بھی بولو گے تو فٹ سے سمجھ جاؤں گا..... بس یقین آنے میں کچھ وقت لگے گا.....

نامراد: تو یقین کر لو اب..... وہ تم سے ملنا چاہتی ہے..... مگر اپنے گھر پر یا کسی شور شرابے والی جگہ پر نہیں.....

موسیٰ: لیکن میں ایسی کسی جگہ کے بارے میں نہیں جانتا..... ویسے بھی وہ جب میرے سامنے آتی ہے..... مجھے آس پاس کا شور اور آوازیں سنائی ہی کب دیتی ہیں..... بس وہ ہی وہ ہوتی ہے چاروں طرف.....

نامراد: واہ پیارے..... شاعری شروع کر دو..... قسم سے لوگ غالب، میر اور درد کو بھول جائیں گے..... دیوان پر دیوان چھپیں گے قسم سے.....

موسیٰ: فضول باتیں مت کرو..... جلدی بتاؤ کہ اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے.....

نامراد: اس کی تم فکر نہ کرو..... پرانے قلعے میں ایک بڑی لائبریری ہے..... بہت خاموش جگہ ہے..... اور زیادہ رش اور شور شرابہ بھی نہیں ہوتا وہاں..... وہیں میٹنگ فکس کرواتا ہوں تمہاری..... اپنی پرانی جان پہچان ہے وہاں..... بس تم تیار رہنا.....

موسیٰ: (موسیٰ کسی سوچ میں گم ہے) ہاں..... مگر مجھے اس ملاقات سے پہلے ایک اور ملاقات کرنی ہے کسی سے.....

نامراد: ایک اور ملاقات..... مگر کس سے.....

موسیٰ: میرے نام سے بندھی ہے جو..... مجھے اُسے وفا کے بندھن سے آزاد کرنا ہے..... ملنا چاہتی ہے وہ مجھ سے ایک آخری بار۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر/ستارہ کا کمرہ

ستارہ برقعہ پہنے چہرے سے نقاب کھولے پریشان سی کمرے میں کھڑی ہے۔ وہ چہرے کا نقاب اُٹھاتی ہے اور سر پر ڈال کر باندھنے کے لئے ڈوری کستی ہے تبھی باہر سے تیزی میں لپکتی جھپکتی مریم اندر داخل ہوتی ہے۔

ستارہ: کہاں رہ گئیں تھیں..... کب سے کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوں.....

مریم: بڑی مشکل سے راستہ صاف کیا ہے..... ممانی سے شکیلہ کے گھر جانے کا بہانہ کیا ہے اور ڈرائیور سے بھی بازار لے جانے کی رازداری کا وعدہ لیا ہے..... بس اب تم باتوں میں وقت ضائع مت کرو..... اور جلدی چلو..... اس سے پہلے کہ ماموں کی عقابی نظریں ہمارے ارادے پڑھ لیں.....

ستارہ: چلو پھر..... یہ لمبی تقریر کیوں کر رہی ہو..... ستارہ اور مریم دونوں برقعے پہنے جلدی سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہیں.....

//Cut//

وقت: مونتاج

جگہ: کار پاسنگ

پیر فضل کی مرسڈیز کار کسی سڑک پر رواں ہے۔ جس کے شیشوں پر پردے گرے ہوئے ہیں۔ اندر ستارہ اور مریم برقعوں میں ملبوس بیٹھی ہوئی ہیں..... کار تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور جگہ

موسیٰ پہلے سے وہاں انتظار کر رہا ہے۔ مریم اور ستارہ پہنچتی ہیں۔ مریم کچھ فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے اور ستارہ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتی ہے۔ ستارہ جھجکتے ہوئے آگے بڑھتی ہے جس طرف موسیٰ اپنا چہرہ دوسری جانب کئے کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ ستارہ کی آہٹ پر موسیٰ چونکتا ہے اور سلام پر پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ستارہ سیاہ برقعے میں ملبوس ہے۔

ستارہ: معذرت چاہتی ہوں..... ہم کچھ لیٹ ہو گئے..... بہت مشکل سے نکلی ہوں آج.....

ستارہ غور سے موسیٰ کو دیکھ رہی ہے۔

موسیٰ: کوئی بات نہیں..... مگر تمہیں اتنا رسک لینے کی کیا ضرورت تھی..... اگر تمہارے گھر والوں کو خبر ہو گئی کہ تم اس طرح چھپ کر مجھ سے ملنے آئی ہو تو بہت مشکل ہو جائے گی تمہارے لئے.....

ستارہ: مشکل تو ہو چکی ہے میرے لئے..... آپ نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے موسیٰ.....

موسیٰ: میں تمہیں پہلے دن ہی یہ سب بتا دینا چاہتا تھا..... مگر میری کسی نے نہیں سنی..... یقین کرو..... تمہیں دکھ دینا میرا مقصد ہرگز

نہیں تھا..... میں..... میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں..... میں.....

ستارہ: (ستارہ بات کاٹ دیتی ہے) بس..... صرف عزت کرتے ہیں آپ میری..... اسی بات کا تو دکھ ہے..... میں کیا کروں موسیٰ..... میرا دل تو عزت کی سرحد سے بہت آگے نکل چکا ہے..... لڑکی جب کسی کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لیتی ہے تو اپنے جیون کا ہر سپنا، ہر جواب اسی انگوٹھی کے دائرے میں باندھ کر ان خوابوں کی تعبیر ملنے کا انتظار کرنے لگتی ہے..... یہ دیکھیں..... میرے ہاتھ میں بھی آپ کی انگوٹھی ہے..... میں نے کبھی اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کیا.....

موسیٰ دکھ سے ستارہ کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: معاف کر دو مجھے..... میں نے اماں کو بہت پہلے سب بتا دیا تھا..... کاش وہ لوگ اتنی جلد بازی نہ کرتے..... لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا..... سارا قصور میرا ہے..... سارا الزام بھی میرے ہی سر آئے گا..... اس سے پہلے کہ بات مزید پھیلے..... تم خود سب کے سامنے انکار کر دو اس رشتے سے.....

ستارہ کی پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔

ستارہ: بہت کچھ بگڑ گیا ہے موسیٰ..... میں بگڑ گئی ہوں پوری کی پوری..... اب میرے دل کے اس بگاڑ کو دوسرا کوئی نہیں سنوار سکتا.....

موسیٰ: میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوں ستارہ.....

ستارہ: کیا وہ بہت خوبصورت ہے.....؟.....

پھر خود ہی ہنس پڑتی ہے۔

ستارہ: دیکھیں ذرا میرا یہ پاگل پن..... بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے..... وہ تو حسین ترین ہوگی..... سب سے زیادہ پیاری اور خوبصورت..... تبھی تو اس نے آپ کے دل پر قبضہ کر لیا ہے..... ہے نا..... قبضے کا لفظ برا لگا ہو تو سوری.....

موسیٰ: میں وہ بدنام اور رسوا بیٹا ہوں ستارہ جسے اس کا خاندان عاق کر چکا ہے..... اور تم ایک شہزادی ہو..... میں تمہارے قابل نہیں ہوں ستارہ..... تمہارے نصیب کا شہزادہ کوئی اور ہے.....

ستارہ: قابل تو آپ نے مجھے نہیں سمجھا موسیٰ..... مجھے کسی رتبے اور درجے کی ضرورت نہیں ہے..... میرے لئے صرف آپ کا نام ہی کافی ہے..... بس اپنا نام میرے نام سے الگ نہ کیجئے گا..... صرف اتنی سی درخواست ہے میری آپ سے..... میں کبھی آپ کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گی..... یہ بھی میرا آپ سے وعدہ ہے.....

موسیٰ پریشانی سے ستارہ کی طرف دیکھتا ہے۔

موسیٰ: کیسی لڑکی ہو تم..... تمہیں ان سب باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... میری بدنامی، رسوائی..... میرے گھر والوں کی ناراضگی اور میرے نام سے جڑے سو افسانے.....

ستارہ: آپ کے نام سے جڑی ہر چیز مجھے پیاری ہے..... چاہے پھر وہ بدنامی کے افسانے ہی کیوں نہ ہوں..... دنیا میں ایک صرف آپ ہی دیوانے نہیں ہیں..... اور بھی پڑے ہیں دو چار مجھ جیسے.....

موسیٰ کچھ کہنے لگتا ہے کہ مریم دور سے ستارہ کو آواز دے کر ہاتھ کی گھڑی دیکھنے اور وقت گزرنے کا اشارہ کرتی ہے۔

ستارہ: مجھے اب جانا ہوگا..... یاد رکھئے گا..... میں نے ایک وعدہ لیا ہے آج آپ سے..... وعدہ وفا کیجئے گا.....

موسیٰ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ستارہ جلدی سے اسے سلام کر کے اور چہرے پر نقاب ڈال کر وہاں سے پلٹ جاتی ہے۔ موسیٰ وہیں کھڑا رہ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران تیزی سے اپنے کمرے میں آتا ہے اور آس پاس یہ دیکھ کر اطمینان کرتا ہے کہ کہیں کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا، پھر جلدی سے کمرے کے دروازے کو کنڈی لگاتا ہے اور تیزی سے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر اس کی سم SIM بدلتا ہے اور سکینہ کا نمبر ڈائل کرتا ہے۔ دوسری طرف گھنٹی جا رہی ہے مگر سکینہ فون اُٹھا نہیں رہی۔ کامران بے چینی سے بڑبڑاتا ہے۔

کامران: کہاں ہو سکینہ..... فون اُٹھاؤ پلیز.....

// Inter Cuts # 1 //

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ کا فون اس کی سائیڈ ٹیبل یا میز پر پڑا ہوا بج رہا ہے۔ سکینہ کمرے میں نظر نہیں آ رہی۔ فون وائبریشن پر ہے اور لگاتار بزر بج رہا ہے۔

// Inter Cuts # 2 //

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران کوشش کرتا رہتا ہے مگر سکینہ کا فون دوسری جانب سے اٹینڈ نہیں ہو رہا۔ کامران تھک ہار کر فون کاٹ دیتا ہے اور سم بدل کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

وقت: رات ہونے کا موناج

جگہ: کاشانہ پیراں/آؤٹر

Montage Time Laps

Scene No # 18

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

قدرت اللہ اور بیوی میں بات چیت۔

قدرت اللہ: اس میں پیر فضل شاہ کا کیا تصور ہے..... کوئی بھی ہوش مند شخص اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ ایسے کسی شخص کے ہاتھ میں کیوں دینا چاہے گا جسے نہ اپنی عزت کی پرواہ ہو اور نہ ہی اپنے خاندان کے وقار کا پاس ہو.....

ہاجرہ: جلد بازی میں معاملات خراب ہو جاتے ہیں..... میں خود شائستہ سے مل کر ان سے درخواست کروں گی کہ ہمیں کچھ وقت دے دیں..... مجھے یقین ہے وہ ہماری بات مان لے گا.....

قدرت غور سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: تمہیں اتنا یقین کیسے ہے.....؟.....

ہاجرہ: مجھے بھروسہ ہے اپنی دعاؤں پر.....

قدرت: نہیں میں صرف تمہاری دعاؤں کے بھروسے کسی کی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرسکتا..... میں دوبارہ پیر فضل کو مجبور نہیں کروں گا

ہاجرہ: لیکن اگر خود ستارہ کی بھی یہی چاہت، یہی مرضی ہو تو..... مجھے یقین ہے ستارہ بھی موسیٰ کے لئے دل میں وہی جذبات رکھتی ہے جو ایک لڑکی کے دل میں کسی سے منسوب ہوجانے کے بعد پیدا ہوجاتے ہیں..... ہمیں ٹھیک وقت کا انتظار کرنا ہوگا پیر صاحب

قدرت کسی سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: رات

جگہ: پیر فضل کا گھر/کمرہ

فضل اور بیوی کے درمیان بات چیت۔ فضل غصے سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

فضل: ستارہ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا..... اور تم..... تم بھی اسی کی بات دہرا رہی ہو.....، ..... حیرت ہو رہی ہے مجھے تمہاری حمایت پر.....

شائستہ: آج صرف ایک ماں اپنی بیٹی کی حمایت میں نہیں بول رہی شاہ جی.....، ..... ایک عورت دوسری عورت کے احساس کا خیال رکھتے ہوئے آپ سے یہ گزارش کر رہی ہے..... ستارہ کی پرورش آپ کے ہاتھوں میں اس حویلی کی چار دیواری میں ہوئی ہے اور اُس نے آپ کے ہی حکم پر سر جھکاتے ہوئے موسیٰ کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی تھی.....

فضل: مانتا ہوں میں..... اس نے میرے حکم کا مان رکھا..... یہی ایک مشرقی لڑکی کا فرض بھی ہے..... لیکن آج وہی باپ اسے یہ رشتہ ختم کرنے کا حکم بھی تو دے رہا ہے.....، ..... مجھے کل بھی ستارہ کی خوشی عزیز تھی اور میں آج بھی اس کے سکھ کی خاطر یہ فیصلہ کر رہا ہوں.....

شائستہ: اس کے دل اور دماغ پر اسی دن موسیٰ کے نام کی مہر لگ گئی تھی شاہ جی جب ہمارے ذریعے پہلی مرتبہ اس کے کانوں میں موسیٰ کا نام اس کے ہونے والے ہم سفر کے نام کے طور پر گونجا تھا..... میں اسی لئے نکاح سے پہلے کی ان بے جا رسموں اور تقریبات کے خلاف تھی.....، سچ تو یہ ہے شاہ جی کے اس گناہ میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں.....

پیر فضل پریشانی سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

فضل: ایک باپ اپنی بیٹی کا دشمن کیسے ہوسکتا ہے..... موسیٰ کے ساتھ ستارہ کا رشتہ بڑی دشمنی ہی تو ہوگی ستارہ کے ساتھ.....

شائستہ: آپ قدرت اللہ بھائی سے بات کر کے تو دیکھیں..... ہوسکتا ہے کوئی بھلے کی راہ نکل آئے.....

فضل: بات تو میں پہلے ہی صاف کر چکا ہوں قدرت اللہ کے ساتھ..... تم کہتی ہو تو ایک بار پھر ان کا دل ٹٹول کر دیکھتا ہوں..... اگر موسیٰ راہ راست پر آجاتا ہے اور دوبارہ کبھی اس بدنام گلی کا رُخ نہ کرنے کا وعدہ کر لیتا ہے اپنے ماں باپ سے..... تو میں اس رشتے کا کڑوا گھونٹ پینے کے لئے ایک بار پھر تیار ہوسکتا ہوں.....

شائستہ شوہر کی بات پر خوش ہوجاتی ہے مگر پیر فضل کے چہرے پر پھیلے پریشانی کے سائے دور نہیں ہوتے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا دفتر

ملک شہریار اپنے خاص دوست پرڈیوسر چوہدری توقیر جاوید کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

توقیر جاوید: کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو..... تم خود وہاں جاؤ گے.....

شہریار: ہاں..... تم نے سنا نہیں..... پیاسا کنویں کے پاس خود چل کر جاتا ہے..... غرض میری ہے..... تو جانے میں کیا حرج ہے.....

فلم پرڈیوسر توقیر: مگر شہریار..... کیا اس طرح تمہارا وہاں جانا مناسب ہوگا..... پیغام تو کسی اور کے ذریعے بھی پہنچایا جا سکتا ہے.....

شہریار: پیغام بھیجا تھا..... جواب نہیں آیا..... لگتا ہے وہ لوگ کچھ محتاط ہو گئے ہیں.....

توقیر جاوید: تم اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی سیریس نہیں ہو گئے.....؟ ایسی تو نہ جانے کتنی تمہاری زندگی میں آئیں..... اور گئیں..... آخر اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات ہے.....؟

شہریار: (شہریار ہنستا ہے) خاص بات نہ ہوتی تو اتنے پاپڑ کبھی نہ بیلتا اس کے لئے..... بزنس مین ہوں..... کچھ فائدہ بھی دیکھا ہے اس سودے میں اپنا..... تبھی بے چین ہوں اتنا.....

توقیر جاوید: مگر میں نے سنا ہے کہ اس کی سرپرست بڑھیا بہت سخت مزاج ہے..... اتنی آسانی سے تمہاری دال نہیں گلنے والی..... ڈانس اور پارٹی کی حد تک تو بات ٹھیک تھی..... مگر تم تو مستقل اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو..... ایسا وہ کبھی ہونے نہیں دے گی.....

شہریار: اگر میں اس کے نام ایک الگ گھر کر دوں، گاڑی، ڈرائیور، نوکر، چاکر اور بہت سا بینک بیلنس..... پھر بھی نہیں.....

توقیر جاوید: بات کر کے دیکھو..... مگر تم نے خود ہی تو بتایا کہ لڑکی بہت اڑیل ہے اور ابھی پڑھ بھی رہی ہے.....

شہریار: پھر تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اس کا ہمیشہ کا ساتھ پانے کے لئے.....

جاوید: (چونک کر) کون سا راستہ.....

شہریار: اسے اپنے نکاح میں قید کرنے کا راستہ..... شکاری کے پاس ہر طرح کا جال موجود ہونا چاہیے اپنے شکار کو قابو کرنے کے لئے.....

ملک شہریار کا دوست ملک کی بات پر چونک کر اُسے دیکھتا ہے۔

جاوید: کیا..... تم نکاح کرو گے اس سے..... مگر تم تو.....

شہریار: کیا فرق پڑتا ہے..... اگر وہ لوگ اس بات سے مطمئن ہوتے ہیں تو یہ جوا کھیلنے میں بھی کوئی حرج نہیں..... نکاح ہی تو ہے..... کوئی لوہے کی زنجیر تو نہیں.....

جاوید: لیکن پھر بھی.....

شہریار: نکاح بھی تو ایک طرح کا کانٹریکٹ ہی ہوتا ہے ایسے لوگوں کے لئے..... تو یونہی سہی..... یہ چونچلہ بھی پورا کر لینے دو..... تم میری بات کرواؤ اس کی گارڈین سے..... قیمت ٹھیک لگے تو بڑے بڑے سودے ہو جاتے ہیں..... بس یوں سمجھو کہ یہ نکاح بھی میری مجبوری ہے۔

شہریار سگار سلگا کر ایک لمبا کش لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: پرانے قلعے کا آؤٹر/

قلعے۔ یا کسی پرانی حویلی کی لائبریری۔ کتب خانہ لائبریری کے ہال میں جالے تنے ہیں اور بڑے بڑے روشن دانوں کے اندر جیسے کبوتروں نے اپنے گھر/گھونسلے بنا

رکھے ہیں۔ لائبریری کی حالت سے لگتا ہے کہ جیسے سالوں سے بند کوئی پرانا کتب خانہ ہے۔ ایک آدھ کبوتر اُڑ کر دوسری کھڑکی کی طرف پرواز کرتا ہے، بڑی بڑی کھڑکیوں سے باہر کی دھوپ چھن کر اندر آ رہی ہے۔ ماحول پہ سناٹا سا طاری ہے۔ موسیٰ بے چین سا لائبریری میں بیٹھا دیوار پر لگے پرانے بڑے گھڑیال کی لمبی لمبی سوئیوں کو ٹک ٹک کر کے اوپر نیچے گرتے دیکھ رہا ہے۔ اچانک باہر برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی ہے۔ موسیٰ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: پرانے قلعے/حویلی کے برآمدے میں

چندا اور زہرہ سیاہ برقعے پہنے آتی ہیں۔ چندا لائبریری کے دروازے کے قریب آ کر رُک جاتی ہے۔

زہرہ: رُک کیوں گئیں.....

چندا: وہ یہیں ہے.....اندر.....تم جا کر مل لو.....میں تمہارا یہیں انتظار کروں گی.....

زہرہ چند لمحے اسے دیکھتی ہے اور پھر دروازے کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: پرانی۔ متروکہ لائبریری

لائبریری کا پرانا سا قدیم سال خوردہ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا ہے۔ موسیٰ بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ زہرہ دھیرے سے اندر داخل ہوتی ہے۔ موسیٰ بے تابی سے یک ٹک اس طرف دیکھتا رہتا ہے۔ زہرہ آس پاس دیکھتی ہے اور موسیٰ پر نظر پڑتی ہے، چند لمحے اسے دیکھتی ہے اور پھر دھیرے سے اپنا نقاب کھول دیتی ہے اور موسیٰ سے کہتی ہے۔

زہرہ: ہاں بولو.....آ گئی ہوں میں.....آج جو کہنا ہے ایک ہی بار کھل کر کہہ دو.....

موسیٰ کی نظر زہرہ پر جمی رہتی ہے جو سیاہ لباس میں سامنے کھڑی ہے اور اس کے لفظ جیسے کہیں کھو جاتے ہیں۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 10

Scene No # 1

جگہ: قلعے/حویلی کی پرانی لائبریری

زہرہ سیاہ لباس میں چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے لائبریری کے دروازے سے اندر داخل ہوتی ہے۔ موسیٰ پلکیں جھپکائے بغیر زہرہ کا ملکوتی حسن اور چہرہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ زہرہ دوبارہ اُسے مخاطب کرتی ہے۔

زہرہ: یونہی خاموش رہو گے یا پھر کچھ بولو گے بھی.....

موسیٰ: بول تو رہا ہوں..... مگر تمہیں شاید میری صدا سنائی نہیں دے رہی.....

زہرہ: (زہرہ دُکھ سے اُسے دیکھتی ہے) اتنی مشکل باتیں کیوں کرتے ہو..... جنہیں سن کر میں پہروں اُلجھی رہتی ہوں.....

موسیٰ: میں بھی تم سے ملنے سے پہلے کبھی اتنا اُلجھا ہوا نہیں تھا..... بڑا مان تھا مجھے اپنے سلجھاؤ پر..... تمہیں دیکھا تو سب اُلجھ گیا.....

زہرہ: دیکھو موسیٰ..... میں تم سے آج یہی کہنے.....

موسیٰ زہرہ کی بات کاٹ دیتا ہے۔

موسیٰ: پھر سے کہو..... موسیٰ..... تمہاری زبان سے اپنا نام سن کر مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوتا ہے..... اچھا لگتا ہے مجھے اپنا نام.....

زہرہ زچ ہو جاتی ہے۔

زہرہ: تم..... تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے..... جو تم چاہتے ہو..... وہ ناممکن ہے..... میرا تمہارا میل کبھی نہیں ہو سکتا..... ہم دریا کے وہ دو کنارے ہیں جو کبھی مل نہیں سکتے.....

موسیٰ: کیوں.....؟..... ایسی کیا مجبوری ہے اب تمہیں..... تم نے شرط رکھی تھی کہ میرے گھر سے کوئی تمہارے گھر بات کرنے آئے..... میں نے اماں کو بھیجا..... وہ خود چل کر تمہارے گھر بات کرنے آئی تھیں ناں..... پھر اب یہ حیلے بہانے کیوں کر رہی ہو.....

زہرہ: ہاں..... تمہاری اماں آئیں تھیں ہمارے گھر..... لیکن ایک مجبور ماں بن کر..... جسے اپنے بیٹے کی ضد کے آگے ہارنا ہی ہوتا ہے..... اور میں آج انہی کی خاطر تم سے یہاں ملنے آئی ہوں..... مت ڈالو اپنی ماں کو اتنے بڑے امتحان میں..... وہ بہت پیار کرتی ہیں تم سے..... اور جو محبت کرتے ہیں..... اُنہیں آزمایا نہیں کرتے.....

زہرہ کی بات پر موسیٰ چونک کر اُسے دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: لالا کا گھر

ملک شہریار اور توقیر جاوید لالا کے سامنے بیٹھے ہیں۔

(پروڈیوسر) توقیر جاوید: ملک صاحب اپنے لفظوں سے پھرنے کے عادی نہیں ہیں لالا جی..... اگر شرط نکاح کی ہے تو نکاح ہی

ہوگا..... بنگلہ گاڑی، اور نقد حق مہر بھی رخصتی سے پہلے ہی ادا کر دیا جائے گا.....

انا پریشانی میں حقے کا ایک لمبا کش لگاتی ہے۔

انا: مگر مجھے سوچنے کا کچھ موقع تو دیں..... اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلوں..... زہرہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے..... میں نے ہمیشہ اس کے لئے کسی ایسے ہی بڑے گھر کے خواب دیکھے ہیں..... مگر اس سے پوچھے بنا کیسے ہاں کر دوں.....

توقیر جاوید: سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع نہ کریں..... آپ نے جو بھی ضمانت مانگی..... ملک شہریار نے اس ضمانت کی حامی بھری ہے..... ویسے بھی ملک صاحب نے اب اس شہر میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے..... باہر کی جائیداد اور کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے ان کے مینیجرز ہی کافی ہیں..... صاف دل کے سیدھے بندے ہیں..... آپ کی زہرہ انہیں پسند آئی ہے کیونکہ وہ رکھ رکھاؤ اور تہذیب میں دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے..... اسی لئے ملک صاحب نے اسے عزت دینے کا فیصلہ کیا ہے.....

انا غور سے دونوں کی طرف دیکھتی ہے۔

انا: تو کیا ملک صاحب کے دیگر خاندان کو اس نکاح کی خبر دی جائے گی.....

جاوید: نہیں..... ابھی نہیں..... فی الحال اس نکاح کو چھپانے میں ہی مصلحت ہے..... ہاں البتہ ٹھیک وقت آنے پر اعلان کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے..... اسی لئے تو بطور ضمانت اتنی بڑی رقم کی پیش کش.....

انا تلخی سے بات کاٹ دیتی ہے۔

انا: کوئی بھی پیشکش میری زہرہ کی مرضی سے بڑھ کر نہیں ہے میرے لئے..... اور پھر حق مہر تو ویسے بھی حق ہوتا ہے ہر لڑکی کا.....

شہریار بات سنبھالتا ہے.....

شہریار: آپ کو سوچنے کے لئے جتنا وقت چاہیے آپ لے لیں..... اچھی طرح تسلی کرلیں اپنی..... مجھے کوئی جلدی نہیں ہے..... ہاں اگر فیصلہ میرے حق میں آیا تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا..... مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا.....

شہریار اور جاوید جانے کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں، شہریار جاتے جاتے ایک لمحے کے لئے رُکتا ہے اور پلٹ کر کہتا ہے۔

شہریار: ہاں مگر قدر دانوں کو پہچاننے میں دیر نہ کر دیجئے گا..... ایسے قدر دان ناپید ہوتے جارہے ہیں آج کل.....

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: لائبریری/قلعہ

زہرہ اور موسیٰ کی ملاقات۔

موسیٰ: ایسا کیوں کہہ رہی ہو..... کیا اماں نے کوئی بات.....

زہرہ: (بات کاٹ کر) انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ان ہونی ہو..... لیکن تم مجھے عمر بھر کے لئے اتنے بڑے احساس کمتری کے مرض کا شکار کیوں کرنا چاہتے ہو..... تم کچھ بھی کرلو..... میں بھی خود کو کتنا ہی بدل لوں..... مگر یہ اونچ نیچ کا فرق کبھی ختم نہیں ہو پائے گا..... تمہارے اعلیٰ نصب مذہبی خاندان میں ایک بازار کی لڑکی کبھی جڑ نہیں پائے گی..... تمام عمر میں تمہارے لئے اور تمہارے خاندان کا نام میرے لئے ایک طعنہ ہی بنا رہے گا.....

موسیٰ: مجھے دنیا کے کسی طعنے کی فکر ہے نہ کوئی خوف.....

زہرہ: (زہرہ سختی سے کہتی ہے) مگر مجھے ہے..... میں نے اپنی زندگی کے لئے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا جس میں عمر بھر کے پچھتاوے شامل ہوں.....

موسیٰ: مجھے اپنا کر تمہیں کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں دنیا کی ہر خوشی دوں گا..... کسی بھی قیمت پر..... چاہو تو میری محبت کا امتحان لے لو ابھی.....

زہرہ غور سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: سوچ لو..... امتحان سخت بھی ہو سکتا ہے..... کہیں مکر تو نہیں جاؤ گے اپنی بات سے.....

موسیٰ: موسیٰ کبھی اپنی بات سے نہیں مکرتا..... اور تمہاری خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں..... تم ایک بار کہہ کر دیکھو..... نام، نسب، عہدہ، رتبہ..... اپنی ہر شناخت چھوڑ سکتا ہوں تمہارے لئے.....

زہرہ: مجھے چھوڑ سکتے ہو..... میرے لئے.....؟

موسیٰ: کیا.....؟

زہرہ: ہاں یہی امتحان ہے تمہارے عشق کا..... اگر مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ..... میری منزل کچھ اور ہے اور تمہارا راستہ کوئی اور..... ثابت کرو کہ تم میری خاطر کچھ بھی کر سکتے ہو..... اور پھر وہی کرو جو تمہارا خاندان تم سے چاہتا ہے..... بولو..... کیا تم میرے لئے یہ سب کر سکتے ہو.....

موسیٰ: اتنا بڑا امتحان کیوں لے رہی ہو..... کیا میری دیوانگی..... میرے جنون کا تم پر ذرہ بھی اثر نہیں ہوا کبھی..... کیا تم نے کبھی مجھے دل کی نظر سے نہیں دیکھا..... میری محبت اتنی بے اثر کیسے ہو سکتی ہے..... کبھی تو تمہارا دل بھی.....

زہرہ: (زہرہ سختی سے کہتی ہے) نہیں..... میرے دل میں تمہارے لئے ایسا کچھ بھی نہیں ہے..... میں نے تم سے کہا ناں..... میری منزل کچھ اور ہے..... اور تم میرے راستے میں بار بار آ کر رکاوٹ بن رہے ہو میرے لئے..... مجھے آزاد کر دو اپنے اس جنون سے.....

موسیٰ زہرہ کی بات سن کر اندر سے جیسے ٹوٹ پھوٹ سا گیا ہے۔

موسیٰ چند لمحے کرب اور اذیت میں بیٹھا تڑپتا رہتا ہے اور پھر سر اُٹھا کر زہرہ کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ: جاؤ..... آزاد کیا.....

زہرہ بے اختیار اس کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: سچ کہہ رہے ہو.....

موسیٰ: ہاں..... تم نے مجھ سے میرے عشق کے ثبوت میں خود سے جدائی مانگی ہے..... تو ٹھیک ہے..... تمہاری خوشی کے لئے مجھے یہ بھی منظور ہے..... آج کے بعد میں تمہارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گا..... میں نے آج سے تمہیں اپنے جنون کی قید سے آزاد کیا..... اب میری دیوانگی تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گی.....

موسیٰ اُٹھ کر جانے لگتا ہے۔ زہرہ اُسے روکتی ہے۔

زہرہ: ہو سکے تو اپنے گھر والوں کی بات مان کر اپنا گھر بسا لینا..... تمہیں بستا دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی.....

موسیٰ: برباد کرنے والے آبادی کی دعائیں دیتے کچھ اچھے نہیں لگتے..... البتہ تمہارے لئے میری بس ایک یہی دعا ہے..... سدا آباد رہو..... ہاں مگر جس شناخت کی وجہ سے تم نے مجھے ٹھکرایا ہے..... آج کے بعد میں اپنی وہ شناخت ہی ختم کر دوں گا.....

موسیٰ پلٹ کر چل دیتا ہے..... چندا اسے جاتا دیکھ تیزی سے زہرہ کی طرف بڑھتی ہے۔ زہرہ خود کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ موسیٰ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا وہاں سے جا رہا ہے۔ زہرہ اسے جاتا دیکھ رہی ہے اور چندا اُن دونوں کو دیکھتی ہے۔ زہرہ

موسیٰ کے جانے تک اُسے دیکھتی رہتی ہے مگر موسیٰ ایک بار بھی پلٹے بنا سیدھا وہاں سے نکل جاتا ہے..... زہرہ کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کے کئی رنگ آ کر گزر جاتے ہیں اور چند ادکھ سے زہرہ کو دیکھتی ہے.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ اپنے کمرے میں کسی کام میں مشغول ہے۔ اس کا شوہر عیسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ سکینہ اُسے دیکھ کر جلدی سے کام ختم کر کے باہر جانے لگتی ہے۔ عیسیٰ بیوی کی جلد بازی دیکھ کر اُسے ٹوکتا ہے۔

عیسیٰ: کہاں چل دیں..... کبھی دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کرو..... شوہر ہوں تمہارا..... کوئی نامحرم تو نہیں جو میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی تمہیں جلد بازی کے پتنگے لگ جاتے ہیں.....

سکینہ شوہر کی جھڑک کھا کر بے زاری سے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔

سکینہ: ہاں بولو..... کیا بات ہے.....

عیسیٰ: ضروری ہے کہ کوئی بات ہو تبھی میں تمہیں روکوں..... تمہارا فرض ہے کہ جب شوہر کمرے میں آئے تو تم اس کا حال چال پوچھو..... خدمت کرو اس کی.....

سکینہ: سارے گھر کے کام تو کرتی ہوں..... ساتھ میں تمہارے بھی..... اور کیا چاہتے ہو مجھ سے..... مزید خدمت نہیں ہوتی مجھ سے.....

سکینہ جلے ہوئے لہجے میں جواب دیتی ہے۔

عیسیٰ: جانتا ہوں میں..... کہ میری موجودگی میں تمہیں یہ کمرہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے..... مگر رہنا تو تمہیں میرے ساتھ ہی پڑے گا..... یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو.....

سکینہ: مجبوری ہے..... میرا بس چلے تو ایک لمحہ بھی نہ گزاروں..... یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو.....

اسی وقت سکینہ کے فون کی گھنٹی بجتی ہے جو سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے۔ سکینہ بے خیالی میں فون اٹھا لیتی ہے۔

سکینہ: ہیلو.....

دوسری طرف خاموشی ہے۔ سکینہ غصے اور بے زاری سے پوچھتی ہے۔

سکینہ: کون ہے بھئی..... بات کرو..... گونگی ہو کیا.....؟

دوسری طرف سے کامران دھیرے سے کہتا ہے۔

کامران: ہیلو..... سکینہ..... میں ہوں..... کامران.....

سکینہ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ عیسیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔

کامران: ہیلو..... سن رہی ہو.....

سکینہ گھبرا کر ایسے ظاہر کرتی ہے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو.....

سکینہ: ہیلو..... ہیلو..... کیا مصیبت ہے..... ایک تو ان رانگ نمبرز نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔

دوسری طرف سے کامران ہیلو، ہیلو کرتا رہ جاتا ہے مگر سکینہ جلدی سے فون کاٹ دیتی ہے۔

عیسیٰ: کس کا فون تھا.....

سکینہ: پتہ نہیں..... کوئی رانگ نمبر تھا..... جاہل لوگ نمبر ملانے سے پہلے ٹھیک طرح سے دیکھتے بھی نہیں.....

سکینہ جلدی سے بات بنا کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔عیسیٰ وہیں بیٹھا اُسے جاتا دیکھتا رہتا ہے

//Cut//

سکینہ تیزی سے کمرے سے نکلتی ہے اور باہر آ کر گہرے گہرے لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔دوسری طرف کامران بات نہ ہونے کی وجہ سے پریشان سا بیٹھا ہوا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: شام

جگہ: انا کا گھر/زہرہ کا کمرہ

کمرے میں زہرہ، چندا اور انا موجود ہیں۔زہرہ شدید غصے میں تلملا کر کہتی ہے۔

زہرہ: اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں تک آنے کی.....اور انا جی آپ.....آپ نے اس کی یہ ساری بات سنی کیسے.....؟

انا: اس نے کوئی ان ہونی تو نہیں کہی.....ہمارے ہاں ایسے کسی رشتے کا آنا خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے.....

زہرہ: تو کیا آپ بھی مجھے کوئی بوجھ سمجھتی ہیں.....

انا: خدانخواستہ.....میں ایسا کیوں سمجھوں گی.....ملک شہریار مجھے صاف اور کھرے انسان دکھائی دیئے.....لیکن میں نے ان سے بھی یہی کہا ہے کہ آخری فیصلہ زہرہ کا ہی ہوگا.....

زہرہ: تو پھر میرا فیصلہ ناں ہے.....میں ابھی مزید پڑھنا چاہتی ہوں.....ایسے اُمیدوار اور بہت مل جائیں گے مگر ایک بار میری Studies ادھوری رہ گئیں تو پھر کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔

انا: پڑھائی اتنی ضروری نہیں ہے.....اور تم نے پڑھ لکھ کر کون سا کسی بینک یا دفتر کی نوکری کرنی ہے.....ایک بار پھر آرام سے سوچ لو.....ملک شہریار جیسے بندے بار بار ایسی آفر نہیں کرتے.....

انا اپنی بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتی ہے.....زہرہ غصے میں تلملاتی رہتی ہے۔

زہرہ: گھٹیا انسان.....جب اور کسی طریقے سے مقصد حاصل نہیں کر پایا تو نکاح کا پیغام لے کر آ گیا.....انا جی کو نظر کیوں نہیں آ رہا کہ یہ رشتہ نہیں.....صرف سودے بازی ہے.....وہ میرا سودا کرنا چاہتا ہے.....اور بس.....

چندا: جو سودا نہیں کرنا چاہتا تھا.....اسے بھی تو تم آج ٹھکرا آئی ہو.....وہ تو دل والا تھا.....اس کے جانے کے بعد تو اب ملک شہریار جیسے سودا گر ہی آئیں گے یہاں.....کس کس کو انکار کر کے واپس پلٹاؤ گی.....بہتر ہے.....اس کو قبول کر لو.....

زہرہ غصے میں تڑپ کر چندا کی طرف دیکھتی ہے۔

زہرہ: تم بھی یہی کہہ رہی ہو.....مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی.....

چندا: ہاں.....میں بھی یہی کہہ رہی ہوں.....اور میں یہ بھی نہ کہتی اگر تم آج موسیٰ کو ہمیشہ کے لئے ٹھکرا کر واپس نہ آئی ہوتیں.....

چندا بھی کمرے سے نکل جاتی ہے۔زہرہ غصے میں بل کھاتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: شام/سہ پہر کے بعد

نامراد اور موسیٰ میں بات چیت.....نامراد گھبرا کر کہتا ہے۔

نامراد: یہ کیا کہہ رہے ہو یار.....وہ ایسا نہیں کہہ سکتی.....

موسیٰ: ٹھیک کہہ رہا ہوں میں..... یہی کہا ہے اس نے..... اپنی محبت کی شرط رکھ دی ہے اور ساتھ ہی تمام رشتے ناطے توڑ گئی ہے جاتے جاتے.....

نامراد: لیکن میں کیسے.....

موسیٰ: (بات کاٹ دیتا ہے) بہتر ہوگا کہ تم بھی میری طرح خوش فہمیوں کے سارے تاج محل توڑ ڈالو..... محبت کی نہیں جاتی..... محبت ہو جاتی ہے..... اور اسے مجھ سے محبت نہیں ہو پائی..... یہ زبردستی کا سودا نہیں..... جیسے مجھے اپنے دل پر قابو نہیں ہے..... اسی طرح اس کا دل بھی کسی کی مرضی کے تابع نہیں ہے.....

نامراد: تو کیا تم نے بھی اس کی بات مان لی ہے؟

موسیٰ: صرف اس حد تک کہ اب میں اس کے راستے کی دیوار نہیں بنوں گا..... اگر اس کی خوشی اسی بات میں ہے تو یونہی سہی.....

نامراد: (نامراد سوال کرتا ہے) تم رہ لو گے اس کے بغیر.....؟

موسیٰ: نہیں..... موسیٰ نہیں رہ پائے گا..... مگر اب وہ موسیٰ میرے اندر نہیں رہے گا..... اس کی شرط نبھانے کے لئے ختم کرنا ہوگا مجھے..... اس پرانے موسیٰ کو.....

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں۔ چھت

سکینہ گھبرائی ہوئی سی چھپتی چھپاتی چھت پر آتی ہے اور اپنے ہاتھ میں چھپائے سیل فون سے کامران کا نمبر ملاتی ہے۔ دوسری طرف سے کامران پہلی گھنٹی پر جھپٹ کر فون اُٹھا لیتا ہے۔

سکینہ: ہیلو.....

کامران: کہاں رہ گئیں تھیں..... کب سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا میں.....

سکینہ: (غصے سے کہتی ہے) پہلے تم یہ بتاؤ، تم کہاں جا کر چھپ گئے تھے چوہے کی طرح کسی بل میں..... تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا.....

کامران: تمہارا خیال نہ ہوتا تو واپس کبھی نہ آتا..... جھگڑا نہ کرو..... یہ بتاؤ..... کیسی ہو.....

سکینہ: (جلے کٹے لہجے میں) مر گئی ہوں..... دفن کر دیا ہے ان سب نے مجھے..... اور تم پوچھ رہے ہو کہ میں کیسی ہوں.....

کامران: جانتا ہوں..... بہت ناراض ہو تم مجھ سے..... مگر میں کیا کرتا..... حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ.....

سکینہ: حالات کا بہانہ بزدل اور کم زور لوگ کرتے ہیں..... میں لڑکی ہو کر ان حالات سے نہیں ہاری تو تم کیوں ڈرتے ہو.....

کامران: انسان اپنوں کے لئے ڈرتا ہے..... اپنے لئے نہیں..... تمہارا وہ خونخوار بھائی موسیٰ..... اُس نے دھمکی دی تھی کہ وہ میرا پورا خاندان تباہ کر دے گا..... گھر پر کفن سلوا کر بھیجا تھا اس نے..... میرے گھر والے بہت ڈر گئے تھے یہ سب دیکھ کر..... اسی لئے مجھے زبردستی سکھر بھیج دیا نوکری کے لئے.....

سکینہ: اور میں..... مجھے اکیلا چھوڑ گئے تم ان بھیڑیوں کے درمیان..... ذرا سا بھی نہ سوچا تم نے میرے بارے میں.....

کامران: صرف تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا میں وہاں.....

سکینہ: اب سوچنے کا نہیں..... عمل کرنے کا وقت ہے کامران..... اگر تم میں میرے شوہر کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں..... جہاں تم کہو..... عیسیٰ مجھے طلاق دے دے گا گھر سے بھاگنے کے بعد.....

کامران: وہ جنگلی بھینسا..... موسیٰ.....

سکینہ: اس کی تم فکر نہ کرو..... اس کا سارا جنگلی پن نکال دیا ہے میں نے..... اب تو وہ گھر میں سر اُٹھا کر کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا..... اب وہ تمہارے راستے کی دیوار نہیں بنے گا..... تم بس پلان کر لو..... میں زیادہ دن اس قید میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی کامران..... نکال کر لے جاؤ مجھے یہاں سے.....

کامران: تھوڑا صبر کرو..... میں کچھ کرتا ہوں.....

سکینہ: دیر مت کرنا..... اور ہاں..... اس بار بھی اگر تم کم زور پڑ گئے تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں مار کر خود زہر کھا لوں گی..... جو مرد عورت کا ساتھ نہ دے سکے..... اسے مرد کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں.....

سکینہ فون بند کر دیتی ہے۔ کامران پریشان بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

بیوی اور قدرت میں بات چیت۔

قدرت: ہاں..... تو کیا فیصلہ کیا ہے تمہارے اس لاڈلے سپوت نے..... میں کسی کی بیٹی کو اس جیسی ناخلف اولاد کے آسرے میں زیادہ دن بٹھائے نہیں رکھ سکتا..... مجھے فضل شاہ کو جواب بھی دینا ہے.....

ہاجرہ/ بیوی: ان شاء اللہ ستارہ ہی میری بہو بنے گی..... میں نے عیسیٰ سے کہا ہے کہ وہ بھائی کو سمجھائے..... آپ دیکھئے گا..... سب ٹھیک ہو گا ان شاء اللہ.....

قدرت: (غصے سے) کیا..... اب عیسیٰ سمجھائے گا موسیٰ کو..... دونوں بھائی ایک ہی ہیں اس معاملے میں..... ہونہہ..... چور کا بھائی گرہ کٹ..... تم خود بات کرو موسیٰ سے پہلی فرصت میں..... یا پھر مجھے اپنے طریقے سے بات کرنے دو.....

بیوی: نہیں نہیں..... میں کروں گی خود بات موسیٰ سے..... مجھے یقین ہے وہ میری بات نہیں ٹالے گا.....

قدرت: اسی میں بہتری ہے اس کی..... ورنہ اسے یہ بھی صاف بتا دینا کہ اس گھر میں میرے حکم کے خلاف جانے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے.....

قدرت غصے میں بڑبڑاتا داش روم کی طرف بڑھ جاتا ہے..... ہاجرہ پریشانی سے شوہر کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات۔ مونتاج

جگہ: کاشانۂ پیراں/ موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا زہرہ سے ہوئی آج کی ملاقات کی یاد میں گم ہے۔ اس کے کانوں میں زہرہ کے کہے جملے اور اس کی محبت ثابت کرنے کی شرط کے بارے میں کہی باتیں گونج رہی ہیں۔

Audio

زہرہ اور لیپ: اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو.....

موسیٰ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔ مگر اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: ملک شہریار کا گھر یا دفتر

توقیر جاوید شہریار کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

توقیر جاوید: خبر کچھ اچھی نہیں ہے..... لڑکی نے انکار کر دیا ہے۔

شہریار: کیا.....؟ ..... اتنی اچھی آفر کے باوجود..... وہ بڑھیا تو بڑی خوش لگ رہی تھی اس دن میری آفر سننے کے بعد.....

توقیر جاوید: مسئلہ بڑھیا کی طرف سے نہیں ہے..... وہ تو شاید اب بھی اندر سے راضی ہے..... مگر لڑکی اڑی کر رہی ہے..... بڑی اڑیل گھوڑی ہے..... کاٹھی نہیں پڑنے دیتی اپنی کمر پر.....

شہریار گہری سانس لیتا ہے۔

شہریار: اسی لئے تو وہ مجھے لڑ گئی ہے..... مجھے ایسی اڑیل گھوڑیاں ہی پسند ہیں..... کیا ڈریسنگ سینس ہے..... کیا نخرہ ہے..... کیا نزاکت ہے اور کیا Appearance ہے..... جس محفل میں جاتی ہے..... محفل لوٹ لیتی ہے..... مجھے ایسی ہی کسی لڑکی کی تلاش تھی جو یہاں میرے بزنس سرکل میں میری دھاگ بٹھا سکے..... جب میرے ساتھ موو Move کرے تو میرے Rivals دیکھتے رہ جائیں..... رانی جیسی بورنگ لائف پارٹنر کے ساتھ یہ ہرگز ممکن نہیں تھا..... وہ تو بس اپنے گھر اور اپنے بچے میں گم رہتی ہے سارا دن..... اسی لئے میں اسے اپنی جاگیر پر ہی چھوڑ آیا ہوں..... آئی نیڈ اے نیو اسٹارٹ فرام ہیر ناؤ I need a new start from here now اور پھر فکر مت کرو..... جو جُوا میں زہرہ پر کھیل رہا ہوں..... بدلے میں خوب کماؤں گا.....

توقیر جاوید: وہ سب تو ٹھیک ہے..... مگر..... زہرہ نے تو صاف انکار کہلوا بھیجا ہے۔

شہریار: جو لڑکی کی ناں کو ہاں میں نہ بدل سکے..... میں اسے مرد ہی نہیں سمجھتا..... ہاں البتہ انگلی تھوڑی ٹیڑھی کرنی پڑے گی..... تم نے کیا نام بتایا تھا اپنے مینیجر دوست کا..... وہی لوکل گورنمنٹ والا.....

توقیر جاوید: جبار خان.....

شہریار: ہاں وہی..... اس سے بات کرو..... اس دن اس بڑھیا نے بتایا تھا کہ وہ لوگ جس پرانی حویلی میں رہ رہے ہیں..... وہ میونسپل کارپوریشن کی ملکیت ہے..... اور انہیں شاید لیز پیا پٹے پر ملی ہوئی ہے.....

توقیر جاوید: ہاں..... مگر..... میں کچھ سمجھا نہیں.....

شہریار: میری بات غور سے سنو.....

شہریار توقیر کو کچھ بتانے لگتا ہے۔ توقیر غور سے سنتا رہتا ہے اور اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے ایک کمینی سی مسکراہٹ ابھرنے لگتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر / زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے کمرے میں لتا اور چندا موجود ہیں۔

لتا: یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا لڑکی..... اگر ملک صاحب نے سوچنے کے لئے تمہیں وقت دیا تھا تو پھر فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی کیوں کی.....

زہرہ: جس چیز کے بارے میں مجھے سوچنا ہی نہیں ہے اس کے لئے وقت لینے کی کیا ضرورت..... آپ جانتی ہیں..... میرا فیصلہ اٹل ہے..... آپ ان کے تحفے اور رقم واپس بھجوا دیں.....

اتنا غصے میں زہرہ کی طرف دیکھتی ہے اور بنا کچھ کہے کمرے سے نکل جاتی ہے چندا غور سے زہرہ کو دیکھتی ہے۔

چندا: اگر فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اتنی الجھن میں کیوں ہو..... کہیں موسیٰ کو ٹھکرانے کے بعد تمہیں کوئی پچھتاوا تو نہیں ہو رہا.....

زہرہ: (غصے سے) کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا مجھے..... اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ سب کو ایک دم مجھے یہاں سے رخصت کرنے کا جنون کیوں سوار ہو گیا ہے..... چلی جاؤں گی میں یہاں سے..... بس کچھ عرصہ اور برداشت کر لو تم بھی مجھے.....

چندا: ایسا کیوں کہہ رہی ہو..... تم جانتی ہو تم میں میری جان اٹکی رہتی ہے.....

زہرہ: تو پھر خدا کے لئے..... مت کیا کرو اس کا ذکر میرے سامنے..... مجھے لگتا ہے وہ جا کر بھی نہیں گیا..... تمہاری باتیں اُسکے میرے آس پاس ہونے کا احساس دلاتی ہیں..... میں نے اپنی مرضی سے اسے اپنی زندگی سے نکالا ہے..... اور مجھے اس کا کوئی پچھتاوا نہیں ہے..... کہو تو لکھ کر دے دوں تمہیں..... آئندہ اگر تم نے اس کا ذکر کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا..... بخش دو مجھے..... پلیز.....

زہرہ غصے میں کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چندا پریشانی میں لمبا سانس لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ کچھ پریشان سی اپنے کمرے میں کسی کام میں مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے مگر اس کا دھیان اپنے سیل فون کی طرف ہے جسے اس نے Silent کر رکھا ہے مگر پھر بھی اس کی نظر بار بار سیل کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ اتنے میں عیسیٰ کمرے میں آتا ہے۔ اور اسی اثناء میں سکینہ کا فون بھی وائبریٹ کرتا ہے جس کی وجہ سے سکینہ گھبرا کر فون کی وائبریشن بند کر دیتی ہے عیسیٰ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھا کرتا ہے اور اپنے بال اور داڑھی وغیرہ سنوارتا ہے۔ سکینہ کن انکھیوں سے شوہر کو دیکھتی ہے جیسے بے چینی سے شوہر کے باہر جانے کا انتظار کر رہی ہو۔

عیسیٰ: ابا کے کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں..... رات دیر ہو گئی تو کل ہی واپسی ہوگی..... تمہیں کچھ منگوانا تو نہیں ہے.....

سکینہ روکھائی سے جواب دیتی ہے۔

سکینہ: نہیں.....

عیسیٰ: پہلے تو بڑی فرمائشیں کرتی تھیں کہ یہ لا دو وہ لا دو..... کتنی چٹوری تھیں تم پہلے..... اور نئے کپڑوں کی شوقین بھی..... اب کیا ہو گیا ہے تمہیں..... ہر وقت سوگ میں ڈوبی رہتی ہو.....

سکینہ: جب سے میرے نصیب تمہارے ساتھ پھوٹے ہیں کسی چیز کو دل نہیں چاہتا میرا..... سوگ نہ مناؤں تو اور کیا کروں..... تم جشن مناؤ..... تمہارے دل کی مراد جو بر آئی ہے.....

عیسیٰ بیوی کو چھیڑتا ہے۔

عیسیٰ: اسی لئے تو تم سے کہتا ہوں..... گھر میں نئے مہمان آ لینے دو..... رونق رہے گی تو تمہارا دل بھی بہل جائے گا.....

سکینہ: فضول باتیں مت کرو.....

عیسیٰ جاتے جاتے پلٹ کر سکینہ کے پھر سے وائبریٹ کرتے سیل فون کو دیکھتا ہے۔

عیسیٰ: فون آ رہا ہے تمہارا..... اٹھا لو.....

سکینہ گھبرا کر فون بند کر دیتی ہے۔

سکینہ: ایک تو اس کوکب نے جان کھا رکھی ہے..... تم جاتے ہوئے تائی جان کو بتاتے جانا..... میں شاید آج شام جاؤں گی کوکب کی طرف..... اس کی بات طے ہوگئی ہے.....

عیسیٰ: (چونکتا ہے) اکیلی جاؤ گی..... چچی جان کو ساتھ لے جانا.....

سکینہ: کیوں..... اکیلی کیوں نہیں جا سکتی..... کیا تم بھی مجھے قید کر کے گھر بٹھانا چاہتے ہو..... ٹھیک ہے..... میں نہیں جاتی..... چاہو تو جاتے ہوئے اسی کھونٹی سے مجھے زنجیر سے بھی باندھتے جانا..... تاکہ کہیں بھاگ نہ جاؤں.....

عیسیٰ: اتنا کڑوا کیوں بولتی ہو..... میں تو صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابا کو تمہارا تنہا باہر جانا پسند نہیں ہے..... اچھا ٹھیک ہے..... چلی جانا..... ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا..... اور واپس آنے کا وقت بھی بتا دینا اُسے..... اچھا ذرا مسکرا کر تو رخصت کرو شوہر کو..... ثواب ملتا ہے نیک بیویوں کو ایسی مسکراہٹ پر.....

عیسیٰ مسکرا کر سکینہ کی طرف دیکھتا ہے، سکینہ برا سا منہ بناتی ہے جیسے شدید چڑ گئی ہو۔ عیسیٰ ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: موسیٰ کا گھر

موسیٰ گھر میں/ پورچ میں آتا ہے جہاں ڈرائیور ایک چھوٹا سا بیگ یا بریف کیس ڈکی میں رکھ رہا ہے۔ موسیٰ چونک کر ڈرائیور سے پوچھتا ہے۔

موسیٰ: یہ کس کا سامان ہے.....

ڈرائیور: سکینہ بی بی نے دیا ہے موسیٰ بھائی..... ان کی کسی سہیلی کے گھر پہنچانا..... شاید کسی تقریب کے کپڑے ہیں..... وہاں پہنچانے ہیں.....

موسیٰ: تو سکینہ بی بی خود کہاں ہیں..... وہ نہیں جا رہیں.....

ڈرائیور: نہیں..... وہ شاید بعد میں جائیں گی.....

موسیٰ: ٹھیک ہے..... تم جاؤ.....

ڈرائیور آگے بڑھ جاتا ہے۔ موسیٰ کچھ دیر سوچتا ہے اور پھر ڈرائیور سے پوچھتا ہے۔

موسیٰ: عیسیٰ کہاں ہے.....

ڈرائیور: عیسیٰ بھائی تو تڑکے ہی نکل گئے تھے کسی کام سے.....

موسیٰ پلٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ فون پر کوکب سے بات کر رہی ہے۔

سکینہ: ہاں..... میں نے ضروری چیزیں، زیور اور پیسے ڈرائیور کے ہاتھ پہلے ہی بھجوا دیئے ہیں..... تم کامران کو فون کر کے بتا دو

کہ آ کر لے جائے.....

کوکب ڈری ہوئی ہے۔

کوکب: دیکھو یار..... مروا مت دینا..... تمہارے گھر والے بہت خطرناک ہیں..... کہیں میری شامت ہی نہ آ جائے.....

سکینہ اُسے ڈانٹتی ہے۔

سکینہ: مری کیوں جا رہی ہو..... کسی کو شک نہیں ہوا یہاں پر..... میں خود سامان لے کر نکلتی تو ہزار سوالات پوچھے جاتے مجھ سے..... میں بھی چار بجے تک گھر سے نکل جاؤں گی..... تم بس ویسا ہی کرو..... جیسا میں نے کہا ہے.....

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران فون پر سکینہ سے بات کر رہا ہے۔ چہرے پر پریشانی ہے۔

کامران: میں کہتا ہوں چند دن مزید انتظار کر لیتیں..... جیسے ہی مناسب وقت آئے گا میں خود.....

سکینہ غصے سے بات کاٹتی ہے۔

سکینہ: میں ایک لمحہ مزید اس قید میں نہیں گزار سکتی..... میں نے سوچ لیا ہے..... ہم دونوں آج رات کی گاڑی سے ہی سکھر نکل جائیں گے..... اور کسی محفوظ مقام پر پہنچتے ہی میں خلع کا دعویٰ دائر کر دوں گی عیسیٰ کے خلاف..... ویسے تو مجھے یقین ہے کہ اس میں ذرا سی بھی غیرت ہوئی تو خود ہی مجھے طلاق بھجوا دے گا..... تمہیں بس میری عدت گزارنے کی مدت تک میرے لئے کسی پناہ گاہ کا انتظام کرنا ہے.....

کامران: یہ سب اتنا آسان نہیں ہے..... اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ چند دن مزید انتظار کر لو..... پہلے مجھے یہ سارے انتظامات کر لینے دو..... مجھے اپنے کسی دوست کو اعتماد میں لے کر پھر اس دوست کے گھر ٹھہرانا ہوگا تمہیں..... پتہ نہیں اس کے گھر والے اس بات پر راضی ہوں گے یا نہیں..... یہ بھی دیکھنا ہوگا ہمیں.....

سکینہ: اگر ہمت نہیں تھی مجھے اس قید سے نکالنے کی تو پھر حامی ہی کیوں بھری تھی.....؟ ..... میں ٹھیک وقت پر تمہارے دوست کے گھر پہنچ جاؤں گی..... اگر تم آج وقت پر نہ پہنچے یا آنے میں دیر کی تو پھر کبھی مجھے اپنی صورت مت دکھانا..... سمجھ لینا کہ سکینہ مر گئی تمہارے لئے.....

کامران: سکینہ..... میری بات تو سنو.....

مگر دوسری جانب سکینہ غصے میں فون کاٹ دیتی ہے۔ کامران پریشان سا فون کو دیکھتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

خدیجہ اور ہاجرہ بیٹھی کچھ بات کر رہی ہیں۔

خدیجہ: عیسیٰ کو اسے اجازت نہیں دینی چاہیے تھی..... بھائی صاحب کو پتہ چلا تو بہت ناراض ہوں گے..... اگر عیسیٰ خود نہیں تھا یہاں اس کے ساتھ جانے کے لئے تو موسیٰ کو ساتھ لے جاتی.....

ہاجرہ: تم ماں ہو کر اتنی پریشان ہو رہی ہو..... مگر اب یہ میاں بیوی کے آپس کی بات ہے..... ہمیں زیادہ دخل نہیں دینا چاہیے.....

اور شاید عیسیٰ اس لئے بھی زیادہ پابندیاں نہیں لگاتا کہ سکینہ مزید نہ چڑ جائے..... پہلے ہی بڑی مشکل سے قبول کیا ہے اس نے عیسیٰ کو.....

خدیجہ: میں سمجھتی ہوں عیسیٰ کی مصلحت کو..... مگر سچ بتاؤں تو مجھے اپنی ہی اولاد سے ڈر لگنے لگا ہے..... بہت سر پھری ہے وہ.....

ہاجرہ: اللہ بہتر کرے گا..... تم پریشان نہ ہوا کرو.....

مگر خدیجہ کے چہرے پر پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: گھر کی کار

گاڑی کسی گلی میں مڑتی ہے اور رک جاتی ہے۔ سکینہ برقعہ پہنے گاڑی میں بیٹھی ہے۔ وہ ڈرائیور سے کہتی ہے۔

سکینہ: ٹھیک ہے تم گھر واپس چلے جاؤ..... مجھے یہاں کچھ دیر ہو جائے گی.....

ڈرائیور: مگر بی بی جی..... مجھے چھوٹی بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ آپ کے ساتھ ہی رہوں.....

سکینہ اُسے ڈانٹتی ہے۔

سکینہ: میں خود بات کر لوں گی اماں سے..... تمہیں جو میں نے کہا ہے وہ کرو.....

سکینہ گاڑی سے اتر جاتی ہے۔ ڈرائیور گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے۔ سکینہ گاڑی کے جانے کے بعد جلدی سے قریب سے گزرتے ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر اس میں بیٹھ جاتی ہے۔ رکشہ چل پڑتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کامران کا گھر

کامران پریشان سا کمرے سے صحن میں نکلتا ہے اور باہر جانے لگتا ہے تبھی پیچھے سے کامران کے باپ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

باپ: ارے کامران بیٹا..... مجھے ذرا ڈاکٹر تک لے چلو..... صبح سے بخار کی سی کیفیت ہے..... تمہاری امی پریشان ہو رہی ہیں.....

کامران: ابو..... وہ میں کسی کام سے.....

پیچھے سے ماں آ جاتی ہے۔

ماں: تیرے ابو کی صحت سے بڑھ کر بھی کوئی کام ہے کیا تجھے..... چل مجھے بھی ساتھ لے کر چل ڈاکٹر کے پاس..... میرا سر بھی کئی دن سے چکرا رہا ہے..... جانے بلڈ پریشر ہے یا کیا بلا..... چل بھی..... اب سوچ کیا رہا ہے۔

ماں بھی اپنی چادر سنبھال لیتی ہے۔ کامران بے چارگی سے ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کوئی دوسرا محلہ/بستی وغیرہ

رکشہ گلی میں داخل ہوتا ہے اور سکینہ اتر کر کسی گیٹ/دروازے پر دستک دیتی ہے۔ اندر سے بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے

بالوں والا ایک اوباش سا نوجوان باہر نکلتا ہے۔ سکینہ اسے دیکھ کر بوکھلا سی جاتی ہے۔

سکینہ: تنویر بھائی ہیں گھر پر.....؟..... مجھے دراصل کامران سے.....

لڑکا/بلال: اوہاں..... تنویر نے بتایا تھا کہ آپ آئیں گی..... آئیں..... اندر آجائیں..... کامران تو ابھی تک نہیں آیا..... شاید پہنچنے والا ہو.....

سکینہ: (گھبرا رہی ہے) تنویر بھائی..... کہاں ہیں.....

بلال: میں تنویر کا دوست ہوں..... اسے ایک ضروری کام سے اچانک جانا پڑا..... آپ اندر آجائیں..... ایسے گلی میں کھڑا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔

سکینہ مجبوراً اندر داخل ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: کامران کے دوست کا گھر

سکینہ اندر داخل ہوتی ہے جہاں کمرے میں پہلے سے دو اوباش اور آوارہ سے لڑکے سگریٹ کے دھوئیں اچھالتے بیٹھے تاش/جوا کھیل رہے ہیں۔ سکینہ اپنے چہرے پر نقاب مزید سخت کر لیتی ہے۔ لڑکوں کی آنکھوں میں سکینہ کو دیکھ کر مزید چمک سی آجاتی ہے۔

بلال: آپ دوسرے کمرے میں بیٹھیں..... کامران بھی بس آتا ہی ہوگا.....

سکینہ جھجکتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: ہسپتال یا کلینک وغیرہ

کامران اپنے ماں باپ کو لئے کسی ہسپتال یا کلینک کی راہداری میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور بے چینی سے سامنے لگی گھڑی کی طرف دیکھ رہا ہے جو دن کے ساڑھے چار بجا رہی ہے۔ گیلری میں اور بھی کافی مریض بیٹھے ہوئے ہیں۔ قطار میں کامران کے ماں باپ کا نمبر کافی دور ہے۔ مریض ایک ایک کر کے اندر ڈاکٹر کے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کامران پریشانی سے پھر گھڑی کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: کامران کے دوست کا گھر

بلال باقی دو لڑکوں کے ساتھ تاش کھیل رہا ہے۔

لڑکا نمبر 1: یہ کیا سین ہے پیارے..... یہ نقاب پوش حسینہ کون ہے.....

بلال: کامران کی محبوبہ ہے..... گھر سے بھاگ کر آئی ہے.....

لڑکا نمبر 2: بلے بھئی بلے..... لڑکی تو بڑی بہادر لگتی ہے..... مگر اپنا کامران..... کیا سنبھال پائے گا اسے.....

تینوں لڑکے زور سے ہنستے ہیں.....

بلال: تنویر نے کہانی سنائی تھی مجھے ان دونوں کی..... یہی وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے کامران کو شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا پہلے بھی.....

لڑکا نمبر1: وہ بھگوڑا اب بھی کیا تیر چلا لے گا..... میں تو کہتا ہوں کہ موقع اچھا ہے..... کامران کو آنا ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا.....

بلال: (ڈانٹتا ہے) بکو مت..... تنویر نے خاص تاکید کی تھی مجھے گھر کی چابی دینے سے پہلے کہ اس کا خاص خیال رکھنا ہے..... امانت ہے یہ کامران کی.....

لڑکا نمبر2: تو میں بھی تو خاص خیال رکھنے کا ہی کہہ رہا ہوں..... امانت تو وہ کامران کی ہی رہے گی..... کیا سمجھے.....؟

تینوں لڑکے اس بات پر دوبارہ زور سے قہقہہ لگاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: کامران کے دوست کا گھر۔ کمرہ

سکینہ پریشان سی نقاب اوڑھے بیٹھی ہوئی ہے۔ اور بار بار کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی کو دیکھ رہی ہے جو اب شام کے 5 بجا رہی ہے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ سکینہ گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دروازے میں بلال کھڑا ہے۔

بلال: آپ بور تو نہیں ہو رہیں..... پتہ نہیں یہ کامران کہاں رہ گیا ہے.....

سکینہ: (سکینہ گھبرا کر کہتی ہے) نہیں نہیں..... میں ٹھیک ہوں.....

پیچھے سے بلال کا دوست نمودار ہوتا ہے۔

لڑکا نمبر1: کتنی بری بات ہے..... اتنی خوبصورت لڑکی کو یوں انتظار کرواتا ہے بھلا کوئی.....

سکینہ: کہا ناں..... میں ٹھیک ہوں..... تم لوگ جاؤ..... میری فکر نہ کرو.....

تیسرا دوست بھی آ جاتا ہے۔

لڑکا نمبر2: فکر کیسے نہ کریں..... کامران جگری یار ہے اپنا..... اس رشتے سے ہمارا بھی تو کچھ حق بنتا ہے ناں..... کیوں رشیدے.....

رشید: ہاں بالکل.....

تینوں اس بات پر زور سے ہنستے ہیں۔ سکینہ اب بالکل ہی بوکھلا چکی ہے۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو جاتی ہے اور باہر نکلنے کے لئے قدم بڑھاتی ہے۔

سکینہ: مجھے لگتا ہے کامران کو دیر ہو جائے گی..... میں چلتی ہوں..... پھر ملنے آ جاؤں گی اس سے.....

مگر رشید سکینہ کے راستے میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

رشید: جاتی کہاں ہو بھابھی جی..... اب آ ہی گئی ہو تو ہم سے ہی ملتی جاؤ..... کیوں بالے.....

سکینہ غصے سے اسے دھکا دیتی ہے۔

سکینہ: راستہ چھوڑ و میرا..... تمہیں شرم نہیں آتی..... میں تمہارے دوست کی امانت ہوں.....

بلال: سب پتہ ہے ہمیں..... کیسی امانت اور کہاں کی امانت..... تمہاری تو اسی دن شادی ہو گئی تھی جس دن کامران نے شہر چھوڑا تھا..... شادی شدہ ہو تم..... اور جو عورت اپنے شوہر کی امانت نہ بن سکی ہو وہ کسی اور کو ایمان داری اور امانت کا سبق دیتی اچھی نہیں لگتی.....

لڑکا نمبر 1: ہاں..... اور ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ تم آج بھی گھر سے بھاگ کر آئی ہو پہلے کی طرح..... تنویر نے سب بتا دیا تھا ہمیں.....

سکینہ: دیکھو..... مجھے جانے دو..... میں تم لوگوں کی منت کرتی ہوں..... میرا تعلق بہت عزت دار اور معزز گھرانے سے ہے..... میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں..... میرا یقین کرو.....

تینوں لڑکے پھر زور سے ہنستے ہیں.....

بلال: ایسی ویسی لڑکی نہیں ہو..... تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو..... ہونہہ..... عزت دار اور معزز گھرانہ..... اتنا ہی معزز گھرانہ ہے تمہارا تو اسے چھوڑ کر یوں در بدر خوار کیوں ہونا چاہتی ہو..... وہ بھی اس کنگلے کامران کے ساتھ.....

سکینہ لڑکوں کو باتوں میں لگا کر تیزی سے جھکائی دے کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی ہے مگر رشید اسے پکڑ لیتا ہے۔ اور دونوں میں کچھ کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی وقت باہر کا دروازہ/گیٹ کوئی زور سے دھڑ دھڑاتا ہے۔ سکینہ چیخ کر باہر والے کو خبردار کرنے کیلئے منہ کھولتی ہے۔

سکینہ: کامرا.....

مگر بلال تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر سختی سے اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اس کا منہ بند کر دیتا ہے اور رشید سے کہتا ہے۔

بلال: رشیدے..... جا کر دیکھ باہر..... کامران ہوا تو اسے باہر سے ہی فارغ کر دینا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے..... میں اسے یہیں روکتا ہوں.....

سکینہ تڑپ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے مگر بلال اسے گھسیٹ کر ایک جانب لے جاتا ہے۔ سکینہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ بلال اور دوسرا لڑکا سکینہ کو سنبھالنے اور روکنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ باہر سناٹا چھایا ہوا ہے، بلال اور دوست باہر کوئی آواز سننے کی کوشش میں کان لگائے کھڑے ہیں۔ بلال تنگ آ کر دھیرے سے سرگوشی کرتا ہے۔

بلال: یہ رشیدا کہاں مر گیا ہے..... واپس کیوں نہیں آ رہا.....

اتنے میں باہر سے قدموں کی آواز اُبھرتی ہے جیسے کوئی چل کر اندر آ رہا ہے۔ بلال اور دوست دم سادھے باہر کی آواز سنتے رہتے ہیں۔ اتنے میں رشید کمرے کے دروازے پر نمودار ہوتا ہے۔ بلال اسے جھاڑتا ہے۔

بلال: کہاں رہ گیا تھا بے..... کون تھا باہر..... بھگا دیا ناں اسے وہاں سے.....

رشید چپ چاپ کھڑا ہے۔ اتنے میں اسے کوئی باہر سے زوردار لات یا دھکا رسید کرتا ہے اور رشید کمرے کے اندر آ کر گرتا ہے۔ بلال اور دوست گھبرا کر دروازے کی طرف لپکتے ہیں۔ مگر پھر وہیں جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دروازے کے بیچوں بیچ موسیٰ کھڑا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 11

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: کامران کے دوست کا گھر

کامران کے دوستوں نے سکینہ کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ رشید دروازے سے اندر آ کر گرتا ہے۔ بلال اور (سلیم دوست نمبر 2) بھاگ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں مگر دروازے کے بیچوں بیچ موسیٰ کھڑا ہے۔ سکینہ موسیٰ کو دیکھ کر رو پڑتی ہے۔

سکینہ: موسیٰ بھائی.....

بلال: (بلال چلا کر موسیٰ سے پوچھتا ہے) کون ہو تم.....اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی.....

موسیٰ: کچھ دیر میں تم تینوں کی ٹانگیں سلامت ہی نہیں رہیں گی کہیں اڑانے کے لیے.....اور رہا سوال یہ.....کہ میں کون ہوں .....تو سن لو.....بھائی ہوں میں اس کا.....

بلال: (موسیٰ کی بات پر سکینہ چونک کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے) آ تو گئے ہو.....مگر اب جا نہیں پاؤ گے.....سلیم ..... رشیدے.....دیکھ کیا رہے ہو.....پکڑ لو اسے بھی.....

(موسیٰ سکینہ کی طرف دیکھتا ہے جو بکھرے بالوں کے ساتھ پریشان سی کھڑی ہے)

موسیٰ: تو یہ دوست ہیں کامران کے.....جن پر بھروسہ کر کے تم گھر سے نکلی تھیں۔ مگر وہ خود کہاں ہے.....یہ عزت ہے تمہاری اس کی نظر میں، کہ اپنی عزت کو ان گیدڑوں کے آگے پھینک کر خود کہیں غائب ہو گیا ہے.....

سکینہ: (سکینہ دکھ سے سسک پڑتی ہے) موسیٰ بھائی.....میں.....

بلال: اوئے.....بند کرو اپنا یہ فیملی ڈرامہ.....اور تم دونوں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو.....پکڑو اسے.....

رشید خوف زدہ نظروں سے بلال کی توجہ آنکھوں آنکھوں میں موسیٰ کے نیفے کمر کی جانب پھنسے پسٹل کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ موسیٰ پسٹل ان تینوں کی طرف سیدھا کرتا ہے بلال کے بھی ہوش اڑ جاتے ہیں۔ موسیٰ سکینہ سے کہتا ہے۔

موسیٰ: تم سر پر چادر لو اور باہر جا کر میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ چپ چاپ ..... میں ان کے ساتھ معاملہ صاف کر کے آتا ہوں.....سکینہ جلدی سے اپنی چادر درست کرتی ہے اور باہر کی طرف لپکتی ہے۔ مگر جاتے جاتے رکتی ہے اور گڑگڑا کر موسیٰ سے کہتی ہے۔

سکینہ: موسیٰ بھائی.....آپ بھی چلیں میرے ساتھ.....میں آپ کو اس طرح یہاں چھوڑ کر.....

موسیٰ: (موسیٰ غصے سے مگر دبی آواز میں سختی سے پھر حکم دیتا ہے) جاؤ.....

سکینہ گھبرا کر تیزی سے باہر نکل جاتی ہے، موسیٰ غصے سے گھور کر تینوں لڑکوں کی طرف دیکھتا ہے۔

رشید: رشید گڑگڑاتا ہے دیکھو بھائی.....ہمیں پتہ نہیں تھا کہ یہ تمہاری بہن ہے.....بلکہ.....یہ تو اب ہم سب کی بہن.....موسیٰ کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: نیا محلہ۔ گلی

سکینہ گھبرائی ہوئی سی اپنا نقاب اور چادر سنبھالتی کامران کے دوست کے گھر سے نکلتی ہے، سامنے ہی موسیٰ کی جیپ کھڑی ہے، وہ گھبراہٹ میں جلدی سے جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتی ہے اور پریشانی سے اس مکان کی طرف دیکھتی ہے جہاں سے وہ ان غنڈوں سے بچ کر نکلی ہے۔ لیکن موسیٰ ابھی تک اندر ہی ہے۔ سکینہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اچانک اندر سے یکے بعد دیگرے تین فائر ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سکینہ کی گھبراہٹ میں چیخ نکل جاتی ہے۔ چند لمحے بعد موسیٰ اندر سے نکلتا ہے اور اطمینان سے گاڑی میں آ کر بیٹھتا ہے اور جیپ اسٹارٹ کر دیتا ہے۔ سکینہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے موسیٰ کو دیکھ رہی ہے۔

(گاڑی چل پڑتی ہے)

سکینہ: بھائی..... تم نے انہیں مار ڈالا.....

موسیٰ: بھول جاؤ کہ تم یہاں کبھی آئی تھیں..... میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ وہ بزدل شخص تمہاری ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا .....اور آج اس نے یہاں نہ پہنچ کر میرا ہر فیصلہ سچا ثابت کر دیا۔

(سکینہ رو پڑتی ہے)

سکینہ: بھائی..... تم میرے سینے میں بھی اس پستول کی باقی ساری گولیاں اتار دو..... میں آج اپنی نظروں میں ہی گر گئی ہوں ہمیشہ کے لیے..... اب کبھی کسی کا سامنا نہیں کر پاؤں گی.....

موسیٰ: میں نے کہا ناں..... تمہیں یہ سب بھولنا ہوگا کہ تم کبھی یہاں آئی تھیں..... اپنی اس سہیلی کا پتہ بتاؤ جس کے گھر جانے کے لیے تم گھر سے نکلی تھیں..... میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا..... اور یاد رکھو..... تم نے آج کچھ نہیں دیکھا..... کھاؤ میرے سر کی قسم.....

(سکینہ حیرت سے موسیٰ کو دیکھ رہی ہے)

سکینہ: یہ تم کہہ رہے ہو بھائی..... مجھے کیوں زندہ جانے دے رہے ہو..... آج سے موت کی بھیک مانگ رہی ہوں..... مجھے بھی ان کے ساتھ ہی وہاں کیوں نہیں مار ڈالا.....

موسیٰ: کیونکہ میں یہ بات جان چکا ہوں کہ محبت کرنا گناہ نہیں ہے..... ہاں غلط انسان سے غلط مقام پر محبت ضرور جرم ہے..... تمہارا مقام اب عیسیٰ کا دل اور اس کا گھر ہے..... وہ بہت چاہتا ہے تمہیں..... اور اپنے اس بھائی کی ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہا کہ عیسیٰ میرا چھوٹا بھائی ہے..... بلکہ اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہ بہت اعلیٰ ظرف ہے..... اور محبت صرف اعلیٰ ظرف ہی کر سکتے ہیں۔

سکینہ حیرت سے موسیٰ کو دیکھ رہی ہے، اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلتا ہے

سکینہ: بھائی.....

موسیٰ: میں تمہیں تمہاری سہیلی کے گھر اتار دوں گا۔ وہاں سے تم عیسیٰ کو فون کر کے بلا لو گی کہ وہ تمہیں آ کر گھر لے جائے..... اور گھر جا کر بھی تم کبھی اس واقعے کا کسی سے ذکر نہیں کرو گی..... سمجھ گئیں..... میں نے تمہیں اپنے سر کی قسم دی ہے..... یاد رکھنا.....

سکینہ: بھائی..... مگر تم.....

موسیٰ: جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو..... مزید کوئی سوال نہیں.....

سکینہ مجبوراً خاموش ہو جاتی ہے مگر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہتے ہیں۔ موسیٰ تیزی سے جیپ بھگاتا ہوا کسی گہری

سوچ میں گم ڈرائیو کرتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: شام کا اندھیرا ڈھل رہا ہے

کامران رکشے میں اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر کے باہر گلی میں اترتا ہے۔ اس کے ماں باپ کے ہاتھ میں دواؤں کا کوئی تھیلا ہے۔ وہ اندر چلے جاتے ہیں۔ کامران جلدی سے اپنا سیل فون جیب سے نکالتا ہے اور کسی کا نمبر ڈائل کرتا ہے۔ دوسری جانب بیل جا رہی ہے مگر کوئی فون پک نہیں کرتا۔ کامران بے چینی سے دوبارہ نمبر ڈائل کرتا ہے۔ دوسری طرف پھر بیل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن/شام

جگہ: کامران کے دوست کا گھر

اندر کمرے میں کسی کے سیل فون کے بجنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کیمرہ اندر پین کرتا ہے تو بلال، سلیم اور رشید تینوں لڑکے الٹے سیدھے اوندھے منہ کمرے کے فرش پر گرے ہوئے ہیں۔ بلال کے قریب پڑا سیل فون بار بار بج رہا ہے مگر اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن/شام

جگہ: کاشانۂ پیراں

عیسیٰ گھر میں اپنے کمرے میں/ یا اپنے باپ قدرت کے گھر میں بنائے دفتر میں کسی کام میں مصروف ہے اور رجسٹر کھولے بیٹھا کچھ حساب کتاب دیکھ رہا ہے کہ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجتی ہے اور وہ بے خیالی میں فون اٹھاتا ہے اور پھر نام دیکھ کر چونک سا جاتا ہے۔ جیسے اسے اس فون کے آنے کا کبھی یقین ہی نہ ہو۔ اور خود سے کہتا ہے۔

ارے..... پھولن دیوی..... یہ کیا..... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا.....

(عیسیٰ جلدی سے فون آن کرتا ہے)

عیسیٰ: تم نے شاید جلد بازی میں کوئی غلط نمبر ڈائل کر دیا ہے بیوی..... میں تمہارا شوہر بول رہا ہوں..... عیسیٰ ولد قدرت اللہ.....

(سکینہ دوسری جانب کسی گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اپنی روہانسی آواز کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی ہے)

سکینہ: ہاں..... میں نے تمہیں ہی فون کیا ہے.....

عیسیٰ: (بے یقینی سے) زہے نصیب..... زہے نصیب..... آج سورج شمال جنوب وغیرہ سے تو نہیں نکلا تھا ناں.....

سکینہ: وہ..... میں کہہ رہی تھی کہ..... مجھے کوکب کے گھر سے آ کر لے جاؤ..... اگر فری ہو تو..... ورنہ ڈرائیور کو بھیج دو.....

(عیسیٰ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا)

عیسیٰ: کیا.....؟..... میرے کان تو نہیں بج رہے..... جناب..... میں ہی آپ کا ڈرائیور ہوں ہمیشہ سے..... کیوں گناہگار کرتی ہو بیوی..... میں خود آ رہا ہوں تمہیں لینے کے لیے..... بس سمجھو نکل پڑا ہوں.....

سکینہ: ٹھیک ہے..... آ جاؤ.....

(سکینہ فون بند کر دیتی ہے۔عیسیٰ خوشی سے اچھل پڑتا ہے اور فون کو چوم لیتا ہے)

عیسیٰ: واہ میرے مولا.....لگتا ہے وہ جو سونفل مانگے تھے.....وہ پچاس پڑھنے سے پہلے ہی قبول ہو گئے.....خوش کر دیا میرے مالک.....چل بھئی عیسیٰ.....جلدی کر.....کہیں وہ ہنٹر والی پھر سے وہی پرانی سکینہ نہ بن جائے۔

عیسیٰ تیزی سے لپک.....جھپک رجسٹر وغیرہ بند کرتا ہے اور باہر کی جانب لپکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں

باہر تیز بارش ہو رہی ہے۔سکینہ کا کمرہ

سکینہ اپنے کمرے میں بے چین سی ٹہل رہی ہے۔اس کی آنکھوں کے سامنے آج اس ویران گھر میں تین لڑکوں کے درمیان گھرے جانے کا منظر گھوم رہا ہے۔پھر موسیٰ کا آنا،سکینہ کو جھڑانا اور موسیٰ کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کان میں گونجتے ہیں۔

موسیٰ کی آواز

اوور لیپ overlap: میں نے تم سے کہا تھا ناں.....وہ بزدل شخص.....محبت ظرف والوں کا کام.....،.....عیسیٰ ظرف والا ہے.....کھاؤ میرے سر کی قسم.....کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی.....

سکینہ کے کان میں موسیٰ کی باتیں گونجتی رہتی ہیں۔

اور سکینہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔پھر اسے یاد آتا ہے کہ آج تک موسیٰ سے کیا گیا سارا بُرا سلوک طنز اور طعنے یاد آتے ہیں۔اسے یاد آتا ہے کہ کیسے اس نے موسیٰ کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا۔موسیٰ کا چپ چاپ سب سہنا۔یہ سب یاد کر کے سکینہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی ہے۔سکینہ قریب پڑا جائے نماز زمین پر بچھاتی ہے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔باہر برستی بارش کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔سکینہ گڑگڑاتے ہوئے دُعا مانگتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات۔تیز بارش

جگہ: کاشانہء پیراں

پیر قدرت اللہ کے گھر کے باہر پولیس کی موبائیل اور چند سرکاری گاڑیاں آ کر رُکتی ہیں جن کے اوپر لگی نیلی بتی جل بجھ رہی ہے۔چند پولیس والے اتر کر دروازہ پیٹتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت اور ہاجرہ بستر پر لیٹے سو رہے ہیں۔اتنے میں باہر سے زور زور سے دروازہ پیٹنے اور گھنٹی بجنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔میاں بیوی اٹھ جاتے ہیں۔پیر قدرت قریب پڑی ٹیبل کلاک پر نظر ڈالتا ہے جو رات کے دو بجے کا وقت دکھا رہی ہے۔

قدرت: اتنی رات کو کون آ گیا.....وہ بھی اس طوفانی موسم میں.....

ہاجرہ: خدا خیر کرے.....جانے کون ہے۔

قدرت: موسیٰ کہاں ہے.....گھر پر تو ہے ناں تمہارا لاڈلا.....

ہاجرہ: ہاں.....وہ تو شام کو ہی لوٹ آیا تھا.....میں نے خود دیکھا تھا اُسے.....

قدرت: پھر کون آیا ہے اس وقت.....

(اتنے میں باہر خاموشی چھا جاتی ہے اور پھر قدرت کے کمرے کے دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے)

قدرت: کون ہے بھئی.....آ جاؤ اندر.....

(عیسیٰ گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

قدرت: کیا ہوا.....سب خیر تو ہے.....

عیسیٰ: وہ.....ابا.....نیچے پولیس آئی ہے.....

(ہاجرہ کے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے)

ہاجرہ: یا اللہ خیر.....

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں۔ڈرائنگ روم

باہر تیز بارش کی آواز آ رہی ہے اور کہیں دور بجلی چمکتی ہے۔ڈرائنگ روم میں قدرت، عیسیٰ، پولیس کا ایس پی رینک کا آفیسر بیٹھے ہیں۔

قدرت: کیا بات ہے SP صاحب ..... یوں رات کے اس پہر کسی شریف شہری کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں۔

ایس۔پی: معافی چاہتا ہوں پیر صاحب.....مگر معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے خود آنا پڑا، میں تھانے سے ایس۔ایچ۔او کو بھی بھیج سکتا تھا مگر آپ کے گھرانے کی عزت اور وقار نے مجھے اس بات سے روکے رکھا.....

عیسیٰ: مگر پھر بھی.....اتنی نفری ساتھ لے کر آنے کی کوئی وجہ تو ہوگی.....

(ایس۔پی قدرت کی طرف دیکھتا ہے)

ایس۔پی: جی.....وجہ ہے اور بہت افسوس ناک وجہ ہے.....میرے پاس آپ کے بڑے بیٹے موسیٰ کو گرفتار کرنے کا وارنٹ ہے.....

قدرت: کیا.....؟.....موسیٰ کا وارنٹ.....

S.P: جی.....میں موسیٰ کو گرفتار کرنے آیا ہوں.....امید ہے آپ لوگ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔

عیسیٰ: مگر کیوں.....کیا جرم کیا ہے میرے بھائی نے.....؟

S.P: جرم تو بڑا سنگین ہے.....مگر خدا کرے کہ ہمارا شک غلط نکلے.....

قدرت: پہیلیاں نہ بجھائیں ایس پی صاحب.....صاف صاف بتائیں کہ موسیٰ نے کیا جرم کیا ہے.....

ایس۔پی: اقدام قتل.....ہمیں شبہ ہے کہ موسیٰ نے آج شام بستی نیاز آباد کے ایک مکان میں تین لڑکوں کو گولی ماری ہے.....(پیر قدرت اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے).....وہ تینوں اس وقت I.C.U آئی۔سی۔یو میں پڑے ہیں اور ان کی حالت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بہت نازک ہے.....دعا کریں کہ وہ ہوش میں آ جائیں.....تینوں کو ٹانگوں میں گولی ماری گئی ہے۔

عیسیٰ: آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ انہیں گولی موسیٰ بھائی نے ہی ماری ہے.....، کیا ان میں سے کسی زخمی نے یہ بیان دیا ہے.....آپ نے ابھی خود بتایا کہ وہ نازک حالت میں I.C.U میں بے ہوش پڑے ہیں۔

S.P: نہیں.....ان میں سے تو فی الحال کسی نے کوئی بیان نہیں دیا.....انہیں بڑی سیریس حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا.....مگر محلے والوں نے اس گھر کے باہر جو کالی جیپ کھڑی دیکھی تھی اس کا نمبر کسی نے نوٹ کر لیا تھا.....وہ جیپ موسیٰ کے استعمال میں ہی ہے.....ہم نے اس بات کا پہلے ہی اطمینان کر لیا ہے.....وہ جیپ اس وقت بھی آپ کے پورچ میں موجود ہے.....موسیٰ کہاں ہے پیر صاحب.....اس سے کہیں گرفتاری دے دے۔

(قدرت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتا ہے)

قدرت: اگر موسیٰ نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ خود چل کر آپ کے ساتھ جائے گا.....عیسیٰ تم جا کر اپنے بھائی کو لے آؤ.....

عیسیٰ: (عیسیٰ تڑپ کر باپ کی طرف دیکھتا ہے) مگر ابا.....

قدرت: میں نے کہاں ناں.....موسیٰ کو بلاؤ.....

ایس۔پی: ایک اور بات پیر صاحب.....محلے کے چند عینی شاہدین نے یہ بھی بتایا ہے کہ موسیٰ کے ساتھ اس گاڑی میں کوئی نقاب پوش لڑکی بھی سوار تھی.....مجھے آپ کے علاقہ ایس۔ایچ۔او نے بتایا ہے کہ موسیٰ پہلے بھی کسی لڑکی کے معاملے میں ایک بار گرفتار ہو چکا ہے.....کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں تھی.....؟

قدرت کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ جاتا ہے مگر آنکھیں شرم اور ندامت سے جھک جاتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ: کاشانہ پیر

ہاجرہ کا کمرہ

ہاجرہ، خدیجہ اور سکینہ تینوں پریشان سی کھڑی ہیں۔

ہاجرہ: کوئی مجھے بھی تو بتائے.....کیا جرم کیا ہے میرے موسیٰ نے جو اس طرح آدھی رات کو پولیس اسے گرفتار کرنے آ گئی ہے.....؟

خدیجہ: ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے پولیس والوں کو.....ہمارا موسیٰ کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا.....(سکینہ پریشانی سے ان دونوں کو دیکھتی ہے)

ہاجرہ: میرا دل بیٹھا جا رہا ہے.....یہ عیسیٰ بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا ہے.....کہا بھی تھا کہ مجھے خبر دیتا جائے۔

(اتنے میں ایک نوکرانی گھبرائی ہوئی سی اندر آتی ہے)

نوکرانی: وہ پیرنی جی.....وہ لوگ موسیٰ بھائی کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: کاشانہ پیراں۔ڈرائنگ روم

موسیٰ سر جھکائے باپ کے سامنے کھڑا ہے۔قدرت اللہ زور سے چلا کر پوچھتا ہے۔

قدرت: موسیٰ.....بولتے کیوں نہیں.....تم پر جو الزام لگا ہے کیا وہ سچ ہے.....بولو.....جواب دو۔

موسیٰ: (موسیٰ دھیرے سے سر ہلاتا ہے) یہ سچ ہے ابا..... ان لڑکوں پر میں نے ہی گولی چلائی تھی.....
(اچانک قدرت کا ہاتھ گھومتا ہے اور موسیٰ کے چہرے پر زور کا چانٹا پڑتا ہے) (عیسیٰ گھبرا کر باپ کو روکنے کے لیے بڑھتا ہے)

قدرت: بس..... اسی کی کسر باقی تھی..... یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا مجھے..... کہ پیر قدرت کا ناہنجار بیٹا کسی آوارہ لڑکی کی خاطر لوگوں پر گولیاں برساتا پھر رہا ہو..... لے جائیں اسے S.P صاحب..... اور پھانسی سے کم سزا دی تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس ناخلف اولاد کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالوں گا..... لے جائیں اسے میری نظروں سے دُور.....
(S.P پیچھے کھڑے ایک اہل کار کو اشارہ کرتا ہے جو آگے بڑھ کر موسیٰ کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے۔ موسیٰ سر جھکائے آگے بڑھنے لگتا ہے)

قدرت: رُکو..... میرا آخری حکم بھی سنتے جاؤ..... میں نہیں جانتا کہ قانون تمہیں کیا سزا دے گا اور اس سزا کو سُنانے میں مزید کتنا وقت درکار ہوگا..... مگر میری عدالت کا فیصلہ میں ابھی جاری کیے دیتا ہوں..... تمہارا اب اس گھر یا اس گھر کے مکینوں سے کوئی تعلق نہیں رہا..... یہاں سے کوئی بھی تمہارے جرم اور تمہارے گناہوں کی پیروی کرنے کسی تھانے کچہری یا عدالت میں پیش نہیں ہوگا..... عیسیٰ تڑپ کر باپ کی طرف دیکھتا ہے۔)

عیسیٰ: مگر ابا..... بھائی.....
(قدرت ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرا دیتا ہے)

قدرت: بس..... یہ میرا حکم ہے..... آج کے بعد موسیٰ اس گھر میں پلٹ کر قدم بھی نہیں رکھے گا..... اور اگر کسی نے اس سے تعلق رکھنے کی کوشش کی..... تو وہ بھی اپنا بندوبست خود کر لے..... لے جائیں اسے ایس۔ پی صاحب..... اور خدا کے لیے..... جب اس کے جرم کا پرچہ کاٹیں تو ولدیت کے خانے میں میرا نام ہرگز نہ لکھئے گا۔ میں اسے پہلے ہی عاق کر چکا ہوں..... آج کے بعد یہ میرے نام کا حق دار بھی نہیں ہوگا..... اور تم دوبارہ کبھی اپنی شکل دکھانے کی کوشش بھی مت کرنا مجھے..... سمجھ لو کہ ہم سب تمہارے لیے اور تم ہمارے لیے مر گئے ہو.....
(قدرت غصے میں پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ پولیس موسیٰ کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔ عیسیٰ جلدی سے آگے بڑھ کر موسیٰ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

موسیٰ: بھائی..... یہ سب..... گھر والوں کا خیال رکھنا..... خاص طور پر ابا کو سنبھالنا اب تمہارا ہی فرض ہے..... ہمت نہ ٹوٹنے دینا ان کی.....
موسیٰ پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن۔ نکلنے کا مونتاج
جگہ: انا کی حویلی۔ صحن

انا صبح کی دھوپ میں تخت پوش پر لیٹی کسی خادمہ سے ہاتھ پاؤں دبوا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حقے کے کش بھی لگا رہی ہے، چند ابر آمدے سے باہر صحن میں آتی ہے اور بال باندھتے ہوئے دور صحن کے گیٹ کے قریب پڑے گول طریقے سے رول شدہ اخبار کو اٹھاتی ہے اور اس پر لگا ربر بینڈ اتار کر پھینکتی ہے، اور کھڑے کھڑے یونہی سرسری سی نظر اخبار کی سرخیوں پر ڈال کر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ تبھی اس کی نظریں جیسے اخبار کی کسی خبر پر جم سی جاتی ہیں اور اسے سکتہ سا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ زہرہ کو آوازیں دیتی اس کے کمرے کی طرف دوڑتی ہے۔

چندا: زہرہ.....غضب ہوگیا.....میری بات سُنو.....

لالہ: (لالہ اسے ڈانٹتی ہے) کیا ہوگیا ہے لڑکی.....کیا اخبار سے سانپ نکل آیا ہے.....کیوں پاگلوں کی طرح بھاگی جارہی ہو.....چندا.....سنتی ہو.....تم سے کہہ رہی ہوں.....

مگر چندا لالہ کی بات سُن کر بھی اسی طرح بھاگتے ہوئے صحن/برآمدہ پار کر جاتی ہے اور زہرہ کے کمرے کی طرف بھاگتی ہے۔

//InterCut//

وقت صبح۔موقتاج

جگہ زہرہ کا کمرہ

زہرہ بستر پر بے زار سی لیٹی ہوئی ہے اور کسی خیال میں گم ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: صبح

جگہ: زہرہ کا کمرہ

چندا ہاتھ میں اخبار تھامے پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی زہرہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔زہرہ غصے سے اسے دیکھتی ہے۔

زہرہ: صبح سویرے کیا قیامت آ گئی ہے۔کیوں سارے گھر میں اودھم مچا رکھا ہے۔

چندا: سمجھ قیامت ہی آ گئی ہے۔وہ تمہارا موسیٰ ہے ناں.....(زہرہ غصے سے گھورتی ہے) میرا مطلب ہے وہ لڑکا ہے ناں موسیٰ.....اس نے ایک ساتھ تین لڑکوں پر گولی چلادی۔

زہرہ: (زہرہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہے) کیا.....کیا بک رہی ہو.....

چندا: بک نہیں رہی ہوں.....یہ لو.....خود پڑھ لو.....

(چندا اخبار زہرہ کے ہاتھ میں دیتی ہے۔زہرہ جلدی سے خبر پر نظر ڈالتی ہے اس کے چہرے کا رنگ بھی اڑ جاتا ہے)

زہرہ: اوہ خدایا.....یہ کیا کر دیا اس لڑکے نے.....

چندا: لگتا ہے تمہارا سارا غصہ کسی اور پر اتار ڈالا ہے اس نے.....جنونی اور دیوانہ تو تھا ہی پہلے سے.....رہی سہی کسر تمہارے عشق نے پوری کر ڈالی.....

زہرہ غصے سے چندا کو دیکھتی ہے، چندا سہم کر چپ ہو جاتی ہے۔زہرہ دوبارہ اخبار کی خبر پر نظر ڈالتی ہے اور پریشانی سے خبر پڑھتی رہتی ہے زہرہ کو یاد آتا ہے کہ موسیٰ نے کہا تھا کہ میں اپنی نیک نامی کی شناخت مٹا دوں گا۔

چندا: مجھے بہت ترس آ رہا ہے اس پر.....جانے اس کی زندگی میں سکون کی کوئی گھڑی ہے بھی یا نہیں.....

//Cut//

Scene No # 14

وقت: صبح

جگہ: پیر قدرت کا گھر (کاشانہ پیراں) لاؤنج

لاؤنج میں ایک طوفان سا آیا ہوا ہے اور پیر قدرت گھر کی روتی عورتوں پر گرج برس رہا ہے۔عیسیٰ بھی ایک جانب خاموش سا کھڑا ہے۔

قدرت: کہہ دیا ناں.....کوئی نہیں جائے گا یہاں سے تھانے.....سارے شہر میں تھو تھو ہو رہی ہے آج ہمارے خاندان پر.....ایسا

لڑکا جننے سے تو بہتر تھا تم خود اپنے ہاتھوں سے اس کا پالنے میں ہی گلا گھونٹ کر مار ڈالتیں..... کم از کم یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا مجھے (سکینہ اور خدیجہ بھی پریشان کھڑی ہیں)

(ہاجرہ رو رہی ہے)

ہاجرہ: میرا موسیٰ ایسا نہیں کر سکتا..... مانتی ہوں وہ غصے کا کچھ تیز اور جذباتی ہے مگر وہ کسی کو بلاوجہ نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا.....

قدرت: اقدام قتل کا پرچہ کٹا ہے تمہارے لاڈلے کے خلاف..... وہ بھی ایک نہیں..... تین تین اقدام قتل کی واردات کا..... اب بھی تم کہتی ہو کہ تمہارا بیٹا بڑا فرمانبردار اور شریف ہے..... ان تین لڑکوں کی حالت بھی کچھ ایسی ہے کہ کسی بھی لمحے ان کی سانسیں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ سکتی ہیں..... پھر تمہارے بیٹے کو قاتل ہونے کی ڈگری بھی مل جائے گی خیر سے..... قاتل کی ماں کہلاؤ گی پھر تم.....

ہاجرہ: خدا نہ کرے..... ایسی باتیں کیوں نکال رہے ہیں آپ اپنی زبان سے..... میرا بیٹا کسی کا قتل نہیں کر سکتا..... یہ ضرور کسی دشمن کی چال ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ جا کر کچھ پتہ کریں..... اگر خود نہیں جانا چاہتے تو عیسیٰ کو ہی بھیج دیں..... میرا دل ڈوب جائے گا ورنہ.....

قدرت: خبردار اگر کسی نے موسیٰ کی کسی بھی غرض سے گھر سے قدم باہر نکالا..... میں اس کے ساتھ بھی ہمیشہ کے لیے اپنا ہر تعلق توڑ ڈالوں گا..... سکینہ تڑپ کر کچھ کہنا چاہتی ہے مگر خود کو زبردستی روک لیتی ہے، اُسے موسیٰ کی دی ہوئی قسم یاد آ جاتی ہے۔

موسیٰ آڈیو/اوور لیپ: "تمہیں میرے سر کی قسم ہے..... اگر دل سے مجھے بھائی سمجھتی ہو تو کبھی یہ راز فاش مت کرنا....."

قدرت ابھی تک ویسے ہی غصے میں چلا رہا ہے۔ خدیجہ ہمت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

خدیجہ: مگر بھائی صاحب..... موسیٰ بھی آپ کا خون ہے..... ایک بار اس بات کا پتہ تو کریں کہ آخر ماجرا کیا ہے..... موسیٰ کے ساتھ وہ لڑکی کون تھی..... شاید بات کچھ اور ہو.....

قدرت: اب بھی تم لوگوں کو شک ہے کہ موسیٰ کے ساتھ کون تھی..... اس بازاری لڑکی کے ساتھ اس کے ہزار افسانے سُننے کے بعد بھی تم لوگ ابھی تک اپنے دل کو جھوٹی تسلی دے رہے ہو..... لیکن میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا..... ہاں..... موسیٰ میرا ہی خون ہے..... مگر کبھی کبھی اپنا ہی خون ناسور بھی بن جاتا ہے۔

قدرت غصے سے وہاں سے نکل جاتا ہے۔ بیوی روتی رہتی ہے۔ خدیجہ اور سکینہ تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: تھانہ۔ لاک اپ

نامراد لاک اپ میں سلاخوں کے پار کھڑے موسیٰ کے سامنے کھڑا ہے اور تقریباً رونے ہی والا ہے۔

نامراد: یہ کیا کر ڈالا شہزادے..... تینوں کو ہی داغ ڈالا..... تینوں پڑے آخری سانسیں لے رہے ہیں..... میں ابھی ہسپتال سے ہی آ رہا ہوں۔

موسیٰ: مر بھی جائیں تو کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا..... کچھ دھرتی کا بوجھ ہی کچھ کم ہو جائے گا۔

نامراد: نہ کر یار..... آخر معاملہ کیا تھا..... اتنا غصہ.....

موسیٰ: سمجھ جاؤ کہ بات ہی کچھ ایسی تھی..... ایک بہن کی عزت کا معاملہ تھا..... میری جگہ کوئی بھی بھائی ہوتا..... وہ یہی کرتا.....

نامراد: سمجھ گیا.....اسی لیے تم نے تفتیشی افسر کو اس لڑکی کا نام نہیں بتایا جو کل تمہارے ساتھ تھی.....

موسیٰ: ہاں.....اور تم بھی آخر وقت تک کبھی کسی سے یہ بات نہیں کہو گے.....

نامراد: فکر مت کرو..... یہاں سے یہ لوگ تمہیں ہفتے بھر میں بڑی جیل منتقل کر دیں گے.....وہاں بڑی جان پہچان ہے اپنی..... میں تمہیں زیادہ دن اندر رہنے نہیں دوں گا.....،.....ابھی تمہارا نامراد زندہ ہے.....بس دعا کرو وہ خبیث بچ جائیں.....

نامراد موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر ہاتھ پہ ہاتھ مارتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: لالہ کا گھر، زہرہ کا کمرہ

زہرہ کسی گہری سوچ میں پریشان بیٹھی ہوئی ہے، اتنے میں لالہ ہاتھ میں کوئی کاغذ لیے پریشان سی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

لالہ: اری زہرہ.....یہ دیکھ تو ذرا..... یہ کیسا کاغذ دے گیا ہے میونسپلٹی والا انسپکٹر آج صبح سویرے..... مجھے تو ابھی چمکی نے لا کر دیا ہے.....

زہرہ: کیا ہے یہ لالہ جی.....

لالہ: پتہ نہیں،.....کہہ رہا تھا کہ ہماری یہ حویلی کسی اور کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔اور ہم اس پر ناجائز قبضہ کیے بیٹھے ہیں.....

(زہرہ جلدی سے لیٹر پکڑتی ہے)

زہرہ: کیا..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔آپ نے تو بتایا تھا کہ پچھلے چالیس سال سے آپ کے بڑوں کے پاس تھی یہ حویلی.....اور آپ کے پاس الاٹمنٹ آرڈر بھی تو پڑا ہے اتنا پرانا.....

(لالہ پریشانی سے کہتی ہے)

لالہ: ہاں.....یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں.....مگر پتہ نہیں یہ موئے میونسپلٹی والے کہاں کہاں سے کاغذ نکال لاتے ہیں.....اب کیا ہوگا زری جان..... ہمارے پاس تو اس پرانی حویلی کے علاوہ سر چھپانے کو کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی نہیں ہے.....میں ان ساری بچیوں کو لے کر اس عمر میں کہاں در بدر خوار ہوتی پھروں گی.....

(زہرہ کاغذ کی تحریر پڑھ رہی ہے، وہ لالہ کو دیکھ کر پریشانی سے کہتی ہے۔)

زہرہ: یہ تو حویلی خالی کرنے کا نوٹس ہے.....لکھا ہے کہ چودہ دن کے اندر اندر ہم یہ مکان خالی کر دیں ورنہ قانون کی مدد سے خالی کرا لیں گے.....اور ہمیں بھاری جرمانہ بھی کریں گے خلاف ورزی پر.....

لالہ: یا خدایا.....یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آن پڑی ہے.....،.....اب کیا کریں گے ہم لوگ.....

(اتنے میں چندا غصے میں کمرے میں داخل ہوتی ہے۔)

چندا: ارے ایسے کیسے نکال دیں گے ہمیں.....ماما جی کا گھر سمجھ رکھا ہے کیا انہوں نے.....آنے دیں اس بار اس بلدیہ کے انسپکٹر کو.....اس کی خبر تو میں لیتی ہوں اچھی طرح.....

لالہ: اے لڑکی.....خدا کے لیے.....دیکھ.....یہ میرے ہاتھ جوڑے ہیں تیرے آگے.....اب کوئی نیا تماشہ کھڑا نہ کر دینا.....

(زہرہ پریشانی سے کہتی ہے)

زہرہ: یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے.....ہمیں کسی وکیل سے بات کرنی چاہیے.....ایسے نوٹس ایک دم سے نہیں آ جاتے.....ان کے پیچھے ضرور کوئی وجہ ہوتی ہے.....

انا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتی ہے۔
زہرہ ایک بار پھر سے نوٹس کی تحریر کو غور سے پڑھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن
جگہ: شہریار کا دفتر/کوئی قیمتی عالیشان عمارت

شہریار اپنے نفیس سجے ہوئے دفتر میں بیٹھا فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔

شہریار: اچھا..... تو نوٹس سرو Serve ہو گیا..... گریٹ..... بس اب دھیان رہے کہ یہ پریشر کم نہ ہونے پائے ان لوگوں پر..... وہ لوگ ہاتھ پاؤں تو ضرور مارنے کی کوشش کریں گے..... شاید کوئی وکیل بھی کر لیں..... مگر ان کی بات اب بننی نہیں چاہیے ..... جب تک میں اشارہ نہ دے دوں..... ہاں..... ٹھیک ہے..... تھینک یو سو مچ..... اور ہاں..... منسٹر صاحب کا خاص شکریہ ادا کرنا..... میں خود بھی حاضری دوں گا ان کے دولت خانے پر..... رائٹ..... آئی ایم گریٹ فل.....
(شہریار فون رکھ دیتا ہے اور خوشی سے ایک قہقہہ لگاتا ہے اور خود سے کہتا ہے)

شہریار: اب دیکھتے ہیں زہرہ جی..... کب تک شہریار کی آفر کو ٹھکراتی ہو..... لاکھوں روپے کے جرمانے کا نوٹس ملے گا تو تمہاری اور اس بڑھیا کی ساری اکڑ ایک پل میں ہوا بن کر اڑ جائے گی.....
لیٹس ویٹ اینڈ واچ ڈیئر. lets wait and watch dear

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن
جگہ: پیر فضل/ستارہ کا گھر

ستارہ اور اس کی ماں پیر فضل کے سامنے کھڑی ہیں (ماں) شائستہ اپنے ہونٹوں میں انگلی دبا لیتی ہے۔
(ستارہ کا رنگ بھی اڑا ہوا ہے)

شائستہ: کیا..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... وہ ایسا تو نہیں تھا کبھی.....

فضل: انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی شائستہ بیگم..... اور پھر وہ لڑکا تو پہلے ہی کسی بازاری لڑکی کے چکر میں پڑی سے اتر چکا تھا..... میں نے کہا تھا تمہیں..... اب یہ نہیں سدھرنے والا..... مگر تمہی کو ضد تھی..... اب دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ.....

شائستہ: مجھے کیا پتہ تھا کہ بات خون خرابے تک پہنچ جائے گی..... موسیٰ کی تربیت تو بڑے اعلیٰ خاندان میں ہوئی ہے۔ اپنی تربیت کا بھی پاس نہ رکھا اس نے.....

فضل: شکر کرو کہ تمہاری باتوں میں آ کر میں نے ستارہ کی بات اسی کے ساتھ آگے نہیں بڑھا دی..... سنا ہے پھر اسی لڑکی کی وجہ سے یہ جھگڑا ہوا ہے..... پتہ نہیں لوگ کیا کیا چہ مگوئیاں کر رہے ہیں موسیٰ کے بارے میں..... جتنے منہ..... اتنی باتیں..... ہمیں تو سمجھو اوپر والے نے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا عین وقت پر.....
(ستارہ باپ کی باتیں سُن کر پلٹ کر جانے لگتی ہے۔ باپ اسے آواز دے کر روک لیتا ہے۔)

فضل: ستارہ..... میری بات سنو.....

ستارہ: (ستارہ گھبرا کر رک جاتی ہے) جی ابا.....

فضل: تمہاری اماں نے مجھے کچھ بتایا تھا بیٹا..... لیکن سارے حالات تمہارے سامنے ہیں..... اوپر والے نے تمہیں بھی کسی

بہت بڑی آزمائش سے بچالیا ہے.....

ستارہ: (ستارہ کا سر جھکا ہوا ہے) ابا.....مگر.....

فضل: اسی لیے میں نے اور تمہاری ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم کسی بہانے مناسب موقع دیکھ کر ان کی پہنائی ہوئی انگوٹھی واپس کر آئیں گے.....اب یہ رشتہ ہونا ناممکن ہے۔

(ستارہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

ستارہ: ابا.....

فضل: ماں باپ کا ہر فیصلہ اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے..... مجھے یقین ہے کہ میرے مالک نے تمہارے لیے بہت بہتر رشتہ چن رکھا ہوگا.....ستارہ کی ماں.....ستارہ کے ہاتھ سے موسیٰ کے نام کی انگوٹھی اتار کر میرے حوالے کردو.....

ستارہ بے چارگی سے ماں کی طرف دیکھتی ہے، ماں بیٹی کو آنکھوں آنکھوں میں صبر کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ستارہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔شائستہ بیٹی کے ہاتھ سے انگوٹھی اتارتی ہے جو ستارہ کی انگلی میں سختی سے جُڑ چکی ہے۔کچھ کوشش کے بعد انگوٹھی اتر جاتی ہے۔ستارہ روتے ہوئے وہاں سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگ جاتی ہے۔شائستہ انگوٹھی شوہر کے حوالے کردیتی ہے۔ماں کی آنکھیں بھی بھیگ چکی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: لاک اپ

موسیٰ لاک اپ میں دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔اسے زہرہ سے کی گئی آخری ملاقات یاد آرہی ہے۔اور زہرہ کے کہے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں،موسیٰ اپنی آنکھیں بند کرلیتا۔

زہرہ/آڈیو

اوورلیپ: اگر مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو تو.....

(زہرہ کی آواز موسیٰ کے کان میں گونجتی رہتی ہے۔موسیٰ ویسے ہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔اتنے میں ایک سنتری آکر سلاخیں اپنے ڈنڈے سے کھٹکھٹاتا ہے)

سنتری: اوئے لڑکے.....اُٹھ تیری ملاقات آئی ہے.....

(موسیٰ چونک کر سلاخوں کی طرف دیکھتا جہاں دور سے عیسیٰ چلتا ہوا اس کی طرف آتا ہے۔عیسیٰ بھائی کو یوں قید میں سلاخوں کے پیچھے بے بس بیٹھا دیکھ کر جذباتی ہوجاتا ہے)

عیسیٰ: بھائی.....یہ سب کیا ہوگیا.....؟.....کون تھے وہ لڑکے جن پر تم نے گولی چلائی.....یہ سب کیا ماجرا ہے.....؟

موسیٰ: تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا.....ابا نے سختی سے منع کیا تھا تمہیں.....پھر کیوں آئے ہو؟

عیسیٰ: ابا کے غصے کو دیکھوں یا اماں کے آنسوؤں اور فریاد کو.....اور پھر میں تمہیں اس حال میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں.....

موسیٰ: دیکھو یار.....میں کبھی ابا کا وہ اچھا اور فرمانبردار بیٹا نہیں بن پایا جس کی انہیں اپنی اولاد سے اُمید تھی.....کم از کم تم تو ان کا ساتھ دو.....اس وقت انہیں سب سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے.....جیسا وہ کہتے ہیں بس ویسا کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو.....

عیسیٰ: کیسے چھوڑ دوں تمہیں تمہارے حال پر.....سچ بتاؤ.....وہ لڑکی زہرہ ہی تھی ناں.....جس کی وجہ سے تمہارا جھگڑا ہوا ہوگا ان لڑکوں سے.....یہ حماقت تم پہلے بھی کرچکے ہو بھائی.....

موسیٰ: جو ہوا سو ہوا ۔۔۔ اب اسے دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ۔۔۔۔

عیسیٰ: فائدہ کیوں نہیں ہوگا بھائی ۔۔۔۔ زہرہ کی گواہی تمہارا کیس مضبوط کر سکتی ہے ۔۔۔ ضرور وہاں ایسی کوئی بات ہوئی ہوگی جس کی وجہ سے تمہیں اس حد تک جانا پڑا ۔۔۔۔

(موسیٰ تلخی سے ہنستا ہے)

موسیٰ: میری بات غور سے سنو عیسیٰ ۔۔۔۔ دوبارہ اس لڑکی کا ذکر اپنی زبان پر مت لانا کبھی ۔۔۔۔ اگر مجھے دل سے بھائی مانتے اور سمجھتے ہو تو اس چیپٹر chapter کو ہمیشہ کے لیے یہیں بند کر دو ۔۔۔۔ میں نے پولیس کو بھی یہی بیان دیا ہے کہ مجھے والوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی کیونکہ میں اکیلا ہی گیا تھا وہاں ۔۔۔۔

عیسیٰ: (غصے سے) مگر کیوں ۔۔۔۔ تم کیوں اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہو جس کی وجہ سے تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی ۔۔۔۔ یہ تو شکر ہے کہ دھیرے دھیرے ان لڑکوں کی حالت سنبھل رہی ہے ۔۔۔۔ ورنہ نہ جانے بات کتنی بڑھ جاتی ۔۔۔۔ مگر پھر بھی ۔۔۔۔ اقدام قتل کا کیس تو پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

موسیٰ: بس ۔۔۔۔ یوں سمجھو کہ میری تقدیر میں ہی یہ لکھا تھا ۔۔۔۔ اور وعدہ کرو مجھ سے ۔۔۔۔ جیسا میں نے ابھی تم سے کہا ہے ۔۔۔۔ تم ویسا ہی کرو گے ۔۔۔۔ بولو وعدہ ۔۔۔۔

(عیسیٰ بے بسی سے بھائی کی طرف دیکھتا ہے)

عیسیٰ: بھائی تم ۔۔۔۔

موسیٰ: وعدہ چاہیے مجھے تمہارا ۔۔۔۔ ابھی ۔۔۔۔ کرو وعدہ

(عیسیٰ نہایت مجبوری کے عالم میں بھائی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے)

عیسیٰ: ٹھیک ہے ۔۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں ۔۔۔۔ لیکن میں تم سے سخت ناراض ہوں ۔۔۔۔ یاد رکھنا یہ بھی ۔۔۔۔

عیسیٰ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ موسیٰ پیار سے اپنے بھائی کا ہاتھ تھپتھپاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: لتا کی حویلی، زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا میں بات چیت

زہرہ: کیا مطلب ۔۔۔۔ میں کیسے ذمہ دار ہوں اس کی اس بربادی کی ۔۔۔۔

چندا: تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ آخری دفعہ جاتے ہوئے اس نے تم سے یہی کہا تھا کہ وہ خود کو برباد کر لے گا ۔۔۔۔ مجھے تو یہ گرفتاری بھی اس کی بربادی کا آغاز لگتی ہے۔

زہرہ: اسی لیے مجھے اس کے جنون سے ڈر لگتا تھا ۔۔۔۔ پتہ نہیں کیسا سر پھرا لڑکا ہے ۔۔۔۔ ایک بار جو دل میں ٹھان لے پھر پیٹ کر دوبارہ کبھی سوچتا بھی نہیں نفع نقصان کا ۔۔۔۔ بس کر گزرتا ہے ۔۔۔۔

چندا: دل والے نفع نقصان کا بھلا کب سوچتے ہیں ۔۔۔۔ سچ ۔۔۔۔ لتا کا ڈر نہ ہوتا تو میں چل چلی جاتی اس سے ملنے ۔۔۔۔

زہرہ: ایسی باتیں مت کرو ۔۔۔۔ لتا پہلے ہی سے بہت پریشان ہیں اس فوٹس والی بات کو لے کر ۔۔۔۔

چندا: ہاں ۔۔۔۔ مگر وکیل نے بھی تو کوئی خاص امید نہیں دلائی آج ۔۔۔۔ جانے کیا گڑبڑ کر رہا ہے اس وقت بھی لتا جی کے سامنے بیٹھا

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: انا کی حویلی،

وکیل ارشد انا کے سامنے کچھ اسٹامپ پیپر اور کاغذات کھولے بیٹھا ہوا ہے۔

انا: مگر یہ حویلی تو پچھلی کئی دھائیوں سے ہمیں الاٹ ہو چکی ہے..... پھر اچانک یہ بلدیہ والے کہاں سے دعوے دار نکل آئے اس جگہ کے.....

وکیل: آپ کے کاغذات پورے ہیں..... مگر غلط وہ لوگ بھی نہیں کہہ رہے..... یہ جگہ تیس سال کی لیز پر دی گئی تھی آپ کے گرو کو ..... اصولی طور پر تیس سال کے بعد دوبارہ تیس سال کے لیے لیز بڑھا دی جاتی ہے اگر مالک مکان یا کرایہ دار نے تمام معاہدے کی ہر شق کی پوری طرح پابندی کی ہو..... ورنہ لیز منسوخ بھی ہو سکتی ہے..... آپ لوگوں کو اسی تناظر میں لیز کی منسوخی کا نوٹس جاری کیا گیا ہے..... آپ کی لیز کو ختم ہوئے چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے..... اور اس عرصے کے لیے وہ جو چاہیں جرمانہ عائد کر دیں..... یا پھر حویلی کی لیز ہی منسوخ کر دیں.....

انا: مگر وہ مُوا کلرک تو لاکھوں روپے کی رشوت کی بات کر رہا تھا..... میں اتنے پیسے کہاں سے لاؤں گی.....

وکیل: پیسے تو لگیں گے ہر صورت..... اگر کیس چلائیں گے یا اسٹے لیں گے تو وہ بھی عارضی ہی ہوگا..... اس صورت میں بلدیہ والے ہر حال میں یہ حویلی خالی کروانے کی کوشش کریں گے..... بہتر یہی ہے کہ عدالت کے باہر ہی اس معاملے کو سلجھا لیا جائے..... یا پھر بھاری جرمانہ ادا کر کے تیس چالیس سال کی لیز کی مُدت مزید بڑھا لی جائے..... ایک بار لیز کی Extention منظور ہو جائے تو پھر ہم مالکانہ حقوق کا کیس بھی دائر کر سکتے ہیں اور تب مجھے امید ہے کہ ہم کیس جیت بھی جائیں گے کیونکہ پچھلے تیس سال سے آپ کا ہی قبضہ ہے اس جائیداد پر.....

(اسی لمحے پیچھے دروازے پر زہرہ نمودار ہوتی ہے اور بات سن لیتی ہے)

انا: تو پھر ہمیں اس وقت کیا کرنا چاہیے۔

وکیل: جتنی جلدی ہو سکے پیسوں کا انتظام کریں اور چاہے قسطوں میں ہی سہی..... مگر یہ رقم ادا کرنے کا کوئی طریقہ کار طے کر لیں کارپوریشن والوں کے ساتھ..... اس مصیبت سے بچنے کا، بس یہی ایک طریقہ ہے۔

زہرہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: کاشانہء ہیراں

موسیٰ کی ماں غم سے نڈھال بیٹھی رو رہی ہے۔ سکینہ اسے تسلی دے رہی ہے۔

ہاجرہ: جانے میرا موسیٰ کس حال میں ہوگا..... ظالموں نے کب سے قید کر رکھا ہے..... ارے کوئی جا کر وجہ تو پوچھے اس سے.....، یہاں تو سب کے دل پتھر ہو گئے ہیں..... کوئی میری نہیں سُنتا.....

(اتنے میں خدیجہ اندر داخل ہوتی ہے)

سکینہ: خود کو سنبھالیں تائی جان..... ان شاء اللہ موسیٰ بھائی کو کچھ نہیں ہوگا..... جب انہوں نے زندگی میں کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا تو ان کے ساتھ بُرا کیسے ہو سکتا ہے..... عیسیٰ کو بھیجا تھا ناں آپ نے..... اس نے بتایا تو تھا کہ موسیٰ بھائی بالکل ٹھیک ہیں..... بس..... چپ کر جائیں۔

(خدیجہ بہت غور سے اور حیرت سے اپنی اکھڑ اور ضدی بیٹی کی ساس کے ساتھ یہ ناز برداری نوٹ کر رہی ہے)

ہاجرہ: میں نے جنم دیا ہے اپنے موسیٰ کو..... میں جانتی ہوں کہ وہ اندر سے کتنا مہربان اور نرم دل ہے..... ٹھیک ہے اس کے غصے سے میں بھی ڈر جاتی تھی..... مگر وہ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا کسی مظلوم پر..... ضرور بات کچھ اور ہے..... میرا دل کہتا ہے کہ میرا بچہ کسی اور کی آئی آفت کا شکار ہو گیا ہے۔

(خدیجہ بیٹی سے کہتی ہے)

خدیجہ: سکینہ..... جاؤ تم اپنی تائی جان کے لیے تازہ جوس بنا کر لاؤ..... ورنہ یہ تو یونہی رو رو کر خود کو ہلکان کرتی رہیں گی۔

سکینہ سر ہلا کر اٹھ جاتی ہے۔ خدیجہ غور سے اپنی بیٹی کی یہ بدلی حالت دیکھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں۔ کچن

سکینہ کسی نوکرانی کے ساتھ جوس بنانے میں مصروف ہے۔ اس کی ماں خدیجہ اندر آتی ہے اور نوکرانی کو باہر جانے کا اشارہ کرتی ہے، نوکرانی چلی جاتی ہے۔ خدیجہ غور سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھتی ہے۔

خدیجہ: بن گیا جوس.....

(سکینہ جلدی میں ہے)

سکینہ: جی اماں..... بس لا رہی ہوں.....

خدیجہ: حیرت کی بات ہے..... اتنی تابعداری..... اتنی فرمانبرداری..... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں سکینہ

(سکینہ ماں کی بات سن کر کچھ گڑبڑا سی جاتی ہے)

سکینہ: ہاں..... تو آپ کو تو خوش ہونا چاہیے ناں

(خدیجہ بیٹی کا ہاتھ پکڑتی ہے اور اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھتی ہے)

خدیجہ: سچ بتا سکینہ..... یہ کیا ماجرا ہے.....

سکینہ گھبرا کر ماں کو دیکھتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 12

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: کاشانہ، پیراں، کچن

خدیجہ اور اس کی بیٹی سکینہ کچن میں موجود ہیں۔ خدیجہ سختی سے بیٹی کا ہاتھ پکڑے کھڑی ہے اور اس سے پوچھتی ہے۔

خدیجہ: سچ بتا سکینہ..... یہ کیا ماجرا ہے؟

سکینہ: کیسا ماجرا اماں.....؟

خدیجہ: یہ ایک دم سے ساس اور شوہر کے لیے اتنا پیار اور احترام کہاں سے امڈ آیا تیرے اندر..... کل تک تو اس رشتے سے شدید چڑ تھی تجھے..... اور موسیٰ کا تو نام سننا بھی پسند نہیں تھا..... پھر یکا یک یہ کایا کیسے پلٹ گئی تیری.....

(سکینہ سنجیدہ ہے)

سکینہ: میں سوچتی تھی کہ اگر کبھی میں بدل گئی تو سب سے زیادہ خوشی تمہیں ہوگی اماں..... مگر تم تو.....

خدیجہ: ضرور خوشی ہوتی مجھے..... اگر میں تیرے اندر چھپی بیٹھی اس فسادن اور سازشی لڑکی سے واقف نہ ہوتی..... سچ بتا..... یہ سب کیا ڈرامہ ہے..... میں نے تجھے جنا ہے سکینہ..... تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں میں اچھی طرح..... خبردار..... مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرنا.....

(سکینہ کے لہجے میں دُکھ اور اذیت ہے)

سکینہ: میں تمہیں کیا بے وقوف بناؤں گی اماں..... میرے ساتھ تو خود تقدیر نے بڑا ہاتھ کر دیا ہے..... آسمان سے اٹھا کر زمین پر لا پھینکا ہے مجھے..... اوقات بتا دی ہے مجھے میری اس مقدر نے.....

(خدیجہ غور سے بیٹی کو دیکھ رہی ہے)

خدیجہ: ایسا کیا ہو گیا ہے.....؟.....

سکینہ: بس اتنا سمجھ لو اماں کہ میرے سارے سنہری خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکے ہیں..... اب کوئی جھوٹا خواب باقی نہیں بچا..... صرف سچ کا تلخ آئینہ ہے میرے سامنے..... اور میں نے اسی سچ کے ساتھ جینے کا فیصلہ کر لیا ہے..... ہو سکے تو تم بھی مجھے معاف کر دینا ان جھوٹے خوابوں کے ساتھ اتنا عرصہ جینے کے لیے..... مگر اب میں جاگ گئی ہوں.....

(سکینہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں)

سکینہ جوس کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھتی ہے اور اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھتی ہوئی باورچی خانے سے نکل جاتی ہے۔ خدیجہ حیرت سے اپنی بیٹی کا یہ بدلا ہوا روپ دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا حجرہ/آفس

پیر قدرت اور پیر فضل آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔

فضل: یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں ہے شاہ جی..... مگر پھر بھی..... میرا فرض تھا کہ میں آپ کو آگاہ کر دوں..... ستارہ کی ماں اور خود ستارہ بھی ساتھ آنا چاہتی تھیں پُرسے کے لیے..... مگر میں نے ہی منع کر دیا۔ سوچا ستارہ کو دیکھ کر پیرنی جی کا دل مزید خراب ہوگا.....

قدرت: ٹھیک کیا آپ نے پیر جی..... اور معذرت کی ہرگز ضرورت نہیں ہے..... موسیٰ نے جس طرح باپ دادا کی پگڑی بھرے بازار میں اچھالی ہے..... اس نے تو خود ہمیں کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا..... آپ کے پاس بھلا اور دوسرا راستہ بھی کیا بچتا ہے..... انگوٹھی واپس کرنے کا بھی آپ نے تکلف ہی کیا۔ اس ناخلف اور ناہنجار کے نام کی انگوٹھی کو تو وہیں کسی اندھے کنویں یا گندے نالے میں پھینک دینا چاہیے تھا آپ کو..... باخدا مجھے آپ سے ہرگز کوئی گلہ نہ ہوتا.....

فضل: ایسا کیوں کہہ رہے ہیں شاہ جی..... اگر موسیٰ اور ستارہ کا ملن ان کی تقدیر میں نہیں تھا..... تو نہ سہی..... مگر ہماری اپنی دوستی تو اپنی جگہ قائم ہے ناں..... اور دوستی کے کچھ اپنے احترام اور اپنے تقاضے ہوتے ہیں.....

قدرت: جی پیر جی..... جانتا ہوں کہ یہ بھی آپ کی رواداری ہے اور تعلق کا احترام ہے کہ آپ آج بھی خود چل کر میرے پاس آئے ہو۔ ورنہ انگوٹھی تو کسی نوکر کے ہاتھ بھی واپس بھجوائی جا سکتی تھی..... کاش..... کاش موسیٰ وہ نہ ہوتا جو وہ آج ہے..... بہرحال ..... ستارہ بیٹی کے لیے اب بھی میرے دل سے دعا ہے کہ اللہ اسے بہت اچھا اور نیک بَر دے..... وہ ہمیشہ خوش رہے..... آباد رہے.....

فضل: آمین..... ایک بیٹی کا باپ ہونے کے ناطے میں بہت مجبور ہوں اور اس کے مستقبل کے لیے نہایت فکرمند ضرور ہوں..... مگر میرا دل موسیٰ کے لیے بھی بہت خفا رہتا ہے..... بہت فکرمند ہوں میں اس کے لیے..... اگر اس حوالے سے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیے گا..... مجھے خوشی ہوگی.....

قدرت: میں اسے عاق کر چکا ہوں فضل بھائی..... اور اب میرا یا میرے خاندان کا اس نافرمان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے..... آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیے..... بس یوں سمجھ لیں میری طرح کہ میرے دو نہیں ...صرف ایک ہی بیٹا تھا اور رہے گا..... عیسیٰ.....

فضل پریشانی سے قدرت کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر۔ لتا کا کمرہ

چندا اندر آ کر بتاتی ہے۔

چندا: وہ لتا جی..... ملک شہریار صاحب کا منیجر آیا ہے..... آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔

لتا: ملک صاحب کا منیجر..... اچھا بلا لو اندر

چندا چلی جاتی ہے، کچھ دیر میں ملک شہریار کا منیجر ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس لیے اندر داخل ہوتا ہے اور سلام کر کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔

لتا: کیسے کیسے آنا ہوا..... اگر کسی تقریب کی دعوت ہے تو معذرت ہی سمجھیے کیونکہ آج کل کچھ ٹینشن چل رہی ہے..... ہماری لڑکیاں کسی تقریب یا پارٹی میں نہیں جا رہیں.....

منیجر: نہیں..... میں کسی پارٹی کا انوی ٹیشن لے کر نہیں آیا..... ملک صاحب نے یہ چیک واپس بھیجا ہے جو آپ نے ان کی آفر ٹھکرا کر واپس بھجوا دیا تھا..... وہ کہتے ہیں کہ آپ بھلے ان سے رشتہ قائم نہ کریں..... کوئی بات نہیں..... مگر ان کا اصول ہے

کہ ایک بار کسی کے نام سے چیک کاٹ دیا تو پھر اسے واپس نہیں لیتے..... یہ رقم اب آپ کی ہی امانت ہے..... اور اس رقم کے بدلے انہیں آپ سے کوئی فیور favour بھی نہیں چاہیے..... ویسے بھی وہ کچھ دنوں میں یو۔ایس U.S جا رہے ہیں واپس..... ان کے کاروباری مسائل ہیں کچھ وہاں۔

لبنا: (لبنا حیرت سے کہتی ہے) لیکن میں یہ رقم کیسے رکھ سکتی ہوں..... کوئی ہزار دس ہزار کی بات نہیں..... لاکھوں کا معاملہ ہے۔ اسے لے جاؤ میاں لبنا چیک واپس منیجر کی طرف پھینک دیتی ہے)

منیجر: آپ نے شاید ملک صاحب کو ٹھیک سے جانا نہیں آج تک..... وہ ایسے ہی سخی ہیں..... جس پر دل آ جائے..... اس پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں..... میں چلتا ہوں۔ آپ کو اگر یہ رقم نہیں رکھنی تو براہ مہربانی چیک پھاڑ دیجئے گا..... مگر میرے ہاتھ اسے واپس نہ لوٹائیں..... میری نوکری کا سوال ہے.....

(منیجر اٹھ کر جانے لگتا ہے۔ اتنے میں پیچھے سے زہرہ برآمد ہوتی ہے)

زہرہ: ٹھہریئے ذرا.....

زہرہ: (منیجر پلٹ کر دیکھتا ہے)

زہرہ: جا کر ملک شہریار سے کہہ دیجئے کہ زہرہ نے ان کا چیک قبول کر لیا ہے..... وہ چاہیں تو آ کر لبنا جی سے مل لیں.....

لبنا چونک کر زہرہ کی طرف دیکھتی ہے، زہرہ چپ چاپ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ لبنا پریشان بیٹھی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر، ستارہ کا کمرہ

مریم اور ستارہ میں بات چیت جاری ہے۔ ستارہ رو رہی ہے۔

مریم: مگر مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم نے اتنی آسانی سے ممانی کو انگوٹھی واپس کیسے کر دی..... اس بات پر.....

ستارہ: تمہارا کیا خیال ہے..... میرے دل پر کیا کیا قیامتیں نہیں گزری ہوں گی وہ انگوٹھی ..... مگر ابا کی بات کیسے ٹالتی میں..... وہ سامنے کھڑے تھے.....

مریم: اور موسیٰ بھائی نے بھی تو حد کر دی..... آخر کیا ضرورت تھی کسی کے پرائے جھگڑے میں پڑنے کی.....

ستارہ: (ستارہ حیرت سے مریم کی طرف دیکھتی ہے) پرایا جھگڑا.....؟

مریم: اور نہیں تو کیا..... میں نے خود سنا ہے..... ماموں جان کسی سے فون پر بات کر رہے تھے کہ موسیٰ بھائی کا جھگڑا کسی لڑکی کی وجہ سے ہوا تھا ان لڑکوں کے ساتھ.....

ستارہ: لڑکی..... مگر کون.....

مریم: اور کون ہو گی..... وہی ہو گی بدنام..... جس کی وجہ سے پہلے بھی موسیٰ کی سارے زمانے میں رسوائی ہو چکی ہے.....

ستارہ: تو پھر موسیٰ نے اس لڑکی کا نام کیوں نہیں لیا کسی کے سامنے.....

مریم: یہی تو مسئلہ ہے..... ماموں بتا رہے تھے کہ اگر موسیٰ بھائی اس کا ذکر پولیس کے سامنے اپنے بیان میں کر دیتے تو موسیٰ بھائی کا کیس بہت مضبوط ہو سکتا تھا..... مگر پتہ نہیں کیوں موسیٰ بھائی نے اس کا نام لینے سے گریز کیا.....

ستارہ: موسیٰ نے وہی کیا جو ایک غیرت مند مرد کو ایسے موقع پر کرنا چاہیے تھا..... مگر مجھے اس لڑکی کی ذات پر افسوس ہو رہا ہے جو موسیٰ کو اتنی مشکل میں ڈالنے کے بعد خود کہیں جا کر چھپ گئی ہے..... اگر واقعی اس کا نام موسیٰ سے منسوب ہے کسی حوالے سے بھی۔ تو اسے تو اس وقت سر بازار چلا چلا کر موسیٰ کے حق میں گواہی دینی چاہیے.....

مریم: کیا کہہ سکتی ہوں..... کاش اس کی یہ حقیقت موسیٰ بھائی پر بھی کھل پاتی.....

(ستارہ کسی سوچ میں گم ہے)

ستارہ: میرا ایک کام کرو گی مریم.....

مریم: ہاں..... بولو.....

ستارہ: مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے..... کسی طرح میری اس سے ملاقات کروا دو.....

مریم: لیکن ہم اسے ڈھونڈیں گے کیسے..... مجھے تو اس کا ٹھیک نام بھی پتہ نہیں.....

ستارہ: میں جانتی ہوں..... کام مشکل ہے..... مگر میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے..... عیسیٰ بھائی موسیٰ کے بہت قریب ہیں..... ان کے راز دار ہیں بچپن سے..... کسی طرح عیسیٰ سے معلوم کرو کہ وہ لڑکی کون ہے اور کہاں رہتی ہے..... میں اس سے ملنا چاہتی ہوں.....

مریم: ٹھیک ہے..... میں کوشش کرتی ہوں کہ اس کا پتہ چل سکے.....

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: زہرہ کی حویلی

چندا اور زہرہ کے درمیان بات چیت

چندا: کیا.....؟ تم نے ملک شہریار کا پروپوزل قبول کر لیا..... یہ کیا کر دیا زری..... تم تو اس شخص کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔

(زہرہ دکھی سی)

زہرہ: یہ تم کہہ رہی ہو..... جو رات دن مجھے اس کے لیے ہاں کرنے کی تاکید کرتی رہتی تھیں.....

چندا: افوہ..... وہ تو میں تمہیں..... اچھا رہنے دو..... مگر ملک شہریار..... کیوں.....؟

زہرہ: اس حویلی کو گروی ہونے سے بچانے کے لیے لاکھوں روپے کی رقم کی ضرورت ہے ابا جی کو..... اور اتنے روپے ہم سب مہینوں بعد بھی اکٹھے نہیں کر سکتے تھے..... ملک شہریار کی دی ہوئی رقم ابا جی و.' تو کسی صورت قبول نہیں کرتیں..... تو ایسے میں ایک ہی طریقہ بچ گیا تھا میرے پاس اس حویلی کو بچانے کے لیے کہ شہریار کا پروپوزل قبول کر لوں.....

چندا: مگر پھر بھی زری..... یہ تمام عمر کا سودا ہے..... تم نے اپنی ساری زندگی اس حویلی پر قربان کر دی.....

زہرہ: ابا جی خود ہی تو کہتی ہیں کہ ہم جیسوں کو تو بس ایک اچھی بولی کا انتظار ہوتا ہے..... تو تم بھی یہی سمجھ لو کہ میرے حصے کی بولی لگ چکی ہے، اب بولی لگانے والا شہریار ہے یا کوئی دوسرا اسیٹھ..... اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔

زہرہ کی بات پر مریم اداسی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

لاؤنج / ڈرائنگ روم

ملک شہریار اور اس کا جگری دوست چودھری تو قیر قہقہہ لگا کہ جام سے جام ٹکراتے ہیں۔

شہریار: چیئرز..... یہ ہوئی ناں بات چوہدری..... میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت مقرر ہے..... اور

اسے خریدا جا سکتا ہے..... ضرورت ہے تو بس ایک اچھے سوداگر کی جو ٹھیک وقت پر اپنی زرخرید کی ٹھیک ٹھیک قیمت لگا سکے.....

توقیر جاوید: واہ ملک صاحب واہ..... بھئی مان گئے..... کیا پتہ کھیلا ہے آپ نے حویلی کی لیز کینسل کروا کر..... کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ ترکیب نہیں آ سکتی تھی..... مگر آپ کو اتنا یقین کیسے تھا کہ وہ اڑیل گھوڑی اس معاملے میں پھنس کر یوں آپ کے لیے ہاں کر دے گی.....

شہریار: میں بزنس مین ہوں چوہدری..... مجبور کی مجبوری خریدنے کا فن سیکھ کر ہی میں نے اتنی ترقی کی ہے..... تم بس اب تیاری کرو..... مجھ سے اب زیادہ صبر نہیں ہو رہا..... لیکن ایک بات کا دھیان رہے..... نکاح کی تقریب میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو..... بس دو چار خاص اور چنیدہ دوستوں کو دعوت دے دو..... میں اس نکاح کی زیادہ پبلسٹی نہیں چاہتا.....

توقیر جاوید: سمجھ گیا..... آپ فکر نہ کریں..... ایسا ہی ہوگا..... (چوہدری ہنستا ہے)

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ کا کمرہ

سکینہ بے چین سی بیٹھی ہوئی ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو، اتنے میں اس کے سیل فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ سکینہ نمبر دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر غصے اور نفرت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ وہ فون اٹینڈ کرتی ہے، دوسری جانب سے کامران گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے۔

کامران: ہیلو..... سکینہ..... میں ہوں..... کامران..... تم ٹھیک تو ہو ناں.....

سکینہ: (شدید غصے سے) بے غیرت انسان..... تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی.....

کامران: یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... مجھے اس دن دیر ہو گئی۔ وہ دراصل.....

سکینہ: مجھے تمہاری کوئی تاویل یا بہانہ نہیں سننا ہے..... آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش کی تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو ان تینوں کا ہوا ہے.....

کامران: میری بات تو سنو..... مجھے دراصل ابا نے روک لیا تھا کسی ضروری کام سے..... ورنہ.....

سکینہ: ضروری کام..... شرم سے ڈوب کر مر کیوں نہیں گئے تم اسی دن..... میری عزت سے بھی زیادہ کوئی ضروری کام ہو سکتا تھا..... تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں وہاں تمہارے آوارہ اور لفنگے دوستوں کے درمیان تنہا بیٹھی ہوئی ہوں گی..... وہ بھیڑیے وہ درندے مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

کامران: مانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی مگر میں مجبور تھا۔

سکینہ: تم ہمیشہ مجبور اور لاچار ہی رہو گے کامران..... مرد جب مجبوری کا بہانہ کرے تو وہ مرد نہیں رہتا بھکاری بن جاتا ہے..... اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم جیسے بھکاری سے کبھی محبت کی تھی..... یہ تمہاری میری آج آخری بات ہے..... آج کے بعد اگر تم نے مجھ سے کوئی بھی رابطہ رکھنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا..... میرا شوہر عیسیٰ اور میرا بھائی موسیٰ ابھی زندہ ہیں..... تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے.....

کامران کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر سکینہ غصے میں فون بند کر کے پٹخ دیتی ہے۔ اتنے میں عیسیٰ پریشان سا اندر داخل ہوتا ہے۔ سکینہ تیزی سے اس کی طرف لپکتی ہے۔ کیا ہوا..... ضمانت نہیں ہوئی موسیٰ بھائی کی.....

عیسیٰ: نہیں..... جب تک ان لڑکوں کا بیان نہیں ہو جاتا..... موسیٰ بھائی کی ضمانت نہیں ہو سکتی..... آج انہوں نے بڑی جیل میں شفٹ کر دیا ہے بھائی کو.....

سکینہ: تم مجھے کب لے جاؤ گے ان سے ملوانے.....

عیسیٰ: ابا جان کو پتہ چلا تو وہ میرے ملنے پر بھی سخت ناراض ہوں گے..... جانتی تو ہو کہ یہ سب ان سے چھپ کر کر رہا ہوں میں .....تمہارا ملنا تو ناممکن ہے.....

(سکینہ پریشانی سے بیٹھ جاتی ہے عیسیٰ غور سے سکینہ کو دیکھتا ہے)

عیسیٰ: تمہیں موسیٰ بھائی کے لیے یوں پریشان دیکھ کر مجھے وہ پرانی سکینہ یاد آ گئی..... جو بچپن میں کھیل کے دوران بھی اپنے موسیٰ بھائی کی حمایت میں سارے محلے سے لڑ جایا کرتی تھی..... اچھا لگا مجھے یہ دیکھ کر کہ تمہارا دل موسیٰ بھائی کی طرف سے صاف ہو گیا ہے..... وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں.....

سکینہ: ٹھیک کہتے ہو تم..... خود غرضی نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ تم نے کہا تھا ناں..... کہ میں نے وہ تھپڑ موسیٰ کے نہیں..... خود اپنے چہرے پر مارا ہے..... سچ کہا تھا..... اب جب سے وہ جیل گئے ہیں..... روز اس تھپڑ کی جلن اپنے گالوں پر محسوس کرتی ہوں میں..... سکینہ کی آنکھیں بھر آتی ہیں

(عیسیٰ اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیتا ہے)

عیسیٰ: خون اپنے خون سے زیادہ دن خفا نہیں رہ سکتا..... تم بس دعا کرو موسیٰ بھائی کے لیے..... کہ ان پر آیا یہ سخت وقت جلد گزر جائے..... میرا بھائی جیل میں ہے اور میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا.....

عیسیٰ کی بات سُن کر سکینہ کے آنسو بہہ جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل (آؤٹر)

قیدیوں کی جیل گاڑی آ کر رکتی ہے اور اس میں سے چند خطرناک قیدی نکل کر نیچے اترتے ہیں۔ پولیس انہیں ہانکتے ہوئے مرکزی بیرک کی طرف لے جاتی ہے۔ ان قیدیوں میں سارنگا اور اس کے دیگر ساتھی بھی شامل ہیں۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: جیل۔ بیرک

موسیٰ جیل کی بیرک میں پتھر کی بنی صلیب پر کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ وہ سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے تبھی سارنگا اور دیگر ساتھی بیرک میں داخل ہوتے ہیں، سارنگا حیرت سے موسیٰ کو نماز پڑھتے دیکھتا ہے اور اپنے کسی ساتھی سے کہتا ہے۔

سارنگا: لے بھئی چاند پوری..... یہ تو اپنی بیرک میں بھی ایک "مُلّاں" آن گھسا ہے..... اب تو یہ بیرک جیل کی بیرک نہ رہی..... سمجھو مسجد ہو گئی.....

(ساتھی ہنستے ہیں۔ کم زور شاعر نما چاند پوری جواب دیتا ہے)

چاند پوری: تمہارے آگے کس کی چلی ہے سارنگا استاد..... تم نے تو بڑے بڑے مُلّا کافر کر ڈالے.....

(سارنگا بھی زور کا قہقہہ لگاتا ہے۔ اتنے میں موسیٰ سلام پھیرتا ہے اور جائے نماز تہہ کرتا ہے۔ سارنگا رعب سے اسے اپنے

پاس بُلاتا ہے۔)

سارنگا: ادھر آ لڑکے..... کیا نام ہے تیرا.....

موسیٰ: (موسیٰ قریب آتا ہے) موسیٰ.....

سارنگا: لے بھئی..... نام بھی پیغمبروں والا رکھ لیا ہے..... اب تو سارنگا بھی تجھے کچھ نہیں کہہ سکتا.....

(چاند پوری موسیٰ کا نام سن کر چونکتا ہے)

چاند پوری: موسیٰ..... اچھا..... تو تم ہو نامراد کے دوست..... مجھے اس نے پیغام دیا تھا تمہارے آنے کا..... ناچیز کو چاند پوری کہتے ہیں..... میرا اور نامراد کا پرانا یارانہ ہے.....

سارنگا: کیوں بے شاعر کی اولاد..... یہ تیرا واقف کار ہے.....

چاند پوری: ہاں استاد..... بڑا جی دار لڑکا ہے یہ..... اس کی نماز اور مُصلے کو نہ دیکھو..... تین تین کے سینے میں فائر داغ ڈالے ہیں اپنے یار نے۔

(سارنگا حیرت سے موسیٰ کو دیکھتا ہے)

سارنگا: کیا بات کر رہا ہے؟ چاند پوری..... اس مولوی نے..... تین بندے پھڑکا ڈالے..... واہ پیارے..... جیو۔

موسیٰ: ابھی مرے نہیں..... زندہ ہیں.....

(سارنگا ہنستا ہے)

سارنگا: فکر ناٹ..... مرے نہیں تو مر جائیں گے۔ ادھر جیل میں اپنا آرڈر چلتا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بولنا..... ہاں مگر تبلیغ نہ کرنا سارنگا کو نمازی بننے کی..... سارنگا بڑا پرانا پاپی ہے.....

(سارنگا قہقہہ لگاتا ہوا دیگر دو ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔ چاند پوری موسیٰ کو وہیں اپنے پاس زمین پر بچھی چٹائی پر بٹھا لیتا ہے۔)

چاند پوری: مجھے نامراد نے تمہاری ساری کہانی سنا دی ہے..... بے فکر رہو..... جیل میں [illegible] اچ چلتا ہے..... اور یقین مانو..... باہر دنیا کی بڑی جیل سے یہ چھوٹی جیل بہت اچھی ہے..... سارنگا یاروں

موسیٰ: اب مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں باہر ہوں یا جیل کے اندر..... بس میرں بدنامی کا اثر میرے خاندان تک نہ پہنچے.....

چاند پوری: فکر مت کرو..... ان لڑکوں کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا..... نامراد میرے پرانے اور بُرے دنوں کا یار ہے..... اگر اس نے تمہیں دوست مانا ہے تو پھر ہماری یاری بھی طے ہے..... مگر تم کو دیکھ کر ایسا لگتا نہیں کہ اندر سے اتنے خطرناک ہو..... شکل سے تو بڑے سیدھے سادھے حافظ جی لگتے ہو.....

(موسیٰ غور سے چاند پوری کی طرف دیکھتا ہے۔ چاند پوری چونک جاتا ہے)

موسیٰ: چہرے پر نہ جایا کرو..... میں نے بھی اس چہرے کے پھیرے میں بڑے دھوکے کھائے ہیں.....

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور

ستارہ عیسیٰ کے سامنے بیٹھی ہے۔

ستارہ: میں بہت مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں عیسیٰ بھائی..... پلیز مجھے مایوس نہ کریں.....

(عیسیٰ الجھن میں ہے)

عیسیٰ: میں سمجھ سکتا ہوں..... مگر تم کیا کرو گی اس لڑکی سے مل کر..... وہ..... میرا مطلب ہے کہ وہ جگہ تمہارے جانے کے قابل نہیں ہے..... اور پھر موسیٰ بھائی نے بھی سختی سے منع کیا ہے اس قصے کو مزید چھیڑنے سے.....

ستارہ: میں آپ کی مجبوری سمجھ سکتی ہوں..... مگر میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے..... میں آپ کی منت کرتی ہوں..... مجھے اس سے رابطہ کرنے دیجئے..... شاید یہ میرے اپنے دل کی تسلی کی ایک ناکام کوشش ہی ہو.....

عیسیٰ: کوئی فائدہ نہیں..... اگر اس لڑکی نے بولنا ہوتا تو اسی رات پولیس کو اپنا بیان دے چکی ہوتی جس رات موسیٰ بھائی کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی.....

ستارہ: یہی سوال میں اس کے سامنے بیٹھ کر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنا چاہتی ہوں عیسیٰ بھائی..... آپ اسے میری آخری فرمائش سمجھ لیں.....

(عیسیٰ مجبور ہو جاتا ہے)

عیسیٰ: ٹھیک ہے..... لیکن میں تمہیں وہاں اکیلے نہیں جانے دوں گا..... میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا اور اس کے دروازے کے باہر تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا.....

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

چندا ایک شادی کا قیمتی سُرخ عروسی جوڑا اور کچھ گہنے، زیورات کے ڈبے وغیرہ اٹھائے زہرہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے، زہرہ ویسے ہی گم سم سی بال کھولے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے، اس کے ہاتھ میں برش یا کنگھا تو پکڑا ہوا ہے مگر وہ کسی اور دھیان میں گم بیٹھی ہے۔ چندا اس کا سامان اسے دکھاتی ہے۔

چندا: یہ دیکھ زری..... تیری شادی کا جوڑا اور گہنے..... ملک صاحب نے بھیجے ہیں..... بڑا خرچہ کیا ہے اس بندے نے بھئی..... ہر چیز بڑی چن کر سلیکٹ کی ہے..... ڈنڈی نہیں ماری کسی بھی شگن میں.....

(زہرہ بے دلی سے نظر ڈال کر کہتی ہے)

زہرہ: ٹھیک ہے..... وہیں رکھ دو.....

چندا: یہ کیا..... تم دیکھو گی نہیں..... بڑا پیارا جوڑا ہے.....

زہرہ: جب پہننا کل ہے تو ابھی سے دیکھ کر کیا کروں گی..... تم کہتی ہو تو اچھا ہی ہوگا.....

(اتنے میں باہر سے ایک خادمہ آتی ہے۔)

خادمہ: زری بی بی..... وہ آپ سے ملنے آپ کی کوئی سہیلی آئی ہے.....

(زہرہ چونکتی ہے)

زہرہ: میری سہیلی..... کون.....

خادمہ: پتہ نہیں جی..... کہتی ہے بہت ضروری کام ہے

چندا: کہیں تمہاری کالج یا یونیورسٹی کی کوئی دوست تو نہیں

زہرہ: نہیں..... تم جانتی ہو میں نے وہاں ایسی کوئی دوستی نہیں پالی جو یہاں مجھ سے ملنے آ سکے.....

چندا: تو پھر منع کر دو.....

(زہرہ کچھ سوچتی ہے۔اور پھر چندا سے کہتی ہے)

زہرہ: نہیں.....نہ مل کر بھی الجھن ہی رہے گی.....اچھا ٹھیک ہے.....تم اسے یہیں بلا لاؤ.....باہر اناؤ دیکھیں گی تو ہزار سوال کریں گی.....تم اس کے ساتھ جاؤ چندا ذرا دھیان رکھنا.....

خادمہ سر ہلا کر پلٹ جاتی ہے۔چندا بھی باہر چلی جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے بستر پر اس کی شادی کا جوڑا اور زیورات ویسے ہی کھلے پڑے ہیں جیسے چندا رکھ کر گئی تھی۔ستارہ کمرے میں داخل ہوتی ہے،اور اس کی نظر اس سامان پر پڑتی ہے۔زہرہ حیرت میں کھڑی الجھن زدہ سی ستارہ کو دیکھ رہی ہے۔ستارہ زہرہ کو غور سے دیکھتی ہے۔

زہرہ: میں نے تمہیں پہچانا نہیں.....کیا ہماری پہلے ملاقات ہو چکی ہے.....

ستارہ: تم مجھے نہیں جانتیں.....مگر میں تم سے اپنے خیالوں میں روز کئی کئی بار ملتی ہوں.....تم سے جھگڑتی ہوں.....شکوہ کرتی ہوں.....بددعائیں دیتی ہوں۔

زہرہ: بددعا دیتی ہو.....مگر کیوں.....میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے.....

(ستارہ غور سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہے)

ستارہ: کیا مجھے دیکھ کر بھی تمہیں اس بگاڑ کا اندازہ نہیں ہو رہا؟ ہاں مگر تم بہت سنوری ہوئی ہو.....قدرت نے بڑی فرصت میں سنوارا ہے تمہیں.....

زہرہ: بہتر ہوگا کہ تم سیدھی اور صاف بات کرو.....مجھے الجھی ہوئی باتیں پسند نہیں ہیں.....

ستارہ: ہاں.....وہ تو میں یہ شادی کا جوڑا اور گہنے دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ تم زندگی میں کہیں الجھنا پسند نہیں کرتی ہو.....جو سودا کرتی ہو .....سیدھا اور صاف کرتی ہو.....

(زہرہ غصے سے پلٹ کر کہتی ہے)

زہرہ: مائنڈ یور اون بزنس.....تم اپنے مطلب سے مطلب رکھو تو بہتر ہوگا.....

ستارہ: ٹھیک ہے.....تو مطلب کی بات سنو.....موسیٰ کی قید پوری ہونے کا تو انتظار کر لیتیں.....تم نے تو اسے جیل بھیجتے ہی سُرخ جوڑا پہننے کی ٹھان لی.....بڑی جلد باز ہو.....

(زہرہ کو موسیٰ کا نام سنتے ہی جھٹکا سا لگتا ہے اور وہ تڑپ کر ستارہ سے پوچھتی ہے)

زہرہ: کون ہو تم.....

ستارہ: ستارہ.....جو موسیٰ کے مقدر کا تارہ نہ بن سکی.....جسے موسیٰ نے کسی زہرہ کے چاند کو پانے کی آرزو میں اپنانے سے انکار کر دیا.....

(زہرہ چونکتی ہے)

زہرہ: میں سمجھی نہیں.....کیا تم موسیٰ کی منگیتر ہو.....؟

ستارہ: ہوں نہیں.....تھی.....میری انگلی سے موسیٰ کے نام کی انگوٹھی اتار لی گئی ہے.....لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ جس کی وجہ سے موسیٰ نے میری محبت کو ٹھکرایا وہ کسی اور کی دلہن بن کر نئی ہواؤں میں اڑنے کے لیے پر تول رہی

ہے.....

زہرہ: تو کیا تم یہاں مجھے تمہاری اور موسیٰ کی منگنی کے ٹوٹنے کی خبر دینے آئی ہو.....؟ دیکھو میرا اس معاملے سے.....

ستارہ: نہیں..... میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ موسیٰ کو جیل بھجوا کر تمہیں کیا ملا.....اس نے تمہاری خاطر اتنا انتہائی قدم اٹھالیا اور تم نے ایک پل میں اسے فراموش کر دیا..... کیوں.....؟

زہرہ حیرت سے ستارہ کو دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر

مریم کمرے میں بے چین سی ٹہل رہی ہے، ستارہ کی ماں کمرے میں آتی ہے اور مریم کو یوں پریشان دیکھ کر کچھ مشکوک سی ہو جاتی ہے۔

شائستہ: تم.....واپس آ گئیں کالج سے.....ستارہ کہاں ہے۔

مریم: (گڑبڑا کر) وہ ممانی جان.....ستارہ کی آج پریکٹیکل کی کلاس تھی ناں.....تو اسے دو گھنٹے بعد چھٹی ملنا تھی..... میں نے سوچا اتنی دیر کیا کروں گی اکیلی بیٹھ کر.....اس لیے گھر آ گئی.....

شائستہ: کتنی بار کہا ہے کہ دونوں اکٹھے آیا جایا کرو.....فون کرو ستارہ کو.....پوچھو کتنی دیر میں فارغ ہو جائے گی.....میں ڈرائیور کو بھیج دیتی ہوں اُسے لینے کے لیے۔

مریم: جی.....فون.....اچھا.....

مریم: شائستہ کو دکھانے کے لیے نمبر ڈائل کرتی ہے۔ شائستہ وہیں کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔

شائستہ: کیا ہوا.....ملاتی کیوں نہیں.....

مریم: جی.....ملا رہی ہوں.....نیٹ ورک بزی ہے شاید.....

شائستہ: ملاؤ جلدی.....پتہ بھی ہے اس لڑکی کو کہ میں پریشان ہو جاتی ہوں اس کے دیر سے آنے پر.....مگر وہ ہے کہ سمجھتی نہیں.....

مریم ممانی کے غصے سے گھبرا کر دوبارہ ٹرائی کرنے کی ایکٹنگ کرتی ہے اور گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر/ زہرہ کا کمرہ

زہرہ غصے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔

زہرہ: تم ہوش میں تو ہو.....موسیٰ نے میری خاطر ان لڑکوں پر گولی چلائی تھی.....یہ تم سے کس نے کہہ دیا.....؟

ستارہ: موسیٰ صرف تمہاری خاطر جنون کی اس حد کو پار کر سکتا ہے.....اور سارے محلے نے دیکھا ہے کہ اس دن اس گھر سے موسیٰ کے ساتھ کوئی لڑکی بھی چادر اوڑھے باہر نکلی تھی.....

زہرہ: لیکن اس سے یہ بات کیسے ثابت ہوتی ہے کہ میں ہی وہ لڑکی ہوں.....

ستارہ: اگر تم وہ لڑکی نہیں ہو تو پھر وہ کون تھی.....

زہرہ: میں کیا کہہ سکتی ہوں.....میرے لیے تو خود یہ بات ایک خبر ہے.....

(ستارہ حیرت، دکھ اور تھکن سے نڈھال سی ہو جاتی ہے)

ستارہ: میں تو صرف یہاں تم سے یہی التجا کرنے آئی تھی کہ اگر بطور گواہ تم موسیٰ کے حق میں گواہی دے سکو تو شاید اس کی جان بچ جائے..... کیونکہ موسیٰ بلاوجہ کسی پر گولی نہیں چلا سکتا..... مگر..... تم نے تو میری ہر امید ہی ختم کر دی..... اچھا..... جو خدا کو منظور..... میں چلتی ہوں.....

(ستارہ مایوس زدہ سی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے زہرہ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو نوٹ کر لیتی ہے اور اسے آواز دے کر روکتی ہے۔)

زہرہ: سنو.....

موسیٰ بہت خوش قسمت ہے کہ اُسے آسمان پر چمکنے والے تاروں جیسی ستارہ اتنا چاہتی ہے..... زہرہ جیسے داغوں بھرے چاند تو روز ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں..... میری دُعا ہے کہ تمہیں تمہاری محبت مل جائے.....

(ستارہ چونک کر پلٹتی ہے)

ستارہ: یہ تم کہہ رہی ہو.....؟

زہرہ: ہاں..... اور یہ بھی جان لو کہ میں نے کبھی موسیٰ کے عشق اور جنون کو بڑھاوا نہیں دیا..... میں اپنی اوقات جانتی ہوں..... میری سگی ماں بھی ایسے ہی کسی عزت دار گھرانے کی آبرو بننے کی آس میں اس حویلی سے کسی کا ہاتھ تھام کر نکلی تھی مگر پھر چند مہینوں بعد اس کا جنازہ ہی واپس اس صحن میں اُترا..... میں جانتی ہوں ہم جیسیوں کو ایسے عزت دار گھرانے راس نہیں آتے..... اس لیے مجھے کبھی اپنی راہ کا کانٹا نہ سمجھنا.....

ستارہ: مقدر اور نصیب گھر یا بازار کی چوکھٹ دیکھ کر نہیں بانٹا جاتا..... میں جانتی ہوں میرے مقدر میں موسیٰ کی محبت نہیں ہے..... کیونکہ وہ اپنا دل تمہاری دہلیز پر ہار چکا ہے..... ہو سکے تو اس کے لیے دعا کرنا..... وہ بڑی مشکل میں ہے.....

ستارہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور وہ تیزی سے مُڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ زہرہ پریشان سی کھڑی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: جیل۔ بیرک

موسیٰ کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے کسی سوچ میں گم بیٹھا ہے۔ چاند پوری سارنگا کے سامنے بیٹھا شعر سنا رہا ہے۔ سارنگا کے دو تین چیلے اس کے ہاتھ پاؤں دبا رہے ہیں۔

چاند پوری: شاعر کہتا ہے

اجنبی سی شہر کی آب و ہوا ہے..... تخلیہ
زرد پتوں کا ہوا کو مشورہ ہے..... تخلیہ
پہلے ہی اس شہر میں افسردگی کچھ کم نہ تھی
اس نے بھی اب گھر کے باہر لکھ دیا ہے..... تخلیہ

کارندہ نمبر 1: (سارنگا کا ایک چیلہ داد دینے کے انداز میں زور سے ہائے کرتا) ہائے ہائے..... ہائے..... مار ڈالا چاند بھائی..... مار ہی ڈالا.....

کارندہ نمبر2: اس نے بھی اب گھر کے باہر لکھ دیا ہے.....تخلیہ..... ہائے ہائے.....

(سارنگا انہی ڈانٹتا ہے)

سارنگا: چپ کر بے.....شعر کی سمجھ آئے نا آئے خوامخواہ ٹرائے لگتا ہے کسی مینڈک کی طرح.....کیوں بے چاند پوری.....یہ شاعر بننے کے لیے عشق کرنا ضروری ہوتا ہے کیا.....مطلب کیا اس کے بغیر بندہ شاعر نہیں بن سکتا.....قسم سے.....اپنی بھی بڑی خواہش تھی بچپن سے کہ میں بھی شعر بولوں.....میری کتابیں بھی لڑکیاں اپنے تکیے تلے چھپا کر رکھا کریں۔

(چاند پوری سارنگا کی معصوم خواہش سن کر مسکراتا ہے)

چاند پوری: تم تو جنگل کے شیر مارتے ہو استاد.....یہ خالی خولی لفظوں کے شعر تمہارے لیول سے بہت نیچے کی بات ہے۔ یہ کام تم ہمارے لیے چھوڑ دو.....

(سارنگا چاند پوری کی بات پر زور سے قہقہہ لگاتا ہے)

سارنگا: بڑا کمینہ ہے تو چاند پوری.....کبھی میرا فائدہ نہ ہونے دینا.....پر آج تیرا یہ صوفی دوست بڑا چپ چاپ ہے.....لگتا ہے جیل میں دل نہیں لگ رہا اس کا.....پر ہے بڑے جگر والا.....،.....سارنگا کے دل کو جا لگا ہے (سارنگا کی نظر موسیٰ پر پڑتی ہے)

چاند پوری: یہ بھی اپنے جیسا ہے استاد.....دل کی مُنتا ہے.....تم اس کے لیے کچھ کرو ناں.....تمہارے لیے کیا مشکل ہے.....میں نے پہلے بھی سفارش کی تھی تم سے اس کی.....

سارنگا: کہہ دیا ہے میں نے باہر اپنے حرام خور لونڈوں سے.....ہو جائے گا بندوبست ان زخمی لڑکوں کا.....تُو ذرا بلا تو سہی اپنے اس عاشق نامراد کو.....

(چاند پوری موسیٰ کو آواز دے کر بلاتا ہے)

چاند پوری: موسیٰ.....ادھر آؤ.....استاد بلا رہا ہے تمہیں.....موسیٰ اٹھ کر ان کے قریب آ جاتا ہے، سارنگا موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

سارنگا: ویسے تو تُو خاموش ہی رہتا ہے.....پر تیری آنکھ بہت بولتی ہے.....،اور بولتی آنکھوں والے بڑے خطرناک ہوتے ہیں.....

موسیٰ: تمہیں آنکھوں کی بولی پڑھنا آتی ہے.....؟

(سارنگا ہنس دیتا ہے)

سارنگا: پہلے آتی تھی کبھی.....،.....مگر جب ہاتھوں نے چاقو تھام لیا تو دل کا اسکول بند ہو گیا.....

موسیٰ: دل کا اسکول کبھی مستقل بند نہیں ہوا کرتا.....،جب نیت ہو، اسی جماعت سے دوبارہ شروع کر سکتے ہو جہاں آخری سبق چھوڑا تھا.....

(سارنگا غور سے موسیٰ کو دیکھتا ہے)

سارنگا: آہ پیارے.....بڑی بات کہہ دی.....پر اپنے اسکول کی تو ہیڈ ماسٹرنی ہی ہمیشہ کے لیے گیٹ بند کر کے تالا لگا گئی تھی.....کس کے بھروسے پھر سے داخلہ لیتے

موسیٰ: تالے کی چابی ڈھونڈنے کی کوشش کرو استاد.....وہیں کہیں آس پاس پڑی ملے گی.....دل والے کبھی ہمیشہ کے لیے تالا بندی نہیں کرتے.....

(چاند پوری اور کارندے حیرت سے موسیٰ اور سارنگا کی یہ عجیب وغریب باتیں سن رہے ہیں)

چاند پوری: واہ استاد واہ.....ہم تو خود کو شاعر سمجھتے تھے مگر آج پتہ چلا کہ تمہارے سامنے تو ہم بھی چنے بیچتے ہیں.....کیا جنگل بندی بنائی ہے تم دونوں نے.....واہ.....مزا آ گیا.....

سارنگا: تیرا یار بڑا گہرا ہے چاند پوری.....ایک دن سب کو ڈبا کہ غرق کر دے گا.....دیکھ لینا.....
موسیٰ چپ رہتا ہے۔سارنگا غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن
جگہ: زہرہ کا گھر۔زہرہ کا کمرہ

زہرہ کو ستارہ اور موسیٰ کی کہی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

موسیٰ
آڈیو/فلیش بیک

اوور لیپ: تم دیکھ لینا.....میں خود کو برباد کرلوں گا.....

ستارہ/آڈیو: موسیٰ نے دل تمہاری دہلیز پر ہار دیا ہے.....زہرہ کے چاند کے سامنے.....

(زہرہ ستارہ اور موسیٰ کی کہی باتیں یاد کر کے بے چین سی ہو جاتی ہے۔اس کے سامنے اس کی شادی کی بری وغیرہ ویسے ہی بکھری پڑی ہے۔اتنے میں انا زہرہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور اسے یوں گم سم بیٹھا دیکھ کر کہتی ہے۔)

انا: کس سوچ میں گم بیٹھی ہو.....وہ لوگ آتے ہی ہوں گے.....تم ابھی تک تیار بھی نہیں ہوئی.....

(زہرہ اداس اور پریشان ہے)

زہرہ: مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے انا جی.....

انا: ارے.....ڈر کیسا.....تم تو میری سب سے بہادر اور نڈر بچی ہو.....تمہاری تو سب یہاں مثالیں دیتے ہیں.....تمہی سے ہم سب کو یہ حوصلہ ملا ہے.....

زہرہ: پتہ نہیں.....عجیب عجیب سے اندیشے سے اٹھانے لگتے ہیں ہر دو گھڑی بعد.....

انا: اُن شاء اللہ سب بہتر ہوگا.....تمہاری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی.....

زہرہ: میں نے جان بوجھ کر آج تک کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی.....مگر شاید کوئی آج انجانے میں میری وجہ سے بہت کرب میں ہے.....آج زندگی میں پہلی بار کسی کی بد دعا سے ڈر لگ رہا ہے انا جی.....

انا: جو دل والے ہوتے ہیں وہ کبھی بد دُعا نہیں دیتے.....اپنے آپ کو بے جا وسوسوں میں نہ الجھاؤ.....چلو اٹھو.....تیار ہو جاؤ.....وقت کم ہے.....ابھی کتنے کام باقی پڑے ہیں.....چلو شاباش.....میں چندا کو بھیجتی ہوں تمہارے پاس.....

انا زہرہ کو تسلی دے کر کمرے سے نکل جاتی ہے مگر زہرہ ویسے ہی پریشان سی بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن
جگہ: کاشانہ،پیراں

عیسیٰ خوشی میں ماں کو آوازیں دیتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے۔مگر کمرے میں باپ کو ماں کے پاس بیٹھے دیکھ کر اس کی زبان کو بریک سی لگ جاتی ہے۔

عیسیٰ: اماں.....اماں میری بات سنو.....کہاں.....

(باپ غور سے عیسیٰ کی خوشی اور پُر جوش انداز کو دیکھتا ہے)

قدرت اللہ: کیا بات ہے.....؟.....کیوں چلا رہے ہو.....؟.....کیا کوئی لاٹری نکل آئی ہے تمہاری—

عیسیٰ: وہ ابا.....وہ.....

ہاجرہ: کیا بات ہے.....؟.....بولتا کیوں نہیں.....

عیسیٰ: وہ اماں.....پولیس نے ان تینوں لڑکوں کا بیان لے لیا ہے—انہوں نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ان پر گولی نامعلوم ڈاکو لٹیروں نے چلائی تھی جنہیں وہ نہیں جانتے.....موسیٰ بھائی کا تو اس واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہاجرہ: (ہاجرہ خوشی سے کہتی ہے) کیا.....؟.....سچ کہہ رہا ہے ناں تو.....

عیسیٰ: ہاں اماں.....میری خود بات ہوئی ہے ایس۔ایچ۔او سے.....

(ہاجرہ آسمان کی طرف اپنی چادر اٹھاتی ہے)

ہاجرہ: یا اللہ.....تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے—میں جانتی تھی کہ میرا موسیٰ بے قصور ہے—دیکھا آپ نے پیر صاحب—اب تو خود ان لڑکوں نے بھی گواہی دے دی۔

(پیر قدرت طنز سے کہتا ہے)

پیر قدرت: اچھی طرح دیکھ رہا ہوں.....بڑی ترقی کر لی ہے تمہارے لاڈلے نے.....جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کی دنیا پر حکومت کرنے لگا ہے—تمہیں تو مٹھائی بانٹنی چاہیے سارے شہر میں.....

ہاجرہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں—آپ کو اپنے بیٹے کی بے گناہی کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی۔

قدرت: میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہاجرہ بی بی—تھیٹی سے پہلے اسی تھانے دار نے مجھے بھی فون کیا تھا—یہ بتانے کے لیے کہ راتوں رات پتہ نہیں ان لڑکوں کے گھر والوں کو کیا پیغام پہنچایا گیا ہے کہ خوف کے مارے ان کی بولی ہی بدل گئی ہے.....اپنے ہاتھوں سے لکھ کر تھانے میں یہ تحریر دے دی ہے کہ موسیٰ کو انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں دیکھا ہی نہیں.....خود پولیس بھی ان کی اس کایا پلٹ پر حیران ہے۔

ہاجرہ: ہمیں اس سے کیا لینا دینا شاہ جی.....ہمارے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارا موسیٰ باعزت رہا ہو کر گھر واپس آ جائے.....میں تو.....

(غصے میں قدرت چلاتا ہے)

قدرت: اتنا کافی نہیں ہے.....جیل سے تو بڑے قاتل اور ڈاکو لٹیرے بھی چھوٹ جاتے ہیں جھوٹی گواہیوں پر—موسیٰ کا اب اس گھر سے کچھ لینا دینا نہیں ہے.....پہلے مجھے صرف شک تھا.....مگر ان تین لڑکوں کے بدلے ہوئے بیان نے مجھے پورا یقین دلا دیا ہے کہ موسیٰ پوری طرح جرم کی دنیا میں ملوث ہو چکا ہے—اور میرا یا میرے خاندان کا کسی مجرم سے کوئی رشتہ.....کوئی ناطہ نہیں ہو سکتا.....

ہاجرہ: مگر پیر صاحب.....

پیر قدرت: بس.....میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا.....اب اس بات پر مزید کوئی بحث نہیں ہوگی اس گھر میں.....

قدرت غصے میں پیر پٹختا وہاں سے چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن۔شام

جگہ: زہرہ کا گھر، ڈرائنگ روم

زہرہ کے گھر میں ملک شہریار اپنے تین چار قریبی لوگوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے، اتنے میں توقیر کچھ فارم

وغیرہ بھروا کر قاضی سے کاغذ لیتا ہے اور دوسری جانب بیٹھی لالہ کو دکھاتا ہے۔ شہریار خوش نظر آ رہا ہے۔ لالہ کاغذات پر نظر ڈال کر قریب بیٹھے اپنے وکیل کو پکڑاتی ہے۔ وکیل بغور تمام اسٹامپ پیپرز اور دستاویزات دیکھتا ہے اور سر ہلا کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے، شہریار جاوید کو اشارہ کرتا ہے۔ توقیر جاوید لالہ جی سے کہتا ہے۔

توقیر جاوید: آپ کی اجازت ہو تو قاضی صاحب نکاح پڑھانا شروع کریں۔

لالہ: جی..... بسم اللہ۔

(قاضی اپنا چشمہ درست کرتا ہے)

قاضی: ملک شہریار ولد ملک رضوان مجھ قاضی شبیر کو یہ نکاح کرانے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے..... ملک شہریار ولد ملک رضوان کیا آپ کو مسماۃ زہرہ بنت رضیہ یہ نکاح بااعیوض دیگر تحریر شدہ شرائط اور 20 لاکھ حق مہر سکہ رائج الوقت معجل قبول ہے؟

شہریار: جی قبول ہے.....

قاضی: قبول ہے؟

شہریار: جی قبول ہے

قاضی: قبول ہے؟

شہریار: قبول ہے.....

//Cut//

Scene No # 19

وقت: شام

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ شادی کا جوڑا پہنے بستر پر بیٹھی ہوئی ہے، چنداں اس کے ساتھ ہے۔ قاضی اور وکیل کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے لالہ بھی اندر آتی ہے، قاضی ایک جانب کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی بات دہراتا ہے۔

قاضی: زہرہ بنت رضیہ..... آپ کو بااعیوض بیس لاکھ حق مہر..... معجل و دیگر تحریر شدہ شرائط..... ملک شہریار ولد ملک رضوان سے یہ نکاح قبول ہے؟

(زہرہ گم سم بیٹھی رہتی ہے۔ قاضی پھر اپنی بات دہراتا ہے۔)

قاضی: زہرہ بنت رضیہ..... آپ کو ملک شہریار ولد ملک رضوان سے بااعیوض بیس لاکھ حق مہر معجل..... یہ نکاح قبول ہے.....

(زہرہ خاموش رہتی ہے۔ لالہ گھبرا کر چنداں کی طرف دیکھتی ہے، چنداں زہرہ کو ہلکا سا ہلاتی ہے۔)

قاضی: آپ کو یہ نکاح قبول ہے۔

زہرہ خاموش گم سم بیٹھی رہتی ہے (کٹ)؟

ہاں جیل میں موی لیٹے لیٹے اچانک بے چین ہو کر اٹھ بیٹھتا ہے جیسے کسی نے اس کا دل زور سے مسل ڈالا ہو۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 13

Scene No # 1

وقت: شام

جگہ: زہرہ کی حویلی/ زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے سامنے قاضی اور وکیل کھڑے ہیں۔ قاضی تیسری مرتبہ زہرہ سے وہی سوال پوچھتا ہے۔ امّا اور چندا پریشانی سے زہرہ کی طرف دیکھ رہی ہیں۔

قاضی: زہرہ بنت رضیہ تمہیں ملک شہریار ولد ملک رضوان سے باعوض 20 لاکھ روپے حق مہر معجل نکاح قبول ہے.....

(چندا زہرہ کو کہنی مار کر متوجہ کرتی ہے)

چندا: قاضی صاحب کچھ پوچھ رہے ہیں زرّی.....

زہرہ: (زہرہ چونکتی ہے اور دھیرے سے سر ہلاتی ہے) قبول ہے.....

امّا کے چہرے پر چھایا تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ چندا خوشی سے امّا کی طرف دیکھتی ہے۔ قاضی اور وکیل رجسٹر آگے بڑھاتے ہیں جس پر زہرہ اپنے دستخط کر دیتی ہے۔ باہر بیٹھا جاوید ملک شہریار سے خوشی سے ہاتھ ملاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: جیل۔ بیرک

موسیٰ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دور سارنگا اور دیگر ساتھی گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں اور بیرک میں ان کے خراٹے گونج رہے ہیں۔ آہٹ سُن کر چاند پوری کی آنکھ بھی کھل جاتی ہے۔ اور وہ لیٹے لیٹے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر موسیٰ سے پوچھتا ہے۔

چاند پوری: کیا ہوا.....؟..... نیند نہیں آ رہی کیا؟

موسیٰ: عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے..... جیسے کچھ چھن گیا ہو..... جیسے کوئی بچھڑ گیا ہو.....

چاند پوری: خدا خیر کرے..... عاشق کا سرمایہ تو بس اس کا عشق ہوتا ہے..... اوپر والا تمہارا عشق سلامت رکھے.....

موسیٰ: کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں بھی کتنا بدقسمت ہوں..... کسی کو بھی میرے وجود سے کبھی کوئی خوشی کوئی راحت نہیں مل پائی..... باپ ناراض، ماں پریشان، بھائی میری وجہ سے دربدر..... اور وہ..... وہ بھی کہاں خوش ہے.....

چاند پوری: اُداس مت ہو پیارے..... ان لڑکوں نے تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیا ہے..... دو دن بعد تمہیں میجسٹریٹ کے سامنے عدالت میں پیش کیا جائے گا..... وہاں سب کے سامنے وہ تینوں بیان دیں گے کہ وہ تمہیں جانتے بھی نہیں..... پھر تمہاری ضمانت پکی.....

موسیٰ: کیا کروں گا یہاں سے باہر نکل کر بھی، گھر بار تو رہا نہیں..... ابّا نے عاق کر کے دیس نکالا تو پہلے ہی سُنا دیا ہے..... اب جیل سے نکلنے کے بعد تو وہ میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کریں گے.....

چاند پوری: اس کی بھی تم فکر نہ کرو..... ویسے تو اس بار میرا کچھ لمبے قیام کا پروگرام تھا استاد سارنگا کے ساتھ..... مگر تمہاری خاطر میں

نے بھی پرسوں ہی اپنی ضمانت کی درخواست لگا دی ہے.....،.....ضمانت نہ بھی ہوئی تو اپنا یار نامراد ہے ناں وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا.....

موسیٰ: تمہاری ضمانت کی درخواست بھی لگی ہے کیا؟

چاند پوری: ہاں.....اپنا آنا جانا لگا رہتا ہے یہاں.....کوئی نئی بات نہیں.....،.....چلو اب تم بھی سو جاؤ.....ابھی رات بہت پڑی ہے.....

(چاند پوری مصرعہ پڑھتے ہوئے دوبارہ لیٹ جاتا ہے۔) 'ستارو تم تو سو جاؤ.....پریشاں رات ساری ہے'

مگر موسیٰ کی آنکھوں سے نیند اسی طرح دور ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کی کوٹھی/ بنگلہ۔آؤٹر

زہرہ ملک شہریار کے بیڈ روم میں سیج پر دولہن بنی بیٹھی ہوئی ہے، کچھ دیر میں شہریار شراب کے نشے میں ہلکا سا لڑکھڑاتے اور زیر لب کچھ گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے، زہرہ آہٹ سن کر سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے۔شہریار ایک نگاہِ غلط سیج پر بیٹھی زہرہ پر ڈالتا ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک کمینی سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔اور وہ اطمینان سے جیب سے اپنا سگار نکالتا ہے اور اسے جلا کر اطمینان سے دو چار لمبے کش لیتا ہوا مسہری کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔زہرہ بے چینی سے پہلو بدلتی ہے جیسے اسے اس خاموشی اور شہریار کے پُر سرار رویے سے بے چینی ہو رہی ہو، شہریار چند لمحے زہرہ کو دیکھتا رہتا ہے اور پھر ایک لمبا کش لے کر دھواں زہرہ کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف پھینک دیتا ہے۔دھویں سے زہرہ کھانس پڑتی ہے، شہریار اس کی حالت انجوائے کرتے ہوئے ہنس دیتا ہے۔

شہریار: یہ کیا تم کسی پُرانی بوری کی طرح سُرخ گھڑی ہو بیٹھی ہو.....کم آن گرل.....کم از کم تم تو یہ Typical Behave ٹپیکل بی ہیو کرنا بند کرو.....چلو.....اتارو یہ گھونگھٹ وغیرہ.....اور ہٹاؤ یہ پردے.....بالکل اچھی نہیں لگ رہیں تم اس رضائی نما ڈریس میں.....

زہرہ چونکتی ہے مگر چپ رہتی ہے اور خاموشی سے گھونگھٹ کھول دیتی ہے۔اور دوپٹہ سر سے اتار دیتی ہے۔شہریار اس پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے اور ہوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

شہریار: ہاں.....یہ ہوئی ناں بات.....کچھ بات کرو.....کچھ بولو.....

زہرہ: کیا بولوں.....

شہریار: اچھا یہ بتاؤ.....کچھ پیو گی.....ڈرنک بناؤں تمہارے لیے.....

زہرہ: نہیں.....میں ڈرنک نہیں کرتی.....

(شہریار طنز کرتا ہے)

شہریار: رئیلی.....دیٹس سٹرینج thats strang.....اتنی پارٹیز میں جاتی رہی ہو.....کبھی تو کسی نے آفر کی ہوگی.....

زہرہ: ہاں.....مگر میرا جواب ہمیشہ ناں ہی رہا ہے.....

شہریار: (ہنس کر) چلو.....مان لیتے ہیں.....اچھا یہ بتاؤ.....کتنوں کے دل توڑ کر یہاں آئی ہو آج.....

زہرہ: (زہرہ کچھ غصے سے) جی.....؟

شہریار: یار میرا مطلب ہے کہ اتنے بہت سے عاشق رہے ہوں گے تمہارے.....جن کے درمیان سے میں یعنی ملک شہریار تمہیں

کسی باز کی طرح جھپٹ کر لے اُڑا..... اب پیچھے ماتم تو بچھا ہوگا ناں تمہارے چاہنے والوں کے درمیان.....

زہرہ: میں اب آپ کی عزت ہوں..... کیا کوئی اپنی عزت سے ایسی باتیں پوچھتا ہے پہلی رات.....

شہریار: پہلی رات ہو یا آخری..... اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... سچ ہمیشہ سچ ہی رہتا ہے۔

زہرہ: میری زندگی میں کبھی کوئی ایسی دوستی یا ایسا رشتہ نہیں رہا جس پر مجھے کبھی شرمندگی ہو یا کبھی آپ کو بتانے میں کوئی ہچکچاہٹ ہو..... چاہیں تو آپ اپنے سرکل سے بھی چیک کر سکتے ہیں.....

شہریار: چیک کیا تھا..... اور چیک کرنے کے بعد ہی تو میں نے اتنا بڑا فیصلہ لیا ہے.....

زہرہ: پھر یہ تفتیش کیوں؟

شہریار: ویسے ہی..... گپ لڑانے کے لیے..... اب میں تمہیں روایتی بیویوں والا درجہ تو دینے سے رہا اور تم مجھے ہر بات بتانے کی پابند ہو..... ویسے بھی مجھے گھر بار سنبھالنے والی کوئی دقیانوس ماسی ٹائپ عورت نہیں بیاہنی تھی..... تمہیں میرے ساتھ ہائی سوسائٹی میں موو move کرنا ہوگا..... پبلی پارٹیز، کلب اور محفلیں اٹینڈ کرنا ہوں گی جہاں عزت اور غیرت کے وہ بوسیدہ اور قدیم پیمانے بہت پہلے دفن کر دیئے گئے ہیں..... بس اتنا یاد رکھنا..... مجھ سے کبھی بے وفائی کرنے کا سوچنا بھی مت..... ورنہ انجام کتنا بُرا ہوگا یہ بتا دوں تو سوچ کر ہی تمہاری رُوح تک لرز جائے گی..... میں چینج کر کے آتا ہوں..... چاہو تو تم بھی چینج کر لو..... تھک گئی ہوگی تم بھی یہ روایتی دلہن کا کردار نبھاتے نبھاتے.....

شہریار اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ زہرہ حیران پریشان بیٹھی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: صبح ہونے کا موقع

جگہ: سنٹرل جیل۔ ملاقاتی کمرہ

نامراد ملاقاتی کمرے میں سلاخوں کے پار سر جھکائے افسردہ کھڑا ہے، موسیٰ کے سر پر جیسے کوئی پہاڑ ٹوٹا ہے مگر وہ ضبط کیے خود کو مضبوطی سے سنبھالے کھڑا ہے۔

نامراد: ہاں یار..... یہ سچ ہے..... کل رات وہ بے وفا کسی ارب پتی سیٹھ کی ڈولی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو گئی ہے..... تیرے جیسا ہیرا چھوڑ کر نہ جانے کون سا پتھر چُنا ہے اس نے.....

(موسیٰ کچھ دیر اپنے اندر چلتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے)

موسیٰ: وہ بے وفا نہیں ہے نامراد..... بے وفا تو تب ہوتی جب مجھ سے کبھی کوئی وعدہ کیا ہوتا اس نے..... ملنے کا کوئی آسرا دیا ہوتا..... مگر اس نے تو ہمیشہ انکار ہی کیا.....

نامراد: جانتا ہوں کہ تیرا دل اندر سے کٹ کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے..... مگر آفرین ہے تجھ پر شہزادے..... تو آج بھی اسی طرح جم کر اپنے پیروں پر کھڑا ہے..... تیری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کا دل پھٹ گیا ہوتا.....

موسیٰ: صرف سانس لینے میں اور زندہ رہنے میں بڑا فرق ہوتا ہے..... ہم میں سے کئی صرف زندہ رہتے ہیں..... ان میں زندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی.....

نامراد: تم دیکھ لینا موسیٰ..... وہ بہت پچھتائے گی..... اور بہت جلد پچھتائے گی..... تڑپے گی اور روئے گی تمہیں یاد کر کر کے..... میری بددعا ہے اسے کہ

(موسیٰ جلدی سے اسے روک دیتا ہے)

موسیٰ: نہیں دوست..... بددعا نہ دو اُسے..... عشق میں بس دُعا ہوتی ہے..... بددعا تو رقیب دیتے ہیں..... اور موسیٰ کسی کا

رقیب نہیں ہے.....

(نامراد کو غصہ آ جاتا ہے، وہ موسیٰ پر پھٹ پڑتا ہے۔)

نامراد: کس مٹی کے بنے ہوئے ہو تم.....، اندر سے دل پھٹ جائے گا ایک دن تمہارا بیٹھے بیٹھے..... اگر اتنے غموں کے پہاڑ جمع کرتے رہو گے اندر.....، چیخو..... چلاؤ.....، آسمان سر پر اٹھا لو..... اسے تباہ و برباد ہونے کی بددعائیں دو.....، .....آج کے بعد یہ سوچنا شروع کر دو کہ جیل سے باہر نکلتے ہی اس کی زندگی کیسے برباد کرو گے.....؟..... کیسے بدلہ لو گے اس سے..... کیسے فنا کرو گے اس کے جھوٹے غرور کو..... کیسے مٹی میں رولو گے اس کی جھوٹی شان کو..... چلاؤ موسیٰ..... آگ لگا دو اس ساری دنیا کو.....

نامراد موسیٰ کو جوش دلاتے دلاتے خود فرطِ جذبات میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتا ہے۔ موسیٰ سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر نامراد کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے اور تھپک تھپک کر اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ مگر نامراد کے آنسو نہیں رُکتے۔ خود موسیٰ کی پلکوں کے گوشے بھی دھیرے دھیرے نم ہونے لگتے ہیں۔ مگر وہ نامراد کو تسلیاں دیتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

زہرہ کمرے سے باہر آتی ہے۔ لاؤنج میں کوئی نہیں ہے۔ وہ کسی کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ڈائننگ ہال کی طرف آتی ہے جہاں کوئی نوکرانی (نوراں) کام میں مصروف ہے۔ وہ زہرہ کو دیکھ کر جلدی سے کہتی ہے۔

نوراں: آپ جاگ گئیں بی بی جی..... میں آپ کے لیے ناشتہ لگا دوں.....

زہرہ: شہریار..... میرا مطلب ہے تمہارے صاحب کہاں ہیں۔

نوراں: وہ تو جی جلدی دفتر چلے گئے تھے آج۔ مجھے کہہ گئے ہیں۔ آپ کو بتا دوں کہ ان کی کوئی ضروری میٹنگ ہے..... شام کو جلدی لوٹنے کی کوشش کریں گے۔

(زہرہ گہری سانس لیتی ہے)

زہرہ: نام کیا ہے تمہارا..... اور اس گھر میں اور کتنے نوکر ہیں۔

نوراں: میرا نام نوراں ہے جی..... باقی گھر میں نوکر خانسامے، ڈرائیور اور مالی وغیرہ کو ملا کر کچھ آٹھ دس ملازم ہیں..... اور بس.....

زہرہ: کیا یہاں کوئی دوسرا آتا جاتا نہیں..... میرا مطلب ہے شہریار کے رشتہ دار، گھر والے یا دوست عزیز وغیرہ.....

نوراں: نہیں جی.....، چند خاص دوستوں کے علاوہ تو کبھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا میں نے..... باقی عزیز رشتہ دار وغیرہ تو ملک صاب کے گاؤں میں ہی ہوتے ہیں..... جہاں ان کا آبائی گھر ہے.....،

زہرہ: تو کیا ملک صاحب خود اپنے گاؤں نہیں جاتے؟

نوراں: بہت کم جی..... زیادہ تر تو وہ ملک سے باہر ہی رہتے ہیں..... ولایت میں..... اپنے کاروبار کے سلسلے میں.....

زہرہ: کون کون ہے ملک صاحب کی فیملی میں..... میرا مطلب ہے ان کے گھر والے.....

(نوراں کچھ گھبرا سی جاتی ہے)

نوراں: نہیں جی..... میں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی..... ویسے بھی ہم نوکروں کو زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہے..... بس اپنے کام سے کام رکھنے کا حکم ہے..... میں ناشتہ بنا دوں آپ کے لیے بی بی جی.....

(زہرہ کسی سوچ میں گم ہے)

زہرہ: ہاں..... ہاں بنا دو..... بلکہ تم مجھے بھی ساتھ لے چلو..... مجھے بھی بچن دکھاؤ نا.....

نوراں: (حیرت سے) آپ بی بی جی..... میرا مطلب ہے آپ کیسے.....؟

زہرہ: ہاں تو کیا ہوا..... چلو..... دکھاؤ مجھے..... گھر پر بھی میں اپنی چائے خود ہی بناتی تھی.....

(نوراں کش مکش میں پریشان کھڑی ہے جیسے وہ زہرہ کو اس کام سے روکنا چاہتی ہو مگر روک نہ پا رہی ہو۔ زہرہ اسے سختی سے کہتی ہے)

زہرہ: چلو بھئی..... کیا سوچ رہی ہو۔

نوراں بادل نخواستہ چل پڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

موسیٰ کی ماں بیٹھی رو رہی ہے۔ سکینہ اسے تسلیاں دے رہی ہے، قریب ہی سکینہ کی ماں اور عیسیٰ بھی کھڑے ہیں۔

سکینہ: چپ کر جائیں تائی جان..... آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ موسیٰ بھائی کی آج ضمانت منظور ہو رہی ہے..... آج وہ آزاد ہو جائیں گے.....

باجرہ: خوش تو میں تب ہوتی جب میرا بچہ رہا ہو کر گھر کو لوٹتا..... مگر وہ تو جیل سے چھوٹنے کے بعد بھی نہ جانے کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا..... کہاں جائے گا وہ..... کیسے رہے گا اکیلا..... میرا تو دل یہی سوچ سوچ کر پھٹے جا رہا ہے۔

عیسیٰ: تم فکر نہ کرو اماں..... میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر کے ہی آؤں گا موسیٰ بھائی کے رہنے کا..... اور اگر تم یونہی روتی رہیں تو ابا کو ضرور پتہ چل جائے گا سارے قصے کا..... بس اب چپ کر جاؤ..... تمہارے بیٹے کو در بدر نہ ہونے دوں گا میں..... یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔

(خدیجہ عیسیٰ سے کہتی ہے)

خدیجہ: تمہیں اس وقت وہاں موجود ہونا چاہیے عیسیٰ..... میں موسیٰ کو جانتی ہوں اچھی طرح..... وہ کبھی بھائی صاحب کی حکم عدولی کر کے گھر کا رخ نہیں کرے گا..... مگر ایسے میں وہاں کوئی تو ہو جو اسے تسلی دے سکے۔

عیسیٰ: میں بس جا ہی رہا تھا کہ ابا نے کسی کام سے روک لیا..... میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں شک ہو..... بس نکل رہا ہوں میں۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: جیل۔ بیرک

ضمانت کے بعد موسیٰ سارنگا اور دیگر ساتھیوں سے رخصت لے رہا ہے۔

سارنگا: (سارنگا مسکراتا ہے) اچھا..... تو جا رہا ہے شہزادہ..... باہر جا کر مجھے بھول تو نہیں جائے گا.....

موسیٰ: کیسی بات کر رہے ہو..... کہو تو ضمانت منسوخ کروا کر یہیں رک جاؤں..... اور ضمانت بھی تو تمہی نے کروائی ہے۔

سارنگا: مخول کر رہا تھا..... اپنا خیال رکھیں..... بڑا قیمتی ہے تو.....

چاند پوری: اس کی تم پرواہ نہ کرو استاد..... میری ضمانت نہیں ہوئی تو کیا ہوا..... اپنا یار نامراد ہے ناں..... یہ اب اُسی کے ساتھ ہی

رہے گا.....۔

سارنگا: اپنی جیل سے زیادہ آج بھی باہر چلتی ہے..... یہ حرام خور چاند پوری بھی جلد باہر آ جائے گا..... کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھنا..... اور جس چیز کی بھی ضرورت ہو..... بے دھڑک کہلوا دینا کسی کے ہاتھ..... سمجھ تیرا سارنگا بھائی ہر وقت تیرے ساتھ ہی ہے

موسیٰ: جانتا ہوں..... اور میں باہر تمہارا انتظار کروں گا..... تم سے ابھی دل کے اسکول کی بہت ساری باتیں سُننی ہیں مجھے.....

(سارنگا زور سے قہقہہ لگا کر موسیٰ کو گلے لگا لیتا ہے)

سارنگا: جانتا ہوں..... تُو بھی اسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے.....

(پھر سارنگا موسیٰ کو خود سے جدا کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہے)

سارنگا: اچھا سُن..... باہر جا کر کسی اکیلی جگہ بیٹھ کر یا خود کو کسی کمرے میں بند کر کے خوب رو لینا..... یہاں تجھے رونے کا موقع بھی نہیں دیا میرے ان حرام خوروں نے..... جو چوبیس گھنٹے تیرے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے.....

(موسیٰ چونک کر سارنگا کی طرف دیکھتا ہے۔)

موسیٰ: مگر..... بھائی.....

سارنگا: جانتا ہوں میں..... اس کا بیاہ ہو گیا ہے کسی سے..... کلیجہ پھٹ گیا ہے میرا یہ سن کر..... پر تُو بڑا اجی دار ہے..... کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیا کہ اندر کیا قیامتیں گزر گئیں تجھ پر..... مگر میری مان لے..... ایک آخری بار ایسے رونا کہ زمین آسمان دونوں لرز جائیں..... مگر اس کے بعد دل کا زخم ہمیشہ کے لیے سی لینا..... کیونکہ یہ دنیا رونے والے کو مزید رُلاتی ہے..... اس کے بعد تجھے رونا نہیں ہے..... اس دنیا کو رلانا ہے.....

(موسیٰ دکھ سے سارنگا کی طرف دیکھتا ہے)

موسیٰ: دل کا زخم کیسے سیتے ہیں سارنگا بھائی.....

سارنگا: وقت سب سی دیتا ہے پگلے..... اُس سے بڑی سلائی مشین ابھی ایجاد نہیں ہوئی..... چل اب نکلنے کی تیاری کر لے..... اور جب تو کہے تیری دلبر کو تیرے قدموں میں لا ڈالوں پر جانتا ہوں تو یہ کبھی کہے گا نہیں.....

سارنگا موسیٰ کو گلے لگاتا ہے اور موسیٰ باقی کارندوں سے ہاتھ ملا کر چاند پوری کے ساتھ بیرک کے دروازے پر آتا ہے جہاں کھڑا سنتری موسیٰ کے لیے دروازہ کھول دیتا ہے۔ موسیٰ چاند پوری سے گلے ملتا ہے پھر موسیٰ بیرک سے باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: جیل کے باہر

نامراد جیل کے باہر موسیٰ کا انتظار کر رہا ہے وہ موسیٰ کو گلے لگاتا ہے۔ نامراد اور موسیٰ کسی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں اور ان کے جانے کے بعد عیسیٰ موسیٰ کی جیپ میں وہاں پہنچتا ہے..... اور اتر کر سنتری سے کچھ پوچھتا ہے مگر سنتری اسے اشارے سے بتاتا ہے کہ موسیٰ وہاں سے جا چکا ہے۔ عیسیٰ پریشانی میں ادھر اُدھر موسیٰ کو تلاش کرتا ہے۔ مگر موسیٰ اسے نظر نہیں آتا۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ اپنے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ اتنے میں اس کے سیل پر فون کی گھنٹی بجتی ہے، وہ جلدی سے فون

اٹھاتی ہے۔دوسری طرف شہریار ہے جو دفتر سے بات کر رہا ہے۔

زہرہ: ہیلو.....

شہریار: ہیلو.....گڈ آفٹرنون.....کیسی ہو.....

زہرہ: ٹھیک ہوں.....

شہریار: سوری یار.....صبح ذرا جلدی میں نکلنا پڑا مجھے.....،.....ایک ارجنٹ میٹنگ تھی.....

زہرہ: جی.....نوراں نے بتادیا تھا مجھے.....

شہریار: اچھا سنو.....شام کو ذرا ٹھیک سے تیار ہو جانا..... میں نے کچھ قریبی دوستوں کو ولیمہ پارٹی دی ہے.....اور ذرا ارینجمنٹس Arangemints بھی دیکھ لینا.....

زہرہ: جی.....میں دیکھ لوں گی۔

شہریار: اچھا سنو.....وہ بلیک ڈریس پہن لینا.....وہی.....جو تم نے اس رات پہنا تھا جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی.....جو اس ڈانس پارٹی میں پہنا تھا۔

(زہرہ کو حیرت کا جھٹکا لگتا ہے)

زہرہ: وہ ڈریس.....مگر وہ تو.....پارٹی ڈریس تھا.....میں وہ ڈریسز تو اپنے ساتھ لے کر نہیں آئی.....

شہریار: نہیں لائیں تو ابھی منگوالو.....بلکہ رُکو.....گھر سے پرانے ڈریسز منگوانے کی ضرورت نہیں ہے،تم ڈرائیور کے ساتھ ابھی شاپنگ مال چلی جاؤ اور جتنے چاہو ایسے ڈریسز لے لو.....میں چاہتا ہوں میری بیوی آج کی محفل میں سب سے زیادہ حسین نظر آئے.....

زہرہ: لانے مجھے بہت قیمتی اور بھاری جوڑے سلوا کر دیے ہیں،میں ان میں سے کوئی جوڑا.....

(شہریار بیچ کر بات کاٹ دیتا ہے)

شہریار: اوہ پلیز زہرہ.....میں نے تم سے کل رات بھی کہا تھا کہ مجھے یہ اولڈ اسٹائل دولہنوں کا فیشن بالکل بھی پسند نہیں.....اپنے وہ سارے خیمہ نما جوڑے گھر کی نوکرانیوں میں بانٹ دو.....میں تمہیں ہمیشہ ویسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں جیسے میں نے تمہیں پہلی مرتبہ اس ڈانس پارٹی میں دیکھا تھا.....شوخ.....چنچل.....زندگی سے بھرپور اور الٹرا ماڈرن.....جس کی ایک جھلک ساری محفل پر بجلی بن کر گرے اور سبھی کے ہوش اڑا دے.....کیا سمجھیں.....

(زہرہ مایوسی سے کہتی ہے)

زہرہ: جی.....سمجھ گئی.....

شہریار: دیٹس لائک اے گڈ گرل Ihats like a good girl.....چلو ٹھیک ہے.....میں شام کو وقت پر گھر پہنچ جاؤں گا.....، تم تیار رہنا.....

شہریار فون بند کر دیتا ہے۔زہرہ دوسری جانب پریشانی سے اپنے فون کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: شام

جگہ: نامراد کا بوسیدہ سا پرانا گھر

گھر کے اندر جالے لگے ہوئے ہیں۔نامراد موسیٰ کو لیے گھر میں داخل ہوتا ہے اور صحن کا دروازہ اندر سے بند کر دیتا ہے۔

نامراد: آجاؤ میاں..... یہ ہے ہمارا تاج محل..... بس اک ممتاز کی کمی ہے.....

(موسیٰ ادھر اُدھر در و دیوار پر نظر ڈالتا ہے۔ نامراد برآمدے میں جا کر کمرے کا تالا کھولتا ہے)

نامراد: اندر آجاؤ..... میرا یہ دولت خانہ..... میرا مطلب ہے غریب خانہ تمہاری اونچی حویلی جیسا تو نہیں ہے مگر سر چھپانے کا ایک آسرا ضرور ہے..... سوا سے جو ہے جہاں ہے کی بنیاد پر قبول کرو..... اماں میری شادی ایک دوسری ممتاز کے ساتھ کرنا چاہتی تھی..... یہ محل اس کے لیے آباد کیا تھا میں نے۔

(موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں دیواروں پر پرانی فلموں اور ہیروئنز کی تصویروں والے پوسٹر سجے ہوئے ہیں۔)

موسیٰ: مگر یہ اتنے بہت سے پوسٹر.....

نامراد: ہاں..... کبھی گزر بسر کے لیے فلموں کی کہانیاں اور گیت لکھتا تھا..... اور جو بھی ہیروئن اپنی اس بے وفا محبوبہ کی طرح نظر آتی ہے..... یا جس میں بھی اس کی ذرا جھلک دکھائی دے جائے..... اس کی تصویر دیوار پر سجا لیتا ہوں۔ مگر فی الحال کے لیے شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ.....

ابھی گھر کے مسائل حل کریں گے
تیری زلفوں کی باتیں کل کریں گے

موسیٰ: مگر وہ اب کہاں ہے..... میرا مطلب ہے تمہاری وہ دوسری ممتاز..... جس کے لیے تم نے یہ تاج محل تعمیر کیا تھا۔ پہلی تو دوبئی کے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی تھی ناں.....

نامراد: ایک فلمی شاعر اور معمولی کہانیاں لکھنے والا اس کے باپ کو قابل قبول نہ تھا..... پھر وہی سماج کی دیوار، ماں کی طرف سے دو دھ نہ بخشنے کی دھمکیاں اور باپ بھائیوں کی غیرت کی للکار..... وہ بے چاری بھی کیا کرتی..... تھک ہار کر رقیب کی ڈولی چڑھ گئی..... اور میرا یہ تاج محل ممتاز کے بغیر سونا پڑا رہ گیا.....

موسیٰ: محبت کی کہانیاں ہمیشہ ادھوری کیوں رہ جاتی ہیں.....

نامراد: اس لیے کہ محبت کا جنم ہی شاید جدائی کے ساتھ ہوتا ہے پیارے..... اچھا تم آرام سے بیٹھو..... میں تمہارے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں.....

موسیٰ: مجھے یوں فارغ بیٹھ کر کھانے کی عادت نہ ڈالو..... میں اگر یہاں رہوں گا تو صرف اس ایک شرط پر کہ تم مجھے کوئی کام دلواؤ گے.....

نامراد: اچھا بابا..... دلوا دوں گا کوئی کام بھی..... مگر آج رات تو تم میرے مہمان بن سکتے ہو ناں..... ویسے تمہیں کون سا کام آتا ہے..... عشق کے علاوہ.....

(موسیٰ سوچ میں پڑ جاتا ہے)

موسیٰ: کام..... کام تو میں نے کوئی سیکھا اسی نہیں ڈھنگ سے..... مگر تم جو بھی کام دلواؤ گے مجھے..... میں سیکھ لوں گا.....

نامراد: ٹھیک ہے جناب..... دیکھتے ہیں کوئی تمہارے لائق کام..... کل چلیں گے اسٹوڈیو.....

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: عیسیٰ کا گھر/کاشانہ، پیراں

سکینہ تڑپ کر عیسیٰ سے پوچھتی ہے۔

سکینہ: مگر موسیٰ بھائی جیل سے نکل کر کہاں گئے ہوں گے..... تمہیں جیل کے عملے سے معلومات تو لینی چاہیے تھیں.....

عیسیٰ: میں نے ہر جگہ ڈھونڈا انہیں..... مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ بھائی کہاں چلے گئے..... اپنی طرف سے تو میں ان کی رہائی کے وقت پر ہی وہاں پہنچا تھا..... مگر نہ جانے کب دیر ہو گئی.....

سکینہ: کہیں وہ زہرہ کی طرف.....

عیسیٰ: نہیں..... میں نے سب سے پہلے وہیں چیک کیا تھا..... مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ زہرہ کی تو گذشتہ روز رخصتی ہو چکی ہے..... وہ بیاہ کر کسی کے ساتھ جا چکی ہے وہاں سے.....

(سکینہ کے سر پر ایک اور بم گرتا ہے)

سکینہ: کیا.....؟..... شادی ہو گئی.....؟..... مگر.....؟..... کیسے..... کیوں..... میرا مطلب ہے..... اوہ میرے خدا.....

عیسیٰ: ہاں..... مجھے بھی یہ سن کر تمہاری طرح ہی شاک لگا تھا..... اس لڑکی نے موسیٰ بھائی کی اتنی شدید محبت کی ذرا قدر بھی نہیں کی..... حالانکہ میں اماں کو بھی لے گیا تھا اسے منانے وہاں.....

سکینہ: کیا.....؟..... تائی جان کو لے گئے تھے..... کب..... اور کیا وہ مان گئی تھی.....

عیسیٰ: جس دن میں اور ماں گھر سے نکلے تھے مزار پر چادر چڑھانے کا کہہ کر..... اس روز میں اماں کو موسیٰ بھائی کے کہنے پر زہرہ کے پاس ہی لے کر گیا تھا..... کیونکہ زہرہ کی یہی شرط تھی کہ کوئی ہمارے گھر سے کوئی اس سے بات کرنے خود چل کر آئے.....

(سکینہ بے چینی سے کہتی ہے)

سکینہ: تو پھر..... کیا بات ہوئی ان کے درمیان وہاں.....؟..... کیا کہا زہرہ نے.....

عیسیٰ: اماں مجھے اندر لے کر تو نہیں گئیں۔ کیونکہ وہ زہرہ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی تھیں..... مگر واپسی پر اماں کی خوشی سے صاف ظاہر تھا کہ زہرہ نے ان کی بات کا مان رکھنے کا وعدہ کر لیا ہے۔

سکینہ: تو پھر زہرہ نے کسی اور کے ساتھ نکاح کی حامی کیسے بھر لی.....؟

(عیسیٰ پریشانی سے کہتا ہے)

عیسیٰ: یہی بات تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی.....

(سکینہ غور سے عیسیٰ کو دیکھتی ہے)

سکینہ: کیا تمہیں یقین ہے کہ بند کمرے میں تائی جان نے زہرہ سے موسیٰ بھائی کے رشتے کی ہی بات کی تھی.....؟.....

عیسیٰ چونک کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کا گھر

سوئمنگ پول سائڈ..... پارٹی

ملک شہریار کے گھر میں پول سائڈ پارٹی جاری ہے۔ ڈی۔ جے میوزک کی بیس بدل بدل کر نئی دھنیں بجا رہے ہیں۔ شہر کا اعلیٰ طبقہ اور جنٹری پارٹی میں موجود ہے۔ جام اور شراب کے دور چل رہے ہیں، شور برپا ہے اور آس پاس قہقہے اور مسکراہٹیں ہیں۔ شہریار اندر کی جانب سے زہرہ کا ہاتھ تھامے بڑی شان سے پارٹی میں نمودار ہوتا ہے جیسے کوئی جیتنے والا کھلاڑی اپنے ہاتھوں میں اپنی ٹرافی تھامے تماشائیوں سے داد وصول کرنے کے لیے آتا ہے۔ ملک شہریار کے دوست اور کپلز coupels تالیاں بجا کر شہریار اور

زہرہ کا استقبال کرتے ہیں، شہریار فخر سے دوستوں کی طرف دیکھتا ہے۔

شہریار: لیڈیز اینڈ جنٹلمین..... ملک شہریار نے آج تک کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا..... جسے اس نے وفا نہ کیا ہو.....، تو پریزنٹنگ مسز زہرہ شہریار Presenting mrs zuhra اور ساتھ ہی یہ ولیمہ پارٹی..... امید ہے اب آپ سب کے گلے شکوے دور ہو گئے ہوں گے.....

سب سیلی بریٹ کرتے ہیں اور کچھ مرد آگے بڑھ کر زہرہ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ زہرہ اس سارے تماشے سے کافی ان کمفرٹیبل Uncomfortable لگ رہی ہے۔ اور وہ مردوں کو Avoid کرنے کی کوشش کرتی ہے، مگر ان دونوں میاں بیوی کے گرد بھیڑ سی لگ جاتی ہے۔ اس پارٹی میں سابق فلمسٹار (ہیروئن/ پروڈیوسر) لیلیٰ جاوید (توقیر جاوید کی بیوی) بھی موجود ہے جو دور کھڑی مشروب پیتے ہوئے یہ سارا تماشا دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا سیکرٹری ظفر فیضی بھی کھڑا ہے۔

ظفر فیضی: میڈم..... آپ نئے جوڑے کو مبارکباد نہیں دیں گی کیا؟

(لیلیٰ مسکراتی ہے اور دُور کھڑے شہریار کے ساتھ اس کی بیوی کو ہجوم میں گھرے دیکھ کر کہتی ہے)

لیلیٰ: پہلے یہ سرکس ختم ہو جانے دو فیضی..... پتہ نہیں شہریار نے یہ کامیڈی شو کیوں لگا رکھا ہے..... اُف..... یہ انفیریرٹی کمپلیکس infriorty complex کے مارے مرد.....

شہریار: (اتنے میں شہریار کی نظر دور کھڑی لیلیٰ جاوید پر پڑتی ہے اور وہ اس کی جانب آتا ہے) کیا بات ہے لیلیٰ جی..... اکیلی کیوں کھڑی ہیں یہاں.....، بھری محفل میں ایسی تنہائی کیوں.....؟ اور یہ توقیر جاوید کہاں غائب ہے..... کہا بھی تھا وقت پر آ جانا.....

لیلیٰ: (لیلیٰ مسکراتی ہے) توقیر از آؤٹ آف ٹاؤن اور جب سارا ہجوم آپ نے اپنے گرد اکٹھا کر لیا تو پھر ہمیں تو تنہا ہی رہ جانا ہے ملک صاحب.....

شہریار: (ہنس کر) نہیں..... اب ایسی بات بھی نہیں..... میں جتنا بھی ہجوم اکٹھا کر لوں..... لیلیٰ جاوید کی پاپولیرٹی poporlarty کو کبھی نہیں پہنچ سکتا.....، مجھے آپ کا دور بھی یاد ہے۔

لیلیٰ: وہ ماضی کی بات ہے ملک صاحب..... اس وقت تو ساری بھیڑ آپ کی نئی نویلی دُلہن کے گرد جمع ہے..... ویسے چہرہ اچھا ہے..... شوبز میں آئی تو اس ملک کی سپر اسٹار ہو گی۔

(شہریار کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور وہ غرور بھرا قہقہہ لگاتا ہے)

شہریار: اسی لیے کہتے ہیں کہ ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی جانتا ہے..... آئیں ناں آپ کو زہرہ سے ملاتا ہوں۔

شہریار بڑے مان سے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر زہرہ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کا گھر۔ پارٹی جاری ہے

ملک شہریار لیلیٰ کو لیے زہرہ کے قریب آتا ہے۔ جہاں زہرہ کچھ پریشان سی کھڑی ہے۔ اس کے قریب کھڑا کوئی عمر رسیدہ بزنس مین (شہباز گل) اسے اپنا کارڈ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

(شہباز گل ہوس بھری نظروں سے زہرہ کو دیکھ رہا ہے)

شہباز گل: شہباز گل نام ہے میرا..... یہ میرا کارڈ رکھ لیں.....، بڑی انڈسٹری ہے میری اس ملک میں اور ابراڈ بھی.....، ان

شاءاللہ رابطہ رہے گا..... ملک شہریار سے تو اپنی پرانی یاری ہے.....

(زہرہ غصے سے کارڈ جھٹک دیتی ہے)

زہرہ: جی.....؟.....مگر میں.....

(اتنے میں شہریار اور لیلیٰ زہرہ کے قریب آ جاتے ہیں)

شہریار: ارے.....اپنے گل صاحب ہیں..... بہت بڑے انڈسٹریالسٹ ہیں.....وہ کیا کہتے ہیں.....کنگ میکر..... ہاں بادشاہ گر ہیں اس ملک کے.....

(شہباز پھر ایک گہری نظر زہرہ پر ڈالتا ہے)

شہباز: کیوں شرمندہ کرتے ہیں ملک صاحب.....ہم تو بس یاروں کے یار ہیں.....،.....دوستوں کی خدمت کرتے ہیں اور بس .....کبھی لے کر آئیں ناں زہرہ بیگم کو ہمارے غریب خانے پر.....

شہریار: ہاں ہاں کیوں نہیں.....اور زہرہ.....ان سے ملو.....تو قیر کی وائف.....یہ لیلیٰ جاوید ہیں.....ملک کی نامور فنکارہ اور فلم انڈسٹری پر کچھ سال پہلے تک راج کرنے والی ہماری ہر دلعزیز ہیروئن ..... ہماری لیلیٰ..... (شہریار شہباز کو دیکھ کر ہنستا ہے)

(شہریار کے خاص انداز میں "ہماری لیلیٰ" کہنے پر شہباز اور شہریار زور سے قہقہہ مار کر ہنستے ہیں)

شہریار: گل صاحب..... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔ وہ اپنے لائسنس Lisence اور N.O.C کے بارے میں.....اگر تھوڑا وقت ہو تو.....

(شہباز گل پھر زہرہ پر ایک لوفرانہ سی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے)

شہباز گل: آپ کے لیے تو ہمیشہ میرے پاس وقت ہی وقت ہے جناب.....آئیں ذرا.....کھل کر بات کرتے ہیں دوسری طرف.....

(شہباز زہرہ کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے)

شہباز: آپ سے پھر ملاقات ہوگی زہرہ جی.....،ویسے یہ شہریار ہے بڑا چیتا.....،..... جب بھی جھپٹتا ہے.....مارکیٹ کی سب سے حسین پری پر جھپٹتا ہے.....

(شہریار زور سے ہنستا ہے اور شہباز کو ایک جانب لے جاتا ہے، زہرہ اپنی نفرت اور غصے کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ لیلیٰ اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔)

لیلیٰ: برداشت کرنے کی عادت ڈال لو.....ان پارٹیوں میں ایسے گدھ نما مرد ملتے رہیں گے تمہیں.....تمہارے شوہر نے یہ پارٹی تمہاری مارکیٹنگ کے لیے ہی تو رکھی ہے.....

(زہرہ غصے سے لیلیٰ کو دیکھتی ہے)

زہرہ: ایکس کیوزمی۔ Excuse Me

لیلیٰ: معاف کرنا.....میں ذرا منہ پھٹ مشہور ہوں.....اسی لیے مجھے زیادہ لوگ منہ نہیں لگاتے.....ویسے تم پیاری ہو.....کبھی فلم لائن ٹرائی کی ہے.....

زہرہ: نہیں.....مجھے انٹرسٹ نہیں ہے ان چیزوں میں.....

لیلیٰ: کبھی انٹرسٹ پیدا ہونے لگے تو میری فرسٹ آفر ہے.....ویسے فلم لائن اتنی بُری نہیں ہے جتنا اسے شہباز جیسے لوگوں نے بدنام کر رکھا ہے۔

زہرہ: تو کیا یہ بڑے میاں فلمیں بھی بناتے ہیں.....؟

(لیلیٰ زور سے ہنس پڑتی ہے)

لیلیٰ: یہ ہر وہ کام کرتا ہے جس میں چند خوبصورت چہرے اس کے آس پاس منڈلاتے رہیں..... اپنے کارخانے میں بھی حسین ترین سیکرٹری اور پرسنل اسٹاف بھرتی کر رکھا ہے..... ہی از اے گڈ کلکٹر He is a good collector زہرہ چونک کر لیلیٰ کو دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ اور نامراد/کمرہ

کمرے میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی ہیں جن پر موسیٰ اور نامراد لیٹے سونے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں، نامراد موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

نامراد: کیا بات ہے میرے گلفام..... نیند نہیں آ رہی کیا؟

موسیٰ: جب یاد آتی ہے تو نیند نہیں آتی.....

نامراد: ہائے..... کیا سُریلی بات کہہ دی..... واقعی جن کی آنکھوں میں یاد اتر آئے..... وہاں پھر نیند نہیں اترا کرتی.....

موسیٰ: تم کیوں جاگ رہے ہو.....

نامراد: سوچ رہا ہوں، تُو ٹھہرا ایک سید زادہ، صوفی..... اور مولوی..... اور میرا تعلق ایک ایسی انڈسٹری سے رہا ہے جس سے تمہارے جیسے گھرانے سات کوس دور سے گزرتے ہیں۔ کیسے کام کرو گے وہاں.....

موسیٰ: نام اور بدنامی کسی شجرے سے نہیں..... انسان کے اپنے اعمال سے جڑی ہوتی ہے..... اور پھر تم ہی تو کہا کرتے ہو کہ "بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا....."

نامراد جوش میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے)

نامراد: واہ..... اسے کہتے ہیں صحبت کا اثر..... نامراد کی صحبت نے ایک مولوی کو بھی شاعر بنا ہی ڈالا..... بس تو پھر ٹھیک ہے..... کل صبح ہم اسٹوڈیو ہی چلیں گے..... ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کسی کارخانے یا فیکٹری میں بھرتی کروا دوں.....

موسیٰ: میں نے کہا ناں..... مجھے نام یا بدنامی سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مجھے کسی نے میرے خاندان کی عزت اور نام کی وجہ سے ہی ٹھکرایا تھا.....

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: ملک شہریار کا بیڈ روم

زہرہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنا میک اپ/گہنے وغیرہ اتار رہی ہے۔ شہریار ڈریسنگ روم سے چینج کر کے باہر نکلتا ہے اور تیکھی نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔

شہریار: تمہارا یہ کھچا کھچا سا رویہ اور پارٹی میں یوں بُری سی شکل بنائے رکھنا مجھے کچھ خاص پسند نہیں آیا..... وہ سب میرے معزز مہمان تھے جو صرف ہماری خوشی میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے.....

زہرہ: میں نے کسی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی..... حالانکہ ان میں سے دو چار تو ایسے تھے جن کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید کرنا

بنتا تھا.....

(شہریار غصے سے کہتا ہے)

شہریار: یہ بدتمیزی نہیں تو اور کیا ہے..... مہمانوں سے ایسا سلوک تو کوئی جاہل بھی نہیں کرتا..... تمہیں تو میں بہت مینرز manner's والی اور ایٹی کیٹڈ سمجھتا تھا۔

زہرہ: مہمان ایسے ہوتے ہیں..... کیا ان کی نظروں میں لکھی تحریر آپ کو صاف نظر نہیں آ رہی تھی..... میں آپ کی عزت ہوں شہریار..... مجھے اپنے گھر کی زینت ہی رہنے دیں..... شمع محفل نہ بنائیں.....

شہریار: تمہیں کسی گھریلو خاندان سے بیاہ کر لایا ہوتا تو گھر کی زینت والی بات بنتی تھی..... میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ مجھے کسی دقیانوسی خیالات والی اور چولہا چوکا کرنے والی عورت کی ضرورت نہیں ہے..... مجھے اپنے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑی ہونے والی ایک ساتھی کی تلاش تھی..... جو میرے سرکل میں موو کر سکے..... میرے بزنس کے معاملات میں میرا ہاتھ بٹائے.....

زہرہ: میں نے کبھی اس بات سے انکار نہیں کیا..... مگر مجھے ایسی پارٹیز سے سخت الجھن ہوتی ہے..... جہاں لوگوں کی نظریں جسم کے آر پار ہوتی ہوں..... میں یہی سب کچھ تو چھوڑ کر آئی تھی..... مجھے تو ایک گھر کی تلاش ہے شہریار..... وہ گھر جو میرا اپنا ہو..... جہاں میں خود کو محفوظ تصور کر سکوں.....

شہریار: اوہ کم آن..... میرے سامنے ایٹ لیسٹ Atleast یہ "نیک پروین" بننے کا ڈرامہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے..... لاکھوں روپے تمہارے جہیز کے نام پر بولی دے کر میں تمہیں یہاں لایا ہوں..... میرا منہ نہ ہی کھلواؤ تو بہتر ہے۔

زہرہ: تو کیا آپ کو یہ اچھا لگے گا کہ میں یوں بن سنور کر شہباز گل جیسے رنگین مزاج مردوں کے درمیان اٹھلاتی پھروں..... اس کی نظریں دیکھی تھیں آپ نے.....

(شہریار کمینی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے)

شہریار: اوہ..... تم گل صاحب جیسے لوگوں کی پرواہ نہ کرو..... یہ سب بس باتوں کے شیر ہیں..... اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے بزنس کے مفادات انہی لوگوں سے جڑے ہوئے ہیں

(زہرہ طنز کرتی ہے)

زہرہ: تو یوں کہیں کہ آپ نے یہ شادی اپنی ادھوری بزنس ڈیلز پکی کروانے کی خاطر کی ہے..... پھر عزت اور غیرت کو درمیان میں کیوں لاتے ہیں.....

(شہریار زہرہ کی بات پر بھڑک کر چلاتا ہے)

شہریار: مائنڈ یور لینگویج زہرہ.....

زہرہ چپ رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: نامراد کا گھر

نامراد ایک ٹرے میں دو پیالی چائے اور کچھ خشک رس وغیرہ لے کر کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ٹرے موسیٰ کے سامنے رکھتا ہے۔

نامراد: یہ لیں حضور..... مغل دربار کا خاص مغلئی ناشتہ حاضر ہے.....

(موسیٰ ٹرے میں پڑے چائے اور پاپے دیکھتا ہے اور سنجیدگی سے کہتا ہے)

موسیٰ: اتنا تکلف کیوں کیا آپ نے نامراد صاحب۔

نامراد: بس پیارے..... اپنے تو دو ہی شوق ہیں..... اچھا کھانا..... اور اچھا پہننا.....

موسیٰ: (موسیٰ مسکراتا ہے) اندازہ ہو رہا ہے مجھے.....

(نامراد بھی ہنس پڑتا ہے)

نامراد: سوچ رہا ہوں پھر سے گیت نگاری شروع کر دوں..... آج گزارہ کر لو اسی سوغات پر..... بہت دن سے گھر بند پڑا تھا ناں..... تو سارا راشن وغیرہ ختم ہو گیا ہے..... آج کہیں سے گیت لکھنے کا ایڈوانس پکڑ لوں گا..... پھر اپنے وارے نیارے..... صرف پان کی دوکان سے ہم دونوں کا گزارہ مشکل ہو گا اب.....

(موسیٰ چائے کا گھونٹ لیتا ہے)

موسیٰ: میری وجہ سے کسی تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں..... میں ایسے ہی پُر تکلف ناشتے کے ساتھ تمام عمر کی حسیں آغاز کر سکتا ہوں.....

نامراد: جانتا ہوں..... جیل میں بھی تم اپنا آدھا کھانا تو باقی قیدیوں میں بانٹ دیتے تھے..... مگر پاپی پیٹ کی خاطر کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ناں..... تم ناشتہ کر کے تیار ہو جاؤ..... ہمیں نکلنا ہو گا..... فلمی دنیا کا ایک اصول ہمیشہ یاد رکھنا..... اور وہ ہے پہلے آیئے..... پہلے پایئے.....

موسیٰ خشک رس چائے میں ڈبوتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: صبح

جگہ: ملک شہریار کا گھر، ڈائننگ ہال

منظر ڈائننگ ٹیبل پر پڑے ناشتے کے قیمتی لوازمات سے اوپن ہوتا ہے۔ فارن کے بریڈ اینڈ بٹر آملٹر اور جیم جیلی وغیرہ کے ساتھ قیمتی نفیس کٹلری وغیرہ، شہریار ناشتہ کر رہا ہے، ملازم اسے سرو کر رہے ہیں..... زہرہ ڈائننگ ہال میں داخل ہوتی ہے۔ شہریار اسے دیکھ کر بنا کسی شرمندگی کے کہتا ہے۔

شہریار: اوہ..... تم بھی جاگ گئیں..... میں نے تمہیں خود نہیں جگایا..... سوچا اچھا ہے کچھ ریسٹ کر لو.....

زہرہ: نہیں..... مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے.....

(شہریار طنز سے مسکراتا ہے)

شہریار: رئیلی..... مگر تمہیں تو پارٹیز سے رات لیٹ ہی فرصت ملتی ہو گی ناں..... تو مجھے لگا تمہیں دیر سے جاگنے کی لت پڑی ہو گی.....

(زہرہ چڑ جاتی ہے)

زہرہ: یہ آپ بار بار کسی نہ کسی بہانے سے مجھے میری گذشتہ زندگی کے بارے میں بات کر کے شرمندہ کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟..... کیا لذت ملتی ہے آپ کو ایسی باتیں کر کے..... کیوں بار بار بھول جاتے ہیں کہ اب میں آپ کے گھر کی عزت ہوں..... بیوی ہوں آپ کی.....

شہریار: اوہو..... تم نے تو مائنڈ ہی کر لی میری بات..... میں تو تمہاری ہی خاطر کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ ان فارمیلٹیز formalities میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے..... تم اپنی مرضی سے جاگ سو سکتی ہو..... میں اتنا فارمل شوہر نہیں

ہوں جو ذرا ذرا سی بات پر بیویوں سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

زہرہ: فارمل ہونے میں اور اجنبی ہونے میں تھوڑا فرق ہوتا ہے..... اور گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہر عورت کا فرض ہوتا ہے..... کوئی فارمیلٹی formality نہیں.....

شہریار: اوہو..... تم نے تو پھر سے وہی بحث شروع کر دی..... گھر کی عورت..... ذمہ داریاں..... فرض..... پلیز بھول جاؤ یہ سب کچھ..... اور تم کیسی عجیب لڑکی ہو..... میں تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنا کر رکھنا چاہتا ہوں..... اور تم ہو کہ نوکرانی بن کر رہنے پر بضد ہو..... تم بس شہزادی بن کر رہو یہاں..... یہ گھر داری میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت نوکر نوکرانیاں پڑے ہیں یہاں.....

(زہرہ کچھ کہنا چاہتی ہے)

زہرہ: لیکن میں یہاں.....

شہریار: اچھا..... میں اب نکلتا ہوں..... آئی ایم گیٹنگ لیٹ..... اور ہاں..... شام کو تیار رہنا..... میں تمہیں خود شاپنگ پر لے کر جاؤں گا اور اپنی پسند کے کچھ ڈریسز وغیرہ دلواؤں گا..... او کے..... سی یو.....

شہریار زہرہ کو ویسے ہی حیران و پریشان اور شش و پنج میں مبتلا چھوڑ کر وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ زہرہ غصے میں ڈائننگ ہال سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور۔ بازار۔ دوکان وغیرہ

جیپ میں عیسیٰ کسی کام سے وہاں پہنچتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ جیپ پارک کر کے اترتا ہے، تبھی وہاں دوسری جانب ستارہ بھی اپنے گھر کی بڑی کار میں ڈرائیور کے ساتھ وہاں پہنچتی ہے۔ اور اس کی نظر سامنے سے آتے عیسیٰ پر پڑتی ہے، ستارہ جلدی سے عیسیٰ کو آواز دے کر روکتی ہے۔

ستارہ: عیسیٰ بھائی.....

(عیسیٰ چونک کر پلٹتا ہے)

عیسیٰ: ارے..... ستارہ..... تم..... یہاں.....

ستارہ: ہاں..... کچھ ضروری کام سے آئی تھی..... آپ نے اس دن کے بعد سے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔

عیسیٰ: بس..... کیا کروں..... موسیٰ بھائی کی پریشانی میں یاد ہی نہیں رہا..... جیل سے ضمانت ہونے کے بعد نہ جانے وہ کہاں چلے گئے ہیں..... بس انہی کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔

(ستارہ پریشان ہو جاتی ہے)

ستارہ: کیا؟..... موسیٰ گھر نہیں آئے..... کہاں جا سکتے ہیں۔

عیسیٰ: پتہ نہیں..... انہی کی کھوج میں در بدر بھٹک رہا ہوں..... تمہاری زہرہ سے ملاقات ہوئی..... کیا کہا اس نے..... اب اس کی گواہی کی ضرورت تو نہیں رہی مگر پھر بھی اگر وہ اپنا بیان دے دے تو بھائی کے ماتھے پر لگا یہ کلنک بھی دھل جائے گا..... پھر شاید ابا بھی انہیں معاف کر دیں.....

ستارہ: نہیں عیسیٰ بھائی..... ہم نے زہرہ کو غلط سمجھا..... اس روز موسیٰ زہرہ کے لیے ان لڑکوں کے پیچھے نہیں گئے تھے..... وہاں زہرہ نہیں تھی.....

(عیسیٰ کو یہ سن کر جھٹکا سا لگتا ہے)

عیسیٰ: کیا..... وہ لڑکی زہرہ نہیں..... تو..... پھر..... وہ کون تھی.....

ستارہ: پتہ نہیں..... مگر وہ جو بھی تھی..... موسیٰ کی بربادی کی ذمہ دار وہی لڑکی ہے۔

عیسیٰ حیران و پریشان گم سم سا کھڑا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

موسیٰ اور نامراد کسی رکشے میں کسی فلم اسٹوڈیو کے باہر اُترتے ہیں۔ نامراد موسیٰ کو لیے اسٹوڈیو کے گیٹ سے اندر چلا جاتا ہے، موسیٰ راہداری میں چلتے ہوئے حیرت سے فلم کے لوگوں اور کمروں میں بیٹھے میوزیشنز اور رقاصاؤں کو دیکھتا چل رہا ہے۔ نامراد کسی آفس کے باہر آ کر رکتا ہے۔ اور دھیرے سے دستک دے کر اندر چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: فلم اسٹوڈیو۔ لیلیٰ کا دفتر

نامراد اور موسیٰ کسی فلم اسٹوڈیو آفس میں بیٹھے ہوئے ہیں، ایک سیکرٹری ٹائپ بندہ آتا ہے اور نامراد سے ملتا ہے۔

فیضی/سیکرٹری: ارے واہ..... نامراد صاحب..... کافی دن بعد دیدار ہوئے..... آئیں..... اندر آ جائیں..... آپ کا ہی انتظار ہو رہا ہے۔ (سیکرٹری اندر کمرے کا دروازہ کھولتا ہے)

نامراد: موسیٰ کو لیے ایک آراستہ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ سامنے لیلیٰ جاوید کھڑی ہے۔

لیلیٰ جاوید: آیئے نامراد صاحب آیئے..... بڑی راہ دکھائی اس بار آپ نے..... موسیٰ اور لیلیٰ کی نظر ملتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 14

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ جاوید کا دفتر

دفتر میں کچھ فلمی ایوارڈ اور فلمی پوسٹر

موسیٰ اور نامراد لیلیٰ کے آفس میں موجود ہیں۔ لیلیٰ غور سے موسیٰ کے حلیئے پر نظر ڈالتی ہے۔ سیاہ کرتا شلوار، آستینیں اوپر کو چڑھی ہوئی، کاندھے پر تبلیغی رومال، موسیٰ لیلیٰ کی بے باک نگاہوں سے گھبرا کر نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگتا ہے، لیلیٰ اس کی اس حرکت پر مسکرا دیتی ہے۔

لیلیٰ: تمہارا یہ دوست تو بڑا شرمیلا ہے نامراد..... یہ بھلا یہاں کیسے ٹِک پائے گا۔

(نامراد برجستہ کہتا ہے)

نامراد: آپ کے ساتھ رہے گا تو بے شرم بھی ہو ہی جائے گا میڈم جی.....

(لیلیٰ نامراد کی بات پر زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی ہے)

لیلیٰ: تمہاری یہی بات مجھے پسند ہے نامراد..... تم کبھی دل کی بات دل میں نہیں رکھتے..... انڈسٹری کے باقی مردوں کی طرح منافق نہیں ہو.....

نامراد: میرا یہ دوست بھی ایسا ہی ہے میڈم جی..... ہمیشہ حق کا ساتھ دے گا..... منافقت نہیں کرے گا آپ کے ساتھ..... کھرا بندہ ہے سو فیصد۔

(لیلیٰ مسکراتی ہے)

لیلیٰ: تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں..... ورنہ کھرے مرد آٹا بند ہو چکے ہیں میرے حساب سے..... اور اسے تم نے بتایا ہے کہ کام خطرے والا ہے.....؟

تمہارا دوست بولتا بھی ہے یا صرف آنکھوں سے ہی باتیں کرنا جانتا ہے.....

نامراد: جہاں ضرورت پڑے وہاں ایسا بولتا ہے کہ دوسرے کی بولتی بند کر دیتا ہے..... آپ کو مایوسی نہیں ہوگی میڈم.....

لیلیٰ: ٹھیک ہے..... پھر چاہے تو آج سے ہی کام پر آ جائے..... فی الحال یہ میرا ذاتی باڈی گارڈ ٹائپ محافظ ہوگا..... مجھے کچھ پرانے لیچڑ ٹائپ فنانسر financer سیٹھوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے..... میں سوچ ہی رہی تھی کہ اپنی سیکورٹی بڑھا لوں.....

نامراد: بے فکر رہیں جی..... بالکل ٹھیک بندہ چنا ہے آپ نے اس کام کے لیے.....

(موسیٰ بول پڑتا ہے)

موسیٰ: باقی معاملات طے ہونے سے پہلے میری ایک شرط سن لیں..... پھر فیصلہ کیجئے گا.....

(لیلیٰ ہنستی ہے)

لیلیٰ: لو جی..... یہ تو بول پڑا..... اور پہلی بات کی بھی تو شرط کی..... بولو کتنی تنخواہ چاہیے.....

موسیٰ: تنخواہ جو آپ چاہیں طے کر لیجئے گا..... میری شرط صرف اتنی ہے کہ میں اپنی نماز قضا نہیں کروں گا..... نماز کے وقت مجھے کوئی کام کرنے کا پابند نہ کیا جائے تو مہربانی ہوگی.....

(لیلیٰ چونک کر نامراد کی طرف دیکھتی ہے)

لیلیٰ: یہ کس مولوی کو اٹھا لائے ہو نامراد..... دشمن مجھ پر گن تانے کھڑا ہوگا اور یہ کہیں اپنی نمازیں پوری کر رہا ہوگا.....

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن، سڑک

جگہ: عیسیٰ کی جیپ کی پاسنگ

عیسیٰ کی جیپ کسی سڑک سے گزر رہی ہے اور اس کے کانوں میں ابھی کچھ دیر پہلے کہی ہوئی ستارہ کی بات گونج رہی ہے۔

ستارہ

آڈیو

اوور لیپ: وہ لڑکی زہرہ نہیں تھی..... کوئی اور تھی..... وہ جو بھی تھی..... وہی لڑکی موسیٰ کی بربادی کی ذمہ دار ہے.....

آڈیو

اوور لیپ: (عیسیٰ گاڑی دوڑاتا رہتا ہے اور پریشانی سے کچھ سوچتا رہتا ہے، اور پھر دل ہی دل میں خود کلامی کرتا ہے) اگر وہ لڑکی زہرہ نہیں تھی..... تو پھر کون ہو سکتی ہے..... موسیٰ بھائی نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی.....

موسیٰ/جیل

آڈیو

اوور لیپ: (عیسیٰ کے ذہن میں جیل کی ملاقات کے دوران کہی گئی موسیٰ کی بات کی بازگشت یاد کی صورت میں گونجتی ہے) وہ جو کوئی بھی تھی..... تم اس بات کو یہیں رہنے دو..... اس چیپٹر کو ہمیشہ کے لیے یہیں ختم کر دو.....

عیسیٰ سوچتا رہتا ہے اور اس کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دیتا ہے۔

//Cut//

مونتاج۔ فلم اسٹوڈیو۔ آؤٹر شاٹ

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: اسٹوڈیو، لیلیٰ جاوید کا دفتر

(لیلیٰ غور سے موسیٰ کو دیکھتی ہے)

لیلیٰ: اور اگر میں تمہاری یہ شرط ماننے سے انکار کر دوں تو.....

موسیٰ: تو میری طرف سے بھی انکار ہی سمجھیے.....

(نامراد پریشانی سے موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے)

نامراد: یار صوفی..... ایسا نہ کر.....

(لیلیٰ ہاتھ اٹھا کر نامراد کو روک دیتی ہے اور موسیٰ کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتی ہے)

لیلیٰ: سوچ لو..... ہزاروں کی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے..... ایسی جاب تمہیں دوبارہ کہیں نہیں ملے گی..... ویسے بھی تم تو تازہ تازہ جیل سے ضمانت پر رہا ہو کر باہر نکلے ہو..... ایسے بندے سے تو لوگ میلوں دور بھاگتے ہیں..... نوکری دینا تو دُور کی بات ہے۔

موسیٰ: جی..... جانتا ہوں..... مگر میں جھوٹ بول کر کوئی نوکری حاصل نہیں کرنا چاہتا..... اسی لیے پہلے ہی اپنی مجبوری بتا دی ہے..... آگے آپ کی مرضی.....

(نامراد مایوسی سے اٹھ کر روانگی کی تیاری کرتا ہے اور موسیٰ سے کہتا ہے)

نامراد: چل بھئی سچے انسان..... اب یہاں تیری بات نہیں بننے والی..... کہیں اور کوشش کرتے ہیں۔

(موسیٰ اور نامراد باہر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں پیچھے سے لیلیٰ انہیں آواز دے کر روکتی ہے)

لیلیٰ: رکو.....

(پھر لیلیٰ اپنے سیکرٹری کو فون پر کہتی ہے)

لیلیٰ: فیضی..... اندر آؤ ذرا.....

(فیضی اندر آتا ہے)

لیلیٰ: میں نے موسیٰ کو گارڈ اپائنٹ کر دیا ہے..... اسے کچھ ایڈوانس دلوا دو اکاؤنٹس سے۔

(فیضی حیرت سے موسیٰ کو دیکھتا ہے)

فیضی: جی.....

لیلیٰ: کیا صاف سنائی نہیں دیتا..... کچھ ایڈوانس موسیٰ کو دے دیں..... یہ آج سے میرا نیا گارڈ ہوگا.....

فیضی: جی..... جی جی.....

(فیضی جلدی سے سر ہلاتا ہے۔ اور پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ نامراد خوشی سے موسیٰ کو گلے لگا لیتا ہے۔)

نامراد: نئی غلامی مبارک ہو.....

لیلیٰ: مجھے سچے لوگ پسند ہیں..... خاص طور پر وہ جو اپنا نقصان برداشت کر کے بھی سچ بولنے کی ہمت رکھتے ہوں..... لیکن ایک بات یاد رکھنا..... لوگ کہتے ہیں کہ میرے انڈر کام کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے،..... اچھے اچھے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں وقت پڑنے پر..... دیکھتی ہوں..... تم کب تک یہ غلامی جھیل پاتے ہو.....

لیلیٰ کی بات کے جواب میں موسیٰ چپ رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

عیسیٰ اپنی ماں کے سامنے کھڑا ہے، پس منظر میں سکینہ بھی نظر آ رہی ہے۔

ہاجرہ: (پریشانی سے) کچھ پتہ چلا.....

(عیسیٰ سر جھکائے کھڑا ہے)

عیسیٰ: نہیں اماں..... بھائی کو ہر اس جگہ تلاش کر چکا ہوں جہاں جہاں ان کے ہونے کی ذرا بھی امید ہو سکتی تھی..... مگر وہ نہیں ملے.....

ہاجرہ: آخر کہاں چلا گیا میرا بیٹا..... اس کا تو شہر میں ایسا کوئی دوست بھی نہیں ہے..... عجیب لڑکا ہے..... کبھی کسی کو دوست ہی نہیں بنایا اس نے.....

عیسیٰ: اسی بات کی تو مجھے حیرت ہے..... ان کے پرانے جاننے والے ہر بندے کو کھنگال چکا ہوں میں..... مگر ہر طرف سے انکار ہی سننے کو ملا ہے مجھے.....

(ہاجرہ کے آنسو نکل آتے ہیں)

ہاجرہ: جانے میرا بچہ کہاں در بدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوگا..... ٹھوکریں کھا رہا ہوگا..... عیسیٰ..... دیکھ تو اپنے بھائی کو جلد ڈھونڈ نکال..... ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا.....

(پیچھے سے پیر قدرت کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے)

قدرت اللہ: کوئی ضرورت نہیں ہے اُسے ڈھونڈنے کی..... بچہ نہیں ہے وہ..... جو کہیں کھو گیا ہے..... لگتا ہے جیل میں بھی اچھی یاریاں لگا لی ہیں اس نے اپنے جیسے بدمعاشوں کے ساتھ..... انہی میں سے کسی کے ساتھ چل پڑا ہوگا..... بالکل ٹھیک ہی کہا ہے بزرگوں نے..... ''صحبت صالح تُرا صالح کُند..... صحبت طالع ترا طالع کُند.....'' انسان جس صحبت میں بیٹھتا ہے وہ اسی صحبت جیسا ہو جاتا ہے..... جیل میں تو اسے خوب کمپنی ملی ہوگی اپنے جیسے لفنگے، چور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی..... انہی میں سے کسی کے ساتھ مزے کر رہا ہوگا وہ خود بھی.....

(خدیجہ بھی آ جاتی ہے، ہاجرہ رو پڑتی ہے)

ہاجرہ: آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں پیر جی..... موسیٰ آپ کا ہی خون ہے۔ اس ایک خطا کے علاوہ اس نے عمر بھر آپ کی کبھی نافرمانی نہیں کی..... شاید آپ بھول گئے ہیں کہ کل تک آپ کا یہی بیٹا آپ کا فخر ہوا کرتا تھا.....

قدرت: انسان کی ایک خطا ہی اسے عرش سے فرش پر لا پٹخنے کے لیے کافی ہوتی ہے..... اور انسان کی اصلیت ایسے ہی موقعوں پر پتہ چلتی ہے۔ تم بھی یاد کرو ..... ابلیس کو بھی ایک خطا نے ہی فرشتے سے شیطان بنا دیا تھا.....

(ہاجرہ کی آواز تلخ ہو جاتی ہے)

ہاجرہ: معاف کیجئے گا شاہ جی..... نہ میرا بیٹا ابلیس ہے اور نہ آپ خدا..... رحم کریں اس پر.....

قدرت: (قدرت غصے سے بیوی پر چلاتا ہے) ہاجرہ.....

بیوی سہم کر چپ ہو جاتی ہے۔ قدرت غصے میں بڑبڑاتا کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

کوئی بڑا اور برانڈڈ دوکانوں سے بھرا شہر کا شاپنگ مال

مونتاج 1- شہریار زہرہ کو بڑی اور اونچے برانڈ کی دوکانوں سے اپنی پسند کی شاپنگ کرا رہا ہے۔

2- ڈریسز دلوا رہا ہے۔

3- وہ زہرہ کے لیے کوئی جین پینٹ سلیکٹ کرتا ہے اور زہرہ کو ٹرائی کرنے کا کہتا ہے۔ زہرہ انکار کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر شہریار زبردستی اسے مناتا ہے۔

4- کسی بڑی جیولری شاپ میں وہ زہرہ کو قیمتی ڈائمنڈ جیولری وغیرہ دلوا رہا ہے۔ زہرہ بظاہر شہریار کے کہنے پر سب دیکھ رہی ہے اور دکھاوے کے لیے پسند کرنے کا ناٹک بھی کر رہی ہے مگر اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اسے ان تمام

چیزوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور وہ مجبوری میں یہ سب کر رہی ہے جبکہ شہریار چن چن کر اسے اپنی پسند کی شاپنگ کروانے میں مگن ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: شام یا رات

جگہ: پاسنگ۔سڑک

ڈرائیور ڈرائیو کرتے ہوئے لیلیٰ جاوید کو گھر لے کر جا رہا ہے

لیلیٰ کی گاڑی کی پاسنگ ڈرائیور کے ساتھ موسیٰ بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔موسیٰ کا سارا دھیان سڑک کی جانب ہے۔

لیلیٰ جاوید موسیٰ سے کہتی ہے۔

لیلیٰ: موسیٰ.....ڈسک پلیئر آن کر دو۔

موسیٰ ڈسک پلیئر کا بٹن دبا کر آن کر دیتا ہے۔گاڑی کے اسپیکرز سے فریدہ خانم/ یا حبیب ولی محمد کی آواز میں غزل کے بول گونج اٹھتے ہیں۔

غزل کے بول: آج جانے کی ضد نہ کرو.....

.....ہائے مر جائیں گے.....

ہم تو لٹ جائیں گے.....

ایسی باتیں کیا نہ کرو.....

موسیٰ میوزک کی آواز سے کچھ ڈسٹرب ہوتا ہے مگر اپنے تاثرات پر قابو پا لیتا ہے لیلیٰ جاوید موسیٰ کے بدلتے Expression's ایکسپریشنز نوٹ کر لیتی ہے اور اس کے ہونٹوں پر ایک دبی سی مسکراہٹ ابھرنے لگتی ہے جسے چھپانے کے لیے وہ اپنی آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیتی ہے اور میوزک انجوائے کرتی رہتی ہے۔ڈرائیور گاڑی روڑا تا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: شام۔مغرب کا وقت، رات

جگہ: کوئی بڑا اور مشہور اٹالین/ ریسٹورنٹ وغیرہ

شہریار زہرہ کو لیے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتا ہے۔مینیجر جلدی سے شہریار کا استقبال کرتا ہے اور ان کی رہنمائی کرتے ہوئے شہریار پھر زہرہ کی میز تک خود چل کر ان کے ساتھ آتا ہے، اور زہرہ کے لیے کرسی پیش کرتا ہے، اور پلٹ کر چلا جاتا ہے۔زہرہ اور شہریار بیٹھ جاتے ہیں۔اسی اثناء میں قریب کی میز پر کوئی دو شخص جو حلیئے سے کسی کارپوریٹ فرم کے بزنس مین ٹائپ لگتے ہیں، ان میں سے ایک کی نظر زہرہ پر پڑتی ہے اور وہ کہنی مار کر اپنے ساتھی کو زہرہ کی طرف متوجہ کرتا ہے، دوسرا ساتھی بھی پلٹ کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور دونوں آپس میں کچھ بات کر کے ہنس پڑتے ہیں۔زہرہ جس رُخ پر بیٹھی ہے وہ ان کی یہ حرکت نوٹ کر لیتی ہے جبکہ شہریار کی پیٹھ ان کی جانب ہے لہٰذا وہ یہ سارا ماجرا نہیں دیکھ پاتا۔زہرہ ان لوگوں کے اشاروں سے ان کمفرٹیبل سی ہو جاتی ہے اور شہریار سے کہتی ہے۔

زہرہ: شہریار.....یہاں سے چلیں.....ہم گھر پر ہی ڈنر کر لیں گے.....

(شہریار لاپرواہی سے منع کرتا ہے)

شہریار: کیوں..... یہاں ڈنر کرنے میں کیا بُرائی ہے..... ہفتہ بھر پہلے یہاں ٹیبل ریزرو کرانی پڑتی ہے..... ورنہ جگہ نہیں ملتی..... وہ تو یہاں کا مینیجر میرا واقف ہے ورنہ باہر بھیڑ دیکھی تھی تم نے.....

(زہرہ کن انکھیوں سے شہریار کے پیچھے بیٹھے ان دو مردوں کو دیکھتی ہے جو اسے دیکھ کر معنی خیز اشاروں میں بات کر رہے ہیں)

زہرہ: میں یہاں ان کمفرٹیبل Uncomfertable فیل feel کر رہی ہوں..... پلیز..... کیا ہم کہیں اور نہیں جا سکتے.....

(شہریار چونک کر پہلے زہرہ کو اور پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنے پیچھے بیٹھے ان دو مرد حضرات کو دیکھتا ہے)

شہریار: اوہ..... آئی سی..... کون ہیں یہ دونوں؟

زہرہ: میں نہیں جانتی..... شاید کسی پارٹی میں دیکھا ہوا نہوں نے مجھے.....

(شہریار طنز کا پتہ چلاتا ہے)

شہریار: ریلیکس Relax..... اس طرح تو تمہارے جانے کتنے چاہنے والے..... آئی مین..... جاننے والے آس پاس دکھائی دیتے رہیں گے..... تم کس کس سے بچتی اور چھپتی پھرو گی..... ؟ Lets face the music now.

لیٹس فیس دا میوزک ناؤ..... یہ ساری اس ایلیٹ کلاس Elliet Class کی جینٹری ہے..... جن محفلوں میں تم جاتی رہی ہو.....

زہرہ: اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ چلیں یہاں سے..... اب میں ان محفلوں میں رقص کرنے والی وہ زہرہ نہیں ہوں..... آپ کو بُرا نہیں لگ رہا یہ سب کچھ.....

(اتنے میں وہ دونوں مرد اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مگر جاتے جاتے بھی زہرہ پر ایک بھرپور نظر ڈالتے جاتے ہیں۔)

شہریار: یہی حقیقت ہے..... میرے بُرا لگنے یا نہ لگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... لو..... وہ خود ہی اٹھ گئے وہاں سے..... اب تم زیادہ panic نہ کری ایٹ create کرو..... خود بھی ڈنر کرو آرام سے اور مجھے بھی کرنے دو.....

زہرہ بے بسی سے بیٹھی غصے میں تلملاتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

موسیٰ لیلیٰ کی بڑی گاڑی/کروزنگ وغیرہ میں لیلیٰ کے بنگلے میں داخل ہوتا ہے، ڈرائیور جلدی سے اتر کر دوسری جانب پچھلا دروازہ کھولتا ہے، لیلیٰ اتر کر اندر چلی جاتی ہے۔ موسیٰ بھی اتر جاتا ہے، اور نیچے اترتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کے نیچے گرے ہوئے ایک سیل فون پر پڑتی ہے۔ سیل فون کافی قیمتی ہے۔ موسیٰ چونک کر سیل اٹھا لیتا ہے اور ادھر اُدھر دیکھتا ہے مگر لیلیٰ جا چکی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔ لاؤنج یا ڈرائنگ روم

لیلیٰ تھکی ماندی سی گھر میں داخل ہوتی ہے جہاں اس کا نکھٹو/نشئی شوہر توقیر پہلے سے غصے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ لیلیٰ کو دیکھ کر غصے سے چلاتا ہے۔

توقیر: (شہریار کا دوست) کہاں سے آ رہی ہو اتنی رات گئے..... کہا بھی ہے کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر لوٹ آیا کرو۔

(لیلیٰ جل کر کہتی ہے)

لیلیٰ: پکنک پر نہیں گئی تھی میں..... پروڈکشن کے ہزار مسئلے ہوتے ہیں..... میں نے تمہیں صبح جاتے وقت بھی بتایا تھا کہ آج میری دو امپارٹنٹ میٹنگز ہیں..... کچھ دیر ہو جائے گی.....

توقیر: سب سمجھتا ہوں میں..... یہ تم جیسی عورتوں کا اچھا بہانہ ہے آدھی رات تک باہر گلچھرّے اڑانے کا..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ..... کس یار سے مل کر آ رہی ہو اس وقت.....

لیلیٰ: توقیر..... اسٹاپ اٹ..... stop it..... اگر تمہیں مجھ پر اتنا ہی شک ہے تو تم خود کیوں آفس نہیں سنبھال لیتے..... میں گھر میں رہوں گی اور پھر تمہارے یہ روز روز کے طعنے بھی نہیں سننا پڑیں گے مجھے..... گھر اور بزنس چلانا ہے تو محنت تو کرنا پڑے گی..... یوں گھر بیٹھے خود بخود.....

توقیر: بکواس مت کرو تم..... مجھے گھر بیٹھے بے کار اور نکھٹو ہونے کا طعنہ دے رہی ہو..... خوب سمجھتا ہوں میں.....

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

موسیٰ پورچ میں باہر بیٹھے ڈرائیور یا چوکیدار وغیرہ سے پوچھتا ہے۔

موسیٰ: یہ میڈم کا موبائل گاڑی میں رہ گیا ہے..... کسی کو اندر سے بلاؤ تاکہ میں اس کو دے دوں.....

گارڈ: انٹر کام آج ٹھیک کام نہیں کر رہا..... تم ایسا کرو خود ہی دے آؤ..... خانساماں کچن والی طرف ہی ہوتا ہے..... اس طرف سے چلے جاؤ۔

موسیٰ گارڈ کی بات سن کر سر ہلاتا ہے اور پھر کچھ سوچ کر پچھلی جانب جاتی گیلری/کاریڈور کی طرف چل پڑتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر/لاؤنج

لیلیٰ: میں تمہیں کوئی طعنہ نہیں دے رہی..... مگر ہم میں سے کسی کو تو گھر سے باہر جانا ہی ہوگا ناں..... تم نے خود بھی فلموں میں کام چھوڑ دیا اور مجھے بھی پابند کر دیا ہے..... اب کسی نہ کسی کو یہ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہے..... میں گھر بیٹھتی ہوں..... تم باہر کی ذمہ داریاں سنبھال لو.....

(توقیر غصے میں آگے بڑھ کر لیلیٰ کا گلا پکڑ لیتا ہے اور چلاتا ہے)

توقیر: حرام زادی..... مجھے طعنہ دیتی ہے.....

ٹھیک اسی لمحے موسیٰ کسی کی تلاش میں ہاتھ میں سیل فون پکڑے اندر داخل ہوتا ہے اور توقیر کو لیلیٰ کا گلا دباتے دیکھ لیتا ہے، اگلے ہی لمحے موسیٰ توقیر کے سر پر پہنچ جاتا ہے اور ایک جھٹکے سے لیلیٰ کو توقیر کی گرفت سے آزاد کروا لیتا ہے۔ توقیر غصے میں موسیٰ پر بھی وار کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر موسیٰ کا ایک سیدھا اور کرارا تھپڑ زوردار آواز کے ساتھ توقیر کے چہرے پر پڑتا ہے اور توقیر لڑکھڑا کر صوفے کی دوسری جانب گر جاتا ہے تو قیر غصے میں چلاتا ہے۔

توقیر: یو باسٹرڈ..... تمہاری یہ مجال..... مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے..... میرے ہی گھر میں.....

لیلیٰ: (لیلیٰ چلا کر موسیٰ کو روکتی ہے) موسیٰ..... رک جاؤ.....

توقیر: کون ہے یہ دہشت گرد..... تمہارا نیا یار ہے کیا.....

لیلیٰ: موسیٰ تم جاؤ..... یہاں کیوں آئے ہو.....

موسیٰ: آپ کا یہ سیل فون گاڑی میں پڑا رہ گیا تھا.....مگر.....یہ.....شخص.....آپ کو کوئی نقصان.....

لیلیٰ: تم جاؤ..... یہ تو قیر ہے۔ میرا شوہر.....

موسیٰ: جی.....

(لیلیٰ غصے سے چلاتی ہے)

لیلیٰ: تم جاؤ.....سُنا نہیں.....

(موسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے۔ تو قیر غصے سے چلا کر اسے روکتا ہے)

تو قیر: رُکو.....بڑے سورما بنے پھرتے ہو.....تمہیں تو میں ابھی مزہ چکھاتا ہوں.....

(تو قیر غصے میں موسیٰ کی طرف بڑھتا ہے۔ موسیٰ ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور سرد لہجے میں کہتا ہے)

موسیٰ: یہ غلطی مت کیجئے گا.....جو ہوا.....غلط فہمی میں ہوا.....معذرت چاہتا ہوں.....

(تو قیر موسیٰ کے لہجے میں چھپی دھمکی سن کر رک جاتا ہے)

لیلیٰ: تم جاؤ موسیٰ.....میں ٹھیک ہوں.....

(موسیٰ پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ تو قیر غصے میں پیچھے سے چلاتا ہے۔)

تو قیر: دیکھ لوں گا میں تمہیں.....تم ابھی مجھے جانتے نہیں ہو.....تو قیر نام ہے میرا.....تو قیر جاوید.....آئی ول فکس یو اپ.....

i,ll fix you up

موسیٰ بنا ئر کے وہاں سے چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: رات

جگہ: عیسیٰ کا کمرہ

عیسیٰ اور سکینہ میں بات چیت

عیسیٰ: ہاں.....ستارہ ملی تھی مجھے.....وہ زہرہ سے مل چکی ہے.....مگر اس کا کہنا ہے کہ زہرہ اس دن موسیٰ بھائی کے ساتھ نہیں تھی.....

سکینہ: (سکینہ اپنی پریشانی چھپاتی ہے) ستارہ زہرہ سے ملنے گئی تھی.....

عیسیٰ: ہاں.....مگر میں اُس وقت سے یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں کہ اگر وہ لڑکی زہرہ نہیں تھی.....تو پھر کون تھی۔

سکینہ: (سکینہ خاموش رہتی ہے اور پھر دھیرے سے کہتی ہے) تم ہاتھ منہ دھولو.....میں تمہارے لیے کھانا لگواتی ہوں.....

عیسیٰ: نہیں.....مجھے بھوک نہیں ہے.....

سکینہ: خود کو یوں پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔

عیسیٰ: مجھے کسی بھی حال میں اس لڑکی کا پتہ لگانا ہوگا.....ابا کے دل میں موسیٰ بھائی کی طرف سے جو گرہ پڑ چکی ہے.....اسے کھولنے کی کنجی صرف اسی لڑکی کے پاس ملے گی.....

(سکینہ دکھ سے عیسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

سکینہ: دلوں میں پڑی گرہیں بڑی سخت ہوتی ہیں.....ایک بار دل میں گرہ پڑ جائے تو پھر بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ نامراد کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ نامراد زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارتا ہے۔

نامراد: بیڑہ غرق..... پہلے مالکن کے سامنے نوکری کے پہلے دن ہی شرط لگا دی اور پھر پہلی رات ہی اس کے شوہر کی گنڈاس لگا دی..... موسیٰ..... موسیٰ..... تیرا کیا ہوگا.....

موسیٰ: مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس کا شوہر نکلے گا..... مجھے لگا کہ کوئی.....

(نامراد موسیٰ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہے)

نامراد: دیکھو مولوی صاب..... آئندہ اپنی عقل پر زور نہ دینا..... نوکری کا مطلب سمجھتے ہو..... نوکر کے آگے چھوٹی 'می' لگانے سے نوکری بنتی ہے میرے یار..... غلامی کا مہذب نام رکھا ہے دنیا والوں نے یہ نوکری..... تو نوکری کرنا سیکھ جاؤ اب پیارے..... اور پہلا سبق یہی ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں اور زبان..... تینوں کو کنٹرول میں رکھنا ہوگا..... کیا سمجھے.....

موسیٰ: سمجھ گیا..... اب کیا صرف لیکچر ہی پلاؤ گے یا پھر کچھ اور کھانے کو بھی ملے گا۔

نامراد: ہاں..... تیار ہے نا کھانا..... اپنا مغلئی قورمہ اور بریانی..... ابھی لایا..... (نامراد ہنس کر اٹھ جاتا ہے۔)

(نامراد اٹھ کر جانے لگتا ہے۔ تبھی موسیٰ کو اچانک جیسے کچھ یاد آتا ہے)

موسیٰ: ہاں مگر ایک بات سمجھ نہیں آئی..... لیلیٰ میڈم جیسی خاتون اس توقیر جیسے شخص کے ساتھ گزارہ کیسے کر رہی ہے..... کون ہے یہ توقیر جاوید؟

نامراد: (نامراد مسکراتا ہے) توقیر جاوید..... اگر فلم بینی کا شوق ہوتا تم تو یہ سوال کبھی نہ پوچھتے..... چند سال پہلے یہ توقیر جاوید بھی فلم انڈسٹری پر راج کرتا تھا..... بڑے ناپ کا ہیرو تھا ظالم کبھی..... پھر ایک ایک کر کے اس کی فلمیں فلاپ ہونے لگیں تو پروڈیوسرز نے بھی منہ موڑ لیا..... مگر یہ بندہ تھا بڑا چلتا پرزہ..... اس نے لیلیٰ کو پھانس لیا جو اس وقت ناپ کی ہیروئن تھی..... شادی کر لی لیلیٰ سے اور اسی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا..... سب بیچ کر کھا گیا یہ پٹرجوئے اور عیاشی میں اڑا دیا..... مجبوراً لیلیٰ کو پھر سے فیلڈ میں آنا پڑا اور اس نے فلم پروڈکشن کا کام شروع کر دیا۔ اب شوہر ہڈحرام گھر میں پڑے پڑے روٹیاں توڑتا ہے اور بیوی بے چاری کماتی ہے.....

موسیٰ: یہ کیسا مرد ہے جو عورت کی کمائی پر پل رہا ہے..... ایسا کہاں ہوتا ہے دنیا میں.....

(نامراد زور سے ہنستا ہے)

نامراد: ہائے میرے بھولے بادشاہ..... ابھی تم نے وہ دنیا دیکھی ہی کہاں ہے جہاں بیویاں کماتی اور مرد کھاتے ہیں..... چلو فی الحال تم میرے ہاتھ کا بنا طعام نوش فرماؤ.....

نامراد باورچی خانے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

Scene No # 14

وقت: صبح کا موہتاج۔ شہر میں دن نکل رہا ہے

جگہ: کاشانہ پیراں۔ عیسیٰ کا گھر

سکینہ عیسیٰ کو تلاش کرتے ہوئے کمرے میں آتی ہے جہاں اس کی ساس اور ماں بیٹھی کچھ بات کر رہی ہیں۔ ماں خدیجہ غور سے سکینہ کو دیکھتی ہے۔

خدیجہ: تمہیں کیا ہوا ہے..... کیوں بوکھلائی سی پھر رہی ہو۔

سکینہ: تائی جان ..... عیسیٰ کہاں ہے..... میں تو اس کے لیے ناشتہ بنانے گئی تھی ... واپس آئی تو وہ کمرے میں نہیں تھا

ہاجرہ: وہ تو پتہ نہیں کسی جلدی میں تھا آج صبح سویرے سے..... ایک جھپک میں جانے کہاں نکل گیا۔

سکینہ: چلا گیا.....؟..... مگر کہاں.....

(خدیجہ بیٹی کو ڈانٹتی ہے)

خدیجہ: یہ تم ہم سے پوچھ رہی ہو.....؟..... ایک بیوی کو پتہ ہونا چاہیے کہ اس کا شوہر صبح سویرے بنا کچھ کھائے پیئے کہاں نکل گیا ہے منہ اندھیرے.....

ہاجرہ: تم فون کرو اُسے..... مجھے تو جیسے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی ہے ان باپ بیٹوں نے..... بس پریشانیاں ہی مقدر ہیں..... دیکھو..... کہاں چلا گیا ہے دن بتائے.....

سکینہ پریشانی میں کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: کسی پولیس اسٹیشن کا آؤٹر

عیسیٰ پولیس اسٹیشن کے باہر اپنی جیپ کے قریب کھڑا کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ اندر سے ایک سپاہی اِدھر اُدھر دیکھتا جلد بازی میں باہر نکلتا ہے اور عیسیٰ کے پاس آتا ہے اور اپنی جیب سے کوئی پرچی/کاغذ نکال کر جلدی سے چھپاتے ہوئے عیسیٰ کی مٹھی میں دبا دیتا ہے۔

سپاہی: یہ لیں عیسیٰ بھائی..... آپ کا کام ہو گیا ہے.....

(عیسیٰ کچھ نوٹ نکال کر سپاہی کے والے کرتا ہے۔)

عیسیٰ: پتہ تو ٹھیک ہے ناں

سپاہی: سو فیصد پکی خبر ہے عیسیٰ بھائی

عیسیٰ: ٹھیک ہے میں چلتا ہوں

(سپاہی جلدی سے رکتا ہے)

سپاہی: شکریہ عیسیٰ بھائی سب خیر تو ہے ناں مہراں طالب ہے تم نے کیا کرنا ہے اس پتے کا اب تو ان لڑکوں نے پرچہ بھی واپس لے لیا ہے خوف کے مارے پہلے ہی موسیٰ بھائی نے کچھ کم نہیں کی ان کے ساتھ سرتے مرتے بچے ہیں اب تم پھر سے

عیسیٰ: بے فکر رہو میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے مجھے بس ایک خبر کا پتہ لگانا ہے اور ہاں دوسرا کام یاد ہے ناں

سپاہی: بالکل یاد ہے..... مجھے کہیں بھی موسیٰ بھائی ملے میں تمہیں ضرور اطلاع کروں گا

عیسیٰ: چلو پھر فی امان اللہ

عیسیٰ جیپ میں سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ اندر سے باہر پورچ میں نکلتی ہے جہاں پہلے سے موسیٰ اور ڈرائیور اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ڈرائیور لیلیٰ کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتا ہے اور اس کے بیٹھنے کے بعد موسیٰ بھی آگے بیٹھ جاتا ہے۔ ڈور لان میں ریٹیرس پر لیلیٰ کے سیکرٹری فیضی کے ساتھ کھڑا توقیر یہ سب غور سے دیکھ رہا ہے۔

توقیر: پتہ نہیں کیوں..... مجھے یہ وہ لگتا نہیں..... جو دکھائی دیتا ہے..... تمہیں میں نے اس کی خبر لانے کا کہا تھا..... خون کھول رہا ہے میرا کل رات سے.....، ایسی جگہ لے جا کر ماروں گا جہاں اسے پانی بھی نہ ملے.....

فیضی: ذرا احتیاط سے باس.....، بندہ بڑا خطرناک ہے.....، سیدھا جیل سے نکل کر آیا ہے..... لیلیٰ میڈم کے پچھلے گارڈ کی طرح کوئی کاغذی محافظ نہیں ہے.....

(چونکتا ہے)

توقیر: جیل سے..... کیا بک رہے ہو.....

فیضی: جی سر..... جیل سے..... اقدام قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا اسے پولیس نے..... تین تین بندوں پر سیدھا فائر کیا تھا اس نے.....

(توقیر بوکھلا سا جاتا ہے)

توقیر: مگر..... اتنا خطرناک بندہ..... لیلیٰ تک کیسے پہنچا.....، کہیں لیلیٰ کو میرے ارادوں کی خبر تو نہیں ہو گئی۔

فیضی: نہیں سر..... ایسا نہیں ہو سکتا..... اسے وہ کمینہ نامراد لے کر آیا تھا میڈم کے پاس.....

توقیر: مگر لیلیٰ نے تو کبھی نیا پرسنل گارڈ رکھنے کا نہیں کہا تھا اس سے پہلے.....، پھر اچانک اسے کیوں رکھ لیا اُس نے..... پہلے والے کو تو ڈرا کر بھگا دیا تھا ہم نے۔

فیضی: اس بات پر تو میں بھی حیران ہوں سر..... مگر ایک بات کنفرم ہے کہ یہ موسیٰ ہے بڑا خطرناک.....

توقیر: تم اس پر نظر رکھو.....، مجھے اپنے پلان میں کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں ہے اب..... بہت جلد میں سب کچھ سمیٹ کر یہاں سے فارن نکلنا چاہتا ہوں.....، ہالی وڈ کا پراجیکٹ میرا خواب ہے..... اور میں اپنے اس ڈریم پروجیکٹ سے اب کسی صورت دستبردار نہیں ہو سکتا.....

فیضی سر ہلاتا ہے۔ توقیر کسی سوچ میں گم اسی طرف دیکھ رہا ہے جہاں سے ابھی موسیٰ لیلیٰ کو لے کر گھر سے نکلا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

جگہ: شہریار کا گھر

شہریار لاؤنج میں کھڑا ہے۔ زہرہ اسے اس کا بریف کیس وغیرہ لا کر دیتی ہے۔ شہریار کسی سے فون پر بات کر رہا ہے۔ دوسری جانب وہی ٹھرکی سیٹھ شہباز گل ہے جس کی رال زہرہ کو دیکھ ٹپک رہی تھی۔

شہریار: جی بس گل صاحب..... میں نکل ہی رہا تھا..... آپ آفس ہی کیوں نہیں آ جاتے..... بہت اچھی سی کافی پلاؤں گا اور بزنس ڈیل کی تفصیلات بھی طے کر لیں گے وہیں.....

شہباز: نہیں ملک صاحب..... آپ کے آفس میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں اپنے بزنس رائیولز کو اس ڈیل کی ہرگز بھنک نہیں لگنے دینا چاہتا..... بات کسی پرائیویٹ جگہ پر ہی ہو تو بہتر ہے..... میں شام کو 6 بجے آ جاتا ہوں آپ کے گھر..... کیا

خیال ہے.....(شہباز کے لہجے میں زہرہ کو دوبارہ دیکھنے کی ہوس صاف جھلک رہی ہے)

شہریار: خیال تو نیک ہے.....چلیں ٹھیک ہے.....میں وقت پر پہنچ جاؤں گا.....او کے.....سی یو دین.....see you then

(شہریار فون رکھ دیتا ہے اور زہرہ سے کہتا ہے)

شہریار: سیٹھ شہباز شام کو گھر آ رہے ہیں.....میرا خیال ہے کہ وہ ڈنر تک بیٹھیں گے.....تم شام کے لیے کچھ اچھا سا نوالو شیف سے.....وہ چائنیز اور اٹالین اچھا کھانا بنا لیتا ہے.....

(زہرہ کچھ ہچکچاتی ہے)

زہرہ: جی.....مگر بزنس ڈیل گھر پر.....میرا مطلب ہے

شہریار: یہ بزنس کی باتیں تم مجھ پر ہی رہنے دو.....اور دیکھو تم بھی کچھ ڈھنگ سے تیار ہو جانا.....

زہرہ: (زہرہ چونکتی ہے) میں.....کیوں.....؟

شہریار: کیوں.....کیا تم آنے والے گیسٹ Guest کا استقبال نہیں کرو گی.....ہو سکتا ہے کہ ان کی فیملی بھی ساتھ ہو.....او کے.....پلیز سب Manage کر لینا.....کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے.....

شہریار بات ختم کر کے چلا جاتا ہے۔ زہرہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے مگر شہریار سنی ان سنی کرتے ہوئے جا چکا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: ان لڑکوں کے گھر والی گلی

جہاں موسیٰ نے کامران کے دوستوں پر گولی چلائی تھی۔ عیسیٰ گلی میں جیپ کھڑی کرتا ہے اور آگے بڑھ کر کسی راہ گیر سے کچھ پوچھتا ہے۔ راہ گیر ایک مکان کی طرف اشارہ کرتا ہے، عیسیٰ آگے بڑھ کر اس دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دوسری دستک پر اندر سے رشید یا بلال دروازے کی جھری سے باہر جھانکتا ہے اور ڈرائے ہوئے لہجے میں پوچھتا ہے۔

رشید: کون.....

عیسیٰ: عیسیٰ.....

رشید: (ڈر کر) عیسیٰ.....کون.....

عیسیٰ: موسیٰ کا بھائی.....

(رشید کی جان نکل جاتی ہے)

رشید: موسیٰ.....کون.....میں کسی موسیٰ کو نہیں جانتا.....تم کسی غلط پتے پر آ گئے ہو بھائی.....

عیسیٰ: پتہ بالکل ٹھیک ہے.....دروازہ کھولو.....ورنہ موسیٰ بھائی کے ہاتھ سے تو تم بچ گئے تھے.....میں دروازے کے باہر سے ہی تمہیں چھلنی کر دوں گا.....جلدی کھولو.....وقت ضائع مت کرو میرا.....

(رشید اندر سے ہی پوچھتا ہے)

رشید: تم.....تم چاہتے کیا ہو.....دیکھو.....ہماری تم سے یا تمہارے بھائی سے کوئی دشمنی نہیں ہے.....اور اب تو ہم نے کیس بھی واپس لے لیا ہے.....

عیسیٰ: گھبراؤ نہیں.....میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا.....صرف کچھ بات کرنی ہے تم سے.....لیکن اگر تم نے فوراً دروازہ نہیں کھولا تو واقعی مجھے غصہ آ جائے گا اور پھر یہ دروازہ بھی زیادہ دیر میرا راستہ روک نہیں پائے گا.....اب تم کھولتے ہو دروازہ یا پھر میں دیوار پھلانگ کر اندر آ جاؤں.....میں صرف تین تک گنوں گا.....ایک.....دو.....

رشید: ٹھہرو..... کھولتا ہوں.....

(رشید گھبرائے ہوئے انداز میں دروازہ کھول دیتا ہے۔عیسیٰ اندر آ جاتا ہے۔رشید کی جان نکلی ہوئی ہے۔عیسیٰ غور سے رشید کی طرف دیکھتا ہے۔)

عیسیٰ: تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں۔

رشید: وہ اب یہاں نہیں آتے..... یہ گھر میرا ہی ہے..... میں نے ان سب سے رابطہ ختم کر دیا ہے..... قسم سے..... میرا اب ان سے کوئی تعلق نہیں ہے.....

عیسیٰ: ابھی تم نے کہا کہ تمہاری میرے بھائی سے کوئی دشمنی نہیں تھی..... پھر موسیٰ بھائی نے تم لوگوں پر گولیاں کیوں چلا دیں.....

(رشید گڑبڑا جاتا ہے)

رشید: وہ..... دراصل..... میرا مطلب ہے تمہارے بھائی کو کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی.....

(عیسیٰ غور سے اسے دیکھتا ہے)

عیسیٰ: تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو.....؟ ..... کیا کسی نے کوئی دھمکی دی ہے..... فکر مت کرو..... کچھ نہیں ہو گا..... بس میرے ایک سوال کا جواب دے دو..... پھر تم میری طرف سے آزاد ہو.....

(رشید کا رنگ اڑ جاتا ہے)

رشید: کک..... کون سا سوال.....

عیسیٰ: اس روز وہ لڑکی کون تھی جو موسیٰ بھائی کے ساتھ اس گھر سے نکلی تھی..... مجھے اس کا پتہ چاہیے.....

رشید گھبرا کر عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: رشید کے محلے کا مونتاج

باہر گلی میں چہل پہل ہے۔

عیسیٰ اور رشید ابھی تک ویسے ہی آمنے سامنے کھڑے ہیں۔

رشید: لڑکی..... کون سی لڑکی..... یہاں تو کوئی لڑکی نہیں آئی تھی اس روز.....

عیسیٰ: بکو مت..... سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس روز یہیں گلی سے کوئی لڑکی موسیٰ بھائی کی گاڑی میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر روانہ ہوئی تھی..... ضرور جھگڑا اسی لڑکی کی وجہ سے شروع ہوا ہو گا..... دیکھو..... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ بناء کوئی لگی لپٹی رکھے مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو..... ورنہ.....

(رشید عیسیٰ کے پیر پکڑ لیتا ہے۔)

رشید: قسم لے لو بھائی..... مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔نہ ہی میں نے کسی لڑکی کو آتے جاتے دیکھا ہے..... وہ تو میرے چند دوست یہاں اتوار کے روز چھوٹی موٹی جوئے کی بازی لگانے..... میرا مطلب ہے کیرم وغیرہ کھیلنے کے لیے آ جاتے تھے..... مجھے کیا پتہ تھا کہ ان لفنگوں کی موسیٰ بھائی کے ساتھ کوئی ان بن ہوئی ہے باہر..... قسم سے اگر پتہ ہوتا تو میں ان کمینوں کو کبھی اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دیتا.....

(عیسیٰ غور سے رشید کو گڑگڑاتے ہوئے دیکھتا ہے۔)

عیسیٰ: تو پھر وہ گلی والی لڑکی کون تھی۔

رشید: مجھے نہیں پتہ بھائی.....تمہاری قسم.....میرا مطلب.....خدا قسم.....

عیسیٰ: سوچ لو.....اگر مجھے بعد میں کہیں سے یہ پتہ چلا کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے یا کوئی غلط بیانی کی ہے تو میری گولی سیدھی تمہارے سر کے آر پار ہوگی.....اس دفعہ نہیں بچو گے تم.....

رشید: میں غریب بندہ ہوں بھائی.....مجھ پر رحم کرو۔

عیسیٰ چند لمحے اسے دیکھتا رہتا ہے اور پھر رشید کے صحن سے باہر نکل جاتا ہے۔ رشید جلدی سے گھبرا کر دروازے سے عیسیٰ کو اس کی جیپ کی طرف بڑھتے دیکھتا ہے اور جھٹ سے اندر سے دوبارہ کنڈی لگا لیتا ہے۔ عیسیٰ چند لمحے سوچتا ہے اور گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ رشید جلدی سے اپنی جیب سے اپنا پرانا ماڈل فون نکالتا ہے اور کسی کا نمبر ڈائل کرتا ہے۔)

رشید: ابے سُن.....غضب ہو گیا.....اس موسیٰ کا چھوٹا بھائی آیا تھا ابھی یہاں پوچھ گچھ کرنے.....سب بے غیرتوں سے کہہ دو کہ خبردار جو کسی نے اس طرف کا رُخ کیا ہو تو.....ایک بار تو بچ گئے.....اب کے نہیں بچیں گے.....ہاں ہاں.....وہی تھا.....میرا تو ابھی تک خوف کے مارے خون خشک ہوا پڑا ہے.....

رشید فون پر کچھ بتاتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

لیلیٰ اپنے دفتر میں داخل ہوتی ہے۔ موسیٰ اس کے پیچھے پیچھے اندر آتا ہے جہاں پہلے سے دو بدمعاش ٹائپ پروڈیوسر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ غور سے موسیٰ کو دیکھتے ہیں جو لیلیٰ کے پیچھے ایک جانب کھڑا ہو جاتا ہے۔

پروڈیوسر نمبر 1

چوہدری: کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں لیلیٰ بیگم.....بڑی دیر کر دی.....

لیلیٰ: کیوں.....کیا کوئی کام تھا چوہدری صاحب.....

چوہدری: ہاں.....مگر تم پہلے اسے باہر بھیجو.....کچھ ضروری بات کرنی ہے.....

لیلیٰ: یہ موسیٰ ہے.....میرا باڈی گارڈ.....آپ کو جو بات کرنی ہے.....اس کے سامنے ہی کریں.....

(چوہدری غصے سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتا ہے)

چوہدری: لے بھائی کر مے.....یہاں تو پہلے سے ہی ایک باڈی گارڈ موجود ہے.....اب کیا بات کریں.....

لیلیٰ: اگر آپ لوگ اس پرانی ڈیل کی بات کرنے آئے ہیں تو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ وہ فلم بند ہو چکی ہے ڈبوں میں.....ہیرو آپ لوگوں کی دھمکیوں سے ڈر کر بھاگ گیا.....اب اس پراجیکٹ پر کام مشکل ہے۔

چوہدری کا دوست: مگر میڈم جی.....نقصان تو بھرنا پڑے گا ناں.....نقصان تو ہمارا ہوا ہے.....

لیلیٰ: نقصان ہم دونوں کا ہوا ہے.....وہ ہمارا جوائنٹ پراجیکٹ تھا.....آدھا نقصان میں نے اُٹھایا ہے.....آدھا آپ لوگوں کو اُٹھانا ہوگا.....یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی ہمارے درمیان.....

(چوہدری غصے سے میز پر ہاتھ مارتا ہے)

چوہدری: اور ہم کیوں نقصان اٹھائیں بھلا.....ہم نے نقصان اٹھانے کے لیے پیسہ تھوڑی لگایا تھا.....

چوہدری کا دوست

(موسیٰ غور سے چوہدری کی طرف دیکھتا ہے۔اور دھیرے سے اپنے نیفے میں اڑسے کسی پسٹل وغیرہ کی جھلک یوں دکھاتا ہے جسے لیلیٰ جج نہیں کر پاتی مگر چوہدری کا دوست موسیٰ کے تیور نوٹ کر لیتا ہے اور چوہدری کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے)

کرما: چل چوہدری فیاض.....، یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے.....حساب کتاب کے لیے زندگی پڑی ہے.....

چوہدری فیاض: اوبیہ کیا بول رہا ہے۔ہم تو یہ طے کر کے آئے تھے کہ آج فیصلہ کر کے ہی واپس جائیں گے.....اور اب تُو ہی.....

(کرما دھیرے سے فیاض کے کان میں کچھ کہتا ہے فیاض غصے سے مگر گڑبڑائے ہوئے انداز میں لیلیٰ کے پیچھے خاموش کھڑے موسیٰ کو دیکھتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے)

فیاض: ٹھیک ہے.....آج تو چلے جاتے ہیں.....مگر بات ابھی ختم نہیں ہوئی لیلیٰ بیگم.....

(لیلیٰ حیرت سے اسے دیکھتی ہے)

(فیاض اور کرما غصے میں تلملاتے خون کے گھونٹ پیتے وہاں سے بڑبڑاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔لیلیٰ پلٹ کر موسیٰ کو دیکھتی ہے)

لیلیٰ: یہ کون سی گیدڑ سنگھی سنگھا دی تم نے انہیں کھڑے کھڑے.....یہ تو بڑے لیچڑ لوگ تھے.....،اتنی آسانی سے چلے گئے اٹھ کر.....،دیکھو پلیز.....ہاتھ ہولا رکھنا تم اپنا.....،.....اب تو مجھے بھی تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔

موسیٰ خاموش کھڑا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دیوار کی گھڑی شام کے 5 بجے کا وقت دکھا رہی ہے

جگہ: زہرہ کا گھر

نوکرانی آ کر زہرہ کو بتاتی ہے۔

نوکرانی: وہ جی.....وہ سیٹھ شہباز آئے ہیں نیچے.....آپ کا پوچھ رہے ہیں۔

زہرہ: تمہارے صاحب کہاں ہیں.....؟

نوکرانی: صاحب تو ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آئے،زہرہ کچھ پریشان سی ہو جاتی ہے اور پھر بادل نخواستہ کہتی ہے۔

زہرہ: اچھا ٹھیک ہے.....تم انہیں بٹھاؤ ڈرائنگ روم میں اور کچھ چائے ٹھنڈا پوچھو.....میں آتی ہوں۔

نوکرانی سر ہلا کر واپس پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن۔شام

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے ڈرائنگ روم میں آتی ہے۔شہباز گل لوفرانہ انداز میں زہرہ کو نیچے آتے دیکھتا ہے اور عاشقانہ انداز میں زہرہ کا استقبال کرتا ہے۔

شہباز: آیئے.....آیئے.....زہرہ جی.....آپ کو دیکھنے کے لیے تو میری آنکھیں ہی ترس گئی تھیں.....

(زہرہ بڑی مشکل سے اپنے غصے کے تاثرات چھپاتی ہے۔)

زہرہ: آپ تشریف رکھیں.....شہریار ابھی آتے ہی ہوں گے.....

شہباز: (شہباز غور سے زہرہ کو دیکھتا ہے) مگر میں یہاں ملک شہریار سے ملنے تو نہیں آیا۔

زہرہ: (غصے سے) جی.....

شہباز: میرا مطلب ہے ملک صاحب سے تو میری تقریباً روز ہی ملاقات ہو جاتی ہے ہر رات کلب میں..... یا کسی دفتری میٹنگ میں..... میں تو آج یہاں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں..... اس دن کے بعد آپ نے دوبارہ کوئی رابطہ ہی نہیں کیا.....

زہرہ: کیا مطلب..... میں بھلا آپ سے کیوں رابطہ کرتی..... آپ کی شہریار سے دوستی ہے..... مجھ سے نہیں..... آپ شاید بھول رہے ہیں۔

(شہباز آپ سے تم پر آ جاتا ہے)

شہباز: ایک ہی بات ہے..... میرا مطلب ہے کہ اب تو تم سے بھی اس ناطے ایک رشتہ بن گیا ہے ناں.....

(زہرہ غصے میں کہتی ہے)

زہرہ: میرا خیال ہے شہریار آتے ہی ہوں گے، آپ یہاں ان کا انتظار کریں..... کچھ چائے پانی چاہیے ہو تو نوکر موجود ہے۔

(زہرہ پلٹ کر جانے لگتی ہے۔ تبھی شہباز زہرہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

شہباز: کہاں جا رہی ہو..... کچھ دیر تو میرے پاس بیٹھو۔ زہرہ کی برداشت جواب دے جاتی ہے اور شدید غصے میں پلٹتی ہے اور شہباز کے چہرے پر ایک زوردار چانٹا مارتی ہے۔ ٹھیک اس لمحے پس منظر میں شہریار نمودار ہوتا ہے اور یہ..... سارا ماجرا دیکھ لیتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 15

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

شہریار زہرہ کو سیٹھ شہباز کو طمانچہ مارتے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور وہیں سے چلا کر کہتا ہے۔

شہریار: زہرہ.....بی ہیو یور سیلف.....Behave yourself

زہرہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی جاتی ہے۔

(شہباز غصے میں چلا کر شہریار سے کہتا ہے۔)

شہباز: گھر بُلا کر بے عزتی کروانے کا بہت شکریہ ملک صاحب.....میں یہ INSULT ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

(شہباز غصے میں پلٹ کر جانے لگتا ہے، شہریار جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روکتا ہے اور منانے کی کوشش کرتا ہے۔)

شہریار: میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے گل صاحب.....ایسے ناراض ہو کر تو نہ جائیں.....ورنہ میں ساری عمر خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا.....

شہباز: اب مزید کون سی بے عزتی رہ گئی ہے جو تمہاری بدتمیز اور بداخلاق بیوی کے ہاتھوں ہونا باقی ہے ملک شہریار.....میں تو ایک دوست سمجھ کر تمہارے بلانے پر چلا آیا تھا.....مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے.....

شہریار: میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں.....ضرور کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے.....ورنہ زہرہ.....اچھا آپ غصہ تھوک دیں.....میں زہرہ کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

شہباز: (شہباز غصے سے شہریار کو اپنے راستے سے ہٹاتا ہے۔) مجھے تمہاری معافی کی ضرورت نہیں ہے شہریار ملک.....ہاں البتہ مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم انڈسٹریل اسٹیٹ کی جس ڈیل کی فائنلائزیشن کا کانٹریکٹ سائن کرنے والے تھے.....اب اس ڈیل کو ختم سمجھو.....جس گھر میں میری عزت نہ ہو.....میں وہاں کبھی دوبارہ قدم.....

شہریار: (گھبرا کر) ایسا نہ کہیں شہباز صاحب.....ہم دونوں نے اس انڈسٹریل اسٹیٹ کی پوری پلاننگ کی ہے۔ مہینوں ساتھ بیٹھ کر ساری ڈیٹیلز فائنل کی ہیں.....اچھا.....آپ سے زہرہ نے بدتمیزی کی ہے ناں.....تو وہی خود آپ سے معافی مانگے گی.....پھر تو آپ کا دل صاف ہو جائے گا ناں.....پلیز.....میری خاطر گل صاحب۔

(شہباز کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور نخرے سے کہتا ہے)

شہباز: دیکھو یار ملک.....میں تو کہتا ہوں تم ضد نہ کرو.....ویسے بھی تمہاری بیوی بہت مغرور ہے.....

(شہریار جلدی سے مزید مکھن لگاتا ہے)

شہریار: نہیں نہیں.....آپ کی میرے گھر میں کوئی بھی بے عزتی کرے.....یہ مجھے برداشت نہیں.....اب تو زہرہ ہی آپ سے معافی مانگے گی.....اچھا آپ بیٹھیں تو سہی۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا آفس

لیلیٰ کا سیکٹری فیضی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔لیلیٰ کے قریب میز پر کچھ کاغذات اور چیک بک وغیرہ پڑی ہوئی ہے۔ لیلیٰ فیضی سے پوچھتی ہے۔

لیلیٰ: فیضی..... یہ 25 لاکھ کا چیک کس لیے.....وہ بھی کیش.....؟.....

(فیضی چالاکی سے کہتا ہے)

فیضی: جی میڈم.....وہ تو قیر باس نے کہا تھا کہ آج آپ سے یہ چیک ضرور سائن کروالوں.....انہوں نے کہیں Payment کرنی ہے.....

لیلیٰ: مگر ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو تو قیر کے لیے تم دو چیک سائن کروا کر لے گئے تھے مجھ سے.....پھر اچانک دوبارہ ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی.....؟

فیضی: سوری میڈم.....یہ تو نہیں بتایا باس نے.....آپ کہیں تو میں فون کر کے پوچھ لوں.....

(لیلیٰ سوچ میں گم ہے۔فیضی پلٹ کر جانے لگتا ہے۔لیلیٰ اسے آواز دے کر روکتی ہے)

لیلیٰ: رکو.....

لیلیٰ چند لمحے سوچتی ہے اور پھر ایک لمبی سانس لے کر چیک بک اٹھا لیتی ہے۔فیضی کے چہرے پر مکارانہ سی مسکراہٹ ابھرتی ہے۔لیلیٰ چیک پر دستخط کر کے فیضی کے حوالے کر دیتی ہے۔فیضی چیک لے کر پلٹ جاتا ہے۔لیلیٰ اس کے جانے کے بعد کچھ سوچتی ہے اور انٹر کام اٹھا لیتی ہے جیسے کسی سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر، بیڈ روم وغیرہ

زہرہ اور شہریار میں بحث چل رہی ہے۔شہریار غصے میں چلاتا ہے۔

شہریار: تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے دوست اور اتنے اہم بزنس پارٹنر پر ہاتھ اٹھانے کی.....جبکہ تمہیں معلوم بھی تھا کہ وہ خاص میری دعوت پر یہاں آئے تھے.....

(زہرہ حیرت سے شہریار کو دیکھتی ہے)

زہرہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شہریار.....وہ بندہ میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ مجھے اس بے ہودہ اور لیچڑ انسان سے دور رکھیں.....وحشت ہوتی ہے مجھے اس کی آنکھوں میں بسی حیوانیت دیکھ کر.....

شہریار: اوہ کم آن.....میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ میرے سامنے تم یہ ستی ساوتری بننے کی ناکام ایکٹنگ نہ کیا کرو۔ ایسی آنکھیں تم نے پہلے بھی بہت دیکھ رکھی ہوں گی.....تم اور میں ہم دونوں یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہارا تعلق.....

(زہرہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ شہریار کا طعنہ مکمل ہونے سے پہلے اس کی بات کاٹ دیتی ہے)

زہرہ: بس.....بس کر دیں یہ مجھے بار بار میرے ماضی کے طعنے دینا.....آپ کیوں بار بار مجھے یہ احساس دلاتے ہیں کہ میرا ماضی داغدار اور آپ کا بہت شاندار ہے.....یہ شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی ہے میں نے کوئی زور زبردستی تو نہیں کی تھی آپ سے اس نکاح کے لیے.....

(شہریار بھی چلاتا ہے)

شہریار: ہاں..... میں نے اپنی مرضی سے یہ نکاح کیا ہے اور یہ بھی سمجھ لو اچھی طرح کہ اب آگے بھی میری ہی مرضی چلے گی..... بہت بھاری رقم ادا کی ہے میں نے تمہارا یہ غرور توڑنے کے لیے.....

زہرہ: میرا غرور.....؟..... مگر میں تو اب آپ کی عزت ہوں..... اور آپ سے یہ رشتہ میرا مان اور آپ میرا بھرم ہیں..... آپ کو تو مجھے اب ساری عمر Protect کرنا ہے..... میں اب گھر داری میں رہنا چاہتی ہوں..... آپ کا گھر سنبھالنا چاہتی ہوں اور آپ مجھے پھر سے شمع محفل بنانے پر تلے ہوئے ہیں..... آپ کی غیرت یہ سب کیسے گوارا.....

(شہریار چلاتا ہے اور طنزیہ کہتا ہے)

شہریار: بس رہنے دو یہ افسانوی باتیں..... میں نے تم سے نکاح اپنا گھر بار چلانے کے لیے نہیں کیا تھا..... اُس کے لیے پہلے ہی سے میرے گاؤں میں میرے خاندان سے میری پہلی بیوی موجود ہے..... وہی میرا نام اور نسل آگے بڑھائے گی..... تم یہ بات آج اور ابھی سمجھ لو تو بہتر ہے.....

(زہرہ کے سر پر جیسے کوئی بم سا پھوٹتا ہے)

زہرہ: کیا..... آپ پہلے سے شادی شدہ ہیں..... تو پھر مجھ سے کیوں نکاح کیا آپ نے شہریار..... اور یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی.....

شہریار: زیادہ بھولی نہ بنو..... کیا تمہیں یا تمہاری اس چالاک نانکہ کو پہلے سے ہی یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسا خاندانی مرد پہلے سے شادی شدہ نہیں ہوگا..... جاگیردار ہوں..... سرمایہ دار ہوں..... اور عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں..... رہی بات بتانے کی تو نہ تم لوگوں نے پہلے کبھی پوچھا اور نہ میں نے بتانے کی ضرورت محسوس کی..... آج ذکر چھیڑا ہے تم نے تو یہ بھی سن لو کہ میرے دو بچے ہیں پہلی بیوی سے..... ایک دس سالہ بیٹا اور ایک آٹھ سالہ بیٹی..... مگر بیوی بھی اسی جاگیردار فیملی کی پرانے خیالات والی عورت ہے جسے گھر اور گھر داری کے علاوہ مزید کچھ سوجھتا نہیں..... اسی لیے مجھے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی سے نکاح کرنا تھا..... جو یہاں شہر میں میرے بزنس اور میرے سوشل سرکل کے تقاضوں کے مطابق میرے ساتھ چل سکے.....

(زہرہ طنز کرتی ہے)

زہرہ: بہت خوب..... اور وہ سوشل سرکل اور بزنس کے تقاضے کیا ہیں.....؟..... یہی کہ میں ہر شام بن سنور کر آپ کے اوباش دوستوں کا دل لبھانے اور ان کی بھوکی نظروں کی تسکین کرانے کا سامان کر سکوں..... یہ کام تو میں پہلے بھی کرتی تھی ڈانس پارٹیز پر جا کر..... فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے وہ معاوضہ کہیں اور جاتا تھا اور اب کسی اور صورت میں آپ یہ معاوضہ وصول کرنا چاہتے ہیں ملک شہریار صاحب..... مجھے تو آپ میں اور اس بازار کے بروکر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا

شہریار: اوہ یو شٹ اپ..... oh you shut up

زہرہ کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی شہریار غصے میں چلا کر زہرہ کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیتا ہے۔ زہرہ کے آفسوفکل پڑتے ہیں.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: انا کا گھر/کمرہ

انا زہرہ کی یاد میں اُسی اپنے کمرے میں سامنے اپنا چھوٹا حقہ رکھے کسی خیال میں گم ہے۔ چند اندر آتی ہے اور حقے کو

ہاتھ لگا کر دیکھتی ہے اور پھر انا کی بے خیالی محسوس کر کے کہتی ہے۔

چندا: کن خیالات میں گم ہیں انا جی..... حقہ بھی کب سے پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے..... لائیں میں گرم کر دوں دوبارہ.....

انا: نہیں..... رہنے دو..... آج من نہیں لگ رہا اس موئے تمباکو میں بھی..... اس کا مزہ بھی جیسے پھیکا پڑ گیا ہے.....

چندا: کیا ہوا..... زرّی یاد آ رہی ہے ناں آپ کو.....

انا: وہ کم بخت بھولتی ہی کب ہے مجھے..... جو اسے یاد کرنا پڑے..... مگر جانے کیوں دل بہت اداس ہو رہا ہے اس کے لیے.....

چندا: دل تو اُداس ہو گا..... نہ آپ نے زرّی کے جانے کے بعد اس کی کوئی خبر لی ہے..... نہ اس سے ملنے کے لیے جاتی ہیں..... ایک فون تک تو کیا نہیں آپ نے اسے نکاح کے بعد.....

انا: تم کیا سمجھتی ہو میرا دل نہیں تڑپتا اسے دیکھنے کے لیے..... اس سے ملنے کے لیے اسے گلے لگانے کے لیے.....

چندا: تو پھر کیا مجبوری ہے..... دل کی مانتی کیوں نہیں آپ.....

انا: اس لیے کہ یہی دستور ہے..... زرّی اب پرائی ہو کر چلی گئی ہے اس علاقے سے..... اب وہ کسی بڑے گھر کی عزت ہے..... اور ہمارے رواج کے مطابق جب ہماری کوئی لڑکی یہاں سے بیاہ کر چلی جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کے پرانے سارے دھاگے بھی ہمیشہ کے لیے توڑ جاتی ہے..... تاکہ اس کا داغ دار ماضی کبھی اس کا پیچھا نہ کرے.....

(چندا اُداس ہو جاتی ہے)

چندا: کیا مطلب..... تو کیا اب زرّی ہم سے کبھی ملنے نہیں آئے گی.....؟

انا: نہیں..... میں نے اسے جاتے وقت یہی نصیحت کی تھی کہ اب وہ ان گلیوں کی طرف کبھی مڑ کر نہ دیکھے.....

چندا: تو کیا ہوا..... ہم تو اس سے ملنے کے لیے جا سکتے ہیں ناں..... میں تو زری سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی انا..... میری جان اٹکی رہتی ہے اس میں..... آپ کو تو سب پتہ ہے۔

انا: ہم سبھی کی جان نکال کر لے گئی ہے وہ اپنے ساتھ..... میرا دل بھی تڑپ رہا ہے۔ مگر ہم اب زری سے نہیں مل سکتے..... نہ اس سے ملنے اس کے گھر جا سکتے ہیں۔

(چندا غصے اور دکھ سے بول پڑتی ہے)

چندا: مگر کیوں..... ہم کیوں نہیں جا سکتے..... وہ بھی تو ہمارے لیے اتنی ہی بے چین ہو گی۔

انا: یہی طے ہوا تھا ملک شہریار کے ساتھ..... اس نے نکاح سے پہلے بس یہی ایک شرط رکھی تھی کہ نکاح اور رخصتی کے بعد ہم میں سے کسی کا بھی زہرہ کے ساتھ آئندہ کوئی تعلق نہیں ہو گا..... نہ وہ یہاں آئے گی..... نہ ہم میں سے کوئی اس سے ملنے وہاں جائے گا..... میری بچی مجھ سے جدا ہو چکی ہے ہمیشہ کے لیے.....

انا رو پڑتی ہے۔ چندا ابھی تک شاک میں بیٹھی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر۔ بیڈ روم/ وغیرہ

شہریار اور زہرہ میں ابھی تک بحث چل رہی ہے۔ شہریار غصے میں چلاتا ہے۔

شہریار: تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھ لو..... لیکن ایک بات اچھی طرح جان لو کہ میں نے تمہیں بھاری رقم کے عیوض خریدا ہے..... تمہاری شرط نکاح کی تھی..... سو دکھاوے کے لیے اور معاشرے میں تمہاری حیثیت تسلیم کروانے کے لیے میں نے نکاح بھی کر لیا

.....مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم خود کو میری روایتی بیوی سمجھ کر مجھ پر حق جتانا شروع کر دو..... تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گا..... ورنہ تمہاری اس گھر میں اور میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہے..... تمہیں یہ سودا ختم کرنا ہے تو اپنی انا سے کہو کہ میری رقم لوٹا دیں۔ اس کے بعد تم آزاد ہو..... جہاں جانا چاہو..... جا سکتی ہو.....

زہرہ: میں نے آپ سے نکاح کیا ہے شہریار..... کوئی سودا نہیں کیا..... اور یہ روایتی بیوی یا غیر روایتی منکوحہ میں کیا فرق ہوتا ہے..... بیوی بیوی ہوتی ہے اور مرد کی عزت ہوتی ہے..... اور کوئی مرد اپنی عزت اور غیرت کو یوں سرِ بازار رسوا نہیں کرتا..... اگر وہ مرد ہو تب.....

شہریار: (غصے میں) اوہ..... تو اب تم بھی مجھے مرد ہونے کا طعنہ دو گی..... Look who is talking..... تو سوچو ہے کھا کر بلی حج کو چلی ہے..... غور سے سنو زہرہ بیگم..... میں نے تمہیں تمہارے ماضی کے ساتھ قبول اسی لیے کیا ہے کہ مجھے تم جیسی ہی ناز و ادا والی کوئی عورت چاہیے تھی..... جو اِن احمق مردوں کے درمیان سمارٹلی پلے کر سکے جن سے میرے مفادات وابستہ ہیں..... میں تمہیں کسی غلط کام کے لیے مجبور نہیں کر رہا..... مجھے پتہ ہے کہ اداؤں کا یہ کھیل تمہیں بہت اچھی طرح کھیلنا آتا ہے اور تم جیسی سمارٹ اور انٹیلی جنٹ لڑکیاں کسی بھی مرد کو اس کی اوقات کے اندر رکھنا بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں..... تمہیں اپنی حفاظت کیسے کرنی ہے یہ بھی تمہیں اچھی طرح پتہ ہے..... لہٰذا اب یہ انجان بننے کا ڈرامہ ختم کرو..... یونو ویری ویل کہ میں تم سے کیا چاہ رہا ہوں..... اور تمہیں کیا کرنا ہے..... بس یہ سمجھو کہ تمہیں میری بیوی سے زیادہ میری بزنس پارٹنر اور میری دوست بن کر میری مدد کرنا ہوگی.....

(زہرہ حیرت اور دُکھ سے شہریار کی یہ ساری بکواس سنتی رہتی ہے)

زہرہ: بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے یہ سب کچھ سن کر..... کاش..... کاش اس ادافروشی کے کام کے لیے آپ کی نظر مجھ پر نہ پڑی ہوتی..... اور کاش آپ نے دھوکے سے مجھے پرپوز کر کے میرے ساتھ یہ نکاح کا ڈرامہ نہ کیا ہوتا..... مجھے لگتا ہے میں ایک بار پھر سے اسی بازار میں آ کھڑی ہوئی ہوں جہاں سے نکلنے کی آرزو میں میں ایک ایک پل گن گن کر کاٹتی رہی ہوں..... فرق صرف اتنا کہ میرے بیوپاری بدل گئے ہیں۔ (زہرہ رو پڑتی ہے)

شہریار: ایسا ہے تو یوں ہی سہی..... مگر جتنی جلدی تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو تمہارے لیے اتنا ہی بہتر ہے.....

No more arguments

شہریار غصے میں کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: شام۔ مغرب کا وقت

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

لیلیٰ اپنے دفتر سے نکلتی ہے اور سامنے بیٹھے ڈرائیور وغیرہ سے کہتی ہے۔

لیلیٰ: گاڑی لگا دو..... میں بس نکلنے والی ہوں..... اور موسیٰ کو بھی بتا دو.....

ڈرائیور: (ہچکچا کر) وہ جی..... موسیٰ تو.....

(لیلیٰ غصے سے پوچھتی ہے)

لیلیٰ: کہاں ہے موسیٰ..... آئی ایم گیٹنگ لیٹ..... جلدی بلاؤ اسے..... ہری اپ.....

(ڈرائیور/پی اے وغیرہ کن انکھیوں سے ایک کمرے کی طرف دیکھتا ہے، لیلیٰ موسیٰ کو آواز دیتی ہوئی غصے میں اس کمرے کی طرف بڑھتی ہے۔)

لیلیٰ: موسیٰ.....کہاں ہو تم.....سنا نہیں تم نے..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔

لیلیٰ موسیٰ کو پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے اور پھر ٹھٹھک کر رک جاتی ہے۔ موسیٰ سامنے چوکی پر جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مگن ہے۔ لیلیٰ کچھ دیر اسے چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے اور پھر خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ موسیٰ نماز ختم کر کے سلام پھیرتا ہے اور دعا کے لیے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیتا ہے۔ لیلیٰ کسی کھڑکی وغیرہ سے موسیٰ کو دعا مانگتے دیکھ رہی ہے کہ اس کے ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں۔ لیلیٰ غور سے موسیٰ کے دعا مانگنے کا یہ انداز دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

وقت: رات۔مونتاج

جگہ: زہرہ کا گھر۔آؤٹر۔outer

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اپنے کمرے میں بے چین سی اکیلی ٹہل رہی ہے، اُسے آج شہریار کی کہی ہوئی زہریلی باتیں یاد آ رہی ہیں جو اس کے کانوں میں گونج رہی ہیں۔

1-شہریار

آڈیو

فلیش بیک: میں نے تم سے اسی لیے شادی کی ہے.....تم زیادہ ستی ساوتری نہ بنو میرے سامنے.....

زہرہ بے چینی سے سر جھٹکتی ہے اور ٹہلتی رہتی ہے مگر شہریار کی باتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

2-شہریار

آڈیو

فلیش بیک: مجھے تم جیسی ہی ناز و ادا والی کوئی عورت چاہیے تھی جو ان احمق مردوں کے درمیان سمارٹلی پلے smartly play کر سکے جن سے میرے کاروباری مفادات وابستہ ہیں۔

زہرہ نڈھال ہو کر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں، تب اسے موسیٰ کی یاد آتی ہے، زہرہ موسیٰ کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی ناکام کوشش کرتی ہے مگر موسیٰ کی کہی باتیں اس کا پیچھا کرتی ہیں جو موسیٰ نے آخری ملاقات میں زہرہ سے کی تھیں۔

موسیٰ

آڈیو

فلیش بیک: ٹھیک ہے.....میں واپس تو جا رہا ہوں.....مگر میں خود کو برباد کر کے رکھ دوں گا.....مگر تمہارے لیے میری ایک ہی دعا ہے.....سدا آباد رہو.....

پھر زہرہ کو موسیٰ کی کوئی محبت بھری بات یاد آتی ہے کہ وہ کس طرح زہرہ کی عزت کرتا تھا اور اس کی نظروں میں زہرہ کے لیے کتنا وقار تھا۔ زہرہ اداس بیٹھی سوچتی رہتی ہے اور موسیٰ کی محبت اسے یاد آتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

موسیٰ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا لیلیٰ کو گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ ڈسک پلیئر پر فریدہ خانم کی غزل چل رہی ہے۔

غزل کے بول: وہ عشق جو ہم سے رُوٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا..... کوئی تبر نہیں..... کوئی مہر نہیں پھر سچا شعر سنائیں کیا.....

(لیلیٰ کچھ دیر غزل سنتی ہے اور پھر ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چلتے ڈسک پلیئر کی آواز بند کر دیتی ہے اور غور سے آگے بیٹھے موسیٰ کو دیکھتی ہے۔)

لیلیٰ: موسیٰ..... تمہارا تعلق تو کسی بہت اچھے اور مذہبی گھرانے سے لگتا ہے..... پھر تم جیل کیسے پہنچ گئے تھے..... کہاں رہتے ہیں تمہارے گھر والے.....

موسیٰ: (موسیٰ سنجیدگی سے کہتا ہے) یہیں..... اس شہر میں میڈم.....

لیلیٰ: پھر تم نامراد کے ساتھ کیوں رہتے ہو..... اپنے گھر کیوں نہیں.....

موسیٰ: وہ مجھ سے ناراض ہیں میڈم..... ابا نے مجھے جیل سے چھوٹ کر واپس گھر آنے سے منع کر دیا تھا..... اس لیے پلٹ کر واپس نہیں گیا.....

(لیلیٰ حیرت سے)

لیلیٰ: کیا واقعی..... حیرت ہے مجھے..... تم تو مجھے بہت سعادت مند اور فرمانبردار قسم کے بیٹے لگتے ہو اپنے ابا کے.....

موسیٰ: انہیں ایسا نہیں لگتا.....

لیلیٰ: تو کیا تم نے واقعی اقدام قتل کے الزام میں جیل کاٹی تھی..... یا صرف الزام ہی تھا.....

موسیٰ: نہیں..... یہ سچ ہے..... الزام نہیں.....

لیلیٰ: پوچھ سکتی ہوں کہ کیا دشمنی تھی تمہاری ان لوگوں سے..... جنہیں تم نے مارنے کی کوشش کی تھی.....

(موسیٰ آگے ہی دیکھتا رہتا ہے اور مؤدب بیٹھا رہتا ہے)

موسیٰ: بعض دشمنیاں کسی ایک پل میں جنم لے لیتی ہیں، ہمیں خود پتہ نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے کون ہمارا دشمن بننے والا ہے..... شاید اسے تقدیر کہتے ہیں۔

(موسیٰ کی بات سن کر لیلیٰ چونک سی جاتی ہے)

لیلیٰ: کیا تم پڑھے لکھے ہو.....

موسیٰ: جی..... ماسٹرز کیا ہے میں نے.....

(لیلیٰ موسیٰ کی بات سن کر خاموش سی ہو جاتی ہے۔)

لیلیٰ: اوہ..... وٹس گڈ..... تم چاہو تو میں تمہیں کسی دوسری جگہ آفس کے پیپر ورک والی وائٹ کالر جاب پر بھی رکھوا سکتی ہوں..... کہیں باہر..... حالانکہ اس صورت میں ایک اچھے محافظ سے محروم ہو جاؤں گی..... مگر تمہاری کوالی فیکیشن کے مطابق.....

موسیٰ: (موسیٰ لیلیٰ کی بات کاٹ دیتا ہے) نہیں..... میری آپ سے درخواست ہے کہ ایسا کبھی نہ سوچئے گا..... میں نے اپنی خوشی سے یہ نوکری کی ہے..... مجھے ایسی ہی کوئی نوکری کرنی تھی..... کسی ایسے ہی ماحول میں..... آپ مجھے جاب سے نکال بھی دیں گی تو میں پلٹ کر انہی گلیوں میں ہی کوئی نوکری تلاش کرنے کی کوشش کروں گا..... یہی میری سزا ہے..... سوری میڈم..... میں شاید زیادہ بول گیا۔

موسیٰ بولتے بولتے چپ ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ پیچھے بیٹھی غور سے موسیٰ کو دیکھتی رہتی ہے جیسے اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

سڑک پر گاڑی آگے دوڑتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ اور عیسیٰ میں بات چیت

بستر پر عیسیٰ سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوا ہے، سکینہ اسے دیکھتی ہے۔

سکینہ: کیا ہوا..... طبیعت ٹھیک ہے تمہاری.....

عیسیٰ: ہاں..... ٹھیک ہوں..... بس سر میں درد ہے شام سے.....

سکینہ: میں چائے بنا لاتی ہوں تمہارے لیے۔

عیسیٰ: نہیں..... رہنے دو..... اس وقت کہاں تکلیف کرو گی..... نیند آ جائے گی کچھ دیر میں تو صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔

سکینہ: سارا دن بھٹکتے جو رہتے ہو..... جانے کہاں کہاں..... کبھی دو گھڑی ٹک کر آرام بھی کر لیا کرو.....

عیسیٰ: کیسے آرام کر سکتا ہوں..... ابا نے موسیٰ بھائی کی ساری ذمہ داریاں میرے سر پہ ڈال دی ہیں..... مجھے تو اب پتہ چل رہا ہے کہ موسیٰ بھائی دن رات کتنی خاموشی سے درجنوں کام کر لیتے تھے اور مجھے خبر تک نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ میں ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا..... مگر انہوں نے مجھ پر کبھی کوئی بوجھ ڈالا ہی نہیں..... کتنا کام چور تھا میں اس وقت..... ہمیشہ انہیں تنگ کرتا رہتا تھا۔ ان سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے کر کے روٹھا رہتا تھا تا کہ مجھے کچھ کام نہ کرنا پڑے..... اور وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے میری ہر بات ٹال جایا کرتے تھے.....

(سکینہ دکھ سے شوہر کی بات سن رہی ہے۔)

سکینہ: ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... وہ بچپن سے ہی ایسے تھے..... یاد ہے میری اور تمہاری خاطر کتنی لڑائیاں لڑی ہیں موسیٰ بھائی نے..... اور ہر بار سارا الزام بھی اپنے ہی سر لے لیا کرتے تھے..... اور پھر بھی میں ان سے کتنا لڑتی تھی کہ بھائی تم نے میرا ٹھیک بدلہ نہیں لیا..... سر تو پھٹا ہی نہیں اس لڑکے کا..... (سکینہ خیالوں میں گم ہے)

عیسیٰ: (عیسیٰ ہنس پڑتا ہے) اور بھائی دوبارہ جا کر ختم ہوئے جھگڑے کو پھر وہیں سے شروع کر دیتا تھا اور سر پھاڑ کر ہی گھر واپس لوٹا کرتا.....

(عیسیٰ کے ساتھ ساتھ پرانی یادیں یاد کر کے سکینہ بھی ہنس پڑتی ہے اور پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنسو جاتے ہیں۔)

سکینہ: پتہ نہیں ہمارا بچپن کہاں کھو گیا عیسیٰ..... اور میں کتنی بُری ہوں..... میں نے موسیٰ بھائی کے ساتھ بچپن سے اب تک کتنی بدتمیزیاں کی ہیں..... میں تو انہیں ادب سے بھائی بھی نہیں پکارتی تھی..... جان بوجھ کر اپنا رعب جمانے کے لیے صرف موسیٰ کہا کرتی تھی.....

عیسیٰ: ہاں..... مگر اب تمہارے دل میں بھائی کے لیے احترام دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا ہے..... کاش ابا بھی بھائی کو معاف کر دیں..... کاش..... کاش پھر سے سب ویسا ہی ہو جائے.....

سکینہ: میری بھی یہی دعا ہے..... ہم سب پھر سے ایک ہو جائیں.....

عیسیٰ: یہ تب ہی ہو گا..... جب میں اس لڑکی تک پہنچ جاؤں گا جس کی وجہ سے بھائی پر اتنا بڑا الزام لگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابا

اسی کی گواہی مانیں گے اور حقیقت جان کر ہی ابا کا دل بھائی کی طرف سے صاف ہوگا.....

audio
overlap: (عیسیٰ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ سکینہ دل ہی دل میں خود سے کہتی ہے۔)
سکینہ: کاش مجھے موسیٰ بھائی نے اپنے سر کی قسم نہ دی ہوتی تو میں آج ہی سب کے سامنے یہ راز فاش کر دیتی عیسیٰ..... پھر چاہے یہ سب مل کر میری کوئی بھی سزا مقرر کرتے مجھے منظور ہوتا.....

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات
جگہ: نامراد کا گھر/کمرہ

نامراد ساتھ والی چارپائی پر بے سُدھ پڑا خراٹے لے رہا ہے، موسیٰ اپنے بستر پر لیٹا جاگ رہا ہے اور اسے زہرہ کی کہی باتیں اور اس سے ہوئی ملاقاتیں یاد آ رہی ہیں۔ موسیٰ اداس ہے۔

زہرہ
فلیش بیک: موسیٰ کی زہرہ سے ہوئی کچھ ملاقاتوں اور باتوں کے فلیش بیک۔
موسیٰ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔
پس منظر میں موسیٰ کی آج کی گاڑی میں سنی فریدہ خانم کی غزل کے بول گونج رہے ہیں۔
غزل کے بول
آڈیو: جب جسم ہی سارا جلتا ہو.....
پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا۔
کوئی مہر نہیں..... کوئی قہر نہیں
پھر سچا شعر سنائیں کیا.....
وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا.....
اب اس کا حال سنائیں کیا.....
موسیٰ زہرہ کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔
باہر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

مونتاج: صبح ہونے کا مونتاج۔
شہر میں دن نکل رہا ہے۔ جگہ جگہ سڑکوں کی چہل پہل۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: صبح

نامراد اپنے ٹوٹے پھوٹے سے پرانے کچن میں ناشتہ بنا رہا ہے۔ موسیٰ اندر آتا ہے۔ نامراد اسے دیکھ کر خوشی سے غلط شعر پڑھتا ہے۔
نامراد: وہ آئے ہمارے کچن میں

خدا کی قدرت.....
کبھی ہم ان کو.....کبھی اُبلتی چائے کو.....
کبھی اپنے آپ کو.....اور کبھی اس کچن کو دیکھتے
ہیں.....

موسیٰ: یہ دوسرا مصرعہ کچھ زیادہ لمبا نہیں ہو گیا۔

نامراد: اب لمبا ہو ہی گیا ہے تو جانے دو.....اپنے باپ کا کیا جاتا ہے.....تم گرما گرم چائے پیو.....میں تمہارے لیے کانٹی نینٹل ناشتہ بناتا ہوں.....

موسیٰ: نہیں.....مجھے جلدی نکلنا ہوگا.....آج شاید میڈم کو کہیں وزٹ پر جانا ہے.....

نامراد: کیا بات ہے پیارے.....بڑی جلدی دل لگا لیا تم نے اپنی میڈم سے.....میرا مطلب ہے اپنی اس نئی نوکری سے.....میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم بہت جلد اُکتا جاؤ گے.....

موسیٰ: میرے پاس اُکتانے کی کوئی وجہ نہیں ہے.....مجھے کرنا ہی کیا ہوتا ہے سوائے سارا دن میڈم کی چوکیداری کے.....بس دعا کرو وہ نہ اُکتا جائیں مجھ سے.....مجھے اس نوکری کی بہت ضرورت ہے ابھی.....

نامراد: ہیرا ہے تُو ہیرا.....تجھ سے بھلا کوئی کیوں اُکتائے گا.....اور وہ تیری لیلیٰ میڈم ہے ناں.....وہ زبان کی تھوڑی کڑوی ضرور ہے مگر وہ دل کی بُری نہیں ہے.....بس اس کا شوہر بڑا کائیاں بندہ ہے.....اس سے ذرا بچ کے رہنا.....وہ اتنے آرام سے بِک کر بیٹھنے والا نہیں ہے.....اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا وہ.....

(موسیٰ حیرت سے نامراد کی طرف دیکھتا ہے)

موسیٰ: مگر میں نے اس سے معذرت تو کر لی تھی.....اور جو بھی ہوا اس روز وہ غلط فہمی میں ہوا تھا.....

نامراد: یا میرے خدا.....کتنا بھولا ہے میرا دوست.....پتہ نہیں تمہیں دنیا داری کی کب سمجھ آئے گی.....بحر حال.....میرا مشورہ یہی ہے کہ ذرا ہوشیار رہنا.....

موسیٰ نامراد کی بات سن کر سوچ میں پڑ جاتا ہے.....

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گھر/ بیڈ روم

شہریار زہرہ کو ڈانٹتا ہے

شہریار: معافی تو تمہیں شہباز گل سے مانگنا ہی پڑے گی.....تمہیں گھر بلائے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

(زہرہ بے چارگی سے کہتی ہے)

زہرہ: لیکن شہریار میں.....

شہریار: کوئی اگر مگر نہیں.....بس میں نے جو کہا ہے تمہیں وہی کہنا ہے.....

(اتنے میں شہریار کے سیل فون پر گھنٹی بجتی ہے)

شہریار: یہ لو.....میرے فون کرنے سے پہلے خود اس کی کال آ گئی ہے.....کوئی الٹی سیدھی بات مت کرنا.....

(شہریار فون آن کرتا ہے)

شہریار: قسم سے بڑی لمبی عمر ہے آپ کی گل صاحب.....ابھی میں اور زہرہ آپ کی ہی بات کر رہے تھے.....

(شہباز فرانہ انداز میں ہنستا ہے)

شہباز: گل: زہے نصیب..... زہے نصیب..... ہمارا ذکر بھی ہوا چاہے کسی بہانے ہی سہی..... ویسے بھابھی کی ناراضگی دور ہوئی کہ نہیں.....

شہریار: ارے ناراضگی کیسی جناب..... یہ لیں..... زہرہ آپ سے بات کرنا چاہ رہی ہے.....

(شہریار فون زہرہ کے حوالے کرتا ہے۔ زہرہ بادل نخواستہ فون پکڑتی ہے شہریار اسے گھورتا ہے۔ زہرہ کے منہ سے بمشکل نکلتا ہے)

زہرہ: جی..... ہیلو..... کیسے ہیں آپ۔

شہباز: (شہباز فرانہ انداز میں ہنستا ہے) زندہ ہیں..... درگور ہیں..... بے قرار ہیں۔

(زہرہ کو غصہ آتا ہے مگر شہریار کی کڑی نظروں کی وجہ سے برداشت کرتی ہے۔ شہریار اسے غصے سے نظروں نظروں میں کچھ اشارہ کرتا ہے)

زہرہ: وہ..... دراصل مجھے یہ کہنا تھا..... کہ..... سوری..... میں اس روز غصے میں.....

شہباز: ارے اب بس بھی کر دیں بھابھی..... کیوں شرمندہ کر رہی ہیں..... ہم تو خادم ہیں آپ کے.....

(زہرہ جان چھڑا کر فون شہریار کے حوالے کر دیتی ہے۔ شہریار ڈھیٹوں کی طرح ہنس کر سیٹھ شہباز سے کہتا ہے)

شہریار: جی جناب..... اب تو گلہ دور ہو گیا ناں آپ کا۔

شہباز: بالکل..... کوئی گلہ باقی نہیں رہا..... مگر اب جرمانہ میری طرف سے بھرا جائے گا..... ایک شان دار ڈنر کی صورت میں..... جس میں آپ اور زہرہ بھابھی میرے اسپیشل گیسٹ ہوں گے..... بولو منظور ہے۔

شہریار: اس تکلف کی کیا ضرورت ہے سیٹھ صاحب.....

شہباز: دیکھو اگر انکار کیا تو میں پھر ناراض ہو جاؤں گا..... اور تمہیں ویسے بھی تو آنا ہے میری طرف ڈیل سائن کرنے کے لیے ..... تو زہرہ کو بھی لیتے آنا.....

(ڈیل سائن کرنے کا سن کر شہریار خوشی سے کہتا ہے اور ہنستا ہے)

شہریار: جو حکم جناب..... ہم دونوں حاضر ہو جائیں گے.....

زہرہ بے بسی، غصے اور نفرت سے شہریار کو دیکھ رہی ہے.....

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: ستارہ کا گھر۔ ستارہ کا کمرہ

ستارہ کی ماں کوئی نیا کپڑوں کا جوڑا ستارہ کے سامنے لا کر رکھتی ہے۔ ستارہ چونک کر ماں کو دیکھتی ہے۔

ستارہ: یہ کیا ہے اماں.....؟

ماں/شائستہ: شام کو احمد کے گھر والے آ رہے ہیں باقاعدہ رسم کرنے..... ڈھنگ سے تیار ہو جانا۔

ستارہ: (ستارہ بے چارگی سے) مگر اماں.....

ماں: اگر مگر کچھ نہیں..... اب کس کے آسرے پر بیٹھی ہو تم..... وہ تو جیل سے نکل کر جانے کس دنیا میں جا بسا ہے..... اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا..... اور آ بھی جائے تو تمہارے ابا اب کبھی اسے قبول نہیں کریں گے۔

ستارہ: مگر آپ لوگوں کو اتنی جلدی کیا ہے میرا رشتہ طے کرنے کی.....

ماں: جلدی ہے..... ایک بار جس لڑکی کی منگنی ٹوٹ جائے اس کے لیے دوبارہ اچھا رشتہ ملنا محال ہو جاتا ہے ہمارے معاشرے میں..... شکر کرو کہ تم خوش قسمت ہو..... موسیٰ کے بعد بھی اتنے ہی بڑے گھرانے کے لوگوں سے رشتہ جڑ رہا ہے تمہارا.....

ستارہ: لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی..... آپ جا کر ابا کو یہ بتا کیوں نہیں دیتیں.....

(ماں ستارہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہے)

ماں: یہ دیکھ لو میرے جڑے ہاتھ..... ان کی ہی لاج رکھ لو..... یا پھر کہیں سے زہر لا کر دے دو ہم دونوں بوڑھا بوڑھی کو.....، .....مجھ سے تو اب تمہارے ابا کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی.....

ستارہ: اماں..... ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپ.....

ماں: تو پھر میری بات مان لو..... شام کو ان لوگوں کو ذرا بھی احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے چہرے پر ماضی کے کسی دُکھ کی پرچھائیاں ہیں..... اب ہماری لاج تمہارے ہاتھ ہے.....

(ماں ستارہ کو کپڑے تھما کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ ستارہ کپڑے دیکھتی رہتی ہے اور پھر رو پڑتی ہے۔ اسی لمحے مریم اندر آتی ہے اور اپنی کزن کو روتے دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیتی ہے۔)

مریم: ارے..... یہ کیا..... رو کیوں رہی ہو..... پلیز..... چپ کر جاؤ ستارہ ورنہ میں بھی رو دوں گی.....

مریم ستارہ کو تھپکیاں دے کر تسلیاں دیتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: شہریار کا دفتر

شہریار اپنے دفتر میں بیٹھا کچھ کام کر رہا ہے۔ توقیر جاوید (لیلیٰ کا شوہر) اندر جھانکتا ہے اور ہنس کر کہتا ہے۔

توقیر: حاضر ہو سکتا ہوں ملک صاحب۔

شہریار: ارے توقیر تم..... کہاں غائب ہو یار..... تم تو میری ولیمہ پارٹی میں بھی نہیں آئے تھے..... ایسی بھی کیا مصروفیت..... اب نیکسٹ پارٹی جلد ہو گی..... مس مت کرنا۔

توقیر: ہاں یار سوری..... میں دوبئی میں تھا..... مگر لیلیٰ تو آئی تھی ناں..... میں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی تمہاری پارٹی اٹینڈ کرنے کے لیے۔

شہریار: ہاں..... وہ تو آئی تھی مگر تمہاری کمی پھر بھی سب نے محسوس کی..... ایٹی وے..... تم سناؤ..... کیا چل رہا ہے آج کل.....

(توقیر بے زاری سے کہتا ہے)

توقیر: کچھ خاص نہیں یار..... وہی روزانہ کی جھک جھک..... یہ بیویاں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد رفتہ رفتہ اتنی سائیکو کیوں ہو جاتی ہیں.....

(شہریار توقیر کی بات پر ہنستا ہے.....)

شہریار: بیویاں جو ہوئیں..... ویسے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے بیوی نام ہی ایک نفسیاتی بیماری کا ہے.....

توقیر: ہاں مگر تمہارا تو ابھی ہنی مون پیریڈ چل رہا ہے ناں..... تمہیں کاہے کا غم..... عیش کرو..... من پسند لڑکی ہاتھ آئی ہے تمہارے..... جسے پانے کے لیے آدھے شہر کی ایلیٹ Elite مری جا رہی تھی۔

(شہریار کا موڈ آف ہو جاتا ہے)

شہریار: نہیں یار..... اس کے تو ابھی سے نخرے شروع ہو گئے ہیں..... خو کو روایتی بیوی ثابت کرنے پر تلی رہتی ہے..... جبکہ تم

جانتے ہو کہ میں نے اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے چُنا تھا..... پتہ نہیں یہ عورتوں کو نکاح کے دو بول پڑھواتے ہی کس قسم کے دورے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں..... عجیب احمقانہ سا اور افسانوی Ramanticison ان کے اندر سے پھوٹنے لگتا ہے..... خود کو ہمارا مالک تصور کرنے لگتی ہیں۔

توقیر: (توقیر ہنستا ہے) مالک نہیں..... مالکن..... مگر تم فکر نہ کرو..... ابھی شروع شروع کے دن ہیں۔ سمجھ جائے گی وہ بھی دھیرے دھیرے..... ویسے اس جیسی لڑکی سے اس دقیانوسی پن کی توقع نہیں تھی مجھے..... پارٹیز میں تو بڑی الٹرا ماڈرن بنی پھرتی تھی۔

شہریار: مگر نری بینڈ وہے اندر سے..... خیر چھوڑو..... تم سناؤ..... بیوی کے بزنس میں 50% کے شیئر ہولڈر بنے کہ نہیں.....

توقیر: کہاں یار..... وہ بھی ایک نمبر کی حرافہ ہے..... اتنی آسانی سے اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دے گی..... اور اب تو بیگم صاحبہ نے نیا باڈی گارڈ بھی رکھ لیا ہے.....

(شہریار ہنستا ہے)

شہریار: باڈی گارڈ..... تمہارے علاوہ مزید کس سے خطرہ ہے اُسے..... اور تمہاری اجازت کے بنا رکھا کیسے.....

توقیر: پتہ نہیں..... مگر جانے کیوں مجھے یہ نیا بندہ ایک آنکھ نہیں بھا رہا، اس کا جلد کوئی بندوبست کرنا پڑے گا..... میرے حواس پر طاری ہوتا جا رہا ہے وہ لڑکا..... موسیٰ.....

شہریار چونک کر توقیر کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

عیسیٰ کامران کے دوست رشید کے گھر کے باہر گلی میں ایک جانب اپنی جیپ کھڑی کیے چھپ کر رشید کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔ اور رشید کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا ہے، لیکن کافی دیر بیٹھنے کے بعد۔ نگرانی کرنے کے بعد بھی اُسے رشید کے مکان کے آس پاس کوئی ہلچل نظر نہیں آتی تو عیسیٰ مایوسی سے گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے اور وہاں سے چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: شام

جگہ: شہریار کا گھر

زہرہ اپنے بیڈ روم میں اداس سی بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے کوئی نوکرانی آ کر بتاتی ہے۔

نوکرانی: وہ میڈم جی..... آپ سے کوئی لڑکی ملنے کے لیے آئی ہے..... میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔

زہرہ: (حیرت سے) لڑکی..... مجھ سے ملنے آئی ہے..... کون.....؟

نوکرانی: چندا نام بتا رہی ہے۔

(چندا کا نام سن کر زہرہ کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔)

زہرہ: چندا آئی ہے۔

زہرہ تیزی سے باہر لپکتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

جگہ: زہرہ کا گھر۔ڈرائنگ روم

زہرہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے اور بنا کچھ کہے دوڑ کر چندا سے لپٹ جاتی ہے اور رو پڑتی ہے۔ چندا بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتی اور اس کے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ کچھ دیر دونوں سہیلیاں یونہی ایک دوسرے سے لپٹی روتی رہتی ہیں۔

زہرہ: اب یاد آئی میری بے وفا.....

چندا: اری رہنے دے.....تُو نے کون سا یاد کر لیا.....آج بھی میں ہی آئی ناں.....اور وہ بھی انا سے بازار جانے کا بہانہ کر کے.....ورنہ انا جی کے پہروں کا تو تمہیں اچھی طرح پتہ ہے.....

زہرہ: ہاں.....پتہ ہے.....اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہیں وہ.....

(دونوں ہنس پڑتی ہیں چندا غور سے زہرہ کا چہرہ ٹھوڑی اٹھا کر دیکھتی ہے)

چندا: زری.....تُو خوش تو ہے ناں.....

زہرہ: اب تم آ گئی ہو ناں.....تو خوش ہو گئی ہوں.....ورنہ جی بڑا اداس تھا میرا.....

چندا: تو آئی کیوں نہیں ملنے.....

زہرہ: انا نے منع کیا تھا.....کہ تم آنا.....جب ملنا ہو گا.....ہم لوگ خود آ جائیں گے.....پر لگتا ہے انا تو اپنی زری کو بھول ہی گئی ہے.....میرا فون تک ریسو نہیں کرتیں اب تو وہ.....جانے کیا مصروفیت ہے ایسی.....جب آئیں گی ملنے تو خوب جھگڑا کروں گی تم دیکھنا.....بالکل بات نہیں کروں گی جب تک وہ مجھے خود منانے نہیں آ جاتیں.....

(دُکھی چندا اُداسی سے زہرہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔)

چندا: وہ اب تمہیں منانے نہیں آئیں گی زری.....

(زہرہ گھبرا کر چندا کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ: ایسا کیوں کہہ رہی ہو.....انا ٹھیک تو ہے ناں.....بتاؤ مجھے.....کیا بات ہے.....

چندا: تمہارے شوہر نے نکاح کے وقت یہ شرط رکھی تھی کہ شادی کے بعد نہ تم ہم سے ملنے وہاں آؤ گی نہ ہی ہم میں سے کوئی تم سے ملے گا.....مطلب ہمارا تمہارا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم.....

زہرہ: کیا.....؟.....یہ کیا کہہ رہی ہو.....ایسا کیسے ہو سکتا ہے.....میرا تم سب سے رشتہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔

چندا: یہی سچ ہے.....اسی لیے نہ تمہیں انا نے کبھی فون کیا نہ کوئی رابطہ رکھا.....اور ہم سب لڑکیوں کے لیے بھی یہی تاکید کی ہے سختی سے.....پر میرا دل تڑپ رہا تھا تم سے ملنے کے لیے.....سو کسی بہانے چلی آئی بغاوت کر کے.....مگر اب میں چلتی ہوں.....بس تمہیں دیکھ لیا.....میرے لیے اتنا ہی کافی ہے.....

(زہرہ حیران و پریشان سی کھڑی ہے۔ چندا واپس جانے کے لیے زہرہ کے گلے لگتی ہے)

زہرہ: یہ کیا کہہ رہی ہو.....میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.....انا جی ایسی فضول شرط کیسے مان سکتی ہیں شہریار کی.....میں یہ ہونے نہیں دوں گی.....تم رکو.....میں ابھی بات کرتی ہوں انا سے.....

(ٹھیک اسی لمحے شہریار ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے اور چندا کو زہرہ کے ساتھ دیکھ کر اس کا موڈ شدید آف ہو جاتا ہے)

شہریار: یہ یہاں کیا کر رہی ہے.....؟.....

(چندا گھبرا کر زہرہ سے کہتی ہے۔)

اچھا میں چلتی ہوں زری.....

چندا: اپا خیال رکھنا.....

(زہرہ چندا کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور سختی سے کہتی ہے)

زہرہ: رکو..... میں تمہیں ایسے جانے نہیں دوں گی..... انا میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتیں.....

شہریار: جانے دو اسے..... اور سنو لڑکی..... آج تو تم آ گئی ہو یہاں..... دوبارہ ایسی غلطی نہ ہو..... جا کر اس بڑھیا سے کہہ دینا کہ ملک شہریار وعدہ خلافی کرنے والوں سے بہت بُری طرح پیش آتا ہے.....

(چندا زہرہ سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ہے اور روتے ہوئے وہاں سے چلی جاتی ہے۔ زہرہ اسے آوازیں دیتی پیچھے لپکتی ہے)

زہرہ: یہ آپ نے کیا کیا..... میرے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر ہے وہ..... آپ مجھ سے یوں میرے جینے کا سہارا..... میرے یہ آخری چند رشتے چھین نہیں سکتے.....

شہریار: یہ سب تو تمہاری انا کو میرے ساتھ کانٹریکٹ سائن کرتے ہوئے سوچنا چاہیے تھا ناں..... وہ چاہتی تو انکار بھی کر سکتی تھی..... مگر پیسے کی لالچ اچھے سے اچھے مضبوط اور سگے رشتوں کو بھی کھا جاتی ہے..... تم تو پھر بھی ان کی سگی نہیں تھیں..... کان کھول کر سن لو..... اب تمہارا اس بدنام اور رُسوا گھرانے سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا..... مر گئے وہ سب تمہارے لیے اور تم ان کے لیے.....

شہریار غصے میں پیر پٹختا اندر چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔ بیڈ روم

لیلیٰ اور توقیر اپنے بیڈ روم میں لیٹے سو رہے ہیں، اچانک باہر کوئی آہٹ سی ہوتی ہے۔ لیلیٰ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے۔ جہاں کوئی سایہ سا اُسے کھڑکی سے پرے نظر آتا ہے۔ لیلیٰ گھبرا کر توقیر کو جگانے کی کوشش کرتی ہے۔

لیلیٰ: توقیر..... اٹھو..... توقیر۔

توقیر: (توقیر نیند میں بڑبڑاتا ہے) اوہوں.....

لیلیٰ: توقیر..... اٹھو پلیز..... باہر کوئی ہے۔

(توقیر نیند میں بند آنکھوں سے ڈانٹتا ہے)

توقیر: کیا مصیبت ہے..... سونے دو..... وہم ہے تمہارا.....

لیلیٰ: نہیں..... میں نے کسی کو دیکھا ہے..... کوئی باہر ہے ٹیرس کی جانب.....

(توقیر کروٹ بدل کر بے سدھ ہو جاتا ہے)

توقیر: سو جاؤ چپ کر کے..... کوئی نہیں ہے وہاں.....

لیلیٰ ایک آدھ بار دوبارہ توقیر کو جگانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ اتنے میں باہر پھر کوئی آہٹ ہوتی ہے۔ لیلیٰ گھبرا کر دوبارہ کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے جہاں کوئی سایہ چلتا نظر آتا ہے۔ لیلیٰ ڈرتے ڈرتے اٹھتی ہے اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتی ہے، مگر باہر سناٹا ہے۔ لیلیٰ بیڈ روم سے باہر نکلتی ہے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہے۔ تبھی پیچھے کی جانب سے کوئی آواز آتی ہے۔ لیلیٰ ڈر کر پلٹتی ہے اور پھر کسی کو اپنے اوپر لپکتے دیکھ کر اس کے منہ سے ایک زوردار اور خوف زدہ سی چیخ بلند ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: رات

جگہ: موسیٰ/نامراد کا گھر

موسیٰ اپنی چارپائی پر سو رہا ہے۔دوسری جانب سے نامراد کے خراٹے بھی بلند ہو رہے ہیں۔اچانک موسیٰ کے پرانے سیل فون کی گھنٹی بجتی ہے۔موسیٰ دوسری گھنٹی پر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ جاتا ہے اور تیزی میں سیل فون پر نمبر دیکھتے ہوئے کال اٹینڈ کرتا ہے۔

موسیٰ: جی.....موسیٰ بول رہا ہوں.....

(دوسری طرف کی بات سن کر موسیٰ کے منہ سے پریشانی میں بس ایک ہی لفظ نکل پاتا ہے۔)

موسیٰ: کیا.....؟.....

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 16

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر

موسیٰ تیزی میں گھبرایا ہوا سا گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتا ہے جہاں پورچ میں چند نیلی سرخ بتیوں والی پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس ٹائپ گاڑیاں کھڑی ہیں، اور چند پولیس والے کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں، موسیٰ گھبرائے ہوئے انداز میں چوکیدار وغیرہ سے پوچھتا ہے۔

موسیٰ: کہاں ہیں میڈم.....

گھر کا گارڈ..... چوکیدار وغیرہ اندر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

موسیٰ تیزی سے اندر کی جانب لپکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔لاؤنج/

ڈرائنگ روم وغیرہ

موسیٰ تیزی سے اندر داخل ہوتا ہے جہاں گھبرائی ہوئی، پریشان سی لیلیٰ پہلے سے بیٹھی ہے اور ایک پولیس والا/SHO اس سے بیان لے رہا ہے۔کمرے میں توقیر، ایک ڈاکٹر/نرس اور کچھ سپاہی بھی موجود ہیں۔موسیٰ جلدی سے لیلیٰ کی طرف بڑھتا ہے۔

موسیٰ: آپ ٹھیک ہیں میڈم.....

SHO: (پولیس والا مشکوک انداز میں موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے۔) یہ کون ہے۔

(توقیر طنزیہ انداز میں جواب دیتا ہے)

توقیر: یہ موسیٰ ہے.....، لیلیٰ کا نیا باڈی گارڈ۔

SHO: کب سے رکھا ہے اسے نوکری پر.....

لیلیٰ: ابھی..... کچھ دن پہلے.....

(ایس ایچ او لیلیٰ کے بجائے موسیٰ سے پوچھتا ہے)

SHO: جس وقت تمہاری میڈم پر یہ قاتلانہ حملہ ہوا..... تم کہاں تھے..... تمہیں تو ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا.....

موسیٰ: (موسیٰ کو شاک لگتا ہے) قاتلانہ حملہ..... میڈم.....

(لیلیٰ پولیس والے سے کہتی ہے)

لیلیٰ: موسیٰ مجھے گھر ڈراپ کر کے آف کر گیا تھا آفیسر..... رات کو موسیٰ یہاں اسٹے نہیں کرتا.....

(SHO غور سے موسیٰ کو سر سے پیر تک دیکھتا ہے)

SHO: ہم م م م..... مجھے لگتا ہے میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے..... کہاں رہتے ہو تم.....

موسیٰ: صادق آباد محلے میں.....مکان نمبر 13.....

SHO: ٹھیک ہے.....تم باہر بیٹھو.....مجھے تمہارا بیان بھی ریکارڈ کرنا ہوگا.....جانا مت.....سمجھے.....

موسیٰ: جی.....سمجھ گیا.....

(توقیر پولیس والوں کو سُنانے کے لیے دھیرے سے بڑبڑاتا ہے جسے سب سن لیتے ہیں)

توقیر: جب انجان اور اجنبی لوگوں کو گھر کا راستہ دکھایا جائے گا.....تو یہ سب کچھ تو ہوگا.....کہا تھا میں نے ہر آنے جانے والے پر بھروسہ نہیں کرتے.....

موسیٰ سنی ان سنی کر کے باہر چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

موسیٰ باہر گیٹ والے گارڈ، کسی نوکر کے ساتھ بات کر رہا ہے۔

نوکر: پتہ نہیں.....ہم لوگ تو سارے اپنے سرونٹ کوارٹرز میں سو رہے تھے کہ اچانک چیخ و پکار مچ گئی۔ باہر نکلے تو پتہ چلا کہ کسی نے میڈم پر حملہ کیا ہے اور بھاگ نکلا.....شکر ہے میڈم کو چوٹ نہیں آئی.....لگتا ہے حملہ آور کا نشانہ چوک گیا.....

موسیٰ: اور گیٹ والے گارڈز.....وہ کہاں تھے اس وقت.....

نوکر: انہیں تو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا.....ایسا لگتا ہے حملہ کرنے والے کو مکان کے نقشے کا اچھی طرح پتہ ہے.....وہ گارڈز کے پہنچنے سے پہلے ہی پچھلے لان والے راستے سے فرار ہو چکا تھا.....

(اتنے میں SHO باہر آتا ہے اور سارے نوکروں اور موسیٰ سے کہتا ہے۔)

SHO: ہاں بھئی..... بیان ریکارڈ ہو گئے تم سب لوگوں کے.....اب میری بات غور سے سنو.....جب تک تفتیش جاری ہے.....تم میں سے کوئی بھی یہ علاقہ یا شہر چھوڑ کر کہیں باہر نہیں جاؤ گے.....کیا سمجھے.....

(سارے نوکر سر ہلاتے ہیں۔ SHO تمکم چل کر موسیٰ کے قریب آتا ہے اور زور دے کر موسیٰ سے کہتا ہے۔)

SHO: اور خاص کر تم.....انڈر سٹینڈ.....

موسیٰ: (موسیٰ سر ہلاتا ہے) جی.....

ایس ایچ او آگے بڑھ جاتا ہے۔ پس منظر میں توقیر کمینی مسکراہٹ لیے کھڑا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: رات

موسیٰ باہر پورچ یا لاؤنج وغیرہ مین انتظار کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد اندر سے لیلیٰ باہر آتی ہے۔

لیلیٰ: موسیٰ تم واپس نہیں گئے ابھی تک.....اس پولیس والے نے تمہیں زیادہ پریشان تو نہیں کیا.....

موسیٰ: نہیں.....پولیس والوں کا کام تفتیش کرنا ہے.....سو وہ کرتے رہیں گے.....آپ ٹھیک ہیں.....اس حملہ آور نے آپ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا.....

لیلیٰ: (لیلیٰ مسکراتی ہے) نہیں.....بس بچت ہو گئی.....لیکن مجھے لگتا ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں بچوں گی.....فلم انڈسٹری میں بہت دشمن پال لیے میں نے ان دس پندرہ سالوں میں.....ظاہری بھی اور ڈھکے چھپے بھی.....

موسیٰ: آج سے میں رات یہیں آپ کے بنگلے پر ہی گزاروں گا.....آپ کوئی سرونٹ کوارٹر دلوا دیں مجھے.....

(لیلیٰ غور سے موسیٰ کو دیکھتی ہے)

لیلیٰ: کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے تمہیں گارڈ رکھ کر تمہاری جان بھی خطرے میں ڈال دی ہے.....رحم آتا ہے تمہاری جوانی پر مجھے.....

موسیٰ: میں نے خود پر رحم کھانا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا میڈم جی.....پلیز آپ میرے یہاں رہنے کا کوئی بندوبست کروادیں..... آپ کی جان کو خطرہ ہے.....

(لیلیٰ چند لمحے سوچتی ہے اور پھر سر ہلاتی ہے۔)

لیلیٰ: ٹھیک ہے.....میں غفور سے کہتی ہوں وہ تمہارے لیے کوئی سرونٹ کوارٹر صاف کروادے.....کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے بتادینا.....

موسیٰ پلٹ کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا بیڈ روم

زہرہ کی آنکھوں سے نیند دور ہے، قریب ہی بیڈ پر شہریار آرام سے سو رہا ہے۔ زہرہ کو موسیٰ کی کوئی کہی بات یاد آتی ہے۔

موسیٰ

فلیش بیک

New-Take

Video: تم نے تیسری مرتبہ مجھے شرعی حلیئے اور مذہبی ہونے کا طعنہ دیا ہے.....کیا محبت کچھ خاص حلیہ یا شناخت دیکھ کر کی جاتی ہے.....یا پھر مذہب مجھ جیسے انسان کو محبت کرنے سے منع کرتا ہے.....؟.....اور میں تمہیں کہیں باہر چلنے یا میرے ساتھ چھپ کر ملنے کے لیے تو نہیں کہہ رہا.....صرف تم سے یہ اجازت مانگ رہا ہوں کہ تم شرع اور مذہب کے مطابق اجازت دو کہ میرے گھر والے تمہارے گھر تمہارا رشتہ لے کر آئیں.....،..... مجھے محبت میں عورت کی عزت کرنا سکھایا گیا ہے..... اسے رُسوا کرنا نہیں..... میں تمہیں اپنے گھر کی عزت بنا کر لے جانا چاہتا ہوں.....،.....اور تمام عمر تمہاری عزت کی حفاظت کرنے کی قسم کھاتا ہوں.....اگر تمہیں قبول ہو تو.....

زہرہ موسیٰ کے فلیش بیک سے نکل کر دوبارہ پریزنٹ Present میں آتی ہے اور اس کی نظر اپنے قریب سوئے شہریار پر پڑتی ہے۔ زہرہ کو شہریار کی کہی انسلٹنگ Insulting باتیں یاد آتی ہیں۔

شہریار

Vidco/flash back: ایسی نظریں تم نے پہلے بھی بہت دیکھ رکھی ہوں گی.....تم اور میں دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے.....بس میں چاہتا ہوں کہ تم سمارٹلی پلے کرو.....تم جیسی سمارٹ لڑکی ان احمق مردوں کے جذبات سے کھیلنا اچھی طرح جانتی ہے.....

زہرہ دونوں مردوں کی باتوں کے درمیان فرق محسوس کر کے بے چینی سے پہلو بدلتی ہے، اور سوچتی رہتی ہے۔ باہر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: توقیر کا دفتر یا آؤٹ ڈور

شہر میں دن نکل رہا ہے۔

(لیلیٰ کے سیکٹری اور توقیر میں بات چیت)

فیضی: یہ کیا غضب کر دیا باس..... اس مصیبت کو گھر میں ٹھہرانے کا جواز فراہم کر دیا..... اپنا کام مزید مشکل کر دیا.....

توقیر: (توقیر مسکراتا ہے) تم نہیں سمجھو گے..... میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کا ماہر ہوں..... اور موسیٰ کو گھر ٹھہرا کر میں نے اپنے دونوں شکاروں کو قریب کر دیا ہے..... پولیس کو پہلے ہی موسیٰ پر شک کے راستے پر ڈال دیا ہے میں نے..... اب لیلیٰ کے ساتھ جو بھی ہو گا..... اس کا سارا الزام موسیٰ کے سر ہی جائے گا.....

(فیضی بھی مسکراتا ہے)

فیضی: اوہ..... اب سمجھا..... آپ نے ضرور موسیٰ کے پرانے پولیس ریکارڈ کے بارے میں بھی ہوشیار کر دیا ہو گا..... اب جو بھی واردات ہو گی شک سیدھا موسیٰ نامی اقدام قتل کے مجرم پر ہی جائے گا..... واہ باس واہ..... اب میں سمجھا کہ رات والے حملہ آور کا نشانہ چوکا نہیں تھا..... اسے صرف ڈرانے کا ہی حکم تھا.....

(توقیر ہنستا ہے)

توقیر: دیر سے سمجھتے ہو..... مگر سمجھ جاتے ہو..... اب بس مجھے اس پاور آف اٹارنی پر لیلیٰ کے Signature سگنیچر زکا انتظار ہے، جس کے بعد اس کے تمام اکاؤنٹس اور پراپرٹی کا میں کو سکھیڈی بن جاؤں گا..... آخر اتنی بڑی جائیداد اور بینک بیلنس کو سنبھالنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے..... (توقیر ہنستا ہے)

(فیضی مکھن لگاتا ہے)

فیضی: مگر فارن جا کر اپنے اس خادم کو بھول تو نہیں جائیں گے ناں باس.....

(توقیر اسے دیکھ کر مسکراتا ہے)

توقیر: ناں..... ناں.....

تم کوئی بھولنے والی چیز ہو بھلا..... بس یونہی مجھے اپنی لیلیٰ میڈم کی خبریاں پہنچاتے رہو.....

دونوں ہنستے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ کہیں جانے کی تیاری میں ہے۔ وہ ڈرائیور سے کہتی ہے۔

لیلیٰ: گاڑی لگوا دو..... میں ابھی نکل رہی ہوں مزار پر چادر چڑھانے کے لیے..... اور موسیٰ کو بھی خبر کر دو.....

(اتنے میں موسیٰ اندر آتا ہے)

موسیٰ: آپ نے بلایا تھا میڈم.....

لیلیٰ: ہاں..... میں نے کل رات والے حادثے کے بعد منت مانگی تھی مزار پر چادر چڑھانے کی..... تم تیار ہو جاؤ..... ہم ابھی

نکل رہے ہیں نیلا گنبد مزار کے لیے..... وہاں عرس کی تقریبات شروع ہونے والی ہیں.....

(نیلا گنبد مزار کا نام سن کر موسیٰ کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں)

موسیٰ: نیلا گنبد.....

لیلیٰ: ہاں..... چلو جلدی کرو..... میں اب اکیلے جانے کا رسک نہیں لے سکتی..... تمہیں آس پاس گہری نظر رکھنا ہوگی..... پتہ نہیں کیوں مگر مجھے یہ وہم ہوتا جا رہا ہے کہ کوئی نادیدہ دشمن ہر وقت میری تاک میں ہے.....

(موسیٰ دھیرے سے مجبوراً سر ہلاتا ہے)

موسیٰ: آپ فکر نہ کریں..... میں آپ کے ساتھ رہوں گا.....

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن۔ سوا تاج

جگہ: نیلا گنبد مزار میں عرس کی چہل پہل

زائرین ادھر اُدھر چل پھر رہے ہیں۔ ایک جانب لنگر جاری ہے۔ ایک طرف منت کی جالی پہ منت کے دھاگے باندھے جا رہے ہیں۔ پھول والے پھول کی چادریں بیچ رہے ہیں۔ مریدین پیر قدرت اور پیر فضل سے مل کر دعائیں لے رہے ہیں۔ پیر قدرت انتظامات کی ہدایات کر رہا ہے۔ مرید بھاگ بھاگ کر کام کر رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد والا مزار

بیرونی دروازہ۔ عرس کی چہل پہل

لیلیٰ دو بڑی گاڑیوں میں اپنے چند نوکروں/سیکرٹری اور موسیٰ وغیرہ کے ساتھ مزار کے بیرونی دروازے پر آ کر رُکتی ہے اور اس کے نوکر سیکرٹری وغیرہ جلدی سے پھولوں کی چادر لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ موسیٰ گاڑی سے اتر کر ایک نظر اپنے باپ قدرت اللہ کے زیر انتظام چلنے والے مزار (نیلا گنبد) کے دروازے پر ڈالتا ہے۔ پس منظر میں کوئی قوالی چل رہی ہے۔ پھر موسیٰ لیلیٰ کے ساتھ مزار کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور آس پاس گہری نگاہ رکھتے ہوئے آتے جاتے لوگوں کو ٹٹولتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد مزار/اندرونی ایریا

لیلیٰ کے نوکر وغیرہ پھولوں کی چادر لیے آگے بڑھتے ہیں۔ موسیٰ لیلیٰ کے ساتھ ہے۔ اسی لمحے قدرت اللہ جو چادر چڑھانے والی جگہ پر پیر فضل کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس کی نظر موسیٰ پر پڑتی ہے جو ایک فلم اسٹار عورت کے ساتھ چادر چڑھانے آیا ہوا ہے۔ موسیٰ کی نظر بھی باپ کی نظر سے ٹکراتی ہے۔ لیلیٰ موسیٰ سے کچھ کہتی ہے۔ موسیٰ سر ہلاتا ہے اور لیلیٰ ایک جانب سے اور موسیٰ دوسری جانب سے پھولوں کی چادر پکڑ لیتا ہے اور دونوں مل کر چادر چڑھاتے ہیں۔ پیر قدرت کا چہرہ بیٹے کو ایک بے پردہ عورت کے ساتھ گھومتے دیکھ کر غصے سے سُرخ ہو جاتا ہے۔

پیر قدرت کی کیفیت کو پیر فضل محسوس کر لیتا ہے اور اس سے پہلے کہ پیر قدرت آگے بڑھ کر بیٹے کو کچھ کہے یا نکل جانے کا

حکم دے۔ پیر فضل، قدرت اللہ کا ہاتھ پکڑ کر دباتا ہے اور اسے آس پاس لوگوں کی موجودگی اور موقعے کی نزاکت کا احساس دلاتا ہے۔ پیر قدرت خون کے گھونٹ پی کر بادلِ نخواستہ وہیں بے بس سا کھڑا رہتا ہے۔ لیلیٰ چادر چڑھانے کے بعد وہیں کھڑے کھڑے دعا مانگتی ہے۔

پیر قدرت کے پیر چھو کر دعا لیتی ہے..... اور پلٹ جاتی ہے۔

موسیٰ بھی دعا ختم کرنے کے بعد چپ چاپ وہاں سے لیلیٰ کے ساتھ پلٹ جاتا ہے۔ قدرت غصے سے بیٹے کو جاتے دیکھتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

توقیر دفتر کے اندر جھانکتا ہے۔ کمرہ خالی ہے توقیر باہر بیٹھی لیلیٰ کی پی۔اے سے پوچھتا ہے۔

توقیر: میڈم کہاں ہیں.....

P.A پی۔اے: جی سر..... میڈم تو نہیں آئیں ابھی تک

توقیر: گھر سے تو صبح سویرے ہی نکل پڑی تھی..... کہاں گئیں ہیں۔

پی۔اے: سر انہیں شاید کسی مزار پر جانا تھا دعا کرنے کے لیے..... اسٹاف بھی ان کے ساتھ گیا ہے۔

توقیر: (توقیر کا موڈ دُعا اور مزار کا نام سن کر آف ہو جاتا ہے اور وہ دھیرے سے بڑبڑاتا ہے) ایک تو میں اس عورت کے ان ڈراموں سے بہت تنگ ہوں.....

(پی۔اے سمجھتی ہے کہ اس سے کچھ کہا ہے وہ جلدی سے پوچھتی ہے)

پی۔اے: جی سر.....؟

توقیر: کچھ نہیں..... تم اپنا کام کرو.....

توقیر پلٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا گھر

پیر قدرت کا غصہ قابو سے باہر ہو رہا ہے اور اس کا پارہ موسیٰ کو لیلیٰ کے ساتھ پھرتے دیکھ کر آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ وہ طیش میں کف بہاتے ہوئے ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ کمرے میں اس کی بیوی، بہو اور بہن بھی پریشان کھڑی ہیں، مگر ان سے قدرت کا غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا۔

قدرت: بس..... یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا اس ناخلف اور ناہنجار اولاد کے ہاتھوں..... سارا زمانہ ہم پر آج ہنس رہا ہوگا کہ سیدوں کی اولاد سر بازار کیا عیاشیاں کرتی پھر رہی ہے..... میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ عرس کے زائرین اور اپنے مریدوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے بجائے وہیں زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما کر زندہ دفن ہو جاؤں.....

(بیوی گھبرائی ہوئی ہے)

ہاجرہ: خدا نہ کرے..... یہ کیسی بدفال زبان سے نکال رہے ہیں آپ پیر جی.....

قدرت: مت کہو مجھے پیر.....،لوگ کیا کہیں گے کہ قدرت اللہ سارے زمانے کو تو نصیحتیں کرتا پھرتا ہے اور خود اس کا بیٹا..... لاحول ولاقوۃ.....

خدیجہ: مگر ایسا کیا کر دیا ہے موسیٰ نے بھائی جان..... کچھ بتائیں تو سہی.....

قدرت: بھرے بازار میں ایک بار پھر ہماری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے اس نافرمان نے.....،..... کسی بدنامِ زمانہ فلمی اداکارہ کے ساتھ سرِعام گھوم پھر رہا ہے وہ سارے شہر میں.....، رنگ رلیاں منا رہا ہے اس عورت کے ساتھ.....، اور اس کم بخت کی ہمت تو دیکھو..... اسے لے کر ٹھیک عین عرس کے دن مزار پر بھی آ گیا..... وہ جانتا تھا کہ میں اپنے مریدوں کے ساتھ وہیں ہوں گا..... جان بوجھ کر موسیٰ اس عورت کو میرے پاس لے کر آیا تھا تاکہ وہ مجھے سارے زمانے میں رسوا کر سکے.....

(ہاجرہ حیرت اور دکھ سے ہکا بکا سی منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔) (سکینہ پریشانی سے سن رہی ہے)

ہاجرہ: ہو سکتا ہے بات ویسی نہ ہو جیسے آپ.....

قدرت: تم تو بس چپ ہی رہو..... بڑا گھمنڈ تھا ناں تمہیں اپنے بیٹے کی تربیت پر.....اور بڑی پریشان پھرتی تھیں کہ وہ جیل سے نکل کر کہاں دربدر خوار ہو رہا ہوگا..... تو خوش ہو جاؤ یہ جان کر کہ تمہارا بیٹا کسی بدنام اور بدکردار فلم والی عورت کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے..... جانے نکاح کے ساتھ یا نکاح کے بغیر.....،.....

(سکینہ بڑی مشکل سے ہمت کر کے کچھ بولنے کی کوشش کرتی ہے)

سکینہ: موسیٰ بھائی ایسے نہیں ہیں تایا جان.....، یہ ضرور کوئی غلط فہمی ہے۔

قدرت: (قدرت پھٹ پڑتا ہے) کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی مجھے.....، اپنی اولاد کی ہر رمز سے خوب واقف ہوں میں.....اور یہ عیسیٰ کہاں رہ گیا ہے.....اب تک تو اسے لوٹ آنا چاہیے تھا..... پورا دن ضائع کر دیا آج کا اس نے.....فون کرو اسے کہ فوراً واپس آئے.....ایک نمبر کا نالائق ہے یہ تمہارا شوہر۔

(سکینہ گھبرا کر کہتی ہے)

سکینہ: جی جی..... بات کی تھی میں نے.....وہ راستے میں ہے.....

قدرت: پتہ نہیں یہ عیسیٰ میرے بعد یہ سب کچھ کیسے سنبھالے گا..... مجھے تو سب ڈوبتا نظر آ رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر۔لاؤنج وغیرہ

زہرہ کسی کام میں مصروف ہے۔لاؤنج میں رکھا لینڈ لائن فون بج اٹھتا ہے، زہرہ فون اٹھاتی ہے۔

زہرہ: ہیلو.....

(دوسری طرف اس کا شوہر شہریار ہے)

شہریار: ہاں.....میں بول رہا ہوں.....

زہرہ: جی.....کیسے فون کیا.....

شہریار: صبح جلدی میں آفس کے لیے نکلنا پڑا مجھے.....تمہیں یاد دلانا بھول گیا تھا کہ آج سیٹھ شہباز کی طرف ڈنر ہے ہمارا..... بھولنا مت.....میں جلدی لوٹ آؤں گا.....

(زہرہ ہچکچاتی ہے)

زہرہ: شہریار..... آپ اکیلے ہو آئیں پلیز..... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے.....

شہریار: اوہ کم آن..... کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت کو..... تمہیں چلنا ہوگا..... کیونکہ تم جانتی ہو کہ یہ دعوت خاص طور پر انہوں نے میرے اور تمہارے اعزاز میں رکھی ہے..... کچھ اور دوست بھی ہوں گے وہاں پر..... وقت پر تیار ہو جانا..... اور پلیز کچھ ڈھنگ کا پہن لینا..... جو تمہارے ساتھ سُوٹ کرے..... کوئی تمبومت اوڑھ لینا..... ویئر سمتھنگ سمارٹ اینڈ کیژول wear samething smart & casual.....

زہرہ: مگر شہریار..... میں.....

(شہریار سنی ان سنی کر دیتا ہے)

شہریار: اچھا میری دوسری کال آ رہی ہے..... سی یو.....

فون کٹ جاتا ہے۔ زہرہ غصے اور بے بسی سے فون کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

لیلیٰ موسیٰ کے ساتھ اپنے آفس میں داخل ہوتی ہے جہاں پہلے سے اس کا شوہر توقیر اس کا انتظار کر رہا ہے، موسیٰ پیچھے ہی رک جاتا ہے۔

توقیر: کہاں چلی گئی تھیں..... بڑی دیر لگا دی..... میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

لیلیٰ: مزار پر منت کی چادر چڑھانے گئی تھی.....

توقیر: اوہ کم آن لیلیٰ..... کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے..... جیسی الٹرا ماڈرن عورت کی سوچ بھی اتنی فرسودہ اور دقیانوس ہو سکتی ہے..... یہ مزار، منت..... پھولوں کی چادریں..... اٹھارویں صدی عیسوی کی باتیں ہیں ساری..... دنیا کا ہر دھندا ہوتا ہے ایسی جگہوں پر آج کل..... (موسیٰ اپنے تاثرات پر کنٹرول کرتا ہے۔)

لیلیٰ: اپنی اپنی سوچ اور عقیدے کی بات ہے..... مجھے تو سکون ملتا ہے ایسی کسی جگہ جا کر.....

توقیر: اینی وے..... anyway..... مجھے تو یہ ضعیف الاعتقادی حماقت لگتی ہے..... مزار پر جانے سے اور وہاں منت مانگنے سے ہی اگر لوگوں کے مسائل حل ہونے لگتے تو خود وہاں مزار پر پڑے فقیروں کا حال اتنا خراب نہ ہوتا.....

(تبھی توقیر کی توجہ اپنے پیچھے کھڑے موسیٰ پر مبذول ہوتی ہے اور وہ بھڑک کر غصے میں کہتا ہے)

توقیر: تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو..... اتنی عقل نہیں ہے تم میں کہ جب تمہارے دو بڑے باسز بات کر رہے ہوں تو نوکروں کو وہاں سے دفع ہو جانا چاہیے.....؟.....

(موسیٰ اپنا لہجہ نارمل رکھ کر جواب دیتا ہے۔)

موسیٰ: اس کا حکم مجھے صرف میڈم دے سکتی ہیں.....

(توقیر بھڑک اٹھتا ہے)

توقیر: واٹ..... اب تم مجھے جواب دو گے..... دو ٹکے کے گارڈ ہو تم صرف..... ہاؤ ڈیر یو.....

(لیلیٰ معاملے کو ٹھنڈا کرتی ہے)

لیلیٰ: موسیٰ تم باہر جاؤ..... میں ضرورت پڑنے پر تمہیں بلوا لوں گی..... اٹس او کے its ok

(موسیٰ چپ چاپ پلٹ کر نکل جاتا ہے۔ توقیر ابھی تک غصے میں بل کھا رہا ہے)

توقیر: تم نے اسے کچھ زیادہ ہی سر نہیں چڑھا لیا..... اس کی یہ مجال..... کہ مجھے جواب دے..... مجھے..... توقیر جاوید کو.....

لیلیٰ: ریلیکس..... وہ صرف اپنی ڈیوٹی کر رہا ہے..... میں نے ہی اسے کہا تھا کہ میرے ساتھ رہے..... اچھا تم بتاؤ..... کیا بات کرنی تھی.....

توقیر: سارا موڈ خراب کر دیا ہے میرا تمہارے اس جاہل گارڈ نے..... میں تمہیں وارن کر رہا ہوں کہ اس پر اتنا زیادہ ٹرسٹ نہ کرو.....

لیلیٰ: اچھا بابا..... تم کہو تو سہی.....

توقیر: سیٹھ شہباز نے آج ڈنر دیا ہے شہریار کی ویڈنگ سیلی بریشن کے لیے..... تیار رہنا..... ہمیں پارٹی اٹینڈ کرنے جانا ہے..... پچھلی بار کا گلہ بھی باقی ہے ابھی ان کا.....

لیلیٰ: تم کہتے ہو تو چلی جاؤں گی..... مگر فرینکلی سپیکنگ frankly speaking مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا..... ہی از اے شوآف

توقیر: آدھے ملک کی انڈسٹری کا مالک ہے..... شوآف تو بنتا ہے اس کا.....

لیلیٰ: اوکے..... مگر میرا پرسنل گارڈ میرے ساتھ رہے گا..... آئی کانٹ ٹیک اینی موررسک..... تم تو ایسی پارٹیوں میں جاتے ہی سب کچھ بھول کر اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہو.....

i need some one to stay with me there.

//Cut//

Scene No # 15

وقت: شام

جگہ: کاشانۂ پیراں

عیسیٰ کا کمرہ..... عیسیٰ اور سکینہ میں بات چیت۔ سکینہ پریشان سی کھڑی ہے۔

عیسیٰ: کیا.....؟..... موسیٰ بھائی اور فلم اسٹار لیلیٰ

سکینہ: ہاں..... تایا جان نے دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا ہے۔ تب سے غصے میں اُبل رہے ہیں۔

عیسیٰ: تبھی میں کہوں یہ گھر میں زلزلہ کیوں آیا ہوا ہے۔

سکینہ: تم پر بھی بہت ناراض ہو رہے تھے..... کہ ایک چھوٹے سے کام میں اتنی دیر لگا دی.....

عیسیٰ: مجھے پتہ تھا کہ یہ سارا نزلہ مجھ غریب پر ہی گرے گا..... خود ہی تو شہر سے باہر بھیجا تھا انہوں نے مجھے مزار کے کام سے .....اب دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے..... اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان معاملات کی زیادہ سوجھ بوجھ بھی نہیں ہے..... وہ موسیٰ بھائی تھے جو پلک جھپکتے سارے مسئلے حل کر لیا کرتے تھے..... میرے بس کا نہیں ہے یہ سارا جنجال.....

سکینہ: تایا جان کا بھی یہی خیال ہے..... مگر تم وہ سب چھوڑو اور موسیٰ بھائی کی فکر کرو..... کچھ خبر لو جا کر.....

عیسیٰ: یہ بھائی بھی ناں..... اب یہ فلم اسٹار لیلیٰ کہاں سے بیچ میں گود پڑی؟ ابا کا پارہ تو ہائی ہونا ہی تھا..... موسیٰ بھائی بھی چُن چُن کر ایسے کام کرتے ہیں جن سے جلتی پر مزید تیل پڑتا رہے..... اچھا دیکھتا ہوں..... یہ کیا نیا معاملہ ہے،..... ویسے وہ فلم اسٹار اپنے وقتوں میں تھی بڑی پیاری..... پتہ نہیں اب کیسی دِکھتی ہو گی.....

سکینہ شوہر کے کمنٹ پر اسے گھورتی ہے۔ عیسیٰ گھبرا جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: رات

جگہ: سیٹھ شہباز گل کا گھر۔لان۔پارٹی

تو قیر اور لیلیٰ پہلے پہنچتے ہیں۔موسیٰ گاڑی سے اترتا ہے اور لیلیٰ کے لیے دروازہ کھولتا ہے،شہباز اپنے خاص ٹھرکی انداز میں آگے بڑھ کر لیلیٰ کا استقبال کرتا ہے۔

شہباز: آیئے آیئے.....خوش آمدید.....خوش آمدید.....بھئی تو قیر.....تمہاری بیگم کو دیکھ کر تو مجھے اس کی ساری کلاسک فلمیں یاد آ جاتی ہیں.....اور میرا دل پھر سے وہی کھلنڈرا جوان بن جاتا ہے.....(موسیٰ لیلیٰ کے پیچھے ہے)

(تو قیر ہنستا ہے)

تو قیر: آپ جیسے قدر دان اب کہاں سیٹھ جی.....زمانہ بڑا بے مروت ہو گیا ہے.....

(لیلیٰ شہباز پر طنز کرتی ہے مگر مسکرا کر کہتی ہے)

لیلیٰ: دن میں کتنوں کی اور کتنی دفعہ یہ تعریف کرتے ہیں آپ گل صاحب.....مجھے تو یہ جملے کچھ باسی سے معلوم ہوتے ہیں.....

(شہباز زور سے ہنس پڑتا ہے)

شہباز: آپ کی اس زندہ دلی کے تو ہم دیوانے ہیں لیلیٰ میڈم.....

اتنے میں پس منظر میں شہر یار کی کروزنگ رکتی ہے۔گارڈ اور ڈرائیور جلدی سے اتر کر زہرہ اور شہر یار کے لیے دروازہ کھولتے ہیں۔موسیٰ کی پیٹھ اس جانب ہے لہٰذا اسے زہرہ کی آمد کا پتہ نہیں چلتا۔مگر شہباز گل سیاہ ساڑھی اور کھلے بلاؤز میں گاڑی سے اترتی زہرہ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور زہرہ کے حسن پر اس کی رال ٹپکنے کو بے قرار ہو جاتی ہے،اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دُور ہی سے زہرہ کو آتے دیکھ کر بول اٹھتا ہے۔

شہباز گل: وہ آئے ہمارے گھر میں.....خدا کی قدرت ہے،کبھی ہم ان کو کبھی گھر کو دیکھتے ہیں.....ماشاءاللہ.....لگتا ہے حُسن کی پوری کان چلی آ رہی ہو.....

شہباز کی نظروں کے تعاقب میں سب پلٹ کر پیچھے دیکھتے ہیں،مگر موسیٰ ویسے ہی مؤدب سیدھا کھڑا رہتا ہے۔تبھی زہرہ اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھتی ہے اور بے خیالی میں دونوں کی نظر اچانک ٹکرا جاتی ہے۔دونوں پر جیسے ایک بجلی سی گرتی ہے،موسیٰ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ جاتا ہے،جبکہ زہرہ کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔وہاں سیٹھ شہباز اپنے ٹھرکی پنے سے باز نہیں آ رہا اور زہرہ کے جسم میں اپنی ایکس رے والی نظریں گھمائے دھڑلے سے اس کی چیپ تعریف کیے جا رہا ہے۔

شہباز: زہرہ بیگم.....دیکھیں پھر سے مائنڈ نہ کر لیجئے گا.....مگر میں بندہ ہوں حُسن پرست.....اور ایسا سچا اور کھرا حُسن سامنے ہو تو بھلا پھر کون کافر تعریف کیے بنا رہ سکتا ہے.....قسم سے سیاہ ساڑھی میں آپ کیا غضب ڈھا رہی ہیں.....،ساری محفل کی روشنیاں بند بھی کر دوں تو آپ کے حُسن کا نور کافی ہے اجالا کرنے کے لیے.....ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں سورج جلتے ہیں آپ کے اس گلابی جسم میں.....

(زہرہ کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ)(موسیٰ کے اندر غصے کا طوفان اُمڈ رہا ہے)

زہرہ غصے اور شرمندگی سے شہر یار کی طرف دیکھتی ہے۔موسیٰ بڑی مشکل سے سیٹھ کی یہ ساری بکواس سن کر خود پر قابو کیے کھڑا ہے،لیلیٰ زہرہ کی کیفیت سمجھ کر جلدی سے بات کو مزاح کا رنگ دیتی ہے۔

لیلیٰ: تم ان کی باتوں کا بُرا نہ منانا زہرہ.....ابھی کچھ دیر پہلے یہ جناب یہ ساری باتیں میرے لیے کر رہے تھے.....عادت ہے

ان کی ہر جگہ منہ مارنے کی

(لیلیٰ مسکراتی ہے)

(توقیر بیوی کی اتنی کھلی بات سن کر بوکھلا سا جاتا ہے اور جلدی سے کہتا ہے۔)

توقیر: سیٹھ صاحب کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے ہی کر لیں گے ... یا مہمانوں کے لیے کچھ اور بھی "بندوبست" کیا ہے آپ نے

(☆ لفظ بندوبست خاص طریقے سے کہتا ہے۔for Drinks)

(شہباز جلدی سے کہتا ہے)

شہباز: ہاں ہاں ... کیوں نہیں ... سارے بندوبست پورے ہیں ... آیئے ... آ جایئے .....

سب لوگ آگے بڑھتے ہیں، موسیٰ وہیں کھڑا رہتا ہے۔ زہرہ اور موسیٰ کی نظر پھر ملتی ہے۔ زہرہ شرمندگی سے نظر جھکا لیتی ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: رات۔ پارٹی

جگہ: سیٹھ شہباز کا گھر

پارٹی جاری ہے، موسیٰ لان میں کچھ فاصلے پر کھڑا ہے جبکہ سامنے کچھ دور شہباز دونوں میاں بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنی دھن میں جانے کیا کچھ بول رہا ہے، شہباز کی ٹون سے لگتا ہے کہ جیسے وہ نشے میں ہے۔ توقیر اور شہریار کے ہاتھ میں بھی پیگ (جام) ہیں۔ اور بات چیت جاری ہے۔ آواز

(موسیٰ تک بھی آ رہی ہے موسیٰ کی نظریں مستقل زہرہ پر جمی ہیں)

سیٹھ شہباز: بھئی ملک صاحب ... آپ کی یہی بات مجھے بُری لگتی ہے ... ابھی تو محفل شروع ہوئی ہے ...، کچھ تو خمار بڑھنے دیں ...، بزنس کی باتیں کرنے کے لیے تو ساری رات پڑی ہے ... کیوں زہرہ ... تم کیا کہتی ہو ...،

(زہرہ اپنا اس طرح براہ راست نام پکارے جانے پر گڑبڑا سی جاتی ہے اور کچھ ناگواری سے شہباز کی طرف دیکھتی ہے۔)

زہرہ: میں کیا کہہ سکتی ہوں ... یہ آپ دونوں کے آپس کا معاملہ ہے ...

(شہباز لوفروں کی طرح ہنستا ہے)

شہباز: یہ بھی ٹھیک ہے ... اچھا چلو وہ بتا دو جو تمہیں پتہ ہے ... یہ ملک شہریار ... تمہارا بندہ ہے ... یہ شوہر زیادہ اچھا ہے ... یا بزنس مین ...

(شہباز کی بات پر توقیر اور شہریار ہنس پڑتے ہیں۔ لیلیٰ زہرہ کی حالت محسوس کر کے کہتی ہے)

لیلیٰ: لگتا ہے آپ کو آج ابھی سے چڑھ گئی ہے سیٹھ جی ... بہتر ہے ہاتھ روک لیں ...

(شہباز ڈھٹائی سے ہنستا ہے اور زہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب لیلیٰ کو دیتا ہے۔)

شہباز: آپ لوگوں جیسے حسین لوگ سامنے بیٹھے ہوں تو پھر کس کافر کو نہیں چڑھے گی ... یہ حسن کا نشہ ہے لیلیٰ بیگم ... اور بھئی توقیر ... شہریار ... تم دونوں رُک کیوں گئے ... جب تک محفل باقی ہے ... دور چلنا چاہیے ...

(شہباز پیچھے پلٹ کر کسی بیرے کو آواز دیتا ہے، مگر بیرے وہاں سے دور ہیں)

شہباز: ہے ... بوائے ...

(توقیر کو موسیٰ کی انسلٹ Insult کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ جاتا ہے اور وہ جان بوجھ کر موسیٰ کو بلاتا ہے)

توقیر: ہے یو ... Hey you ... سُنا نہیں سیٹھ صاحب بُلا رہے ہیں

شہباز: سم مور ڈرنکس some more Drinks ... اس ٹیبل پر ... مگر جلدی ...

(زہرہ کی نظر موسیٰ پر پڑتی ہے جو اس کو دیکھ رہا ہے۔ موسیٰ سیٹھ کی بات نہیں سمجھتا)

موسیٰ: جی ... ؟ .....

(شہباز موسیٰ کی بات سن کر غصے میں آ جاتا ہے)

شہباز: سُنا نہیں تم نے ... ہمیں مزید ڈرنکس چاہیے ..... جاؤ جا کر بارٹینڈر سے کہو کہ یہاں سرو serve کرے ... ہمارا نشہ نہیں ٹوٹنا چاہیے ..... گو گو ..... ہری اپ .....

(موسیٰ اپنے اوپر کنٹرول قائم رکھتا ہے اور سکون سے کہتا ہے)

موسیٰ: جی ..... بہتر .....

زہرہ پریشان سی بیٹھی اس موسیٰ کو دیکھ رہی ہے جو دوسری بات کہنے سے پہلے ہی سامنے والے کا منہ توڑ دیا کرتا تھا۔ موسیٰ خاموشی سے پلٹ جاتا ہے۔ زہرہ اسے جاتا دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: رات، پارٹی جاری ہے

دور موسیٰ ایک جانب کھڑا پارٹی میں شہباز کی خرمستیاں دیکھ رہا ہے۔ شہباز کسی بات پر زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔ شہریار اور توقیر پوری طرح شہباز کی چاپلوسی میں مصروف ہیں مگر سیٹھ کی نظریں مسلسل زہرہ کے سراپے پر گڑھی ہوئی ہیں۔

(شہباز زہرہ کو دیکھ کر شعر پڑھتا ہے)

شہباز: پتہ پتہ ..... بوٹا بوٹا ..... حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے ..... باغ تو سارا جانے ہے

توقیر: واہ واہ ..... بھئی کیا کہنے ..... ویسے کہاں سے چُن کر لاتے ہیں آپ یہ نایاب شعر سیٹھ صاحب .....

(شہریار مکھن لگاتا ہے)

شہریار: کیا بات کرتے ہو یار ..... بڑے ذوق والے ہیں اپنے گل صاحب ..... یہ تو بزنس نے انہیں موقع نہیں دیا ورنہ آج یہ بھی ملک کے نامور شاعر ہوتے .....

(شہباز آہ بھر کر زہرہ کو دیکھتا ہے)

شہباز: بس جناب کیا بتائیں ..... ویسے لیلیٰ بیگم ..... یہ آپ کی سہیلی تو کچھ لیتی ہی نہیں ... نہ ڈرنک نہ سنیکس ... لگتا ہے کسی ڈائٹ پر ہیں جناب .....

(اب زہرہ کی برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ غصے میں ایکس کیوز کرتے ہوئے کھڑی ہو جاتی ہے۔)

زہرہ: ایکس کیوزمی ... Excuse me

زہرہ اٹھ کر ایک جانب چلی جاتی ہے، شہریار بات سنبھالنے کے لیے کوئی بات شروع کر دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: رات۔ پارٹی

زہرہ غصے میں کھولتی ہوئی ایک جانب کسی کارنر میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے والے ہیں۔ اتنے میں اچانک پیچھے سے اسے موسیٰ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(زہرہ گھبرا کر پلٹتی ہے)

موسیٰ: تو یہ ہے وہ زندگی جسے پانے کے لیے تم نے مجھے ٹھکرا دیا تھا ، یہ مدہوشی یہ محفلیں یہ جام اور یہ ہوس بھری نگاہیں ، بہت سستا سودا کیا تم نے میرے بدلے... یا پھر شاید تمہاری چاہت ہی یہی جسموں کی پکا چوند اور ان محفلوں کی یہ رونق تھی

(زہرہ دکھ سے موسیٰ کو دیکھتی ہے)

زہرہ: میرے مقدر میں جو تھا... وہ مجھے مل کر رہا... مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو اس بے حجاب محفل میں... کیوں چنی ہے تم نے یہ راہ

موسیٰ: تمہیں میرے خاندان کی عزت، نیک نامی اور رواج سے چڑ تھی ناں... تو میں نے وہ دنیا ہی چھوڑ دی... اب دیکھو... میں بھی اتنا ہی بدنام ہوں... جیسا تم مجھے چاہتی تھیں...

زہرہ: میں نے کبھی تمہاری ایسی بربادی نہیں چاہی تھی... واپس لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں خدا کے لیے... یہ محفلیں تمہارے قابل نہیں ہیں... اپنا نہیں تو اپنے والدین کے حسب نسب کا ہی خیال کرو...

موسیٰ: حیرت ہے... جب میں اس حسب نسب اور خاندانی وراثت کے ساتھ تمہارا ہاتھ مانگنے آیا تھا۔ تب تم نے مجھے اسی حسب نسب کا طعنہ دیا تھا... تمہیں چڑ تھی میرے حلیئے سے... میرے خاندان کے ساتھ جڑے نام اور نیک نامی سے... اور آج تم ہی مجھے اسی دنیا میں واپس جانے کا کہہ رہی ہو... جو کبھی تمہارے معیار پر پوری نہیں اتری...

(زہرہ مجبور ہو جاتی ہے)

زہرہ: جو ہوا... سو ہوا... پچھلی باتوں کو بھول جاؤ موسیٰ... اور ویسے بھی تمہاری ماں نے میرے سامنے روتے ہوئے بس یہی درخواست رکھی تھی کہ میں ان کا نیک اور فرمانبردار بیٹا لوٹا دوں... جو بھٹک کر زہرہ نامی کسی بازار والی کی حویلی میں آ گیا تھا... میں ایک ماں کے بندھے اور جڑے ہاتھ کیسے ٹھکرا دیتی موسیٰ...

موسیٰ: اور میں... میرا خیال نہیں آیا تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی... سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں یہی عیاشی، محفل اور نیش و عشرت چاہیے تھی... جو ظاہر ہے موسیٰ جیسا ایک دین دار نہ تمہیں نہیں دے سکتا تھا... روپے پیسے اور جائیداد کی تو ہمارے ہاں بھی نہیں تھی... ہاں مگر دل کے بہلانے کو یہ جام اور یہ سامان نہیں تھا میرے پاس...

زہرہ: تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھ سکتے ہو... میں نے کبھی تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھا موسیٰ... اور اب تو میری تقدیر کا فیصلہ بھی ہو گیا ہے... برا یا بھلا... جو بھی سہی... پھر اب کس امید کے سہارے یوں در بدر بھٹک رہے ہو تم... واپس لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں... یہ میری تم سے ایک آخری درخواست ہے...

(اتنے میں پیچھے سے لیلیٰ وہاں آ جاتی ہے اور موسیٰ کو زہرہ کے سامنے کھڑے دیکھ کر کچھ حیرت سے کہتی ہے۔)

لیلیٰ: موسیٰ... تم یہاں کیا کر رہے ہو... سب ٹھیک تو ہے ناں...

(موسیٰ اپنی جیکٹ پلکیں چھپا لیتا ہے)

موسیٰ: جی... سب ٹھیک ہے... میں غلطی سے اس جانب آ نکلا تھا... معذرت چاہتا ہوں۔

(موسیٰ پلٹ کر چلا جاتا ہے۔ لیلیٰ غور سے موسیٰ اور زہرہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ زہرہ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے دوسری جانب دیکھنے لگتی ہے۔)

لیلیٰ: یہ موسیٰ ہے... میرا باڈی گارڈ... کسی بہت اچھے گھرانے کا لگتا ہے... پتہ نہیں وہ کون سی مجبوری ہے جو اس سے یہ خطرناک اور چھوٹا کام کروا رہی ہے...

(زہرہ دھیرے سے کہتی ہے)

زہرہ: ہاں..... واقعی کسی اچھے گھر سے تعلق ہوگا اس کا..... مجبوری انسان سے بہت کچھ کروالیتی ہے۔

(لیلیٰ چونک کر زہرہ کو دیکھتی ہے)

لیلیٰ: کیا تم جانتی ہو اسے.....؟..... وہ تم سے کیا بات کر رہا تھا.....

زہرہ: نہیں..... کچھ خاص نہیں..... شاید تمہیں تلاش کرتے ہوئے بھٹک کر اس طرف آ نکلا ہوگا.....

زہرہ لیلیٰ سے جان چھڑانے کے لیے دوسری طرف بڑھ جاتی ہے۔ لیلیٰ زہرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں

قدرت اللہ کی بہن خدیجہ کا کمرہ۔

کمرے میں ہاجرہ، خدیجہ اور سکینہ موجود ہیں۔ ہاجرہ رو رہی ہے۔

(خدیجہ تسلی دیتی ہے)

خدیجہ: آپ تسلی رکھیں بھابھی جان..... مجھے یقین ہے کہ ہمارا موسیٰ واپس لوٹ آئے گا..... ذرا سا راہ سے بھٹک گیا ہے۔ مگر ہے تو وہ آخر ہمارا ہی خون..... اور خون خون سے جدا کیسے رہ سکتا ہے بھلا.....

ہاجرہ: نہیں خدیجہ..... میرا بیٹا روٹھ گیا ہے ہم سے..... کاش میں نے اس کے دل کی بات سُنی ہوتی اور میں اپنے من کی نہ کرتی..... تو شاید موسیٰ آج ہمارے درمیان ہوتا۔

(سکینہ بھی چونکتی ہے)

سکینہ: ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ تائی جان.....

ہاجرہ: جانتی ہو موسیٰ جان بوجھ کر ایسی بدنام جگہوں پر بھٹکتا رہتا ہے اب..... کیونکہ میں نے اس لڑکی کو جا کر اس کی حقیقت بتائی تھی..... آئینہ دکھایا تھا اسے کہ وہ جس بدنام علاقے سے تعلق رکھتی ہے اس جیسی لڑکی کا ہمارے اونچے اور پاکباز گھر کی دہلیز پار کرنا ناممکن ہے..... دھتکار آئی تھی میں اسے بازاری اور بدنام ہونے کا طعنہ دے کر..... آج موسیٰ ہر قدم پر ہمیں ہمارا وہی طعنہ واپس لوٹا رہا ہے..... ورنہ وہ اس فلم وان کو لے کر کبھی اپنے باپ کے سامنے نہ آتا.....

ہاجرہ روتی رہتی ہے، سکینہ اپنی ساس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: رات

جگہ: سیٹھ شہباز گل کی پارٹی

زہرہ دور ایک جانب کھڑی ہے۔ شہباز کی نظریں اُسی کا طواف کر رہی ہیں۔ ایک جانب تو قیر اور شہریار بیٹھے کسی دوست سے بات کر رہے ہیں۔ لیلیٰ دوسری جانب کسی عورت سے بات چیت میں مصروف ہے۔ سیٹھ شہباز اٹھ کر دوسری طرف آتا ہے اور قریب سے گزرتے کسی بیرے/ بٹلر وغیرہ کو کچھ سمجھاتا ہے، بیرہ سر ہلا کر سافٹ ڈرنکس/ یا جوس وغیرہ کی ٹرے لے کر دور کھڑی زہرہ کی جانب بڑھ جاتا ہے۔ زہرہ اپنی دُھن میں مگن اپنے خیالوں میں کھڑی ہے۔ بیرہ اسے جوس پیش کرتا ہے مگر اسی لمحے بیرے کے ہاتھ سے جوس کا گلاس چھلک کر زہرہ کے لباس پر گر جاتا ہے۔ زہرہ گھبرا کر اپنے کپڑے جھٹکتی ہے، اتنے میں شہباز وہاں آ جاتا ہے اور بیرے کو ڈانٹتا ہے۔

شہباز: یو ایڈیٹ..... یہ کیا کیا تم نے ....میڈم کا سارا ڈریس خراب کر دیا..... ،باسٹرڈ..... تمہیں تو میں.....

زہرہ: اٹس اوکے.....کوئی بات نہیں.....

شہباز: بات کیسے نہیں ہے جی..... آئی ایم ویری سوری.....اب تم یہاں کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو ہمارا..... لے جاؤ میڈم کو ریسٹ روم کی جانب.....،.....اور کوئی نیپکن یا ٹاول وغیرہ دو انہیں.....

بیرہ شرمندگی سے زہرہ کو ایک جانب چلنے کا اشارہ کرتا ہے۔زہرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے کپڑوں کی حالت دیکھتے ہوئے بیرے کے ساتھ چل پڑتی ہے۔شہباز کا موڈا بھی تک آف نظر آ رہا ہے۔ذور کھڑا موی یہ سب ماجرا دیکھ لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: رات

جگہ: سیٹھ شہباز کا گھر

بیرہ زہرہ کو لیے کسی Lavish سے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ایک ریسٹ روم کا دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کرتا ہے۔

بیرہ: آپ فریش ہو جائیں میڈم.....ٹاول اور نیپکنز بھی اندر ہی پڑے ہیں۔

(زہرہ اندر چلی جاتی ہے اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آتی ہے۔زہرہ اپنا ڈریس صاف کر کے باہر نکلتی ہے تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر جاتے ہیں۔سامنے سیٹھ شہباز اپنی کمینی سی مسکراہٹ لیے سینا بنا کھڑا ہے۔)

زہرہ: تم.....یہاں.....

شہباز: معافی چاہتا ہوں اس گستاخی کی.....وہاں باہر تو اپنے شوہر کے سامنے تم کھل کر کوئی بات ہی نہیں کر رہی تھیں.....میں نے سوچا ہم دو گھڑی یہیں بات کر لیں.....بے فکر رہو.....وہاں باہر کسی کو میرے اور تمہارے غائب ہونے کی خبر نہیں ہو گی.....سب مدہوش ہیں اس وقت.....

(زہرہ تیزی سے آگے بڑھ کر باہر جانے کی کوشش کرتی ہے مگر سیٹھ شہباز اس کا راستہ روک لیتا ہے،زہرہ شدید غصے میں اپنی آواز دبا کر کہتی ہے)

زہرہ: راستہ چھوڑو میرا.....،ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا.....

شہباز: اب ایسے تو نہ کہو ناں.....میں تو زمانے بھر میں تمہاری تعریفیں کرتا نہیں تھکتا کہ ملک شہریار نے کیا ہیرا چنا ہے اپنے لیے.....اور تم خود کو بُرا ثابت کرنے پر تلی ہو.....یہ تو بہت بُری بات ہے.....

زہرہ: میرا راستہ کیوں روکا ہے تم نے.....یہ کیا حرکت ہے.....میں شور مچا دوں گی.....

شہباز: نہ نہ.....ایسی کوئی کوشش بھی نہ کرنا.....یہ کمرہ باہر ہونے والی لان پارٹی سے بہت دور ہے.....آس پاس تمہاری سننے والا کوئی نہیں ہے.....

زہرہ: شرم آنی چاہیے تھی تمہیں یہ ساری بے ہودہ پلاننگ کرتے ہوئے.....میں اس انسان کی بیوی ہوں جسے تم اپنا دوست کہتے ہو بے غیرت آدمی.....

(شہباز گالی سن کر غصے سے بھڑک اٹھتا ہے)

شہباز: بس.....بہت سن لی میں نے تمہاری یہ بکواس.....میرے سامنے بڑی عالمہ بننے کی کوشش مت کرنا.....اچھی طرح واقف ہوں میں تمہاری اصلیت سے.....ڈانس پارٹیز میں کمر لچکانے والی.....تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں.....مگر میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا.....بہت بار دیکھا ہے میں نے تمہیں ان محفلوں میں.....،.....وہاں تو بڑی پٹاخہ بنی پھرتی تھیں

کسی پھل جڑی کی طرح ... اب یہاں یہ دکھاوے کی شرم کیسی ..؟

(زہرہ زور سے چلاتی ہے)

زہرہ: کوئی ہے ... شہریار ..... پلیز ہیلپ .....

شہباز: کس شہریار کو پکار رہی ہو..... وہ ..... تمہارا شوہر..... جو خود تمہیں یہاں لے کر آیا ہے ..... یہ جانتے بوجھتے کہ میری نیت تم پر خراب ہے..... نیت تو میری تمہیں اس ڈانس پارٹی میں دیکھتے ہی خراب ہوگئی تھی مگر افسوس ... مجھ سے پہلے تمہیں شہریار لے اڑا ..... ورنہ میں تمہیں اس سے بہت بڑی اور بہتر ڈیل آفر کرتا اس نکاح کے ناٹک کے لیے..... مگر کوئی بات نہیں..... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا..... تم جو ملک شہریار سے لیتی ہو..... اس سے ڈبل، ٹرپل..... جتنی پے منٹ بھی چاہو..... میں تمہیں آج بھی اس پر رکھ سکتا ہوں..... تم صرف ایک بار ہاں تو کہہ کر دیکھو..... ساری دنیا کے خزانے تمہارے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دوں گا.....

زہرہ: یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم غلیظ انسان..... میں شہریار ملک کی منکوحہ ہوں.....

شہباز: سب ڈرامہ ہے..... اور یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو..... اور جس نکاح پر تم اتر ا رہی ہو..... وہ میرے لیے ایک بڑی ڈیل کی مار ہے..... ابھی پارٹنر شپ آفر کر دوں کسی بڑے پراجیکٹ میں ملک شہریار کو تو وہ تم جیسی درجنوں یہیں میرے دروازے پر خود چھوڑ جائے..... تم کس کھیت کی مولی ہو..... میں تمہیں اہمیت دے رہا ہوں تو اس کو غنیمت سمجھو..... سیٹھ شہباز ہر ایری غیری پر عاشق نہیں ہوتا..... تم خوش قسمت ہو کہ میرا تم پر دل آ گیا ہے..... میری بات مان لو..... بہت فائدے میں رہو گی..... چاہو تو ملک شہریار کے نکاح میں ہی رہو لوگوں کو دکھانے کے لیے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے.....

(زہرہ نفرت سے سیٹھ کو دیکھتی ہے اور غصے سے کہتی ہے)

زہرہ: جتنی تمہاری شکل کریہہ ہے..... اتنی ہی تمہاری باتیں اور ارادے.....

زہرہ شہباز کو ذرا سا غافل پا کر اسے دھکا دیتی ہے اور باہر کے دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ شہباز اس پر جھپٹتا ہے اور زہرہ کی کلائی اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ وہ زہرہ کو جکڑنے کی کوشش کرتا ہے، زہرہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔ ٹھیک اسی وقت کمرے کے دروازے پر کسی کی لات پڑتی ہے اور دروازہ لاک ٹوٹنے سے کھل جاتا ہے۔ شہباز گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے جہاں موسیٰ دروازے کے بیچوں بیچ اپنا پسٹل ہاتھ میں لیے کھڑا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 17

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: سیٹھ شہباز کا گھر

سیٹھ شہباز گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتا ہے جہاں موسیٰ ہاتھ میں پٹرول لیے کھڑا ہے۔ زہرہ کی زبان سے موسیٰ کو دیکھتے ہی بے اختیار اس کا نام نکلتا ہے۔

زہرہ: موسیٰ.....

(زہرہ روتے ہوئے بھاگ کر موسیٰ سے لپٹ جاتی ہے۔ موسیٰ اپنے حواس پر قابو پائے رکھتا ہے مگر اس کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو رہی ہیں موسیٰ کے تیور دیکھ کر زہرہ ڈر جاتی ہے۔)

موسیٰ: تم ٹھیک ہو.....؟

زہرہ: موسیٰ.....یہ.....یہ مجھے دھوکے سے.....

(موسیٰ ڈانٹ کر دوبارہ پوچھتا ہے)

موسیٰ: تم ٹھیک ہو.....؟

(زہرہ سر ہلاتی ہے، شہباز سیٹھ تب تک حواس بحال کر چکا ہے، وہ چلا کر غصے میں موسیٰ کو رنگ میں بھنگ ڈالنے پر ڈانٹتا ہے)

شہباز: تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرف قدم رکھنے کی یو ایڈیٹ.....کون ہو تم.....

موسیٰ: (موسیٰ زہرہ سے کہتا ہے) تم جاؤ یہاں سے.....

زہرہ جلدی سے کمرے سے نکل جاتی ہے)

شہباز موسیٰ کی آنکھوں میں اترا خون دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: شہباز سیٹھ کا گھر

زہرہ غصے میں تلملاتی اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتی اس جانب آتی ہے جہاں شہریار اور توقیر کسی تیسرے مرد کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں مار رہا ہے۔ زہرہ قریب پہنچ کر ابلتے ہوئے لہجے میں شہریار سے کہتی ہے۔

زہرہ: شہریار.....مجھے گھر جانا ہے ابھی..... شہریار چونک کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے۔ زہرہ کے چلانے پر دُور کھڑی لیلیٰ اور دیگر لوگ چونک کر اس جانب دیکھتے ہیں۔

شہریار: کیا جلدی ہے.....؟..... چلتے ہیں کچھ دیر میں.....

(زہرہ چلاتی ہے)

زہرہ: شہریار آپ ابھی چل رہے ہیں یا میں اکیلی واپس چلی جاؤں۔
(شہریار لوگوں کو گھورتے ہوئے دیکھ کر شرمندگی سے ادھر اُدھر دیکھتا اور زہرہ کو ڈانٹتا ہے)
شہریار: کیا بدتہذیبی ہے آہستہ بولو لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔
زہرہ: تہذیب ... غیرت..... مائی فٹ.....
(زہرہ تیزی سے پلٹتی ہے اور تنہا ہی بیرونی گیٹ کی طرف چل پڑتی ہے۔ شہریار غصے میں اس کے پیچھے لپکتا ہے۔)
شہریار: زہرہ..... رُکو..... کہاں جا رہی ہو.....
مگر زہرہ نہیں رکتی اور چلی جاتی ہے۔ شہریار بھی اس کے پیچھے پیچھے غصے میں باہر نکل جاتا ہے۔ سب لوگ حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

پارٹی ختم ہو چکی۔ اور لوگ واپس جا چکے ہیں، سیٹھ شہباز اپنے نوکروں پر غصے میں گرج برس رہا ہے۔ گارڈز وغیرہ بھی سر جھکائے کھڑے ہیں۔
شہباز: کہاں مر گئے تھے تم سب کے سب..... میں پوچھتا ہوں نوکروں کی اتنی بڑی نکمی فوج کیا کا فائدہ ہے مجھے..... جب وہ میرے ہی گھر میں ایک مسلح شخص کو یوں دندناتے ہوئے پھرنے سے بھی نہ روک سکے..... تم سب کو میں ابھی اسی وقت فارغ کیوں نہ کر دوں نوکری سے.....
(سکیورٹی گارڈز/نوکروں کا ہیڈ سر جھکا کر شرمندگی سے کہتا ہے۔)
نوکر: سوری سر..... ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص مسلح بھی ہے اور وہ اسلحہ لے کر جانے کس وقت پچھلی جانب سے گھر کے اندر آ گیا..... آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا..... اور ہم نے تو اسے لیلیٰ میڈم کی وجہ سے زیادہ نہیں چھیڑا تھا..... اسی بات کا فائدہ اٹھا گیا وہ.....
شہباز: مت سناؤ مجھے اپنی یہ فضول کہانیاں اب..... لعنت ہو تم سب کی اس بے کار کی پہرے داری پر..... اتنے گارڈز اور نوکروں کے ہوتے ہوئے وہ میرے بیڈ روم تک آ گیا..... مجھے خوشی تو تب ہوتی جب تم میں سے کوئی اسے دیکھتے ہی دو میں موقعے پر گولی مار دیتا..... لاش پڑی ہوتی اس کی خون میں لت پت تو میں بڑا انعام دیتا اس سورما کو جو اسے قتل کرتا، مگر وہ ایک لڑکا تم سب کو چکمہ دے گیا..... ڈوب مرو شرم سے تم سارے چلو بھر پانی میں
(ہیڈ گارڈ کچھ صفائی دینے کی کوشش کرتا ہے)
نوکر/گارڈ: سر ہمارا یقین کریں ہم.....
شہباز: دفع ہو جاؤ سارے کے سارے میری نظروں کے سامنے سے نہیں ہے مجھے ضرورت تم میں سے کسی بھی حرام خور کی ... گیٹ لاسٹ
نوکر سر جھکائے کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ شہباز شدید غصے میں تلملاتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات
جگہ: شہریار/زہرہ کا گھر

زہرہ غصے میں پیر پٹختی لاؤنج میں داخل ہوتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے شہریار بھی شدید غصے میں اندر آتا ہے اور چلا کر زہرہ

سے کہتا ہے۔

شہریار: میں کہتا ہوں بات سنو میری..... یہ کیا جہالت دکھائی ہے تم نے آج بھری محفل میں.....؟..... میں پوچھتا ہوں اس طرح ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی .....آخر ہوا کیا ہے تمہیں.....

(زہرہ طنزیہ انداز میں گھورتی ہے)

زہرہ: اچھا.....؟.....تو کیا آپ کو نہیں پتہ کہ کیا ہوا تھا وہاں.....کتنے انجان ہیں آپ.....؟

شہریار: مجھے کیسے پتہ ہو سکتا ہے.....میں تو باہر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک تمہیں کوئی نفسیاتی قسم کا دورہ پڑ گیا اور تم وہاں سے چلی آئیں.....

زہرہ: کاش آپ اتنے ہی بھولے اور معصوم ہوتے جتنا آپ بن رہے ہیں.....آپ جاننا چاہتے ہیں ناں کہ وہاں کیا ہوا تھا..... تو سنیں غور سے.....اس گھٹیا انسان نے جسے آپ اپنا دوست کہتے ہیں.....ہاں.....وہی سیٹھ شہباز.....اس نے میرے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی ہے آج.....زیادتی کرنا چاہتا تھا وہ میرے ساتھ اپنے ہی بیڈ روم میں.....سن لیا.....اتنا کافی ہے یا مزید کچھ تفصیلات بھی بتاؤں اس کے کمینے پن کی.....

(شہریار انجان بنتا ہے، اور حیرت سے کہتا ہے۔)

شہریار: کیا.....سیٹھ شہباز نے.....نہیں نہیں.....میں نہیں مان سکتا.....،ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ تھوڑا سا ٹھرکی ضرور ہے عورت کے معاملے میں.....اور آتے جاتے اپنا ٹھرک پن جھاڑتا رہتا ہے ہر آتی جاتی عورت پر.....مگر.....وہ اس حد تک نہیں جا سکتا.....ضرور کوئی مس انڈر سٹینڈنگ.....

(زہرہ دکھ اور غصے میں زور سے چلا اٹھتی ہے اور آپ جناب بھول جاتی ہے)

زہرہ: بس.....بس کرو ملک شہریار.....مجھے اس وقت تم سے بھی گھن آ رہی ہے.....تمہارا کردار تو اس سیٹھ شہباز جیسے لعنتی مرد سے بھی زیادہ گھناؤنا ہے.....شہباز تو پھر بھی خریدار نکلا.....مگر تم تو کسی بروکر کی طرح.....

(شہریار زہرہ کی زبان سے گالی برداشت نہیں کر پاتا اور چلا کر اس کی بات کاٹ دیتا ہے)

شہریار: بکواس بند کرواپنی.....مجھ پر کوئی الزام لگانے سے پہلے ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم بھری محفل چھوڑ کر اس کے بیڈ روم تک پہنچیں کیسے.....؟..... کیوں گئیں تھیں تم اس کے اکیلے بیڈ روم میں جب کہ تمہارا شوہر باہر دور لان میں بیٹھا ہوا تھا.....اور جسے یہ خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب اس کی جوان بیوی خود ہی چل کر کسی دوسرے کی خواب گاہ میں پہنچ گئی.....کوئی یہ بات سننے لگا تو الزام کس پر آئے گا.....تم پر.....یا شہباز پر.....؟

(زہرہ دکھ حیرت اور بے چارگی سے پھٹ پڑتی ہے)

زہرہ: وہ ذلیل انسان کسی اور کے ذریعے دھوکے سے مجھے لے گیا تھا وہاں.....،مجھے اپنی مرضی سے ہی جانا ہوتا تو میں ابھی وہیں ہوتی.....اور کیا غیرت مند مرد ہو تم کہ ابھی تک یہاں کھڑے اپنی بیوی سے ہی تفتیش کیے جا رہے ہو.....کیوں جا کر اس گھٹیا اور ذلیل انسان کا منہ نہیں توڑ دیتے جس نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے آج.....تف ہے تمہاری مردانگی پر.....(زہرہ نفرت سے زمین پر تھوک دیتی ہے۔)

زہرہ شہریار کو ذلیل کرتی ہوئی وہاں سے چلی جاتی ہے۔ شہریار ذلت کے احساس سے تڑپ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس سے کچھ بن نہیں پاتا.....جبکہ زہرہ جا چکی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ اور شوہر توقیر کا بیڈ روم

لیلیٰ چینج کر چکی ہے۔ توقیر غصے میں تلملا رہا ہے۔ جبکہ لیلیٰ پُر سکون ہے۔

(توقیر چلا رہا ہے۔)

توقیر: میں کہتا ہوں کہ آخر ضرورت ہی کیا تھی تمہارے اس چہیتے موسیٰ کو وہاں جا کر خدائی فوج دار بننے کی..... اور دوسروں کے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کی.....

(لیلیٰ سکون سے ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی ہاتھوں پر لوشن لگا رہی ہے)

لیلیٰ: اس نے بتایا تو ہے کہ اسے اچانک کسی عورت کی چیخ سنائی دی..... تو وہ سمجھا کہ کہیں گھر میں کوئی واردات نہ ہو گئی ہو..... اس لیے وہ سیٹھ شہباز کے بیڈ روم میں جا گھسا.....

توقیر: وہ تمہارا پرسنل گارڈ ہے لیلیٰ..... ساری دنیا کی حفاظت کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا اس نے..... اگر سیٹھ شہباز کے گھر میں کوئی واردات ہوتی بھی تو یہ مسئلہ شہباز کے پرسنل گارڈز کا تھا..... موسیٰ کیوں درمیان میں کودا.....

لیلیٰ: میرے خیال میں تو ہمیں موسیٰ کو Appriciate اپری شیٹ کرنا چاہیے کہ اس نے تمہارے سوکالڈ دوست سیٹھ شہباز کے گھر کے مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہوئے ایکشن لے لیا..... جبکہ تم خود کہہ رہے ہو کہ اس حرکت کے نتیجے میں موسیٰ کی جان بھی جا سکتی تھی اگر شہباز کا کوئی بے وقوف محافظ یا سیکورٹی گارڈ گھبراہٹ میں موسیٰ پر ہی گولی چلا دیتا اسے چور ڈاکو سمجھ کر.....

(توقیر لیلیٰ کی لاجک سُن کر غصے میں پھٹ پڑتا ہے)

توقیر: کمال ہے..... بجائے اس کے کہ تم ابھی اس جاہل موسیٰ کو دھکے مار کر اس گھر سے نکال دو..... تم آج بھی اس کی فیور faver میں بول رہی ہو.....

(لیلیٰ اٹھ کر توقیر کی طرف آتی ہے اور غور سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سخت لہجے میں کہتی ہے۔)

لیلیٰ: سیٹھ شہباز اپنے بیڈ روم میں کون سا گھناؤنا کھیل کھیلنے جا رہا تھا..... یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو توقیر جاوید اور مجھے بھی سب پتہ ہے..... شکر کرو کہ سیٹھ شہباز موسیٰ کے ہاتھوں آج زندہ بچ گیا..... ورنہ جتنا جذباتی موسیٰ ہے..... وہ ضرور سیٹھ کے سر میں دو چار سوراخ ڈال کر ہی واپس لوٹتا.....

توقیر: کیا بکواس ہے یہ..... تم اپنے گارڈ کو ایک شریف انسان کے قتل کی شہ دے رہی ہو.....

(اب لیلیٰ کا ضبط بھی جواب دے جاتا ہے اور وہ غصے میں جواب دیتی ہے)

لیلیٰ: شریف شہری..... مائی فٹ..... کس قدر گھٹیا اور کمینہ انسان ہے وہ سیٹھ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے۔ (مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کی)..... اور آج بھی وہ تمہارا محسن اور دوست نما بھیڑیا ایک تنہا اور کم زور لڑکی کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا..... مگر موسیٰ نے عین وقت پر پہنچ کر اس کے ارادے خاک میں ملا دیئے..... موسیٰ اگر اسے مار بھی دیتا تو میں اس کے ساتھ ہی کھڑی رہتی اور عدالت میں موسیٰ کے حق میں گواہی دیتی

اب میرا زیادہ منہ نہ کھلواؤ..... یہ بات کوئی عزت اور غیرت والا مرد ہی سمجھ سکتا ہے..... مجھے نیند آ رہی ہے..... تم بھی سو جاؤ.....

لیلیٰ کمرے کی بتی بجھا دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا کمرہ/لیلیٰ کا گھر

موسیٰ اپنے سرونٹ کوارٹر/کمرے میں بستر پر لیٹا سوچوں میں گم ہے۔ اسے آج زہرہ سے ہوئی ملاقات یاد آ رہی ہے۔ جب اس نے زہرہ کو پارٹی میں شہریار جیسے مرد سے شادی پر طعنے دیئے تھے اور زہرہ نے جواباً موسیٰ کو واپس اپنی دنیا میں لوٹ جانے کی درخواست کی تھی۔

زہرہ/ڈائیلاگ

فلیش بیک: میرے مقدر میں جو لکھا تھا..... وہ مجھے مل کر رہا..... مگر تم کیوں در بدر بھٹک رہے ہو..... واپس لوٹ جاؤ..... یہ میری آخری درخواست ہے.....

موسیٰ بے چینی سے کروٹ بدلتا ہے۔ پھر اسے زہرہ پر بیرے کا جان بوجھ کر جوس گرانا اور اسے سیٹھ شہباز کے بیڈ روم کی طرف لے جانا یاد آتا ہے۔

F/B موسیٰ بیرے کی حرکت نوٹ کر لیتا ہے اور فلیش بیک میں دیکھتا ہے کہ کس طرح بیرا زہرہ کو گھر کے لاؤنج ایریا کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ موسیٰ بھی نظر بچا کر ان کے پیچھے چل پڑتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بیرہ زہرہ کو کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا ہے اور پیچھے سے سیٹھ شہباز کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ موسیٰ چند لمحے رک کر آس پاس کا جائزہ لیتا ہے اور پھر چھپتے چھپاتے خود بھی اس جانب چل پڑتا ہے۔

اچانک سامنے سے کوئی دو گارڈ/نوکر وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔ موسیٰ کو جلدی سے کسی دیوار یا ستون وغیرہ کی آڑ لینا پڑتی ہے۔ گارڈز چند لمحے وہیں کھڑے خوش گپیاں کرتے ہیں اور پھر مخالف سمتوں میں چلے جاتے ہیں۔ موسیٰ تیزی سے لپک کر بیڈ روم کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ موسیٰ غصے میں دروازے پر زوردار لات رسید کرتا ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے۔ سامنے شہباز زہرہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے۔ زہرہ موسیٰ کو دیکھتی ہے تو روتے ہوئے اس کا نام پکارتی ہے۔

زہرہ: .....موسیٰ.....

(زہرہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آتی ہے اور بے اختیار موسیٰ کے سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو پڑتی ہے، زہرہ، موسیٰ ..... یہ مجھے دھوکے سے یہاں.....)

موسیٰ: تم ٹھیک ہو.....

زہرہ: ہاں..... مگر تم ٹھیک وقت پر نہ آتے تو.....

(زہرہ جملہ مکمل کیے بنا رو پڑتی ہے۔ سیٹھ شہباز اس طرح موسیٰ کے اچانک آنے پر شدید طیش کے عالم میں چلاتا ہے۔)

شہباز: کون ہو تم..... اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرح میرے پرسنل بیڈ روم میں گھسنے کی یو ایڈیٹ.....

(موسیٰ کی آنکھوں میں سہمی ہوئی زہرہ کی حالت دیکھ کر خون اتر آتا ہے اور وہ شہباز کی طرف شدید نفرت سے دیکھتا ہے۔)

موسیٰ: تمہارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ میرا نام موسیٰ ہے..... اس سے زیادہ جاننے کی تمہیں ضرورت پڑے گی بھی نہیں ..... کیوں کہ تمہارا آخری وقت آ گیا ہے سیٹھ شہباز..... کلمہ پڑھ لو.....

(شہباز گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔ موسیٰ اپنا پسٹل نکال کر اس کا رُخ شہباز کے سر کی طرف کر چکا ہے۔ زہرہ کا رنگ بھی اڑ جاتا ہے۔ موسیٰ زہرہ سے کہتا ہے)

موسیٰ: تم جاؤ یہاں سے.....

زہرہ: نہیں موسیٰ میری خاطر تم اس غلیظ انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگو گے..... تم پہلے ہی بہت مصیبتیں اٹھا چکے ہو خود کو روکو۔

(شہباز کو جیسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔)

شہباز: کک کون موسیٰ... تم.....تم تو لیلیٰ جاوید کے پرسنل باڈی گارڈ ہو نا.....، دیکھو کوئی حماقت کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ ساری عمر کے لیے سلاخوں کے پیچھے ڈلوا دوں گا.....تم مجھے جانتے نہیں ہو شاید.....سُولی پر لٹکا دوں گا تمہیں.....

موسیٰ: تم جیسے گٹر کے کیڑے کو جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے مجھے.....، اور مجھے سولی پر لٹکانے کے لیے میرے ہاتھوں تمہارا مرنا بہت ضروری ہے.....

(موسیٰ پسٹل سیدھا کرتا ہے۔ شہباز کی جان نکل جاتی ہے۔ زہرہ تڑپ کر موسیٰ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ موسیٰ کے لیے چند لمحے جیسے زندگی رک سی جاتی ہے۔ زہرہ منت کرتی ہے۔)

زہرہ: نہیں موسیٰ.....تمہیں میری قسم ہے.....تمہیں.....تمہاری زہرہ کی قسم.....

(موسیٰ اپنی جگہ جم سا جاتا ہے، شہباز موقع پا کر پیچھے کسی دروازے یا کھڑکی سے باہر کود جاتا ہے، موسیٰ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔)

موسیٰ: تم آج بھی موسیٰ کے لیے اتنی ہی محترم ہو.....وہی موسیٰ.....جسے تم نے اپنے پیروں سے کسی دھول کی طرح اڑا دیا.....

زہرہ: (زہرہ رو پڑتی ہے) تم مجھ جیسی کسی کم ظرف کے پیروں کی دھول ہونے کے لیے نہیں بنے ہو موسیٰ.....تم تو کسی شہزادی کے سر کا تاج بنو گے.....،

تم نے ٹھیک کہا تھا.....میں نے بہت گھاٹے کا سودا کر لیا ہے.....اور اب اس نقصان کی اذیت مجھے عمر بھر سہنی ہے.....،

.....ہو سکے تو معاف کر دینا مجھے.....

زہرہ روتی ہوئی وہاں سے واپس پلٹ جاتی ہے۔

موسیٰ کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں اور وہ وہیں گم سم سا کھڑا زہرہ کو جاتے دیکھ رہا ہے۔ زہرہ دور جا کر مڑنے سے پہلے ایک بار پھر روتے ہوئے پلٹ کر موسیٰ کو دیکھتی ہے۔ دونوں کی نظر ملتی ہے اور پھر زہرہ راہداری میں غائب ہو جاتی ہے۔

// End of flash Back //

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

موسیٰ زہرہ سے ہوئی ملاقات کے فلیش بیک سے واپس لائیو ہوتا ہے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں آنسو ہیں وہ زہرہ کی یاد میں گم ہے۔

// Intercut //

// Cut //

Scene No # 8

ٹھیک اسی وقت زہرہ بھی اکیلی بیٹھی موسیٰ کو یاد کر رہی ہے اور وہ بھی رات کے اس پہر رو رہی ہے، اسے بھی موسیٰ یاد آ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ سیٹھ شہباز کا دفتر/یا گھر

توقیر شرمندہ سا شہباز کے سامنے بیٹھا ہے۔

توقیر: میں کیا بتاؤں سیٹھ صاحب..... ساری رات مجھے شرمندگی کے مارے نیند نہیں آئی..... اسی لیے صبح ہوتے ہی خود معافی مانگنے چلا آیا میں آپ کے پاس.....

شہباز: بس بس..... رہنے دو..... تم اتنے ہی شرمندہ ہوتے تو اب تک اس کریمنل گارڈ کو نوکری سے دھکے مار کر نکال چکے ہوتے ... مگر وہ تو اس وقت بھی تمہارے گھر میں ہی دندناتا پھر رہا ہے..... سب خبر ہے مجھے ... کتنا لاڈلا ہے وہ تمہاری بیوی کا.....

(توقیر بات بناتا ہے)

توقیر: اسی بات کی تو شرمندگی ہے مجھے ... آپ جانتے ہیں کہ وہ میرا نہیں..... لیلیٰ کا پرسنل گارڈ ہے..... اور میں تو خود لیلیٰ کے دیے خرچے پر پل رہا ہوں..... میرے بس میں ہوتا تو

شہباز: جب تمہارے بس میں ہی کچھ نہیں تو پھر معافی کس بات کی مانگ رہے ہو..... ... اور اس لیلیٰ سے مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی، اس سے کہنا کہ شکر کرے کہ میرے گارڈز نے وہیں موقعے پر اس موسیٰ کا قسم چھلنی نہیں کر دیا..... صرف لیلیٰ کی وجہ سے میں رک گیا ورنہ آج تم سب اس کی فاتحہ پڑھ رہے ہوتے ... ویسے ایک بات بتاؤ ... تمہاری بیوی اتنی مہربان کیوں ہے اس لڑکے پر..... صرف پرسنل گارڈ ہی ہے نا اس کا..... یا پھر.....

(توقیر بوکھلا جاتا ہے)

توقیر: میں کچھ سمجھا نہیں سیٹھ صاحب.....

شہباز: ایک طرف وہ موسیٰ تمہاری بیوی کا لاڈلہ اور چہیتا بنا پھرتا ہے تو دوسری جانب وہاں زہرہ اس سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی... کون سی گیدڑ سنگھی ہے بھئی اس موسیٰ کے پاس..... کچھ سمجھ نہیں آیا.....

(توقیر کو حیرت کا جھٹکا لگتا ہے)

توقیر: کیا..... زہرہ اس گارڈ کو جانتی ہے.....؟ مگر کیسے.....

شہباز: یہ تو میں نہیں جانتا... مگر یہ بات کنفرم ہے کہ وہ دونوں چھپ کر وہاں ملنے آئے تھے..... وہ تو میں موقعے پر پہنچ گیا اور اس چالاک لڑکی نے سارا مُدعا جھٹ کر مجھی پر ڈال دیا..... میرے نوکروں نے خود مجھے بتایا ہے کہ کل رات اس کمرے میں آنے سے پہلے زہرہ اور وہ گارڈ کچھ دیر لان میں ہی آپس میں کچھ راز و نیاز کرتے دکھائی دیئے تھے انہیں.....

توقیر: یہ تو آپ کہانی ہی دوسری سُنا رہے ہیں سیٹھ صاحب..... مگر شہریار شاید اس بات پر یقین نہ کرے..... کوئی ثبوت تو دکھانا ہو گا ہمیں اسے بھی.....

شہباز: ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... ہے تو یہ ناقابل یقین بات..... کہاں وہ بھائی کلاس زہرہ اور کہاں وہ لفنگا گارڈ..... لیکن مجھے یقین کرنا پڑا جب میں نے خود لان اور سوئمنگ پول سائڈ کی سی سی ٹی وی کیمرہ فوٹیج نکال لی..... یہ دیکھو..... اس میں پہلے وہ دونوں بات کر رہے ہیں ... اور پھر دوسرا کلپ دیکھو..... جس میں وہ موسیٰ سب سے چھپ کر میرے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہا ہے ... جہاں یہ زہرہ بہانے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی..... سچ کہا ہے کسی نے بھی ... جوانی واقعی بڑی بے صبری ہوتی ہے ... (سیٹھ اپنا موبائل توقیر کے حوالے کرتا ہے توقیر جلدی سے کلپ دیکھتا ہے۔)

(سیٹھ شہباز اپنی بات پر خود ہی بے تحاشہ قہقہہ لگا کر ہنستا ہے۔ توقیر کے ہوش کلپ دیکھ کر پہلے ہی اڑ چکے ہیں۔)

توقیر: اوہ مائی گاڈ ... یہ زہرہ تو بڑی پہنچی ہوئی چیز نکلی.....

شہباز: یہی میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں..... وہ ہم سب کی نظروں میں اس گارڈ کے ساتھ مل کر دھول جھونک رہی ہے..... سب سے زیادہ ملک شہریار کے..... پتہ لگاؤ یہ موسیٰ آخر کون ہے..... اور تم بھی اپنی بیوی پر نظر رکھو ذرا ..... کہیں وہ بھی اندر ہی اندر موسیٰ کے ساتھ

شہباز اپنی بات ادھوری چھوڑ کر زور سے ہنستا ہے۔

توقیر کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا ہے۔

//Cut//

مونتاج..... شہر کی چہل پہل

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

ملک شہریار غصے میں زہرہ پر چیخ چلا رہا ہے، اس کے ہاتھ میں اس کا سیل فون ہے جو اس نے ابھی زہرہ سے جھپٹ کر واپس لیا ہے۔

شہریار: کیا ہے یہ سب؟..... اب کہہ دو کہ یہ وڈیو کلپس بھی جعلی ہیں.....

زہرہ: تم کہنا کیا چاہتے ہو..... الزام لگا رہے ہو مجھ پر.....

شہریار: صرف الزام نہیں..... ثبوت بھی دکھا دیا ہے میں نے تمہیں..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ..... یہ موسیٰ کون ہے.....

زہرہ: یہ بات تم مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہو..... وہ لیلیٰ کا پرسنل گارڈ ہے۔

شہریار: پرسنل گارڈ ہے تو تم سے اتنی لمبی بات کیا کر رہا تھا وہ پول سائیڈ پر کل رات..... اور پھر تمہارے پیچھے پیچھے بیڈ روم بھی پہنچ گیا..... کیا تم دونوں نے کوئی ڈیٹ.....

زہرہ: شرم آتی ہے مجھے تمہاری اس گندی سوچ پر..... لیکن اب تک تو مجھے بھی عادی ہو جانا چاہیے تھا تمہاری ان بے ہودہ باتوں کا ..... انسان جیسا ہوتا ہے اس کی دوسروں کے لیے سوچ بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔

شہریار: بات مت ٹالو..... جو پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ..... کیا تعلق ہے تمہارا اس دو ٹکے کے گارڈ کے ساتھ.....

زہرہ: تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھتے رہو..... میں پابند نہیں ہوں تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے.....

(زہرہ جانے لگتی ہے۔ شہریار غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر دھکا دے کر گرا دیتا ہے۔)

شہریار: جواب تو تمہیں آج ہر بات کا دینا پڑے گا زہرہ بیگم..... تم میری آنکھوں میں یوں دُھول نہیں جھونک سکتیں..... بتاؤ کیا لگتا ہے وہ موسیٰ تمہارا..... اور سیٹھ شہباز کے گھر میں تم دونوں نے مل کر یہ کون سا ڈرامہ رچایا تھا کل رات..... ضرور یہ کوئی پرانا عاشق ہے تمہارا..... بولو.....

(زہرہ چڑ کر جواب دیتی ہے)

زہرہ: ہاں ہے..... تو پھر کیا؟

(شہریار کا ہاتھ اٹھتا ہے اور زہرہ کو طمانچہ مارتا ہے)

شہریار: بے حیا عورت..... میرے سامنے اقرار کر رہی ہو اپنے کرتوتوں کا ..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارا اسٹینڈرڈ اتنا گر جائے گا کہ تم ایک دو ٹکے کے گارڈ کے ساتھ.....

زہرہ: حیرت ہے ملک شہریار..... تم اپنی مرضی سے مجھے کسی کے سامنے پیش کرو تو وہ تمہارے ہائی اسٹینڈرڈز ہوتے ہیں..... اور

میں اگر اپنی مرضی سے کسی سے بات کروں تو تمہیں میں لو اسٹینڈرڈ دکھائی دیتی ہوں، سچ بتاؤ موسیٰ اگر ایک معمولی گارڈ نہ ہوتا..... سیٹھ شہباز کی طرح کوئی بلیز Billioner ہوتا تو تم اس وقت مجھے یہاں بیٹھے مبارک دے رہے ہوتے..... ہیں ناں.....

(شہریار غصے میں پاگل ہو کر چلاتا ہے)

شہریار: اوہ یو شٹ اپ.....

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ نامراد کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

نامراد: یا میرے خدا..... ایسی کوئی حماقت نہ کرنا میرے یار..... شکر ہے وہ کمینہ سیٹھ تمہارے ہاتھوں بچ گیا..... دیکھ موسیٰ مزید کوئی گڑبڑ نہ کرنا.....

موسیٰ: اگر وہ مجھے اپنی قسم نہ دیتی تو اس سیٹھ کا بچنا محال تھا..... مگر مجھے اسے اس حال میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوا ہے نامراد..... زہرہ بہت دکھی ہے.....

نامراد: یہ دُکھوں کا راستہ اس نے خود چنا ہے موسیٰ..... تم کر بھی کیا سکتے ہو اس کے لیے..... یہ غم اس نے خود اپنے مقدر میں لکھے ہیں.....

موسیٰ: اس نے بتایا کہ اماں وہاں اسے میرے لیے مانگنے نہیں بلکہ اسے مجھ سے دُور رکھنے کی کوئی تدبیر کرنے گئیں تھیں..... پھر انکار تو اسے کرنا ہی تھا۔

نامراد: اس بات کا کہیں نہ کہیں اندازہ تھا مجھے..... زہرہ کا خوف بھی اپنی جگہ بجا ہے کیوں کہ اس کی ماں کو بھی ایسے ہی ایک عزت دار گھرانے میں چھپ کر نکاح کرنے کی سزا ملی تھی..... اور اس کی ماں طلاق کا داغ ماتھے پر سجائے واپس لوٹا دی گئی تھی..... اس کا شوہر ایک کم زور مرد ثابت ہوا جو اپنے اونچے خاندان کی ناراضگی اور پریشر برداشت نہیں کر پایا تھا.....

موسیٰ: مجھے زہرہ کے فیصلے کا اتنا زیادہ دکھ نہ ہوتا اگر اس کا انتخاب ٹھیک ثابت ہوتا..... مگر کل رات مجھے پتہ چلا کہ اس نے تو ایک ایسے شخص کو چن لیا ہے جو مرد کہلائے جانے کے بھی قابل نہیں..... ایک ذلیل انسان اس کے سامنے بیٹھا اس کی بیوی سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شوہر بے غیرت سب جانتے ہوئے بھی ہنستا رہا.....

نامراد: اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک شہریار نے صرف دکھاوے کے لیے زہرہ کے ساتھ نکاح کیا ہے..... دل سے وہ اسے اپنی منکوحہ نہیں مانتا اور نہ ہی اسے اپنے گھر کی عورت سمجھتا ہے..... ورنہ وہ ضرور زہرہ کو عزت دیتا..... مگر وہ آج بھی زہرہ کو اسی ناچنے گانے والے طبقے کی ایک بدنام لڑکی سمجھتا ہے.....

(موسیٰ کو غصہ آ جاتا ہے)

موسیٰ: تو پھر اس نام نہاد رشتے کی بھی کیا ضرورت تھی..... ایسا سلوک تو کوئی اپنے پالتو جانور کے ساتھ بھی نہیں کرتا.....

نامراد: انسان بڑی گنجل پہیلی ہے پیارے..... اسے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں..... پتہ نہیں اس ملک شہریار کے ذہن میں کیا خناس بھرا ہوا ہے..... مگر ایک بات تو طے ہے کہ اس نے زہرہ کی زندگی برباد کرنی تھی..... سو کر دی.....

موسیٰ: کاش..... کاش مجھے یہ سب زہرہ کے نکاح سے پہلے پتہ ہوتا..... تو میں زبردستی اسے ہاتھ سے پکڑ کر لے آتا.....

نامراد: اب آگے کیا ارادہ ہے.....؟.....

موسیٰ: میری وجہ سے لیلیٰ میڈم کو بہت کچھ سُننا اور سہنا پڑ رہا ہے..... سوچتا ہوں ان سے معذرت کر کے کام چھوڑ دوں.....، تو قیر نے رات کو بھی بہت ہنگامہ کیا تھا پارٹی سے واپسی پر..... اب وہ چپ بیٹھنے والا نہیں ہے..... میں نے تم سے اس بندے کی خبر نکالنے کا کہا تھا جس نے لیلیٰ میڈم پر حملہ کیا تھا..... اس کا کیا ہوا.....؟

نامراد: میں نے چاند پوری کو جیل میں پیغام بھجوا دیا ہے.....، فکر مت کرو..... جلد پتہ چل جائے گا.....

موسیٰ: مگر چاند پوری تو سارنگا استاد سمیت اندر بند ہے..... وہ بھلا کیسے پتہ لگائے گا وہاں سے.....

نامراد: جیل ہی تو ایسے ہر بدمعاش اور چور اُچکوں کی یونیورسٹی ہوتی ہے پیارے..... پولیس سے زیادہ ان اندر بیٹھے ہوئے استادوں کو باہر کی وارداتوں کی خبر ہوتی ہے..... اور سارنگا کا بہت بڑا اور مضبوط نیٹ ورک ہے سارے شہر کے انڈر ورلڈ گروہوں سے..... تم دیکھنا..... زیادہ دیر نہیں لگے گی وہاں سے جواب آنے میں.....

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر/ بیڈ روم

لیلیٰ کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی ہے۔ اُسے گذشتہ رات اپنے شوہر کی کہی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

flash back .....

New take

تو قیر: یہ ویڈیو کلپ دیکھنے کے بعد بھی تمہیں کوئی شک ہے کہ موسیٰ کے ارادے بہت خطرناک ہیں..... مجھے تو پہلے دن سے ہی وہ بہت مشکوک دکھائی دیا تھا.....، اور اب تو اس کا زہرہ سے تعلق بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی.....، زہرہ کا بیک گراؤنڈ کیا ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو..... مجھے تو اس موسیٰ کا یہ مذہبی حلیہ اور نمازیں سجدے بھی نرا ڈھونگ لگتی ہیں..... ضرور یہ موسیٰ کوئی زبردست بہروپیا ہے..... جو اپنا کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہاں چھپا بیٹھا ہے.....

(کٹ)

لیلیٰ سوچ میں گھری ایک لمبی سی سانس لیتی ہے اور بزر دے کر انٹر کام پر اپنی پی۔ اے/ نوکرانی وغیرہ سے کچھ پوچھتی ہے۔/ یا نوکر آتا ہے۔

لیلیٰ: موسیٰ کہاں ہے..... بھیجو اسے میرے پاس.....

نوکرانی: میڈم جی..... وہ تو صبح سویرے ہی کہیں نکل گیا تھا..... واپس نہیں لوٹا اب تک.....

لیلیٰ: کچھ بتا کر نہیں گیا کہ کہاں جا رہا ہے.....

نوکرانی: نہیں جی..... فون بھی بند جا رہا ہے اس کا.....

(لیلیٰ سر ہلاتی ہے۔ نوکرانی پلٹنے سے پہلے اطلاع دیتا ہے۔)

نوکرانی: کوئی ملاقاتی بڑی دیر سے بیٹھا ہے..... کہتا ہے ضروری کام ہے.....

لیلیٰ: میں آج کسی سے نہیں ملنا چاہتی..... ٹال دو اسے..... کوئی بھی ہے.....

نوکرانی: بہت ٹالنے کی کوشش کی ہے میڈم جی..... مگر بڑا ڈھیٹ بندہ ہے۔ کہتا ہے موسیٰ کے بارے میں کچھ بات کرنی ہے.....

(لیلیٰ چونک جاتی ہے)

لیلیٰ: موسیٰ کے بارے میں..... کون ہے آخر.....

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔ڈرائنگ روم

لیلیٰ ڈرائنگ روم میں آتی ہے۔کوئی شخص دیوار کی طرف منہ موڑے کھڑا ہے۔

لیلیٰ: کون ہو تم.....اور موسیٰ کے بارے میں کیا جانتے ہو.....؟ آنے والا پلٹتا ہے۔وہ عیسیٰ ہے۔

عیسیٰ: عیسیٰ.....عیسیٰ نام ہے میرا.....

(لیلیٰ حیرت سے نام دہراتی ہے)

لیلیٰ: عیسیٰ.....کون عیسیٰ.....

عیسیٰ: موسیٰ کا چھوٹا بھائی.....عیسیٰ.....

(عیسیٰ کی بات سن کر لیلیٰ کو حیرت کا جھٹکا لگتا ہے۔)

لیلیٰ: کیا.....؟.....تم موسیٰ کے بھائی ہو.....کہاں ہے موسیٰ.....؟

(عیسیٰ چونکتا ہے)

عیسیٰ: یہی تو میں آپ سے پوچھنے آیا ہوں.....کہاں ہیں موسیٰ بھائی.....؟.....آخری اطلاع تک تو وہ یہیں آپ کی نوکری کر رہے تھے۔

لیلیٰ: ہاں.....موسیٰ یہیں ہے.....میرا مطلب ہے کہ وہ یہیں جاب کرتا ہے.....مگر آج صبح سے بنا بتائے کہیں چلا گیا ہے.....

عیسیٰ ایک سرسری سی نظر آس پاس کی دیواروں پر ڈالتا ہے جہاں لیلیٰ کی بڑی بڑی تصویریں اور ایوارڈز وغیرہ دکھائی دے رہے ہیں۔عیسیٰ دھیرے سے بڑبڑاتا ہے۔

عیسیٰ: ویسے پوچھ سکتا ہوں یہاں کس معاوضے پر کام کرتے ہیں موسیٰ بھائی.....اور نوکری کیا ہے ان کی.....

لیلیٰ: موسیٰ میرا سیکورٹی گارڈ ہے.....تیس ہزار ماہانہ تنخواہ ہے اس کی.....اوپر سے بھی کچھ.....

(عیسیٰ دکھ سے ہنس پڑتا ہے مگر اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔وہ لیلیٰ کی بات کاٹ دیتا ہے اور جیسے خود سے کہتا ہے)

عیسیٰ: یہ وقت بھی آنا تھا بھائی پر.....کبھی اس سے دو گنے تگنے وہ خود روزانہ آتے جاتے "فقیروں میں بانٹ دیا کرتے تھے.....بُرا کیا بھائی تم نے.....بہت بُرا کیا خود کو اتنی بڑی سزا دے کر.....

(عیسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے اور پل بھر کے لیے رک کر لیلیٰ سے کہتا ہے)

عیسیٰ: اگر بھائی آئے تو اُسے بتانا کہ عیسیٰ ملنے آیا تھا.....ہو سکے تو ایک بار مل لے مجھ سے.....مجھے اس لڑکی کے بارے میں بات کرنی ہے جس کی وجہ سے بھائی نے گولی چلائی تھی.....اسے بتا دینا کہ میں ان لڑکوں تک پہنچ گیا ہوں.....

لیلیٰ: رُکو.....موسیٰ کون ہے.....میں نے کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے کبھی اس سوال کا جواب ہی نہیں دیا.....

عیسیٰ: اور کبھی دے گا بھی نہیں.....اسی شناخت سے بھاگ کر تو وہ یہاں آئے ہیں.....بس اتنا جان لیں کہ جتنے کی وہ یہاں آپ کے پاس نوکری کرتے ہیں.....اس سے کئی گنا زیادہ اماں صبح ان کے سر کے اوپر سے وار کر صدقہ کر دیا کرتی تھیں.....

(عیسیٰ جانے لگتا ہے۔لیلیٰ بے چینی سے پیچھے لپکتی ہے)

لیلیٰ: مگر موسیٰ کون ہے.....؟

عیسیٰ: (عیسیٰ ایک پل کے لیے رکتا ہے) پیر قدرت اللہ شاہ کا بڑا بیٹا.....موسیٰ.....

(لیلیٰ کے سر پر جیسے حیرت کا بم پھٹتا ہے۔عیسیٰ چلا جاتا ہے۔لیلیٰ دھیرے سے دھراتی ہے۔)

لیلیٰ: پیر قدرت اللہ شاہ.....اوہ مائی گاڈ.....

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: توقیر کا دفتر

توقیر کسی سوچ میں گم اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ہے، کچھ لمحوں بعد لیلیٰ کا پرسنل سیکٹری فیضی پُر جوش انداز میں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

فیضی: حاضر ہو سکتا ہوں سر.....؟

توقیر: آؤ فیضی.....کہاں رہ گئے تھے.....کب سے انتظار کر رہا ہوں.....کیا خبر لائے ہو؟

فیضی: خبر بڑی کمال ہے.....میڈم آج صبح سے گھر سے نکلیں ہی نہیں.....،.....نہ ان کا کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے.....

توقیر: کیوں.....؟.....صبح میرے آفس آنے سے پہلے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی.....کیا ہوا ہے اسے.....

فیضی: میڈم کو کچھ نہیں ہوا.....مگر وہ ان کا باڈی گارڈ موسیٰ.....سنا ہے وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے.....صبح سے غائب ہے مگر اس کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہے.....

(توقیر جوش میں کھڑا ہو جاتا ہے)

توقیر: کیا.....؟.....موسیٰ چلا گیا.....یہ ہوئی ناں بات.....اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے.....

فیضی: میرا خیال ہے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا آپ کو اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے.....

توقیر: ٹھیک کہہ رہے ہو.....اب تو ہنڈرڈ پرسنٹ پولیس کا سارا شک موسیٰ پر ہی جائے گا جو اچانک یوں کسی کو بنا کچھ بتائے غائب ہو گیا ہے.....تم ایسے کرو کہ اطلاع کروا دو کرائے کے قاتل کو کہ آج رات ہی وہ بہترین موقع ہے واردات کر گزرنے کا.....،.....میں رات کو پروڈیوسر جبار کی پارٹی میں جا رہا ہوں.....وہ پارٹی آدھی رات سے کچھ اوپر ہی چلے گی.....اور میں تب تک وہاں رہوں گا جب تک کہ گھر کا کوئی نوکر یا پولیس مجھے فون کر کے لیلیٰ کے ختم ہو جانے کی اطلاع نہیں کر دیں گے.....اس طرح درجنوں گواہ بھی خود بخود میری غیر موجودگی کی گواہی دینے والے پیدا ہو جائیں گے کہ میں تو ان کے ساتھ اس وقت پارٹی انجوائے کر رہا تھا جب یہ واردات ہو رہی تھی.....،.....میرے بعد صرف ایک موسیٰ ہی بچتا ہے جسے لیلیٰ کی حفاظت کے لیے وہاں موجود ہونا چاہیے تھا.....مطلب قصہ ختم.....پیسہ ہضم.....(توقیر اور فیضی پلانگ کر کے زور سے ہنستے ہیں۔)

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ اداس سی اپنے بیڈ روم سے باہر نکلتی ہے۔سامنے کوئی نوکرانی وغیرہ کام کر رہی ہے۔وہ جلدی سے زہرہ کی طرف بڑھتی ہے۔

maid میڈ: آپ کے لیے کچھ بنا دوں بی بی جی.....کچھ کھا لیں.....آپ نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا.....

زہرہ: نہیں.....مجھے بھوک نہیں ہے.....

(نوکرانی پلٹ کر جانے لگتی ہے)

زہرہ: سنو.....یہ باہر پورچ میں بڑی گاڑیوں کا شور کیسا تھا.....؟.....کوئی آیا تھا کیا.....

میڈ: جی.....وہ ملک صاحب کے گاؤں سے ان کے مہمان آئے ہیں.....

زہرہ: مہمان.....؟.....مگر کون.....؟.....

نوکرانی: پتہ نہیں جی.....بڑی بڑی گاڑیوں میں اونچے اونچے شملے والے کچھ مہمان آئے ہیں.....نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں .....ملک صاحب بھی ان کے ساتھ نیچے ہی ہیں.....

زہرہ: اچھا ٹھیک ہے.....تم جاؤ.....

نوکرانی چلی جاتی ہے۔زہرہ کچھ سوچتی ہے اور پھر نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر،ڈرائنگ روم

ڈرائنگ روم سے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔اندر کچھ پگڑیوں والے اور بڑی مونچھوں کے ساتھ بارعب چہرے والے دو تین مرد بیٹھے ہوئے ہیں۔شہریار ان کے درمیان سر جھکائے پریشان سا بیٹھا ہے اور ان میں سے ایک بڑی عمر کا مرد شہریار کو بُری طرح جھاڑ رہا ہے۔

ملک شیر/مرد نمبر1: اوئے ملک شہریار.....تُو نے تو ناک کٹوا کر رکھ دی ہے سارے علاقے میں ہماری.....دو ٹکے کی عزت نہیں چھوڑی تُو نے ہماری.....تجھ سے یہ امید نہیں تھی مجھے.....کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ تُو ہمارا خون ہے بھی یا ہمارے جنتی والدین نے تجھے کہیں سے لے کر پالا تھا.....

شہریار: کیوں بھائی جی.....ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ اب آپ کو اپنے خون پر بھی شک ہونے لگا ہے.....

(☆زہرہ دروازے کے پیچھے کھڑی سن رہی ہے)

مرد نمبر2: اچھا.....تو اب یہ بھی تم اپنے بڑے بھائی صاحب سے پوچھ رہے ہو.....؟.....کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم نے ایک ماڈرن ناچنے والی طوائف کو گھر میں ڈال رکھا ہے.....

شہریار: (شہریار طنز کرتا ہے)اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے ملک وجاہت.....کیا میں نہیں جانتا کہ علاقے میں میرے کس کس کزن نے کس کس بازار والی کو شہر میں یا باہر کہیں نہ کہیں کوٹھی بنگلہ لے کر ڈال رکھا ہے.....

مرد نمبر1 /شہریار کا بڑا بھائی

ملک شیر: (مرد نمبر ایک غصے میں پھنکارتا ہے)اوئے.....میرے سامنے تو اپنے چچازادوں کو طعنے مار رہا ہے.....جانتا نہیں.....یہ دونوں صرف تیرے چچازاد ہی نہیں.....ان کی بہن بھی تیرے گھر والی ہے.....عزت ہے وہ ہمارے سارے خاندان کی.....وارث دیا ہے اس نے تجھے.....شملا اونچا کیا ہے تیرا سارے علاقے میں.....

شہریار: میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے بھائی صاحب.....رانی میری گھر والی اور میری عزت تھی.....عزت ہے.....اور ہمیشہ رہے گی.....

مرد نمبر3: (مرد نمبر3 غصے میں اونچا بول جاتا ہے)تو پھر تم نے اس دوسری عورت سے نکاح کیوں کر رکھا ہے.....عیاشی ہی کرنی تھی تو دس عورتیں رکھ ڈالتے کہیں بھی.....ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا.....یہ تو مردوں کی شان ہوتی ہے.....مگر تم نے تو حد ہی پار کر لی.....

(شہریار چپ رہتا ہے اس کا بھائی ملک شیر اسے ڈانٹتا ہے۔)

مرد نمبر 1: اوئے اب چپ کیوں ہو گیا..... بولتا کیوں نہیں..... کیا یہ سچ ہے کہ تُو نے ایک بازاری عورت سے نکاح کر رکھا ہے اور وہ رہتی بھی یہیں ہے..... اسی گھر میں تیرے ساتھ.....

شہریار: یہ میرا ذاتی معاملہ ہے بھائی صاحب..... آپ لوگ اس میں نہ ہی پڑیں تو بہتر ہے.....

مرد نمبر 2: (شہریار کا بڑا سالا غصے میں غراتا ہے۔) ذاتی معاملہ تمہارا تب ہوتا، جب ہماری بہن تمہاری گھر والی نہ ہوتی مگر اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں رہا..... کل کو وہ عورت تم سے زمین جائیداد میں حصہ مانگے گی..... وراثت کے دعوے دار پیدا کر کے لے آئے گی تو تم کیا کرو گے..... الٹا ہمیں ذلیل کرواؤ گے تھانے کچہریوں میں..... عدالتوں کے چکر لگاتے پھریں گے ہم تمہارے مقدمات کے پیچھے.....

شہریار: یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اس دوسری عورت سے میری کوئی اولاد ہو گی یا کوئی وراثت میں حصے کا دعوے دار پیدا ہو گا.....؟ ..... میں نے اولاد کے لیے یہ نکاح نہیں کیا..... میرا وارث تو پہلے ہی پیدا ہو چکا ہے..... میرا بیٹا..... یہ نکاح تو بس مجبوری میں کرنا پڑا ہے مجھے۔

باہر کھڑی زہرہ یہ سب سن کر صدمے سے گنگ کھڑی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر/ لاؤنج وغیرہ

لیلیٰ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی ہے اور ساتھ ہی بار بار کسی کا فون نمبر ڈائل کر کے کال ملانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر دوسری طرف سے کمپیوٹر کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

voice: آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے، برائے مہربانی کچھ دیر بعد.....

(لیلیٰ پریشانی سے دوبارہ نمبر ڈائل کرتی ہے مگر فون لگاتار بند ہے۔ لیلیٰ پریشانی سے بڑبڑاتی ہے۔)

لیلیٰ: کہاں ہو موسیٰ..... پلیز..... اپنا فون آن کرو.....

voice overlap: (لیلیٰ کو موسیٰ کا پڑھتے ہوئے دعا مانگتے وقت رونا، توقیر کی موسیٰ کی بار بار بے عزتی کرنا، لیلیٰ کا گاڑی میں جان بوجھ کر موسیٰ کو پریشان کرنے کے لیے ڈسک ریکارڈر کا والیوم تیز کرنا، اور سیٹھ شہباز کا موسیٰ کو شراب/ ڈرنکس لانے کا کہنا، یہ سب یاد آتا ہے۔ لیلیٰ افسوس سے خود کو ملامت کرتی ہے۔) اتنے بڑے گھر کے بیٹے ہو تم ..... کبھی تم نے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا..... اور میں کتنی نادان تھی..... تمہیں پہچان بھی نہ پائی..... مگر آخر وہ ایسی کون سی مجبوری تھی، جس نے تمہیں ایک شہزادے سے فقیر بنا دیا ہے.....

لیلیٰ سر جھٹک کر ایک بار پھر سے نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گھر

زہرہ پریشانی سے گھبرا کر دروازے کے پیچھے سے ہٹ جاتی ہے۔ اندر وہی گرما گرم ماحول ہے اور شہریار کا بڑا بھائی اور

اس کے دو سالے اس سے جھگڑا کر رہے ہیں۔

ملک شیر علی

بڑا بھائی: اوئے میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ملک شہریار..... نکاح کے بعد وراثت کے جھگڑے پیدا ہو کر ہی رہتے ہیں .....تُو ان عورتوں کے چلتر نہیں جانتا..... جائیداد اور وراثت کے لیے وہ کسی حد سے بھی گزر سکتی ہیں.....

شہریار: لیکن جب یہ بات طے ہے کہ میری اس سے کوئی اولاد ہوگی ہی نہیں تو پھر وراثت کے جھگڑے کا کیا سوال.....؟.....

(ملک وجاہت غصے سے اپنے ساتھی مردوں کی طرف دیکھتا ہے۔)

ملک وجاہت: دیکھ لیا ناں بھائی جی..... اس کی نیت تو ابھی سے ڈنواڈول ہے..... کیسے اس کے حق میں بول رہا ہے جیسے اس کے گھر آئے ابھی چار دن بھی نہیں ہوئے..... کچھ عرصہ اور وہ اس کے ساتھ رہی تو یہ تو اس کے عشق میں ہمیں چھوڑنے سے بھی باز نہیں آئے گا..... لڑ پڑے گا یہ ہم سے.....

(شہریار زچ ہو جاتا ہے)

شہریار: آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں.....؟ میں نے صاف صاف بتا تو دیا ہے آپ سب کو کہ میں نے ایک عورت گھر میں ڈال رکھی ہے..... اور بس..... اور اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے میری زندگی میں..... کہیں تو کاغذ لکھ کر دے دوں آپ لوگوں کو..... (زہرہ باہر سن رہی ہے۔)

ملک شیر علی: کاغذ تو لکھنا پڑے گا تجھے..... پر ہمارے لیے نہیں..... اس عورت کے لیے لکھ دے کاغذ.....

شہریار: کیا مطلب.....؟

مرد نمبر 3: ابھی چار حرف بھیج کر فارغ کر دے اس عورت کو..... طلاق دے دوا سے.....

شہریار: کیا.....؟..... طلاق.....

باہر کھڑی زہرہ کو ایک زور کا چکر آتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 18

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

زہرہ باہر کھڑی اندر اپنے شوہر اور اس کے رشتہ دار مردوں کے درمیان ہونے والی بحث سن رہی ہے اور تبھی وہ طلاق کا لفظ سن کر چکرا جاتی ہے۔ اندر شہریار ان کا مطالبہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔

شہریار: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جی..... بڑا خرچہ کیا ہے میں نے اس نکاح پر..... ایسے کیسے ایک دم سے طلاق دے دوں اُسے۔

شیر علی: طلاق تو تجھے دینی ہی پڑے گی ملک شہریار..... اس مسئلے کا بس یہی ایک حل ہے.....

وجاہت: ورنہ رانی کو طلاق دے..... ابھی..... نکاح میں تو تمہارے ایک ہی عورت رہے گی..... یا ہماری بہن..... یا وہ عورت.....

مرد نمبر 3 / ملک رمضان: اور یہ بات یاد رکھنا کہ رانی کو طلاق دینے کے بعد خاندان اور شریکے سے تیرا کوئی تعلق نہیں رہے گا..... وہ ساری زمین جائیداد اور مربے جو رانی کے نام ہیں۔ ان سے بھی تجھے ہاتھ دھونا پڑیں گے..... اور بچے بھی اسی کے پاس رہیں گے۔

(شہریار بوکھلا جاتا ہے)

شہریار: یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں بھلا اپنی بیوی بچوں سے کیسے دست بردار ہو سکتا ہوں.....

(ملک شیر علی کھڑا ہو جاتا ہے۔ باقی دونوں مرد بھی اٹھتے ہیں)

شیر علی: اچھی طرح سوچ لے ملک شہریار..... تُو میرا چھوٹا بھائی ہے مگر جہاں خاندان کے ریتی رواج اور اصول کی بات آئے گی..... میں شریکے کا بڑا ہونے کے ناطے اپنے ٹبر کی روایتوں کے ساتھ ہی کھڑا رہوں گا..... تیرے سالے ٹھیک کہہ رہے ہیں..... اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے..... چاہے تو اپنا خاندان بچا لے..... اور چاہے تو عیاشی کر لے..... چل ملک رمضان..... چل وجاہت..... ہم نے جو بات کرنی تھی..... کر لی..... اب مزید یہاں بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں.....

شہریار: آپ لوگ بیٹھیں تو سہی..... اس طرح ایک دم اٹھ گئے ہو.....

ملک رمضان: ہم اس گھر میں دو گھڑی بھی زیادہ بیٹھنا پسند نہیں کرتے جہاں ہماری بہن کی سوتن رہ رہی ہو..... رب راکھا..... تیرے جواب کا انتظار کریں گے ہم.....

تینوں مرد ڈرائنگ روم سے نکل جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن۔ شام

جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت کا گھر۔ کمرہ

قدرت اللہ اور عیسیٰ کمرے میں بیٹھے ہیں۔ باپ عیسیٰ کو کچھ ہدایات دے رہا ہے، مگر عیسیٰ کسی اور خیال میں گم بیٹھا ہے۔

قدرت اللہ: علامہ شہاب الدین دو تین روز ٹھہریں گے..... تمام انتظامات تمہی کو دیکھنا ہیں..... وہ ہر سال کی طرح اس بار بھی وہیں مزار کے حجرے میں پڑاؤ ڈالیں گے..... دیکھو کوئی کوتاہی نہ ہو.....

(باپ عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے مگر عیسیٰ کا دھیان کسی اور جانب ہے قدرت اللہ اسے جھاڑتا ہے)

قدرت: عیسیٰ..... عیسیٰ.....

عیسیٰ: (عیسیٰ گڑبڑا جاتا ہے) جی..... جی ابا جان.....

(قدرت ڈانٹتا ہے)

قدرت: دماغ حاضر رکھو اپنا..... جو کہتا ہوں غور سے سنا کرو..... پتہ نہیں کن خیالوں میں گم رہتے ہو..... موسیٰ کو کبھی مجھے اپنی بات دھرانی نہیں پڑتی تھی..... وہ ہمیشہ.....

قدرت کی زبان سے انجانے میں موسیٰ کا نام نکل جاتا ہے، عیسیٰ چونک کر باپ کو دیکھتا ہے۔ قدرت کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ جلدی سے بات پوری کئے بنا چپ ہو جاتا ہے۔ عیسیٰ باپ کی کشمکش سمجھ جاتا ہے۔ اور خود ہی بات بدل دیتا ہے۔

عیسیٰ: آپ کچھ کہہ رہے تھے.....

قدرت: ہاں..... میں کہہ رہا تھا کہ میرے استادِ مکرم علامہ شہاب الدین تشریف لا رہے ہیں ہر سال کی طرح..... کچھ دن رُکیں گے یہاں اور میں ان کے ساتھ رہوں گا..... پیچھے سب تم نے ہی دیکھنا ہے..... خبردار..... کوئی کوتاہی نہ ہو۔

عیسیٰ: (عیسیٰ سعادت مندی سے سر جھکاتا ہے) جی ابا جان..... لیکن ہر سال تو علامہ صاحب کی خدمت موسیٰ بھائی کیا کرتے تھے..... اس بار وہ انہیں غیر حاضر پائیں گے تو کیا کوئی سوال نہیں کریں گے.....

(قدرت سوچ میں پڑ جاتا ہے)

قدرت: سوال تو اب ساری زندگی اُٹھتے رہیں گے..... کس کس سے حقیقت چھپائیں گے ہم.....

(عیسیٰ چالاکی سے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے)

عیسیٰ: اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں موسیٰ بھائی کو کہیں سے ڈھونڈ لاؤں..... میرا مطلب ہے۔ وہ چار دن کے لیے جب تک علامہ صاحب یہاں رُکیں گے..... ان کو دکھانے کے لیے..... پھر وہ واپس چلے جائیں گے۔

(قدرت سختی سے انکار کرتا ہے)

قدرت: نہیں..... چاہے علامہ صاحب کے سامنے مجھے کتنی ہی شرمندگی نہ اٹھانی پڑے..... میں موسیٰ کو دوبارہ یہاں قدم نہیں دھرنے دوں گا..... اس نے اپنے لیے ہر دروازہ خود بند کیا ہے واپسی کا..... اب ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے..... تم وہ کرو..... جو میں نے تم سے کہا ہے..... خوامخواہ ادھر اُدھر کی باتوں میں اپنا دماغ مت الجھاؤ۔

عیسیٰ ایک گہری مایوسی کی سانس لیتا ہے۔

عیسیٰ: جی ابا جان.....

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: شہریار کا دفتر

توقیر شہریار کے آفس آتا ہے۔ شہریار کسی سوچ میں گم بیٹھا ہوا ہے۔

توقیر: کہاں کھوئے ہوئے ہو ملک صاحب! نہ فون اٹھاتے ہو نہ ہی کال کا جواب دیتے ہو..... سب خیر تو ہے ناں.....

شہریار: خیر نہیں ہے یار..... رانی کے گھر والوں کو میرے زہرہ کے ساتھ خفیہ نکاح کا پتہ چل گیا ہے..... بہت ہنگامہ کیا ہے اس کے

بھائیوں نے میرے نئے گھر آ کر.....اور تو اور میرا اپنا بڑا بھائی بھی ان کے ساتھ مل کر انہی کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے..... سمجھ نہیں آ رہا کہ کیسے نکل Tackle کروں یہ پچوئشن.....

توقیر: تم نے تو بڑی رقم لگا دی تھی اس نکاح پر..... یہ تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔

شہریار: یہی تو.....سوچا تھا اپنے بزنس کا کنیکٹس contacts مضبوط کروں گا.....ہائی کلاس میں move کرنے والی بیوی ساتھ ہو گی تو ان خاندانوں میں بھی Easily انٹری ہو جائے گی جہاں بنا لائف پارٹنر ہائی جنٹری کی خواتین کسی کو گھسنے نہیں دیتیں.....سوچا تھا کہ زہرہ کے ذریعے ان کی ٹی پارٹیز اور گیدرنگز میں اپنا سرکل بڑھاؤں گا اور یوں اس ایلیٹ بزنس فورمز Ellite Business forms تک بھی رسائی ہو جائے گی جہاں پہنچنے میں ہم جیسے جاگیرداروں کو سالوں لگ جاتے ہیں.....مگر ساری پلاننگ چوپٹ ہوتی نظر آ رہی ہے۔

توقیر: میری طرف بھی کچھ ایسا ہی حال ہے.....لیلیٰ سارے بزنس پر ناگن بن کر بیٹھی ہوئی ہے.....بڑی مشکل سے اسے پچاس کروڑ کی لائف انشورنس کروا کر دی ہے.....بزنس اور آفس میں تو صرف 25% شیئر ہے میرا.....وہ بھی ماہانہ قسطوں کی صورت میں ملتا ہے.....زندگی عذاب کر رکھی ہے اس عورت نے میری.....

(شہریار غور سے توقیر کی طرف دیکھتا ہے)

شہریار: کہیں تم لیلیٰ کو راستے سے ہٹانے کا تو نہیں سوچ رہے.....ایسی کوئی حماقت مت کرنا.....

توقیر: فکر مت کرو.....جو بھی کروں گا.....سوچ سمجھ کر ہی کروں گا.....ویسے کتنی عجیب بات ہے.....ہم دونوں نے اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے دو عورتوں کو اپنی سیڑھی بنانے کی کوشش کی.....مگر لگتا ہے ہم دونوں نے ہی لنگڑی گھوڑیوں پر داؤ کھیلا ہے.....یہ عورتیں ہمیں کوئی فیض نہیں پہنچانے والی.....

شہریار: ٹھیک کہہ رہے ہو تم.....اور اس زہرہ نے تو بہت زیادہ مایوس کیا ہے مجھے.....

توقیر: میں تو کہتا ہوں یہ موسیٰ والے قصے نے بہت اچھا بہانہ فراہم کر دیا ہے تمہیں.....اگر کوئی صورت نکلتی ہے اس نقصان کی بھرپائی کی تو اپنی رقم نکالو اور جان چھڑاؤ اس عورت سے.....زندگی رہی تو ایسی اور بہت مل جائیں گی.....

شہریار: سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں.....کیونکہ جاگیر سے دستبرداری تو میں کسی بھی حال میں افورڈ نہیں کر سکتا.....زہرہ سے ہی جان چھڑانی ہو گی.....مگر دکھاوے کے لیے نکاح میں جو کچھ اس کے نام کیا تھا.....وکیل سے کہہ کر وہ سب دوبارہ لازمی اپنے نام کروانا ہو گا پہلے.....اس کی وہ بڑھیا لاتا بڑی چالاک عورت ہے.....بہت ہنگامہ کرے گی طلاق کا سن کر.....مجھے جو بھی کرنا ہے وہ اسی موسیٰ والے واقع کو بنیاد بنا کر کرنا ہو گا.....مگر اس سے پہلے اس موسیٰ کا کوئی انتظام کرنا بھی بہت ضروری ہے.....تاکہ بعد میں وہ کہیں اپنی بے گناہی کی گواہی دینے کے لیے نہ پہنچ جائے۔

(توقیر مسکراتا ہے)

توقیر: اس کی تم فکر نہ کرو.....قدرت نے ہمیں اگر ایک ساتھ اس مسئلے میں ڈالا ہے تو حل بھی میرے پاس ایسا موجود ہے کہ ہم دونوں کی ہی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی.....موسیٰ کا بہت پکا بندوبست ہو جائے گا.....یو جسٹ ڈونٹ وری.....

(شہریار بھی ہنستا ہے)

شہریار: مطلب ایک تیر سے کئی شکار.....زہرہ.....لیلیٰ اور موسیٰ.....سبھی کا قصہ تمام.....کمال ہو تم

دونوں دوست زور سے ہنستے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن
جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ اور نامراد موجود ہیں۔

موسیٰ: کیا..... عیسیٰ لیلیٰ میڈم کے گھر گیا تھا..... مگر کیوں..... ضرور اماں نے اسے میرے پیچھے بھیجا ہوگا.....

نامراد: ہاں..... شاید یہی بات ہو..... مگر اس نے لیلیٰ میڈم سے زیادہ لمبی بات نہیں کی..... مجھے خود لیلیٰ میڈم نے فون کر کے بتایا ہے..... وہ تمہارے لیے بھی بہت پریشان ہیں..... تمہیں یاد کر رہی تھیں.....

موسیٰ: مگر عیسیٰ نے کچھ تو کہا ہوگا ان سے.....

نامراد: ہاں..... تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ وہ ان لڑکوں تک پہنچ گیا ہے جن پر تم نے گولی چلائی تھی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ ہو سکے تو تم ایک بار عیسیٰ سے مل لو.....

(موسیٰ پریشان ہو جاتا ہے)

موسیٰ: میں نے اس لڑکے کو منع بھی کیا تھا کہ بھول جائے یہ سارا واقعہ..... مگر یہ عیسیٰ بھی ناں..... بہت ضدی ہے.....

نامراد: میری مانو تو اس سے مل لو ایک بار..... آخر بھائی ہے تمہارا..... پریشان ہوتا ہوگا تمہارے لیے.....

(موسیٰ کسی سوچ میں گم ہے)

موسیٰ: پریشان تو اس نے مجھے کر دیا ہے۔ اگر ان تین لڑکوں میں سے کسی نے اپنی زبان کھول دی تو بہت برا ہوگا..... مجھے عیسیٰ سے مل کر کسی بھی طرح اسے اس کھوج سے باز رکھنا ہوگا.....

//Cut//

Scene No # 5

وقت: شام سے رات ڈھلنے کا مونتاج

توقیر کسی دوست کے گھر آیا ہوا ہے جہاں شور وغل اور میوزک کا ہنگامہ ہے اور مرد اور عورتیں آپس میں ہنس بول رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں، توقیر نظر بچا کر ایک جانب آتا ہے اور اپنے فون سے کسی کا نمبر ڈائل کرتا ہے۔

توقیر: ہاں..... میں ڈنر کے لیے پہنچ گیا ہوں سلطان صاحب کی طرف..... اب رات دو تین بجے تک یہیں رکوں گا..... تم آگے اطلاع کر دو کہ میدان صاف ہے..... لیکن یاد رہے..... نئی سم ڈال کر فون کرنا..... اور بات ختم ہونے کے بعد فوراً وہ سم توڑ کر فلش کر دینا..... یاد رکھو..... سم توڑ کر پھینکنی نہیں ہے..... واش روم میں جا کر قاعدہ flush فلش میں سم کو بہا دینا ہے..... یہ بہت ضروری ہے..... اوکے..... ok گڈ لک..... اب دوبارہ مجھے کال نہ کرنا۔

(توقیر فون کاٹ دیتا ہے اور اپنے فون میں سے خاموشی سے سم نکال کر کوئی دوسری سم ڈال دیتا ہے۔ تبھی اسے پیچھے سے کسی میزبان کی آواز آتی ہے۔)

میزبان: کہاں ہو توقیر یار..... سب تمہارا وہاں پوچھ رہے ہیں.....

توقیر جلدی سے اس کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات
جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ کمرے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ کوئی نوکرانی آ کر پوچھتی ہے۔

نوکرانی: میڈم کھانا لگادوں.....صاحب تو شاید دیر سے لوٹیں گے.....

لیلیٰ: نہیں..... مجھے بھوک نہیں ہے۔تم باقی نوکروں کو بھی چھٹی دے دو اور جاتے ہوئے دروازے چیک کرتی جانا.....رات والے گیٹ کے گارڈز آ گئے ہیں یا نہیں.....

نوکرانی: جی.....وہ تو مغرب کے بعد ہی آ جاتے ہیں دونوں.....

لیلیٰ: اچھا ٹھیک ہے.....تم جاؤ.....

نوکرانی سر ہلا کر پلٹ جاتی ہے،لیلیٰ وہیں بیٹھے بیٹھے کمر ٹکانے کے لیے بستر پر ٹیک لگا لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ اپنے خیالوں میں چارپائی پر لیٹا کچھ سوچ رہا ہے،نامراد تیزی میں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔وہ کچھ پریشان لگ رہا ہے۔

موسیٰ: بڑی دیر لگادی.....کہاں رہ گئے تھے۔

نامراد: تمہارے ہی کام سے گیا تھا۔لیلیٰ میڈم پر جس نے حملہ کیا تھا.....اس کا پتہ چل گیا ہے۔

(موسیٰ جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا ہے)

موسیٰ: کون ہے وہ.....مجھے ابھی اس کے پاس لے چلو.....

نامراد: کرسچین کالونی کا کوئی بندہ ہے.....ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی وارداتیں شروع کی ہیں اس نے.....کندن نام ہے اس کا.....

موسیٰ: اس کا پتہ معلوم کرلیا ہے تم نے.....فوراً مجھے وہاں لے چلو.....

نامراد: بات پتے سے کافی آگے نکل گئی ہے پیارے.....جیل سے ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ آج کل میں ہی دوبارہ میڈم پر حملہ کرے گا.....کسی شخص نے پانچ لاکھ میں ڈیل فائنل کی ہے۔جس میں سے ڈھائی لاکھ وہ پہلے ہی کندن کو دے چکا ہے.....

موسیٰ: (موسیٰ پریشان ہو جاتا ہے)اوہ میرے خدا.....مجھے اس موقع پر میڈم کو تنہا چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا.....بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے.....

نامراد: سارنگا کے بندے شام سے کندن کے گھر کے باہر پہرہ دے رہے ہیں.....مگر وہ سرِ شام ہی سے غائب ہے.....

موسیٰ: ایک لمحہ ضائع کیے بنا مجھے میڈم کے گھر جانا ہوگا.....ابھی.....

(چابی دکھاتا ہے نامراد)

نامراد: میں دوست کی ٹیکسی لے کر آیا ہوں.....میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

(موسیٰ جلدی سے چابی لے لیتا ہے)

موسیٰ: نہیں.....تم کندن کے ٹھکانے پر جاؤ اور اگر نظر آئے تو وہیں دبوچ لینا.....میں میڈم کے گھر جا رہا ہوں۔

(موسیٰ تیزی سے باہر کی طرف لپکتا ہے نامراد پیچھے سے آواز لگاتا ہے)

نامراد: دھیان سے.....

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر

// Inter Cuts //

لیلیٰ اپنے بیڈ روم میں لیٹی سو رہی ہے، باہر مکان پر سناٹا چھایا ہوا ہے..... تیز ہوا سے کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں اور کھڑکی کا ایک پٹ کھل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: گاڑی۔ پاسنگ

موسیٰ پرانے ماڈل کی ایک کالی پیلی ٹیکسی تیزی سے سڑک پر دوڑاتے ہوئے کسی جانب بڑھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ:

توقیر کسی لیوش Lavish بڑے کامن واش روم common wash room میں داخل ہوتا ہے۔ دروازہ بند کرتا ہے اور جیب سے ایک بم نکال کر اسے دو ٹکڑے کر کے فلش میں پھینک کر بہا دیتا ہے۔ اور پھر خود ہی زور سے زور سے ہنس پڑتا ہے۔

توقیر: گڈ بائے لیلیٰ بیگم..... تمہارے ساتھ جتنی کٹی..... اچھی کٹی.....

توقیر واش روم سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: سڑک

موسیٰ تیزی سے گاڑی بھگاتے ہوئے لیلیٰ کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ اچانک سامنے کسی گاڑی کے آ جانے کی وجہ سے اسے زوردار بریک لگانی پڑتی ہے۔ سکریچ کی آواز سناٹے میں گونجتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا بیڈ روم

لیلیٰ سو رہی ہے۔ اچانک باہر کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ لیلیٰ گھبرا کر پوچھتی ہے۔

لیلیٰ: کون.....؟.....

جواب نہیں ملتا۔ لیلیٰ اٹھ کر دروازے کے قریب آتی ہے۔

لیلیٰ: کون ہے باہر.....؟..... بولتے کیوں نہیں..... گارڈ..... یہ تم ہو.....؟

لیکن باہر سناٹا طاری رہتا ہے۔ لیلیٰ دھیرے سے دروازہ کھولتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

موسیٰ تیزی سے گاڑی بھگاتے ہوئے لیلیٰ کے بنگلے کے باہر آ کر رکتا ہے اور گاڑی بند کئے بنا اندر کی طرف لپکتا ہے، گیٹ دھڑ دھڑاتا ہے مگر اندر سے گارڈ کی طرف سے خاموشی طاری رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

لیلیٰ کاریڈور میں ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی گھبرائے ہوئے انداز میں آگے بڑھتی ہے، دور کوئی سایہ نظر آتا ہے۔ لیلیٰ گھبرا کر پوچھتی ہے۔

لیلیٰ: کون ہو تم..... بولتے کیوں نہیں

آنے والا اندھیرے میں ہی چھپا رہتا ہے مگر اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوتا ہے جس میں ایک پسٹل نظر آ رہا ہے۔ لیلیٰ گھبرا کر پلٹتی ہے اور خوف کے مارے اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی وقت فضا میں فائر کی زوردار آواز گونجتی ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے دو مزید فائر ہوتے ہیں لیلیٰ لڑکھڑا کر زمین پر گر جاتی ہے۔ اندھیرے میں کوئی بھاگتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: پارٹی

توقیر پارٹی میں اپنی موجودگی کے زیادہ سے زیادہ گواہ بنانے کے لیے خوامخواہ لوگوں سے گھل مل رہا ہے اور تصویریں وغیرہ کھنچوا رہا ہے، سب ہنس بول رہے ہیں۔ اتنے میں توقیر کے فون پر گھنٹی بجتی ہے۔ وہ فون اٹینڈ کرتا ہے اور دوسری جانب کی بات سن کر اس کے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے۔

(لوگوں کو دکھانے کے لیے توقیر کی اداکاری عروج پر ہے)

توقیر: ہاں نثار..... سب خیر ہے ناں..... میں بس پارٹی سے نکل ہی رہا تھا..... کیا.....؟..... اوہ نو نو..... نو..... یہ نہیں ہو سکتا..... اوہ..... مائی گاڈ..... ہاں..... ہاں میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔

(توقیر گھبراہٹ میں فون بند کرتا ہے۔ کوئی پوچھتا ہے)

دوست: کیا ہوا توقیر۔ تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو.....

(توقیر روتے ہوئے کہتا ہے)

توقیر: میری دنیا اجڑ گئی ہے ثاقب بھائی..... کسی نے لیلیٰ کو گولی مار دی ہے..... یا اللہ..... میں کیا کروں۔

توقیر تیزی میں باہر کی جانب لپکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: رات

جگہ: توقیر کا بنگلہ

توقیر تیزی سے اپنی گاڑی میں اپنے گھر کے پورچ میں داخل ہوتا ہے اور اتر کر اندر بھاگتا ہے۔ اندر لاؤنج / راہداری وغیرہ میں گھر کے گارڈز اور پولیس وغیرہ جمع ہیں، توقیر جلدی سے کسی افسر کی طرف لپکتا ہے۔

توقیر: انسپکٹر صاحب..... لیلیٰ کیسی ہے.....؟..... وہ..... وہ ٹھیک تو ہے ناں.....

انسپکٹر: آپ کہاں تھے توقیر صاحب..... پیچھے آپ کے گھر پر اتنی بڑی واردات ہوگئی.....

توقیر: میں..... میں کسی دوست کے گھر انوائیٹڈ تھا..... مجھے کیا پتہ تھا کہ پیچھے..... اوہ میرے خدا.....

توقیر سر پکڑ کر خود کو کوستا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سامنے موسیٰ کسی پولیس والے کے ساتھ نظر آتا ہے۔ توقیر موسیٰ کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور تیزی سے آگے بڑھ کر موسیٰ کا گریبان پکڑ لیتا ہے۔

توقیر: تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو..... تم تو کہیں غائب ہو گئے تھے ناں..... تو اتنی رات کو اچانک کیسے لوٹ آئے..... انسپکٹر صاحب..... یہی ہے وہ جس نے میری بیوی پر گولی چلائی ہے..... پہلے بھی ایک مرتبہ یہ لیلیٰ پر قاتلانہ حملہ کروا چکا ہے..... اریسٹ کر لیں اسے..... یہی میری بیوی کا قاتل ہے..... (موسیٰ چپ چاپ کھڑا سن رہا ہے)

(SHO آگے بڑھ کر توقیر کے ہاتھ سے موسیٰ کا گریبان چھڑاتا ہے اور توقیر کو ایک جھٹکے سے پیچھے کرتا ہے۔)

SHO: ریلیکس توقیر صاحب..... آپ کی بیوی زندہ اور صحیح سلامت ہے..... صرف فرش پر گرنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا تھا جس کی وجہ سے انہیں ایمرجنسی میں ہاسپٹل شفٹ کرنا پڑا کیونکہ خون کافی بہہ گیا تھا..... بٹ شی ول بی فائن سون.....

(توقیر کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے)

توقیر: اوہ..... شکر ہے خدا کا..... لیلیٰ ٹھیک ہے..... لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے..... یہ حملہ اس موسیٰ نے کیا ہے..... گرفتار کر لیں اسے.....

(موسیٰ غور سے توقیر کو دیکھتا ہے۔)

موسیٰ: حملہ میں نے نہیں..... کندن نے کیا تھا توقیر صاحب..... وہی کندن..... جسے آپ نے پانچ لاکھ روپے کے عیوض یہ کام سونپا تھا.....

توقیر: یہ کیا بکواس کر رہے ہو..... کون..... کندن.....

(SHO پلٹ کر آواز لگاتا ہے)

SHO: لے آؤ اسے جمیل.....

راہداری کے کونے سے دو سپاہی حملہ آور کندن کو ہتھکڑیاں ڈالے گھسیٹتے ہوئے لیے سامنے آتے ہیں۔ جس کے کاندھے پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔

SHO: یہ کندن توقیر صاحب..... موسیٰ نے تو آپ کی بیوی کو بچایا ہے..... اگر موسیٰ کا نشانہ چوک جاتا تو کندن کا نشانہ سیدھا آپ کی بیگم کے سر کے پار ہوتا.....

(توقیر گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے)

توقیر: لیکن..... یہ..... کون ہے..... میں اسے نہیں جانتا انسپکٹر صاحب..... یہ ضرور میرے خلاف کوئی گہری چال ہے.....

SHO: اس کا فیصلہ تو اب تھانے چل کر ہی ہوگا مسٹر توقیر..... تمہیں تمہاری بیوی پر قاتلانہ حملہ کروانے کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔

توقیر: یہ سب کیا بکواس ہے..... آپ اس موسیٰ کے کہنے پر مجھے گرفتار کر رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے..... انڈر ورلڈ سے کتنے تعلقات جڑے ہیں اس کے..... میرے پاس سارے ثبوت موجود ہیں۔

SHO: تمہیں موسیٰ کے بیان پر گرفتار نہیں کیا جا رہا..... کندن نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے اور ہسپتال شفٹ کرنے سے پہلے خود تمہاری بیوی نے موسیٰ کی بے گناہی کی گواہی دی ہے..... جو اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہے..... لے چلو اسے..... باقی باتیں اب تھانے کے ڈرائنگ روم میں ہوں گی.....

(پولیس والے تیزی سے آگے بڑھ کر توقیر کو دونوں طرف سے جکڑ لیتے ہیں اور باہر کی جانب کھینچتے ہیں۔ توقیر چلاتا ہے۔)

توقیر: یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو انسپکٹر..... تم سب ملے ہوئے ہو..... جانتے نہیں ہو میری پہنچ کہاں تک ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کوئی misunderstanding ہے.....

مگر پولیس اسے لے جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: رات

جگہ: شہریار کا گھر، بیڈ روم

شہریار کے سیل فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ نمبر دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو جاتا ہے اور جلدی سے بیڈ روم سے باہر نکلتا ہے اور دھیرے سے مگر غصے میں پوچھتا ہے۔

شہریار: کیا بات ہے فیضی..... ایسی کیا آفت آ گئی ہے جو تم نے یوں آدھی رات کو فون کیا ہے۔ (دوسری جانب فیضی بے حد پریشان ہے۔)

فیضی: (لیلیٰ کا سیکرٹری) آفت ہی سمجھیں ملک صاحب..... وہ دراصل توقیر صاحب کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے..... لیلیٰ میڈم پر قاتلانہ حملے کے شبے میں.....

شہریار: کیا..... یہ کیا بک رہے ہو..... توقیر نے تو امر، موسیٰ کو..... میرا مطلب ہے کہ یہ پھندہ تو موسیٰ کے لیے تیار کروایا تھا اس نے.....

فیضی: بس جناب..... ساری چال الٹی پڑ گئی ہے..... وہ حملہ آور بھی گرفتار ہو گیا ہے جس نے میڈم پر حملہ کیا تھا پہلے بھی..... اور اس نے اپنے بیان میں توقیر صاحب کا نام لے لیا ہے..... کچھ کریں ملک صاحب۔

شہریار: میں..... میں کیا کر سکتا ہوں فیضی..... اور تمہارا یہ باس توقیر بھی ایک نمبر کا ایڈیٹ ہے..... کہا بھی تھا میں نے اس سے کہ کوئی نئی حماقت نہ کرے..... سنبھل کر چلے..... مگر اس نے میری ایک نہیں مانی..... اب بھگتے خود ہی.....

فیضی: ایسے نہ کہیں ملک صاحب..... ان کا تو بس اب ایک آپ ہی آسرا ہیں..... اس موسیٰ نے تو سب تلپٹ کر کے رکھ دیا عین وقت پر پہنچ کر..... میں نے صاحب سے کہا بھی تھا کہ یہ بڑا خطرناک بندہ ہے..... اس سے بچ کر رہیں ذرہ.....

شہریار: کیا..... موسیٰ نے.....؟ اب کہاں ہے وہ موسیٰ.....

فیضی: ہسپتال میں ہے جی میڈم کے ساتھ..... مجھے تو اپنی فکر ہو رہی ہے..... اگر اسے مجھ پر ذرہ بھی شک ہوا تو میری ہڈی پسلی ایک کر دے گا وہ..... بڑا اجلا دبندہ ہے جی.....

(شہریار پریشان ہو جاتا ہے)

شہریار: بکومت..... اور سب سے پہلے تو تم یہ فون بند کرو اور کچھ عرصے کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤ فوراً..... اور خبردار جو مجھے دوبارہ فون کرنے کی کوشش کی تو میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کروادوں گا..... اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً اپنی شکل گم کرو کہیں..... اور مجھ سے ہرگز دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا..... اس وقت جو بھی توقیر کے حق میں پولیس کے سامنے آئے گا وہ خود بھی مارا جائے گا..... اپنی جان بچاؤ فیضی.....

شہریار فون کاٹ دیتا ہے اور پریشانی سے بیٹھا کچھ سوچتا رہتا ہے۔ دوسری جانب فیضی جلدی سے اٹھتا ہے اور اپنا سامان وغیرہ سمیٹنا شروع کر دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: صبح ہونے کا مونتاج

جگہ: کسی بڑے اور مہنگے ہسپتال کا آؤٹر

لیلیٰ بستر سے ٹیک لگائے ہسپتال کے کمرے میں گم سم بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور چہرے پر نقاہت کے آثار ہیں۔ کوئی نرس یا ڈاکٹر اس کا ٹمپریچر لے کر چارٹ بناتی ہے۔ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے۔ دروازے پر موسیٰ کھڑا ہے۔ لیلیٰ اسے دیکھ کر ہلکے سے مسکراتی ہے۔

لیلیٰ: آؤ موسیٰ..... آؤ..... رک کیوں گئے.....

موسیٰ: آپ کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا..... مگر کچھ ضروری باتیں ہیں جو آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔

لیلیٰ: مجھے انسپکٹر صاحب نے سب بتا دیا ہے موسیٰ..... اور سچ تو یہ ہے کہ بہت زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی مجھے..... ہاں..... ایک جھوٹی آس کا ناکام سا بھرم اپنے اندر قائم کر رکھا تھا میں نے..... آخر کار وہ بھی ٹوٹ گیا.....

موسیٰ: تو آپ کو پہلے ہی توقیر پر شک تھا..... پھر بھی آپ نے اسے اتنی مہلت کیوں دی کہ وہ آپ پر اپنا آخری وار کر سکے..... ..... اس سے پہلے ہی اس کا بندوبست کیوں نہیں کیا آپ نے..... آپ کی ذرا سی غفلت سے آپ کی جان بھی جا سکتی تھی.....۔

لیلیٰ: چلی ہی جاتی جان تو اچھا تھا..... کون سا رشتہ بچا ہے میرے پاس کہ جس کے لیے جینے کی تمنا کروں اب.....

موسیٰ: ایسا کیوں کہہ رہی ہیں..... آپ ایسے شخص کے لیے اداس ہو رہی ہیں جس نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی..... وہ بھی صرف چند روپوں کے لیے.....

لیلیٰ: محبت کی تھی میں نے کبھی بہت ٹوٹ کر توقیر سے..... آئیڈیل تھا وہ میرا..... مگر شادی کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا مقصد زندگی بھر میری دولت پر عیاشی کرنا ہے..... میں نے یہ بھی قبول کر لیا کیونکہ میرا پیسہ صرف میرا ہی نہیں تھا..... میں تو بس اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی..... اس لیے جان بوجھ کر بے وقوف بنتی رہی..... اسی پر اندھا اعتماد کرتی رہی..... کہ شاید کبھی اسے میری وفاؤں کی قدر ہو جائے..... مگر توقیر جن راستوں پر چل پڑا تھا..... وہاں سے اس کی کبھی واپسی نہ ہو پائی..... اگر وہ اپنی زبان سے مجھ سے یہ سب مانگتا تو شاید تب بھی میں انکار نہ کرتی اُسے..... پتہ نہیں کیوں میرے اندر سے ہمیشہ ایک یہی آواز آتی رہی کہ وہ کبھی نہ کبھی میری قدر ضرور کرے گا..... مگر.....

موسیٰ: ایسی کیا مجبوری تھی آپ کو..... توقیر جیسے بندے کے لیے اتنی بڑی قربانی.....؟..... کیوں.....

لیلیٰ: فلم والی ہوں ناں..... ہمیشہ بے وفائی کو ہی میرا پیشہ سمجھا گیا ہے..... مجھے توقیر سے پہلے بھی ایک طلاق ہو چکی ہے..... تب بھی الزام میرے ہی سر آیا تھا کہ میری وجہ سے ہی میرا گھر ٹوٹا ہے..... تب تو قیر میری زندگی میں آیا اور میں نے خود

سے عہد کیا تھا کہ اس بار ہر حال میں اپنا گھر جوڑے رکھوں گی..... چاہے اس کے لیے مجھے خود کو ہی کیوں نہ تباہ کرنا پڑ جائے..... اور دیکھو موسیٰ.....

آج میں خود تباہ ہو کر بھی اپنا گھر نہ بچا پائی..... لوگ آج بھی مجھے ہی الزام دے رہے ہوں گے کہ میں نے اپنے گھر والے کو گرفتار کروا دیا۔

موسیٰ: دنیا کا کیا ہے..... وہ تو کسی حال میں بھی جینے نہیں دیتی..... آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں..... کام میں ذہن بٹائیں گی تو وقت کاٹنا آسان ہو جائے گا..... میں یہیں باہر ہوں..... کوئی کام ہو تو بلا لیجئے گا.....

(موسیٰ اٹھ کر جانے لگتا ہے۔ لیلیٰ اسے آواز دے کر روکتی ہے۔)

لیلیٰ: موسیٰ..... ایک بات پوچھوں..... سچ بتاؤ گے.....؟

موسیٰ: جی..... پوچھیے.....

لیلیٰ: زہرہ کون ہے؟

موسیٰ: (موسیٰ کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے) زہرہ..... کون.....

لیلیٰ: وہی زہرہ..... جس کی جدائی میں اتنے بڑے سید پیر گھرانے کا چشم و چراغ یوں در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے..... کیا مجھے نہیں بتاؤ گے کہ ایسی کیا مجبوری تھی کہ زہرہ نے تم جیسے ہیرے کو چھوڑ کر اس شہر یار جیسے پتھر کو چنا ہے.....

اپنی اصلیت کھل جانے پر موسیٰ گھبرا کر لیلیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: حوالات/جیل

توقیر حوالات میں سلاخوں کے پیچھے پریشان سا بیٹھا ہوا بار بار بے چینی سے سلاخوں سے باہر جھانک رہا ہے جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو، ایک سنتری/پولیس والا قریب سے گزرتا ہے توقیر جلدی سے اسے آواز دے کر روکتا ہے۔

توقیر: سنو بھائی..... میری بات سنو.....

(پولیس والا کڑک کر کہتا ہے)

پولیس والا: کیا ہے..... آرام سے کیوں نہیں بیٹھ جاتے.....

توقیر: وہ..... میری ضمانت کے لیے کوئی آیا ہوگا..... ذرا معلوم کر کے تو بتا دو مجھے.....

سنتری: واہ واہ..... لاٹ صاحب کے ٹھاٹ تو دیکھو..... ایک رات ابھی گزاری نہیں سرکاری مہمان خانے میں..... اور ضمانت کی فکر ستانے لگی ابھی سے..... آرام سے بیٹھے رہو..... کوئی نہیں آیا تمہاری ضمانت کے لیے.....

توقیر: کوئی نہیں آیا..... نہیں نہیں..... فیضی نام کا بندہ آیا ہوگا..... سیکرٹری ہے وہ میرا..... یا پھر ملک شہر یار نے کسی کو بھیجا ہوگا.....

سنتری: (سنتری ہنستا ہے) اوئے یہاں کوئی نہیں آتا..... سب مطلب کے یار ہوتے ہیں..... باہر کی یاریاں باہر ہی رہ جایا کرتی ہیں..... تم بھی بھول جاؤ..... اگر کسی نے تمہاری ضمانت کروانا ہوتی تو کب کا آ چکا ہوتا..... اب اکیلے بیٹھ کر سڑو یہاں پر..... سنا ہے بڑی سخت دفعہ لگی ہے تجھ پر..... آٹھ دس سال کے لیے گیا تُو اندر.....

سنتری آگے بڑھ جاتا ہے، توقیر پریشان بیٹھا دیکھتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

موسیٰ لیلیٰ کے سامنے بیٹھا اپنی کہانی ختم کرتا ہے۔

موسیٰ: بس اتنی سی کہانی تھی میری..... ہمارے راستے جُدا ہو گئے..... اور میں پلٹ کر کبھی اپنے گھر نہ جا سکا..... ابّا کی ڈکشنری میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں ہے.....

(لیلیٰ دُکھ سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

لیلیٰ: مجھے یقین ہے وہ اب تمہیں کھو کر بہت پچھتاتی ہو گی..... ملک شہریار ایک گرا ہوا انسان ہے جسے اپنے بزنس اور ترقی کے آگے مزید کچھ نہیں سُوجھتا..... وہ زہرہ جیسے نازک دل کی لڑکی کو کیا رکھ پائے گا..... جس سے اس نے صرف دکھاوے کے لیے نکاح کیا ہے..... اصل میں تو اسے ایک اسکارٹ کی ضرورت تھی..... اور بس.....

موسیٰ: یہ فیصلہ زہرہ کا تھا بابا اس کی ابّا کا..... میں یہ تو نہیں جانتا..... مگر کاش وہ کسی بہتر انسان کو چُنتی تو آج میرا دل اس کے لیے اتنا پریشان نہ ہوتا.....

لیلیٰ: کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی موسیٰ..... کہو تو میں جا کر خود ملک شہریار کے قدموں پر گر جاؤں اور زہرہ کی آزادی کی بھیک لے لیے بنا وہاں سے دوبارہ نہ اُٹھوں

موسیٰ: یہ قید زہرہ نے خود اپنے لیے چُنی ہے میڈم جی..... اور اب وہ اسے آخری دم تک نبھائے گی۔

لیلیٰ: پھر تو تمہاری زہرہ کی اور میری کہانی ایک جیسی ہی ہے.....

موسیٰ: ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... پہلے مجھے زہرہ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں..... مگر آپ سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ عورت کے لیے شناخت اور وفا کا بھرم قائم رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ساری عمر گزر جاتی ہے اس کو یہ بھرم قائم کرنے میں..... مگر زمانہ ایک لمحے میں ان کی ساری وفائیں ملیا میٹ کر دیتا ہے.....

لیلیٰ: یہی المیہ ہے..... اور تمہاری زہرہ بھی اس وقت اسی وفا کی کسوٹی پر خود کو قربان کر رہی ہے..... سب کچھ سہہ رہی ہے..... صرف اس لیے کہ کل کوئی اسے بے وفائی کا یا بازاری ہونے کا طعنہ نہ دے سکے..... ارے ہاں..... یاد آیا..... تمہیں نامراد نے بتا تو دیا ہو گا..... تمہارا بھائی آیا تھا یہاں..... بہت پریشان تھا تمہارے لیے..... تم ایک بار اس سے مل کیوں نہیں لیتے.....

موسیٰ: ہاں..... میں نے پیغام بھیجا ہے اُسے..... میں گھر تو جا نہیں سکتا..... لیکن وہ جانتا ہے کہ ہماری ملاقات کہاں ممکن ہے.....

لیلیٰ: اور زہرہ.....؟..... کیا زہرہ سے ایک بار نہیں ملو گے.....؟..... مجھے یقین ہے وہ بہت بے چین ہو گی تمہیں اس حال میں دیکھنے کے بعد.....

موسیٰ زہرہ کے نام پر چونک کر لیلیٰ کو دیکھتا ہے، مگر چپ رہتا ہے۔

موسیٰ: یک طرفہ محبت میں زبردستی نہیں چلتی..... بس آپ دعا کریں کہ وہ جہاں رہے..... خوش رہے..... کچھ کہانیاں ہمیشہ ادھوری ہی رہتی ہیں.....

موسیٰ بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔

لیلیٰ دکھ سے اسے جاتا دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: نیا گنبد مزار

پیر قدرت اللہ، پیر فضل، عیسیٰ اور چند دیگر مریدین وغیرہ مزار کے دروازے پر قدرت اللہ کے استاد علامہ شہاب الدین کا استقبال کر رہے ہیں۔ شہاب الدین ایک نورانی چہرے والا باریش بزرگ ہے جس کے چہرے پر سفید داڑھی عجیب سا نور بکھیر رہی ہے۔

قدرت اللہ: خوش آمدید..... خوش آمدید یا حضرت..... ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ایک بار پھر ہمارے غریب خانے کو رونق بخشی..... بخت جاگ گئے ہمارے.....

(عیسیٰ آگے بڑھ کر علامہ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا ہے۔

شہاب الدین: شہاب الدین اسے دعا دیتا ہے۔) جیتے رہو..... سدا آباد رہو.....

(پھر شہاب الدین کا دھیان ادھر اُدھر پڑتا ہے اور وہ عیسیٰ سے پوچھتا ہے)

شہاب الدین: تم عیسیٰ ہو ناں..... وہ تم سے بڑا کہاں ہے..... موسیٰ..... آج وہ دکھائی نہیں دے رہا.....

(عیسیٰ گھبرا کر اپنے باپ قدرت کی طرف دیکھتا ہے)

قدرت: موسیٰ آج یہاں نہیں ہے حضرت..... آپ اندر چلئے..... ان شاء اللہ عیسیٰ بھی آپ کی خدمت میں کوئی کمی نہیں آنے دے گا..... موسیٰ کی ڈیوٹی اب عیسیٰ نے سنبھال لی ہے.....

علامہ شہاب: (علامہ عیسیٰ کو دعا دیتا ہے) اچھا اچھا..... ماشاء اللہ..... تمہارے دونوں بیٹے ہی بہت سعادت مند ہیں قدرت اللہ ..... میں دونوں کے لیے دعا گو ہوں.....

علامہ شہاب الدین سب لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: شہریار کا آفس

شہریار اپنے آفس میں پریشان بیٹھا ہوا ہے، اسے اپنے بھائی اور سسرالیوں کی کہی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

Avdio

فلیش بیک

شیر علی: طلاق تو تمہیں دینی ہی پڑے گی..... یا تو وہ عورت تمہارے نکاح میں رہے گی یا پھر ہماری بہن..... اور یاد رکھو کہ رانی کو طلاق کی صورت میں ساری جائیداد، مُربعے بھی تمہارے نہیں رہیں گے..... اور بچوں کو بھی چھوڑنا ہوگا..... اتنے میں شہریار کے فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شہریار چونک کر فون اٹھاتا ہے۔ دوسری طرف لیلیٰ ہے۔

لیلیٰ: کیسے ہو ملک شہریار..... مزاج پُرسی کو بھی نہیں آتے میری.....

(شہریار چور لہجے میں کہتا ہے)

شہریار: مجھے تو قیر کی حرکت پر بہت افسوس ہوا ہے لیلیٰ جی..... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اب، شکر ہے تمہاری جان بچ گئی۔

(لیلیٰ طنز کرتی ہے)

لیلیٰ: کیا واقعی.....؟.....میں تو سوچ رہی تھی کہ اپنے جگری یار کی یاد ستا رہی ہوگی تمہیں.....کیا اس سے ملاقات کے لیے تھانے نہیں جاؤ گے.....تمہیں یاد کر رہا ہوگا بے چارہ.....

شہریار: ہاں جاؤں گا.....مگر فی الحال اپنی ایک پریشانی میں مبتلا ہوں.....تم بتاؤ.....کیسے فون کیا.....

لیلیٰ: کوئی کسی بزنس مین کو بھلا کیوں فون کرتا ہے.....ظاہر ہے.....کسی بزنس کے لیے.....

شہریار: کیسا بزنس.....میں سمجھا نہیں.....

لیلیٰ: میں تمہارے ساتھ ایک ڈیل کرنا چاہتی ہوں شہریار.....بہت بڑی ڈیل.....جس میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے.....

شہریار: ڈیل.....بزنس.....پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو.....کھل کر بات کرو.....

لیلیٰ: تمہیں زہرہ کو آزاد کرنا ہوگا.....بدلے میں جو تم چاہو.....سب تمہارے نام لکھنے کو تیار ہوں.....بلینک چیک بھیج دوں گی.....رقم بھرنے کا اختیار تمہیں دیتی ہوں.....جو چاہے بھر لینا.....بولو.....منظور ہے۔

(شہریار کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں)

شہریار: تمہیں زہرہ کی آزادی میں کیا انٹرسٹ ہے.....پوچھ سکتا ہوں۔

لیلیٰ: نہیں.....سوال کرنے کا اختیار نہیں رہے گا تمہارے پاس.....اور ایک اور کمٹ منٹ بھی کرنی ہوگی میرے ساتھ کہ تم نے زہرہ کو کیوں آزاد کیا.....یہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا.....

شہریار: انٹرسٹنگ.....ویسے تمہیں پتہ تو ہے ناں کہ میں نے زہرہ کو پانے کے لیے کتنا کچھ لٹایا ہے.....تو قیر نے کچھ تو بتایا ہوگا تمہیں.....

لیلیٰ: وہ نہ بھی بتاتا.....تو میں تمہیں بولی دے چکی ہوں.....فکر مت کرو.....اپنی بات سے مکرنے والی نہیں ہوں میں۔

(شہریار ہنستا ہے)

شہریار: ایک بار پھر سوچ لو لیلیٰ.....کہیں میں یہاں زہرہ کو آزاد کروں اور وہیں دوسری طرف تمہارا وہ غلام موسیٰ بھی آزاد ہو جائے .....سنا ہے بڑی پرانی جان پہچان تھی کبھی دونوں میں.....

(لیلیٰ سختی سے پوچھتی ہے)

لیلیٰ: ہاں.....یاں.....ناں.....مجھے ایک جواب چاہیے۔

شہریار: لگتا ہے معاملہ کافی سنجیدہ ہے.....ٹھیک ہے.....تم مجھے ذرا میرے سارے نقصان کا تخمینہ لگانے دو جو زہرہ کو چھوڑنے کی صورت میں مجھے اٹھانا پڑے گا.....کل تک تمہیں جواب مل جائے گا.....

(لیلیٰ فون کاٹ دیتی ہے شہریار زور سے ہنستا ہے)

شہریار: اسے کہتے ہیں چت بھی میری اور پٹ بھی.....واہ زہرہ بیگم واہ.....تم تو جاتے جاتے بھی میری تجوری بھر چلی ہو۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

وہ مکان جہاں موسیٰ نے کامران کے دوستوں پر گولی چلائی تھی۔

عیسیٰ اپنی جیپ میں گلی میں داخل ہوتا ہے اور چپ چاپ ایک جانب جیپ پارک کر کے گھر کی نگرانی کرنے لگتا ہے۔ وقت گزر رہا ہے اور حسب معمول کوئی ہل چل نظر نہیں آ رہی۔ عیسیٰ اکتانے لگتا ہے اور ایک لمبی انگڑائی لیتا ہے۔

تبھی اچانک اسے ایک جانب سے کوئی شخص پرانے اسکوٹر پر آتا نظر آتا ہے۔ عیسیٰ چونک کر سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور

پھر آنے والے شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے چمک اٹھتی ہیں۔ آتا ہوا شخص کامران ہے، عیسیٰ غصے سے بڑبڑاتا ہے۔

عیسیٰ: کامران..... یہ کمینہ یہاں کیا کر رہا ہے.....

پھر عیسیٰ کو وہ دن یاد آتا ہے جب سکینہ چھپ کر کامران کے ساتھ نکاح کرنے آئی تھی۔ عیسیٰ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوتا ہے اور وہ خود ہی بول اٹھتا ہے۔

عیسیٰ: اوہ میرے خدا..... اس کا مطلب ہے اس دن یہاں سکینہ کامران سے ملنے آئی تھی.....

یہ سوچتے ہی عیسیٰ کی آنکھوں میں غصے سے خون اتر آتا ہے۔

// FREEZ //

// Eng of Epi //

قسط نمبر 19

Scene No # 1

وقت: دن

عیسیٰ وہیں کھڑا مکان کے باہر گلی میں اپنی جیپ میں انتظار کر رہا ہے۔

کامران کچھ دیر کے بعد گھر سے باہر نکلتا ہے اور اپنے اسکوٹر کی جانب بڑھتا ہے، عیسیٰ بھی اپنی جیپ اسٹارٹ کرتا ہے اور کامران کے پیچھے اپنی گاڑی ڈال دیتا ہے۔ کامران چند گلیاں کراس کر کے باہر سڑک پر آتا ہے، عیسیٰ ایک سنسان جگہ دیکھ کر اپنی گاڑی کامران کے اسکوٹر کے آگے لا کر زوردار اسکریچ کے ساتھ بریک مار کر روک دیتا ہے۔ کامران گرتے گرتے بچتا ہے۔ عیسیٰ کو دیکھ کر خوف کے مارے اس کا رنگ سفید پڑ جاتا ہے، عیسیٰ اسے پسٹل دکھاتا ہے۔

عیسیٰ: چپ چاپ اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ..... ورنہ یہیں سڑک پر تمہاری قبر بنا دوں گا۔

کامران بے بسی سے آس پاس دیکھتا ہے اور پھر سر جھکا کر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ عیسیٰ گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 1-A

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

کردار: سکینہ کا کمرہ

سکینہ اپنے کمرے میں پریشان سی بیٹھی ہوئی ہے، اس کی ماں خدیجہ کمرے میں آتی ہے۔ اور سکینہ کی پریشانی نوٹ کرتی ہے۔

خدیجہ: کیا ہوا.....؟ تم آج کیوں صبح سے منہ سر لپیٹے کمرے میں پڑی ہو..... گھر کے ہزار کام کاج پڑے ہیں.....، ..... کمرے سے نکلنا نہیں ہے کیا۔

سکینہ: پتہ نہیں..... دل بہت گھبرا رہا ہے میرا..... کسی کام میں دل نہیں لگ رہا اماں.....

خدیجہ: کیوں کیا ہوا..... اور یہ عیسیٰ آج کل صبح سویرے کہاں نکل جاتا ہے..... کچھ خبر ہے تمہیں بھی۔

سکینہ: پتہ نہیں..... میں نے فون کیا تھا..... نمبر بند جا رہا ہے اس کا..... شاید تایا جان نے عا' صاحب کی ڈیوٹی پر لگا رکھا ہے اُسے.....

خدیجہ: ہاں..... مگر عیسیٰ کی بے چینی اور جلد بازی تو مجھے کچھ اور ہی کہتی نظر آتی ہے..... تم ذرا خیال رکھا کرو اپنے شوہر کا..... اسے اب تمہاری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

(سکینہ کہیں کھوئی ہوئی سی ہے)

سکینہ: شکایت تو اب صرف مجھے اپنے آپ سے رہتی ہے اماں..... ، ..... بہت گھٹن جمع ہو گئی ہے میرے اندر..... ڈرتی ہوں یہ گھٹن مجھے اندر ہی اندر مار نہ ڈالے.....

خدیجہ بیٹی کی بات پر گھبرا کر اسے دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 1-B

وقت: دن

جگہ: کوئی پرانا گودام.....اپارٹمنٹ/ تہہ خانہ، ویران فلیٹ وغیرہ

عیسیٰ گن پوائنٹ پر کامران کو گودام کے اندر لا چکا ہے۔ گودام میں آس پاس کاٹھ کباڑ بکھرا پڑا ہے اور جالے تنے ہوئے ہیں۔ جیسے برسوں سے یہ کمرہ/تہہ خانہ بند پڑا ہو۔ عیسیٰ کامران کو کسی کرسی پر بٹھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کسی رسی سے باندھ رہا ہے۔ کامران خوف زدہ ہے اور عیسیٰ سے منت زاری کر رہا ہے۔

کامران: دیکھو..... تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... میں نے تو کب کا یہ شہر بھی چھوڑ دیا ہے.....اب سکھر میں نوکری ہے پکی میری..... چاہو تو میری جیب میں پڑا میرے دفتر کا آفیشل کارڈ بھی چیک کر سکتے ہو.....

عیسیٰ: فکر مت کرو.....اب تمہیں یہاں لایا ہوں تو تمہارے سارے کارڈ اطمینان سے چیک کروں گا.....اس وقت تو مجھے تم سے صرف یہ جاننا ہے کہ جس گھر سے تم ابھی کچھ دیر پہلے نکلے تھے..... وہ کس کا ہے.....اور تم وہاں کیا کرنے گئے تھے۔

(کامران گھبرا جاتا ہے)

کامران: وہ..... میں..... میں وہاں کسی کو نہیں جانتا.....ابا نے بھیجا تھا کسی کام سے اس گلی میں..... میں غلطی سے غلط پتے پر چلا گیا تھا.....تم میری بات کا یقین کر دیں.....

(کامران کی بات اس کے منہ میں ادھوری رہ جاتی ہے اور اس کے بولنے سے پہلے ہی عیسیٰ کا زوردار چانٹا کامران کے چہرے پر پڑتا ہے۔)

عیسیٰ: سیدھی طرح سچ بتاتے ہو یا وقت سے پہلے ہی تمہاری قبر یہیں بنا دوں.....

کامران کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

لیلیٰ کے کمرے کے باہر موسیٰ بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ اندر لیلیٰ سو رہی ہے، موسیٰ کے فون پر گھنٹی بجتی ہے۔

(موسیٰ فون اٹینڈ کرتا ہے)

موسیٰ: ہاں نامراد.....بولو.....

(دوسری طرف کی بات سن کر موسیٰ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

موسیٰ: کیا.....کب ہوا یہ سب؟

نامراد: تمہارے کہنے پر میں نے اپنے بندے لگا دیئے اُس گلی میں.....آج عیسیٰ آیا تھا وہاں..... وہ پہرہ دیتا رہا اور پھر کسی لڑکے کو اٹھا کر لے گیا ہے وہ وہاں سے اپنی گاڑی میں۔

(موسیٰ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں)

موسیٰ: اسی بات کا ڈر تھا مجھے.....نامراد تم اپنے بندے کے ساتھ رابطے میں رہو.....اس سے کہنا کہ کسی بھی حال میں عیسیٰ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے..... میں ابھی نکل رہا ہوں یہاں سے.....

موسیٰ فون کاٹتا ہے اور ایک لمحے کے لیے کمرے میں جھانکتا ہے۔ لیلیٰ ویسے ہی پُرسکون نیند سو رہی ہے۔ موسیٰ دروازہ بند کر کے تیزی

سے باہر جاتے راستے کی طرف لپکتا ہے۔

//Cut//

وقت: مونتاج

جگہ: کاشانہء پیراں

عیسیٰ کی جیپ تیز رفتاری سے گھر کے باہر آ کر رکتی ہے اور وہ غصے میں بھرا اندر داخل ہوتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

عیسیٰ غصے میں آگ بگولہ سکینہ کو آوازیں دیتے ہوئے گھر میں اسے ڈھونڈ رہا ہے۔اس کی آوازوں سے ڈر کر اس کی ماں اور ساس بھی اپنے کمروں سے باہر نکل آتی ہیں۔

عیسیٰ: سکینہ.....کہاں ہو تم.....سکینہ.....باہر نکلو.....

ماں: کیا ہو گیا ہے عیسیٰ.....یہ کیا طریقہ ہے اپنی گھر والی کو آواز دینے کا.....

عیسیٰ: وہ کسی کے گھر کی نہیں ہو سکتی اماں.....بے وفا اور بد کردار عورت تو خود اپنی بھی نہیں ہوتی.....وہ دوسرے کسی کی کیا ہو گی۔

ماں: عیسیٰ.....یہ کیا بک رہا ہے.....؟.....آخر ہوا کیا ہے.....

(اتنے میں سکینہ اندر سے گھبرائی ہوئی باہر آتی ہے)

سکینہ: عیسیٰ.....تم.....اس وقت.....

عیسیٰ: ہاں میں.....تمہارے اندازے کے مطابق تو مجھے شام ڈھلنے کے بعد لوٹنا چاہیے تھا.....ہے ناں.....مایوسی ہوئی ہو گی مجھے جلد واپس گھر آتا دیکھ کر.....

(سکینہ کی ماں گھبرا کر کہتی ہے)

خدیجہ: یہ تم دونوں آپس میں کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو.....آخر ماجرا کیا ہے.....

عیسیٰ: یہ تو آپ اپنی اس لاڈلی سے پوچھیں چچی جان.....ہو سکتا ہے آپ کو ہی سچ بتا دے.....ورنہ ہمارے سامنے تو یہ ایک مکمل جھوٹ کا دوسرا نام ہے.....،.....جو آج تک مجھے.....آپ کو.....ہم سب کو صرف دھوکہ ہی دیتی آئی ہے.....

(سکینہ سر جھکائے کھڑی رہتی ہے)

سکینہ کی ماں: سکینہ کی طرف پلٹتی ہے۔

خدیجہ: تم بتاؤ.....یہ سب کیا ماجرا ہے.....عیسیٰ اتنے غصے میں کیوں گھر واپس آیا ہے.....

(سکینہ چپ رہتی ہے۔عیسیٰ اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سختی سے پوچھتا ہے)

عیسیٰ: یہ اپنے منہ سے کبھی اقرار نہیں کرے گی چچی جان.....کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ یہ آپ کی سگی بیٹی ہے بھی یا نہیں.....ایک آپ ہیں جنہوں نے چچا جان کی جوان موت کے بعد اس سفید لباس کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور پھر کبھی پلٹ کر اس چار دیواری کے باہر قدم رکھنا تو دور.....کبھی کسی کھڑکی یا روشن دان سے بھی باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی.....اور ایک یہ آپ کی بیٹی ہے.....جس نے عورت کے نام پر اتنے دھبے لگائے ہیں۔اتنی کالک ملی ہے کہ آج میرا دل کر رہا ہے میں اسے اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دوں.....

عیسیٰ کی ماں

ہاجرہ: عیسیٰ..... یہ کیا اول فول بک رہا ہے۔ آخر بولتا کیوں نہیں..... کیا کیا ہے سکینہ نے عیسیٰ ماں کو جواب دینے کی بجائے سکینہ سے براہ راست پوچھتا ہے۔

عیسیٰ: تم بتاتی ہو..... یا میں ہی تمہاری فرد جرم پڑھ کر سناؤں..... اس سے پہلے ان سب کو ذرا یہ بتا دو کہ جس دن موسیٰ بھائی نے ان تین لڑکوں پر گولی چلائی تھی..... تم اس وقت کہاں تھیں.....

(ہاجرہ اور خدیجہ چونک کر اور گھبرا کر سکینہ کی طرف دیکھتی ہیں، سکینہ چپ رہتی ہے۔ عیسیٰ چلاتا ہے۔)

عیسیٰ: بولو..... کہاں تھیں تم اس وقت.....

سکینہ: میں اس وقت اسی گھر میں تھی جہاں موسیٰ بھائی نے مجھے بچانے کے لیے ان لڑکوں پر فائر کیا تھا.....

(عیسیٰ غصے میں پھنکارتا ہے۔)

عیسیٰ: تم وہاں کیا کر رہی تھیں.....

سکینہ: میں کامران سے یہ کہنے گئی تھی کہ وہ مجھے گھر سے بھگا کر کہیں دور لے جائے۔

اچانک عیسیٰ کا ہاتھ گھومتا ہے اور ایک زوردار چانٹا سکینہ کے چہرے پر پڑتا ہے۔ سکینہ تھپڑ کھا کر دوسری جانب گر پڑتی ہے۔ سکینہ کی ماں اپنا سینہ پیٹ لیتی ہے اور ہاجرہ لپک کر عیسیٰ کو پکڑتی ہے تاکہ وہ کہیں غصے میں سکینہ کو مار ہی نہ ڈالے۔

ہاجرہ: عیسیٰ..... بس کر..... اب کیا جان لے گا اس کی.....

(خدیجہ بیٹی کو پیٹتی ہے اور روتی ہے)

خدیجہ: تجھے پیدا ہوتے ہی موت کیوں نہ آ گئی سکینہ..... آج تو نے میرا آخری مان بھی توڑ ڈالا۔

(عیسیٰ آگے بڑھتا ہے اور سکینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہے)

عیسیٰ: چلو میرے ساتھ..... تمہاری اس گھٹیا محبت کی کہانی تو میں وہیں ختم کروں گا جہاں سے یہ شروع ہوئی تھی۔

عیسیٰ سکینہ کو کھینچتے ہوئے باہر لے جاتا ہے۔ عیسیٰ کی ماں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہے مگر عیسیٰ سکینہ کو گھسیٹتے ہوئے لے جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: سڑک/ پاسنگ

موسیٰ کسی گاڑی میں تیزی سے عیسیٰ کو روکنے جا رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کوئی خالی پرانا فلیٹ/
ویران اپارٹمنٹ وغیرہ/
کوئی گودام

کامران کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور اس کے منہ میں کپڑا دے کر اس کی آواز بند کر دی گئی ہے۔ کامران کسی کرسی پر بندھا بیٹھا ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو آزاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک کمرے/ گودام کا دروازہ کھلتا ہے اور عیسیٰ سکینہ کا ہاتھ پکڑے اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لاتا ہے اور اسے کامران کے قدموں میں لا کر پھینک دیتا ہے۔

سکینہ گھبرا کر کامران کو دیکھتی ہے۔ کامران بھی سکینہ کو اس حال میں دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔ عیسیٰ آگے بڑھ کر کامران کے منہ

میں پھنسا کپڑا نکالتا ہے۔

عیسیٰ: یہ لو..... آ گئی تمہاری محبوبہ..... بہت بے چین تھے ناں تم دونوں ایک دوسرے سے ملنے کے لیے..... کتنے منصوبے بنایا کرتے تھے مگر میں تم دونوں کے راستے کی دیوار بنا بیٹھا تھا..... تو یہ لو..... آج میں نے خود ہی یہ دیوار گرا دی..... ملا دیا ہے تم دونوں کو..... اب جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھ لو کیونکہ بہت جلد تم دونوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہونے والی ہیں..... کامران گھبرا کر سکینہ کی طرف دیکھتا ہے، سکینہ نفرت سے دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔

کامران: تمہارے ساتھ سکینہ کی شادی زبردستی کی گئی تھی..... یہ زبردستی کا رشتہ اگر چل نہیں پا رہا تو اس کی سزا تم ہم دونوں کو کیوں دے رہے.....

عیسیٰ: بکواس مت کرو..... میں نے پہلے دن ہی سکینہ کو یہ کہہ دیا تھا کہ جس دن تم نے ایک اصلی مرد کی طرح میرے سامنے کھڑے ہو کر سکینہ پر اپنا حق جتایا..... میں خود تم دونوں کے راستے سے ہٹ جاؤں گا..... مگر جھوٹ اور سازش برداشت نہیں کروں گا.....

سکینہ: وقت ضائع مت کرو عیسیٰ..... میں اپنا جرم پہلے ہی قبول کر چکی ہوں..... اپنا انصاف کر کے اب تم سزا سنا دو.....

(عیسیٰ اپنے نیفے سے پسٹل نکالتا ہے اور گن کو لوڈ کر کے بولٹ کھینچتا ہے۔)

عیسیٰ: تم دونوں کو عیسیٰ موت کی سزا سناتا ہے..... کلمہ پڑھ لو.....

(کامران کی جان نکل جاتی ہے، سکینہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے)

کامران: دیکھو تم یہ سب.....

(اسی وقت گودام کا دروازہ دھڑ سے کھلتا ہے اور دروازے کے بیچوں بیچ موسیٰ پریشان سا کھڑا دکھائی دیتا ہے۔)

موسیٰ: رُک جاؤ عیسیٰ..... ایسی غلطی مت کرنا.....

//Cut//

Scene No # 5-A

وقت: دن

جگہ: پرانا گودام/ فلیٹ وغیرہ

عیسیٰ سکینہ اور کامران پر اسی طرح گن تانے کھڑا ہے موسیٰ بھائی کو روک رہا ہے۔ مگر عیسیٰ کے سر پر خون سوار ہے۔

عیسیٰ: تم آج درمیان میں کچھ نہیں بولو گے بھائی..... اس بے وفائی کی کہانی کو آج میں یہیں ختم کر کے یہ بوجھ دھرتی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دوں گا.....

موسیٰ: بوجھ ہوتا تو میں تم سے پہلے ختم کر چکا ہوتا..... جوش سے نہیں ہوش سے کام لو عیسیٰ..... سکینہ اب تمہاری بیوی ہے..... تمہاری عزت ہے.....

عیسیٰ: (عیسیٰ چلاتا ہے) نہیں ہے یہ میری عزت..... صرف کلنک کا ایک ٹیکہ ہے جو ہمارے خاندان کے نام پر نہ جانے کب سے کسی داغ کی طرح چپکا ہوا ہے..... اور تم بھائی..... تم بھی تو سب جانتے تھے ناں..... اسی سکینہ کی وجہ سے تم نے فائر کیا تھا ناں اس کمینے مردود کے دوستوں پر..... پھر تم نے کیوں چھپائی مجھ سے یہ بات..... اس سکینہ کو بھی وہیں ان سب کے ساتھ ہی ختم کیوں نہیں کر دیا..... کیوں جانے دیا اسے زندہ وہاں سے.....

موسیٰ: بہن ہے یہ میری..... بھول رہے ہو تم..... اور بہنوں کو عزت سے چادر میں چھپا کر گھر کی چار دیواری میں رکھا جاتا ہے..... انہی یوں سر بازار رسوا نہیں کرتے ان کے بھائی.....

(سکینہ موسیٰ کی بات سن کر رو پڑتی ہے)

عیسیٰ: واہ بھائی واہ..... ایسی بہنوں کو تو لوگ زندہ دفن کر دیا کرتے ہیں..... اور تم اسے عزت بنا کر چار دیواری میں چھپانے کی بات کر رہے ہو..... اور یہ اتنی عیار اور چالاک ہے کہ چپ چاپ گھر واپس چلی آئی..... ہم میں سے کسی کو کان و کان خبر بھی نہیں ہونے دی اس نے کہ وہاں پیچھے کیا قیامت ڈھا کر آ رہی ہے یہ.....

موسیٰ: سکینہ کو میں نے ہی اپنے سر کی قسم دی تھی کہ وہ یہ بات جا کر کسی سے نہیں کہے گی..... اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے.....

عیسیٰ: ہاں..... اس کا تو کسی بات میں بھی کوئی قصور نہیں ہے..... اس کے کردار کو جانتے ہوئے بھی میں نے اسے اپنی عزت بنایا..... اسے اپنا نام..... اپنا مان دیا..... اور اس نے کیا کیا بھائی..... سارے مان، عزت اور بھرم چھوڑ کر ایک بار پھر گھر کی دہلیز پار کر کے اپنے اس پرانے عاشق کے پاس چلی آئی..... یہ صلہ دیا اس نے ہماری محبتوں کا بھائی..... اور تم آج بھی اسی کی حمایت میں بول رہے ہو.....

(موسیٰ ٹھنڈے لہجے میں کہتا ہے)

موسیٰ: کیا اسے مار دینے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا.....؟ ابا کا ایک بیٹا تو پہلے ہی در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے..... ان کا ایک بازو تو پہلے ہی کٹ چکا ہے..... تم ان دونوں کو مار کر ان کا دوسرا بازو بھی کاٹ دینا چاہتے ہو قتل کے الزام میں جیل جا کر..... پیچھے گھر کا کیا بنے گا عیسیٰ..... اماں کا..... چچی جان کا کیا ہوگا..... کچھ سوچا ہے تم نے.....

موسیٰ کے سمجھانے پر عیسیٰ غصے سے تلملا رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

ہاجرہ اور خدیجہ رو رہی ہیں۔ پیر قدرت ان کے قریب کھڑا غصے میں پوچھ رہا ہے۔

قدرت: اوہو..... اب کیا تم دونوں روتی ہی رہو گی..... آخر ہوا کیا ہے.....؟ کہاں لے گیا ہے عیسیٰ سکینہ کو..... کچھ پتہ بھی تو چلے.....

(خدیجہ بھائی کی منت کرتی ہے)

خدیجہ: عیسیٰ بہت غصے میں تھا بھائی جان..... کہیں وہ اسے کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دے.....

ہاجرہ: آپ جا کر پتہ کریں ناں پیر جی..... آپ کی بات تو وہ کبھی نہیں ٹالتا..... آپ کہیں گے تو ضرور معاف کر دے گا وہ سکینہ کو.....

قدرت: سمجھ نہیں آ رہا کہ قدرت کس بات کی سزا دے رہی ہے مجھے..... پہلے بڑا بیٹا راہ سے بھٹک کر آوارگی میں پڑ گیا..... اور اب یہ چھوٹا بھی اپنے ہوش کھو بیٹھا ہے..... یہ سب ہو کیا رہا ہے.....

خدیجہ: میں مانتی ہوں سکینہ کی غلطی بہت بڑی ہے..... اس نے اپنی نادانی میں بہت سی حدیں پار کر لیں مگر مجھے لگتا ہے اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ اپنی غلطیوں کا کفارہ بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے..... اسے ایک موقع تو ملنا چاہیے تھا.....

ہاجرہ: آپ کھڑے کیوں ہیں۔ خدا کے لیے کچھ کیجئے..... کسی کو بھیجئے ان کے پیچھے..... میں آپ کی منت کرتی ہوں۔

قدرت کچھ سوچ کر باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: پرانا گودام

سکینہ اور کامران ویسے ہی زمین پر پڑے ہیں اور عیسیٰ ان دونوں کے سر پر ویسے ہی گن تانے کھڑا ہے۔

عیسیٰ: تو تم کیا چاہتے ہو بھائی..... کیا میں انہیں یونہی چھوڑ دو..... جانے دوں انہیں زندہ.....

(سکینہ تڑپ کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

موسیٰ: ہاں..... چھوڑ دو انہیں..... اور آزاد کر دو سکینہ کو.....

عیسیٰ: کیا.....؟..... یہ تم کہہ رہے ہو بھائی..... تم.....؟..... جو پہلے ایسی کسی حد کو پار کرنے سے پہلے ہی اگلے کی گردن اتار دیا کرتے تھے..... تم آج مجھے اپنی غیرت کو نیلام کرنے کا مشورہ دے رہے ہو..... کیا ہو گیا ہے تمہیں بھائی.....

موسیٰ: ہاں..... میں یہی کہہ رہا ہوں تم سے کہ آزاد کر دو اسے..... کیونکہ میں یہ بات جان چکا ہوں کہ ہم زبردستی اپنی محبت کو قید نہیں کر سکتے..... محبت تو ایک خوشبو کی طرح آزاد احساس ہے جو اپنا رستہ خود بناتی ہے..... جانے دو اسے..... اگر یہ دل سے تمہاری نہیں ہو سکی تو پھر اس کے جسم کو قید رکھنے سے بھی کیا فائدہ..... تم اگر آج یہیں اسی جگہ اس کی سانسیں بند کر کے اسے مار بھی ڈالو تو بھی صرف اس کے جسم کو ہی ختم کر پاؤ گے..... اور میرا بھائی اتنا کم زور تو ہرگز نہیں ہے جو ایک کم زور عورت کے جسم کو ختم کر کے اپنی فتح کا جشن منائے گا..... میرا بھائی تو بہت بہادر ہے..... وہ جسم کو نہیں..... روح کو فتح کر کے جینے والا فاتح ہے.....

(بھائی کی باتیں سن کر عیسیٰ شدید درد و کرب میں موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے اس کی پلکیں نم ہونے لگتیں ہیں اور وہ بمشکل ایک ہی لفظ بول پاتا ہے اور اس کا پسٹل والا ہاتھ نیچے گر جاتا ہے۔)

عیسیٰ: بھائی..... تم.....

(موسیٰ سکینہ کی طرف پلٹتا ہے اور اسے زمین سے اُٹھا کر کھڑا کرتا ہے)

موسیٰ: تمہارا دل اگر آج بھی عیسیٰ کے ساتھ نہیں جڑ پایا تو تم جہاں چاہے جا سکتی ہو..... عیسیٰ تمہیں آزاد کر دے گا..... چاہو تو عدّت کے دن میرے گھر آ کر گزار لینا..... اور پھر کامران سے نکاح کر لینا..... جاؤ ...آج تم دونوں پر کوئی پابندی نہیں ہے..... موسیٰ تم دونوں کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے۔

(سکینہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ کامران کی جان میں جان آ جاتی ہے۔ عیسیٰ چہرہ دوسری طرف کیے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔)

کامران: چلو سکینہ..... اب ہم آزاد ہیں..... میں تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں..... اب میرے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا..... ہم دونوں ایک نئی زندگی شروع کریں گے..... چلو..... اب دیر نہ کرو.....

(کامران آگے بڑھتا ہے مگر سکینہ اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے اور پیچھے سے کامران کو آواز دے کر روکتی ہے۔)

سکینہ: رُکو کامران..... میرا فیصلہ ابھی باقی ہے..... مجھے ان سب کو اپنا فیصلہ بھی تو سُنانے دو..... آج تک تو قید تھی..... آج آزادی ملی ہے تو مجھے بھی اپنے دل کی بات کہہ لینے دو..... پھر جانے کبھی موقع ملے..... نہ ملے.....

کامران حیرت سے سکینہ کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن، مونتاج

جگہ: زہرہ کا گھر۔ زہرہ کا کمرہ

زہرہ اپنے کمرے میں بے چین سی ٹہل رہی ہے، اسے موسیٰ کی کہی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ وہ بے چینی سے فون اٹھاتی ہے اور کوئی نمبر ڈائل کرتی ہے..... دوسری طرف بیل جاتی ہے مگر پھر اچانک ہی زہرہ کچھ سوچ کر بادلِ نخواستہ فون کاٹ دیتی ہے۔ جیسے اس کا دل بات کرنا چاہ رہا ہو۔ مگر اس کا ذہن اسے منع کر رہا ہو۔ زہرہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: پرانا گودام

کامران حیرت سے سکینہ کی طرف دیکھتا ہے۔

کامران: کیسا فیصلہ.....؟..... یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے..... اب جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے اور قدرت ہم پر ایک بار پھر مہربان ہو کر ہماری محبت کو ملانے جا رہی ہے،..... ایسے میں تمہیں جانے کون سی بات ستا رہی ہے۔

سکینہ: مجھے کہہ لینے دو کامران..... کیونکہ آج نہیں کہا تو پھر شاید کبھی نہ کہہ پاؤں..... ہاں یہ سچ ہے کہ میری شادی زبردستی عیسیٰ کے ساتھ طے کر دی گئی تھی اور اس رشتے کو میں نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا..... یہ بھی سچ ہے کہ اس رشتے کو توڑنے کے لیے میں نے اپنی ہر ممکن کوشش کر دیکھی..... حتیٰ کہ وہ حدیں بھی پار کر لیں جن حدوں کو پار کرنے کے بعد شاید ہی کوئی لڑکی پلٹ کر گھر واپس جا سکتی ہو..... لیکن ہر بار ناکام رہی..... مگر آج وہ مقام آ گیا ہے کہ خود میرے ہاتھ میں میری تقدیر کا فیصلہ سونپ دیا گیا ہے۔

کامران: تبھی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب دیر مت کرو..... جلدی چلو..... اب ہم آزاد ہیں۔

(کامران آگے بڑھ کر سکینہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ مگر سکینہ ایک قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ کامران حیرت سے اسے دیکھتا ہے۔)

سکینہ: تم آزاد ہو کامران..... میں نہیں..... تم جہاں چاہے جا سکتے ہو..... موسیٰ بھائی نے تمہاری جان بخش دی ہے۔

(عیسیٰ چونک کر پلٹتا ہے)

کامران: یہ کیا کہہ رہی ہو..... موسیٰ بھائی نے ہم دونوں کو آزاد کر دیا ہے۔

سکینہ: موسیٰ بھائی جانتے ہیں کہ اب میں عمر بھر کے لیے قید ہو چکی ہوں..... تمہارے سامنے یہ جو دو مرد کھڑے ہیں کامران..... ان میں سے ایک میرا وہ بھائی ہے جس نے عمر بھر کے لیے میری حفاظت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے..... اور دوسرا مرد میرا شوہر ہے جس نے زندگی بھر کے لیے مجھے قید کر لیا ہے..... اپنی وفا کا قیدی بنا لیا ہے..... اور کتنی عجیب بات ہے ناں..... یہ قید میں نے آج خود اپنی مرضی سے اپنے لیے چنی ہے..... میں کہیں نہیں جاؤں گی..... ساری عمر عیسیٰ کی قیدی بن کر رہوں گی.....

کامران: یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... تم تو مجھ سے محبت.....

سکینہ: کرتی تھی کبھی..... لیکن نہ جانے کب اور کس وقت میرے اندر تمہارے لیے ہر احساس خود بخود مرتا چلا گیا..... مجھے موسیٰ بھائی نے یہ احساس دلایا کہ ایک عورت کے لیے محبت سے کہیں زیادہ بڑھ کر عزت اور حفاظت کے احساس کی اہمیت ہوتی ہے..... جو مرد عورت کی حفاظت نہ کر سکے..... اسے عزت اور معاشرے میں صحیح مقام نہ دے سکے..... وہ مرد کسی بھی

عورت کی محبت کے قابل بھی نہیں ہوتا..... اور یہ عزت، مقام اور مرتبہ مجھے عیسیٰ نے دیا..... مرد اگر بہادر ہونے کے ساتھ اعلیٰ ظرف بھی ہو تو عورت کا دل خود بخود اس کے آگے جھکتا چلا جاتا ہے..... میں جانتی ہوں میں شاید ہمیشہ کے لیے عیسیٰ کی نظروں سے گر چکی ہوں اور اب اس کا دل مجھے شاید کبھی وہ مقام، وہ مرتبہ نہ دے پائے جو ایک شوہر کے دل میں اس کی شریکِ حیات کے لیے ہوتا ہے..... مگر پھر بھی ..... میرا دل ہمیشہ عیسیٰ کے آگے ہی جھکا رہے گا..... جاؤ کامران..... تم اب آزاد ہو۔

(کامران سر جھکائے شرمندگی سے کھڑا سکینہ کی یہ ساری بات سن رہا ہے۔ موسیٰ آگے بڑھتا ہے اور کامران کے لباس سے زمین کی گرد جھاڑتا ہے)

موسیٰ: سُن لیا تم نے..... یہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی کا فیصلہ ہے..... اُمید ہے تمہیں تمہارا جواب مل گیا ہوگا..... جاؤ جا کر اپنی زندگی کو ایک نیا آغاز دو..... تمہاری جوان بہنیں گھر میں بیٹھی ہیں..... پہلے ان کا گھر بسانے کی کوئی تدبیر کرو..... مجھے یقین ہے اللہ نے تمہارے لیے بھی کچھ بہتر ہی سوچ رکھا ہوگا.....

(کامران کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں)

موسیٰ: وقت بدل جاتا ہے..... رشتے بدل جاتے ہیں..... عقل مند وہی ہے جو خود کو وقت کے ساتھ ڈھال لے اور نئے رشتوں کے ساتھ چلنا سیکھ جائے.....

کامران اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا وہاں سے چلا جاتا ہے۔ سکینہ بھی رو رہی ہے۔ عیسیٰ اُسی طرح گم سم کھڑا ہے۔ موسیٰ ان دونوں کی طرف بڑھتا ہے۔

موسیٰ: سوچ کیا رہے ہو چھوٹے بھائی..... وہ جسے تم ساری زندگی اپنے دل میں قید کرنا چاہتے تھے..... اس نے آج خود اپنی مرضی سے خود کو تمہاری عمر قید میں دے دیا ہے..... جاؤ..... لے جاؤ اسے..... اور ایک نئی زندگی شروع کرو.....

(عیسیٰ ایک نظر بھر کر ناراضگی سے سر جھکائے کھڑی روتی ہوئی سکینہ کو دیکھتا ہے اور پھر پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ سکینہ جلدی سے اسے پیچھے سے آواز دیتی ہے۔)

سکینہ: سُنو..... کیا مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟.....

(عیسیٰ اب بھی ناراض ہے)

عیسیٰ: تمہیں گھر کا رستہ پتہ ہے..... چاہو تو رکشہ لے کر آ جانا.....

(سکینہ موسیٰ سے شکایت کرتی ہے)

سکینہ: دیکھیں موسیٰ بھائی..... یہ آج بھی مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے.....

عیسیٰ: چھوڑا میں نے تمہیں ہے یا تم نے.....

(موسیٰ بات کاٹ دیتا ہے)

موسیٰ: اچھا چلو اب یہ جھگڑا ختم کرو..... عیسیٰ..... سکینہ کو لے جاؤ گھر.....

عیسیٰ: (عیسیٰ ضد کرتا ہے) بھائی.....

موسیٰ: میں جو کہہ رہا ہوں..... سُنا نہیں..... میں تم سے زیادہ اس کا بھائی ہوں.....

(سکینہ جلدی سے آگے بڑھتی ہے اور موسیٰ کے گلے لگ کر رو پڑتی ہے۔)

سکینہ: آپ بھی گھر چلیں بھائی..... وہ گھر آپ کے بنا بہت ویران ہے.....

موسیٰ: جس دن ابا کا دل صاف ہو گیا..... میں خود واپس آ جاؤں گا تم لوگ جاؤ اب..... وہاں سب پریشان ہو رہے ہوں گے.....

(عیسیٰ اور سکینہ جانے لگتے ہیں۔ موسیٰ عیسیٰ کو پیچھے سے آواز دیتا ہے)

موسیٰ: عیسیٰ..... گلے نہیں ملو گے یار.....

(عیسیٰ کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں اور وہ لپک کر بھائی کے گلے لگ جاتا ہے)

عیسیٰ: بہت رُلاتے ہو بھائی..... بڑے ظالم ہو قسم سے.....

موسیٰ کی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ سکینہ بھی دونوں بھائیوں کو گلے لگا دیکھ روتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

زہرہ اور شہریار میں بحث چل رہی ہے۔

زہرہ: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... میں نے آج تک آپ کی دی ہوئی ہر ذلت اور ہر بے عزتی کو صرف اسی لیے برداشت کیا ہے کہ کسی طرح میرا گھر بنا رہے..... میں آتے ہوئے ابا جی سے وعدہ کر کے آئی تھی کہ اب اس گھر سے میرا جنازہ ہی واپس جائے گا.....

(شہریار چڑا ہوا ہے)

شہریار: کمال ہے..... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری مجھ سے جان چھوٹ رہی ہے..... ویسے بھی جب سے تم اس گھر میں آئی ہو ایک عجیب سی نحوست پھیلا رکھی ہے تم نے..... ہر وقت کا رونا دھونا..... ہر وقت کی کل کل.....

زہرہ: مگر میں کسی بھی حال میں گزارہ تو کر ہی رہی ہوں شہریار..... اگر مجھے چھوڑنا ہی تھا تو پھر مجھ سے نکاح ہی کیوں کیا.....

شہریار: بھول تھی میری..... تم تو میری توقعات کے بالکل ہی برعکس نکلیں..... میں تمہیں ایک ہائی فائی اور الٹرا ماڈرن زمانے کے ساتھ چلنے والی لڑکی سمجھ کر اپنے گھر لایا تھا..... مگر تم تو ماڈرن ڈریس میں ایک بوسیدہ بوڑھی روح سے زیادہ کچھ نہیں نکلیں..... اب جاؤ اپنے اسی عاشق موسیٰ کے پاس..... تم اسی کے قابل ہو.....

زہرہ: یہ الزام ہے..... صرف ایک تہمت ہے مجھ پر..... آپ اپنی پہلی شادی بچانے کے لیے اور اپنے سسرالیوں کے ڈر سے مجھ پر الزام لگا کر اپنی جان نہیں چھڑا سکتے.....

(شہریار چونک کر زہرہ کی طرف دیکھتا ہے)

شہریار: اوہ..... تو تمہیں خبر ہو گئی ہے..... چلو اچھا ہے مجھے زیادہ Explain نہیں کرنا پڑا..... ویسے بھی تم سے میرا نکاح ایک سودے سے زیادہ بڑھ کر نہیں تھا..... اور سودے بازی میں زیادہ وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں ہوتی.....

زہرہ: (زہرہ پھٹ پڑتی ہے) تو پھر کیوں میری زندگی برباد کی تم نے..... اگر نبھا نہیں سکتے تھے تو پھر ساتھ دینے کے جھوٹے دعوے بھی کیوں کیے تھے..... کتنے کم زور ہو تم..... تمہیں تو مرد کہتے ہوئے بھی مجھے شرم آ رہی ہے اس وقت.....

شہریار: تو نہ کہو..... ہاں مگر تم البتہ اتنی ہی حسین اور جوان ہو..... تمہیں تو کوئی بھی دوسرا طلب گار مل جائے گا..... اگلے مہینے میرے سسرال والے آ رہے ہیں میری بیوی بچوں کے ساتھ..... ان کے آنے سے پہلے اپنا کوئی بندوبست کر لو.....

(شہریار اپنی بات ختم کر کے وہاں سے چلا جاتا ہے۔ زہرہ رو پڑتی ہے)

زہرہ: ملک شہریار..... تم چاہو تو میری جان لے لو..... مگر جیتے جی اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی..... چاہے تم نے سودا کیا ہو..... مگر میں نے رشتہ جوڑا ہے..... میں اب یہ دہلیز مر کر ہی پار کروں گی۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں/ قدرت اللہ کا کمرہ

پیر قدرت اور بیوی میں بحث جاری ہے۔

قدرت: آخر کسی نے ان دونوں سے پوچھا بھی ہے کہ کہاں گئے تھے اور پھر واپس آئے ہیں تو پیچھے کون سی نئی کہانی شروع کر کے آئے ہیں..... یہ گھر ہے یا سرائے.....

ہاجرہ: اب جانے بھی دیں پیر صاحب..... یہ ان دونوں میاں بیوی کا اپنا معاملہ ہے..... خود ہی مل بیٹھ کر طے کر لیں گے..... میرے لیے تو یہی خوشی کی بات ہے کہ میرا بیٹا اور بہو صحیح سلامت واپس لوٹ آئے ہیں.....

(قدرت غصے میں تلملا رہا ہے)

قدرت: مگر وہ سکینہ..... کیا اس سے بھی اس کی ماں نے کچھ نہیں پوچھا..... اس لڑکی نے تو ہمارے پرکھوں کی عزت مٹی میں ملانے کی قسم کھا رکھی ہے جیسے..... اور وہ عیسیٰ..... مجھے تو اس کی غیرت پر بھی اب شک ہونے لگا ہے..... اتنا دکھ مجھے اس بات پر نہ ہوتا اگر وہ سکینہ کا گلا دبا کر اسے باہر ہی کہیں دفن کر آتا..... جتنا افسوس مجھے اسے اپنی بیوی کے ساتھ واپس چپ چاپ گھر آتے دیکھ کر ہوا ہے..... بے غیرت کہیں کا..... حور کا غلام.....

ہاجرہ: بس کر دیں پیر جی..... اس کی غیرت کو گالی نہ دیں..... اس نے تو ہمیشہ آپ کی بات کا ہی بھرم قائم رکھا ہے..... اس روز آپ نے عیسیٰ کو بے غیرت کیوں نہ کہا جب سکینہ پہلی بار گھر سے بھاگی تھی مگر آپ کے کہنے پر آپ کے اسی بیٹے نے اسے اپنے نکاح میں لے لیا تھا..... اس دن تو یہی عیسیٰ آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ فرمانبردار بیٹا دکھائی دے رہا تھا۔

قدرت: تب کی بات اور تھی..... مگر اس بار تو سکینہ اس کی بیوی تھی..... جب اس نے ایک بار پھر دہلیز سے باہر قدم نکالا۔

ہاجرہ: سکینہ کل بھی وہی سکینہ تھی..... اور آج بھی وہی سکینہ ہے..... جس طرح سر جھکائے آج وہی اکھڑ اور بددماغ سکینہ عیسیٰ کے پیچھے پشیمان اور شرمندہ چلی آ رہی تھی..... اسے دیکھ کر آج مجھے عیسیٰ پر بے حد پیار آیا..... اس نے سکینہ کو صحیح راہ دکھا دی ہے..... اب ان دونوں کو آپ کی سزا کی نہیں..... دعا کی ضرورت ہے.....

(قدرت چڑ کر کہتا ہے)

قدرت: پتہ نہیں..... تم عورتوں کی باتیں مجھے تو آج تک سمجھ آئی نہیں

ہاجرہ: اور اب تو میرے موسیٰ کی بے گناہی بھی ثابت ہو گئی ہے پیر صاحب..... وہ تو اپنے ہی گھر کی عزت کو بچانے نکلا تھا..... اب اس کی سزا بھی معاف کر دیں..... میرا بچہ کب تک در در کی خاک چھانتا رہے گا۔

قدرت: میں جانتا تھا کہ تمہارا اگلا مطالبہ یہی ہو گا..... لیکن تم سب ایک بات کان کھول کر سن لو..... جب تک موسیٰ اس بازاری لڑکی کے چکر سے باہر نہیں نکلے گا، تب تک میرے گھر میں وہ قدم بھی نہیں رکھ سکتا..... اگر اپنے بیٹے کو اس کے عشق سے توبہ کروا سکتی ہو..... تو تم بھی ایک بار کوشش کر دیکھو.....

قدرت غصے میں کروٹ لے کر لیٹ جاتا ہے۔ ہاجرہ پریشان سی بیٹھی شوہر کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

لیلیٰ ہسپتال میں اپنے بستر پر کسی سوچ میں گم بیٹھی ہے۔ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ لیلیٰ چونک کر فون

اٹھاتی ہے۔

لیلیٰ: ہیلو.....کون.....

(دوسری طرف خاموشی طاری رہتی ہے)

لیلیٰ: ارے بابا بولو بھی.....کون ہے.....تیسری مرتبہ کال آ رہی ہے تمہاری مگر کوئی بات نہیں کرتا..... میں یہ نمبر اب بلاک کر دوں گی.....

(دوسری طرف سے زہرہ کی آواز آتی ہے)

زہرہ: فون نہ کاٹیئے گا.....میں.....میں زہرہ بول رہی ہوں.....

(لیلیٰ حیرت سے ڈھراتی ہے)

لیلیٰ: زہرہ.....تم.....سب خیر تو ہے ناں.....تم ٹھیک تو ہو.....

زہرہ: نہیں.....میں ٹھیک نہیں ہوں.....احساس جرم مجھے اندر ہی اندر کاٹ کر دھیرے دھیرے ختم کر رہا ہے۔

لیلیٰ: خود کو الزام مت دو.....مجھے موسیٰ نے بھی بتا دیا ہے.....اس نے تمہاری خاطر بڑے درد جھیلے ہیں.....

زہرہ: جانتی ہوں میں.....اور میں ہی موسیٰ کی مجرم ہوں.....مجھ پر ایک احسان کریں گی لیلیٰ جی.....وہ آپ کی بہت عزت کرتا ہے.....بہت مان دیتا ہے آپ کو.....آپ اس سے کہیں اب گھر واپس لوٹ جائے.....بہت تباہ کر لیا اس نے اپنے آپ کو.....بہت بربادی ہو چکی اس کی.....لیکن اب بس کر دے خود کو یوں اذیت دینا.....میں اپنی ہار مانتی ہوں.....

لیلیٰ: تم کیا سمجھتی ہو میں نے اس سے یہ التجا نہیں کی ہوگی۔ جب سے اس کی اصلیت اور خاندان کا پتہ چلا ہے.....میں تو خود اپنی نظروں میں گر گئی ہوں.....مگر تم جانتی ہو.....وہ کسی کی نہیں سنتا.....اب یہ جوگ شاید شاید موسیٰ کے ساتھ ہی ختم ہوگا.....

(زہرہ کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے۔)

زہرہ: خدانخواستہ.....ایسا نہ کہیں لیلیٰ جی.....میں پہلے ہی خود کو معاف نہیں کر پا رہی ہوں.....

لیلیٰ: تو پھر تم ایک بار خود اس سے مل کر یہ سب کچھ کیوں نہیں کہہ دیتیں.....تمہاری تو خاموشی بھی سن لیتا ہے وہ.....

زہرہ: میں.....مگر میں.....کیسے.....؟

لیلیٰ: کسی ڈوبتے کو بچانے کے لیے تمہیں کچھ بھی کرنا ہوگا زہرہ.....وہ ڈوب رہا ہے.....ہو سکے تو اسے بچا لو.....تم جگہ طے کرو.....میں موسیٰ کو وہاں بھجوا دوں گی.....

زہرہ: ٹھیک ہے.....اس سے کہیے گا کہ جہاں ہم پہلے ملے تھے.....اسی جگہ آ جائے.....میں اس کا انتظار کروں گی مگر شہریار کے مجھ پر بہت پہرے ہیں۔ وہ بہت شکی مزاج ہیں.....اس لیے دیر نہ کرے.....میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا.....

(زہرہ فون کاٹ دیتی ہے۔ اسی لمحے موسیٰ لیلیٰ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ لیلیٰ اسے دیکھ کر مسکراتی ہے)

لیلیٰ: بڑا زور ہے بھئی تمہارے عشق میں.....میں تو آج تک خود کو ہی پورے نمبر دیتی آئی ہوں مگر آج ماننا پڑے گا.....کوئی اور بھی ہے ہمارے سوا.....

موسیٰ: ہوا کیا ہے لیلیٰ جی.....

لیلیٰ: زہرہ کا فون آیا تھا ابھی.....وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ آج ہی.....

(موسیٰ کے دل کی دھڑکنیں رک سی جاتی ہیں)

موسیٰ: زہرہ.....مجھ سے ملنا چاہتی ہے.....

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گھر

شہریار کے گھر سے زہرہ کسی دوسری گاڑی میں پورچ سے نکلتی ہے اور گیٹ سے باہر چلی جاتی ہے، گیٹ بند ہونے سے پہلے ہی شہریار کی گاڑی گھر میں داخل ہوتی ہے اور شہریار پورچ میں اتر کر اندر آتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گھر

شہریار لاؤنج میں داخل ہوتا ہے اور نوکر کو آواز دیتا ہے۔

شہریار: شبیرے.....شبیرے.....بات سنو میری.....شبیر جلدی سے اندر آتا ہے۔

شبیر: جی سرکار.....

شہریار: یہ دوسرے ڈرائیور کے ساتھ باہر کون گیا ہے ابھی؟

شبیر: بیگم صاحبہ گئی ہیں جی.....

شہریار: زہرہ.....مگر اس وقت.....کہاں.....؟

نوکر: جی وہ برکت ڈرائیور بتا رہا تھا کہ کسی لائبریری چلنے کا کہا ہے انہوں نے.....شاید کچھ کتابیں لینی ہوں۔

شہریار: (شہریار چونکتا ہے) لائبریری.....اس وقت.....اچھا تم ذرا کچھ دیر بعد برکت کو فون کر کے معلوم کرو کہ کون سی لائبریری گئی ہیں بیگم صاحبہ.....اور مجھے آ کر بتاؤ ان کی لوکیشن.....

نوکر: جی بہتر سرکار.....

شہریار: ہاں.....مگر دھیان سے.....جب وہ اپنی' رس پر پہنچ جائیں.....تب مجھے پوچھ کر بتانا.....جلدی کی ضرورت نہیں ہے.....

نوکر: جی.....سمجھ گیا صاحب.....

نوکر پلٹ کر چلا جاتا ہے۔شہریار کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: دن

جگہ: پرانے قلعے کی لائبریری

موسیٰ ویران سنسان لائبریری میں بے چین اور پریشان سا بیٹھا بار بار دیوار پر لگے پرانے وال کلاک کو دیکھ رہا ہے جس کی ٹِک ٹک کی آواز سے سارا ہال گونج رہا ہے۔دیوار کے روشن دانوں میں بنے کبوتروں کے گھونسلے سے کبوتروں کی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز آ رہی ہے اور کھلی بڑی کھڑکیوں سے شام کی ڈھلتی دھوپ اندر ہال میں چھن کر آ رہی ہے۔موسیٰ مایوس ہو کر پریشانی سے کھڑا ہو جاتا ہے تبھی باہر برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز گونجتی ہے۔موسیٰ چونک کر کھلے دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔تبھی زہرہ برقعہ پہنے اور چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے اندر داخل ہوتی ہے۔موسیٰ کے دل کی دھڑکنیں زہرہ کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح تھمنے لگتی ہیں۔وہ ایک ٹک زہرہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے، زہرہ بھی موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے اور چند لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی

چھائی رہتی ہے۔

زہرہ: کیا دیکھ رہے ہو.....؟

موسیٰ: ہر بار تم پر نظر پڑتی ہے اور ہر بار سب کچھ بھول جاتا ہوں.....

(زہرہ دکھ سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ: مت کرو مجھ سے اتنی محبت..... میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں موسیٰ.....

موسیٰ: مجھ سے وہ مانگو جو میرے اختیار میں ہو..... جس بات پر میرا اختیار ہی نہیں..... وہ کیوں کہتی ہو.....؟..... تمہاری محبت میں میں بے اختیار ہوں.....

زہرہ: کاش میں یہ اختیار تمہیں سونپ سکتی..... میرے بس میں ہوتا تو محبت نام کے اس عذاب کو تمہارے دل سے نکال کر سات سمندر پار کسی دور ویرانے میں پھینک آتی..... وفا دیتی کسی صحرا میں تاکہ تمہیں سکون نصیب ہو جائے.....

موسیٰ: اب اسی بے سکونی میں میرا سکون ہے..... تم خود کو میری وجہ سے بے آرام نہ کرو..... مت سوچو اس بارے میں..... جو میرا نصیب تھا..... وہ مجھے مل کر رہا.....

(زہرہ رو پڑتی ہے)

زہرہ: یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے..... کاش..... کاش تمہاری نظر مجھ پر کبھی نہ پڑتی..... کاش میں اس منحوس لمحے کو واپس لوٹا سکتی..... یہ سب میری نحوست.....

(موسیٰ جلدی سے زہرہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی بات روک دیتا ہے)

موسیٰ: ایسا پھر کبھی نہ کہنا..... وہی ایک لمحہ تو میری زندگی کا حاصل ہے..... اس ایک لمحے نے ہی تو مجھے جینے کی وجہ دی ہے۔

زہرہ: اور اسی ایک لمحے نے تم سے تمہارا سب کچھ چھین بھی تو لیا.....

موسیٰ: مجھے اس ایک لمحے سے صرف یہ شکایت ہے کہ ٹھیک اسی پل جب میرے دل پر یہ قیامت بیتی تھی..... تب تمہارے دل کی دھڑکن نے بھی وہی گواہی کیوں نہیں دی..... تمہارے اندر بھی سب کچھ جل کر اسی طرح راکھ کیوں نہ ہوا جیسے میرے اندر قیامت بیت گئی..... میں تو اسی پل "تم" ہو گیا تھا..... تم تم کیوں رہیں..... موسیٰ زہرہ ہو گیا تھا تو زہرہ موسیٰ کیوں نہ ہوئی۔

(زہرہ نظریں جھکا لیتی ہے۔)

زہرہ: کچھ حقیقتوں کا پتہ ہمیں بہت دیر میں چلتا ہے موسیٰ..... شاید میں بھی اسی پل تم ہو گئی تھی..... میرے اندر بھی وہی بجلی گری تھی جس نے تمہارے اندر سب راکھ کر دیا تھا..... مگر میں اس سچ سے انکار کرتی رہی.....

موسیٰ: کیا..... تو تم بھی.....

زہرہ: ہاں موسیٰ..... آج میں اقرار کرتی ہوں کہ میرے اندر کی دنیا بھی تم نے بدل ڈالی..... مگر میں اپنے ذہن میں تم سے ضد کرتی رہی..... لڑتی رہی خود سے بھی..... مگر آج میں اپنی ہار کا اقرار کرتی ہوں موسیٰ..... مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میرا دل بھی تمہاری بولی بولنے لگا اور کب تمہارے نام کی سرگوشی نے میرے دل کی دھڑکنیں بدل ڈالیں..... اور جب تک مجھے یہ احساس ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی..... میرا نام کسی اور کے نام کے ساتھ جڑ چکا تھا اور اب مجھے تمام عمر اسی نام کے ساتھ گزارنی ہے موسیٰ..... اس لیے میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں..... میری زندگی کو اور مشکل نہ بناؤ..... واپس لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں..... میں تمہاری مجرم ہوں..... معاف کر دو مجھے۔

(زہرہ بولتے بولتے رو رہی ہے۔)

(زہرہ موسیٰ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔ موسیٰ گھبرا کر بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

موسیٰ: خدا کے لیے ایسا نہ کہو..... تم میری مجرم نہیں ہو..... تم نے تو آج یہ سچ بتا کر مجھے بادشاہ کر ڈالا ہے..... شہنشاہ بنا دیا ہے اس ساری سلطنت کا..... اب اور کچھ نہیں چاہیے مجھے اس زندگی سے..... بس..... تمہارا یہ ایک اقرار کافی ہے یہ ساری زندگی بتانے کے لیے.....

(زہرہ امید بھری نظروں سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ: تو پھر میں یہ امید رکھوں کہ تم میری بات مان لو گے.....

موسیٰ: تمہارا ہر حکم سر آنکھوں پر..... مگر میں نے گھر چھوڑا نہیں..... ابا نے مجھے گھر سے نکالا ہے..... وہ واپس آنے کی اجازت دیں گے تو میں ضرور پلٹ جاؤں گا..... ویسے بھی وہ نامراد بہت بُرا کھانا بناتا ہے..... زیادہ عرصے جھیل نہیں پاؤں گا میں اس کے تجربوں کو.....

(زہرہ روتے روتے مُسکرا دیتی ہے)

زہرہ: اچھا..... تو تم اس نامراد کے ساتھ رہتے ہو..... وہ پان بھی بہت بُرے بناتا تھا.....

(موسیٰ اور زہرہ دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ موسیٰ غور سے زہرہ کی طرف دیکھتا ہے)

زہرہ: کاش میں تمہارے لیے کبھی اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر بھیج سکتی کھانے کے لیے.....

موسیٰ: ہاں..... سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ میرے گھر کے باورچی خانے کی انچارج اب ہمیشہ تم ہی رہو گی..... پر اپنے نصیب میں اُسی نامراد کے ہاتھ کی دال روٹی ہی لکھی تھی شاید.....

(زہرہ مسکراتی ہے اور ٹوٹے دل کے ساتھ کہتی ہے)

زہرہ: خوش نصیب ہے وہ نامراد..... کہ بامُراد ہوا..... اچھا..... اب میں چلتی ہوں..... وقت سے بہت زیادہ مہلت لے کر نہیں نکلی تھی میں گھر سے.....

(موسیٰ تڑپ سا جاتا ہے)

موسیٰ: اتنی جلدی..... ابھی تو تم آئی ہو..... نہ جاؤ..... جانے پھر کبھی ملاقات ہو..... نہ ہو.....

زہرہ: نہیں..... مجھے جانا ہوگا..... یہ پل..... یہ لمحے..... میرے لیے بھی بہت قیمتی ہیں..... عمر بھر سنبھال کر رکھوں گی میں انہیں اپنے دل کے اندر.....

(زہرہ کھڑی ہو جاتی ہے)

(موسیٰ ڈوبتے دل کے ساتھ کہتا ہے)

موسیٰ: جا رہی ہو.....؟

زہرہ: ہاں..... مگر اس امید کے ساتھ کہ تم اپنا وعدہ یاد رکھو گے اور حالات بہتر ہوتے ہی گھر واپس لوٹ جاؤ گے..... یاد رکھو گے ناں اپنا وعدہ..... وعدہ کرو مجھ سے.....

موسیٰ: تم سے کہی میری ہر بات میرا وعدہ ہے..... اطمینان رکھو.....

زہرہ: جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے وعدوں کا بھرم قائم رکھنا آتا ہے۔ میں صرف.....

زہرہ کی بات منہ میں ہی دبی رہ جاتی ہے کہ اچانک دروازے کی طرف سے کھٹکے کی آواز آتی ہے، دونوں گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 20

Scene No # 1

وقت: دن۔شام

جگہ: پرانے قلعے کی لائبریری

زہرہ واپس جانے کے لیے کھڑی ہے اور موسیٰ سے کچھ کہنے لگتی ہے کہ تبھی دروازے کی طرف کچھ آہٹ ہوتی ہے جیسے کوئی آیا ہو۔ زہرہ اور موسیٰ دونوں گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ تبھی لائبریری کے دروازے سے کوئی بوڑھا لائبریرین/اہل کار اندر داخل ہوتا ہے۔

ملازم: لائبریری بند کرنے کا وقت ہو چلا ہے کب سے..... باقی باتیں کل کر لینا.....

(موسیٰ بوڑھے ملازم کی دوٹوک بات سن کر گڑبڑا سا جاتا ہے، جب کہ زہرہ اپنی مسکراہٹ چھپا جاتی ہے)

موسیٰ: جی جی..... ہم بس جا ہی رہے تھے۔

(ملازم چپ چاپ واپس پلٹ جاتا ہے۔ زہرہ موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔)

زہرہ: اب تو جانا ہی پڑے گا..... وہ بے چارا بھی جانے کب سے ہماری وجہ سے بندھا بیٹھا ہے.....

(موسیٰ غصے میں بڑبڑاتا ہے)

موسیٰ: ایک دن کچھ دیر زیادہ ڈیوٹی کر لے گا تو قیامت نہیں آ جائے گی..... پتہ نہیں یہ وقت ہم سے عمر بھر اتنی ضد لگا کر کیوں چلتا ہے..... جب ہم اس کے جلدی گزرنے کی دعائیں کرتے نہیں تھکتے، تب ایک ایک پل ایک صدی کی طرح گزرتا ہے..... اور جب کبھی ہم اس کے رُک جانے کی آرزو میں مرے جا رہے ہوتے ہیں..... تب صدیاں بھی کسی ایک پل کی طرح بیت جاتی ہیں.....

زہرہ: کون سکھاتا ہے تمہیں یہ باتیں.....؟ کون بولتا ہے تمہارے اندر جو پھر مجھے ہفتوں تک الجھائے رکھتا ہے۔

موسیٰ: تم..... تم بولتی ہو میرے اندر..... تمہی نے سکھائی ہیں مجھے یہ باتیں.....

(زہرہ ایک لمحے موسیٰ کو جی بھر کر دیکھتی ہے)

زہرہ: دل کی یہ بولیاں ..... مجھے یاد رہیں گی ہمیشہ..... اپنا خیال رکھنا موسیٰ..... بہت قیمتی ہو تم..... یہ ہماری آخری ملاقات تھی.....

زہرہ بات ختم کر کے پلٹتی ہے اور دروازے کی طرف چل پڑتی ہے موسیٰ تڑپ کر اسے روکنے کے لیے دو قدم بڑھتا ہے۔ زہرہ دروازے کے قریب جا کر ایک لمحے کے لیے رُکتی ہے اور موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ چکے ہیں۔

زہرہ: زہرہ پل بھر کے لیے ہاتھ اٹھا کر موسیٰ کو الوداع کہتی ہے اور پھر تیزی سے پلٹ کر دروازے سے نکل کر اندھیرے میں اوجھل ہو جاتی ہے۔ موسیٰ تڑپ کر آگے بڑھتا ہے مگر زہرہ جا چکی ہے۔ موسیٰ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ اس کا ہاتھ ہوا میں ہی الوداع کہنے کے لیے معلق رہ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ کمرے میں کچھ تلاش کر رہا ہے اور کمرے کی الماریاں کھول کھول کر سامان الٹ پلٹ کر رہا ہے۔ سکینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

سکینہ: کیا ڈھونڈ رہے ہو.....؟

(عیسیٰ روکھے لہجے میں جواب دیتا ہے)

عیسیٰ: میری سیاہ پٹے والی دوسری گھڑی نہیں مل رہی..... کب سے ڈھونڈ رہا ہوں..... دیر ہو رہی ہے مجھے.....

سکینہ: تو مجھے بتاؤ..... میں ڈھونڈ دیتی ہوں..... تمہیں ویسے بھی کب اپنی چیزوں کی خبر رہتی ہے۔

(سکینہ آگے بڑھتی ہے اور کسی دراز سے گھڑی نکال کر عیسیٰ کے حوالے کر دیتی ہے۔)

سکینہ: یہ لو..... یہیں تو پڑی تھی.....

(عیسیٰ بنا سکینہ کے چہرے کی طرف دیکھے گھڑی پکڑتا ہے اور جانے لگتا ہے۔ سکینہ جاتے ہوئے عیسیٰ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

سکینہ: ابھی تک ناراض ہو مجھ سے..... معاف نہیں کیا ناں تم نے اب تک مجھے.....

(عیسیٰ روکھے لہجے میں جواب دیتا ہے)

عیسیٰ: میں کون ہوتا ہوں تمہیں معاف کرنے نہ کرنے والا..... موسیٰ بھائی نے تمہیں معاف کر دیا..... سمجھو ہم سب نے کر دیا.....

سکینہ: ایک بھائی کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے اپنی بہن کے لیے..... اسے تو آخر کار بہن کو معاف کرنا ہی ہوتا ہے..... مگر میں تو اپنے شوہر کی معافی کی طلب گار ہوں..... سنو..... معاف کر دو ناں مجھے.....

(عیسیٰ ہاتھ چھڑاتا ہے)

عیسیٰ: مجھے جانا ہے..... وہاں علامہ صاحب انتظار کر رہے ہوں گے میرا..... آج انہیں کہیں باہر جانا ہے میرے ساتھ.....

سکینہ: دیکھو اگر تم نے یونہی شکل بنائے رکھی اور اپنا موڈ خراب کیے رکھا تو میں درگا آ جاؤں گی اور وہیں علامہ صاحب سے تمہاری شکایت کر دوں گی کہ تمہارا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔

(عیسیٰ ڈر کر گڑبڑا سا جاتا ہے)

عیسیٰ: تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا..... ایسی کوئی حرکت مت کرنا..... ورنہ ابا جان کے غصے کا پتہ ہے تمہیں.....

سکینہ: میں کسی کے غصے سے نہیں ڈرتی..... اور یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ میں اپنی پر آؤں تو کچھ بھی کر گزرتی ہوں..... اس لیے سیدھی طرح مان جاؤ۔

عیسیٰ: مان تو گیا ہوں..... اب اور کیا چاہتی ہو مجھ سے.....

سکینہ: یوں نہیں..... مجھے وہ پرانا والا عیسیٰ چاہیے..... وہ جو ذرا ذرا سی بات پر مجھے تنگ کرتا تھا..... مجھے ہنسانے کے لیے احمقانہ حرکتیں کیا کرتا تھا..... جو 24 گھنٹے میرے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا کہ کب میں کچھ کہوں اور وہ میری فرمائش پوری کرے۔

(عیسیٰ سکینہ سے اپنا ہاتھ چھڑاتا ہے اور دھیمے لہجے میں بیوی سے کہتا ہے۔)

عیسیٰ: دل بجھ سا گیا ہے اس عیسیٰ کا..... ہنسنا چاہوں بھی تو ہنس نہیں پاتا..... اور تم جانتی ہو کہ دل پر کسی کا زور نہیں چلتا..... تم کہتی ہو تو دکھاوے کے لیے یہ بھی کر لوں گا مگر سچ یہی ہے کہ مجھے لگتا ہے میں اندر سے آدھا مر چکا ہوں.....

(عیسیٰ بات ختم کر کے وہاں سے پلٹ جاتا ہے۔ سکینہ دُکھ سے اسے جاتا دیکھتی رہتی ہے۔ پھر اپنے آپ سے کہتی ہے)

سکینہ: جانتی ہوں عیسیٰ..... اس دل کے قتل میں میں بھی برابر کی شریک ہوں..... مگر میں تمہیں یوں خود کو کھونے نہیں دوں گی.....

سیکنہ اس پرانے عیسیٰ کو تمہارے اندر دوبارہ زندہ کر کے رہے گی..... یہ میرا تم سے..... اور خود اپنے آپ سے وعدہ ہے.....

//Cut//

Scene No # 3

وقت: شام۔ مغرب کا وقت

جگہ: اندھیرا چھا رہا ہے۔

زہرہ اپنی گاڑی میں گھر کے پورچ میں داخل ہوتی ہے اور تیزی سے گاڑی سے اتر کر اندر کی طرف لپکتی ہے جیسے اسے دیر ہو گئی ہو۔

//Cut//

Scene No # 4

زہرہ گھر کے لاؤنج میں داخل ہوتی ہے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگتی ہے تبھی پیچھے سے شہریار کی کڑکتی ہوئی آواز اس کے قدم روک لیتی ہے۔

شہریار: رُکو..... کہاں سے آ رہی ہو اس وقت.....

زہرہ: میں اپنے کسی ذاتی کام سے گئی تھی..... اور گھر میں نوکروں کو اطلاع کر کے گئی تھی کہ تم لوٹو تو تمہیں بتا دیں.....

شہریار: تو اب میں نوکروں کا محتاج رہوں گا تمہارے بارے میں جاننے کے لیے.....؟..... اور میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ میری اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر مت نکالنا.....

زہرہ: حیرت ہے۔ ایک طرف تو تم مجھے ہمیشہ کے لیے یہاں سے نکالنے کے درپے ہو..... اور دوسری طرف میرے قدم باہر رکھنے پر بھی تمہیں اعتراض ہے.....

شہریار: جب تک تم میرے نکاح میں ہو..... تب تک تمہیں میری لگائی ہر پابندی کے اندر جینا ہوگا..... ہاں..... ایک بار جب تمہیں آزاد کر دوں تو پھر جہاں اور جس کے ساتھ جی چاہے.....

(زہرہ نفرت سے شہریار کی بات کاٹ دیتی ہے)

زہرہ: یوں کیوں نہیں کہتے کہ آج بھی تمہیں میری ٹھیک بولی لگنے کا انتظار ہے..... تم سونے کی اس چڑیا کو اتنی آسانی سے آزاد کرنا بھی چاہو..... تو نہیں کر سکتے.....

(شہریار زہرہ کے طنز پر آگ بگولہ ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے)

شہریار: تم اپنی حد سے گزر رہی ہو..... میں تمہیں یوں.....

زہرہ: اور تم اپنی حد سے گزر چکے ہو.....

شہریار: (زہرہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ شہریار تلملاتا رہتا ہے اور خود کلامی کرتا ہے) ٹھیک کہا تم نے..... سونے کی چڑیا کو اتنی آسانی سے سستے داموں کیسے جانے دوں..... مگر یہ فیصلہ بھی اب جلد ہو جائے گا۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن نکلنے کا موقع

جگہ: سنٹرل جیل

توقیر جاوید کو کوئی سنتری لمبی راہداری میں پکڑے ہوئے لاتا ہے اور ایک بیرک کے سامنے اس کے ہاتھ سے زنجیر/ ہتھکڑی کھول کر اسے اندر دھکیل دیتا ہے۔ اندر سارنگا، چاند پوری اور دیگر ساتھی بیٹھے ہوئے ہیں اور چند قیدی سارنگا کے ہاتھ پاؤں

دبارہ ہے ہیں، چاند پوری تو قیر جاوید کو اندر آتے دیکھ کر سارنگا کو اشارہ کرتا ہے۔ سارنگا آنکھیں بند کئے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔

چاند پوری: پنچھی آ گیا ہے اُستاد..... (سارنگا ایک آنکھ کھول کر تو قیر جاوید کی طرف دیکھتا ہے)

(سارنگا اپنے کارندوں کی طرف پلٹتا ہے)

سارنگا: اچھا..... تو یہ ہے وہ..... دیکھ کیا رہے ہو حرام خورو..... جا کر سارنگا کا سلام دو اُسے.....

سارنگا کے دو تین کارندے اٹھ کر تو قیر کی طرف بڑھتے ہیں جو خوف زدہ سا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔

قیدی/کارندہ نمبر 1: اوئے..... یہ تو اپنا ہیرو ہے..... وہی..... فلموں والا

قیدی/کارندہ نمبر 2: کون..... وہی جو فلموں میں ہم جیسے غنڈوں کو اٹھا اٹھا کر مارتا ہے اور ان کی خوب ٹھکائی کرتا ہے.....

قیدی/کارندہ نمبر 3: ہاں ہاں..... وہی ہے..... چل بے ہیرو..... اٹھ اور ہمیں مار.....

تو قیر: (تو قیر گڑگڑاتا ہے) میں..... بھائی صاحب..... میں تو.....

(پہلا قیدی تو قیر کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیتا ہے۔)

قیدی: اب مارنا..... فلموں میں تو بہت زبردست فائٹ کرتا ہے قسم سے..... تو قیر گھبرا کر گریبان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے مگر تینوں قیدی مل کر اسے دو چار کرارے ہاتھ لگاتے ہیں، تو قیر زمین پر گر جاتا ہے۔ پیچھے سے سارنگا کہتا ہے۔

سارنگا: بس کرو دو حرام خورو..... اب کیا جان سے مارو گے اسے..... لے لیا تم نے آج اس سے بدلہ سارے پنڈوں کا.....

چاند پوری سارنگا کی بات پر مسکراتا ہے۔ سب قیدی ہنستے ہیں۔ تو قیر زمین پر پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

لیلیٰ کے سامنے نرس/ڈاکٹر کھڑے ہیں۔

ڈاکٹر: اب آپ پوری طرح ریکور کر گئی ہیں ماشاءاللہ..... ہم آج آپ کو ڈسچارج کر دیں گے یہاں سے

لیلیٰ: تھینک یو ڈاکٹر.....

(ڈاکٹر/نرس پلٹتے ہیں۔ تبھی موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ موسیٰ اُداس اور پریشان ہے۔)

لیلیٰ: سُنا تم نے موسیٰ..... آج اس ہسپتال کی قید سے آزادی مل رہی ہے مجھے.....

موسیٰ: اچھا..... یہ تو خوشی کی بات ہے میڈم..... میں جا کر بل وغیرہ کلیئر کرواتا ہوں۔ آپ تب تک تیاری کر لیں.....

(موسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے۔ لیلیٰ اسے روکتی ہے)

لیلیٰ: سُنو موسیٰ..... مل آئے زہرہ سے..... ہو گئی تم دونوں کی ملاقات.....

موسیٰ: ہاں..... مل آیا ہوں..... مگر ملاقات نہیں ہوئی.....

لیلیٰ: (لیلیٰ چونکتی ہے) کیا مطلب.....

موسیٰ: جتنی بار بھی اس سے ملتا ہوں..... مزید ادھورا ہو جاتا ہوں..... نہ ملاقات پوری ہو پاتی ہے..... نہ میں اس سے مل کر پورا واپس لوٹتا ہوں..... وہ میری روح کا کچھ نہ کچھ مزید حصہ اپنے ساتھ لے جاتی ہے.....

لیلیٰ: تمہیں دیکھ کر مجھے عشق کے وجود کا احساس ہوتا ہے..... اصل عشق..... جو تمہارے اندر سے جھلکتا ہے..... کتنی خوش نصیب ہے زہرہ کہ اُسے تم نے چاہا..... اور کتنی بدنصیب ہے زہرہ کہ تمہیں پا نہ سکی.....

موسیٰ: شاید اسی کو مقدر کہتے ہیں..... اور مقدر سے کون جیتا ہے آج تک.....

لیلیٰ: یہ تم کہہ رہے ہو موسیٰ..... تم..... جس نے آج تک کبھی ہار نہیں مانی..... تم چاہو تو ابھی اپنی زہرہ کو چھین لاؤ سارے زمانے کے شکنجے توڑ کر.....

موسیٰ: کبھی میں سمجھتا تھا کہ صرف عشق میں ہی زبردستی چلتی ہے..... محبت خودسری کا دوسرا نام ہے..... مگر اب مجھے پتہ چلا کہ عشق میں تو جنون بھی کسی کا تابع ہوتا ہے..... سارے ہتھیار ڈال دینے کا نام ہے عشق..... مجھے اب اس کی مرضی پر چلنا ہے..... میری وجہ سے مزید اس کی رسوائی ہو..... یہ قبول نہیں ہے مجھے.....

موسیٰ بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ لیلیٰ دکھ سے گہرا سانس لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: شہریار کا دفتر

شہریار کے دفتر میں اس کا بڑا بھائی اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔

شہریار: آپ گھر کیوں نہیں آئے بھائی صاحب..... یوں غیروں کی طرح دفتر میں.....

شیر علی: جب تک وہ عورت اس گھر میں ہے، ہم میں سے کوئی بھی وہاں قدم نہیں رکھے گا۔

شہریار: کہا تو ہے میں نے بھائی صاحب..... کر دوں گا میں اس کا فیصلہ جلد ہی..... کچھ مجبوریاں ہیں میری بھی..... کچھ مسئلے ہیں جو مجھے سلجھانے ہیں اسے طلاق دینے سے پہلے.....

شیر علی: اوئے شہریار جھلا نہ بن..... میں نے پہلے ہی بڑی مشکل سے تیرے سالوں کو قابو کیا ہے..... وہ تو بھڑ کے بیٹھے تھے کہ اگر دو دن میں تو نے اس عورت کو طلاق نہ دی تو وہ رانی کو اپنے ساتھ اپنی جاگیر پر لے جائیں گے..... اوئے بے وقوفا..... سمجھتا کیوں نہیں ہے..... تیرے پاس آج جو بھی ہے وہ انہی لوگوں کا دیا ہوا ہے..... اپنی زمین اور جائیداد تو تو نے کب کی شہر کے کاروبار میں کھپا دی..... اب اس جائیداد سے بھی جائے گا اور بیوی بچوں سے بھی.....

شہریار: مگر بھائی صاب..... میں

شیر علی: اگر مگر کچھ نہیں..... تو کل میرے ساتھ جاگیر پر چل رہا ہے..... وہاں چل کر سب سے معافی مانگ اور اپنے معاملات سدھارنے کی کر..... اور ہاں..... جانے سے پہلے اس عورت کو کاغذ پکڑا کر جانا..... اب اس کے بعد میں تیری ایک بھی نہیں سنوں گا..... سارا شریکا تیرا انتظار کر رہا ہے وہاں..... دشمن تیرا گھر توڑنے کی تاک میں ہیں..... سمجھتا کیوں نہیں ہے..... پہلے اپنا گھر اور جاگیر بچا لے..... ایسی دس عورتیں مل جائیں گی تجھے بعد میں.....

شہریار پریشانی سے اپنے بھائی کو دیکھ رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا گھر

زہرہ نیچے لاؤنج میں آتی ہے جہاں گھڑی رات کے ساڑھے بارہ بجا رہی ہے، زہرہ نوکرانی سے پوچھتی ہے۔

زہرہ: تمہارے صاحب نہیں آئے ابھی تک.....

نوکرانی: نہیں بی بی جی.....

زہرہ: ٹھیک ہے..... وہ آئیں تو کھانا دے دینا انہیں..... میں نے گرم کرنے کے لیے رکھ دیا ہے نکال کر

نوکرانی: جی بہتر.....

زہرہ ایک بار پھر پریشانی سے گھڑی کی طرف دیکھتی ہے اور پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: رات

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ کمرے میں آتی ہے۔عیسیٰ آواز سن کر کروٹ بدل کر لیٹ جاتا ہے اور یوں ظاہر کرتا ہے جیسے سو رہا ہو، سکینہ ایک لمحہ رک کر اپنے شوہر کو دیکھتی ہے اور پھر ٹیبل لیمپ/ روشنی بجھا کر وہ بھی بستر پر لیٹ جاتی ہے۔عیسیٰ آنکھیں کھول دیتا ہے مگر کروٹ بدلے لیٹا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: رات

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ بستر پر لیٹا زہرہ سے لائبریری میں ہوئی ملاقات کی یادوں میں گم ہے، اسے زہرہ کا نقاب میں لپٹا چہرہ اور اس کا محبت کا اقرار یاد آ رہا ہے۔

زہرہ/فلیش بیک: کچھ حقیقتوں کی خبر ہمیں خود بہت دیر سے ہوتی ہے..... میں آج اقرار کرتی ہوں موسیٰ..... وعدہ کرو تم واپس پلٹ.....

موسیٰ زہرہ کی باتیں یاد کرتے کرتے مزید بے چین ہو جاتا ہے۔اور کروٹ بدلتا ہے مگر زہرہ اس کے اندر اسی طرح بولتی رہتی ہے۔ باہر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: صبح ہونے کا موہتاج

زہرہ کا کمرہ/شہریار کا گھر

زہرہ اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔اسے شہریار کی طلاق کے متعلق کہی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

آڈیو

اوور لیپ

شہریار: تمہیں تو خوش ہونا چاہیے..... مجھ سے جان چھوٹ جائے گی تمہاری..... ویسے بھی تم سے یہ نکاح محض ایک سودے بازی تھی..... تم تو ماڈرن لباس میں چھپی ایک بوڑھی رُوح نکلیں..... اب جاؤ..... اپنے اسی عاشق موسیٰ کے پاس..... تم اسی کے قابل ہو.....

(زہرہ پریشانی سے ٹہل رہی ہے)

زہرہ: یا خدا..... تو میرے دل کا حال جانتا ہے..... میری ہر مجبوری سے واقف ہے پھر بھی میں نبھانا چاہتی ہوں، میری ساری عمر کی ریاضت ضائع ہونے سے بچا لے میرے اللہ.....

(اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ زہرہ گھبرا کر اس جانب دیکھتی ہے۔ ایک نوکرانی اندر داخل ہوتی ہے)

زہرہ: کیا بات ہے صابرہ.....؟.....تمہارے صاحب کہاں ہیں.....

صابرہ: وہ تو جی صبح سویرے ہی گاؤں کے لیے نکل پڑے تھے۔ کہہ رہے تھے جاگیر پر کچھ ضروری کام ہیں.....ان کو نپٹانے میں تین چار دن لگ جائیں گے.....

(صابرہ کے ہاتھ میں ایک لفافہ ہے۔ وہ لفافہ زہرہ کی طرف بڑھاتی ہے۔)

صابرہ: وہ بی بی جی.....صاحب جی جاتے ہوئے یہ کاغذ آپ کے لیے دے گئے تھے.....، کہہ رہے تھے ضروری ہیں.....دیکھ لیجئے گا.....

(زہرہ کانپتے ہاتھوں سے لفافہ پکڑتی ہے۔)

زہرہ: ٹھیک ہے.....تم جاؤ.....

نوکرانی پلٹ جاتی ہے، زہرہ ڈرتے ڈرتے لفافے کے اندر سے کاغذات نکالتی ہے جو دراصل ایک اسٹامپ پیپر ہے، زہرہ کاغذ کھولتی ہے، اندر کی تحریر پڑھتی ہے۔ کیمرہ سٹامپ کی تحریر کو فوکس کرتا ہے اور پس منظر میں شہریار کی آڈیو اوور لیپ ہوتی ہے۔

Avdio

شہریار: میں ملک شہریار ولد ملک رضوان اپنے ہوش و حواس میں اپنی زوجہ زہرہ بنت رضیہ کو طلاق دیتا ہوں.....طلاق دیتا ہوں.....طلاق دیتا ہوں.....

(زہرہ کاغذ پڑھتے ہی وہیں زمین پر ڈھے کر گر سی جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو جاتے ہیں۔ زہرہ زار و قطار روتی رہتی ہے.....سامنے پڑا کاغذ ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ زہرہ کے اندر سے اس کی اپنی آواز آڈیو اوور لیپ کی صورت سنائی دیتی ہے۔)

زہرہ کی آڈیو: تم آج ایک بار پھر بے گھر ہو گئی ہو زہرہ.....زمانہ تمہاری بے گناہی پر کبھی یقین نہیں کرے گا اور تم جہاں بھی جاؤ گی سب تمہیں ہی بے وفائی اور بازاری ہونے کے طعنے دیں گے.....ایک بار پھر زمانہ یہی بات دُہرائے گا کہ بازار میں بیٹھی عورت کبھی اپنا گھر نہیں بسا سکتی.....اس کی سرشت میں ہی گھر داری نہیں ہوتی.....

زہرہ بیٹھی روتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: انا کا گھر، کمرہ

انا پریشان سی اپنے تخت پر بیٹھی کسی سوچ میں گم ہے، چندا اندر آتی ہے اور انا کی پریشانی نوٹ کرتی ہے۔

چندا: کیا بات ہے.....آج کل آپ بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کی تربیت میں دھیان نہیں رہتا آپ کا.....نہ ہی مجھے ڈانٹتی ہیں.....اور تو اور.....آج تو اپنے گرو جی بھی پوچھ رہے تھے کہ انا جی کو کیا ہو گیا ہے.....، .....کتنے دنوں سے انہوں نے کھڑکی کھولی نہیں سنائی ہمیں.....

انا: بس.....دل بہت پریشان ہے زرّی کی طرف سے.....کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے انتہائی غلط فیصلہ کیا ہے زرّی کو اس ملک شہریار کے ساتھ رخصت کر کے.....

چندا: بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں.....مجھے وہ لڑکا موسیٰ بہت یاد آتا ہے.....کتنا پاگل تھا وہ ہماری زرّی کے لیے.....مگر کتنی

عزت اور کتنا احترام تھا اس کی نظر میں اپنی محبت کے لیے..... مرد کے پاس چاہے سات سمندروں کے خزانے ہوں عورت کو دینے کے لیے..... مگر نظر میں احترام اور دل میں عزت نہ ہو تو ساری کائنات کے سونے چاندی اور ہیرے موتی مل کر بھی عورت کو وہ خوشی نہیں دے سکتے..... اور ہماری زرّی کا تو دل ہی شیشے کا بنا ہوا ہے..... ملک شہریار جیسا پتھر کیا سنبھالے گا اُسے.....

انا: ٹھیک کہہ رہی ہو تم..... اب مجھے بھی لگتا ہے کہ وہی پگلا موسیٰ ہماری زرّی کا اصل جوڑ تھا..... میں خوامخواہ ہی اس کے خلیے اور جنون سے ڈر گئی تھی..... جس کی لو اللہ کے ساتھ لگی ہوئی ہو..... اس کے دل میں پلتا عشق تو اور بھی زیادہ پاک ہوتا ہوگا..... میں تو زری کم بخت نکلی..... کیچڑ میں رہتے رہتے کیچڑ ہی ہو گئی..... کسی کے دل میں بہتا عرقِ گلاب اور اس میں کھلا محبت کا پاکیزہ پھول بھی نہ دیکھ پائی..... اللہ مجھے معاف کرے..... میری خطا کی سزا کہیں میری بچی کو نہ ملے.....

(انا کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ چندا جلدی سے انا سے لپٹ کر اسے تسلی دینے لگتی ہے۔)

انا: میری زہرہ کی طرح اس لڑکے کی آنکھ بھی بڑی پاک تھی ری چندا..... بڑا گناہ ہو گیا مجھ سے..... وہ تو جب بھی اپنے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوگا..... ہم پر اوپر والے کی جانب سے پھٹکار پڑتی ہوگی.....

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کوئی بڑی مسجد، مسجد کا صحن

موسیٰ صحن کے بیچوں بیچ کھڑا نماز ادا کر رہا ہے۔ وہ رکوع اور پھر سجدے میں جاتا ہے پھر قعدے میں بیٹھ کر چند لمحے بعد سلام پھیر دیتا ہے اور اپنے ہاتھ فضا میں دعا کے شکو بلند کر دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: شام

جگہ: شہریار کا گھر

شام ڈھل رہی ہے، زہرہ اپنے کمرے میں گم سُم سی بیٹھی ہے، اس کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس کے اندر اس کی اپنی آواز گونج رہی ہے۔

زہرہ: کتنا آسان ہے کسی مرد کے لیے تین لفظ لکھ کر یا بول کر تمام عمر کے رشتے کو کسی کچے دھاگے کی طرح توڑ دینا..... اور کتنا مشکل ہے اس سماج میں مجھ جیسی کسی عورت کا خود کو وفادار ثابت کرنا اور اس وفا کے سہارے عمر بھر اپنا رشتہ نبھانا..... مجھے معاف کر دیجئے گا انا جی..... میں آپ سے کیا وعدہ پورا نہیں کر سکی..... میری لاکھ کوشش اور ہزار منت سماجت کے باوجود اس بے رحم شخص نے میرے سر سے چھت چھین لی۔ آج آپ کی ایک اور بیٹی برباد ہو گئی انا جی.....

(اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے اور زہرہ چونک کر اپنے خیالات سے باہر آتی ہے، اور آواز دے کر پوچھتی ہے)

زہرہ: کون ہے.....

(باہر سے صابرہ ایک ہٹے کٹے خوف ناک سے مرد (نوکر) کے ساتھ اندر آتی ہے۔)

زہرہ: کیا بات ہے صابرہ..... جی؟..... اور یہ کون ہے۔

صابرہ: (صابرہ بتاتے ہوئے جھجکتی ہے) وہ بی بی جی..... یہ جاگیر سے رانی بی بی کے نوکر آئے ہیں رانی بی بی کا سامان لے کر.....

زہرہ: رانی بی بی..... شہر یار کی پہلی بیوی.....

صابرہ: جی..... وہ جی..... یہ کہہ رہے ہیں کہ کل رانی بی بی یہاں آ رہی ہیں ملک صاحب کے بچوں کے ساتھ..... تو..... تو آپ یہ کمرہ خالی کر دیں..... یہاں رانی بی بی کا سامان رکھنا ہے.....

زہرہ: کیا.....؟..... مگر..... مگر میں کہاں جاؤں گی..... میرا مطلب ہے..... تمہیں تو پتہ ہے.....

(صابرہ دکھ سے کہتی ہے)

صابرہ: جی بی بی جی..... میں نے بڑی منت کی ہے اس شکورے کی..... پر جی یہ مانتا ہی نہیں.....

شکورا: (شکورا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے) ہمیں تو اوپر سے یہی حکم ہے جی..... آج ہی یہ کمرہ خالی کروا کر بیگم صاحبہ کے لیے سیٹ کرنا ہے..... ہم تو دوپہر سے باہر بیٹھے ہیں باقی نوکروں کے ساتھ..... بس ابھی آپ مہربانی کرو..... یہ کمرہ خالی کرو..... بولو تو آپ کے سامان کے لیے کوئی ٹرک یا بڑی گاڑی کرائے پر لے آؤں.....

صابرہ: مگر شکورے..... چھوٹی بی بی اس حال میں اس وقت کہاں جائیں گی..... اوپر سے رات بھی ڈھلنے والی ہے..... تم لوگ ایک رات تو رک جاؤ..... صبح میں خود جا کر.....

(شکورا غصے سے صابرہ کو گھورتا ہے اور چلا کر کہتا ہے)

شکورا: بس..... بہت دے دی مہلت..... ملک صاحب کو پتہ چلا کہ ہم لوگوں نے ابھی تک رانی بیگم کا کمرہ سیٹ نہیں کیا تو وہ ہماری کھال ادھیڑ دیں گے..... لگتا ہے ہمیں اب خود ہی یہ سامان اٹھا کر باہر پھینکنا ہوگا.....

(شکورا آگے بڑھنے لگتا ہے۔ زہرہ اسے روکتی ہے)

زہرہ: رک جاؤ..... تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... مجھے یہاں سے کچھ نہیں لے جانا..... میں جا رہی ہوں..... اپنے مالک سے کہنا یہ سب کچھ اسے مبارک ہو..... میں انہی دو کپڑوں میں یہ گھر چھوڑ رہی ہوں..... اور صابرہ..... تم گواہ رہنا..... میں نے کوئی زیور، گہنا، روپیہ، پیسہ..... کوئی چیز یہاں سے نہیں لی ہے۔

زہرہ اپنے ہاتھوں میں پڑے سونے کے کنگن اور کانوں میں اور گلے میں پڑا زیور لاکٹ بندے وغیرہ بھی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیتی ہے۔ صابرہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ زہرہ ایک لحہ رک کر کمرے کو دیکھتی ہے اور پھر اپنی سیاہ شال اپنے سر پر ٹھیک کرتے ہوئے کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: سڑک

زہرہ رات کے وقت اکیلی سڑک پر پریشان سی چلی جا رہی ہے۔ اُسے شہر یار کے طنز، طعنے اور وہ سب کڑی ہوئی باتیں یاد آ رہی ہیں جو وقتاً فوقتاً شہر یار اسے کہتا رہا ہے۔ زہرہ کی طبیعت بگڑ رہی ہے، وہ اپنے سر کو تھام کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے اور سڑک پار کرنے کے لیے ایک طرف کو رُکتی ہے۔ سڑک پر چلتی گاڑیوں کا رش اور ہارن کا شور ہے۔ زہرہ سڑک پار کرنے لگتی ہے تبھی اُسے زوردار چکر آتا ہے اور سامنے سے آنے والی ایک پُرانی کھٹارہ سی فوکسی گاڑی بریک لگانے کے باوجود زہرہ سے آ کر ٹکراتی ہے۔ زہرہ زمین پر گر جاتی ہے۔ گاڑی میں سے لیلیٰ کا پرانا سیکرٹری فیضی گھبرائے ہوئے انداز میں باہر نکلتا ہے۔ اور اس کی زہرہ پر نظر پڑتی ہے۔ فیضی چونک جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: رات

جگہ: فیضی کا پرانا بوسیدہ سا/
پرانے طرز کا بنا گھر

کمرے میں زہرہ سر پر بندھی پٹی کے ساتھ بے ہوش پڑی ہے۔فیضی کی لڑاکا بیوی سعیدہ کمرے سے فیضی کے ساتھ باہر نکلتی ہے۔

سعیدہ: بتاتے کیوں نہیں ہو فیضی..... یہ تم کس کو اٹھالائے ہو اپنے ساتھ.....لڑکی زخمی ہے.....اسے ہسپتال کیوں نہیں لے گئے تم اپنے ساتھ.....

فیضی: اوہو.....تم تو چھری تلے دم لو.....بتادوں گا سب کچھ.....فی الحال تم اس کا خیال رکھو.....

سعیدہ: یا خدا.....یہ بندہ مجھے کبھی سکون سے جینے نہیں دے گا.....پہلے ہی نوکری چھوڑ کر سب سے چھپے گھر میں بیٹھے ہو.....خرچے کی رقم پوری کرنا مشکل ہو گیا ہے.....اوپر سے تم یہ نئی مصیبت اٹھالائے ہو.....کیا کروں گی میں اس کا.....

فیضی: او جاہل عورت.....جسے تم مصیبت کہہ رہی ہو.....یہی ہمارے لیے لاکھوں روپے کا چیک ثابت ہوگی.....یہ زہرہ ہے.....میرے باس توقیر جاوید کے پارٹنر اور دوست ملک شہریار کی گھر والی.....،.....ملک شہریار کروڑ پتی بندہ ہے.....،.....اس کی بیوی ہمارے دن بدل دے گی.....

سعیدہ: یہ.....اس کے ہاتھوں میں تو سونے کی کیا کانچ کی چوڑیاں تک نہیں ہیں۔کان، ناک، گلہ سب سُونے پڑے ہیں.....یہ کیسی بیوی ہے کروڑ پتی سیٹھ کی.....اور اگر واقعی یہ اس سیٹھ کی بیوی ہے تو یوں در بدر خاک بسر سڑکوں پر کیوں رُلتی پھر رہی تھی۔اسے تو کسی شاندار گاڑی میں ہونا چاہیے تھا.....

فیضی: یہ راز بھی جلد کھل جائے گا.....فی الحال تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں.....،.....اس کی دیکھ بھال کرو.....مگر اسے پوری طرح ہوش بھی نہیں آنا چاہیے.....بس اتنا دھیان رکھو کہ بالکل ہی جان سے نہ گزر جائے.....اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔

سعیدہ: مگر تمہارے دماغ میں چل کیا رہا ہے.....اس سیٹھ کی بیوی کو تم نے زخمی حالت میں اسے پیش کر بھی دیا تو دس بیس ہزار تمہارے منہ پر مار کر چلتا کرے گا.....اتنا تو ہم اس کی دوادارو پر ہی لگا چکے ہوں گے۔

فیضی: دس بیس ہزار نہیں.....تیس چالیس لاکھ کی بات کرو.....

(سعیدہ کی آنکھیں کھل جاتی ہیں)

سعیدہ: تیس چالیس لاکھ.....تم ہوش میں تو ہو فیضی.....

فیضی: ہاں.....ہو سکتا ہے کھیل اس سے بھی بڑا ہو جائے.....بس.....کچھ دن صبر کر لو.....

سعیدہ: دیکھ لو فیضی.....تمہارے کہنے پر میں یہ مزدوری اپنے سر لے رہی ہوں.....،.....اجرت بھی پوری لوں گی.....

(فیضی اپنا سر پیٹ لیتا ہے)

فیضی: اُفوہ.....لے لینا اجرت.....ساری لے لینا.....کیسی لالچی عورت سے پالا پڑا ہے میرا.....

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن/دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: انا کا گھر، کمرہ

چندا بار بار کوئی نمبر ڈائل کر رہی ہے، مگر نمبر بند جا رہا ہے۔ انا بے چین اور پریشان سی بیٹھی اسے دیکھ رہی ہے۔

انا: کیا ہوا..... نمبر کیوں نہیں مل رہا زری کا.....

چندا: پتہ نہیں..... اتنی دیر سے ملا رہی ہوں مگر نمبر بند جا رہا ہے..... اتنی دیر تو کبھی نمبر بند نہیں ہوا اس کا.....

انا: تو گھر کے نمبر پر ملاؤ ناں.....

چندا: وہاں بھی ملانے کی کوشش کی تھی..... مگر کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا..... لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں ہے.....

(انا پریشان ہو جاتی ہے)

انا: یہ کیسے ہو سکتا ہے.....، کہاں چلے گئے سارے..... خدا خیر کرے..... میری تو کل رات سے ہی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے..... میرا تو دل ھولے جا رہا ہے ری چندا.....

چندا: آپ کہیں تو میں خود جا کر دیکھ آؤں زری کو.....، ..... اس طرح تو پریشانی بڑھتی ہی جائے گی

انا: کہیں اس کا گھر والا بُرا نہ منا لے..... وہ غصے کا تیز ہے ویسے بھی.....

چندا: آپ فکر نہ کریں..... میں باہر سے ہی زری سے مل کر اور اس کی خیریت پوچھ کر لوٹ آؤں گی..... اس کے شوہر کو پتہ نہیں چلے گا میرے آنے کا.....

انا: اچھا..... ٹھیک ہے..... مگر ذرا جلدی واپس آنا..... جب تک تم واپس نہیں آتیں میں یہیں انگاروں پر لوٹتی رہوں گی.....

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور ایریا

ملک شہریار کسی بڑی گاڑی/ ویگو/ vigo / جیپ وغیرہ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا کہیں جا رہا ہے..... اور فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔

شہریار: ہاں..... میں نے وعدے کے مطابق تمہارا کام کر دیا ہے..... اب تم بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا..... میں تین چار روز میں جاگیر کے کام نپٹا کر واپس آ جاؤں گا..... ہو سکے تو اس سے پہلے میرے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کروا دینا.....

(دوسری جانب لیلیٰ ہے)

لیلیٰ: مگر زہرہ اس وقت کہاں ہے.....؟..... میں مستقل اس کا نمبر ڈائل کر رہی ہوں..... مگر نمبر بند جا رہا ہے..... یاد رکھو ملک شہریار..... مجھے زہرہ بالکل خیر خیریت سے واپس یہاں اپنے پاس چاہیے.....

شہریار: یہ میرا ذمہ نہیں تھا..... تم بہر حال اس کے پُرانے گھر سے چیک کرو..... ظاہر ہے وہ میرے گھر سے نکل کر وہیں جائے گی..... اور کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں اس کا.....

لیلیٰ: ٹھیک ہے..... میں تم سے دوبارہ بات کرتی ہوں..... پہلے مجھ زہرہ کی خیر خیریت معلوم کرنی ہے۔

لیلیٰ پریشانی میں فون کاٹ دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گھر

چندا گھر کی نوکرانی صابرہ کے سامنے حیران و پریشان اندر گیٹ کے پاس کھڑی ہے۔

چندا: کیا..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم..... نہیں نہیں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

صابرہ: یہی بات سچ ہے جی..... ملک صاحب نے زہرہ بی بی کو طلاق دے دی ہے..... سارے نوکر یہ بات جانتے ہیں..... اور پھر ملک صاب تو اپنی جاگیر پر چلے گئے..... ہمارا تو دل پھٹ رہا ہے جی..... زہرہ بی بی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے ان لوگوں نے.....

(چندا بے صبری سے پوچھتی ہے)

چندا: اور زہرہ..... تمہاری زہرہ بی بی کہاں ہے اس وقت؟

صابرہ: ملک صاحب کی پہلی بیوی نے انہیں رات کو ہی گھر سے نکلوا دیا۔ وہ تو جی اسی وقت نہ جانے کہاں نکل گئیں بنا کسی کو بتائے..... سُنا ہے جی ملک صاحب کے شریکوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے زہرہ بی بی کو طلاق نہ دی تو وہ ان کو برادری سے نکال دیں گے۔ اسی لیے انہیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔ زہرہ بی بی کو ایک رات بھی نہیں گزارنے دی انہوں نے یہاں..... مگر..... کیا وہ گھر نہیں پہنچیں.....

(صابرہ پریشان ہو جاتی ہے)

(چندا کا سر گھوم رہا ہے۔ وہ پریشانی میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

چندا: زری..... کہاں ہو تم..... یا اللہ..... میری بہن کی حفاظت کرنا.....

چندا رونے لگتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: انا کا گھر، کمرہ

لنا چندا کی بات سُن کر وہیں دل تھام کر گر جاتی ہے۔

لنا: یا میرے خدا..... میری بچی.....

(چندا اور باقی لڑکیاں تیزی سے لنا کی طرف لپکتی ہیں)

چندا: لنا جی..... ہمت کریں..... ہوش میں آئیں..... ہم زری کو ڈھونڈ نکالیں گے..... بس آپ دعا کریں کہ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو.....

لنا: جانے میری بچی کس حال میں ہو گی..... کہاں دربدر کی خاک چھانتی پھر رہی ہو گی..... خدا غارت کرے اس منحوس شہریار ملک کو..... کیڑے پڑیں اس کی قبر میں..... کیسا ظلم ڈھایا ہے اس نے میری پھول سی زہرہ پر..... خدا کرے اسے مرتے وقت تڑپنا بھی نصیب نہ ہو۔ موت آئے اسے اور ایسی آئے کہ زمانہ عبرت سے دیکھے..... ارے کوئی ہے اس ظالم مردود سے پوچھنے والا کہ اس نے زہرہ کو بنا کسی قصور کے طلاق کیوں دی..... کوئی تو جا کر اس کا گریباں پکڑے۔ (انا روتے روتے ہچکیاں لینے لگتی ہے)

چندا: یہ وقت یہ باتیں سوچنے کا نہیں ہے انا جی..... پہلے ہمیں زری کا پتہ لگانا ہو گا..... آخر وہ ملک شہریار کے گھر سے نکل کر

کہاں گئی.....اس نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی.....وہ اپنے گھر واپس لوٹ کر کیوں نہیں آئی.....

لبا: ارے کیسے آتی وہ بے چاری واپس.....مجھ کم بخت نے ہی اس پر پابندی لگا دی تھی کہ اب اُس گھر سے اس کی لاش ہی واپس آنی چاہیے.....میں نے ہی اسے گھر ہستی سے باندھ کر بھیجا تھا.....وہ میرا مان کیسے توڑ دیتی.....کیسے طلاق کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر واپس اپنی دہلیز پار کرتی.....اسی لیے واپس نہیں لوٹی یہاں.....اسے اپنی لبا سے کیے وعدے کا پاس جو تھا.....

(لبا روتی رہتی ہے۔ چندا اسے تسلیاں دینے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔)

چندا: خود کو سنبھالیں لبا جی.....ہم سب مل کر زرّی کو ڈھونڈ لیں گے.....دیکھنا.....وہ مل جائے گی ہمیں.....بہت جلد مل جائے گی.....

مگر لبا کی تسلی نہیں ہوتی اور اسے ویسے ہی غشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

زہرہ کو دھیرے دھیرے ہوش آنے لگتا ہے.....وہ کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیتی ہے۔اور زور سے کراہتی ہے۔

زہرہ: کوئی ہے.....کہاں ہوں میں.....

سعیدہ: (سعیدہ برآمدے میں بیٹھی چائے پی رہی ہے۔وہ جلدی سے اندر لپکتی ہے اور زہرہ کو اٹھنے کی کوشش کرتے دیکھ جلدی سے اسے دوبارہ لٹا دیتی ہے)

سعیدہ: لیٹی رہو.....تمہیں گہری چوٹ لگی ہے.....

(زہرہ سر پکڑتی ہے)

زہرہ: مگر.....میں کہاں ہوں.....اور یہاں کون لایا ہے مجھے.....

سعیدہ: رات کو سڑک پار کرتے وقت تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا کسی گاڑی سے.....شکر کرو کہ میرا شوہر وہاں سے گزر رہا تھا۔باقی لوگ تو بھاگ گئے سارے موقعے سے.....میرا میاں فیضی تمہیں مرہم پٹی کروا کر یہاں اپنے گھر لے آیا.....تم لیٹی رہو.....ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

سعیدہ جلدی سے قریب پڑی کسی دوا کی شیشی سے چند گھونٹ شربت چمچ میں نکال کر زبردستی زہرہ کے حلق میں انڈیل دیتی ہے۔زہرہ پر پھر سے غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سر پکڑ کر پھر وہیں بستر پر لیٹے لیٹے بے سُدھ ہو جاتی ہے۔سعیدہ مسکرا کر غور سے زہرہ کو دیکھتی ہے اور پھر لائٹ بند کر کے کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔زہرہ بستر پر بے ہوش پڑی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: لبا کا گھر، کمرہ

لبا اپنے کمرے میں بستر پر بیمار، نڈھال اور ہلکان سی پڑی ہے۔چندا اور دوسری لڑکیاں اپنے گرو سمیت لبا کے بستر کے گرد جمع ہیں۔چندا لبا کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی اور برف میں بھگوئی پٹیاں رکھ رہی ہے۔لبا غنودگی میں بڑبڑا رہی ہے۔

لبا: زرّی.....زری کا کچھ پتہ چلا.....جاؤ.....جا کر میری زرّی کو لے آؤ کہیں سے.....میں اسے دیکھے بنا مرنا نہیں چاہتی

.....،.....میری سانسیں اٹکی رہیں گی اور میرا دم ساکت رہے گا جب تک میں زرّی کو دیکھ نہیں لیتی۔

(چندا روپڑتی ہے)

چندا: ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپ..... کچھ نہیں ہوگا آپ کو.....اور زرّی جب آئے گی اور آپ کو اس حال میں دیکھے گی تو کتنی ناراض ہوگی آپ سے.....آپ کو اس کے غصے کا پتہ ہے ناں.....ہم سب سے لڑے گی وہ کہ آپ کا خیال کیوں نہیں رکھا ہم لوگوں نے.....

لنا: تو جاؤ ناں.....لے آؤ اسے کہیں سے ڈھونڈ کر.....اسے دیکھتے ہی میں بھلی چنگی ہو جاؤں گی.....

چندا: گرو جی نے سب جگہ اطلاع کر دی ہے.....، بہت سارے لوگ ڈھونڈ رہے ہیں زرّی کو..... وہ جلد مل جائے گی ہمیں.....

لنا: ان لوگوں سے کچھ نہیں ہوگا.....جاؤ کوئی جا کر اس لڑکے کو اطلاع دو.....موسیٰ کو جا کر بتاؤ کہ زرّی کہیں کھو گئی ہے.....وہ ضرور ڈھونڈ لائے گا زرّی کو..... مجھے تو لگتا ہے کہ ہمیں اس لڑکے کی آہ لگی ہے.....وہ ہماری وجہ سے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔قدرت نے اسی کا بدلہ لیا ہے ہم سے.....(لنا پھر سے غنودگی میں چلی جاتی ہے)

چندا: اچھا میں بات کرتی ہوں موسیٰ سے.....آپ خود کو ہلکان نہ کریں.....ڈاکٹر نے آپ کو بہت احتیاط کا مشورہ دیا ہے..... آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے.....

(گرو چندا کو اشارہ کرتا ہے۔چندا اٹھ کر ایک جانب گرو کے ساتھ آتی ہے)

گرو: چندا بیٹا.....کسی بھی طرح موسیٰ کو اطلاع کرواؤ.....خدا کرے ہماری زرّی خیریت سے ہو.....سلامت ہو.....، مگر اس طرح اس کا ملک کے گھر سے نکل کر کہیں غائب ہو جانا میرا دل ہولائے دے رہا ہے.....کہیں اس بدذات کمینے شہریار نے ہماری بچی کو کوئی نقصان نہ پہنچایا ہو.....اس بات کا پتہ صرف موسیٰ ہی لگا سکتا ہے.....، ہماری تو یہاں کوئی سُنے گا نہیں.....سب اسی جاگیردار کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔

چندا: جی گرو جی.....میں بات کرتی ہوں موسیٰ سے.....جسے ہم نے کبھی دھتکار کر اس گھر سے نکالا تھا.....آج ہم اسی کے محتاج ہوئے.....لنا جی ٹھیک کہتی ہیں.....آہ لگی ہے ہمیں موسیٰ کی.....

چندا بات ختم کر کے واپس لنا کے بستر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔گرو پریشان کھڑا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ لاؤنج میں بیٹھی کوئی فلمی رسالہ پڑھ رہی ہے۔موسیٰ اندر آتا ہے۔

موسیٰ: اگر آپ کا کہیں باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے تو میں کچھ دیر کے لیے نامراد سے مل آؤں.....دوبار اس کا پیغام آ چکا ہے.....

لیلیٰ: نہیں میں آج گھر پر ہی رہوں گی.....تم جا کر مل آؤ اپنے دوست سے.....اور ہاں.....اسے کہنا کہ جیل میں توقیر کے ساتھ بہت ہو چکی.....، .....اب معاف کر دے اس کم ظرف کو.....میرا دل آج بھی بہت کمزور ہے اس کے معاملے میں.....

موسیٰ: اوہ.....تو آپ کو پتہ چل گیا.....

لیلیٰ: ہاں۔جیلر کا فون آیا تھا.....شاید توقیر نے ہی کوئی سورس لگوا کر اپنی فریاد بھجوائی ہے اس کے ذریعے.....تمہارے جیل کے ساتھیوں نے بڑی پلاننگ سے اسے اپنی ہی بیرک میں شفٹ کروالیا تھا، جہاں وہ روز کسی نہ کسی بہانے سے توقیر کی خاطر

تواضع کرتے رہتے ہیں.....،اب اسے معاف کردو موسیٰ۔

(موسیٰ مسکراتا ہے)

موسیٰ: ٹھیک ہے.....اگر آپ نے ہی اسے معاف کر دیا ہے تو پھر ہماری مداخلت کا بھی کوئی جواز نہیں.....آج کے بعد تو قیر کو جیل میں کوئی کچھ نہیں کہے گا.....

(موسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے۔)

لیلیٰ: موسیٰ.....میں تمہارے کس کس احسان کا شکریہ ادا کروں.....تم نہ ہوتے.....تو میرا کیا ہوتا.....

موسیٰ: (موسیٰ مسکراتا ہے۔) میں نہ ہوتا.....تو میری جگہ کوئی اور ہوتا میری طرح.....آپ آرام کریں.....ان باتوں میں خود کو نہ الجھایا کریں.....

لیلیٰ: موسیٰ.....مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے.....میری نیت پر شک نہ کرنا.....وہ دراصل.....

(اتنے میں موسیٰ کے فون پر گھنٹی بجتی ہے موسیٰ فون رسیو کرتا ہے۔)

موسیٰ: جی.....موسیٰ بول رہا ہوں.....کون چندا.....؟ میں نے پہچانا نہیں.....؟.....اچھا اچھا.....کیا ہوا.....سب خیر تو ہے ناں.....؟.....زہرہ تو ٹھیک ہے ناں.....؟.....کیا.....؟.....

کب.....؟.....کیسے.....اوہ میرے خدا.....گھر بھی نہیں آئی.....آپ لوگوں نے اچھی طرح تسلی کی ہے ناں.....،گھر نہیں آئی تو کہاں گئی.....نہیں.....میں.....میں ابھی آرہا ہوں.....،.....ہاں ہاں.....میں آتا ہوں

(موسیٰ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔لیلیٰ بھی سمجھ جاتی ہے کہ موسیٰ کو زہرہ کی طلاق کی اطلاع مل چکی ہے)

لیلیٰ: کیا ہوا.....؟.....کس کا فون تھا.....؟

موسیٰ: چندا کا فون تھا.....؟.....زہرہ کی اکلوتی سہیلی کا.....مجھے ابھی جانا ہوگا لیلیٰ جی.....غضب ہوگیا ہے.....

لیلیٰ: موسیٰ.....رُکو.....میری بات تو سنو.....

مگر موسیٰ بات سُنے بغیر تیزی میں پریشانی سے گھبرایا وہاں سے نکل جاتا ہے۔لیلیٰ اسے آوازیں دیتی روکتی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن

موسیٰ تیزی سے زہرہ کے گھر کے صحن کا گیٹ پار کر کے اندر داخل ہوتا ہے۔اسے ایک لمحے کے لیے یہاں ہونے والی اپنی وہ بے عزتی یاد آتی ہے جو کبھی لانے کی تھی۔پھر اسے ستون کے پیچھے سے وہ جھانکتی زہرہ کا فلیش بیک یاد کی صورت نظر آتا ہے۔موسیٰ چند لمحے صحن میں کھڑا یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔تبھی اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔موسیٰ گھبرا کر اندر کی طرف لپکتا ہے اور کمرے کا دروازہ کھولتا ہے۔

موسیٰ: میں آ گیا ہوں.....

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 21

Scene No # 1

کردار: موسیٰ، انا، چندا، گرو، لڑکیاں

موسیٰ زہرہ کی پرانی حویلی میں داخل ہوتا ہے جہاں اسے اپنی ماضی میں ہوئی انا کے ہاتھ بے عزتی اور زہرہ سے ملاقات کے دیگر واقعات یاد آتے ہیں۔ تبھی اسے اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے اور موسیٰ تڑپ کر اندر کمرے کی طرف لپکتا ہے اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیتا ہے۔ اندر بیٹھی عورتیں گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتی ہیں۔

موسیٰ: گیا ہوں میں.....

(چندا لپک کر موسیٰ کے پاس آتی ہے اور روتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے۔)

چندا: موسیٰ.....وہ.....وہ زہرہ.....

(موسیٰ بے چین ہو جاتا ہے۔)

موسیٰ: کیا ہوا زہرہ کو.....تم بتاتی کیوں نہیں ہو۔

(اتنے میں موسیٰ کی آواز سن کر انا دھیرے سے آنکھ کھولتی ہے اور موسیٰ کو نقاہت سے اپنے پاس بلاتی ہے۔)

انا: لڑکے.....تُو آ گیا.....ادھر آ میرے پاس.....موسیٰ گم سم سا انا کی طرف بڑھتا ہے۔ انا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور پھر وہ بنا کچھ کہے موسیٰ کے آگے ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔ موسیٰ انا کی اس حرکت پر تڑپ سا جاتا ہے اور جلدی سے انا کے بندھے ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

موسیٰ: کیوں گناہ گار کرتی ہیں مجھے.....میں پہلے ہی بہت بوجھل ہوں.....

انا: گناہ گار تو ہم ہیں تمہارے.....دل توڑ کر واپس بھیجا تھا ناں میں نے تمہیں.....اسی کی سزا ملی ہے میری زرمی کو.....

موسیٰ: آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔ کچھ نہیں ہوگا اُسے.....

(انا کی آنکھوں میں امید سی جاگتی ہے)

انا: ڈھونڈ لاؤ گے ناں.....وعدہ کرتے ہو۔

موسیٰ: ہاں.....وعدہ کرتا ہوں.....آپ خود کو سنبھالیں.....وہ تو آپ سے بہت پیار کرتی ہے ناں.....آپ کو اس طرح نڈھال بستر پر پڑا دیکھے گی.....تو کیا کہے گی۔

انا: اس ملک شہریار نے بڑا ظلم ڈھایا ہے میری بچی پر.....پتا کسی قصور کے طلاق کا کلنک سونپ دیا اسے.....

موسیٰ: آپ دعا کریں وہ خیریت سے ہو بس.....باقی اس پر ظلم کرنے والا کوئی بھی چین کی سانس نہیں لے گا آج کے بعد.....، مگر پہلے ہمیں زہرہ کو تلاش کر کے واپس لانا ہے۔

(انا کے ساتھ ساتھ باقی لڑکیاں بھی رونے لگتی ہیں۔ گرو آگے بڑھ کر موسیٰ کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے۔)

گرو: جیتے رہو.....شاد اور آباد رہو.....

گرو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔ موسیٰ پیار سے گرو کا ہاتھ تھپکتا ہے۔ ماحول پر شدید افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ موسیٰ ایک جھٹکے سے غصے میں اٹھتا ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر ان سب کو ایک لمحے کے لیے دیکھتا ہے اور پھر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: جیل

کردار: توقیر کی بیرک

سارنگا اور چاند پوری اپنے کارندوں کے ساتھ دور بیرک کے ایک کونے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ سب زوردار قہقہہ لگاتے ہیں۔ توقیر جو سلاخوں کے قریب منہ پر زخموں کے نشان اور نیل لیے بیٹھا ہے، ان کے قہقہے پر بُرا سا منہ بناتا ہے۔ ایک قیدی جو توقیر کے قریب ہی بیٹھا ہے۔ توقیر کے تاثرات دیکھ کر کھسک کر اس کے قریب آتا ہے اور دھیمی آواز میں سرگوشی کی طرح بات کرتا ہے۔

قیدی: شکر ہے ان ظالموں نے تمہاری جان بخش دی..... ورنہ ان کے ہاتھ سے کوئی محفوظ نہیں ہے یہاں..... اس سارنگے کے تو اشاروں پر ناچتے ہیں یہاں سارے

توقیر: مگر ان کی مجھ سے کیا دشمنی ہے..... میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو بات بے بات میری جان کو آ جاتے ہیں۔ میں نے تو جیلر کو بھی درخواست بھیجی تھی کہ خدا کے لیے مجھے کسی اور بیرک میں شفٹ کر دو..... باہر سے بھی سفارش لگوائی تھی..... مگر کوئی جواب ہی نہیں آیا۔

قیدی: جواب آئے گا بھی نہیں..... یہ جیل سارنگا کا دوسرا گھر ہے..... بڑے بڑے سیاستدان ملنے آتے ہیں اس سے یہاں۔ میں نے تو سُنا ہے کہ جیل کے عملے کی پوسٹنگ اور تبادلہ بھی سارنگا کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔

توقیر: یہ آخر ہے کیا بلا.....؟..... اور تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو..... کہیں تم بھی ان بدمعاشوں کے ساتھی تو نہیں ہو.....؟

(قیدی جلدی سے صفائی دیتا ہے)

قیدی: نہیں جناب..... میں تو آپ کا بڑا فین ہوں۔ بہت فلمیں دیکھی ہیں میں نے آپ کی..... آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں..... دو چار فلموں میں ایکسٹرا فائٹر کا رول بھی کیا ہے میں نے۔

توقیر: اچھا..... تو تم بھی ایکسٹرا ہو..... پھر سارنگا کے بارے میں اتنا کیسے جانتے ہو.....

قیدی: سارنگا کو کون نہیں جانتا جی۔ اور مجھے تو یہ بھی پتہ ہے کہ یہ سارے اس پرانے قیدی موسیٰ کی وجہ سے آپ کے دشمن بن گئے ہیں۔

(توقیر کو حیرت کا جھٹکا لگتا ہے)

توقیر: موسیٰ..... تم موسیٰ کو جانتے ہو۔

قیدی: ہاں جی..... وہ اس بیرک میں تھا سارنگا کے ساتھ..... میں نے خود سارنگا کے پیچھے چاند پوری کو کہتے سُنا تھا کہ اس بندے نے موسیٰ کو پھنسایا تھا۔ اس سے بدلہ لینا ہے ہم نے اپنے دوست کا۔

(توقیر غصے میں لال پیلا ہو جاتا ہے۔)

توقیر: اچھا..... تو یہ سارا فساد بھی اس موسیٰ کا پھیلایا ہوا ہے..... اسے تو میں.....

(قیدی جلدی سے منہ پر انگلی رکھ کر توقیر کو خاموش کرواتا ہے۔)

قیدی: شش..... آہستہ بولو..... یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں..... بس چند دن کی بات ہے..... سُنا ہے سارنگا کی اگلی پیشی پر ضمانت ہونے والی ہے۔ تب تک اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا..... بندہ مارتے ایک سیکنڈ نہیں لگتا اسے.....

توقیر سہم کر خاموش ہو جاتا ہے اور دُور بیٹھے سارنگا کے گینگ کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

زہرہ بستر پر بے ہوش پڑی دھیرے دھیرے کرا رہی ہے۔ فیضی اندر آتا ہے۔ بیوی سعیدہ جلدی سے اس کی طرف بڑھتی ہے۔

سعیدہ: کہاں رہ گئے تھے تم.....اسے ہوش آ رہا تھا.....دو بار تمہاری دی ہوئی دوا اس کے حلق سے اندر انڈیل چکی ہوں.....یہ مصیبت میرے گلے ڈال کر تم خود کہاں نکل گئے تھے۔

فیضی: حالات کا جائزہ لینے گیا تھا ذرا.....اس کے گھر کی جانب۔

سعیدہ: تو کیا پتہ چلا۔ وہاں تو اب تک قیامت مچ چکی ہوگی.....سب تلاش کر رہے ہوں گے اسے.....

فیضی: نہیں.....وہاں تو سناٹا پڑا ہے.....ملک شہریار اپنی جاگیر پر گیا ہوا تھا اور چوکیدار نے بتایا کہ گھر میں صرف نوکر ہیں جو ملک شہریار کی پہلی بیوی کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

سعیدہ: کیا مطلب.....؟.....اس کی پہلے سے بھی کوئی بیوی ہے کیا.....؟

فیضی: ہاں۔ جاگیردار بندہ ہے۔ جتنی چاہے کرے۔

سعیدہ: تو پھر یہ.....؟.....ہائے میری قسمت.....کہیں اس سیٹھ نے اسے.....

فیضی: (فیضی نظریں چراتا ہے) ہاں.....وہاں بھی کچھ ایسی ہی افواہ سُنی ہے میں نے کہ ملک شہریار نے اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے.....

(سعیدہ اپنا سر پیٹ لیتی ہے۔)

سعیدہ: پھوٹ گئی قسمت.....پتہ تھا مجھے.....پتہ تھا کہ یہ آخر میں ہم پر ہی تاوان کرائے گی۔ فیض علی.....فیض علی.....تم نے کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہ کیا.....ہائے میری تقدیر.....(سعیدہ وہیں بین ڈالنے لگتی ہے۔ فیضی اسے ڈانٹتا ہے۔)

فیضی: تم تو یہ رونا دھونا بند کرو.....سوچنے دو مجھے کچھ.....

سعیدہ: اب کیا سوچنا ہے.....فضول خرچ ہے یہ تو.....میں کہتی ہوں لے جا کر کسی سڑک کے کنارے ڈال آؤ.....خود ہی پہنچا دیں گے اسے ہسپتال آس پاس سے گزرنے والے.....اب تو میں اسے ایک پل بھی مزید یہاں نہیں رہنے دوں گی.....

فیضی: تم نے شاید وہ کہاوت نہیں سنی کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے.....مجھے یقین ہے کہ ہم اب بھی اس کی اچھی خاصی رقم وصول کر سکتے ہیں۔ ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔

(سعیدہ غصّے میں فیضی کو صلواتیں سُناتی ہوئی کمرے سے نکل جاتی ہے۔)

سعیدہ: ہونہہ.....تم اور تمہارے کھوٹے منصوبے.....مجھ سے اب کوئی توقع نہ رکھنا۔

سعیدہ بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ فیضی کا موڈ بھی آف ہو جاتا ہے اور وہ زہرہ کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ اور نامراد میں بات چیت۔ موسیٰ غصّے میں اٹھ کر جانے لگتا ہے۔

موسیٰ: تو تم کیا چاہتے ہو میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا سوچتا رہوں..... یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔

(نامراد اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

نامراد: یار صوفی..... ایک تو تیرے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے..... میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے ہم لوگ..... مگر ملک شہریار کے گھر یوں دندناتے ہوئے جا گھسنے میں بھی ہمارا اپنا ہی نقصان ہے۔ وہ ہوشیار ہو جائے گا ..... بڑا ٹیڑھا بندہ ہے وہ..... اوپر سے پہنچ والا بھی ہے.....

موسیٰ: ایسے کئی ٹیڑھوں کو سیدھا کیا ہے موسیٰ نے..... جو ہوگا دیکھا جائے گا.....

(موسیٰ باہر کی طرف نکل جاتا ہے نامراد جلدی سے اٹھ کر پیچھے لپکتا ہے۔)

نامراد: موسیٰ..... میری بات تو سنو..... اچھا ٹھہرو..... میں بھی آ رہا ہوں..... یا الٰہی..... یہ لڑکا تو کبھی میری نہیں سنتا۔

نامراد بھی موسیٰ کے پیچھے باہر نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل/ آؤٹر موتاج

توقیر جیل کی بیرک میں پریشان سا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ اتنے میں ایک سنتری وہاں پہنچتا ہے۔ اور سلاخیں ڈنڈے سے کھٹکھٹا کر ڈپٹ کر کہتا ہے۔

سنتری: چل بھئی ہیرو..... تیری ملاقات آئی ہے۔

توقیر چونک کر سنتری کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل

کردار: ملاقاتی کمرہ/ بیرک

ملاقاتی بیرک کے کمرے میں ایک دیوار میں جالی کی کھڑکی بنی ہے۔ جس کی دوسری طرف ملاقاتی انتظار کرتے ہیں۔ توقیر بے زار اور نڈھال سا ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور اس کی نظر اپنے ملاقاتی پر پڑتی ہے۔ توقیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ تیزی سے جالی کی طرف لپکتا ہے۔

توقیر: فیضی..... تم..... نمک حرام..... کہاں بھاگ گئے تھے..... لعنت ہو تم پر مفاد ار انسان۔

(فیضی ہاتھ جوڑ کر مکاری سے کہتا ہے)

فیضی: معاف کر دیں باس..... میں ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا لیلیٰ میڈم مجھے بھی اندر کروا دیں گی۔ اس لیے روپوش ہو گیا تھا۔

(توقیر غصے میں فیضی کو بے عزت کرتا ہے)

توقیر: اور میں.....؟ میرا خیال نہیں آیا تمہیں..... جس کے ٹکڑوں پہ تم برسوں سے پل رہے ہو..... جس نے تمہیں اتنا عرصہ پالا ہے..... ورنہ یاد ہے ناں اپنی پرانی اوقات..... اسٹوڈیوز کے باہر گلیوں میں رُلتے پھرتے تھے تم..... کوئی تمہیں گیٹ سے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا..... میں تمہیں اندر لے کر آیا تھا اسٹوڈیو میں..... میں نے تمہیں لیلیٰ کے پاس رکھوایا..... کام دلایا..... اور تم..... کتنے نمک حرام اور طوطا چشم نکلے تم۔ وقت پڑنے پر مجھے ہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

فیضی: (فیضی مکر سے کہتا ہے) سو جوتے مار لیں باس۔ جتنا چاہے بے عزت کر لیں..... مگر ہوں تو آپ کے در کا ہی کتا..... لوٹ کر ہمیشہ یہیں واپس آؤں گا..... چاہے جہاں بھی چلا جاؤں۔

(توقیر کا پارہ کچھ نیچے آتا ہے۔)

توقیر: کہو..... کہاں دفعہ ہو گئے تھے۔ اور اب اپنا یہ منحوس چہرہ لے کر میرے سامنے کیوں آئے ہو.....

فیضی: آج بھی آپ کے ہی فائدے کی خبر لے کر آیا ہوں باس.....

توقیر: میں یہاں سلاخوں کے پیچھے بند پڑا سڑ رہا ہوں۔ ضمانت ہو نہیں رہی میری..... اور تم میرے فائدے کی بات کر رہے ہو.....

فیضی: آپ سنیں تو سہی باس..... آپ کے یار شہریار ملک سے متعلق ہے.....

(توقیر اس کا نام سن کر مزید بھڑک اٹھتا ہے)

توقیر: مت نام لو اس کمینے انسان کا میرے سامنے..... میں نے کیا کچھ نہیں کیا اس کی خاطر..... اور وہ مجھ سے ملنے تک نہیں آیا ..... مجھے مصیبت میں تنہا چھوڑ کر رنگ رلیاں منا رہا ہے نہ جانے کہاں وہ کمینہ.....

فیضی: نہیں باس..... وہاں بھی سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ملک شہریار نے اپنی پرانی بیوی کے دباؤ میں آ کر زہرہ کو طلاق دے دی ہے..... اور زہرہ اس وقت میرے قبضے میں ہے.....

(طلاق اور زہرہ کے بارے میں سن کر توقیر کو زور کا جھٹکا لگتا ہے۔)

توقیر: کیا..... ملک نے زہرہ کو طلاق دے دی..... اچھا..... مگر..... وہ تمہارے پاس کیسے پہنچی۔

(فیضی مسکرا کر توقیر کی طرف دیکھتا ہے۔)

فیضی: کیوں باس..... ہے ناں دھماکے دار خبر.....

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: ملک شہریار کا گھر

موسیٰ گارڈ کو دھکا دے کر اندر آ جاتا ہے۔ نامراد بھی اس کے پیچھے ہے۔

موسیٰ: کہاں ہے تمہارا مالک..... وہ ملک شہریار..... باہر نکالو اسے.....

گارڈ: دیکھو تم ایسے اندر نہیں جا سکتے..... میں کہتا ہوں رُک جاؤ..... ورنہ.....

موسیٰ: ورنہ..... ورنہ کیا کر لو گے۔ میں کہتا ہوں اپنے اس مالک کو اطلاع دو جا کر..... بولو کہ موسیٰ آیا ہے باہر..... وہ اندر کہاں چھپا بیٹھا ہے۔

گارڈ: تم میری بات کیوں نہیں سن رہے۔ ملک صاحب نہیں ہیں گھر پر۔ وہ دو دن سے اپنی زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔

(موسیٰ غصے سے کہتا ہے)

موسیٰ: جھوٹ بول رہے ہو تم..... وہ بزدل یہیں کہیں اندر چھپا بیٹھا ہے۔

گارڈ: مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ چاہو تو اندر سے کسی نوکر کو بلوا کر بھی پوچھ لو.....

(نامراد آگے بڑھ کر موسیٰ کو قابو کرتا ہے اور اسے روکتا ہے۔)

نامراد: یہ ٹھیک کہہ رہا ہے موسیٰ..... ملک شہریار کی گاڑی بھی دکھائی نہیں دے رہی..... تم چلو ابھی یہاں سے..... ہم پھر آ جائیں گے۔

(موسیٰ جاتے جاتے گارڈ سے کہتا ہے، نامراد موسیٰ کو کھینچ کر باہر لے جاتا ہے)

موسیٰ: ملک شہریار سے کہنا کہ میں دوبارہ آؤں گا..... وہ مجھ سے بچے گا نہیں.....

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل

فیضی کی بات سن کر توقیر جاوید کی آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں۔

توقیر: واہ..... کیا خبر سُنائی ہے فیضی تم نے..... اس بات پر تو تمہارے سو گناہ معاف کر سکتا ہوں میں.....

فیضی: مگر یہ بات کنفرم ہے باس کہ ملک شہریار نے اس لڑکی کو طلاق دے دی ہے..... اب وہ اس کے کسی کام کی نہیں رہی.....

(توقیر غصّے میں تلملاتا ہے)

توقیر: بھاڑ میں جائے ملک شہریار..... مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں ہے..... مگر یہ زہرہ تو میرے دشمن موسیٰ کی جان ہے..... تو اگر زہرہ ہمارے قبضے میں ہے تو سمجھو کہ دشمن کی جان میری مٹھی میں ہے..... اب آئے گا مزہ..... بہت دل جلایا ہے میرا اس موسیٰ نے..... آج میں جو یہاں جیل میں پڑا سڑ رہا ہوں۔ یہ بھی اسی کی وجہ سے ہے..... تم بس اس لڑکی پر پورا پہرہ رکھو..... وہ اب ہمارے ہاتھ سے نکلنی نہیں چاہیے۔

فیضی: مگر باس..... اب آگے پلان کیا ہے..... مجھے بھی تو کچھ بتائیں.....

توقیر: یہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گا..... اب آگے جو بھی کھیل کھیلنا ہے..... سوچ سمجھ کر کھیلنا ہوگا..... یہ لڑکی ہمارے لیے ٹرمپ کا پتہ ہے..... یہی ہمیں بازی جتوائے گی۔

فیضی غور سے سن رہا ہے، توقیر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لاؤنج، ڈرائنگ روم وغیرہ

کردار: لیلیٰ، شہریار

لیلیٰ فون پر ملک شہریار سے لڑ رہی ہے۔

لیلیٰ: میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ زہرہ کو چھوڑ دو..... یہ نہیں کہا تھا کہ اسے یوں دربدر بھٹکنے کے لیے گھر سے ہی نکال دو..... وہ میری امانت تھی تمہارے پاس شہریار..... یاد رکھو..... اگر وہ ذرا بھی اسے کوئی نقصان پہنچا تو تمہیں بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(دوسری جانب شہریار اپنے علاقے میں بیٹھا فون پر بات کر رہا ہے۔ پس منظر میں دو چار دیہاتی باڈی گارڈ بھی بندوقیں اٹھائے کھڑے ہیں۔)

شہریار: تم نے میرے ساتھ ڈیل کی ہے لیلیٰ میڈم۔ اب اپنی ڈیل سے مکرنے کی کوشش مت کرنا..... ورنہ تمہارے اس چہیتے موسیٰ کو یہ خبر پہنچ جائے گی کہ زہرہ کا گھر توڑنے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے..... سیدھی طرح رقم میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دو ورنہ انجام تمہارا بھی اچھا نہیں ہوگا۔

شہریار غصے میں بول کر فون کاٹ دیتا ہے۔ لیلیٰ فون پکڑے پریشان سی ٹہلتی رہتی ہے۔ اتنے میں موسیٰ اندر داخل ہوتا ہے لیلیٰ اسے دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔

لیلیٰ: کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی.....

موسیٰ: اس ملک شہریار کو سبق سکھانے گیا تھا مگر افسوس وہ گھر پہ ملا نہیں۔

لیلیٰ: زہرہ کا کچھ پتہ چلا.....

موسیٰ: نہیں.....بس اتنا پتہ چل سکا ہے کہ طلاق والی رات اسے ملک کی بیوی نے نوکروں کے ذریعے گھر سے نکال دیا تھا۔..... وہاں سے نکل کر زہرہ کہاں گئی..... یہ کوئی نہیں جانتا.....،.....کاش وہ نکلنے سے پہلے اپنے گھر والوں کو فون کر دیتی..... مجھے بتا دیتی.....مگر.....

(لیلیٰ جھجکتے ہوئے موسیٰ سے کہتی ہے)

لیلیٰ: تم نے آس پاس کے ہسپتالوں میں چیک کیا.....میرا مطلب ہے.....خدانخواستہ.....

موسیٰ: میں اور نامراد آس پاس کے سارے ہسپتال اور ایمبولینسز کھنگال چکے ہیں۔ وہاں اس رات ایسی کوئی لڑکی نہیں لائی گئی کسی حادثے میں..... جہاں کچھ شبہ تھا.....ہم نے جا کر خود اسے دیکھ کر تسلی کر لی ہے.....زہرہ کسی ہسپتال میں نہیں ہے.....

لیلیٰ: تو پھر کہاں جا سکتی ہے زہرہ۔

موسیٰ: یہی تو مجھے اس ملک شہریار سے پوچھنا ہے۔ کب تک وہ چھپ کر بیٹھے گا اپنی جاگیر کی چار دیواری میں.....ضرورت پڑی تو میں وہاں بھی اس کے سر پر پہنچ جاؤں گا.....زہرہ کے ساتھ جو بھی انہونی ہوئی ہے۔ اب اس کا سرا ہمیں اس ملک شہریار سے ہی ملے گا۔

موسیٰ غصے میں تلملاتا رہتا ہے۔ لیلیٰ پریشانی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

زہرہ کا کمرہ

زہرہ کو دھیرے دھیرے ہوش آ رہا ہے۔ کمرے میں اور کوئی نہیں ہے، زہرہ کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیتی ہے اور آہستہ سے پکارتی ہے۔

زہرہ: پانی.....پانی.....

مگر کمرے میں اسے پانی پلانے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ زہرہ مجبوراً خود ہی ہانپتی ہوئی اٹھنے کی کوشش کرتی ہے اور پہلی مرتبہ وہ چکر آنے پر سر تھام کر وہیں دوبارہ بیٹھ جاتی ہے۔ اور کراہتی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے دوسری مرتبہ ہمت کر کے چارپائی کا کونہ پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ لڑکھڑاتی ہے مگر پھر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

فیضی اور سعیدہ دوسرے کمرے میں بحث میں مصروف ہیں۔

سعیدہ: اب کیا منصوبہ بنایا ہے تمہارے اس کنگلے اور قیدی بیٹھ نے.....اب کیا گل کھلانے کا ارادہ ہے اس کا۔

فیضی: تم فکر نہ کرو.....ایسے کاموں میں میرے بیٹھ کا دماغ بہت چلتا ہے۔ وہ ضرور اس لڑکی سے کوئی بڑا فائدہ اٹھائے گا۔

(سعیدہ چڑ جاتی ہے)

سعیدہ: کیا مطلب.....فائدہ وہ اٹھائے گا تو ہم کیا یہاں آلو چنے بیچنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں کیا ملے گا۔

(فیضی غصے سے بیوی کو دیکھتا ہے۔)

فیضی: اری بدبخت۔ ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر کیوں سوار رہتی ہے۔ کہا تو ہے کہ جو بھی ملے گا اس لڑکی کا۔ وہ آدھا آدھا ہوگا۔ یہ ڈیل میں نے پہلے ہی طے کر لی ہے اپنے باس سے.....

فیضی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی کمرے کے اندر کھلتا دروازہ دھڑ سے کھلتا ہے اور اس کے بیچوں بیچ زہرہ کھڑی نظر آتی ہے۔ سعیدہ اور فیضی دونوں گھبرا کر زہرہ کی طرف دیکھتے ہیں۔

سعیدہ: ارے.....تم کیوں اٹھ گئیں.....کہا بھی تھا میں نے کہ.....

(زہرہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے۔)

زہرہ: میں.....میں.....

مگر پھر اسے زوردار چکر آ جاتا ہے اور وہ لڑکھڑا کر وہیں دروازے کے بیچوں بیچ گر جاتی ہے۔ سعیدہ اور فیضی دونوں گھبرا کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ سعیدہ زہرہ کے گال تھپکتی ہے۔

سعیدہ: یہ تو بے ہوش ہوگئی دوبارہ.....مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی فیضی.....اس کا جو بھی فیصلہ کرنا ہے۔ جلدی کر دو.....کہیں یہ لڑکی ہمارے گلے ہی نہ پڑ جائے۔ مر گئی تو ٹھکانے لگانا مشکل ہو جائے گا۔

(فیضی بیوی کو ڈانٹتا ہے)

فیضی: میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ اس کی پوری نگرانی کرنا.....اس کے سرہانے بیٹھی رہنا۔ مگر تم میری کبھی نہ سننا.....اب دیکھ اسے.....کہیں اس نے ہم دونوں کی باتیں تو نہیں سن لیں.....

سعیدہ: سُن بھی لے تو کیا ہے.....اس کی حالت دیکھی ہے.....یہ تو دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ تم بس جلدی کرو.....جو بھی کرنا ہے۔

فیضی: اچھا اچھا۔ فی الحال اسے تو سنبھالو میرے ساتھ.....

//Cut//

Scene No # 12

وقت: رات

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ نامراد اسے تسلی دیتا ہے۔

نامراد: دو گھڑی دم تو لے تو یار موسیٰ.....ان شاء اللہ ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ اور ایک آدھ دن میں سارنگا بھی باہر آ جائے گا جیل سے.....پھر اس ملک شہریار سے بھی نپٹ لیں گے.....

موسیٰ: میرا ایک ایک پل کانٹوں پر گزر رہا ہے نامراد.....جانے وہ کہاں ہوگی۔ کیسی ہوگی۔؟

نامراد: چاند پوری نے سارے علاقے میں اپنے بندوں کو خبر کر دی ہے۔ کسی بھی لڑکی کی اطلاع ملتے ہی وہ ہمیں خبر کریں گے۔ اس شہر کے انڈر ورلڈ کا چپہ چپہ چھان مارا ہے انہوں نے.....کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑیں گے سارنگا کے کارندے جہاں ذرا بھی امکان یا شبہ ہو زہرہ کی موجودگی کا.....تم فکر نہ کرو.....جلد ہی اس کا سُراغ مل جائے گا.....ہم ہیں نہ پیارے.....تم

کیوں غم کرتے ہو۔

نامراد موسیٰ کو تسلی دینے کے لیے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ نامراد موسیٰ کی حالت دیکھ کر تڑپ کر اسے گلے لگا لیتا ہے۔

نامراد: ارے ... یہ کیا... میرے فولادی یار موسیٰ کی آنکھوں میں آنسو..... نہ یار نہ..... ایسے نہ کر..... تُو تو دلیر ہے..... شیر ہے میرا شیر... اگر تو نے ہی ہمت ہار دی تو قسم سے نامراد تو مر ہی جائے گا.....

(موسیٰ نامراد کے گلے لگا ہوا ہے)

موسیٰ: اب درد اپنی ہمت سے بڑھ گیا ہے یار..... اب اور برداشت نہیں ہوتا۔

(نامراد اپنی آنکھیں پونچھتا ہے)

نامراد: اچھا بس ناں..... اب کیا مجھے بھی رُلائے گا..... قسم سے..... آخری مرتبہ اس کے نکاح کے دن رویا تھا۔ اور تب سے قسم کھا رکھی ہے کہ دوبارہ کبھی ان آنکھوں سے یہ آنسو نہیں بہنے دوں گا..... پر لگتا ہے یہ آج تو یہ قسم بھی تڑوا کر رہے گا نامراد کی.....

نامراد موسیٰ کو گلے لگائے تھپکتا رہتا ہے۔ دونوں کی آنکھیں بھیگ چکی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن نکلنے کا موسم اج

انا کا گھر۔ انا بستر پر بے ہوش پڑی ہے۔ آس پاس لڑکیاں، چندا اور گُرو وغیرہ جمع ہیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر ٹمپریچر لے کر دوا کی پرچی پر کچھ لکھتی ہے اور چندا کو دیتی ہے۔

ڈاکٹر: شدید ڈپریشن کا اٹیک ہے۔ اوپر سے ہائی fever فیور نے مزید نڈھال کر دیا ہے۔ میں نے کچھ دوائیں لکھ دی ہیں۔ یہ آج سے شروع کروا دیں۔ اور کوشش کریں کہ ان پر کوئی ذہنی دباؤ نہ پڑے۔ ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

چندا: جی ڈاکٹر صاحب..... ہم تو پوری کوشش کر رہے ہیں..... مگر یہ بار بار کسی کو یاد کر کے رونے لگتی ہیں۔

ڈاکٹر: احتیاط ضروری ہے۔ کسی طرح سے ان کا دل بہلاتی رہیں..... فی الحال میں نے نیند کی دوا دے دی ہے۔ یہ جتنا سوئیں۔ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ میں شام کو پھر وزٹ کروں گی۔

(گُرو میڈیکل باکس اٹھا لیتا ہے۔)

لیڈی ڈاکٹر گُرو کے ساتھ باہر نکل جاتی ہے۔ چندا پریشان سی انا کے سرہانے بیٹھ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: مزار، حجرہ

شیخ علامہ شہاب الدین کا درس جاری ہے۔ سامنے عیسیٰ اور پیر قدرت بھی بیٹھے ہوئے ہیں اور چند دیگر مریدین بھی موجود ہیں۔

شہاب الدین: جانتے ہو..... دنیا میں ہوس کی بہت سی اقسام ہیں۔ مگر ان میں سے سب سے زیادہ مہلک کون سی قسم ہے..... وہ جسے دونوں فریق آخر تک محبت سمجھتے رہتے ہیں۔

(ایک مرید پیچھے بیٹھا بے اختیار بول اٹھتا ہے۔)

مُرید: سبحان اللہ یا مُرشد.....تو پھر ہم محبت اور ہوس میں تفریق کیسے کریں.....کیسے پتہ چلے گا ہمیں کہ ہماری محبت، محبت ہی ہے۔ ہوس نہیں.....

(علامہ شہاب مسکراتے ہیں۔)

شہاب: دل.....دل ہی سب سے بڑی کسوٹی ہوتی ہے یہاں بھی انسان کی.....اپنے دل میں جھانکو.....اور سب پوچھ لو.....مگر یاد رکھو پوچھتے وقت نیت سچ بولنے اور سچ سننے کی ہونی چاہیے.....انسان خود کو بہت عرصہ دھوکے میں نہیں رکھ سکتا.....اس کے اوپر اپنا سچ کھل ہی جاتا ہے کبھی نہ کبھی.....

سب مرید سر ہلاتے ہیں۔ علامہ شہاب دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ سب اس کی تقلید میں دعا مانگتے ہیں اور دعا ختم کر کے باری باری علامہ شہاب کا ہاتھ چوم کر وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ صرف قدرت اور عیسیٰ پیچھے باقی رہ جاتے ہیں۔

قدرت: حضرت آپ کچھ آرام کر لیں۔ تھک گئے ہوں گے۔

شہاب: ہاں پیر قدرت۔ تھکن تو ہے ذرا سی۔ مگر سوچ رہا ہوں کہیں نماز نہ قضاء ہو جائے۔ اس بار بہت دن لگ گئے یہاں.....ابھی آس پاس مضافات کی درگاہوں کا بھی دورہ باقی ہے۔

قدرت: آپ کی یہاں موجودگی ہم سب کے لیے باعث سعادت ہے حضرت۔

(شہاب کی نظر سامنے سر جھکائے گم سم بیٹھے عیسیٰ پر پڑتی ہے اور وہ مسکرا کر عیسیٰ سے پوچھتا ہے۔)

شہاب: کیوں بھئی عیسیٰ میاں۔ اتنے اداس اور گم سم کیوں بیٹھے ہو.....؟.....کیا گھر والی یاد آ رہی ہے تمہیں۔

(عیسیٰ شہاب الدین کی بات پر گڑبڑا سا جاتا ہے۔)

عیسیٰ: نہیں.....نہیں تو۔ علامہ جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں.....(قدرت اللہ اور شہاب الدین دونوں عیسیٰ کے اس طرح بوکھلا جانے پر مسکرا دیتے ہیں۔)

شہاب: پھر یہ تو مزید تشویش کی بات ہے.....نئی نئی شادی ہوئی ہے تمہاری.....ایسے میں گھر والی کو یاد نہیں کر رہے تو کسے یاد کر رہے ہو۔

(عیسیٰ مزید بوکھلا جاتا ہے۔)

عیسیٰ: جی.....میرا مطلب ہے اسے یاد تو کرتا ہوں.....مگر یہاں درگاہ میں نہیں.....

(شہاب الدین کی مسکراہٹ گہری ہو جاتی ہے وہ قدرت کی طرف دیکھتا ہے۔)

شہاب الدین: جیتے رہو.....بھئی قدرت تمہارا یہ چھوٹا بیٹا بھی اپنے بھائی موسیٰ کی طرح نہایت سعادت مند اور فرمانبردار ہے۔ مگر سچ کہوں تو ایک کے بنا دوسرا بہت اکیلا اور تنہا لگتا ہے۔ ان دونوں کی تو جوڑی ہی بنتی ہے.....مالک ان دونوں کو جلد از جلد ملا دے.....(آمین).....

قدرت اللہ نظریں جھکائے بیٹھا شہاب الدین کی بات سن رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا گھر

سکینہ کی ماں لاؤنج / کچن وغیرہ کی طرف آتی ہے اور دیکھتی ہے کہ سکینہ کچھ کام کرتے کرتے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے خیالوں میں کھو گئی ہے اور جو کام کر رہی تھی وہ ویسے ہی ادھورا پڑا ہے۔ خدیجہ چند لمحے بیٹی کی یہ غائب دماغی کی حالت دیکھتی رہی ہے، پھر اسے آواز دیتی ہے۔

خدیجہ: سکینہ.....اری او سکینہ.....کہاں کھوئی ہوئی ہو.....سکینہ.....

(تیسری آواز پر سکینہ چونک کر خیالات سے واپس آتی ہے۔)

سکینہ: جی.....جی اماں جی.....

خدیجہ: کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہو.....اور تمہارا دھیان کہاں رہتا ہے آج کل.....تمہاری ساس نے بھی تمہاری یہ غائب دماغی نوٹ کی ہے.....مگر تمہاری محبت میں بولی نہیں کبھی وہ پلٹ کر.....

سکینہ: جانتی ہوں اماں.....میں کبھی کسی کی محبت کی قدر نہیں کر پائی.....بڑی بدنصیب ہوں میں.....

خدیجہ: اور یہ عیسیٰ کہاں رہتا ہے آج کل سارا سارا دن.....پہلے تو کمرے سے نکلنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا.....ماں تھک جاتی تھی بُلا بُلا کر، اب گھر میں قدم ہی نہیں رکھتا۔ اکھڑا اکھڑا رہتا ہے تم سے، تم دونوں میں صلح نہیں ہوئی اب تک.....

سکینہ: روٹھ گیا ہے عیسیٰ بھی مجھ سے میری قسمت کی طرح اماں.....اب زیادہ بولتا نہیں مجھ سے

خدیجہ: یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ بھی شکر کرو کہ عیسیٰ بھی میرے موسیٰ کی طرح ظرف والا بندہ ہے۔ کوئی اور مرد ہوتا تو کب کا چوٹی سے پکڑ کر تمہیں گھر کے دروازے سے باہر دھکیل چکا ہوتا.....

(سکینہ ماں کو دکھ سے دیکھتی ہے۔)

سکینہ: تمہارے دونوں بیٹے تو تم پر چلے گئے اماں۔ پر میں تم سی کیوں نہ ہوئی.....میرا اندر کیوں ٹیڑھا کر دیا اوپر والے نے۔ میں تم پر کیوں نہ گئی.....

(خدیجہ حیرت سے سکینہ کو دیکھتی ہے)

خدیجہ: اے لڑکی۔ آج یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے.....یہ کون بول رہا ہے تیرے اندر.....

سکینہ: پتہ نہیں اماں.....میں تو بڑی ہی بھلی تھی.....تب میرا دل تو یوں نہیں کٹتا تھا کسی کے لیے۔ بڑے آرام سے تھی میں.....اب موسیٰ بھائی کا سوچتی ہوں تو میرے اندر آری سی چلتی ہے.....میری وجہ سے میرا بھائی برباد ہو گیا.....سب لوٹ لیا اسی کی مجھ جیسی ڈائن بہن نے.....خدا مجھے کبھی معاف نہ کرے اماں.....دعا کرو.....میں بھی اپنے بھائی کی طرح برباد ناشاد رہوں عمر بھر.....

(سکینہ بولتے بولتے رو پڑتی ہے۔ خدیجہ جلدی سے آگے بڑھ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیتی ہے اور خود بھی رو پڑتی ہے۔)

خدیجہ: ہائے.....خدا نہ کرے.....میرا دل تو ہر وقت تیری آبادی کی دعائیں مانگتا ہے.....تیری ہی خوشیوں کی التجا کرتا ہے اپنے رب سے.....یہی احساس۔ یہی آنسو تو تیرا کفارہ ہیں.....اپنے رب کے سامنے سجدے میں گر کر روتے ہوئے خوب گڑگڑا کر دعا مانگا کر اپنے بھائی کے لیے.....اللہ اس کے لیے بھی آسانیاں پیدا کرے گا۔

ماں بیٹی دونوں روتے رہتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: جیل

ملاقاتی کمرہ/ بیرک

فیضی اور توقیر جالی کے آر پار کھڑے ہیں۔

توقیر: سب سے پہلے تمہیں واپس لیلیٰ کے پاس جا کر اس کا اعتماد جیتنا ہوگا.....یہ بہت ضروری ہے۔

فیضی: کیا کہہ رہے ہیں باس.....لیلیٰ میڈم کی تو خیر ہے.....انہیں میں کسی نہ کسی طرح پٹا لوں گا.....مگر وہاں وہ موسیٰ بھی ہوگا

ان کے ساتھ۔ وہ تو مجھے کچا ہی چبا جائے گا دیکھتے ہی۔

توقیر: اسی موسیٰ پر نظر رکھنے کے لیے تو تمہیں وہاں بھیج رہا ہوں۔ جب تک ہم زہرہ کی پوری قیمت وصول نہیں کر لیتے ان لوگوں سے..... تمہیں موسیٰ پر نظر رکھنی ہوگی.....

فیضی: کیوں میری جان اس کے ہاتھوں نکلوانا چاہتے ہیں باس..... مجھے تو اس کا نام سنتے ہی ٹھنڈے پسینے آنے لگے ہیں ابھی سے.....

توقیر: بکو مت..... موسیٰ زہرہ کی تلاش میں ملک شہریار کے پیچھے ضرور جائے گا..... تمہاری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ شہریار یا موسیٰ میں سے کوئی ایک ہی زندہ بچے..... دونوں صورتوں میں ہمارا ہی فائدہ ہوگا..... یا تو ملک شہریار ساری عمر سلاخوں کے پیچھے کاٹے گا یا پھر وہ موسیٰ ملک کے قتل کے الزام میں سُولی چڑھ جائے گا..... موسیٰ کے مارے جانے یا جیل جانے کی صورت میں میں لیلیٰ سے زہرہ کے بدلے ڈیل بھی کر سکوں گا..... اور ہم لیلیٰ کی ساری دولت اور جائیداد پر بھی با آسانی قبضہ کر سکیں گے.....

فیضی: واہ باس..... پلاننگ تو بڑی زبردست ہے تمہاری..... اگر ایسا ہوگا تو ہمارے تو واقعی وارے نیارے ہو جائیں گے۔ موسیٰ کے مارے جانے یا جیل جانے کے بعد لیلیٰ میڈم تو بالکل تنہا رہ جائیں گے..... تب ہم کھل کر کھیل سکیں گے.....

توقیر: ہاں..... مگر یہ کھیل بڑی ہوشیاری سے کھیلنا ہوگا ہمیں..... ذرا سی بے احتیاطی سے سارے پتے الٹے بھی پڑ سکتے ہیں..... تمہیں کسی بھی طرح موسیٰ کو یہ یقین دلانا ہے کہ زہرہ کی گمشدگی کی اصل وجہ ملک شہریار ہی ہے..... اور اس آگ کو تیل ڈال ڈال کر اس وقت تک بھڑکاتے رہنا ہے جب تک ان دونوں کا سامنا نہ ہو جائے اور ان میں سے کوئی ایک ہی بچے.....

فیضی: سمجھ گیا باس..... مگر اس زہرہ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے باس۔ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں وہ.....

توقیر: نہیں..... فی الحال اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیلیٰ سے ایک بار اس کی بات بھی کروانی ہوگی تاکہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ زہرہ ابھی زندہ ہے اور کسی اغواء کار کے قبضے میں ہے..... پھر چاہے ختم کر دینا اس لڑکی کو بھی۔

(فیضی مکاری سے کہتا ہے)

فیضی: سب سمجھ میں آ گیا ہے باس..... آپ بے فکر رہیں..... ایسا فساد برپا کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر/آفس

فیضی لیلیٰ کے قدموں میں گرا ہوا مکر سے رو رہا ہے۔

فیضی: مجھے معاف کر دیں میڈم جی..... میں کیا کرتا..... غریب اور کم زور سا بندہ ہوں..... توقیر صاحب کی دھمکیوں سے ڈر گیا تھا میں۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اپنی زبان کھولی تو وہ مجھے بھی قتل کروا دیں گے.....

لیلیٰ: کاش تم مجھ سے ایک بار کھل کر بات کر لیتے فیضی..... تو آج توقیر بھی یوں سلاخوں کے پیچھے نہ پڑا ہوتا..... بہر حال..... اب تو سب ختم ہو گیا۔ اب کیا لینے آئے ہو میرے پاس.....

فیضی: اور کہاں جاؤں گا میں میڈم جی۔ ایک آپ ہی تو میرا آخری سہارا ہیں..... بس اپنے قدموں میں جگہ دے دیں..... میں تو ہمیشہ ہی سے آپ کا پی۔ اے تھا..... اور پی۔ اے ہی رہوں گا.....

لیلیٰ: دو تین بار پولیس بھی تمہاری تلاش میں آ چکی ہے یہاں.....

(فیضی جلدی سے ہاتھ جوڑ دیتا ہے)

فیضی: مجھے بچالیں میڈم جی..... میں بالکل بے قصور ہوں.....

(اتنے میں موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

موسیٰ: آپ نے مجھے بلایا.....

(موسیٰ کی نظر فیضی پر پڑتی ہے تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔)

موسیٰ: یہ یہاں کیا کر رہا لیلیٰ جی.....

(لیلیٰ فیضی سے کہتی ہے)

لیلیٰ: فیضی..... تم باہر جا کر بیٹھو..... میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ (فیضی جلدی سے موسیٰ کو سلام کرتے ہوئے نکل جاتا ہے۔)

موسیٰ: یہ بھی ہر سازش میں توقیر کے ساتھ شامل تھا..... اس پر دوبارہ اعتماد نہ کیجئے گا۔

لیلیٰ: اس نے کبھی میرے بُرے دنوں میں میرا بہت ساتھ دیا تھا..... آج موقع ملا ہے تو اس کا یہ احسان بھی اتار دیتی ہوں..... ویسے بھی اب میرے پاس کھونے کو بچا ہی کیا ہے۔

موسیٰ: جیسے آپ کی مرضی..... مگر اس پر نظر رکھیے گا..... آپ نے مجھے یاد کیا تھا..... سب خیر تو ہے ناں۔

(لیلیٰ ہچکچاتی ہے)

لیلیٰ: ہاں..... میں دراصل..... وہ میں دراصل زہرہ کے بارے میں تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی..... کچھ پتہ چلا اس کا.....

موسیٰ: فی الحال نہیں..... مگر تلاش جاری ہے..... بس ایک بار وہ ملک شہریار میرے سامنے آ جائے..... مجھے یقین ہے پھر مجھے زہرہ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک پائے گا.....

(اتنے میں فیضی کمرے میں جھانکتا ہے۔)

فیضی: مداخلت کی معذرت چاہتا ہوں میڈم جی..... مگر ایک بات آپ دونوں کو بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں..... جب توقیر صاحب باہر تھے اور ہر شام ملک شہریار ان کے دفتر آیا کرتے تھے تب میں نے بارہا ملک شہریار کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ اپنی بیوی زہرہ سے بہت اُکتا گیا ہے..... اور بہت جلد وہ زہرہ سے جان چھڑا لے گا۔

(لیلیٰ اور موسیٰ دونوں چونکتے ہیں)

لیلیٰ: مگر کیوں..... شہریار نے تو بڑے چاؤں سے زہرہ کو اپنایا تھا۔ پھر اچانک یہ بددلی اور نفرت کیوں پیدا ہو گئی تھی ملک کے دل میں.....

(فیضی ڈرتے ڈرتے جھجک کر موسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔)

فیضی: وہ جی..... میرا مطلب ہے۔ میرے منہ میں خاک..... مگر ملک شہریار کو شک ہو گیا تھا کہ زہرہ اور موسیٰ میں کچھ تعلق ہے پہلے سے.....

(موسیٰ غصے میں فیضی کی طرف بڑھتا ہے)

موسیٰ: کیا بکتے ہو..... زہرہ بہت معصوم اور پاکیزہ تھی..... ہے..... اور ہمیشہ رہے گی۔

(فیضی ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے)

فیضی: جی جی موسیٰ بھائی..... یہ تو میں جانتا ہوں..... مگر وہ اس روز پارٹی میں..... میرا مطلب ہے سیٹھ شہباز کی پارٹی میں شاید کچھ بدمزگی ہو گئی تھی..... تو اگلے روز ملک شہریار بہت غصے میں توقیر صاحب کے دفتر آیا تھا..... اور بتایا تھا کہ سیٹھ شہباز نے اسے کوئی سی سی کیمرہ کی فوٹیج دکھائی ہے جس میں موسیٰ بھائی اور زہرہ باتیں کر رہے ہیں۔

(فیضی پوری مکاری سے اپنی جھوٹی داستان سناتا رہتا ہے)

اور پھر اس فوٹیج میں موسیٰ بھائی کو بیڈ روم کی طرف جاتا بھی دکھایا گیا تھا..... تو ملک شہریار اسی دن سے ہی آگ بگولہ ہو گیا تھا..... مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں.....

(موسیٰ غصے میں تلملا رہا ہے)

خدانخواستہ..... میرے منہ میں ایک بار پھر خاک کہیں شہریار نے زہرہ کو قتل ہی نہ کر دیا ہو غصے میں..... اور اب یہ طلاق کا ڈرامہ رچا رہا ہو..... تاکہ کسی کو اس پر شک نہ ہو.....

فیضی کی بات سن کر لیلیٰ اور موسیٰ ڈر کر پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر۔ کمرہ

زہرہ آنکھیں کھولتی ہے اور ایک بار پھر کراہ کر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سعیدہ جو قریب ہی موجود ہے اسے آواز دے کر روکتی ہے۔

سعیدہ: لیٹی رہو..... تمہاری حالت ابھی چلنے پھرنے والی نہیں ہے زہرہ۔

زہرہ: (زہرہ چونکتی ہے) تم کون ہو۔ اور۔ اور مجھے کیسے جانتی ہو۔

سعیدہ: اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں..... اور یہ بھی کہ تمہیں تمہارے شوہر سیٹھ شہریار نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔

(زہرہ پریشان ہو جاتی ہے)

زہرہ: کون ہو تم..... اور تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے..... میں..... میں کہاں ہوں.....

زہرہ گھبرا کر پھر اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔

سعیدہ اسے اٹھنے نہیں دیتی۔

سعیدہ: کہا ناں..... تم محفوظ جگہ پر ہو..... مگر یہاں سے باہر تمہارے لیے بہت خطرہ ہے۔ تمہارا شوہر تمہاری جان لینا چاہتا ہے۔ شاید اس کے سسرال والوں کو تم سے کچھ خطرہ ہے۔ کہ کہیں تم ان کی جاگیر میں سے اپنا حصہ نہ مانگ لو.....

زہرہ: مگر..... میں تو تمہیں.....

سعیدہ: جانتی ہوں تمہیں میری زبان سے یہ سب کچھ جان کر شدید حیرت ہو رہی ہو گی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا شوہر فیضی تمہارے شوہر کے جگری یار اور رازدار دوست سیٹھ توقیر کے دفتر میں کام کرتا ہے..... خاص بندہ ہے اس کا..... تم تو جانتی ہو گی ناں توقیر کو..... وہی فلم اسٹار لیلیٰ کا شوہر..... اس نے فیضی کو یہ ساری باتیں بتائی ہیں.....

مجھے تو شک ہے کہ تمہارا یہ ایکسیڈنٹ بھی دراصل کوئی حادثہ نہیں تھا، یہ بھی تمہیں مارنے کی ایک کوشش تھی تمہارے سابق شوہر کی طرف سے..... تم ان کمینے کو نہیں جانتیں..... اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ گھٹیا مخلوق کسی حد تک بھی جا سکتی ہے..... (زہرہ پریشان ہو جاتی ہے۔ سعیدہ عیاری سے اپنی باتوں میں لگا کر نیند کے شربت کا ایک گھونٹ چمچ میں ڈال کر پلا دیتی ہے۔)

زہرہ: مگر میں نے تو کبھی شہریار سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، بلکہ اپنے حصے کی جائیداد اور دولت بھی وہیں چھوڑ آئی ہوں میں..... دیکھو..... بالکل خالی ہاتھ ہوں.....

(زہرہ اپنے سونے ہاتھ سعیدہ کو دکھاتی ہے۔)

سعیدہ: یہی تو تم نے سب سے بڑی غلطی کی..... اپنا حصہ تو تمہیں ہر حال میں وصول کرنا چاہیے تھا اس ملک سیٹھ سے..... بہر حال ... تم فکر نہ کرو۔ تمہارا حصہ اب فیضی تمہیں وصول کر کے دلائے گا..... تم بس آرام کرو فی الحال۔ تمہاری حالت بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔

زہرہ کی آنکھیں ایک بار پھر غنودگی سے بند ہونے لگتی ہیں۔ سعیدہ اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیتی ہے زہرہ کچھ کہنے کی کوشش کرتی ہے مگر بولتے بولتے ہوش کھو بیٹھتی ہے۔

زہرہ: تم..... مجھے..... یہاں سے.....

(زہرہ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ سعیدہ کمینگی سے مسکراتی ہے۔)

سعیدہ: فیضی نے ٹھیک ہی کہا تھا..... تم تو واقعی سونے کی چڑیا ہو۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

فیضی لیلیٰ کے دفتر سے نکل کر باہر کے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ اتنے میں پیچھے سے موسیٰ بھی لیلیٰ کے آفس سے باہر آتا ہے اور فیضی کو آواز دے کر روکتا ہے۔

موسیٰ: سنو فیضی.....

(فیضی جلدی سے چاپلوسی سے کہتا ہے)

فیضی: جی موسیٰ بھائی..... حکم۔

موسیٰ: مجھے ملک شہریار کی جاگیر کا پتہ چاہیے.....؟ کیا تم جانتے ہو اس کی زمین اور جائیداد کس علاقے میں ہے۔

فیضی: ٹھیک سے جانتا تو نہیں..... مگر آپ کہیں تو پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

موسیٰ: تو پتہ لگاؤ اور مجھے جلد از جلد بتاؤ کہ آج کل وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے.....

فیضی: ٹھیک ہے موسیٰ بھائی..... میں جلد از جلد پتہ لگواتا ہوں کہ وہ ملک شہریار دارادات کر کے کہاں جا کر روپوش ہو گیا ہے.....

موسیٰ غصے میں آگے بڑھ جاتا ہے، فیضی کے چہرے پر ایک کمینی سی مسکراہٹ آ جاتی ہے اور وہ زیر لب خود کلامی کرتا ہے۔

فیضی: تمہاری یہ تڑپ، یہ بے چینی..... اور یہ غصہ ظاہر کرتا ہے کہ تمہارے اور زہرہ کے بارے میں جو افسانے بنے تھے۔ وہ صرف ایک خیالی کہانی نہیں تھی..... دال میں ضرور کچھ کالا ہے.....، ..... اب مزہ آئے گا.....

فیضی اپنی سوچ پر خود ہی زور سے ہنستا ہے پھر خود ہی ڈر کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور گھبرا کر چپ ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر

موسیٰ اور نامراد آپس میں بات کر رہے ہیں۔

نامراد: میں تمہاری پریشانی سمجھ رہا ہوں موسیٰ..... مگر میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ملک شہریار اس حد تک بھی جا سکتا ہے..... وہ بنیادی طور پر ایک کمینہ صفت مرد ہے جو ہر بات میں صرف اپنا فائدہ تلاش کرتا ہے.....

موسیٰ: تو پھر زہرہ کہاں ہے۔؟ ملک کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ کہاں گئی..... اور اتنا تلاش کرنے کے باوجود وہ ہمیں مل کیوں

نہیں رہی.....

نامراد: مانتا ہوں.....مانتا ہوں کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے.....سارنگا کے بندوں نے شہر کی ہر وہ جگہ بھی چھان ماری ہے جہاں زہرہ کی موجودگی کا ذرا بھی امکان تھا۔ مگر میں پھر بھی مایوس نہیں ہوں ابھی تک۔ وہ ہمیں۔

اتنے میں موسیٰ کے فون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے۔ موسیٰ جلدی سے نمبر پر نظر ڈالتا ہے اور دھیرے سے بڑبڑاتا ہے۔

موسیٰ: فیضی کا فون.....اس وقت.....

// FREEZ //

End of Epi

قسط نمبر 22

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر

نامراد اور موسیٰ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ فون کی گھنٹی بجنے پر موسیٰ فیضی کا نمبر دیکھ کر چونکتا ہے اور بے چینی سے پوچھتا ہے۔

موسیٰ: ہاں فیضی..... بولو..... کیا خبر ہے۔

فیضی: موسیٰ بھائی..... میں نے ملک شہریار کے گاؤں کا پتہ لگا لیا ہے..... ملتان اور بہاولپور کے درمیان کچے کے علاقے میں جاگیر ہے اس کی..... اس کی کیا ہے بلکہ اس کی بیوی کی ہے۔ جو اس کے سالوں کے کنٹرول میں رہتی ہے مگر ہے شہریار کے نام..... انتظام اس کے سسرالی چلاتے ہیں۔ وہیں قریب میں گاؤں ہے ان کا.....

موسیٰ: ٹھیک ہے..... میں ابھی نکلتا ہوں وہاں کے لیے۔

فیضی: نہیں موسیٰ بھائی..... وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اب۔

موسیٰ: کیوں..... فائدہ کیوں نہیں ہے۔ میں وہیں جا کر اس کی گردن ناپتا ہوں۔

فیضی: اس لیے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ ملک شہریار اپنے گاؤں سے نکل پڑا ہے۔ آج شام یا رات تک وہ شہر پہنچ جائے گا۔ اگر وہ واپس یہیں آ رہا ہے.....

موسیٰ: وہ یہاں آئے یا کہیں بھی جائے..... میں اسے زمین کی سات تہوں میں سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا..... اب وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا..... تم بس مجھے اطلاع دے دینا.....

(موسیٰ غصے میں فون بند کر دیتا ہے۔ دوسری جانب فیضی اپنی عیاری پر خود ہی ہنستا ہے۔)

فیضی: یہی تو میں بھی چاہتا ہوں میرے عاشقِ نامراد..... کہ اب ملک شہریار تم سے بچ کر کہیں نہ جائے.....

//Cut//

Scene No # 2

وقت: شام/دن

جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ کمرے سے نکل کر باہر جانے لگتا ہے، تبھی..... سکینہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

سکینہ: کہاں چل دیے..... میں تمہارے لیے چائے لے کر آئی تھی۔

عیسیٰ: مجھے چائے کی طلب نہیں ہے۔

سکینہ: اچھا دو گھڑی بیٹھ تو جاؤ میرے ساتھ..... کبھی تمہیں مجھ سے یہ گلہ رہتا تھا کہ تمہارے کمرے میں آتے ہی میں باہر نکل جاتی تھی..... اور اب یہ صورت حال ہے کہ تم میرا وجود بھی اپنے کمرے میں برداشت نہیں کرتے..... میں اندر آتی ہوں تو تم لپک کر باہر نکل جاتے ہو۔

عیسیٰ: وقت وقت کی بات ہے.....اسی لیے تو کہتے ہیں کہ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

سکینہ: مان لیا۔ کہ میرا وقت بدل چکا ہے۔ میری ساری انا اور غرور مٹی میں مل چکا ہے۔ لیکن آج یہ تو بتاؤ کہ میری یہ سزا آخر کب تک چلے گی۔ کوئی معیاد تو مقرر کرو عیسیٰ.....تا کہ میں اپنے انتظار کی حد طے کرلوں.....

عیسیٰ: میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ دل کے فیصلے ہوتے ہیں.....ان کی کوئی حد اور کوئی معیاد مقرر نہیں کی جا سکتی.....لیکن ایک بات تم بھی یاد رکھنا کہ غلطی تم نے کی ہے.....لیکن اس کی سزا میں بھگت رہا ہوں.....

عیسیٰ بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتا ہے۔

سکینہ ویسے ہی پریشان کھڑی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت کا کمرہ

قدرت کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ ہاجرہ اپنے خیال میں گم سم بیٹھی ہے۔ قدرت بیوی کی طرف سے توجہ نہ پا کر دھیرے سے کھنکارتا ہے۔ ہاجرہ شوہر کی کھانسی کی آواز سن کر اپنے خیالوں سے باہر آتی ہے۔ اور جلدی سے اٹھ کر حسب معمول اپنے شوہر کو پانی کا گلاس پیش کرتی ہے۔

ہاجرہ: اوہ.....آپ آ گئے.....

قدرت: ہاں.....میں تو بہت پہلے آ گیا تھا۔ لیکن تم اپنے بیٹے کے خیالات میں اس قدر کھوئی ہوئی تھیں کہ تمہیں شاید میرے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔

ہاجرہ: خیالات پر کس کا زور چلتا ہے پیر صاحب۔ اور پھر ایک بے کس اور لاچار ماں کے ہاتھ میں تو صرف خواب دیکھنا ہی باقی رہ جاتا ہے.....تو اکیلی بیٹھی بس خواب ہی دیکھتی رہتی ہوں کہ ہمارا گھرانہ پھر سے مکمل ہو گیا ہے.....باپ اور بیٹے کی ساری دُوریاں ختم ہو گئی ہیں اور ہم سب پھر سے ایک ہو گئے ہیں.....

(قدرت سختی سے کہتا ہے)

قدرت: یہ دوریاں میں نے اپنی خوشی سے نہیں بڑھائی ہیں ہاجرہ.....تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے موسیٰ نے کیا کیا ہے.....

ہاجرہ: جانتی ہوں.....اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں نے آپ سے کبھی کوئی گلہ بھی نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کیا ہے میں نے.....ہاں مگر ایک ماں کا دل خود سے ہی خفا ہے۔ بہت خفا ہے.....

قدرت: تو اس ماں کے دل کو یہ سمجھاؤ کہ ایک باپ نے اپنے بیٹے کو پلٹ آنے سے کبھی نہیں روکا.....مگر واپس بلانے پر تمہارے اس بیٹے نے کیا جواب دیا تھا.....یہ بھی تمہیں یاد ہونا چاہیے.....تم بھی تو وہاں موجود تھیں ناں.....

ہاجرہ: ہاں.....یاد ہے مجھے.....مگر وہ جواب دینے والا میرا موسیٰ یا آپ کا بیٹا نہیں تھا.....وہ تو ایک دیوانے سر پھرے کا جواب تھا جو کسی نامحرم لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر دیوانگی کی ساری حدیں پار کر چکا ہے.....اور یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں پیر صاحب کہ مجنوں اور دیوانے پر دین اور شرع میں بھی کوئی حد نہیں لگتی.....وہ ہر سزا سے مبرّا ہوتے ہیں۔ کاش آپ بھی میرے موسیٰ کو ایک مجنوں۔ ایک دیوانہ سمجھ کر ہی معاف کر دیتے.....

(قدرت سختی سے بیوی کو جواب دیتا ہے)

قدرت: دیوانے اور مجنوں کے لیے چاہے کوئی سزا مقرر نہ بھی کی ہو شرع نے.....مگر انہیں یوں کھلے عام پھرنے اور شر پھیلانے کی

اجازت بھی نہیں دی ہے دین نے کہیں.....اور تمہارے بیٹے کی دیوانگی اور جنون کا شر میرے خاندان کی عظمت اور نیک نامی کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا ہاجرہ.....علاقہ بدری ایسے دیوانوں کا مقدر ہوتی ہے۔انہیں بھی دیس نکالے کی سزا سنا دی جاتی ہے.....

قدرت اپنی بات ختم کر کے کروٹ لے کر لیٹ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

ہاجرہ پریشان سی بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔اسے موسیٰ اور پیر قدرت کے درمیان ہوئی ایک پرانی بحث یاد آتی ہے۔وہ ماضی کی یاد میں کھو جاتی ہے۔

ہاجرہ کا فلیش بیک۔پیر قدرت کا کمرہ

// NEW TAKE //

موسیٰ پیر قدرت کے سامنے کھڑا ہے۔قدرت غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے۔ہاجرہ باپ بیٹے کے ایک جانب پریشان سی کھڑی ہے۔

قدرت: میں نے اسے یہ گھر چھوڑنے کا حکم دیا تھا ہاجرہ.....پھر تم اسے میرے پاس کیوں لے کر آئی ہو دوبارہ.....

ہاجرہ: آپ ایک بار موسیٰ کی بات تو سُن لیں۔یہ غلطی سے اس لڑکی کے پیچھے چلا گیا تھا جہاں وہ رقص کی محفل چل رہی تھی۔موسیٰ کو تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی ایک پیشہ ور رقاصہ.....میرا مطلب ہے اسے تو وہاں جا کر یہ پتہ چلا تھا۔کہ اتنے میں ہنگامہ ہو گیا اور پولیس وہاں پہنچ گئی۔اسے تو بے گناہ ہی دھر لیا گیا تھا.....

(قدرت غور سے اپنے بیٹے کو دیکھتا ہے)

قدرت: یہ تو تم کہہ رہی ہو ہاجرہ۔ایک ماں تو اپنے بیٹے کی صفائیاں دیا ہی کرتی ہے.....مگر میں یہی بات موسیٰ کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں.....

موسیٰ: یہ بات سچ ہے ابا کہ مجھے زہرہ کی حقیقت وہاں جانے سے پہلے پتہ نہیں تھی.....

قدرت: مطلب.....تمہیں پتہ ہوتا تو تم وہاں نہ جاتے.....یہی کہنا چاہ رہے ہو تم۔

موسیٰ: میں نہیں جانتا کہ حقیقت پتہ چل جانے پر میرا ردِ عمل کیا ہوتا۔مگر جب وہاں پہنچ کر میں نے اسے دھتکارا.....اس پر لعن طعن کی.....اور اپنا غصہ نکالنے کے لیے اسے گناہ ثواب کی حد بتائی تو اس نے جواب میں مجھ سے ایک سوال پوچھ لیا ابا۔جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔میں لاجواب ہو کر واپس آیا ہوں ابا.....آپ مجھے جواب دے دو.....تو شاید میں خود کو کچھ تسلی دے سکوں۔

قدرت: (قدرت غصے سے بیٹے کو دیکھتا ہے،اور بیٹے کے قریب آ جاتا ہے۔) کیسا سوال.....؟میں بھی تو سنوں۔

موسیٰ: یہی کہ میں ایک نیک،دین دار،شرع کے پابند عزت دار پیر گھرانے میں پیدا ہوا۔تو اس میں میرا کیا کمال ہے.....اور اگر اس نے اس بدنام بازار میں جنم لیا.....تو اس میں اُس کا کیا قصور ہے.....؟ یہ فیصلہ تو ہمارے ہاتھ میں تھا ہی نہیں۔تو پھر اس تقسیم پر میں کیوں کر فخر کروں.....اور وہ شرمندہ کیوں ہو.....کہیں اگر وہ کسی بنک گھرانے میں پیدا ہو جاتی.....اور میں کسی بازار.....

(قدرت غصے میں چلاتا ہے اور اس کا تھپڑ موسیٰ کے چہرے پر پڑتا ہے۔)

قدرت: بس.....اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہنا.....سن رہی ہو ہاجرہ اپنے اس ناخلف بیٹے کی یہ بولی۔ایک ہی ملاقات میں کیسا دل بدل ڈالا ہے اس حرافہ نے تمہارے اس احمق بیٹے کا.....آج یہ خود نہیں بول رہا۔اس کے اندر چھپا بیٹھا شیطان

اس سے یہ سب کہلوا رہا ہے.....

(موسیٰ باپ سے چانٹا کھا کے بھی سر جھکائے کھڑا ہے۔)

موسیٰ: یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے ابا..... آپ کو لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی شیطان بول رہا ہے تو اس شیطان کو ہی چپ کرا دیں جواب دے کر..... میری تسلی ہو جائے گی..... ورنہ یہ سوال تو مجھے عمر بھر کے لیے ڈستا رہے گا..... بے چین رکھے گا مجھے..... میں کہیں بھی چلا جاؤں..... یہ بار بار پلٹ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوگا.....

مجھے بتائیے کہ میرے نیک ہونے میں میرا کتنا حصہ ہے اور اس کی بدنامی میں اس کا کتنا قصور ہے؟..... کیا صرف کسی ماحول میں پیدائش ہی سے ہماری عمر بھر کی اچھائی اور بُرائی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔؟ پھر تو ہم انسان خود اچھے بُرے نہیں ہوتے ابا.....

وہ جگہ..... وہ ماحول اچھا یا بُرا ہوتا ہے جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں..... تو اس جگہ اور ماحول کا صلہ یا اس کی سزا ہم انسانوں کو کیوں دی جاتی ہے.....؟

قدرت: لے جاؤ اس دیوانے کو یہاں سے ہاجرہ..... کہیں میرے ہاتھوں آج کوئی جرم سرزد نہ ہو جائے..... بہت سن لی میں نے اس کی یہ بکواس۔ یہ اپنے پرکھوں کی عظمت اور اپنے خاندان کی شرافت اور نجابت کو صرف ایک اتفاق کہہ رہا ہے..... مقابلہ کر رہا ہے اپنے آباؤ اجداد اور ان بازاری لوگوں کے درمیان..... کیا تمہیں اب بھی کوئی شک ہے کہ تمہارا بیٹا اپنی راہ سے بھٹک کر شیطانی قوتوں کا غلام بن چکا ہے..... اور آج میرے سامنے تمہارا موسیٰ نہیں۔ کوئی فرعون کھڑا ہو کر یہ سوال و جواب کر رہا ہے..... لے جاؤ اسے..... ورنہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھوں گا.....

ہاجرہ ڈر کر جلدی سے موسیٰ کا ہاتھ پکڑتی ہے اور اسے کھینچ کر باہر لے جانے لگتی ہے۔ موسیٰ کے چہرے پر اب بھی وہی کش مکش ہے اور وہ جاتے جاتے بھی ماں سے ایک ہی بات کہے جا رہا ہے۔

ہاجرہ: موسیٰ..... پگلا تو نہیں گیا ہے تو کہیں..... چل یہاں سے.....

موسیٰ: مگر اماں..... میں نے تو صرف ایک سوال ہی پوچھا ہے ابا سے..... کوئی گستاخی تو نہیں کی.....

ہاجرہ: چل یہاں سے.....

ہاجرہ بیٹے کو کھینچتے ہوئے باہر لے جاتی ہے۔ قدرت غصے میں کھڑا تلملاتا رہتا ہے۔

//Cut//

// Back to Live //

Scene No # 5

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

ہاجرہ اپنے بیٹے کی یاد/فلیش بیک Flash Back سے واپس آتی ہے۔ پیر قدرت کب کا کروٹ بدلے سو چکا ہے۔ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ موسیٰ کو یاد کرتے ہوئے دھیرے سے خود بھی کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہے اور چپکے چپکے رو کر بیٹے کو یاد کرتے ہوئے سونے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ باہر رات ڈھل رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن نکلنے کا موسم تاج

شہر میں دن نکل رہا ہے

شہر کی کسی سڑک پر گاڑیوں کا رش اور ہارنز کا شور ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: صبح/دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر۔فیضی کا کمرہ۔

تیسری منزل

فیضی اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا کوئی فائل دیکھ رہا ہے اچانک اس کی نظر، نیچے پارکنگ میں رُکتی ملک شہریار کی کروزنگ گاڑی پر پڑتی ہے۔فیضی زور سے چونکتا ہے۔

فیضی: اوہ.....ملک شہریار کی گاڑی.....مگر یہ یہاں کر رہا ہے.....؟.....

(نیچے ملک شہریار اپنے ڈرائیور اور گارڈ سمیت نیچے اترتا ہے اور اوپر لیلیٰ کے دفتر کی طرف دیکھتا ہے۔فیضی جلدی سے پیچھے ہو جاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے۔)

فیضی: اوہ.....یہ تو یہیں آ رہا ہے.....چل بھئی فیضی.....تیرا کام شروع۔

(فیضی جلدی سے فون نکالتا ہے اور موسیٰ کا نمبر ملاتا ہے۔)

فیضی: ہاں.....موسیٰ بھائی.....فیضی بول رہا ہوں.....وہ ملک شہریار کا بچہ واپس آ گیا ہے۔اور اس کی ہمت تو دیکھو.....آتے ہی سیدھا لیلیٰ میڈم کے دفتر آیا ہے۔ہاں ہاں۔میں نے خود ابھی اسے نیچے پارکنگ میں دیکھا ہے.....بس تم اب دیر نہ کرو.....اور جلدی پہنچو یہاں.....ہاں.....اچھا.....ٹھیک ہے.....

(فیضی فون کاٹ کر کمینی سی مسکراہٹ سے مُسکراتا ہے اور خود کلامی کرتا ہے۔)

فیضی: اسے کہتے ہیں ''خس کم۔جہاں پاک.....''

فیضی تیزی سے دوبارہ کھڑکی کی طرف آتا ہے اور نیچے دیکھنے لگتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

لیلیٰ اپنے آفس میں کسی کام میں مصروف ہے۔اچانک آفس کا دروازہ دھڑ سے کھلتا ہے اور شہریار اپنے گارڈ سمیت غصے میں آفس میں داخل ہوتا ہے۔

لیلیٰ: تم.....یہاں.....؟.....اور یہ کیا طریقہ ہے کسی کے پرائیویٹ آفس میں داخل ہونے کا.....؟.....

شہریار: جو جس زبان میں سمجھتا ہے.....شہریار اسے اسی زبان میں سمجھانے کا عادی ہے.....

لیلیٰ: کیا مطلب.....؟

شہریار: تم شاید بھول رہی ہو.....ہمارے درمیان ایک ڈیل ہوئی تھی۔میں نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے.....جبکہ تمہاری طرف سے کی گئی commitmet کمٹ منٹ ابھی پورا ہونا باقی ہے.....

لیلیٰ: میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں.....وعدہ خلافی تو تمہاری طرف سے ہوئی ہے.....

شہریار اپنے گارڈ کو باہر جانے کا اشارہ کرتا ہے۔

گارڈ سر ہلا کر باہر چلا جاتا ہے۔اس کے جاتے ہی شہریار غصے سے کہتا ہے۔

شہریار: میں نے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔ بات زہرہ کو طلاق دینے کی ہوئی تھی..... وہ میں نے دے دی..... اب تم اپنا وعدہ پورا کرو..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔

(لیلیٰ بھی غصے سے کہتی ہے)

زہرہ: میں تمہاری کسی دھمکی میں آنے والی نہیں ہوں ملک شہریار..... سیدھی طرح بتاؤ کہ زہرہ کہاں ہے۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ.....

باہر کھڑا فیضی دروازے سے لگا یہ سب کچھ سن رہا ہے۔

طلاق والی بات پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

ملک شہریار کا گارڈ باہر گیلری میں بیٹھا آفس کے باہر شہریار کا انتظار کر رہا ہے۔ اندر فیضی لیلیٰ کے دروازے سے کان لگائے سن رہا ہے۔ جبکہ آفس میں شہریار اور لیلیٰ کے درمیان شدید غصے کے ماحول میں بحث جاری ہے۔

شہریار: مجھے کیا پتہ وہ میرے گھر سے نکلنے کے بعد کہاں چلی گئی ہے..... یہ بات تو تمہیں اپنے اس چہیتے سوکالڈ باڈی گارڈ موسیٰ سے پوچھنی چاہیے..... ضرور وہ مجھ سے جان چھڑا کر اپنے اسی پرانے عاشق کے پاس گئی ہوگی.....

لیلیٰ: یہ سب جھوٹ ہے..... تم تہمت لگا رہے ہو ایک معصوم لڑکی پر..... اور تم نے یہ تہمت ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار لگائی ہے زہرہ پر..... یہ کیوں نہیں کہتے کہ خود تمہارے ناپاک ارادے پورے نہیں ہوئے تو تم نے زہرہ کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا..... ایک بات میں تمہیں آج صاف صاف بتا رہی ہوں شہریار..... اگر زہرہ نہ ملی تو اس کی گمشدگی کی ایف۔آئی۔آر میں خود تمہارے خلاف کٹواؤں گی.....

شہریار: یہ شوق بھی پورا کر لینا۔ ویسے سیٹھ شہباز ٹھیک ہی کہتا تھا کہ ضرور اس موسیٰ کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے۔ کوئی جادو آتا ہے اُسے کہ جسے دیکھو..... وہ اسی موسیٰ کی دیوانی ہے..... تمہارا تو باڈی گارڈ ہے ناں وہ..... میرا مطلب ہے صرف کہنے کو ہی سہی..... مگر اس کے دن اور رات تو تمہارے ساتھ ہی گزرتے ہوں گے..... ویسے بہت جلدی نہیں لگا لیا تم نے یہ یارانہ اپنے شوہر کو اس کے ہاتھوں جیل بھجوا کر.....

(لیلیٰ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ زور سے چلاتی ہے۔)

لیلیٰ: بکواس بند کرو اپنی گھٹیا انسان

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر سے طرف جڑا

پی۔اے (فیضی کا کمرہ)

فیضی کان لگائے اندر کی باتیں سن رہا ہے۔ اتنے میں باہر قدموں کی آواز گونجتی ہے۔ فیضی جلدی سے دروازے سے ہٹ جاتا ہے اور ٹھیک اسی لمحے غصے میں بھرا موسیٰ اندر آتا ہے۔

موسیٰ: کہاں ہے وہ بے غیرت۔

فیضی: بتاتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے موسیٰ بھائی..... میں چاہتا ہوں کہ تم پر کسی اور کی اصلیت بھی کھل جائے آج.....

موسیٰ: کیا مطلب ہے تمہارا.....

فیضی: میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بس چند لمحے ذرا کان لگا کر اندر ہوتی گفتگو سن لیں..... سب سمجھ میں آ جائے گا۔

موسیٰ الجھن زدہ سا فیضی کی بات سن کر دروازے کی طرف بڑھتا ہے جہاں اندر لیلیٰ اور شہریار میں بحث جاری ہے۔ فیضی کے چہرے پر مکارانہ سی مسکراہٹ ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

کردار: لیلیٰ اور شہریار میں بحث جاری ہے۔

لیلیٰ: تم جیسا خود غرض، گھٹیا..... اور کمینہ انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا شہریار۔ تم جیسے خود ہو..... باقی لوگوں کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہو.....

شہریار: تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ تمہاری یہ چالبازیاں مجھے میرا حق لینے سے روک سکتی ہیں تو یہ تمہاری بھول ہے لیلیٰ میڈم..... میں اپنی بیوی کے ٹکڑوں پر پل پل کر تھک چکا ہوں..... چھوٹی سے چھوٹی رقم اور خرچے کا بھی حساب دینا پڑتا ہے اسے..... اسی لیے میں نے تمہاری یہ آفر قبول کی تھی اور زہرہ کو طلاق لکھ بھیجی تھی..... تاکہ تمہاری دی ہوئی رقم سے میں اپنا الگ کوئی کاروبار شروع کر سکوں..... اب تم اپنی بات سے مکر نہیں سکتیں..... اگر تم نے فوراً اپنی آدھی پراپرٹی اور بینک بیلنس میرے نام نہ کیا تو میں تمہیں پوری طرح برباد کرنے کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاؤں گا۔ مگر سب سے پہلے میں تمہارے اس چہیتے موسیٰ کو یہ خبر دوں گا کہ زہرہ کو طلاق دلوانے والی کوئی اور نہیں..... تم ہی ہو۔

اتنے میں دھڑ سے آفس کا دروازہ کھلتا ہے۔ لیلیٰ اور شہریار دونوں گھبرا کر دروازے کی طرف پلٹتے ہیں جہاں دروازے کے بیچوں بیچ آنکھوں میں خون لیے موسیٰ کھڑا ہے۔

لیلیٰ: موسیٰ؟..... تم؟..... یہاں.....؟

موسیٰ: ہاں..... شاید غلط وقت پر آ گیا..... کاش کچھ دیر سے آتا تو شاید میرے کان وہ نہ سنتے جنہیں سننے کے بعد میرا دنیا کے ہر معتبر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا ہے.....

لیلیٰ: تم غلط سمجھ رہے ہو موسیٰ..... باخدا میری نیت

موسیٰ: آپ سے میں بعد میں بات کروں گا لیلیٰ جی..... پہلے مجھے اس خبیث انسان سے نمٹ لینے دیں.....

(شہریار غصے سے چلاتا ہے)

شہریار: بکو مت..... تم دو ٹکے کے گارڈ۔ تم مجھ سے نمٹو گے۔

(موسیٰ اپنے نیفے سے پسٹل نکال لیتا ہے۔)

موسیٰ: تمہاری اوقات تو دو ٹکے کی بھی نہیں ہے ملک شہریار..... بازار میں تم جیسے مردوں کے لیے ایک خاص لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مجھے تو وہ بھی تم سے زیادہ عزت دار لگتے ہیں..... کم از کم وہ اپنی گھر کی عورتوں کا سودا تو نہیں کرتے۔ اس سے پہلے کہ میں تمہارے اندر چھ کی چھ اتار دوں..... سیدھی طرح بتا دو کہ زہرہ کہاں ہے.....

(موسیٰ ٹریگر پر ہاتھ رکھتا ہے شہریار چلا کر اپنے گارڈ کو بلاتا ہے)

شہریار: گارڈ..... گارڈ..... کہاں مر گئے ہو۔

لیلیٰ: یہ غضب مت کرنا موسیٰ.....صرف یہی ہمیں بتا سکتا ہے کہ زہرہ اس وقت کہاں ہے.....

موسیٰ: تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے شہریار.....یا تو زہرہ کا پتہ بتاؤ.....یا پھر کلمہ پڑھ لو.....

لیلیٰ کا رنگ خوف سے فق پڑ جاتا ہے۔شہریار گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے موسیٰ شہریار کی طرف آخری مرتبہ دیکھتا ہے اور کمرے میں فائر کی آواز گونجتی ہے۔

//Cut//

مونتاج۔ لیلیٰ کے دفتر کا آؤٹر/ بلڈنگ/عمارت۔

عمارت کے سناٹے میں فائر کی آواز گونجتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: فیضی کا کمرہ

فائر کی آواز سن کر فیضی بے اختیار چلا اٹھتا ہے۔

فیضی: مار ڈالا۔موسیٰ نے ملک شہریار کو مار ڈالا۔

کیمرہ روم آؤٹ کرتا ہے تو فیضی اور شہریار کے گارڈ کو کسی اور مسلح شخص نے اپنی پسٹل/ کے نشانے پر ہالٹ کر رکھا ہے اور چاند پوری میز پر بیٹھا اپنی ہتھیلی پر رکھی پان سپاری پھانک رہا ہے۔چاند پوری ڈپٹ کر فیضی اور شہریار کے گارڈ کو چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

چاند پوری: چپکے بیٹھے رہو میاں.....ورنہ اگلی باری تمہاری ہوگی.....

فیضی دوبارہ ڈر کر دبک کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔اور بے بسی سے شہریار کے گن مین کی طرف دیکھتا ہے جس سے اس کی گن پہلے ہی چھینی جا چکی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا دفتر

لیلیٰ کا رنگ خوف کے مارے سفید پڑ چکا ہے۔مگر شہریار اپنی جگہ ابھی صحیح سلامت کھڑا ہے۔*(ریورس فلیش بیک میں دکھایا جائے گا کہ جب موسیٰ نے شہریار پر گولی چلانے کے ہاتھ سیدھا کیا تھا تبھی پیچھے سے ایک ہاتھ نے بڑھ کر موسیٰ کا ہاتھ اوپر کر دیا تھا اور گولی شہریار کو لگنے کے بجائے اوپر چھت میں جا لگتی ہے۔موسیٰ کا ہاتھ پکڑنے والا ہاتھ سارنگا کا ہوتا ہے۔موسیٰ غصے سے پلٹتا ہے تو سارنگا کو اپنے سامنے دیکھتا ہے)۔End of Revers flash Back

سارنگا: کیا سبھی کو مار ڈالے گا شہزادے.....کچھ ہمارے لیے بھی چھوڑ دے.....

(موسیٰ جوش میں ہے۔سارنگا نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے تاکہ موسیٰ گولی نہ چلا سکے)

موسیٰ: اس دھرتی کے بوجھ کو مجھے ختم کر لینے دو سارنگا بھائی.....ایسے بے غیرتوں کو اگلا سانس لینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے.....

سارنگا: جانتا ہوں اس جیسے بے غیرتوں کی ساری خصلتوں کو.....مگر ابھی اس کا موقع نہیں آیا میرے گلفام.....تم جاؤ سیٹھ.....اور جاتے ہی شکرانے کے دو نفل ضرور پڑھ لینا.....چند سانسیں بخش دی ہیں تمہیں اوپر والے مالک نے.....ہو سکے تو صدقہ

بھی دے دینا.....

(شہریار اپنے ماتھے سے پسینہ صاف کرتا ہے اور غصے سے موسیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔)

شہریار: دیکھ لوں گا تمہیں.....ساری عمر کے لیے جیل کی چکی نہ پسوائی تو میرا نام بھی شہریار نہیں۔

(موسیٰ سارنگا سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے مگر سارنگا اسے جکڑے رکھتا ہے اور جاتے ہوئے شہریار پر طنز کرتا ہے۔)

سارنگا: تو پھر ابھی سے کوئی اچھا سا نام سوچ لینا سیٹھ.....ویسے بھی تمہارا پرانا نام تم پر کچھ جچتا نہیں ہے.....گدھ شاہینوں والے نام نہیں رکھا کرتے۔

شہریار غصے میں بڑبڑاتا لیلیٰ کے دفتر سے نکل جاتا ہے۔ موسیٰ ابھی تک تلملا رہا ہے۔ لیلیٰ بے دم ہو کر اپنی کرسی پر وہیں ڈھے سی جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ کا کمرہ

سکینہ اپنے کمرے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی ہے۔ وہ نماز ختم کر کے سلام پھیرتی ہے اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔ دعا مانگتے مانگتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

سکینہ: (Overlap آڈیو اور لیپ) ہم انسان بھی کتنے جلد باز ہوتے ہیں میرے اللہ.....غصے اور دکھ میں ذرا سی تکلیف پاتے ہی منہ سے کیسے کیسے بدکلمات اور بددعائیں نکل جاتی ہیں ہمارے.....میں بھی تیری ایک ایسی ہی کم زور، جلد باز اور نادان بندی ہوں میرے مالک۔ میں نے ہی رو رو کر جانے کتنی بددعائیں کی تھیں اس گھرانے کے لیے.....موسیٰ بھائی کی بربادی کے لیے.....مگر مجھ جیسی کم ظرف اور گناہ گار بندی کی بددعا تو نے اتنی جلدی سن لیں.....جبکہ تجھے علم تھا کہ میرا دل پلٹ جائے گا.....جب مجھے ہدایت دے دی ہے میرے رب تو میری بددعائیں بھی پلٹا دے.....میرا بھائی بہت تکلیف میں ہے.....اس کی تکلیف دور کر دے میرے مولا.....میرے حصے کی خوشیاں بھی اسے سونپ دے۔ مجھے اپنے لیے اب کچھ نہیں چاہیے۔ بس تو موسیٰ کو اس کی محبت سے ملا دے.....کوئی معجزہ کر دے یارب.....کوئی کرشمہ دکھا دے۔

(سکینہ روتی رہتی ہے اور گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہتی ہے)

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر/ یا سارنگا کا اڈہ

سارنگا، موسیٰ، نامراد اور چاند پوری موجود ہیں۔ موسیٰ ناراض سا بیٹھا ہے۔ سارنگا چارپائی پر تکیہ رکھے نیم دراز ہے۔

چاند پوری: نامراد بھائی.....عرض کیا ہے۔

نامراد: ارشاد.....ارشاد.....

چاند پوری: کسی بات پر میں.....کسی سے خفا ہوں.....

میں زندہ ہوں پر.....زندگی سے خفا ہوں۔

سارنگا: واہ چاند پوری.....واہ.....

نامراد: مگر چاند پوری صاحب..... یہ شعر تو کسی گانے کا نہیں.....

(چاند پوری ڈھٹائی سے کہتا ہے)

چاند پوری: تو میں نے کب کہا ہے کہ میرا ہے۔ میں تو موقعے کی مناسبت سے چپکا رہا ہوں۔

نامراد: اچھا اچھا..... پھر ٹھیک ہے..... ارشاد.....

(چاند پوری ناراض بیٹھے موسیٰ کی طرف سب کو اشارہ کر کے کہتا ہے)

چاند پوری: مزید عرض کیا ہے۔

مجھے دوستوں سے شکایت ہے شاید.....

مجھے دشمنوں سے محبت ہے شاید.....

میں اس دوستی، دشمنی سے خفا ہوں.....

نامراد: واہ واہ..... واہ..... یعنی بہت ہی اعلیٰ.....

(سارنگا ایک گہری سانس لیتا ہے۔)

سارنگا: آج یہاں کوئی ہم سے بھی خفا ہے رے..... کوئی تو اسے بھی مناؤ۔ کیوں شہزادے..... کیا اب ہم سے بھی نہیں بولے گا۔

موسیٰ: تم سے بھلا کیسے ناراض ہو سکتا ہوں سارنگا بھائی۔ مگر آج میرا ہاتھ روک کر تم نے اس ملک شہریار کو بچا لیا..... میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے نہیں چھوڑوں گا.....

(سارنگا موسیٰ کا شانہ تھپتھپاتا ہے۔)

سارنگا: فکر نہ کر۔ اس کے موقعے اور بھی ملیں گے۔ اور پھر دشمن کو ایک ہی جھٹکے میں مار ڈالا۔ تو کیا کمال کیا..... یہ تو سمجھوا سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔ دشمن کو مارنا ہو تو پل پل تڑپا تڑپا کر مارو..... ایسے کہ وہ خود تم سے مرنے کی بھیک مانگے.....

نامراد: میری تو یہ سُنتا نہیں ہے سارنگا استاد۔ اسی لیے مجھے جیسے ہی چاند پوری نے جیل سے نکل کر یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ تم دونوں کی ضمانت ہو گئی ہے..... میں نے فوراً اسے اطلاع کر دی کہ موسیٰ ابھی ابھی لیلیٰ میڈم کے دفتر کے لیے نکلا ہے۔

سارنگا: ٹھیک کیا تو نے نامراد۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں ذرا سی انیس بیس ہو جاتی تو اس نے سر میں سوراخ کر دینا تھا اس بے غیرت کے.....

چاند پوری: تم سمجھتے کیوں نہیں موسیٰ..... شہریار کو مار کر تم تو جیل چلے جاتے..... پیچھے اس کا کیا ہوتا جو شاید آج بھی تمہاری آس میں بیٹھی ہو..... پہلے اسے تلاش کرنے کی فکر کرو۔ پھر ملک شہریار جیسوں سے نپٹنے کے لیے سارنگا استاد کے ایک ہزار چیلے موجود ہیں اس شہر میں..... اسے مارنا کیا مسئلہ ہے.....

نامراد: یہی بات میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں کہ اسے اپنے ہاتھ کسی کے خون سے رنگنے کی ضرورت نہیں..... پیچھے سارا خاندان رُل جائے گا اس کا یہ رُسوائی لے کر۔ باپ اور بھائی تو شاید تمام عمر کسی کو منہ بھی نہ دکھا سکیں۔

سارنگا: اور پھر اس کا بھی تو سوچ پیارے..... جس کی خاطر تو نے یہ جوگ لے رکھا ہے.....

وہ اگر زندہ ہے تو ساری عمر تیرے لیے در بدر بھٹکتی رہے گی..... پہلے اسے ڈھونڈتے ہیں میرے یار..... تب تک اپنے اندر کا یہ لاوا یونہی گرم رکھ..... دنیا پھونکنے کے کام آئے گا۔

زہرہ کے لیے ''اگر زندہ ہے تو'' والے جملے پر موسیٰ تڑپ کر سارنگا کو دیکھتا ہے۔

موسیٰ سر جھکائے بیٹھا سنتا رہتا ہے۔

سارنگا اسے اپنے ساتھ لپٹا کر کمر پر زور زور سے ہاتھ مار کر تسلیاں دیتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل

ملاقاتی کمرہ

فیضی تو قیر کے سامنے جالی کے پار کھڑا ہے۔تو قیر شدید غصے میں اپنا ہاتھ زور سے جالی پر مارتا ہے۔

تو قیر: لعنت ہو اس سارنگا پر.....وہ کہاں سے عین وقت پر پہنچ گیا وہاں.....کیا بکواس ہے یہ سب.....کتنا بہترین موقع تھا موسیٰ کو پھنسانے کا.....ساری چال چوپٹ ہوگئی عین وقت پر.....

فیضی: میرا تو خود غصے اور بے بسی سے بُرا حال ہو رہا تھا باس.....،..... بازی اپنے ہاتھ میں تھی.....سارے پتے ٹھیک ٹھیک بچھا دیے تھے میں نے.....بس موسیٰ کے ٹریگر دبانے کی دیر تھی کہ پتہ نہیں کہاں سے درمیان میں وہ سارنگا استاد آن ٹپکا.....ملک شہریار تو سمجھو بال بال بچا ہے اس بار۔

تو قیر: (غصے سے) نہیں بچنا چاہیے تھا اُسے.....موسیٰ کی ایک گولی ایک تیر سے کئی شکار کرتی ہمارے لیے.....مگر.....

فیضی: اب آگے کیا کرنا ہے باس.....یہ وار تو خالی گیا ہمارا.....

تو قیر: موسیٰ اتنے آرام سے بیٹھنے والا نہیں ہے.....جب تک اسے زہرہ زندہ یا مردہ مل نہیں جاتی.....وہ نہ خود چین سے بیٹھے گا.....نہ کسی کو بیٹھنے دے گا.....تم نے بس یہ آگ بھڑکائے رکھنی ہے موسیٰ کے دل میں.....اور ملک شہریار کو بھی الجھائے رکھنا ہے کسی طرح.....

فیضی: اور وہ لڑکی زہرہ۔اس کا کیا کرنا ہے۔میں زیادہ عرصہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا۔جلد یا بدیر مجھے اسے وہاں سے کہیں اور شفٹ کرنا ہی ہوگا۔

تو قیر: اس کی نوبت نہیں آئے گی.....اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو تم لیلیٰ سے زہرہ کے بدلے تاوان کی رقم طلب کرو گے.....کسی غیر اور انجان لہجے میں.....اور اسے دھمکی دو گے کہ اگر اس نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا تو زہرہ جان سے جائے گی۔

فیضی: مگر باس.....اگر لیلیٰ میڈم تاوان دینے پر راضی ہوگئیں اور ہمیں پیسہ مل بھی گیا۔تب بھی تو زہرہ واپس جا کر سب بتا دے ان سب کو.....ہم تو پھر بھی دھر لیے جائیں گے۔

تو قیر: نرے احمق ہو تم فیضی.....تم پہلے پیسہ وصول کرو گے اور پھر اسے کسی ویران جگہ پر زہرہ کو لے جانے کے لیے بلاؤ گے۔مگر جب لیلیٰ تاوان ادا کر کے تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر زہرہ کو لینے پہنچے گی۔تو وہاں اُسے زہرہ نہیں.....صرف زہرہ کی لاش ملے گی.....اور قتل کا الزام تم شہریار کے سر ڈالو گے.....کیا سمجھے.....؟

فیضی تو قیر کی بات سن کر گھبرا کر تو قیر کی طرف دیکھتا ہے جس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کوئی پولیس اسٹیشن

ملک شہریار تھانے میں افسر کے سامنے بیٹھا ہے اور شہریار کسی پولیس افسر سے بات کر رہا ہے۔

شہریار: جی۔اسی سلسلے میں مجھے موسیٰ کے خلاف ایف۔آئی۔آر کٹوانی ہے۔اس نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

SHO/افسر: حیرت ہے ملک صاحب.....ایسی ہی ایک درخواست آپ کے خلاف کسی چاند پوری نامی شاعر نے بھی آج جمع کروائی ہے کہ آپ نے اسے فلم پروڈیوسر لیلیٰ کے دفتر میں بلوا کر جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔

(شہریار بوکھلا جاتا ہے۔)

شہریار: کیا.....؟.....کون چاند پوری..... میں تو ایسے کسی شخص سے واقف بھی نہیں ہوں۔

SHO: شاید انہی لوگوں میں سے ایک ہو جن کے ساتھی کے خلاف آپ پرچہ کٹوانے آئے ہیں۔

(شہریار غصے میں)

شہریار: مگر یہ سب جھوٹ ہے.....بکواس ہے.....اس شخص کے پاس ثبوت کیا ہے اس بات کا کہ میں نے اسے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔

SHO: معاف کیجئے گا ملک صاحب.....ثبوت تو آپ کے پاس بھی نہیں ہے کوئی۔ جس گارڈ کی گواہی کی آپ بات کر رہے ہیں۔ وہ تو خود آپ کا ہی ذاتی ملازم ہے۔ اس کی گواہی اتنی اثر دار نہیں ہوگی اس معاملے میں۔ جب کہ دوسری طرف اس چاند پوری نے فلم اسٹار لیلیٰ سمیت تین اور گواہوں کے نام جمع کرائے ہیں اپنے حق میں۔ جن کے سامنے آپ نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا.....

شہریار: مگر یہ سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے.....میں نے ایسا کچھ نہیں کیا.....

SHO: مگر قانون تو اندھا ہوتا ہے ملک صاحب۔ اگر آپ کی ایف۔ آئی۔ آر کاٹوں گا تو بدلے میں ان کی آپ کے خلاف دی گئی درخواست پر بھی کارروائی کرنی پڑے گی۔ آپ کے خلاف بھی پرچہ کٹے گا پھر تو.....

شہریار: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں.....؟

SHO: مجھے معاملہ سمجھ میں آ گیا ہے ملک صاحب۔ مگر آپ کا پالا اس مرتبہ بڑے پروفیشنل اور چھٹے ہوئے لوگوں سے پڑا ہے..... وہ اس چھپن چھپائی کے کھیل کے ماہر ہیں اور جیل حوالات ان کے لیے گھر جیسی بات ہے.....میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ ان سے باہر ہی کوئی سیٹلمنٹ کر لیں تو بہتر ہے.....میں آج اگر آپ کی ایف۔ آئی۔ آر کاٹ کر موسیٰ کو گرفتار کر بھی لوں تو وہ عدم ثبوت کی بنیاد پر پہلی پیشی میں ہی باہر آ جائے گا.....مگر پھر یہ لوگ ٹک کر نہیں بیٹھیں گے اور آپ کے خلاف بھی جھوٹے سچے دس گواہ عدالت میں پیش کر دیں گے.....یہ ان کے لیے روز کا معمول ہے۔ میری مانیں تو اس پھڈے میں ٹانگ نہ اڑائیں.....یہ سارے سارنگا کے بندے ہیں.....اور آپ شاید سارنگا کو ٹھیک سے جانتے نہیں.....آپ کا جینا اجیرن کر دیں گے یہ لوگ۔ پھر بھی مرضی آپ کی ہے۔ آپ کہیں گے تو میں آپ کی شکایت درج کر لوں گا.....یہ آپ کا حق ہے.....مگر آپ کو سمجھانا بھی میرا فرض تھا.....

شہریار SHO کی بات سن کر گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

فیضی کمرے میں جھانکتا ہے جہاں زہرہ بے سدھ سی پڑی ہے، پھر واپس باہر کھڑی بیوی کی طرف پلٹتا ہے۔ سعیدہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

سعیدہ: کتل.....یہ کچھ زیادہ نہیں ہو جائے گا.....

(فیضی جلدی سے منہ پر انگلی رکھ کر بیوی کو خاموش کراتا ہے اور ڈانٹ کر کہتا ہے۔)

فیضی: شش شش..... آہستہ بولو..... سارے محلے میں ڈھنڈورا پیٹو گی کیا.....

(سعیدہ پریشانی سے کہتی ہے)

سعیدہ: مگر تم ایک بار پھر سوچ لو..... اغوا برائے تاوان اور بات ہے۔ مگر قتل کرنے کے لیے بڑی پلاننگ کرنی پڑے گی فیضی..... اور اگر پکڑے گئے تو سیدھے پھانسی کا پھندہ.....

(فیضی گھبرا کر سعیدہ کی بات کاٹ دیتا ہے۔)

فیضی: تم پہلے سے ہی تو یہ نحوست نہ پھیلاؤ..... بڑا کام کرنے کے لیے بڑا رسک بھی لینا پڑتا ہے۔ تاوان لینے کے بعد اس لڑکی کا زندہ رہنا ہمارے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔

سعیدہ: ہاں مگر پھر یہ بات بھی غور سے سن لو میری..... میں دو کروڑ روپے سے ایک آنہ کم نہیں لوں گی تاوان میں..... اتنا بڑا رسک لے رہے ہیں تو پھر انعام بھی اتنا ہی بڑا ہونا چاہیے یہ خطرہ مول لینے کا..... وہ تمہارا باس تو صرف جیل میں بیٹھا آرڈر دیتا رہتا ہے..... اس نے اور تو کچھ کرنا نہیں ہے..... سارا کام تو ہم دونوں کریں گے۔

فیضی: فکر مت کرو..... میں بھی کوئی سستا سودا نہیں کروں گا اس بار..... عمر بھر کی عیاشی اور خرچے کا بندوبست کرنا ہے اس بار..... میں تو سوچ رہا ہوں کہ کام ختم ہوتے ہی ہم دوبئی نکل جائیں گے۔

(سعیدہ کی آنکھیں دوبئی کا نام سن کر چمک اٹھتی ہیں۔)

سعیدہ: کیا واقعی.....؟ ہائے..... برسوں سے میری خواہش ہے کہ کبھی دوبئی جا کر خوب شاپنگ کروں..... کاش یہ خواب سچ ہو جائے.....

فیضی: ضرور سچ ہوگا..... بس تم خود پر کنٹرول رکھو اور یہ بات بے بات بھڑکنے کی عادت چھوڑ دو..... چند دن کی بات ہے..... سختی برداشت کر لو.....

سعیدہ سعادت مندی سے سر ہلاتی ہے۔

اندر لیٹی زہرہ بے چینی سے آنکھیں پٹ پٹاتی ہے اور آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور بے چینی کے آثار بتاتے ہیں کہ اس نے باہر ہونے والی گفتگو کو آدھی نیند اور آدھے جاگنے کی کیفیت میں سُنا تو ہے مگر وہ پوری طرح سمجھ نہیں پائی کہ یہ اس کا خواب تھا یا حقیقت..... زہرہ دھیرے دھیرے دوبارہ بے ہوشی کے عالم میں چلی جاتی ہے۔ باہر برآمدے میں سعیدہ اور فیضی اپنے مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر/یا سارنگا کا اڈہ

موسیٰ آنکھوں پر ہاتھ رکھے نیم دراز کسی سوچ میں گم بیٹھا ہے، اتنے میں نامراد بوکھلایا ہوا سا اندر آتا ہے۔

نامراد: وہ موسیٰ..... وہ آئی ہیں۔

(موسیٰ آنکھوں سے ہاتھ اٹھائے بغیر بے زاری سے پوچھتا ہے)

موسیٰ: کون آئی ہیں..... اتنا بوکھلائے ہوئے کیوں ہو۔

نامراد: وہ..... لیلیٰ میڈم آئی ہیں..... تم سے ملنے۔

(موسیٰ چونکتا ہے)

موسیٰ: میڈم..... یہاں.....؟..... جاؤ جا کر ان سے کہہ دو کہ میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔

نامراد: مگر موسیٰ۔

موسیٰ: (موسیٰ غصے سے) سنا نہیں تم نے..... میں کسی سے نہیں ملنا چاہتا، اتنے میں پیچھے سے لیلیٰ کی آواز آتی ہے۔

لیلیٰ: جانتی ہوں..... تمہاری نظر میں میرا جرم بہت بڑا ہے اور میں اپنے جرم کی بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کو بھی تیار ہوں موسیٰ..... مگر اپنی صفائی دینے کا ایک موقع تو دنیا کی ہر عدالت دیتی ہے۔ تم بھی ایک بار میری پوری بات سن لو..... پھر جو چاہے سزا دے دینا۔ میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی اس کے بعد۔

(نامراد پلٹ کر چلا جاتا ہے۔)

موسیٰ: کسی کا یقین اور اعتبار توڑ دینے کی سزا کیا ہو سکتی ہے بھلا..... اس کا تعین آج تک کوئی نہیں کر پایا۔

لیلیٰ: ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ اور اعتبار اور بھروسہ ٹوٹ جانے کی اذیت کتنی ہولناک ہوتی ہے..... یہ مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے موسیٰ.....

(موسیٰ غصے سے کہتا ہے)

موسیٰ: پھر بھی آپ نے میرا یقین توڑنے کا جرم کیا؟..... کیوں..... میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا..... یا زہرہ سے آپ کی بھلا کیا دشمنی تھی۔ کیوں اس کی گھر ہستی اجاڑ دی آپ نے۔ میں نے تو اس کے بغیر جینے کی ٹھان لی تھی..... پھر آپ نے یہ سب کیوں کیا۔ کس کے کہنے پر کیا.....؟.....

لیلیٰ: اپنے دل کے کہنے پر..... ہاں..... یہ سب میں نے اپنے دل کی آواز پر کیا ہے موسیٰ۔ تمہاری زہرہ اس شخص کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی..... وہ پل پل اسے بے عزتی کی نہ ختم ہونے والی اذیت دیتا رہتا..... کیوں کہ زہرہ نے اس کے اشاروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا..... اور شہریار کو کسی صورت یہ قبول نہیں تھا..... اس کا زہرہ سے نکاح..... کوئی نکاح کا رشتہ نہیں تھا۔ صرف ایک انوسٹمنٹ تھی..... جسے وہ ہر حال میں کیش کروانا چاہتا تھا۔

(موسیٰ لیلیٰ کی بات سن کر الجھن میں پڑ جاتا ہے۔)

موسیٰ: کیا مطلب.....؟.....

//Cut//

Scene No # 20

لیلیٰ موسیٰ کو زہرہ کی کہانی سنا رہی ہے۔

لیلیٰ: بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ شہریار بہت پہلے جوئے، شراب اور عیاشی میں اپنا سب کچھ لٹا کر دیوالیہ ہو چکا تھا..... اس کے پاس اب اپنا کچھ نہیں..... یہ جو ظاہری شان و شوکت اور گھر بار ہے..... یہ سب اس کی پہلی بیوی کے نام ہے۔ جو اپنے مرد پر شیر کی نظر رکھتی ہے۔ اور پائی پائی کا حساب لیتی ہے اس سے..... یہ سب کچھ بھی شہریار کسی نہ کسی طرح Manage مینج کر ہی لیتا مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اپنی جاگیردارنی بیوی اور سسرال کی طرف سے بطور امانت اور بزنس کے لیے دی گئی ایک بہت بڑی رقم اور جائیداد بھی اپنی عیاشیوں اور جوئے میں اڑا ڈالی اور اب اس کے پاس مزید کچھ نہیں بچا تھا بازار میں بیچنے کے لیے۔ اوپر سے اس کی بیوی اور سالوں کی روزانہ کی پوچھ گچھ اور بزنس کا حساب کتاب..... یہ سب کچھ Balance کرنے کے لیے شہریار کو دو چار بڑی بزنس ڈیلز کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی بیوی سے ملے پیسے کا نقصان پورا کر سکے۔ تبھی اس کی نظر زہرہ پر پڑی اور اس نے مختلف محفلوں میں بوڑھے سرمایہ داروں اور بزنس مینوں کو اس کی ایک ادا پر لاکھوں اڑاتے دیکھا تو اس کے شیطانی دماغ نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک شیطانی منصوبہ بُن لیا..... وہ پہلے صرف زہرہ سے دکھاوے کی دوستی رکھنا چاہتا تھا..... تاکہ وہ زہرہ کے ذریعے بزنس ڈیلز کر سکے، مگر زہرہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو مردوں سے دوستی رکھتی ہیں۔ لہٰذا اس محاذ پر ناکامی کے بعد ملک شہریار نے دکھاوے کی محبت

کا ڈھونگ کیا اور باقاعدہ زہرہ کا رشتہ لے کر اس کے گھر پہنچ گیا..... نکاح تو ہو گیا مگر ملک شہریار کی توقعات کے برعکس زہرہ بالکل گھریلو لڑکی اور وفا کی پُتلی نکلی..... شہریار کو اپنے خواب مٹی میں ملتے نظر آئے تو وہ چڑ گیا۔ اور زہرہ کی زندگی اجیرن کر دی..... اوپر سے کسی نے اس کی پہلی بیوی کو اس خفیہ نکاح کی اطلاع بھی دے دی۔ وہ لوگ شہریار کے جان کے درپے ہو گئے۔ اور شہریار کو آخری وارننگ دے دی کہ وہ زہرہ یا اپنی پہلی بیوی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے..... شہریار جانتا تھا کہ پہلی بیوی کو چھوڑنے کا مطلب بیوی، بچوں کے علاوہ اس کے دیئے Status اور عیش و آرام سے دست برداری تو ہو گا ہی۔ ساتھ ہی ساتھ اسے ان کروڑوں اربوں کا حساب بھی دینا ہو گا جو اس نے اپنے اللّے تللّوں میں بیوی سے نئے بزنس کھڑے کرنے کے نام پر لے کر اڑا دیئے تھے۔ اس لیے شہریار کے پاس اب زہرہ کو طلاق دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ موسیٰ چونک کر لیلیٰ کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ/ یا نامراد کا گھر/ جنگل۔
باہر کا موسم

اندر کمرے میں ابھی تک موسیٰ اور لیلیٰ کے درمیان بحث جاری ہے۔

موسیٰ: لیکن یہ سب کچھ آپ کو کیسے پتہ چلا..... اور اگر ملک نے زہرہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ تو آپ نے اس کے ساتھ وہ ڈیل کیوں کی۔؟۔

لیلیٰ: شہریار ہماری سوچ سے بھی زیادہ چالاک، عیار اور موقع پرست شخص ہے۔ مجھے اس کے اندرونی حالات اور اس کی طلاق دینے والی مجبوری کا پہلے پتہ نہیں چل پایا..... میں تو صرف زہرہ کی نجات کا سوچ رہی تھی۔ تبھی میں نے شہریار کو اپنی مرضی کی بولی لگانے کی آفر دی تھی۔ شہریار نے یہ سُنا ہو گا تو اسے ضرور ایسا لگا ہو گا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہے..... اس لیے اس نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا منصوبہ بنا لیا..... وہ مجھ پر یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ صرف میرے کہنے پر زہرہ کو طلاق دے رہا ہے۔ جب کہ سچ یہ ہے کہ اگر میں درمیان میں نہ بھی آتی تو شہریار زہرہ کی طلاق کے کاغذات بنوا چکا تھا..... ..... اسے ہر حال میں زہرہ کو طلاق دینی ہی تھی..... کیونکہ دوسری صورت میں اس کے سالے اور بیوی شہریار کا جینا حرام کر دیتے اور اس کے ہاتھ سے سب کچھ چلا جاتا۔

موسیٰ سر جھکائے لیلیٰ کی بات سُن رہا ہے۔

(موسیٰ لیلیٰ کی طرف دیکھتا ہے)

لیلیٰ: کیا اب بھی تم مجھے معاف نہیں کرو گے موسیٰ؟..... میری غلطی ضرور ہے مگر میری نیت ہرگز بُری نہیں تھی.....

//Cut//

Scene No # 22

وقت: لیٹ دن یا شام۔
اندھیرا ہونے کو ہے

جگہ: فیضی کا گھر۔ زہرہ کا کمرہ

زہرہ کراہتے ہوئے پانی مانگتی ہے۔

زہرہ..... پانی..... پانی.....

مگر اسے پانی دینے والا کوئی نہیں ہے۔ زہرہ دھیرے دھیرے کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرتی ہے ایک آدھ بار لڑکھڑاتی ہے مگر گرتے پڑتے کمرے کے دروازے تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ دروازہ کھول کر وہ بمشکل باہر برآمدے میں آتی ہے۔ مگر باہر کوئی نہیں ہے۔ زہرہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے اور برآمدے سے باہر نکلتی ہے۔

تبھی اچانک زہرہ کی نظر صحن میں کھڑی ایک پرانی فوکسی foxy کار پر پڑتی ہے۔ جس پر ایک بڑا کور/ کپڑا ڈال کر اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر گاڑی کے اوپر سے آدھا کپڑا ڈھلکا ہوا ہے اور بونٹ وغیرہ نظر آ رہا ہے۔ زہرہ کے دماغ میں اچانک ایکسی ڈنٹ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اسے یاد آ جاتا ہے کہ وہ اسی گاڑی سے ہی تو ٹکرا کر سڑک پر گری تھی۔ زہرہ کو زور کا چکر آتا ہے۔

تبھی صحن کا دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ زہرہ گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 23

Scene No # 1

وقت: شام۔مغرب کا وقت

جگہ: فیضی کا گھر۔پورچ

زہرہ لڑکھڑاتے ہوئے پورچ میں آتی ہے جہاں اسے وہی پرانی فوکسی کار نظر آتی ہے جس سے وہ ٹکرائی تھی، زہرہ کو سب یاد آتا ہے اور اسے ایک زوردار چکر آ جاتا ہے۔تبھی اچانک دروازہ/گیٹ کھلنے کی آواز آتی ہے اور زہر گھبرا کر گیٹ کی طرف دیکھتی ہے۔دروازے کے بیچوں بیچ فیضی کھڑا ہے۔فیضی زہرہ کو باہر جاتے دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور زہرہ کی طرف لپکتا ہے۔زہرہ لڑکھڑاتی ہے اور سر پکڑ کر وہیں زمین پر گر جاتی ہے۔فیضی تیزی سے زہرہ کی طرف لپکتا ہے اور غصے سے سعیدہ کو آوازیں دے کر بلاتا ہے۔

فیضی: سعیدہ.....او سعیدہ.....کہاں مر گئی ہو۔

زہرہ بے جان سی زمین پر پڑی ہے
فیضی پریشانی سے زہرہ کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: فیضی کا گھر۔کمرہ

فیضی سعیدہ پر بگڑ رہا ہے۔

فیضی: اگر دو گھڑی مزید لیٹ ہو جاتا میں تو یہ نکل چکی تھی گھر سے.....آخر تم اسے چھوڑ کر باہر گئی ہی کیوں.....؟

سعیدہ: میں تو بس دو لمحے کے لیے ہمسائی کے ہاں تک گئی تھی.....چینی ختم ہو گئی تھی اور مجھے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی.....سوچا فوراً لوٹ آؤں گی۔

فیضی: حد کرتی ہو تم سعیدہ.....تمہیں اپنی چائے کی پڑی ہے۔وہ بھی ایسے نازک موقعے پر.....تم نے سوچا ہے.....اگر یہ باہر نکل جاتی تو۔

سعیدہ: مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنی جلدی ہوش آ جائے گا اسے.....دوا کا ڈوز تو ٹھیک وقت پر پلا دیا تھا میں نے اسے.....میرے حساب سے تو مزید دو گھنٹے اسے ہوش نہیں آنا چاہیے تھا۔

فیضی: لگتا ہے ڈوز بڑھانا پڑے گا ہمیں.....

سعیدہ: جلدی کچھ کرو اس مصیبت کا.....مجھ سے اب زیادہ چوکیداری نہیں ہوتی اس کی۔

(فیضی جیب سے ایک فون نکال کر سعیدہ کے حوالے کرتا ہے)

فیضی: اسی کا بندوبست کرنے گیا تھا.....یہ لو فون.....اس میں ایک نئی سم بھی ڈال دی ہے میں نے.....فون اور سم دونوں چور بازار سے لیے ہیں میں نے آج شام ہی.....

سعیدہ: (حیرت سے) میں اس فون کا کیا کروں گی.....؟

فیضی: اری بے وقوف عورت۔ اس فون سے تم نے لیلیٰ کو فون کرنا ہے تاوان کے لیے۔ مگر یاد رکھو۔ فون اپنے گھر کی لوکیشن سے نہیں ملاؤ گی تم..... یہاں سے دُور کسی پُر ہجوم بازار سے کال کرنی ہوگی اُسے.....اور ہر بار یہ لوکیشن بدلنی ہوگی.....، کال ختم ہوتے ہی فون بند کر دینا اور تبھی آن کرنا جب دوبارہ کال کرنی ہو لیلیٰ کو.....

سعیدہ: سمجھ گئی.....مگر..... پیسے کتنے مانگنے ہیں اس سے.....

فیضی: پانچ کروڑ

(سعیدہ کے منہ سے زور سے نکلتا ہے)

سعیدہ: پانچ کروڑ.....کیا.....واقعی.....

فیضی: آہستہ بولو.....دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں.....

ہم یہ پیسہ پکڑتے ہی یہاں سے رفو چکر ہو جائیں گے..... میں نے ایک ٹریول ایجنٹ سے بات کر لی ہے.....تھوڑے بہت پیسے کہیں سے ادھار پکڑ کر ایڈوانس دینے ہوں گے اسے.....باقی دوبئی کا ویزا لگنے پر دے دوں گا۔

سعیدہ: آج کیا مجھے خوش خبریاں سنا سنا کر مار ہی ڈالو گے۔ مگر وہ تمہارا باس..... میں اسے ایک روپیہ بھی نہیں دوں گی.....چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

فیضی: (فیضی مکاری سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے) تو قیر باس کا کام ختم ہوا.....وہ جب تک جیل سے باہر آئے گا.....تب تک ہم پاکستان چھوڑ چکے ہوں گے۔

سعیدہ اور فیضی زور زور سے ہنستے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن نکلنے کا موقع

جگہ: دن/سارنگا کا اڈہ

کردار: موسیٰ، نامراد، چاند پوری اور سارنگا موجود ہیں۔

نامراد: ہزار بے غیرت مرے ہوں گے تب ہی یہ ملک شہریار پیدا ہوا ہوگا.....

(موسیٰ غصے سے تلملا رہا ہے)

موسیٰ: اسی لیے اس بے غیرتی کے ناسور کو وہیں دفن کر دینا چاہتا تھا.....

سارنگا: سمجھتا کیوں نہیں ہے سر پھرے..... تیری زہرہ تک پہنچنے کا وہ آخری سرا ہے.....فی الحال اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے زیادہ ضروری ہے۔

(چاند پوری کسی گہری سوچ میں گم ہے۔)

چاند پوری: لیکن لیلیٰ میڈم کی سُنائی ہوئی اس ساری کہانی سے ایک بات تو ظاہر ہو رہی ہے کہ زہرہ کی گم شدگی میں ملک شہریار کا کوئی ہاتھ نہیں ہے..... کیونکہ شہریار کو تو جلد از جلد زہرہ کو طلاق دے کر اپنی رقم وصول کرنے کی جلدی ہوگی تاکہ وہ اپنے بزنس اکاؤنٹ میں پیسہ ڈال کر اپنی بیوی اور سسرال والوں کو مطمئن کر سکے کہ وہ دیوالیہ نہیں ہوا۔

نامراد: واہ چاند پوری..... بات تو بڑی عقل کی کی ہے تم نے.....، مطلب زہرہ کے ساتھ جو حادثہ یا معاملہ ہوا ہے.....وہ شہریار کے گھر سے نکلنے کے بعد ہوا ہے۔

چاند پوری: ہاں..... میرا قیاس تو یہی کہتا ہے..... اور جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ کوئی اور بھی ہے جسے اس سارے معاملے کی خبر ہے.....

(سارنگا آنکھیں بند کئے اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہے وہ بند آنکھوں سے ہی کہتا ہے۔)

سارنگا: فکر مت کرے..... اسے بھی ڈھونڈ نکالیں گے..... مگر سب سے پہلے اس ملک کو سب کے سامنے ننگا کرنا ہے..... باقی کام اس کے خاندان والے خود کر دیں گے.....

(موسیٰ، نامراد اور چاند پوری تینوں چونک کر سارنگا کی طرف دیکھتے ہیں۔)

نامراد: کیا چل رہا ہے تمہارے ذہن میں سارنگا استاد..... کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔

سارنگا: ملاقات کا وقت آ گیا ہے..... مگر دھیان رہے..... اس ملک کے سارے کرتا دھرتا موجود ہونے چاہیے ہیں اس موقع پر.....

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: انا کا گھر

انا ویسے ہی بے ہوش اور غنودگی کے عالم میں پڑی ہے اور بخار سے اس کا بدن تپ رہا ہے۔ چندا اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی ہے..... آس پاس ایک دو لڑکیاں اور گرو بھی موجود ہے۔ گرو انا کے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر دیکھتا ہے اور پریشانی سے سر ہلاتا ہے۔

گرو: بخار تو ابھی تک 104 ایک سو چار کو چھو رہا ہے..... لگتا ہے دوا بدلنی پڑے گی.....

چندا: دوا بدلنے سے کچھ نہیں ہوگا گرو جی..... انا کی دوا صرف زرّی ہے..... اس کی صورت دیکھ لیں گی تو سارا بخار اور بیماری جاتی رہے گی.....

گرو جواب میں کچھ نہیں کہتا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: صحن

صحن میں کچھ ہلچل ہے، قدرت اور شہاب نگرانی کر رہے ہیں۔ ایک باریش نوجوان لڑکا سر پر سفید ٹوپی پہنے، کاندھے پر چارخانہ رومال اور کرتہ شلوار میں ملبوس مزدوروں کو ہدایات دے رہا ہے۔

نوجوان: نہیں نہیں ٹھیکے دار صاحب..... یہ قناتیں اور شامیانے پچھلی طرف لگیں گے..... پچھلی

احمد جمعرات کو بھی خواتین کا بہت ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا اور وہ ساری دوپہر دھوپ میں بیٹھی جھلستی رہی تھیں..... یہاں مردوں کے لیے تو برآمدے اور حجرے بھی موجود ہیں۔ یہاں گزارہ چل جائے گا۔

(احمد کے چہرے پر شرعی داڑھی اسے باانور کر رہی ہے)

ٹھیکے دار: ٹھیک ہے احمد بھائی..... جیسا آپ کہو۔ مگر لنگر اور نمازیوں کی ترتیب آپ خود ہی بناؤ گے۔ وہ ہمارے بس کی بات نہیں۔، اس کے ماسٹر تو آپ ہی ہو۔ (احمد مسکراتا ہے۔)

احمد: (احمد چل پڑتا ہے) اچھا ٹھیک ہے۔ یونہی سہی..... بس تم صفیں پہنچا دینا وقت پر

(کچھ فاصلے پر کھڑے قدرت اور شہاب الدین یہ سارا ماجرا دیکھ رہے ہیں۔ شہاب الدین احمد کو آواز دے کر بلاتا ہے۔)

احمد: جی حضرت.....

شہاب: بھئی وہ اجمیر والی جماعت کا کیا ہوا۔ انہیں تو آج صبح تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

احمد: جی اعلیٰ حضرت..... میری بات ہوئی تھی ان کی جماعت کے امیر سے..... راستے میں ٹرین کا انجن فیل ہو گیا تھا..... اس لیے انہیں آنے میں تاخیر ہو گئی..... مگر اب وہ چل پڑے ہیں۔ امید ہے شام تک پہنچ جائیں گے یہاں۔

شہاب: اچھا..... اچھا چلو اللہ خیر سے لائے انہیں..... اب سارا انتظام تم نے ہی دیکھنا ہے یہاں کا۔ عیسیٰ کو میں نے کچھ باہر کی ذمہ داریاں سونپ رکھی ہیں۔ وہ مزید تمہارا ہاتھ نہیں بٹا پائے گا۔

احمد: جی حضرت..... عیسیٰ بھائی نے بتایا تھا مجھے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ان شاء اللہ ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔

شہاب: جزاک اللہ..... جیتے رہو۔

(احمد سر جھکا کر خاموش سلام کرتا ہے اور واپس پلٹ جاتا ہے۔)

قدرت: میں پچھلے دو ہفتوں سے اس نوجوان کو یونہی زائرین کی خدمت میں جتے دیکھ رہا ہوں..... ایک پل کو آرام کے لیے کمر نہیں ٹکائی اس نے..... مگر پھر بھی تہجد کے ساتھ ساتھ ہر نماز باجماعت پڑھنے کے لیے پہلی صف میں دیکھتا ہوں میں اسے..... جزاک اللہ

شہاب: ہاں..... احمد میاں تو سمجھو لڑکپن سے ہی ساتھ ہیں ہمارے۔ بہت فرمانبردار نیک اور سعادت مند بچہ ہے..... صوم وصلوٰۃ اور شرع کا سخت پابند..... اس کے ماں باپ احمد کے بچپن میں ہی چل بسے تھے۔ تب اس کے چچا نے اسے میری تربیت میں دے دیا تھا۔ تب سے یہ ہمارے ساتھ ہی ہے۔

قدرت: ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ۔

شہاب: دو دن بعد میری روانگی ہے پیر قدرت اللہ..... مگر یہاں پیچھے بہت سے کام ابھی ادھورے پڑے ہیں..... سوچتا ہوں احمد کو میں یہیں چھوڑ جاؤں، سارے معاملات نپٹا کر وہ ہماری جماعت کے ساتھ آن ملے گا۔ ہم جہاں بھی ہوں گے۔

قدرت: جیسے آپ کی مرضی حضرت..... یہاں اسے کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی ان شاء اللہ.....

شہاب: (شہاب مسکراتا ہے) جانتا ہوں تم جو یہاں موجود ہو..... اور شاید احمد میاں کا بھی دانا پانی یہیں لکھا ہے.....

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر، لان

لیلیٰ اپنے گھر میں اداس اور پریشان سی بیٹھی ہوئی ہے، اچانک اس کے فون پر بیل بجتی ہے۔ لیلیٰ بے دلی سے فون کی طرف دیکھتی ہے۔ جس پر کوئی انجان نمبر ہے۔ لیلیٰ فون اٹھا کر بے زاری سے کاٹ دیتی ہے اور فون ایک جانب پھینک دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور/ پارک یا

ریسٹورنٹ وغیرہ

سعیدہ فون کٹ جانے پر فیضی کی طرف دیکھتی ہے۔

سعیدہ: اس نے تو فون ہی کاٹ دیا.....

فیضی: (فیضی ادھر اُدھر دیکھتا ہے) دوبارہ ٹرائی کرو.....ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔گھر پر وہ اکیلی ہے۔

سعیدہ پھر ملاتی ہے، اور دوسری طرف گھنٹی جاتی ہے۔

//Cut//

// continue //

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر، لاؤنج

لیلیٰ کا فون دوبارہ بجتا ہے۔لیلیٰ نہیں اٹھاتی مگر فون بجتا رہتا ہے۔آخر لیلیٰ تنگ آ کر اٹھا لیتی ہے۔

لیلیٰ: ہیلو.....کون؟

سعیدہ: تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے.....بس اتنا سمجھ لو کہ تمہاری ایک ہم درد ہوں ہوں لیلیٰ میڈم.....

لیلیٰ: (غصے سے) کون ہو تم.....سیدھی طرح بتاؤ۔

سعیدہ: کہا ناں.....تمہارے کام کی بندی ہوں۔فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ جس زہرہ کو تم سارے زمانے میں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہی ہو۔وہ میرے پاس ہے۔

(لیلیٰ کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔)

لیلیٰ: کیا.....کون ہو تم.....؟۔اور زہرہ کہاں ہے؟.....وہ ٹھیک تو ہے ناں.....پلیز مجھے بتاؤ۔

سعیدہ: ہاں.....فی الحال تو ٹھیک ہے۔مگر آگے چل کر ٹھیک رہتی ہے یا نہیں۔اس کا سارا دارومدار تم پر ہے۔میری بات مانتی رہو گی شرافت سے تو وہ ٹھیک ٹھاک حالت میں تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔

لیلیٰ: کیا مطلب؟.....تم کہنا کیا چاہتی ہو.....کھل کر بتاتی کیوں نہیں.....یہ پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو۔

سعیدہ: اچھا تو پھر صاف بات کرتی ہوں.....پانچ کروڑ کا انتظام کر لو.....تمہارے پاس صرف دو دن ہیں۔.....میری بتائی ہوئی جگہ پر آ کر پیسے دے جانا اور اپنی زہرہ کو لے جانا.....اور خبردار اگر تم نے پولیس وغیرہ کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو عمر بھر زہرہ کی قبر ڈھونڈتی رہ جاؤ گی۔یہ میری آخری وارننگ ہے تمہیں.....میری اگلی کال کا انتظار کرو.....پیسے کہاں لانے ہیں۔یہ میں تمہیں بتا دوں گی۔

(سعیدہ فون کاٹ دیتی ہے۔لیلیٰ اسے آوازیں دیتی رہ جاتی ہے۔)

لیلیٰ: سنو.....میری بات سنو.....تم یہ سب نہیں کر سکتیں مگر دوسری جانب خاموشی چھا چکی ہے، لیلیٰ پریشانی سے سر پکڑ لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل

توقیر جاوید اپنی بیرک میں پریشان اور بے چین سا بیٹھا ہوا ہے اور بار بار بیرک کی سلاخوں سے باہر دیکھ رہا ہے جیسے

اسے کسی کا انتظار ہو۔ اتنے میں قریب سے ایک سنتری گزرتا ہے۔ توقیر جلدی سے اسے آواز دے کر روکتا ہے۔

توقیر: بات سنو..... میری کوئی ملاقات نہیں آئی تین چار دن سے..... کیا جیل میں ملاقاتوں پر پابندی لگ گئی ہے.....

(سنتری ہنستا ہے)

سنتری: نہیں..... پابندی کوئی نہیں لگی..... پر تم سے جب کوئی ملنے ہی نہیں آیا تو پھر ملاقات کیسے ہوگی.....؟

(سنتری آگے بڑھ جاتا ہے، توقیر غصے میں سلاخوں پر ہاتھ مارتا ہے۔)

توقیر: یہ فیضی کہاں جا کر مر گیا ہے۔ کہیں سارا کھیل ہی نہ بگاڑ دے.....

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ بار بار موسیٰ کا فون ملانے کی کوشش کر رہی ہے مگر فون بند مل رہا ہے۔ دوسری جانب سے کمپیوٹر کی آواز آ رہی ہے۔

آڈیو ٹون: آپ کا ملایا ہوا نمبر اس وقت بند ہے.....

(لیلیٰ الجھن زدہ انداز میں خود کلامی کرتی ہے۔)

لیلیٰ: فون اٹھاؤ موسیٰ..... کہاں ہو تم.....

لیلیٰ پھر سے کوشش کرتی ہے مگر فون پھر بھی بند ملتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: نامراد کا گھر

نامراد کے فون کی گھنٹی بجتی ہے نامراد فون اٹھاتا ہے۔

نامراد: جی میڈم جی..... کیسے یاد کیا.....؟

لیلیٰ: نامراد جی..... موسیٰ کہاں ہے..... مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

نامراد: موسیٰ تو سارنگا استاد کے ساتھ اس کمینے شہریار کی جاگیر پر گیا ہے۔ ایک آدھ دن تو لگ جائے گا اس کی واپسی میں۔

لیلیٰ: اوہ..... پلیز..... اسے کسی طرح سے کانٹیکٹ کریں نامراد جی..... اور اسے میرا یہ پیغام دیں کہ وہ فوراً مجھ سے رابطہ کرے..... مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے اس سے.....

نامراد: ٹھیک ہے میڈم جی۔ میرا جیسے ہی موسیٰ سے رابطہ ہوا..... میں اسے آپ کا پیغام دے دوں گا۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور گاؤں/ جاگیر کا ڈیرہ ٹائپ جگہ.....

ڈیرے پر ملک رمضان، ملک وجاہت اور اس کے بھائیوں کے علاوہ شیر علی، شہریار کا بھائی اور دیگر بزرگ وغیرہ جمع ہیں

گرو، سارنگا، موسیٰ اور چاند پوری بھی ایک جانب بیٹھے ہوئے ہیں۔ سب آپس میں چہ مگوئیاں کر رہے ہیں اور ڈیرے پر سرگوشیوں جیسی آواز کی بھن بھناہٹ ہو رہی ہے..... اتنے میں شہریار گھبرایا ہوا اور پریشان سا ڈیرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور سب کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں۔ شہریار وہاں موسیٰ اور سارنگا کو دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے غصے پر کنٹرول کرتا ہے، شہریار سلام کرتا ہے اور اپنے بڑے بھائی سے پوچھتا ہے۔

شہریار: خیریت تو ہے بھائی جی..... اتنی ایمرجنسی میں مجھے کیوں بلایا ہے آپ لوگوں نے..... اور یہ جرگہ کس لیے بیٹھایا ہے..... سب خیر تو ہے؟

گرد نفرت سے شہریار کو دیکھ رہا۔

شہریار کا بڑا بھائی شیر علی غصے سے اپنے بھائی کو گھورتا ہے۔

ملک شیر: یہ لوگ تم سے کوئی سودا کرنے آئے ہیں ملک شہریار..... کہتے ہیں کوئی پرانا قرض باقی ہے.....

(شہریار غصے میں سرخ ہو جاتا ہے اور موسیٰ کی طرف پلٹتا ہے۔)

شہریار: بکواس کر رہے ہیں یہ لوگ..... اور تم..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں تک آنے کی..... یہاں تمہاری کوئی بدمعاشی نہیں چلے گی..... میرے لوگ چیر پھاڑ دیں گے تم سب کو.....

(سارنگا اطمینان سے صوفے سے ٹیک لگائے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا ہوا ہے۔)

سارنگا: پتہ ہے ملک جی..... سارے آدم خور ہیں یہاں پر..... مگر ہم تو صرف اپنی چیز واپس مانگنے آئے ہیں..... بدلے میں تمہیں تمہارا پورا معاوضہ بھی ملے گا..... بینک چیک بھی جیب میں رکھ کر لایا ہوں..... یہ سودا تمہی نے تو طے کیا تھا.....

(سارا جرگہ شہریار کو دیکھتا ہے۔ شہریار گھبرا جاتا ہے۔)

(گرو غصے میں تلملاتا ہے)

شہریار: کیسا سودا.....؟..... میں ایسے کسی سودے کے بارے میں نہیں جانتا.....

(موسیٰ اپنا غصہ بہت مشکل سے کنٹرول کیے بیٹھا ہے)

سارنگا: سوچ لو ملک صاحب..... پھر نہ کہنا کہ ہم نے وعدہ خلافی کی ہے..... ہم تو لیلیٰ میڈم کی طرف سے ڈیل پوری کرنے آئے ہیں۔ ہماری چیز دے دو..... اپنی رقم لے لو..... یہ گرو جی زہرہ کے سرپرست ہیں آج یہاں.....

شہریار: یہ کیا اول فول بکے جا رہے ہو..... کس کی بات کر رہے ہو تم.....؟..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

(سارنگا سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

سارنگا: تو پھر صاف بات کرتا ہوں..... زہرہ کہاں ہے ملک شہریار۔ اسے ہمارے حوالے کر دو..... ورنہ تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا.....

سارے جرگہ کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: کسی دیہاتی جاگیر کا مونتاج

جاگیر کا ڈیرہ جرگہ جاری ہے

جرگے میں بیٹھے اونچی پگڑیوں والے جاگیردار سارنگا کی بات سن کر غصے میں آ جاتے ہیں۔ شہریار کا بھائی گرج کر

کہتا ہے۔

ملک شیر علی: ہماری جاگیر میں بیٹھ کر ہی کوئی دھمکی دینا آج تک کسی کو راس نہیں آیا..... تم لوگ مہمان ہو..... مہمان بن کر رہو۔

گرو: تمہارا بھائی جھوٹ بول رہا ہے..... اسی نے ہماری لڑکی کی زندگی خراب کی ہے.....

(گرو ضبط نہیں کر پاتا سارنگا اسے چپ کراتا ہے)

سارنگا: اپنی یہی خراب عادتیں ہیں ملک صاب..... جنھوں نے ہمیں برباد کیا..... مگر آج تو ہم ایک سیدھا سادھا سودا کرنے آئے ہیں۔ وہ سودا جو تمہارے بھائی نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دینے کے بدلے شہر میں کسی سے کیا تھا.....

(شہریار کا بھائی چونکتا ہے)

شیر علی: کیسا سودا.....؟.....

سارنگا: یہی سودا کہ شہریار اپنی بیوی کی طلاق کے بدلے لیلیٰ جی کی آدھی جائیداد اور روپے پیسے کا مالک ہوگا..... ہم جائیداد کے کاغذ اور چیک لے آئے ہیں..... اب اپنے بھائی سے بولو کہ وہ لڑکی ہمارے حوالے کر دے..... کیونکہ وہ ابھی تک واپس اپنے گھر نہیں پہنچی.....

(شیر علی بھائی کی طرف دیکھ کر غصے میں چلاتا ہے۔)

شیر علی: یہ سب کیا ہے شہریار..... یہ کیسی بے غیرتی کی داستان سنا رہا ہے یہ بندہ.....

شہریار: یہ سب جھوٹ ہے بھائی صاحب..... میں نے کسی سے ایسا کوئی سودا نہیں کیا..... آپ لوگوں کے حکم پر میں نے زہرہ کو طلاق دے دی..... اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں..... نہ ہی مجھے یہ پتہ ہے کہ وہ اب کہاں ہے.....

(سارنگا اٹھنے کی تیاری کرتا ہے۔)

سارنگا: ٹھیک ہے ملک شہریار..... ہم چاہتے تھے کہ بات تھانے کچہری کے باہر ہی حل ہو جائے۔ مگر اگر تمہاری یہی ضد ہے تو پھر مجبوراً گرو جی کو تھانے میں رپٹ درج کروانی ہوگی۔ ہمیں شک ہے کہ تم نے زہرہ کو مار ڈالا ہے..... کیونکہ آخری بار اسے تمہارے گھر میں ہی دیکھا گیا تھا..... پھر پولیس جانے اور تم جانو..... مگر یاد رکھنا..... اس صورت میں تمہیں لیلیٰ کی جائیداد میں سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی..... چلو نکمو..... ادھر اپنی بات کسی کو سمجھ نہیں آ رہی..... (سارنگا چاندپوری اور موسیٰ سے کہتا ہے)

(سارنگا اٹھتا ہے۔ جرگے میں بے چینی پھیل جاتی ہے، ایک بزرگ کسی کونے سے کہتا ہے۔)

بزرگ: تھانے کچہری تک بات چلی گئی تو ہمارے پرکھوں کی بڑی رسوائی ہو جائے گی ملک شیر علی.....

(شہریار کا بھائی لوگوں کے غصے کو بھانپ لیتا ہے اور سارنگا کو روکتا ہے۔)

شیر علی: ٹھہرو..... بیٹھ جاؤ..... یہ جرگہ ہم نے تمہاری وجہ سے ہی بلایا ہے..... مگر صرف الزام لگانے سے بات نہیں بنے گی..... تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ شہریار نے اس طلاق کے بدلے کوئی سودا کیا ہے۔ وہ خود جدی پشتی اور خاندانی جاگیردار ہے۔ اسے یہ گری ہوئی حرکت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے.....

(سارنگا غور سے شہریار کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہتا ہے۔)

سارنگا: یہ انسان بڑی کمینی شئے ہے ملک جی..... گرنے پر آئے تو اتنا گر جاتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں..... باقی رہی ثبوت کی بات..... تو میرا دعویٰ ہے کہ ملک شہریار ایک سال پہلے ہی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ گھر، جائیداد، دفتر، کاروبار..... سب گروی پڑا ہے اس کا..... کیونکہ اس نے اپنے حصہ کی اور بیوی سے ملی ساری جاگیر اور دھن دولت اڑا ڈالی ہے جوئے اور عیاشیوں میں..... اگر مجھ پر یا میری بات پر اب بھی شک ہے..... تو ملک شہریار سے بولو کہ اپنی زمین اور جائیداد کے اصل کاغذ جرگہ

کے سامنے پیش کر دے ابھی..... ہم سات بار زمین پر ناک سے لکیر لگائیں گے اور تم سب سے معافی مانگ کر واپس لوٹ جائیں گے.....

سارا جرگہ غصّے سے شہریار کی طرف دیکھتا ہے۔ شہریار کو پسینے آ جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ ابھی تک موسیٰ کا نمبر ڈائل کر رہی ہے مگر اسے نمبر بند مل رہا ہے۔ لیلیٰ پریشان ہے۔ اتنے میں اس کی لیڈی پی۔اے یا مینیجر اندر آتا ہے۔

لیلیٰ: ہاں..... کیا ہوا.....

مینیجر: کیش کا انتظام ہو گیا ہے میڈم۔ سب آپ کی ہدایت کے مطابق نئے اور بڑے نوٹ ہیں۔

لیلیٰ: ہاں..... مگر مجھے ساری رقم کسی بڑے سوٹ کیس یا بیگ میں چاہیے.....

مینیجر: جی..... آپ مطمئن رہیں..... ایسا ہی ہوگا.....

لیلیٰ سر ہلا کر اسٹاف کو رخصت کرتی ہے اور پھر سے موسیٰ کا نمبر ٹرائی کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جرگہ جاری ہے

شہریار کے سالے، سارنگا کی بات سُن کر غصے میں آ جاتے ہیں اور بڑا سالا ملک رمضان جھڑک کر شہریار سے پوچھتا ہے۔

ملک رمضان: یہ ہم کیا سن رہے ہیں ملک شہریار..... کیا تُو نے ہماری برسوں کی محنت اور پُرکھوں کی جائیداد جُوئے میں اڑا دی ہے۔

شہریار: بکواس کر رہا ہے یہ شخص..... سب جھوٹ ہے یہ.....

ملک وجاہت: ٹھیک ہے..... تو پھر جاگیر کے اصل کاغذ تو ہوں گے ناں تمہارے پاس..... وہی دکھا دو..... ہمیں اطمینان ہو جائے گا.....

(شہریار کو پسینے آ رہے ہیں)

شہریار: میں زمین جائیداد کے کاغذ جیب میں رکھ کر تو نہیں پھرتا..... دکھا دوں گا جب ضرورت پڑی.....

ملک وجاہت: کاغذ تو تمہیں آج ہی دکھانے ہوں گے۔ اگر شہر میں بھی ہیں تو ابھی فون کر دو اپنے مینیجر کو..... شام تک لے کر آ جائے گا..... ہم انتظار کر لیں گے چند گھنٹے اور.....

(شہریار بہانہ کرتا ہے)

شہریار: کاغذات لاکر میں پڑے ہیں..... جو میرے علاوہ کوئی اور بنک جا کر نہیں کھلوا سکتا.....

چاند پوری: (سارنگا چاند پوری کو اشارہ کرتا ہے۔ چاند پوری ہاتھ میں پکڑی ایک فائل اٹھا کر ملک رمضان کو پکڑاتا ہے۔)

چاند پوری: جناب..... تھوڑی سی محنت اس ناچیز نے بھی کرائی ہے..... ویسے تو شاعر ہوں..... پر ابھی کچھ عقل باقی ہے..... یہ ملک شہریار کی کچھ جائیداد کے کاغذات کی نقل ہے..... جو میں نے آج صبح ہی تحصیل کے دفتر سے نکلوائی ہے۔ سارے

کاغذات تو غور سے دیکھیں..... ملک شہریار نے چھ ماہ پہلے ہی یہ زمین اور جائیداد سیٹھ جھن جھن والا کو فروخت کی ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ جوئے میں ہاری ہے۔

شہریار کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ ملک رمضان اور وجاہت جلدی سے تمام کاغذات کو سرسری دیکھتے ہیں اور فائل شہریار کے بڑے بھائی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ شیر علی بھی ایک آدھ ورق پلٹتا ہے اور غصے سے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھ کر غراتا ہے۔

ملک شیر علی: یہ سب کیا ہے شہریار.....

چاند پوری: صرف یہی نہیں..... جس گھر میں شہریار ابھی رہتا ہے اور اس کا شہر میں پرانا آبائی گھر..... دونوں ہی سود خور مارکیٹ میں گروی پڑے ہیں..... بولیں گے تو ابھی بات کرادوں گا ان سارے سیٹھوں کے ساتھ جن کا قرضہ شہریار نے دینا ہے۔

(سارا جرگہ شہریار پر لعن طعن شروع کر دیتا ہے۔ شہریار کے پاس کوئی جواب نہیں ہے)

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

زہرہ بستر پر پڑی بے ہوشی میں کسمسا رہی ہے۔

اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار ہیں، اسے خواب کے فلیشز میں انا، چندا، گرو اور پھر موئی کے flashes یاد کی صورت نظر آ رہے ہیں، دوسرے کمرے میں سے سعیدہ دوا کی بوتل اٹھائے اندر آتی ہے۔ اور زہرہ کو سہارا دے کر تکیے کے سہارے بٹھاتی ہے۔

سعیدہ: چل شہزادی..... تیری دوا کے ڈوز کا وقت ہو گیا ہے..... اس سے تُو بھی آرام سے پڑی رہے گی اور ہمیں بھی سکون رہے گا۔ چل شاباش میری بہن..... پی لے.....

زہرہ ہچکچاتی ہے اور نیند میں انکار میں سر ہلاتی ہے

مگر سعیدہ بوتل زبردستی زہرہ کے منہ سے لگا کر ایک بڑا گھونٹ اس کے حلق میں انڈیل دیتی ہے۔ زہرہ کی مزاحمت سست پڑ جاتی ہے۔ سعیدہ مکاری سے ہنستی ہے اور زہرہ کو دوبارہ لٹا کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ چند لمحوں بعد زہرہ کروٹ بدلتی ہے اور اپنے منہ میں جمع کر رکھی دوا نکال کر زمین پر اُلٹ دیتی ہے۔ اور چند گہرے گہرے سانس لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: شہریار کا گاؤں/علاقہ۔ جاگیر

جرگہ جاری ہے، شہریار کے سالے غصے سے آگ بگولہ ہو رہے ہیں اور شہریار پر برس رہے ہیں۔

ملک وجاہت: اب اور سُننے کو کیا باقی رہ گیا ہے شہریار..... تم نے تو آج سارے شہر میں ہماری ناک کٹوا کر رکھ دی ہے..... کسی بھی غیرت مند انسان کے لیے یہ سب سُننے سے پہلے ڈوب مرنا زیادہ آسان ہوتا.....

(سارنگا طنز کرتا ہے)

سارنگا: ٹھیک کہا ملک صاب..... مگر شاید کچھ لوگوں کے پاس چُلو نہیں ہوتا..... یا پھر شاید پانی کی کمی ہوتی ہے اس علاقے

میں.....اس بندے نے اپنی بیوی کی طلاق کے بدلے یہ سودا کیا ہی اس لیے تھا کہ اس کے دیوالیہ ہونے کی خبر پھیلنے سے پہلے یہ پھر سے اپنی تجوریاں بھر سکے.....ہمارے ہاں تو ایسے شخص کے لیے ایک خاص نام ہوتا ہے۔ پتہ نہیں آپ کے علاقے میں ایسے بندے کو کیا کہتے ہیں.....

(شہریار جلدی سے اپنے سر جھکائے، شرمندہ کھڑے بھائی کی طرف لپکتا ہے)

شہریار: یہ سب جھوٹ ہے بھائی جی.....آپ میرا یقین کریں میں.....

شیر علی سر اٹھا کر بھائی کو دیکھتا ہے، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اور شہریار کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ زوردار طریقے سے گھومتا ہے اور شہریار کے چہرے پر پڑتا ہے، زوردار چانٹے کی آواز سے سارا ماحول گونج اٹھتا ہے۔

شیر علی: بے غیرت.....نیچ.....کمینے انسان۔ آج تو نے اپنے باپ کی قبر کو بھی شرمندہ کروا دیا ہے اس سارے جرگے کے سامنے.....میں اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد میرا ملک شہریار سے ہر رشتہ ختم ہے.....چند، موت، خوشی، غمی، لین دین، آنا جانا.....سب ختم.....میں اپنے مرحوم باپ بڑے ملک صاحب کی طرف سے ان کا نمائندہ اور بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے بھی سارے خاندان اور ملکوں کے ٹبر کی طرف سے بھی اس نیچ اور تنگ خاندان سے ہر رشتہ توڑتا ہوں.....اب ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے.....(شہریار کو بے عزت ہوتے دیکھ کر گرو کی آنکھیں شکرانے کے آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں)

شیر علی اپنی پگ سنبھال کر اپنے سر پر سیدھی رکھتا ہے اور جرگے سے اٹھ جاتا ہے۔ اسی کے پیچھے دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے سارے ممبر شہریار کو لعن طعن کرتے اور غصے میں بڑبڑاتے جرگے سے نکلتے جاتے ہیں۔ شہریار کے سالے ایک لمحے کے لیے جاتے جاتے شہریار کے قریب رُکتے ہیں اور اسے خون خوار نظروں سے دیکھتے ہیں۔

ملک رمضان: ابھی اپنا کچھ حساب کتاب باقی ہے ملک شہریار.....جلد سارے کھاتے کھولیں گے تمہارے.....فی الحال اتنا جان لو کہ ہماری بہن اب تمہارے ساتھ نہیں رہے گی.....باقی فیصلہ اس کو سامنے بٹھا کر کریں گے.....

(شہریار لوگوں کو جانے سے روکنے کے لیے چلا کر سب کی منت کرتا ہے۔)

شہریار: آپ لوگ میری بات تو سنیں.....یہ سب میرے خلاف ایک سازش ہے.....یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں.....خدا کے لیے.....میری بات سنیں.....

(مگر لوگ شہریار کی بات نہیں سنتے اور ایک ایک کر کے نکل جاتے ہیں۔ شہریار غصے میں کھولتا، سرخ چہرے کے ساتھ سارنگا اور موسیٰ کی طرف بڑھتا ہے۔)

شہریار: تم لوگوں کو تو میں دیکھ لوں گا.....ایسا حشر کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔

(سارنگا مسکراتا ہے۔ موسیٰ پہلی بار زبان کھولتا ہے۔)

(موسیٰ سرد لہجے میں جواب دیتا ہے)

موسیٰ: ابھی تو شروعات ہے ملک شہریار.....اور حشر نشر تو تمہارا میں کروں گا اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہوا کہ زہرہ کی گم شدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے.....سڑکوں پر بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا میں تمہیں.....دن گننا شروع کر دو اب تم.....

(سارنگا، روتے ہوئے گرو کے گلے میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے تھپکی دیتا ہے)

سارنگا: چلو گرو جی.....ادھر اپنا کام ختم ہو گیا.....

گرو ایک لمحہ شہریار کو دیکھتا ہے اور پھر نفرت سے زمین پر تھوک دیتا ہے اور پھر موسیٰ اور چاند پوری کے ساتھ سارنگا کے پیچھے چل پڑتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

سعیدہ لیلیٰ سے فون پر بات کر رہی ہے۔

سعیدہ: جگہ ٹھیک سے سمجھ میں آ گئی ہے نا تمہیں..... 7 نمبر کے پرانے پارک کے پیچھے کچھ لکڑی کے بینچ پڑے ہیں۔ان کے ساتھ کچھ ڈسٹ بن کے ڈرم بھی ہیں۔انہی میں سے سُرخ رنگ والے ڈرم میں تمہیں رقم کا بیگ رکھنا ہے..... رقم رکھ کر پانچ منٹ اسی بینچ پر بیٹھی رہنا..... اور پھر یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ تمہیں کسی نے بیگ وہاں رکھتے نہیں دیکھا..... چپ چاپ اٹھ کر چلی جانا.....

لیلیٰ: مگر میں یہ کیسے مان لوں کہ زہرہ تمہارے پاس ہی ہے۔اور تم نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

سعیدہ: فکر نہ کرو..... تمہارے اطمینان کے لیے ایک لمحے کو اس سے بات کرا دوں گی..... مگر وہ زیادہ تر بے ہوش رہتی ہے..... زیادہ بات نہیں کر پائے گی۔

لیلیٰ: دیکھو..... زہرہ کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

سعیدہ: کہا نا..... اس کا دارومدار تم پر ہے..... اگر تم ہمارے ساتھ ٹھیک چلو گی..... تو زہرہ بھی ٹھیک رہے گی.....

لیلیٰ: مگر رقم دینے کے بعد مجھے زہرہ کہاں ملے گی۔تم اسی ویران پارک میں اسے کیوں نہیں چھوڑ جاتیں۔

سعیدہ: یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔تم بس رقم لے کر ٹھیک وقت پر پہنچ جانا سورج ڈھلنے سے پہلے..... دیر کی تو انجام کی ذمہ دار تم خود ہو گی.....

سعیدہ فون کاٹ دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کوئی آؤٹ ڈور

کردار: سارنگا، موسیٰ، گرو، چاند پوری

ایک جانب سارنگا کی جیپ اور دوسری گاڑی کھڑی ہے سارنگا باقی لوگوں کے ساتھ باہر نکلتا ہے۔اس کے مسلح گارڈز اور محافظ ہوشیار ہو جاتے ہیں۔اتنے میں گرو پیچھے سے سارنگا کو آواز دے کر روکتا ہے۔

گرو: سارنگا استاد.....

سب چونک کر پلٹتے ہیں، گرو دو قدم چل کر سارنگا کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔موسیٰ اور سارنگا سوالیہ نگاہوں سے گرو کو دیکھ رہے ہیں، اچانک گرو روتے ہوئے سارنگا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہتے ہیں، سارنگا جلدی سے آگے بڑھ کر گرو کے بندھے ہاتھ کھول دیتا ہے۔

سارنگا: کیوں گناہ گار کرتے ہو گرو جی..... اپنے پہلے ہی گناہ کچھ زیادہ ہیں.....

گرو: بہت کم زور۔بہت ہلکے..... اور معاشرے کے سب سے نچلے طبقے سے ہیں ہم لوگ..... عمر بھر ہمیں ہر طرف سے دھتکار، نفرت اور گالی ہی سننے کو ملی ہے.....

گرو روتا ہے

اور بولتا رہتا ہے

مگر آج آپ نے اور موسیٰ نے میری زندگی بھر کے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہے۔ میری بچی کے لیے اتنے بڑے فرعون سے ٹکر لے کر اُسے بھری محفل میں ننگا کر دیا سب کے سامنے..... ورنہ مجھ جیسا کم زور اور چھوٹا آدمی تو عمر بھر اُس جاگیردار کے دروازے پر بیٹھا رہتا تب بھی چوکیدار اندر نہ جانے دیتا..... اس سے بدلہ لینا اور اس کا گریبان پکڑنا تو دور کی بات ہے مگر آج آپ لوگوں نے میری بچی کا بدلہ لے لیا۔

سارنگا: بھول جاؤ اس بات کو گرو جی..... موسیٰ کے حوالے سے وہ اب ہماری بھی کچھ لگتی ہے..... ایک بار ہم زہرہ کو ڈھونڈ لیں..... پھر باقی سب کو بھی دیکھ لیں گے..... اور اگر تم میرے دل کی پوچھو تو آج کی اس محفل میں میرے لیے سب سے زیادہ عزت دار اور محترم تم ہی تھے..... سارنگا کے پاس بندہ تولنے کا کوئی اور ترازو ہے.....

(سارنگا گرو کا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ گرو موسیٰ کے قریب آتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے۔)

گرو: افسوس یہ دنیا تمہاری محبت پہچان نہیں پائی..... جا کر بتاؤں گا اس کی لتا کو آج کہ ہم نے جسے دھکے دے کر اپنی حویلی سے نکالا تھا۔ آج وہی کھڑا رہا ہماری بچی کے لیے چٹان کی طرح ہر طوفان کے سامنے..... آج گرو کا قد اونچا کر دیا ہے تم نے ساری دنیا کے سامنے..... اب میں مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں.....

(گرو پھر رو پڑتا ہے۔ موسیٰ اس کے آنسو پونچھتا ہے اور تسلی دیتا ہے۔)

موسیٰ: مرنے کی باتیں نہ کریں..... ابھی ہم سب کو مل کر اسے ڈھونڈنا ہے..... آپ کی دعاؤں کے بنا وہ کیسے ملے گی.....

(گرو موسیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا ہے)

گرو: میری دعا تو اس دن بھی تمہارے ساتھ تھی جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں اپنی حویلی میں دیکھا تھا..... مگر لگتا ہے میری دعاؤں میں ہی اثر نہیں رہا.....

موسیٰ گرو کو لے کر چل پڑتا ہے۔

Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: فیضی کا گھر

فیضی سعیدہ کو ہدایات دے رہا ہے۔

فیضی: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں آج تک کسی نے دیکھا ہی نہیں تو پہچانے گا کیسے.....؟ بس تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ تم پارک میں لیلیٰ پر اور آس پاس نظر رکھو گی کہ کوئی لیلیٰ کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ تو نہیں گیا..... لیلیٰ جب بیگ ڈسٹ بن میں ڈال کر واپس لوٹ جائے گی تب بھی تمہیں کم از کم آدھا گھنٹہ مزید دور سے ہی جائزہ لینا ہے..... پھر پورا اطمینان کر کے بیگ اٹھانا اور پارک کے پچھلے دروازے سے نکل جانا.....

سعیدہ: لیکن یہ سب میں اکیلے کیسے کروں گی..... ہو سکتا ہے وہاں کوئی اور بھی پہلے سے موجود ہو اس جگہ کی نگرانی کرنے کے لیے.....

فیضی: اس کا بھی بندوبست میں نے کر لیا ہے..... تم فکر مت کرو..... میں خود بھی چہرہ لپیٹ کر دور سے تمہاری نگرانی کرتا رہوں گا۔ لیکن قریب نہیں آؤں گا۔

سعیدہ: تو کیا ہم لڑکی کو یہاں اتنی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیں گے.....؟

فیضی: نہیں..... یہ رسک نہیں لے سکتے ہم۔ اسے دوا کا ڈبل ڈوز دے دو..... پچھلی سیٹ پر ڈال کر مریضوں کی طرح لے جائیں گے اسے یہاں سے..... تم اس پر کپڑا ڈالے رکھنا جیسے کوئی تیماردار کسی مریض کا خیال رکھنے کے لیے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے..... جیسے ہی تم پیسہ لے کر وہاں سے نکلو گی..... میں اندھیرا ہوتے ہی موقع پا کر اس کا قصہ تمام کر دوں گا اور وہیں پارک کی کسی جھاڑی کے پیچھے پھینک آؤں گا اسے.....

(سعیدہ کو جھرجھری سی آ جاتی ہے)

سعیدہ: سوچ لو فیضی..... قتل بڑا جرم ہے.....

فیضی: زندگی میں کچھ بڑا کرنے کے لیے بڑا ہی سوچنا پڑتا ہے..... تم نے لیلیٰ کو اس کی آواز تو سنا دی تھی ناں فون پر.....

سعیدہ: ہاں..... اس کا اطمینان کروا دیا تھا میں نے.....

فیضی: ٹھیک ہے..... تو پھر تیاری پکڑو..... ہمیں لیلیٰ سے تقریباً دو گھنٹے قبل وہاں پہنچنا ہوگا۔ اور ہاں..... پارک میں آتے جاتے اکا دکا لوگوں کی کسی ٹولی کے ساتھ اندر داخل ہونا۔ اکیلے داخلہ مشکوک اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

(سعیدہ سر ہلاتی ہے)

سعیدہ: ہاں..... سمجھتی ہوں.....

//Cut//

Scene No # 21

Rood Passing

وقت: دن

موسیٰ اور سارنگا پارٹی شہر کی طرف اپنی گاڑیوں میں واپس روانہ ہیں۔

موسیٰ زہرہ کی یادوں میں گم چپ چاپ اپنی سوچوں میں گم بیٹھا ہوا ہے، اسے زہرہ سے ہوئی لائبریری کی آخری ملاقات اور زہرہ کی باتیں، مسکراہٹ، آنسو اور رونا سب یاد آ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ موسیٰ کی پلکوں کے گوشے بھی نم ہونے لگتے ہیں۔ مگر جیسے ہی اسے احساس ہوتا ہے۔ وہ جلدی سے باقی لوگوں سے چھپانے کے لیے اپنی آنکھیں مسل کر پونچھ دیتا ہے۔

گاڑیاں شہر کی طرف روانہ ہیں۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لیلیٰ نامراد سے فون پر بات کر رہی ہے۔

لیلیٰ: ہاں..... یہی وہ بات تھی جو میں موسیٰ کو بتانا چاہ رہی تھی..... مگر ہزار کوشش کے باوجود میرا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا.....

(نامراد پریشان ہے)

نامراد: اوہو میڈم جی..... آپ نے مجھے کیوں نہیں بتائی یہ بات..... شاید گاؤں کی طرف سگنل پرابلم ہے کیونکہ چاند پوری کا فون بھی نہیں لگ رہا مجھ سے..... باقی سارنگا استاد کو تو چڑ ہے یہ موبائل وغیرہ سے۔ آپ رُکیں وہیں..... میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

لیلیٰ: نہیں.....اسی لیے میں نے تمہیں فون پر اطلاع دی ہے۔ وہ لوگ ضرور میرے گھر کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ یہ زہرہ کی زندگی کا سوال ہے۔

(نامراد غصے میں دانت پیستا ہے)

نامراد: جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے.....اس نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے.....موسیٰ نہیں ہے یہاں تو کیا ہوا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں گا.....

لیلیٰ: کوئی جذباتی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس موسیٰ کو ٹرائی کرتے رہو۔ جب تک وہ زہرہ خیر خیریت سے ہمارے حوالے نہیں کر دیتے۔ ہمیں ان کی ہر بات ماننا ہوگی.....تم بس دعا کرو کہ میں جس مقصد کے لیے جا رہی ہوں۔ خدا اس میں سرخرو کرے مجھے.....

نامراد: میڈم میری بات تو سنیں۔

لیلیٰ فون کاٹ دیتی ہے۔ نامراد غصے میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

فیضی اپنی پرانی فوکسی کار میں گھر سے نکلتا ہے۔ پچھلی سیٹ پر سعیدہ برقعہ پہنے بیٹھی ہے اور زہرہ کو بھی بے ہوشی کی حالت میں پچھلی سیٹ پر ڈالے اس پر چادر ڈال کر اس کا چہرہ چھپا رکھا ہے۔ خود فیضی نے بھی کوئی پی۔ کیپ وغیرہ پہن کر اپنا چہرہ ممکنہ حد تک چھپا رکھا ہے۔ فیضی گاڑی چلاتے ہوئے چور نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔ پورچ

لیلیٰ اپنے گھر کے پورچ میں آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس یا بیگ ہے، ڈرائیور جلدی سے لیلیٰ کے ہاتھ سے بیگ لے کر پچھلی سیٹ پر رکھتا ہے۔

لیلیٰ: کریم.....چابی مجھے دے دو.....تم گھر پر ہی رہو گے.....

کریم سر ہلا کر مؤدب انداز میں چابی لیلیٰ کے حوالے کر دیتا ہے۔ لیلیٰ گاڑی اسٹارٹ کرتی ہے اور گھر سے باہر نکل کر گاڑی روڈ پر ڈال دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: دن

جگہ: کوئی ویران پارک

پارکنگ.....

سعیدہ اپنا برقعہ ٹھیک کرتی ہے اور پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی زہرہ پر چادر اس طرح پھیلا دیتی ہے کہ وہ چھپ جائے۔ فیضی سعیدہ کو اشارہ کرتا ہے۔ سعیدہ برقعہ سنبھالتے ہوئے گاڑی سے اتر کر پارک میں داخل ہونے والی ایک گیلی کے پیچھے اندر چلی

جاتی ہے۔فیضی اپنے ہاتھ کی گھڑی پر نظر ڈال کر ٹائم چیک کرتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 26

وقت: دن

جگہ: پارک

سعیدہ دور پڑے ڈسٹ بن کے سامنے رکھے ایک بینچ پر بیٹھی کن انکھیوں سے آس پاس دیکھ رہی ہے۔اس کی نگرانی کا مرکز دور پڑا سُرخ رنگ کا ڈسٹ بن ہے۔

//Cut//

Scene No # 27

وقت: دن

جگہ: پارکنگ۔پارک

پارک کی پارکنگ میں لیلیٰ کی بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے۔دور ایک کونے میں چھپا کر پارک کی گئی فیضی کی گاڑی میں بیٹھا فیضی لیلیٰ کی گاڑی اندر آتے دیکھ کر چونک جاتا ہے اور جلدی سے اپنی کیپ مزید نیچے کر کے اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔لیلیٰ گاڑی پارک کر کے چند لمحے آس پاس کا جائزہ لیتی ہے اور پھر بیگ سمیت نیچے اتر کر اندر پارک کی طرف بڑھ جاتی ہے۔فیضی بے چینی سے آس پاس دیکھتا ہے اور پھر کسی کو وہاں نہ پا کر وہ پیچھے سیٹ پر لیٹی زہرہ کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر زہرہ کو غور سے دیکھتا ہے.....اور یہ اطمینان کرتا ہے کہ وہ مکمل بے ہوش ہے کہ نہیں..... پھر ایک دو مرتبہ زہرہ کو ہلا جلا کر دیکھنے کے بعد جب اسے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ زہرہ مکمل طور پر بے ہوش پڑی ہے فیضی خود بھی گاڑی نیچے اتر جاتا ہے اور لاک کر کے چھپتے چھپاتے اکا دکا لوگوں کی آڑھ میں پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔اس اثنا میں اسے ایک بچہ آئس کریم والے سے آئس لے کر اندر جاتا نظر آتا ہے۔فیضی جلدی سے چہرہ چھپا کر بچے کی انگلی پکڑ لیتا ہے اور اس کے ساتھ اس طرح پارک میں داخل ہوتا ہے جیسے وہ ہی بچے کا باپ ہے۔ پارک میں آس پاس دور دور کچھ لوگ واک کرتے ٹہلتے نظر آ رہے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 28

وقت: دن،شام،عصر کا وقت

موسیٰ سارنگا کی گاڑیوں کی پاسنگ۔

گاڑیاں شہر میں داخل ہو رہی ہیں۔شہر کی سڑک پر ٹریفک کی ہلچل ہے دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی ہے۔موسیٰ کو بیٹھے بیٹھے اونگھ سی آ گئی ہے۔اذان کی آواز سن کر وہ جاگ جاتا ہے اور نیند بھگانے کے لیے اپنے سر کو دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیتا ہے اور کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 29

وقت: دن۔عصر

جگہ: پارک

لیلیٰ چپ چاپ چلتی ہوئی آتی ہے اور سُرخ ڈسٹ بن کے سامنے پڑے بینچ پر بیٹھ جاتی ہے اور چند لمحے انتظار کرتی

ہے۔ اچانک اس کے فون پر بیل بجتی ہے۔ لیلیٰ جلدی سے فون آن کرتی ہے۔

لیلیٰ: ہاں..... میں آ گئی ہوں تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر.....

(دوسری جانب سے سعیدہ بولتی ہے۔)

سعیدہ: ٹھیک ہے..... تمہارے سامنے جو تین ڈسٹ بن پڑے ہیں..... ان میں سے سرخ والے کے اندر بیگ رکھ دو اور چپ چاپ واپس پلٹ جاؤ.....

لیلیٰ: مگر زہرہ کہاں ہے۔ میں اسے لیے بنا واپس نہیں جاؤں گی.....

سعیدہ: زہرہ تمہیں صدر والے پارک کے پچھلے حصے میں بیٹھی مل جائے گی..... ہم نے اسے وہاں چھوڑ دیا ہے..... مگر تم جلدی پہنچو وہاں..... اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے..... زیادہ دیر مت کرنا..... اب بیگ رکھو اور نکلو یہاں سے.....

(لیلیٰ جلدی سے کہتی ہے)

لیلیٰ: مگر تم نے تو کہا تھا کہ.....

لیکن سعیدہ لیلیٰ کی بات سنے بنا فون کاٹ دیتی ہے۔ اور لیلیٰ ہیلو ہیلو کرتی رہ جاتی ہے۔ فون کٹنے کے بعد لیلیٰ پریشانی سے ادھر اُدھر دیکھتی ہے اور پھر جیسے کسی مجبوری کے عالم میں اُٹھ کر بیگ ڈسٹ بن میں ڈال دیتی ہے اور ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کرتی ہے کہ اس کی یہ حرکت کسی نے آتے جاتے نوٹ نہیں کی۔ اور پھر تیزی سے وہاں سے باہر کی جانب لپک جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 30

وقت: دن، شام، عصر کا وقت

سعیدہ دبے قدموں آس پاس نظر ڈالتی غیر محسوس طریقے سے اس ڈسٹ بن کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے جہاں لیلیٰ نے کچھ دیر پہلے بیگ پھینکا تھا۔ سعیدہ برقعے کا پلو ٹھیک کرنے کے بہانے جھکتی ہے اور جلدی سے وہ بیگ نکال کر اپنے برقعے تلے دبا لیتی ہے۔ اور پھر چور نظروں سے آس پاس دیکھتی ہے۔ دُور ایک ٹھیلے والے کی آڑ میں چھپا کھڑا فیضی بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ سعیدہ کو دور سے ہی وہاں سے کھسک جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ سعیدہ جلدی سے بیگ سنبھالتی وہاں سے رفو چکر ہو جاتی ہے۔ فیضی چند لمحے کھڑا سعیدہ کو جاتے دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ وہاں دوسرا کوئی سعیدہ کا پیچھا نہیں کر رہا۔ خود بھی اپنا چہرہ ٹوپی سے چھپاتے ہوئے وہاں سے چل پڑتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 31

وقت: دن

جگہ: سڑک، لیلیٰ کی گاڑی کی پاسنگ

لیلیٰ تیزی سے گاڑی بھگاتے ہوئے دوسرے پارک کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔

//Cut//

Scene No # 32

وقت: دن، شام، عصر کا وقت

فیضی چھپتا چھپاتا تیزی سے پارک کے مرکزی دروازے سے باہر نکلتا ہے اور پارکنگ میں دور ایک کونے میں چھپا کر کھڑی کی گئی اپنی لوکسی کار کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ہیجان کے ملے جلے تاثرات ہیں جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو کہ یہ سارا کام اتنی آسانی سے ہو گیا ہے۔

فیضی جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر سیلف مارتا ہے اور گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے۔ تبھی بے خیالی میں اس کی نظر پچھلی سیٹ پر پڑتی ہے اور اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ پچھلی سیٹ خالی پڑی ہے۔ فیضی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں اور وہ پریشانی میں جلدی سے پوری گاڑی چھان مارتا ہے اور پھر تیزی سے نیچے اتر کر زہرہ کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور ایک جانب اسے سیاہ چادر میں ملبوس کوئی لڑکی جاتی نظر آتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 24

Scene No # 1

وقت: دن۔عصر کے بعد کا وقت

جگہ: پارکنگ ایریا، پارک کے باہر

فیضی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر زہرہ کو نہ پا کر شدید حواس باختہ ہو جاتا ہے اور جلدی سے اتر کر آس پاس جاتے لوگوں اور راستوں پر نظر دوڑاتا ہے۔ اتنے میں دور ویسے ہی ایک سیاہ چادر اور سیاہ لباس میں ملبوس کوئی لڑکی باہر کی طرف جاتی نظر آتی ہے۔ فیضی سب چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ اور درمیان میں آتے لوگوں کو ہٹاتا دھکے دیتا گھبرایا ہوا سا کسی نہ کسی طرح گیٹ سے نکلنے سے پہلے اس لڑکی تک پہنچ جاتا ہے اور ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب موڑتا ہے لڑکی کی چادر گر جاتی ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر چلاتی ہے۔ فیضی ڈر کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ کوئی اور لڑکی نکلتی ہے۔ فیضی لڑکی کی چیخ و پکار پر پلٹ کر بھاگتا ہے۔ مگر آس پاس اسے کہیں زہرہ نظر نہیں آتی۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: کوئی سڑک۔گلی

زہرہ سیاہ چادر میں خود کو لپیٹے، بدحال، بیمار اور لڑکھڑاتی ہوئی کسی جانب چلی جا رہی ہے۔ اسے ایک دو بار زوردار چکر سے آتے ہیں اور سب کچھ اپنی نظروں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مگر وہ ہی نہ کسی طرح خود کو سمیٹے اور سنبھالے چلتی رہتی ہے اور خود کو سڑک کے اگلی کے ہجوم میں گم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: آؤٹ ڈور out door

دوسری جانب فیضی پاگلوں کی طرح آس پاس بھاگ بھاگ کر زہرہ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر اسے زہرہ نظر نہیں آ رہی۔

//Cut//

Rood Passing

Scene No # 4

وقت: دن

موسیٰ چلتی گاڑی میں دور ایک مسجد دیکھ کر سارنگا سے کہتا ہے۔

موسیٰ: سارنگا بھائی..... میں نماز پڑھ لوں..... چاند پوری ڈرائیور کو جھاڑتا ہے۔

چاند پوری: گاڑی لگا دو بھیا..... تم نے سنا نہیں..... نماز پڑھو..... قبل اس کے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے.....

ڈرائیور گاڑی ایک جانب مسجد کے سامنے لگا دیتا ہے۔
پیچھے آتی گارڈز کی گاڑی بھی رُک جاتی ہے۔
موسیٰ اترنے لگتا ہے۔ پیچھے بیٹھا سارنگا اسے آواز دیتا ہے۔
سارنگا: دعا کرنا میرے لیے بھی، شاید اپنے سیاہ مقدر بھی ڈھل جائیں.....
موسیٰ: آپ خود چل کر دعا کیوں نہیں کرتے..... میری آج کل وہ نہیں سن رہا.....
(سارنگا ہنستا ہے)
سارنگا: عاشق کی دُعا کبھی رَد نہیں ہوتی..... جا کر دل سے مانگنا اُسے..... سارنگا کا دل تو کھوٹ سے بھر چکا ہے..... اب یہاں سے خالص دُعا نہیں نکلتی..... موسیٰ ایک لمحے سارنگا کو دیکھتا ہے اور نیچے اتر کر مسجد میں داخل ہو جاتا ہے۔ مسجد کا وسیع و عریض صحن ہے جس میں بہت سے کبوتر بیٹھے ہیں۔ موسیٰ کے اندر آنے پر دانہ چگتے کبوتر فضا میں بلند ہو کر اڑتے ہیں۔ موسیٰ ایک جانب لگے پانی کے نل کی طرف وضو کرنے کے لیے بڑھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

زہرہ لڑکھڑاتی، خود کو سنبھالتی، گرتی پڑتی ایک جانب چلی جا رہی ہے۔ اچانک اسے دُور سے قوالی، ڈھول اور دھمال کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ زہرہ چونک کر سامنے دیکھتی ہے۔ دُور کسی مزار کا نیلا گنبد نظر آ رہا ہے۔ زہرہ خود کو اس طرف دھکیلتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

مسجد کا وسیع و عریض صحن/ دور ایک جانب کبوتر دانہ چگ رہے ہیں۔
موسیٰ نماز ختم کر کے سلام پھیرتا ہے اور دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور لب پر فریاد ہے۔
موسیٰ: بہت تکلیف میں ہوں میرے مالک..... بڑی اذیت میں ہوں..... میرا پل پل کانٹوں پر گزر رہا ہے..... ہر لمحہ اندر سے کٹ رہا ہوں میں.....
(موسیٰ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ دعا کرتا رہتا ہے۔)
موسیٰ: اس کی یاد ہر وقت میرے کھلے زخموں پر نمک بن کر پڑتی ہے..... بہت تڑپاتی ہے مجھے..... جینے نہیں دیتی..... مگر میرے رب۔ میں جانتا ہوں..... تو کسی کو..... اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا..... مگر میرا عاجز اور کم زور بندہ اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہے میرے مولا..... یا تو میرے دل کو اور زیادہ صبر اور برداشت عطا کر یا پھر مجھ سے میرا حافظہ چھین لے..... مجھے خود سے بیگانہ اور دیوانہ کر دے..... مجھے دیوانہ کر دے.....

//Cut//

.....☆انٹر کس میں زہرہ کے مزار/ نیلا گنبد پر آنے کے سین.....☆موسیٰ کی دعا جاری رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

زہرہ مزار کے مرکزی دروازے پر سیاہ لباس میں اُجڑی اجڑائی اور برباد حال حالت میں نمودار ہوتی ہے۔ اس نے

چہرے پر سیاہ نقاب لے رکھا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ مزار پر عرس کی چہل پہل، قوالی اور دھمال جاری ہے۔ زہرہ دروازے سے اندر صحن میں داخل ہوتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: مسجد۔ صحن

موسیٰ کی دعا جاری ہے۔ موسیٰ زار و قطار رو رہا ہے اور دعا مانگ رہا ہے۔

موسیٰ: میں نے تجھ سے محبت کا نذرانہ مانگا تھا میرے مولا..... مگر میں نادان یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت دلوں کو چیر کر رکھ دیتی ہے..... بہت بھاری ہے یہ بوجھ میرے دل کے لیے میرے رب..... محبت انسان کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے اور دل کو کسی آری کی طرح کاٹ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے وجود میں بکھیر دیتی ہے۔ یہ محبت تو بڑی ظالم شے ہے میرے مولا۔ یا تو میرے دل کو ہر پل اس آری سے کٹ کٹ کر ٹکڑے ہونے کی ہمت عطا کر..... یا میرا دل ہمیشہ کے لیے بند کر دے میرے مالک..... یہ عشق جن دلوں پر طاری ہو جائے انہیں تو تڑپنے کی مہلت بھی نہیں دیتا..... یا تو مجھے اس عشق پر حاوی کر یا پھر مکمل دیوانگی طاری کر دے میرے مولا.....

موسیٰ روتے روتے دعا کر رہا ہے۔ دوسری جانب زہرہ مزار کی جالی سے لگی بیٹھی رو رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: مزار

زہرہ روتے روتے مزار کی جالی کے پاس پہنچتی ہے اور وہیں نڈھال ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ زہرہ جالی کو پکڑے روتے ہوئے دعا کر رہی ہے۔

زہرہ: اب سر سے چھت چھینی ہے تو یوں در بدر نہ رولنا مجھے..... مجھے بھی اپنے پاس بلا لے یار با.....، اب میرا یہاں کوئی نہیں..... پھر سے در در کی خاک چھاننے کے لیے نہ چھوڑنا مجھے..... میں پھر سے اس کیچڑ بھری بدنامی کی زندگی کو نہیں جینا چاہتی..... اس بازار کی دنیا سے دور رکھ مجھے میرے مالک..... میں پھر سے اُس بے پردگی والی گلیوں میں واپس نہیں جانا چاہتی.....، ..... مجھے پھر سے وہاں نہ بھیجنا میرے اللہ..... چاہے تو یہیں میری سانسیں بند کر کے میری جان لے لے.....

زہرہ روتے روتے وہیں نڈھال ہو کر گر جاتی ہے۔ تبھی پیچھے سے احمد، قدرت اللہ اور علامہ شہاب الدین چند مریدین کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ احمد زہرہ کو یوں نڈھال گرا ہوا دیکھ کر تیزی سے لپکتا ہے۔

احمد: ارے..... اسے کیا ہوا.....؟.....

پیر قدرت اور علامہ شہاب بھی جلدی سے زہرہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ قدرت مزار کی کسی خدمتگار عورت کو اشارہ کرتا ہے۔ ایک مریدنی/عورت جلدی سے آگے بڑھتی ہے اور زہرہ کی نبض دیکھتی ہے۔

مریدنی: (مزار کی خدمتگار) اسے تو بہت تیز بخار ہے۔

شہاب: کون ہے یہ قدرت اللہ..... شکل و صورت اور حلیئے سے تو کسی اچھے خاندان کی لگتی ہے۔

(زہرہ کے چہرے سے چادر ہٹتی ہے تو احمد زہرہ کے حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ہے۔ اور بڑی مشکل سے اپنی نظر ہٹاتا ہے۔)

قدرت: پتہ نہیں یا حضرت..... پہلے تو کبھی دیکھا نہیں اسے یہاں

(شہاب عورتوں کو حکم دیتا ہے)

شہاب الدین: اسے اٹھا کر عورتوں کے حجرے میں لے جاؤ اور اس کی پوری طرح دیکھ بھال کرو..... پتہ نہیں کس مجبوری کے عالم میں گھر سے نکلی ہے اور جانے کیا مصیبت اور مشکل درپیش ہے اس بے چاری کو..... احمد..... تم دیکھو ذرا..... (احمد جلدی سے سر ہلاتا ہے۔)

چند اور عورتیں زہرہ کی طرف بڑھتی ہیں اور چادریں ڈال کر زہرہ کے گرد پردہ کر لیتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: مزار/ نیلا گنبد

عیسیٰ مزار کے حجرے میں داخل ہوتا ہے جہاں پہلے سے پیر قدرت اور شہاب الدین موجود ہیں۔

عیسیٰ: ابا جان..... باہر یہ بھیڑ کیسی تھی..... کیا ہوا ہے۔

قدرت: پتہ نہیں کوئی دکھیاری عورت ہے۔ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی..... علامہ صاحب نے اسے زنانے کی طرف منتقل کروا دیا ہے..... تم بتاؤ..... لنگر بٹ گیا ہے سارا کہ کچھ کام باقی ہے ابھی.....

عیسیٰ: نہیں..... سب بانٹ دیا ہے آج وقت سے..... ماشاءاللہ

شہاب الدین: ماشاءاللہ..... قدرت شاہ..... کسی کو بھیجو زنانے کی طرف..... شاید لڑکی کو ہوش آ گیا ہو..... جب تک وہ اس مزار کی چار دیواری میں ہے..... وہ ہماری ذمہ داری ہے۔

قدرت: جی بہتر..... آپ مناسب سمجھیں تو خود چل کر حال پوچھ لیں..... شاید کسی دوسرے کے سامنے وہ اپنے دل کا حال کھولنے میں ہچکچائے.....

شہاب الدین: ہاں۔ چلو یہ بھی مناسب ہے..... تم بھی میرے ساتھ چلو..... قدرت اور شہاب اٹھ جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 11

علامہ شہاب اور پیر قدرت اللہ دروازے پر کھڑے احمد کے ساتھ زنانہ حجرے میں داخل ہوتے ہیں۔ آس پاس کھڑی عورتیں پردہ کر لیتی ہیں۔ زہرہ ایک لکڑی کی جالی سے پرے بیٹھی رو رہی ہے۔ شہاب دھیرے سے کھانس کر زہرہ کو متوجہ کرتا ہے۔

علامہ شہاب الدین: تم کون ہو بیٹی..... اور کس مشکل میں گرفتار ہو..... ہمیں بتاؤ..... شاید ہم تمہارے کچھ کام آ سکیں۔

(احمد کن انکھیوں سے زہرہ کو دیکھتا ہے)

زہرہ: ایک دُکھیاری ہوں۔ کوئی نہیں ہے میرا اب یہاں..... شوہر نے بنا کسی قصور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا ہے..... دعا کریں مجھے جلد موت آ جائے..... بہت تھک گئی ہوں میں اس زندگی کے جھمیلوں سے۔

شہاب الدین: ایسا نہیں کہتے بیٹی..... مایوسی کفر ہے..... تمہارا کوئی اپنا ہے تو بتاؤ..... تمہیں باحفاظت وہاں پہنچا دیا جائے.....

زہرہ: نہیں..... کوئی نہیں ہے اب میرا..... اس طلاق کے داغ کو لے کر اب میں کہاں دَر دَر بھٹکتی پھروں گی..... کوئی میری بے گناہی پر یقین نہیں کرے گا.....

شہاب الدین: ہم یقین کرتے ہیں تمہاری بے گناہی پر..... بھئی قدرت اللہ..... یہ آج سے میری بیٹی ہے..... اور تم بتاؤ کہ میری بیٹی کی عدت گزاری کے لیے تم کیا کر سکتے ہو.....

قدرت اللہ: آپ حکم کریں یا حضرت.....کہیں تو میں اسے اپنے گھر لے جاؤں۔ وہاں گھر میں تین عورتیں ہیں جو اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ آپ نے بیٹی کہا ہے تو اس رشتے سے تو یہ میری بھی بیٹی ہوئی.....

// Inter Cut //

شہاب الدین: جزاک اللہ.....تم نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا.....ٹھیک ہے.....اب جب تک میری بیٹی کی عدت کے دن پورے نہیں ہو جاتے.....یہ تمہاری سرپرستی میں ہی رہے گی.....

قدرت اللہ: جو حکم حضرت.....میں ابھی تمہاری روانگی کا انتظام کرتا ہوں.....نام کیا ہے تمہارا بیٹی.....

(زہرہ چونک کر سر اٹھاتی ہے اور پھر اپنا ٹھیک نام بتاتے بتاتے اپنا گھریلو نام بتا دیتی ہے۔)

زہرہ: جی زُہ.....زُہ ی نام ہے میرا.....مگر آپ میرے لیے کوئی زحمت نہ کریں۔ میں چلی جاؤں گی جہاں میرا مقدر مجھے لے جائے.....

قدرت: بیٹیاں باپوں کے لیے کبھی زحمت نہیں ہوا کرتیں.....تم یہیں انتظار کرو.....میں ابھی واپس آتا ہوں علامہ صاحب کو رخصت کر کے.....

قدرت کسی عورت کو اشارہ کرتا ہے وہ سر ہلا کر زہرہ کو سنبھالتی ہے۔ احمد، قدرت اور شہاب حجرے سے نکل جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: مزار

احمد ایک جانب کھڑا سامان بندھوا رہا ہے۔ کچھ دور علامہ شہاب الدین، قدرت اللہ، عیسیٰ اور چند مرید موجود ہیں جو علامہ کو رخصت کر رہے ہیں۔

قدرت اللہ: دو ماہ کیسے گزر گئے پتہ بھی نہیں چلا حضرت.....اور آپ کو ایک بار پھر سے الوداع کہنے کا وقت بھی آ گیا.....ہم سب کے دل بہت اُداس ہیں اس موقعے پر.....

(شہاب الدین مسکراتا ہے)

علامہ شہاب: ہر ملاقات کے سرے پر یہی ایک الوداع ہی تو لکھا ہوتا ہے۔ مگر پھر ملاقات ہو گی ان شاء اللہ.....اس بار میں جلد آنے کی کوشش کروں گا.....احمد کو یہیں چھوڑے جا رہا ہوں.....سب خیر ہو گی ان شاء اللہ۔

قدرت: ان شاء اللہ.....

شہاب: ہاں مگر ایک گلہ تم سے باقی رہ گیا پیر قدرت اللہ.....تم نے ہمارے لاڈلے موسیٰ کو اس بار ہم سے نہیں ملایا.....بہت یاد آئی اس کی.....

(قدرت نظریں چرا لیتا ہے)

قدرت: بس حضرت.....اس کے لیے بھی دعا کریں.....اللہ اُسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے.....کہیں بھٹک کر دُور نہ نکل جائے۔

(علامہ شہاب مسکراتا ہے اور معنی خیز لہجے میں کہتا ہے)

علامہ شہاب: فکر مت کرو قدرت اللہ.....وہ جتنا بھی دور نکل جائے.....اس کی منزل پلٹ کر تمہاری حویلی کی طرف ہی آئے گی.....اللہ بڑا کارساز ہے اور سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے.....

قدرت اللہ: جی حضرت.....بے شک.....

شہاب: اچھا بھئی..... میرا ارادہ تو اس بار موسیٰ کو اپنے ساتھ لے جانے کا تھا سفر پر..... مگر اب اس کی جگہ یہ فرض عیسیٰ کے ذمے رہے گا..... میں تمہارے عیسیٰ کو ساتھ لے جا رہا ہوں چند دن کے لیے..... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....

(شہاب الدین مسکراتا ہے)

قدرت: خدانخواستہ حضرت..... کیسی بات کر رہے ہیں..... اعتراض کیسا..... یہ تو عیسیٰ کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے..... آپ جتنے دن چاہیں۔ اسے اپنے ساتھ رکھیں..... اس کی تربیت ہوتی رہے گی..... ویسے بھی یہ اب تک بڑا الاابالی ہے.....

(شہاب مسکراتا ہے، اور قریب سے گزرتے احمد کو اشارہ کرتا ہے، احمد پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

شہاب: احمد میاں..... بات سنو ذرا..... تم یہیں پیر صاحب کے ساتھ رہو گے کچھ دن..... میں عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں..... کیوں عیسیٰ میاں..... تیار ہو میرے ساتھ چلنے کے لیے۔

(احمد سر جھکا کر تعظیم دیتا ہے)

عیسیٰ: (عیسیٰ جلدی سے سر جھکاتا ہے) جی..... جی علامہ حضرت..... بالکل.....

(شہاب الدین مسکرا کر عیسیٰ کے کاندھے پر تھپکی دیتا ہے۔)

شہاب الدین: تم کچھ بھی کہو قدرت اللہ..... تمہارا یہ بیٹا بہت اچھا بھائی ہے موسیٰ کا..... اللہ ان دونوں کی جوڑی سلامت رکھے.....

(قریب کھڑا احمد سر جھکا کر تعظیم دیتا ہے)

چلو بھئی عیسیٰ..... رخت سفر باندھ لو..... اور قدرت اللہ میرے پیچھے اس لڑکی کا خیال رکھنا..... سمجھو میری امانت ہے وہ تمہارے پاس.....

قدرت: آپ بے فکر رہیں..... حکم کی تعمیل ہو گی۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: پارک پارکنگ

شام ڈھلنے والی ہے۔ فیضی آس پاس زہرہ کو تلاش کرتے کرتے ناکام ہو چکا ہے اور تھک کر پریشان اور بوکھلایا سا واپس پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آتا ہے اور چند لمحے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد یا ول نخواستہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے اور پارکنگ سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: شام ڈھلنے والی ہے

جگہ: فیضی کا گھر/کمرہ

سعیدہ کمرے میں بیٹھی خوشی، بے یقینی اور ہیجان کی کیفیت میں بار بار بیگ سے نوٹ نکال کر دیکھ رہی ہے اور پھر ڈر کر دوبارہ پیسے بیگ میں ڈال دیتی ہے۔ پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر پانچ پانچ ہزار کے نوٹ گنتی ہے اور پھر واپس رکھ دیتی ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ سعیدہ جلدی سے بیگ چارپائی کے نیچے چھپا کر باہر لپکتی ہے۔

سعیدہ: شکر ہے..... واپس آ گیا فیضی..... جانے کہاں رہ جاتا ہے.....

(سعیدہ جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہی کہتی ہے)

سعیدہ: کہاں رہ گئے تھے۔ یہاں میرا ڈر کے مارے خون خشک ہو رہا تھا..... تم.....
(مگر باہر کوئی اجنبی کھڑا ہے)
باہر کھڑے کسی شخص کو دیکھ کر سعیدہ کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے ہیں اور وہ ڈر کر کہتی ہے۔
سعیدہ: کک..... کون ہو تم.....
اجنبی: خدائی خدمت گار.....

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن
جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت اللہ سر پر دوپٹہ اور نقاب اوڑھے زہرہ کو لیے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اور بیوی کو آواز لگاتا ہے۔
قدرت: سنتی ہو..... کہاں ہیں سب..... اندر سے سکینہ جلدی سے بھاگتی ہوئی آتی ہے۔
سکینہ: جی تایا جان.....
قدرت: یہ ہاجرہ اور خدیجہ..... کہاں ہیں دونوں.....
سکینہ: اماں اور تائی جان تو پڑوس میں گئی ہیں پُرسے کے لیے..... وہ ساتھ والوں کے ہاں ان کی خالہ کا انتقال ہو گیا تھا ناں پچھلے ہفتے.....
قدرت: اوہ اچھا..... اچھا تم اسے لے جاؤ اور پچھلے زنانے کے کسی الگ حصے میں اس کی رہائش کا انتظام کر دو..... کسی چیز کی کمی نہ ہو..... یہ ہماری خاص مہمان ہے۔
(سکینہ حیرت سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہے)
سکینہ: جی تایا جان..... میں انتظام کروا دیتی ہوں..... مگر یہ.....
قدرت: زرّی نام ہے اس کا..... علامہ حضرت نے ذمہ داری سونپی ہے زرّی کی ہمیں..... ہاں مگر یاد رہے..... زرّی کی عدّت کے دن چل رہے ہیں..... اس لیے اس کی رہائش والے کمرے کی طرف کسی نامحرم مرد کا گزر نہیں ہونا چاہیے۔ خاص تاکید ہے یہ.....
(سکینہ چونک کر زرّی کی طرف دیکھتی ہے)
سکینہ: آپ بے فکر رہیں تایا جان..... میں خاص احتیاط کروں گی..... چلو..... آؤ میرے ساتھ.....
سکینہ زہرہ کو لے کر چلی جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن
جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ زہرہ کو اس کا کمرہ دکھاتی ہے۔
سکینہ: یہ رہا تمہارا کمرہ..... تم اب یہیں رہو گی..... یہ اندر سے زنانے سے جُڑا بھی ہوا ہے اور ایک جانب الگ تھلگ بھی ہے باقی گھر سے..... تمہیں یہاں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی..... میں کسی نوکرانی یا خادمہ کو خاص تمہاری خدمت پر بھی لگا دوں گی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تم اسے بتا سکتی ہو.....

زہرہ: اتنا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے لیے..... تمہاری یہی مہربانی کیا کم ہے کہ تم لوگوں نے مجھے رہنے اور سر چھپانے کے لیے ایک چھت فراہم کر دی ہے..... باقی مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں.....

سکینہ: مگر تمہارا سامان کہاں ہے..... میرا مطلب ہے کپڑے لتے وغیرہ..... یا کچھ اور.....

زہرہ: میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ جو بھی تھا..... وہ پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ انہی تین کپڑوں میں نکلی تھی میں وہاں سے.....

سکینہ: کوئی بات نہیں..... اس سب کا انتظام بھی ہو جائے گا..... ویسے تو تمہیں میرے کپڑے بھی آ جائیں گے..... ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی ہوئی ہے میری..... سارے کپڑے زیور سب کچھ ویسے ہی بکسوں میں بند پڑا ہے..... تم دیکھ لینا..... جو بھی پسند آئے لے لینا..... میں نے استعمال نہیں کیا ابھی کچھ.....

زہرہ: ایک طلاق یافتہ عورت کو زیور گہنے اور کپڑے لتے کی ضرورت نہیں ہوتی..... سفید پوش کی پرانی چادر بھی مل جائے تو غنیمت ہے..... ویسے تمہارا دل بہت بڑا ہے..... بہت اچھی ہو تم..... شکریہ.....

سکینہ: شکریے کی کوئی بات نہیں..... میرے لیے تو تمہارا اس گھر میں آنا ہی کسی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے..... یہاں صرف میں ہوں..... اماں ہیں اور میری ساس..... کوئی سہیلی نہیں ہے میری قریب آس پاس..... اب تم آ گئی ہو تو خوب باتیں کروں گی تم سے..... ویسے بھی تایا جان نے تمہارا خاص خیال رکھنے کا کہا ہے..... جو وہ کبھی کسی کے لیے نہیں کہتے..... اور جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ ہم تینوں کے علاوہ کوئی رشتے دار عورت ٹھہری ہی نہیں اس چھت تلے..... تمہیں اگر تایا جان خود لے کر آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ تم ضرور کوئی خاص مہمان ہو ان کی..... اچھا تم بیٹھو..... میں تمہارے کھانے کا کچھ انتظام کرتی ہوں.....

باتونی سکینہ بولتی رہتی ہے اور زہرہ اسے چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔ سکینہ بات ختم کر کے کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: شام

جگہ: فیضی کا گھر

فیضی صحن کا دروازہ کھول کر اندر آتا ہے اور غصے میں بڑبڑاتا ہے۔

فیضی: یہ عورت کبھی نہیں سدھرے گی..... آج کے دن بھی اس نے اندر سے دروازہ بند نہیں کیا گھر کا..... جاہل کہیں کی..... سعیدہ..... وسعیدہ..... کہاں ہو تم.....

(فیضی سعیدہ کو آوازیں دیتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ سعیدہ آنکھیں پھاڑے خوف زدہ سی اندر کرسی پر بیٹھی نظر آتی ہے)

فیضی: کمال کرتی ہو تم بھی..... میں گاڑی تین گلی پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں احتیاطاً اور تم ہو کہ پھر صحن کا دروازہ بند کرنا بھول گئیں..... خدا تمہیں سمجھے سعیدہ.....

(مگر سعیدہ فیضی کی تمام باتیں سن کر بھی خوف زدہ چپ بیٹھی رہتی ہے، فیضی چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہے)

فیضی: تمہیں کیا ہوا ہے..... اب یہ مت کہنا خدا کے لیے کہ راستے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے تم سے..... میرے پاس پہلے ہی سنانے کے لیے ایک بہت بُری خبر ہے.....

(اتنے میں پیچھے سے نامراد کی آواز سنائی دیتی ہے فیضی خوف سے اچھل پڑتا ہے)

نامراد: چلو ایک بُری خبر تم سناؤ..... دوسری میں تمہیں سنا دیتا ہوں فیضی نمک حرام.....

(فیضی گھبرا کر پیچھے دیکھتا ہے۔ دروازے میں نامراد کھڑا ہے)

فیضی: نامراد.....تم..... یہاں.....تم یہاں کیا کر رہے ہو.....

نامراد: پہلے تم بُری خبر تو سنا دو اپنی.....پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔ہاں مگر سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ زہرہ کہاں ہے۔

فیضی: کیا بکواس کر رہے ہو.....ہم..... مجھے کیا پتہ.....کس.....زہرہ کی بات کر رہے ہو تم.....اور یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے ڈر جاؤں گا.....تم تہتے ہو.....اور میں تم سے اچھی طرح نپٹ سکتا ہوں۔

(نامراد مسکراتا ہے اور پیچھے کی طرف اشارہ کرتا ہے)

نامراد: ہم شاعروں کی بس یہی کم زوری ہے پیارے.....لفظوں کی تلوار تو خوب چلاتے ہیں.....مگر پسٹل یا طمنچہ چلانا نہیں جانتے.....مگر فکر مت کرو.....اس کا انتظام بھی کر رکھا ہے میں نے.....ذرا پیچھے دیکھو اپنے.....

(فیضی گھبرا کر پیچھے دیکھتا ہے۔تو وہی اجنبی شخص (بلا) سعیدہ کے سر پر پسٹل رکھے نظر آتا ہے۔فیضی کے ہوش اڑ جاتے ہیں)

فیضی: تم.....تم کہاں سے آئے.....نامراد.....یہ.....یہ سب کیا ہے.....

نامراد: امید ہے تمہارا اطمینان ہو چکا ہوگا.....اس بندے کا نام بلا ہے اور یہ پارک سے ہی تمہاری بیوی کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا.....مزید اطلاع کے لیے بتا دوں کہ اس وقت بھی بلے پر قتل کے تین مقدمات چل رہے ہیں.....تم دونوں کو ملا کر ہو جائیں گے پانچ.....تو پھر کیا ارادہ ہے فیضی.....سیدھی طرح زبان کھولو گے یا.....(بلا گن کو اوڈ کرتا ہے فیضی گھبرا کر بلے کی طرف دیکھتا ہے۔)

//Cut//

Scene No # 18

وقت: شام

جگہ: کاشانہ ویراں

خدیجہ اور ہاجرہ سکینہ کے سامنے حیران و پریشان سی کھڑی ہیں۔

ہاجرہ: پیر صاحب لے کر آئے ہیں.....کسی طلاق یافتہ لڑکی کو.....مگر کون ہے.....کہاں سے آئی ہے.....

سکینہ: یہ سب تو مجھے نہیں پتہ مگر ہے بہت پیاری،اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کوئی اتنا سنگ دل بھی ہو سکتا ہے جو اس جیسی معصوم اور پاکیزہ صورت والی کو یوں بیٹھے بیٹھے طلاق دے دے۔

خدیجہ: مگر تم تو بتا رہی تھیں کہ علامہ حضرت نے اسے خاص طور پر بھائی صاحب کی تحویل میں دیا ہے.....

سکینہ: ہاں.....اور تایا جان نے بھی سخت تاکید کی ہے کہ زرّی کا خاص خیال رکھا جائے..... کیونکہ وہ علامہ حضرت کی خاص مہمان ہے.....

(ہاجرہ سکینہ سے کہتی ہے۔)

ہاجرہ: کہاں ہے وہ.....میں بھی مل لوں اس سے ذرہ

//Cut//

Scene No # 19

وقت: شام/رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ/کاشانہ ویراں

زہرہ لمبی چادر سے خود کو لپیٹے اُداس اور پریشان سی اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے۔اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوتی ہے اور ہاجرہ ہلکی سی دستک دے کر اندر آتی ہے،زہرہ کا چہرہ دوسری جانب ہے۔

ہاجرہ: تنہائی میں مخل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں..... دراصل مجھے ابھی سکینہ نے بتایا کہ پیر صاحب کی کوئی مہمان یہاں آئی ہوئی ہیں..... میں ہاجرہ ہوں..... پیر جی کی پیرنی..... ہاجرہ.....

(زہرہ ہاجرہ کا نام سن کر چونک کر پلٹتی ہے اور ہاجرہ کی نظر زہرہ کی نظر سے ٹکراتی ہے۔ دونوں کے چہروں پر کئی رنگ آ کر گزر جاتے ہیں۔ ہاجرہ بے اختیار بول اٹھتی ہے۔)

ہاجرہ: تم.....

//Cut//

Scene No # 20

وقت: شام یا رات

جگہ: سارنگا کا اڈہ۔ کمرہ/ ہال

موسیٰ، سارنگا، چاند پوری اور ایک آدھ گارڈ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارنگا ایک لمبی انگڑائی لیتا ہے۔

سارنگا: بڑھاپا طاری ہو رہا ہے بے چاند پوری..... وہ کیا کہتے ہیں تیری شاعری میں..... کتاب زیست کا اک اور باب ختم ہوا..... شباب ختم ہوا..... اک عذاب ختم ہوا.....

(چاند پوری بے اختیار چونک کر داد دیتا ہے)

چاند پوری: واہ استاد..... واہ واہ..... مطلب کہ..... واہ بھئی واہ..... استاد..... قسم سے..... کبھی کبھی تو بالکل چونکا دیتے ہو جب موقعے کا شعر اس طرح پڑھتے ہو ایمان سے کہ سیدھا جا کر دل پر لگتا ہے.....

(سارنگا ہنستا ہے)

سارنگا: رہنے دے..... نامراد حرام خور سے سُنا تھا بھی..... اب سارا دن تم لکھوں کے ساتھ رہوں گا تو تھوڑی بہت شاعری تو میں بھی سیکھ ہی جاؤں گا ناں..... وہ کیا کہتے ہیں..... بُروں کی صحبت انسان کو بُرا ہی بناتی ہے.....

چاندی پوری: اب ایسا تو نہ کہو استاد.....

(اتنے میں نامراد گھبرایا ہوا سا کمرے میں داخل ہوتا ہے)

سارنگا: یہ لے..... دوسرا شاعر بھی آ گیا..... کہا تھا ناں میں نے..... شیطان کی عمر لمبی ہوتی ہے..... نام لیا اور حاضر.....

نامراد: کہاں رہ گئے آپ سب لوگ استاد..... کتنے گھنٹوں سے فون ملا رہا ہوں۔ مل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔

موسیٰ: تم اتنے پریشان کیوں ہو..... سب خیر تو ہے ناں.....

نامراد: خیر نہیں ہے..... اور میں اکیلا نہیں آیا ہوں..... اپنے ساتھ دو خاص مہمان بھی لے کر آیا ہوں..... (سب چونک کر اسے دیکھتے ہیں۔)

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/ زہرہ کا کمرہ

ہاجرہ کی نظر جیسے ہی زہرہ کے اوپر پڑتی ہے وہ حیرت اور خوف سے چلا اٹھتی ہے۔

ہاجرہ: تم..... تم تو وہی ہو ناں..... مگر تم..... یہاں کیسے.....؟

(زہرہ کے حواس بھی ہاجرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر معطل ہو چکے ہیں)

زہرہ: آپ.....؟..... آپ تو موسیٰ کی والدہ ہیں ناں.....

ہاجرہ: ہاں..... میں وہی بدنصیب ہوں.....

زہرہ: میں نہیں جانتی تھی کہ یہ موسیٰ کا گھر ہے..... ورنہ کبھی نہ آتی..... بہت معذرت چاہتی ہوں..... مجھے اب جانا چاہیے.....
(زہرہ تیزی سے باہر کی طرف لپکتی ہے، ہاجرہ اسے آواز دے کر روکتی ہے)

ہاجرہ: رُکو..... کہاں جاؤ گی اس وقت.....

زہرہ: کہیں بھی..... جہاں قسمت لے جائے..... مگر آپ کے اس پاک گھر کو اپنے وجود سے ناپاک نہیں کروں گی..... مجھے آپ کی ہر بات یاد ہے آج تک..... اور میں نے اپنا ہر وعدہ نبھایا ہے.....

ہاجرہ: جانتی ہوں..... تم اپنے قول کی بہت پکی ہو..... مگر کاش میں نے تمہیں اس قول سے نہ باندھا ہوتا.....

زہرہ: میری وجہ سے آپ کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی..... مجھے موسیٰ کی ضد کی وجہ سے اسے یہ بتانا پڑا کہ آپ مجھ سے اپنے بیٹے کی رہائی طلب کرنے آئی تھیں..... مگر میں نے موسیٰ کو یہ سب تب بتایا جب میں کسی اور کے نکاح میں بندھ چکی تھی..... اور میں چاہتی تھی کہ موسیٰ یوں در بدر بھٹکنے کے بجائے گھر واپس چلا جائے..... دعا کرتی ہوں آپ کا بیٹا جلد واپس لوٹ آئے.....

ہاجرہ: کاش ایسا ہو جائے..... کتنی ستم ظریفی ہے یہ مقدر کی کہ جس کی وجہ سے موسیٰ کے باپ نے اُسے گھر بدر کر دیا۔ آج وہی لڑکی اس گھر میں پیر قدرت اللہ کی سب سے خاص مہمان ہے..... وقت نے یہ کیسی کروٹ لی ہے زہرہ.....
(زہرہ جانے کے لیے بڑھتی ہے)

زہرہ: میں چلتی ہوں..... آپ پیر صاحب سے کوئی بہانہ کر دیجئے گا.....
(ہاجرہ اس کا راستہ روک دیتی ہے)

ہاجرہ: نہیں..... اس گھرانے کی یہی ریت ہے کہ آنے والے مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے..... تم بھی اب ہماری مہمان ہو..... اس دن موسیٰ کی ماں تم سے کچھ مانگنے آئی تھی اور تم نے ایک ماں کا بھرم رکھا تھا..... آج بھی تم سے موسیٰ کی ماں ہی یہ کہہ رہی ہے کہ مت جاؤ..... یہیں رک جاؤ..... تم سے مجھے اپنے موسیٰ کے وجود کے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔
(زہرہ چونک کر ہاجرہ کو دیکھتی ہے)

//Cut//

Scene No # 22

وقت: رات

جگہ: سارنگا کا اڈہ

کردار: موسیٰ، سارنگا، نامراد، چاند پوری

کوئی بڑا کمرہ۔ ہال

فیضی اور سعیدہ کرسیوں سے بندھے بیٹھے ہیں۔ سارنگا کا کوئی کارندہ فیضی کے چہرے پر زوردار چانٹا مارتا ہے، فیضی کی ڈر کے مارے چیخ نکل جاتی ہے اور اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلتی ہے۔

فیضی: میرا یقین کرو..... خدا کی قسم..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں..... مجھے نہیں پتہ زہرہ کہاں ہے.....

چاند پوری: تیرا یقین کریں نمک حرام..... تجھ جیسے بے غیرت اور احسان فراموش کا یقین کریں جس نے اسی عورت کے گھر ڈاکہ ڈالا جس نے تجھے برسوں پالا..... تیرا خیال رکھا..... ہر غمی خوشی میں تیری مدد کی..... اور تو نے بدلے میں کیا کیا..... اسی کو ڈس لیا.....

(چاند پوری فیضی کو ایک اور جھانپڑ رسید کرتا ہے۔ موسیٰ بے چین اور بے قرار سا پیچھے ٹہل رہا ہے، وہ جلدی سے فیضی کی

طرف بڑھتا ہے)

موسیٰ: دیکھو میرا دماغ پہلے ہی بہت خراب ہو رہا ہے..... میرے ہاتھ سے آج تمہارا خون ہو جائے گا..... اتنا تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ موت بھی کانپ اٹھے گی..... تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ زہرہ کہاں گئی.....

(فیضی رونے لگتا ہے)

فیضی: میں سچ کہہ رہا ہوں موسیٰ بھائی..... ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ زہرہ میری ہی گاڑی میں تھی..... اور ہمارا ارادہ اسے وہیں پارک میں چھوڑ دینے کا تھا..... مگر جب میں کچھ دیر کے لیے نیچے اترا تو پتہ نہیں وہ کب اور کس وقت گاڑی سے نکل گئی۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ مگر وہ ملی نہیں مجھے.....

(سارنگا غور سے فیضی کو دیکھ رہا ہے)

سارنگا: یہ کیا کہانی سنا رہا ہے حرام کا.....

نامراد: جب لیلیٰ میڈم نے مجھے فون کر کے بتایا کہ کسی نے زہرہ کو اغوا کر رکھا ہے اور اس کے بدلے تاوان کی رقم پارک میں لانے کو کہا ہے تو میں اس علاقے سے بہت دور تھا استاد..... میں نے فوراً بلے کو فون کیا جس کا وہ علاقہ ہے، اور بلے کو اس پر نظر رکھنے کا کہا..... بلے نے بتایا کہ اس کی گاڑی سے یہ عورت اتر کر پارک کے اندر گئی تو وہ اسی کے پیچھے لگا رہا..... اور اس کے گھر تک پہنچ گیا۔ اس فیضی کا پیچھا اس لیے نہیں کیا کیوں کہ اسے تو پیسوں کے لیے اپنے گھر پلٹنا ہی تھا۔ تو میں بھی سیدھا بلے کے بتائے ہوئے پتے پر ان کے گھر پہنچ گیا۔ مگر وہاں زہرہ نہیں ملی ہمیں.....

(سارنگا افسوس سے سر پر ہاتھ مارتا ہے)

سارنگا: سارنگا یہیں غلطی ہو گئی تم حرام خوروں سے..... ایک بندہ اس کمینے کے سر پر بھی لگائے رکھتے تو ساری کہانی کھل جاتی آج..... چل ٹھیک ہے..... ان دونوں کو کچھ نہیں پتہ تو پھر ہمارے بندے بھی کس کام کے..... اس حرام خور بلے سے کہو کہ مار کر وہیں پرانے پارک میں پھینک دے ان کو.....

(سارنگا کی بات سن کر فیضی اور سعیدہ کی جان نکل جاتی ہے)

//Cut//

Scene No # 23

وقت: رات

جگہ: کاشانہ، پیراں، کمرہ، زنانہ

زہرہ اور موسیٰ کی ماں ہاجرہ آمنے سامنے کھڑی بات کر رہی ہیں۔

ہاجرہ: ہاں..... جانتی ہوں..... لیکن آج میں ہی تم سے یہ بات کہہ رہی ہوں..... اونچ نیچ کے جو معیار میرے اندر خود ساختہ طور پر تعمیر تھے..... وہ میرے بیٹے کی جدائی نے توڑ ڈالے ہیں..... نیک، بد..... اچھا برا..... کم ذات یا بلند ذات..... اعلیٰ یا ادنیٰ..... یہ سب تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی مرضی سے اپنے پیدا ہونے کی جگہ نہیں چنتا.....

زہرہ: ہاں..... مگر زمانہ آج بھی انہی رواجوں، نیک نامی اور بدنامی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے..... میرے اور آپ کے سوچنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جب یہ بات آپ کے گھر والوں کو پتہ چلے گی کہ میں وہی زہرہ ہوں جو.....

ہاجرہ: یہ بات میرے اور تمہارے علاوہ کبھی کسی کو پتہ نہیں چلے گی..... تم یہاں زرّی بن کر آئی ہو اور زرّی کی حیثیت سے ہی قیام کرو گی..... علامہ شہاب صاحب نے تمہاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی لی ہو گی..... اور میرے شوہر کے لیے علامہ شہاب کی کہی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے..... قدرت نے جب تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے تو پھر خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دو..... کبھی کبھی ہم انسان بہت بے بس ہو جاتے ہیں حالات کے سامنے..... ایسے میں ہتھیار ڈال کر

خود کو مقدر کے سپرد کر دینا ہی عقل مندی ہے.....

زہرہ: پتہ نہیں.....میری قسمت میں کیا لکھا ہے.....

ہاجرہ: مگر یہ طلاق کا داغ.....ابھی تو تمہارے ارمانوں کی کلیاں کھلنے کے دن تھے.....،.....مگر تم تو سارا باغ ہی جلا بیٹھی ہو..... یہ سب ہوا کیسے.....

زہرہ: کسی کم ظرف کے ساتھ رشتہ جُڑ گیا تھا میرا.....مجبوری یہ تھی کہ ہم جیسوں کی حقیقت جان کر ہمیں اپنانے والے بہت کم ہوتے ہیں.....اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے معیار پر بھی پورے اترتے ہوں.....وہ مجھے دوبارہ محفل کی طرف دھکیلنا چاہتا تھا جبکہ میں گھر کی چار دیواری میں جینا چاہتی تھی.....اسی کش مکش میں رشتہ ٹوٹ گیا میرا.....

(ہاجرہ دکھ سے زہرہ کو دیکھ رہی ہے)

ہاجرہ: بدنصیب تھا وہ جس نے تمہیں کھو دیا.....پچھتائے گا وہ بہت.....کبھی کبھی ہمیں کچھ کھونے کے بعد ہی اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے.....بہر حال.....تم یہیں اپنی عدت پوری کرو گی.....شاید تمہارے کسی کام آ کر میں بھی اپنی ماضی کی غلطی کا کچھ مداوا کر سکوں.....ہاں مگر دھیان رہے.....تمہارے ماضی کے بارے میں یہاں ہرگز کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔(ہاجرہ زہرہ کو تسلی دیتی ہے۔)

زہرہ پریشان سی کھڑی ہاجرہ کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: رات

جگہ: سارنگا کا اڈہ

کردار: موسیٰ، نامراد، چاند پوری

سارنگا کے کارندے فیضی اور سعیدہ کی طرف بڑھتے ہیں۔سعیدہ خوف کے مارے چلا اٹھتی ہے۔

سعیدہ: مجھے مت مارو.....خدا کے لیے.....میرا کوئی قصور نہیں ہے.....یہ بدبخت فیضی ہی اس لڑکی کو وہاں لے کر آیا تھا۔یہ سارا منصوبہ اسی کا تھا.....میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ اس لڑکی کو جانے دے.....مگر اس نے میری ایک نہیں سُنی.....

(فیضی بیوی کو یوں ایک دم نظریں بدلتے دیکھ کر غصے میں چلا اٹھتا ہے)

فیضی: بدبخت عورت.....اتنی جلدی نظریں پھیر لیں تو نے.....اب ان کو یہ بتاؤ کہ پانچ کروڑ کی رقم کا سن کر کس کی رال ٹپک گئی تھی اسی لمحے.....

(نامراد کچھ کہنے لگتا ہے مگر سارنگا اُسے نظر کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے تاکہ دونوں میاں بیوی خود ہی ایک دوسرے کے پول کھول دیں)

سعیدہ: میں سچ کہہ رہی ہوں بھائی.....میرا یقین کریں.....اس کے منصوبے میں اس کا پرانا سیٹھ توقیر بھی شامل تھا.....وہی لیلیٰ کا شوہر.....وہی جیل میں بیٹھ کر یہ ساری منصوبہ بندی کر رہا تھا.....اور اس کمینے فیضی کی بھی ساری ڈوریاں اسی پرانے باس کے ہاتھ میں تھیں.....اصل قصوروار تو وہ ہے.....

(توقیر کے نام پر سب چونکتے ہیں)

نامراد: اچھا.....تو وہ بے غیرت بھی شامل ہے اس سارے پلان میں.....مگر اسے زہرہ سے کیا دشمنی تھی۔

سعیدہ: دشمنی اس کی زہرہ سے نہیں.....موسیٰ سے ہے.....جس کی وجہ سے وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہے۔یہ ساری باتیں مجھے خود فیضی نے بتائی ہیں.....قسم لے لو مجھ سے.....

سارنگا: چل ٹھیک ہے بے نامراد کہیں کے..... عورت کو رہنے دے..... مرد کو مار دے..... مگر شرط یہ ہے کہ یہ عورت اپنے مرد کا سارا کچا چٹھا کھولے گی اور ہمیں زہرہ بھی ڈھونڈ کر دے گی۔

فیضی: سارنگا استاد..... قسم سے یہ ناہنجار بے وفا عورت جھوٹ بول رہی ہے..... مجھے اس جرم پر اس نے اُکسایا ہے..... اور زہرہ کو میں تلاش کر کے دوں گا آپ کو.....

(فیضی چلاتا رہتا ہے)

(سارنگا اپنے کارندوں کو اشارہ کرتا ہے وہ سعیدہ اور فیضی کو زبردستی گھسیٹ کر باہر لے جاتے ہیں۔

سارنگا: صرف آج کی رات ہے تم دونوں کے پاس، خود ہی فیصلہ کر لو کون جھوٹ بول رہا ہے..... اور کون سچ..... لے جا کر ڈال دو ان دونوں کو کسی اندھیرے تہہ خانے میں..... جہاں سانپ بچھو لٹکتے ہوں رات کو..... صبح تک بچ گئے تو پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے ان کا.....

فیضی اور سعیدہ چلاتے رہتے ہیں مگر کارندے انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر کھینچتے ہوئے باہر لے جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: رات

جگہ: لیلیٰ کا گھر۔ لاؤنج

لیلیٰ بے چینی سے ٹہل رہی ہے اور فون پر نامراد سے بات کر رہی ہے۔

لیلیٰ: مجھے اپنے پیسوں کی ذرہ برابر بھی فکر نہیں ہے نامراد..... زہرہ اور موسیٰ کو ملانے کے لیے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں..... میری تو یہ سوچ سوچ کر جان ہلکان ہو رہی ہے کہ جانے زہرہ کہاں ہو گی..... کس حال میں ہو گی.....

نامراد: اسی بات کی ہمیں بھی فکر ہے..... موسیٰ اور چاند پوری نکل پڑے ہیں بندے لے کر..... رات بھر سارا علاقہ چھان ماریں گے وہ..... ہر پتھر پلٹ کر دیکھیں گے..... بس آپ دُعا کریں کہ زہرہ

لیلیٰ: آمین..... مگر موسیٰ..... موسیٰ تو اب تک خفا ہے ناں مجھ سے..... شاید میری شکل دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے وہ اب کبھی.....

نامراد: موسیٰ کا دل بہت بڑا ہے میڈم..... بس وہ بہت پریشان ہے زہرہ کی گم شدگی کی وجہ سے..... ورنہ آپ جانتی ہیں..... وہ کسی اپنے سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا.....

لیلیٰ: (لیلیٰ دُکھی ہے) ہاں..... جانتی ہوں..... مگر افسوس یہ جاننے میں میں نے بہت دیر کر دی..... اچھا سنو..... میں جاگ رہی ہوں..... جیسے ہی وہ لوگ زہرہ کی کوئی خبر لے کر آئیں..... مجھے اسی وقت ضرور بتانا.....

//Cut//

Scene No # 26

وقت: رات کا سوناٹا

جگہ: شہر کی سڑکیں

موسیٰ، چاندی پوری اور کچھ کارندے سارنگا کی جیپ/ڈبل کیبن/ویگو vigo گاڑی میں شہر کی سڑکوں پر آدھی رات کے وقت زہرہ کی تلاش میں در بدر بھٹک رہے ہیں۔ موسیٰ اداس اور پریشان ہے، اسے زہرہ کی یاد کے فلیش بیک flash backs آ رہے ہیں۔ زہرہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے جھلک رہا ہے۔ سارنگا کے کارندے آس پاس گزرتے لوگوں اور اکا دُکا کھلی

دوکانوں کے دوکان داروں سے کچھ پوچھ رہے ہیں اور زہرہ کی تلاش جاری ہے۔مگر ہر طرف سے ناکامی ان کا مقدر ہے۔

//Cut//

Scene No # 27

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں

زہرہ کا کمرہ

(مونتاج): زہرہ اپنے کمرے میں بستر پر اداس اور غم گین سی لیٹی ہوئی ہے،اسے اپنی گزری زندگی کے پل.....موسیٰ کا ملنا،شہریار سے نکاح،اور پھر جھگڑوں کے بعد طلاق کے مناظر یاد آ رہے ہیں۔زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور آنسو آنکھوں سے ٹپک کر تکیے میں جذب ہو جاتے ہیں۔زہرہ روتی رہتی ہے۔باہر رات ڈھلتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 28

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں

کردار: سکینہ کا کمرہ

سکینہ اکیلی بیٹھی عیسیٰ کا فون نمبر ڈائل کر رہی ہے۔مگر دوسری طرف سے فون بند مل رہا ہے۔سکینہ جھنجھلا کر فون پٹخ دیتی ہے۔خدیجہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔اور بیٹی سے پوچھتی ہے۔

خدیجہ: بات ہوئی عیسیٰ سے.....

سکینہ: نہیں اماں.....فون ہی بند کر رکھا ہے اس نواب زادے نے.....

خدیجہ: ہونہہ.....شوہر کو ایسا نہیں کہتے.....

سکینہ: اور شوہر،اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا.....اس طرح بنا ء بتائے کوئی جیل پڑتا ہے کیا.....اپنے کپڑے تک نوکر کے ہاتھ منگوا لئے.....کیا ہو جاتا اگر وہ دو گھڑی گھر آ کر بتا جاتا کہ کہاں اور کتنے دن کے لیے جا رہا ہے.....بس بیگ منگوالیا گھر سے کہ سفر پر جا رہا ہوں.....بیگ پیک کر دو.....

خدیجہ: اری لڑکی.....اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو.....،پیر صاحب نے بتایا تو تھا کہ عیسیٰ کو علامہ صاحب اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں کچھ دن کے لیے۔تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے عیسیٰ پہلی مرتبہ گھر سے باہر گیا ہو.....وہ پہلے بھی جاتا رہا ہے موسیٰ کے ساتھ ایسے دوروں پر.....

(سکینہ جھنجھلائی جاتی ہے)

سکینہ: اوہو اماں.....پہلے کی بات اور تھی.....بس تم رہنے دو.....تم نہیں سمجھو گی.....ویسے تم نے یہ مجھے اچھا بنا کر کچھ اچھا نہیں کیا میرے ساتھ.....

(سکینہ جھنجھلاہٹ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اٹھ جاتی ہے۔ماں حیرت سے بیٹی کو دیکھتی ہے۔)

خدیجہ: اب میں نے کیا کر دیا ہے.....کمال ہے یہ لڑکی.....

//Cut//

Scene No # 29

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں، زہرہ کا کمرہ

زہرہ بستر پر لیٹی ہوئی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے..... اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر زور کی دستک ہوتی ہے۔ زہرہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ اور دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ کچھ لمحے بعد دوسری مرتبہ کوئی زیادہ زور سے دروازہ دھڑ دھڑاتا ہے۔ زہرہ ڈر کر کہتی ہے۔

زہرہ: کک..... کون..... کون ہے وہاں.....

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 25

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں

زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے کمرے کے دروازے پر باہر سے کوئی زور زور سے دستک دے رہا ہے۔ زہرہ گھبرا کر پوچھتی ہے مگر پھر جواب نہ ملنے پر اٹھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں دروازے کے قریب آ کر پوچھتی ہے۔

زہرہ: کون ہے باہر.....؟

باہر سے سکینہ کی آواز آتی ہے۔

سکینہ: میں ہوں سکینہ.....زری دروازہ کھولو.....

زہرہ دروازہ کھول دیتی ہے۔ سکینہ اندر آ جاتی ہے۔

سکینہ: تم سوتو نہیں گئی تھیں..... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی..... سوچا تھوڑی دیر تم سے بات کرلوں..... شاید من بہل جائے.....

زہرہ: کیوں پریشان ہو.....؟.....اور تمہارا شوہر کہاں ہے.....؟ سکینہ کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ اور چڑ کر کہتی ہے۔

سکینہ: اسی کی وجہ سے تو یہ ساری پریشانی ہے..... وہ مجھے بتائے بغیر اور مجھ سے ملے بنا ہی کہیں تبلیغ پر نکل گیا ہے۔

(زہرہ سکینہ کے غصے پر دھیمے سے مسکرا دیتی ہے۔)

زہرہ: تو گویا تمہارا یہ غصہ اس کے تم سے نہ مل کر جانے پر ہے۔

(سکینہ منہ بناتی ہے)

سکینہ: تو اور کیا.....، ایسا بھی کیا کرتا ہے کوئی..... میں جتنی بھی کوشش کرلوں اچھی بیوی بننے کی..... وہ ضرور کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کر دیتا ہے کہ مجھے غصہ آ جاتا ہے.....

زہرہ: مگر تم غصے والی لگتی تو نہیں ہو.....

سکینہ: اب نہیں رہی۔ پہلے بہت غصہ کرتی تھی۔ سارا گھر سر پر اٹھا لیا کرتی تھی۔

زہرہ: کون کون ہے تمہارے گھر میں.....

سکینہ: میں.....میری اماں.....ہاجرہ تائی اور میرے سُسر پیر قدرت اللہ..... میرا شوہر عیسیٰ.....اور میرا بھائی موسیٰ.....، جو اب میرا جیٹھ بھی ہے.....مگر.....

(موسیٰ کے نام پر سکینہ دُکھی اور زہرہ اپنے جذبات چھپاتی ہے۔)

زہرہ: مگر کیا.....

سکینہ: میرے موسیٰ بھائی کو تایا جان نے گھر بدر کر دیا ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔

(زہرہ چونکتی ہے)

زہرہ: تمہاری وجہ سے.....مگر کیسے.....

سکینہ: لمبی کہانی ہے..... سناؤں گی تو دیر ہو جائے گی..... تمہاری نیند کا وقت ہوگا.....

زہرہ: میری نیند اب مجھ سے روٹھی رہتی ہے۔تم چاہو تو اپنے دل کی بات کر سکتی ہو میرے ساتھ۔

سکینہ: میں کبھی کسی کے سامنے اتنی جلدی نہیں کھلتی.....مگر پتہ نہیں.....تم میں ایسا کیا ہے.....تمہیں دیکھتے ہی اپنی سہیلی بنانے کو جی چاہتا ہے.....بہت اپنی سی لگی ہو تم مجھے.....سنو.....تم میری سہیلی بنو گی.....دوستی کر لو مجھ سے.....میں بہت اکیلی ہوں یہاں.....

سکینہ زہرہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: کاشانہ ءپیراں

کردار: قدرت اللہ کا گھر

ہاجرہ اور قدرت اللہ موجود ہیں۔

قدرت اللہ: علاقہ حضرت کی نظر بہت دُور تک دیکھتی ہے۔ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی رمز چھپی ہوتی ہے۔انہوں نے اگر اس لڑکی پر توجہ دی ہے اور اسے خاص طور پر میری نگرانی اور ذمہ داری میں دیا ہے تو ضرور اس میں بھی کوئی مصلحت چھپی ہو گی.....

(ہاجرہ دھیرے سے کہتی ہے۔)

ہاجرہ: لیکن کیا اس لڑکی نے اپنا کچھ اتہ پتہ نہیں بتایا علامہ حضرت کو.....

(ہاجرہ حیرت سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے)

قدرت اللہ: نہ انہوں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی.....اور نہ ہی کسی نے کچھ بتانے کی.....مگر لڑکی باحیاء، پردہ دار اور اس نے اچھے گھرانے کی لگتی ہے.....انسان کے منہ سے نکلے دو بول ہی اس کے خاندان اور تربیت کی خبر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں.....

ہاجرہ: درست کہہ رہے ہیں آپ.....بہت سلجھی ہوئی اور شائستہ اطوار کی لڑکی ہے.....

قدرت اللہ: بس اب یہ دھیان رہے کہ اُسے یہاں کسی قسم کی تکلیف یا زحمت نہیں ہونی چاہیے.....علامہ صاحب نے اسے اپنی امانت کے طور پر چھوڑا ہے میرے پاس.....کہیں تم لوگ مجھے شرمندہ نہ کروا دینا ان کے سامنے۔

(ہاجرہ کسی سوچ میں گم کہتی ہے)

ہاجرہ: آپ بے فکر ہو جائیں.....وہ یہاں ایسے ہی رہے گی جیسے کوئی بیٹی اپنی ماں کے گھر رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور سکینہ بیٹھی بات کر رہی ہیں۔زہرہ کے چہرے پر شدید دُکھ کے تاثرات ہیں جبکہ سکینہ بھی روہانسی سی ہو چکی ہے۔

سکینہ: لیکن موسیٰ بھائی نے مجھے اپنے سر کی قسم دے دی کہ میں یہ بات کسی کو گھر جا کر نہیں بتاؤں گی.....یہاں سب یہی سمجھتے رہے کہ موسیٰ بھائی نے اپنی زہرہ کو بچانے کے لیے ان لڑکوں پر گولی چلائی تھی۔پولیس موسیٰ بھائی کو گرفتار کر کے لے گئی اور تایا جان نے موسیٰ بھائی کے اس گھر میں داخلے پر عمر بھر کے لیے پابندی لگا دی.....میری ایک غلطی نے میرے بھائی کی

زندگی برباد کردی..... وہی بھائی جسے میں اپنا دشمن سمجھتی رہی مگر وقت آنے پر اس نے اپنا سب کچھ صرف میری عزت بچانے کے لیے قربان کر دیا.....

(زہرہ کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی ہیں، وہ بڑی مشکل سے اپنے اندر کے جذبات چھپاتی ہے۔)

زہرہ: مگر..... تم نے ابھی خود ہی تو بتایا تھا کہ بعد میں یہ بات سارے گھر والوں سمیت تمہارے شوہر پر بھی کھل گئی تھی کہ موسیٰ زہرہ کو نہیں۔ تمہیں بچانے کے لیے وہاں گیا تھا..... تو پھر اس کے لیے آج تک اسے معاف کیوں نہیں کیا.....

سکینہ: تایا جان موسیٰ بھائی کو اس وقت تک ہرگز معاف نہیں کریں گے جب تک وہ اپنے دل سے زہرہ کا خیال نہیں نکال دیتے..... اس کا نام لینا نہیں چھوڑ دیتے..... زہرہ دھیرے سے پوچھتی ہے، اس کے لہجے میں دُکھ ہے۔

زہرہ: تو کیوں نہیں نکال دیتے تمہارے موسیٰ بھائی ایسی بدنام لڑکی کو اپنے دل سے..... کیوں اس کے نام سے دست بردار نہیں ہو جاتے۔ آخر دیا ہی کیا ہے اس لڑکی نے آج تک انہیں۔ سوائے بدنامی، رسوائی اور دربدری کے.....

(زہرہ کے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے ہیں)

سکینہ: ناممکن..... موسیٰ بھائی سانس لینا تو بھول سکتے ہیں..... مگر زہرہ کا نام لینا نہیں..... وہ تو ان کے اندر بستی ہے۔ ایسے ہی تو نہیں اپنا گھر بار، ماں باپ اور معاشرے میں اتنا بڑا مقام چھوڑ کر یہ جوگ نہیں لے لیا انہوں نے کسی کے لیے۔

(زہرہ دُکھی لہجے میں سکینہ سے پوچھتی ہے۔)

زہرہ: کیوں..... ایسی کیا خاص بات ہے اس زہرہ میں۔

سکینہ: یہ تو میں نہیں جانتی..... میں کبھی ملی ہی نہیں اس سے۔ مگر موسیٰ بھائی کی نظر سارے زمانے میں اگر کسی ایک لڑکی پر جا کر ٹھہری ہے تو وہ ضرور بہت خاص ہو گی..... کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی کی نظر کبھی کسی عام پر رک ہی نہیں سکتی۔

زہرہ: مگر تمہارے گھر والے..... وہ تو اسے وہی بدنام اور بازاری لڑکی سمجھتے ہیں ناں..... رُسوائیوں سے لتھڑی کسی نیچ خاندان کی اولاد.....

سکینہ: ہاں..... کیونکہ ان لوگوں کے پاس وہ نظر نہیں ہے جو موسیٰ بھائی کے پاس ہے..... پہلے میں بھی انہی لوگوں کی طرح تھی جو صرف انسان کا ظاہر دیکھتے ہیں..... اس کے باطن میں نہیں جھانکتے..... مگر اللہ جن کے دلوں میں محبت ڈالتا ہے..... ان کو باطن کے اندر جھانکنے والی نظر بھی عطا کر دیتا ہے..... اسی اللہ نے میرے موسیٰ بھائی کے دل میں زہرہ کی محبت ڈالی ہے اور اُسی نے انہیں وہ نظر بھی عطا کی..... جس کے بغیر یہ سب گھر والے اندھے ہیں.....

زہرہ: ہمارے معاشرے میں ایسی نظر رکھنے والے تو چند ہی ہوں شاید..... لوگ تو زمانے کے معیار پر ہی کسی کو پرکھتے ہیں ناں..... پھر تمہارے موسیٰ بھائی کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی کہ جو سب کو نظر آئے..... وہی سچ مانا جاتا ہے اور جو اسے ماننے سے انکار کرے..... یہ سماج اسے اندھا سمجھتا ہے..... پھر موسیٰ نے سارے زمانے سے ٹکر کیوں لی..... تم تو بہن ہو اس کی..... تمہیں اسے سمجھانا چاہیے تھا.....

(سکینہ فخر سے بتاتی ہے، سکینہ بولتی رہتی ہے اور زہرہ کے دل پر آرے چلتے رہتے ہیں)

سکینہ: میرے موسیٰ بھائی زمانے وانے سے نہیں ڈرتے..... بس جو دل میں سما گیا..... سو سما گیا..... وہ تو میرے تایا جان کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے زہرہ کی خاطر..... اسی باپ کے سامنے جن کی ایک آواز پر ہم سب ننگے پاؤں دوڑے جاتے ہیں..... جن کے سامنے کبھی موسیٰ بھائی نے نظر اٹھانا تو دُور..... پلک جھپکانے کی ہمت بھی نہیں کی تھی..... مگر ہمارے ہاں ذات پات، اونچ نیچ، برادری اور خاندان کی بہت اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئیں موسیٰ بھائی کے لیے..... اور میرا بھائی یہ دیواریں پار نہیں کر پایا.....

(سکینہ بولتے بولتے رو پڑتی ہے۔ زہرہ اذیت سے کہتی ہے)

زہرہ: پھر تو میں یہی دعا کروں گی کہ تمہارے بھائی کا دل خدا اس لڑکی کی طرف سے پلٹ دے..... تاکہ ان کی یہ اذیت ختم ہو جائے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن نکلنے کا موقع

جگہ: شہر میں صبح ہو رہی ہے
کوئی تہہ خانہ/

فیضی تہہ خانے میں بندھا پڑا ہے۔ کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے زمین پر پھینک دیا ہے۔ فیضی تکلیف سے کراہ رہا ہے اور ادھر اُدھر حرکت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اس کے ہاتھ پاؤں کھل جائیں۔ اتنے میں اوپر سیڑھیوں پر دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ فیضی ساکت ہو جاتا ہے۔ سارنگا کے دو کارندے سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آتے ہیں۔ ان میں ایک فیضی کو سیدھا کر کے بٹھاتا ہے۔

کارندہ نمبر1: چل بھئی فیضی عرف بے فیض انسان..... تیری رُخصتی کا وقت ہو گیا ہے۔

کارندہ نمبر2: ابے اس کے منہ سے کپڑا تو نکال دے..... شاید کوئی آخری خواہش ہو۔ اس کمینے کی.....

کارندہ نمبر1: چل تو کہتا ہے تو سُن لیتے ہیں اس کی آخری خواہش بھی..... ورنہ سارنگا استاد نے تو اسے یوں ہی بند منہ اور زبان کے ساتھ اوپر بھیجنے کا حکم دیا ہے.....

(کارندہ فیضی کے منہ میں ٹھنسا کپڑے کا گولا نکال کر ایک جانب پھینک دیتا ہے۔ فیضی کی آنکھیں خوف کے مارے باہر نکل پڑی ہیں اس سے بات نہیں ہو پا رہی۔)

فیضی: یہ..... یہ تم لوگ..... کیا باتیں کر رہے ہو..... دیکھو..... مجھ پر رحم کرو..... میں..... میں کیسے سمجھاؤں تمہیں..... تم..... تم مجھے سارنگا استاد کے پاس لے جاؤ۔ میں ان کے پیروں میں گر کر اپنی جان کی بھیک مانگ لوں گا..... وہ..... وہ ضرور مجھے معاف کر دیں گے..... دیکھو..... مجھے مت مارو..... رحم کرو مجھ پر.....

کارندہ نمبر2: استاد نے تو تم پر رحم کھایا تھا اس لڑکی کا پتہ پوچھ کر..... مگر تم خود ہی اپنی جان کے دشمن بنے ہو تو کوئی کیا کرے۔

فیضی: خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ پارکنگ میں کھڑی گاڑی سے وہ لڑکی نکل کر کہاں چلی گئی۔ میں تو اسے بے ہوش سمجھ کر چند لمحوں کے لیے نیچے اترا تھا..... میرا یقین کرو.....

کارندہ نمبر1: یہ ایسے نہیں مانے گا بے..... چل..... کلمہ پڑھ لے۔ تیرا آخری وقت آ گیا ہے..... تیری بیوی کو تو ہم نے رات کو ہی ٹھکانے لگا دیا تھا..... اس نے بھی یہی بات چھپانے کی غلطی کی تھی۔

(فیضی کی جان نکل جاتی ہے)

فیضی: کیا.....؟..... تم لوگوں نے سعیدہ کو مار ڈالا..... اوہ میرے خدا..... اسے بھی کچھ نہیں پتہ تھا کہ وہ لڑکی کہاں چلی گئی ہے۔ وہ تو اندر پارک میں گئی تھی لیلیٰ سے پیسے لینے.....

کارندہ: اوہو۔ پھر تو غلطی ہو گئی ہم سے..... چلو کوئی بات نہیں..... تجھے بھی اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ یاد کرتی ہو گی وہ تجھے وہاں۔

(کارندہ فیضی کی کن پٹی پر پستول رکھ دیتا ہے۔ فیضی زور سے چلاتا ہے۔)

فیضی: مجھے میری مری ہوئی ماں کی قسم میں نہیں جانتا کہ زہرہ کہاں ہے..... خدا کے لیے مجھے نہ مارو..... میں تم سے۔

فیضی کی بات اس کے منہ میں ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی لمحے تہہ خانے میں فائر کی آواز گونجتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ،

سارنگا کا کمرہ، موسیٰ، سارنگا، چاند پوری، نامراد کمرے میں موجود ہیں۔ اچانک باہر کہیں کسی فائر کی آواز گونجتی ہے۔ نامراد اچھل سا جاتا ہے۔ سارنگا آرام سے آنکھیں بند کئے لیٹا رہتا ہے۔

نامراد: یہ آواز کیسی تھی..... کیا واقعی مار ڈالا اسے استاد.....

سارنگا: نہیں رے..... دشمن کو جان سے مار ڈالا تو مطلب اسے آزاد کر ڈالا..... ایک گولی بھیجے گئی نہیں کہ رُوح فٹ سے نکلی..... یہ کیا سزا ہوئی بھلا..... میں تو اسے دشمن پر رحم کرنا سمجھتا ہوں۔

چاند پوری: واہ استاد واہ..... دشمنی نبھانا تو کوئی تم سے سیکھے..... تم تو پل پل مارتے ہو اپنے دشمن کو..... جس لمحے اس کی کن پٹی پر طمنچہ رکھا جاتا ہے، اس کی رُوح تو اسی لمحے پرواز کر جاتی ہوگی..... اور ہر لمحہ یہ دھڑکا کہ اب مرے کہ تب مرے اسے خود موت کی بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتا ہے.....

(موسیٰ کہیں کھویا ہوا ہے۔ وہ اسی کھوئے کھوئے لہجے میں کہتا ہے۔)

موسیٰ: کس کس کو ماریں گے ہم سارنگا بھائی..... چھوڑ دو انہیں..... جانے دو.....

(نامراد حیرت سے کہتا ہے)

نامراد: یہ کیا کہہ رہے ہو یار..... چھوڑ دیں انہیں۔

موسیٰ: ہاں..... چھوڑ دو..... یہاں تو سارا زمانہ اپنا دشمن ہے۔ کس کس کے خون سے ہاتھ رنگیں کریں گے ہم..... مجھے ایک بات سمجھ میں آئی ہے..... جب تقدیر کسی کی مخالف ہو جائے تو پھر یہ عام معمولی بندے کچھ نہیں کر سکتے..... یہ تو صرف اس تقدیر کے مہرے ہوتے ہیں۔ میرا اصل دشمن تو میرا مقدر ہے..... میرا نصیب ہے میرا قاتل..... یہ کمزور لوگ بھلا میرا کیا بگاڑ لیں گے..... میری لڑائی اپنی تقدیر سے ہے..... جسے میں ہر روز ہار رہا ہوں.....

(سارنگا آنکھیں کھول کر موسیٰ کو دیکھتا ہے۔)

سارنگا: فکر مت کر رے..... تُو اکیلا نہیں ہے اپنے مقدروں سے سر پھوڑنے والا..... کچھ اور بھی پڑے ہیں ہم جیسے..... جب تک تیری زہرہ مل نہیں جاتی۔ ہم سارے بھی اپنا سر پھوڑتے رہیں گے اپنی دیواروں سے.....

چاند پوری: مگر ان دونوں خبیث میاں بیوی کا کیا کرنا ہے سارنگا استاد.....؟

سارنگا: تھانے دار کو بلا کر کوتوالی کے حوالے کر دے انہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے کسی کام کے نہیں..... سر پر پستول تنا ہو اور گولی چلانے کے لیے طمنچے کا گھوڑا دبانے کی آواز بھی کان میں پڑے تو بڑے سے بڑے سُورما کا بھی پتہ پانی ہو جاتا ہے..... ایک بات تو پکی ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کو زہرہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے..... ورنہ کب کا بک چکے ہوتے..... اوپر والوں سے بول کر ایسا پرچہ کٹواؤ کہ آٹھ دس سال دونوں سرکار کی چکی پیستے رہیں.....

نامراد: ہاں..... یہ ٹھیک ہے..... اس طرح اس کمینے تو قیر کو بھی مزید لمبی سزا ہو گی اس دوسرے مقدمے میں..... وہ بھی تو شامل تھا اس سارے منصوبے میں۔

(موسیٰ ان سب کی باتوں سے بے زار سا اٹھ کر کمرے سے نکل جاتا ہے چاند پوری اور نامراد پریشانی سے سارنگا کی طرف دیکھتے ہیں۔ سارنگا لمبی آہ بھرتا ہے۔)

سارنگا: اپنے اندر سے لڑ رہا ہے..... لڑنے دو اسے یہ جنگ..... یہ ہارنے والوں میں سے نہیں ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

پیر قدرت زنانے کی طرف آتا ہے اور ایک نوکرانی کو آواز دے کر روکتا ہے۔ نوکرانی جلدی سے پلو سر پر ڈھک کر با ادب ہو جاتی ہے۔

نوکرانی: جی پیر جی.....

قدرت اللہ: بھئی وہ سکینہ کہاں ہے۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ مجھے مہمان سے پوچھ کر بتا دے کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں..... تا کہ میں کسی کو کہہ کر منگوا دوں بازار سے.....

نوکرانی: جی..... سکینہ بی بی تو شاید اندر گئی ہیں..... آپ کہیں تو میں بُلا لاؤں۔

(پیر قدرت کچھ سوچتا ہے)

قدرت: ہاں..... نہیں تم رہنے دو۔ میں خود ہی مل آتا ہوں..... دو گھڑی حال احوال بھی پوچھ لوں گا..... تم نے اندر پردے کا تو کہہ دیا ہے ناں.....

نوکرانی: جی جی..... میں نے کہلوا دیا ہے.....

پیر قدرت سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، زنان خانہ

پیر قدرت سکینہ کو آوازیں دیتا ہوا گھر کے زنانہ حصے/مہمان خانے کی طرف آتا ہے۔

قدرت: سکینہ..... سکینہ..... کہاں ہو..... ذرا بات سن لو میری.....

تبھی ایک جالی/کسی دروازے یا کھڑکی کی اوٹ سے یا کسی پردے کے پیچھے سے اس کی نظر اندر کمرے میں تخت پوش پر بچھے جائے نماز پر بیٹھی زہرہ پر غیر ارادی طور پر پڑ جاتی ہے..... زہرہ اپنا سر پوری طرح سفید دوپٹے سے ڈھانکے اور جسم کو پوری طرح کسی بڑی چادر میں لپیٹے جائے نماز پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے۔

نماز ختم کر کے وہ سلام پھیرتی ہے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی ہے..... پیر قدرت اسے دیکھتا ہے کہ دعا کرتے وقت زہرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ پیر قدرت زہرہ کا یہ باپردہ روپ اور اس کی عبادت کا انداز دیکھ کر بہت متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے۔

قدرت اللہ: جزاک اللہ.....

(پھر قدرت بنا کچھ کہے وہاں سے پلٹ جاتا ہے۔ سامنے سے وہی نوکرانی آ رہی ہے۔)

نوکرانی: جی پیر جی..... میں نے سکینہ بی بی کو بتا دیا ہے کہ آپ یاد کر رہے ہیں۔

قدرت: نہیں..... بس رہنے دو..... ذرّی بیٹی اپنی عبادت میں مصروف ہے شاید اس وقت..... تم یہیں رہو اور مہمان کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً رحیم یا سلطان کو بازار بھیج کر منگوا دیا کرو..... کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

(نوکرانی سر جھکاتی ہے)

نوکرانی: جی پیر جی۔

قدرت اللہ کسی سوچ میں گم وہاں سے چل پڑتا ہے۔

//Cut//

مونتاج: لیلیٰ کا گھر

آؤٹر.....

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: لیلیٰ کا گھر

لاؤنج.....ڈرائنگ روم وغیرہ

لیلیٰ کسی سوچ میں گم بیٹھی ہے، نامراد اندر آتا ہے۔اس کے ہاتھ میں وہی پیسوں کا بیگ ہے جو لیلیٰ پارک میں چھوڑ کر آئی تھی۔

نامراد: یہ لیں میڈم جی.....آپ کی امانت.....،گن لیں۔پورے ہیں کہ نہیں.....ورنہ پھر کل کہیں یہ نہ کہیں کہ نامراد نے چائے سگریٹ کے لیے کچھ نکال لیے ہیں۔

(لیلیٰ پھیکی سی مسکراہٹ مسکاتی ہے۔)

لیلیٰ: چاہو تو ابھی نکال لو میرے سامنے.....یا چاہو تو سبھی رکھ لو.....میں رسید لکھ دیتی ہوں کہ میں نے تم سے وصول پائے.....

نامراد: بس.....یہی تو آپ کی بات ہے کہ دل چھوٹا نہیں ہے آپ کا۔ویسے یہ اُداسی ختم کر دیں اب.....آپ کے ناراض مہمان کو بھی لایا ہوں ساتھ.....

لیلیٰ: کیا سچ.....،کہاں ہے موسیٰ۔

(موسیٰ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔لیلیٰ بے یقینی سے اسے دیکھتی ہے۔)

لیلیٰ: مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے موسیٰ.....

موسیٰ: ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔آپ تو محسن ہیں میری.....کسی انجان کے لیے اتنا کون کرتا ہے۔

لیلیٰ: انجان تو نہ کہو.....لگتا ہے اب بھی ناراض ہو مجھ سے.....

موسیٰ: خود سے ناراض ہوں میں.....وہ یہیں تھی.....اسی شہر میں.....اور میں اسے نہیں ڈھونڈ پایا.....،اور آج ایک بار پھر اسے کھو دیا میں نے.....،.....یہ سب میری نااہلی ہے.....شاید میں اسے پانے کا اہل ہی نہیں ہوں.....

لیلیٰ: ایسا نہیں کہتے.....،ایک بس تم ہی تو اس کے قابل ہو.....اہل ہو اسے پانے کے.....،مگر نہ جانے قسمت کو کیا منظور ہے.....میں نے تم سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی۔مگر تم سے بات نہیں ہو سکی.....

موسیٰ: کاش میں اس وقت موجود ہوتا.....جانے وہ کس اذیت میں ہوگی۔جانے اس نے یہ دن اس قید اور قفس میں کیسے کاٹے ہوں گے.....وہ تو.....وہ تو بہت نازک ہے.....کیسے جھیلیں ہوں گی اس نے یہ تکلیفیں.....اسی لیے تو خود.....پر بے انتہا غصہ ہے مجھے.....میرے ہوتے.....اتنا کچھ ہو گیا.....اور میں کچھ بھی نہیں کر پایا.....

لیلیٰ: خود پر اتنی ناراضگی اچھی نہیں موسیٰ.....مت سزا دو خود کو اتنی.....

(نامراد ناراضگی سے کہتا ہے۔)

نامراد: یہی تو ہم سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں میڈم جی.....،مگر وہ موسیٰ ہی کیا جو کسی کی سن لے کبھی.....اچھا میڈم جی۔

استاد نے کہا ہے کہ آپ فیضی اور اس کی بیوی کے خلاف پرچہ درج کروا دو تھانے میں۔ کیونکہ فون پر رابطہ آپ سے ہی تھا.....اور اس توقیر کا کیا کرنا ہے۔ یہ بھی آپ سوچ کر بتا دو۔

(لیلیٰ دکھ اور نفرت سے کہتی ہے)

لیلیٰ: توقیر.....ہاں.....اس سے تو میری ایک ملاقات بنتی ہے اب.....ملنا ہی پڑے گا مجھے اس سے ایک بار.....

لیلیٰ کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد والا مزار

پیر قدرت مزار کے احاطے میں چند مریدین کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ صحن میں احمد بیٹھا حدیث کی یا کسی تفسیر کی کتاب میں سے کچھ پڑھ رہا ہے اور اس کے گرد دائرے میں کچھ لوگ بیٹھے غور سے اس کی بات سُن رہے ہیں۔

(پیر قدرت کچھ فاصلے پر پیچھے رک کر یہ سب کچھ سن رہا ہے)

احمد: تو بھائیو آج کا یہ درس ہمیں بتاتا ہے کہ حقوق اللہ کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر حقوق العباد ادا کیے بنا ایمان نامکمل ہی رہے گا.....لہٰذا حقوق العباد کی ادائیگی کو یقینی بنائیں اور اس بات کا خاص دھیان رکھیں کہ ہمارے ہاتھ اور زبان سے کسی ذی رُوح کو ذرا سی بھی تکلیف نہ پہنچنے پائے.....ان شاء اللہ کل ہم حقوق اللہ کے درجات پر بات کریں گے۔

احمد درس ختم کر کے عقیدت سے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو چُوم کر آنکھوں سے لگاتا ہے۔ سب لوگ اٹھ جاتے ہیں۔ احمد کی نظر پیچھے کھڑے پیر قدرت پر پڑتی ہے اور وہ جلدی سے قدرت اللہ کی طرف بڑھتا ہے۔

احمد: معاف کیجئے گا حضرت.....میرا دھیان درس کی طرف تھا۔ آپ کو آتے نہیں دیکھا.....

قدرت: (قدرت مسکراتا ہے) کوئی بات نہیں..... ماشاء اللہ تمہارے درس دینے کا انداز بڑا دل پذیر ہے۔ تبھی علامہ صاحب تمہاری اتنی تعریف کرتے ہیں۔

(احمد انکساری سے کہتا ہے)

احمد: یہ ان کی محبت ہے.....سچ تو یہ ہے کہ میں صرف ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں..... مجھے جو بھی آتا ہے.....یہ سب انہی کا سکھایا ہوا ہے.....

(قدرت مسکراتا ہے۔)

قدرت: چلو یونہی سہی.....مگر وہ کہتے ہیں ناں.....نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے.....تو یہ بات تو طے ہے کہ علامہ صاحب نے بھی تمہاری عقل دیکھ کر ہی تم پر خاص توجہ دی ہوگی.....

احمد: (احمد سر جھکا لیتا ہے) آپ کی عنایت ہے.....میرے لائق کوئی خدمت ہے تو بتائیں.....

قدرت: نہیں بھئی..... جب سے تم نے انتظامات سنبھالے ہیں..... ہر شئے ٹھکانے پر ہے.....عیسیٰ نے تو کافی کام چھوڑا تھا پیچھے.....مگر تم نے سب سنبھال لیا.....کبھی میرا بیٹا موسیٰ یہ سب تمہاری طرح.....

(قدرت بے اختیار موسیٰ کا نام لیتے لیتے رک جاتا ہے۔ احمد بھانپ لیتا ہے کہ قدرت موسیٰ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا لہٰذا وہ بات بدل لیتا ہے۔)

احمد: جی.....مجھے مزار کے پرانے مریدین نے بتایا ہے کہ موسیٰ بھائی کس طرح اپنی نگرانی میں سارے کام کرواتے تھے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو موسیٰ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔

قدرت: جیتے رہو۔

(احمد تعظیم سے سر ہلا کر ایک جانب ہو جاتا ہے۔ قدرت آگے بڑھنے کے لیے دو قدم بڑھتا ہے اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔)

قدرت: ہاں سنو..... احمد میاں..... وہ مجھے یونہی اچانک ایک خیال آیا..... علامہ صاحب نے تمہاری گھر ہستی کے بارے میں بھی تو کچھ سوچ رکھا ہوگا ناں.....

(احمد شرما سا جاتا ہے)

احمد: جی..... جی نہیں..... ابھی تو بہت کچھ سیکھنا باقی ہے..... شادی بیاہ کے لیے تو عمر پڑی ہے۔

قدرت: بھئی شرع میں شادی کے بعد بھی تعلیم حاصل کرنے کی کوئی قید تو نہیں ہے..... چلو کوئی بات نہیں..... یہ معاملہ بھی حل کر دیں گے تمہارا.....، ..... کوئی تمہاری طرح کی نیک، شریعت اور عبادت گزار لڑکی ڈھونڈ کر..... جو تمہارا خیال بھی رکھ سکے.....

(احمد سٹ پٹایا سا کھڑا ہے، جیسے اسے کوئی جواب نہ مل رہا ہو.....)

احمد: حضرت..... آپ جیسے مناسب سمجھیں.....

(قدرت اللہ احمد کے شرمانے پر مسکرا دیتا ہے)

قدرت: چلو..... جس میں اللہ نے تمہاری خیر رکھی ہو..... جیتے رہو.....

قدرت اللہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ احمد سر جھکائے کھڑا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں۔ زہرہ کا کمرہ

ہاجرہ پیرنی زہرہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ زہرہ، رحمٰن کی جانب کھلتی کھڑکی کے قریب اداس اور گم سم سی بیٹھی ہوئی ہے۔ ہاجرہ چند لمحے اسے دیکھتی رہتی ہے اور پھر زہرہ کو متوجہ کرنے کے لیے دھیرے سے کھنکارتی ہے۔ زہرہ اپنے خیالات کی رو سے باہر آتی ہے اور ہاجرہ کو دیکھ کر جلدی سے سلام کر کے کھڑی ہو جاتی ہے۔

پیرنی / ہاجرہ: سارا دن خود کو کمرے میں بند کیوں رکھتی ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو باغیچے یا صحن کی طرف..... مرد اس طرف نہیں آتے..... یہ حویلی کا زنانہ حصہ ہے.....

زہرہ: میرا جی نہیں چاہتا.....

(ہاجرہ شفقت سے کہتی ہے)

ہاجرہ: جی کو منانا پڑتا ہے..... ہم اگر یونہی دل کی باتوں پر چلتے رہیں تو یہ تو چار دن میں ہمیں مار ڈالے.....

زہرہ: (زہرہ دھیرے سے کہتی ہے) اب مار ہی ڈالے تو اچھا ہے.....

ہاجرہ: ایسا نہیں کہتے..... لگتا ہے تمہیں تمہارے گھر والے یاد آ رہے ہیں..... تم چاہو تو میں تمہاری ملاقات کا انتظام کروا سکتی ہوں.....

زہرہ: نہیں..... وہاں واپس جانا ہوتا تو بہت پہلے جا چکی ہوتی.....، ..... لیا خود یہ چاہتی تھیں کہ میرے ماتھے سے اس علاقے کا کلنک ہمیشہ کے لیے اتر جائے.....، انہوں نے مجھے ہمیشہ کے لیے رخصت کیا تھا اس گھر سے..... مگر لگتا ہے میرے نصیب میں گھر ہستی کا سکھ نہیں ہے.....

(ہاجرہ دکھی نظروں سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہے)

ہاجرہ: مگر پھر بھی۔ وہ تمہاری ایسے اچانک گم شدگی سے بہت پریشان ہوں گے.....، چاہے منہ بولی ہی سہی.....مگر وہ تمہاری ماں تو ہے.....اور ماں تو ماں ہی ہوتی ہے.....،اس کا دل تمہارے لیے ضرور تڑپتا ہوگا..... جب کسی کو ماں کہہ دو.....تو وہ منہ بولی نہیں رہتی..... پوری ماں ہی بن جاتی ہے۔

زہرہ: ٹھیک کہتی ہیں آپ.....لفظ کے لیے ہم سب نے کبھی منہ بولی کا لفظ استعمال بھی نہیں کیا.....،مگر مجھے جھجک ہوتی ہے..... اگر کسی کو اطلاع دینا بھی چاہوں تو کیسے دوں.....،وہاں کا کوئی فرد اگر آپ کی پاک دہلیز پار کرے تو کہیں.....؟.....

(زہر بولتے بولتے رک جاتی ہے)

ہاجرہ: ایسا کیوں سوچتی ہو.....میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میں ذات پات، اونچ نیچ اور اعلیٰ ادنیٰ کی لکیر بہت پہلے پار کر آئی ہوں.....،اور یہ احساس مجھے موسیٰ کے ایک چھوٹے سے سوال نے دلایا تھا.....

(زہرہ چونک کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی ہے)

زہرہ: کیسا سوال.....؟

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں/ ہاجرہ کا کمرہ

سکینہ اپنی ساس کو ڈھونڈتے ہوئے اس کے کمرے میں آتی ہے۔ اندر کوئی نوکرانی کام کر رہی ہے۔

سکینہ: تائی جان کہاں ہیں نوراں.....؟

نوکرانی: وہ تو جی پچھلی طرف گئی ہیں زنان خانے.....

سکینہ: اوہ زرّی کی طرف.....چلو ٹھیک ہے میں بھی وہاں جا رہی ہوں.....اماں پوچھیں تو بتا دینا.....

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں۔ زہرہ کا کمرہ

ہاجرہ: بس ایک چھوٹا سا سوال..... جو شاید وہ تم سے ہی سن کر آیا تھا.....اور جو اس نے اپنا ابا کے سامنے کر ڈالا تھا.....کہ موسیٰ اگر پیر قدرت کے گھر پیدا ہوا تو اس میں موسیٰ کا کیا کمال..... اور زہرہ اگر کسی بازار میں پیدا ہوئی تو اس میں زہرہ کا کیا قصور.....؟

(زہرہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے)

زہرہ: پھر کیا جواب ملا اُسے.....

ہاجرہ: شاید جواب کی تلاش میں ہی آج تک بھٹک رہا ہے میرا بیٹا.....

زہرہ: اس کی قصوروار میں ہوں.....سزا مجھے ملنی چاہیے تھی.....وہ کیوں در بدر ہوا.....

ہاجرہ: اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ دل میں کوئی بات ہے تو چھپا کر نہ رکھو..... یہاں کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم سے کون ملنے آیا ہے.....

(زہرہ کچھ سوچتی ہے)

زہرہ: تو پھر کسی طرح وہاں سے چندا کو بُلوا دیجئے۔ ابا کو پتہ چلا تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکیں گی..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے محسنوں کو میری وجہ سے مزید کوئی تکلیف پہنچے..... پیر صاحب میرے محسن ہیں..... پناہ دی ہے انہوں نے مجھے..... لیکن وہ انجانے میں اسی کو اپنے گھر اٹھا لائے ہیں جس کی وجہ سے ان کا گھرانہ تتر بتر ہو گیا..... میں انہیں اپنی حقیقت سے آگاہ کر کے مزید کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی..... آپ بس میرا یہ کام کر دیں۔

(ٹھیک اسی وقت سکینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے)

سکینہ: کون کس کو آزمائش میں ڈال رہا ہے بھئی..... اور تمہیں بھی کوئی کام ہے..... یہ سن کر خوشی ہوئی مجھے..... ورنہ تائی جان..... میں تو پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہوں اس سے..... کچھ بولتی نہیں۔

(ہاجرہ مسکرا کر بات بناتی ہے)

ہاجرہ: فکر مت کرو..... اس کے سارے کام اب تم سے ہی کروایا کروں گی..... فی الحال تم زرّی کے پاس بیٹھو..... میں خدیجہ سے دو گھڑی کا کہہ کر آئی تھی اور دیکھو کتنی دیر ہو گئی..... باقی کام زرّی تمہیں خود بتائے گی.....

(سکینہ مسکراتی ہے)

سکینہ: ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... میں نے تو اسے دل سے اپنی سہیلی مانا ہے..... اب پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے.....

زہرہ: میرے دل میں بس یہ ہے کہ تم..... بہت اچھی ہو.....

(زہرہ بھی دھیرے سے مسکرا کر بات ٹال دیتی ہے۔ سکینہ زور سے ہنستی ہے)

سکینہ: وہ تو میں ہوں ہی.....

ہاجرہ ان دونوں کو باتوں میں مشغول دیکھ کر چپکے سے کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ

کردار: نامراد، موسیٰ اور سارنگا موجود ہیں

نامراد: چاند پوری گیا تو ہے پھر سے مگر آس پاس کے سبھی علاقے تو ہم نے پچھلے ایک ہفتے میں چھان مارے ہیں استاد.....

(سارنگا اپنے مخصوص انداز میں نیم دراز ہے)

سارنگا: ہسپتال اور ایمرجنسی چیک کی ہے نالائقو.....

نامراد: ہسپتال.....؟..... کیوں استاد۔ خدانخواستہ.....

(موسیٰ چپ چاپ بیٹھا ان کی بات سن رہا ہے)

سارنگا: اپنے استاد نے پہلے دن یہی ایک سبق دیا تھا مجھے..... کسی گم شدہ کو تلاش کرنا ہو تو سب سے پہلے علاقے کا ہسپتال، مردہ خانہ یا پھر تھانہ چیک کرو.....

نامراد: تھانے دار سے تو روزانہ ہی بات ہوتی ہے استاد..... اس نے تو پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ ایسی کسی لڑکی کی کوئی رپٹ یا ایف۔آئی۔آر آس پاس کے کسی تھانے میں درج نہیں کی گئی.....

سارنگا: تو پھر علاقے کے سارے ہسپتال چھان مارو..... بلکہ شہر کا ہر ہسپتال چھان مارو..... آس پاس کے سارے جرائم کے اڈے اور بدمعاشوں کے ٹھکانے میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں..... وہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں لائی گئی..... اگر انہیں ذرہ بھی کوئی خبر ملی تو وہ فوراً مجھے بتا دیں گے.....

(سارنگا موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے)

سارنگا: اور سُن شہزادے..... ہسپتال اور خاص طور پر مردہ خانے دیکھتے ہوئے تجھے دل پر قابو رکھنا ہوگا..... یہ دنیا ان ہونیوں کا نام ہے..... خدانخواستہ کوئی ان ہونی ہوگئی ہو تو.....

(موسیٰ سارنگا کی بات کاٹ دیتا ہے)

موسیٰ: کوئی اَن ہونی نہیں ہوگی..... نہیں..... اس کے ساتھ کوئی اَن ہونی ہوئی ہوتی تو ابھی تک میرا یہ دل دھڑک نہ رہا ہوتا..... یہ اتنا بے ایمان تو نہیں ہوسکتا..... اسی دل کے کہنے پر تو آج تک چلتا آیا ہوں.....

(سارنگا موسیٰ کی بات سن کر ایک لمبی آہ بھرتا ہے)

سارنگا: ہائے..... عشق..... یہ کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا..... پر کبھی کبھی دماغ کی بھی سُن لینی چاہیے.....

نامراد: تم فکر مت کرو استاد..... میں موسیٰ کے ساتھ رہوں گا..... یہ اپنے دل کی سنے گا اور میں اپنے دماغ کی.....

(سارنگا ہنستا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے)

سارنگا: جانتا ہوں..... تُو بھی انہی دیوانوں میں شامل ہے جو کبھی اپنے دماغ کی نہیں سُنتے..... تبھی تو شاعر ہے نکمے..... چل ٹھیک ہے..... تیری نگرانی میں دیتا ہوں اس موسیٰ کو..... وہ کیا کہتا ہے چاند پوری..... ہاں..... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو.....

(نامراد پھڑک اٹھتا ہے اور پورا شعر پڑھتا ہے)

نامراد: ہائے استاد..... پھر کیا موقعے پر شعر پڑھا ہے

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: سنٹرل جیل، توقیر کی بیرک

کوئی سنتری توقیر سے آ کر کہتا ہے۔

سنتری: چل بھئی فلم اسٹار..... تیری ملاقات آئی ہے..... چل..... جلدی کر..... آج جیلر نے اسپیشل اجازت دی ہے تیری ملاقات کروانے کی.....

توقیر: اسپیشل اجازت..... وہ کیوں.....

سنتری: تُو چل تو سہی..... سب پتہ چل جائے گا.....

توقیر الجھن زدہ سا اٹھتا ہے.....

//Cut//

Scene No # 15

جگہ: جیل۔ ملاقاتی کمرہ

توقیر ملاقاتی کمرے کی سلاخوں/ جالی سے لگا کھڑا ہے اور دور اندھیری راہ داری میں کسی کے جوتوں کی ٹک ٹک کی آواز سُن رہا ہے۔ آنے والی اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آتی ہے۔ یہ توقیر کی بیوی لیلیٰ ہے۔ توقیر کی آنکھیں لیلیٰ کو دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور وہ بے تابی سے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے۔

توقیر: لیلیٰ..... تم..... اوہ مائی گاڈ..... میں جانتا تھا..... جانتا تھا کہ تم میرے بغیر نہیں رہ پاؤ گی..... اور ایک نہ ایک دن مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی..... کیونکہ تم جانتی ہو کہ تمہارا توقیر اندر سے بے حد شرمندہ ہوگا..... اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوگا..... اوہ گاڈ..... ایک تم ہی تو ہو جو مجھے پوری طرح جانتی ہو.....

(لیلیٰ مسکراتی ہے)

لیلیٰ: پوری طرح ہی تو تمہیں جان نہیں پائی کبھی..... ویسے تمہیں افسوس تو بہت ہوا ہوگا مجھے زندہ دیکھ کر.....

توقیر: یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو..... حالانکہ مجھ سے بھی بہت غلطیاں ہوئی ہیں مگر میں اتنا سنگ دل بھی نہیں کہ اپنی محبت کو قتل کرنے کا سوچ بھی سکوں..... تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ اس موسیٰ کی ایک چال تھی۔ وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا کر خود تمہاری ساری جائیداد اور دولت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں نہیں پتہ کہ وہ کتنا خطرناک بندہ ہے لیلیٰ۔ یہاں جیل میں بھی اس کے مافیا کی بندے موجود ہیں جنہوں نے مجھے یہاں بھی قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہیں مجھ پر یقین نہیں تو جیل کے اسٹاف سے پوچھ لو۔ موسیٰ سارنگا کے گینگ کا بندہ ہے۔

(لیلیٰ پریشانی سے کہتی ہے)

لیلیٰ: اوہ سارنگا..... وہ مشہور انڈر ورلڈ ڈان..... نہیں نہیں..... آئی کانٹ بلیو اٹ i cant be lieve it

توقیر: یقین کرو جان..... مجھے بھی یہ حقیقت یہاں جیل آ کر پتہ چلی کہ موسیٰ سارنگا کا خاص آدمی ہے..... تبھی تو میں تمہارے لیے اتنا پریشان تھا.....

(لیلیٰ غور سے توقیر کو دیکھتی ہے)

لیلیٰ: تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں کہ موسیٰ سارنگا کا خاص آدمی ہے..... مگر ایک خاص آدمی تو تم نے بھی بھرتی کرایا تھا میرے پاس بطور مینیجر..... فیضی..... یاد ہے ناں جان..... مگر وہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے مجھ سے اچھی خاصی رقم بٹور کر.....؟ ..... کیا تمہیں اس کی کچھ خبر ہے..... یہاں تو نہیں آیا تھا وہ تم سے ملنے.....؟.....

(توقیر فیضی کے نام پر چونکتا ہے)

لیلیٰ غور سے توقیر کو دیکھ رہی ہے۔ توقیر کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: کسی ہسپتال کا آؤٹر، پارکنگ وغیرہ

موسیٰ اور نامراد مایوسی سے ہسپتال سے باہر نکلتے ہیں اور پارکنگ میں کھڑی اپنی جیپ/وغیرہ کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

نامراد: یہ ساتواں ہسپتال تھا..... اب کہاں جانا ہے۔

موسیٰ نامراد کو کوئی جواب نہیں دیتا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: جیل

کردار: ملاقاتی کمرہ

(توقیر گڑبڑا کر کہتا ہے)

توقیر: ہاں وہ فیضی..... نمک حرام۔ نہیں نہیں۔ وہ تو میرے گرفتار ہوتے ہی ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ..... ویسے کتنے پیسے لے گیا ہے تم سے.....

لیلیٰ: پانچ کروڑ.....

(توقیر کے سر پر بم سا گرتا ہے)

توقیر: پانچ کروڑ..... اوہ..... تبھی وہ غائب ہے۔ ہم..... میرا مطلب ہے کہ تم نے اسے اتنی بڑی رقم دی ہی کیوں۔

(لیلیٰ دوسرا بم گراتی ہے)

لیلیٰ: زہرہ کی رہائی کے لیے..... اسے فیضی نے اغواء کر کے بند کر رکھا تھا۔

(توقیر ایکٹنگ کرتا ہے)

توقیر: کیا..... اس فیضی کی تو..... مگر..... جان..... زہرہ.....

لیلیٰ: ہاں..... وہی زہرہ جسے تمہارے منصوبے کے مطابق فیضی نے Ransome رین سم لینے کے لیے استعمال کیا۔

توقیر: کیا..... میرے کہنے پر..... یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم.....

(لیلیٰ غصے میں چلاتی ہے)

لیلیٰ: ہاں..... فیضی گرفتار ہو چکا ہے لالچی انسان..... اور اس نے اپنا بیان بھی پولیس کو ریکارڈ کروا دیا ہے..... تم اپنے غصے، انتقام اور نفرت کی آگ میں اس قدر آگے نکل گئے توقیر..... کہ ایک معصوم لڑکی کی زندگی ختم کرنے کے منصوبے بناتے رہے یہاں جیل میں بیٹھ کر..... جانتے ہو..... میں نے تمہیں اپنا قصور معاف کرنے فیصلہ کر لیا تھا..... چاہے میں تم سے کوئی تعلق نہ رکھتی مگر تمہیں قید سے رہائی مل جاتی..... مگر تم نے زہرہ اور موسیٰ کے ساتھ جو کیا ہے..... اسے میں کبھی معاف نہیں کروں گی..... اب یہیں پڑے سڑتے رہو اور اپنے دونوں جرائم کی سزا کاٹو..... تم اسی قابل ہو۔

(لیلیٰ پلٹ کر جانے لگتی ہے تو توقیر گھبرا کر اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔)

توقیر: سنو..... لیلیٰ..... میری بات تو سنو.....

(لیلیٰ ایک لمحے کے لیے رُکتی ہے)

لیلیٰ: کیوں کیا تم نے یہ سب کچھ..... صرف پیسے کے لیے..... مجھ سے مانگ لیتے..... میرا تو پہلے ہی سب کچھ تمہارا تھا توقیر..... تم باہر جانا چاہتے تھے ناں پروڈکشن کے لیے..... تو مجھ سے کہتے۔ مجھے بھی ساتھ لے جاتے..... مگر تمہارا مسئلہ کچھ اور تھا توقیر..... تمہیں میرا پیسہ تو چاہیے تھا۔ مگر اس پیسے کے ساتھ میں نہیں..... تمہیں تو کسی طور مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی تھا..... تو ٹھیک ہی مسٹر توقیر جاوید آغا..... میں آج تمہیں آزاد کر رہی ہوں ہر رشتے سے..... کیونکہ اب تم مجھے برداشت نہیں ہو..... کسی بھی صورت میں..... کسی بھی رشتے کے حوالے سے..... طلاق کا نوٹس تمہیں یہیں جیل میں سرو Serve ہو جائے گا..... دوبارہ کبھی اپنی شکل مجھے مت دکھانا.....

(لیلیٰ ایک جھٹکے سے پلٹتی ہے اور راہداری میں چلتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے۔ توقیر اسے پکارتا، چلاتا۔ سر پیٹتا رہ جاتا ہے۔ مگر لیلیٰ پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھتی۔)

توقیر: لیلیٰ..... میری بات تو سنو..... مجھے ایک موقع تو دو..... میں..... مجھے معاف کر دو..... پلیز..... ایک بار..... میری بات سُن لو.....

توقیر سلاخوں سے سر پیٹتے پیٹتے وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: انا جی کا گھر۔ کمرہ

کوئی سیاہ برقعے میں ملبوس عورت کمرے میں بیٹھی غور سے کمرے کی سجاوٹ دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں چندا کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ عورت اٹھ کر سلام کرتی ہے۔

عورت: السلام علیکم.....

چندا: وعلیکم السلام.....میں نے آپ کو پہچانا نہیں.....

عورت: ہاں.....میں دراصل ایک ضروری کام سے آئی ہوں دراصل وہ.....

(چندا بات سُننے سے پہلے ہی کاٹ دیتی ہے)

چندا: دیکھیں.....اگر آپ کوئی مدد وغیرہ مانگنے آئی ہیں تو فی الحال معذرت.....انا جی ہی یہ سب کچھ دیکھتی ہیں اور فی الحال ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے انہیں سختی سے آرام کرنے کا کہا ہے.....

عورت: میں مدد مانگنے نہیں آئی۔ میں نیلے گنبد والے پیروں کی حویلی سے آئی ہوں.....پیر نی جی کا ضروری پیغام لے کر.....

(چندا کو حیرت کا جھٹکا لگتا ہے)

چندا: پیر نی جی کا پیغام.....میرے لیے.....

عورت: ہاں.....انہوں نے تمہیں بلایا ہے.....مگر سختی سے تاکید کی ہے کہ اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا.....اپنی انا سے بھی نہیں.....

چندا: مگر میں.....

عورت: میں چلتی ہوں۔ مجھے بس یہی پیغام پہنچانا تھا.....آج شام پیر نی جی آپ کا انتظار کریں گی، مگر ان کی رازداری کی تاکید ہرگز نہ بھولنا.....اور ٹھیک وقت پر پہنچ جانا.....

عورت لپک جھپک اپنے برقعے کا پلو سیدھا کرتے ہوئے وہاں سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، ہاجرہ کا کمرہ

ہاجرہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی ہے۔ اتنے میں وہی برقعے والی عورت اندر آتی ہے۔ ہاجرہ تیزی سے اس کی طرف لپکتی ہے۔

عورت/خادمہ: پیر نی جی سلام.....

ہاجرہ: وعلیکم السلام.....کام ہو گیا.....

خادمہ: جی پیر نی جی.....پیغام دے دیا ہے اور رازداری کی تاکید بھی کر دی ہے.....

ہاجرہ: ٹھیک ہے.....مگر دھیان رہے.....یہ بات حویلی سے باہر تو کیا حویلی کے اندر بھی نہیں پھیلنی چاہیے.....

کریماں/خادمہ: بے فکر رہیں پیر نی جی.....آپ کا نمک کھایا ہے.....

ہاجرہ: ٹھیک ہے کریماں.....اب تم جاؤ.....

کریماں سر ہلا کر سلام کرتے ہوئے اُلٹے پاؤں پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

جگہ: کاشانہء پیراں، زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے پاس خدیجہ بیٹھی ہوئی ہے۔

خدیجہ: سکینہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کے ابا پیر عنایت اللہ دل کے دورے میں چل بسے..... تبھی وہ باپ کی کمی محسوس کرتی ہے..... اور اسی لیے وہ دھیرے دھیرے ضدی اور چڑچڑی بھی ہوتی گئی..... پورے گھر میں اس کی جان صرف اس کے سسر یعنی تایا جان سے جاتی تھی..... ورنہ ہم میں سے تو کسی کو کبھی اس نے کسی قابل ہی نہیں سمجھا..... سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتی تھی.....

(زہرہ دھیرے سے مسکراتی ہے)

زہرہ: اچھا..... مگر سکینہ تو ایسی نہیں لگتی ہر گز۔

خدیجہ: تمہاری جس سکینہ سے ملاقات ہوئی ہے..... یہ کوئی اور لڑکی ہے..... ورنہ اس سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا تھا..... سارے گھر میں اس کی دوستی صرف اس کے بڑے بھائی موسیٰ کے ساتھ ہی تھی بچپن سے..... بس اسی کا سر کھاتی رہتی تھی۔ موسیٰ بھائی یہ لا دیں۔ موسیٰ بھائی وہ لا دیں..... یہاں لے جائیں..... وہاں لے جائیں..... یہ کر دیں..... وہ کر دیں..... اور موسیٰ بھی بھاگ بھاگ اپنی بہن کے سارے حکم بجالاتا تھا۔ مگر پھر دونوں کو کسی کی نظر لگ گئی..... سب برباد ہو گیا۔

(موسیٰ کے نام پر زہرہ کے دل کو دھچکا لگتا ہے۔)

زہرہ: (دھیرے سے) ہاں..... مجھے سکینہ نے بتایا تھا.....

خدیجہ: بس..... تقدیر کے کھیل ہیں سارے..... موسیٰ نے میرا دودھ پیا ہے..... اور اس نے ایک بیٹے اور بھائی ہونے کا ہر حق ادا کیا..... مگر میرا وہی بیٹا آج دربدر ہے..... اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی یہاں وہاں بھٹک رہا ہے..... میرا شہزادہ پریشان ہے۔ سرگرداں ہے.....

زہرہ: اور یہ سب کچھ اس ایک لڑکی کی وجہ سے ہوا..... ضرور بڑی منحوس اور بدقسمت رہی ہوگی وہ بھی۔

خدیجہ: جانے کون قصوروار ہے۔ میں تو کسی کو بددعا بھی نہیں دے سکتی..... میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ موسیٰ گھر واپس آ جائے..... اور اسے پیر صاحب پھر سے اس کا اس حویلی میں جائز مقام دے دیں..... جو موسیٰ سے چھین لیا گیا ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: شام 4 بجے

جگہ: کاشانہء پیراں۔ آؤٹر

چندا کسی رکشہ میں حویلی کے باہر پہنچتی ہے اور رکشے کو پیسے دے کر دور سے ہی فارغ کر دیتی ہے۔ وہ بھی سیاہ برقعے میں ملبوس ہے اور چہرہ بھی چھپا رکھا ہے۔ وہ حویلی کی طرف بڑھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: شام

جگہ۔ زہرہ کا کمرہ کاشانہء پیراں

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی زہرہ کچھ سوچ رہی ہے۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوتی ہے اور کوئی نوکرانی اندر آ کر

بتاتی ہے۔

نوکرانی: وہ بی بی جی..... بڑی پیرنی جی نے کسی لڑکی کو آپ سے ملنے کے لیے بھجوایا ہے اور کہا ہے کہ آپ نے لائبریری سے جو کتابیں منگوانی ہیں..... وہ ان کو بتا دیں.....

زہرہ: ٹھیک ہے۔ اسے اندر بھیج دو.....

(تبھی کوئی اندر داخل ہوتا ہے)

(زہرہ دروازے کی طرف دیکھتی ہے، اور پھر اس کے ہاتھ سے کنگھا یا برش گر جاتا ہے۔ دروازے میں کھڑی چندا زہرہ کو دیکھ کر صدمے، حیرت، خوشی سے چلاتی ہے۔)

چندا: زرّی..... تم.....

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 26

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں، زہرہ کا کمرہ

چندا زہرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر خوشی سے ساکت کھڑی رہ جاتی ہے اور پھر روتے ہوئے دوڑتی ہوئی جا کر زہرہ کے گلے لگ جاتی ہے۔ زہرہ بھی رو پڑتی ہے۔ چندا ٹٹول ٹٹول کر زہرہ کا جسم چھو کر دیکھتی ہے جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ اس کے سامنے زہرہ ہی کھڑی ہے۔ دونوں کچھ دیر فرط جذبات میں روتی رہتی ہیں۔

چندا: میں تو ڈر گئی تھی زرّی۔ کہ دوبارہ تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو..... کہاں چلی گئیں تھیں تم۔ لٹا تمہارے غم میں نڈھال پڑی ہیں۔ ہم سب کا بُرا حال ہے.....

(زہرہ رو رہی ہے)

زہرہ: قسمت نے میرے لیکھے میں گھر کا سکھ نہیں لکھا ہے چندا..... ملک نے مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا.....

چندا: ہاں..... یہ منحوس خبر ہمیں مل چکی ہے۔ مگر تم اتنے دن کہاں رہیں..... اور آج ملی بھی ہو تو یہاں..... اس پیروں کی حویلی میں..... یہ سب کیا ہے زرّی.....

زہرہ: لمبی داستان ہے..... قدرت کے کھیل تو دیکھو..... مجھے میری عزت پوری کرنے کے لیے ان کی چھت کے نیچے بھیج دیا جہاں ہم جیسوں کے چھونے سے بھی چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔

چندا غور سے زہرہ کو دیکھتی ہے اور دوبارہ اس سے لپٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

جگہ: کاشانہ پیراں، سکینہ کا کمرہ

سکینہ اور اس کی ماں خدیجہ موجود ہیں۔

(سکینہ اپنا کوئی کامدار یا خوبصورت سا جوڑا دکھاتی ہے)

سکینہ: یہ دیکھیں اماں..... یہ میں نے زرّی کے لیے نکالا ہے..... اچھا ہے ناں..... بالکل نیا ہے.....

خدیجہ: ہاں..... بہت اچھا ہے۔ مگر وہ بھلا ایسے رنگین اور کامدار جوڑے کہاں پہنتی ہے..... تم نے جو بھی بنا کر دیا یا اسے اپنے جہیز کے سامان سے نکال کر دیا۔ اس نے الماری میں ہی رکھ ڈالا..... بہت سیدھی سادھی سی ہے وہ..... سفید یا کالے کے علاوہ کچھ پہنتی ہی نہیں.....

سکینہ: ہاں..... یہ تو ہے..... مگر جب اس کی عدّت ختم ہو جائے گی تو میں زبردستی اسے اپنی پسند کا ہر رنگ پہناؤں گی..... طلاق ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندہ اپنے آپ کو اندر سے ہی مار ڈالے۔

خدیجہ: زرّی کا دل بہت دُکھا ہوا ہے..... ایک بے سہارا لڑکی اگر طلاق یافتہ بھی ہو جائے تو اندر سے خود بخود موت واقع ہو جاتی ہے اس کی..... مگر مجھے وہ بہت معصوم لگتی ہے..... جانے اندر کتنے طوفان چھپائے بیٹھی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی۔ تم اس کا دھیان رکھا کرو..... تمہاری ہم عمر ہے۔ تم سے دل کی بات کر لیتی ہے پھر بھی.....

سکینہ: میں تو بہت خیال رکھتی ہوں اس کا..... مگر اُسے تو جیسے چپ ہی لگ گئی ہے۔ لیکن میں اسے زندگی کی جانب کھینچ ہی لوں گی..... تم دیکھنا اماں.....

(پھر سکینہ کپڑے سمیٹ کر باہر جانے لگتی ہے)

خدیجہ: اب کہاں چل دیں۔

سکینہ: میں زرّی کو یہ جوڑا دکھا کر آتی ہوں۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا.....

سکینہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ اور چندا میں بات چیت جاری ہے۔

چندا: اسے کہتے ہیں قدرت کے کھیل..... وہ موسیٰ جسے تم سے محبت کے جرم میں اس گھر سے نکال دیا گیا، اسی موسیٰ کے گھر میں تم آج ان کی معزز مہمان بن کر اپنی عدّت کے دن پورے کر رہی ہو..... اسی لیے کہتے ہیں غرور کا سر نیچا.....

زہرہ: ایسا مت کہو..... میں نے اس گھر کے لوگوں کو بہت مختلف پایا ہے..... بہت احترام دیکھا ہے میں نے یہاں عورت کا..... اب مجھے سمجھ میں آیا کہ موسیٰ کی نظر میں اتنی حیاء کیوں ہے..... یہ سب اس کی تربیت کا اثر ہے..... بہت خوش نصیب ہیں اس گھر کی عورتیں..... بڑے کھلے دل اور کشادہ ظرف کے مالک ہیں یہاں کے مکین.....

چندا: حیرت ہے..... چار دن میں ہی تم ان لوگوں کے گن گانے لگی ہو..... جب کہ یہ جانتی بھی ہو کہ جب انہیں تمہاری حقیقت پتہ چلے گی تو.....

زہرہ: موسیٰ کی اماں تو جانتی ہیں میری حقیقت..... پھر بھی انہوں نے مجھے پناہ دی..... کبھی کبھی ہمارے اندازے لوگوں کے بارے میں بہت غلط ثابت ہوتے ہیں چندا..... میں بھی ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتی رہی

چندا: ٹھیک ہے..... میں مان لیتی ہوں مگر اب آگے کیا ارادہ ہے..... واپس گھر چلو۔ لالا تمہارے لیے بہت نڈھال ہیں۔

زہرہ: نہیں..... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی عدّت اسی گھر کی محفوظ چار دیواری میں گزاروں گی..... واپس اپنی حویلی نہیں جاؤں گی..... وہاں چھت ہوتے ہوئے بھی ہم بے آسرا ہیں..... میں اس ماحول میں دوبارہ واپس نہیں جانا چاہتی چندا..... میں کسی گھر میں کام کاج کر کے گزر بسر کر لوں گی..... دو وقت کی روٹی مل ہی جائے گی مجھے بھی عزت کی.....

چندا: تو پھر ابا جی کو واپس جا کر کیا کہوں گی میں۔

زہرہ: تم کسی کو میری یہاں موجودگی کا کبھی نہیں بتاؤ گی۔ تمہیں میرے سر کی قسم ہے۔ بس ابّا سے اتنا کہنا کہ زرّی خیریت سے ہے..... میرا بس چلے تو میں ابّا اور تمہیں بھی وہاں سے کہیں دور نکال لے جاؤں۔ میں تمہیں ایک نمبر بھیج دوں گی جلد ہی..... ابّا کی تسلی کے لیے میری بات کروا دینا ان سے.....

(زہرہ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں)

(چندا کچھ کہنے لگتی ہے مگر ٹھیک اسی وقت سکینہ ہاتھ میں وہی نیا جوڑا لیے زور زور سے باہر سے ہی باتیں کرتی اندر آ جاتی ہے، زہرہ جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے۔)

سکینہ: زرّی..... یہ دیکھو تم..... میں نے تمہارے لیے نکالا ہے..... اچھا ہے ناں..... اب تم.....

(سکینہ چندا کو دیکھ کر چپ ہو جاتی ہے اور حیرت سے پوچھتی ہے)

سکینہ: یہ کون ہے زرّی۔

(زہرہ بات بدلتی ہے)

زہرہ: یہ چندا ہے۔ میری سہیلی..... مجھ سے ملنے آئی ہے.....

(سکینہ خوش ہو جاتی ہے۔)

سکینہ: ارے واہ..... پھر تو بہت اچھی بات ہے..... اور خدا کا شکر ہے اس سارے جہاں میں تمہاری بھی ایک سہیلی تو نکل آئی۔ ورنہ میں تو تمہیں بالکل ہی آدم بے زار سمجھی تھی۔

سکینہ اپنی بات پر خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی ہے۔

زہرہ اور چندا بھی اس کی زندہ دلی پر مسکرا پڑتی ہیں۔

چندا غور سے سکینہ کی زہرہ کے لیے محبت دیکھتی ہے..... سکینہ انہیں جوڑا دکھانے میں مگن ہو جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: نیلا گنبد۔ مزار

پیر قدرت اللہ مزار کے خدمت گاروں کو کچھ ہدایات دے رہا ہے۔ انہی میں احمد بھی موجود ہے۔

قدرت: ماشاء اللہ..... تمام انتظامات بہت خوبی سے انجام پائے..... مزار کی مرمت کا کام تو تقریباً مکمل ہو چکا ہے..... اب آرائش و زیبائش اور اندرونی سجاوٹ کے کام کی نگرانی احمد میاں کے ذمے رہی..... کیوں احمد میاں..... پہلے کی اتنی شدید مشقت کے بعد تھک تو نہیں گئے..... چاہو تو چار دن آرام کا وقفہ لے لو۔

(قدرت احمد کو دیکھ کر مسکراتا ہے)

احمد: نہیں جناب..... یہ تو میرے لیے سعادت کی بات ہے..... آپ بے فکر رہیں..... سب کچھ آپ کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہوگا.....

قدرت: جیتے رہو..... تم نے واقعی مجھے عیسیٰ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا..... علامہ حضرت کو واپس آ جانے دو خیر سے..... تمہیں تمہاری محنت اور مشقت کا اچھا انعام دلوانے کی سفارش کروں گا ان شاء اللہ۔

احمد: آپ کی اور علامہ حضرت کی دعائیں ہی میرا سب سے بڑا انعام ہیں پیر صاحب.....

قدرت: ہاں..... وہ تو ہے..... مگر میں صرف زرّی بیٹا کی عدت مکمل ہونے کے انتظار میں ہوں۔ پھر کچھ ضروری فیصلے کرنے ہیں مجھے..... اللہ نے چاہا تو سب خیر ہوگی..... جیتے رہو.....

قدرت اللہ احمد کو دعا دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ احمد کے ذہن میں زہرہ کی تصویر گھوم جاتی ہے۔ اور اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نمودار ہو جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: سیٹھ شہباز گل کا دفتر

شہباز کی پی۔ اے اسے فون پر بتاتی ہے۔

پی۔ اے: سر..... وہ آپ سے ملک شہریار صاحب ملنے آئے ہیں۔

(شہباز بُرا سا منہ بناتا ہے)

شہباز: اس سے کہو میں ایک میٹنگ میں ہوں۔ پھر کسی دن آ جائے..... اور دوبارہ مجھے.....

(شہباز کی بات اس کے منہ میں رہ جاتی ہے اور شہریار غصے میں بنا دستک دیئے اندر آ جاتا ہے۔ شہباز غصے سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔)

شہباز: یہ کیا طریقہ ہے ملک شہریار..... تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کسی کی پرائیویسی میں دخل نہ دینے کی۔

(شہریار کی حالت بہت ابتر ہے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی ہے اور کپڑوں پر شکنیں ہیں)

شہریار: سیٹھ صاحب..... تو اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ آپ مجھے باہر سے ہی ٹرخا رہے ہیں..... میٹنگ کا کہہ کر..... بہت افسوس ہوا یہ دیکھ کر.....

شہباز: انسان کو ہزار کام ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔

شہریار: کبھی میں بھی اتنا ہی ضروری ہوا کرتا تھا آپ کے لیے.....

شہباز: وقت وقت کی بات ہے شہریار..... انسان کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں.....

شہریار: مگر مجھے اس وقت آپ کی مدد کی ضرورت ہے سیٹھ صاحب..... میں کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا ہوں..... میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا ہے انہوں نے..... میں دیوالیہ ہو گیا ہوں سیٹھ صاحب۔ خدا کے لیے مجھے اپنے پیروں پر پھر سے کھڑا ہونے کے لیے کچھ تو مدد کریں میری..... کبھی میں نے بھی آپ کو بہت سے پراجیکٹس اور سودوں کی ڈیل میں لاکھوں کروڑوں کا منافع پہنچایا ہے۔

شہباز: تم نے مجھے فائدہ پہنچایا ہے تو اس کا پورا کمیشن بھی دیا ہے میں نے تمہیں..... کوئی احسان نہیں کیا تم نے مجھ پر..... اور تمہارے دیوالیہ ہونے کی خبر مجھے تمہارے آنے سے بہت پہلے ہو چکی ہے۔ بہتر ہو گا تم مجھ سے مزید کوئی امید نہ رکھو..... سیٹھ شہباز ہارے ہوئے اور لنگڑے گھوڑے پر کبھی بازی نہیں کھیلتا..... اب تم میرے کسی کام کے نہیں ہو.....

شہریار: ایسے نہ کہیں سیٹھ صاحب..... قرض خواہ میرے دروازے تک پہنچ گئے ہیں۔ میرا گھر، دفتر، گاڑی..... سب گروی پڑے ہیں.....

شہباز: قرض تو تم نے میرا ابھی ابھی بہت سا لوٹانا ہے۔ مگر تمہاری حالت دیکھتے ہوئے میں تمہیں فی الحال دو چار ماہ کی مہلت دے رہا ہوں..... اسے بھی تم میری مہربانی سمجھو..... اب نکلو یہاں سے۔ مجھے کچھ ضروری کالز کرنی ہیں۔

شہریار: سیٹھ صاحب..... پلیز.....

(شہباز گھنٹی دیتا ہے، گارڈ اندر آتا ہے)

شہباز: ملک صاحب کو نیچے تک چھوڑ کر آؤ۔ اور دوبارہ یہ مجھے یہاں دکھائی نہ دیں.....

گارڈ آگے بڑھتا ہے۔ شہریار خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے اور شہباز کو گھورتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔ شہباز بُرا سا منہ بناتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: شام، عصر کا وقت۔ مونتاج

جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت اپنی بڑی گاڑی (کروزنگ) میں اپنے گارڈز وغیرہ کے ساتھ حویلی میں داخل ہوتا ہے اور مرید/ خدمت گار/ نوکر وغیرہ جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہیں۔ پیر قدرت نیچے اتر کر ان کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اندر کی طرف بڑھ

جاتا ہے۔ خدمت گار پیر قدرت کے ہاتھ چومتے ہیں اور بچھ بچھ سے جاتے ہیں۔ قدرت اندر داخل ہو جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

جگہ: کاشانہ پیراں۔ لاؤنج وغیرہ

پیر قدرت اندر داخل ہوتا ہے اور آواز لگاتا ہے۔

قدرت: کوئی ہے..... آج سب کہاں چلے گئے ہیں بھئی۔

(اندر سے ایک نوکرانی بھاگتی ہوئی آتی ہے اور مخصوص انداز میں گھونگھٹ کا پردہ کیے پوچھتی ہے)

نوکرانی: جی پیر جی..... حکم.....

قدرت: یہ ساری عورتیں آج کہاں ہیں گھر کی..... کوئی نظر نہیں آ رہی۔

نوکرانی: سکینہ بی بی تو اپنے کمرے میں ہیں جی..... اور خدیجہ بیگم جی نماز پڑھ رہی ہیں۔

قدرت: اچھا..... اور تمہاری پیرنی جی کہاں ہیں۔

نوکرانی: جی وہ پیرنی جی تو مہمان خانے کی طرف گئی ہیں۔ وہ روزانہ عصر کے بعد زری بی بی کو قرآن کا درس دینے جاتی ہیں آج کل..... بتا رہی تھیں کہ زری بی بی تفسیر پڑھنا چاہتی ہیں۔ پیرنی جی روزانہ انہیں تفسیر پڑھ کر سناتی ہیں اور درس بھی دیتی ہیں ایک گھنٹہ روزانہ..... قدرت اللہ کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل جاتے ہیں اور وہ مسکرا کر کہتا ہے۔

قدرت: ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ..... بہت اچھی بات ہے..... سنو۔ تم سب اپنی زری بی بی کا خیال تو رکھ رہی ہو ناں..... وہ ہماری خاص مہمان ہیں۔ یہ سب کو یاد رکھنا ہے۔

نوکرانی: جی پیر جی۔ ہم سب کو آپ کی تمام ہدایات اچھی طرح یاد ہیں۔ مگر وہ زری بی بی ہیں ناں۔ وہ تو جیسے کسی اور ہی جہاں کی لگتی ہیں ہمیں۔ اتنی سیدھی سادھی۔ اتنی صابر و شاکر۔ اتنی تمیز اور تہذیب والی..... کبھی ہم نوکروں سے بھی کوئی تلخ بات نہیں کی۔ تلخ لہجہ یا غصہ تو دور کی بات ہے پیر جی۔ وہ تو کبھی اپنے ماتھے پر شکن تک نہیں آنے دیتیں..... ہمیشہ پیار اور شفقت سے بات کرتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم سے زیادہ انہیں ہم نوکروں کے آرام کا خیال رہتا ہے..... کبھی بے وقت آواز نہیں دیتیں ہمیں۔

قدرت: سبحان اللہ..... اسے کہتے ہیں تربیت..... یہ تہذیب کسی اچھے اور بڑے گھرانے کی تربیت سے ہی آتی ہے..... جزاک اللہ۔ جزاک اللہ

پیر قدرت زہرہ کی تعریف پر سر دھنتا اور تسبیح پھیرتا آگے بڑھ جاتا ہے..... نوکرانی بھی فریم آؤٹ ہو جاتی ہے۔

//Cut//

مونتاج۔ موسیٰ کی گاڑی کسی بڑے ہسپتال کے آؤٹر سے اندر داخل ہوتی ہے۔ گاڑی میں سے موسیٰ اور نامراد اترتے ہیں.....

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

ہاجرہ زہرہ کے کمرے میں موجود ہے۔ اس کے ہاتھ میں تفسیر کی کتاب ہے۔ ہاجرہ آج کا درس ختم کرتی ہے۔

ہاجرہ: ''اور اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی جو تعبیر بتائی تھی وہ سچ ثابت ہوئی اور انہیں دوبارہ ان کا مقام عطا کر دیا گیا.....'' چلو آج کا درس ختم ہوا۔ کل ہم دوبارہ یہیں پھر سورہ یوسف سے شروع کریں گے۔

(زہرہ غور سے ہاجرہ کی طرف دیکھ رہی ہے)

زہرہ: آپ کو دیکھ کر مجھے اپنے بچپن کی وہ سپارے والی محلے کی خالہ یاد آ جاتی ہیں..... لفاجی خاص طور پر انہیں یونہی روزانہ شام کو بلایا کرتی تھیں..... حویلی کے سارے بچوں کو سبق پڑھانے کے لیے۔

(ہاجرہ چونکتی ہے)

ہاجرہ: تو کیا تم نے قرآن شریف پڑھ رکھا ہے پورا؟

زہرہ: جی۔ اس معاملے میں لفاجی بہت سختی کرتی تھیں..... مجھے یاد ہے..... چندا ہمیشہ سر درد، تھکن یا بخار کا بہانہ کر کے کہیں چھپ جاتی تھی..... اور پھر لفا مجھے ہی بھیجا کرتی تھیں اسے پکڑ کر لانے کے لیے..... ہمارے ہاں باقاعدہ سے عید، شب رات اور محرم کی نیاز بھی بانٹی جاتی تھی..... مگر اپنے محلے سے باہر نہیں..... باہر والے ہماری نیاز لینے سے کتراتے تھے۔ میں ہمیشہ لفا جی سے جھگڑا کیا کرتی تھی کہ مجھے محلے سے باہر والی میری سکول کی سہیلیوں کے گھر یہ نذر کا دستر خوان کیوں نہیں لے جانے دیتیں..... نا ہی میری سہیلیوں کو کچھ لے کر ہماری طرف آنے کی اجازت دیتی ہیں..... مگر لفا ہر بار مسکرا کر میرے معصومانہ سوالات کو ٹال جایا کرتی تھیں..... مجھے بہت دیر بعد جا کر اپنے سوالوں کا جواب ملا.....

(ہاجرہ غور سے زہرہ کے لہجے میں چھپا دکھ محسوس کرتی ہے)

ہاجرہ: انسان نے اپنے جیسے ہی سیدھے اور معصوم انسانوں کے لیے کتنے پہرے لگا رکھے ہیں..... کتنے پھندے بنا رکھے ہیں رسم و رواج کے..... مگر ہم یہ بات کبھی سمجھتے نہیں کہ.....

(اتنے میں دروازے کے باہر ہلکی سی دستک اور باہر سے ہی پیر قدرت کے کھنکارنے کی آواز آتی ہے۔ ہاجرہ جلدی سے کھڑی ہو جاتی ہے)

پیر قدرت: میں نے کہا پیرنی جی..... میں مخل تو نہیں ہو رہا۔

ہاجرہ: نہیں نہیں پیر جی..... آپ نے کیوں زحمت کی..... مجھے بلا لیا ہوتا..... میں آتی ہوں باہر.....

(قدرت باہر ہی کھڑے کھڑے بات کرتا ہے اور زہرہ کی عدت کی وجہ سے اندر نہیں آتا۔)

قدرت: نہیں..... میں بس گزر رہا تھا یہاں سے..... سوچا زرّی بیٹی کی طبیعت کا پوچھ لوں.....

(زہرہ جلدی سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کر کے دروازے کے قریب آتی ہے اور دروازے کی اوٹ سے ہی پیچھے کھڑے رہ کر جواب دیتی ہے)

زہرہ: جی پیر صاحب..... میں ٹھیک ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ..... آپ نے آنے کی زحمت کی۔

قدرت: ارے نہیں..... زحمت کیسی۔ تم بھی تو میری بیٹیوں جیسی ہو..... خدا خیریت سے تمہاری عدت کے دن پورے کرے..... مگر تم کسی قسم کا تکلف نہ کرنا..... مجھے نوکروں نے بتایا ہے کہ تم نے کبھی کسی چیز کی فرمائش تک نہیں کی..... بیٹی اسے اپنا ہی گھر سمجھو..... اگر کسی اور کو نہیں کہہ سکتیں تو سکینہ یا پیرنی جی کو ہی بتا دیا کرو جو بھی تمہیں چاہیے ہو.....

زہرہ: جی بہت شکریہ..... ضرورت کی ہر چیز میسر ہے یہاں..... پھر بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں بتا دوں گی.....

قدرت: جیتی رہو..... مجھے سُن کر خوشی ہوگی..... اور تم بالکل فکر نہ کرو..... آگے بھی اللہ تمہارے لیے بہتری کرے گا۔ وہ بڑا مسبّب الاسباب ہے..... وہ اپنے نیک بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔

زہرہ: جی..... جانتی ہوں..... بس میرے لیے دعا کیا کریں۔

قدرت: ان شاء اللہ..... ہر وقت دعا رہتی ہے تمہارے لیے میرے لبوں پر..... چلو..... خوش رہو..... میں چلتا ہوں.....

دعائیں دیتا قدرت آگے بڑھ جاتا ہے۔ زہرہ کی پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ اس کے پیچھے کھڑی ہاجرہ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: کوئی بڑا ہسپتال

موسیٰ اور نامراد کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہیں۔ نامراد کاؤنٹر سے کچھ معلومات حاصل کر رہا ہے جبکہ موسیٰ اداس سا کھڑا بے زاری سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا ہے۔ اچانک اس کی نظر پیر فضل پر پڑتی ہے جو مریم کے ساتھ پریشان سا ہسپتال کی راہداری کی طرف جا رہا ہے، موسیٰ انہیں دیکھ کر چونکتا ہے اور تیزی سے پیر فضل کی طرف لپکتا ہے۔ وہ دونوں اپنے خیال میں چلے جا رہے ہیں۔ موسیٰ پیچھے سے آواز دیتا ہے۔

موسیٰ: السلام علیکم..... فضل چچا آپ..... یہاں.....؟..... سب خیر تو ہے.....

(پیر فضل اور مریم چونک کر پلٹتے ہیں۔ پیر فضل موسیٰ کو اپنے سامنے دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہو جاتا ہے۔)

مریم: موسیٰ بھائی..... آپ یہاں کیسے.....؟..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔

موسیٰ: ہاں ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... مگر آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ گھر میں سب خیریت سے تو ہیں ناں.....

(پیر فضل مریم سے کہتا ہے)

فضل: مریم بیٹا..... تم جاؤ اندر..... تمہاری ممانی انتظار کر رہی ہوں گی..... میں موسیٰ سے بات کر کے آتا ہوں۔

مریم: (مریم سر جھکا لیتی) جی ماموں جان۔

اور ایک نظر موسیٰ کو دیکھتی ہے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

موسیٰ اب بھی الجھن زدہ سا کھڑا پیر فضل کو دیکھ رہا ہے۔ نامراد پس منظر میں کھڑا ان دونوں کو دیکھتا ہے مگر آگے نہیں آتا۔

موسیٰ: بتائیں ناں..... آپ خاموش کیوں ہیں۔ شائستہ چچی تو خیریت سے ہیں ناں۔

(فضل گہری سانس لیتا ہے)

فضل: ہاں..... وہ ٹھیک ہیں..... دراصل..... وہ..... اصل میں ستارہ یہاں ایڈمٹ ہے پچھلے دو ماہ سے.....

(موسیٰ کو ایک حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے)

موسیٰ: ستارہ..... یہاں..... مگر..... ستارہ کی تو رخصتی ہو گئی تھی ناں..... اماں نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا بہت اچھی جگہ رشتہ طے ہو گیا ہے..... اسے تو اس وقت اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا..... پھر وہ یہاں کیسے.....؟..... کیا ہوا ہے اسے.....

(فضل موسیٰ کے سوالوں کے جواب میں چند لمحے سر جھکائے کھڑا رہتا ہے۔ پھر دکھ سے کہتا ہے۔)

پیر فضل: ستارہ کی رخصتی نہیں ہوئی..... بارات آنے سے پہلے ہی اس کے سسرال والوں کی حقیقت سامنے آ گئی..... انہوں نے ہم سے جھوٹ کہا تھا..... لڑکا پرانا ڈرگ ایڈیکٹ Drag Adict نکلا..... ہماری بچی کی زندگی برباد ہوتے ہوتے بچی.....

موسیٰ چونک کر پیر فضل کو دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: لالہ کی حویلی، کمرہ

چندا لالہ کے سرہانے بیٹھی اسے تسلی دے رہی ہے۔ مگر لالہ رو رہے جا رہی ہیں۔

لالہ: اگر وہ بالکل ٹھیک ہے اور خیریت سے کسی کی پناہ میں ہے تو مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی..... گھر واپس کیوں نہیں لوٹ آتی

اس سے کہو..... میں نے اسے جو اپنی قسم دی تھی..... وہ میں واپس لیتی ہوں۔ بس اب وہ بھی لوٹ آئے.....

چندا: وہ آپ سے خود بات کرے گی..... مجھے بھی اس نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ میں اس کا راز فاش نہ کروں..... مگر اب وہ اس گھر میں لوٹنا نہیں چاہتی لالہ جی..... کہتی تھی کہ وہ مجھے اور آپ کو بھی یہاں سے لے جائے گی..... بس ذرا کچھ صبر کر لیں..... ابھی وہ جن کی پناہ میں ہے..... ان کے احسان کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی زرّی.....

(لالہ دکھ سے ایک گہری سانس لیتی ہے)

لالہ: ہاں..... جانتی ہوں..... ساری زندگی وہ ہم سب کے بھرم ہی تو رکھتی آئی ہے۔ اب بھی وہ سارے عذاب خود ہی سہے گی..... ٹھیک ہے..... میں تمہاری بات پر اعتبار کر کے انتظار کروں گی اس کی کال کا..... اب اس کی آواز سن کر ہی میری سانس میں سانس آئے گی..... ورنہ میں یونہی تڑپتی رہوں گی.....

لالہ کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہے۔ چندا پریشانی سے لالہ کو دیکھ رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

موسیٰ اور پیر فضل ہسپتال کے کسی لان/ یا کینٹین وغیرہ میں بیٹھے بات کر رہے ہیں پیر فضل شرمندہ سا نظر آ رہا ہے موسیٰ ابھی تک حیران اور پریشان ہے۔

موسیٰ: مگر..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اماں نے خود بتایا تھا کہ ستارہ کا رشتہ بہت اونچے اور نجیب الطرفین سید گھرانے میں طے ہوا ہے..... اور ظاہر ہے کہ آپ لوگوں نے بھی اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح چھان بین کی ہو گی..... تو پھر..... یہ سب.....

فضل: انسان اپنی طرف سے یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس نے بہترین منصوبہ بندی کر لی ہے..... اس کے ارادوں میں کوئی نقص نہیں نکال سکتا..... اور اس نے اپنی جدوجہد اور ترکیب سے بہترین فیصلہ کیا ہے۔ مگر پھر اچانک قدرت پلٹ کر اسے ایک جھٹکے میں یہ سبق دے جاتی ہے کہ ہماری ہر ترکیب، ہر منصوبہ بندی اور ہر چال ناقص تھی..... ناقص ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

موسیٰ غور سے سر جھکائے سن رہا ہے۔

ہم بھی آخری وقت تک اونچے خاندان اور عزت دار گھرانے کی کسوٹی پر پرکھتے رہے اسے..... مگر عین بارات کے دن جب ستارہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ وہ لڑکا نشے کے over dose اوور ڈوز کی وجہ سے نکاح کی بجائے ہسپتال پہنچ گیا اور اس کا یہ راز فاش ہو گیا۔ اور میری ستارہ دلہن کے سرخ جوڑے سے پھر سفید پوش ہو گئی.....

موسیٰ: بہت دکھ ہوا سن کر..... بہت زیادہ افسوس ہوا جان کر۔ ستارہ جیسی نایاب لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں کیا انہوں نے..... وہ تو انمول ہے..... بہت قیمتی احساس کی مالک ہے.....

(پیر فضل موسیٰ کے دکھ کو محسوس کرتا ہے۔ اور افسوس سے کہتا ہے)

فضل: دنیا میں بہت سے انمول ہیروں کو خاک میں رُلتے دیکھا ہے میں نے..... مگر نہیں جانتا تھا کہ یہ ناقدری میری اپنی بچی کے حصے میں بھی آئے گی.....

موسیٰ: مگر ستارہ کو ہوا کیا ہے.....؟..... میرا مطلب ہے اس ہسپتال میں کیوں داخل ہے وہ.....

فضل: ٹوٹ پھوٹ گئی ہے وہ اندر سے..... ڈاکٹر کہتے ہیں شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ نے اسے مایوسی کے اندھیرے گڑھوں میں دھکیل دیا ہے۔ ڈپریشن کی مستقل مریضہ بن گئی ہے۔ خوش تو وہ اس رشتے سے پہلے بھی نہیں تھی۔ مگر صرف ہماری خوشی کے

لیے اس نے ہمارے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا تھا..... لیکن شاید اندر ہی اندر گھلتی رہی تھی وہ..... پھر ایک دن آیا کہ موم کی طرح پوری پگھل گئی۔

(موسیٰ دکھ سے پیر فضل کو دیکھتا ہے وہ اٹھ کر پیر فضل کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے)

موسیٰ: میری دعائیں ہمیشہ ستارہ کے ساتھ رہیں گی..... میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ضرور حکم کیجئے گا..... میں ہمیشہ حاضر ہوں..... میں منتظر رہوں گا.....

فضل: کیا تم ستارہ سے نہیں ملو گے..... وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے..... میرے سامنے تو بولتی نہیں..... مگر اس کی ماں اور بہن کو اس کے دل کا حال خوب معلوم ہے۔

(موسیٰ پیر فضل کی بات پر حیرت سے جھجک کر پیر فضل کی طرف دیکھتا ہے)

موسیٰ: جی پیر صاحب..... میں.....؟

پیر فضل سر جھکا لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

سکینہ زہرہ کے کپڑے تہہ کرتے ہوئے اُسے دیکھتی ہے اور بظاہر بے خیالی میں پوچھتی ہے۔

سکینہ: یہ لڑکی کس لائبریری میں کام کرتی ہے..... زہرہ اپنے کسی خیال میں گم ہے۔

زہرہ: لائبریری.....؟ کس لڑکی کی بات کر رہی ہو۔

سکینہ: ارے بھئی یہی تمہاری دوست چندا، اماں نے بتایا تھا کہ تمہاری کوئی دوست آئی ہے جو لائبریری میں کام کرتی ہے..... کن خیالوں میں گم ہو..... ابھی ملاقات ہوئی اور ابھی بھول بھی گئیں.....

(زہرہ کو اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے اور وہ جلدی سے بات بناتی ہے)

زہرہ: ہاں..... وہ چندا..... لائبریری میں کام نہیں کرتی..... بس میری فرمائش پر میری پسند کی کتابیں لا دیتی ہے لائبریری سے جہاں وہ ممبر ہے.....

سکینہ: ارے ..... تو تم مجھ سے کہتیں..... میرے پاس کتنی کتابیں رکھی ہیں جو موسیٰ بھائی مجھے لا کر دیتے تھے..... خود موسیٰ بھائی کا کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا ہے..... پتہ نہیں کہاں کہاں سے کتابیں جمع کر کے لاتے تھے..... فلسفے کی..... منطق کی..... مگر سچ کہوں تو مجھے ان کی کتابوں کی خاک سمجھ نہیں آتی تھی..... انتہائی بورنگ لگتی تھیں مجھے..... مجھے تو بس رومانٹک ناول پسند تھے۔

(موسیٰ کے ذکر پر زہرہ کھو سی جاتی ہے)

زہرہ: اچھا..... تو تمہارے موسیٰ بھائی کو کتابیں پڑھنے کا بھی شوق تھا.....

سکینہ: تو اور کیا.....؟ ..... یہ تو تایا جان اور عیسیٰ کبھی ان کو کہیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے..... کبھی یہ کام تو کبھی وہ مسئلہ..... ہمیشہ کسی نہ کسی پھڈے میں الجھے ہی پایا ہے میں نے انہیں۔ مگر جب بھی ذرا دنیا کے ان ہنگاموں سے فرصت ملتی تھی..... وہ کتابوں میں ہی غرق نظر آتے تھے مجھے.....

(سکینہ اپنی بات سوچ کر خود ہی ہنس پڑتی ہے)

سکینہ: ویسے ایک راز کی بات بتاؤں..... سب سے زیادہ ڈسٹرب انہیں میں ہی کیا کرتی تھی کتاب پڑھتے ہوئے..... کبھی یہ

فرمائش تو کبھی وہ فرمائش.....اور کچھ نہیں تو عیسیٰ سے خود ہی جھگڑا کر کے اس کی شکایت لے کر موسیٰ بھائی کے پاس پہنچ جایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں..... مجھے ان کی توجہ کتاب کی طرف دیکھ کر برداشت ہی نہیں ہوتا تھا.....

(زہرہ غور سے سکینہ کو دیکھتی ہے)

زہرہ: تمہیں بہت یاد آتے ہیں ناں تمہارے موسیٰ بھائی.....

(سکینہ اُداس ہے)

سکینہ: ہاں.....بہت زیادہ.....کاش ہم تینوں ہمیشہ بچے ہی رہتے.....کبھی بڑے نہ ہوتے.....وہ میری.....عیسیٰ کی.....اور موسیٰ بھائی کی زندگی کا بہترین دور تھا.....مگر اب سب کھو گیا۔

زہرہ: میری دعا ہے کہ تم سب کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں.....

سکینہ: ہاں.....اللہ کرے.....اس سب کی ذمہ دار میں ہوں۔ میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

زہرہ: نہیں۔ تمہارا کوئی قصور نہیں۔ ذمہ دار تو وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے موسیٰ کی زندگی میں یہ سارے طوفان آئے۔ اور جس کی وجہ سے وہ آج بھی در بدر بھٹک رہا ہے.....سکینہ!.....(زہرہ جھجکتے ہوئے بولتی ہے)

کیا تم مجھے اپنے موسیٰ بھائی کا کمرہ دکھاؤ گی.....شاید میرے مطلب کی کوئی کتاب مل جائے وہاں۔

سکینہ: ہاں ہاں کیوں نہیں.....میں تائی جان سے کمرے کی چابی لے کر آج شام ہی تمہیں لے جاؤں گی وہاں.....

//Cut//

Scene No # 13

وقت: دن

جگہ: ہسپتال

موسیٰ پیر فضل کے ساتھ راہداری میں چلتے ہوئے ستارہ کے مرے تک آتا ہے، ٹھیک اسی وقت ستارہ کی ماں کمرے سے باہر نکلتی ہے اور موسیٰ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں، موسیٰ اسے سلام کرتا ہے۔

شائستہ: جیتے رہو.....دیکھو موسیٰ بیٹا.....میری ستارہ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے.....اب تو وہ میری بھی نہیں سُنتی.....

موسیٰ: آپ فکر نہ کریں.....ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا.....

(شائستہ رو پڑتی ہے)

شائستہ: یہ سب ہمارے جھوٹے غرور اور گھمنڈ کی سزا ہے.....ہم نے تم کو خود سے کم تر جانا.....تو دیکھو.....قدرت نے ہم سے کیسا بدلہ لیا.....

موسیٰ: ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں.....، اور شکر کریں کہ اصل حقیقت آپ سب پر ستارہ کی رخصتی سے پہلے کھل گئی.....کہیں خدانخواستہ یہ ساری باتیں ستارہ کے نکاح کے بعد کھلتیں تو آپ لوگ کیا کرتے.....

(پیر فضل درمیان میں دخل دیتا ہے)

فضل: کیسی ہے اب اس کی طبیعت.....

شائستہ: ویسی ہی ہے۔ مریم بیٹھی ہے اس کے سرھانے.....مگر میری بچی نے تو کسی سے بات چیت کرنی ہی بند کر دی ہے.....میری چڑیا جیسی چہکنے والی گڑیا جس کے قہقہوں سے ہمارا سارا گھر گونجتا تھا.....اسے تو کوئی چپ لگ گئی ہے موسیٰ بیٹا.....تم بات کر کے دیکھو.....شاید تمہیں دیکھ کر اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جائے.....ورنہ یہ چپ میری بچی کو کھا جائے گی.....

//Cut//

Scene No # 14

وقت: دن

جگہ: ہسپتال، ستارہ کا کمرہ

موسیٰ دروازے پر خاموش سی دستک دے کر دروازہ کھولتا ہے اور اندر آ جاتا ہے۔ اندر مریم ستارہ کے سرھانے بیٹھی ہوئی ہے، اور ستارہ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی ہے۔ موسیٰ کو دیکھ کر مریم کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ دھیرے سے نڈھال، کم زور اور لاغر سی پڑی ستارہ کو شانے سے ہلا کر کہتی ہے۔

مریم: ستارہ..... آنکھیں کھولو..... دیکھو..... تم سے کون ملنے آیا ہے۔

(ستارہ کوئی رسپانس نہیں دیتی۔ موسیٰ قریب آ جاتا ہے)

مریم: ستارہ..... آنکھیں تو کھولو..... دیکھو..... موسیٰ بھائی تم سے ملنے آئے ہیں.....

موسیٰ کا نام سن کر ستارہ کے وجود میں حرکت سی ہوتی ہے اور وہ دھیرے سے آنکھیں کھول کر بے یقینی سے پہلے مریم کی طرف دیکھتی ہے جیسے اسے مریم کی بات پر یقین نہ ہو اور پھر موسیٰ پر نظر پڑتے ہی اسے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔

موسیٰ: لیٹی رہو آرام سے..... تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے ابھی۔

ستارہ: موسیٰ..... آپ..... یہاں.....؟..... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا.....

موسیٰ: یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے اپنا..... میں تو تمہیں بہت بہادر لڑکی سمجھتا تھا.....

ستارہ: کچھ نہیں ہوا مجھے۔ امی ابا تو بس خوامخواہ مجھے اٹھا لائے ہیں اس ہسپتال میں..... ذرا سی کم زوری ہے..... اور بس.....

موسیٰ: ذرا سی کم زوری نے ہی تمہارا رنگ کسی خشک پتے کی طرح پیلا اور زرد کر دیا ہے..... سانس رک رک کر آ رہی ہے..... نقاہت سے ہلکے پڑے ہوئے ہیں تمہاری آنکھوں کے گرد.....

(موسیٰ سائیڈ ٹیبل پر پڑی دواؤں کا انبار دیکھتا ہے۔)

موسیٰ: اور ڈاکٹروں نے اتنی ساری دوائیں لکھ دی ہیں تمہارے لیے..... سچ بتاؤ..... کیا اتنا پسند تھا تمہیں وہ تمہارا دولہا.....؟

(ستارہ موسیٰ کی بات پر مسکرا دیتی ہے، مریم حیرت سے ستارہ کو دیکھتی ہے)

ستارہ: ہاں..... بہت پسند تھا..... اس کی جدائی برداشت نہیں کر پائی.....

مریم: اوہ خدایا..... موسیٰ بھائی۔ آپ کی وجہ سے آج یہ مہینوں بعد مسکرائی ہے..... قسم سے..... ہم تو اس کے ہونٹوں پہ یہ مسکراہٹ دیکھنے کے لیے ترس ترس کر مر ہی گئے تھے۔

(موسیٰ بھی مسکرا کر ستارہ کو دیکھتا ہے)

موسیٰ: پھر کب تک ارادہ ہے اس نایاب دولہا کی جدائی کا سوگ منانے کا.....

(ستارہ غور سے موسیٰ کو دیکھتی ہے)

ستارہ: غم بہت بڑا ہے۔ وقت تو لگے گا.....

(مریم ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ چپکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے، موسیٰ اور ستارہ کمرے میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔)

موسیٰ: تمہاری وجہ سے تمہارے سب چاہنے والے کتنے پریشان ہیں..... کچھ سوچا ہے تم نے.....

ستارہ: سوچنے سمجھنے کی حس بہت پہلے مر گئی تھی میرے اندر..... اب تو بس سانس باقی ہے جو آ جا رہی ہے..... دعا کریں یہ بھی ساتھ چھوڑ جائے۔

(ستارہ کی پلکیں بھیگنے لگتی ہیں)

(موسیٰ ستارہ کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔)

موسیٰ: لیکن کبھی تم نے کہا تھا کہ ہماری زندگی صرف ہماری نہیں ہوتی.....،.....اس پر ہم سے جُڑے ہمارے اپنوں کا حق کبھی کبھی خود ہم سے بھی زیادہ ہوتا ہے.....کہا تھا ناں

ستارہ بے بسی سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن

جگہ: کاشانہ ہیراں، زہرہ کا کمرہ

زہرہ اپنے کمرے میں سوچ میں گم بیٹھی ہے۔اتنے میں سکینہ حسب معمول اپنے انداز میں آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوتی ہے،اس کے ہاتھ میں ایک چابی ہے۔

سکینہ: سوری یار.....مجھ سے صبر نہیں ہوا.....میں نے تائی جان سے ابھی چابی مانگ لی.....چلو تیار ہو جاؤ

زہرہ: مگر تم نے تو شام کا کہا تھا۔

سکینہ: ہاں.....مگر پھر مجھے خیال آیا کہ شام کو تو تایا جان بھی ہوں گے گھر پر.....پتہ نہیں انہیں تمہارا یوں عدّت میں مردانے میں نکلنا کہیں معیوب نہ لگے.....وہ بڑے سخت مزاج ہیں ان معاملات میں.....اسی لیے میں نے جاتے ہی تائی جان سے چابی پکڑ لی۔

زہرہ: انہوں نے پوچھا نہیں.....کیا کرنی ہے موسیٰ کے کمرے کی چابی.....

(سکینہ پٹر پٹر بولتی رہتی ہے)

سکینہ: پوچھا تھا.....،.....میں نے بتا دیا کہ کسی کتاب کی تلاش ہے تمہیں.....،.....اور بھئی.....کیا جادو ہے تمہارے نام میں.....فٹ سے انہوں نے چابی میرے حوالے کر دی.....ورنہ پہلے تو میں موسیٰ بھائی کے کمرے کی چابی مانگ مانگ کر تھک جاتی تھی.....مگر مجال ہے جو کبھی انہوں نے اتنی آسانی سے مجھے دی ہو یہ چابی.....اچھا اب یہ گم سم سی کیوں بیٹھی ہو.....چلو جلدی کرو.....اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے.....

سکینہ زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اٹھاتی ہے اور دونوں کمرے سے نکل جاتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: ہسپتال، ستارہ کا کمرہ

کمرے میں خاموشی سی طاری ہے۔ستارہ اور موسیٰ خاموش بیٹھے ہیں۔موسیٰ سر جھکائے کچھ سوچ رہا ہے۔ستارہ اسے غور سے دیکھتی ہے۔

ستارہ: آپ میری چھوڑیں.....اپنی سنائیں۔میں گئی تھی آپ کی زہرہ سے ملنے.....،بلکہ لڑنے.....مگر اسے دیکھ کر سب بھول گئی.....واقعی وہ ایسی ہی زہرہ ہے جسے دیکھ کر چاندنی بھی شرما جائے.....

موسیٰ: (موسیٰ چونکتا ہے) کب.....؟.....کب ہوئی تھی تمہاری ملاقات.....مجھے عیسیٰ نے کچھ بتایا تو تھا.....مگر وہ غصے میں پوری بات نہیں بتا پایا تھا اس دن.....

ستارہ: جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ آپ نے زہرہ کی خاطر ان لڑکوں پر گولی چلائی تھی۔ مگر زہرہ سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ وہ کوئی اور تھی.....

موسیٰ: بس..... وہ بھی تقدیر کا ایک کھیل تھا..... سو کھیلنا پڑا.....

ستارہ: میری ایک بات مانیں گے آپ موسیٰ.....

موسیٰ: ہاں..... بولو.....

ستارہ: آپ گھر واپس چلے جائیں..... وہ سب لوگ آپ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں..... آپ کو شاید اندازہ نہیں۔

موسیٰ: میرا گھر واپس جانا میری اپنی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ تم جانتی ہو کہ مجھے ابا جان نے گھر سے چلے جانے کا حکم دیا تھا..... اب ان کی اجازت کے بناء میں واپس کیسے لوٹ سکتا ہوں۔

ستارہ: میں ابا سے کہوں گی کہ وہ جا کر انہیں منا لیں..... اپنی پرانی دوستی کا اتنا تو بھرم رکھیں گے وہ۔

موسیٰ: تم میری فکر چھوڑ دو۔ میں جہاں بھی ہوں..... ٹھیک ہوں..... مگر تم جہاں ہو..... یہ جگہ تم جیسی لڑکی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ وعدہ کرو مجھ سے کہ ہماری اگلی ملاقات اس ہسپتال میں نہیں ہوگی۔

ستارہ: اتنا مشکل وعدہ نہ لیں مجھ سے موسیٰ..... یہ سب میرے بس میں نہیں ہے..... اور پھر آپ کی طرح میں بھی تو ان ڈاکٹروں کی مرضی کی مرہون منت ہوں ناں..... اب طبیب ہی نہ چاہے تو مریض کیسے رخصت ہو..... (ستارہ مسکراتی ہے)

موسیٰ: (موسیٰ بھی مسکرا دیتا ہے) چلو یونہی سہی..... سمجھو آج سے میں تمہارا طبیب ہوں..... اور تم وعدہ نہیں۔ کوشش تو کر سکتی ہو ناں..... یہ سب تمہاری ول پاور wil power پر منحصر ہے..... اچھا سوچو گی..... تو اچھا ہی ہوگا۔

ستارہ: چلیں میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنے اندر بہتری لانے کی کوشش کروں گی..... مگر میرا یہ وعدہ آپ کے ایک وعدے پر منحصر ہوگا۔

موسیٰ: کیسا وعدہ.....

ستارہ: یہی کہ آپ کو جب بھی وقت ملے گا..... آپ دوبارہ یہاں مجھ سے ملنے آئیں گے.....

موسیٰ: بس اتنی سی بات ہے..... چلو وعدہ رہا.....

ستارہ: دیکھیں بھول نہ جایئے گا..... میں انتظار کروں گی آپ کا..... صبح شام.....

موسیٰ ستارہ کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر چپ رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

سکینہ موسیٰ کے بند کمرے کا تالا کھولتی ہے اور زہرہ سے کہتی ہے۔

سکینہ: کھل جا سم سم ..... چلو آ جاؤ..... ویسے زرّی تم بڑی قسمت والی ہو..... ورنہ موسیٰ بھائی کے ہوتے ہوئے تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کے کمرے میں قدم بھی دھر سکے.....

زہرہ کھوئی کھوئی سی موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے جہاں ہر چیز نفاست سے اپنی جگہ پڑی ہوئی ہے۔ کمرے میں چار اطراف بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن کے اوپر پڑے ہلکے پردے ہوا سے جھول رہے ہیں اور باہر کی دھوپ ان کھڑکیوں سے چھن کر اندر آ رہی ہے۔ ایک جانب الماری میں بہت سی کتابیں رکھی ہیں اور آس پاس دیواروں کے ریکس بھی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔

سکینہ: تایا جان کہتے ہیں کہ گھر اور کمرے ہماری شناخت ہوتے ہیں، کمرے کی نفاست اور ترتیب اس میں رہنے والے انسان کی شخصیت کا پتہ دیتی ہے.....تو بتاؤ..... یہ کمرہ دیکھ کر تمہیں میرے موسیٰ بھائی کی شخصیت کا کچھ اندازہ تو ہوا ہوگا.....؟

زہرہ سکینہ کی بات سُن کر چونکتی ہے اور اسے یاد آتا ہے کہ موسیٰ اس کی خاطر کہاں کہاں اور کس کس طرح گلیوں میں انتظار کرتے اور رانا کی ڈانٹ سُن کر خوار نہیں ہوا۔ سکینہ اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتی ہے۔

سکینہ: کیا ہوا.....کہاں کھو گئیں.....

زہرہ: ہاں.....کہیں نہیں.....واقعی.....کمرے کی ترتیب اور نفاست سے ہی تمہارے بھائی کی اندرونی شخصیت جھلک رہی ہے .....سوچتی ہوں.....ایسے انسان کو کیسے کیسے پتھر لوگوں کے لیے لوگوں کی سنگ باری سہنا پڑی ہوگی.....زمانے نے کتنے پتھر برسائے ہوں گے اس ایک لڑکی کی وجہ سے تمہارے بھائی پر.....،.....

(سکینہ بھی دکھی ہو جاتی ہے)

سکینہ: سچ کہتی ہو.....،.....اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھو.....جس کی وجہ سے میرے بھائی نے سارے زمانے سے جنگ مول لی.....وہ خود بھی بیاہ کر کسی اور کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر پیا گھر سدھار گئی.....

زہرہ: فکر مت کرو.....ایسے لوگ کبھی بستے نہیں.....وہ بھی کبھی آباد نہیں ہوگی.....

(سکینہ چونک کر زہرہ کے لہجے کی تلخی کو نوٹ کرتی ہے)

سکینہ: اچھا تم کتابیں دیکھ لو جلدی سے.....میں ابھی آتی ہوں.....سکینہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ زہرہ چند لمحے وہیں کھڑی رہ کر کمرے کے در و دیوار کو دیکھتی ہے اور پھر کسی ریک سے ایک آدھ کتاب اٹھا کر دیکھتی ہے۔ پھر اس کی نظر کھڑکی کے قریب پڑی ایک میز پر پڑتی ہے جس پر رکھی کوئی ڈائری باہر کی ہوا سے پھڑ پھڑا کر کھل جاتی ہے۔ کھڑکی سے آتی ہوا سے ڈائری کے ورق پھڑ پھڑاتے ہوئے کھل جاتے ہیں۔ اور ا۔ر سے ایک خشک گلاب نیچے گر جاتا ہے.....زہرہ چونک کر گلاب کا پھول اٹھاتی ہے اور جہاں سے پھول گرا تھا وہ ورق دیکھتی ہے۔ ورق پر زہرہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ زہرہ اپنا نام دیکھ کر چونک جاتی ہے اور جلدی سے اٹھا کر ڈائری کا ورق پڑھتی ہے.....ڈائری میں بہت نفیس ہینڈ رائٹنگ میں غالب کی ایک غزل زہرہ کے نام کے سامنے والے صفحے پر لکھی ہے۔

غالب کی غزل زہرہ کی آواز میں

اس پر اوور لیپ ہوتی ہے۔

غزل کے بول.....

ہر ایک بات پر کہتے ہو تم، کہ تُو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے.....؟

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو راکھ اب آخر یہ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے.....

زہرہ پڑھتی رہتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس کے کانوں میں موسیٰ کی آواز میں پہلا شعر پھر سے گونجتا ہے جس کی بازگشت اسے دیر تک سُنائی دیتی رہتی ہے۔

موسیٰ کی آواز

اور لیپ

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم، کہ تُو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے.....؟

زہرہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑی پڑھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: سڑک/پاسنگ

موسیٰ اور نامراد سارنگا کی جیپ میں ہسپتال سے باہر نکلتے ہیں۔ موسیٰ چپ چاپ کسی سوچ میں گم بیٹھا ہے۔ نامراد اسے غور سے دیکھتا ہے۔

نامراد: کون تھے یہ بزرگ جو ہسپتال میں ملے تھے.....اور یہ کیا ماجرا ہے شہزادے.....

موسیٰ: یہ پیر فضل شاہ ہیں.....ابا کے بہت پرانے دوست.....ان کی صاحبزادی یہاں داخل ہے.....

نامراد: اچھا.....مگر تمہیں کیوں اپنے ساتھ لے گئے تھے مریض کے کمرے میں.....یہ کیا کہانی ہے صوفی صاحب.....؟

موسیٰ: یہ بھی ایک ادھوری کہانی ہے.....میری اور بہت سی ادھوری کہانیوں کی طرح.....

نامراد: سب ٹھیک تو ہے ناں.....

(موسیٰ کہیں کھویا ہوا ہے)

موسیٰ: ہاں.....شاید.....بس اتنا سمجھ لو کہ پیر فضل صاحب کے ہاں رشتہ طے کیا تھا میرا میرے ماں باپ نے.....مگر پھر زہرہ کی اور میری داستان عام ہوگئی.....اور یہ رشتہ ٹوٹ گیا.....مگر وہ پاگل لڑکی ستارہ، آج بھی میرے انتظار میں بیٹھی ہے.....خود کو اس نے اتنا الجھا لیا ہے عشق کے دھاگوں میں کہ شدید بیمار ہو کر بستر پر آن پڑی ہے.....یہ سب میرے مقدر کی بدبختیاں ہیں.....کہ جو بھی میرے قریب آیا یا جس کے قریب بھی میں نے جانے کی کوشش کی.....وہ سدا برباد ہی ہوا.....

نامراد: ایسے نہ کہو.....مجھے تو تمہارا عشق پارس جیسا لگتا ہے۔ جسے بھی چھو گیا.....اسے کندن کر ڈالا.....تم تو بڑے نصیبوں والے ہو موسیٰ.....اتنی محبتیں زندگی میں بھلا کسے نصیب ہوتی ہیں.....

موسیٰ: کاش.....کاش میرا عشق ایسا ہوتا.....مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے جسے بھی چھوا.....اسے خاک کر ڈالا.....تم بس دعا کرو کہ ستارہ جلد ٹھیک ہو جائے.....اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا.....

//Cut//

Scene No # 19

وقت: شام

جگہ: کاشانہ پیراں، زہرہ کا کمرہ

ایک نوکرانی آتی ہے اور زہرہ کو ایک سیل فون دیتی ہے۔

نوکرانی: زرّی بی بی۔ یہ بڑی پیرنی جی نے بھیجا ہے۔ آپ کے لیے۔

زہرہ: ہاں.....ٹھیک ہے۔ مگر تم کچھ دیر بعد یہ فون واپس لے جانا.....مجھے بس ایک کال کرنی ہے.....پھر ضرورت نہیں پڑے گی مجھے اس کی۔

نوکرانی: جی.....ٹھیک ہے.....

نوکرانی چلی جاتی ہے۔ زہرہ اس کے جانے کے بعد چند لمحے انتظار کرتی ہے اور پھر کوئی نمبر ملاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: شام

جگہ: لالہ کی حویلی

چندا ہاتھ میں فون پکڑے بھاگتی ہوئی لالہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

چندا: آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ناں..... یہ لیں..... کر لیں اپنی لاڈلی سے بات.....

(لالہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ جلدی سے بیماری بھول کر اٹھ بیٹھتی ہے)

لالہ: کیا..... زرّی کا فون ہے..... کہاں..... لاؤ دکھاؤ..... میری بچی سے بات کراؤ میری.....

چندا: یہ لیں..... مگر لمبی بات مت کیجئے گا..... زرّی جہاں ہے وہاں پر وہ کھل کر بات نہیں کر سکتی..... بس اپنا اطمینان کر لیں۔

لالہ کانپتے ہاتھوں سے فون پکڑتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 21

وقت: شام/رات

جگہ: کاشانہ ء پیراں، زہرہ کا کمرہ

زہرہ لالہ سے فون پر بات کر رہی ہے۔

زہرہ: اچھا..... آپ رونا تو بند کریں..... ٹھیک ہوں میں..... کچھ نہیں ہوا مجھے..... اور بہت محفوظ مقام پر ہوں.....

لالہ: خدا غارت کرے اس شہر یار کو..... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ کاش میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کرنے میں اتنی جلدی نہ کرتی.....

زہرہ: جو بھی ہوا..... وہ میرا نصیب تھا.....

لالہ: ہم نے اس لڑکے موسیٰ کو پہچاننے میں بھی بہت غلطی کر دی زرّی..... وہ تو بہت مختلف۔ بڑا ہمدرد نکلا..... ان بُرے دنوں میں اس نے بہت ساتھ دیا ہے ہمارا..... کاش میں اسے پہلے پہچان لیتی.....

(زہرہ چپ چاپ لالہ کی بات سُنتی رہتی ہے۔ تبھی دروازے پر سکینہ کسی کام سے آتی ہے مگر اسی وقت زہرہ کے منہ سے موسیٰ کا نام سن کر ٹھٹھک کر رک جاتی ہے۔)

زہرہ: جی لالہ جی..... ہم سب نے موسیٰ کو جاننے میں بہت غلطیاں کی ہیں..... لیکن جو ہونا تھا..... ہو چکا..... آپ خود کو ہلکان نہ کریں..... آپ کی زہرہ ٹھیک ہے..... اور بہت معزز گھرانے میں اپنی عزت گزار رہی ہے.....

سکینہ زہرہ کا نام سن کر ہکا بکا سی باہر کھڑی اپنی جگہ پر جم جاتی ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 27

Scene No # 1

وقت: رات

جگہ: کاشانہ وپیراں/ دروازہ

زہرہ کا کمرہ۔زہرہ لفاً سے بات کررہی ہے۔

سکینہ زہرہ کے منہ سے اس کا اصل نام یعنی زہرہ سن کر چکرا جاتی ہے اور اس کی زبان سے خود بخود دھیرے سے نکل جاتا ہے۔

سکینہ: اوہ میرے خدا..... زرّی ہی زہرہ ہے..... موسیٰ بھائی کی زہرہ.....

سکینہ خود پر قابو پاتی ہے اور کان لگا کر اندر ہوتی زہرہ اور لفاً کی فون کال سننے کی کوشش کرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ۔فون کال

زہرہ لفاً سے فون پر بات کررہی ہے۔

زہرہ: اچھا وعدہ کریں مجھ سے۔اب آپ بالکل بھی پریشان نہیں ہوں گی اور نہ ہی مجھے یاد کر کے روئیں گی.....اور اپنی ساری دوائیں وقت پر لیں گی۔

(لفاً اپنے آنسو صاف کرتی ہے)

لفاً: بہت ضدی ہو..... ہمیشہ اپنی ہی منواتی ہو مجھ سے.....

زہرہ: اور ہاں..... چندا کہہ رہی تھی کہ آج کل آپ اس کی کوئی بات نہیں سنتیں..... یہ بھی وعدہ کریں کہ اب اپنی صحت کے معاملے پر کوئی ضد نہیں کریں گی آپ اور چندا کی ہر بات مانیں گی۔جیسے پہلے میری ہر بات مانا کرتی تھیں.....ٹھیک ہے ناں.....

زہرہ لفاً سے بات کرتی رہتی ہے۔باہر دروازے پر کھڑی سکینہ دھیرے سے واپس پلٹ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: رات

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ حیران و پریشان سی اپنے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور جلدی سے دروازہ بند کر کے بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے،اس کے پس منظر میں خود اس کی اپنی سوچ کی آواز اس پر اوورلیپ ہوتی ہے۔

سکینہ/ آڈیو: یہ کیا بھید ہے میرے اللہ..... زرّی ہی موسیٰ بھائی کی زہرہ ہے..... لیکن ..... زہرہ اوورلیپ..... یہاں.....وہ تو اپنی عدّت پوری کرنے کے لیے یہاں آئی ہے.....مطلب زہرہ کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی

ہے.....اوہ میرے خدا..... یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ زہرہ یہاں ہے اور موسیٰ بھائی جانے کہاں در بدر بھٹک رہے ہیں..... مگر عیسیٰ نے تو بتایا تھا کہ زرّی کو علامہ شہاب الدین صاحب نے بطورِ امانت ہمارے گھر عدت گزارنے کے لیے بھیجا ہے.....

سکینہ بے چینی سے ٹہلتی رہتی ہے اور پھر اسے اچانک ایک خیال آتا ہے۔

Audio: مگر عیسیٰ نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تائی جان خود زہرہ سے ملنے کے لیے اس کے گھر گئی تھیں.....اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تائی جان کو بھی پتہ ہے کہ زرّی ہی اصل میں زہرہ ہے۔ مگر انہوں نے کسی مصلحت کے تحت ہی خاموشی اختیار کر رکھی ہو گی.....کاش۔ کاش میں کسی طرح موسیٰ بھائی تک یہ اطلاع پہنچا سکوں کہ جس لڑکی کی خاطر انہوں نے سارے زمانے سے ٹکر لے رکھی ہے۔ وہ یہیں ہے.....ان کے اپنے گھر میں..... جوان کے کمرے میں خاموش کھڑی جانے کتنی دیر دیواروں کو تکتی رہی تھی آج.....

(سکینہ کی سوچ چلتی رہتی ہے اور وہ تھک کر بیٹھ جاتی ہے)

سکینہ: ٹھیک ہے۔ اگر تائی جان نے اور زہرہ نے اپنی شناخت پر پردہ ڈالا ہے تو میں بھی اس راز کو تب تک راز ہی رہنے دوں گی جب تک حالات بہتر نہیں ہو جاتے.....عیسیٰ.....عیسیٰ.....کہاں ہو تم.....مجھے آج تمہاری کمی شدّت سے محسوس ہو رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن نکلنے کا مونتاج۔صبح

جگہ: شہر کی ہل چل.....سارنگا کا اڈّہ

سارنگا، چاند پوری، موسیٰ بیٹھے ہیں۔ موسیٰ گم سم سا بیٹھا ہے۔ نامراد جلدی میں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

نامراد: چل بھئی موسیٰ.....آج ہم نے شہر کے لیڈیز ہاسٹل اور عورتوں کی دارالامان وغیرہ دیکھنی ہیں.....چل جلدی کر..... اور چاند پوری تم اور کوکا باقی ہسپتال دیکھو گے.....چلو جگہیں بہت ہیں اور وقت کم ہے۔

چاند پوری جانے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔

موسیٰ ویسے ہی بیٹھا رہتا ہے، سب اسے چونک کر دیکھتے ہیں۔

سارنگا: کیا بات ہے.....آج جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا.....؟.....گم سُم کیوں بیٹھا ہے اس طرح.....

موسیٰ: کوئی فائدہ نہیں ہے.....کتنے ہفتوں سے ہم شہر کا شہر چھان رہے ہیں.....، اسے ملنا ہوتا تو اب تک مل چکی ہوتی۔ میری وجہ سے تم سب بھی دن رات ایک خوامخواہ کی اذیّت اور عذاب کا شکار ہو چکے ہو.....اپنے سارے کام دھندے بھول کر سارا سارا دن میرے ساتھ اس کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہو۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اب ہم سب سارے دن کی یہ کھوج ترک کر دیں گے.....

سارنگا: کیسی بات کر رہا ہے موسیٰ.....بھلا عشق بھی کبھی مایوس ہوتا ہے.....اور بھلا عاشق بھی کبھی ہار مانتا ہے.....

موسیٰ: ہار نہیں مان رہا میں بھائی.....بس تم سب سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تم لوگ اپنے کام دھندے پر دھیان دو.....، میری تو ساری زندگی پڑی ہے اسے تلاش کرنے کے لیے.....سو میں تلاش کرتا رہوں گا اسے اکیلے.....، میری خاطر اتنے بہت سے لوگ کیوں خوار ہوں آخر.....

(سارنگا، چاند پوری اور نامراد ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں)

چاند پوری: تو ہم نے کون سا روزانہ ٹائی کوٹ یا سوٹ بوٹ پہن کر کسی سرکاری دفتر جانا ہوتا ہے نوکری کرنے کے لیے..... پہلے بھی

تو سارا دن لفٹری ہی کرتے تھے پیارے.....وہی آوارہ گردی آج بھی سہی.....

نامراد: چاند پوری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بلکہ تمہاری وجہ سے تو ہماری اس آوارہ گردی کو بھی ایک وجہ مل گئی ہے.....ایک مقصد بن گیا ہے ہماری زندگی کا بھی.....،.....تم ہم سے یہ مقصد، یہ خوشی کیوں چھین لینا چاہتے ہو جو تمہارے ساتھ در بدر بھٹکنے سے ہمیں ملتی ہے۔ کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے.....؟.....کوئی رشتہ نہیں ہے ہمارا تمہارے ساتھ.....(نامراد جذباتی ہو جاتا ہے)

موسیٰ: یہ مقصد نہیں تھا میرا.....میری بات کو غلط رنگ میں نہ لو.....خدا کے لیے.....

سارنگا: (سارنگا غور سے موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے) ادھر آ میرے پاس شہزادے.....

(موسیٰ سارنگا کے قریب آتا ہے، سارنگا اسے شانوں سے پکڑ کر غور سے دیکھتا ہے)

سارنگا: اگر تُو ہار گیا ناں.....تو عشق ہار جائے گا.....پھر زمانے میں کوئی کسی عاشق پر یقین نہیں کرے گا.....ہمت کر.....ایسے دل نہ چھوڑ اپنا.....

(سارنگا موسیٰ کا شانہ تھپکتا ہے، موسیٰ کی پلکیں بھیگنے لگتی ہیں۔)

موسیٰ: تھک گیا ہوں سارنگا بھائی.....

(سارنگا موسیٰ کی پلکیں پونچھتا ہے)

سارنگا: نہ.....یہ نہ کرنا.....،ورنہ سارنگا بھی زندگی میں پہلی بار رو پڑے گا.....،.....چل.....ہمت پکڑ.....چل شاباش.....،یہ کم بخت نامراد تجھے لیے بنا یہاں سے نہیں جائے گا.....جا.....شاباش.....

موسیٰ اپنے آنسو چھپاتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے.....اس کے پیچھے نامراد بھی لپکتا ہے۔ سارنگا اپنا پلکوں کی نمی چھپانے کے لیے دیوار کی طرف منہ کر لیتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن، دوپہر

جگہ: کاشانہء پیراں

کمرے میں فرش پر دستر خوان بچھا ہوا ہے اور پیر قدرت، ہاجرہ، خدیجہ وغیرہ بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ سکینہ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی ماں خدیجہ اسے غصے سے گھورتی ہے۔

خدیجہ: کہاں رہ گئیں تھیں۔ کب سے دستر خوان بچھا ہوا ہے.....رزق کو انتظار نہیں کرواتے۔

سکینہ: وہ اماں.....میں زرّی کے لیے کھانا لے کر گئی تھی.....مگر اس کا تو آج روزہ ہے.....

(روزے کی بات پر پیر قدرت چونکتا ہے۔ خدیجہ پریشانی سے پوچھتی ہے)

خدیجہ: ارے.....کسی نے اسے سحری بھی پہنچائی تھی کہ نہیں.....؟

ہاجرہ: (پیرنی جواب دیتی ہے) ہاں.....زرّی نے مجھے بتا دیا تھا کہ اُس نے اپنے پچھلے کچھ قضا روزوں کی گنتی پوری کرنی ہے.....میں نے نوراں کو اس کی سحری اور افطاری کی تیاری کی ذمہ داری سونپ دی ہے.....

(قدرت کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے)

قدرت اللہ: ماشاءاللہ.....،.....دیکھو سکینہ.....تمہیں بھی روزے دار کا پورا خیال رکھنا ہے.....اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔

(سکینہ غور سے اپنی ساس کو دیکھتے ہوئے کہتی ہے)

سکینہ: جی تایا جی.....میں تو بہت خیال رکھتی ہوں زرّی کا.....وہ ہے ہی اتنی اچھی.....نیک.....اور دین دار.....،تایا جان.....

سچ کہوں تو میرا تو دل نہیں چاہتا کہ زرّی اس گھر سے اب واپس جائے..... کیا ہم اسے یہاں رکھ نہیں سکتے ہمیشہ کے لیے.....

قدرت: (قدرت مسکراتا ہے) لگتا ہے چار دن میں ہی زرّی نے تم سب کے دل میں گھر کر لیا ہے..... یہی اچھے خاندانی اور نسلی ہونے کی نشانی ہوتی ہے..... مگر وہ یہاں علامہ صاحب کی امانت ہے ہمارے پاس..... کل علامہ حضرت واپس لوٹ آئیں گے ان شاءاللہ..... دیکھو..... پھر جو اس کا نصیب.....

سکینہ: ویسے زرّی کی عدت ختم ہونے میں بھی تو کچھ ہی دن باقی رہ گئے ہیں تایا جان..... سچ..... وہ اتنی پیاری ہے کہ اگر موسیٰ بھائی یہاں ہوتے تو میں زرّی کو اپنی بھابھی بنا لیتی.....

(ہاجرہ سکینہ کی بات سن کر زور سے چونکتی ہے۔ خدیجہ بیٹی کو غصے میں جھاڑتی ہے)

خدیجہ: سکینہ..... تم ہوش میں تو ہو..... جو منہ میں آتا ہے بکے جاتی ہو..... نہ بڑوں کا لحاظ..... نہ شرم.....

(سکینہ مسکین بننے کی ایکٹنگ کرتی ہے، میں نے کون سی کوئی غلط بات کہہ دی)

سکینہ: ..... بس..... نکل گیا منہ سے جو دل میں تھا..... اور پھر ہمیں موسیٰ بھائی کے لیے ایسی ہی نیک اور خاندانی لڑکی کی تلاش تھی..... زرّی میں وہ سب گُن موجود ہیں جو اسے اس گھر کی بہو بننے کے لائق بناتے ہیں.....

سکینہ کی بات سُن کر ہاجرہ اور پیر قدرت دونوں کسی سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ سکینہ کن انکھیوں سے ان سب کے (Reactions) تاثرات دیکھتی ہے کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے یا نہیں، خدیجہ ایک بار پھر بیٹی کو ڈانٹتی ہے۔

خدیجہ: کسی پرائے گھر کی بیٹی کے لیے ایسا نہیں کہتے..... جانے وہ بے چاری کن مشکلات اور تکلیفوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے..... بس اس کے لیے دعا کیا کرو کہ خدا اس کے آگے نصیب اچھے کرے.....

قدرت: (پیر قدرت کسی گہری سوچ میں گم ہے۔) ان شاءاللہ..... اس کے لیے آگے بہتری ہوگی..... سب کھانا کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: رات

جگہ: سارنگا کا اڈہ۔ یا نامراد کا گھر

موسیٰ زہرہ کی یاد میں گم سم سا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ اُسے زہرہ سے ہوئی لائبریری والی ملاقات اور اس کا مسکرانا وغیرہ سب یاد آ رہا ہے۔ موسیٰ کی اداسی بڑھتی جا رہی ہے۔ پس منظر میں ''رقصِ بسمل'' کا OST اوور لیپ ہو رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: رات

جگہ: کاشانۂ پیراں، زہرہ کا کمرہ

OST Back Ground زہرہ پر شفٹ ہوتا ہے۔ زہرہ بھی اپنے ہاتھ میں کوئی کتاب پکڑے گم سم سی بیٹھی موسیٰ کی یادوں میں کھوئی ہوتی ہے، اتنے میں اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی ہے اور سکینہ اندر جھانکتی ہے۔

سکینہ: میں آ جاؤں..... سوئی تو نہیں ناں ابھی تک۔

زہرہ: (زہرہ سکینہ کے انداز پر مسکرا دیتی ہے) نہیں..... جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔

سکینہ: (سکینہ جلدی سے اندر آ جاتی ہے) پتہ ہے..... مجھے آج کل نیند نہ آنے کی بیماری ہوتی جا رہی ہے..... ساری ساری

رات بھٹکی ہوئی روح کی طرح حویلی کی راہداریوں کے پھیرے کاٹتی رہتی ہوں۔

زہرہ: فکر نہ کرو..... عیسیٰ بھائی واپس آ جائیں گے تو اس بھٹکتی رُوح کی بے چینی بھی ختم ہو جائے گی.....

سکینہ: ہاں..... کاش اُس کی ناراضگی بھی ختم ہو جائے..... اچھا دکھاؤ..... کیا پڑھ رہی ہو.....

(سکینہ زہرہ کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھتی ہے اور پھر معنی خیز انداز میں زہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔)

سکینہ: ھم م م م..... موسیٰ بھائی کے کمرے سے لائی ہو ناں..... دیکھی..... میرے بھائی کی کلیکشن collection..... کلاسک ہے ناں.....

زہرہ: ہاں واقعی..... بہت عمدہ ذخیرہ ہے کتابوں کا وہاں.....

سکینہ: بظاہر میرا بھائی بہت اکھڑ، غصیلا..... اور بات بات پہ سر پھاڑ دینے والا لگتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جانتا کہ موسیٰ بھائی کا دل اندر سے کتنا نرم ہے۔

(زہرہ کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے، پھر جلدی سے بات بناتی ہے)

زہرہ: شاید..... کوئی جانتا ہو..... میرا مطلب ہے..... انسان کا اصل کہیں نہ کہیں جھلک ہی جاتا ہے..... چاہے وہ اپنے اوپر جتنے بھی خول چڑھا لے.....

(سکینہ غور سے زہرہ کو دیکھ رہی ہے)

سکینہ: ہاں..... ٹھیک کہتی ہو تم..... ویسے پتہ نہیں کیوں..... مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ لڑکی موسیٰ بھائی کے دل کو اچھی طرح پہچانتی ہو گی..... ایسا ہو نہیں سکتا کہ میرے موسیٰ بھائی کی محبت نے اس کے دل پر اثر نہ کیا ہو..... وہ بھی ضرور موسیٰ بھائی کو یاد کرتی ہو گی..... مگر پتہ نہیں..... بے چاری نے کس مجبوری کے تحت شادی کر لی.....

(زہرہ کے دل پر چھریاں سی چل رہی ہیں۔)

زہرہ: ہاں..... شاید کوئی مجبوری ہی رہی ہو گی..... مگر اب تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے موسیٰ بھائی کے لیے بھی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر ان کا گھر بسا دو..... وہ کب تک یونہی در بدر خوار پھرتے رہیں گے..... ایک بار ان کی شادی ہو گئی تو دھیرے دھیرے خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا.....

سکینہ: (سکینہ زہرہ کو دیکھتی ہے) ہائے سچ..... کاش ایسا ہو جائے..... ویسے ایک لڑکی تو ہے میری نظر میں..... مگر پتہ نہیں..... وہ مانتی بھی ہے کہ نہیں.....

زہرہ: کیوں نہیں مانے گی..... تم نے ابھی خود ہی تو بتایا کہ کوئی بھی تمہارے موسیٰ بھائی کے لیے ناں نہیں کہہ سکتی..... ضرور کسی اونچے عزت دار گھرانے کی ہی بچی ہو گی تم نے..... تم کہو تو عدت ختم ہونے کے بعد میں خود تمہارے ساتھ چلوں گی اُسے منانے کے لیے.....

سکینہ: ٹھیک ہے..... ضرورت پڑی تو تمہاری سفارش ہی کروا دوں گی..... مگر وعدہ یاد رکھنا اپنا تم بھی.....

زہرہ دُکھی سی بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: نیلا گنبد مزار

علامہ شہاب اور عیسیٰ واپس آ چکے ہیں۔ پیر قدرت اپنے کچھ مریدوں کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتا ہے۔ احمد بھی کھڑا ہے۔

قدرت: خوش آمدید..... خوش آمدید..... بڑی راہ دکھائی آپ نے حضرت۔

شہاب: ہاں بھئی..... اس بار دورہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا..... یہاں سب خیر تو رہی ماشاءاللہ۔

قدرت: جی..... سب خیریت ہے..... اور آپ بتائیں..... اس نالائق عیسیٰ نے آپ کو زیادہ پریشان تو نہیں کیا.....

(شہاب مسکراتا ہے اور عیسیٰ کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے)

شہاب: نہیں نہیں..... عیسیٰ نے تو میرا خوب ساتھ نبھایا..... اور احمد کی کمی بالکل بھی محسوس نہیں ہونے دی.....

احمد: (احمد مسکراتا ہے) مجھے یقین تھا کہ عیسیٰ بھائی سب بخوبی سنبھال لیں گے.....

(عیسیٰ دھیرے سے احمد کے کان میں کہتا ہے)

عیسیٰ: اسے کہتے ہیں گھر کی مرغی دال برابر.....

(شہاب عیسیٰ کی سرگوشی سُن کر دھیرے سے مسکراتا ہے)

شہاب: بھئی قدرت اللہ..... اب تم نے عیسیٰ کو کم از کم ایک ہفتے کی چھٹی دینی ہے آرام کرنے کے لیے..... جاؤ عیسیٰ بیٹا..... تم گھر جاؤ..... تمہاری گھر والی بھی تمہاری راہ دیکھتی ہوگی کہ کب میرا گھر والا لوٹے گا.....

(عیسیٰ سر ہلا کر وہاں سے چلا جاتا ہے)

شہاب: اور سناؤ احمد میاں..... تم نے قدرت اللہ شاہ کا ہاتھ بٹایا ان کی ذمہ داریوں میں یا یونہی بیٹھے رہے.....

قدرت: نہیں نہیں..... احمد نے تو میرے حصے کی ساری ذمہ داریاں بھی۔ اپنے سر لے لیں ہیں..... مجھے تو اب یہ فکر پڑ گئی ہے کہ اگر احمد چلا گیا تو یہ سارا کام پیچھے کون دیکھے گا.....

شہاب: (شہاب مسکراتا ہے) اچھا..... ایسی بات ہے تو احمد کو تم یہیں رکھ لو..... ارے ہاں ..... یاد آیا..... میں ایک بٹیا کو بھی تو تمہاری نگرانی میں دے گیا تھا..... وہ اب کیسی ہے.....؟

(زہرہ کے ذکر پر احمد کے تاثرات بدلتے ہیں۔)

قدرت: جی..... ماشاءاللہ..... وہ بھی خیریت سے ہے..... اور بہت نیک اور فرمانبردار بچی ہے..... جلد ہی اس کی عدت بھی پوری ہو جائے گی علامہ حضرت.....

شہاب: ہاں..... میرا اللہ اس کے نصیب اچھے کرے..... اور دیکھو..... وقت کیسے پر لگا کر اڑ جاتا ہے.....

قدرت: درست فرمایا..... مجھے دراصل نرگس کے بارے میں ہی آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی..... آپ ذرا آرام کر کے تازہ دم ہو جائیں۔ پھر ملتے ہیں۔ احمد میاں۔ تم علامہ صاحب کی خدمت کا انتظام دیکھو گے.....

احمد سعادت مندی سے سر ہلاتا ہے اور وہاں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: سکینہ کا کمرہ

سکینہ غصے اور الجھن زدہ سی کمرے میں ٹہلتے ہوئے خود کلامی کر رہی ہے۔

سکینہ: یہ کیا بات ہوئی بھلا..... پہلے جب مجھے چڑ تھی اس سے تو چوبیس گھنٹے میرے سر پر سوار اسی کمرے میں گھسا رہتا تھا..... اور آج جب میں اس کا انتظار کر رہی ہوں تو جب سے آیا ہے، ماں اور ساس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا جانے کہاں کے قصے سُنا رہا ہے ان کو..... آنے دو اس عیسیٰ کے بچے کو کمرے میں..... میں بھی بات نہیں کروں گی اب اس کے ساتھ۔

سکینہ غصے میں بھری ٹہلتی رہتی ہے اور بار بار جا کر دروازے سے باہر جھانک کر دیکھتی ہے مگر عیسیٰ کو نہ آتے دیکھ کر پھر

سے پیر مختی اندر واپس آ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

عیسیٰ اپنی ماں ہاجرہ اور ساس خدیجہ کے سامنے بیٹھا انہیں مختلف شالیں، چادریں وغیرہ دکھا رہا ہے۔

عیسیٰ: یہ دیکھیں چچی جان..... یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں بالکل جیسی اماں کے لیے لی ہے.....

خدیجہ: (خدیجہ چادر دیکھتی ہے) ہاں..... بہت اچھی ہے..... جیتے رہو.....

ہاجرہ: سب کچھ ہم دونوں کے لیے ہی اٹھا لایا ہے یا اپنی بیوی کے لیے بھی کچھ خریدا ہے.....

(عیسیٰ نظریں چراتا ہے۔ ماں اور ساس غور سے اسے دیکھ رہی ہیں۔)

عیسیٰ: ہاں..... اس کے لیے بھی لایا ہوں.....

خدیجہ: اسے اس کی غلطیوں کی بہت سزا مل چکی ہے بیٹا..... اب اسے معاف کر دو..... وہ بہت بدل گئی ہے..... اور یہ بات میں اپنی بیٹی کی حمایت میں نہیں..... اپنے بیٹے عیسیٰ کی خوشی کے لیے کہہ رہی ہوں..... اسے ایک موقع اور دے دو واپس زندگی کی طرف لوٹنے کا.....

عیسیٰ ساس کی بات سن کر خاموش رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن یا شام۔ عصر کا وقت

جگہ: نیلا گنبد مزار/کمرہ، حجرہ

حجرے میں پیر قدرت اور علامہ شہاب بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں۔

علامہ شہاب: کھل کر بات کرو قدرت اللہ..... میں سن رہا ہوں.....

قدرت: جی علامہ صاحب..... میں یہی بتا رہا تھا کہ ماشاءاللہ وہ بچی بڑی نیک، پرہیزگار اور دین دار ہے..... اس کے تمام انداز و اطوار بھی کسی اونچے خاندان کی تربیت کی نشان دہی کرتے ہیں..... اور ماشاءاللہ احمد کی تربیت تو خود آپ کے زیر شفقت ہوئی ہے..... میری تجویز ہے کہ زرّی کی عدّت ختم ہونے کے بعد ہم سادگی سے احمد اور زرّی کا نکاح کروا دیں..... اگر آپ کو اور کوئی اعتراض نہ ہو تو ان دونوں کی مرضی معلوم کر لی جائے۔

(علامہ شہاب قدرت کی بات سن کر گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے)

شہاب: جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں قدرت اللہ شاہ..... اگر نصیب نے ان دونوں کا جوڑا بنا رکھا ہے تو ہم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ مگر سب سے پہلے اس بچی کی رضامندی معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ باقی رہا احمد تو وہ ہمارے کہنے پر آنکھیں بند کر کے ہمارے ہر فیصلے پر آمنا و صدقنا کہے گا.....

قدرت: ٹھیک ہے حضرت..... میں گھر میں عورتوں سے بات کرتا ہوں کہ وہ مناسب موقع دیکھ کر زرّی سے بات کر لیں..... اگلے ہفتے اس کی عدّت ختم ہو جائے گی تو میں براہ راست بھی بات کر لوں گا اس سے.....

(شہاب آنکھیں بند کر لیتا ہے)

شہاب: جو اللہ کو منظور.....

دروازے پر باہر کھڑا احمد یہ سب سن لیتا ہے اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن/شام

جگہ: کاشانہء پیراں، زہرہ کا کمرہ

نوکرانی زہرہ کے کمرے میں آتی ہے۔

زہرہ: آج پیرنی جی مجھے درس دینے نہیں آئیں نوراں.....سب خیر تو ہے ناں.....

نوراں: جی بی بی جی.....سب خیر ہے۔ وہ دراصل ان کے بیٹے واپس آئے ہیں دورے سے بہت دن بعد۔ عیسیٰ بھائی.....بس اسی لیے مصروف تھیں بڑی پیرنی جی.....ابھی آتی ہوں گی.....

زہرہ: اوہ.....اچھا.....

زہرہ عیسیٰ کی واپسی کا سن کر سوچ میں پڑ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: رات

جگہ: عیسیٰ اور سکینہ کا کمرہ

سکینہ کڑی نظروں سے شوہر کو دیکھتی ہے جو کوئی حساب کتاب کا رجسٹر کھولے بیٹھا ہے۔

سکینہ: مل گئی تمہیں فرصت کمرے میں آنے کی.....؟ میں تو سمجھی تھی کہ رات بھی وہیں اپنی اماں اور ساس کے گھٹنے سے چپکے ہی گزار دو گے.....

عیسیٰ: حیرت ہے،.....کبھی میرے کمرے میں رہنے پر تمہیں اعتراض تھا۔ اور آج.....

سکینہ: ہاں.....آج میں ہی کہہ رہی ہوں.....کیوں انتظار کرواتے ہو مجھے اتنا.....ہفتوں، مہینوں غائب رہتے ہو.....اتنے لمبے دورے پر جانا تھا تو کم از کم مجھے بتا کر تو جاتے.....

عیسیٰ: (عیسیٰ بے زاری سے کہتا ہے) مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ اتنے دن لگ جائیں گے.....اور سچی بات یہ ہے کہ میرا اپنا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا واپس آنے کو.....میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا ہے.....جو شاید اب جڑ نہیں پا رہا.....

سکینہ: جانتی ہوں۔ اسی لیے تم سے اس بے رُخی کا گلہ کرنے کا حق بھی کھو چکی ہوں.....مگر ایک بار.....صرف ایک بار مجھے اس ٹوٹ پھوٹ کا مداوا کرنے کا ایک موقع تو دو.....کفارہ ادا کرنے کا حق تو ہر انسان کو ملتا ہے.....

عیسیٰ: کیسے.....؟.....کیسے کفارہ ادا کرو گی.....تم نے صرف میرا دل ہی نہیں توڑا.....تمہاری وجہ سے موسیٰ بھائی کی زندگی بھی برباد ہوئی ہے.....

سکینہ: میں اپنی غلطی تسلیم کر چکی ہوں.....لیکن موسیٰ بھائی اپنی جس زہرہ کی تلاش میں دَر دَر گلیوں کی خاک چھان رہے ہیں.....اگر میں تمہیں اس زہرہ کی خبر دوں اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کروں.....تو کیا پھر بھی تم مجھے معاف نہیں کرو گے.....

(عیسیٰ چونک جاتا ہے)

عیسیٰ: کیا.....؟.....تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہے.....؟.....اور زہرہ تو کسی اور کے ساتھ بیاہ کر رخصت ہو گئی تھی ناں.....پھر موسیٰ بھائی اس کے لیے کیوں بھٹکیں گے بھلا.....؟

سکینہ: زہرہ کو اس کے بدکار شوہر نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا.....،.....اور میں جانتی ہوں کہ اس وقت وہ کہاں

ہے.....

(عیسیٰ جلدی سے اٹھ کر سکینہ کے پاس آ جاتا ہے۔)

عیسیٰ: کیا.....؟.....جلدی بتاؤ.....کہاں ہے وہ.....؟

سکینہ: پہلے وعدہ کرو کہ پھر تم بھی مجھے معاف کر دو گے۔

عیسیٰ: (عیسیٰ جان چھڑاتا ہے) اچھا وعدہ.....

سکینہ: ایسے نہیں۔ پکا والا وعدہ کرو.....کہ اپنی بات سے مکرو گے نہیں.....

☆عیسیٰ چڑ کہ سکینہ کو "ماں" کہنے لگتا ہے مگر پھر عین وقت پر لفظ بدل دیتا ہے۔

عیسیٰ: اچھا میری.....زوجہ.....محترمہ.....پکا والا وعدہ کیا۔ اب بتا بھی دو.....

سکینہ: زہرہ اس گھر میں ہے.....ہمارے مہمان خانے میں۔

(عیسیٰ کے سر پر بم گرتا ہے، اور وہ چلا اٹھتا ہے)

عیسیٰ: کیا.....زہرہ یہاں ہے.....اس گھر میں.....؟

سکینہ: (سکینہ جلدی سے اسے خاموش کراتی ہے۔) شش.....آہستہ بولو.....یہ راز یہاں صرف تائی جان کو پتہ ہے.....کیونکہ تم نے خود ہی بتایا تھا کہ وہ زہرہ سے ملنے گئیں تھیں تمہارے ساتھ.....لیکن انہوں نے بھی اس راز کو راز ہی رکھا ہے کسی مصلحت کے تحت.....اور زہرہ کا نام یہاں زہرہ نہیں.....زرّی ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے جسے علامہ حضرت نے تم دونوں کے دورے پر جانے سے پہلے بطور امانت رہنے کے لیے ہمارے گھر بھیجا تھا.....

عیسیٰ حیرت سے بیٹھا سن رہا ہے۔ سکینہ اسے ساری تفصیل بتانے لگتی ہے، سکینہ کی باتوں نے اس کا سر گھما کر رکھ دیا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

جگہ: پیر قدرت اور ہاجرہ کا کمرہ

قدرت اپنے سر سے اپنی پگڑی اتار کر ایک جانب رکھتا ہے۔ ہاجرہ میاں کو پانی کا گلاس پیش کرتی ہے۔

ہاجرہ: علامہ حضرت نے عیسیٰ کی کوئی شکایت تو نہیں کی.....مجھے تو اس سارے عرصے میں یہی دھڑکا لگا رہا کہ کہیں وہ کوئی حماقت نہ کر بیٹھے.....، کیونکہ یہ ساری خدمت تو آج تک موسیٰ نے ہی انجام دی ہے۔ عیسیٰ تو ابھی تک اندر سے ایک لاابالی بچہ ہے.....

قدرت: ہاں.....ڈر تو مجھے بھی یہی تھا مگر اس بار عیسیٰ نے مجھے حیران کر دیا ہے.....خوشی بھی ہوئی یہ سن کر کہ اُس نے ہر ذمہ داری کو بخوبی نبھایا ہے۔ علامہ حضرت بہت تعریف کر رہے تھے عیسیٰ کی.....

(ہاجرہ مسکراتی ہے اور موسیٰ کا نام لیتے لیتے شوہر کے ڈر سے چپ ہو جاتی ہے)

ہاجرہ: لگتا ہے میرا چھوٹا بیٹا بھی اب اپنی ذمہ داریاں سمجھنے لگا ہے میرے موسیٰ کی طرح.....وہ بھی اپنے.....

(قدرت گھور کر ہاجرہ کو دیکھتا ہے۔ ہاجرہ کو غلطی کا احساس ہوتا ہے)

قدرت: اور ہاں.....ایک اور ضروری بات کرنی تھی مجھے تم سے.....تمہیں کوئی مناسب موقع دیکھ کر زرّی سے بات کرنی ہوگی.....میں نے اور علامہ حضرت نے فیصلہ کیا ہے کہ عدت ختم ہونے کے بعد زرّی کا نکاح احمد سے کروا دیں.....بہت نیک فرمانبردار اور لائق بچہ ہے.....مجھے یقین ہے وہ زرّی کو بہت خوش رکھے گا.....

(زرّی کے نکاح کا سن کر ہاجرہ کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔)

ہاجرہ: نرمی کا نکاح..... مگر..... وہ.....

قدرت: ہاں..... اب وہ بھی ہماری ذمہ داری ہے..... اسے یوں تنہا تو نہیں چھوڑ سکتے..... میں خود بھی اس کی مرضی معلوم کروں گا وقت آنے پر..... مگر پہلے تم عورتیں آپس میں صلاح مشورہ کرلو تو بہتر ہے..... جوان لڑکی ہے..... جتنی جلدی اپنے گھر کی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: کاشانہء پیراں۔ سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ کہیں باہر جانے کی جلدی میں ہے۔ وہ کسی کا نمبر ملا رہا ہے مگر لگ نہیں رہا۔

(وہ جھنجھلا کر فون پٹخ دیتا ہے)

عیسیٰ: مجھ سے تو ایک پل بھی صبر نہیں ہو رہا۔ جی چاہتا ہے کہ اڑ کر موسیٰ بھائی کے پاس پہنچوں اور یہ خبر سنا دوں..... مگر انہوں نے تو اپنا نمبر ہی بند کر رکھا ہے.....

سکینہ: ہمیں جو بھی کرنا ہے، بہت سوچ سمجھ کر اور تحمل سے کرنا ہوگا..... کہیں ہماری جلد بازی ایک بار پھر سے سارا کھیل نہ بگاڑ دے.....

عیسیٰ: ہاں..... کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو..... مگر موسیٰ بھائی سے ملے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے.....

سکینہ: کوئی تو ٹھکانہ ہوگا ان کا جہاں انہیں ڈھونڈا جا سکتا ہو۔

عیسیٰ: (عیسیٰ کچھ سوچتا ہے) ہاں..... ہے ایک بندہ..... وہی موسیٰ بھائی تک مجھے پہنچا سکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ

موسیٰ اور سارنگا بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سامنے ایک بھکاری نما مشکوک سا شخص کھڑا ہے۔

سارنگا: کیوں بے مختارے..... اب تک مزاروں پر جیبیں کاٹ رہا ہے حرام خور..... سُدھرے گا نہیں تو.....

مختارا: قسم لے لو سارنگا استاد..... جیب کُترائی کا کام تو مہینوں پہلے چھوڑ دیا تھا..... اب درزی سالے ایسی جیبیں بناتے ہی نہیں جو آسانی سے کٹ جائیں۔ میں تو اپنے سارے گروہ کے ساتھ شہر کے مزاروں پر بھیک اکٹھی کرتا ہوں..... ڈیڑھ سو بھکاری کام کرتا ہے استاد میرے نیچے..... (مختارا فخر سے بتاتا ہے)

سارنگا: اچھا زیادہ بکواس نہ کر۔ یہ بتا کوئی خبر ملی تجھے..... یا یونہی خالی ہاتھ چلا آیا ہے منہ اٹھا کر.....

مختارا: ہاں استاد..... خبر تو ملی ہے مگر ہے بہت پرانی..... تین چار مہینے پہلے کی بات ہے یہ، مگر مجھ تک دیر سے پہنچی کیوں کہ میرا مخبر کم بخت پکڑا گیا تھا چوری کے الزام میں..... کل ہی ضمانت پر نکالا ہے اسے.....

سارنگا: (سارنگا اسے جھاڑتا ہے) آگے بھی کچھ بکے گا یا نہیں.....

مختارا: جی استاد۔ وہی تو بتا رہا ہوں..... جو حلیہ تمہارے بندوں نے بتایا تھا اس سے ملتی جلتی ایک لڑکی نیلا گنبد مزار کے صحن میں چکرا کر گر پڑی تھی..... میرے گروہ کی دو بھکارنیں بھی وہیں تھیں..... وہ لڑکی کے تن سے زیور لتا اتارنے کے چکر میں اس طرف لپکیں بھی..... مگر سنا ہے کہ پھر کوئی بزرگ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

(نیلا گنبد کے نام پر موسیٰ زور سے چونکتا ہے)
(سارنگا موسیٰ کو دیکھتا ہے)

سارنگا: کب کی بات ہے یہ.....؟

مختارا: تقریباً انہی دنوں کی جب تمہارا حکم ملا تھا کہ اس حلیئے کی کوئی لڑکی دکھائی دے تو تمہیں خبر دی جائے۔
(موسیٰ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

موسیٰ: نیلا گنبد..... یہ علاقہ تو زہرہ کے گھر سے بہت قریب ہے..... ہمیں ابھی وہاں چلنا ہوگا بھائی.....
(اتنے میں دروازے کی طرف سے نامراد کی آواز آتی ہے۔)

نامراد: کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے..... نیلے گنبد والے خود تم سے ملنے کے لیے آ گئے ہیں موسیٰ.....

موسیٰ اور سارنگا چونک کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دروازے پر عیسیٰ اور نامراد کھڑے نظر آتے ہیں۔ عیسیٰ بھائی کو دیکھتا ہے اور فرطِ جذبات میں بھاگ کر موسیٰ کے گلے لگ جاتا ہے اور رو پڑتا ہے۔

عیسیٰ: بھائی..... بہت سنگ دل ہو..... پلٹ کر کبھی میری خبر بھی نہیں لی.....
(موسیٰ اسے تھپکتا ہے)

موسیٰ: تم یہاں کیسے.....؟..... سب خیر تو ہے ناں.....

عیسیٰ: جی بھائی..... سب خیر ہے..... تم جس کی تلاش میں شہر شہر گلی گلی کی خاک چھان رہے ہو..... میں اسی کی خبر لے کر آیا ہوں..... زہرہ نے ہمارے ہی گھر میں پناہ لے رکھی ہے بھائی.....

موسیٰ سمیت سارے کے سارے دنگ رہ جاتے ہیں۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں۔ پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت گھر سے نکلنے کی تیاری میں ہے، ہاجرہ شدید کشمکش کا شکار ہے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ بھی نہیں پا رہی۔ قدرت اس سے کچھ مانگتا ہے مگر ہاجرہ کا دھیان کسی اور طرف ہے۔

قدرت: میری گھڑی پکڑانا.....
(ہاجرہ گم سم بیٹھی ہے، قدرت اسے پھر زور سے آواز دیتا ہے)

قدرت: ہاجرہ.....

ہاجرہ: (ہاجرہ چونکتی ہے) جی..... جی.....

قدرت: دھیان کہاں ہے آج تمہارا..... میں نے اپنی گھڑی مانگی ہے۔

قدرت: (ہاجرہ جلدی سے اٹھ کر گھڑی پکڑاتی ہے) کیا مسئلہ ہے۔ صبح سے دس مرتبہ کمرے سے باہر اندر آ جا چکی ہو..... کیا بے چینی ہے تمہیں.....

ہاجرہ: وہ پیر جی..... مجھے دراصل کچھ بات کرنی تھی آپ سے.....
(مگر قدرت اللہ جلدی میں ہے)

قدرت: ابھی نہیں..... شام کو بات کریں گے..... مجھے ابھی جا کر علامہ حضرت سے بہت سے اہم معاملات طے کرنے ہیں..... ان کے جانے سے پہلے ساری تفصیلات طے ہو جائیں تو بہتر ہے.....

ہاجرہ: مگر پیر صاحب.....میں.....

قدرت: اچھا وہ عیسیٰ آئے تو فوراً اسے بھیجو میری طرف..... پتہ نہیں صبح صبح کہاں نکل گیا ہے وہ نالائق.....کہا بھی تھا میں نے کہ اسے میرے ساتھ چلنا ہے.....اچھا میں چلا.....

قدرت جلدی میں سر پر پگڑی/ وغیرہ درست کرتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔ ہاجرہ کی بات اس کے منہ میں ہی دبی رہ جاتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ

عیسیٰ، موسیٰ، سارنگا اور نامراد موجود ہیں۔ سارنگا آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ سے کہتا ہے۔

سارنگا: واہ رے مولا۔ تیری قدرت کے رنگ نرالے..... جسے ہم سارے زمانے میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں.....اس کو اسی گھر میں پہنچا دیا جہاں سے وہ دھتکاری گئی تھی.....سبحان تیری قدرت.....

(موسیٰ بے چینی میں کھڑا ہو جاتا ہے)

موسیٰ: چلو عیسیٰ..... مجھے اس کے پاس لے چلو.....

(عیسیٰ گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھتا ہے)

عیسیٰ: مگر بھائی.....ابا جان.....

موسیٰ: چلو تم.....

(موسیٰ آگے بڑھنے لگتا ہے، پیچھے سے سارنگا آواز ے کر روکتا ہے)

سارنگا: رک جا شہزادے.....ابھی اس کا وقت نہیں آیا.....

موسیٰ: بہت ہو گیا سارنگا بھائی۔ اب میں اسے یوں اکیلے دنیا کے ان طوفانوں کا سامنا نہیں کرنے دوں گا.....

سارنگا: رُک جا..... بڑی مشکل سے اس بے چاری کو ایک پناہ گاہ ملی ہے.....سر چھپانے کی چھت مل گئی ہے اسے اپنی عذت گزاری کے لیے.....تُو اس سے وہ چھت بھی چھین لینا چاہتا ہے.....

(موسیٰ کو غصہ آ جاتا ہے)

موسیٰ: تو کیا کروں.....اُسے یوں ہی تنہا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دوں۔ جیسے ہی ابا جان کو اس کی اصلیت پتہ چلے گی وہ ایک لمحے میں اسے دھکے دے کر اپنی اس اونچی شان والی چھت سے نکال کر پھر سے بے گھر کر دیں گے۔ میں ایک بار پھر اسے پا کر نہیں کھونا چاہتا سارنگا بھائی.....

سارنگا: تُو شاید بھول رہا ہے کہ اسے یہ پناہ خود تیرے باوا نے دی ہے.....کیوں خود جا کر اس بے چاری کا بنا بنایا بھرم توڑ دینا چاہتا ہے۔ ٹھہر جا ابھی.....ہم وہاں جائیں گے.....مگر ٹھیک وقت.....اور صحیح موقعے پر.....

موسیٰ: مگر کب.....

(سارنگا عیسیٰ کی طرف دیکھتا ہے۔)

سارنگا: بٹیا کی عذت کب ختم ہو رہی ہے.....؟

//Cut//

Scene No # 19

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، خدیجہ کا کمرہ

ہاجرہ خدیجہ کے سامنے پریشان بیٹھی ہے، خدیجہ حیرت سے بول اٹھتی ہے۔

خدیجہ: کیا..... زرّی ہی زہرہ ہے.....؟

ہاجرہ: ہاں..... اور میں نے یہ راز آج تک صرف اس لیے راز رکھا کہ میں اس معصوم لڑکی کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی تھی جو علامہ حضرت اور پیر صاحب نے اسے پناہ دے کر قائم کیا تھا.....

خدیجہ: اچھا کیا آپ نے بھابھی..... اور واقعی..... وہ بہت معصوم ہے..... میرے موسیٰ کی پسند ہے..... تبھی اسے دیکھ کر میرا دل اس کی طرف کھچا جاتا تھا..... آج سمجھی کیا وجہ ہے.....

ہاجرہ: ہاں..... میں پہلے بھی زہرہ سے مل چکی ہوں..... اور اس نے میری بات کا مان رکھنے کے لیے ہی موسیٰ کو نہ کی تھی..... مگر اس غلطی کی سزا، میں اپنے بیٹے کو کھو کر آج تک بھگت رہی ہوں.....

خدیجہ: مگر..... اب کیا ہوگا..... ہم پیر صاحب کو یہ بھی تو نہیں بتا سکتے کہ زرّی ہی اصل میں موسیٰ والی زہرہ ہے۔

ہاجرہ: یہی تو سمجھ نہیں آ رہا..... وہاں پیر جی علامہ حضرت کے ساتھ مل کر زہرہ کے نکاح کی تیاری کر رہے ہیں.....

خدیجہ: مگر ظاہر ہے زرّی کی اجازت کے بنا تو وہ یہ نکاح نہیں کر پائیں گے..... ہم ابھی چل کر زرّی کو ساری حقیقت بتا دیتے ہیں..... اور یہ بھی سختی سے تاکید کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی بہانے اس نکاح سے انکار کر دے.....

ہاجرہ: ہاں..... یہی ٹھیک رہے گا.....

(پیچھے سے سکینہ کی آواز آتی ہے)

سکینہ: میں بھی چلوں گی آپ دونوں کے ساتھ، خدیجہ اور ہاجرہ گھبرا کر پلٹ کر دیکھتی ہیں۔ سکینہ دروازے میں کھڑی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن

جگہ: مزار۔ حجرہ

احمد پیر قدرت اور علامہ شہاب کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے۔

پیر قدرت: تم کھل کر بات کر سکتے ہو احمد میاں..... شرع میں کوئی شرم نہیں.....

احمد: آپ دونوں میرے محترم بزرگ ہیں پیر جی..... آپ دونوں کا حکم سر آنکھوں پر.....

شہاب: (شہاب اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا ہے۔) ماشاءاللہ..... ماشاءاللہ..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔

(قدرت مسکراتا ہے)

پیر قدرت: چلو پھر کچھ تیاری بھی کر لو نکاح کی..... میں عیسیٰ سے کہہ دوں گا کہ تمہاری پسند کی خریداری کروا دے اور رہنے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے..... مزار کے صحن کے پیچھے بہت کشادہ کوارٹر موجود ہیں مریدین کی رہائش کے لیے..... ان میں سے کوئی بھی اچھا کوارٹر تیار کروا دوں گا تمہیں..... کچھ عرصہ یہیں رہو..... پھر جی چاہے تو علامہ حضرت کی طرف بھی ہو آنا.....

(احمد کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ہیں)

احمد: جی..... جیسے آپ کی مرضی.....

//Cut//

Scene No # 21

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں۔زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے سامنے سکینہ، ہاجرہ اور خدیجہ بیٹھی ہوئی ہیں۔زہرہ گھبرا کر سکینہ کو دیکھتی ہے۔

سکینہ: ہاں..... میں نے تو سب جان لینے کے باوجود اس راز کو راز ہی رکھا تھا میری پیاری بچی..... حتیٰ کہ تمہیں بھی خبر نہیں ہونے دی..... مگر اب مجبوری ہی ایسی آن پڑی ہے کہ ہم سب کو زبان کھولنی ہی پڑی.....

(زہرہ پریشانی سے ان تینوں کو دیکھتی ہے)

خدیجہ: مگر تم پریشان مت ہونا میری بچی..... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں..... اب کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے..... بس اپنی ہمت بنائے رکھو.....

زہرہ: میں جانتی تھی۔آج نہیں تو کل میری اصلیت آپ سب پر کھل ہی جائے گی۔مگر میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے اس حویلی کی حرمت پر کبھی کوئی حرف آئے۔بہتر یہی ہے کہ آپ پیر صاحب کو بھی میرے بارے میں سب سچ بتا دیں..... وہ میرے محسن ہیں..... میں انہیں اتنے بڑے فیصلے کے موقعے پر کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی.....

ہاجرہ: تم نے کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا..... یہ ہم سب جانتے ہیں..... بس جب تم سے پیر صاحب نکاح کے لیے تمہاری مرضی پوچھیں تو تم نے کسی بھی طرح انکار کرنا ہے..... مجھے کچھ وقت چاہیے..... میں سب ٹھیک کر دوں گی..... مگر تمہیں اس بار جی کڑا کر ہمت دکھانی ہوگی زہرہ.....

زہرہ پریشانی سے ان تینوں کو دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، سکینہ آگے بڑھ کر کے زہرہ کو گلے لگا لیتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: رات

موسیٰ کسی جیپ سارنگا کی گاڑی میں آدھی رات کے وقت اپنے گھر کے باہر کسی سڑک/گلی وغیرہ میں آ کر رُکتا ہے اور اپنے گھر کی طرف دیکھتا ہے جہاں ان دیواروں کے پیچھے زہرہ کسی کمرے میں بیٹھی ہے۔موسیٰ گاڑی کھڑی کر کے اترتا ہے اور بہت دیر اپنے گھر کے در و دیوار کو تکتا رہتا ہے۔پس منظر میں رقصِ بسمل کا OST اوور لیپ ہو رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 23

وقت: رات

جگہ: زہرہ کا کمرہ

ٹھیک اسی وقت جب موسیٰ گھر کے باہر کھڑا زہرہ کو یاد کر رہا ہے، اسی لمحے زہرہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی ہے اور وہ بھی موسیٰ کی یادوں میں کھوئی ہوئی ہے اور اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔باہر موسیٰ کی پلکیں نم ہیں اور دونوں پر رقصِ بسمل کا ساؤنڈ ٹریک اوور لیپ ہوتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: کاشانہء پیراں۔سکینہ کا کمرہ

عیسیٰ سکینہ کی بات سُن کر اچھل پڑتا ہے۔

عیسیٰ: کیا.....زہرہ اور احمد کا نکاح.....اوہ میرے خدا.....اسی لیے دو دن سے ابا جان مجھے احمد کے ساتھ بازار جانے کا کہہ رہے ہیں۔مطلب احمد تو پہلے ہی ہاں کر چکا ہے اس رشتے کے لیے۔

سکینہ: ہاں.....ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں کہ دوسرا سر اٹھائے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے.....

عیسیٰ: میں ابھی جا کر موسیٰ بھائی کو بتاتا ہوں.....

(عیسیٰ اٹھ کر جانے لگتا ہے،سکینہ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑتی ہے۔)

سکینہ: یہ غضب نہ کرنا.....تمہیں موسیٰ بھائی کے غصے کا پتہ نہیں ہے کیا.....؟.....وہ یہ سنتے ہی آندھی طوفان کی طرح ساری دیواریں رکاوٹیں توڑتے ہوئے گھر آ جائیں گے اور تایا جان کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے زہرہ کو واپس لے جانے کے لیے.....اور ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔

عیسیٰ: (عیسیٰ پریشانی سے بیٹھ جاتا ہے) پھر میں کیا کروں.....مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔

سکینہ: ہمیں زہرہ اور موسیٰ بھائی کو ملانے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی اس گھر میں باعزت واپسی کا راستہ بھی نکالنا ہے.....اس وقت کوئی بھی جذباتی قدم ان دونوں کے لیے مزید مشکلات پیدا کر سکتا ہے.....تایا جان کے غصے کو جانتے ہو ناں.....کبھی ان دونوں کی صورت بھی نہیں دیکھیں گے اگر موسیٰ بھائی ایک بار پھر ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

عیسیٰ: تو پھر.....کیا سوچا ہے تم نے.....

سکینہ: فی الحال تو انتظار کرنا پڑے گا جب تک تایا جی زہرہ سے اس کی مرضی نہیں پوچھتے نہیں آتے۔.....ایک بار زہرہ نے انکار کر دیا تو مجھے یقین ہے وہ زہرہ کے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے.....ایک بار احمد سے نکاح کی بات ٹل جائے.....پھر موسیٰ بھائی کی اس کہانی میں دوبارہ انٹری کے بارے میں کچھ سوچا جا سکتا ہے۔

عیسیٰ سکینہ کی بات سن کر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

خدیجہ اور بیٹی سکینہ ایک رنگین چادر لیے زہرہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔سکینہ آگے بڑھ کر زہرہ کے سر سے سیاہ چادر اتار کر ایک جانب رکھتی ہے اور اسے رنگ دار چادر اوڑھا دیتی ہے۔زہرہ گھبرا کر چادر اتارنے لگتی ہے۔

زہرہ: سکینہ.....یہ کیا.....

سکینہ: بس اب یہ سوگ کا جوگ اتار کر پھینک دو۔آج تمہاری عدت بھی ختم ہو گئی ہے.....خزاں کا دور گزر چکا۔اب تو بہار آنے والی ہے۔

زہرہ: (زہرہ دکھ سے انہیں دیکھتی ہے) موسموں کے آنے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے.....کچھ لوگوں کے نصیب میں ہمیشہ خزاں کا سیاہ سوگ ہی لکھا ہوتا ہے.....

دونوں حیرت سے اسے دیکھتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 26

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت اور بیوی ہاجرہ میں بات چیت

قدرت: چلو شکر ہے.....زرّی کی عدت بھی ختم ہوئی.....اور ہاں.....میں نے تم سے زرّی سے بات کرنے کا کہا تھا.....تم نے کی یا نہیں.....

(ہاجرہ گھبرائی ہوئی ہے)

ہاجرہ: وہ.....دراصل.....میں وہ کہہ رہی تھی کہ.....قدرت کو غصہ آ جاتا ہے۔

قدرت: کمال کرتی ہو ہاجرہ تم بھی.....ایک معمولی سا کام تم سے نہیں ہو پایا.....تم عورتوں کی بھی اپنی عجیب منطق ہوتی ہے.....جس کام کے کرنے کو جی نہ چاہے.....اسے خوامخواہ ٹالتی رہتی ہو.....

ہاجرہ: میں یہ کہہ رہی تھی کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے.....چند دن اسے یہیں رہنے دیں.....اور عدّت ختم ہوتے ہی اگلے دن نکاح کی بات کرنا کچھ معیوب سا لگتا ہے۔

قدرت: (غصے سے) اس میں معیوب لگنے کی کیا بات ہے بھلا.....دین میں جس چیز کی اجازت موجود ہے، تم اس بات میں کیڑے کیوں نکال رہی ہو.....؟

ہاجرہ: اچھا آپ ناراض نہ ہوں.....میں کر لوں گی بات زرّی سے.....

قدرت: بس.....اب تم رہنے دو.....جاؤ.....جا کر زرّی کو بلا لاؤ مہمان خانے سے.....میں باہر آ کر خود اس سے پوچھ لوں گا.....پہلے اگر وہ عدّت میں نہ ہوتی تو میں خود ہی پوچھ لیتا اس سے، وہاں احمد میاں کو ہم نے ساری تیاری کروا دی ہے۔ اور یہاں گھر میں عورتوں کو اتنا احساس نہیں ہے کہ یہ کتنا حساس معاملہ ہے.....پرائی لڑکی کا بوجھ تم کیا سمجھو گی.....؟ بہت مایوس کیا ہے آج تم نے مجھے ہاجرہ.....

(ہاجرہ سر جھکائے کھڑی رہتی ہے قدرت غصے میں ڈانٹتا ہے)

قدرت: اب یہاں کیا سر جھکائے کھڑی ہو.....زرّی کو بلا لاؤ ڈرائنگ روم میں۔ میں خود بات کروں گا آج اس کے ساتھ.....جاؤ۔

ہاجرہ: (ہاجرہ گھبرا کر کہتی ہے) جی ٹھیک ہے.....میں بلاتی ہوں.....ہاجرہ گھبرا کر پلٹ کر کمرے سے نکل جاتی ہے، پیر قدرت غصے میں بڑبڑاتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 27

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں۔ ڈرائنگ روم

زہرہ گھبرائی ہوئی سی سکینہ کے ساتھ نظریں جھکائے، سر پر وہی اپنی پرانی سیاہ چادر اور سیاہ لباس میں کمرے میں داخل ہوتی ہے جہاں پہلے سے خدیجہ، ہاجرہ اور پیر قدرت موجود ہیں۔

زہرہ: السلام علیکم پیر صاحب

(قدرت نظریں جھکائے کھڑا رہتا ہے)

قدرت: وعلیکم السلام..... جیتی رہو..... امید ہے تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف یا زحمت نہیں ہوئی ہوگی۔

زہرہ: نہیں..... یہاں پر سب نے میرے اپنوں سے بڑھ کر میرا خیال رکھا ہے..... مجھ پر یہ آپ سب کا احسان ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے پناہ دی..... عزت کی چھت دی۔

قدرت: نہیں نہیں..... احسان کی بھلا کیا بات ہے..... مجھے تو خوشی ہے کہ اس نیک کام کی سعادت قدرت نے ہمارے حصے میں لکھی تھی..... دراصل آج میں نے تمہیں ایک اور بہت بڑی ذمہ داری نبھانے کی غرض سے بلوایا ہے..... تم عدت میں تھیں..... اس لیے پہلے تم سے براہ راست بات نہیں کر سکا.....

زہرہ: جی حکم کریں.....

قدرت: نہیں..... حکم نہیں ہے..... بس یوں سمجھو ایک خواہش ہے اور میری اس خواہش میں علامہ حضرت کی تائید بھی شامل ہے..... اگر تمہارا کوئی بڑا بزرگ یا رشتہ دار ہوتا تو میں یہ بات اس سے کرتا..... مگر اب مجبوری ہے..... تمہاری مرضی براہِ راست تم سے ہی معلوم کرنی پڑے گی.....

(ہاجرہ، سکینہ اور خدیجہ سانس روکے کھڑی سن رہی ہیں)

زہرہ: آپ کو تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں ہے پیر صاحب..... آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے..... آپ مجھے اپنی بیٹی سکینہ کی طرح کچھ بھی کہہ سکتے ہیں.....

قدرت: (قدرت مسکراتا ہے) جیتی رہو..... مجھے تم سے اسی تعظیم اور تابعداری کی امید تھی..... دراصل ہم چاہتے ہیں کہ تمہارا پھر سے گھر بسا دیا جائے..... احمد علامہ شہاب صاحب کا بھی لائق، فرمانبردار اور عزیز شاگرد ہے۔ نوجوان ہے..... پڑھا لکھا ہے اور اچھے خاندان کا شریف لڑکا ہے..... ہم چاہتے ہیں کہ تمہارا اور احمد کا کچھ دنوں میں سادگی سے نکاح کر دیں..... تاکہ تمہاری گھر ہستی پھر سے شروع ہو سکے..... اب تم بتاؤ کہ تمہارا فیصلہ کیا ہے؟..... کیونکہ تمہاری رضامندی اس رشتے کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے.....

کمرے میں سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ خدیجہ، ہاجرہ اور سکینہ ایک دوسرے کی طرف بے چینی سے دیکھتی ہیں۔ زہرہ سر اٹھاتی ہے۔

زہرہ: آپ میرے محسن ہیں..... میرے لیے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتے..... یہ رشتہ آپ نے میرے لیے چنا ہے..... اس لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں..... مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔

خدیجہ، سکینہ اور ہاجرہ کے سر پر بم گرتا ہے۔

// FREEZ //

// End of Epi //

قسط نمبر 28

Scene No # 1

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں، ڈرائنگ روم

زہرہ کا جواب سن کر عورتوں کے سر پر تو آسمان گر جاتا ہے مگر پیر قدرت اللہ کے چہرے پر سکون اور اطمینان بھری مسکراہٹ آ جاتی ہے اور وہ فخریہ انداز میں بیوی اور بھابھی وغیرہ کی طرف دیکھتا ہے۔

پیر قدرت: جزاک اللہ..... جیتی رہو..... میں جانتا تھا تمہارا جواب یہی ہوگا..... اسی بھروسے پر تو میں نے احمد میاں کو تم سے پوچھے بنا ہی زبان دے دی تھی..... خوش رہو..... خدا تمہیں سدا آباد رکھے..... یہ تمہاری اچھی اور اعلیٰ تربیت ہی تو ہے جو تمہیں اپنے بزرگوں کا بھرم رکھنا سکھاتی ہے۔

(پیر قدرت زہرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا ہے۔)

پیر قدرت: جس گھر میں جاؤ گی..... اسے بھی جنت بنا دو گی ان شاء اللہ..... سلامت رہو.....

پیر قدرت دعا دے کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ زہرہ جواب تک بڑی مشکل سے ضبط کیے کھڑی تھی، وہ اپنے آنسو چھپاتی ہوئی وہاں سے تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے۔ ہاجرہ پریشانی سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ جاتی ہے۔ سکینہ گھبراہٹ میں زہرہ کے پیچھے نکل جاتی ہے۔ خدیجہ پریشان بیٹھی ہاجرہ کو ناکام تسلی دینے کی کوشش کرتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 2

وقت: دن

جگہ: ہسپتال۔ ستارہ کا کمرہ

موسیٰ ستارہ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے جہاں مریم ستارہ کے کپڑے اور سامان پیک کر رہی ہے۔

مریم: ارے موسیٰ بھائی آپ..... کیا وقت پر آئے ہیں۔ دیکھیں۔ آپ کی تیمارداری نے کیا معجزہ دکھایا ہے آج ہماری ستارہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو رہی ہے۔

موسیٰ: (موسیٰ خوش ہو جاتا ہے) ارے واقعی..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے.....

(مریم شوخ نظروں سے ستارہ کو دیکھتی ہے)

مریم: آپ دونوں باتیں کریں..... میں ذرا باہر کے معاملات دیکھ لوں.....

(مریم نکل جاتی ہے، ستارہ غور سے موسیٰ کی طرف دیکھتی ہے)

ستارہ: اب بھی آپ کو اپنی مسیحائی پر یقین نہیں آیا..... دیکھیں میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ گھر جا رہی ہوں آج..... جو کام دنیا کے سارے طبیب مل کر نہ سکے..... وہ آپ کی ایک مسکراہٹ بھری تسلی نے کر دکھایا.....

(موسیٰ غور سے ستارہ کو دیکھتا ہے)

موسیٰ: ہاں..... مگر بات تو تب ہے جب اس مسیحائی کا اثر اب عمر بھر رہے..... اور میں جب بھی تمہیں دیکھوں تم ایسے ہی ہنستی مسکراتی ہوئی نظر آؤ مجھے.....

ستارہ: (ستارہ مسکراتی ہے) وعدہ نہیں کرتی کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے مگر آپ کا حکم ہے تو کوشش یہی ہوگی.....

موسیٰ: اچھا ایک خوشی کی خبر تم نے سنائی ہے تو ایک مجھ سے بھی سن لو.....زہرہ کا پتہ چل گیا ہے۔

(ستارہ کی روشن آنکھیں زہرہ کا نام سن کر بجھ سی جاتی ہیں، اور بڑی مشکل سے اپنے تاثرات چھپاتی ہے)

ستارہ: اچھا..... یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے.....آخر کار آپ کی تلاش رنگ لے آئی.....کتنی خوش قسمت ہے زرّی..... جس کے لیے آپ دن رات بے چین رہتے ہیں.....ویسے وہ ہے بھی ایسی ہی.....جو اُسے ایک بار دیکھ لے.....پھر کبھی اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا.....پھر.....کب جا رہے ہیں آپ اسے لینے.....

موسیٰ: (موسیٰ دکھ سے مسکراتا ہے) ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں.....

(ستارہ اُداسی سے کہتی ہے)

ستارہ: میری دعا ہے کہ آپ اس عشق کے ہر امتحان میں کامیاب اور سُرخرو ہوں.....کاش میں آپ کے لیے اور زہرہ کے لیے کچھ کر سکتی.....

(موسیٰ اس کی اُداسی کو نوٹ کرتا ہے)

موسیٰ: تمہاری دعا ہی ہم دونوں کے لیے سب سے بڑا سہارا ہے.....اور یاد رکھنا.....تم نے ابھی ابھی مجھ سے خوش رہنے کی ڈیل کی ہے.....

(ستارہ بولتے بولتے رو پڑتی ہے)

ستارہ: سچ بتاؤں موسیٰ.....میں بہت کم ظرف ہوں.....تمہاری خوشی میں مجھے خوش ہونا چاہیے.....مگر محبت میں منافقت نہیں کر سکتی میں.....میں اندر سے خوش نہیں ہوں موسیٰ.....زہرہ کا سن کر.....کچھ ٹوٹ گیا ہے میرے اندر.....مگر پھر بھی میں ہمیشہ یہی دعا کروں گی کہ خدا زہرہ کو آپ سے ملا دے.....

(موسیٰ تڑپ کر آگے بڑھتا ہے مگر پھر نامحرم ہونے کا احساس اسے ستارہ کا ہاتھ پکڑنے سے روک دیتا ہے)

موسیٰ: نہیں.....تم بہت اعلیٰ ظرف ہو.....بہت سچی.....اور صاف دل کی لڑکی ہو.....نایاب اور انمول ہو تم.....جو بھی تمہارا ہم سفر ہوگا وہ اپنے نصیب پر رشک کرے گا.....اب یہ آنسو پونچھ لو ستارہ.....اور وعدہ کرو کہ پھر کبھی نہیں روؤ گی۔

بُرا میں یا تم نہیں.....بُری یہ محبت ہے جو ایک کو دوسرے.....اور دوسرے کو تیسرے کی محبت میں مبتلا کر کے پھر خود دور بیٹھی تماشہ دیکھتی اور ہنستی ہے.....

.....بس.....بہت کھیل کھیل چکی یہ محبت ہم سے.....چپ ہو جاؤ.....اب مت رونا.....

موسیٰ ستارہ کو تسلی دیتا رہتا ہے، ستارہ روتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 3

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

زہرہ رو رہی ہے۔ سکینہ اس کے قریب بیٹھی ہے اور دکھی ہے۔

سکینہ: یہ کیا کیا تم نے.....؟.....خود اپنے ہاتھوں اپنی منزل گنوا دی.....کیوں کیا تم نے ایسا زرّی.....

زہرہ: محل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا.....، میں اپنی حیثیت اور اوقات جانتی ہوں.....اور میں اپنے محسن کو دھوکہ نہیں دے سکتی.....، آج نہیں تو کل پیر صاحب کو میری اصلیت کا پتہ چل جائے گا.....میں پھر سے ایک بیٹے کو اس کے باپ کے مقابل کھڑا نہیں کرنا چاہتی سکینہ.....، جو انہوں نے میرے بارے میں سوچا ہے.....وہی درست ہے.....

سکینہ: لیکن موسیٰ بھائی.....؟ان کا کیا ہوگا.....تم جانتی ہو وہ تمہارے بنا جی نہیں پائیں گے.....اور تم بھی زندہ کہاں ہو.....صرف سانس آ جا رہی ہے تمہاری.....

زہرہ: اب مجھے اور موسیٰ کو صرف اسی آتی جاتی سانس کے ساتھ ہی جینا ہوگا، ایک ساتھ زندہ رہنے کا خواب صرف ایک خواب ہی رہتا ہے چند لوگوں کے لیے.....اور ضروری نہیں کہ ہمارا ہر خواب پورا بھی ہو.....

سکینہ پریشانی سے زہرہ کو دیکھتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 4

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ

موسیٰ اور سارنگا میں بات چیت

موسیٰ: ایک بار پھر سوچ لو سارنگا بھائی..... مجھے پتہ نہیں کیوں ایک عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے یہ سب سوچ کر.....جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔

سارنگا: سُنا تھا کہ محبت میں وسوسے بہت آتے ہیں.....تجھے دیکھ کر یہ بات بھی سچی لگتی ہے.....

موسیٰ: ابا نہیں مانیں گے.....

سارنگا: عدت ختم ہوگئی ہے اس کی.....آج نہیں تو کل.....کسی نہ کسی سے تو بیاہنا ہوگا اُسے.....ہم تو سوالی بن کر جا رہے ہیں.....دل پر کوئی بوجھ نہ رکھ.....

سارنگا موسیٰ کا شانہ تھپتھپا کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 5

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، ڈرائنگ روم

پیر قدرت ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے جہاں پہلے سے سارنگا، نامراد اور چاند پوری بیٹھے ہوئے ہیں، پیر قدرت قدرے ناگواری سے انہیں دیکھتا ہے مگر مہمان نوازی کے آداب نہیں بھولتا، اور سر ہلا کر ان کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

قدرت: معاف کیجئے گا.....میں مزار اور درگاہ کے معاملات گھر پر نہیں نپٹاتا.....اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو شام کو عصر کے بعد مزار پر تشریف لائیے گا.....ان شاء اللہ جو ممکن ہوا مدد کروں گا۔

سارنگا: اپنی اُردو آپ کی طرح نکھری ہوئی نہیں ہے پیر صاحب.....مگر ہم کسی خانقاہ یا درگاہ کے پیر سے ملنے نہیں آئے ہیں یہاں.....کچھ اور غرض ہے اپنی.....دو گھڑی سن لو گے تو مہربانی ہوگی.....

(قدرت سارنگا کے حلیے اور بات کرنے کے انداز سے کچھ چونکتا ہے۔)

قدرت: جی فرمائیے۔

(سارنگا نامراد کی طرف دیکھتا ہے، اور پھر سنبھل کر بولتا ہے)

سارنگا: سُنا ہے آپ کے ہاں ایک بٹیا نے پناہ لی ہے.....اور آپ نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہے.....ہم اسی سلسلے میں آئے ہیں.....

(قدرت کو جھٹکا لگتا ہے)

قدرت: آپ زرّی کی بات کر رہے ہیں.....آپ اسے کیسے جانتے ہیں.....کیا وہ آپ کی کوئی رشتہ دار.....

سارنگا: رشتے صرف خون کے نہیں ہوتے پیر صاحب..... کبھی کبھی صرف پانی کا اک گلاس پلانے سے بھی بن جاتے ہیں..... یا یوں کہہ لو کہ کبھی کبھی پانی خون سے زیادہ گاڑھا اور رنگین ثابت ہوتا ہے.....

(سارنگا بڑی گہری بات کرتا ہے۔ قدرت پھر چونکتا ہے)

قدرت: جی..... میں سمجھ سکتا ہوں۔ آپ اپنی بات جاری رکھیں.....

سارنگا: بات لمبی نہیں ہے اپنی..... آپ کے گھر بیری ہے اور ہم پتھر بن کر آئے ہیں.....

(پیر قدرت قدرے غصے سے سارنگا کی طرف دیکھتا ہے)

قدرت: کیا مطلب.....؟

(نامراد جلدی سے بات واضح کرتا ہے)

نامراد: مطلب یہ کہ ہم زرّی کا رشتہ لے کر آئے ہیں..... اگر آپ کو قبول ہو تو۔

قدرت: زرّی کا رشتہ..... مگر ابھی تو آپ لوگوں نے خود کہا کہ آپ کا زرّی سے کوئی رشتہ نہیں.....

سارنگا: رشتہ تو آپ کا بھی اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے پیر صاحب..... مگر پھر بھی آپ نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہے..... اپنی بیٹی بنایا ہے اسے.....

قدرت: ہاں مگر یوں چلتے پھرتے سرِ بازار رشتے طے نہیں کیے جاتے۔

سارنگا: جانتے ہیں صاحب..... مگر ہم جس کا رشتہ لائے ہیں وہ ہماری طرح کوئی چلتا پھرتا بازاری نہیں ہے۔ آپ کی طرح اونچا سادات والا ہے..... پانچ وقت کا نمازی ہے..... ماتھے پر آپ کی طرح محراب ہے..... یوں سمجھو آپ کا ہی ہم پلّہ ہے.....

قدرت: کس کی بات کر رہے ہیں آپ.....

(کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے)

چاند پوری: پیر صاحب..... ہم موسیٰ کا رشتہ لے کر آئے ہیں.....

(موسیٰ کا نام سنتے ہی پیر قدرت کے چہرے کا رنگ غصے سے سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔)

قدرت: اچھا..... تو اس ناخلف نے باپ کو رُسوا کرنے کی یہ نئی چال چلی ہے..... مجھے پہلے ہی تم سب کی زبان اور حلیئے دیکھ کر سمجھ جانا چاہیے تھا کہ کس قبیلے سے تعلق ہے تم لوگوں کا..... بہتر ہے کہ تم لوگ ابھی اس گھر سے نکل جاؤ..... ہمارے ہاں مہمان کی بڑی عزت کی جاتی ہے..... مہمان کی طرح ہی لوٹ جاؤ..... کہیں ایسا نہ ہو کہ آج مجھے اس گھر کی ایک اور ریت توڑنی پڑ جائے.....

نامراد اور چاند پوری گھبرا کر سارنگا کی طرف دیکھتے ہیں۔ سارنگا ویسے ہی آرام اور اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے۔

//Cut//

Scene No # 6

وقت: دن

جگہ: کاشانۂ پیراں

کوئی نوکرانی بھاگتی ہوئی زنانے میں آتی ہے جہاں عیسیٰ، میکنہ اور ہاجرہ کے ساتھ بیٹھا کوئی بات کر رہا ہے۔

نوکرانی: عیسیٰ بھائی..... جلدی چلیں..... مردانے میں بڑے پیر صاب کچھ مہمانوں سے اُلجھ پڑے ہیں۔

(عیسیٰ گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

عیسیٰ: کون مہمان.....

نوکرانی: پتہ نہیں.....مگر کریم نے ابھی بتایا کہ ڈرائنگ روم سے بہت زور زور کی بات کرنے کی آواز آ رہی ہے جیسے کوئی جھگڑ رہا ہے.....

عیسیٰ جلدی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 7

وقت: دن

جگہ: کاشانہ، پیراں

پیر قدرت غصے سے لرز رہا ہے، سارنگا اور باقی ساتھی بھی کھڑے ہو چکے ہیں۔

قدرت: میں نے کہا ناں.....میں اس سلسلے میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا.....آپ لوگ جا سکتے ہیں.....

اتنے میں عیسیٰ گھبرایا ہوا سا کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سارنگا وغیرہ کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ سارنگا پیر قدرت کے سامنے آتا ہے۔

سارنگا: ٹھیک ہے پیر صاب.....مگر رشتہ نہ کرنے کی وجہ تو بتا دو.....

(قدرت غصے سے کہتا ہے)

قدرت: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے زرّی کا رشتہ اُس کی مرضی سے ایک بہت دین دار لڑکے کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ جو واقعی زرّی جیسی لڑکی کے قابل ہے.....اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں کسی اوباش، آوارہ اور موسیٰ جیسے گمراہ لڑکے کے ہاتھ میں کسی نیک اور پارسا بچی کا ہاتھ نہیں دے سکتا.....چاہے وہ میری سگی بیٹی نہ سہی.....مگر کسی کی بیٹی تو ہے.....

(سارنگا موسیٰ کے لیے اس کے باپ کی زبان سے اوباش، آوارہ اور گمراہ جیسے القابات سن کر اپنی آنکھیں اذیت سے بند کر لیتا ہے۔)

سارنگا: بہتر ہوتا پیر صاب.....آپ ایک بار بچی سے بھی [illegible] مرضی.....

(پیر قدرت غصے میں چلاتا ہے)

قدرت: بس.....بہت سن لی میں نے تمہاری.....عیسیٰ.....ان لوگوں کے جانے کے بعد گھر کا دروازہ اچھی طرح بند کر لینا.....

قدرت غصے میں کمرے سے نکل جاتا ہے۔ عیسیٰ پریشانی میں سارنگا پارٹی کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 8

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت غصے میں کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ ہاجرہ سہمی سی پاس کھڑی ہے۔

قدرت: ہمت کیسے ہوئی ان لفنگوں کی میرے گھر تک آنے کی.....دیکھ رہی ہو اپنے بیٹے کے لچھن.....اب مجھے ذلیل کرنے کا یہ نیا طریقہ نکالا ہے اس نے.....

ہاجرہ: آپ اتنا غصہ نہ کریں.....پہلے آپ کو موسیٰ پر اس بات کا غصہ تھا کہ اس نے کسی نیچ اور بازاری خاندان کی لڑکی سے رشتہ جوڑنے کی بات کی.....اور آج اس پر آپ اس لیے بگڑ رہے ہیں کہ وہ کسی نیک اور دین دار لڑکی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔

(قدرت بیوی کی بات سن کر مزید آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور چلاتا ہے.....)

قدرت: ہاجرہ.....تم کہنا کیا چاہتی ہو.....نہ یہ وہ لڑکی ہے نہ ہی موسیٰ اب وہ میرا بیٹا پرانا موسیٰ ہے.....میں زرّی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں کیسے دے دوں.....سب کچھ جانتے بوجھتے.....

(ہاجرہ کا صبر جواب دے جاتا ہے اور زندگی میں پہلی مرتبہ شوہر سے چلا کر بات کرتی ہے۔)

ہاجرہ: واہ پیر صاحب واہ.....کیسا انصاف ہے یہ آپ کا.....یعنی دونوں بار دھتکار میرے بیٹے کو ہی ملی آپ کی طرف سے.....، لیکن آج آپ کے سامنے ایک بیوی نہیں ایک بیٹے کی ماں کھڑی ہے اور وہ ماں آپ کے اس انصاف کو رد کرتی ہے..... نہیں مانتی میں ایسی منصفی کو جس میں ایک باپ کی ضد اور انا کی وجہ سے ہمیشہ ایک بیٹا ہی پستا ہے.....

قدرت: (قدرت چلاتا ہے) ہاجرہ.....تم نے اپنی حد پار کر لی ہے آج۔

ہاجرہ: حد ہی تو کبھی پار نہیں کی آج تک آپ کے حکم کے سامنے کسی نے پیر صاحب.....مگر آج آپ نے مجبور کر دیا کہ آپ کو یاد دلاؤں کہ آج آپ نے خود اپنے خون کے خلاف گواہی دے دی ہے.....اگر موسیٰ غلط ہے تو ہماری تربیت ہی غلط ہے۔

(قدرت غصے میں چلاتا ہے)

قدرت: چلی جاؤ یہاں سے.....اس سے پہلے کہ میری زبان سے کچھ ایسا نکل جائے جسے میں چاہ کر بھی بعد میں واپس نہ لے سکوں.....

(ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں)

ہاجرہ: جا رہی ہوں میں پیر صاحب.....مگر میرے جانے کے بعد اس بات پر غور ضرور کیجئے گا کہ موسیٰ نے زرّی کے لیے ہی رشتہ کیوں بھیجا.....؟.....اُسے تو آپ نے ایک نیچ خاندان اور بدنام لڑکی زہرہ کے عشق میں مبتلا ہونے کے جرم میں گھر سے نکال دیا تھا.....پھر وہ زرّی جیسی پاکیزہ صفت لڑکی سے نکاح کیوں کرنا چاہتا ہے.....؟.....آنکھیں کھولیے پیر صاحب.....

(پیر قدرت چونک کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے)

قدرت: کہنا کیا چاہتی ہو تم.....

ہاجرہ: کبھی کبھی ہماری نظریں بہت قریب کی حقیقتیں بھی جان نہیں پاتیں.....اور ہم بس اپنے جھوٹے نظریے سے چپکے رہتے ہیں.....غور کیجئے گا پیر صاحب.....

ہاجرہ روتی ہوئی کمرے سے نکل جاتی ہے۔ پیر قدرت کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں، اسے اپنی بیوی کی بات کاٹتی رہتی ہے۔

Avdio/overlap

ہاجرہ: اسے تو آپ نے ایک نیچ خاندان اور بدنام لڑکی زہرہ کے عشق میں مبتلا ہونے کے جرم میں گھر سے نکال دیا تھا.....پھر وہ زرّی جیسی پاکیزہ صفت لڑکی سے نکاح کیوں کرنا چاہتا ہے.....

پیر قدرت اپنا سر پکڑ لیتا ہے جیسے اسے بیوی کی بات کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہو۔ اس کے اندر اس کی اپنی آواز گونجتی ہے۔

قدرت: نہیں نہیں.....زرّی ہی وہ لڑکی زہرہ نہیں ہو سکتی

آڈیو: .....میری نظریں اتنا بڑا دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔

اوور لیپ

قدرت غصے اور پریشانی میں پیر پٹختا کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 9

وقت: دن

جگہ: سارنگا کا اڈہ

نامراد اور چاند پوری سر جھکائے کھڑے ہیں۔ سارنگا موسیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بارے ہوئے لہجے میں کہتا ہے۔

سارنگا: آج سارنگا ایک بازی ہار کر آیا ہے شہزادے.....

(موسیٰ کی آنکھوں میں شدید غصہ ہے)

موسیٰ: میں نے کہا تھا کہ ابا نہیں مانیں گے.....

سارنگا: تیرے باوا کہتے ہیں کہ لڑکی کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا ہے.....

(موسیٰ پلٹ کر جانے لگتا ہے۔ نامراد اور چاند پوری اس کے پیچھے لپکتے ہیں۔ موسیٰ پلٹ کر غصے میں چلاتا ہے۔)

موسیٰ: آج میرے پیچھے کوئی نہیں آئے گا..... اب یہ جنگ صرف میری جنگ ہے..... بول دو ان سے سارنگا بھائی۔

نامراد اور چاند پوری گھبرا کر سارنگا کی طرف دیکھتے ہیں۔ سارنگا انہیں رک جانے کا اشارہ کرتا ہے، وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ موسیٰ کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 10

جگہ: کاشانہء پیراں

موسیٰ سارنگا کی جیپ میں تیزی سے اپنے گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتا ہے۔ نوکر گھبرا کر لپکتے ہیں۔ موسیٰ گاڑی سے اترتا ہے اور غصے میں بھرا مختلف راہداریوں سے ہوتا ہوا زنان خانے کی طرف بڑھتا ہے اور ایک ایک کمرے کے دروازے کو لات مار کر کھولتا جاتا ہے، اسے زہرہ کے کمرے کی تلاش ہے۔ مگر شروع کے چند کمرے خالی نکلتے ہیں۔ نوکرانیاں موسیٰ کی وحشت دیکھ کر گھبرا کر چلاتی ہوئی ادھر اُدھر بھاگتی ہیں۔ مگر موسیٰ سب سے بے خبر زہرہ کو آوازیں دیتے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

موسیٰ: زہرہ.....؟..... زہرہ..... کہاں ہو تم اور پھر پانچویں دروازے کو کھولتے ہی اسے سامنے آنسوؤں میں ڈوبی بیٹھی زہرہ نظر آتی ہے۔ زہرہ دروازے کے دھماکے سے گھبرا کر دیکھتی ہے۔

زہرہ: موسیٰ..... تم..... یہاں.....

(موسیٰ آگے بڑھتا ہے اور زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے باہر کی طرف لے جاتا ہے)

موسیٰ: چلو میرے ساتھ.....

زہرہ: موسیٰ..... میری بات تو سنو.....

مگر موسیٰ نہیں رُکتا اور زہرہ کو لئے کمرے سے نکل جاتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 11

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، ہاجرہ کا کمرہ

ہاجرہ کے کمرے میں خدیجہ اور سکینہ بیٹھے ہیں۔ نوکرانی گھبرائی ہوئی بھاگتی آتی ہے۔

نوکرانی: پیرنی جی..... موسیٰ بھائی آ گئے ہیں..... اور وہ زرّی بی بی کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں.....

(سب عورتیں گھبرا جاتی ہیں)

خدیجہ: یااللہ خیر.....

//Cut//

Scene No # 12

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں، لاؤنج، برآمدہ وغیرہ

موسیٰ زہرہ کو بازو سے پکڑے کھینچتے ہوئے مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اچانک پیچھے سے پیر قدرت کی گرجدار آواز آتی ہے۔

قدرت: موسیٰ.....رک جاؤ.....

زہرہ گھبرا کر دیکھتی ہے۔ قدرت کے پیچھے عیسیٰ بھی گھبرایا ہوا کھڑا ہے، اسی لمحے گھر کی عورتیں بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ جاتی ہیں۔

(قدرت غصے میں گرجتا ہے)

قدرت: یہ کیا بدمعاشی لگا رکھی ہے.....شاید تم بھول گئے کہ یہ پیر قدرت اللہ شاہ کا گھر ہے.....

موسیٰ: یاد ہے مجھے اچھی طرح.....لیکن اس کاشانہء پیراں نامی جیل خانے میں آپ نے کسی کو قید کر رکھا تھا۔ میں اسی قیدی کو چھڑا کر لے جا رہا ہوں یہاں سے.....پھر کبھی نہیں آؤں گا.....آپ کو آپ کی یہ سلطنت مبارک ہو.....

موسیٰ زہرہ کو پکڑے آگے بڑھتا ہے، مگر اس بار زہرہ کے قدم جم جاتے ہیں اور وہ رک جاتی ہے موسیٰ حیرت سے اسے دیکھتا ہے۔

زہرہ: رک جاؤ موسیٰ.....میں یہاں کسی کی قید میں نہیں.....کسی مہربان کی پناہ میں ہوں.....مجھ سے یہ پناہ مت چھینو۔

(موسیٰ حیرت زدہ ہے)

موسیٰ: یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟.....جانتی نہیں ہو انہوں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے.....یہ لوگ پھر سے تمہیں مجھ سے جدا کر دینا چاہتے ہیں.....مگر اس بار میں یہ ہونے نہیں دوں گا.....تم ابھی میرے ساتھ چل رہی ہو.....اور ہمارا نکاح بھی آج ہی ہوگا.....چلو.....

(موسیٰ زہرہ کو کھینچتا ہے مگر زہرہ وہیں کھڑی رہتی ہے۔)

زہرہ: میرا نکاح وہیں ہوگا جہاں پیر صاحب نے طے کیا ہے.....اور یہ نکاح میری مرضی پوچھ کر طے کیا گیا ہے..... مجھے بھول جاؤ موسیٰ.....میرا مقدر کہیں اور لکھا ہے.....اور میں خوش ہوں اپنے نصیب پر۔

(موسیٰ کے سر پر بجلیاں سی گرتی ہیں اور وہ چلاتا ہے)

موسیٰ: تم ہوش میں تو ہو زہرہ.....یہ کیا کہہ رہی ہو.....یہی وہ گھر ہے جہاں پہلی بار تمہیں آوارہ اور بدچلن کہہ کر ٹھکرایا گیا تھا..... تمہارا نام لینے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی.....

زہرہ: ٹھیک کیا تھا پیر صاحب نے..... مجھے بھی یہ بات سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ یہ سب نصیب کے کھیل ہیں مگر محل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے والے سارے محل کی شان برباد کر دیتے ہیں.....میں تمہارے اس "کاشانہء پیراں" کی شان اور حرمت تباہ نہیں کر سکتی موسیٰ.....تمہارے قابل نہیں ہوں میں..... مجھے خود سے جوڑ کر اپنے پرکھوں کی نیک نامی پر داغ نہ لگاؤ..... چلے جاؤ.....

موسیٰ: یہ.....یہ تم کہہ رہی ہو.....؟ جو ہمیشہ مجھے.....

زہرہ: میں نے اپنی غلطی مان لی ہے موسیٰ.....دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کے تقاضے بھی نبھانے پڑتے ہیں.....کب تک بغاوت

کرتے رہو گے..... کس کس سے لڑو گے..... میں اپنے محسن کے ہر فیصلے سے متفق اور مطمئن ہوں..... مجھے احسان فراموشی پر مجبور نہ کرو..... پلٹ جاؤ یہاں سے..... اور اب اس گھر میں پیر صاحب کی اجازت سے واپس تب ہی آنا جب میری ڈولی یہاں سے رخصت ہو چکی ہو..... یہی میری تم سے آخری درخواست ہے۔

زہرہ بات ختم کر کے موسیٰ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتی ہے اور واپس پلٹ جاتی ہے۔ موسیٰ چند لمحے سر جھکائے کھڑا رہتا ہے اور پھر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بھی وہاں سے پلٹ کر چل پڑتا ہے۔ ہاجرہ کے دل پر بیٹے کی حالت دیکھ کر چھریاں چل رہی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 13

وقت: شام یا رات

جگہ: کاشانۂ پیراں

پیر قدرت اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا کسی سوچ میں گم ہے، اتنے میں دروازے پر دھیرے سے دستک ہوتی ہے اور پھر زہرہ سر پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے۔

زہرہ: آپ کے آرام میں مخل ہونے کی معذرت چاہتی ہوں..... مگر میں یہاں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں.....

(قدرت چونکتا ہے)

پیر قدرت: کیسی معافی.....؟

زہرہ: ہر اس بات کی جس وجہ سے اس گھر کی ہنستی بستی زندگی میں بھونچال آتے چلے گئے۔ یقین جانیے..... میں نے پیرنی جی کی خواہش پر خود کو دنیا کی بھٹی میں جھونک دیا تھا..... شادی بھی کر لی تھی تا کہ نئی گھر ہستی بسا سکوں اور اس ذلت اور بدنامی سے بہت دور چلی جاؤں جو میری پیدائش سے ہی میری قسمت میں لکھ دی گئی تھی..... مگر شادی ایک کم ظرف سے ہو گئی جس کے ارادے کچھ اور تھے۔ ارادے پورے نہ ہوئے تو اس نے مجھے طلاق دے کر پھر سے سڑک پر پھینک دیا..... قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس نے ایک بار پھر مجھے آپ کے ہی در پہ لا پھینکا..... میں اپنی حقیقت آپ سے چھپانا نہیں چاہتی تھی..... اور اس رات یہاں سے کہیں اور چلی جانا چاہتی تھی..... مگر کچھ مہربانوں نے مجھے روک لیا..... انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہی چھت میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو گی..... اور یقین جانیں..... ایسا ہی ہوا..... جو دن میں نے اس چھت تلے گزارے ہیں۔ وہی میری زندگی کے سب سے زیادہ پُرسکون..... عزت اور احترام والے..... مقدس اور پاکیزہ ہیں۔ اس چھت تلے آ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہاں رہنے والے کتنے خوش نصیب ہیں جنہیں آپ جیسا سایہ دار اور مہرباں سرپرست میسر ہے..... میری زندگی پر اس احسان کے بدلے اب صرف آپ کا حق ہے..... اور آپ کا ہر فیصلہ میرے لیے خوش بختی کا باعث ہے..... لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ میری رخصتی بھی اسی گھر سے کیجیے گا..... میری حقیقت جان کر مجھے واپس اس دنیا میں جانے کا حکم نہ دیجیے گا..... کیونکہ میں اب کبھی واپس وہ دہلیز پار نہیں کروں گی..... یہ آپ کا مجھ پر ایک اور احسان ہو گا.....

زہرہ اپنی بات ختم کر کے اسی طرح سر جھکائے، سر پر چادر درست کرتی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ پیر قدرت ویسے ہی جھولتی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا کچھ سوچتا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 14

وقت: رات

جگہ: کاشانہء پیراں۔زہرہ کا کمرہ

زہرہ کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلتا ہے اور روتی ہوئی زہرہ بھاگتے ہوئے آ کر اپنے بستر پر گر جاتی ہے اور زار و قطار روتی رہتی ہے، اس کی ہچکیاں بلند ہوتی جاتی ہیں اور اس کے رونے کی آواز سن کر دروازے پر سکینہ نمودار ہوتی ہے اور زہرہ کو یوں روتے دیکھ بے چین ہو کر آگے بڑھنے لگتی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر وہیں دروازے کے قریب ہی رک جاتی ہے۔ دروازے پر کھڑی سکینہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔اور وہ چپ چاپ واپس پلٹ جاتی ہے۔زہرہ کی روتے روتے ہچکیاں سی بندھ جاتی ہیں۔

//Cut//

Scene No # 15

وقت: رات

جگہ: سارنگا کا اڈہ

موسیٰ تھکا ہارا ٹوٹا ہوا سا اڈے پر پہنچتا ہے۔سارنگا کے ساتھ نامراد اور چاند پوری بیٹھے ہوئے ہیں۔وہ چونک کر موسیٰ کی طرف دیکھتے ہیں۔

چاند پوری: اکیلے کیوں آئے ہو.....اسے کیوں ساتھ لے کر نہیں آئے.....

موسیٰ: وہ بھی بدل گئی ہے.....اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا.....

نامراد: کیا.....یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟

(سارنگا آنکھیں بند کیے نیم دراز پڑا رہتا ہے)

سارنگا: میں جانتا تھا وہ تیرے ساتھ نہیں آئے گی ے.....وہ بھی تیری طرح کسی اور مٹی کی بنی ہوئی ہے۔

موسیٰ: جانتے تھے تو پھر اس کا ہاتھ میرے لیے مانگنے کیوں گئے تھے۔

(سارنگا اٹھ بیٹھتا ہے)

سارنگا: اس لیے کہ اب وہ صرف وہی کرے گی جو پیر صاحب کی مرضی ہوگی.....پیر صاب کی ہی مانے گی.....اسی لیے میں نے تیری عرضی وہاں لگائی تھی جہاں سے منظوری کے بعد ہی تیرے مقدر پر اس کے نام کا ٹھپہ لگنا ممکن تھا.....

موسیٰ: پتھروں سے سر ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا.....تم جس در پر بڑی آس لگا کر گئے تھے.....وہاں انسان نہیں..... صرف اونچ نیچ اور ذات پات کے پتھروں کے بُت کھڑے ہیں۔اور انہی پتھر دلوں نے زہرہ کو بھی پتھر بنا دیا ہے.....یا شاید اپنے نصیب میں صرف پتھر ہی لکھے ہیں.....

موسیٰ بات ختم کر کے کچھ کہے سُنے بغیر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔نامراد اور چاند پوری پریشانی سے ایک دوسرے کو اور پھر سارنگا کو دیکھتے ہیں۔مگر سارنگا کسی اور ہی گہری سوچ میں گم بیٹھا ہوا ہے۔

//Cut//

Scene No # 16

وقت: دن

جگہ: مزار۔نیلا گنبد۔حجرہ

حجرے میں احمد پیر قدرت کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہے۔ ایک جانب علامہ شہاب بیٹھا اپنے ہاتھ میں پکڑی لکڑی کی بڑی سی تسبیح پھیر رہا ہے۔ کمرے میں خاموشی سی طاری ہے۔

قدرت: سچ یہ ہے کہ یہ بات خود مجھے کل تک پتہ نہیں تھی کہ لڑکی کا ماضی کیا ہے..... صرف اتنا پتہ تھا کہ زرّی طلاق یافتہ تھی اور پھر علامہ حضرت کے حکم پر اس نے ہمارے ہاں پناہ لے رکھی ہے..... مگر تم دونوں کا بہت جلد عمر بھر کا رشتہ جڑنے والا ہے..... اس لیے زرّی کے بارے میں یہ ساری تفصیل بتانا بہت ضروری تھی..... فیصلہ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے..... کیونکہ زندگی تم دونوں نے ساتھ گزارنی ہے.....

(احمد سنتا رہتا ہے)

احمد: یہ بھی آپ کی محبت اور شفقت ہے پیر صاحب..... کہ آپ نے ہر بات سے مجھے باخبر رکھا..... میرا فیصلہ آج بھی وہی ہے جو آپ دونوں کا فیصلہ ہے..... مجھے زرّی کے ماضی یا حال سے کچھ لینا دینا نہیں ہے..... آپ جو حکم کریں..... وہی میرے لیے باعث سعادت ہے۔

قدرت: جزاک اللہ..... تمہاری یہی سعادت مندی تمہیں بہت آگے لے کر جائے گی ان شاءاللہ.....

(پیچھے بیٹھا علامہ شہاب غور سے پیر قدرت کی طرف دیکھتا ہے، قدرت اپنی بات جاری رکھتا ہے)

قدرت: تو پھر نکاح اگلی جمعرات کو بعد از نماز عصر ہی ہوگا..... یہ طے رہا.....

احمد: جو حکم یا مرشد

(احمد پیر قدرت کے ہاتھ چوم کر وہاں سے اٹھ کر نکل جاتا ہے۔ شہاب الدین غور سے قدرت کی طرف دیکھتا ہے۔)

شہاب: تم نے لڑکی کی مرضی تو ٹھیک سے معلوم کر لی ہے ناں قدرت اللہ..... شریعت کا یہ سب سے اہم نکتہ ہے جو رشتہ طے کرتے وقت ہم عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

قدرت: جی حضرت..... سب کچھ لڑکی کی مرضی سے ہی ہو رہا ہے۔

شہاب: تو پھر واقعی وہ بچی بہت صابر اور سعادت مند ہے ورنہ ایسے موقعوں پر اچھے اچھوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں..... خدا اس کے نصیب اچھے کرے..... اور ہمیں انجانے میں بھی کسی کے ساتھ زیادتی کرنے سے بچائے رکھے..... (قدرت چونک کر شہاب کو دیکھتا ہے)

شہاب اٹھ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ قدرت وہیں سوچ میں گم بیٹھا رہتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 17

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں

قدرت اللہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے، اس کے کان میں علامہ شہاب کے الفاظ گونج رہے ہیں۔

آڈیو/شہاب: خدا اس کے نصیب اچھے کرے..... اور ہمیں انجانے میں بھی کسی کے ساتھ زیادتی کرنے سے بچائے رکھے.....

قدرت کچھ سوچ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے رک کر زہرہ کے کمرے کی طرف پلٹ جاتا ہے اور زہرہ کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگتا ہے مگر اندر ہوتی باتوں کی آواز اسے دستک دینے سے روک دیتی ہے۔ اندر ہاجرہ زہرہ سے کچھ بات کر رہی ہے۔

//Cut//

Scene No # 18

وقت: دن

جگہ: زہرہ کا کمرہ

ہاجرہ اور زہرہ میں بات چیت

ہاجرہ: یہ تم نے کیا کیا..... خود اپنے ہاتھوں سب جلا کر راکھ کر دیا..... میں صرف موسیٰ کی ماں بن کر یہ بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں تم بھی موسیٰ کے بنا کبھی خوش نہیں رہو گی..... پھر کیوں اس کے ساتھ چلی نہیں گئیں۔

زہرہ: جانتی ہوں میں..... مگر میں اپنا صرف ایک رشتہ جوڑنے کے لیے موسیٰ کے باقی تمام رشتے نہیں توڑ سکتی..... مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ مجھ سے رشتے کے بعد موسیٰ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے کٹ کر رہ جائے گا.....

اندر ہاجرہ اور زہرہ بات کرتی رہتی ہیں۔ پیر قدرت سن رہا ہے۔

ہاجرہ: تم جس گھر کی خوشیوں کے لیے اتنی بڑی قربانی دے رہی ہو..... وہ موسیٰ کے بنا بھی سدا یونہی سونا رہے گا..... اور میں جانتی ہوں..... موسیٰ اب کبھی پلٹ کر اس گھر میں نہیں بسے گا جہاں ہم سب نے مل کر اس کی خوشیوں کو آگ لگائی تھی.....

زہرہ: ایک بار میری رُخصتی ہو جانے دیں..... پھر میں خود موسیٰ کی منت کر کے اسے آپ کے پاس لے آؤں گی..... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔

(ہاجرہ غور سے زہرہ کو دیکھتی ہے)

ہاجرہ: اتنا یقین ہے تمہیں خود پر.....؟

زہرہ: نہیں..... مجھے آپ کی اور پیر صاحب کی تربیت پر یقین ہے کہ موسیٰ کبھی بھٹک نہیں سکتا۔ بہت عزت کرتا ہے وہ آپ دونوں کی.....

ہاجرہ: ایک بار پھر سوچ لو..... تم پر اس حویلی کا کوئی قرض نہیں ہے..... خوش رہ لوگی موسیٰ کے بغیر.....

زہرہ: نہیں..... کبھی نہیں..... مگر میری وجہ سے اگر پیر صاحب کو کوئی دُکھ پہنچا..... تو یہ غم میرے لیے اس خوشی سے کہیں بڑھ کر ہو گا، جو میرے اور موسیٰ کے ملن سے بڑی ہے۔ اور پھر ایک دن درس میں خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ ہمیں سب کچھ اسی دنیا میں ہی مل جائے..... کچھ انعامات قدرت ہماری اگلی زندگی کے لیے بھی بچا رکھتی ہے..... میں سمجھوں گی موسیٰ میرے لیے وہی قدرت کا انعام ہے۔

زہرہ اور ہاجرہ اندر اپنی باتوں میں مشغول رہتے ہیں۔

پیر قدرت تھکے ہارے قدموں سے دروازے سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔

//Cut//

شام ڈھلنے کا موقع/سورج سمندر پر ے ڈوب رہا ہے۔

//Cut//

Scene No # 19

وقت: شام، رات

شہریار اپنے گھر میں تنہا بیٹھا شراب پی رہا ہے۔ اس نے آس پاس تمام کھڑکی دروازے بند کر رکھے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کے کانوں میں باہر سے آتی فرضی آوازیں اسے پریشان کر رہی ہیں جیسے سارے قرض دار اس کے آس پاس جمع ہو کر اس سے اپنے قرض کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مختلف آوازوں کی Audio

اوور لیپ: کہاں چھپ کر بیٹھے ہو ملک شہریار.....

1- باہر نکلو.....تم ہمارا مال یوں ہضم نہیں کر سکتے

2- ہم تمہارا خون نچوڑ کر بھی اپنی رقم وصول کریں گے۔

3- باہر نکلو شہریار.....ورنہ ہم خود گھس کر تمہیں باہر نکالیں گے.....اور سرِ عام چوراہے پر تمہیں نیلام کر کے اپنا قرض وصول کر لیں گے۔

پھر سب چلاتے ہیں۔.....نکالو.....اس کو گھسیٹ کر باہر نکالو.....

شہریار گھبرا کر اٹھتا ہے اور کمرے کی ساری کھڑکیاں، دروازے، روشن دان وغیرہ بند کرتا ہے مگر باہر کی آوازوں کا شور بڑھتا جاتا ہے۔ شہریار تنگ آ کر ایک لمبا گھونٹ لیتا ہے اور جلدی سے اٹھ کر میز کا دراز کھولتا ہے اور اندر سے ایک پسٹل نکالتا ہے۔ اور غور سے پسٹل کو دیکھتا ہے، پھر زور زور سے ہیجانی انداز میں قہقہے لگاتا ہے اور چلاتا ہے۔

شہریار: نہیں آؤں گا.....میں کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا.....لعنت ہو تم سب پر.....

شہریار یونہی ہنستا رہتا ہے اور پھر اچانک اپنی کن پٹی پر پسٹل رکھتا ہے اور گولی چلا دیتا ہے، سناٹے میں فائر کی آواز گونجتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 20

وقت: دن نکلنے کا مونتاج

جگہ: کاشانۂ پیراں

زہرہ کا کمرہ۔ زہرہ خاموشی سے بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے، سکینہ ہاتھ میں شادی کا عروسی جوڑا لیے اندر کمرے میں آتی ہے اور زہرہ کو کھول کر دکھاتی ہے۔

سکینہ: یہ تائی جان نے تمہارے لیے بھجوایا ہے، ذرا ناپ کا اندازہ کر کے بتا دو مجھے کہ تمہیں پسند ہے کہ نہیں.....؟

زہرہ: اس سب کی کیا ضرورت ہے.....میں نے درخواست کی تھی کہ میں اپنے انہی دو کپڑوں میں اس گھر سے رخصت ہونا چاہتی ہوں.....نکاح انتہائی سادگی سے ہو تو بہتر ہے.....

(سکینہ سنجیدگی سے کہتی ہے)

سکینہ: ہاں.....تائی جان تو یہ سمجھتی ہیں۔ مگر دنیا والے تو یہی دیکھیں گے ناں کہ ایک دلہن کو کاشانۂ پیراں سے رخصت کیا جا رہا ہے.....تمہارے ہونے والے دولہا کے بھی کچھ ارمان ضرور ہوں گے.....تمہیں یوں سادگی سے رخصت کیا تو سب کیا کہیں گے۔ پیر قدرت اللہ کا خاندان ایک لڑکی کو بھی ڈھنگ سے رخصت نہ کر سکا.....

زہرہ: لیکن میں.....

(سکینہ بات کاٹ دیتی ہے)

سکینہ: میں تمہاری دلی کیفیت جانتی ہوں۔ مگر تمہیں نہ چاہتے ہوئے بھی دنیاداری کی ساری رسمیں نبھانی پڑیں گی.....

زہرہ مجبوراً خاموش ہو جاتی ہے۔ سکینہ آگے بڑھ کر اس کے سر پر عروسی جوڑے کا دوپٹہ رکھ کر دیکھتی ہے اور ماتھے پر ٹیکہ سجا کر چیک کرتی ہے۔ زہرہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

//Cut//

Scene No # 21

سین زہرہ کے چہرے کے Dissolve سے ہی شروع ہوتا ہے، زہرہ کا سادہ میک اپ سے عاری چہرہ دلہن کے میک

اپ سے آراستہ چہرے میں ڈھل جاتا ہے، زہرہ کے اردگرد سکینہ اور دیگر لڑکیاں بیٹھی اسے دلہن بنا رہی ہیں، میک اپ، گہنے اور ٹیکہ جھومر وغیرہ اس کے ماتھے پر سجا رہی ہیں۔ زہرہ کا چہرہ سپاٹ ہے اور وہ چپ چاپ لاتعلق سی بیٹھی ہے اور چہرے پر اداسی ہے۔

//Cut//

Scene No # 22

وقت: دن

جگہ: مزار۔احمد کا کمرہ، حجرہ

احمد اپنے کمرے میں شادی کی تیاری میں مصروف ہے، اور ایک سادہ سی سفید پگڑی اپنے سر پر رکھ کر ٹھیک کرتا ہے۔ اور اپنا کرتا ٹھیک کر کے خود کو آئینے میں دیکھتا ہے، اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوتی ہے، احمد جلدی سے کہتا ہے۔

احمد: ارے عیسیٰ بھائی..... کہاں رہ گئے تھے آپ..... مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا کہ.....

(تبھی احمد کی نظر آنے والے پر پڑتی ہے۔ جو سارنگا ہے، احمد کی بات ادھوری رہ جاتی ہے)

احمد: جی فرمایئے..... کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی.....

(سارنگا کے پیچھے موسیٰ بھی اندر آ جاتا ہے)

سارنگا: آج کوئی اپنی امانت آپ کو سونپنے آیا ہے چھوٹے پر جی..... امید ہے اپنی شنوائی کرو گے.....

(احمد غور سے موسیٰ کو دیکھتا ہے)

احمد: امانت..... کیسی امانت؟ اور میں تو انہیں جانتا بھی نہیں.....

سارنگا: موسیٰ نام ہے اس کا..... بڑے پیر صاب کا بیٹا..... موسیٰ.....

(احمد چونک کر موسیٰ کی طرف دیکھتا۔)

احمد: موسیٰ.....

//Cut//

Scene No # 23

وقت: دن

جگہ: پیر قدرت کا کمرہ

پیر قدرت اپنے کمرے میں نکاح کی تقریب کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ اس کی بیوی کمرے میں آتی ہے اور قدرت کا امامہ/ پگڑی اٹھا کر قدرت کے سر پر رکھتی ہے۔ قدرت بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

قدرت: زہرہ کو تیار کر دیا ہے لڑکیوں نے.....

ہاجرہ: جی..... زہرہ نے ایک آخری فرمائش بھیجی ہے آپ کے لیے.....

قدرت: کیسی فرمائش.....

ہاجرہ: وہ چاہتی ہے کہ اس کا نکاح قاضی نہیں..... خود آپ پڑھائیں..... وہ کہتی ہے، یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی۔

قدرت زہرہ کی فرمائش سن کر چونک کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 24

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

پیر قدرت مردانے میں آتا ہے جہاں علامہ شہاب، عیسیٰ اور دیگر مرد موجود ہیں، پیر قدرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے۔

قدرت: احمد نہیں آیا ابھی تک.....؟

عیسیٰ: بات ہوئی ہے میری اس سے ابا جان۔ وہ بس آ رہا ہے..... یہ لیں..... آ گیا احمد بھی۔

(احمد کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ دُولہے کے لباس میں کرتا/ پاجامہ اور سر پر سفید کلاہ/ پگڑی پہنے ہوئے ہے۔ احمد سلام کرتا ہے۔)

احمد: معافی چاہتا ہوں۔ کچھ دیر ہو گئی مجھے.....

(علامہ دھیرے سے کہتا ہے)

علامہ شہاب: دیر آئید..... دُرست آئید.....

احمد: (پیر صاحب..... اس سے پہلے کہ آپ نکاح پڑھائیں۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔

قدرت اللہ چونک کر احمد کی طرف دیکھتا ہے۔

//Cut//

Scene No # 25

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں

زہرہ کو دلہن بنا کر کمرے میں لایا جاتا ہے اور دلہن کی جگہ پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہاجرہ، خدیجہ اور سکینہ زہرہ کے ساتھ موجود ہیں، باہر سے ایک عورت آ کر بتاتی ہے۔

عورت: تیاری کر لیں..... پیر صاحب نکاح پڑھانے آ رہے ہیں..... عیسیٰ بھائی زہرہ بی بی کے وکیل ہوں گے۔

ساری عورتیں جلدی سے دوپٹے سر پر ٹھیک کرتی ہیں اور پلّو نکال لیتی ہیں۔ سکینہ بے چارگی سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہے۔ زہرہ کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر ٹپکتا ہے۔

//Cut//

// Inter Cuts //

Scene No # 26

انٹر کٹس میں پیر قدرت کو سنجیدہ چہرے کے ساتھ کاشانہ پیراں کی مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے نکاح پڑھانے کے لیے زہرہ کے کمرے کی طرف جاتے دکھایا جائے گا۔ اس کے پیچھے عیسیٰ بھی پریشان سا چلا آ رہا ہے۔ زہرہ کی ٹریٹمنٹ اور پیر قدرت کا آنا انٹر کٹنگ میں دکھایا جائے گا۔

//Cut//

Scene No # 27

وقت: دن

پیر قدرت زنان خانے میں داخل ہوتا ہے جہاں زہرہ دُلہن بنی عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہے۔ زہرہ والے حصے میں اور پیر قدرت کے کھڑے ہونے کی جگہ کے درمیان ایک جالی دار ریشمی پردے کی آڑ ہے۔ قدرت اور عیسیٰ پردے کی آڑ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہاجرہ، خدیجہ اور سکینہ بے چارگی سے زہرہ کی طرف دیکھتی ہیں۔ قدرت کھنکار کر سب کو متوجہ کرتا ہے۔

قدرت: میں پیر قدرت اللہ شاہ بطور قاضی اور عیسیٰ ولد قدرت اللہ بطور دُلہن کے وکیل۔ دُلہن زہرہ سے شرعی حوالے سے ایجاب و قبول کے لیے حاضر ہوئے ہیں..... اجازت ہے.....

(ہاجرہ ٹوٹی ہوئی آواز میں دُلہن کی طرف سے کہتی ہے)

ہاجرہ: اجازت ہے پیر صاحب.....

قدرت: زہرہ بنت منصور.....تمہیں باعوض حق مہر مبلغ پانچ لاکھ روپے.....سکہ رائج الوقت.....موسیٰ ولد پیر قدرت اللہ سے نکاح قبول ہے.....

زہرہ مایوس سی بیٹھی ہے مگر اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ پیر قدرت اللہ نے احمد کے بجائے موسیٰ کا نام لیا ہے۔ وہ گھبرا کر بے یقینی سے اوپر دیکھتی ہے۔ خدیجہ اور سکینہ بھی گھبرا کر پیر قدرت کی طرف دیکھتی ہیں۔ ہاجرہ اپنے حواس پر قابو پا کر کہتی ہے۔

ہاجرہ: آپ شاید فرطِ جذبات میں موسیٰ کا نام لے بیٹھے ہیں پیر صاحب.....!

مگر پیر قدرت کی طرف سے جواب نہیں آتا۔

//Cut//

Scene No # 28

وقت: دن

جگہ: کاشانہء پیراں۔ مردانہ

پیر قدرت، احمد، عیسیٰ اور علامہ شہاب موجود ہیں۔

قدرت: (قدرت غصے میں کہتا ہے) یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....ساری دنیا کو پتہ ہے کہ آج تم زہرہ کی بارات لے کر آئے ہو یہاں.....اب تم اس رشتے سے مکر نہیں سکتے۔

احمد: میں مکر نہیں رہا ہوں پیر صاحب.....آپ کا حکم سر آنکھوں پر.....مگر زہرہ میرے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ پائے گی.....وہ یہ رشتہ صرف آپ کی خوشی کے لیے کر رہی ہے.....اس لیے وہ بھی مرتے مر جائے گی مگر اپنی زبان سے کبھی شکوہ نہیں کرے گی.....

(قدرت چونک کر احمد کو دیکھتا ہے)

قدرت: اور یہ سب تمہیں کیسے پتہ ہے.....

احمد: موسیٰ مجھ سے ملنے آیا تھا آج.....

قدرت: اوہ.....تو یہ سب کچھ اس موسیٰ کا کیا دھرا ہے.....ضرور وہ تمہیں اس رشتے سے متنفر کرنے اور بھڑکانے کے لیے آیا ہوگا۔ اور تم اتنے بیوقوف ہو کہ اس کی باتوں میں بھی آ گئے۔

احمد: نہیں.....موسیٰ مجھے بھڑکانے یا اس رشتے سے متنفر کرنے نہیں آیا تھا پیر صاحب.....اس کی رگوں میں بھی آپ کا ہی خون دوڑ رہا ہے.....اس نے مجھ سے صرف اتنا وعدہ لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے.....میں آخری دم تک زہرہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ موسیٰ اس وقت بھی باہر کھڑا ہے پیر صاحب۔ میں نے ہی اسے روک رکھا ہے.....میں، زہرہ اور موسیٰ۔ ہم تینوں آپ کے حکم کے پابند ہیں.....آپ کہیں گے تو موسیٰ باہر سے ہی واپس پلٹ جائے گا.....لیکن یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ کیا آپ ایک ایسی لڑکی سے میرا نکاح کروائیں گے۔ جس کی روح اس رشتے میں بندھ جانے کے بعد بھی ہمیشہ دو حصوں میں بٹی رہے گی۔

(علامہ شہاب قدرت کی طرف دیکھتا ہے)

علامہ شہاب: میں نے تمہیں ہمیشہ انصاف کرنے کی نصیحت کی ہے قدرت اللہ۔ دیکھو آج کہیں ایک بیٹی کے لیے فیصلہ کرتے وقت تم کہیں ناانصافی نہ کر جاؤ.....

قدرت: (قدرت غصے میں چلاتا ہے) موسیٰ.....اندر آؤ.....

(موسیٰ سر جھکائے اندر آ جاتا ہے۔ ماحول پر شدید تناؤ اور خاموشی طاری ہے۔ پیر قدرت چند لمحے موسیٰ کو دیکھتا رہتا ہے پھر دھیرے سے پوچھتا ہے۔)

قدرت: کیا تم.....زہرہ سے نکاح کرو گے.....

(موسیٰ چونک کر سر اٹھاتا ہے۔ عیسیٰ، شہاب الدین اور احمد کرا دیتے ہیں)

موسیٰ: ابا.....

قدرت بالآخر اپنے بازو کھول دیتا ہے اور موسیٰ بھاگ کر باپ کے گلے لگ جاتا ہے، اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا ہے۔ اسے تسلی دیتے دیتے پیر قدرت کی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ سبھی کی پلکیں بھیگ چکی ہیں کہ باپ بیٹے کا آخر کار ملن ہو ہی گیا ہے، علامہ احمد کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتا ہے۔

//Cut//

Back To Live / Red Time

Scene No # 29

وقت: دن

جگہ: کاشانہ پیراں۔ زنان خانہ

زہرہ کے نکاح کی تقریب

RESUME

پیر قدرت کے منہ سے موسیٰ کا نام سُن کر سب ہی ہکا بکا کھڑے ہیں۔

ہاجرہ: آپ شاید فرطِ جذبات میں موسیٰ کا نام لے بیٹھے ہیں شاید.....نکاح موسیٰ کا نہیں.....احمد اور زہرہ کا طے ہوا ہے۔

(پیر قدرت اپنا گلا صاف کرتا ہے اور کھنکار کر دوبارہ کہتا ہے)

قدرت: میں ایک بار دوبارہ اپنے ہوش و حواس میں دُہراتا ہوں.....زہرہ بنت منصور علی خان۔ تمہیں باعوض حق مہر پانچ لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت موسیٰ ولد پیر قدرت اللہ شاہ پہ نکاح قبول ہے۔

(عیسیٰ دھیرے سے کہتا ہے)

عیسیٰ: خدا کے لیے ہاں کہہ دیں بھابھی..... یہ آخری چانس ہے۔ زہرہ کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پہ دھیمی سی مسکان آ جاتی ہے اور وہ دھیرے سے کہتی ہے۔

زہرہ: مجھے قبول ہے..... 'کٹ'

Inter Cut

(نوٹ) انٹر کٹس میں دونوں کو تین تین مرتبہ قبول ہے کہتے دکھایا جائے گا۔

(انٹر کٹ) موسیٰ آہستہ سے کہتا ہے۔ مردانے میں بیٹھا ہے،

موسیٰ: قبول ہے۔ 'کٹ'

زہرہ: قبول ہے۔ 'کٹ'

موسیٰ: قبول ہے۔ 'کٹ'

زہرہ: قبول ہے۔ 'کٹ'

موسیٰ: قبول ہے۔ 'کٹ'

//Cut//

Scene No # 30

وقت: دن/شام

جگہ: کاشانہ پیراں۔ مردانہ

مردانے میں سارنگا، چاند پوری اور نامراد اپنے کچھ کارندوں کے ساتھ خاموش پریشان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ سارنگا پریشانی سے اندر کے دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔ تبھی عیسیٰ اندر سے بھاگتا ہوا آتا ہے۔ سب پریشانی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عیسیٰ کچھ دیر ان کے چہروں کے تاثرات دیکھتا اور پھر خوشی سے چلاتا ہے۔

عیسیٰ: قبول ہے۔ قبول ہے..... قبول ہے۔ موسیٰ کو زہرہ اور زہرہ کو موسیٰ قبول ہے.....

یہ سنتے ہی سارنگا کے سارے کارندے خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں اور نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ عیسیٰ قریب کھڑے ڈھول والے اور شہنائی والے کو کھینچ کر ان کے قریب لے آتا ہے اور ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی گونج پر خود بھی ناچتا ہے اور چاند پوری اور نامراد وغیرہ کے ساتھ باقیوں کو بھی کھینچ لیتا ہے۔ سارنگا دو لمحے یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور پھر وہ خود بھی ڈانس پارٹی میں کود جاتا ہے۔ اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے لگتا ہے۔ چاند پوری اور نامراد سیٹیاں بجا بجا کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ کاشانہ پیراں کے مردانے میں پہلی مرتبہ یہ طوفانِ بدتمیزی جاری رہتا ہے۔ سب ناچ رہے ہیں، تالیاں اور سیٹیاں بجا رہے ہیں اور نعرے لگا رہے ہیں۔ اتنے میں شور سن کر موسیٰ اندر سے گھبرایا ہوا سا باہر آتا ہے اور سب کو روکتا ہے۔

موسیٰ: بند کرو یہ ہنگامہ..... اندر ابا بہت ناراض ہو رہے ہیں..... کہ ہمارے گھر میں یہ ڈھول ڈھمکا کیسا ہے۔

ڈھول والے سمیت سبھی ایک لمحے کو رک جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر اچانک سارنگا آگے بڑھتا ہے اور موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور ڈھول والے کو ڈانٹتا ہے۔

سارنگا: بجاؤ ے..... رک کیوں گیا..... آج میرے پیر کی شادی ہے۔

شہنائی اور ڈھول والا پھر سے اسی جوش اور جذبے سے بجانا شروع کر دیتا ہے، موسیٰ نہ نہ کرتے رہ جاتا ہے اور سب اسے ہاتھ پکڑ پکڑ کر نچاتے رہتے ہیں۔ پھر موسیٰ بھی سارا پروٹوکول بھول بھال کر بے تحاشہ سب کے ساتھ ناچنا شروع کر دیتا ہے۔ عیسیٰ اور موسیٰ کی سیٹیاں آسمان چھوتی رہتی ہیں۔ سب ناچ رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور پھر سارنگا موسیٰ کو گلے لگا لیتا ہے۔ آس پاس ساری ٹولی ناچتی رہتی ہے۔

//Cut//

Scene No # 31

وقت: رات

جگہ: موسیٰ کا کمرہ

موسیٰ کے کمرے کو جلد بازی میں تھوڑا بہت سنوارنے کی کوشش کی گئی ہے مگر ساری سجاوٹ ادھوری سی ہے۔ کیمرہ کمرے کی خالی مسہری اور دیواروں سے پین PAN کرتا ہوا کمرے کے ایک کونے کی طرف Move کرتا ہے جہاں سامنے موسیٰ اپنے اسی صبح کے سادہ لباس میں اور اس کے پیچھے دلہن بنی عروسی جوڑے میں زہرہ دونوں آگے پیچھے شکرانے کے نفل ادا کر رہے ہیں۔ موسیٰ آگے ہے اور کچھ فاصلے پر زہرہ پیچھے بیٹھی نماز پڑھ رہی ہے۔ پہلے موسیٰ..... اور پھر زہرہ سلام پھیرتی ہے۔ موسیٰ زہرہ کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔

موسیٰ: تم بھی کہتی ہو گی کہ مجھے یہ کیسا ڈولہا ملا ہے۔ جس نے آتے ہی کوئی محبت کی بات کرنے کے بجائے تمہیں شکرانے کے نفل

پڑھنے پر لگا دیا.....

(زہرہ دھیرے سے مسکراتی ہے)

زہرہ: ایسا دولہا ملا ہے کہ ساری عمر بھی شکرانے کے نفل ادا کروں تو کم ہے۔

موسیٰ: (موسیٰ بھی مسکراتا ہے) ایسی کیا خاص بات ہے اس دولہے میں..... شادی کے لیے ڈھنگ کا جوڑا تو پہن نہیں سکا۔ عیسیٰ کی شیروانی پہننے کی کوشش کی تو چھوٹی پڑ گئی اور بازوؤں سے چر گئی..... نہ تمہاری سیج ڈھنگ سے سجائی گئی اور نہ ہی تمہارا عجلۂ عروسی تیار ہوا..... یہ بھی دنیا کی ایک الگ اور عجیب و غریب شادی ہوئی ہو جیسے.....

(زہرہ مسکرا دیتی ہے اور اپنا اور موسیٰ کا جائے نماز تہہ کر کے ایک جانب رکھتی ہے۔)

زہرہ: میری نظر سے دیکھو تو..... سب تیار ہے..... سجا ہوا ہے۔..... جگمگا رہا ہے..... باہر ستارے نہ ملیں تو اپنی آنکھوں میں تارے بھر کر دیکھو..... کتنی تاروں بھری رات ہے..... کتنی سجیلی شام ہے یہ موسیٰ.....

(موسیٰ زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس ہی نیچے بٹھا لیتا ہے)

موسیٰ: سچ کہہ رہی ہو..... عشق ہمارے اندر اتنی روشنی بھر دیتا ہے کہ باہر کے اندھیرے پھر کوئی معنی نہیں رکھتے..... تم بھی میرے نصیب کا ایک ایسا ہی ستارہ ہو زہرہ.....

(زہرہ ہلکے سے مُسکاتی ہے)

زہرہ: مگر زہرہ تو چاند کو کہتے ہیں..... تو یوں کہو کہ یہ زہرہ تمہارے مقدر کا سب سے روشن چاند ہے.....

موسیٰ: کیا چاند، کیا ستارے..... آج ساتوں آسمانوں کی کہکشائیں ہمارے ملن پر حیراں ہیں..... مجھے بھی اب تک یقین نہیں آیا کہ ہم مل چکے ہیں.....

زہرہ: کیا جلدی ہے..... یقین کرنے کو زندگی پڑی ہے..... ابھی تو ہم دونوں کو یہ وہم ہی رہنے دو کہ ہم مل چکے ہیں..... خواب ہے تو خواب ہی سہی۔ اسے خواب ہی رہنے دو موسیٰ اپنا سر زہرہ کی گود میں رکھ کر لیٹ جاتا ہے اور اس کا دوپٹہ/چُنری اپنی آنکھوں پہ ڈال کر آنکھیں موند لیتا ہے۔

موسیٰ: چلو تو پھر خواب میں چلتے ہیں..... خواب میں ملتے ہیں، ایک نیا خواب بنتے ہیں زہرہ.....

زہرہ اپنا سر موسیٰ پر جھکا دیتی ہے..... پس منظر میں نظم کے بول موسیٰ کی آواز میں اوورلیپ ہوتے ہیں۔

گر ایسا ہے تو پھر.....
چلو خواب میں چلتے ہیں.....
ہم خواب میں ملتے ہیں.....
اور اسی خواب میں پھر سے
اک نیا خواب بُنتے ہیں.....
خواب میں تتلیاں ہیں
جگنو، چاند اور تارے ہیں.....
خواب میں تم میرے ہو.....
اور یہ سب تمہارے ہیں.....
خواب میں ہم بھیگتے ہیں.....
جیسے کوئی بارش ہو
یا بادلوں کی سازش ہو.....،

خواب میں سب خواب سا ہے،
ہر چہرہ جناب سا ہے،
جیسے کوئی پردہ، حجاب سا ہے
تھوڑا موتیا، کچھ گلاب سا ہے،
تو پھر چلو ناں.....
ہم اُس باغ میں چلتے ہیں.....،
کسی خواب میں ملتے ہیں،
اور اُسی خواب میں پھر سے
اک نیا خواب بُنتے ہیں.....

.....ختم شد.....

ایڈمن اردو بکس
محمد سلمان سلیم
03067163117

SULMAN Online Shopping Centre



السلام علیکم معزز ممبرز اردو بکس!

ب کے ایڈمن سلمان سلیم نے اپنی بہنوں اور بھائیوں کی سہولت کے لیے آن لائن پراڈکٹس کا کام شروع کیا ہے جس میں لیڈیز اینڈ ٹس کے لئے ہر موسم کے مطابق کپڑوں کی ورائٹی کے علاوہ فینسی ڈریسز، برائیڈل، مہندی کے فنکشن کے فراک، بچوں کے لیے صورت کلیکشن، کاسمیٹکس پراڈکٹس اور لیڈیز پرس اچھی کوالٹی کے مشہور برانڈ وغیرہ مناسب قیمت پر آپ کو مارکیٹ ریٹس سے بھی کم ت پر آپ کے گھر پر ہی بذریعہ کوریئر سروس مل جائیں گے۔ کیونکہ دکان دار حضرات دکان کا کرایہ، ماہانہ بجلی کے بلز اور ملازموں کی ایں وغیرہ بھی آپ ہی کی جیب سے نکالتے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو مناسب قیمت میں گارنٹی کے ساتھ (کلر اور سٹف کی گارنٹی ہوگی) یعنی آپ پسند کر کے آرڈر کریں گے وہی چیز اگر نہ ملے ہم بخوشی بغیر کسی ردوقدح کے واپسی کر کے آپ کے پیسے آپ کو لوٹا دیں گے۔ ڈیلوری ر دینے کے تین سے چار دن کے اندر ہو جایا کرے گی (ان شاء اللہ)۔

JOIN

روزانہ نیو کلیکشن کی پوسٹنگز دیکھنے کے لیے ہمارا گروپ جوائن کریں۔ برائے رابطہ: 03067163117

Disclaimer: Product Colour may vary slightly due to photographic lighting or your device settings

(فی میلز کے لئے علیحدہ گروپ کی سہولت موجود ہے)





E-mail-hashimnadeem@gmail.com

Pride of Performance
Urdu Literature 2011

ہاشم ندیم ملک کے مقبول ترین ڈرامہ نگار اور نوجوان نسل کے پسندیدہ ترین ناول نگار ہیں۔ جن کی ادبی خدمت پر انہیں 2011ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا ہے۔

ان کی جائے پیدائش کوئٹہ ہے ابتدائی تعلیم کے بعد کیڈٹ کالج پشاور سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ بولان میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم کے دوران ہی 1996ء میں سول سروس جوائن کی اور بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی نوکری کے فرائض سرانجام دیے اور اس وقت حکومت بلوچستان میں بطور سیکریٹری تعینات ہیں۔

ہاشم ندیم کے ناول ''عبداللہ'' کو خاص طور پر ملک کی نوجوان نسل کو دوبارہ ناول کی صنف سے رغبت دلانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''خدا اور محبت''، ''بچپن کا دسمبر''، ''ایک محبت اور سہی''، ''مقدس''، ''پری زاد'' وغیرہ شامل ہیں۔









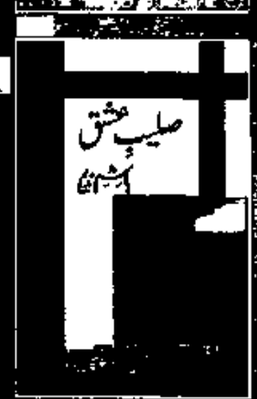













ILM-O-IRFAN PUBLISHERS

2 Al-Hamd Market 40-Urdu Bazar Lahore.
3 37213644 37213630 37353731
4 www.ilmoirfanpublishers.com
5 ilmoirfanpublishers1@gmail.com
6 www.facebook.com/ilmoirfanpublishers
7 96-T Block Commercial, Bacheran Phase-II DHA Lahore
8 +92 321 41 56 827 | +92 336 4633803
9 www.lelorebooks.com
10 yasirkhan34@gmail.com

Rs:1000/-

ایک محبّت اور سہی

ہاشم ندیم



ایک محبت اور سہی

''وہ نظام بدلنا چاہتے تھے، لیکن انہیں ہر قدم پر
سماج کے اک نئے ''ان داتا'' کا سامنا تھا''

ہاشم ندیم

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون 7352332-7232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	.....	ایک محبت اور سہی
مصنف	.....	ہاشم ندیم
ناشر	.....	گل فراز احمد علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	.....	منصور بٹ، شیر محمد طاہر
کمپوزنگ	.....	عاصم، انیس احمد
سن اشاعت	.....	دسمبر 2010ء
قیمت	.....	=/500 روپے

.....ملنے کے پتے.....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

باب 1

کبھی کبھی شام اس طرح ڈھلتی ہے جیسے وہ افق کے پار نہیں بلکہ قطرہ قطرہ کر کے ہمارے اندر اتر رہی ہو۔ سرمئی جھالروں سے ڈھکے گلابی بادل سورج ڈھلنے کے بہت دیر بعد بھی فلک پر دمکتے رہتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ دلوں میں بھیگا سرمئی اجالا بکھیرنے والی شام..... فضا کو گلابی کر دینے والی شام۔.....

بارش کی بوندوں سے تازہ بھیگی ہوئی سڑک پر ''کیفے فراق'' کے ادھ جلے یا ادھ بجھے نیون سائن کی زرد بتیوں کا عکس وقفے وقفے سے ابھر رہا تھا۔ کبھی کبھی ''اصل'' سے ''عکس'' زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یا شاید انسان ہمیشہ سے طے شدہ اجسام کی ترکیب و ترتیب بدلنے کا خواہش مند رہا ہے۔ تبھی وہ حقیقت سے زیادہ سراب کو نہارتا ہے۔ ''کیفے فراق'' جو کبھی ''کیفِ فراق'' تھا، آج بھی ہمارے محلے کی بیرونی سڑک کے چوراہے کے بائیں کونے پر اس لٹے پٹے عاشق کی طرح خاموش ایستادہ تھا جسے مدتوں پہلے سے اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے کہ اب اس کا محبوب کبھی واپس نہیں لوٹے گا..... لیکن انتظار تو عاشق کی سرشت ہے، سو محبوب کی واپسی بھلا کب شرطِ عاشقی ٹھہری.....؟

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے کیفے فراق اور اس کے اکلوتے ''پروپرائٹر'' چچا فراق کو بعین اسی حالت میں پایا تھا، مہ و سال کی گردش دونوں کی خستگی میں کچھ زیادہ بدلاؤ نہیں لا سکی تھی۔ کہتے ہیں جب چچا فراق نے اپنے آخری عشق میں ناکامی کے بعد شاعری اور عشق دونوں کو خیر آباد کہہ کر یہ ریسٹورنٹ کھولنے کی ٹھانی، تب اس کا نام انہوں نے اپنی طبعی حالتِ غیر اور اپنے تخلص، دونوں کو یکجا کر کے ''کیفِ فراق'' رکھا تھا لیکن یہ ''لطف جدائی'' زیادہ عرصہ ریستوران کے بورڈ کا ساتھ نہ دے سکا اور رفتہ رفتہ لوگ اسے ''کیفے فراق'' کے نام سے پکارنے لگے۔ ایک زمانے میں یہاں کی ہاف سیٹ چائے کا شہرہ دور دور تک تھا اور سرِ شام ہی کیفے کے باہر فٹ پاتھ پر پڑی میزیں دفتری بابوؤں اور نچلے درمیانے طبقے کے سرکاری ملازمین سے بھر جاتی تھیں۔ ہماری کالونی جو خود بھی ایسے ہی نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کی رہائش گاہ تھی اور بابو کالونی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ دراصل اسی کیفے فراق کی شہرت کی مرہونِ منت تھی، کیفے سے ذرا آگے چند قدم دور سڑک کے پار جو پرانا بس اسٹاپ تھا وہ بھی بابو کالونی سٹاپ یا فراق سٹاپ کہلاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم سب دوست اسکول جاتے وقت صبح سویرے یا پھر شام کی چائے سے پہلے اپنی جیبوں میں سکے چھنکاتے فراق چچا کے ہوٹل آدھمکتے اور شیشے کے لمبے لمبے مرتبانوں میں شہر کی مشہور بمبئی بیکر کے بنے ہوئے کیک رس، بن شیرمال یا پھر ایرانی ''شیک'' ببل کی زرد اور سبز پیٹوں کو پھر و لتے تو چچا سے خوب ڈانٹ پڑتی۔ کاؤنٹر کے ساتھ ہی پولکا آئس کریم سے بھرا بڑا سا واٹر کولر نما تھرماس بھی رکھا رہتا تھا۔ جس دن ہمارے پاس سب دوستوں کے لئے علیحدہ علیحدہ پولکا آئس کریم کی کون یا کپ خریدنے جتنے پیسے جمع ہو جاتے اس روز تو گویا ہماری عید ہو جاتی تھی، اور جب کبھی لمکا سوڈا، سیون اپ یا ایپل سوڈا کی ٹھنڈی بوتلیں ہماری دسترس میں آتیں تو ہم ان کے ڈھکن میں چھپے نرم ربڑ کے گول اسٹکر نکال کر اپنی

جیبوں میں بھر لیتے۔ اس ڈھکن میں پیوست گول ربڑ کے اوپر ہمارے پسندیدہ کارٹونز مثلاً پوپائے، ڈونلڈ ڈک، اور دیگر کی تصاویر چھپی ہوتی تھیں۔ پھر سارا سال ان ربڑ کی گول مہروں کی میٹھی مہک سے ہمارے اسکول کی کتابوں اور کاپیوں میں خوشبو بسی رہتی تھی۔ جانے ہماری زندگی سے ہمارے بچپن کے رنگ اور خوشبو وقت کے ساتھ ساتھ کیوں اڑ جاتے ہیں؟ جیون اتنا پھیکا کیوں پڑ جاتا ہے؟

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک زندگی کی قوس وقزح سے کئی رنگ اڑ گئے۔ ہمارے والدین بوڑھے اور ان کی فکر اور پریشانیاں فزوں تر ہوتی چلی گئیں۔ شاید غربت بذات خود ایک ایسی آکاس بیل کی جڑ ہے جسے دکھوں، غموں اور پریشانیوں کی ڈالیاں پھیلانے کے لیے مزید کسی آبیاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غم کے کالے سائے سدا کے لیے اس کا مقدر اور فکر کی گھنی پرچھائیاں ہمیشہ سے غربت کا نصیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر خدا ہم سبھی کو ایک جیسی تقدیر سے نواز دیتا تو اس کے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی.....؟

لیکن یہ تب کی بات ہے کہ جب ہم آوارہ گردوں کو غربت نام کی دیمک چھو نہیں پائی تھی۔ ہم سب اپنی ایک الگ دنیا میں مست تھے۔ جہاں فکر اور غم نام کا کوئی بھی گھنا سایہ ہمارے بلند قہقہوں کی دھوپ کے سامنے ٹک نہیں پاتا تھا۔ ایک ایسی دنیا جہاں صبح زیادہ روشن اور دن کہیں زیادہ کھلے رہتے۔ جہاں شامیں گلابی اور راتیں سرمئی خوابوں کی آماجگاہ بنی رہتی تھیں۔ میں آیان احمد ایک ایسی ہی دنیا کا باسی تھا۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر توقیر کا نالائق بیٹا..... رشتے سے پہلے کا سابقہ میرے ابا کے الفاظ میں میرے تعارف کا سدا بہار صیغہ تھا۔ ان کے بقول میرے ''آوارہ'' اور ''لوفر'' دوستوں کی صحبت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم چاروں کے والدین ایک جیسی رائے رکھتے تھے لہٰذا ہم سبھی دوستوں کے لیے یہ بات ہمیشہ سے ہی ایک معمہ بنی رہی کہ آخر ہم میں سے اصل آوارہ اور لوفر ہے کون.....؟؟؟

آیان احمد یعنی میں، اقبال (بالا)، راجہ اور جہانگیر عرف مشی..... ہم سب ٹاٹ کے پرائمری اسکول سے یونیورسٹی تک نہ صرف ہم پیالہ ہم نوالہ بلکہ ''ہم محلہ'' بھی رہے تھے۔ ہماری دوستی ''غرض'' نام کی کسی بھی بیماری سے مبرا تھی اور ہم سبھی کو ایک دوسرے کے ماں باپ کی اپنے بارے میں تمام ''زریں'' آراء کا بچپن سے ہی بخوبی علم تھا لیکن ہم نے کبھی اپنے بارے میں ایسی کسی رائے کو بدلنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ہم جو تھے، بس تھے اور زمانے سے ہمیں بس یہی درکار تھا کہ ''جہاں ہے جیسا ہے'' کی بنیاد پر ہمیں قبول کیا جائے۔

میرے ابا سرکاری اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے ریٹائر ہونے کے بعد بس ایک ہی ارمان دل میں بسائے جی رہے تھے کہ ان کے دونوں بیٹے کمیشن پاس کر کے بڑے ماسٹر (اسسٹنٹ پروفیسر) بھرتی ہو جائیں تاکہ ان کی زندگی کی سب سے دیرینہ خواہش پوری ہو سکے۔ مجھ سے بڑا ریحان احمد تو پھر بھی کسی نہ کسی طور محنت کر کے ۱۶ جماعت پاس کر چکا تھا اور اب ابا کے حکم اور خواہش کی تعمیل میں دن بھر پبلک سروس کمیشن کے دفتر کے چکر کاٹتا رہتا تھا لیکن سچ پوچھیں تو یہ پروفیسری میرے بس کا روگ نہ تھی۔ مجھے تو اپنی کلاس کے پروفیسروں کو دیکھتے ہی خلجان سا شروع ہو جاتا تھا اور پھر میرے ابا پر ہی کیا منحصر؟ اس کالونی میں ہم سبھی نوجوانوں کے والدین اپنی اولاد سے اپنی ہی کسی حسرت ناتمام کی تکمیل چاہتے تھے۔ بالے کے ابا کسی سرکاری ورکشاپ میں مکینک تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بالا اسی ورکشاپ میں ہیڈ مستری لگ جائے۔ راجہ کے ابا کلرک تھے اور وہ دن رات اسی فکر میں دبلے ہوئے جاتے تھے کہ جانے کب ان کا بیٹا بی اے کرنے کے بعد انہی کے محکمے میں کم از کم سپرنٹنڈنٹ بھرتی ہوگا۔

جہانگیر (مشی) اور جاوید (مٹھو) کے ابا محکمہ صحت میں ڈسپنسر تھے اور دونوں میں ہی سارا سال اسی بات پر ٹھنی رہتی تھی کہ پہلے کس کا

سپوت ہسپتال میں انچارج ڈسپنسر کی کرسی سنبھالے گا۔ جانے یہ والدین اپنی زندگیوں کی تمام ناکامیوں کے داغ اپنے بچوں کی خواہشات کے خون سے ہی کیوں دھونا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ہم بھی کے والدین کی خواہشات معصوم اور ہماری دسترس سے زیادہ دور بھی نہ تھیں لیکن ہماری بدنصیبی یہ تھی کہ ہمارا خمیر بابو کالونی کی مٹی سے کوسوں پرے گوندھا گیا تھا۔ اگر کوئی قصوروار تھا تو وہ ہمارا نصیب تھا، اگر کچھ قابل تعذیر تھی تو وہ قسمت تھی جس نے ہمیں ان معصوم خوابوں کی بھٹی میں جھونک تو ڈالا مگر خود ہمارے اندر خواب گر بننے کی صفت پیدا کرنا بھول گئی۔

گھر میں میرے علاوہ مجھ سے بڑا ریحان اور مجھ سے چھوٹی رافعہ تھی جس کی صبح ہم دونوں بڑے بھائیوں کے نام کے درد سے شروع ہوتی اور رات مجھے ابا کے غیض وغضب سے بچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ امی بالکل دیسی ہی دھان پان سی، آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگانے والی ہزاروں، لاکھوں امیوں جیسی تھیں جنہیں آخر وقت تک یقین ہوتا ہے کہ ان کا ہونہار سپوت دنیا کی تمام تر توقعات کے باوجود ایک دن سکندر اعظم کی طرح فاتح بن کر لوٹے گا۔ ویسے اس معاملے میں ریحان کافی ہوشیار واقع ہوا تھا اور وہ اپنی روایتی مسکینی اور عاجزی کے بدلے رافعہ اور مجھ سے ہمیشہ کچھ زیادہ نمبر سمیٹ کر امی کا لاڈلہ بنا رہتا تھا۔ ابا بھی ریحان سے ہی اپنی ہر آس جوڑے بیٹھے تھے کیونکہ اس نے خاصے اچھے نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کر لیا تھا اور امید یہی تھی کہ جلد یا بدیر وہ ابا کے خوابوں میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

باقی رہا میں.....تو میری زندگی تو کٹ ہی رہی تھی۔ بی اے کے پرچے ختم ہونے کو تھے اور ہم سب حسب معمول کیفے فراق میں اپنی مخصوص میز کے گرد سر شام سے ہی سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور بوندیں کیفے فراق کی ٹین کی چھت پر کسی بے ترتیب تال کی سرگم بکھیر رہی تھیں۔ چچا فراق کے کیفے کی ایک اور مخصوص نشانی.....یعنی ان کے ابا کے دور کا گراموفون بھی ہمیشہ کی بلیک اینڈ وائٹ دور کے نغموں کے سر بکھیر رہا تھا۔ ہم اکثر چچا کو چھیڑا کرتے تھے کہ اب اس گراموفون سے ان گلوکاروں یا مغنیاؤں کے گیتوں کے بجائے ان کی چیختی روحوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لہٰذا خدا کے لیے اسے بدل ڈالیں۔ مگر بدلے میں ہمیشہ ہمیں چند ناقابل اشاعت قسم کے کلمات سننے کو ملا کرتے تھے۔ اس بھیگی شام میں بھی گراموفون چرچرا رہا تھا۔

''اے میرے دل کہیں اور چل.....

غم کی دنیا سے دل بھر گیا.....ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نیا.....''

راجہ نے کل رات کی بچائی ہوئی سگریٹ کے ٹوٹے سے آخری کش باقاعدہ کشید کیا اور سگریٹ فضا میں اچھال دی۔

''ہاں یار.....اب تو دل یہی کہتا ہے کہ کہیں اور چلا جائے..... بھیا ہمارا تو اب اس ''بابو کالونی'' میں دل نہیں لگتا.....''

بالے نے اپنے ہاتھ کی پرانی کیمی Camy گھڑی پر نظر دوڑائی.....'

''یار بڑی دیر کر دی اس کالج کے کلرک نے.....اب تک تو پرچہ آؤٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ کہیں مروا ہی نہ دے.....میں نے بارہ لڑکوں سے پیسے جمع کر کے خود اس کے حوالے کیے تھے۔ کہہ رہا تھا 12 بجے رات تک پرچہ پہنچا دے گا.....''

قریب سے گزرتے کیفے کے سدا بہار منشی مرزا نے بالے کی بات سن لی۔ ''جتنی محنت اور وقت تم لوگ پرچہ آؤٹ کروانے پر صرف کرتے ہو۔ اس کا دس فیصد بھی اگر پڑھنے پر لگا دو تو تم سب کی فرسٹ ڈویژن آ جائے گی۔'' مرزا آگے بڑھ گیا۔

مشی نے اپنی اداسی بھری نگاہیں اٹھائیں.....

''یار تم لوگوں کو اپنی پڑی ہے۔ کسی کو میرے اردو کے پرچے کی فکر نہیں ہے..... یقین کرو اس بار میرے ابا کم نمبر آنے پر میری جان ہی لے لیں گے.....''

مشی کی پریشانی بالکل بجا تھی۔ اس کے ابا محلے کے جز وقتی شاعر بھی رہ چکے تھے اور ان کا بیٹا پچھلی بار پرچے میں اقبال کا مشہور شعر کچھ اس طرح لکھ آیا تھا

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ رابعہ نے اس کی ہمت بندھائی

''فکر نہ کرو..... مجھے پورا یقین ہے کہ نمبر دیتے وقت ممتحن تمہارے ''شعری وزن'' کی داد ضرور دے گا..... شاباش.....'' بالے نے ایک گہری سانس لی ''آخری وارننگ تو مجھے بھی گھر سے مل چکی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ محمود غزنوی سترہ حملوں کی بجائے ایک ہی بار جی کڑا کر کے سومنات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تو تاریخ پر کیا فرق پڑ جاتا.....؟ کم از کم میں تو ان سترہ تاریخوں کے جھنجٹ سے نکل پاتا۔ ہر بار کہیں نہ کہیں ان سن اور تاریخوں کے جھمیلے میں چوک جاتا ہوں.....''

''سنو لفنگو..... کیا ضروری ہے کہ ہر رات تم لوگوں کو باقاعدہ اعلان کر کے گھروں کو بھیجا جائے..... ابھی کچھ دیر میں ہی تم لوگوں کے گھروں سے پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا..... پھر سب یہی کہیں گے فراق تم لوگوں کو بگاڑ رہا ہے.....''

رابعہ نے دور سے ہی ہانک لگائی

''فکر نہ کرو چچا..... اب ہمیں مزید بگاڑنا ممکن نہیں.....''

ہم سب کیفے سے باہر نکلے تو بارش کچھ تھم سی گئی تھی، لیکن ہوا میں موجود نمی کے قطرے جھونکوں کے ساتھ ہمارے چہروں پر شبنم بکھیرنے لگے..... میں نے بالے اور رابعہ کو یاد دلایا کہ صبح آخری پرچہ ہے لہٰذا وہ مجھے وقت پر گھر سے لیتے چلیں۔ گلی کے نکڑ پر میں نے ان سب کو رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور گلی میں داخل ہوتے وقت دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا کی کہ ابا سو چکے ہوں۔ زمین سے کچھ کنکر چن کر میں نے وقفے وقفے سے تین کنکر صحن میں آہستگی سے اچھال دیئے۔ یہ میرے اور مجھ سے چھوٹی رافعہ کے درمیان بہت پرانا اشارہ مقرر تھا۔ کنکر صحن میں گرنے کی آواز سن کر وہ چپکے سے صحن کے اندر دروازے کی چٹخنی اندر سے کھول دیتی تھی کیونکہ ابا کے فرمان کے مطابق ٹھیک عشاء کی نماز کے بعد گھر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ رافعہ کو میری اسی ''غیبی امداد'' پر بچپن سے لے کر اب تک درجنوں مرتبہ ابا سے سخت ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن وہ بھلا اپنے ''انو بھیا'' کو رات کا کھانا کھلائے بغیر کب سکون کی نیند سو سکتی تھی۔ لہٰذا ہر بار اسی بے چاری کو ابا کے غیض و غضب کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

تیسرے پتھر کے چند لمحوں بعد صحن میں قدموں کی دھیمی سی آواز ابھری اور پھر رافعہ نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔

''آیان بھیا..... آپ آج بھی اتنی دیر سے آئے ہیں.....؟..... پتہ ہے ابا کتنے غصے میں تھے.....؟.....'' میں نے کندھے اچکائے ''یہ

کون سی نئی بات ہے..... مغل اعظم کا پارہ ہمیشہ ہی بلند رہتا ہے.....'' رافعہ نے مجھے گھورا..... ''انو بھائی..... بری بات.....''

''ارے یار ہم مغل ہیں..... تو ابا مغل اعظم ہوئے ناں اس گھر کے..... اچھا بہت بھوک لگی ہے..... کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا پھر یونہی کھڑی میرا سر کھاتی رہو گی.....؟''

رافعہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف پلٹی۔ ''تین مرتبہ گرم کر چکی ہوں''

''وہ پڑھاکو پروفیسر کہاں ہے۔ سو گیا کیا.....؟'' میں نے باورچی خانے میں پڑی چوکی گھسیٹی اور وہیں بیٹھ گیا۔ رافعہ نے سالن گرم کرنے کے لیے چولہے کو آگ دکھائی۔ ''اس طرح پکارتے ہیں اپنے بڑے بھائی کو..... پورے ڈیڑھ سال بڑے ہیں ریحان بھیا آپ سے.....''

''سب تاریخ پیدائش کا چکر ہے..... ڈیڑھ سال پہلے میں پیدا ہوا ہوتا تو آج میں بڑا ہوتا.....'' میں نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا ''بھائی..... کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ..... پتہ ہے ابا آپ کی تعلیم اور نوکری کے لیے کتنے پریشان رہتے ہیں..... اور امی تو آپ کی فکر میں پہلے سے بھی آدھی رہ گئی ہیں..... آخر آپ ان دونوں کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے.....''

میں نے چڑ کر ہاتھ جوڑے ''خدا کے لیے چھوٹی..... اب تم میری نانی اماں بننے کی مشق شروع نہ کرو..... یہ کام امی ابا کے لیے ہی چھوڑ دو..... اور پھر مجھ سے جو بھی بن پڑتا ہے کرتا تو ہوں..... لیکن اگر ابا یہ سمجھتے ہیں کہ بی اے کرتے ہی وزیر اعظم لگ جاؤں تو یہ میرے لیے ناممکن ہے..... آخر تم سب کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ یہ سرکاری بابو گیری میرے بس کا روگ نہیں ہے..... مجھ سے نہیں ہوتی یہ سرکار کی چوبیس گھنٹے کی غلامی..... اس قربانی کے لیے ریحان موجود ہے..... بکرا بننے کے لیے..... مجھے تو تم لوگ بخش ہی دو.....''

میری آواز بلند ہوتے دیکھ کر رافعہ نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اچانک میرے عقب میں ابا کی گرجتی ہوئی آواز سے ماحول کانپ سا گیا۔

''مل گئی فرصت گھر آنے کی..... اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی صاحبزادے..... ابھی تو آدھی رات باقی پڑی تھی آوارہ گردی اور لوفر گیری کرنے کے لیے..... میں پوچھتا ہوں یہ کون سا وقت ہے گھر واپس آنے کا..... یہ گھر ہے یا کوئی سرائے.....؟؟''

رافعہ جو پہلے سے ہی گھبرا کر کھڑی ہو چکی تھی اس نے مجھے نظروں ہی نظروں میں کھانا جلدی ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ میں بادل نخواستہ پانی کا ایک لمبا سا گھونٹ لے کر کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹی جانتی تھی کہ ابا کے قہر و غضب سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ فی الوقت ان کی آگ برساتی نظروں سے دور ہٹ جایا جائے۔ ابا کی آواز سن کر اندر سے امی اور ریحان بھی بوکھلائے ہوئے سے باہر نکل آئے۔ میں سر جھکا کر چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھا تاکہ اوپر بنے جز وقتی گودام اور کل وقتی اس ''کمرہ نما'' میں جا کر پڑ رہوں جو بچپن سے اب تک میری آخری پناہ گاہ تھا، لیکن میرا قدم اٹھتے ہی ابا ایک بار پھر زور سے چلائے۔

''کہاں چل دیے..... رکو..... آج ایک بات کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔''

ریحان اور چھوٹی نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا۔ میرے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

باب2

مجھے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ راتوں کو دیر تک گھر سے غائب رہنے پر ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن آج مغل اعظم کا پارہ واقعی ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ امی نے کمزوری مدافعت کرنے کی کوشش کی۔

''اب جانے بھی دیں..... رات بہت ہوگئی ہے..... صبح بات کرلیں گے.....''

ابا پھر گرجے ''خبردار..... آج کوئی بیچ میں نہیں بولے گا..... اور رافعہ کی ماں..... تمہاری اسی طرف داری نے اس لوفر کو آج اس مقام پر پہنچادیا ہے۔ لوگ میری پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں کہ سارے زمانے کو اصولوں کا سبق دینے والے ماسٹر توقیر کی اپنی اولاد اس کے کہے میں نہیں ہے..... ہاں تو میاں..... آج صاف صاف بتادو کہ کب تک یونہی ہمارے سینوں پر مونگ دلتے رہو گے..... تمہاری یہ آوارہ گردیاں کب ختم ہوں گی.....''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا۔ امی نے ابا کے عقب سے مجھے گھور کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریحان نے بھی غیر محسوس طور پر ہاتھ جوڑے۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

''جی..... کوشش کروں گا کہ آئندہ دیر نہ ہو.....''

لیکن میرا یہ کہنا ہی غضب ہوگیا۔ آتش فشاں پھٹ پڑا.....

''کوشش..... بہت خوب..... سنتی ہو رافعہ کی ماں..... ابھی بھی یہ لوفر صرف کوشش کرے گا۔ آج اس کی ہڈی پسلی ایک نہ کی تو میرا نام بھی توقیر احمد نہیں ہے.....''

ابا اپنی چھڑی سنبھال کر میری طرف لپکے۔ امی جلدی سے ان کی راہ میں مزاحم ہوگئیں اور چھوٹی نے فوراً لپک کر ابا کی چھڑی پکڑ لی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابا صحن میں ٹھیک وہاں کھڑے تھے جہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی بنی ہوئی تھی لہٰذا میرے پاس اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ امی اور رافعہ ابا کی منت سماجت میں مصروف تھیں لہٰذا میرے پاس گھر سے باہر نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں صحن کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل گیا۔ پہلے تو سوچا کچھ دیر یہیں گلی میں کھڑے رہ کر اس لاوے کے سرد ہونے کا انتظار کروں لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ابا کے چلانے کی آواز آئی ''ریحان..... دروازہ بند کردو..... ایک رات باہر کی ہوا کھائے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے اس بدمعاش کے.....'' گھر کے اندر کچھ دبا دبا سا احتجاج ابھرا لیکن پھر آخر کار اندر سے صحن کے دروازے کی چٹخنی چڑھائے جانے کی آواز گلی میں گونجی..... میں جانتا تھا کہ مغل اعظم اپنے فیصلے واپس لینے کے عادی نہیں ہیں۔ لمحے بھر میں میرے مغل خون نے بھی جوش مارا ''ٹھیک ہے اگر مغل شہنشاہوں کو دیس نکالا دینے کی عادت ہے تو مغل شہزادے بھی اپنی سلطنت کو ٹھوکر مار کر خاک چھاننے کا ہنر جانتے ہیں۔'' سو میں بھی ابا کے اس دو کمروں کے سرکاری کوارٹر کی ریاست کو ٹھکرا کر رات گزارنے کے لیے کسی جزیرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جزیرہ اس لیے کہ فی الحال تو

سارا شہر بارش کے بہتے پانی کی وجہ سے ایک چھوٹے دریا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کر لیے کیونکہ تیز بوندوں نے ایک بار پھر زمین کو جل تھل کرنے کے لیے سازش باندھ لی تھی۔ جانے بارش کا واسطہ ہمیشہ غریب کے کچے گھروندے سے ہی کیوں ہوتا ہے؟ یا پھر امراء کے محلوں پر برسنے والی بارش شاید کوئی اور ہوتی ہوگی.....؟؟؟

پہلے میں نے سوچا کہ کالونی سے نکل کر سڑک کے اگلے چوراہے سے متصل سڑک پر واقع بالے کے ابا کے گیراج چلا جاؤں، لیکن جانے کالونی سے نکلتے ہی میرے قدم خود بخود کیفے فراق کے باہر بچھے لکڑی کے بنچ نما تختوں کی جانب کیوں بڑھتے گئے۔ کیفے کے لکڑی سے بنے چاروں دروازے تو بند تھے لیکن کھڑکیوں سے چھن کر سڑک پر گرتی روشنی کے مستطیل ٹکڑے اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ اندر صبح کے ناشتے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ کیفے فراق کی حلوہ پوری سارے شہر میں مشہور تھی اور صبح منہ اندھیرے ہی شہر سے باہر موجود سیمنٹ کی فیکٹری کو جانے والے پہلی شفٹ کے بہت سے مزدور یہیں سے ناشتہ کر کے صبح چھ بجے والی پہلی بس پکڑتے تھے۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔ میں ٹین کی چھت والے برآمدے کے نسبتاً خشک حصے میں پڑے ایک تختے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر سے چائے کی سوندھی اور کچھ بے چین سی کر دینے والی مہک باہر کیفے کے برآمدے تک آ رہی تھی۔

اگر صبح کا واحد تعارف روشنی اور سورج کے طلوع ہونے سے ہی تھا تو ابھی صبح ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ میں کچھ دیر تک بینچ پر لیٹا سڑک پر گرتی بوندوں کے فنا ہونے کا کھیل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی روٹھی پری میری پلکوں کے مورچھل سے آ کر لپٹ گئی اور میں نے آنکھیں موندھ لیں شکر ہے ہم غریبوں کو امیروں کی طرح نیند خریدنی نہیں پڑتی۔ مجھے سوئے کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرے سے میرا شانہ ہلایا ہو۔ چند لمحوں کے لیے میں بھول گیا کہ میں اپنے گھر میں نہیں سڑک کنارے سو رہا ہوں۔ مجھے لگا جیسے حسب معمول دیر تک سونے کی وجہ سے چھوٹی مجھے چھت پر جگانے آئی ہے۔ میں نے نیند میں اپنا غصہ نکالا ''کیا مصیبت ہے.....سونے دو نا.....''

''معافی چاہتا ہوں برخوردار.....وہ دراصل.....میں.....''

ادھ کھلی پلکوں سے میں نے اپنے سامنے بارش میں شرابور ایک بزرگ کو پریشان کھڑے دیکھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا.....لیکن مجبوری ہی کچھ ایسی آن پڑی تھی.....گھر والی اور بچیاں میرے ساتھ ہیں اور بارش ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی.....''

سڑک کے کنارے ایک عورت اور دو لڑکیاں ہاتھ میں کپڑے کی چند گٹھڑیاں تھامے، ٹین کے ایک صندوق کے قریب کھڑی، خود کو بارش سے بچانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں۔ ماں اور ایک لڑکی باقاعدہ برقعے میں اور دوسری لڑکی نے بھی مناسب پردہ کر رکھا تھا، لیکن تیز ہوا کے تھپیڑے انہیں بار بار سر کا پلو ٹھیک کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سر کا پلو عورت کا سائبان ہوتا ہے لیکن طوفان کو بھی تو سدا ہی سائبانوں سے سروکار رہا ہے۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے۔

''جی فرمایئے.....''

بزرگ نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا ''دراصل ہم لوگ ابھی کچھ دیر پہلے ہی نور پور کی گاڑی سے اترے ہیں۔ ٹرین کو کل شام پانچ بجے اس شہر کے پلیٹ فارم سے لگنا تھا لیکن سیلابی پانی کی وجہ سے رات تین بجے پہنچی۔ جنہوں نے ہمیں اسٹیشن لینے کے لیے آنا تھا وہ نہ جانے کب تک ہمارا انتظار کرنے کے بعد واپس جا چکے ہیں۔ میں اس شہر میں نو وارد ہوں۔ تانگے والے کو جو پتہ زبانی یاد تھا وہی بتا دیا لیکن یہاں اترنے کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ شاید ہم کسی غلط جگہ اتر گئے ہیں۔ یہ سادات محلہ نہیں ہے.....''

''سادات محلہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں لیکن آپ اس برستی بارش میں خواتین کو لے کر وہاں تک پہنچیں گے کیسے.....؟''

میری بات سن کر بزرگ نے کچھ تامل کیا۔

''میاں.....اسی لیے تو تمہیں سوتے سے جگایا ہے۔ میں جانتا ہوں تم دن بھر کی محنت مشقت کے بعد ہی یوں لمبی تان کر سوئے ہو گے.....لیکن اگر تم ہمیں سادات محلے کے اس مکان تک پہنچا دو تو میں معقول مزدوری دوں گا تمہیں.....''

مجھے کیفے کے باہر یوں بینچ پر سوتا دیکھ کر شاید وہ مجھے کیفے کا ہی کوئی ملازم یا مزدور سمجھے تھے۔ اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس وقت میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ یا شاید میں نے فٹ پاتھ سے لگے جس بینچ کا اپنا بستر بنا رکھا تھا۔ اس مقام نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا؟ اگر میں اسی حلیے میں کسی پنج ستارہ ہوٹل کے کمرے میں سو رہا ہوتا تو لوگ اسے میرا ''بے تکلف برتاؤ Non-formal behaviour'' گردانتے، شاید ہمارے ظاہری حلیوں سے کہیں زیادہ ہمارے آس پاس کا ماحول ہمارے تعارف پر اثر انداز ہوتا ہے.....

میں نے کچھ کہے بغیر ان کے ہاتھ میں دبی کاغذ کی وہ پرچی پکڑ لی جس پر سادات محلے کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ ''مکان نمبر 13، گلی نمبر 7، سادات محلہ'' پرچی کے دوسری جانب کسی تنویر علی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ''چلیے.....''

میں نے بڑے میاں کا جواب سنے بغیر قدم بڑھا دیے۔ پیچھے سے ان کی کم زوری آواز ابھری۔

''میاں.....صندوق تو اٹھا لو.....''

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود کو کوسا

''برے پھنسے آیان میاں.....اور لو سڑک کے کنارے کھلی فضا میں سونے کے مزے.....'' میں نے بادل نخواستہ سڑک پر پڑا ٹین کا صندوق اٹھایا۔ جانے کیا پتھر ڈال رکھے تھے بڑے میاں نے صندوق میں.....توقع کے خلاف وزن کی زیادتی کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے میرے قدم لڑکھڑا سے گئے، چہرے کو نقاب میں چھپائے ہوئے بنا برقعے والی لڑکی کڑک کر بولی ''ٹھیک سے اٹھاؤ.....بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں اندر، کہیں گرا نہ دینا سب کچھ.....'' غصے سے میرے خون کا بہاؤ تیزی سے میری کن پٹیوں کی طرف دوڑا۔ جی میں آئی کہ صندوق وہیں سڑک پر پھینک کر ہاتھ جھاڑ لوں کہ ''بی بی یہ لو.....سنبھالو اپنا قیمتی سامان.....آیان احمد نے آج تک گھر میں اٹھ کر پانی کا گلاس تک نہیں پیا.....اور یہ محترمہ صندوق اٹھانے کا درس دے رہی ہیں؟'' میں نے زور سے صندوق سڑک پر پٹخ دیا۔ سناٹے میں دور تک کچھ ایسی آواز گونجی جیسے کسی نے بہت اونچی عمارت سے ملبہ زمین پر پھینک دیا ہو۔ برقعوں کے اندر کچھ ہلچل سی مچی اور لڑکی چلائی۔ ''ارے ارے.....دیکھ کر.....''

لیکن تب تک بڑے میاں میرے برتاؤ کا کچھ نتیجہ اخذ کر چکے تھے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھے۔

''میاں تم اس کی بات کا برا نہ منانا..... نادان بچی ہے.....''

پھر وہ لڑکی کی طرف پلٹے اور انتہائی غصیلی لیکن دھیمی آواز میں بھڑکے۔

''گہنا.....اب تم کچھ نہیں بولو گی..... سمجھ گئیں.....'' لڑکی نے دبی آواز میں خود سے کچھ بڑبڑاہٹ کی، لیکن جواباً کچھ نہ بولی۔ اچھا.....تو اس نادان بچی کا نام گہنا تھا۔ بڑے میاں نے صندوق کی دوسری جانب کا کنڈا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا..... ''چلو صاحبزادے.....میں تمہارا وزن کچھ ہلکا کیے دیتا ہوں۔.....ہم دونوں اسے اٹھالیں گے.....''

میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ ایک جانب کر کے صندوق خود اٹھایا اور آگے چل پڑا۔ لڑکی نے بڑے میاں سے نظر اور زبان بچاتے ہوئے غصے میں طنزیہ جملہ پھینکا ''بڑے نخرے ہیں اس قلی کے بھئی.....''

میں نے سنی ان سنی کر دی کیونکہ بارش کی وجہ سے بزرگ اب ہلکے ہلکے کانپنے سے لگے تھے۔ ہم سب بارش میں بھیگی سڑک پر چھپ چھپ کرتے قریباً 20 منٹ میں سادات محلے پہنچ گئے۔ اینٹ سے چنی گلیوں کے لیمپ پوسٹ ابھی روشن تھے لہٰذا مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ دوسری ہی دستک پر اندر سے لپکتے جھپکتے ایک چھبیس ستائیس سالہ نوجوان آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے برآمد ہوا اور بزرگ کو دیکھتے ہی لپک کر ان کے گلے لگ گیا۔ پتہ چلا کہ یہی تنویر علی صاحب ہیں اور بزرگ جن کا نام شیخ کبیر تھا نور پور کے حالیہ سیلاب میں اپنا سب کچھ ڈبونے کے بعد اپنی مرحومہ بہن کے بیٹے کے پاس ہمارے شہر میں پھر سے ایک نئی زندگی کی ابتداء کے لیے اترے تھے۔ ماموں بھانجا کچھ دیر تک دروازے پر ہی گلے شکوے کرتے رہے اور برقعے والی بڑی عمر کی عورت تنویر کی بلائیں لیتے نہ تھکی تو مجبوراً مجھے ہلکے سے کھنکار کر انہیں احساس دلانا پڑا کہ ان قیمتی جذبات کا اظہار دو گھر کے اندر جا کر بھی کر سکتے ہیں۔ میرے کھانسنے پر بڑے میاں چونکے اور جلدی سے اپنی واسکٹ کی جیب سے بیس بیس کے دو نوٹ نکال کر میری طرف بڑھے ''معاف کرنا میاں.....موقع ہی کچھ ایسا تھا کہ من بہک گیا۔ میں تو بے دھیانی میں تمہارا نام پوچھنا بھی بھول گیا تھا۔ لو یہ رکھ لو.....تم نے اس برستی بارش میں بڑی ہمت دکھائی۔'' میں نے روپے ان کے ہاتھ سے لے کر ان کی واسکٹ کی اوپر والی جیب میں ڈال دیے۔

''میرا نام آیان ہے.....اور میں قلی نہیں ہوں.....''

میں نے واپس پلٹتے وقت کڑی نظروں سے خود کو قلی کے عہدے پر فائز کرنے والی ''نادان'' کو دیکھا اور چل پڑا۔ بڑے میاں چند لمحوں کے لیے تو ہکا بکا سے ہی رہ گئے اور پھر میرے پیچھے لپکے ''ارے میاں.....یہ کیسے.....میرا مطلب ہے.....دو گھڑی ہماری بات تو سن لو.....''

لیکن میں رکے بنا اس گلی سے نکل آیا۔ قریبی مسجد سے فجر کے نمازی نکل رہے تھے۔ مطلب صبح ہونے کو تھی، لیکن گھنے بادلوں اور بارش کی وجہ سے ابھی تک دھندلکا بہت گہرا تھا۔ مرکزی سڑک پر دودھ والے گوالے اور اخباری ہاکر اپنی اپنی سائیکلوں پر بھونپو بجاتے، سڑک پر بہتے پانی میں تیزی سے دوڑتے سانپ جیسی لکیریں بناتے، شہر میں نکل آئے تھے۔ میں بھی پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ کچھ سائیکل سواروں نے سر پر کشتی نما پلاسٹک کی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں جو ان کے لیے عارضی چھتری کا کام دے رہی تھیں، لیکن کچھ میری طرح سدا کے بے سائبان بھی تھے جنہیں مفلسی کی وجہ

سے طوفانوں میں کچھ لٹ جانے کا خوف نہ تھا۔

میں جب ''کیفے فراق'' کے نکڑ تک پہنچا تو سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے سے ابھرتی دودھیا گلابی روشنی نے ماحول پر کسی کم طاقت والے زرد بلب کا اجالا پھیلا دیا تھا۔ مجھے دور سے ہی ریحان اسی بینچ پر چھتری تانے بیٹھا نظر آ گیا جہاں اب سے گھنٹہ بھر پہلے میں خود محو استراحت تھا۔ ریحان مجھے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں تھے تم..... میں ریلوے اسٹیشن اور بالے کا گیراج بھی دیکھ آیا ہوں..... یہ کوئی وقت ہے مٹر گشتی کرنے کا؟'' ریحان نے بھیگی چھتری کو ہوا میں جھاڑ کر اسے دوبارہ ہم دونوں کے سروں پر تان لیا۔ جانے کیوں مجھے اسٹیشن کا ذکر سن کر غصہ آ گیا ''کیوں..... تم مجھے ڈھونڈنے ریلوے اسٹیشن کیوں گئے تھے..... میرا فی الحال وہاں قلی بھرتی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے.....'' ہمیشہ کی طرح ریحان نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

''اچھا گھر چلو..... امی ساری رات تمہاری وجہ سے سوئی نہیں ہیں..... آج تمہارا پرچہ بھی تو ہے.....'' ''کیوں.....؟..... مغل اعظم نے میرے دیس نکالے کا فرمان واپس لے لیا ہے کیا.....؟..... مجھے نہیں جانا ہے واپس..... جا کر کہہ دو سب سے.....'' ریحان نے فوراً گلے میں پڑا ہوا مفلر اتار کر اسے میری کمر کے گرد کس کر پکڑ لیا۔ ''تمہارے تو اچھے بھی واپس جائیں گے..... چلو سیدھی طرح گھر.....'' یہ اس کا بہت پرانا اور آزمودہ طریقہ تھا۔ بچپن میں جب میں امی یا ابا سے کسی بات پر روٹھ کر کالونی سے باہر کھیل کے میدان میں شام تک چھپا بیٹھا رہتا تھا تو تب بھی ریحان مجھے ڈھونڈ چکنے کے بعد اسی طرح مفلر، پتلون کی بیلٹ یا کسی رسی وغیرہ سے باندھ کر کھینچتے ہوئے گھر تک لے جاتا اور امی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ آس پاس سے گزرتے اجنبی حیرت سے یہ ماجرا دیکھ رہے تھے کہ قریباً ایک ہی عمر کے دو لڑکوں میں سے ایک دوسرے کو مفلر سے باندھے کھینچے لے جا رہا ہے اور دوسرا لڑتا جھگڑتا پہلے کے پیچھے روانہ ہے۔ محلے کے چند بزرگ جو نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے وہ ایک بار پھر دہی برسوں سے دھرایا جانے والا کھیل دیکھ کر زیرِ لب مسکرائے۔ چند ایک نے ہنس کر ریحان کو داد دی ''شاباش ریحان بیٹا..... جانے نہ پائے یہ بدمعاش آیان.....'' ''ذرا کس کے پکڑنا اس شیطان کو.....'' تیسرے بڑے میاں منمنائے ''اب آیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے..... بھئی یہ ریحان ہی ہے جو اس آفت کو قابو کر سکتا ہے.....''

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں گھر کے صحن میں موجود تھے جہاں امی برآمدے میں پریشانی سے ٹہل رہی تھیں۔ میری حالت دیکھ کر انہوں نے بنا کچھ کہے تولیے سے میرے بال خشک کرنا شروع کر دیے اور رافعہ جلدی سے دھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑا استری کرا لائی۔ امی کی نان اسٹاپ نصیحتوں کا پٹارہ کھل چکا تھا۔

''انو..... کیوں ستاتا ہے اپنی ماں کو ہر وقت..... بات کیوں نہیں مان لیتا اپنے ابا کی.....؟..... وہ تیرے بھلے کے لیے ہی تو کہتے ہیں.....'' میں نے دل ہی دل میں ان کے آگے کہے جانے والے جملے اپنے دل میں دھرانا شروع کر دیے۔ ''کوئی باپ اپنی اولاد کا دشمن نہیں ہوتا''۔ ''تو نہیں جانتا کہ انہوں نے کس مشکل سے تم تینوں کی پرورش کی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر آخر میں امی نے ایک بار پھر ابا کی ان ''قربانیوں'' کا ذکر کیا جو ہم تینوں بچوں سے ابھی تک پوشیدہ تھیں۔ میں حسب معمول ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں بالے کی

پھٹ پھٹیا کا سائلنسر غرانے لگا۔ میرے ابا کے ڈر سے وہ صرف ایک بار ہارن دے کر پھر وقفے وقفے سے موٹر سائیکل کو صرف ریس دیتا رہتا تھا، لیکن آج ابا صحن میں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ویسے بھی جس رات دیر سے ان کا مجھ پر قہر نازل ہوتا تھا اس کی اگلی صبح وہ میرا سامنا کرنے سے گریز ہی کرتے تھے۔ امی مجھے زبردستی ناشتہ کراتی رہ گئیں اور میں بھاگم بھاگ بالے کے ساتھ یونیورسٹی پہنچا۔ ''اردو'' میرے لیے ہمیشہ ہی سے بہت سہل تھی۔ شاید اردو میڈیم ہونے کا بس یہی ایک فائدہ ملا تھا مجھے۔ جبکہ بالے اور راجہ کا پرچہ کچھ خاص نہیں ہوا۔ حسب معمول گھر واپسی پر راجہ اور بالے میں یہی بحث ہوتی رہی کہ جانے ممتحن کو ان سے آخر ایسی کیا دشمنی تھی کہ جب وہ میرا در سودا پڑھ کر جاتے تو پرچے میں غالب ہوتا اور جس دن غالب کا دیوان گھول کر پینے کے بعد پرچہ دینے بیٹھتے تو اقبال وہاں براجمان ملتے..... ان دونوں نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دماغ کے بجائے کوٹ اور واسکٹ کی جیبوں میں ان شاعروں کی سوانح عمریاں اور کلام بھر کر لے جائیں گے۔

بارش کچھ تھم چلی تھی لیکن گھٹائیں اب بھی آسمان پر ایک دھانی آنچل اوڑھے ہوئے تھیں۔ ایسا آنچل جس کے کناروں پر سرمئی رنگ کی گوٹہ کناری جڑی ہوئی ہو..... بالے نے راستے ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ ایسے ''قاتل موسم'' میں کیفے فراق سے ادھار گرم سموسے اور چائے پیے بنا گزرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔ لہٰذا ہم سب اپنے گناہ بخشوانے کیفے فراق جا پہنچے۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی کیفے کا منشی مرزا زور سے چلایا ''ارے یہ رہا اپنا آیان..... بھئی یہ صاحبان بہت دیر سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں'' میں نے مرزا کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ سامنے والی میز سے دو افراد اٹھ کر چلنے۔ وہ گزشتہ رات والے شیخ صاحب اور تنویر تھے۔

باب3

میں ان دونوں کو وہاں اپنا انتظار کرتے دیکھ کر کچھ چونک سا گیا لیکن شیخ صاحب مجھے دیکھتے ہی کچھ اس وارفتگی سے میری جانب لپکے جیسے ہماری برسوں کی شناسائی ہو۔ ''یہ کیا میاں..... تم تو رات ناراض ہو کر یوں چل دیے کہ پھر دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ سچ پوچھو تو مجھے شرمندگی کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی اور صبح ہوتے ہی تنویر میاں کو لے کر تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔ بھلا ہو ان مرزا صاحب کا جنہوں نے ہمیں یہیں روکے رکھا ورنہ ہم تو تمہارے گھر جانے والے تھے۔'' میرے دوستوں نے بھنویں اچکا کر مجھ سے بڑے میاں کا تعارف پوچھا اور پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے رات کا تمام ماجرا من وعن بیان کر دیا۔ میں نے درمیان میں بڑی کوشش کی کہ وہ ''قلی'' والا حصہ حذف کر جائیں مگر کہاں جناب.....؟ وہ بھی پوری کہانی سنا کر ہی دم لینے کو رکے۔ درمیان میں راجہ، بالا اور منشی جان بوجھ کر میرا ریکارڈ لگانے کے لیے ٹہوکے دیتے رہے ''اچھا..... تو انو نے آپ کا بکس بھی گھر تک پہنچایا.....؟ کمال ہے..... بھئی کچھ بھی کہو..... ہمارا آیان ہے بڑا فرمانبردار اور سعادت مند بچہ..... قلی ہو تو ایسا..... مزہ آ گیا.....'' آخر میں تینوں شیطان یک زبان ہو کر بولے ''جیتے رہو بیٹا آیان..... ہم سب کو تم پر فخر ہے.....'' شیخ صاحب اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔ ''ہاں ہاں..... تم سب کو اپنے دوست پر فخر تو ہونا ہی چاہیے..... آج کل کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔'' میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اپنے گروہ کی جانب دیکھا اور شیخ صاحب سے پوچھا ''آپ نے صرف میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے اتنی زحمت کیوں اٹھائی..... مجھے جو ٹھیک لگا وہ میں نے کیا'' لیکن شیخ صاحب اپنی ہی بات پر اڑے رہے اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ وعدہ لے کر واپس پلٹے کہ میں پہلی فرصت میں ان کی طرف حاضری دوں گا۔ میری طرف سے راجہ اور بالے نے بڑے خشوع وخضوع سے انہیں یقین دلایا کہ مجھے شیخ صاحب کی طرف لے کر آنا اب ان کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا وہ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور ہماری آمد کا انتظار اور استقبال کی تیاری کریں۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے دوست نما دشمنوں کی طرف پلٹا ''یہ سب کیا تھا.....؟ تم لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے..... کیا ضرورت تھی ان کے سامنے یہ ساری بکواس کرنے کی.....'' لیکن وہ تینوں میری کوئی بات سنتے تب ناں..... وہ بمشکل اپنے قہقہوں کو روک روک کر مجھے گریدتے رہے ''اچھا انو..... یہ تو بتا یار..... وہ تھی کیسی..... جس نے تجھے قلی کا خطاب دے دیا.....'' ''ہاں بیٹا..... ہم سب سمجھتے ہیں تیری اس ''خدمت خلق'' کو..... بنیئے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔ ضرور..... کچھ نہ کچھ تو کالا ہے دال میں..... سچ بتانا..... کیسی دکھتی تھی وہ اور وہ بڑی والی کیسی تھی.....'' میرا پارہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا۔ آخر کار میں پھٹ پڑا ''کیا بتاؤں کیسی دکھتی تھیں وہ..... دونوں درجن گز بھر ٹینٹ نما برقعوں اور چادروں میں ملبوس تھیں..... آنکھ بھی بس ایک ہی اور بقدرِ ضرورت باہر نکال رکھی تھی..... بس..... ہو گئی تسلی..... یا مزید کچھ بتاؤں.....'' میری بات سنتے ہی ان تینوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی ''کیا..... برقعے میں..... دھت تیرے کی.....'' ہم سب جانتے تھے کہ ہماری زندگیوں میں ایسے کسی ٹشل کاک برقعے والی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے چند روز نتیجہ نکلنے تک ہماری چھٹیاں تھیں لہٰذا میں نے راجہ اور بالے کو سختی سے منع کیا کہ خبردار جو کسی نے مجھے صبح گیارہ بجے سے پہلے جگانے کی کوشش کی، لیکن کچھ خواب ہمیشہ ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میں بھی اگلی صبح جانے کس خواب کی نیلگوں وادی میں بھٹک رہا تھا کہ اچانک میرے خوابوں کے ریزہ گر کی آواز گونجی ''آیان کے بچے چلو اٹھو..... ابا نیچے بلا رہے ہیں تمہیں.....'' میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ریحان کسی منکر نکیر کی طرح میرے سر پر کھڑا میرا کاندھا ہلا کر مجھے جگا رہا تھا۔ ''کیا مصیبت ہے..... چھٹی کے دن بھی ٹھیک سے نیند پوری نہ کرنے دینا کبھی.....''

''تم نیچے چلو..... ابا ساری نیندیں پوری کروائیں گے تمہاری.....''

میں نیچے اترا تو ابا صحن میں یوں بے چینی سے ٹہل رہے تھے جیسے میرا بی اے کا نتیجہ اعلان ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہو گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر ان کی تیوری چڑھ گئی ''یہ وقت ہے تمہارے جاگنے کا۔ دوپہر ہونے کو ہے'' میں چپ رہا۔ ابا نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا ''تمہارے پرچے ختم ہو گئے ہیں۔ اب آگے کیا ارادہ ہے.....؟''

''جی نتیجہ آ جائے..... تو پھر کچھ سوچوں گا.....'' وہ تیزی سے میری جانب مڑے۔

''کیا مطلب..... کیا نتیجہ آنے تک اگلے تین ماہ یونہی سارا دن چارپائی توڑتے رہو گے.....؟..... جانتے ہو جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میں صبح چار بجے اٹھ کر پہلے اخبار بانٹتا تھا اور پھر صبح سے شام تک تین ٹیوشنز پڑھانے جاتا تھا۔ چھٹیاں بھی کبھی ضائع نہیں کی تھیں میں نے.....'' میں نے بے زاری سے ایک لمبی سانس بھری اور برآمدے میں پریشان سی بیٹھیں امی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا کہ وہ مجھے اگلے دو گھنٹے کے بے زار کن لیکچر سے بچائیں۔ لیکن آج وہ بھی بے بس سی نظر آ رہی تھیں۔ آخر پونے گھنٹے کے نصیحت آمیز ''خطاب'' کے بعد ابا نے حکم صادر کر دیا کہ چونکہ ریحان نوکری کی تلاش میں صبح سے شام کرتا ہے لہٰذا گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ میں نے آج تک کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ بہرحال امی اور رافعہ کے اشاروں پر میں خاموش کھڑا رہا۔ مغل اعظم فرمان سنانے کے بعد گھر سے نکل گئے لیکن مجھے ایک نئی آزمائش میں ڈال گئے۔

میری نیند اڑ چکی تھی اور مجھے فوری طور پر اپنی تین کی کابینہ سے مشورے کے لیے کیفے فراق پہنچنا پڑا، لیکن وہاں بھی ریستوران کا خالی ہال میرا منتظر تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے خود ہی تو سب دوستوں کو اپنی نیند میں مداخلت نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے سوچوں میں گم بیٹھا دیکھ کر چچا فراق میری میز کی جانب چلے آئے۔ ''آج وہ باقی تین لفنگے نظر نہیں آ رہے۔ اور میاں..... پورے پونے چار سو کا ادھار چڑھ چکا ہے کھاتے میں..... پیسے کب دو گے.....؟'' میں نے دکھی نظروں سے چچا کو دیکھا ''ایک تو میں پہلے ہی ابا کی وجہ سے اتنا پریشان ہوں اوپر سے آپ بھی میرا جی جلا رہے ہیں۔'' میری رونی شکل دیکھ کر چچا فراق حسب معمول اپنا سارا ادھار بھول گئے۔ ''کیا ہوا..... کیا پھر توقیر احمد نے تمہیں ڈانٹا ہے..... بھئی دنیا بدل گئی لیکن ان کی ہیڈ ماسٹری نہ گئی۔ اچھا چلو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... گرما گرم چائے پیو..... اور میں تمہارے لیے فریش کریم رول بھجواتا ہوں.....'' ایسے ہی تھے ہمارے چچا فراق باہر سے پتھر اور اندر سے ریشم..... بالکل کسی اخروٹ کی طرح۔ کچھ ہی دیر میں میں وہیں بیٹھا چائے اور

فریش رول کے ساتھ اپنا غم غلط کر رہا تھا کہ اچانک باہر..... کچھ ہنگامے کی آوازیں ابھریں۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو کیفے کے منشی مرزا کو تین ہٹے کٹے مشٹنڈے لڑکوں کے ساتھ الجھتے پایا۔ میں لپک کر باہر نکلا تو سب سے آگے والا لڑکا مرزا کے گریبان پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے مرزا کا گریبان چھڑالیا اور مرزا سے پوچھا ''یہ کیا چاہتے ہیں مرزا.....؟'' لیکن مرزا بے چارے کی حالت ایسی تھی کہ اس وقت وہ صرف ہوں ہاں کر کے ہی رہ گیا، لیکن لڑکوں کا سرغنہ شاید ایسی مداخلت کا عادی نہیں تھا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو کر غرایا ''اپنے کام سے کام رکھو..... ورنہ تمہاری بھی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے.....'' میں نے کچھ جواب دیے بنا مرزا کو ایک ہاتھ سے دھکیل کر پیچھے کر دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے..... تو پھر پہلے مجھ سے ہی نبٹ لو..... اس کے بعد وقت بچے تو مرزا کی ہڈیاں بھی گن لینا.....'' ان تینوں کے چہرے زخم کھائے سانڈ کی طرح تن گئے۔ سرغنہ نے میری جانب قدم بڑھایا لیکن تبھی نہ جانے کس طرف سے چچا فراق ہانپتے کانپتے ہمارے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں پانچ سو کے تین نوٹ تھے جو انہوں نے سرغنہ کی جیب میں ڈال دیے اور لڑکے سے بولے

''معاف کرنا شوکت بیٹا۔ ذرا دیر ہو گئی..... دراصل میں تمہارے ہی کام سے ساتھ والے دوکاندار کے پاس گیا تھا۔ چلو اب غصہ تھوک دو۔ آئندہ دیر نہیں ہو گی.....'' لیکن شوکت نامی سرغنہ کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ ''یہ خدائی خدمت گار کون ہے چچا..... کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ یہاں کس کی حکومت چلتی ہے۔'' چچا فراق نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ ''جانے دو شوکت بیٹا..... یہ بھی اپنا ہی بچہ ہے..... اسے ان معاملات کی خبر نہیں ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا'' شوکت کی قہر برساتی نظریں اب بھی مجھ پر ہی گڑی ہوئی تھیں ''تم ہی سمجھا دو تو اچھا ہے..... اور جتنی جلدی سمجھ جائے اتنا ہی بہتر ہے..... ورنہ میں نے سمجھایا تو.....'' اتنے میں شوکت کے پیچھے کھڑے لڑکوں میں سے ایک بولا ''جلدی کر شوکی..... ابھی بڑی وصولی باقی پڑی ہے۔'' شوکت نے آخری بار نظر بھر کے مجھے دیکھا اور زیر لب کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس تمام عرصے میں چچا فراق نے میرا دایاں بازو سختی سے جکڑ کر پکڑے رکھا تھا جیسے انہیں خدشہ ہو کہ میں جذبات میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ ان کے جانے کے بعد میں مرزا کی طرف پلٹا۔ ''یہ کیا ماجرا تھا.....؟..... اور یہ لوگ اس طرح دھمکا کیوں رہے تھے جیسے کوئی پرانا ادھار باقی ہو ان لوگوں کا.....''

چچا نے بات ٹالی ''آیان بیٹا تم ان باتوں میں نہ پڑو۔ ہے کوئی پرانا حساب کتاب ان لوگوں کا..... ایسے لوگوں کے آڑے نہیں آیا کرتے۔ ہاں بھئی مرزا..... تم ذرا میرے ساتھ چلو..... کچھ ضروری حساب کرنا ہے۔ پچھلے ماہ کا.....''

صاف لگ رہا تھا کہ وہ مرزا کو بھی کسی بہانے وہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تاکہ میں اسے نہ کرید سکوں۔ ان دونوں کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی راجہ پارٹی آ پہنچی۔ میں نے کچھ دیر پہلے کا سارا واقعہ انہیں تفصیل کے ساتھ بتایا تو وہ تینوں بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھیک اسی وقت سڑک پر وہی تین لڑکے پرانی سی ویلیز جیپ میں تیزی سے سکریچ لگاتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا ''یہی تین سور ما تھے وہ.....'' بالا ایسے موقعوں پر زیادہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ ''چلو انو..... ان کا پتہ لگاتے ہیں..... ان کی تو.....'' میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ ''ان کا بھی پتہ چل جائے گا۔ پہلے مرزا کو گھیرنا ہو گا اکیلے میں..... کیونکہ چچا فراق کے سامنے وہ کچھ نہیں بتائے گا.....'' اور پھر ٹھیک کیفے بند ہونے کے وقت پر ہم چاروں کاؤنٹر کے سامنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ پیسے گنتے ہوئے مرزا نے ہم چاروں کو یوں ساکت کھڑے دیکھا تو وہ گھبرا سا گیا ''کیوں

بھئی.....کیاارادے ہیں.....؟.....''غشی نے اپنی آواز گھمبیر بناتے ہوئے اسے دھمکایا'' آج کی جتنی بھی کمائی ہے.....نکال کر سامنے کاؤنٹر پر رکھ دو.....'' مرزا گھگھایا۔'' کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرا دل ویسے ہی بڑا کمزور ہے.....'' راجہ بولا'' ٹھیک ہے تو پھر آج جن لڑکوں کو چچا نے پیسے دیے تھے۔ان کا سارا کچا چٹھا بتادو ورنہ آج سے ہم بھی پیسے جمع کرنے کا وہی طریقہ آزمائیں گے.....'' مرزا ان لڑکوں کا ذکر سن کر بدحواس سا ہو گیا اور اس نے جلدی میں دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا۔'' فکر نہ کرو.....فراق چچا گھر جا چکے ہیں.....'' مرزا اب بھی خوف زدہ سا تھا۔'' لیکن اگر مالک کو پتہ چلا کہ میں نے.....''

'' فکر نہ کرو.....انہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا.....'' مرزا نے جلدی جلدی بڑے چھوٹے نوٹ الگ کر کے ان پر ربڑ بینڈ چڑھایا اور تجوری میں رکھ کر ہماری جانب پلٹا۔اس کی آواز اب بھی سرگوشی نما تھی۔

'' وہ تینوں رنگا بھائی کے آدمی تھے۔ ہفتہ اکٹھا کرنے آئے تھے۔'' راجہ نے حیرت سے اسے دیکھا'' رنگا بھائی.....یہ رنگا کون ہے مرزا جی۔'' مرزا نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔'' شش.....آہستہ بولو.....دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔تم لوگ رنگا کو نہیں جانتے.....سارنگا عرف رنگا بھائی۔اس پورے علاقے کا ان داتا ہے وہ.....اس کی مرضی کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی اس ایریا میں.....''

'' کیوں.....وہ اس علاقے کا وزیر ہے کیا.....اور پہلے تو کبھی اس کا نام نہیں سنا ہے ہم نے.....''

'' ارے میاں وزیر خود رنگا بھائی کے گھر کا پانی بھرتے ہیں.....اور پہلے وہ یہاں ہوتا ہی کب تھا جو تم اس کا نام سنتے.....رنگا ایسے چھوٹے شہروں کی بادشاہت قبول نہیں کرتا۔ جانے کیا بات ہے جو اس مرتبہ وہ یہاں آ کر ٹک گیا ہے۔'' ہم سب حیرت سے مرزا کی طرف دیکھ رہے تھے جو سارنگا کا تعارف یوں کروا رہا تھا جیسے وہ کوئی دیومالائی کردار ہو مجھ سے رہا نہیں گیا'' لیکن اگر وہ ایسا ہی کوئی لاٹ صاحب ہے تو اس کے کارندے گلی گلی دوکان دوکان یہ چندہ کیوں اکٹھا کرتے پھرتے ہیں.....؟'' مرزا نے اپنا سر کھجایا'' اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانے.....اور پھر کسے پتہ کہ یہ ہفتہ وصولی سارنگا کے ہی حکم سے ہوتی ہو یا پھر یہ لونڈے لپاڑے اس کے نام پر یہ بدمعاشی کرتے ہوں بہرحال.....ایک بات تو طے ہے کہ جو بھی یہ ہفتہ دیتا ہے پھر علاقے کے باقی تمام غنڈوں، چوراچکوں بشمول پولیس.....کوئی بھی ہفتہ دینے والے دوکاندار پر بری نظر نہیں ڈال سکتا.....پھر وہ بندہ سارنگا کی ذمہ داری بن جاتا ہے.....'' راجہ جو بہت دیر سے یہ ساری کہانی برداشت کر رہا تھا بے زار ہو کر بولا'' مجھے تو یہ سب کسی انتہائی پٹی ہوئی اور بوگس فلم کا پاٹ لگتا ہے۔ یہ رابن Robin Hud ٹائپ کردار آج کل کہیں نہیں پائے جاتے اور مرزا جی.....تم یہ ہفتہ اگر ہم چاروں کو باقاعدگی سے ادا کرو تو آج سے کیفے فراق اور تمہاری جان کی ذمہ داری ہماری.....کسی کی کیا مجال جو اس کینے کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ سکے.....''

مرزا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔'' تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ بھتہ نہ دینے والوں کے گھر اور کاروبار تباہ ہوتے دیکھے ہیں۔ خدا کے لیے اس ساری بات کا ذکر مالک سے ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میری خیر نہیں.....''

مرزا ہمیں گہری سوچ میں گم چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ شہر کی بتیاں بجھ چلی تھیں اور صرف سڑکوں کے کنارے لگی زرد بتیوں کی روشنی آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم چاروں کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی لیکن ہم چاروں میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہی ایک بات

ہماری زندگیوں کا رخ پلٹنے والی تھی۔

اگلی صبح راجہ میرے جاگنے سے پہلے ہی گلی میں موجود تھا۔ میں نے اسے چھت سے وہیں اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ راجہ ساری معلومات لے کر آیا تھا۔ ہفتہ لینے والے لڑکے ہر جمعرات کو ہمارے محلے کے اطراف اسی پرانے ماڈل کی ویلیز جیپ میں آتے تھے۔

ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اگلے ہفتے ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اور راجہ سر جوڑے اپنی منصوبہ بندی میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ ہمیں ریحان کے چھت پر آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس نے ہمیں یوں سرگوشیاں کرتے دیکھا تو مشکوک سا ہو گیا۔ ''یہ تم دونوں کون سے منصوبے کی کڑیاں جوڑ رہے ہو..... آیان خدا کے لیے اب مزید کوئی کارنامہ نہ کر بیٹھنا۔ ابا پہلے ہی تم سے بہت ناراض ہیں..... اس بار وہ تمہاری کوئی غلطی معاف نہیں کریں گے.....'' میں نے ریحان کی بات حسب معمول ہوا میں اڑا دی..... ''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے..... اب تم میرے ابا ثانی بننے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے پتہ ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط.....'' اتنے میں نیچے گلی میں بالے کی پھٹ پھٹی کا سائیلنسر گونجا اور میں اور راجہ ریحان کے منع کرنے کے باوجود چھت سے ملحق گلی میں اترتے پائپ سے لٹکتے ہوئے گلی میں کود گئے۔ یہ ہمارا خاص شارٹ کٹ تھا۔ بالے اور منشی نے بھی اپنا کام نپٹا لیا تھا۔ بالے نے خبر دی ''سب پتہ چل گیا ہے..... وہ ہفتہ لینے کی ابتداء سادات محلے کی چوڑی گلی سے کرتے ہیں..... کل ستر دو دکاندار بھتہ دیتے ہیں انہیں وہاں.....''

''ٹھیک ہے..... تو پھر ہمیں ایک مرتبہ سادات محلے کی چوڑی گلی کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ بغور لینا ہوگا تاکہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ ان سور ماؤں کو کہاں روکنا ہے۔'' میری بات پر سبھی نے سر ہلائے اور کچھ دیر بعد ہی ہم سادات محلے کی چوڑی گلی سے منسلک گلیوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔ تیسری گلی جہاں بھتہ دینے والا صرف ایک دوکاندار تھا، نسبتاً کچھ سنسان تھی۔ ہم نے سارنگا کے غنڈوں کو روکنے کے لیے یہی گلی منتخب کر لی۔ ابھی ہم دیگر جزئیات طے کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا۔ ''واہ آیان صاحب..... بڑی راہ دکھائی آپ نے..... لگتا ہے وعدہ کر کے بھول گئے.....'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے تنویر کا مسکراتا چہرہ تھا۔ ''ماموں روزانہ آپ کا انتظار کرتے ہیں..... لگتا ہے آپ نے ہماری خطا ابھی تک معاف نہیں کی.....''

''نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... بس امتحانات کی مصروفیت میں الجھے رہے ہم سب''۔

''ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو آپ ابھی اسی وقت میرے ساتھ گھر چلیں ماموں کو پتہ چلا کہ آپ سادات محلے تک آ کر واپس لوٹ گئے ہیں تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے.....'' میں نے تنویر کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن لگتا تھا وہ مجھے ساتھ لے جائے بنا نہیں جائے گا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اشارتاً اپنا کام جاری رکھنے کا کہا اور خود تنویر کے ساتھ چل پڑا۔ تنویر مجھے چند لمحوں کے لیے دروازے کے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر گھر کے اندر گیا اور دوسرے ہی لمحے شیخ صاحب لپکتے جھپکتے دروازے سے برآمد ہوئے اور گلے شکوے کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئے۔ کچے صحن والا چھوٹا سا صاف ستھرا کوارٹر تھا۔ جس میں چاروں جانب پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سرخ، پیلے اور سفید گلاب خوبصورتی سے ترشی ہوئی باڑھ میں ٹنگے ہوئے تھے۔ برآمدے کو سبز رنگ کی جافری سے بند کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب مجھے نفاست سے بنی ایک چھوٹی سے بیٹھک میں لے آئے۔ ''کیا میاں..... لگتا ہے تم بھول گئے شیخ کبیر کو.....'' شیخ صاحب کافی دیر اپنے دکھڑے سناتے رہے۔ انہی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ

اپنے اکلوتے بیٹے حمید کو نور پور اپنی بچی کھچی متاع کے حساب کتاب کے لیے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں وہ اپنی گھر والی اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ آئے تھے۔ چھوٹی بیٹی گہنا کا نام تو میں سن چکا تھا۔ البتہ بڑی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب کی آواز کچھ بھرا سی گئی ''بڑی کا نام ستارہ ہے میاں..... لیکن نصیب کے معاملے میں اس کا تارہ بہت سیاہ نکلا۔ شادی کے تیسرے ماہ ہی شوہر ایک حادثے میں چل بسا، اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ خدا کسی کی بیٹی کو کبھی بیوہ نہ کرے۔'' ماحول سوگوار سا ہو گیا۔ شیخ صاحب مجھ سے معذرت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ تنویر شاید پہلے ہی چائے کے لوازمات وغیرہ کے سلسلے میں زنانے میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ مجھے وہاں سے نکلنے کی جلدی تھی کیونکہ باہر میرے دوست میری راہ تک رہے تھے۔ اچانک درمیانی دروازے کی جانب سے کچھ آہٹ بلند ہوئی، اور کسی کی شرارت بھری کھنکتی آواز گونجی۔

''اوہ..... تو وہ والے آپا ن صاحب تشریف لائے ہیں..... جو قلی نہیں ہیں.....''

میں چونک کر پلٹا۔

باب4

دروازے پر پڑے پردے کی آڑ میں ضرور چھوٹی والی گہنا ہی تھی۔ کیونکہ بڑی والی کی تو میں نے کبھی آواز تک نکلتے نہ سنی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''جی..... فرمایئے..... مزید کچھ سامان ڈھونا ہو تو میں حاضر ہوں.....'' دوسری جانب سے بے اختیار دبی دبی ہنسی کی آواز ابھری۔

''نہیں..... فی الحال تو ایسی کوئی ضرورت نہیں..... البتہ جب کبھی مزدوری کا کچھ کام آن پڑا تو آپ کو زحمت ضرور دیں گے.....''

پردے کے پیچھے مزید کچھ کھسر پھسر ہوئی جیسے کوئی اور بھی وہاں موجود ہو اور وہ گہنا کو دبی آواز میں سرزنش کر رہا ہو۔ پھر گہنا کی ہی آواز آئی۔

''آپی آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں.....''

گویا گہنا سے بڑی ستارہ بھی وہیں موجود تھی۔ چند لمحے سکوت کے گزرے اور پھر قدرے گھبرائی سی آواز سنائی دی۔

''ہم سب آپ سے اس روز کے رویے کی معذرت چاہتے ہیں..... گہنا کی زبان کو لگام نہیں ہے۔ ابا کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے، لیکن امی گہنا کی اس رات کی حرکت پر بہت نادم ہیں.....''

''آپ لوگ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ بات تو اسی رات ختم ہو گئی تھی۔ رہی بات گہنا کی تو میں ایسی ''نادان بچیوں'' کی بات کا برا نہیں منایا کرتا۔ اپنی امی سے کہیں دل پر بوجھ نہ لیں۔''

میری ''نادان بچی'' والی اصطلاح پر اندر شاید گہنا پر کچھ چوٹ ہو گئی، تبھی وہ ایک دم بولی ''میں نادان بچی نہیں ہوں..... تھرڈ ائیر میں پڑھتی ہوں..... سمجھے آپ..... اور مجھے بالکل پسند نہیں کہ ابا یا کوئی اور مجھے نادان بچی کہے.....'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تیر نشانے پر لگا تھا۔ اتنے میں بیرونی دروازے پر برتنوں کی آہٹ ہوئی اور شیخ صاحب تنویر کے ساتھ چائے کی ٹرے اور کیک، بسکٹ وغیرہ لیے اندر داخل ہوئے۔ درمیانی کمرے کے پردے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔ چائے کے دوران شیخ صاحب کے دل میں چھپا سوال زبان پر آ ہی گیا۔

''آیان بیٹا..... ایک بات کی سمجھ نہیں آئی..... تمہارا اپنا گھر خدا کے فضل سے قائم و سلامت ہے..... تو پھر اس رات تم وہاں اس ہوٹل کے باہر برستی بارش میں فٹ پاتھ پر کیوں سو رہے تھے؟''

''اس لیے کہ میرے ابا نے اس رات مجھے گھر بدر ہونے کا حکم دے دیا تھا.....'' شیخ صاحب شاید ایسے کسی جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے لہٰذا اچھل ہی پڑے ''کیا مطلب.....؟ یعنی کہ..... لیکن کیوں.....؟ بھئی تم تو بڑے فرمانبردار بچے ہو.....''

''شکریہ..... لیکن میرے ابا کے خیالات آپ سے کافی مختلف ہیں.....'' میں نے بنا کچھ چھپائے تفصیل سے شیخ صاحب کو اس رات کی تمام روداد بتا دی۔ تنویر اور شیخ کبیر حیرت سے سنتے رہے۔ پھر شیخ صاحب نے ہی بات جوڑی۔ ''مجھے تمہاری صاف گوئی بہت اچھی لگی۔ ماں باپ کا اپنی اولاد کے لیے فکر مند ہونا بھی ایک معمول کی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب تم کسی مقام پر پہنچ کر دکھاؤ گے تو تمہارے یہی ابا فخر سے لوگوں کو

تمہارے بارے میں بتایا کریں گے۔'' تنویر نے مجھے بتایا کہ وہ مقامی ہائی سکول میں تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا ہے اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی دیتا ہے۔ اس نے مجھے بھی پیش کش کی کہ اگر میں کچھ پیسے کمانا چاہوں تو وہ میرے لیے کوئی ٹیوشن ڈھونڈ سکتا ہے۔ بلکہ اسے ان دنوں بھی اپنے کسی جاننے والے کی خواہش پر کوئی استاد درکار تھا۔ میں نے تنویر کو بتایا کہ میری پڑھائی لکھائی سے کچھ خاص نہیں ہاں البتہ اگر اردو کے لیے کوئی ٹیوشن درکار ہو تو شاید میں پڑھا سکوں۔

میری بات سن کر تنویر کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''بہت خوب..... پھر تو سمجھو کام بن گیا۔ بارہویں جماعت کی ایک طالبہ کے لیے اردو کا استاد درکار ہے۔ مہینے کے دو ہزار ملیں گے۔ شاید کچھ زیادہ بھی طے ہو جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو اس طالبہ کے گھر جانا ہوگا۔ سواری کا انتظام بھی وہ لوگ خود ہی کریں گے.....'' مجھے اپنے ابا کی آخری وارننگ یاد آئی اور میں نے ہامی بھر لی۔ تنویر نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز ہی میری ٹیوشن پکی کروا دے گا۔ مجھے اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹے کی قربانی دینا تھی، لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے عمر قید کی سزا سنائی جا رہی ہو۔ پابندی بھی تو ایک قید ہی ہوتی ہے بلکہ شاید خود کو پابند کرنا قید سے بھی بڑی قید ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی کا فلسفہ اور سزا و جزا کا تمام تصور ایک اسی ''پابندی'' کے محور کے گرد ہی تو گھومتا ہے۔

کافی دیر بعد مجھے شیخ صاحب نے صرف اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ میں اب ان کے ہاں آتا جاتا رہوں گا۔ میں رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو درمیانی کمرے کے پردے کے پیچھے سے کسی خاتون کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ شیخ صاحب بے تکلفی سے بولے ''آ جائیں شیخانی جی..... آیان بھی تنویر کی طرح اپنا ہی بچہ ہے۔'' پردے کے پیچھے سے شیخ صاحب کی گھر والی برآمد ہوئیں۔ آج وہ صرف ایک بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ انہوں نے میرے سلام کے جواب میں آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں اور چلتے وقت خواہش ظاہر کی کہ وہ اور ان کی بچیاں اس نئے ماحول میں کسی اپنے اور شناسا چہرے کی رفاقت کے بغیر اداس سے ہو گئے ہیں لہٰذا میں اپنے گھر کی خواتین کو لے کر ضرور ان کے ہاں آؤں۔ میں نے انہیں امی اور چھوٹی رافعہ کے بارے میں بتایا اور انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

جب میں شیخ صاحب کے گھر سے باہر نکلا تو وہ تینوں اسی گلی کی نکڑ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ رابعہ سے رہا نہ گیا ''خیر تو تھی..... بڑی دیر لگا دی ہم تو سمجھے تھے کہ شیخ صاحب نے تمہیں گھر داماد ہی سونپ دی ہے.....''

''بکو مت..... یہ بتاؤ سارا آگا پیچھا دیکھ لیا ہے.....؟''

''ہاں..... چاروں اطراف کا جائزہ لے لیا ہے ہم نے..... لیکن یار انو..... ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ان کے سامنے نہیں آؤ گے۔ کیونکہ وہ تمہیں پہلے دیکھ چکے ہیں اور ہم اپنے محلے سے اتنی دور انہیں اسی لیے روک رہے ہیں کہ وہ اس معاملے کا کوئی بھی سرا کینے فراق سے نہ جوڑ سکیں۔ بلکہ ہم تینوں بھی چہرے چھپا کر ان کا راستہ روکیں گے.....

مشی لڑائی جھگڑے سے ذرہ کتراتا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے ''لیکن یار کیا انہیں بھتہ لینے سے روکنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری ہے..... ہم لوگ ویسے ہی ان سے جا کر بات کیوں نہیں کر لیتے.....''

''دھت تیرے کی.....'' راجہ نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی۔

''اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری اس درخواست پر کہ جناب عالی براہ مہربانی آپ ہمارے علاقے سے آئندہ اگر بھتہ اکٹھا نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی.....وہ مسکرا کر کہیں گے کہ عالی حضور.....آپ لوگوں نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں.....آج کے بعد اگر ہم آپ کے علاقے میں قدم دھریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری.....'' مجھے راجہ کے انداز پر ہنسی آگئی۔ بالے نے بڑے بزرگوں کی طرح مشی کو سمجھایا۔

''مشی بیٹا.....وہ چھٹے ہوئے غنڈے ہیں.....بات بے بات چاقو چلا دینے والے.....ان سے ہمیں ان کی زبان میں ہی بات کرنا ہوگی.....اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو اس روز تم آرام سے گھر میں بیٹھ کر اپنی امی کے ہاتھ کی بنائی بریانی کھانا اور ہمیں یاد کرنا.....'' مشی کی امی بریانی بہت اچھی بناتی تھیں لیکن مشی کی یہی کمزوری اس کی چڑ بھی تھی۔ وہ بھنا کر بولا ''ڈرتی ہے میری جوتی.....جو ہوگا دیکھا جائے گا.....'' بالے اور راجہ نے نظر بچا کر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ ان کا مقصد حل ہو چکا تھا۔

میں گھر پہنچا تو امی اور رافعہ، ریحان سمیت صحن میں ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ امی نے مجھے ڈانٹا ''انو.....تو یہ سارا دن گھر سے باہر کہاں بھٹکتا پھرتا ہے.....کبھی دو گھڑی ماں کے ساتھ بھی بیٹھ جایا کر.....جا رافعہ.....بھائی کے لیے گرم چائے لے آ.....'' میں نے ریحان سے پرانا بدلہ چکایا ''امی.....آپ کے پاس آپ کی یہ بڑی بیٹی ریحانہ جو ہر وقت موجود رہتی ہے.....ایسے میں بھلا آپ کو آیان کی کیا ضرورت.....'' امی مسکرائیں۔ ریحان کو غصہ آگیا۔ ''ہاں ہاں بیٹا.....اڑا لو مذاق.....کم از کم گھر میں رہ کر ابا کا گھر کے کسی کام میں ہاتھ تو بٹاتا ہوں ناں.....تمہاری طرح تو نہیں ہوں.....گھر کا نہ گھاٹ کا.....''

''فکر نہ کرو ریحان میاں.....اب تمہارے اس طعنے کا بھی توڑ کر لیا ہے ہم نے.....آیان احمد کو ایک ٹیوشن مل گئی ہے.....مبلغ دو ہزار روپے کی.....کبھی کتاب وتاب خریدنے کے لیے پیسے ویسے چاہئے ہوں تو مانگ لینا.....آیان منگتوں کو منع نہیں کیا کرتا.....اب بولو.....کون ہوا گھر کا نہ گھاٹ کا.....ہاں.....'' امی خوشی کے مارے کھڑی ہو گئیں۔ ''سچ.....انو سچ بتا.....کہیں تو بڑے بھائی کے ساتھ دل لگی تو نہیں کر رہا.....'' رافعہ کے ہاتھ میں بھی گرم چائے کا کپ چھلک سا گیا۔

''سچ بھائی.....آپ ٹیوشن پڑھانے جایا کریں گے.....واہ.....کتنا اچھا لگے گا ابا کو یہ سن کر.....''

ریحان کو ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔ ''ٹیوشن.....لیکن کہاں.....اور مضمون کیا ہوگا ٹیوشن کا.....'' میں نے گول مول لفظوں میں بتایا کہ میرے کوئی جاننے والے ہیں جنہوں نے اردو ٹیوشن کا بندوبست کروایا ہے، اور ایک آدھ دن میں باقی تفصیلات بھی طے ہو جائیں گی۔ پل بھر میں گھر کے اندر عید کا سماں ہو گیا۔ ان سب کے لیے یہ خبر کسی عید کے چاند کی نوید سے کم نہیں تھی کہ بقول ابا دنیا جہاں کے ناکارہ آیان نے بھی آخر کار کوئی کام کرنے کی ہامی بھر ہی لی تھی۔ امی کو فوراً فکر لگ گئی کہ ان کا ہونہار سپوت کل کون سے کپڑے پہن کر ٹیوشن پڑھانے جائے گا۔ انہوں نے فوراً چھوٹی کو میرے سبھی کرتے استری کرنے کا حکم دے دیا۔ ریحان میری بڑھی ہوئی شیو دیکھ کر چلایا ''خدا کے لیے اب تو اپنا یہ حالت سدھار لو۔ چھوٹی جلدی سے بھاگ کر میری دراز سے نیا ریزر اور شیونگ کریم لے آؤ۔ آج ہم سب مل کر اس کی شیو کریں گے.....ایسے تو یہ مانے گا نہیں.....'' وہ آفت کی

پر کالہ بھی جیسے ریحان کی طرف سے اشارے کی منتظر تھی۔ اگلے ہی لمحے ریحان مجھے جکڑ چکا تھا اور رافعہ اندر سے شیو کا سامان لیے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ امی ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں اور ان دونوں نے میرا چہرہ جھاگ سے بھر دیا۔ میں چلاتا رہا کہ ہلکی بڑی ہوئی شیو میں میں کچھ زیادہ سنجیدہ استاد لگوں گا پر وہاں کوئی میری سنتا تب ناں..... ایک لمحے کے لیے ریحان کی گرفت مجھ پر کم زور ہوئی تو میں زور لگا کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ چھوٹی ہاتھ میں شیونگ کٹ اور برش اور ریحان ریزر تھامے میرے پیچھے پیچھے گول دائرے میں بھاگ رہے تھے اور میں امی کو درمیان میں آڑ بنا کر پورے صحن میں ان سے بچنے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہم سب چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے ہنس رہے تھے اور امی اپنی ہنسی چھپا کر ہم سب کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اچانک صحن کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ابا کی دھاڑ گونجی "یہ سب کیا ہڑبونگ مچا رکھی ہے تم لوگوں نے.....؟"

ہم سب ابا کی آواز سن کر یوں جامد ہو گئے جیسے کسی نے ریموٹ کنٹرول سے ساکت کا بٹن دبا دیا ہو۔ ابا نے اپنی چھتری بوکھلائی سی امی کے حوالے کی اور پھر گرجے "گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا ہے..... ریحان..... کم از کم تم سے مجھے ایسی امید نہیں تھی....." گویا مجھ سے تو ابا نے کبھی کوئی اچھی امید باندھی ہی نہیں تھی۔ چھوٹی نے جلدی سے ابا کی شیروانی سنبھالی "ابا پتہ ہے آیان بھیا کو دو ہزار روپے کی ٹیوشن مل گئی ہے....." ابا کو شاید زندگی میں پہلی بار میری جانب سے کوئی خوشی کا جھٹکا لگا "کیا.....؟؟" امی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا "میرا انواب ذمہ دار ہوتا جا رہا ہے....." شاید یہ میرا وہم ہی ہو، پر جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ ابا کی آنکھوں میں کچھ نمی سی جھلملائی ہو، اور پھر وہ ہوا جو بچپن کے بعد آج تک کبھی میرے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی "جیتے رہو....." پھر وہ صحن میں رکے بنا اندر چلے گئے۔ اچھا ہی ہوا ورنہ شاید کچھ ہی دیر میں سب ہی وہاں رو پڑتے اور پھر دوسرے لمحے ہی ان کی اندر کمرے سے جھلائی ہوئی تیز آواز آئی..... "ارے بھئی..... یہ میرے سلیپر پھر کون پہن گیا..... کتنی بار منع کیا ہے اس نالائق آیان کو کہ میرے چپل نہ پہنا کرے....." امی، ریحان اور چھوٹی تینوں کی نظر بیک وقت میرے پیروں کی جانب اٹھی اور میں ابا کے چپل وہیں صحن میں اتار کر ننگے پاؤں چھت کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ کاش اس وقت خبر ہوتی کہ ان مسکراہٹوں کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے تو میں وقت کو روک دیتا..... لیکن وقت بھلا کسی کے روکے سے کب رکا ہے۔

اگلے روز تنویر سے طے کردہ وقت پر میں کیفے فراق پہنچا تو میری چنڈال چوکڑی بھی وہیں موجود تھی۔ راجہ نے مجھے دیکھ کر سیٹی بجائی۔ بالے نے اٹھ کر چاروں طرف طواف کر کے مجھے غور سے دیکھا اور منشی نے شکوہ کیا "یارا نو..... تو نے شادی کر لی اور ہمیں بتایا بھی نہیں....." میں نے اسے گھورا "ہوش میں تو ہو..... میں نے کب شادی کی.....؟" راجہ نے ہونٹ سکیڑے "یہ چمچاتی شیو..... یہ لشکارے مارتا نیا کرتہ..... یہ ریحان کی واسکٹ..... ہم تمہیں دولہا نہ کہیں تو کیا کہیں....."

"بکو مت..... مجھے آج ٹیوشن پڑھانے جانا ہے دعا کرو سب ٹھیک رہے..... زندگی میں پہلی مرتبہ آج ابا مجھے ریحان کی طرح رخصت کرنے صحن تک آئے تھے....." ان تینوں نے باقاعدہ دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ ٹھیک اسی لمحے ان تینوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے پس منظر میں مجھے تنویر کیفے فراق کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ جس گھر میں مجھے ٹیوشن پڑھانے

جانا ہے وہاں کا ڈرائیور مجھے لینے آچکا ہے اور اب روزانہ وہ یہیں کیفے فراق سے ٹھیک چار بجے شام مجھے لینے پہنچ جائے گا اور دو گھنٹے کی ٹیوشن کے بعد یہیں چھوڑ جایا کرے گا۔ تنویر کو خود کسی کام سے کہیں جانا تھا لہٰذا مجھے اکیلے ہی یہ سفر طے کرنا تھا۔ میرے تینوں دوستوں نے مجھے یوں رخصت کیا جیسے کسی محاذ پر جا رہا ہوں، اور سچی بات یہ ہے کہ خود میرے لیے یہ سب کچھ کسی محاذ جیسا ہی تھا۔ کیونکہ ہم چاروں میں سے کسی نے آج تک کوئی بھی کام تنہا شروع نہیں کیا تھا۔

درمیانے ماڈل کی بڑی سی کار کی چاروں کھڑکیوں پر سفید پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مطلب اس گھر کی خواتین پردہ کرتی تھیں۔ ڈرائیور کچی عمر لیکن مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ پوچھنے پر نام اسماعیل بتایا۔ کچھ خاموش سا تھا یا پھر اجنبیوں سے زیادہ بے تکلفی پر پابندی تھی۔ میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں اس نے بس اتنا ہی بتایا کہ شہر کے کوئی بہت بڑے بیوپاری ہیں سیٹھ داؤد..... انہی کی صاحبزادی کو پڑھانا ہے۔ دو ہزار روپے تنویر کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی میری جیب میں ڈال چکا تھا۔ گاڑی شہر کی بھیڑ سے نکل کر مضافاتی سڑک پر مڑ گئی اور تقریباً بیس منٹ کی سواری کے بعد ہم ایک کوٹھی نما بنگلے میں داخلے ہو گئے۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ اس عمارت کے گرد ان دیکھی، لیکن کڑی نگرانی کا حصار ہے۔ دربان بھی نہایت چاک و چوبند اور عام نوکر بھی غیر معمولی طور پر نظریں کھلی رکھنے والے دکھائی دیے۔ مجھے ایک کشادہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا جس کی چار اطراف کی کھلی کھڑکیوں سے آخر ستمبر کی شام کی نرم دھوپ اور خوشگوار ہوا کے جھونکے، ملائم ریشمی پردوں سے چھن کر میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایک اماں بی اپنے پاندان اور ایک سہمی ہوئی سی لڑکی کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا تو انہوں نے کڑی نظر سے گھورتے ہوئے مجھے دعا دی، اور بولیں ''نام کیا ہے تمہارا.....''

''آیان.....''

''پہلے بھی کہیں ٹیوشن پڑھائی ہے.....'' ''نہیں..... پہلا تجربہ ہے۔'' انہوں نے لمبی ہوں کی ''ہونہہ..... کتنا پڑھا ہے تم نے.....''

''جی ابھی چند دن پہلے بی اے کا آخری پرچہ دیا ہے..... نتیجہ نہیں آیا ابھی تک.....'' وہ چونکیں ''مطلب ابھی چودھویں پاس بھی نہیں ہو.....؟.....'' میں نے ایک لمبی سانس بھری ''جی نہیں..... فی الحال تو نہیں.....''

''اور اگر فیل ہو گئے تو.....''۔

''تو پھر دوبارہ امتحان میں بیٹھوں گا..... یونیورسٹی تین مواقع دیتی ہے..... پھر بھی کامیاب نہ ہو سکا تو صرف بارھویں پاس ہی کہلاؤں گا۔'' میری اکتاہٹ پر وہ کچھ سٹ پٹا سی گئیں ''لیکن اس طرح تو.....'' مگر اس بار لڑکی نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

''اوہو..... بوا..... آپ بھی کمال کرتی ہیں..... انہیں دم تو لینے دیں..... آپ نے تو آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی..... سر آپ بیٹھ جائیں آرام سے..... میرا نام ناہید ہے..... میں ہی آپ کی شاگرد ہوں..... کانونٹ سے بارھویں کا امتحان دوں گی دو ماہ بعد.....'' میں نے شکر ادا کیا کہ بڑی بی کے انٹرویو سے جان چھوٹی، لیکن وہ دو گھنٹے مسلسل وہیں ڈرائنگ روم میں موجود رہیں اور چھالیہ کتر کتر کے پان بناتی رہیں..... بیچ میں دو بار پر تکلف لوازمات کے ساتھ چائے کی ٹرالی بھی آئی۔ پہلے دن میں نے ناہید کو صرف ابتدائی باتیں بتائیں اور اپنی سمجھ کے مطابق اسے ایک

شیڈول بھی بنا کر دے دیا کہ ہم اگلے دو ماہ امتحان شروع ہونے تک اس ترتیب سے چلیں گے۔ میں نے ناہید کو یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ چونکہ مجھے ٹیوشن پڑھانے کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے اس لیے اگر وہ درمیان میں کہیں بھی محسوس کرے کہ میں اسے ٹھیک طرح سے مضمون سمجھا نہیں پا رہا ہوں تو وہ بلا تکلف مجھے بتا دے اور اپنے لیے کسی نئے استاد کا انتظام کر لے۔ میں نے وہ دو ہزار روپے بھی ہوا کی ہتھیلی پر رکھ دیے کہ مہینہ ختم ہونے پر اگر وہ مطمئن ہوں تب ہی یہ رقم وہ میرے حوالے کریں۔ بوا نہ نہ ہی کرتی رہ گئیں اور میں پہلے دن کی ٹیوشن ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ اب یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ چار بجے اسماعیل گاڑی لے کر کیفے فراق آ جاتا اور ساڑھے چھ بجے مجھے چھوڑ جاتا۔ ناہید کافی ذہین طالبہ ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ کوئی بات بتانے کے بعد اسے دوبارہ کبھی وہ سبق دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی انگریزی میڈیم بورڈنگز میں پڑھتی رہی ہے اس لیے اس کی بنیادی اردو کچھ کم زور رہ گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی ناہید کے خاندان میں سے کوئی دوسرا فرد اس گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میرے لیے اردو پڑھانا بذات خود ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ اور میں ناہید کو پڑھاتے پڑھاتے خود بھی کافی کچھ سیکھ رہا تھا۔

یوں ہی چھ دن گزرے اور آخر اگلی جمعرات بھی آ گئی۔ ہم چاروں صبح سویرے سادات محلے کی چوڑی گلی کے علاقے میں پہنچ گئے۔ منصوبے کے مطابق راجہ، بالے اور منشی کو بھتہ لینے والے لڑکوں کو کسی سنسان مقام پر روک کر للکارنا تھا اور بات بڑھنے کی صورت میں مجھے پیچھے سے ان کی مدد کو آنا تھا۔ وہ تینوں گلی کے نکڑ پر اور میں گلی کی دوسری جانب ایک چوڑی والے کے ٹھیلے کے عقب میں موجود تھا۔ وقت سرک سرک کے گزر رہا تھا، اور پھر اچانک میں نے چوڑی گلی میں وہی پرانے ماڈل کی ویلیز جیپ داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ آج جیپ کوئی نیا لڑکا چلا رہا تھا..... لیکن اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکوں میں شوکی اور تیسرا لڑکا اسی دن والے تھے۔ شوکی نے جیپ سے اتر کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑی۔ مجھے لگا جیسے شوکی کی نظر مجھ سے ٹکرائی ہے۔

.....❁.....

باب5

لیکن وہ میرا وہم تھا۔شوکی نہ جانے کس خیال میں خلا میں گھورتا رہا اور پھر اپنے ہی دھیان میں پلٹ گیا۔ باقی دو لڑکے جیپ سے اترے اور اندر دوکان کی جانب بڑھ گئے۔ راجہ پارٹی یہاں سے کچھ دور گلی کے نکڑ پر جیپ کی روانگی کا انتظار کر رہی تھی اور میں یہاں سے انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، جانے ان دو لڑکوں نے دوکان سے نکلنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی تھی، اور پھر اچانک ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور وہ دونوں لڑکے شور مچاتے، گالیاں بکتے کسی شخص کو دھکے دیتے اور مارتے پیٹتے دوکان سے باہر نکل آئے۔ کچھ لمحوں کے لیے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور پھر جب اچانک میری نظر زیر عتاب شخص پر پڑی تو میرے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ وہ شیخ صاحب تھے لیکن ان کا مکان تو چوڑی گلی کے عقب والی گلی میں تھا، تو پھر وہ یہاں.....؟ کیسے؟.....لیکن یہ سب کچھ سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا میرے پاس.....میں تیزی سے ان لڑکوں کی طرف دوڑا جو شیخ صاحب کو گھسیٹتے ہوئے شوکی کی جانب لے جا رہے تھے۔ میری زوردار ٹکر سے شیخ صاحب کا گریبان ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ایک لڑکا دور جا گرا۔ یہ ان تینوں کے لیے ضرور کوئی نیا تجربہ رہا ہوگا کیونکہ آج تک وہ دوسروں کو ہی گراتے آئے تھے۔شوکی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ زور سے چلایا ''یہ تو وہی ہے.....کیفے فراق والا.....آج اس کا دماغ بھی درست کیے دیتے ہیں۔'' گرنے والا لڑکا بھی اب تک سنبھل چکا تھا شوکی کے اشارے پر ان دونوں نے میرے دونوں بازو جکڑ کر پیچھے موڑ دیے اور شوکی مغلظات بکتا میری جانب لپکا، لیکن وہ یہ بھول گیا کہ میرے ہاتھ بندھے ہیں پاؤں نہیں.....دوسرے ہی لمحے شوکی میری ضرب سے چلاتا ہوا پیچھے جا گرا۔اس عرصے میں ہمارے آس پاس کافی بھیڑ اکٹھی ہو چکی تھی لیکن کسی نے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔ شیخ صاحب ہی ادھر اُدھر بھاگ کر لوگوں کی اور ان تینوں کی منت سماجت کرتے رہے.....اب تک شوکی کو یہ بات سمجھ میں آ چکی تھی کہ میں اس کے لیے کوئی سیدھی کھیر ثابت ہونے والا نہیں ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے اور میرے دوستوں نے ایسی لڑائیوں میں درجنوں بار سر پھوڑے تھے تو خود اپنے ہاتھ بھی کھلوائے تھے اور بعد میں گھر جا کر ابا کی لاٹھیاں الگ کھائی تھیں۔ چند یادگاری نشان تو اب تک میری پیٹھ پر جگمگا رہے تھے۔شوکی نے اس بار کوئی جلد بازی نہیں کی اور اپنے نیفے سے چاقو نکال کر خاص فلمی انداز میں یکے بعد دیگرے اس کی گراریاں کھولیں شاید شکار کو مارنے سے پہلے دہشت زدہ کرنے کا اس کا کوئی خاص انداز تھا۔لڑکوں نے مجھے مزید جکڑ کر پکڑ لیا اور شوکی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مہارت سے چاقو منتقل کرتے ہوئے میری جانب بڑھنے لگا۔شیخ صاحب حواس باختہ ہو کر ہجوم سے مدد طلب کرنے لگے لیکن وہاں ایسا کون تھا جو ہمارے بیچ پڑتا.....دفعتہً بھیڑ میں ہل چل سی ہوئی اور راجہ، بالا اور منشی چیختے چلاتے اندر گھس آئے۔ شاید انہیں نکڑ پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ کوئی لڑکا بھتہ لینے والوں سے بھڑ گیا ہے۔شوکی اس صورتحال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ راجہ اور بالے نے آتے ہی شوکی کو گرا دیا اور اس پر چڑھ بیٹھے۔ منشی نے میرا ایک بازو چھڑوایا تو باقی دو بھی ہمارے نشانے پر آ گئے۔اب ہم چار تھے اور وہ تین، اور ہم نے دو ہفتوں سے جو فٹ بال میچ کی پریکٹس چھوڑ رکھی تھی، وہ ساری کی ساری ان تینوں پر پوری کر لی۔ پھر شیخ صاحب نے ہی درمیان

میں پڑ کر بیچ بچاؤ کروایا۔ بالے نے زمین پر نڈھال پڑے شوکی کو ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اسے آخری تنبیہ کی کہ وہ دوبارہ اس علاقے میں نظر نہ ہی آئے تو بہتر ہوگا۔ شوکی کی آنکھوں سے اس کے اندر کی حالت عیاں تھی لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر صرف اتنا ہی بولا ''ابھی ایک ملاقات باقی ہے پیارے'' ہمارے لباس مٹی میں لت پت اور کچھ جگہوں سے باقاعدہ پھٹ چکے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال شیخ صاحب کا بھی تھا۔ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہے تھے۔ میں نے انہیں سہارے کے ذریعے گھر کے دروازے تک پہنچا کر واپس پلٹنا چاہا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ''اس حال میں گھر کیسے جاؤ گے میاں.....؟.....دو گھڑی رک کر ہاتھ منہ دھولو اور چاہو تو تنویر کا کوئی لباس بدل لو.....'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی ہماری دی ہوئی دستک کے جواب میں شیخ صاحب کی آواز سن کر اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا اور پھر شیخ صاحب کے ماتھے سے بہتی خون کی ایک پتلی لکیر دیکھتے ہی اندر گھر میں جیسے طوفان سا آ گیا۔ شاید وہ بڑی والی ستارہ تھی جس کی چیخ سن کر پہلے اندر کمرے سے شیخانی اور پھر چھوٹی والی گہنا بھی باہر صحن میں نکل آئی، میں شیخ صاحب کو سہارا دے کر اندر لے آیا، دروازہ کھولنے والی باقاعدہ رو رہی تھی اور شیخ صاحب ان سب کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں اس قدر حواس باختہ ہو گئی تھیں کہ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ وہ میری موجودگی میں پردہ کر لیں۔ تنویر شاید گھر میں نہیں تھا۔ میں نے ستارہ اور گہنا کی آواز سے ہی ان کے بارے میں اندازہ لگایا تھا ورنہ دیکھنے میں دونوں بہنیں ایک دوسرے کا آئینہ دکھائی دیتی تھیں۔ ستارہ کے سادہ لباس اور چہرے پر پھیلی سرسوں اور ملال سے ہی اس کے بڑے ہونے کا اشارہ ملتا تھا ورنہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹی عمر میں یہ نازک سی لڑکی ماتھے پر بیوگی کا داغ سجائے بیٹھی ہوگی اور گہنا.....وہ تو سرتاپا ''گہنا'' تھی۔ ہلکے فیروزی رنگ کے کرتا پاجامے میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ میں ان کے گھر کے صحن میں ایک عجیب و غریب صورت حال میں گرفتار کھڑا تھا۔ نظر اٹھاتا تو وہ دونوں سامنے تھیں اور نظر جھکاتا تو ان کی ٹٹولتی نظریں میرے بوسیدہ لباس اور الجھے ہوئے حلیے میں گڑھ کر مجھے بے چین کر دیتیں۔ آخر شیخ صاحب کو ہی سب سے پہلے خیال آیا اور انہوں نے لڑکیوں کو دوپٹہ اوڑھنے کا حکم دیا اور میرے لیے کوئی مناسب لباس بھی لانے کو کہا۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا لیکن انہوں نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے صحن میں ایک جانب لگے واش بیسن تک پہنچا دیا۔ میں نے چہرے پر دو چار چھینٹے مارے تو چہرے اور ہاتھوں پر لگی خراشوں میں جما ہوا خون پانی کے ساتھ بہہ گیا، لیکن میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں وہاں سے جلد از جلد جانا چاہتا تھا لیکن شیخ صاحب نے میرا راستہ روکے رکھا، اور بے حد اصرار کر کے میرا کرتہ بھی تبدیل کروا دیا۔ تنویر کا کرتہ مجھ پر ذرا سا تنگ تھا۔ کچھ ہی دیر میں شیخانی جی بیٹھک میں چائے کی ٹرے اٹھا لائیں اور شیخ صاحب بھی نہا دھو کر نئے لباس میں میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئے ''آپ لوگوں نے یہ سب تکلف کیوں کیا.....؟ میرے دوست میرے لیے پریشان ہوتے ہوں گے.....مجھے اب جانا چاہئے.....'' شیخانی جی ممنونیت سے بولیں ''بیٹا ایک کپ چائے پی کر چلے جانا.....شیخ صاحب نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے.....شاید قدرت نے تمہیں ہی اس گھر پر احسانات کرنے کے لیے چن رکھا ہے.....ہم سب تمہارے بہت ممنون ہیں.....'' میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں.....میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو وہ ان کا ہاتھ ضرور روکتا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ موقع پر میں اور میرے دوست وہاں موجود تھے.....'' شیخ صاحب نے لمبی سی سانس لی ''اسی بات کا تو دکھ ہے میاں.....کہ اس مردہ معاشرے میں اب ظالم کا ہاتھ روکنے والا بھی کوئی نہیں رہا.....یہ صرف تم ہی تھے جو تنہا ان سے بھڑ گئے.....تمہارے دوست تو ذرا دیر میں پہنچے.....اور سچ تو یہ ہے کہ اگر انہیں ذرا سی مزید دیر ہو جاتی تو وہ بھیڑیا تمہاری جان

لینے سے بھی نہ چوکتا..... تم مانو یا نہ مانو..... میری یہ زندگی اب تمہارا قرض ہے۔'' شیخ صاحب نے بتایا کہ وہ اس وقت اسی دوکان میں گہنا کے لیے کوئی لیس وغیرہ لینے کے لیے چند لمحے رکے تھے جب وہ دولڑکے مالک دوکان سے ہفتہ لینے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ دوکان دار کے پاس اس وقت پوری رقم نہیں تھی لیکن لڑکے اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجبوراً شیخ صاحب کو ہی دخل اندازی کرنا پڑی کہ ''یہ کیا طریقہ ہے کسی شریف آدمی سے بات کرنے کا.....؟..... اور یہ کہ وہ دونوں ہٹے کٹے ہیں تو بجائے محنت مزدوری کے وہ دوکانداروں سے یوں زبردستی پیسے جمع کرتے اچھے نہیں لگتے.....'' بس اتنا سننا تھا کہ انہوں نے شیخ صاحب کو دھر لیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ وہ کن پیشہ وروں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ میں نے دانستہ ان کے سامنے سارنگا کا نام نہیں لیا۔ وہ دوسرے شہر سے آئے تھے۔ انہیں ان جھمیلوں سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ چائے ختم کر کے میں نے ان سے اجازت طلب کی اور بڑی مشکل سے انہیں دروازے تک آنے سے روکا کیونکہ انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ میں صحن کے دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ میرے عقب سے ایک آواز ابھری ''سنیئے'' میں چونک کر پلٹا۔ برآمدے کی جالفری کے پیچھے ستارہ اور گہنا کٹی سمٹائی سی کھڑی تھیں ''جی؟'' کچھ دیر دونوں بہنوں میں بات شروع کرنے کے لیے ہچکچاہٹ آمیز اشارے ہوئے پھر گہنا نے ہی ہمت کی ''وہ دراصل ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بات زیادہ بڑھ تو نہیں جائے گی؟ دراصل بڑے بھیا بھی ابا کے سہارے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں اور تنویر بھائی پہلے ہی ہماری وجہ سے کافی پریشانیوں کا شکار ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف ہو.....'' بات کے دوران ایک پتلی سی شریر لٹ گہنا کو مستقل ستاتی رہی۔ یہ لڑکیاں اپنے والدین اور خاص طور پر اپنے بابل کے لیے اتنی ڈھیر ساری پریشانی جانے کہاں سے اکٹھی کر لاتی ہیں۔ شاید آسمان پر جب روحوں کو کوئی فیض بانٹا جاتا ہوگا تو ان کے حصے میں یہی انعام آتا ہوگا۔ میں نے ان پریشان روحوں کو تسلی دی۔

''آپ مطمئن رہیں..... شیخ صاحب کو مزید کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم دوستوں میں سے کوئی ایک مستقل آپ کے گھر کے باہر پہرہ بھی دے سکتا ہے۔ بس آپ لوگ انہیں ایک آدھ دن گھر سے باہر نہ جانے دیجئے گا۔'' ستارہ نے ممنونیت بھری آواز میں شکریہ کہا اور اندر پلٹ گئی لیکن گہنا کو مڑتے مڑتے پھر کوئی بات یاد آ گئی۔ ''وہ دراصل.....'' میں چلتے چلتے پھر رک گیا۔ ''دراصل میں آپ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی بھی مانگنا چاہتی ہوں..... میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا.....'' میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری..... ''آپ کے ابا آپ کو ٹھیک ہی نادان بچی کہتے ہیں، کیا یاد کریں گی..... جائیں معاف کیا.....'' گہنا مسکرا دی۔ یہی میرا مقصد بھی تھا کہ وہ نازک اندام شیخ صاحب کی پریشانی سے باہر نکل آئے۔ اس کے ماتھے پر پڑی شکنیں دور ہوئیں تو جیسے دنیا کی ہر سلوٹ دور ہو گئی۔ وہ دھیرے سے شکریہ کہہ کر پلٹ گئی اور میں وہیں جما کھڑا رہ گیا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا؟ پہلے تو کبھی میرے اندر ایسی پروائیاں نہیں چلی تھیں کہ باہر چمکتی دھوپ بھی مجھے سایہ لگنے لگی تھی۔ میں جانے کس عالم میں کیفے فراق تک پہنچا۔ راجہ پارٹی وہیں میرا انتظار کر رہی تھی لیکن مجھے ان کی باتیں بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ میں بس خوامخواہ ہوں ہاں کرتا رہا۔ جانے آس پاس کون کیا کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموش تھے یہ بھی کچھ بول رہے تھے..... مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ جانے کب دوپہر ڈھلی اور کب اسماعیل گاڑی لیے مجھے لینے کے لیے آ بھی گیا۔ اس دن ٹیوشن کے دوران ناہید نے بھی میری ذہنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا۔

''سر..... کیا بات ہے..... آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں سب ٹھیک تو ہے.....''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ گویا مجھے جو ہو رہا تھا وہ صرف میرے اندر تک محدود نہیں تھا۔ وہ تو میرے پوروں اور میرے مساموں سے جھلک کر باقی دنیا کو بھی بھگو رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر ایک بار پھر دھیان کتاب کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ناہید غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر جھجھکتے ہوئے بولی۔

''سر ایک بات کہوں..... اگر آپ برا نہ مانیں تو.....؟''

''نہیں نہیں..... تم ضرور کہو.....'' دور بیٹھی بوا نے بھی ناہید کی بات سن کر سر اٹھایا۔

''سر اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو آیان بھائی کہہ لیا کروں..... میرا کوئی بھائی نہیں ہے..... جو تھا اسے خدا نے چھین لیا..... آپ کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آپ مجھے بالکل اپنے بھیا جیسے ہی لگے تھے..... میں نے کبھی آپ کو دل سے اپنا استاد تسلیم نہیں کیا..... ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میرے بھیا مجھے پڑھا رہے ہیں.....'' بوا کی آنکھیں بھر آئیں جنہیں چھپانے کے لیے وہ تیزی سے چھالیہ کترنے لگیں۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ناہید کا کوئی بھائی بھی تھا جواب اس دنیا میں نہیں ہے۔ خود ناہید بھی بولتے بولتے اپنی آواز کھو بیٹھی۔ ''ٹھیک ہے..... لیکن تمہارا بھیا بننے کے لیے میری بھی ایک شرط ہے.....''

''جی بتایئے..... میں ہر شرط پوری کروں گی.....''

''سوچ لو..... کہیں بعد میں مکر نہ جانا..... میری شرط یہ ہے کہ اب یہ اداسی کبھی ناہید کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے..... ورنہ میں بھائی سے ایک سخت گیر ٹیوٹر بننے میں ذرا سی بھی دیر نہیں کروں گا۔'' بوا ہنس پڑیں..... ناہید کی آنکھوں کے ستارے بھی جھلملا اٹھے۔ میں نے اسے چھوٹی رافعہ کے بارے میں بتایا کہ اسی کی طرح کی ایک شرارتی بلی، خود ہمارے گھر میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب دو بلیاں میرا سر کھایا کریں گی۔ اس روز ٹیوشن ختم کر کے میں گھر واپس جانے لگا تو بوا نے پہلی مرتبہ اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ''جیتے رہو.....'' میں مسکرا کر باہر نکل آیا۔

لیکن میری یہ مسکراہٹ اتنی عارضی ثابت ہوگی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے ہی میں کیفے فراق کے پاس پہنچا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اسماعیل بھی معاملہ جاننے کے لیے وہیں رک گیا۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر مرزا میری جانب لپکا ''غضب ہو گیا انو یار..... پولیس راجہ، بالے اور منشی کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے..... فراق چچا بھی انہی کو چھڑانے تھانے گئے ہیں۔'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''تھانے لے گئے ہیں..... لیکن کیوں.....؟''

''پتہ نہیں..... کہہ رہے تھے کہ آج دن میں تم لوگوں نے کچھ لڑکوں کو حملہ کر کے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے..... پولیس تمہارا بھی پتہ پوچھ رہی تھی..... میں تو کہتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ..... ورنہ وہ تمہیں بھی دھر لیں گے.....''

میں نے اسماعیل کی طرف دیکھا۔

''میرا ایک کام کرو گے.....'' اسماعیل مسکرایا ''ضرور..... کہاں جا کر چھپنا چاہتے ہو..... میں پہنچا آتا ہوں.....''۔

''مجھے علاقے کے تھانے تک جانا ہے..... لیکن بہت جلدی.....'' اسماعیل زور سے چونکا ''پولیس تمہاری تلاش میں چھاپے مار رہی ہے

اورتم خودتھانے جاکران کانوالہ بننا چاہتے ہو.....'' مرزا بھی چلایا

''آیان..... یہ کیا بے وقوفی ہے..... تمہارے جانے سے وہ لوگ باقی تین کو چھوڑ تو نہیں دیں گے.....'' میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا ''ہاں..... مگر مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں ان کے ساتھ ہوں.....'' اسماعیل نے گاڑی آگے بڑھادی اور ہم کچھ ہی دیر میں تھانے کی بیرونی سڑک پر جارکے اسماعیل نے مجھ سے کہا ''اگر میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں رک جاؤں۔''

''نہیں..... تم نے مجھے یہاں تک پہنچادیا۔ یہی بڑی مدد ہے.....'' اسماعیل نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا ''آج تک میں تمہیں صرف ناہید بیٹا کا استاد سمجھتا تھا..... لیکن آج پتہ چلا کہ تم ایک بہت اچھے دوست بھی ہو..... اور اسماعیل کے دل میں یاروں کی بڑی قدر ہے بابو..... کبھی وقت پڑے تو یاد کرلینا.....'' اسماعیل نے گاڑی گیئر میں ڈال دی۔ میں تھانے میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے سے نکلتے اے ایس آئی کی مجھ پر نظر پڑی۔ شاید وہ مجھے جانتا تھا تبھی الٹے پیروں واپس اندر لپکا۔ میں نے ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر اجازت طلب کی۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں.....؟''

تب تک اے ایس آئی تھانیدار کے کان میں میرا تعارف پھونک چکا تھا۔

تھانیدار نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''اوہ..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں پکڑ کر لانے کے لیے ہمیں اپنی آج کی رات برباد کرنی پڑے گی..... لیکن شاباش ہے تمہاری جرأت کو..... تم تو خود ہی چلے آئے.....'' وہ اے ایس آئی کی جانب مڑا ''ڈال دو اسے بھی لاک اپ میں، باقی کارروائی بڑے صاحب کے آنے کے بعد ہوگی۔''

''لیکن ہمارا جرم کیا ہے؟''۔

''خوب..... جرم بھی مجھی سے پوچھ رہے ہو..... تم لوگوں کے خلاف پرچہ کٹوایا گیا ہے آج صبح ساڑھے گیارہ بجے کے قریب تم لوگوں نے شوکی ولد عنایت اور دیگر دو پر جان لیوا حملہ کیا اور انہیں شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے فرار ہوگئے.....''

''یہ غلط ہے..... وہ سارنگا کے آدمی تھے جو بھتہ لینے آئے تھے اور ایک بزرگ کو زدوکوب کررہے تھے ہم نے صرف اس بزرگ کی مدد کی تھی..... اور بس.....''۔

''شاباش..... بھئی جوانا..... کون کہتا ہے کہ اس ملک میں ہیروز کی کمی ہے..... اچھا تو اب یہ بھی بتادو کہ وہ بزرگوار اس وقت کہاں ہیں..... اور تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے۔ تمہارے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے.....؟'' میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ستارہ اور گہنا سے کیا وعدہ یاد آگیا کہ اب ان کے ابا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ ہی دیر میں مجھے بھی حوالات میں پہنچادیا گیا جہاں پہلے ہی تین نوآموز قیدی پڑے ہوئے تھے۔ راجہ لہک لہک کر گا رہا تھا ''کون کسی کو..... باندھ سکا..... صیاد تو اک دیوانہ ہے.....'' مجھے دیکھتے ہی تینوں نے زوردار نعرہ لگایا ''آگیا وہ شاہ کار..... تھا جس کا انتظار..... سچ یار

انو..... تیرے بغیر بڑا سونا پن تھا اس حوالات میں..... اب تم آ گئے ہو تو شاید کچھ دل لگ جائے.....''

میں نے راجہ کے سر پر ایک چپت رسید کی ''احمقو..... پولیس کے ہتھے چڑھنے کی کیا ضرورت تھی..... کہیں چھپ نہیں سکتے تھے.....؟ اب پولیس ہمارے ساتھ جو دل لگی کرے گی اس سے تم سب کا دل خوب لگ جائے گا یہاں.....'' مشی رد ہانسا ہو گیا ''یار چھپنے کی مہلت ہی کہاں ملی..... آناً فاناً دھر لیا ہم سب کو ہاں..... یار آیان..... سچ بتاؤ..... اب کیا ہوگا۔ کانسٹیبل بتا رہا تھا کہ جب ان کے بڑے صاحب آئیں گے تو ہمیں بہت مار پڑے گی.....؟..... یہ لوگ ہمیں ماریں گے کیا.....؟

''پولیس کا گزشتہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کانسٹیبل کی پیشین گوئی سو فیصد درست ثابت ہوگی، لیکن تم فکر نہ کرو..... معجزات بھی تو اسی دنیا میں ہی رونما ہوتے ہیں ناں.....'' مشی کا اترا ہوا چہرہ مزید اتر گیا، کچھ ہی دیر میں حوالات میں شام کا اندھیرا اتر آیا، اور پھر اچانک ہی باہر کچھ ہل چل مچی۔ ایک سنتری نے آ کر ہمیں زور سے جھاڑا ''چلو اٹھو اوئے..... بڑے صاحب تم لوگوں کو بلا رہے ہیں۔''



باب6

ہم چاروں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے ہم آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ سنتری نے حوالات کا دروازہ کھولا اور ہمیں ہانک کر ایک بڑے ہال نما کمرے کی طرف لے گیا۔ مشی نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا ''انو..... کیا یہ لوگ ہمیں ٹارچر سیل کی طرف لے جا رہے ہیں.....؟'' سنتری نے زور سے ''شش.....'' کی آواز نکال کر ہمیں خاموش رہنے کی تنبیہ کی۔ ہال میں تین کانسٹیبل، تھانے دار اور ایک جوان آفیسر موجود تھا۔ ریحان سے سال دو سال ہی بڑا ہوگا عمر میں..... ہمیں ایک قطار میں مؤدب سا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ نوجوان افسر کوئی براہ راست بھرتی شدہ اے ایس پی تھا۔ اس نے غور سے ہماری جانب دیکھا..... ''اچھا تو یہی چاروں ہیں..... پرچہ کاٹ دیا ہے تم لوگوں نے.....؟'' تھانے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''نہیں سر..... آپ کی اجازت کے بغیر کیسے کاٹ سکتے تھے..... ویسے چاروں نے بہت ادھم مچا رکھا تھا علاقے میں.....'' ہم نے نظریں اٹھا کر حیرت سے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ ہم علاقے میں ادھم مچائے ہوئے تھے اور خود ہمی کو پتہ نہیں تھا۔ اے ایس پی نے لمبی سی ہوں کی اور ہم چاروں کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی نظر مشی پر رک کر ٹک سی گئی۔ پھر وہ حیرت سے بولا ''یہ عینکو بھی ان بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ چہرے سے تو یہ کوئی پڑھا کو قسم کا لڑکا لگتا ہے۔'' مشی نے گھگھیا کر کہا ''ہم بدمعاش نہیں ہیں جناب..... وہ لڑکے وہاں بھتہ لینے کے لیے آئے تھے''

اتنے میں باہر سے کچھ شور اور بحث کی آوازیں ابھریں اور پھر ایک سنتری نے اندر آ کر اطلاع دی ''جناب ان لڑکوں کے گھر والے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اے ایس پی نے سنتری کو جھاڑ دیا ''کہہ دو ان سے میں فی الحال کسی سے نہیں مل سکتا اور سب سے پہلے ان چاروں کے کوائف نوٹ کر کے میرے دفتر پہنچاؤ۔'' اے ایس پی تھانیدار کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور ایک سپاہی نے ہمارے نام بمعہ ولدیت اور پتے وغیرہ لکھنا شروع کر دیے۔ میرا نام تیسرا تھا ''آیان احمد ولد توقیر احمد، پیشہ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ اسکول'' اے ایس پی نے چونک کر میری طرف دیکھا ''اپنے والد کا نام پھر سے دھراؤ.....'' میں نے پھر سے ابا کا نام اور پیشہ دھرایا ''تم توقیر احمد صاحب کے بیٹے ہو..... آئی کانٹ بلیو اٹ..... وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں.....؟'' پھر میرا جواب سنے بغیر اس نے ملاقاتیوں کے آنے کی اطلاع کرنے والے سنتری سے ان کی فہرست لانے کو کہا۔ سنتری بھاگ کر گیا اور کچھ ہی دیر میں سب نام لکھ کر لے آیا۔ اے ایس پی نے فہرست پر نظر ڈالی اور سنتری سے کہا ''ان سب کو میرے دفتر میں بٹھاؤ..... میں ابھی آتا ہوں'' سنتری سیلوٹ کر کے واپس پلٹا۔ اے ایس پی ہمیں وہیں کھڑا رکھنے کا حکم دے کر اپنی ٹوپی سیدھی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پتہ نہیں اے ایس پی ابا کا نام سن کر ایسے چونکا کیوں تھا۔ مگر میرا دل تو یہی سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر ابا بھی باہر موجود ہوئے تو میرا کیا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ ''ہم چاروں کو بڑے صاحب نے دفتر بلایا ہے۔''

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جیسے ہی ہم اے ایس پی کے کمرے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری نظر بالے کے ابا کے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے ابا پر پڑی۔ پس منظر میں ریحان بھی باقی ابا ؤں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا لیکن اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ ہمیں

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنے کا حکم دے کر سپاہی باہر نکل گیا۔ اے ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی ''سر میں تو آپ کا نام سن کر ہی چونک گیا تھا۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو..... میں نے چھٹی اور ساتویں جماعت آپ کے ہی سکول سے پاس کی تھی۔ پھر بورڈنگ میں داخل ہو گیا اور میں دوسرے شہر چلا گیا تھا..... ابھی دو سال پہلے ہی میں نے سی ایس ایس کلیئر کیا ہے..... میں تو آج بھی مانتا ہوں کہ میری تعلیم کی بنیاد رکھنے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔'' ابا سر جھکائے بیٹھے تھے ''ہاں میاں..... یہ تو تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تم نے میری محنت کی لاج رکھ لی۔ ورنہ یہاں تو خود میرا اپنا خون میری بنیادیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ مجھے تو اسے اپنا بیٹا کہنے میں بھی شرم آتی ہے..... کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا مجھے.....''۔

''بہرحال سر..... میرا مشورہ یہی ہے کہ یہ ان لڑکوں سے تھانے کے باہر راضی نامہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا۔ وہ اونچی پہنچ والے لوگ ہیں، اور قانون گواہ اور ثبوت کی بنیاد پر فیصلے کرتا ہے، لیکن اس معاملے میں آپ کے بیٹے اور اس کے دوستوں کے حق میں نہ تو کوئی گواہ ہے..... اور نہ ہی ثبوت..... اگر ایک بار تھانے کچہری کی مہر لگ گئی اور انہوں نے ملزم سے مجرم تک کا سفر طے کر لیا تو ان چاروں کا تعلیمی کیریئر ہمیشہ کے لیے برباد ہو جائے گا..... میں آج انہیں صرف آپ کی وجہ سے جانے دیتا ہوں، لیکن یہ جھگڑا جس قدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی ان سب کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ لوگ اپنے بیٹوں کو لے جا سکتے ہیں۔''

ابا نے زہریلی نظروں سے ہم سب کی طرف دیکھا ''چلو اب.....''

ہم لوگ تھانے سے باہر نکلے تو سبھی خاموش تھے۔ پھر سب سے پہلے منشی کے ابا نے اس کے کان کھینچے ''کہا تھا میں نے..... چھوڑ دے ان لوفروں کی دوستی..... کھلا دی نہ آج جیل کی ہوا تجھے..... اور نہ مان اپنے باپ کی بات.....'' دوسری جانب سے بالے کے ابا نے اسے لتاڑا ''سن لے..... آج تیری وجہ سے کیا کیا سننے کو مل رہا ہے..... بروں کی صحبت میں بیٹھے گا تو یہی سب کچھ ہوگا۔'' پھر بھلا راجہ کے ابا کہاں چپ رہنے والے تھے ''ہاں ہاں..... لوفروں کی صحبت میں لوفر نہ بنے گا تو کیا حاجی بنے گا، خبردار جو تو نے آئندہ ان تینوں کی شکل بھی دیکھی تو..... کام کے نہ کاج کے..... دشمن اناج کے.....'' اور پھر سب سے آخر میں مغل اعظم گرجے۔

''بس..... بہت ہو گیا..... گھر چلو..... انتہا ہو گئی بے غیرتی کی.....'' ہم چاروں کو ہمارے بڑوں نے چار مختلف سمتوں میں کھینچا اور ہم ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے جیسے پلیٹ فارم سے چھوٹتی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے پیارے اسٹیشن پر کھڑے اپنوں کے ہاتھ چھوٹتے ہیں۔ بچپن سے آج تک کئی بار محلے میں مختلف شرارتوں کی سزا کے طور پر ہمیں اسی طرح کھینچ کر علیحدہ کر دیا جاتا تھا، کئی کئی دن ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے کبھی بازو کے باوجود پلٹ پلٹ کر ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھا کرتے تھے اور پھر چند دن بعد ہی سب سے نظر بچا کر پھر سے اکٹھے ہو جاتے تھے، لیکن جانے کیوں اس بار جدا ہوتے ہوئے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو امی برآمدے میں جائے نماز بچھائے گڑگڑا کر دعا مانگتی نظر آئیں۔ چھوٹی بھی ان کے ساتھ بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں جلدی سے میری جانب لپکیں۔ ''آ گیا تو انو..... ان لوگوں نے تجھے مارا پیٹا تو نہیں.....؟'' امی نے جلدی جلدی میرا جسم ٹٹول کر یوں دیکھا جیسے وہ بچپن میں تب دیکھتی تھیں جب میں باہر سے کوئی چوٹ کھا کر گھر آتا تھا۔ دنیا بدل جائے تو بدل جائے پر یہ مائیں کبھی نہیں بدلتیں۔ ابا

دھاڑے ''وہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ آوارہ اور لوفر تو پہلے ہی سے تھا..... اب غنڈہ گردی بھی شروع کر دی ہے تمہارے سپوت نے..... میری برسوں کی کمائی عزت ایک دن میں خاک کر کے رکھ دی..... پوچھا اس سے کہ اب کون سا تمغہ سینے پر سجا کر آیا ہے تھانے سے.....'' میں سر جھکائے کھڑا رہا ''میں نے صرف ایک بزرگ کی مدد کی تھی۔ وہ لڑکے انہیں پیٹ رہے تھے.....'' ابا زور سے چلائے ''کیا ضرورت تھی اس خدائی خدمت گاری کی..... وہاں پر موجود باقی لوگ مر گئے تھے کیا.....؟''۔

''نہیں..... لیکن کوئی ان کی مدد کو آگے نہیں بڑھا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' ابا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے غصے میں اپنی چھڑی اٹھالی ''زبان چلاتا ہے باپ کے سامنے.....'' پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ ابا کی چھڑی اور میری پیٹھ..... میں چپ چپ مار کھاتا رہا اور بے چاری امی اور رافعہ اپنے ہاتھوں پر میرے حصے کے وار سہتی گئیں۔ جانے ہمارے والدین ہمیں بچپن میں جن باتوں کا درس دیتے ہیں جوان ہونے پر ہمیں انہی باتوں پر مار کیوں پڑتی ہے؟ دوسروں کی مدد، ظلم کے خلاف بغاوت اور برائی کے خلاف ڈٹ جانا، ایسے جانے کتنے سبق میں نے اپنی کتابوں میں اپنے انہی ابا سے پڑھے تھے جو آج مجھے کسی دوسرے کی مدد کے لیے کود پڑنے پر مار رہے تھے۔ کاش وہ سارے سبق پڑھاتے وقت ابا مجھے یہ بھی بتا دیتے کہ بیٹا یہ کتابیں صرف امتحان پاس کرنے کے لیے ہیں۔ ان پر کبھی عمل نہ کرنا..... کیونکہ ہم عزت دار لوگ پولیس یا کچہری کا سامنا نہیں کر سکتے۔ سو اگر کہیں کچھ غلط ہوتے دیکھو تو چپ کر کے آگے بڑھ جانا مگر خود کو کسی جھمیلے میں نہ ڈالنا۔ کیونکہ یہ اچھائی اور بھلائی کی جذباتی باتیں صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔

ہمیشہ کی طرح ابا کی اس مشق کا اختتام بھی چھڑی کے ٹوٹ جانے پر ہی ہوا۔ حسب معمول امی نے روتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر بام کی شیشی چھوٹی کے حوالے کی کہ وہ بھائی کے نیلوں پر مل دے، اور پھر ہمیشہ کی طرح ریحان اور چھوٹی بہت دیر تک چھت پر میرے کمرے میں بیٹھے میرے زخموں پر مرہم رکھتے اور میرا دماغ کھاتے رہے کہ آخر میں کب سدھروں گا؟ آخر کار میں نے ہی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ اب وہ دونوں اپنی ''اقوال زریں'' نما نصیحتوں کے ساتھ یہاں سے روانگی اختیار کریں کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ مگر میں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ جب بھی میں آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتا میری پلکوں کے پیچھے ایک من موہنی سی صورت چھم سے ابھر آتی ''گبنا.....'' آخر کار میں اٹھ بیٹھا اور دو چار مرتبہ زور سے اپنے سر کو جھٹکا، لیکن کاش سر جھٹکنے سے من میں بسی مورتوں کی شبیہہ بھی ذہن سے اتر جاتی۔ میں جتنا اپنا دھیان کسی اور جانب لگانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ میرے ذہن اور دل کی تہوں میں اترتی جاتی تھی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ آج تک پہلے کبھی تو یہ میٹھی سی کسک میرے اندر نہیں جاگی تھی کیوں مجھے آس پاس کی ہر چیز خواہ مخواہ ہی اچھی لگ رہی تھی؟ کیوں رات کا ایک ایک پہر پوری پوری رات کی طرح ڈھل کر مجھ پر بیت رہا تھا۔ کیا یہ وہی جذبہ تھا جسے ساری دنیا محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ لیکن ''محبت'' اور آیان احمد کو.....؟؟ نہیں نہیں..... میں بھلا ان خرافات پر کب یقین کرنے والا تھا۔ ضرور ابا کی چھڑی مجھ پر برستے وقت میرے دماغ کی کسی ایسی رگ کو چھو گئی ہو گی جو من مندر میں ایسی روشنی بھر جاتی ہو گی۔ صبح تک میں ضرور اس سحر سے نکل آؤں گا، لیکن تب میں شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت سحر نہیں..... وہ کالا جادو ہے جس کا توڑ دنیا کے کسی ساحر کے پاس نہیں..... یا شاید موت کی طرح محبت بھی ایک واپس نہ پلٹنے والے عمل کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوتی ہے، اور ہم معصوم انسان

ساری عمر بے خبری میں اس جادو ڈھونے کا توڑ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

صبح میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ درد گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔ بے چینی کم سے فزوں تر ہوتی گئی۔ دل دیوانہ تلاش کرنے لگا اور باتیں اضافی لگنے لگیں۔ مجھے یوں گم سم دیکھ کر امی میری چپ کا مطلب میری ابا سے ناراضگی سمجھیں۔ میرا جی خوش کرنے کے لیے انہوں نے دبے الفاظ میں ابا کے خلاف ایک آدھ بات بھی کہہ دی کہ ''بھلا کون اپنی جوان اولاد کو یوں چھڑی سے پیٹتا ہے'' اور یہ کہ ''اگر میرا دل ابا کی جانب سے خراب ہے تو ہونا بھی چاہئے.....'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب میں اپنی بھولی ماں کو یہ کیسے سمجھاتا کہ میرا دل تو نہ جانے میرے ساتھ کتنی بڑی سازش کر بیٹھا ہے اور ساوات محلے جانے کے کتنے ہی بہانے تراش کر خود ہی انہیں رد کر رہا ہے۔ آج میرے دوستوں میں سے بھی کوئی دن چڑھے تک گلی یا چھت پر نہیں آیا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرح آج ان تینوں کی بھی ''خصوصی نگرانی'' کی جارہی ہوگی۔ میری طرح سبھی کے والدین انہیں گھر کے صحن میں بٹھا کر یہ تبلیغ کر رہے ہوں گے کہ انہیں اس حال تک پہنچانے والے اور کوئی نہیں..... بس وہ آوارہ دوست ہیں۔ عام حالات میں ایسے موقعوں پر میں بمشکل ابا کے گھر سے نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا اور ان کا قدم گھر سے باہر پڑتے ہی میں امی اور چھوٹی کی ہزار منت سماجت کے باوجود گھر سے باہر نکل جاتا تھا لیکن اس روز جب بارہ بجے کے قریب ابا حسب معمول کپڑے کا تھیلا اپنی سائیکل سے لٹکائے باہر سودا سلف لینے کے لیے چلے بھی گئے اور میں پھر بھی صحن میں گلی انگور کی بیل کے نیچے بیٹھا خشک پتوں کو اپنے ہاتھ سے مسلتا رہا تو امی کو میری فکر لاحق ہوگئی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھو کر دیکھا ''انو..... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....''

میں چپ چاپ اٹھ کر چھت پر چلا آیا، اور ریحان اور چھوٹی کے درجنوں بار بلانے پر بھی دن کے کھانے کے لیے نیچے نہیں اترا۔ چار بجے کے قریب جب میرے گھر والوں نے باقاعدہ چھت کی ڈیوڑھی سے مجھے جھانک جھانک کر تکنا شروع کر دیا تو میں جھنجھلا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ کیفے فراق کے باہر اسماعیل میرا انتظار کرتے کرتے اب واپس جانے کو تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تازگی سی چھا گئی۔

''تم یہاں ہو یا بو..... میں تو تمہیں دیکھنے کے لیے تھانے جانے والا تھا'' میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ''نہیں..... رات کو ابا مجھے وہاں سے چھڑا لائے تھے..... اب میں ان کی قید میں ہوں.....'' میری بات سن کر اسماعیل زور سے ہنسا..... ''فکر نہ کرو..... میرے مالک دو بئی گئے ہوئے ہیں..... آج کل میں ان کی واپسی ہے..... ان کے آتے ہی تمہارا یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کروا دوں گا.....'' اسماعیل نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ ٹیوشن میں بھی ناہید کو گزشتہ روز کے باب کی دہرائی کا کہہ کر میں خود کو اپنے اندر کھوجتا رہا۔ میری حالت کے پیش نظر ناہید نے بھی مجھ سے غیر ضروری سوال و جواب سے گریز کیا۔ واپسی پر بوا نے بے حد اصرار کے ساتھ دو ہزار میری جیب میں ڈال دیے اور جاتے جاتے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ ''اپنا خیال رکھا کرلڑکے.....''

محبت کی بے خودی بھی عجب بے خودی ہے۔ پہلے پہل اس میں صرف گھائل ہونے والے کو اپنے درد کا پتہ چلتا ہے اور باقی ساری دنیا بے خبر ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ مقام بھی آجاتا ہے جب ساری دنیا کو اس جنوں کا پتہ چل جاتا ہے مگر جو خود اس دور جنوں سے گزر رہا ہوتا ہے صرف اسی کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک چلتا پھرتا اشتہار بن چکا ہے اور جہاں سے وہ گزرتا ہے فسانہ بن جاتا ہے۔

میرا فسانہ بننے میں بھی بس کچھ دیر ہی باقی تھی۔ مجھے واپسی پر اسماعیل نے کیف فراق اتارا تو شام ڈھل چکی تھی۔ فراق چچا حسب معمول کاؤنٹر

پر کسی گہرے مراقبے میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کا گراموفون چل رہا تھا۔ ''یہ میرا دیوانہ پن ہے..... یا محبت کا سرور..... تو نہ پہچانے تو ہے یہ..... تیری نظروں کا قصور.....'' مجھے لگا کسی نے میرے اندر کے چور کو پکڑنے کے لیے یہ گانا چن کر لگایا ہے۔ اتنے میں اندر کسی گاہک سے بحث کرتے مرزا کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے میری جانب لپکا..... ''کہاں تھے تم دن بھر..... سادات محلے سے شیخ صاحب کے ہاں سے تین بار تمہارے لیے پیغام آ چکا ہے کہ آیان میاں آئیں تو ان سے کہوں کہ دو دو گھڑی شیخ صاحب کے ہاں سے ہوتے جائیں.....'' مرزا کی سرگوشیانہ آواز سے لگ رہا تھا کہ اسے ہماری اور شوکی کی لڑائی کی اصل وجہ بھی پتہ چل چکی ہے۔ پھر اس نے خود ہی بات کھولی ''رابعہ آیا تھا دوپہر کو..... پھر اس کے جانے کے بعد بالا بھی چکر لگا گیا ہے..... سچ کہوں تو مجھے تو تم لوگوں کی خالی میز کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ میں نے بیروں سے کہہ کر اس کی جگہ ہی بدلوا دی ہے..... جب تم چاروں اکٹھے آؤ گے..... تبھی وہ میز وہاں لگے گی.....'' مرزا بولتے بولتے رو ہانسا سا ہو گیا۔ ہمارا اور مرزا کا بھی ایک عجیب تعلق تھا۔ اس رشتے کا شاید کوئی نام بھی دنیا کی کسی لغت میں موجود نہیں ہو گا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا..... مرزا کو اسی حلیے اور اسی عمر میں کیفے فراق کی منشی گیری کرتے پایا تھا۔ شاید اس کی اصل عمر ہمارے چچا، تایا جتنی ہو گی لیکن بچپن سے وہ ہمارے لیے صرف ''مرزا'' ہی رہا۔ ہم نے کبھی اس کے نام کے ساتھ کوئی سابقہ یا لاحقہ احتراماً یا تکلفاً بھی لگانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ سچ ہے، دل کے رشتے کسی بھی سابقے یا لاحقے سے کہیں زیادہ بالا ہوتے ہیں۔ مرزا ہم چاروں کی ٹیم کا غیر اعلان شدہ پانچواں رکن تھا۔ وہ کون سی شرارت تھی جس میں اس نے آج تک ہمارا ساتھ نہ دیا ہو؟ ہمارا کون سا ایسا منصوبہ تھا جس میں وہ براہِ راست نہیں تو پسِ منظر میں شامل نہ رہا ہو؟ اسی لیے آج اس کا دل ہم چاروں کی اس مسلط کردہ جدائی پر کٹ رہا تھا۔ میں مرزا سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے دور سے ریحان آتا دکھائی دیا۔ وہ ضرور میری تلاش میں آیا ہو گا۔ میں نے جلدی سے مرزا سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح شیخ صاحب کے گھر پیغام بھجوا دے کہ میں موقع ملتے ہی وہاں آؤں گا۔ ریحان نے دور سے ہی مجھے گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ مرزا نے مجھے نظروں نظروں میں اشارہ کیا کہ ''کام ہو جائے گا'' میں ریحان کے ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو ابا صحن میں ہی کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ میں چپ چاپ اوپر چھت پر جانے کے لیے ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کی جانب بڑھا تو انہوں نے مجھے آواز دی۔

''ٹھہرو..... بات سنتے جاؤ.....''

میں رک گیا۔ ابا نے چند لمحے توقف کیا۔ پھر حتمی لہجے میں بولے

''ریحان نے ان لڑکوں کا پتہ لگا لیا ہے..... تم کل اس کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے..... یہ میرا حکم ہے.....''

میرے سیڑھیوں پر چڑھتے قدم رک گئے۔

''میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔'' میری بات سن کر ابا کے ہاتھ میں پکڑا سلور کا گلاس زمین پر گر گیا۔ ریحان نے نظروں نظروں میں مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے اسے میری ذہنی حالت پر کوئی شک ہو۔ ابا کے ہاتھ کی گرفت ان کی چھڑی کے دستے پر شدید ہو گئی اور وہ غصے میں ایک جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔

باب 7

ابا غصے میں کھڑے ہو گئے ''دیکھ لیا رافعہ کی ماں.....اب اپنے باپ کو جواب بھی دینا آ گیا ہے اسے.....بس اس کی کسر باقی تھی.....'' امی نے جلدی سے صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی سدا بہار نصیحت اور ہزاروں بار کا کہا اپنا پسندیدہ جملہ دھرایا ''انو.....تیرے ابا تیرے بھلے کے لیے ہی یہ سب کہتے ہیں.....'' ابا نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا.....''اے ایس پی صاحب نے صرف تین دن کی مہلت دی ہے راضی نامے کے لیے.....یہ بھی ان کی بڑی مہربانی ہے، ورنہ ان پر دوسری پارٹی کی وجہ سے بہت دباؤ ہے.....صرف شاگردی کا حق ادا کر رہے ہیں وہ.....تم کل ریحان کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے کہ جو بھی ہوا وہ انجانے میں ہوا.....ایک بار وہ لوگ اپنی شکایت واپس لے لیں تو باقی بات اے ایس پی بلال سنبھال لیں گے.....'' میرا ضبط جواب دے گیا ''لیکن ابا.....پولیس کیا صرف ایک جانب کی بات سننے کے لیے ہی اپنا دفتر کھولے بیٹھی ہے.....شکایت تو ہم بھی درج کرا سکتے ہیں۔ پھر بات برابر کی ہو جائے گی اور فیصلہ عدالت کرے گی.....آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں بے قصور ہوں'' ابا زور سے چلائے ''میں یقین کر بھی لوں تو دوسرا کوئی اور نہیں کرے گا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی کورٹ کچہری کے چکر میں نہیں پڑا.....یہ ہمیں زیب نہیں دیتا.....اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ کچہری بنا ثبوت اور گواہ تمہیں بے گناہ مان لے گی۔ دوسروں نے تمہارے لیے پھندا تیار کر رکھا ہے.....میری بوڑھی ہڈیوں پر رحم کھاؤ اور اس عمر میں مجھے مزید رسوا نہ کرو.....ہم ان لوگوں کے سامنے بہت چھوٹے.....بہت کم زور ہیں.....'' ابا مزید کوئی بات سنے بغیر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میرا جی چاہا کہ ان سے چلا چلا کر پوچھوں کہ کیا یہ قانون اور عدالتیں صرف بڑے اور منہ زور لوگوں کی حفاظت کے لیے بنی ہیں؟ اور کیا اگر کوئی ثبوت اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے بے گناہ کہلانے کا کوئی حق نہیں رہتا؟ لیکن وہ میری کوئی صفائی سنے بنا ہی اپنا ترپ کا آخری پتہ پھینک چکے تھے۔ والدین کا آخری ہتھیار کیا ہوتا ہے۔ رشتوں کا جذباتی دباؤ.....ایموشنل بلیک میلنگ.....تب مجھ جیسی مجبور اور لاچار اولاد کے پاس اور کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟ صرف یہی کہ اپنے اندر کو مار کر اور اپنی شخصیت کو مسخ کر کے خود کو والدین کی ہر اس خواہش اور حکم کی بھینٹ چڑھا دیا جائے جسے وہ جائز اور ہمارے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے ابا کے علاوہ اور کسی کے سامنے آج تک ہاتھ نہیں جوڑے تھے اور آج وہی ابا مجھے ایک غنڈے سے معافی مانگنے کا حکم دے رہے تھے وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری اور صبح میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ریحان چھت پر آ گیا ''میں جانتا ہوں یہ سب تمہارے لیے بے حد مشکل ہے.....لیکن ہم ان لوگوں سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ چلو تم تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ہمیں ابھی بازار جانا ہے.....''

نیچے صحن میں ابا بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا سارا دھیان اس وقت میری طرف ہے۔ میں چپ چاپ ریحان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ریحان نے چوڑی گلی کے اسی دوکاندار کی مدد سے شوکی گروہ کو پیغام بھجوایا تھا جہاں سے یہ سارا جھگڑا شروع ہوا تھا۔ ہم سادات محلے میں پہنچے تو ماحول پر کچھ عجیب قسم کا سناٹا طاری تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس موقع پر کہیں شیخ صاحب یا تنویر نظر نہ آئیں۔

گلی میں مڑتے ہی دور سے مجھے شوکی کی جیپ نظر آ گئی۔ آج وہ احتیاطاً اپنے ساتھ چار لڑکوں کو لے کر آیا تھا جن میں وہ وہی تھے جو اس روز ہم سے پٹ کر گئے تھے۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر شوکی جیپ کے بونٹ سے نیچے اتر آیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ مجھے سامنے پا کر اس نے گلی والوں کو دکھانے کے لیے زور سے زمین پر تھوکا اور چلا کر بولا ''دیکھ سینڈو..... آج یہ کون سور ماہم سے معافی مانگنے آیا ہے۔ ارے یہ تو 48 گھنٹے بھی ٹک نہیں پایا اپنی بہادری پر..... لیکن یہ اکیلا کیوں آیا ہے، باقی تین جوکر کہاں ہیں؟'' ریحان جلدی سے بولا ''باقی تین بھی تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں لیکن ان کے والدین نے خوف کی وجہ سے انہیں گھروں میں نظر بند کر رکھا ہے۔ آیان ان سب کی طرف سے تم سے معافی مانگنے کو تیار ہے.....'' شوکی نے ریحان کی بات سن کر اپنے ساتھیوں سمیت ایک زوردار قہقہہ لگایا ''کیا کہا..... ان کے گھر والوں نے چھپا رکھا ہے..... چوزے کہیں کے..... کب تک شوکی سے بچیں گے.....؟'' پھر شوکی نے آس پاس کے دوکانداروں اور راہ گیروں کو بھیڑ اکٹھی کرنے کی غرض سے آوازیں دے کر بلایا اور کچھ ہی دیر میں ہمارے اردگرد کافی بڑا مجمع لگ چکا تھا۔ شوکی کو اس روز ہمارے ہاتھوں جو ہزیمت اٹھانا پڑی تھی اس کے تدارک کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے شوکی کے خلاف دخل اندازی کرنے والوں کا انجام دیکھ لیں۔ اب شوکی اور اس کے ساتھی صورتحال کا باقاعدہ لطف لے رہے تھے۔

''ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم..... تمہارا یہ چھوٹا سور ما بھائی مجھ سے ہاتھ جوڑ کر اور میرے پاؤں پڑ کر معافی مانگنا چاہتا ہے؟..... کیونکہ اس کی عقل ٹھکانے آ گئی ہے اور یہ اس دن کا تمام ہرجانہ بھی بھرنے کو تیار ہے..... بھئی واہ..... لیکن میں یہ سب اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں وہ کیا ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کل تک ہمارے سامنے اکڑنے والا تمہارا یہ بہادر بھائی آج کسی خوف زدہ چوہے کی طرح ہمارے تلوے چاٹنے کے لیے تیار ہے.....''

میں چپ کیے کھڑا رہا۔ جب خود میرے اپنے گھر والوں کو میری عزت نفس کا کچھ خیال نہیں تھا تو پھر یہ غنڈے اس کا پاس کیوں کرتے۔ ریحان میرے اندر کی حالت سے واقف تھا اور خود اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے کہنی ماری تاکہ میں اپنی زبان سے معافی کا لفظ ادا کروں۔

''مجھے معاف کر دو..... مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ میں تمہارے راستے میں آیا.....'' میری زبان سے یہ جملہ سن کر شوکی نے نچلے درجے کے اداکاروں جیسی نقل کی اور بولا ''میں نے کچھ سنا نہیں..... کیوں بھائیو..... تم لوگوں نے کچھ سنا..... نہیں نا..... تو بیٹا ذرا زور سے بولو..... آج صبح امی نے ناشتہ کروا کر نہیں بھیجا کیا.....؟'' شوکی کے مذاق پر اس کے دوستوں نے فرمائشی قہقہے لگائے۔ بھیڑ میں موجود کچھ بزرگوں کے چہرے پر تاسف کے آثار ابھرے۔ ریحان نے بے چارگی سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اس بار بآواز بلند معافی مانگی..... ''مجھے معاف کر دو.....'' شوکی نے خوش ہو کر تالی بجائی..... ''ہاں..... یہ بات..... لیکن کیا تمہیں تمہارے بڑوں نے معافی مانگنے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا..... بیٹا..... معافی ہاتھ جوڑ کر مانگی جاتی ہے..... آگے بڑھو اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگو.....'' مجمعے میں تیز سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ شاید وہ سب میرے صبر کی انتہا کے منتظر تھے۔ ریحان نے آگے بڑھ کر خود شوکی کے سامنے ہاتھ جوڑنے کی نیت سے قدم اٹھایا، لیکن میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا اور خود شوکی کے سامنے جا کھڑا ہوا کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ شوکی کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک لہری ابھری۔ خوف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ خوف کو خوف کی حد میں رکھ کر دوسرے کو مجبور کیا جائے۔ اگر اس موقع پر میں شوکی کی بات ماننے سے انکار کر دیتا تو چاہے

مجھے بعد میں جو بھی نتائج بھگتنا پڑتے.....لیکن شوکی کا علاقے کے لوگوں پر پھیلایا ہوا خوف کا یہ جال ٹوٹ جاتا.....اور اس وقت وہ اس کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں اپنے ڈر اور دہشت کے بت کو پاش پاش ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ میں یہاں اس کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے کھڑا تھا، لیکن شوکی نے پورے مجمعے کو یہی باور کرا رکھا تھا کہ میں اس کے خوف کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ میں کچھ دیر مزید شوکی کی آنکھوں میں اس بے یقینی اور بے چینی کی لہر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا لیکن ریحان کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔

''آیان.....میری خاطر یار.....'' میں نے ریحان کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر التجا تھی۔ میرا بھائی مجھے اس وقت دنیا کا سب سے مجبور انسان نظر آیا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر شوکی کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ شوکی کے دوستوں نے تالیاں پیٹیں اور سیٹیاں بجائیں۔ بھیڑ میں بہت سے لوگوں نے سر جھکا دیے۔ یہ صرف میری نہیں شاید ان کے اندر کے آدمی کی بھی شکست تھی۔ شوکی چند لمحے مجھے انہی سفاک نظروں سے گھورتا رہا اور پھر چلا کر سب کو سنانے کے لیے بولا'' آج تو معاف کیے دیتا ہوں.....لیکن آئندہ اگر شوکی کے راستے میں آیا تو میرے جوتوں پر اپنا ماتھا بھی رگڑے گا تو نہیں معاف کروں گا.....'' میں پلٹ کر واپس جانے لگا تو شوکی نے ریحان کو آواز دی'' سنتے ہو بڑے بھیا' اپنے چھوٹے بھائی کی غلطی کا جرمانہ تو بھرتے جاؤ.....''

شوکی شاید بھیڑ کو یہ پیغام بھی دلوانا چاہتا تھا کہ ان لڑکوں نے اسے اس علاقے میں بھتہ لینے سے روکا تھا آج ان کا لیڈر خود اسے بھتہ دینے پر تیار ہے۔ یہ سارے نفسیاتی حربے شوکی جیسے غنڈوں کو بخوبی پتہ تھے، اور شاید یہ ان کا کاروبار دہشت کے لیے ضروری بھی تھے۔ ریحان نے ٹوٹی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا اور اپنی جیب سے دو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر شوکی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ یہ وہی دو ہزار روپے تھے جو میں نے گزشتہ رات ریحان کو امی کو دینے کے لیے حوالے کیے تھے۔ میری زندگی کی پہلی کمائی جسے دیکھ کر میری ماں کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے ہی سہی.....پر ایک ایسی چمک لہراتی جو میری اس ناکارہ زندگی کا حاصل ہوتی۔ ریحان نے وہی دو ہزار شوکی کو دے دیے۔ شاید اس بات کا علم بھی ابا نے ہی اسے دے رکھا ہوگا۔ شوکی کے لیے ان دو ہزار روپوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایسے جانے کتنے نوٹ وہ روزانہ آس پاس کی دوکانوں سے لوٹ کر لے جاتا ہوگا مگر میرے لیے وہ دو ہزار کیا تھے، یہ میں ہی جانتا تھا۔ ابا کی پوری پینشن، امی کے لیے مہینے بھر کا سودا سلف، چھوٹی کے لیے مہینوں سے کیا ہوا گرم شال کا وعدہ، ریحان کی پسند کی کوئی کتاب..... جانے کون کون سے خواب چھپے تھے ان دو ہزار کے نوٹوں میں.....چاہے ان میں سے کوئی ایک خواب ہی پورا ہوتا پر ہو تو جاتا.....ریحان نے میرا وہ پہلا معصوم خواب شوکی کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ شوکی نے چند لمحے حقارت سے ان نوٹوں کو دیکھا'' ہونہہ.....بس.....اتنے کے تو شوکی روزانہ پان کھا جاتا ہے.....'' شوکی نے بے پروائی سے وہ نوٹ اپنے سر سے وار کر پیچھے کھڑے اپنے ساتھیوں پر نچھاور کر دیے۔ ریحان نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بھیڑ کے اندر سے راستہ بناتے ہوئے واپسی کی راہ لی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے'' سچ ہے بھئی.....ان غنڈوں سے کون نپٹ سکتا ہے''۔'' لڑکے نے اچھا ہی کیا.....ورنہ ساری عمر کا نقصان اٹھاتا.....''۔

''ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ سارنگا سے پنگا ان کو مہنگا پڑے گا.....'' ریحان سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے میرا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا

رہا..... میں تو پہلے ہی اپنی ساری سماعتیں کھو چکا تھا۔ میرے لیے اب کوئی لفظ معنی نہیں رکھتا تھا۔ شاید میں وہیں شوکی کے سامنے کھڑے کھڑے ہی مر گیا تھا۔

ریحان مجھے گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن کیفِ فراق کے سامنے میں نے اس سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

''تم لوگ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا..... اب مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو.....'' ریحان سٹ پٹا سا گیا ''لیکن وہاں گھر میں سب لوگ ہمارا انتظار کرتے ہوں گے.....''۔

''تم تنہا واپس جا کر انہیں یہ شرم ناک داستان سنا سکتے ہو.....'' میں ریحان کی مزید کوئی بات سنے بغیر وہاں سے پلٹ گیا۔ ریحان جانتا تھا کہ اس وقت میں اس کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔ وہ پیچھے سے چلا کر بولا ''اچھا ٹھیک ہے لیکن جلدی گھر واپس لوٹ آنا..... امی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں گی.....''

میرا دل اس وقت زور زور سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ میں اتنی زور سے چیخنا چاہتا تھا کہ میری آواز سے آسمان پھٹ جائے..... جانے میں کہاں جا رہا تھا؟ شاید کسی ایسے ہم درد کی تلاش میں جس کے سامنے میں اپنی روح پر لگے ان زخموں کی ٹیسوں کو کچھ دیر کے لیے بھلا سکتا، اور پھر مجھے تب ہوش آیا جب میرا ہاتھ شیخ صاحب کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور تنویر میرے سامنے کھڑا تھا ''ارے..... بڑی لمبی عمر پائی ہے تم نے..... ماموں ابھی تمہارا ذکر ہی کر رہے تھے۔'' تنویر اپنائیت میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر بیٹھک کی جانب لے گیا۔ صحن کے برآمدے میں ایک جانب بنے باورچی خانے سے دوپہر کے کھانے کی خوشبو سے سارا آنگن مہک رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بے وقت آمد آداب کے خلاف ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے وقت کا احساس ہی کب تھا بھلا؟ اور پھر جب کچھ ہی دیر بعد بیٹھک میں خوان آنے لگے تو میرے خدشات حقیقت میں بدل گئے۔ شیخ صاحب اور ان کے گھر والے میری آمد کے وقت دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے اور میری وجہ سے انہیں اٹھنا پڑا تھا۔ میں تنویر اور شیخ صاحب سے معذرت ہی کرتا رہ گیا کہ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے اور میں یوں اچانک آنے پر بہت شرمندہ ہوں مگر میزبان بھلا کب مہمانوں کے عذر سنتے ہیں؟ مجبوراً مجھے شیخ صاحب اور تنویر کا ساتھ دینے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی چند نوالے نگلنا پڑے۔ بے وقت اور بنا بھوک کھانا بھی کیسی سزا ہے؟ اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔ شاید انسان سدا ہی سے بس اپنی منشا کا غلام ہے۔ اسی لیے یہ بڑے بڑے تیاگی اور جوگی اپنی مرضی کو ترک کر دینے میں ہی اپنی زندگی کا حاصل پوشیدہ سمجھتے ہیں۔

کھانے کے بعد درمیانی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور قہوہ تھما دیا گیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دروازے کی دوسری جانب گہنا تھی۔ شیخ صاحب نے باتوں کے دوران میری ذہنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور پھر آخر مجھے انہیں آج کا تمام واقعہ تفصیل سے سنانا ہی پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس تمام عرصے میں درمیانی دروازے کے پیچھے ہماری گفتگو کو مستقل سنا جا رہا ہو۔ لہٰذا بار بار یہ بھول جاتا کہ میں شیخ صاحب سے مخاطب ہوں یا پھر اس مسیحا سے کہ جس کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے مجھے راحت محسوس ہو رہی تھی۔

میری بات ختم ہونے پر شیخ صاحب نے لمبی سی سانس لی۔ ''چلو جو ہوا بہتر ہوا میاں..... دراصل میں خود بھی تمہیں یہی کہنے کے لیے کل سے بلا رہا تھا کہ اس فساد کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔ تم نے آج بڑی بہادری کا کام کیا۔ بہادری صرف دشمن کو زیر کر لینے کا ہی نام نہیں۔ اصل بہادر وہ ہوتا ہے جو اپنے

غصے اور خواہش پر قابو پالے۔ جو تم نے کر کے دکھادیا.....''

میں خاموش رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے معذرت کر کے اندر چلے گئے۔ پردے کے پیچھے سے تنویر کو برتنوں کی واپسی اور مزید چائے کے لیے پوچھا گیا۔ تنویر نے برتن لوٹا دیے۔ میں نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ شیخ صاحب بھی لوٹ آئے۔ جانے کیوں اس وقت میرا دل بہت عجیب انداز میں دھڑکا۔ شاید دل کی فریادیں کبھی کبھی براہ راست ساتویں آسمان سے بھی پرے قبولیت کے کسی ستون سے جا کر ٹکراتی ہیں۔ ٹھیک اسی وقت جب میں شیخ صاحب سے رخصت طلب کر کے پلٹنے والا تھا۔ درمیانی پردہ ہٹا اور شیخانی جی بیٹھک میں آگئیں۔ ان کے پس منظر میں ستارہ اور گہنا کی جھلک بھی دکھائی دے گئی وہ دونوں دروازے کے پرے رکی رہیں۔ شیخانی جی نے مجھ سے کہا کہ وہ اور دونوں بچیاں سمجھتیں ہیں کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے اس شہر سے کہیں باہر چلے جانا چاہئے تاکہ وہ غنڈے مزید کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ میرا دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ گویا وہ میرے بارے میں سوچتی ہے۔ ابھی اس کی ماں نے یہی تو کہا کہ وہ دونوں بھی ایسا سوچتی ہیں۔ ستارہ اور گہنا..... میری نظر اٹھی اور شیخانی جی کے پس منظر میں فکر مندی کھڑی گہنا پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے دنیا میں سب کچھ برا نہیں ہے۔ کوئی ماہ رو ہے جو میرے لیے پریشان ہے۔ شیخانی جی نے مسکرا کر پوچھا ''اب تو تمہارے ابا تم سے ناراض نہیں رہیں گے؟'' اور ان کی بات ختم ہوتے ہی گہنا کی کھلتی آواز نے ماحول متبسم کر دیا ''اور ہاں..... اگر اس بار آپ کے ابا آپ کو گھر بدر کریں تو فٹ پاتھ پر رات گزارنے کے بجائے یہاں آجایئے گا۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔'' شیخ صاحب نے تنبیہ کی ''گہنا..... ایسا نہیں کہتے.....'' میں بھی مسکرایا۔ ''گھر بدر کیا تو آپ کی پیش کش پر ضرور غور کروں گا، لیکن اگر شہر بدر کرنے کے احکامات آگئے تو پھر کیا ہوگا.....'' سب زور سے ہنس پڑے۔ وہ مسکرائی اور میرا زندگی میں کھویا اعتماد بحال ہونے لگا۔ دروازے پر رخصت کرتے وقت تنویر نے مجھے بتایا کہ وہ آج کل شام میں سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ جڑنا چاہوں تو اسے خوشی ہوگی۔ ''نہیں تنویر..... یہ مقابلے کا امتحان وغیرہ میرے بس کی بات نہیں..... مجھے تو اس مستقل غلامی سے دور ہی رکھو..... ویسے تمہیں یہ خیال کیسے آیا.....؟''۔

''بس..... سوچا کہ یہ معرکہ بھی سر کر لیا جائے..... افسر بن کر دیکھا جائے.....'' میں نے مسکرا کر تنویر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''افسر بن کر ہمیں نہ بھول جانا جہاں پناہ.....''

دن بھر آوارہ گردی کے بعد میں شام ڈھلے کالونی میں داخل ہوا تو محلے میں مشی کے گھر کے باہر غیر معمولی چہل پہل اور چند پولیس والوں کو کھڑا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اچانک بھیڑ میں سے راجہ دوڑتے ہوئے آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

''کہاں تھا تو انو..... یار شوکی اور اس کے غنڈوں نے مشی کو بہت مارا ہے..... ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایمبولینس میں ہسپتال لے کر گئے ہیں.....''

باب 8

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ راجہ نے مجھے بتایا کہ شام کو جب مشی فٹ بال گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا تو محلے کے باہر اسے شوکی گروہ نے گھیر لیا اور اسے مجبور کرنے لگے کہ وہ ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے ورنہ وہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ مشی کے انکار پر بات بڑھ گئی اور انہوں نے مشی کو بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر وہیں سڑک کنارے پھینک ڈالا۔ بالا ایمبولینس میں مشی کے ابا کے ساتھ ہسپتال جا چکا تھا اور راجہ میری تلاش میں نکلنے والا تھا۔ راجہ زار و قطار رو رہا تھا۔ خود میرا دل ایسا ڈوبا کہ میرے لفظ ہی گم ہو گئے تھے۔ ہم ہسپتال پہنچے تو کالونی کے بزرگ مختلف ٹولیاں بنائے یہاں وہاں کھڑے سرگوشیوں میں مشغول تھے۔ انہی میں مجھے ابا بھی ایک ٹولی میں کھڑے دکھائی دیے۔ ریحان نے ہسپتال کی راہداری میں مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکا۔ ''کہاں تھے تم..... کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں.....'' میں نے ریحان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اس سے پوچھا ''مشی اب کیسا ہے..... کس وارڈ میں رکھا ہے اسے.....؟'' ریحان نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ وہ اسے آئی سی یو میں لے گئے ہیں.....'' میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مشی کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لے جایا گیا تھا۔ مطلب اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ میں ان سب کے ساتھ لرزتے قدموں سے آئی سی یو کے باہر والی راہداری میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ صرف بالا مشی کے ابا کے ساتھ راہداری میں دیوار کے ساتھ جڑی کرسیوں کی قطار میں خاموش سا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں تیزی سے اٹھ کر میری جانب بڑھا جیسے کوئی ناراض بچہ اپنی ماں کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے کھلونے کی شکایت کرنے کے لیے اس کی جانب دوڑتا ہے لیکن وہ میرے قریب آ کر بھی کچھ کہہ نہیں پایا۔ بس میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو پڑا۔ اس کے ہاتھ میں مشی کی ٹوٹی ہوئی عینک کا فریم تھا۔ مشی کو بچپن میں ہی نظر کی عینک لگ گئی تھی اور ہم جب اسے چشمش کہتے تھے تو وہ بہت چڑتا تھا۔ دراصل اس کا یہ بگڑا ہوا نام یعنی مشی بھی اسی چڑ یعنی چشمش کی الٹی اختراع تھا۔ وہ جہانگیر سے چشمش اور پھر مشی کب بنا یہ تو ہمیں یاد نہیں تھا لیکن اتنا ہم سب جانتے تھے کہ ہم چاروں میں وہ سب سے زیادہ نازک اور نفاست پسند تھا۔ گھر کا اکلوتا بچہ ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کا شدید لاڈلا اور باپ کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے شروع سے ہی ان لڑائی جھگڑوں سے سخت کوفت ہوتی تھی اور ہمارے ہر پھڈے کی شروعات سے ہی اس کی یہ کوشش رہتی تھی کہ معاملہ صلح صفائی سے ہی مل جائے تو بہتر ہے، لیکن اگر معاملہ آخر کار اس کے برعکس بھی ہوتا تو اس نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔ مشی کی درجنوں عینکیں ان جھگڑوں کے دوران ٹوٹی تھیں لیکن آج بالے کے ہاتھ میں وہ شکستہ شیشوں والا فریم دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ آج ہمارا دوست تنہا دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی مشی کے ساتھ ہوتا تو ان کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ تنہا مشی کو للکارتے۔ ہمیں جدا کرنے والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔ اچانک راہداری کے آخری سرے سے چچا فراق اور مرزا بوکھلائے ہوئے سے آتے دکھائی دیے۔ مشی کے ابا نے جلدی سے پوچھا ''خون کا انتظام ہو گیا.....؟''

''ہاں..... خون تو ہم بلڈ بینک میں جمع کرا آئے ہیں اور ڈاکٹر کو اطلاع بھی کر دی ہے، لیکن شاید اور ضرورت بھی پڑ جائے۔'' مشی کے ابا نے

ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا دیے "یا مالک..... بس تیرا ہی آسرا ہے..... میرے بچے پر رحم کر....."

کتنی عجیب بات تھی کہ ہم تین دوستوں میں سے کسی کا بھی خون مشی کے خون کے گروپ سے میل نہیں کھاتا تھا جبکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد دوستوں کا خون بھی ایک جیسا ہو جاتا ہوگا کیونکہ یہ وہ رشتہ ہے جو خون کے رشتوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔

جانے کب گہری شام رات میں ڈھلی اور کب رات کو صبح کے اجالے نے نگل لیا۔ ہمارے لیے وقت اور گھڑیاں ٹھہر چکی تھیں۔ ہم وہیں آئی سی یو کی راہداری میں دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ مشی کی حالت بگڑے اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ گزر چکے تھے۔ جب بھی وارڈ کا دروازہ کھلتا ہم سب کے دل دھک سے رہ جاتے۔ مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشے سے اسے پٹیوں میں لپٹا پڑا دیکھ لوں۔ پولیس والے تین چار مرتبہ مشی کا بیان لینے آ چکے تھے لیکن وہ ہوش میں آتا تو کوئی بیان دیتا میں نے مرزا کے ذریعے اسماعیل کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ شاید میں دو چار روز ٹیوشن کے لیے نہ جا سکوں۔ لہٰذا وہ مجھے لینے نہ آئے۔ ریحان نے دبے لفظوں میں مجھے ایک دو بار گھر چل کر تازہ دم ہو جانے کا کہا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے تب تک نہیں ٹلوں گا جب تک مشی کی حالت سنبھل نہیں جاتی۔ امی اور رافعہ محلے کی باقی عورتوں سمیت اب تک دو بار وارڈ کے باہر ہی سے مشی کو دیکھنے آ چکی تھیں۔ البتہ مشی کی اماں تو اسی وقت سے جائے نماز پر سجدے میں پڑی ہوئی تھیں جب سے انہیں اپنے لاڈلے کی خبر ملی تھی وہ مشی کو دیکھنے بھی نہیں آئی تھیں۔ راجہ اور بالا بھی دو روز سے اپنے گھروں کو نہیں گئے تھے۔ ہم تینوں کے دل کے اندر اس وقت جو طوفان اٹھ رہا تھا اسے ہم نے صرف مشی کی ابتر حالت کے پیش نظر اپنے سینے میں دبا رکھا تھا، اور شاید کہیں نہ کہیں اس جوار بھاٹے کی خبر ہمارے والدین کو بھی تھی۔ تبھی جب تیسری رات محلے کے بزرگ مشی کے ابا کو تسلی دے کر گھر لوٹنے کے لیے چلے تو انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

"غصے میں آ کر ایسا کوئی قدم نہ اٹھا لینا کہ جس کے لیے بعد میں تمہیں پچھتاوا ہو۔ اللہ نذیر کے بیٹے کو جلد شفا عطا کرے، یاد رکھو..... قانون ایسے غنڈوں سے نپٹنے کے لیے ہی بنا ہے....."

میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اس وقت یہ قانون کہاں تھا جب ہم چاروں حوالات میں بند تھے، لیکن میں چپ رہا۔ یہ وقت ان سے بحث کے لیے مناسب نہیں تھا۔ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ شرافت انسان کو بزدل بنا دیتی ہے یا بزدل اپنے اوپر شرافت کا لبادہ اوڑھے پھرتے ہیں؟؟ شرافت کی اصل تعریف کیا ہے؟ اور کیا تھانے کچہری جیسی جگہیں صرف شریفوں کے نام پر ہی ہمیشہ کے لیے بٹہ لگا دیتی ہیں کیا شرافت اجلا لباس اس قدر نازک ہوتا ہے کہ ان مقامات سے صرف گزر ہی اسے ہمیشہ کے لیے داغ دار کر دیتا ہے؟ کہ انہیں ہمیشہ سے بُرے لوگوں کی گزرگاہ سمجھا گیا ہے۔

تو پھر شرفاء کو انصاف دلانے کے لیے کب اور کون سی جگہ وجود میں آئے گی؟ اگر کسی شریف کا واسطہ کسی غنڈے سے پڑ جائے تو وہ داد رسی کے لیے کہاں جائے؟ کیونکہ بقول ابا تھانہ کچہری جانا شرفا کو زیب نہیں دیتا۔ کاش حکومت نے شرفا اور غیر شرفا کے لیے علیحدہ سے انصاف کی فراہمی بھی ممکن بنائی ہوتی کیونکہ جس دوغلے، منافق اور بوسیدہ معاشرے میں ہم نے جنم لیا ہے وہاں تو انصاف سے متعلق ہر مقام کو پہلے ہی ناکامی کا سامنا ہے یا پھر شاید یہ بھی ہم جیسے نام نہاد شرفاء کا حقیقت سے فرار کا ایک خود ساختہ بہانہ ہے۔ دراصل یہ ہم جیسے شرفاء ہی ہوتے ہیں جو اس غنڈہ گردی کے پھلنے پھولنے کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف گلیوں کے نکڑ، سنسان چوراہوں اور گھر کی چار دیواری کے پیچھے چھپ کر سرگوشیاں کرنا آتی ہیں۔ ہم برائی کے خلاف اعلان

کرنے کی جرأت ہی نہیں رکھتے، صرف کسی غیبی نجات دہندہ کے انتظار میں ہجوم کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ کبھی ہجوم سے ایک قدم آگے بڑھ کر ظالم کو للکارنے کی ہمت نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمیں تنہا رہ جانے کا خوف ہر دم ستاتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے اردگرد کی اس منافقت سے گھن آنے لگی تھی۔

آخر آسمان کو ہم پر رحم آیا اور تیسرے دن مشی نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں۔ اتفاق سے اس وقت اس کے نزدیک بالا موجود تھا۔ وہ چیختا چلاتا شور مچاتا باہر راداری میں نکل آیا۔ مشی کے ابا کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی اور میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بالے کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''انو..... یار..... وہ..... وہ مشی کو ہوش آ رہا ہے۔'' ہم سب اندر کی جانب بھاگے، راہداری میں کھڑا تھانے دار بھی اپنے منشی کے ساتھ لپکا۔ مشی کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے نیلے ہونٹوں پر وہی بچپن والی معصوم سی مسکراہٹ ابھری۔ اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔ ''انو..... کہاں تھا یار.....''

میں نے جلدی سے مشی کا ہاتھ تھام لیا ''میں یہیں ہوں..... اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا.....'' تھانے دار نے جلدی سے ہمیں ایک طرف کیا اور مشی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''تمہاری یہ حالت کس نے بنائی..... کیا تم ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہو..... انہیں پہچان سکتے ہو.....؟''

مجھے تھانیدار کی بات پر شدید غصہ آ گیا۔ ''آپ کو ابھی تک ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلا..... یہ وہی لوگ ہیں جن کے کہنے پر آپ نے اس روز ہمیں گرفتار کیا تھا۔ آپ کو ابھی تک ثبوت اور گواہ کی تلاش ہے۔'' تھانے دار نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''دیکھو لڑکے..... مجھے بیان لینے دو..... میں یہ ساری حقیقت زخمی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں.....''

ٹھیک اسی لمحے مشی کے ابا نے مشی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اشارہ کیا جو ہر مجبور اور غریب باپ اپنے تئیں اپنی اولاد کی بہتری کے لیے کر سکتا ہے۔ مشی نے بے چارگی سے ہماری طرف دیکھا اور آنکھیں موند لیں ''نہیں..... میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا..... نہ ہی دوبارہ سامنے آنے پر پہچان سکوں گا کیوں کہ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔''

راجہ اور بالے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ تھانے دار اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے مشی سے سوالات کرتا رہا اور آخر کار ڈاکٹر کی مداخلت پر بیان ختم کر کے وہاں سے چلا گیا۔

مشی کے بے ہوشی کے وقفوں میں بتدریج کمی آتی گئی۔ چوتھے روز اس نے زبردستی ہمیں کپڑے اور شکلیں بدلنے کے لیے گھر بھجوا دیا۔ پانچویں روز میں چند لمحوں کے لیے ناہید کو ٹیوشن دینے بھی چلا گیا۔ ناہید کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ غیر ضروری سوالات سے ازحد پرہیز کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''آیان بھائی..... اچھا ہوا آپ آ گئے..... میں اور بوا ابھی آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔ پتہ ہے بھیا..... بابا بھی آج رات کی فلائیٹ سے واپس آ رہے ہیں۔ سچ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے.....'' میں ناہید کی دل جوئی کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ورنہ میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔

ٹیوشن سے فارغ ہو کر ہسپتال پہنچا تو شیخ صاحب تنویر سمیت کمرے سے نکلتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلہ کیا۔

''یہ کیا میاں..... اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم نے ہمیں خبر تک نہیں کی..... وہ تو اچھا ہوا کہ تنویر میاں کی مرزا صاحب سے ملاقات ہو گئی اور

ان سے اس سانحہ کا پتہ چلا۔'' میں نے جواز پیش کیا۔

''دراصل میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ پہلے ہی گھر کی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں.....''

لیکن شیخ صاحب اب تک ناراض سے تھے ''نہیں آیان میاں..... بس آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا..... اور کچھ نہیں..... جانتے ہو یہ بات سن کر شیخانی جی اور بچیاں کس قدر پریشان ہیں۔ تم آجاتے تو انہیں بھی کچھ حوصلہ ہو جاتا۔''

''ضرور حاضر ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ مشی کی حالت بہت سیریس تھی۔ ابھی دو رات پہلے ہی تو اس نے آنکھیں کھولی ہیں۔'' شیخ صاحب کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے..... ''ہاں میاں..... بڑا ظلم کمایا ان ظالموں نے..... خدا انہیں پوچھے گا.....'' میرا جی چاہا کہ میں ان سے کہوں کہ ''اگر ہر ظالم کو اس دنیا میں خدا نے خود پوچھنا ہوتا تو آج یہ دنیا جنت ہوتی'' لیکن میں چپ رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مجھ سے جلد گھر آنے کا وعدہ لے کر اٹھ گئے۔

راجہ اور بالے کو میں نے کسی کام سے باہر بھیج رکھا تھا لہٰذا ہر آہٹ پر میں چونک چونک جاتا تھا۔ آخر ساڑھے دس بجے کے قریب وہ پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم تینوں مشی کو غنودگی میں چھوڑ کر باہر راہداری میں آ گئے۔ راجہ کی آواز دھیمی لیکن پرجوش تھی۔ ''کام کی ابتداء ہو گئی ہے..... ریگل سینما کی پچھلی گلیوں میں آج رات ہفتہ مانگنے والوں سے نپٹنے کے لیے یہ چھ لڑکے تیار کر دیے ہیں اور وہ قدیر ہے نا۔ ہائی اسکول والا ہمارا کلاس فیلو وہ آج کل شام کے کسی اخبار کا رپورٹر لگا ہوا ہے وہ کوریج بھی دے گا اس واقعے کی۔ بس دعا کرو کہ کوئی چوک نہ ہو جائے.....''

''کوئی بات نہیں..... اگر آج وہ ہم سے چوک بھی گئے تو کل پھر آئیں گے۔ اب یہ جنگ ہم میں سے کسی ایک کے خاتمے پر ہی ختم ہو گی۔''

ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس بھتہ خوری کے خلاف خود ہمیں ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا، اور اس کام کے لیے ہم نے آس پاس کی گلیوں میں موجود اپنے جیسے درجنوں فارغ الاوقات نوجوانوں کو متحرک کرنے کا فیصلہ کیا تھا جنہیں راتوں کو گلیوں کی نکڑ اور سڑک کے تھڑوں پر بیٹھنے اور گپ شپ کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم چاروں کی پیدائش اسی علاقے کی تھی اور ہم میں سے ہر ایک کہ بہتوں سے جان پہچان تھی۔ ہمارے اسکول کے لڑکے کالج اور اب یونیورسٹی کے ہم جماعتوں کی ایک کثیر تعداد انہی گلیوں میں بستی تھی۔ ان سب کے والدین بھی انہیں دن بھر ناکارہ اور نالائق ہونے کے طعنے دیتے تھے اور ملک کے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی صرف ایک ہی تھا ''روزگار'' لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی ان میں سے ایسے بہت سے ہوں گے جن کے دلوں پر منافقت کی مہر نہیں لگی ہو گی۔ ان کے اندر بہتے خون میں انا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے جراثیم بھوک، بے کاری اور بے روزگاری کے طعنوں نے ختم نہیں کیے ہوں گے۔ البتہ شوکی اور اس کے گروہ کو ہم نے اپنے لیے رکھ چھوڑا تھا اور ہم رات دیر تک اس پیامبر کا انتظار کرتے رہے جسے ہم نے شوکی کی خبر دینے پر لگا رکھا تھا۔ آخر صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے مرزا ہانپتے کانپتے ہسپتال پہنچ گیا۔ ''وہ لوگ پٹھان کے ہوٹل پر چائے پراٹھے کے ناشتے کے لیے رکے ہیں پٹھان انہیں ناشتہ دینے میں کچھ دیر لگائے گا۔ میں اشارہ کر آیا ہوں۔'' ہم تینوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ مرزا کچھ ہچکایا ''ایک بار پھر سوچ لو۔ بات بہت بڑھ جائے گی''۔ ''بات تو پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔ تم بس یہ دھیان رکھنا کہ ریگل چوک سمیت کم از کم دو چار محلوں میں ان گروہوں کو آج رات ٹھیک ٹکر ملنی چاہئے۔ شوکی گروہ پر حملے کی خبر تیزی سے گلیوں میں پھیلنی چاہئے۔'' مرزا تیزی سے راہداری میں ہمارے پیچھے لپکا ''اس کی تم فکر نہ کرو..... مگر ٹھہرو..... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' مرزا تیزی سے ہمارے سامنے آ گیا۔

بالے نے اسے گلے لگا لیا ''نہیں مرزا جی..... تمہیں اور بہت سے کام کرنے ہیں.....'' وہ پیچھے سے ڈوبتی ہوئی آواز میں چلایا ''اپنا خیال رکھنا نالائقو.....'' ہم جب پٹھان کے ہوٹل کے قریب پہنچے تو ہمیں دور سے ہی شوکی اور اس کے دو ساتھیوں کے قہقہے سنائی دیے۔ شاید یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ دیر رات تک ہفتہ اکٹھا کرنے یا آوارہ گردی کرنے کے بعد یہاں مفت کا ناشتہ کرنے آتے تھے۔ ہم ان کی بے خبری میں کچھ یوں اچانک ان کے سر پر پہنچے کہ انہیں سنبھلنے کا ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ پھر راجہ کی ہاکی اور بالے کی بائیک کی چین ان پر کچھ اس طرح برسی کہ مشی کے جسم پر لگے ہر زخم اور ہر نیل کا حساب برابر ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کارِ خیر میں پٹھان کے ہوٹل کے وہ ننھے منے بیرے اور چھوٹو بھی شامل ہو گئے جو نہ جانے کب سے روزانہ اس وقت شوکی کی گالیوں اور عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ پٹھان پہلے تو انہیں روکنے کے لیے چیخ رہا تھا پھر کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے شاگردوں کو شاباشی دینے لگا ''مارو ان خانہ خرابوں کو..... اس کا ہڈی توڑ دو.....'' شوکی اور اس کے ساتھی ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن شاید انہیں یہ ہتھیار استعمال کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ ہتھیار بہت دن تک استعمال نہ ہوں تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے حرام کی روٹیاں توڑنے والوں کا اندر زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے بھی چند زنگ آلود جسم ٹیڑے میڑھے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے شوکی کو کھینچ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا ''معافی مانگنے کے آداب یاد ہیں تمہیں''۔ شوکی نے بنا کچھ کراہتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر ڈھے گیا۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہم نے سوچ رکھا تھا۔ ہم گھروں کو جانے کے بجائے کیفے فراق کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے پولیس کی جیپیں ہمارے استقبال کو پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے ہم مرزا کو اپنے لیے وکیل کرنے کا تمام طریقہ کار سمجھا چکے تھے۔ مرزا نے ہمیں بتایا کہ اس رات ریگل سینما سمیت چار مقامات پر بھتہ خوروں سے علاقے کے لڑکوں کی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ صبح کے اخبارات میں چھوٹی مگر نمایاں خبروں میں بھتہ لینے والوں کے خلاف اس ایکے کا ذکر تھا۔ ہمیں بنا کسی تفتیش کے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں بالے اور راجہ کے ابا ہکلتے جھکتے اپنے بیٹوں کو کوستے ہوئے تھانے پہنچ گئے لیکن اس بار پولیس نے انہیں باہر ہی روکے رکھا۔ میرے گھر سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ابا مجھے لینے نہیں آئیں گے۔ پولیس نے اس بار ہم پر دفعات بھی بہت سخت لگائی تھیں اور پھر عصر کے وقت تک میرے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ مجھے ڈوبتے سورج کے سے ریحان کی رونی صورت دکھائی دی۔ اسے چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''انور یار..... یہ کیا کر دیا.....'' میں نے اس کی طرف دیکھا

''ابا نہیں آئے.....'' ریحان نے مجھ سے نظریں چرائیں۔

''میں انہی کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ اب تم سے کوئی رشتہ باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ نہ ہی تم جیل سے رہا ہونے کے بعد گھر کا رخ کرنا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ ہر تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔''

.....❁.....

باب9

میرے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھری ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغل اعظم نے شہزادے سلیم کو عاق کر دیا آخر کار.....'' میں ریحان اور چھوٹی جب کبھی اچھے موڈ میں امی کو تنگ کرنے بیٹھا کرتے تھے تو ہم اندازہ لگایا کرتے تھے کہ اگر کبھی ابا نے غصے میں مجھے عاق کر دیا تو میں ان کے کس کس ترکے سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں انگلیوں پر گنتا ''ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل، دو پرانے پارکر پین، ایک زنگ زدہ چھتری.....'' اور پھر امی ہمارے مارنے کو لپکتیں تو ہم ہنستے ہوئے بھاگ جایا کرتے تھے، لیکن آج ابا نے آخر کار مجھ سے اپنا رشتہ توڑنے کا اعلان کر ہی دیا تھا۔ ریحان نے جلدی سے مجھے تسلی دی۔

''ایسی بات نہیں ہے آیان..... وہ تم سے اب بھی بہت پیار کرتے ہیں..... بس ذرا غصے میں ہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ تم نے بھی تو ان کی آج تک ایک نہیں مانی.....''

''میری بات ہوتی تو میں نے آج تک انہی کی بات کے سامنے سر جھکایا ہے..... لیکن تم جانتے ہو اس بار معاملہ کچھ اور تھا۔ آج اگر مشی کی جگہ ان کا اپنا بیٹا اس ہسپتال کے بستر پر یوں پڑا ہوتا تو کیا تب بھی وہ مجھے یا تمہیں یوں لاتعلق رہنے کا حکم دیتے.....؟..... ہمارے والدین کے سبھی اصول سبھی ضابطے صرف اپنی اولاد کے لیے ہی کیوں ہوتے ہیں.....؟''

ریحان چپ رہا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ دوسروں کی مان لینے والا۔ خود ہار جانے والا۔ اسی لیے تو وہ ہمیشہ سب کے دل جیت لیتا تھا، اور میں ہمیشہ سب کچھ جیت کر بھی ہار جاتا تھا۔ آج شاید میں نے ایک اور رشتہ کھو دیا تھا۔

ریحان میرے پاس مزید ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن سنتری نے اسے واپس بلا لیا۔ میں واپس حوالات میں آیا تو راجہ اور بالا میرے کہے بنا ہی سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ بالے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''فکر نہ کر یار..... یہ سارے ابا ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ناریل کی طرح اوپر سے کڑک اور اندر سے ملائی کی طرح نرم۔ تیرے ابا بھی تجھے معاف کر دیں گے آخر کار.....''

باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ ایک سپاہی نے آ کر حوالات کے سامنے لگی ہوئی گیس بتی کی لو اونچی کی ''تم لوگوں میں سے آیان کون ہے.....؟'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''چلو تمہاری ضمانت ہو گئی ہے.....'' میں نے حیرت سے راجہ اور بالے کی جانب دیکھا ''میری ضمانت؟..... کس نے دی.....؟'' سنتری نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا ''بڑے کرموں والے ہو بھئی..... ورنہ میں نے تو آج تک سارنگا کے نائب کو خود کبھی کسی کی ضمانت کے لیے تھانے آتے دیکھا..... نہ سنا'' ہم تینوں اچھل ہی تو پڑے ''کیا کہا، سارنگا کا نائب میری ضمانت کے لیے آیا ہے.....؟'' بالے نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا ''انویار..... مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ ضرور وہ تجھے تھانے سے نکال کر کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے.....''

سپاہی زور سے ہنسا ''اسے نقصان پہنچانا ہو تو یہ حوالات اس کی پہنچ سے کیا دور ہے.....'' پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ انجانے میں شاید وہ

کوئی ''غیر سرکاری راز'' افشا کر بیٹھا ہے۔اس نے جلدی سے بات بدلی'' چلو جلدی کرو.....ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔''

میں نے باہر نکلتے وقت راجہ اور بالے کو اطمینان رکھنے کا اشارہ کیا۔تھانے دار کے کمرے کے دروازے پر ایک جھولتی ہوئی پرانی چک پڑی ہوئی تھی۔جہاں سے ایک خاص بیڑی کے دھویں کی مہک نے باہر نکل کر اس تمام اندھیری راہداری کو مہکا رکھا تھا۔

میں چک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا تو تھانے دار مؤدب سا بیٹھا ہوا سامنے والے کو کچھ وضاحت کر رہا تھا۔کمرے میں دو اور اشخاص اپنے مضبوط بازوؤں کے کف کہنی تک چڑھائے مستعد سے کھڑے تھے۔شاید وہ بیٹھے ہوئے شخص کے محافظ تھے۔تھانیدار کہہ رہا تھا''لیکن موسیٰ بھائی ان تینوں نے شوکی اور اس کے ساتھیوں کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دی ہے۔وہ تینوں اس وقت ہڈیوں کے وارڈ میں داخل ہیں.....لو یہ آ گیا تمہارا مجرم.....اسی کا نام آیان ہے.....یہی ان سب کا سرغنہ ہے.....''

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہو گیا اور میری جانب پلٹا۔وہ چالیس پینتالیس سال کا ایک دراز قد آدمی تھا۔چہرے پر نوکیلی مونچھیں، گلے میں کسا ہوا تعویز اور دائیں ہاتھ پر مضبوطی سے بندھا ہوا امام ضامن.....بازوؤں کی مچھلیاں کرتے کی آستین سے پھٹ کر باہر نکلنے کو تیار، ایک ہاتھ میں لوہے کا سخت کڑا، آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی اور کرختگی، چہرہ ہر احساس سے عاری اور گھنے بال لٹوں کی صورت میں گدی سے ہو کر شانوں پر جھول رہے تھے۔وہ موسیٰ تھا۔کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔موسیٰ کی آنکھوں میں ضرور کچھ بات تھی۔کچھ عجیب سی لہر.....جیسے ایکس رے.....وہ بغور میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا''اچھا.....تو یہ ہے وہ بہادر جس نے ایک ہی رات میں سارنگا کی چار ٹولیوں سے ٹکر لی ہے.....خوب.....بہت اچھا کیا.....اس حرام خور شوکی کی تو بچی ہوئی پسلیاں بھی توڑ ڈالنی چاہئے تھیں تجھے.....جی خوش کر دیا.....''

موسیٰ تھانے دار کی طرف مڑا.....''کوتوال جی.....شوکی کی طرف سے کیس میں واپس لیتا ہوں۔تم اس جوان کو ضمانت پر رہا کر دو .....کوئی کاغذ بھرنا ہے تو ابھی بھروالو.....''

ایس ایچ او نے مستعدی سے کہا.....''لکھت پڑھت بھی ہو جائے گی۔جب آپ نے کیس ہی واپس لے لیا ہے تو پھر بات ختم ہو گئی۔ جاؤ بھئی.....تم اپنے گھر جا سکتے ہو.....''

''میں اپنے دوستوں کو لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا.....اگر رہا کرنا ہے تو ہم تینوں کو رہا کرو.....ان پر بھی وہی الزام ہے جو مجھ پر تھا.....''

تھانے دار نے موسیٰ کی طرف دیکھا۔موسیٰ نے سر ہلایا۔

''لگتا ہے دوستی کے سبق پڑھ چکے ہو.....کوتوال جی.....اس کے دوستوں کو بھی جانے دو.....'' تھانے دار کے اشارے پر باہر کھڑا ایک سپاہی حوالات کی جانب چلا گیا میں نے موسیٰ سے پوچھا''میں اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''موسیٰ نے تازہ بیڑی زبان سے بھگو کر ہونٹوں میں دبائی۔اس کے قریب کھڑے ایک محافظ نے جلدی سے بیڑی کو تیلی دکھائی۔موسیٰ نے ایک گہرا کش لیا

''کیا کریں شہزادے.....تیری سفارش ہی بڑی اونچی آئی تھی.....تبھی تو مالک نے مجھے یہاں بھیجا ہے.....جا اب گھر جا.....تیرے گھر والے تیری راہ دیکھتے ہوں گے.....''

اتنے میں بالا اور راجہ بھی سپاہی کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ موسیٰ نے انہیں بھی غور سے دیکھا اس کے انداز میں کچھ ایسی دلچسپی تھی جیسے کوئی بزرگ اپنے خاندان کے چند شریر بچوں کو سرزنش بھی کر رہا ہو اور ساتھ ہی ان کی شرارت کا مزہ بھی لے رہا ہو..... اس نے آگے بڑھ کر پہلوانوں کے انداز میں راجہ اور بالے کے شانوں پر زور ڈالا اور ہم سب کے بازوؤں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا ''ہڈیاں مضبوطی سے بٹھائی ہیں اپنی اپنی جگہ پر تم سب نے..... میرے حرام کے جنے تو لگتا ہے صرف روٹیاں ہی توڑتے رہے آج تک.....'' ہمارے لیے سارنگا کا یہ روپ بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ آخر اس نے ہماری مدد کے لیے اپنے خاص کارندے موسیٰ کو تھانے ہماری ضمانت کے لیے کیوں بھیجا تھا۔ جبکہ ہمارے خلاف اس بار اتنے بڑے الزامات تھے کہ ہم آرام سے چھ چھ ماہ کے لیے جیل کی ہوا کھا سکتے تھے۔ اگر سارنگا کو ہم سے کوئی بدلہ لینا تھا یا ہمیں نشان عبرت بنانا تھا تو اس کے لیے ابھی اس کے پاس بہت وقت پڑا تھا۔ پھر ہمیں تھانے سے نکالنے کی اتنی جلدی کیوں؟ ہو سکتا ہے وہ اپنے حساب کتاب زیادہ دیر باقی نہ رکھنے کا عادی ہو؟؟

ہم جتنا سوچتے اتنا ہی مزید الجھتے رہے۔ جب ہم کیفے فراق کے قریب پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مرزا اور فراق چچا جا چکے تھے۔ ہم تینوں میں سے سب سے زیادہ مجھے گھر واپس جانے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن مجبوری تھی۔ گھر کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا۔ راجہ نے جدا ہونے سے پہلے مجھے اور بالے کو سختی سے تاکید کی کہ اب ہم تینوں میں سے کوئی بھی اکیلا کالونی سے باہر نہیں جائے گا۔ جب تک سارنگا کی نیت ہم پر پوری طرح کھل نہیں جاتی تب تک ہمارا تنہا گھومنا بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک غلطی کی سزا ہم مشی کے ہسپتال میں پڑے گھائل جسم کی صورت میں بھگت رہے تھے۔

اپنی گلی میں پہنچ کر میرے قدم خود بخود سست پڑ گئے۔ میں نے جھجکتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے زمین سے دو چار کنکر اٹھائے اور وقفے وقفے سے صحن میں اچھال دیے۔ کچھ ہی دیر میں صحن میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے کھلے دروازے سے چھوٹی نے جھانکا۔ اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی ''آیان بھائی..... آپ آ گئے..... مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور رہا ہو جائیں گے..... آپ جانتے ہیں آپ کے لیے آپ کی چھوٹی کتنا روئی ہے.....'' چھوٹی کے آنسو اب بھی ٹپکنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور صحن میں داخل ہو گیا ''کیوں تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا..... صبح ناشتے کی ملائی کا ایک حصہ دار تو کم ہوتا نا..... اب تمہارا اور اس پڑھاکو پروفیسر کا راج ہوتا سارے دسترخوان پر.....'' چھوٹی روتے روتے ہنس پڑی ''نہیں چاہیے اب مجھے اپنا حصہ..... کل سے میں اپنا حصہ بھی آپ کو دے دیا کروں گی..... بس اب آپ کہیں نہ جائیے گا..... آپ چھت پر چلیں میں آپ کے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں.....'' میں نے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ ابا کی سرد سی آواز گونجی

''وہیں رک جاؤ..... اب تمہارا اس گھر پر کوئی حق نہیں ہے..... تم کس منہ سے واپس آئے ہو..... ہم سب کے چہرے پر کالک پوت کر.....''

امی ان کے پیچھے برآمدے میں لپکیں..... ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... وہ اپنے گھر نہ آتا تو اور کہاں جاتا.....؟.....'' ابا چلائے ''نہیں ہے

یہ اس کا گھر.....اس گھر کو اپنا سمجھتا تو اس کی عزت کا بھی پاس ہوتا اسے.....اخباروں تک شہرت پہنچ گئی ہے اس کی لوفر گردی کی.....لوگ بازار میں مجھے روک روک کر پوچھتے ہیں کہ یہ آیان احمد آپ کا سپوت ہے جو شہر کے سب سے بڑے غنڈے سے الجھتا پھرتا ہے.....مطلب یہ تو اس غنڈے سے بھی بڑا غنڈا ہوا.....''

اتنے میں ریحان بھی چھت سے نیچے اتر آیا۔اس کی عادت تھی کہ وہ رات دیر تک چھت پر میرے کمرے میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا.....اس نے میری طرف داری کی ہمت کی.....''نہیں ابا.....اب انو کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے.....اب یہ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔''

ابا گرجے''بس.....بہت ہو گیا.....خبردار جو اب اگر کسی نے بھی اس کی طرف داری کی کوشش بھی کی.....پوچھو اس سے.....کیا میں نے اسے منع نہیں کیا تھا کہ اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے.....کیا میں نے اسے خود ہسپتال میں خاص طور پر یہ حکم نہیں دیا تھا کہ خود کو اس غنڈہ گردی سے علیحدہ رکھے.....لیکن اس نے ایک نہیں کئی بار پھر پورے خاندان کو رسوا کر دیا.....''

میں نے سر اٹھایا''انہوں نے ہمارے دوست کو موت کے منہ تک پہنچا دیا.....کل کو یہ سلوک وہ میرے یار ریحان کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں.....کیا تب بھی آپ.....''ابا نے غصے سے کانپتے ہوئے میری بات کاٹ دی''ریحان کو مت ملاؤ اپنے ساتھ.....یہ تمہاری طرح لوفر نہیں ہے.....''

گویا ابا کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی مجھے مار کر پھینک جائے انہیں تو بس اپنے بڑے اور سعادت مند بیٹے کی فکر تھی۔امی نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور وہ جلدی سے بولیں

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ریحان کے ابا.....دونوں بیٹوں میں فرق تو نہ کریں.....''ابا امی کی طرف پلٹے''اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے یہ فرق روا رکھنے کو.....کہو اس سے کہ اگر یہ ریحان کی طرح بننا چاہتا ہے تو آج سب کے سامنے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ یہ آئندہ اپنے ان آوارہ دوستوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔صرف اسی صورت میں مَیں اسے معاف کروں گا۔''

ابا کی بات سن کر سب ہکا بکا سے رہ گئے۔دنیا کی سب سے کڑی شرط رکھی تھی انہوں نے مجھے معاف کرنے کی۔ماحول پر سناٹا سا چھا گیا۔پھر میں نے ہی خاموشی توڑی''ہم چاروں میں سے ہر ایک کے والد دوسرے تینوں کے لیے وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ کے ان کے بارے میں ہیں اور ہم میں سے ہر ایک خود کو باقی تین کی بدنامی کا باعث سمجھتا ہے۔اگر میں ریحان کی طرح پڑھائی میں بہت زیادہ تیز نہیں ہوں تو اس میں ان تینوں کا نہیں.....میرا قصور ہے ابا.....اور پھر خدا نے ہر انسان کو الگ ذہن اور الگ استطاعت دی ہے،لیکن میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اتر سکوں،لیکن ہر طالب علم کا نصیب یا خواہش صرف سرکاری نوکری ہی تو نہیں ہوتی اور شاید میں کوئی بہت اچھا سرکاری نوکر بن بھی نہ پاؤں کیونکہ صبح نو سے شام پانچ بجے تک کی پابندی میرے مزاج کے خلاف ہے.....شاید میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں.....شاید میرا نصیب اور خواہش کچھ اور ہو.....؟؟.....''

امی چھوٹی اور ریحان دم سادھے میری بات سن رہے تھے۔کیونکہ زندگی میں پہلی بار میں نے ابا سے ایک ہی وقت میں اتنی لمبی اور سیدھی

بات کی تھی۔ ورنہ ہمارے درمیان نسلی فاصلہ کچھ اتنا طویل تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد صرف سلام دعا، ڈانٹ یا کسی ضرورت کے وقت میری ابا سے بات ہوتی تھی اور وہ بھی بذریعہ امی، چھوٹی یا ریحان اور صرف مجھ پر کیا موقوف..... مجھے تو لگتا تھا کہ ہمارے ملک کی نوے فی صد غریب اور اوسط درجے کی نوجوان نسل اپنے ماں باپ سے کھل کر اپنی بات نہیں کر پاتے۔ ابا کی سانس میری لمبی تمہید کے دوران پھرتی رہی۔ ''بہت خوب..... تو آج تم نے اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ ٹھیک ہے..... شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ تو تم اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتے..... اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو..... ساری زندگی سیکنڈ اور تھرڈ ڈویژن کے نمبروں سے بمشکل پاس ہونے والے کو ایسی کون سی پیشکش ہوگئی ہے لاکھوں روپے ماہانہ کمانے کی.....؟''

''مانتا ہوں کہ میں ساری زندگی بہت کم نمبروں سے کامیاب ہوا ہوں لیکن اس کی وجہ میری نالائقی سے زیادہ نمبر لینے کی دوڑ میں شامل نہ ہونے کی خواہش بھی تھی۔ میں نے ہمیشہ 35 نمبروں کو ہی کافی سمجھا..... کیونکہ میرے مضمون ہمیشہ آپ کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ آپ نے کبھی مجھے یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ میں خود کیا پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا بننا چاہتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج اپنے آپ کو ہی گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا تعلیمی کیریئر اوسط درجے کا ہے اور میرے سامنے کوئی بڑی منزل نہیں ہے..... مجھے چار پانچ گریڈ کی کسی سرکاری نوکری پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا جو میں کر نہیں سکتا.....''

امی نے بات بگڑتے دیکھ کر مجھے ڈانٹا ''انو..... یہ تو کیا کہہ رہا ہے..... اپنے ابا سے کوئی ایسے بات کرتا ہے.....؟''

ابا نے امی کو روک دیا ''نہیں کہنے دو اسے..... اس کے اندر کا زہر باہر تو آئے..... تاکہ تم سب کو بھی پتہ چل سکے کہ اس کے دل میں اپنے باپ کی کتنی عزت ہے..... اب سنو آیان میاں..... میں نے تمہاری سن لی..... اس گھر میں اب تم اسی وقت رہ سکتے ہو جب اپنے باپ کو کچھ بن کے اور کچھ کر کے دکھاؤ گے..... دوسری صورت وہی ہے کہ تمہیں یہاں رہنے کے لیے وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو میں تم سے ہمیشہ کہتا آیا ہوں..... اپنی تمام آوارہ گردی ترک کرو اور اپنے بھائی کی طرح اپنے باپ کا سہارا بننے کی کوشش کرو..... نہ کہ اپنے بزرگوں کا نام یوں بازاروں میں اچھالتے پھرو..... میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا.....''

میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ''ٹھیک ہے..... اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو میں اس گھر میں تبھی قدم رکھوں گا..... جب کچھ بن جاؤں گا..... نہ بن سکا تو آپ کو اپنی صورت کبھی نہیں دکھاؤں گا.....''

امی حواس باختہ ہوگئیں..... ''انو..... دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تیرا..... ریحان..... تو کچھ کہتا کیوں نہیں اپنے چھوٹے بھائی کو.....'' لیکن ریحان کی تو اپنی سیٹی گم تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑنے کے لیے میری جانب لپکا۔ چھوٹی رو پڑی ''آیان بھائی..... مت جائیں.....'' لیکن ابا چٹان کی طرح مضبوط کھڑے رہے۔ میں ریحان سے ہاتھ چھڑا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اندر امی اور چھوٹی رو رو کر ابا کو دہائیاں دیتے رہے لیکن ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تو قیر احمد کے اندر کا سخت گیر استاد آج اسے کسی دہائی کے سامنے پگھلنے نہیں دے رہا تھا۔ ریحان نے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو ابا نے زور سے ڈانٹ کر اسے اندر بلا لیا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہم غریب لوگوں کی جیبیں کتنی خالی اور انا کتنی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اینٹ پتھر کی کوئی بھی دیوار انا کی دیوار سے بلند نہیں ہو سکتی۔ میرے اور ابا کے درمیان بھی آج وہی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔

میرے قدم ایک بار پھر اسی مہربان بینچ کی طرف بڑھتے گئے جو ہمیشہ سے کیفے فراق اور میری تنہائیوں کا ساتھی تھا میں بہت دیر لیٹ کر آسمان کے تاروں سے پوچھتا رہا کہ اب کہاں جاؤں.....؟.....تارے مجھے دیکھ کر روتے رہے اور میرے سوالوں سے منہ چھپاتے رہے۔ جانے کتنی دیر بیت گئی اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی موٹر میرے سامنے سے گزر کر آگے جا کر رک گئی ہے اور پھر اس میں سے کوئی اترا ہے۔ میں اس وقت چونکا جب کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ ''کیوں جوان.....گھر نہیں گئے اب تک'' وہ موسیٰ تھا ''گیا تھا.....لیکن ابا نے گھر سے نکال دیا.....'' موسیٰ نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''یہ ساری دنیا کے بزرگوں کو ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کیا.....؟ اچھا چلو.....مالک تمہیں بلا رہے ہیں.....'' میں نے بے دھیانی میں پوچھا ''کون''۔

''ارے بھائی رنگا بھائی.....اپنے مالک تمہیں بلا رہے ہیں.....وہاں سامنے گاڑی میں۔'' میں زور سے چونکا.....ٹھیک اسی لمحے دور کھڑی کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک قدم نیچے اترنے کے لیے باہر نکلا۔

باب10

کار سے نیچے اترنے والا شخص سارنگا ہی تھا۔ لمبا قد، تانبے جیسی تیز گندمی رنگت، آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور سر کے دھار، بال سلیقے سے پیچھے کو اٹھائے ہوئے، فراخ ماتھا، ہونٹوں میں دبا پان، مضبوط کسرتی بدن، دائیں ہاتھ کی کلائی میں سٹیل کا کڑا اور بائیں ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی، مہنگی بوسکی کا کرتہ اور سفید کلف والی لٹھے کی شلوار میں ملبوس، بے خیالی میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ واقعی کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سلطان محسوس ہو رہا تھا۔ میں موسیٰ کے ساتھ چلتے ہوئے نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کار کے قریب پہنچ گیا۔ موسیٰ نے ہنستے ہوئے دور ہی سے سارنگا کو اطلاع دی..... ''کہتا ہے ابا نے گھر سے نکال دیا ہے..... ادھر بھی اپنی ہی کہانی ہے مالک.....''

موسیٰ کی بات سن کر رنگا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری ''تو تو سچ مچ نالائق تھا موسیٰ..... تجھے تو گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا ہوگا تیرے ماں باپ نے.....'' پھر اس نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''تو کہے تو میں خود چل کر تیرے باوا سے بات کروں..... انہیں بتاؤں کہ ہمارا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ لہٰذا وہ تجھے معاف کر دیں.....''

''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے..... اور پھر آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر تو انہیں پورا یقین ہو جائے گا کہ میں.....''

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا لیکن رنگا نے میری بات پکڑ لی تھی۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور موسیٰ سے کہا

''لے بھائی موسیٰ..... شہر میں صرف تو ہی اکیلا بدنام نہیں..... اپنا نام بھی شامل ہے اس افسانے میں..... ویسے لڑکا کہتا تو ٹھیک ہے..... اپنے تو قدم بھی جس چوکھٹ پر پڑ جائیں اسے دیمک مار جاتی ہے..... تو پھر تو ہی بتا کہ رنگا تیرے لیے کیا کر سکتا ہے..... تیرے لیے کہیں رہنے کا بندوبست کر دوں جب تیرے باوا راضی ہو جائیں تو واپس چلے جانا..... اور اطمینان رکھ..... کسی کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ بندوبست رنگا بھائی کی طرف سے ہے۔''

''نہیں..... آپ کا بہت شکریہ..... میں کچھ کر لوں گا.....''

''جیسے تیری مرضی بھئی..... خوش رہ'' رنگا نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

''چل بھئی موسیٰ..... ہماری نیا بھی پار لگا دے.....'' موسیٰ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کی جانب بڑھا۔ رنگا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکا ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ہم سب کی ضمانت کیوں دی۔ ہم تو آپ کے دشمنوں میں سے ہیں۔'' سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا ''سارنگ کا دشمن زمین میں چھ فٹ نیچے یا پھر چھ فٹ اوپر ننگا ہوتا ہے ساجن..... اور وہ لونڈے لپاڑے میرے آدمی نہیں میرے آدمیوں کے ورکر ہیں۔ گلیوں سے پیسے جمع کر کے اپنا گزارہ کرتے ہوں گے..... تو نے ٹھیک کیا ان حرام کے جنوں کے ساتھ..... کافی نام خراب کر ڈالا تھا انہوں نے رنگا کا بے فکر رہ..... اب ان میں سے کوئی تیری راہ میں نہیں آئے گا۔ آئے تو کاٹ ڈالنا..... آگے رنگا

سنبھال لے گا.....''

''لیکن آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ میں تو آپ کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں.....''

رنگا نے اپنا سر جھٹکا..... ''اسماعیل کو تو جانتا ہے ناں..... وہی حرام خور خبر لے کر آیا تھا تیری..... چل اب اپنے دماغ کو زیادہ نہ تھکا..... زیادہ سوال ہمیشہ چیزوں کو الجھا دیتے ہیں..... جو گتھی جتنی کھل سکے..... اسے اتنا ہی کھولا کر.....'' سارنگا نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی اور میں اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بند گتھیاں لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

اسماعیل کا رنگا کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اور اس نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ رنگا کو جانتا ہے۔ میں صبح تک یونہی الجھا بیٹھا رہا، اور پھر جب فجر کے بعد مرزا اور پھر فراق چچا کیفے پر آئے تو میری حالت جان کر پریشان ہو گئے۔ چچا فراق تو باقاعدہ غصے میں کھڑے ہو گئے۔

''لگتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب سے آج تفصیلی بات کرنی ہی ہوگی.....'' اتنے میں راجہ اور بالا بھی آ گئے۔ انہیں بھی شاید ابا کے فیصلے کی کوئی سن گن مل چکی تھی۔ وہ مشی کے لیے ہسپتال ناشتہ لے جانے کے بہانے سے گھر سے نکلے تھے۔ راجہ جذباتی ہو گیا۔

''یارانو..... اب ہم بھی اپنے گھروں میں نہیں رہیں گے۔ یہاں کسی کو ہماری فکر نہیں ہے۔''

مرزا نے انہیں ڈانٹا ''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ سب گھر والوں کو تمہاری فکر ہے۔ تبھی وہ تم لوگوں کو منع کرتے ہیں لیکن اس وقت انہیں تمہاری بات سمجھ نہیں آ رہی ہے..... یہ جنریشن گیپ Generation Gap ہے پیارے..... بھرتے بھرتے بھرے گا.....'' میں نے فراق چچا کا ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے انہیں روکا..... ''نہیں..... اب ابا سے کوئی بھی اس معاملے میں بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنی جگہ درست ہوں گے کہ ہر باپ ایک کامیاب اولاد کی خواہش رکھتا ہے، لیکن شاید وہ من چاہی کامیابی ہر اولاد کا مقدر نہیں ہوتی میں اپنی منزل اب خود تلاش کروں گا..... کم از کم منزل نہ ملنے کی صورت میں بھٹک جانے کا الزام تو میرے سر ہی رہے گا نہ.....؟'' وہ سب خاموش ہو گئے ہم کچھ دیر کے لیے مشی کے پاس ہسپتال بھی گئے۔ اسے گھر والوں سے خبر مل چکی تھی کہ اس کا یہ حال بنانے والوں کو ہم نے کسی دوسرے ہسپتال کے بستروں کی زینت بنا دیا ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت فکر مند تھا۔ ''انو یار..... یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا..... اگر تم لوگوں کو کچھ ہو جاتا تو.....'' راجہ نے لمبی سی انگڑائی لی..... ''ہو جاتا تو ہم تینوں بھی اسی وارڈ میں پڑے ہوتے اور اس سرکاری ہسپتال کی خوبصورت نرسوں کو بار بار بہانے سے بخار چیک کروا رہے ہوتے۔'' مشی نے تکیہ اٹھا کر اسے مارا ''تم کبھی نہیں سدھرو گے۔''

ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے راجہ اور بالے کو ان کے گھر جانے کا کہا۔ وہ دونوں بیک وقت بولے ''لیکن اس وقت تم کہاں جاؤ گے.....؟''

''میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کی طرف جانا چاہتا ہوں..... شام ہونے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنے ہیں.....''

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا ''اوہ..... تو گویا شیخ صاحب کے ہاں ڈیرہ ڈالنے کی ٹھانی ہے جناب نے..... ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ اپنے آیان کا ایک سسرال سادات محلے میں بھی ہے.....''

''بکومت.....تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان کے گھر رہنے کے لیے جا رہا ہوں.....؟ وہ بہت پریشان تھے۔انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ رنگا والا معاملہ ختم ہو گیا ہے.....''

جاتے جاتے راجہ نے ایک جملہ اور پھینکا'' کچھ بھی کر لینا آیان پیارے..... پر کہیں گھر داماد بننے کی ہامی نہ بھر آنا'' میں نے انہیں گھور کر دیکھا لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کالونی کی طرف بڑھ چکے تھے۔میں سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں پہنچا تو سورج سر پر آ چکا تھا اور چند لمحے پہلے تک سکون سے دھڑکنے والا میرا دل اس وقت کچھ اس طرح سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے چند ہی لمحوں میں پسلیوں کی حوالات توڑ کر باہر آ گرے گا۔ ہمیشہ کی طرح گہنا کا سامنا کرنے کا سوچ کر ہی میری سانسیں تیز اور گلا خشک ہونے لگا تھا۔لاکھوں کی بھیڑ میں کوئی ایک چہرہ ہماری اندرونی حالت کو ایسے یکسر کیسے بدل سکتا ہے.....؟ میں یہ راز کبھی جان نہیں پایا تھا۔

دستک پر دروازہ ستارہ نے کھولا۔میں نے شیخ صاحب کا پوچھا تو وہ کہیں کام سے نکلے ہوئے تھے،تنویر بھی اپنے کالج کی نوکری کو جا چکا تھا۔میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم تولے۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ شیخ صاحب کو میرا پیغام دیجئے گا کہ آیان ان سے ملنے آیا تھا۔میں پھر حاضر ہو جاؤں گا.....''

دروازے کی اوٹ سے ستارہ کی لپکتی سی آواز ابھری.....

''آپ اندر آ جائیں.....ابا کچھ دیر میں آ جائیں گے.....''

میں ذرا جھجکا''لیکن اس وقت گھر میں کوئی مرد.....''

''آپ غیر تو نہیں ہیں.....ابا کو اگر پتہ چلا کہ ہم نے آپ کو یوں دروازے سے لوٹا دیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔میں بیٹھک کا دروازہ کھلواتی ہوں.....آپ وہاں بیٹھ کر ابا کا انتظار کر سکتے ہیں.....''

ستارہ مزید کوئی بات سنے بغیر اندر چلی گئی اور پھر کچھ دیر کے بعد اندر برآمدے سے اسی کی آواز دوبارہ ابھری

''اندر آ جائیں.....''

میں اندر داخل ہوا۔صحن میں آگے برآمدے میں بیٹھک کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ستارہ وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی رہی اور میں بیٹھک میں داخل ہو گیا۔کچھ دیر بعد شیخانی جی اندر آئیں اور سلام کے جواب میں دعا دے کر مجھے بیٹھنے کا کہا۔وہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

''کل مرزا صاحب ملے تھے انہیں.....انہوں نے بتایا کہ تم لوگوں کا پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے ان بدمعاشوں سے،آیان بیٹا میری مانو تو اس معاملے کو یہیں ختم کر دو،ان کا تو کام ہی تھانہ کچہری ہے،لیکن تمہارے بوڑھے والدین شاید زیادہ دیر یہ سب کچھ سہہ نہ پائیں۔''

''جی.....ایسا ہی ہو گا.....آپ بے فکر رہیں.....''

''جیتے رہو.....تم بیٹھو میں تمہارے لیے شکنجبین بنوا کر بھیجتی ہوں.....شیخ صاحب قریبی ڈاک خانے تک گئے ہیں۔بس آتے ہوں گے.....'' شیخانی بھی اٹھ کر اندر چلی گئیں اور ان کے اٹھتے ہی درمیانی پردے کے پیچھے سے ہلکی سی کھنکار سنائی دی۔میرا من ڈول سا گیا۔وہ گہنا ہی تھی

''جناب آیان صاحب.....آج آپ ایک بات تو بتائیں.....یہ ساری دنیا میں ایک آپ ہی ہیں جسے سب سے زیادہ غصہ آتا ہے.....؟'' مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی ''کیوں.....آپ کیوں پوچھ رہی ہیں.....؟'' وہ واقعی غصے میں تھی ''اس لیے کہ غصہ کسی اور کو بھی آسکتا ہے۔آخر آپ ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کرتے ہیں.....؟.....آپ کو ابا نے پہلے بھی کہا تھا نا کہ ان لڑکوں کے منہ نہ لگیں.....لیکن آپ نے تو کسی کی بات بھی نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا ہے۔شاید.....'' گہنا پردے کے پیچھے ہی سے یہ ساری باتیں کر رہی تھی مگر میں اس کے ملیح چہرے پر غصے کے آثار اور اس کی شریرلٹ کی بار بار کی پریشانی یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔''معافی چاہتا ہوں.....لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ کوئی میرے لیے اتنا پریشان ہے.....'' میرے شرارت بھرے جواب پر وہ مزید جز بز ہو کر رہ گئی ''یہی تو آپ کا مسئلہ ہے.....آپ کو کبھی کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ستارہ آپا بھی آپ سے بے حد ناراض ہیں۔''

''اچھا چلیں.....جھگڑا ختم کریں اور اپنی ستارہ آپی سے پوچھ کر کوئی ہرجانہ طے کر دیں.....میں بھرنے کے لیے تیار ہوں.....''

اس کی چوڑیاں کھنکیں ''ہرجانہ تو آپ کو ضرور بھرنا پڑے گا۔تیار رہیے گا،اور ستارہ آپی کو آپ سے کچھ کام بھی ہے.....وہ بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا.....'' اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی اور شیخانی جی خود ہی شربت کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئیں۔پردے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔میں نے جلدی سے ٹرے تھام لی ''ارے.....آپ نے کیوں زحمت کی.....''

.....''زحمت کیسی بیٹا.....ستارہ نے میری مدد کی ہے.....وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے لیکن شیخ صاحب کے سامنے اسے جھجک ہوتی ہے۔تمہارے پاس وقت ہے تو ذرا اس کی بھی سن لو.....'' میں ہڑبڑا سا گیا ''جی جی.....ضرور''۔شیخانی جی نے ستارہ کو آواز دے کر اندر بیٹھک میں ہی بلوالیا۔وہ جھجھکتی ہوئی سی اندر آئی اور سمٹ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔شاید غم اور یاس کا پیلے رنگ سے کوئی گہرا تعلق ہوتا ہے۔تبھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چار سو پیلاہٹ سی چھا گئی۔اس کی پلکیں جھکی ہوئی اور لب نیلگوں سے تھے۔ستارہ نے مجھ سے کہا۔''میں ایم۔اے فائنل میں تھی کہ اسے پڑھائی چھوڑنی پڑی۔شادی کے بعد تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ تھا لیکن حالات نے اس بات کی مہلت ہی نہ دی،لیکن اب وہ محسوس کرتی ہے کہ اسے بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں باپ کا سہارا بننا چاہیے۔تنویر اپنے طور پر تو ہر خاطر داری کرتا ہے مگر ایک تنخواہ میں وہ اتنے لوگوں کا بوجھ کیسے اور کب تک اٹھا پائے گا۔جو جائیداد اور مال متاع تھا وہ سب سیلاب بہا کر لے گیا۔ان کا بڑا بھائی صغیر اپنے علاقے میں حکومت کی جانب سے کسی امداد کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر سوکھ چکا ہے لیکن وہاں سے بھی کچھ ملنے کی امید نظر نہیں آتی۔اس لیے گھر کا خرچ بانٹنے کے لیے اس نے کچھ کام کرنے کی ٹھانی ہے۔تنویر سے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ مروت میں کبھی یہ ہونے نہیں دے گا۔لہٰذا اگر میری نظر میں کوئی بھی سلائی کڑھائی کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی بھی ایسا کام ہو تو میں ستارہ کو ضرور مطلع کروں۔'' میں چپ چاپ ستارہ کی بات سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس نازک سی لڑکی کی مدد کیسے کروں۔میں اسے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ یہ زمانہ گدھ کی نظر رکھتا ہے اور اس جیسی شفاف دامن ہستی کے سفید کورے دامن پر داغ لگانے میں یہ سماج ذرا سی دیر بھی نہیں کرے گا۔عورت جتنی محفوظ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے اتنی محرم شاید کسی مسجد مندر میں بھی نہ ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا'' آپ ٹیوشن کیوں نہیں پڑھاتیں یہیں گھر پر۔اس طرح آپ کو گھر سے باہر بھی نہیں نکلنا پڑے گا اور آپ گھر کے خرچے میں ہاتھ بھی بٹا سکیں گی۔''

''ہاں میں نے تنویر بھائی سے ٹیوشن کی بات بھی کی تھی۔ مگر اتنے دن گزر گئے کام نہیں بنا..... دراصل آج کل طالب علم خود چل کر جانے کے بجائے استاد کو گھر بلانا زیادہ پسند کرتے ہیں..... میں دوسروں کے گھر جانے کو بھی تیار ہوں مگر کوئی بات بنے تو سہی.....''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں دو ہزار روپے کی ایک ٹیوشن لے رہا ہوں لیکن شاید اب جاری نہ رکھ پاؤں..... میں وہاں آپ کی بات چلاتا ہوں.....''

''نہیں نہیں..... وہاں کیوں..... وہاں تو آپ خود ہی پڑھائیے..... ایسا کچھ بھی ہرگز نہ کیجئے گا..... ہم پر آپ کے پہلے ہی بہت احسانات ہیں.....'' ستارہ کی بات ادھوری رہ گئی اور باہر کے دروازے پر دستک ہوگئی۔ شیخ صاحب واپس لوٹ آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ کھل سا گیا ''اخاہ..... اپنے آیان میاں آئے ہیں..... بھئی بڑی راہ دکھائی تم نے.....'' ستارہ ان کے بیٹھک میں آنے سے پہلے ہی واپس اندر جا چکی تھی۔ میں نے تنہائی ملتے ہی دبے لفظوں میں شیخ صاحب کو ابا کی ناراضگی کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہ شاید اب میں واپس اپنے گھر نہ جاؤں۔ ساتھ ہی میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ جب بھی اس بات کا ذکر اپنے گھر والوں کے سامنے کریں تو ان کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے بات کا اسلوب کچھ ہلکا رکھیں۔ آس اور امید ہی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ بری سی بری خبر بھی امید و آس کی پنی میں لپیٹ کر سنائی جائے تو انسان بہل جاتا ہے۔ میں کچھ دیر شیخ صاحب کے پاس بیٹھنے کے بعد اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے برآمدے میں شیخانی جی کو خدا حافظ کہنے کے لیے رکا تو ان کے عقب میں چھپی گہنا نے شیخ صاحب سے نظر چرا کر جانے اشارے میں مجھ سے کیا کہا، لیکن اس کے ہلتے لبوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے ستارہ کا کام یاد دلا رہی ہے۔ یہ لڑکی کس طرح میری آنکھوں سے بنا اجازت میرے دل کے بند کواڑوں کو توڑتی ہوئی اندر گھسی جا رہی تھی۔ کیا محبت کی لہروں کو روکنے والا کوئی بند نہیں ہوتا؟ شیخ صاحب نے دروازے سے نکل کر گلی میں چلتے وقت میرا ہاتھ تھام لیا ''یقین کرو آیان میاں..... یہ میرا اپنا گھر ہوتا تو کبھی تمہیں واپس نہ جانے دیتا آج..... تمہیں کبھی یوں در بدر بھٹکنے نہ دیتا، لیکن تم جانتے ہو میں خود یہاں مہمان ہوں.....'' میں نے انہیں تسلی دی ''آپ دل پر بوجھ نہ لیں۔ رشتوں کو کبھی خود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی..... اور آپ میری فکر نہ کریں..... اب تو جب تک ابا مجھے ہفتے میں ایک بار گھر سے نکال نہ دیں مجھے خود اپنا گھر بھی اجنبی سا لگنے لگتا ہے'' شیخ بھی میرے ساتھ ہی مسکرا پڑے۔ انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''مجھے تمہاری یہ بات سب سے زیادہ پسند ہے..... حالات چاہے جیسے بھی ہوں آیان میاں..... میں نے تمہیں کبھی ہار مانتے نہیں دیکھا..... جیتے رہو.....'' میں کیفے فراق پہنچا تو مرزا نے بتایا کہ اسماعیل دوبار آ کر میرا پوچھ چکا ہے۔ اسماعیل سے تو میں خود بھی ملنے کے لیے بے چین تھا، لیکن وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سوال کے جواب کے لیے مجھے پورے چار بجے تک انتظار کرنا پڑا۔

اور پھر ٹھیک چار بجے اسماعیل کی گاڑی سڑک کے نکڑ سے مڑتے دیکھ کر میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

اسماعیل کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی میں کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اسماعیل نے گاڑی بڑھا دی ''کہاں تھے تم آیان بابو..... سارا شہر ڈھونڈ لیا تمہارے پیچھے.....''

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم سارنگا کو جانتے ہو'' اسماعیل مسکرایا ''مجھے کب پتہ تھا کہ تم لوگوں کا جھگڑا شوکی پارٹی سے ہوا ہے۔ ورنہ

پہلے ہی یہ قصہ نپٹ جاتا۔ میں سمجھتا رہا کہ یہ محلے کے اندر کی کوئی لڑائی ہے۔ وہ تو بھلا ہو مرزا کا جس نے مجھے اصل بات بتائی..... ورنہ تم تو کچھ بتاتے ہی نہیں.....''

میں نے اسماعیل کی طرف غور سے دیکھا۔

''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... تم سارنگا کو کیسے جانتے ہو..... اور وہ صرف تمہاری سفارش پر ہمارے خلاف اپنے ہی کارندوں کی درج کرائی گئی شکایت واپس لینے پر کیسے تیار ہو گیا؟.....''

اسماعیل نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

''سارنگا بھائی ہی میرے مالک ہیں۔ میں انہی کا ون کا ڈرائیور ہوں اور انہوں نے میرے کہنے پر نہیں بلکہ ناہید بیٹا کے کہنے پر موسیٰ بھائی کو تمہاری حفاظت کے لیے تھانے بھیجا تھا۔''

میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ گویا اب تک جانے انجانے میں خود بھی ناہید کے ٹیوٹر کے روپ میں سارنگا کی ہی نوکری کر رہا تھا۔

باب 11

میں ابھی تک ہکا بکا سا تھا "مگر..... تم..... تم نے تو کہا تھا کہ تم کسی سیٹھ داؤد کے ملازم ہو؟ اور یہ کہ تمہارا مالک دوبئی گیا ہوا ہے۔"

اسماعیل نے ایک گہری سی سانس لی..... یہ ایک لمبی کہانی ہے، کبھی وقت اور موقع ہوا تو سناؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ دنیا والوں کی نظر میں ناہید بٹیا سیٹھ داؤد کی صاحبزادی ہے۔ جسے دنیا سے گزرے دو سال ہو چکے، اسکول اور کالج میں بھی بٹیا کی یہی ولدیت درج ہے لیکن رنگا بھائی کے صرف چند قریبی ساتھی ہی جانتے ہیں کہ ناہید کا اصل باپ خود سارنگا ہے، لیکن اس کی پیدائش والے دن سے ہی اس نے اپنے نام کی بدنامی کو اپنی بیٹی کے نام کے ساتھ جوڑنے سے گریز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعلیمی میدان یا ذاتی زندگی میں کہیں بھی ناہید اس کے نام سے جانی جائے۔ وہ اس کوٹھی میں رہتا بھی نہیں جہاں ناہید بٹیا رہتی ہے۔ گھر میں میرے علاوہ صرف بوا ہے جسے یہ بات پتہ ہے۔"

میں حیرت سے اسماعیل کی بات سنتا رہا۔ "لیکن کیا ناہید یہ بات جانتی ہے کہ سارنگا ہی اس کا باپ ہے؟" اسماعیل نے گاڑی کا گیئر بدلا "ہاں..... اور وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتی ہے..... شاید سارنگا کی بھی دنیا میں واحد کمزوری اس کی اپنی بیٹی ہی ہے....."

اسماعیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سارنگا ہمیشہ ہی سے "رنگا بھائی" نہیں تھا۔ تیس (30) سال پہلے وہ صرف یعقوب فورمین تھا جو اپنے بڑے بھائی داؤد کے ساتھ دوبئی کے ریگزاروں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیسہ اپنے ملک میں منتقل کرتا تھا تاکہ ایک دن یہاں وہ اپنے سپنوں کا محل تعمیر کر سکے۔ دونوں بھائیوں نے دن رات اپنا خون پسینہ بہا کر ایک ایک پائی جوڑی لیکن کچھ بازی گروں نے فنانس کمپنی کے نام پر دونوں بھائیوں کا ملک میں جمع شدہ پیسہ ہڑپ کر لیا۔ ان دنوں ملک میں چاروں طرف ایسی کمپنیوں کا ایک مافیا سا قائم ہو چکا تھا اور داؤد اور یعقوب بھی اس کی زد میں آ گئے۔ داؤد کا پیسہ تو ایک ایسی کمپنی کھا گئی جو ملک میں آسمانی کتاب کی اشاعت کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ آخر کار یعقوب کو حساب کتاب کے لیے ملک واپس آنا پڑا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ یعقوب پراپرٹی اور زمین کے کاروبار میں کچھ یوں ابھرا کہ ساحلی شہر کے بڑے بڑے صنعت کار اس کی چوکھٹ پر حاضری دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس نے زمین کے کاروبار میں باقاعدہ اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا جو راتوں رات زمین پر قبضہ کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتا تھا۔ یعقوب، یعقوب فورمین سے رنگا بھائی کیسے اور کب بنا یہ تو کوئی نہیں جانتا ہاں مگر دنیا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یعقوب فورمین نے سارنگا بننے سے پہلے آخری قبضہ ایک رنگ ساز کارخانے پر کیا تھا۔ کہتے ہیں کارخانے کا مالک بھی بڑا جی دار اور اونچی پہنچ والا بندہ تھا مگر جیت یعقوب کی ہوئی۔ تب سے اس کے نام کے ساتھ کارخانے کا نام سارنگا لگ گیا تھا جو رفتہ رفتہ رنگا بھائی میں تبدیل ہو گیا۔ داؤد جب ملک واپس آیا تو سیٹھ داؤد بن چکا تھا، لیکن اس نے اپنی پہچان کو سارنگا کی بدنامی سے ذرا پرے ہی رکھا مگر دونوں بھائیوں میں اندرونِ خانہ زبردست ایکا تھا۔ اسی نے رنگا کی شادی ایک سیدھی سادھی عورت سے کروا دی جو انہی دو بھائیوں کی برادری میں سے تھی۔ رنگا کی بیوی نے ایک بیٹے اور اس کے دو سال بعد ایک بیٹی کو جنم دیا اور پھر کسی وبائی مرض میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ سارنگا کی زندگی کا محور اب اس کی اولاد تھی لیکن کہتے ہیں کہ بہت زیادہ پیسہ اور زر اپنے ساتھ

بہت سارے دشمن بھی لے کر آتا ہے۔ رنگا کا اسکول جاتا بیٹا بھی اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ تب رنگا نے اپنی بیٹی کو داؤد کے حوالے کر دیا اور خود اپنی دشمنیاں نبھانے لگا۔

بھائی کی موت کے بعد سارنگا نے شہر بدل لیا اور ہمارے شہر میں آ کر اپنی بیٹی کے لیے وہ حویلی خرید لی۔ آس پاس اپنے وفاداروں کا فولادی جال بن کر وہ بھی ہر وقت اپنی لاڈلی کے لیے ہر وقت پریشان ہی رہتا ہے۔ زندگی نے سارنگا کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا کہ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی وہ علی الاعلان اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں پکار سکتا تھا۔"

اسماعیل کی باتوں میں راستہ کیسے کٹ گیا مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں تب چونکا جب گاڑی پورچ میں داخل ہو کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

میں بڑے ہال میں پہنچا تو بوا اور ناہید دونوں کو ہی پریشان پایا۔ ناہید مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکی "آیان بھائی..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں..... پولیس نے آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کیا..... جب اسماعیل چاچا نے آپ کی گرفتاری کی خبر دی تھی، میں اور بوا تو پریشانی کے مارے ایک کروٹ بھی چین سے نہیں بیٹھے....."

میں اس معصوم سی مخلص لڑکی کو دیکھتا رہا۔ کیا دنیا سے خلوص اور وفا بالکل مٹ چکے ہیں؟ نہیں..... کیونکہ میرے سامنے ان کہے رشتوں کا خلوص اب بھی بکھرا پڑا تھا۔ میں نے ماحول کو بدلنے کی خاطر خوش دلی سے کہا "میں سمجھتا تھا کہ صرف میری امی ہی ملکہ جذبات ہیں، لیکن آج پتہ چلا کہ اس گھر میں تو ان کی ٹکر کے لیے دو، دو ملکائیں موجود ہیں....." بوا اور ناہید دونوں ہی میری بات سن کر مسکرا دیں "وہ تو بڑی خوش ہوتی ہیں جب میں انہیں یہ لقب دیتا ہوں" ناہید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت در آئی۔ "آیان بھائی سچ..... کبھی کبھی بہت جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے سب گھر والوں سے ملوں..... امی سے، رافعہ سے، ریحان بھائی سے..... آپ مجھے لے چلیں گے نا اپنے گھر..... لیکن بابا تو مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے..... آیان بھائی..... میں بھی باقی سب کی طرح رہنا چاہتی ہوں..... آزاد..... اپنی مرضی کی مالک....."

"تم فکر نہ کرو..... میں تم اور بوا تمہارے بابا سے چھپ کر سب سے مل آئیں گے..... چلو اب یہ اداسی پرے دھکیلو۔" ناہید بچوں کی طرح خوش ہو گئی "سچ.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے..... ہم چھپ کر سب سے مل آئیں گے....." پھر جیسے ناہید کو اچانک کچھ خیال سا آیا۔ "آیان بھائی..... بابا میری حفاظت کی خاطر مجھ سے دور رہتے ہیں۔ لوگ ان کے خوف کی وجہ سے میرے قریب نہیں آتے..... کالج میں بھی میری کوئی سہیلی نہیں ہے، حالانکہ میں وہاں سیٹھ داؤد کی بیٹی کی حیثیت سے داخل ہوں..... لیکن جنہیں یہ پتہ ہے کہ میرا سارنگا فیملی سے کوئی تعلق ہے وہ میرے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں..... حتیٰ کہ کوئی مجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ آپ نے ہامی بھر لی۔ آپ مجھے پہلے دن سے ہی بالکل اپنے بھیا کی طرح لگے۔ کھوئے کھوئے سے..... لاپرواہ سے..... سلمان بھیا بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اسی لیے میں نے اسماعیل چاچا کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ آپ سے کچھ نہ چھپائیں۔ چاچا کو خوف تھا کہ بابا اس بات سے کہیں ناراض نہ ہو جائیں لیکن میں نے بابا سے بھی کل رات صاف کہہ دیا تھا کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی، اور بابا میری بات کبھی ٹال نہیں سکتے اس کا مجھے ہمیشہ سے یقین ہے....."

ناہید بے خودی کے عالم میں اپنے بابا کی باتیں بتاتی گئی اور میں سوچتا رہا کہ باہر کی دنیا میں اس بات پر کون یقین کرے گا کہ سارنگا کے دل

میں بھی ایک باپ کا دل ہو سکتا ہے۔ انسان اپنے اوپر کتنی تہیں کتنی پرتیں چڑھائے رکھتا ہے۔ اس کی خبر کسی کو نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی تو ہمارے اندر کا انسان اس تہہ در تہہ پرت در پرت خول کے نیچے ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہے، اور ہم صرف ایک مصنوعی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس روز میں معمول سے کچھ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پڑھائی کا تو موقع ہی نہیں ملا۔ بس ناہید کی سنتا رہا۔ شاید اس کے دل پر پڑا بہت دنوں کا بوجھ اتر گیا تھا اس لیے وہ ہلکی پھلکی ہو کر اپنے بچپن سے لے کر اب تک کی ہر بات مجھ سے بانٹ رہی تھی۔ جانے یہ لڑکیاں اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتیں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ کیسے یاد رکھ لیتی ہیں۔ میں نے اس موقع پر ابا کی طرف سے اپنے ''دیس نکالے'' کا ماجرا سنا کر اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

نتیجہ جب میں باہر نکلا تو ناہید کی باتوں کی پٹاری بند ہوتے ہوتے گہری شام نے اپنے بال کھول دیے تھے۔ اسماعیل میرے انتظار میں پورچ میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ''بابو..... میں جانتا تھا کہ آج تمہیں دیر ہو جائے گی۔'' میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ''پہلے تو مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے بابو کیوں کہتے ہو؟ آپان کہہ کر کیوں نہیں بلاتے.....؟'' اسماعیل نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر سڑک پر ڈال دی ''بس مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم کپڑے بھی تو بابوؤں جیسے پہنتے ہو.....؟'' میں نے اپنی پرانی جینز اور آدھی آستین کی چیک والی شرٹ پر نظر ڈالی اور مجھے ہنسی آ گئی۔

''لیکن میرے ابا کے بقول یہ لوفروں والا لباس ہے.....'' اسماعیل بھی ہنس پڑا۔ ''آج کہاں اتاروں تمہیں.....؟..... گھر تو تم جا نہیں سکتے.....''

''کہیں بھی اتار دو..... جو بے گھر ہوتے ہیں۔ سارا شہر انہی کا ہوتا ہے..... کسی بھی فٹ پاتھ پر یا پارک میں رات گزاری جا سکتی ہے.....'' اسماعیل کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

''بابو ایک بات مانو گے میری.....؟

''ضرور..... اگر میرے اختیار میں ہوا تو ضرور.....''

''تم میرے ساتھ چلو..... میں رنگا بھائی کی حویلی کے پچھواڑے کوارٹرز میں رہتا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی خون کا رشتہ باقی نہیں رہا..... جب تک تمہارے ابا تمہیں معاف نہیں کر دیتے یا تمہیں کوئی دوسرا مستقل ٹھکانہ نہیں مل جاتا تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہ جگہ بدنام ضرور ہے لیکن یقین کرو وہاں اتنے برے لوگ نہیں رہتے جتنے ان اجلی اور نئی کوٹھیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اگر مجھ پر ذرا بھی اعتبار ہے تمہیں تو یقین رکھو کہ اسماعیل تمہیں کبھی کسی غلط جگہ چلنے کے لیے نہیں کہے گا.....'' میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ''مجھے اپنے علاوہ دنیا کے باقی ہر شخص پر اعتبار ہے۔ جانے میں خود پر کب اعتبار کرنا سیکھوں گا۔'' میری بات سن کر اسماعیل نے پہلے یوٹرن ہی سے بنا کسی حجت کے گاڑی موڑ لی۔ فضا میں ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونجی۔ کچھ ہی دیر میں شہر کا وہ علاقہ شروع ہو گیا جو انگریز کے دور میں اصل شہر تھا اور اب اندرون شہر یا صدر کا علاقہ کہلاتا تھا۔ یہاں پرانے طرز کے مکانات اور چھوٹی بڑی حویلیوں کی بہتات تھی۔ یہ متوسط درجے کے لوگوں کا یا پھر اب تک اپنی پرانی تہذیب سے جڑے متمول لوگوں کا رہائشی علاقہ تھا۔ پرانے طرز کے مکان، چوبارے، گلیاں اور کھڑکیوں سے جھانکتی ماضی کی شاندار روایت کی عکاسی کرتی بالکنیاں اب بھی ویسے ہی ایستادہ تھیں۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سی بات آئی کہ انسان شاید ازل سے ابد تک زوال کا ہی شکار رہا ہے۔ اسی لیے ہمیں ہر حال کے دور میں ماضی کی روایات، تعمیرات اور سلیقے سدا بھاتے ہیں۔ سو جن پر ماضی پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے وہ ماضی پر بہت کچھ ایسے قصوروار بھی نہیں کیونکہ حال اور مستقبل کا

آئینہ ماضی کے مقابلے میں ہر دور میں دھندلا ہی رہا ہے۔

گاڑی تنگ سڑکوں اور کشادہ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک ایسے احاطے میں داخل ہوگئی جس کے چار اطراف پھولوں کے خوانچوں سمیت خشک میوے، دودھ اور پنسار کی دوکانیں موجود تھیں۔ مغرب کا وقت تھا اور بازار میں کافی چہل پہل تھی۔ انہی دوکانوں میں شاید کہیں پرانے ریکارڈوں کی دوکان میں کوئی پرانا گیت بج رہا تھا۔ ''دو بنسوں کا جوڑا..... بچھڑ گیو رے..... گجب ہیو را ما..... ظلم ہیو رے.....'' میں بھی تو ایک بچھڑا ہوا ہنس تھا۔ جو اپنی ڈار سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب یہاں وہاں بھٹک رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر ہی مجھے کیفے فراق، اپنے گھر اور دوستوں کی بے حد اور بری طرح یاد نے آگھیرا۔

گاڑی ایک بہت بڑے سے چوبی گیٹ کے سامنے جا کر رک گئی اور اسماعیل نے تین بار کچھ مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ گیٹ کے اندر سے کسی نے چھوٹی سی روشن دان نما کھڑکی کا تختہ ہٹا کر باہر جھانکا اور پھر فوراً ہی دو کسرتی بدن کے دربانوں نے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ پر یعقوب مینشن کی تختی لگی ہوئی تھی۔ گویا سارنگا نے اپنے پرانے نام سے مکمل ناطہ نہیں توڑا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تو مجھے ایک اور ہی جہاں دیکھنے کو ملا۔ یہ حویلی بذات خود کسی محلے جتنی ہی وسیع و عریض تھی جس کے بڑے بڑے دالان اور اونچے اونچے سفید ستون کسی پرانی رومن دور کی فلم کے منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ دالانوں میں جا بجا لکڑی یا سنگ مرمر کے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر کچھ ضعیف مگر پہلوان نما افراد بیٹھے اپنے سامنے ہوتے دنگل کے کھلاڑیوں کی رہنمائی کر رہے تھے اور انہیں مختلف داؤ پیچ سکھا رہے تھے۔ ایک طرف باقاعدہ چاقو کھولنے بند کرنے اور اسے کلائی میں گھمانے یا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کی مشق ہو رہی تھی۔ مجھے ایک دم ہی شوکی کا چاقو یاد آ گیا۔ ایک جانب خالص دودھ کی باقاعدہ سیل سی لگی ہوئی تھی اور اہتمام دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں روزانہ منوں کے حساب سے خالص دودھ آتا ہوگا۔ تو گویا باہر کی دوکانوں میں دودھ کے کاروبار کی وجہ بھی یہی احاطہ ہی تھا۔ احاطے میں موجود بڑے بڑے دالانوں کو کیاری کی اینٹوں سے مختلف مگر ایک ہی پیمائش کے درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں ریت اور خشک یا گیلی مٹی سے پاٹ کر کے انہیں مشق کے قابل بنایا گیا تھا۔ مجھے تو وہ حویلی کم اور پہلوانی سکھانے کا کوئی اڈہ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ چاروں طرف استادوں اور شاگردوں کے شور سے ایک عجیب سا سماں بندھ گیا تھا۔

میں نے حیرت سے اسماعیل کی طرف دیکھا ''یہ سب کیا ہے.....؟'' اسماعیل مسکرایا ''اپنے رنگا بھائی کو ہمیشہ سے بس ایک شوق ہی تو رہا ہے..... کسرت کا۔ داؤ پیچ کا اور کلائی کے زور کا..... اور تم یہ جتنے نوجوان یہاں تربیت لیتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ آگے چل کر یہ رنگا بھائی کے علاقوں کا کنٹرول بھی سنبھالیں گے۔ جو اس وقت کام سنبھال رہے ہیں۔ وہ بھی سال دو سال پہلے یہیں سے سیکھ کر میدان میں نکلے ہیں..... یہ رنگا بھائی کی فوج ہے بابو.....''

''لیکن اس دور میں لڑنے والا کلائی کا زور اور داؤ پیچ استعمال ہی کب کرتا ہے۔ وہ تو پسٹل یا کلاشن کوف نکالتا ہے اور پل بھر میں کھیل ختم ..... بلکہ اب تو پسٹل اور ریوالور جتنے ماؤزر بھی آ گئے ہیں..... پھر ان آتشیں اسلحہ برداروں کے سامنے تمہاری یہ فوج کس کام کی.....''

اسماعیل نے برا سا منہ بنایا ''گولی سے بزدل لڑتے ہیں۔ ہمارے دھندے میں اصل کی پہچان زور ہے اور یہی پیمانہ بھی ہے..... ہاں جن تھڑدلوں اور پسٹل چلانے والے کم ظرفوں کی تم بات کر رہے ہو ان کے بندوبست کے لیے بھی یہاں خاص انتظام موجود ہے، لیکن وہ صرف محافظ

ہوتے ہیں۔ اڈے کا اصل آدمی کبھی ایسی اوچھی حرکت نہیں کرتا لیکن ایسے اوچھے وار کرنے والوں کو جواب دینے کے لیے اس کے ساتھ یہ آتشیں اسلحہ رکھنے والے محافظ بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں.....''

میں حیرت سے اسماعیل کی باتیں سنتا رہا۔ میرے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی جہاں باقاعدہ شاگردی کی رسم ہوتی تھی اور چاقو بازی یا زور سیکھنے کے لیے شاگرد کی کلائی پر دھاگا باندھا جاتا تھا اور بدلے میں وہ اپنے استاد کو نیگ میں جوڑا، پگڑی، ایک سو ایک روپیہ اور امام ضامن پیش کرتا تھا۔ چاقو بازی کی شاگردی کے لیے پہلے اپنا چاقو استاد کے قدموں میں ڈالا جاتا تھا اور پھر جب استاد وہ بند چاقو اٹھا کر اور کھول کر اپنے شاگرد کے حوالے کرتا تو باقاعدہ اسے شاگرد کی سند مل جاتی تھی۔

بعض مشقوں کی شاگردی پانے کے لیے وفاداری کے طور پر شاگرد کو اپنی کلائی کاٹ کر خون کے چند قطرے استاد کے قدموں یا پھر اڈے کی مٹی کے نذر کرنے ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ عمر بھر اپنے استاد اور اس اڈے سے وفاداری نبھائے گا۔

عام اسکول کالجوں کی طرح یہاں بھی وقت اور سند رائج تھی۔ جو جتنا مشق میں وقت گزارتا اور مختلف امتحان پاس کرتا جاتا اس کا درجہ اور سند بھی اس قدر بلند ہوتی جاتی۔ جیسے کراٹے میں مختلف بیلٹس Belts کی ڈگری ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی جماعت اور مشق کی بنیاد پر شاگردوں کو مختلف درجوں میں بانٹا جاتا تھا۔ شاید سارنگا کی یہی فوج تھی جو تربیت پانے کے بعد شہر میں اس کا راج چلاتی تھی۔ زمین پر قبضہ کرتی تھی اور سارنگا کی ان دیکھی حکومت کے احکامات کو شہر بھر میں رائج کرتی تھی۔

اسماعیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ زیر زمین حکومت بھی باقاعدہ ایک طریقہ کار کے تحت وجود میں آتی تھی اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ شفاف اور ایماندارانہ چناؤ اس حکومت کے قیام کے لیے رائج تھا۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے زیر زمین گروہ اس چناؤ میں شامل ہوتے تھے اور چار یا دو بڑوں کو اپنا رہنما تسلیم کر کے ان کا چناؤ کرتے تھے۔ چناؤ کے لیے باقاعدہ کوئی دن مخصوص ہوتا تھا اور پرچی اور بولی کے ذریعے اپنے اپنے رہنما چن لیے جاتے تھے۔ وہ چار رہنما شہر کے نقشے کو میز پر رکھ کر اسے چاقو کے ذریعے چار حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور یوں مشرق، مغرب اور شمال جنوب کے چار علاقے وجود میں آجاتے تھے۔ پھر ان علاقوں کی حکمرانی کے لیے یا تو پیسے کی بولی اور یا پھر زور اور بل کی بنیاد پر حصہ داری تقسیم کر لی جاتی تھی۔ عام طور پر بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن اور ڈاک یارڈ وغیرہ کے علاقے جس کے حصے میں آتے وہ زیادہ خوش قسمت تسلیم کیا جاتا تھا، مگر ایک بار جب تقسیم ہو جاتی تو اگلے تین سال تک ان میں سے کوئی بھی لیڈر دوسرے کے علاقے میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں زیر زمین دنیا کے بزرگ اور پرانے حکمران سخت جرمانہ عائد کرتے تھے اور بعض اوقات ایسی جرأت کی پاداش میں دراندازکو علاقہ بدری اور نااہلی کی سزا بھی مل سکتی تھی۔ ہاں اگر کوئی زور کے بل پر کسی کے علاقے کا دعوے دار ہوتا تو اسے باقاعدہ مقابلہ کر کے اپنی طاقت ثابت کرنے کے بعد وہ علاقہ چھیننا پڑتا تھا مگر اس مقابلے کے اصول بھی بزرگ رہنما ہی طے کرتے تھے اور ان کی سینٹ Senate ہی آخری فیصلہ صادر کرتی تھی۔

میں یہ سب سن کر ایک جہان حیرت میں غرق تھا کہ اچانک میرے عقب سے آواز ابھری اور کسی نے میرے کاندھے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی ''باہر سے کیا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ ہمت ہے تو اکھاڑے میں آ کر مقابلہ کرو.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔

باب12

میرے پیچھے موسیٰ اور سارنگا کھڑے تھے۔ سارنگا نے قریب آکر گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگالیا۔ موسیٰ نے بھی حسب عادت میرے سینے اور بازوؤں کی بٹیاں چٹخاں ڈالیں" اچھا کیا تو یہیں آگیا۔ ہم برے ہیں..... پر اتنے بھی برے نہیں ساجن....."

اسماعیل نے دبی دبی آواز میں سارنگا کو بتایا کہ وہ مجھے کس شرط پر اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا ہے اور یہ کہ میں اس کے ساتھ ہی پچھلے حصے میں ٹھہروں گا۔ موسیٰ نے اسماعیل کو ڈانٹا" کیوں بے..... تو کہاں کا حاجی ہے کہ شہر کی رہنمائی کرنے چلا ہے.....؟" سارنگا مسکرایا" چل ٹھیک ہے..... جیسے تیری مرضی..... ہمارے حصے میں رہ یا پچھلے حصے میں..... رہے گا تو اپنے ساتھ ہی..... اپنی لاڈلی تیری بڑی تعریف کرتی ہے، کہتی ہے بھیا بنالیا ہے میں نے اسے..... تو اس ناطے سے تُو تو ہمارا بھی کچھ ہوا نا..... کسی چیز کی ضرورت ہو تو مانگ لینا..... شرم نہ کرنا..... پھر چلیں گے کسی دن تیرے بادا کی طرف بھی..... انہیں منانے....."

سارنگا نے جاتے جاتے اسماعیل کو ہدایت کی کہ وہ میرے لیے حویلی کے عقب میں بنے مہمان خانوں کے کمروں میں سے کوئی بھی کمرا کھلوا دے اور میرے کھانے پینے سمیت ہر چیز کا خیال رکھے۔ پھر دو قدم چل کر وہ واپس پلٹ آیا۔

"اور سن اسماعیلے..... دو چار جوڑی کپڑے بھی بنوا دے اس ضدی کے لیے..... درزی کو یہیں بلوالینا اور بتا دینا کہ صبح کپڑے تیار چاہئیں..... کیا سمجھا.....؟" اسماعیل نے جلدی سے تابعداری میں سر ہلایا۔ سارنگا موسیٰ کے ساتھ نہ جانے کس گوشے کی جانب چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ ویسے بھی اس طویل و عریض حویلی کی بھول بھلیوں کو یاد رکھنے میں مجھے ہفتوں لگ سکتے ہیں۔ اسماعیل مجھے لیے حویلی کے عقب میں رہائشی حصے میں آگیا۔ اس طرف شاید عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہ بھی پرانے طرز کی ایک پوری حویلی ہی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل اس علاقے میں ہندوؤں کے بڑے بڑے پاڑے اور مندر تھے۔ لہٰذا یہاں کی تعمیر میں ہندو ثقافت کا رنگ بھی نمایاں نظر آرہا تھا۔ کمروں کے سامنے کشادہ اور وسیع برآمدہ جس کے فرش پر قدیم طرز کی منقش مینا کاری کی گئی تھی اور برآمدے کے سامنے سرخ اینٹوں کا بہت بڑا دالان۔ دالان کے درمیان میں بہت بڑا سا پیڑ جس کے گرد سفید سنگ مرمر کا بڑا سا گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ دائیں جانب چند سنگ مرمر کی مورتیاں اور ان سے پرے ایک بہت بڑا سا باغیچہ تھا جہاں رنگ برنگ پھول اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

باغیچے کی گھاس اور باڑھ بہت نفاست اور ترتیب سے تراشی ہوئی تھی۔ آس پاس بہت سے نوکر اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ اسماعیل کو دیکھ کر سبھی نے اسے تعظیم دی۔ مطلب اسماعیل کو یہاں رنگا کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسماعیل کے اشارے پر میرے لیے فوراً ایک کمرہ کھول دیا گیا۔ کمرہ کیا تھا پورا ہال تھا۔ ہمارے کوارٹر کے تینوں کمرے اس میں سما جاتے۔ پرانے طرز کی بڑی بڑی لکڑی کی کھڑکیاں اور ڈوری سے کھلنے اور بند ہونے والے چاروں دیواروں میں روشن دان..... کمرے کے وسط میں وسیع چوبی پلنگ اور دائیں جانب قد آدم آئینہ (ڈریسنگ) اسماعیل نے

کمرے میں گھوم پھر کر غسل خانے اور باقی الماریوں وغیرہ کا جائزہ لیا ''کمرہ ٹھیک ہے نا..... پسند نہ ہو تو بدلوا لینا.....''۔

''نہیں نہیں..... ٹھیک ہے..... لیکن مجھے اتنے بڑے کمرے میں سونے کی عادت نہیں ہے..... تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔'' اسماعیل ہنس پڑا ''وہ بابو..... کھلی برسات میں سڑک کنارے بچھے لکڑی کے تختے پر تو خوب مزے سے سو جاتے ہو اور کمرے میں ڈرتے ہو.....'' میں خاموش رہا..... اب اسے کیا بتاتا کہ وہ سڑک کے کنارے نصب لکڑی کا بنچ تو بچپن سے مجھے ماں کی طرح لوری دے کر سلاتا رہا ہے اس کا مقابلہ بھلا ان بے جان محلوں کی خواب گاہوں سے کیا؟

کچھ ہی دیر میں رات کا کھانا آ گیا۔ پوری دعوت کا اہتمام تھا۔ اسماعیل نے مجھے بتایا کہ حویلی کا اپنا لنگر خانہ ہے جو چوبیس گھنٹے جاری رہتا ہے۔ اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا ''صبح کے لیے کوئی خاص فرمائش ہے تو بتاؤ..... کیسا ناشتہ کرو گے.....؟''۔

''ایک سادہ روٹی اور چائے کا ایک پیالہ.....'' اسماعیل کا منہ کھلا رہ گیا ''بس..... اور کچھ نہیں.....''۔

''نہیں۔ ہم برسوں سے گھر میں ایسا ہی ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔'' مجھے یاد آیا کہ امی کس طرح ریحان اور چھوٹی سے چھپا کر میرے لیے باورچی خانے میں بالائی کا پیالہ اوپر طاق میں رکھ دیتی تھیں اور وہ دونوں پھر شام تک امی سے جھگڑتے رہتے کہ وہ میری وجہ سے ان کے حصے کی چیز بھی مجھے کھلا دیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے لیکن میں نے آنکھیں مسل ڈالیں۔ اسماعیل کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد واقعی مجھے تنہائی کا احساس کاٹنے لگا۔ میں نے بستر پر آدھا گھنٹہ کروٹیں بدلنے کے بعد تنگ آ کر سبھی کھڑکیوں کے پردے ہٹا ڈالے۔ باہر آسمان پر میرے بچپن کے سبھی دوست تارے حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ آج تک میں ان سے اپنی چھت سے باتیں کرتا آیا تھا، لیکن آج وہ سب مجھے اس اجنبی جگہ دیکھ کر حیرت سے اپنی آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ پھر مجھے اس ماہ رو، مہتاب کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی اپنے گھر کے آنگن سے ان تاروں کو دیکھ رہی ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے سوچتی ہوگی.....؟..... کیا میرا نام اتنا مقدر والا ہوگا جسے وہ اپنی ہتھیلی پر لکھ لکھ کر مٹاتی ہوگی.....؟ نہیں نہیں..... مجھ جیسے آوارہ بنجارے کے لیے کوئی نازنین بھلا کیوں اپنی زلف کو پریشان کرے گی..... مگر اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اسے میری بہت فکر ہے..... پوری رات میرا نادان دل خود ہی اعتراض پیدا کرتا رہا اور خود ہی تاویلیں گھڑ کر ان اعتراضات کے جواب بھی دیتا رہا۔ سچ ہے کہ دل کسی کا دوست نہیں۔ یہ خود عشق کی بھٹی سلگاتا ہے اور پھر خود ہی ہماری نسوں میں بہتے خون کو اس بھٹی کا ایندھن بنا کر آخری قطرے تک جلاتا رہتا ہے۔

میں بھی صبح تک اسی عشق بھٹی میں جلتا رہا لیکن اس سوال کا جواب پھر بھی نہ مل سکا کہ کیا گہنا بھی میرے بارے میں سوچتی ہوگی؟ صبح ناشتے کے ساتھ ہی اسماعیل بھی پہنچ گیا ''کیوں بابو..... نیند تو آئی نا ٹھیک سے؟''..... اسماعیل کے ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا تھا ''چلو نہا دھو کر کپڑے بدل لو..... یہ تمہارا نیا لباس ہے.....'' اسماعیل نے تھیلے سے کرتا شلوار نکال کر ہینگر میں لٹکا دیا۔ میں نے مسکرا کر اسماعیل کو دیکھا ''ایک تعویذ اور ہاتھ کا کڑا بھی لا دو..... پورا اڈے والا بن کر پھروں گا.....'' ناشتے کے دوران اسماعیل نے مجھے بتایا کہ روزانہ صبح 10 بجے سارنگا کا دفتر لگتا ہے جہاں دن بھر کی مصروفیات اور آئندہ کے کام بانٹے جاتے ہیں۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ''دفتر.....؟..... کیا..... یہاں بھی باقاعدہ دفتری کام ہوتا ہے.....''۔

''دفتر کیا آیان بابو..... پوری عدالت کہو..... حکومت چلانا آسان کام تھوڑی ہے.....''

یہاں میرے لیے ہر قدم پر ایک نئی حیرت ہانیں کھولے میری منتظر کھڑی تھی۔ اسماعیل کے بقول یہ علاقہ ابھی چند ماہ پہلے ہی سارنگا کے قبضے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی ''کالی'' نام کا زور آور اس علاقے کا مالک تھا لیکن رنگا اسے ہرا کر شہر کے اس حصے کا قبضہ دار بنا جس میں ہمارا کیفے فراق اور بابو کالونی بھی شامل تھی۔ علاقے کا کنٹرول سنبھالتے ہی قبضہ دار کو سب سے پہلے مختلف حصوں کی تعیناتیاں (پوسٹنگ) کرنی ہوتی ہیں۔ اپنی انتظامیہ کے اہل اور ایمان دار کارندوں کو ان کی اہلیت کے مطابق علاقے بانٹے جاتے ہیں جہاں کے تمام معاملات کے وہی نگران ہوتے تھے۔ ان معاملات میں زمین پر قبضہ، علاقے کے سیٹھوں سے بھتہ وصولی، مخالفوں کا اغواء، بازار کا قبضہ، سٹہ، جوئے کے اڈوں کا حساب، تاجروں کے معاملات اور شیئر بازار کا حساب کتاب، علاقے کے تھانے سے تعلقات و روابط، اپنے علاقے میں کسی دوسرے گروہ کی دخل اندازی کو روکنا اور ایسے کئی دوسرے جھگڑے نمٹانا بھی شامل تھا۔ عام نظام حکومت کی طرح اس زیر زمین سلطنت کی بھی اپنی عدالتیں اور اپنی سزائیں مقرر تھیں، اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ پر اثر اور مکمل بھی۔ حکومتی اہل کاروں کی طرح یہاں بھی عہدے دار اپنے عہدے کے حساب سے اپنا کام سر انجام دیتے تھے۔ مجھے یہ سن کر بھی بہت حیرت ہوئی کہ ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی ہے جو ہماری سرکار اور عدالتوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے براہ راست اپنے جھگڑے اسی زیر زمین نظام کے تحت حل اور ختم کروانے پر یقین رکھتے ہیں اور وہ اس نظام کے فیصلوں کو من و عن تسلیم بھی کرتے ہیں، کیونکہ یہاں انصاف ملنے میں دیر نہیں لگتی۔ عام عدالتوں کی طرح سالوں خجل خوار نہیں ہونا پڑتا نہ ہی ہر روز پولیس اور عدالتوں کے ہاتھ اپنی عزت نفس کو کچلتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے ایک اور سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جس دن سے میں نے سارنگا کی اس بادشاہت کے بارے میں سنا تھا میرے ذہن میں ایک الجھن ہمیشہ کلبلاتی رہی کہ اگر ایسا کوئی زیر زمین نظام ہمیشہ سے ہمارے آس پاس موجود رہتا ہے تو پھر مجھ جیسے عام انسانوں کو اس کے بارے میں پتہ کیوں نہیں چلتا؟..... اسماعیل کی باتیں سن کر یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ اس نظام کا براہ راست تعلق زر اور زور والوں کے ساتھ تھا۔ غریب بے چارہ تو ان کے لیے صرف مزدوری ہی کر سکتا تھا۔ اس نظام کا غربت اور غریب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے مجھ جیسے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ نظام سدا پوشیدہ رہتا تھا۔ تاوقتیکہ کوئی حادثہ ہمیں اس زیر زمین دنیا سے متعارف نہ کروا دے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے میں ان جانے میں اس نظام سے آ ٹکرایا تھا۔

جب تک میں اسماعیل کے ساتھ بیرونی احاطے میں پہنچا۔ تب تک رنگا کی عدالت لگ چکی تھی۔ احاطے میں باقاعدہ دربار کی طرح دائیں بائیں دو قطاروں میں بہت سی کرسیاں بچھائی گئی تھیں جن پر عہدیدار اور ضرورت مند آ کر بیٹھ چکے تھے۔ سارنگا قطاروں کے اختتام پر درمیان میں رکھے ایک بہت بڑے صوفے پر براجمان تھا اس کے بائیں جانب ہاتھ میں ایک رجسٹر پکڑے کوئی شخص کھڑا لوگوں کے نام پکار رہا تھا اور بائیں جانب موسیٰ کھڑا تھا جو آنے والے سائل کے کوائف اور مسئلے سے رنگا کو آگاہ کرتا جا رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر موسیٰ نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا..... ''واہ شہزادے..... آج تو اپنا ہی بھائی بند لگ رہا ہے.....'' سارنگا نے چونک کر سر اٹھایا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ اسماعیل کچھ دور ہی رک گیا تھا لیکن رنگا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلا کر ایک خالی کرسی پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسماعیل وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔

مقدمات کھل چکے تھے۔ سب سے پہلے موٹی توند والا ایک ٹھیکے دار نما سیٹھ اٹھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ موسیٰ نے تعارف کروایا۔ ''رنگا بھائی یہ اپنا سیٹھ جبار ہے..... تین سال ہو گئے ہیں اس کے کمرشل پلازے کے کیس کو..... دوسری پارٹی قبضہ نہیں دے رہی..... کروڑوں کا نقصان ہو چکا ہے اس کا..... زمین تو گئی سو گئی..... تعمیر کا پیسہ بھی گیا۔ چالیس منزلیں تیار پڑی ہیں لفٹ تک لگ گئی ہے.....''

سارنگا نے لمبی سانس لی..... ''ہونہہ..... ٹھیک ہے..... قبضہ تو اسے تیس 30 دن کے اندر مل جائے گا..... مگر نچلی پہلی دو منزلیں ہماری ہوں گی۔ منظور ہے تو کاغذ بھروالے اس سے.....''

سیٹھ جبار کے منہ سے مری مری سی آواز نکلی..... ''رنگا بھائی گراؤنڈ فلور اور میزانین تو بہت زیادہ ہو جائے گا..... میں نیچے کی چالیس دوکانوں کی زبان علاقے کے ایم پی اے کو دے آیا ہوں.....'' رنگا کو غصہ آ گیا..... ''زبان دے آیا ہے تو پھر یہاں کیا لینے آیا ہے۔ قبضہ بھی جا کر اسی وزیر سے لے لے.....'' سیٹھ جبار نے بات بگڑتی دیکھ کر جلدی سے دائیں جانب کھڑے منشی نما شخص سے ایک اسٹامپ پیپر لے کر دستخط کر دیے اور سلام کر کے پلٹ گیا۔

دوسرا سائل آگے بڑھا..... موسیٰ نے پہچان کروائی..... ''یہ فیقا فلم والا ہے بھائی..... دو سال پہلے اپنی فلم کا اعلان کر کے ایڈوانس بھی دے چکا ہے..... لیکن کوئی نیا ہیرو ہے جو وقت نہیں دے رہا۔ پیسے بھی کھا چکا ہے، لیکن اب شوٹنگ کے لیے مزید پیسے مانگ رہا ہے۔ پروڈیوسر تباہ ہو گیا ہے رنگا بھائی.....''

سارنگا نے فلم پروڈیوسر پر معنی خیز نظر ڈالی..... ''کیوں بھئی، فیقے عرف رفیق، مل گئی تجھے فرصت اپنی فلم کی پریوں سے..... وہ تیری ہیروئن تو اسٹوڈیو سے زیادہ وقت تیرے اس فلیٹ میں گزارتی ہے۔ پھر کیسے بنے گی تیری فلم.....؟''..... موسیٰ نے لقمہ دیا ''زیادہ تر تو یہ اپنی ہیروئنوں سے شادی رچا لیتا ہے رنگا بھائی.....'' رنگا نے زیر لب کچھ کہا اور پروڈیوسر کو جھاڑا ''خوب جانتا ہوں میں اس کی ان فلمی شادیوں کو..... بہر حال..... کاغذ بھروالے اس سے کہ فلم مکمل ہونے کے بعد چل پڑی تو آدھا منافع ہمارا..... اور پیشگی کے طور پر اس کا وہ فلیٹ لکھوا لے..... اچھا ہے نہ رہے گا فلیٹ نہ چلیں گی اس کی یہ عیاشیاں..... جا کر اپنی فلم پر دھیان دے.....'' پروڈیوسر بھی دستخط کر کے آگے بڑھ گیا۔ سامنے بیٹھے ایک پکی عمر کے عہدے دار نے شکایت کی ''رنگا بھائی وہ ڈاک یارڈ کا نیا افسر بہت تنگ کر رہا ہے۔ دو مہینے پہلے ہی ڈی ایس پی لگا ہے علاقے میں لیکن آتے ہی ہمارے ہر کام میں دخل دینے لگا ہے۔ دو مرتبہ سندیسہ بھی بھجوایا ہے کہ ہمارے معاملوں میں ٹانگ نہ اڑائے مگر ایمان داری کا بھوت سوار ہے اس کے سر پر.....'' رنگا نے غور سے عہدے دار کی طرف دیکھا، ایمان دار ہے یا ریٹ زیادہ چاہتا ہے.....''۔

''نہیں بھائی..... ریٹ تو اس کے آتے ہی ودگت کر چکے ہیں ہم لوگ.....'' رنگا کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے موسیٰ کو حکم دیا ''وہ کون سا وزیر ہے جو یہ معاملے دیکھتا ہے۔ ہاں..... داخلے کا..... فون لگا اس کو.....'' موسیٰ نے جلدی سے دستی فون سیٹ اٹھا کر کوئی نمبر لگایا۔ دوسری جانب لائن ملنے پر اس نے فون رنگا کے حوالے کر دیا۔ رنگا نے سلام دعا کے بعد براہ راست شکوہ کیا ''کیا بولوں سرکار..... آپ بھی چن چن کر ہمارے

علاقے میں افسر لگاتے ہو..... ڈاک یارڈ میں جس کو آپ نے نیا بھرتی کر کے بھیجا ہے بار بار راستے میں آ رہا ہے..... کل کلاں کو لڑ کے کچھ کر بیٹھیں گے پھر آپ ہی کو شکایت ہوتی ہے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا.....'' وہ دوسری جانب کی بات سننے لگا ''بس اس کو بدلی کرنا ہے اور آج شام تک ہی کرنا ہے..... ڈاک یارڈ میں آپ کے تیرہ ہزار ووٹ ہیں..... پبلک ناراض ہوگئی تو اگلے الیکشن میں سنبھالنا مشکل ہو جائے گا..... ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... کل تک ہی سہی..... آپ کا ہی دیا کھاتے ہیں.....'' رنگا نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور عہدے دار سے بولا

''آج تین بجے بڑے دفتر میں جا کر اس افسر کا نام دے دینا جسے ڈاک یارڈ میں لگوانا ہے اور دھیان رہے۔ بندہ کام کا ہو..... ہڈ حرام نہ ہو.....'' رنگا دوپہر تک احاطے میں بیٹھا اپنی سرکار چلاتا رہا۔ کون سا مسئلہ تھا جو اس کی عدالت میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ چوری، ڈکیتی، قتل، اغواء، قبضہ، رسہ گیری، شادی بیاہ، ہنڈی، سیاسی جھگڑے..... غرض کوئی قضیہ ایسا نہیں تھا جس کا فیصلہ سارنگا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نہ کر دیا ہو، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بمشکل ہی کسی نے اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب جانتے تھے کہ چاہے انہیں آدھا انصاف ہی ملے لیکن مل ضرور جائے گا، اور سچ بھی یہی تھا کہ رنگا انہیں فوری طور پر ان کے حصے کا آدھا انصاف فراہم کر دیتا تھا۔ باقی آدھا انصاف رنگا کی سرکار کے حق میں جاتا تھا۔ لہٰذا کچھ نہ ملنے سے آدھا ملنا ہی سب کے لیے قابل قبول ہوتا تھا۔

دوپہر 2 بجے دربار برخواست ہوگیا۔ باقی ماندہ کیس اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیے گئے۔ کچھ ہی دیر میں وہیں درختوں کی چھاؤں تلے ایک وسیع اور کشادہ دسترخوان بچھا دیا گیا اور کھانا چن دیا گیا۔ سارنگا نے وہیں سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ مجھ سے دو بار اس نے پوچھا کہ مجھے یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میرے لیے یہ سب کیسا جہان حیرت ہے۔

4 بجے اسماعیل نے ناہید کی حویلی کی طرف جانے کے لیے گاڑی لگا دی۔ رنگا دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے رہائشی حصے کی طرف جا چکا تھا ہم ناہید کے ہاں پہنچے تو اسے اور ہوا کو میری گزشتہ شب بسری کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ ناہید بے حد خوش تھی کہ میں نے کہیں اور نہیں اس کے بابا کی طرف منتقلی کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے مجھ سے گلہ بھی کیا میں نے گزشتہ روز ہی اسے اپنے گھر بدری کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔ جانے اسے یہ ساری خبریں کون پہنچاتا تھا۔ اسماعیل تو کل رات دیر تک میرے ساتھ ہی تھا۔ شاید دن میں جب میں رنگا سرکار کی عدالت دیکھ رہا تھا کسی وقت وہ یہاں آیا ہو۔ کیونکہ درمیان میں وہ دو مرتبہ کہیں گیا تھا۔ میں نے ناہید کو تسلی دی کہ ابا کا غصہ ختم ہوتے ہی ریحان خود مجھے لینے آ جائے گا، لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اندر سے کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ گھر اور میرے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا..... ناہید مجھ سے بار بار پوچھتی رہی کہ اس کے بابا مجھے کیسے لگے؟ انہوں نے میرا ٹھیک سے خیال رکھا یا نہیں.....؟ اور میں وہاں خوش تو ہوں؟ وغیرہ وغیرہ اور میں اسے اپنے گزرے دن کے بارے میں بتاتا رہا۔

پھر میں نے خاص طور پر ناہید سے ستارہ کے بارے میں بات کی کیونکہ میں سارنگا سے پہلے ناہید سے ستارہ کی ٹیوشن کے بارے میں اجازت لینا چاہتا تھا۔ ناہید تمام بات سن کر افسردہ ہوگئی ''کیوں آیان بھائی..... آپ مجھے نہیں پڑھانا چاہتے کیا.....؟''۔

''ایسی بات نہیں..... وہ لوگ اس وقت ضرورت مند ہیں لہٰذا انہیں کسی ایسی مدد کی ضرورت ہے کہ ان کی خودداری متاثر نہ ہو، اور اب میرا

اور تمہارا رشتہ ایسے کسی بہانے کا متقاضی بھی تو نہیں..... تمہارا جب جی چاہے میں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود رہوں گا.....'' میری بات سن کر ناہید کے چہرے پر روشنی سی آ گئی ''تو پھر ٹھیک ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں..... مگر بابا شاید مجھے گھر سے باہر پڑھنے کے لیے نہ جانے دیں.....''۔

''کوئی بات نہیں..... اس صورت میں اسماعیل روزانہ ستارہ کو یہاں لا سکتا ہے..... جیسے وہ مجھے لے کر آتا ہے.....''

ناہید کی رضامندی کے بعد میں ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جب اسماعیل مجھے دوبارہ یعقوب مینشن لے کر پہنچا تو ایک اور شام ڈھلنے والی تھی۔

احاطے میں کل شام کی طرح کلائی اور زور کی مشق جاری تھی۔ آج رنگا خود بھی ایک بڑے سے اسٹول پر بیٹھا اپنے کارندوں کو زور سکھا رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان نے دوسرے کی کلائی زور سے درمیان میں بچھی میز پر گرا دی۔ فضا میں ہلکی سی ہڈی چٹخنے کی آواز ابھری۔ مجھے دیکھ کر سارنگا نے دعوت دی ''کیوں بھئی ساجن..... کلائی لڑائے گا میرے شیروں سے..... سنا ہے تجھ میں بڑا دم خم ہے۔ یہ یاد رکھنا پنجہ لڑانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔'' میں نے ہلکے سے مسکرا کر معذرت کی۔

''نہیں..... آپ کے شیر واقعی سوا سیر ہیں۔ میرا ان سے کیا مقابلہ.....؟'' لیکن موسیٰ نہ مانا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سارنگ کے سامنے بچھی لکڑی کی میز پر بائیں جانب بڑھا دیا۔ ایک نوجوان اپنی کلائی پر ہاتھ پھیرتا ہوا میرے مدمقابل آ کر بیٹھ گیا۔ مجبوراً میں نے اپنا ہاتھ پنجہ لڑانے کے لیے میز پر رکھ دیا۔ نوجوان کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں۔

باب13

سارنگا نے زور سے تالی پیٹی ''واہ بھئی..... میدان میں تو میرا بڑا سورما اترا ہے۔ چل سینڈو..... دکھادے اپنا زور اس شہزادے کو.....''

بچپن سے اب تک میں کئی بار ریحان اور اپنے دوستوں کے ساتھ پنجہ لڑانے کا یہ کھیل کھیل چکا تھا، لیکن بالے کے علاوہ مجھے اور کوئی ہرا نہیں پایا تھا۔ بالے کی کلائی میں واقعی بلا کا زور تھا۔ ریحان کو تو میں زبردستی بھی دونوں ہاتھوں سے پنجہ گرا کر ہرا دیتا تھا اور اس کام میں چھوٹی میرا ساتھ دیتی تھی وہ میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا زور بھی ڈال دیتی تھی اور ریحان کو ہارنا ہی پڑتا تھا کیونکہ اگر وہ جیت جاتا تو پھر میں دن بھر منہ پھلائے پھرتا اور ریحان سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ جانے یہ بچپن ایک دم پھر سے اڑ کر کہاں اوجھل ہو جاتا ہے۔

سینڈو نے اپنا بایاں ہاتھ اپنی پشت پر پیچھے مضبوطی سے کس لیا اور مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی اسی عمل کو دہراؤں تاکہ صرف دائیں ہاتھ کے پنجے اور کلائی کا زور ہو سکے۔ ہمارے آس پاس موجود باقی سارے شاگرد، کارندے اور ان کے بوڑھے استاد بھی ہمارا یہ بے وزن مقابلہ دیکھنے کے لیے اپنی مشق چھوڑ کر ایک دائرے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ قاعدے کے مطابق موسیٰ میری طرف سے میرا حوصلہ بڑھانے والا مقرر ہو گیا اور سینڈو کی سرپرستی خود سارنگا نے سنبھال لی۔ میرے حق میں نعرے لگانے والوں کو موسیٰ نے بائیں جانب کھڑا کر دیا اور سینڈو کے حمایتی دائیں جانب اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گویا باقاعدہ ٹیم بنا کر پنجہ لڑانا بھی یہاں کے آداب و تربیت میں شامل تھا۔ ایسا شاید اس لیے کیا جاتا ہوگا کہ کوئی ایک مقابل داد اور جوش کی بٹائی میں تنہا نہ رہ جائے۔ ایسا موقع سارنگا یہاں اپنے دشمنوں کے لیے بھی ضرور فراہم کرتا ہوگا۔ سینڈو نے اپنا پنجہ کھولا اور میں نے اپنی ہتھیلی اس کی ہتھیلی سے جوڑ کر اپنی انگلیاں کس لیں۔ موسیٰ نے گنتی شروع کی۔ تین۔ دو۔ ایک اور اس کی انگلی گرتے ہی فضا میں شور سا مچ گیا۔ ''شاباش سینڈو..... دس سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں..... گرا دے اسے.....'' کوئی میری طرف سے چلایا ''شاباش جوان..... ہمت کرو..... گرنے نہ پائے'' سینڈو بآسانی میرا ہاتھ میری طرف جھکانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن میز کی سطح چھونے سے پہلے ہی میری کلائی نے اپنا زور پکڑ لیا اور میں دھیرے دھیرے سینڈو کا ہاتھ واپس برابر سطح پر لانے میں کامیاب ہو گیا لیکن سینڈو واقعی پنجہ لڑانا جانتا تھا۔ اس نے میری لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنے ہاتھ کو اپنی جانب زیادہ جھکنے نہ دیا۔ میری کن پٹی سے پسینے کی ایک بوند پھوٹی اور دھیرے دھیرے میرے کان کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں کی نسیں پھٹنے کو تھیں۔ چاروں طرف شور برپا تھا۔

''بلے بھئی بلے..... آج تو سینڈو کو پنجہ دکھانے والا بھی کوئی پیدا ہوا ہے۔ آفرین ہے جوانا.....'' دوسری طرف سے سارنگا نے نعرہ مارا ''کیا کر رہا ہے..... عزت ڈبوئے گا کیا سارے اڈے کی..... اتنا لمبا مت کھینچ.....'' موسیٰ تو باقاعدہ چلا رہا تھا ''واقعی ماں کا دودھ پی کر پلا ہے یہ جوان..... توڑ ڈال اس سانڈ کی کلائی آج..... ہڈی پسلی دے سینڈو کی.....'' میں اور سینڈو دونوں پسینے میں تربتر ہو چکے تھے۔ ہماری کہنیوں کے نیچے بچھی میز کی سطح میں سے اب باقاعدہ لکڑی کی چرچراہٹ کی آوازیں آنے لگی تھی۔ مجھے آس پاس صرف ایک سرخ اندھیرا دکھائی دے رہا تھا اور میری

پوری حسیات سمٹ کر صرف میری کلائی کے اندر سما گئی تھیں۔ پھر اچانک سینڈو نے ہاتھ کو ایک لمحے کے لیے کچھ ڈھیلا چھوڑا اور میری توجہ ہٹی اور شاید یہ میری غلطی تھی کیونکہ دوسرے ہی لمحے سینڈو میرا بازو میز کی سطح پر گرا چکا تھا۔ ماحول نعروں اور چیخوں سے گونج اٹھا۔ اڈے کا سینڈو جیت چکا تھا لیکن سارنگا کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ اس نے قریب پڑی لکڑی کی ایک پلیٹ اٹھا کر سینڈو کی کمر پر دے ماری ''حرام خور..... پورے ڈھائی منٹ لگا دیے تو نے..... چربی چڑھ گئی ہے تیرے جسم پر..... اتارنی پڑے گی..... اتنی دیر میں تو پہلے دس بندے گرا دیتا تھا'' سینڈو نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری کلائی تھام کر مجھے کھڑا کر دیا ''اس میں بڑا دم ہے بھائی..... یہ ان میں سے نہیں ہے۔'' موسیٰ نے بھی میرے بازو سہلائے..... ''جی خوش کر دیا تم نے آج.....'' سارنگا نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکالا، اور مجھ پر وار کر کسی خدمت گار کو تھما دیا ''جانتا ہے تو سینڈو سے کیوں ہار گیا.....؟.....''۔

''کیونکہ سینڈو مجھ سے بہتر پنجہ باز ہے.....'' سارنگا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں..... اس لیے کہ عین آخری لمحے میں تیری نظر اس کی نظر سے ہٹ گئی تھی'' میں نے حیرت سے سارنگا کی طرف دیکھا ''کیا مطلب ہے؟..... مقابلہ تو کلائی کے زور کا ہو رہا تھا۔ پھر نظر کا نظر سے کیا واسطہ.....؟.....''

سارنگا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ ''نظر کا ہی تو سارا کھیل ہے پیارے..... پنجہ آزمائی میں جتنا کلائی کا زور درکار ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے مقابل کی نظر پہچاننا بھی ضروری ہے.....'' میں حیرت سے سارنگا کی بات سنتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ پنجہ آزمائی کے دوران حریف ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ایک دوسرے کو آخری لمحے تک گھورتے کیوں ہیں۔ اصل میں وہ دوسرے کی نظر پڑھ رہے ہوتے ہیں ہاتھ تو دماغ کی ہدایت پر اپنی پوری توانائی کا زور صرف کر ہی رہا ہوتا ہے لیکن مقابل کی نظر یہ بتاتی ہے کہ وہ کس وقت اپنی کلائی کو کس انداز میں جھٹکے گا یا ساکت رکھے گا۔ نظر سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اگلا حریف اب اس مقام پر ہے جہاں ایک آخری جھٹکا اس کی کلائی کو گرا سکتا ہے۔ غرض یہ صرف کلائی سے کلائی کی نہیں..... بلکہ آنکھ سے آنکھ کی بھی برابر کی لڑائی ہوتی ہے..... سارنگا کے جانے کے بعد موسیٰ نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پنجہ آزمائی کے چند گر بھی بتا دیے اور مجھے مشق کرتے رہنے کی تلقین بھی کی۔

بعد میں اسماعیل نے مجھے بتایا کہ موسیٰ خود ایک زمانے میں شہر کا سب سے بڑا چاقو باز رہ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بجلی کی سی تیزی اور پھرتی تھی کہ مقابل کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور وہ اپنی شہ رگ سے خون کے فوارے بلند ہوتے دیکھتا تھا۔ اسماعیل نے مجھے چاقو بازی کے کہنہ اصولوں سے بھی روشناس کروایا کہ اچھا چاقو باز کبھی جلدی میں اور اوچھا وار نہیں کرتا اور اگر وہ ماہر بھی ہو تو اگلے کے جسم پر لگا چاقو کا ہر زخم اور نشان ہمیشہ کے لیے اس کی نیک یا بدنامی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ ماہر کو ہمیشہ ناپ تول کر وار کرنا ہوتا ہے کسی مستند جراح کی طرح، اور اس کی مشق کا ایک عام پیمانہ یا امتحان یہ رکھا جاتا ہے کہ اسے مختلف جسموں کے کسی ایک مخصوص حصے پر ایک ہی ناپ اور سائز کا زخم لگانے کا کہا جاتا ہے اور بعد میں اگر ان دس بارہ زخموں سے ایک سنٹی میٹر بھی کم یا زیادہ ہو تو اسے ماہر کی گدی سے اتار دیا جاتا ہے۔ یا پھر سے امتحان میں شریک ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور بڑی حیرت انگیز بات پتہ چلی کہ ایک ماہر سرجن یا جراح کی طرح اچھا چاقو باز چاہے تو اپنے زخم کا نشان نہیں چھوڑتا وہ ہر دار جسم پر بنی قدرتی لکیروں (Body lines) کے متوازی کرتا ہے اور زخم بھرنے پر زخم کا زرہ برابر نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی تجربہ کار پلاسٹک سرجن کسی مریض کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ بقول اسماعیل نئے لڑکوں کو مشق کراتے ان عمر رسیدہ استادوں میں اب بھی ایسے کئی چاقو باز موجود تھے جو اڑتی مکھی کو بھی نشان بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں نے اسماعیل سے درخواست کی کہ کیا میں اگر اس فن کی کوئی سدھ بدھ حاصل کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں، لیکن اسماعیل نے نفی میں جواب دیا کہ صرف چند مشقوں کی حد تک تو ٹھیک ہے ورنہ باقاعدہ یہ فن چاقو بازی سیکھنے کے لیے مجھے اڈے سے وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا اور کسی ایک استاد کو باقاعدہ اپنا استاد مان کر اور بھینٹ چڑھا کر اس کی شاگردی میں آنا ضروری ہوگا ورنہ اس دنیا کے ریتی رواج اور اصول میرے آڑے آجائیں گے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اسماعیل نے مجھے پان کی پیش کش کے لیے باہر جانے کا پوچھا۔ مجھے یاد آیا کہ سارنگا سے پہلی ملاقات کی رات وہ بھی موئی کے ساتھ کیفے فراق سے اگلے چوراہے پر بتی شہر کی مشہور پان کی دوکان سے ہی پلٹ رہے تھے جب موئی نے مجھے سڑک کنارے دیکھا تھا۔ میں نے اسماعیل کے سامنے شرط رکھی کہ اگر وہ کیفے فراق کے اگلے چوراہے تک لے چلے تو مجھے پان کی یہ پیش کش منظور ہے۔ اسماعیل میرا مدعا سمجھ کر مسکرا دیا اور کچھ دیر بعد ہم گاڑی میں سوار شہر کی سنسان سڑکیں ناپ رہے تھے۔

اسماعیل نے پان خریدنے کے بعد واپسی پر گاڑی کیفے فراق کے سامنے کھڑی کر دی۔ مرزا نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا میری جانب آیا۔ مجھے گھر سے نکلے بمشکل اڑتالیس گھنٹے ہوئے تھے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میں اڑتالیس سال بعد کیفے فراق آیا ہوں۔

مرزا آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا ''انو یار..... کہاں چلے گئے تھے تم.....'' میں نے اس سے راجہ اور بالے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں مشی کے پاس ہسپتال گئے ہیں لیکن میرے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں جب بھی آؤں تو مرزا کے ساتھ کوئی وقت ضرور طے کر لوں جب ہماری ملاقات ہو سکے۔ میں نے مرزا سے کہا کہ کل کا پتہ نہیں لہٰذا میں ابھی ہسپتال سے ہو آتا ہوں۔ میں نے مرزا کو ریحان کے لیے پیغام بھی دیا کہ میں ٹھیک ہوں میری فکر نہ کرے۔ میں نے اسماعیل کو ہسپتال چلنے کا کہا۔ میں دل ہی دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ وارڈ میں مجھے مشی کے ابا یا محلے کا کوئی دوسرا بزرگ نہ مل جائے۔ اس وقت میں کوئی وضاحت دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

میری دعائیں رنگ لائیں اور مجھے راہداری کے شیشے والے دروازے سے اندر صرف راجہ اور بالا ہی نظر آئے۔ وہ دونوں مجھ پر نظر پڑتے ہی یوں اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی ''کہاں تھے تم..... تمہیں پتہ بھی ہے ہم کتنے پریشان تھے، تمہیں تو بس سدا سے اپنی من مانی کا شوق ہے نا، ہماری پرواہ کسے.....؟'' ان کے شور سے گھبرا کر مشی نے بھی اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ اس کی حالت اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں دوسرے مریضوں کا واسطہ دے کر چپ کرایا۔ ''ٹھیک ہے ہم شور نہیں کریں گے مگر یہ بتاؤ کہ تم دو دن سے غائب کہاں ہو..... اور رات کہاں گزاری تم نے.....''۔

''میں سارنگا کے یعقوب مینشن میں تھا.....'' میری بات سن کر پہلے تو وہ کچھ سمجھے ہی نہیں اور پھر جب انہیں سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کہا ہے تو جیسے ان کے سروں پر کسی نے زوردار بم پھوڑ دیا۔ اس مرتبہ چلانے والوں میں مشی خود بھی شامل تھا۔ ان کی آوازیں سن کر ڈیوٹی پر موجود نرس گھبرا کر ڈیوٹی روم سے بھاگتی ہوئی مشی کے بستر کی جانب آگئی اور پھر اس نے تینوں کی وہ خبر لی کہ انہیں معافی مانگتے ہی بنی ورنہ وہ سٹاف انہیں وارڈ بدر کرنے پر ہی مصر تھی۔ ان تینوں کی آواز اب بھلے ہی دھیمی ہو چکی تھی مگر ان کے تاثرات اب بھی انتہائی اونچے (Loud) تھے۔ میں نے الف سے لے کر ی تک ساری کہانی انہیں سنا دی۔ کچھ دیر تک وہ سب خاموش رہے پھر راجہ نے پہل کی ''لیکن یار انو.....لوگ تو یہی کہیں گے نا کہ کل تک جس رنگا کے خلاف ہم لڑ رہے تھے۔ آج ہمارا یار اسی رنگا بھائی کے گھر میں رہ رہا ہے'' میں نے ان کی طرف دیکھا ''لوگوں کی پرواہ کسے ہے؟.....اور وہ شوکی جسے ہم رنگا کا خاص آدمی سمجھتے تھے وہ تو اس کے احاطے کے سو کوس دور بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اپکا پن شہر میں اور بھی بہت سی جگہوں پر سارنگا کے نام پر ہوتا ہوگا۔ میں اس جگہ یا ان لوگوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں.....لیکن سچ یہی ہے کہ ہم جو انہیں سمجھتے ہیں وہ لوگ اس سے بہت مختلف ہیں.....'' بالے نے دھیرے سے کہا ''ویسے جس دن سے ہم تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔ علاقہ میں زبردستی بھتہ یا ہفتہ لینے کے لیے کوئی پارٹی نہیں آئی.....اب تم نے بتایا ہے تو پتہ چلا ہے ورنہ آس پاس کے سبھی دوکاندار اسے ہمارا ہی کارنامہ سمجھ رہے تھے.....''۔

''چلو چاہے جیسے بھی سہی پر یہاں کے لوگوں نے سکون کا سانس تو لیا.....اور مجھے یقین ہے کہ اب دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔.....جب تک سارنگا کے پاس یہ علاقہ ہے تب تک تو ہرگز نہیں.....''

تب ہی راجہ کی زبان سے ایک ایسا سوال نکل گیا جس کا جواب اس وقت ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

''لیکن جب یہ علاقہ سارنگا کے ہاتھ سے نکل گیا تب کیا ہوگا؟'' ہم سب ہی چپ ہو گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ''اس سے پہلے ہمیں یہ علاقہ اپنے نام کرنا ہوگا۔ اس مسئلے کا سب یہی ایک حل ہے.....'' میرے پھیلے ہاتھ پر تین ہاتھ اور آ گرے اور ہم چاروں نے آج تک زندگی میں ایسے بہت سے عہد ایک دوسرے کے ساتھ کیے تھے اور ہم چاروں جانتے تھے کہ اب یہ عہد پورا کرنا ہم چاروں کا فرض بن چکا ہے۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسماعیل کے خیال کی وجہ سے وہاں سے اُٹھ آیا۔ اسماعیل آرام سے سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس کا کاندھا ہلایا ''آ گئے بابو.....مل لیا دوستوں سے.....''۔

''ہاں.....مگر میں نے تمہیں بے آرام کر دیا.....''۔

''ارے نہیں.....ڈرائیور کا تو کام ہی انتظار کرنا ہے.....اور سچ بتاؤں.....جب تم اپنے دوستوں سے ملتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی کبھی یاروں کا یار تھا۔ پھر وقت نے ایسے پھیرے دیے کہ سارے دوست ایک ایک کر کے چھوٹتے گئے، لیکن تم اپنے دوستوں کو کبھی نہ چھوڑنا آیان بابو.....یہی ایک وہ رشتہ ہے جو ہم خود بناتے ہیں۔ باقی تو بنے بنائے ملتے ہیں اور بس نبھانے پڑتے ہیں۔''

ہم یعقوب مینشن پہنچے تو رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ احاطے میں صبح سویرے کی مشق کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہم کار سے اترے تو میں نے چند بزرگوں کو دودھ کی سبیل والی جگہ پر بنی پانی کی بڑی ٹینکی کے نیچے وضو کرتے دیکھا۔ کچھ دور چند حضرات صفیں بچھا رہے تھے۔

گویا یہاں نمازی حضرات کے لیے نماز ادا کرنے کا بھی مکمل بندوبست موجود تھا۔

اگلہ دن جمعہ کا تھا۔ میں نے اسماعیل سے کہا کہ مجھے صبح ساڑھے دس بجے تک کچھ دیر کے لیے سادات محلے جانا ہے لہٰذا اگر وہ مجھے یہاں نہ پائے تو پریشان نہ ہو، لیکن جب صبح ساڑھے دس بجے کے قریب میں باہر نکلنے لگا تو اسماعیل گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا ''آیان بابو..... ڈرائیور حاضر ہے.....''

''لیکن تم نے کیوں تکلیف کی..... میں چلا جاتا..... ہماری غیر موجودگی میں کسی کو گاڑی کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے.....؟''

اسماعیل نے گاڑی گیئر میں ڈال دی..... ''نہیں..... یہ گاڑی صرف ناہید بٹیا کی ڈیوٹی پر ہے اور بٹیا نے اسے اب تمہاری ڈیوٹی پر لگا دیا ہے کیونکہ اسے خود تو کہیں جانا نہیں ہوتا۔ بس کبھی کبھار شہر کی بڑی لائبریری تک جانا ہو تو فون کر کے مجھے بلا لیتی ہے.....''

کچھ دیر بعد ہم سادات محلے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی کو شیخ صاحب کے دروازے کے قریب رکتے دیکھ کر اٹھیں..... دروازہ خود شیخ صاحب نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی حسب معمول ان کا چہرہ کھل گیا۔ میں نے بیٹھک میں بیٹھتے ہی سب سے پہلے ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کے چہرے پر بہت سی سوچوں کی لکیریں ابھر آئیں۔

''ہاں میاں..... شیخانی جی نے ذکر تو کیا تھا ستارہ کی اس خواہش کا۔ پر تمہیں سچ بتاؤں تو میرا دل نہیں مانتا۔ اور پھر اگر ان کے بڑے بھائی یعنی میرے صاحبزادے حمید کو اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کی بہن نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی ہے تو یقین جانو وہ بہت ناراض ہوگا۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت مزاج ہے..... اور اب اس کے یہاں آنے میں کچھ زیادہ دن بھی باقی نہیں ہیں'' تنویر بھی کچھ دیر میں بیٹھک میں آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ وہی ٹیوشن ہے جو اس نے مجھے دلائی تھی۔ سیٹھ داؤد کی صاحبزادی والی..... لیکن جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ناہید اصل میں سارنگا کی بیٹی ہے تو ان دونوں کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ شیخ صاحب نے سوچنے اور سب سے مشورہ کرنے کے لیے مجھ سے کچھ وقت مانگ لیا۔ کچھ دیر میں چائے بھی آ گئی مگر وہ جسے میری نظریں غیر ارادی طور پر ہمیشہ ڈھونڈتی رہتی تھیں آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر رخصت ہوتے وقت شیخانی جی نے ہی یہ عقدہ کھولا کہ ستارہ اور گہنا دونوں ہی پڑوس میں کسی کے بے حد اصرار پر ان سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ میں بھاری دل کے ساتھ یعقوب مینشن پہنچا تو وہاں کچھ عید کا سا سماں تھا۔ مختلف اہل کار، شاگرد اور استاد سروں پر فلسطینی رومال باندھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اسماعیل نے سر پر ہاتھ مارا ''اوہو..... شکر ہے ہم وقت پر واپس آ گئے..... آج تو جمعۃ المبارک ہے.....'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ''ہاں..... تو.....؟''۔

''چلو تم بھی جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ آج کے دن ہم سب رنگا بھائی کے ساتھ جامع مسجد جاتے ہیں نماز پڑھنے..... یہاں جمعہ کو خاص تیاری ہوتی ہے.....'' مجھے حیرت ہوئی کہ ہفتے کے باقی چھ دن کی نمازیں ضائع کر دینے والا رنگا جمعہ کو اس قدر اہتمام سے کیوں مناتا ہے۔

کچھ دیر بعد جب میں لباس تبدیل کر کے باہر احاطے میں آیا تو سبھی گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ جلد ہی سامنے سے رنگا، موئی سمیت آتا نظر آیا۔ رنگا نے بھی سر پر چار خانے کا مخصوص فلسطینی رومال باندھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تسبیح تھی۔ آنکھوں میں سرمے کی دھار کچھ

زیادہ گہری اور لباس میں خاص اہتمام۔اس نے مجھے احاطے میں گم سم کھڑے دیکھا تو اشارے سے مجھے اپنی بڑی وین نما گاڑی میں بلا لیا جس میں اس کے خاص محافظ موسیٰ سمیت پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔وین کے پیچھے باقی ساری گاڑیاں بھی چل پڑیں لیکن گیٹ سے نکلتے ہی ایک اور انہونی ہماری منتظر کھڑی ملی۔سامنے پولیس کی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان سب کی سربراہی اے ایس پی بلال کر رہا تھا۔یہ وہی اے ایس پی تھا جو کبھی میرے ابا کا شاگرد رہ چکا تھا اور جس کے تھانے میں ہماری گرفتاری ڈالی گئی تھی۔

گاڑیاں رک گئیں۔ہم گاڑیوں سے اترے اور اے ایس پی کی نظریں مجھے رنگا کی وین سے اترتے دیکھ کر حیرت سے پھیلتی گئیں۔



باب14

سارنگا کے محافظوں نے فوراً اپنی بندوقیں اور پستول لوڈ کر لیے لیکن سارنگا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اے ایس پی مجھے رنگا کے ساتھ دیکھنے کی حیرت کے پہلے جھٹکے سے باہر آ چکا تھا۔ رنگا نے اس سے پوچھا ''کیوں بھائی..... یہ باہر کیوں بازار لگا رکھا ہے..... کوئی کام تھا تو اندر آ جاتا''۔ بلال شاید رنگا کی حیثیت سے واقف تھا ''اندر آنے کا وقت آیا تو وہاں تک بھی ضرور آئیں گے۔ فی الحال تو ہم ایک اشتہاری کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی علاقے میں غائب ہو گیا ہے مجھے شک ہے کہ وہ اسی مینشن میں جا کر چھپ گیا ہے۔''

رنگا نے مسکرا کر موسیٰ کی جانب دیکھا ''اے موسیٰ..... تو یہاں اشتہاریوں کو بھی پناہ دیتا ہے؟..... کم از کم ان سے روز کا بھاڑا ہی لے لیا کر.....''

رنگا کی بات پر ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجا..... بلال نے خون کے گھونٹ پی کر ہم سب کی طرف دیکھا..... ''ساری دنیا جانتی ہے کہ علاقے کا ہر اشتہاری اسی حویلی کی بھول بھلیوں کی طرف آ کر گم ہو جاتا ہے.....'' سارنگا نے اسے دعوت دی ''چل اگر تجھے اتنا ہی شک ہے تو دور کر لے اپنا وسوسہ..... جا کر اندر تلاشی لے لے..... مگر پہلے اپنے بڑوں سے کاغذ لے آ.....'' اے ایس پی نے سرد لہجے میں کہا ''سرچ وارنٹ بھی لے آؤں گا ایک دن..... اور یاد رکھنا..... وہ دن ان سب اشتہاریوں کا آخری دن ہو گا.....'' موسیٰ نے لقمہ دیا ''ٹھیک ہے بڑے صاحب..... ہم ابھی جمعہ کی نماز کے لیے جا رہے ہیں..... تیرے لیے بھی دعا ڈالتے آئیں گے۔'' موسیٰ کی بات پر سب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سارنگا نے سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس پلٹنے لگا تو بلال نے آواز دے کر مجھے روک لیا..... ''بات سنو.....'' میں دو قدم بڑھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا ''تم توقیر احمد صاحب کے بیٹے ہو ناں..... کیا نام تھا تمہارا.....'' بلال نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی ''آیان..... آیان احمد نام ہے میرا.....'' بلال نے مجھ پر طنزیہ نظریں ڈالیں..... ''ہاں..... آیان..... تمہیں تمہارے محلے میں انو کہتے ہیں ناں.....؟ خوب..... آیان سے انو دادا بننے میں بڑا کم وقت لگایا تم نے..... تبھی نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسی سارنگا کے آدمیوں کو پیٹنے کا دعویٰ کیا تھا..... بڑی جلدی تم نے اپنا ٹریک بدل لیا''..... میں چپ رہا۔ میرے دوستوں کے خدشات سچ ثابت ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے دین میں سے موسیٰ نے آواز دی۔ ''چل شہزادے..... دیر ہو رہی ہے.....'' میں پلٹا اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور بلال کی جانب مڑا ''تم نے اس روز بھی میری بے گناہی پر یقین نہیں کیا تھا اور آج بھی تم تصویر کا ایک رخ ہی دیکھ رہے ہو۔ اس روز ہم چلاتے رہے کہ ہماری جنگ ایک بھتہ خور کے خلاف تھی لیکن تمہاری وردی نے شوکی کا ساتھ دیا تھا۔ آج جب میں اسی شوکی کی جگہ کھڑا ہوں تو تمہارے اعتماد کو کیا ہو گیا.....؟.....'' میں بات ختم کر کے لمبے لمبے قدم لیتا ہوا دین میں جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔ سارنگا نے اپنی تسبیح ختم کر کے مجھ سے پوچھا

''کیوں ساجن..... کیا بول رہا تھا وہ پولیس والا.....''۔

''وہ میرے ابا کا پرانا شاگرد ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا'' رنگا نے گہری سانس لی ''کیا کریں بھیا..... اپنا تو

مقدر ہی اتنا سیاہ ہے کہ جو ذرا دیر ہمارے ساتھ بیٹھ جائے اس کو بھی کالک چاٹ جاتی ہے۔"

وین میں گہری خاموشی طاری ہوگئی صرف کناروں پر لگے چھوٹے پنکھوں کی ہوا۔ گاڑی کے اے سی کی ٹھنڈک کے ساتھ مل کر مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز پیدا کرتی رہی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم جامع مسجد کے باہر پہنچ گئے۔ نمازیوں کے ہجوم میں سے بہت سوں کے ساتھ سارنگا کی اچھی خاصی شناسائی ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ یہیں جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے آتا ہے۔

نماز ختم ہوئی تو مسجد کے وسیع و عریض سنگ مرمر کے فرش والے صحن میں اور باہر مرکزی دروازے کی روش کی جانب سینکڑوں بھکاریوں اور ضرورت مندوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اڈے کے تین نوجوان نمکین اور میٹھے چاول کی کئی دیگیں کھلی گاڑیوں میں لے کر مسجد کے باہر پہنچ گئے اور سارنگا اور موسیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی پرات نما تھالیوں سے چاول نکال کر سب لوگوں میں بانٹنے کا عمل شروع کر دیا۔ پھر جلد ہی افتتاح کے کچھ دیر بعد دیگر کارندوں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی اور سارنگا موسیٰ سمیت ان سب کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران رنگا نے بہت سے لوگوں کی مٹھیوں میں بنا کچھ دیکھے کچھ روپے منتقل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات نے یک دم ہی سر اٹھانا شروع کر دیا۔

تقریباً سہ پہر چار بجے کے قریب یہ مشق ختم ہوئی اور ہم سب یعقوب مینشن پہنچ گئے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہاں بھی دسترخوان بچھ گیا اور سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے اسماعیل کو ناہید کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو سارنگا نے کہا "ٹھہر جا ساجن..... آج اپنی بھی باری ہے اپنی لاڈلی کے گھر پھیرا ڈالنے کی..... اکٹھے چلیں گے....."

اسماعیل نے مجھے بتایا کہ رنگا بھائی زیادہ تر جمعہ کو ہی ناہید سے ملنے جاتا ہے کیونکہ باقی دن اسے اپنی سرکار کے معاملات سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔

ہم اسماعیل کی گاڑی میں یعقوب مینشن سے نکلے تو رنگا کی وین نے بھی ہماری راہ پکڑ لی۔ شاید اس میں دوسرے محافظ موجود تھے۔ موسیٰ البتہ ہماری گاڑی میں بیٹھا رہا۔ تب اچانک میرے ذہن کے پردے پر ایک جھماکا ہوا کہ جس رات میں کیفے فراق کے باہر پہلی مرتبہ سارنگا سے ملا تھا تب بھی یہی وین سڑک کی دوسری جانب کھڑی تھی مگر میں اس وقت اسے کسی دوسرے فرد کی سواری سمجھا تھا۔ مطلب سارنگا کے گرد چوبیس گھنٹے اس کے جان نثاروں کا پہرہ رہتا ہے۔

ہم ناہید کی حویلی میں داخل ہوئے تو ہم سب کو ایک ساتھ دیکھ کر خوشی کے مارے اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ بوا بھی چاروں طرف بھاگ بھاگ کر احکامات جاری کرتی رہی۔ موسیٰ ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور دعا دے کر واپس باہر دیگر محافظوں کی جانب چلا گیا، اور پھر سارنگا نے قہوے اور خشک میوے کی ٹرے رکھ کر واپس لپکتی ناہید کی کلائی پکڑ لی۔ "یہ سب رہنے دے لاڈلی..... تیرا ابا ایسا تجھ سے ملنے آتا ہے اور تو سارا وقت یہ خوان ڈھلائی کرنے میں ہی گزار دیتی ہے۔ اب یہاں چپکی بیٹھی رہ میرے پاس....."

ناہید ہنس دی "بابا آپ بھی تو مہمانوں کی طرح آتے ہیں ناں ہفتے میں صرف ایک بار..... تو پھر خاطر مدارات تو بنتی ہے نا..... اور آج تو میرے لیے دوہری خوشی ہے کہ آپ کے ساتھ آیان بھیا بھی آئے ہیں..... میرے لیے آج کا دن بہت بہت خاص ہے....." سارنگا نے پیار سے ناہید کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور بوا سے شکوہ کیا "یہ کیا بڑی بی..... تو اپنی لاڈلی کو ٹھیک سے کھلاتی پلاتی نہیں ہے کیا..... کیسی سوکھ کر ہڈیوں کا ہار ہوئے جا رہی ہے....." بوا کو شکایت کا موقع مل گیا "یہ کچھ کھائے پیئے تو میں اسے کھلاؤں نا یعقوب..... یہ تو بس پانی پر زندہ ہے....." بوا کے لہجے

سے لگ رہا تھا کہ وہ ضرور کبھی سارنگا کی بزرگ بھی رہی ہوگی۔ ناہید نے لاڈ سے اپنے باپ سے پوچھا "بابا آپ کو میرے آیان بھائی کیسے لگے..... بالکل سلمان بھیا جیسے ہیں ناں....."

سارنگا کی آنکھوں میں غم کی ایک لہری آ کر گزر گئی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا "ہاں ری..... ویسا ہی ضدی ہے..... اکھڑ اور من موجی....." ناہید خوش ہوگئی "دیکھا..... میں نے کہا تھا نا بھائی..... بابا کو بھی ایسا ہی لگتا ہے" ناہید شاید دوری کی وجہ سے سن نہیں پائی مگر میں نے سارنگا کی وہ زیرلب بڑبڑاہٹ سن لی کیونکہ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ سارنگا کا لہجہ دعائیہ تھا "ہاں..... پر خدا نہ کرے اس کا نصیب بھی اس جیسا ہو....." ناہید اور بوا نے ہمیں رات کے کھانے سے پہلے واپس جانے نہیں دیا۔ درمیان میں ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر بھی آیا۔ سارنگا کو اس کے ناہید کے گھر آ کر پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر وہ ناہید کے گھر سے نکلنے کے خلاف تھا اور اس کی وجہ بھی بہت واضح تھی۔ سادات محلے میں ناہید کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنے میں بہت سی الجھنیں درپیش تھیں کیونکہ وہ ایک چھوٹا سا محلہ تھا اور وہاں روزانہ ایک مخصوص وقت پر اتنے محافظوں کی بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں کا آنا جانا خود محلے والوں کے لیے ایک اچھی خاصی زحمت کا باعث بن سکتا تھا۔

ہم ناہید کی حویلی سے نکلے تو رات سر پر تھی۔ موسیٰ نے واپسی کے لیے ڈرائیور کو دوسرا راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ یعقوب مینشن کے دربان نے ہمیں داخل ہوتے ہی بتا دیا کہ کچھ خاص مہمان بڑے مہمان خانے میں سارنگا کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی رہائش کی طرف قدم بڑھائے تو سارنگا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ساتھ لیے بڑے مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا جہاں میں اس سے پہلے نہیں گیا تھا۔

وہ دراصل ایک بہت بڑا ڈرائنگ روم نما ہال تھا جس میں بنا جوڑ کے ایک بہت بڑا اور قیمتی قالین فرش کو ڈھانپے ہوئے تھا اور چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ چھت کے درمیان میں لٹکے فانوس سے چھن کر آنے والی روشنی کچھ اس زاویے سے زمین تک پہنچ رہی تھی کہ ماحول روشن ہونے کے باوجود خواب ناک سا تھا۔ آنے والے مہمان دو عمر رسیدہ شخص تھے جن کے لباس کی نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ان کی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک شخص سفاری سوٹ اور دوسرا قیمتی شیروانی میں ملبوس تھا۔ دربان کے مطابق وہ لوگ مغرب سے بھی پہلے ہمارے انتظار میں یہاں آ بیٹھے تھے۔ سلام دعا کے بعد سفاری سوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر موسیٰ کو دیا جو اس نے سارنگا کو تھما دیا۔ سارنگا نے کارڈ پر نظر ڈالی اور پھر اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں ہاں..... مجھے بولا تھا ابراہیم نے کہ کچھ مہمان آنے کو ہیں..... پر وہ تو کسی نواب صاحب کا ذکر کرتا تھا....."

سفاری سوٹ والے نے شیروانی والے صاحب کی طرف اشارہ کیا "جی..... یہی ہیں میرے دوست نواب دبیر الملک..... شہر کے شمالی علاقے میں جو کاشانہ زمرد ہے، وہ انہی کا ہے....."

سارنگا نے جلدی سے بات کاٹی..... "کاشانہ کیا بولتے ہو صاحب..... وہ تو پورا محل ہے..... سنا ہے ابھی تین سال پہلے ہی اس کا سودا طے ہوا تھا۔ اچھا تو یہ ہیں وہ نواب صاحب جو بھوپال سے تشریف لائے ہیں۔"

نواب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "بھوپال تو آباؤ اجداد کی راج دھانی تھی جناب..... میری پیدائش اور تعلیم ساری باہر کی ہے..... بس

قسمت میں اس شہر کا دانہ پانی لکھا تھا تو یہیں آ کر بس گئے۔ میری زندگی کا زیادہ عرصہ ایران کے شہر تہران میں گزرا ہے..... وہاں زمرو کی کائیں تھیں ہماری.....'' نواب صاحب اپنی اور کاروبار کی باتیں بتاتے رہے جنہیں سارنگا غور سے سنتا رہا۔ شاید جس ابراہیم نے نواب کو ہماری طرف بھیجا تھا وہ سارنگا کو بہت عزیز تھا کیونکہ میں نے اب تک سارنگا کو کسی اجنبی کو اتنا وقت دیتے نہیں دیکھا تھا۔'' تو نواب صاحب..... ابھی ہم کو بولو کہ کیا خدمت کریں آپ کی..... کہیں وہاں کسی حرام خور نے آپ کے محل میں کوئی پرچی درچی تو نہیں ڈال دی اگر ایسا ہے تو رنگا کو بس حکم کر دو.....'' نواب نے جلدی سے رنگا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔'' نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں.....'' سارنگا کو کچھ اطمینان سا ہوا'' اچھا تو پھر کسی مصیبت میں ہو تو بولو..... کسی کو اٹھانا ہے یا کسی کا سر کاٹنا ہے..... زمین چاہئے یا پھر طاقت..... رنگا حاضر ہے.....''

نواب دبیر نے اپنے دوست کی طرف دیکھا جس نے اپنا نام کمال پاشا بتایا تھا۔ پاشا صاحب نے ہلکے سے کھنکار کر وضاحت کی۔'' وہ دراصل رنگا بھائی..... معاملہ کچھ ذاتی ہے..... تو اس لیے.....'' رنگا نے بات سمجھ کر دروازے پر کھڑے محافظوں اور چائے کافی پیش کرتے خدمت گاروں کو اشارہ کیا اور پل بھر میں ہی وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔'' جی نواب صاحب..... ابھی بولو آپ..... اب صرف وہ لوگ باقی ہیں جو رنگا کے اپنے ہیں.....'' میں نے موسیٰ سے نظروں ہی نظروں میں وہاں سے اپنے اٹھنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارنگا میری وجہ سے کسی تکلف کا مظاہرہ کرے لیکن سارنگا نے مجھے اٹھ کر پیچھے جاتے دیکھ لیا'' بیٹھ جا رے..... اب تجھ سے کیا چھپا ہے..... چپ کا بیٹھا رہ.....''

میں خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے گلا صاف کر کے اپنا مدعا بیان کیا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ وہ ان کی ایرانی بیگم اور بیٹی اور پچھلی بیوی سے ان کے دو بیٹے سب ہی کاشانہ زمرد میں رہتے ہیں۔ جسے لوگ اب زمرد حویلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دونوں بیٹے اپنی سوتیلی ماں سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے اور ان دونوں کے اپنے مشاغل ہیں۔ گھر میں ان سب کے علاوہ نواب کے بڑے بھائی کی بیوہ نواب خاتون بھی رہتی ہیں لیکن ان کا گزر حویلی کے پچھلے حصے میں ہی زیادہ رہتا ہے اور وہ شوہر کی موت کے بعد زیادہ لوگوں سے گھلتی ملتی نہیں ہیں۔ پاشا صاحب بھی اپنے دوست کے اصرار پر اپنا زیادہ وقت زمرد حویلی کے مہمان خانے میں ہی گزارتے ہیں، لیکن گزشتہ مہینے سے حویلی میں کچھ پراسرار واقعات کی وجہ سے نواب صاحب کا چین غارت ہو گیا ہے۔ پہلے ان کی خواب گاہ میں کہیں سے کوئی سانپ گھس آیا جب کہ اس علاقے میں سانپ بسیرا نہیں کرتے۔ پھر ان کی رولز رائس کار کی بالکل ٹھیک ٹھاک بریکیں عین سفر کے دوران جواب دے گئیں۔ ڈرائیور اگر عین وقت پر اپنے حواس درست نہ رکھتا تو بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔ پھر نواب صاحب کے چھت کی بالکنی سے ایک وزنی گملہ ٹھیک اسی وقت نیچے گر گیا جب نواب صاحب کی چہل قدمی کا وقت تھا۔ ایک آدھ بار کھانے میں بھی کچھ زہریلی چیز کی آمیزش پائی گئی لیکن محتاط ہونے کی وجہ سے پہلے ہی لقمے کے بعد نواب صاحب نے سب کو کھانا کھانے سے روک دیا۔ غرض ہر واقعہ پہلے حادثے سے زیادہ گھمبیر اور منصوبہ پہلے سے زیادہ پختہ محسوس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اسی بارے میں سارنگا کی مدد کے طالب تھے۔

سارنگا نے ساری بات سن کر لمبی سی ہونہہ کی'' تو پھر آپ کے ساتھ اپنا کوئی حرام خور لگا دیویں..... جو آپ کی حفاظت کرے.....''

''جی محافظ تو پہلے بھی کچھ ہیں برائے نام گھر میں..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں بات کی تہہ تک پہنچ کر اس دشمن کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکوں..... وہ جو کوئی بھی ہے حویلی کے اندر ہی کا ہے..... لہٰذا گھر کی بات باہر نکلنے کا بھی ڈر ہے مجھے..... کوئی ایسا طریقہ ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے.....''

رنگا گہری سوچ میں گم ہو گیا، اور پھر کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ''ٹھیک ہے نواب صاحب..... آپ میرے کو کچھ وقت دے دو..... تب تک آپ کی کوٹھی کے باہر ہم اپنا پہرہ ڈال دیں گے..... کچھ بات سمجھ میں آئی تو آپ سے رابطہ کریں گے..... رب بھلی کرے گا.....''

پاشا اور نواب دبیر شکریہ ادا کر کے جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے نواب نے بتایا کہ اس نے اپنی یہاں آمد کو بے حد خفیہ رکھا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا دشمن ہوشیار ہو جائے۔ موسیٰ نے برسبیل تذکرہ نواب صاحب سے پوچھ لیا کہ کہیں مستقبل قریب میں اس کا سیاست وغیرہ میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ تو نہیں۔ نواب دبیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں..... مگر آپ کو کیسے پتہ چلا''۔ موسیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیسہ اور اس کا اقتدار ہوتا ہے۔ آپ جدی پشتی نواب ہو لہٰذا پیسہ اپنی دشمنی آپ کے پرکھوں سے نکال چکا ہوگا۔ اب تو صرف کوئی ذاتی دشمنی یا اقتدار کی دشمنی ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے آج رات جب آپ سونے کو جاؤ تو بستر پر لیٹ کر اپنے ذاتی دشمنوں کی فہرست بھی بنا لینا۔ ہو سکتا ہے کوئی آپ سے پرانی دشمنی کا حساب چکا رہا ہو۔ ویسے دھیان رہے کہ آپ کا محل ہمارے علاقے سے باہر ہے.....''

نواب نے سر ہلایا..... ''میں اس جانب بھی پورا اطمینان کر چکا ہوں مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری کسی سے کوئی ذاتی پرخاش ہو، بہرحال آپ کہتے ہیں تو آج دوبارہ سوچتا ہوں۔'' پاشا اور نواب ہم سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ میں اس رات اپنے بستر پر لیٹا یہ سوچتا رہا کہ یہاں ہر دیوار کے پیچھے ایک نئی کہانی بنتی اور ایک نیا فسانہ جڑتا ہے لیکن بظاہر دیکھنے میں یہ سب در و دیوار، یہ محل یہ مکان اور یہ شہر اوپر سے کتنا پرسکون لگتا ہے۔

اگلی صبح پھر سے رنگا کی سرکار کا دفتر لگا اور دوپہر تک لوگوں کے مسائل کا انبار سمیٹا جاتا رہا۔ سہ پہر کی چائے کے بعد اسماعیل نے ناہید کی طرف جانے کے لیے گاڑی تیار کر لی۔ میرا ارادہ تھا کہ آج میں شیخ صاحب اور ستارہ کو بھی ناہید کی طرف لے جاؤں گا تا کہ ان کے ذہن اور دل سے جھجک دور ہو سکے.....

اسماعیل نے گاڑی مرکزی گیٹ سے باہر نکالی تو دربان کو کسی سے بحث کرتے پایا۔ وہ زور زور سے کسی کو اندر جانے سے منع کر رہا تھا کہ رنگا بھائی سے اجازت لیے بغیر وہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے بے خیالی میں گیٹ کے باہر کھڑے افراد پر نظر ڈالی اور پھر میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''گاڑی روکو.....''

اسماعیل نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگائی۔ گیٹ کے باہر ابا اور ریحان کھڑے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے گاڑی سے اترا۔ اپنے خیالوں میں گم کھڑے ابا کی نظر مجھ پر پڑی۔

باب15

ابا کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ کی ایک لہر سی ابھری جس نے پل بھر میں ہی شدید غصے اور قہر کے طوفان میں جذب ہو کر ان کے اندر اٹھتے طوفانوں کی خبر دے دی۔ وہ بولے تو ان کی آواز آس پاس لوگوں کی وجہ سے دھیمی تھی مگر ان کے لہجے میں چھپا آتش فشاں میں خوب جانتا تھا۔

''خوب..... جب اے ایس پی بلال نے مجھے بتایا کہ میرا سپوت باقاعدہ غنڈہ بن گیا ہے تو میرے اندر شک کی ایک ہلکی سی رمق باقی تھی کہ شاید میرا خون ابھی اتنا سفید نہ ہوا ہو لیکن آج یہ آخری بھرم بھی توڑ دیا تم نے..... آیان تم اس حد تک چلے جاؤ گے..... یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا.....'' اسماعیل پریشانی سے باپ بیٹے کے درمیان گہری ہوتی اس خلیج کو دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اے ایس پی واپس جا کر اتنی جلدی ابا کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی مناسب موقعے پر پہلے ریحان کو یہ بات بتاؤں گا تاکہ ایسی کسی صورت حال میں وہ بات بگڑنے سے بچا سکے، لیکن کہتے ہیں کہ تقدیر ہمیشہ تدبیر سے دو قدم آگے چلتی ہے۔

ریحان خاموش کھڑا رہا کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس نے ابا کو سنبھالنے کی کوشش کی'' آپ کی طبیعت پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا..... آپ خود پر مزید بوجھ نہ ڈالیں۔ میں آیان سے بات کر لوں گا'' ابا کی آواز اب بھی کانپ رہی تھی..... ''نہیں..... یہ سب جانتا ہے۔ یہ صرف مجھے آزار پہنچانے کے لیے یہ سب کرتا ہے۔ ریحان مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج سے میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ چلو یہاں سے.....'' ابا تیزی سے پلٹے اور چل دیے۔ ریحان نے بے بسی سے میری جانب دیکھا اور تیزی سے لڑکھڑاتے ابا کو سہارا دے کر قریب سے گزرتے ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ ریحان ابا کو لے کر وہاں سے چلا گیا اور میں وہیں گیٹ کے سامنے لٹا پٹا سا کھڑا رہ گیا۔ اسماعیل نے مجھے بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میرے دو بے تاب اور بہت دیر سے رکے آنسو میری آنکھوں سے چھلک ہی پڑے۔ ٹھیک اسی لمحے سارنگا کی وین گیٹ سے باہر نکلی اور شاید سارنگا نے مجھے روتے اور اسماعیل کو مجھے سنبھالتے دیکھ لیا۔ وہ ہڑبڑایا سا گاڑی سے باہر نکل کر میری جانب لپکا۔ تب تک میں اپنی آنکھوں کو زور سے مسل چکا تھا'' کیا ہوا شہزادے..... سب خیر تو ہے نا.....'' مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا لیکن اسماعیل نے اسے ابا کی آمد سے لے کر واپسی تک کا سارا قصہ مختصراً بیان کر دیا۔ سارنگا کچھ بے چین سا ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک جانب لے گیا'' تیرا من تو اندر سے بڑا کومل ہے ساجن..... پر یاد رکھ..... یہ دنیا رونے والے کے ساتھ نہیں، بلکہ رلانے والے کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو کہے تو ہم ابھی تیرے باوا کے گھر چلتے ہیں۔ میں خود پیر پکڑ لوں گا ان کے..... پر تو خود کو یوں نڈھال نہ کر..... رنگا سے دیکھا نہیں جائے گا.....''

میں نے رنگا کو تسلی دی کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ابا کی حالت دیکھ کر من بھر آیا تھا۔ مجھے ان کی ڈانٹ کا کوئی ملال نہیں ہے۔ سارنگا کے چہرے پر فکر کی پرچھائیاں کچھ کم ہوئیں تو اسے وہ ضروری کام یاد آیا جس کے لیے وہ گھر سے نکل رہا تھا لیکن آج خلاف معمول موئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ رنگا کے جانے کے بعد میں بھی اسماعیل کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسماعیل نے گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا'' تم

کہو تو آج کی پڑھائی رہنے دیتے ہیں۔ میں ناہید بٹیا کو جا کر پیغام دے آؤں گا۔ تم آج گھر پر ہی آرام کر لو۔"

"نہیں..... میں ٹھیک ہوں..... یہاں تنہائی میں پڑا رہا تو ضرور کچھ ہو جائے گا مجھے۔ تم شیخ صاحب کے ہاں چلو..... آج انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جانا ہے ہم نے....."

ہم سادات محلے پہنچے تو پھر سے گلی میں موجود لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی پر جم گئیں انسان ہمیشہ سے اپنے معمول کا کس قدر پابند رہا ہے کہ کوئی بھی غیر معمولی رویہ اس کے ماحول کی تمام جزئیات بدل کر اسے چونکنے پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔ شاید ہم سب اپنے اپنے معمول کے غلام ہوتے ہیں۔

آج شیخ صاحب نے اسماعیل کو بھی اندر بیٹھک میں ہی بلا لیا مگر وہ ابھی تک کسی شدید الجھن کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف ان کی لاڈلی مگر غم زدہ بیوہ بیٹی کی فرمائش تھی تو دوسری جانب ان کے اپنے خدشات، کاش ناہید کو یہاں لانے میں اتنی مشکلات درپیش نہ ہوتیں تو میں خود اسے اپنی نگرانی میں روزانہ یہاں لے کر آ جایا کرتا..... کچھ ہی دیر میں اندر سے چائے کے لوازمات آ گئے تو شیخ صاحب نے مجھ سے کہا "آیان بیٹا..... شیخانی جی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم میرے ساتھ چل کر ذرا ان کی بات سن لو۔" میں کچھ حیرت زدہ سا ان کے ساتھ چل پڑا۔ اسماعیل سے انہوں نے دو گھڑی کے لیے معذرت چاہی کہ بس ابھی دوبارہ حاضر ہوتے ہیں۔ میرا دل پھر سے اپنی پوری قوت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ جانے یہ اچانک بیٹھے بیٹھے اس دل کو کیا ہو جاتا تھا۔ میں آج پہلی بار شیخ صاحب کے ساتھ بیٹھک سے ملحق درمیانی کمرے میں آیا تھا جس کے دروازے کے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ستارہ اور گہنا مجھ سے بات کیا کرتی تھیں۔ سادہ سا فرنیچر کتابوں کے چند ریک اور ان سے جڑی میز کرسی یہ بتا رہی تھی کہ یہ تنویر کے پڑھنے کا کمرہ تھا۔ شاید گہنا بھی یہیں بیٹھ کر پڑھتی ہوگی کمرے کے وسط میں بید کی لکڑی سے بنی چند ہلکی پھلکی کرسیاں اور میز بھی پڑی تھی۔ شیخ صاحب نے مجھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کر کے باہر کی جانب آواز لگائی۔ "اجی سنتی ہیں..... آیان میاں آئے ہیں....." باہر سے شیخانی جی اور ستارہ اندر کمرے میں آ گئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر سلام کیا اور دعا لی۔ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا "انو میاں..... تم ان کی بات سنو..... میں اسماعیل صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔ وہ تنہا بیٹھے ہیں وہاں....." شیخ صاحب کے جانے کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ستارہ کچھ الجھی سی تھی "دراصل ابا نے مجھے اجازت تو دے دی ہے لیکن وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خاص طور پر اس گھرانے کے بارے میں جان کر۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات پر بھی شرمندہ ہیں کہ میری خاطر آپ نے اتنا کچھ کیا مگر اب اگر میں نے انکار کر دیا تو آپ کی کتنی دل آزاری ہوگی۔ انہوں نے برسبیل تذکرہ ٹیلی فون پر حمید بھائی سے بھی ان کی رائے لی تھی کل شام وہ خاص طور پر ڈاک خانے گئے تھے سرکاری فون پر بات کرنے، مگر حمید بھائی نے بھی انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔" ستارہ کی پیشانی پر پسینے کے چند ننھے موتی سے جھلملانے لگے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی شدید کش مکش کا شکار ہے۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی کوشش کی "ٹھیک ہے..... اس میں ایسی پریشانی والی بھی کوئی بات نہیں..... اگر وہ مناسب نہیں سمجھتے تو آپ کو انہی کی بات ماننا چاہیے....." اتنے میں برآمدے سے آواز آئی "پریشانی ہی کی تو بات ہے آیان صاحب..... آپ کو بھی تو ذرا ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے..... اب ہم بے چارے تو آپ کے غصے سے بھی ڈرتے ہیں ناں....." وہ شریر سی آواز

گہنا کی ہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اندر آ چکی تھی۔ شیخانی جی نے اسے گھورا ''گہنا..... کتنی بار کہا ہے تم سے کہ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے'' وہ گلابی کرتے اور سفید دوپٹے میں کوئی پری محسوس ہو رہی تھی۔ جانے یہ اس کے عارض کا گلال تھا جو اس کے کرتے کو گلابی کر رہا تھا یا پھر اس کی پوشاک کا گلابی پن تھا جس نے اس کے چہرے پر گلال بکھیر رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی سلام کر کے اپنی ماں کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے سارے لفظ، اپنی پوری لغت ہی بھلا بیٹھا..... پھر زبردستی بات جوڑنے کی خاطر میں نے کچھ بے ربط سے لفظ منہ سے نکالے ''نہیں نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں..... جیسا آپ سب کو مناسب لگے وہی ٹھیک ہوگا.....'' مگر ستارہ اب بھی پریشان تھی..... ''لیکن آپ نے تو ان لوگوں سے ساری بات بھی طے کر لی ہے۔ وہ لوگ برا مان جائیں گے۔''

''ان کی آپ فکر نہ کریں۔ ناہید میری چھوٹی بہن جیسی ہے۔ اسے اپنے بھائی کی کوئی بات بری نہیں لگ سکتی..... آپ دل پر کوئی بوجھ نہ رکھیں.....'' گہنا پھر بول پڑی ''ارے..... چھوٹی بہن سے یاد آیا۔ ہم کل محلے کی تیسری گلی میں کسی تقریب میں گئے تھے۔ وہاں ہماری ملاقات رافعہ سے ہوئی تھی.....'' مجھے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''واقعی.....؟..... کمال..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے..... کیسی تھی وہ..... اور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ رافعہ ہے.....؟'' میں جوش میں بیک وقت کئی سوال کر گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے خود ہی اپنا راز کھول دیا ہے۔ شیخانی جی نے مجھ سے گلہ کیا ''آیان بیٹا تم نے گھر چھوڑ دیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں..... وہ تو کل جب تمہاری بہن ستارہ اور گہنا کی ملاقات ہوئی اور سارا واقعہ کھلا تو ہمیں پتہ چلا.....؟''

شاید شیخ صاحب نے ابھی تک گھر میں ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے شیخانی جی کو بتایا کہ میں نے شیخ صاحب سے ذکر کیا تھا۔ ستارہ کی آواز میں بھی گلہ تھا ''آپ نے اپنے گھر والوں کو پوری بات کیوں نہیں بتائی تھی کہ آپ ابا کو بچاتے ہوئے اس جھگڑے میں ملوث ہو گئے تھے، بلکہ آپ کو چاہئے تھا کہ اپنے ابا کو ہمارے ہاں لے آتے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتے اور ہمارے ابا سے مل کر ان کی ناراضگی بھی ختم ہو جاتی، لیکن آپ نے یہ سب اپنے گھر والوں کو نہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اور یہ سب کچھ ہمارے خاندان کی وجہ سے ہوا۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی ''نہیں نہیں..... سچ تو یہ ہے کہ ہم پہلے سے ہی ان لڑکوں کو اپنے علاقے میں غنڈہ گردی کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ شیخ صاحب کا قصہ درمیان میں نہ بھی آتا تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ ان کی وجہ سے کوئی بات نہیں بگڑی.....'' گہنا نے براہ راست مجھ سے پوچھا ''لیکن آپ کو یہ سب کچھ برا نہیں لگتا..... میرا مطلب ہے ایسے گھٹیا غنڈوں اور اچکوں کے لیے قانون موجود ہے۔ آپ نے ان سب کو قانون کے حوالے کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ سچ بتاؤں تو مجھے یہ غنڈہ گردی اور یہ سب ہنگامے بہت برے لگتے ہیں..... ہمیں ان کی وجہ سے ان جیسا تو نہیں بن جانا چاہئے ناں..... کل تقریب میں بھی سب لوگ آپ اور آپ کے دوستوں کے بارے میں بات کر رہے تھے..... سنیں..... آپ یہاں وہاں بھٹکنے کے بجائے سی ایس ایس کیوں نہیں کر لیتے.....؟.....''

میں نے حیرت سے اس نازک اندام کی طرف دیکھا جو آج پہلی مرتبہ مجھ سے اتنا کھل کر بات کر رہی تھی ''کیوں.....؟..... کیا میرے سی ایس ایس کرنے سے ملک کے تمام معاملات سدھر جائیں گے.....'' میرے جواب پر ستارہ اور شیخانی جی مسکرائیں..... گہنا نے ضد کی ''بتائیں نا..... آپ مقابلے کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے.....''

''کیونکہ میری طبیعت کسی بھی سرکاری نوکری کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ مجھے یہ افسری بھی بڑی غلامی لگتی ہے.....'' گہنا حیران ہوئی ''اچھا۔ حیرت ہے.....؟ بھئی مجھے تو یہ سی ایس پی افسران بڑے کمال لگتے ہیں۔ سوٹ بوٹ، ٹائی شائی، نکھرے نکھرے سے، سب پر حکم چلاتے ہوئے افسر.....ویسٹ کوٹ میں تو اور بھی شاندار نظر آتے ہیں اور اگر وردی میں ہوں تو پھر تو کیا ہی بات ہے.....میں نے سوچ لیا ہے کہ میں بھی مقابلے کا امتحان پاس کر کے سی ایس پی بنوں گی پھر آپ اور ستارہ آپی آنا میرے پاس.....ان سب غنڈوں کی چھٹی نہ کر دی تو گہنا نام نہیں ہے میرا.....''

اتنے میں بیٹھک کی جانب سے شیخ صاحب کے کھانسنے کی آواز سن کر گہنا کی پھول جڑتی زبان کو فوراً ہی جیسے بریک سی لگ گئی۔ ستارہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ''ہاں بھئی.....کیا فیصلہ ہوا.....'' میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ ''آپ نے خود کو اتنے جوکھم میں کیوں ڈالے رکھا.....آپ مجھے خود مع کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ بہر حال اب اس قصے کو ختم کیجئے۔ آپ کے اطمینان میں ہی ہم سب کا اطمینان ہے۔'' شیخ صاحب نے گہری سانس لی ''سچ تو یہ ہے آیان میاں کہ ستارہ مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تھی کیونکہ تم نے واقعی سچے دل سے اس کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔'' میں نے بات ٹالنے کے لیے ادھر ادھر کی چند باتیں کیں اور شیخ صاحب سے اجازت چاہی کہ ناہید ہمارا انتظار کرتی ہوگی لہٰذا اب مجھے چلنا چاہئے۔ اچانک شیخ صاحب کے ذہن میں کوئی بات آئی ''آیان میاں.....اگر تم مناسب سمجھو تو آج میں اور ستارہ خود تمہارے ساتھ چل کر ناہید بٹیا کو اپنی مجبوری سے آگاہ کر آئیں میں جانتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں مگر ہم دونوں کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جائے گا کہ ہماری وجہ سے تمہیں اس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ہامی بھر لی ''ٹھیک ہے.....جیسے آپ کی مرضی۔ ناہید بہت مختلف لڑکی ہے، لیکن اگر آپ کا دل ہلکا ہوتا ہے تو آپ دونوں ضرور چلیے اسی بہانے ناہید کو بھی ایک نئی سہیلی سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔''

ستارہ کے چہرے پر بھی شیخ صاحب کی یہ تجویز سن کر روشنی سی آ گئی۔ کچھ ہی دیر میں ہم گھر سے نکلنے لگے تو گہنا نے اپنی اماں کے عقب سے حسب معمول شرارت کی ''آپ نے ستارہ آپی کی تو بڑے جی جان سے مدد کر دی لیکن اگر کبھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی تو مکر تو نہیں جائیں گے.....؟'' شیخ صاحب اندر شیروانی بدلنے گئے ہوئے تھے میں نے اسے اطمینان دلایا ''چلیں آج آپ کی امی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جب کبھی آپ کو ضرورت ہوئی.....میں اتنی ہی جی جان سے حاضر رہوں گا۔'' شیخانی جی اور ستارہ نے بڑی مشکل سے اسے گھور گھور کر چپ رہنے کے اشارے کئے، اور ہم سب گھر سے نکل پڑے۔ ناہید واقعی بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، اور ستارہ کو دیکھ کر تو اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی ''آیان بھیا.....اتنی پیاری استاد کو اتنے دن مجھ سے دور کیوں رکھا.....'' شیخ صاحب اور میں مردانے کی طرف بڑھ گئے اور بوا نے جھٹ پٹ ہمارے لیے چائے کے ساتھ بہت کچھ بھجوا دیا۔ شیخ صاحب حیرت سے حویلی کے در و دیوار کو دیکھتے رہے اور اس کی سجاوٹ اور نفاست کی داد دیتے رہے۔ تقریباً گھنٹے بعد ستارہ کی طرف سے واپسی کا پیغام آ گیا۔ ہم مردانے سے نکلے تو بوا، ناہید اور ستارہ برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ ستارہ ناہید کو اپنی مجبوری شاید بہت اچھی طرح سمجھا چکی تھی اسی لیے ناہید کے چہرے پر ملال کی کوئی پرچھائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''آیان بھیا.....یو آر گریٹ.....آپ نے مجھے اتنی اچھی دوست سے ملوا دیا.....اب یہ دوستی کبھی ختم نہیں ہوگی.....میں نے ستارہ آپی سے وعدہ لیا ہے کہ وہ گہنا کو بھی ضرور لے کر آئیں گی کسی دن.....''

ناہید نے بڑی محبت سے ستارہ کو رخصت کیا۔شیخ صاحب نے بڑھ کر ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ''جیتی رہو''۔ میں اسماعیل کے ساتھ ستارہ اور شیخ صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے کے لیے ان کی گلی میں پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا کہ ہم بھی کچھ دیر کے لیے اندر چلیں لیکن میں نے معذرت کر دی۔کبھی کبھی ہمیں دل کے بہت خلاف جا کر بھی دنیا کی ریت رواج نبھانے کے لیے کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔

ستارہ نے اترتے ہوئے دھیرے سے کہا'' آپ کا بہت شکریہ آپا ن.....خدا حافظ'' ہم واپس یعقوب مینشن پہنچے تو سارنگا ابھی واپس نہیں لوٹا تھا اور موسیٰ آج تنہا ہی مشق اور زور کی نگرانی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دور سے ہاتھ ہلایا، اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔آج نہ جانے میرا دل تنہائی کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔شاید وہ بھی مجھ سے آج ملی ڈھیر ساری خوشی بانٹنا چاہتا تھا۔آج وہ تمام حجاب بالائے طاق رکھ کر مجھ سے محو گفتگو تھی۔اس سے بڑی خوشی کی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور جب ہمیں بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو باقی سب لوگوں سے پہلے ہمارا دل ہم سے اسے بانٹنا چاہتا ہے۔کیونکہ بھیڑ میں تو ہم دل کی سن ہی نہیں پاتے.....دل سے باتیں تو صرف تنہائی میں ہی ہوتی ہیں۔سو اس رات میں اور میرا دل بھی بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔اگلی صبح میرا وجود بہت ہلکا پھلکا تھا۔ میں نے گہنا سے اپنے دل کی بات کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن کب اور کیسے.....؟.....بس یہی طے ہونا باقی رہ گیا تھا۔دل کے راز بہت عرصہ دل میں رہیں تو ناسور بننے لگتے ہیں، اور میں نے ایسے کسی بھی ناسور کو دل میں نہ پالنے کا عہد کر لیا تھا۔

صبح ساڑھے دس بجے کے قریب اسماعیل نے مجھے بتایا کہ میرا بڑا بھائی مجھ سے ملنے کے لیے گیٹ پر آیا ہے مگر اندر آنے سے ہچکچا رہا ہے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔'' ریحان.....یہاں.....خدا خیر کرے۔'' میں تقریباً دوڑتا ہوا باہر احاطے میں نکلا۔تب تک موسیٰ ضد کر کے ریحان کو اندر باغیچے میں لا کر سامنے پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا چکا تھا۔ میں تیزی سے ریحان کی جانب لپکا'' تم.....یہاں.....سب ٹھیک تو ہے نا.....''۔

''ہاں.....سب ٹھیک ہے.....لیکن تم سب ٹھیک رہنے کب دیتے ہو.....ابا کی طبیعت تمہاری وجہ سے کل شدید بگڑ گئی تھی.....رات بھر ہم سب ان کے سرہانے کھڑے رہے.....صبح نماز کے بعد کچھ آرام آیا تو سوئے ہیں.....ڈاکٹر بھی آیا تھا.....کہہ رہا تھا کہ ہائی بلڈ پریشر ہے.....''

میں نے ریحان سے شکوہ کیا.....''تمہیں ابا کو یہاں نہیں لانا چاہئے تھا''.....''میرے روکنے سے وہ بھلا کب رکنے والے تھے۔ میں ساتھ نہ بھی آتا تو وہ خود چلے آتے.....اے ایس پی نے خبر ہی ایسی دی تھی کہ ہم سب کے تو حواس ہی معطل ہو گئے تھے.....تم چلو یہاں سے.....میں نے یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ایک دوست سے کمرہ لے لیا ہے چند دنوں کے لیے.....جب تک ابا کا غصہ اتر نہیں جاتا تم وہیں رہ لینا.....''

''نہیں.....میں اب کہیں نہیں جاؤں گا.....اور یہ تم سب نے اس جگہ کا اس قدر ہوا کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔ یہاں بھی انسان بستے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح اچھے یا برے ہیں۔''

ریحان نے غور سے میری جانب دیکھا''ہاں.....وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ تم پر یہ جگہ کتنی اثر انداز ہو رہی ہے۔تم سیدھی طرح چلتے ہو یا میں تمہیں زبردستی کھینچ کر لے جاؤں.....'' میں نے دکھ سے اپنے معصوم بھائی کی طرف دیکھا.....وہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی وقت ہمیں کچھ اس طرح

سے زمین میں گاڑ دیتا ہے کہ پھر کوئی بندھن ہمیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں پاتا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ''ٹھیک ہے چلا جاؤں گا، مگر ان لوگوں کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں..... میں یوں منہ اٹھا کر تو نہیں چل سکتا ناں..... کچھ وقت دو مجھے.....'' ریحان کے چہرے پر سکون کے آثار پیدا ہوئے..... ''اچھا ٹھیک ہے..... مگر جلدی کرنا۔ ویسے مجھے بالے اور راجہ نے ان کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا ہے لیکن پھر بھی ہماری اور ان کی دنیا بہت الگ ہے۔ ہاں تم چاہو تو اس لڑکی کو ٹیوشن پڑھاتے رہنا.....''

میں خاموشی سے ریحان کو دیکھتا رہا۔ خدا کسی کو اتنا بھولا بھالا اور سیدھا بھائی بھی نہ دے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ جو بات میں گہنا سے پوچھنا چاہتا تھا اب وہ بات رافعہ بھی تو پوچھ سکتی تھی۔ وہ گہنا سے مل چکی تھی اور ضرور اس نے حسب عادت اسے اپنی ''سب سے گہری سہیلی بھی بنا لیا ہوگا۔ میں نے ریحان کو چند منٹ انتظار کرنے کا کہا اور جلدی سے ایک کاغذ پر ساری تفصیل لکھ کر رافعہ کو سختی سے تاکید کی کہ وہ ریحان کے ہاتھ ہی جلد از جلد جواب بھجوا دے۔

میں نے خط ریحان کے حوالے کیا کہ وہ اسے چھوٹی کو دے آئے اور جیسے ہی وہ جواب دے فوراً مجھ تک واپس پہنچا دے۔ ریحان کو میرے اور چھوٹی کے یہ جاسوسی رابطے ہمیشہ سے بہت برے لگتے تھے مگر آج اس نے بنا چوں چرا کیے خط لے لیا، اور چلا گیا، لیکن میں انتظار کی سولی پر ٹنگا رہا، اور پھر ٹھیک تیسرے دن مجھے اسماعیل نے ایک لفافہ لا کر دیا ''صبح سویرے تمہارا بھائی گیٹ پر دے گیا تھا۔ تم سو رہے تھے اس وقت.....'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ پکڑا۔ اس پر چھوٹی کے ہاتھ کی لکھائی نظر آ رہی تھی۔

باب16

میری حالت اس وقت اس پیامبر جیسی تھی جو اپنے محبوب کو خط روانہ تو کر دیتا ہے مگر پھر سارا وقت یہی سوچ سوچ کر خود کو ہی تو چتار ہتا ہے کہ کاش وہ یہ سندیسہ نہ ہی بھیجتا تو اچھا تھا۔ خود ہی دل کی بات چٹھی میں لکھ بھیجتا ہے اور پھر خود ہی پشیمان ہوتا ہے کہ کاش وہ ڈاکیے کو روک لیتا۔ تو بہتر ہوتا کہ کہیں اس کا محبوب اس کے کسی لفظ سے، کسی شکوے سے آزردہ نہ ہو جائے۔ لفظ لکھے ہوں تو سب کچھ بول نہیں پاتے..... کاش وہ خود ہی جا کر اپنا مدعا بیان کرتا تو یہ ملال تو نہ رہتا۔

میں بھی رافعہ کا خط ملنے تک اسی شش و پنج کا شکار رہا۔ جانے چھوٹی میری بات ٹھیک طرح سے گہنا تک پہنچا بھی سکے گی یا نہیں..... کہیں گہنا کسی بات کا کوئی غلط مطلب نہ لے لے..... مجھے خود جا کر اس سے بات کرنی چاہیے تھی..... اس جلد بازی کا انجام کہیں برا نہ ہو۔ غرض ایسی ہزار سوچوں کے تیر میرا وجود تین دن تک چھلنی کرتے رہے اور جب خدا خدا کر کے تین دن بعد مجھے میری سوچوں کا جواب ملا تو میں گھنٹوں چھوٹی کا خط لیے بیٹھا اسے کھولنے سے ڈرتا رہا جیسے وہ خط نہ ہو، کسی سپیرے کی پٹاری ہو۔ جسے کھولتے ہی کوئی ناگ مجھے ڈس لے گا۔ پھر بہت دیر بعد جب میں نے وہ خط کھولا تو اس میں لکھی حقیقت کا زہر کسی زہریلی ناگن کے زہر سے زیادہ تیزی کے ساتھ میری نسوں میں پھیلتا گیا۔

میں نے اپنے خط میں چھوٹی کو لکھا تھا کہ وہ کسی طرح گہنا سے میرے بارے میں اس کی رائے پوچھ کر مجھے بتائے۔ رافعہ نے خط کے شروع میں تو مجھ سے حسب معمول خوب جھگڑا کیا تھا کہ میں اگر فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس نہ لوٹا تو وہ مجھ سے پھر کبھی نہیں بولے گی، اور مجھے کسی بڑی آپی کی طرح بہت سی نصیحتیں لکھ بھیجی تھیں کہ بڑے تو چھوٹوں پر اپنا غصہ نکالتے ہی رہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ چھوٹے روٹھ کر ہی بیٹھ جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مجھے جن لفظوں کا شدت سے انتظار تھا وہ آخری صفحے پر چمکے مگر میری تقدیر کا ستارہ سدا کے لیے بجھا گئے۔ حالانکہ چھوٹی نے میری دل آزاری کو دھیان میں رکھتے ہوئے بہت مناسب الفاظ کا استعمال کیا تھا مگر خنجر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اور اس کی دھار شکار کی اذیت کم کرنے کے لیے کتنی بھی تیز کیوں نہ کر لی جائے..... اس کا وار ہمیشہ نازک ریشوں کو چیر کر جسم کے آر پار ہو جاتا ہے۔ ٹھیک میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا۔

رافعہ کی تحریر پر میری نظریں پھسلتی گئیں۔ انو بھیا میری پہلے ون بھی گہنا سے آپ کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ بات ہوئی تھی مگر آپ کے کہنے پر ابا سے بہانہ کر کے میں خاص طور پر سادات محلے ان کے گھر گئی۔ ماشاءاللہ بڑی تہذیب اور رکھ رکھاؤ والے لوگ ہیں۔ گہنا کی اماں تو بچھی بچھی جاتی تھیں۔ ستارہ آپی بھی گہنا ہی کی طرح بہت پیار کرنے والی ہیں۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ بڑی مشکل سے مجھے گہنا سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ مگر بھائی..... وہ کچھ اور خیالات کی لڑکی ہے۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ کوئی غریب معمولی لڑکا نہیں بلکہ کوئی سی ایس پی آفیسر ہے۔ میں نے طریقے سے اس سے پوچھا کہ آپ کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو جھٹ سے بولی کہ ایسے مخلص انسان اس دور

میں شاید کچھ ہی بچے ہوں مگر اسے آپ کے رہن سہن اور مصروفیات سے بہت اختلاف تھا۔ کہنے لگی کہ آپ کو ان غنڈے بدمعاشوں کا پیچھا چھوڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہئے۔ پھر میں نے کسی اور طریقے سے بات بدل کر اس سے اس کے مستقبل اور شادی وغیرہ کے بارے میں بات کی تو گہنا ہنستے ہوئے بولی کہ اس نے تو پہلے ہی اپنی اماں اور آپی کو خبردار کر رکھا ہے کہ کسی سی ایس پی افسر کے علاوہ کہیں ہاں نہ کریں۔

آیان بھائی جانے مجھے اس کی باتوں سے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ وہ آپ کی دل چسپی ستارہ آپی میں سمجھتی ہے اور شاید اسی رشتے سے وہ آپ سے چھیڑ خانی بھی کرتی رہتی ہے اور ستارہ آپی..... وہ تو آپ کی اتنی ممنون ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔ جتنی دیر میں وہاں رہی، وہ آپ کے ہی گن گاتی رہیں اگر آپ نے خود مجھے گہنا کی مرضی معلوم نہ کرنے کا کہا ہوتا تو میں بھی ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ بہرحال میرے پیارے اور معصوم سے بھیا..... آپ گہنا کا خیال دل سے نکال دیں کیونکہ اس کے خوابوں کی تعبیر کچھ اور ہے.....

چھوٹی نے اس کے بعد بھی کچھ لکھا تھا لیکن میری آنکھوں کی ضیاء تو اتنا ہی پڑھ کر عدوم ہو چکی تھی۔ خط کے صفحے میرے ہاتھوں سے پھسل کر گرے اور کھڑکی سے اندر آتی تیز ہوا کے ساتھ کمرے میں یہاں وہاں بکھر گئے۔ بالکل اس طرح جیسے میرے خزاں رسیدہ دل کی شاخوں کے سوکھے پتے اس وقت میرے وجود کے اندر بکھرے پڑے تھے۔

تو گویا گہنا بھی مجھے ایک غنڈے اور بدمعاش سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک ایسا غنڈہ جو ان جانے میں اس کے گھر والوں کی کچھ مدد کر گیا تھا۔ مگر بُرے تو سدا بُرے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کچھ پل کے لیے کسی کی مدد ہی کیوں نہ کر جائیں۔ میرے اندر بیک وقت بہت سے چھناکے ہوئے۔ کون کہتا ہے کہ دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی۔ کاش کوئی اس وقت میرے قریب ہوتا تو اسے میرے روئیں روئیں سے یہ چیخ و پکار سنائی دے جاتی میں اس کے تکلف کو بھی اخلاص سمجھتا رہا جب کہ وہ تو کبھی میرے دل کی شناسا ہی نہ تھی اور پھر اس روز اس نے کھلے لفظوں میں اپنی پسند ناپسند بھی تو سب کے سامنے مجھے بتا دی تھی۔ شاید وہ یہ سب مجھی کو سنانا چاہتی تھی۔ میں پھر بھی کیوں نہ سمجھ پایا؟ اور پھر سچ ہی تو ہے۔ گلیوں بازاروں میں بھٹکتے ایک آوارہ کو کون اچھا سمجھے گا۔ جسے خود اس کے اپنے بھی دھتکار چکے ہوں اسے گھر بدر کر دیا گیا ہو، اور زمانے بھر کے الزام اور بدنامی اس کے ماتھے کا ٹیکہ ہوں۔ ایسے بے گھر بنجارے کو کوئی نازنین اپنے دل کا محرم بھلا کیوں بنائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور جھماکا ہوا۔ اس روز گھر سے رخصت ہوتے وقت تنویر نے گلی میں مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ اوہ..... اس کا مطلب وہ بھی گہنا ہی کی خاطر یہ معرکہ سر کرنا چاہتا ہے۔ یا شاید گہنا نے ہی اسے یہ مشورہ دیا ہو۔ میرے ذہن میں خیال آتے چلے گئے اور میرے دل میں پہلی بار رقابت نام کے سنپولیے نے جنم لیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ رقیب لفظ ہی سے دل کی شریانوں میں کتنا کڑوا زہر پھیل جاتا ہے کہ جس کا ذائقہ ہمیں اپنے پینے والے پانی میں بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں نے بھی ایک گھونٹ پی کر باقی پانی زمین پر پھینک دیا۔ آج مجھے ہر چیز کڑوی لگ رہی تھی۔

تو گویا ستارہ کے نام پر وہ چھیڑ چھاڑ صرف دل لگی کی خاطر تھی، اور اس نے آخر یہ کیسے سوچ لیا کہ میری توجہ کا محور ستارہ ہو سکتی ہے.....؟..... ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اس پاکیزہ ہستی کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا اور کسی نہ کسی طور اس کے دکھوں کے مداوے کی کوشش بھی کی مگر اس میں میرے کسی ذاتی غرض کو کب دخل حاصل تھا؟ اس ستارہ کی پلکوں کی نمی مٹانے کے لیے تو کچھ بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر گہنا نے میرے ستارہ سے

اس بے غرض اور عقیدت بھرے التفات کو اتنا غلط کیسے سمجھ لیا۔ دفعتہً میرے ذہن میں ایک اور شک نے سر ابھارا ''کہیں خود ستارہ کو بھی تو ایسا نہیں لگتا ہوگا؟..... نہیں نہیں..... وہ ایک سمجھدار لڑکی ہے اور زمانے کے سرد و گرم سے خوب آشنا ہے۔ وہ کبھی میرے بارے میں ایسا کوئی غلط اندازہ نہیں لگا سکتی..... لیکن گہنا..... آخر وہ کیوں میری نظر کا مطلب نہیں سمجھ پائی؟؟ کیا میری نظر اسی قدر بے زبان تھی کہ وہ اپنا مفہوم بھی گہنا تک نہیں پہنچا سکی۔ کون کہتا ہے کہ نگاہوں کی زباں ہوتی ہے۔ میری بصارت تو گویائی سے محروم ثابت ہوئی تھی۔ میں جتنا سوچتا گیا، اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ کہتے ہیں من کی گرہیں ذہن و دل میں بہت زیادہ الجھ جائیں تو نتیجہ جسم کو بھگتنا پڑتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور شام سے پہلے ہی میرا بدن تیز بخار میں پھنکنے لگا۔ اسماعیل کسی کام سے میرے کمرے میں آیا تو مجھے یوں آڑھا ترچھا بستر پر پڑا دیکھ کر گھبرا سا گیا اور پھر میرا ماتھا چھوتے ہی وہ باہر کی طرف لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد علاقے کا مشہور ڈاکٹر اپنے نائب کے ساتھ میرے سرہانے موجود تھا۔ اس نے حرارت تشخیص کی اور مکمل آرام تجویز کیا لیکن کیا صرف جسم کو آرام دینے سے دل کے سب درد دور ہو جاتے ہیں؟ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ ظاہری سکون ہمارے اندر کی بے تابی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ انسان چلتا پھرتا رہے اور دھیان کسی طرف بٹا ہو تو بڑی نعمت ہے ورنہ خالی ذہن کے ساتھ یوں کسی بند کمرے میں پڑے رہنے سے تو اندر کے طوفان اور سوا ہو جاتے ہیں۔ آدھی رات کے قریب میں بھی اپنے اندر کی اس جنگ سے جھنجھلا کر باہر صحن میں نکل آیا۔ میں نے اپنے جسم پر وہی بستر پڑا کھیس لپیٹ لیا تھا۔ باہر صحن کے آسمان پر میرے سارے دوست چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک چمکیلا تارہ بولا ''ہم نے کہا تھا نا..... ہمارے سوا کسی سے دل نہ لگانا..... یہ انسان بڑے بے مروت ہوتے ہیں۔ یہ بھلا تمہاری محبت کی قدر کیا جانیں..... چلو بھول جاؤ سب..... اور پھر سے ہمارے دوست بن جاؤ.....'' کاش انسان کا حافظہ ہی اس کے اختیار میں ہوتا تو شاید باقی کسی مزید اختیار کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ مگر انسان تو سدا کا ''مجبورِ محض'' ہے۔ میں بھی انہی لاچاروں میں سے ایک تھا جو اس حافظے کے عذاب کے ساتھ صحن میں حوض کے قریب بنے چوبارے پر بیٹھا خود سے لڑ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ بڑے احاطے سے صحن کی طرف آنے والے راستے پر کوئی آہٹ سی ہوئی اور کسی نے کڑکدار آواز میں پوچھا ''کون ہے وہاں.....'' میں نے جواب دیا ''آیان'' آواز دینے والا اندھیری ڈیوڑھی سے صحن کی تاروں بھری روشنی میں آ گیا۔ وہ موسیٰ تھا ''اوئے شہزادے..... سب خیر تو ہے نا..... اسماعیل تو بتا رہا تھا کہ تجھے سخت بخار ہے پھر تو یہاں صحن میں کیا کر رہا ہے اس وقت۔'' موسیٰ میری جانب چلا آیا۔

''بس اندر کمرے میں دم گھٹ رہا تھا..... اس لیے باہر کھلی ہوا میں آ کر بیٹھ گیا۔'' موسیٰ نے میرا ماتھا چھوا..... ''بخار تو اب بھی ہے۔ یہ کون کون سے روگ لگا رکھے ہیں تو نے اپنی جوانی کے ساتھ.....؟'' موسیٰ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے دھیرے سے کہا ''ساری زندگی ہی روگ ہے شاید..... تم آدھی رات کو کیا کر رہے تھے یہاں.....''

موسیٰ نے لمبی سانس بھری ''یہاں دن سے زیادہ رات کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے شہزادے..... گھات لگانے کے لیے دن سے زیادہ رات مددگار ہوتی ہے..... رات ہمیشہ دشمن کی دوست ہوتی ہے.....'' میں نے چاروں طرف چھائے اندھیرے کو دیکھ کر کہا ''ٹھیک کہا تم نے..... رات سے بڑا

دشمن شاید اور کوئی نہیں.....'' موسیٰ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''سچ بتا..... تجھے کسی سے عشق تو نہیں ہو گیا.....؟..... تیری آنکھیں بولتی ہیں کہ تو اپنا سب کچھ ہار چکا ہے.....''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی ''کیوں..... کیا چاقو بازی کی طرح اس میدان کے بھی کھلاڑی رہے ہو کبھی.....؟ تو بتاؤ پھر کیسا تجربہ رہا.....؟''

موسیٰ بھی مسکرا دیا ''چاقو کی دھار تو پھر بھی نظر آ جاتی ہے پیارے لیکن اس بے بخت عشق کی دھار کا تو اندازہ بھی نہیں لگا پاتا انسان اور اگلے لمحے ہی زمین پر پڑا اپنے ہی خون میں تڑپ رہا ہوتا ہے..... اسی تڑپ سے گزرنے کے بعد ہی تو چاقو اٹھایا تھا میں نے.....''

موسیٰ کی آواز نے ہی مجھے اس حقیقت سے آشنا کروایا تھا کہ وہ بھی محبت کی اس دو دھاری تلوار سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے ٹوہ لینے کے لیے اس سے پوچھا ''اس دھار کی کسک کچھ کم ہوئی یا ابھی باقی ہے.....'' موسیٰ کہیں دور خلا میں دیکھتا رہا ''نہیں شہزادے..... شروع شروع میں تو میں بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم بھی بھر ہی جائیں گے مگر میں غلط تھا۔ عشق کا ناسور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مزید لاعلاج ہوتا جاتا ہے..... اور ظلم تو یہ ہے کہ نہ یہ انسان کو پوری موت دیتا ہے اور نہ ہی مکمل زندگی..... بس انسان ساری عمر برزخ میں ہی گزار دیتا ہے.....''

میں حیرت سے موسیٰ کو دیکھتا رہا۔ بظاہر اوپر سے فولاد نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا پگھل چکا تھا، لیکن اب بھی دن رات جل رہا تھا۔ پھر اچانک موسیٰ جیسے ہوش میں آ گیا۔ ''میری ایک بات مانے گا شہزادے.....؟.....''

''ہاں..... بولو.....'' موسیٰ نے میرا ہاتھ تھام لیا ''تو اپنے گھر واپس چلا جا..... یہ جگہ تیرے لیے نہیں بنی ہے۔ میری اور رنگا بھائی کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں، چاروں طرف گدھ منڈلاتے پھرتے ہیں..... ابھی وقت ہے تیری واپسی کا..... ورنہ پھر عمر بھر کے لیے خوار ہو جائے گا..... تیرا باپ بڑا شریف انسان ہے..... اس کے غصے کا برا نہ منایا کر.....'' میں نے موسیٰ کا ہاتھ تھپتھپایا ''کچھ فیصلے انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے موسیٰ بھائی..... میرا خمیر اس گھر سے کہیں پرے اٹھایا گیا ہے..... میں جانتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا..... لیکن وہاں رہتا بھی تو ہر روز انہیں کوئی نہ کوئی تکلیف دیتا رہتا..... تو پھر کیوں نا ایک ہی بار یہ جھنجھٹ ختم کر دیا جائے..... میرے ابا جو مجھ سے چاہتے ہیں وہ میں چاہ کر بھی نہیں کر پاتا۔ ان کے دکھاوے کے لیے دو چار دن ویسا بن بھی جاؤں تو پانچویں دن ضرور خود سے ہی ٹکرا جاتا ہوں..... کاش میرے اندر خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت ہوتی.....''

موسیٰ میری بات سن کر سر ہلاتا رہا جیسے اسے آدھی بات سمجھ میں آئی ہو اور آدھی نہیں۔ میں نے بات کا رخ موڑنے کے لیے اس سے پوچھا ''اسماعیل بتا رہا تھا کہ یہاں باقاعدہ چاقو بازی کی مشق سیکھنے کے لیے شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے..... کیا تم مجھے اپنی شاگردی میں لو گے..... مجھے یہ فن سکھا دو گے.....؟'' موسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی ''ہاں..... باقاعدہ شاگرد بننا ہے تو ضروری..... پر تم کیوں سیکھنا چاہتے ہو یہ سب..... ہماری دنیا سے باہر اس ہنر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں مرنے والے اور مارنے والے دونوں کو بڑی جلدی ہوتی ہے۔ بس ایک گولی چلتی ہے چالیس، پچاس روپے والی..... اور کھیل ختم.....''

''تم نے ابھی کہا تھا نا کہ تم بھی کسی دوسرے درد کی دھار مٹانے کے لیے چاقو کی دھار کی طرف آئے تھے، تو بس یوں سمجھ لو کہ میرا بھی کچھ

ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے بھی ایک زہر کی کاٹ ختم کرنے کے لیے دوسرا زہر پینا ہے..... کیا تم اس میں میرا ساتھ دو گے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری تربیت مکمل ہونے تک یہ بات راز میں ہی رہے تو بہتر ہے۔'' موسیٰ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا'' اگر ایسی بات ہے تو پھر موسیٰ حاضر ہے..... لیکن راز رکھنے کے لیے ہمیں بڑے احاطے سے دور رہنا ہوگا۔ میں روزانہ تمہیں اس صحن میں آ کر سبق دے جایا کروں گا..... یہاں سب میرے اپنے اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں۔ بات باہر نہیں جائے گی..... تم فکر نہ کرو..... اور ہاں..... تمہاری باقاعدہ شاگردی کا اعلان بھی اب اسی وقت ہوگا جب تم اپنی تربیت مکمل کر لو گے..... میں خود رنگا بھائی سے کہہ کر تمہاری کلائی پر دھاگا بندھواؤں گا.....'' موسیٰ میرا سر سہلا کر وہاں سے اٹھ کر چل دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنے جسم کو روزانہ اس قدر تھکا دوں گا کہ اس کے ریشے ریشے سے ٹوٹنے کی الگ آواز سنائی دے تا کہ میرے ذہن کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ حافظہ اگر خود سے چھینا نہیں جا سکتا تو کیا ہوا..... اس پر شدید تھکن سے ٹوٹتے جسم کا غلاف تو ڈالا جا سکتا ہے۔

موسیٰ نے میری تربیت کا وقت صبح فجر کے بعد کا چنا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت آس پاس برائے نام چہل پہل ہوتی تھی اور دس بجے سارنگا کا دفتر لگنے تک بمشکل ہی کوئی اس صحن کی طرف آتا تھا۔ اسماعیل پہلے ہی دن سے ہمارا راز دار تھا اور صحن کی جانب کے کارندوں اور نوکروں کو موسیٰ نے اپنی خاص زبان میں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی کو اس طرف ہوتی کارروائی کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔ میں نے احتیاطاً اسماعیل کے ہاتھ ایک رقعے میں رابعہ کو لکھ بھیجا تھا کہ میں چند دن تک شاید ان سے رابطہ نہ کر پاؤں اس لیے وہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اسے یہی بات طریقے سے ریحان کو بھی منتقل کرنے کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ چھوٹی اور امی کو میری طرف سے اطمینان دلا دے کہ میں ٹھیک ہوں اور ابا کی شرط کے مطابق کچھ ''بننے'' کی کوشش میں ہوں لہٰذا وہ لوگ میری جانب سے خود کو ہلکان نہ کریں۔ ناہید کی ٹیوشن کا سلسلہ البتہ جاری رہا، لیکن میں نے ٹیوشن کا وقت بدل دیا تھا۔ اب میں مغرب کے اندھیرے میں یعقوب مینشن سے نکلتا اور رات نو بجے تک واپس لوٹ آتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی مجھے دن کی روشنی میں باہر دیکھے۔ یا شاید میں اپنے آپ سے چھپنے کے لیے اس اندھیرے کا سہارا لے رہا تھا۔

شروع شروع میں موسیٰ نے مجھے خود میری کلائی پر قابو پانے کے طریقے کی مشق کروائی۔ کلائی کا کون سا پٹھا اور کون سی رگ کب اور کس طرح خود اپنی مرضی سے حرکت میں لائی جا سکتی ہے..... اس کی خصوصی تربیت کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکتی تھی۔ ابتدائی چار پانچ دنوں تک تو چند منٹ کے اندر ہی میرے بازوؤں کے پٹھے کھنچے اور رگیں یوں تڑخنے لگتی تھیں کہ میں بمشکل اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ پاتا تھا۔ واقعی موسیٰ ایک ماہر استاد تھا اور اس نے دل و جان سے اپنا سارا اثاثہ دن بدن میری جانب منتقل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مشق کے بعد میری حالت کچھ اتنی ابتر ہو جاتی تھی کہ گھنٹوں مجھے اپنی دونوں کلائیوں کے ساتھ لکڑی کی پتلی کھپچیاں باندھ کر درد پر قابو رکھنا پڑتا تھا۔ شام کے اوقات میں موسیٰ وقت نکال کر مجھے چاقو بازی کی دوسری جزئیات کے بارے میں بتاتا رہتا، مثلاً نظر رکھنے کا فن، قدموں کو کس توازن سے کب اور کس طرف جھکانا ہے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرتے وقت حریف کی کس کس حرکت کو جانچنا پڑتا ہے۔ چاقو پر کب اور کتنی مضبوط گرفت رکھنا ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ غرض اب میں اور موسیٰ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب بھی وقت ملتا صرف ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے اور وہ تھا صرف اور صرف موسیٰ کا یہ فن۔ دوسرے ہفتے کے اختتام پر موسیٰ نے مجھے مختلف زخموں کی اقسام کے بارے میں سبق دینا شروع کر دیا کہ کس زخم کے لیے کتنی دھار اور گہرائی کی ضرورت ہوتی

ہے اور پل بھر میں ہی صرف چاقو کی پانچ سنٹی میٹر کی نوک سے مخالف کے جسم پر کتنے نقش و نگار بنائے جا سکتے ہیں۔ موسیٰ ہر بار مجھ سے یہی کہتا کہ جس کے ہاتھ میں چاقو ہو اور اگر وہ ''اصیل'' ہو تو پھر اس کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس فن کی حرمت کا پاس رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے کہ جس سے دوسرے چاقو بازوں کی عزت پر کوئی حرف آ جائے۔

شاید وہ میری تربیت کا سولہواں دن تھا۔ موسیٰ مجھے بتا رہا تھا کہ چاقو پر ہتھیلی کا دباؤ کب اور کتنا رکھا جائے کہ جس سے مخالف کو وار سمجھنے میں دشواری ہو۔ ہم اب صحن کے احاطے میں ایک کچی جگہ پر باقاعدہ کچی مٹی اور ریت میں دائرہ ڈال کر ایک دوسرے کے مقابل آ کر وار کرتے ہوئے یہ مشق کرتے تھے۔ اچانک صحن کے بڑے دروازے پر زور کی دستک ہوئی اور موسیٰ کا وار چوک گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بائیں شانے میں انگارے سے بھر گئے ہیں۔



باب 17

دراصل غلطی موسیٰ کی نہیں تھی۔ میں خود ہی دستک کی تیز آواز سن کر کچھ ایسا چونکا کہ موسیٰ کے اشارہ کرنے کے باوجود اپنا قدم پیچھے نہ لے سکا اور چاقو کی زد میں آ گیا۔ پل بھر میں میرا سفید کرتا شانے کی جانب سے سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ موسیٰ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا اور اسماعیل کو اشارہ کیا کہ آنے والے کو سنبھالے جب کہ مجھے برآمدے میں لے جا کر اس نے شانے کی جانب سے میرا کرتا پھاڑ کر جلدی سے زخم کا جائزہ لیا..... ''شکر ہے زخم زیادہ گہرا نہیں ہے شہزادے..... لیکن مرہم پٹی ضروری ہے.....'' کچھ ہی دیر میں حویلی کا ہی ایک نوکر جو ڈسپنسر کا کورس بھی کر چکا تھا میری مرہم پٹی کر رہا تھا۔ دروازے پر رنگا کا ہی کوئی خاص کارندہ تھا جس نے موسیٰ کو بتایا کہ باہر دروازے پر پولیس آئی ہے۔ موسیٰ معاملہ دیکھنے چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آ کر تکیے سے سر ٹکا کر لیٹ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ شاید یہ اس مسکن دوا کا اثر تھا جو مرہم پٹی کرنے والے نے مجھے درد دور کرنے کے لیے چند گولیوں کی صورت میں دی تھی۔

میری آنکھ پھر دوپہر کو ہی کھلی جب اسماعیل میرے لیے کھانا لے کر آیا ''اب کیسی طبیعت ہے.....'' میں نے اٹھ کر تکیے سے ٹیک لگا لیا'' بہتر ہوں..... معمولی زخم ہے..... بھر جائے گا.....'' اسماعیل نے ہمدردی سے میری جانب دیکھا'' کیوں خود کو اتنا ہلکان کرتے ہو..... کیا شیخ صاحب کے گھر والوں سے کوئی ان بن ہو گئی ہے.....؟'' مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اسماعیل کو میرے اندر کی خبر کیسے ہو گئی..... ''کیوں.....؟..... تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو.....؟'' اسماعیل نے کھانا چنتے ہوئے جواب دیا'' تم بہت دنوں سے ان کی طرف گئے جو نہیں..... ان کی بڑی بیٹی نے ناہید بٹیا کی طرف تمہارے لیے پیغام بھی بھجوایا تھا مگر تم پھر بھی نہیں گئے.....''

دو روز پہلے ہی میں کسی وجہ سے ناہید کے ہاں نہیں جا پایا تو میں نے اسماعیل کو پیغام دینے کے لیے کہلا بھیجا تھا۔ اسی روز ناہید نے اسماعیل کو یہ بتایا تھا کہ ستارہ نے شیخ صاحب کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے کہ وہ سب میری اتنی لمبی غیر حاضری سے بہت پریشان ہیں لہٰذا میں پیغام ملتے ہی ضرور شیخ صاحب کے ہاں ہو آؤں، لیکن میں نے اسماعیل کی سنی ان سنی کرتے ہوئے ناہید کو بھی صرف ہوں ہاں کر کے ہی ٹال دیا تھا کہ'' کچھ مصروفیت ہے وقت ملتے ہی چلا جاؤں گا۔'' ناہید کو تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنوں سے خود کو محبوس کیے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اسماعیل مجھے غور سے دیکھتا رہا'' صرف یہی بات نہیں ہے بابو..... بات کچھ اور بھی ہے جو تم اسماعیل کو بتانا نہیں چاہتے.....''

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا'' اور بھلا کیا بات ہو سکتی ہے..... تم جانتے تو ہو کہ صبح دو گھنٹے کی یہ سخت تربیت کیسے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیتی ہے۔ پھر دن بھر کہیں جانے کے قابل ہی کب رہتا ہے انسان.....؟.....''

اسماعیل نے میرے لیے پانی جگ سے گلاس میں ڈالا'' نہیں بابو..... جب تم شیخ صاحب کے گھر سے ہو کر آتے تھے تو تمہارے چہرے پر ایک خاص روشنی ہوتی تھی۔ ایک میٹھی سی مسکراہٹ..... پورے بابو لگتے تھے تب تم.....''

مجھے ہنسی آ گئی..... ''تو اب کیا آدھا رہ گیا ہوں.....'' اسماعیل کی آواز میں درد تھا'' کاش آدھے ہی رہ جاتے..... پر تم تو خود کو پورا ختم کرنے کے درپے ہو..... خود کو اتنا آزار نہ دو..... مر جاؤ گے.....''

میں چپ رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ عشق نامی بیماری اپنے ساتھ کچھ ایسی مہریں بھی ہماری پیشانیوں پر چھاپ جاتی ہے کہ پھر سارا زمانہ انہیں ہماری جبینوں پر جگمگاتے دیکھ کر ہمارے اندر کے حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے یہ محبت بیماری کم اور بدنامی زیادہ کہلاتی ہے۔

شام تک دوبارہ موئی بھی میرا حال احوال پوچھنے کے لیے چھوٹے صحن کی طرف چکر لگا گیا تھا۔ میں نے اس سے پولیس کے معاملے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار میں سینڈو کی کسی سے ہاتھا پائی ہو گئی تھی اور جلدی میں چاقو غلط چل جانے کی وجہ سے مخالف کچھ زیادہ گھائل ہو گیا تھا۔ لہٰذا سینڈو کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ پولیس اسی کی تفتیش کے لیے یعقوب مینشن کے دروازے تک آئی تھی پر سینڈو کی ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذ دیکھ کر واپس چلی گئی۔ یہ وہی سینڈو تھا جس نے اس روز مجھے پنجہ بازی کے مقابلے میں شکست دی تھی۔ کھلے دل کا لڑکا تھا اور بعد میں جتنی بار بھی میرا اور اس کا بڑے احاطے میں آمنا سامنا ہوا اس نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ میرا حال احوال پوچھا تھا۔ درمیان میں سارنگا نے بھی ایک آدھ بار آتے جاتے مجھے ٹوکا تھا کہ آج کل میں کہاں غائب رہتا ہوں کہ میری کچھ خبر ہی نہیں ملتی، لیکن ہر بار میں کوئی بہانہ بنانے میں کامیاب ہو ہی جاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں سارنگا اس نواب دبیر کے مسئلے میں بری طرح الجھا ہوا تھا جو کچھ روز پہلے اپنے ان جان دشمن کی کھوج لگانے میں سارنگا کی مدد لینے آیا تھا۔ اسماعیل نے مجھے بتایا کہ اب تک سارنگا کو اس معاملے میں اس لیے بھی کامیابی نہیں مل سکی تھی کیونکہ نواب دبیر کی ''زمرد حویلی'' کالی کے علاقے میں پڑتی تھی۔ وہی کالی دادا جسے سارنگا نے ٹکر دے کر اس سے یہ علاقہ چھینا تھا جس پر آج کل سارنگا کا راج تھا۔ میں نے اسماعیل سے کالی کے بارے میں تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس کے اور سارنگا کے درمیان ہمیشہ سے ہی کانٹے کی ٹکر رہی ہے۔ دونوں میں کسی نہ کسی بات پر ٹھنی ہی رہتی ہے اور آج کل وجہ تنازعہ نواب دبیر کی زمرد حویلی ہے، کیونکہ زیر زمین دنیا کے اصول کے مطابق کوئی بھی دوسرے کے علاقے اور سرکار میں مداخلت نہیں کر سکتا، لیکن سارنگا اپنے محسن ابراہیم کے بھیجے ہوئے سائل کو یوں خالی ہاتھ بھی تو نہیں لوٹا سکتا۔ لہٰذا معاملہ گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔

ابراہیم وہ شخص تھا جس نے سارنگا کی تب مدد کی تھی جب وہ صرف یعقوب فور میں تھا اور اپنی خون پسینے کی کمائی لوٹنے والوں سے حساب کتاب کے لیے دوبئی سے واپس اپنے ملک پہنچا تھا۔ تب ابراہیم نے یعقوب کو اس وقت پناہ دی تھی جب ساری دنیا اس کے خلاف ہو چکی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ ابراہیم جو خود بھی اس وقت اس علاقے کا نامور استاد تھا اس نے یعقوب کو اپنے وفادار بھی فراہم کیے تھے جنہوں نے یعقوب کو اس کا حق دلانے میں بھرپور مدد کی تھی۔ ابراہیم بہت عرصہ قبل یہ شہر چھوڑ چھاڑ کر اپنے آبائی گاؤں میں سکون کی زندگی گزار رہا تھا اور اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کی سفارش کی تھی، تو پھر ایسے میں سارنگا اپنے محسن کے سفارش کردہ شخص کی مدد سے کیسے دست بردار ہو جاتا۔ اسی لیے وہ دن رات نواب دبیر کے معاملے میں ہی جتا رہتا تھا اور میرے لیے سارنگا کی یہ ہمہ وقت مصروفیت بہت سود مند ثابت ہو رہی تھی کیونکہ میں اپنی پوری توجہ اپنی تربیت پر مرکوز کر سکتا تھا۔

شام تک میرے درد کو کافی آرام آ چکا تھا لیکن اسماعیل پھر بھی ضد کر کے مجھے پٹی بدلنے کے لیے قریبی کلینک تک لے گیا۔ مقصد کچھ دیر کے لیے مجھے کمرے کے گھٹن زدہ ماحول سے نکالنا بھی تھا۔ کلینک سے نکلتے نکلتے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ ناہید بہت دنوں سے مجھ سے شکوہ کر رہی تھی کہ

اب میں صرف پڑھائی کے وقت ہی آتا ہوں اور بنا اس کے ہاتھ کی چائے پیئے ہی ٹیوشن دے کر واپس بھاگنے کی کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج یعقوب مینشن سے نکل ہی آئے ہیں تو ناہید کا یہ شکوہ بھی دور کر دوں۔ ویسے بھی اس کا کورس تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور اگلے ہفتے سے اس کے سالانہ امتحانات بھی شروع ہونے والے تھے۔ لہٰذا یہ ٹیوشن کا سلسلہ بھی اب دو چار دن کا ہی مہمان تھا، لیکن شاید میں نے ناہید کے ہاتھ کی چائے پینے کے لیے اس روز جو وقت چنا تھا۔ وہ میری تقدیر کے پھیرے کی طرح مجھ پر الٹا پڑنے والا تھا۔

میں جب ناہید کے گھر پہنچا تو برآمدے میں ہی مجھے اندر سے کسی کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں سمجھا حسب معمول بوا کی پرانی جان پہچان والیاں اس سے ملنے آئی ہوں گی مگر کاش میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مہمانوں کے بارے میں تصدیق کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم جم سے گئے۔ سامنے ناہید کے ساتھ ستارہ اور گہنا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے سارے حواس ہی معطل ہو گئے اور میں نے غیر ارادی طور پر واپسی کے لیے قدم اٹھائے، مگر مجھے یوں تیزی سے پلٹتے دیکھ کر ناہید بولی..... ''ارے ارے..... آیان بھیا۔ واپس کہاں چل دیے..... یہ کوئی غیر نہیں..... ستارہ اور گہنا ہیں۔'' تب تک ان دونوں کا چہرہ ناہید کی جانب تھا۔ میرا نام سن کر ان دونوں نے چونک کر مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اب میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ گہنا نے شوخی سے کہا ''اچھا تو یہ جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور ہم پورے شہر میں ان کی گم شدگی کے ڈھنڈورے پیٹتے پھرتے ہیں..... کہاں تھے آپ اتنے دنوں.....؟''۔

''بس یونہی..... کچھ مصروفیت تھی.....'' میں نے فوراً ستارہ سے شکایت کی ''دیکھا آپی..... یہ ہم ہی ہیں جو ان کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں انہیں تو ہماری کوئی فکر نہیں.....'' ستارہ نے بھی دبے لفظوں میں مجھ سے شکوہ کیا ''ابا بھی آپ کے لیے بہت پریشان ہیں..... آپ نے پھر دوبارہ ہمارے گھر کا چکر ہی نہیں لگایا.....''

ناہید کا خیال نہ ہوتا تو شاید میری زبان سے کوئی تلخ حقیقت بیان ہو ہی جاتی کہ ''مجھ جیسے برے انسان کا ان کی گلی سے دور رہنا ہی بہتر تھا، کہیں میری بدنامی کے چھینٹے ان کے در پر نہ پڑ جائیں''..... لیکن میں چپ رہا۔ ستارہ میری خاموشی کو بھانپ گئی اور پھر آخر وقت تک وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا کھوجتی رہی۔ گہنا البتہ ویسے ہی مگن تھی اور بہانے بہانے سے مجھے چھیڑتی رہی۔ وہ آج آسمانی کرتا شلوار اور سیاہ شال میں ملبوس تھی۔ گویا آسمان نے سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ خیرہ کن اور نظر لگ جانے کی حد تک دل کش..... مگر افسوس..... وہ آسمان میرا نہ تھا۔

آخر ستارہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ''آپ کچھ چپ چپ سے ہیں آج.....؟ سب ٹھیک تو ہے نا.....'' میں چونک سا گیا ''جی..... جی بالکل..... بالکل ٹھیک ہوں..... آپ بتائیے..... نئی سہیلی کے ساتھ دل لگ گیا ہے آپ کا.....'' ناہید میرا اشارہ سمجھ کر ہنس دی۔ ''آیان بھیا، اب تو میری ایک نہیں..... دو دو سہیلیاں ہیں..... آپ گہنا کو بھول گئے کیا؟''۔

''نہیں..... انہیں کون بھول سکتا ہے.....'' میں گہنا کی طرف مڑا ''آپ سنائیں..... آپ کے تنویر بھیا نے سی ایس ایس کی تیاری کر لی..... کب حصہ لے رہے ہیں وہ مقابلے کے امتحان میں.....؟''

گہنا اپنی رو میں بولتی رہی ''دیکھیں..... شاید اگلے ماہ بیٹھیں وہ تحریری امتحان کے لیے..... تیاری تو انہوں نے واقعی بڑی زبردست کی

ہے..... بس اب دعا کریں کہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو کر جلدی سے افسر لگ جائیں.....'' میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا'' میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں..... اور اس کے ساتھ بھی جس کے لیے آپ مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی ہیں.....''

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے ناہید سے واپسی کی اجازت طلب کی'' کچھ دیر تو بیٹھیں آیان بھائی، ستارہ اور گہنا جائیں تو چلے جایئے گا۔ ان کے ابا انہیں لینے کے لیے بس آتے ہی ہوں گے.....''

''نہیں مجھے اسماعیل کے ساتھ کسی ضروری کام سے جانا ہے..... وہاں مینشن میں بھی میرا انتظار ہو رہا ہوگا..... پھر ملاقات ہوگی.....'' میں بات ختم کر کے سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں آ کر میرا جی چاہا کہ ایک بار اور اسے جی بھر کے دیکھ لیتا تو کیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے دل کی اس معصوم سی خواہش کو بری طرح کچل ڈالا۔ یہی چھوٹی چھوٹی اور بظاہر معصوم سی خواہشیں ہمیں آس اور آرزوؤں کے گھنے جنگل میں اس پتلی سی پگڈنڈی تک لے جاتی ہیں۔ جس کا اختتام بالآخر عشق کی اس اندھی اور گہری کھائی میں ہوتا ہے جہاں گرنے کے بعد آج تک کوئی عاشق سلامت واپس نہیں آیا۔ میں برآمدے میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے ستارہ کی ملائم آواز نے میرے قدم روک لیے'' سنیے.....'' میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ خود ہی قدم بڑھاتی میرے قریب چلی آئی، اس کا سر جھکا ہوا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر ان دو بہنوں کو ایک جیسے کپڑے پہنا دیے جاتے تو شاید ان میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یا پھر شاید ستارہ کی یہ سنجیدگی اس کی بیوگی کی دین تھی؟

اس نے حسب معمول اپنی سانس درست کرنے میں کچھ لمحے صرف کیے'' آیان..... کیا آپ ہم لوگوں سے کچھ ناراض ہیں.....؟..... شاید ہم لوگوں سے انجانے میں کوئی خطا ہو گئی ہے.....؟''

میں ہڑبڑا سا گیا۔ ستارہ سے ایسے کسی سوال کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا'' نہیں نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کے دل میں ایسا خیال آیا کیسے.....'' اس نے نظریں اٹھائیں'' بس یونہی..... آپ اتنے دن سے گھر بھی نہیں آئے..... نہ ہی اپنی کوئی خیر خبر دی.....''

''بس مصروفیات ہی کچھ ایسی ہو گئی ہیں کہ یعقوب مینشن سے نکلنا ہی نہیں ہوتا، اور پھر سچ تو یہ ہے کہ میرا تعلق اب ایسی جگہ سے جڑ گیا ہے کہ جس کے نام کی کالک آپ کے آنگن سے دور ہی رہے تو بہتر ہے۔''

ستارہ نے تڑپ کر میری جانب دیکھا'' آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کوئی جگہ اچھی یا بری نہیں ہوتی..... ہم اپنے رویوں سے اسے ایسا بناتے ہیں..... آپ کا کردار کیا ہے یہ ہمارا پورا گھرانہ اچھی طرح جانتا ہے.....''

میرے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا..... ''لیکن شاید گہنا ایسا نہیں سمجھتی.....'' ستارہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہی۔'' میں جانتی ہوں..... اس دن رافعہ نے آپ کے کہنے پر ہی گہنا سے آپ کے بارے میں اس کی رائے جاننے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ میرا یقین کریں۔ وہ ابھی بہت نادان ہے..... اسے زندگی کی بہت سی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں ابھی..... اور اس نے جو کچھ بھی کہا اس میں آپ کی جانب اس کا اشارہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ بس ایک عمومی بات کر رہی تھی، ہاں البتہ شاید اس کے الفاظ کا چناؤ کچھ غیر مناسب تھا۔ آپ میرا تو یقین کریں گے ناں..... میں اس

ساری گفتگو کے دوران وہیں موجود تھی..... ساری بات میرے سامنے ہوئی تھی.....'' میں چپ کر کے ستارہ کی بات سنتا رہا۔ گویا اسے بھی میرے حال دل کی خبر تھی۔ بس اگر کوئی نہیں جان پایا تو وہ ایک وہی تھا کہ جس کے دم سے یہ سارا فسانہ باقی تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں بہنوں میں۔ میں نے ستارہ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ ''چلیں..... کوئی بات نہیں..... ویسے بھی دل کے فیصلوں پر کس کا زور چلتا ہے..... میرا دل بھی بہل جائے گا دھیرے دھیرے..... اس میں گہنا کی کوئی خطا نہیں..... میں ہی اس کے لیے کچھ جذبے پالنے کا مجرم تھا، اور اس جرم کی خوب سزا مل چکی ہے مجھے..... اب حساب برابر ہو چکا ہے.....''

ستارہ نے دکھ سے میری جانب دیکھا ''یقین کریں وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ اسے تو آپ کے کسی جذبے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ شاید مجھے بھی نہ پتہ چلتا اگر اس روز آپ کی بہن اور گہنا کی باتیں نہ سن لیتی۔ آیان..... محبت اپنا راستہ خود بناتی ہے..... اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی.....''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ..... میرے ہی جذبے میں کچھ کمی ہوگی جو وہ اپنا راستہ نہیں بنا پایا..... بہرحال..... آپ خود کو اتنا نہ الجھائیں..... وقت سارے زخم بھر دیتا ہے..... اور ایک وعدہ کریں مجھ سے کہ مجھ پر جو بھی بیتی آپ وہ گہنا کو کبھی نہیں بتائیں گی.....'' ستارہ دھیرے سے بولی ''میں کوشش کروں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ اپنے دل میں ہم لوگوں کے خلاف مزید کوئی ملال نہیں رکھیں گے اور کل ہمارے گھر بھی آئیں گے.....'' میں نے اس نازک اندام کا دل ہلکا کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر لیا اور وہاں سے چلا آیا۔

راستے میں کچھ دیر کے لیے کیفے فراق پر رکا تو راجہ اور مشی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مشی دو دن پہلے ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر واپس آیا تھا اور اب اس کی صحت بھی کافی بہتر لگ رہی تھی۔ دونوں بہت دیر تک مجھ سے گلے شکوے کرتے رہے۔ بالے کو اس کے باپ نے گیراج کا سامان لانے کے لیے دوسرے شہر بھیج رکھا تھا۔ مشی نے مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے شاید ہمارا بی اے کا رزلٹ بھی نکل آئے۔ شکر ہے کہ میں نے اپنے شانوں پر شال ڈال رکھی تھی ورنہ اگر ان کی نظر کرتے کے اندر میرے شانے پر بندھی پٹی پر پڑ جاتی تو ان کے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ میں نے ناہید کے گھر میں بھی پورا وقت خود کو اسی شال سے ڈھکے رکھا تھا۔ مرزا کی فرمائش پر میں تیسری مرتبہ چائے پی کر اٹھا تو رات گہری ہو چکی تھی۔ یعقوب مینشن میں داخل ہوئے تو ایک عجیب سی ہل چل محسوس ہوئی۔

میں گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ موسیٰ کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ ''آ گیا شہزادے..... رنگا بھائی تین مرتبہ تیرا پوچھ چکے ہیں..... بڑے مہمان خانے میں وہ تیرا انتظار کر رہے ہیں چل آ جا..... میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔''

میں موسیٰ کے ساتھ بڑے مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کون سے خاص بات ہے جس کے لیے مجھے رنگا نے اس وقت خاص طور پر طلب کیا ہے۔ میں مہمان خانے کے ہال میں داخل ہوا تو میرے قدم جم سے گئے۔ اندر سارنگا کے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا۔

.....❁.....

باب18

مجھے دروازے پر رکتے دیکھ کر سارنگا نے آواز لگائی ''اندر آجا سانجن..... یہاں سبھی اپنے ہیں.....'' میں اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی نواب دبیر الملک اور پاشا صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ پاشا نے مسکرا کر سارنگا کی طرف دیکھا'' آپ نے اس نوجوان کا تعارف نہیں کروایا..... اس سے آپ کا کچھ خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔'' سارنگا نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا'' ہاں صاحب..... کچھ ایسا ہی اپنا ہے یہ..... پر زمانے سے ذرا خفا خفا سا رہتا ہے.....'' نواب دبیر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا'' پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو میاں.....''۔

''جی..... بی اے کا رزلٹ آنے والا ہے میرا.....'' میری بات سن کر نواب صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک لہرائی.....'' رنگا بھائی..... یہ تو مسئلہ گھر میں ہی حل ہوتا معلوم ہو رہا ہے..... آپ اس نوجوان کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔ یہ تو آپ کے یہاں کا معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس پر کسی کے شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور بہانہ بھی میرے پاس بہت معقول موجود ہے.....'' میں نے حیرت سے پہلے نواب اور پھر سارنگا بھائی کی طرف دیکھا۔ سارنگا ہنس پڑا۔

''نہیں نہیں بڑے صاحب..... یہ واقعی یہاں کا نہیں ہے..... بس مہمان ہے کچھ دن کے لیے اپنے پاس..... پھر اڑ جائے گا یہ پنچھی.....'' یہ سن کر نواب صاحب کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔ میں نے وضاحت طلب نظروں سے سارنگا کی طرف دیکھا تو سارنگا نے مختصر لفظوں میں مجھے بتایا کہ چونکہ نواب صاحب کی زمرد حویلی کالی کے علاقے میں آتی ہے اس لیے رنگا سرکار کے لیے وہاں براہ راست دخل اندازی کی صورت میں بڑوں کی سینٹ Senate کے سامنے جواب دہی بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آج شام سے وہ تینوں بیٹھے یہ مشورہ کر رہے تھے کہ اگر کوئی ایسا طریقہ ہو سکے کہ رنگا بھائی کے گروہ کا کوئی مستند شخص بھیس بدل کر کسی دوسرے روپ میں زمرد حویلی میں جا کر رہائش اختیار کرے اور در پردہ نواب کے دشمن کی کھوج لگائے تو اس طرح مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور کسی جواب دہی کی نوبت بھی نہیں آئے گی لیکن انہیں بہت سوچ بچار کے بعد بھی ایسا کوئی اڈے سے وابستہ شخص بھائی نہیں دے رہا تھا لیکن رنگا نے مجھے تین مرتبہ شام سے اب تک کیوں یاد کیا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس سے پوچھا تو اسے کچھ یاد آیا۔'' ہاں..... وہ علاقے کا ڈاکٹر ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی نوجوان اسماعیل کے ساتھ مرہم پٹی کروانے اس کے دواخانے آیا تھا۔ تجھے چوٹ لگی ہے کیا.....'' میں نے گھبرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا'' ہاں..... کندھے پر ہلکی سی خراش آگئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں.....''

لیکن مجھے لگا کہ جیسے سارنگا میرے جواب سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا۔

میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لئے نواب سے سوال کیا۔

''آپ کو وہ شخص اپنے ہاں کس بھیس میں درکار ہے.....'' نواب نے پاشا کی طرف دیکھا'' کچھ بھی..... ایسا کچھ جس سے وہ دشمن اُسے کچھ خاص سمجھ کر چوکنا نہ ہو سکے۔ مثلاً ہماری بیٹی فِضّہ کا اتالیق..... فِضّہ کی زیادہ تر پرورش اس کی ماں کے ہاں ایران میں ہوئی ہے..... ہم بہت دنوں

سے اس کے لئے یہاں کی تہذیب اور تاریخ کا کوئی استاد رکھنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں..... بلکہ پاشا صاحب تو دو مرتبہ اخبار میں اشتہار بھی دے چکے ہیں لیکن کوئی بھی کل وقتی بنیادوں پر یہ کام کرنا نہیں چاہتا..... اور جز وقتی بنیاد پر ہم کسی کو رکھنا نہیں چاہتے۔ فضہ کو اس خطے کی تہذیب اور تاریخ سے بے حد لگاؤ ہے.....'' میں نے کسی گہری سوچ میں گم رنگا کی طرف دیکھا اور دوسرا سوال کیا'' اخبار میں اشتہار دینے کی صورت میں یہ عمل کتنے دن میں مکمل ہو سکتا ہے.....'' پاشا نے کچھ سوچ کر کہا۔'' پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے..... اور پھر تم جزئیات طے کرنے کے بعد استاد کی زمرد حویلی میں منتقلی تک سمجھو مہینہ پورا ہو جائے گا۔'' میں نے موسیٰ کی طرف سوال طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا کر مجھے'' ہاں'' کا اشارہ دیا۔ مطلب وہ دن رات ایک کر کے ایک مہینے کے اندر میری تربیت کا اہم حصہ مکمل کروا سکتا تھا۔ میں نے سارنگا کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اس نے سر ہلایا

'' بول کیا بولنا چاہتا ہے.....'' میں نے نواب سے کہا'' آپ اخبار میں اتالیق کا اشتہار دے دیں..... پاشا صاحب کی ذمہ داری لگا دیں کہ وہ مجھے کامیاب امیدوار چن لیں جو میں ہوں گا۔ اور پھر میں دکھاوے کے لئے باقاعدہ کسی دوسرے شہر سے زمرد حویلی میں اتالیق کے طور پر وارد ہو جاؤں گا.....''

نواب کی آواز میں جوش تھا'' لیکن ابھی تو تمہارے استادِ محترم نے فرمایا کہ تم یہاں کے نہیں ہو.....''۔'' ہاں..... لیکن یہی بات آپ کے حق میں بھی تو جاتی ہے، کیونکہ اس طرح مجھے کوئی اڈے کے آدمی کی حیثیت سے وہاں شناخت بھی نہیں کر پائے گا.....''

رنگا نے مسکراتے ہوئے میری پیٹھ تھپتھپائی۔'' لیکن پیارے..... اڈے کا کوئی پرانا چاول چل پائے گا۔ دشمن بڑا گھاگ ہے اور وہاں سب کچھ اُلٹا بھی پڑ سکتا ہے۔ تجھے کچھ ہو گیا تو میں تیرے باوا کو کیا جواب دوں گا ساجن میں نے رنگا کو اطمینان دلایا'' آپ مطمئن رہیں..... آپ کا امتحان پاس کیے بغیر میں ان کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ رنگا بھائی کی سرکار پر کوئی آنچ نہیں آئے گی میرے نام سے.....'' سارنگا نے کچھ حیرت سے پہلے مجھے اور پھر موسیٰ کو دیکھا'' لگتا ہے کوئی کھچڑی پک رہی ہے بچا بھتیجے کے درمیان..... ٹھیک ہے بھئی..... سانچ کو آنچ کیا..... پر یاد رکھ..... آگ پر چل کر دکھائے گا تب ہی اجازت ملے گی تجھے.....'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر پاشا سے کہا'' آپ تمام انتظامات کر لیں..... اشتہار ایک آدھ دن میں آ جانا چاہئے.....'' کچھ دیر بعد وہ لوگ سارنگا سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد رنگا نے ہم سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے سارنگا سے وہ سوال بھی پوچھ لیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔'' لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ نواب صاحب کا دشمن بھی ایک ماہ تک انتظار کرے..... وہ اس تیس دنوں کے وقفے میں بھی تو کوئی جان لیوا وار کر سکتا ہے؟'' رنگا نے مسکرا کر موسیٰ کی طرف دیکھا'' دیکھ لیا موسیٰ..... تیرا لاڈلا بھی اب اڈے والوں کی طرح سوچنے لگا ہے..... لگتا ہے یہاں کا پانی اثر کر رہا ہے.....'' موسیٰ بھی ہنس دیا۔'' نواب صاحب ایک ماہ کے لیے ایران جا رہے ہیں۔ کچھ جدی پشتی زمین داری کے مسئلے نبٹانے ہیں..... اسی لیے یہ وقفہ وہ کسی استاد کے چناؤ میں لگانا چاہتے ہیں.....''

کچھ دیر بعد محفل برخاست ہو گئی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پھر وہی تنہائی اور پھر وہی یادوں کے آسیب..... دن تو جیسے تیسے کٹ

جاتا تھا مگر یہ کم بخت رات جیسے رک سی جاتی تھی۔ آج شام جب میں نے ناہید کے ہاں اسے دیکھا تھا تب سے جو اک ذرا سا آرام نصیب ہوا تھا وہ بھی شدید بے چینی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ ہم محبت کرنے والے بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں۔ چار دن اپنے محبوب کو اپنی نظروں سے اوجھل رکھ کر اور اس سے کوئی بات یا رابطہ نہ کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اسے بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صدیوں اوجھل رہنے کے بعد بھی محبوب کی پہلی جھلک ہمیں ٹھیک اسی مقام پر دھکیل دیتی ہے جہاں سے ہم نے ترک ملاقات کی ابتدا کی ہوتی ہے۔ سچ ہے کہ محبت سے کوئی فرار ممکن ہی نہیں..... شاید محبت بھی موت کا دوسرا نام ہے۔ محبت جان لیوا ہے۔

میں بھی اسی جان کنی کے عالم میں ساری رات اپنے تکیے پر سر پٹکتا رہا، مگر محبت کا اندھا تیر ہمارے خون میں کچھ ایسا زہر چھوڑ جاتا ہے کہ پھر نیند اور خواب جیسی نعمتیں ہمیں کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ صبح موسیٰ کی پہلی دستک پر ہی میں جھٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا ''لگتا ہے آج رات پھر خود سے لڑتے رہے ہو..... کبھی کبھی تو میں تجھ سے ڈر جاتا ہوں شہزادے..... اتنی آگ اپنے اندر مت جلا کہ دوسرے بھی بھسم ہو جائیں۔'' اس روز سے موسیٰ نے مجھے باقاعدہ ایک ہاتھ میں رسی باندھ کر اور دوسرے ہاتھ میں چاقو دے کر مشق کروائی۔ یہ رسی ہم دونوں کی بائیں کلائی کو جکڑے رہی اور صرف ہمارا داہنا ہاتھ ہی آزادورہ کر دار کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے پاس پینترے بدلنے کے لیے بھی نہایت کم جگہ تھی کیونکہ موسیٰ نے کچی زمین پر سفید چونے سے ڈالا ہوا دائرہ بھی بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ اس روز موسیٰ نے مشق ختم ہونے پر فراخ دلی سے میری پیٹھ تھپتھپائی۔

''شاباش..... تو واقعی مہینوں کا کام دنوں میں سیکھ رہا ہے۔ بڑی صفائی آتی جا رہی ہے تیرے ہاتھ کے اندر..... شاید یہ تیرے اندر کی اسی نار کا اثر ہے شہزادے..... ناکام محبت اگر بہت کچھ لے جاتی ہے تو بدلے میں دل جلوں کو کچھ ایسا دے بھی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو جھونک دیں تو دنیا فتح کر سکتے ہیں.....''

شاید موسیٰ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ محبت میں ناکامی ہمیں بیک وقت دو مختلف انتہاؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ ایک انجام خود کو اور دنیا کو ترک کر دینے کی صورت میں نکلتا ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لیے غروب کر دیتا ہے اور وہ پھر سدا کے لیے ایک عضو معطل کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اسے دن رات کا ہوش نہیں رہتا اور وقت اسے گزار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری انتہا اس کے اندر کے انسان کو طلوع کر دیتی ہے۔ اس کے اندر کا غصہ اور دکھ اور جلن کی کاٹ اسے کچھ ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ جس سے وہ دنیا کی نظروں میں آ جائے..... چاہے بدنامی کی صورت ہی سہی پر اس کا تذکرہ کسی طور تو اس کے محبوب تک جا پہنچے..... ایسے میں اسے کسی انجام کا خوف یا راہ میں آئی کسی بھی رکاوٹ کی جھجک اپنے مقصد سے روک نہیں پاتی۔

مجھے بھی شاید وہی دوسری انتہا اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ ورنہ خود کو اس جنوں اور اس اذیت میں ڈالے رکھنے کی اور کوئی وجہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میری زندگی سے جیسے ایک پل میں ہی تمام خواہشیں، سب منزلیں اور تمام مقاصد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔ محبت ہمیں اپنوں سے بیگانہ اور غیروں کے معاملے میں بے حس بنا دیتی ہے، مگر میرے اپنے مجھے بھلا کیسے بھول سکتے تھے۔ صبح نو بجے کے قریب اسماعیل نے مجھے ریحان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ میرے لیے امی کا پیغام لے کر آیا تھا کہ ابا آج صبح کی گاڑی سے ہمارے شہر سے چالیس کلومیٹر دور قصبے میں رہائش پذیر تایا جان کی مزاج پرسی کے لیے نکل چکے ہیں اور اب ان کی واپسی شام چار بجے تک ہوگی لہٰذا میں کسی بھی طرح ان سے ملنے آ جاؤں۔ ریحان نے

مجھے دھمکی آمیز نظروں سے دیکھا" دیکھو..... اس دن میں نے تمہاری بات مانی تھی..... لیکن آج اگر تم نے میری بات نہ مانی تو ان سب کے سامنے تمہیں باندھ کر لے جاؤں گا۔" ریحان کے تیور اور گلے میں پڑا مفلر بتا رہا تھا کہ آج وہ واقعی بچپن کا کھیل دھرانے کے موڈ میں ہے۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا "اچھا میرے تھانے دار..... کپڑے بدلنے کی اجازت تو ہے نا....." ریحان بھی ہنس دیا۔ میرے دل سے صدا آئی کہ کاش میرا بھائی یونہی سدا ہنستا رہے۔ "کاش اسے کبھی کسی سے محبت نہ ہو"..... ریحان جب مجھے لیے گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں سے برتنوں کی ٹرے اٹھائے گزرتی چھوٹی کے ہاتھ سے سارے برتن گر گئے۔ چند لمحے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ میں اس کے سامنے صحن میں کھڑا ہوں اور پھر وہ امی کو آوازیں دیتی ہوئی میری جانب دوڑی۔ امی بھی اس کی آوازیں سن کر ہڑبڑائی ہوئی سی کمرے سے نکل آئیں اور پھر کچھ ہی دیر میں سب جل تھل ہو گیا۔ یہ مائیں اور بہنیں اپنے اندر اتنے آنسو کہاں چھپا رکھتی ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے اور ریحان نے ان دونوں کو چپ کرایا، لیکن پھر بھی بات بے بات امی کی آنکھ چھلک ہی جاتی تھی۔ انہوں نے مجھے پہلا اور آخری حکم یہی صادر کیا کہ میں فوراً ابا سے معافی مانگ کر گھر واپس آ جاؤں ورنہ وہ مجھے اپنا حق نہیں بخشیں گی..... وغیرہ وغیرہ..... ان ماؤں کے پاس بھی اپنے بچوں کو دھمکانے کے کیسے کیسے گر ہوتے ہیں، لیکن ماں کا سب سے بڑا ہتھیار تو اس کی محبت ہوتی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کی دھمکیاں سن کر مسکراتا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں بہت محفوظ ہاتھوں میں ہوں اور کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ میری بھی ابا کے سامنے کچھ شناخت بن سکے۔ باتوں باتوں میں میں نے نواب صاحب کے ہاں نوکری کی بات بھی ان کے کان میں ڈال دی۔ کیا کریں، ان ماؤں کو بہلانا بھی تو بڑا مشکل ہوتا ہے، اور میری بھولی امی بھی آخر کار بہل ہی گئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر تین ماہ تک میں خود کو ثابت نہ کر سکا تو جیسا ابا کہیں گے، چپ کر کے وہی کروں گا۔ حتیٰ کہ اسسٹنٹ پروفیسری کے امتحان میں بھی پوری تیاری کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ امی نے دوپہر کے کھانے میں ہر چیز میری پسند کی بنائی اور شام چار بجے سے پہلے میں بمشکل اس وعدے پر گھر سے نکل پایا کہ وہ جب بھی ریحان کو مجھے لینے کے لیے بھیجیں گی..... میں ضرور ان سے ملنے آؤں گا۔

محلے کے کیفے ٹیریا میں اپنے کسی ساتھی کو نہ پا کر میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں ابا کے آنے سے پہلے ہی جلد از جلد کالونی سے نکل جانا چاہتا تھا، اور پھر سڑک پر آ کر میرے قدم سادات محلے کی طرف اٹھ گئے۔ کل میں نے ستارہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے گھر ضرور آؤں گا۔ کچھ وعدوں کا پاس نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میری آمد کا ذکر گھر میں بھی ضرور کیا ہوا۔ سادات محلے کی چوڑی گلی میں مڑتے ہی مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے کی دوکان سے برقعے میں ملبوس ستارہ اور بڑی سی کالی شال میں لپٹی گہنا نکل رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ انہیں آواز دوں یا نہیں کیونکہ یوں سر بازار انہیں پکارنا مجھے معیوب لگ رہا تھا کہ اچانک گلی کے نکڑ پر کھڑے چند اوباش لڑکوں نے خواہ مخواہ بات بے بات زور زور سے ہنسنا اور سیٹی کی دھن پر کچھ گنگنانا شروع کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا نشانہ اور مخاطب وہی دونوں تھیں۔ میں نے اتنی دور سے بھی ان دونوں کی چال میں واضح پریشانی کی لڑکھڑاہٹ اور تیزی محسوس کر لی۔ بجبور مجھے اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آنا ہی پڑا۔ "آپ لوگ یہاں..... تنہا..... شیخ صاحب کہاں ہیں....." گہنا اور ستارہ کی جیسے جان میں جان آ گئی۔ "اوہ شکر ہے..... یہ آپ ہیں..... ہم تو ڈر ہی گئے تھے....." میں نے پلٹ کر ان نوعمر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ شوکی سے جھگڑے کے بعد یہاں کا ہر فرد میری شکل خوب اچھی

طرح پہچانتا تھا۔ وہ مجھے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر بوکھلا سے گئے اور جلد بازی میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

میں نے ستارہ اور گہنا کو چلنے کا اشارہ کیا ''لیکن آپ دونوں یہاں کیا کر رہی ہیں'' ستارہ نے نقاب کے پیچھے سے گہنا کو گھورا ''یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔ میں نے گہنا کو کہا بھی تھا کہ ابا قریبی بازار تک گئے ہیں سودا سلف لانے کے لیے۔ وہ آ جائیں تو ان کے ساتھ ہی چلیں گے..... لیکن اس نے تو کسی کی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے'' گہنا بڑی بہن کی ڈانٹ سن کر روہانسی سی ہو گئی ''اچھا آپی..... اب ڈانٹیں تو نہیں..... پہلے ہی ان بدتمیزوں کی وجہ سے میرا آدھا خون خشک ہو چکا ہے.....'' میں انہیں ساتھ لیے ان کی گلی میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر دستک کے چند لمحوں بعد اندر سے قدموں کی چاپ ابھری۔ گہنا نے دھیرے سے ستارہ سے کہا ''لگتا ہے ابا جی واپس آ گئے ہیں.....''

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور اس کے بیچوں بیچ کسی کا کرخت چہرہ ابھرا۔ اس کو دیکھ کر ستارہ اور گہنا کی جان نکل سی گئی۔ وہ ریحان سے بڑی عمر کا کوئی نوجوان تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی شدید غصے میں گہنا اور ستارہ سے پوچھا ''تم دونوں اس وقت باہر کیا کر رہی ہو..... اور ابا کہاں ہیں.....؟'' وہ شیخ صاحب کا بیٹا حمید تھا جو اپنے آبائی مکان کی رکھوالی کے لیے سیلاب زدہ علاقے سے شاید آج ہی واپس آیا تھا۔ ستارہ اور گہنا خوف کے مارے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔ اس نے انہیں جھاڑا ''اور یہ کون ہے تم لوگوں کے ساتھ.....؟'' تم لوگ تو چلو اندر..... تم سے بعد میں بات ہو گی.....'' وہ دونوں تیزی سے لپکتی جھپکتی گھر کے اندر چلی گئیں۔ حمید نے اب مجھے کڑی نظروں سے گھورا ''جی فرمایئے..... کس سے ملنا ہے آپ کو.....''

''شیخ صاحب سے..... انہوں نے مجھے یاد کیا تھا..... میرا نام آیان ہے.....''۔

''اچھا.....؟ لیکن ابا تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں اور آپ ستارہ اور گہنا کے ساتھ ہی آئے ہیں یا یہ صرف محض ایک اتفاق ہے.....''

''نہیں..... وہ دونوں مجھے گلی کی نکڑ پر گھر کی طرف آتی ہوئی ملی تھیں..... آپ چاہیں تو اسے اتفاق بھی سمجھ سکتے ہیں.....''

حمید کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی کی ایک لہر تیر رہی تھی۔ ایک سخت گیر بھائی کو شاید ایسا برتاؤ ہی کرنا چاہئے تھا۔ میں واپسی کے لیے پلٹا۔

''ٹھیک ہے..... شیخ صاحب آ جائیں تو انہیں میرا سلام دیجئے گا..... خدا حافظ'' میرے مڑتے ہی شیخ صاحب خود مجھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلی میں داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ مجھے اور حمید کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہماری جانب لپکے۔ حمید کی آمد کی خبر انہیں بھی نہیں تھی، باپ بیٹا مل چکے تو وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

''ارے آیان میاں..... تم باہر کیوں کھڑے ہو..... اندر بیٹھ کر باتیں ہوں گی'' میرا جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ آپ کے فرزند شاید میرے دروازے پر موجودگی سے بھی نالاں ہیں اور آپ مجھے گھر کے اندر لیے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئے اور تمام ملاقات کے دوران حمید کو میرے اب تک کے کارنامے سناتے رہے لیکن میں چائے ختم کرتے ہی معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ حمید کا برتاؤ شیخ صاحب کے خاندان سے مختلف تھا اور اس کے اندر کی تلخی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شیخ صاحب جیسے نرم دل باپ کا بیٹا ہے۔

میں سادات محلے سے نکل رہا تھا تب مجھے پہلے دوکاندار نے سلام کیا ''آیان بھیا سلام'' میں نے سر ہلا کر جواب دیا تو سامنے ٹھیلے والے نے ہاتھ جوڑ دیے..... ''انو بھائی سلام عرض کرتا ہوں.....'' میں نے کچھ حیرت سے دوبارہ جواب دیا تو نکڑ والے پان کے کھوکھے سے پنواڑی

باقاعدہ ہاتھ جوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ ''سلام انو بھائی..... آپ سے ایک عرض تھی.....'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ میرا نام کس طرح جانتے ہیں اور مجھے اس قدر عزت و تکریم سے کیوں پکار رہے ہیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یہ لوگ مجھے اب سارنگ کے توسط سے جانتے ہیں۔ میں اب صرف آیان نہیں رہا..... اس علاقے کا ''بھائی'' بن چکا تھا۔



باب19

میں اپنی جگہ گم سم سا کھڑا تھا اور کچھ ہی دیر میں میرے آس پاس بازار کے دوکانداروں کا جھمگٹا اکٹھا ہو چکا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی بس اتنا ہی چاہتا تھا کہ میں دو گھڑی اس کی دوکان پر ٹھہر جاؤں۔ ان سب کے پاس سارنگا کی سرکار میں پیش کرنے کے قابل کوئی نہ کوئی عرضی یا درخواست تھی۔ جب تک آیان احمد صرف ایک شریف النفس ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا وہ ان کی نظروں سے اوجھل اور نہایت غیر اہم تھا اور آج جب اسی غریب گھرانے کے آیان کا نام سارنگا کے اڈے کے ساتھ جڑ گیا تھا تو ان سب کے لیے وہ دنیا میں سب سے اہم ہستی بن چکا تھا۔ اسی بازار میں جب میں نے شوکی کو مارا پیٹا تھا تو کوئی میری مدد کو آگے نہیں آیا تھا اور پھر جب اسی بازار میں مجھے ہاتھ جوڑ کر شوکی سے معافی مانگنی پڑی تھی تب بھی یہ سب خاموش تھے، لیکن آج مجھ سے بات کرنا ان کے لیے قابل فخر ہو چکا تھا۔ شاید ہمارے اندر کی اسی منافقت نے اس معاشرے کو اس قدر مکروہ اور قابل نفرت جگہ بنا دیا ہے۔

اس علاقے کے دوکانداروں کے لیے میرا یہ احسان ہی کافی تھا کہ اب ان سے کوئی زبردستی ہفتہ وصول نہیں کرتا تھا۔ وہ سارنگا کے ان برائے نام کارندوں کے خوف سے آزاد ہو چکے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں اس خوف سے آزاد کرواتے کرواتے خود میں اپنا سب کچھ گروی رکھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں موسیٰ کی ایک نصیحت گونجی "یاد رکھ شہزادے..... اس دنیا میں بس زور کو سلام ہے..... تو زور آور ہوگا تو لوگ تیرے آگے پلکیں بچھانے کو بھی تیار ہو جائیں گے..... اور اگر کم زور پڑ گیا تو یہ تجھے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے....."

اور آج میں اپنے سامنے اسی "زور کو سلام" کا ایک مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ ابا کے خدشات اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ انہیں یہی ڈر تھا کہ لوگ مجھے اڈے کی وجہ سے جانیں گے اور سلام کریں گے اور آج مجھے پورا بازار سلام کر رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب سے پیچھا چھڑایا کہ جس کو بھی کسی مدد کی ضرورت ہو وہ یعقوب مینشن آ جائے۔ اگر وہ حق پر ہوا تو اس کی دادرسی ضرور کی جائے گی، لیکن اس کے لیے انہیں سارنگا سے خود بات کرنی ہوگی۔"

مینشن واپس پہنچ کر بھی میں بہت دیر تک ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار رہا۔ ہم لوگ اپنے گھروں کی بند چار دیواریوں میں جن لوگوں کی طاقت کا رونا روتے ہیں اور غلط اختیارات پر انہیں برا بھلا کہتے اور معتوب کرتے ہیں، باہر کی کھلی فضا میں ان کے سامنے ہی سر کیوں جھکا دیتے ہیں۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی طاقت واقعی "خوف" کی طاقت ہوتی ہے.....؟

موسیٰ نے اسی روز سے میری تربیت کو دن کے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اب صبح فجر کے بعد دو گھنٹے کی تربیت کے علاوہ مجھے دن گیارہ سے ایک اور پھر شام چار سے سات بجے تک تربیت دی جاتی تھی۔ ناہید کے پرچے شروع ہو چکے تھے لہٰذا اب اسے ٹیوشن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب میری تربیت باقی استادوں سے کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی وہ اس رہائشی صحن کی طرف آنے سے گریز ہی کرتے تھے جہاں موسیٰ

مجھے یہ سب سکھا رہا تھا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب مجھے سارنگا کے سامنے امتحان کے لیے پیش کر دیا گیا۔ وہ شام کی معمول کی مشق کا وقت تھا جس کی نگرانی سارنگا خود کیا کرتا تھا۔ موسیٰ نے جب مجھے احاطے میں چلنے کا کہا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تربیت اور مشق اگر سب کے درمیان ہو تو انسان کو اپنے قد کاٹھ کا اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کا پیمانہ بھی دیکھ چکا ہوتا ہے مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میرا انداز صرف موسیٰ کی حد تک محدود تھا۔ میں خود کو صرف اس کی نظر میں ہی تول سکتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ میرا آج تک کسی سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا دوسروں کے بارے میں میرے اندازے کا پیمانہ بالکل خالی تھا۔ اب یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ میں اڈے کے معیار پر پورا بھی اترتا تھا یا پھر وہی سدا کا بے معیار تھا۔

سارنگا نے مسکرا کر مجھے دیکھا "اچھا تو موسیٰ کا پٹھا آ گیا ہے میدان میں..... بھئی واہ..... دیکھیں تجھے کتنا کندن بنایا ہے تیرے استاد نے....."

سارنگا نے میری پہلی آزمائش پنجہ بازی ہی رکھی۔ شاید وہ سب سے پہلے میری کلائی کا دم خم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پرکھ کے لیے اس نے پھر اسی سینڈو کو میدان میں آنے کا حکم دیا جو مجھے پہلے بھی اس مقابلے میں شکست دے چکا تھا۔ سینڈو مسکراتے ہوئے میرے مقابل آ کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی کہنی تختے پر رکھ دی۔ میں نے اپنی کلائی کا توازن صحیح کیا اور اپنا پنجہ سینڈو کے پنجے سے بھڑا دیا۔ کچھ لمحے تک ہم دونوں کے جڑے ہاتھ اسی مقام پر ساکت جمے رہے اور پھر میں نے سینڈو کی نظر میں پریشانی کی جھلک دیکھی وہ اپنی کلائی کا زور میرے پنجے پر منتقل کرنے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آج بھی ہمارے گرد اسی دن جتنی ہی بھیڑ تھی لیکن آج وہ سب دم سادھے یوں خاموش کھڑے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے جیسے ان میں سے کسی کی بھی سرگوشی یہ سارا طلسم توڑ دے گی۔ میں نے چند لمحے سینڈو کی جانب سے کسی تحریک کا انتظار کیا۔ یہ اس کی اڈے پر بنی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا۔ پھر میں نے موسیٰ کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے دوسرے ہی لمحے سینڈو کی کلائی ایک جھٹکے میں گرا دی۔ کچھ دیر تو ہجوم کے اندر مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ ہوتی رہی اور پھر ایک چیخ و پکار مچ گئی۔ سب لپک لپک کر موسیٰ کو مبارکباد دے رہے تھے اور میرے کاندھے اور بازو سہلا رہے تھے۔ سارنگا نے سینڈو کو ڈانٹا "دھت تیرے کی..... حرام خور..... سانڈ کا سانڈ ہے پر اپنی تو آج کرکری کروا دی نا....." میں نے مسکرا کر سینڈو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ سینڈو میرے گلے لگ گیا..... "سچ انو بھائی آج بہت عرصے کے بعد ہارنے میں مزہ آیا ہے....."

سارنگا نے مجھے مسکراتے ہوئے خبردار کیا "ذرا ٹھہر جا سورما..... ابھی اصل امتحان باقی ہے۔" اڈے کی روایت کے مطابق دو بند چاقو ایک چاندی کی تھال میں سارنگا کے سامنے لائے گئے۔ اس نے ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر گویا مقابلے کی اجازت دے دی۔ ان میں سے ایک چاقو کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ موسیٰ کا وہی چاقو تھا جو اس نے تمام تربیت کے دوران استعمال کیا تھا۔ ماہروں کی بھیڑ میں سے ایک پکی عمر کا شخص سارنگا کے اشارے پر آگے بڑھا۔ میں نے اسے احاطے میں شاگردوں کو تربیت دیتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا نام اشرف تھا۔ رنگا نے اشرف کو آگے بڑھنے کی دعوت دی مگر اس نے ریت کے مطابق اپنے سب سے مضبوط اور مستند شاگرد کو آگے بڑھا دیا۔ میں نے موسیٰ کا چاقو اٹھا لیا اور میرے حریف

نے دوسرا چاقو اپنی ہتھیلی میں تولا۔ پھر ہم دونوں نے رواج کے مطابق اپنے اپنے چاقو سارنگا کے قدموں میں ڈال دیے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہم سارنگا کو ہی اپنا سب سے بڑا استاد اور گرو مانتے ہیں۔ سارنگا نے پاس بلا کر ہم دونوں کو اپنے انداز میں شاباشی اور دعا دی۔ ہم دونوں نے چاقو اٹھا لیے اور کھلے احاطے میں آ گئے۔ کچھ دیر تک میرا حریف چاروں جانب گھوم کر مجھے نظروں ہی نظروں میں تولتا رہا۔ جبکہ میرے ذہن میں موسیٰ کا ایک ہی جملہ گردش کر رہا تھا کہ اگر سامنے والے کی طاقت اور چال کا اندازہ نہ ہو تو اپنے دونوں پیروں پر اپنا بوجھ برقرار رکھو اور صرف اس کی نظر پڑھتے رہو۔ میں نے بھی یہی کیا اور کھڑے کھڑے اپنے حریف کی حرکت کے ساتھ گھومتا رہا۔ میرے مقابل نے میرا دھیان بٹانے کے لیے اپنے چاقو کو تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اندر واقعی بجلی بھری ہوئی تھی لیکن میری نگاہیں اس کے ہوا میں ادھر سے ادھر منتقل ہوتے چاقو کے پھل سے زیادہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ فضا میں چاقو کی دھار کی چمک سورج کی ایک کرن سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی اور میرے لیے حریف کی چال پر نظر رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی میں نے دکھاوے کی خاطر ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں اور میرا حریف اسے میری بھول سمجھ کر میری جانب لپکا، لیکن یہ خود اس کی اپنی چوک ثابت ہوئی مجھے ایسے ہی کسی لمحے کے ہزارویں حصے کا انتظار تھا۔ میں نے ذرا سا پہلو بدلا اور دوسرے ہی لمحے حریف کی داہنی کلائی میرے بائیں ہاتھ کے پنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے بوکھلا کر ہاتھ چھڑانے کے لیے زور سے کھینچا اور میں نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور اگلے ہی پل میرا چاقو اس کی شہ رگ کو چھو رہا تھا۔ میں نے اس کے لڑکھڑانے کے دوران بائیں ہاتھ سے اس کے شانے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا تھا اور میرے داہنے ہاتھ میں پکڑا چاقو اب اس کی گردن پر تھا۔ میں نے حریف کو آزاد کر دیا اور مقابلہ ختم ہو گیا۔ رنگا دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے ہوئے جوش میں چلایا..... ''واہ ساجن..... موسیٰ کی جوانی یاد دلا دی.....'' موسیٰ نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوم لیا۔ میں نے اڈے کے سب سے مشاق چاقو باز کو بہت کم وقت میں مات دے دی تھی۔

رنگا نے اشرف استاد کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اشرف استاد چاقو تھامے زمین پر لگے چونے کے دائرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں کے بائیں ہاتھ کی کلائی کو رسی سے باندھ دیا گیا اور صرف داہنے ہاتھ کو آزاد رہنے دیا گیا۔ اب ہم میں سے جس کا قدم بھی دائرے سے باہر نکل جاتا وہ مقابلہ ہار جاتا۔ اشرف استاد اڈے کے پرانے استادوں میں سے ایک تھا، اور اس کی یہاں بڑی دھاک تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر تک نظروں نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے اور پھر اشرف نے جھاکا دینے کے لیے اپنا چاقو ہوا میں اچھالا۔ ٹھیک اسی لمحے اس نے رسی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اگر میری نظر ہوا میں اچھلے چاقو کی طرف ہوتی تو میں ضرور اوندھے منہ دائرے سے باہر جا گرتا مگر میں نے چاقو کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔ اشرف نے دوسرے ہی لمحے بازی گروں جیسی پھرتی کے ساتھ اپنا ہوا میں اچھالا چاقو پھر سے پکڑ لیا اور دھیرے سے مجھے داد دی ''شاباش جوان..... یونہی ڈٹے رہنا.....'' میں نے دائیں ہاتھ سے ہی چاقو اچھال کر تولا اور بنا کسی منصوبے کو ظاہر کیے رسی کو تیزی سے اپنی کلائی کے گرد دو بل دے کر اپنے اور اشرف کے درمیان فاصلہ کم کرتے ہوئے چاقو کی نوک سے اشرف کے بازو پر وار کیا لیکن یہ دھیان رکھا کہ میرے چاقو کی نوک اس کے بازو کے گوشت کو چھو نہ پائے اور صرف اس کے کرتے کو ہی گزند پہنچے۔ میرا اندازہ ٹھیک رہا اور اشرف کے بازو پر کرتا کٹ کر ایک جانب کو جھول گیا۔ مجمعے میں ایک تیز سی تحیر آمیز سرگوشی ابھری..... میرا مقصد پورا ہو گیا تھا، میں نے رسی ڈھیلی کرتے ہوئے خود ہی دائرے سے باہر قدم رکھ دیا۔

میں نے اشرف استاد کے آگے اپنی ہار خود تسلیم کر لی تھی۔ سب ہی کو سانپ سونگھ گیا اور پھر سب سے پہلے اشرف استاد نے ہی اپنا چاقو پھینک کر مجھے گلے لگا لیا۔ فضا سیٹیوں، تالیوں اور نعروں کے شور سے گونج اٹھی۔ میں نے خود کو ایک استاد کے سامنے مقابلے کے لیے پیش تو کر دیا تھا کہ یہ موسیٰ کی عزت کا سوال تھا مگر موسیٰ کے دیے ہوئے فن کی ایک جھلک دکھا کر میں نے خود کو مقابلے سے دست بردار کر کے اس استاد کی سالوں کی محنت کا مان بھی رکھ لیا تھا۔

موسیٰ نے مجھے دونوں بازوؤں میں اوپر اٹھا لیا۔ ''تو نے آج موسیٰ کو خرید لیا ہے شہزادے..... جیتا رہ.....''

سارنگا نے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔ ''مارڑ الا جہاں..... رنگا کو مارڑ الا آج تو نے..... ہر ریتی رواج پکی طرح سیکھ کر اترا ہے آج تو میدان میں.....'' رنگا نے آگے بڑھ کر موسیٰ کو سینے سے لگا لیا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر ایک بوسہ دیا ''تیرے ہاتھ میں آج بھی جادو ہے موسیٰ'' موسیٰ نے عقیدت سے رنگا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر لگایا۔ ''سب آپ سے ہی سیکھا ہے مالک.....''

سارنگا نے اپنی سونے کی چین گلے سے اتاری اور میرے گلے میں ڈال دی۔ ہجوم نے خوشی سے نعرے لگائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سارنگا نے مجھے اپنے اڈے کا مستند اور ماہر تسلیم کر لیا اور اسی خوشی میں اس رات سارنگا کی طرف علاقے کے تمام استادوں، اپنے احاطے کے تمام شاگردوں اور ارد گرد کے سارے اڈے کے لوگوں کو رات کے بڑے کھانے کی دعوت دی گئی، اور اسی رات مجھے پتہ چلا کہ آس پاس کے تمام بڑے لیڈر اور سیاستدان بھی رنگا کی طرف سے دی گئی اس دعوت میں شریک تھے۔ طاقت کی اس شطرنج پر بچھے تمام مہرے آج اس محفل میں موجود تھے۔ آج مجھے سارنگا کی اصل طاقت کا راز بھی پتہ چل گیا تھا ''سیاست'' سیاست دان رنگا کی طاقت کا سہارا لے کر اوپر آتے تھے اور لوگوں پر راج کرتے تھے، لیکن ان کا یہ راج رنگا کی طاقت کا مرہون منت تھا۔

اس رات رنگا نے میرا تعارف ایسے لوگوں سے بھی کروایا جن سے ہیڈ ماسٹر توقیر احمد کے بیٹے آیان کی حیثیت سے ملنے کے لیے شاید ایک جنم بھر کا انتظار بھی کافی نہ ہوتا، لیکن آج وہ لوگ خود آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے مل رہے تھے۔ فلم، ٹی وی، سیاست، تجارت، ثقافت..... غرض کون سا شعبہ تھا جس کے لوگ اس دعوت میں شریک نہیں تھے۔ دن کی روشنی میں یہ لوگ اڈے اور اس سے وابستہ لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے اور حکومت سے مطالبے کرتے تھے کہ شہر کے امن و امان کو قائم رکھنے کے لیے ایسے زیر زمین اڈوں کا خاتمہ کیا جائے، لیکن رات کے اندھیرے میں یہ لوگ اس زیر زمین سرکار سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے کے لیے چہروں پر مسکراہٹ سجائے۔ اس محفل میں چلے آ رہے تھے۔ میں نے دعوت میں بعض پولیس افسران کو بھی دیکھا جو سادہ لباس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اس رات نہ جانے کیوں مجھے رنگا اور اس کے ساتھیوں کا قد ان سب بونوں کے مقابلے میں بہت اونچا لگا۔ کم سے کم وہ ان سب کی طرح منافق تو نہیں تھے۔ وہ جو تھے، سب کے سامنے تھے۔ برے تھے یا بھلے تھے مگر سچے تھے۔ چھپ کر دار نہیں کرتے تھے۔ کھلے دل کے تھے۔ خوشی کو خوشی اور غم کو غم کی طرح مناتے تھے۔

میں بھی باقی بھیڑ کو چھوڑ کر صرف موسیٰ کے آس پاس ہی موجود رہا اچانک مجھے ایک گوشے میں شوکی اپنے دوستوں کے ساتھ دبکا سا کھڑا نظر آیا۔ میں ایک دم ہی اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو کچھ پل کے لیے مجھے دیکھ کر وہ بالکل ہی ہکا بکا سا رہ گیا۔ یقیناً اسے بھی دیگر اڈے والوں کی

طرح دعوت پر بلوایا گیا ہوگا مگر شاید وہ میری وجہ سے سب کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ میری زندگی کا رخ بدلنے میں اس لڑکے کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں گھر سے بے گھر ہوا اور آج آیان احمد سے انو بھائی بن چکا تھا۔ سارنگا کے خاص آدمی کی حیثیت سے شوکی جیسے سینکڑوں کارکن آج کے بعد میرے ایک اشارے کے منتظر ہوں گے لیکن شاید یہی میری تقدیر تھی۔ شوکی تو اس بے رحم تقدیر کا ایک کم زور سا مہرہ تھا۔ مجھے شوکی کے سامنے کھڑے اور سینہ تانے دیکھ کر آس پاس اڈے کے لوگوں میں بے چینی سی پھیل گئی۔ شاید وہ اتنی بڑی محفل میں میری جانب سے کسی بدمزگی کے خیال سے سراسیمہ ہو گئے تھے۔

موسیٰ جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس نے بھی پہلو بدلا۔ کچھ دیر تک میں شوکی کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور وہ سر جھکائے آنکھیں چراتا رہا۔ پھر میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ شوکی کو کچھ دیر تک تو میرا دوستی کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے شوکی سے پوچھا ''اب تو رنگا بھائی کے نام پر بھتہ اکٹھا نہیں کرتے'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا ''نہیں انو بھائی..... میرے بزرگوں کی بھی توبہ.....'' میں، شوکی اور اس کے دوست سبھی ہنس پڑے۔

رات گزری تو صبح میں نے رنگا سے زمرد حویلی جانے کی اجازت مانگ لی۔ ''میں نے آپ کی شرط پوری کر دی۔ اب مجھے بھی آپ کے لیے کچھ کرنے کی اجازت دے دیں..... میرے لیے تو آپ لوگوں نے بہت کچھ کر لیا..... میں نواب کے دشمن کو پکڑ کر آپ کے محسن ابراہیم کا کچھ قرض اتارنا چاہتا ہوں.....''

سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ موسیٰ بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ''کبھی کبھی تو تو اپنا ہی کوئی جنم جایا لگتا ہے..... ٹھیک ہے۔ جا چلا جا زمرد حویلی..... تیرا رب راکھا.....''

باب20

میں اس وقت اپنے شہر سے پینتیس 35 کلومیٹر دور مضافات میں واقع اس چھوٹے سے ویران ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا جہاں سے مجھے کمال پاشا لینے آیا تھا۔ زمرد حویلی ہمارے شہر کی حدود سے باہر لیکن ایک ہی ضلع کی حدود میں آتی تھی۔ میرا حلیہ اس وقت کسی یونیورسٹی سے تازہ تازہ ماسٹر کر کے نکلے اناڑی جیسا ہی تھا۔ سادہ سا کرتا شلوار، کرتے کے اوپر کالی واسکٹ اور واسکٹ کے جیب میں لگے چند پین..... ہاتھ میں فلسفے کی ایک مشہور کتاب اور سوٹ کیس میں تاریخ اور سوشیالوجی کی بہت سی کتابیں..... میں پاشا صاحب کے دیے گئے اشتہار کی تمام شرائط پوری کرنے کے بعد اور زمرد حویلی کے بوڑھے منیجر کے ذریعے لیے گئے انٹرویو میں پاس ہونے کے بعد باقاعدہ نوکری کے لیے یہاں پہنچا تھا۔

اوائل دسمبر کی خنک ہوا دھیرے دھیرے میرے وجود کے ریشوں کو کاٹنے لگی تھی۔ گاڑی کو مجھے اسٹیشن پر اتارے اور پلیٹ فارم پر چھوڑے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، لیکن نواب صاحب کے ہاں سے ابھی تک کوئی مجھے لینے کے لیے اسٹیشن نہیں پہنچا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے اور مغرب کی جانب والی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر سورج کی سنہری کرنوں کا تاج سا بنا ہوا تھا۔ سورج ڈوبتے وقت کتنا مہربان ہو جاتا ہے۔ شاید ہر غروب ہوتی ہوئی شے اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔ اس رویے کی تلافی جو اس نے طلوع ہونے کے بعد اپنے عروج کے دور میں روا رکھا ہے۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد جب میری گرم سانس باقاعدہ بھاپ بن کر ڈھلتی شام کے دھوئیں میں مدغم ہونے لگی تو میں نے پلیٹ فارم پر نصب ویسٹرن ریلوے (WR) کی مہر والے اور عام سائز سے دوگنے نیالے پیلے رنگ کے بینچ پر اپنا سوٹ کیس رکھ کر اسی سے ٹیک لگا لیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد میں نے دور اسٹیشن کی طرف پگڈنڈی پر سنہری دھول اڑتے ہوئے دیکھی۔ پرانے ماڈل کی ایک رولز رائس کار جو اب ہمارے ملک میں چند گنے چنے نوابوں کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ اپنے باوردی ڈرائیور کے ساتھ دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ پیچھے کمال پاشا صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی تیزی سے موڑ کاٹ کر اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے قریب رک گئی۔ میں نے اپنا سامان اٹھا لیا۔ پاشا صاحب نے آتے ہی معذرت کی۔ معاف کرنا میاں..... یہاں ریلوے کراسنگ پر پھاٹک نہیں ہے اور ٹرین بھی عین اسی وقت وہیں کھیتوں میں سے گزرتی کراسنگ پر آ کر اٹک گئی تھی۔ لہٰذا دیر ہو گئی..... ویسے اسٹیشن سے نظارہ بہت خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں اور نواب صاحب تو جب بھی کچھ فارغ ہوں..... چائے بنوا کر یہیں چلے آتے ہیں۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں.....“

میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ڈرائیور کو مدد کرنے کا اشارہ کیا مگر میں نے اسے روک دیا۔ یہ اسٹیشن شہر کے باہر مضافات میں ہونے کے باوجود شہر سے اس قدر قریب تھا کہ یہاں شاذ و نادر ہی کوئی ٹرین سے آتا ہوگا۔ کیونکہ سڑک کا راستہ آدھا تھا اور وقت کی بچت کے ساتھ سہولت بھی موجود تھی مگر میں منصوبے کے مطابق جان بوجھ کر ٹرین سے یہاں اترا تھا کیونکہ ہمیں حویلی والوں پر ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں کسی دور پار کے شہر سے یہاں آیا ہوں اور ہمارا پہلا گواہ یہی ڈرائیور تھا جو پاشا کے ساتھ مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آیا تھا۔ پاشا صاحب نے

راستے میں اسے سنانے کے لیے میرے اس فرضی شہر اور وہاں کے موسم کے بارے میں چند سوالات بھی کیے۔ کچھ ہی دیر میں ہم اسٹیشن کی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے پکی سڑک پر آ گئے اور یہ سڑک ہمیں سیدھی زمرد حویلی کے دروازے تک لے گئی۔ واقعی سارنگا نے ٹھیک کہا تھا۔ حویلی کیا تھی پورا محل تھا۔ جس کے سبز سنگ مرمر کے دالانوں اور ستونوں میں کچھ ایسی پچی کاری کی گئی تھی کہ دور سے وہ پورا محل ہی زمرد کا بنا ہوا لگتا تھا۔ مرکزی دروازے سے ایک سفید سنگ مرمر کی سڑک سیدھی کار پورچ تک جاتی تھی اور سفید سڑک کے دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطار موجود تھی۔ جس سے پرے دونوں اطراف گھاس کے بڑے بڑے میدان تھے جن میں جا بجا پھولوں کی کیاریاں، پانی کے فوارے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں اور بیٹھنے کے لیے مناسب فاصلوں پر بنی راہداریوں میں سنگ مرمر کے بڑے بڑے خوبصورت تخت نما صلیب رکھے ہوئے تھے۔ طرز تعمیر کی پہلی جھلک ہی مغلوں کے ہاتھ کی گواہی دے رہی تھی۔ مغل ہمارے خطے میں کیسے کیسے شاہکار بنا گئے۔ کاش تاج محل بھی ہماری طرف ہوتا، میں ایسی کئی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کار حویلی کے پورچ میں جا کر رک گئی۔ ستونوں کی لمبائی اتنی اونچی تھی کہ پورچ میں ہی تین منزلیں ڈالی جا سکتی تھیں۔ کہتے ہیں ستون اور چھت کی اونچائی قوم کے ظرف کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ گویا یہ حویلی بھی کسی اعلیٰ ظرف کے تخیل کا کارنامہ تھی۔

ہم پورچ سے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تو ایک بار پھر سے کسی مغل شہزادے کے محل کا تصور تازہ ہو گیا۔ آج تک میں نے ایسے وسیع دربار نما ہال اور اونچی بالکنیاں صرف تاریخی فلموں میں ہی دیکھی تھیں۔ جھروکے، ریشمی لہلہاتے پردے، مردان خانے، زنان خانے، دیوان خاص و عام، راہداریاں، ردشیں اور غلام گردشیں..... سبھی کچھ تو موجود تھا اس محل میں۔ کچھ ہی دیر میں نواب صاحب بھی پہنچ گئے اور بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملے۔ یہ مردان خانے کا حصہ تھا جس میں ہم ابھی موجود تھے۔ بیگمات کے لیے زنان خانہ مخصوص تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ شہر کی تیز اور بھاگ دوڑ والی زندگی کو ایک دم ہی جیسے بریک سی لگ گئی ہو۔ جیسے کسی ماڈرن سائنس فکشن فلم کے دوران اچانک ہی چالیس یا پچاس کی دھائی کی کوئی ریل جڑ گئی ہو۔ یہاں وقت بھی کتنی آہستگی سے گزرتا تھا۔ میں نے اوپر لگے گھڑیال پر نظر ڈالی۔ ابھی مجھے یہاں پہنچے صرف ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ پورا مہینہ بیت گیا ہے۔

کچھ ہی دیر میں نوکروں نے کھانا لگنے کی اطلاع دی اور ہم سب مرکزی ہال میں متصل کھانے کے کمرے میں آ گئے جو بذات خود ایک درمیانے ناپ کا ہال ہی تھا۔ کھانے کی میز کافی طویل اور خوان بے شمار تھے۔ کھانے پر نواب کی پہلی بیوی سے ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ بڑے کا نام وقار اور چھوٹے کا نام سجاد تھا۔ دونوں کے نام کے ساتھ الملک کا لاحقہ بھی جڑا ہوا تھا۔ وقار الملک اور سجاد الملک، لیکن شاید دونوں ہی اس قدیم خاندانی مہر سے بے زار تھے لہٰذا تعارف کرواتے وقت انہوں نے صرف وقار اور سجاد ہی کہا۔ لاحقہ لگانے کا فریضہ خود نواب دبیر الملک ادا کرتے رہے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے کچھ اکھڑے اکھڑے اور بے زار نظر آئے۔ بڑے والے نے تو در پردہ باپ کو یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی سوتیلی بہن کے لیے ایسے کسی استاد یا اتالیق کی ضرورت بھی تھی۔ اس نے کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے..... جہاں بیاہ کر جائے گی وہاں خود ہی سب باتوں سے آشنا ہو جائے گی، لیکن نواب صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اب میری رہائش یہیں مردان خانے کے مہمان کے طور پر ہو گی اور انہوں نے حویلی کے پرانے خادم اور منیجر رحیم کو مہمان خانہ کھولنے اور میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی۔ حویلی کا خانساماں اعظم (Chef) شبیر عرف شبن بھی ایک ایسا کردار تھا جس کا آگے چل کر مجھ سے کچھ زیادہ واسطہ پڑنے والا تھا، کیونکہ میرے

کھانے پینے کی ذمہ داری اس کے سر پر ڈالی گئی۔ زمرد حویلی کے اصول کے مطابق رات کے کھانے پر سب کو مردان خانے کی کھانے کی میز پر اکٹھا ہونا پڑتا تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا البتہ نواب صاحب زنان خانے میں اپنی ایرانی بیگم اور بیٹی فضہ کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ ساری تفصیلات مجھے وقفے وقفے سے پاشا صاحب کی زبانی مل رہی تھیں۔ وہ خود بھی نواب صاحب کے خاص مہمان کی حیثیت سے مردان خانے میں ہی مقیم تھے، مگر ان کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ کھانے کے دوران ہی مجھے نواب صاحب کے محافظ خاص نواز علی سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا..... وہ ہمہ وقت مجھے نواب صاحب کے آس پاس ہی بھٹکتا دکھائی دیا۔ حتیٰ کہ کھانے کے دوران بھی میں نے اسے باہر کی راہداری میں ٹہلتے اور آس پاس کھانا لاتے لے جاتے نوکروں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں ایک اور کھٹکا بھی تھا کہ کہیں نواب کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی مجھ سے تاریخ یا تہذیب و ثقافت کے مضمون کی کسی ڈگری کے بارے میں نہ پوچھ لے یا اس بارے میں میری قابلیت جاننے کے لیے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔

ان دونوں کو اپنے باپ سے اپنے اپنے روزانہ کے خرچ اور ضرورتوں پر بحث کرنے سے ہی فرصت نہیں ملی لہٰذا میرے مضمون کی طرف ان کا دھیان کم ہی گیا۔ میں گزشتہ ایک مہینے سے یعقوب مینشن میں چار گھنٹے روزانہ ان مضامین کی دو مستند استادوں سے ٹیوشن لیتا رہتا تھا کیونکہ مجھے انہی مضامین کے بھیس میں زمرد حویلی میں اترنا تھا مگر پھر بھی میری معلومات ابھی ابتدائی درجے سے ذرا ہی اوپر کی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ ایک ماہ میں میں نے اتنا کچھ پڑھا اور رٹا لگا کر یاد کیا تھا جتنا اب تک میں نے اپنے پورے تعلیمی کیریئر میں نہیں پڑھا تھا۔ عجیب خشک مضامین تھے یہ تاریخ وغیرہ بھی، لیکن مجھے ہر صورت یہاں آنے سے پہلے ان چند موٹی موٹی کتابوں کو گھول کر پی جانا تھا کیونکہ یہاں میرا واسطہ انہی مضامین کی شائق ایک شاگرد سے پڑنے والا تھا۔ اس تمام تجربے کے دوران مجھے ایک اور سبق بھی ملا کہ صرف کتابیں پڑھ لینے سے اور کم از کم وقت میں انہیں ازبر کر لینے سے انسان کسی علم کو پا نہیں سکتا۔ وہ اس عمل سے صرف اپنی یادداشت بڑھا سکتا ہے اور مختلف حوالے سے اپنے ذہن میں ترتیب وار بچھا سکتا ہے۔ اصل علم کتاب سے بھی پرے کی کوئی چیز ہے۔

کھانے کے بعد سبز قہوے کا ایک دور چلا اور محفل برخاست ہو گئی۔ شہین مجھے میرے کمرے تک پہنچانے کے لیے آیا۔ اس کا بے حد باتونی ہونا میرے لیے فائدہ مند بھی تھا۔ بہت سی باتیں اس نے مجھے بنا پوچھے ہی بتا دیں کہ نواب صاحب کی پہلی مرحومہ بیوی اپنی آخری سانس تک نواب صاحب کی ایران میں دوسری شادی کو قبول نہیں کر پائی تھیں۔ جاتے جاتے یہ زہر وہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی منتقل کر گئیں مگر شومئی قسمت کہ دونوں بھائیوں میں خود ہمیشہ ٹھنی ہی رہی۔ بڑا بیٹا وقار رقص و سرور کی محفلوں کا دلدادہ تھا اور اس کی شامیں رنگین ہی رہتی تھیں۔ چھوٹے والے سجاد کے شوق البتہ کچھ مردانہ تھے اور وہ ہفتوں آس پاس کے جنگلوں میں اپنے خاص نوکروں سمیت شکار کی تلاش میں بھٹکتا رہتا تھا۔ اور اس کی شکاری بندوق ہمیشہ بھری ہوئی اور جیپ ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ شہین نے رازدارانہ انداز میں مجھے یہ بھی بتایا کہ بڑے بیٹے وقار کو اس راہ پر ڈالنے والے اس کے اوباش دوست تھے جن کا سربراہ رئیس نام کا ایک بگڑا ہوا مگر قلاش نواب زادہ تھا جو اپنے باپ کی تمام جائیداد تو طوائفوں اور کوٹھوں پر لٹا ہی چکا تھا مگر اب اس کی نظر وقار کی جاگیر اور حصے پر تھی۔ بڑے نواب صاحب یہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے رہتے تھے مگر خون کے گھونٹ پینے کے سوا اور کچھ کر نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی مرحومہ بیوی جاتے جاتے دونوں بیٹوں کو ان کے خلاف اور گستاخ کر گئی تھیں۔ شہین کچھ دیر مزید بھی میرے کمرے میں موجود رہنا چاہتا تھا مگر حویلی کے منیجر رحیم نے ڈپٹ کر اسے میرے آرام کی خاطر کمرے سے باہر بھیج دیا اور مجھ سے معذرت کی کہ شہین کی قینچی کی طرح چلتی

زبان کو روکنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

میں نے ان دونوں کے جانے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ قالین، صوفوں اور پردوں کے رنگوں کی یکسانیت اور کمرے کے بھاری فرنیچر کی نفاست کا بیان طویل تھا۔ ایک طرف پڑھنے والا کونہ بھی مخصوص تھا اور دیوار میں لگے شیلف میں میرے مطلب کی بہت سی کتابیں ترتیب سی رکھی ہوئی تھی۔ شاید نواب صاحب کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ میں ان مضامین سے نابلد تھا اور میرے لیے ان کتابوں کو دہراتے رہنا بہت ضروری تھا۔ تاوقتیکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ میں نے رات ڈھلنے کا انتظار کیا اور پھر نصف شب کے قریب اٹھ کر مردان خانے کا سرسری جائزہ لیا۔ اس طرح کہ مجھے اگر کوئی یوں آدھی رات کو ٹہلتا ہوا دیکھ بھی لے تو اسے چہل قدمی سے زیادہ اہمیت نہ دے۔

مجھے کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ نواز اور اس کا عملہ باہر فصیل پر اور مرکزی دروازے پر نہایت چاک و چوبند حاضر تھا اور ان کی موجودگی میں کوئی پرندہ بھی اندر پر نہیں مار سکتا تھا۔ نواز نے مجھے بھی اپنے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تو وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ ''خیر تو ہے آیان صاحب..... کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.....''۔

''نہیں بس..... نیند نہیں آ رہی..... شاید نئی جگہ کا اثر ہے.....'' نواز نے سر ہلایا ''ہو سکتا ہے..... مجھے بھی نئی جگہ پر ذرا مشکل سے ہی نیند آتی ہے'' نواز کا چہرہ حسب معمول سپاٹ تھا جب سے میں یہاں آیا تھا میں نے اسے ایک بار بھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے باہر گھاس کے میدان میں کچھ دیر چہل قدمی کی، اور کن انکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ زنان خانہ مردان خانے کے پیچھے ایک علیحدہ محل نما عمارت میں تھا اور مردان خانے سے کچھ راہداریوں کے ذریعے منسلک تھا۔ البتہ مردانہ اور زنانہ دونوں حصوں میں داخلے کے لیے الگ الگ راستے مخصوص تھے۔ میں نے چہل قدمی کے دوران حویلی کا محل وقوع خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میرے ذہن میں سارنگا کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت ابھی تک موجود تھی جو اس نے یہاں بھیجنے سے پہلے وقتاً فوقتاً مجھے بطور نصیحت اور سبق سکھائی تھیں۔ انہی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ''اجنبی منڈیروں پر چڑھنے سے پہلے ان کا نقشہ اچھی طرح ذہن میں بٹھا لینا ضروری ہوتا ہے.....''

میں کچھ دیر چہل قدمی کے بعد اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ مجھے اگلی صبح ایک اور امتحان سے گزرنا تھا اور نواب کی صاحبزادی سے اس کے اتالیق کے روپ میں ملنا تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن کو باقی کسی قسم کی بھی سوچ یا فکر سے آزاد ہونا چاہیے تھا۔ ذہن کی گتھیاں کہیں اور الجھی ہوں تو کبھی کبھی ان جانے میں ہم اپنا آپ ظاہر کر جاتے ہیں اور میرے لیے اپنا بہروپ قائم رکھنا بہت ضروری تھا۔

لیکن وہ ایک چہرہ مجھے یک سر بہنے ہی کب دیتا تھا۔ جیسے ہی میں نے پلکیں موندیں وہ میرے ذہن کے پردے پر کھلتا چلا گیا۔ وہی آسمانی جوڑا اور وہی کالی شال..... آسمان پر گھٹائیں تو سب نے دیکھی ہیں لیکن گھٹاؤں پر آسمان شاید آج تک کسی نے نہ دیکھا ہو۔ میں زمرد حویلی آنے سے پہلے آخری مرتبہ شیخ صاحب کو ملنے کے لیے دو دن پہلے ہی سادات محلے کی دہلیز تک گیا۔ دل کے اندر کے چور کا تو پتہ نہیں البتہ ذہن کا بہانہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے انہیں خدا حافظ کہہ آؤں کہ جانے پھر کب ملاقات ہو، لیکن دروازے پر حمید کا چہرہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا۔ خلاف معمول آج اس کے چہرے کی کرختگی کچھ کم تھی۔ شیخ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں واپس پلٹنے لگا تو حمید نے آواز دی ''اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم اندر بیٹھ کر کچھ بات کر لیں'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ کچھ دیر بعد ہم اسی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں

میں کئی بار پہلے بھی آچکا تھا۔حمید چائے کے برتن خود اندر سے اٹھا لایا اور جانے کیوں میرے کان ابھی تک ان مانوس آہٹوں اور قدموں کی چاپ کو محسوس کرنا چاہتے تھے جو اب میرے لیے نامحرم ہو چکی تھی۔حمید نے کچھ دیر رسمی باتوں کے بعد اصل بات شروع کی۔''معاف کیجئے گا میں اس روز آپ کے ساتھ کافی تلخ بول گیا۔دراصل دو جوان بہنوں کی ذمہ داری انسان کو تلخ بنا ہی دیتی ہے۔اور پھر اس روز حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں غصے کی رو میں بہہ گیا۔دراصل میں جب گھر پہنچا تھا تو میں نے محلے کے چند اوباش لڑکوں کو ہماری گلی میں ادھر اُدھر بے مقصد پھرتے اور ہمارے دروازے کی طرف جھانکتے دیکھا تھا۔پہلی جھڑپ ان کے ساتھ ہوئی اور گھر پہنچا تو ستارہ گھبنا بھی موجود نہیں تھیں اور پھر جب دروازے پر ان کو آپ کے ساتھ دیکھا تو جانے کیا کچھ کہہ گیا۔بعد میں ستارہ نے جب مجھے ساری بات بتائی اور ابا نے پہلے دن سے لے کر تب تک آپ کی طرف سے کی گئی مدد کے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے رویے پر بڑی شرمندگی ہوئی۔''

میں نے اسے اس تکلف سے باز رکھنے کی کوشش کی اور ٹھیک اسی لمحے مجھے پردے کے پیچھے وہ مانوس سی خوشبو بھی محسوس ہوئی''آپ خود کو نہ الجھائیں.....جو ہوا سو ہوا.....میرے دل میں کوئی ملال نہیں ہے.....''

''یہ آپ کا بڑا پن ہے۔میری آپ سے ایک اور درخواست ہے.....اگر آپ برا نہ مانیں تو.....''۔

''جی.....فرمایئے.....''حمید نے زبان سے ادا ہونے سے پہلے اپنی بات کو تولا''میں نے اس علاقے میں آتے جاتے آپ کا نام سنا ہے۔لوگ آپ کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن افسوس یہ شہرت ایک اڈے کے ساتھ جڑی ہے۔میرے گھر میں دو جوان بہنیں ہیں۔مجھے آپ کے کردار کی سچائی کے لیے کسی بھی گواہی کی ضرورت نہیں کہ ابا کو انسان کی خوب پرکھ ہے۔لیکن آپ کی اس اڈے سے وابستگی ہماری دہلیز پر آنے والوں کے ذہن میں ہزار سوال پیدا کرتی ہے۔لوگ اگر ہمارے سامنے نہیں تو ہماری پیٹھ پیچھے ایک دوسرے سے سوال ضرور کرتے ہوں گے کہ آخر ایک اڈے سے وابستہ بندہ یہاں کیوں آتا ہے۔امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے.....''میرے ذہن میں بیک وقت کئی تیز آندھیاں اور طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ایک بدمعاش کا بھلا کسی شریف کے در پر کیا کام اور کیسی غرض.....؟؟

میں کھڑا ہو گیا''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں.....کسی بھی اڈے سے وابستہ بدنامی آپ کی دہلیز تک نہیں آنی چاہئے۔کاش یہ بات خود مجھے آپ سے پہلے سمجھ میں آجاتی تو اچھا تھا۔بہرحال آپ اس بارے میں ذرا بھی فکرمند نہ ہوں.....میں اب کبھی اس دروازے کی چوکھٹ پار نہیں کروں گا.....''حمید نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن شاید اب کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں رہا تھا۔میں شیخ صاحب کے گھر سے نکل آیا۔میرا دماغ اس وقت بالکل سن تھا،لیکن حمید نے ایسا نیا کیا کہا تھا۔اس کی بہن بھی تو مجھے کسی لوفر یا آوارہ سے کم نہیں سمجھتی تھی۔حمید نے تو بس کچھ دوسرے لفظوں میں وہ بات صرف دہرائی تھی۔

میرے دل میں اس بات کو یاد کر کے وحشت کی ایک ایسی شدید لہر اٹھی کہ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔کمرے کا گھڑیال صبح کے ساڑھے آٹھ بجا رہا تھا مجھے یاد آیا کہ نواب صاحب نے ٹھیک نو بجے مجھے زنان خانے میں طلب کرنے کا وقت بتایا تھا۔میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔میرے پاس وقت بہت کم تھا۔

.....❁.....

باب 21

ٹھیک نو بجے زنان خانے کی جانب سے شہن پیغام لے کر ہڑبڑایا ہوا سا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نستعلیق اور قافیہ درست تھا" آپ کو نواب صاحب زنانے میں یاد کرتے ہیں۔" میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے دوبارہ پوچھا" نواب صاحب کیا کرتے ہیں.....؟" وہ مسکرا دیا" اجی یاد کرتے ہیں آپ کو صاحب....." میں بھی ہنس دیا" میرا نام آیان ہے..... مجھے صاحب نہ کہا کرو....." شہن کا چہرہ کھل گیا" واقعی..... آپ کا کشادہ ماتھا ہی آپ کے وسیع ظرف کی نشان دہی کرتا ہے.....تو آیان میاں کہہ لیا کروں.....؟" ہم دونوں مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے زنان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔" جو تمہارا جی چاہے کہہ سکتے ہو....." میری نظریں تیزی سے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ شہن کی زبان پٹر پٹر چل رہی تھی۔" بس کیا بتائیں آیان میاں.....حویلی کی ساری ذمہ داری بھی پر تو ڈال رکھی ہے نواب صاحب نے.....سب ہی میری سنتے ہیں بس ذرا بڑی بہو ہیں ناں.....نواب خاتون.....ان کا مزاج ذرا کڑوا ہے.....ان سے ذرا بچ کر رہیے گا....." وہ شاید نواب کے مرحوم بڑے بھائی کی بیوہ کی بات کر رہا تھا۔ پاشا صاحب کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق حویلی کا کلی نظام در پردہ نواب خاتون ہی دیکھتی تھیں اور انتہائی سخت مزاج خاتون مشہور تھیں۔ ان کے کیے گئے فیصلوں میں نواب دبیر بھی دخل نہیں دیتے تھے۔ آخری راہداری سے نکلتے ہی ہم ایک کشادہ پائیں باغ نما لان میں نکل آئے۔ سامنے ہی زنان خانے کی سفید اور سبز سنگ مرمر سے بنی پر شکوہ عمارت غرور سے سر تانے کھڑی تھی۔ نواب صاحب اور ایک نازک سی خاتون باہر دالان میں بچھی چھتریوں کے سائے تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے میرا استقبال کیا اور شہن کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا" آؤ آیان میاں آؤ.....ان سے ملیے.....یہ ہماری بیگم خانم جان ہیں" میں نے اس ملیح سے چہرے والی عورت کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ خانم جان نے اپنے سر پر مخصوص ایرانی سکارف کو حجاب کی طرح باندھ رکھا تھا اور صبح کی خنک ہوا سے بچنے کے لیے انہوں نے نیلے رنگ کا ایک لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کی آواز بڑی شستہ تھی۔" تو تم ہو ہماری فضہ کے اتالیق، بھئی ہم تو کسی کمر جھکائے اور نظر پر موٹا چشمہ لگائے بزرگ کا انتظار کر رہے تھے۔ تم تو ابھی خود طالب علم لگتے ہو....."۔

"جی.....بس طالب علم ہی سمجھیں.....علم کا سلسلہ تو کہیں رکتا نہیں۔"۔ وہ مسکرائیں" درست.....درست.....ماشاءاللہ....." نواب نے خانم سے پوچھا" بھئی آپ کی صاحب زادی نہیں آئیں ابھی تک....." ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اندر سے نیلپر، کوٹ اور سر پر وہی مخصوص ایرانی حجاب نما سکارف باندھے ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔" یہ لو بھئی.....آ گئیں فضہ....." فضہ خانم کی ہی کوئی نوجوانی کی تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ خانم نے اسے ہلکے سے تنبیہاً پوچھا" ایں کز دیر.....؟" (اتنی دیر).....فضہ نے جلدی سے تلافی کی" معذرت.....موبخشن (معافی چاہتی ہوں)۔" نواب نے اس سے میرا تعارف کروایا" بیٹی یہ آیان احمد صاحب ہیں.....آپ کے اتالیق....." فضہ نے جلدی سے مجھے سلام کیا" خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....کب سے میں آغا جان سے درخواست کر رہی تھی کہ میرے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دیں.....لیکن اس

ویرانے میں آنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا.....آپ کا بہت بہت شکریہ جناب.....تشکر.....''

دونوں ماں بیٹی کی زبان سے ک اور ق کا فرق بہت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس عفت مآب کے تشکر کا جواب دیا۔ فضہ کی پلکیں اپنی ماں کی طرح گھنی اور سیاہ تھیں۔ ایران کا حسن پہلی نظر میں خیرہ نہیں کرتا، مگر اس کے جوہر دھیرے دھیرے کھلتے ہیں اور پھر وہ سنہری عارض اور وہ سرمئی آنکھیں اپنا سکہ ایسا جماتی ہیں کہ بڑے بڑے شہنشاہ اس کوئے یار میں جھک کر حاضری دیتے ہیں.....

میری فضہ سے صبح کی یہ ملاقات مختصر رہی اور طے پایا کہ روزانہ شام 4 بجے ایک گھنٹہ کے لیے کہیں زنان خانے میں ڈرائنگ روم یا لان وغیرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ میں نے واپسی کے لیے رخصت طلب کی تو نواب صاحب کو کچھ یاد آیا ''ارے آیان میاں.....مردان خانے کی بالائی منزل پر حویلی کی لائبریری بھی موجود ہے۔ وہاں دنیا بھر کی کتابیں اکٹھی کر رکھی ہیں مرحوم بڑے نواب صاحب نے.....تم چاہو تو وہاں سے بھی اپنے مطلب کے حوالے جمع کر سکتے ہو۔'' اتنے میں ایک بوڑھی نوکرانی نے آ کر اطلاع دی کہ اگر نواب صاحب ملاقات سے فارغ ہو چکے ہوں تو نواب خاتون ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ نواب نے فوراً اثبات میں سر ہلایا ''ہاں ہاں کیوں نہیں..... بلکہ وہ یہیں کیوں نہیں آ جاتیں.....خانم اور فضہ بھی یہیں ہیں'' میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اجازت کے لیے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے اسی خادمہ کو مجھے مردان خانے تک چھوڑ کر آنے کا حکم دے دیا۔ واپس پلٹتے وقت میں نے روایتی غرارے کے لباس میں ایک پکی عمر کی عورت کو آتے دیکھا جس کے چہرے سے نخوت اور بے زاری ٹپک رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزرے تو اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں بولیں ''رکو.....'' میں ٹھہر گیا ''تو تم ہی ہو فضہ کے نئے استاد؟.....لیکن چہرے سے تو استاد نہیں لگتے.....'' میرا جی چاہا کہ انہیں جواب دوں کہ آپ بجا فرماتی ہیں.....میں استاد ہوں.....لیکن رنگا بھائی کے اڈے کا'' کچھ دیر تک وہ میرا ناقدانہ جائزہ لیتی رہیں اور پھر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ''اچھا ٹھیک ہے جاؤ.....لیکن زنان خانے کے آداب کا خیال رہے۔'' اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی تک مردان خانے کے آداب کا بھی نہیں پتہ لیکن میں بنا کچھ کہے سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔

شام تک میرے پاس کافی وقت تھا اور میں نے یہ وقت کمرے میں بند رہ کر صرف کرنے کے بجائے زمرد حویلی کے آس پاس مضافات کا جائزہ لینے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ حویلی کے آس پاس گندم کے کھیت اور دور تک پھیلی خاموشی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس لمحے بہت دن پہلے کا کہیں پڑھا جون ایلیا کا شعر یاد آ گیا۔

قابل رحم ہیں وہ دیوانے
جن کو حاصل نہیں ہیں ویرانے

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ نواز اس تمام عرصے میں مجھ پر خصوصی نظر رکھے رہا، لیکن مجھے اس کی مستعدی سے زیادہ اس کمزور کڑی کی تلاش تھی جہاں سے نواب صاحب پر اگلا حملہ ممکن ہو سکتا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے حویلی میں اب تک میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی ان سب کی ایک فہرست بنالی اور موسیٰ کی ہدایت کے مطابق ان سب کو شک کے دائرے میں ایک ایک کر کے رکھا اور پھر ایک نئی

فہرست بنائی جس میں نمبر شمار میرے زیادہ شک کی بنیاد سے ہو کر نیچے تک جاتے تھے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر نواز تھا۔ پھر نواب صاحب کے دونوں بیٹے، ان کے ذاتی محافظ اور اسی طرح میں اپنی پہلی کیفیت کے حساب سے سب ہی کو شک کی نظر سے دیکھتا، سوچتا اور پھر رد کرتا گیا لیکن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

چار بجے کے قریب ایک بار پھر شہن مجھے لینے کے لیے آ گیا۔ وہ منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اس کے بگڑے موڈ کی وجہ پوچھی تو وہ پھٹ پڑا۔ ''بس کیا بتائیں آپان میاں..... ان دونوں بھائیوں کی آپسی چپقلش نے ہم نوکروں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ایک کی بات مانو تو دوسرا بگڑ جاتا ہے، ایک کوئی حکم دیتا ہے تو دوسرا اس کی ضد میں اس سے بھی بڑی فرمائش کر بیٹھتا ہے اور تعمیل نہ ہونے پر ڈانٹ ہم غریبوں کو پڑتی ہے۔''

''لیکن یہ دونوں تو سگے بھائی ہیں ناں..... پھر ان میں آپس میں اتنی دشمنی کی وجہ کیا ہے''۔ شہن کی آواز دھیمی ہو گئی ''اب ہم کچھ بولیں گے تو راز افشائی کا طعنہ سنیں گے۔ سنا ہے دونوں نواب خاتون کی کسی بھانجی پر فدا ہیں..... سلمیٰ نام ہے بچی کا..... لیکن نواب خاتون دونوں کو ہی ہاں کہتیں ہیں نہ ناں..... سچ کہوں تو مجھے اس دشمنی کا خاتمہ صرف نواب خاتون کے ہاتھوں لکھا نظر آتا ہے۔ کیونکہ دونوں ہی بھائی ان کی بہت سنتے ہیں.....''

شہن جاتے جاتے مجھے ایک نیا زاویہ بھی دکھا گیا تھا۔ میں زنان خانے کے دالان تک پہنچا تو فضہ مجھے وہیں حویلی میں بہتی ایک چھوٹی سی پانی کی مصنوعی نہر کے کنارے ڈالی ہوئی کرسی پر بیٹھی نظر آ گئی۔

''میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' وہ حسب معمول سر پر اپنے پیرہن سے ملتا سا سکارف باندھے ہوئے تھی اور نہر کے پانی میں پڑتی ہوئی کرنوں کا عکس اس کے چہرے کو جھلملا رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پڑی دوسری ٹاٹ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اندازہ لگانے کے لیے اس سے کہا کہ وہ اس علاقے کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں جو کچھ خود جانتی ہے، پہلے مجھے وہ بتائے۔ اس سوال کا مقصد خود اپنے آپ کو جانچنا بھی تھا کہ میں کتنے دن تک فضہ کو اپنے محدود علم کی بنیاد پر پڑھا سکتا تھا، لیکن فضہ کی ان دونوں مضامین میں پہنچ دیکھ کر مجھے اسی دن اندازہ ہو گیا کہ یہ بیل زیادہ عرصے تک منڈیر نہیں چڑھ پائے گی۔

''آپ کو تو یہاں کی تاریخ کی اچھی خاصی سوجھ بوجھ ہے اور علاقے کی قدیم اور جدید تہذیب کے موضوع پر بھی آپ کی گرفت مضبوط ہے..... تو پھر یہ خصوصی طور پر کسی استاد کو رکھنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔''

فضہ ہنس پڑی ''سچ بتاؤں تو میں بھی کوئی بزرگ نما اتالیق ہی تصور کیے بیٹھی تھی۔ سوچا تھا کہ ان سے خوب لمبی لمبی بحث کر کے اپنی قابلیت کا رعب بھی جماؤں گی اور ان کے تجربے سے اپنے اندر کے سوالات کی پیاس بھی بجھاؤں گی۔ مجھے اردو بھی ایسے ہی ایک بزرگ استاد کی وساطت سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا مگر آپ کو دیکھ کر میں اور موصو دونوں ہی بہت حیران ہیں۔ برا نہ مانیے گا لیکن آپ بھی میری طرح ابھی تازہ گریجویٹ ہی لگتے ہیں، لیکن اگر آغا جان نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو ضرور کچھ سوچ کر ہی کیا ہو گا۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دیجیے گا.....''

میرا جی چاہا کہ میں اس معصوم سی لڑکی کو سچ بتا دوں لیکن بڑی مشکل سے میں نے خود کو باز رکھا۔ اتنے میں خانم بھی اندر سے نکل کر ہمیں دالان میں بیٹھا دیکھ کر ہماری جانب چلی آئیں ''تم دونوں یہاں بیٹھے ہو..... میں چائے کا پوچھنے آئی تھی کہ اندر لگواؤں یا یہیں بھیج دوں.....'' فضہ

نے ماں کو روک لیا'' آپ بیٹھیں مومو جان..... چائے یہیں آجائے گی۔ میں نے کہہ رکھا ہے.....''

خانم نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا..... ''ہاں تو کیا بات ہو رہی تھی شاگرد اور اتالیق کے درمیان.....'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا'' یہ کہ انہیں پہلے ہی مضامین کے بارے میں اتنا زیادہ علم ہے کہ کچھ دنوں میں یہ میری اتالیق بن جائیں گی.....'' دونوں ماں بیٹی زور سے ہنس پڑیں۔ خانم نے مجھ سے کہا'' تمہاری ایک بات مجھے بہت پسند آئی..... تم نے آتے ہی اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی کسی پر..... علم انسان کو سمندر کی طرح گہرا بنا دیتا ہے..... اسے بار بار چھلکنے سے روکتا ہے.....''

میں نے صاف دلی سے کہا'' میں سمجھتا ہوں آپ کی صاحب زادی کو مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار استاد کی ضرورت ہے جو صرف اب ان کے اندر بہتے علم کے دریا کو کوزے میں بند کر سکے..... میری یہاں موجودگی صرف ان کے وقت کا ضیاع ہی نہ ثابت ہو.....'' فضہ جلدی سے بول پڑی'' ارے نہیں نہیں..... ایسا کیوں کہا آپ نے..... میرا یا مومو کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ ہر انسان دوسرے انسان کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا ہے..... اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اس سے کیا فیض حاصل کرتے ہیں۔ آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ مجھ سے ایک اچھے دوست کی مانند وہ سب علم بانٹیں جو آپ کے پاس ہے..... چاہے وہ کتابی نہ بھی ہو..... کتاب ہی مقصد ہوتا تو وہ میں خود بھی پڑھ سکتی تھی۔ آپ مجھ سے اپنی وہ سوچ بانٹیں جو ان کتابوں میں لکھی تعلیم نے آپ کے اندر پیدا کی ہے۔ بدلے میں میں بھی یہی کچھ تقسیم کرنے کی کوشش کروں گی۔''

فضہ کی بات سن کر میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا..... سچ تو یہی تھا کہ کتابی علم کی صورت میں اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا ہاں..... میں کیا سوچتا تھا اگر اس سے ہم دونوں کی اس علم کی تحریک کو کوئی فائدہ ملتا تھا تو یہ ہم دونوں کے لیے ہی منافع بخش سودا تھا کیونکہ بدلے میں مجھے بھی تو اس کی سوچ جاننے کا موقع مل رہا تھا۔ جانے ہمارے تعلیمی اداروں میں کتابیں ذہن میں ٹھونسنے پر ہی کیوں زور دیا جاتا تھا۔ کتاب کے ذریعے سوچ کو پروان چڑھانے کے عمل کو فروغ کیوں نہیں دیا گیا آج تک؟؟؟

پہلے دن کا اختتام بہتر طریقے سے ہونے پر میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا، لیکن مردان میں داخل ہوتے ہی تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آوازوں نے میرے قدم روک لیے۔ وقار اور سجاد میں تیز بحث جاری تھی اور نواب صاحب سر جھکائے دونوں کے درمیان پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ وقار نے چلا کر کہا'' بس بہت ہو گیا..... آپ کے پاس اس کی شکاری فضول خرچیوں کے لیے تو رقم کی کوئی کمی نہیں..... اور میں اگر کبھی اپنے دوستوں کی دعوت کے لیے کچھ روپے اضافی مانگ لوں تو آپ کو اپنے اصول یاد آجاتے ہیں۔'' سجاد نے ترکی بہ ترکی بلند آواز سے کہا'' میں شکار پر خرچ کرتا ہوں کوٹھوں پر نہیں..... میری برابری کرنے کی کوشش نہ ہی کریں تو بہتر ہے.....'' بڑے بھائی سے یہ جملہ برداشت نہیں ہوا اور وہ تیزی سے چھوٹے کی جانب بڑھا'' بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری..... آج اس کا بھی بندوبست کیے دیتا ہوں.....'' نواب صاحب کی برداشت جواب دے گئی اور وہ زور سے چلا کر اٹھ کھڑے ہوئے'' شرم آنی چاہیے تم دونوں کو..... اب تو باپ کی موجودگی کا لحاظ نہیں رہا کسی کو۔ میں نے بہت برداشت کر لیا۔ اب اگر تم دونوں نے اس بات کو بڑھایا تو دونوں کو ہی عاق کر دوں گا۔'' وقار نے باپ کی جانب دیکھا'' میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ہی کسی موقعے کی تاک میں ہیں تاکہ میرے حصے کی وراثت بھی اپنی اس لاڈلی بیٹی کو منتقل کر سکیں۔'' وقار پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں ایک اوٹ

میں کھڑا تھا لہٰذا اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ چھوٹا سجاد بھی بکتا جھکتا وہاں سے چلا گیا جاتے جاتے اس نے باپ سے اپنے حصے کی جائیداد کی علیحدگی کا مطالبہ بھی کیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں مرکزی ہال میں ہوتے اس تماشے کے آخری کردار نواب دبیر کے سامنے آ گیا۔ وہ ابھی تک اپنا سر تھامے بیٹھے ہوئے تھے۔

''آؤ آیان میاں..... تم نے اس ناخلف اولاد کی زبان درازی تو دیکھ ہی لی ہوگی۔ جانے میری تربیت میں ہی کچھ کمی تھی یا پھر کہیں اور چوک ہوگئی ہے مجھ سے..... یہ دونوں پہلے تو ایسے کبھی نہ تھے.....'' میں نے ایک تلخ سوال کیا'' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے بھی کوئی آپ کی جان کے درپے ہو سکتا ہے، تاکہ آپ کی وراثت اسے جلدی منتقل ہو سکے.....'' نواب صاحب بری طرح چونک گئے۔ خون کے رشتے بعض اوقات انسان کی آنکھوں پر گہرے کالے پردے ڈالے رکھتے ہیں۔ ''نہیں نہیں..... یہ دونوں کتنے بھی نافرمان کیوں نہ سہی..... مگر اپنے باپ کی جان نہیں لے سکتے..... مجھے یقین نہیں آتا.....''

میں نے نواب صاحب کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ نہ ہی میں نے شمن سے سنی بات ان کے کان میں انڈیلی کہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کہیں ان کی اپنی بھابھی نواب خاتون تو نہیں کیونکہ کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے مجھے ابھی بہت سے کام انجام کو پہنچانے تھے۔ بہت سے چہروں کو ٹٹولنا تھا۔

باب22

وہ رات میں نے اپنے کمرے میں ہی گزاری۔ دونوں بھائی ناراض ہو کر شام ہی سے گھر سے باہر جا چکے تھے اور صبح تک ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ پاشا صاحب اپنے کسی قریبی رشتے دار کے ہاں کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی اب اگلے ہفتے ہی متوقع تھی۔ گویا مردان خانے میں اس رات میرے اور حویلی کے ملازموں کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ میرا بار بار باہر ٹہلنا نواز کو مشکوک کر سکتا تھا لہٰذا میں نے خود کو کمرے تک ہی محدود رکھا۔ جانے کیوں آج مجھے راجہ بالا اور مشی تینوں ہی بہت یاد آ رہے تھے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے..... مجھے یاد تو ضرور کرتے ہوں گے۔ کیفے فراق میں ان کی محفلیں اب بھی اسی طرح جمتی ہوں گی یا نہیں..... چچا فراق کیسے ہوں گے..... مرزا اب بھی ان تینوں کے لیے فراق چچا سے چھپا کر فریش رول اور گرم پیٹیز رکھتا ہوگا یا نہیں؟..... سب کچھ ویسا ہی ہوگا..... بس میری کمی ہوگی۔.....

میں جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک مجھے باہر کسی کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا اور پھر دوسرے کھٹکے سے پہلے ہی میں آہستگی سے اپنے کمرے سے نکل چکا تھا۔ آواز اوپر والی منزل سے آئی تھی میں دبے پاؤں مگر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر راہداری میں آ گیا۔ راہداری سنسان پڑی ہوئی تھی۔ اسی منزل پر حویلی کی لائبریری بھی تھی۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کے بعد واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اگلی صبح میں نے نواب صاحب سے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ مردان خانے کی دوسری منزل پر عام حالات میں کون رہائش پذیر رہتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مستقل رہائشی نہیں ہے دوسری منزل کا بس کبھی کبھار چوکیدار یا محافظ رات کو وہاں کا چکر لگا لیتے ہیں، لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی محافظ کی آہٹ نہیں تھی۔ میں نے بات ٹال دی۔

شام کو فضہ اپنی کل والی جگہ پر ہی میرا انتظار کر رہی تھی لیکن آج وہ کتابیں لے کر نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک ضرور موجود تھی۔ جس میں اس نے اس علاقے کی طرز تعمیر کے بارے میں اپنے کچھ مشاہدات درج کیے ہوئے تھے ''آپ کیا سمجھتے ہیں..... مغل اس خطے کے آرکی ٹیکچر Architecture پر اتنا اثر انداز کیوں ہو پائے.....؟''

''شاید اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ ایک نئی تازگی اور تعمیرات میں کسی خوبصورت تصویر جیسی باریکیاں لے کر آئے تھے۔ اب آپ اپنے اس محل کو ہی لے لیں۔ یہ بذات خود اس وادی میں اور ان کھیتوں کے درمیان کسی ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح ہی تو لگتی ہے..... مغل واقعی مصور تھے.....'' فضہ مسکرائی ''آپ مغلوں سے بہت متاثر لگتے ہیں.....''۔

''نہیں..... خود اپنے آپ سے کیا متاثر ہونا..... ہم بھی مغل ہیں.....'' فضہ خوشی سے بے یقینی سے چلائی ''اچھا..... واقعی..... اوہ یہ کتنی حیرت کی بات ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں واقعی مغلوں سے بہت متاثر ہوں..... آپ سے مل کر خوشی ہوئی سرآیان مغل.....'' ہم دونوں ہنس پڑے۔ اس دن ہم دونوں نے بہت دیر تک مغل تہذیب اور طرز تعمیر پر اپنے اپنے خیالات بانٹے اور اپنا اپنا نظریہ پیش کیا۔ فضہ ایک ذہین لڑکی تھی اور

اس کی سوچ کے زاویے بہت منفرد تھے۔ وہ شاید زمرد حویلی میں تنہائی کا بھی شکار تھی کیونکہ ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس یہاں اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر کم بولتا اور اسے زیادہ سنتا رہا..... اور وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی قابل سماعت..... خود میرے بھی بہت سے مبہم زاویے اس کی معلومات سے واضح ہوتے گئے اور پھر ہمارا یہ روز کا معمول بنتا چلا گیا۔ ہم روزانہ زمرد حویلی کی اس نہر کے کنارے بیٹھ کر خود اپنے اندر کو کھوجتے اور فضہ اہم باتیں نوٹ بک میں درج کرتی رہتی۔ اب میں اس کا استاد نہیں تھا بلکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچ اور خیال سے ایک دوسرے کو تعلیم دے رہے تھے۔ دھیرے دھیرے خود مجھے بھی ان مضامین سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی اور میں نے خود اپنی معلومات کے لیے اپنی لائی ہوئی اور لائبریری میں موجود کتابیں کھنگالنا شروع کر دی تھیں۔ اب جب میں فضہ سے یہاں کی تاریخ اور تہذیب پر بات کرتا تھا تو وہ ماضی کی طرح میرے رٹے رٹائے جملے نہیں ہوتے تھے بلکہ میری اپنی کھوج اور تحقیق ہوتی تھی۔ فضہ کی صحبت آیان احمد کو بھی کتابوں سے محبت کرنا سکھا رہی تھی یا شاید میں اندر سے تبدیل ہو رہا تھا لیکن جس اصل مقصد سے میں زمرد حویلی میں داخل ہوا تھا وہ ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھا۔ پاشا صاحب بھی واپس آ چکے تھے اور دن گزرتے جا رہے تھے۔ مجھے فضہ جیسی سچی اور صاف گو لڑکی سے اپنی حقیقت چھپانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن عجیب الجھن تھی کہ میری شناخت کا چھپا رہنا خود اسی کے گھرانے کے لیے ضروری تھا۔

آخر کار مجھے زمرد حویلی میں داخل ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہمیں حملہ آور کا چھپ کر انتظار کرنے کے بجائے اسے خود آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی ترغیب اور لالچ دینا ہوگی۔ میں نے نواب صاحب کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو پاشا صاحب فکر مند ہو گئے۔ ''لیکن میاں یہ بھی تو سوچو کہ اگر ہم سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو نواب صاحب کی جان کو واقعی خطرہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے ان پر واضح کیا کہ ہم اعلان کی حد تک یہ مشہور کریں گے کہ نواب صاحب اپنی بیگم خانم سے کسی کھٹ پٹ کی وجہ سے مردانے کی خواب گاہ میں منتقل ہو رہے ہیں جبکہ اصل میں وہ اپنی مردانے والی خواب گاہ میں نہیں میرے کمرے میں سوئیں گے اور ان کی خواب گاہ میں ان کے بستر پر میں موجود رہوں گا۔ نواب صاحب نے بھی میری حفاظت کے پیش نظر کچھ تامل کیا لیکن میں نے آخر کار انہیں قائل کر ہی لیا کہ شکار کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے کے لیے یہ چارہ ڈالنا بہت ضروری ہے۔ طے یہ پایا کہ نواب صاحب ایک آدھ دن میں میرے منصوبے کے مطابق مردانے میں منتقل ہو جائیں گے اور خانم کو اس معاملے میں اعتماد میں لینے کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا۔

اس رات میں اپنے منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے کے لیے بہت دیر تک جاگتا رہا۔ ویسے بھی نیند کا اور میرا ساتھ تو جانے کب کا چھوٹ چکا تھا کبھی یہ نیند میری کتنی گہری سہیلی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گھر کی نیند یاد آتی۔ امی، ریحان اور چھوٹی دن چڑھے تک مجھے جگا جگا کر تھک جاتی تھیں اور پھر آخر کار ابا کے حکم پر ریحان باقاعدہ بالٹی بھر پانی لا کر مجھ پر انڈیل دیا کرتا تھا۔ کاش ہمارے من میں نیند اور بے داری کا بھی کوئی مخصوص خود کار نظام ہوتا تو کم از کم اپنی آدھی زندگی تو اپنی مرضی سے بتا سکتے..... میری نیندیں تو اس حسن بے پرواہ نے برباد کر دی تھیں جسے آخری لمحے یہ احساس بھی نہیں ہو سکا کہ کوئی اس کے لیے دھیرے دھیرے اندر سے مر رہا ہے۔ گہنا کا خیال آتے ہی میرے آس پاس پھر سے اسی اداسی کی گہری دھند اور کہرا چھا گیا جو میرے آس پاس باقی تمام مناظر دھندلا دیتا تھا۔

اچانک مجھے اوپر کی منزل سے پھر وہی ہلکے قدموں کی چاپ اور کسی تالے کے کھلنے جیسا کھٹکا سنائی دیا۔ اس بار مجھے اپنی سماعتوں پر بالکل شک نہیں ہوا۔ میں بجلی کی تیزی سے اپنے کمرے سے نکلا اور اوپر کی منزل کی جانب لپکا۔ اوپر راہداری مکمل اندھیری اور سنسان تھی۔ اچانک ایک ستون کے پیچھے نیچے دالان سے آتی روشنی کے ایک ٹکڑے میں مجھے کسی ہیولے کا سایہ سا دکھائی دیا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑی سی کالی چادر میں لپیٹے میری موجودگی سے بے خبر دوسری منزل پر بنے کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس دروازے کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سانس روکے کھڑا تھا۔ اس کمرے کا ایک ہی دروازہ کھلا تھا اور دوسرے بڑے دروازے کے باہر لگا بڑا سا تالہ مجھے یہاں سے بھی بند نظر آ رہا تھا۔ لمحے برسوں کی طرح گزرنے لگے۔ جانے وہ اتنی دیر تک اندر کیا کر رہا تھا۔ قریباً بیس منٹ بیس صدیوں کی طرح بتانے کے بعد میں نے آخر کار خود اندر جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن ٹھیک اسی وقت اندر سے کسی کے دھیمے قدموں کی چاپ نے مجھے پھر سے دم سادھنے پر مجبور کر دیا۔

کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور پھر اس نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے ہاتھ کے پنجے کی مضبوط گرفت نے اس اجنبی کی کلائی کو جکڑ لیا مجھے موسیٰ کا دیا ہوا ابتدائی سبق یاد آیا۔ دشمن کے ہاتھ کو سب سے پہلے قابو کر لو تو وہ آدھا رہ جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلی جدوجہد اور کوشش ہاتھ کی ہی ہوتی ہے۔ مخالف کا ہاتھ ناکارہ کر دو تو آدھی جیت پہلے ہی اپنے نام ہو جاتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی کلائی کو جھٹکا دے کر ناکارہ کرتا، فرش پر بہت سی کانچ کی چوڑیاں اور کنگن ٹوٹ کر گرنے کی آواز گونجی۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ سیاہ شال کے نیچے سے ایک سسکی سی ابھری۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اجنبی کی چادر الٹا دی۔ فضا میں ایک کوندا سا لپکا اور کسی کی سنہری زلفیں تیز ہوا سے اڑیں اور کسی چاند چہرے سے لپٹ کر خود نقاب بن گئیں۔ وہ فضہ تھی جو اس قدر خوف زدہ ہو چکی تھی کہ اس کے کانپتے لبوں سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کی کلائی سے چوڑیاں ٹوٹنے کی وجہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ابھر کر بہنے کو تیار تھی۔ میں نے اس سے پہلے آج تک کبھی بھی فضہ کو بنا اسکارف یا کھلے بالوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سر کو ڈھانپے رکھتی تھی۔ میرے سامنے لرزتی کانپتی سی ایک نئی فضہ کھڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ خوف کے مارے بے ہوش ہو کر گر پڑتی میں نے جلدی سے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''ہوش میں آیئے..... یہ میں ہوں..... آیان.....''

فضہ نے ایک جھرجھری سی لی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی کلائی پر باندھا ''آپ اس وقت آدھی رات کو یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ ہکلائی ''میں..... میں تو لائبریری سے چند کتابیں لینے اور پرانی واپس رکھنے آئی تھی..... دراصل میرے بھائیوں کو میرا دن کے وقت یہاں مروانے کی لائبریری میں آنا پسند نہیں ہے..... اس لیے میں چھپ کر رات کو یہاں آتی ہوں..... ہفتے میں دو مرتبہ.....'' میری نظر فضہ کے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ایک کتاب پر پڑی ''لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟؟.....'' مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا ''میں..... میں تو آہٹ سن کر اوپر آ گیا تھا۔ میں سمجھا کوئی اجنبی کسی غلط ارادے سے حویلی میں آ گھسا ہے.....'' دفعتہً فضہ کو اپنے بلیو اور کھلے سر کا خیال آیا اور اس نے جلدی سے خود کو اسی بڑی شال سے ڈھانپ لیا۔ ہم دونوں ہی بڑی عجیب سی صورت حال میں پھنسے ایک دوسرے سے نظریں چرا

رہے تھے۔ پھر فضہ نے ہی مشکل کا حل نکالا ''اب میں چلتی ہوں..... موسو جاگ گئیں تو پریشان ہوں گی۔ میں انہیں بتائے بنا آئی ہوں.....''۔

''چلیں میں آپ کو زنان خانے کی راہداری تک چھوڑ دیتا ہوں..... راستے میں بہت اندھیرا ہوگا.....'' فضہ دھیرے سے مسکرائی ''مجھے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا..... لیکن آج اندھیرے کے محافظ نے بری طرح ڈرا دیا۔ آپ بھی جا کر سو جایئے بہت دیر ہوگئی ہے.....'' فضہ وہاں سے پلٹ کر چل دی۔ میں اپنی جگہ یوں ہی ساکت کھڑا رہا..... اس نے راہداری کے اختتام پر مڑنے سے پہلے مجھے پلٹ کر دیکھا اور دھیرے سے آداب کا اشارہ کرتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ مجھے میری ہتھیلی میں ہلکی سے چبھن کا احساس ہوا میں نے ہاتھ کھول کر دیکھا تو میری ہتھیلی میں فضہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھب کر پھنسا رہ گیا تھا۔ میں نے بے خیالی میں وہ خوبصورت ''پھانس'' اپنی ہتھیلی سے نکالی اور خود میری ہتھیلی پر بھی خون کی چند ننھی منی بوندیں ابھر آئیں۔

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا مگر پھر صبح تک نیند میری آنکھوں سے میرے نصیب کی طرح روٹھی رہی۔ صبح ناشتے پر پاشا صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ نواب صاحب آج سے مردانے میں منتقل ہونے کی خبر مشہور کروا دیں گے اور پھر سب سے پہلے حویلی کے ڈھنڈورچی شمن نے ہی مجھ تک رازدارانہ انداز میں یہ خبر پہنچائی ''کیا بتائیں آیان میاں..... لگتا ہے حویلی کو کسی کی سیاہ نظر کھا گئی ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ نواب صاحب اور خانم بیگم کے درمیان کچھ ناچاقی ہوگئی ہے شاید۔ تبھی تو انہوں نے اپنی مردان خانے والی خواب گاہ کی صفائی کا حکم دے دیا ہے۔ آج شام سے وہ خود بھی مردانے میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے.....'' شمن نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میری نظر بار بار اپنی ہتھیلی کے اس ننھے منے سے گاؤ پر جا کر ٹک جاتی تھی جو گزشتہ رات سے میری تقدیر کی اندھیری لکیروں میں کسی جگنو کی طرح جگمگا رہا تھا۔

چار بجے میں ٹیوشن کے لیے زنان خانے پہنچا تو فضا کو پہلی مرتبہ کچھ بے اعتنا اور الجھا سا پایا۔ میں خود بھی اس سے نظر ملانے سے نہ جانے کیوں کترا رہا تھا۔ اس روز ہمارا موضوع بھی کچھ تشنہ ہی رہا۔ فضہ مجھ سے تاریخ اور اس خطے کی ایجادات کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے لفظ کچھ بے ربط سے تھے ''آپ نہیں سمجھتے کہ نور جہاں نے عطر ایجاد کر کے اپنے عہد کو کتنا عظیم تحفہ دیا تھا'' میں مسکرایا ''کون جانے وہ ایجاد نور جہاں کی ہی تھی یا پھر ملکہ نے اپنی کسی کنیز یا غلام کی تحقیق کو اپنے نام کر لیا تھا.....'' وہ بحث کے موڈ میں تھی..... ''نہیں..... آپ صرف اپنے اندر کے ایک شک کی وجہ سے اتنا بڑا سہرا اس ملکہ سے نہیں چھین سکتے، اور پھر ایک عطر کی ایجاد پر ہی کیا منحصر..... کیا ہر دور میں ایسی کئی ایجادات کے بانیوں نے ہمارے لیے زندگی بے حد سہل اور آسان نہیں کر دی؟ ہم سے پہلے کے لوگ سبھی کچھ تو کر گئے ہیں ہمارے لیے.....'' میں نے ایک گہری سانس لی ''لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان نے انسان کے لیے ایجادات کی صورت میں جو بھی آسانیاں پیدا کیں ہم انسانوں نے ہی ان کا حصول چند سکوں سے منسلک کر کے خود اپنی ہی زندگی کو پھر سے اپنے لیے کس قدر مشکل بنا دیا ہے۔ کاش اس دنیا میں یہ روپے پیسے اور سکے وجود میں ہی نہ آتے..... اگر ہم زندگی کو اس بے جان اور مادی پیمانے پر نہ پرکھ سکتے تو کتنا اچھا ہوتا..... تب یہاں کوئی امیر ہوتا نہ کوئی غریب..... صرف انسان ہوتے..... سب برابر اور یکساں انسان.....''

فضہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی ''کبھی کبھی آپ بالکل فرہاد کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اسے بھی یہ دنیاوی تقسیم اور روپے پیسے کی

بنیاد پر اونچ نیچ سخت زہر لگتی تھی.....وہ بھی بالکل آپ جیسا تھا۔'' فضہ اپنی رو میں کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ میں نے اس کے چہرے کے اترتے چڑھتے رنگ کو بغور دیکھا۔'' یہ فرہاد کون ہے.....؟'' فضہ نے مجھ سے نظریں چرالیں'' ہے نہیں.....تھا.....تہران یونیورسٹی میں میرا ہم جماعت تھا۔ میرا بہترین دوست.....میرا ہم نفس.....''۔

''تھا کیوں.....ہے کیوں نہیں.....؟'' فضہ دور خلا میں دیکھ رہی تھی'' آغا جان کو میرا اس سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ وہ غریب تھا مگر اس کے خیالات انقلابی تھے.....اور رئیس وامراء کو انقلاب ذرا کم ہی بھاتا ہے.....'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو آپ نے ہتھیار کیوں ڈال دیے.....آپ بھی اس انقلاب میں فرہاد کی مددگار کیوں نہیں بن گئیں.....؟'' فضہ اداس ہوگئی۔

''انقلابیوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی.....کبھی کبھی انقلاب تین چار نسلوں تک صرف ایک سراب ہی رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار تھی.....مگر وہ مجھے ان کانٹوں میں گھسیٹنے کے حق میں نہیں تھا۔ لہٰذا چپ چاپ سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے وظیفے پر جرمنی چلا گیا، اور میں دو سال بعد آغا جان کے اصرار پر یہاں آ گئی.....تب سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں رہا.....'' فضہ نے آج پہلی بار اپنا دل میرے سامنے کھولا تھا۔ تو اس نازنین کو بھی دنیا میں منفرد اور جدا رکھنے والا یہ'' محبت'' نامی پارس ہی تھا۔ ہاں.....سچ ہے.....محبت کی تاثیر بھی تو پارس پتھر جیسی ہی تھی۔ جس نے آج تک جس کسی کو بھی چھوا اسے سونا کر دیا، لیکن اس کے اندر سے روح کھینچ لی۔ دنیا کے سبھی محبت کرنے والے اس پارس سے چھو جانے کے بعد بنا روح اور جان کے سونے کی مورتیوں جیسی زندگی ہی تو گزارتے ہیں۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھو یا رہا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ فضہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔

''کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی ہے یا تھا جس کے لیے آپ کی یہ آنکھیں بار بار جھلملا سی جاتی ہیں.....''

میں نے چونک کر جلدی سے آنکھیں مسل ڈالیں.....کبھی کبھی ہماری نظریں ہمیں چلتا پھرتا اشتہار بنا دیتی ہیں۔'' پتا نہیں.....وہ تھی بھی کہ نہیں.....محبت یک طرفہ ہو تو اس کا نام محبت نہیں الزام رکھ دینا چاہئے.....مجھ پر بھی اسی ادھوری محبت کا الزام ہے.....اور شاید سدا رہے گا۔'' میں نے فضہ کو گہنا کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ میں نے رنگا کے اڈے سے تعلق کے علاوہ اسے یہ بھی بتایا کہ ستارہ کا یہ کہنا ہے کہ کبھی کبھی محبت ہم پر ظاہر ہونے اور اپنا آپ منوانے میں بہت وقت لیتی ہے، اور کبھی کبھی خود ہمارے اندر کی یہ دیر کی بازیاں پلٹ دیتی ہے۔ لیکن میں تو پیار کی پہلی بازی ہی اس بری طرح ہارا تھا کہ اب کسی اور محبت کی گنجائش ہی کب بچی تھی میرے اندر۔ مجھے تو اب اس لفظ محبت سے ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس دن میں فضہ کے پاس سے اٹھ تو آیا لیکن ہم دونوں کے اندر کئی خلا اور کئی سوال تشنہ رہ گئے تھے۔

شام کو نواب صاحب بھی مردان خانے والی اپنی خواب گاہ میں منتقل ہو چکے تھے اور مردان خانے کے نوکروں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ شمن ڈانٹ ڈانٹ کر سب کو حکم دے رہا تھا۔ نواز کی تیز نظریں سب پر جمی ہوئی تھیں۔ نواب کے دونوں بیٹے بھی رات کے کھانے پر موجود تھے لیکن دونوں کے انداز میں سرد مہری نمایاں تھی۔ کھانے کے بعد نواب صاحب نیند کا بہانہ کر کے جلدی اٹھ گئے اور اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئے میں نے قبوے کے دور چلنے تک کچھ توقف کیا اور پھر میں بھی اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کسی کو پتہ نہیں چل پایا کہ پاشا صاحب نے نواب صاحب کو کس وقت میرے

کمرے میں منتقل کیا اور کب میں اپنے کمرے کی جانب جاتے جاتے نواب صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہوگیا۔ دونوں ہی کمرے نچلی منزل پر تھے اور تقریباً ایک دوسرے کے بالمقابل بھی تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی صفر کے ایک بلب کے علاوہ باقی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ پتہ نہیں کیوں آج میرا دل کسی انہونی کی گواہی دے رہا تھا۔ میں نے خود کو بستر پر ڈال دیا اور آنکھیں موندھ کر اپنے اندر کے اندھیروں سے لڑتا رہا ۔رات کے دو بج چکے تھے اور اب گھڑیال کی ٹک ٹک باقاعدہ میرے ذہن پر کسی ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھی۔ اچانک کمرے کی باغیچے کی جانب کھلنے والی بالکنی میں ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ آواز بہت مدہم اور خفیف سی تھی اگر میں ہلکی سی غنودگی میں بھی ہوتا تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ اندھیرے میں ایک ہاتھ کھڑکی کی ہلکی سی کھلی درز سے اندر داخل ہوا مطلب وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنے اندر آنے کا راستہ پہلے سے ہی ہموار کر رکھا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔

باب23

آنے والے نے خود کو نقاب اور ایک کالی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ شاید اپنے اندر مدغم ہو جانے والا سب سے زیادہ گہرا رنگ ہوتا ہے۔ تبھی تو اس کی رات کے اندھیرے سے اس قدر دوستی ہوتی ہے۔ نقاب پوش نے نہایت احتیاط سے ہر مقام پر رک کر اطمینان کیا کہ کہیں اس کی کوئی آہٹ سونے والے کو ہوشیار نہ کر دے۔ میں نے جسم پر پڑی چادر کو اس طرح چہرے تک اوڑھ لیا تھا کہ صرف ایک ہلکی سی جھری باقی تھی جس کے ذریعے مجھے اس کی حرکات و سکنات کی ایک نامکمل سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ دفعتہً مجھے نقاب پوش کے ہاتھ میں کسی خنجر کی دھار صفر کے بلب کی ادھوری روشنی میں چمکتی نظر آئی۔ میرا سارا جسم اکڑنے لگا۔ مجھے اپنی موت کو اپنے اس قدر نزدیک آنے دینا تھا کہ وہ قاتل میرے ہاتھوں سے نکل کر مجھ سے قضا نہ ہو جائے اور اس کے لیے مجھے اس کے قدموں کو گنتے رہنا تھا کیونکہ چادر کے نیچے سے اب وہ مجھے کسی پرچھائیں کی طرح بھی دکھائی نہیں دے پا رہا تھا۔ میں نے موسیٰ کا سبق یاد کیا..... اندھیرے میں دشمن کی چاپ اور اس کی سانس کے ہانپنے کی آواز سے اس کا اندازہ لگاتے رہو اور ٹھیک وقت پر اس پر جھپٹ پڑو..... لیکن یاد رہے کہ اندھیرے میں کیے گئے وار سے دونوں کو بیک وقت ایک جیسا خطرہ رہتا ہے۔ لہٰذا ہاتھ چوک گیا تو سمجھو کہ کھیل ختم.....'' میں نے دل ہی دل میں الٹی گنتی شروع کر دی۔ ''پانچ، چار، تین، دو..... ایک..... اور اچانک ہی میں نے چادر الٹ کر پھینک دی۔ ٹھیک میرے اندازے کے مطابق نقاب پوش کا ہاتھ مجھ پر حتمی وار کے لیے فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ میرے کروٹ لینے اور اس کے گھبرا کر تیزی سے نیچے آتے ہاتھ میں شاید سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے کا فرق تھا۔ میں نے کروٹ لی اور خنجر میرے کرتے کو چیرتا ہوا بستر کے نرم فوم میں دھنس گیا۔ نقاب پوش نے گھبرا کر خنجر دوبارہ نکالنے کی کوشش کی لیکن تب تک میرا ہاتھ اس کی کلائی کو جکڑ چکا تھا کہتے ہیں وحشت میں انسان کی طاقت دوگنی ہو جاتی ہے۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے تھا۔ دوسرے ہی لمحے نقاب پوش باقاعدہ اپنی پوری قوت سے مجھ پر اپنا سارا بوجھ ڈال چکا تھا۔ اس کا فولادی گھٹنا ٹھیک میری شہ رگ کے اوپر اپنا قاتل دباؤ بڑھا رہا تھا جب کہ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے خنجر کو پھر سے تولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ موسیٰ ہمیشہ کی طرح میرے ذہن میں اپنے تمام داؤ اور گروں کے ساتھ موجود تھا۔

''نڈھال پڑنے لگو تو بازی پلٹنے سے پہلے اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے مخالف پر پل پڑو..... یاد رہے..... کبھی کبھی زیادہ دیر تک خود کو روکے رکھنا بھی مات کا باعث بن سکتا ہے.....'' میں نے اب تک اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ نقاب پوش کو کوئی ایسی چوٹ نہ لگ جائے جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہو کیونکہ اس کی موت سے ہمارا مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو ہمیں بہت سے راز کھول جاتا، لیکن اب میں نے یہ احتیاط ترک کر کے اس سے نپٹنے کا فیصلہ کر لیا اور خود کو تول کر پوری قوت سے اسے پیچھے کی جانب اچھال دی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا اور پھر میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میری ٹھوکروں نے تھوڑی ہی دیر میں اسے بآواز بلند چیخنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کھڑکی کی جانب کود کر باہر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلائی پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ فضا میں ہڈی تڑخنے کی آواز گونجی اور اس کے منہ سے ایک بلند چیخ ابھری اور وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر وہیں نڈھال ہو کر

گر پڑا۔اس عرصے میں اس تمام شور وغل سے حویلی کے مردان خانے کے سبھی افراد جاگ کر میرے دروازے پر جمع ہو کر بری طرح سے پیٹ رہے تھے میں نے آگے بڑھ کر نقاب پوش کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا، اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''رحیم.....تم.....مگر.....مگر کیوں.....'' میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔سب سے آگے نواب صاحب اور ان کے عقب میں دونوں بیٹے۔پاشا اور نواز سمیت سبھی تیزی سے کمرے میں گھس آئے۔ان کے سامنے حویلی کا سب سے پرانا اور بظاہر سب سے زیادہ خدمت گار اور وفادار ملازم رحیم جو حویلی میں منیجر کی حیثیت سے برسوں سے یہاں موجود تھا اس وقت زمین پر آڑھا ترچھا پڑا اوندھے منہ کراہ رہا تھا۔نواب صاحب تو نڈھال ہو کر وہیں ڈھے سے گئے ''رحیم.....تم نے یہ سب کیوں کیا.....میری شفقت میں کیا کمی رہ گئی تھی.....بولو.....جواب دو.....'' لیکن نواب صاحب کے سوال کے جواب میں رحیم کے پاس ایک خاموشی تھی۔نواب کے بیٹے چلائے ''یہ سب کیا ہو رہا ہے.....؟.....اس لڑکے نے رحیم کی یہ حالت کیوں بنائی ہے۔یہ سب حویلی میں کیا چل رہا ہے.....؟''

نواب صاحب نے سب کو واپس اپنے اپنے کمروں میں جانے کا حکم دے دیا ''اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہوگا۔کل صبح دس بجے مرکزی دالان میں سب کے سامنے یہ راز بھی کھول دیا جائے گا۔فی الحال آپ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں۔میں تنہائی میں رحیم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں.....''

وقار اور سجاد نہ چاہتے ہوئے بھی بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور پھر سب نوکر ایک ایک کر کے وہاں سے چل دیے۔نواب صاحب نے آخر میں مجھے اور پاشا صاحب کو وہیں روک لیا۔

رحیم اب سکڑ سمٹ کر وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔میں نے سب کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا اور نواب صاحب کی طرف پلٹا ''نواب صاحب.....آپ کا دشمن آپ کے سامنے ہے لیکن اس پر میرا راز بھی افشا ہو چکا ہے.....لہٰذا اب اس کا زندہ رہنا ہم میں سے کسی کے مفاد میں نہیں.....بہتر یہی ہے کہ اس کی قبر یہیں حویلی کے پچھواڑے بنا دی جائے باقی سب سارنگا استاد سنبھال لے گا.....'' سارنگا کا نام سن کر رحیم کے ساکت جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔پاشا صاحب میرا اشارہ سمجھ چکے تھے۔انہوں نے بھی میری تائید کی۔''ہاں.....آیان ٹھیک کہہ رہا ہے نواب صاحب.....اب یہ کھیل یہیں ختم ہو جائے تو بہتر ہے۔آپ کا مسئلہ تو حل ہو ہی چکا.....'' نواب صاحب کو اب ہماری منشا سمجھ میں آئی اور انہوں نے ایک لمبا سا سانس لیا ''ٹھیک ہے.....اگر آپ دونوں کی یہ مرضی ہے تو یوں ہی سہی.....لیکن دھیان رہے.....یہ میرا بہت پرانا آدمی ہے.....زیادہ تکلیف نہ ہو.....'' نواب صاحب واپس جانے کے لیے پلٹے اور رحیم لپک کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا ''خدا کے لیے .....مجھے ان کے حوالے کر کے نہ جائیں.....مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی صاحب.....میں سب بتانے کے لیے تیار ہوں.....مجھے اس کام کے لیے نواب بیگم نے اکسایا تھا۔'' ہم سب کے سروں پر ایک بم جیسے پھوٹا اور ہم سب ساکت کے ساکت کھڑے رہ گئے لیکن سب سے زیادہ صدمے کا شکار نواب صاحب تھے۔وہ بمشکل قریبی صوفے تک پہنچے اور بنا کچھ کہے وہیں ڈھے گئے۔پاشا صاحب ان کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئے اور بڑی مشکل سے ہم نے انہیں چند گھونٹ پانی پلا کر کچھ دیر کے لیے لٹا دیا۔رحیم جو اپنے مالک کی جان لینے کے درپے تھا اور چند لمحے پہلے ان کے سینے میں خنجر گھونپنے کے لیے بے تاب تھا اب خود روتے ہوئے تیزی سے بھاگ بھاگ کر نواب صاحب کی خدمت کر رہا تھا۔ان کے ہاتھ پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے

کی کوشش کر رہا تھا اور نہ جانے دل ہی دل میں کون کون سی دعائیں پڑھ کر ان پر پھونک رہا تھا۔ انسان کے کتنے رنگ ہیں یہ شاید کبھی کوئی نہ جان پائے۔ شیطان اور رحمان کتنے ٹکڑوں میں بٹ کر اس کے اندر پلتے ہیں اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا پایا۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد نواب صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلی، لیکن اب وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ رحیم نے دھیرے دھیرے ساری بات کھول دی کہ نواب خاتون کے دل میں یہ خناس آج کا نہیں بلکہ برسوں پرانا ہے جب ان کے شوہر یعنی نواب صاحب کے بڑے بھائی نواب امیر الملک کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ دونوں بھائی شکار کے لیے گھر سے نکلے اور پھر بھوپال کے جنگلات میں سے ان دو میں سے ایک بھائی ہی واپس گھر پہنچا تھا۔ کہتے ہیں کہ اونچی مچان کا عین شیر کے حملے کے وقت ٹوٹ جانا اور بڑے بھائی کا زمین پر گر جانا اس حادثے کا باعث بن گیا تھا۔ اس وقت رحیم کا باپ جوان دو بھائیوں کی منیجری کرتا تھا وہ بھی اپنے بڑے مالک کو بچانے کے لیے نیچے کود گیا مگر افسوس دونوں میں سے کوئی نہیں بچ پایا۔ جنگل سے دو لاشیں گھر پہنچیں تو ایک کہرام مچ گیا۔ تین دن تک تو نواب خاتون کو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کس بدخواہ نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بھائی کی مدد کو منیجر کے بجائے چھوٹا بھائی کیوں نہیں کود۔ رفتہ رفتہ یہ سوال ان کے اندر پک پک کر ناسور بنتا چلا گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ دولت، جائیداد اور جاگیر کی خاطر چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو مار ڈالا، اور پھر نواب خاتون نے اپنے اس خود ساختہ یقین کے سہارے نواب دبیر اور ان کے پورے خاندان سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ گھر کے اندر دونوں بھائیوں میں سدا کے لیے پھوٹ ڈال کر انہوں نے ہر طرح سے گھر کا سکون ہمیشہ کے لیے برباد کیے رکھا لیکن ایک عورت ہونے کی وجہ سے ان کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں لہٰذا انہوں نے رحیم کو اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم کا باپ بھی اس حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور رحیم کو اسی کے باپ کی وفاداری کے صلے میں منیجر کی نوکری دی گئی تھی، لیکن نواب خاتون نے رحیم کے دل میں شک کا بیج بو دیا کہ وہ دونوں کسی حادثے میں نہیں بلکہ باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے، اور پھر آخر کار شک کا وہ کڑوا زہر رحیم کی رگوں میں بھی پھیلتا چلا گیا کہ اس کے باپ کا قاتل بھی نواب دبیر ہی ہے۔ لہٰذا اس نے نواب خاتون کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لی۔ تب سے اب تک وہ نواب پر تقریباً سات وار کر چکا تھا مگر نواب کی تقدیر ہمیشہ نواب خاتون کی تدبیر کے آڑے آتی رہی اور آج آخر کار اس کہانی کا انجام بھی ہمارے سامنے تھا۔

رحیم بات ختم کر کے سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا روتا رہا۔ نواب صاحب نے ہم سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تنہا رہنا چاہتے ہیں لہٰذا ہم اب اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں اور انہیں تنہا چھوڑ دیں۔ رحیم سے انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ آزاد ہے۔ جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے۔ ہمارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پاشا صاحب ان کی ذہنی حالت کے مدِنظر بہت سے شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ خود میرے دل میں بھی صبح تک عجیب عجیب وسوسے آتے رہے اور پھر دس بجے شمن تیزی سے بھاگتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''وہ نواب صاحب..... نواب صاحب.....'' میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔.....

''کیا ہوا نواب صاحب کو.....''

باب24،25

چند لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ میرے سارے حواس ہی معطل ہو چکے ہیں۔ میں نے شہن کو ڈانٹا ''بولتے کیوں نہیں.....؟.....نواب صاحب ٹھیک تو ہیں نا.....!'' شہن نے اپنی سانس درست کی ''کیا کہوں کہ ٹھیک ہیں بھی یا نہیں.....لگتا ہے ساری رات کسی شدید کرب میں روتے رہے ہیں۔ انہوں نے حویلی کے زنانے اور مردانے کے سبھی لوگوں کو بڑے دالان میں جمع کرنے کا کہا ہے مجھے.....سچ.....آج تو مجھے ان سے شدید خوف محسوس ہو رہا ہے.....'' شہن مجھے اطلاع دے کر باقی لوگوں کو بلانے کے لیے الٹے پاؤں دوڑ گیا۔ نواب صاحب نے حویلی کے سبھی افراد کو ایک ساتھ کیوں طلب کیا ہے؟.....میں یہی سوچتے ہوئے کچھ دیر بعد زمرد حویلی کے مرکزی دالان میں پہنچا تو فضہ، خانم، نواب کے بیٹوں سمیت حویلی کا ہر فرد چھوٹے بڑے سبھی ملازم، نواز اور اس کا عملہ، حتیٰ کہ دربان بھی وہاں موجود تھے۔ ایک جانب رحیم بھی گم سم سا کھڑا تھا۔ اس نے نواب کی پیشکش کے باوجود فرار کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ کہتے ہیں انسان کا سب سے بڑا فرار خود اس کے اندر لگے آئینے سے اوجھل ہونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس آئینے سے نہ چھپ سکے تو پھر دنیا کے سبھی فرار بس برائے نام ہیں۔ کوئی چھپنے کی کوشش کرے تو خود سے چھپے ورنہ خود کو تھکانا لاحاصل ہے، اور پھر کچھ دیر بعد نواب خاتون بھی سُتے ہوئے چہرے اور سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہاں آ گئیں۔ ان کی آمد پر حسب معمول نواب دبیر سمیت حویلی کے ہر فرد نے انہیں اٹھ کر تعظیم دی۔ نواب خاتون کی وہ دو مخصوص خادمائیں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں آج بھی ان کے پیچھے دائیں بائیں موجود تھیں مطلب ان سے ابھی تک ''مراعات'' واپس نہیں لی گئیں تھیں، لیکن نواب خاتون کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں رحیم کے ذریعے ساری بات کھل جانے کی اطلاع مل چکی ہے لیکن میں نے آج بھی نواب صاحب کو ان کی تعظیم کے لیے اٹھتے دیکھا تو مجھے ریت رواجوں میں بندھے اس شخص کے لیے خود اپنے دل میں بڑی قدر محسوس ہوئی۔ نواب دبیر واقعی ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے۔

نواب صاحب نے کچھ دیر تک سب کے بیٹھ جانے کا انتظار کیا۔ پھر انہوں نے پاشا صاحب کو تمہید باندھنے کا اشارہ کیا۔ پاشا صاحب اٹھ کر نواب صاحب کے ساتھ سب کے سامنے جا کھڑے ہوئے ''آج چند ایسی باتیں آپ لوگوں کے علم میں آئیں گی جس سے آپ میں سے کوئی بھی پہلے واقف نہیں تھا۔ دراصل کچھ عرصے سے نواب صاحب کی زندگی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ کوئی ان دیکھا دشمن نواب صاحب کی زندگی کے درپے تھا اور وہ جتنے بھی حادثے آج تک اس حویلی میں اتفاقیہ سمجھے گئے تھے وہ سب کے سب اس اجنبی قاتل کی نواب صاحب کی جان لینے کی کوششیں تھیں۔'' سارے مجمعے کو جیسے سانپ سا سونگھ گیا اور پھر سبھی نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ خانم پریشانی میں اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں۔ ''نواب صاحب.....یہ سب کیا ہے.....یہ پاشا صاحب کیا کہہ رہے ہیں.....؟'' نواب صاحب نے خانم سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ پاشا صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''آپ سب کو پہلے اس حقیقت سے اس لیے آگاہ نہیں کیا گیا کیونکہ نواب صاحب اس بات کی تشہیر اور حویلی کی بدنامی کو روکنا چاہتے تھے

اور پھر شروع میں تو خود نواب صاحب بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے، لیکن تیسرے حادثے کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ لہٰذا نواب صاحب اپنے طور پر محتاط تو ہو گئے لیکن وہ انجانا دشمن وار کرنے سے نہیں رکا۔ لہٰذا میں نے اور نواب صاحب نے طے کیا کہ ہمیں پولیس یا کوتوالی کو درمیان میں ڈالے بنا اس دشمن کو کھوجنا ہوگا تاکہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے اور باہر کوئی نئی داستان نہ بن پائے۔ اس کام کے لیے ہم نے زیرِ زمین دنیا سے رابطہ کیا اور ایک مہربان کی وساطت سے آیان میاں کو نفسہ بیٹا کے اتالیق کے روپ میں حویلی میں مدعو کیا گیا، لیکن وہ دراصل نواب صاحب کی جان کے دشمن کے خاتمے کے لیے یہاں بلائے گئے تھے....." اس لمحے میں نے نفسہ کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر جاتے دیکھے۔ اس نے کچھ ایسی نظر سے میری طرف دیکھا جس کا بیان ممکن نہیں..... پاشا صاحب نفسہ کے دل کی حالت سے بے خبر بولتے رہے۔

"اور پھر آخر کار کل رات آیان کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اور خود نواب صاحب کی خواب گاہ میں اپنے آپ کو شکار کے لیے پیش کر دیا اور وہ انجانا دشمن اس وقت رحیم کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔" سب ہی کی نفرت بھری نگاہیں رحیم پر ٹک گئیں۔ نواز کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت رحیم سے وہیں سارے حساب بے باک کر لے۔ پاشا صاحب نے رحیم کی سنائی ہوئی داستان ایک بار پھر سے سب کو سنا دی کہ اس دشمنی کی ابتداء بھوپال کے حادثے سے ہوئی اور اس کا انجام کل رات نواب کی خواب گاہ میں کیسے ہوا۔ اس تمام عرصے کے دوران نواب خاتون بالکل خاموش اور ساکت سی بیٹھی رہیں۔ پاشا صاحب نے اپنی بات ختم کی تو بہت دیر تک ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ نواب صاحب خود بھی مضمحل سے کھڑے تھے جیسے ان کا دل مردہ ہو چکا ہو۔ انہوں نے پاشا صاحب کو اشارہ کیا اور پاشا صاحب نے دوبارہ کلام کا سلسلہ جوڑا "جس حادثے پر قتل کا شک کیا جا رہا ہے اس کا ایک عینی گواہ جو بھوپال کے جنگل میں اس شکار کے دوران بڑے نواب یعنی نواب خاتون کے شوہر نواب امیر الملک کا سب سے قابلِ اعتماد ساتھی بھی تھا اور نواب امیر الملک کے دائیں بازو کے طور پر مشہور تھا۔ اس کا نام اکبر ہے۔ جسے نواب صاحب نے راتوں رات اپنی خصوصی گاڑی بھیج کر یہاں سے تین گھنٹے دور کی مسافت پر اس کے قصبے سے بلوا لیا تھا اور وہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔" پاشا کے اشارے پر نواز نے اپنے عقب میں کھڑے ایک بہت ضعیف شخص کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اکبر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ نواب خاتون کے چہرے پر حیرت اور یادِ ماضی کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ اکبر سلام کر کے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ پاشا نے کہا "اس روز بھوپال کے جنگل میں جو کچھ بیتا اکبر نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آج آپ کے سامنے وہ پھر سے وہی سب بیان کرے گا۔ یاد رہے کہ یہی وہ اکبر ہے جس پر نواب امیر اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ ان کی خواب گاہ کی ایک کنجی ہمیشہ اکبر کے پاس رہتی تھی۔ اکبر دو قدم آگے بڑھ آیا اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں اس شام کا ذکر چھیڑ دیا۔ مچان خود اکبر نے جنگل کے دیگر شکاری کارندوں کے ساتھ مل کر بندھوائی تھی اور اس کے ٹوٹنے کی بات درست نہیں تھی۔ دراصل نواب امیر نشانہ لینے کے لیے خود خطرناک حد تک آگے کو جھکے ہوئے تھے اور کنارے کی لکڑی اتنا بوجھ سہار نہ سکی اور چیخ کر علیحدہ ہو گئی۔ ٹھیک اسی لمحے شیر کا حملہ ہوا اور رحیم کا باپ جو اسی مچان پر موجود تھا اپنے مالک کی مدد کے لیے نیچے کود گیا نواب دبیر کچھ فاصلے پر دوسری مچان میں بیٹھے تھے اور انہی کی گولی نے شیر کو گھائل ہو کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نواب دبیر نے نشانہ لینے اور گولی چلانے میں ایک پل کی دیر

بھی نہیں کی تھی لیکن تب تک وہ درندہ بڑے نواب اور رحیم کے باپ کو خاصا زخمی کر چکا تھا۔ نواب دبیر نے اپنے بھائی کا بہت خون دیکھ کر اپنے حواس نہیں کھوئے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکتا انہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر دور کیمپ میں کھڑی گاڑیوں تک پہنچے کیوں کہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے گاڑی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن لمبے راستے کی وجہ سے ہسپتال تک پہنچتے ان دونوں کا خون اس قدر زیادہ بہہ چکا تھا کہ یکے بعد دیگرے دونوں مالک نوکر نے ہسپتال میں ہی جان ہار دی۔ اکبر نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا جو بڑے نواب کی موت کے بعد اس کی اچانک گم شدگی کی صورت میں انواہوں کا باعث بنی تھی۔ اس نے بتایا کہ بڑے نواب کے بعد اس کا دل ہی نہیں چاہا کہ وہ روزانہ اپنے مہربان مالک کی یادوں کو کریدنے کے لیے حویلی آئے لہٰذا اس نے چھوٹے نواب سے اجازت لے کر خود کو اپنے قصبے تک محدود کر لیا اور آج بھی وہ صرف اپنے مالک کے عزیز از جان چھوٹے بھائی پر لگے الزام کو دھونے کے لیے اپنے گھر سے نکلا ہے۔

ساری بات آئینے کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ نواب صاحب نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر جب وہ بولے تو برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔

''میں نے نواب خاتون کو ہی ہمیشہ اس حویلی کا بڑا سمجھا ہے اور آج بھی وہی اس خاندان کی بڑی ہیں۔ کاش وہ اپنے دل کا یہ کانٹا کبھی مجھے بھی دکھا پاتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ بہر حال دیر آید، درست آید۔ میں نے بھائی جان کی موت سے لے کر اب تک ان کے حصے کی ایک ایک پائی نواب خاتون کی خدمت میں ہی پیش کی ہے لیکن اگر وہ آج تک یہی سمجھتی رہیں کہ یہ سارا مکر وہ کھیل ہی وراثت کا ہے تو آج میں نے ان کے نام یہ سادہ مختار نامہ (Power of Atrony) دستخط کر دیا ہے۔ وہ اس پر جو جی چاہے بھر کر اپنے نام کر سکتی ہیں۔ میں نے یہ زمرد حویلی بھی ان کے نام کر دی اور خود اگلے ماہ ایران منتقل ہو کر باقی ساری زندگی وہیں بسر کرنے کی ٹھان لی ہے۔ رحیم کو میں نے پہلے ہی معاف کر دیا ہے وہ چاہے تو اسی حویلی کے منیجر کے طور پر اپنی نوکری جاری رکھ سکتا ہے۔ میں نے نواب خاتون کو بھی معاف کیا اور ان سے بھی اپنے تمام حقوق بخشنے کی التجا کرتا ہوں.....''

بات ختم کرتے کرتے نواب صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چکے تھے۔ پاشا نے جلدی سے انہیں سنبھالا ایک کونے میں کھڑا رحیم بھی رو رہا تھا اور پھر میں نے شمن سمیت حویلی کے سبھی ملازمین کی آنکھوں کو بھیگتے ہوئے دیکھا۔ حیرت ہے وہ ایک شخص جو اپنے غلاموں کے دلوں میں بھی بستا تھا۔ خود اپنے ہی خون کی نظروں میں ساری عمر کے لیے معتوب ٹھہرا تھا۔

دفعتہً نواب خاتون اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا'' دبیر میں تو تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی.....'' اور اگلے ہی لمحے نواب خاتون زمین پر ڈھے چکی تھیں۔ ہم سب ان کی طرف دوڑے۔ نواب خاتون کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔ ہلکا سا بہتا کف اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ شاید انہوں نے نواب صاحب کی جان لینے کے لیے جو زہر بچا رکھا تھا اسے وہ یہاں آنے سے پہلے خود گھول کر پی چکی تھیں۔ انتہائی عجلت میں انہیں شہر کے ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور وہاں چند گھنٹوں بعد انہوں نے آنکھیں بھی کھولیں، لیکن شاید یہ ان کے لیے قدرت کی جانب سے کفارے کے لیے دیا جانے والا آخری موقع تھا۔ انہوں نے اپنے سرہانے بیٹھے نواب دبیر سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ زمرد حویلی ایک بار پھر اجڑ گئی۔ نواب خاتون نے اس روز بڑے دالان میں آنے سے پہلے ہی زہر چکھ لیا تھا۔ انہیں شبہ تھا کہ نواب دبیر کبھی معاف نہیں کریں گے اور سارے زمانے میں ان کی رسوائی الگ ہو گی لہٰذا انہوں نے یہ آخری بازی مات

ہونے سے پہلے ہی اپنی زندگی کی بازی ہار جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کاش وہ نواب صاحب کے ظرف کا تھوڑا سا بھی اندازہ کرلیتیں تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، لیکن بات اگر ظرف کی شناخت کی ہی ہوتی تو وہ بھلا نواب دبیر کے خلاف اتنے سال تک اپنے دل میں یہ عداوت اور دشمنی ہی کیوں پالے رکھتیں.....؟؟

نواب خاتون کا تیسرا بھی ہوگیا اور حویلی کی وحشت اور ویرانی میں کوئی کمی نہیں ہو پائی۔ میں اب نواب صاحب سے اجازت لینا چاہتا تھا کیونکہ میرا کام یہاں ختم ہو چکا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس مہ جبیں سے بھی معافی مانگنی تھی جس سے اپنی شناخت چھپانے کے جرم کا بوجھ اب مجھے کچلے جا رہا تھا، لیکن کوئی ایسا موقع یا بہانہ مجھے مل نہیں پایا کہ میں فضہ تک اپنا پیغام پہنچا سکوں۔ رحیم نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور حویلی کے زیادہ تر فرائض اب نواز اور شمن کے کاندھوں پر آن پڑے تھے۔ اس رات کے واقعے کے بعد نواز اور حویلی کے باقی سبھی ملازمین کی نظروں میں حیرت کے ساتھ ساتھ میرے لیے ایک خاص احترام کی جھلک بھی واضح دکھائی دیتی تھی۔ جب سے انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ میرا تعلق سارنگا کے اڈے سے ہے اور میں نواب صاحب کی حفاظت کی خاطر یہاں آیا تھا تب سے وہ میرا خصوصی خیال رکھنے لگے تھے۔ نواز دن میں تین چار بار سلام کرنے ضرور آتا تھا اور شمن نے تو جیسے میرے کمرے کی راہ ہی پکڑ لی تھی۔ ''آیان میاں..... شمن کی نظر نے تو پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ آپ ضرور کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہیں..... آپ کی نگاہ کا تو میں پہلے دن سے معترف ہوگیا تھا جب آپ نے طائرانہ جائزہ لیا تھا زمرو حویلی کا..... آپ جانتے ہیں کہ جب سے رحیم پکڑا گیا ہے چاروں طرف آپ کے نام کی دھوم ہے حویلی میں..... اور وہ کھڑوس نواز تو جیسے آپ کا مرید ہی ہوگیا ہے۔ کہتا ہے میں آیان بھائی سے کچھ سیکھ کر ہی انہیں جانے دوں گا..... آخر آپ سارنگا کے اڈے کی شان جو ہو.....'' گویا اڈے کے ساتھ جڑی شہرت یا بدنامی نے حویلی میں بھی ڈیرہ جما لیا تھا۔ میں نے شمن ہی کے ذریعے فضہ کو پیغام بھجوانے کی ٹھان لی، لیکن براہ راست ملنے کے بجائے احتیاطاً خانم کو وسیلہ بنانے کا سوچ کر میں نے کاغذ پر فضہ کے لیے دو سطریں لکھیں کہ میں کل اس حویلی سے رخصت ہو رہا ہوں اور جانے سے پہلے اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ کاغذ کو لفافے میں ڈال کر میں نے شمن کے حوالے کیا کہ وہ اسے خانم کے ہاتھ میں دے آئے۔ میں جانتا تھا کہ خانم میرا پیغام فضہ تک ضرور پہنچائیں گی۔ اب میرا فضہ کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا کہ میں زنان خانے میں اپنی مرضی سے جا سکتا۔ میری توقع کے مطابق خانم نے شمن کے ہاتھ ہی جوابی پیغام بھجوایا کہ آج شام کی چائے میں ان لوگوں کے ساتھ زنان خانے میں ہی پیئوں۔

چار بجے مجھے لینے کے لیے خانم کی خاص نوکرانی آگئی۔ زنان خانے کے در و دیوار پر ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ فضہ نہر کے قریب سنگ مرمر کی سلوں والی اپنی پسندیدہ جگہ پر موجود نہیں تھی۔ جانے اسے خانم نے میرے آنے کی اطلاع دی ہوگی یا نہیں.....؟..... خانم مرکزی ہال کے دروازے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائیں ''تم اپنے اندر حیرتوں کی اتنی زیادہ سوغات لیے، اتنے پرسکون کیسے رہ سکتے ہو..... جاؤ..... جا کر مل لو اس سے..... وہ اپنے کمرے میں ہی ہے..... میں چائے لگوا کر تم دونوں کو اطلاع کر دوں گی۔ نواب صاحب کو بھی میں نے زبردستی مدعو کر رکھا ہے آج کی چائے کے لیے..... ورنہ انہوں نے تو اپنے کمرے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے.....'' میں خانم کا شکریہ ادا کر کے خادمہ کی سربراہی میں آگے بڑھنے لگا تو انہوں نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

''آیان.....'' میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ ''میں تشکر کے دو بول بول کر تمہارے احسان کا رتبہ کم نہیں کروں گی.....بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی یہ نہ بھولنا کہ اب ہم بھی تمہارے اپنوں میں سے ہیں۔ بس ہمیں اپنا سمجھنا.....''

میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا ''یہ اعزاز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ آپ بے فکر رہیں'' خادمہ نے راہداری کے کونے میں آخری کھلے دروازے کے جانب اشارہ کیا اور خود واپس پلٹ گئی۔ کمرے کے اندر چاروں جانب کھلی کھڑکیوں سے باہر ڈھلتے سورج کی روشنی نے عجیب زردی مائل سا اجالا پھیلا رکھا تھا لیکن یہ پیلاہٹ فضہ کے چہرے پر پھیلی زردی سے بہت کم تھی۔ کمرے کے شیلف کتابوں سے بھرے ہوئے اور گل دانوں میں بھرے پھول مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ شاید بہت دنوں سے ان پھولوں کو تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ایران کے چند مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر سجی تھیں۔ ایک جانب پڑے ہوئے موسیقی کے جدید سسٹم(Audio system) کے قریب اردو اور فارسی کی غزلوں کی چند ڈسکس بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ فضہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں کی مشہور گلوکارہ گوگوش کو آج بھی ایران میں ایک دیوی کی حیثیت حاصل ہے، لیکن فضہ اس وقت خود اداسی اور ملال کی ایک ایسی دیوی کی طرح کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ جسے اس کا دیوتا ہمیشہ کے لیے سنیاس کی سوغات دے کر بچھڑ گیا ہو۔

میری آہٹ پر اس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا اور جلدی سے خود کو سنبھالا۔ آج اس نے سر پر اسکارف نہیں باندھا ہوا تھا۔ بس ایک سیاہ شال تھی جو بار بار اس کے سر سے سرک سرک جاتی تھی ''اوہ.....آپ آ گئے معاف کیجیے گا۔ میں اپنے دھیان میں تھی.....آیئے.....بیٹھیے.....وہاں کیوں کھڑے ہیں.....؟'' میں ایک جانب کھڑکی کے سامنے بچھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے نہ جانے لفظوں کے کتنے انبار اپنے ذہن و دل میں جمع کر رکھے تھے، لیکن فضہ کے سامنے آتے ہی جیسے میں اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھا تھا۔ میں نے خود کو مجتمع کیا ''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں.....'' فضہ سر جھکائے بیٹھی رہی ''جانتی ہوں لیکن اگر آپ اپنی شناخت چھپانے کے لیے کوئی معذرت کرنا چاہتے ہیں.....تو ایسا نہ کیجیے گا.....آپ نے اپنا فرض ہی تو پورا کیا ہے.....ہاں البتہ اگر آپ میرے اندر مچنے والی اتھل پتھل کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتے ہیں تو میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ یہ میری تقدیر میں تھا.....آپ اپنے دل کو بوجھل نہ کریں.....'' فضہ کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں اور آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ''میں جانتا ہوں میرا جرم بہت بڑا ہے.....لیکن مجھے اپنے منصب کے ظرف کی وسعت کا بھی خوب اندازہ ہے.....لہٰذا میں معذرت جیسے کم وزن لفظ استعمال کرنے نہیں آیا.....سچ یہی ہے کہ میرا تعلق زیریں دنیا کے ایک بدنام اڈے سے ہے اور یہی میری شناخت ہے۔'' فضہ کچھ دیر خود کو سنبھالے رکھنے کی جدوجہد میں جتی رہی اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی ''کیوں آیان.....کیوں.....؟.....کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا.....؟.....اگر آپ مجھے بتا بھی دیتے تو کیا میرے ظرف پر آپ کو اتنا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ میں یہ راز سنبھال پاتی.....'' میں اس کے یوں ایک دم رو پڑنے سے بالکل حواس باختہ سا ہو گیا ''ارے ارے.....ایسے کیسے.....آپ اپنے قیمتی آنسو یوں تو نہ بہائیں.....چپ ہو جائیں.....مجھے بہت دکھ ہوگا اگر آپ ان موتیوں کو یوں ضائع کر دیں گی.....'' میرا دل چاہا کہ میں خود اپنی ہتھیلیوں میں اس خزانے کو جذب کر لوں۔ اس نے تڑپ کر میری جانب دیکھا ''اور مجھے جو دکھ ہوا ہے.....اس نقصان کی بھرپائی کیسے کریں گے

آپ.....؟'' مجھے اس کے اس معصوم سوال نے لاجواب کر دیا'' واقعی اس نقصان کا ازالہ تو ناممکن ہے۔ میں تو آپ کے ایک آنسو کی قیمت بھی عمر بھر ادا نہیں کر پاؤں گا..... آپ چاند نگر کی شہزادی ہیں اور میں ایک بے گھر بنجارہ..... آوارہ..... مجھے اتنا قرض دار نہ کریں کہ میں خود کو بیچ کر بھی اسے ادا نہ کر سکوں۔'' فضہ نے اپنی زخمی نگاہ اٹھائی'' ایسا کیوں کہتے ہیں آپ..... آپ سے ان چند دنوں میں بہت کچھ سیکھا ہے میں نے..... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا تعلق کس گروہ یا قبیلے سے ہے۔ آپ وہ واحد انسان ہیں جن کی باتیں سن کر فرہاد کی یاد کی کسک میرے دل سے مٹ جاتی ہے۔ مجھے آج تک لگتا تھا کہ زندگی کا بس ایک ہی زاویہ ہے جو فرہاد کے فلسفے نے میرے من کے اندر اجاگر کیا ہے، لیکن آپ سے مل کر اور آپ کے زندگی کے بارے میں نظریات جان کر میں نے اپنے اندر اک نئی فضہ کو جنم لیتے پایا تھا۔ مجھے بس یہی بات اندر سے کاٹے جا رہی ہے کہ آپ جیسا فرد یہ دوہری شناخت کیسے رکھ سکتا ہے؟..... میں آپ کی کس پہچان کو حتمی سمجھوں..... کسی انڈر ورلڈ مافیا سے جڑے ایک شخص کی یا پھر اس انسان کی جو مجھے چند دنوں میں بہت کچھ دے گیا.....؟ کیا آج تک آپ نے مجھ سے جو بھی باتیں وہ لفظ صرف ایک دکھاوا تھے؟ اپنے فرض سے بندھے ایک شخص کی مجبوری تھے.....؟''۔

''نہیں..... ایسا نہیں ہے..... ہاں میں اپنے فرض اور وعدے کے ہاتھوں مجبور ضرور تھا لیکن آپ سے مل کر تو میں نے خود اپنے اندر چھپے اک نئے آیان کو ڈھونڈا ہے..... آپ سے ملاقات کسی اڈے سے وابستہ شخص کی نہیں..... ایک نئے آیان کی تھی..... جسے اپنی کم مائیگی اور آپ کی بیش قیمت کا خوب احساس ہے۔''

فضہ نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں۔ ''نہیں..... وہ آیان بھی بہت قیمتی ہے..... فضہ سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے، اور ان تین چار دنوں میں اس آیان سے مل کر مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے وہ آیان میری زندگی کا جزو بنتا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ فرہاد کے جانے کے بعد میرا دل اب کسی کے لیے یوں دھڑک نہیں پائے گا..... لیکن مجھے اعتراف کرنے دیں کہ اس رات لائبریری سے جب میں اپنی زخمی کلائی لے کر واپس لوٹی تھی تو شاید خود کو وہیں لائبریری کے دروازے پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ شاید اسی رات کا یہ اثر ہے کہ میں اب تک کسی خواب کی کیفیت میں ہوں.....'' فضہ رو پڑی..... ''آیان..... مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں آپ کی محبت میں نہ مبتلا ہو جاؤں.....''

باب26

میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا۔ میں اس بھولی اور معصوم لڑکی کو یہ بھی نہ کہہ سکا کہ ایسے راز دل کی چار دیواری میں ہی قید رہیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ سن کی چوکھٹ پار کر جانے کے بعد یہ محترم باتیں بس ایک الزام بن کر رہ جاتی ہیں..... تہمت بن کر زبان در زبان پھیل جاتی ہیں، اور میں اس عفت مآب کے کورے دامن پر ایک ہلکا سا دھبہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ محبت جیسے الزام کا داغ تو بہت بڑی بات تھی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... ایسی غلطی نہ کیجئے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں اڈے سے جڑا ایک بدنام ہوں..... جو کسی کی محبت کے قابل نہیں..... محبت کے لیے معاشرے میں کسی کی عزت و رتبہ ضروری ہوتے ہیں..... کسی مقام کی ضرورت ہوتی ہے..... میں تو وہ ہوں جس کو دیکھ کر لوگ اپنی چوکھٹ بند کر دیتے ہیں..... اپنی دہلیز پر سیاہ لکیر پھیر دیتے ہیں تاکہ میرے سبز قدم اسے پار نہ کر جائیں.....'' بولتے بولتے میری آواز روہانسی ہو گئی اور شاید میری آنکھوں کا کوئی کمزور بندھ ٹوٹ گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور اس نے میری آنکھیں پونچھ ڈالیں ''آیان..... یہ کیا..... نہیں ایسا نہیں کرتے.....'' یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ شاید خود فضہ کو بھی اپنی اس بے اختیاری کا ادراک نہیں ہو سکا۔

باہر سے برتنوں کی آواز آئی اور پھر خانم دو خادماؤں کے ساتھ چائے کی ٹرالی لیے کمرے میں آ گئیں ''نواب صاحب بھی یہیں آ رہے ہیں..... باہر بہت خنکی ہو گئی ہے''..... کچھ ہی دیر میں نواب بھی آ گئے اور ہم سب نے فضہ کے کمرے کی کھڑکی کے پاس ہی چائے پی۔ باہر ہلکی سی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور تیز سرد ہواؤں کے شور اور زور سے والان کے بلند و بالا درختوں کے پتے ٹوٹ کر فضا میں بکھرنے لگے تھے۔ میں انہی بکھرے پتوں پر چلتا ہوا شام ڈھلے مردان خانے میں واپس پہنچا تو میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کے لیے وہ باہر بہتی بارش کا پانی تھا جس نے میرے گال بھگو دیے تھے اچھا ہی ہے کہ قدرت نے بارش کے پانی یا آنسوؤں میں سے کسی ایک کا رنگ جدا تخلیق نہیں کیا تھا ورنہ شاید میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کاش کبھی رونے والوں کے سروں پر کوئی بادل آ کر برس جایا کرتا تو ہم میں سے بہتوں کا بھرم باقی رہ جاتا۔ میں نے کمرے میں پڑے تولیے سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ ہر آنسو کی قسمت میں کسی نازنین کی ہتھیلی کا گداز نہیں ہوا کرتا۔

رات گئے میرے اندر کی ہل چل نے بخار کی صورت اختیار کر لی اور صبح تک میرا جسم شدید تپ سے پھنکنے لگا۔ شین نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو گھبرا کر واپس دوڑا اور پھر نواب صاحب اور ڈاکٹر سمیت ہی واپس لوٹا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ شاید رات کو سردی لگ گئی ہو..... لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن ڈاکٹر کب بھلا مریض کی سنتے ہیں۔ سو اس ڈاکٹر نے بھی مٹھی بھر کڑوی گولیاں اور چند سیرپ میرے حلق سے نیچے انڈیل دیے۔ مجھے بچپن سے ہی ان کڑوی داوؤں اور گولیوں سے شدید چڑ تھی، لیکن جب انسان کا نصیب ہی کڑوا ہو تو پھر ان دنیاوی کڑواہٹوں سے کیسا گلہ.....؟

اپنے پروگرام کے مطابق مجھے آج شام زمرد حویلی سے رخصت ہو جانا چاہئے تھا مگر اس بخار نے مجھے شام ڈھلے تک بے سدھ کیے رکھا اور پھر

شام کو نواب صاحب نے باقاعدہ حکم صادر کر دیا کہ طبیعت سنبھلنے تک میں واپسی کی سوچ بھی دل سے نکال دوں۔ میں موسیٰ کو واپسی کا پیغام بھجوا چکا تھا اور اگلے روز میں بستر پر پڑا اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ یعقوب میشن میں سبھی میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ سہ پہر بارہ بجے کا وقت تھا جب اچانک ہی حویلی کے پورچ میں چند گاڑیوں کے رکنے اور پھر زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر سب سے پہلے نواب صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

''لو بھئی..... تمہیں بہت فکر تھی نا اپنے انتظار کرنے والوں کی..... تو تمہارا انتظار بھی ختم ہوا.....'' اور پھر نواب صاحب کے عقب میں سب سے پہلے مجھے موسیٰ کی جھلک نظر آئی۔ میں حیرت اور خوشی سے اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے پیچھے اسماعیل اور پھر خود سارنگا بھی مجھے کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے۔ میں موسیٰ سے گلے مل کر ہٹا تو رنگا نے کھینچ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ''کہاں رہ گیا تھا تو ساجن..... تو نے تو سب کو اداس ہی کر ڈالا.....''۔ موسیٰ نے مجھے تھپکی دی ''رنگا بھائی..... ہمارے شہزادے نے ہماری لاج رکھ لی..... جس کام کے لیے یہاں آیا..... وہ اس نے کر دکھایا.....'' سارنگا نے ہنس کر موسیٰ سے کہا ''ہاں رے..... آخر شاگرد کس کا ہے..... یہی کہلوانا چاہتا تھا نا تو میری زبان سے.....'' سب ہنس پڑے۔ میں اب تک حیران تھا ''لیکن آپ سب لوگ..... اچانک یہاں..... کیسے.....''۔

''بس تیرے بغیر دل نہیں لگا تو ہم تجھے لینے چلے آئے۔ نواب صاحب نے تیری بیماری کی اطلاع پہنچا دی تھی..... ابھی کوئی اور بھی ہے جس کا دل تیرے بنا نہیں لگتا..... اس کی سواری بھی بس آتی ہی ہوگی.....'' میں نے چونک کر سارنگا کو دیکھا، اور کون مجھ سے ملنے یہاں تک آ سکتا تھا بھلا.....؟؟ اور پھر پورچ میں کسی تیسری گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں میں جو چہرہ دروازے پر نمودار ہوا اس نے مجھے حیرت اور خوشی کا ایک مزید جھٹکا دیا۔ وہ ناہید تھی ''آیان بھائی..... آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں..... لیکن دیکھ لیں..... آپ کی بہن نے آخر آپ کو ڈھونڈ نکالا.....''

''ارے بلی..... تم بھی یہیں موجود ہو..... سچ ہے بلیوں سے چھپنا بڑا مشکل کام ہے.....'' ناہید کچھ روہانسی سی ہو گئی ''پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے آپ کو گئے ہوئے..... کوئی ایسا کرتا ہے اپنی بہنوں کے ساتھ.....'' خود میری آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں ایسے کتنے قیمتی رشتے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ سارنگا نے اسے شانے سے پکڑ کر کھینچ لیا ''چل ری..... اب تو مل گیا نا تجھے تیرا بھائی..... اب کاہے کو اپنی جان ہلکان کرتی ہے.....'' میں نے ناہید کے سامنے کان پکڑے ''چلو..... اب کی بار معاف کر دو..... پھر کبھی ایسا ہوا تو جو چور کی سزا وہ تمہارے بھیا کی.....'' ناہید ہنس پڑی۔ نواب صاحب نے سارنگا کی لاکھ منتوں کے باوجود انہیں اسی روز واپسی سے روک لیا۔ ایک بہانہ میری بیماری بھی تھی اور دوسرا یہ کہ سارنگا پہلی مرتبہ زمرد حویلی میں آیا تھا۔ اس لیے نواب صاحب کی مہمان داری کا مزہ چکھے بنا اسے بھلا کون یہاں سے جانے دیتا۔

دوپہر کے کھانے پر نواب صاحب نے خصوصی طور پر خانم اور فضہ کو بھی مردانے میں مدعو کیا ہوا تھا۔ خانم حیرت سے اس دوسری دنیا کے لوگوں کو دیکھتی رہیں اور فضہ اور ناہید آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کرتی رہیں۔ شاید دنیا کی ہر عورت عالم ارواح سے ہی دوسری عورت کی سہیلی ہوتی ہے۔ شرط صرف دنیا میں ملاقات کی ہے۔ خانم نے بھی ناہید کو ڈھیر سارا پیار کیا اور اسے بتایا کہ اس کا بھیا آیان اب ان کا بیٹا بھی ہے لہٰذا اس ناطے سے اب وہ ناہید کی ماں ہوئیں۔ ناہید تو پہلے ہی اتنے سارے نئے رشتے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد عورتیں زنان خانے کی جانب چلی گئیں۔

ہم سب مرکزی ہال میں آ کر بیٹھ گئے اور ایرانی سبز قہوے کے کئی دور چلتے رہے۔ رنگا کو اس قہوے کا ذائقہ بہت بھلا محسوس ہوا اور اس نے نواب صاحب سے یہ چائے ایران سے منگوانے کی فرمائش بھی کر دی۔ نواب صاحب نے رنگا کو بتایا کہ حویلی کے گوداموں میں چائے کی وافر مقدار موجود ہے جو کل صبح ہی یعقوب مینشن منتقل کر دی جائے گی۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں لیکن سارنگا نے رحیم منیجر کا موضوع چھیڑنے سے جان بوجھ کر احتراز کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس موضوع سے نواب صاحب کے بہت سے دبے درد پھر سے ابھر آئیں گے..... وہ نواب خاتون کی اس ناگہانی موت کے صدمے سے ابھی تک باہر نہیں نکل پائے تھے۔ عصر کے بعد ہم سب چہل قدمی کرتے ہوئے باہر دالان میں نہر والی طرف نکل آئے اور شمن نے جھٹ پٹ وہیں ہم سب کے لیے کرسیاں ڈلوا دیں۔ چھتری کی ضرورت تو یوں بھی نہیں تھی کیونکہ دھوپ کی نرم گرماہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ نواب صاحب نے چپکے سے پاشا کو نہ جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے کچھ دیر کے لیے محفل سے غائب ہو گئے، اور پھر واپس لوٹے تو درمیانے سائز سے ذرا بڑا بریف کیس ان کے ہاتھ میں تھا۔ جسے انہوں نے نواب صاحب کے کہنے پر ایک طرف رکھ دیا۔ نواب وبیر نے اپنے لفظ جوڑے۔

''سارنگا بھائی..... میں جانتا ہوں کہ آپ کے کسی ایک احسان کی قیمت بھی میں اپنی ساری زندگی لٹا کر بھی ادا نہیں کر پاؤں گا..... لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ کچھ.....''

رنگا نے ہاتھ اٹھا کر نواب صاحب کی بات کاٹ دی۔ ''بڑے صاحب..... مارنا ہے تو جوتے سے مار لو..... لیکن یہ نوٹوں کا تھپڑ رنگا کو نہ مارو..... بولو تو ہم ابھی یہاں سے اٹھ جاتے ہیں..... کیا آپ نے رنگا کو بس اتنا ہی سمجھا ہے.....''

نواب صاحب گھبرا گئے ''نہیں نہیں..... خدانخواستہ میری ایسی مجال کہاں..... میں جانتا ہوں کہ یہ کاغذ کے چند ٹکڑے آپ کے لیے کتنے حقیر ہوں گے..... لیکن دنیا کی ایک ریت بھی تو ہے نا.....''

''دنیا کی ساری ریتی اور سب رواج ہم نے آپ کی حویلی پر حاضری دے کر اور یہاں آپ کا نمک کھا کر پورے کر دیے ہیں..... ہاں اگر آپ کو اب بھی کوئی شک ہے تو اس بجناں سے پوچھ لیتے ہیں.....'' سارنگا نے میری جانب دیکھا ''کیوں رے..... کیا تجھے چاہیے یہ بکسا؟..... کیا تو اسی کے لیے یہاں آیا تھا'' میں گڑبڑا سا گیا ''مجھے..... نہیں تو..... میں بھلا کیا کروں گا اس کا.....؟'' موسیٰ اور سارنگا دونوں ہی میری اس بوکھلاہٹ پر ہنس پڑے۔

''دیکھا بڑے صاحب..... ہمارا سور ما بھی یہ نہیں چاہتا..... آپ ایسا کرو کہ اسے اپنی گڑیا بٹیا کے سر سے وار کر صدقہ نیاز دے دو..... تاکہ حویلی پر آتی بلائیں بھی ہمیشہ کے لیے ٹل جائیں.....''

نواب صاحب کی آواز میں ممونیت تھی۔ ''میں جانتا ہوں کہ میرا پالا کمال ظرف والوں سے پڑا ہے۔ میری گستاخی کو میری نادانی سمجھ کر معاف کر دیجیے گا.....'' بات آئی گئی ہو گئی اور نواب صاحب نے دوبارہ کسی معاوضے کی بات نہیں چھیڑی۔ رات کا کھانا مردانے اور زنانے میں الگ الگ چنا گیا البتہ کھانے کے بعد قہوے کے دور سے پہلے خانم، فضہ اور ناہید سمیت کچھ دیر کے لیے مردانے آئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر پلٹ گئیں۔ فضہ شاید مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن ایسا کوئی موقع ہی نہیں مل سکا۔ مجھے بخار کی تھکن نے پھر سے ستانا شروع کر دیا تھا جب کہ سارنگا، موسیٰ

اور نواب صاحب کا ابھی مزید محفل جمانے کا ارادہ تھا۔ میں ان سب سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے ذہن میں بار بار اسی ناز آفریں کے آنسو اور باتیں کسی جھماکے کی طرح لپک جاتے تھے۔

میں آدھی رات تک بستر پر پڑا کروٹیں لیتا رہا۔ یہ محبت ہمیشہ انہی دلوں پر وا کیوں مارتی ہے جہاں اگلے کے نصیب میں مقدر کی صرف خالی تجوریاں ہی منہ چڑاتی ملتی ہیں۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں اسے مجھ سے محبت نہ ہو جائے کتنی نادان تھی وہ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت ہمیشہ اپنے خوف سے پہلے دلوں میں ڈیرے ڈالتی ہے۔ یہاں کبھی کسی کا مکمل جہاں نہیں ملتا۔ محبت کوئی جوئے کی بازی تو نہیں کہ ہر بازی کے بعد محبت کا جواری بھی یہی کہتا پھرے کہ چلو "ایک محبت اور سہی....." یہ تو وہ بازی ہے جو ہر بار آخری بازی ہوتی ہے۔ جوا ہوتا تو ایک بازی اور سہی کا کلیہ ہمیں ہر بار نیا داؤ کھیلنے پر مجبور کیے رکھتا اور شاید ہم کبھی نہ کبھی اپنے من کی مراد کو جیت ہی لاتے، لیکن یہاں کے تو اصول ہی جدا تھے۔ دفعتہً مجھے ایک اور عجیب سا احساس بھی ہوا۔ فضہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے فرہاد کے سامنے کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اگر وہ محبت ہی تھی تو پھر یہ کلیہ فضہ کی محبت پر کیوں لاگو نہیں ہوا..... شاید دنیا کی ہر نئی محبت اپنی جگہ آپ بناتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت پچھلی محبت کے اثرات کو نہیں مٹا سکتی نہ ہی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ شاید محبت کی مثال بھی بہتے پانی جیسی ہے جو ہر بار اپنا راستہ خود بناتا ہے، تو پھر میرے دل کی راہیں گہنا کے ساتھ ہی کیوں بند ہو گئی تھیں۔ اس کی ہر پگڈنڈی پر خاردار جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کیوں اگ آئی تھی جس نے سبھی راستے اور ساری منزلوں کے نشان مٹا ڈالے تھے..... صبح تک میرا بخار اتر گیا لیکن نواب صاحب نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے بعد ہی روانگی کی اجازت دی، لیکن قدرت ہمارے لیے کب واپسی کے راستے آسان اور کھلے چھوڑ کر رکھتی ہے۔ ہر قدم پر ایک نئی گھات، ایک نئی بیڑی ہمارے قدم روکنے کے لیے موجود ہوتی ہے۔

عصر کے وقت جب ہم حتمی طور پر نواب صاحب سے رخصت ہونے کے لیے مرکزی دالان میں جمع تھے تو ماحول اداس تھا۔ خانم نے ناہید اور مجھ سے ہزار وعدے لیے کہ اب ہم زمرد حویلی کی راہ نہیں بھلائیں گے اور آتے جاتے رہیں گے۔ فضہ صبح سے ہی کچھ خاموش سی تھی۔ میں نے اسے ماحول میں واپس لانے کے لیے ٹوکا "اور ہاں یاد رہے..... ابھی ہم دونوں پوری طرح اس بات پر متفق نہیں ہوئے کہ مغل آرکی ٹیکچر زیادہ بہتر ہے یا پھر ان کی اس دور کی مصوری..... یہ مدعا ابھی باقی ہے....." فضہ دھیرے سے مسکائی "ابھی بہت سے دوسرے مدعے بھی ادھورے تھے جنہیں چھوڑ کر آپ جا رہے ہیں....." میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حویلی کے مرکزی دروازے کی جانب سے ایک کڑک دار اور بھاری آواز ابھری "ایسی بھی کیا جلدی ہے رنگا بھائی..... ہم سے ملے بنا ہی چلے جاؤ گے کیا.....؟....."

سب نے چونک کر پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ موسیٰ کی زبان سے سرسراتی سی سرگوشی نکلی۔

"یہ تو کالی ہے..... یہ یہاں کیا کر رہا ہے.....؟"

.....❁.....

باب 27

میں نے آج تک کالی دادا کا صرف نام ہی سنا تھا، اور یہ جانتا تھا کہ زیرِ زمین تقسیم کے اصول کے مطابق زمرد حویلی کا علاقہ کالی کے حصے میں ہی آتا ہے، لیکن وہ اس طرح اور اچانک یہاں حویلی تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ معمہ ابھی تک حل طلب تھا۔ ہم سبھی دم بخود کھڑے تھے۔ کالی نے حویلی کے دروازے کو دھکیلا اور اس کے عقب میں ہمیں اس کے دو ساتھی اور دو رکھڑی جیپ بھی نظر آئی۔ رنگا نے بنا کسی مرعوبیت سے کہا ''تیری بن بلائے آنے جانے کی عادت نہ گئی کالی..... یہ شریفوں کا گھر ہے..... یہاں منہ اٹھا کر اندر آنا منع ہے.....''

کالی نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا ''واہ استاد..... شرافت کی بھی تم نے خوب کہی..... اگر یہ شریفوں کی جگہ ہے تو پھر رنگا اور موئی یہاں کیا کر رہے ہیں.....؟ سنا ہے تیرا کوئی نیا سور ما بھی یہیں ہے اسی حویلی میں'' کالی کی نظریں سب پر سے پھسلتی ہوئی مجھ پر آ کر ٹک گئیں ''اچھا تو یہ ہے تیرا نیا ہتھیار..... انو بھائی..... بڑا بانکا سپاہی ڈھونڈا ہے استاد'' سارنگا نے خواتین کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی آواز کو بڑی مشکل سے دھیما رکھا ''کام کی بات کر کالی..... اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....؟''

کالی مسکرایا ''پر اپنے پاس تو وقت ہی وقت ہے استاد..... تم چلے جاؤ..... ویسے بھی اپنا کام نواب صاحب کے ساتھ ہے..... کچھ لمبی باتیں کرنی ہیں ان کے ساتھ.....''

اب نواب صاحب کے غصے میں آنے کی باری تھی ''لیکن میں تمہیں نہیں جانتا..... تمہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی.....؟.....''

''میں خود نہیں آیا نواب صاحب..... آپ کے بڑے بیٹے نے نیوتا بھیجا تھا مجھے بلانے کے لیے.....'' ہجوم میں سے وقار دو قدم آگے بڑھ آیا ''انہیں میں نے بلایا ہے ابا جان.....'' نواب صاحب گنگ سے رہ گئے ''لیکن کیوں.....؟.....'' وقار کی جگہ کالی نے جواب دیا ''میں بتاتا ہوں..... آپ کا صاحبزادہ اپنا حق چاہتا ہے جو آپ اسے دے نہیں رہے..... اسی لیے اسے ہماری مدد کی ضرورت پڑی ہے اور کالی کی سرکار نے تو ہمیشہ حق داروں کو ان کا حق دلایا ہے۔ لہٰذا اب حویلی اور جائیداد کا بٹوارہ کر ہی دو تو بہتر ہے نواب صاحب.....''

حویلی کی خواتین اور ملازموں کی جانب سے دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ سارنگا کے اشارے پر نواب صاحب نے ناہید سمیت دیگر خواتین کو واپس زنانے میں جانے کا کہہ دیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ وقار نے اپنے اوباش دوست رئیس کے مشورے پر کالی کو اپنے حصے اور جائیداد کے بٹوارے کے لیے طلب کیا تھا۔ نواب خاتون کی وصیت اور موت بھی اس ناخلف اولاد پر کوئی اثر نہیں کر سکتی تھی۔ نواب صاحب سر پکڑے بیٹھے تھے اور پاشا صاحب انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔ کچھ دیر میں رئیس بھی وہیں بھٹکتا نظر آیا۔

رنگا نے کالی کو مخاطب کیا ''دیکھ کالی..... یہ باپ بیٹے کا جھگڑا ہے..... اس میں تو اپنی ٹانگ نہ ہی اڑا تو بہتر ہے.....'' کالی نے وقار کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''نہ رنگا استاد نہ..... ابھی تو میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرے علاقے کے کسی گھریلو جھگڑے میں تیرا یہ بانکا کہاں سے

ٹپک پڑا.....؟..... ابھی تو تیری پیشی اپنی کابینہ کے سامنے ہونی باقی ہے.....اور تو جانتا ہے کہ کالی کے قدم ایک بار جس چوکھٹ کو پار کر جائیں..... وہاں کا قصہ نپٹا کر ہی پلٹتے ہیں.....نواب صاحب بٹوارہ کردیں تو کالی اپنا حصہ لے کر ابھی پلٹ جائے گا....."

رنگا کا پارہ چڑھ گیا" کتنے میں سودا کیا ہے تجھ سے اس نواب زادے نے.....گدھ آخر گدھ ہی ہوتا ہے کالی.....حرام اور مردار خوری سے باز نہیں آتا....."

نواب صاحب کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی" تم سے وقار نے جیتنے کا وعدہ کیا ہے وہ میں تمہیں یونہی دینے کو تیار ہوں.....میں نہیں چاہتا کے حویلی کے جھگڑے باہر کچہری اور عدالتوں میں طے ہوں۔تم اپنا معاوضہ لو اور واپس لوٹ جاؤ....."

کالی نے زہر خند انداز میں نواب کو دیکھا" ایسے کیسے واپس لوٹ جاؤں نواب صاحب.....اپنے دھندے کا اصول ہے کہ کام لے لو تو پورا کر کے ہی جاؤ.....ہاں اگر رسوائی کا ایسا ہی خوف ہے تو ٹھیک ہے ایک سودا کر لیتے ہیں۔آپ یہ زمرد حویلی نواب زادے کے نام کردو اور رنگا استاد سے کہو کہ وہ اپنا علاقہ میرے حق میں خالی کر جائے.....پھر کچھ بات بن سکتی ہے.....بولو.....منظور ہے یہ سودا.....؟"

کالی کی بات سن کر ماحول پر ایک سناٹا طاری ہوگیا۔رنگا نے کالی پر طنز کیا" واہ رے کالی.....بل سے علاقہ نہ حاصل کر سکا تو اب چھل پر اتر آیا.....پھر بھی خود کو استاد کہتا ہے.....تف ہے تیری مردانگی پر....."

کالی مسکرایا" استاد وہی ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر ٹھیک ہتھیار استعمال کرتا جانتا ہو.....چھل کے وقت چھل اور بل کے وقت بل.....ہر جگہ طاقت ہی کام نہیں آتی رنگا استاد.....میں تو کہتا ہوں تو بھی کچھ وقت میری صحبت میں گزار لے.....فائدہ ہوگا" دفعتہً نواب کی آواز ابھری" حویلی کا بٹوارہ ہو بھی گیا تو یہ دو بھائیوں میں تقسیم ہوگی۔ان کی سوتیلی بہن اور ماں پہلے ہی اپنے حصے سے دست بردار ہو چکی ہیں۔اگر دونوں بھائی اس تقسیم کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے.....یہ کام بھی ہو جائے گا....." چھوٹا بیٹا سجاد اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔کہتے ہیں کہ شر میں سے بھی کبھی خیر کا پہلو نکل آتا ہے، اور اس وقت یہ بات سچ ثابت ہوتی نظر آرہی تھی۔سجاد نے مجبور باپ کے ساتھ کاندھا ملایا اور تن کر بولا" مجھے کچھ نہیں چاہئے.....یہ فیصلہ ابا جان کا ہوگا کہ وہ حویلی کا کیا انجام چاہتے ہیں۔میں ہر صورت ابا جان کے ساتھ ہوں....." نواب کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے سجاد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا" کاش.....میرے دونوں بازو آج میرے ساتھ ہوتے.....جیتے رہو سجاد بیٹا....." کالی نے زور سے ایک تالی بجائی" چلو جی.....یہ مسئلہ تو حل ہوا۔چلو نواب صاحب.....اب جلدی سے اسٹامپ پیپر اور قلم منگوا کر اس قصے کو ختم کرو.....میں اپنا حساب بعد میں نواب زادے سے خود کر لوں گا....."

نواب صاحب نے لمبی سی سانس بھری اور پاشا صاحب کو کچھ کہنے کے لیے مڑے.....لیکن ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رنگا کی کڑک دار آواز گونجی....." ٹھہر جا کالی بادشاہ ایسی بھی کیا جلدی ہے.....ابھی کچھ دیر پہلے تو تجھے میرا علاقہ بھی بھیک میں چاہئے تھا، اتنی جلد صرف حویلی پر ہی راضی ہوگیا.....؟ ایک سودا تو نے پھینکا تھا۔اب ایک سودا رنگا کا بھی سن لے.....یہ حویلی اور میرا علاقہ چاہئے تو فیصلہ چاقو کے بل پر ہوگا.....تو مجھ سے بچ گیا تو میرا سارا علاقہ اور یہ حویلی تیرے نام ہو جائے گی اور اگر بازی میرے نام رہی تو پھر تجھ سے تیرا علاقہ تو جائے گا ہی.....ساتھ میں ہمیشہ کے لیے در بدر بھی ہو جائے گا.....بول منظور ہے رنگا کا یہ سودا....."

زیرِ زمین دنیا کے اصول کے مطابق کالی کے پاس اس للکار کے جواب میں سوائے ہاں کرنے کے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے بہت سے کارندوں کے سامنے رنگا نے اسے چیلنج کیا تھا اور یہ بات اب چھپنے والی نہیں تھی۔ رنگا نے بہت بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ چاقو پر گرفت کے معاملے میں کالی بھی رنگا سے بس انیس بیس ہی تھا اور کون جانے کہ اس نے خود رنگا کو اکسانے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا ہو، کیونکہ ان کی دنیا کے قانون کے مطابق ایک بار جب کوئی علاقہ کسی کے نام ہو جائے تو ہارنے والا حریف کم از کم دو سال تک دوبارہ اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ دوسرا فریق خود اسے چیلنج نہ کر دے۔ رنگا کو کالی سے وہ علاقہ چھینے ابھی صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور شاید کالی اس ہزیمت کو بھلا نہیں پایا تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا جب رنگا زچ ہو کر خود کالی کے مقابل آ جائے۔ اگر زمرد حویلی کا قصہ درمیان میں نہ آتا تو شاید کالی کا یہ خواب کبھی پورا نہ ہوتا، لیکن قدرت نے وقار کی نافرمانی کی صورت میں اسے یہ موقع جلد فراہم کر دیا۔ اچانک میری نظر اس سازش کے مرکزی کردار رئیس کے چہرے پر پڑی، اور اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور کالی کے ساتھ ہوتے اشاروں نے مجھے یہ بھی باور کرا دیا کہ رئیس کو کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی نواب کے بڑے بیٹے پر دوستی کا جال پھینکنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ مطلب کالی کی نظر شروع سے ہی زمرد حویلی پر تھی جب میرے اور رنگا کے قدم بھی یہاں نہیں پڑے تھے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ آگے چل کر یہ کروٹ لے لے گا۔ اب جانے یہ ان کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ سارنگا بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ کالی کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ ابھری جیسے اسے اپنا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا ہو۔

''ٹھیک ہے رنگا استاد..... جیسے تمہاری مرضی..... آج ہی یہ خبر نیچے کے سب بڑوں تک پہنچ جائے گی..... تم دنگل کی تاریخ اور جگہ طے کر لو.....'' رنگا نے سکون سے جواب دیا ''تاریخ میں دیتا ہوں..... آج ہفتہ ہے..... اگلے ہفتے کے روز اسی وقت، جگہ بھی تمہاری اور علاقہ بھی تمہارا ..... جا..... جا کر اپنی بربادی کی تیاری کر لے.....''

نواب صاحب پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز میں سراسیمگی تھی ''رنگا بھائی آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... آپ کے اس حویلی پر پہلے ہی کئی احسان ہیں اور میں خود یہ حویلی وقار کے نام کرنا چاہتا ہوں..... اب تو سجاد بھی اپنے حق سے دست بردار ہو گیا ہے..... کوئی الجھن باقی نہیں رہی..... پھر آپ یہ سب کیوں.....''

رنگا نے نواب کی بات کاٹ دی ''ہمارے سامنے کوئی مردار خور آپ کی حویلی چھین کر لے جائے..... ایسا کیسے نواب صاحب..... اور پھر بعد میں وہ نواب زادے کے پاس ہی رہے گی اس کا آپ کو کیا پتہ.....؟.....'' اس کے اتنے حصے بخرے ہوں گے کہ خود آپ کے بیٹے کے ہاتھ میں صرف وراثت کا کاغذ رہ جائے گا..... اب جو ہوگا، سو دیکھا جائے گا.....'' کالی اور وقار دونوں واپس جا چکے تھے۔ رنگا نے بھی پریشانی میں گھرے نواب سے رخصت چاہی اور اسے تسلی دے کر ہم ناہید کو لے کر شہر لوٹ آئے۔ ناہید کے چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ موسیٰ اور سارنگا یعقوب مینشن جا چکے تھے۔ میں اسماعیل کے ساتھ ناہید کو گھر اتارنے کے بعد واپسی کے لیے پلٹا تو ناہید نے آواز دے کر مجھے روک لیا ''آیان بھیا.....'' میں جاتے جاتے رکا..... ''ہاں بولو.....؟''

ناہید کسی کش مکش کا شکار تھی ''آپ بابا کو یہ سب کرنے سے روک کیوں نہیں دیتے..... میرا دل اندر سے کانپ رہا ہے.....'' اس کی آواز روہانسی ہو گئی۔ ''ارے ارے..... یہ کیا.....؟ اتنے بہادر باپ کی بیٹی یوں پریشان ہو رہی ہے..... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا.....'' ناہید رو پڑی ''یہ

خوف آج کا نہیں ہے بھائی..... بچپن سے میں دن میں اس خوف اور ان وسوسوں کے ہاتھ سو سو بار مرتی آئی ہوں اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میں اپنا ایک بھائی پہلے ہی کھو چکی ہوں۔ اب کوئی اور نقصان سہہ نہیں سکتی۔ میری آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ اس اندھیری دنیا کو چھوڑ دیں۔ جس کا اندھیرا انسان کا ہر رشتہ نگل جاتا ہے۔ میں آپ دونوں کے ہاتھ جوڑتی ہوں..... میری یہ التجا مان لیں" ناہید واقعی ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کے بندھے ہاتھ کھول دیے" بہنیں ہاتھ نہیں جوڑتیں..... بس حکم دیا کرتی ہیں..... میں اور تمہارے بابا..... شاید ہم دونوں ہی اپنی مرضی سے اس دنیا کا حصہ نہیں بنے..... ہمیں ہماری دنیا نے دھکیل کر ان اندھیروں کا حصہ بنایا ہے..... لیکن اتنا یقین رکھو کہ تمہارے بابا اس کالی دنیا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اندر سے بہت اجلے ہیں..... اپنے اوپر جھوٹ کی سفیدی کا ملمع چڑھائے ہوئے ظاہری دنیا کے ان منافقوں سے کہیں زیادہ سچے ہیں....."

"میں جانتی ہوں..... اسی لیے تو زیادہ ڈرتی ہوں کہ ان کی دنیا میں ان جیسے ظرف والے بہت کم ہیں اور اگر کسی کم ظرف نے انہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو میں جی نہیں پاؤں گی۔ وہ آپ کی بہت سنتے ہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ ان سے بات ضرور کریں گے....."

"ٹھیک ہے..... وعدہ کرتا ہوں..... اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ جب تک میں ان کے آس پاس ہوں کسی بھی خطرے کو مجھ سے ہو کر ان تک پہنچنا ہوگا۔ چلو اب تم یہ اداسی پیریڈ ختم کرو..... اور مجھے ہنستے ہوئے رخصت کرو....."

میں ناہید کو تسلی دے کر وہاں سے چلا تو آیا مگر خود میرا دل اندر سے انجان وسوسوں کا شکار تھا۔ یعقوب مینشن میں کافی چہل پہل تھی۔ خبر عام ہو چکی تھی کہ ٹھیک چھ دن بعد رنگا اور کالی ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے۔ بڑے احاطے میں سارنگا موسیٰ کے ساتھ مشق میں مصروف تھا۔ میں نے پہلی بار رنگا کے ہاتھ میں چاقو کی دھار کو بجلی کی طرح ادھر ادھر لپکتے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ "آجا ساجن..... تو بھی کچھ ہاتھ صاف کر لے..... موسیٰ تو اب بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے بہت انکار کیا مگر موسیٰ نے اپنا چاقو میری طرف پھینک دیا اور خود دائرے سے باہر نکل گیا۔ احاطے کے بزرگ استادوں نے بھی موسیٰ کو بڑھاوا دیا اور یوں بھی اس شرارت میں شامل ہوتے چلے گئے، لیکن میں رنگا کے سامنے چاقو کیسے اٹھا لیتا؟ میں نے چاقو اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ رنگا اب بھی مسکرا رہا تھا" جانتا ہوں تو میرے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہتا۔ پر مجھے ذرا دیر مشق تو کروا سکتا ہے نا..... ہر نیا حریف پچھلے کو کچھ نہ کچھ سکھا ہی جاتا ہے..... چل اب آجا..... میں نے تجھے اپنا خون معاف کیا....." میرے پاس اب کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ مجبوراً میں نے رنگا کے قدموں میں پڑا چاقو اٹھا لیا، اور کرتے کی آستینیں چڑھا کر دائرے میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک میں اور رنگا ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے اور پھر رنگا نے تیزی سے چاقو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ میں نے اچانک ہی غیر ارادی طور پر چاقو کو یوں منتقل ہوتے دیکھ کر رنگا کی بائیں کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ شاید ہم میں سے کسی کو بھی مجھ سمیت میری اس پیش رفت کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ یہ انتہائی اقدام تھا۔ رنگا کو بھی مجھ سے اس پھرتی کی توقع ہرگز نہ تھی اور ایک لمحے کے لیے اس کی کلائی میرے پنجے کی مضبوط گرفت میں آ گئی لیکن تب تک رنگا کا چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شور مچاتا مجمع یک دم ساکت سا ہو گیا۔ اب میرا دایاں ہاتھ اور چاقو آزاد تھا اور جو فن چاقو بازی سے واقف ہیں وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ حریف کا چاقو والا ہاتھ قابو میں کر لینے کے بعد اگر دایاں ہاتھ وار کے لیے کھلا ہو تو یہ ایک بونس پوائنٹ مانا جاتا ہے، اور وار کرنے کی آزادی بازی ختم بھی کر سکتی ہے، لیکن میری گرفت صرف لمحاتی ثابت ہوئی۔ رنگا نے لمحے کے

ہزارویں حصے میں میری چال سمجھ کر اپنی کلائی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور یہیں مجھ سے بنیادی غلطی ہوگئی۔ قاعدے کے مطابق مجھے فوراً ہی رنگا کے چاقو کی پہنچ سے دور ہو جانا چاہئے تھا، لیکن مجھے ایک پل کی دیر ہوگئی اور چاقو کے کھیل میں ایک پل ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگلے ہی لمحے رنگا کے چاقو کی تیز دھار میرے بازو کو کلائی سے اوپر کہنی تک چیرتی چلی گئی۔ خون کی ایک تیز پھوار نے رنگا کا چہرہ اور میرا سارا وجود رنگ دیا۔ ایک شور سا مچ گیا رنگا نے چاقو پھینک کر اپنا کرتہ دامن سے پھاڑا اور جلدی سے میرے بازو پر باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔ موسیٰ نے لپک کر قریب پڑی زہر کش دوا کا سپرے میرے زخم پر کر دیا اور مجھے اپنے گھاؤ میں تیز مرچیں سی بھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سارنگا نے فوراً گاڑی نکلوائی اور موسیٰ اور دوسرے کارندوں سمیت مرہم پٹی کے لیے مجھے قریبی کلینک لے جایا گیا۔ سبھی بے حد پریشان تھے لیکن رنگا اور موسیٰ کی بوکھلاہٹ سب سے سوا تھی۔ بڑی مشکل سے واپس پہنچ کر میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ میں اب کافی بہتر ہوں اور ہفتہ دس دن میں یہ گھاؤ بھی بھر ہی جائے گا۔ لیکن انہیں بھلا میری تسلی سے آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ رنگا بار بار خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اس نے مجھے دائرے میں اترنے پر مجبور ہی کیوں کیا۔ وہ بار بار کف افسوس مل رہا تھا ''بڑی بھول ہوگئی رے سنجاں..... پر تو نے تو پہلا داؤ ہی ایسا کھیل دیا تھا کہ آدھی جیت اپنے نام کر لی تھی۔ رنگا کی کلائی پر آج تک کسی نے ہاتھ ڈال کر پنجہ بند کرنے کی مہلت نہیں پائی..... پر تو نے تو مجھے جکڑ ہی لیا تھا۔ پر واپس پلٹنے میں دیری کیسے ہوگئی تجھ سے میں تو سمجھا تھا کہ اسی پھرتی سے تو ہاتھ واپس بھی کھینچ لے گا.....''

میں نے اسے تسلی دی ''آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔ کھیل میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے..... اور پھر جب چاقو اٹھا ہی لیا تو پھر کاٹ سے کیسا ڈر..... دھار کا تو کام ہی چیر دینا ہوتا ہے.....''

''ٹھیک کہتا ہے تو..... پر دھار اگر اپنوں کو چیرے تو ایسی دھار کو پہلے سے کند کرنا ضروری ہوتا ہے.....'' میں نے غور سے سارنگا کی طرف دیکھا۔

''دھار بھلا اپنے پرائے کا فرق کرنا کب جانتی ہے..... اپنے اگر ہاتھ روک بھی لیں تو پرائے کاٹ ڈالتے ہیں..... ہماری دنیا کا تو یہی اصول ہے نا.....'' میری بات سن کر رنگا اور موسیٰ دونوں ہی کسی گہری سوچ میں گم ہوگئے۔ موسیٰ سے پہلے رنگا بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ''لگتا ہے آج تو بھی لاڈلی کی زبان بول رہا ہے..... یہ اسی کی بولی ہے'' میں نے اقرار میں سر ہلایا اور رنگا کو ناہید کے سبھی وسوسوں اور پریشانیوں سے آگاہ کر دیا۔ جواب میں رنگا بہت دیر تک خاموش رہا۔

''تو نے اسے بتایا نہیں کہ یہ کالی دنیا ایک ایسی بند سرنگ کی مانند ہے جہاں اندر آنے کے ہزار پر واپسی کا ایک بھی راستہ نہیں ہے۔ وہ بھولی یہ بھی نہیں جانتی کہ زور کی اس دنیا میں صرف زور آور ہی جیتا ہے۔ جو تھک کر قدم واپس موڑے اسے یہ خود مار ڈالتے ہیں'' میں دھیرے سے بولا ''میں نے اسے یہ سب کچھ نہیں بتایا..... ابھی اس کے پاس ایک خواب باقی ہے کہ اس کا بابا کبھی نہ کبھی اس دنیا سے لوٹ آئے گا۔ اگر میں یہ سب بتا کر اس کا یہ خواب بھی توڑ دیتا تو پھر شاید وہ بالکل ہی ہار جاتی۔ اس کے پاس یہ آس باقی رہنے دیں.....''

ماحول پر یاسیت طاری ہونے لگی۔ رنگا اور موسیٰ میرے کمرے سے باہر نکلے تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، اور پھر دن اور رات آپس میں ملتے چلے گئے۔ میرا زخم تو ٹھیک نہ ہوا پر وہ دن آ پہنچا جب کالی اور رنگا کو شاید آخری بار ایک دوسرے کے مقابل آنا تھا۔

باب28

ہم سب اپنی اپنی جگہ گاڑیوں میں یعقوب مینشن سے نکلے تو موسیٰ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ ہم سب زمرد حویلی کے بیرونی میدان کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے موسیٰ سے اس کے دھیمے پن کی وجہ پوچھی تو اسے کچھ الجھا ہوا سا پایا۔ ''کچھ نہیں شہزادے.....رنگا استاد پچھلا پورا ہفتہ تیرے زخم کی پریشانی میں من لگا کر مشق نہیں کر پایا.....دراصل جب سے ناہید بٹیا جوان ہوئی ہے ویسے بھی اس کے اندر کا وہ رنگا کہیں کھو گیا ہے جو اپنے شکار پر جھپٹ کر اسے پہلے ہی وار میں ادھیڑ ڈالتا تھا۔ اب استاد صرف اس وقت وار کرتا ہے جب ضرورت ہوتی ہے.....اور کالی جیسے خبیث کے ساتھ مقابلہ کرتے وقت یہ دیری بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے.....'' میں پریشانی سے موسیٰ کی بات سنتا رہا۔ موسیٰ کے کہنے کے مطابق چاقو بازی کے مقابلے میں انسان کے اندر مقابل کو مار دینے کی فطری جبلت(Killer instinct) کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کلر انسٹینکٹ کے بغیر کوئی بھی اپنے مقابل کے سامنے ادھورا پڑ جاتا ہے اور رنگا کے اندر سے یہ حیوانی جبلت بیٹی کے جوان ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ زیادہ تر اپنا دفاع کر کے مقابلے کو لمبا کرتا ہے اور حریف کے تھک جانے پر اسے کم سے کم نقصان پہنچا کر زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر رنگا کا حریف کوئی عام چاقو باز ہوتا تو یہ سستی برداشت کی جا سکتی تھی لیکن آج اس کے مقابل کالی جیسا شاطر اور کائیاں حملہ آور تھا۔ موسیٰ کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ خدانخواستہ آج کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ بقول اس کے جب رنگا نے کالی سے اس کا یہ علاقہ چھینا تھا تب بھی رنگا نے مقابلہ بہت لمبا کھینچ دیا تھا اور وہ کالی کے چاقو کی زد میں آنے سے کئی بار بال بال بچا تھا۔

میں موسیٰ اور اسماعیل ایک گاڑی میں، جب کہ سارنگا اڈے کے دیگر استادوں کے ساتھ اگلی گاڑی میں تھا۔ ہمارے پیچھے تین اور بڑی گاڑیاں بھی دیگر کارندوں کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ کالی نے مقابلے کے لیے زمرد حویلی کے باہر والے بڑے میدان کو چنا تھا۔ شاید وہ اس طرح رنگا پر کوئی نفسیاتی دباؤ بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ ہم صبح گیارہ بجے سے پہلے زمرد حویلی کے بیرونی میدان میں پہنچے تو کالی اپنے ہرکاروں سمیت پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب اور پاشا بھی حویلی کے تمام عملے کے ساتھ باہر آ چکے تھے اور مجھے دور حویلی کی فصیل پر بھی کچھ چہل پہل نظر آئی۔ شاید خانم اور فضہ بھی منڈیر کی کسی بڑی درز سے یہ عجیب و غریب اور خونی مقابلہ دیکھنا چاہتی تھیں جس کی ہار یا جیت پر ان کی جدی پشتی حویلی کے قبضے کا دارومدار تھا۔ کچھ ہی دیر میں میدان میں سفید قلعی سے ایک دائرہ ڈال دیا گیا۔ آج اس میدان میں رنگا اور کالی کی سرکار کی پوری کابینہ، ریٹائرڈ ٹائپ بزرگ استاد اور زیر زمین دنیا کے سبھی دادا مدعو تھے اور مقابلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں ایک بہت ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک بوڑھے استاد(Don) نے دائرے میں کھڑے ہو کر سارنگا کا دیا ہوا چیلنج پڑھ کر سنایا اور تصدیق چاہی۔ رنگا نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے مقابلے کے اصول پڑھ کر سنائے اور کسی بھی فریق کی جان جانے کی صورت میں کسی بھی خوں بہا یا کو توالی کے حق کی نفی ظاہر کی۔ یعنی یہ کھیل زیر زمین کی سرکار کے رواج کے مطابق کھیلا جائے گا۔ آخر دائرے کے اندر کھڑے بزرگ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک سرخ رومال لہرایا اور رنگا اور کالی دائرے میں داخل

ہوگئے۔ بزرگ استاد نے ہوا میں تین بار رومال لہرایا۔ سینیٹ اراکین نے صوفے سنبھال لیے اور ہاتھ اٹھا کر اجازت دی۔ بزرگ نے رومال ہاتھ اونچا کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ موسیٰ زور سے چلایا "کچل ڈالو استاد....." میرے دل سے آواز نکلی "یا اللہ رحم....." نواب اور حویلی کے باقی مرد اراکین اور عملہ حیرت اور پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ شاید ان کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دن تھا۔

چاقو نکالنے سے پہلے رنگا اور کالی میں زور کا مقابلہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے دو چٹانیں اپنی اپنی جگہ جامد کھڑی ہوں۔ نہ تو رنگا اور نہ ہی کالی اپنی جگہ سے انچ بھر بھی ہلے۔ دونوں کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلکنے لگیں اور میں اتنے فاصلے سے بھی ان دونوں کے بازوؤں کی رگیں چٹخنے کی آواز سن سکتا تھا۔ کالی کے اندر واقعی بڑا دم خم تھا کیوں کہ سارنگا استاد کے سامنے اتنی دیر ٹک پانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرے اندر موسیٰ کی ڈوبتی آواز ابھری "استاد کو اپنے اندر پھر سے مار دینے کی حیوانی جبلت پیدا کرنا ہوگی..... ورنہ کالی انہیں مار دے گا....." زور کا مقابلہ بنا کسی نتیجے کے ختم ہوگیا۔ ایک کارکن گول طشت میں دو چاقو رکھ کر بزرگ رہنما کے پاس آیا۔ بوڑھے استاد نے دونوں چاقوؤں کو چھو کر اپنی دعا اور اجازت ظاہر کی۔ طشت رنگا اور کالی کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے ایک ایک چاقو اٹھا لیا اور اسے چوم کر کھٹکے سے کھول لیا۔ ہم سب یوں دم سادھے کھڑے تھے جیسے اگر کسی نے بھی ذرا زور سے سانس بھی لی تو یہ خواب بکھر جائے گا۔ دونوں حریفوں نے کچھ دیر تک فضا میں تیزی سے چاقو لہرا کر اور پینترے بدل کر ایک دوسرے کے داؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر یکایک کالی نے ہوا میں اپنے اچھالے چاقو کو دوسرے ہاتھ تک پہنچنے سے قبل ہی ہوا میں دوبارہ دبوچ لیا۔ عام حالات میں حریف دائیں سے بائیں ہاتھ تک چاقو کے سفر کا وقت شمار کر کے پینترا بدلتا ہے لیکن کالی کی تیزی دیکھ کر میں خود بھی ششدر رہ گیا۔ اگر عین لمحے پر رنگا اپنے اوپری جسم کو فوراً پیچھے نہ جھکا لیتا تو کالی کا چاقو ضرور اس کے سینے کے آر پار ہو جاتا۔ فضا میں کالی کے حمایتیوں کے نعرے اور رنگا کے ساتھیوں کی بے چین سرگوشیاں ابھریں۔ موسیٰ نے بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخائیں "دھیان سے رنگا استاد" اس کی اپنے آپ سے کی گئی یہ سرگوشی صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ رنگا نے خود کو اگلے ہی پل سنبھال لیا، اور اس نے نظروں نظروں میں کالی کو داد بھی دی، اور ابھی کالی رنگا کی نظروں کی داد ہی سمیٹ رہا تھا کہ رنگا کا ہاتھ اسی تیزی سے لہرایا کہ کالی کو جھکنے کا وقت بھی نہیں ملا مگر رنگا نے شاید جان بوجھ کر چاقو کی نوک کو صرف چھونے کی استعداد تک بڑھایا تھا۔ زیادہ قریب آنے میں کالی کے چاقو کی زد میں آنے کا خطرہ بھی اس کے پیش نظر ضرور ہوگا، لیکن اس نپے تلے وار میں بھی وہ کالی کے کرتے میں سینے کی جگہ ایک بڑا سا سوراخ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب چیخنے کی باری رنگا کے حامیوں کی تھی۔ موسیٰ زور سے چلایا "واہ استاد واہ..... کاٹ ڈالو اس حرام خور کو یہیں....."

اپنے پھٹے کرتے کو دیکھ کر کالی کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے پے در پے رنگا پر کئی آڑھے ترچھے وار کیے۔ دور سے ہمیں فضا میں چاقو کی دھار اوھر اوھر لپکتی نظر آ رہی تھی، لیکن رنگا اس بار پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے خود کو دائیں بائیں جھکائیاں دے کر بڑی مہارت سے کالی کے چاقو کی پہنچ سے دور رکھا اور پھر وقت جیسے تھم سا گیا۔ دونوں حریف ایک دوسرے پر جھپٹتے اور وار کرتے رہے۔ گھنٹہ بھر ہونے کو تھا۔ دونوں کے چاقو کی نوکیں اب ایک دوسرے کو چھونے لگی تھیں۔ فضا میں دونوں کے خون کے چھینٹے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اچھل جاتے تھے۔ دونوں ہی لہولہان ہو چکے تھے ہر گھاؤ پر نواب صاحب اپنی آنکھیں میچ لیتے تھے اور پاشا صاحب کی تسبیح اور زیر لب پھونکی جانے والی دعائیں تیز تر ہو جاتی تھیں۔ موسیٰ اب باقاعدہ

التجا کرنے لگا تھا'' استاد.....لمبا مت کھینچو.....بس کاٹ ڈالو.....'' لیکن کالی بھی رنگا کے وار کی زد میں کب آنے والا تھا۔ تھکن دونوں کے چہروں سے واضح تھی اور دونوں کی نظر ایک پل کے لیے بھی دوسرے حریف سے نہیں ہٹی تھی۔ دفعتہً کالی نے اپنا چاقو ابتدائی حملے کے انداز میں ہی دوبارہ فضا میں اچھالا۔ شاید وہ اس بار بھی رنگا کو بائیں ہاتھ کا جھانسا دے کر چاقو کو دائیں ہاتھ سے ہی فضا میں دبوچ کر پھر سے وہی اپنا آزمودہ نسخہ آزمانا چاہتا تھا لیکن جانے رنگا نے اس کی آنکھوں میں کیا پڑھ کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹھیک جس طرح میں نے رنگا کے چاقو فضا میں بلند کرتے ہی اپنا آزاد پنجہ رنگا کی کلائی پر ڈال دیا تھا رنگا نے بھی اپنا پنجہ کالی کی اس کلائی پر ڈال دیا جس کی طرف اس نے چاقو اچھالا تھا شاید کالی کے ذہن میں بھی یہی چال تھی کہ اس بار وہ رنگا کو دھوکہ دے کر چاقو والی دوسرے ہاتھ میں تھام کر رنگا کو کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ رنگا اس کا وہی ہاتھ دبوچ لے گا۔ کالی کا چاقو اور رنگا کا پنجہ ٹھیک ایک ہی وقت میں کالی کی ہتھیلی اور کلائی سے ٹکرائے۔ کالی کی کلائی رنگا کی گرفت میں آئی اور فضا میں ہڈی تڑخنے کی آواز گونجی۔ کالی کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نظر آئے لیکن رنگا کی گرفت سے اپنی کلائی نکالنا اس کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ رنگا کی نظر میری نظر سے ٹکرائی اور اس نے اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے میرا داؤ اب بھی یاد ہے۔

دوسرے ہی لمحے اس نے کالی کی کلائی موڑ دی اور اس کے پنجے میں جکڑا چاقو ناکارہ ہو گیا۔ ہجوم چلا رہا تھا'' کاٹ ڈال رنگا استاد.....ختم کر دے.....مار ڈال اسے.....'' رنگا کالی کا بازو پشت پر موڑنے کے بعد اب خود اس کے عقب میں یوں کھڑا تھا کہ اس کا چاقو کالی کی شہ رگ کو چھو رہا تھا۔ ہجوم کا شور بڑھتا گیا رنگا کے حمایتی چیخ چیخ کر اسے کالی کی شہ رگ پر چاقو پھیر دینے کی دہائی دے رہے تھے۔ کالی نے ایک نظر سب کو دیکھا، اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کالی نے بھی آنے والی قضا کے استقبال میں اپنی آنکھیں موند لیں اور دوسرے ہی لمحے رنگا نے کالی کی شہ رگ پر اپنے چاقو سے عمر بھر کے لیے ایک گہرا نشان ڈال کر اسے لات مار کر سفید دائرے سے باہر دھکیل دیا۔ کالی مقابلہ ہار چکا تھا لیکن رنگا نے اس کی جان بخش دی تھی۔ کالی دائرے کے باہر ہی تھکن اور زخموں سے چور نڈھال سا پڑا رہا اور پھر سب سے پہلے موسیٰ چلاتے ہوئے رنگا کی طرف دوڑا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا پھر تو یکے بعد دیگرے سبھی رنگا کی طرف لپکے اتنا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نواب صاحب نے شکرانے کے طور پر وہیں اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے اور پاشا صاحب کی تسبیح رک گئی۔ خود سارنگا کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اور اس کے زخموں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ نواب صاحب نے احتیاط کے پیش نظر اپنے ذاتی معالج کو ایمبولینس سمیت پہلے ہی سے وہاں بلا رکھا تھا، لیکن رنگا واقعی اعلیٰ ظرف دشمن تھا۔ اس نے خود سے پہلے معالجین کو کالی کی طرف بھیجا۔

سارنگا کو فوراً حویلی کے مردانے میں منتقل کر دیا گیا لیکن رنگا کی حالت سنبھلنے میں تین روز لگ گئے۔ نواب صاحب کے معالجین نے موسیٰ کو آخری لمحے تک یہی مشورہ دیا کہ وہ رنگا کو فوراً کسی بڑے ہسپتال لے جائے لیکن اڈے کی مصلحتوں کے تحت موسیٰ نے حویلی میں ہی علاج جاری رکھنے پر زور دیا۔ وہ تو رنگا کو لے کر فوراً یعقوب مینشن پہنچنا چاہتا تھا لیکن نواب صاحب نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر موسیٰ کو رنگا کا علاج زمرد حویلی میں ہی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے روز ناہید کی بے انتہا ضد پر اسماعیل اسے بھی زمرد حویلی لے آیا۔ حالانکہ اسے سارنگا کی شدید ناراضگی کا بھی علم تھا

لیکن اس سے ناہید کی حالت بھی نہیں دیکھی گئی۔ ناہید نے رنگا کو پیٹوں میں جکڑا یوں بستر پر پڑے دیکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی باپ کے گلے لگ گئی۔ رنگا اسے روکتا ہی رہ گیا "یہ حرام خور اسماعیل کبھی نہیں سدھرے گا..... اب کیوں روتی ہے ری..... لاڈلی کا بابا ابھی بالکل ٹھیک ہے..... بس چند کھرونچیں ہی تو آئی ہیں....." لیکن ناہید کی آنکھوں کا ساون اب تھمنے کا نام نہ لیتا تھا وہ سارنگا کے بستر سے ہٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے زنانے سے خانم کو بلوا کر اسے رات گزارنے کے لیے ان کے ساتھ بھیجا گیا۔ سارنگا کی کچھ دیر کے لیے آنکھ لگ گئی تو میں بھی دبے پاؤں باہر حویلی کے دالان میں آ گیا۔ رات کے اندھیرے میں چمکتے تارے اور کھلا آسمان بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ یہ رات نہ ہوتی تو تاروں کو بھی یہ چمک نصیب نہ ہو پاتی۔ ہم ظاہر پرست انسان ہمیشہ چاند اور ستاروں کی خوبصورتی کو سراہتے ہیں کبھی کسی کی یہ نظر اس رات کی سیاہی پر کیوں نہیں پڑتی جس کے دان کے بغیر یہ جھرمٹ یہ آنچل کبھی جگمگا ہی نہ پاتا۔ شاید دنیا کی ہر چمک کسی اندھیرے کی قربانی کی مرہون منت ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم چلتا ہوا نہر کی پرلی جانب جا نکلا تب مجھے خیال آیا کہ میں چلتے چلتے زنان خانے کے عقب میں بہتی نہر کی شاخ کے قریب آ پہنچا ہوں۔ حویلی کے محافظوں نے بھی مجھے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کی نظر میں اب ہم سب بھی حویلی کے ہی فرد تھے لیکن خود مجھے تو احساس تھا کہ حویلی کی چار دیواری کے اندر کی حد بندیوں کا خیال رکھنا اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے میں جلدی سے واپسی کے لیے پلٹا اور تبھی میری نظر نہر کے قریب بچھی سنگ مرمر کی سل کے اوپر گم سم سی بیٹھی فضہ کے ہیولے پر پڑی۔ وہ میری آہٹ سن کر چونکی "کون ہے وہاں....." پہلے میں نے سوچا کہ خاموشی سے پلٹ جاؤں کیونکہ اس طرح رات کی تنہائی میں کوئی مجھے فضہ کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ لے تو نہ جانے کیا سوچے گا لیکن پھر بے اختیار میں جواب دے بیٹھا "میں آیان ہوں....." میں چند قدم بڑھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی شرارت تھی۔

"کیا آپ اب تک راتوں کو جاگ کر زمرد حویلی کی حفاظت کرتے ہیں....." میرے ہونٹوں پر بھی مسکان آ گئی "اور کیا آپ ابھی تک اندھیرے میں چھپ کر کتابیں تلاشتی ہیں....." وہ بھی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اور پاس بہتی نہر کے پانی کی جھنکار میں کتنی مماثلت تھی "ہنستی رہا کریں..... اچھی لگتی ہیں....." ہم سنگ مرمر کی سل پر بیٹھ گئے۔ اس نے غور سے میری جانب دیکھا "اب مجھے پتہ چلا کہ آپ اپنے وجود میں اتنی حیرتیں سمیٹے کیسے پھرتے ہیں۔ آپ کے آس پاس بھی لوگ جو اتنے حیران کن ہیں..... میں نے اس روز جو بھی دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سنا تھا کہ پرانے دور میں گلیڈیٹرز ہوا کرتے تھے جنہیں بادشاہ وقت کی تفریح کی خاطر اکھاڑوں میں اتارا جاتا تھا۔ میں وہ مقابلہ دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی دور میں پہنچ گئی تھی لیکن آیان..... مجھے آپ کی بہت فکر ہو رہی ہے..... یہ سب بہت خطرناک ہے..... اور آپ کے بازو پر کلائی کے قریب یہ زخم کیسا ہے..... ضرور یہ بھی ایسی ہی کسی مہم جوئی کی یادگار ہوگا..... یہاں سے جاتے وقت تو آپ کا بازو بالکل ٹھیک تھا....." میں نے بات ٹالنے کے لیے اس سے سوال کیا "لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اتنی رات گئے....."۔

"بس..... نیند نہیں آ رہی تھی۔ ناہید کو موموں نے آج اپنے کمرے میں ہی روک لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سوئی ہے۔ اس لیے میں باہر آ گئی ورنہ موموں سے باتیں کر کے وقت بتاتی....."

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ خاموشی صرف باتیں ختم ہو جانے کے بعد ہی در نہیں آتی۔ کبھی کبھی جب کہنے کے لیے بہت

زیادہ ہو۔تب بھی ہمارے لفظ کھو جاتے ہیں۔ پھر اسی نے لب کھولے ''آیان..... میں آپ سے اپنے اس دن کے رویے کے لیے بھی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں پہلے کبھی شدید دباؤ کے باوجود بھی اتنی جذباتی نہیں ہوئی لیکن جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے یوں ایک لمحے میں ہی آپ کے سامنے اپنا من الٹ کر آپ کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا..... ہو سکے تو مجھے.....'' میں نے اس کی بات کاٹ دی ''آپ حق کی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ بات اگر حق کی ہے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی کسی عنایت کا حق دار نہیں.....'' وہ الجھی گئی ''آخر آپ ایسا کیوں کہتے ہیں..... اگر کسی ایک شخص نے آپ کے کومل جذبے کو پہچاننے میں بھول کر دی تو کیا آپ اس کی سزا زندگی بھر خود سمیت دوسروں کو بھی دیتے رہیں گے.....؟..... کیا کبھی بھی ایسا کوئی نہیں آئے گا جو آپ کے پرانے زخم مندمل کر پائے.....؟..... کیا کوئی گھاؤ ایسا گہرا ہو سکتا ہے کہ اس کا مسیحا ڈھونڈے سے نہ مل پائے۔''

وہ اپنے معصوم سوالات کے جواب کے انتظار میں میرا چہرہ تکتی رہی۔ مسیحا خود گھائل سے شفا کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ تو خود وہ طبیب ہے کہ جس کی ایک شفایاب نظر کی طلب میں ہزاروں مریض عمر بھر اس کی چوکھٹ پر پڑے رہیں۔ پر میرا تو مرض ہی جدا تھا۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے پہلے ہنگامے سے لے کر اب تک ہر بات دھیرے دھیرے بتانا شروع کی۔ امی، ابا، ریحان، چھوٹی، پھر کیفے فراق، میرے دوست، گہنا سے میری پہلی ملاقات، شیخ صاحب، ستارہ، حمید، تنویر اور پھر شوکی کے ساتھ میرا پہلا جھگڑا اور وہاں سے لے کر زمرد حویلی تک کے اس لمبے سفر کی ایک ایک بات اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ درمیان میں سانس لینے کو کہیں رکتا تو صرف سامنے بہتی ندی کے پانی کی سرسراہٹ ماحول کو زندہ رکھتی۔ فضہ خود دم سادھے، بالکل خاموش میری کہانی سنتی رہی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ درمیان میں کہیں ٹوکنے پر میں کچھ بھول نہ جاؤں، اور پھر جب میری داستان ختم ہوئی تو زمرد حویلی کے اونچے برجوں کے درمیان سے صبح کی سپیدی اندھیرے پر غالب آنے کو تھی۔ سچ ہے کہ ہماری زندگی میں اندھیرے یا روشنی سمیت کسی شے کو دوام حاصل نہیں.....

جس طرح ایک بھرپور روشن دن گزار چکنے کے بعد ڈھلتی شام اور رات کا اندھیرا ہمیں اداس کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بھرپور کالی رات اور چاند ستاروں کے ساتھ کے بعد صبح کا دھیرے دھیرے چھاتا ہوا اجالا بھی انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں شب کاٹنے کا لطف تو کوئی کسی شب گزیدہ سے پوچھے۔ ہم دونوں بھی اس رات کے شب گزیدہ تھے اور اب یہ صبح کی آمد ہمیں ایک دوسرے سے نظریں چرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ رات کا فسوں ٹوٹ رہا تھا اور ہماری زبانیں ہمارے الفاظ کا ساتھ دینے پر مائل نہیں تھیں۔ میں نے فضہ سے اجازت چاہی۔ واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو اس نے مجھے آواز دی ''آیان.....'' میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی ''میں اس رات کو زندگی بھر کسی سرمائے کی طرح اپنی یادوں میں سمیٹ کر رکھوں گی..... اب میرے حافظے کو کسی مزید یادداشت کی ضرورت نہ ہو شاید.....'' میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا ''میں اس اعزاز کو ہمیشہ یاد رکھوں گا.....'' میں پلٹ کر چل دیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی ایک شہزادی کی طرح..... اپنی سلطنت کے ایک بنجارے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو صبح کا اجالا زمرد حویلی کے وسیع دالانوں میں اتر رہا تھا۔ شب بیت چکی تھی لیکن یادِ شب ابھی باقی تھی اور شاید سدا باقی رہنے والی تھی۔

.....❁.....

باب29

اور پھر صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو شمن کو فکر مند سا اپنے دروازے کے باہر کھڑا پایا" اچھا ہوا آپ جاگ گئے۔ ناہید بٹیا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سخت تیز بخار نے آگھیرا ہے انہیں۔" میں فوراً لباس تبدیل کر کے شمن کے ساتھ ناہید کے کمرے میں پہنچا۔ خانم خود اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ فضہ مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ شاید وہ دوسری جانب حویلی کے مہمانوں کے ناشتے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ ناہید اپنے پیارے بابا کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر گزشتہ شام سے ہی سخت تناؤ کا شکار تھی اور اس کے ذہنی دباؤ کا کچھ ایسا ہی نتیجہ متوقع تھا۔ میں نے ماحول بدلنے کی خاطر اسے چھیڑا" خود اپنی خدمت کروانے کا خوب بہانہ ہے یہ بخار بھی..... لیکن دھیان رہے ہم یہاں مہمان ہیں بلی....." خانم اور ناہید دھیرے سے مسکرائیں" آیان بھائی..... میں پہلے ہی اپنے میزبانوں سے بہت شرمندہ ہوں..... آپ اور شرمندہ نہ کریں مجھے....." خانم نے پیار سے اسے ڈانٹ دیا" بیٹیاں اپنے گھر میں کبھی پرائی نہیں ہوتیں..... تم میری فضہ جیسی ہی تو ہو....." کچھ دیر میں شمن رنگا کا پیغام لے کر آ گیا اور میں مردانے میں چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی رنگا نے پوچھا" کیسی ہے وہ....." اسے شاید ناہید کی بیماری کی خبر مل چکی تھی" تیز بخار ہے۔ خانم تیمارداری کر رہی ہیں اس کی".....

"اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ لاڈلی یہاں آئے..... اس حرام خور اسماعیل کی کھال کھنچوانی پڑے گی....."

"کس کس کی کھال کھنچوائیں گے آپ..... ان زخموں کے نشان تو جاتے جاتے اپنی داستان سارے زمانے کو سنا جائیں گے..... ناہید کہیں اب آپ کو کھونے کے ڈر سے خود کو ہی نہ کھو دے....." رنگا نے موسیٰ کی طرف دیکھا" دیکھ رہا ہے موسیٰ..... یہ دونوں بہن بھائی اب مل کر میری طنابیں کسنا چاہتے ہیں..... تو انہیں سمجھاتا کیوں نہیں کہ ہمارے دھندے میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا..... اپنی دنیا کے راجہ گدھوں سے جان چھڑا بھی لوں تو پولیس اور کوتوالی ساری زندگی جان نہیں چھوڑے گی۔ باقی ساری عمر یا سلاخوں کے پیچھے ہی کٹ جائے گی..... وہ تو نادان ہے ساجن..... پر تو کیوں نہیں سمجھتا.....؟" ہماری باتوں کے درمیان نواب صاحب بھی پاشا کے ساتھ کمرے میں آ چکے تھے" بھئی کون کس کو نہیں سمجھ رہا.....؟" رنگا نے نواب کو دہائی دی" دیکھو نہ سرکار..... یہ بھی لاڈلی کے ساتھ مل گیا ہے..... کہتا ہے دھندا چھوڑ دوں....." نواب صاحب نے گہری سانس لی" بھائی رنگا استاد..... اس معاملے میں تو میں بھی آیان میاں کا ہی ساتھ دوں گا۔ ہم میں سے کوئی بھی آپ کو اب اپنی جان یوں جوکھم میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو شہر میں رہنے میں کوئی اعتراض ہے تو آپ یہاں میرے پاس رہ سکتے ہیں۔ یہ ناہید بٹیا کا بھی اتنا ہی گھر ہے جتنا ہماری فضہ کا....." سارنگا نے بے چارگی سے موسیٰ کی جانب دیکھا" لو جی..... ہم دو کو رو رہے تھے، یہاں تو بڑے سرکار بھی انہی کے ہم نوا نکلے..... نواب صاحب..... ہماری دنیا میں زور کو سلام پڑتا ہے..... کمزور کو نگل جاتے ہیں..... اور رنگا کا زور اس کے اڈے کے بل پر ہی قائم ہے" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا" بات اگر صرف طاقت کی ہے تو طاقت حاصل کرنے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں مثلاً سیاست..... آپ ہمیشہ بادشاہ

گر بنے رہے اور آپ کے بل پر لوگ تخت حاصل کرتے رہے..... ایک بار خود سیاست کی بادشاہ گری کیوں نہیں اپناتے..... طاقت پھر بھی آپ کے پاس رہے گی..... ہاں البتہ اڈے کی زندگی ترک کرنے کا اور اپنی دنیا کے لوگوں سے کنارہ کشی کا ایک بہت اچھا بہانہ ضرور مل جائے گا.....'' رنگا نے میری بات سن کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑے ''یہ لو..... اب ہمیں کون ووٹ ڈالے گا..... کیوں رے موسیٰ..... تو کھڑا ہوگا میری طرف سے الیکشن میں.....؟ بس تین ماہ ہی باقی ہیں'' موسیٰ نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا ''نہ استاد نہ..... میں نے تو پانچویں بھی پاس نہیں کی..... آج کل تو سنا ہے صرف چودھویں پاس الیکشن لڑ سکتا ہے.....'' رنگا نے ہاتھ پر ہاتھ مارا ''دھت تیرے کی..... میں بھی تو صرف دسویں فیل ہوں..... یہ بیل تو منڈھے نہیں چڑھنے کی سجنوا.....''

رنگا اور موسیٰ دونوں ہی ہنستے رہے۔ اچانک نواب صاحب نے لقمہ دیا ''تو کیا ہوا..... آیان نے بھی تو بی اے کا امتحان دے رکھا تھا۔ شاید نتیجہ بھی نکل گیا ہے..... میرے ذہن میں نہیں رہا اس پریشانی میں..... میں نے کچھ دن پہلے ہی اخبار میں سرخی دیکھی تھی..... پاشا صاحب..... آپ پرانے اخبار تو نکلوائیں شبن کو کہلوا کر..... ہاتھ گنگن کو آرسی کیا.....؟'' بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور کچھ ہی دیر میں شبن پرانے اخباروں کا پلندہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اس تندہی سے اخبار میں بی اے کا نتیجہ ڈھونڈ رہے تھے، جیسے میرے پاس ہونے سے ہی ان کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ میرا رول نمبر پاشا صاحب پہلے ہی مجھ سے پوچھ چکے تھے جو بے حد آسان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زبانی یاد رہا تھا۔ 1985..... میری پیدائش کا سال ہی میرا رول نمبر تھا، اور پھر اچانک ہی شبن چلایا۔ ''حضور کہیں یہ اخبار تو نہیں..... اس میں بہت سے نمبر لکھے ہوئے ہیں.....'' پاشا صاحب نے لپک کر اخبار پکڑ لیا اور تیزی سے نظریں اخبار کے صفحے پر دوڑائیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے ابا یاد آ گئے جو اسی طرح بے چینی سے میرا نتیجہ اخبار میں تلاش کیا کرتے تھے اور عام طور پر انہیں بدلے میں مایوسی ہی ملا کرتی تھی۔ لیکن آج جب وہ میرے ساتھ نہیں تھے تو نتیجہ وہ نکلا جس کا انہیں ہمیشہ سے انتظار تھا۔ پاشا صاحب زور سے چلائے ''ہاں..... یہ رہا..... انیس سو پچاسی..... بھئی واہ..... ہائر سیکنڈ ڈویژن آئی ہے..... اپنے آیان میاں پاس ہو گئے.....'' وہ چاروں اس طرح خوشی منا رہے تھے اور بچوں کی طرح بار بار میرا رول نمبر اخبار میں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی پاس ہونے پر میرے سارے دوست ہلہ مچاتے تھے۔ میں نے لپک کر پاشا صاحب کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ مجھے بالے، مشی اور راجہ کا رول نمبر بھی یاد تھا۔ ہم سب ایک ہی قطار میں ہی تو بیٹھے تھے۔ بالا مجھ سے پیچھے تھا اور راجہ اور مشی میرے آگے..... راجہ اور مشی کا نمبر میرے رول نمبر کے آگے موجود تھا لیکن بالے کا رول نمبر مجھے نظر نہیں آیا۔ مطلب پھر اس کی ایک آدھ کمپاٹ (سپلی) آ گئی تھی۔ میں نے اپنے تصور میں ان تینوں کو کیفے فراق میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھا لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ بالا ضرور ان دونوں کو مجھ سمیت غداری کے طعنے دے رہا ہوگا کہ ہم سب نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے، اور وہ دونوں اسے منا رہے ہوں گے کہ جب تک بالا سارے پرچے پاس نہ کر لے ہم اگلی جماعت میں نہیں بیٹھیں گے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا ایک دوسرے کے ساتھ جماعت میں بیٹھنے کے چکر میں بی اے کرتے کرتے ہم سب چوبیس سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ میں اپنے خیالات کی رو میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ نواب صاحب مجھے تیسری بار مبارک باد دے چکے ہیں ''کہاں کھوئے ہو میاں..... لگتا ہے دوست اور گھر بار یاد آ گئے تمہیں.....'' رنگا نے غور سے میری طرف

دیکھا'' لے چلیں گے اسے اس کے باوا کے پاس.....اب تو اس نے امتحان بھی پاس کرلیا ہے.....شاید اب دوا سے معاف کردیں.....''

موسیٰ نے مجھے چھیڑا'' کیوں شہزادے.....لڑے گا الیکشن ہمارے لیے.....؟'' میں نے سارنگا کی طرف دیکھا'' ہاں.....اگر آپ دونوں یہ وعدہ کریں کہ میری جیت کی صورت میں ہمیشہ کے لیے اڈہ ترک کردیں گے۔ یعقوب مینشن ہمارا ہیڈ کوارٹر بنے گا اور وہاں موجود سارے شاگرد استاد اور تمام کارندے ہمارا سیاسی عملہ ہوگا۔ وہاں کلائی اور زور کی مشق ہمیشہ جاری رہے گی لیکن وہ طاقت اب ہم سیاست کے میدان میں استعمال کریں گے۔ بولیں.....منظور ہے میری شرط.....؟'' ہنسی مذاق میں شروع ہونے والی ایک بات نے اتنا سنجیدہ رخ اختیار کرلیا تھا کہ خود ہم نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ رنگا کسی گہری سوچ میں گم تھا'' الیکشن لڑنا آج کل اتنا آسان کام نہیں رہا ساجن.....یہ پرانے گدھ کسی نئے پنچھی کو اس آسمان پر کہاں اڑنے دیتے ہیں بھلا.....؟ تیری جان خطرے میں پڑ جائے گی.....ہماری دنیا میں تو پھر بھی للکار کر وار کرتے ہیں پھر وہاں پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی ریت ہے پیارے.....تجھے کیسے اس دوزخ میں جھونک دوں سجناں.....''۔

''میری زندگی اتنی قیمتی نہیں ہے.....لیکن آپ کی زندگی سے ناہید کی زندگی جڑی ہے۔ سینکڑوں خاندان ہیں جن کا چولہا قدرت نے آپ کے دم سے جلا رکھا ہے۔ میں اس آگ میں کودنے کے لیے تیار ہوں.....اب آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے.....'' میں ان سب کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

کالی کا علاقہ بھی اب رنگا کی راج دھانی میں شامل ہو چکا تھا۔ نواب کا بڑا بیٹا وقار کالی کی شکست کے بعد سے غائب تھا۔ موسیٰ نے تیسرے دن ہی کالی کے اڈے کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ نواب صاحب کو بھی حویلی کے انتظامات سنبھالنے کے لیے اب کسی نئے منیجر کی ضرورت تھی کیونکہ رحیم کے جانے کے بعد اب اس کی ذمہ داریاں نبھانے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بہت پہلے ستارہ کی کہی ہوئی بات گونجی کہ شیخ صاحب حمید کی بے روزگاری کی وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ تیسرے روز موسیٰ کسی ضروری کام سے شہر جانے کے لیے زمرد حویلی سے نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا میں کیفے فراق کے پاس اترا تو دوست تھم سا گیا۔ شام کی چائے کا وقت ہو رہا تھا اور بیرے تیزی سے فٹ پاتھ پر لگی میزوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔ کیفے کا ریکارڈ پلیئر اپنی مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ سر بکھیر رہا تھا

کیسے قت میں ہائے.....دل کو دل کی لگی بیماری
مہنگائی کے دور میں مہنگی ہوگئی یار کی یاری
دل کی لگی دل کو جب لگائی مار گئی
راشن والی لائن کی لمبائی مار گئی
پاؤڈر والے دودھ کی ملائی مار گئی
اور جنتا جو چیختی چلائی مار گئی.....
باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی.....مہنگائی مار گئی

ہائے مہنگائی.....مہنگائی مہنگائی.....تو کہاں سے آئی
تجھے کیوں موت نہ آئی.....کہ باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی.....مہنگائی مار گئی

آس پاس بیٹھا بابو اور کلرک طبقہ گانے کے بولوں پر سر دھن رہا تھا۔ غریب جب غربت سے لڑتے لڑتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ اپنے دل کی بھڑاس ایسی ہر بات اور شعر کو داد دے کر نکالتا ہے جس میں غربت اور مہنگائی کا رونا رویا گیا ہو۔ یہ شاعر اور سیاست دان ایسی ہی باتیں کر کے ان کے دلوں میں پلتے کسی لولے لنگڑے انقلاب کے غبارے سے بھی ہوا نکال دیتے ہیں اور غریب رات کو تھکا ہارا پھر سے آنے والے خیالی سہانے دنوں کی یاد میں بستر پر جا پڑتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں میری آمد کی اطلاع سارے علاقے کو ہو چکی تھی اور پھر سب سے پہلے راجہ اور پھر مشی اور بالا دوڑتے ہوئے کیفے فراق کے ہال میں داخل ہوئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے مرزا کو شیخ صاحب اور ریحان کو اطلاع دینے کے لیے بھی کہلوا بھیجا تھا، کیونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے موی کے ساتھ زمرد حویلی بھی پلٹنا تھا۔ میرے مستقبل کے منصوبے سن کر راجہ چلایا "یہ تو کیا کہہ رہا ہے انو.....الیکشن.....نہیں نہیں....." مشی نے غور سے میری طرف دیکھا "کیا تم سنجیدہ ہو.....؟" میں نے گہری سانس لی "شاید تین دن پہلے تک میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن اگر یہی ناہید کے اطمینان اور خوشی کا واحد ذریعہ ہے تو ہاں.....میں سنجیدہ ہوں....." بالے نے فکرمندی سے کہا....."لیکن سیاست خود ایک بہت بڑا گندہ تالاب ہے پیارے.....جو اس میں اترا.....وہ داغ دار ہی ہوا....."۔

"ہاں.....جانتا ہوں میں.....ہم خود بھی تو تمام عمر اپنے ہی چنے ہوئے سیاست دانوں کو برا بھلا کہتے گزار دیتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی آخر یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر یہ گند ہے تو اسے پاک کرنے کے لیے ہمیں خود اس جوہڑ میں اترنا پڑے گا۔ ہمارے مسئلے حل کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ تو اترنے سے رہا.....جب تک ہم سیاست کو گندہ تالاب سمجھ کر اس کے کنارے بیٹھ کر اندر والوں پر صرف تنقید کرتے رہیں گے یہ پانی ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا.....اسے نتھارنا ہے تو ہم جیسوں میں سے کسی کو تو پہل کرنی ہوگی.....میں مانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سیاست صرف پیسے اور طاقت کے بل پر کی جاتی ہے.....لیکن آج قدرت کی مرضی سے یہ دونوں لوازمات میرے ہمدردوں کے پاس موجود ہیں.....تو پھر یہ بازی کھیلنے میں بھی کیا حرج ہے.....ہم چاروں نے آج تک صرف اپنے دل کی مانی ہے.....ایک بار زمانے کی مان لینے میں کیا حرج ہے....."

وہ سب میری بات سن کر خاموش ہو گئے لیکن ان کے چہروں پر چھائی فکر اور پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی وہاں پہنچ گیا۔ شیخ صاحب البتہ مرزا کو گھر میں نہیں ملے۔

میں نے اسے اپنی آمد گھر والوں سے چھپانے کی ہدایت کی تھی۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ امی میری غیر موجودگی میں کافی بیمار پڑ گئی تھیں۔ البتہ میرا رزلٹ دیکھ کر ان کی طبیعت قدرے سنبھلی ہے۔ ابا میرا نتیجہ دیکھ کر اندرونی طور پر خوش ہوئے پر انہوں نے اپنی خوشی گھر والوں پر ظاہر نہیں کی۔ چھوٹی روزانہ شام کو میرا انتظار کرتی ہے اور امی حسب معمول ہر جمعرات کی شام میرے نام کا صدقہ نکالتی ہیں۔ ریحان نے میرا ہاتھ تھام لیا "انو یار.....تم کب گھر واپس آؤ گے.....بس اب یہ ضد چھوڑ دو.....ہم سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تمہاری واپسی کی راہ تکتے رہتے ہیں....." میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا ابا بھی.....؟" ریحان نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے میرا جواب مل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا "جس

دن ابا کو بھی میری کمی محسوس ہوگی میں ضرور لوٹ آؤں گا'' میں نے مرزا کو شیخ صاحب کے لیے ایک رقعہ لکھ کر دیا کہ وہ اپنے طور پر حمید کو پاشا صاحب سے رابطے کے لیے کہیں۔ اسے معقول تنخواہ پر حویلی کی نوکری مل جائے گی۔ کچھ دیر بعد موسیٰ کی گاڑی مجھے لینے کے لیے پہنچ گئی اور میں ان سب سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

نواب صاحب سارنگا کے زخم پوری طرح مندمل ہونے تک اسے وہاں سے منتقل کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن رنگا نے اپنی مجبوری ظاہر کی کہ اسے یعقوب مینشن سے نکلے بہت دن ہو چکے ہیں وہاں کا نظام درہم برہم ہو چکا ہوگا لہٰذا اس کا جانا ضروری ہے۔ نواب صاحب نے جاتے جاتے دو الفاظ میں رنگا کو پیش کش کی کہ میرے الیکشن لڑنے کی صورت میں ان کی خواہش یہی ہوگی کہ میرا سارا خرچہ وہ خود برداشت کریں۔ رنگا نے مسکرا کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''میرے اور آپ کے پیسے میں کوئی فرق ہے بھلا..... دیکھیں گے وقت آنے پر..... ابھی تو میرا دل نہیں مانتا اس فیصلے کو..... ہم غنڈے ہی سہی..... پر سیاست دان نہیں ہیں.....''

لیکن جب ناہید کو پتہ چلا کہ میں نے رنگا کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے سیاست کا درمیانی راستہ نکالا ہے تو اس نے وہیں زمرد حویلی کے بستر پر بخار کے دوران ہی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا اور اس وقت تک اناج کا ایک بھی دانہ منہ میں نہ رکھنے کی قسم کھالی کہ جب تک اس کے بابا میرے پیش کردہ منصوبے کی منظوری کا اعلان نہ کر دیں۔ آخر کار باپ کو اپنی بیٹی کی ضد کے آگے ہار ماننا ہی پڑی۔ رنگا نے خود زنانے میں جا کر ناہید کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس روز سارنگا نے اپنی لاڈلی کو بہت عرصے بعد اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کروا کر اس کی قسم توڑی۔ ہم سب زمرد حویلی سے رخصت ہوئے تو حویلی کے سبھی مکین بہت دیر تک مرکزی گیٹ پر کھڑے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہاتھ ہلاتے رہے، لیکن ان سب میں فضہ شامل نہیں تھی۔ الوداع کہنے کے بعد میں نے اس کی آخری جھلک زمرد حویلی کے اونچے برج کی ایک منڈیر کے پیچھے دیکھی تھی۔ وہ وہیں سے کھڑی ہمیں رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔

اگلے چند روز بے حد مصروف گزرے۔ رنگا نے یعقوب مینشن پہنچتے ہی باقاعدہ اخبار والوں کو چائے کی دعوت پر بلا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس بار انتخابات میں کسی بھی پارٹی کا ساتھ دینے کے بجائے خود اپنا نمائندہ کھڑا کر رہا ہے، اور وقت آنے پر اس نمائندے کے نام کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ رنگا نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ کسی بڑی پارٹی سے ٹکٹ لینے کے بجائے اپنے امیدوار کو آزاد میدان سے لڑانے پر بھی غور کرے گا۔ رنگا کے اس اعلامیے کے ساتھ ہی زیر زمین اور سیاست کے ایوانوں میں تھرتھلی سی مچ گئی اور دونوں جانب سے اس پر شدید دباؤ ڈالا جانے لگا کہ وہ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سارنگا کس قدر دور اندیش تھا۔ اگر وہ اڈے کی گدی چھوڑ کر یہ اعلان کرتا تو واقعی دونوں اطراف کے ''بڑے'' اس کی ہڈیاں تک چبا جاتے، لیکن رنگا نے اڈے اور اپنے زیر زمین سرکار کے بل پر یہ فیصلہ لیا تھا لہٰذا رفتہ رفتہ سبھی خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہوتے گئے لیکن رنگا اب بھی ہر قدم نہایت پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا اور اس نے کاغذات جمع ہونے کے آخری وقت تک میرے نام کا اعلان نہیں کیا، اور سب سے پہلے اپنے چار اطراف کے کلے مضبوطی سے گاڑنے کے بعد آخری تاریخ سے صرف ایک دن پہلے میرا نام سب کے سامنے ظاہر کر دیا۔ آیان احمد کے ہزاروں پوسٹر چھپ کر آ گئے اور علاقے کی ہر در و دیوار پر میرا نام چسپاں ہوتا چلا گیا۔ اس تمام عمل کے دوران

میرے سب سے تیز اور پرجوش ورکر علاقے کے وہی نوجوان ثابت ہوئے جن کو کبھی ہم نے ہفتہ خوری کے خلاف اکٹھا کیا تھا۔ مشی، بالے اور راجہ کی سربراہی میں ہمارے علاقے کے سینکڑوں نوجوان صبح شام میرے حق میں لوگوں کی رائے بدلنے کے لیے لوگوں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔ وہ جنہیں لوگ لوفر، آوارہ، ناکارہ اور نکما کہہ کر سدا دھتکارتے آتے تھے۔ آج اپنے جیسے ایک لوفر اور آوارہ کے لیے اپنا تن من لگا کر اپنے دن رات ایک کیے دے رہے تھے۔ ان کے اندر کہیں نہ کہیں یہ بات بھی ضرور ہلچل مچاتی ہوگی کہ یہ انہی جیسے ایک آوارہ کی شناخت کی بازی ہے، اور وہ سب یہ بازی اپنی بازی سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس دنیا پر یہ ثابت کرنے کا آخری موقع تھا کہ وہ ناکارہ نہیں ہیں..... اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ بھی زمانہ جیت کر دکھا سکتے ہیں۔ میری فرمائش پر رنگا نے خصوصی طور پر انہی سبھی کے لیے روزانہ اور ہفتہ وار خصوصی معاوضے کا بندوبست بھی کر دیا تھا تاکہ انہیں گھر والوں کے طعنوں اور اعتراضات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان میں سے خود کسی نے کوئی مطالبہ نہیں کیا لیکن میں جانتا تھا یہ سب نوجوان ہیں جو ہر گھر میں کہیں کسی عضو معطل کی طرح بکھرے پڑے رہتے ہیں ان کے لیے کبھی کوئی خاص برتاؤ نہیں ہوتا۔ ان کو کبھی اپنا کمرہ میسر نہیں آتا۔ کبھی کوئی خصوصی تقریب منعقد نہیں کی جاتی۔ ان کی فرمائش پر کبھی گھر میں کچھ خاص پکوان تک نہیں پکایا جاتا۔ ہر بار کسی چھوٹے یا بڑے بھائی یا کسی چچازاد یا پھر کسی دور پار کے رشتے دار کی کامیابی پر انہیں طنز، طعنوں اور جلی کٹی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی سے کسی کی مدد کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا شمار گھر کی سب سے ناقص العقل قسم کی مخلوق میں کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ گھر میں چار پیسے لا کر دیں گے تو کم از کم انہیں راتوں کو آوارہ گردی کے طعنے تو نہیں ملیں گے۔ گھر میں یہ پیسے نہ بھی دیں تو کچھ دن کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی شرمندگی سے تو بچ جائیں گے۔ وہ سب اب میرے ساتھی تھے اور میں ان سب کا آیان بھائی تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب میرا پہلا جلسہ ہونا تھا۔ مقام وہی تھا جہاں سے میری کہانی شروع ہوئی تھی..... کیف فراق کے سامنے والی سڑک اور بابو کالونی۔

باب30

اس روز صبح سے ہی آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں اور ہلکی بدلیوں کے درمیان ایک دوسرے کو چھونے کی شرط بندھ چکی تھی اور سہ پہر تک ان سب نے مل کر آسمان کو پوری طرح ڈھک لیا۔ میں جب کیفے فراق کے سامنے پہنچا تو بارش کی بوندیں موٹی اور تیز تر ہو چکی تھیں۔ موسیٰ نے برسات کے پیش نظر خدشہ ظاہر کیا کہ شاید لوگ زیادہ تعداد میں جمع نہ ہو پائیں لیکن جب میں نے مرزا کو باہر فٹ پاتھ پر کوئی میز رکھنے کا اشارہ کیا جس پر کھڑے ہو کر میں اپنے لوگوں سے بات کر سکتا تب تک چھتریوں کا ایک انبار ہمارے ارگرد اکٹھا ہو چکا تھا۔ مرزا جلدی سے وہی میز اٹھا لایا جس کے گرد ہم دوستوں نے بچپن سے لے کر اب تک جانے کتنے اور ان گنت لمحے ہنستے مسکراتے گزارے تھے۔ میں میز پر کھڑا ہوا تو مشی، بالے اور راجہ نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ آج بھی میرے ساتھ میرے وہی پرانے سہارے جڑے ہوئے تھے۔ بارش کی بوچھاڑ نے مجھے پل بھر میں نہلا سا دیا، لیکن بابو کالونی، سادات محلے اور آس پاس سے جوان، بزرگ، بوڑھے اور بچے نکلے چلے آ رہے تھے۔ میری فورس کے نوجوان ایک جانب جمع تھے اور سڑک پر دور دور تک صرف سیاہ چھتریاں بچھی نظر آ رہی تھیں۔ چچا فراق نے سروی کے پیش نظر چائے کا خصوصی انتظام بھی کر رکھا تھا۔ راجہ نے ان سے ادائیگی کا پوچھا تو وہ رو پڑے کہ ''ادائیگی کرنی ہے تو پہلے ان چار سو ستر روپوں کی کرو جو انو کا اب تک کا ادھار ہے۔ بولو کر پاؤ گے ادا؟'' راجہ لاجواب ہو گیا۔ واقعی ہم ساری عمر بھی کما کر چچا فراق کی محبت کا وہ ادھار نہیں چکا سکتے تھے۔

میرے سامنے ان چہروں کا ہجوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا جنہیں میں بچپن سے اپنے ارد گرد دیکھتا آیا تھا۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مجھے اپنی گود میں کھلا چکے تھے وہ اپنے کاندھوں پر مجھے بٹھا کر کیفے فراق سے واپس میرے گھر تک چھوڑ کر آیا کرتے تھے۔ آج وہ سب یہاں جمع ہو کر یہ سننے آئے تھے کہ ان کا انوان سے کیا کہنا چاہتا ہے میں جانتا تھا کہ ابا نہیں آئیں گے نہ ہی وہ ریحان کو میرے جلسے میں آنے کی اجازت دیں گے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میری نظریں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہی میرے لفظ کھونے لگے۔ جنہوں نے مجھے بولنا سکھایا تھا ان کے سامنے بھلا تقریر کیسی؟؟ بڑی مشکل سے میں نے خود کو مجتمع کیا۔

''میں آج یہاں آپ لوگوں کے سامنے کوئی تقریر کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی میں نئے وعدوں اور امیدوں کا کوئی پرانا جال لے کر آیا ہوں میں جو بھی ہوں..... آپ کے سامنے ہوں اور جو تھا وہ بھی آپ سے کبھی چھپا نہیں رہا..... میں کوئی لیڈر، سیاست دان یا انقلابی بھی نہیں ہوں کہ اگلے چند ماہ میں اس سڑک اس محلے اور اس علاقے کی ہر برائی کسی انقلاب کے ذریعے ختم کرنے کا دعویٰ کر سکوں۔ میں تو بس آیان ہوں۔ وہی پرانا انو جس نے یہاں کے بزرگوں کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ وہی نالائق آیان جس کی شرارتوں پر آپ میں سے کئیوں نے اس کے کان بھی کھینچے ہیں۔ جس کی حرکتوں سے تنگ آ کر خود اس کے ابا نے اسے گھر بدر کر ڈالا۔ ہاں..... میں وہی آیان ہوں..... اور میں یہاں آج آپ کے سامنے صرف ایک عہد کرنے آیا ہوں کہ میں منتخب ہو کر بھی ہمیشہ یہیں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کوئی محل مجھے میرے جھونپڑے سے دور نہیں کر سکے گا۔ میں چٹکی بجاتے ہی

مہنگائی تو شاید دور نہ کر سکوں لیکن راشن کی لائن میں آخر میں آپ مجھے بھی قطار میں کھڑا دیکھیں گے۔ گھی، آٹا، چینی مہنگی ہوں گی تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ سڑک پر احتجاج کے لیے نکلوں گا جب آپ کے گھر اندھیرا ہوگا تو میں بھی اسی لوڈ شیڈنگ میں اپنے آنگن میں مچھروں کا سامنا کروں گا۔ بارش کا پانی آپ کے کچے گھروں میں داخل ہوگا تو میرا کوارٹر بھی سوکھا نہیں رہ پائے گا۔ جس بس اسٹاپ پر آپ گھنٹوں سرکاری ٹرانسپورٹ کا انتظار کریں گے میں بھی اسی ٹوٹے شیڈ کے نیچے کھڑا رہوں گا، اور وہی بس مجھے بھی میرے دفتر پہنچایا کرے گی، اور ہم اسی طرح ساتھ رہ کر اپنی بات اوپر کی سرکار تک پہنچائیں گے۔ یاد رکھیں مجھے یہ سوچ کر ووٹ ہرگز نہ ڈالیے گا کہ میں راتوں رات اس علاقے کی تقدیر بدل دوں گا۔ ہاں اس اعتماد کے ساتھ ضرور ڈالیے گا کہ تدبیر کرنے والوں میں سے کل آپ کا ایک اپنا بھی ہوگا۔ جو ہمیشہ آپ کے ساتھ اور آپ کے اندر موجود رہے گا۔''

میں بات ختم کر کے خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر تک چاروں طرف ایک سناٹا چھایا رہا اور پھر سب سے پہلے مرزا کے ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور پھر چند لمحوں میں تالیوں، نعروں اور سیٹیوں کا ایسا شور اٹھا کہ آس پاس سے گزرتی ٹریفک رک گئی۔ راجہ، بالا اور منشی تینوں مجھے کھینچتے ہوئے کیف فراق کے ہال میں لے گئے ''یارانو..... تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں۔ کیا تیرا رنگا استاد وہاں اڈے پر یہ تعلیم بھی دیتا ہے؟.....''۔ میں مسکرایا..... ''نہیں..... یہ باتیں وقت خود ہمیں سکھا جاتا ہے۔ البتہ مجھے یہ تعلیم ایک دوست سے ملی ہے..... ایک ایسا استاد جو خود کچھ سیکھنے کی چاہ میں مجھے بہت کچھ سکھا گیا.....'' میرے ذہن میں فضہ کی کومل شبیہہ لہرائی۔ واقعی..... یہ لفظ اور یہ سوچ اسی کی چند روزہ رفاقت کی دین تھے۔ شام کو میں ریگل چوک اور ریلوے اسٹیشن پر دو مزید جلسے کرنے کے بعد یعقوب مینشن واپس پہنچا تو رنگا احاطے میں ہی دیگر استادوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب مسکرائے۔ رنگا نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا ''آ گیا میرا سورما..... پہلے ہی دن جھنڈے گاڑ کے..... سنا ہے بابو کالونی میں بڑا زبردست بولا ہے تو..... تیرے مخالفوں کی نیندیں تو پہلے دن سے ہی حرام ہونے لگی ہیں۔ آیا تھا علاقے کا پرانا ایم پی اے کچھ دیر پہلے یہاں..... نوٹوں کا بریف کیس لے کر.....'' میں نے حیرت سے رنگا کو دیکھا ''نوٹ لے کر..... لیکن نوٹ کس لیے.....''۔

''تجھے اپنے حق میں بٹھانے کے لیے اور تیری حمایت کا رخ اپنی طرف موڑنے کے وعدے کے لیے.....'' میں اب بھی الجھا ہوا تھا ''لیکن ملک صاحب تو پچھلے کئی الیکشن وہاں سے جیتتے آ رہے ہیں میری حمایت تو بس علاقے کے ڈیڑھ دو سو بے روزگار نوجوان ہی کر رہے ہیں جنہیں سارا علاقہ لوفر کے نام سے پکارتا ہے۔ پھر مجھ سے خوف زدہ ہونے کی وجہ.....؟.....'' رنگا نے مسکرا کر موئی کی جانب دیکھا ''دیکھ لیا موئی..... یہ تیرا لاڈلا شاگرد بھی ابھی تک تیری ہی طرح نادان ہے..... تو دیکھ لینا..... آگے چل کر یہی ڈیڑھ دو سو کئی ہزار کے لشکر میں تبدیل نہ ہوئے تو میرا نام بھی رنگا نہیں..... اپنے ملک کی عوام کو بس ایک امید کا ہی تو سہارا رہتا ہے..... اور آج تو نے وہ امید ان کے دلوں میں جگا دی ہے..... اب بہت دھیان سے رہیو..... تیرے دوستوں کے ساتھ ساتھ تیرے دشمنوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جائے گی.....''

اور پھر اگلے چند ہفتوں میں رنگا کی بات سچ ثابت ہوتی گئی۔ میرے جلسوں کا حجم بڑھنے لگا اور مخالفوں کی جانب سے مجھ پر مختلف الزامات کی بوچھاڑ بھی شروع ہو گئی۔ کسی نے مجھے مافیا کا ایجنٹ قرار دیا تو کسی نے اسے رنگا استاد کی جانب سے اپنے بھاؤ بڑھانے کا گر بتایا۔ بوڑھے گدھ آسمان پر ایکا کرنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے اور مختلف اتحاد بننے اور ٹوٹنے لگے۔ سارنگا کو مختلف بڑی پارٹیوں کی جانب سے اپنے رنگ زدہ

اور پرانے آزمائے ہوئے دھڑوں کے ساتھ انضمام کی پیش کش ہونے لگی۔ بڑے بڑے پارسا اور برائے نام اصولی سیاست کرنے والے اپنا ظاہری چولا اتار کر میدان میں مختلف تراغیب کے ساتھ کود پڑے۔ کچھ ''بڑے شرفا'' نے پولیس اور قانون کی دھمکیاں بھی دیں اور کچھ چھپے ہوئے ٹھنڈوں نے مصلحت کے انداز میں میری جان کو خطرہ ظاہر کرنے کا ڈھونگ بھی کیا۔ میں یہ سب حیرانی سے دیکھتا اور سوچتا رہتا کہ اگر رنگا میری پشت پر موجود نہ ہوتا تو شاید میں پہلے قدم پر ہی یا تو کسی ہسپتال میں گھائل یا پھر کسی حوالات میں مرغی یا بکری چوری کرنے کے الزام میں پڑا چھ ماہ کی کاٹ رہا ہوتا۔ سارنگا نے موسیٰ کو کہہ کر انتخابی مہم کے دوران میری حفاظت کا غیر معمولی بندوبست بھی کروا دیا تھا۔ پولنگ میں اب کچھ روز ہی باقی رہ گئے تھے۔ نواب صاحب بھی درمیان میں دو مرتبہ شہر کا چکر لگا چکے تھے۔ اسی دوران مجھے پاشا صاحب نے فضہ کا یہ پیغام پہنچایا کہ اسے میری کامیابی کا شدت سے انتظار ہے، اور وہ اب اسی دن مجھ سے آکر ملے گی جب میری جیت کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا ہوگا، لیکن ہمارے ہاں ایسی تبدیلیاں خون مانگتی ہیں اور ابھی میری کامیابی پر میرے کسی اپنے کے خون کا ٹیکہ لگنا باقی تھا شاید اس روز ہمیں ڈاک یارڈ کے ایریا میں جلسہ کرنا تھا۔ موسیٰ صبح سے انتظامات میں مصروف تھا۔ راجہ، مشی اور بالے نے اسٹیج کا انتظام سنبھال رکھا تھا اور باقی لڑکے پنڈال کے دیگر انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، لیکن جانے اس روز حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سپاہیوں کی تعداد نصف سے بھی کم تھی۔ حوالدار نے بتایا کہ نفری کی کمی کی وجہ سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ اس روز ہجوم بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا اور لڑکوں سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا میں اسٹیج پر چڑھا اور میں نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں سے خاموش ہو جانے کی درخواست کی۔ ٹھیک اسی وقت فائر کی ایک آواز گونجی اور میرے دائیں جانب کھڑا ریگل چوک کا سلیم عرف سلو پلٹ کر پیچھے گرا میں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے شانے سے خون ابل ابل بہہ رہا تھا۔ فوراً ہی دوسرے فائر کی آواز آئی لیکن تب تک میرے بائیں کھڑا موسیٰ مجھے زور سے دھکا دے کر گرا چکا تھا۔ مگر گرتے گرتے بھی میں نے موسیٰ کے سینے سے خون کا ابلتا فوارہ دیکھ لیا تھا ایک افراتفری مچ گئی اور اڈے سے وابستہ لوگوں نے اگلے لمحے ہی اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کر دی تاکہ حملہ آور ہمیں نہتا سمجھ کر مزید پیش رفت نہ کریں۔ گولی پرلی جانب کی کسی اونچی عمارت کی جانب سے چلی تھی اور لڑکے پل بھر میں ہی اس عمارت کی چھت پر پہنچ چکے تھے لیکن وہاں انہیں سوائے دو چلی ہوئی گولیوں کے خالی خول کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ چند لمحوں بعد ہی ہم موسیٰ اور سلو کو اپنی وین میں ڈالے قریبی ہسپتال کی جانب اڑے جا رہے تھے۔ موسیٰ کا سر میری گود میں تھا اور میرے کپڑے اس کے خون سے تر بتر ہو چکے تھے میں موسیٰ کے گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ''کچھ نہیں ہوگا تمہیں..... میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا..... ہوش کرو استاد.....'' موسیٰ نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر بے ہوشی نے اسے بے سدھ کر دیا۔ سلو کا شانہ بھی بری طرح گھائل تھا لیکن وہ ابھی ہوش میں تھا لیکن اذیت کے مارے شدت سے آنکھیں میچے وین کے فرش پر راجہ کی گود میں سر ڈالے پڑا ہوا تھا۔ سارنگا کو کسی نے جلسہ گاہ سے ہی اطلاع کر دی تھی اور وہ تقریباً ہمارے ساتھ ہی اڈے کے سینکڑوں لوگوں سمیت ہسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ ہسپتال میں ایک ساتھ اتنے ہجوم کو دیکھ کر ایک سراسیمگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بمشکل ان سب کو ایمرجنسی کے باہر والے گھاس کے میدان میں رکنے کی التجائیں کر کے ہجوم کو اندر آنے سے روکا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار رنگا کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں ''ہوش کرو موسیٰ..... اپنے استاد کے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلنا..... ساتھ رہیں ہیں ہمیشہ ساتھ ہی چلیں گے ساجن.....'' لیکن رنگا کی باتوں کا جواب

دینے والا اور اس کے ہر حکم پر لبیک کہنے والا موسیٰ آج ہر سوال کے جواب میں خاموش تھا۔ سلو کو گھنٹے بھر بعد ایمرجنسی سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اب کچھ بہتر تھا لیکن موسیٰ کو جس آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا اس کی سرخ بتی پانچ گھنٹے سے زیادہ جلتی رہی اور ہم سب کسی سولی پر ٹنگے باہر راہداری میں خود اپنے ہی چہرے نوچتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی راجہ کے ساتھ ہانپتا کانپتا وہاں آ گیا لیکن میری حالت کے پیش نظر وہ خاموش ہی رہا اور بس میرے شانے دبا کر اور گلے لگا کر تسلیاں ہی دیتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے رشتوں کی کتنی گہری گانٹھ ان انجانوں کے ساتھ بندھ چکی تھی۔ رات گئے نواب صاحب اور پاشا بھی شدید پریشانی کے عالم میں راہداری میں نمودار ہوئے، لیکن موسیٰ ابھی تک آپریشن تھیٹر میں تھا۔ جانے اس کی اندر کیا حالت تھی لیکن ہم سب یہاں باہر پل پل میں سو سو بار جی کر مر رہے تھے۔ ہسپتال کے باہر جمع ہوتا علاقے کے نوجوانوں کا ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے اے سی پی بلال کو پریشانی کے عالم میں راہداری میں داخل ہوتے دیکھا۔

''ریگل چوک اور بابو کالونی کے آس پاس ہنگامہ آرائی اور جلاؤ گھیراؤ شروع ہو چکا ہے۔ وہاں کے نوجوان شرانگیزی پر آمادہ ہیں اور باہر ہجوم بھی بے قابو ہو چکا ہے۔ میری آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ کوئی میرے ساتھ چل کر ان سے بات کرے ورنہ آج سارا شہر جل جائے گا.....''

گم سم بیٹھے سارنگا نے شاید اے ایس پی کی بات سنی ہی نہیں۔ مجبوراً میں دھیرے سے اٹھ کر بلال کے ساتھ باہر گھاس کے میدان میں جمع بپھرے ہجوم کے پاس پہنچا۔ ان سب نے مجھے دیکھ کر میرے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیے۔ ایک جوشیلا لڑکا چیخ کر بولا ''ہم سارے شہر کو آگ لگا دیں گے انو بھائی..... آج کوئی سرمایہ دار غدار نہیں بچے گا ہمارے ہاتھوں سے'' وہ سب ایک ساتھ چیخنے لگے.....

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو چند لمحوں کے لیے خاموش کرایا۔ ''اس وقت موسیٰ بھائی کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے..... سلو کی جان اللہ نے بچالی ہے، لیکن اس کا خون بہت بہہ گیا ہے وہ بھی بستر پر پڑا اس منزل کو پانے کا انتظار کر رہا ہے جس کے لیے اس نے اپنا سیروں خون بہایا ہے'' دفعتہً ایک نوجوان آگے بڑھا اور اے ایس پی کی جانب اشارہ کر کے چلایا ''اس پولیس افسر سے پوچھ آیان بھائی..... یہ اس وقت کہاں تھا جب تم پر گولیاں چل رہی تھیں تب ساری علاقہ پولیس کہاں غائب تھی..... یہ سب ملے ہوئے ہیں آپس میں.....''

ایک بار پھر شور مچ گیا۔ میں نے چلا کر کہا ''خدا کے لیے آپ سب ہوش میں آ جائیں۔ دشمن یہی چاہتا ہے کہ ہم غصے میں اپنے حواس کھو کر ان کے منصوبے کے مطابق شہر میں ہنگاموں کے لیے نکل کھڑے ہوں تاکہ ہمارے ورکر اور ووٹر پولنگ کا دن جیل یا ہسپتال میں گزاریں۔ اپنا یہ غصہ الیکشن والے دن کے لیے بچا کر رکھیں اور اسے دشمن کے خلاف اپنے ووٹ کی صورت میں نکالیں۔ ایک بار ہم جیت گئے تو پھر ان سب سے بھی نبٹ لیں گے تب ہم اس پولیس سے بھی جواب مانگیں گے کہ جس دن ہم پر حملہ ہوا خاص اسی روز نفری کم کیوں ہوئی۔ ہم گولی چلانے والوں کو جواب دیں گے لیکن اپنے ووٹ کی صورت میں۔ یہ صرف میری نہیں، رنگا استاد کی بھی خواہش ہے۔ آپ سب چاہیں تو یہیں خاموشی سے دھرنا دیں لیکن اس وقت بس دعا اور صرف دعا کریں یہی میری آپ سب سے التجا ہے.....'' میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ان سب نے سر جھکا دیے اور پھر ہجوم میں سے ایک بزرگ نے باہر نکل کر دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ باقی سب نے اس کی تقلید کی اور پھر ہم سب کی دعائیں عرش سے ٹکرانے کے لیے آسمانوں کی جانب پرواز کرنے لگیں اور پھر نہ جانے کس کی دعا عرش پار کر گئی اور جب میں دوبارہ راہداری

میں پہنچا تو پاشا صاحب نے جلدی سے بڑھ کر میرے کان میں سرگوشی کی کہ ابھی ایک ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا ہے کہ موسیٰ نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ابھی اگلے چوبیس گھنٹے بہت زیادہ اہم ہیں۔ حالت بگڑ گئی تو سنبھالنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ میں نے کونے میں گم سم کھڑے سارنگا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا ''وہ حرام خور ٹھیک تو ہو جائے گا نا ساجن..... ایسا بے وفا تو کبھی نہ تھا.....'' میں نے رنگا کا ہاتھ پکڑ لیا ''اسے کچھ نہیں ہوگا..... قدرت اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی استاد..... موسیٰ کو واپس لوٹنا ہوگا۔ آپ کے لیے..... ہم سب کے لیے.....'' دفعتہً رنگا نے زور سے جکڑ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا اور بچوں کی طرح ہڑک ہڑک کر رونے لگا ''اپنی ساری زندگی اس نکمے نے میرا حکم مانتے مانتے جلا دی۔ میرے کہنے پر بلوے کیے۔ لوگوں کو اٹھایا۔ انہیں مارا پیٹا، کاٹ ڈالا ہر آگ میں آنکھیں بند کر کے کودتا چلا گیا۔ پر آج میں کتنا بے بس ہوں کہ جب اسے میری ضرورت ہے تو میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس حرام خور کا تو خون بھی الگ نمبر کا ہے..... میرا خون بھی اس کے کسی کام کا نہیں..... اگر وہ اس طرح اوپر چلا گیا تو میں اوپر والے کو کیا جواب دوں گا؟..... اس کو تو کوئی جواب دینا بھی نہیں آتا..... خدا نے اس سے کچھ پوچھا تو وہ نیچے میری جانب ہی دیکھے گا۔ اور میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں ہوگا۔''

میں رنگا کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ سارے زمانے کے لیے دہشت کی علامت سارنگا کو آج کوئی یوں معصوم بچوں کی طرح روتے دیکھتا تو شاید کبھی یقین نہ کرتا لیکن زندگی ایسی ہی انہونیوں کا نام ہے۔ کہیں پتھروں سے چشمے نکل آتے ہیں اور کہیں آنکھوں کا پانی بھی سوکھ کر پتھر بن جاتا ہے۔

باب 31

اور پھر موسیٰ نے دوبارہ آنکھیں کھولنے میں پورے تین دن لگا دیے اور یہ تین دن ہم سب نے اس کے کمرے کی باہر والی راہداری کے چھت کی کڑیاں گنتے' اپنے پیروں پر کھڑے کھڑے گزار دیے' رابعہ' منشی اور بالے نے میری انتخابی مہم سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن میری غیر موجودگی کی وجہ سے اس کا گراف تیزی سے نیچے گرتا چلا گیا۔ میرے ورکر لڑکے چلاتے رہے کہ ان آخری چند دنوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور میرے جلسوں سے غیر موجودگی کا فائدہ علاقے کا پرانا ایم پی اے خوب اٹھا رہا ہے اور وہ لوگوں میں یہ تاثر پھیلا رہا ہے کہ میں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی میدان چھوڑ گیا ہوں لیکن میرے لیے اس وقت موسیٰ کی جان اور صحت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا۔ رنگا نے بھی مجھ سے کئی بار کہا کہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر اب میں اُسے اپنے ہاتھ سے کیوں کھو رہا ہوں' موسیٰ کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے اپنے محاذ پر نکل پڑوں لیکن رنگا خود بھی جانتا تھا کہ میں موسیٰ کو یوں زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا' اور پھر قدرت کو ہم پر رحم آ ہی گیا اور تیسرے دن شام کو ڈاکٹر نے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ موسیٰ کو ہوش آ گیا ہے' لیکن فی الحال ہم اُسے بے آرام نہ کریں تو بہتر ہے۔ یعقوب مینشن میں سات روز کے لیے نیاز کا لنگر کھول دیا گیا' رنگا کچھ یوں سجدے میں گرا کہ پھر ہم نے اُسے گھٹنوں اُٹھتے نہیں دیکھا۔ جامع مسجد کے جس امام کو موسیٰ کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن سے ملنے کے لیے سارا یعقوب مینشن رنگا سمیت پیدل چل کر جامع مسجد پہنچ گیا۔ شہر کا ہر ضرورت مند' مفلس اور بھکاری اس روز اڈے کے دروازے سے سارنگا کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ لے کر ہی گیا۔ اگلی صبح ہمیں تھوڑی دیر کے لیے موسیٰ کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ ہمیں دیکھ کر موسیٰ کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ رنگا نے اس کا ہاتھ تھام لیا ''اور کتنی روٹیاں توڑے گا تو اس ہسپتال کے لنگر کی موسیٰ ..... چل اب گھر چلیں .....''۔ موسیٰ ہنس دیا' لیکن اس کی آواز نقاہت سے بھرپور تھی ''ہسپتال کا لنگر چکھے بھی تو کتنے سال بیت گئے ہیں استاد..... یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی بھرتی ہوئے تھے.....'' رنگا کی آنکھیں نم ہونے لگیں ''ہاں..... پر اس بار تُو نے بڑی غداری کی موسیٰ..... بڑا ستایا ہے تُو نے ہم سب کو..... اور یہ تیرا شہزادہ..... دیکھ اپنا سارا راج پاٹ چھوڑ کر تیرے سرہانے سے لگا کھڑا ہے کتنے دن سے..... یہ بھی تیری طرح بڑا ضدی ہے..... کسی کی نہیں مانتا اب تُو خود ہی اسے سمجھا دے ذرا.....''

موسیٰ کو جب پتہ چلا کہ میں نے تقریباً اپنی الیکشن مہم ختم ہی کر دی ہے تو وہ شدید بے چین ہو گیا۔ ''نہیں شہزادے..... یہ کیا کیا تم نے..... لڑے بغیر ہی جنگ ہار دی..... کیا تُم میرا بہا خون بھی ضائع جانے دو گے..... میرا بدلہ نہیں لو گے ان لوگوں سے.....'' میں نے موسیٰ کا ہاتھ تھپتھپایا ''تم ٹھیک ہو کر گھر واپس آ جاؤ..... یہی میری سب سے بڑی جیت ہو گی..... ویسے بھی۔ میرے بہت سے دن ضائع ہو چکے ہیں اور کل تو انتخابی مہم کا آخری دن ہے'' لیکن موسیٰ کہاں ماننے والا تھا ''چاہے کچھ بھی ہو جائے..... لیکن یوں لڑے بغیر ہم کسی کے لیے میدان خالی نہیں چھوڑیں گے..... ہر استاد اپنے شاگرد سے اپنے گُرو کی کوئی بھینٹ چاہتا ہے..... آج میں بھی تم سے اپنی اُستادی کا معاوضہ مانگتا ہوں' اور میری بھینٹ یہی ہے کہ تم اپنی

جنگ آخر تک لڑو..... ہار یا جیت کے نتیجے کی پرواہ کیے بغیر ڈٹ کر مقابلہ کرو.....''

اتنے میں پاشا نے کمرے میں آ کر نواب صاحب کو اطلاع دی کہ حویلی کا مینیجر خانم کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ نواب صاحب نے اُسے کمرے میں ہی بلا لیا اور جب حمید کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ میں خود بھی بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا کہ خود میں نے ہی شیخ صاحب کو کہلوا کر حمید کو زمرد حویلی کے مینیجر کی نوکری کے لیے نواب صاحب کے ہاں بھجوایا تھا۔

حمید نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا کر خانم کا پیغام نواب صاحب کو دے دیا۔ دراصل خانم موسیٰ کی صحت یابی کے بارے میں فکر مند تھیں اور انہوں نے اپنے طور پر نواب صاحب سے اجازت بھی طلب کی تھی کہ وہ موسیٰ کی صحت کے لیے حویلی میں ختم قرآن اور خصوصی دعا کی محفل منعقد کرنا چاہتی ہیں۔ نواب صاحب مسکرائے ''ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں..... اس میں بھلا اجازت طلب کرنے والی کیا بات ہے..... اور میاں تم جا کر خانم بی کو یہ بھی بتا دینا کہ موسیٰ استاد کی حالت اب بہت بہتر ہے، اور ہم سب اُنہی کے ساتھ ہیں۔'' حمید نے سر ہلایا۔ وہ ابھی تک اس حیرت سے ہی نہیں نکل پایا تھا کہ نواب صاحب جیسے وضع دار شخص کا ان اڈے کے لوگوں کے ساتھ بھلا کیا رابطہ؟ اور تعلق بھی ایسا کہ گذشتہ تین دن سے وہ اسی ہسپتال میں ایک ایسے شخص کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے کہ جسے سارا زمانہ ایک غنڈے کی حیثیت سے جانتا ہے۔ میں چپ رہا۔ نواب صاحب نے خانم کا بھیجا ہوا رقعہ پڑھنے کے بعد اپنی شیروانی کی جیب میں ڈال لیا اور میری طرف پلٹے ''اور آیان میاں..... تمہارے لیے بھی خانم بی کا خاص حکم نامہ ہے کہ انتخابات کے بعد پہلی فرصت میں زمرد حویلی کا چکر لگاؤ۔ وہاں سب تمہیں اور ناہید بٹیا کو بہت یاد کرتے ہیں''۔ میں سر ہلا کر رہ گیا۔ نواب صاحب نے حمید کو حویلی کے انتظامی معاملات کے بارے میں چند مزید ہدایات دے کر واپس بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد میں کسی کام سے باہر نکلا تو حمید ابھی تک حویلی کے پرانے ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال کے احاطے میں موجود تھا۔ مجھے باہر نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے میری جانب بڑھا ''میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کس طرح کمرے سے باہر آنے کا کہوں..... اسی شش و پنج میں ابھی تک یہیں کھڑا ہوں.....'' میں نے اُسے غور سے دیکھا ''کیوں..... سب خیریت تو ہے..... آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں.....'' حمید اب بھی کچھ الجھا ہوا تھا ''جب ابا نے مجھے اپنے طور پر رقعہ لکھ کر زمرد حویلی میں پاشا صاحب سے ملنے کا کہا' میں تب ہی سے سوچ رہا تھا کہ ان کی واقفیت اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ کب اور کیسے ہوئی تھی کہ صرف اُن کے ایک رقعے پر مجھے مینیجر کی نوکری دے دی گئی۔ آج مجھے اپنے اُس سوال کا جواب تو مل گیا..... لیکن ذہن میں کچھ نئے سوال بھی جنم لے چکے ہیں.....'' میں نے اُسے تسلی دی ''اپنے دل میں کسی وہم کو جگہ مت دیجیے..... آپ کو آپ کی اہلیت کے مطابق نوکری ملی ہے..... جسے آپ ثابت بھی کر رہے ہیں..... اور یقین جانیے کہ اس بار آپ کا پالا بہت اعلیٰ ظرف اور خاندانی لوگوں کے ساتھ پڑا ہے..... اُن کی اڈے کے کسی شخص کے ساتھ وابستگی سے کوئی غلط اندازہ نہ لگا لیجیے گا۔'' حمید گم سم سا کھڑا تھا ''آج احساس ہو رہا ہے کہ میرے گذشتہ اندازے بھی کچھ درست ثابت نہیں ہوئے۔ ہو سکے تو میری معذرت قبول کر لیں۔ شاید میں بہت ظاہر پرست ہوں'' میں نے حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سب بھول جانے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ ہسپتال کے احاطے میں جمع چند ورکر لڑکوں کو شام کے لیے ہدایات دے کر میں کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے موسیٰ کی خاطر یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب میرے پاس وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن اپنے محسن اور اپنے استاد کو چڑھاوا چڑھانے کے لیے

میں نے یہ آخری بازی لڑنے کی ٹھان لی تھی شام کو میں نے کیفے فراق سے دوبارہ اپنی مہم کا آغاز کیا اور وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ میرے ساتھ رنگا کے دو ذاتی محافظ اور میرے کارندے لڑکوں کا ہجوم تھا اور ہم نے کیفے فراق' ریگل چوک' ڈاک یارڈ' پھول نگر اور سادات محلے کا ہر دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔ سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں داخل ہوتے وقت میرا دل اُسی وحشی انداز میں دھڑکا۔ وقت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کہاں وہ کھلنڈرا لاپرواہ اور بے فکرا سا انور اور کہاں یہ ذمہ داریوں اور فرائض کے نیچے جھکا آیان.....؟

میں شیخ صاحب کے دروازے تک نہیں جانا چاہتا تھا لیکن گلی میں شور سن کر وہ خود ہی باہر نکل آئے اور پھر مجھے دیکھ کر وہ یوں بے تابی سے میری جانب لپکے جیسے کوئی اپنے کسی صدیوں سے بچھڑے عزیز کی جانب لپکتا ہے۔ ''کہاں چلے گئے تھے آیان میاں..... بھئی میں تو اب تم سے ملنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا..... بس شہر کی دیواروں پر لگے پوسٹرز پر ہی تمہارا دیدار ہوتا ہے اب تو..... کوئی ایسا بھی کرتا ہے بھلا اپنوں کے ساتھ .....؟؟؟'' میں شیخ صاحب کے گلے شکووں کے جواب میں صرف مسکرا کر ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جیسے انہیں پھر سے میرے کہیں کھو جانے کا شک ہو۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ فرصت ملتے ہی ضرور ان سے تفصیلی ملاقات ہوگی لیکن وہ بگڑ گئے ''کیا مطلب..... اب کیا دروازے سے یونہی پلٹ جاؤ گے..... ایسا ہرگز نہ ہوگا' دو گھڑی کے لیے تو تمہیں گھر چلنا ہی ہوگا..... شیخانی جی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں..... اور وہ سب حمید کی نوکری کے لیے بھی تمہارے بے حد شکر گزار ہیں..... ان سب کا دل توڑ دو گے کیا.....؟''

میں نے بے چارگی سے راجہ اور بالے کی طرف دیکھا۔ منشی نے سر ہلا کر مجھے ان کے ساتھ جانے کے لیے کہا کہ وہ جب تک سادات محلے کی دیواروں پر میرے بقیہ اشتہار چسپاں کرتے ہیں' تب تک میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کے ہاں سے ہو آؤں، میں شیخ صاحب کے ساتھ ان کے صحن میں داخل ہوا تو موتیے کی اُسی مخصوص خوشبو نے میرے حواس معطر کرنا شروع کر دیے جو ان کے صحن کی کیاری میں ستون کے ساتھ لپٹی بیل سے پھوٹتی تھی۔ ستارہ اور شیخانی جی برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ شاید انہیں میری گلی میں آمد کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیخانی جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری کامیابی کے لیے بہت ساری دعائیں کر ڈالیں۔ ستارہ نے شکوہ کیا'' آپ تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے آیان صاحب..... ابھی سے یہ حال ہے اپنے ووٹرز کے ساتھ بے رُخی کا تو آگے چل کر کیا ہوگا.....؟'' ستارہ کی بات پر شیخ صاحب اور شیخانی جی زور سے ہنس پڑے۔ گہنا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور جانے کیوں آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے کہیں برسوں کی ''مشقِ جدائی'' اور ریاضت پل بھر میں خاک نہ ہو جائے۔

شیخ صاحب مجھے بیٹھک میں بٹھا کر چند لمحوں کی اجازت لے کر باہر نکل گئے۔ میں گم سم سا بیٹھا کمرے کے در و دیوار کو تکتا رہا۔ اچانک درمیانی پردے کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھا ستارہ یا شیخانی جی چائے لے کر آئی ہیں، میری نظر اُٹھی اور وہ مجھے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی دکھائی دی۔ ہاں..... وہ گہنا ہی تھی، وہی..... سراپا گہنا..... سفید جوڑے پر وہی سیاہ شال..... گلابی مہتاب چہرے کو چھوتی وہی ایک شریر سی لٹ..... کون کہتا ہے کہ ثبات صرف ایک تغیر کو ہے زمانے میں..... اور بھی بہت کچھ ایسا ہے جو کبھی بدلتا نہیں..... اُس کا یہ حسنِ بے پرواہ..... یہ بھی تو سدا یونہی قائم رہنے والا تھا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، لیکن آج اُس کی وہ دروائتی شوخی مفقود سی تھی۔ وہ کچھ الجھی الجھی..... کچھ کھوئی کھوئی سی

تھی۔ آداب کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا ''بہت دنوں کے بعد آپ کو ہماری یاد آئی.....اور وہ بھی شائد ابا کے اصرار پر.....'' میں چپ رہا اُس نے میری خاموشی کو معنی پہنا دیے ''حمید بھائی آج سہ پہر کو کچھ دیر کے لیے گھر آئے تھے حویلی لوٹنے سے پہلے.....وہ آپ سے اپنی آخری ملاقات اور رویے پر بہت شرمندہ تھے.....'' میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اِس کا مطلب جس دن اس بیٹھک میں میری حمید کے ساتھ آخری ملاقات ہوئی تھی، پردے کے پیچھے ہماری بات سننے والی گہنا ہی تھی۔ میں نے اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر کہا ''آپ کے بھیا نے اُس روز بھی کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ ایک بھائی کو اپنی بہنوں کے لیے اسی قدر فکر مند ہونا چاہیے.....''

''ہاں لیکن دوسرا کوئی اتنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا۔ آپ نے ان کی نوکری پکی کروا کر ابا کی بہت بڑی فکر دور کر دی ہے۔ انہوں نے آج تک یہ بات حمید بھائی سے چھپا کر رکھی تھی لیکن آج آپ سے ملاقات کے بعد یہ راز بھی ان پر کھل ہی گیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اب تو آپ ایک طرح سے ان کے مالکوں میں شمار ہوتے ہیں۔'' میں نے جلدی سے تصحیح کی ''نہیں نہیں.....ایسا کچھ نہیں ہے.....نواب صاحب تو بس ایک مہربان بزرگ کی طرح ہیں.....اور یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ مجھے اپنے قریب محسوس کرتے ہیں.....'' لیکن گہنا آج کچھ اور ہی تھی۔ ''نہیں.....حمید بھائی نے بتایا کہ زمرد حویلی میں بھی سب چوبیس گھنٹے آپ ہی کے گن گاتے ہیں، اور نواب صاحب تو آپ اور آپ سے جڑے لوگوں کے بغیر سانس تک نہیں لیتے.....آپ مجھے یہ بتائیں.....اتنے بہت سے لوگوں کو کیسے جوڑے رکھتے ہیں آپ اپنے ساتھ۔ میں نے اپنی نظریں جھکائے رکھیں۔ ڈر تھا کہ کہیں پھر سے خود کو نہ کھو دوں ''کہاں جوڑ پایا میں کسی کو اپنے ساتھ.....میرے تو اپنے بھی مجھ سے چھوٹ گئے.....''

''جو آپ سے چھوٹ گئے.....یہ ان کی اپنی قسمت ہے.....لیکن مجھے یقین ہے کہ جلد وہ سب ایک بار پھر آپ کے ساتھ ہوں گے.....ہم سب نے آپ کی کامیابی کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔'' میں نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ اُس کی نظر جھک گئی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے مات دینے والا آج میری جیت کی دعا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز سے گئے۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت ستارہ اور شیخانی چائے کے لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور گہنا بنا کچھ کہے اندر پلٹ گئی۔ کچھ دیر میں شیخ صاحب بھی تنویر سمیت بیٹھک میں داخل ہوئے ''معاف کرنا میاں.....میں ذرا سامنے والی گلی سے تنویر کو بلانے گیا تھا۔ یہ آج کل وہیں چند دوسرے طالب علموں کے ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہیں سارا دن۔ تحریری امتحان تو پاس کر لیا ہے اب اللہ کرے کہ زبانی امتحان میں بھی سرخرو ہو جائیں.....'' میں نے تنویر کو تحریری امتحان کی کامیابی پر بہت مبارک باد دی۔ اُس نے بتایا کہ اگلے ہفتے ہی اس کا زبانی امتحان (Viva) ہے، اور اُس نے اپنی طرف سے تیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میں نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور شیخ صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی۔ چلتے چلتے شیخ صاحب نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ حمید چاہتا ہے کہ اُس کے گھر والے اب زمرد حویلی کے اُس کوارٹر میں منتقل ہو جائیں جو نواب صاحب نے اُسے بطور مینیجر الاٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس کی نوکری کے فرائض کچھ ایسے ہیں کہ اُسے چوبیس گھنٹے حویلی میں ہی گزارنے پڑتے ہیں۔ شیخ صاحب کے بقول وہ ہفتہ بھر میں حویلی کے کوارٹر میں منتقل ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ وہاں ان کا پالا ظرف والوں سے ہی پڑے گا لہٰذا وہ اطمینان سے روانگی کی تیاری کریں۔

میں رات کو دیر سے یعقوب مینشن پہنچا، رات بارہ بجے بھی اُمیدواروں کی مہم ختم ہو چکی تھی لیکن مجھے لوٹتے لوٹتے تین بج گئے۔ میں

آخری جلسے کے بعد موئی کو دیکھنے ہسپتال پہنچا تو وہ اور رنگا میرے ہی انتظار میں تھے۔ میں نے موئی کے سرہانے بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا ''میں نے تمہاری ضد پوری کر دی..... اور اب تمہیں میری مان کر جلد از جلد یہ بستر چھوڑ کر پھر سے ہمارے ساتھ کھڑا ہونا ہوگا۔ تم جانتے ہو مجھے تمہارے بنا چلنے کی عادت نہیں ہے.....'' رنگا نے میرا شانہ دبایا ''یہ بڑا حرام خور ہے بجا..... اسے کھینچ کر یہاں سے لے جانا ہوگا ورنہ اس کی ہڈیوں کو بھی زنگ لگ جائے گا''۔ موئی ہم دونوں کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ رنگا نے زبردستی مجھے کچھ دیر کے لیے سیشن بھیج دیا کہ میں کچھ دیر کے لیے کمر ٹکا لوں لیکن میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی بقیہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، گہنا کی وہ بے چین آنکھیں مجھے تمام شب ستاتی رہیں، اور میں خود کو کوستا رہا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے میں بار بار پلٹ کر اس کوچہء جفا میں جاتا ہی کیوں ہوں؟ اب تو تنویر نے اس جفاکش کی فرمائش پر مقابلے کا امتحان بھی پاس کر لیا ہے اور چند دن میں وہ آخری مرحلے سے گزرنے کے بعد افسر بن جائے گا..... ویسا ہی افسر جیسا گہنا کے خوابوں میں بستا تھا۔ جس وقت تنویر مجھے اپنے تحریری امتحان میں کامیاب ہونے کی نوید دے رہا تھا اس لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں وہی خواب بسا ہوا دیکھ لیا تھا جو گہنا کی پلکوں تلے پلتا تھا، مگر آج گہنا کی آنکھیں بے خواب سی کیوں تھیں؟ یونہی آنکھوں آنکھوں میں میری رات بھی بنا کسی خواب کے کٹ ہی گئی۔ کہتے ہیں خواب ہمیشہ بڑے دیکھنے چاہئیں تاکہ تعبیر بھی بڑی ملے، لیکن مجھ جیسے شوریدہ سر کیا کریں کہ جن کی قسمت میں کوئی خواب ہی نہ ہو.....؟''

ایک دن کے بعد پولنگ تھی اور شہر کا ماحول تناؤ کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ رنگا نے اس روز خاص طور پر مجھے ہسپتال سے تنہا کہیں باہر جانے سے منع کر رکھا تھا اور میں دن بھر موئی کے کمرے میں ہی اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جانے کیوں مجھے اب کسی بھی چیز کے نتیجے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ امتحان کا مزہ تب تک ہی رہتا ہے جب تک ہمیں کسی اچھے نتیجے کی آس یا ڈر سے نتیجے کا خوف رہتا ہے، لیکن اگر ہم اس آس اور خوف کی کیفیت ہی سے باہر نکل آئیں تو پھر کوئی امتحان، امتحان نہیں رہتا، بس ایک معمول بن جاتا ہے۔ میں بھی کسی ''معمول'' کی طرح بیٹھا اپنے سامنے اپنے باقی تمام ساتھیوں کو رنگا کی سربراہی میں اگلے روز ہونے والے اس امتحان کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتا رہا، مگر خود میرے اندر ہار یا جیت کی تحریک شائد ختم ہو چکی تھی۔ جو اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکا ہو اُسے پھر بھلا ان معمولی بازیوں سے کیا سروکار.....؟؟؟

آخر کار پولنگ کا دن بھی آن پہنچا۔ رنگا اپنی جیپ میں مجھے بٹھا کر خود ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے حلقے کا جائزہ لینے کے لیے صبح سویرے اپنے باقی لشکر کے ساتھ نکل پڑا، موئی نے جاتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ مجھ سے پھر کمرے میں رُکا نہیں گیا اور میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ دھوپ چڑھتے ہی پولنگ اور دردروں کا مزاج بھی گرم ہوتا چلا گیا۔

شہر میں جا بجا دنگے فساد کی خبریں پھیل رہی تھیں، اور مخالفین اپنے حریفوں کو پچھاڑنے کے لیے اس روز ہر حربہ آزمانے کو تیار تھے۔ صبح سویرے سے گیارہ بجے تک ہمارے پولنگ اسٹیشن تقریباً ویران پڑے رہے، میری تین چار دن کی اپنی مہم سے غیر حاضری کے آثار اب دکھائی دینے لگے تھے۔ سارنگا بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ ''کیا کہتا ہے ساجن..... تُو بولے تو لڑکوں سے کہہ کر تیرے حلقے کی ساری پولنگ بند کروا دوں.....؟'' یہاں کا الیکشن ہی ختم کرائے دیتے ہیں.....'' میں نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں..... اگر دھاندلی سے ہی جیتے تو پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہ جائے گا جو آج سے پہلے بھی آپ کی طاقت کے بل پر جیتتے آئے ہیں۔ میں آج ہار بھی گیا تو ہم سب اسے آپ کی طرف سے انہیں ملی

فتوحات کا کفارہ سمجھ کر قبول کریں گے..... بے ایمانی کی جیت سے ایمان داری کی ہار ہزار ہا بہتر ہے۔'' رنگا نے میرا شانہ تھپتھپایا..... ''ٹھیک ہے سجناں..... آج تیری خاطر یہ پہلی ہار بھی قبول ہے سارنگا کو.....''

سارنگا اور میں نے اپنا ووٹ کیفے فراق کے پیچھے بنے پرائمری اسکول کے پولنگ اسٹیشن میں ڈالا اور پھر اچانک ہی سے دوپہر بارہ بجے کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ میرے پولنگ بوتھس (Polling Booths) پر نوجوانوں کے جمگھٹے نظر آنے لگے۔ یہ سارے آس پاس کے علاقوں کے وہ نوجوان تھے جن کی آنکھ ہی بارہ بجے دن کو کھلتی ہے۔ چند ایک اسٹیشنوں پر رنگا کے کارندوں اور دیگر امیدواروں کے ورکرز کے درمیان ہاتھا پائی اور سر پھٹول بھی ہوئی لیکن رنگا کو ان حالات کا تجربہ باقی سب سے کہیں زیادہ تھا۔ لہٰذا اس کے بندوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ سہ پہر تین بجے تک میرے اور میرے مخالفین کے حامیوں کی تعداد تقریباً برابر نظر آنے لگی تھی، لیکن صبح کے تین گھنٹے کا وقت اب بھی میرے خسارے میں شامل تھا۔ شام ساڑھے چار بجے جب پولنگ کا وقت ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا، رنگا مجھے لے کر کیفے فراق کے پچھلے اسٹیشن پر آ گیا اور ہم وہیں صحن میں درخت تلے بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ وہی پرائمری اسکول تھا جہاں میں راجہ، بالا اور منشی پڑھا کرتے تھے، اور آج بھی وہی تینوں اس پولنگ اسٹیشن کے انتظامات سنبھال رہے تھے۔ ہم اپنی بازی کا آخری داؤ کھیل چکے تھے اور اب صرف پتے پلٹے جانے کا انتظار باقی تھا، اور پھر اچانک میں نے جو دیکھا وہ میرے ہوش اور گمان کی سرحد سے بالکل پرے تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ریحان ابا کو لیے میرے پولنگ اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

باب32

چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ تعبیر تھی۔ میری زندگی بھر کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر..... کہ کبھی ابا مجھ پر بھی اُتنا ہی اعتماد اور اعتبار کریں جتنا انہیں ریحان پر تھا، میں یونہی گم سم کھڑا ان دونوں کو دیکھتا رہا اور وہ چلتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ رنگا بھی ابا کو دیکھ کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ میرے منہ سے سلام کے لفظ بھی نہ نکل پائے۔ ریحان نے مجھے ہوش میں لانے کے لیے زور سے کھنکار کر کہا ''کہاں گم ہو..... ابا تمہیں ووٹ ڈالنے کے لیے یہاں تک چل کر آئے ہیں.....'' میرے حلق میں نمکین پانی کا پھندہ سا کستا چلا گیا اور میری آنکھیں بھیگنے لگیں، میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میری آواز بیٹھ چکی تھی۔ ابا نے اپنی چھڑی کا دستہ میری گردن میں ڈالا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے وہ بچپن میں ڈانٹنے اور مجھے سرزنش کرنے کے لیے اُسے میری گردن میں پھنساتے تھے ''مجھے تمہاری جیت یا ہار سے کوئی غرض نہیں ہے نالائق .....لیکن اگر جیت کر تم نے اپنے وہ سارے وعدے پورے نہیں کیے جو تم نے اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ کیے ہیں تو پھر اس چھڑی کو حسب معمول یاد رکھنا..... کھال ادھیڑ دوں گا تمہاری..... کیا سمجھے.....''۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ابا دھاڑے ''اب رونا کیوں ہے گدھے..... چلو مجھے اپنا بوتھ دکھاؤ.....'' ابا دو قدم آگے بڑھے، سارنگا نے جلدی سے ان کی رہنمائی کی۔ میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ ابا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، میں بلک بلک کر رونے لگا اور انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا، جانے کتنے جنموں کے بعد مجھے ان کے شانے پر سر رکھ کر رونے کا موقع دوبارہ ملا تھا۔ شاید میں ساتویں جماعت میں تھا جب سائیکل سے گرنے کے بعد چوٹ لگنے پر یوں ابا کے گلے لگ کر رویا تھا، ابا مجھے تھپکتے اور ''ارے ارے'' کہتے رہے اور میں یونہی پھڑکتا رہا۔ آس پاس کھڑے میرے دوست بھی رونے لگے اور خود رنگا بھی مجھے اپنے آنسو پونچھتا نظر آیا۔ ریحان بھی میرے کاندھے سہلاتے ہوئے سسکنے لگا۔ ابا کے لیے ہم دونوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ''یہ لو..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں..... بڑے میاں بھی بس سبحان اللہ ہی ہیں..... اب بس کرو نالائقو..... مجھے بھی رُلاؤ گے کیا.....؟.....'' بڑی مشکل سے رنگا نے ہمیں سنبھالا اور ابا کے ہاتھوں میرے نام کی پرچی ڈبے میں ڈلوا دی۔ 'مشی' بالے اور راجہ نے زور زور سے تالیاں پیٹ کر آسمان سر پر اٹھا لیا، اور پھر ان کی تالیوں کی گونج میں باقی افراد کی تالیاں بھی شامل ہوتی چلی گئیں۔ میں نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی سرخرو ہو گیا۔ میرے ابا نے میرے حق میں ووٹ ڈال کر مجھے ہمیشہ کے لیے فتح یاب کر دیا تھا، ریحان نے دھیرے سے میرے کان میں بتایا کہ امی اور چھوٹی کو وہ لوگ زنانہ پولنگ اسٹیشن پر چھوڑ آئے تھے۔ جاتے جاتے ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ''جیتے رہو.....'' اور اس دعا کے بعد آج میری زندگی ختم بھی ہو جاتی تو مجھے کوئی گلہ اور قدرت سے کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ واپسی پر وہ چند قدم دور سر جھکائے اور کسی گہری سوچ میں گم رنگا کے پاس چند لمحوں کے لیے ٹھہرے ''صرف جنم دینے سے ہی کوئی باپ نہیں بن جاتا..... آپ نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا..... اور کسی باپ کی طرح ہی آج تک اس کی حفاظت کی ہے..... میرا لوگوں کو پرکھنے کا نظریہ شاید اس دور کے لیے فرسودہ ہو چکا ہے..... لیکن یہ نئی نسل اپنے راستے خود بنا لیتی ہے..... ہو

سکے تو اسے گھر واپس بھیج دیجئے گا.....اس کی ماں ہمیشہ خود کو ہلکان کیے رکھتی ہے۔" ابا رنگا کا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے، اور رنگا کسی فرمانبردار بچے کی طرح سر جھکائے وہیں کھڑا رہا، اور ٹھیک اُسی لمحے نواب صاحب اور پاشا بھی پولنگ اسٹیشن میں داخل ہوتے نظر آئے۔ ابا نے چند گھڑیاں رک کر ان کے ساتھ سلام دعا کی اور آگے بڑھ گئے اور پھر نواب صاحب کی مسکراہٹ نے سارے بھید کھول دیے۔ وہ ہم سب کی لاعلمی میں جب ہم موسیٰ کی زندگی کے لیے ہسپتال کی راہداریوں میں سر ٹکراتے پھر رہے تھے، ابا سے مل آئے تھے۔ نواب صاحب کو اپنے دروازے پر ان کی گاڑی سے اترتا دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ابا بھی پریشان ہو گئے ہوں گے، لیکن نواب صاحب نے انہیں الف تا ے ساری کہانی سنائی اور ابا کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جیسے ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی ٹھیک اُسی طرح ہر سیاہ کوئلہ نہیں ہوتا۔ کچھ ہیرے بھی اس کالک میں دبے رہ جاتے ہیں نواب صاحب نے میرے حق میں دلائل دیتے وقت ضرور اپنا زورِ بیاں آخری حد تک صرف کر دیا ہوگا، ابا کو اُن کے آنے سے پہلے ہی مجھ پر چلائی گئی گولی اور موسیٰ کا مجھے بچاتے ہوئے خود کو قربانی کے لیے پیش کرنا بھی علاقے کی پولیس اور لوگوں سے حرف بہ حرف نقل ہو چکا تھا، اور پھر جب سارے محلے والوں نے یک جا ہو کر ابا کا در کھٹکھٹایا اور میری اس واحد تقریر کا ذکر کیا جس میں میں نے مرتے دم تک اُن کے ساتھ کھڑے رہنے کا وعدہ کیا تھا تو آخر ابا کے دل کا سنگ بھی پگھل ہی گیا۔ منتہی آنچ نواب صاحب کے دلائل نے فراہم کر دی جب انہوں نے ابا سے صرف اتنا پوچھا کہ کیا انہیں نواب صاحب کے خاندان اور ان کے حسب نسب پر کوئی شبہ ہے.....؟.....اگر نہیں تو پھر وہ اپنے بیٹے پر اتنا یقین ضرور قائم رکھیں کہ اگر اُس میں اتنی صلاحیت نہ ہوتی تو آج وہ نواب صاحب کے گھر کا ایک فرد نہ بن چکا ہوتا۔ نواب صاحب نے ابا سے یہ بھی کہا کہ انہیں ہمیشہ یہ حسرت ہی رہے گی کہ آیان احمد ان کا اپنا بیٹا کیوں نہیں ہے.....میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھا پاشا کی زبانی رنگا کو سنائی جانے والی یہ داستان سنتا رہا جس نے ابا کی کایا پلٹ دی تھی۔ نواب صاحب کی فریاد اور دلائل کا نتیجہ آج میرے سامنے تھا۔ دو نسلوں کے درمیان کبھی نہ مٹنے والے فاصلے اور سدا کی گہری خلیج کو آج انہوں نے پاٹ دیا تھا۔ آج ابا نے تسلیم کر لیا تھا کہ شائد ہم دونوں ہی کہیں نہ کہیں اور ہمیشہ درست ہوتے تھے، بس ہمارا نظریہ جدا تھا۔

پولنگ کا وقت ختم ہو چکا تھا اور مغرب کے بعد سرکاری عملہ تمام مواد اور ڈبوں سمیت جا چکا تھا۔ ہم سب یعقوب مینشن لوٹ آئے، رات گئے سرکاری ٹی وی پر دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے نتائج بھی چلنا شروع ہو گئے۔ رنگا نے اتنے بڑے ہجوم کے ساتھ واپس موسیٰ کے پاس ہسپتال جانے کے بجائے وہیں مینشن کے بڑے احاطے میں کارندوں کو ٹی وی لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ ہسپتال انتظامیہ ہم سے پہلے بھی کئی بار درخواست کر چکی تھی کہ ہمارے ساتھ موجود درکرز کی بھیڑ سے باقی مریضوں کے آرام میں بہت خلل پڑتا ہے، البتہ ہماری درخواست پر موسیٰ کے لیے اُس کے کمرے میں خبریں لگا دی گئی تھیں۔ نواب صاحب اور پاشا وہیں موسیٰ کے کمرے میں ہی موجود تھے اور رات بھر وہ وہیں میرے آخری نتیجے کا انتظار کرنے والے تھے۔

یعقوب مینشن میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر بار جب ہمارے حلقے کے کسی نئے پولنگ اسٹیشن کے نتائج جمع کر کے ووٹوں کی گنتی بتائی جاتی تو چاروں جانب ایک شور سا مچ جاتا تھا۔ کچھ من چلے نوجوانوں نے باقاعدہ ڈھول تاشوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا، لیکن شروع کے نتائج میرے حق میں نہیں تھے اور پہلی بار انہیں ڈھول بجانے کا موقع رات ایک بجے کے بعد ملا جب سول لائن والے پولنگ اسٹیشن پر ووٹوں کی گنتی میں میرا شمار

میرے قریبی حریف اور حلقے کے پرانے ایم پی اے سے کچھ زیادہ نکلا۔ میں اور پرانا ایم پی اے تقریباً ساتھ ساتھ ہی شمار میں برابر تھے، اور پھر رات تین بجے کے بعد جب حتمی نتائج کا اعلان شروع ہوا تو میں کئی علاقوں میں اس سے ہار رہا تھا۔ رنگا کے شاگردوں اور میرے جوان کارندوں کے چہروں پر مایوسی چھانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ایسی ہی پژمردگی مشی، راجہ، ریحان اور بالے کے چہروں سے بھی ٹپک رہی ہوگی جو اس وقت کیفے فراق کے ہال میں مرزا اور چچا فراق سمیت محلے کے سبھی افراد کے ساتھ بیٹھ کر یہ نتائج دیکھ رہے ہوں گے، کالونی سے آنے والے ایک ورکر نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ہمارے محلے کے احاطے میں بھی ایک بڑا ٹی وی رکھے محلے کی تمام خواتین اس کے گرد جمع بیٹھی یہ نتائج تک رہی تھیں۔ جبکہ امی اور چھوٹی کے بارے میں، میں یہاں بیٹھے ہوئے بھی یہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں حسب معمول جائے نماز بچھائے گڑگڑاتی اور میری کامیابی کی دعائیں اور منتیں مانگنے کے لیے سجدے میں پڑی ہوں گی۔ اس روز مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ اپنوں کے چہروں پر لمحہ بہ لمحہ پھیلتی ہوئی مایوسی کو دیکھنا کس قدر اذیت ناک ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بھی رنگا اور اڈے کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر پھیلتی ہوئی یہ تاریکی زیادہ دیر تک دیکھی نہ گئی اور میں نے احاطے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میرا اس طرح وہاں سے اٹھ جانا ان سب کو مزید اداس اور دکھی کر دے گا لہٰذا میں خود پر جبر کر کے وہیں بیٹھا رہا..... پھر نہ جانے کیا ہوا..... شاید امی اور چھوٹی کے سجدے قبولیت کی چوکھٹ پار کرنے لگے تھے، نتائج کے آخری لمحات میں میں اپنے حریفوں سے آگے نکلتا گیا اور پھر میرے اور پرانے ایم پی اے کے درمیان صرف چند ووٹوں کا فرق باقی رہ گیا۔ اب تک وہی ہر علاقے سے سب کو ہراتا آ رہا تھا لیکن جب خاص ریگل چوک، ڈاک یارڈ اور سادات محلے کی حتمی گنتی ختم ہونے لگی تو میں اس کے قریب آتا گیا اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ ہم تقریباً برابر ہو گئے۔ رنگا سمیت تمام استاد، شاگرد، کارندے اور اڈے کا باقی سبھی عملہ حتیٰ کہ مرکزی گیٹ کے دربان بھی اپنی ڈیوٹی بھلا کر دم سادھے ٹی وی کے سامنے یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ تقریباً تمام وارڈز اور کونسل گنتی کے معاملے میں بھگتائے جا چکے تھے، رنگا کے دستی فون سیٹ پر اس کے کارندے اُسے لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورتِ حال سے بھی آگاہ رکھ رہے تھے اور رات بارہ بجے تک تو وہ فون رنگا کے کان سے ہی لگا رہا تھا لیکن اب بے دھیانی میں رنگا وہ فون بھی میز کے کنارے رکھ کر بھول گیا تھا اور اُس کی سبز بتی بار بار جل بجھ کر بند ہو رہی تھی لیکن اب فون سننے کا ہوش ہی کسے تھا، اور پھر بابو محلے اور کیفِ فراق کی پولنگ اسٹیشن کا نتیجہ بھی آ گیا۔ گنتی کرنے والے اپنی گنتی بھول چکے تھے۔ دور سے کسی پڑھا کو نوجوان نے چیخ کر کہا۔ ''انو بھائی کے ووٹ برابر ہو گئے ہیں'' اسماعیل چلایا

''نہیں..... برابر نہیں..... یہ تو کچھ زیادہ بنتے ہیں.....'' آپس میں کچھ تکرار ہوئی اور کوئی تیسرا اٹھ کر رنگا کی طرف دوڑا ''مبارک ہو اُستاد..... اپنا انو بھائی تو جیت گیا ہے.....'' ہم سب نے بے یقینی سے اسماعیل کی طرف دیکھا اور پھر اچانک سکرین کے نیچے چلتی پٹی پر میرا نام جگمگایا ''غیر حتمی نتائج کے مطابق آیان احمد پندرہ ہزار چار سو تیس ووٹ سے اول اور ملک نذیر پندرہ ہزار ستر ووٹ سے دوئم رہے۔'' ایک لمحے کے لیے سب چپ ہو گئے اور ہم سب نے اپنی بصارتوں پر یقین کرنے کے لیے کچھ وقت لیا اور سب سے پہلے میرے مقابلے پر آنے والے اُستاد سلامی نے زور کا نعرہ لگایا ''اوئے بادشاہو..... انو جیت گیا ہے..... پھاڑ ڈالو آج سارے نگاڑے..... آواز آسمان تک جانی چاہیے نکمو.....'' اور پھر وہ طوفان آیا کہ واقعی یعقوب مینشن کے در و دیوار زمیں بوس ہونے لگے، رنگا نے بھاگ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور ہوائی فائرنگ ڈھول اور نگاڑوں کی آواز سے

آسمان لرزنے لگا۔

ابتدائی نتائج کے مطابق میں قریباً تین سو ووٹوں کے فرق سے اپنے حریف سے آگے رہتے ہوئے جیت چکا تھا، نوجوانوں نے بڑھ کر مجھے اپنے کاندھوں پر سوار کرلیا اور رنگا نے مینشن کے باہر رات بھر سے میری جیت کی اُمید میں بیٹھے فقیروں پر نوٹوں کی برسات کردی۔ ٹھیک اُس لمحے جب میرا نام دوسری مرتبہ سکرین پر آیا اور ووٹوں کا فرق چار سو سے زائد بتایا گیا، تبھی قریبی مسجد سے فجر کی اذان گونجی ''اللہ اکبر..... اللہ اکبر..... واقعی اللہ عظیم ہے..... اُس نے مجھ جیسے بے گھر، بے آسرا اور بے نوا کو آج اتنا نواز دیا تھا کہ جسے پانے میں لوگ اپنی عمریں ضائع کردیتے ہیں، اور پھر سب سے پہلے رنگا اور اس کے پیچھے تمام یعقوب مینشن سجدے میں گر گیا۔ یعقوب مینشن کے احاطے میں پہلی مرتبہ صفیں ڈال کر صبح کی نماز باجماعت ادا کی گئی جس میں سبھی ایک ساتھ سربسجود ہوئے۔ ٹھیک یہی مناظر کیف فراق اور ہمارے محلے کی مسجد میں بھی دھرائے گئے ہوں گے، آج اُن کا انو بھی تو جیتا تھا۔ وہی آیان..... جسے ہارنے کی عادت سی پڑ گئی تھی، وہ آج جیتا تو یوں جیتا کہ اُس نے اپنوں کے ماضی کی تمام شکستوں کا بدلہ بھی چکا دیا تھا۔ روشنی ہونے سے پہلے ہی سارا محلہ ریحان کی معیت میں مجھے مبارکباد دینے کے لیے یعقوب مینشن کے دروازے پر جمع ہو چکا تھا، لیکن آج اُن سب کے لیے دروازے کھلے تھے، آج یہ کسی استاد کا اڈہ نہیں اُن سب کا اپنا گھر بن چکا تھا۔ مشی، بالا، راجہ، ریحان، مرزا اور چچا فراق سبھی تو وہاں موجود تھے مجھ سے لپٹ کر مبارکبادیں دیتے ہوئے، میرے بال سہلاتے ہوئے، میرے گال کھینچتے ہوئے، شیخ صاحب تو باقاعدہ گھر کی کیاری سے جلدی میں پیر وئے گئے پھولوں کے ہار لے کر آئے تھے جو تنویر نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ڈال دیے..... جانے اس تحفے کا نام کسی نے ہار کیوں رکھ ڈالا تھا، اس کا نام تو جیت ہونا چاہیے تھا، کہ اس کا تعلق تو سدا فتح سے ہی رہا ہے، ابا کے بارے میں پوچھنے پر ریحان نے مجھے بتایا کہ انہوں نے شکرانے کے لیے کچھ نیاز مانگ رکھی تھی۔ امی وہ بانٹ دیں، تبھی وہ گھر سے نکلیں گے۔ میں نے اُسی وقت رنگا سے گھر چلنے کا کہا اور ہم سب کچھ ہی دیر میں پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ راستے میں میری فتح کا جشن مناتے میرے نوجوان ورکر اور ساتھی ہمارے ساتھ چلتے گئے..... اور قافلہ بنتا گیا..... میں گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میرے ذہن میں، گھر چھوڑتے وقت کا اپنا جملہ گونجا ''اب میں اُسی وقت یہاں قدم رکھوں گا جب آپ کو کچھ بن کر دکھاؤں گا.....'' غصے اور شدید جھنجھلاہٹ میں کہی گئی ایک بات کو قدرت نے میری دعا میں بدل دیا تھا۔ سچ ہے آہیں کب دعاؤں میں اور دعائیں کب آہوں میں بدل جاتی ہیں..... یہ کوئی نہیں جانتا۔ امی نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھے دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے رو پڑیں۔ میں نے لپک کر ان کے ہاتھ تھام لیے..... ''اپنے انو کو ناشتے کا بھی نہیں پوچھیں گی کیا.....؟.....'' کچھ ہی دیر میں چھوٹی اور ابا بھی برآمدے میں میرے گرد جمع ہو چکے تھے، ریحان باہر گلی میں رنگا اور باقی ہجوم کے ساتھ کھڑا میرے حق میں راجہ اور مشی کے ساتھ مل کر نعرے لگا رہا تھا ''اپنا انو..... آوے ہی آوے..... دشمنوں کے دل پر..... چھاوے ہی چھاوے.....'' ابا نے مجھے ایک بار پھر یاد دلایا ''آیان..... اپنے کہے ہوئے وعدوں کو بھول نہ جانا..... آج تمہاری خاطر یہ جو پورا علاقہ باہر اُمڈا پڑ رہا ہے..... انہیں تمہاری صورت میں ایک نئی اُمید نظر آ رہی ہے..... وہ آس جو شائد برسوں پہلے مر چکی تھی، اب تمہاری صورت پھر زندہ ہونے لگی ہے..... اسے اب دوبارہ مرنے نہ دینا..... ورنہ یہ سب جیتے جی مر جائیں گے.....''۔

''آپ مطمئن رہیں..... میں اپنا کوئی وعدہ نہیں بھولا..... یہی محلہ اور یہی گھر ہمیشہ میرا مرکز رہے گا۔ انہیں مجھ سے ملنے کے لیے کسی اونچی فصیل کو پار نہیں کرنا پڑے گا.....'' ابا مسکرا دیے ''جیتے رہو.....''

باہر گلی میں لگتے نعروں میں تیزی آنے لگی تھی۔ میں جلدی سے امی کے ہاتھ کی چائے اور چھوٹی کے ہاتھ سے بنے پراٹھے کے چند لقمے لے کر باہر نکل آیا۔ پھر وہ سارا دن کیسے لمحوں میں گزر گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ ہم ہسپتال پہنچے تو موسیٰ اور نواب صاحب میرے ہی انتظار میں بے چین بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگا موسیٰ کو دیکھتے ہی چلایا ''لے بھئی موسیٰ..... تیرا شاگرد تو اُستادوں کو بھی مات دے گیا..... ایم پی اے بن گیا ہے تیرا لاڈلا.....'' آج موسیٰ کے پاس بھی مجھے دینے کے لیے وہی تحفہ تھا۔ یہ آنسو بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ خوشی ہو یا چاہے غم..... دونوں مواقع پر ہماری آنکھوں کا ساتھ نبھانے کے لیے اُن کے یہی ساتھی سب سے پہلے دستک دیتے ہیں۔ میں بس موسیٰ کو تھپکتا رہا۔ جانے یہ آہنی نظر آنے والے میرے بڑے اندر سے اتنے موم کیوں ہوتے جا رہے تھے۔ یا شائد یہ موم سدا ہی سے ان کے اندر کا حصہ تھا، صرف کسی اپنے کی آنچ کی کمی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے خانم اور فضہ کی جانب سے بھی ڈھیروں مبارک باد کا پیغام سنایا اور یہ بھی کہ وہ سبھی زمرد حویلی کے تمام مکینوں کے ساتھ میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن مجھے حویلی جاتے جاتے بھی تین دن لگ ہی گئے، کیونکہ اگلے دن موسیٰ کے زخموں کے ٹانکے کھلنا تھے اور دو دن ابتدائی نتائج حاصل کرنے اور علاقے کے معتبرین سے ملنے میں نکل گئے۔ تیسرے دن جب میں رنگا اور اسماعیل کے ساتھ حویلی پہنچا تو سورج ماند پڑ رہا تھا اور عصر کے وقت کی نرم سردیوں کی دھوپ نے زمرد حویلی کے کلش دہکا رکھے تھے، چاروں طرف سنہری دھوپ کا سونا بکھرا ہوا تھا۔ خانم اور نواب صاحب نے حویلی کے دالان میں ہی میرا استقبال کیا۔ خانم بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ 'لڑکے..... تم نے آخر کر دکھایا..... شاید تمہارے لیے ہی کہا ہے کسی نے کہ ناممکن لفظ کا وجود نہیں ہوتا.....'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ''سب آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' اچانک پیچھے سے فضہ کی شرارتی آواز اُبھری ''اچھا جناب آیان احمد صاحب..... گویا ہماری دعاؤں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے سارے فسانے میں.....'' فضہ کی بات سن کر سبھی مسکرا دیے۔ نواب صاحب رنگا کو لے کر خانم کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئے۔ میں اور فضہ ان کے پیچھے چل پڑے، اچانک فضہ رُک گئی۔

''آیان.....'' میں نے بھی رُک کر دو قدم پیچھے کھڑی فضہ کو دیکھا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ آوارہ جوگی اور بنجارہ ایک دن زمانے بھر کو جیت لے گا۔ میری پیشین گوئی کا کوئی انعام نہیں دیں گے آپ.....'' میں مسکرا دیا ''انعام بھی آپ ہی بتا دیں نجومن جی'' فضہ بھی ہنس پڑی..... ''چلیں..... یہ طے رہا کہ وقت آنے پر یہ نجومن اپنا انعام مانگ لے گی.....'' اتنے میں اندر سے خانم ہمیں بلانے کے لیے باہر چلی آئیں، اور ہم دونوں ان کے پیچھے اندر ہال کی جانب بڑھ گئے، جانے کیوں اس روز مجھے خانم کا چہرہ اور آنکھیں یہ کہتی ہوئی نظر آئیں کہ وہ اپنی فضہ کے دل کے ہر راز سے آشنا ہیں۔

باب33

اس روز کھانے کی میز پر میں نے نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے سجاد کو بھی بہت دن کے بعد دیکھا، میں نے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو نواب صاحب کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ''وہ ناخلف اب مجھے معافی کی درخواستیں بھجوا رہا ہے، اور خانم بھی اُس کی طرف داری کرتی رہتی ہیں کہ مجھے اُسے معاف کر دینا چاہیے.....'' میں نے بھی خانم کی تائید میں کہا ''اگر وقار کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو آپ کو اُسے معاف کر دینا چاہیے.....شاید یہ آخری ٹھوکر اُس کے لیے سبق آموز ثابت ہوئی ہو.....'' نواب صاحب نے ہتھیار ڈال دیے ''ٹھیک ہے میاں.....اگر سب کی یہی مرضی ہے تو پھر میں اُسے معاف تو کر دوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ وہ ولایت جا کر اپنی ادھوری تعلیم سب سے پہلے مکمل کرے.....تب ہی میں اس کی شکل دیکھوں گا۔'' وقار تک یہ پیغام پہنچانے کا فریضہ خانم نے سجاد کے سُپرد کر دیا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ حمید کی غیر حاضری کے بارے میں نواب صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے گھر والوں کو زمرد حویلی کے پچھلے حصے میں بنی منیجر کی رہائش گاہ میں منتقل کروانے کے مقصد سے آج ہی شہر گیا ہے۔ حمید کے گھر والوں کی حویلی منتقلی کا سن کر فضہ نے چونک کر میری جانب دیکھا، میں اُسے اس رات حمید اور شیخ صاحب کے تمام خاندان کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا اور اُسے گہنا کو دیکھنے کا شدید اشتیاق بھی تھا۔ خانم نے رنگا سے ناہید کے بارے میں بھی بہت بار پوچھا اور اصرار کیا کہ رنگا اُسے چند دن کے لیے زمرد حویلی چھوڑ جائے تو کتنا اچھا ہو.....

تین دن پہلے جب میری کامیابی کا اعلان ہوا تھا اور میں اور سارنگا ناہید کی کوٹھی پہنچے تو اس نے وہاں دن میں بھی چراغاں کر رکھا تھا۔ رنگا اپنی لاڈلی کے دیوانے پن پر مسکرا تا رہا اور وہ بھاگ بھاگ کر اپنے بابا اور بھیا کی خدمت میں ہلکان ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اگر میں ہار جاتا تو پھر وہ کیا کرتی تو اُس نے رک کر اٹل یقین اور عزم سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا ''آپ کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی تھی آیان بھائی.....یہ ایک بہن کا اُس کے خدا کے ساتھ معاملہ تھا.....اور مجھے یہ یقین بھی اُسی خدا نے بخشا ہے کہ آپ کی فتح یقینی تھی.....''

رنگا نے خانم سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ناہید کو حویلی بھجوا دے گا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نے نواب صاحب سے رخصت طلب کی۔ وہ سب پورچ تک ہمیں چھوڑنے کے لیے آئے اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فضہ نے دھیرے سے مجھے کہا ''تو گہنا جی یہاں آ رہی ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ آپ کا خواب کیسا تھا.....؟'' میں نے پلٹ کر فضہ کو دیکھا ''وہ میرا خواب ضرور تھی لیکن اُس خواب کی تعبیر میرا مقدر نہ بن سکی.....کاش وہ خواب نہ ہوتی.....صرف تعبیر ہوتی.....'' ہم یعقوب مینشن واپس پہنچے تو رات ڈھل چکی تھی، اگلے چند دن حکومت سازی اور جوڑ توڑ میں گزر گئے اور کامیاب ارکان کا باقاعدہ اعلامیہ جاری کر دیا گیا، موسیٰ بھی ہسپتال سے فارغ ہو کر دوبارہ مینشن آ چکا تھا اور پھر ایک صبح ریحان اور ابا مجھے باقاعدہ لے جانے کے لیے مینشن آ گئے، ابا نے رنگا کی اُداسی دیکھ کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ آپ سب کے لیے بہت مشکل ہو گا لیکن آیان نے سب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چاہے حکومت میں بیٹھے یا چاہے مخالفت میں.....لیکن وہ اپنا محلہ نہیں چھوڑے گا.....'' رنگا نے ایک گہری سانس لی ''جی ماسٹر صاحب

..... مجھے سب یاد ہے..... لیکن یہ جاتے جاتے اس چار دیواری سمیت ہم سب کو ہمیشہ کے لیے اُداس کر جائے گا..... موسیٰ کو تو ابھی سے ہول اُٹھنے لگے ہیں.....'' لیکن وہ سب جانتے تھے کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہوگا۔ رنگا نے ابا سے درخواست کی کہ اس کی خواہش ہے کہ مجھے باقاعدہ اعزاز کے ساتھ یعقوب مینشن سے رخصت کیا جائے لہٰذا وہ ایک دن مزید صبر کر لیں، کل شام رنگا اور موسیٰ مجھے خود بابو محلے چھوڑ جائیں گے۔ ابا کے جانے کے بعد جب میرے جانے کی خبر پھیلی تو ان سب کے چہرے واقعی مُرجھا سے گئے اور رات تک میں ان سب کو یہی سمجھاتا رہا کہ میں چاہے یہاں رہوں یا چاہے اپنے گھر میں..... اب ہمارے درمیان جزا رشتہ موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ اگلے دن صبح سے یعقوب مینشن میں مہمانوں کا تانتا بندھنے لگا۔ رنگا نے شائد سارے شہر کو ہی مدعو کر لیا تھا، اڈے کے پرانے ساتھی، سیاستدان، نوکر شاہی، پولیس، تاجر..... کون سا ایسا طبقہ تھا جو اُس شام رنگا کی دعوت میں مدعو نہیں تھا۔ شہر کے آئی۔ جی نے اس روز خاص طور پر یعقوب مینشن کی سیکورٹی پر پولیس کے افسروں اور نفری کی ڈیوٹی لگائی تھی، میں کسی کام سے گیٹ سے باہر نکلا تو مجھے ایک جانب اے ایس پی بلال کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کھٹ سے سلیوٹ کسا ''آئی۔ جی صاحب نے کل سے میری ڈیوٹی آپ کے ساتھ لگا دی ہے۔ سنا ہے آپ نے سرکاری رہائش گاہ لینے سے انکار کر دیا ہے لہٰذا کل سے میری نفری آپ کے اپنے گھر کے باہر موجود ہوگی۔ آپ سے درخواست ہے کہ کہیں بھی جانے سے پہلے اپنا پروگرام اور شیڈول پولیس کو ضرور بھجوا دیا کریں.....'' میں نے بلال کو غور سے دیکھا ''کیا صرف ایک الیکشن جیت لینے سے کوئی مجرم سے محرم بن جاتا ہے، ''تم سے آپ'' کا سفر طے کر لیتا ہے.....؟'' بلال کو بھی شائد وہ دن یاد آ گیا جب اُس نے مجھے اسی اڈے کے ایک لڑکے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر رکھا تھا۔ بلال نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولا ''سب نظام کی بات ہے آیان صاحب..... سچ تو یہ ہے کہ یہی نظام ہمیں محرم بھی بناتا ہے اور یہی مجرم.....'' میں نے بلال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آج بھی وہی آیان ہوں جو کل تھا، اور تم بھی آج مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ نظام چاہے کتنا ہی زنگ آلود کیوں نہ ہو جائے، ہم سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ سدا قائم رکھیں گے..... اور اس عمل میں مجھے تم ہمیشہ اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے.....'' بلال نے مسکرا کر میرا اس کے آگے پھیلا ہاتھ تھام لیا ''ضرور.....'' مجھے چلتے چلتے کچھ یاد آیا۔ ''اور ہاں..... مجھے سیکورٹی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے..... جس دن مجھے اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کے درمیان سیکورٹی کی ضرورت محسوس ہوئی، میں اُسی روز استعفیٰ دے دوں گا۔''

آخر کھانے کے بعد میرے الوداع کی گھڑی بھی آ گئی۔ میں فرداً فرداً اڈے کے ہر فرد سے گلے مل کر رخصت ہوتا رہا۔ یہ الوداع اس قدر اذیت ناک بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے پہلے کبھی نہ تھا۔ اسماعیل اور موسیٰ تو پہلے ہی احاطے کے دوسرے کونے میں جا کر اپنی بھیگی پلکیں سب سے چھپا رہے تھے، رنگا سب کو سنبھالنے کی خاطر خود پر ضبط کیے کھڑا تھا لیکن مجھ میں بھلا اتنے ضبط کا یارا کہاں تھا..... میں آخری استاد سے مل کر تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے باہر کے احاطے میں کھڑی رنگا کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سب آخری گاڑی کے روانہ ہونے تک وہیں کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے، دوسری جانب جب ہم بابو کالونی میں داخل ہوئے تو یکسر مختلف سماں تھا۔ سارے محلے میں میرے دوستوں نے چراغاں سا کر رکھا تھا۔ امی اور ابا نے چھوٹی اور ریحان سمیت گلی میں ہی میرا استقبال کیا۔ رنگا اور موسیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا رنگا بولا ''اچھا ساجن..... اب

چلتے ہیں۔ ماسٹر صاحب آپ کی امانت آپ کے سپرد ہے..... دیکھ لو کوئی کمی بیشی تو نہیں ہے.....'' ابا ہنس پڑے ''آپ نے تو اس نالائق کو بیش قیمت بنا کر واپس کیا ہے..... کمی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا.....'' رنگا اور موسیٰ نے بھاری دل کے ساتھ مجھے گلے لگایا۔ خود میرا دل بھی اندر سے کٹ رہا تھا۔ میں نے اسماعیل کی دل گرفتگی کم کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ میں کم از کم ہر جمعرات کی شام اُن سب سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

رنگا اور موسیٰ نے جاتے جاتے بھی کئی بار مجھے گلے لگایا۔ ان کے پلٹتے ہی مجھے محلے والوں نے گھیر لیا اور مجھے اپنے گھر کے صحن میں قدم رکھتے رکھتے نصف شب ہوگئی۔ چھوٹی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے محلے والوں کے رش اور پھر صحن میں دیر تک ابا اور امی کی موجودگی کی وجہ سے اُسے یہ موقع بہت دیر سے ملا۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ ''بھائی..... دو دن پہلے گہنا اور اُس کے گھر والے آئے تھے یہاں..... آپ کی کامیابی کی مبارکباد دینے.....'' میں نے چونک کر چھوٹی کو دیکھا ''اور کون کون تھا.....''

''سبھی تھے، ستارہ، گہنا ان کی امی اور ابا..... وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ اُسی دن زمرد حویلی منتقل ہو رہے ہیں..... اور ستارہ نے یہ بھی بتایا کہ تنویر بھائی نے مقابلے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے اور وہ جلد ٹریننگ کے لیے اکیڈمی جا رہے ہیں.....'' میں کچھ دیر خاموش رہا، اور پھر بولا تو خود میری اپنی آواز مجھے اجنبی لگی۔ ''چلو اچھا ہوا..... تنویر کی محنت رنگ لائی'' میں چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا تو چھوٹی نے پھر مجھے روک لیا۔

''پوری بات تو سن لیں آیان بھائی..... گہنا جاتے جاتے آپ کے لیے پیغام دے گئی ہے کہ آپ ایک بار زمرد حویلی آ کر اس سے ضرور مل لیں۔ وہ آپ کا انتظار کرے گی.....''۔ میں چونک سا گیا، اب گہنا کو مجھ سے بھلا کیا کام.....؟..... شاید تنویر کی کامیابی کی خوش خبری خود مجھے اپنی زبانی سنانا چاہتی ہو.....؟..... میں انہی سوچوں میں گم اوپر اپنے پرانے کمرے میں جا کر بستر پر پڑ گیا۔ ابا اور ریحان نے بہت کوشش کی تھی کہ میں نیچے برآمدے میں ریحان والا کمرہ لے لوں، لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ مجھے اپنی پرانی شناسا دیواروں کے درمیان اور اُس مہربان چھت کے نیچے ہی سب سے اچھی نیند آئے گی، لیکن چھوٹی نے گہنا کا پیغام دے کر میری رہی سہی نیند بھی اڑا دی تھی، لہٰذا میں کھلے آسمان تلے آ کر لیٹ گیا اور پھر ساری رات میرے اپنے دوست تاروں کے ساتھ گلے شکوے چلتے رہے۔ وہ سب مجھ سے روٹھے روٹھے تھے کہ میں تو انہیں بھلا ہی بیٹھا تھا، میں نے انہیں بڑی مشکل سے منایا کہ میں بھلا کب اُن سے جدا ہوں..... ہاں بس کچھ دن کے جوگ کی وجہ سے کچھ دور ضرور ہو گیا تھا، اور پھر اسی روٹھنے منانے میں صبح ہوگئی، اور سب ستارے اگلی رات کے وعدے پر ماند پڑ گئے۔

آج میری نئی زندگی کی پہلی صبح تھی۔ ابا نے ریحان کو بھیج کر مجھے جلدی نیچے بلوا لیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹی نے میرے بازو پر امام ضامن باندھا اور امی نے میرے سر پر قرآن کا سایہ کر کے مجھے گھر سے رخصت کیا۔ باہر گلی میں میرے تینوں دوست میرا انتظار کر رہے تھے، وہ میرے ساتھ بس اسٹاپ تک چلے آئے۔ مجھے اسمبلی جانے والی روٹ کی بس کا انتظار تھا، اس دن سفر کرنے والے کم اور میرے ساتھ جانے والے لوگ زیادہ تھے۔ بس حسب معمول اپنے وقت سے پندرہ منٹ لیٹ پہنچی، اور منشی نے اپنی کاپی میں درج کر لیا ''بس کے اوقات درست ہونے چاہئیں.....'' بس میں ہمیشہ کی طرح شدید بھیڑ اور خواتین والے حصے میں بھی مرد گھسے ہوئے تھے۔ کاپی میں درج ہو گیا۔ ''ٹرانسپورٹ کی حالت زار.....'' اور یوں

اسمبلی تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہ سب درج کرتے گئے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم بچپن سے کڑھتے آئے تھے، صفائی، ٹریفک، سگنل، تیز رفتاری، زیبرا کراسنگ کی کمی، بوڑھوں اور بزرگوں کے لیے سڑک پار کرنے کے لیے سیڑھی والے پل اور وہ سب کچھ جو میرے حلقے میں بدنظمی کا شکار تھا۔ اسمبلی کے اندر وہی مردہ ماحول تھا، اونگھتے ہوئے وزیر اور بے زار سے اسپیکر اور ڈپٹی سپیکر، وقت گزاری کی خاطر آنے والی اور تماشوں کی منتظر اپوزیشن اور نوکر شاہی کے ٹالنے والے جوابات، پہلے دن تو اسمبلی کو دیکھ کر مجھے اپنے پرائمری اسکول کی جماعت یاد آ گئی جہاں بیٹھتے ہی ہمیں گھر واپسی کی فکر پڑ جاتی تھی اور ہم کسی نہ کسی طرح اسکول کا وقت بے زاری بے دلی اور انگڑائیاں لیتے ہوئے سر سے اُتار کر پھینکنے کے انداز میں گزار کر فوراً گھر بھاگنے کی کیا کرتے تھے۔ واپسی کی بس پر پھر وہی معمول دہرایا گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کچھ آرام کے بعد امی سے بجلی کا تازہ بل لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد میں محلے کی بیرونی سڑک پر لگی لمبی قطار میں بل جمع کروانے کے لیے کھڑا تھا۔ ان سب نے مجھے قطار میں اپنی اگلی جگہ کی پیشکش کی لیکن میرا مقصد تو خود کو انہی جیسا ثابت کرنا ہی تو تھا، سو میں مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا رہا، شام کی چائے ہم سب دوستوں نے کیفے فراق میں ہی پی اور وہیں مرزا کے کمرے کو میں نے اپنا دفتر بنانے کا اعلان بھی کر دیا۔ پہلے دن ہی میرے پاس تقریباً دو درجن درخواستیں جمع کرائی گئیں۔ میرے حلقے کے مسائل بھی میرے گھر کے مسائل کی طرح معصوم اور چھوٹے چھوٹے سے تھے، کسی کی بجلی کا بل زیادہ آیا تھا تو کسی کا بل جمع کروانے کے باوجود بھی میٹر کٹ گیا تھا۔ کسی کی گیس آتی ہی نہیں تھی اور کسی کے کنکشن کا لیکج سال بھر سے بند نہیں ہوا تھا۔ کسی کے بچے کو سرکاری اسکول سے لمبی غیر حاضری پر نکال دیا گیا تھا اور کوئی اسکول کے دروازے سے اندر ہی داخل نہیں ہوا تھا کہیں سڑک بن کر ٹوٹی تھی اور کہیں ٹوٹی سڑک پر ہی بجری ریت ڈال کر بھر دیا گیا تھا۔ کسی کو پولیس صرف شک کی بنیاد پر اٹھا لے گئی تھی اور کوئی پولیس کے سامنے دہائیاں دے دے کر تھک گیا تھا مگر اس کی داد رسی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے منشی، بالے اور راجہ کو مختلف محکمے بانٹ دیے اور مرزا کو اپنا سیکرٹری مقرر کر دیا چچا فراق نے ہمارے منتظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور یہ سب کچھ بناء کسی تنخواہ یا معاوضے کے طے ہوا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اس وقت مجھے ان سب کی کتنی ضرورت ہے اور میرے ساتھ قابل اعتماد ساتھیوں کا ہونا کس قدر اہم ہے۔ سارنگا میری اس نئی چوار کا ناخدا اور موسیٰ کہے دیا ٹھہرا۔ یعقوب مینشن ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں اب رنگا اور موسیٰ سارا دن لوگوں کے مسئلے سنتے اور انہیں طاقت کے بجائے سیاست سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے، میں نے دوسرے روز ہی آئی۔ جی سے مل کر اپنے علاقے کی پولیس میں چند ضروری تبدیلیوں کی درخواست کی جنہیں کمالِ شفقت سے اُسی وقت تسلیم کر لیا گیا اور حاکموں کی جگہ مددگار طبیعت عملہ تعینات کر دیا گیا۔ بلال کا ساتھ اب بھی مجھے حاصل تھا۔ میں نے منشی، بالے اور راجہ کے والدین سے پہلے روز ہی ان تینوں کو اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی اجازت طلب کر لی تھی۔ بالے کے ابا مسکرا کر بولے تھے "ہم منع بھی کریں گے تو یہ نالائق ہماری بات تھوڑی مانیں گے..... لیکن اس بار ہم سب اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر اس علاقے کی تقدیر بدل دیں۔ اب ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے بچوں پر فخر ہے....."

اور پھر تین چار دن بعد جب یہ ساری خبریں ریڈیو، ٹی وی اور اخبار والوں کو پتہ چلنے لگیں اور ان کے رپورٹر اور کیمرہ میرے ساتھ ساتھ گھومنے لگا تو واقعی اگلے چوبیس گھنٹوں میں سب بدلنے لگا۔ سرکاری بس ٹھیک اپنے وقت پر آنے لگی۔ میونسپل کا عملہ صبح سویرے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے لگا۔ علاقے کی دیواروں پر قلعی اور سڑکوں پر نئی زیبرا کراسنگ جگمگانے لگی۔ اسکول وقت پر لگنے اور دفتر کا عملہ وقت پر چھٹی کرنے لگا، بل درست ہونے

لگے اور قطاریں گھٹنے لگیں۔ بجلی اب بھی جاتی تھی مگر مقررہ وقت پر، پانی اب بھی کم آتا تھا، مگر روز آنے لگا تھا۔ گوالا اب بھی ملاوٹ کرتا تھا مگر اب اُس نے پانی میں دودھ کے بجائے دودھ میں پانی ملانا شروع کر دیا تھا۔ غرض ہر بگڑی چیز نے درست ہونے کے لیے ایک انگڑائی ضرور لی تھی۔ ابا کے بقول یہ ساری تبدیلی صرف اس وجہ سے ہو پائی تھی کیونکہ میں نے اپنے علاقے سے ناطہ نہیں توڑا تھا۔ ورنہ یہی سارے محکمے اپنا سارا زور صرف میرے سرکاری گھر کو سدھارنے میں لگا دیتے۔ میرے نوجوان کارکن اور ساتھی اب بھی ہر قدم پر میرے ساتھ تھے اور ہم ہر دوسرے تیسرے دن ریگل یا صدر کے علاقے میں اپنی میٹنگز منعقد کر کے آگے کا لائحہ عمل طے کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد اور خصوصیت کے مطابق کام بانٹ دیا گیا تھا اور میں نے ان کے معاوضے کا منصوبہ بھی 'حکام بالا' کو پیش کر دیا تھا کہ لاکھوں کروڑوں کے فنڈ نمائندوں میں بے کار بانٹ دینے کے بجائے اگر اسی رقم کو ہر علاقے کے بے روزگار نوجوانوں کے ہنر کو اُجاگر کرنے میں خرچ کیا جائے تو ہم چند سالوں میں ہی اس ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ ان نوجوانوں نے میرے حلقے کی ہر گلی، ہر سڑک کا انتظام سنبھال لیا تھا اور یہ اُنہی کی کوششوں کا ثمر تھا کہ شہر کے سب سے بڑے اخبار نے دوسرے ہفتے ہی ہمارے علاقے کے بارے میں اپنے اخبار میں شہہ سرخی جمائی۔

''نوجوان انقلاب.....''

اس تمام عرصے میں مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ہم اگر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے گھر اور گلی سے ابتداء کرنی ہو گی۔ گھر، گلی، محلہ، سڑک، یونین کونسل، شہر، ضلع، صوبہ اور پھر ملک..... یہ ترتیب رہے گی تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے ورنہ سدا بھٹکتے رہیں گے۔ خود کو تبدیل کیے بناء نظام کو بدلنے کی باتیں صرف ایک دھوکہ اور سراب ہوتی ہیں اور ہم شائد سدا سے ہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے آئے ہیں۔

لیکن ہم سب نے مل کر اس سراب کو خواب اور پھر اس خواب کو ایک حقیقت میں بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، دن، ہفتوں میں اور پھر چار ہفتے ایک مہینے میں بدل گئے، میں روز زمرد حویلی کی طرف جانے کا سوچتا اور روز کسی نہ کسی کام میں پھنس کر رہ جاتا۔ آخر ٹھیک ایک مہینے بعد نواب صاحب کی گاڑی خود مجھے لینے آ پہنچی، اسماعیل نے بتایا کہ نواب صاحب نے رنگا موی اور مجھے دعوت پر بُلایا ہے اور سختی سے تاکید کی ہے کہ اگر اس بار میں نے غیر حاضری کی تو وہ باقاعدہ ناراض ہو جائیں گے۔ اب میرے پاس کوئی بہانہ نہیں بچا تھا، اور پھر ہم سب اُسی شام دو گاڑیوں میں زمرد حویلی کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ رنگا مجھے راستے میں ہی بتا چکا تھا کہ اس نے خانم کی درخواست پر ناہید کو کچھ دن کے لیے زمرد حویلی بھجوا دیا ہے۔

باب34

اور پھر حویلی میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر ناہید ہی پر پڑی جو باہر دالان میں ہی موجود تھی، لیکن وہ مجھ سے بہت ناراض تھی اور اس نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ اب وہ مجھ سے تبھی بات کرے گی جب میں یہ وعدہ کر لوں کہ کم از کم دو دن زمرد حویلی سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گا، رنگا اور موسیٰ نے بھی میری معاونت سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے ہاں کرنی ہی پڑی۔ خانم نے مردانے اور زنانے کے انتظامات خوب سنبھال رکھے تھے اور فضہ ان کی مدد میں جٹی ہوئی تھی۔ ایک آدھ بار مردانے میں آتے جاتے اور ملازموں کو ہدایات دیتے حمید پر بھی میری نظر پڑی۔ جانے شیخ صاحب اور ان کے گھر والے یہاں حویلی میں دل لگا پائے تھے یا نہیں.....؟ نئی جگہ کے اپنے مسائل اور نت نئے وسوسے ہوتے ہیں، پھر چاہے وہ زمرد حویلی جیسا محل ہی کیوں نہ ہو، نئے مکینوں کو اپنی پرانی کٹیا کی یاد بھی ضرور آتی ہو گی لیکن میں چاہ کر بھی نواب صاحب یا فضہ سے گاہے یا شیخ صاحب کے گھر والوں کی خیریت نہ پوچھ سکا، شائد میرے ہی دل کا کوئی چور تھا جو مجھے یہ سوال کرنے سے روکتا رہا۔ دل کے کھنکے یوں تو سدا بے آواز ہوتے ہیں، لیکن ہر آہٹ پر یہ دل کے اندر بڑا شور مچاتے ہیں۔ ہاں مگر باہر والوں کو یہ شور کبھی سنائی نہیں دیتا۔

میرے اندر کا شور بھی بس خود مجھی کو سنائی دے رہا تھا، اور جب انسان کے اپنے اندر اتنا شور ہو تو اُسے باہر کی باتیں ذرا کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ مجھے بھی اس رات کھانے کی میز پر سب کے درمیان ہوتی گفتگو کا کچھ پتہ نہیں چلا، اور ان سب کا ساتھ دینے کے لیے میں بس ہوں ہاں کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فضہ میری اس کیفیت کو بھانپ چکی ہے اور کئی بار جب میں نے نظر اُٹھائی تو میں نے اُسے اپنی جانب ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ کھانے کے بعد ایرانی قہوے کی فرمائش کی گئی اور پھر سبھی باہر دالان میں چہل قدمی کرنے کے لیے اِدھر اُدھر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ میں چپ چاپ بہتی نہر کے کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ فضہ نے اپنی نگرانی میں سنگ مرمر منگوا کر نہر کے کنارے بہت سی مزید سنگ مرمر کی شفاف سلیں بیٹھوں کی صورت میں بچھوا دیں تھیں اور نظر کو دور تک بہت بھلا منظر محسوس ہوتا تھا۔ ان سلوں کی ساخت بھی راج ہنسوں کے تیرتے ہوئے جوڑوں کی طرز پر بنائی گئی تھی اور دور سے بہت سے راج ہنس نہر کے پانی پر پیراکی کرتے، بہتے نظر آتے تھے، لیکن کچھ ہنس ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کی کوئی راج ہنسی نہیں ہوتی۔ میں اُس ماحول میں وہی ایک اکیلا اور جدا راج ہنس تھا "یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں آپ.....؟....." میں چونک کر پلٹا فضہ جانے کب سے میرے عقب میں کھڑی تھی "بہت لمبی محفل کے بعد ذرا دیر کی تنہائی اچھی لگتی ہے....." فضہ نے غور سے میری جانب دیکھا "واقعی.....لیکن کیا صرف اتنی ہی بات ہے.....؟ کہیں آپ خود سے بھی تو نہیں چھپ رہے....." میں نے مسکرا کر اس بے اعتبار کی جانب دیکھا "گویا آپ نے چہرے پڑھنا بھی سیکھ لیا ہے فضہ جی....." وہ بھی مسکرا دی "نہیں..... چہرہ شناسی کا دعویٰ تو کبھی نہیں رہا مجھے.....بس یونہی ایک خیال سا آ گیا تھا..... ویسے آپ کی نگاہ کی داد نہ دینا بھی بہت زیادتی ہو گی۔ وہ واقعی چاہے جانے کے قابل ہے..... ہزاروں میں بھی گھری ہو تو پل بھر میں ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا لینے والی.....میری بہت لمبی ملاقاتیں ہوئی ہیں اس کے ساتھ اس ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران....." میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کم بخت دل ہمیشہ پرائے

کھلونے دیکھ کر ہی کیوں مچلتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ فضہ سے اس کی بہت سی باتیں کروں لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود پر جبر کیا۔ فضہ میری حالت سے بے خبر اپنی اور گہنا کی ملاقاتوں کی تفصیل بتاتی رہی۔ درمیان میں کہیں کہیں ستارہ کی نفاست اور سلیقے کا ذکر بھی آیا۔ میں نے فضہ کو بتایا کہ گہنا نے یہاں آنے سے پہلے چھوٹی کو ہمارے گھر آ کر میرے لیے کیا پیغام دیا تھا۔ فضہ کی آواز کچھ لرزسی گئی ''اچھا..... تو وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے..... ٹھیک ہے میں کل..... آپ دونوں کی ملاقات کا بندوبست کروانے کی کوشش کروں گی.....'' فضہ میری الجھن سلجھانے میں کھو کر خود کچھ الجھ سی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ یونہی الجھی الجھی سی مجھ سے رخصت لے کر اپنے کمرے کی جانب چلی گئی اور میں بھی واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

صبح شیخ صاحب سے بھی حویلی کے بیرونی احاطے میں ملاقات ہوگئی، اور میں کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ عقبی احاطے میں موجود ان کی رہائش گاہ تک چلا آیا۔ شیخانی جی کا دل تو نئی جگہ میں خوب لگ گیا تھا۔ ستارہ سلام کر کے مسکراتے ہوئے بولی ''لگتا ہے آپ نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا ہے..... بس آپ کے قصے سننے کو ملتے ہیں..... اخباروں میں بڑا چرچا ہے آج کل آپ کے اس نوجوان انقلاب کا.....'' میں اُسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ اچانک گہنا کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے مجھے سلام کر کے دھیرے سے کہا ''بہت دن لگا دیے آپ نے یہاں آنے میں.....'' مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ یہ وہ گہنا تو نہیں تھی جسے میں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ یہ تو زردی مائل چہرہ اور آنکھوں میں اداسی کے گہرے سیاہ ڈورے لیے، خاموش اور کھوئی کھوئی سے کوئی اور لڑکی تھی۔ میں جس گہنا کو جانتا تھا اس کے چہرے کا گلال تو سرمئی شام کو بھی گلابی کر دیتا تھا، جس کی آنکھوں کا کاجل بھری دھوپ میں بھی اندھیرا کر سکتا تھا اور جس کی گھنی پلکوں کی چھاؤں اور دھانی آنچل کا سایہ صحرا کو بھی نخلستان کر دیتا تھا.....

لیکن یہ گہنا تو کوئی اور ہی تھی۔ جیسے خود برسوں سے کڑی تپتی دھوپ میں کھڑی ہو۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اب تو تنویر بھی سی ایس پی افسر بن چکا تھا۔ اب کیا پریشانی لاحق تھی اُس گلفام کو..... کہ اس کا پھول سا چہرہ یوں کملا گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ دیر تک وہاں بیٹھا نہ گیا اور میں جلد شیخ صاحب سے رخصت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

سہ پہر کو خانم سے ایک لمبی نشست رہی اور وہ بہت دیر تک مجھ سے میرے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ اُن کے انداز میں تجسس سے زیادہ خوشی کا عنصر واضح تھا اور انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ تہران یونیورسٹی کی طالبہ تھیں تو پولیٹیکل سائنس Political Scienc ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ شام کی چائے پر مجھے فضہ دکھائی نہیں دی۔ شائد پُرخلوص لڑکی اپنا وعدہ نبھانے کے جتن میں جتی ہوئی تھی۔ اس نے آج میری گہنا سے ملاقات کروانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ کل ہمیں واپس لوٹ جانا تھا۔ رات کے کھانے پر مجھے فضہ کی ایک جھلک دکھائی دی مگر وہ شبن کے ساتھ مہمانوں کی تواضع میں مصروف رہی۔ دس بجے کے بعد ہم سب اپنے اپنے کمروں کی جانب لوٹ گئے۔ مجھے ایک عجیب طرح کی بے چینی نے آ گھیرا تھا۔ جیسے ہمیشہ کسی انہونی سے قبل میرے حواس معطل سے ہونے لگتے تھے۔ میں نے گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کمرے میں رکھی کتابوں میں سے ایک اٹھالی اور یونہی ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں چونک گیا۔ باہر شبن کھڑا تھا ''چلیں میاں..... آپ کو فضہ بی بی نہر کنارے یاد کرتی ہیں.....'' شبن کے رازدارانہ انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی فضہ کے تمام رازوں میں برابر کا شریک ہے۔ میں شبن کی سربراہی میں نہر کے قریب پہنچا تو وہ راستے ہی سے پلٹ گیا۔ آخری دنوں کے چاند کی مدہم روشنی میں مجھے سنگ مرمر کے بینچ کے

قریب کوئی کھڑا نظر آیا۔ شائد وہ فضہ کا ہیولا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر دھیرے سے کھنکارا ہیولے نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن..... وہ تو گہنا تھی، ویسے ہی دن کی طرح گہنائی ہوئی..... کچھ دیر کے لیے میں سب کچھ بھول گیا، وہ مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا..... ''آپ..... یہاں..... اس وقت.....؟ .....'' گہنا بھی سنبھل گئی ''جی..... ابھی چند لمحے پہلے فضہ مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں..... آپ نے مجھ سے ملنے کے لیے وقت نکالا..... میں شکر گزار ہوں آپ کی.....'' میں ہڑبڑا سا گیا ''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ..... آپ سے ملاقات میرے لیے ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ رہا ہے.....'' میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کبھی میری پوری زندگی کا مقصد ہی صرف ایسی ایک ملاقات ہی تو تھا۔ اُس نے اصرار کیا ''نہیں..... پہلے کی بات اور تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ اب آپ کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں.....'' میں مسکرا دیا ''انسان کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو اُسے اپنے گھر آنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ حویلی بھی میرا گھر ہی تو ہے، نہ صرف یہ بلکہ یعقوب مینشن اور ناہید کی کوٹھی بھی..... سبھی میرے اپنے گھر ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ ابا نے مجھے گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا تھا۔ نہ وہ مجھے گھر سے نکالتے نہ میرے اتنے بہت سے آشیانے بنتے.....''

گہنا اب بھی کچھ گم سم سی تھی ''آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں..... سب کھو کر بھی اس سے دوگنا پا لیا آپ نے..... ورنہ یہاں تو ایسے بھی کچھ سیاہ نصیب ہیں جو سب پا کر اپنے ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔''

میں نے چونک کر گہنا کی طرف دیکھا ''آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا..... تنویر کی کوئی خیر خبر آئی اکیڈمی سے..... معافی چاہتا ہوں میں تنویر کی کامیابی کی مبارک باد دینے نہیں آسکا وقت پر.....''

گہنا نے زخمی نظر سے میری جانب دیکھا ''وہ ٹھیک ہیں..... ابھی کل ہی ان کا ابا کے نام خط آیا تھا۔ انہوں نے ستارہ آپی کا ہاتھ مانگا ہے ابا سے.....'' میرے اندر ایک زوردار چھناکے کی آواز کے ساتھ بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

''کیا.....؟..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... تنویر نے ستارہ کا ہاتھ مانگا ہے..... مگر.....؟..... لیکن.....'' مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں آگے کیا کہوں، لیکن گہنا کے چہرے پر کچھ اور بے چینی تھی۔

''جی..... تنویر بھائی تو ستارہ آپی کی پہلی شادی سے بھی قبل ان کے امیدوار تھے..... لیکن تب وہ بے روزگار تھے اور ابا نے اچھا رشتہ آنے پر آپی کو بیاہ دیا تھا۔ آپی کی بیوگی کے بعد بھی تنویر بھائی کے دل میں ستارہ آپی ہی بستی ہیں۔ تنویر بھائی نے میرے کہنے پر ہی مقابلے کا امتحان دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ حمید بھائی اس کے بعد ان کے رشتے کو ''ناں'' نہیں کہہ پائیں گے۔ آپ کیا سمجھے تھے کہ تنویر بھائی میری خاطر اتنی محنت کر رہے ہیں.....؟''

''جی..... سچ تو یہی ہے کہ میں نے جب آپ کے مستقبل کے ہم سفر کے بارے میں خیالات سنے تو مجھے تنویر ہی اس خاکے پر پورا اُترتا نظر آیا تھا، لیکن خود ستارہ نے بھی تو کبھی ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا.....''

''وہ کبھی اپنی زبان سے تنویر بھائی کی چاہت کا اقرار نہیں کریں گی۔ وہ تو تب بھی نہیں بولیں تھیں جب ابا نے ان کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا تھا.....'' گہنا کی باتیں سن کر میرے اندر کا شور بڑھتا جا رہا تھا، گہنا نے اپنی بات جاری رکھی ''ہاں..... البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا

جب تنویر بھائی کے ساتھ میری بے تکلفی دیکھ کر خود ستارہ آپی اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھیں کہ شائد ان کی شادی کے بعد میں خود تنویر بھائی کی زندگی کا حصہ بن چکی ہوں، لیکن میری اور تنویر بھائی کی وہ گھنٹوں باتیں اور وہ چھپ چھپ کر کھسر پھسر بھی ستارہ آپی کو دوبارہ ان کی زندگی میں لانے کے لیے ہی ہوتی تھی۔ تنویر بھائی کی خواہش پر ہی یہ بات ان کے سی۔ایس۔ایس (CSS) کے امتحان کا نتیجہ نکلنے تک پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک بار وہ یہ معرکہ سر کر لیں تبھی وہ ستارہ آپی اور ہمارے گھر والوں کے سامنے اس رشتے کی پیش کش رکھیں گے..... کیونکہ ایک بار پہلے بھی بے روزگاری کی وجہ سے حمید بھائی ان کا ستارہ آپی کے لیے آیا ہوا رشتہ سختی سے ٹھکرا چکے تھے، اور تنویر بھائی صرف ایک جونیئر ٹیچر کی نوکری کے بل پر دوبارہ یہ پروپوزل نہیں بھیجنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی ٹیچر کی نوکری بھی عارضی تھی....." گہنا کی باتیں سن کر پل بھر میں میرے سامنے اب تک تنویر سے ہوئی سبھی ملاقاتیں ایک جھماکے کی صورت میں چمکیں.....اوہ.....تو اُس کا والہانہ پن اور مقابلے کا امتحان پاس کرنے کا وہ جنون ستارہ کی خاطر تھا، لیکن میری بہت سی الجھنیں ابھی باقی تھیں۔

"لیکن آپ خود بھی تو ہمیشہ سے ایک منظم زندگی اور افسرانہ انداز کی شیدائی رہی ہیں.....میرا مطلب ہے کہ....."

"ہاں.....یہ درست ہے کہ مجھے سی ایس پی افسر اور اُن کی زندگی کا ایک منظم انداز بہت پسند ہے.....میں لڑکا ہوتی تو خود بھی ایسا ہی کوئی کیریئر چنتی یا پھر فوج میں کمیشن لے لیتی.....بچپن سے میرے خوابوں کا شہزادہ ایسا ہی کوئی افسر رہا ہے.....اور یہ بات ہمارے گھر میں کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے.....بلکہ جب میں دسویں میں تھی اور امی نے ایک دن مجھے ڈانٹ کر یونہی کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے گھر کا کام ٹھیک سے نہیں کیا تو وہ مجھے کسی کلرک کے ساتھ بیاہ دیں گی تو میں باقاعدہ رو پڑی تھی اور دو دن تک میرے آنسو بات بے بات ٹپک جاتے تھے، پھر خدا خدا کر کے پورے گھر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے تب کہیں جا کر میں چپ ہوئی تھی.....اسی لیے جب آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی تو آپ صرف ایک اچھے انسان اور دوست لگے تھے، اور میں چاہتی تھی کہ ایک اچھا دوست اپنی زندگی کو یوں غیر منظم انداز میں گزار کر ضائع نہ کرے بلکہ خود کو کسی باقاعدہ اور سنجیدہ طرز حیات میں ڈھال کر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے.....لیکن تب کبھی میں نے آپ کے لیے اس سے سوا کچھ نہیں سوچا.....کچھ نہیں چاہا.....مگر جب آپ کی غیر حاضری کے وقفے طویل ہونے لگے تو نہ جانے کیوں مجھے آپ یاد آنے لگے، آپ کی شرارت آمیز باتیں، آپ کا وہ زندگی کو ایک پل میں جی لینے کا نظریہ اور وقت کو اپنے قابو میں کرنے کے بجائے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑے رکھنا.....یہ سب اندر ہی اندر مجھے بھانے لگا.....لیکن اس وقت میں خود اپنے اندر ہوتی اس تبدیلی سے انجان تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ محبت کسی نظم وضبط یا ڈسپلن کی پابند نہیں ہوتی، محبت اپنا ڈسپلن خود قائم کرتی ہے.....چاہے اس قیام کے لیے وہ دوسروں کے دلوں کا ہر نظم تلپٹ کر دے، ہر ضبط کو کسی تیز آندھی اور طوفان کی طرح اکھاڑ پھینکے .....محبت ایک دھیمے طوفان کی طرح ہمارے دل کے کواڑوں پر دستک دیتی ہے لیکن ایک بار وہ دل کے دریچوں سے اندر گھس جائے تو پھر اس تیز آندھی کے سامنے ہمارے تمام اصول، تمام قاعدے اور بندھن خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جب مجھے ستارہ آپی نے آپ کے دل میں میرے لیے پلتے جذبے کے بارے میں بتایا تو ٹھیک یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے تمام اصول، میرے تمام معیار اپنی جگہ موجود رہتے ہوئے بھی بے معنی سے ہوتے چلے گئے۔ شروع شروع میں تو مجھے خود پر بھی بہت غصہ آتا تھا کہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے.....لیکن تب مجھ پر ایک اور

راز آشکارا ہوا کہ ضروری نہیں کہ ہم عمر بھر جس معیار کو اپنے دل میں سجائے بیٹھے ہوں، صرف اس پر پورا اترتا کوئی شخص ہی ہماری محبت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس معیار اور اُن خوابوں کی تعبیر ہمارے دل میں ہمیشہ پلنے کے باوجود کوئی بالکل مخالف سمت کا انسان بھی ہمارے دل کے سنگھاسن پر آ کر براجمان ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم اپنے آئیڈیل اور معیار کی ساری عمر عزت تو کر سکتے ہیں..... لیکن کبھی کبھی محبت کی تعبیر کسی اور کی صورت ہمارے دل میں وارد ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حادثہ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرا آئیڈیل آج بھی میرے اندر کسی محترم شخصیت کی طرح پلتا ہے..... لیکن وہ میری محبت نہیں بن سکا آیان..... میں اپنے دل کے آئیڈیل کی ہمیشہ عزت کرتی رہوں گی لیکن میں محبت آپ سے....." گہنا روانی میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔

"میں جانتی ہوں میں نے اپنے دل کے جذبوں کو سمجھنے میں بہت دیر کر دی ہے، آپ کی زندگی میں اب کچھ اور لوگ بھی ہیں جو شائد مجھ سے زیادہ محرم اور محترم ہوں گے آپ کے لیے..... لیکن اگر میں آپ کو یہ سب کچھ نہ بتاتی تو عمر بھر یہ خلش مجھے بے چین کیے رکھتی....." وہ شائد فضہ کی بات کر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کچھ کہوں یا بس اُسی کو سنتا رہوں۔ میرے پاس کہنے کو کچھ باقی ہی کب تھا بھلا.....؟؟ گہنا نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کتنی عجیب بات ہے کہ جس وقت میرا دل اپنے سارے اصول قاعدے اور معیار بھلا کر آپ کے حق میں میرے من کو استوار کر رہا تھا اور مجھے آپ کی محبت کے دلائل سے لاجواب کر رہا تھا، ٹھیک اُسی وقت فضہ یہاں اس حویلی میں آپ کو وہ تمام قاعدے اور نظم و ضبط سکھا رہی تھیں جو میرے آئیڈیل کا تقاضہ تھے۔ انہوں نے آپ کو زندگی کا ڈسپلن سکھا کر کامیابی کی راہ پر گامزن کر دیا اور میرے دل نے میرے اندر کا ہر ڈسپلن اور قاعدہ توڑ ڈالا..... میں اُس لاابالی۔ کھلنڈرے اور جھگڑالو انو کا انتظار کرتی رہی اور میرے سامنے ایک بدلا ہوا، سنجیدہ اور بردبار آیان آ گیا۔ وہ آیان ..... جس کی زندگی اب کسی اور کی محبت کی مقروض تھی۔ فضہ نے پہلے روز ہی مجھ پر اپنے دل کی حالت کھول دی تھی، اور یہ بھی ان کی سادہ دلی اور صاف گوئی کی ایک مثال ہے..... مجھے انہیں اپنے اندر کی بات بتانے کا وقت ہی نہیں دیا قدرت نے..... شائد میں انہیں پہلے بتا دیتی تو وہ اتنی اعلیٰ ظرف ہیں کہ کبھی مجھ سے اپنی محبت کا ذکر نہ کرتیں..... لیکن مقدر نے انہیں یہ موقع پہلے دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ فضہ ہی آپ کی حق دار ہیں آیان..... انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ نے انہیں میرے بارے میں سب بتا رکھا ہے اور ابھی ان کی محبت کو سندِ قبولیت بھی نہیں بخشی..... لیکن وہ تو اب بھی یہی سمجھتی ہیں کہ میرا آئیڈیل اور میری محبت کوئی اور ہے..... آپ نہیں..... اور اب میں یہ بات انہیں بتا کر ان کا حق کبھی غصب نہیں کروں گی..... شائد مجھے اس وقت آپ پر بھی اپنے دل کے یہ بھید ظاہر نہیں کرنے چاہیے تھے..... لیکن میں مجبور تھی..... میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ تمام عمر اس خلش کے ساتھ گزار دیں کہ میں نے آپ کو کبھی ٹھکرایا تھا....." میں گم سم کھڑا گہنا کی تمام بات سنتا رہا اور مجھ سے تو یہ بھی نہیں بولا گیا کہ ایک خلش ختم کر کے اس سے بڑی خلش دے جانا کہاں کا انصاف ہے.....؟..... "میں بس آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتی....." گہنا کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اچانک قدموں کی چاپ اور فضہ کے دھیرے سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی "معافی چاہتی ہوں لیکن آپ دونوں

کی بات میں مخل ہونا ہی پڑا..... دراصل گہنا کی امی جان تین چار مرتبہ ان کا پوچھ چکی ہیں..... اور اب تو باقاعدہ شبن کے ہاتھ پیغام بھی آ چکا ہے..... دیر بھی کافی ہو چکی ہے..... لہٰذا یہ ملاقات آپ دونوں کو اب یہیں برخواست کرنی پڑے گی..... ''باقی آئندہ'' کا بورڈ لگا کر..... ''فضہ کی شائستگی نے ہمیں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ گہنا نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور وہ دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر پلٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ اس کا آخری الوداع ہو۔ ایک لمحے میں میرا دل جیسے آخری بار دھڑک کر ساکت ہو گیا۔ نظر کیا تھی..... ایک تیز دھار برچھی تھی جو گہنا کی آنکھ سے نکلی اور عین میرے دل میں پیوست ہو کر گزر گئی تھی۔

وہ دونوں کب کی واپس جا چکی تھیں اور میں اب تک وہیں اپنی جگہ جامد کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ہر سفر آج یہاں آ کر ختم ہو گیا ہو۔ ایک بار پھر وہی زمانے بھر کا ڈاکو کہ جس کا نام دل جلوں نے عشق رکھ چھوڑا ہے۔ اس سیاہ رات کی تنہائی میں میرے دل کا سارا چین و قرار لوٹ کر چلتا بنا تھا، اور میں پھر سے تہی دامن اور لٹا پٹا سا محبت کی پگڈنڈی پر کھڑا اس تاریکی میں اپنے مقدروں کو رو رہا تھا۔ ساری رات ٹھنڈ میں یوں باہر کھڑے رہنے نے صبح تک اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور سورج نکلنے سے پہلے میں شدید تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔

.....❁.....

باب35

قدرت کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ کبھی مجھے ایک محبت بھی میسر نہیں تھی، اور میں زمانے بھر سے بے زار ہو کر یعقوب مینشن کے جوگ میں پڑنے کے بعد خود کو بھی بھلا بیٹھا تھا اور آج جب مجھ سے محبت کی دعوے دار وہ دو دل رُبا نازنینیں تھیں کہ جو بذاتِ خود اپنے اندر محبت کی اک تکمیل اور عمر بھر کا جوگ لیے جانے کے قابل تھیں..... تب بھی میں اُسی قدر تنہا تھا، شائد کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ محبت کبھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک سدا کا ادھورا اور نامکمل جذبہ ہے جس کی تکمیل دنیاوی ملن کے بس کی بات نہیں۔

میری طبیعت کے پیشِ نظر رنگا اور موہی کو اپنی واپسی بھی ایک آدھ دن کے لیے مؤخر کرنی پڑی۔ صبح سے فضہ بیسیوں مرتبہ شمین اور حویلی کی دیگر خادماؤں کے ہاتھ پیغام بھیج کر میری طبیعت کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔ گہنا نے رات ٹھیک ہی کہا تھا کہ میری اس نئی زندگی کی بنیاد ڈالنے والی فضہ ہی تھی۔ میں آج اگر اس معاشرے میں محترم تھا تو یہ سکھ بھی مجھے فضہ کے ساتھ سے ہی ملی تھی۔ وہ میری ایسی محسن تھی جس نے میرے اندر کے آیان کو یہ حوصلہ اور اعتماد بخشا تھا کہ جس سے مجھے زندگی کی راہیں چننے اور منزلیں سر کرنے کا ہنر ملا تھا۔ تو میں اب منزل پر پہنچ جانے کے بعد اپنے رہبر کو، اپنے خضر کو کیسے بھول سکتا تھا؟

اور فضہ تو پہلے ہی مجھے تمام عمر انتظار کرنے کا عندیہ دے چکی تھی کہ میں جب بھی اپنی منزل پر پہنچ کر اُسے پکاروں گا..... وہ میرے ہم قدم ہو گی۔ گہنا بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اپنی محسن کو اپنے انتظار کی سولی پر لٹکا کر خود نئی منزلیں سر کرنے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اسی لیے اُس نے خود مجھ سے دست بردار ہو کر یہ قربانی دینے کی ٹھان لی تھی۔ زندگی کے دوراہوں سے بڑا معمہ اس جہاں میں کوئی اور نہیں ہو سکتا، یہ معمے بنانے والے بھلا کیا معمہ جوڑتے ہوں گے۔ کوئی جا کر انہیں سمجھائے۔

آخر سہ پہر تک فضہ سے صبر نہیں ہوا اور وہ خود میری طبیعت کا پوچھنے میرے کمرے میں چلی آئی ''یہ آپ کو اچانک کیا ہوا.....؟..... ابھی کل رات تک تو آپ بھلے چنگے تھے.....''

''شائد رات کو دیر تک باہر رہنے سے سردی لگ گئی ہے..... آپ پریشان نہ ہوں..... مجھ پر بدلتے موسم دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا.....'' فضہ نے غور سے میری جانب دیکھا ''پھر کوئی موسم بدل گیا ہے کیا.....؟'' میں چونک گیا، لیکن اس کے چہرے پر وہی سدا کی ملاحت بکھری ہوئی تھی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا ''کچھ لوگوں کے مقدر کا موسم سدا ٹھہرا رہتا ہے اور کچھ مجھ جیسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا نصیب ہر پل کروٹ بدلتا رہتا ہے..... آپ سے تو کچھ چھپا نہیں..... سب آپ کے سامنے ہی ہے.....'' فضہ کے چہرے پر بشاشت آ گئی ''ہاں..... آپ کا تمام سفر میرے سامنے ہے..... اور مجھے فخر ہے کہ میں بھی آپ کے اس سفر کے ایک چھوٹے سے پڑاؤ کی ہم سفر رہی ہوں.....''

''آپ ہم سفر نہیں..... میری رہبر ہیں..... اور سدا رہیں گی.....'' فضہ نے مان سے پوچھا.....

''آیان..... آپ کو یاد ہے ناں..... آپ نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا۔ کچھ انعام دینے کا.....''

''جی مجھے یاد ہے..... اور آپ نے کہا تھا کہ وقت آنے پر آپ اپنا انعام خود مانگ لیں گی..... میں ابھی تک اُس وقت کا انتظار کر رہا ہوں.....''

''تو بس پھر سمجھ لیں کہ وہ وقت آنے والا ہے آیان..... اس بار آپ کو زمرد حویلی سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے میرا انعام دے کر ہی جانا ہوگا.....''

میں نے فضہ کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان دیکھا، جیسے اُسے وہ انعام مانگ کر ساری کائنات مل جائے گی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا'' آپ مجھے کبھی وعدہ خلاف نہیں پائیں گی.....'' فضہ کھل گئی'' تو بس پھر طے رہا..... آپ اب تیار رہیئے گا..... زیادہ وقت باقی نہیں رہا .....لیکن اُس سے پہلے مجھے کچھ اپنوں سے بات کرنی ہے.....'' فضہ مجھے ایک نئی پہیلی میں ڈال کر خود وہاں سے چل پڑی۔ شائد وہ حتمی طور پر مجھ کو مجھ سے مانگنے سے پہلے اپنے بزرگوں کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ خانم تو پہلے ہی اس کی دل آشنا تھیں۔

مغرب تک میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں تازہ ہوا میں چہل قدمی کی نیت سے بڑے والان کی جانب نکل آیا، اور وہاں نواب صاحب، پاشا موسیٰ اور رنگا کو کرسیاں ڈالے بیٹھا دیکھ کر ان کی جانب چلا آیا۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ رنگا اور موسیٰ کی آنکھیں کچھ نم ہیں، اور وہ گم سم سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر نواب صاحب نے جلدی سے کہا'' یہ لیں..... اپنے آیان میاں بھی آ گئے..... ان کی رائے بھی لینا ضروری ہے.....'' میرا دل زور سے دھڑکا۔ نہ جانے میری آمد سے قبل وہاں کیا گفتگو چل رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے رنگا کی جانب دیکھا لیکن وہ رقت آمیز کیفیت میں مبتلا تھا۔ آخر موسیٰ نے ہی یہ جان لیوا خاموشی توڑی'' شہزادے..... نواب صاحب نے ہم سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے.....''

''کیا.....؟..... کیا مطلب.....؟'' موسیٰ کی آواز جذبات سے لبریز تھی'' وہ ہماری لاڈلی کو اپنے چھوٹے بیٹے وقار کی دلہن بنانا چاہتے ہیں..... اس حویلی کی بہو بنانا چاہتے ہیں.....'' اور پھر یہ سن کر میری اپنی حالت بھی سارنگا سے کچھ مختلف نہیں رہی..... اگلے ہی لمحے میں اٹھ کر اپنی نم آنکھیں چھپاتے اس مجبور باپ کو اپنے سینے سے لگا چکا تھا جسے عمر بھر بس اسی خدشے اور فکر نے مارے رکھا کہ اُس کی بیٹی کو نہ جانے کوئی عزت دار گھر قبول کرے گا بھی یا وہ ساری عمر کسی اچھے رشتے کی آس میں اپنے گھر کی چوکھٹ پار نہیں کر پائے گی..... لیکن آج قدرت نے کتنا بڑا انعام اس بابل کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ رنگا کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا لہٰذا میں نے ہی ناہید کے بھائی کی حیثیت سے نواب صاحب کو جواب دیا'' ہمارے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہوگی نواب صاحب..... کہ ہماری ناہید آپ کی بہو بن کر اس حویلی میں اُترے..... لیکن کیا آپ نے وقار سے اس کی مرضی معلوم کر لی ہے..... کہیں اُس کو کوئی.....'' نواب صاحب نے جلدی سے میری بات کاٹ دی'' نہیں نہیں..... سچ تو یہ ہے کہ یہ خود وقار کی بھی مرضی ہے..... اس نے سب سے پہلے خانم سے اپنی پسند کا تذکرہ کیا تھا اور بھئی خانم تو پہلے دن سے ہی ناہید کی گرویدہ ہیں..... بس اب آپ لوگ ہاں کر دیں تو ہم منگنی کی رسم کی تیاری شروع کریں.....'' رنگا کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی'' ناہید اب آپ کی بیٹیا ہے نواب صاحب..... جو مناسب سمجھیں طے کر دیں.....'' موسیٰ اور رنگا نے فرداً فرداً اٹھ کر نواب صاحب کو گلے لگایا۔ پاشا صاحب بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے، رنگا نے

میرے ہاتھ تھام لیے ''دیکھ لے ساجن..... یہ سب تیرے دم سے ہے.....اب تو ہی اپنی بہنا کو رخصت بھی کرے گا.....میں اور لاڈلی کا یہ چچا موسیٰ تو بس ڈولی سجائیں گے اُس کی.....رنگا تیرے آنے سے پہلے اتنا خوش قسمت کب تھا بھلا.....؟.....''

اور پھر چند لمحوں میں ہی ناہید کے رشتے کی بات ساری حویلی میں پھیل گئی۔ میں نے اسے بلوا کر خصوصی طور پر اس کی مرضی معلوم کی لیکن اس کا جواب بڑا سادا تھا ''جو آپ کی اور بابا کی پسند.....وہی میرا مقدر ہوگا آیان بھائی.....''

نواب صاحب نے دو روز بعد ہی ناہید اور وقار کی مہندی اور اگلے روز منگنی کی تقریب کا اعلان کر دیا۔ چاروں اطراف ایک ہل چل سی مچ گئی۔

رنگا اور موسیٰ نے تمام یعقوب مینشن سمیت ہمارے قریباً پورے محلے کو بھی تقریب میں مدعو کر رکھا تھا۔ نواب صاحب کی طرف سے خصوصی دعوت نامہ ای، ابا، ریحان اور چھوٹی کے نام خود پاشا اور رنگا جا کر دے آئے تھے، محلے سے مُنشی بالا اور راجہ ایک دن پہلے ہی حویلی پہنچ گئے اور محلے کی شادیوں کی طرح وہ یہاں بھی خدائی خدمت گاروں کی طرح حویلی کی سجاوٹ اور دیگر انتظامات میں جٹ گئے۔

راجہ نے مجھے گم سم بیٹھا دیکھ کر چھیڑا.....

''کیوں انو.....کہے تو تیرے حصے کی لڑیاں بھی سجا دوں.....سنا ہے وہ تیرے شیخ صاحب کے گھر والے بھی اب یہیں رہتے ہیں.....''

بالے اور مُنشی نے بھی شرارت سے ایک دوسرے کو آنکھ ماری، اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ان کے انو کے مقدر میں کس کی لڑیاں لکھی ہوئی تھیں، تقریب کی شام ساری زمرد حویلی واقعی کسی انمول نگینے کی طرح جگمگا رہی تھی، ابا اور امی کو رنگا نے خاص درخواست کر کے ناہید کی طرف سے اس کے بزرگ مقرر کر رکھا تھا۔ میں بہت دیر تک اس شور اور ہنگامے کو بیٹھا دیکھتا اور یہ سوچتا رہا کہ جب میں اپنے گھر سے نکلا تھا تب میرا خاندان صرف چار افراد پر مبنی تھا لیکن آج میرا گھرانہ کتنا پھیل چکا تھا۔ منگنی کی تقریب میں میں نے ستارہ اور شیخانی جی کو بھی چھوٹی کے ساتھ مختلف کاموں میں مصروف دیکھا لیکن گہنا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا جی چاہا کہ پاس سے گزرتے شیخ صاحب سے اس کا پوچھوں لیکن میں چپ ہی رہا۔

شائد گہنا بھی اس وقت میری طرح خود اپنے اندر لگے تمام آئینوں سے فرار چاہتی ہوگی تبھی وہ اس ہنگامے کا حصہ نہیں بن پائی تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک فضہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا ''آپ یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں آیان.....'' میں نے سنبھلنے کی کوشش کی ''کچھ نہیں بس شائد کچھ تھکن ہو گئی ہے.....'' فضہ نے میری آنکھوں میں جھانکا ''آپ ابھی سے تھک گئے.....ابھی تو بڑا لمبا سفر باقی ہے.....'' میں نے مسکرا کر فضہ کو دیکھا ''پھر تو مجھے تحریک دینے کے لیے میرے ہم سفر کو معمول سے کچھ زیادہ محنت کرنا ہوگی.....مجھے اپنے ساتھ ہم قدم رکھنے کے لیے.....'' فضہ کی آواز لرز سی گئی ''اور اگر ہم سفر گہنا جیسی آپ کے دل کی محرم ہو تو.....پھر.....کیا پھر بھی آپ کے قدم نہیں اُٹھ پائیں گے.....''

میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ''گہنا.....؟؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟'' فضہ کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ ''ہاں آیان.....گہنا.....وہی آپ کی اصل ہم سفر ہے.....میں تو بس ایک عارضی سرائے تھی جسے آپ کی کچھ دن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی آخری منزل کی ساتھی گہنا ہی ہے.....''

''کیا آپ سے گہنا نے کچھ کہا ہے.....؟''

''نہیں آیان..... وہ آپ کی پسند ہے..... وہ جیتے جی کبھی مجھ سے اپنا غم نہیں بانٹے گی..... اُس رات جب میں گہنا کو بلانے کے لیے آئی تھی تو میں نے آپ دونوں کی باتیں سن لی تھیں..... مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں بڑی دشوار راہوں سے گزرنا پڑا ہے آیان..... میں آج آپ کو اپنی محبت سے آزاد کرتی ہوں..... محبت دو طرفہ نہ بھی ہو تو وہ دوسرے کو کسی نہ کسی ڈور میں باندھے رکھتی ہے..... میں آج یہ ڈور خود توڑ رہی ہوں.....''

میں فضہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

''لیکن آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں..... میں نے گہنا سے کوئی اقرار نہیں باندھا''

''جانتی ہوں میں..... اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ دونوں ہی اتنے اعلیٰ ظرف ہیں کہ ساری عمر اس ان بندھے پیمان کو میری خاطر یونہی بے نام ہی رہنے دیں گے لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا آیان۔ محبت میں کوئی احسان نہیں ہوتا، نہ ہی محبت میں کوئی ''دان'' ہوتا ہے۔ میں اور آپ اس دان اور احسان کے بوجھ کے بنا، تمام عمر ایک دوسرے کے اچھے دوست اور اچھی یاد بن کر بھی تو رہ سکتے ہیں، اور آپ کا ساتھ چاہے کسی بھی صورت میں ہو..... میرے لیے اعزاز ہوگا، محترم ہوگا.....''

میں اب بھی اُلجھا ہوا تھا کیونکہ فضہ کی بہتی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ''میں نے آغا جان کو منا لیا ہے کہ وہ مجھے دوبارہ تہران یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی اجازت دے دیں۔ دو دن کے بعد میں مومو کے ساتھ ایران چلی جاؤں گی آیان..... لیکن جانے سے پہلے آپ کو حسب وعدہ میرا انعام مجھے دینا ہوگا۔ بولیں..... دیں گے نا.....؟''

خود میری آواز بھی ڈوبتی جا رہی تھی ''آپ میری جان بھی انعام میں مانگ سکتی ہیں فضہ..... آپ کہہ کر تو دیکھیں.....''

فضہ نے اپنی ستارہ پلکوں کے موتی اپنی ہتھیلیوں کے چاند میں جذب کرنے کی ناکام کوشش کی، ''آپ کی جان پر اختیار چاہیے مجھے.....''

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

''مجھے منظور ہے.....'' فضہ نے اپنی تمام ہمت مجتمع کی ''میں جانتی تھی آپ میرا مان ضرور رکھیں گے..... میں چاہتی ہوں کہ آپ ابھی حویلی کے چھت سے جڑے بڑے چوبارے پر چلے جائیں..... گہنا وہاں آپ کا انتظار کر رہی ہے..... میں اُسے بتا کر آئی ہوں کہ آپ وہاں اُس سے ملنے کے لیے ضرور آئیں گے.....''

''لیکن آپ..... فضہ..... آپ یہ سب کیوں.....'' فضہ نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی ''آپ خود پر میرا اختیار مان چکے ہیں آیان..... اور میں نے کہا نا کہ محبت میں کوئی دان، کوئی احسان نہیں ہوتا..... میں جانتی ہوں کہ آپ اور گہنا ایک دوسرے کے بنا سدا ادھورے رہیں گے..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے دو عزیز ترین اور سب سے پیارے دوست یوں عمر بھر ادھوری زندگی جئیں.....''۔ میری ہچکچاہٹ ابھی باقی تھی..... ''لیکن گہنا.....''۔

''میں اس سے بات کر چکی ہوں..... وہ تو آپ سے بھی کہیں زیادہ ضدی ہے لیکن میں نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر اُسے بھی منا لیا ہے..... وہ آپ کے بنا کبھی خوش نہیں رہ سکتی آیان..... جائیں دیر نہ کریں..... اپنی گہنا کے بھرم میں اب کوئی دراڑ نہ آنے دیجئے گا..... میری دعائیں

سدا آپ دونوں کے ساتھ رہیں گی....." فضہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چھت کی جانب جاتی ہوئی راہ پر دھکیل دیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے ہاتھ تھام کر اُس سے پوچھوں کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے اتنا بڑا تیاگ کہاں سے سیکھ لیا ہے؟ لیکن پھر مجھے اپنے سوال پر خود ہنسی آ گئی، بھلا محبت سے بڑا استاد اس جہاں میں اور کوئی کیا ہوگا؟ محبت از خود دنیا کا سب سے بڑا جوگ اور سب سے عظیم تیاگ ہے۔ عشق ہی انسان کو جوگی بناتا ہے۔

پیار، محبت اور عشق..... یہی تو آخری تین منزلیں ہوتی ہیں پرتیاگ کی۔

میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ چوبارے پر پہنچا تو نیچے حویلی کے دالان میں ہوتی آتش بازی کی پھل جھڑیاں دور فضا کی بلندی میں پھوٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ گہنا کسی گہری سوچ میں گم چوبارے کی منڈیر کے پاس کھڑی تھی اور آسمان میں اپنی گلابی روشنی کے ستارے چھوڑتی آتش بازی کی ضیا سے اُس کا چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ سفید آنچل کے نور تلے وہ گہنا کا گلابی چہرہ خود آسمان میں پھوٹتے کسی شرارے کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا.....

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اُس نے اپنی جھکی پلکیں اُٹھائیں..... "آپ آ گئے آیان..... بہت انتظار کروایا آپ نے مجھے....." میں نے دھیرے سے جواب دیا "بڑی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں..... کسی کے ظرف کی سیڑھیاں طے کر کے کسی بلندی پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے....."

"جانتی ہوں..... میں خود بھی یہاں آنے سے پہلے ایسی ہی کسی کیفیت سے دوچار تھی..... لیکن مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ وہ آپ کو بھی منا کر یہاں بھیج دے گی..... تقدیر نے ہم تینوں کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا ہے آیان..... ہم تینوں کے دل میں وہ یہ جذبے کیوں جگا گئی؟..... اور اب مقدر خود دور بیٹھ کر ہمارا تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟"۔

"محبت کا خود اپنا ایک نظام عدل ہوتا ہے گہنا..... اور بدقسمتی سے اُس کا انصاف بہت کم خوش نصیبوں کو راس آتا ہے..... محبت کی تکون میں ایک کونا سدا ہی سزاوار ٹھہرتا ہے..... اور ہماری محبت کی تکون میں یہ سزا فضہ نے ہم دونوں کی خاطر خود اپنے لیے تجویز کی ہے..... حالانکہ اُسے خود کے لیے جزاء چننے کا اختیار بھی حاصل تھا لیکن یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے ہم دونوں کو سزاوار نہیں ٹھہرایا..... اور ہمارے نصیب کی تکون سے اپنا زاویہ علیحدہ کر کے ہمیں ملا دیا....."

گہنا نے نظر بھر کے مجھے دیکھا "آپ اس ملن سے خوش تو ہیں نا آیان.....؟"۔ "میری ہر خوشی اب آپ سے وابستہ ہے گہنا جی..... میرے دل کی حالت جاننے کے لیے اب آپ کو ہمیشہ خود اپنے اندر جھانکنا پڑے گا....." گہنا نے شرارت سے میری جانب دیکھا "لیکن میرا دل تو کچھ اور کہہ رہا ہے....." میں چونک سا گیا "کیا کہتا ہے آپ کا دل.....؟....."

گہنا کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ اُبھری "جو دل کی باتیں جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں..... وہ سوال نہیں پوچھا کرتے..... بس خود جھانک کر پڑھ لیا کرتے ہیں....." میں بھی مسکرا دیا "ہاں..... شائد دلوں کی تحریر پڑھنے کا فن بھولتا جا رہا ہوں..... بہت سے وعدے ہیں جو نبھانے ہیں..... اپنوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں اپنے اس ننھے اُلو سے....."

''لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ اُن سب کی امیدوں پر ضرور پورا اتریں گے..... میں اس امتحان میں ہر قدم آپ کے ساتھ ہوں.....''

''تو پھر وعدہ کریں کہ جب تک میں اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتا..... آپ میرا انتظار کریں گی..... ابھی بہت سی آنکھوں کے آنسو چننا باقی ہیں..... یہ تو سفر کا آغاز ہے..... مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کے خواب تعبیر کرنا ہیں..... بولیں..... دیں گی میرا ساتھ.....؟''

''میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی آیان..... اور آخری دم تک آپ کا ساتھ دوں گی۔''

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''وعدہ.....''

گہنا نے پلکیں اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''وعدہ.....''

ہم دونوں مُسکرا دیے۔ آسمان پر ایک ساتھ بہت سی ہُمل جھڑیاں چھوٹیں اور فلک بھی گہنا کے پُرنور چہرے کی طرح گلنار ہو گیا۔

.....❁.....

﴿ختم شد﴾



مُقدس

ہاشم ندیم

انتساب!

اک پری زاد

کے نام!

جو مجھ میں رہ کر مجھے بے چین رکھتی ہے

دیباچہ

''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا'' ہاں اس بار کچھ زیادہ تاخیر ہوگئی..... بہت سی الجھنوں باعث تاخیر ہوئیں اور اپنا حال تو ہمیشہ سے کچھ ایسا ہے کہ ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں'' ہو حال ''مقدر'' آپ کے ہاتھ میں ہے اور میری خود سے لڑی ہوئی اک اور جنگ اقساط کی صورت اس کتاب کے صفحوں پر آپ کو بکھری ہوئی ملے گی۔ شکست پہلے بھی میرا مقدر تھی اور شکست آج بھی میرا نصیب ہے یہ جو لوگ لفظوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی لفظوں کے روٹھنے اور ان کو منانے میں بیت جاتی ہے۔ اگر پھر یہ لفظ مجھ سے روٹھ نہ گئے تو پھر کسی قسط کے ذریعے آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ میرے پبلشر نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

ہاشم ندیم

باب 1

مقدس

کہتے ہیں شہنشاہ روم نیرو کو جب سزائے موت دی جا رہی تھی تو اُس وقت اس نے حسرت زدہ انداز میں تمام مجمعے کو دیکھتے ہوئے صرف تین لفظ کہے تھے۔

"Qualis qilifex perco"

''افسوس دنیا نے مجھ جیسا ''نایاب صفت'' کھو دیا۔''

کچھ اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار اُس اٹالین لسٹر کے نے بھی کیا تھا جسے کچھ دیر پہلے اس کے ساتھی اُس کی ہیوی بائیک سمیت ٹوٹی پھوٹی حالت میں ایک نیگرو کی ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ ہم سب اس وقت نیویارک شہر کے مین ہیٹن علاقے میں بنی دیو قامت کمرشل عمارتوں کے عقب میں موجود سنسان اور اندھیری گلی میں موجود تھے۔ موسم سرد تھا اور دور کسی گھڑیال نے ابھی کچھ دیر پہلے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا تھا۔ تیز بارش نے ہم سبھی کو شرابور کر رکھا تھا اور سنسناتی ہوا کی وجہ سے تقریباً سبھی نے اپنی اپنی جیکٹ اور کوٹ کے کالر کھڑے کر رکھے تھے۔ ہم سب یہاں اس سنسنان سی گلی میں ایک کھیل کھیلنے کے لیے جمع ہوئے تھے جس کا نام تھا "The last surviver" (آخری فاتح)۔ پہلے یہ کھیل ہم تیرہویں گلی میں اپنے رہائشی اپارٹمنٹس کے پیچھے والی گلی میں کھیلا کرتے تھے لیکن پھر جب ہمارے بھاری اور طاقت ور موٹر سائیکلوں کے پھٹے ہوئے سائیلنسروں کے بے ہنگم شور

نے علاقے کے مکینوں کو آدھی آدھی رات تک جاگنے پر مجبور کر دیا تو آخر کار ہماری شکائیت ہو گئی اور "NYPD" (نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ) والوں نے ہمارے سرپرستوں سے بھاری ضمانتیں طلب کر کے ہمیں گھر جانے کی اجازت دی تھی۔ اُس دن کے بعد سے ہمیں مجبوراً مین ہیٹن کی یہ ویران گلیاں چھاننا پڑ رہی تھیں۔ تجارتی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سرشام ہی ویرانی چھا جاتی تھی لہٰذا ہماری رات بھر کی ہلڑ بازی کو روکنے والا یا اُس کی شکایت کرنے والا یہاں کوئی نہیں تھا۔ ہاں البتہ رات کو دیر گئے گھر لوٹنے میں علاقے کے کالے لٹیروں کے ہاتھوں لٹنے کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ اس لیے ہم عموماً چار پانچ کی ٹولیوں میں سفر کرتے تھے۔ اپنے نام کی طرح ہمارا یہ کھیل بھی بہت عجیب وغریب اور جان لیوا تھا۔ ہمیں یہ کھیل کھیلنے کے لیے کسی ایسی تنگ گلی کی ضرورت ہوتی تھی جہاں سے بیک وقت صرف دو بائیکس ایک ساتھ گزر سکیں۔ تنگ گلی کے اُس آخری سرے کو جو باہر کھلی سڑک پر کھلتا تھا ایک آہنی دروازے یا پھر اسی قسم کی کسی مضبوط رکاوٹ کے ذریعے آدھا بند کر دیا جاتا تھا، اس طرح گلی کے سرے سے اب صرف ایک ہی بائیک کے گزرنے کی جگہ باقی رہ جاتی تھی۔ کھیل یہ تھا کہ دو موٹر سائیکل سوار اپنی ہیوی بائیک کی تمام تر رفتار کے ساتھ گولی کی سی تیزی سے گلی کے تنگ کونے سے پہلے نکلنے کے لیے ریس لگاتے تھے۔ ایک سو ستر یا ایک سو اسّی کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جب یہ جانباز گلی کے سرے کی طرف سفر کرتے تھے تو ان میں سے ایک ہی گلی سے سلامت نکل پاتا تھا جب کہ متوازی چلنے والا حریف دیوار یا آہنی دروازے سے ٹکرانے کے بعد سیدھا ہسپتال پہنچتا اور پھر ہفتوں اُس گریٹر نیویارک ہسپتال کا بل بھرا کرتا جو ہمارے اس میدان جنگ سے قریب تر تھا۔ رات گیارہ بجے سے اب تک اٹالین رومیو اپنی ہڈی پسلی تڑوانے والا تیسرا گھائل تھا۔ اور اب آخری فاتح کی دوڑ کی باری میری تھی۔ میرے مقابل حبشی لڑکا ٹم تھا جو میرے انتظار میں اپنی بائیک پر بیٹھا اسے ریس دے کر گول دائرے میں ایک ٹائر پر گھمائے جا رہا تھا۔ اُس نے پیش کیا جانے والا ہیلمٹ اُٹھا کر دور پھینک دیا۔ مطلب یہ کہ اب مجھے بھی بنا کسی حفاظتی خول کے یہ مقابلہ لڑنا تھا۔ آس پاس کھڑے دونوں اطراف کے حمایتیوں کا شور اور نعرے تیز ہوئے جا رہے تھے۔ میں نے جیکٹ کی زپ کھینچ کر بند کر دی۔ بارش کی وجہ سے موٹر سائیکل کی تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی کے باوجود چند فٹ آگے کا منظر بھی دُھندلایا ہوا تھا۔

میں نے اپنی بائیک کی چین اور گیئر کو درست کرتے ہوئے بسام کو ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود جا کر بائیک کی سیٹ سنبھال لی۔

میں آپان احمد، امریکن، نژاد پاکستانی جو اپنے بڑے بھائی بسام کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ امریکہ منتقل ہونے کے بعد گزشتہ بیس سالوں میں بمشکل بیس دن کے لیے بھی اپنے ملک واپس نہیں گیا تھا۔ ہاں چار سال پہلے جب ممی اور ڈیڈی کا ہائی وے پر کار کے حادثے میں ایک ساتھ انتقال ہوا تو میں اور بسام اپنے والدین کی وصیت پوری کرنے کے لیے ان کے جسد خاکی دفنانے کے لیے پاکستان لے گئے تھے۔ بسام مجھ سے عمر میں یوں تو ایک سال بڑا تھا لیکن زیادہ تر وہ ہی میرے رعب میں رہتا یا مجھ سے ڈانٹ کھاتا رہتا تھا۔ ممی اور ڈیڈ کے بچھڑنے کے بعد نیویارک میں صرف عارفین ماموں ہی ہمارے اپنوں میں باقی بچے تھے جو گراؤنڈ زیرو کے علاقے میں تنہا رہتے تھے، ماموں امی کے سب سے بڑے بھائی تھے اور ہم دو بھائیوں سے بہت پیار کرتے تھے لیکن دُنیا کے اس تیز ترین شہر کی برق رفتار زندگی کو نبھاتے ہمیں اُن سے ملے بھی ہفتوں گزر جایا کرتے تھے میں اور بسام شہر کی مرکزی یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رہے تھے۔ بسام شام کو ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتا تھا اور میں آوارہ گردی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کے سارے خرچے اور اللّے تللّوں سمیت گھر کے تمام خرچے بھی بسام ہی اُٹھاتا تھا۔ محنت کرنا بچپن سے ہی میری سرشت میں شامل نہیں تھا اور ان گوروں کی اُلٹی سیدھی باتیں تو میں بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے بچپن سے لے کر اب تک بسام کی آدھی زندگی میرے جھگڑے نپٹاتے ہی گزری تھی۔ بسام میرا اور اپنا خرچہ اُٹھانے کے لیے رات دن محنت کرتا لیکن مجھے اس کے دیئے پیسے ہمیشہ کم ہی لگتے تھے، مجبوراً مجھے خود کمانے کے لیے اُلٹی سیدھی شرطیں لگانی اور ایسے کھیل کھیلنا پڑتے تھے جن سے میں لمحوں میں ہفتوں کا خرچہ نکال سکوں۔ اس وقت بھی ہم سب اس اندھیری گلی میں میری ایک ایسی ہی شرط کی پاداش میں جمع ہوئے تھے، یونیورسٹی میں ایک ہم جماعت نے جب مجھے ''لاسٹ سروائیور'' نام اس کھیل کی شرط اور اسے جیتنے کی صورت میں ملنے والی رقم کا بتایا تو میں نے فوراً ہاں کر دی تھی۔

میں نے بائیک کا کلچ دبا کر الوداعی نظروں سے بسام کی جانب دیکھا بسام نے آخری مرتبہ التجا کی ''اُلو یار رہنے دو..... یہ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ میں اگلے ہفتے اوور ٹائم لگا کر تمہیں کچھ ڈالر مزید دے دوں گا..... میں نے مسکرا کر اپنے بھولے بھیا کا منہ چڑایا، اسے بھلا کیا پتا کہ اپنی ''محنت کی کمائی'' کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے بسام کو مشورہ دیا۔ ''تم سے نہیں دیکھا جا رہا تو آنکھیں بند کر لو۔ آیان اپنی شرط سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا.....'' میں نے بائیک کو گیئر میں ڈالے رکھا اور جھنڈی ہلانے والے لڑکے کے اشارے کے انتظار میں بائیک کو زور زور سے ایکسی لیٹر دینے لگا۔ اس وقت ہم سب نسبتاً ایک کھلی گلی میں موجود تھے اور ٹھیک ہمارے سامنے دو سو گز کے فاصلے پر وہ تنگ گلی شروع ہوتی تھی جس کے اختتام پر لوہے کی چادریں لگا کر اُسے نصف بند کر دیا گیا تھا۔ جو نیگروز یہ مقابلے منعقد کرواتے تھے وہ اپنے پرانے کھٹارہ بیڈفورڈ ٹرک میں یہ تمام سامان لے کر آتے تھے اور علاقے کا تعین اور باقی تمام انتظامات انہی کے ذمہ تھے۔ ہر شرط لگانے والے کو بیس 20 ڈالر کی فیس ان کے پاس پیشگی بھرنا لازمی تھی، ستم یہ ہے کہ میں نے اپنی فیس بھی بسام کی جیب سے بھروائی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے ایسے کاموں سے منع کرتا اور آخری لمحے تک میری مدد سے انکار کرتا رہتا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑ سکتا، لہٰذا آخری لمحوں میں ہمیشہ اُسے میرے سامنے ہتھیار ڈالتے ہی بنی تھی، آج شام بھی ٹھیک ایسا ہی ہوا اور جب میں بسام سے جھگڑنے کے بعد اُس کے کام والی جگہ سے رُوٹھ کر مین ہیٹن لوٹا تو گھنٹے بعد ہی وہ بھی اس جگہ پہنچ چکا تھا، اور ناراض سا کھڑا نیگرو کے پاس میری فیس جمع کروا رہا تھا۔

نیگرو پارٹی نے کچھ دیر مزید بارش تھمنے کا انتظار کیا لیکن اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے، اب تو باقاعدہ گلی میں پانی جمع ہونے لگا تھا اور گلی کے دونوں اطراف بچھی لوہے کی جالیوں کے نیچے بنی نالیوں میں سے تیز پانی کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ اب مزید انتظار بے سود ہے لہٰذا مقابلہ شروع کیا جائے۔ ہمارے سامنے کھڑے نوجوانوں کا ہجوم تیزی سے چھٹ گیا اور سب دیوار کے ساتھ دونوں جانب بنے فٹ پاتھ پر چڑھ گئے۔ جھنڈی دکھانے والا لڑکا چلایا ''تین''، ''دو''، ''ایک.....'' میری اور میرے حریف کی بائیک یوں اُچھل کر تیزی سے آگے کو

دوڑیں جیسے کسی توپ کے دہانے سے دو گولے نکلے ہوں۔ اُس کے پاس نئے ماڈل کی سپر 180 بائیک تھی جبکہ میری بائیک کچھ پرانی تھی اور اس کی دیکھ بھال میں اور بسام خود کیا کرتے تھے، دراصل ہم خود اپنی بائیک کے مکینک بھی تھے اور بسام اپنی اب تک کی پڑھی تمام مکینکل انجینئرنگ اس بائیک کی رفتار اور کارکردگی بہتر کرنے پر صرف کر چکا تھا۔ چند لمحوں میں ہی میری اور ٹم کی بائیک سو کی رفتار کے ہندسے کو چھونے لگی تھی۔ لیکن اس وقت میں اپنی بائیک کے ڈیجیٹل میٹ پر جگمگاتے اور تیزی سے بڑھتے نمبر دیکھنے کا خطرہ نہیں مول سکتا تھا کیونکہ تنگ گلی بالکل میرے سامنے تھی۔ بہت سے اناڑی سوار تو اس گلی کے آغاز پر ہی دیوار سے ٹکرا کر مقابلے سے باہر ہو جاتے تھے۔ کیونکہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اس تنگ گلی میں سیدھے داخل ہونا بھی نہایت مہارت کا متقاضی تھا۔ خاص طور پر اُس وقت جب آپ کی بائیک سے بالکل جڑی دوسری متوازن بائیک بھی ٹھیک اُسی رفتار سے اڑی چلی آ رہی ہو۔ ٹم ایسے مقابلوں کا پرانا اور شاطر کھلاڑی رہا تھا اور اُس نے گلی میں داخلے سے قبل مجھے جھاکا دینے کے لیے اپنی بائیک کا اگلا پہیہ ذرا سا موڑ کر تیزی سے سیدھا کر لیا۔ تاکہ میں ڈر کر اس سے چند انچ پیچھے رہ جاؤں لیکن میں جانتا تھا کہ ٹم ایک دو سیکنڈ سے زیادہ اپنی بائیک کے پہیے کو موڑے نہیں رکھ پائے گا کیونکہ اس صورت میں وہ خود بھی دیوار سے ٹکرا سکتا تھا لہٰذا میں نے بریک پر دباؤ نہیں بڑھایا اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں اس سرنگ نما گلی میں ایک ساتھ یوں داخل ہوئے کہ گلی کے فرش پر ٹائروں کی رگڑ سے فضا میں کئی چنگاریاں لپکیں۔ گلی اس قدر تنگ تھی کہ ہم دونوں کے مخالف شانے تقریباً دیوار کو چھو رہے تھے، اس مرحلے پر سوار کا سب سے مشکل امتحان اپنی بائیک کو ناک کی سیدھ میں سیدھا رکھ کر آخری گنجائش کی حد تک تیزی سے دوڑانا ہوتا ہے، ذرا سی بھی لاپرواہی ہم دونوں کو موت کے منہ میں لے جا سکتی تھی کیونکہ ایک بھی سوار گرنے کی صورت میں دوسرا خود بخود اُس کی لپیٹ میں آ جاتا اور دیوار سے ٹکرا کر یا موٹر سائیکلوں تلے روندے جانے کے بعد ہمارے چیتھڑے بھی شاید لوگوں کو نہ ملتے، گلی کا بند کونا ہماری طرف بڑھنے والے کسی میزائل کی طرح لحہ بہ لحہ قریب آتا جا رہا تھا، اچانک میں بے خیالی میں ذرا سا بائیں جانب جھکا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بائیں کاندھے پر سے اپنی لیدر جیکٹ کا ایک ٹکڑا دیوار کی رگڑ سے چھل کر فضا میں اڑتے ہوئے

دیکھا۔ ایک پل میں ہی مجھے اپنے بائیں شانے میں مرچیں سی بھرتی ہوئی محسوس ہوئیں اور ٹھیک یہی وہ لمحہ تھا جب ٹم نے اپنی بائیک کی پوری رفتار ایک جھٹکے سے کھول لی تھی۔ اس کی بائیک کا اگلا پہیہ میرے بائیک سے چند انچ آگے بڑھ چکا تھا اور ٹم نے کمال مہارت سے اپنی بائیک کو گلی سے باہر نکلنے والے سرنگ نما راستے کی جانب دھکیلے رکھا۔ سرنگ کے دھانے سے باہر کی جانب سے آتی نیلگوں روشنی کا مستطیل ٹکڑا خلا میں بھٹکتے کسی شہاب ثاقب کی طرح ہمارا وجود اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور پھر ٹم کی مہارت نے اثر دکھایا اور اس نے اپنا جسم سکیڑ کر خود کو کسی پیراک کی طرح بائیک کی سیٹ پر لٹا لیا اور جس طرح ماہر غوطہ خور اونچائی سے چھلانگ لگا کر پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے اپنا جسم اندر داخل کرتے ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح ٹم گلی کے سرے سے باہر نیلی روشنی کے سمندر میں پار ہو گیا۔ میں نے پوری قوت سے اگلی اور پچھلے پہیوں کی بریک کو جکڑ لیا۔ لیکن پھر بھی میں بائیک کو سنبھال نہ سکا، میری بائیک ترچھی ہو کر اڑتی ہوئی بے پناہ طاقت کے ساتھ لوہے کی چادر سے ٹکرائی اور ٹھیک اگلے لمحے میرا جسم بھی اس فولادی رکاوٹ سے متصادم ہو چکا تھا، لیکن میری خوش قسمتی رہی کہ میرے بے توازن جسم کے ٹکرانے سے پہلے ہی میری ہیوی بائیک کا تمام تر وزن اس فولادی چادر کو صرف ایک سیکنڈ پہلے کافی حد تک ترچھا کر چکا تھا لہٰذا میرے ٹکراتے ہی وہ آہنی دروازہ بھی فضا میں اُچھلا اور دوسرے لمحے میں فضا میں قلابازیاں کھاتا ہوا پکی سڑک پر گر کر بے سدھ ہو چکا تھا۔ میری بائیک گیلی سڑک پر پھسلتی ہوئی جانے کس رُخ جا ٹکرائی تھی اور میں زخموں سے چور بدن کے ساتھ برستی بارش میں نیچے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو سبھی لڑکے میرے اِرد گرد جمع تھے اور مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرا سر بسام کی گود میں تھا۔ اور وہ پریشانی سے میرے گال تھپتھپا رہا تھا۔ ''آپان ..... ہوش میں آؤ ..... تم ٹھیک تو ہو .....؟ ..... بولتے کیوں نہیں .....؟'' میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں تو آسمان سے برستے قطرے میرے آنسو بن گئے۔ ''ہاں ٹھیک ہوں ..... بس کچھ ہڈیاں اپنی جگہ سے سرک گئی ہیں .....'' اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دائیں گھٹنے سے بھی خون بہہ رہا ہے اور میری نیلی جینز سرخ ہو چکی ہے۔ نیگروز نے اپنے نام نہاد فرسٹ ایڈ کے بکسے سے میری حتی الامکان مرہم پٹی کر دی تھی، لیکن میرا سارا جسم اب بھی کسی پھوڑے کی طرح

ڈھ رہا تھا۔ فاتح ٹم نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔"Well played" تم خوب کھیلے لڑکے..... لیکن جانتے ہو تم آج مجھ سے کیوں ہارے ہو.....'' میں نے سوالیہ انداز میں ٹم کی جانب دیکھا۔ '' کیونکہ میری بائیک کا ماڈل تم سے تین سال پرانا ہے.....'' ٹم مسکرایا ''نہیں ..... بائیک کا ماڈل اتنے معنی نہیں رکھتا ..... اصل بات ہے"Killer instinct" (مارنے کی جبلت)۔ جب تک تمہارے اندر مخالف کو ختم کر دینے کی یہ فطری جبلت پیدا نہیں ہوگی۔ تب تک تم اُدھورے ہی رہو گے۔ جس طرح جنگل کے درندوں میں اپنے بچاؤ اور بقا کے لیے دوسرے جانور کو چیر پھاڑ دینے کا نظام رائج ہے، ٹھیک اُسی طرح ہماری اس نام نہاد تہذیب یافتہ دنیا کا بھی کچھ ایسا ہی اصول ہے۔ میں نے پوری ریس کے دوران یہ محسوس کیا تھا کہ تم اپنے ساتھ ساتھ میری بچت کا بھی سوچ رہے ہو۔ اور یہی تمہاری بنیادی غلطی تھی۔ جیتنے کے لیے دوسرے کو کچل دینے کا جذبہ سب سے زیادہ ضروری ہوتا ہے..... اگلی بار جب میرے مقابلے پر آؤ تو اس حیوانی جبلت(killer instinit) کے بغیر نہ آنا، شہنشاہ جب اپنی تفریح کے لیے گلیڈیٹرز Gladiaters کو اکھاڑے میں بھوکے شیروں کے سامنے اُتارتے تھے تو تب بھی یہی فطری جبلت گلیڈیٹرز کو بچاتی تھی ورنہ اس کی ادھ بچی لاش ہی میدان سے باہر جاتی تھی .....'' میں غور سے ٹم کی بات سن رہا تھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔'' مارو..... یا مر جاؤ۔'' کا اصول ہی ہمیں فتح کے قریب رکھتا ہے میری بائیک مڑی تڑی سی ایک جانب پڑی ہوتی تھی اور اُس کے ریڈی ایٹر سے گرم بھاپ نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ بسام مجھ سمیت بچی کھچی ہوئی بائیک کو ایک ٹیکسی میں ڈال کر ہمارے اپارٹمنٹ کی عمارت تک پہنچا تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے، اور بارش تھم چکی تھی۔

اگلے تین دن بسام نے میرے جسم کی سینکائی اور مجھے ڈانٹنے میں گزارے، میری وجہ سے اُس کی کلاسز اور شام کے اور ٹائم کا بھی بہت حرج ہو رہا تھا لہٰذا چوتھے دن میں نے اُسے زبردستی یونیورسٹی بھجوا دیا لیکن خود یونیورسٹی کی کلاس لینے میں مجھے دو ہفتے لگ گئے۔

میری بائیک ابھی تک زیرِ مرمت تھی لہٰذا مجھے یونیورسٹی کے لیے زیرِ زمین ریل کے سب وے اسٹیشن سے ٹرین پکڑنی پڑی اور میں جب باہر کھلی فضا میں پہنچا تو چمکیلی دھوپ سے میری

آنکھیں چندھیا سی گئیں، یونیورسٹی میں حسب معمول میرا گروپ کلاس روم کے بجائے کیفے میں مجھے اودھم مچاتا ہوا ملا۔ میرے گروپ میں امریکن ایرک اور جم، ایرانی نژاد فرہاد اور کینڈین جینی شامل تھی۔

اور ہم سب کی قدر مشترک صرف ہلڑ بازی اور زندگی کے اُس لمحے گزرتے پلوں کا لطف لینا تھا۔ ''باقی دنیا جائے بھاڑ میں'' ہمارا اصول اور ''آ بیل ..... مجھے مار'' ہمارا آئین تھا۔

مجھے دیکھ کر ایرک زور سے چلایا ''ہے آپان ..... کہاں رہ گئے تھے MAN .....؟ ..... ہم صبح سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں .....'' وہ سب درمیانی عرصے میں میری عیادت کے لیے لگاتار ہمارے فلیٹ آتے رہے تھے اور میں نے ہی دو دن پہلے اپنی آج یونیورسٹی آمد کا انہیں بتایا تھا۔ ''بائیک ٹھیک نہیں ہوئی ابھی تک ..... ٹرین میں دھکے کھاتا ہوا پہنچا ہوں یہاں تک .....'' جم کو اپنے شہر کی کسی چیز کی بھی برائی سخت ناگوار گزرتی تھی لہٰذا وہ جلدی سے بولا ''نیویارک کی سب وے ٹرینیں دنیا میں بہترین مانی جاتی ہیں .....؟ فرہاد نے اُسے جھاڑا'' اچھا اچھا ٹھیک ہے ..... زیادہ طرف داری کرنے کی ضرورت نہیں ہے ..... امریکن کہیں کے .....'' ہم سب ہنس پڑے جم کو غصہ آ گیا۔ ''تم تو خاموش ہی رہو۔ ہمارا بس چلے تو ہم تمہارے ایران کو پھر سے فارس بنا دیں .....'' جینی نے لقمہ دیا ''بس یہیں تو تم امریکن مار کھا جاتے ہو ..... تم لوگوں کا بس ہی تو نہیں چلتا .....'' ابھی یہ نوک جھونک جاری تھی کہ اچانک یونیورسٹی کے مرکزی احاطے میں کچھ طلباء کی نعرہ بازی کا شور گونجا۔ میں نے کیفے کی دوسری منزل سے جھانک کر دور صحن میں کھڑے طلبا کو بینر اُٹھائے اور نعرے لگاتے دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے .....؟'' جینی نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''تم کیسے پاکستانی ہو ..... یہ سب طلباء تمہارے ہی ملک کی کسی ڈاکٹر کی امریکنوں کے ہاتھ گرفتاری کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ سنا ہے چند ہفتوں میں اُسے سزا سنائی جانے والی ہے .....'' میں نے بے زاری سے سر ہلایا۔ مجھے اپنا ملک چھوڑے بیس سال ہو چکے ہیں ..... بھلا میرا وہاں کی روزمرہ خبروں کے ساتھ اب کیا تعلق .....؟'' جینی نے اپنے سنہرے بال یوں جھٹکائے جیسے اُسے بہت افسوس ہوا ہو۔ فرہاد نے فوراً فتویٰ جاری کر دیا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ تم مسلمان بھی ہو یا نہیں ..... اس قدر بے زاری .....'' میں نے فرہاد کو جھاڑ دیا۔

''اچھا اب میرا بزرگ بننے کی کوشش نہ کرو۔ اس کام کے لیے میرے عرفی ماموں ہی کافی ہیں ..... چلو جلدی سے کچھ آرڈر کرو ..... دو ہفتوں سے بسام کے ہاتھ کی بدمزہ کافی پی پی کر میرا تو حلق بھی لڑوا ہو چکا ہے۔''

ابھی ہم کیفے ٹیریا سے نکلے ہی تھے کہ سامنے سے مسلمان طلباء کے کونسلر اسٹوڈنٹ عامر بن حبیب گروپ یونیورسٹی کے کسی مسئلے کی کونسلنگ counsiling کرتا نظر آیا۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر مذہب کے طلبا کا ایک نمائندہ مقرر تھا جو خود بھی طالب علم ہوتا۔ اور دیگر طلباء کے ووٹ سے ہر سال اُس کا چناؤ ہوتا تھا۔ اس کونسلر کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے ہم مذہب طلبا کے مسائل یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کرے اور اُن سے مل کر کچھ ایسا حل نکالے جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ مسلم کونسلر کی طرح عیسائی کونسلر اور یہودی کونسلر بھی یونیورسٹی کے طلباء میں سے ہی چنے جاتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں مجھے انسان کو ان مذہبی گروہ بندیوں میں تقسیم کرنا شروع سے ہی بہت برا لگتا تھا۔ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ انسان کو صرف انسان کی پہچان سے کیوں نہیں جانا جاتا؟ کیا مذہب اور نسل کی یہ تقسیم واقعی اتنی ضروری ہوتی ہے کہ انسانیت کہیں پس منظر میں چلی جائے؟ شاید یہ میری امریکہ میں ہوئی پرورش کا اثر تھا کہ میں بھی لاکھوں نوجوانوں کی طرح مذہب کو صرف ایک پابندی کے طور پر دیکھ رہا تھا۔

آج کل ہماری یونیورسٹی کا مسلم کونسلر معاشیات ڈپارٹمنٹ کے سال آخر کا طالب علم عامر بن حبیب تھا جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جب ہم اس عرب شیخ کو یوں ٹھٹھرتی سردیوں یا کڑک دھوپ تلے باقی مسلمان طلباء کے مسائل حل کروانے کے لیے دربدر بھٹکتے دیکھتے تو ہمیں بہت حیرت ہوتی تھی کہ یہ امیر زادہ کن چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ میں اور بسام تو ہمیشہ یہی آہیں بھرتے رہتے تھے کہ کاش ہمارے پاس اتنا پیسہ ہوتا تو ہم ہیوی بائیکس کا ایک شوروم کھول لیے اور باقی تمام عمر عیش کی زندگی جیتے شاید قدرت جب کسی کو کوئی نعمت بخشتی ہے تو ٹھیک اُسی لمحے اس انسان کے دل سے اس نعمت کی قدر بھی چھین لیتی ہے۔ یا شاید کچھ لوگوں کو ہمیشہ تب ملتا ہے جب وہ اہمیت کھو چکا ہوتا ہے۔

میری عامر سے یونہی ایک آدھ بار سرسری سی ملاقات ہوئی تھی اور آج بھی میں نے اس گروپ کو دیکھ کر رستہ بدل کر نکلنے کی کوشش کی لیکن عامر نے مجھے دیکھ کر دور سے ہی اپنے مخصوص لہجے کی انگریزی میں پکارا ہے آپان ..... بس دو منٹ .....'' میں بادل نخواستہ رک گیا اور عامر سمیت کے چار ساتھی میری سمت بڑھے جن میں فلسطینی لڑکا بابر بھی شامل تھا۔ جانے کیوں میری اور با پہلے دن سے ہی نہیں بنی تھی اور ہماری تین چار جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ وہ بھی میری طرح تیز مزاج حساب باقی نہ رکھنے والا انسان تھا۔ عامر نے قریب آ کر مجھے سلام کیا۔ ''ہم شہر میں مسلمان طلباء خلاف نیویارک پولیس کے کریک ڈاؤن کے خلاف کل سے مظاہرے شروع کر رہے ہیں ..... تم ہ ساتھ نہیں دو گے؟'' میں نے طنز کیا ''یہ تم لوگوں کو بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ بن کر ناچنے کی عادت پڑ گئی ہے .....؟ نیویارک پولیس کو اپنا کام کرنے دو ..... جو بے گناہ ہوگا۔ خود چھوٹ جا گا.....'' میرا کرارا جواب سن کر بابر سے صبر نہیں ہو سکا ''میں نے تم لوگوں سے پہلے ہی کہا تھا کہ ا سے بات کرنا فضول ہے..... لیکن تم لوگوں نے میری نہیں سنی.....'' میں نے بابر کو گھورا ''تمہارے ۔ بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنے گھر کی فکر کرو ..... دوسروں کے غم میں دُبلا ہونا چھوڑ دو'' بابر سینہ تان آگے بڑھا لیکن عامر نے جلدی سے بیچ بچاؤ کروایا ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے ..... کوئی زبردستی نہیں ہے..... لیکن آپان ..... جانے میرا دل کیوں کہتا ہے کہ ایک دن تم ضرور ہمارے ساتھ چلو گے.....'' لوگ آگے بڑھ گئے اور میں اپنے راستے ہو لیا۔

اُس رات بسام کو واپس آنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ شاید میری ٹوٹی بائیک اور شرط نقصان بھرنے کے لیے اس نے اور ٹائم لے لیا تھا۔ میں کچھ دیر ٹی۔ وی کے چینل بدلتا رہا اور پھر مجھے سستی نے آ گھیرا۔ اور میں وہیں لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اچانک ایک گزرے ہوئے چینل نے مجھے جھٹکے سے دوبارہ اُٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے فوراً دوبارہ وہی چینل لگایا۔ بسام جس ریستوران میں کام کرتا تھا۔ ''وہ کیفے پنولی'' کے علاقے میں تھا اور اُس وقت ٹی۔ وی پر وہاں نیویارک پولیس کے چھاپوں کے بارے میں رپورٹ چل رہی تھی۔ اور پھر میں نے دیگر لڑکوں کے ساتھ بسام کو بھی پولیس کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تو میرے ہاتھ سے ریموٹ گر گیا۔ میرے ذہن میں آج عامر کی

یہی ہوئی بات گونجی "NYPD" والے مسلمانوں کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہے ہیں۔ٹھیک اُسی وقت کسی نے ہیجانی انداز میں باہر کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

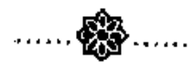

باب2

جس انداز میں دوبارہ پیٹا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید ہمارے اپارٹمنٹ پر بھی پولیس نے چھاپہ مار دیا ہے، لیکن مجھے خود سے زیادہ بسام کی فکر تھی جسے میں نے ابھی ابھی نیوز چینل پر پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ باہر فرینکلن کھڑا تھا جسے ہم سب پیار سے انکل فرینکی کہتے تھے، وہ ہمارے اپارٹمنٹس کی یونین کا صدر تھا، اور میرا اور بسام کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا ''ہے آیان ..... تم نے ابھی نیوز دیکھیں۔ کیفے پنولی کے علاقے میں تمام چھوٹے ریسٹورنٹس پر ریڈ کر کے پولیس نے کئی مسلمانوں کو گرفتار کر لیا ہے ..... اور خدا کے لیے تم لوگ اپنی یہ گھنٹی ٹھیک کرواؤ ..... کب سے دروازہ پیٹ رہا ہوں .....'' شاید فرینکی نے بسام کو گرفتار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے یہ نئی خبر سنا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جلدی سے اپنی جیکٹ پہنی ''ہاں ..... میں وہیں جا رہا ہوں ..... دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے .....'' فرینکی شاید غصے میں تھا ''تماشہ بنا رکھا ہے ان پولیس والوں نے ..... ہم امریکی ایسے تو کبھی نہیں تھے .....'' انکل فرینک جس سنہرے دور کو یاد کرتا رہتا تھا، وہ امریکہ اب صرف کتابوں میں ہی ملتا تھا۔ میں نے نیچے اُتر کر مل بیری سٹریٹ کے لیے ٹیکسی پکڑی اور اُسے پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ میرے وہاں پہنچنے سے قبل ہی کافی بھیڑ اکٹھی ہو چکی تھی جس میں زیادہ تر مسلمان اور ایشین Asian طلباء کے رشتہ دار شامل تھے۔ کافی لمبی بحث کے بعد مجھے بسام سے ملاقات کی اجازت ملی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ ممی ڈیڈی کا لاڈلا بچہ ہونے کی وجہ سے

ام اندر سے کافی نازک اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ میں نے زور سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی ''ہمت
ار یار ..... آخر یہ ماجرا کیا ہے.....؟'' بسام نے رونی صورت کے ساتھ جواب دیا ''پتا نہیں..... کسی
ا تانی لڑکے کو گرفتار کیا ہے آج نیویارک پولیس نے ..... سنا ہے ٹائمز سکوائر پر کسی گاڑی میں بم نصب
ا تھا اُس نے ..... بم تو نہیں پھوٹا پر ہمارے مقدر پھوٹے ہیں کہ ہم سب ایشین اور مسلمان ہونے
ے جرم میں دھر لیے گئے ہیں .....'' میں نے غصے سے کچھ دور بیٹھے آفیسرز کی طرف دیکھا۔'' لیکن کسی
ے ایشین یا مسلمان کے جرم میں یہ لوگ باقی بے گناہوں کو کیسے پکڑ سکتے ہیں .....؟ ہم نے سب
ا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا .....؟ اور تم نے انہیں بتایا نہیں کہ تم گزشتہ بیس سالوں سے امریکی شہریت
ھتے ہو ..... تو پھر یہ لوگ تمہیں ایشیائی ہونے کا الزام کیوں دے رہے ہیں .....؟ اب ہم بھی انہی کی
ح امریکن شہری ہیں .....'' بسام نے گہری سانس لی'' بھائی ایشیائی ہونا اتنا بڑا جرم نہیں ہے ان
اکوں کی نظر میں ..... ہمارا اصل جرم مسلمان ہونا ہے ..... یہ لوگ اب ہر مسلمان کو شک کی نگاہ سے
یکھتے ہیں ..... پھر وہ چاہے کوئی ان کا اپنا شہری ہی کیوں نہ ہو.....'' اتنی دیر میں بسام کے ریستوران کا
مالک بھی اپنے وکیل کے ساتھ لاک اپ پہنچ گیا۔ لیکن پتا چلا کہ اب اُن سب کی ضمانتیں صبح عدالت
ے ہی ہوسکیں گی۔ میں بسام کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن رات بارہ بجے کے بعد ہم سب کو مرکزی
ہال خالی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ بسام نے ضد کر کے مجھے واپس اپارٹمنٹ بھجوادیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا
ہ میں ساری رات وہیں پولیس اسٹیشن کے باہر کھڑے رہ کر گزار دوں گا۔

لیکن گھر واپس پہنچ کر بھی مجھے ایک پل کے لیے بھی قرار نصیب نہیں ہوا۔ بار بار میری نظر
سام کے خالی کمرے اور بستر کی طرف جاتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب بسام گھر میں ہوتا تھا تو میں تمام
وقت اس سے مختلف چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتا رہتا تھا اور آج جب وہ یہاں نہیں تھا تو مجھے کسی
ا ت چین نہیں آ رہا تھا۔ شاید خون کے سبھی رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دور یا جدا ہونے کے بعد
ہ تھا یاد آنے والے ..... شاید اُداس کر دینے والے ..... ممی ڈیڈی کے انتقال کے بعد یہ پہلا موقع
ھا: ب میں اور بسام الگ ہوئے تھے۔ ہمارے والدین نے اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال امریکہ
ا ا) نیویارک شہر میں گزارے تھے مگر ڈیڈ کی تمام عمر جدوجہد میں ہی گزر گئی۔ وہ بھی بہت سے رنگین

سپنے لے کر اپنے ملک سے یہاں آئے تھے مگر نیویارک کی تیز زندگی انہیں کبھی راس نہیں آئی اور اسی
رفتار زمانے نے ایک دن ان دونوں کی جان لے لی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اور بسام چھوٹے تھے
ہمارے اسکول کی فیس بھرنے کے لیے ڈیڈی کو تین تین جگہ نوکری کرنا پڑتی تھی، ممی سیدھی سادھی گھر
خاتون تھیں اور انہیں اس نئی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیں ہمارے ملک کی کہانیاں سنایا کر
تھیں جو ہمیشہ مجھے کسی پریوں کے دیس کی باتیں لگتی تھیں کہ جہاں پندرہ بیس افراد کا کنبہ بھی ایک چھت
تلے گزارہ کر لیتا تھا اور جہاں شام کے بعد اب بھی نانیاں اور دادیاں بچوں کو چاند کی بڑھیا کی کہا
سناتی تھیں۔ ڈیڈی اپنی تمام تر کوشش اور ان تھک محنت کے باوجود اس کرائے کے اپارٹمنٹ سے آگے
نہ بڑھ سکے جس میں اب میں اور بسام تنہا رہتے تھے اور انہی کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں ا
بسام ابھی تک جیسے تیسے کر کے اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے۔ ورنہ یونیورسٹی کی آسمان کو چھوتی فیس اور دیگ
اخراجات ہمیں اس عیاشی کی اجازت ہرگز نہیں دیتے تھے کہ ہم دونوں ایک سیمسٹر بھی آگے پڑھ سکیں
لیکن بسام نے ڈیڈ کی آخری خواہش اور وصیت سنبھالنے کا عزم کر رکھا تھا اور اب تو اس کا آخر
سیمسٹر تھا، مجھے البتہ ابھی تین سیمسٹر درکار تھے اور ڈیڑھ سال کے بعد مجھے بھی معاشیات میں ڈگری مل
جانی تھی۔ میں ساری رات اُنہی سوچوں میں گم کروٹیں بدلتا رہا اور صبح ہوتے ہی پھر پولیس اسٹیشن
پہنچا لیکن تب تک وہ لوگ بسام سمیت سبھی لڑکوں کو عدالت لے جا چکے تھے۔ مجھے بسام کے مالک
وکیل عدالت کی سیڑھیوں پہ ہی مل گیا، وہاں اور بھی بہت سے متاثرہ لوگوں کے رشتہ دار موجود تھے
وکیل نے ہم سب کو اطمینان دلایا کہ دن بارہ بجے تک وہ سب کی ضمانتیں کروا لے گا۔ ہمیں کمرہ
عدالت میں جانے کی اجازت نہیں کیونکہ جج اپنے ذاتی چیمبر میں یہ کیس سن رہا تھا، میں وہیں عدالت
کے باہر سنگ مرمر کی یخ بستہ سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور پھر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے بسام مجھے باہر نکلتا ہ
نظر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اُسے نہ جانے کتنے سالوں بعد دیکھ رہا ہوں۔ میں لپک کر اس کے پاس
پہنچ گیا ''کیا بنا.....؟'' بسام رات بھر کی تھکن کا شکار لگ رہا تھا میری ہمت ہو گئی ہے یار..... لیکن
کچھ لڑکوں کو انہوں نے شبہے میں روک لیا ہے..... زیادہ تر پاکستانی شک کا شکار رہیں کیونکہ ٹائمز اسکوائر
پر بم لگانے والا بھی کوئی پاکستانی طالب علم ہی ہے۔ لیکن میں نے بسام کی آدھی بات ان سنی کر دی

بہ ے لیے یہی بہت تھا کہ میرا بے قصور بھائی رہا ہو گیا تھا۔ لیکن شاید میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا لہ یہ عارضی رہائی ہم دونوں کے لیے کسی مستقل قید کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ بسام کی آخری لاس کا وقت ابھی باقی تھا لہٰذا وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر یونیورسٹی لے گیا، اس روز یونیورسٹی میں بھی چاروں طرف ٹائمنز اسکوائر والے واقعے کی بازگشت ہی سنائی دے رہی تھی۔ فرہاد نے پریشانی سے میری جانب دیکھا ''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ کچھ عرصے سے آخر ہر بات کا نزلہ مسلسل پاکستانیوں پر کیوں گر رہا ہے.....؟'' ایرک نے بُرا سا منہ بنایا ''کیوں کہ پاکستان کو سارے عالم کا خلیفہ بننے کی سوجھ گئی ہے .....'' فرہاد نے اُسے جھاڑا ''بکو مت ..... کل تک تمہارے یہی خیالات ہمارے ایران کے بارے میں تھے .....'' جم نے ایرک کی تائید کی ''ایرک ٹھیک کہہ رہا ہے ..... آخر کوئی تو وجہ ہوگی ہر معاملے میں پاکستانیوں کے ملوث ہونے کی .....؟'' جینی نے غور سے میری جانب دیکھا ''تم اپنے ملک کی صفائی میں کچھ نہیں کہو گے آیان .....'' میں بسام کی پریشانی کی وجہ سے کچھ کھویا سا تھا۔ ''بسام کہتا ہے کہ یہ معاملہ قوم کا نہیں ..... بلکہ مذہب کا ہے ..... ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دی جا رہی ہے ..... البتہ پاکستانی ہونا سونے پر سہاگ ہے .....'' ایرک نے زور سے نفی میں سر ہلایا ''سب بکواس ہے ..... اگر صرف مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا تو یہاں سینکڑوں عرب، فلسطینی، ایرانی سوڈانی اور ملائیشن مسلمان بھی تو پڑھ رہے ہیں ..... حتیٰ کہ انڈین مسلمان طلباء بھی بڑے آرام سے زندگی گزارتے ہیں ہمارے امریکہ میں ..... تو پھر صرف پاکستانیوں کے ساتھ عداوت کا الزام سراسر غلط ہے .....'' فرہاد کے علاوہ باقی سب نے ایرک کی تائید میں سر ہلایا۔ میں نے بے زاری سے بات ختم کی۔ ''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ہم جیوا اور جینے دو کے قائل نیو یارک شہر کے باسی ہیں۔ ہمیں کسی کے بھی کیے کی سزا ملنا بہت نا انصافی ہوگی ..... کسی ملک میں پیدا ہونا ہمارے اختیار میں ہرگز نہیں ہوتا ..... ہاں کسی ملک کی شہریت ہم اپنی پسند اور مرضی سے اختیار کرتے ہیں اور میں نے اور بسام نے یہ امریکی شہریت اپنی مرضی سے اختیار کی ہے ..... لہٰذا اب ہمیں بھی باقی امریکیوں کی طرح امریکی سمجھا جائے اور ہمارے حقوق کا خیال رکھا جائے .....'' فرہاد نے میری تقریر سن کر برا سا منہ بنایا۔ ''مسٹر آیان ..... بہت جلد تمہاری آنکھوں کے سامنے سے امریکی حقوق کا یہ رنگین پردہ بھی ہٹ

جائے گا..... یہاں اب وہی امریکی کہلائے گا جو ابراہام لنکن کے دور کا ہوگا.....'' فرہاد کی بات سن کر
سبھی ہنس پڑے۔ کچھ دیر میں ہی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی اور ایرک اور جینی ہم سے کوئی بہانہ کر
وہاں سے یونیورسٹی کے اس بڑے دالان کی طرف چل پڑے جہاں زمین پر زرد آتشی رنگت کے خ
پتوں کا قالین سا بچھا رہتا تھا۔ ایرک اور جینی پہلے سیمسٹر سے ہی ایک دوسرے کی چاہت کا شکار
اور یہ بات ہم میں سے کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی، مگر ایسے موسم میں وہ دو احمق ابھی تک ہم لوگ
سے کچھ ایسے ہی عجیب وغریب بہانے کر کے علیحدہ ہوتے تھے۔ پہلی بوند پڑتے ہی جینی کو یاد آتا
''اوہو..... میں تو اپنی گلاسز لائبریری میں بھول آئی ہوں.....'' ایرک بھی چند لمحوں کے بعد اپنی کار
چابیاں ڈھونڈنے یا ایسے ہی کسی دوسرے ''اشد ضروری'' کام سے وہاں سے اُٹھ جاتا اور پھر وہ دونو
شام دیر گئے تک ان زرد پتوں کی چادر پر ایک دوسرے کی گود میں سر رکھے جانے کیا کھسر پھسر کر
مسکراتے رہتے تھے۔ یہ محبت بھی کیا بلا ہے جو اچھے خاصے عقل مند انسان کو نرا احمق بنا کر رکھ دی
ہے۔ ٹھٹھرتے گیلے موسم اور برستی بارش میں یہ محبت کرنے والوں کو باہر کھلے میں ٹہلنے پر مجبور کرتی۔ او
سخت جس زدہ اور گرم لو کے دوران یہ انہیں تپتے کمروں میں چھپ کر باتیں کرنے کی ترغیب دیتی
ہے۔ محبت میں سب اُلٹا ہوتا ہے۔ یا شاید سب محبت کرنے والے سر کے بل کھڑے ہو کر اس دنیا کو
دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ بہرحال سچ تو یہ ہے کہ مجھے آج تک کبھی ان محبت کی بھول بھلیوں کی سمجھ ہی نہیں
آئی تھی۔ فرہاد کہتا تھا کہ محبت سب پر وارد نہیں ہوتی۔ یہ اپنا شکار بہت دیکھ بھال کر اور نہایت اطمینان
سے چنتی ہے..... اور محبت کا مرغوب ترین شکار وہ ہوتا ہے جو درد سے زیادہ تڑپے۔ جس کی جان نکلتے
نکلتے نکلے اور جو مر مر کر جیے اور جی جی کر مرے..... ایک دم سے ٹھنڈے ہو جانے والے شکار محبت نام
کے عفریت کو زیادہ نہیں بھاتے تھے..... بقول فرہاد ''وہ عشق ہی کیا جو اپنے خون سے دیواروں کا رنگ
لال نہ کر دے.....'' لیکن مجھے یہ جذباتیت سخت ناپسند تھی۔ یا شاید ''مجھے محبت کی کہانیوں سے ہی نفرت
تھی.....؟'' جانے مجھے ایسا کیوں لگتا تھا کہ جیسے محبت انسان سے اس کا سارا غرور، ساری اَنا جھپٹ کر
اُسے ایک بھکاری بنا دیتی ہے۔ عشق مرد سے اُس کا گریس (Grace) چھین لیتا ہے اور محبت عورت
سے اُس کے عورت پن کو جدا کر دیتی ہے۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے اس محبت نامی بیماری میں عورت

مردوں جیسا اور مرد عورتوں کی طرح برتاؤ کرنے لگتے ہیں۔ شاید محبت ہم سے ہماری جنس چھین لیتی ہے۔ اسی لیے میں اس روگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ لیکن بسام شاید دو سال پہلے ہی کیوپڈ کے اس ان دیکھے تیر کا شکار ہو چکا تھا۔ فائن آرٹس کے آخری سال کی ایرانی نژاد صنم کبیر اس کی توجہ کا خاص مرکز تھی لیکن دوسرے محبت کرنے والے احمقوں کی طرح بسام بھی مجھ سے یہ بات چھپانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا تھا۔ جانے پریمیوں کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے ''باقی ساری دنیا گھاس چرتی ہے اور صرف وہی دانہ کھاتے ہیں۔''

کچھ ہی دیر میں بارش تیز ہو گئی اور ہم کیفے ٹیریا سے نکل کر اپنی آخری کلاس لینے سے اکیڈمک بلاک کی طرف چل دیئے۔ اگلی صبح میری بائیک کو گیراج سے واپس لینے کا دن تھا لہٰذا میں نے بسام کو عدالت میں حاضری لگوانے کے لیے کورٹ کے احاطے کے باہر چھوڑا اور خود ستر ہویں گلی میں واقع ڈیوڈ کے گیراج کی جانب چل پڑا، بسام کے وکیل نے آج ان سب کو ان کی ضمانت پکی کرنے کے لیے طلب کر رکھا تھا اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد بسام کو سیدھا یونیورسٹی ہی جانا تھا کیونکہ کل سے اس کی ''صرف ایک اچھی دوست'' صنم کبیر کے بیسیوں فون آ چکے تھے کہ ضمانت پکی ہوتے ہی سب سے پہلے بسام اُسے خبر کرے، صبح جب میں اور بسام گھر سے نکلے تو راستے میں کئی جگہ لوگ ہمیں اس لیڈی ڈاکٹر کی رہائی کے لیے مظاہرے کرتے نظر آئے۔ میں نے چند تصویروں میں اُسے میڈیکل کی ڈگری وصول کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ دکھنے میں تو بالکل دھان پان سی نظر آتی تھی پھر نہ جانے سارے امریکہ کو اس کے خوف کا بخار کیوں چڑھا ہوا تھا؟ راستے میں ہی ہم نے کئی جگہ گزشتہ ٹائم گرفتار ہونے والے پاکستانی لڑکے کی ٹائم اسکوائر کو بم سے اُڑانے کی کہانی بھی مختلف نیوز سٹالز اور ہاکروں کے ہاتھوں دھڑا دھڑ بکتی ہوئی دیکھی۔ بسام جو پہلے ہی اس جیل یاترا سے اُکتایا ہوا اور عدالت کے چکروں سے بے زار ہو چکا تھا۔ یہ سب دیکھ کر غصے میں آ گیا ''یہ سارا کیا دھرا اُس ٹائم اسکوائر والے کا ہی ہے..... اُسی کی وجہ سے کل رات سے اب تک 27 ستائیس مسلمان طلبہ گرفتار ہو چکے ہیں۔ بم پھوڑنا ہی تھا تو کم از کم درست بم تو لگاتا..... ٹائم اسکوائر پر پٹاخہ تک تو پھوٹا نہیں اور خوامخواہ درجن مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔'' مجھے بسام کی چڑچڑاہٹ پر ہنسی آ گئی۔ بسام مزید

چڑ گیا۔ ''تم ہنس رہے ہو.....؟ ..... اور ایسے لوگوں کی وجہ سے ہماری شناخت تبدیل ہوتی جا رہی ہے..... ساکھ تو پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی.....''

بسام کو عدالت چھوڑ کر جب میں ڈیوڈ کے گیراج پہنچا تو وہ میری بائیک کے ساتھ ہی جٹا ہوا تھا۔ آخر دو گھنٹے بعد مطمئن ہو کر اُس نے مجھے بائیک لے جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی خبردار بھی کیا۔ ''اور خدا کے لیے لڑکے..... اب ایک ہفتے تک اسے سو 100 سے اوپر ہرگز نہ چلانا..... اب کی بار چین ٹوٹی تو تمہاری یہ بائیک صرف کباڑیے کی دکان کے قابل رہ جائے گی.....''

لہٰذا میں ڈیوڈ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ٹھیک ایک سو کی سپیڈ سے بروکلین ایوینیو سے اپنی بائیک اُڑاتا ہوا یونیورسٹی کی لین میں مڑ گیا۔ مجھے نیویارک کی ان کشادہ سڑکوں پر بائیک دوڑانا ہمیشہ سے ہی بہت اچھا لگتا تھا۔ زندگی میں رفتار نہ ہو تو زندگی رُکی سی جاتی ہے مگر مکمل جمود تو بس موت کا دوسرا نام ہے۔ زندوں کو کبھی سست اور ساکت نہیں ہونا چاہیے میں نے یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ میں بائیک روک کر اپنا سیاہ ہیلمٹ سر سے اُتارا، ٹھیک اُسی وقت صنم کبیر پریشان سی مجھے اپنی جانب آتی ہوئی نظر آئی۔ ''آیان ..... آج بسام تمہارے ساتھ نہیں آیا.....'' میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ ''تو کیا بسام ابھی تک یونیورسٹی نہیں پہنچا اس نے کہا تھا کہ عدالت میں صرف آدھے گھنٹے کی پیشی ہے..... اُسے تو دو گھنٹے قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا.....'' میں بھی پریشان ہو گیا اور میں نے فوراً بسام کا موبائل نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا فون بند ملا۔ صنم نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ ''فون تو میں بھی دو گھنٹوں سے ملا رہی ہوں لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا.....'' میرے ذہن میں اچانک ہی بہت سے وسوسوں نے ایک دم سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ ''کہیں بسام کی ضمانت منسوخ تو نہیں ہو گئی کہیں وہ کسی اور مصیبت کا شکار تو نہیں ہو گیا.....؟'' اتنے میں جینی نے مجھے اور صنم کو پارکنگ لاٹ سے نکلتے دیکھ کر جلدی سے آواز دی ..... ''آیان ..... کہاں تھے تم ..... ہم سب کب سے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں.....''۔ ''کیوں خیریت.....؟'' جینی کچھ ہچکچائی۔ ''وہ بسام اور بابر کا جھگڑا ہو گیا تھا..... بات زیادہ نہیں بڑھی لیکن بسام کا فون ٹوٹ گیا۔ ایرک اور جم اسے لے کر ہاسٹل کی طرف گئے ہیں.....'' بسام کا جھگڑا فلسطینی کے ساتھ؟ ..... لیکن کیوں.....؟'' ایک لمحے میں ہی میری

لن پٹیاں سلگنے لگیں اور میں ہاسٹل کی جانب لپکا۔ صنم اور جینی بھی میرے پیچھے دوڑیں اور جینی نے مجھے راستے میں ہی ہانپتے کانپتے بتایا کہ آج جب بسام یونیورسٹی پہنچا تو اس کی پہلی مڈبھیڑ ہی فلسطینی بابر کے ساتھ ہوگئی۔ بابر نے چھوٹتے ہی اُسے طعنہ دے مارا کہ دو دن پہلے اگر اُس کے چھوٹے بھائی نے مسلم طلبہ کے گروپ کے ساتھ نیویارک پولیس کے چھاپوں کے خلاف احتجاج کرنے سے انکار نہ کیا ہوتا تو آج سارا گروپ بسام کی حفاظت کے لیے سڑکوں پہ نکل آتا، جواب میں پہلے سے چڑے ہوئے بسام نے اُسے جھاڑ دیا کہ اصل میں ''یہ سب انہی مسلمان طلبہ کے خدائی خدمت گار بننے کا نتیجہ ہے کہ آج پورے نیویارک شہر میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔'' بات سے بات نکلی اور بڑھتی گئی اور آخر کار نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ لیکن اُسی لمحے مسلم کونسلر عامر اور باقی لڑکے وہاں پہنچ گئے اور معاملہ رفع دفع کروا دیا گیا۔ لیکن اس سے پہلے بسام کی جیب میں رکھا اس کا سیل فون نیچے گر کر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ وہ فون صنم نے ہی بسام کی پچھلی سال گرہ پر اُسے تحفے میں دیا تھا اور میں جانتا تھا کہ اُس فون کی بسام کے نزدیک کتنی اہمیت ہے۔ ہاسٹل میں فرہاد کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے میری نظریں چاروں جانب بابر کو تلاش کرتی رہیں لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ مجھے راستے میں کہیں نظر نہیں آیا ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی اپنے پیروں پر چل کر واپس جاتا۔ میں نے ایک جھٹکے سے فرہاد کے کمرے کا دروازہ کھولا تو بسام اپنی شرٹ کے ٹوٹے بٹن بند کر رہا تھا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا ''تم ٹھیک تو ہو.....؟ ..... چلو میرے ساتھ ..... ابھی اُس فلسطینی سے حساب برابر کرتے ہیں .....'' فرہاد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کم آن آیان ..... چھوٹی سی بات تھی ..... ختم ہوگئی ہے ..... اسے طول مت دو .....'' میں زور سے چیخا۔ ''یہ تم لوگوں کے لیے چھوٹی سی بات ہے .....؟ اس نے میرے بھائی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا ہے ..... میں جب تک اُس کی حالت خراب نہ کر دوں ..... چین سے نہیں بیٹھوں گا ..... تم لوگوں نے نہیں آنا تو نہ سہی .....'' میں تیزی سے واپس جانے کے لیے پلٹا لیکن بسام نے بھاگ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ''جانے دو انو یار ..... غلطی ہم دونوں کی ہی تھی۔ میں صبح ہی سے عدالت کی پیشی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی غصے میں تھا۔ عامر نے مجھ سے معافی مانگ لی ہے ..... اب ختم کرو یہ سب کچھ .....'' لیکن میرے اندر کا اُبلتا لاوا اب

بھی بھڑک رہا تھا۔ ''لیکن اُس کی ہمت کیسے ہوئی تم سے بھڑنے کی ..... اور اس نے تمہارا فون بھی توڑ ڈالا ..... ایک بار مجھے کہیں مل جائے تو .....'' ایرک جم اور فرہاد سب نے مل کر مجھے زبردستی وہیں روکے رکھا۔ صنم کبیر تو باقاعدہ رو پڑی۔ یہ ایشین لڑکیاں بھی کس قدر نازک ہوتی ہیں۔ فرہاد کے کمرے کے باہر دیگر طلباء کا ہجوم جمع ہونے لگ گیا تھا۔ مجبوراً ہم سب کو فرہاد کے کمرے سے نکل کر کیفے کی جانب آنا پڑا۔ بسام نے بچپن کی طرح مجھے کسی غلطی سے روکنے کے لیے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا تاکہ میں اس کی گرفت سے نکل کر کچھ کر نہ بیٹھوں صنم کبیر بھی میری وجہ سے بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی آخر کار مجھے بسام کو کہنا پڑا کہ میں کہیں نہیں جاؤں گا پہلے تم اپنی اس ''صرف اچھی دوست'' کو تو سنبھالو۔ صنم ایران کے شہر تہران کے ایک متمول اور عزت دار پہلوی خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ اس کے والد کبیر پہلوی کا وہاں کپڑے کا بہت بڑا اور آباؤ اجداد کے دور سے کاروبار قائم تھا۔ جینی نے ماحول بدلنے کے لیے گرم کافی اور چیز سینڈوچ آرڈر کر دیئے۔ وہ صنم کبیر کا بالکل اُلٹ تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں اُس وقت بابر سے جھگڑے کے لیے نکلتا تو وہ ہم سب سے آگے ہوتی۔ ہم سب بمشکل اپنا موڈ بدل کر ابھی اس نئے ماحول کا حصہ بننے کی کوشش میں مصروف ہی تھے کہ اچانک مسلم کونسل عامر سمیت اس کا تمام گروپ کیفے میں داخل ہوگیا۔ ماحول پر تناؤ اور سنجیدگی سی چھا گئی۔ کیونکہ کیفے میں موجود دوسرے تمام طلباء کو بھی بسام اور بابر کے جھگڑے کی اطلاع مل چکی تھی۔ بابر چپ چاپ اپنے گروپ کے ساتھ دوسرے کونے میں بچھی ایک میز کے گرد بیٹھ گیا۔ بسام نے نظروں نظروں میں مجھے اُس پر دھیان نہ دینے کا اشارہ کیا۔ لیکن میں اچانک ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ وہ سب مجھے اشارے کرتے رہ گئے اور میں عامر گروپ کی میز کے قریب پہنچ گیا۔ عامر نے حسب عادت خوش دلی سے مجھے سلام کیا ''آؤ آیان ..... تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھو .....'' میں نے بابر کی جانب سرد لہجے میں دیکھتے ہوئے عامر کو جواب دیا ''میں یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں ..... بلکہ تم سب کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں بسام میرا اکلوتا بھائی اور آخری رشتہ ہے اس پوری دنیا میں ..... میں پہلے ہی سب کچھ کھو چکا ہوں ..... اب مزید کچھ نہیں کھوسکتا ..... اس لیے پہلی اور آخری بار تم سب یہ سمجھ لو کہ اگر کبھی بسام کو ہلکی سی کھروچ بھی آئی تو

ں انسانیت کا آخری درس بھی بھول جاؤں گا ..... '' عامر نے اطمینان سے میری بات سنی '' جو کچھ ہوا
ں اُس کے لیے پہلے بھی بابر کی طرف سے بسام سے معافی مانگ چکا ہوں۔ تم بھی اپنے دل سے
تمام غبار نکال دو ..... چلو بابر ..... اُٹھ کر آیان سے ہاتھ ملا کر تم پہل کرو ..... '' بابر نے بادل نخواستہ
اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور تمام کیفے ٹیریا میں شور سا مچ گیا۔ جینی نے وہیں بیٹھے بیٹھے کئی سیٹیاں بجا
ڈالیں۔ میری نظریں چونکہ عامر اور بابر پر ہی جمی تھیں اس لیے میں عامر بن حبیب کے ساتھ بیٹھی
ہوئی اس نئی لڑکی کو نہیں دیکھ سکا جس نے اچانک اُٹھ کر اپنا نازک ہاتھ میرے آگے ملانے کے لیے
بڑھا دیا تھا '' ہائے ..... آئی ایم پروا ..... پروا ضمیر خان فرام دہلی، انڈیا ..... '' میں کچھ سٹ پٹا سا گیا
آیان میں نے اُس سے ہاتھ ملا لیا۔ پروا نے روشن سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا '' اُمید ہے اب یہ دوستی
نہیں ٹوٹے گی ..... '' میں چند لمحوں بعد جب اپنی میز پر واپس آیا تو ایرک اور جم نے باقی سب کے
ساتھ مل کر میرا جینا دوبھر کر دیا۔ '' اچھا جناب ..... یہاں سے تو بڑے غصے میں اُٹھ کر گئے تھے اور
وہاں لڑکیوں سے ہاتھ ملا کر واپس آ رہے ہو ..... بہت خوب ..... تم سے یہ امید نہ تھی ہمیں
آیان ..... '' '' بکو مت ..... میں تو اُسے جانتا بھی نہیں ..... شاید کوئی نئی مسلم اسٹوڈنٹ ہے جس نے
عامر بن حبیب کا گروپ جوائن کیا ہے ..... '' فرہاد نے لمبی سی آہ بھری '' ہاں ..... میں اُسے جانتا ہوں
ابھی دو دن پہلے ہی اس نے فزکس ڈپارٹمنٹ جوائن کیا ہے ..... سنا ہے جب سے پروا وہاں آئی
ہے تب سے پروائیاں سی چل رہی ہیں فزکس کے لیکچر ہال میں ..... '' میں نے فرہاد کو گھورا '' تم
کبھی نہیں سدھر سکتے ..... '' تمہارے نام میں ہی گڑبڑ ہے۔

بات آئی گئی ہوگئی لیکن میں اور بابر دونوں ہی شاید اس حقیقت سے واقف تھے کہ کبھی نہ کبھی
ہمارا ٹکراؤ ضرور ہوگا۔ بسام لاک اَپ سے آنے کے بعد ہی کچھ سستی کی شکایت کر رہا تھا مگر شام تک
اس کی طبیعت کی یہ کسل مندی باقاعدہ تیز بخار کی شکل اختیار کر گئی۔ رات گئے میں کہیں سے اپارٹمنٹس
کے رہائشی ڈاکٹر سام کو لے آیا اور اس نے بسام کی حالت دیکھتے ہی اُسے کسی ہسپتال میں منتقل کرنے
کی ہدایت کر دی۔ ڈاکٹر کے خیال میں ٹائی فائڈ کا حملہ تھا۔ بسام کے انکار کے باوجود میں صبح سویرے
اسے ہی ہسپتال میں بھرتی کرانے لے گیا۔ بسام '' نہ نہ '' ہی کرتا رہا کہ اگلے مہینے ہم دونوں کی سیمسٹر

کی فیس بھرنا ضروری ہے لہٰذا وہ نوکری سے چھٹی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں نے ڈانٹ کر اسے خاموش کرا دیا۔ البتہ فیس اور دیگر بلوں کی فکر مجھے بھی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم میں یونیورسٹی پہنچا تو پارکنگ لاٹ میں یہودی لڑکوں کا گروپ اپنی بائیکس کے قریب کھڑا تھا۔ ''ہے آیان ..... سنو ..... کیا خیال ہے..... کچھ پیسے کمانا چاہتے ہو..... تقریباً ایک ہزار ڈالر مہینے کے .....'' میں نے حقارت سے مائیکل کی جانب دیکھا جس نے یہ پیش کش کی تھی۔ '' کیوں ..... کیا تم لوگوں کا کوئی خزانہ نکل آیا ہے؟'' اس بار سیم sam نے جواب دیا۔ ''ہاں ..... بس یہی سمجھ لو ..... تم تو ویسے بھی پیسہ کمانے کے لیے شرطیں لگاتے رہتے ہو..... بس یوں سمجھ لو کہ ہم نے بھی ایک شرط لگائی ہے''۔ ''مجھے کرنا کیا ہوگا؟''۔ ''کام کچھ خاص نہیں ہے ..... بس تمہیں مسلم کونسلر عامر بن حبیب کا گروپ توڑنا ہوگا۔ گروپ ٹوٹنے تک تم اُس گروہ میں شامل ہو کر ہمارے لیے مخبری کرو گے کہ وہ لوگ اپنی میٹنگز میں کیا طے کرتے ہیں ..... اور پھر تمہاری تو ویسے بھی اس گروپ کے بابر سیّدی کے ساتھ دشمنی چل رہی ہے۔ اس طرح سے تم ایک تیر سے دو شکار کر پاؤ گے ..... ہمارا وعدہ ہے کہ وقت آنے پر ہم بابر کے خلاف تمہاری پوری مدد کریں گے بولو ..... منظور ہے ہماری پیش کش .....'' میں نے مائیکل کی طرف سے بڑھائے ہوئے دوستی کے ہاتھ کو غور سے دیکھا۔ شاید قدرت نے میری مشکلات کا حل تلاش کر لیا تھا۔



باب3

کچھ دیر ہم سب ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ مائیکل نے پوچھا ''کس سوچ
یں گم ہو۔ اتنی اچھی آفر تمہیں کوئی اور نہیں دے گا۔'' میں نے غور سے ان سب کے چہروں کی طرف
یکھا۔ ''لیکن عامر بن حبیب سے تم لوگوں کی ایسی کیا چوخاش ہے کہ تم لوگوں کو اُس کی مخبری کی
ضرورت پڑ گئی۔ کھل کر مجھے بتاؤ.....'' سیم نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بات کچھ ایسی خاص بھی
نہیں ہے، لیکن ہمیں اس عرب شیخ سے بہت سے پرانے حساب چکانے ہیں۔ وہ آج تک ہر مرحلے پر
ہمیں نیچا دکھاتا آیا ہے۔ پہلے یونیورسٹی کے مسائل کے حل کا ذمہ دار بھی تھا۔ تب اس یونیورسٹی کی فضا
اتنی آلودہ نہیں تھی۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ عامر بن حبیب کا گروپ ہر مسئلے میں ٹانگ اڑاتا رہتا ہے
اور اسی کی وجہ سے اب ہماری یونیورسٹی کے لڑکوں کو بھی نیو یارک پولیس شک کی نگاہ سے دیکھنے لگی
ہے۔ اگر حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو تمہارے بھائی کی گرفتاری بھی دراصل عامر بن حبیب
اور نوبیوں کی کاروائیوں کا شاخسانہ ہے..... لیکن اب ہم سب نے مل کر عامر بن حبیب سمیت سبھی
ایسے پندوں کا راستہ روکنے کی ٹھان لی ہے..... اب بولو..... دو گے ہمارا ساتھ..... ہم تمہاری دی ہوئی
اطلاعوں سے ان کی حکمت عملی کا توڑ کریں گے اور اگر تم اس گروپ میں رہ کر عامر اور بابر کی منصوبہ بندی
کا مطالعہ کرو گے تو اُس کے گروپ کو ٹوٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، مگر تمہیں اس بابر سیّدی سے ذرا
ہوشیار رہنا ہوگا۔ عامر بن حبیب کی اصل طاقت دراصل وہی بابر ہے.....''

میں نے کچھ دیر توقف کیا ''ٹھیک ہے..... لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے..... جو

تم کہہ رہے ہو..... وہ سب اتنا آسان نہیں ہے .....تم لوگ پورے ایک مضبوط اور منظم ریکٹ کو توڑنے کی بات کر رہے ہو.....'' مائیکل نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے.....تم اپنا وقت بگاڑ سکتے ہو.....لیکن یاد رہے کہ ہم یہ کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور تم نہیں تو کوئی اور ہمارا یہ کام کر ہی دے گا.....'' وہ کچھ توقف کے بعد مسکرایا۔ ''بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کوئی ایجنٹ اب تک عامر کے گروپ میں شامل بھی ہو چکا ہو.....'' وہ بھی ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور میں اپنی کلاس کی جانب جاتے ہوئے اسی سوچ میں ڈوبا رہا کہ مائیکل کس ایجنٹ کی بات کر رہا تھا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں۔ عامر گروپ جوائن کرنے والی وہی انڈین لڑکی آخری تھی۔ ٹھیک اسی لمحے میرے عقب میں کسی نے اپنی ملائم آواز میں مجھے پکارا ہے.....غصیلے لڑکے.....کب سے آوازیں دے رہی ہوں .....تم اتنا تیز کیسے چل لیتے ہو.....؟ وہ وہی تھی ..... پُروا ..... ڈھیلی ڈھالی سی نیلی شرٹ اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس .....سر پر بالوں کی پونی ٹیل بنائے اور چیونگم چباتی ہوئی وہ ابھی کسی اسکول کے گیٹ سے نکلی طالبہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ اُس نے حسب عادت گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا ''پُروا ..... پروا ضمیر خان .....'' میں مسکرا دیا۔ ''تمہارے انداز تعارف کا ایک فائدہ تو ضرور ہے کہ لوگوں کو تمہارا نام ازبر ہو جاتا ہو گا''۔ وہ بھی زور زور سے ہنس پڑی۔ ''اوہ سوری.....بس عادت سی پڑ گئی ہے .....لیکن پُروا ہر ایک کو یوں اپنا تعارف کراتی نہیں پھرتی ..... آئی ایم ویری سلیکٹو I am very selective ..... دوست چننے میں مَیں ہمیشہ سے بہت محتاط اور کنجوس ہوں۔ ''اچھا واقعی .....؟'' ہم دونوں اکیڈمک بلاک کی جانب جا رہے تھے۔ ''میں جانتی ہوں تم اس بات پر دل سے یقین نہیں کرو گے، کیونکہ تمہاری طرف میں نے خود دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے..... لہٰذا اَنا اور خودداری کے نمبر تو تم نے پہلے ہی کاٹ دیئے ہوں گے.....'' مجھے اس کی یہ صاف گوئی پسند آئی۔ ''نہیں ..... میں انسان کو صرف انسان کی کسوٹی پر پرکھتا ہوں .....عورت یا مرد ہونا میرے نزدیک کوئی پہچان نہیں ہے ..... لہٰذا لڑکیوں والی روایتی اَنا اور خودداری کے نمبروں کے باقی رہنے یا کٹ جانے سے تمہارے مجموعی تاثر پر کوئی فرق نہیں پڑے گا.....'' پُروا خوش ہو گئی۔ ''یہ ہوئی نا بات .....اس کا مطلب ہے میں نے تمہیں پہچاننے میں واقعی غلطی نہیں کی .....تو کہو ..... دوستی پکی.....'' وہ اپنی جگہ

جم کر کھڑی ہو گئی جیسے مجھ سے ہاں کروا کر ہی اب وہاں سے ٹلے گی۔ ''لیکن تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ آخر تم نے مجھے اس ''اعزاز'' کے قابل کیوں سمجھا.....'' پُروا اعزاز کا لفظ سن کر مسکرائی۔ ''پتا نہیں..... بس مجھے لگا کہ تم ایک سچے اور بہادر انسان ہو..... اس روز جس طرح تم نے پورے مسلم گروپ کو آ کر تنہا للکارا تھا اور تمہاری آنکھوں میں اپنے بھائی کے لیے جو محبت اور اس کی حفاظت کے لیے جو عزم تھا وہ مجھے بہت اچھا لگا..... میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ اپنے خون کے رشتوں کے لیے اتنے مخلص ہوتے ہیں..... وہی اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں..... لیکن مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ تم خود بھی تو مسلمان ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستانی بھی ہو..... پھر تم نے اپنے مسلم کونسلر کو ووٹ کیوں نہیں دیا..... تمہارے ہاں تو مذہب پر بڑی سختی سے عمل درآمد کیا جاتا ہے.....'' چلتے چلتے ہم دونوں اُس راہداری تک پہنچ چکے تھے جہاں سے میرے اور پُروا کے ڈپارٹمنٹ کی راہیں الگ ہو جاتی تھیں۔ ہم دونوں رُک گئے۔ ''میرے ماں باپ پاکستانی تھے لیکن میں گزشتہ بیس سالوں سے امریکن ہوں۔ رہی بات مذہب کو نبھانے کی تو میں مذہب کو ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا ہوں۔ مسلمان تو کیا میں کسی بھی کونسلر کو صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں چن سکتا..... ابھی کچھ دیر پہلے تم نے اَنا اور خودداری کے نمبروں کی بات کی تھی نا..... تو میں تمہیں تمہاری نمبروں کی زبان میں ہی سمجھاتا ہوں کہ میرے نزدیک مذہب اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کا ذاتی معاملہ ہے۔ اندرونی طور پر مذہب کو تم سو بٹہ سو 100/100 نمبر دینا چاہو تو بھی دے سکتی ہو..... لیکن بیرونی دنیا میں مذہب کے نمبر میرے نزدیک صرف 33 ہیں..... صرف پاس ہونے کی حد تک ضروری نمبر..... باقی 77 نمبر اس کے برتاؤ، سچائی، ایمانداری اور انسانی اقدار کے ہیں..... میں اُس کونسلر کو اپنا رہنما چنوں گا جو ان سب کو ملا کر کم از کم 80 فیصد سے زیادہ نمبر حاصل کر سکے.....'' ''پُروا غور سے میری بات سنتی رہی.....'' واہ..... کمال فارمولہ ہے تمہارے چناؤ کا..... لگتا ہے پُروا کو بھی اپنے معیار پھر سے دھرانا پڑیں گے..... لیکن کیا عامر بن حبیب بھی تمہارے اس چناؤ کے معیار پر پورا نہیں اُترتا.....'' ''کچھ کہہ نہیں سکتا ابھی..... میں نے اُسے اس نظریے سے پرکھا نہیں ہے..... ہاں تم پرکھ لو تو مجھے بھی ضرور بتانا.....'' پُروا نے زور سے سر ہلایا ''ضرور..... میں ضرور تمہیں بتاؤں گی..... آج تم سے بات کر کے واقعی بہت خوشی ہوئی آیان.....''

اس نے حسب عادت جاتے جاتے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ ملا کر زور سے کہا۔ ''مجھے بھی مس پُر واضمیر خان .....'' وہ زور سے ہنس پڑی۔ فرہاد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی بے لوث ہنسی بھی تو کسی پروائی کی طرح ہی تھی۔ ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب بڑھ گئے۔

شام تک میں یونیورسٹی کے کیفے میں بیٹھا مائیکل کی پیش کش پر غور رہا۔ میرے دوستوں میں جم، ایرک اور جینی امراء کے خاندان سے تھے اور وہ بہ آسانی میری اور بسام کی فیس بھر سکتے تھے، میں ان سے مہینوں، سالوں کے لیے بھی اُدھار مانگ سکتا تھا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ زندگی بھر اُس رقم کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ لیکن میرے اندر کا آیان اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اور بسام نے آج تک جو بھی کیا، وہ اپنے بل پر ہی کیا تھا۔ شاید سخت حالات میں بھی ہم نے اپنے اندر کے آئینے کو کسی کی مالی مدد یا اعانت سے دھندلا نہیں ہونے دیا تھا۔ اور پھر دنیا میں اچھے دوستوں کا ساتھ ہی سب سے بڑی دولت ہوتا ہے اُسے روپے پیسے میں تول کر میں خود اپنے آپ کو کنگلا کیسے کر سکتا تھا.....؟ لہٰذا میں نے اپنے کسی بھی دوست سے اپنی اس پریشانی کا ذکر تک نہیں کیا۔ شام کو وہ سب صنم کبیر سمیت بسام کی عیادت کے لیے ہسپتال جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ میرے پاس بائیک موجود تھی لہٰذا ہم سب ایک ہی وقت میں الگ الگ سواریوں پر یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ سے نکل پڑے۔ وہ سب جم کی بڑی وین میں سوار تھے۔ آج نیو یارک شہر میں ایک تازہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کی خالی جگہ جسے اب گراؤنڈ زیرو کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہاں پر اسلامی سنٹر بنایا جائے یا ٹریڈ ٹاور کے حادثے میں مارے جانے والوں کی یادگار..... پھر وہی مذہبی معیار..... وہی پرانی پہچان کا جھگڑا اور وہی لاحاصل بحث .....، میں نے آج یونیورسٹی میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس بحث میں پڑنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ میری بلا سے اگر صدر اوبامہ بھی مسجد کے حق میں تھا یا گرجے کا حمایتی..... مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گراؤنڈ زیرو پر گرجا اور یادگار بننے سے نیویارک کو کون سے سرخاب کے پر لگ جانے تھے یا مسجد اور اسلامی سنٹر کے بننے سے اسلام کی کون سی ایسی بڑی خدمت ہو جاتی.....؟ آخر ہم اپنے مذہبی رویوں میں اعتدال کا پیمانہ سدا قائم کیوں نہیں رکھ پاتے.....؟؟ ایسے مواقع پر مجھے فرہاد کا ہمیشہ کا دھرایا جانے والا اردو شعر یاد آ جاتا تھا۔

''مسجد تو بنالی شب بھر میں ..... ایماں کی حرارت والوں نے

مَن اپنا پرانا پاپی ہے۔..... برسوں میں نمازی بن نہ سکا.....''

اب یہ فیصلہ میں نے مذہب کے دعوے داروں پر چھوڑ دیا تھا کہ ہمیں مسجد کی زیادہ ضرورت ہے یا نمازیوں کی .....؟ گرجا گھر زیادہ ضروری ہیں یا عیسیٰ کے حواری .....؟ مندر زیادہ اہم میں یا پجاری .....؟؟

ڈھلتی شام میں ویسٹ اورینج west orange کی سڑکیں اب پوری طرح جگمگانے لگی تھیں۔ نیو یارک کی شام انسان کو خود میں جذب کر لینے والی ہوتی ہے ..... جلتے بجھتے رنگین نیون سائن، چمکیلی سٹریٹ لائٹس، فٹ پاتھ پر عارضی طور پر بڑھ آنے والے ریسٹورنٹس کی کافی کی مہک، سجے سنورے مرد اور اور سجی ہوئی دوکانوں کے بیرونی شیشوں سے اندر کو جھانکتی خوبصورت عورتیں ..... ہر کوئی اپنے جہاں میں مگن، سگاروں سے اُٹھتے دھویں کی مہک اور یخ بستہ ہوا کو باقاعدہ اپنے اندر کشید کرتے ہوئے نوجوان جوڑے .....کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ نیویارک جیسے شہر بستے بستے ہی بستے ہوں گے .....شہر بسنا یا بسانا واقعی بڑا جوکھم ہے .....شہر صرف اونچی عمارتیں کھڑی کر دینے یا چوڑی شفاف سڑکیں بچھانے سے نہیں بستے، انہیں بسانے کے بہت کچھ الگ اور سوا بھی چاہیے ہوتا ہے۔ نیویارک بھی اپنے رہائشیوں کی وجہ سے بستا تھا۔ شہر اپنے شہریوں کے سوک سینس civic sense کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اور یہی آداب معاشرت ایسی بستیاں بساتے ہیں۔ ہم سب بسام کو دیکھنے ہسپتال پہنچے تو وہ بے زار سا اپنے بستر پر لیٹا ٹی۔وی کے چینل بدل رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ حالانکہ مجھے یہ رونق اس کی ''صرف اچھی دوست'' صنم کبیر کی مہربانی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے بسام کو کم از کم دو ہفتے کا آرام تجویز کیا تھا لہٰذا اس کے پاس ہسپتال سے نکل بھاگنے کا اب مزید کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے دوستوں یا صنم کے سامنے اپنی بے چینی اور ہسپتال سے جلد چھٹی کی اصل وجہ بیان نہیں کرے گا لیکن میں اس کی پریشانی سے خوب واقف تھا۔ اُسے خرچے کی فکر کھائے جا رہی ہو گی۔ صنم کبیر نے غیر محسوس انداز میں بسام سے کئی بار پوچھا بھی کہ اگر وہ سب لوگ بسام کے کسی کام آ سکیں تو انہیں بہت خوشی ہو گی۔ خود مجھے بھی صنم کے خلوص پہ کوئی

شک نہیں تھا لیکن میں بسام کا جواب بھی پہلے سے جانتا تھا۔ ''بس تم سب مجھے دیکھنے آ گئے ..... اس سے زیادہ مجھے بھلا اور کیا چاہیے ہوگا.....''

ہم لوگ جب بسام کے کمرے سے نکلے تو صنم کبیر کو باہر آنے میں چند لمحے زیادہ لگے، محبت وقت کا خراج مانگتی ہے۔ جو برتاؤ سب کے لیے یکساں اور جو وقت سب رشتوں کو برابر بانٹا جائے، وہ محبت کی کتاب میں درج نہیں ہوتا۔ محبت اپنے لیے خصوصی برتاؤ اور سب سے الگ وقت کی بھینٹ چاہتی ہے۔ کہ ''انداز محبت'' سدا شاہانہ ہی رہے ہیں۔

اگلی صبح جب میں یونیورسٹی پہنچا تو بوندا باندی تیز ہو چکی تھی۔ عامر بن حبیب کا گروپ پوری یونیورسٹی میں ایک سروے منعقد کروا رہا تھا اور چند لمحوں میں سروے میرے ہاتھوں میں بھی تھما دیا گیا۔ جائزہ کاغذ کے سوال نامے پر بس ایک ہی سوال درج تھا۔ ''آپ گراؤنڈ زیرو پر کس تعمیر کے حق میں ہیں۔ (1) اسلامی سنٹر (2) یادگار (3) کچھ نہیں میں نے نمبر (3) پر ٹک کا نشان لگایا اور فارم بانٹنے والے لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیا ٹھیک اُسی وقت پُروا بھی بارش سے خود کو بچاتی، سر پر اسکارف نما کوئی رومال لپیٹے وہاں نمودار ہوئی۔ میں اس وقت یونیورسٹی کے آڈیٹوریم کی شیشے والی دیوار کی سمت کھڑا تھا جہاں سے باہر دور تک لان میں گرتی بوندوں کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ پُروا نے جلدی سے میرا بھرا ہوا فارم اُس لڑکے سے لے کر دیکھا۔ ''ارے ..... یہ کیا.....؟ تم گراؤنڈ زیرو پر اسلامی سنٹر بننے کے حق میں نہیں ہو.....؟'' ''میں کسی تنازعے کے حق میں نہیں ہوں ..... اگر شہر کی اکثریت اسلامی سنٹر بنانا چاہتی ہے تو پھر سنٹر ہی بننا چاہیے اور اگر یہاں کے شہری کوئی یادگار وغیرہ بنانا چاہتے ہیں تب بھی کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے ..... ہم میں سے کسی کو بھی دوسرے کی رائے کو اکثریت ملنے پر اسے اپنی اَنا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے جس کے نظریے میں طاقت ہوگی ..... وہ اپنا آپ خود منوا لے گا.....''

پروا کچھ اُلجھ سی گئی ''پتا نہیں کیوں ..... میں جب بھی تمہارے نظریات سنتی ہوں۔ کچھ اُلجھ سی جاتی ہوں۔ کیا مذہب میں بھی اتنا calculative ہوا جا سکتا ہے.....؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مذہب ایسی اکائیوں سے نہیں ناپا جا سکتا ہے.....؟'' میں نے شیشے کی دیوار پر جمتی ہوئی بھاپ میں اپنے نام کے حرف بنائے۔ ''تو پھر یہ جان لو کہ تم بھی مذہب کے بارے میں کہیں نہ کہیں متعصب ہو رہی ہو۔

جب ہم دنیا کی ہر چیز میں میرٹ کا معیار سامنے رکھتے ہیں ..... تو مذہب میں کیوں نہیں رکھ سکتے ....." پُروا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ "شاید اس لیے کہ ہمیں پیدائش سے ہی ہمارے بڑے مذہبی تعصب کا تھوڑا بہت سبق ضرور پڑھا جاتے ہیں ....." میں نے پُروا کی طرف دیکھا۔ "تم نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دے دیا ....." میں آگے چل پڑا پُروا جلدی سے میرے پیچھے لپکی۔ "لیکن ہمارا آبائی مذہب کم از کم اتنے تعصب کا تقاضہ تو کرتا ہے نا .....؟" میں چلتا رہا "مذہب کبھی آبائی نہیں ہوتا ..... جس نے اُسے آبائی سمجھ کر اختیار کیا۔ سمجھو وہ منافق ہے ....." پُروا میرے قدموں کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کر رہی تھی "اچھا یہ بتاؤ محبت کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے .....؟" "محبت نام کی حماقت سے بڑی بے وقوفی شاید ہی اس دنیا میں کسی اور جذبے کی صورت میں وارد ہوئی ہو گی ..... لیکن افسوس آج کل ساری دنیا اسی بخار میں مبتلا نظر آتی ہے۔" ہم باہر نکل آئے تھے اور بوندیں ہمارے چہروں پر پھسل رہی تھی۔ پُروا باقاعدہ بحث کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ "ایسے نہیں ..... اگر یہ حماقت ہے تو کسی دلیل سے ثابت کرو ....." میں رک گیا۔ ہمارے آس پاس لان میں بارش کی وجہ سے دور دور تک سناٹا تھا اور صرف برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی۔ "سچ کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تمہاری تسلی کے لیے میں تمہیں تمہارے انڈیا کی مثال دیتا ہوں۔ "تاج محل" جسے آج ساری دنیا محبت کی نشانی کے طور پر سنبھالے پھرتی ہے، شاعروں نے پورے کے پورے دیوان لکھ مارے ہیں اس سفید عمارت پر، روزانہ ہزاروں محبت کے متوالے اُس کی زیارت کو جاتے ہیں ..... لیکن کیا کسی نے تاریخ سے اس یادگار محبت کی اصل تصویر کھوجنے کی کوشش بھی کی .....؟ شاہ جہاں نے جس ممتاز کے لیے یہ یادگار بنوائی تھی وہ اس کی سات بیویوں میں سے چوتھے نمبر پر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے ممتاز کے شوہر کو قتل کروا کر ممتاز سے شادی رچائی تھی۔ ممتاز کی موت اپنے چودھویں (14) بچے کی پیدائش کے دوران جان دینے سے ہوئی اور اُس کی موت کے بعد شاہ جہاں نے ممتاز کی چھوٹی بہن سے شادی کر لی تھی۔ اتنا کافی ہے یا محبت کی "آفاقیت اور لافانیت" کے بارے میں یا جولیس سیزر، قلوپطرہ یا روس کے راسپوتین کی بد نام زمانہ داستانوں کا حوالہ بھی دوں ....." پُروا نے فوراً ہاتھ اُٹھا دیئے ..... "نہیں نہیں ..... بس اتنا ہی بہت ہے، شکر ہے کسی ایک معاملے میں تو ہمارے خیالات ملتے

ہیں میں خود بھی محبت کو بس چند ہارمونز کی اپنی جگہ سے غیر مستقل تبدیلی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی ..... لیکن یہ چند ہفتوں کی ہارمونل چینج Harmonal change انسان سے کیا کچھ نہیں کروا جاتی .....'' ہم دونوں پوری طرح بھیگ چکے تھے، میں نے آسمان کی جانب دیکھا ''لیکن اگر ہم دونوں کچھ دیر مزید اس برستے موسم میں یہاں کھڑے رہے تو سردی کے مارے ہمارے سبھی طرح کے ہارمون اپنی جگہ ہی جم کر ختم ہو جائیں گے ..... چلو اب یہاں سے ..... ورنہ لوگ ہمارا تاج محل بنانے میں بھی دیر نہیں کریں گے۔'' میں آگے چل دیا اور پُروا گھاس پر نیچے پانی میں میرے قدموں کے نشانات پر اپنے کینوس شوز کے نشان بناتی میرے پیچھے چل پڑی۔

تین دن بعد یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر اگلے سیمسٹر کی فیس جمع کروانے کا آخری نوٹس بھی لگا دیا گیا۔ میں نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ تین دن کے اندر اپنی اور بسام کی فیس کا انتظام کیسے کروں گا۔ نیویارک میں ہمارے واحد رشتہ دار عارفین ماموں اپنے چھوٹے سے جنرل اسٹور کے لیے ہوئے قرض کی اقساط بھی بمشکل جمع کر پاتے تھے۔ بلکہ بسام ہی گاہے بگاہے اُنہیں تھوڑی بہت رقم بھجواتا رہتا تھا۔ گزشتہ شام وہ مجھے ہسپتال میں بسام کے کمرے میں ملے تو ان کے گلے شکوے انبار کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ''اب ایسی بھی کیا مصروفیت آیان میاں .....؟ کہ اپنے اکلوتے ماموں کی ہی بھلا دیا .....؟ بھئی حد ہوتی ہے لاپرواہی کی .....'' لیکن میں اور بسام انہیں منانا خوب جانتے تھے، لہٰذا کچھ دیر میں ہی عارفین ماموں سب بھول بھال کر ہمیں اپنی جوانی کے چند آخری معاشقوں کا حال سنا رہے تھے۔ میں نے کل شام جان بوجھ کر بسام کے سامنے فیس کی آخری تاریخ کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن اس وقت میرے سامنے بورڈ پر لگا یہ نوٹس میرے لیے ایک بہت بڑا سوال بنا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایک بار پھر ''آخری بقاء'' (last surviver) کے کھیل میں قسمت آزماؤں لیکن ابھی تک میں پچھلی ہاری ہوئی رقم کی پوری ادائیگی بھی نہیں کر پایا تھا۔ میرے پاس بیچنے کے لیے صرف میری بائیک ہی تھی لیکن آخری شرط میں اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد اس کی قیمت بھی برائے نام ہی ملتی۔ اچانک میرے ذہن میں اس رات مجھ سے جیتنے والے حریف ٹم کا جملہ گونجا ''جب تک دوسرے کو کچل کر آگے بڑھنے اور پانے کی جبلت اپنے اندر پیدا نہیں کرو گے۔ ہارتے ہی رہو گے ..... اس دنیا سے

جیتنا ہے تو اپنے اندر کلر انسٹنکٹ Killer instinct پیدا کرو آیان ..... یہ دنیا ایک جنگل ہے اور یہاں آخری درندہ وہی بچے گا جو اپنے سبھی حریفوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائے گا .....'' ٹھیک اُسی وقت میرے عقب سے بابر سیّدی چند دیگر مسلم طلباء کے ساتھ گزرا۔ جانے وہ سب کس بات پر زور سے ہنسے مگر مجھے ایسا لگا جیسے بابر نے میرے متعلق کوئی بات کہی ہو۔ میں غصے میں تیزی سے پلٹا لیکن وہ لوگ آگے بڑھ چکے تھے اور مائیکل اپنے ساتھیوں سمیت راہداری میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو زور سے بولا۔ ''تم یہاں ہو..... اور ہم تمہیں پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈ رہے ہیں .....'' وہ سب میرے قریب آ گئے۔ ''تو کیا فیصلہ کیا تم نے .....؟'' میں نے اپنے اندر کے درندے کو آخری بقا کے لیے چیر پھاڑ کرتے محسوس کیا، میں نے درندے کی مان لی ..... ٹھیک ہے ..... مجھے تم لوگوں کی پیش کش منظور ہے ..... لیکن مجھے تم لوگوں سے کچھ کیش وغیرہ نہیں چاہیے ..... تم لوگ میری اور بسام کی ایک سیمسٹر کی فیس اور ٹیوشن کی رقم انتظامیہ کے ڈیسک پر جمع کروا دو، سیمسٹر چھ ماہ کا ہوتا ہے لیکن میں تین ماہ سے بھی کم عرصے میں تم لوگوں کا ٹارگٹ پورا کر دوں گا۔ فیس ادائیگی کی رسید جس وقت مجھ تک پہنچے گی ٹھیک اسی وقت سے ہمارے معاہدے کی گنتی شروع ہو جائے گی۔ کام پورا ہونے کے بعد ہم ایک دوسرے سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے۔ تم لوگ مجھے کوئی ہدایات نہیں دو گے ..... میں عامر بن حبیب کی کونسلر شپ اپنے طریقے سے ختم کروں گا بولو منظور ہے .....؟'' مائیکل نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ ''بالکل منظور ہے ..... ہمیں تمہاری صلاحیتوں پر کوئی شبہ نہیں ہے۔'' ''ٹھیک ہے ..... ایک آخری بات ..... اس معاہدے کو ایک کاغذ پر اس کی تمام شقات سمیت تحریر کر کے میں اور مائیکل دستخط کریں گے اور اس کی ایک ایک کاپی ہم اپنے پاس رکھیں گے تا کہ کل کوئی پیچیدگی پیدا ہونے کی صورت میں ہمارے پاس ثبوت موجود ہو۔'' انہیں میری اس شرط سے بھی کوئی تغرض نہ ہوا۔ ہم نے سب وہیں کھڑے کھڑے طے کیا اور اپنی اپنی سمت چل پڑے۔ اب مجھے کسی ایسے موقعے کا انتظار تھا جب عامر بن حبیب خود مجھے اپنی کونسلر شپ میں داخلے کی پیش کش کرتا۔ اور یہ موقع مجھے قدرتے نے بہت جلد فراہم کر دیا۔ ٹائم اسکوائر دھماکہ کیس میں نیو یارک پولیس کی مسلمان طلباء کے خلاف کاروائیاں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں۔ چار دن بعد پولیس نے یونیورسٹی کی سڑک کے بالکل مخالف سمت میں واقع

ایشیائی ورکنگ بوائز کے ہاسٹل پر ریڈ کی تو ہماری یونیورسٹی کے طلباء میں باہر نکل آئے۔ عامر کے گروپ نے وہیں سڑک پر NYPD کے اقدامات کے خلاف جلسے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن نیویارک پولیس نے پورے علاقے کو اپنے مخصوص نیلے اور سرخ ربن سے سیل کر دیا جس پر بڑے بڑے حروف میں Dont cros ''پار مت کیجیے'' لکھا ہوا تھا۔ طلباء کی پولیس افسر سے بحث شروع ہوگئی۔ میں نے بھیڑ سے نکل کر زور سے چلا کر دوسری جانب کھڑے پولیس والے سے کہا۔ ''میں مسلمان ہوں ..... لیکن امریکن ہوں ..... مجھے کسی بھی گرفتار شدہ سے کوئی ہم دردی بھی نہیں ہے۔ لیکن تم لوگ اگر ایک ہی لاٹھی سے ہم سب مسلمان طلباء کو ہانکتے رہے تو صرف اسی یونیورسٹی سے کئی ٹائم اسکوائر جیسے حادثے جنم لیں گے۔ ہم NYPD کی عزت کرتے ہیں اور بدلے میں عزت چاہتے ہیں ..... اور بس .....'' میری بات سن کر دونوں جانب خاموشی سی چھا گئی۔ پولیس والوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی اور ان میں سے ایک ہماری طرف چل کر آیا۔ ''ہمیں یونیورسٹی کے لڑکوں سے کچھ سروکار نہیں ..... اور ہمارے جانے کے بعد تم لوگ اپنا احتجاج جاری رکھ سکتے ہو۔ لیکن اس وقت ہمیں اپنا کام کرنے دو .....'' دونوں جانب سکون سا چھا گیا اور میں دوبارہ کیفے ٹیریا کی طرف چلا آیا۔ کچھ دیر بعد ہی عامر بن حبیب اور اس کے چند ساتھی کیفے ٹیریا میں داخل ہوئے۔ عامر سیدھا میری طرف چلا آیا۔ ''مدد کرنے کا شکریہ..... تم نے ایک بڑا جھگڑا شروع ہونے سے پہلے ہی ٹال دیا .....'' میں کافی کے سپ لیتا رہا۔ ''میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ جو میرے بھائی کے ساتھ ہوا ..... وہ کسی اور بے گناہ کے ساتھ نہ ہو ..... ورنہ تمہارے گروپ میں تو ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مدد نہ کر کے بھی احسان کی طرح جتاتے ہیں .....'' میرا طنز سن کر بابر سیّدی نے میری جانب گھور کر دیکھا لیکن عامر نے فوراً کہا۔ ''پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں آج ایک بار پھر تمہیں مسلم طلبہ کے وُنسلنگ گروپ میں شمولیت کی دعوت دیتا ہوں۔ تمہارے پاس دو بہت اہم چیزیں ہیں جو مسلم طلباء کے مسائل کو انتظامیہ تک پہنچانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ ایک تمہاری امریکی شہریت اور دوسری تمہاری قائل کرنے کی صلاحیت ..... اور ہمیں ان حالات میں ان دونوں کی اشد ضرورت ہے .....'' میں نے نیم رضا مندی کا اظہار کیا۔ ''سوچ لو ..... ہو سکتا ہے خود تمہارے گروپ میں میری شمولیت کو اچھی نظر سے نہ دیکھنے والے موجود

ہوں .....'' عامر نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ..... ایسا کوئی نہیں ہے ..... ہم سب ایک اچھے مقصد اور مسلمان طلباء کی مدد کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں ..... تمہیں دل سے خوش آمدید کہا جائے گا .....'' میں نے چند لمحے سوچنے میں وقت گزارا۔ ''ٹھیک ہے ..... مجھے منظور ہے ..... لیکن مجھے اپنے فیصلے کرنے کا اختیار تو حاصل ہوگا نا؟'' عامر نے خوش ہو کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''ہم ہر فیصلہ مل جل کر کرتے ہیں ..... مسلمان طلباء کی کابینہ میں خوش آمدید .....'' عامر سے گلے لگتے ہوئے میری نظر بابر سیّدی کی نظر سے ٹکرائی جہاں شک کی گہری پرچھائیاں ڈیرے ڈالے ہوئی تھیں۔ میری نظر نے اس کی نظر سے کہا۔ ''تم لوگوں کے برے دن شروع ہو چکے ہیں مسٹر بابر سیّدی اب صرف اپنی بربادی کا انتظار کرو.....''



باب4

اگلی صبح یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میری نظر کیفے ٹیریا کے باہر ٹہلتی پُروا پر پڑی لمبے سفید سکرٹ اور دھانی قمیض میں وہ بہت نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکی۔ ''کہاں تھے تم ..... صبح نو بجے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کلاس میں کبھی تم پائے نہیں جاتے، یہی تمہارا ٹھکانہ ہے لہٰذا یہیں ڈیرے ڈال دیئے میں نے .....'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا سب خیر تو ہے نا .....؟''۔ ''ارے بھئی تم نے عامر بن حبیب کا گروپ جوائن کر لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔ لگتا ہے آخر کار وہ تمہارے معیار کے فارمولے پر پورا اُتر ہی گیا۔ ویسے میں تم سے خود بھی یہی کہنے والی تھی کہ میں نے ہر طرح سے عامر کو پرکھ کر دیکھا ہے۔ وہ تمہاری شرائط پر مکمل اُترتا ہے۔ صرف نام کا مسلم کونسلر نہیں ہے وہ ..... عمل کا بھی پکا ہے۔ ..... تبھی تو سارے مسلمان اسٹوڈنٹ اس کے دیوانے ہیں ..... تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے آیان .....'' میں نے کیفے ٹیریا میں داخل ہونے سے لے کر اپنی مخصوص میز پر بیٹھنے تک پُروا کی یہ تمام تقریر اطمینان سے سنی، لیکن کچھ ہی دیر میں یہ خبر میرے اپنے دوستوں تک پہنچی تو ان سب کا چین و اطمینان غارت ہو گیا۔

سب سے پہلے جینی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''کیا ..... تم نے مسلم گروپ جوائن کر لیا ..... بیڑہ غرق ..... اب گئے تم کام سے .....'' ایرک اور جم تو صدمے سے کچھ بول ہی نہیں سکے البتہ فرہاد نے پوری تقریر کر ڈالی۔ آیان ..... تم نے وہ کام کیا ہے جو بروٹس بھی نہ کر پایا ہوگا۔ ساری زندگی مذہب کی رواداری کا سبق دے دے کر ہمارے خیالات بدل ڈالے اور آخر میں خود ان لوگوں سے جا کر مل گئے

جن سے ہمیں ہمیشہ رویوں میں انتہا پسندی کا گلہ رہا ہے..... ''قتل کر ڈالا تم نے میرے تمام نظریات کو ہمیشہ کے لیے.....'' کچھ ایسے ہی تاثرات کا اظہار گزشتہ شام بسام بھی کر چکا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس وقت صنم کبیر بھی ہسپتال میں موجود تھی ورنہ بسام کے سوالات کا سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔ ''کیا.....؟ یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟ .....اُلو.....تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے.....ساری زندگی ہم جن سے لڑتے آئے ہیں .....تم انہی کے ساتھ جا ملے ہو.....؟ سچ بتاؤ ..... یہ کیا معاملہ ہے.....؟ کیوں کر رہے ہو تم یہ سب .....؟'' میں نے اُسے صرف ایک ہی جواب دیا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ..... میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں .....تم بس جلد از جلد ٹھیک ہو کر گھر پہنچنے کی کرو.....'' صنم خاموشی سے بیٹھی ہم دونوں بھائیوں کے درمیان ہوتی یہ تکرار سن رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ صرف اُسی وقت بات کرتی تھی جب اُس بات کا مناسب وقت آ جاتا تھا۔ اور یہ وہی وقت تھا۔ اس نے بسام کی پھلوں کی ٹوکری سے ایک سیب نکال کر چھیلا۔ ''اگر آیان نے عامر بن حبیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس میں ایسی کیا برائی ہے۔ آخر وہ بھی تو مسلمان طلباء کی مدد کے لیے ہی یہ سب مشکلات جھیلتے ہیں۔ نیویارک کی یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کا مسلم کونسلر کی ذمہ داری سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اُسے اپنے تعلیمی کیریئر میں اس بات کی وجہ سے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا؟۔ اس کی جو کلاسز روزانہ حاضری سے رہ جاتی ہیں وہ ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہر سیمسٹر میں ہزاروں ڈالر کی اضافی ٹیوشن فیس جمع کرواتا ہے۔ راتوں کو دیر تک لائبریری میں بیٹھ کر اپنے چھوٹے ہوئے لیکچرز کو تیار کرتا ہے۔ مسلمان طلباء کا حامی ہونے کی پاداش میں عیسائی اور یہودی انتظامیہ اور طلبہ کی باتیں بھی سننا پڑتی ہیں اُسے ..... میں تو سمجھتی ہوں کہ آیان نے دیر سے ہی سہی .....مگر درست فیصلہ کیا ہے۔'' بسام نے صنم کبیر سے مزید بحث نہیں کی لیکن اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں گہری ہوتی گئیں ٹھیک اُسی طرح جیسے اس وقت میرے سارے دوستوں کی آنکھوں میں میرے فیصلے کی وجہ سے بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ فرہاد نے تو فوراً فتویٰ ہی صادر کر دیا کہ میں نے پُروا کی وجہ سے عامر بن حبیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

میں ان سب کو کیفے میں اسی بحث میں اُلجھا چھوکر ہال نمبر 3 کی طرف چلا آیا جہاں مجھے آج صبح پرُوا نے مسلم کونسلر گروپ کی ہفتہ وار میٹنگ میں عامر کی جانب سے شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں اس چھوٹے سے ہال میں داخل ہوا تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ سب نے مجھے خوش آمدید کہا پرُوا بھی وہیں موجود تھی اور سبھی طلباء کو اس میٹنگ کا ایجنڈا بانٹتی پھر رہی تھی۔ مجھے کاغذ پکڑاتے ہوئے وہ خوش دلی سے بولی ''خوش آمدید غصیلے لڑکے ..... اللہ کرے تمہارا آنا ہمارے لیے مبارک ثابت ہو۔'' میں مسکرا دیا۔ البتہ اس ہال میں کوئی ایسا بھی تھا جسے میرے آنے کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی ..... بابر سیّدی، جو اس وقت اپنے گلے میں چار خانوں والا فلسطینی رومال باندھے کسی گہری سوچ میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ اجلاس میں سب سے پہلے میری شمولیت کا اعلان کیا گیا اور پھر اس کے بعد اگلے ہفتے کے لیے ایک پلان ترتیب دیا گیا کہ کن مسائل پر یونیورسٹی انتظامیہ سے بات چیت کی جائے گی۔ جمع شدہ چندے کی تفصیل اور مستقبل قریب کے خرچے کی فہرست بھی پیش کی گئی۔ سچ یہ ہے کہ میں مسلم طلبہ کو اس قدر منظم انداز میں اپنی تنظیم چلاتا دیکھ کر کافی حیرت زدہ بھی تھا۔ کیونکہ باہر رہتے ہوئے ہم سب کی عامر بن حبیب گروپ کے بارے میں رائے بالکل مختلف تھی۔ ہم ان سب طلبہ کو صرف چند جذباتی لڑکوں کا ٹولہ سمجھتے تھے جو اپنی مسلمان شناخت کی بقا کے لیے یونیورسٹی میں یکجا ہوئے تھے۔ لیکن میں نے یہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔ وہ سب عامر بن حبیب کی قیادت میں متحد اور بہت منظم انداز میں اپنے مقصد کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اُس روز جو سب سے فوری مسئلہ مسلم طلباء کی توجہ کا مرکز تھا وہ یونیورسٹی کے احاطے میں یا ہاسٹل کی چار دیواری میں کسی ایسے کمرے کی ضرورت کے بارے میں تھا جہاں لڑکے ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ کیونکہ عصر تک تو زیادہ تر مسلم طلباء واپس ہاسٹل پہنچ جاتے تھے لیکن ظہر کے اوقات میں سبھی یونیورسٹی میں ہی موجود ہوتے تھے۔ کچھ ماہ پہلے ہی طلباء یونیورسٹی انتظامیہ سے دوپہر میں ظہر کے اوقات کے دوران پندرہ منٹ کی بریک لینے میں کامیاب ہو چکے تھے جس میں وہ نماز ادا کر سکتے تھے لیکن اب ان کی کوشش تھی کہ انہیں کوئی ایک کمرہ یا ہال بھی صرف پندرہ منٹ کے ان اوقات کے دوران مل جایا کرے جہاں وہ سب اکٹھے ہو کر باجماعت نماز ادا کر سکیں۔ قاعدے کے مطابق پہلے مسئلہ پیش کیا گیا اور پھر سبھی شرکاء سے رائے اور حل طلب کرنے

کے لیے ووٹنگ شروع کی گئی۔ گویا وہاں سب کو اپنی اپنی رائے کے اظہار کی آزادی حاصل تھی۔ تقریباً 90 نوے فیصد طلباء نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ میں نے اپنی باری پر کھڑے ہو کر صرف اتنا ہی کہا کہ میرا ووٹ اکثریت کی طرف ہوگا۔ کیونکہ یہ میرا پہلا دن ہے اور مجھے ان مسائل کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت مزید درکار ہے۔ ووٹنگ کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا کہ اگلی سٹوڈنٹ اور انتظامیہ کے مابین ہونے والی پندرہ روزہ میٹنگ میں یہ مطالبہ یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ اجلاس برخاست ہونے سے پہلے مختلف مسلم طلباء کو اگلے ہفتے کے لیے مختلف قسم کے ٹارگٹ دیئے گئے جن میں سب سے اہم غیر ممبر مسلم اسٹوڈنٹس کو متحرک کرنا بھی شامل تھا۔ مین ہال سے نکلا تو پرُوا بھی میرے ساتھ چل پڑی۔ ''کیسا رہا آج کا تجربہ تمہارے لیے .....؟'' میں نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''ٹھیک تھا ..... مگر کچھ اُدھورا سا ..... دراصل میں اس سے کچھ زیادہ کی اُمید کر رہا تھا۔ یہ لوگ تو ابھی تک مسجدوں اور نمازوں کے مسائل سے ہی باہر نہیں نکل پائے ..... کیا عامر بن حبیب اس یونیورسٹی کی 70 سالہ تاریخ میں پہلا مسلم کونسلر منتخب ہوا ہے .....؟ یہ بنیادی باتیں تو بہت پہلے طے ہو جانا چاہیے تھیں .....'' پرُوا نے سر ہلایا ..... ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ..... ہم ابھی بنیادی مسائل میں ہی الجھے ہوئے ہیں لیکن شاید تمہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ یونیورسٹی کی ستر 70 سالہ تاریخ میں عامر بن حبیب یہاں کا صرف تیسرا مسلم کونسلر بنا ہے اس سے پہلے مسلمان طلباء کو یہ سہولت حاصل ہی نہیں تھی ..... تب وہ صرف کسی عیسائی یا یہودی کونسلر کے ذریعے اپنی بات انتظامیہ تک پہنچانے کے پابند تھے .....'' میں حیرت سے رُک گیا۔ اچھا .....؟ لیکن کیوں .....؟ اور اس کا مطلب ہے کہ مسلم کونسلر کا عہدہ مسلمان طلباء کے پاس آئے یہ صرف چھٹا سال ہے .....؟ حیرت ہے .....''۔ ''ہاں ..... یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ چھ سال پہلے تک مسلم کونسلر کی سیٹ ہی نہیں تھی یونیورسٹی میں ..... اور پہلے دو مسلم کونسلر تو بے چارے یونیورسٹی انتظامیہ اور دیگر طلباء کے دباؤ کے تحت ازخود استعفیٰ دے گئے تھے کیونکہ ان کی اپنی پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا تھا اور وہ یونیورسٹی میں تعصب کا شکار بھی ہو رہے تھے .....'' میرے لیے پرُوا کی یہ باتیں واقعی غیر متوقع تھیں۔ ''لیکن ایسا کیوں ہے ..... آخر یہ مٹھی بھر مسلم طلباء کسی کا کیا بگاڑ لیتے جو انہیں کام ہی نہیں کرنے دیا

جاتا.....''۔ پرُوا نے کسی گہری سوچ میں گم جواب دیا۔ ''شاید یہ سب اسلام سے خوف زدہ ہیں ..... شاید پابندیوں کے باوجود یہ امریکہ میں گزشتہ دھائی کے دوران سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے .....'' میں پرُوا کی بات سن کر مزید اُلجھ گیا۔ پھر وہی مذہبی تخصیص .....'' لیکن اسلام کے تیزی سے پھیلنے سے امریکہ کو کیا خطرہ ہوسکتا ہے.....؟ یہاں چند لاکھ مزید مسلمان جمع بھی ہو جائیں گے تب بھی یہ USA یو ایس اے ہی رہے گا..... ''اسلامستان'' تو نہیں بن جائے گا..... میں نہیں مانتا کہ اتنی بڑی جمہوریت کو ایسی کسی بھی مذہبی تبدیلی کا کوئی خوف یا خطرہ ہوسکتا ہے۔''

پرُوا نے مجھ سے اس مدعے پر مزید بحث نہیں کی اور چپ چاپ میرے ساتھ چلتی رہی پھر اچانک اسے کوئی بات یاد آئی۔ ''ارے ہاں .....جینی نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا بھائی بیمار ہے..... اب اس کی طبیعت کیسی ہے ..... ویسے ایک بات ہے تمہارا چھوٹا بھائی ہے کافی کیوٹ سا .....'' مجھے ہنسی آگئی۔ ''ہاں ..... وہ کیوٹ ضرور ہے لیکن مجھ سے ایک سال بڑا ہے۔'' پرُوا کو شدید حیرت ہوئی۔ ''ارے ..... واقعی .....؟ تو پھر بجائے اس کے کہ تم اس کے رعب میں رہو، وہ ہر وقت تم سے ہی ڈانٹ کیوں کھاتا رہتا ہے''۔ ''کیونکہ اسے ڈانٹنے کے حقوق صرف میرے پاس محفوظ ہیں''۔ ''سنو آیان .....تم میرے ساتھ اُردو میں کیوں بات نہیں کرتے ..... جانتے ہو اُردو کو میں دنیا کی بہترین زبان سمجھتی ہوں''۔ کیوں ..... ایسی کیا خاص بات ہے اُردو میں ..... اور تمہارے انڈیا میں تو اسی اُردو کو بگاڑ کر ہندی کے نام سے بولا جاتا ہے۔'' پرُوا کی آواز تیز ہوگی۔ ''ہندی یا سنسکرت کے چند لفظ شامل کردینے سے ''اُردو'' ہندی نہیں بن جاتی ..... اور کون سی خاص بات ایسی ہے جو اُردو زبان میں نہیں ہے؟ کتنی وسیع لغت ہے اُردو کی ہر رشتے کے لیے اور اُس رشتے کے احترام کے لیے کتنے معنی موجود ہیں اُردو میں ..... اور یہ جو تم امریکن انگریزی کے گن گاتے پھر رہے ہو..... اس سے زیادہ غریب اور ناشائستہ زبان تو میں نے آج تک نہیں دیکھی جس میں ماں باپ کے لیے بھی صرف ''تم'' کا لفظ موجود ہے۔ بس میں نے طے کرلیا ہے کہ اب ہم دونوں اُردو میں ہی بات کریں گے .....'' حسب معمول پرُوا اپنا فیصلہ صادر کر کے اطمینان سے چیونگم چباتی رہی۔ ''ٹھیک ہے مس پرُوا ضمیر خان ..... لیکن خدا کے لیے اُردو کی یہ مشق تبھی جاری رکھنا جب ہمارے دوست آس پاس موجود نہ ہوا کریں ..... یہاں

محفل کے آداب کچھ مختلف ہیں ....." پروا نے بے پرواہی سے کہا "سب جانتی ہوں میں ..... ویسے تم دونوں بھائی گھر میں تو اُردو میں بات کرتے ہوئے نا .....؟ سچ میری تو زبان ترس گئی ہے یہاں والایت میں دلی کی خاص اردو بولنے کے لیے ....." پروا کی زبان یونہی پٹر پٹر چلتی رہی اور ہم آگے بڑھتے گئے .....۔

اگلے چند دن میں بسام نے بھی یونیورسٹی آنا شروع کر دیا لیکن اس کی نقاہت ابھی باقی تھی لہٰذا میں اسے یونیورسٹی سے سیدھے گھر واپس لے جاتا تھا۔ سیمسٹر کی فیس کے بارے میں مجھے اس سے جھوٹ بولنا پڑا کہ میں نے کسی شرط کے عوض پیشگی رقم لے کر فیس ادا کی ہے لیکن میں رفتہ رفتہ وہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ بسام جانتا تھا کہ میں کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے میری بات پر یقین کرنا ہی پڑا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ دن بھی آ گیا جب مسلم کونسلر کی یونیورسٹی انتظامیہ سے پندرہ روزہ میٹنگ طے تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار یونیورسٹی کے ایڈمن بلاک میں قدم رکھا اور اُسی روز میں نے یونیورسٹی ڈین کو پہلی مرتبہ اتنے قریب سے دیکھا۔ ورنہ اس سے پہلے ہم صرف اس کی آواز یا ویڈیو کانفرنس کے ذریعے بھیجے ہوئے ریکارڈ شدہ پیغامات میں ہی اُسے دیکھا کرتے تھے۔ ڈین بھاری تن و توش اور گہرے نظر کے چشموں کے ساتھ ایک سخت گیر شخصیت کا مالک تھا۔ جس کے کمرے کے باہر بڑی سی "روبن سن پیٹرک Robinson patrick" کے نام کی سنہری تختی لگی ہوئی تھی۔

کمرے میں عیسائی اور یہودی طلباء کونسلر بھی موجود تھے اور ڈین نے بڑے طمطراق سے میٹنگ کا آغاز کیا، ہر طالب علم کونسلر کے ساتھ صرف تین ممبروں کو اجلاس میں شرکت کی اجازت تھی اور عامر بن حبیب کے ساتھ میں اور بابر سیّدی مسلم طلبہ کی جانب سے شریک تھے۔ لیکن ابھی تک میری نظر یہودی طلباء کے کونسلر شمعون کے پیچھے بیٹھے اس کے ساتھیوں پر نہیں پڑی تھی۔ اور پھر جب تعارف کے وقت مائیکل کا نام پڑھا گیا تو میں نے چونک کر اُوپر دیکھا۔ مائیکل نے سب سے نظر بچا کر میری طرف دیکھ کر اپنی بائیں آنکھ دبائی۔ تو گویا وہ خود بھی یہودی گروپ کا ممبر تھا۔ مجھے ان کے منصوبے کے تانے بانے اب جڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اجلاس شروع ہوا تو پہلے عیسائی اور پھر یہودی کونسلر نے اپنے اپنے طلباء کے چھوٹے موٹے مطالبے اور مسائل پیش کیے۔ ڈین نے موقع پر ہی احکامات جاری کر دیئے۔ انتظامیہ کی ٹیم میں ڈین سمیت چار افراد تھے جن میں ایک عیسائی ایک یہودی ممبر شامل تھے۔ مسلمان طلباء کی فیکلٹی Faculty میں کوئی مسلمان استاد نہ ہونے کی وجہ سے انتظامیہ کی جیوری میں کوئی مسلمان ممبر موجود نہیں تھا۔ مائیکل کو میں پہلے ہی عامر بن حبیب کے پہلے اجلاس کی تمام روداد بتا چکا تھا اور جب عامر بن حبیب نے کیمپس میں نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرنے کی درخواست پیش کی اور یہودی گروپ کی جانب سے اس کی شدید مخالفت بہت موثر انداز میں پیش کی گئی تو مجھے مائیکل کی وہ بے چینی سمجھ میں آ گئی جو عامر بن حبیب کے اجلاس کی پہلی مخبری کے لیے اس کے انداز سے صاف ظاہر تھی۔ وہ لوگ اسی لیے عامر کے ایجنڈے کے بارے میں خبر رکھنا چاہتے تھے تا کہ وہ اس کے لیے انتظامیہ کی اہم میٹنگ سے پہلے مضبوط دلائل کے ذریعے موثر توڑ کر کے مسلم طلباء کے منصوبے ناکام کر سکیں۔ شمعون نے پہلا اعتراض تو چھوٹتے ہی داغ دیا تھا۔ ''نہیں نہیں ..... نماز کے لیے کوئی جگہ کیسے مخصوص کی جا سکتی ہے۔ پھر تو عیسائی طلبہ کے لیے کیمپس میں گرجا گھر اور یہودی اسٹوڈنٹس کے لیے سنی گوگ (یہودی عبادت گاہ) تعمیر کرنا پڑے گا۔ پھر تو یہ یونیورسٹی کیمپس کم اور مختلف مذاہب کا اکھاڑہ زیادہ بن جائے گا۔'' ڈین نے سر ہلایا۔ ''شمعون ٹھیک کہہ رہا ہے ..... کیمپس میں نماز پڑھنے کی جگہ مخصوص نہیں کی جا سکتی .....'' عامر نے دفاع کیا۔ لیکن صرف مسلم طلباء کو ہی دن میں پانچ مرتبہ یہ فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ چرچ یا سنی گوگ کی ضرورت تو تب پڑتی جب ان دو مذاہب کے طلباء کو بھی روزانہ باقاعدگی سے اپنی عبادت کا کوئی وقت کیمپس روٹین کے بیچ یونیورسٹی کی چار دیواری میں گزارنا پڑتا۔ اور ہم بھی تو صرف ظہر کے وقت پندرہ منٹ کی بریک کے دوران کسی کمرے یا چار دیواری کا مطالبہ کر رہے ہیں ..... یہ جز وقتی Partime ضرورت ہے ..... اسے مستقل نہیں کیا جائے گا .....'' لیکن مائیکل کی اطلاعات کی بنیاد پر شمعون خوب تیاری کر کے آیا تھا۔ ''ہاں ..... مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ سال چھ ماہ بعد مسلم طلبہ اسی جگہ کو مستقل مسجد بنانے کا مطالبہ نہیں کر دیں گے .....؟ اور پھر اگر عیسائی اور یہودی طلبہ نے بھی ہفتے اور اتوار کی چھٹی کے دوران کیمپس میں عبادت کرنے کی ٹھان لی اور یہ ضد بازی چل پڑی تو ہم

سب جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا ..... '' فیصلہ ہو چکا ..... تمام جیوری ممبر کیمپس میں کسی مخصوص جگہ پر نماز کی ادائیگی کے حق میں نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ مدعا یہیں ختم کیا جاتا ہے ..... ''

ہم لوگ ڈین کے کمرے سے باہر نکلے تو شمعون نے طنزیہ انداز میں عامر کی جانب جملہ اُچھالا ..... ہم سب تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں عامر بن حبیب ..... بیٹر لک نیکسٹ ٹائم ''Better luck nex time''۔ شمعون کی بات سن کر اس کے سبھی ساتھیوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بابر سیّدی غصے میں ایک قدم آگے بڑھا لیکن عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور خوش دلی سے شمعون کو جواب دیا۔ ''بس تم یونہی دعا کرتے رہا کرو ..... عبادت میری ہو یا تمہاری ..... اس کی ادائیگی میں مقابلہ کیسا .....؟'' شمعون اور عیسائی کونسلر جارج اپنے اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ بابر ابھی تک شدید غصے میں تھا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے ایجنڈے کی پہلے سے خبر تھی۔ ورنہ اتنی مکمل تیاری کر کے تو یہ لوگ پہلے کبھی بھی نہیں آئے .....؟'' بولتے وقت بابر کی نظر میری جانب ہی مرکوز تھی۔ عامر نے اسے تسلی دی۔ ''اس بار ان کی تیاری زیادہ نہیں ..... شاید ہماری کچھ کم تھی ..... بہر حال ..... اس میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ..... ہم نے بات آگے پہنچا دی ہے ..... رفتہ رفتہ اُنہیں قائل بھی کر لیں گے .....''

لیکن میں خود عامر کے چہرے پر مایوسی کے ہلکے سائے اُسی وقت دیکھ چکا تھا جب ہم ڈین کے کمرے سے نکل رہے تھے۔ دوسری جانب یونیورسٹی سے واپسی پر مجھے مائیکل گروپ نے پارکنگ لاٹ میں دیکھا تو خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے وہ میرے قریب آ گئے۔ '' زبردست یہ ہوئی نا بات ..... پہلی ضرب میں ہی عامر بن حبیب کو آدھا چت کر دیا ہے تم نے۔ تمام مسلم طلباء میں اس فیصلے سے شدید مایوسی پھیل چکی ہے۔ ایک آدھ بار اگر پھر ایسا ہوا تو اسے اپنی مسلم کونسلر کی سیٹ بچانا مشکل ہو جائے گا۔ یو آر گریٹ آیان .....'' وہ شور مچاتے اور ہنستے گاتے وہاں سے پلٹے تو بسام کو میں نے پارکنگ لاٹ کے آغاز میں کھڑے دیکھا '' کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ .....؟'' میں نے بات ٹالی '' کچھ نہیں ..... کلاس کی کوئی بات تھی ..... تم چلو ..... دیر ہو رہی ہے .....'' بسام وہیں کھڑا رہا۔ نہیں اُلو ..... مجھے یہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے ..... تم اتنے پراسرار کیوں ہوتے جا رہے ہو ..... آج سے پہلے تو ہم دونوں

میں کوئی راز نہیں تھا.....'' میں نے اسے زبردستی کھینچ کر بائیک پر بیٹھا دیا۔ تمہاری یہ جیمز بونڈ بننے کی عادت نہ گئی کبھی..... کہہ جو دیا کہ ایسا کچھ نہیں ہے..... چلو اب جلدی کرو..... ابھی تم نے رات کا کھانا بھی تیار کرنا ہے..... میں اتنے دن تک وہ بدمزہ پزا اور برگر کھا کھا کر تھک گیا ہوں.....'' بسام سارے راستے خاموش سا رہا۔ لیکن میں جانتا تھا اس کے ذہن میں کلبلاتا شک کا کیڑا اب اسے بے چین رکھے گا۔

اور پھر اگلے تین ہفتوں میں مسلم کونسلر کا گراف روزانہ کی بنیاد پر تیزی سے نیچے آتا چلا گیا۔ عامر بن حبیب مختلف مدعوں پر مسلم طلبہ کی نمائندگی مناسب طور پر نہ کر سکا جس میں حلال کھانے کا الگ کاؤنٹر نہ کھولے جانے پر تو ٹھیک ٹھاک ہنگامہ ہوا اور مسلم طلبہ نے کیفے کا بائیکاٹ بھی کیے رکھا اور پھر بصد مشکل میں نے لڑکوں کو راضی کیا۔ اس دوران میری بابر سیّدی سے دو تین بار شدید جھڑپ بھی ہوتے ہوتے رہ گئی لیکن ہمارے درمیان دشمنی دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ اگر ہر بار عامر بن حبیب ہمارے درمیان پڑھ کر معاملہ رفع دفع نہ کرواتا تو ہم اب تک ضرور لڑ چکے ہوتے، خاص طور پر اُس دن جب بابر نے یہ اعتراض کر دیا کہ میں باقی مسلم طلباء کی طرح نماز کے وقت نماز ادا کیوں نہیں کرتا.....؟ میں نے اسے جواب دیا کہ وہ مجھے مذہب کا درس دینے کے بجائے اپنے مذہب کی فکر کرے اور سب کے ایمان کا ٹھیکے دار بننے کی کوشش نہ کرے، بات بہت بڑھ گئی لیکن اس موقعے پر بھی عامر ہی نے فیصلہ دے دیا کہ اُن کے منشور میں کسی بھی طالب علم پر کوئی مذہبی پابندی نہیں لگائی جا سکتی نہ ہی اسے عبادت کے لیے زبردستی مجبور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بابر نے عامر کو احتجاجاً اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ ان حالات میں وہ مزید مسلم طلباء کے حقوق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتا۔ بڑی مشکل سے لڑکوں نے بابر کا غصہ ٹھنڈا کیا لیکن عامر بن حبیب کے گروپ میں جو دراڑ پڑ چکی تھی وہ روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ میرا مائیکل سے کیا ہوا معاہدہ اپنی تکمیل کے قریب پہنچنے کو تھا۔ لیکن جانے کیوں میں اندر سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ عامر بن حبیب ایک شریف النفس اور اعلیٰ خاندانی لڑکا تھا جس نے براہِ راست میرا کبھی کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ مجھے مسلم کونسلر گروپ کی پالیسیوں سے اختلاف ضرور تھا لیکن ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مجھے ان کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بھی پتا چلیں جو میں

پہلے نہیں جانتا تھا، مجھے مذہب کی بنیاد پر تخصیص بہت بُری لگتی تھی لیکن میں نے ان دنوں میں محسوس کیا کہ مسلم طلباء کو اس مذہبی پہچان کی بنیاد پر اکٹھا کرنے میں خود یونیورسٹی انتظامیہ اور دیگر گروہوں کی مذہبی سرگرمیوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مسلمان کو ہمیشہ ہی یہ احساس دلا کر علیحدہ اکٹھا ہونے پر مجبور کیا گیا کہ وہ کمزور ہے اور متحد نہ ہوا تو بہت جلد مٹا دیا جائے گا۔

نیویارک شہر میں ابھی ٹائم اسکوائر بم کیس کی گونج ختم نہیں ہوئی تھی کہ اُس پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کو سزا سنائے جانے کا وقت قریب آنے پر ایک بار پھر یہ بحث گلیوں میں موضوع بنتی گئی کہ آیا وہ دھان پان سی عورت مجرم ہے بھی یا نہیں؟

لیکن عامر بن حبیب کی گرفت مسلم طلباء پر کمزور ہونے کی وجہ سے مسلم طلباء ان تمام ایشوز پر متحد ہو کر اپنا کوئی مؤقف پیش کرنے میں ناکام رہے۔ اسلام پر بحث چھڑتی گئی اور مسلمان طلباء کو اپنا دفاع کرنا مشکل ہوتا گیا۔ اور پھر ایک دن وہ سب کچھ ہو گیا جس نے ہم سب کی زندگیوں میں ایک نئے طوفان کو جنم دے دیا۔ بسام کی گرفتاری کے ڈیڑھ ماہ بعد اچانک ہی اس کی ضمانت منسوخ کر دی گئی کیونکہ ٹائم اسکوائر بم والے کیس کے ملزم کے بیان کی روشنی میں چھاپوں کی ایک لہر کے دوران اس کے دو قریبی ساتھی اسی علاقے سے پکڑے گئے تھے جہاں بسام نے بیماری ختم ہونے کے بعد پھر سے اپنی شام کی نوکری شروع کر دی تھی۔ مجھے یہ خبر شام کو عارفین ماموں نے فون پر دی جب میں یونیورسٹی میں ہی موجود تھا۔ عامر بن حبیب نے اُسی وقت بسام کی گرفتاری کے خلاف طلباء کو منظم کیا کیونکہ یہ ہماری یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم کی گرفتاری کا معاملہ تھا، لیکن اس بار نیویارک پولیس پہلے سے ہی ہوشیار تھی اور جیسے ہی وہ احتجاج کرتے ہوئے یونیورسٹی سے باہر سڑک پر آئے، اُن پر تیز ٹھنڈے پانی کی دھاریں ماری گئیں اور پھر جب لاٹھی چارج سے بات نہ بنی تو ربڑ کی گولیاں بھی فائر کی گئیں۔ عامر بن حبیب کو اس طرح بے جگری سے بابر سیّدی کے ساتھ بسام کے لیے لڑتے اور ساری رُکاوٹیں توڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر میرے اندر کا شور بڑھتا گیا۔ عامر کیا جانتا تھا کہ جس کے بھائی کی رہائی کے لیے وہ اپنے جسم پر لاتعداد ضربات جھیل رہا ہے وہی آیان اُس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ چکا ہے۔ بابر سیّدی نے بھی اس رور جم کر عامر کا ساتھ دیا لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ

پولیس اتنی جلدی وہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟ میں تو بسام کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی یونیورسٹی سے لاک اپ چلا آیا تھا اور یہ تمام مناظر میں ملاقاتیوں کے ہال میں لگے بڑے ٹی وی اسکرین پر دیکھ رہا تھا جس پر شہر کی براہِ راست کوریج دکھائی جا رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں مائیکل کا جملہ گونجا ''کون جانے تم سے پہلے ہی ہم اپنا کوئی مخبر عامر بن حبیب کے گروپ میں شامل کر چکے ہوں .....'' ضرور یہ اُسی مخبر کی کارستانی تھی جس نے مسلم طلباء کے یونیورسٹی میں جمع ہونے سے پہلے ہی نیویارک پولیس کو اس جلسے سے آگاہ کر دیا تھا۔ پھر اچانک ٹی۔ وی اسکرین پر ہی میں نے یونیورسٹی کے ڈین کو نمودار ہوتے دیکھا جس نے یونیورسٹی ڈسپلن کو توڑنے کے جرم میں عامر اور بابر سیدی کو چھ ہفتوں کے لیے معطل Suspend کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں رات گئے بسام سے مل کر دوبارہ یونیورسٹی کے ہاسٹل ایریا میں پہنچا تو مسلم طلبہ کے ہاسٹل پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ عامر بن حبیب اور بابر کو پولیس سے مڈبھیڑ کے دوران کافی چوٹ آئی ہے۔ خاص طور پر عامر بہت تکلیف میں ہے۔ میں ڈوبتے دل کے ساتھ عامر کے کمرے میں پہنچا تو سبھی وہاں جمع تھے۔ میں نے عامر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تم ٹھیک ہو.....؟'' بابر عامر کے سرہانے ہی بیٹھا تھا۔ عامر نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ''تمہیں میری اور بابر کی چھ ہفتے کی معطلی کا تو پتا چل گیا ہوگا۔ لیکن رمضان بالکل قریب ہے اور ان حالات میں مسلم طلبہ کو بنا کونسلر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ لہٰذا ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے تین ماہ کے لیے تمہیں مسلم طلباء کا کونسلر بنا دیا جائے۔ تمہیں کل سے ہی اپنی ذمہ داری سنبھالنی ہوگی'' میرے سر پر جیسے کوئی بم سا پھٹا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

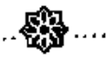

باب5

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عامر..... میں بھلا مسلم کونسلر کی ذمہ داریاں کیسے سنبھال سکتا ہوں..... مجھے تو گروپ جوائن کیے بھی بمشکل ڈیڑھ ماہ ہوئے ہیں..... اور پھر مجھ سے باقی سب سینئر ہیں..... تم انہی میں سے کسی کو یہ ذمہ داری سونپ دو.....'' عامر نے اصرار کیا۔ ''یہ فیصلہ انہی تمام سینئر مسلم طلبہ کے مشورے سے ہی کیا گیا ہے..... انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''صرف چھ ہفتے کی ہی تو بات ہے..... یہ عرصہ تو کوئی بھی دوسرا سینئر تمہارے معاملات دیکھ کر گزار سکتا ہے..... چھ ہفتے کے بعد تم دونوں واپس بحال ہو جاؤ گے تو یونیورسٹی آتے ہی تم دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال لینا.....'' عامر نے گہری سانس لی..... ''یہی تو ہے مسئلہ ہے دوست..... ڈین نے ہم دونوں کو چھ ہفتے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر معطل کیا ہے۔ یونیورسٹی کے آئین اور منشور میں درج قانون کے مطابق کوئی بھی اسٹوڈنٹ کونسلر اگر چار ہفتے کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے غیر حاضر رہے تو اس کی کونسلر کی نشست خالی قرار دے دی جاتی ہے۔ اُسی آئین کی دوسری شق یہ ہے کہ کونسلر کی غیر موجودگی میں اگر اس مذہب کے طلبا کا گروپ کسی دوسرے کونسلر کو عبوری مدت کے لیے منتخب کرنا چاہے تو یہ عرصہ کم از کم تین ماہ کا ہونا چاہیے۔ اس تین ماہ کے عرصے کے بعد دوبارہ کونسلر کا انتخاب کیا جائے گا، لیکن مسلم طلباء کے پاس درمیانی مدت کا کونسلر منتخب کرنے کے لیے صرف دو ہفتے یعنی پندرہ دن کا وقت ہے۔ اس وقت میں اگر وہ کوئی عارضی کونسلر نہ چن سکیں تو اگلے تین ماہ انتخابات ہونے تک انہیں بنا کسی رہنما یا کونسلر کے گزارنے ہوں گے..... اور یقین جانو..... یہ بہت بُرا ہوگا ہم پہلے ہی بہت سے اہم مسائل پر

شکست کھا چکے ہیں ..... یہ ہماری آخری شکست ثابت ہو گی .....''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں عامر کو کس طرح قائل کروں، گویا عامر کی مسلم کونسلر شپ ختم ہو چکی تھی اور مسلم طلباء کی دوسری اُمید بابر سیّدی بھی اگلے تین ماہ تک کونسلر نہیں بن سکتا تھا کیونکہ اب انتخابات تین ماہ بعد ہی ہو سکتے تھے۔ عبوری مدت کے دوران تو بابر بھی عامر کے ساتھ ہی معطل رہتا۔ مائیکل گروپ نے بہت سوچ سمجھ کر چال چلی تھی اور ڈین کے نپے تلے فیصلے سے تو یہ بھی لگ رہا تھا کہ جیسے وہ بھی عامر بن حبیب کی کونسلری ختم کرنے کے لیے کسی ایسے ہی موقعے کے انتظار میں تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک شک نے سر اُبھارا ..... کہیں خود ڈین بھی تو اس منصوبے کا ایک حصہ تو نہیں تھا.....؟ میں نے بے چارگی سے عامر کی طرف دیکھا۔ لیکن اگر تم لوگ جانتے تھے کہ اس احتجاج کا نتیجہ اس قدر نقصان دہ اور انتہائی بھی نکل سکتا ہے تو تمہیں اور بابر کو ایک ساتھ باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا..... کم سے کم تمہاری معطلی کی صورت میں کوئی متبادل تو باقی رہتا مسلم طلبہ کی رہنمائی کے لیے .....'' عامر مسکرایا۔ ''یہ تم بابر سے ہی پوچھو ..... میں نے آتے ہوئے اسے منع بھی کیا تھا .....'' بابر دوسرے بستر پر خاموش سا نیم دراز تھا۔ ''مجھے یہودی لڑکوں میں سے کسی نے اطلاع دی تھی کہ عامر پولیس کی شیلنگ سے گھائل ہو گیا ہے اور لڑکے تتر بتر ہو رہے ہیں ..... اس لیے مجھے عامر کو ریسکیو Rescue کرنے کے لیے باہر آنا پڑا .....'' زندگی میں پہلی مرتبہ میرے دل میں بابر سیّدی کے لیے بے پناہ عزت کے جذبات اُبھرے۔ وہ اُجڈ تھا۔ بدتمیز اور لڑاکا تھا، لیکن وفادار تھا۔ اور اس دور میں ''وفا'' ہی تو ایک ایسی صنف ہے جو صنف ناپید بن چکی ہے۔ کہاں ملتی ہے آج کل وفا؟ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والے بھی وقت بدلتے ہی چہرہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''مجھے افسوس ہے عامر بن حبیب ..... میں خود کو اس ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور اگلے چند دن مجھے بسام کی رہائی کے لیے دن رات ایک کرنا ہوں گے ..... ایسے میں مسلم کونسلر کی ذمہ داریاں نبھانا میرے لیے ناممکن ہو گا ..... تم لوگ کوئی دوسرا لیڈر چن لو۔'' میں ان کا جواب سنے بغیر ٹوٹے قدموں سے وہاں سے واپس چلا آیا ..... آج پہلی بار مجھے اپنے اندر کے آیان سے نظریں ملاتے ہوئے بڑی مشکل درپیش تھی۔ ساری رات میں خود سے نظریں چراتا رہا۔ اگلی صبح یونیورسٹی میں یہ چرچا تھا کہ عامر

بن حبیب کے سسپنڈ suspend ہو جانے کے بعد اب مسلم طلبہ کا اگلا کونسلر کون ہوگا؟ یا پھر مزید چند سال مسلم طلبہ کو بنا کسی نمائندے کے دوسرے مذہب کے کونسلر کے رحم و کرم پر گزارنے ہوں گے؟ مائیکل نے مجھے لان میں الگ تھلگ گرتے پتوں کی چادر تانے دیکھا تو وہ سب لپک کر میرے قریب آ گئے۔ ''تم کمال ہو بائیونک بوائے ..... لوگ سالوں میں جو کام نہ کر سکے، تمہاری مدد سے ہم نے ہفتوں میں کر دکھایا۔ آج اس خوشی میں ہم ایک گرانڈ پارٹی دے رہے ہیں ..... تمہیں بھی ضرور آنا ہوگا.....'' میں نے غور سے مائیکل کو دیکھا۔ ''تم لوگوں نے اپنے کسی مخبر کا ذکر بھی کیا تھا مجھ سے ..... لیکن مجھے آج تک اس کا نام نہیں بتایا تم نے .....'' مائیکل زور سے ہنسا۔ ''معاف کرنا ..... شروع شروع میں تو ہم تم پر بھی پورا اعتبار نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ تم مسلمانوں کی جذباتی رگ پھڑکنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا ..... لیکن تم نے واقعی خود کو مرد عہد (man of his word) ثابت کیا ہے ..... لہٰذا اب تمہیں اس سے ملوانے میں کوئی حرج نہیں ہے ..... ویسے بھی تمہارا وعدہ پورا ہو چکا اور ہماری راہ کا سب سے بڑا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل چکا ..... اب ہم اتنی آسانی سے عامر کو دوبارہ مسلم کونسلر نہیں بننے دیں گے ..... یہ لو ..... وہ مخبر اسی جانب چلا آ رہا ہے .....'' میں نے مائیکل کے ہاتھ کے اشارے کی جانب تیزی سے گردن موڑی ..... میرا دل ڈوب سا گیا۔ سامنے دور اکیڈمک بلاک کی سیڑھیاں اُترتے پُروا نظر آئی۔ ''کون ..... پُروا .....'' مائیکل ہنسا۔ ''ارے نہیں ..... اُس انڈین لڑکی کے پیچھے دیکھو .....'' اور پھر دوسرے ہی لمحے پُروا کے عقب سے کیفے کا پرانا بیرا جوزف جو مسلم طلبہ کی ہر میٹنگ میں چائے کافی اور سنیکس وغیرہ کی فراہمی پر مقرر ہوتا تھا۔ اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے پر کافی کے چند مگ لیے ہماری جانب بڑھا چلا آیا۔ جوزف نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری، گویا وہ بھی میرے کردار سے واقف تھا۔ پل بھر میں ہی مجھے اس کا تمام میٹنگ کے دوران کسی نہ کسی بہانے آس پاس منڈلاتے رہنا۔ اور بار بار مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کا پوچھنا یاد آ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مائیکل نے اُسے میری نگرانی پر بھی لگا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ تمام وقت تو ہال میں موجود نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا وہ اس بات کی یقین دہانی بھی کرتا ہوگا کہ میں اپنا کردار ٹھیک سے ادا کر رہا ہوں کہ نہیں۔ اسے کہتے ہیں بے عیب منصوبہ "Perfect plan"۔

پُروا کو میری جانب آتے دیکھ کر وہ لوگ وہاں سے ٹل گئے۔ پُروا نے قریب آ کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ ..... ضرور عامر بن حبیب والے واقعے پر طنز کر رہے ہوں گے .....'' میں چپ رہا..... پُروا خود بھی کافی پریشان سی دکھائی دے رہی تھی'' آیان ..... اب کیا ہوگا.....؟ آخر تم یہ ذمہ داری کیوں نہیں سنبھال لیتے .....؟ یہ وقت تمام مسلم طلبہ کے لیے بہت نازک ہے ..... ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی ..... خدا خدا کر کے تو مسلم طلبہ کو ایک پلیٹ فارم میسر آیا تھا۔ وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا.....''

میں اُلجھ کر بولا۔ ''آخر تم لوگ یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ مسلم کونسلر بننے کے لیے کسی طالب علم میں جن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے ..... میں ان سے قطعی نا بلد ہوں۔ مجھے تو دن میں پڑھی جانے والی پانچ نمازوں کی مکمل رکعتوں کا بھی ٹھیک سے نہیں پتا..... میں اور بسام ڈیڈ کے ساتھ صرف عید کی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ جن اصولوں کی بنیاد پر مسلم کونسلر کو انتظامیہ سے اپنا کیس لڑنا ہوتا ہے ..... میں ان میں سے زیادہ تر سے اتفاق ہی نہیں کرتا۔ میں مذہب کی بنیاد پر انسانوں کی گروہوں میں تقسیم کے ہی خلاف ہوں ..... میرے نزدیک سبھی انسان برابر ہیں ..... کوئی بھی مذہب انہیں میرے نزدیک اہم یا غیر اہم نہیں بناتا۔ میرے نزدیک تو مذہب کسی کی شناخت کا ذریعہ بھی نہیں..... مذہب کو میں انسان کا ذاتی فعل سمجھتا ہوں ..... اور بس اس سے زیادہ کچھ نہیں .....۔'' پُروا نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔ تو پھر تم نے مسلم طلباء میں شمولیت کیوں اختیار کی تھی .....؟'' میں صرف اتنا ہی کہہ کر آگے چل پڑا۔ ''بس یوں سمجھ لو کہ وہ میری ایک مجبوری تھی ..... ایک عہد کر بیٹھا تھا کسی سے جس کا نبھانا فرض ہو چکا تھا میرے لیے.....'' پُروا وہیں درخت کے نیچے گم سم سی کھڑی رہ گئی اور خزاں رسیدہ پتوں نے اس کے وجود کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔ کاش میرے اندر کے اس ننگے سچ کو ڈھانپنے کے لیے بھی کوئی خزاں اپنے پتے اسی طرح برسا پاتی۔

عرفی ماموں مجھے عدالت کی سیڑھیوں پر ہی باہر کھڑے مل گئے۔ آج بسام اور دیگر تین لڑکوں کی وہاں پیشی تھی۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟ وہ لوگ ابھی کچھ دیر پہلے ان تینوں کو عدالت لے گئے ہیں.....'' میں ماموں کے ساتھ عدالت میں داخل ہوا تو بسام کو ملزموں کی مخصوص نشست پر بیٹھا دیکھ کر

میرا دل کٹ سا گیا۔ میرا جی چاہا کہ اپنے نازک مزاج بھائی کا ہاتھ پکڑوں اور سب کے سامنے سے اُسے چھین کر کہیں دُور لے جاؤں۔ حکومت کا وکیل اور نیویارک پولیس کے نمائندے بسام اور دیگر لڑکوں کو مشکوک اور دہشت گرد بنا کر پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ مجھے بسام لوگوں کا وکیل کچھ زیادہ منطقی اور پُر اعتماد نظر نہیں آیا اور یہی بات عرفی ماموں نے بھی محسوس کی۔ ''یہ گدھا یہاں چنے بیچنے کے لیے آیا ہے کیا.....؟ پولیس کے الزامات کا ٹھیک سے جواب کیوں نہیں دے رہا بسام کا وکیل.....؟'' جج نے بسام کے وکیل کو تیاری کے لیے ایک ہفتے کا وقت دے کر پیشی ختم کر دی اور تب تک سبھی طالب علموں کو کسٹڈی custody میں رکھنے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ میں غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن عرفی ماموں نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوبارہ بیٹھا دیا۔ ''یہ وقت جوش کا نہیں..... ہوش کا ہے.....'' پیشی سے واپسی پر عدالت سے باہر راہداری میں میری چند لمحوں کے لیے بسام سے بات ہوئی، وہ پُرسکون تھا۔ ''انو یار..... پریشان مت ہونا..... یہ سالے گورے ہمیں بنا کسی ثبوت کے زیادہ دن اندر نہیں رکھ پائیں گے.....'' مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا اور میں نے آگے بڑھ کر بسام کو گلے سے لگا لیا۔ میرا معصوم بھائی میری تسلی کی خاطر خود کو مضبوط کر رہا تھا ورنہ میں جانتا تھا کہ وہ یہ سات دن کس عذاب میں گزارے گا..... ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو وہ بستر بیماری سے اُٹھا تھا۔ ابھی تو اس کی چہرے کی پیلی رنگت بھی نہیں ڈھلی تھی۔ میں نے اُس کے شانے دبائے ''تم بے فکر رہنا..... اگر تمہیں لاک اپ توڑ کر بھی نکالنا پڑا تو میں تمہیں نکال کر ہی دم لوں گا..... بس ہمت نہ ٹوٹنے پائے..... تمہیں مجھ پر اعتبار ہے نا.....؟'' بسام نے ٹوٹی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا۔ ''ہاں انو..... مجھے تم پر پورا یقین ہے.....'' عرفی ماموں ایک جانب کھڑے ہم دو بھائیوں کی یہ ساری گفتگو چپ چاپ سنتے رہے اور پھر وہ لوگ بسام کو لے گئے۔ میں ماموں کی طرف پلٹا تو انہوں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ ''جس کا آیان جیسا بھائی ہو..... اُسے بھلا پھر کس بات کی فکر بھانجے.....'' لیکن خود میری فکر اور پریشانیوں کے دن اب طویل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ اگلے روز نوٹس بورڈ پر بسام کی یونیورسٹی سے معطّلی کا نوٹس لگا ہوا تھا۔ اُسے کیس کی کاروائی کے دوران یونیورسٹی سے Suspend کر دیا گیا تھا کیونکہ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی عدالتی کاروائی میں ملوث

طالب علم کو کیس کا فیصلہ ہونے تک یونیورسٹی کی حاضری لسٹ میں شامل نہیں رکھا جا سکتا تھا اور ایک دن کی بھی عدالتی سزا ملنے کی صورت میں وہ طالب علم ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے رسٹی کیٹ کر دیا جاتا تھا۔

کیفے میں اسی بات پر شدید بحث چھڑی ہوئی تھی اور جم اور ایرک فرہاد سمیت یونیورسٹی انتظامیہ کے ان اصولوں پر سخت تنقید کر رہے تھے کہ کم از کم جب تک عدالت کسی کو بے گناہ یا قصوروار قرار نہ دے ڈالے تب تک طالب علم کو معطل کیے رکھنا سراسر ناانصافی ہے ..... میں اس بحث سے لاتعلق چپ چاپ ان سب کے درمیان بیٹھا کچھ اور ہی سوچ رہا تھا کہ کسی بیرے نے مجھے پرُوا کے ہاتھ کی لکھی ایک چٹ پہنچائی۔ ''ہم سب ہال نمبر 3 میں بسام کی گرفتاری پر اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں ..... تم بھی وہیں پہنچو .....'' اپنے دوستوں سے کچھ دیر کی معذرت کر کے میں ہال نمبر 3 میں پہنچا تو جوزف سب کو کافی پیش کر کے ہال سے نکل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی کمینی سی مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے اس کے جانے کے بعد انڈونیشین صالح کو کہہ کر دروازہ اندر سے بند کروا دیا۔ لیکن آج جتنے منہ، اتنی ہی باتیں تھیں۔ میٹنگ میں کوئی نظم وضبط نہیں تھا اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ عامر بن حبیب کے بغیر وہ سارے بنا کسی گڈریئے کے بھٹکتی ہوئی بھیڑیں تھیں وہ سبھی بسام کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن کیا .....؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ پرُوا نے بے بسی سے میری جانب دیکھا۔ اسی لیے میں کسی لیڈر کو چننے کے لیے زور دے رہی تھی۔ اس طرح تو یہ سب آپس میں ہی لڑتے رہیں گے اور پندرہ دن کا وقت یونہی گزر جائے گا۔ اگر تم خود ان کا کونسلر نہیں بننا چاہتے تو کم از کم ان کے ساتھ مل کر انہیں اپنا ایک نمائندہ چننے میں تو مدد کر سکتے ہو .....'' اجلاس بنا کسی فیصلے کے ختم ہو گیا۔ ہال سے نکلتے نکلتے سوڈانی احمر نے سب کو یاد دہانی کروائی کہ ہر سال کی طرح اس بار بھی بیت المقدس سے مشہور خطیب شیخ الکریم اپنے پانچ سالانہ لیکچرز کے لیے کل نیویارک پہنچ رہے ہیں اور وہ چاٹنا ٹاؤن کے علاقے میں موجود جامع مسجد میں خطاب کریں گے۔ میں نے وہیں معذرت کر دی کہ شاید میں اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکوں لیکن احمر نے مجھے یہ کہہ کر باندھ دیا کہ یہ عامر بن حبیب کی خصوصی ہدایت اور درخواست پر وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کیونکہ عام حالات میں عامر خود تمام طلبہ کو لے کر وہاں جایا کرتا تھا لیکن اس بار وہ اپنی طبیعت اور معطلی کے باعث ایسا نہیں کر پائے گا

لہٰذا اس نے مجھے خاص طور پر یہ پیغام دینے کا کہا ہے کہ میں ان سب کو جمع کر کے شیخ صاحب کی خدمت میں حاضری ضرور دوں نہ جانے کیوں میں عامر کی یہ درخواست رد نہیں کر سکا اور اگلے روز ہم سب مسلم طلباء ڈین سے یونیورسٹی کی بس الاٹ کروا کر چائنا ٹاؤن پہنچ گئے۔ جن طلبہ کا وضو نہیں تھا انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی لیکن میں مسجد کے صحن میں ہی بیٹھا رہا۔ کچھ دیر میں جماعت ختم ہوئی تو شیخ الکریم باقی طالب علموں کے ساتھ صحن میں آ گئے۔ وہ ایک پُرنور چہرے والے بزرگ تھے جو مخصوص عربی لباس میں ملبوس تھے۔ نئے طلبا کا ان سے تعارف کروایا گیا۔ انہوں نے مجھے الگ تھلگ بیٹھے دیکھا تو مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت پوچھ بیٹھے۔ ''کیوں لڑکے ..... تم نے نماز نہیں پڑھی کیا .....'' میں نے دھیرے سے جواب دیا ''نہیں ..... مجھے ٹھیک طرح سے نماز ادا کرنا نہیں آتی۔'' وہ مسکرا پڑے'' اچھا ..... تو یہ تو ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ..... جماعت کے ساتھ کھڑے ہو جایا کرو اور جیسا امام اور باقی مقتدی کریں، کرتے جاؤ ..... دھیرے دھیرے باقی دعائیں اور تلاوت بھی یاد ہو جائے گی تمہیں.....'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس بات پر میری سخت سرزنش کریں گے کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ میں خود کو مسلمان کہتا ہوں اور ٹھیک طرح سے نماز تک ادا نہیں کر سکتا ..... لیکن انہوں نے تو اس بات کا دوبارہ تذکرہ بھی نہیں کیا اور ہم سب کے بیٹھ جانے کے بعد اپنا لیکچر شروع کر دیا۔ ان کے آج کے لیکچر کا موضوع تھا۔ ''یورپ اور امریکہ میں اسلام کی ترویج اور مسائل .....'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی شیخ صاحب کے ملیح انداز گفتگو کی وجہ سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کے کہنے کے مطابق اسلام کے ان علاقوں میں پھیلنے سے کسی کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ صرف مذہب کی بنیاد پر سلطنت فتح ہو جائے۔ اور مذہب پھیلانے کا مقصد بھی کسی کی ریاست حاصل کرنا ہرگز نہیں ہے۔ مذہب تو ایک ضابطہ حیات کی طرح ہوتا ہے۔ ورنہ تقریباً ہر مذہب میں بری باتوں کو بُرا اور اچھی باتوں کو اچھا ہی کہا گیا ہے۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ کس ضابطہ حیات کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم سب کا یہی ایمان ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے بہترین مذہب اور ضابطہ حیات ہے۔ شاید وہ جو اسلام کی مخالفت میں حد سے گزر کر اسے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اُنہیں بھی یہ خبر ہے کہ اسلام ہی بہترین ہے۔ اور

یہی خوف انہیں اس کی شدید مخالفت پر اُبھارتا ہے ..... لیکن ہمیں اس صورت حال میں بھی صبر اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ..... اگر وہ اپنی خو نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اپنی وضع کیوں بدلیں؟ سچ ہی آخری جیت کا حق دار ہوتا ہے ..... ابھی کسی طالب علم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ فرانس میں حجاب پر مکمل پابندی سے انہیں کیا حاصل ہوگا .....؟ تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس سے فرانس کی معاشرت پر تو شاید کوئی خاص فرق نہ پڑے لیکن یہ حجاب کا خوف ظاہر کرتا ہے کہ وہاں بھی کچھ عناصر اسلام کی پھیلتی شناخت سے بے حد خوف زدہ ہیں۔ اور یہ پابندی صرف ایک اسلامی روایت کو اپنے معاشرے کا حصہ بننے سے روکنے کے لیے لگائی گئی ہے۔ لیکن میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ ہمیں اس طرح کی پابندیوں پر سیخ پا ہو کر اپنی روایت شائستگی کو بھی نہیں بھولنا ہوگا۔ فرانس کے مسلمانوں پر ریاست کے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ سو وہ قانون کے اندر رہتے ہوئے اپنے احتجاج کا حق استعمال کریں اور کسی کو بھی خود پر روایتی اور فرسودہ الزام لگانے کے موقع نہ دیں۔ اسلام جبر اور جنونیت کا نہیں، منطق اور دلیل کا مذہب ہے مجھے یقین ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب ہم اپنا آپ منوانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے ..... شیخ الکریم کا پہلا لیکچر ختم ہوا تو میرے ذہن میں بہت سے سوال جنم لے چکے تھے لیکن مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ طالب علموں کے نرغے میں گھرے رہے اور ہماری واپسی کا وقت بھی ہو گیا۔

شام کو میں اور ماموں بسام کے ریستوران کے وکیل کے پاس پہنچے تو اس کا رویہ وہی بے زاری لیے ہوئے تھا۔ ''میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن سرکاری اٹارنی نے کیس ہی بڑا تگڑا بنایا ہے ان سب لڑکوں کے خلاف ..... دراصل نائن الیون 9/11 سے پہلے امریکہ میں سبھی معصوم سمجھے جاتے تھے جب تک وہ ملزم ثابت نہ ہو جائیں لیکن نائن الیون کے بعد یہاں سبھی ملزم ہیں، جب تک کہ وہ خود کو معصوم ثابت نہ کر دیں ..... دوسرے ایشیائی لڑکے تو پھر بھی شاید جلد باہر آ جائیں مگر بسام۔ ''ماموں نے تنک کر پوچھا''۔ کیوں ..... بسام نے ایسا کیا گناہ کر دیا ہے۔ وکیل نے ایک گہری سانس لی۔ ''بسام مسلمان بھی ہے ..... اور یہ بات اس وقت اس کے خلاف جاتی ہے۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ ''تو پھر یوں کہو کہ امریکہ میں نائن الیون کے بعد ہر انسان نہیں صرف ہر مسلمان ملزم ہے جب تک وہ خود کو

بے گناہ نہ ثابت کر دے ..... یہ اسلام کے خوف کا بھوت تم لوگوں کے دلوں سے نکل کیوں نہیں جاتا.....؟ بسام مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ امریکن شہری بھی ہے۔ اور اس کے اپنے بھی کچھ حقوق واجب ہیں ریاست پر..... ہم بھی اُتنا ہی ٹیکس بھرتے ہیں جتنا کوئی دوسرا امریکی شہری.....'' ماموں نے دھیرے سے اُردو میں مجھے سرزنش کی۔ ''چپ کر جاؤ بھانجے ..... اس بھینس کے آگے بین بجانے سے کچھ نہیں ہوگا.....'' کچھ دیر بعد ہم دونوں جب اُس موٹے وکیل کے دفتر سے نکل رہے تھے تو ہم دونوں ہی بسام کے لیے کسی دوسرے اچھے وکیل کی خدمات لینے کا سوچ رہے تھے۔ لیکن اچھے وکیل کے لیے اچھی رقم کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس وقت نہ میرے پاس تھی اور نہ ہی عرفی ماموں کے پاس۔

دوسرے روز یونیورسٹی میں صنم کبیر نے جب مجھ سے بسام کے بارے میں پوچھا تو میں اپنے اندر کا غبار روک نہ پایا۔ ''بسام کی واحد خطا صرف مسلمان ہونا ہے..... میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن خود کو مہذب ترین کہلانے والوں کے شہر میں ہمارا مذہب ایک جرم بن جائے گا.....'' صنم مجھے تسلیاں دیتی رہی لیکن شاید میرے اندر بنے بت اب ایک ایک کر کے ٹوٹنا شروع ہو چکے تھے۔ گیارہ بجے میں خود اس بس میں جا کر بیٹھ گیا جو ہمیں گزشتہ روز والی شیخ الکریم کی مسجد میں لے گئی۔ آج شیخ صاحب کا دوسرا لیکچر تھا اور موضوع تھا ''اسلام قابل خوف کیوں.....؟'' شیخ صاحب نے اپنے روایتی انداز میں بات جوڑی۔ ''عیسائیت کو اسلام سے بھلا کیا خطرہ..... عیسائیت میں تو خود تبلیغ کا رواج عام ہے۔ عیسائی مشینریاں تمام دنیا میں تبلیغ کرتی پھرتی ہیں۔ اسلام نے کبھی ان پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ اسلام سے اصل خطرہ یہودیت کو ہے..... کیونکہ یہودی تبلیغ کے ذریعے وجود میں نہیں آ سکتا۔ یہودی ہونے کے لیے انسان کے جسم میں خالص یہودی خون ہونا ضروری ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ یہودی عیسائیت کے پھیلاؤ سے خوف زدہ نہیں ہوتے..... شاید وہ عیسائیت کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہی نہیں ہیں..... گویا اصل جنگ صرف یہودیت اور اسلام کے بیچ میں ہے۔ دراصل اسلام کی جدت انہیں خائف کرتی ہے کیونکہ اسلام اس دنیا کا سب سے ماڈرن مذہب ہے..... اسلام سے چھ سو سال پہلے عیسائیت اور اُس سے چھ سو سال پہلے یہودیت کا بول بالا تھا۔ اصل میں سارا مسئلہ شاید درمیان کے ان بارہ سو سالوں کو پر کرنے کا ہے۔ چودہ سو سالوں میں ہزاروں لاکھوں یہودی مسلمان تو ہوئے، مگر شاید ایک بھی مسلمان

پلٹ کر یہودی نہیں بنا .....؟ بس ..... یہی خوف طاری ہے ان سب کے دلوں پر ..... عیسائیت سے یہود کو پلٹنے والوں کی مثال کثرت سے ملتی ہے۔ اور اسلام آنے کے بعد عیسائیت کا اکثریت میں اسلام کی طرف بڑھنا بھی ایک فیکٹر Facter ہے ..... دلچسپ بات یہ ہے کہ عرب ممالک میں آج کے اکثر مسلمانوں کے آباؤ اجداد کبھی عیسائی اور اس سے پہلے کبھی نہ کبھی یہودی بھی رہے ہیں۔ لہٰذا یہود ان اپنوں کو بھی مائل بہ اسلام دیکھ کر کڑھتے ہیں ..... اس لیے آج تمام دنیا میں مسلمان اور اسلام کی شناخت کو ایک دہشت گرد اور جنونی کی شناخت سے بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے ..... اور دکھ اس بات کا ہے کہ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں اور انہیں کامیاب کرنے میں ہماری جذباتیت کا بھی بہت دخل ہے ..... کل ہم اس جذباتیت کے نتائج اور ان کے توڑ کے متعلق بات کریں گے ..... ''شیخ کا لیکچر ختم ہوا تو حسب معمول انہیں مسلم طلبا نے اپنے گھیرے میں لے لیا اور مختلف مسائل پر بحث کرنے لگے۔ میں بھی ایک جانب کھڑا اپنی باری آنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور پھر بھیڑ کچھ کم ہوتی تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''تم کچھ اُلجھے ہوئے سے لگتے ہو ..... کیا کسی مشکل میں ہو .....؟''، ''جی ..... مشکل ہی سمجھ لیں ..... دراصل میں یہاں جس ماحول میں پلا بڑھا ہوں، اس میں مجھے ''انسانیت'' ہی کو سب سے بڑا مذہب سکھایا، پڑھایا اور بتایا گیا ہے۔ لیکن گزشتہ کچھ ہفتوں سے میرے اِردگرد مذہب کی اتنی زیادہ تکرار جاری ہے کہ میں اُلجھ گیا ہوں۔ میں مذہب کو ایک ذاتی فعل جان کر اس کی ادائیگی کو اپنی روح کی تسکین کے لیے کی جانے والی انسانوں کی ایک معصوم مشق سمجھتا رہا، جب کہ یہاں تو مذہب کو باقاعدہ شناخت کے طور پر انسانوں کے بنیادی رویوں کی ایک پہچان بنا لیا گیا ہے۔ یہ مسلمان ہے تو ضرور ''جذباتی اور جنونی'' ہوگا۔ عیسائی ہے تو ضرور ''دوغلا'' ہوگا اور یہودی ہے تو ضرور ''سازشی اور مکار'' ہوگا۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اگر مذہب کو شناخت بنانا اتنا ہی ضروری ہے تو اُس مذہب کی اچھی باتوں سے انسان کی پہچان کیوں نہیں کی جاتی .....؟'' شیخ صاحب نے غور سے میری بات سنی۔ ''واقعی یہ تو اس وقت کی سب سے بڑی اُلجھن ہے ..... لیکن تم نے غور کیا ہوگا کہ یہ بُری شناخت اور پہچان انسان خود نہیں بلکہ ہمارے غیر مذہب اُسے عام کرتے ہیں۔ دراصل تینوں ہی ایک دوسرے کے مذہب کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی

بتایا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو دوسرے مذہب کے سبھی پیغمبروں اور کتابوں کو نہ صرف مانتا ہے بلکہ ان کا احترام بھی ہمارے ایمان کا ایک بنیادی جزو ہے۔ چاروں آسمانی کتابوں پر ایمان لائے بنا تو کوئی مسلمان ہو بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا اگر کوئی صرف مذہبی تخصیص کی بنیاد پر کسی کے مذہب کو بُرا بھلا کہتا ہے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ہمیں غیر مذہبوں کے لیے ہدایت اور ان کے شر سے بچنے کی دعا کرنی چاہیے''۔ ''ٹھیک ہے..... لیکن یہ تو آپ عام حالات اور عمومی رویے کی بات کر رہے ہیں..... لیکن اگر مسئلہ خود اپنی مذہبی شناخت کو بچانے اور اس پر لگنے والے غلط الزامات کو مٹانے کا ہو تو پھر کوئی مسلمان کیا کرے.....؟ خاص طور پر اُس معاشرے میں جہاں مسلمان اقلیت میں بھی ہو''۔ شیخ الکریم مسکرائے۔ ''تب مسلمانوں کا اتحاد اور اُس اکثریت سے شائستہ بحث ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے..... یاد رہے۔ اشتعال کا سب سے زیادہ نقصان اس وقت خود مسلمان کو ہو رہا ہے.....'' اتنے میں اچانک مسجد کے باہر اللہ اللہ کے نعرے اور بہت سے لوگوں کا شور گونجنے لگا۔ ایک طالب علم جلدی سے مسجد کے باہر صورت حال معلوم کرنے کے لیے گیا اور جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ ''ٹائم اسکوائر کے آس پاس ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں۔ فلوریڈا کے کسی ٹیری جونز نامی پادری نے 11 ستمبر کو قرآن پاک جلانے کا اعلان کر دیا ہے۔''

شیخ الکریم کی زبان سے بے اختیار نکلا ..... نعوذ باللہ.....''



باب6

شیخ الکریم نے ہم سب کو پرسکون رہنے کی تلقین کی کیونکہ مسلم طلبہ اس مکروہ اعلان کو سننے کے بعد خاصے غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ چائنا ٹاؤن سے واپسی پر ہم نے بروکلین پل اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مختلف ممالک کے مسلمان باشندوں کو بڑے بڑے بینر اور کارڈ اٹھائے پادری ٹیری جونز کے اس انتہا پسندانہ رویئے کے خلاف احتجاج کرتے دیکھا۔ میری نظر ایک بہت بڑے بینر پر جم کر رہ گئی جس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ ''ٹیری جونز ..... دہشت گرد.....'' یونیورسٹی میں بھی چاروں جانب اسی بات کا چرچا تھا اور مسلم طلبہ بڑے احاطے میں جمع ہو کر نعرے لگا رہے تھے۔ پتا چلا کہ ٹیری جونز نے، نائن الیون کے دن ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کے انہدام اور اس جگہ پر امریکی حکومت کی جانب سے مسجد اور اسلامی سنٹر بنانے کے متوقع اعلان کے پیش نظر ٹھیک اسی دن اور ٹھیک ورلڈ ٹاور سے جہاز ٹکرانے کے وقت گراونڈ زیرو کے مقام پر جمع شدہ قرآن کے اوراق جلانے کا ناپاک منصوبہ بنایا ہے اور باقاعدہ اعلان بھی کر دیا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلبہ کے ممکنہ احتجاج کے پیش نظر باہر پولیس کی ایک بہت بڑی نفری اکٹھی کر رکھی تھی۔ مسلم طلبہ بے حد مشتعل تھے اور اس موقعے پر میں نے پہلی مرتبہ خود عامر بن حبیب اور بابر سیّدی کی کمی محسوس کی۔ اس روز یونیورسٹی کی کلاسز ختم کر کے اگلے دو دن کے لیے چھٹی کا اعلان کر دیا گیا لیکن یہ مسئلہ اب صرف ایک دو دن کی چھٹی سے حل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیخ الکریم کے تین لیکچر ابھی باقی تھے اور مسلم طلباء تیسرے روز چھٹی ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر مختلف علاقوں اور ہاسٹل سے براہ راست چائنا ٹاؤن کی مسجد تک

پہنچے۔ اس روز وہاں مسلم طلباء کا ایک بہت بڑا اور مشتعل ہجوم موجود تھا۔ شیخ نے اپنا لیکچر شروع کیا تو نعرے بازی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

''میں آپ سب کے جذبات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ خود میرے اندر بھی غم اور غصے کا ایسا ہی ایک آتش فشاں موجود ہے..... لیکن ہم سب کو اللہ کا مسلمانوں سے کیا گیا وعدہ یاد رکھنے کی بھی ضرور ہے۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے لہٰذا کسی جنونی پادری کی ایسی کسی دھمکی سے ہمیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ وہ اس مذموم حرکت میں کبھی کامیاب بھی نہیں ہوگا۔ ہاں..... مگر امت اسلام کی جتنی دل آزاری وہ کرسکتا..... اس نے اُس سے کہیں زیادہ کر دی ہے..... لیکن کیا یہ دل آزاری کوئی نئی بات ہے..... مسلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور ان جیسے کئی ملعونوں سے لے کر اس ڈینش کارٹوسٹ تک ایسے کتنے ہی ہیں اس مکروہ قطار میں..... اور انہیں روکنے کے بجائے ہمیشہ بڑھاوا دیا گیا ہے۔ سیاسی پناہ ملنا ان کا پہلا انعام اور مسلمانوں کو اذیت دینے کے دیگر کئی تحفے انہیں تمام عمر دیئے جاتے ہیں۔ سلمان رشدی کو برطانیہ نے نائٹ Knight کا خطاب تک دے ڈالا۔ ہمارے نزدیک جو ملعون ہو جائے وہ اسے اپنی یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے..... ہم ہر بار ایک جذباتی گروہ کی طرح سڑکوں پر تو نکل آتے ہیں لیکن حسب معمول صرف اپنی ہی املاک کو نقصان پہنچا کر اسے توڑ پھوڑ اور جلا کر اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں اور اگلی صبح یوں مطمئن اپنے اپنے کام پر روانہ ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہمارا فرض ادا ہوا..... بس..... یہی ہے ہمارا احتجاج.....؟ اور اتنا ہی ہے اس بے مقصد ہنگامے کا اثر.....؟ اب تو وہ جو ہمیں آزاد پہنچانے کے لیے یہ سب کچھ کرتے ہیں اُنہیں بھی ہمارے احتجاج کی وقعت کا پتا ہے..... بات صرف اتنی سی ہے کہ مسلمان دنیا کی پچاس سے زیادہ امیر ترین اور تیل کی دولت سے مالا مال ریاستوں کے حکمران ہونے کے باوجود اس وقت ایک کمزور ترین نسل یا گروہ کے طور پر جانے جاتے ہیں..... اور کمزور کا احتجاج کیا ہو سکتا ہے.....؟ صرف رونا دونا اور اپنے سر پر خاک ڈال کر بد دعا دینا..... ہم مسلمان تو اس قدر بٹ چکے ہیں کہ اجتماعی بد دعا بھی نہیں کر سکتے..... نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اسلام دشمن قوتیں اپنے کھیل کھیلتی رہیں

گی، کبھی آزادی اظہار کے نام پر تو کبھی کسی جنونی کا ذاتی فعل سمجھ کر وہ اسے تحفظ بھی فراہم کرتے رہیں گے یہ سب کچھ ایک تواتر سے جاری رہتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم مسلمان آج تک اس کا کوئی توڑ نہیں کر پائے .....''

ایک جذباتی لڑکا اُٹھا اور غصے میں بولا۔ ''ہمیں ایسے ہر دشمن کو کچل کر ختم کر دینا چاہیے میری قوم کمزور ہی کیوں نہ ہو ..... لیکن میں ایسا گیا گزرا نہیں ہوں ..... میں یہاں موجود سب حاضرین سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں فلوریڈ جا کر اپنے ہاتھوں سے ٹیری جونز کا خاتمہ کروں گا ..... اور اس کے لیے مجھے کسی کی مدد بھی درکار نہیں ہے .....'' مجمع پر سناٹا سا چھا گیا اور پھر سبھی نے تعریفی انداز میں پر جوش تالیاں بجائیں۔ شیخ الکریم نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''یہی ہماری بنیادی غلطی ہے ..... ہماری بے بسی فوراً جنون میں بدل جاتی ہے جو ہمیں تشدد پر اُکساتا ہے، لیکن ہم اپنے اس جنون کو دلیل اور بحث کے ذریعے ان اقوام تک منتقل کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں۔ ایک ٹیری جونز کے مر جانے سے اس طبقے کے اندر پلتی سوچ ختم نہیں ہو جائے گی۔ ہمیں اس وقت سب سے زیادہ مکالمہ بین المذاہب (Interreclgion dialoge) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسے سکالرز اور مسلم عالم چاہیں جو انہی ٹیری جونز جیسے پادریوں کے درمیان بیٹھ کر ساری دنیا کے میڈیا کے سامنے اُن سے بات کریں، بحث کریں اور مناظرہ کریں کہ ہمارے دین میں توریت، زبور، بائبل اور انجیل کو بھی مقدس گردانا جاتا ہے لیکن قرآن پر ان سب آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا اختتام ہے۔ ہماری کتاب ہی آخری کتاب ہے اور اس کتاب کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن اپنے سے پہلے آنے والی کسی کتاب کی نفی نہیں کرتا۔ لہٰذا نعوذ باللہ قرآن کی توہین کرنا یا اُسے جلانے کا اعلان کر کے دراصل وہ خود اپنی مقدس کتابوں کی توہین کر رہے ہیں۔ لیکن اس بات کو اب بند کمروں سے نکل کر ساری دنیا کے سامنے واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے دین کی تعلیمات کیا ہیں اور ہمارا قرآن ہمیں کیا سکھاتا ہے؟ آپ لوگوں میں سے جس کے دل میں بھی اُس پادری کو قتل کرنے کی خواہش مچل رہی ہے میری ان سب سے یہی درخواست ہے کہ مختلف مذاہب سے مکالمہ کر کے اور کھلے میڈیا کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیارے قرآن کی تعلیمات کا ذکر کریں اور یوں ہر روز پادری ٹیری

جونز سمیت اس جیسے کئی انتہا پسند اور جنونیوں کے خیالات کا قتل کریں ان کی قرآن اور اسلام کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو سولی چڑھائیں اور ان کے پروپیگنڈے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیں۔ جائیں اور جا کر اپنے سبھی غیر مسلم عیسائی یہودی اور دیگر مذاہب کے یونیورسٹی فیلوز کو یہ بتائیں کہ جس قرآن کی پادری جونز سمیت کئی دوسرے بے حرمتی کے منصوبے بناتے ہیں، وہی قرآن ہمیں اُن کی بائبل اور دوسری آسمانی کتابوں کو اُسی طرح چوم کر اور سینے سے لگا کر طاق پر رکھنے کی تربیت دیتا ہے جیسے ہم خود اپنے قرآن کو بوسہ دے کر اور آنکھوں سے مس کرنے کے بعد رحل پر رکھ کر کھولتے ہیں۔''

شیخ الکریم کا تیسرا لیکچر ختم ہوا تو مسجد کے صحن میں سناٹا سا چھا چکا تھا۔ طالب علموں کا جوش اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت کے لیے ایک تقدس میں بدل رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس وقت مسجد میں موجود ہر ذی نفس اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کر رہا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دن سے پہلے خود مجھے بھی قرآن کریم کی اس خصوصیت کا پتا نہیں تھا۔ مجھے اور بسام کو بچپن میں یہیں امریکہ میں امی اور عرفی ماموں نے قرآن پڑھایا تھا لیکن بات صرف عربی پڑھنے کی حد تک ہی محدود رہی۔ ہم دونوں بھائی کبھی اس کتاب کی آیات کا مفہوم سمجھ ہی نہیں پائے۔ یہاں انگریزی ترجمے والے قرآن بھی ملتے تھے لیکن اس کا ترجمہ اس قدر لفظ بہ لفظ اور مشکل ہوتا تھا کہ بہت کم لوگ اصل معنی کے تہہ تک پہنچ پاتے تھے۔ اس روز شیخ الکریم کی بات سن کر مجھے ایک اور بھی بہت عجیب سا احساس ہوا کہ جو بھی مسلمان قرآن کو صرف عربی اور تلاوت کی حد تک برتتا ہے وہ بھلا اس مقدس کتاب کی اصل تہہ تک کیا پہنچ پاتا ہوگا؟ اور پھر اچانک ہی مجھے ان سب لوگوں پر رشک آنے لگا جو عربی زبان جانتے ہیں۔ اُسے بولتے ہیں اور اس کے معنی در معنی نکالنا جانتے ہیں اُن لوگوں کے لیے نماز اور قرآن کی تلاوت میں کس قدر سکون اور طمانیت پوشیدہ ہوتی ہوگی .....؟ اور وہ جو مجھ جیسے عربی سے نابلد اور جلد باز تھے وہ تو صرف پانچ وقت کا ''رٹا'' ہی لگا پاتے ہوں گے .....؟ اور پھر میری تو بات ہی کیا ..... میں تو ابھی تک اس رٹے اور ''روٹین'' سے بھی ہزاروں کوس دور تھا۔

دو دن کی چھٹیوں میں مَیں نے اور عارفین ماموں نے اپنے اپنے طور پر بہت سے اچھے

وکیلوں سے رابطہ کیا لیکن ان سب کی فیس بھی ان کے نام کی طرح بڑی تھی ۔ بسام کی اگلی پیشی قریب آتی جا رہی تھی اور ہم ابھی تک اس کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر پائے تھے۔ شیخ الکریم کے ابھی دو لیکچر باقی تھے جنہیں شہر کے حالات کی وجہ سے اگلے ہفتے کے شروع تک مؤخر کر دیا گیا تھا۔ دوسری جانب مسلم کونسلر کے انتخاب کا وقت روز بروز گھٹتا جا رہا تھا۔ اور ابھی تک مسلمان طلباء کسی بھی متفق اُمیدوار کے نام پر حتمی اجتماع نہیں کر پائے تھے۔ میں نے یونیورسٹی کھلنے کے بعد پہلے روز ہی احمر کا نام تجویز کر دیا تھا لیکن احمر خود ذہنی طور پر اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اگلے روز یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر اُس بینر پر پڑی جو مسلم طلبہ نے اکیڈمک بلاک کے اوپر کافی اونچائی پر لٹکایا ہوا تھا۔ بینر کی تحریر دور سے ہی پڑھی جا سکتی تھی۔ ''ہم ٹیری جونز کو قرآن کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں'' کچھ مزید چھوٹے بینر اور کارڈز بھی یونیورسٹی کی دیواروں پر چسپاں تھے۔

9/11 کا بدلہ قرآن سے کیوں .....؟۔ ''پادری جونز کیا واقعی بائبل اور انجیل کی تعلیم دینے والا ایک پادری ہے .....؟۔ ''آؤ..... ہم سب ایک دوسرے کی مقدس کتابوں کا احترام کرنا سیکھیں اور سکھائیں .....'' شیخ الکریم کے لیکچر نے مسلم طلبہ کے دلوں میں اُبلتے لاوے کا رخ ایک مثبت سمت موڑ دیا تھا۔ لیکن وہ ..... جو شیخ کا لیکچر سن نہیں پائے تھے، وہ اب بھی مختلف ٹولیوں کی صورت میں یونیورسٹی کے پچھلے صحن میں جمع ہو کر نعرے لگا رہے تھے اور غیر مسلم یہودی اور عیسائی طلبہ ان کے نعرے سن کر بُرے بُرے سے منہ بنا رہے تھے، کوئی لڑکا اپنی دوست کو یہ بتاتے ہوئے میرے سامنے سے گزرا کہ صدر اوبامہ نے ٹیری جونز کے اعلان کی مذمت کی ہے اور اسے افغانستان اور عراق میں امریکی فوجیوں پر مزید حملوں کا شاخسانہ قرار دیا ہے، مجھے کچھ عجیب سا لگا، گویا بات تعظیم کی نہیں بلکہ اپنی فوج کی حفاظت کی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ عمل کسی جنونی نے بائبل کے نسخے جلانے کے اعلان کے طور پر کیا ہوتا تو شاید یہی امریکی ..... اُس کی سرکوبی کے لیے اس ملک میں اب تک اپنی فوجیں اُتار چکے ہوتے۔ میرے ذہن میں ایک بہت بڑا سوال پھوڑے کی طرح پکنے لگا تھا۔ کیا امریکی مسلمان امریکہ کے شہری

نہیں ہیں .....؟'' میرے ذہن میں فرہاد کی آواز گونجی ''وقت آنے دو مسٹر آیان .....تمہارے دل سے یہ امریکی شہریت کا بھوت بھی اُتر جائے گا ..... یہاں صرف وہی امریکن ہے جو ان کا ہم مذہب ہے..... مسلمان اور چاہے کچھ بھی ہو..... مگر امریکی شہری نہیں ہوسکتا ..... اگر کسی پرانے قانون کی مجبوری کی وجہ سے اُسے یہ شہریت مل بھی گئی ہے تو اُسے اپنے مذہب کو بھلا کر ''امریکن اسلام'' کے تحت یہاں زندگی گزارنی ہوگی اور جس دن اس کے اندر کا اصل مسلمان جاگا ..... وہ امریکہ سے اس کی واپسی کا آغاز ہوگا.....''

میں انہی سوچوں میں گم جانے کب سے یونیورسٹی کے اسٹیڈیم میں بیٹھا سامنے ہوتا رگبی کا میچ دیکھ رہا تھا۔ رگبی میرا اور بسام کا پسندیدہ کھیل تھا اور اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہم دونوں رگبی ٹیم کا حصہ بھی تھے، لیکن آج میرا دل رگبی کھیلنے کو بھی نہیں کر رہا تھا۔ میری ٹیم کے ارکان چیخ چیخ کر مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتے اور پھر رگبی بال کے پیچھے دوڑ پڑتے، ہلکی بارش تیز ہونے لگی تھی اور رگبی کا میدان کیچڑ کے ایک بہت بڑے تالاب میں بدلتا جا رہا تھا۔ کھلاڑی کیچڑ میں لت پت اپنے ہاتھوں میں گیند تھامے ایک دوسرے کو شانے کی ٹکر سے گراتے، دھکیلتے اپنے ساتھیوں کو گیند پاس کرتے تیزی سے گول پوسٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ رگبی کے کھیل میں کم زور کھلاڑی کے شانے کا جوڑ اُتر جانا معمول کی بات تھی لہٰذا دونوں ٹیموں نے شانوں اور سینے کی حفاظت والا خصوصی لباس اور سر پر ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے اپنا اور بسام کا سرخ ہیلمٹ یاد آ گیا جو ہمارے فلیٹ کی دیوار پر ٹنگے رہتے تھے۔ اچھا ہوا بارش تیز ہوگئی تھی ورنہ میرے گالوں پر بہتے قطروں کو لوگ آنسو سمجھ لیتے۔ اچانک میرے عقب میں پُروا کی آواز اُبھری۔ ''آیان .....تم یہاں بارش میں بیٹھے ٹھیک رہے ہو..... اور تمہارے دوست تمہیں کیفے میں ڈھونڈ رہے ہیں .....'' میں نے پلٹ کر پُروا کی جانب دیکھا۔ کالی جینز اور کالی ہائی نیک سویٹر میں وہ خود برکھا کی کوئی بدلی لگ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ''لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو .....؟''۔ ''میرے فزکس ڈپارٹمنٹ کے پانچ کولیگ اس میچ میں کھیل رہے ہیں ..... یہ آس پاس جو دور دور تمہیں چھتریاں کھلی نظر آ رہی تھیں یہ سب میرے ہی شعبے کے اسٹوڈنٹ ہیں جو اپنے کلاس فیلوز کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں آئے

ہیں۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''ہاں ..... کبھی کبھی حوصلہ بھی ہار کو جیت میں بدل دیتا ہے .....''۔ پُروا نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''آج کل تم بہت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہو ..... وہ پرانا آیان تو کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ لڑاکا، جھگڑالو اور بس اپنی منوانے والا ..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟'' ''ہاں ..... سب ٹھیک ہے ..... شاید میں اپنے اندر سے ہار رہا ہوں اور بدقسمتی سے مجھے حوصلہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔'' پُروا ایک دم ہی پریشان ہوگئی۔ ''کیوں آیان ..... ایسا کیوں کہا تم نے ..... کیا میں بھی نہیں .....؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم مجھے بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ مجھ سے اپنی پریشانی بانٹ سکو .....''۔ میں کچھ دیر اس معصوم شہزادی کو دیکھتا رہا ..... اب اُسے کیسے بتاتا کہ بانٹنے سے درد کبھی کم نہیں ہوتا ..... بس دوسرے تک پھیل جاتا ہے۔ جیسے کاغذ پر گری سیاہی کو بلاٹنگ پیپر چوس تو لیتا ہے لیکن دونوں ہی داغ دار ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے آس پاس گرتی بارش کی باتیں سنتے رہے۔ وہ جو بوندوں کی بولی جانتے ہیں انہیں پتا ہے کہ یہ بارشیں ہم سے کتنی باتیں کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی سی معصوم باتیں ..... ٹپ ٹپ کرتی باتیں ..... رم جھم کی سرگوشی والی باتیں .....۔

پھر کچھ دیر بعد پُروا نے ہی یہ خاموشی توڑی ''آیان ..... آج کل ''یونیورسٹی کا ماحول کتنا عجیب ہو رہا ہے نا ..... جیسے بہت جلد دو تہذیبوں کی بات سے یاد آیا کہ میں اور تم بھی تو ایسی ہی دو تہذیبوں کے باسی ہیں۔ پاکستان اور انڈیا ..... 63 تریسٹھ سالوں سے دریا کے دو کناروں کی طرح ایک ساتھ بہنے پر مجبور ..... لیکن کبھی ایک نہ ہونے والے دو کنارے ..... آیان تم نے بتایا تھا کہ تم پانچ سال کی عمر میں امریکہ شفٹ ہو گئے تھے اور گزشتہ بیس سالوں میں صرف چار دن کے لیے پاکستان گئے ہو ..... اس لیے شاید تم میری بات سمجھ نہ پاؤ ..... لیکن ہم دو ایسے ملکوں کے باسی ہیں جو نصف صدی سے زائد گزر جانے کے باوجود خود اوپر جانے کے بجائے دوسرے کو نیچے کھینچنے میں اپنی ساری محنت صرف کر رہے ہیں۔ ایک کی ہار دوسرے کا جشن ثابت ہوتی ہے اور دوسرے کی جیت سے پہلے کے گھروں میں ماتم بچھ جاتا ہے۔ نفرتوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ پرکھوں اور بزرگوں کے ساتھ ہوئی زیادتیوں اور ظلم کے حوالے دے کر نئی نسل کو ہر روز یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ ابھی آخری

جنگ باقی ہے..... لیکن دونوں طرف کے ''بڑے'' یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر یہ آخری لڑائی ہوگئی تو پھر ان کے پاس سیاست کرنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا..... اس لیے وہ آخری معرکہ کبھی ہو کے نہیں دیتا۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کی مسلمان اقلیت کے حق میں جلسے جلوس نکالتے ہیں۔ اُن کے حقوق کے لیے کٹ مرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کی مسجد کی جگہ پر مندر بنانے پر آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ مرنے مارنے پر تُل جاتے ہیں مگر خود اپنے ملک کی مسجدوں کو بم کے دھماکوں سے اُڑا ڈالتے ہیں..... مسجدوں میں گھس کر ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو وہیں بھون کر رکھ دیتے ہیں..... کتنا عجیب رشتہ ہے نا یہ آیان..... میں اور تم کتنے عجیب دیسوں کے باسی ہیں.....''

شاید پُروا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میرے ملک کے بارے میں ایسی خبریں روز یہاں کے میڈیا کی زینت بنتی تھیں اور پاکستانیوں کو روزانہ یہاں کے عام لوگوں کے ہزارہا سوالوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ شرم سے سر جھکانا پڑتا تھا کیونکہ عام امریکی اب یہی سمجھتا تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہوائی جہاز سے اُترتے ہی ائیر پورٹ ٹرمینل پر ہی ڈاکو انہیں لوٹ لیں گے، گھر کے راستے میں قزاق ان کو جان سے مارنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں گے اور جو بچ گئے وہ کسی نہ کسی دھماکے کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اچانک پُروا نے مجھ سے ایک عجیب سا سوال پوچھ لیا۔ ''ہم جنگ کیوں کرتے ہیں آیان.....؟'' میں نے چھوٹی سی چھتری کے نیچے سمٹ کر بیٹھی اس لڑکی کو غور سے دیکھا جو اپنی چھتری سے بیک وقت ہم دونوں کو برستی بارش سے بچانے کی سعی کر رہی تھی اور اس کی اس ناکام کوشش کی وجہ سے ہم دونوں ہی مسلسل بھیگ رہے تھے۔ ''شاید ہم اپنے خوف کے ردعمل میں جنگ کرتے ہیں۔ جنگیں جیت کر اخلاق ہار دیئے جاتے ہیں اور شاید جنگ اتنی بُری چیز نہیں جتنی فتح کے بعد اپنی اقدار بھول جانا ہے کیونکہ اس فاتح سے بڑا شکست خوردہ اور کوئی نہیں ہوتا جو جنگ جیت لینے کے بعد اپنی اخلاقیات بھول جائے۔'' پُروا غور سے میری بات سنتی رہی۔ ریفری نے سیٹی بجا کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ تیز بارش اور کیچڑ کی وجہ سے اب کھلاڑیوں کے چہرے اور وردیاں بھی نہیں پہچانی جا رہی تھیں۔ دونوں ٹیموں کے

کھلاڑیوں نے میچ کے دوران ہوئی مار دھاڑ اور دھکے بازی کو بھلا کر ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور اپنے ٹوٹے پھوٹے جسموں پر ایک ثابت مسکراہٹ سجائے کھیل کے میدان سے باہر نکلنے لگے۔ ان میں سے شاید کوئی ایک ٹیم میچ ضرور ہاری تھی لیکن ان دونوں ٹیموں نے اپنے اخلاق کو ہارنے نہیں دیا تھا۔

میں اور پُروا بھی وہاں سے اُٹھ کر چل پڑے۔ اب وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔ میں اچانک ہی اُس سے پوچھ بیٹھا۔ ''اگر تمہیں کبھی پتا چلے کہ میں نے اپنی ایک ذاتی غرض کی خاطر کسی جنگ میں اپنا معیار کھویا ہے۔ یا اپنی اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا ہے..... تو کیا تم یقین کرو گی .....؟'' پُروا چونک گئی .....نہیں ..... کبھی نہیں ..... میں نے بڑے بڑے امتحانوں میں تمہیں پرسکون اور ثابت قدم دیکھا ہے..... کم از کم میں اس بات پر کبھی یقین نہیں کروں گی .....'' میں نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔ تو پھر سنو..... میں نے اپنی زندگی میں بہت سی فتوحات حاصل کی ہیں..... لیکن ان میں سے ایک فتح ایسی بھی ہے جو میری اخلاقی شکست کا حاصل ہے..... جنگ ہارنے کے بعد بھی جیتی جا سکتی ہے..... لیکن اخلاق ہارنے کے بعد اسے دوبارہ فتح کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ پُروا کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ تحیر معمول کی ضد ہے..... لیکن ہم انسان اس فانی زمانے میں کسی بات کو اپنا معمول بناتے ہی کیوں ہیں کہ جس کا فریب ٹوٹتے ہی حیرت ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔

میں شام کو یونیورسٹی سے فارغ ہو کر لاک اَپ میں بسام سے ملاقات کے لیے پہنچا تو وہ ملاقاتیوں کے بڑے ہال میں ایک بنچ پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گم سم بیٹھا تھا۔ ''کہاں کھوئے ہوئے ہو.....؟'' میری آواز سن کر وہ چونکا۔ ''انو یار..... تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ عامر بن حبیب اور بابر سیّدی کو میرے حق میں یونیورسٹی سے باہر احتجاجی مظاہرہ کرنے اور پولیس سے مڈبھیڑ کے جرم میں کلاسز سے چھ ہفتوں کے لیے معطل کر دیا گیا ہے..... بسام نے پاس پڑا ایک پرانا اخبار کھول کر مجھے دکھایا۔ .....ہاں ..... یہ سچ ہے کہ وہ دونوں معطل کر دیے گئے ہیں۔ مگر یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ یونیورسٹی ڈین نے انہیں بنا اجازت جلسہ کرنے پر پہلے ہی آخری وارننگ دے رکھی ہے..... اس لیے اس بار انہیں اپیل کا موقع بھی نہیں دیا گیا اور اسی معطلی کی وجہ سے عامر بن حبیب

کی مسلم کونسلر شپ کا بھی خاتمہ ہو گیا ....." بسام نے بے چینی سے سر ہلایا۔ "یہ ٹھیک نہیں ہوا آیان ..... ہم نے ہمیشہ اُن لڑکوں کی مخالفت کی اور پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑایا ہے ..... لیکن وہی مسلم گروپ آج میری گرفتاری کی وجہ سے تتر بتر ہو چکا ہے ..... سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو ان کا مجرم محسوس کرنے لگا ہوں میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارا جرم میرے جرم سے بڑا نہیں ہے بھائی ..... میں نے تو انہی لڑکوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے ....." بسام نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو ..... ایسا کیا کر دیا ہے تم نے .....؟"۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک پوری بات بسام کو بتا دی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "اوہ میرے خدا ..... ایسا کیوں کیا تم نے آیان.....؟ اگر ان لوگوں کو اس بات کا پتا چل گیا تو تمام مسلم طلبہ تمہاری جان کے درپے ہو جائیں گے" ..... "مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے ..... لیکن اُس وقت میرے پاس ہم دونوں کی فیس بھرنے کا اور کوئی ذریعہ ہی کیا تھا .....؟ اور مجھے بابر سیّدی سے تمہارا بدلہ بھی لینا تھا ..... لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ یہ انتقام آگے چل کر خود میرے ضمیر کے لیے ایک سزا بن جائے گا ....." بسام نے پریشانی سے میری جانب دیکھا۔ "اب تم کیا کرو گے ....." میں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ "کفارہ تو ادا کرنا ہی پڑے گا ..... میرے اندر کی عدالت بار بار میرے اس جرم کی سزا کا فیصلہ مانگتی ہے ..... اور اب مجھے کوئی حتمی فیصلہ کرنا ہی ہوگا ....."

بسام نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرے باہر آنے تک ایسا کچھ نہ کرنا کہ میں خود کو ان دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ہی ختم کر دوں ..... جو بھی سزا ہوگی ..... ہم دونوں مل کر اسے جھیلیں گے ....." میں چپ رہا۔ میں اپنے بھولے بھائی کو کیسے سمجھاتا کہ ضمیر کی عدالتوں کی سزا صرف اکیلے ہی بھگتنی پڑتی ہے۔ اگلے روز یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر مسلم کونسلر کی عبوری مدت کے چناؤ کا آخری نوٹس لگ چکا تھا اور تمام مسلم طلباء میں ایک سراسیمگی سی پھیلی ہوئی تھی کیونکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کا یہ تنظیمی عہدہ خالی ہی چلا جائے گا۔ عامر بن حبیب کے کمرے میں طلباء کا ہجوم تھا اور بھانت بھانت کی بولیوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو عامر نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا ..... اس کانٹوں کی سیج پر بیٹھنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا ....." میں نے قریب

بیٹھے مایوس سے بابر سیّدی پر نظر ڈالی۔ ''اگر یہ کانٹوں کی سیج ہی ہے تو اس چبھن کو میرا مقدر کر دو ..... میں اپنے ایک جرم کی سزا میں خود کو بطور کفارہ اس سیج کے لیے پیش کرتا ہوں۔ میں مسلم کونسلر بننے کے لیے تیار ہوں .....''

کمرے میں میری بات سن کر ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ وہ سبھی میری طرف دیکھ رہے تھے۔



باب 7

میری رضا مندی کا اعلان سن کر کچھ دیر تو وہ سب سکتے میں رہے اور پھر جب عامر بن حبیب نے اُٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا تو وہاں ایسا شور مچا کہ اس کی گونج میں میرے کفارے کا ذکر ہی کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ میں نے کئی بار عامر سے کہا کہ میں اُس سے اکیلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں لیکن ان سب کو تو میرے مسلم کونسلر شپ کے فارم بھرنے کی جلدی پڑ گئی تھی کیونکہ اگلے دن اس کی آخری تاریخ تھی۔ بھاگم بھاگ سارے کام کیے گئے اور مجھ سے بہت سی جگہوں پر دستخط لینے کے بعد اگلی صبح احمر نے میرے کاغذ جمع کروا دیئے۔ یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر جب ڈین کی طرف سے یہ اعلامیہ چپکایا گیا کہ ''آیان احمر کے مسلم کونسلر بننے پر اگر کسی بھی مسلم طالب علم کو اعتراض ہے تو وہ تین دن کے اندر ڈین کے دفتر میں درخواست جمع کرا سکتا ہے۔'' تو یہ نوٹس پڑھ کر چاروں طرف ایک بھونچال سا آ گیا۔ میرے دوست تو میرا مسلم گروپ جوائن کرنے پر ہی مجھے رو چکے تھے۔ کونسلر بننے کا اعلان سن کر تو ان کے حواس ہی گم ہو گئے۔ ''آیان ..... تم اپنے ہوش میں تو ہو ..... جانتے بھی ہو تم کیا کرنے جا رہے ہو ..... یہ وہ پگڈنڈی ہے جس سے واپسی کی کوئی راہ نہیں نکلتی .....''۔ ''میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر ہی اس ساحل پر اُترا ہوں۔ میرے پاس فتح یا فنا کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے اب .....''۔ پُر وا البتہ بہت پر جوش تھی۔ ''یہ ہوئی نا بات ..... مسلم اسٹوڈنٹس کو عامر بن حبیب کے بدلے میں ایسا ہی جوشیلا اور نڈر کونسلر چاہیے تھا جو یونیورسٹی انتظامیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے .....''۔ میں اکیڈمک بلاک سے نکلا تو مجھے سامنے سے شمعون اور مائیکل اپنے گروپ کے دو یہودی لڑکوں کے ساتھ

آتے ہوئے نظر آئے۔ مائیکل اور شمعون نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''تم تو ہماری توقعات سے بھی زیادہ تیز نکلے..... تو عامر بن حبیب کی سیٹ پر نظر تھی تمہاری.....؟ بحر حال..... ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... بلکہ ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہمارا ہی ایک ساتھی مسلم کونسلر بن کر اب ہمارا ہی کام کرے گا۔ سنا ہے تم آج کل اپنے بھائی کی گرفتاری کی وجہ سے بہت پریشان ہو..... اب تمہیں اُس کی فکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں..... شمعون نے تمہارے بھائی کے لیے ایک بہت اچھا وکیل کرنے کا سوچ لیا ہے..... بس اب تم اطمینان سے مسلم طلبہ کے بیچ رہتے ہوئے ہمارا کام کرتے جاؤ..... اور اپنے تمام مسائل ہم پر چھوڑ دو.....''

میں چپ چاپ مائیکل کی تقریر پر سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوا تو میں بولا۔ ''میں نے تم لوگوں سے ایک معاہدہ کیا تھا، جسے میں نے تکمیل تک پہنچا دیا..... اب ہمارا ایک دوسرے پر کوئی قرض باقی نہیں ہے..... بہتر ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کے راستے میں نہ آئیں..... اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے.....'' میں اپنی بات ختم کر کے آگے بڑھنے لگا تو مجھے شمعون نے پیچھے سے آواز دی۔ ''تم شاید یہ بات بھول رہے ہو کہ تم نے مسلم کونسلر کی یہ سیٹ جس عامر بن حبیب کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر حاصل کی ہے۔ اُس کے وفادار مسلم طلباء ابھی تک اسی یونیورسٹی میں موجود ہیں اور اگر ہم نے انہیں تمہارے پچھلے کارنامے کے بارے میں ہلکا سا اشارہ بھی کر دیا تو وہ تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے.....'' میں نے رُک کر شمعون اور اس کے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی۔ ''جب وہ مقام آیا تو تب دیکھ لیں گے..... فی الحال تم لوگ میرا مشورہ گرہ سے باندھ لو تو تم سب کے لیے بہتر ہوگا۔ میں کوئی نیا جھگڑا نہیں چاہتا..... لیکن مجھے کمزور سمجھنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا.....''۔ میں اپنی بات ختم کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میرا اصل امتحان شروع ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر اپنے خدا سے دعا کی کہ مجھے اس امتحان میں کامیاب کر دے۔

دو دن بعد یونیورسٹی کے قانون کے مطابق مسلم طلباء کے اکثریتی ووٹ سے میرا مسلم کونسلر کا نوٹی فیکیشن جاری کر دیا گیا کیونکہ میرے مقابلے پر کسی دوسرے مسلمان طالب علم نے کاغذ جمع نہیں کرائے تھے۔ عامر بن حبیب اور باقی سب نے فرداً فرداً مجھے مبارک باد دی۔ وہ سب بہت خوش

تھے۔ بابر سیدی کے چہرے پر بھی میں نے زندگی میں پہلی مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے مجھے گلے لگا کر اپنی نم آنکھیں چھپانے کی کوشش کی۔ ''بس اتنا یاد رکھنا آیان ..... اب مسلم طلباء کی ہر امید تم ہی سے وابستہ ہے ..... کیوں کہ شاید امریکہ کی تاریخ میں یہ سب سے سخت وقت ہے جو ہم مسلمانوں پر آیا ہے..... مجھے امید ہے تم اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹو گے .....'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں آخری دم تک اپنا فرض نبھانے کی کوشش کروں گا ..... بس ایک بات دھیان میں رہے کہ مجھے میری ماضی سے نہیں ..... میرے حال سے پہچاننا .....''۔ بابر اور عامر نے زور سے میری پیٹھ تھپکی۔ ''فکر مت کرو ..... ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں .....''

اگلے روز صبح ڈین آفس میں میری بطور مسلم کونسلر پہلی تعارفی ملاقات تھی جس میں اُس نے شمعون اور عیسائی کونسلر جارج کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ ڈین نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا۔ ''مبارک ہو تمہیں ..... ویسے کافی کچھ سن رکھا ہے تمہارے بارے میں ..... امید ہے تم مسلم طلبا کی ٹھیک طرح سے نمائندگی کر پاؤ گے اور پچھلے کونسلر کی طرح بات بے بات مسلم اسٹوڈنٹس کو مظاہروں اور جلسوں کے لیے یونیورسٹی میں جا بجا اکٹھا کر کے ان کی تعلیم ضائع نہیں کرو گے .....'' شمعون اور جارج نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم نے یونیورسٹی آئین میں یہ بات تو پڑھ لی ہوگی کہ تمہاری کیا حدود ہیں ..... چلتے چلتے تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ شہر کے تازہ حالات کے پیش نظر یونیورسٹی کیمپس سے باہر کسی بھی قسم کے مظاہرے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ لہٰذا تم تینوں کونسلرز کو اب ڈسپلن کی بہت پابندی کروانی ہوگی اپنے اپنے ہم مذہب طلبا سے ..... اور خود بھی بہت محتاط رہنا ہوگا .....''

میں نے پہلی مرتبہ اپنی زبان کھولی۔ ''آپ مطمئن رہیں ..... عامر بن حبیب کی معطلی کے بعد مسلم طلبہ کافی محتاط ہو گئے ہیں۔ ویسے اگر یونیورسٹی انتظامیہ کلاسز کے اوقات کے دوران کیمپس سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دے تو ایسے بہت سے مسائل کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مسلم طلبہ کو سنبھالنے کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ امید ہے باقی دو کونسلر بھی اپنے اپنے گروپ کو رضا مند کر لیں گے۔'' ڈین نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ ''تجویز بُری نہیں ہے ..... میں آج ہی ڈپٹی ڈین سے کہہ کر یہ حکم نامہ جاری کروا دیتا

ہوں .....''۔ ڈین نے شمعون اور جارج کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے اس تجویز پر.....؟''۔

وہ دونوں اس اچانک سوال سے گڑ بڑا سے گئے۔ ''نہیں نہیں ..... ہمیں بھی منظور ہے.....''۔

تعارفی میٹنگ ختم ہوئی تو ہم تینوں ڈین کے دفتر سے باہر نکل آئے۔ شمعون کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ ''تم نے اتنی بڑی بات اندر کہہ تو دی ہے ..... لیکن کیا تمہارا مسلم اسٹوڈنٹس پر واقعی اتنا کنٹرول ہے بھی کہ تم انہیں باہر جانے سے منع کر کے قابو میں رکھ سکو.....؟''۔ جارج البتہ خوش نظر آ رہا تھا۔ ''ویسے ہے تو یہ ہمارے فائدے کی ہی بات ..... آئے دن یونیورسٹی کی بیرونی سڑک پر مظاہروں سے ہماری یونیورسٹی کی بہت بدنامی ہو رہی تھی۔'' میں نے غور سے جارج اور شمعون کو دیکھا۔ ''لیکن اس طرح سے مسلم طلبہ کی بات میڈیا کے ذریعے براہ راست سارے نیو یارک تک بھی تو پہنچ رہی تھی ..... تم یونیورسٹی کی نیک نامی کی وجہ سے نہیں ..... میڈیا کی مسلم اسٹوڈنٹس پر سے توجہ ہٹ جانے پر زیادہ خوش ہو.....''۔

وہ دونوں چونک گئے شمعون مسکرایا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بہت آگے تک دیکھنے کی عادت ہے ..... کسی بھی لیڈر کے لیے یہ دور بینی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے ..... لیکن خیال رہے ..... تمہارے کسی بھی اقدام سے ہمیں نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ..... ورنہ انجام سے تم واقف ہو.....''

وہ دونوں دھمکی دے کر آگے بڑھ گئے۔ شام چار بجے تک، انتظامیہ کی جانب سے کلاس ٹائمنگ class timing کے دوران یونیورسٹی احاطے سے بلا اجازت باہر جانے پر عارضی پابندی کا نوٹس لگا دیا گیا۔ وجہ اعلان شہر کے بگڑتے ہوئے حالات اور NYPD نیو یارک پولیس کی طرف سے کی گئی درخواست کو بنایا گیا تھا۔ احمر اور دیگر طلباء نے مجھ سے حکم نامے کے خلاف اپیل جمع کروانے کی اجازت طلب کی تو میں نے انہیں دو دن انتظار کرنے کا کہہ دیا۔ اگلے روز شیخ الکریم کا چوتھا لیکچر تھا۔ پادری ٹیری جونز کے اعلان کے بعد مسلمانوں کے لیے شہر کی فضا کافی تناؤ کا شکار ہو چکی تھی اور جیسے جیسے گیارہ ستمبر کا دن قریب آ رہا تھا مسلمانوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اتفاق سے اس بار مسلم ممالک میں عید گیارہ ستمبر یا ایک دن پہلے آ رہی تھی اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بات بھی کسی بڑے ہنگامے کے لیے وجہ تنازعہ بن سکتی ہے۔ ہم سب شیخ الکریم کا لیکچر سننے کے لیے یونیورسٹی سے ڈین کی

اجازت لے کر نکلے تو ٹائمز اسکوائر پر میری نظر "Lion King" نامی اسٹور کے بڑے سے پیلے Yellow بورڈ پر پڑی جس کے قریب گاڑی کھڑی کر کے دھماکہ کرنے کی سازش کا الزام اُس پاکستانی لڑکے پر لگایا گیا تھا۔

ٹائمز اسکوائر سے کچھ فاصلے پر اُس دھان پان سی لیڈی ڈاکٹر کی رہائی کے حق میں بھی نعرے لگائے جا رہے تھے۔ یوں میڈیا کی تمام تر توجہ ان دو پاکستانیوں پر مرکوز تھی ..... یا شاید کسی خاص مقصد سے مرکوز کروائی گئی تھی کیونکہ اس وقت یہ دونوں پاکستانی انتہائی خطرناک ملزمان کی فہرست میں شامل اور امریکن پولیس کی قید میں تھے۔ لہٰذا الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کی یہ توجہ کم از کم مسلمانوں کے حق میں ہرگز نہیں جاتی تھی۔

چائنا ٹاؤن میں ہم جب مسجد کے باہر پہنچے تو ہمیں وہاں سیکورٹی کے غیر معمولی انتظامات نظر آئے۔ پتا چلا کہ کسی نے ٹیلی فون پر پولیس کو چائنا ٹاؤن کی مسجد کے باہر دھماکہ کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بنگالی طالب علم شکیل نے دھیرے سے بُڑ بڑا کر کہا۔ ''سارا منصوبہ جامع مسجد کے گرد شیخ الکریم پر نظر رکھنے کے لیے پولیس جمع کرنے کا ہے .....اور کچھ نہیں .....'' میں حیرت میں پڑ گیا۔ آخر نیو یارک پولیس کو شیخ الکریم جیسے صلح پسند بزرگ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ شیخ صاحب کے آج کے لیکچر کا موضوع تھا۔ ''جو آسمان سے اُترا..... وہی سب کے لیے مقدس ہے''۔ انہوں نے حسب معمول ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات کا آغاز کیا۔

''نیو یارک کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص یہ وقت بڑی آزمائش کا ہے۔ ہر روز کوئی نیا فتنہ کھڑا کیا جاتا ہے اُسے میڈیا کے ذریعے ہوا دے کر ساری دنیا کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور پھر مسلمانوں کے ساتھ مل کر مگرمچھ کے آنسو بہائے جاتے ہیں کہ امریکہ اپنے مسلمان شہریوں کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔ معروف قلم کار ٹامس ہارڈی کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) ''اگر اس کائنات کا کوئی خدا نہیں تھے، تب بھی ہمیں ایک خدا ایجاد کر لینا چاہتا کہ ہمارے معاشرے کی اخلاقی اقدار قائم رہ سکیں.....'' لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ امریکنوں کا خدا تو ہمیشہ سے برقرار ہے۔ پھر اس معاشرے کی اقدار دن بہ دن مرتی کیوں جا رہی ہیں .....؟ آپ لوگوں کو خبر مل چکی ہو گی کہ گستاخانہ خاکے بنانے

والے ویسٹر گارڈ Wester Guard کو انٹرنیشنل میڈیا کانفرنس 2010ء ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جو ہمارے دلوں میں جس قدر اندر تک برچھی گھونپے وہ اُسی قدر زیادہ محترم کیوں؟۔ ہم اُن پر مبعوث ہوئے ایک لاکھ تیئس ہزار نو سو ننانوے پیغمبروں کو اپنے دل کی مسند پر بٹھا کر رکھتے ہیں کہ یہی ہمارا ایمان ہے لیکن اُن سے ہمارے ایک نبی ﷺ برداشت نہیں ہوتے ..... حالانکہ ان سے پہلے آنے والے ہر نبی نے اُن ﷺ کے آنے کی بشارت دی اور بار ہا دی ہے کہ اس تمام کائنات کے ظہور پذیر ہونے کا مقصد ہی ان ﷺ کی آمد ہے ..... پھر بھی یہ انکار کیوں .....؟ کیوں بار بار یہ اپنے ہی وجود کی خود نفی کرتے ہیں .....؟ یہ کیا انداز دشمنی ہے .....؟ کیا مسلمان اسی قدر ضعیف ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پیارے نبی ﷺ کی حرمت کے لیے بھرپور احتجاج بھی نہیں کر سکتا؟ آخر ہم کب تک مختلف حیلے بہانوں سے اپنے فرض سے پہلو تہی کرتے رہیں گے۔'' حد یہ ہے کہ ایک ملعون کے عمل کو بار بار دھرانے کے لیے انٹرنیٹ کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ ویب سائٹس پر اس موذی عمل کے مقابلے منعقد کروائے جا رہے ہیں۔ اور ہمارے ایمان کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہم صرف ایک ویب سائٹ فیس بک face book کا بائیکاٹ نہیں کر پائے۔ کچھ عقل مندوں نے کہا کہ ایک ویب سائٹ کا بائیکاٹ کرنے سے کیا ہوگا؟ کچھ اور ذہین لوگوں نے اسے ''علم و تمدن سے دوری'' کا خطرہ بنا کر ظاہر کیا اور کچھ نے اُسی ویب سائٹ پر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے لاکھوں پیغامات بھیج کر اُسی ویب سائٹ کی سالوں کی کمائی ہفتوں میں کروا دی۔ جس قوم کا ایمان اس قدر کم زور ہو چکا ہو کہ وہ اپنا احتجاج رجسٹر کروانے کے لیے اجتماعی تعداد میں صرف ایک ویب سائٹ کو بھی نہ چھوڑ سکے وہ کسی شکایت کی حق دار بھی نہیں۔ بات صرف احساس کی ہے..... احساس اللہ ہمارے دلوں میں ڈالتا ہے اور جب آپ اپنے اندر اس احساس کی کمی یا غیر حاضری پائیں تو سمجھ جائیں کہ آپ کے دل پر مہر لگنے والی ہے ..... ہزار بہانے، لاکھ توجیہات خود آپ کے اندر سے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے جواب تلاش کر لائیں گی ..... لیکن فارسی میں کہتے ہیں کہ ''خوئے بدرا بہانہ بسیار.....''۔

ہم اس ملعون ڈینش کارٹونسٹ کو تو دن رات برا بھلا کہتے ہیں لیکن ڈنمارک کی بنی ہوئی اشیاء استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ پھر وہی بہانہ کہ میرے ناشتے میں صرف مکھن یا پنیر کا ایک ٹکڑا نہ

کھانے سے بھلا ڈنمارک کی معیشت پر کون سا آسمان گر جائے گا؟۔ یاد رکھیے۔ ہر بارش کا ایک پہلا قطرہ ضرور ہوتا ہے اور ہر سیلاب ایسے ہی ہزاروں قطروں سے مل کر جنم لیتا ہے۔ اگر ہم سبھی یہی سوچ کر صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا نام ونشان بھی مٹ جائے گا۔ اور یہ درندے ہمارا سب کچھ نگل جائیں گے۔ ان لوگوں کا مقابلہ اس وقت تیر وتلوار سے نہیں ..... ایک متحدہ سوچ سے ہی ممکن ہے۔ مغرب ایک دولت پرست اور کاروباری ذہن کا معاشرہ ہے جہاں دن اور رات کی گنتی صرف منافعے کے شمار سے کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے دن، ہفتے، مہینے اور سالوں کے ٹارگٹ ہوتے ہیں۔ اگر یہ وہ مالی منافع کا سنگ میل پار نہ کر سکیں تو ان کے دن رات بے چین ہو جاتے ہیں اور انہیں دنیا اپنے ہاتھ سے نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ ان سے مقابلے کا بس ایک ہی ذریعہ فی الوقت قابل عمل ہے کہ انہیں یہ احساس دلایا جائے کہ ایسی حرکتیں کر کے یہ اپنے ہاتھوں سے مسلمان ممالک کی ایک بہت بڑی تجارتی منڈی کھو دیں گے۔ یہ لوگ مالی مفاد کے لیے خود اپنوں کو بھی دغا سکتے ہیں۔ ایک بار..... صرف ایک بار ان لوگوں کے دل میں اس تجارتی خسارے کا خوف تو پیدا کر کے دیکھیں ..... اگر یہ خود گھٹنوں پر چل کر نہ آئے تو جو چور کی سزا وہ میری.....''

''پھر چاہے وہ خسارہ ان کی ویب سائٹس کے بائیکاٹ سے ہو یا صرف آپ کی ناشتے کی میز پر مکھن کی ایک ٹکیہ کی کمی سے انہیں بھگتنا پڑے۔ لیکن ہم میں سے ہر ایک کو اس خسارے کے لیے اپنا حصہ ڈالنا ہی ہوگا.....'' مجمع میں سے ایک جوشیلا نوجوان اُٹھا۔ ''لیکن ہم ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے .....؟ مسلمان یہ سب کچھ کیوں برداشت کر رہے ہیں .....؟'' شیخ الکریم نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ ''ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ..... اس میں یہ عمل بھی کسی جہاد اصغر سے کم نہیں ہے۔ اور جس جہاد کا تم ذکر کر رہے ہو اس کے لیے بھی اپنے اندر اس نظم وضبط کو پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ جس دن آپ سب اپنے کمپیوٹر کی سکرین اور ناشتے کی ٹیبل سے یہ جہاد اصغر شروع کر دیں گے آپ کا ہر گزرتا دن آپ کو اس جہاد اکبر کے قریب تر کر دے گا..... اپنی تربیت آپ کرنا سیکھیں۔ جو اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے ایمان کو آزمانے کی ہمت نہ کر سکیں وہ میدان میں آ کر اپنا زور بازو بھلا کیا آزمائیں گے.....؟

شیخ کا لیکچر ختم ہوا تو سارا مجمع سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی جب ہم بہت عرصے تک اپنے اندر کا آئینہ نہیں دیکھ پاتے تو اچانک باہر کسی کے دکھائے ہوئے آئینے پر نظر پڑتے ہی ہم خود اپنے آپ سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں ..... نظریں چرانے لگتے ہیں ..... آج وہاں مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوا سارا ہجوم بھی ایک دوسرے سے نظر ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

مسجد سے واپس نکلتے وقت شیخ الکریم نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''نئی ذمہ داری مبارک ہو ..... لیکن راہ بڑی دشوار ہے ..... ثابت قدم رہنا .....'' میں نے سر جھکا لیا۔ ''میں خود کو اس ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھتا۔ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے مجھے .....''۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور چلتے چلتے انہیں جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ ''ہاں ..... ہو سکے تو میرے ہوتے ہوئے یہاں آ کر نماز سیکھ جایا کرو ..... تین دن بعد میرا آخری لیکچر ہے اور ہفتہ بھر رہنے کے بعد میں مصر چلا جاؤں گا۔ جلد یا بدیر تمہیں یہ کمی پوری کرنا ہی ہوگی .....'' وہ میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

اگلے روز ڈین کے دفتر میں تمام کونسلرز کی پندرہ روزہ میٹنگ تھی۔ ڈین پابندی کا معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹ جانے پر کافی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ شمعون نے یہودی طلباء کی جانب سے آنے والے ہفتے کے روز اپنے کسی اسکالر کو ایک سیمینار میں دعوت دینے کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔ جارج نے پچھلے سیمسٹر کے دوران چند عیسائی طلباء کی غیر حاضریوں کا جرمانہ معاف کرنے کی درخواست کی۔ ڈین نے آدھا جرمانہ معاف کر دیا۔ اور میری جانب متوجہ ہوا۔ ''تمہارے پاس کوئی خاص معاملہ ہے مسلم کونسلر .....؟''۔ ''جی ہاں ..... آپ کے حکم نامے کی تعمیل میں تمام مسلم طلباء نے پڑھائی کے اوقات میں کیمپس سے باہر جانے کی پابندی قبول کر لی ہے۔ اور اب وہ کوئی جلسہ جلوس یا مظاہرہ بھی آپ کی اور انتظامیہ کی اجازت کے بغیر نہیں کریں گے''۔ تمام جیوری ممبران نے تعریفی انداز میں میری طرف دیکھا ..... ''لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے ..... اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس چھوٹی سے بات کے لیے میری اور آپ سب لوگوں کی یہ ساری محنت ضائع نہ ہو جائے .....'' ڈین پریشان ہو گیا۔ ''نہیں نہیں ..... ایسا نہیں ہونا چاہیے ..... تم بتاؤ کیسا مسئلہ ہے .....؟'' میں نے ترچھی نظر سے شمعون کی طرف دیکھا۔ ''اس پابندی کی وجہ سے مسلم طلباء کی ظہر کی نماز کا وقت بھی کیمپس میں ہی

گزرنے لگا ہے۔ ابھی تو ابتدائی دن ہیں لہٰذا وہ سب کسی نہ کسی طور نماز قضا کر رہے ہیں۔ لیکن کچھ دن گزرے تو یا تو وہ اس پابندی کے خلاف متحد ہو کر انتظامیہ کے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر دیں گے یا پھر پابندی توڑ کر نماز کے وقت کیمپس سے باہر جا کر کہیں اور نماز ادا کر آیا کریں گے۔ اور ایک مرتبہ اگر ان اسٹوڈنٹس نے پھر سے باہر ملنا جلنا شروع کر دیا تو ضرور بات ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی.....''

ڈین اور انتظامیہ نے پریشانی سے پہلو بدلے۔ شمعون اور جارج نے کڑی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ جیوری کے ایک ممبر نے مجھ سے پوچھا۔ ''تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے تمہارے پاس.....؟''۔ ''حل بہت آسان ہے..... ہمیں صرف ظہر کے وقت کے لیے مسلم طلبہ کو کیمپس میں نماز ادا کرنے کی اجازت دینی ہوگی۔ اس طرح ان کے دل میں یونیورسٹی انتظامیہ کے لیے وہ مخالفت کے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ جائیں گے جو عامر بن حبیب کی معطلی سے پیدا ہوئے ہیں۔''

شمعون تڑپ کر بولا۔ ''لیکن اس طرح سے تو یہودی اور عیسائی طلبہ کی مانگیں بھی بڑھ جائیں گی..... ہم انہیں کیا جواب دیں گے.....'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''یہودی طلباء صرف ہفتے کے روز عبادت کرتے ہیں اور عیسائی طلبہ صرف اتوار کے روز..... اوّل تو یہ دو دن یونیورسٹی بند رہتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلم طلباء کی طرح انہیں بھی یہ حق ملنا چاہیے..... لہٰذا ہمیں اُن سب کو اُن کے مقررہ اوقات جو کلاس ٹائمنگ کے دوران کیمپس میں گزارنا پڑیں، اس میں اپنی اپنی عبادت کی اجازت دے دینی چاہیے۔ سبھی کا دورانیہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ ہو.....'' ڈین اور جیوری ممبران آپس میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے اور پھر ڈین نے ہی اعلان کیا۔ ''ٹھیک ہے..... ہمیں مسلم کونسلر کی یہ تجویز منظور ہے.....'' شمعون نے احتجاجاً کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ڈین نے یونیورسٹی کے ''بہتر ماحول'' کی خاطر اس کا احتجاج مسترد کر دیا۔

ہم سب ڈین کے کمرے سے باہر نکلے تو شمعون نے قہر برساتی نظروں سے میری جانب دیکھا ''ٹھیک ہے..... یہ کھیل تم نے شروع کیا ہے..... لیکن اب اسے ختم میں کروں گا.....'' وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مسلم طلباء کو جب یونیورسٹی میں ظہر کی نماز کی اجازت ملی تو نمازی

لڑکوں نے خوشی سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ عامر بن حبیب اور بابر سیّدی نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ''بہت دنوں بعد یہ پہلی خوش خبری سننے کو ملی ہے..... اور وجہ تم ہو.....''

میں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے عامر بن حبیب کی جیب میں ڈال دیا۔ ''کل مجھے اپنے پہلے مسلم اسٹوڈنٹس کے اجلاس میں اعتماد کا ووٹ لینا ہے..... لیکن تم ہال میں آنے سے پہلے میرا یہ خط ضرور پڑھ لینا..... ہوسکتا ہے اسے پڑھنے کے بعد تمہارا ووٹ میرے خلاف ہو جائے۔'' میں عامر کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اگلے روز ہال نمبر 3 مسلم طلباء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج مجھے بطور مسلم کونسلر ان سب سے اعتماد کا ووٹ لینا تھا۔ احمر نے اسٹیج سیکرٹری کے طور پر اجلاس کا مقصد بیان کیا اور مجھے اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ پُروا کے ہاتھ میں مائیک تھا اور اس نے اعتماد کے ووٹ سے پہلے میرا تعارف اور ظہر کی نماز کی اجازت ملنے کو میری پہلی کامیابی کے طور پر بیان کیا تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ لیکن میں سب باتوں سے بے نیاز عامر بن حبیب کو طلباء کی نشستوں میں تلاش کر رہا تھا مگر ہر بار میری نظر ناکام لوٹ رہی تھی۔ بابر سیّدی تو پہلے ہی آ چکا تھا لیکن عامر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر ووٹنگ کا مرحلہ بھی آ گیا۔ احمر نے اسٹیج پر آ کر اعلان کیا کہ جو طلبہ میری کونسلر شپ کے حق میں ہیں وہ اپنا ہاتھ کھڑا کریں۔ اتنے میں دروازے کی جانب سے شمعون کی تیز آواز اُبھری۔

''ٹھہر جاؤ..... اس سے پہلے کہ تم لوگ اسے اپنا کونسلر بننے کا حتمی اجازت نامہ فراہم کر دو..... میرے پاس تم سب کے لیے ایک اطلاع ہے..... تمہارا یہ لیڈر آیان غدار ہے۔'' ہال میں ایک سناٹا سا چھا گیا اور سب کی نظریں مجھ پر گڑھ گئیں۔

باب8

بابر سیّدی نے زور سے چلا کر شمعون کو ہال سے نکل جانے کا کہا ''تم لوگ ہمیشہ ہمارے درمیان نفاق پیدا کرنے کی کوئی کوشش ضرور کرتے ہو۔ بہتر ہے تم خود ہی چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں اُٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔'' شمعون نے جیب سے چند کاغذ نکال کر ہوا میں لہرائے۔ ''تم لوگوں کی اسی جذباتیت نے ہمیشہ تمہیں ڈبویا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ کاغذ ضرور پڑھ لینا۔ میں نے تم لوگوں کی سہولت کے لیے اس کی بہت سی نقول تیار کروالی ہیں .....'' یہ اُس عہد نامے کی نقل تھی جس پر میں نے اور شمعون نے میری مسلم گروپ میں شمولیت کے وقت دستخط کیے تھے۔ مائیکل اور شمعون کے ساتھ آئے دوسرے لڑکوں نے پل بھر میں ہی وہ تمام نقول ہال میں موجود تمام طلباء کو بانٹ دیں اور اُسے پڑھ کر جیسے ہال میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ سب ایک دم چلانے اور شور مچانے لگے۔ آدھے طلباء میرے حق میں تھے کہ یہ سب کچھ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے اور آدھے اس عہد نامے کی وضاحت چاہتے تھے۔ آخر بابر سیّدی نے ہی سب سے پہلے چلا کر مجھ سے پوچھا۔ ''آخر یہ سب کیا ہے آیان .....تم خود کچھ بتاتے کیوں نہیں .....؟'' شمعون نے طنز سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ بھلا کیا بتائے گا۔ آج تک کسی مجرم نے اپنے جرم کا اقرار خود کیا ہے بھلا.....؟ لیکن میں تم لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ اسی نے تم لوگوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر تمہارے پچھلے کونسلر عامر بن حبیب سے اُس کی نشست چھینی ہے.....اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے یہ تم سب خوب جانتے ہو.....'' شمعون نے مجھ پر ایک طنزیہ مسکراہٹ اچھالی اور اپنے ساتھیوں سمیت واپسی کے لیے پلٹا۔ میں نے اُسے آواز دے کر

روک لیا۔

''ٹھہر جاؤ..... میرا انجام بھی دیکھتے جانا..... کیونکہ تم نے کہا تھا کہ اس کہانی کا خاتمہ بھی تمہارے ہاتھوں ہی ہوگا..... وہ گھڑی اب آن پہنچی ہے.....'' پُروا نے پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے آیان..... تم کہتے کیوں نہیں کہ یہ تمہیں بدنام کرنے کی ان کی ایک بھونڈی کوشش ہے کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے..... ہمیں تم پر پورا اعتبار ہے.....''

''نہیں..... شمعون ٹھیک کہہ رہا ہے..... میرا ان لوگوں سے عامر بن حبیب گروپ توڑنے کا معاہدہ ہوا تھا اور اس صلے میں انہوں نے میری اور بسام کی سیمسٹر فیس بھی بھری تھی۔ میں آج اس تمام ہال کے شرکاء کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں.....'' میری بات سن کر پُروا تو گنگ ہو کر سکتے میں آ گئی جبکہ دوسری جانب غصے اور قہر کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ بابر سیّدی اور احمر تو صدمے کے مارے اپنی نشستوں پر ہی ڈھے سے گئے جبکہ بنگالی شکیل نے چلا کر کہا۔ ''اس غداری کے صلے میں ہم تمہیں عبرت کا نشان بنا دیں گے..... تا کہ آئندہ کسی کو ہمارے جذبات سے کھیلنے کی ہمت نہ ہو.....'' ہال میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا اور قریب تھا کہ لڑکے اسٹیج پر چڑھ آتے کہ اچانک کہیں سے عامر بن حبیب کی گرجدار آواز گونجی ''رُک جاؤ..... یہ میرا حکم ہے.....'' ہال میں دھیرے دھیرے خاموشی چھا گئی۔ عامر ہال کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں میرا کل شام کا تھمایا ہوا خط لہرا رہا تھا۔ احمر نے چلا کر عامر سے کہا۔ ''تم نہیں جانتے عامر..... اس آیان نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔''

''..... یہ غدار ہے.....'' عامر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں آیان نے کل شام ہی سب کچھ لکھ کر مجھے بتا دیا تھا اور مجھ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اگر میں یہ سب پڑھنے کے بعد تم لوگوں کو اُسے اعتماد کا ووٹ دینے سے روکنا چاہوں تو تم لوگوں کو اس اجلاس سے پہلے ہی منع کر دوں۔ میں کل رات سے آیان کا یہ خط درجنوں بار پڑھ چکا ہوں لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے میں مجھے اتنا وقت آج سے پہلے کبھی نہیں لگا..... اسی لیے مجھے آنے میں کچھ دیر ہو گئی.....''

سب لڑکے حیرت سے عامر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ عامر بن حبیب نے میرا خط کھولا اور

سب کے سامنے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہال میں گہرا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ جب تک تم میرے لکھے ہوئے یہ لفظ ختم کرو گے۔ تب تک تمہارے اندر میرے لیے بسی ہوئی دنیا مکمل تبدیل ہو چکی ہو گی۔ کل مجھے مسلم طلباء سے اعتماد کا ووٹ لینا ہے اس لیے آج تمہیں اس بات سے آگاہ کر رہا ہوں کہ میں کس نیت سے مسلم طلباء کی جماعت میں شامل ہوا تھا۔ میری مجبوری چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن اس سے میرے جرم کی نوعیت کم نہیں ہو سکتی۔ مجھے شمعون اور مائیکل نے تمہارا گروپ توڑنے کے لیے باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت اس شمولیت پر آمادہ کیا تھا۔ اور مجھے اپنا کام ختم کر کے واپس لوٹ جانا تھا۔

لیکن قسمت ہمیشہ ہمارے ارادوں کے مخالف سمت کی لکیر ہماری ہتھیلیوں پر اُبھارتی ہے۔ تمہارا گروپ تو نہ ٹوٹا، البتہ تمہاری کونسلر شپ ختم ہو گئی اور تم لوگوں نے مجھے اس عہدے کے لیے نامزد کر دیا۔ تمہاری اور بابر سیّدی کی بسام کے حق میں نکالی گئی ریلی نے میرا اندر بھی تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ میں ہمیشہ تم سب کو ایک جذباتی گروہ سمجھتا رہا لیکن جب آگ میرے گھر تک پہنچی تو مجھے ان جذبات کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے یہ عہدہ ایک کفارے کے طور پر ہی قبول کیا تھا اور میرا اصل کفارہ اب شروع ہو گا لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے حتمی چناؤ کے ووٹ سے پہلے میرے ماضی کا نہ صرف علم ہو بلکہ تم اپنے تمام گروپ کو بھی میرے اس دوھرے کردار کی حقیقت سے آگاہ کر دو۔ ہاں اگر اُس کے بعد بھی تم لوگوں کا مجھ پر ذرہ برابر اعتبار باقی رہ جائے تو اس بات کا یقین رکھ کر مجھے یہ ذمہ داری سونپنا کہ میں اس کفارے اور اپنے دامن پر لگے دھبے کو مٹانے کے لیے ہر حد سے گزر سکتا ہوں.....

تم سب کا قصوروار.....آیان۔

عامر بن حبیب نے خط تہہ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا لیکن اس کے چپ ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک ہال میں کوئی کچھ نہ بول سکا۔ پھر عامر نے ہی کھنکار کر سب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''یہ خط آیان نے کل شام مجھے دیا تھا اور میں کل رات سے ہی اس کشمکش میں مبتلا ہوں کہ میں ایک شخص کے ماضی کی جرم کی سزا سناؤں یا اُسی کے ہاتھ میں اپنے حال اور مستقبل کی ڈور تھما دوں۔ دماغ کہتا

تھا کہ ایک بار ٹھوکر کھانے کے بعد دوبارہ اسی پر اعتماد کرنا حماقت ہوگی کہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا ہے..... لیکن دل کہتا تھا کہ میرا رب انسانوں کی کایا بھی تو پلٹ دیتا ہے۔ اور اگر ایسا ہو چکا ہے تو ہم ایک انسان کو سچ کے راستے پر چلنے سے پہلے ہی کہیں دوبارہ بھٹکا نہ دیں ..... لیکن ساری رات اپنا دل و دماغ جلانے کے باوجود میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس لیے میں آج یہ فیصلہ آپ سب پر چھوڑتا ہوں کیونکہ میں نے ہمیشہ دماغ پر اپنے دل کے فیصلوں کو ترجیح دی ہے ..... آیان کے بارے میں بھی میں اپنے دل کی ہی ماننا چاہتا تھا لیکن یہ صرف میرا معاملہ نہیں۔ لہٰذا آپ سب کا بھی اس فیصلے میں شریک ہونا بہت ضروری ہے .....''۔ عامر اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گیا۔ شمعون اور مائیکل پہلے ہی ہال سے جا چکے تھے۔ میں نے سوچ میں گھرے ہال کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں نے خود کو ہر سزا کے لیے پیش کر دیا ہے۔ میں چاہتا تو شمعون کے بانٹے ہوئے اس کاغذ سے مکر بھی سکتا تھا۔ آج کل کسی کے دستخط کی نقل بنا لینا کچھ مشکل نہیں ..... اور میں یہ بہانہ بھی کر سکتا تھا کیونکہ پورے عہدنامے پر صرف میرے ایک دستخط ہی تو ہیں۔ تم سب میری بات پر یقین کرنے میں کوئی تامل بھی نہ کرتے کیونکہ شمعون کے مقابلے میں، مَیں بہرحال تم سب کی نظر میں زیادہ معتبر تھا۔ لیکن میں نے آج یہ سچ بتانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اب فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ مجھے جو بھی سزا سنائی جائے گی مجھے قبول ہوگی۔ ہاں لیکن اگر مجھ پر یقین کرنے کو جی چاہے تو دل سے ہر شبہ، ہر دھڑکا نکال کر پورا یقین کرنا..... کیونکہ ادھورا یقین پورے شک سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مجھے تم سب کے فیصلے کا انتظار رہے گا.....''۔ میں ان سب کو سوچوں کے بھنور میں ڈوبا چھوڑ کر ہال سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی راہداری میں ایرک، جم، فرہاد اور جینی تیزی سے میری جانب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں سے شدید پریشانی ٹپک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب لپکے۔ فرہاد نے جلدی سے میرا بدن ٹٹولا۔ ''تم ٹھیک تو ہو نا.....؟ ہمیں پتا چلا کہ تم پر عامر بن حبیب کے ساتھیوں نے حملہ کیا ہے.....'' ایرک اور جم بھی شدید غصے میں تھے۔ ''تم صرف نام بتاؤ اُن کے ..... ہم ابھی زندہ ہیں آیان .....'' جینی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے دوبارہ ہال کی جانب کھینچا۔ ''تم چلو ہمارے ساتھ ..... دیکھتے ہیں کس میں ہمت ہے، تمہیں چھو کر تو دکھائے .....'' میری آنکھیں بھر آئیں، دل تو جانے کب سے بھرا ہوا تھا۔ میں جانتا

تھا وہ چاروں میرے لیے چار سو سے بھی بھڑ سکتے تھے۔ ''میں ٹھیک ہوں ..... کچھ نہیں ہوا مجھے .....''۔ فرہاد چلایا۔ ''لیکن ہم اُن لوگوں کو اُن کے کیے کی سزا ضرور دیں گے .....'' میں نے ہال کی طرف جاتے ہوئے فرہاد کی کلائی پکڑ لی۔ ''نہیں ..... اس بار سزا دینے کا اختیار اُن لوگوں کا ہے چلو تم لوگ میرے ساتھ .....'' میں آگے بڑھ گیا اور وہ چاروں بھی بادل نخواستہ میرے پیچھے چل پڑے۔

پھر میں زیادہ دیر کیمپس میں نہیں ٹھہرا۔ مجھے بسام سے ملنے کے لیے بھی جانا تھا اور جب لاک اَپ پہنچا تو ملاقات کے ٹائم میں صرف دس منٹ باقی بچے تھے۔ بسام بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ''کہاں رہ گئے تھے ..... آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے ..... سب ٹھیک تو ہے نا .....؟'' میں نے بسام کو آج کی رُوداد سنا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ''ہاں سب ٹھیک ہے ..... دو دن بعد تمہاری پیشی ہے ..... میں تمہارے لیے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرنا .....'' بسام کے ہونٹوں پر ایک شکستہ سی مسکراہٹ اُبھری۔ ''نہیں انو ..... اب میں نے فکر کرنا چھوڑ دی ہے ..... بس تم اپنا خیال رکھنا .....''۔ بسام کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں اتنی مایوسی تھی کہ میرے اندر کا رواں رواں چھل سا گیا۔ ''ایسے کیوں کہہ رہے ہو .....؟ میں تمہیں ان دیواروں کے پیچھے زیادہ دن قید نہیں رہنے دوں گا۔ اور یہ بھی غور سے سن لو کہ میں اپنا خیال بالکل بھی نہیں رکھوں گا۔ تمہی کو باہر نکل کر میرا خیال رکھنا ہوگا۔ تم جانتے ہو مجھے اپنا خیال رکھنے کی بالکل عادت نہیں ہے .....'' بسام نے کچھ نہیں کہا۔ بس چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔

جب بچپن میں چھٹی کے بعد دیر گئے اسکول خالی ہو جانے پر بھی ڈیڈی ہمیں لینے کے لیے نہ آتے تو ہم دونوں بھائی خوف کے مارے اسی طرح بڑے میدان میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر تب تک بیٹھے رہتے جب تک کوئی آ کر ہمیں وہاں سے گھر نہیں لے جاتا تھا۔ لیکن آج ہم دونوں کو پیار کر کے گھر لے جانے والے ممی ڈیڈی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ آج ان کے دونوں لاڈلے اُسی طرح خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس شام ہمیں وہاں سے لے جانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔

میں بسام کو جھوٹی تسلی دے کر باہر نکلا تو ستمبر کی اداس شام ڈھل رہی تھی۔ ان شاموں کو جانے ہمارے اندر کے موسم کی خبر کیسے ہو جاتی ہے .....؟ جیسا سرمئی اندھیرا ہمارے اندر اُتر رہا ہوتا

ہے ٹھیک ویسا ہی روپ باہر کا افق بھی دھار لیتا ہے۔ اور پھر ہمارے اندر اور باہر ایک ہی وقت میں روشنی کی آخری کرن بھی ڈوب جاتی ہے۔ میں اُسی اندھیرے میں اپنا آپ ٹٹولتا، بائیک نیو یارک کی مصنوعی روشنیوں سے بھری سڑکوں پر دوڑاتا ہوا مین ہیٹن میں کھیل کا انتظام کرنے والے نیگروز کے اپارٹمنٹ کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ سب اپارٹمنٹ کے پکے فرش پر بنے کورٹ میں باسکٹ بال کھیل رہے تھے، آس پاس گلی کی روشن لائٹس نے ایک دائرہ سا بنا رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کا لیڈر کیلی kelly چلایا۔ ''ہے آیان ..... کہاں ہو مین man ..... ہمیں بھول گئے ہو کیا .....؟'' نہیں ..... تمہیں یہ یاد دلانے کے لیے آیا ہوں کہ میرے پرانے زخم بھر چلے ہیں اور میں اب پھر سے کھیلنے کے لیے تیار ہوں۔'' کیلی خوش ہوگیا۔ ''یہ ہوئی نا بات ..... لیکن میرا کچھ پرانا ادھار بھی باقی ہے تم پر .....''۔ ''ہاں ..... مجھے یاد ہے میرا میچ ڈلوا دو تم کے ساتھ ..... جیت گیا تو سارا اُدھار کل رات ہی چکا دوں گا .....'' کیلی ہنسا ''اور اگر ہار گئے تو .....''۔ ''تو بدلے میں تم مجھ سے کوئی بھی بانڈ بھروالینا۔ میں اگلے دس میچ تمہاری جانب سے بلا معاوضہ کھیلنے کے لیے بھی تیار ہوں ..... اور تم جانتے ہو کہ میں اپنے وعدے کا پکا ہوں .....''۔ کیلی نے سر ہلایا۔ ''ہاں ..... خیر اس میں تو مجھے کوئی شک نہیں ..... لیکن تم کے ساتھ ہی کیوں کھیلنا چاہتے ہو .....؟ وہ پہلے بھی تمہیں ہرا چکا ہے اور اس وقت وہ نیویارک کا بہترین رائیڈر ہے ..... خوامخواہ اپنی جان کو مصیبت میں نہ ڈالو ..... وہاں جیتنے کے چانسز سو میں سے دس فیصد بھی نہیں ہیں .....''۔ ''اسی لیے میں اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں ..... اُس سے جیتنے کی صورت میں رقم بھی دس کے مقابلے میں 100 فیصد زیادہ ملے گی .....''۔ کیلی نے کندھے اُچکائے۔ ''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی ..... کل رات 10 بجے تک پہنچ جانا ہمارے پرانے ٹھکانے پر .....''۔ میں نے سر ہلا کر بائیک کا ایکسی لیٹر دبا دیا۔ میرے پاس بسام کے لیے نئے وکیل کی فیس جمع کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اب چاہیے انجام تخت ہوتا یا تختہ ..... مجھے یہ بازی کھیلنا تھی۔ واپسی پر ٹائم اسکوائر کے مشہور کیفے کے باہر میں نے لوگوں کو کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیاں کرتے دیکھا تو ان کی خوش نصیبی پر رشک آنے لگا۔ ہم انسان بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ جب ہمارے پاس فرصت اور خوشی کے لمحات ہوتے ہیں تو ہم انہیں کھل کر جینے کے بجائے مستقبل کی اُلجھنوں میں خود کو کھپائے رکھتے ہیں اور جب وہی

مستقبل حال بن کر ہم پر کسی نئے عذاب کی صورت کھلتا ہے تو ہم بیٹھ کر اس سنہرے ماضی کی یاد میں آہیں بھرتے اور خود کو کوستے رہتے ہیں کہ کتنا اچھا وقت ہم نے یونہی ضائع کر ڈال۔ شاید انسان کا مستقبل سدا ہی سے دھندلا، حال ہمہ وقت بے کیف و بے چین اور ماضی ہمیشہ دل فریب رہا ہے.....

اگلے روز میرا یونیورسٹی جانے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن میں یہ سوچ کر چلا آیا کہ کہیں اسے کسی فرار کے طور پر نہ لیا جائے۔ کاش انہیں کوئی بتاتا کہ اب میرا اصل فرار ان سب کے درمیان میری موجودگی ہی ہے ..... ورنہ تنہائی تو مجھے اب کسی بُرے خواب کی طرح ڈرانے لگی تھی۔ اس روز صبح سویرے سے ہی یخ بستہ ہوائیں نیویارک کی بھرپور خزاں کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں اور ہماری یونیورسٹی کی طرف جانے والی سنسان سڑک زرد اور پیلے پتوں سے یوں ڈھکی ہوئی تھی جیسے کسی نے سونے کے پانی سے بھرے کئی تھال وہاں اُلٹ دیئے ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی اور شاخوں پر جھولتے وہ خشک پتے جنہیں تیز ہوا بھی گرا نہیں پائی تھی۔ بوندوں کی سازش کی وجہ سے اپنی محبوب ٹہنیوں کی بانہوں سے چھوٹ کر زمین پر گرنے لگے۔ فنا اور جدائی ہی دنیا کے ہر رشتے کا حاصل ہے۔

کیفے میں مجھے اپنے دوستوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میرا کلاس لینے کو بالکل بھی من نہیں تھا لہٰذا میں اسٹیڈیم کی بھیگی ہوئی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گیا۔ آج اسٹیڈیم بھی ابھی تک خالی تھا اور تیز بوندا باندی کی وجہ سے اسٹیڈیم کی خزاں سے خشک ہوتی ہوئی سنہری گھاس ایک مخملی قالین کی طرح لگ رہی تھی جس پر بہت سے چاندی کے موتی ٹانکے گئے ہوں۔

میں اپنے خیالوں میں گم جانے کتنی دیر تک بارش کے قطروں کو گھاس کا سنگھار کرتے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی ایک مانوس سی خوشبو اور جانی پہچانی سی قدموں کی آہٹ نے مجھے سر اُٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پُروا ہی تھی۔ سفید جینز پر کالی شال لپیٹے، اُداس اور نڈھال سی ..... کچھ لڑکیاں اُداس ہو کر زیادہ حسین کیوں ہو جاتی ہیں؟ یا شاید ان کا اصل ''انداز حسن'' اُداسی کی ہی دین ہوتا ہوگا.....؟ شاید کچھ چہرے خوشی یا عام معمول کے حالات میں وہ زاویے اختیار نہیں کر پاتے جس سے اُن کا اصل حسن جھلک سکے.....؟ گویا ہم اپنی زندگی میں اپنے آس پاس بہت سے لوگوں کی اصل خوب صورتی کو

اپنی نظر سے نہار ہی نہیں پاتے.....؟ اور کون جانے اس فہرست میں اوّل نمبر پر..... ہمارے کمرے میں لگے آئینے کے اندر بیٹھا شخص خود ہی ہو.....؟

''یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو آیان.....؟ تمہارے دوست کہاں ہے.....؟''

''شاید وہ سب کلاس میں ہوں گے..... کچھ دیر تنہا بیٹھنے کو دل چاہ رہا تھا اس لیے یہاں چلا آیا.....''

پُروا کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''جانتے ہو..... میں کل سے کئی بار ٹوٹی اور پھر ٹوٹ کر جڑی ہوں۔ میرے اندر شکست و ریخت کے اس مسلسل عمل نے مجھے ایک رات میں ہی برسوں کی تھکن عطا کر دی ہے۔ تم تو اپنا اعتراف جرم کر کے سکون سے چلے گئے تھے لیکن مجھے ایک عذاب میں ڈال گئے..... بولو آیان..... میں کس سے یہ فریاد کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں تم سے خوب جھگڑا کروں..... اتنا لڑوں کہ میرے اندر کا سارا غبار نکل جائے..... لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ایسا کر نہیں پا رہی..... تم نے مجھ سے میرا اپنا آپ بھی چھین لیا ہے آیان.....، برا کیا تم نے..... بہت بُرا کیا.....''

پُروا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا دل چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس کی پلکوں کے یہ ستارے اپنی ہتھیلی کے چاند میں جذب کر لوں اور اس کی بھیگی آنکھیں پونچھ کر اس سے یہ کہوں کہ موتیوں کا یہ خزانہ وہ مجھ جیسے ضمیر کے مجرم کے لیے ضائع نہ کرے..... کہ ایک خلقت انہیں چننے کے لیے اپنی ہتھیلیاں دعا کے انداز میں اُٹھائے بیٹھی ہوگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ہاں..... جانتا ہوں کہ میں نے بہت بُرا کیا..... لیکن ایک بُرے سے برائی کی توقع ہی کی جا سکتی ہے پُروا..... تم آئندہ کبھی بھی کسی بُرے سے کسی اچھائی کی توقع نہ رکھنا۔ امیدیں ٹوٹ جائیں تو واقعی بڑا درد ہوتا ہے..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا.....'' پُروا نے تڑپ کر اپنی پلکیں اُٹھائیں۔ اس کی پلک پر ٹنگا ایک ننھا سا آنسو ٹپک کر اس کے سردی سے نیلے پڑتے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ ''کاش میرا دل تمہیں مجرم مان کر مجھے اُس مقام تک تو لاتا جہاں میں تمہیں معاف کرنے کا سوچ پاتی۔ میرا دل تو مجھے تمہارے جرم کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہا..... مجھ سے غداری پر اُتر آیا ہے اور میری ایک نہیں سنتا..... شاید مجھے تم سے محبت ہو رہی ہے آیان.....''

تیز ہوا کے ایک بھیگے جھونکے نے پُروا کے چہرے پر بال بکھرا دیئے۔ میں زور سے چونکا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں ..... خدا کے لیے اپنے آپ کو اس عذاب میں مت دھکیلو..... یہ تمہاری روح کا آخری ریشہ بھی اُدھیڑ کر تمہارے جسم کو نیلا کر دے گا..... محبت کے زہر کا کوئی تریاق نہیں ہوتا کیونکہ یہ جسم میں نہیں، روح کی رگوں میں تحلیل ہو کر انسان کی جان لیے لیتا ہے.....''

پُروا سر جھکائے بیٹھی رہی ''جانتی ہوں ..... پر افسوس ہمیں اپنی روح کی دھیرے دھیرے ہوتی قضا کا بہت دیر سے پتہ چلتا ہے..... مجھے بھی بہت دیر ہو چکی ہے آیان ..... اب میرا بچنا مشکل ہے.....''

اتنے میں میرے عقب سے بابر سیّدی کی تیز آواز ابھری ..... ''اچھا تو تم یہاں بیٹھے ہو..... کب تک اپنی سزا سے بچو گے مسٹر آیان.....''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بابر سیّدی کے ساتھ عامر بن حبیب اور دوسرے بہت سے مسلم طلباء اسٹیڈیم کے گیٹ نمبر 7 سے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ ''میں اپنی سزا کے انتظار میں ہی یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ پھانسی کے قیدی کو سولی پر زیادہ انتظار نہیں کروایا جاتا۔ اپنا فیصلہ سناؤ.....'' پُروا بھی گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ عامر بن حبیب اور بابر سیّدی باقی سب لڑکوں کے ساتھ میری جانب بڑھے۔ عامر اور بابر میرے بالکل مقابل آن کھڑے ہوئے اور کچھ دیر تک ہم تینوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ عامر بولا۔ ''سزا تو ہم نے تمہارے لیے بہت کڑی تجویز کی ہے لیکن ہم تمہیں اپیل کا حق بھی دینا چاہتے ہیں۔ تم چاہو تو سزا میں کمی کے لیے اپیل کر سکتے ہو.....'' میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''جو پہلے ہی سے فنا ہو چکے ہوں ..... انہیں دوبارہ آتی موت کا بھلا کیا غم..... تم آخری حد کی سزا سناؤ..... میں اپیل کر کے وقت ضائع نہیں کروں گا.....'' عامر بن حبیب نے بابر سیّدی کی جانب دیکھا۔ بابر ایک قدم آگے بڑھا۔ ''تو پھر سنو..... ہم نے تمام مسلم طلباء کی ذمہ داری کی سزا تمہارے لیے تجویز کی ہے..... تمہیں بطور مسلم کونسلر ان سب کا خیال رکھنا ہوگا اور ہر مرحلے پر اپنے تن، من اور روح کی آخری گہرائی سے ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھنا ہوگا۔ بولو..... ایک سال کی یہ سزا قبول

ہے تمہیں .....؟'' میں گنگ سا کھڑا تھا۔ اور پھر اچانک میری آنکھوں سے کفارے کے دو آنسو ٹپک کر نیچے زمین پر بارش کے پانی میں مل گئے۔ کاش کفارے کے لیے بہائے گئے آنسوؤں کا رنگ عام بہتے آنسوؤں سے کچھ مختلف ہوتا تو شاید بہت سی باتیں ان کہی اور بہت سے لفظ بچ جاتے ..... عامر بن حبیب نے گھبرا کر کہا۔ ''ارے ..... یہ کیا ..... اتنا بہادر لڑکا یوں رو رہا ہے ..... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا.....''۔ عامر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پھر وہاں موجود سبھی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور میں جب رویا تو یوں ٹوٹ کر رویا کہ کئی جنموں کا قرض ادا ہو گیا۔ وہ سبھی مجھے تھپکیاں اور دلاسے دیتے رہے۔ پُروا جو پہلے یہ بے حد گھائل تھی۔ اپنے آنسو اُن سب سے چھپا نہیں پائی اور پھر وہ وہاں نہ رُک سکی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی اسٹیڈیم سے باہر نکل گئی۔ بابر نے میرے شانوں کو پکڑ کر مجھے سیدھا کھڑا کیا اور اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھ ڈالے۔ ''اچھا کیا تم آج جی بھر کر رو لیے ..... لیکن اب یہ آنسو میں اُن کی آنکھوں میں دیکھنا پسند کروں گا جنہوں نے ہم سب کو رُلایا ہے تم ہی ہماری آخری امید ہو آیان ..... خدا تمہاری مدد کرے .....''

کچھ ہی دیر میں تمام یونیورسٹی میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ مسلم طلباء نے مجھے بطور اپنا مسلم کونسلر کنفرم کر دیا ہے اور انتظامیہ کو بھی قاعدے کے مطابق اطلاع کر دی گئی۔ شام تک بے حد مصروفیت رہی لیکن مجھے یاد تھا کہ آج رات مجھے ٹم کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے بسام کی رہائی کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت تھی لہٰذا میں ٹھیک وقت پر رات دس بجے مین ہیٹن کی اُس سنسان گلی میں پہنچ چکا تھا جہاں آج وہ آخری بازی کھیلی جانی تھی۔ گلی میں نیگروز اور دوسرے کھلاڑیوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ آج ان کے چیمپئن ٹم کا مقابلہ مجھ سے ہونا تھا۔ کیلی kelly نے ایک بار پھر مجھ سے پوچھا کہ میں مقابلے کے لیے تیار ہوں اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں ٹم بھی اپنی سپر بائیک پر گلی میں داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ایک دوسرے سے ٹکرائی۔ اور پھر ٹم سے ہوتی ہوئی میری نظر ٹم کی بائیک پر جم کر رہ گئیں۔ ایک نئی پریشانی میری منتظر تھی۔

باب9

ٹم Tim نے اپنی بائیک کو ڈبل سائیلنسر کروالیا تھا۔ یعنی اب اس کی بائیک پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو چکی تھی۔ ٹم نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ''کیوں پھر اپنی جان جوکھم میں ڈالنے آ گئے ہولڑ کے .....؟ سچ مانو تو اب تمہیں ہرانے کو جی نہیں چاہتا ..... اب بھی وقت ہے ..... میرے مقابل فہرست سے اپنا نام واپس لے لو .....'' میں اپنی جگہ جما رہا ..... ٹم نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں دیکھ رہا ہوں تمہاری بائیک ..... وہی پرانی ہے ..... جبکہ میں نے اپنی بائیک میں نئے پاور سائلنسر بھی لگوا لیے ہیں ..... یہ تو برابر کا مقابلہ نہ ہوا .....'' میں نے اطمینان سے ٹم کو جواب دیا۔ ''تم نے اُس دن خود ہی تو کہا تھا کہ مقابلہ جیتنے کے لیے صرف مشین کا نیا ہونا ہی آخری وجہ نہیں ہوتی ..... اور بھی کچھ سوا چاہیے ہوتا ہے ..... آج میں صرف اپنی بائیک کے بل پر یہ مقابلہ لڑنے نہیں آیا ہوں ..... کچھ اور بھی ہے جو مجھے اکسا رہا ہے .....''

ٹم نے غور سے میری جانب دیکھا ''ٹھیک ہے ..... جیسے تمہاری مرضی لیکن ہار جاؤ تو پھر کوئی بہانہ نہ کرنا ..... جیت کا مزہ کِرکرا ہو جاتا ہے''۔ ''بے فکر رہو ..... مجھے بہانے بازی کی عادت نہیں ہے ..... چاہے جیت ہو یا ہار ..... مکمل اور بھرپور ہوگی .....'' ٹم Tim اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا۔ ہم آج اُسی پرانی گلی کے کشادہ حصے میں ایک بار پھر جمع ہوئے تھے جہاں آگے چل کر یہ گلی آدھی رہ جاتی تھی۔ کھیل کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ اور گلی کے تنگ دھانے کو آج ایک دروازے کے آدھے پٹ سے نصف بند کیا گیا تھا۔ آخری اشارہ ہونے سے پہلے نیگرو کیلی kelly میرے پاس آیا۔ وہ کچھ

پریشان تھا۔ ''ہے (HEY) آیان .....تم نے شاید ٹم کی بائیک نہیں دیکھی۔ وہ تمہاری بائیک کی دوگنی رفتار سے بھی تیز دوڑ سکتی ہے.....''۔ ''جانتا ہوں .....لیکن گلی کا تنگ دھانہ شروع ہونے سے پہلے وہ جس آخری حد رفتار تک اپنی بائیک پر کنٹرول قائم رکھ سکتا ہے۔ اتنی تیز میری بائیک بھی بھاگ سکتی ہے مجھے صرف گلی تنگ ہونے کی حد تک ٹم کے ساتھ پوری رفتار سے اپنی بائیک دوڑانی ہو گی جس میں میری بائیک کے کنٹرول سے نکل جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے کیونکہ میری بائیک پوری رفتار سے دوڑ رہی ہوگی جبکہ ٹم کے پاس اُس کی بائیک کی آدھی رفتار ابھی باقی ہوگی لہٰذا وہ اپنی بائیک پر مکمل کنٹرول رکھ سکے گا۔ ہاں .....البتہ ایک بار ہم دونوں گلی کے تنگ حصے میں داخل ہوگئے تو وہاں صرف انہیں بیس کا ہی فرق رہ جائے گا۔ اور جو اُنیس رہ گیا وہ دوڑ ہار جائے گا.....''۔ کیلی نے اپنے ہاتھ سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ''خداوند تم پر رحم کرے .....تم جان بوجھ کر خودکشی کر رہے ہو کیونکہ آج تک میں نے تو کسی کی پوری رفتار سے بھاگتی ایک بے قابو بائیک کو بنا ٹکرائے اس تنگ سرنگ میں جاتے دیکھا تو نہیں ہے.....اور ٹکرانے کے بعد اُن رائیڈرز کا کیا حال ہوتا ہے یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔''

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''کیلی .....تم خدا پر یقین کرتے ہو.....؟'' کیلی نے جلدی سے سر ہلایا۔ ''ہاں .....ایسے موقعوں پر تو بس ایک اُسی کا یقین باقی رہ جاتا ہے.....'' میں بائیک پر بیٹھ گیا۔ تو بس یوں سمجھ لو کہ آج میں بھی اپنے اللہ کے بھروسے اور تو کل یہاں اس گلی میں کھڑا ہوں ..... اور سنو..... بسام جیل میں ہے..... اگر مجھے کچھ ہو جائے تو اُسے خبر نہ کرنا..... ایرک اور جم کو اطلاع دے دینا.....سمجھ گئے نا.....'' کیلی نے جلدی سے سر ہلایا کیونکہ ٹم اپنی بائیک کو بار بار ریس دے کر مقابلہ شروع کرنے کی ضد کر رہا تھا۔

اُلٹی گنتی شروع ہوگئی۔ تین ، دو ..... ایک.....۔ اور ہم کمان سے نکلے ہوئے دو تیروں کی طرح گولی کی رفتار سے دوڑتی اور غراتی ہوئی بائیکس پر سوار اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھے۔ گلی کے کھلے حصے سے تنگ حصے تک کا فاصلہ تقریباً ایک ہزار گز اور اتنا ہی فاصلہ تنگ گلی سے باہر نکلتے دروازے تک کا تھا۔ میں نے پانچ لمحوں میں ہی بائیک کا ایکسی لیٹر پوری قوت سے دبائے رکھتے ہوئے بائیک کو پانچویں گیئر میں ڈال دیا تا کہ میں اس کی پوری رفتار حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکوں۔

لیکن ٹم کے پاس اپنی بائیک کی ابھی آدھی رفتار باقی تھی۔ اس لیے وہ بنا کوئی خطرہ لیے اپنی بائیک کو قابو میں رکھ کر بھی میری بائیک جتنی رفتار حاصل کر سکتا تھا۔

پہلے ہزار گز کے لیے ہماری رفتار پہلے ہی انتہا سے زیادہ تھی۔ اس بار میرے اندر وہ کلر انسٹنکٹ Killer instinct پہلے لمحے میں ہی اپنی پوری قوت سے جاگ چکی تھی۔ دوسرے کو کچل کر آگے بڑھنے کا جذبہ..... اپنی جیت کے لیے دوسرے کو مسلنے اور برباد کرنے کے لیے پوری قوت لگا دینے کا شاید کوئی اپنا ہی نشہ ہوتا ہے۔ اور یہی نشہ ہمیں ہر خطرے کی فکر سے آزاد کر دیتا ہے۔ میں بھی ان لمحوں میں ہر ڈر ہر خطرے سے آزاد ہو چکا تھا۔ ٹم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ گلیڈیئٹرز اگر کٹہرے میں چھوڑے جانے والے شیر کے گھائل ہونے کی فکر میں پڑ جائے تو پھر میدان سے اُن کی ادھڑی ہوئی لاش ہی باہر جاتی..... اس وقت مجھ اور ٹم میں سے بھی کوئی ایک وہ گلیڈیئٹر تھا اور دوسرا کٹہرے میں اُترا ایک بھوکا آدم خور شہر..... اب ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہی فاتح واپس لوٹنا تھا۔ گلی کا تنگ دھانہ تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ ٹم کی شروع میں کی گئی ذرا سی احتیاط اور میری ابتداء سے ہی ہر حد کو پار کر دینے کی کوشش نے ہم دونوں کی بائیکس کو اب تک تقریباً ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹم مجھ سے چند سینٹی میٹر آگے تھا اور یہ چند سینٹی میٹر بھی میرے لیے میلوں جیسے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر ٹم کی بائیک کو ایک طرف دبائے رکھنے کے لیے اپنی بائیک کو خطرے کی حد سے زیادہ ترچھا جھکا دیا۔ اس صورت میں اگر ایک چیونٹی برابر کنکر بھی میری بائیک کے پہیے کے نیچے آ جاتا تو میں پھسل کر نہ جانے کتنی قلابازیاں کھاتا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا..... ٹم نے چلا کر مجھے خبردار کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میں اُسے گلی میں ان چند سینٹی میٹرز کی برتری کے ساتھ داخل ہوتے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ٹم کو مجبوراً خود کو میری بائیک سے کچھ فاصلے پر رکھنا پڑا..... نتیجہ ہم دونوں ایک ساتھ تنگ گلی کی سرنگ میں داخل ہو گئے۔ آس پاس قطاروں میں کھڑے تماشائی لڑکوں کے شور سے فضا گونج رہی تھی۔ مجھے کہیں دور سے کیلی کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاباش لڑکے..... مارو یا مر جاؤ..... تم ایسا کر سکتے ہو.....''۔

لیکن اب ٹم کی تمام حسیات بھی جاگ چکی تھیں۔ اُسے پتا چل گیا تھا کہ اس بار اُس کا مقابلہ صرف ایک بائیک سے نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مدمقابل اس بائیک کا سوار ہے۔ اور شاید دنیا کی ہر

جنگ کا سب سے بڑا اصول اور راز بھی یہی ہے کہ جنگ ہمیشہ حریف کے حوصلے اور اس کے اندر کے انسان کی صلاحیت سے لڑی جاتی ہے۔ ہتھیار اور اوزار ایک اضافی طاقت تو ہو سکتے ہیں لیکن کسی بھی جنگ کی فتح کی ضمانت ہرگز نہیں ..... شاید اسی لیے دشمن کو کبھی کمزور نہ سمجھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ انسان سے بڑا اوزار اور اس کے حوصلے سے بڑا ہتھیار بھلا اور کیا ہوگا؟

میں اور ٹم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سرنگ کے دھانے سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت ہماری بائیکس تقریباً ایک دوسرے میں اُلجھی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ میرا ترچھا ہینڈل ٹم کی بائیک کی ہیڈ لائٹ کو چھو رہا تھا اور ٹم کی بائیک کا جھکاؤ دونوں بائیکس کے ٹینکس Tanks کو بار بار ٹکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس وقت اگر غلطی سے ہم دونوں میں سے کسی ایک کا بھی پاؤں بریک کو صرف چھو لیتا تو ہم دونوں ہی فضا میں قلابازیاں کھا رہے ہوتے۔ آخری سو گز باقی رہ گئے تھے۔ میری کن پٹی سے شدید تناؤ کے باعث پسینے کا ایک قطرہ گر کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ٹم نے جھنجھلاہٹ میں اپنی بائیک کی سپیڈ انتہائی حد تک بڑھانے کی آخری کوشش کی۔ لیکن میں نے اپنی بائیک تقریباً آدھی ترچھی اُسی کی بائیک پر ہی جھکا رکھی تھی۔ فضا میں ہم دونوں کی بائیکس کی آپس میں رگڑ کی وجہ سے تیز چنگاریاں لپکیں ..... ٹم کی بائیک شدید طاقت ور تھراٹل Throttel سے کسی اندھے بھینسے کی طرح اچھلی اور میری اُلجھی ہوئی بائیک سے ٹکرا کر اُسے بھی اپنے ساتھ دھکیلتے ہوئے آگے کو بڑھی۔ میں نے اپنے جسم کی پوری قوت لگا کر اپنی بائیک کو سیدھا رکھنے کی کوشش کی اور اگلے ہی لمحے میں اور ٹم دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دروازے کو توڑتے ہوئے فضا میں اُچھلے۔ ہماری بائیکس پھسل کر ہمارے نیچے سے نکلیں اور ہم دونوں سمیت فضا میں لہراتی ہوئی باہر کھلی سڑک پر آ گریں۔ ٹھیک ایک لمحہ پہلے اس سڑک سے ایک 22 بائیس ویلر wheeler بھاری ٹرک تیزی سے ہارن بجاتا ہوا گزرا اور اس کے پہیوں کی سڑک سے رگڑ کی جلتی ہوئی مہک ابھی باقی تھی جب میں اور ٹم زوردار آواز کے ساتھ منہ کے بل سڑک پر آ گرے۔ مجھے لگا میری ساری ہڈیاں ایک ساتھ ہی کسی بڑے گرائنڈر Grinder میں مجھ سمیت ڈال کر پیس دی ہوں۔ میں نے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اب مجھے دوبارہ کبھی یہ پلکیں اُٹھانے کی زحمت بھی نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اس وقت مجھے اپنی پلکوں کا وزن بھی

ہزاروں ٹن جتنا بھاری لگ رہا تھا۔ جب ہم اپنے اندر کے آخری ریشے تک کو ملوث کر کے شدید مشقت اور محنت کے بعد کوئی جنگ ہارتے ہیں تو اس ہار کے اندر بھی ایک طمانیت چھپی ہوتی ہے۔ اپنے مطمئن ضمیر کے سراہے جانے کا سکون شامل ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آنکھیں بند ہوتے وقت میرے اندر بھی اُسی طمانیت کی ایک لہر اُٹھ رہی تھی۔

جانے کتنی صدیاں یونہی گزر گئیں۔ پھر مجھے ایک ساتھ بہت سی آوازیں اور ملا جلا شور سنائی دیا۔ کوئی میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر میرے گال تھپتھپا رہا تھا۔ ہے (HEY) آیان ..... ہوش میں آؤ .....تم ٹھیک تو ہو.....؟ تم جیت گئے ہو Man اور جیت کے اس لفظ نے مجھے واپس ہوش میں لانے کے لیے جیسے ایک زور آور Talyst کا کام کیا۔ میں نے کراہتے ہوئے پلکیں اُٹھائیں تو وہ سب مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میری ضروری ''مرہم پٹی'' کی جا چکی تھی۔ دور میری اور ٹم کی بائیکس کے کچومر نما ڈھیر میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ کیلی نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے کھڑا کر دیا اور میرے منہ سے بہت سی آہیں اور کراہیں نکلیں۔ ''ٹم کہاں ہے.....؟'' دوسرا نیگرو مارٹن زور سے ہنسا۔ ''وہ بھی دوسرے فٹ پاتھ پر پڑا کراہ رہا ہے.....'' پتا چلا کہ آخری بیس گز میں جب ٹم کی بائیک نے انتہائی تیز تھراٹل Throttel کی وجہ سے میری بائیک کو اپنے راستے سے دھکیلنے کی کوشش کی تھی تو ٹم کی بائیک کے جھٹکے کی وجہ سے میری بائیک بھی اُچھل گئی تھی لیکن یہی بات ٹم کی ہار کا باعث بن گئی کیونکہ اس کی بائیک کی اندھا دھند طاقت نے میری بائیک کو اچھال کر دروازے کی جانب پھینک دیا تھا اور پھر جب ٹم کی بائیک میری بائیک سے ٹکرائی تو پہلے میری اور پھر ٹم کی بائیک ہم دونوں سمیت ہوا میں اُچھلتی ہوئی باہر سڑک پر آ گریں۔ اور اس طرح میری بائیک چند انچ کے فاصلے سے آگے رہنے کی وجہ سے یہ مقابلہ جیت گی تھی۔ میں نے نظر اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ مجھے ٹھیک طرح سے اللہ کا شکر ادا کرنا بھی نہیں آتا یا شاید جتنی بڑی کامیابی یا خوشی وہ ہمیں عطا کرتا ہے، اُسی قدر ہمارے اندر موجود لفظوں کا ذخیرہ بھی کم ہو جاتا ہے .....؟ عام حالات میں اپنی دعاؤں میں بے حد نظم و نسق اور سلیقے سے جڑے الفاظ ادا کرنے والے شدید خوشی یا کسی انہونی فتح کی صورت میں میری طرح بس ''غوں غاں'' کر کے ہی رہ جاتے ہوں گے .....؟؟۔ میں دوسری جانب

اپنے ساتھیوں میں گھرے ٹم کی جانب بڑھا اور اُسے بھی ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ٹم نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم نے تو آج مجھے مار ہی ڈالا تھا آیان ..... مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم جیت چکے ہو.....''۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ یہ مشورہ تمہارا ہی تھا ..... کہ تم سے مقابلہ کرنے سے پہلے مجھے خود میں وہ کلر انسٹنکٹ killer instinct پیدا کرنی ہوگی۔'' ٹم نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ''آئندہ میں کسی کو اپنے راز بتاؤں تو تم سب مل کر مجھے مارنا.....'' ٹم کے سب ساتھی بھی مجھ سمیت ہنس پڑے۔

کیلی نے مقابلے کی انعامی رقم میری جیب میں ٹھونس دی ''جاؤ ..... جا کر عیش کرو لڑکے ..... میں تمہاری بائیک کی ''باقیادت'' تمہارے میکنک کے پاس بھجوادوں گا.....''۔ میں لڑکھڑاتا ہوا سب سے ملنے کے بعد جانے کس وقت اپنے اپارٹمنٹ پہنچا اور بستر پر ڈھے گیا۔ اگلے روز بھی میرا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا لیکن میں بستر میں پڑھے رہنے کی عیاشی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ آج مجھے کسی بھی حال میں بسام کے لیے کسی بہتر وکیل کا بندوبست کرنا تھا۔ 12 بجے دوپہر عرفی ماموں بھی میری طرف آ گئے اور ہم اکٹھے ہی گھر سے نکل پڑے۔ عرفی ماموں میری لڑکھڑاہٹ دیکھ کر پریشان سے ہوگئے۔ ''خیریت تو ہے بھانجے ..... تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی.....''۔ ''نہیں ..... میں ٹھیک ہوں ..... بس ہلکی سی موچ ہے پاؤں میں.....'' ماموں نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا لیکن چپ رہے ..... ہم شہر کے مشہور وکیل آسٹن کے پاس جا رہے تھے جس کی شہرت ایسے کیسز میں بہت اچھی تھی۔ ''آسٹن چیمبرز'' بروک لین برج کے قریب ہی تھا اور اُس کی راہداری میں باہر کی جانب کھلتی کھڑکیوں کی طویل قطار سے اندر آتی نرم دھوپ کے مستطیل ٹکڑے فرش پر یوں بچھے ہوئے تھے جیسے کسی نے باقاعدہ انہیں ''سوکھنے'' کے لیے زمین پر ڈالا ہو۔ برآمدے میں منی پلانٹ کی سبز بیلیں بھی دور تک ستونوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ کافی ماحول دوستانہ، قسم کا دفتر تھا وہ، کچھ دیر میں آسٹن کی سمارٹ میں سیکریٹری نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اور میں ماموں کے ساتھ آسٹن کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ آسٹن نظر کی عینک لگائے ایک دھان پان سا شخص تھا جس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ چپکی رہتی تھی۔ اس نے غور سے ہماری ساری بات سنی اور پھر کچھ دیر تک

کیس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''بظاہر تو یہ کوئی خاص اُلجھا ہوا کیس نہیں لگتا..... تمہارے بھائی کو دو نہیں تو چار پیشوں کے بعد باہر آ جانا چاہیے کیونکہ اس پر کوئی جرم ثابت نہیں، نہ ہی کوئی چارج لگایا گیا ہے ..... پھر تم لوگوں نے سرکاری یا ریستوراں کے وکیل پر اکتفا کیوں نہیں کیا.....؟ معاف کیجیے گا شاید یہ بات کاروباری اصولوں کے خلاف ہو لیکن اتنے سے کام کے لیے آپ کو میری بھاری فیس بھرنے کی کوئی خاص ضرورت نظر نہیں آ رہی مجھے..... آپ لوگ پھر سوچ لیں.....'' مجھے آسٹن کی یہ صاف گوئی پسند آئی۔ میں نے اپنی جیب سے پیسے نکال کر میز پر رکھے۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس پیسے بھی بمشکل آپ کی دو پیشوں کی فیس جتنے ہی ہیں۔ لیکن یہ پیسے میں نے صرف آپ کی فیس بھرنے کے لیے ہی کمائے ہیں۔ اب ان پیسوں کے بدلے کوئی مجھے امریکہ کی صدارت بھی پیش کرے تو وہ میرے لیے بے مصرف ہو گی۔ میں جانتا ہوں آپ چھوٹے موٹے کیس نہیں لیتے۔ لیکن یہ ہمارے لیے دنیا کا سب سے اہم کیس ہے۔ سنا ہے وکیل جذبات سے ہٹ کر سوچتے ہیں..... لیکن میری درخواست ہے کہ آپ یہ مقدمہ جذبات کی بنیاد پر لڑیں ..... ہاں اگر میرا بھائی ان دو پیشوں میں باہر نہ آ سکا تو یہ ہماری اور اُس کی قسمت.....'' آسٹن غور سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ''بہت محبت کرتے ہو اپنے بھائی سے.....؟ اچھا لگا مجھے سن کر..... رشتوں اور جذبات سے عاری اس امریکن معاشرے میں یہ محبت کسی تازہ پھول کی طرح محسوس ہوتی ہے..... چلو ٹھیک ہے..... اس بار جذبات ہی سہی..... تم یہ فارم بھر دو اور یہ پیسے واپس جاتے ہوئے کاؤنٹر پر جمع کراتے جانا..... میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بھائی کو زیادہ عرصہ قید میں نہ گزارنا پڑے.....'' عرفی ماموں کے چہرے پر بھی رونق سی آ گئی۔ میں نے کاغذات بھر دیئے اور ہم معاوضے کی رسید لے کر آسٹن کے دفتر سے نکل آئے۔ میں ماموں کو اُن کے اسٹور چھوڑتا ہوا یونیورسٹی چلا آیا۔ کل شام سے لے کر اب تک یہ سب کچھ اتنی تیزی اور تواتر سے پیش آیا تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے بھی سنبھل نہیں سکا تھا۔ آج جب بسام کے لیے وکیل کا انتظام ہو گیا تھا تو مجھے کچھ فرصت ملی تھی۔ مجھے گزشتہ روز پُروا سے ہوئی وہ ملاقات یاد آئی جس میں اُس نے اپنے معصوم من کے کچھ راز مجھ سے بانٹے تھے۔ وہ اتنی بھولی تھی کہ اُسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ ایسے کومل راز دل کی سرحدوں کو پار کر کے دوسرے کی سماعتوں کے شریک بن جائیں تو

کئی بار اپنی حرمت کھو دیتے ہیں کون جانے سننے والے کا ظرف اتنا بلند ہو بھی یا نہیں کہ وہ اس نازک جذبے کی قیمت کو جان سکے.....؟ اور پھر امریکہ جیسے مادر پدر آزاد معاشرے میں محبت کا مفہوم زیادہ تر جنس کی صورت ہی لیا جاتا تھا۔ ایسے میں بھلا یہ نازک آب گینوں جیسی اور دل کی محرم باتیں بھلا کسے سمجھ میں آتیں.....؟ میں نے سوچا کہ میں کسی وقت اطمینان سے پُروا کو سامنے بٹھا کر یہ سب سمجھاؤں گا۔ لیکن وہ آج یونیورسٹی آئی ہی نہیں تھی۔ صنم کبیر بھی بسام کی گرفتار کی وجہ سے روز بروز بجھتی سی جا رہی تھی۔ میرے سامنے وہ میری ہمت باندھنے کے لیے لمبی لمبی تقریریں کرتی رہتی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے چہرے پر پھیلی وہ شفق جیسی لالی دن بہ دن دھیمی کیوں پڑتی جا رہی تھی۔ مجھے تو یہی سمجھ نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکیاں اپنے دل میں بیک وقت اتنے درد چھپا کر زندہ کیسے رہ لیتی تھیں.....؟

مسلم طلبہ نے ظہر کی نماز کے لیے یونیورسٹی کے عقبی دالان کے ایک چھوٹے سے گوشے کو چنا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو بنگالی حافظ قرآن، شکیل کی معیت میں وہ سب با جماعت نماز پڑھ رہے تھے۔ شکیل کے سلام پھیرنے تک میں غور سے ان سب کو دیکھتا رہا۔ آخر کچھ تو کشش ہو گی اس سجدے میں جو انہیں سارے کام اور تمام مصروفیات بھلا کر یہاں اکٹھا ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر وہ سب میرے اطراف جمع ہو گئے۔ احمر نے جوش میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آیان ..... آج ہم نے یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کیمپس میں سجدہ کیا ہے..... اور یہ موقع اللہ نے تمہارے توسط سے ہمیں عطا کیا ہے..... ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں.....'' میں نے اس کا شانہ تھپکا..... ''یہ ہم سب کی مشترکہ جیت ہے..... لیکن ابھی ہمیں اپنی شناخت کا بہت لمبا سفر طے کرنا ہے..... تم سب میرا ساتھ دینا.....'' سب نے زور و شور سے سر ہلا کر اپنی وفا داری کی تجدید کی۔ ہجوم میں سے کسی نے مجھے چھیڑا۔ ''ہے (HEY) کونسلر..... تم خود نماز کیوں نہیں شروع کر دیتے..... ہمیں بڑی خواہش ہے کہ تمہاری سربراہی میں جماعت ادا کریں.....'' سب ہنسے میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ''ہماری زبان میں ایک بڑی مشہور کہاوت ہے کہ۔ ''نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان.....''۔ ''وہ سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بات سے بات نکلی لیکن مجھے شیخ الکریم کی نماز سیکھنے کے بارے میں کی گئی نصیحت یاد آ گئی۔ جانے کیوں لیکن مجھے ہمیشہ ہی سے نماز پڑھنے میں ایک عجیب سی جھجک مانع رہتی

تھی۔ جیسے میں اس مقدس فرض کو ادا کرنے کے لائق ہی نہیں ہوں۔ میرے اندر ایک اور عجیب سا احساس بھی ہمیشہ پلتا رہتا تھا کہ جب ایک بار انسان نماز کی تمام تیاری کر کے، وضو سے اپنے آپ کو پاک کر کے سر کو ڈھانپ کر اُس اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہو جائے۔ تو پھر اُس کا دوبارہ اس دنیا کے جھمیلوں کی طرف پلٹنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے.....؟ لیکن یہ عبادت زندگی بھر میں اگر صرف ایک بار ہی فرض ہوتی تو کیا تب بھی ہم اپنی عبادت ختم کر کے دوبارہ گناہوں کی طرف پلٹ نہ جاتے؟ مجھے ہمیشہ ہی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ میں نماز پڑھنے کے بعد پھر سے اپنی اسی آلودہ زندگی کی طرف لوٹ آیا تو میری عمر بھر کی عبادت ہی ضائع ہو جائے گی۔ میں اپنے اُس پہلے سجدے کو بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ تاوقتیکہ وہی ایک سجدہ میری نیا پار لگا دے ..... اور پھر مجھے دوبارہ اس گناہوں سے آلودہ کنارے پر واپس پلٹ کر نہ آنا پڑے۔ جانے میرے نصیب کا وہ آخری سجدہ کب اور کس خاک کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہوگا؟ میں اپنے مسلم گروپ کے ساتھ یونیورسٹی کے اکیڈمک بلاک میں پہنچا تو صحن کی سیڑھیوں پر ہماری مڈبھیڑ اوپر سے آتے شمعون اور مائیکل پر پڑی جو چند یہودی لڑکوں کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہے تھے ..... چند لمحوں کے لیے ہم دونوں گروہ رک گئے۔ میں اور شمعون کچھ دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ شمعون نے مجھ پر طنز کیا۔

''بڑی تیزی سے مقبول ہو رہے ہو مسلم کونسلر .....؟ لیکن یاد رکھنا جو بہت تیزی سے اوپر جاتے ہیں، وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ نیچے بھی آ گرتے ہیں ..... خود کو گرنے سے بچا لینا ..... اگر بچا سکو تو .....'' احمر غصے میں ایک قدم آگے بڑھا، لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور شمعون کی طرف دیکھا۔ ''مجھے جتنا گرنا تھا ..... تم لوگوں کا ساتھ دے کر اُس سے کہیں زیادہ گر چکا ہوں۔ مگر اب میرے اُٹھنے کی باری ہے ..... اور یاد رکھنا ..... جس دن میں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اُس دن تم جیسوں کو شاید بیٹھنے کی جگہ بھی نہ ملے ..... ہو سکے تو اپنا اور اپنے جیسوں کا پہلے ہی سے کچھ بندوبست کر لینا .....'' میرا جواب سن کر شمعون کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اگر ٹھیک اُسی وقت ڈپٹی ڈین کا وہاں سے گزر نہ ہوتا تو بات کافی بڑھ جاتی۔ ڈپٹی ڈین نے ہمیں سیڑھیاں خالی کرنے کا حکم دے دیا کیونکہ ہماری وجہ سے بھیڑ جمع ہو رہی تھی لہٰذا ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے مخالف سمتوں

میں چل پڑے۔

شام کو میں بسام سے ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ اگلے روز نائن الیون کی وجہ سے ان سب لڑکوں کی پیشی کو دو روز کے لیے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ میں نے بسام کو تسلی دی کہ ہم نے اُس کے لیے آسٹن نامی وکیل کر لیا ہے اور اب وہ جلد ہی باہر نکل آئے گا۔ بسام نے میرے جسم اور ہاتھوں پر پڑی خراشیں دیکھ کر مجھے گھورا۔ ''تم نے پھر ریس لگائی ہے.....؟'' لیکن میں اس کی بات ٹال گیا۔ اگلی صبح نیو یارک میں ہوئے ایک ایسے خوفناک حادثے کی یاد دلاتی صبح تھی جس نے تمام دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی۔ 11 ستمبر کی اس صبح جب میں یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلا تو شہر میں ایک عجیب ہو کا عالم تھا۔ حادثے ہو کر گزر جاتے ہیں پر اپنی تکلیف دہ یادیں عمر بھر کے لیے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ گراؤنڈ زیرو پر ان عمارتوں کے انہدام کی جگہ پر گزشتہ رات سے ہی مرنے والوں کی یاد میں موم بتیاں جلا کر رکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو..... وہ سب مرنے والے انسان تھے اور معصوم بھی ..... میں نے بھی ایک شمع اُن کی یاد میں روشن کر دی۔ میں بس سے اُتر کر یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوا۔ تو نہ جانے مجھے وہاں بھی شہر کی طرح ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ آج مسلم طلبہ نے کیمپس میں عید منانے کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن مجھے اکیڈمک بلاک تک پہنچتے ہوئے کہیں بھی اس روایتی عید کی جھلک نظر نہیں آئی۔ اچانک سامنے سے احمر تیزی سے چلتا ہوا نظر آیا۔ ''اوہ آیان..... کہاں تھے تم ..... پولیس نے بابر سیّدی کو نائن الیون پر یہودیوں پر حملہ کرنے کے منصوبے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔''

باب10

میرے ہاتھ میں پکڑا ہیلمٹ گرتے گرتے بچا۔ ''کیا.....؟ یہ سب کب ہوا..... اور تم لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں.....؟''۔ ''ہمیں خود صبح پتا چلا۔ جانے رات کو کس وقت پولیس نے چھاپہ مارا۔ عامر بن حبیب اس وقت کمرے میں نہیں تھا ورنہ اُسے بھی ضرور گرفتار کر لیا جاتا.....''۔ میں تیزی سے مسلم ہاسٹل کی جانب پلٹا۔ ''عامر اس وقت کہاں ہے.....'' احمر میرے پیچھے ہی لمبے لمبے قدم اُٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ ''اسے ہم لوگوں نے ضمانت ملنے تک روپوش کروا دیا ہے۔ آج عدالتیں بند ہیں..... کل اس کی ضمانت کی کوشش کریں گے.....''۔ یونیورسٹی میں بھی آج 9/11 کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیاں موقوف تھیں۔ مجھے ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے راہداریوں میں یونیورسٹی آڈیٹوریم میں آج کے دن کی مناسبت سے یہودی طلباء کی جانب سے منعقد کیے گئے سیمینار کے بڑے بڑے بینر اور پوسٹر لگے ہوئے نظر آئے۔ میرا جی چاہا کہ میں ہال میں زبردستی گھس جاؤں اور اسٹیج پر چڑھ کر زور زور سے چلا کر پوچھوں کہ ''یہ جو تم سب آج یہاں مگرمچھ کے آنسو بہانے کے لیے جمع ہوئے ہو مجھے صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دو کہ جس روز وہ جہاز عمارت سے ٹکرائے تھے تو پچاس ہزار ملازمین کے ہجوم میں سے ساڑھے پانچ ہزار یہودی ہی کیوں کم تھے.....؟ اُس روز اچانک وہ سب کہاں جا چھپے تھے.....؟

مسلم ہاسٹل کی گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے بہت سے سفید اور سبز ہلالی نشان والے غبارے اور رنگین جھنڈیاں راہداری میں لٹکتی ہوئی نظر آئیں۔ میری آنکھیں جلنے لگیں مسلمان طلباء نے

میں چل پڑے۔

شام کو میں بسام سے ملنے گیا تو اس نے بتایا کہ اگلے روز نائن الیون کی وجہ سے ان سب لڑکوں کی پیشی کو دو روز کے لیے مؤخر کر دیا گیا ہے۔ میں نے بسام کو تسلی دی کہ ہم نے اُس کے لیے آسٹن نامی وکیل کر لیا ہے اور اب وہ جلد ہی باہر نکل آئے گا۔ بسام نے میرے جسم اور ہاتھوں پر پڑی خراشیں دیکھ کر مجھے گھورا۔ ''تم نے پھر ریس لگائی ہے.....؟'' لیکن میں اس کی بات ٹال گیا۔ اگلی صبح نیو یارک میں ہوئے ایک ایسے خوفناک حادثے کی یاد دلاتی صبح تھی جس نے تمام دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی۔ 11 ستمبر کی اس صبح جب میں یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلا تو شہر میں ایک عجیب ہو کا عالم تھا۔ حادثے ہو کر گزر جاتے ہیں پر اپنی تکلیف دہ یادیں عمر بھر کے لیے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ گراؤنڈ زیرو پر ان عمارتوں کے انہدام کی جگہ پر گزشتہ رات سے ہی مرنے والوں کی یاد میں موم بتیاں جلا کر رکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو..... وہ سب مرنے والے انسان تھے اور معصوم بھی ..... میں نے بھی ایک شمع اُن کی یاد میں روشن کر دی۔ میں بس سے اُتر کر یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوا۔ تو نہ جانے مجھے وہاں بھی شہر کی طرح ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوا۔ آج مسلم طلبہ نے کیمپس میں عید منانے کا اہتمام کیا تھا۔ لیکن مجھے اکیڈمک بلاک تک پہنچتے ہوئے کہیں بھی اس روایتی عید کی جھلک نظر نہیں آئی۔ اچانک سامنے سے احمر تیزی سے چلتا ہوا نظر آیا۔ ''اوہ آیان..... کہاں تھے تم ..... پولیس نے بابر سیّدی کو نائن الیون پر یہودیوں پر حملہ کرنے کے منصوبے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔''

باب10

میرے ہاتھ میں پکڑا ہیلمٹ گرتے گرتے بچا۔ ''کیا.....؟ یہ سب کب ہوا.....اور تم لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں.....؟''۔ ''ہمیں خود صبح پتا چلا۔ جانے رات کو کس وقت پولیس نے چھاپہ مارا۔ عامر بن حبیب اس وقت کمرے میں نہیں تھا ورنہ اُسے بھی ضرور گرفتار کر لیا جاتا.....''۔ میں تیزی سے مسلم ہاسٹل کی جانب پلٹا۔ ''عامر اس وقت کہاں ہے.....'' احمر میرے پیچھے ہی لمبے لمبے قدم اُٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ ''اسے ہم لوگوں نے ضمانت ملنے تک روپوش کروا دیا ہے۔ آج عدالتیں بند ہیں.....کل اس کی ضمانت کی کوشش کریں گے.....''۔ یونیورسٹی میں بھی آج 9/11 کی وجہ سے تعلیمی سرگرمیاں موقوف تھیں۔ مجھے ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے راہداریوں میں یونیورسٹی آڈیٹوریم میں آج کے دن کی مناسبت سے یہودی طلباء کی جانب سے منعقد کیے گئے سیمینار کے بڑے بڑے بینر اور پوسٹر لگے ہوئے نظر آئے۔ میرا جی چاہا کہ میں ہال میں زبردستی گھس جاؤں اور اسٹیج پر چڑھ کر زور زور سے چلا کر پوچھوں کہ ''یہ جو تم سب آج یہاں مگرمچھ کے آنسو بہانے کے لیے جمع ہوئے ہو مجھے صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دو کہ جس روز وہ جہاز عمارت سے ٹکرائے تھے تو پچاس ہزار ملازمین کے ہجوم میں سے ساڑھے پانچ ہزار یہودی ہی کیوں کم تھے.....؟ اُس روز اچانک وہ سب کہاں جا چھپے تھے.....؟

مسلم ہاسٹل کی گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے بہت سے سفید اور سبز ہلالی نشان والے غبارے اور رنگین جھنڈیاں راہداری میں لٹکتی ہوئی نظر آئیں۔ میری آنکھیں جلنے لگیں مسلمان طلباء نے

اس دیار غیر میں گھر سے ہزاروں میل دور رہ کر بھی عید کی یاد تازہ رکھنے کے لیے بہت محنت کی تھی لیکن اُن کی یہ عید نیویارک پولیس نے برباد کر دی..... جو گھر سے دور ہوتے ہیں صرف وہی جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر یہ تہوار کتنے اہم ہوتے ہیں اور کتنا اُداس کر جاتے ہیں۔ مجھے اس روز عید کی اصل اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ورنہ آج سے پہلے تو میں اور بسام بھی سو کر ہی یہ دن گزارتے تھے۔ جب تک والدین زندہ تھے تو ممی بہت اہتمام کرتی تھیں عید کا۔ سویاں بھی بنتی تھیں اور انکل فرینکی اور ماموں تو ویسے ہی ہمارے گھر کے شیر خرمہ کے شیدائی تھے۔ عید کے روز ممی ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے اور بسام کو کرتا شلوار پہن کر ڈیڈ کے ساتھ علاقے کی جامع مسجد میں عید کی نماز پڑھنے بھیجا کرتی تھیں اور میں اور بسام ایک دوسرے کو شلوار قمیص میں دیکھ کر خوب ہنستے۔ ممی اور ڈیڈ کے جانے کے بعد اسے تو ہر ''عید'' سراب ہو گئی تھی۔

کچھ ایسا ہی منظر مسلم طلبہ کے ہاسٹل کا بھی تھا۔ اُن کی عید بھی خواب ہو چکی تھی۔ وہ سبھی ہاسٹل کے فوارے کے گرد سردی میں باہر بیٹھے جانے کن سوچوں میں گم تھے۔ جونیئر طلبا جن کی گھر سے باہر یہ پہلی عید تھی وہ زیادہ پریشان اور اُداس تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گرد جمع ہو گئے۔ میں نے ایک جونیئر سٹوڈنٹ کے سینے پر ہلکا سا گھونسہ مارا۔ ''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے چھوٹے..... بھلا عید ایسے مناتے ہیں میرے بشاش لہجے نے ان کی کچھ ہمت باندھی۔ میں نے جان بوجھ کر خود کو ان کے سامنے ہلکا پھلکا پیش کیا تھا۔ میں بھی اپنا کتنا ہوا اندر ان کے سامنے رکھ دیتا تو وہ بالکل ہی رہ جاتے۔ کبھی کبھی شدید پریشانی میں کسی کی ایک مسکان اندھیرے میں روشنی کی ہلکی سی کرن ثابت ہوتی ہے۔ سوڈانی بلال نے غصے سے کہا۔ ''یونیورسٹی میں بہت دن سے ایک پمفلٹ گردش کر رہا تھا کہ نائن الیون کے سانحے کے دن عید منانے کا مزہ ہم مسلمانوں کو چکھا کر رہیں گے.....''۔ اس کی بات سن کر باقی سب طلباء بھی جوش میں آ گئے۔ ''تو ہم کیا اپنی مرضی سے آج عید منا رہے ہیں..... یہ تو چاند کا معاملہ ہے..... اِدھر امریکہ میں گزشتہ کل عید منائی گئی۔ ہم باقی مسلم ممالک کے ساتھ منانا چاہتے ہیں تو اس میں ایسا کیا گناہ کر ڈالا ہم نے.....'' لڑکوں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا ''ٹھیک ہے..... ایسا ہے تو ایسا ہی سہی..... چلو آیان..... ہم ابھی چل کر اُن کا سیمینار خراب کرتے ہیں۔ ہم عید نہیں منا سکے تو انہیں بھی

نائن الیون نہیں منانے دیں گے ..... چلو ..... سب تیاری کر لو .....'' سب لڑکے بھڑک کر کھڑے ہو گئے۔ ''ہاں بالکل ٹھیک ہے ..... اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے ہم آڈیٹوریم کی .....'' سبھی جوش میں آگے بڑھے۔ ''رُک جاؤ ..... پہلے میری بات سن لو .....'' لیکن وہ سب بپھرے ہوئے تھے ''نہیں آیان ..... آج نہیں ..... آج ہم کسی کی نہیں سنیں گے .....''۔ ''شیخ الکریم کی بھی نہیں .....؟'' میری زبان سے شیخ الکریم کا نام سن کر وہ سب رک گئے، میں نے بات جاری رکھی۔ ''تم سب لوگ شیخ الکریم کے لیکچر تو بڑے ذوق وشوق سے سننے جاتے ہو، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ مسجد سے نکلتے ہی سب کچھ بھلا دیتے ہو ..... کل تک میں بھی تم جیسا تھا، پل میں بھڑک جانے والا ..... لیکن میں نے شیخ الکریم سے ہی یہ سیکھا کہ ہماری اسی جلد بازی اور جذباتی پن سے دوسرے فائدہ اُٹھا جاتے ہیں۔ وہ ہمیں بھڑکا کر مشتعل کرتے ہیں اور ہم ان کا باقی کام خود آسان کر دیتے ہیں۔ عامر بن حبیب اور بابر سیّدی کو اس وقت ہماری مدد کی ضرورت ہے لیکن ہم توڑ پھوڑ کر کے انہیں مزید مشکل میں ڈال دیں گے۔ ملزم کو مجرم بنانے میں اپنے دشمن کی مدد نہ کرو ..... میری بات مان لو .....''۔ ''احمر نے بے بسی سے سر پٹکا .....'' تو ہم کیا کریں ..... یونہی چپ کر کے یہ سب دیکھتے رہیں .....؟''۔ میں نے اس کی جھکی ہوئی ٹھوڑی اپنے ہاتھ سے اوپر کی۔ ''نہیں ..... ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھیں گے ..... ہم انہیں جواب دیں ..... لیکن اپنے انداز سے ..... آج گیارہ ستمبر ہے ..... وہی دن جس پر فلوریڈر کے پادری ٹیری جونز نے اُس گستاخی کا اعلان کیا تھا۔ آج ہم سب وہیں جائیں گے جہاں ٹیری جونز نے آنے کا اعلان کیا تھا ..... ہمارا جواب اُنہیں وہیں ملے گا۔''

سارے گروپ نے حیرت سے میری طرف دیکھا، لیکن وہ چپ رہے۔ میں نے اُسی وقت ڈین کے نام ایک درخواست لکھی اور بلال سے کہا کہ وہ جا کر کانفرنس ہال میں ڈین سے اس پر دستخط لے کر گراؤنڈ زیرو پہنچے، تب تک ہم وہاں اُس کا انتظار کریں گے۔ ہمارے گراؤنڈ زیرو پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد بلال بھی ڈین کا دستخط شدہ کاغذ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ یہاں آج ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کے گرنے سے ہلاک ہونے والوں کے پیاروں کا رش تھا۔ لوگ یادگار کی جگہ پر پھول اور گلدستے نچھاور کر رہے تھے اور شمعیں روشن کر رہے تھے۔ میں نے حافظ شکیل کو اشارہ کیا اور اس نے دو سیڑھیاں

چڑھ کر اپنی جگہ سنبھال لی۔ شکیل نے میری جانب دیکھا ہم سب اس کے سامنے نیم دائرے میں جمع ہو چکے تھے۔ میں نے سر ہلا کر اُسے اجازت دے دی اور اُس نے اپنی خوبصورت آواز میں تلاوت شروع کر دی۔ لوگوں نے چونک کر حافظ کو دیکھا۔ شکیل نے جب تک سورۃ اخلاص کی تلاوت ختم کی لوگ پوری طرح ہماری جانب متوجہ ہو چکے تھے اور وہاں موجود میڈیا کا ہر کیمرہ ہماری فلم بنا رہا تھا۔ شکیل کی تلاوت ختم ہوئی تو میں اس کی جگہ اوپر چڑھ آیا۔ ''میں آیان احمر سنٹرل امریکن یونیورسٹی کا مسلم کونسلر آپ سے مخاطب ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ آج ہماری عید ہے لہٰذا آج ہم سب نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنا یہ تہوار یہاں گراؤنڈ زیرو پر نائن الیون کے لواحقین کے ساتھ شمعیں روشن کر کے منائیں گے۔ آج یہاں ٹیری جونز تو نہ آپایا لیکن ہم نیویارک کے شہریوں کو یہ بتانے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں کہ ہم نفرتوں کو پھیلانے نہیں ..... ختم کرنے آئے ہیں۔ کل رات ہمارے ایک پیارے ساتھی بابر سیّدی کو پولیس نے دہشت گردی کے شبہے میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہم پہلی شمع یہاں بابر سیّدی کی جانب سے بھی روشن کریں گے ..... امید ہے آپ سب ہمارے اس پیغام محبت کو ٹیری جونز اور اُس جیسے ہر نفرت کرنے والے تک پھیلائیں گے .....'' میں نے پہلی شمع اُٹھائی اور کیمرے کی جانب دیکھ کر کہا۔ ''بابر ..... یہ پہلی تمہاری جانب سے ..... اور بسام ..... یہ دوسری تمہاری طرف سے .....'' سب مسلم طلبہ اپنے ساتھ لائی ہوئی شمع ایک ایک کر کے جلاتے گئے اور میں نے بلال کو جو گلدستے لانے کا کہا تھا وہ ہم نے دیگر پھولوں کے انبار کے ساتھ رکھ دیئے۔ سارے حاضرین نے زوردار تالیاں بجا کر مسلم طلباء کے اس تاثر کو سراہا۔ میں نے بلال کو ڈین کے نام یہی درخواست لکھ کر بھیجی تھی کہ ہم سب مسلم گروپ والے گراؤنڈ زیرو پر جا کر دعا کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اجازت دی جائے اور میری توقع کے مطابق اُس نے اجازت دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا میں جانتا تھا کہ آج نیویارک کا سارا میڈیا یہاں گراؤنڈ زیرو پر جمع ہوگا اور اپنا پیغام دینے کا اس سے بہتر موقع ہمیں پھر شاید کبھی نہ ملے۔ عام امریکن شہریوں اور نیویارک کے باسیوں کے لیے یہ ایک نیا منظر تھا کہ آج تک وہ جس قوم پر نائن الیون کے سانحے کا الزام لگاتے آئے ہیں۔ آج اُسی قوم کی نوجوان نسل ان کے ساتھ مل کر مرنے والوں کے لیے دعا کر رہی تھی۔ دعا ختم ہوئی تو وہاں موجود سبھی لوگوں نے فرداً فرداً مسلم طلبہ کے ساتھ

ہاتھ ملایا اور سہ پہر تین بجے جب ہم واپس یونیورسٹی پہنچے تو تمام میڈیا ہر پانچ منٹ بعد یہی خبر نشر کر رہا تھا۔ ہمارا پہلا پیغام نیویارک کے باسیوں تک پہنچ چکا تھا اور اس کے اثرات ہمیں یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی نظر آنے لگے تھے۔ ڈین نے ہمیں دیکھ کر اپنی گاڑی رکوائی اور چل کر ہماری جانب آیا ''ویل ڈن آیان ..... میں نے ٹی وی پر تمہارا پیغام سنا ..... تم نے مسلم کونسلری کا فرض خوب نبھایا ..... keep it up'' مسلم طلباء ڈین کی مبارکباد اور اس کا یہ نرم لہجہ سن کر حیران سے تھے لیکن مجھے اس دن محسوس ہوا کہ ڈین رابن سن ایک اصول پرست، منطق اور دلیل کا انسان ہے۔ مجھے شیخ الکریم کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ ان گوروں کو اُن کی نفسیات کے مطابق برتنا ہی اصل مسئلہ ہے۔ یہ لوگ کڑوی سے کڑوی بات بھی برداشت کر جاتے ہیں اگر بات اُس زبان اور طریقے سے کی جائے جو ان کی سمجھ میں آتا ہو۔ آج گراؤنڈ زیرو پر ہم نے اپنا پیغام ان کی زبان میں دیا تھا لہٰذا سب کو سمجھ آ گیا تھا۔

شام کو ہم سب بابر سیّدی سے ملنے اور اسے عید کے پھول اور کارڈ دینے کے لیے ہاسٹل سے باہر نکلے تو سامنے سے اُلجھی اُلجھی اور خود سے روٹھی سی پُروا چلی آ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی ہمیں زور وشور سے مبارک باد دی۔ ''میں نے ٹی وی پر تم سب کو ایک نئے روپ میں دیکھا۔ آیان ..... تمہیں بہت مبارک ہو ..... تم نہیں جانتے کہ اس کے اثرات کہاں تک جائیں گے .....'' احمر نے پُروا سے شکایت کی۔ ''وہ سب تو ٹھیک ہے ..... لیکن تم دو دن سے کہاں غائب ہو ..... گروپ کی ساری مسلم لڑکیاں تمہارے بارے میں پوچھ پوچھ کر تھک گئی ہیں ..... انہیں حوصلہ دینے والا بھی تو یہاں کوئی ہونا چاہیے نا .....''

پُروا کی نظر جھک گئی۔ ''بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی میری۔ لیکن تم لوگ فکر نہ کر ..... اب میں آ گئی ہوں ..... پُروا ضمیر خان اِز بیک (is back) .....'' ہم سب مسکرا دیئے۔ بابر سیّدی بھی اسی لاک اپ میں تھا جہاں بسام کو رکھا گیا تھا۔ البتہ ان دونوں کے بیرک علیحدہ تھے۔ ہم پہلے بابر کے پاس پہنچے تو اسے پہلے ہی ملاقاتیوں والے لمبے ہال میں لایا جا چکا تھا۔ بابر ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ ''تمہارے گراؤنڈ'' زیرو کے کارنامے کے چرچے پہنچ چکے ہیں مجھ تک ..... آیان ..... لگتا ہے عامر بن حبیب کی روح آج تم میں حلول کر گئی ہے ..... اتنا صبر کہاں سے آ گیا تمہارے اندر .....؟'' پتا

نہیں..... میں خود نہیں جانتا ..... لیکن شاید یہ جنگ ہی صبر اور برداشت کی جنگ ہے ....." بابر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ نیویارک پولیس نے ٹھیک رات بارہ بجے اُسے اس کے کمرے سے گرفتار کیا تھا۔ اُس پر چند دن پہلے یہودی طلباء کے سامنے نائن الیون کے دن کے لیے دی جانے والی دھمکی کا الزام لگایا گیا تھا جس میں اُس نے کیا تھا کہ اگر ٹیری جونز یا کسی نے بھی نائن الیون کے سانحے کو بہانہ بنا کر اُس روز مسلمانوں کے ساتھ کوئی بھی زیادہ کی تو اس کا منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔ پولیس کے مطابق انہوں نے بابر سیّدی کے کمرے سے کچھ متنازعہ لٹریچر وغیرہ بھی برآمد کیا تھا جو بابر سیّدی کے ارادوں کو ظاہر کرتا تھا۔ میں نے بابر سے لٹریچر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بے زاری سے کہا۔ "کچھ نہیں یار..... ایسے پمفلٹ، پوسٹر اور کتابیں تو اُنہیں ہر فلسطینی کے کمرے سے ..... نائن الیون سے پہلے بھی مل سکتی تھیں۔ ہماری پوری نسل دل میں یہودی قبضے کے خلاف نفرت لے کر پلی ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ اس کا نائن الیون سے کوئی تعلق نہیں اور آج اگر یہی نیویارک پولیس شمعون اور مائیکل وغیرہ کے کمرے پر چھاپہ مارے تو انہیں اس سے کہیں زیادہ فلسطین مخالف مواد وہاں سے ملے گا۔ لیکن ہم کمزور ہیں اس لیے ہر پھندا ہماری گردن کے گرد کس دیا جاتا ہے۔ سو یہ الزام بھی میرے ہی سر سہی....."

میں نے بابر کا ہاتھ زور سے جکڑ لیا۔ "ہم کمزور تھے ..... لیکن ہمیشہ نہیں رہیں گے میرے دوست ..... چاہے ہزار الزام مزید لگ جائیں ..... بس تم ہمت نہ ہارنا ....." بابر ہنس پڑا۔ "یہ ہوئی نا مسلم کونسلر جیسی بات thats like my councler" میں انہیں بابر کے پاس چھوڑ کر بسام سے کچھ دیر ملنے جانے کے لیے اُٹھا تو احمر اور پُروا بھی میرے ساتھ چلے آئے۔ بسام کچھ نڈھال سا لگ رہا تھا۔ میں نے اُسے اپنے گلے لگا کر خوب زور زور سے جھنجھوڑا، میں گھر میں ایسا تب کرتا تھا جب وہ کبھی سست پڑ جاتا تھا۔ آخر وہ ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈال کر ہنس پڑا "بس کرو یار ..... ہڈیا توڑو گے کیا.....؟" میں نے پُروا اور احمر کا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ دونوں سے ملا اور پُروا کو دیکھتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں مجھ سے بولا۔ "اچھا ..... تو یہ پُروا ہے ..... بھئی خوب ہے ....." میں نے بسام کو گھورا، پُروا ہنس پڑی۔ "تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا میرا..... سو آیان کے ساتھ چلی آئی .....

تمہیں بُرا تو نہیں لگا ....." بسام مسکرایا "نہیں ..... مجھے خوشی ہوئی ..... البتہ اس گدھے کے ساتھ اتنی اچھی لڑکی مجھ سے ملنے آتی ہے۔ اس بات کی حیرت ضرور ہے مجھے ..... جینی کے بعد تم دنیا کی دوسری لڑکی ہو جس نے اسے شرف دوستی بخشا ہے ..... اور مجھے تم دونوں لڑکیوں کی عقل پر کافی شبہات ہیں۔" اتنے میں عارفین ماموں بھی ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لیے وہاں پہنچ گئے "عید مبارک ....." اور پھر کچھ ہی دیر میں سارا ہال میرے گروپ کے لڑکوں سے بھر گیا۔ بسام نے حیرت سے سب کو دیکھا۔ حافظ شکیل نے سوچوں کا بٹن بسام کے ہاتھ میں تھمایا۔ "ہم سب تمہیں عید کی مبارک باد دینے آئے ہیں بسام ..... بابر کو اجازت نہیں ملی ورنہ وہ بھی اپنی بیرک سے کچھ دیر کے لیے یہاں آنا چاہتا تھا ....." سب فرداً فرداً بسام سے گلے ملتے رہے اور بسام کی پلکیں نم ہوتی گئیں۔ میں جانتا تھا اسے بھی آج میری طرح ممی اور ڈیڈ یاد آ رہے ہوں گے ..... کاش دنیا میڈ ہر چیز کو موت آتی، بس ماں باپ سدا زندہ رہتے تو کتنا اچھا ہوتا .....

ہم لاک اَپ سے باہر نکلے تو شام سو چکی تھی اور نیویارک کی رات جاگنے والی تھی۔ میں سارے گروپ سے اگلے روز کی ملاقات کا وعدہ کر کے سڑک کی پرلی جانب بڑھنے لگا تو پُروا نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ "آیان ..... دو منٹ میری بات سنتے جاؤ ....." میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ باقی ہجوم سے علیحدہ ہو کر میری جانب چلی آئی۔ ہم سب کچھ دیر پہلے یونیورسٹی کی بس سے وال اسٹریٹ کے گرجا گھر کے قریب اُترے تھے جہاں سے ہم سب کو علیحدہ سمتوں میں جانا تھا۔ گرجا گھر کے اندر روشنیاں جل چکی تھیں اور اندر شاید کسی شادی کی تقریب چل رہی تھی۔ پُروا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی میری جانب چلی آئی۔

"میں تم سے اپنے اس روز کے جذباتی پن کی معافی مانگنا چاہتی ہوں ..... میں نے زندگی میں پہلے کبھی اس طرح اپنے جذبات پر اختیار نہیں کھویا ..... لیکن ہر چیز کا پہلا دن ہوتا ہے ..... میں ساری عمر جس جذبے کو صرف انسانی جسم کے اندر ہوتی مادوں کی تبدیلی سمجھتی رہی ..... وہ احساس جب مجھ پر طاری ہونے لگا تو میں شاید بُری طرح بوکھلا گئی تھی۔ شاید مجھے خود بھی اپنے اندر ہونے والی اس تبدیلی کا بہت دیر سے پتا چلتا لیکن جب میں نے تمہاری شمعون گروپ کے ساتھ ہوئی ڈیل کا سنا تو پل

بھر میں ہی میرے اندر دُور کسی کونے میں چھپا یہ احساس ایک دم ہی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا اور مجھ سے ایک لمحے میں ہزار بار یہ سوال پوچھ پوچھ کر مجھے نشتر چبھوتا رہا کہ وہ پُروا ضمیر خان جو خود کو ایسے ہر جذباتی احساس سے بالاتر سمجھتی تھی اُسے پسند آنے والا شخص بھلا کیسے غلط ہو سکتا ہے؟ لیکن تب تک شاید میں یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت کا اپنا غلط اور صحیح ہوتا ہے..... محبت دنیا کا قانون بھلا کب مانتی ہے کہ اُس کے تو اپنے قاعدے ہوتے ہیں۔ وہ دن میں نے بہت اذیت میں گزارے ہیں آیان ..... اور اُسی اذیت میں مَیں نے تمہیں وہ سب بتا دیا جو شاید کسی جذبے کی حرمت کو باقی رکھنے کے لیے پوشیدہ رکھنا ضروری ہوتا ہے....."

میں چپ چاپ پُروا کی بات سنتا رہا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اُس وقت اُسے ٹوکنا مناسب نہیں تھا۔ وہ میلوں دور کا سفر طے کر کے آئی ہوئی ایک شہزادی تھی جس کے لہجے میں نئے دیس کا خوف اور سفر کی تھکن نمایاں تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ "اگر تم میرے بارے میں تھوڑا سا بھی جانتی ہو تو اتنا یقین رکھو کہ تم نے وہ سب کچھ کہہ کر اپنی حرمت کھوئی نہیں ..... اُس میں اضافہ ہی کیا ہے..... میں چاہتا ہوں کہ تم ایسے ہر احساس ندامت کو اپنے دل سے مٹا کر ہمیشہ سر اُٹھا کر جیو..... محبت کو تو فخر اور غرور کا احساس ہمارے اندر بھرنا چاہیے ..... نہ کہ کسی ندامت و شرمندگی کا....." پُروا نے اپنی پلکیں اُٹھائیں ..... "تم ٹھیک کہتے ہو آیان اور بالکل یہی میرے اندر کی آواز بھی تھی۔ بس یہی دھڑکا لگا تھا کہ کہیں تم مجھے غلط نہ سمجھ لو..... آج یہ اُلجھن بھی دور ہوئی۔ اب میں اپنی محبت کے ساتھ فخر سے جی سکوں گی ..... اور تم مطمئن رہنا ..... یہ محبت کبھی تمہارے راستے کی دیوار یا پیروں کی زنجیر نہیں بنے گی..... کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے..... ایک پورا کارواں ہے جسے لے کر تمہیں چلنا ہے..... اور شاید میں بھی کہیں دور اسی کارواں کی آخری مسافر ہوں..... اس سفر میں تمہارا ساتھ دوں گی آیان ..... لیکن ایک درخواست ہے کہ میری محبت کی وجہ سے خود پر کبھی کوئی پابندی لگانا..... نہ مجھے کوئی خصوصی رعایت دینا..... یہ میرا اور میرے دل کے آپس کا معاملہ ہے....."

میں محویت سے اس صاف گو اور بہادر لڑکی کو دیکھتا رہا جو اس دور میں بھی سچ بولنے کا حوصلہ رکھتی تھی جب جھوٹ اور منافقت نے چار سو ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں نے اس بار اُسی کے انداز

میں خود ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر طے رہا کہ دوستی رہے گی اور آخری سانس تک رہے گی..... کیوں مس پُروا ضمیر خان .....؟'' پُروا نے میرے انداز پر چونک کر سر اُٹھایا اور پھر میری زوردار آواز اور بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر زور سے ہنس پڑی اور اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔ ''بالکل ٹھیک مسٹر آیان احمر'' دُور والی سٹریٹ کے چرچ کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔

اگلے روز ایک ہی کورٹ کے احاطے میں دو مختلف ججوں کے سامنے پہلے بسام اور پھر بابر سیّدی کی پیشی تھی۔ آسٹن پوری تیاری کے ساتھ عدالت آیا تھا اور اس نے آتے ہی سرکاری وکیل کو آڑے ہاتھوں لیا کہ صرف ٹائم اسکوائر کے دھماکے کی بنیاد پر کیا وہ نیویارک کے ہر مسلمان طالب علم کو نیویارک پولیس کے ہاتھوں قید کروانا چاہتا ہے؟ اگر بسام نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے عدالت کے سامنے ثبوت کے ساتھ پیش کیا جائے ورنہ بسام سمیت اس کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے سبھی بے گناہ طالب علموں کو رہا کیا جائے .....'' جج نے غور سے آسٹن کی ساری بات سنی اور پولیس حکام کو حکم دیا کہ اگر وہ اگلی پیشی پر مکمل ثبوت کے ساتھ حاضر نہ ہوئے تو سب کو رہا کر دیا جائے گا۔ آسٹن کی کوشش کے باوجود ہمیں اگلی پیشی کی تاریخ پانچ دن بعد کی ملی۔ میں نے بے چارگی سے بسام کی طرف دیکھا۔ اس نے دور سے ہی مجھے اطمینان رکھنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے نکل کر ہم بھاگم بھاگ بابر سیّدی کی پیشی والے کورٹ میں پہنچے۔ کاروائی شروع ہو چکی تھی۔ اور حکومت کا وکیل بابر سیّدی کے کمرے سے ملے کاغذ لہرا لہرا کر اسے خطرناک دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بابر سیدی کے لیے مسلم طلبہ نے چندہ اکٹھا کر کے وکیل کیا تھا اور اس چندے کی آدھی سے زیادہ رقم عامر سیّدی نے اپنے اکاؤنٹ سے ادا کی تھی۔ بابر کا وکیل اچھے انداز میں بابر کا دفاع کر رہا تھا لیکن بابر نے خود ایک ایسا جملہ کہہ دیا۔ جو اُس روز کے بعد ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ جس وقت بابر کا مخالف وکیل بابر کے کمرے سے ملنے والے پمفلٹ اور پوسٹر لہرا لہرا کر بھری عدالت میں چیخ رہا تھا کہ جناب والا ..... یہ دیکھیں اس لڑکے کے کمرے سے یہود کے خلاف کیسے کیسے خطرناک پوسٹر اور لٹریچر نکلا ہے۔'' تو بابر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اُس سے کہا۔ ''تم جسے الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو..... وہ ہماری تاریخ ہے..... جن قوموں کے آبائی وطن قبضہ کر کے ہتھیا لیے جاتے ہیں..... اُن کی

تاریخ سدا ایسے ہی پوسٹرز اور پمفلٹس سے بھری رہتی ہے..... اب میں اپنی تاریخ کو کیسے بدلوں.....؟ تم لوگ میرا وطن آزاد کروا دو..... میرے کمرے سے بھی محبت نامے ملا کریں گے.....'' چند لمحوں کے لیے کورٹ میں سناٹا چھا گیا پھر جج نے بابر کو سرزنش کی کہ جب اس کا وکیل عدالت میں موجود ہے تو اسے بولنے کی ضرورت نہیں..... بابر کو بھی اگلی پیشی تک پابند سلاسل رکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس دن عدالت سے نکلتے وقت پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک جدوجہد مسلسل کا شکار ہیں۔ مسلمان کے لیے تو یہ جہاں بڑی مشکل جگہ ہے۔ چاروں طرف ''لٹیروں کے پہرے'' ہیں اور مسلمان یرغمال ہے۔

اور پھر دو دن بعد اُس پاکستانی ڈاکٹر کی سزا کا فیصلہ بھی سنا دیا گیا۔ امریکہ کی تمام ''اعتدال پسند'' تنظیموں اور ''انصاف پسند'' جماعتوں کی امید کی برعکس اسے ''صرف'' 86 چھیاسی سال کی قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ نیویارک میں اس سزا پر مختلف قسم کا ملا جلا ردعمل دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن مسلم طلبہ اس فیصلے سے بے حد مایوس تھے۔ فرہاد نے چلا کر کہا۔ ''یہ تو اذیت در اذیت دینے والی بات ہے۔ اس انصاف سے تو بہتر تھا کہ وہ اس مجبور عورت کو ایک ہی بار زہر کا انجکشن دے کر مار ڈالتے.....'' کیفے کی دوسری میز پر احمر کے ساتھ بلال بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کہا۔ ''وہ اسے ہم سب کے لیے عبرت کا نشان بنانے کی باتیں کرتے تھے..... اور عبرت کا نشان بنانے کے لیے ایک ہی بار نہیں مارا جاتا..... روز روز کی موت دی جاتی ہے..... بار بار زندہ کر کے مارا جاتا ہے.....'' جم اور ایرک بھی خاموش سے بیٹھے ہوئے تھے پہلی بار ایرک کے پاس امریکہ اور نیویارک کی حمایت میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ فرہاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے مسلم گروپ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ ''ہاں آیان..... اب میں تم سب کے ساتھ مل کر یہ احتجاج کروں گا۔ اگر مذہب ہی اس دور میں وجہ شناخت ہے تو یوں ہی سہی..... اور مجھے اپنے مذہب پر فخر ہے.....''

یونیورسٹی کی فضا عدالت کے اس فیصلے سے کافی کشیدہ ہو گئی تھی۔ آج شام شیخ الکریم کا آخری لیکچر تھا۔ ہم سب چائنا ٹاؤن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے احمر اور بلال کو باقی تمام طلبہ کو بس میں سوار کر کے وہاں پہنچنے کا کہا اور خود آج ہی گیراج سے واپس آئی اپنی بائیک پر یونیورسٹی

کے گیٹ سے باہر نکلا تو چائنا ٹاؤن کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے چوراہا کراس کرتے ہی میری بائیک کے پیچھے ایک سادہ کیڈلک کار لگ گئی۔ میں کچھ دیر تک سائڈ کے شیشے میں اُسے اپنی بائیک کے بمپر سے تقریباً چھونے کی حد تک قریب دوڑتا دیکھتا رہا۔ پھر کار کی چھت پر کسی نے ہاتھ نکال کر نیلی بتی رکھ دی اور ہوٹر بجنے لگا۔ میں نے بائیک سڑک کے کنارے روک دی۔ کار بھی رک گئی اور اس میں سے دو افراد اُتر کر میری جانب چلے آئے۔ پہلے نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تمہارا نام ہی آیان ہے .....'' ''ہاں ..... میں آیان ہوں .....'' اس شخص نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دکھایا۔ ''میں سی آئی اے سے ہوں ..... آفیسر فورڈ ..... ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے .....'' دفعتہً مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھے گھیرے میں لے چکے ہیں۔

باب 11

میں نے آفیسر فورڈ کے ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو غور سے دیکھا۔ فورڈ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور والکس ویگن آ کر کھڑی ہو گئی تھی جس میں سے دو افراد نکل کر غیر محسوس طریقے سے کچھ فاصلے پر میرے دائیں بائیں کھڑے ہو چکے تھے۔ میں نے فورڈ سے پوچھا ''کیا مجھے گرفتار کیا جا رہے.....؟'' فورڈ مسکرایا۔ ''کافی تلخ حقیقت پسند لگتے ہو..... نہیں..... ہم تمہیں گرفتار نہیں کر رہے۔ بس تمہارے ساتھ کچھ باتیں کرنی ہیں۔ تم شاید چائنا ٹاؤن کی طرف جا رہے ہو؟ میرا آدمی تمہاری بائیک لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔ تم ہماری وین میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہیں مسجد تک ڈراپ بھی کر دیں گے اور راستے میں بات بھی ہو جائے گی۔ اس طرح تمہارا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔'' ان کی معلومات سے لگتا تھا کہ وہ بہت دن سے میری نگرانی کرتے رہے ہیں۔ میں نے بائیک کی چابی فورڈ کے حوالے کر دی جسے اس نے میرے دائیں جانب کھڑے شخص کی جانب اچھال دیا اور ہم وین میں جا کر بیٹھ گئے جس کے شیشے گہرے سیاہ تھے۔ وین چل پڑی۔ فورڈ کے علاوہ پچھلے حصے میں دو شخص اور موجود تھے۔ وین کے ڈرائیور والے حصے کو موٹے شیشے کی پارٹیشن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ فورڈ نے وین کے چھوٹے سے ریفریجریٹر سے کوئی مشروب نکال کر ٹن کھولا اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے مشروب لینے سے انکار کر دیا۔ ''تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے.....''

فورڈ نے لمبی سی ہاں کی ''کوئی خاص بات نہیں ہے..... بس تم جیسے ایک ماڈریٹ مسلمان لڑکے کو یوں اچانک ان مسجدوں کے چکر لگاتے دیکھ کر کچھ حیرت ہو رہی ہے..... ویسے تم نے اپنے

بھائی کے لیے بالکل ٹھیک وکیل چنا ہے۔ آسٹن اُسے اگلی پیشی میں ضرور رہا کروالے گا.....'' میں نے چونک کر فورڈ کر دیکھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ امریکن سی۔ آئی۔اے میں تم جیسے قابل اور ہوشیار افسر موجود ہیں۔ لیکن اس بات کا افسوس بھی ہے کہ سی۔ آئی۔ اے اپنی ساری صلاحیتیں مجھ جیسے ایک امریکن شہری کی نگرانی پر صرف کر رہی ہے..... تبھی تو ایک عام سیدھا سادھا طالب علم بھی ٹائم اسکوائر پر بم نصب کر کے آرام سے چلتا بنا۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ توجہ اُدھر بھی ہونی چاہیے.....'' فورڈ نے میرا طنز بہت آرام سے برداشت کیا۔ ''کافی بدتمیز ہو۔'' لیکن نڈر ہو..... ہم مسلمان کی اسی خصوصیت سے خائف رہتے ہیں..... تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... یہ اچانک تم پر اسلام کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے.....؟ مسلم کونسلر بننے سے پہلے تو تم ان مسلمان لڑکوں کے قریب پھٹکتے بھی نہیں تھے۔'' اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج مجھے یوں سرراہ روکنے سے پہلے ان سی۔ آئی۔ اے والوں نے ہفتوں میرے متعلق معلومات اکٹھی کر کے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا۔ میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا۔ ''اسلام میرا مذہب ہے، اور مسجد ہماری عبادت گاہ..... اس میں ایسی حیرانی کی کیا بات ہے..... کیا تم اپنے گرجا گھر نہیں جاتے.....؟'' فورڈ نے مشروب کی چسکی لی۔ ''پچھلے کرسمس پر گیا تھا..... اب اِس کرسمس پر دوبارہ جانے کا ارادہ ہے۔ خدا کو یاد رکھنے کے لیے عبادت گاہ کے چکر لگانا ضروری تو نہیں.....؟'' میں نے سر ہلایا ''اوہ..... میں اب سمجھا کہ تم بھی ایک ''ماڈریٹ'' عیسائی ہو..... اور تمہاری نظر میں سال میں ایک مرتبہ عبادت گاہ جانا ہی ماڈریٹ ہونے کی نشانی ہے.....''

فورڈ نے بات بدل دی۔ ''چلو مان لیا کہ یہ تمہارا ذاتی فعل ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اُس فلسطینی لڑکے کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے جس کے لیے تم نے گراؤنڈ زیرو پر مشعل جلائی تھی۔ تم خود کو امریکن شہری بھی مانتے ہو اور امریکہ دشمن لوگوں کے لیے دل میں ہمدردی بھی رکھتے ہو..... یہ تو بڑا دوغلا معیار ہوا.....'' ''بابر سیدی میرے گروپ کا متحرک کارکن طالب عالم اور ایک سچا دوست ہے..... مجھے اس کے امریکہ دشمنی کے بارے میں کبھی کوئی اشارہ تک نہیں ملا..... ہاں..... اس کی پوری نسل کا یہودیوں سے جھگڑا ضرور ہے اور یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے..... کیا یہود دشمن امریکہ دشمن بھی ہوتا ہے.....؟؟'' فورڈ نے میرا جواب سن کر پہلی مرتبہ بے چینی سے پہلو بدلا ''ہاں..... مگر یہودی

امریکن شہری بھی ہو..... تب.....'' وین تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی لیکن مجھے راستوں کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ فورڈ نے بات جاری رکھی۔ ''اچھا یہ بتاؤ اسامہ بن لادن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟'' میں نے برجستہ کہا ''کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔'' فورڈ زور سے ہنسا۔'' اچھا القاعدہ کے بارے میں تو ضرور جانتے ہو گئے..... تمہارے اندازے کے مطابق وہ لوگ کہاں تک جا سکتے ہیں.....؟''۔''میں تو آج تک یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ یہ القاعدہ آخر ہے کیا بلا.....؟..... کوئی خیالی یا فرضی تنظیم یا ایک حقیقت .....؟..... یا پھر خود کو مصروف رکھنے کا ایک بہانہ.....؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ جب کسی قوم کے سارے دشمن ختم ہو جائیں یا کم زور پر جائیں تو پھر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتی ہے..... ایسے میں اسے یکجا رکھنے کے لیے کوئی فرضی دشمن تراشنا پڑتا ہے..... شائد یہ القاعدہ بھی کچھ ایسی ہی ایک تنظیم ہو گی.....؟'' وین رُک گئی۔ میں اور فورڈ گاڑی سے نیچے اتر آئے جبکہ باقی دو افراد اسی طرح لاتعلق سے اندر بیٹھے رہے جیسے انہیں اس سارے معاملے سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ لیکن پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ میری اور فورڈ کی باتیں ریکارڈ کر رہے ہوں۔ ہم چائنا ٹاؤن کی مسجد کی پرلی سڑک پر کھڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر میری بائیک کھڑی تھی اور اس کے اگنیشن میں چابی جھول رہی تھی۔ فورڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا'' مجھے ایک بات نے متاثر ضرور کیا ہے کہ تم نے اپنے اندر کی ہر بات بلا جھجک کہہ دی۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم تمہارے بھائی کی گرفتاری سے لے کر اب تک تمہاری نگرانی کرتے آئے ہیں۔ دراصل ٹائمز اسکوائر دھماکے کے کیس میں گرفتار لڑکے کے بیان کی روشنی میں ہمیں بھی پاکستانی نژاد یا پاکستانی طالب علموں پر نظر رکھنے کی ہدایات موصول ہوئی ہیں اور جب تک ہم اس کیس کی آخری کڑی کو بھی گرفتار نہیں کر لیتے یہ پوچھ گچھ اور تحقیق جاری رہے گی۔ تم دونوں بھائیوں کا اب تک کا ریکارڈ صاف ہے لیکن تمہاری اس روز گراؤنڈ زیرو پر کی جانے والی دعا نے سارے میڈیا کی توجہ تم پر مبذول کرا دی ہے..... میں تمہیں بس اتنا ہی مشورہ دوں گا کہ امریکی شہری ہونے کے ناطے تمہاری وفاداریاں کسی اور سمت کا رُخ نہ کریں تو تم سب کے لیے بہتر ہو گا..... فورڈ نے مجھے پر الوداعی نظر ڈالی۔ ''شاید یہ ہماری آخری ملاقات نہ ہو۔'' وین چل پڑی۔

جب میں مسجد میں پہنچا تو شیخ الکریم کا آخری لیکچر سننے کے لیے طلباء کی ایک کثیر تعداد جمع ہو

چکی تھی۔ میرے ذہن میں جو سوالات تھے وہ میں پہلے ہی ایک کاغذ پر لکھ کر لایا تھا جسے میں نے بلال کے ساتھ شیخ صاحب تک پہنچا دیا۔ کچھ دیر میں شیخ الکریم نے اپنی جگہ سنبھالی اور مسجد کے صحن میں سناٹا سا چھا گیا۔ ''آج میں آپ لوگوں سے چند الوداعی کلمات کہنا چاہوں گا۔ گذشتہ تین ہفتوں میں نیویارک کی پرسکون فضا میں کافی ہل چل رہی۔ بدقسمتی سے یہ فضا ہمارے حق میں بہتر نہ تھی، مذہب کسی بھی شکست خوردہ قوم کا لٹنے والا آخری اثاثہ ہوتا ہے، اور مجھے لگتا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب فاتح ہمارے مذہب پر آخری ڈاکہ مارنے کی تیاریوں میں مصروف ہو چکے ہیں۔ جب دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو تاریخ ہمیشہ فاتح کے ہاتھوں لکھی جاتی ہے، اور اس تاریخ میں مفتوح کی اچھائیوں کا ذکر نہیں ہوتا، جیسا کہ نپولین نے کہا تھا کہ ''تاریخ کیا ہے.....؟'' بس چند تسلیم کردہ اوراق کا پلندہ.....'' لیکن یاد رہے کہ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے تو شاید تاریخ کے ان چند تسلیم شدہ صفحات میں بھی ہمارا ذکر کہیں نہ ملے.....، جنگیں تیاری سے لڑی جاتیں ہیں اور خود کو اس تاریخ کی لڑائی کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رکھیں۔ وہ (نعوذ باللہ) برن قرآن ڈے Burn Quran Day مناتے ہیں تو آپ لرن قرآن ڈے Learn Quran Day منائیں۔ وہ (استغفراللہ) نبی ﷺ کی تضحیک کا شیوہ اپناتے ہیں تو آپ اسی پیارے نبی ﷺ کی تعلیمات کو سارے معاشرے میں تبلیغ کر کے ان کو جواب دیں۔ یاد رکھیں، میانہ روی ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ ابھی بات شروع کرنے سے پہلے مجھے مسلم کونسلر کا ایک خط ملا جس میں بڑا دلچسپ سوال پوچھا گیا ہے کہ اپنی زندگی کے پہلے سجدے کی حرمت کو آخری سجدے تک کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی تمام عبادت کا حاصل کیا ہے.....؟ اسے لاحاصل ہونے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے.....؟ میں سمجھتا ہوں یہ صرف ایک سوال نہیں، تمام عمر کا ایک نظریہ اور ایک کلیہ ہے جسے اگر ہم سمجھ جائیں تو ہم سب کی نیا پار لگ جائے..... بہت مشکل ہے کہ پہلے سجدے کی حرمت کو آخری سجدے کی عظمت تک قائم رکھا جا سکے لیکن ناممکن نہیں.....، انسان جب اپنی عمر کا پہلے بے لوث اور خالص خدا کی رضامندی کے لیے اوّل سجدہ کرتا ہے تو اس کے زمین پر ماتھا ٹیکتے ہی اس کے تمام ماضی کے گناہ مٹ جاتے ہیں.....، مسلمان کا پہلا سجدہ تو ویسے ہی عموماً معصومیت کے دور کی ایک خوش گوار یاد ہوتا ہے، لیکن پھر انسان دوبارہ دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے۔ پہلے سجدے سے لے کر

آخری سجدے کے درمیان کئی بار گناہوں سے آلودہ شب و روز اُس کا مقدر رہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کو سجدہ کرتا ہے، اپنے اللہ کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے۔ معافی مانگتا ہے اور اگلی صبح پھر اسی خدا کی نافرمانی شروع کر دیتا ہے۔ سچ بتاؤں تو میں خود بھی کبھی اپنے پہلے سجدے کی حرمت برقرار نہیں رکھ پایا لیکن میرے دوست مسلم کونسلر کے دل میں یہ ڈر ہے کہ جب ایک بار ماتھا ٹیک ہی دیا تو پھر کہیں کوئی بھی لغزش اس کی ساری ریاضت ضائع نہ کر پائے.....واہ.....سبحان اللہ ایسا تزکیۂ نفس تو اب سوچ کی حدوں سے بھی پرے کی بات ہے، روزانہ ہم سے نہ چاہتے ہوئے بھی کیا کچھ سرزد نہیں ہو جاتا.....؟ آنکھ، کان، زبان..... دل اور دماغ.....کسی کا بھی تو پردہ نہیں رکھ پاتے ہم لوگ .....لیکن میں ایمان کے جس کم زور ترین درجے پر فائز ہوں اُس حوالے سے اِس مشکل تر سوال کا بس ایک ہی جواب ہے میرے پاس..... کہ جب تک سانس رہے اور جب تک اللہ کی طرف سے سجدوں کی توفیق باقی ہو، انسان کو اپنے ہر سجدے کو آخری سمجھ کر ماتھا ٹیکنا چاہیے اور ہر بار پہلے سجدے کی طرح سر اٹھانا چاہیے، یعنی ہر سجدہ ہی اس کا آخری اور پہلا سجدہ ہے..... اور ہر بار کی ملی درمیانی مدت صرف عبوری سمجھ کر گذارنی چاہیے..... یاد رہے کہ صرف سجدہ ہی وہ واحد عبادت ہے جو ابلیس کو شیطان بنا گئی، ورنہ وہ تو فرشتوں کا بھی فرشتہ تھا۔ ایک سجدے کے انکار نے اُسے کیا سے کیا بنا ڈالا.....لہٰذا اس سجدے کو معمولی ہرگز نہ جانیئے گا..... یہی ایک سجدہ ہی تو آدم کو ابلیس ہونے سے بچاتا ہے..... ورنہ خدا کو سجدہ کرنے والے فرشتوں کی بھلا کیا کمی تھی.....؟ ان میں سے کچھ تو شاید ازل سے ابد تک سجدے میں ہی پڑے رہے ہیں۔ لیکن یہ آدم کا سجدہ ہے جو اُسے صرف مخلوق سے اشرف المخلوقات بناتا ہے.....لہٰذا اپنے سجدوں کو گراں نہ جانے دیں..... ساری خلقت جب مسلمان کے درپے ہو تو اسے اپنے خالق کا ہی سہارا ہوتا ہے.....اُس خالق کو بھی خود سے ناراض نہ کر دیجئے گا۔ وما الینا الا البلاغ .....''

شیخ الکریم کا آخری لیکچر بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا لیکن مجھے اب بھی مزید کچھ آگہی کی تشنگی محسوس ہو رہی تھی۔ تین دن بعد شیخ الکریم یہاں سے قاہرہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے اور پھر وہاں لیکچرز دینے کے بعد انہیں واپس تل ابیب جانا تھا۔ طلباء ان سے الوداعی ملاقات کے لیے انہیں گھیرے کھڑے تھے اور میرا نمبر آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔ انہوں نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا، ہاں

بھئی..... کچھ حصہ تو مل ہی گیا ہوگا تمہیں اپنے سوال کے جواب کا..... بہرحال میں کوشش کرتا رہوں گا کہ کوئی کامل جواب ملے تو تم تک پہنچاؤں..... تم نماز سیکھنے نہیں آئے میرے پاس.....؟.....''

''جی..... میں یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ کیا میں کل شام سے آپ کے جانے تک روزانہ دو گھنٹے یہاں آسکتا ہوں..... جو وقت بھی آپ کو مناسب لگے.....'' ''ضرور ضرور کیوں نہیں..... ماشاء اللہ تمہارا خمیر تو پاکستان کی مٹی سے اٹھا ہے، بچپن کی یاد کردہ آیات دہرانے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا تمہیں..... تم یوں کرو عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت مقرر کرلو..... آگے جو اللہ کی مرضی.....''

ہم یونیورسٹی واپس پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی اور صرف لائبریری اور چند دیگر شام کے شعبے کھلے تھے۔ ایرک اور جینی مجھے کیفے کے باہر والے بڑے دالان کے ایک بینچ پر سرگوشیاں کرتے نظر آئے اور میں ان کی جانب بڑھ گیا۔ ''مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا کہ آخر تم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر روزانہ آخر کیا کھسر پھسر کرتے رہتے ہو.....؟ .....تم دونوں کی باتیں آخر کبھی ختم کیوں نہیں ہوتیں.....؟'' جینی زور سے ہنس پڑی۔ ''پکے مسلم کونسلر بنتے جارہے ہو..... چند دن میں تم ہماری ملاقاتوں پر بھی پابندی لگا دو گے۔ آیان.....'' ایرک بھی مسکرایا۔ ''میری بد دعا ہے کہ کبھی تم بھی کسی کی ان پیار بھری سرگوشیوں کو ترسو..... لیکن شاید تمہارے ہاں محبت گناہ کے زمرے میں آتی ہے.....؟'' جینی نے گرہ لگائی ''حالانکہ میں نے ٹی۔ وی پر پاکستانی چینلز پر ہمیشہ موبائل فونز کے اتنے زیادہ سستے پیکیجز کے اشتہارات چلتے دیکھے ہیں کہ مجھے حیرت ہوئی ہے۔ ''تمام رات مفت بات کرنے کا پیکیج، وغیرہ وغیرہ..... تم ان کی پیش کش پر کیوں تبصرہ نہیں کرتے کہ آخر تمام رات مفت کال کرنے کا یہ پیکیج ایک اسلامی ملک میں کس طبقے کے لیے متعارف کروایا جارہا ہے.....؟ میں بھی مسکرایا۔ ''وہ تمام پیکیجز Packages بھی تم جیسے احمقوں کے لیے ہی متعارف کروائے جاتے ہیں جو آئندہ زندگی کی تمام باتیں راتوں میں ختم کرکے خوش قسمتی سے رشتہ ہو جانے کی صورت میں تمام عمر ایک دوسرے سے باتیں ختم ہو جانے کی شکائتیں کرکے لڑتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو وہاں میں زندگی بھر کا رومانس چند راتوں میں نچوڑ دینے والی ایسی ہر پیش کش پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگا دیتا.....'' کبھی کسی کو ملانے کی بات بھی کرلیا کرو۔ You Seperator..... جدائی کے فرشتے میں اور جینی ایرک کی یہ دھائی سن کر

زور سے ہنس پڑے۔ اتنے میں مجھے احمر نے عقب سے پکارا ''آیان..... کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' جینی نے لقمہ دیا۔ ''جاؤ..... تمہارے ''جدائی گروپ'' کا ایک اور ہرکارہ آیا ہے، دیکھنا آیان..... تمہیں جب بھی محبت ہوئی ایسی جان لیوا ہوگی کہ اس کاٹے کا پانی بھی نہیں مل پائے گا تمہیں.....'' میں مسکراتا ہوا وہاں سے پلٹ گیا۔ تم جیسے دوستوں کی موجودگی میں ہی دشمنوں کو اضافی کہا گیا ہے.....''

احمر کچھ پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''تمہیں عامر بن حبیب نے بلایا ہے۔ ہمیں ابھی چلنا ہوگا.....'' عامر بن حبیب کی روپوشی کو آج تین دن پورے ہو چکے تھے اور ان تین دنوں میں یہ ہماری پہلی ملاقات ہو رہی تھی۔ عامر بن حبیب بارکلے سٹریٹ کے ایک کشادہ سے اپارٹمنٹ میں رُوپوش تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گیا جیسے کوئی برسوں پرانا رفیق اُس سے ملنے آیا ہو۔ کبھی کبھی ہمارے آس پاس ہی کیسے کیسے نادر اور مخلص لوگ موجود ہوتے ہیں لیکن ہمیں وہ نظر نہیں آتے اور ہم زمانے میں وفا اور خلوص کی دھائی دیئے پھرتے ہیں۔ عامر بن حبیب بھی ایسا ہی ایک نایاب صفت تھا جسے پہنچاننے میں میں نے کتنی دیر لگا دی۔ عامر نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''آیان ..... یقین جانو اب میں بہت مطمئن اور Relax ہوں..... مجھے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ میری گرفتاری یا کسی اور ناگہانی آفت کی صورت میں یہ پورا گروپ بکھر جائے گا اور ہم نے اتنے برسوں میں اپنی ایک جو پہنچا بنائی ہے وہ بھی مٹ جائے گی، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا..... مجھے یقین ہے کہ تم آخری سیمسٹر تک مسلم کونسلر شپ کی ایسی مضبوط روایت ڈال جاؤ گے کہ ہمارے جانے کے بعد بھی اس یونیورسٹی میں مسلم کونسلر کا عہدہ ہمیشہ برقرار اور مضبوط رہے گا۔'' میں نے عامر کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی ''لیکن تم اتنی لمبی منصوبہ بندی کیوں کر رہے ہو.....؟ کچھ دن بعد تم اور بابر سیدی یونیورسٹی دوبارہ جوائن کر لو گے۔ اور ہم سب مل کر یہ جدوجہد جاری رکھیں گے.....اور تیسرا مہینہ ختم ہوتے ہی میں تمہیں دوبارہ مسلم کونسلر بنا کر تمہاری امانت تمہارے سپرد کر دوں گا۔ جب تک تم یونیورسٹی میں ہو تبھی مسلم کونسلر رہو گے..... اور میں اور بابر آخری دم تک تمہارے بازوؤں کی طرح تمہاری مدد کے لیے ساتھ دیں گے.....'' عامر نے گہری سی سانس لی۔ ''میرا دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرنا اب اتنا آسان نہیں ہے میرے دوست..... سی۔ آئی۔ اے میرے پیچھے پڑ چکی ہے اور یہ بات بہت پہلے سے ہی متوقع تھی۔

اسی لیے میں یہ چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح کوئی امریکن شہریت رکھنے والا مسلمان طالب علم مسلم کونسلر بن جائے تاکہ اگر وہ مجھے کسی زندان میں ڈال دیں یا پھر ملک بدر بھی کریں تو وہ میرے جانے کے بعد یہ ذمہ داری سنبھال سکے..... کیونکہ کسی امریکن شہری کو ملک بدر کرنا ان کے لیے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا.....'' میں نے عامر کو وہ بُری خبر سنانے کا فیصلہ کر لیا جیسے میں پہلے اس کی پریشانی کا سوچ کر چھپائے رکھنے کی سوچ رہا تھا۔

سی۔ آئی۔اے کی تو مجھ پر بھی نظر ہے عامر بن حبیب.....'' وہ میری بات سن کر زور سے چونکا اور میں نے عامر کو آج دن کی ہوئی تمام واردات بتا دی۔ عامر گہری سوچ میں ڈوب گیا'' نائن الیون کے بعد یہ لوگ ہر اس مسلمان سے کھٹک جاتے ہیں جو ذرا سا بھی دل جمعی کے ساتھ اپنے مذہب کی جانب متوجہ ہو..... اُن کا خیال ہے کہ ہماری مسجدوں میں صرف دہشت گرد پلتے ہیں اور شیخ الکریم جیسے بزرگ اُستاد وہاں طالب علموں کو بم بنانے اور خودکش حملوں کی تربیت دیتے ہیں۔ آیان تم امریکی شہری ہو تبھی اُس آفیسر نے تمہاری اتنی بات برداشت کر لی۔ ایسی بات مجھ سا کوئی عرب یا بابر جیسا فلسطینی کرتا تو وہ اب تک ہمیں اسامہ بن لادن کا دایاں ہاتھ ثابت بھی کر چکے ہوتے۔ مسلمان کی زندگی ہجرت میں یہاں بڑا عذاب ہے دوست..... تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ آخر کار تم ان کے لیے مسلمان پہلے اور امریکن بعد میں ثابت ہو گے..... کوشش کرنا کہ ان سے اُلجھے بنا ہی معاملات طے پا جائیں.....''

''لیکن اُنہیں تم سے اب ایسی کیا پرخاش ہو گئی ہے.....؟'' عامر مسکرایا'' پرخاش تو انہیں نائن الیون کے بعد ہر عرب مسلم کے ساتھ ہے کیونکہ ٹکرانے والے جہازوں کے پائیلٹ زیادہ تر عرب ہی تھے..... لیکن امریکن اپنے کچھ مفادات کی وجہ سے اب تک کھلم کھلا عربوں کی مخالفت نہیں کر پائے..... البتہ سارا نزلہ پاکستان اور افغانستان پر جا گرا..... عراق کا نمبر بعد میں آیا..... لیکن یہ کسی عرب کو یہاں نیویارک میں ایسی کسی سرگرمی میں ملوث ہوتے بھی برداشت نہیں کر سکتے جو ان کے لیے کسی انتظامی مشکل کا باعث بن جائے.....'' اسی روز عامر بن حبیب نے کافی تفصیل سے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک ممتاز عرب خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ ہے اور اس سے پہلے وہ قاہرہ کی اسلامک

یونیورسٹی سے گریجوایشن مکمل کر چکا ہے اس کے والد کا ریاض میں قالینوں کا بہت بڑا کاروبار ہے اور ان کی جائیداد دنیا کے چھ ممالک میں موجود ہے۔ عامر کے والد اُسے اپنے کاروبار میں شریک کر کے سب انتظام اسی کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن قاہرہ یونیورسٹی میں کچھ ایسا ہوا کہ اس کا من مذہب کی اس جدوجہد کی طرف پلٹ گیا اور وہ ماسٹرز کے لیے نیویارک آ گیا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے عامر کا چہرہ قاہرہ یونیورسٹی کے ذکر پر کچھ شکن زدہ سا ہو گیا تھا لیکن میں نے اُسے کرید کر مزید اُداس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اُٹھتے ہوئے عامر کے شانے کو سہلایا۔ ''فکر مت کرو..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... اگر یہ جنگ ہے تو ہم اسے بھرپور لڑیں گے اور اگر ہار ہی مقدر ہے تو پھر آخری مات تک لڑیں گے.....'' عامر مسکرایا ''مجھے تمہاری یہ فائٹنگ اسپرٹ ہی سب سے زیادہ بھاتی ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں ہرانا اتنا آسان نہیں ہوگا ان کے لیے..... تم ہارتے ہارتے ہارو گے آیانؔ.....''

اگلے روز بسام کی پیشی تھی، میں کورٹ پہنچا تو سیڑھیوں پر ہی صنم کبیرؔ اور ماموں سے ملاقات ہو گئی، کچھ ہی دیر میں جینی، ایرک، جم اور فرہاد بھی آ گئے۔ میں نے آج جان بوجھ کر مسلم گروپ کے لڑکوں کو عدالت آنے سے منع کر دیا تھا، میں اب ذرا محتاط ہو کر ہر قدم اٹھانا چاہتا تھا اور ویسے بھی میں نے اپنے تمام دوستوں کو فی الحال بسام کو میرے مسلم کونسلر بننے کی خبر دینے سے منع کر رکھا تھا۔ میں اسے تنہائی میں آرام سے یہ خبر سنانا چاہتا تھا۔ وہ میرے مسلم گروپ کو جوائن کرنے پر ہی بہت پریشان تھا، اس لیے اسے ایک دم ہی یہ خبر سنانا بہتر نہ ہوتا۔ اس روز آسٹن پوری تیاری کر کے آیا تھا اور اس نے سرکاری وکیل کی ایک نہیں چلنے دی۔ جج نے رسمی کارروائی کے بعد بسام کی ضمانت منظور کر لی۔ وہ عدالت سے باہر نکلا تو ہم سب اس سے لپٹ گئے، آسٹن نے میرا شانہ تھپکا ''لو بھئی..... ضمانت تو ہو گئی تمہارے بھائی کی..... لیکن اب ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا..... کیونکہ الزام ابھی ختم نہیں ہوا.....'' آسٹن دو قدم آگے بڑھا پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ ''ارے ہاں..... یاد آیا..... بھئی تم اُس دن نائن الیون پر خوب بولے تھے..... تم تو بڑے مشہور ہو گئے ہو لڑکے.....'' بسام کے کان کھڑے ہو گئے ''یہ وکیل کیا کہہ رہا تھا.....'' میں نے بات ٹالی کچھ نہیں..... یونیورسٹی کی طرف سے کوئی تقریب تھی۔ تم چلو..... دیر ہو رہی ہے.....'' ہم سب آگے بڑھے، لیکن سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کی ریلنگ کے

پاس آفیسر فورڈ کو دیکھ کر میں ٹھٹھک سا گیا۔ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ وہاں کھڑا بے پرواہی سے یوں مونگ پھلی کے چھلے ہوئے دانے چبا رہا تھا جیسے اُس نے آج وہ کاغذ کا بڑا سا تھیلا ختم نہ کیا تو کوئی غضب ہو جائے گا، اس نے مجھے دیکھتے ہی گرم جوشی سے کہا ''ہے یو..... Hey you، مسلم کونسلر..... بھائی کی آزادی مبارک ہو..... میں نے کہا تھا نا آسٹن اُسے چھڑا لے جائے گا۔'' بسام فورڈ کے منہ سے میرے لیے مسلم کونسلر کا لفظ سن کر بری طرح سے چونکا۔ میں نے فورڈ کو گھورا۔ کیا تم مجھے یہاں یہ احساس دلانے کے لیے کھڑے ہو کہ سی۔آئی۔اے اب امریکن عدالتوں کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے..... فورڈ مسکرایا ''نہیں..... ہم تو کسی اور کام سے عدالت آئے تھے..... لیکن یہاں تم سے ملاقات ہو گئی..... بہر حال میں تمہاری بہترین قسمت کی دعا دیتا ہوں.....'' فورڈ اپنے ساتھیوں سمیت آگے بڑھ گیا لیکن بسام کے پاؤں وہی گڑھ کر رہ گئے۔ ''آیان..... تم مسلم کونسلر بن گئے ہو..... بہت خوب..... اور کیا کیا چھپایا ہے تم نے مجھ سے.....؟'' میں نے بڑی مشکل سے اسے اپارٹمنٹ چلنے پر راضی کیا لیکن گھر کا دروازہ بند کرتے ہی وہ مجھ پر برس پڑا۔ ''انو..... یہ سب کیا ہو رہا ہے..... تم مسلم کونسلر بن چکے ہو اور سی۔آئی۔اے تمہاری تفتیش کرتی پھر رہی ہے..... تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے..... یہ سب ہمارے بس کی بات نہیں ہیں..... تم اسلام کے ٹھیکے دار کب سے بن گئے.....؟'' مجھے بھی غصہ آ گیا۔ ''تب سے جب عامر بن حبیب اور بابر سیدی کو تمہاری حمایت کے جرم میں یونیورسٹی سے نکالا گیا اور عامر بن حبیب کی کونسلر شپ میری وجہ سے ختم ہوئی۔'' آیان بھی زور سے چلایا۔ ''ہاں..... لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ تم ان کی جگہ لے لو..... عامر یا بابر کو اگر امریکہ سے نکالا گیا تو وہ پھر بھی اپنے ملک اپنے گھر واپس لوٹ جائیں گے..... لیکن ہم کہاں جائیں گے ہمارا نہ تو کوئی اور ملک ہے اور نہ گھر..... مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم بھی آخر کار اسی رستے پر چل پڑو گے جس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہے..... میں کچھ نہیں جانتا..... تم صبح یونیورسٹی جا کر پہلا کام یہی کرو گے کہ کونسلری اور مسلم گروپ کی ممبر شپ سے استعفیٰ دو گے..... اور اگر تم خود نہیں دو گے تو میں تمہاری طرف سے لکھ آؤں گا..... اور مجھے اس سلسلے میں مزید کوئی بحث نہیں سننی ہے.....'' میں نے زور دے کر کہا ''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے..... میں تمہاری طرح احسان فراموش نہیں ہوں..... اب میں ان کا

ساتھ نہیں چھوڑ سکتا.....'' بسام نے طنزیہ لہجے میں کہا ''واہ..... خوب برین واش کیا ہے تمہارا ان لوگوں نے..... انہیں اور آتا ہی کیا ہے.....؟..... تم جیسے نادانوں کو ایسی ہی پٹیاں پڑھا کر وہ دہشت گرد بنا دیتے ہیں..... لیکن میں تمہیں دہشت گرد نہیں بننے دوں گا آیان میں زور سے چلایا ''تم کون ہوتے ہو مجھے یہ پٹیاں پڑھانے والے.....'' بسام غصے میں چلایا..... ''میں کون ہوتا ہوں ..... بہت خوب آج تم ان دہشت گردوں کی وجہ سے مجھ سے یہ پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں..... لگتا ہے چار دن میں کافی یارانہ ہو گیا ہے.....'' میں اور بسام ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوئے..... میرا لہجہ بھی تلخ ہو گیا ''اور مجھے لگتا ہے کہ امریکہ میں رہتے ہوئے تمہارا خون بھی انہی لوگوں کی طرح سفید ہو گیا ہے.....'' بسام زور سے چلایا۔ ''آیان.....'' اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور ایک زوردار چانٹے کی صورت میرے گال پر پانچ انگلیوں کا نشان چھوڑ گیا۔



باب 12

کمرے میں زوردار چانٹے کی آواز گونجی، میری پوری زندگی میں بسام نے آج تک کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا، جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تب ایک بار بسام نے یونہی دھمکانے کے لیے صرف ہاتھ سے مجھے مارنے کا اشارہ کیا تھا تو میں اگلے دو دن اس سے ناراض رہا اور بات چیت بند کر دی تھی۔ پھر ڈیڈ نے ہم دونوں بھائیوں کو زبردستی گلے ملایا اور ہمیں ساحل پر ہماری پسندیدہ پولکا آئس کریم کھلانے لے گئے تھے، اس سے اگلے برس ہم سب امریکہ آ گئے اور تب سے آج تک کبھی بسام نے مجھے پھول سے بھی نہیں چھوا تھا..... حالانکہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ نازک مزاج تھا لیکن اس نے ہمیشہ میرے ہی ناز اٹھائے تھے۔

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی ساکت ہو گئے اور پھر میں شدید غصے میں پلٹا اور بسام کے روکنے کے باوجود زور سے دروازہ بند کر کے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ وہ رات میں نے نیویارک کی سڑکوں پر آوارہ گردہ کرتے ہوئے گذاری..... ستمبر جا رہا تھا اور نیویارک کی راتیں بہت سرد ہو چکی تھیں۔ راستے میں بہت سی جگہوں پر بے گھر افراد نے لوہے کے بڑے بڑے ڈرمز میں ہاتھ سینکنے کے لیے آگ جلا رکھی تھی۔ آخر بسام کو بے گھر ہونے کا اتنا خوف کیوں تھا؟..... یہ لوگ بھی تو تھے جو یوں بنا کسی گھر، کسی چھت کے اپنی زندگی گذار رہے تھے۔ کیا زندگی صرف ''چھت اور چھایا'' کما لینے کا ہی نام ہے.....؟..... صبح کے وقت میں بنا کسی ارادے کے چائنا ٹاؤن جانے والی زیر زمین ریل میں آ بیٹھا، مسجد میں فجر کی نماز کی تیاریاں جاری تھیں۔ شیخ الکریم کی معیت میں جماعت کھڑی ہوئی تو میں

بھی دوسروں کو دیکھا دیکھی وضو کر کے جماعت کے ساتھ کھڑا ہو گیا، شیخ نے سلام پھیرا تو مجھے وہاں دیکھ کر تعجب آمیز خوشی سے بولے۔ ''ارے..... آج تو مسلم کونسلر بھی یہاں موجود ہے..... لیکن اتنی صبح..... تمہیں تو عصر کے وقت آنا تھا لڑکے.....'' میں نے دبے لفظوں میں انہیں بسام سے ہوئی جھڑپ کے بارے میں بتا دیا، وہ مسکرائے ''دو بھائیوں میں تکرار نہ ہو تو زندگی پھیکی ہے..... اس کی یہ ڈانٹ بھی دراصل تمہاری محبت کا ثبوت ہے..... اُسے ڈر ہے کہ کہیں تم غلط ہاتھوں میں پڑ کر جنوں کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اور اس میں اس کا ایسا کچھ قصور بھی تو نہیں ہے۔''

ہم نے کچھ عرصے سے خود اپنی شناخت کو بھی تو اسی جنون کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے..... لہٰذا اب نوے فیصد جھوٹ اور دس فیصد سچ کا سارا ملبہ تو ہم پر گرنا ہی تھا۔'' میں اب بھی کسی اندرونی الجھن کا شکار تھا۔ ''لیکن یہ شناخت کا جھگڑا شروع ہی کیوں ہوا.....؟..... کیا مذہبی پہچان واقعی اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ کئی تہذیبیں اس جنگ میں جھونک دی گئیں..... آخر مسلمان سے ایسا کیا بیر ہے باقی نسلوں کو.....؟.....'' شیخ الکریم مسکرائے۔ انہیں اپنی شناخت چھن جانے کا خطرہ ہے اس لیے وہ ہم سے لڑتے ہیں اور ہماری بے وقوفی دیکھو کہ ہم خود اپنی شناخت مٹانے کے درپے ہیں یہود یکجا ہو چکے.....، اور ہماری فرقہ در فرقہ تقسیم کا عمل رُکنے میں نہیں آتا۔ ''لیکن یہ یہودی بھی ہیں تو آخر وہ ہمیں کیوں مٹانا چاہیں گے.....؟..... جب کہ آپ نے ابھی خود کہا کہ ہم خود اپنے آپ کو مٹانے کے درپے ہیں..... تو یہ بات پھر مسلمان دشمن نسلوں کو بھی اچھی طرح پتا ہو گی..... پر وہ اپنی تمام توانائیاں ہم پر ہی کیوں صرف کرنے لگے.....؟..... وہ ہماری نسبت پہلے ہی بہت ترقی یافتہ ہیں اور انہوں نے کم از کم اس دنیاوی ترقی کا راز بھی پالیا ہے کہ کس طرح وقت کی اس دوڑ میں خود کو آگے رکھا جا سکتا ہے، پھر وہ اپنا قیمتی وقت ایک ہارے ہوئے پسپا دشمن پر کیوں ضائع کرنے لگے.....؟..... سچ کہوں تو مجھے اب بھی یہ سب افسانوی باتیں لگتی ہیں..... ہم نے اپنی ناکامی کو ان یہودیوں کے سر تھوپنے کا آسان طریقہ ڈھونڈ لیا ہے اور بس.....'' شیخ الکریم نے اطمینان سے میری بات سنی ''شاید کسی حد تک یہ اندازہ درست ہے..... لیکن یہود اور مسلمان کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے..... اسی عداوت کی مثال بالکل شیطان اور آدم کی دشمنی کی ابتداء جیسی ہے..... جس طرح ابلیس آدم سے پہلے اللہ کے مقرب ترین فرشتوں

میں سے ایک تھا اور آدم کی تخلیق اور سجدے کے حکم سے اسے اپنی اہمیت اور لاڈلہ پن ختم ہوتا نظر آیا..... ٹھیک اسی طرح مسلمان سے پہلے یہود اللہ کی لاڈلی قوم تھی اور پیارے نبی محمد ﷺ کی آمد اور نبی آخر الزمان ﷺ کی اُمت نے جب یہود سے ان کا وہ اعزاز اپنے نام منتقل کروالیا تو ٹھیک اسی ابلیس کی طرح جس نے تاابد آدم کو بہکا کر اس سے یہ تکریم چھیننے کا عہد کر لیا تھا، یہود سے بھی مسلمان کو ملا یہ اعزاز کبھی ہضم نہیں ہوا۔ شیطان کی طرح یہود بھی جانتے ہیں کہ وہ غلط ہیں لیکن بغض اور حسد اُس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ وہ اپنی خطا تسلیم کرنے کے بجائے، وہ جسے عزت و رتبہ ملا، اس کو وجہء خطا مانتے ہیں اور اُسے بے عزت اور ذلیل کر کے فنا کرنے کے درپے ہیں..... اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ آدم شیطان کی اور مسلمان خود یہود کی مدد کر کے ان کا یہ کام آسان کرتا آیا ہے۔ سچ ہے..... شیطان کی چال بڑی گھائل کر دینے والی ہے.....'' میں غور سے ان کی باتیں سنتا رہا..... مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ان سوالوں کے جواب ملے جو ہمیشہ سے میرے اندر کہیں موجود تھے لیکن جواب نہ ملنے کے ڈر سے میں نے سدا انہیں دبائے رکھا۔ دُھوپ نکلنے کے کچھ دیر بعد شیخ نے مجھے وضو کرنے کا کہا اور مجھے دیکھتے رہے۔ پھر چند جگہوں پر انہوں نے میری تصحیح کی اور خود مجھے پورا وضو کر کے بتایا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے نماز سنی اور جہاں جہاں تصحیح کی ضرورت تھی وہاں میری درستگی اور رہنمائی بھی کرتے گئے۔ ظہر تک میں ان کے ساتھ ہی رہا اور انہوں نے بہت سی بنیادی باتیں مجھے سکھا دیں، ظہر کے بعد میں اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے مسجد سے نکل آیا..... بارش کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور بادلوں نے آسمان سے اُفق تک اپنا خیمہ باندھنا شروع کر دیا تھا۔ نیلے فلک کے گڈریئے نے بادلوں کی سفید بھیڑوں کو ہانک ہانک کر شام سے پہلے گھر جانے کے لیے اکٹھا کرنا شروع کیا تو نیچے گھاٹیوں سے سرمئی اندھیرا سا چھانے لگا، اور جب میں نے یونیورسٹی کے گیٹ سے قدم اندر رکھا تو پہلی بوند میری جبیں پر سجدہ کر چکی تھی۔ اکیڈمک بلاک میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے صنم کبیر کی مجھ پر نظر پڑی اور وہ بدحواس سی میری جانب لپکی ''آیان..... کہاں تھے تم دن بھر'' ہم سب تمہیں تلاش کر کر کے تھک گئے..... کہاں چلے گئے تھے تم.....؟'' میں نے حیرت سے اُسے دیکھا ''کیا ہوا.....؟..... خیر تو ہے.....؟..... میں کسی میلے میں کھو تو نہیں گیا تھا مس پہلوی.....''۔ ''بسام تمہیں کل رات سے پورے

نیویارک میں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈ چکا اب تک..... تم ساری رات کہاں تھے.....؟ جانتے نہیں تمہارا بھائی تمہارے لیے کتنا فکر مند ہو جاتا ہے.....'' مجھے رات والی جھڑپ یاد آ گئی۔ ''وہ تمہیں ملے تو اس سے کہنا کہ اسے میرے لیے فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... میں نے مسلم ہاسٹل میں کمرہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے..... میری ذمہ داریاں اب مجھے یونیورسٹی سے زیادہ دیر باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتیں.....'' اچانک میرے عقب سے بسام کی آواز ابھری۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری قید کے دوران تمہیں وہ لوگ اپنے بھائی سے زیادہ پیارے ہو گئے ہیں..... اس لیے تم اپنا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہنے کی بات کر رہے ہو.....'' بسام جانے کس وقت وہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ میں چپ رہا۔ صنم کبیر نے پریشانی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا ''کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو..... پوری یونیورسٹی تم دونوں بھائیوں کی آپس کی محبت کی مثالیں دیتے نہیں تھکتی۔..... اور تم دونوں یوں.....؟'' بسام نے صنم کی بات کاٹ دی ''یہ تم اسے سمجھاؤ..... میں اسی کے بھلے کے لیے اسے ان لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں..... میں جانتا ہوں کہ عامر بن حبیب اور بابر سیدی نے میرے لیے تحریک چلا کر ہم پر بڑا احسان کیا..... مجھے ذاتی طور پر ان دونوں لڑکوں سے کوئی پرخاش بھی نہیں ہے..... وہ اچھے لڑکے ہیں لیکن یہاں بات کسی کی ذات کی نہیں ہو رہی..... یہ ایک اجتماعی تاثر کی بات ہے اور نیویارک کے آج کل کے حالات میں کسی یونیورسٹی میں مسلم کونسلر ہونا بذاتِ خود اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے اور آیان کے پیچھے تو پہلے ہی سی۔آئی۔اے کی عقابی نظریں لگ چکی ہیں.....'' بسام اپنی بات کر رہا تھا کہ اتنے میں پروا اور جینی کے ساتھ ایرک اور جم بھی وہاں پہنچ گئے ایرک نے میرا ہاتھ تھام لیا بسام ٹھیک کہہ رہا ہے آیان..... تمہارا بھائی بناء کسی قصور کے تین ہفتے جیل میں گزار کر آ رہا ہے..... تم پر کوئی الزام لگانے میں تو انہیں شاید ایک لمحہ بھی نہ لگے..... ہم سب دوستوں کی یہی رائے ہے کہ تم فی الحال خود کو سی۔آئی۔اے کی نظروں میں آنے سے بچانے کے لیے مسلم کونسلر شپ سے استعفیٰ دے دو..... تم پس منظر میں رہ کر بھی اپنے مسلم دوستوں کی مدد کر سکتے ہو.....'' پروا نے ان سب کی باتوں میں کوئی دخل نہیں دیا اور وہ چپ چاپ کھڑی ان سب کی سنتی رہی۔ میں نے ان سب پر نظر ڈالی۔ ''آج تم لوگ پولیس اور سی۔آئی۔اے کے ڈر سے مجھے سچ کا ساتھ دینے سے منع کر رہے ہو..... کل اگر یہی ادارے

مجھے بسام کے رشتے سے بھی دست بردار ہونے کے لیے کہیں گے تو کیا تب بھی تم لوگوں کا یہی مشورہ ہوگا.....؟ بسام بھی تھا ان کی نظروں میں مشکوک ہو چکا ہے؟ آخر ہم لوگ کب تک اس خوف کے اثر تلے اپنی زندگی گذارتے رہیں گے.....؟ آخر ہمارا جرم کیا ہے.....؟ ہم کیوں ان کی لگائی ہوئی فردِ جرم سے پہلے ہی خود کو مجرم ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں.....؟..... کیا نیویارک پولیس کے صرف کہہ دینے سے ہم میں سے کوئی بھی دہشت گرد ثابت ہو جائے گا.....؟ ہمارا ہر فیصلہ کیا اب صرف یہی سوچ کر ہوگا کہ یہاں کی کسی ایجنسی کو ہمارا کوئی عمل ناگوار نہ گذر جائے..... سی۔آئی۔اے تو شاید ہمیں بعد میں گرفتار کرے لیکن ہم اس سے پہلے ہی خود اپنے آپ کو قید کر چکے ہیں۔ موت آنے سے پہلے ہی ہم خود اس خوف کے مارے اپنا گلا گھونٹ چکے ہیں..... یار پلیز..... مجھے چند دن جی لینے دو..... اگر میرا انجام انہی صیادوں کے ہاتھ لکھا ہے تو کچھ سانسیں مجھے اپنی مرضی سے سینے میں بھرنے دو..... پھر جو ہو گا..... دیکھا جائے گا.....'' اتنے میں کسی جانب سے احمر بوکھلائے ہوئے انداز میں وہاں نمودار ہوا۔

''آیان..... ٹائمز اسکوائر والے بم کس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ اس پاکستانی لڑکے کو عمر قید کی سزا ہوگئی ہے..... سنا ہے اس نے خود جج سے کہا تھا کہ اسے اپنے جرم پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور اس نے عمر قید کا سن کر بھری عدالت میں اللہ اکبر کا نعرہ بھی لگایا ہے..... مسلم ہاسٹل میں سب طلباء اس فیصلے پر اپنا ردِعمل طے کرنے کے لیے جمع ہو چکے ہیں اور تمہارا انتظار ہو رہا ہے.....''

میں نے احمر سے کہا ''ٹھیک ہے..... میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں.....'' پروانے بھی میرے ساتھ قدم اٹھاتے۔ بسام نے زور سے کہا۔ ''رک جاؤ آیان..... آج اگر تم ہاسٹل گئے تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے مجھ سے اپنا ہر رشتہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے.....'' میں نے رک کر بسام کی جانب دیکھا۔ ''اگر ہم دونوں کا رشتہ اتنا ہی کچا ہے کہ وہ میرے کسی ایسے قدم سے ٹوٹ سکتا ہے جسے میں صرف اپنی کھوج مکمل کرنے کے لیے اٹھانا چاہتا ہوں..... تو پھر اسے ٹوٹ ہی جانا چاہیے.....''

میں نے دوبارہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرے دوست اور صنم کبیر کی مجھے بلانے کی آوازیں دور تک میرا پیچھا کرتی رہیں ان آوازوں میں بسام کی کوئی آواز شامل نہیں تھی۔ جانے کیوں موڑ مڑتے وقت تک میرے کانوں کو بسام کی ایک ہلکی سی آواز کی آس رہی۔ جانے وہ اتنا سنگ دل کیسے ہو گیا

تھا؟ چند دن کی قید نے اُسے کس قدر بدل ڈالا تھا.....؟ یا شاید چند دن کی اُسی قید نے اس کے اندر میرے مستقبل کے لیے اتنا سخت قدم اٹھانے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا؟

پُرواغور سے میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی لیکن اس نے کچھ نہیں کیا ''ہم تینوں مسلم ہاسٹل میں داخل ہوئے تو سبھی لڑکے جمع ہو چکے تھے اور زوردار بحث جاری تھی۔ سب ہی کا ایک سوال تھا کہ اب ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے.....؟'' میں نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو خاموش کروایا۔ ''یہ ایک عدالتی فیصلہ ہے جسے ثابت کرنے کے لیے عدالت کو ثبوت اور گواہی بھی خود اسی لڑکے نے فراہم کی ہے..... اس نے اپنا جرم قبول کیا اور یہاں کی عدالت نے قانون کے مطابق اسے سخت سزا سنا دی..... اس لیے اس فیصلے کو پاکستانی لیڈی ڈاکٹر کے فیصلے کے ساتھ مشروط کیا جائے نہ ہی اسے اس تناظر میں دیکھا جائے کیونکہ یہ ایک بالکل الگ کیس ہے..... رہی بات سزا میں زیادتی یا کمی کی..... تو یہ ایک الگ بحث ہے اور یاد رہے کہ اپنی سزا اُس لڑکے نے خود عدالت کے سامنے تجویز کی ہے..... ہمیں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی ہوگی کہ امریکہ ایک خودمختار ریاست ہے اور اسے اپنی سلطنت کی حدود میں ہوئے جرم کے خلاف ہر اس ردِعمل کی اجازت ہے جو یہاں کے قانون اور آئین کے مطابق جائز ہے.....، یہ جرم اس لڑکے نے پاکستان یا کسی اور اسلامی ملک میں کیا ہوتا، تب بھی اسے شاید یہی سزا ملتی۔ لہٰذا اس معاملے میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ شیخ الکریم نے کہا تھا کہ اس ماحول میں ہمیں علم اور قلم کے جہاد کی ضرورت ہے..... یہ جنگ کسی اور دیس میں ایک اقلیت کی حیثیت سے لڑی جا رہی ہے، اس لیے یہاں تلوار نہیں دلیل کی کاٹ سے کام چل جائے تو ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی .....'' میری باتیں سن کر لڑکوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ احمر نے پوچھا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو آیان..... لیکن اگر ہم اس معاملے پر خاموش رہیں گے تو یہودی اور عیسائی گروپ ہمیں کمزور ہونے کا طعنہ دیں گے.....''

اس کی ''معصوم'' تشویش سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''اس بار اگر وہ لڑکے تمہیں کمزور ہونے کا طعنہ دیں تو جواب میں تم لوگ صرف ایک جملہ کہو گے کہ ''ہم سب امریکن قوانین کا احترام کرتے ہیں..... اور کرتے رہیں گے تاوقتیکہ وہ قانون صرف ہم مسلمانوں کے خلاف کوئی امتیازی

شکل اختیار نہ کر لے.....'' اور میں تم لوگوں کو احتجاج سے ہرگز نہیں روک رہا ہوں مگر احتجاج تو بازو پر کالی پٹی باندھ کر بھی کیا جا سکتا ہے، مسلم گروپ میں سے جس کسی کو بھی اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا ہے وہ ایسا کوئی بھی مہذب احتجاج کر سکتا ہے، صرف شور شرابہ، توڑ پھوڑ اور سڑکوں پر جلوس نکالنا ہی احتجاج نہیں کہلاتا..... اور کل ہم سب بابر سیدی کی گرفتاری کے خلاف اپنے دائیں بازو پر سیاہ پٹی باندھ کر کلاس میں آئیں گے..... آئندہ سے ہمارا احتجاج نوٹس بورڈ پر لگے ایک کاغذ اور اس پر لکھی تفصیل کی صورت میں بولے گا اور ہم خاموش رہ کر، کارڈ اٹھا کر، پٹیاں باندھ کر یا پھر ہونٹوں پر ٹیپ لگا کر اپنا احتجاج رجسٹر کروایا کریں گے۔ بولو..... یہ طریقہ احتجاج سب کو منظور ہے.....؟..... سب لڑکوں کو یک زبان ہو کر کہا ''ہمیں منظور ہے.....'' لڑکے مطمئن ہو کر منتشر ہو گئے۔ پروا اس تمام معاملے کے دوران ایک جانب خاموش کھڑی رہی۔ مسلم گروپ میں پانچ لڑکیاں بھی گروپ کی ممبرز تھیں لیکن ان تک یہ احکامات زیادہ تر پروا کے ذریعے ہی پہنچائے جاتے تھے اور جب ضرورت پڑتی تبھی انہیں لڑکوں کے ساتھ مشترکہ ایجنڈے کے لیے طلب کیا جاتا تھا۔ میں نے پروا سے کہا کہ وہ طالبات کو بھی کل کے اس احتجاج کا پیغام دے آئے، وہ کسی الجھن کا شکار تھی، آیانؔ..... کیا تم نے واقعی ہاسٹل منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے.....؟..... میں جانتی ہوں کہ بسام اوپری طور پر سخت نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ اندر سے اب بھی اتنا ہی نازک ہے..... تمہارے بناء وہ دو قدم بھی نہیں چل پائے گا..... تم ایک بار پھر سوچ لو.....'' میں جانتا ہوں ..... ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے بنا مکمل نہیں رہ پائیں گے..... یہ دونوں کا آدھا آدھا حصہ ایک دوسرے کے پاس ہی رہ جائے گا..... لیکن شاید اب ہماری سوچ میں تضاد آ چکا ہے..... ہم ایک ہی گھر میں رہے تو یہ بحث روزانہ طول پکڑے گی اور ہم روز ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکلا کریں گے..... لہٰذا اس وقت یہی بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر رہوں۔ ایک بار عامر بن حبیب اور بابر سیدی میں سے کوئی بھی ایک دوبارہ مسلم کونسلر بن کر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لے، تب میں خود اس عہدے سے دست بردار ہو جاؤں گا..... لیکن اگلے دو مہینے تک ایسا ممکن نہیں ہے، کیونکہ مسلم کونسلر کے عہدے کا چناؤ دو مہینے بعد ہو گا.....''

شام تک میری مسلم ہاسٹل میں کمرے کی درخواست پر کاروائی مکمل ہو چکی تھی کیونکہ بطور مسلم

کونسلر یہ سہولت مجھے ہمیشہ سے حاصل تھی۔ شام کو وارڈن نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ''ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے..... تمہاری رائے چاہیے.....'' وارڈن نے مجھے بتایا کہ عامر بن حبیب کے معطل ہونے کے بعد ابھی تک مسلم کونسلر کا کمرہ اس سے خالی نہیں کروایا گیا تھا کیونکہ میں نے بطور نئے مسلم کونسلر ہاسٹل میں کمرہ لینے کی درخواست جمع نہیں کرائی تھی۔ لہٰذا کمرہ بھی عامر کے نام پر ہی الاٹ ہے۔ اگر مجھے وہی کمرہ چاہیے تو انہیں عامر کا سامان وہاں سے نکال کر سیل کرنا ہو گا یا پھر مجھے ایک تحریری درخواست دینی ہو گی کہ میں اس کی ذاتی اشیاء کا ذمہ دار رہوں گا جب تک کہ اس کا سامان واپس نہ کر دیا جائے..... تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے کوئی اور کمرہ الاٹ کر دیا جائے۔ میں نے وارڈن سے کہا کہ عامر بن حبیب کے ذاتی سامان کو وہاں سے کہیں اور منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... اُسے وہیں کسی الماری میں سیل کر دیا جائے۔ میں اس کا ذمہ دار رہوں گا..... لیکن مجھے وہی کمرہ الاٹ کیا جائے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ مسلم کونسلر کے کمرہ نمبر ۱۳۷ کی یہ شناخت مدہم نہ ہونے پائے۔ میری درخواست منظور کر لی گئی اور دو گھنٹے کے بعد وارڈن نے کمرے کی چابی میرے حوالے کر دی۔ اتنی دیر میں ایرک اور جم میرے اپارٹمنٹ سے چند کپڑے اور میری ضرورت کا سامان لے کر آ چکے تھے۔ نہ مجھ میں خود اتنی ہمت نہیں تھی کہ جا کر اپنے گھر سے یہ سب اُٹھا کر لا سکوں۔ جانے بسام نے کس دل سے یہ سب اکٹھا کر کے جم اور ایرک کے حوالے کیا ہو گا.....؟ سامان نکالتے ہوئے اچانک وہ چھوٹا سا تکیہ نیچے گرا جس کے لیے روز رات کو میرے اور بسام کے درمیان باقاعدہ دھینگا مشتی ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے اُسے اٹھایا تو میری آنکھیں نم ہونے لگیں..... کبھی کبھی بے جان چیزوں کے ساتھ جڑی ہوئی یادیں انہیں کتنا جاندار بنا دیتی ہیں..... بت میں رُوح سی پھونک دیتی ہیں..... یا شاید ''یاد'' بذات خود ایک روح کی طرح ہوتی ہے، ''ہمارے گذرے دنوں اور ماضی کی روح''..... رات کا کھانا ہم سب نے ہاسٹل کے میس Mess میں کھایا اور پھر وہ رخصت ہو گئے، سب سے آخر میں جانے والی پروا تھی۔ میں اُسے چھوڑنے کے لیے ہاسٹل کی پارکنگ تک آیا جہاں اس کی چھوٹی نیلے رنگ کی شیورلیٹ کھڑی تھی۔ ''اچھا تو مس پروا ضمیر خان..... اب صبح آپ سے ملاقات ہو گی..... دعا ہے کہ آپ کو اُردو زبان میں ڈب شدہ اچھے اچھے رنگین خوابوں والی نیند نصیب

ہو....." پُروا میری بات سن کر مسکائی۔ "بلیک اینڈ وائٹ خواب بھی چل جائیں گے..... خواب سچے ہوں تو رنگ اپنے آپ بھر جاتے ہیں....." وہ چند قدم چل کر اپنی گاڑی تک پہنچ کر پلٹی..... "آیان..... تم ٹھیک تو ہو نا.....؟..... شاید پہلی رات تمہیں یہاں ٹھیک سے نیند نہ آئے..... میرے پاس ابھی کچھ سکون آور گولیاں ہیں گاڑی کی ڈیش بورڈ میں..... تمہیں دے جاؤں.....؟" "نہیں پروا..... کبھی کبھی نیند کو رُوٹھنے دینا چاہیے..... تاکہ خوابوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے....." "آیان..... تم اتنے بڑے بڑے فیصلے ایک دم کیسے کر لیتے ہو.....؟ میرا دل تو اتنی آسانی سے میری بات کبھی نہیں مانا....." "لیکن پھر بھی تم اُسے منا کر ہی دم لیتی ہو..... تم ایک بہادر اور بہت مضبوط لڑکی ہو پُروا ضمیر خان..... کاش میں بھی اتنا ہی مضبوط ہوتا..... پُروا مزید کچھ کہہ نہیں پائی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی، میرے قریب سے گذرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رُکی..... "کبھی کبھی اتنا مظبوط ہونا ہمیں خود اپنے اندر سے ہی چٹخا کر رکھ دیتا ہے..... میرے لیے دعا کرنا آیان..... کہیں میں کسی روز ایک دم ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہ ہو جاؤں....." پروا نے گاڑی آگے بڑھا دی اور میں تھکے قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں آ گیا۔

پُروا نے ٹھیک ہی کہا تھا..... نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی بار بار یہی خیال آ جاتا تھا کہ جانے بسام کیا کر رہا ہوگا؟ وہ بھی میری طرح خالی دیواروں سے باتیں کر رہا ہوا؟۔ کھانا بھی کھایا ہوگا کہ نہیں..... مجھے رات کو بہت دیر تک لاؤنج کے صوفے پر لیٹ کر ٹی۔ وی دیکھنے کی عادت، اس لیے میں رات گئے اپنے اور بسام کے لیے ایک ایک مگ کافی بناتا تھا۔ بسام کو جان بوجھ کر سوتے سے جگا کر کافی اُسے تھماتا تو وہ اکثر تنگ آ کر میرے ساتھ ہی لاؤنج میں آ جاتا تھا اور پھر میں کچھ دیر میں سو جاتا اور بسام ساری رات جاگتا رہتا تھا جانے اُسے میری کافی یاد آ رہی ہوگی یا نہیں.....؟ انہی سوچوں میں گم میں بستر پر کروٹیں بدلتا اور پھر تنگ آ کر میں نے کمرے کی روشنی جلا دی۔ کمرے سے عامر بن حبیب کا سامان جمع کر کے اسے الماری میں لاک کر دیا گیا تھا۔ بس اس کی رائٹنگ ٹیبل پر کچھ کاغذ، چند سیاہی والے پارکر پن، اور میز کے سامنے لگے شیلف میں چند کتابیں ابھی تک ویسے ہی سجی ہوئی تھیں، جیسے عامر انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے میں چند مشہور عرب مصوروں کے فن پارے سجے ہوئے

تھے جو عامر کے ذوق کا پتا دیتے تھے۔ چند عربی رسائل، لیلیٰ بن خالد کا ایک پوسٹر بھی کمرے کی زینت تھے۔ میں نے یونہی بے خیال میں ایک عربی ناول شیلف سے اٹھا کر اس کے صفحے پلٹنا شروع کر دیئے۔ ناول کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی کیا گیا تھا، اچانک ناول کے بند صفحات کے درمیان سے ایک تصویر نیچے گر پڑی۔ میں نے میز پر پڑی تصویر اٹھا کر اسے جھاڑا۔ تصویر کسی معصوم سی خوبصورت لڑکی کی تھی جو سر پر اچھی طرح اسکارف لپیٹے اور اپنے جسم کو ایک بڑے سے اوورکوٹ سے ڈھانپے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لڑکی نے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے اور اس کے پاؤں بھی بند جوتوں سے ڈھکے ہوئے تھے، مطلب وہ مکمل باپردہ لباس میں ملبوس تھی۔ تصویر کے پیچھے لکھا گا۔'' ماریا قاہرہ یونیورسٹی۔ دسمبر ۲۰۰۶ء'' جانے کیوں مجھے وہ تصویر دیکھ کر اس روز عامر بن حبیب کی آنکھوں میں جھلکتی وہ بے نام سی اداسی یاد آ گئی..... کہیں اس اُداسی کے پیچھے بھی ایسی ہی کسی میٹھی یاد کی کسک تو شامل نہیں تھی۔؟؟

وہ رات جانے کس عذاب سے کٹی اور صبح جب میں یونیورسٹی پہنچا تو تمام مسلم طلباء نے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں اور نوٹس بورڈ پر ایک تحریر جگمگا رہی تھی۔ ''ہم بابر سیدی سمیت ہر اس مسلم یا غیر مسلم قیدی کی گرفتاری کی مذمت کرتے ہیں جسے صرف مذہبی تعصب کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا ہے۔'' میں سیڑھیوں سے اُترا تو شمعون سامنے سے اپنے ساتھیوں سمیت آتا دکھائی دیا۔ ہم چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ''اچھے جا رہے ہو مسلم کونسلر..... لگتا ہے تم انہیں تمیز اور تہذیب کے کافی گر سکھا چکے ہو۔'' شمعون کی بات سن کر اس کے ساتھی مسکرائے۔ میں نے ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ''ہاں..... انہیں تو سکھا چکا..... بس اب تم ہی باقی بچے ہو۔'' شمعون مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھا گیا۔ اچانک ہال نمبر ۳ کی جانب سے عجیب سے شور کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی بہت زبردست بحث چل رہی ہو۔ ساتھ ہی کچھ جوشیلے نعروں کی آواز بھی سنائی دی۔ میں تیزی سے چل کر جب تک راہداری میں پہنچا تب تک گیلری مسلم طلباء سے بھر چکی تھی۔ حافظ شکیل نے مجھے دیکھا تو غصے میں بھرا میری جانب لپکا۔

''آیان ..... تم نے سنا کچھ..... اس بار تو انہوں نے وہ مکروہ سازش کی ہے اور ایسی گری ہوئی حرکت کا ارتکاب ہونے جا رہا ہے اس یونیورسٹی میں کہ ہم خود اس کے در و دیوار کو آگ لگا کر بھسم

بھی کر دیں تو کم ہوگا.....'' ''ہوا کیا ہے.....؟'' احمر نے ایک کاغذ پھاڑ کر ہوا میں پھینکا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ''یونیورسٹی انتظامیہ نے گستاخانہ خاکوں پر مبنی ایک سیمینار کی اجازت دی ہے جسے کوئی ڈینش این۔ جی۔او سپانسر کر رہی ہے۔ وہ لوگ ہماری یونیورسٹی میں اپنے توہین آمیز خاکوں کی نمائش اور سیمینار میں تقاریر کرنے کی اجازت لے چکے ہیں لیکن اگر ایسی حرکت کا کسی نے سوچا بھی تو ہم یہ یونیورسٹی ہی جلا کر راکھ کر دیں گے..... چاہے پھر ہمیں پھانسی ہی کیوں نہ دے دی جائے.....''



باب 13

سب لڑکے چلانے لگے ''ہاں ہاں..... ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے..... ہم سب گرفتاریاں دینے کے لیے تیار ہیں..... لیکن ہم اس یونیورسٹی کے گیٹ سے کسی کو اس مقصد کے لیے اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے.....'' چاروں جانب سے ایک ساتھ بولنے اور چلانے کی آوازوں نے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش کروایا۔ ''سیمینار کی تاریخ کیا مقرر کی گئی ہے.....؟'' احمر نے ایک کاغذ میری جانب بڑھایا۔ تاریخ کا حتمی فیصلہ ابھی باقی ہے کیونکہ انہوں نے پہلے مرحلے کے طور پر یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو اس مکروہ عمل کا حصہ بنانے کے لیے انہیں بھی اس معاملے میں اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی ہے..... ویسے اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ متوقع ہے..... ایک آدھ دن میں تاریخ کا اعلان بھی ہو جائے گا.....'' یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلباء کا ردعمل جاننے کے لیے اور ان کے جذبات کا اُبال ٹھنڈا کرنے کے لیے بہت آزمودہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے صرف سیمینار کا شوشہ چھوڑ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں میں تمام لڑکوں سمیت ڈین کے کمرے کے باہر راہداری میں موجود تھا۔ ہم نے اندر ڈین سے ملاقات کے لیے پرچی بھیج دی اور اب ہمیں بلاوے کا انتظار تھا۔ میں نے لڑکوں کو نعرے بازی سے روکے رکھا۔ پہلے میں ڈین سے بات کر کے اس معاملے کا سرا ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر میں ڈین کے پی۔اے نے صرف مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ڈین ہونٹوں میں پائپ دبائے اپنے کمرے کی شیلف میں کوئی کتاب تلاش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''آؤ

مسلم کونسلر..... میں بس دو لمحے مزید لوں گا۔ جانے یہ میری کتابیں ہمیشہ کون آگے پیچھے کر دیتا ہے..... تم کتابیں پڑھتے ہو کونسلر..... میرا مطلب ہے نصاب سے ہٹ کر.....'' میں کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ''نہیں..... زیادہ نہیں..... مجھے تو نصاب کی کتابیں بھی دل جمعی سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا کبھی.....'' ''ڈین نے اپنے مطلب کی کتاب ڈھونڈلی اور اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔'' نہیں نہیں ..... تمہیں کتاب پڑھنے کے لیے زندگی میں سے تھوڑا بہت وقت تو ضرور نکالنا چاہیے۔ کتابیں ہمیں بہت کچھ دے جاتی ہیں.....'' میں نے دھیرے سے کہا..... ''ہاں..... سوچتا ہوں کتابوں سے رشتہ جوڑ لوں۔ لیکن پھر جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان کتابوں کا دیا ہمیں بدل نہیں پاتا تو پھر رُک جاتا ہوں..... صرف صفحے پلٹنے اور وقت گذاری کے لیے کتابیں پڑھنے کو میں وقت کا ضیاع سمجھتا ہوں.....'' ڈین نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ کتابیں ہمیں بدل نہیں پاتیں..... کتاب سے بڑا انقلاب تو شاید بھوک بھی نہیں لا سکتی.....'' میں نے احمر کا دیا ہوا کاغذ ڈین کے سامنے رکھ دیا۔ ''دنیا کی ہر کتاب ہمیں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے۔ اگر ہم کتاب سے کچھ سیکھتے تو کیا یہ مذہبی تعصب اب تک ہمارے اندر پنپتا.....؟؟ آپ نے زندگی میں سینکڑوں کتابیں پڑھی ہوں گی..... لیکن آپ بھی ابھی تک مذہبی رواداری کا سبق عام نہیں کر پائے سر..... پھر کتابوں کا اثر ہم انسانوں کو بدل دیتا ہے..... یہ میں کیسے مان لوں؟؟'' ڈین کچھ دیر کے لیے خاموش سا ہو گیا۔'' ''آیان..... کچھ باتیں ہمارے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہوتیں..... کبھی کبھی ہمیں اپنے اندر کے فیصلوں کے خلاف بھی جانا پڑتا ہے..... شاید میں اس معاملے میں تمہاری کچھ زیادہ مدد نہ کر سکوں.....'' میں نے کاغذ ڈین کی میز سے اٹھالیا ''میں یہاں آپ سے مدد مانگنے نہیں آیا..... آپ کو صرف اتنا بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں آپ کے کہنے کے مطابق اپنے ساتھیوں کو ہر اسی قانون کی پاسداری کا سبق دیتا آیا ہوں جسے یونیورسٹی کے اندر اور باہر لاگو رکھا گیا ہے..... لیکن اس بار یہ وار ہم سب کے جگر کے پار ہو چکا ہے..... اور اگر یونیورسٹی نے اپنا فیصلہ جلد واپس نہ لیا تو شاید اس یونیورسٹی میں ایک مسلم طالب علم بھی نہ بچے..... وہ سب گرفتار ہو کر جیل چلے جائیں گے لیکن جاتے جاتے کیا کر جائیں..... یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں.....'' میں اٹھ کر جانے لگا تو ڈین نے مجھے آواز دے کر روک لیا ''میں اب بھی تم سب

کو یہی مشورہ دوں گا آیان..... کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس کے بعد پچھتانے کے لیے تم لوگوں کو وقت بھی نہ ملے..... اگر ڈینش این۔جی۔او N.G.O والے آزادئ اظہار کا اپنا حق استعمال کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ مسلم اسٹوڈنٹس چاہیں تو وہ بھی یونیورسٹی کے قوانین کے اندر رہتے ہوئے اسی روز کسی دوسرے ہال میں جلسہ کر سکتے ہیں'' ..... میں نے پلٹ کر ڈین کو دیکھا ''بات صرف اگر ایک جلسے یا سیمینار کی حد تک رہتی تو ہم ضرور تقریر سے ان کا مقابلہ کرتے..... لیکن آپ اپنی یونیورسٹی کے اندر اُن گستاخانہ خاکوں کی تشہیر کی اجازت دینے کی بات کر رہے ہیں۔ اور یقین کریں..... ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے.....'' میں بات ختم کر کے ڈین کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ راہداری میں سبھی مسلم طلباء اسی طرح جمع تھے جیسے میں انہیں اندر جاتے وقت چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ تیزی سے میری جانب لپکے۔ ''بات ہوگئی.....؟ انتظامیہ کا کیا فیصلہ ہے.....؟.....'' میں نے ان سب کے چہرے پر نظر دوڑائی..... '' اس بار فیصلہ یونیورسٹی انتظامیہ کا نہیں..... ہمارا ہوگا..... ہم ان مکروہ گستاخانہ خاکوں کی نمائش یہاں کسی صورت نہیں ہونے دیں گے.....'' لڑکوں نے جوش میں آ کر نعرے بازی شروع کر دی۔ میں نے انہیں خاموش کرایا ''لیکن یاد رہے..... ہمیں ایک بہت بڑی اور لمبی جنگ کی تیاری کرنا ہوگی۔ اس جنگ کے اصول اور ضوابط میں طے کروں گا۔ کیا تم سب کو مجھ پر اور میرے لڑنے کی صلاحیت پر اعتبار ہے.....؟ ''سبھی نے زور سے چلا کر کہا ہمیں تم پر اعتبار ہے کونسلر.....'' کہیں پیچھے سے پروا کی آواز آخر میں سنائی دی۔ ''اور مجھے بھی..... ہم سب کو تم پر مکمل اعتماد ہے آیان.....'' میں نے تمام لڑکوں کو شام کو ہاسٹل میں جمع ہونے کا کہا۔ پتا نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس لڑائی کا انجام ہم سب کا آخری انجام ثابت ہونے والا ہے۔ لڑکے اپنی اپنی کلاس میں واپس چلے گئے۔ پروا نے غور سے میری جانب دیکھا ''اب کیا سوچا ہے.....؟.....'' کچھ فیصلے سوچے سمجھے بغیر بھی لے لیے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ازل سے ہی ہمارے خمیر میں طے شدہ حالت میں گوندھے جا چکے ہوتے ہیں۔ میری یونیورسٹی میں موجودگی میں تو یہ سب وہ کسی صورت نہیں کر پائیں گے..... ہاں اگر میں یونیورسٹی ہی میں نہ رہا یا مجھے کچھ ہوگیا تب یہ ذمہ داری میں تمہیں سونپ جاؤں گا۔ فی الحال تمہیں تمام مسلم لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملا کر دوسرے مذہب کی طالبات کو اس بات پر قائل

کرنا ہوگا کہ یہ صرف ہمارے دین اور پیغمبرﷺ کے خلاف ہی نہیں..... بلکہ پوری انسانیت کے خلاف ایک ایسی گھناؤنی سازش ہے جس کے اثرات ہماری آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے رہیں گے اور اگر ایک بار مذہبی جذبات کے قتل کا یہ سلسلہ اس معاشرے میں شروع ہوگیا تو پھر یہ کبھی نہیں رُکے گا۔ پھر کوئی دین اور کسی کا بھی مذہب اس شر سے محفوظ نہیں رہ پائے گا.....'' پروا نے دھیان سے میری بات سنی ''تم ٹھیک کہتے ہو..... ہم سب مسلم لڑکیاں آج سے ہی یہ پیغام یہاں کی ہر طالبہ تک منتقل کرنا شروع کردیں گی.....تم اپنا محاذ سنبھالو..... میں اپنا محاذ سنبھالتی ہوں.....'' میں اور پروا مختلف سمتوں میں آگے بڑھ گئے۔ ہماری زندگیوں کا سب سے بڑا امتحان شروع ہو چکا تھا۔

عصر کے بعد میں کچھ دیر کے لیے چائنا ٹاؤن بھی گیا۔ شیخ الکریم سے عبادت کا درس لینے کے بعد میں نے انہیں آج یونیورسٹی میں ہوئے اس واقعے کے بارے میں بتایا تو ان کے چہرے پر دُکھ کے سائے چھا گئے ''جانے یہ سلسلہ رُکنے میں کیوں نہیں آتا۔ کبھی لفظوں سے نشتر چھبو کر ہماری روح تک کو لہولہان کیا جاتا تھا اور اب یہ خاکے..... میں نے اس دن بھی کہا تھا کہ اگر مسلمان فیس بک facebook پر ہوئے اس مقابلے کا ٹھیک انداز میں بائیکاٹ جاری رکھتے تو نوبت آج یہاں تک نہ پہنچتی.....'' میں نے شیخ سے سوال کیا ''لیکن ایسی زیادہ تر حرکات کے پیچھے یہ ناروبجین یا ڈینش اقوام کا کوئی فرد ہی کیوں ہوتا ہے.....ان کا مسلمانوں سے کیا لینا دینا.....؟..... جب کہ ہماری ان سے براہ راست کوئی دشمنی بھی نہیں ہے.....؟.....'' شیخ الکریم نے گہری سانس بھری۔ ''یہ سب مادہ پرست اور مادرِ پدر آزاد معاشرے ہیں..... انہیں اخلاقیات سے بھلا کیا واسطہ کیوں کہ انہیں زیادہ تر اپنے اصل والدین کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ جب کہ مذہب، تہذیب اور اخلاق کا پہلا درس تو ماں باپ ہی دیتے ہیں۔ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ایسے معاشرے مذہب اور تقدس کی خدمت سے نابلد ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے خون میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ لہٰذا ان سے کسی بھی بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ رہی بات خاص طور پر اسلام کو نشانہ بنانے کی، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت پیسہ کمانے کا بہترین ذریعہ اسلام کی تذلیل کرنا ہے اور انہیں آسان پیسہ کمانے کی عادت ہے.....'' میں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ''پھر تو انہیں پیسہ دینے والے بھی اس گناہ عظیم میں برابر کے شریک ہوئے.....لیکن انہیں ایسے

کاموں کے لیے پیسہ دے کر ابھارتا کون ہے.....؟'' ''وہی..... جو خود دنیا کے سامنے آ کر کھلم کھلا مسلمان اور اسلام کو زچ کرنے کا یہ مکروہ طریقہ استعمال نہیں کر سکتا..... یہ وہی اَن دیکھا دشمن ہے جو نبوت ﷺ کے زمانے سے آج تک منافق اور منافقت کے کسی نہ کسی رُوپ میں دنیا میں موجود ہے..... اور یاد رہے۔ یہ منافق مسلمان، عیسائی، یہودی یا کسی بھی مذہب کے لبادے میں ہمارے آس پاس موجود رہتا ہے..... وہ فقیر کا بھیس بدل سکتا ہے۔ اور کسی شہنشاہ کے روپ میں بھی اپنی شناخت چھپا سکتا ہے..... اُسے پہچاننے کے لیے مومن کی نظر چاہیے..... اور دُکھ اس بات کا ہے کہ ہمارے اندر کا وہ مومن ختم ہو گیا ہے، مسلمان کے پاس بصارت رہ گئی ہے، نظر کب کی فنا ہو چکی ہے.....''

میں شیخ الکریم کی باتیں سن کر گہری سوچوں میں ڈوبا شام ڈھلے ہاسٹل پہنچا تو سارے طلباء دالان میں جمع ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں آج دن میں ڈین کے ساتھ ہوئی ساری گفتگو حرف بہ حرف سنا دی۔ بلال نے مجھے بتایا کہ ڈینش NGO این۔جی۔او والے یونیورسٹی انتظامیہ کے ساتھ مل کر اس سیمینار کو بہت بڑے پیمانے پر منعقد کروانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یونیورسٹی کا سب سے بڑا ہال جس میں تین ہزار نشستوں کی گنجائش موجود تھی اور جسے عام طور پر صرف یونیورسٹی کے سالانہ کانووکیشن کی تقریب منعقد کروانے کے لیے کھولا جاتا تھا۔ اُسی کشادہ ہال کو اس سیمینار کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ سیمینار کی تمام نشستیں باقاعدہ ٹکٹ لگا کر بیچی جائیں گی اور این۔جی۔اوز نے داخلہ ٹکٹوں سے حاصل ہونے والی تمام رقم کو یونیورسٹی انتظامیہ کو بطور عطیہ دینے کا لالچ بھی دے رکھا ہے۔ جبکہ سبھی مسلمان طلباء کو اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ یونیورسٹی کو یہ سیمینار منعقد کروانے کے لیے بھی بہت بڑی رقم ضرور پیش کی گئی ہو گی۔ میرے ذہن میں شیخ الکریم کا جملہ گونجا..... ''کوئی منافق ہے جو پس پردہ رہ کر اپنے پیسے کے بل پر یہ تمام تحاریک کنٹرول کرتا ہے.....''

لڑکوں کی بے چینی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں سیمینار کی تاریخ کا اعلان ہونے سے پہلے کوئی بھی انتہائی ردِّعمل ظاہر کرنے سے سختی سے منع کیا۔ اور انہیں اپنے ذہنوں میں گرفتاریاں دینے کے خیال کو بھی نکال دینے کا کہا۔ حافظ شکیل۔ زِچ ہو کر بولا'' ..... تم کیا چاہتے ہو..... ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں..... جب تک ہم شور شرابہ کر کے ان کے حوالات نہیں بھریں گے..... یہاں

کامیڈیا ہماری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ یہ نہ ہو کہ اس خاموشی کو وہ ہماری نیم رضامندی سمجھ لیں اور جب تک ہم احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکلیں تب تک بہت دیر ہو چکی ہو.....'' میں نے اطمینان سے شکیل کی ساری بات سنی۔ ''تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح خود کو گرفتار کروا کر تم انہیں ان کے مقصد میں کامیاب ہونے سے روک لو گے؟ اس مرحلے پر تو وہ خود چاہتے ہوں گے کہ ''ان کے مقابلے پر مسلمان طلباء کی نفری جتنی کم ہو، اتنا ہی ان کے لیے بہتر ہے۔'' اس وقت ہماری سب سے زیادہ ضرورت اسی کیمپس میں ہے فی الحال تم سب متحد رہو اور اس ان دیکھے دشمن کی اگلی چال کا انتظار کرو..... جو ہمیں ابتداء میں ہی جذبات کی رَو میں بہکا کر ہماری طاقت توڑ دینا چاہتا ہے۔

میں نے لڑکوں کے چہرے پر عارضی اطمینان کی جھلک تو دیکھ لی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سکون کسی بڑے طوفان سے پہلے کی خاموشی کا ہے۔ اگلے روز بابر سیدی کی پیشی تھی۔ ہم سب کو امید تھی کہ اسے ناکافی شہادت اور کم زور ثبوت کی بنیا پر رہائی نہیں تو کم از کم ضمانت کی ضرور مل جائے گی لیکن زور دار بحث کے باوجود جج نے نہ صرف اس کی ضمانت رَد کر دی بلکہ اگلی پیشی تک اُسے جیل منتقل کرنے کا فیصلہ بھی سنا دیا۔ بابر کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح کسی بھی قسم کا تاثر مفقود تھا۔ میں نے عدالت میں کمرے کے باہر دو لمحوں کے لیے اُس سے بات کی ''تم فکر نہ کرو..... ہم کوئی دوسرا وکیل کریں گے.....'' بابر نے دھیرے سے کہا ''دوسرا وکیل کرنے سے کچھ نہیں ہو گا..... کہیں سے دوسرا مقدر لا دو.....'' ''ایسا کیوں کہہ رہے ہو.....؟..... اتنا مایوس تو میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا.....'' بابر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ مایوس نہیں ہوں..... لیکن خوش فہم بھی نہیں..... اس وقت یہ لوگ مجھے رہا کرنے کا رِسک نہیں لیں گے کیونکہ نیویارک کی فضا روزانہ مزید تناؤ کا شکار ہو رہی ہے۔ اور یونیورسٹی انتظامیہ نے عدالت کو کسی نہ کسی طور پر یقین دلا رکھا ہے کہ مجھ جیسے ''اسلام پرست'' طالب علم کا اس وقت باہر آنا کسی بڑی تحریک کا باعث بن سکتا ہے..... لیکن وہ سب شاید یہ بھول گئے ہیں کہ تمہاری صورت میں مسلم طلباء کی سب سے بڑی تحریک تو ان کے درمیان ہی موجود ہے..... مجھے بلال اور احمد سے یونیورسٹی کیمپس کی خبریں ملتی رہتی ہیں..... تم بہت خوبی سے یہ ذمہ داری نبھا رہے ہو دوست..... ہم سب کی ہر امید اب تم سے ہی وابستہ ہے آیانؔ..... بابر مجھے گلے لگا کر پولیس والوں

کے ساتھ آگے بڑھ گیا لیکن مجھے ذمہ داری کی ایک نئی زنجیر میں باندھ گیا۔ دوسروں کی ہم سے بندھی ''آس'' سے بڑی زنجیر اور کیا ہوگی بھلا۔ عمر قید صرف چند دیواروں کے پیچھے کسی کو بند کر دینے کا ہی تو نام نہیں..... کبھی کبھی اس چار دیواری سے باہر چلتے پھرتے انسان کسی جیل سے کہیں زیادہ مقید ہوتے ہیں..... ، عدالت کی بیرونی سڑک پر مجھے احمر نے عامر بن حبیب کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میں بروکلین کے علاقے میں پہنچا تو عامر کی رہائش گاہ کے آس پاس بہت دیر یونہی بے مقصد بائیک گھماتا رہا تاکہ اگر کوئی میرا پیچھا کرتے ہوئے وہاں تک آ بھی گیا ہے تو وہ میری سمت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے، ویسے بھی سی۔آئی۔اے کے آفیسر فورڈ سے ملاقات کے بعد مجھے ہر وقت یہی شبہ سا رہتا تھا کہ جیسے کوئی ان دیکھی آنکھ میری نگرانی کر رہی ہے۔ میں نے اپنی بائیک سڑک کی دوسری جانب واقع شاپنگ پلازہ کی پارکنگ میں کھڑی کردی اور پھر کچھ دیر شاپنگ سنٹر میں چہل قدمی کرنے کے بعد میں سڑک پار کر کے دوسری جانب اپارٹمنٹس کی لفٹ میں داخل ہوگیا۔ اس روز عامر مجھے کچھ پریشان دکھائی دیا۔ ''آیان..... یہ سب کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ.....؟..... ابھی فیس بک Face book والا معاملہ ٹھنڈا بھی نہیں پڑا تھا کہ یہ سیمینار کا قصہ شروع ہوگیا۔ مجھے یہ سب کسی ایک ہی سازش کی کڑیاں لگتی ہیں.....'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم فکر نہ کرو..... ان کا کام سازشیں کرنا اور ہمارا فرض ان سازشوں کا توڑ ہے..... یہ ایک مستقل جنگ ہے جس کا کوئی اختتام نہیں..... صرف فوجیں بدلتی رہیں گی اور نئے سپہ سالار آتے جاتے رہیں گے..... لیکن لڑائی ہمیشہ جاری رہے گی..... لہٰذا ہمیں خود کو پہلے ہی سے ہلکان کر کے ان کا کام آسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... جیسا وار وہ کریں گے..... ویسا توڑ ہماری طرف سے ہوگا.....'' عامر چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ''کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی آیان ہے جو دو مہینہ پہلے ہمارا نام بھی نہیں سننا چاہتا تھا..... لیکن تم نے اپنا گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا بسام بہت سمجھدار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے..... اگر وہ ہمیں غلط سمجھتا ہے تو اس میں اس کا ایسا کچھ قصور بھی نہیں..... ہمارا وقت ہی خراب چل رہا ہے.....'' پھر جیسے عامر کو کچھ اور یاد آیا ''اور ہاں..... پروانے بھی اس معاملے میں اپنے آپ کو خوب ثابت کیا ہے، مجھے احمر نے بتایا ہے کہ

اس نے بہت سی طالبات کو مذہب کی تخصیص کے بغیر اس بات پر قائل کر لیا ہے کہ یہ خاکوں کا معاملہ صرف اسلام کا نہیں..... ہر اس شخص کا معاملہ ہے جو خدا کی وحدانیت اور وجود کا قائل ہے..... مجھے امید ہے کہ پُروا اس قافلے کی بہترین رہبر ثابت ہو گی'' میں دھیرے سے مسکرایا ''ہاں ..... میں جانتا ہوں..... اور پھر پروا ضمیر خان کی قائل کرنے کی صلاحیت سے تو سبھی واقف ہیں.....'' عامر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''ہاں.....'' اُس کی اسی صلاحیت نے تو اسے ہمارے گروپ کی سب سے فعال خاتون ممبر بنا رکھا ہے اور..... ''وہ کچھ کہتے کہتے رُک سا گیا۔'' اور وہ تم سے ایک خاص انسیت بھی رکھتی ہے آیان..... ایسے ہم سفر کو کبھی کھونے نہ دینا.....'' میں نے چونک کر عامر بن حبیب کی آنکھوں میں جھانکا۔ گویا اسے بھی ان معاملات کی کچھ سن گن تھی۔ اچانک میری زبان سے وہ بات پھسل گئی جسے عام حالات میں شاید میں کبھی لفظوں کی شکل نہ دیتا۔ ''کہیں تم بھی کسی ایسے قیمتی ہمسفر کے کھو جانے کے تجربے سے تو نہیں گذرے.....'' اس بار چونکنے کی باری عامر کی تھی۔ ''تمہارے کمرے کے شیلف میں ایک کتاب کی ورق گردانی کے دوران کسی ماریا کی تصویر نیچے گر پڑی تھی۔ لیکن تم اگر میرے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہو تو کوئی بات نہیں..... یہ تمہارا نہایت ذاتی معاملہ ہے.....'' عامر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گذر گئے لیکن اس نے خود کو پر سکون رکھنے کی کوشش کی۔ ''نہیں آیان..... تمہارے سامنے میرا کچھ ذاتی نہیں ہے۔ بس میں خود ہی ان یادوں کی چنگاریوں کو وقت کی راکھ میں دبائے رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن آج تم نے خود پوچھا ہے تو تمہیں اپنے اندر کے یہ داغ ضرور دکھاؤں گا۔'' عامر نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے کچھ وقت لیا۔ دل کے کمرے میں بکھری یادیں سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ ''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ریاض سے گریجویشن کے لیے قاہرہ یونیورسٹی آیا تھا۔ میرے ہر انداز سے میرے بڑے خاندان کی جاہ و حشمت ٹپکتی تھی اور میں اپنے یونیورسٹی کے ساتھیوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنی دولت بے تحاشہ ضائع کرتا تھا۔ ہاسٹل میں میرے پاس ایک نہیں، تین تین مرسڈیز اور بی۔ایم۔ڈبلیو کاریں کھڑی رہتی تھیں، اور میں صرف نمائش کے لیے روزانہ گاڑی بدل کر یونیورسٹی آتا اور پھر میرا روزانہ کا ہزاروں ڈالر کا بدلا جانے والا لباس کسی غریب طالب علم کے پورے

سال کے خرچے سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ بات بے بات پوری یونیورسٹی کو ٹریٹ دینا یا پھر ان کے کسی بھی تفریحی پروگرام، پکنک یا کسی دوسری مصروفیت کا سارا خرچہ خود اٹھا لینا میرا معمول بن چکا تھا۔ اور جس لمحے بھی میں یونیورسٹی کے کیفے یا مَیس میں داخل ہو جاتا، اس وقت سے لے کر میرے وہاں سے اُٹھنے تک ہر کسی کا بل میرے ہی ذمہ ہوتا۔

دراصل اس نمائش اور خود پسندی کی تعلیم بھی مجھے اپنے گھر سے ہی ملی تھی اور زیادہ تر عرب و رئیس ایسی ہی ظاہر پرستانہ زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہمارا ہاں ایک مقولہ بہت مشہور ہے کہ ''گھر میں اگر سونے کا کنواں بھی بہتا ہو تو باہر والوں کی اس کی کیا خبر.....'' لہٰذا ہم اپنی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب میں کیفے میں اپنے دوستوں کے ساتھ داخل ہوا اور میرے ایک دوست نے حسب معمول کیفے کے مینیجر کو سب حاضرین کا بل میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا حکم دے دیا جس میں میرا سٹاف ہر ماہ ایک خطیر رقم پہلے ہی جمع کرا چکا ہوتا تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی کاؤنٹر پر کسی بحث کی آواز سنائی دی اور مینیجر نے مجھے بتایا کہ سالِ دوئم کی کوئی ماریا نامی لڑکی اپنے سینڈوچ اور کوک کا بل خود ادا کرنا چاہتی ہے کیونکہ اسے میری یہ مہربانی قبول نہیں ہے۔ شاید یہ بات ہمیشہ کے لیے وہیں ختم ہو جاتی اگر کچھ دیر بعد ماریا خود میرے سامنے نہ آ کھڑی ہوتی۔ مجھے آپ کی پیش کش ٹھکرانے کا بہت افسوس ہے یا سیدی..... لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اگر روزانہ لٹائی جانے والی اس رقم سے یونیورسٹی کے ان غریب طلباء کے لیے کوئی اکاؤنٹ کھول دیں جنھیں اپنے ہر سیمسٹر کی فیس بھرنے میں شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یقین جانیں یہ بہت بڑی نیکی ہوگی..... اور واضح رہے کہ میں ان طلباء میں شامل نہیں ہوں کیوں کہ میں اپنی فیس خود بھر سکتی ہوں.....'' اس کے چہرے کے گرد سیاہ سکارف سے جھلکتا نور کا ایک ایسا ہالہ تھا جو میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بات ختم کر کے اطمینان سے چلتی بنی لیکن میں اسی معصوم سی لڑکی کے حسن میں الجھ کر رہ گیا۔ حالانکہ میرے اردگرد میری دولت کی وجہ سے حسین چہروں کا ایک جھرمٹ موجود رہتا تھا لیکن ان کے بے باک حسن میں بھلا وہ رُعب، وہ سادگی، کشش اور نور کہاں.....؟ جو اس سیدھی سادھی، خود کو سر سے پاؤں

تک ڈھکی ہوئی لڑکی کی ایک جھلک میں تھا۔ اور پھر مجھ پر جیسے ایک دُھن سی سوار ہوگئی۔ ماریا جیالوجی شعبے کی طالبہ تھی اور اب میں صبح شام اس کے شعبے کے اردگرد منڈلاتا رہتا تھا تاکہ کسی بہانے اس سے مزید بات چیت کا موقع مل جائے۔ تین چار دن تک وہ مجھ سے صرف ہیلو ہائے کہہ کر آگے بڑھ جاتی تھی لیکن پھر ایک دن وہ کچھ دیر کے لیے رُک گئی ''کیا تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے عامر.....؟'' میں نے جھٹ سے کہہ دیا ''اتنے دن۔ تم سے متعلق کوئی کام ڈھونڈنے میں ہی تو ضائع کر ڈالے ہیں میں نے.....'' اور وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑی۔ کتنی مقدس ہنسی تھی اس کی۔ پھر ہم دونوں میں خوب دوستی ہوگئی۔ مجھے تو ویسے ہی پڑھنے لکھنے سے کچھ خاص غرض نہیں تھی لیکن وہ اپنی تعلیم کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھی۔ میں دن بھر اس کے شعبے کے باہر اس کا انتظار کرتا اور وہ کلاس ختم ہونے کے بعد روز مجھ سے آ کر ملتی۔ ہم نے قاہرہ کی کوئی سڑک، کوئی پارک کوئی اچھا کیفے نہیں چھوڑا جہاں بیٹھ کر ہم نے گھنٹوں مختلف موضوعات پر بات نہ کی ہو۔ اسے ہر شعبے پر مکمل دسترس حاصل تھی اور اس کے خیالات نہایت پاکیزہ تھے۔ وہ تمام وقت خود کو ایک خاص پردے کی حد تک ڈھکے رہتی اور اس نے اپنی ہر حد آپ مقرر رکھی تھی، چند ہفتوں میں ہی میں اس کا اس قدر عادی ہوگیا کہ اب مجھے زندگی اس کے بغیر بے مقصد نظر آنے لگی تھی۔ تب مجھے اپنے اندر ماریا کے لیے پلتے ہوئے اس خوبصورت احساس کا ادراک ہوا جسے لوگ محبت کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہاں..... وہ محبت ہی تھی، لیکن شدت کے آخری درجوں کو چھوتی ہوئی محبت..... میرے دوست، میرے مشاغل سب مجھ سے رفتہ رفتہ ترک ہو چکے تھے اور اب صرف ماریا ہی میری کل کائنات تھی۔ لہٰذا میں نے اُسے شادی کی پیش کش کا سوچ لیا اور وہ ایک ایسی ہی جاتے اکتوبر کی سرد شام تھی جب میں نے ماریا کو اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ وہ میری بات سن کر کچھ خاموش سی ہوگئی اور پھر بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ''نہیں عامر..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔'' میں چیخ پڑا ''لیکن کیوں.....؟.....'' اس نے اپنے بیگ سے بائبل نکال کر میز پر رکھ دی۔ ''کیونکہ میں عیسائی ہوں۔''

باب 14

عامر بن حبیب سے ماریا کے عیسائی ہونے کی بات سن کر میرے ہاتھ کافی کا مگ گرتے گرتے بچا..... کیا.....؟ وہ عیسائی تھی..... لیکن .....؟ میرا مطلب ہے.....؟'' عامر کہیں دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔ ''ماریا کی بات سن کر میرا تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ چند لمحے تو میں کچھ بول ہی نہیں پایا۔ وہ جس کتاب کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھتی اور جو کتاب اس کے بیگ میں ہر لمحہ کسی مقدس نشانی کی طرح سجی رہتی تھی..... میں اسے قرآن سمجھتا رہا..... لیکن وہ بائیبل کا نسخہ تھا۔ ماریا کے حلیے اور اس کی خود پر لگائی پابندیوں کو دیکھ کر میں تو کیا..... کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ دراصل ہم دونوں نے کبھی مذہب کو موضوع گفتگو بنایا ہی نہیں تھا۔ میں خود تو مذہب سے کوسوں دور رہا لہٰذا میرے پاس مذہب پر بحث کا وقت ہی کہاں تھا اور خود نے بھی کبھی اپنا مذہب ظاہر نہیں کیا۔ ماریا نے اس روز مجھے بتایا کہ وہ عیسائیوں کے پینٹی کاسٹ قبیلے سے تعلق رکھتی ہے جو اب بھی روایتی پردے اور عیسائیت کے تمام مروّجہ اصولوں کی پابندی کرتا ہے اور ان کے ہاں بھی حرام حلال کی تمیز کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ماریا اپنی بات ختم کر کے وہاں سے چلی گئی لیکن میں جانے کتنی دیر گم سم وہیں بیٹھا رہا۔ اب مجھے دھیرے دھیرے ماریا کی گاہے بگاہے عیسائیت اور عیسائی قوم کے تعارف اور اچھائیوں کے بارے میں کی جانے والی گفتگو یاد آنے لگتی تھی۔ اس نے تو کبھی شعوری طور پر اپنا مذہب چھپانے کی کوشش کی ہی نہیں تھی۔ یہ میں ہی تھا جو اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ ایک دو روز میں اس کش مکش میں گم سم سا سارے قاہرہ میں بھٹکتا رہا اور پھر ایک عجیب سے احساس نے میرے وجود میں اپنے پنجے گاڑنا شروع

کر دیے۔ کیا ہوا اگر وہ کسی کٹر عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی؟ اہل کتاب تو تھی..... میں جانتا تھا کہ میرے والدین اس فیصلے کے بعد مجھے اپنی تمام جائیداد اور وراثت سے ہمیشہ کے لیے عاق کر دیں گے لیکن محبت کی وراثت تو صرف محبت ہی ہوتی ہے، اسے اس دنیاوی دولت، جائداد اور جاہ وحشم سے کیا مطلب ہے..... محبت کے لیے تو شہنشاہوں نے تخت چھوڑ ڈالے، تو کیا میں صرف اپنی چھوٹی سی سلطنت کی قربانی نہیں دے سکتا.....؟..... اس فیصلے نے جیسے مجھے پر لگا دیئے اور میں اُڑتے ہوئے ماریا کے پاس اس کے ہاسٹل پہنچ گیا۔ میں نے بنا کسی تمہید کے ماریا کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا کہ میں اس کی محبت میں اب اس مقام پر ہوں جہاں ذات، مذہب قبیلہ کوئی معنی نہیں رکھتا..... لہٰذا میں اب بھی اس سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ لیکن ماریا کا جواب اب بھی انکار ہی نکلا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس وجہ سے مجھے قبول کرنے سے ہچکچا رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں اس کے قابل نہیں.....؟..... یا اسی کی زندگی میں کوئی اور ہے.....؟ ماریا رو پڑی، اس نے مجھے بتایا کہ اس کے دل کے کواڑ زندگی میں صرف ایک ہی شخص کے لیے کھلے اور وہ صرف میں ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا مذہب اُسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ البتہ اب وہ اپنی زندگی میں کسی دوسرے مرد کی چھایا تک برداشت نہیں کرے گی۔ لہٰذا اس نے تمام عمر تنہا رہنا کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ ساری شام میرے سامنے بیٹھی روتی رہی اور میں ماریا کو سمجھاتا رہا کہ مجھے اس کے مذہب اور قبیلے سے کوئی غرض نہیں۔ وہ شادی کے بعد بھی عیسائی ہی رہے گی اور میں اسے اپنے رستے پر چلنے کے لیے ہرگز مجبور نہیں کروں گا، لیکن اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے کہ مذہب اس کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ مقدم ہے۔ میں رات گئے ٹوٹے قدموں کے ساتھ ماریا کے ہاسٹل سے اٹھ آیا۔ اگلے چند دن میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میرا ماریا سے سامنا نہ ہو۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ خود ماریا مجھ سے بڑے عذاب سے گذر رہی ہے اور محبت کا نیلا زہر اس کے رگوں میں بھی آخری نس تک پھیل چکا ہے۔ محبت اسے جینے نہیں دیتی اور مذہب مرنے سے روکتا تھا، پانچویں روز وہ خود مجھ سے ملنے آئی تو برسوں کی نڈھال اور بیمار لگ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس دن مجھے خود اپنی محبت کی طاقت پر فخر محسوس ہوا کہ اگر میں اس کی محبت میں جل کر راکھ ہو چکا ہوں تو وہ بھی سلگ سلگ کر دُھواں ہو رہی تھی۔ وہ بہت

دیر چپ چاپ میرے سامنے بیٹھی رہی، پھر اس نے آخر کار یہ اقرار کر ہی لیا کہ وہ بھی میرے بنا اب جینے کا تصور نہیں کر سکتی، مجھے اپنی محبت کی فتح بہت قریب نظر آ رہی تھی، میں نے ماریا سے کہا کہ میں تو پہلے ہی اپنی ساری کشتیاں جلا کر عشق کے اس جزیرے پر اُترا ہوں لہٰذا میری واپسی کے راستے تو ابتدا سے ہی مسدود ہیں۔

ماریا چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ''عامر..... مجھ سے شادی کر لو..... لیکن اس کے لیے تمہیں عیسائیت کو اپنے مذہب کے طور پر اپنانا ہو گا..... بولو..... تم میرے لیے یہ کر سکتے ہو.....؟.....'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا..... ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... میں تو پہلے ہی تمہاری خاطر اپنا گھر بار، دھن دولت، رتبہ اور مقام ترک کر چکا ہو..... پھر یہ مذہب کی آخری پونجی تمہیں کیوں درکار ہے.....؟'' ماریا سر جھکائے بیٹھی رہی ''تمہارے پاس سب کچھ ہے عامر لیکن میرے پاس میرے مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور پھر تم خود ہی تو کہتے ہو کہ تم نے کبھی خود کو ان مذہبی دیواروں کے اندر قید نہیں سمجھا، نہ ہی تم اسلام کو ایک پکے مسلمان کی طرح برتتے ہو..... تو پھر تمہیں خود کو عیسائیت میں ڈھالنے میں زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہئے..... میرے پاس اپنے اور تمہارے اس لازوال درد اور عمر بھر کی جدائی سے چھٹکارا کا بس یہی ایک طریقہ بچا ہے..... لیکن یہ راستہ تمہارے مذہب کی بند گلی سے ہو کر گذرتا ہے.....''

میں عامر کی کہانی یوں دم سادھے سن رہا تھا جیسے میری ذرا سی جنبش اس طلسم کو کرچی کرچی کر دے گی۔ لیکن عامر بن حبیب ماریا کی گذارش سن کر یوں خاموش ہو گیا جیسے اس کی داستان وہی ختم ہو گئی ہو۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ''پھر..... پھر تم نے اسے کیا کہا.....؟'' میں اسے اس وقت کوئی جواب دیئے بنا ہی الجھا ہوا سا وہاں سے اٹھ کر چلا آیا..... سچ یہی ہے کہ ماریا کی اس بات سے پہلے میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میں اگر مسلمان نہ ہوتا یہودی یا عیسائی بھی ہوتا تو مجھے کیا فرق پڑ جاتا.....؟..... میرے اعمال، میرا کردار میرا لباس اور میرا رہن سہن تو کسی طور پر مسلمانوں جیسا نہ تھا۔ میں تو بس ایک برائے نام اور صرف ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان کہلاتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی اور کش مکش نے مجھے آ گھیرا تھا۔ ذہن کہتا تھا کہ شادی کی حد تک اپنے اوپر

کسی بھی مذہب کا لبادہ اوڑھ لینے سے کیا حرج ہے.....؟..... میں کون سا دل سے اپنے مذہب سے منحرف ہونے جا رہا ہوں.....؟ ایک بار ماریا میری زندگی میں آ جائے تو پھر اسے بتا دوں گا کہ میں نے صرف زبان سے مذہب بدلنے کی حامی بھری تھی ورنہ اندر سے میں اب بھی مسلمان ہوں..... لیکن میرا دل اس سودے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ایسا کے میں اپنے ساتھ ہی نہیں، اپنے خدا اور مذہب کے ساتھ ساتھ ماریا کو بھی دھوکا دوں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ مصر کے کسی جید عالم سے اس بارے میں کوئی فتویٰ لے لوں کہ صرف زبانی کلامی کسی مذہب پر ایمان لے آنے سے اپنے اصل مذہب پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟ جب کہ دل میں یہ نیت بھی شروع دن سے ہی طے شدہ ہو کہ میں حقیقتاً اپنا مذہب ترک نہیں کروں گا اور مناسب وقت آتے ہی دوبارہ اپنے مذہب کی جانب لوٹ آؤں گا۔ اتفاق سے انہی دنوں قاہرہ میں شیخ الکریم کے لیکچرز کا بڑا شہرہ تھا، سو میں بھی ایک دن ہمت کر کے مصر کی بڑی جامع مسجد پہنچ گیا اور شیخ کا لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ خوش نصیبی سے اس روز شیخ کا لیکچر بھی میرے مسئلے سے کچھ ملتا جلتا ہی تھا۔ میں نے شیخ کو کہتے سنا کہ ہم مسجد کے حاضرین میں سے اس وقت بیشتر بلکہ شاید تمام اس لیے مسلمان ہیں کہ ہم ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گویا ہم پر اللہ کا خصوصی فضل و کرم تو ہماری پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ذرا سوچیے، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو کسی غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہو کر اپنی کوشش اور سچ کے حصول کی خاطر اسلام کی جانب آ سکتے تھے؟ اللہ نے ہمیں اس وقت عظیم امتحان سے بچایا ہے تاکہ ہمارا مزید وقت ضائع نہ ہو۔ ہمیں کائنات کے سب سے عظیم مذہب اور عظیم امت میں پیدا کر کے اس نے ہمیں ''چنا ہوا'' (Chosen - One) ثابت تو کر دیا لیکن آج آپ سب اپنے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر خود سے سوال کیجئے کہ کیا ہم واقعی خود کو اس اعزاز کا حق دار ثابت کر سکتے ہیں.....؟..... کیا ہم اپنی ذات کی خامیوں سمیت اس قابل تھے کہ ہمیں یہ انعام دیا جاتا.....؟..... ہمیں دوسرے مذاہب کی نسبت ابتداء ہی سے ایمان بخش کر ہمارا جو وقت سچ کی کھوج میں ضائع ہونے سے بچایا گیا ہے..... کیا ہم واقعی اس وقت کا حق ادا بھی کر پائے ہیں یا نہیں.....؟ ہم سے تو لاکھ درجہ بہتر وہ نومسلم ہے جو چالیس پینتالیس سال کی عمر اس ایمان کی کھوج میں در بدر بھٹکتا ہے اور پھر ایک دن کائنات کے خالق کا راز

جان کر ایمان لے کر آتا ہے..... اور اپنے خدا اور پیارے نبی ﷺ کی یاد میں جُت جاتا ہے۔ ہم تو اپنی عمر اس تسلی کے ساتھ ضائع کر دیتے ہیں کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے..... جب بڑھاپا آئے گا..... تب دیکھا جائے گا..... مجھے آپ سب میں سے کوئی ایک آج اس بات کی ضمانت دے دے کہ وہ واقعی اپنا بڑھاپا دیکھ پائے گا.....؟ چلیں بڑھاپا تو بہت دور کی بات ہے..... آپ میں سے کوئی مجھے اتنا ہی یقین دلا دے کہ میں اس ممبر سے اپنا دوسرا قدم نیچے رکھنے تک سانس لیتا رہوں گا.....؟ جب ہم سب جانتے ہیں کہ یہ عالم اس قدر ناپائیدار ہے تو پھر یہ حجت کیوں.....؟..... ہم ہر لمحے کو کسی آخری لمحے کی طرح مہلت جان کر اپنے اللہ کی جانب رجوع کیوں نہیں کر لیتے.....؟ دنیا کے پھندے بڑے دل کش اور دل فریب ہیں دوستو..... ہم میں سے کوئی بھی ان کی دل پذیری سے انکار نہیں کر سکتا..... لیکن سچ یہی ہے کہ یہ دنیا ایک بہت بڑا دھوکہ ہے..... اور ہم سب جو آج یہاں جمع ہوئے ہیں..... وہ یہ جان لیں کہ ہمیں ہمارے اللہ نے ایک اور وقع عطا کیا ہے..... اور شاید یہ آخری موقع ہو، کیوں کہ کون جانے اگلی نماز تک بھی ہم میں سے کتنوں کو یہ مہلت ملتی ہے..... تو کیوں نہ ٹھیک اسی لمحے اپنے ماضی کے ہر گناہ سے تائب ہو کر خود کو اپنے رب کے سپرد کر دیں.....'' عامر نے بات کرتے کرتے پہلو بدلا تو مجھے اس کی آنکھیں نم ہوتی دکھائیں دیں۔ عامر نے بات جاری رکھی۔ ''شیخ کا لیکچر ختم ہوا تو میرے اندر بیک وقت کئی طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ میں جو وہاں اس کے سامنے اپنے ایمان کو چند روز کے لیے گروی رکھنے آیا تھا، اپنے ایمان کے علاوہ باقی سب کچھ لٹا بیٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قدرت نے اس روز شیخ الکریم کا وہ بیان صرف میرے لیے ان کی زبانی جاری کروایا تھا۔ کیونکہ میرا ایمان بھی تو ایسی ہی دی گئی ایک مہلت کا شاخسانہ تھا۔ اور اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ جس عرصے میں میں ماریا کو پانے کے لیے عارضی طور پر اپنی مذہب بدل کر ''دِھریے'' کا روپ دھار لیتا..... ٹھیک اسی دوران میری رُوح قبض نہیں کی جائے گی.....؟..... اور اگر اس دوران میری موت ہو جاتی تو میں تو اس فضل و کرم کے انعام سے بھی محروم رہ جاتا جو اللہ نے میری پیدائش ایک مسلم گھرانے میں کر کے مجھ پر عنایت کیا تھا، اور کچھ نہ سہی..... مسلمان کا نام اور پڑھے گئے اُس کلمۂ وحدانیت کا آسرا ہی سہی۔ روزِ آخر کہیں کسی فہرست میں آخری صفحے پر میرا نام تو ہو گا..... شاید وہ برائے نام مسلمانوں کی فہرست میں چھپا ہوا

میرا نام ہی میری نجات کا ذریعہ بن جائے۔ میں جتنا سوچتا رہا۔ اُسی قدر میرے جسم پر طاری لرزہ تیز ہوتا گیا اور پھر جب مسجد خالی ہوئی اور شیخ کی نظر مجھ پر پڑی تو میں کوئی اور عامر بن حبیب بن چکا تھا، وہ عامر بن حبیب جو اپنی محبت کی خاطر اپنے مذہب کو گروی رکھنے آیا تھا، وہ اپنی محبت سمیت اپنا سب کچھ دان کر کے صرف اپنا گروی ایمان چھڑا کر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے شیخ کو الف تا ی ساری بات بتا دی۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پھر سے چھ کلمے اپنے پیچھے دہرانے کی ہدایت کی اور جب میں مسجد سے باہر نکلا تو صرف میرا ایمان میرے ساتھ تھا، میں نے اسی شام ماریا کو قاہرہ کے اس پرسکون کیفے میں بلایا جو شہر سے کچھ باہر دو رویہ درختوں کی ایک قطار کے سائے تلے موجود اور ہماری ملاقات کا پسندیدہ مقام تھا۔ کیفے کی پرلی جانب جو پانی کا جھرنا بہہ کر ایک لمبی سی نالی کا رُخ اختیار کر یا تھا۔ اس پانی کے بہنے کی آواز ہماری بہت سی خاموشیوں کی گواہ بھی تھی۔ اُس روز بھی اس یخ بہتے ہوئے جھرنے کے پانی کی رِم جھم ہمارے اطراف کی خاموشی کو مزید خاموش کر رہی تھی لیکن خود میرے اندر ایک طوفان کا شور موجود تھا۔ میں نے ماریا کو اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ میں اپنی محبت کی خاطر اپنے ایمان کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں عمر بھر ماریا سے ہی محبت کرتا رہوں گا اور آخری سانس تک میرا دل اُسی کے لیے دھڑکے گا مگر میں اپنا مذہب ترک کر کے اس کا ہاتھ نہیں تھام سکتا۔ اس روز میں اور ماریا بہت دیر تک روئے..... کبھی میں نے اُسے تسلی دی اور کبھی اس نے میری ہمت باندھی..... ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سچے تھے.....، اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کے ساتھ جھوٹ بول کر اُسے حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا..... وہ میری ماریا سے آخری ملاقات تھی.....، میں ماریا کے لیے اس روز شیخ الکریم کا دیا ہوا چھوٹا سا خوبصورت جلد والا قرآن کا نسخہ بطور تحفہ لے کر گیا تھا۔ جسے ماریا نے اپنی آنکھوں سے لگا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور اپنی بائبل جسے وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے پھرتی تھی.....، میرے حوالے کر دی۔ میرے پاس اب بھی ماریا کا دیا ہوا وہ تحفہ موجود ہے آیان.....'' میں نے عامر بن حبیب کے ہاتھ کے اشارے کی جانب نظر اٹھا کر شیلف میں دیکھا تو کالے کور Cover والی بائبل کا ایک نسخہ وہاں سجا ہوا تھا۔ عامر نے گہری سانس لے کر اپنی بات ختم کر دی۔ ''اس روز کے بعد میری ماریا سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی..... میں ماسٹرز کے لیے نیویارک چلا آیا اور سنا ہے وہ دوبارہ اپنے

آبائی شہر سینٹ لوئیس کو لوٹ گئی.....'' کمرے پر گھمبیر سی خاموشی چھا گئی۔ صرف آتش دان میں جل کر چٹختی ہوئی لکڑیوں کی آواز باقی رہ گئی۔ میں اور عامر دونوں اس وقت کسی ایسے ایک چھوٹے سے جزیرے کے باسی لگ رہے تھے، جن کے اردگرد کی ساری زمین سمندر کھا چکا ہو اور اب ان کے پاس صرف اتنی ہی جگہ باقی بچی ہو جس پر وہ دونوں اپنے گھٹنوں کو اپنے سینوں سے جوڑ کر دم سادھے بیٹھے صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہوں کہ کب پانی کی کوئی بڑی لہر یہ مٹھی بھر زمین بھی ان سے چھین کر انہیں سدا کے لیے غرق آب کر جائے۔ میں نے کمرے سے نکلنے سے پہلے عامر سے ایک آخری سوال پوچھا۔ ''تو کیا تم نے یا ماریا نے کبھی ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی..... دل میں ایمان کی موجودگی رکھتے ہوئے بھی تو ایک ''سنگتِ پارینہ'' کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات کی جا سکتی تھی؟..... عامر اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا ''نہیں..... کچھ رشتے ملاقات کے تکلف سے ماورا ہو جاتے ہیں.....، اب ہمیں شاید کسی ملاقات کی ضرورت ہی نہیں رہی، کیونکہ ہم دونوں جانتے ہیں کہ ہم اب ملیں چاہے نہ ملیں..... عمر بھر ایک دوسرے کے اندر..... ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے.....''

میں دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ اس روز نیویارک کا آسمان بھی عامر اور ماریا کی یاد میں نیر بہانے پر تلا ہوا تھا، میں بائیک لے کر مرکزی سڑک پر آیا تو بوندوں نے میرے آنسوؤں کا رُوپ دھار لیا،..... پھر وہی محبت..... میں نے ایک جھرجھری لی..... مجھے جینی کی بددعا یاد آئی ''خدا کرے جب تمہیں محبت ہو تو ایسی ہو کہ اس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے.....'' میری بائیک تیزی سے نیویارک کی سنسان سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی، میں بارش تیز ہونے سے پہلے جان۔ ایف۔ کینڈی ائیر پورٹ پہنچنا چاہتا تھا جہاں رات تین بجے شیخ الکریم کی فلائیٹ کا اعلان ہو چکا تھا اور وہ سب سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے، وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے ان سے کہا ''میں آپ کے لیے پھول نہیں لا سکا..... دراصل مجھے ''الوداع'' کا ایسا کچھ تجربہ نہیں ہے لیکن اب پشیمان ہوں.....'' وہ مسکرائے اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک گلاب کا پھول میری جیکٹ کے کالر میں سجا دیا۔ ''یہ الوداع نہیں..... ابتداء ہے..... ایک نئے رشتے کی ابتداء..... اور اگر پھولوں کی رسم ان مواقع کے لیے

ضروری ہے تو یہ لو..... میں نے تمہارے کالر میں پھول سجا کر یہ فرض بھی نبھا دیا..... ہاتھوں میں پھول ہوں یا نہ ہوں..... دل کا گلاب سدا کھلا رہنا چاہئے۔'' میں نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا'' مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت رہے گی..... آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیا کروں.....'' شیخ نے کاغذ کے ایک پرزے پر کوئی نمبر لکھ کر میرے حوالے کیا۔'' یہ میرا موبائیل نمبر ہے۔ عبادت اور تلاوت کے اوقات کے علاوہ کھلا رہتا ہے..... لیکن پیغام Message نہ کرنا..... مجھے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے.....'' وہ مسکرا کر اور مجھے سینے سے لگا کر آگے بڑھ گئے اور کچھ دیر میں ہی ائیر پورٹ لاؤنج کی بھیڑ میں کھو گئے۔ اچانک مجھے اپنے گالوں پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تو میرے آنسو تھے..... میں نہ جانے کب سے رو رہا تھا..... اور پھر میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس موجود سبھی طلباء شیخ الکریم کے اس الوداع پر رو رہے تھے، مجھے ان سب طلباء کے جذبات کا احساس تو ہمیشہ سے تھا لیکن میں خود اپنے اوپر حیران تھا۔ آیان نے تو خود کو ہمیشہ ایسی کسی بھی جذباتیت سے مبرا سمجھ رکھا تھا..... پھر آج وہی آیان احمد اپنے آنسوؤں پر قابو کیوں نہیں رکھ پایا..... کبھی کبھی ہمیں اپنے اندر ہوتے انقلاب کی خبر سب سے آخر میں ہوتی ہے..... میں جب ائیر پورٹ سے واپس ہاسٹل پہنچا تو صبح کا سویرا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ لیکن تیزی سے ہوتی بارش میں اِکا دُکا برف کے گالے بھی شامل ہو چکے تھے۔

اس روز یونیورسٹی کی فضاء سخت کشیدہ تھی۔ مسلم طالب علموں اور طالبات نے متوقع ڈینش سیمینار کے پیش نظر کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ مجھے احمر نے صبح سویرے ہی بتا دیا تھا کہ نیویارک پولیس نے گذشتہ رات ٹائم اسکوائر بم والے کیس میں سزا شدہ لڑکے کے بیان کی روشنی میں بہت سی جگہوں پر چھاپے مار کر پاکستانی اور ایشین طلبا کو گرفتار کیا ہے۔ احمر نے ہی مجھے بابر سیدی کا پیغام بھی پہنچایا کہ ہو سکے تو میں چند دن کے لیے بسام کو کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کا کہہ دوں۔ کیونکہ نیویارک پولیس مجھے دباؤ میں رکھنے کے لیے یہ آخری حد بھی استعمال کر سکتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ بابر کے ذہن میں کون سے خدشات پل رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ بطورِ مسلم کونسلر پولیس یا سی۔آئی۔اے کے لیے بنا کسی ثبوت کے مجھے گرفتار کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا لیکن اگر انہیں یہ محسوس ہوا کہ میں یونیورسٹی کے مسلم طلبا کے ساتھ مِل کر گذشتہ رات ہوئی گرفتاریوں پر ان کے لیے کوئی پریشانی کھڑی کر سکتا ہوں یا

یونیورسٹی انتظامیہ ہی ہونے والے سیمینار سے پہلے میرے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر دے تو وہ لوگ مجھے دباؤ میں رکھنے کے لیے بسام کی ضمانت منسوخ کروا کر اُسے ضرور گرفتار کر سکتے تھے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ بسام کو یہ سب سمجھانا کس قدر مشکل ثابت ہوگا..... اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، جب میں نے بسام کو صنم کبیر کے ذریعے یہ پیغام بھجوایا کہ وہ چند دنوں کے لیے یونیورسٹی سے چھٹی لے کر عرفی ماموں کی جانب منتقل ہو جائے تو اس نے صاف انکار کر دیا، ہمارا آمنا سامنا کیفے کے باہر والے بڑے دالان میں ہوا جب میں اور پُروا کیفے سے نکل رہے تھے اور بسام اور صنم کبیر کیفے جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہے تھے۔ ہم چاروں اچانک ہی ایک دوسرے کے سامنے آئے تو کچھ دیر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ پھر بسام نے ہی بات شروع کی..... ''میں جانتا تھا کہ تم جس رستے پر چل رہے ہو..... اس کا انجام ایک دن ایسی کوئی گرفتاری یا روپوشی ہی ہوگا..... لیکن میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا..... اگر ایک مسلم کونسلر کا بھائی ہونے کی کوئی سزا مقدر کی جا چکی ہے..... تو میں اُسے ضرور بھگتوں گا..... شائد میری سزا ہی تمہاری آنکھیں کھول دے.....'' میں زچ ہو کر بولا ''آخر تم ہم سب کی بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ..... یوں خود کو پولیس کے حوالے کر دینا سراسر بے وقوفی ہوگی..... ابھی تو یہ بات صرف ایک خدشے کی حد تک ہے..... لیکن اگر حالات بگڑے تو یہ خدشہ حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ وقت نہیں لے گا..... میری مشکلات میں اضافے کا سبب مت بنو بسام.....'' پُروا اور صنم کبیر دم سادھے ہم دونوں بھائیوں کے بیچ ہوتی یہ تکرار سن رہی تھیں۔ بسام پھٹ پڑا ''مشکلات میں تم اضافہ کر رہے ہو یا میں.....؟..... تمہارے ذہن پر اسلامیات کا جو یہ بھوت سوار ہے..... ایک دن یہ جنون ہم سب کی زندگیاں برباد کر دے گا..... اس دن تم پچھتاؤ گے آیان..... لیکن تب تمہارا دامن ہر رشتے سے خالی ہو چکا ہوگا.....''

میں نے کچھ توقف کیا ''بات اگر پچھتاووں کی ہی ہے تو پھر میرے دامن میں ماضی کے بہت سے پچھتاوے ابھی زندہ ہیں کہ جن کا حساب وقت سے کرنا باقی ہے..... کاش تم وہ دیکھ سکتے جو میں دیکھ رہا ہوں..... بہرحال..... میں اپنی جذباتی تسلی کے لیے تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کروں گا..... تم وہی کرو..... جو تمہیں بہتر لگے..... اور میں وہی کروں گا جو مجھے ٹھیک لگے گا.....''

میں اور بسام پُروا اور صنم کے ساتھ مختلف سمتوں میں آگے بڑھ لئے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے ایڈمن بلاک کے برسر نے ڈین کا پیغام دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ڈین کے کمرے میں پہنچا تو پُروا کو پی۔اے نے باہر ہی روک لیا۔ ڈین کے چہرے پر اشتعال کے آثار تھے۔

''میں اس طرح کلاسز کے بائیکاٹ کی وجہ پوچھ سکتا ہوں.....؟ کیا تم سب لوگ اپنا سمیسٹر اپنے ہاتھ سے ضائع کرنا چاہتے ہو.....؟'' ''نہیں..... ہم اپنی ایک کلاس بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے..... اور آپ اس بائیکاٹ کی وجہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں.....'' ڈین نے خود پر ضبط جاری رکھا ''آیان..... تمہیں میں نے اس دن بھی بتایا تھا کہ کچھ باتیں خود میرے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہیں..... یہ یونیورسٹی صرف طلبا کی فیسوں سے نہیں چلتی..... بلکہ فیس اور دیگر فنڈز سے تو شائد ہم اتنی بڑی یونیورسٹی کو ایک ہفتہ بھی نہ چلا سکیں..... ہمیں اسے چلانے کے لیے بہت بھاری عطیات کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عطیات ہمیں یونیورسٹی کے بورڈ آف گورنرز کے ذریعے ملتے ہیں۔ میں بورڈ آف گورنرز کے فیصلے کے خلاف نہیں جا سکتا کیونکہ جو لاکھوں ڈالر کے سالانہ عطیات بھیجتے ہیں..... یہ بورڈ آف گورنرز انہی کا قائم کردہ ہے..... میں اگر زیادہ مزاحمت کروں گا تو انہیں دوسرا ڈین لانے میں بمشکل ایک ہفتہ بھی نہیں لگے گا..... لہٰذا یہ سیمینار ہو کر رہے گا.....''

میں نے چند لمحے غور سے ڈین کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت واقعی ایک مجبور انسان کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ ''میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ آپ کی نوکری پر ہماری وجہ سے کوئی حرف آئے..... لیکن میں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ مسلم طلبا کی موجودگی میں ایسا کوئی سیمینار منعقد کروانا ناممکن ہے..... آپ چاہیں تو ہمارے خلاف یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں..... لیکن ہم نے ابھی یونیورسٹی کے قانون اور آئین کے دائرے سے نکل کر کوئی کام نہیں کیا ہے۔''

ڈین خاموش ہو گیا لیکن میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اُسے بورڈ آف گورنرز کو جواب تو دینا ہی ہو گا۔

اس رات میں جلد اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ گذشتہ رات ایئر پورٹ کے راستے میں بائیک پر بھیگتے رہنے سے شائد ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی۔ میں نے بخار کی ایک گولی نگلی اور تکیے پر سر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند بھلا کوشش سے کب آتی ہے، شائد نیند کوشش کی ضد ہے، لیکن

پھر بھی رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی۔ اور پھر شدید دھڑ دھڑانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو سبھی مسلم طلبا دروازے کے باہر پریشان کھڑے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ان میں سے کوئی ایک چلایا۔

''نیویارک پولیس نے دو گھنٹے قبل عامر بن حبیب کو ایک چھاپے کے دوران گرفتار کر لیا ہے۔''

باب 15

عامر بن حبیب کی گرفتاری نے ساری یونیورسٹی میں ایک ہل چل سی مچا دی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر اُس کی بروکلین والی رہائش کا پولیس کو پتہ کیسے چلا.....؟۔ میں کل شام ہی تو اس سے مِل کر آیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے تو اُس اپارٹمنٹ تک نہیں پہنچ گئے تھے؟ مسلم طلباء میں، میں ہی سب سے آخر میں عامر سے مِل کر آیا تھا۔ اُس روز بھی مسلم طلبا نے کلاسوں کا بائیکاٹ جاری رکھا اور جب ہم ساڑھے گیارہ بجے کے قریب عدالت کے اُس احاطے میں پہنچے جہاں کچھ دیر بعد عامر کو لایا جانا تھا، تو ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ یہ اس موسم سرما میں نیویارک کی پہلی برف باری تھی۔ کچھ ہی دیر میں عدالت کے احاطے میں موجود بڑا اینٹوں کا صحن اور تمام درخت برف سے اَٹ گئے، خزاں رسیدہ شاخوں پر برف کے پھول سجنا شروع ہو گئے تو وہ لوگ عامر بن حبیب کو لیے کورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے، نیویارک پولیس نے بڑی مشکل سے اپنی حد کے لیے لگائی نیلی پٹی سے میڈیا کو دُور رکھا ہوا تھا۔ میں نے دُور سے ہی عامر کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا ''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں عامر..... تمہی ہمارے مسلم کونسلر ہو اور ہمیشہ رہو گے.....'' عامر بن حبیب نے مسکرا کر میرے ''جوشیلے خوش آمدید'' کو سراہا۔ میڈیا کے کیمروں کا رُخ میری جانب ہو گیا۔ میں تیزی سے ہجوم کو چیرتا ہوا عامر کے قریب تر ہوتا گیا۔ برف ہمارے سروں کو ڈھک رہی تھی اور ہماری سانسیں گرم بھاپ کی مانند فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ میں عامر کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا جہاں سے وہ میری بات آسانی سے سُن سکتا تھا، میں نے تیزی سے چلتے ہوئے

پولیس کے قدموں سے قدم ملائے ''مجھے شک ہے یہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے کہیں تمہارے اپارٹمنٹ تک نہ پہنچ گئے ہوں.....؟'' عامر نے آگے چلتے ہوئے کہا ''نہیں..... یہ اپارٹمنٹ والوں کا کارنامہ ہے، بہت دنوں سے آس پاس کے ہمسائے تم سب لوگوں کی آمدورفت کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے..... آج آخرکار انہوں نے شکایت کر دی.....'' عامر کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے شانوں سے بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔ کیونکہ عامر نہ سہی مگر کسی اور مسلم طالب علم کے ذہن میں یہ شک سر ابھار لیتا کہ عامر کی مخبری میں میرا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے تو مجھے اُنہیں جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا کیونکہ میرا دامن پہلے ہی ایک ایسے الزام سے داغ دار تھا۔ عامر نے شائد میرا ذہن پڑھ لیا اور وہ ایک لمحے کے لیے سیڑھیوں کے قریب رُک گیا۔ گرتی ہوئی برف کا ایک بڑا سا گالہ اس کی پلکوں میں آ کر اٹک گیا۔ عامر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے اگر اپارٹمنٹ یونین کا صدر نہ بھی بتاتا کہ اُس نے خود فون کر کے پولیس کے سامنے اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے..... تب بھی میرے ذہن میں ہرگز کوئی شک سر نہ اُبھارتا آیان..... خود کو بلاوجہ ہلکان نہ کیا کرو..... تمہیں ابھی بہت سی اہم ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں..... اور اس بات پر اعتماد اور یقین رکھو کہ تمہاری ایک پکار پر پورا مسلم گروپ اپنا سر کٹا سکتا ہے..... تم اب اُن کی رُوح کے اندر بستے ہو.....، اور وقت آنے پر تم خود یہ سب دیکھ لو گے.....'' میڈیا کے کیمرے دھڑا دھڑ ہماری تصویریں اتار رہے تھے اور بہت سے ٹی۔وی چینل والے بھی ہمیں کور کر رہے تھے۔ پولیس نے عامر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا، برف باری تیز ہو چکی تھی۔ عامر بن حبیب کے قدموں کے نشان برف پر بنے تو میں اُس کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا کورٹ روم میں داخل ہو گیا۔ عامر پر بھی کم و بیش وہی الزامات لگائے گئے تھے جو بابر سیّدی کے سر تھے، نیویارک پولیس عامر بن حبیب کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور ٹائمز اسکوائر بم کیس یا پھر ایسی ہی دیگر ''ان دیکھی اور ان ہونی سازشوں'' کے ساتھ جوڑنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ عامر کی روپوشی اور اس دوران اُس سے ملنے کے لیے آنے والے ملاقاتیوں کی ''مشکوک سرگرمیوں'' کا بھی بہت مرتبہ ذکر آیا اور اپارٹمنٹ کے مکینوں کی شکایت اور شہادت بھی پیش کر دی گئی۔ جج نے تمام ''ثبوتوں'' کو دیکھتے ہوئے عامر کو سات دن کے لیے حراست میں رکھ کر تفتیش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ مسلم لڑکوں نے

عدالت کے باہر گرتی برف میں بہت دیر تک مظاہرہ جاری رکھا۔ عامر کے چہرے پر پوری سماعت کے دوران اُس کی مخصوص مسکراہٹ چھائی رہی اور مجھے جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ اس کی یہ مسکراہٹ سرکاری وکیل اور پولیس سمیت جج کے لیے بھی ایک تازیانے کی طرح تھی۔ کیونکہ اس قوم کو تو مرعوبیت مرغوب ہے اور یہ مرعوبیت انہیں بابر سیّدی کے چہرے پر ملی نہ۔ عامر بن حبیب نے ہی اُن کی یہ خواہش پوری کی تھی۔ پیشی کے بعد انہوں نے عامر کو ہم سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی اور تیزی سے اسے عدالت سے نکال باہر لے گئے۔ میں عدالتی کمرے سے باہر نکلا تو رپورٹرز نے مجھے گھیرے میں لے لیا ''تم تو وہی نئے مسلم کونسلر ہو نا..... جس نے گراؤنڈ زیرو پر اُس روز شمع روشن کی تھی..... تم کیا سمجھتے ہو کہ پُرانے مسلم کونسلر کا نیویارک میں ہوئی دہشت گردی کی وارداتوں سے کوئی تعلق ہے یا نہیں.....؟'' میں اُنہیں کوئی جواب دیئے بنا ہی آگے بڑھ جانا چاہتا تھا لیکن دہشت گردی کا الزام سن کر میرے قدم رُک گئے۔ میں رپورٹر کی جانب مڑا ''دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر نیویارک پولیس کو عامر بن حبیب پر ایسا کوئی شک ہے تو پھر یہ شک ہر مذہب پرست پر کیا جانا چاہیے۔ اس دہشت گردی کے پیچھے پادری ٹیری جونز یا ملعون ویسٹر گارڈ جیسا کوئی شخص بھی تو ہو سکتا ہے جو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیل رہا ہو.....؟..... آخر ایک مسلم کونسلر پر ہی تمام الزامات کیوں.....؟..... کوئی عیسائی یا یہودی کونسلر بھی تو اس طرح کی واردات کا منصوبہ بنا سکتا ہے.....؟ اگر جنون کا تعلق کسی مذہب سے جوڑنا ہی آخری کلیہ ہے تو پھر یہ ایسے مجنوں تو ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں..... اُن میں سے دو کے نام تو میں نے ابھی آپ کو بتا دیئے ہیں.....'' اتنے میں پُروا ہجوم کو دھکیلتی کہیں سے بھیڑ میں گھس آئی اور اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے لے جانے کے لیے کھینچا ''آیان..... چلو یہاں سے.....''

وہ جانتی تھی کہ میڈیا مجھے بھڑکا کر مجھ سے اپنے مطلب کے جوابات کا خواہاں ہے..... لیکن میں بھی کیا کرتا؟..... کچھ سوال بروقت جواب کے ہی متقاضی ہوتے ہیں..... ہم ایک قدم آگے بڑھے تو ایک اور برف سے ڈھکا مائیک میرے سامنے آ گیا۔ ''تم نے ابھی ویسٹر گارڈ پر منفی مذہبی جنون کا الزام لگایا ہے..... لیکن خود تمہاری یونیورسٹی اسی ویسٹر گارڈ کے بنائے ہوئے خاکوں پر باقاعدہ

سیمینار کا پروگرام بنا چکی ہے..... مسلم طلباء کا اس سیمینار سے متعلق ردعمل کیا ہوگا.....؟'' پُروا نے جلدی سے میری جگہ جواب دیا ''ہم تمام مسلمان طلبا یونیورسٹی کے قانون کے اندر رہتے ہوئے اس سیمینار کو رُکوانے کے لیے ہر ممکن احتجاج کریں گے.....'' ہم نے تیزی سے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن ہجوم بہت زیادہ تھا، ایک اور زہر میں بجھا سوال میرے سماعتوں میں چھید کر گیا۔ ''آخر یونیورسٹی کے دو ہزار سے زائد طلبا میں سے صرف دو ڈھائی سو مسلمان طلباء کو ہی آزادیٔ اظہار سے اس قدرت نفرت ہے.....؟ یہ بذاتِ خود مسلمان طلباء کا ایک انتہا پسندانہ رویّہ نہیں تو اور کیا ہے.....؟'' میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ برف باری کا رُخ اب ترچھا ہو چکا تھا اور مجھے برف کے دبیز اور بڑے گالوں کے عقب میں رپورٹر کا چہرہ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا ''ہمیں آزادیٔ اظہار پر کوئی اعتراض نہیں .....لیکن یہ آزادی نہیں..... وحشت ہے..... اور آج تم جو یہ ہاتھ میں مائیک تھامے آزادیٔ اظہار کے گُن گاتے پھرتے ہو.....تمہاری ہمت ہے کہ اس بھرے نیویارک میں کسی یہودی کے سامنے ہالوکاسٹ کے بارے میں اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کر سکو.....؟ ..... کیا تم میں سے ایسا کوئی شیر دل ہے جو کسی عیسائی کے سامنے چرچ کی کسی رسم یا بپتسمہ کو غلط قرار دے سکے..... کیا تم کسی بھی کیتھولک کے سامنے پروٹسٹنٹ کو اور پروٹسٹنٹ کے سامنے کیتھولک عقیدے کو کھل کر اچھا کہہ سکتے ہو.....؟ ..... کیا کسی یہودی کے سامنے سینہ تان کر یہ بات کہہ سکتے ہو کہ عیسیٰؑ کو صلیب دینے کی سازش کے پیچھے خود یہودی علماء کا ہاتھ تھا.....؟ .....کبھی تم لوگوں نے سینہ ٹھونک کر یہ کہا ہے کہ اسرائیل یہود کی ایک ناجائز بستی ہے جسے جنگ عظیم دوئم سے پہلے ہی یہودی منصوبہ کاروں نے فلسطین کے مقام پر بسانے کا فیصلہ کر لیا تھا.....؟ ..... کیا تم میں سے کوئی رپورٹر آج شام کی خبروں میں یہ اعلان کر کے آزادیٔ اظہار کا بول بالا کر سکتا ہے کہ بیت المقدس پہ اسرائیلی قبضہ ناجائز اور اس کے اردگرد ہوتی کھدائی دراصل ہمارے قبلۂ اول کے اِنہدام کی ایک سازش ہے.....؟ بولو..... کوئی ہے آزادیٔ اظہار کا ایسا متوالا جو میرے ان سوالات کا جواب دے سکے.....؟؟.....'' ہجوم پر ایک سناٹا سا طاری ہو گیا اور ہمارے اردگرد صرف گرتی ہوئی برف کی سرگوشیاں رہ گئیں.....، کوئی کچھ نہ بولا..... میں نے اپنی بات ختم کی ''اگر تم سب مل کر بھی آزادیٔ اظہار کے اتنے چھوٹے سے نمونے سے خائف ہو..... تو پھر ہم

مسلمانوں پر اپنی کائنات کی سب سے مقدس ہستی ﷺ کے مقدس نام کی حرمت کا دفاع ہی تمہیں آزادیٔ اظہار کے خلاف کیوں لگتا ہے.....؟..... یاد رہے کہ اظہار کی آزادی کی اپنی کچھ حدود مقرر ہیں، اور آزادی اظہار کا بھی اپنا ایک تقدس ہوتا ہے..... اور جو کوئی بھی اپنے کسی ذاتی مذموم مقصد کے لیے ان حدوں کو پار کر جائے..... میری نظر میں وہ خود ایک انتہا پسند اور دہشت گرد ہی ہے.....'' میں اور پُروا ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ہمارے یونیورسٹی واپس پہنچنے سے پہلے ہی نیویارک کا تمام میڈیا آج عدالت کے احاطے میں میری رپورٹرز سے ہوئی اس خود ساختہ جھڑپ کی کہانیاں بیان کر رہا تھا۔ ایک آدھ چینل کے علاوہ باقی سب کا انداز ابھی تک نہایت منفی تھا اور میری کہی گئی بات کو یہود اور عیسائیوں کے لیے ایک چیلنج کے طور پر نمایاں کیا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز یہودی اور عیسائی طلباء کی جانب سے بھی کلاس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے کسی ممکنہ ناخوش گوار واقعے سے بچنے کے لیے نیویارک پولیس سے حفاظتی حصار کا مطالبہ کر دیا اور جب میں برف سے ڈھکی روشنیوں اور راستوں سے ہوتا ہوا یونیورسٹی کے بڑے دالان میں پہنچا تو سارا میدان سنسان پڑا ہوا تھا۔ چند منچلوں نے نیویارک کی پہلی برف باری کا لطف لینے کے لیے گذشتہ روز میدان میں برف کے جو پتلے بنائے تھے وہ اب بھی اُسی طرح ایستادہ تھے اور رات کی گری مزید برف نے ان کے نقوش گہرے کر دیئے تھے۔ احمر اور بلال میرے ساتھ تھے اور کچھ ہی دیر میں ہمارے اردگرد ہمارا سارا گروپ اکٹھا ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر پُروا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے لیکن وہ خاموش رہی مگر ٹھیک اُسی وقت صنم کبیر گھبرائی ہوئی سی وہاں آ پہنچی ''آیان..... آج تمہیں یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا..... یہاں دوسرے گروپس کے لڑکے بہت مشتعل ہیں.....''۔ احمر غصے میں مجھ سے پہلے ہی بول پڑا ''کوئی مشتعل ہوتا ہے..... تو ہونے دو..... ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں..... اگر کسی نے آیان کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی خیر نہیں ہے.....'' میں نے ان سب کو منع کیا ''جب تک کوئی ہم پر ہاتھ نہ اُٹھائے..... ہمیں چپ رہنا ہے..... اور کسی جھگڑے کی صورت میں بھی ہمیں صرف اپنا دفاع کرنا ہے..... تم سب کو یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ ہماری منزل اِن جھگڑوں سے کہیں آگے ہے..... ہمیں اپنے راستے سے بھٹک کر کسی اور جانب نہیں نکلنا ہے.....''۔ پُروا ہماری

باتوں کے درمیان نہ جانے چپ چاپ کہاں جا چکی تھی۔ ہم سب نے کیفے کے باہر والے دالان میں نصب سنگِ مرمر کے بینچوں سے برف جھاڑی اور وہیں ٹِک گئے۔ آج کیفے بھی حالات کے پیشِ نظر بند تھا لہٰذا کچھ طلباء اپنے ساتھ تھرماس میں کافی اور کچھ پلاسٹک کے کپ بھی لے کر آئے تھے، سخت جمی ہوئی برف میں کافی پینا بھی کچھ الگ ہی تجربہ ہے۔ ہم سب وہیں اپنے خیالوں میں گُم بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک جانب سے شمعون مائیکل اور ان کے گروپ کے بیس بائیس لڑکے وہاں آ پہنچے۔ میں نے اپنے گروپ کو آرام سے بیٹھے رہنے کی ہدایت کی، شمعون گروپ میری جانب بڑھ آیا۔ اُن سب کے چہرے تنے ہوئے اور آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں سی لپک رہی تھیں۔ شمعون میرے سر پر آ کھڑا ہوا ''ویسے تمہاری ہمّت کی داد دینی چاہیے..... تم آج بھی یونیورسٹی آئے ہو..... حالانکہ ہم سمجھ رہے تھے کہ کل کے انٹرویو کے بعد تم ہفتوں کیمپس میں دکھائی نہیں دو گے.....'' میں نے سر اُٹھا کر شمعون کو دیکھا ''کیوں؟..... کل میں نے ایسی کیا بات کہہ دی کہ تم مجھے دیس بدر کروانے کا سوچ رہے ہو.....؟.....''

شمعون میری بات سن کر پھٹ پڑا..... ''دیکھا تم لوگوں نے..... اِسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس نے سارے نیویارک کے میڈیا کے سامنے کیا ہرزہ سرائی کی ہے..... ہمارے مذہب پر کتنا کیچڑ اچھالا ہے..... آج اگر اردگرد پولیس کا یہ پہرہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں بتاتے کہ اس بکواس کا کیا انجام بھگتنا پڑے گا تمہیں.....'' میں نے کافی کا آخری سِپ لیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر شمعون کے ٹھیک مقابل کھڑا ہو گیا۔ ''میں تمہارا یہ شوق اب بھی پورا کر سکتا ہوں..... تم شائد بھول رہے ہو کہ میں مسلم کونسلر بننے سے پہلے صرف آیان تھا..... اور دعا کرو کہ وہ آیان یہ نہ بھول جائے کہ وہ اب مسلم کونسلر بھی ہے..... رہی بات پولیس کے پہرے کی..... تو وہ تو صرف اس یونیورسٹی کی چاردیواری کی حد تک ہے..... تم پورے نیویارک میں کہیں بھی مجھ سے ملاقات کا شوق پورا کر سکتے ہو..... بس جگہ اور مقام بتا دو.....'' کچھ دیر تک میں اور شمعون ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر دیکھتے رہے..... اتنے میں عیسائی کونسلر جارج بھی وہاں آ پہنچا، لیکن وہ یہ ساری صورت حال دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ اچانک دور برف سے اٹے میدان میں پُروا چالیس پچاس یہودی، عیسائی اور مسلمان لڑکیوں کے ایک جلوس نما گروپ کی

سربراہی کرتی ہوئی نمودار ہوئی اُن لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے سے کارڈ اور بینر اُٹھا رکھے تھے جس کے اوپر نمایاں طور پر مسلمانوں کا نشانِ ہلال، عیسائی مذہب کی نشانی صلیب اور یہود کا ستارۂ داؤدی بنا ہوا تھا کارڈز اور بینرز پر تینوں مذاہب کی حرمت کا پاس رکھنے کے نعرے درج تھے۔ ''جو آسمان سے اُترا..... وہ سب کے لیے مقدس ہے.....'' ''ہمارا خدا ایک ہے'' ''مذہبی تعصب کی بنیاد پر طلبا میں پھوٹ ڈالنے کی سب کوششیں ناکام ہوں گی.....''۔ ''دنیا کا ہر مذہب دوسرے مذہب کا احترام سکھاتا ہے'' اور ایسے ہی بہت سے دوسرے نعرے۔

لڑکیاں اپنے قدموں سے ''برف کی دُھول'' اڑاتی ہوئی ہمارے پاس پہنچ گئیں اور وہاں انہوں نے تینوں مذاہب اور تینوں مذاہب کے کونسلروں کے حق میں پُر جوش نعرے بازی شروع کر دی تینوں گروپس کے لڑکوں کے چہروں پر تناؤ کم ہونے لگا۔ پُروا پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ لڑکیوں کے پاس چائے کے لوازمات، کافی اور کپ وافر مقدار میں تھے، یہودی لڑکیوں نے مسلمان لڑکوں کو کافی پیش کرنا شروع کی تو مسلمان لڑکیاں عیسائی اور یہودی طالب علموں کے کپ میں چائے کافی انڈیلنے لگیں، عیسائی لڑکیوں کا گروہ بھی ان کی مدد کرتا رہا، اس طرح کچھ لمحوں میں ہی ایک بہت بڑے تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔ لیکن ہم سب جانتے تھے کہ چنگاری نے بھڑک کر آگ پکڑ لی ہے..... اور اب ذرا سی بھی ہوا اس آگ کو اتنی تیزی سے پھیلائے گی کہ شائد سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے..... شمعون کافی پیے بنا وہاں سے چلا گیا، البتہ جارج کو عیسائی گروپ کی طالبات نے گھیرے رکھا اور وہ اپنا کپ ختم کیے بنا وہاں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے ڈین کے دفتر سے بُلاوا آ گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں سیاہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس دو اجنبی چہرے بھی موجود تھے۔ ڈین نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا..... وہ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔ ''آیان..... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارا کل کا بنا اجازت لیے میڈیا کو دیا گیا بیان یونیورسٹی کے قاعدے اور قانون کی مکمل خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے اور یونیورسٹی انتظامیہ کی پوری جیوری تمہارے اس عمل کے بارے میں جلد ہی کوئی فیصلہ لینے کا سوچ رہی ہے۔ بحرحال..... یہ تو بعد کی بات ہے..... فی الحال تم سے نیویارک پولیس کے دو آفیسر کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے دونوں پولیس والوں کی طرف

دیکھا جو قد اور جسامت کے لحاظ سے مشہور کردار لورل اور ہارڈی کی نقل نظر آ رہے تھے۔ پتلے والے نے غور سے میری جانب دیکھا ''اچھا..... تو تم ہو مسلم کونسلر..... ویسے کل تم نے اتنی تلخ باتیں کر کے اپنے لیے اچھی خاصی مصیبت مول لی ہے۔ نیویارک میں ایک ہی دن میں کئی دشمن پیدا کر لیے تم نے.....'' میں جو شمعون کی باتوں کی وجہ سے پہلے ہی کافی تلخ ہو چکا تھا اپنے لہجے پر قابو نہ رکھ سکا ''تو میں تم دونوں کو ہمدردوں کی فہرست میں شمار کروں یا نئے دشمنوں کی.....'' وہ دونوں چونک سے گئے۔ بھاری بھرکم بولا ''نہیں..... ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ صرف تمہیں اتنا خبردار کرنے آئے ہیں کہ اپنی نقل و حرکت اب ذرا محدود ہی رکھنا۔ نیویارک بہت بڑا شہر ہے اور یہاں اپنے مذہب کی بات پر بھڑک جانے والے بہت ہوں گے..... کہیں کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچا دے.....'' میرا جی چاہا کہ میں اس سے پوچھوں کہ یہ تنبیہہ ہے یا دھمکی.....؟ لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنی زبان بند رکھی۔ انہوں نے مجھ سے ادھر اُدھر کی بہت سی باتیں پوچھیں اور خاص طور پر پاکستان میں میرے والدین کی جائے پیدائش، ان کی رہائش اور ہمارے رشتہ داروں کے بارے میں بھی خوب کُرید کُرید کر سوالات کیے۔ آخرکار مجھے ایک مقام پر زِچ ہو کر کہنا پڑا کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے میں نے پاکستان سے ابھی ابھی اپنے لیے امریکہ کا ویزا طلب کیا ہے یا پھر میں کوئی امریکی نہیں بلکہ ان کی نظر میں ایک مشکوک پاکستانی شہری ہوں جسے سی آئی اے نے ائرپورٹ پر ہی کسی شک کی بنیاد پر دھر لیا ہے اور اُسے واپس اپنے ملک ڈی۔ پورٹ کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ لیکن میرے احتجاج کے باوجود انہوں نے اپنے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میری جان چھوٹی۔ کمرے سے نکلتے وقت انہوں نے ڈین کو خبردار کیا کہ ان کی رپورٹ کے مطابق نیویارک کی دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات بھی اب اس جھگڑے میں کود پڑنے کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں اور وہاں کے مسلم طلبا نے میری مکمل حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ بات آگے چل کر کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے ڈین کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں اپنے طلبا کو باہر کی کسی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے روابط بڑھانے نہ دے.....'' اُن دونوں کے جانے کے بعد ڈین نے تشویش سے میری جانب دیکھا ''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو..... دیکھ لو..... چنگاریاں کہاں کہاں

تک پہنچ چکی ہیں.....'' میں نے دھیرے سے جواب دیا ''یہ آگ انہوں نے لگائی ہے..... ہم تو صرف اپنا گھر بچانا چاہتے ہیں سر..... آج میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ بطور مسلم کونسلر نیویارک اور قانون کے مختلف اداروں کے سامنے میرا تحفظ کرنے کے بجائے۔ خود مجھی کو جواب دہ کر رہی ہے..... بہرحال..... آپ کا بہت بہت شکریہ.....'' ڈین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ ہو گیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو پُروا رھداری میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی ''کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ..... خلیئے سے تو پولیس کے آدمی دکھائی پڑتے تھے؟'' ''پولیس والے ہی تھے۔ خبردار کرنے آئے تھے کہ مجھ پر اب کسی سمت سے بھی حملہ ہوسکتا ہے.....'' پُروا پریشان ہو گئی..... ''پھر..... تم نے اب کیا سوچا ہے.....'' مجھے اس کی پریشانی اچھی لگی..... ''جو ہوگا دیکھا جائے گا مِس پُروا ضمیر خان..... ویسے تم نے آج یونیورسٹی کی ساری طالبات کو یکجا کرنے کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے..... اس پر تم شاباشی کے پورے پانچ ستاروں کی حق دار ہو..... بہت خوب مِس ضمیر..... ویل ڈن.....'' پُروا شرما سی گئی۔ یہ مشرق کی لڑکیاں تمام عمر مغرب میں گزار لیں تب بھی ان کے اندر گالوں سے پھوٹتی اِس شفق کا خزانہ سدا برقرار رہتا ہے۔.....

ہم راھد اری سے باہر نکلے تو ''دوسری مشرقی لڑکی'' بھی سامنے ہی بوکھلائی سی آتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے صنم کبیر کو چھیڑا ''خدا کے لیے تم کبھی تو چہرے پر مسکراہٹ سجا کر ملا کرو..... تمہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایران کی گُوگوش یاد آجاتی ہے..... بس تم مسکراتی نہیں ہو.....'' صنم واقعی مسکرا پڑی ''تم دونوں بھائی مجھے کبھی مسکرانے کا موقع دو تو میں مسکراؤں ناں..... بسام زبان سے تو نہیں کہتا لیکن وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے..... خاص طور پر کل میڈیا سے ہوئی تمہاری جھڑپ کے بعد..... آیان..... میری ایک بات مانو گے.....؟ بسام سے ایک بار مل لو.....''۔ ''لیکن وہ مجھ سے ملنا چاہے تب ناں.....؟'' صنم خوش ہو گئی۔ ''اس کی تم فکر نہ کرو..... میں نے آج شام اُسے کیفے پنولی میں ملنے کے لیے بلایا ہے..... تم بھی پُروا کے ساتھ وہیں آجانا..... اکیلے آؤ گے تو وہ سمجھ جائے گا کہ یہ ملاقات میرے کہنے پر ہو رہی ہے..... تم اپنی زبان سے اُسے تسلی دو گے تو وہ ضرور کچھ سنبھل جائے گا.....'' میں نے اس معصوم لڑکی کی خواہش کو رد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہامی بھر لی۔ شام کو پُروا اپنی نیلی شیورلیٹ

لے کر ہاسٹل پہنچ گئی اور ہم ہاسٹل سے کیفے نپولی کے لیے نکلے تو سڑک کے دونوں طرف برف کے بڑے بڑے انبار اکٹھے کیے جا چکے تھے، میں نے ٹھیک طرح سے غور نہیں کیا لیکن مجھے شک ضرور ہوا کہ کالے رنگ کی ایک بڑی وین ہماری گاڑی کے نکلتے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ پُروا کو نیویارک کے راستے ازبر ہو چکے تھے لہٰذا وہ بڑی شاہراہوں سے بچتی گلیوں کے درمیان گاڑی دوڑاتی ہوئی منزل کی جانب بڑھتی رہی اور چند گلیوں کے بعد مجھے وہ وین بھی اپنے پیچھے آتے دکھائی نہ دی۔ میں بھی اُسے اپنا وہم سمجھ کر پُروا سے باتوں میں مشغول رہا۔ پُروا نے کیفے نپولی کی پرلی سڑک پر کار پارک کر دی اور ہم دونوں گاڑی سے نیچے اُتر آئے۔ میں سڑک پار کرتے ہوئے پُروا سے کوئی بات کر رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اچانک شدید خوف کا سایہ لہرایا اور وہ زور سے چلائی ''بچ کے آیان'' لیکن میں نے پلٹ کر دیکھنے میں ایک لمحے کی تاخیر کر دی۔ سیاہ وین بالکل میرے سر پر پہنچ چکی تھی اور اس کا انجن زور سے چنگھاڑ رہا تھا۔ پُروا نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا مجھے زور سے دھکا دیا اور میں دوسری جانب فٹ پاتھ پر جا گرا۔ وین تیزی سے اسکریچ مارتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور پھر میری نظر سڑک کے درمیان میں برف پر بے سُدھ گری پُروا پر پڑی۔ اس کے ماتھے سے بھل بھل بہتا خون تیزی سے آس پاس کی برف کو لہو رنگ کر رہا تھا۔ میں چلّا کر پُروا کی جانب دوڑا۔ پُروا کی گردن ایک جانب ڈھلک چکی تھی۔



باب 16

پُروا کو یوں لہولہان زمین پر بے سُدھ پڑے دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھا جانے کس نے ایمبولینس کوفون کیا اور کب ہم نے پُروا کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ باہر کا شور شرابہ سن کر صنم کبیر بھی کیفے سے نکل کر ہماری جانب چیخ کر دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ لیکن وہ کب میرے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھی، مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا، میں تو بس تمام راستے چلا چلا کر پُروا کو ہوش میں لانے کی کوششیں کرتا رہا۔ لیکن جب تک ہم کیفے نپولی سے قریب ترین ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوئے، پُروا کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ اس نازک سی لڑکی کے جسم میں پہلے ہی کتنا خون ہوگا جو یوں بوتلوں کے حساب سے ضائع بھی ہوتا جا رہا تھا۔ ایمبولینس کو بنا روکے زمین دوز راستے کے ذریعے سیدھے ایمرجنسی تھیٹر کے دروازے تک پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم تمام تیاریوں کے ساتھ موجود تھی۔ ہمیں راھداری میں ہی روک دیا گیا اور ہم جلتے انگاروں پر وہیں باہر راھداری میں کھڑے، لوٹتے رہ گئے..... جانے کب شام ڈھلی اور کب رات گہری ہوئی..... مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ انہیں پُروا کو اندر لے جائے پانچ گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ہمارے ہسپتال پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی سب سے پہلے بسام اور پھر سارا مسلم گروپ وہاں پہنچ گیا تھا۔ جس وقت پُروا کو وین نے کچلا تھا اس وقت تک بسام صنم کبیر سے ملنے کے لیے کیفے نہیں پہنچا تھا۔ مسلم طلبا کا اشتعال لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا لیکن وہ سب میری حالت دیکھتے ہوئے چُپ سادھے رہے..... جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ہماری تشویش بھی دو چند ہو رہی تھی۔ جانے اُنہیں اندر اتنی دیر کیوں لگ رہی تھی۔ اور

پھر صبح سے کچھ دیر پہلے آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور اندر سے تھکا ہارا میڈیکل اسٹاف باہر نکلا۔ ہم سب ان کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے ہم سے نظریں چُرانے کی کوشش کی۔ میں پھٹ پڑا، ''بولتے کیوں نہیں..... کیا ہوا ہے اُسے.....؟'' ''وہ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے..... اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہوش نہ آیا تو یہ کومہ بھی ہوسکتا ہے..... بحرحال..... ہم ابھی نا اُمید نہیں ہیں.....'' ڈاکٹر جاتے جاتے بھی ہم سب کو ایک نئی سُولی پر ٹانگ گئے۔ ہمارے سامنے پُروا کو بے ہوشی کے عالم میں ایک خاص کمرے کے اندر منتقل کر دیا گیا اور ہم سب کمرے کی شیشے کی دیوار سے اندر مختلف ٹیوبز اور پٹیوں میں جکڑی پُروا کو دیکھتے رہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر ڈاکٹروں سے کہوں کہ انہیں ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ یہ تو ہماری پُروا ہے ہی نہیں۔ ہماری پُروا ضمیر خان تو ہمیں دیکھتے ہی جھٹ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر زوردار انداز میں اپنا تعارف کرواتی تھی۔ اُس کی دھیمی مُسکان سے تو یونیورسٹی کے درودیوار اور راہداریاں ہمیشہ روشن رہتی ہیں۔ وہ تو ایک پُروائی ہے۔ ایک دھنک ہے جو ہم سب کی زندگیوں پر ہمیشہ قوس وقزح بن کر چھائی رہتی ہے..... ہماری پُروا تو ہم سب کو یوں روتا چھوڑ کر خود شیشے کی دیوار کے پرے یوں آرام سے آنکھیں موندھ کر یوں بے خبر نہیں سو سکتی۔ نہیں نہیں..... یہ سرسوں کے پھول جیسی پیلی اور کُملائی ہوئی لڑکی تو کوئی اور ہے۔ جتنا ایرک، جم اور فرہاد مجھے تسلی دیتے..... میں اتنا ہی بکھرتا جا رہا تھا۔ جینی دوسری جانب صنم کبیر کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی جس کا اسکارف ابھی تک پُروا کے خون سے سرخ تھا۔ وہ صنم کبیر جو کسی کو زور کی چھینک مارتے دیکھ کر بھی ڈر جاتی تھی، آج وہی صنم اپنی گود میں پُروا کا لہولہان چہرہ رکھے سارے راستے اُسے تھپکتے ہوئے یہاں تک لائی تھی۔ لیکن اُس کی ہمت پُروا کے آپریشن تھیٹر میں جاتے ہی یوں ٹوٹی کہ اُسے ریزہ ریزہ کر گئی۔ کبھی کبھی اچانک اور بہت گہرا صدمہ بھی ہمیں فوری حوصلہ تو دے جاتا ہے اور ہم اپنی روزمرہ کی قوتِ برداشت سے کہیں زیادہ بڑا دھچکا بھی جھیل جاتے ہیں، لیکن اس صدمے کے اثرات کچھ دیر بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ صبح کا اجالا ہونے تک یونیورسٹی کی سبھی مسلم، عیسائی اور یہودی لڑکیوں کے گروپ پھولوں کے گلدستے لیے ہسپتال کے دالان میں جمع ہونے لگے۔ وہ ان سب کی بھی تو ''پُروا'' تھی۔ اُس لمحے مجھے احساس ہوا کہ پُروا نے ان سب کو جوڑے رکھنے کے لیے کس قدر جوکھم اٹھایا ہوگا۔

لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک دوسرے سے پُروا کی خیریت پوچھ پوچھ کر جانے کہاں کہاں فون کیے جا رہی تھیں۔ میں چپ چاپ سا وہیں راھداری میں پڑے ایک بینچ پر بیٹھا باہر گرتی برف کی سسکیاں سنتا رہا.....

مجھے اُس روز گاڑی میں کیفے نپولی جاتے ہوئے پُروا کی کہی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ برف باری اسے ہمیشہ مسحور کر دیتی ہے اور گرتی برف کے دوران سخت سردی میں آئس کریم کھانا یا ٹھنڈی بوتل پینا بچپن سے اس کی عادت ہے۔ اُس نے مجھ سے بھی وعدہ لیا تھا کہ ہم کیفے نپولی سے نکل کر سامنے کھڑے آئس کریم والے سے ''لیمن فلیورکون'' لے کر ضرور کھائیں گے۔ اُسے رنگین شیشے کی بوتل سے آنکھ لگا کر گرتی برف اور سفید آسمان دیکھنا بھی بہت پسند تھا۔ اتنی زندہ دل لڑکی ایک دم سے یوں خاموش کیسے ہو سکتی ہے.....؟ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک نئے خوف کا تجربہ ہوا، بچھڑنے کا خوف..... کسی کے چلے جانے کا خوف..... موت کا خوف..... یہ کتنی ڈرا دینے والی بات ہے کہ ہمارے آس پاس ہم سے جڑے تمام رشتے ایک نہ ایک دن ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے..... دنیا کتنی آسان ہو جائے اگر ہم سب اپنوں سے پہلے ہی چلے جایا کریں..... مجھے رہ رہ کر وہ سیاہ وین یاد آ رہی تھی اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ میں نے وہ وین اس سے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے..... مجھے جب سی۔آئی۔اے کے آفیسر فورڈ نے روکا تھا اُس روز ان کے پاس بھی ایسی ہی ایک وین تھی لیکن میرے دماغ میں اُس روز سے پہلے کی بھی کوئی یادداشت بار بار میرے ذہن کی دیواریں جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی..... لیکن پُروا کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر میرے اندر سب کچھ جامد سا ہو گیا تھا۔ ہسپتال کے دالان میں تیز برف باری کے باوجود مسلم طلبا اور دیگر طالبات بڑی بڑی سیاہ چھتریاں تلے یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ڈین نے آج کلاسز بھی معطل کر دی ہیں۔ اور کچھ دیر میں ہمارے کئی اساتذہ بھی ہسپتال کا چکر لگا گئے۔ ڈین بھی ان میں شامل تھا، وہ راھداری میں جاتے ہوئے کچھ دیر میرے پاس رُکا۔ ''تم ایک بہادر لڑکے ہو آیان..... اور میں جانتا ہوں تم اس صورتِ حال کا بھی دلیری سے مقابلہ کرو گے.....'' میں سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا..... ''لیکن دھیان رہے..... تم جانتے ہو کہ وہ گاڑی پُروا کو نہیں..... تمہیں کچلنے کے لیے آگے بڑھی تھی.....

تمہیں اب بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے.....'' ڈین میرا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں چند قدم چل کر شیشے کی اس دیوار تک جا سکوں، جس سے پرے پُروا کی ڈوبتی سانسوں کا گراف سامنے لگا مانیٹر سکرین دِکھا رہا تھا۔ یہ بے جان مشینیں، یہ تاریں، یہ نلکیاں بھلا کسی کی زندگی ماپنے کا پیمانہ کیا جانیں.....؟ زندگی ان سب چیزوں سے بہت الگ..... بہت سِوا ہے..... اور یہ مصنوعی آلات اگر کل کلاں کسی کی زندگی کی لکیر کے اُتار چڑھاؤ کو ختم کر کے سیدھا دکھانا شروع کر دیں تو ہم یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ وہ زندگی ہم سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے.....؟..... مشینیں بھلا اس زندگی کے احساس کو کیا جان پائیں گی.....؟ میرا جی چاہا کہ پُروا کے کمرے کی تمام مشینوں کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر کے باہر کسی ویرانے میں پھینک آؤں.....

کچھ دیر بعد پولیس والے بھی آئے لیکن ڈاکٹرز سے بات کر کے باہر ہی سے لوٹ گئے، میرا بیان وہ گذشتہ شام ہی لے چکے تھے، اور ان کے بقول وہ شہر میں اس سیاہ وین کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر میں مجھے احمر کا بلاوہ آ گیا۔ میں راھداری سے باہر نکلا تو بیرونی سیڑھیوں کے پاس وہ تیز برف باری میں سی۔آئی۔اے کے آفیسر فورڈ کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ فورڈ حسب معمول کچھ چبا رہا تھا اور اس کا سیاہ چمڑے کا اورکوٹ برف سے سفید ہو چکا تھا۔ احمر مجھے آتے دیکھ کر وہاں سے اندر راھداری کی جانب چلا گیا۔ فورڈ نے غور سے میری طرف دیکھا ''میرے لیے یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے..... تم نے اپنے ساتھ اپنی پیاری دوست کو بھی مشکل میں ڈال دیا۔'' میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا ''اُسے کچلنے والی وین بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسے اُس روز تمہارے پاس تھی.....'' فورڈ چونکا ''نہیں..... تم غلط سوچ رہے ہو..... تم تو ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہو..... ہم تمہیں کوئی نقصان کیوں پہنچائیں گے بھلا.....؟'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ''کیا مطلب.....؟..... کھل کر بات کرو.....'' برف نے ہمارے بالوں میں چاندی بھرنا شروع کر دی تھی۔ فورڈ نے اپنے شانے جھاڑے ''میں آج تمہیں یہاں ایک پیش کش کرنے آیا ہوں..... تم اگر ہمارے لیے کام شروع کر دو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری اور تمہارے بھائی سمیت تمہارے سبھی دوستوں کی تمام تکالیف کا نہ صرف خاتمہ ہو جائے گا بلکہ نیویارک اور امریکہ سے زیادہ محفوظ جنت تمہیں دنیا بھر میں

کہیں نہیں سُوجھے گی.....'' اور تمہارے لیے مجھے کرنا کیا ہو گا.....؟.....''فورڈ مسکرایا'' کچھ زیادہ نہیں..... بس دنیا بھر میں کہیں بھی امریکی مفادات کو کوئی زک نہ پہنچنے پائے اور ہمارے شہری سدا محفوظ رہیں۔ اتنا ہی خیال رکھنا ہو گا تمہیں..... ہم سب بھی یہی کام کرتے ہیں..... اور اس کام کے عوض تمہاری سات نسلوں کی ہر ضرورت اور عیش و آرام کا خیال رکھنے کی ضمانت تمہیں پیشگی دی جائے گی.....'' میں نے اُسی کی بات پکڑی ''گویا اگر میں ''ہاں'' نہیں کرتا تو میری حفاظت کی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی۔ مطلب سی۔آئی۔اے مسلمانوں کو اپنا شہری نہیں سمجھتی..... اور ہم چاہے یہیں کی پیدائش بھی رکھتے ہوں، تب بھی ہمارے مفادات کا تحفظ تم میں سے کسی کا بھی فرض نہیں بنتا.....؟؟'' فورڈ کا چہرہ سپاٹ رہا''تم بہت جذباتی ہو..... اور یہی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے.....تم سے کہیں زیادہ عقل مند تو تمہارا بھائی ہے..... جس نے نہ صرف ہماری بات غور سے سنی..... بلکہ اس پر غور کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔'' مجھے فورڈ کی بات سن کر زور کا جھٹکا لگا ''کیا.....؟ کیا کہا تم نے.....؟ میرے بھائی سے تم لوگوں کی ملاقات کب ہوئی.....'' ''دو دن پہلے..... وہ کافی سمجھ دار اور سلجھا ہوا لڑکا ہے..... اور مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد ہمارے نیٹ ورک کا حصہ ہو گا..... میری یہ پیش کش تمہارے لیے بھی قائم رہے گی..... ہو سکے تو تنہائی میں بیٹھ کر کھلے دل سے اس پر غور کرنا.....'' فورڈ اپنی بات ختم کر کے زمین پر جمی برف اپنے جوتوں سے کُھرچتا ہوا وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ لیکن میرے ذہن و دل پر جو زنگ کی تہہ چڑھتی جا رہی تھی، اُسے کھرچنے کے لیے میرے پاس کوئی اوزار میسر نہیں تھا۔ میں جانے کتنی دیر وہیں برف کا پُتلا بنا کھڑا رہا، اور پھر بہت دیر بعد کسی نے جب عقب سے میرا نام پکارا تو میں چونک کر پلٹا۔ وہ بسام تھا، لیکن آج اُس کی آواز اتنی اجنبی کیسے ہو گئی تھی کہ میں سن کر بھی پہچان نہیں پایا..... ایک وہ وقت بھی تھا جب ہم بِنا کچھ کہے ایک دوسرے کی آہٹ بھی پہچان لیتے تھے..... وہ چند قدم چل کر میرے قریب آیا، میں نے اس کے پس منظر میں راھداری کے شیشے کے پیچھے صنم کبیر کو بھی کھڑے دیکھا۔ وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی، بسام بولا''یہاں باہر کیوں کھڑے ہو..... ٹھنڈ لگ گئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔ اندر چلو، مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے.....'' میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا''سی۔آئی۔اے کا مخبر بننے کے بارے میں.....؟'' بسام چونکا''یہ تم سے

کس نے کہا.....؟'' ''اُسی نے ..... جو دو دن پہلے تمہیں بھی یہ پیش کش کر چکا ہے اور جس کے پروپوزل پر تم نے ''غور'' کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے.....'' بسام کو غصہ آ گیا ''یہ جھوٹ ہے..... میں نے صرف حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فورڈ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں خود بھی ایک امریکی ہوں اور مجھے امریکہ اور اس کے باسیوں کے تمام مفادات اتنے ہی عزیز ہیں ..... جتنا کہ اس کی ایجنسی کو.....'' میں دو قدم بڑھ کر بسام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''خوب..... تمہاری اس مفاہمت کی پالیسی سے وہ ضرور خوش ہوا ہوگا۔ تم نے اس سے یہ پوچھنے کی زحمت کیوں نہیں کی کہ آخر ہم مسلمانوں کا کیا قصور ہے..... اور ان کی لٹکائی ہوئی ہر تلوار صرف ہم پر ہی کیوں گرتی ہے.....؟ چاہے ہم امریکہ کے اندر ہوں یا باہر ..... ہمیشہ ہم ہی ٹارگٹ کیوں کیے جاتے ہیں.....؟ ہر بار ہم مسلمانوں کو ہی امریکی مفادات کے خلاف اور امریکی شہریوں کا دشمن کیوں مان لیا جاتا ہے.....؟'' بسام نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا ''کیونکہ ہر بار ان پر کیے گئے حملے کے پیچھے انہیں کسی مسلمان کا چہرہ ہی ملتا ہے..... ہم لوگ اپنے ملک چھوڑ کر یہاں آ کر بس جاتے ہیں..... سالوں یہاں سے کما کما کر واپس اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں اور پھر ایک دن اپنے تمام ''گناہوں کے کفارے'' کے طور پر یہاں کوئی تخریب کاری کر جاتے ہیں۔ اور اب اس وبا میں یہاں کے مسلمانوں کی نئی نسل بھی مبتلا ہوتی جا رہی ہے..... یہ ٹائمنز اسکوائر کیس جس کی وجہ سے آج ہم سب کی جان عذاب میں آئی ہوئی ہے..... یہ نری حماقت نہیں تو اور کیا ہے.....؟..... جنگ اگر امریکی سی۔آئی۔اے یا اُس کی پالیسیوں سے ہے تو معصوم شہریوں کو نشانہ بنانا کہاں کا انصاف ہے..... اگر اس بات کو کُلیہ بنا کر اس جنون کو ہوا دی جائے کہ یہاں کے شہری بھی ٹیکس دے کر اور خاموش رہ کر اس جنگ کا حصہ بنتے ہیں۔ تو پھر یہی فارمولہ خود ان مسلم ممالک میں معصوم شہریوں کے قتلِ عام پر بھی لاگو ہوگا جن کی سرکار اس جنگ میں امریکی حکومت کی حامی ہے..... وہاں جب مسلمان خود اپنے مسلم ممالک کے مسلمانوں کا گلا یہ سوچ کر کاٹتا ہے کہ یہ لوگ بھی خاموش رہ کر اور اپنے ملک کو امریکہ کی حمایت اور مدد کے لیے ٹیکس دے کر برابر کے حصے دار مجرم ہیں تو پھر اُن کی ہر وحشت بھی تو جائز قرار دی جا سکتی ہے..... نقصان تو دونوں طرف معصوم لوگوں کا ہو رہا ہے..... یہاں کی اور وہاں کی حکومتوں کو بھلا کیا فرق پڑتا ہے.....؟ میں نے بسام کو بات

پوری کرنے کا موقع دیا اور پھر بولا ''خوب ..... فورڈ نے ایک ملاقات میں ہی تم پر اپنا خاصا اثر چھوڑا ہے..... اتنی اچھی وکالت تم نے آج سے پہلے کبھی اور کسی کی نہیں کی..... اب غور سے میری بات سنو..... کوئی مسلمان اس دہشت گردی کی حمایت نہیں کرتا..... چاہے وہ یہاں امریکہ کے شہریوں کے خلاف ہو، پاکستان میں ہو یا انڈیا میں..... یا دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو..... دہشت گردی صرف دہشت گردی ہی کہلائی جاتی ہے..... یہاں امریکہ میں تو پھر بھی ان کے اپنے ہم نسل شہریوں کے کچھ حقوق باقی ہیں باقی ممالک میں شہری بے چارے کسی گنتی میں بھی نہیں آتے۔ حقوق اور حکومت کی حمایت تو بہت دور کی بات ہے۔ ان پر تو پالیسیاں مسلط کر دی جاتی ہیں لہٰذا انہیں اپنی حکومت کے گناہوں کی حمایت کی سزا میں قتل کرنا انسانیت کے قتل سے بھی زیادہ گھناؤنی بات ہے..... میں نے کبھی ٹائمنز اسکوائر کیس یا اس جیسی کسی بھی دوسری واردات کو اچھا کہا نہ اس کی حمایت کی ہے..... اور تم بھی اب دہشت گردی کا وہی ایک چہرہ بطور شناخت مقرر کر رہے ہو جو یہاں کی حکومت نے کر رکھا ہے ''مسلمان کا چہرہ.....'' اور یہی میرا تم سب سے اختلاف ہے کہ دہشت گرد اور تخریب کار کو مذہب کی پہچان سے ہٹ کر صرف ایک جنونی انسان کی شناخت کیوں نہیں دی جاتی.....؟..... ہاں یہ سچ ہے کہ زیادہ تر وارداتوں کے پیچھے ہمیں یہی پہچان ملتی ہے۔ لیکن ساری دنیا میں جو یہ جنگ چھڑی ہوئی ہے..... اس کے اندر مسلمانوں کی تعداد گنو گے تو تمہیں گنتی میں ایسے بہت سے دوسرے مذاہب اور نسلوں کے چہرے ملیں گے جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہو گی، تو کیا تم اس بنیاد پر ساری صرف عیسائیت یا یہود کو ''عالمی دہشت گرد'' قرار دے دو گے.....؟؟؟.....'' میں نے اپنی بات ختم کی تو میرا سانس جذبات کی وجہ سے پھول چکا تھا اور تیز گرتی برف میں میرے نتھنوں سے بھاپ نکل کر فضاء میں بکھرے سفید گالوں کو پگھلا رہی تھی۔ دُور شیشے کی راھداری سے بہت سی برف پھسل کر نیچے گری تو راھداری میں کھڑی ہماری طرف پریشانی سے دیکھتی صنم کبیر چونک کر بے خیالی میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں اور بسام کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے خلاء میں کسی انجانی چیز کو تکتے رہے۔ بسام نے مجھ سے حتمی لہجے میں پوچھا ''گویا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم اپنے ساتھ ہم سب کو بھی مزید مشکلات میں ڈالتے رہو گے..... آج صرف تمہاری وجہ سے وہ معصوم لڑکی اندر بستر پر پڑی

اپنی ڈوبتی سانسیں گن رہی ہے..... اور اگر اُسے کچھ ہوا تو اُس کے ذمہ دار بھی صرف تم.....'' میں نے زور سے چلا کر بسام کی بات کاٹ دی'' کچھ نہیں ہوگا اُسے ..... کچھ نہیں..... میں اُسے کچھ ہونے نہیں دوں گا..... اور رہی بات تمہاری .....تو اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہاری زندگی میں مزید مشکلات پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہوں تو تمہیں اجازت ہے..... کل کے اخبار میں مجھ سے اپنی لاتعلقی کا باقاعدہ ایک اعلان چھپوا دو کہ تمہارا میرے قول وفعل سے آئندہ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کے بعد تمہیں کوئی میری وجہ سے تنگ نہیں کرے گا..... اور تمہاری سی۔آئی۔اے بھی خوش ہو جائے گی.....'' سی۔آئی۔اے کے طعنے پر بسام کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ دانت چبا کر بولا'' ٹھیک ہے میں ''اپنی'' سی۔آئی۔اے کو خوش کرتا ہوں اور تم اپنے ''جنونی انتہا پسند'' گروپ کو راضی رکھو.....'' بسام تیزی سے پلٹا اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ تقدیر ہمارے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے..... کون جانتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم دو بھائی جو ایک دوسرے کے بنا سانس بھی نہیں لے سکتے آج ایک دوسرے کو ایک نئی شناخت کا الزام دے کر یوں ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں گے۔

دوپہر سے شام ہوگئی لیکن پُروا کی حالت ویسے ہی بدستور نازک تھی۔ میرا دل اندر سے یوں کٹ رہا تھا جیسے کوئی زنگ آلود آری سے اُس کے ٹوٹے کر رہا ہو..... آری کے کُند دانداںوں میں دل کے ٹکڑے اٹک اٹک جاتے تھے اور پھر کوئی جلاد زور لگا کر آری کے کُند پنے کو طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں کسی وقت کی دی ہوئی جینی کی بددعا کے لفظ گونجے ''خدا کرے آیان..... تمہیں بھی محبت ہو..... اور جب کبھی ہو تو ایسی ہو کہ اس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے.....'' میں نے زور سے اپنے ذہن کو جھٹکا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟۔ کہیں یہ محبت تو نہیں.....؟..... نہیں نہیں..... میں..... اور محبت.....؟ ایسا نہیں ہوسکتا..... یہ تو صرف اس معصوم لڑکی سے دوستی کا دکھ ہے جو مجھے یوں کاٹے جا رہا ہے..... لیکن میں بسام سے پُروا کو کچھ ہو جانے کی بات پر اتنا اُلجھا کیوں تھا.....؟..... اُس نے تو بس ایک خدشہ ہی ظاہر کیا تھا مگر میرا دل اندر سے یوں لرز کیوں گیا تھا..... میرا سارا وجود پل بھر میں ہی کانپا کیوں تھا.....؟..... کیا محبت اپنے ساتھ اتنے شدید وسوسے اور جان

لیوا خوف بھی لے کر آتی ہے.....؟..... مجھے بار بار اور رہ رہ کر پُروا کی ہر بات، اُس کی مسکراہٹ اور اس کا وہ زندہ دل انداز یاد آنے لگا تھا، اور پھر جب مجھے اُس کی وہ برستی بارش میں اسٹیڈیم میں کہی بات یاد آئی تو جیسے میری تمام نازک رگیں کسی نے یوں زور سے کھینچیں کہ ایک جھٹکے سے ہی میرے اعصاب ریزہ ریزہ ہو گئے ''آیان..... مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں تمہاری محبت میں مبتلا نہ ہو جاؤں'' ٹھیک اُسی کی طرح آج میرے دل میں بھی یہ ''خوفِ محبت'' جاگنے لگا تھا۔ میں اور پُروا بھی کتنے عجیب تھے، لوگ محبت میں مبتلا ہونے کا جشن مناتے ہیں اور ہم کسی قاتل بیماری کی طرح اس کے خوف سے سوگ منا رہے تھے۔ پُروا تو پھر بھی اپنے دل کی بات بتانے کی ہمت رکھتی تھی پر جانے میں اتنا بہادر تھا بھی یا نہیں.....؟ اُس وقت میرا دل شدت سے یہ خواہش کر رہا تھا کہ کاش پُروا اپنی آنکھیں کھولے اور میں اسے بتاؤں کہ میرے اندر بھی ''اندیشہء محبت'' کے وسوسے پلنے لگے ہیں۔ چلو ہم دونوں کسی ''مسیحاءِ عشق'' کے آستانے پر جا بیٹھیں۔ اور اس کے در سے تب تک نہیں اُٹھیں گے جب تک کہ وہ ''طبیبِ محبت'' ہمارے اِس زہرِ عشق کا کوئی تریاق نہ ڈھونڈ نکالے۔ اِس عشق کے خونی اژدھے کے بَل نہ کھول دے جس نے ہماری روحوں کے گرد شدید کس کر بَل ڈالے تھے یا محبت کے اِس بچھو کا ڈنک نہ نکال دے جو ہم دونوں کے دِل میں دُور تک پیوست ہو گیا ہے۔ جانے کیوں..... لیکن ٹھیک اُس ایک لمحے میں مجھے ''محبت'' سے شدید خوف محسوس ہوا۔ رات نے ہسپتال کی راھداریوں میں ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے، باہر دالان کے درختوں سے تو گہری شام کی دوستی عصر کے بعد ہی شروع ہو چکی تھی۔ جنگلوں میں شامیں بہت جلد اُتر آتی ہیں..... ہسپتال کا بڑا دالان بھی اس وقت برف سے اٹے درختوں کا ایک ایسا ہی جنگل لگ رہا تھا۔ اسٹوڈنٹس کی ٹولیاں اب بھی ہسپتال کی راھداریوں میں بکھری ہوئی تھیں اور وہ عملے کی بار بار تلقین کے باوجود وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ سبھی پُروا کے لیے اُداس اور فکرمند تھے، اچانک کسی سنسان راھداری سے کسی پشتو ٹپے کی تان گونجی۔ یہ ضرور زرک خان ہو گا جو ابھی چند دن پہلے پاکستان سے وظیفہ لے کر ہماری یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا اور اس نے آتے ہی مسلم گروپ بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ اس شاعری کا انگریزی ترجمہ بھی اپنے ساتھیوں کو سنا رہا تھا۔ مجھے ان کے درمیان جینی اور ایرک کی آوازیں بھی سنائی دیں، زرک کی آواز

بڑی میٹھی تھی۔'' او بی بی شیرین

ہاں..... پُروا بھی تو بی بی شیرین کی طرح ایک زرد پھول لگ رہی تھی۔ ایک ایسا زرد گلاب جسے اُس کی شاخ سے جُدا کر دیا گیا ہو۔ اور اب وقت دھیرے دھیرے اس کی کومل پنکھڑیوں سے شبنم اور تازگی کشید کر اُسے مرجھا رہا ہو۔ میں بہت دیر تک کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکتا اور مشینوں کی ''بیپ بیپ'' کی آواز سنتا رہا۔ پھر جانے کب رات بیتی اور کب نیا سویرا ہسپتال کی راھداریوں کی درزوں سے اندر جھانکنے لگا۔ کبھی کبھی رات کیسے چھم سے اچانک اتر آتی ہے اور کبھی سویرا اپنے پَر پھیلانے میں کتنا زیادہ وقت لیتا ہے۔ شائد ہماری زندگیوں کا فلسفہ بھی کچھ ایسا ہی ہے..... ہم اپنے اردگرد دولت، سکون، آرام و آسائش اور رشتوں کا اُجالا پھیلانے میں اپنی ساری عمر بتا دیتے ہیں اور موت کا صرف ایک جھماکا، چند لمحوں میں ہی ہمارے چار سُو اندھیرا کر جاتا ہے۔

آج بابر سیّدی اور عامر بن حبیب کی ایک ساتھ اور ایک ہی عدالت میں پیشی تھی۔ میں نے احمر اور بلال کو اُن کی خبر لینے کے لیے بھیج رکھا تھا۔ لیکن ان دونوں نے واپس آتے آتے سہ پہر کر دی۔ ان دونوں کے چہرے دیکھ کر میرا پہلے سے ڈوبا ہوا دل بیٹھ سا گیا۔ ''کیا ہوا..... سب خیر تو ہے ناں.....؟'' بلال نے مایوسی سے سر ہلایا ''اچھی خبر نہیں ہے..... عدالت نے بابر اور عامر کو ڈی۔ پورٹ کر کے واپس اُن کے ممالک بھیجنے کا فیصلہ سنا دیا ہے..... انہیں کل کی فلائیٹ سے ہی ملک بدر کر دیا جائے گا.....''۔ بلال کی بات سن کر میرے ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ چھوٹ کر زمین پر گرا اور ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

باب 17

میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹنے والے مگ کے چھناکے کی آواز سُنسان راہداری میں دور تک سنائی دی ہوگی تبھی ایرک، جم اور جینی سمیت سبھی میری جانب دوڑے آئے، ''کیا ہوا.....؟'' میں نے خالی خالی نظروں سے فرہاد کی طرف دیکھا ''عامر اور بابر کو ملک بدر کرنے کے احکامات آ گئے ہیں.....'' کچھ دیر کے لیے وہ سبھی خاموش ہو گئے اور پھر سبھی ایک دم بولنے لگے ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے.....؟..... اپیل کا حق تو ملنا چاہیے تھا؟..... یہ تو سراسر ناانصافی ہے.....؟'' قریب سے گزرتی دو نرسوں نے گھور کر سبھی مسلم طلباء کو دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب راہداری سے نکل کر باہر برفیلے دالان میں آ گئے۔ فرہاد نے غصے سے جم اور ایرک کی طرف دیکھا ''سُن لیا تم لوگوں نے عدالت کا فیصلہ..... یہ ہے تمہارا امریکی انصاف.....؟ آج کچھ نہیں کہو گے اپنے امریکہ کی حمایت میں.....؟؟.....'' میں نے فرہاد کو جھاڑا ''فضول باتیں مت کرو..... انصاف کو صرف انصاف ہی رہنا چاہیے۔ جب وہ امریکی، روسی، جاپانی یا پاکستانی انصاف بن جائے تو انصاف نہیں رہتا..... صرف ایک مذاق بن جاتا ہے..... اور اس مذاق میں جم اور ایرک کا کوئی قصور نہیں.....'' احمر چلایا ''لیکن ہم امریکن عدالتوں کو مسلمانوں کے ساتھ یہ گھناؤنا مذاق نہیں کرنے دیں گے.....'' اتنے میں اندر سے صنم کبیر بوکھلائی ہوئی سی دوڑتی باہر آئی۔ ہم سب کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا، ''وہ..... وہ پُروا کو ہوش آ رہا ہے.....'' ہم سب اندر کی جانب لپکے۔ پُروا نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولیں اور پھر موند لیں۔ ہم سب شیشے کی دیوار کے پرے کھڑے اُس کی اُلجھتی سانس گنتے رہے۔ جانے وہ کس اذیت

سے گزر رہی ہوگی۔ ڈاکٹرز اور دیگر عملے نے چند لمحوں میں ہی جانے کیا کچھ کر ڈالا، آکسیجن بدلی گئی، کچھ انجیکشن لگائے، دل کی حرکت گنی گئی۔ برقی جھٹکا دینے والے آلے تیار کر لیے گئے لیکن پُروا پھر سے اُسی مدہوشی کی دنیا میں واپس چلی گئی۔ بوڑھا ڈاکٹر باہر نکلا تو ہم نے اُسے گھیر لیا ''وہ کچھ دیر کے لیے ہوش میں آئی تھی..... لیکن پھر سے خواب میں چلی گئی ہے..... لیکن یہ بہتر ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے..... اُمید ہے اگلی بار اُس کے ہوش کا وقفہ طویل ہوگا..... آپ لوگ دُعا کریں.....''

ڈاکٹر ہمیں تسلی دے کر آگے بڑھ گیا۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں نے تو دعا کرنا ہی ان دو دنوں میں سیکھا ہے..... اِس سے پہلے تو شائد مجھے ٹھیک سے ہاتھ اُٹھانا بھی نہیں آتا تھا۔ لیکن صرف ہاتھ اُٹھا لینے سے دُعا کے تقاضے تھوڑا ہی پورے ہو جاتے ہیں؟ دُعا کے آداب تو کچھ اور ہی ہوتے ہیں..... اور دعا کی قبولیت کسی اور جذبے سے مشروط ہوتی ہے..... شائد اس وقت پُروا کے لیے دعا مانگتے وقت ہم سب کے اندر وہی جذبہ کروٹیں لے رہا تھا۔

خود کو اللہ کی بارگاہ میں ڈال دینے کا جذبہ..... اپنا ہر احساس اس دعا کے لیے سرنگوں کر دینے کا جذبہ..... پھر شام ڈھلی اور پھر وہی رات ہمارے دل کے اندھیروں کو مزید بڑھانے کے لیے در و دیوار پر مسلط ہوگئی، دُکھ کی راتیں کتنی طویل ہوتی ہیں۔ شائد دکھ ہمارے گزرتے وقت کا پیمانہ بدل دیتا ہے..... ورنہ آس پاس دوسروں کے لیے تو وقت کی وہی پرانی رفتار ہوتی ہے۔ اگلی صبح دس بجے بابر اور عامر کی فلائیٹ تھی جو ان دونوں کو ایک ساتھ پہلے قاہرہ لے جاتی، پھر وہاں سے الگ الگ اُن کے گھروں کو جانے والے جہاز میں اُنہیں بٹھایا جاتا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں پُروا کو اس حال میں چھوڑ کر اُن دونوں کو رُخصت کرنے ایئر پورٹ کیسے جاؤں گا؟۔ آخر صنم کبیر اور جینی نے میری ڈھارس باندھی کہ وہ پُروا کے سرھانے بیٹھی رہیں گی اور ہر پل کی خبر مجھے دیتی رہیں گی لہٰذا میں بنا کسی اُلجھن اپنے ان دو دوستوں کو رخصت کرنے ایئر پورٹ جا سکتا ہوں جن کی دوستی سمجھنے میں میں نے بہت دیر کر دی۔ میں ایئر پورٹ پر پہنچا تو ڈیپارچر لاؤنج کے باہر مسلم طلباء کا جمِ غفیر اکٹھا تھا۔ آج عامر اور بابر کو رخصت کرنے کے لیے صرف ہماری یونیورسٹی کا مسلم گروپ ہی نہیں آیا تھا بلکہ نیویارک کی سبھی یونیورسٹیوں کے مسلم اسٹوڈنٹس جان۔ایف۔ کینڈی ایئر پورٹ کے بیرونی لاؤنج میں اکٹھے

تھے۔ عامر اور بابر کو ابھی تک حکام ایئر پورٹ نہیں لائے تھے۔ مجھے رات کو احمر نے بتایا کہ پرسوں رات دوبارہ ٹائمنز اسکوائر پر کوئی مشکوک گاڑی کھڑی ملی تھی جس کی اطلاع ملتے ہی ٹائمنز اسکوائر کا سارا علاقہ فوراً خالی کروا کر سیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن گاڑی میں سے کچھ نہیں ملا۔ البتہ اگلے روز سرکاری وکیل نے عدالت میں گذشتہ رات کے اس واقعے کو خوب اُچھالا اور نمک مرچ لگا کر اس بات کو بھی عامر اور بابر کی گرفتاری کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کے طور پر پیش کیا عدالت نے بھی وکیل کے دلائل کو اہمیت دی کہ جب تک عامر بن حبیب اور بابر سیدی جیسے لڑکے اسٹوڈنٹ لیڈر کے روپ میں نیویارک کی یونیورسٹیوں میں مسلم طلبا کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے موجود ہیں، ایسے واقعات ہوتے رہیں گے..... لہٰذا عدالت نے کافی ''سوچ بچار'' کے بعد دونوں طالب علموں کو امریکہ بدر کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ میں ابھی تک اسی سوچ میں گم تھا کہ آخر وہ مشکوک گاڑی دوبارہ وہیں ٹائمنز اسکوائر کے علاقے تک پہنچی کیسے؟ پچھلی بار جب وہ پاکستانی طالب علم گاڑی کھڑی کر کے وہاں سے نکلا تھا تو آس پاس لگے درجنوں کیمروں نے اس کی فلم بنا لی تھی، لیکن اس دوسری گاڑی کی کوئی فلم کیوں منظرِ عام پر نہیں آئی؟ جب کہ پچھلے کیس کے بعد وہاں کیمروں کی تعداد بھی دُگنی کر دی گئی تھی، اچانک ایک شور سا اُٹھا اور نیویارک پولیس ڈپارٹمنٹ NYPD کی بہت سی گاڑیاں نیلی، سُرخ بتیوں کی چکاچوند میں ایئر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ آج برف باری رُکی ہوئی تھی لیکن سڑکوں کے گرد جمع کی گئی برف میں سے اب بھی دھواں سا اُٹھ رہا تھا..... ٹھیک اُس دھویں کی طرح جو اس وقت ہمارے دلوں کو سُلگا رہا تھا۔ عامر اور بابر گاڑی سے اُترے تو ان دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھ کر میرے دل پر بیک وقت کئی چھریاں سی چل گئیں۔ لڑکوں نے شدید نعرے بازی شروع کر دی۔ نیویارک پولیس نے اپنی طرف سے ہر ممکن حفاظتی اقدام کر رکھا تھا۔ انہیں طالب علموں کے اس ردِّعمل کا خوب اندازہ تھا۔ میں اُس راستے پر جا کھڑا ہوا جہاں سے بابر اور عامر کو لاؤنج کے اندر لے جایا جانا تھا۔ پولیس نے مجھے ہٹانے کے لیے دھکا دیا تو آس پاس بکھرے طالب علم اُن سے الجھ پڑے، شدید دھکم پیل اور نعرے بازی شروع ہو گئی۔ میں اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا اور میرے آس پاس لڑکوں نے ایک مضبوط حصار بنا لیا۔ وہ مجھ پر برسائی جانے والی لاٹھیاں اپنے جسم پر جھیلتے رہے

لیکن انہوں نے پولیس کو مجھ تک پہنچنے سے روکے رکھا۔ نیویارک کا سارا میڈیا یہ ساری ہلڑبازی اور ہنگامہ آرائی ''زندہ نشریات'' کے ذریعے تمام امریکہ میں نشر کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں عامر اور بابر بھی مجھ تک پہنچ گئے۔ عامر نے میری آنکھ سے بہتے آنسو کو اپنی ہتھیلی سے صاف کیا ''میں نے تم سے کہا تھا نا آیان..... ایک وقت آئے گا کہ یہ سب تم پر اپنی جان لٹانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے..... مجھ سے وعدہ کرو دوست..... تم اُن کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گے..... میں اور بابر یہاں نہیں ہوں گے لیکن ہمارے دل یہیں دھڑکتے رہیں گے..... تم سب کے پاس.....'' میں نے عامر کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں بہت تنہا ہو جاؤں گا عامر بن حبیب..... تم دونوں کے بغیر تو میں آدھا بھی نہیں ہوں.....'' پولیس عامر اور بابر کو آگے دھکیلنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی اور چیخ چیخ کر ہم سب کو راستے سے ہٹ جانے کی تنبیہہ کر رہی تھی لیکن طلبا نے انہیں اس طرح الجھایا ہوا تھا کہ وہ ہم تینوں کی اس الوداعی ملاقات میں زیادہ رخنہ اندازی نہیں کر پا رہے تھے۔ بابر نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا..... ''مجھے ایک بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا آیان..... ہم دونوں نے شروع کے دو سال اپنی دشمنی کی نذر کر دیئے..... کاش ہم پہلے دوست بن جاتے تو اب تک ہم نہ جانے کیا کچھ کر جاتے ..... بہرحال..... اب تم ہی ہو جو اِس کشتی کو پار لگاؤ گے..... ہم نے بہت کوشش کی کہ مجھے اور عامر کو پُرسا کی صرف ایک جھلک دیکھنے کی اجازت مل جائے لیکن ان بزدلوں نے ہمیں ہماری گھائل ساتھی کی مزاج پُرسی کی اجازت بھی نہیں دی۔ اپنا بہت خیال رکھنا جوشیلے لڑکے.....'' میں عامر اور بابر کے گلے لگ کر اُن کے شانے بھگوتا رہا..... جانے میری آنکھوں تلے اتنے آنسو کب سے جمع تھے؟ میں تو اپنی زندگی میں مسلم گروپ جوائن کرنے سے پہلے کبھی نہیں رویا تھا۔ وہ لوگ عامر اور بابر کو کھینچتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنج میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے اور آخرکار مسلم طلبا کے شدید نعروں کی گونج میں عامر اور بابر ہم سے رخصت ہو گئے۔ اُن دونوں نے بھیڑ میں ایک لمحے کے لیے رک کر پلٹ کر ہماری جانب دیکھا۔ بابر نے اپنی دو انگلیوں سے فلسطینیوں کا مخصوص نشان وی ''V'' بنا کر ہم سب کو ایک بار پھر فتح کی دُعا دی اور پھر وہ دونوں ہجوم میں گم ہو گئے۔ میرے دل سے ایک آہ نکلی ''ہاں میرے دوست..... ہمیں وہ فتح ضرور ملے گی جو ازل سے ہماری تقدیر ہے..... اور تمہارا یروشلم ایک بار پھر صرف تمہارا ہو گا..... قبلہ اول آزاد ہو

گا اور بابر سیّدی کے بیٹے اس کے پوتوں اور نواسوں کو ان کے دادا اور نانا کی کہانیاں سنایا کریں گے..... کہ ان کی نسل کا ہیرو بابر سیّدی کس طرح قبلہ اول پر آزادی کا جھنڈا لہرانے میں پیش پیش تھا، بیت المقدس کی بیرونی دیوار پر بابر جیسے کئی جانبازوں کے نام ہوں گے اور عامر بن حبیب وہاں کی آزادی کی پہلی باجماعت نماز کی قیادت کرے گا۔ ہاں..... ''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے.....'' میں اپنی نم آنکھیں لیے واپسی کے لیے پلٹا تو مسلم طلبا کا وہی جم غفیر جو چند لمحے پہلے تک ایک آتش فشاں بنا پولیس سے جھگڑ رہا تھا، اس وقت کسی پُرسکون گلیشیئر کی طرح چُپ چاپ اور اُداس کھڑا تھا۔ احمر، بلال، حافظ شکیل اور حتیٰ کہ فرہاد..... سبھی آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ آج ان کا دوست ان کا رہنما عامر اپنے یارِغار بابر سیّدی کے ساتھ اُن سے رخصت ہو گیا تھا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے مسلم رہنما میری جانب بڑھے ''تم خود کو تنہا مت سمجھنا آیان..... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں..... اور تمہاری ایک آواز پر ہم نیویارک کا پہیہ جام کر دیں گے..... یہ امریکی ہماری جان تو لے سکتے ہیں لیکن ہماری آواز نہیں دبا سکتے..... ایک وقت آئے گا کہ انہیں ہم سب کو ڈی۔ پورٹ کرنے کے لیے امریکہ کے ہر ایئرپورٹ کے سارے جہاز ایک قطار میں کھڑے کرنے ہوں گے، لیکن ہماری آواز سدا یہیں رہ جائے گی.....''

میں نے ان سب کو خاموش کروایا۔ ''میں اس وقت تم سب لوگوں سے صرف اتحاد کا تقاضہ کرتا ہوں..... ایک ایسا اتحاد جس میں ہمارا کوئی بھی دشمن نقب لگا کر دراڑ نہ ڈال سکے..... عامر اور بابر کی ملک بدری تو صرف ابتداء ہے..... ہمیں ابھی اس جیسے ان گنت امتحانات سے گزرنا ہوگا..... شاید ہماری باقی تمام عمر ایسی سزائیں جھیلتے ہوئے ہی گزر جائے گی..... لیکن ہمیں شیخ الکریم کی ہدایت کے مطابق ہر جنگ کا سامنا نظم و نسق کے ہتھیار سے کرنا ہوگا..... بولو..... تم لوگ میرا ساتھ دو گے.....'' ایئرپورٹ سارے طالب علموں کے نعروں سے گونج اُٹھا ''ہاں..... ہم تمہارا ساتھ دیں گے آیان..... ہمیشہ دیں گے.....''

ہم لوگ ایئرپورٹ سے باہر نکلے تو مرکزی شاہراہ پر مُڑنے سے پہلے ہی میرے فون پر جینی کا نمبر جگمگانے لگا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جلدی سے فون کان سے لگایا۔ میرے ہاتھ باقاعدہ

لرز رہے تھے۔ میری آواز بیٹھ گئی، دوسری جانب سے جینی کی آواز بھی لرزش کی ماری تھی۔ ''آیان..... پُروا کو ہوش آ رہا ہے..... تم جلدی آ جاؤ.....''۔ اب میں اس بھولی جینی کو کیسے بتاتا کہ دنیا میں کبھی ہماری ''جلدی'' نہیں چلتی۔ ہم اپنی مرضی کے غلام بن جائیں تب بھی دنیا کے راستے، یہ موڑ اور یہ فاصلے ہمارے پیروں کی رُکاوٹ بن جاتے ہیں۔ فاصلوں کو ہم سے تکلّف ہو جائے تو راستے لمبے ہو جاتے ہیں۔ اور راستوں کا واسطہ تو سدا لمحوں سے رہا ہے سو مجھے بھی ہسپتال پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ گیا۔ سارے راستے میرا دل انہی وسوسوں سے گھرا رہا کہ پُروا کہیں پھر سے مدہوشی کی وادی میں نہ چلی جائے۔ میں پُروا کے کمرے میں پہنچا تو میرے سارے دوست اُسے گھیرے کھڑے تھے اور نرس ان سب کے ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ فی الحال مریض کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ پُروا نے ایک نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا اور اس کے خشک ہونٹوں پر دُنیا کی تازہ ترین مسکراہٹ اُبھر آئی۔ نرس نے ہمیں کمرے سے نکل جانے کا آخری حکم باقاعدہ انتظامیہ کو شکایت کرنے کی دھمکی کے ساتھ سنایا تو ہمیں وہاں سے نکلتے ہی بنی۔ لیکن میں وہاں سے نکل کر شیشے کی دیوار کے پرے آ کھڑا ہوا جہاں سے میں اب بھی پُروا کو دیکھ سکتا تھا۔ پُروا کے چہرے پر گذشتہ روز کے مقابلے میں آج زندگی کی لہر زیادہ واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں بہت دیر یونہی چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا، پھر مجھے اپنے شانے پر جینی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ ''وہ سنبھل رہی ہے آیان..... اور جانے کیوں میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ وہ صرف تمہاری دعاؤں کے جواب میں واپس پلٹی ہے..... کیونکہ میں جانتی ہوں محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے.....''

میں نے چونک کر جینی کی طرف دیکھا۔ ''ہاں آیان..... تمہارا رُواں رُواں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تمہیں پُروا سے محبت ہو گئی ہے..... ایسی محبت جو موت کے منہ سے بھی روح کو واپس کھینچ کر بدن میں بھر سکتی ہے.....'' میں چپ چاپ کھڑا حیرت سے جینی کی باتیں سنتا رہا۔ شاید یہ محبت نامی عذاب باقاعدہ کسی اعلان کی صورت ہم پر وارد ہوتا ہے۔ ایک ایسا اعلان جو صرف اُسی کو سب سے آخر میں سنائی دیتا ہے جس کا نام اس محبت کی تختی پر سب سے اوپر لکھا ہوتا ہے۔

شام تک پُروا کی حالت مزید بہتر ہو گئی اور ڈاکٹر نے ہمیں چند لمحوں کے لیے اس سے ملاقات کی اجازت بھی دے دی۔ میں نے پُروا کا ہاتھ دھیرے سے دبایا ''کیسی ہو مس پُروا ضمیر

خان..... اب ہمیں مزید کتنے روز اس ہولناک ہسپتال کی ان بے جان راھد اریوں میں ٹہلاؤ گی؟''
پُروا دھیرے سے مُسکائی ''جب تک نصیب میں یہ بستر اور تقدیر میں یہ زخم لکھے ہیں.....''
فرہاد نے جلدی سے دخل اندازی کی ''بس بس..... اتنی مذہبی باتیں نہ کرو..... ویسے بھی مرد مذہبی باتیں کرنے والی عورتوں کو زیادہ پسند نہیں کرتے.....'' ہم سب فرہاد کی بات سن کر ہنس پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ پُروا کچھ کھوئی کھوئی سی ہے۔ اس کا یہی کھویا پن اس وقت بھی قائم رہا جب اگلی صبح نیویارک پولیس اس کا بیان لینے کے لیے ہسپتال پہنچی۔ پُروا نے سیاہ وین کے ذکر پر گول مول سا جواب دیا کہ اُسے یاد نہیں کہ ڈرائیور کس حلیے کا شخص تھا حالانکہ وہاں صرف پُروا ہی ایسی تھی جس نے وین کے ڈرائیور کو بالکل قریب سے براہ راست دیکھا تھا کیوں کہ وین سے ٹکراتے وقت اُس کے چہرے کا رُخ سیدھا وین کے اسٹیرنگ پر بیٹھے شخص کی جانب تھا۔ میں نے پولیس کے سامنے پُروا سے اس بارے میں کوئی بات کرنے سے احتراز کیا لیکن پولیس کے کمرے سے نکلتے ہی میرا سوال لبوں پر آ گیا ''تم نے پولیس والوں سے یہ کیوں کہا کہ تم نے ڈرائیور کو نہیں دیکھا..... جب کہ تم نے اس کی واضح جھلک ضرور دیکھی ہوگی۔ چہرہ تو میرا دوسری جانب تھا، کیونکہ تم نے مجھے پلٹنے سے پہلے ہی دھکیل دیا تھا۔'' پُروا نے بات ٹالی۔ ''تم نے سنا نہیں مسلم کونسلر..... مریضوں کو ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالنے کی ہدایت کی جاتی ہے..... تم طب کے اصولوں کے خلاف جا رہے ہو.....'' بات آئی گئی ہوگئی لیکن میرے اندر یہ شک مزید تقویت کے ساتھ اپنی جڑ پکڑ گیا کہ پُروا نے ڈرائیور کو شناخت نہیں بھی کیا تو اُسے دیکھا ضرور ہوگا۔ شام کو میں تقریباً ایک ہفتے کے بعد کچھ دیر کے لیے کیمپس پہنچا تو ایک اور بُری خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے مسلم طلباء کی پُروا کی جانب توجہ بٹ جانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گستاخانہ خاکوں کے سیمینار کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ پندرہ جنوری اُس منحوس مقصد کے لیے مقرر کی گئی تھی میں نے شام کو ہی ڈین سے ملاقات کی کوشش کی لیکن وہ تین دن کی چھٹی پر جا چکا تھا۔ میں نے طلبا کو فی الحال ہاتھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر اور کارڈز اور بینرز کے ذریعے اپنا احتجاج جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں بیک وقت کئی محاذوں پر بٹتا جا رہا تھا۔ پُروا کی جان لیوا بیماری سے واپسی، بسام کی سی۔آئی۔اے والوں سے ملاقاتیں، عامر اور بابر کی ملک بدری..... اور اب یہ سیمینار..... کاش

میرے ایک وجود کے کئی حصے ہوتے تو میں ہر حصے کو اس کا کام سونپ دیتا لیکن یہ ہم انسانوں کی کتنی بڑی مجبوری ہے کہ ہمیں اپنے ایک اسی گھائل اور بوسیدہ وجود پر یہ تمام قیامتیں بیک وقت جھیلنا ہوتی ہیں۔ میں یونیورسٹی سے باہر نکلا تو فورڈ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سڑک کی پرلی جانب کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا تو میں نے بائیک ایک جانب کھڑی کر دی اور سڑک پار کر کے اس کے پاس جا پہنچا۔ فورڈ مسکرایا ''تمہاری دوست کی نئی زندگی تمہیں مبارک ہو..... تم بیک وقت کئی محاذوں پر لڑنے کے عادی معلوم ہوتے ہو.....'' میں نے فورڈ کے لہجے میں کوئی تاثر تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی ''اور تم بیک وقت اپنے دشمنوں کو کئی محاذوں پر اُلجھائے رکھنے کے عادی معلوم ہوتے ہو..... بڑی کامیاب حکمت عملی ہے یہ تم لوگوں کی.....'' فورڈ نے میری آنکھوں میں جھانکا ''تم پھر غلطی پر ہو..... ہم تمہیں اپنا دشمن نہیں..... دوست تصور کرتے ہیں..... اس روز ایئر پورٹ پر جس طرح نیویارک بھر کے مسلم طلبا تمہارے لیے اپنے جسم پر پولیس کی برستی لاٹھیاں کھا رہے تھے، اُسے دیکھ کر میرا یقین تم پر مزید پختہ ہو گیا ہے..... تم ہمارے لیے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہو..... اگر اپنے ذہن سے یہ فرسودہ مذہبی جذبات نکال کر سوچو گے تو تمہیں اس میں نہ صرف اپنا بلکہ ان تمام جذباتی اسٹوڈنٹس کا بھی فائدہ نظر آئے گا جو جنون کے اس راستے پر چلنے کی تیاری میں ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ایجنسیاں اُنہیں ہمیشہ کے لیے امریکہ بدر کرنے کی تیاری میں لگی ہوئی ہیں''۔ میں نے غور سے فورڈ کی جانب دیکھا۔ ''چلو فرض کرو میں تمہاری بات مان کر تم لوگوں کے ساتھ آ ملتا ہوں تو تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟..... ہماری یونیورسٹی میں تمام عالم اسلام کی دل آزاری کے لیے ایک سیمینار منعقد کروایا جا رہا ہے..... کیا تمہاری سی۔آئی۔اے اسے منسوخ کروا سکتی ہے.....؟'' فورڈ سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں نے ابھی تم سے کہا کہ ہمارا ساتھ دینے کے لیے تمہیں اِن بوسیدہ مذہبی دیواروں کے حلقے سے باہر آنا ہوگا۔ ان خاکوں کی نمائش پہلی مرتبہ اور صرف نیویارک کی اس یونیورسٹی میں تو نہیں ہو رہی۔ یہ مسئلہ پرانا ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے فیس بک پر بھی یہی اِیشو اٹھایا گیا تھا اور بڑی ہاہا کار مچی تھی..... لیکن تمہاری طرح کتنے ایسے ہوں گے جنہوں نے فیس بک کا باقاعدہ بائیکاٹ ہی کر ڈالا ہو.....؟..... کیا دنیا میں مسلمان صرف تم یا یہاں کا مسلم گروپ ہی باقی رہ گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا

کہ تم لوگ احتجاج نہ کرو..... ضرور کرو..... بائیکاٹ کر دو اس سیمینار کا..... اپنا احتجاج بھی دنیا کے سامنے درج کروانے سے تمہیں کوئی نہیں روک رہا..... لیکن اپنے دل سے اس سیمینار کو سبوتاژ کرنے کا خیال نکال دو..... جس بات کی اجازت نیویارک کا قانون دے چکا ہو اُسے روکنے کا اختیار تمہارے پاس نہیں ہے..... اور اگر ایسی کوئی کوشش زبردستی کی گئی تو یاد رکھو کہ ہماری تم پر گہری نظر ہے..... عامر اور بابر کے بعد تیسری گرفتاری تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ اور یقین جانو اس بار الزامات کی فہرست بہت لمبی ہوگی۔'' میں نے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ سجا کر فورڈ کی جانب دیکھا ''دھمکی دینے اور مجھے ذہنی طور پر اُس گرفتاری کے لیے تیار کرنے کا بہت شکریہ آفیسر فورڈ..... تم تیر آزماؤ..... ہم اپنا جگر آزمائیں گے.....''۔ میں نے سڑک پار کر کے دوسری جانب کھڑی اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور فورڈ کے نہایت قریب سے تیزی سے گزارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سٹی ہال کے چوراہے پر سرخ بتی نے مجھے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے پارک کی جانب کسی عمارت کا پچھلا حصہ ڈھایا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی کرینیں ملبہ ہٹانے کے لیے وہاں جمع تھیں۔ یک جانب بڑا سا لکڑی کا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر سُرخ حرفوں میں بڑا سا ''زمین دوز پارکنگ'' لکھا ہوا تھا اور ایک تیر کے نشان سے پارکنگ کی جگہ کی نشان دہی کی گئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایسا بورڈ تو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ پھر دوسرا جھماکا ہوا اور پھر تو میرے ذہن میں دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور جب تک میں ہسپتال پہنچا تو مجھے یاد آ چکا تھا کہ پُروا کو کچلنے والی سیاہ وین میں نے پہلے کہاں دیکھی تھی۔

میں تیزی سے پُروا کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں نے شدید غصّے کے عالم میں اس سے پُوچھا۔

''تم نے پولیس سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم کو تقریباً ختم کر دینے والی وہ سیاہ وین کون چلا رہا تھا..... اب تمہارے چھپانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا پُروا ضمیر خان..... کیونکہ میں اس درندے کو پہچان چکا ہوں.....''

باب 18

پُروا نے گھبرا کر میری جانب دیکھا ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو آیان.....؟'' اتفاق سے اس وقت پُروا کے کمرے میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ ''ہاں ..... میں نے وہ سیاہ وین سب سے پہلے اُس وقت اپنی یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ میں دیکھی تھی جب مائیکل گروپ نے پہلی مرتبہ عامر بن حبیب کا گروپ توڑنے اور مجھے اُس میں شمولیت کے لیے رقم دینے کی پیش کش کی تھی، اور دوسری مرتبہ یہی وین مجھے ایک بار شمعون سے ملاقات کے وقت اُس کے پس منظر میں کھڑی نظر آئی تھی۔ اگر میں سٹی ہال کے سامنے اپنی یونیورسٹی کی زمین دوز پارکنگ جیسا ایک بورڈ لگا نہ دیکھتا تو شائد کچھ دن مزید میری یاداشت سے یہ سب کچھ محو رہتا لیکن آج شاید یہ راز کھلنا ہی تھا، مگر تم نے ان لوگوں کو کیوں بچایا.....؟؟ بہرحال..... اب شمعون اور مائیکل کے جیل جانے کا وقت آ گیا ہے..... میں ابھی اسی وقت پولیس کو اپنا بیان دینے کے لیے جا رہا ہوں..... اور اُمید ہے اس بار تمہاری گواہی میرے حق میں ہو گی'' میں واپسی کے لیے پلٹا تو پُروا نے آواز دے کر مجھے روک لیا ''ٹھہرو آیان..... میری بات سن لو.....'' میں نے پلٹ کر پُروا کو دیکھا ''ہاں..... یہ سچ ہے کہ میں نے شمعون کو اُس روز چہرے پر مفلر لپیٹے وہ سیاہ وین چلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور میں اُسے لاکھ چُھپنے کے باوجود پہچان بھی گئی تھی۔ لیکن میں بات نہیں بڑھانا چاہتی..... اِسی لیے میں نے پولیس کے سامنے شمعون اور مائیکل کا نام نہیں لیا جو اس دن شمعون کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کیا ہو گا۔ انہیں یونیورسٹی سے نکال کر جیل میں ڈال دیا جائے گا اور اُن کی جگہ کوئی اور یہودی لڑکا سنبھال کر پھر ہم سے اپنی دشمنی نکالنے کی تازہ فکر میں لگ

جائے گا..... یہ جنگ کب ختم ہوگی آیان..... میں اس کا خاتمہ چاہتی ہوں..... میں یہ لڑائی یہیں ختم کر دینا چاہتی ہوں..... اور تم اس جنگ بندی میں میرا ساتھ دو گے..... یہ میرا تم پر مان اور بھرم ہے.....'' میں زور سے چلایا ''یہ جنگ ہم نے نہیں..... انہوں نے شروع کی ہے مس پُروا ضمیر خان..... وہ اس لڑائی میں اخلاق کی آخری حد بھی پار کر چکے ہیں..... اور تم اب بھی اُنہیں معاف کر دینے کی بات کر رہی ہو..... جانتی ہو ہم نے یہ پچھلے چند دن کس سولی پر لٹکے اور کس عذاب میں کاٹے ہیں؟ ایک پل میں ہزار بار جی کر مرا ہوں میں..... اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو جانتی ہو.....؟'' میں جذبات کی رو میں کچھ کہتے کہتے رُک سا گیا۔ پُروا چپ چاپ میری ڈانٹ سہتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی ''میں جانتی ہوں آیان..... تمہاری سُرخ آنکھیں، تمہاری بڑھی ہوئی شیو اور تمہارا یہ مٹیالا لباس ہی وہ ساری داستان سنانے کے لیے کافی ہے جو یہاں تم سب پر لحہ لحہ بیتی ہے۔ لیکن میری تم سے درخواست ہے..... ہماری دوستی کی خاطر..... میری خاطر..... تم ان لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں کرو گے..... ہمیں ان فضول کے جھگڑوں سے آگے نکل کر سب سے پہلے اُس سیمینار کی بندش کا کچھ سامان کرنا ہوگا جو ہماری روحوں میں چھید کرنے کے لیے بہت جلد منعقد ہونے جا رہا ہے..... اس وقت مسلم گروپ مزید کوئی انتشار اور ایسا کوئی بھی نقصان برداشت نہیں کر سکتا جو ہمیں پھر سے بکھرے پتّوں کی طرح جُدا کر دے..... عامر اور بابر کی ملک بدری کے بعد اُن لوگوں کی نظر اب تم پر ہے..... اور ہم سب تمہیں کھونا نہیں چاہتے..... اپنے جذبات پر قابو رکھو..... تمہاری گرفتاری کے بعد گروپ کی کمر ہی ٹوٹ جائے گی..... اسی لیے میں اس بات کو یہیں ختم کر دینا چاہتی ہوں..... ہمیں اپنے کل کے لیے اس آج کی قربانی دینا ہوگی..... کیا تم میرا ساتھ نہیں دو گے آیان.....؟'' میں لاجواب ہو گیا۔ پُروا دھیرے سے مُسکرائی ''مجھے تمہارے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے، اور مریض کے لیے خوف بڑا نقصان دہ ہوتا ہے..... چلو اب مسکرا دو.....'' میں نے پُروا کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ کسی بچے کی طرح اپنی خواہش پوری ہونے کے انتظار میں میرے چہرے کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے میری مسکراہٹ نظر آتے ہی اس کی کوئی لاٹری نکل آئے گی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر خود بخود میرے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان اُبھر آئی۔ میں نے اُس لمحے پُروا کی پریشانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے لب سی لئے۔ لیکن میں جانتا تھا

کہ شمعون یا مائیکل میں سے جب بھی کوئی میرے سامنے آیا..... تب مجھے خود پر قابو رکھنا بہت مشکل ہو جائے گا اور اگلے روز ٹھیک ایسا ہی ہوا۔ میں نے پارکنگ میں اپنی بائیک کھڑی کی اور سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ اوپر سے شمعون اور مائیکل نیچے اُترتے نظر آئے۔ میرے قدم وہیں جم گئے۔ شمعون نے مجھے دیکھا تو اُس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر اُبھرا ''کیوں مسلم کونسلر..... کہاں رہتے ہو آج کل..... تمہاری لیڈری کا دور ختم ہوتا نظر آ رہا ہے مجھے.....'' میں نے اُسے گھورا ''میرا زیادہ تر وقت آج کل سنٹرل ہسپتال کی اُس راھداری میں گزرتا ہے جس کے ایک کمرے میں وہ معصوم لڑکی گھائل پڑی ہے جسے کسی کم ظرف بزدل نے مجھ سے اپنی دشمنی نکالنے کی خاطر کچل ڈالا.....'' میری بات سن کر شمعون اور مائیکل دونوں کچھ گڑبڑا سے گئے۔ پھر شمعون ڈھٹائی سے بولا ''ظاہر ہے جب تم لوگوں کو یوں للکارتے پھرو گے تو دشمن تو پیدا ہوں گے..... اور اس کا نقصان تمہارے اپنوں کو بھی اٹھانا پڑے گا.....'' شمعون اور مائیکل نے بات ختم کر کے قدم نیچے کی طرف بڑھائے۔ اور ٹھیک اسی لمحے میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے آواز دے کر ان دونوں کو روکا۔ ''رُکو..... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟..... کچھ باتیں صاف کرنی ہیں مجھے تم دونوں سے.....'' شمعون اور مائیکل رُک گئے۔ لیکن انہوں نے پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں چند سیڑھیاں اتر کر اُن دونوں کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ آس پاس سے گزرتے چند لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی گاڑی وغیرہ پارک کر کے جا آ رہے تھے ہمیں سیڑھیوں پر آمنے سامنے یوں تنا ہوا کھڑے دیکھ کر جلدی جلدی ادھر اُدھر ہو گئے کیونکہ پچھلے چند دن کے دوران یونیورسٹی میں اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب اُن میں سے کوئی بھی ہمارے جھگڑے میں پڑ کر یونیورسٹی سے باہر نہیں ہونا چاہتا ہوگا۔ شمعون نے بے چینی سے پہلو بدلا ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟.....'' میں نے سرسراتی آواز میں اس سے پوچھا ''آج کل تم لوگ اپنی وہ سیاہ وین یونیورسٹی نہیں لا رہے جس کو میرے اوپر چڑھانے کی کوشش میں تم لوگوں نے پُروا کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ کیا کسی گیراج میں چھپا رکھی ہے.....؟ کیونکہ پولیس کو ابھی تک وہ وین ملی نہیں.....'' میری بات کسی توپ کے گولے کی طرح ان کے سروں پر پھٹی، شمعون زور دے کر بولا ''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو..... کیا پورے نیویارک میں وہی ایک سیاہ وین ہے..... ہزاروں بلیک ویگنز ہوں

گی اس شہر میں ویسی.....'' میرے ہونٹوں پر زہر خندہ سی مسکراہٹ اُبھر آئی ''میرے شک کو یقین میں بدلنے کا شکریہ..... تمہیں کیسے پتا چلا کہ جس وین نے پُروا کو کچلا تھا وہ کیسی تھی؟..... اور اُس جیسی اور بہت سی گاڑیاں ہوسکتی ہیں..... جب کہ وین کا ٹھیک حلیہ تو ابھی تک پولیس کو بھی نہیں پتا.....؟'' میری بات سن کر وہ دونوں مزید الجھ گئے، مائیکل نے پریشانی سے شمعون کی طرف دیکھا شمعون کڑک کر بولا ''تم ہمیں باتوں میں اُلجھا کر کچھ ثابت نہیں کر سکتے..... ہوسکتا ہے کہ وہ گاڑی اب تک کریش ہو کر سکریپ کا حصہ بن گئی ہو اور اس کے ہزاروں حصے پورے امریکہ میں پھیل چکے ہوں..... لہٰذا اپنا وقت ضائع نہ کرو.....'' میں نے شمعون کے ریلنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ سختی سے جما دیا ''تم دونوں اپنے وقت کی فکر کرو..... آج شام تک پولیس کو پُروا کا تحریری بیان مل جائے گا۔ پھر اُسے وہ وین کیسے تلاش کرنی ہے یہ تم جانو اور نیویارک پولیس..... میں چاہوں تو اسی وقت یہیں پارکنگ میں اپنے سارے حساب برابر کر سکتا ہوں..... لیکن جب پولیس خود تم دونوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر پوری یونیورسٹی کے سامنے لے کر جائے گی اور تین چار سال تم لوگ نیویارک کی کسی جیل کی روٹیاں توڑو گے تو تم لوگوں کے پاس بہت وقت ہو گا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا..... کیوں کہ یونیورسٹی تو گرفتاری کے فوراً بعد تم دونوں کو رسٹی کیٹ کر ہی چکی ہو گی..... اور جب تم دونوں جیل سے باہر آؤ گے تب میں تم دونوں سے اپنی بات کروں گا..... فی الحال تم لوگوں کے لیے اتنا ہی کافی ہے.....'' میں ان دونوں کو ھکا بکا چھوڑ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر یونیورسٹی کے بڑے دالان میں نکل آیا۔ آج آسمان اور سورج بادلوں کے ساتھ دھوپ اور سائے کی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ویسے ہی آنکھ مچولی جیسے میں اور بسام بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے چھپنے کی باری پر بسام مجھے ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگا دیتا تو میں خود ڈر کر رونا شروع کر دیتا تھا کیونکہ تب مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اگر بسام نے مجھے ڈھونڈ کر نہ نکالا تو میں ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا۔ اور اب قسمت نے ہم دونوں کے ساتھ ایک ایسی آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا تھا کہ ہم دونوں بھائی ایک دوسرے کو آخر کار کھو بیٹھے۔ کبھی کبھی ہمارے بچپن کے کھیل جوانی میں سچ ہو جاتے ہیں۔ بسام کی یاد آتے ہی میری پلکوں کے گوشے نم ہونے لگے۔ مجھے آج کل اس کی جتنی ضرورت تھی اتنی شاید پہلے کبھی نہ رہی ہو۔ میں نے شمعون اور مائیکل کو

پریشان کرنے کے لیے صرف ایک دھمکی ہی دی تھی، میں چاہتا تھا کہ جس درد سے ہم اُن کی وجہ سے گزر رہے ہیں..... اس خوف کا کچھ مزہ وہ بھی چکھ لیں۔ پُروا سے کیے گئے وعدے کا خیال نہ ہوتا تو میں واقعی ان دونوں کو آج ہتھکڑی لگوا کر ہی یہاں سے بھیجتا۔ میں نے ابھی آدھا دالان ہی پار کیا تھا کہ میرے عقب سے مائیکل کی آواز اُبھری ''آیان.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں گھاس پر پڑی پگھلتی برف میں قدم جمائے پریشان سے کھڑے تھے۔ مائیکل میری جانب بڑھا ''میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد تمہیں یا پُروا کو کوئی نقصان پہنچانا ہرگز نہیں تھا۔ اور پُروا تو بلاوجہ ہی نشانہ بن گئی۔ شمعون صرف تمہارے بہت قریب سے گاڑی گزار کر تمہیں خوف زدہ کرنا چاہتا تھا، لیکن پھر اچانک ہی پُروا نے ہماری گاڑی تمہاری جانب بڑھتی ہوئی دیکھی تو وہ بہت گھبرا گئی، اُسے لگا کہ ہم تمہیں کچلنا چاہتے ہیں۔ اور اس نے گھبرا کر تمہیں دھکا دے دیا اور خود گاڑی کے سامنے آ گئی۔ شمعون نے آخری وقت میں بھی اُسے بچانے کی پوری کوشش کی تھی، اور اس کا ثبوت سڑک پر ابھی تک موجود گاڑی کے ٹائروں کے مُڑنے کے نشانات بھی ہیں، لیکن وہ پُروا کو نہیں بچا پایا۔ ہم اتنے بوکھلا گئے تھے کہ ہم نے گاڑی روکے بنا وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت جانی اور سیدھا اپنے ایک دوست کے سکریپ گودام میں لے جا کر اس گاڑی کو کریش کروا ڈالا، تاکہ اُس کا نام و نشان ہی مِٹ جائے..... تم یقین کرو میں سچ کہہ رہا ہوں..... مجھے داؤدؑ اور موسیٰؑ کی قسم.....، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایک بار پُروا نے ہمارے نام پولیس کے سامنے اگل دیئے تو اُن کا اُس سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنا زیادہ مُشکل نہیں ہوگا..... اور پھر ہمارے کیریئر عمر بھر کے لیے جیل کی نظر ہو جائیں گے..... اس لیے ہمارے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے.....'' میں نے مائیکل کو گھورا، ''کیسی آفر؟''..... شمعون اب بھی ہم دونوں سے دس بارہ قدم دور کھڑا تھا۔ وہ چند قدم اٹھا کر قریب آ گیا۔ مائیکل نے سر جھکا کر کہا ''یہی..... کہ تم بدلے میں جو بھی چاہو..... ہم وہی کریں گے..... اسلام اور مسلم گروپ کی مخالفت بھی چھوڑ دیں گے اور جب تک تم مسلم کونسلر ہو ہم تمہاری راہ میں کوئی روڑہ نہیں اٹکائیں گے..... اس کے علاوہ تمہارے گروپ کو جتنی بھی فنڈنگ درکار ہوگی۔ ہم تمہاری کونسلر شپ کے مکمل دور میں وہ تمام رقم بھی تمہیں اپنی جیب سے ادا کرنے کے لیے تیار ہیں..... بدلے میں تمہیں صرف اپنی زبان بند رکھنا ہو

گی..... ہم پُروا کو بھی تمام نقصان کی تلافی کر دیں گے.....'' میرا ضبط جواب دے گیا اور میں نے اپنے بیگ سے پُروا کی اب تک کی تمام میڈیکل رپورٹس نکال کر ان دونوں کے چہرے پر دے ماریں ''کس کس نقصان کی تلافی کرو گے تم لوگ۔ یہ پُروا کی رپورٹس ہیں..... اگر چند گھنٹے۔ مزید اُس بے ہوشی میں گزر جاتے تو وہ ایسے کومہ میں چلی جاتی جہاں سے شائد اُس کی واپسی کبھی ممکن نہ ہوتی۔ تم لوگوں میں تو اتنی اخلاقی جرأت بھی نہیں ہے کہ ایک بار ہسپتال آ کر اس کی خیریت ہی پوچھ جاتے۔ اور ایک وہ ہے جو تم دونوں کو پہچان لینے کے باوجود بھی پولیس کے سامنے تم لوگوں کے نام نہیں ظاہر کرنا چاہتی..... شرم سے ڈوب مرو.....'' ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا'' کیا..... پُروا نے ہماری شناخت ظاہر نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے..... لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ.....''۔ ''وہ میری اپنی دلی خواہش تھی کہ تم لوگوں کو اقدامِ قتل کے جُرم میں جیل کی ہوا ضرور کھلاؤں لیکن وہ صاف دل لڑکی صرف تمہاری یہ گھٹیا دشمنی ختم کرنے کی خاطر اپنی جان بھی نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ ہمیں تمہاری کوئی مدد کوئی فنڈ یا کوئی حمایت درکار نہیں ہے..... ابھی ہمارے بازوؤں میں اتنا دم باقی ہے کہ ہم اپنا بوجھ خود اٹھا سکتے ہیں۔ ہمیں تمہاری مخالفت کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے۔ تم لوگ جس طرح چاہو ہمارے مقابلے پر ڈٹ سکتے ہو..... مگر ہر جنگ کے کچھ اصول ہوتے ہیں..... لیکن تم لوگوں نے گراوٹ کی ہر سطح پار کر لی ہے..... کیا دشمنی ہے تمہاری ہم سے یا ہمارے مذہب سے؟..... کیا کبھی ہم نے تمہارے مذہب پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے.....؟ ہم تو آج بھی داؤدؑ، زبور، توریت اور موسیٰؑ کا نام زبان پر آتے ہی آنکھوں کو چھوتے ہیں..... وہ ہمارے لیے بھی اُتنے ہی محترم ہیں جتنے تم لوگوں کے لئے..... بلکہ شاید تم لوگوں سے بھی زیادہ..... کیوں کہ تم تو انہی کی دی ہوئی تعلیمات کو بُھلا کر ایک ایسی دشمنی کی آگ میں خود کو جھونک چکے ہو جس میں صرف حسد کی تپش ہے۔ کیا چاہتے ہیں ہم مسلم طلبہ تم سب سے؟.. بس اتنا ہی کہ خود بھی جیو اور ہمیں بھی جینے دو..... ہمارے مذہب اور ہمارے مذہب کی معتبر اور پاکیزہ ہستیوں کی بے حرمتی نہ کرو کیونکہ اُن کی حرمت صرف ہم پر ہی لازم نہیں..... خود تمہارے مذہب نے بھی ان کی عظمت اور پاکیزگی پر تصدیق کی مُہر ثبت کر رکھی ہے۔ کیا تم اپنے مذہب سے بھی مخلص نہیں ہو؟..... مسلمان دشمنی نے تمہارے اندر کے انسان کو ختم کر کے صرف ایک جانور باقی چھوڑ دیا ہے.....

اور میں اب بھی تمہارے اندر کے درندے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں..... لیکن مجھے کسی کی دی ہوئی قسم اور دوستی کے وعدے نے روک رکھا ہے۔''

میری بات کے دوران عیسائی کونسلر جارج بھی وہاں پہنچ گیا تھا لیکن وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، پارکنگ میں جن چند طلباء نے مجھے اور شمعون کو سیڑھیوں پر بحث کرتے دیکھا تھا انہوں نے شائد اوپر جا کر خبر کر دی تھی، اسی لیے میری بات ختم ہونے تک مسلم، یہودی اور کرسچن طلباء دوڑتے ہوئے میدان میں داخل ہونا شروع ہو چکے تھے۔ وہ اپنے ذہن میں مسلم اور یہودی کونسلر کا جھگڑا رکھ کر وہاں پہنچے تھے لہٰذا سبھی نے ہاتھ میں ہاکی، بیس بال بیٹ، موٹر سائیکلوں کی چین، لوہے کے کنڈے والے بیلٹ اور اُسی قسم کے دوسرے کئی ہتھیار تھام رکھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بڑے دالان کا علاقہ اسٹوڈنٹس سے بھر چکا تھا اور وہ تین گروہوں کی صورت میں میرے، شمعون اور جارج کے عقب میں جمع ہوتے گئے۔ وہ سب ہمارے ایک اشارے کے منتظر تھے۔ میں نے جارج کی طرف دیکھا ''دیکھ رہے ہو اس نفرت کی تبلیغ کا نتیجہ..... تمہارے گروپ کو یہ بھی پتا نہیں کہ اصل جھگڑا کیا ہے..... لیکن وہ مسلم دشمنی میں یہاں یہ سوچ کر اکٹھے ہو گئے ہیں کہ یہودیوں کی آڑ میں وہ اپنے بدلے بھی چکا سکیں گے.....'' اتنے میں میرے عقب میں جینی، ایرک اور جم کی بیک وقت آواز اُبھری ''لیکن ہم تمہارے ساتھ ہیں آیان.....'' ایرک ایک قدم آگے آیا ''سب عیسائی اور شاید سبھی یہودی طلباء اِن کے ساتھ نہیں ہیں۔ میں آج اپنی، جینی اور جم کی طرف سے یہ کھلا اعلان کرتا ہوں کہ اگر مذہب کی جنگ مسلط کی گئی تو ہم تینوں آیان کی طرف سے لڑیں گے..... کیوں کہ ہمارا مذہب ہمیں سچ کا ساتھ دینے کی تلقین کرتا ہے.....'' میرے تینوں دوست کندھے سے کندھا ملا کر میرے ساتھ کھڑے ہو گئے، کچھ یہودی اور عیسائی لڑکیاں جو پہلے بھی پُروا کے ساتھ تھیں، وہ بھی دو قدم بڑھا کر مسلم گروپ کی جانب آ گئیں۔ ماحول پر ایک گھمبیر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ شائد اوپر ایڈمن بلاک کی دوسری منزل سے کسی نے نیچے یہ ہنگامہ دیکھ کر ڈین کو اطلاع کر دی تھی لہٰذا کچھ لمحوں بعد ڈین بھی دیگر اساتذہ کے ساتھ یونیورسٹی کی تاریخ کے اس سب سے بڑے اور تین مذاہب کے ہجوم کو آپس میں ٹکرانے سے روکنے کے لیے دور سے ہماری جانب بھاگتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اپنی بات ختم کی

''میں آج تم سب پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جسے تم لوگ مذہب کی جنگ سمجھ کر لڑ رہے ہو، وہ صرف تمہارے اور تمہارے بڑوں کی غلط نظریات کی جنگ ہے، جسے تم لوگوں نے صرف مذہبی تعصب کی بنیاد پر خود پر مُسلط کر لیا ہے۔ اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنہیں اپنی مذہب کی صحیح پہچان ہے، کتنے ہیں جو دل میں اپنے مذہب کا سچا درد رکھتے ہیں۔؟ ہم تو بس ایک بھیڑ چال کا شکار ہیں ہمیشہ سے.....''

میری بات ختم ہوئی تو ڈین پارٹی پہنچ گئی ''یہ تم سب لوگ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو..... میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تین منٹ کے اندر اندر یہ میدان خالی کر دو..... تین منٹ بعد اگر مجھے کوئی اس میدان میں نظر آیا تو میں اس کے خلاف سخت کارروائی کروں گا..... چلو..... جلدی کرو..... اپنی اپنی کلاس میں پہنچ کر اپنی حاضری لگواؤ.....'' ڈین کی بات سن کر لڑکے وہاں سے منتشر ہونے لگے، میں نے بھی پلٹ کر دوسری جانب قدم بڑھائے۔ ڈین نے مجھے روک لیا ''آیان..... یہ میری آخری وارننگ ہے..... اور ہاں تمہارے گذشتہ میڈیا انٹرویو کے لیے بھی تمہیں اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کر دیا گیا ہے۔ تمہیں سات دن کے اندر اس کا جواب جمع کروانا ہوگا.....'' میں میدان سے باہر نکلا تو بلال نے دھیرے سے میرے کان میں کہا، ''کل سے سیمینار کے ٹکٹوں کی فروخت شروع ہو جائے گی۔ پانچ سو اور ہزار ڈالر کے ٹکٹ ہوں گے نیچے ہال اور اوپر والی گیلری کے، سیمینار میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں.....'' میں نے پریشانی سے بلال کی جانب دیکھا۔ ''ہماری یونیورسٹی میں مسلم گروپ کی تعداد کتنی ہے.....'' بلال نے سوچ کر جواب دیا۔ ''کل ملا کر 313 تین سو تیرہ کے قریب ہوں گے.....''۔ ''اور نیویارک کی باقی یونیورسٹیوں میں مسلمان طلباء کی کل تعداد کیا ہوگی؟ بلال نے پھر سے گنتی کی ''ہماری یونیورسٹی کے طلباء مِلا کر کل بارہ سو کے قریب ہو جائیں گے۔ ان میں غیر حاضر طلباء کی تعداد بھی شامل ہے.....'' میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ''اور ہال کی نشستیں کتنی ہیں؟'' بلال نے حیرت سے میری جانب دیکھا ''تین ہزار..... لیکن تم یہ کس اعداد و شمار کے پھیرے میں پڑ گئے ہو.....؟'' میں نے کچھ دیر سوچا اور پھر بلال سے کہا ''تم سب لڑکوں کو کسی کھلی جگہ میں اکٹھا ہونے کا کہو..... ہال نمبر 3 کا نہ کہنا..... مجھے اب اُن دیواروں کے کان بے اعتبار لگنے لگے ہیں..... انہیں عقب والے اسٹیڈیم میں

جمع کرو..... میں بھی کچھ دیر میں وہیں پہنچتا ہوں''..... ''بلال سر ہلا کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ بلاک کے نوٹس بورڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے میری نظر اخبار کی دو تازہ لگائی گئی کٹنگز پر پڑی (1) ''لیسٹر شائر (لندن) کی ایک عدالت نے مسلم خاتون کو برقعہ اتار کر بیان دینے پر مجبور کیا۔ (2) ہوسٹن (امریکہ) کی عدالت نے عدنان مرزا نامی پاکستانی طالب علم کو طالبان سے روابط کے جرم میں پندرہ سال کی قید سُنا دی۔'' شاید یہ دونوں تراشے غیر مسلم طلبا کے گروپ نے مسلم گروپ کو چڑانے کے لیے یہاں چپکا رکھے تھے۔ میرے دماغ میں شیخ الکریم کی بات گونجی ''مسلمان کے لیے یہ دُنیا بڑی سخت جگہ ہے۔'' انہی دو تراشوں کے نیچے ایک اور چھوٹی سی خبر چپکی ہوئی تھی ''سی۔آئی۔اے اور ایف۔بی۔آئی کو انتہا پسند گروپوں سے روابط رکھنے والے مسلم طلباء کی تلاش.....'' میرے ذہن نے آفیسر فورڈ کی دھمکی دُھرائی ''اور یاد رکھنا، اس بار اگر تم گرفتار ہوئے تو الزامات کی فہرست بہت لمبی ہو گی.....'' مجھے لگا کہ میرے گرد شکنجہ کستا جا رہا ہے۔ میں سٹیڈیم پہنچا تو قریباً سارا گروپ جمع ہو چکا تھا۔ صرف وہی لڑکیاں غیر حاضر تھیں جو پُروا کے پاس ہسپتال میں رُکی ہوئی تھیں۔ وہ سب سیمینار کی حتمی تاریخ کے اعلان اور ٹکٹوں کی فروخت کا سن کر بے حد آرزدہ اور بے چین تھے۔ بے بسی جب حد سے گزر جائے تو وہ اشتعال کی آخری لکیر پار کر کے ایک ایسی مایوسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا انجام صرف فنا ہوتا ہے۔ مجھے اُن سب کے چہروں پر بھی ایک ایسی ہی فنا دکھائی دے رہی تھی۔ آج وہ خلافِ توقع خاموش تھے۔ سچ ہے مجھے ان کے غصّے اور اشتعال سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی لیکن آج ان کی اس زبان بندی نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ ہمیں پندرہ دن بعد ہونے والے اس سیمینار کو روکنے کے لیے آج ہی اپنا حتمی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ اس لیے اس معاملے میں مجھے اُن سب کا مشورہ درکار ہے۔ اور اُن سب کی سننے کے بعد آخر میں میں انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کروں گا۔ وہ لوگ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ اپنی بات دُھرائی لیکن ان کے چہرے ویسے ہی سُتے رہے۔ ''تم لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں.....؟..... جنگ ابھی جاری ہے..... اور ہمیں لڑنا ہے.....'' احمر نے سب لڑکوں کی طرف دیکھا اور دو قدم بڑھا کر آگے آ گیا۔ ''نہیں آیان..... شائد ہم یہ جنگ اِس طرح اُن سے نہ جیت پائیں..... سیمینار میں صرف دو ہفتے باقی ہیں اور ہم انہیں روکنے میں ناکام

رہے ہیں..... لہذا ہم نے بھی آخری حد سے گزر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے.....'' میں نے حیرت سے پوچھا ''کیسا فیصلہ.....؟'' احمر نے سر جھکا لیا۔ ''حافظ شکیل سے کل رات کسی انجان گروپ نے فون پر رابطہ کیا ہے..... وہ لوگ خود کو جہادی کہتے ہیں اور انہوں نے اس گستاخی کی سزا دینے کے لیے سیمینار والے دن ہال میں بم نصب کر کے دھماکہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم سب نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اس کام میں ان کا ساتھ دیں گے.....، حافظ شکیل اُن کے رابطے میں رہے گا اور سیمینار والے دن سے ایک رات قبل ہال میں بم نصب کرنے میں اُن کی مدد کرے گا۔ ہم اُن سب کو فنا کر دیں گے جنہوں نے ہمارے پیارے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کا ناپاک خیال بھی اپنے دل میں کہیں پال رکھا ہے۔'' احمد کی بات سن کر مجھے سارا اسٹیڈیم گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

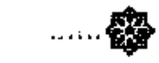

باب 19

میں زور سے چلایا۔ ''تم لوگ اپنے ہوش میں تو ہو.....؟..... جانتے بھی ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو.....'' وہ سب خاموش رہے اور ان کی خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خود کو اس بات کے لیے ذہنی طور پر گذشتہ رات ہی سے تیار کر چکے ہیں۔ اس بار حافظ شکیل بولا ''ان لوگوں نے ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں چھوڑا۔ ہمارے لاکھ احتجاج کے باوجود یونیورسٹی انتظامیہ نے سیمینار کی تاریخ کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم زیادہ ہنگامہ کریں گے تو یہ لوگ ہمیں پولیس والوں سے اُٹھوالیں گے، اور عامر بن حبیب اور بابر سیّدی کی طرح ہمیں بھی عدالتوں سے ملک بدر کروا کر چھوڑیں گے..... لیکن ہم نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ چاہے ہم قید ہو جائیں یا ملک بدر..... یہ سیمینار تو ہم کسی صورت نہیں ہونے دیں گے..... بس اب ہمیں اُس تاریخ کا انتظار ہے جب وہ ملعون ڈینش این۔ جی۔ او ہماری یونیورسٹی کے بڑے ہال میں اکٹھی ہو گی اور ہم ان سب کو واصلِ جہنم کریں گے.....''

میری آواز تیز ہو گئی ''ٹھیک ہے..... میں مان لیتا ہوں کہ اس طرح تم لوگ انہیں وقت سے کچھ پہلے دوزخ پہنچا دو گے..... حالانکہ ان کے اگلے جہاں کا یہ ٹھکانہ پہلے سے ہی طے شدہ ہے..... لیکن پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا ان چند مٹھی بھر لوگوں کے مر جانے سے وہ سوچ بھی فنا ہو جائے گی جو اس تمام مکروہ عمل کے پیچھے پوشیدہ اور کارفرما ہے؟؟..... اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ان لوگوں کے بعد کوئی دوسرا گستاخ یہ ملعون عمل دُھرانے کی جرأت نہیں کرے گا؟ تب اُسے روکنے والا یہاں باقی کون ہو گا.....؟ کیونکہ تم لوگ جو دھماکہ کرنے جا رہے ہو اس کے بعد ہماری یونیورسٹی میں تو کوئی

مسلم طالب علم بچے گا نہیں، صرف ہماری یونیورسٹی پر ہی کیا منحصر ہے..... نیویارک بھر کے تمام تعلیمی اداروں میں ایسا کریک ڈاؤن ہوگا کہ آدھے سے زیادہ ملک بدر ہو جائیں گے اور جو باقی بچ گئے وہ عمر بھر یہاں کی جیلوں میں سڑتے رہیں گے تب اگر آئندہ ایسی شرارت ہوئی تو ان کا راستہ کون روکے گا؟ ہاں اگر یہ آخری جنگ ہوتی تو میں خود سب سے پہلے یہ سب کچھ کر گزرتا، لیکن ابھی قیامت دُور ہے اور ہمیں ایسے جانے کتنے محاذوں پر ان سے لڑنا ہے۔ خود کو پہلے ہی مورچے پر فنا کر دینا کہاں کی عقل مندی ہے.....؟'' وہ سب میری بات سن رہے تھے لیکن بالکل مُردوں کی طرح..... اور سانس لیتے مُردوں سے زیادہ مُردہ شے اس جہاں میں اور کوئی نہیں ہوتی۔ دشمنوں نے پے در پے اور بار بار اُن کی روحوں پر اتنے وار کیے تھے کہ ان کی رُوح بھی مر چکی تھی..... صرف یہ بوسیدہ جسم سانس لینے کا تکلّف جاری رکھے ہوئے تھے..... اور جب کسی انسان کی رُوح مر جائے اور صرف جسم زندہ رہے تب وہ ایک بھیانک قضاء کی صورت اپنے روح کے قاتلوں پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ مذہب، مقدس ہستیوں اور پیارے نبی ﷺ کی توہین (نعوذ باللہ) ہی تو کسی مسلمان کی رُوح کو قتل کرنے کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ ہمارے مذہب کے دشمن آج کل یہ قتل سرعام اور بار بار کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور آج اُس قتلِ عام کا نتیجہ میرے سامنے اس مسلم گروپ کی صورت میں کھڑا تھا جو بے بسی کی آخری حد سے گزر جانے کے بعد اب مکمل اور بااختیار ہو چکے تھے۔ حد سے زیادہ بے بسی بھی تو انسان کو ایک طرح کا کامل مختار بنا دیتی ہے۔ خود کو فنا کرنے کا اختیار اور حوصلہ بخش دیتی ہے۔ بے بس اگر حوصلہ مند بھی ہو تو پھر وہ خودکش بن جاتا ہے۔ اور خودکش سے بڑا خطرہ اس دنیا میں بھلا اور کیا ہوگا.....؟؟

بلال نے آخر کار اپنے لب کھولنے کی ہمّت کی۔ ''ہم نے ہر طرح طریقہ آزما کر دیکھ لیا ہے آیان..... بہت دفعہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ سب طرح کی منّت زاری بھی کر دیکھی..... مگر انہوں نے شائد اپنے کان سی لیے ہیں..... دِلوں پر لوہے کے خول چڑھا رکھے ہیں اور اپنا ذہن شیطان کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے..... یہ ایسی گستاخیاں کرنے سے باز نہیں آئیں گے اور تم ٹھیک کہتے ہو کہ ان لوگوں کے جہنم واصل ہونے کے بعد بھی شائد یہ گستاخی جاری رہے گی کیونکہ ان کے دِلوں پر زنگ لگ چُکا ہے..... ایک ایسا دائمی زنگ جو اب ان کی رُوح کے ساتھ ہی اگلے جہاں جائے گا..... تمہارا یہ خدشہ

بھی ٹھیک ہے کہ اس دھماکے کے بعد نیویارک کا کوئی بھی مسلم طالب علم یہاں کی ایجنسیوں کی زد میں آنے سے نہیں بچ پائے گا..... لیکن ہمارے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا..... ہم اپنا فرض تو ادا کر جائیں..... ہمارے بعد آنے والے اپنا فرض ادا کریں گے.....'' بلال نے اپنی بات ختم کی تو وہ سب سر جھکائے دھیرے دھیرے وہاں سے چل دیئے..... میں انہیں آوازیں دیتا اور روکتا ہی رہ گیا لیکن ان سب کے دِلوں پر فنا کا سایہ پڑ چکا تھا۔ وہ سایہ جو سماعتیں معطل کر دیتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں تیز بارش شروع ہوگئی۔ سخت برف پر بارش کے قطرے گر کر خود بھی جم رہے تھے، یہاں بھی قدرت نے فنا کا وہی ابدی کھیل شروع کر دیا تھا۔ میں پُروا کے پاس پہنچا تو وہ تکیہ سیدھا کئے کچھ پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کِھل اُٹھا .....'' آیان میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے..... تمہیں پتا ہے.....'' پھر میرے چہرے پر اُبھری فکر کی لکیروں نے اُسے اپنی بات خود کاٹنے پر مجبور کر دیا ''کیا ہوا..... سب ٹھیک تو ہے نا.....؟.....'' میں نے اُسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آج بہت دن بعد اس کے چہرے کی لالی واپس لوٹی تھی '' کچھ خاص بات نہیں..... بس جُوں جُوں سیمینار کی تاریخ قریب آ رہی ہے..... اُلجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں..... لڑکے اپنا حوصلہ ہار رہے ہیں..... ڈرتا ہوں ان کے اندر ہوتی یہ شکست کہیں اُنہیں کسی انتہائی اقدام کی طرف نہ دھکیل دے.....'' پُروا ابھی تک آگہی کے عذاب سے ناآشنا تھی ''نہیں..... مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوگا۔ تم اُن کی ہمت کبھی کھونے نہیں دو گے..... یہ میرا یقین ہے..... اچھا تمہیں ایک اچھی خبر سناتی ہوں..... مجھے یقین ہے کہ مایوس دِل مسلم طلباء اسے سن کر ایک بار پھر سے جی اٹھیں گے..... سُنو گے.....؟'' میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔ ''ہاں..... ہاں ضرور.....''۔ پُروا نے ہاتھ میں پکڑا نیویارک ٹوڈے رسالے کا ایک صفحہ کھولا ''یہ دیکھو..... کتنی اچھی خبر ہے۔ سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی سالی لورین بوتھ نے اسلام قبول کر لیا.....'' پُروا کی بات سن کر میں زور سے چونکا ''کیا..... کہاں دکھاؤ.....'' میں نے جلدی سے ساری رپورٹ پر نظر ڈالی، لورین بوتھ ایران کے شہر قُم کے دورے پر اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر چکی تھی اور اس خبر سے برطانیہ کے محلوں میں ہل چل سی مچ گئی تھی، پُروا نے مُسکرا کر میری جانب دیکھا'' ''اچھی خبر ہے نا..... اسلام کی مخالفت کے اس سیاہ دور میں بھی ہمارا دین اُن کے امراء

اور شہزادے، شہزادیوں تک پہنچ رہا ہے..... مطلب اگر وہ ہمیں زِچ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تو قدرت بھی ہماری مدد سے غافل نہیں ہے..... مجھے تو لگا کہ یہ خبر خاص ہمارے لیے ہی مُقدّر نے بچا رکھی تھی'' میں جوش میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا ''ہاں پُروا ضمیر خان..... یہ ہمارے نصیب کی خبر ہے..... جو قدرت نے آج تمہارے ذریعے مجھ تک پہنچائی ہے..... اگر یہ میگزین میں رکھ لوں گروپ کو دکھانے کے لیے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں.....'' پُروا ہنس پڑی ''نہیں آیان احمد صاحب..... آپ کے لیے ہی اب تک سب سے چھپا رکھا تھا.....'' میں جلدی میں واپسی کے لیے پلٹا۔ پُروا نے مجھے پکارا ''کہاں چل دیئے..... کچھ دیر تو بیٹھو.....'' ''نہیں..... میں پھر آؤں گا..... اس وقت کچھ بھٹکے ہوئے ذہنوں کو یہ خبر پہنچانا بہت ضروری ہے.....'' پُروا نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک اور کتاب نکالی ''اردو تو پڑھ لیتے ہو نا..... میں نے تمہارے لیے یہ کلامِ اقبال منگوایا ہے..... اس میں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' ضرور پڑھنا..... بہت سے سوالوں کے جواب مِل جائیں گے..... میں جب کبھی بہت زیادہ اُلجھ جاؤں..... ایک بار اِسے اپنے شیلف سے نکال کر ضرور پڑھ لیتی ہوں..... اور یقین کرو..... ہر بار یہ کلام مجھے کچھ نئے جواب دے جاتا ہے..... واقعی اقبال ہر دور کا شاعر ہے.....'' میں نے پُروا کے ہاتھ سے کتاب لے لی..... ''ضرور پڑھوں گا.....'' میں جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رُکا وہ سر جھکائے کسی سوچ میں گُم تھی ''پُروا''..... اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ہماری نظریں ایک لمحے کو ملیں، میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا ''نہیں..... کچھ نہیں.....'' میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے اور اس بار پُروا نے دھیرے سے میرا نام لیا۔ ''آیان.....'' میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔ ''کچھ نہیں.....'' کبھی کبھی جب کہنے کے لیے بہت کچھ ہو تب بھی کچھ کہا نہیں جاتا..... وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں ایک لمحے کے لیے دروازے کے قریب رُکا۔ ''جب تم ہسپتال سے لوٹ کر واپس یونیورسٹی آؤ گی۔ اُس روز ہم ویسٹ اورنج کے وھسپرز Whisper`s ریستورانٹ میں پوری ایک شام بتائیں گے..... اور وہ شام صرف ہماری ہو گی..... تب ہم ایک دوسرے سے وہ سب کچھ کہہ دیں گے جسے کہنے میں ہمیں ایک زمانہ لگا.....'' پُروا نے چونک کر سر اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک ایسی انمول چمک لہرائی جو اس کی آنکھوں کی جوت لَو ہمیشہ

کے لیے امر کر گئی ''سچ آیان.....'' میں دھیرے سے مسکرایا ''ہاں.....بالکل سچ.....'' میں پُروا کے کمرے سے نکلا تو مجھے سینکڑوں بار کی دیکھی ہوئی وہ راھداری جانے کیوں بالکل نئی اور بہت زیادہ جگمگاتی ہوئی نظر آئی۔ ہسپتال سے یونیورسٹی تک کے تمام دیکھے بھالے راستے کسی نئے پرستان کی ڈگر دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں پر جمی برف مجھے کسی سانتا کلاز کی جادو کی چھڑی سے چھڑکی گئی نمک کی پریوں جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ سڑکوں کے کناروں پر برف کے سفید گھوڑے اپنے سنہری رتھ میں جُتے میری بائیک کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے، جانے آج یہ کس کی بارات کا سماں طاری تھا؟ نیویارک کی شامیں تو سدا ہی گلابی تھیں لیکن آج یہ بکھرا اگلال کچھ خاص، کچھ سوا تھا۔ شائد محبت ہمارے اردگرد کے پُرانے ماحول پر قلعی پھیر کر اُسے پھر سے اُجال دیتی ہے۔ زنگ زدہ پُرانی بوسیدہ اشیاء چمکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ہزاروں بار کے دیکھے ہوئے نظارے بھی کنوارے محسوس ہوتے ہیں۔ شائد محبت ہماری ہستی کی ایک بار پھر سے تجدید کر دیتی ہے۔ آج میں بھی نیا اور تجدید شدہ تھا۔

میں نے ہاسٹل پہنچ کر احمر کو سب لڑکوں کو صحن میں جمع کرنے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ سب میرے سامنے موجود تھے۔ اُن سب کے چہروں پر ابھی تک وہی دن والے تاثرات نمایاں تھے۔ اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ صرف میرا بھرم رکھنے کے لیے بادلِ نخواستہ وہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں نے بات کا سِرا جوڑنے کی کوشش کی ''میں نے تم سب کو کسی نئی بحث میں اُلجھانے کے لیے یہاں اکٹھا نہیں کیا۔ میرے پاس اب کوئی تازہ دلیل بھی نہیں ہے۔ جنون کے آگے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ ہم مسلمانوں کا اس دور میں یہی سب سے بڑا المیہ رہا ہے کہ جہاں قلم کے جہاد کی ضرورت ہوتی ہے، ہم وہاں تلوار اُٹھا لیتے ہیں اور جہاں تلوار کی دھار کے پنا کام نہیں چل سکتا وہاں ہم قلم کی سیاہی خشک کرتے رہتے ہیں۔ خود کو بے مقصد بحث میں الجھائے رکھتے ہیں۔ اور پھر زمانے بھر کو اپنی مظلومیت کی دُھائی دیئے پھرتے ہیں۔'' میں کچھ دیر سانس لینے کے لیے رُکا۔ وہ سب سر جھکائے چپ چاپ کھڑے رہے۔ میں نے بات جوڑی ''کیا تم لوگوں کا اب بھی یہی خیال ہے کہ صرف فنا ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے.....؟ کیا تم لوگوں کا اپنے دین سے بھروسہ ہمیشہ کے لیے اُٹھ گیا ہے.....؟'' بلال نے میری بات کا جواب دینے میں پہل کی ''نہیں..... یہ ہمارا دین پر بھروسہ ہی تو ہے جو ہمیں اس حد سے گزرنے کی

ہمت دے رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ قدم ہم سب پر ہمیشہ کے لیے انتہا پسندی کی شناخت کی ایسی مُہر لگا دے گا جو ہماری سات نسلیں بھی نہیں دھو پائیں گی..... لیکن تم ہی بتاؤ..... اور کوئی چارہ ہے کیا.....؟..... کوئی کرن باقی نہیں بچی ہمارے لیے اس گھپ اندھیرے میں.....'' میں اِسی موقعے کے انتظار میں تھا، ''ایک کرن باقی ہے ابھی.....'' ان سب نے چونک کر اپنے سر اُٹھائے اور میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا رسالہ کھولا اور لورین بُوتھ کے قبول اسلام کی خبر انہیں پڑھ کر سنائی۔ ''اگر تم سب کا اپنے دین پر کامل یقین اب بھی برقرار ہے تو اس خبر کو تم سب بار بار پڑھنا..... یہ اُسی مغربی معاشرے کی ایک سچی عورت کی کہانی ہے جو شائد اسلام قبول کرنے سے چند دن پہلے تک انہی لوگوں کی طرح سوچتی ہو جنہیں تم لوگ قتل کر کے ختم کرنے کے درپے ہو..... لیکن اس عورت کے مقدر میں قُدرت نے فلاح کا راستہ لکھ دیا تھا۔ سوچو اس پورے ہال میں اگر ایک بھی ایسا فرد ہُوا جس کے نصیب میں آگے چل کر سچائی کا یہ راستہ لکھ دیا گیا ہو تو اُس کی فنا کا حساب کون دے گا.....؟؟ جب اگلے جہاں میں وہ دربارِ الٰہی میں فریاد کرے گا کہ اُس سے تو اس کا مقدر ملنے سے پہلے ہی چھین لیا گیا، تو کون ذمہ داری لے گا.....؟'' وہ سب چُپ رہے۔ احمر نے خود کو سنبھالا ''لیکن ہم کسی کافر کے مستقبل کی آس پر اُسے حال میں ایسی گستاخی کی اجازت بھی تو نہیں دے سکتے..... ہمارا اللہ ہماری نیتوں کا حال جانتا ہے.....'' میں نے زور دے کر کہا ''نہیں ..... ہم کبھی ایسی کسی بھی گستاخی کی اجازت نہیں دیں گے اُنہیں .....بس ..... ایک بار میرا ساتھ دو..... میں تم سب کے سامنے اعتبار کی بھیک کا کشکول لیے کھڑا ہوں..... خدا کے لیے خود کو اس جنون کے سُپرد نہ کرو..... میری بات مان جاؤ.....'' ان کے چہروں پر کش مکش کے آثار نظر آئے۔ پھر سب سے پہلے بلال نے ہی دو قدم اُٹھائے اور وہ میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں آیان کے ساتھ ہوں.....'' اور پھر رفتہ رفتہ کچھ اور لڑکے بھی میرے بھروسے بھیڑ میں سے نکل میری جانب آتے گئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر دوسری جانب صرف احمر اور حافظ شکیل کھڑے رہ گئے۔ احمر نے سر جھکا لیا۔ ''لیکن اُن لوگوں کا کیا بنے گا جن سے شکیل نے مدد کا وعدہ بھی لے لیا ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں ہم سے کہا تھا کہ ایک بار جب وہ قدم اُٹھا لیں تو نہ وہ خود واپس پلٹتے ہیں نہ کسی کو پلٹنے دیتے ہیں۔ وہ لوگ سیمینار کو سبوتاژ کرنے کے

لیے ضرور آئیں گے اُس دن.....'' میں نے انہیں تسلی دی ''اُن کی فکر تم مجھ پر چھوڑ دو.....اب اگر وہ تم میں سے کسی سے بھی رابطہ کریں تو انہیں میرا نمبر دے دینا کہ تم لوگوں نے حتمی فیصلے کا اختیار مجھے دے دیا ہے.....لہٰذا اب وہ مجھ سے بات کریں.....'' شکیل اور زرک اب بھی تذبذب کا شکار تھے۔ ''لیکن تمہارے ذہن میں آخر اُس سیمینار کو روکنے کا منصوبہ ہے کیا.....؟؟'' میں نے گہری سانس لی ''فی الحال خاکہ کچھ واضح نہیں ہے.....لیکن مجھے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہال کی نشستوں کے ٹکٹ چاہیے ہوں گے کل صبح سے پہلے ہمارا تمام مسلم گروپ چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دے گا.....لڑکیاں اور لڑکے مل کر یہ کام کریں گے لیکن ہم دوسری یونیورسٹیوں کے صرف مسلم طلبہ تک محدود رہیں گے..... تین ہزار نشستوں میں سے جتنے بھی ٹکٹ خرید سکتے ہو.....خرید لو.....لیکن خیال رہے کہ یہ کام بہت خاموشی کے ساتھ کرنا ہوگا، تمہارے غیر مذاہب کے دوست بھی اگر تم لوگوں کے لیے اپنے نام سے ٹکٹ خرید کر لا سکیں تو کوئی حرج نہیں.....لیکن پیسے پورے ادا کرنے ہوں گے.....'' لڑکوں نے اپنے سر ہلائے۔ شائد میری طرح اُن کے ذہن میں بھی کوئی نامکمل خاکہ بن رہا تھا۔ لیکن ہم سب کا مسئلہ یہ تھا کہ ہم میں سے چند ہی ایسے تھے جو اپنے جیب خرچ سے ٹکٹ خریدنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ ورنہ پانچ سو یا ہزار ڈالر کا ٹکٹ خریدنا ہمارے لیے خواب ہی تھا۔ جانے اس لمحے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا جیسے یونیورسٹی انتظامیہ نے جان بوجھ کر ٹکٹوں کی قیمت اتنی زیادہ رکھی تھی تاکہ وہ مسلمان طلباء کی دسترس سے باہر رہیں۔ مجھے اس لمحے عامر بن حبیب کی کمی شِدّت سے محسوس ہوئی۔ مجھے کل ہی احمر نے بتایا تھا کہ اس کا یونیورسٹی والا اکاؤنٹ سیل کر دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے پیسوں سے مسلمان ''انتہا پسند گروہوں'' کی مدد نہ کر سکے..... اگر نیویارک پولیس او۔سی آئی اے والوں نے عامر بن حبیب کی رقوم کی منتقلی پر پابندی نہ لگائی ہوتی تو اکیلا عامر ہی سارے ہال کی نشستیں خرید سکتا تھا لیکن اب ہمارے ہاتھ بندھ چکے تھے.....ہمیں اپنے زورِ بازو پر ہی اکتفا اور بھروسہ کرنا تھا اور اگلے روز تیر اور جگر آزمانے کا یہ خاموش مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ لڑکیوں نے اپنے زیور اور باقی تمام غیر ضروری اشیا ''برائے فروخت'' رکھوا دیں اور لڑکے بھی کلاس کے بعد خالی وقت میں کچھ نہ کچھ کمانے کی دُھن میں سرگرداں ہو گئے۔ میرے پاس بیچنے کے لیے اپنی بے مول رُوح کے علاوہ صرف ایک ہی چیز تھی سو میں اُسے لے کر

سرِ شام نیگروز کے علاقے میں ٹم کے پاس جا پہنچا۔ وہ میری بات سن کر حیرت سے چلایا ''کیا؟؟..... تم اپنی بائیک بیچنا چاہتے ہو..... وہی بائیک جس نے مجھے شکست دی تھی اور جسے پانے کے لیے اب نیویارک کا ہر رائیڈر کھلاڑی بے تاب ہے..... تم ایسی ان مول ساتھی کو کیسے بیچ سکتے ہو آیان..... ایک بار پھر سوچ لو.....'' میرے پاس سوچنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا دوست..... تم یہ بتاؤ..... کیا تم میری بائیک خریدو گے..... اِسے خریدنے والے شائد اور بہت مِل جائیں لیکن میں اسے کسی ایرے غیرے کو نہیں سونپنا چاہتا..... میرا اور اس بائیک کا برسوں کا ساتھ رہا ہے..... میرے جسم کے ساتھ اس نے بھی بہت زخم سہے ہیں..... لہٰذا اس کا حق ہے کہ اسے کسی بہترین سوار کے سپرد کیا جائے..... ''ٹم میرے افسردہ چہرے کو دیکھ کر خود بھی غمگین ہو گیا'' ہاں..... میں اسے ضرور خریدوں گا..... اور اتنی ہی تعظیم دوں گا جس کی یہ حق دار ہے..... لیکن اس نایاب مشین کے بدلے میں تمہیں صرف پانچ ہزار ڈالر دے سکتا ہوں..... یہ میری اب تک کی کل جمع پونجی ہے..... اگر تمہیں قبول ہو.....'' میں نے بنا کچھ کہے سر ہلا دیا، ٹم اندر چلا گیا ور کچھ دیر بعد واپس لوٹا تو رقم اس کے ہاتھ میں تھی جو اُس نے میری شرٹ کے جیب میں منتقل کر دی'' میں جانتا ہوں آیان..... تم نے کسی عظیم مقصد کے لیے ہی اپنی اس ساتھی کو قربان کیا ہو گا..... اور میں آج تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی تم اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہو..... یہ یہیں تمہاری منتظر رہے گی..... میں اسے کسی بھی حال میں فروخت نہیں کروں گا.....'' میں ٹم کا شانہ تھپتھپا کر پلٹ گیا۔ کون کہتا ہے کہ بے جان اشیاء کے پاس زبان نہیں ہوتی۔ مجھے تو واپسی کے ہر قدم پر ایسا ہی محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھے پکار رہی ہے۔ رو رہی ہے اور مجھے روکنے کی کوشش کر رہی ہے..... لیکن میں نہیں رُکا اور بنا مڑ کر دیکھے وہاں سے چلا آیا۔ پُروا کی غیر موجودگی میں اُس کی ذمہ داریاں صنم کبیر نے سنبھال لی تھیں، اور وہ حسبِ عادت خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کی اداس آنکھیں یہ راز کھول جاتی تھیں کہ بسام اس کی یہ سرگرمی پسند نہیں کرتا۔ پُروا ہسپتال میں تھی لیکن وہ ہر لمحے کی خبر رکھتی تھی۔ اتفاق سے اس کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کی تاریخ بھی سیمینار والے دن کی ہی تھی۔

سیمینار میں صرف سات دن باقی تھے لیکن ابھی تک ہمارا گروپ بمشکل 437 چار سو سینتیس

ٹکٹ ہی خرید پایا تھا، اور یہ بھی تمام تر پچھلی نشستوں والے پانچ سو ڈالر مالیت کے ٹکٹ تھے۔ ٹکٹوں کی فروخت جاری تھی اور جم، ایرک اور جینی نے بھی ہمارے لیے پچاس سے زائد ٹکٹ خرید لیے تھے لیکن اتنی زیادہ مالیت کے تمام ٹکٹ خریدنا ہم میں سے کسی کے بس کی بھی بات نہیں تھی۔ ہم نے خاموشی سے دیگر یونیورسٹیوں کے مسلم گروپوں سے چندہ اکٹھا کرنا بھی شروع کر رکھا تھا اور لڑکیاں دن بھر نیویارک کی یونیورسٹیوں میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق سیمینار میں پہلی فوقیت ہماری اپنی یونیورسٹی کے طلباء کی شرکت کو دی جا رہی تھی اور نشستیں بچ جانے کی صورت میں باقی یونیورسٹیوں کو بھی ٹکٹ خریدنے کی پیش کش کی جاتی لیکن جس رفتار سے ٹکٹ بک رہے تھے اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ شائد ہال ہماری یونیورسٹی کے طلباء سے ہی بھر جائے گا۔ میں اسی جمع تفریق میں پڑا ہوا تھا کہ میرے موبائل پر کوئی انجان نمبر جگمگانے لگا..... ''ہیلو.....'' ''کیا تم آیان بول رہے ہو.....'' ''ہاں..... میں آیان ہوں..... لیکن تم کون؟.....'' ''میری شناخت کی فکر چھوڑ دو..... بس اتنا جان لو کہ ہم سب تمہاری شہہ رگ کے آس پاس رہتے ہیں اور ہمارا دل تمہارے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے..... تمہارے درد کو محسوس کر کے ہی ہم نے تم لوگوں کی مدد کا سوچا ہے..... لیکن تم یہ کس ہیر پھیر میں پڑ گئے ہو..... تم کیا سمجھتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ حاصل کر کے تم ان لوگوں کو اُس ملعون حرکت سے روک پاؤ گے.....؟ نہیں..... یہ وہ لاتوں کے بھوت ہیں جن پر کوئی بات اثر نہیں کرتی..... دین قربانی مانگتا ہے نوجوان..... اور ہم سب تم لوگوں کی طرف سے قربانی دینے کے لیے تیار ہیں..... پھر یہ ہچکچاہٹ کیسی؟؟''

میں دوسری طرف کی بات سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ اُسی گروپ کا فون ہے جو خود کو جہادی کہتا ہے۔ میں نے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا..... ''تم اگر واقعی مدد کرنا چاہتے ہو تو صرف ہماری شناخت پر لگے اس جنون اور انتہا پسندی کے دھبّے کو مٹانے میں ہماری مدد کرو..... تمہارا ایک دھماکہ چند جسم تو ضرور فنا کر دے گا لیکن ہمارے خلاف پلتی سوچ اور نفرت میں ہزار گنا اضافہ کر جائے گا..... پھر شائد ہم میں سے کوئی اس سوچ کو مٹانے کے لیے یہاں موجود بھی نہ ہو..... لہٰذا اپنا ارادہ بدل دو..... مجھے تم لوگوں سے صرف اچھی دُعا کی ضرورت اور اُمید رہے گی.....'' دوسری جانب سے بھی میری بات

اطمینان سے سُنی گئی۔ ''تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو کونسلر..... ان کتابی باتوں کا اثر وہاں ہوتا ہے جہاں اگلے کی نیّت فلاح پانے کی ہو..... لیکن تم جن لوگوں سے لڑ رہے ہو..... اُن کی نیت میں ہی فتور ہے..... اُن کے قلب سیاہ ہو چکے ہیں اور اب اُن کا علاج صرف اچانک اور ایک بجلی کی طرح چمکتی قضاء ہے..... اور تم اس قضاء کا راستہ روکنے کی حماقت کر رہے ہو..... جلد یا بدیر انہیں ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہونا ہے..... لہٰذا تم خود کو اس اُلجھن سے دور ہی رکھو تو بہتر ہو گا.....''

میں نے حتمی لہجے میں بات ختم کی ''میں تمہارے ساتھ کسی جائز اور ناجائز کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ نیتوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، سو میں تو یہی دعا کروں گا کہ رب اُن کی نیت بھی ہمارے حق میں بہتر کر دے جو ہماری شناخت مٹانے کے درپے ہیں۔ میری اور تمہاری لڑائی کا میدان الگ ہے..... اور اگر ہم دونوں کی نیت ایک ہے تو پھر ایک دوسرے کا راستہ کاٹنے سے فائدہ نہیں..... دوبارہ مجھے فون نہ کرنا.....'' میں فون بند کرنے لگا تو اُس نے کڑک کر کہا ''سنو لڑکے..... تم پچھتاؤ گے''۔ لیکن میں نے اس کی بات پوری ہونے سے قبل لائن کاٹ دی۔ دن لمحوں کی طرح گزرنے لگے اور پھر آخر کار سیمینار سے قبل والی شام بھی آ پہنچی۔ ہم سب مسلم ہاسٹل کے دالان میں جمع اپنے ٹکٹ گن رہے تھے۔ کل صبح کی تقریب کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ شہر کے بڑے اور مشہور یہودی اور عیسائی علماء کو بھی تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے ان چند دنوں میں ڈین سے ملنے کی بارہا کوشش کی لیکن مجھے ہر بار ناکامی ہوئی تھی۔ میں اپنے شوکاز نوٹس کا جواب داخل کرانے کے لیے خاص طور پر روزانہ صبح و شام اس کے دفتر کے چکر لگاتا رہا لیکن مجھے اپنا جواب ڈیسک پر جمع کروانے کی ہدایت دے دی گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ ڈین جان بوجھ کر سیمینار سے پہلے کسی وضاحت سے بچنے کے لیے مجھے ٹال رہا ہے۔ لڑکوں کی بے چینی بھی حد درجہ بڑھ چکی تھی مگر وہ میرے کسی بھرم کی خاطر اپنے لبوں کو سیئے ہوئے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی ہے۔ احمر نے ٹکٹ گن کر مایوسی سے سر ہلایا۔ ''ہم صرف چھ سو ستر 670 ٹکٹ خرید پائے ہیں آیان..... اگر تمہارا ارادہ ہال کی زیادہ سے زیادہ نشستیں خرید کر انتظامیہ پر دباؤ بڑھانے کا تھا تو ہمارا یہ منصوبہ ناکام ہو چکا ہے.....'' اتنے میں مسلم گروپ کی لڑکیاں دوسری یونیورسٹی

کی لڑکیوں کے ساتھ صنم کبیر کی سربراہی میں مسلم ہاسٹل کی راہداری میں داخل ہوئیں۔ صنم کبیر نے اپنے بیگ سے ٹکٹ نکال کر لہرائے اور خوشی سے بولی ''ہمارے تین سو بیس 320 ٹکٹ بھی شامل کر لو..... یہ دوسری یونیورسٹی کی مسلم لڑکیوں کی محنت کی کمائی ہے.....'' بلال نے تمام ٹکٹ یکجا کر کے لہرائے ''نو سو نوے 990.....'' ہم سب نے پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہال میں مسلم اکثریت حاصل کرنے کے لیے ہمیں اب بھی تقریباً چھ سو ٹکٹ درکار تھے۔ احمر کا اندازہ ٹھیک تھا۔ میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس کے لیے کثیر تعداد میں ٹکٹوں کا ہونا بہت ضروری تھا۔ لیکن ہم سب دو ہفتے کی سرتوڑ کوشش کے بعد صرف ایک تہائی ٹکٹ جمع کر سکے تھے۔ ہال کی دو ہزار دس نشستیں اب بھی کسی اور کے پاس تھیں۔ بلال کی اطلاع کے مطابق ٹکٹ ختم ہو چکے تھے۔ احمر نے مایوسی سے سر ہلایا ''ہم ہار گئے آیان.....'' اور ٹھیک اسی لمحے دروازے کی جانب سے آواز اُبھری ''نہیں..... ہمارے ہوتے ہوئے آیان کبھی ہار نہیں سکتا.....'' ہم سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور دروازے میں کھڑے فرد کو دیکھ کر ہم سب پریشانی میں اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے۔

باب 20

ہاسٹل کے بیرونی دروازے پر شمعون اور جارج اپنے گروپ کے چند لڑکوں کے ساتھ کھڑے تھے، ہم سب یہودی اور عیسائی کونسلر کو ایک ساتھ مسلم ہاسٹل میں ایسے وقت دیکھ کر پریشان ہو گئے کیونکہ ہم نے اب تک اپنا ٹکٹ جمع کرنے کا منصوبہ ہر ممکن حد تک خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ احمر نے کڑک دار آواز میں کہا ''تم لوگ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو.....؟''۔ وہ لوگ اندر داخل ہو گئے، شمعون میرے مقابل آ کھڑا ہوا ''آیان..... تم نے اُس دن کہا تھا کہ پُروا نے صرف ہماری دشمنی ختم کرنے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی لیکن ہم اتنے کم ظرف نکلے کہ ہم اُسے دیکھنے ہسپتال بھی نہ جا سکے۔ آج ہم نے وہ داغ دھو دیا ہے دوست..... میں مائیکل اور جارج کے ساتھ ابھی ہسپتال سے واپس لوٹا ہوں۔ پُروا تو ہمیں پہلے معاف کر چکی ہے..... لیکن اس کی دشمنی ختم کرنے کی شرط پوری کرنے کے لیے میں خود یہاں چل کر آیا ہوں..... کیا ہم بیتی باتیں بُھلا نہیں سکتے.....؟'' تمام مسلم لڑکے لڑکیاں تذبذب کی کیفیت میں گم سُم کھڑے تھے۔ پھر میں نے ہی آگے بڑھ کر شمعون کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ''نظریات کا اختلاف اپنی جگہ..... لیکن ہماری تم لوگوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے..... ہم مسلم تو اِس وقت اپنی شناخت کی جنگ لڑ رہے ہیں..... مطمئن رہو..... ہمارے دل بہت بڑے ہیں..... تم سے کوئی گلہ باقی نہیں.....'' میں بات ختم کر کے واپس پلٹا لیکن شمعون کی بات نے میرے قدم روک لئے۔ ''اپنی اِس جنگ میں ہمیں شامل نہیں کرو گے آیان.....'' میں چونک کر واپس پلٹا۔ شمعون کے ہاتھ میں بہت سارے ٹکٹ لہراتے نظر آئے ''یہ وہ ٹکٹ ہیں جو یہودی اور عیسائی گروپ

کے طلباء نے سیمینار میں شرکت کے لیے خریدے تھے۔ تم نے اُس دن ٹھیک کہا تھا کہ ہم میں سے شائد کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے مذہب کی تعلیمات پر پُورا اُتر سکے..... یا اپنے دل میں اپنے مذہب کا پورا درد رکھتا ہو، ہم واقعی ایک بھیڑ چال کا شکار ہیں۔ لیکن میں آج ذاتی طور پر اس مخالفت برائے مخالفت کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ پُروا نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم لوگ زیادہ سے زیادہ ٹکٹ جمع کرنے کے مِشن میں مصروف ہو..... میں تم لوگوں کے لیے اور تو کچھ نہیں کر سکتا۔ بس یہ ٹکٹ حاضر ہیں..... اسے پُروا کے زخموں کا بدلہ ہرگز نہ سمجھنا..... یہ بس ایک کفّارہ ہے..... شاید ''مُقدّس'' کو مقدّس سمجھنے کی طرف ہمارا یہ پہلا قدم ہے.....'' شمعون میرے ہاتھ میں ٹکٹ تھما کر تیزی سے پلٹا اور اس کے پیچھے اس کے سارے ساتھی بھی چل پڑے۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا ''بات سُنو یہودی کونسلر.....'' شمعون ٹھٹھک کر رُک گیا۔ سارے ماحول پر شدید تناؤ چھا گیا۔ میں چند قدم چل کر شمعون کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر میں نے اپنا ہاتھ شمعون کی جانب بڑھا دیا۔ شمعون کی آنکھوں میں خوشی کی تیز چمک لہرائی اور اگلے ہی پل اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ چاروں طرف سیٹیوں اور تالیوں کا ایک شور سا مچ گیا۔ صنم کبیر کے ہر لمحہ تیار آنسو چھلک پڑے اور مجھے یوں لگا کہ شمعون اور جارج کے ہمارے ساتھ مِل جانے سے ہم آدھی جنگ پہلے ہی جیت گئے ہیں۔ میں شمعون اور جارج کو رُخصت کرنے کے لیے ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ جارج نے جاتے جاتے دھیرے سے میرے کان میں کہا ''پتا نہیں مجھے تمہیں یہ بات بتانی چاہیے کہ نہیں..... لیکن مجھے شک ہے کہ تمہارا بھائی بسام سی۔آئی۔اے والوں کے چُنگل میں پھنستا جا رہا ہے۔ اس سیمینار کی مُہم کے دوران میں نے کئی بار اُسے کچھ مشکوک لوگوں سے بات کرتے دیکھا ہے: شائد یہ میرا وہم ہو..... لیکن میں نے تمہیں بتانا ضروری سمجھا.....'' جارج میرا شانہ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا اور میں ان گنت سوالوں کی سُولی پر وہیں ٹنگا رہ گیا۔ قدرت کب، کس وقت اور کیسے کسی کی کایا پلٹ دیتی ہے، یہ ہم انسان کبھی نہیں جان پائے..... کل تک جو میرے بدترین دشمن تھے، پُروا کی قربانی کی وجہ سے وہ آج میرے شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے، مگر میرا اپنا خُون مجھے چھوڑ کر میرے دشمنوں کے ساتھ جا ملا تھا۔ میرے وجود میں دُکھ کی ایک شدید تیز لہر کسی نیزے کی طرح رُوح کی گہرائیوں تک

پیوست ہوگئی۔ لیکن جنگ میں سپاہی اپنے رِستے لہو کے قطرے اور کُھلے زخم نہیں گِنا کرتے۔ انہیں تو بس آگے بڑھنا ہوتا ہے، جنگیں رِشتوں کو مدِّنظر رکھ کر نہیں لڑی جاتیں، سُو میں بھی آگے بڑھ گیا۔ ہاسٹل میں احمر اور بلال ٹکٹ گِن رہے تھے، انہوں نے مجھے دیکھ کر خوشی سے نعرہ لگایا ''مبارک ہو آیان..... ہمارے پاس اب پورے دو ہزار نو سو ننانوے ٹکٹ موجود ہیں۔ صرف ایک ٹکٹ کم ہے لیکن اب پورا ہال ہمارے قبضے میں ہی ہوگا.....'' صنم کبیر نے جلدی سے اپنے بیگ میں سے یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہال کے انتظامی منشور کا کتابچہ نکال کر پڑھا..... کاش یہ آخری ٹکٹ بھی ہمارے پاس ہوتا تو ہم یونیورسٹی کے آڈیٹوریم قوانین کی رُو سے تمام ہال کو باقاعدہ سیل بھی کروا سکتے تھے۔ کیونکہ اس منشور میں صاف درج ہے کہ اگر کسی بھی فرد یا گروہ کے پاس نشستوں کی فروخت کی صورت میں پورے ہال یا مکمل تین ہزار نشستوں کے حقوق حاصل ہوں، تو وہ اُس خاص پروگرام یا ایونٹ Event کے لیے اُس مخصوص دن کی حد تک ہال کی ملکیت حاصل کر سکتے ہیں..... لیکن اگر ایک ٹکٹ یا نشست بھی کسی دوسرے فرد یا گروہ کی ملکیت ہو تو پھر باقی تمام ٹکٹ حاصل کرنے کے باوجود اکثریتی گروپ اُس روز اس پروگرام یا تقریب کے لیے ہال کے سارے حقوق حاصل نہیں کر سکتا.....'' احمر نے جوشیلے لہجے میں سب کو مخاطب کیا ''لیکن ہمارے پاس ابھی پوری رات پڑی ہے..... ہم کوشش تو کر سکتے ہیں اس آخری ٹکٹ کو پانے کی ..... ہمیں مختلف ٹولیوں میں بٹ کر وہ ٹکٹ تلاش کرنا ہوگا اور اس آخری ٹکٹ کی جتنی بھی قیمت لگے..... ہمیں اُسے حاصل کرنا ہی ہوگا..... صرف اسی صورت ہم یونیورسٹی انتظامیہ اور اس ڈینش این۔ جی۔ او کو مُنہ توڑ جواب دیں سکیں گے.....'' سارا گروپ اپنی اپنی بولیاں بول رہا تھا جب کہ میرے ذہن میں صرف ایک ہی خدشہ بار بار سر اُٹھا رہا تھا کہ کہیں اگر وہ آخری ٹکٹ خود ڈین یا یونیورسٹی انتظامیہ کی ملکیت ہوا، تو پھر ہم کیا کریں گے.....؟؟ ..... شام ڈھلنے لگی تھی اور آسمان پر گلابی بادلوں کی دھند ایک بار پھر برف باری کی پیشین گوئی کر رہی تھی۔ میں نے صنم کبیر سے کہا کہ میں ایک آخری کوشش کے طور پر بستام سے ملنا چاہتا ہوں۔ لڑکے اور لڑکیاں آخری ٹکٹ کی کھوج میں ٹکڑیوں میں بٹ کر روانہ ہو چکے تو میں اور صنم کبیر بھی ہاسٹل سے نکل آئے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور ہوا کے ساتھ آسمان سے ہلکے پھلکے برف کے گالے بھی اُڑ اُڑ کر ہمارے سروں میں چاندی

بکھیرنے لگے تھے میں اپنے اپارٹمنٹ کی بیرونی سڑک پر ہی رُک گیا۔ جہاں کافی بنانے کی خود کار مشین سے نشیلا دھواں اٹھ رہا تھا۔ صنم بسّام کو بُلانے کے لیے اوپر چلی گئی اور جب تک بسّام اس کے ساتھ نیچے واپس آیا، برف باری تیز ہو چکی تھی، میں نہ جانے کن خیالات میں گُم تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں فٹ پاتھ پر نصب جس بینچ پر بیٹھا ہوا ہوں اسے برف نے مکمل ڈھک لیا ہے۔ بسام نے قریب آ کر میرا نام لیا تو میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ صنم کبیر کچھ فاصلے پر بنے شیشے کے چوبارہ نُما بس اسٹاپ کی چھت کے نیچے کھڑی رہی، لیکن میں اتنی دُور سے بھی دُعا کے لیے اس کے تیزی سے ہلتے لبوں کی جُنبش محسوس کر سکتا تھا۔ میں اور بسام کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بسام نے ہی بات شروع کی۔

''کیسے ہو.....؟.....'' ''ٹھیک ہوں.....بس ہر سردی کے ساتھ آنے والے فِلو نے تنگ کر رکھا ہے.....'' بسام نے اپنی پریشانی چُھپانے کی کوشش کی ''تم اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتے.....، سارا دن اور ان برفیلی شاموں میں بائیک دوڑاتے پھرو گے تو یہی ہو گا.....'' پھر بائیک کا ذکر کرتے ہی بسام خود چونک سا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا ''تمہاری بائیک کہاں ہے؟.....'' ''میں نے بائیک بیچ دی ہے یار.....'' بسام کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ وہ جانتا تھا کہ میری زندگی میں اُس بائیک کی کتنی اہمیت تھی جسے میں بسام کو بھی چُھونے نہیں دیتا تھا۔ ''کیا.....؟؟؟.....تم نے بائیک بیچ دی.....مگر کیوں.....؟؟؟''

''میرے گروپ نے سیمینار کے زیادہ سے زیادہ ٹکٹ جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا مگر میرے پاس بیچنے کے لیے اور کچھ بھی نہیں تھا.....سو بائیک بیچ دی.....'' بسام ابھی تک حیرت اور دُکھ سے میری جانب دیکھ رہا تھا.....''یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا.....آج تمہیں دیکھ کر کون اس بات پر یقین کرے گا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو سارے شہر کے سو جانے کے بعد اپنی بائیک پر آوارہ گردی کے لیے نِکلا کرتا تھا.....تم کتنا بدل گئے ہو آیان.....'' میں نے کہیں دُور خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا ''شائد وقت ہر چیز بدل دیتا ہے.....خُون کے رِشتے بھی.....ایسا نہ ہوتا تو آج تم میرے خلاف سی۔آئی۔اے کا ساتھ نہ دے رہے ہوتے مُجھے سی۔آئی۔اے، ایف۔بی۔آئی یا کسی بھی ایسی دوسری ایجنسی کا کوئی خوف نہیں ہے.....لیکن میں آج آخری بار تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ یہ لوگ اپنے سوا کسی

اور کے نہیں ہوتے..... جانے انہوں نے تمہیں کس موقعے اور کس مقام کے لیے تیار کرنے کی ٹھانی ہے..... لیکن یاد رکھنا کہ یہ ایجنسیاں خود کسی جنون کی پیداوار ہیں..... یہ لوگ ہم مسلمانوں پر انتہا پسندی کا الزام لگاتے ہیں لیکن درحقیقت یہ خود نفرت کے جنون کی ایک زندہ مثال ہیں..... ہو سکے تو ان سے بچ کر رہنا.....'' برف نے ساری سڑک اور آس پاس کی ہر شے سفیدے سے ڈھک دی تھی۔ میں بات ختم کر کے واپس پلٹا تو میرے قدموں کے نشان برف میں ثبت ہو گئے۔ بسام نے مجھے آواز دی ''ٹھہرو آیان.....'' میں رُکا..... بسام کی آواز میں درد تھا ''گھر واپس لوٹ آؤ یار..... یہ ہم دونوں کن مخالف سمتوں میں چل پڑے ہیں۔ میں سی۔آئی۔اے کے ساتھ صرف اس لیے رابطے میں ہوں تا کہ وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں..... لیکن بات میرے ہاتھ سے بھی نکلتی جا رہی ہے..... پولیس آج کل جگہ جگہ مسلم طلبا کو انتہا پسندوں سے روابط رکھنے کے الزام میں گرفتار کر کے انہیں عمر بھر کے لیے جیلوں میں ڈال رہے ہیں اور کون جانے کہ انتہا پسندی کا یہ چارہ بھی خود یہی ایجنسیاں تیار کرتی ہوں..... یہ لوگ اپنی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں آیان..... اُن کے راستے کی رُکاوٹ نہ بنو..... میری بات مان جاؤ..... میں نے دُکھ کے ساتھ اپنے بھولے بھیّا کو دیکھا ''حیرت ہے..... جب تم یہ سب کچھ جانتے ہو..... پھر بھی ان کا ساتھ کیوں دے رہے ہو.....؟''.....اس لیے کہ یہ ان کا ملک ہے..... میں اور تم بھی امریکی ہیں اور یہ ہر امریکی کا حق ہے کہ وہ چین اور سکون سے اپنے ملک میں زندگی گزارے..... ''میں نے زور دے کر کہا''۔ ہاں..... یقیناً یہ ہر امریکی کا حق ہے..... لیکن شائد ہر مسلمان امریکی کا نہیں..... بہر حال..... میں تم سے مزید کوئی بحث نہیں کروں گا..... ہم دونوں اپنا اپنا راستہ چُننے کا حق رکھتے ہیں..... میں نے اپنے مذہب کے لیے امریکی قوانین کے اندر رہ کر لڑنے کا راستہ چُنا ہے..... مگر تمہارا راستہ کیا ہے..... یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے.....'' بسام کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''کس مذہب کی حفاظت کی بات کر رہے ہو تم.....؟ وہ..... جس پر عمل کیے سالوں بیت چُکے.....؟..... جسے آج تک تم نے کسی ناگوار فریضے کے طور پر برائے نام ابھی ادا نہیں کیا.....؟..... جس کے فرائض تو درکنار..... بنیادی ارکان کو سمجھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تمہیں.....؟ اور آج تم اُسی مذہب کی حفاظت کا بیڑہ اٹھا رہے ہو.....؟ حیرت ہوتی ہے مجھے تمہاری اِن باتوں پر آیان.....'' میں

سر جھکائے بسام کی بات سنتا رہا۔ زمین پر ہمارے قدموں کے اردگرد برف کا گڑھا بھرتا جا رہا تھا۔

"ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... یہ وہی مذہب ہے جس پر میں نے کبھی عمل کرنے کا سوچا تک نہیں تھا..... جسے میں آج تک برائے نام بھی پورے دل سے ادا نہیں کر سکا..... اور جس کے بنیادی ارکان کو اپناتے اپناتے میرا جیون بیت گیا..... لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے بسام..... کیا مجھے آج تک تم امریکہ میں آ کر اسی ست رنگی زندگی کے جال میں خود کو الجھا نہیں بیٹھے تھے.....؟..... گھر میں صرف ہماری ماں تھی جو اس دین سے ہمارے تعلق کا ایک واحد ذریعہ تھیں..... لیکن کیا ہم دونوں نے کبھی ان کی بات ہی غور سے سُنی تھی.....؟..... میرے، تمہارے اور ہم جیسے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کے پاس مذہب یا اسلام کا کریڈٹ ہی کتنا ہے..... صرف یہی کہ ہمیں خُدا نے کسی مسلمان گھرانے میں پیدا کر کے ہماری مُشکل آسان کر دی۔ ورنہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ اگر ہم کسی عیسائی یا یہودی گھرانے میں پیدا ہوتے تو کیا تب بھی ہمارے اندر اتنی جرأت اتنی روشنی ہوتی کہ ہم خود اپنی کھوج کے بل پر اس مذہب کے دروازے سے اندر داخل ہو پاتے.....؟؟۔ کم از کم میں تو خود میں ایسی کوئی سچائی کی جوت جلتے ہوئے نہیں دیکھتا..... لیکن آج اگر قدرت نے خُود مجھے ایک موقع دیا ہے کہ میں اپنے دین کے لیے یہ چھوٹی سی خدمت اور کارگزاری دِکھا سکوں تو کیا مجھے یہ سوچ کر رُک جانا چاہیے کہ مجھے تو فرض نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں رہتیں..... میں دو کلموں کے بعد تیسرے کلمے پر ہی گڑبڑا جاتا ہوں..... مجھے وضو کے فرض اور سنتوں کا فرق پتا نہیں ہے یا میں نے آج تک روزہ نہیں رکھا، زکوٰۃ نہیں دی.....؟ اگر تقدیر نے موقع اور قدرت نے توفیق دی تو ایک دن یہ سب بھی سیکھ ہی جاؤں گا۔ لیکن میرے مُقدّر نے مجھے اس کل ہونے والے سیمینار کے ذریعے اپنے مذہب سے روشناس ہونے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ شائد اگر ہم پاکستان میں ہوتے تو میں بھی ہر عام مسلمان کی طرح کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ترتیب سے دین کو سمجھ پاتا..... لیکن ہم امریکہ میں پلے بڑھے ہیں بسام..... لہٰذا مجھے اتنی رعایت تو دو کہ میں اپنی خامیوں پر قابو پانے کی کوشش کر سکوں..... کل وہ جس دین پر کیچڑ اُچھالنے جا رہے ہیں..... وہ تمہارا بھی مذہب ہے..... اور جس عظیم الشان ہستی ﷺ اور جس خاتم النبین ﷺ پیغمبر کی شان میں (نعوذ باللہ) گستاخی کی کوشش کی جا رہی ہے وہ صرف میرے تمہارے

نہیں، ساری کائنات کے نبی آخرالزمان ﷺ ہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم ہماری صف میں کھڑے ہو کر ہمارے ساتھ لڑتے ہو یا پھر ہمارے دشمنوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ہمارا تماشہ دیکھتے ہو..... ہاں..... البتہ دونوں صورتوں میں تم مسلمان ہی کہلاؤ گے.....'' میں بسام کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا، برف پر اپنے جوتوں کے نشان بناتا دوسری سمت بڑھ گیا۔ شائد صنم کبیر بھی میرے نقشِ قدم پر چل پڑی تھی۔ تبھی مجھے اُسے پکارتی بسام کی آواز سنائی دی لیکن صنم کبیر نہیں رُکی۔ جب تک ہم دونوں صنم کی دُور پارک کی گئی کار تک پہنچے، ہم تیز گرتی برف سے ڈھکے جا چکے تھے..... صنم نے مجھ سے کہا ''چلو میں تمہیں ہاسٹل تک چھوڑ دیتی ہوں.....'' اس کی بھیگی پلکیں بتا رہی تھیں کہ اس نے بسام کی پکار پر نہ رُکنے کے لیے اپنے اندر کتنی بڑی جنگ لڑی ہے، میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ٹھیک اُسی لمحے میرے موبائل پر احمر کا نمبر جگمگانے لگا۔ ''ہیلو'' دوسری جانب سے احمر کی پریشانی سے بھرپور آواز اُبھری ''آیان..... تم اس وقت کہاں ہو.....؟.....'' ''اپنے اپارٹمنٹ کی بیرونی سڑک پر..... کیوں.....؟ خیریت.....؟..... نہیں..... سب ٹھیک نہیں ہے..... نیویارک پولیس نے تمہیں گرفتار کرنے کے لیے کچھ دیر قبل مسلم ہاسٹل پر چھاپہ مارا ہے..... ان کے ساتھ کچھ سادہ لباس والے اور وہ آفیسر فورڈ بھی ہے جو تم سے ملنے اُس روز ہسپتال آیا تھا..... تم وہاں سے جلدی نکلنے کی کوشش کرو..... کیونکہ یہاں ناکامی کے بعد یہ لوگ ضرور تمہارے گھر پر بھی دھاوا بولیں گے، اور ہاں..... مسلم ہاسٹل کی طرف بالکل نہ آنا..... یہ لوگ ساری رات یہاں پہرے کا منصوبہ بنا کر آئے ہیں..... تم گراؤنڈ زیرو پہنچنے کی کوشش کرو..... ہم کچھ انتظام کرتے ہیں.....'' احمر نے جلدی میں فون بند کر دیا۔ میں نے حیران پریشان سی کھڑی صنم کبیر کو ساری بات بتائی، اُسے غصہ آ گیا۔ ''میں جانتی تھی..... یہ لوگ سیمینار سے پہلے ہمارے خلاف کریک ڈاؤن ضرور کریں گے..... اور ہماری کمر توڑنے کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کونسلر کو ایک رات پہلے گرفتار کر کے اس سیمینار کی سازش کو کامیاب بنایا جائے..... صنم کبیر تنگ گلیوں کے درمیان گاڑی دوڑاتے ہوئے گراؤنڈ زیرو کی طرف بڑھتی رہی ہم مرکزی شاہراہوں پر پولیس کی موجودگی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اور میں کل یونیورسٹی جائے بنا کسی بھی حال میں گرفتاری نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہم گراؤنڈ زیرو پہنچے تو

گھڑیال رات کے بارہ بجا چکا تھا۔ چوراہے کے گرد تیز زرد رنگ کی طاقت ور لائٹس نے آس پاس گرتی برف پر بھی نارنجی رنگ چھڑک کر اُس میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ صنم کبیر میرے ساتھ وہاں رُکنا چاہتی تھی لیکن میں نے زبردستی اُسے گھر واپس بھجوا دیا، کیونکہ میری آج رات گرفتاری کی صورت میں اُسے کل صبح بہت اہم ذمہ داری نبھانا تھی۔ وہ جاتے جاتے بھی مُڑ مُڑ کر میری جانب دیکھتی رہی اور پھر اس کی کار سفید دُھند میں کہیں غائب ہوگئی۔

میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اونچے کر کے زِپ اوپر تک کھینچ لی۔ تیز برچھی جیسی ہوا میرے روئیں روئیں کو کاٹنے لگی تھی تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب ایک سیاہ ویگن گراؤنڈ زیرو کے چوراہے کے گرد گھومتی گول سڑک پر نمودار ہوئی۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ فورڈ کی گاڑی ہو۔ لیکن قریب آنے پر اس میں سے میرے پرانے چار یار، وفادار برآمد ہوئے۔ ''ہے آیان..... سوری ہمیں آنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ نیویارک پولیس سارے شہر میں تمہاری تلاش میں بھٹک رہی ہے..... ہمیں بھی یہاں سے نکلنا ہوگا.....'' میں بِنا کچھ کہے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایرک نے مجھے راستے میں بتایا کہ پولیس کی پوری کوشش ہے کہ مجھے کل صبح یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے گرفتار کر لیا جائے کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد تین ہزار طلباء کی موجودگی میں مجھے کیمپس سے گرفتار کرنا اُن کے لیے کافی مشکل ثابت ہوسکتا تھا۔ جینی خود وین ڈرائیو کر رہی تھی، اُس نے ویسٹ اورنج کی جانب سے لمبا موڑ کاٹا اور بولی ''لیکن تمہیں صبح یونیورسٹی کیمپس میں اتنے سخت کڑے پہرے میں داخل کرنا بھی ناممکن ہوگا..... اس لیے ہم نے ایک آخری جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے..... ہم آج رات ہی تمہیں دوبارہ مسلم ہاسٹل میں کسی بھی طرح پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ پولیس وہاں کی تلاشی کے بعد کافی حد تک مطمئن ہو چکی ہوگی اور ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ تم دوبارہ وہاں آؤ گے..... اور صبح یونیورسٹی لگتے ہی تمہیں اندرونی راستے سے کیمپس پہنچا دیا جائے گا۔ ایک بار تم یونیورسٹی کی چاردیواری میں داخل ہو جاؤ..... پھر سارے نیویارک کی پولیس اور ایجنسیاں مل کر بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں''۔ ''لیکن انہوں نے مجھ پر الزام کیا لگایا ہے؟..... اچانک ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا مجھ سے کہ انہیں یوں راتوں رات میری تلاش میں سارا شہر چھاننے کی ضرورت پیش آ گئی.....؟''..... فرہاد کھڑکی سے باہر گرتی برف کے

گالے اپنی مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا ''تم پر مسلم انتہا پسندوں سے رابطے رکھنے کا الزام ہے..... سی۔آئی۔اے کی اطلاع کے مطابق تم نے کسی جنونی گروپ کے ساتھ مل کر کل کے سیمینار کو بم دھماکے سے سبوتاژ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے.....'' فرہاد کی بات سن کر خود میرے سر میں بیک وقت کئی دھماکے ہوئے۔ میں نے انہیں حافظ شکیل کو آنے والی کال اور اس کے بعد کا سارا واقعہ سنا دیا۔ جم نے پریشانی سے میری طرف دیکھا ''پھر تو یہ واقعی بہت پریشانی کی بات ہے..... اب آگے کیا ارادہ ہے.....؟'' میں نے وین کے شیشے سے باہر برف کے جگنو گنتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم کہا۔ ''فی الحال تو مجھے صرف کل کے سیمینار کی فکر ہے..... ایک بار یہ معاملہ خوبی سے نبٹ جائے..... پھر آگے کی سوچیں گے..... مگر مجھے احمر نے فون پر بتایا تھا کہ پولیس نے ہاسٹل کے گرد کڑا پہرا لگا رکھا ہو گا..... کیا ایسی صورت میں ہم ہاسٹل میں داخل ہو سکیں گے.....؟.....'' جینی نے تیزی سے گیئر بدلا..... ''یہی پریشانی ہے مجھے بھی..... لیکن اتنا رسک تو شائد لینا ہی پڑے گا ہمیں.....'' اچانک فرہاد کے سیل فون کی گھنٹی بجی، اس نے دوسری جانب کی بات سنی اور پھر پریشانی میں فون بند کر دیا۔ ''پولیس نے شکیل بنگالی کو گرفتار کر لیا ہے، سوڈانی بلال اور مسلم گروپ کے چند دوسرے لڑکوں کو بھی گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا ہے۔ پاکستانی زرک خان بھی ان میں شامل ہے.....'' ''وین میں کچھ دیر سناٹا طاری رہا، صرف برف پر پھسلتے ٹائروں کی مدہم آواز کچھ اس طرح سنائی دیتی رہی جیسے بہت دُور کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ مسلم گروپ کے لڑکوں کی گرفتاری نے ہم سب کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے شدید پریشانی کے عالم میں فرہاد سے پوچھا۔ ''ہال کے جمع شدہ ٹکٹ کس کے پاس ہیں.....'' فرہاد کا چہرہ بھی تاریک ہو گیا۔ ''ٹکٹ.....؟ ٹکٹ تو ہم سبھی نے گن کر دوبارہ بلال کے حوالے کر دیئے تھے..... اوہ میرے خُدا..... کہیں پولیس کے ہاتھ بلال کے ساتھ وہ ٹکٹ بھی.....'' فرہاد پریشانی میں خود اپنی بات بھی ختم نہ کر سکا۔ ٹکٹوں کی گم شدگی کی صورت میں یونیورسٹی آڈیٹوریم کے قوانین کے مطابق یونیورسٹی انتظامیہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے طور پر نشستوں کی دوبارہ تقسیم کر دے۔ انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق ''مصیبتیں اور مشکلات کبھی تنہا نہیں آتیں''، شائد ہماری آج کی رات اس محاورے کو پوری طرح سچ ثابت کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ جینی نے ہاسٹل

جانے والی سڑک پر گاڑی موڑی تو سامنے ہی ایک لمبی قطار میں نیویارک پولیس کی نیلی پٹیوں والی سفید کاریں کھڑی نظر آئیں۔ کاروں کی چھت پر لگی نیلی اور سرخ بتیوں کی گھومتی روشنیوں سے سارا ماحول جگمگا رہا تھا۔ ہاسٹل کے باہر کافی چہل پہل نظر آ رہی تھی اور پولیس کے علاوہ سادہ لباس والے بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے اور سرگرداں دکھائی دے رہے تھے۔ ایرک نے سرگوشی کی ''یہ تو ابھی تک یہیں دھرنا دیئے بیٹھے ہیں۔ اب کیا کریں.....'' جینی نے حتمی فیصلہ کر لیا۔ ''آیان.....تم گاڑی کے پچھلے حصّے میں رکھی ترپال سے خود کو اچھی طرح ڈھک لو..... اور جب تک میں خود تمہیں آواز نہ دوں.....پچھلی سیٹوں کے درمیان ہی دُبکے رہنا۔ ہمیں کسی بھی حال میں اندرِ داخل ہونا ہوگا کیونکہ یہودی اور عیسائی ہاسٹل بھی احاطے کے اندر ہی ہیں.....اگر وہ مسلم ہاسٹل کے باہر بھی پہرہ لگائے بیٹھے ہوئے تو ہم ہاسٹل بدل بھی سکتے ہیں.....لیکن یہ سب کیمپس میں داخلے کے بعد ہی ممکن ہوگا.....'' میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا اور جینی کی ہدایت کے مطابق پیچھے جا کر ترپال کا زرد آسمان خود پر اوڑھ لیا۔ گاڑی سٹارٹ ہو کر چند فرلانگ آگے بڑھی اور پھر ہاسٹل کا گیٹ آ گیا۔ کسی پولیس والے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بیٹن سے زور سے گاڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کڑک کر بولا۔

''ٹھہرو..... کہاں سے آ رہے ہو تم لوگ.....؟ کون کون ہے گاڑی کے اندر.....؟ دروازہ کھولو.....''

میں نے دم سادھ لیا۔ سخت سردی کے باوجود میری کن پٹی سے پسینے کا ایک قطرہ تیزی سے بہہ کر ترپال میں جذب ہو گیا۔ کسی نے گاڑی کا پچھلا دروازہ زوردار انداز کے ساتھ کھول دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارا کھیل یہیں ختم ہونے والا ہے۔



آخری باب

گاڑی کا دروازہ کُھلنے کی آواز کے ساتھ ہی جینی کی غصّے میں بھری آواز سُنائی دی۔

''کیا بات ہے آفیسر..... کیا آج پھر ان مسلمان انتہا پسندوں نے کوئی حرکت کی ہے.....؟..... جان عذاب میں ڈال رکھی ہے ان جنونیوں نے.....'' کسی دوسرے پولیس والے کی آواز سنائی دی۔''ہاں..... آگے کچھ گڑبڑ ہے.....تم تینوں بھی سٹوڈنٹ ہو کیا.....؟''۔تین کا لفظ سن کر میں چونکا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ فرہاد کو وہ لوگ پہلے ہی اُتار چکے تھے۔ایرک نے جواب دیا۔''ہاں میں ایرک، یہ جم اور وہ جینی.....اور یہ رہے ہمارے یونیورسٹی کارڈ.....لیکن تم نے بتایا نہیں.....معاملہ کیا ہے.....'' پولیس والے نے بے زاری سے کہا ''معاملہ کیا ہونا ہے..... وہی مذہبی جنونیت کا قِصّہ..... اِن مسلمان لڑکوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے ساری نیویارک پولیس کا.....تم لوگ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو.....''۔''ہم ذرا کلب تک گھومنے گئے تھے.....عیسائی ہاسٹل سے اپنے دوست کو لے جانے آئے ہیں.....آج جینی کی سالگرہ ہے اور ہم صبح تک ہلّہ گُلّہ کریں گے.....تم بھی ہمارے ساتھ چلو آفیسر.....'' پولیس والے زور سے ہنسے ''سالگرہ مبارک ہو خوبصورت لڑکی..... پر ہمارے ایسے نصیب کہاں.....اچھا تم لوگ اندر جا سکتے ہو مگر مسلم ہاسٹل والی سڑک سے نہ جانا.....وہ راستہ سِیل کر دیا گیا ہے.....'' جینی نے جواب دیا ''ٹھیک ہے.....جیسا تم کہو.....میرا بس چلے تو ان سارے مسلم لڑکوں کو عمر بھر کے لیے رسٹی کیٹ کروا دوں .....ان کی وجہ سے ہمیں ہر جگہ جواب دہ ہونا پڑتا ہے.....کرے کوئی اور بھرے کوئی.....'' پولیس والے نے وین کا پچھلا دروازہ دھکیل کر بند کر دیا

''چلو اب اتنا غصّہ نہ کرو..... ان سے نپٹنے کے لیے ہم جو موجود ہیں..... تم اپنی سالگرہ کا جشن مناؤ.....'' ایرک اور جم نے شکریہ ادا کیا اور جینی نے وین آگے بڑھا دی۔ اور پھر جب وین رُکی تو میں نے خود کو عیسائی ہاسٹل کے احاطے میں پایا۔ میں گاڑی سے باہر نکل آیا ''تم تینوں کو کسی نوٹنکی میں اچھا موقع مِل سکتا ہے..... یونیورسٹی کے بعد بھوکوں نہیں مرو گے.....'' ایرک نے ڈھٹائی سے دانت نکالے ''تو پھر طے رہا..... اس بار کے ڈرامہ فیسٹول میں جب ہم شیکسپیئر کا ''میک بتھ Mecbith'' کھیلیں گے تو تم ہماری اداکاری دیکھنے ضرور آؤ گے.....'' کچھ ہی دیر میں عیسائی کونسلر جارج نیچے احاطے میں پہنچ چُکا تھا۔ ہم نے اُسے تمام صورتِ حال بتائی جس کی زیادہ تر تفصیل اُسے پہلے ہی معلوم تھی، اس نے ہمیں تسلی دی ''ہاں..... یہ خبر مجھ تک پہنچ چکی ہے..... لیکن تم لوگ فکر نہ کرو..... آیان یہ رات یہیں ہمارے ہاسٹل میں گزار سکتا ہے اور صبح ہم سب اِسے عیسائی طلباء کے ہجوم کے ساتھ یونیورسٹی کیمپس بھی پہنچا دیں گے..... حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سب عیسائی طلباء اس بات پر شدید حیران ہیں کہ ایک مسلم لڑکے کی گرفتاری کے لیے ساری نیویارک کی پولیس اور ایجنسیاں اس قدر بے تاب کیوں ہو رہی ہیں..... کہیں یہ کسی ''سچ'' کا خوف تو نہیں ہے.....'' ہم چُپ رہے۔ وہ تینوں پولیس سے کچھ دیر کی اجازت لے کر اندر آئے تھے لہٰذا اُن کا جلدی واپس لوٹنا ضروری تھا ورنہ پولیس کو شک ہو سکتا تھا۔ جارج نے دکھاوے کے لیے ایک لڑکے کو ان کی گاڑی میں بٹھا دیا تا کہ واپسی پر پولیس والے انہیں روکیں بھی تو چوتھا فرد جسے لینے وہ ہاسٹل آئے تھے، ان کے ساتھ موجود ہو۔ جاتے ہوئے جم اور ایرک نے خُوب بھینچ کر مجھے گلے لگایا۔ ''اپنا خیال رکھنا یار..... ہم صبح ہوتے ہی لوٹ آئیں گے..... سویرا ہونے میں بس کچھ گھنٹے باقی ہیں.....'' میں دھیرے سے مُسکرایا ''کاش ہمارے مُقدّر کا سویرا اتنا قریب ہوتا..... مجھے تو ابھی شام ڈھلنے کے آثار دکھائی دے رہے ہیں.....'' میری بات سن کر اُن سے مزید وہاں رُکا نہ گیا اور وہ افسردہ سے گاڑی میں بیٹھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جارج نے مجھے ایک خالی کمرے میں پہنچا دیا اور میں تمام رات آتش دان کی راکھ کریدتا کھڑکی سے باہر گرتی برف کا نظارہ دیکھتا رہا۔ برفیلے موسم کی صبح نہایت دُودھیا ہوتی ہے..... جیسے آسمان سے نُور کی برسات ہو رہی ہو۔ برف کی قلعی سارے ماحول کو اس قدر پاکیزہ بنا دیتی ہے جیسے اس کائنات پر کبھی کسی کے گناہ کا ایک

سیاہ دھبہ بھی نہ لگا ہو۔ یہ اُجلا پن اور یہ دودھیا اُجالا انسان کی رُوح تک پُرنور کر دیتا ہے اور کچھ دیر کے لیے ہم اپنے دامن پر لگا ہر داغ بھول جاتے ہیں۔ میں بھی اپنی رُوح کو اسی سفیدے سے اُجال رہا تھا جب جارج نے کیمپس جانے کے لیے میرے دروازے پر دستک دی۔ میرے کمرے کے باہر تقریباً سو سے زائد عیسائی طلبہ کا ہجوم جمع تھا جو اپنی آڑ میں مجھے کیمپس کے آڈیٹوریم تک لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے جارج کا نم پلکوں کے ساتھ شکریہ ادا کیا تو اس نے میرا شانہ تھپتھپایا ''یہ میرا فرض تھا مسلم کونسلر..... کیونکہ ہر مذہب اُس کے ماننے والوں کے لیے ''مقدس'' ہوتا ہے اور یہ ہم نے تم سے ہی سیکھا ہے.....'' ہم لوگ عیسائی ہاسٹل سے باہر نکلے تو کیمپس کے آس پاس پولیس اور سادہ لباس والوں کی کافی نفری اِدھر اُدھر بکھری نظر آئی۔ کچھ ہی دیر میں شمعون کے گروپ کے لڑکے بھی عیسائی لڑکوں سے آن ملے اور ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ پولیس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ایک مسلمان کونسلر کی حفاظت اور بھید کے لیے یہودی اور عیسائی طلبہ اُسے اپنے گھیرے میں لے کر کیمپس میں داخل ہو سکتے ہیں، اور پھر یہی ہوا، مسلمان طلباء کو باقاعدہ تلاشی اور شناختی کارڈ کی پرکھ کے بعد اندر جانے کی اجازت دی جا رہی تھی جبکہ یہودی اور عیسائی طلباء کے صرف تعارف کرواتے ہی سامنے کی رکاوٹ ہٹا دی گئی اور میں تین ساڑھے تین سو طلباء کے گھیرے میں اطمینان سے آڈیٹوریم تک پہنچ گیا۔ ایرک، جم اور جینی پہلے سے وہاں موجود تھے اور انہوں نے بِنا وقت ضائع کیے اسی چہل پہل کے درمیان مجھے اسٹیج کے پردے کے پیچھے ایک کشادہ سے کمرے میں پہنچا دیا جہاں عام حالات میں یونیورسٹی کے تھیٹر کی ریہرسل ہوا کرتی تھی۔ لکڑی کے چکنے تختوں کے فرش والا یہ طویل کمرہ اس وقت سنسان تھا اور شیشے کے ایک پٹ والی بہت سی لمبی اور مستطیل کھڑکیوں سے آتی باہر گرتی برف کی روشنی نے ایک ٹھنڈا اور پُرسکون اجالا بکھیر رکھا تھا۔ مجھے ٹکٹوں کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کیونکہ اگر بلال کی گرفتاری کے وقت ٹکٹ اُس کی جیب میں ہوئے، تو ہم ایک بڑی مُشکل کا شکار ہو چکے تھے۔ میں ایک کھڑکی کے قریب کھڑا انہی سوچوں میں گُم تھا کہ اچانک کسی کے قدموں کی ہلکی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے بے خیالی میں نظر اُٹھائی اور پھر میری نظریں وہی جمی رہ گئیں، یہ کمرہ انگریزی کے حرف ڈی کی طرز پر بنا ہوا تھا اور ڈی کے آدھے دائرے والے حصّے میں بیرونی دالان کی طرف نکلتی یہ

مستطیل شیشے کی کھڑکیاں چُنی ہوئی تھیں جن سے باہر کا برفیلا اُجالا چھن کر اندر آ رہا تھا۔ میں نے اُسی دودھیا روشنی کے ایک مستطیل ٹکڑے میں پُروا کو کھڑے دیکھا..... ہاں..... وہ پُروا ہی تھی۔ کھڑکی سے چھن کر اندر آتا نُور بھی اُس کے چہرے کی زردی کم نہیں کر پایا تھا، یا شاید نُور خود اس کے چہرے کو چھوتے ہی ''زرد رنگ'' ہو جاتا ہو گا.....؟..... وہ سیاہ لباس میں ملبوس کوئی زرد گلاب ہی تو لگ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پھر دھیرے سے اُس کے پنکھڑی لب ہلے ''آیان.....'' میں جلدی سے اس کی جانب بڑھا۔ ''پُروا..... تم..... یہاں.....؟ اس وقت.....؟'' وہ مسکرائی ''ہاں..... ویسے تو آج شام کو ہسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی..... لیکن میں اپنے ڈاکٹرز سے ضِد کر کے صبح ہی وہاں سے چلی آئی..... بس وقت پر دوا کھانے کا ایک لمبا سا حلف اُٹھانا پڑا سارے عملے کے سامنے.....'' میں پریشانی سے بولا ''لیکن تمہیں یوں ہسپتال سے نکل سیدھا یونیورسٹی نہیں آنا چاہیے تھا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے..... تمہاری طبیعت بگڑ گئی تو.....'' پُروا نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا ''نہیں آیان..... آج ہماری زندگیوں کا سب سے بڑا امتحان ہے..... آج میں آرام کیسے کر سکتی ہوں.....، اور تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ناں..... ہم آج کا دن خیریت سے گزر جانے کے بعد شام کو وھسپرز ریستوران (Whisper`s Resturant) میں ملیں گے..... جہاں ہمیں آج صرف اپنی باتیں کرنی ہیں..... تم جانتے ہو آیان..... تمہارے اس وعدے نے مجھے اتنی جلد اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔'' میں نے چونک کر پُروا کی معصوم مسکراہٹ کو دیکھا۔ شائد اُسے باہر کسی نے میری گرفتاری کے لیے جاری مہم کے بارے میں ابھی تک اطلاع نہیں دی تھی۔ اتنے میں احمر تیز قدم اٹھاتا پردے کے پیچھے آ پہنچا، ''شکر ہے تم خیریت سے یہاں تک پہنچ گئے۔ چلو جلدی کرو..... راہداری میں ٹکٹوں کی گنتی شروع ہونے والی ہے.....'' پُروا نے سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کی جانب دیکھا۔ احمر میری مشکل سمجھ گیا، اور پُروا سے بولا ''تمہیں صنم کبیر ساری تفصیل بتا دے گی..... وہ باہر راہداری میں تمہارا انتظار کر رہی ہے..... چلو اب دیر نہ کرو.....'' احمر تیزی سے باہر نکل گیا، میں نے گم صُم سی کھڑی پُروا کا نازک ہاتھ چند لمحوں کے لیے اپنے ہاتھ میں تھام لیا ''ہاں..... مجھے اپنا ہر وعدہ یاد ہے..... اور اگر تم جسمانی فاصلوں کو بے معنی سمجھو تو جان لو گی کہ آج

اس پل..... اس لمحے کے بعد میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا..... ہر دن کی ڈولی اٹھنے سے لے کر ہر رات کا گھونگھٹ سرکنے تک..... ہر کنواری صبح سے ہر سہاگن شام تک..... آیان پُروا کے ساتھ رہے گا.....'' پُروا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا ''کیا بات ہے آیان..... تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے.....؟..... تمہارے لہجے میں اتنا یقین اور اتنا درد میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سُنا..... بولو نا..... کیا بات ہے.....؟ ''میں کچھ بول نہیں پایا، بس اُسے دیکھتا رہا اور وہ بھی چپ چاپ میری آنکھوں میں ان دیکھے لفظوں کی تحریر پڑھتی رہی، اور پھر صنم کبیر کی آواز ہمیں واپس حقیقت کی دنیا میں لے آئی ''آیان..... سب لڑکے باہر تمہارا انتظار کر رہے ہیں.....'' میں نے صنم کبیر کے قریب سے گزرتے ہوئے دھیرے سے اُسے کہا ''اِس کا خیال رکھنا.....''

ہم تینوں باہر راہداری میں نکلے تو لڑکوں نے مجھے دیکھ کر زوردار نعرے لگائے۔ احمر کے ہاتھوں میں ٹکٹ کی گڈی دیکھ کر میرے سینے سے اطمینان کی ایک لمبی سی سانس باہر نکلی۔ گویا بلال نے گرفتاری سے پہلے سارے ٹکٹ احمر کے حوالے کر دیئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں یونیورسٹی کی طرف سے مدعوشدہ مہمان ہال میں پہنچنے لگے۔ پولیس ابھی تک میری کیمپس کی راہداری میں موجودگی سے بے خبر تھی، انتظامیہ کی طرف سے یونیورسٹی کے برسرگیٹ پر ٹکٹوں کی گنتی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا، لیکن تمام طالب علم ابھی تک میرے اشارے کے منتظر تھے، کچھ ہی دیر میں ڈین بھی چند ''مہمانانِ خصوصی'' کے ساتھ راہداری میں پہنچ گیا۔ مجھے دروازے کے قریب کھڑے دیکھ کر اسے حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا لیکن وہ اپنے تاثرات چھپانا خوب جانتا تھا۔ اس نے لڑکوں کو مخاطب کیا ''تم سب باہر کیوں کھڑے ہو.....؟ اندر چلو..... تقریب کا وقت ہونے والا ہے.....'' ڈین ہماری بات سُنے بغیر اندر چلا گیا۔ صنم کبیر نے پریشانی سے فرہاد کی جانب دیکھا ''اُس آخری ٹکٹ کا کچھ پتا چلا.....؟ ہم اس ٹکٹ کی غیر موجودگی میں سارے ہال پر اپنا حق ثابت نہیں کر سکتے..... اگر ایک نشست بھی کسی اور کے پاس رہی تو وہ لوگ یہ سیمینار منعقد کروانے کا قانونی اختیار استعمال کر سکتے ہیں.....'' فرہاد نے مایوسی سے سر ہلایا ''نہیں..... ہم وہ آخری ٹکٹ نہیں ڈھونڈ پائے.....'' میں نے راھد اری کے باہر میدان میں کھڑے تمام مسلم، یہودی اور عیسائی طلباء کے چہروں پر نظر دوڑائی..... لیکن اُن سب نے بھی سر جھکا دیا۔ میں

نے صبر کھو دیا ''آخر وہ آخری ٹکٹ گیا کہاں.....؟'' اچانک راہداری کے آخری سرے سے ایک آواز گونجی ''آخری ٹکٹ میرے پاس ہے آیان.....'' ہم سب چونک کر پلٹے..... راہداری کے اندھیرے گوشے سے روشنی میں قدم رکھنے والا کوئی اور نہیں..... میرا بھائی بسام تھا..... چند لمحے کے لیے وقت تھم سا گیا۔ بسام چل کر میرے قریب آ گیا۔ اور اس نے وہ ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ ''یہ میں نے آفیسر فورڈ کے کہنے پر خرید رکھا تھا اپنے پاس..... لیکن کل رات جب انہوں نے تمہاری تلاش میں ہمارے گھر پر چھاپہ مارا اور اُن کی دیکھا دیکھی سارے نیویارک کے میڈیا نے تمام رات تمہارے نام کے ساتھ دہشت گرد کا لیبل لگا کر خبریں نشر کیں تو مجھے تمہاری ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ تم نے ٹھیک کہا تھا آیان..... امریکہ صرف امریکیوں کا ہے..... امریکن مسلمانوں کا نہیں..... اور آج بسام احمد، تمہارا بڑا بھائی مذہب کی اس جنگ میں تمہارے ساتھ صف آراء ہونے کے لیے یہاں کھڑا ہے۔ ان لوگوں کو ہمارے مذہب کی توہین نہ کرنے دینا میرے بھائی..... چاہے کچھ بھی ہو جائے..... اپنی جان لڑا دینا آیان..... ہم سب تمہارے ساتھ کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں..... تم قدم پیچھے نہ ہٹانا بھیا..... ہماری لاج رکھ لینا.....'' بولتے بولتے بسام کی آواز روہانسی ہوگئی اور جب میں نے اسے کھینچ کر اپنے گلے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، میں بھی رو پڑا اور وہاں اور بھی کئی آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے بسام کو تھپک تھپک کر خاموش کروایا اور ٹھیک اُسی وقت آفیسر فورڈ کی آواز میرے عقب میں گونجی۔ ''واہ کیا بات ہے..... اس دور میں دو بھائیوں کے مِلن سے بڑھیا نظارہ بھلا اور کیسا ہوگا..... آیان تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے میرے پاس..... کل رات سے تم نے پوری نیویارک پولیس کی کافی پریڈ کروالی..... اب چلو میرے ساتھ.....'' فورڈ کی بات سُن کر طلباء نے غیر محسوس طور پر میرے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔ میں نے چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈال کر فورڈ کی جانب دیکھا۔ ''کیمپس میں اس وقت تین ہزار طلباء ہیں، اور یہ سب میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں نیویارک کی سڑکوں پر نکلنے کے لئے..... کیا تمہیں اب بھی یقین ہے کہ تم میری مرضی کے خلاف مجھے یہاں سے گرفتار کر کے لے جا سکتے ہو.....؟''

فورڈ نے غور سے آس پاس دیکھا ''میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں..... ایسی کوئی

صورتِ حال پیدا مت کرنا جو آگے چل کر عدالت میں تمہارے کیس کو مزید بگاڑ دے..... اگر طلباء نے تمہاری گرفتاری میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو ہمیں عدالت کو یہ یقین دلانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی کہ تم باقاعدہ تربیت یافتہ اور حالات کو اپنے حق میں استعمال کرنا خوب جانتے ہو..... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑو.....'' فورڈ بسام کی جانب مُڑا ''اور تم.....؟ تم بھی اس کے ساتھ مِل گئے..... میں تو تمہیں کافی حقیقت پسند لڑکا سمجھتا تھا.....'' بسام نے تلخی سے جواب دیا ''ہاں..... کل رات تک میں بھی خود کو یہی الزام دیتا تھا، لیکن تم نے میری آنکھیں کھول دیں مِسٹر فورڈ..... میں نے آج تک تم لوگوں کا ساتھ صرف اس شرط پر دیا کہ تم نے بدلے میں مجھ سے آیان کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا..... تم نے کہا تھا کہ اگر میں تم لوگوں کی مدد کروں گا تو تم لوگ میرے بھائی پر کوئی الزام نہیں آنے دو گے..... لیکن کل رات جب تم نے انتہا پسندوں کے ساتھ روابط کے الزام میں ہمارے گھر پر آیان کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا تب مجھے تمہارا سارا کھیل سمجھ میں آ گیا۔ کیوں آفیسر فورڈ..... کن انتہا پسندوں کی بات کر رہے تھے تم.....؟ اگر آیان کے سیل فون پر کسی جنونی گروپ کی کالز کا ریکارڈ تمہارے پاس محفوظ ہے تو آیان سے پہلے تم نے ان لوگوں کو گرفتار کیوں نہیں کیا جو آیان کو فون کر رہے تھے..... کیونکہ کال آیان کو آئی تھی..... آیان نے تو کبھی ایسا کوئی نمبر ڈائل ہی نہیں کیا..... اور صرف ایک فون کال ریسیو کرنے پر تمہارے سارے نیویارک کی پولیس حرکت میں آ گئی..... لیکن اس سارے ڈرامے کے مرکزی کردار وہ فون کال کرنے والے تمہاری نظروں سے اوجھل رہے۔؟ آخر کیوں.....؟ بس اتنی ہی تحقیقات آتی ہیں تمہاری سی۔آئی۔اے کو..... اور کیا تم نے خود مجھ سے تین بار ایسے انجان نمبروں پر کال کرنے کی درخواست نہیں کی تھی جن پر تمہیں انتہا پسند ہونے کا شبہ تھا؟ کون جانے کہ حافظ شکیل اور آیان کو آنے والی فون کالز بھی تم جیسے کسی سی۔آئی۔اے آفسر کے کہنے پر ہی کی گئی ہوں.....'' بسام کی بات سن کر ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا، ہم سب کی نظریں فورڈ پر جم گئیں۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا ''ان سب باتوں کا فیصلہ اب عدالت میں ہو گا۔ میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں آیان..... خود کو قانون کے حوالے کر دو..... تم پہلے ہی اپنا کیس بہت بگاڑ چکے ہو..... مزید کوئی حماقت نہ کرنا.....'' میں دو قدم بڑھا کر فورڈ کے بالکل مقابل کھڑا ہو

گیا۔ اُس کے آس پاس کھڑے پولیس والوں نے کسی ناخوشگوار صورت حال کے پیش نظر باقاعدہ پوزیشن لے لی۔ ''تمہیں میری گرفتاری کے لیے تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا آفیسر..... تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتے ہو..... میرا کہیں غائب ہونے کا ارادہ نہیں ہے.....'' لڑکوں نے شدید نعرے بازی شروع کر دی تھی اور احمر نے یونیورسٹی کے تمام گیٹ بند کرنے کی ہدایت کر دی۔ فورڈ کی توقع کے برعکس عیسائی اور یہود لڑکے بھی مسلمان طلباء کے ساتھ کھڑے دکھائی دیئے تو پہلی مرتبہ اس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے چمکتے نظر آئے۔ پُروا اور صنم نے راہداری کی دوسری جانب لڑکیوں کی صف بندی کروالی تھی۔ اگلے ہی لمحے ڈین گھبرایا ہوا سا ہال کے اندر سے باہر نکلا۔ ''یہ سب کیا ہنگامہ ہے.....؟ فورڈ..... تمہارے پولیس والے کس مرض کی دوا ہیں.....؟'' میں نے لڑکوں کو ہال میں چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈین اور انتظامیہ کے ارکان نے مزاحمت کی ''تمہارے خلاف وارنٹ ہیں آیان..... تم ہال میں نہیں آ سکتے.....'' میں نے احمر کے ہاتھ سے ٹکٹوں کا بنڈل لے کر ڈین کو تھما دیا۔ ''یہ پورے تین ہزار ٹکٹ ہیں ہال کی تمام نشستیں ہمارے پاس ہیں اور قاعدے کی رُو سے ہم آپ سب کو ہال سے باہر نکال کر اسے باقاعدہ سیل کر سکتے ہیں..... لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا..... آپ کے ''معزز'' مہمانوں کے سامنے آپ لوگوں کی سُبکی کروانا ہمارا مقصد نہیں ہے..... لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ہال کے اندر چل کر بات کریں.....'' ہمارے ہاتھ میں تین ہزار ٹکٹ دیکھ کر ڈین کا سارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اس نے بے چارگی سے فورڈ کی جانب دیکھا۔ فورڈ نے اسے نظروں میں تحمل رکھنے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر میں ہی ہال طلبا سے بھر گیا۔ ڈینش این۔جی۔او والے بڑے پروجیکٹر اور باقاعدہ تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ میں نے چند لمحے طلباء کے سیٹوں پر بیٹھنے کا انتظار کیا اور پھر میں اسٹیج پر چڑھ گیا۔ فورڈ اور پولیس والے ہال کے دروازوں پر ٹِک گئے۔ این۔جی۔او والوں نے پریشانی سے ڈین کی طرف دیکھا، میں نے اوپر چڑھ کر وہ بڑی اسکرین نیچے گرا دی جس پر ان کافروں نے وہ متنازعہ خاکے دِکھانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا، اسکرین زوردار آواز سے نیچے گر کر ٹوٹی تو ہال میں طلباء کے نعروں کا شور مچ گیا۔ وہ سب چلا رہے تھے۔ ''ہمیں کسی بھی مذہب کی توہین برداشت نہیں..... اپنے لیے ہر ایک کا مذہب ''مقدس'' ہے.....'' ڈین اپنا سر پکڑے اگلی قطار میں لاچار بیٹھا ہوا تھا اور این۔جی۔او کے

سربراہان اس پر برس رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ نیویارک کا میڈیا لمحہ بہ لمحہ یہ ساری کارروائی براہِ راست نشر کر رہا تھا۔ اسٹیج فلیش لائٹس کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے ڈینش این۔جی۔او کے سربراہ پر نظر ڈالی ''شائد آپ سب کو یہ بات جان کر مایوسی ہو کہ یونیورسٹی کے طلبا کی مرضی کے مطابق آج یہاں کوئی سیمینار نہیں ہوگا..... نہ ہی کسی قسم کے خاکے دکھائے جائیں گے..... بحیثیت مسلم کونسلر اس وقت میرے پاس یہ طاقت بھی موجود ہے کہ میں یونیورسٹی انتظامیہ سمیت آپ سب کو پانچ منٹ کے اندر ہال سے بے دخل کروا کر آپ سب کو کیمپس سے نکال دوں..... لیکن ہم مسلمانوں کو رواداری اور تہذیب کا درس گود سے ہی مل جاتا ہے..... لہٰذا باوجود اس کے کہ آپ سب یہاں میرے عظیم مذہب کی توہین کے لیے جمع ہوئے ہیں..... میں آپ کو بے عزت کر کے یہاں سے نہیں نکالوں گا..... مجھے افسوس ہے کہ اس ہال میں چند عیسائی اور یہودی علماء بھی موجود ہیں..... وہ جنہیں ہمیں مذاہب کی عظمت کا درس دینا چاہیے تھا..... وہ خود اس تماشے کا حصہ بنے ہیں..... لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری نئی نسل نے اس مقدس سرحد کو پار نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں عیسائی اور یہودی کونسلر کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دینا چاہتا ہوں..... تاکہ وہ یہاں میرے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس میڈیا کے ذریعے تمام دنیا کو یہ پیغام دے سکیں کہ ہماری نئی نسل ہر مذہب کے تقدس کو سمجھتی ہے اور اسے پامال کرنے والوں کے خلاف یکجا ہو کر لڑنے کو تیار ہے.....'' جارج اور شمعون اسٹیج پر چڑھ آئے اور ہال ایک بار پھر نعروں اور تالیوں سے گونج اُٹھا۔ میں نے عیسائی اور یہودی علماء کی طرف دیکھا۔ ''آپ لوگوں میں سے اگر کوئی اسٹیج پر آ کر بات کرنا چاہتا ہے تو ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے..... یہ پلیٹفارم ڈینش لوگوں کے لیے بھی ہے جو ویسٹر گارڈ کے یہ خاکے یہاں دکھانا چاہتے تھے..... کسی کے پاس کوئی دلیل..... کوئی جواز ہے اس مذہبی تعصب اور اس بے حُرمتی کا تو وہ یہاں اسٹیج پر آ جائے.....'' ہال میں کوئی ہل چل نہیں ہوئی ''ٹھیک ہے..... تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے ایک معزز مہمان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دوں.....'' ڈین، انتظامیہ اور این۔جی۔او والوں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے مائیک میں زور سے کہا، ''ایرک، جم..... انہیں لے آؤ.....'' اور پھر اسٹیج کے پیچھے سے وہ دونوں شیخ الکریم کو لیے برآمد ہوئے

جو آج صبح کی فلائیٹ سے میری خاص درخواست پر نیویارک پہنچے تھے۔

عامر بن حبیب نے ان کی نیویارک آمدورفت کا سارا خرچہ خود برداشت کیا تھا اور ہم نے آخری لمحے تک اس بات کو اس لیے خفیہ رکھا تھا کہ کہیں آخری وقت پر انہیں ائرپورٹ سے ہی واپس نہ بھیج دیا جائے۔ مسلم طلباء کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ شیخ ان کے درمیان موجود ہیں۔ فورڈ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ شیخ نے مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہال کی جانب متوجہ ہو گئے۔ ''السلام وعلیکم..... میرا مذہب سب کو سلامتی کی دُعا سے آغاز کرتا ہے..... کیا آپ لوگوں میں سے کوئی یہاں اسٹیج پر آ کر باقاعدہ مجھ سے مناظرہ کرنا چاہے گا.....؟..... کوئی ہے جو اس حرکت کا کوئی جواز کوئی توجیہہ پیش کر سکے؟''..... ڈینش این۔ جی۔ او کا سربراہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا ''ہم صرف اپنی آزادیٔ اظہار کا حق استعمال کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں..... لیکن ہمیں یہ حق استعمال کرنے سے روکا جا رہا ہے.....'' شیخ دھیرے سے مسکرائے ''بات اگر صرف آزادیٔ اظہار کی ہے تو پھر اس پروگرام کا اتنا مہنگا ٹکٹ رکھ کر غریب مسلم طلباء کو ان کے اظہار کی آزادی سے کیوں محروم رکھا جا رہا تھا.....؟؟ کیا آپ کے یہاں بولنے کی آزادی پر بھی ٹکٹ لگایا جاتا ہے؟ بہرحال ان بچوں نے باقاعدہ قانونی طریقے سے اس آزادیٔ اظہار کی قیمت ادا کر کے یہ حق آپ سے چھینا ہے لیکن میں پھر بھی آپ کو بولنے کی اجازت دیتا ہوں۔ صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دیں۔ آپ کا تعلق کس مذہب سے ہے؟ عیسائی، یہودی، یا کسی اور فرقے سے ہے؟.....'' این۔ جی۔ او کا سربراہ گڑبڑا سا گیا۔ ''ہم مذہبی شناخت کے بل پر کسی بھی برتاؤ کو تعصب سمجھتے ہیں.....'' شیخ الکریم نے ہال کی جانب دیکھا ''سنا آپ لوگوں نے..... یہ اپنے مذہب کی شناخت تک کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ ان کا کوئی دین ہی نہیں ہے..... ان کا مذہب صرف پیسہ ہے۔ آج مسلمان کمزور قوم ہے تو وہ ہمارے نبی ﷺ کا (نعوذ باللہ) تمسخر اڑانے کے لیے یہ خاکے بیچ رہے ہیں..... کل اگر ان کو کہیں سے زیادہ پیسے ملے تو یہ یہود و نصاریٰ کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آئیں گے..... یہ کیا طرفہ تماشہ ہے بھائی..... پہلے کوئی مذہب تو چُن لو اپنے اختیار کرنے کے لیے تاکہ تم سے اُسی مذہب کی زبان اور دلیل سے بات کی جا سکے، ایک لادین سے اب میں کیا بات کروں تم تو نہ عیسیٰؑ کو مانتے ہو نہ موسیٰؑ کو،

نہ داؤدؑ کو نہ سلیمانؑ کو..... نہ بدھ مت کے حامی ہو نہ کسی گرو گرنتھ کے پیروکار..... اسماعیلی ہو نہ ابراہیمی، آدمؑ سے ہو یا ابلیس سے.....؟ کہاں سے تمہارا سرا تلاش کر کے میں تم سے بات کی ابتدا کروں؟ اور اگر ان میں سے کسی کے بھی نہیں ہو تو پھر تم صرف ایک بوسیدہ جسم ہو، یا روح کے ایک مریض جسم..... جس کے اندر ایک بیمار ذہن پل رہا ہے..... اب تم جیسے مُردہ سے بھلا کیا بات کروں.....؟'' ہال پر سناٹا طاری تھا۔ این۔جی۔او کا سربراہ تلملانے کے باوجود شیخ الکریم کی کسی بات کا جواب نہیں دے پایا، شیخ نے مسلمان طلباء کی طرف اشارہ کیا ''جانتے ہو..... ان مسلم طلباء کی تعداد اس یونیورسٹی میں کتنی ہے.....؟ صرف تین سو تیرہ..... لیکن یہ تین سو تیرہ کا ہندسہ ہمارے مذہب کی تاریخ میں بڑا اہم ہے..... کبھی موقع ملے تو غزوۂ بدر کے جان نثاروں کی تعداد کسی مسلم اسکالر سے پوچھ لینا..... اور آج قدرت نے یہ خدمت یہاں کے تین سو تیرہ طلباء کے حوالے کر رکھی تھی جسے انہوں نے خوب نبھایا ہے..... میں جانتا ہوں کہ اس سیمینار کی ناکامی کے بعد بھی تم لوگ کہیں نہ کہیں یہ ملعون حرکت دُھرانے کی کوشش ضرور کرو گے۔ لیکن یاد رکھنا کہ دُنیا میں ہر جگہ ایسے تین سو تیرہ مجاہد تمہارا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ملیں گے..... اگر مسلمان دہشت گرد اور جنونی ہوتے تو آج یہاں سے اس ڈینش این۔جی۔او کا کوئی بھی فرد زندہ واپس باہر نہیں جا سکتا تھا..... لیکن آج پھر میں اس میڈیا کے ذریعے تمام دنیا کو یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ ہم سے زیادہ مہذب اور روادار کوئی دوسرا نہیں..... ہم اپنی روح کے قاتلوں کو بھی برداشت کرنا اور ان سے بات کر کے مسئلہ حل کرنا جانتے ہیں..... لیکن ہمیں کونے سے لگانے کی کوششیں اب ترک کرنا ہوں گی۔ وما الینا الالبلاغ.....'' شیخ نے بات ختم کی تو ہال تالیوں کی گونج سے پھٹنے لگا۔ باہر گرتی برف تیز ہو چکی تھی اور شیخ نے بڑے دالان کے برفیلے میدان میں ہی ظہر کی نماز کی جماعت کھڑی کروانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر نیویارک کے میڈیا نے یہ نظارہ بھی اپنی ٹی وی سکرین کے ذریعے سارے امریکہ کو دکھا دیا کہ کس طرح ہماری داغ دار جبینوں نے سفید کوری اور پاکیزہ برف پر بوسہ دے کر اپنے مُقدر بھی اُجلا لئے۔ ڈینش این۔جی۔او والے ناکام و نامراد یونیورسٹی سے واپس لوٹ چکے تھے۔ ہم نے سلام پھیرا تو ہم سبھی کے آنسو برف پر گر کر موتی بن چکے تھے۔ فورڈ میرے انتظار میں ہوشیار کھڑا تھا اور اس نے مزید نفری بھی منگوالی تھی۔ لڑکے بے حد

مشتعل تھے لیکن میں نے ان سب کو میدان کی برفیلی فضا میں یکجا کیا ''میں چاہتا ہوں کہ میری گرفتاری کے وقت ہم ایک اعلیٰ ظرف دشمن کا برتاؤ کریں..... یہ لوگ مجھے لیے بنا یہاں سے نہیں جائیں گے..... اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میرے دوست اور دیگر طلباء پر بھی کسی جنون کا الزام لگے..... تم لوگوں کے پاس احتجاج کے اور بہت ذرائع موجود ہیں اور ابھی ہمیں ایک لمبی عدالتی جنگ بھی لڑنی ہے..... لہٰذا اپنی ساری طاقت اُس وقت کے لیے بچا کر رکھو..... اور مجھے ہنستے چہروں کے ساتھ یہاں سے رُخصت کرو.....'' وہ سب مزید افسردہ ہو گئے۔ میں نے سب سے پہلے شیخ الکریم سے اجازت طلب کی۔ ''میرے لیے دعا کیجئے گا..... ابھی جنگ کی ابتداء ہے..... میں اس کے اختتام تک ثابت قدم رہوں اس کے لیے مجھے آپ کی دعاؤں اور رہنمائی کی ضرورت رہے گی.....'' انہوں نے مسکرا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا ''میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ اُسی طرح سُرخرو اور کامیاب رہو جیسے تم آج رہے ہو.....'' ان کے بعد میں نے شمعون اور جارج کا شکریہ ادا کیا۔ وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے ''پاگل ہوئے ہو کیا.....؟..... آج تم نے ہمیں زندگی کا ایک نیا نظریہ دیا ہے..... تمہارا شکریہ آیان.....'' پھر ایرک، جینی، جم اور صنم کبیر قطار میں کھڑے تھے، ''دیکھو..... کوئی نہیں روئے گا..... کیونکہ اگر میں رو پڑا تو تم سبھی جانتے ہو کہ مجھے چُپ کرانا مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ بات بھی کسی سے چُھپی نہیں ہے کہ میں روتے ہوئے بہت بُرا لگتا ہوں.....'' وہ سب مُسکرا دیئے اور سب نے مجھے اپنے اپنے طریقے سے رُخصت کیا۔ ان سب کے بعد بسام اپنی بھیگی پلکیں پونچھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''اپنا خیال رکھنا اور میری فکر نہ کرنا..... یاد ہے نا ہم بچپن میں ممی کو ستانے کے لیے کیا بولا کرتے تھے۔ کہ جو ہمارے اپارٹمنٹ میں رہ سکتا ہے وہ دنیا کی کسی بھی جیل میں گزارہ کر لے گا.....'' بسام روتے روتے مسکرا پڑا ''جلدی واپس آنا یار..... تم جانتے ہو میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا.....'' میں اس کے بال سہلا کر آگے بڑھا اور تمام مسلم گروپ سے ملتا ہوا احمر تک پہنچ گیا۔ وہ سر جھکائے پریشان کھڑا تھا۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''ہمت کرو..... اب آگے تمہی کو مسلم کونسلر کی ذمہ داریاں نبھانا ہوں گی..... گروپ کو بکھرنے نہ دینا.....'' برف باری تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ دُور کھڑے آفیسر فورڈ نے چلا کر کہا ''جلدی کرو مسلم کونسلر..... ہمیں دیر ہو رہی ہے..... مجھے

یقین ہے کہ نیویارک کی عدالت تمہیں کم از کم عمر قید کی سزا ضرور سنائے گی۔ تب تمہارے پاس جیل میں بہت سال ہوں گے ان ملاقاتوں کے لئے.....'' میں نے اس کی طرف دیکھا ''ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو..... لیکن تم نے آج یہاں ایک آیان کو گرفتار کر کے مستقبل کے تین ہزار آیان پیدا کر دیئے ہیں..... بڑا گھاٹے کا سودا کیا تم نے مسٹر فورڈ.....'' سب سے آخر میں پُروا کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں پر جم رہے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی ''تم تو بڑے وعدہ خلاف نکلے آیان احمد..... تم نے مجھے آج کیفے وھسپرز Whispers لے جانے کا وعدہ کیا تھا..... دیکھو..... شام بھی قریب آ رہی ہے..... اپنا وعدہ پورا کئے بنا ہی چلے جاؤ گے کیا.....؟'' میرا دل اندر سے کٹ کٹ گیا۔ ''میں نے آج تم سے ایک اور وعدہ بھی تو کیا تھا..... ہمیشہ ساتھ رہنے کا وعدہ..... اس فانی جسم کی حدوں سے آگے نکل کر رُوح کے ملاپ کا وعدہ..... اور یقین کرو..... میں یہ نیا وعدہ کبھی نہیں توڑوں گا.....'' پُروا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں تمہاری ہر بات پر یقین کرتی ہوں آیان..... اور میں جانتی ہوں کہ ایک نہ ایک دن تم اپنا پچھلا وعدہ بھی ضرور پورا کرو گے..... میں آج کے بعد اپنی زندگی کی ہر شام اُسی کیفے میں کھڑکی والی میز پر تمہارا انتظار کرتے بتاؤں گی..... جب تک تم واپس نہیں آ جاتے..... اور تب تک وہاں جتنے بھی محبت کرنے والے آ کر ملیں گے..... دراصل وہ ہماری ہی وفا کی تجدید ہوگی..... ہم اپنی نسل کے کل کے لیے اپنا آج قربان کر رہے ہیں آیان..... مجھے یقین ہے کہ قدرت ہماری یہ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جانے دے گی.....''

فورڈ کے اشارے پر پولیس کی گاڑیاں آگے بڑھ آئیں اور ایک پولیس افسر نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک کار کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ میرے دائیں بائیں دو پولیس والے بیٹھ گئے۔ فورڈ نے اگلی سیٹ سنبھال لی۔ لڑکے برفیلے میدان میں پولیس کی کاروں کے ساتھ دوڑنے لگے، سب میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ دُور برفیلے میدان میں بسام اور دیگر لڑکے اپنی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑے تھے اور ان سب سے الگ پُروا گم سم سی کھڑی دور جاتی کار کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ برف کا ایک گالا اس کی پلکوں میں اٹک کر اس کے آنسوؤں کا حصہ بن گیا۔ کاریں تیزی سے برف کا

میدان پار کر رہی تھیں اور رفتہ رفتہ میرے عقب میں دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے آخری بار پلٹ کر ان سب کی طرف دیکھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ سب نیویارک کی دھند کا حصہ بن گئے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور میرے دل نے کہا "الوداع....."

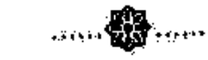

Interview



پاکستان کے نامور ناول نگار

ہاشم ندیم

ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس

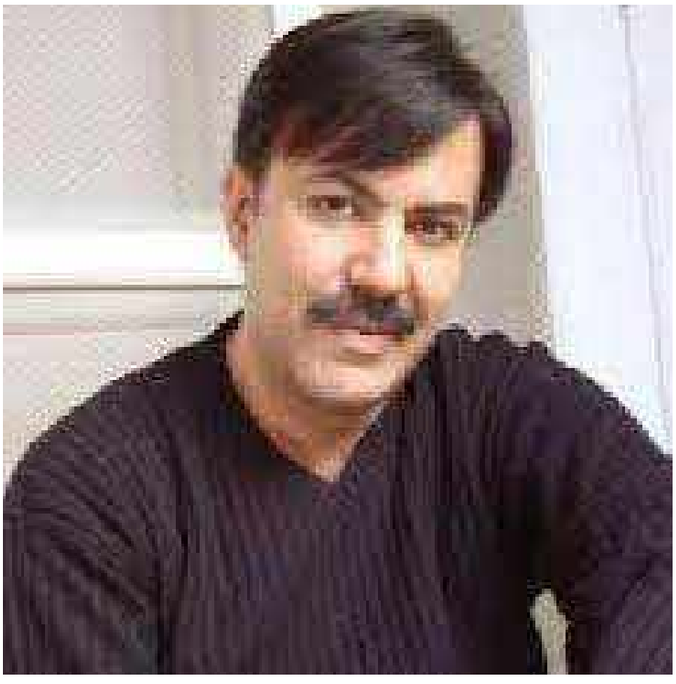

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملاحظہ کیجیے، ہمارے ''نئے ناولٹ'' ناول کی پہلی قسط۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

نرجس ملک، ایڈیٹر ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ایک سرائیکی گیت ہے ''میرے محبوب یہ تیری یک بارگی جدائی بڑی جان لیوا ہے..... مگر تجھے مجھ سے بچھڑنا ہی ہے، تو دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑ..... ''اس بار کا موسمِ گرما بھی کچھ اسی سنگ دل محبوب جیسا روپ دھارے، دھیرے دھیرے قسطوں میں بچھڑنے کے جتن کر رہا تھا۔ تیز گرم تپتی دھوپ میں کول تار کی لمبی سنسان سڑک کسی سیاہ گلیشیئر سے پگھلی ہوئی جھیل جیسی چمک رہی تھی۔ میرے پرانے فلیٹ جوتوں کا تلوا نیچے سے کئی جگہ سے کُھل چکا تھا، لہٰذا ابلتا ہوا کول تار میرے پیروں میں انگارے بھر رہا تھا۔ اسکول کی چھٹی کے بعد گھر تک یہ راستے کا پُل صراط مجھے ہر روز ہی پار کرنا ہوتا تھا۔ کتنی بار دبے لفظوں میں اماں کو جتا چکا تھا کہ میرے پیروں کے چھالے اب شمار کی حد سے نکلتے جا رہے ہیں، مگر نو بہن بھائیوں میں سے فریاد کا میرٹ نکالا جاتا، تو میری عرضی کا نمبر چھٹا تھا اور ابا کی تنخواہ بس اتنی کہ وہ صرف اماں ہی کی سُن سکتے تھے۔ راستے سے گزرتے ہوئے حسبِ معمول چند لمحوں کے لیے جوتوں کی بڑی دکان کے چمچماتے تلے ستانے کے لیے ٹھہرا اور ہمیشہ کی طرح حسرت بھرے تجسس کے ساتھ دکان کی شیشے کی دیوار سے ہاتھوں کا کٹورا بنا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ اندر ایک ملازم، ایک میم صاحب کو اس کی پسند کے سینڈل پہنا کر جانچ کروا رہا تھا۔ کتنی پیاری تھی، وہ گوری سی میم، دودھ میں دھلی، آب شار کی جلترنگ کی مانند نکھری نکھری سی..... مگر خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا، کیوں کہ شاید پہلے دکان کے مالک اور پھر ملازم نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ ملازم تیزی سے باہر آیا اور حقارت بھرے لہجے میں مجھے جھڑکنے لگا۔ ''اوئے! کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یہاں شیشے کے پاس کھڑا نہ ہوا کر، سارا شیشہ گندا کر دیا۔ چل بھاگ یہاں سے، ورنہ مار کھائے گا۔'' میں جلدی سے گھبرا کر اپنا بستہ سنبھالے آگے بڑھ گیا۔ یہ نفرت و حقارت، یہ رویہ میرے لیے، کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے مجھے ایسے تحقیر آمیز رویوں کا سامنا تھا، اور پھر لوگوں سے کیا گلہ، شکوہ، میری صورت، میرا حلیہ ایسے رویے، ایسی ہی نفرت و حقارت کا متقاضی تھا۔ میں اپنے ماں باپ کا چھٹا بچہ تھا۔ ابا ایک شربت پیک کرنے والی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ صبح سے شام تک بوتلوں کو گتے کے ڈبوں میں بھر کے شام کو جب گھر آتے تو ان کے غصّے کا جن کھل چکا ہوتا۔ اور پھر ہم سب کونوں کھدروں میں دبک کر باقی کا دن گزارا کرتے۔ قلیل تنخواہ، ضروریات، مہنگائی اوپر سے نو بچّوں کی فوج۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا کہ یہ جو غریب والدین ہوتے ہیں، یہ اپنی غربت بانٹنے کے لیے ہی اپنا آنگن بچّوں سے بھر لیتے ہیں یا پھر شاید یہ ان کا غربت سے کوئی انتقام ہوتا ہے۔

وہ سردیوں کی ایک طویل اور کٹھن رات تھی، جب میرا جنم ہوا۔ نانی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش کے وقت حسبِ معمول کم خوراکی کی وجہ سے اماں کی صحت اور طبیعت کافی بگڑی ہوئی تھی۔ نتیجتاً میری صورت میں ایک کم زور، لاغر اور گہرے سانولے رنگ کا بچہ اس دنیا میں وارد ہوا۔ باقی بہن بھائی پھر بھی کافی بہتر اور کھلی ہوئی گندمی رنگت لیے پیدا ہوئے تھے۔ یہ نہ جانے قدرت نے ساری سیاہی میرے مقدر کی دوات ہی میں کیوں انڈیل دی تھی۔ چھوٹی خالہ کی، اماں سے ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ چلتی رہتی تھی، انہیں تو جیسے موقع ہی مل گیا۔ جھٹ بولیں۔ ''آئے ہائے باجی! یہ اتنا کالا کلوٹا سا بچہ کس پر چلا گیا لگتا ہے، جیسے آنگن میں اماوس کی رات اُتر آئی ہے۔'' اماں جو پہلے ہی میرے رنگ کی وجہ سے جلی بھنی پڑی تھیں، تلملا ہی تو گئیں ''جیسا بھی ہے، ہے تو میری ہی اولاد۔ ویسے تمہاری اس بھینگی بیٹی سے تو زیادہ ہی پیارا ہے۔'' اب جلنے کی باری خالہ کی تھی، وہ بھی تڑپ کر بولیں۔ ''ہاں ہاں، بڑا کوہ قاف کا شہزادہ جنا ہے تم نے۔'' اماں بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ ''ہاں میرے لیے کوہ قاف کا شہزادہ ہی ہے، اور میں نے تو اس کا نام بھی شہزادوں جیسا سوچ رکھا ہے۔'' ''پری زاد'' ہاں، بس یہی نام ہوگا، میرے بچّے کا۔'' ''پری زاد'' آس پاس موجود سب ہی عورتیں زیرِ لب بڑبڑائیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی باہر نکل گئیں۔ ''پری پیکر تو سُنا تھا، یہ پری زاد بھلا کیا نام ہوا۔'' بس وہی دن تھا، جب میری قسمت میں ہمیشہ کے لیے لوگوں کی نظر میں تمسخر، طنز اور حقارت لکھ دی گئی تھی۔ کاش! اُس روز اماں چھوٹی خالہ کے طنز کے جواب میں خاموش رہتیں تو میری زندگی اتنی تلخ نہ ہوتی۔ میری کالی سیاہ رنگت، لاغر جسم اور غیر دلکش نین نقش والی مسکین سی صورت کا تعارف جب پری زاد کے نام سے کروایا جاتا تو سُننے والا خود بخود قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا گیا تو استاد نے سب بچّوں کو فرداً فرداً کھڑا کر کے ان کے نام پوچھے تھے۔ میری باری آئی، تو میں نے

کھڑے ہو کر معصومیت سے اپنا نام بتایا۔ "پری زاد" استاد چند لمحے حیرت سے میرے پرانے لباس اور حلیے کو دیکھتے رہے، پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ "واہ شہزادے..... نام تو بڑا کمال رکھا ہے، ماں باپ نے....." استاد کی بات پر باقی بچے بھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ تب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر میرے نام میں ایسی کیا خامی ہے کہ جو بھی سنتا ہے، مذاق اُڑاتا ہے، مگر پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ مسئلہ نام کا نہیں، صورت کا ہے۔ اور پھر اسکول ہی کیا، گلی، محلے اور بازار میں، جہاں بھی میرے نام کی شہرت پہنچتی، پہلے تو لوگ اچنبھے کا شکار ہوتے اور پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرت ایک طنزیہ مسکراہٹ میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر میں اُس وقت ایک ناسمجھ بچہ تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس دوغلی دنیا میں انسان کا من چاہے، جتنا بھی میلا ہو، تن ضرور اُجلا ہونا چاہیے۔ بندے کے دل میں چاہے کتنا ہی کھوٹ ہو، چہرے اور صورت میں کوئی کھوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا ظاہر پرستوں کا ڈیرہ ہے۔ روح کا اُجلا پن اور خوب صورتی کو پرکھنے والی آنکھیں ان بے بصیرت لوگوں کے پاس کہاں.....؟

میری بدنصیبی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ میرے ساتھ یہ مذاق تب سنگین تر ہونے لگے، جب شاید ڈھائی یا تین سال کی عمر سے میرے من میں کچھی "خوب صورتی کی چاہ" کو آس پاس کے لوگوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اماں بتاتی تھیں کہ بھری پُری محفل میں جب کوئی مجھے پکارتا، تو میں درمیان میں بیٹھی درجن بھر عورتوں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی گود میں جا بیٹھتا، جو اس محفل میں سب سے اُجلے چہرے والی ہوتی تھی۔ خوب صورتی کی یہ چاہ صرف خوب صورت چہروں تک ہی محدود نہیں تھی، مجھے قدرت کی بنائی ہر خوب صورت چیز سے پیار ہو جاتا تھا، چاہے وہ پھول ہوں، رنگ، خوشبو، آسمان یا بادل۔ کوئی دھن ہو، بارش یا برف سے سجا کوئی نظارہ، کچھ بھی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں اسکول کے رستے میں آنے والی ایک تصویروں کی دکان کے باہر گھنٹوں کھڑا خوب صورت نظاروں والی تصاویر کو دور ہی سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا، مگر مجھ جیسے غریب خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کے اندر پلتی یہ حُسن پرستی تو جیسے زہر اعذاب بن گئی۔ شاید دنیا کی ہر خوب صورت چیز پر صرف حسین لوگوں ہی کا حق ہوتا ہے۔ بدصورت لوگوں کے لیے ہر طرف صرف بدصورتی ہی بچتی ہے۔ سو، میرے آس پاس بھی ہر لمحہ وہ بدصورتی ہی بھٹکتی رہتی، چھوٹا سا کچا گھر، کچرے سے اَٹی گلیاں، دھول اُڑاتا محلہ اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی کرخت اور بدصورت سوچ اور نظریں۔

اس پر طُرہ تماشا یہ کہ پانچویں جماعت میں، جس دن اسکول میں چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے والی سرکاری ٹیم آئی تھی، اُس روز میں نہ جانے کس وجہ سے اسکول ہی نہیں جا پایا اور ٹھیک ایک ماہ بعد میرے چہرے پر عجیب سے سرخ سرخ دانے اُبھرتے دیکھ کر اماں نے چلا کر ابا سے کہا کہ "پری زاد کے باوا، یہ لڑکے کا چہرہ تو دیکھو، یہ کیسے دانے ہیں؟" ابا بھاگم بھاگ مجھے لیے سرکاری اسپتال ٹیکا لگوانے پہنچ تو گئے، مگر جب تک بیماری اپنا کام کر چکی تھی اور پھر جب چند ہفتوں بعد زخموں کا کھرنڈ اترا تو بیماری ساری عمر کے لیے چہرے پر چیچک کے بدنما داغوں کی نشان چھوڑ چکی تھی اور ان داغوں سے بھی کہیں زیادہ گہرے داغ اور زخم تو مجھے ان لوگوں کی باتوں نے لگائے، جو بظاہر تیمارداری کرنے اور اماں سے ہمدردی جتانے آتے تھے، مگر ہلکی مذاق کی تہہ میں، طنز کے ایسے نشتر اور تیر چلاتے کہ اس چھوٹی عمر میں بھی میرا دل چھلنی ہو کے رہ جاتا۔ کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل، بم اور ڈرون ایجاد کر کے جا بجا پھیلائی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے، اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ ایٹم بم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔

شاید میرے والدین کا بھی اس معاملے میں اتنا قصور نہیں تھا۔ جب کسی غریب گھرانے میں یکے بعد دیگرے اوپر نیچے بچے پیدا ہو جائیں، تو پھر ان میں سے کسی ایک بچے کی حساسیت کا بھلا کسے خیال رہتا ہے۔ یہ میری اپنی بدقسمتی تھی کہ میں ایسی صورت کے باوجود بھی اندر سے بے حد حساس واقع ہوا تھا۔ کاش! انسان اس دنیا میں صرف غریب ہی پیدا ہوتا یا صرف نازک دل۔ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں بچے اس ملک کی ان ہی گلی کوچوں کی دھول چاٹتے رل کھل کر بڑے ہو ہی جاتے ہوں گے، مگر میری حساسیت نے میری زندگی کا خارزار میرے لیے طویل تر کر ڈالا۔ میں جتنا لوگوں کی آنکھوں سے پھسلتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں آ جاتا تھا۔ اور پھر میرے اندر پلتا وہ ایک حُسن پرست پری زاد، جسے ہر خوب صورت چہرہ اس قدر لبھاتا تھا کہ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں اور سب سے بڑے دو بھائی اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور دو بھائی سب ہی کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی، کیوں کہ انہیں نہ تو اپنی زندگی سے کوئی توقع تھی، اور نہ ہی جیون کا برتاؤ ان سے کچھ الگ تھا۔ شاید زندگی میں سب سے بڑی دشمن، ہماری اپنی توقعات ہی ہوتی ہیں۔ کانٹوں میں اُلجھاؤ رکھنے والی امیدیں، گرم تپتی ریت پر چلنے پر مجبور کر دینے والی توقعات۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا، جب دو بڑے بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی گئی، گھر میں دو افراد کا اضافہ ہو گیا اور ہم سب بہن بھائی اپنی اپنی مخصوص جگہوں سے سرکتے باہر برآمدے اور صحن میں آ گئے، چھوٹے سے گھر کی تقسیم کتنی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں باتیں تو درکنار، ایک دوسرے کی سوچ بھی سنائی دے جاتی ہے۔ لہٰذا دھیرے دھیرے ہم بہن بھائیوں کی سوچ بھی سرگوشیانہ ہوتی چلی گئی۔ شاید مجبوری اور غلامی کی انتہا بھی یہی ہوتی ہوگی کہ انسان اپنی سوچ کی بولی بھی اونچی نہ ہونے دے، سوچنا بھی سرگوشیوں میں شروع کر دے۔

بھائیوں کی شادی کے بعد گھر کی مزید آبادی بڑھی تو ہم سب کو مزید سرکا دیا گیا۔ کمرے والے برآمدے میں، برآمدے والے صحن میں اور میں جو صحن میں سوتا تھا، میرے لیے فرمان صادر ہوا کہ باقی بھائی بہن چوں کہ چھوٹے ہیں، لہٰذا مجھے گھر کی چھت پر بنے ایک کچے گودام نما کمرے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چھت پر ٹین اور مٹی کا بنا یہ چھوٹا سا کمرا گھر کا کاٹھ کباڑ جمع کرنے کے کام آتا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں کوئی چیز فالتو نہیں ہوتی۔ ایک سال پہلے جس شے کو فالتو کچرا سمجھ کر اس گودام میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اگلے سال اسی کی تلاش میں اماں اور بڑی بہنیں سارا گودام الٹ پلٹ رہی ہوتی تھیں۔ میرے لیے بھی یہی حکم تھا کہ میں گودام کی تمام ''قیمتی اشیا'' ایک طرف سلیقے سے لگا کر اپنی چارپائی اس گودام میں ڈال لوں۔ آتے وقت میں اپنی کورس کی کتابیں بھی وہیں اٹھا لایا۔ اب اسکول سے واپسی پر کھانا کھانے کے بعد میں چپ چاپ اوپر بنے ٹین کی چھت والے کمرے میں چلا آتا۔ شروع شروع میں مجھے یہاں کچھ گھٹن سی محسوس ہوئی، مگر پھر دھیرے دھیرے اپنی اس تنہائی سے سکون ملنے لگا۔ یہ تنہائی میرے پورے وجود میں سرایت کرنے لگی اور پھر جیسے میری، اپنی اس تنہائی سے دوستی سی ہوگئی۔ تنہائی میں ہم خود اپنے ساتھ ہوتے ہیں اور مجھ جیسا لڑکا، جسے کسی ساتھی کا بھی ساتھ میسّر نہیں تھا۔ اس کے لیے اپنا یہ ساتھ کتنا غنیمت تھا۔ یہ میں ہی جانتا تھا، آہستہ آہستہ میری ہی تنہائی مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے اوروں کی طرح بدصورت، لاغر اور کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ میں اس کے لیے حقیقت میں ایک پری زاد تھا، وہ میرے ساتھ مختلف دل چسپ کھیل کھیلا کرتی۔ میری تنہائی کبھی مجھے اسکول کا سب سے لائق ہونہار طالب علم بنا دیتی، جو ضلعے بھر میں اول پوزیشن لینے کے بعد کھچا کھچ بھرے ہال میں ہیڈ ماسٹر سے ٹرافی وصول کر رہا ہوتا، تو کبھی اسکول کا سب سے بہترین کھلاڑی بن کر سارے مقابلے جیت رہا ہوتا اور میری ہر کام یابی پر سارا اسکول دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ غرض، میری تنہائی نے میرا ہر وہ خواب سچ کر دکھایا، جس کا میں عام زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاس میں، مَیں ایک درمیانے درجے کا شرمیلا طالب علم تھا، جس نے غیر نصابی سرگرمیاں تو دُور، کبھی نصاب میں بھی کوئی غیر معمولی کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔ اگر غلطی سے استاد کبھی مجھ سے کوئی سوال پوچھ بھی لیتے تو میری ٹانگیں کانپنے لگتیں۔

مجھ سے بڑے بھائیوں نے تو جیسے تیسے دسویں کا امتحان پاس کر کے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کر دی تھیں۔ اور اب اپنی دنیا میں مگن تھے اور ان ہی دنوں، جب میں دسویں جماعت میں تھا۔ میری بڑی بہن کی بات کہیں طے ہوگئی اور اس کے سُسرال والوں کی ضد کے آگے ہار کر ابا کو رخصتی کی ہامی بھرتے بنی۔ ہماری برسوں کی لگی بندھی زندگی کی روٹین میں ایک ذرا سی ہلچل پیدا ہوئی اور اماں نے آس پاس کی پڑوسنوں اور لڑکیوں بالیوں کو ڈھولکی کے لیے ہفتہ بھر پہلے ہی روزانہ شام کو گھر آنے کی دعوت دے دی، ایسے مواقع پر میں زیادہ تر چھت پر اپنے ڈربے نما کمرے ہی میں قید رہتا، حالاں کہ دل بہت چاہتا تھا کہ صحن میں جھانک کر محلے کی لڑکیوں کو شور وغل اور ہنگامہ کرتے دیکھوں۔ ان کی ہنسی اور قہقہوں کی آواز اوپر کمرے تک آتی، تو کئی بار چھت کی منڈیر تک بھی آتا، مگر پھر واپس لوٹ جاتا۔ اگر کسی کام سے گھر سے باہر بھی جانا ہوتا، تو چپ چاپ صحن کی پچھلی جانب سے نیچے اُترتا۔

اُن دنوں سرِ شام ہی محلے کے نوجوان لڑکے ہماری گلی کے اردگرد منڈلانے لگے تھے اور میری اماں یا ابا کے بلاوے پر بھاگ بھاگ کر گھر کے کام یوں کرتے، جیسے یہ ان کا فرض ہو۔ مجھ پر یہ بھید بہت دیر میں کُھلا کہ ان میں سے ہر ایک محلے کی کسی نہ کسی لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کی آس میں یہ ''گلی یاترا'' کرتا ہے۔ کبھی کبھار ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی سرد آہیں اور عشقیہ جملے میرے کانوں میں بھی پڑ جاتے۔ ''یار! کیا ہوا، وہ آئی کہ نہیں؟'' ''کہاں یار! اس کا تو گھر سے نکلنا ہی عذاب ہو چلا ہے، تُو بتا تیری والی آئی کہ نہیں.....؟'' ''ہاں، آئی تو ہے، پر اس کی اماں کی بڑی کڑی نگرانی ہے آج کل اُس پر، سوچتا ہوں، خط پکڑانے کی کوئی ترکیب کروں۔'' میں حیرت سے ان سب کی یہ باتیں سُنتا اور رشک سے ان سب کو دیکھا کرتا، میری نظر میں وہ سب لوفر بہت عظیم درجہ رکھتے تھے۔ بھلا اس دنیا میں کسی کا محبوب بننے سے بھی بڑا کوئی درجہ ہو سکتا ہے۔ عاشق تو لاکھوں مل جائیں گے، محبوب کے درجے پر شاذ و نادر ہی کوئی فائز ہوتا ہے۔ یہ خود کو کتنا مکمل کر دینے والا احساس تھا کہ کوئی اس دنیا میں ایسا بھی ہے، جو اپنی تنہائی میں آپ کو سوچتا ہے، آپ کی فکر کرتا ہے، آپ کی یاد اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھی سی مسکان بکھیر دیتی ہے۔ مجھ جیسے معمولی لڑکے کے لیے تو یہی زندگی کی معراج تھی کہ محلے کی کسی لڑکی نے میری طرف دیکھنا تو درکنار، کبھی ایک اچٹتی سی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ لڑکیاں تو لڑکیاں، مجھ سے تو محلے کے خوب رُو لڑکے بھی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں آپس میں اپنے معاشقوں کی باتیں کرتے رہتے اور میں ان کے قریب بیٹھے ہونے کے باوجود کبھی اتنی توجہ کا باعث بھی نہیں بن سکا تھا کہ ان میں سے کوئی مجھ سے اتنا ہی کہہ دے کہ ''بھائی جاؤ، جا کر اپنا کام کرو، کہاں ہمارے درمیان گھسے بیٹھے ہو؟'' ان میں سے اگر کبھی کسی کی کوئی اچٹتی نگاہ مجھ پر پڑ ہی جاتی تو وہ بڑی بے پروائی سے کہتا ''یار پری! جلدی سے جا کر ایک ڈبیا کیپسٹن کی تو پکڑ لا۔'' ہم سب عُمر کے اس دور میں تھے، جہاں گھر والوں سے چُھپ کر سگریٹ پینا بھی ایک کارنامہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی نظر میں میری وقعت بس اتنی تھی کہ میں ان کی یہ ہلکی پھلکی خدمت کرتا رہوں۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ میں ان کی نظر میں قطعی بے ضرر تھا، عاشق کو خطرہ صرف اپنے رقیب سے ہوتا ہے اور میری اتنی اوقات ہی نہیں تھی کہ میں کسی ادنیٰ درجے کے رقیب کے عہدے پر ہی فائز ہو سکوں۔

ان دنوں محلے میں ناہید نامی لڑکی کا بہت چرچا تھا۔ محلے کے سبھی لڑکوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، اس پری چہرہ نے۔ اور ہماری گلی میں جمع ہونے والی اس بھیڑ کی بنیادی وجہ بھی ناہید ہی تھی۔ کیوں کہ وہ روزانہ اپنی ماں کے ساتھ مغرب کے بعد ہمارے گھر کی تقریب میں شامل ہونے آتی تھی۔ ہمیشہ نظریں جھکائے اور سر پہ اوڑھنی اوڑھے ناہید کو میں نے بھی ایک آدھ بار گلی میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پاکیزہ اور کتنی معصوم دکھائی دیتی تھی۔ شادی کا دن قریب تھا اور گھر میں ہنگامہ بھی اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، جب ایسی ہی ایک شام میں گھر کے صحن سے گزر کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا، تو صحن میں بیٹھی کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ذرا سُنیے..... میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری سانس تھم گئی، مجھے پکارنے والی کوئی اور نہیں، ناہید ہی تھی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے میرے پیچھے یا صحن میں آس پاس کوئی اور موجود ہے، جسے ناہید نے آواز دی ہوگی۔ مگر وہاں تو میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میری نظر ایک پل کے لیے اس کی جانب اٹھی اور اس کی سیاہ گھنی پلکوں اور بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے ٹکرا کر دوسرے ہی پل زمین میں گڑ گئی۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا لحاظ یا رعب، لحاظِ حُسن، یا رعبِ حُسن بھی ہوتا ہے۔ اور میرے لیے تو یہ ویسے بھی ایک ناقابلِ یقین اور ان ہونی تھی۔ میں نے اس لڑکی کے لیے محلے کے کڑیل جوانوں کو تپتی دوپہروں میں گھنٹوں اسکول کے رستے میں کھڑے چلتے دیکھا تھا، مگر وہ اسکول سے واپسی پر یا کبھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے آنکھ اٹھا کر بھی کسی کی طرف نہیں دیکھتی تھی۔ مجال ہے، جو آج تک کسی نے اسے ننگے سَر دیکھا ہو۔ آج وہی محلے کی سب سے خوب صورت لڑکی مجھ سے براہِ راست مخاطب تھی۔ مجھ سے، جسے اس کے اپنے گھر والے بھی عموماً بھول جاتے تھے۔ میں تو اگر کھانے کے لیے کبھی دیر سے چھت سے نیچے آتا، تو عام طور پر چھوٹے بہن بھائی سب صفاچٹ کر چکے ہوتے اور اماں مجھے دیکھ کر سر پیٹ لیا کرتیں کہ ''ارے..... ٹو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔'' پھر میں کیوں حیران نہ ہوتا، جب اس نے میرا نام لے کر دوبارہ پوچھا۔ ''آپ خالہ صغراں کے بیٹے ہیں ناں..... پَری زاد.....'' میرا جی چاہا کہ اسے روک کر کہوں کہ پَری تو آپ ہیں، میں تو صرف زاد ہی زاد ہوں۔ مگر میرے حلق سے عجیب و غریب سی آواز نکلی۔ ''جی.....'' ''آپ ذرا اس شادی کے ہنگامے سے فارغ ہولیں، تو ایک بار ہمارے گھر کا چکر لگا لیجیے گا۔ میری امی آپ کو یاد کر رہی تھیں''۔ وہ بات ختم کر کے نہ جانے کب کی جا چکی تھی، مگر میرے قدم تو جیسے وہیں صحن کی کچی زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ میں جانے کتنی دیر وہیں کھڑا ان چند گھڑیوں کے خواب یا گمان ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ وہ پل حقیقت بھی ہو سکتے ہیں، جب وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ واقعی کچھ لوگ ہمارا نام پکاریں، تو نام بھی معتبر لگنے لگتا ہے۔

مَیں جیسے کسی طلسم کے زیرِ اثر باہر گلی میں نکلا تو حسبِ معمول لفنگوں کی ایک ٹولی گلی کے نکڑ پر جمع تھی۔ وہ سب اس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ماجد بھی تھا۔ محلے کا سب سے کڑیل اور خوبرو جوان، میرے ہم عُمروں میں سب سے زیادہ زندہ دل اور ہر محفل کی جان، پڑھائی لکھائی میں بھی آگے اور شام کو جب محلے کے باقی لڑکے بڑے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے، تو ماجد کی تیز باؤلنگ اور ہوا میں اُڑتے لمبے بال دیکھنے کے لیے ہم بھی تماشائی گھنٹوں کھڑے رہا کرتے۔ میں چُپ چاپ نکڑ پر کھڑے لڑکوں کی ٹولی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ناہید ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ ان سب نے خود اپنے طور پر ہی، اپنی پسند کے مطابق محلے کی لڑکیاں اپنے اپنے ناموں سے منسوب کر رکھی تھیں۔ اور ماجد کے نام کا قرعہ اس کی جاذبِ نظر شخصیت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ناہید کے نام نکلتا تھا۔ ماجد خود بہت عرصے سے ناہید کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا تھا۔ مگر بقول اس کے، وہاں اس کی دال گلتی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی وہی ذکرِ جاناں جاری تھا۔ اکرم نے پوچھا ''یار! بتا تو سہی، کچھ بات تو کی ہوگی اس نے تجھ سے.....'' ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''کہاں یار..... اُس نے تو جیسے مجھ پر نظر نہ ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جانے کب اپنے بھاگ کھلیں گے'' پھر اچانک ماجد کی مجھ پر نظر پڑی۔ میں منہ کھولے محویت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ماجد نے ایک دم ہی مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''ارے پَری زاد..... تُو نے کبھی کسی سے عشق کیا ہے.....؟'' سب لڑکوں نے ماجد کی بات سُن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میں نے..... نہیں تو.....'' ماجد سنجیدہ سی شکل بنا کر بولا۔ ''ہر کسی کو زندگی میں ایک بار عشق ضرور کرنا چاہیے۔ عشق آدمی کو انسان بنا دیتا ہے۔'' اکرم نے شرارت سے ماجد کی طرف دیکھا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''صرف ایک بار، ذرا پھر سوچ لے ماجد''۔ سب لڑکے ایک بار پھر زور سے ہنس پڑے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ نہ صرف ہمارے محلے، بلکہ آس پاس کی جانے کتنی گلیوں میں ماجد کے چکر چلتے تھے۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ میں بھی ان سب کو آج یہ بتا کر حیران کر دوں کہ جس ناہید کی ایک جھلک پانے کے لیے وہ سب یہاں گھنٹوں سے کھڑے ہیں، اُسی ناہید نے آج خود مجھ سے نہ صرف بات کی بلکہ اپنے گھر بھی بُلایا ہے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ بھلا کون میری بات پر اعتبار کرے گا۔ الٹا

مزید مذاق بنے گا۔

وہ میری زندگی کی پہلی رات تھی، جو مجھ سے گزارے نہیں گزر رہی تھی۔ پہلے تو میں اپنے کمرے ہی میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا، پھر تنگ آ کر اس جھلنگا سی چارپائی کو کمرے سے باہر کھینچ کر کھلے آسمان تلے تاروں کی چھت کے نیچے ڈال دیا اور پھر ساری رات تاروں سے پوچھتا رہا کہ آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے، جس کے لیے اس "ستارہ جبیں" نے مجھے اپنے گھر آنے کو کہا ہے؟ کہتے ہیں، جادوگر اور بازی گر ہمیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ ہماری نظر بندی کر کے جانے کیسے کیسے کھیل تماشے دکھا جاتے ہیں۔ آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، مگر اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ سب سے بڑا جادوگر اور ماہر ترین بازی گر تو خود ہمارے سینے کے اندر دھڑکتا یہ دل ہوتا ہے۔ جادوگروں اور بازی گر کی نظر بندی کا علاج تو شاید پھر بھی ممکن ہو، مگر اس کم بخت دل کی نظر بندی کا کوئی علاج نہیں۔ میرے دل نے بھی اس رات میری عقل پر پردے ڈال کر میری نظر بندی کر دی تھی۔ اپنے سیاہ چیچک زدہ چہرے کو بھلا کر میں کسی شہزادے کی طرح ساری رات اپنے سپنوں میں ناہید کا ہاتھ تھامے انجان وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی ہمارے خواب بھی کتنے خوب صورت ہو جاتے ہیں، شاید اسی لیے انہیں "خواب" کہا جاتا ہے۔

اس رات کے بعد نیند تو جیسے مجھ سے روٹھ ہی گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں نے شادی کے دن گزارے اور پھر خستی کے ٹھیک دوسرے دن جھجکتے ہوئے ناہید کے گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔ ناہید کے ابا نے دروازہ کھولا، جنہیں ہم سب مرزا جی کہتے تھے۔ ان کا غصہ سارے محلے میں مشہور تھا۔ "ہاں بھئی، کیا بات ہے.....؟" انہوں نے کڑک دار لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ میں پل بھر کے لیے تو بوکھلاہٹ میں سب بھول گیا۔ وہ دوبارہ گرجے۔ "اب کچھ بولو گے بھی یا یونہی منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑے رہو گے.....؟" میں گھگھیایا "جی..... وہ..... میں..... مجھے بلایا تھا خالہ نے....." انہوں نے حیرت سے مجھے ایک بار پھر سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ "اندر آ جاؤ....." میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہر حال اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ناہید کی امی آ گئیں اور عقدہ یہ کھلا کہ ناہید کے نویں جماعت کے پرچے ہونے والے تھے اور سالانہ امتحانات میں اسے اردو کے مضمون میں رہنمائی چاہیے تھی۔ جانے اس کی امی کو کس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میری اردو بہت اچھی ہے۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا، کیوں کہ مجھے پوری زندگی میں آج تک اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔ طے یہ پایا کہ میں شام کو چار سے پانچ بجے تک ایک گھنٹہ ناہید کو اردو کی تیاری کروا جایا کروں گا۔ مرزا صاحب ٹیوشن کی فیس بھی مقرر کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے انہیں ٹال دیا۔ ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بہت دیر تک تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس خوب صورت حادثے پر بہرا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ رات تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں رہا۔ صدمے کا تعلق ہمیشہ غم ہی سے نہیں ہوتا، کبھی کبھی اچانک مل جانے والی بے پناہ خوشی بھی ہمارے عمومی رویے سے متصادم ہو جاتی ہے۔ شاید ساری بات ظرف کی ہے، خوشی ہو یا غم، ہمارے ظرف کے پیمانے سے بڑھ جائے تو ہم اپنی ظاہری شخصیت کا رکھ رکھاؤ کھو بیٹھتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا اور اگلے دن، تین چار مرتبہ اماں اور بڑے بہن بھائیوں سے مختلف باتوں پر ڈانٹ پڑ گئی۔ مثلاً میں عام طور پر شاذ و نادر ہی آئینہ دیکھا کرتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے آئینے سے ڈر لگتا تھا۔ مگر اُس روز، جب لگاتار تیسری مرتبہ برآمدے میں لگے آئینے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے شیشے میں جھانکا تو برآمدے میں کچھ کام کرتے بڑے بھائی نے مجھے گھورا "خیر تو ہے..... یہ کنگھی پٹی آج کس خوشی میں کی جا رہی ہے؟" میں سٹپٹا سا گیا۔ "تمہارے دسویں کے امتحانات سر پر ہیں، اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دو، آئینہ دیکھنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔" میں جلدی سے سر ہلا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ اس روز گھڑی کے ہندسوں کی مجھ سے جیسے کوئی جنگ سی جاری تھی۔ میں گھنٹہ بھر بعد بھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو سوئی صرف چند منٹ ہی آگے کھسکی ہوتی۔ شاید گزرتے وقت کا تعلق کسی سوئی یا گھڑی سے نہیں ہوتا۔ وقت ہمیشہ ہماری لمحوں کے ساتھ ضد سے ناپا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کے خلاف ہمیشہ، ہماری خواہش کے برعکس گھڑیوں کے گزرنے کو وقت کا نام دے دیا گیا ہے۔ جب ہم اسے تیز تر چاہتے ہیں، یہ سُست تر ہو جاتا ہے، اور جب کبھی ہم اس کے آہستہ پن کی دعا اور التجا میں گڑگڑا رہے ہوتے ہیں، اسے بَرَق لگ جاتے ہیں، تو پھر ہم بھولے انسان وقت کو گھڑی یا سوئی کے پیمانے پر کیوں ناپتے ہیں۔ بس، اپنے دل میں جھانک کر اپنی خواہش ٹٹول لیا کریں، وقت ہمیشہ اس کی مخالف سمت ہی دوڑتا ملے گا۔

ٹھیک چار بجے شام، میں ناہید کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے، شکر ہے، اس وقت ماجد اور اس کے دوستوں کی ٹولی وہاں مورچہ جمائے نہیں بیٹھی تھی، ورنہ مجھے ہزار سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ دروازہ ناہید کے چھوٹے بھائی نے کھولا۔ اور مجھے اندر لے جا کر صحن میں لگی انگوروں کی بیل کے نیچے بچھی کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز اور دوسری کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میرا دم پھول رہا تھا۔ دھڑکن بے قابو تھی، اور سانس رُک رُک کر آ رہی تھی۔ میں نے بچپن ہی سے اپنے لیے لوگوں کی نظر میں اس قدر تحقیر اور تمسخر دیکھا تھا کہ مجھے براہِ راست اوپر دیکھنے یا سامنے والے کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی، لہٰذا جب ناہید اپنا سیاہ دوپٹا سر پر جمائے ہوئے آ کر بیٹھی، تو تب بھی میری نظریں نیچے زمین ہی میں گڑی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ جب اس کے گورے پاؤں سیاہ سینڈلز میں جکڑے میری نظر کے دائرے میں آئے تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں مزید جھکا لیں اور خود اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور شاعری کا باب نکال کر بولی۔ "سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ میر تقی میر اور درد کی شاعری کی تشریح کرنا سکھا دیں۔ ہمیشہ یہ سوال مجھ سے رہ جاتے ہیں۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا، جیسے کوئی عالم دماغ مقرر حاضرین سے کھچا کھچ بھرے ہال کے سامنے اسٹیج پر آ کر یک دم اپنے دماغ سے ہٹ جانے والی تقریر کو یاد کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پتا نہیں، میں نے شعر کی تشریح کیا کی اور نثر کا باب کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا۔ ناہید کے کومل ہاتھ صفحے پلٹتے گئے اور میں اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ڈوبا ہوا مقدر تلاش کرتا رہا۔ ٹھیک پانچ بجے ناہید کی امی چائے کا کپ لے کر آ گئیں اور میں نے حیرت سے برآمدے میں لگی بڑی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک گھنٹہ گزر بھی گیا۔ پھر وہی وقت کی ہماری خواہش سے جنگ.....؟ میں چائے کا کپ ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا، مگر کبھی کبھی سُرور کا تعلق صرف کسی نشہ آور شے سے نہیں ہوتا۔ کچھ پل ایسے ہوتے ہیں، جب فضا میں، ہوا میں، آس پاس کے ماحول ہی میں نشہ گھل جاتا ہے۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ، جو دن بھر، بنا کسی گناہ کے بوجھ تلے دبے اس سُرور کا نشہ لیتے ہیں۔ اس روز میں بھی پورا دن بنا کسی نشے کے سرور میں رہا۔ مگر کہتے ہیں کہ دنیا کا ہر نشہ عارضی ہوتا ہے، عموماً رات بھر کے خمار کے بعد صبح اتر ہی جاتا ہے۔ میرا نشہ بھی صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی بھک سے اڑ گیا۔ میں بے خیالی میں کنگھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لگے ٹوٹے اور میلے سے آئینے کے ایک ٹکڑے میں اپنا چہرہ دیکھ بیٹھا اور میرے سارے سپنے پل بھر میں کرچی کرچی ہو گئے۔ کاش یہ آئینہ ایجاد نہ ہوا ہوتا، تو ہم جیسوں کے لیے دنیا اتنی مشکل جگہ نہ ہوتی۔ اس پل میرا جی چاہا کہ دنیا کے سارے آئینے

توڑ ڈالوں یا کاش ایسا ہو جائے کہ دنیا کے سارے خوب صورت اندھے ہو جائیں۔ یا پھر اوپر والے نے دنیا میں ہر صورت ایک سی ہی بنادی ہوتی، تو اس بصارت یا آئینے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اگلے روز ناہید کے گھر کے باہر ہی مجھے ماجد نے دھر لیا۔ ''ہاں، شہزادے! کیا چکر ہے، ہماری بجنی کے گھر، وہ بھی ہم سے چھپ چھپ کے.....!'' میں نے ماجد کو ٹیوشن والی بات بتائی۔ ماجد نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''ہاں میاں! ایسی تو فائدے ہوتے ہیں لکھ پڑھ جانے کے۔ چلو عیش کرو، میری قسمت میں تو ویسے بھی اُس ظالم کی نظر نہیں ہے۔ کبھی پلٹ کر دیکھتی تک نہیں''۔ پھر ماجد کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں..... یاد آیا۔ یار ایک خط تو لکھ دے کسی کے نام، دراصل میری لکھائی اتنی اچھی نہیں ہے اور سُنا ہے، لڑکیوں پر اچھی لکھائی کا بڑا اثر ہوتا ہے''۔ ''کوئی اور وقت ہوتا، تو میں شاید ماجد کو ٹال دیتا، کیوں کہ ہر ہفتے کسی نہ کسی کے قدموں میں پھینکنے کے لیے ماجد کو ایسے خط اور رقعوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، مگر اس وقت چوں کہ ٹیوشن کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے میں نے بادلِ نخواستہ چند سطور ایک سادے صفحے پر کھینچ کر ماجد کے حوالے کر دیں۔ وصول کرنے والی کا نام اس نے نہیں لکھوایا اور اپنے نام کی جگہ بھی خالی رہنے دی تاکہ وہ اپنے ''متاثر کن'' دستخط کر سکے۔ میں جیسے تیسے جان چھڑا کر ناہید کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آج مرزا صاحب بھی گھر میں موجود تھے اور صحن میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری پڑھائی کے دوران وہ بھی وقتاً فوقتاً لقمے دیتے رہے اور کچھ جگہ میری تصحیح بھی کی۔ اب انہیں کوئی بتاتا کہ تصحیح ہوش مندوں کے لیے ہوتی ہے۔ مدہوش بھلا یہ درست اور غلط کی تکرار کیا جانیں۔ ناہید کی باتوں سے اس دن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے شعر و شاعری سے کافی لگاؤ ہے اور اسے بہت سے اچھے شعر بھی زبانی یاد ہیں۔ مگر میرے ساتھ ایک بہت عجیب سا مسئلہ یہ تھا کہ میں دن بھر شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا۔ پل پل کانٹوں پر کاٹ کر گزارا کرتا، مگر جیسے ناہید میرے سامنے آتی اور اس کے حُسن کے نُور کی پہلی کرن میری آنکھوں پر پڑتی، میری نظریں خود بخود جھک جاتیں۔ مجھے ناہید کے گھر ٹیوشن پڑھانے جاتے ہوئے سات آٹھ روز ہو چکے تھے اور ان دنوں میں، میں نے شاید سات پل کے لیے بھی اس کے چہرے کو براہِ راست نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کے ہاتھ، کنگن، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، آواز کا زیر و بم، بالوں کی وہ ایک لمبی سی شریر لٹ، جو بار بار چہرے سے نیچے ڈھلک کر اُسے تنگ کرتی رہتی تھی، اس کی مخروطی انگلیاں اور اس کا وہ قلم پکڑنے کا ایک خاص انداز۔ بس یہی کچھ ان لمحوں کا سرمایہ تھا۔ ہاں البتہ ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا تھا کہ ناہید کو اردو پڑھانے کے چکر میں، مَیں خود دن بھر اردو کے رٹّے لگاتا رہتا اور اپنے اردو کے استادوں سے اس روز کی ٹیوشن کے باب بھی خوب اچھی طرح سمجھ کر آتا تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، سو اس مشق سے میری اپنی دسویں کی اردو کی تیاری بہت اچھی ہوتی گئی۔

میرے میٹرک کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ اسکول کی طرف سے دسویں جماعت کو شہر کے مقامی سنیما میں اردو فلم دکھانے کے لیے لے جایا گیا۔ ہیرو پیانو پر بیٹھا ایک محفل میں ہیروئن کو اپنے دل کا حال سُنا رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ ہیرو، پیانو بجاتے ہوئے مجھے بہت اچھا لگا اور جانے کیوں اُسی لمحے میرے اندر بھی پیانو سیکھنے اور بجانے کی خواہش، ایک شدید کسک کی صورت میں جاگ اٹھی۔ اس رات میں نے خود کو خواب میں وہی سفید سوٹ پہنے پیانو بجاتے دیکھا اور ناہید اسی فلم کی ہیروئن کی طرح پیانو کے پہلو سے جُڑی میرے قریب کھڑی محویت سے میری دُھن سُن رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ خواب میں میرا چہرہ اور وجود کسی بھی قسم کے داغ دھبوں اور سیاہی سے بالکل پاک صاف تھا۔ صبح جب اچانک کسی کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی تو بہت دیر تک میں نے صدمے کے مارے آنکھیں میچے رکھیں۔ کچھ خواب کتنے اثر انگیز اور روح تک میں سرایت کر جانے والے ہوتے ہیں کہ بہت دن تک ہمیں اُداس اور بے چین رکھتے ہیں۔ تب ہمارا جی چاہتا ہے کہ کاش ہماری موجودہ زندگی ایک خواب ہوتی اور وہ خواب ہماری زندگی سے بدل جاتے، مگر کچھ لوگوں کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ میں بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

ناہید کو ٹیوشن پڑھاتے ہوئے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا کورس تقریباً ختم ہونے کو تھا، بلکہ مرزا صاحب نے تو اب ہفتے میں صرف تین دن ٹیوشن اور تین دن خود ناہید کی اپنی دُھرائی کے لیے مقرر کر دیے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ چند دن بعد یہ تین دن کی ملاقات بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ اس تمام عرصے میں ناہید نے مجھ سے کبھی کورس کی کتابوں اور اپنی ٹیوشن کے ہوم ورک کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ ہم دونوں اُس ایک گھنٹے میں زمانے بھر کی باتیں کرتے ہیں۔ شاید حُسن کی اپنی کوئی گفتگو، کوئی بولی ہوتی ہے، جسے عام لفظوں یا زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا شاید خوب صورتی کا احساس ہی اپنے اندر سارے جہاں کی گفتگو سموئے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں، تخیلے کی باتوں میں، گفتگو اضافی ہے۔ میں ناہید کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اُسی تخیلے میں مقید رہتا۔

اُس رات بھی میں اپنے کمرے میں گود میں کتاب رکھے اپنے آپ سے اسی گفتگو میں مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں ایک شور سا اٹھا، جیسے بہت سے لوگ کسی کا پیچھا کرتے چلاتے چیخ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا اور چھت سے نیچے گلی میں جھانکا، تو عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔ جلدی سے نیچے اتر کر معلومات کیں، تو بھانت بھانت کی باتیں سُن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ گلی میں چند بزرگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ''نہ میاں..... کوئی کسی کی چھت پر یونہی نہیں ناچتا۔ ضرور لڑکی کی طرف سے کوئی اشارہ ہوگا''۔ دوسرے صاحب منمنائے۔ ''ہاں بھئی، یہ آج کل کی نئی نسل بھلا بزرگوں کی عزت اور غیرت کیا جانے''۔ پتا چلا کہ مرزا صاحب کے گھر والے خاندان کی کسی تقریب سے واپسی پر لیٹ ہو گئے تھے۔ گھر میں صرف ناہید اور اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کسی پڑوسی نے اُن کے چھت پر کسی کو کودتے دیکھا تو شور مچا دیا۔ سایہ شناخت ہوئے بنا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا، مگر اپنے پیچھے افواہوں اور بدنامیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا تھا۔ مجھے ان سب پر بہت غصہ آیا کہ وہ ناہید جیسی شریف اور باکردار لڑکی پر ایسے الزامات لگا رہے تھے۔ اگلے دن بھی محلے میں یہی چرچا رہا۔ دن کے تقریباً دو بجے کے قریب کسی نے ہمارے گھر کا دروازہ بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ابا جی اور پھر ان کے پیچھے دونوں بڑے بھائی بھی گھر سے باہر نکلے، باہر سے مرزا صاحب کے شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بھی سن گن لینے کے لیے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ باہر محلے داروں کی بھیڑ میں کھڑے مرزا صاحب غصے اور نفرت سے چلائے۔ ''یہ رہا..... یہاں گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ جیسی اس کی شکل مکروہ ہے، ویسے ہی گھناؤنے کرتوت ہیں اس کلوے کے''۔ میں نے حیرت سے گھبرا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ ''جی.....؟ مگر میں نے کیا کیا ہے؟'' ''کیا کیا ہے تم نے؟ خوب..... ابھی بتاتا ہوں''۔ انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر سب کے سامنے لہرایا۔ ''اب یہ نہ کہنا کہ یہ خط تم نے نہیں لکھا۔ تمہاری تحریر خوب پہچانتا ہوں میں لفنگے''۔ میں نے پہلی نظر ہی میں ماجد کے لیے لکھا اپنا خط پہچان لیا اور میری زبان سے حیرت میں بے ساختہ نکلا۔ ''ہاں..... مگر یہ خط تو میں نے''۔ مگر میری بات ادھوری ہی رہ گئی اور مرزا صاحب کا ہاتھ تیزی سے گھوما اور میرے گال پر ایک زناٹے دار چانٹا پڑ گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سناٹے میں اس زوردار تھپڑ کی آواز ایسے گونجی، جیسے بم دھماکا ہوا ہو، مگر آواز کے دھماکے سے کہیں زیادہ گونج میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ جانے کی تھی۔ مرزا صاحب نے اس طمانچے کے بعد مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چیخ چیخ کر مجمعے کو بتانے لگے کہ گزشتہ رات ان کی چھت پر کوئی اور نہیں، میں کودا تھا اور اس بات کی خبر ناہید کی امی کو صبح سویرے اُس وقت ہوئی، جب وہ چھت پر کپڑے ڈالنے گئیں اور انہیں وہاں ایک کونے میں میرا لکھا ہوا یہ خط مڑا تڑا سا پڑا ہوا ملا۔ وہ سب گھر والے میری تحریر اچھی طرح پہچانتے تھے، کیوں کہ ناہید کا اردو کا رجسٹر میری تحریر سے بھرا پڑا تھا۔ سارے محلے دار مجھے لعنت ملامت کرنے لگے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح زمین شق ہو اور میں اس میں سما جاؤں۔ مرزا صاحب کے بھاری تھپڑ کے نشان تو اگلے تین دن میں دھیرے دھیرے گال سے مدھم پڑنے لگے، مگر روح پر لگے تھپڑ کے داغ پھر عمر بھر مندمل نہ ہو پائے۔ بھیڑ کے چھٹتے ہی ابّا اور بڑے بھائی مجھے گردن سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اندر صحن میں لے آئے اور پھر جس کے ہاتھ جو آیا، اس نے اسی سے میرے جسم پر سیاہ نیل ڈال دیے۔ بدن پر چوٹ کے نشان نیلگوں ہوں تو انہیں نیل کہا جاتا ہے، مگر جب گھائل کا پورا جسم سیاہ پڑ جائے تو اسے کیا کہا جائے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں بتا سکوں کہ وہ خط میری تحریر میں ضرور تھا، مگر میرا نہیں تھا، مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ ''اچھا..... تو یہ تھی تمہاری ٹیوشن..... خوب عزت افزائی کروائی ہے آج ہماری، ڈوب مرو شرم سے..... عشق لڑانے سے پہلے اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لینی تھی۔'' جسم پر چوٹ کے ساتھ، روح پر بید کی طرح پڑنے والا اک طعنہ بھی کسی تازیانے کی طرح لگتا رہا۔

بہت روز تک تو میں شرم کے مارے چھت والے کمرے ہی سے باہر نہیں نکلا۔ سارے گھر والوں نے تقریباً میرا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ میں دن بھر کمرے میں بیٹھا سوچتا رہتا کہ آخر ماجد کو دیا گیا وہ رقعہ ناہید کی چھت سے کیسے برآمد ہوا۔ جانے ناہید میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی، اسے بھی تو باقی سب لوگوں کی طرح یہی لگا ہوگا کہ میں اسے یہ عشقیہ خط دینے کے لیے رات کو اس کی چھت ناپا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ناہید تک اپنے دل کی بات پہنچاؤں کہ مجھے اپنی شکل اور اپنی اوقات کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور میں کبھی ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو بھی تھا، وہ ہمیشہ کے لیے میرے دل کے کسی نازک گوشے میں پنہاں رہنے کے لیے تھا۔ پجاری کی پوجا کسی صلے کی تمنا کے لیے تو نہیں ہوتی۔ پروانے کو شمع سے موم کا دان کب چاہیے ہوتا ہے، اسے تو بس جل جانا ہوتا ہے، مجھے بھی صرف جلنے سے واسطہ تھا، روشنی کس کے حصے میں آئے، اس سے بھلا مجھے کیا غرض تھی۔ دسویں کے امتحانات میں نے بوجھل دل اور الجھے ہوئے دماغ کے ساتھ دیے اور بہ مشکل سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ بڑی مشکل سے ابّا سے کالج میں داخلے کی اجازت ملی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اپنی کتابوں اور کالج کی فیس کا خرچہ میں خود برداشت کروں گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کالج کے بعد شام کو کوئی چھوٹی موٹی نوکری یا کسی دکان پر کام پکڑ لوں گا۔ اس لیے کالج میں داخلے کی کوشش کے ساتھ ساتھ، دن بھر شہر کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں اور پیٹرول پمپس وغیرہ پر کام ڈھونڈنے کے لیے بھٹکتا رہتا۔

ایسے ہی ایک دن میں کام ڈھونڈنے شہر کے پارسی ہوٹلوں والی سڑک پر نکلا تو ایک لمحے کو یوں لگا، جیسے آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر غور سے دیکھا، تو وہ واقعی ناہید ہی تھی، شاید اسکول کی چھٹی کے بعد کسی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔ ناہید اب دسویں جماعت کی طالبہ تھی، اور اس علاقے میں اسکول یا کالج کی طالبات کا گروپ کی شکل میں چائے پینے یا بریک میں سموسے چٹنی کی پلیٹ اڑانے کے لیے آنا معمول کی بات تھی۔ میرا دل زور سے دھڑکا، شاید آج ہی وہ موقع تھا، جب میں ناہید سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا۔ مگر جانے اس کے ساتھ اور کون کون ہو، اور اگر ناہید نے برا منایا اور غصہ کیا تو پھر..... ؟؟ ایک اور تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔ پھر تو میرے ابّا کے ہاتھوں میرا خون ہونا لازمی تھا، مگر میرے پاس اور چارہ بھی کیا تھا۔ جانے پھر دوبارہ ناہید سے زندگی بھر اس طرح آمنا سامنا ہو پائے یا نہیں۔ مجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے، آخر ناہید نے خود بھی تو مہینہ بھر مجھ سے پڑھا ہے۔ میرے بارے میں کچھ اندازہ تو اس نے بھی لگایا ہوگا، میں نے تو کبھی نظر بھر کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اپنے آپ ہی سے لڑتا، خود ہی فیصلے کر کے انہیں رد کرتا رہا اور پھر اپنے اندر کی جنگ سے گھبرا کر مزید کچھ سوچے بنا کیفے کی طرف قدم بڑھا ہی دیے۔ اندر بہت رش تھا، میں پریشان نگاہوں سے اُسے چاروں طرف کھوج رہا تھا، اور پھر..... وہ مجھے ایک کیبن کے پردے کی اوٹ میں بیٹھی دکھائی دے گئی۔ کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اس کے ساتھ زیادہ بھیڑ نہیں ہے، بات کرنے میں آسانی ہوگی سو، دھڑکتے دل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ میرا کچھ دیر پہلے

ہی چائے کے کپ میز پر سجا کر واپس پلٹا تھا۔ ناہید کسی سے بات کر رہی تھی اور اس کے سر پر اس کی سیاہ چادر ہمیشہ کی طرح سلیقے سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے زور سے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور دھیرے سے سلام کیا۔ اس کی ہتھیلی ابھی تک پردے کی اوٹ میں تھی۔ ناہید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر، جیسے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ سا گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا کہ میرا مقصد اس کی بدنامی نہیں ہے۔ میں تو صرف اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں، مگر کیبن میں بیٹھے دوسرے شخص کو دیکھتے ہی خود میرے حواس یک دم مختل سے ہو گئے۔ ناہید کے سامنے کوئی اور نہیں، ماجد بیٹھا تھا۔ وہی ماجد، جس نے مجھ سے ناہید کے لیے رقعہ لکھوایا تھا۔ ماجد بھی پل بھر کے لیے گھبرا گیا۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور کیفے سے باہر آ گیا۔ ماجد میرے پیچھے دوڑتا ہوا باہر تک آیا اور زبردستی راستے میں حائل ہو کر معذرت کرنے لگا۔ ''معاف کر دے یار پری..... میں خود تجھے بتانا چاہتا تھا، مگر ناہید نے منع کر دیا کہ فی الحال معاملہ گرم ہے۔ ذرا بات ٹھنڈی ہو جائے تو پھر..... مگر، تو نے بھی بڑا مردوں والا کام کیا۔ تیرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، تو نے آخر تک زبان نہیں کھولی۔'' میرا سر تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ناہید جانتی تھی کہ اس کی چھت پر اُس رات ماجد کو دیکھا تھا، پھر بھی اس نے اپنے گھر والوں سے یہ بات چھپائے رکھی۔ مجھے میرے گھر، محلے والوں کے سامنے اتنا رسوا کیا، سارے زمانے میں میرا تماشا بنا دیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا، میں نے بہ مشکل ماجد سے سوال کیا۔ ''تو کیا وہ خط تم نے ناہید ہی کے لیے لکھوایا تھا؟'' ''ہاں یار! اُسی کو دینا تھا۔ ایک دن اس نے میرے سامنے تمہاری لکھائی کی تعریف کی، تو میں نے بھی اس سے شرط لگا لی کہ تمہارے ہی ہاتھ سے خط لکھوا کر اُسے دوں گا۔'' میں نے حیرت سے ماجد کو دیکھا۔ ''مگر تم تو ہر وقت یہی کہتے تھے کہ وہ تمہیں کبھی گھاس تک نہیں ڈالتی.....'' ماجد نے کھسیا کر قہقہہ لگایا۔ ''وہ سب بھی نہیں ناہید کے کہنے ہی پہ کہتا تھا، تُو نہیں جانتا یار۔ یہ لڑکیاں ہم بے وقوف لڑکوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ بڑا دماغ چلتا ہے، ان کا ایسے معاملات میں، دراصل وہ کسی بھی طرح کی بدنامی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ آج بھی بڑی مشکل سے اسے چائے کے ایک کپ کے لیے راضی کیا تھا۔ پر تُو نے آ کر سارا معاملہ بگاڑ دیا۔'' میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ماجد اپنی دھن میں نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اتنے میں کیفے کا ایک بیرا باہر آیا اور ماجد سے بولا۔ ''آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔ کہتی ہیں، مہمان کو بھی ساتھ لے آئیں، ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کوشش کی، مگر ماجد مجھے تقریباً کھینچتا ہوا اندر کیفے میں لے گیا۔ ناہید سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔ ''امید ہے آپ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی، ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ میں خود آپ سے مل کر آپ کو ساری بات بتانا چاہتی تھی، مگر حالات ایسے بگڑے کہ میں کچھ نہ کر سکی۔'' میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ کم از کم مجھے تو سچ بتا دیتی۔ ناہید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دراصل میں چاہتی تھی کہ جب تک ماجد کے گھر سے میرے لیے باقاعدہ رشتہ نہیں آ جاتا، تب تک کسی کو بھی ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ آپ تو ابا جی کے غصے سے واقف ہیں ناں۔ اس رات بھی ماجد کی ایک ذرا سی غلطی سے یہ سارا ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کا لکھا وہ رقعہ کب اور کیسے گھبراہٹ میں وہیں گر گیا۔'' ناہید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ کچھ لوگ جب بولتے بولتے خاموش ہو جائیں تو ان کی خاموشی بولنے لگتی ہے۔ مگر مجھے آج اس کی یہ خاموشی بہت گراں گزر رہی تھی۔ ''دراصل میں بہت ڈر گئی تھی، اسی لیے جب ابا نے آپ کی تحریر دیکھ کر آپ پر شک کیا، تو میں چپ رہی۔ کیوں کہ میں اگر ماجد یا کسی اور کا نام لیتی تو انہیں مجھ پر بھی شک ہو سکتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوں، صرف ایک آپ ہی ایسے تھے، جن کے نام کے ساتھ میرا نام نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ مطلب کسی کو بھی مجھ پر شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھی آپ کو پسند کر سکتی ہوں۔'' میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ میرے اندر بہ یک وقت کئی شیشے چٹخ کر چور ہو گئے اور میں ننگے پاؤں ان کرچیوں پر چلتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

پتا نہیں، میں نے اُس روز گھر تک کا راستہ کیسے طے کیا۔ میرے آس پاس تیز ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور لوگوں کی آوازوں کی بھرمار تھی، مگر میں جیسے ساری دنیا سے لاتعلق اور بیگانہ سا ان راستوں پر چلتا رہا، شاید ہمارے قدم کچھ راستوں پر چل چل کر اتنے راستہ آشنا ہو چکے ہوتے ہیں کہ دل اور دماغ بند ہونے کی صورت میں بھی وہ ہر موڑ پہچان لیتے ہیں، ورنہ اس وقت میری جو حالت تھی مجھے ضرور کسی ویرانے میں بھٹک جانا چاہیے تھا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ..... کوئی اندھا ہی ہوگا جو ناہید پر مجھ سے کوئی بھی تعلق جوڑنے کا شک کرے گا۔ کہاں وہ اور کہاں میں؟ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی۔ بعض حقائق ہم پر پہلے دن ہی سے روز روشن کی طرح عیاں ہوتے ہیں، مگر پھر بھی کسی کی زبان سے ان کی تشریح ہمیں کس قدر سوگوار کر دیتی ہے، ہم کم زور انسان اپنے اندر اتنی خود فریبیاں کیوں پالے رکھتے ہیں؟ شاید اسی لیے انسان اپنی پیدائش سے لے موت تک جانے کتنی بار ٹوٹتا ہے، مگر ناہید کی پسند ماجد بھی کیسے ہو سکتا ہے۔ مخلّہ ماجد کے قصوں سے واقف تھا، مگر پھر بھی ناہید.....؟ میرا ذہن سُن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا انسان کی ظاہری شخصیت ہی آخر کار فتح یاب ہوتی ہے۔ یہ اندر کی خوب صورتی، دل کی سچائی وغیرہ جیسی فضول کتابی باتیں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یکسر غلط ثابت ہو گئی تھیں۔ شاید یہ ساری کتابی تکرار مجھ جیسے پری زادوں کی تسلی کے لیے ہی تھی۔

میرا داخلہ ایک سرکاری کالج میں ہو چکا تھا، مگر دل کالج جانے پر آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دسویں جماعت تک ایک ہی اسکول میں پڑھتے پڑھتے سارے استاد اور طالب علم میرے نام اور صورت کے تضاد کے عادی ہو چکے تھے اور انہوں نے میری بدصورتی کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا، مگر کالج جاتے ہی یہ ساری بحث ایک بار پھر سے تازہ ہو گئی۔ بہت دنوں تک کلاس میں، کینٹین میں اور کالج کی راہ داریوں میں مجھے پھر سے اسی تجربے سے گزرنا پڑا، وہی طنز بھری مسکراہٹ، جملے اور حقارت بھری مثالیں۔ میرا جواب ہمیشہ کی طرح خاموشی ہی تھا، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ مجھے اس چھلنی سے بار بار چھننا ہوگا۔ ان ہی دنوں میری ملاقات نور تھا ئیر کے ناساز سے ہوئی۔ دراصل اس سے پہلا تعارف بھی اس کے اس عجیب و غریب تخلص کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا پورا نام جمیل احمد تھا، مگر وہ خود کو ناساز کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ایک دن میں راہ داری سے گزر رہا تھا کہ کسی سینئر طالب علم نے زور سے اس کا نام پکارا۔ ''ابے او

ناساز..... تیری پھر سے تین سہیلیاں آئی ہیں۔ مطلب تو اگلے سال بھی اسی کالج کے لنگر کی روٹیاں توڑے گا۔'' ناساز کے باقی دوست بھی ہنس پڑے۔ ناساز نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور ایک بھرپور کش لے کر دھواں فضا میں اڑا دیا۔'' وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلے.....'' پتا چلا کہ گزشتہ تین چار سال سے ناساز چوتھے سال ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ نہ اسے پاس ہونے کی جلدی تھی، نہ ہی کالج والے اسے نکالنے پر آمادہ، کیوں کہ وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کا صدر تھا اور اس کی صدارت میں کالج بہت سی ٹرافیاں اور کپ جیت چکا تھا۔ وہ ایک بہترین مقرر، شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اگلی صبح میں کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ناساز گیٹ کے قریب ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔'' بات سنو لڑکے.....'' میں جھجکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔'' سگریٹ پیتے ہو؟'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے زاری سے بولا۔'' پھر کیا خاک جیتے ہو.....'' میری جیب میں اس وقت شام کی ٹیوشن سے ملنے والے چند روپے پڑے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے کینٹین گیا اور سب سے بہتر برانڈ کی ایک ڈبیا اور ماچس لے کر دوبارہ ناساز کے پاس آیا اور سگریٹ اور ماچس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ سگریٹ دیکھ کر چونک سا گیا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ سلگا کر دو چار بھرپور کش لگائے اور میں نے پہلی مرتبہ نکوٹین کو اپنے سامنے بیٹھے شخص کی رگوں میں پوری طرح سرایت ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے مزید چند کش لیے تو میں پلٹ کر جانے لگا۔ ناساز نے جلدی سے مجھے آواز دے کر روکا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔'' پیسے تھے تمہارے پاس.....؟'''' ہاں! کرائے کے پیسے تھے، جو آج تمہارے کام آ گئے۔'' وہ زور سے ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔'' مجھے ناساز کہتے ہیں۔ میں اپنا تخلص ناشاد رکھنا چاہتا تھا، مگر پتا چلا کہ میرے حق پر پہلے ہی کوئی موسیقار ڈاکا ڈال گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے.....؟'' میں نے اٹکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔'' پری زاد''..... ناساز نے زور سے ''واہ'' کہا۔'' نام تو بڑا شاعرانہ رکھا ہے پیارے..... زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی کے لہجے اور نظر میں اپنا نام سن کر طنز اور تمسخر کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ یہ میری اور ناساز کی دوستی کی ابتدا تھی۔ میری زندگی کا پہلا دوست، جس سے بات کرتے ہوئے میری زبان لڑکھڑائی نہیں تھی، نہ ہی مجھے ٹھنڈے پسینے آئے تھے۔ سگریٹ اس کی زندگی کا ایک ایسا لازمی جزو تھا کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے ناساز سگریٹ کو نہیں، سگریٹ دھیرے دھیرے ناساز کو پی رہی ہو، نگل رہی ہو۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال ہی بڑا تھا، مگر اپنی باتوں سے کوئی بوڑھی روح دکھائی دیتا تھا۔

چند ہفتوں بعد شہر کے تمام مردانہ اور زنانہ کالجوں کے درمیان تقریری مقابلے ہوئے تو ناساز کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ میں ایسی تقریبات میں جانے سے حتی الامکان گریز کرتا تھا، مگر وہ فائنل مقابلے کی تقریب میں مجھے کسی طرح زبردستی پکڑ کر لے گیا۔ ہال میں ایک جانب ہمارے کالج کے لڑکوں کی نشستیں تھیں اور دوسری جانب لڑکیوں کے کالج کی طالبات بیٹھی اپنی کالج کی مقررات کی حوصلہ افزائی کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھا رہا، ناساز نے اپنی دھواں دار تقریروں سے ماحول گرما دیا، مگر نہ جانے آخری مرحلے پر وہ پسپا کیوں ہو گیا اور لڑکی نے پہلا انعام جیت لیا۔ میں نے باہر نکلتے ہی اس سے براہ راست اپنے اس خدشے کا اظہار کر دیا کہ وہ جان بوجھ کر ہارا ہے۔ ناساز دھیرے سے مسکرایا۔'' تم اگر دھیان سے دیکھتے تو تمہیں پتا چلتا کہ میں جیت گیا ہوں۔ زندگی میں ہر بازی اول اور دوم نمبر سے نہیں ناپی جاتی۔'' پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔'' تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے پری زاد.....؟'' پل بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ناساز بھی باقی سب لوگوں کی طرح میرا مذاق اڑا رہا ہے، مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے سوال کی سچائی دکھائی دی۔ میں نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔'' مجھ سے بھلا کون محبت کرے گی.....؟'''' کیوں..... تم سے محبت کیوں نہیں کی جا سکتی.....؟'' میں چپ رہا۔ ناساز سمجھ گیا اور بات بدل کر بولا۔'' شاعری پڑھتے ہو.....؟'''' ہاں، مگر مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔'' ناساز نے نصیحت کی۔ ''شعر یاد رکھا کرو، صنفِ نازک پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے اچھے شعروں کا.....'' پھر کچھ سوچ کر بولا۔'' منیر نیازی کو پڑھا کرو..... اور اس کی ایک نظم تو زبانی یاد کر لو۔'' ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں..... ضروری بات کہنی ہو..... کوئی وعدہ نبھانا ہو، اسے آواز دینی ہو..... اسے واپس بلانا ہو..... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں..... کسی کو موت سے پہلے..... کسی غم سے بچانا ہو..... حقیقت اور تھی کچھ، اس کو جا کر بتانا ہو..... ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....'' میں نے جلدی جلدی ساری نظم اپنی کاپی میں نوٹ کر لی اور اسی وقت اس کا رٹا بھی لگا لیا۔'' بس..... اب یاد رکھنا کہ تمہیں اپنی گفتگو کے دوران کسی نہ کسی بہانے یہ نظم دہرانی ہے۔ میں تمہیں چند اور اثر انگیز غزلیں اور نظمیں بھی یاد کروا دوں گا۔ کیا سمجھے.....؟'' میں نے جلدی سے کسی بچے کی طرح سر ہلایا۔ مجھے یاد آیا کہ ناہید کو بھی شعر و شاعری سے کافی گہرا لگاؤ تھا اور شاید ماجد کو بھی بہت سے شعر یاد تھے۔ ناہید کا خیال آتے ہی میرے گال پر شدید جلن کا ایک احساس ہوا۔

اگلے چند دنوں میں ناساز نے مجھے بہت سی نظمیں یاد کروا دیں اور پھر جس دن میں نے بزم ادب کے پیریڈ میں کھڑے ہو کر'' محبت اب نہیں ہوگی..... یہ کچھ دن بعد میں ہوگی..... گزر جائیں گے جب یہ دن..... یہ ان کی یاد میں ہوگی'' سنائی تو پہلی مرتبہ کلاس کے لڑکوں نے دل سے میرے لیے تالیاں بجائیں اور استاد نے بھی مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دی۔ ناساز کی کہی بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ لوگ میری بات غور سے سننے لگے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کبھی کالج میں پہلے کی طرح لڑکے اور لڑکیوں کے اداروں کا مقابلہ ہو اور میں بھی اسٹیج پر جا کر ناساز کی طرح کچھ پڑھوں، میں نے سارے بڑے شعراء کو تقریباً حفظ کر لیا..... اور مجھے کالج کی بزم ادب کی ٹیم میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کوشش میں میرے اندر بھی جھوٹا سا ہی سہی، مگر ایک چھوٹا موٹا شاعر پلنے لگا تھا۔ میری باتوں میں شاعری کا رنگ جھلکنے لگا۔ ناساز کسی منجھے ہوئے استاد کی طرح میری ''شاعرانہ تربیت'' کر رہا تھا، وہ کہیں سے بھی اچانک نازل ہو جاتا۔'' یہ کیا غالب اور میر کے رٹے لگاتے رہتے ہو۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی مشکل شاعری بھلا کب سمجھتی ہیں۔ احمد فراز کو پڑھا کرو، اور ہاں..... کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کو دہرانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ساحر کو تو جانتے ہو ناں..... میں'' پل دو پل کا شاعر ہوں..... پل دو پل میری کہانی ہے'' والا..... اور ہاں..... کل سے تمہیں یہ دہراتے رہنا ہے۔'' میں اور میری تنہائی..... اکثر یہ باتیں کرتے ہیں..... تم ہوتیں تو کیسا ہوتا..... تم اس پر کتنا حیراں ہوتیں.....'' میں وہ بے لفظوں میں ناساز کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ جس کسی ایک کے لیے وہ مجھ سے یہ ساری مشق کروا رہا ہے، اس'' ایک'' کا تو میری زندگی میں کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ تیاری کس کام کی؟ مگر ناساز بھلا میری کب سنتا تھا۔ ایک دن کالج سے واپسی کے راستے پر وہ میری اسی تربیت میں مصروف تھا کہ میری نظر پرانے کباڑیے کی دکان کے مٹیالے شیشے سے اندر پڑی اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ اندر ایک پرانا پیانو پڑا تھا۔ کباڑیے نے میری دل چسپی محسوس کی تو جلدی سے بولا۔'' خالص شیشم کی لکڑی کا ہے۔ انگریز کے پرانے کلب سے خریدا ہے۔ خریدو گے۔ صرف تیرہ ہزار میں دے دوں گا۔'' میں نے اپنی جیب دیکھی، دو سو اسی روپے پڑے تھے، میں نے دھیرے سے کباڑیے سے کہا۔'' ایک دن ضرور خریدوں گا.....'' ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ میں تھکے ہارے قدموں سے گھر واپس پہنچا تو صحن میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے رک گیا۔ صحن میں ناہید کی امی کھڑی میری اماں سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں نے قدموں کی آواز سن کر میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناہید کی امی نے مجھے دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور اماں کو تاکید کرتی ہوئی گھر سے نکل گئیں۔ ''اے بہن آنا ضرور..... ہم لوگ زیادہ عرصے تک ناراضیاں پالنے کے شوقین نہیں۔'' اُن کے جانے کے بعد بُرا منہ بنانے کی باری اماں کی تھی۔ ناہید اور ماجد کی بات طے ہوگئی، انہی کی منگنی کا پیغام دینے آئی تھی یا شاید یہ جتانے کے لیے کہ تیری اس حرکت کے بعد بھی ان کی لاڈلی کے لیے محلے کے سب سے بڑے گھر سے رشتہ آیا ہے۔ تُو نے تو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا پری زاد.....'' میں اماں کی بڑبڑاہٹ نظر انداز کرتا اوپر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک دن یہ ہونا ہے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ناہید کے رشتے کی خبر سن کر دل بجھ سا گیا تھا۔ اگلے روز کالج میں ناساز نے میری یہ کیفیت بھانپ لی۔ ''کیا بات ہے پیارے! آج کچھ بجھے بجھے سے دکھائی دے رہے ہو؟'' میں نے قریب پڑا کنکر اٹھا کر دُور تالاب کی طرف پھینکا۔ ''تو اس سے پہلے تم نے مجھے کب جلتے یا جگمگاتے دیکھا ہے؟'' وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ''جل تو رہے ہو اور بڑی شدت سے جل رہے ہو، مگر یہ جلن اندر ہی اندر راکھ کر دینے والی ہے۔ بتاؤ گے نہیں، کب سے سلگ رہے ہو؟'' میں نے اسے ناہید والی ساری بات بتادی۔ ناساز نے سُن کر ایک سرد سی آہ بھری، پھر کسی بزرگ کی طرح بیٹھ کر مجھ سے عہد لینے لگا۔ ''تم مجھ سے ایک وعدہ کرو، آج کے بعد اپنے اندر لگی اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دو گے کہ یہ جیون اس مَن کی مار کے بغیر صرف ایک سرد خانہ، ایک بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بندے کے اندر یہ سلگن لگی رہنی چاہیے۔ انسان سے بھی بڑے بڑے کارنامے کروا جاتی ہے یہ تڑپ، یہ جلن..... عام طور پر، آدمی گیلی تیلی کی طرح ساری عُمر سیلن سے بھری نم زندگی گزار دیتا ہے، مگر جلنے کے لیے ماچس کی رگڑ میسّر نہیں آتی۔ اس لڑکی سے ناکام محبت نے تمہیں وہی رگڑ دے دی ہے، اب جل گئے ہو، تو خود کو بُجھنے مت دینا۔'' اُس وقت مجھے ناساز کی بات ٹھیک طرح سمجھ نہیں آئی، مگر اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب مقدر میں آخر کار فنا ہونا ہی لکھا ہے، تو پھر یہ بُجھ بُجھ اور سلگ سلگ کر جینا کیسا؟ تیز بھڑکتے شعلے کی طرح جل کر راکھ ہو جانے ہی میں مزہ ہے۔ میں بھی اُس روز کے بعد کچھ ایسا جلا کہ اندر سب کچھ بھسم ہوگیا۔ بس میں، میری کتابیں، میری چھت اور آسمان پر رات کو چمکتے میرے دوست ستارے، یہی کچھ باقی رہ گیا تھا زندگی میں۔

اگلے سال کالج والوں نے رحم کھا کر ناساز کو سند دے ہی دی، تو وہ اپنے گاؤں واپس جانے سے پہلے مجھ سے لپٹ کر رو پڑا۔ ''اپنا خیال رکھنا اور مجھے بھول مت جانا'' میں بھیگی پلکوں کے ساتھ اسٹیشن پر اس کی گاڑی کو چھوٹتے دیکھتا رہا اور پھر، بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آگیا۔ کالج کے فائنل ایئر سے قبل ہی، پہلے ابا اور پھر اماں یکے بعد دیگرے چل بسے، پر مجھے پہلی بار یتیمی کا احساس اُس وقت ہوا، جب بھائی بھابیوں نے گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کا حکم صادر کردیا۔ ان سب کی خواہش تھی کہ میں یونی ورسٹی میں داخلے کا ارادہ ترک کر کے کہیں کلرک یا چپڑاسی کی نوکری پکڑ لوں تاکہ میرا بوجھ ان کے کاندھوں سے ہٹ جائے۔ مگر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کر ہی لیا کہ کسی سرکاری نوکری کے ملتے ہی میں تعلیم کا سلسلہ ترک کردوں گا۔ تب تک شام سے رات تک تین چار ٹیوشنز پڑھا کر گھر کا خرچہ بانٹ سکتا ہوں۔ مَیں اب وہ پہلے والا ناکام اور نالائق طالب علم نہیں تھا۔ ناساز کی لگائی آگ کی بھٹی میں تپ کر کُندن ہو چکا تھا۔ کالج میں بھی فائنل میں، میری تیسری پوزیشن آئی تھی۔ تعلیمی ادارے مجھے فخر سے اپنے ادبی پروگراموں اور مشاعروں میں مدعو کرتے تھے۔ میرا نام ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کے طور پر شہر کے گلی کُوچوں میں پھیل رہا تھا، لوگ میری سوچ اور لفظوں کی مدح سرائی کرتے تھے، ہاں اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو میری صورت دیکھتے ہی لوگوں کا وہ بے اختیار تاثر، البتہ اب لوگوں کے رویّے میں اتنی منافقت ضرور آگئی تھی کہ بچپن میں وہ میرے منہ ہی پر ہنس دیتے تھے، مگر اب قہقہہ میرے پلٹ جانے کے بعد گُھونٹا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی تعارفی کلاس میں بھی، جب مجھے لیکچر ہال کے ڈائس پر بلایا گیا، تو آس پاس سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں بلند ہونے لگیں۔ ''ارے! تو یہ ہے پَری زاد.....'' ''آئے ہائے..... سارا مزہ کرکرا کردیا'' ''شاعری تو غضب کرتا ہے، مگر شخصیت..... توبہ توبہ.....'' ''نہیں نہیں، یہ پَری زاد نہیں ہوسکتا، یہ تو کسی فیکٹری کا فورمین لگتا ہے۔'' میں یہ ساری سرگوشیاں اور فقرے سُنتے ہوئے ان کے درمیان سے چلتا ڈائس پر آگیا۔ کلاس پر ایک سکوت طاری تھا۔ میں نے اپنا نام بتانے کے بعد کسی لمبی چوڑی تمہید کے بجائے صرف تین مصرعوں پر اکتفا کیا۔ ''قصّے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے..... آ دیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے..... شاید یہ ظرف ہے، جو خاموش ہوں اب تک..... ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے..... سب جُرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن..... کیا میرے سوا اس شہر میں معصوم ہیں

سارے .....؟ اور بس، میں اپنی بات ختم کر کے ڈائس سے اتر آیا، گزرتے دنوں کے ساتھ میری کلاس نے بھی میری بدصورتی سے سمجھوتا کر لیا، مگر میں خود اپنے اس بے چین اور بے قرار دل کا کیا کرتا؟ کبھی کبھی تو مَن کرتا کہ کوئی تیز دھار خنجر لے کر اپنا سینہ چیر ڈالوں اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ روگی دل نکال کر اس کے اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کروں کہ پھر کبھی کوئی ٹکڑا سینے میں جڑنے نہ پائے، مگر پھر میرا سدا کا نادان دل مجھ سے سوال کرتا کہ آخر اس کی خطا ہی کیا تھی۔ صرف اتنی کہ کوئی اسے بھی کبھی اک پیار بھری نظر سے دیکھ لے، صرف ایک نظر..... جو صرف میرے لیے ہو۔ میرا اس ایک نظر کے لیے ہر احساس، بالکل پاک تھا۔ مجھے تو بس ایک لمحہ ہی ساری زندگی کے بدلے درکار تھا۔ ایک پل، جب کوئی مجھے اپنا مان لے۔ کیا یہ خواہش، یہ تمنا اتنی ہی مشکل اور ناجائز تھی کہ میں اس کے اپنے اندر جاگ اٹھنے ہی پر ساری زندگی خود کو ملامت کرتا ہوں۔ آخر یہ دنیا ایسی ہر نظر، خوب روؤں کے لیے کیوں بچا رکھتی ہے، کیا مجھ جیسوں کے لیے کسی کے کشکول میں ایسی ایک نظر کی بھیک بھی نہیں۔

اُس روز بھی میں یونی ورسٹی کی ایک سنسان راہ داری سے گزرتے ہوئے کچھ ایسے ہی بے سروپا خیالات کی یلغار کا شکار تھا کہ اچانک اپنے عقب میں کسی لڑکے کی آواز سنائی دی۔ "مسٹر پَری زاد....." میں نے رُک کر دیکھا، انگریزی ڈیپارٹمنٹ کا ایک ہینڈسم سا لڑکا حسنام اپنے دو، تین کلاس فیلوز کے ساتھ میری جانب بڑھ رہا تھا، جن میں شعلۂ جوالا قسم کی ایک لڑکی بھی تھی۔ "آپ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پَری زاد ہیں ناں، میرا نام حسنام ہے، یہ باسط اور یہ ہماری دوست لبنیٰ۔ ہم تینوں انگلش ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔" "جی فرمایئے....." میں نے کہا تو حسنام کے بجائے لبنیٰ بولی۔ "دراصل ہمیں آپ کی مدد چاہیے۔ ہم شیکسپیئر کا پلے، پرفارم کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمیں اجازت اسی صورت ملی ہے کہ ڈرامے کا ایک شوار اردو ترجمے کے ساتھ بھی پیش کیا جائے۔ کیا آپ ہمارے لیے ڈرامے کا ترجمہ کر دیں گے.....؟" میں نے ان تینوں کے متجسس چہروں پر نظر ڈالی۔ "کوشش کروں گا کہ کر پاؤں۔ ویسے کس ڈرامے کا ترجمہ کرنا ہے۔" وہ تینوں خوش ہو گئے اور باسط جلدی سے بولا۔ "اوتھیلو (OTHELO)" "ٹھیک ہے، آپ لوگ تین چار دن کی مہلت دیں۔ میں ترجمہ کر کے آپ لوگوں کو بتا دوں گا۔" ان تینوں نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ "گریٹ" اور جاتے وقت بڑے پُرجوش انداز سے ہاتھ ملایا۔ لبنیٰ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کی لرزش پر قابو پایا۔ تیسرے دن میں ترجمے کا پہلا ڈرافٹ لے کر انگلش ڈیپارٹمنٹ میں حسنام گروپ کی تلاش میں نکلا تو پتا چلا کہ سارا گروپ آڈیٹوریم میں ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہے، میں چپ چاپ ہال میں داخل ہو کر آخری نشستوں پر بیٹھ گیا۔ ہال میں ملگجی سی نامکمل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ صرف سامنے ہال کے اسٹیج پر تیز لائٹس تھیں۔ سب ہی اداکاری کے بہترین جوہر دکھا رہے تھے، مگر لبنیٰ کی اداکاری الگ ہی تھی۔ وہ بہت ڈوب کر مکالمے ادا کر رہی تھی اور سارا گروپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے خوب جم کر داد بھی دے رہا تھا۔ لبنیٰ ایک منجھی ہوئی اداکارہ کی طرح آخری سین میں ہیروئن کی موت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ میں خود اس کی اداکاری میں اس قدر کھو چکا تھا کہ جب اس نے آخری سانس لے کر سر ڈھلکایا تو بے اختیار ہی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو گیا۔ سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور زور سے چلائے۔ "ارے..... تم ہو پَری زاد..... آؤ، اسٹیج پر آ جاؤ....." حسنام نے باقی لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں اس ڈرامے کا اردو ترجمہ کرنے والا ہوں۔ میں نے لبنیٰ کو اس کی اداکاری کی داد دی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ "نہیں، ابھی میں پوری طرح سے خود کو کردار میں ڈھال نہیں پا رہی۔ میرا خیال ہے کہ جب ہیروئن کی موت ہو تو اُس وقت کچھ اشعار یا کوئی غم گین نظم ضرور اوورلیپ ہونی چاہیے..... تب ہم یقیناً پورے ہال کو رونے پر مجبور کر دیں گے۔" انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے باقی کچھ طلبہ، جو اس ڈرامے میں حصہ لے رہے تھے، مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ وہ سب کے سب اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے قیمتی لباس، کلون اور پرفیوم کی مہک، ہاتھوں میں پہنی قیمتی گھڑیاں، بریسلٹس اور ایک جانب بے پروائی سے پھینکے گئے مہنگے بیگز اور جیکٹس، میری سادہ سفید شرٹ اور پانچ سال پرانی گھسی ہوئی پتلون سے بالکل بھی میل نہیں کھا رہے تھے۔ دراصل امارت کی بھی اپنی ایک خاص چمک دمک ہوتی ہے، جسے کسی تشریح کی ضرورت نہیں پڑتی اور غربت..... سات پردوں میں بھی چھپی ہو تو، شناخت چھپائے نہیں چھپتی۔ لبنیٰ کی کچھ انگریزی میڈیم سہیلیوں نے اسے کہنی مار کر کچھ کہا اور سب زور سے ہنس پڑیں۔ لبنیٰ نے مجھ سے نظر بچا کر ان سب کو انگریزی میں ڈانٹا اور اپنے رونے پر قابو پانے کی ہدایت کی۔ میں نے لبنیٰ کو بتایا کہ میں نے اوتھیلو کا ترجمہ کر لیا ہے اور اگر وہ لوگ چاہیں تو کل ہی سے اردو ڈرامے کی بھی ریہرسل شروع کر سکتے ہیں۔ حسنام نے مجھے بھی ریہرسل دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کی تاکہ میں ان کے تلفظ کی جانچ بھی کر سکوں۔ ہاں، زندگی کی دوڑ میں ہم اردو میڈیم والوں کے پاس آخر میں صرف یہی ایک تلفظ ہی تو باقی رہ جاتا ہے۔

رات کو جب میں کھلی چھت پر تاروں کی اوڑھنی کے نیچے لیٹا، ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا، تو مجھے لبنیٰ کی بات یاد آ گئی کہ اگر لڑکی کی موت کے پس منظر میں کوئی دردانگیز سی نظم ہو تو تاثر دوبالا ہو جائے گا۔ "اوتھیلو" کے اختتام پر ہیرو کسی رقیب کی لگائی ہوئی شک کی آگ میں جھلس کر خود اپنے ہاتھوں سے ہیروئن کو گلا دبا کر مار دیتا ہے اور پل بھر کی نفرت کا غلبہ ساری عمر کی محبت کو نگل جاتا ہے۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ انسان کی برسوں کی محبت کا امرت گھڑی بھر میں نفرت کے کڑوے زہر میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے؟ یا پھر شاید محبت اور نفرت دراصل ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ جذبات کے بازار میں دونوں کا مول یک ساں رہتا ہے، مگر جب کسی انسان کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے، تو وہ اس سے وابستہ چیزوں، جگہوں، یادوں اور ایک دوسرے سے جُڑے معمولات سے بھی کیوں نفرت کرنے لگتا ہے۔ جس راستے پر کبھی دو پیار والے ایک ساتھ چلے تھے، وہ راستہ کیوں علاقۂ ممنوعہ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بینچ، جہاں کبھی وہ ساتھ بیٹھے تھے، بارش میں گیلی سڑک کے کنارے کھڑا وہ چائے والا، جس کے ایک کپ میں دونوں نے ساتھ چائے پی تھی۔ وہ کتابوں کی پرانی دکان، پہلی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا، صفحوں میں رکھا وہ سوکھا گلاب، پرفیوم کی خالی شیشی، بجی ہوئی وہ آدھی ٹیپ اسٹک، ایک کھویا ہوا کف لنک، ایک ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا ٹکٹ، وہ فٹ پاتھ پر بچھے پتے، وہ پرانا بس اسٹاپ، 23 نمبر کی کھٹارا سی بس، درخت کے نیچے کھڑا وہ لمحوں پانی والا..... بھلا ان سب چیزوں کا ان کی بدلتی محبت اور نفرت میں ڈھلتی اس کڑواہٹ سے کیا تعلق.....؟؟ ہم اس ایک شخص کی نفرت میں ان سب یادوں، باتوں اور جگہوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں۔ انسان کتنا ظالم ہے کہ معصوم یادوں سے بھی انتقام لینے سے باز نہیں آتا۔

ڈرامے والے دن ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ ساری یونی ورسٹی اوتھیلو کو اردو میں جملے بولتے دیکھنے کے لیے جمع تھی اور..... ہیروئن کی آخری سانس نکلنے سے پہلے پس منظر میں میری نظم کے بول گونج اٹھتے ہیں۔ سنو، تمہاری وفا پر..... گرچہ پورا یقیں ہے، مگر..... بدلتی رُتوں کے وار کا، کچھ بھروسا نہیں..... سو، گر کبھی ایسا ہو کہ..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے..... اور میری روح کی کومل پنکھڑیاں..... تمہیں کسی ببول کے مانند چبھنے لگیں، تو..... بیتے دنوں کو یاد نہ کرنا..... کہ یادوں کا زہر، زخم کو بھرنے نہیں دیتا..... ہاں مگر دیکھو، کبھی ان باتوں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر کی تھیں..... کہ باتیں تو معصوم رابطہ ہوتی ہیں..... اور کسی کم نصیب کی بے ربطی سے..... ان باتوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈرامے کے منظر میں اوتھیلو ہیروئن کے پاس پہنچتا ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور ہیروئن (ڈیسڈی مونا) سو رہی ہے۔ اوتھیلو اپنی محبوبہ کو جگاتا ہے اور سرد لہجے میں اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی آخری دعا کر لے۔ اوتھیلو کی محبوبہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، وہ اپنے محبوب سے التجا کرتی ہے کہ وہ اسے آج کی رات جینے دے، پھر چاہے تو صبح مار ڈالے، مگر اوتھیلو کی آنکھوں پر شک کے کالے ناگ کس کر پٹی باندھ چکے ہیں، وہ کہتا ہے ''اب بہت دیر ہو چکی.....''

پس منظر میں نظم کے بول اوور لیپ ہو رہے تھے۔ اور سنو، میرے محبوب..... کبھی ان رنگوں سے نفرت نہ کرنا..... جو مجھے بہت اچھے لگتے تھے..... کہ رنگ تو روح کو اُجالتے ہیں..... اور کسی کے مقدر کے اندھیروں سے..... ان رنگوں کا کیا لینا دینا.....؟ ڈیسڈی مونا آخری مرتبہ اپنے محبوب، اوتھیلو کو بھیگی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھتی ہے۔ اوتھیلو کے بھاری ہاتھوں کی انگلیاں اس کی نازک شہ رگ کو دبانا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکی سانس گھٹنے کی وجہ سے تڑپتی ہے اور بستر کی چادر نیچے گر جاتی ہے۔ اے میری وفا کے مالک..... کبھی ان نظاروں سے نفرت نہ کرنا..... جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے..... کہ نظارے تو قدرت کا حُسن ہوتے ہیں..... اور کسی حرماں نصیب کی بدصورت یادوں سے..... ان نظاروں کا کیا لینا دینا.....؟ اوتھیلو کی مضبوط گرفت میں اس کی محبوبہ کا دم گھٹ رہا ہے اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ اوتھیلو کی آنکھیں دہشت سے باہر کو ابل رہی ہیں، مگر وہ پوری قوت سے اپنی جان سے پیاری ڈیسڈی مونا کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تکلیف کی شدت سے اس کی محبوبہ کی انگلیوں کے ناخن اوتھیلو کے بازوؤں کی رگوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہیں۔ لڑکی کا نازک بدن آخری مرتبہ زور سے کانپتا ہے۔ میرے ہم نفس..... میری جان..... بس مجھ سے، اور صرف مجھ سے نفرت کرنا..... کہ میری روح کی سیاہی سے ہی..... یہ چار سُو اندھیرا ہے۔ اوتھیلو کی محبوبہ اپنے محبوب کی گرفت میں تڑپ کر آخری ہچکی لیتی ہے اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے، مگر مرتے مرتے بھی اس کی بے جان کھلی آنکھیں اپنے پیارے اوتھیلو ہی کو دیکھ رہی ہیں۔ لڑکی کا محبوب، اس کا قاتل، اوتھیلو اپنی محبوبہ کا سر گود میں لیے بیٹھا رو رہا ہے اور اسٹیج کا پردہ گر جاتا ہے۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد چند لمحے تو سارے ہال میں سناٹا سا چھایا رہا اور پھر تالیوں کی گونج میں وہ شور مچا کہ بس۔ لبنیٰ راتوں رات سارے شہر کی یونی ورسٹیز میں مقبول ہو چکی تھی۔ ڈرامے کی کام یابی کی خوشی میں اس نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی اور ہم سب کو تاکید کے ساتھ دعوت دی۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر اس نے میری ایک نہیں سُنی اور مجبوراً مجھے اُس شام وہاں جانا ہی پڑا۔ گھر کیا تھا، اک محل تھا۔ مغربی طرز کا ایک وسیع و عریض پھولوں بھرا باغیچہ، جس کے درمیان پریوں کے گھر جیسی ایک شان دار عمارت کھڑی تھی۔ پچھلی جانب سوئمنگ پول تھا اور پارٹی کا بندوبست وہیں کیا گیا تھا۔ موسیقی کا اہتمام بھی تھا۔ لبنیٰ کہیں سے اپنی ماں کو کھینچتی ہوئی لے آئی اور ان سے میرا تعارف کروایا۔ قیمتی ساڑی میں ملبوس، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی اس عورت نے مجھے غور سے دیکھا اور ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ''خوب..... تو یہ ہے پری زاد.....؟ انٹرسٹنگ۔'' میرا جی چاہا لبنیٰ کے کان میں دھیرے سے کہوں کہ ایسے جانے کتنے مناظر میں اردو فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جہاں امیروں کی محفل میں غریب کو اس کی حیثیت یاد دلائی جاتی ہے، پھر مجھے خود اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ اتنے میں میرے عقب سے ایک بھکی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ ''اخاہ..... تو یہ ہیں مسٹر پری زاد..... جن کی شاعری ڈرامے میں ڈب کی گئی تھی، بھئی واہ لبنیٰ، کیا اداکاری کی تھی تم نے.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پکی عمر کا موٹا سا شخص آہستہ آہستہ ڈگمگاتے قدموں سے ہماری جانب چلا آ رہا تھا۔ لبنیٰ نے تعارف کروایا کہ ''یہ سیٹھ عابد ہیں، ان کے خاندانی دوست۔'' وہ شخص لبنیٰ سے بہت بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر یہ نشے کا کمال تھا۔ میں ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ لبنیٰ کو فرصت ملے تو میں اس سے اجازت لے کر وہاں سے نکل جاؤں۔ سیٹھ عابد کھانا لے کر پلٹا تو اس کی نظر پھر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ ''اور جناب! کیا مصروفیات ہیں آج کل، دراصل میں خود بھی چھوٹا موٹا شاعر ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جلد ہی میری کتاب بھی میرے مداحوں کی پیاس بجھانے کے لیے شائع ہو جائے، مگر کیا کروں۔ یہ کاروبار اور دھندا ہی جان نہیں چھوڑتا۔'' سیٹھ عابد نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی دو چار غزلیں بھی مجھے سنائیں، جنہیں سن کر میں نے شُکر کیا کہ اس کی کتاب ابھی تک شایع نہیں ہوئی۔ سیٹھ عابد اپنی دھن میں مگن بولے جا رہا تھا۔ ''لبنیٰ! تمہاری شاعری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری شاعری کی نوک پلک سنوار کر اسے بھی ایسا بنا دو کہ وہ لبنیٰ کے معیار پر پوری اتر جائے۔'' میں نے حیرت سے سیٹھ عابد کی طرف دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی شاعری اس کے نام کر دوں۔ سیٹھ عابد نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''اور اس کام کے لیے میں ایک خطیر رقم دینے کو بھی تیار ہوں۔ لبنیٰ بتا رہی تھی کہ تم ٹیوشنز پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچہ پورا کرتے ہو۔'' میں اپنے غصّے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ''معاف کیجیے گا عابد صاحب، زندگی میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔'' عابد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''غلط..... آج کل سب بکاؤ ہے اور جس محفل میں آج تم کھڑے ہو، ان اُمراء کے لیے تو یہ شاعری، یہ خوب صورت الفاظ محض ایک شام بہلانے کے کام آتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ لینا۔ میں نے بڑے بڑے قلم کاروں کے مسودے ردّی کے بھاؤ بکتے دیکھے ہیں۔'' میں لبنیٰ سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ جب انسان کے پاس دولت کی بہتات ہو تو اس کے اندر کا کباڑیا کیوں جاگ جاتا ہے؟ کیا یہ سبھی امیر ایک جیسے ہوتے ہیں؟ مگر لبنیٰ تو ان جیسی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں اپنے لفظوں کے لیے ایک خاص احترام دیکھا تھا۔ میرا بھولا دل ایک بار پھر راہ بھٹکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

اگلے دن لبنیٰ نے مجھے یونی ورسٹی میں چُپ اور اُداس دیکھا تو اُسے لگا کہ میں گزشتہ شام کے اُس کی ماں کے سلوک سے دل برداشتہ ہوں۔ اس نے مجھ سے معذرت کی، مگر میں نے اسے تسلّی دے دی کہ میں اس سلوک کا عادی ہوں، میری بات سُن کر اس کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں اُداسی اتر آئی۔ مجبوراً اس کا دل بہلانے کے لیے مجھے اردو فلموں والی مثال دہرانی پڑی کہ اس کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں نے درجن بھر ایسی فلمیں دیکھ کر خود کو پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، البتہ بس ایک کمی رہ گئی کہ وہاں کوئی بڑا سا پیانو نہیں تھا، جس پر بیٹھ کر ایسی سچویشن میں غریب لڑکا ہیروئن کے لیے گانا گاتا ہے۔ میری بات سُن کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ اور یوں لگا جیسے تیز بارش میں دھوپ نکل آئی ہو۔

اور پھر چند دن بعد لبنیٰ نے اچانک یونی ورسٹی آنا بند کر دیا۔ میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا، مگر کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر پانچویں دن میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے بنگلے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے لبنیٰ کے نام پر مجھے گھر کے لان تک پہنچا دیا۔ لان میں لگے سنگِ مرمر کے بڑے فوارے کے پاس لبنیٰ کی ماں کو بیٹھے دیکھ کر میرے قدم اٹکنے لگے۔ دوسرا جھٹکا مجھے لبنیٰ کی ماں کی انگلیوں میں پکڑے سگریٹ کو دیکھ کر لگا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولی۔ ''لبنیٰ سے ملنے آئے ہو؟'' میں نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ ''جی'' لبنیٰ کی ماں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''محبت کرتے ہو، میری بیٹی سے.....؟'' مجھے لگا، جیسے کسی نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ لبنیٰ کی ماں کی آنکھیں مجھے اپنے جسم کے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

لبنیٰ کی ماں کی بات سُن کر چند لمحوں کو تو میں گنگ سا رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''جواب دو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں، تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم لبنیٰ سے محبت کرتے ہو۔'' میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر شاید ان کو خود ہی میری حالت پر ترس آ گیا۔ ''اندر چلے جاؤ، وہ ڈرائنگ روم میں ہوگی۔'' میں تیز تیز قدم اُٹھاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ لبنیٰ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے قریب اُداس سی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ''پری زاد کیسے ہو؟'' میں نے چُھوٹتے ہی سوال کیا؟ ''آپ اتنے دن سے یونی ورسٹی کیوں نہیں آئیں۔ سب ٹھیک تو ہے ناں۔'' لبنیٰ نے میری طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ''ہاں..... میں نے یونی ورسٹی چھوڑ دی ہے۔ منا نے میری شادی طے کر دی ہے۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''شادی یوں اچانک، مگر کس کے ساتھ؟'' ''سیٹھ عابد کے ساتھ۔ میری شادی عابد سے ہو رہی ہے۔'' یہ میرے لیے دوسرا جھٹکا تھا۔ ''سیٹھ عابد سے مگر، آپ اور وہ، میرا مطلب ہے، آپ کے لیے اس شخص سے کہیں بہتر لوگ موجود تھے۔'' لبنیٰ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ ''بات میرے انتخاب کی نہیں ہے پری زاد۔ اونچی بولی کی ہے، جو بھی میرے لیے اونچی بولی لگائے گا، میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ عابد کی بولی پندرہ کروڑ تھی۔ میری نیلامی میں اس سے اونچی بولی کسی اور نے نہیں دی۔ لہٰذا مجھے عابد کے نام کر دیا گیا۔'' مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں بول پڑا۔ ''بولی شریف لڑکیوں کی نہیں لگتی ہے لبنیٰ جی، شریف گھرانوں کی لڑکیاں تو رُخصت ہوتی ہیں، عزت کے ساتھ۔'' لبنیٰ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ ''تو پھر یہی سمجھ لو کہ میں بھی وہیں سے تعلق رکھتی ہوں، جہاں لڑکیوں کی بولیاں لگتی ہیں۔ رُخصتی نہیں ہوتی۔'' مجھے سب کچھ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' ''ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اب میں یونی ورسٹی نہیں آؤں گی پری زاد۔ پندرہ دن کے بعد میری دُنیا دکھاوے کے لیے وہ رسم بھی ادا ہو جائے گی، جسے یہاں رُخصتی کہتے ہیں۔'' لبنیٰ کی آنکھیں اب باقاعدہ برسنے لگی تھیں۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ عالی شان گھر، یہ رہن سہن اور میری یہ اعلیٰ تعلیم..... یہ سب دکھاوا ہے پری زاد۔ ہماری یہ شان وشوکت ان ہی سیٹھ عابد جیسے لوگوں کے دم سے ہے۔ جسے لوگ کبھی بازارِ حُسن کہا کرتے تھے، اب وہ بازار کسی خاص علاقے تک محدود نہیں رہا۔ پھیل کر شہروں کی ان اونچی اور اعلیٰ بستیوں تک پہنچ گیا ہے، اور جسے میں اپنی ماں کہتی ہوں، پتا نہیں، وہ میری سگی ماں ہے بھی یا نہیں۔ یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی تعلیم کا شوق پورا کرنے دیا یا شاید یہ بھی بازار میں بولی بڑھانے کا ایک کارآمد نسخہ ہوگا۔'' لبنیٰ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ میرے پاس بھی اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا، سو، واپسی کے لیے قدم اٹھا دیے کہ عقب سے لبنیٰ کی آواز آئی۔ ''میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے پری زاد کہ تم ایک سچے دوست ہو۔'' میں نے پلٹ کر سر جُھکائے سیاہ لباس میں ملبوس، ڈھلتی سُرمئی شام جیسی لبنیٰ کے وجود کو آخری بار اپنی دُکھتی آنکھوں کے آئینے میں سمویا۔ اس کے گلابی عارض آنسوؤں سے دُھل سے گئے تھے۔ ''لبنیٰ جی..... کاش! میرے پاس پندرہ کروڑ روپے ہوتے تو میں آپ کو خرید کر آزاد کر دیتا۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ زندگی کی اصل فلم میں لڑکے کے پاس لڑکی کے ماں باپ کو ادا کرنے کے لیے کبھی پیسے نہیں ہوتے۔ وہ تو بس کسی اور کے خریدے گئے پیانو پر بیٹھ کر بُجدائی کا گانا ہی گا سکتا ہے۔'' لبنیٰ کے ہونٹوں پر میری بات سُن کر ذرا دیر کے لیے ایک ہلکی سی مُسکان اُبھری اور میں اس کا، وہی آخری مدھر مسکان بھرا چہرہ، آنکھوں میں لیے پلٹ آیا۔ لان میں فوارے کے قریب کرسی ڈالے لبنیٰ کی ماں ابھی تک بیٹھی فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ مجھے واپس جاتا دیکھ کر فون کاٹ دیا اور پھر ان کی کاروباری آواز نے جیسے میرے قدم جکڑ لیے۔ ''سُنو لڑکے! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہو، تو اپنی جیب میں اس کے دام ضرور رکھو۔ شاید اس وقت میں تمہاری نظر میں ایک بہت بُری عورت ہوں، مگر تمہیں ایک پتے کی بات بتا رہی ہوں۔ مرد کی شکل اور شخصیت کوئی نہیں دیکھتا۔ سب اس کا رُتبہ اور عہدہ پرکھتے ہیں۔ دولت مرد کے ہر عیب، ہر خامی پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ آئندہ زندگی میں کچھ پانا چاہو تو میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا۔''

پندرہ دن بعد شہر کے تمام بڑے اخباروں میں مُلک کے معروف صنعت کار، سیٹھ عابد کی دوسری شادی کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔ میں نے بے زاری سے اخبارات یونی ورسٹی کی لائبریری کی میز پر پٹخ دیے۔ ٹھیک ہی کہا تھا لبنیٰ کی ماں نے، سارا کھیل پیسے کا ہے، جیب میں دھیلا نہ ہو تو یہ سوچ، الفاظ، اعلیٰ خیالات اور ادب وفن، سب کسی کام کے نہیں۔ دمڑی پاس ہو تو پھر سارا میلہ ہی اپنا ہے۔ میں ان ہی خیالات میں گھرا گھر آیا تو دونوں بڑے بھائی اور بھابھیاں استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ''ہاں میاں..... اور کتنی چلے گی تمہاری یہ پڑھائی، گھر کے خرچوں کا کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔ اب تمہاری ان شام کی دو ٹیوشنوں میں گزارہ نہیں ہوتا۔'' دوسرے بھائی بولے۔ ''میں تو کہتا ہوں کہ پڑھ لکھ کر بھی تمہیں کون سا کہیں کلکٹر لگ جانا ہے۔ وہی کلرکی ہوگی اور وہی مہینے بھر کے پانچ سات ہزار۔'' بھابھی نے مشورہ دیا ''میری مانو تو کوئی کل وقتی ملازمت پکڑ لو۔ بھئی، سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے اپنے بچّوں کے خرچے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں خود اپنے منہ سے کہتے شرم آتی ہے۔ تمہاری عُمر کے محلّے کے سب لڑکے نوکریوں پر لگ کر اپنا گھر چلا رہے

ہیں۔'' میرے لیے ان کے یہ جملے کچھ نئے نہیں تھے، ہفتے میں ایک آدھ بار یہ قسط وار سیریل ضرور چلتا تھا، مگر آج نہ جانے کیوں میرا دل پہلے ہی اتنا بھرا ہوا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ لہجے میں ان سب سے کہہ دیا کہ اگر اس گھر کا کاروبار میری کمائی کی وجہ ہی سے رُکا ہوا ہے تو میں کوشش کروں گا کہ اسی ماہ کوئی نوکری یا مزدوری پکڑ کر ان سب کے منہ بند کر دوں۔ گھر والے ٹھیک ہی کہتے تھے، ڈگری مل جانے کے بعد بھی مجھ جیسے جانے کتنے، نوکری کے لیے برسوں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انٹرویو، جو کسی بھی نوکری کا لازمی جزو ہوتا ہے، اس کے لیے اچھی شخصیت کا ہونا کبھی کبھی شرطِ اول بن جاتا ہے اور میری شخصیت..... مجھے تو شاید کوئی بڑی فرم یا دفتر انٹرویو کے لیے طلب ہی نہ کرے۔ مگر نوکری یا کام ملنے کے لیے میرے پاس کوئی منتر بھی تو نہیں تھا۔

مجھے یاد آیا کہ محلے کا ایک لڑکا، شوکی بچپن ہی سے کسی ویلڈنگ گیراج پر مزدوری پر لگ گیا تھا اور اس کی ماں کے بقول ہر ماہ ایک معقول رقم گھر والوں کے ہاتھ پر لا کر رکھتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ فائنل امتحانات، جو اگلے ماہ شروع ہو رہے تھے، ان کی تیاری میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا اور آج گھر جانے سے پہلے کوئی نہ کوئی کام ضرور ڈھونڈ کر پلٹوں گا۔ شوکی کے گیراج کا پتا مجھے معلوم تھا۔ میں نے گیراج کے گیٹ پر پہنچ کر سامنے کام کرتے لڑکے سے شوکی کے بارے میں پوچھا، تو لڑکا شوکی کو بلانے اندر چلا گیا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ گیراج کے گیٹ کے اُوپر ایک بورڈ پر بڑا بڑا ''استاد مستانہ ویلڈنگ گیراج'' لکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں شوکی نمودار ہوا اور مجھے گیٹ پر کھڑے دیکھ کر گرم جوشی سے آگے بڑھ کر ملا۔ ''ارے..... بڑی زاد بھائی آپ، یہاں..... سب خیر تو ہے؟'' میں نے ایک لمبی سانس بھری۔ ''ہاں، سب خیر ہے۔ مجھے تمہارے گیراج میں کوئی کام مل سکتا ہے کیا، مجھے کام کی تلاش ہے۔'' شوکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''آپ، یہاں کام کریں گے، مگر آپ تو پڑھے لکھے ہو بڑی بھائی۔'' میں نے شوکی کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ نوکری اب میری ضرورت سے بڑھ کر مجبوری بن چکی ہے۔ اتنے میں کُرتے شلوار میں ملبوس اُوپر سیاہ واسکٹ پہنے، کانوں میں موتیے کا پھول سجائے ایک شخص باہر سے اندر داخل ہوا، جس کے تیل میں چپڑے بال ایک جانب سلیقے سے کڑھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پان کی لالی اور پتلی طرح دار مونچھیں، دونوں جانب سے اُوپر اٹھی تھیں۔ اس نے شوکی کے سلام کے جواب میں مجھے غور سے دیکھا اور دھیرے سے گنگناتے ہوئے بولا ''وہ آئے ہمارے گھر میں، خدا کی قدرت ہے..... میاں شوکی! یہ حضرت کون ہیں؟'' شوکی نے جلدی سے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ بڑی زاد بھائی ہیں استاد جی، میرے محلے میں رہتے ہیں اور کسی کام کی تلاش میں ہیں۔'' استاد مستانے پر بھی میرے نام کا وہی اثر ہوا، جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا۔ میں نے درپیش آنے والی بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بولنے میں پہل کی۔ ''اگر میری صورت اور تعلیم آپ کی راہ میں حائل نہ ہو تو کیا آپ مجھے کوئی کام دے سکتے ہیں۔ میں بہت محنت کروں گا اور جلد ہی سیکھ جاؤں گا۔'' استاد مستانہ میری بات سُن کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''معاف کرنا میاں..... شاید تم بُرا مان گئے۔ میرا مقصد تمہارا دل دُکھانا ہرگز نہیں تھا، تم کرتے کیا ہو.....؟'' میرے بولنے سے پہلے شوکی بول اُٹھا ''بڑی زاد بھائی یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں استاد۔'' استاد نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے کوئی بہت بڑی مجبوری ہے؟'' ''ہاں، ایسا ہی سمجھ لیجیے۔'' مستانے استاد نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی، ''ٹھیک ہے میاں..... کب سے کام پر آنا چاہتے ہو؟ فی الحال تمہیں دیہاڑی پر رکھ سکتا ہوں۔'' میں نے آستینیں چڑھا لیں۔ ''آج سے استاد۔'' رات دیر گئے، میں گھر واپس پہنچا تو حسبِ معمول میرا انتظار کیے بنا سب سو چکے تھا۔ میں نے اپنی زندگی کی پہلی مزدوری کی دیہاڑی کے روپے برآمدے میں پڑی چوکی پر رکھ دیے اور صبح سویرے مُنہ اندھیرے پھر سے اُٹھ کر گیراج چلا گیا۔ استاد مستانہ اپنے مزاج کا ایک الگ ہی بندہ تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق، اسے لڑکپن ہی میں اس کے گاؤں سے شہر تو کھینچ لایا تھا، لیکن قسمت نے اداکار کے بجائے مستری بنا ڈالا۔ مگر اس کے اندر کا فن کار ابھی تک زندہ تھا اور مستانہ ابھی تک ہر نئی فلم کا پہلا شو، پہلے دن دیکھنے کا قائل تھا اور پھر فلم شو سے واپسی پر گھنٹوں اس کے تبصرے جاری رہتے۔ ''کیا خاک ایکٹنگ کی ہیرو نے، ہاں ولن نے پھر بھی کچھ رنگ جمایا..... نہ میاں! موسیقی کا تو بیڑہ غرق ہی کر دیا ہے، ان نئے لڑکوں نے، اور شاعری بھی کیا بے ہودہ اور بکواس ہو گئی ہے، تُو فلانے کا باپ، میں فلانے کا بیٹا، بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے؟ شاعری تو تب ہوا کرتی تھی۔ جایئے آپ کہاں جائیں گے، یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی..... تیرے میرے سپنے اب ایک رنگ ہیں..... عجیب داستاں ہے یہ، کہاں شروع، کہاں ختم..... واہ واہ کیا بات تھی اس شاعری کی۔'' استاد مستانہ گھنٹوں بولتا رہتا اور ہم سارے شاگرد چُپ چاپ اس کے تبصرے سنتے رہتے۔ مجھے استاد نے ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھنے سے پہلے ایک طویل لیکچر دیا۔ ''دیکھ میاں! یہ جو آگ کی چنگاریاں ہیں، یہ آج سے تمہارے لیے پھول کلیاں اور بھلجھڑیاں ہیں۔ یہ ایک آدھ دن ہی میں تمہارے لباس میں ہزاروں ننھے منے شگاف ڈال دیں گی۔ تمہارے ہاتھوں اور جسم کے کھلے حصوں پر انگاروں کی طرح برس کر تمہارے سارے جسم کو داغ دار کر دیں گی۔ شروع شروع میں کافی جلن بھی ہو گی، مگر پھر دھیرے دھیرے یہ آگ تمہاری دوست بن جائے گی اور تمہیں ان چنگاریوں کی عادت پڑ جائے گی۔ آگ کے ان جگنوؤں سے جتنی جلدی آشنائی ہو جائے، اُتنا ہی بہتر ہے۔ ان سے بچنے کی کوشش کرو گے تو کام نہیں سیکھ سکو گے۔'' اب میں استاد کو کیا بتاتا کہ جو پہلے سے جل کر راکھ ہو چکے ہوں، ان کا بھلا یہ بھڑکتی آگ کیا بگاڑے گی؟ اور پھر جلن کے لیے احساس زندہ ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، مجھ جیسے بے حسوں کے لیے کیا چنگاری اور کیا بھلجھڑی۔

یونی ورسٹی کا فائنل امتحان بھی میں نے جیسے تیسے کر کے دے ہی ڈالا۔ حالاں کہ اب مجھے ڈگری لینے میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ ان ہی دنوں میرے ہم جماعتوں نے مجھے بتایا کہ یونی ورسٹی کے سالانہ رسالے میں میری بہت سی شاعری کو اکٹھا کر کے ایک خاص نمبر بھی نکالا گیا ہے۔ میں نے کسی کے ہاتھ وہ رسالہ منگوا لیا اور ایک دن گیراج میں بیٹھا اسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ استاد نے مجھے دیکھ لیا اور میرے ہاتھ سے رسالہ جھپٹ کر اس پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہی اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''ارے واہ میاں! تو تم شاعر بھی ہو۔ بھئی کمال ہے، بتایا کیوں نہیں پہلے؟'' میں نظریں چرا گیا۔ ''اس میں بتانے لائق کیا تھا بھلا؟'' ''کیا مطلب، تم شاعری کو معمولی بات سمجھتے ہو۔ مجھ جیسوں سے اس کی قدر پوچھو میاں! کیا رچا ڈالا ہے تمہارے لفظوں میں، ہر ایک مصرع، دوسرے سے بڑھ کر، استاد نے وہیں باہر سردیوں کی ڈھلتی دھوپ میں کرسی ڈلوائی اور سورج ڈوبنے سے قبل وہ سب کچھ حفظ کر ڈالا۔

میں بہت دیر سے لوہے کے ایک بڑے پٹری نما ٹکڑے کو کاٹنے کی تگ ودو میں الجھا تھا، مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا، جیسے شعلے کو بھی مجھ سے کوئی بیر ہو گیا ہے۔ جب انسان کا وقت بُرا ہو تو ہر چیز اپنا تاثر کھو دیتی ہے۔ شبنم آگ اگلنے لگتی ہے اور شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔ استاد مجھے بہت دیر تک اس سرد چنگاری میں فولاد کاٹنے کی لاحاصل سعی کرتے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کہیں زیادہ تپش تمہارے اپنے اندر ہے، جو ہر پل تمہیں جھلساتی رہتی ہے۔ پری زاد میاں، کیوں اپنی جوانی ان شعلوں میں راکھ کر رہے ہو، آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہاری۔'' میں نے مستانہ استاد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''پیسا..... مجھے لگتا ہے میری ہر کم زوری، ہر عیب اور ہر خامی کا علاج صرف پیسا ہے استاد اور مجھے زندگی میں بہت سارا پیسا کمانا ہے۔'' استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''پر، اس روزانہ کی مزدوری سے تم کتنا کما سکو گے۔ دن رات محنت کرو، تب بھی مہینے کے آخر میں تمہارے ہاتھ میں پندرہ بیس ہزار سے زیادہ کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ چند سالوں کے اندر تمہاری جوانی ضرور گھل چکی ہو گی اور تمہاری نظر الگ جواب دے جائے گی۔'' میں بے بسی سے ہار کر بولا۔ ''تو پھر میں کیا کروں..... مجھے بہت پیسا کمانا ہے استاد۔ بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ اس کی چمک سے میرے وجود کا ہر داغ، ہر عیب چھپ جائے۔'' ''اگر تم پیسا کمانا چاہتے ہو تو دبئی چلے جاؤ، وہاں اس ہنر کی بہت مانگ ہے، اگر قسمت نے ساتھ دیا تو چند سالوں میں کافی کما لو گے۔ کم از کم اپنا گیراج تو کھول ہی سکو گے۔'' میں استاد سے یہ نہیں کہہ پایا کہ میں صرف ایک گیراج نہیں، یہ پورا شہر خریدنا چاہتا ہوں۔ ''استاد! کیا تم مجھے دبئی بھجوا سکتے ہو کسی طرح؟'' ''دبئی جانا اتنا آسان نہیں ہے میاں۔ ویزا، ٹکٹ اور قدم جمانے کے لیے تین چار ماہ کے قیام پر چار پانچ لاکھ روپیا تو لگ ہی جائے گا۔ اور پھر آگے تمہاری قسمت کہ تمہیں لمبے عرصے کے لیے کوئی کفیل ملتا ہے کہ نہیں۔'' اگلا پورا ہفتہ میں یہی سوچتا رہا کہ آخر، ہمارے مقدر کا ہر فیصلہ کاغذ کے ان چند ٹکڑوں ہی سے کیوں جُوا رہتا ہے، لوہے کے پرانے صندوق سے سردیوں کے کپڑے ڈھونڈتے ہوئے میں ایسی ہی کسی سوچ میں گم تھا کہ اچانک میری نظر کالج اور یونی ورسٹی کے دور میں لکھی گئی اپنی شاعری کے رجسٹر پر پڑی۔ کبھی میرا خواب تھا کہ میری شاعری کا مجموعہ بھی بازار میں آئے اور میری کتاب کی پزیرائی میں شہر کے دانش ور شامیں منعقد کریں اور مجھے بھی لوگوں کے جمگھٹے میں سراہا جائے۔ رجسٹر کے ورق پلٹتے ہوئے میری پلکیں بھیگنے لگیں، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے ہمارے سینے میں دھڑکتے دل کا رشتہ باقی جسم سے کسی سوتیلے جیسا ہوتا ہے۔ سارا جسم اور اعضا، جب ایک دوسرے کے ساتھ تال میل میں جڑے رہتے ہیں، تب یہ سوتیلا تنہا اور اداس کسی روٹھے بچے کی طرح دُور بیٹھا کسی اور ہی دنیا میں گم ہوتا ہے۔ رجسٹر میں لکھی میری شاعری بھی کسی ایسے ہی سوتیلے اور روٹھے بچے کی باتوں جیسی تھی۔ اگلے روز میں عابد گروپ آف کمپنیز کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ پہلے تو چوکیدار نے میرا حلیہ دیکھتے ہی مجھے صاف منع کر دیا، مگر جب میں نے اپنے نام کی پرچی انگریزی میں لکھ کر اس کے حوالے کی کہ وہ ایک بار استقبالیے پر جا کر اسے اندر بھجوا دے، اگر انکار ہوا تو میں گیٹ ہی سے واپس لوٹ جاؤں گا، تو چند لمحے سوچنے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ مجھے اندر بلا لیا گیا اور گھنٹہ بھر انتظار کے بعد میں سیٹھ عابد کے دفتر میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیٹھ عابد نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کیوں، میں نے کہا تھا ناں، اس دنیا میں ہر چیز بکاؤ ہے، بس ٹھیک قیمت لگانے والا ہونا چاہیے، تو بولو، کتنی قیمت رکھی ہے تم نے اپنی شاعری کی۔'' میں نے اپنا رجسٹر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''مجھے دبئی کا ٹکٹ اور ویزے کا خرچہ چاہیے۔ اگر آپ دے سکیں تو.....'' سیٹھ عابد نے رجسٹر اٹھا کر کسی دکان دار کی طرح اسے پہلے تولا اور پھر ورق گردانی کی۔ ''ٹھیک ہے، شاعری میری کم زوری ہے، مگر پھر بھی دو سو صفحات کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔'' میں نے اس کباڑیئے کو غور سے دیکھا۔ ''آپ چاہیں تو بطور قرض مجھے یہ رقم دے دیں اور اسٹامپ لکھوا لیں کہ میں کسی خاص مدت کے بعد آپ کو یہ پیسے واپس لوٹا دوں گا۔ شاعری البتہ ہمیشہ کے لیے آپ ہی کی رہے گی۔'' سیٹھ عابد کے ہونٹوں پر جمی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ''واپس لوٹا بھی سکو گے یا دبئی جا کر غائب ہو جاؤ گے.....؟ چلو ٹھیک ہے۔ میرا سیکرٹری تم سے شاعری کے حقوق کے بارے میں کچھ دستاویزات دستخط کروا لے گا۔ تمہارا دبئی کا ٹکٹ اور ویزا میرے ذمے رہا۔'' میں واپسی کے لیے پلٹ کر دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''لبنیٰ اب بھی کبھی کبھی تمہاری شاعری کی تعریف کرتی ہے۔ مجھے امید ہے، تم نے اس رجسٹر میں لکھی شاعری اسے نہیں سنائی ہو گی۔'' میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ ''آپ بے فکر رہیں، یہ نظمیں اور غزلیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور آج کے بعد یہ میرے حافظے سے بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گی۔'' اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

مستانہ استاد حسب معمول اپنا چھوٹا سا ریڈیو کانوں سے لگائے کھڑا تھا اور عالم گیر کی آواز کے ساتھ سر دھن رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ''آؤ میاں آؤ! کہیں تمہارا دل بھی تو اپنے استاد سے بھر نہیں گیا۔ آج کل گیراج میں بھی دل نہیں لگ رہا تمہارا۔ ناغہ پر ناغے کرنے لگے ہو۔'' میں نے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ ''استاد! میرے دبئی جانے کا بندوبست کر دو ٹکٹ اور ویزا لگوا لیا ہے میں نے۔ وہاں تمہاری کوئی جان پہچان ہے تو بتاؤ۔'' استاد کے ہاتھ سے ریڈیو نیچے گر گیا، اس نے لپک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ''واہ! خوش کر دیا پیارے، میں جانتا تھا کہ تم ایک دن ضرور کچھ کر دکھاؤ گے..... کب جانا ہے؟ میرا ڈور کا ایک برخوردار رہتا ہے وہاں۔ میں آج ہی اسے فون کر دیتا ہوں، تم اسی کے ساتھ رہو گے۔ وہ بھی وہاں اکیلا ہے، کئی سال سے..... رفیق نام ہے اس کا۔''

اگلے تین چار ہفتے یوں گزرے، جیسے چار پل گزرے ہوں۔ بھائی بھابھیاں اور گھر والے آخری وقت تک یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہے اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا، جس دن میں اپنا مختصر سا سامان باندھے ائرپورٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی جہاز سے تو کیا، ٹرین سے بھی کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھ سے وہ تمام حماقتیں سرزد ہوتی رہیں، جو مجھ جیسے کسی بھی فرد سے پہلی بار ہوائی سفر میں ہو سکتی تھیں۔ جہاز نے دبئی ائرپورٹ پر لینڈ کیا اور میں گھنٹہ بھر بعد باہر نکلا، تو بہت دیر انتظار کے باوجود مجھے رفیق کہیں نظر نہیں آیا۔ ائرپورٹ سے باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں چونک کر پلٹا، آنے والا شخص مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''جعلی ویزے پر دبئی آئے ہو، جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے.....؟''

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

e@janggroup.com.pksundaymagazin

اس شخص کی بات سن کر چند لمحوں کے لیے تو میں گنگ ہی رہ گیا۔ دیارِ غیر میں گرفتار ہونے والے پھر مشکل ہی سے سلاخوں کے پار آ پاتے ہیں۔ سیٹھ عابد جیسے شخص سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی تھی۔ ہوسکتا ہے، اس نے ہمیشہ کے لیے میرا بندوبست کرنے کی غرض سے مجھے جعلی ویزا ہی لگوا کر دیا ہو؟ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک عجیب سی نفرت دیکھی تھی۔ یہ ویسی نفرت نہیں تھی، جو باقی سب لوگ میری بدصورتی کی وجہ سے مجھ سے محسوس کرتے تھے، یہ عداوت کچھ الگ ہی تھی۔ مجھے یاد ہے، جب میں اپنا ویزا لگا پاسپورٹ سیٹھ عابد کے دفتر سے اٹھانے کے لیے گیا، تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''لبنیٰ تمہاری شاعری کی عاشق ہے۔ سچ پوچھو، تو اگر میں نے تمہیں دیکھ نہ رکھا ہوتا تو ضرور تمہیں اپنے رقیبوں میں شمار کرلیتا.....'' اب میں اسے کیا بتاتا کہ رقیب ہونا میرا نصیب ہوتا تو پھر بات ہی کیا تھی، مگر بہرحال سیٹھ عابد میرے الفاظ کا رقیب تو تھا اور اس کے لیے اتنی رقابت بھی کافی تھی شاید.....؟ میں چپ چاپ کھڑا اپنی گرفتاری کا انتظار کررہا تھا کہ اچانک وہ شخص زور سے ہنس پڑا۔ ''او یار! تم تو سنجیدہ ہی ہوگئے۔ مجھے پہچانا نہیں۔ رفیق ہوں میں۔ استاد مستانے کا بھانجا۔'' میں نے چونک کر غور سے اسے دوبارہ دیکھا۔ استاد کے بتائے ہوئے حلیے سے تو یک سر مختلف تھا وہ۔ رفیق میری الجھن سمجھ گیا۔ ''ارے یار..... استاد نے مجھے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا، جب میں فیکا ہوا کرتا تھا۔ ایک کم زور، لاغر اور نا کارہ سا منہ بسورتا لڑکا۔ مگر یہ دبئی ہے پیارے۔ اچھے اچھوں کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو۔'' رفیق نے جیب سے اپنی اور استاد کی ایک ساتھ کھنچی ہوئی پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکالی۔ وہ واقعی بہت بدل گیا تھا۔ عربی لباس، اونچا قد، بھرا ہوا جسم اور کھلتی رنگت، کون کہہ سکتا تھا، یہ وہی پرانا فیکا ہے، جو چند سال پہلے پاکستان سے دبئی کے اس صحرا میں قسمت آزمائی کے لیے اُترا ہوگا۔ میں نے شکایت کی۔ ''بہت اچھا استقبال کیا تم نے، جان ہی نکال کر رکھ دی میری۔'' وہ زور سے ہنسا۔ ''معاف کرنا یار! مذاق اپنی پرانی عادت ہے۔ ویسے تم ائرپورٹ کے اس کونے میں جس طرح سہمے، ڈرے ہوئے کھڑے تھے، تمہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ تم غیر قانونی طریقے سے دبئی آئے ہو۔'' ہم دونوں گیٹ نمبر 17 کے سامنے والے بڑے ستون کے پاس کھڑے تھے۔ دبئی آنے سے پہلے فون پر رفیق کے ساتھ یہی جگہ ملنے کے لیے طے ہوئی تھی۔ ائرپورٹ پر ایک نہ ختم ہونے والی بھیڑ تھی، بھانت بھانت کے لوگ، مرد و زن کا ایک سیلاب، جہاں کسی کو کسی کی طرف دیکھنے یا اس پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے آپ میں گم کسی ان جانی منزل کی طرف رواں تھا، مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، خود کو گم کردینے کے لیے ہمیشہ کسی جنگل یا ویرانے کی ضرورت نہیں ہوتی، انسانوں کا ہجوم بھی خود کو کھو دینے کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ رفیق میرے منع کرنے کے باوجود میرا سامان اٹھا کر ائرپورٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے عمر میں تین چار سال ہی بڑا ہوگا، مگر اس وقت میرے لیے ایک مکمل بزرگ کا روپ دھارے مجھے مختلف نصیحتیں کررہا تھا۔ ''یہاں کے عرب بڑے مغرور اور اجڈ ہیں۔ انہیں خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے کا خبط ہے۔ اس لیے ان کے منہ لگنے سے پرہیز کرنا، ورنہ یہ اپنے بندے کا قصور ہوتے ہوئے بھی تمہی کو خطاوار سمجھیں گے اور اگلے جہاز میں بٹھا کر واپس پاکستان روانہ کردیں گے۔ مجھے بھی ایک عمر ہوگئی، ان کے ناز نخرے اٹھاتے اور ان کا خبط برداشت کرتے۔ گالی ان کی زبان پر آتے دیر نہیں لگتی اور اپنے علاوہ دوسری سبھی اقوام کو یہ اپنا خادم تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہم مزدور طبقہ لوگوں کو تو ہر پل ان کا غلام بن کر ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا دماغ ہمیشہ ٹھنڈا رکھنا.....''

رفیق نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا اور میں حیرت سے صحرا میں بسے اس شہر کو دیکھتا رہا، جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوا تھا کہ

جیسے چند بدوؤں نے صحرا میں چلتے چلتے کچھ دیر کھیل تماشے کے لیے اونچی عمارتوں اور کشادہ سڑکوں کا یہ میلہ سجایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں شام ہوجائے گی تو وہ اپنے خیموں سمیت یہ نقلی شہر بھی اکھاڑ کر چلتے بنیں گے، جیسے ساحل پر کھیلنے والے بچے دن بھر گیلی ریت سے گھروندے بنا کر انہیں خشک کرتے ہیں اور پھر شام کو جب ان کی مائیں واپسی کے لیے آواز لگاتی ہیں، تو جاتے جاتے پیروں سے اپنا ہی بنایا شہر مسمار کرکے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دبئی بھی ایسے چند شرارتی بچوں کا بنایا ہوا عارضی بسا شہر لگ رہا تھا۔ رفیق مجھے جس عالی شان اور لمبی سی گاڑی میں لیے چوڑی سڑکوں پر تیزی سے دوڑے جارہا تھا، میں نے اس گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہاتھ پھیر کر رفیق سے کہا۔ ''گاڑی تو بڑی کمال ہے، اپنی ہے کیا؟'' رفیق نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''فی الحال نہیں، مگر ایک دن اپنی بھی ہوجائے گی۔ میرے مالک کی گاڑی ہے یہ۔ ہم تو صرف ڈرائیور ہیں۔ مالک کی ڈرائیوری کرکے روزی روٹی کماتے ہیں۔'' گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کسی رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی، جہاں اونچی اونچی عمارتوں میں بہت سے چھوٹے فلیٹس بھی بنے تھے۔ رفیق اسی علاقے میں رہتا تھا، ہم اس کے چھوٹے سے، مگر صاف ستھرے فلیٹ میں داخل ہوئے، تو اس نے فوراً چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔ ''فریج میں کھانے پینے کا سارا سامان پڑا ہے۔ کھانا گرم کرکے کھالینا۔ مجھے کچھ دیر میں واپس جانا ہوگا۔ مالک سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ رات کو باقی باتیں ہوں گی۔''

رفیق لپک جھپک چائے کی پوری پیالی دو گھونٹ میں حلق سے اتار کر وہاں سے چلتا بنا۔ بہت کھلے دل کا تھا رفیق! بالکل استاد مستانہ کی طرح..... مجھے وہ سب یاد آئے، تو میں ایک دم اُداس ہو گیا۔ میں نے زندگی میں کبھی گھر سے باہر اور اتنی دُور وقت نہیں گزارا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے زود فراموش ہوتے ہیں، ذرا سی دُوری ہمیں ماضی کا ہر عذاب بھلا کر پھر اُسی ماضی کو یاد کر کے آہیں بھرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جب میں اپنے گھر میں تھا، تب بھی وہاں میں نے کون سے اچھے دن دیکھے تھے، مگر آج چند ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہی مجھے اسی گھر اور اپنی گلیوں کی یاد ستانے لگی تھی، جہاں مجھے ہر پل کسی نئی ذلت کا سامنا رہتا تھا۔ جب ایک دن ہمیں یہ سب کچھ چھوڑ ہی جانا ہوتا ہے، تو پھر ہم ان در و دیوار، رشتوں، درختوں اور آس پاس کے ماحول سے اتنا جُڑ کیوں جاتے ہیں کہ ذرا سی دوری خود ہمیں توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ دنیا اگر عارضی پڑاؤ ہے، تو اپنے ساتھ عارضی پن کا احساس لے کر کیوں نہیں آتی۔

اگلے ایک ڈیڑھ ہفتے میں رفیق نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے ایک تعمیراتی کمپنی کے ذریعے کام پر لگوا دیا، فی الحال میرے پاس تین ماہ کا کام کرنے کا ویزا تھا، مگر رفیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے مالک سے میری سفارش کروا کر اسے سال بھر کے ویزے میں تبدیل کروا دے گا اور اگر میں نے محنت اور ایمان داری سے اپنا کام جاری رکھا، تو اس مدت میں سال بہ سال توسیع بھی ہوتی رہے گی۔ مجھے ایک زیرِ تعمیر عمارت کی پندرہویں منزل میں ویلڈنگ پلانٹ پر کام کرنے کی مزدوری ملی تھی۔ میں اور رفیق صبح سویرے اپنے اپنے کاموں پر نکل جاتے اور رات گئے واپسی ہوتی تو عام طور پر دونوں ہی تھکن سے اس قدر چُور ہوتے کہ بات کرنا بھی کسی بھاری بوجھ اٹھانے کے مانند لگتا۔ مہینے بھر بعد جب مجھے میری پہلی تن خواہ ملی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے، اپنے ملک کی سال بھر کی کمائی سے بھی کچھ زیادہ روپے میرے مُٹھی میں بند تھے۔ مگر سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان پیسوں کا کروں گا کیا۔ اُس روز رفیق کو بھی تن خواہ ملی تھی، لہٰذا شام کو اسی خوشی میں وہ مجھے دبئی دکھانے کے لیے اپنے مالک کی گاڑی مانگ لایا۔ دبئی کی ڈھلتی شام میں تبدیل ہوتی رات، رنگ اور نور کی برسات، ہر چہرہ دُھلا ہوا، ہر عمارت جگمگاتی سی، چمکتے رستے اور خوشیوں سے سرشار جوڑے، باہوں میں باہیں ڈالے، اس دل رُبا شہر کی ایک اور شام سے زندگی کے جام کشید کرتے خوش نصیب لوگ۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں، اس بات کا احساس مجھے اُس شام ہوا، ہر سانس سے زندگی نچوڑ لینے کو جینا کہتے ہیں، اور ''ہم جیسے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔'' رفیق نے مجھے یوں گم صم بیٹھے دیکھا، تو چُپ نہ رہ سکا۔ ''کیا بات ہے شہزادے.... کہاں کھو گئے ہو؟ شہر کی رونقیں دیکھو۔'' میں نے فوراً چڑ کر کہا۔ ''ایک تو تم مجھے شہزادہ نہ کہا کرو، مجھے لگتا ہے، باقی سب کی طرح تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔'' رفیق نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تم تو واقعی برا مان گئے۔ اچھا چلو، میں تمہارا دل بہلانے کے لیے دبئی کے سب سے بڑے کلب لیے چلتا ہوں۔ ویسے تو وہاں کا داخلہ ٹکٹ ہی ہم دونوں کی سال بھر کی کمائی سے زیادہ کا ہے، مگر میرے مالک کی وجہ سے ہم سے کوئی ٹکٹ کا نہیں پوچھے گا۔'' میں نے حیرت سے رفیق کو دیکھا۔ ''کیوں، تمہارے مالک کی جان پہچان ہے کلب والوں سے؟'' رفیق زور سے ہنس پڑا۔ ''ارے نہیں، وہ کلب بھی میرے مالک ہی کا ہے۔ نہ صرف یہ کلب بلکہ ایسے نہ جانے کتنے کلب اور ہوٹلز ہیں میرے مالک کی کمپنی کے پاس۔ کوئی حساب نہیں ہے، اس کی دولت کا۔ کہتے ہیں کہ آج اگر وہ اپنا ہر کام اور کاروبار بند کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی بیٹھ جائے اور آئندہ ساری زندگی روزانہ لاکھوں درہم اُڑاتا رہے، تب بھی اس کی نسلیں تا قیامت عیش کرتی رہیں گی۔'' رفیق اپنے مالک کے بارے میں بتاتا رہا اور گاڑی ساحل کے کنارے دوڑتی ایک عظیم الشان کلب میں داخل ہو گئی۔ میرے لیے یہ سب کچھ ایک طلسم جیسا تھا، کئی منزلہ عمارت کے لیے ہر منزل پر کار پارکنگ بنائی گئی تھی اور ہر منزل کسی الگ کھیل یا تفریح کے لیے مخصوص تھی۔ عمارت کی لابی اور اندرونی حصّوں کو جدید اور خود کار لفٹس کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا، عمارت کے اندر ہی ہوٹل، ریستوران، سوئمنگ پول، گالف اور اسنوکر کلبز، شاپنگ پلازا، سنیما، تھیٹر، جوئے خانے، بار، رقص گاہیں، کیفے اور نہ جانے کیا کیا کچھ آباد تھا۔ کلب کیا تھا، پورا ایک شہر تھا، جسے پچاس منزلہ عمارت میں سمو دیا گیا تھا۔ چھت پر فلکی نظام اور مختلف ستاروں اور ستاروں کو دیکھنے والا ایک پورا ہال بنایا گیا تھا، جہاں بڑی بڑی دیو ہیکل دُوربینوں کے ذریعے چاند ستاروں کا معائنہ کیا جا سکتا تھا۔ کلب میں تو جوان جوڑوں کی بہتات تھی، سب اور بارہ تیرہ پُر ہجوم کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، جوئے خانوں اور بڑے کیسینو کے باہر انتظار کرنے والوں کی لمبی قطاریں ہاتھ میں ٹوکن لیے کھڑی تھیں۔ میں نے رفیق سے جب اپنی اس حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کلب تو کسی طور ایک اسلامی ملک کا حصّہ نہیں لگ رہا، تو رفیق نے حسبِ معمول ایک جان دار قہقہہ لگایا اور سر جھٹک کر بولا۔ ''اسلامی ملکوں میں کلب نہیں ہوا کرتے۔ دبئی ایک الگ ہی شہر ہے۔ یہاں تمہیں ہر مذہب کا پیروکار ملے گا۔ اب یہ اُس پیروکار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے مذہب کو کس حد تک برتتا ہے۔ عابدوں اور زاہدوں کے لیے مسجدیں کھلی ہیں اور رندوں کے لیے شراب خانے، وہ کہتے ہیں ناں۔ ''رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔'' تو بس وہی معاملہ یہاں بھی ہے۔'' کلب کی ہر منزل پر حُسن کے جلوے اس کثرت سے بکھرے تھے کہ انہیں اپنی سحر دو بصارت میں سمیٹنا کسی بھی انسان کے لیے ناممکن تھا۔ رفیق مجھے کیسینو کے اندر لے گیا اور میں وہاں پیسے کی ریل پیل دیکھ کر چکرا ہی تو گیا۔ مذہب انسان کو جس چیز سے منع کرتا ہے، جانے اُسی عمل میں انسان کو اتنی کشش کیوں محسوس ہوتی ہے؟ شاید گناہ اور ثواب کا بنیادی فلسفہ ہی یہی ہے اور اسی جبر پر سزا و جزا کا دار و مدار۔ مگر فی الحال تو اس کلب میں لوگ پانسے پھینک رہے تھے اور قمار بازی کے نشے میں مسحور سزا اور جزا کا ہر فلسفہ بُھلا کر بس ان لمحوں کو جی رہے تھے، جو انہیں میسّر تھے۔ مسئلہ تو مجھ جیسوں کا تھا، جو گناہ کرتے وقت ثواب کی طرح کنجوسی کر جاتے ہیں اور کارِ ثواب بھی ڈر ڈر کر کسی گناہ کی طرح کرتے ہیں۔

ہم کیسینو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک کلب میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ سارا عملہ ایک دم چاق چوبند ہو گیا اور محافظوں کی دوڑیں لگ گئیں، پتا چلا کہ کلب کا مالک اور رفیق کا آقا بہروز کریم وہاں آ چکا ہے۔ میں بھی رفیق اور باقی سارے نوکروں کے ساتھ ایک جانب قطار میں کھڑا ہو گیا۔ بہروز ہال میں داخل ہوا تو چاروں طرف سناٹا سا چھا گیا۔ وہ ڈھلتی عمر کا ایک نفیس سا شخص تھا۔ مغربی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہوانا کا قیمتی سگار، ہیرے سے جڑی ٹائی پن اور کف لنکس، امریکی ڈیزائنر سوٹ اور میچنگ جوتے، آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشت اور اُداسی، کھویا کھویا سا وہ شخص واقعی کسی عظیم سلطنت کا

سلطان ہی لگ رہا تھا۔ جیسے دولت ہر کسی کو راس نہیں آتی، ویسے ہی امیری بھی ہر کسی کے ساتھ نہیں جچتی، میں نے بہت سے امیروں کو فقیروں سے بدتر شخصیت لیے پھرتے دیکھا تھا، مگر بہروز کریم پر امارت ٹوٹ کر برستی محسوس ہو رہی تھی، اس کے اردگرد اسٹاف، منیجرز اور محافظوں کا ایک ہجوم تھا، مگر پھر بھی وہ کلب کے نوکروں کے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ جس رات بہروز اپنے کسی ہوٹل یا کلب کا دورہ کرتا ہے، وہ رات وہاں کے عملے کے لیے شب برأت بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رات ان سب کو ایک ماہ کی تن خواہ کے برابر بونس ملتا ہے اور اس مخصوص کلب کی ہر منزل پر موجود سبھی افراد بہروز کے مہمانوں کے طور پر برتے جاتے ہیں، ان کا ہر بل، ہر خرچہ بہروز کی طرف سے ادا کیا جاتا ہے۔ گویا سبھی کے لیے دعوت عام ہوتی ہے۔ میں حیرت سے رفیق کی یہ ساری رام کہانی منہ کھولے سُن رہا تھا کہ اچانک بہروز ہمارے قریب سے گزرا تو رفیق نے جلدی سے اسے سلام کیا۔ بہروز نے مسکرا کر جواب دیا تو رفیق نے موقع غنیمت جان کر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کے، کھینچ کر قطار میں آگے کر دیا۔ ''یہ میرا دوست پُری زاد ہے مالک..... کچھ دن پہلے ہی پاکستان سے آیا ہے یہاں مزدوری کے لیے۔ اس کا سلام بھی قبول کیجیے۔'' بہروز نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''کیا نام بتایا تم نے.....؟'' میں چُپ رہا، رفیق نے جلدی سے میرا نام دہرایا۔ ''پُری زاد مالک۔'' بہروز کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''خوب، اسے کام نہ ملے تو فیکٹری کے منیجر مصطفیٰ کے پاس بھیج دینا۔'' بہروز مختصر سی بات کر کے آگے بڑھ گیا اور میں حیرت سے رفیق کو دیکھتا رہا۔ ''تمہارا مالک تو اردو بول لیتا ہے۔'' رفیق نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دبئی میں سبھی عربی نہیں بولتے۔ میرے مالک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ تقسیم کے بعد ان کے والدین یہاں دبئی آ کر بس گئے تھے، ہم پاکستانی اور ہندوستانی نوکروں سے وہ اردو میں بات کرتے ہیں۔''

کلب سے واپسی پر رفیق مجھے بہروز کریم کی کام یابیوں کی داستانیں سُناتا رہا کہ کیسے کام یابی کی سیڑھیاں طے کرتے کرتے آج وہ دبئی کے بزنس ورلڈ کے آسمان کا تارہ بن چکا ہے۔ بہروز کریم کی اس افسانوی کام یابی سے متعلق بہت سی پُراسرار کہانیاں بھی مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور اس کے اس وجیہہ چہرے کے پیچھے ایک سفاک شخص چُھپا ہوا ہے، جو اپنی کام یابی کی راہ میں آنے والی ہر شے کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ رفیق، بہروز کے بارے میں بولتے بولتے اچانک اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنس پڑا۔ ''دیکھ لو پُری زاد ے پیارے..... تمہیں جس نام سے اتنی چڑ ہے، آج وہی نام میرے مالک سے تمہارے تعارف کا سبب بن گیا۔ ورنہ بہروز صاحب نے آج تک کسی کا نام پلٹ کر دوبارہ نہیں پوچھا۔ وہ کہتے ہیں ناں..... خدا نے دنیا میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی کوئی مقصد ضرور رکھا ہے، تو بھائی مجھے تو تمہارے نام کا مقصد آج صاف نظر آ رہا ہے۔'' گھر پہنچنے کے بعد بھی ساری رات میں بہروز کریم کے بارے میں سوچتا رہا۔ کوئی انسان آخر اتنی بے تحاشا دولت کا کیا کرتا ہوگا۔ دولت مندوں کے دن بھی تو ہم غریبوں کی طرح چوبیس گھنٹے ہی کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری طرح سوتے جاگتے ہیں، تو پھر باقی بچے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کسی کے پاس قارون کا خزانہ اور کسی کے ہاتھ خالی کشکول کیوں ہوتا ہے۔

اگلے دن رفیق مجھے فیکٹری ایریا میں لے گیا۔ منیجر مصطفیٰ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج مصری تھا۔ جو سوائے کام کی بات کے، دوسری کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے رفیق کو سر سے پیر تک گھورا اور عربی میں کچھ کہا۔ اتنے سالوں میں یہاں رہتے رہتے رفیق کی عربی بھی کافی رواں ہو چکی تھی۔ رفیق نے عربی ہی میں میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مصطفیٰ نے میرے کاغذات طلب کیے اور پانچ منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ رفیق نے میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''چل پیارے..... تیرا کام تو بن گیا۔ یہ منیجر تھوڑا سا ٹیڑھا آدمی ہے، مگر ہے مالک کا خاص بندہ۔ اب یہ تمہارے سارے انتظامات یوں چٹکی بجاتے میں کر دے گا۔ میں نے اسے مالک کا حکم پہنچا دیا ہے۔'' اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ بہروز کریم کی سلطنت میں تو سیکڑوں ایسی گاڑیاں ہیں، جیسی ایک رفیق چلاتا ہے۔ خوش قسمتی سے رفیق کچھ عرصے تک بہروز کریم کے ذاتی دفتر کی گاڑی چلاتا رہا تھا، اس لیے بہروز کو رفیق کا چہرہ یاد رہ گیا ہوگا۔ پانچ روز بعد، رفیق نے مصطفیٰ کا دستخط شدہ، فیکٹری کا ایک حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے خاصی معقول تن خواہ پر فیکٹری کی رات کی شفٹ میں کام پر لگا دیا گیا تھا۔ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ بس لوہے اور دیگر خام مال کا کمپیوٹر میں اندراج کرنا اور سپلائی کے وقت چارٹ بنانا تھا۔ میں رات بھر فیکٹری میں ڈیوٹی دے کر صبح گھر واپس پہنچتا تو رفیق جانے کی تیاری میں ہوتا۔ ہم ایک ساتھ چائے کا ایک ایک کپ حلق سے نیچے انڈیلتے اور مَیں سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ جاتا۔ میری راتیں جاگنے اور دن سونے لگے تھے، اُن دنوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا کہ رات کو انسان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے، دن کا اُجالا ہماری بہت سی اَن دیکھی صلاحیتوں کو خوابیدہ کر دیتا ہے، جب کہ شام ڈھلنے کے بعد ہم زیادہ رومان پرور، شفاف اور کسی حد تک نڈر بھی ہو جاتے ہیں یا شاید مختلف شخصیات پر اس دن اور رات کے بھید کا کچھ مختلف اثر ہوتا ہوگا۔

مَیں فیکٹری میں اپنا کام رات کے پہلے پہر ہی میں مکمل کر لیتا تھا۔ پھر میں ہوتا اور صحرا کا تاروں بھرا آسمان، جو رات بھر مجھ سے باتیں کرتا۔ میں گھر سے آئے خطوں کا جواب نہیں دیتا تھا، البتہ ہر ماہ ایک معقول رقم انہیں ضرور بھیج دیتا تھا۔ اس رات بھی میں گھر سے آیا ایک خط دیکھ رہا تھا کہ فیکٹری کے پچھلے حصّے میں کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ مَیں تیزی سے پیچھے کی جانب لپکا۔ چند پرانے مزدور کچھ لوہے کی پیٹیاں ایک گودام میں سنبھال کر رکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے تفصیل پوچھنا چاہی تو فورمین نے مجھے جھڑک دیا۔ مگر مَیں خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ میں نے تہیہ کی کہ اگر انہوں نے مجھے تفصیل نہ بتائی، تو مَیں صبح ہوتے ہی منیجر مصطفیٰ کو اطلاع دے دوں گا۔ اتنے میں پیچھے سے مصطفیٰ کی آواز آئی۔ ''مَیں یہیں ہوں..... تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اور آج تو تمہارا آف تھا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' سچ تو یہ ہے کہ مصطفیٰ کو وہاں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا۔ آج واقعی میری چھٹی تھی۔ مگر ایک ساتھی کے بیمار ہونے کی وجہ سے مجھے اچانک ڈیوٹی پر آنا پڑا۔ میں نے مصطفیٰ کو بتایا کہ شفٹ انچارج کے طور پر یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں ہر چیز کا باقاعدہ اندراج کروں۔ مصطفیٰ نے میری بات لاپروائی سے ٹال دی۔ ''ٹھیک ہے، تم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تمہارے انچارج کی حیثیت سے میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے اپنی شفٹ ختم کر کے چُپ چاپ واپس گھر چلے جاؤ۔'' مصطفیٰ کی آواز کھردری اور لہجہ بہت سخت تھا۔ میں نے اُس وقت ان سب سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی بھی طرح بہروز کریم تک یہ اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کا انجام کچھ بھی ہو۔ بہروز ہفتے میں ایک آدھ بار اس فیکٹری کا دورہ بھی کرتا تھا اور پھر چھٹی رات جب میں نے احاطے کے باہر بہروز کریم کے اسکواڈ کی گاڑیوں کو رکتے دیکھا، تو تیزی سے ہال کے گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ مصطفیٰ بھی بہروز کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے کام کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہا تھا۔ مجھے راستے میں کھڑے دیکھ کر مصطفیٰ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جب وہ لوگ راہ داری میں میرے قریب سے گزرے تو میں نے اچانک آگے بڑھ کر بہروز کریم کو براہِ راست مخاطب کر کے کہا۔ ''مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے سر!.....'' بہروز نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

مصطفیٰ نے مجھے بُری طرح جھاڑ دیا۔ ''تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ مالک بہروز کو آج تک کسی نے یوں بیچ راستے میں نہیں روکا، میں تمہیں اسی وقت نوکری سے فارغ کرتا ہوں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے، کل آکر مہینے بھر کی تنخواہ لے جانا۔'' میں نے اطمینان سے مصطفیٰ کی بات سُنی۔ ''ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے ایک بار مالک سے بات کرنی ہے، یہ بہت ضروری ہے''۔ آس پاس کا عملہ وحشت زدہ سا مجھے یوں گھور رہا تھا، جیسے مجھ سے بڑا احمق انہوں نے اس روئے زمین پر پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ بہروز نے اطمینان سے اپنا سگار سلگایا۔ ''ہاں بولو لڑکے..... اگر تمہیں پیسے وغیرہ چاہئیں، تو تم نے واقعی میرا بہت وقت ضائع کیا، اکاؤنٹس والوں سے لے لو۔'' میں نے جلدی سے واضح کیا۔ ''نہیں جناب..... مجھے پیسے نہیں چاہئیں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہاں اس فیکٹری سے کچھ ایسی ترسیلات بھی ہوتی ہیں، جن کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے کوشش کی تو مجھے بھی منع کر دیا گیا۔'' میری بات سُن کر مصطفیٰ نے ڈانٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بہروز نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا اور اپنے خاص محافظ فیروز سے کہا۔ ''فیروز خان کچھ دیر بعد اس لڑکے کو میرے دفتر لے آؤ۔'' بہروز حسبِ معمول مختصر سی بات کر کے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ فیروز نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے بہروز کے بہت قریب سمجھا جاتا تھا اور وہی بہروز کا محافظِ خاص بھی تھا۔ اس کے علاوہ بہروز کسی دوسرے باڈی گارڈ پر اتنا بھروسا نہیں کرتا تھا۔ فیروز خان ہی اس کی خواب گاہ کے باہر بھی پہرہ دیتا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے رفیق پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے جب بھی فیروز کو دیکھا، اسے خاموش ہی پایا، شاید اسے بھی اپنے مالک بہروز کریم کی طرح زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ رات کی شفٹ کے تمام ملازم فیروز کے ایک اشارے پر دوبارہ اپنے اپنے کام میں جُت گئے۔ کچھ دیر بعد چپڑاسی نے آکر فیروز کو بتایا کہ مالک مجھے طلب کر رہے ہیں۔ فیروز نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بہروز کے جہازی سائز، عالی شان دفتر میں داخل ہو گئے۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود تھا، جانے اس نے میرے بارے میں مالک کو کیا بتایا ہوگا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسبِ معمول سپاٹ سا تاثر تھا، اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''تم تو وہی ہو ناں، جسے رفیق نے بھرتی کروایا تھا؟ ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو.....؟'' میں نے اس رات کا پورا قصّہ بہروز کو سُنا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا سگار کے کش لیتا میری بات سُنتا رہا۔ میری بات ختم ہوئی، تو اس نے ایک گہرا کش لے کر میری طرف غور سے دیکھا۔ ''تم جانتے ہو کہ اگر تمہارا لگایا ہوا یہ الزام غلط ثابت ہوا تو نہ صرف تمہاری نوکری جائے گی بلکہ تمہیں غلط بیانی کے الزام میں پولیس کے حوالے بھی کیا جا سکتا ہے۔'' ''جی..... میں جانتا ہوں، آپ اپنے طور پر تصدیق بھی کروا سکتے ہیں۔'' بہروز کریم نے پلٹ کر اپنے عقب میں مؤدب کھڑے مصطفیٰ سے براہ راست پوچھا۔ ''کیوں مصطفیٰ! کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے؟'' مصطفیٰ نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا۔ ''جی مالک..... یہ سچ کہہ رہا ہے۔'' میں نے چونک کر مصطفیٰ کی طرف دیکھا، اس کا جواب میری توقع کے بالکل برعکس تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت بہروز کریم کا ردِعمل دیکھ کر ہوئی۔ اس نے اطمینان سے سگار کا ایک اور لمبا کش لیا اور مصطفیٰ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے مصطفیٰ جاتے ہوئے میرے لیے ایک کپ بلیک کافی کا کہتے جانا۔'' بہروز کو میرا خیال آیا ''لڑکے، تم کافی پیو گے.....؟'' میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔ مصطفیٰ کمرے سے جا چکا تھا۔ میں نے بھی واپسی کے لیے دروازے کا رخ کیا کہ بہروز نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''مصطفیٰ میرا خاص آدمی ہے۔ میرے وفاداروں میں سے ایک قریبی وفادار، لیکن مجھے اچھا لگا کہ ابھی وفاداری کی یہ نایاب صنف دنیا سے بالکل ہی ناپید نہیں ہوئی۔ تم نے اپنی نوکری کی پروا کیے بنا اپنی وفاداری نبھائی۔ میرے ذہن سے تمہارا نام نکل گیا۔ بڑا منفرد سا نام تھا.....؟'' بہروز نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیرے سے اپنا نام دہرا دیا۔ ''پَری زاد'' بہروز مسکرایا ''ہاں..... پَری زاد! میں نے اس دن بھی محسوس کیا تھا کہ تمہیں اپنا نام کچھ خاص پسند نہیں، تو پھر تم یہ نام بدل کیوں نہیں لیتے.....؟'' میں نے بہروز کی طرف دیکھا۔ ''نام بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل جائے گی مالک..... ویسے بھی یہ نام مجھے میری اوقات یاد دلاتا رہتا ہے۔'' بہروز نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''مرد کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ دبئی کس لیے آئے ہو؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''بہت سا پیسا کمانے..... آپ کی طرح بہت بڑا آدمی بننے۔'' بہروز کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ لمحے بھر کو جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ ''بڑا آدمی.....؟ جانتے ہو لڑکے، یہ میری طرح کے جو بڑے لوگ تمہیں دولت اور ترقی کے آسمان پر چمکتے نظر آتے ہیں، ان سب کو بھی زندگی میں ایک نہ ایک بار تمہاری طرح ایک رات کسی غیر قانونی ترسیل کا پتا چلا ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اس کی خبر دینے کے بجائے، اس آلودہ نظام کا حصّہ بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔'' بہروز کریم اپنی بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا اور

باہر جاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے میرے پاس رُکا۔ ''گھر جانے سے پہلے اکاؤنٹنٹ سے ملتے جانا.....'' میں اپنی جگہ گم صم سا کھڑا رہ گیا اور بہروز کمرے سے نکل گیا۔ صبح چھٹی سے پہلے فیکٹری کا اکاؤنٹنٹ میرے پاس آیا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ میرے ہاتھ میں تھما گیا۔ اُس روز مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بہروز کریم کی اس سلطنت کا اصل دارومدار کچھ ایسے ہی غیر قانونی دھندوں پر ہے، جن کی خبر باہر والوں کو نہیں۔

رفیق کو جب اس سارے معاملے کا پتا چلا تو وہ مجھ پر بُری طرح برس پڑا کہ آخر مجھے ان کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ ایک بار تو بہروز نے مجھے معاف کر دیا، مگر دوبارہ اگر کبھی ایسا کچھ ہوا، تو وہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے دوسرے عملے کے برعکس بہروز کریم سے بالکل بھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہفتے میری ڈیوٹی رات کے بجائے دن کی شفٹ سے تبدیل کر دی گئی۔ مصطفیٰ سے اب بھی میرا آگا پیچھا ہوتا رہتا، مگر اب اس کے لہجے اور تیور میں وہ پہلے جیسی سختی نہیں رہی تھی۔ اور پھر کچھ دن گزرنے کے بعد ایک شام جب میں فیکٹری سے باہر نکلنے سے پہلے اپنے برقی کارڈ کے ذریعے واپسی کا وقت نوٹ کروا رہا تھا، تب اچانک رات کی شفٹ والے کارکن نے مجھے مصطفیٰ کا پیغام دیا کہ اس نے مجھے مل کر جانے کو کہا ہے۔ میں وہیں گیٹ کے قریب ایک شیڈ کے نیچے مصطفیٰ کا انتظار کرنے لگا۔ مغرب کے بعد مصطفیٰ اپنے محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے مجھے کنڈی لگانے کا اشارہ کیا اور اپنے مخصوص کرخت لہجے میں بولا۔ ''جتنا کمار ہے ہو، اس پر اکتفا کرنا چاہتے ہو یا پھر کم وقت میں کچھ زیادہ بنانے کی ہمت رکھتے ہو.....؟'' میرا جواب بہت سیدھا تھا۔ ''میرے پاس کھونے کے لیے کچھ خاص نہیں اور میں اپنی ہمت آزمانا چاہتا ہوں۔'' مصطفیٰ نے لمبی بات نہیں کی۔ بس اتنا کہا کہ رات کو ساحل پر کچھ لانچوں پر سامان آئے گا۔ مجھے وہ سامان وصول کر کے بہروز کی ایک دوسری فیکٹری کے گودام تک پہنچانا ہوگا۔ اس کام میں میرے ساتھ چند دوسرے معاون مع چار گاڑیوں اور ڈرائیورز موجود ہوں گے۔ میں نے زیادہ تفصیل میں جائے بنا ہامی بھر لی۔ مصطفیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ ''کام مشکل ہے، مگر یاد رکھو، کام یابی ہمیشہ بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ قانون کی نظر سے بچ کر کرنا ہوگا اور گرفتاری کی صورت میں تمہارا مالک سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''آپ بے فکر رہیں، میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔''

رات ڈھلتے ہی ہم آٹھ لوگ چار بڑی جیپوں میں سوار دُور دراز کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ سمندر خاموش اور آسمان تاریک تھا۔ ہم سب اندھیرے میں ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں گاڑیاں کھڑی کر کے لانچوں کا انتظار کرنے لگے۔ میرے لیے وہ سات کارندے بالکل اجنبی تھے اور ہم میں سے کوئی بھی آپس میں بات نہیں کر رہا تھا۔ دُور کہیں سمندر میں لنگر انداز جہاز سے موسیقی اور نوجوان جوڑوں کے گانے بجانے کی آوازیں ہوا کے دوش پر چند لمحوں کے لیے فضا میں بکھر جاتیں اور پھر وہی طویل سناٹا ہمیں گھیر لیتا۔ آج 14 فروری کا دن تھا، جسے ساری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب میں فلیٹ سے نکل کر ڈیوٹی کے لیے فیکٹری کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دبئی کے در و دیوار، بازار اور سڑکوں کو سرخ اور سفید رنگ کے غباروں اور پھولوں سے اٹے دیکھا تھا، نوجوان لڑکیاں سُرخ لباس میں اِدھر اُدھر رنگ برنگی تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں اور لو جوان سیاہ لباس کے ساتھ گلے میں سرخ اسکارف یا ٹائی پہنے محبت کا دن منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شاید سمندر میں لنگر انداز جہاز میں بھی ویلنٹائن کی پارٹی جاری تھی۔ کاش! دنیا میں بدصورت لوگوں کا بھی کوئی ویلنٹائن ڈے منایا جاتا۔ یہ ہر تقریب اور تہوار جو محبت سے منسوب ہے، اس پر صرف خوب صورت لوگوں ہی کا قبضہ کیوں ہوا رہتا ہے۔ اگر خوب صورت لوگ محبت کا دن مناتے ہیں، تو ہم جیسوں کو بھی کوئی نفرت کا دن منانے کی اجازت ہونی چاہیے، کچھ تو ایسا ہو، جو ہم سے بھی منسوب ہو۔ میں جانے کن الٹی سیدھی سوچوں کے بھنور میں گھرا تھا کہ اچانک دور سے چند لانچوں کی مخصوص جلتی بجھتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شاید یہ کوئی سگنل یا خاص اشارہ تھا، جو پہلے سے ساحل والوں کے لیے طے شدہ تھا۔ ہم سب ہوشیار ہو گئے۔ میری گاڑی کے ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کھول کر اس میں سے پسٹل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ مجھے اس کا استعمال نہیں آتا، کچھ دیر میں لانچیں ساحل کے قریب آ گئیں اور ہم سب گاڑیوں سے اتر کر لانچوں کی طرف بڑھے۔ لانچیں ساحل سے لگ چکی تھیں اور ہم ابھی چند قدم کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ساحل کا وہ ویران حصہ بڑی بڑی دیو ہیکل سرچ لائٹس کی روشنیوں میں جگمگا سا گیا اور ہم سب پل بھر میں اس تیز روشنی میں نہا گئے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر پر زور سے انگریزی میں چلایا۔ ''کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے، تم سب کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔'' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے، پھر ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی چلایا۔ ''بھاگو'' اور اس کے ساتھ ہی ہماری طرف سے تین چار فائر ہوئے اور سرچ لائٹس چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی، تیز روشنی کے بعد ایک دم چھا جانے والا اندھیرا عام اندھیرے سے زیادہ سیاہ اور گہرا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم سب اندھیرے میں گرتے پڑتے اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگے، مگر مجھے راستے میں ایک ٹھوکر لگی اور اگلے ہی لمحے میں گیلی ریت پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ لوہے کی ایک سرد نال میری کنپٹی سے ٹکرائی اور کسی نے پوری قوت سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا۔ اندھیرے کا طوفان میری آنکھوں کی پتلیوں سے ہوتا دماغ کی رگوں میں اتر گیا اور میرے وجود پر موت جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ بے ہوشی، شاید نیند کی انتہا ہے اور نیند موت کا ایک چھوٹا وقفہ ہوتی ہے۔

میں بھی کسی ایسے ہی وقفے کے درمیان موت کی صلیب پر لٹک رہا تھا، جب شدید ٹھنڈے پانی کی ایک بوچھاڑ نے مجھے کھینچ کر اس صلیب سے نیچے اتارا پھینکا۔ پانی کے دوسرے ریلے کے ساتھ ہی میں ایک جھٹکے سے واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی کھردری رسّی کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے ایک کرسی کے ساتھ باندھے گئے تھے کہ مجھے وہ خاردار تار جیسی رسّی اپنے ہاتھوں کی کلائیوں اور پاؤں کے ٹخنوں میں کھبتی محسوس ہو رہی تھی،

مجھے کرسی پر بٹھا کر میری گردن بھی رسّی سے لپیٹ کر کرسی کی پشت سے اس طرح کس کر باندھی گئی تھی کہ میری ذرا سی جنبش سے وہ رسّی گردن کے گوشت میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک اندھیرا سا کمرا شاید تہہ خانہ تھا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ کچھ دیر میں، میرے عقب میں چند لوگوں کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور کسی نے سامنے آ کر میرے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور عربی میں چلّا کر کچھ پوچھا۔ پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی دوسرا طمانچا گال پر اپنے نشان ثبت کر گیا۔ میں نے چلّا کر کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا، لہٰذا وہ جو کوئی بھی ہیں، مجھ سے انگریزی میں بات کریں۔ اس بار وہ تینوں اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ شاید پولیس یا کوئی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اہل کار تھے۔ اس بار انہوں نے رابطے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا۔ ان کے سوال انتہائی مختصر اور انداز بڑا سفاکانہ تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں، دبئی میں کب سے قیام پزیر ہوں اور میرا ان اسمگلرز سے کیا تعلق ہے اور یہ کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں.....؟ میرے پاس جواب میں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا اور پھر کوئی چارہ نہ پا کر انہوں نے دھیرے دھیرے اپنے ستم کا دائرہ کار بڑھانا شروع کر دیا۔ میرے بدن کے ہر جوڑ کو لوہے کی ایک چھوٹی سی مخصوص ہتھوڑی سے اس طرح ٹھوکا گیا کہ ہر ضرب روح میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم کو جلتے سگریٹوں سے وقفے وقفے سے داغا جاتا رہا اور اس تمام عرصے میں مجھے پنجوں کے بل کھڑا کر کے میرے ہاتھ اسی کھردری رسّی سے چھت پر ایک کنڈے کے ساتھ باندھے رکھے گئے، اس طرح کہ میرے بازوؤں پر میرے جسم کا سارا بوجھ یوں پڑتا رہے کہ میرے شانوں اور کہنیوں کے جوڑ کھل جائیں۔ وہ ہر بار تشدد کے وقفے میں دوبارہ اپنا سوال دہراتے کہ میں کس کے لیے کام کرتا ہوں؟ میں ہر دفعہ تکلیف اور اذیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے ڈوب کر جب ہوش کی حد پار کر کے بے سدھ ہو جاتا تو مجھے یہی لگتا تھا کہ میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے اور اب میں دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آؤں گا۔ مگر میرے ستم گر بہت تجربہ کار اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ انہیں مجھے زندہ رکھنا آتا تھا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان میں سے ایک نے تھک کر دوسرے دو جلادوں سے کہا کہ اسے ڈر ہے کہ کہیں مَیں مر ہی نہ جاؤں، لہٰذا ہمیں اسے سلطانی گواہ بنا لینا چاہیے اور مجھ سے عدالتی اسٹامپ پیپر پر ایک معاہدہ کر لیا جائے کہ اگر میں انہیں اپنے گروہ یا مالک میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اقبالی بیان دے دوں، تو وہ مجھے اگلے جہاز سے میرے ملک بنا کسی الزام کے ڈی پورٹ کر دیں گے۔ مجھے وہاں قید ہونے کے بعد دو یا تین دن کا حساب تو یاد رہا تھا، مگر پھر اس کے بعد اذیت کی شدت سے میری بے ہوشی کے وقفے اتنے طویل ہونے لگے کہ مجھے دن اور رات کی ہر تمیز اور گنتی بھول چکی تھی۔ جانے میرے اندر درد برداشت کرنے کی اتنی سکت کب اور کیسے پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ساری عُمر زبان کے گھاؤ سہتے سہتے، روح کو بھی اذیت سہنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ جسم پر ہر لمحہ لگتے یہ گھاؤ اور داغ ان روح کے زخموں کے مقابلے میں مجھے بہت کم تر محسوس ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہر طرح سے آزما چکے تو آخری حربے کے طور پر انہوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں کے ناخن میری کھال سے نوچنے کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ اوزار منگوا لیے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھ کھولنے نیچے جھکا تو دوسرے نے بے زاری سے ایک لمبی انگڑائی لی کہ آدھی رات تو بیت ہی چکی ہے تو کیوں نا اس ''نیک کام'' کو اگلے روز صبح تک مؤخر کر دیا جائے۔ ویسے بھی میری حالت اس وقت تک اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ شاید مجھے اپنے ماس سے ناخنوں کے علیحدہ ہونے کا پتا بھی نہ چلتا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ درد اور اذیت محسوس کرنے کے لیے بھی انسان کا اپنے حواس میں رہنا ضروری ہے۔ مجھے اُس روز دنیا کے ہر دیوانے اور خرد سے بیگانے شخص کی تقدیر پر ٹوٹ کر رشک آیا۔ نہ دنیا میں کسی درد کا جھمیلا اور نہ آخرت میں کسی عذاب کا ڈر۔ کاش! اس دیوانے پن کو اختیار کرنا بھی ہمارے اپنے بس میں ہوتا.....

وہ لوگ جانے کس وقت تہہ خانے سے جا چکے تھے، مگر میرا ذہن ابھی تک کسی آزاد جنگلی اور وحشی گھوڑے کی طرح بے لگام دوڑ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری پشت پر بندھے ہاتھوں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے، شاید کوئی ایک آدھ گرہ کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے کرسی کو دو چار زوردار جھٹکے دینے کی کوشش کی تو منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ اذیت، درد اور تکلیف سے دریاؤں کے بند کھل سے گئے اور میرے جسم کے تمام مساموں سے درد یوں قطرہ قطرہ کر کے پھوٹ نکلا، جیسے شدید گرمی کی کڑی دوپہر میں پسینہ پھوٹتا ہے۔ کرسی ایک جانب لڑھک گئی اور میں اس کے ساتھ ہی بندھے ہاتھوں پیروں سمیت زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ کچھ دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، جانے کتنی دیر بعد دوبارہ ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ کرسی کی ہتھی ٹوٹ چکی ہے اور ہاتھ پشت سے تقریباً کھل چکے ہیں۔ میں نے پوری قوت لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ آزاد کروائے اور کانپتی، زخمی، خون سے سنی انگلیوں کے ساتھ اپنے پیروں کی بندشیں بھی کھول ڈالیں۔ خود کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں تک جا پہنچا اور پھر، چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے جانے کتنی صدیوں میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تہہ خانے کے دروازے تک اپنے گھائل اور پور پور زخمی بدن کو پہنچایا۔ خوش قسمتی سے دروازہ ایک ہلکی سی کنڈی کی مدد سے باہر کی جانب سے بند تھا اور جب میں نے اپنے پورے جسم کے وزن کو دروازے پر دو چار مرتبہ دے مارا تو چٹخنی کھل گئی اور میں اپنے ہی زور پر، باہر کھلے ہال میں جا گرا۔ میری توقع کے برعکس وہ کوئی جیل یا دفتر کے بجائے ایک ویران سی نامکمل عمارت تھی، جس کے تہہ خانے میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔ میں پوری قوت لگا کر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس کوشش میں جانے کتنی بار زمین پر گرا۔ میرے قدم یوں جھولتے ہوئے زمین پر پڑ رہے تھے، جیسے ٹانگوں میں موجود ہر ہڈی کو پیس کر چکنا چُور کر دیا گیا ہو۔ کسی نہ کسی طرح میں زیرِ تعمیر ہال کے ڈھانچے سے باہر نکلا اور دُور صحن میں نظر آنے والے لوہے کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مَیں احاطے کی دیوار کا سہارا لے کر دھیرے دھیرے گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک صحن اور عمارت کا پورا احاطہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ صرف اندھیرا ہی انسان کی بصارت نہیں چھینتا، کبھی کبھی روشنی کی چکاچوند بھی اندھا کر دیتی ہے۔ مَیں بھی چند لمحوں کے لیے نابینا سا ہو گیا اور پھر مجھے بہت سے سائے اپنی جانب دوڑتے نظر آئے، میں نے دیوانہ وار گیٹ سے باہر نکلنے کے لیے چھلانگ لگائی، مگر مجھے راستے ہی میں کسی نے دبوچ لیا اور میں اس طرح بے سدھ سا زمین پر گر گیا، جیسے سیکڑوں میل صحرا اور جنگل میں لگاتار دوڑنے والا کوئی گھوڑا شدید تھکن سے چُور ہو کر ہانپتے ہوئے آخری بار کبھی نہ اٹھنے کے لیے زمین پر گر جاتا ہے۔ میری پلکیں بوجھل ہو کر دھیرے دھیرے بند ہوتی گئیں۔ شاید میری موت آخرکار مجھے اپنی مہربان آغوش میں لینے کے لیے، پلکوں کے در پر اپنے سفید پنکھ پھیلائے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس موت کی دیوی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''پُری زاد..... اٹھو..... چلو بہت دیر ہو گئی.....'' میں نے غور سے آواز سُننے کی کوشش کی۔ ہاں، کوئی میرا نام پکار تو رہا تھا، مگر یہ آواز.....؟ ہاں، میں اس آواز کو پہچانتا تھا۔ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا ''اسے اب ہوش میں لاؤ..... یہ مجھے زندہ چاہیے.....'' میرے ڈوبتے ذہن نے آواز پہچان لی..... یہ بہروز کریم کی آواز تھی۔ تو کیا مجھے بہروز کریم نے خود اغوا کروایا تھا؟

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کریم کی آواز سُنتے ہی میرے خوابیدہ حواس کو ایک جھٹکا سا لگا، مگر پھر میں ہوش کی سفاک سرحدوں کو پار کر گیا۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ یہ سرحدیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ جاوید اختر نے ٹھیک ہی کہا تھا، ''سرحدیں انسانوں کے لیے ہوتی ہیں..... سوچو تم نے اور میں نے، کیا پایا انسان ہو کے.....؟'' میں بھی ایک ایسا ہی بدنصیب انسان تھا۔ پنچھی، ندیا یا پون کا جھونکا ہوتا، تو جانے کب کا اس سفاک دنیا سے پرواز کر چکا ہوتا، مگر میرے پَر تو بندھے ہوئے تھے، جتنی بار ہوش آیا، میں نے خود کو سفید پٹیوں میں بندھے پایا، پھر نہ جانے کتنے دن بعد مجھے تھوڑی دیر کے لیے مکمل ہوش آیا، تو میں ایک آرام دہ کمرے میں ایک نرم بستر پر پڑا تھا۔ ایک نرس میرے قریب بیٹھی مستعدی سے میری دواؤں کا چارٹ بنا رہی تھی، میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں.....؟'' تو وہ مسکرا کے بولی۔ ''فکر مت کرو، تم محفوظ ہاتھوں میں ہو..... تمہارے زخم دھیرے دھیرے بھر رہے ہیں، بس تم آرام کرو۔'' نرس کمرے سے نکل گئی اور پھر جتنی دفعہ بھی مجھے ہوش آیا، میں نے اسی نرس اور چند مخصوص چہروں کو اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھا، جو پوری طرح میرا خیال رکھ رہے تھے۔ یہ زخم بھی کتنے بے وفا ہوتے ہیں۔ مسیحائی کا مرہم ملتے ہی کیسے اپنا مسکن، ہمارا یہ جسم چھوڑ جاتے ہیں۔ وہی جسم جو ان زخموں کی خاطر جانے کیسے کیسے درد اور عذاب جھیلتا ہے، یہ اُسی کو بھول جاتے ہیں۔ ان سے اچھے تو ان زخموں کے دیے ہوئے داغ ہوتے ہیں۔ عُمر بھر ساتھ تو نبھاتے ہیں۔ تقریباً ہفتہ بھر بعد میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر رفیق کی تھی۔ جانے وہ میری تلاش میں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوگا۔ میری دیکھ بھال پر مامور طبی عملہ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا یا شاید انہیں واقعی کچھ پتا ہی نہیں تھا اور پھر آٹھویں دن پہلی مرتبہ فیروز خان کا چہرہ نظر آیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ ''یہ سب کیا ہے فیروز..... میں کہاں ہوں، مجھے یہاں کون لایا ہے، مالک کہاں ہیں، کوئی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا.....؟'' فیروز نے حسبِ معمول خاموشی سے میرے سارے سوالات سُنے اور پھر بہت اطمینان سے بولا۔ ''سب پتا چل جائے گا۔ ویسے تم تو واقعی بہت سخت جان نکلے، ورنہ میرا خیال تھا کہ تم جیسا کچا لڑکا ایک جھٹکے ہی میں ٹوٹ جائے گا۔ مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔'' میں نے حیرت سے فیروز کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب، تو کیا تم لوگوں کو خبر تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، اور مجھے اغوا کر کے کہاں رکھا گیا؟'' فیروز کا چہرہ پھر بے تاثر تھا۔ اس نے جیب سے اپنی مخصوص برانڈ کی بیڑی نکالی اور ہونٹوں میں داب کر سلگائی۔ ''ہاں، نہ صرف جگہ کا پتا تھا، بلکہ تمہیں یہاں اٹھا کر لانے والے بھی ہمارے ہی آدمی تھے۔'' میرے دماغ کا تو جیسے فیوز ہی اُڑ گیا، میں نے چلا کر کہا۔ ''مگر کیوں، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا گیا.....؟'' فیروز کا لہجہ اب بھی دھیما اور پُرسکون تھا۔ ''تم ہی نے تو مالک سے کہا تھا کہ تمہیں بہت پیسا کمانا ہے۔ یہ پیسا کمانے کی پہلی کسوٹی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اتنے ہی پاگل ہیں کہ ایک دن راہ چلتے تمہیں پسٹل تھما کر کروڑوں ریال کا مال لینے ساحل پر بھیج دیں گے، پیسا کمانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیجے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمہاری برداشت، حوصلے اور بہادری کا امتحان تھا۔ ہم میں سے جو بھی مالک کے خاص کارندے ہیں، انہیں اسی طرح کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہاں، مگر تم پر مالک نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ رکھا۔'' میں منہ کھولے حیرت سے فیروز کی بات سُنتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ساحل پر ہونے والے ڈرامے سے لے کر میرے فرار کی کوشش تک سب ہی پہلے سے طے شدہ تھا۔ مجھے بہروز کریم کے خاص گروہ میں شامل کرنے سے پہلے انہیں میری وفاداری کا ہر طرح سے امتحان لینا تھا۔ فیروز کے مطابق اگر میں کسی بھی مرحلے پر ہار کر اپنی زبان کھول دیتا، تو اسی لمحے مجھے اس اذیت خانے سے نکال کر پہلی فلائٹ سے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ مجھے فرار کا موقع بھی جان بوجھ کر دیا گیا تھا، کیوں کہ بہروز یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں درد سے ٹوٹ کر اپنی ہمت اور حوصلہ تو نہیں کھو بیٹھا۔ فیروز نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایسی ساری کارروائیوں کی براہ راست نگرانی خود بہروز کریم کرتا ہے، کیوں کہ اُسے اپنے اردگرد صرف ایسے خاص چُنے ہوئے وفاداروں کا گروہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کے ہر امتحان پر پورا اُترے۔ میں نے فیروز سے رفیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلی رکھنے کو کہا کہ رفیق کو اتنا ہی پتا ہے کہ مجھے مالک نے کسی ضروری کام سے ابوظہبی کے دفتر بھیج دیا ہے اور اس عرصے میں وہ لوگ میری طرف سے رفیق کو میرے گھر بھیجنے کے لیے پیسے بھی دیتے رہے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے فیروز نے اپنے فون پر میری رفیق سے بات بھی کروادی۔ میری آواز سن کر رفیق کھل سا گیا۔ ''اوئے کہاں ہو تم یار! ایسی بھی کیا نوکری، یاروں کو ہی بُھلا دیا۔'' میری آواز بھرا سی گئی۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں جلد ہی واپس آ کر تم سے ملوں گا۔ اور پھر فیروز کے جانے کے بعد میں نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں انسان دولت، روپیا، پیسا، سب کچھ کما لیتا ہے، مگر سب سے مشکل کسی کی وفاداری کمانا ہے کہ اس کا تعلق کسی دوسرے کے خلوص اور ایمان سے ہوتا ہے۔ بہروز کریم کی یہ احتیاط اور پریشانی اپنی جگہ بجا تھی۔ سلطنت بنا لینے سے کہیں زیادہ مشکل، سلطنت کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ، بہت چھوٹے اور معمولی غداروں کے ہاتھوں اپنی بادشاہت گنوا چکے ہیں اور بہروز کریم مجھے تاریخ یاد رکھنے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ شام کو اچانک باہر وہی ہلچل سی مچ گئی، جو بہروز کی آمد کا خاصہ اور ابتدائی پیغام لے کر آتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بہروز میرے کمرے میں موجود تھا، فیروز خان بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بہروز نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بستر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ

کر مجھے بہت دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ ''کچھ کہو گے نہیں مجھ سے، میری وجہ سے تم پر ظلم کے اتنے پہاڑ توڑے گئے، تمہاری نس نس میں درد کا زہر بھر دیا گیا۔ غصہ تو بہت آیا ہوگا مجھ پر۔'' میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ براہ راست بہروز کی طرف دیکھا۔ ''نہیں..... آپ نے وہی کیا، جو دنیا میں کسی کی بھی وفاداری جانچنے کے لیے رائج طریقہ ہے۔ انسان کا جسم ہی بظاہر اس کی سب سے بڑی کم زوری اور مجبوری ہوتا ہے۔ تو اگر آپ نے بھی کم زوری کو آزما کر وفاداری کی جانچ کی تو کیسا گلہ شکوہ.....؟'' بہروز نے دل چسپی سے پوچھا۔ ''خوب! گویا وفاداری پرکھنے کا کوئی اور طریقہ بھی ہوتا ہے، میں بھی جاننا چاہوں گا۔'' ''جس وفادار کے لیے اس کا جسم اور درد کم زوری ہو، اس کے لیے برداشت کی جانچ ہی سب سے آزمودہ طریقہ ہے، مگر جسے درد سہنے اور اذیت برداشت کرنے کی عادت پڑ چکی ہے، اس کا امتحان کیا ہوگا؟'' بہروز چپ رہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس دنیا میں ہر انسان کے لیے قدرت نے ایک الگ امتحان تیار کر رکھا ہے۔ کہیں درد، کہیں دولت، کہیں حُسن اور کہیں اقتدار۔ آپ نے تو ابھی مجھے صرف ایک آزمائش سے گزارا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے حصے کا امتحان ہی نہ ہو.....؟'' بہروز نے اپنے سگار کو بے خیالی میں توڑا اور فیروز خان نے جلدی سے لائٹر سے سگار کو شعلہ دکھایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لڑکے، مگر میں اپنے وفاداروں کو اتنا کچھ دے دیتا ہوں کہ انہیں اور کسی چیز کی حسرت ہی نہیں رہتی، لیکن ایک بات تمہاری دل کو لگتی ہے۔ واقعی وفاداروں کی وفا نانپنے کا کوئی حتمی پیمانہ ایجاد ہی نہیں ہوا ابھی۔ انسان کے خون ہی میں وفا نہ ہو تو یہ صرف دل بہلاوے کی آزمائشیں ہیں۔ مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی اور مجھے تمہاری قوتِ برداشت کی بھی داد دینی پڑے گی، حالاں کہ دیکھنے میں تم اتنے سخت جان نہیں لگتے۔ بہر حال، اب تم بھی ہماری ٹیم کا حصہ بن چکے ہو، مگر یاد رہے، جس دنیا میں تم قدم رکھنے جا رہے ہو، وہاں سے واپسی کا کوئی دروازہ نہیں۔ میں کبھی خود کسی کو یہ پیش کش نہیں کرتا، مگر تم اگر چاہو تو میں آج بھی تمہیں بہت کچھ دے کر واپس تمہارے ملک رخصت کر سکتا ہوں۔ مگر ایک بار جب تم ہمارے راز اور ٹھکانوں سے واقف ہو گئے، تو پھر تمہاری واپسی کبھی ممکن نہیں ہوگی۔ چاہو تو میں تمہیں سوچنے کے لیے دو دن مزید دے سکتا ہوں۔'' ''میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے ہی میں اپنے واپسی کے سارے راستے بند کر چکا ہوں، اور واپسی کی فکر وہ کرتے ہیں، جن کی واپسی کا کوئی منتظر ہو۔ میرا کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' بہروز نے اطمینان سے میری بات سُنی اور پھر کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پہلے تم مکمل صحت یاب ہو جاؤ، پھر بہت کام پڑے ہیں تمہارے کرنے کے۔ اور ہاں، کچھ دن بعد تمہارے دوست کو یہاں سے کسی بہتر جگہ ٹرانسفر کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہاں سے واپسی کے بعد تم اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔'' بہروز کریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

فیروز خان کچھ حیرت زدہ سا تھا، وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رُکا۔ ''تم واقعی بہت خوش قسمت ہو لڑکے! مالک کو میں نے آج تک اتنی باتیں کسی سے کرتے نہیں دیکھا۔ جلدی تندرست ہو کر باہر آنا، تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں مزہ آئے گا۔'' فیروز چلا گیا اور اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد جب میں رفیق کے فلیٹ پہنچا تو وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے، مجھے مالک نے انچارج بنا کر ابوظہبی والی فیکٹری میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ پر تم فکر نہ کرنا، میں نے مالک سے التجا کی ہے کہ وہ تمہیں بھی جلدی ترقی دے کر میرے پاس بھجوا دے۔ تب تک تم یہیں میرے فلیٹ میں رہو گے۔'' میں خاموش رہا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ میں رفیق کو رخصت کرنے ائرپورٹ تک اس کے ساتھ آیا اور جہاز فضا میں بلند ہونے تک باہر لاؤنج میں کھڑا رہا۔ ہماری زندگی میں کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں، جن کی موجودگی سے کہیں زیادہ ہمیں ان کی غیر حاضری محسوس ہوتی ہے۔ رفیق کے جانے کے بعد میں نے اسے زیادہ قریب پایا۔ ہم انسان اتنے کوتاہ نظر کیوں ہوتے ہیں؟ اپنے قریب کی چیزیں، رشتے، ناتے اور لوگ ہمیں کیوں نظر نہیں آتے، جب کہ ان ہی جذبوں اور رشتوں کی تلاش میں ہم سات سمندر پار تک ساری دنیا چھان لیتے ہیں، مجھے تو ویسے بھی دو چار دن میں بہروز کریم کی طرف سے دیے گئے نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جانا تھا، مگر رفیق کے جانے کے بعد مجھ سے چوبیس گھنٹے بھی اُس فلیٹ میں نہیں رہا گیا۔ میں نے فیروز کو کہلوا بھیجا کہ ہو سکے تو مجھے چند دن کے لیے کسی ہوٹل میں منتقل کروا دے۔ جواب میں فیروز نے شام تک ایک بڑے فرنشڈ اپارٹمنٹ کی چابی میرے حوالے کر دی۔ جہازی سائز کے اس اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر شے پہلے سے موجود تھی۔ ہر چیز نئی، قیمتی اور چمکتی ہوئی۔ قرینے سے سجائی گئی۔ اتنی بڑی خواب گاہ، جس کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی تھی۔ دبیز ایرانی قالین، ریشمی پردے، فانوس، بڑے بڑے مصوروں کی تصویروں سے سجی دیواریں، ساتویں منزل پر بنے ہوئے اس اپارٹمنٹ کا سمندر کی طرف کھلنے والا بیلکونی اور وہاں پڑی وہ بید کی قیمتی آرام کرسی..... پل بھر کے لیے مجھے اپنے گھر کی چھت پر بنا وہ گودام نما چھوٹا سا کمرا یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس چھوٹے سے ذرے نما کمرے سے نکل کر اس عالی شان اپارٹمنٹ کے سفر میں نہ جانے میں نے پایا زیادہ تھا یا کھویا بہت۔ مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مجھے کام کیا کرنا ہوگا۔ مگر ایک بات تو بہت حد تک واضح ہو چکی تھی کہ بہروز کریم کے کچھ ایسے خفیہ دھندے بھی ہیں، جو قانون کی نظر سے چھپ کر جاری تھے۔ فیروز سے مجھے اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ وہ لوگ در پردہ سونے کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے، یہ دولت کمانا بھی تو ایک خبط ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا خبط اور جنون، ورنہ بہروز کریم کو بھلا مزید روپیا کمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یا شاید یہ بھی ایک نشہ ہے۔ کچھ لوگ خرچ کر کے اس نشے کا سُرور محسوس کرتے ہیں اور کچھ جمع کر کے۔ اسی روز مجھے ایک اور ادراک بھی ہوا کہ دولت مند کی دولت جتنی بڑھتی جاتی ہے، وہ اتنا ہی اپنے اندر سے خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے اور ٹھیک اس کے برعکس فقیر کا فقر اور فاقہ جتنا زیادہ بڑھتا ہے، وہ اتنا ہی بہادر اور لاپروا ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی جب تک فقیر تھا، مجھے اپنی جھلنگا چارپائی پر بھی جھولتے جھولتے نیند آ جاتی تھی اور آج جب میرے پاس دبئی کے سب سے پوش علاقے میں مہنگا ترین اپارٹمنٹ موجود تھا، تو میں اپنی خواب گاہ کی نرم مسہری پر ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح سویرے ہی فیروز خان کا پیغام آ گیا کہ بہروز کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے۔ اور جانے سے پہلے اس نے ہم سب کو کسی خاص میٹنگ

کے لیے اپنے ساحل والے بنگلے پر بلایا ہے۔ سہ پہر کو ڈرائیور گاڑی لے آیا اور مجھے اور دو چار مزید ارکان کو لیے وہ بہروز کریم کی شاہانہ رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پہلے یہ جگہ نہیں دیکھی تھی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ بہروز کو صرف کمانا نہیں، خرچ کرنا بھی آتا تھا اور اس نے اپنی اس رہائش گاہ پر جی بھر کے خرچ کیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کا خط اور اس کی رہائش کا سلیقہ، اس کے اندر کے آدمی کی نزاکت یا کرختگی ظاہر کرتے ہیں۔ بہروز کریم کا یہ عالی شان محل اس مثال کی غمازی کر رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک جانب پورچ میں دنیا کی چند بہترین اور مہنگی ترین گاڑیاں شیڈ کے نیچے کھڑی تھیں۔ شاید بہروز کو دنیا کی نایاب ترین کاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دائیں جانب چھوٹی سی پانی کی ایک نہر تھی، جس سے پرے، سبزے پر ایک وسیع و عریض گالف کورس بنایا گیا تھا۔ گھاس کے اونچے نیچے ٹیلوں کی پشت پر جہاں وہ پتھر اور درختوں کے جھنڈ ختم ہوتے تھے، وہاں ٹینس کورٹ بھی تھا، مگر گاڑی ہم سب کو لیے ان سب عجوبوں کو پار کرتی شیشے اور لکڑی کی ایک خوب صورت عمارت کی طرف بڑھتی گئی، جو شاید بہروز کے بنگلے کی انیکسی تھی، کیوں کہ اصل گھر جو کسی برطانوی دور کے قلعے سے مشابہ تھا، اس کی سرخ اور بھوری اینٹوں سے بنی عمارت تو ان سب سے پرے دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب انیکسی میں داخل ہوئے تو بہروز اور فیروز خان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بہروز نے مجھ سمیت سب کا حال پوچھا اور پھر ہمیں بتایا کہ اسے اچانک ایک ضروری کام سے چند دن کے لیے لندن جانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کی واپسی ہفتہ بھر میں متوقع ہے۔ پھر اس نے فیروز کو اس عرصے میں سبھی ارکان کی ڈیوٹی کے بارے میں تفصیل بتانے کی ہدایت کی، فیروز نے سب کو مختلف ادھورے کام اور وہ سودے بتائے، جو اس عرصے میں انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے تھے۔ مگر میرے لیے اس تفصیل میں کوئی فرض شامل نہیں تھا۔ باقی سب رکن ایک ایک کر کے وہاں سے رخصت ہوتے گئے اور پھر آخر میں صرف میں ہی کھڑا رہ گیا۔ بہروز کریم نے مسکرا کر فیروز سے پوچھا ''کیوں فیروز خان! پری زاد سے تمہاری بہت دوستی ہو گئی ہے کیا، اسے کوئی کام نہیں دیا تم نے؟'' فیروز خان نے حسب معمول سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیا ''یہ ابھی نیا ہے مالک..... اور اسے کوئی پرانا سودا بھی نہیں چکانا۔ آپ خود ہی اس کے لیے کوئی کام بتا دیں۔'' بہروز نے اپنا مخصوص سگار نکالا اور فیروز نے لائٹر سے اسے سلگایا۔ ''ہاں اس کے لیے میرے پاس ایک خاص کام ہے، تم جانتے ہو پری زاد، تم میرے گروپ کے سب سے نئے رکن ہو۔ اس لیے میرے کاروباری حریفوں اور میرے دشمنوں کی اب تک تم پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔ تمہاری اسی خصوصیت کو میں اس ایک ہفتے میں بروئے کار لانا چاہتا ہوں۔'' ''میں نے سر جھکا کر کہا ''میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔'' بہروز نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ محل اپنی چوتھی بیوی کے لیے تعمیر کروایا ہے، جو اس کی سب سے زیادہ لاڈلی بھی ہے۔ اس کی باقی دو بیگمات یہیں دبئی میں اور ایک بیوی اور چھوٹا بیٹا لندن میں رہتے تھے۔ وہ لندن اپنے اسی بیٹے کا کسی نامور تعلیمی ادارے میں داخلہ کروانے کی غرض سے جا رہا تھا، لیکن اُسے اپنی اس نئی کم سن دلہن کی بہت زیادہ فکر لگی رہتی تھی۔ اسی لیے بہروز نے اس محل میں اس کی تفریح کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ اس کے دشمنوں کو ابھی بہروز کریم کی اس نئی شادی کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کریم کی نئی نویلی دلہن کی صورت سے واقف تھے۔ مگر بہروز کے بقول اس کی گھر والی اب گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب چکی تھی، لہٰذا وہ اپنی سہیلیوں اور خاندان سے ملنے کے لیے باہر جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ بہروز اس کی محبت کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہونے کے باوجود اسے اپنے کسی پرانے وفادار یا محافظ کے ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ بہروز کے پرانے وفاداروں کو پورا شہر جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کا مطلب ہی بہروز کے خاندان کی نشان دہی تھا۔ لہٰذا بہروز چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اگر اس کی دلہن کو کہیں جانا ہو تو میں بھی ڈرائیور کے ساتھ اس کے ساتھ جاؤں، دوسری احتیاط مجھے یہ بھی کرنی تھی کہ بہروز کی دلہن کو کسی گارڈ کی موجودگی کی الجھن سے بے بھی بے خبر رکھوں کہ اسے اس زیرزمین دنیا کے خطرات سے آگاہ کر کے بہروز اس کی زندگی اجیرن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں، البتہ جس گاڑی میں، میں ڈرائیور اور بہروز کی وہ لاڈلی گھر سے نکلیں گے، اس کے تعاقب میں بہروز کے خاص وفادار محافظوں کی ایک ٹیم غیر محسوس طور پر ضرور رہے گی۔ اس دوسری گاڑی کا صرف مجھے پتا ہوگا اور ان کمانڈوز سے فون پر میرا رابطہ رہے گا تاکہ جب کبھی میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو وہ پلک جھپکتے ہی گاڑی کو اپنی حفاظت کے حصار میں لے لیں۔ پوری بات کہنے کے بعد بہروز نے تصدیق کے لیے میری طرف دیکھا ''سب سمجھ گئے ناں، کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا، لیلیٰ صبا میری جان ہے۔ اسے ہلکی سی کھرونچ بھی آئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے پری زاد۔'' میں نے سر ہلایا ''نہیں مالک! میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ کوئی غلطی نہیں ہوگی۔'' بہروز مسکرایا ''شاباش! تم ظاہر نہیں کرتے، مگر کافی ذہین ہو۔'' میں چپ رہا، مگر نہ جانے کیوں مجھے اس ساری کہانی میں کوئی ایک چیز بار بار الجھا رہی تھی، جیسے بہروز نے سب کچھ بتاتے ہوئے بھی کچھ بہت خاص چھپا لیا ہو، جیسے کوئی بہت بڑا راز میرے آس پاس بھٹک کر میرے کان میں کوئی سرگوشی کر کے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہو، پر بتا نہ پا رہا ہو۔

کچھ دیر میں ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ لیلیٰ صبا جاگ چکی ہیں اور کریم کا پوچھ رہی ہیں۔ بہروز کریم نے اٹھتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ''تم بھی وہیں آ جاؤ، میں تمہارا تعارف بھی لیلیٰ سے کروا دیتا ہوں۔'' میں بہروز کریم اور فیروز کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا اس محل کے ہال نما لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک جانب رکھے نفیس اور خوب صورت سفید رنگ کے پیانو کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک سے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں، میں بھی تو ایک پیانسٹ بننا چاہتا تھا اور آج قدرت نے پیانو دکھایا بھی تو کہاں.....؟ اتنے میں اوپر کی منزل کی طرف سے نیچے آتی لکڑی کی سیڑھیوں پر کسی کے نازک قدموں کی آواز گونجی، میری نظریں خود بہ خود جھک گئیں، آنے والی نزاکت سے پاؤں دھرتے نیچے اُتری تو بہروز نے مجھ سے کہا ''ان سے ملو پری زاد، یہ ہیں میری بیگم۔ اس گھر کی مالکن، لیلیٰ صبا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے نظر اٹھائی اور مجھ پر جیسے ایک پل کے لیے بجلی سی گر گئی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین''، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے لیلیٰ صبا کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے تو جیسے پتھر کا ہوگیا۔ بہروز کریم کو خدا نے صرف روپے پیسے ہی سے نہیں نوازا تھا، لیلیٰ صبا کی صورت حُسن کی ایک ان مول نعمت بھی عطا کر رکھی تھی۔ لیلیٰ حُسن و نزاکت کا ایک مکمل امتزاج تھی۔ مغربی لباس میں ملبوس، سیاہ فلیپر کے اوپر میرون شرٹ اور گلے میں سیاہ اسکارف، کُھلے بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کا خمار..... بہروز کریم کی فکر اپنی جگہ بالکل بجا تھی۔ اس گل رُخ کی حفاظت کے لیے سارے دبئی کو بھی مامور کردیا جاتا، تو کم تھا۔ کریم نے لیلیٰ سے میرا تعارف کروایا ''اس سے ملو، یہ پری زاد ہے، میرا نیا اسسٹنٹ.....'' میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، وہ لیلیٰ سے اردو میں بات کر رہا تھا۔ لیلیٰ نے نخوت سے میری طرف دیکھا اور انگریزی میں بہروز سے کہا ''او کم آن آغا، آپ کی پسند کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟'' بہروز نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور انگریزی ہی میں مجھے لاؤنج کے ساتھ ملحق دوسرے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا۔ شاید وہ لیلیٰ کو یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ میں انگریزی جانتا ہوں۔ میں چُپ چاپ وہاں سے نکل آیا، مگر لیلیٰ اور کریم کی اونچی آواز میں بحث میرے کانوں تک پہنچتی رہی۔ خاص طور پر جب کریم نے لیلیٰ کو یہ بتایا کہ اب میں گھر سے باہر نکلتے وقت ہمیشہ لیلیٰ کے ساتھ رہوں گا، تو لیلیٰ کی آواز مزید اونچی ہوگئی ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آغا، اب یہ شخص میرا سایہ بنا رہے گا.....؟ آپ یہ تو سوچیں کہ جب یہ میرے ساتھ چلے گا تو میرا کتنا مذاق بنے گا، اس سے تو بہتر ہے کہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکلوں۔'' بہروز کریم نے اپنے مخصوص ٹھنڈے لہجے میں بیوی کو سمجھایا کہ میرا اس کے ساتھ باہر جانا کیوں ناگزیر ہے، اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ لیلیٰ کی محبت میں کر رہا ہے، ورنہ وہ پردیس جا کر بھی لیلیٰ کی طرف سے پریشانی میں مبتلا رہے گا۔ بہرحال، ایک لمبی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ لیلیٰ کو معاملے کی نزاکت سمجھانے میں کام یاب ہوگیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ محبت کا رنگ کتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ جو بہروز کریم جیسے فولاد کو بھی بُھربُھری مٹی میں تبدیل کرسکتا ہے۔ مجھے نیا حکم یہ ملا کہ میں اپنا ضروری سامان لے کر انیکسی منتقل ہوجاؤں، تاکہ اگر کبھی لیلیٰ کو اچانک باہر جانا ہو تو اسے میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر میری اُلجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ سیدھا سادہ نظر آنے والا معاملہ مجھے بہت ٹیڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بات صرف لیلیٰ کی حفاظت سے کہیں بڑھ کر ہے اور پھر میرے اس خدشے کی تصدیق بھی جلد ہی ہوگئی، جب ائرپورٹ روانگی سے قبل بہروز نے مجھے بُلا کر سختی سے تاکید کی کہ گھر سے باہر مجھے ہر لمحہ لیلیٰ کے ساتھ رہنا ہوگا اور روزانہ کی رپورٹ دینی ہوگی۔

بہروز کے لندن جانے سے پہلے میں انیکسی میں منتقل ہو چکا تھا۔ فیروز نے لیلیٰ کے اردو بولنے کا معما بھی حل کردیا کہ دراصل لیلیٰ ترکی سے تعلق رکھتی ہے اور بہروز نے اسے وہیں استنبول کے ایک میلے میں دیکھا اور اس پر دل ہار بیٹھا۔ لیلیٰ نے بہروز کی محبت میں اردو سیکھی اور اب وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول بھی لیتی ہے۔ یہ ان کی شادی کا دوسرا سال تھا، مگر میں بدقسمتی سے پہلے روز ہی لیلیٰ صبا کی نظروں میں ایک ناپسندیدہ شخص قرار پا چکا تھا، کیوں کہ اسے بہروز کے لگائے ہوئے پہرے سے شدید چڑ ہوگئی تھی اور اس کی جھنجھلاہٹ کا سارا نزلہ مجھ ہی پر گرنا تھا، لیکن اگر بہروز یہ حکم نہ بھی دیتا، تب بھی لیلیٰ جیسی ماہ رُخ کی مجھ جیسے بدصورت شخص سے نفرت لازمی تھی۔ خاص طور پر اُس وقت، جب اس شخص کی ہم سفری کی شرط بھی لازمی قرار دے دی گئی ہو۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا بہت دیر تک سامنے دیوار میں لگے بڑے آئینے کو دیکھتا رہا۔ مجھے آئینے پسند نہیں تھے۔ مگر ہر گھر میں، ہر دیوار پر لگے یہ شیشے ہر پل میرا راستہ کاٹتے رہتے تھے۔ اور گھر ہی پر کیا منحصر، باہر گلی میں، سڑک پر، گاڑیوں میں، عمارتوں کے اندر ہر طرف میرے یہ دشمن میری تاک میں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں کہاں کہاں ان سے بچ پاتا۔ سارے شہر میں جا بہ جا یہ میرا منہ چڑانے اور مذاق اڑانے کے لیے کھڑے ملتے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی مجھے اپنا گھر بنانے کا موقع ملا تو اس میں کسی آئینے کی جگہ نہیں ہوگی۔ کوئی گوشہ تو اس دنیا میں ایسا ہو، جہاں میں بنا کسی خوف اور جھجک صرف اپنے ساتھ رہ سکوں۔

اگلے روز سہ پہر تین بجے کے قریب مجھے گھر کے ملازم نے آکر حکم سنایا کہ مالکن باہر جانا چاہتی ہیں اور ڈرائیور باہر پورچ میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو لیلیٰ صباغصے میں بھری کھڑی تھی ''اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے، کیا اب مجھے تمہاری تیاری کا انتظار بھی کرنا پڑے گا؟'' میں نے اسے بتایا کہ مجھے ملازم نے صرف تین منٹ پہلے روانگی کا بتایا ہے اور میں جس حالت میں بیٹھا تھا، ویسے ہی چلا آیا ہوں۔ مگر لیلیٰ نے میری بات پوری ہی نہیں ہونے دی اور جھڑک دیا ''اچھا اچھا..... ٹھیک ہے، اب گاڑی میں بیٹھو، مَیں کسی فضول بحث کے موڈ میں نہیں ہوں'' میں چُپ چاپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور لیلیٰ نے عربی میں ڈرائیور سے کہیں چلنے کو کہا۔ گاڑی دبئی کی بارونق سڑکوں سے ہوتی ایک جدید طرز کی کالونی میں داخل ہوگئی، جہاں اونچے اونچے پُرتعیش اپارٹمنٹس کی بہت سی قطاریں تھیں۔ ہماری گاڑی ''جے'' سیریز کے اپارٹمنٹس کی قطار کے سامنے آکر رک گئی۔ لیلیٰ نیچے اُتری تو میں بھی نیچے اُتر آیا۔ اس نے غصّے سے میری طرف دیکھا۔ ''تم کہاں اُتر آئے..... یہیں نیچے میرا انتظار کرو، میں اپنی سہیلی سے مل کر آتی ہوں'' میں نے سر جھکا کر جواب دیا ''مجھے آپ کو اکیلا نہ چھوڑنے کا حکم ہے۔ مَیں آپ کی سہیلی کے اپارٹمنٹ تک ساتھ چلوں گا۔'' لیلیٰ میری بات سُنتے ہی آپے سے باہر

ہو گئی۔" ہاؤ ڈیئر یُو ..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے پلٹ کر جواب دینے کی۔ اپنی اوقات میں رہو ورنہ....." اس بار مجھے اپنا لہجہ سخت کرنا پڑا۔" معافی چاہتا ہوں مگر یہ مالک کا حکم ہے" ہمارے تعاقب میں آنے والے گارڈز کی گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی ہو چکی تھی، اور مجھے ان کی بے چینی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا کچھ پریشان کر رہا ہے۔ لیلیٰ غصے سے رائٹ پیسٹی، پیر پٹختی اندر لفٹ کی جانب بڑھ گئی۔ پندرہویں منزل پر لیلیٰ کی دوست کا اپارٹمنٹ تھا۔ اُس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا تو دونوں سہیلیاں یوں ملیں، جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔ لیلیٰ اندر چلی گئی اور میں باہر راہ داری میں ایک جانب دیوار کے ساتھ لگے لوہے، کے بینچ پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں۔ لیلیٰ نے قریبی شہر کی مارکیٹ سے کچھ خریداری کی اور ہم اُس کی سہیلی کو اپارٹمنٹ کے باہر چھوڑ کر واپس گھر چلے آئے۔ لیلیٰ نے گاڑی سے اُترتے ہی چیخ کر فیروز خان کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور غصے میں بھری اندر چلی گئی۔ میں انیکسی میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز خان بھی وہاں نازل ہو گیا" تمہاری، مالکن سے کوئی بحث ہوئی تھی آج ... ؟" "ہاں، وہ اکیلے جانے کی ضد کر رہی تھیں، میں نے صرف مالک کے حکم کی تعمیل کی۔" فیروز نے ایک لمبی سانس بھری، آئندہ ایسی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔ لیلیٰ مالکن، مالک کی بہت چہیتی ہیں۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کریں گے۔ یوں سمجھ لو کہ تم ایک دو دھاری تلوار پر چل رہے ہو اور تمہیں دونوں جانب ہی اپنا وزن برابر رکھنا ہے، ورنہ کٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔" فیروز جاتے جاتے مجھے ایک نئی اُلجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر میں بہروز کریم کا حکم مانتا تو لیلیٰ کی ناراضی یقینی تھی، اور اگر لیلیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس سے دُور رہتا اور مکمل نگرانی نہ کرتا تو بہروز کی حکم عدولی ہوتی اور دونوں صورتوں میں سزا میرا ہی مقدر تھی۔

شام ڈھلتے ہی گھر کے ہال سے پیانو کی مدھر تانیں اُبھرنے لگیں۔ کوئی پیانو پر بہت خوب صورت دُھن بجا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم ہال کی جانب بڑھ گئے۔ ایک بوڑھی انگریز استانی پیانو بجاتے ہوئے لیلیٰ کو پیانو کا سبق دے رہی تھی۔ میں نے لاؤنج کی کھڑکی سے ہال کے اندر کا منظر دیکھا تو اُلٹے قدموں واپس چلا آیا۔ گویا لیلیٰ کو بھی پیانو سیکھنے کا شوق تھا۔ چلو، ایک بات تو ثابت ہوئی کہ کم از کم خوب صورت اور بدصورت لوگوں کے اندر ایک سا دل ہوتا ہے۔ ورنہ میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ بدصورت لوگوں کا دل شاید کچھ کم دھڑکتا ہوگا۔ اگلے روز لیلیٰ صبح سویرے ہی کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شاید ڈرائیور تک بہروز کریم کی ہدایات پہنچا دی گئی تھیں۔ ورنہ لیلیٰ کا بس چلتا تو وہ اکیلی ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل پڑتی ہوتی۔ آج لیلیٰ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور ڈرائیور سے جمیرا کی طرف چلنے کے لیے کہا اور خواہ مخواہ شام تک مالز میں خریداری کرتی رہی۔ جانے یہ امیر عورتوں کو شاپنگ کا اتنا خبط کیوں ہوتا ہے؟ شاید یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہوتی ہے۔ اور یہ بھوک صرف نچلے پیٹ ہی لگتی ہے۔ شام کو گھر واپسی کے بعد میرے کان نہ چاہتے ہوئے بھی پیانو کی اس خوب صورت دُھن کی آس کرنے لگے، سماعت کو بھی کبھی کبھی بہت شدید بھوک محسوس ہے۔ خاص طور پر مجھ جیسوں کی سماعت کو کہ جو ساری عُمر کسی کی زبان سے دو میٹھے بول سُننے کو ترستی رہی۔ اور پھر، ہماری سماعت انسانوں کی زبان سے مایوس ہو کر قدرت کی بکھیری دیگر آوازوں میں اپنے حصے کی چاشنی ڈھونڈنے لگتی ہے۔ مجھے بہتے پانی کی آواز، بارش کی خاموش بوندوں کی ٹپ ٹپ، سرسراتی ہوا، جھرنوں اور ایسی میٹھی دُھنوں کی سرگوشیاں ہمیشہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سو، جب پیانو کے لے چھڑی، تو میں بے اختیار انیکسی سے نکل آیا اور باہر باغیچے میں، لاؤنج کی کھڑکیوں کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد اندر سے آواز آنا بند ہوئی اور بوڑھی پیانو ٹیچر سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے باہر نکلی اور گیٹ کی طرف چل پڑی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور بہروز کے خادم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ خوش دلی سے مسکرا دی۔ اس کا نام مارتھا تھا، میں نے مارتھا سے درخواست کی کہ کیا وہ مجھے بھی پیانو بجانا سکھا سکتی ہے، میں اسے پورا معاوضہ دینے پر بھی تیار تھا، مگر مارتھا کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں اُبھر آئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اپنا پیانو نہیں ہے۔ وہ تو کرسچین کالونی میں رہتی ہے۔ اور اسکول کے بچوں اور شام کو ایک دو بڑے گھروں میں پیانو سکھا کر اپنا گزارہ کرتی ہے۔ اس کی بات سُن کر میری امیدوں پر اوس گر گئی۔ پھر کسی خیال سے میری آنکھیں چمکیں،" اگر میں کبھی اپنا پیانو لے سکوں تو کیا آپ مجھے سکھانے آئیں گی؟" مارتھا میرا سوال سُن کر زور سے ہنس پڑی" ہاں ہاں، کیوں نہیں، بلکہ تمہارا شوق دیکھتے ہوئے میں تمہاری فیس بھی آدھی کر دوں گی۔" مارتھا ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میرے دل میں یہ خواب پلنے لگا کہ جانے کب میں اپنا پیانو خریدوں گا اور مارتھا سے پہلا سبق لوں گا۔

اب میرے پاس اچھی خاصی رقم ہر ماہ جمع ہو جاتی تھی۔ پیانو خریدنا میرے لیے کوئی خاص بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ مگر انیکسی میں پیانو رکھنے کی اجازت شاید مجھے نہ مل پاتی۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر کروٹیں بدلتا رہا کہ ایسی کیا تدبیر کروں کہ میری برسوں کی دبی خواہش پوری ہو سکے۔ جب خواب روٹھ جائیں تو راتیں بڑی طویل ہو جاتی ہیں۔ انسان بھی عجب ہے، خواب دیکھے، تو راتوں پر فریب دینے، جال بُننے کا الزام لگا دیتا ہے۔ اور خواب نہ آئیں تو اُسی رات کی طوالت سے اُسے بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں بھی اس طویل رات کے بعد صبح اٹھا، تو سر درد سے پھٹ رہا تھا بستر چھوڑنے کو بالکل بھی من نہیں کر رہا تھا، مگر دس بجتے ہی مالکن کا پیغام آ گیا۔ نوکری یا غلامی کی ایک تعریف شاید اپنے اندر کو کچلنا بھی ہے۔ کسی طرح اٹھ کر منہ پر دو چار چھینٹے مارے اور سُوجی آنکھوں کے ساتھ پورچ میں پہنچ گیا۔ مگر توقع کے برعکس ابھی تک وہاں کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار نہیں تھی۔ البتہ دوسری گاڑی میں محافظ چاق چوبند اور تیار بیٹھے تھے۔

کچھ دیر میں اندر سے ایک خادمہ باہر آئی اور اس نے بتایا کہ مالکن اندر لاؤنج میں مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں اُلجھا ہوا سا لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ جانے اب کیا آفت آنے والی تھی، لیلیٰ کے مزاج کا کچھ بھروسا نہیں تھا۔ اور یہ بات ابھی تحقیق طلب تھی کہ یہ خلل کثرتِ حُسن کی وجہ سے تھا یا کثرتِ زر کے سبب، کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اندر دماغی فتور پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر جب میں ہال میں داخل ہوا تو خلافِ معمول لیلیٰ بڑی پُرسکون سی پیانو کے قریب بیٹھی اس کے تاروں سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے زور سے پیانو کی کلوں پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے کہا" تمہیں پیانو بہت پسند ہے، بجانا سیکھنا چاہتے ہو ...؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی" میں نے کل شام تمہاری اور مارتھا کی گفتگو سُن لی تھی۔ تم چاہو تو اسی پیانو پر مارتھا سے سیکھ سکتے ہو، تمہارے مالک سے اجازت میں تمہیں لے دوں گی۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے" میرا جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کرم خاص اور مہربانی کی کوئی وجہ بھی تو بتائیں۔ اس نے شاید خود ہی میری آنکھوں میں لکھا سوال پڑھ لیا۔" ہاں مگر بدلے میں تمہیں بھی مجھ سے کچھ تعاون کرنا

پڑے گا۔'' ''کیسا تعاون، میں کچھ سمجھا نہیں.....'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''جب سے میں اس محل میں آئی ہوں، مجھے یوں لگتا ہے، جیسے کسی قید خانے میں آ گئی ہوں، بہروز مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ مگر میرے لیے ان کا یہ خوف اور احتیاط کی انتہا کبھی کبھی میرا دم گھونٹنے لگتی ہے۔ مَیں اپنی ہم عُمر سہیلیوں سے ملنا چاہتی ہوں، ان کے ساتھ شہر میں گھومنا چاہتی ہوں، وہاں ترکی میں تو مَیں کسی تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی، مگر یہاں مجھ پر بڑے پہرے ہیں۔'' میں نے دھیرے سے سَر جُھکائے جواب دیا ''یہ سب آپ ہی کی حفاظت کی خاطر کیا گیا ہے۔ مالک کے دشمن بہت ہیں۔ جو ہر پل اُنہیں نقصان پہنچانے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔'' لیلیٰ نے اُداسی سے ایک سرد آہ بھری ''جانتی ہوں میں، لیکن کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح پہروں میں نکلنے سے میں آغا کے دشمنوں کی نظر میں زیادہ نمایاں ہو جاؤں گی۔ اگر میں اسکارف اور نقاب کے ساتھ سارا دن بھی شہر میں گھومتی پھروں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔'' میں نے بے بسی سے اس ضدی لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' لیلیٰ نے غور سے میری طرف دیکھا، میری نظر خود بخود جُھک گئی ''میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم یوں دُم چھلا بن کر میرے ساتھ نہ پھرا کرو۔ میری سہیلیاں کتنا مذاق اڑاتی ہیں، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔'' میری نظر بے اختیار اٹھ گئی۔ لیلیٰ نے جلدی سے بات جوڑی ''میری بات کا غلط مطلب مت لینا۔ میں تمہارا مذاق نہیں اُڑا رہی۔ مگر جب ہم ساتھ چلتے ہیں، تو مذاق بن ہی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم دکھاوے کے لیے میرے ساتھ گھر سے نکلا ضرور کرو، مگر کسی مال یا شاپنگ پلازا میں، مَیں اسکارف اور نقاب پہن کر اپنا حلیہ بدل لیا کروں گی۔ تم وہیں کسی کیفے میں بیٹھ کر میرا انتظار کیا کرنا، اور مَیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آ جایا کروں گی، لیکن ہم دونوں گھر ایسے ہی آیا کریں گے، جیسے تم مستقل میرے ساتھ تھے۔ آغا بہروز کو اطمینان رہے گا، تمہارا بھرم بھی سب پہ قائم رہے گا، اور میں بھی کچھ گھنٹوں کے لیے ان ساری زنجیروں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی جی لیا کروں گی..... بولو، میرا ساتھ دو گے پَری زاد.....؟'' اپنا نام لیلیٰ صبا کی زبان سے سُن کر میں زور سے چونکا۔ اس نے اب تک کبھی مجھے یوں براہِ راست نام لے کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ کچھ لہجے، کچھ بولیاں کچھ تلفظ اور کچھ لبوں کی ایک جنبش ہی سے عام سے حرف، لفظ اور نام کتنے معتبر ہو جاتے ہیں۔ میرا دل بھی کتنا پاگل تھا، پل بھر ہی میں یہ بھول گیا کہ کل تک یہی عورت مجھے کس نفرت اور حقارت سے پکار رہی ہے، مگر میں اب تک اس لہجہ بدلنے کے فن اور ہنر سے ناواقف ہی تھا۔ لہٰذا میرا جواب بھی سیدھا سادہ سا تھا۔ ''شاید مالک میرا یوں لاؤنج میں بیٹھ کر پیانو سیکھنا پسند نہ کریں۔ میری حدود اس لاؤنج سے باہر تک ہیں'' لیلیٰ نے اس مسئلے کا حل بھی چٹکیوں میں نکال لیا۔ ''کوئی بات نہیں، تم اپنی انیکسی میں پیانو رکھوا سکتے ہو۔ اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں آج ہی تمہارے لیے ایک نیا پیانو بُک کروا دیتی ہوں۔ ویسے بھی بہت عرصے سے انیکسی کی نئی تزئین و آرائش کا سوچ رہی تھی۔ اسی بہانے یہ کام بھی ہو جائے گا۔'' جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔

اگلے دو دن کے اندر انیکسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا، نیا رنگ، نئے پردے، قالین، پینٹنگز، آرائش اور سب سے بڑھ کر سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا خوب صورت پیانو، جب کاری گر وہ پیانو انیکسی کے ہال میں رکھوا کر اس کی فٹنگ کر رہے تھے، تو میں وہیں بیٹھا اپنے ایک دیرینہ خواب کو پورا ہوتے دیکھ رہا تھا۔ خواب حقیقت میں ڈھلنے لگیں تب بھی بہت دیر تک ہمیں خواب ہی لگتے ہیں۔ شاید انسان سدا کا بے اعتبار ہے یا پھر مجھ جیسے، جن کے خواب، سدا خواب ہی رہتے ہیں۔ اُسی شام مارتھا نے مجھے ایک گھنٹے کی ٹیوشن میں پیانو کی بنیادی کلوں اور سُروں کے بارے میں پہلی کلاس دی، اور تیسرے دن میری انگلیوں نے پہلی مرتبہ کسی دُھن کو چھیڑا۔ اس درمیان لیلیٰ دو مرتبہ گھر سے باہر نکلی اور شہر کے وسط میں واقع ایک کثیر المنزلہ شاپنگ مال میں داخل ہو کر اس نے اپنے منصوبے کے مطابق خود کو اسکارف اور نقاب سے ڈھانپ لیا۔ میں وہیں ایک کیفے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور قریباً تین چار گھنٹے کے درمیان وہ واپس لوٹ آئی۔ اس مال کے دونوں طرف آنے اور جانے کے راستے واقع تھے اور لیلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے پچھلے راستے کا انتخاب کیا تھا، پھر ایک دن کے وقفے کے بعد وہ اپنی اُسی سہیلی سے ملنے کے لیے گئی، جہاں میں بھی ایک بار اُس کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس بار اس نے مجھے نچلے فلور ہی پر رکنے کا اشارہ کیا اور خود لفٹ کے ذریعے اوپر چلی گئی۔ بہروز کے واپس آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے لیلیٰ کی بات مان تو لی تھی، مگر میں اندر سے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا، میں جانتا تھا کہ مَیں بہروز کا حکم نہ مان کر بہت بُرا کر رہا ہوں، مگر لیلیٰ کی آزادی کی خواہش بھی مجھے جائز ہی لگ رہی تھی، عجیب کش مکش جاری تھی میرے دل و دماغ کے درمیان۔ دل کہتا تھا کہ لیلیٰ کا ساتھ دے کر میں نے کچھ غلط نہیں کیا، مگر دماغ کچھ الگ ہی راگ الاپ رہا تھا۔ جانے یہ دل اور دماغ نامی دو سوکنوں کی آپس میں کبھی بنتی کیوں نہیں۔ اور پھر، جب اس شش و پنج نے جب مجھے پوری طرح نڈھال کر دیا، تو تیسرے دن لیلیٰ کے مال سے نکلنے سے پہلے ہی میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ لیلیٰ جیسے ہی مال کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی، میں بھی کیفے سے نکل کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ نے خود کو ایک لمبی سی عبایا سے ڈھانپ رکھا تھا، وہ سڑک پار کر کے دوسری جانب بنے ایک پارکنگ میں پہنچی، جہاں پہلے سے ایک سیاہ لینڈ کروزر ٹائپ گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ گاڑی میں پہلے بھی لیلیٰ کی دوست کے اپارٹمنٹ کے نیچے کھڑی دیکھ چکا تھا، مطلب لیلیٰ اپنی اُسی دوست سے ملنے جا رہی تھی یا اس کے ساتھ مل کر کہیں اور گھومنے جا رہی تھی۔ میں نے فوراً قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اُسے آگے جاتی سیاہ گاڑی کے پیچھے چلنے کو کہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں لیلیٰ کو بتائے بغیر اس کی نگرانی جاری رکھوں گا، اس طرح میری الجھن کا حل بھی نکل آئے گا اور لیلیٰ کو بھی میری وجہ سے اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ دبئی کی سڑکوں کا ہجوم اور ٹیکسی کے لیے مقررہ رفتار کی حد ہماری گاڑی کی راہ میں حائل تھی۔ مگر ہم پھر بھی کسی نہ کسی طرح اس سیاہ بڑی گاڑی کا پیچھا کرتے رہے۔ لیکن، پھر ایک سگنل کے اچانک بند ہونے کی وجہ سے لیلیٰ کی گاڑی نظروں کے سامنے ہی دور ہوتی ہوتی، اوجھل ہو گئی۔ سگنل کھلنے کے بعد ٹیکسی ڈرائیور نے پوری کوشش کی کہ ہم دوبارہ اسے پکڑ سکیں، مگر ناکام رہے۔ تھک ہار کر ہم دوبارہ اُسی مال کے باہر آ کر رک گئے، جہاں سے میں نے ٹیکسی پکڑی تھی۔ مجھے کیفے میں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا، تب کہیں جا کر لیلیٰ کی صورت، دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی، ہم واپس گھر پہنچے تو لیلیٰ اُتر کر اندر چلی گئی اور میں نے انیکسی کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے عقب میں ایک گرج دار آواز گونجی، اتنی دیر کہاں لگا دی تم لوگوں نے.....؟ میں گھبرا کر واپس پلٹا، کچھ فاصلے پر بہروز کریم کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین''، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

بہروز کی آواز سُن کر ایک لمحے کے لیے تو جیسے میرا خون ہی خشک ہوگیا۔ انسان بظاہر تو بڑے بڑے ڈاکے مار کر صاف بچ نکلتا ہے، مگر اس دل کے چور کی ایک چھوٹی سی چوری چُھپائے نہیں چُھپتی۔ میں نے ہڑبڑا کر بہروز کو سلام کیا۔ ''مالک آپ واپس آگئے.....؟'' بہروز مسکرایا ''تو کیا کچھ غلط کیا واپس آکر۔ مگر تم لوگ اتنی دیر سے کہاں تھے؟'' میں نے نظریں جُھکائے صرف اتنا بتایا کہ مالکن کو کچھ ضروری خریداری کرنی تھی، لہٰذا ہم شاپنگ مال تک گئے تھے۔ بہروز نے بظاہر اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، مگر خود میرے اندر کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ انسان کے جسم اور دماغ کو سُلانے اور سُن کرنے کے لیے بازار میں ہزارادویہ مل جاتی ہیں، مگر سارے زمانے کے وید، حکیم اور طبیب مل کر بھی ایسی دوا ایجاد نہیں کرپائے، جو چند لمحوں کے لیے کسی کے جاگے ہوئے ضمیر کو سُلادے۔ بہروز کے گھر واپس لوٹنے کے بعد لیلیٰ نے باہر نکلنا کم کردیا۔ اب وہ تین چار دن بعد گھنٹے دو گھنٹے کے لیے باہر گھوم آیا کرتی، مگر زیادہ تر گھر ہی میں رہتی۔ ان دنوں میں مجھے مارتھا سے پیانو سیکھنے کا بھرپور وقت ملا اور مہینے بھر میں، انگلیاں پیانو پر خوب چلنے لگیں۔ خود مارتھا بھی میری اس تیز پیش رفت اور لگن سے بہت خوش تھی۔ ایک شام میں تنہا بیٹھا پیانو پر کسی نئی دھن کی مشق کرتے ہوئے اپنے آپ میں اس قدر مگن ہوگیا کہ مجھے انیکسی کے دروازے سے اندر ہال تک آتی قدموں کی چاپ بھی سُنائی نہ دی اور چونکا اُس وقت، جب پس منظر میں بہروز کریم کی بھاری آواز گونجی۔ ''اچھا بجالیتے ہو.....'' میں گھبرا کر چونک سا گیا اور جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ ''معاف کیجیے مجھے آپ کے آنے کا پتا نہیں چلا۔'' بہروز نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''انسان کو اپنے اندر اتنا مگن نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی طرف بڑھنے والے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دے۔ آنے والا دشمن بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے دوبارہ معذرت کی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیانو کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیر کر اسے غور سے دیکھا۔ ''مجھے صبا نے بتایا تھا کہ اس نے انیکسی میں پیانو رکھوادیا ہے۔ تم نے بہت تھوڑی مدت میں اپنی مالکن کا اعتبار جیت لیا، حالاں کہ لیلیٰ صبا جیسی عورت کے خیالات اپنے حق میں بدلنا بہت مشکل کام ہے..... ایسا کیا جادو ہے تمہارے پاس پَری زاد، ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟'' میں نے چونک کر بہروز کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر حسبِ معمول کوئی مثبت یا منفی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسے بے تاثر چہرے والے لوگ، بہت غیر متوقع شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ میں چُپ رہا۔ بہروز چند ضروری ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا۔

اگلے ہفتے کی ابتدا ہی سے محل کی نئی سجاوٹ اور تزئین شروع ہوگئی۔ پتا چلا کہ دو دن بعد لیلیٰ صبا کی سال گرہ ہے اور بہروز پچھلے سال کی طرح اسے انتہائی دھوم دھام سے منانا چاہتا ہے۔ لیلیٰ بھی انتہائی خوش دکھائی دیتی تھی، مگر نہ جانے کیوں مجھے لیلیٰ کے اس کھلے ہوئے چہرے کے پیچھے کبھی کبھی ایک بڑی گہری اُداسی چھپی دکھائی دیتی۔ شاید بہت زیادہ خوشی اور اطمینان بھی اپنے ساتھ ایک نامعلوم سی اُداسی لے کر وارد ہوتے ہیں یا پھر ساری بات توازن کی ہے۔ تھوڑی سی پریشانی، بے قراری اور بے چینی بھی ضروری ہے، زندگی کے ترازو کو برابر رکھنے کے لیے۔ اگلے روز جب بہروز سال گرہ کی تیاریوں میں مصروف تھا اور محل کے دالان میں بیٹھا ہم سب کو مختلف ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک فیروز خان پریشانی میں تیز تیز قدم اٹھاتا بہروز کے قریب آیا اور جھک کر بہروز کے کان میں کوئی بات کہی۔ لیلیٰ بھی اُسی وقت وہاں پہنچی تھی، اس نے بہروز کے چہرے پر پریشانی اور کشمکش کے آثار دیکھے تو فیروز خان کو جھڑک دیا۔ ''تمہیں کتنی بار منع کیا ہے میں نے فیروز، یوں وقت بے وقت انھیں پریشان مت کیا کرو۔'' فیروز سر جھکائے کھڑا رہا۔ بہروز نے فیروز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایک آدھ دن آگے نہیں ہوسکتا یہ سودا.....؟'' ''نہیں مالک! وہ لوگ بہت دور سے آئے ہیں۔ اتنا لمبا انتظار نہیں کریں گے ہمارا۔ ان کا زیادہ دیر جزیرے پر انتظار کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔'' بہروز نے ایک گہری سانس لی ''مگر فیروز خاناں! تم جانتے ہو کل تمہاری مالکن کی سال گرہ ہے، اور میں پورا سال اس دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔'' لیلیٰ نے چلّا کر پوچھا۔ ''کوئی مجھے بھی بتائے گا۔ یہ سب کیا چل رہا ہے.....؟'' بہروز نے ٹھنڈے لہجے میں لیلیٰ کو بتایا کہ ایک بہت ضروری سودے کے لیے اسے دو راتوں کے لیے ایک قریبی جزیرے پر جانا تھا۔ یہ سودا پہلے سے طے شدہ تو تھا، مگر فیروز نے ابھی آکے بتایا کہ انہیں آج شام ہی نکلنا ہوگا۔ لیلیٰ یہ سُنتے ہی غصّے سے کھڑی ہوگئی۔ ''ٹھیک ہے آغا! تو پھر آپ جائیں اپنے ضروری سودے کے لیے، مگر مجھ سے بھی دوبارہ کبھی بات کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ نہیں منانی مجھے کوئی سال گرہ وغیرہ۔'' لیلیٰ پیر پٹختے ہوئے اندر چلی گئی اور بہروز اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ لیلیٰ کے جانے کے بعد بہروز نے غصّے سے گھور کر فیروز کی طرف دیکھا۔ ''کردیا ناں اسے ناراض، فیروز خان۔ تم کبھی موقع محل دیکھ کر بات نہیں کرتے۔ جاؤ، چلنے کی تیاری کرو۔ میں اسے مَنا کر آتا ہوں.....'' بہروز بھی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ جانے اس نے کس طرح اپنی محبوب بیوی کو رضامند کیا ہوگا، مگر جب شام کو وہ گھر سے رخصت ہونے کے لیے نکلا تو لیلیٰ صبا بھی اسے پورچ تک چھوڑنے کے لیے آئی، البتہ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھی تک نمایاں تھے اور وہ بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ بہروز کریم جانے سے پہلے جلد واپس لوٹنے اور پھر بہت دن اس کے ساتھ رہنے کے وعدوں کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ لیلیٰ بھی پلٹ کر اندر چلی گئی۔ انسان ساری زندگی وعدے کرنے اور وعدے نبھانے کی زنجیر ہی سے بندھا رہتا ہے اور شاید ہم دوسروں سے

کیے وعدے تو نبھا بھی لیتے ہیں، مگر اپنے آپ سے کیے وعدے سدا وفا ہونے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ اب اگر لیلیٰ نے مجھ سے کہیں اکیلے جانے کی ضد کی تو میں اسے صاف بتادوں گا کہ میں بہروز کے ساتھ مزید غداری نہیں کرسکتا۔ ہاں، یہ غداری ہی تو تھی کہ میں بہروز کی دی ہوئی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ دوسرے روز حسب توقع لیلیٰ نے سرِ شام ہی کہیں جانے کی ٹھان لی۔ اور ہم گاڑی میں ان ہی اپارٹمنٹس کی پارکنگ میں پہنچ گئے، جہاں ساتویں منزل پر لیلیٰ کی سہیلی رہتی تھی۔ میں نے لیلیٰ سے دبے لفظوں میں کہا کہ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے، کیوں کہ مالک نے مجھے جاتے ہوئے خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ ان دنوں میں لیلیٰ کے ساتھ کہیں بھی باہر نکلنے سے گریز کروں، کیوں کہ وہ جس بڑے کاروباری سودے کے لیے گھر سے جارہے ہیں، وہ اس کے حریفوں کے دلوں میں کاروباری رقابت کی آگ مزید سلگا کر انہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرسکتا ہے۔ لیلیٰ نے میری بات سُن کر ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، وہ جاتے ہوئے مجھے بھی گھر سے نہ نکلنے کی تاکید کر گئے ہیں۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ میں جلدی مل کر واپس آجاؤں گی۔ میری دوست نے میری سال گرہ کے لیے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ نہ آتی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی۔'' لیلیٰ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھ گئی اور میں اپنے ساتھ کیے وعدے کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے، وہیں تہہ خانے کی پارکنگ میں کھڑا رہ گیا۔

شام تیزی سے ڈھل رہی تھی اور پارکنگ لاٹ میں لگی بتیاں دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے جلنا شروع ہو چکی تھیں۔ جب لیلیٰ کو گئے تین گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تو میں نے خود اوپر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی قدم بڑھائے ہی تھے کہ لیلیٰ تیزی سے لفٹ سے نکل کر میری جانب بڑھتی نظر آئی۔ وہ اپنا اسکارف لپیٹ کر پرس میں رکھ رہی تھی۔ ''آپ نے بہت دیر کردی۔ آج تو ہم نے آتے وقت آپ کی ہدایت کے مطابق محافظوں کی گاڑی کو بھی منزل سے آگاہ نہیں کیا تھا، وہ سب وہاں گھر میں بے چین ہوں گے۔'' لیلیٰ نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ''ہاں اس دیر ہوگئی، مگر اب چلو۔ ہمیں وہاں گھر میں یہی تاثر دینا ہے کہ ہم قریبی مال سے روزمرہ کی چند ضروری چیزیں لینے کے لیے اچانک نکل گئے تھے، لہٰذا بتانے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' میں بھی جلدی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور ٹھیک اُسی وقت تہہ خانے کی مصنوعی سرد فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے جانِ آغا! دیکھو ہم تو تمہاری تلاش میں خود ہی چل کر یہاں تک آپہنچے ہیں۔'' میرے قدموں تلے زمین سرک گئی، دور اندھیرے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی گاڑی سے بہروز کریم اور فیروز خان اُتر کر ہماری جانب بڑھتے دکھائی دیئے۔ پس منظر میں محافظوں کی وہ جیپ بھی نظر آئی، جسے میں اور لیلیٰ اپنی دانست میں چکمہ دے کر گھر ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ لیلیٰ کے چہرے کا رنگ بھی پل بھر میں زرد پڑ گیا اور میں نے اس کے جسم میں باقاعدہ کانپنے جیسی لرزش دیکھی۔ بہروز نے لیلیٰ کے قریب پہنچ کر پیار سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر لیلیٰ کا جھکا ہوا چہرہ بلند کیا۔ ''یہ کیا بات ہوئی جانِ آغا! میرے منع کرنے کے باوجود تم گھر سے نکل آئیں۔ کیا کوئی نئی سہیلی بنالی ہے تم نے یہاں۔ ہمیں بھی تو اس سے ملواؤ۔ جس کے پیار میں اتنی کشش ہے کہ تم اپنے محبوب آغا کے حکم کا مان بھی نہ رکھ پائیں۔'' لیلیٰ نے جلدی سے جھک کر بہروز کے پاؤں پکڑ لیے ''معاف کردیں مجھے آغا! بڑی بھول ہوگئی مجھ سے۔ مجھے واقعی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ مگر میں کسی کی باتوں کے بہکاوے میں آگئی تھی۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔'' بہروز کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ''میں تمہیں تو معاف کردوں گا جانِ آغا! مگر اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا، جس نے تمہیں بہکا کر گھر سے نکالا اور میری حکم عدولی کی۔ بتاؤ، کون ہے وہ بدنصیب.....'' لیلیٰ نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا ''کہا ناں آغا، بڑی غلطی ہوگئی۔ میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اوب گئی تھی۔ اس لیے یہاں چلی آئی۔ یہاں ٹاپ فلور پر ایک بہت اچھا ریستوران ہے۔ سوچا، کافی پی کر دل بہلالوں گی۔ اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے۔'' بہروز نے دوبارہ سختی سے پوچھا ''کون ہے وہ، جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا.....؟'' لیلیٰ دھیرے دھیرے کھڑی ہوگئی اور اس نے اپنی انگلی میری جانب اٹھادی۔ ''یہ بُری زاد..... یہی مجھے اس طرح کی الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا کہ یہ زندگی میری اپنی ہے، مجھے اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔ میں کوئی پنجرے میں قید، قیدی تو نہیں ہوں کہ ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر جیوں۔'' لیلیٰ چیخ چیخ کر مجھ پر الزام لگاتی رہی اور میں تو جیسے پل بھر ہی میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک لمحے کو میری لیلیٰ سے نظر ملی اور مجھے لگا، میرے سامنے لیلیٰ نہیں تاہید کھڑی ہے اور ہم دبئی میں نہیں، میرے پرانے محلے میں کھڑے ہیں۔ بہروز کریم نے اطمینان سے لیلیٰ صبا کی بات سُنی اور میری طرف پلٹا ''اچھا..... تو یہ ہے وہ نمک حرام..... اس سے مجھے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مگر جانِ آغا، تمہیں تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا ناں۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہو جاتا اور میرے دشمنوں کے ساتھ مل کر یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیتا تو سوچو، پھر میرا کیا ہوتا۔'' ''مجھے ایک غلام کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' لیلیٰ روتے ہوئے گڑگڑائی ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا، اس بُری زاد نے اپنے ذرا سے فائدے کے لیے مجھے میری راہ سے بھٹکا دیا۔ میری ہم دردی حاصل کرنے کے لیے میرے دل میں بغاوت کی چنگاری بھڑکا دی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے بنا کتنی تنہا پڑ جاتی ہوں۔ یہ ضرور مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوگا۔ تب ہی مجھے یوں اکیلے گھر سے نکلنے پر اُکساتا رہا۔ اچھا ہوا آپ لوگ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گئے۔'' میں حیرت سے گنگ اور اپنی جگہ جما کھڑا لیلیٰ کی یہ ساری خرافات سُنتا رہا۔ بہروز دھیرے دھیرے چلتا میرے قریب آیا اور اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔ ''تم بتاؤ بُری زاد..... کیا لیلیٰ ٹھیک کہہ رہی ہے؟ اور کوئی بھی جواب دینے سے قبل اتنا ضرور سوچ لینا کہ بہروز کریم کی عدالت میں غداری کی صرف ایک سزا مقرر ہے، سزائے موت۔'' میں نے ایک پل کے لیے نظر اٹھا کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ لاتعلق سی کھڑی تھی۔ بہروز دوسری بار زور سے چلایا۔ ''جواب دو لڑکے..... کیا یہ سچ ہے.....؟'' میں نے سر جھکا لیا ''جی ہاں، مالک جو کہہ رہی ہیں، سچ کہہ رہی ہیں۔ میں ہی انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے کر آیا تھا۔'' ایک لمحے کے لیے لیلیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی کی ایک چمک لہرائی، مگر پھر فوراً ہی اس نے خود کو نارمل کرلیا۔ بہروز کریم نے سرسراتی آواز میں مجھ سے پوچھا ''کوئی آخری خواہش ہو تو بتادو۔ تمہاری گنتی کی چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں۔'' میں نے بہروز کی طرف دیکھا ''جی مالک..... بس ایک آخری خواہش ہے۔ مجھے مارنے کے بعد میرا چہرہ مسخ کردیجیے گا۔ میں نے یہ زندگی تو جیسے تیسے اس چہرے کے ساتھ گزار لی۔ مگر میں قبر میں اس شناخت کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔'' بہروز کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، مجھے اس کے لہجے میں پہلی بار اپنے لیے غصے سے زیادہ افسوس کا عنصر محسوس ہوا۔ ''جانتے ہو، مرد کی بربادی

کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، ٹھیک اُس لمحے، جب وہ اپنے دل کے فیصلوں پر عمل شروع کر دیتا ہے۔ میری طرح تم نے بھی خود کو اس عورت کی خاطر برباد کر لیا، پری زاد..... بُرا کیا، بہت بُرا کیا تم نے۔'' بہروز پلٹا اور زور سے چلایا۔ ''اسے لے آؤ فیروز خان.....'' بہروز کی آواز اس ویران تہہ خانے کی پارکنگ میں گونج کر رہ گئی۔ اُس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ لیلیٰ خاص طور پر اس پارکنگ میں گاڑی کیوں لگواتی تھی، کیوں کہ یہ پارکنگ تقریباً متروک ہو چکی تھی اور اپارٹمنٹ والے اب چھت پر بنی نئی پارکنگ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا یہاں کسی کا آنا جانا نہیں تھا۔ اس لیے لیلیٰ کی گاڑی گھنٹوں یہاں کھڑی رہتی، تب بھی کسی کے متوجہ ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مگر آج وہی ویرانی اور تنہائی اس پارکنگ میں ہمارے لیے وبالِ جان بن گئی تھی۔ بہروز کے چلانے پر کچھ دیر بعد فیروز خان دو محافظوں کی مدد سے ایک خوب صورت اور ہینڈسم سے نوجوان کو سختی سے جکڑے اور اس کے منہ پر ٹیپ لپیٹے ایک جانب سے برآمد ہوا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا، کیوں کہ آج سے پہلے میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر لیلیٰ کے جسم سے تو جیسے خون کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں زور سے چلائی ''نہیں آغا نہیں..... اس میں ولید کا کوئی قصور نہیں..... بخش دیں اسے۔'' لیلیٰ دوڑتی ہوئی آئی اور بہروز کے قدموں سے لپٹ گئی۔ بہروز نے کسی اَن دیکھی اذیت کے احساس سے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور دھیرے سے یوں بڑبڑایا، جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔ ''کیوں جانِ آغا..... کیوں..... کس چیز کی کمی تھی تمہیں..... کیا نہیں دیا میں نے تمہیں؟ پیار، محبت، عیش، آرام، دولت، جائیداد، رتبہ، عزت..... آخر کس چیز کی کمی تھی میرے پاس تمہیں؟'' لیلیٰ زار و قطار رو رہی تھی اور وہ اجنبی نوجوان بہروز کے محافظوں کے شکنجے میں تڑپ رہا تھا۔ بہروز نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ''یہ وہی ہے ناں، تمہارا سابقہ منگیتر، استنبول والا، ولید.....'' لیلیٰ تڑپ کر آگے بڑھی۔ ''ہاں آغا! یہ وہی ہے، اسے میری محبت یہاں کھینچ لائی..... یہ سچ ہے کہ آپ نے مجھے سب کچھ دیا۔ پر میں اپنی پہلی محبت کبھی بُھلا نہیں پائی۔ معاف کر دیں ہم دونوں کو۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ کم از کم اسے جانے دیں۔'' بہروز نے کرب سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ رقیب کو سامنے زندہ دیکھنے سے زیادہ اذیت ناک، اپنے محبوب کی زبان سے اس کی تعریف سُننا ہوتا ہے۔ بہروز نے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ ''واہ رے عورت! واہ، ساری کائنات کے سربستہ راز ایک جانب اور تیرے من کا گورکھ دھندا ایک طرف۔ تجھے سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔'' بہروز ایک جھٹکے سے فیروز کی طرف مڑا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا ناں فیروز خان! ہمارے پیچھے کچھ چکر چل رہا ہے۔ اب دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے؟'' فیروز خان نے سر جُھکا لیا۔ اب مجھے بہروز کی منصوبہ بندی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے لیلیٰ کی نگرانی پر رکھا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لیلیٰ صبا میری نگرانی میں غیر محتاط ہو جائے گی۔ اس کی سال گرہ والے دن جزیرے پر جانے کا پروگرام بھی ساری ڈرامے بازی تھی۔ وہ کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں تھا۔ اسے بہت پہلے سے لیلیٰ کی بے وفائی کا علم تھا۔ وہ تو بس لیلیٰ کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا۔ سب مُہرے بہروز نے بہت ناپ تول کر چُنے تھے۔ ساری بساط ہی بہروز کی اپنی بچھائی ہوئی تھی۔ اور اب بازی بھی اسی کے ہاتھ تھی۔ بہروز نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے فیروز خان کی طرف

دیکھا۔ ''مجھے لیلیٰ صبا بہت پیاری ہے فیروز..... بہت ٹوٹ کر محبت کی ہے میں نے اس سے..... دھیان رہے، اسے مرتے وقت زیادہ تکلیف نہ ہو اور ولید چوں کہ میری محبوب کا محبوب ہے۔ لہٰذا اس کی موت بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ آخر یہ بہروز کریم کا رقیب ہے۔ یہ اگر عام لچے لفنگے عاشقوں کی طرح مارا گیا، تو یہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ لے جاؤ ان دونوں کو۔'' لیلیٰ زور سے چلائی۔ ''نہیں آغا! نہیں.....'' فیروز نے محافظوں کو اشارہ کیا، انہوں نے لڑکے اور لیلیٰ کو لے جانے کے لیے کھینچا۔ بہروز دھیرے سے بڑبڑایا۔ ''عشق بڑا ظالم ہوتا ہے..... جان کا صدقہ لیے بنا کہاں ٹلتا ہے۔'' اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں جلدی سے بہروز کی طرف بڑھا۔ ''انہیں معاف کر دیں مالک! ان کا قصور بہت بڑا ہے، مگر آپ رحم کریں۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی میرے سر پر کسی محافظ کی خودکار مشین گن کا دستہ پوری قوت کے ساتھ ٹکرایا اور میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔ گرنے سے پہلے میں نے تہہ خانے کے کسی کونے سے دو فائرز کی آواز سُنی۔ اور ان سے زیادہ بلند لیلیٰ کی کرب ناک چیخ تھی، پھر دھیرے دھیرے میرا وجود گہرے تاریک اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

سائنس دان موت کی ایک تشریح یہ بھی کرتے ہیں کہ جب انسانی دماغ سے نکلنے والی برقی نبض (Electrical impulse) ختم جائے تو اسے روح نکل جانے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اور روح نکل جانے کے بعد انسانی جسم کی حالت کو ہم موت کہتے ہیں۔ جانے میری روح کتنے عرصے بعد دوبارہ میرے جسم میں واپس آئی۔ رات کا شاید آخری پہر تھا۔ میں کسی اندھیرے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا تھا، مگر یہاں اتنا اندھیرا کیوں تھا۔ ضرور بہروز نے ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیا تھا۔ اور اب میں کمرے میں نہیں، کسی قبر میں دفنایا جا چکا تھا۔ ٹھیک ہی کیا بہروز نے۔ زندگی کے کسی امتحان میں بھی تو پورا نہیں اُتر پایا تھا میں..... چلو، جو ہوا، اچھا ہوا۔ قصہ تمام ہوا۔ شجر تو تھے ہی نہیں راستے میں کیا کرتے..... خود اپنے سائے میں چل کر سفر تمام کیا۔ مگر میرا سفر ابھی کچھ باقی تھا شاید..... اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی اور کسی نے دھیرے سے میرا نام پکارا۔ ''پری زاد..... ہوش میں آؤ، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسن کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

رومی کہتا ہے کہ'' تمہارا مقصد محبت کی تلاش میں بھٹکنا نہیں..... تمہیں تو بس ان تمام رکاوٹوں کو کھوجنا ہے، جو تم نے خود اپنے اندر اس محبت کے خلاف کھڑی کر رکھی ہیں۔'' میں بھی شاید اپنے اندر کی رکاوٹیں کھوج لیتا، اگر مجھے مزید کچھ دیر اس بے ہوشی کے سمندر میں غرق رہنے کا موقع مل پاتا، مگر کوئی مجھے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔'' پَری زاد، ہوش میں آؤ..... ہم یہاں سے کوچ کر رہے ہیں.....'' میری چندھیائی آنکھوں نے فیروز خان کا دُھندلا سا ہیولا دیکھا، جو مجھ پر جُھکا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، چند لمحوں کی غنودگی کے بعد میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں انیکسی میں اپنے کمرے کے بستر پر تھا۔ فیروز نے میرا چہرہ تھپتھپایا۔'' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم سب کچھ دن کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں۔ تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ ہم لوگ باہر گاڑیوں کے قریب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دوپہر کی تیز دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مطلب میں پورا دن بے سُدھ پڑا رہا تھا۔ میرے سَر میں ابھی تک درد سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی مجھے ایک زوردار چکّر آیا اور میں نے جلدی سے پلنگ کی پائنتی کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک سُرخ اور سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے رہے اور پھر میں اپنے ڈولتے قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا باہر نکل آیا۔ پورچ میں تقریباً سبھی گاڑیاں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ سارا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ یہ عمارتیں مکینوں کے بنا کتنی ویران ہو جاتی ہیں۔ شاید انسان دنیا کا سب سے بڑا ساحر، جادوگر ہے، لوگوں کو تو اپنا عادی بناتا ہی ہے۔ گھر، دیواریں اور مکان بھی اس کے سحر سے بچ نہیں پاتے۔ میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی فیروز نے گاڑی آگے بڑھا دی اور باقی ساری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے چل پڑیں۔

'' مالک کہاں ہیں.....؟'' فیروز میرا سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔'' وہ وہیں گھر پر رہیں گے تین دن۔ مالکن کے سوئم کے بعد ہم بھی واپس چلے جائیں گے گھر.....'' میرے اندر کوئی دل نما چیز بہت زور سے ٹوٹی۔ بڑے زور کا چھناکا ہوا۔ ایک ہلکی سی آس، جو میرے سینے میں کسی پھانس کی طرح اٹکی ہوئی تھی، فیروز نے ایک جھٹکے ہی میں اسے کھینچ کر باہر نکال دیا۔ کچھ تیر، جن کے دو مونہے سرے آگے کی جانب سے باہر کو مُڑے ہوتے ہیں، ان کا جسم میں پیوست ہونا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا، جتنی اذیت ان کو جسم سے باہر کھینچ نکالنے میں ہوتی ہے۔ جانے میں کیوں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ بہروز کریم نے لیلیٰ کو معاف کر دیا ہوگا۔ مگر افسوس ہماری آس اور امیدیں اکثر دغا دے جاتی ہیں۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ رات کو قریبی پولیس اسٹیشن میں بہروز کے ڈرائیور نے رپورٹ درج کروائی کہ جیسے ہی اس کی مالکن لفٹ سے باہر نکلی، ایک نوجوان نے اس پر حملہ کر دیا اور نوجوان کے پستول سے نکلی گولی مالکن کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ ڈرائیور کی جوابی گولی سے نوجوان بھی وہیں ڈھیر ہوگیا۔ لیلیٰ کے سینے میں پیوست گولی، جس پستول سے نکلی تھی، وہ بنا لائسنس تھا اور نوجوان کے ہاتھ میں دبا پایا گیا تھا۔ ڈرائیور کا پسٹل لائسنس والا تھا، جو اس نے رپورٹ کے ساتھ ہی تھانے میں جمع کروا دیا۔ اور اس وقت ڈرائیور پولیس کی حراست میں تھا۔ بہروز نے ہم سب کو احتیاطاً محل سے منتقل کروا دیا تھا، تاکہ ہم میں سے کوئی پولیس کی نظروں میں نہ آسکے۔ پولیس اس بات کی تفتیش میں لگی تھی کہ آخر مرنے والے اس نوجوان کا مقصد کیا تھا۔ بہروز نے پولیس کے سامنے شک ظاہر کیا تھا کہ مرنے والے ولید کا تعلق اس کے مخالف کاروباری طبقے سے ہوسکتا ہے۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا۔ یہ تفتیش اب لمبی چلنے والی تھی، مگر میں ان سب باتوں سے لاتعلق اپنے آپ میں گم بیٹھا صرف لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیلیٰ صبا نے ایسا کیوں کیا۔ یہ محبت تو انسان کو جان لیوا حد تک نڈر بنا دیتی ہے، آخر کس چیز کی کمی تھی لیلیٰ کو۔ حُسن، صورت، شکل، دولت، مرتبہ اور عزت..... کیا محبت ان سب نعمتوں سے الگ، کچھ سوا مانگتی ہے؟ شاید محبت کی ضروریات اور محبت کی دنیا ہماری ان سب عارضی خواہشات اور دکھاوے کی دنیاؤں سے بہت بلند، بہت جدا ہوتی ہے۔ ہم ایک ہفتے تک کسی اور کوٹھی میں منتقل بلکہ مقیّد رہے۔ پابندی اور اکتاہٹ گزرتے وقت کو بہت طویل بنا دیتی ہے، مگر جیسے تیسے وہ ایک طویل ترین ہفتہ بھی گزر ہی گیا۔

آٹھویں دن ہم پھر سے بہروز کے محل میں تھے، مگر بہروز اب وہ بہروز نہیں تھا، جسے میں نے آٹھ دن پہلے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر میں اندر سے لرز سا گیا، وہ چُپ چاپ سا اپنی خواب گاہ کی بالکونی (ٹیرس) میں بیٹھا دُور خلا میں گھور رہا تھا۔'' آ گئے تم لوگ..... اچھا کیا، مگر اب کچھ دن تک ذرا محتاط رہنا، معاملہ تازہ ہے.....'' فیروز سَر ہلا کر باقی ساتھیوں سمیت پلٹ گیا، مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور تنہائی پاتے ہی ان سے براہِ راست پوچھ لیا۔'' آپ نے انہیں مار کیوں دیا، آپ تو ان سے بہت محبت کرتے تھے، پھر.....؟'' بہروز اب بھی گم صم تھا'' محبت کرتا تھا، تب ہی تو مار ڈالا.....'' میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہوگئی۔'' مگر کیوں؟ آپ انہیں طلاق دے کر فارغ بھی تو کر سکتے تھے۔ جان بخشی بھی تو ممکن تھی ان کی۔ آپ کے ساتھ نہ سہی، مگر کم از کم وہ زندہ تو رہتیں۔'' بہروز نے میری طرف دیکھا۔ میری نظر جُھک گئی۔'' اتنا ظرف نہیں تھا مجھ میں پَری زاد..... کبھی کبھی محبت ہمیں بہت خودغرض، بڑا کم ظرف بنا دیتی ہے۔ یہ جو لوگ محبت میں قربانی، ایثار اور بانٹ دینے کے فلسفے کی باتیں کرتے ہیں، یہ سب بکواس ہے، جھوٹ بولتے ہیں سب۔ محبت، شدید نفرت سے بھی زیادہ کمینہ اور خودغرض جذبہ ہے اور جن کی محبت میں لالچ، خودغرضی اور سب کچھ پا لینے کی ہوس نہیں ہوتی، سمجھ لو، ان کی محبت میں ہی بڑا کھوٹ ہے۔'' بہروز نے آج پہلی بار مجھ سے یوں کھل کر بات کی تھی یا پھر شاید آج اُسے دل کی بات سُنانے کے لیے کسی سامع کی ضرورت تھی۔ ہم زندگی میں اپنے دل کی بہت سی باتیں اس لیے نہیں کر پاتے، کیوں کہ ہمیں اپنے معیار کا سامع نہیں ملتا۔ میری آواز ٹوٹ

لوٹ کر نکل رہی تھی۔ ”تو پھر مجھے کیوں بخش دیا آپ نے۔ میرا جرم بھی تو کچھ کم نہیں تھا۔ مجھے بھی وہیں مار ڈالتے۔“ بہروز اب بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ”ہاں، تمہیں بھی مار دیتا اسی وقت۔ بس تمہاری آخری خواہش نے ہاتھ روک دیا میرا۔ کیوں خود سے اتنی نفرت کرتے ہو؟ مرد کی شخصیت صرف اس کے چہرے سے مکمل نہیں ہوتی۔ یہ سب لوئر مڈل کلاس طبقے کی محرومیاں ہیں۔ مرد دولت، اختیار، طاقت اور رتبے سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ چہرہ، وجاہت وغیرہ فلمی ستاروں کی ضرورت ہے۔ سپنوں کے شہزادے صرف ناولز میں پائے جاتے ہیں۔ اصل دنیا تمہارے چہرے سے کہیں زیادہ کرخت ہے پری زاد۔“ میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ یہ بات کبھی مجھے لبنیٰ کی ماں نے بھی کہی تھی۔ اور پھر اچانک ہی بہروز کو کچھ یاد آ گیا۔ ”ہاں، مگر تمہیں خودکشی کا اتنا شوق کیوں ہے۔ تم جانتے تھے کہ وہ عورت تمہاری جان کے درپے ہے اور سارے الزام تمہارے سر ڈال کر اپنی آئی قضا تمہارے حصے منتقل کرنا چاہتی ہے، پھر بھی تم نے اس کے لیے جھوٹ بولا، کیوں.....؟“ ”اس لیے کہ میں آپ کے نوکروں اور دیگر عملے کے سامنے آپ کے گھر کی عزت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے لیلیٰ مالکن نے ہمیشہ یہی بتایا کہ وہ اپنی سہیلی یا رشتے داروں سے ملنے جاتی ہیں، اپنی تنہائی سے گھبرا کر۔ ورنہ میں کبھی آپ سے نہ چھپاتا۔“ بہروز نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں جانتا ہوں، اس کے لیے تمہیں بے وقوف بنانا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بہرحال، تم نے اپنی زندگی کے بدلے میری عزت بچانے کا سوچا۔ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہاری ذمے داریاں آج سے بدل دی گئی ہیں۔ جاتے ہوئے فیروز سے ملتے جانا اور ہاں اب تم انیکسی ہی میں رہو گے۔“ بہروز کے کمرے سے نکل کر میں انیکسی میں واپس آ گیا۔

اگلے روز فیروز نے مجھے ایک آراستہ دفتر میں پہنچا دیا۔ ”یہ آج سے تمہارا دفتر ہے، مالک نے تمہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی ہے۔ باہر بیٹھا عملہ تمہیں سارا کام سمجھا دے گا۔ یہ ہماری سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا دفتر ہے اور یہ سارا عملہ آج سے تمہارے ماتحت ہوگا۔“ میں حیرت سے فیروز کو دیکھتا رہا۔ فیروز نے میرے چہرے پر لکھے سوال پڑھ لیے اور مسکرا کر بولا ”تم بہت جذباتی ہو۔ مگر وفادار ہو۔ اور مالک وفاداروں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تمہیں اب کچھ عرصے تک اسی کمپنی کا کام دیکھنا ہوگا، کیوں کہ ہمیں ڈر ہے کہ تمہاری جذباتیت کسی بھی موڑ پر ہمارے لیے کوئی نیا بکھیڑا نہ کھڑا کر دے، لہٰذا فی الحال تمہیں کسی خطرے والے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ویسے بھی دبئی کی پولیس اب چوبیس گھنٹے ہم سب پر نظر رکھ رہی ہے۔ یہاں کا قانون سب کے لیے یک ساں اور بہت سخت ہے، تمہیں بھی بہت ہوشیار رہنا ہوگا۔“ فیروز اپنی بات ختم کر کے چلا گیا۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا اس عالی شان دفتر اور بڑی سی میز کے پیچھے رکھی اس چمکتی سیاہ کرسی کو دیکھتا رہا۔ کل کی ایک غریب بستی کا پری زاد آج دبئی کی سب سے بڑی تعمیراتی کمپنی کا منیجر تھا۔ میں نے کرسی کی بے داغ سطح پر ہاتھ پھیرا اور اس پر بیٹھ کر تین چار مرتبہ اسے گھما کر بارہویں منزل پر واقع اپنے دفتر کی بڑی بڑی شیشے کی کھڑکیوں سے دبئی شہر کی گہما گہمی کا نظارہ کیا۔ اُس روز مجھ پر ایک اور صدیوں پرانا راز بھی منکشف ہوا کہ ان اونچی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کے کمروں میں بیٹھے لوگوں کو زمین پر چلتے عام انسان اتنے چھوٹے، حقیر اور کیڑے مکوڑوں جیسے کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرے دن رفیق اچانک ہی بنا بتائے کسی کام سے دبئی آ گیا، اور عملے سے پوچھتے پاچھتے فیکٹری کے دفتر تک آ پہنچا۔ مجھے منیجر کی کرسی پر بیٹھے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو وہ کچھ کہنا ہی بھول گیا۔ میں نے چپڑاسی سے چائے یا کافی لانے کے لیے کہا اور رفیق کو ہاتھ سے پکڑ کر سامنے صوفے پر بٹھا دیا۔ ”اب کچھ کہو گے بھی یا یوں ہی گم صم بیٹھے رہو گے؟“ رفیق نے ایک ہی سانس میں پانی کا پورا گلاس حلق سے نیچے انڈیل لیا۔ ”پری زاد پیارے..... سچ بتاؤ، تم کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہے، جو تم مجھے اور باقی دنیا کو بتا نہیں سکتے۔“ میں نے گہری سانس بھری ”نہیں، میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا، جس کے بارے میں مجھے تم سے یا کسی اور سے کچھ چھپانے کی ضرورت پیش آئے۔“ مگر میرے جواب سے رفیق کی تشفی نہیں ہوئی۔ ”دیکھو پری زاد! میں جانتا ہوں کہ بہروز مالک کے ہاں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جس کی ہمیں بھی خبر نہیں۔ اگر خود کو کسی ایسی گرہ میں الجھا بیٹھے ہو، تو ابھی بھی وقت ہے، میں تمہیں چپ چاپ دبئی سے پار کروا سکتا ہوں، ایک دو دوست ہیں میرے لانچ والے۔ کسی کو تمہارے فرار کی خبر بھی نہیں ہوگی۔“ میں نے مسکرا کر اپنے اس نادان دوست کی طرف دیکھا۔ ”مجھے صرف خود اپنے آپ سے فرار چاہیے۔ بولو، خود مجھے اپنے آپ سے فرار کروا سکتے ہو.....؟ ہے کوئی ایسی لانچ، بحری جہاز یا اڑن کھٹولا، جو مجھے خود میری ذات کے جزیرے سے فرار کروانے میں مدد کر سکے.....؟“ رفیق کی پلکیں نم ہو گئیں اور پھر وہ زیادہ دیر وہاں بیٹھ نہیں سکا۔

میرے دن اور رات پھر سے اسی یک سانیت کا شکار ہونے لگے، جس سے میں ہمیشہ ہی بے زار رہتا تھا، البتہ پیانو سے دوستی پکی ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کی موت کے بعد مارتھا نے محل میں آنا بند کر دیا تھا، مگر اب میری انگلیاں اپنی مرضی کی دھنیں بکھیرنا خوب جانتی تھیں۔ بہروز کریم بھی اب زیادہ تر گھر ہی پر رہتا تھا، خاموش، کھویا کھویا، افسردہ سا..... اُس شام میں ایک ضروری فائل پر اس کے دستخط لینے اس کے پاس پہنچا، تو وہ کہیں جانے کی تیاری میں دکھائی دیا۔ ”آپ کہیں جا رہے ہیں مالک؟“ ”ہاں، کچھ دن کے لیے اس کی یادوں سے فرار کی ایک کوشش کر دیکھتا ہوں، حالاں کہ کہیں نہ کہیں اندر سے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بے کار جائے گا۔“ بہروز شام کے جہاز سے لندن فلائی کر گیا اور میں رات گئے تک یہ سوچتا رہا کہ ہم انسان سب کچھ بھلا دیتے ہیں۔ رشتے ناتے دوستیاں، دشمنیاں، مذہب اور حتیٰ کہ اپنے خدا کو بھی، تو پھر صرف ایک محبت کی یاد کو اپنے دل سے مٹا کیوں نہیں پاتے۔ کاش یہ مقدر انسان کو اور کوئی اختیار نہ دیتا، صرف یادیں بھلانے کا مختار کر دیتا۔

میری توقع کے مطابق بہروز زیادہ دن باہر نہیں بتا سکا اور ٹھیک دو ہفتے کے بعد واپس آ گیا۔ مگر اس کی واپسی کی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا، جب فیروز نے مجھے خبر دی کہ اس ترک نوجوان، ولید کا باپ انتہائی اثر و رسوخ والا ہے اور وہ بہت جلد دبئی پہنچ کر لیلیٰ صبا اور اپنے بیٹے کے قتل کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش شروع کروانا چاہتا ہے اور پھر ٹھیک تین دن بعد پولیس کی بہت سی گاڑیاں بہروز کریم کے گھر کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئیں اور ایک بار پھر ہم سب سے بیانات لیے گئے۔ بہروز کے چہرے پر حسب معمول کوئی تاثر نہیں تھا، مگر فیروز مجھے کافی پریشان دکھائی دیا۔ رات کو بہروز نے ہم سب کو محل کے بڑے ہال میں میٹنگ کے

لیے بلایا اور پُرسکون لہجے میں بتایا کہ دبئی پولیس نے کیس پھر سے کھول لیا ہے، اور ڈرائیور جس کی ضمانت ہو چکی تھی، اسے بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے، لہٰذا اس کے ذاتی عملے کو آج کے بعد کھلی اجازت ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے جو جہاں نکلنا چاہے، نکل جائے، اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے دن بہت سخت ہوں، کیوں کہ دبئی پولیس بہت عرصے سے اس موقعے کی تلاش میں تھی کہ انہیں بہروز کے خلاف کوئی شکایت موصول ہو، تو وہ سارے گڑے مردے ایک ساتھ ہی اکھاڑنا شروع کر دے، کیوں کہ اب تک بہروز اتنا محتاط رہا تھا کہ سب جانتے ہوئے بھی کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو صرف میں اور فیروز وہاں رُکے، باقی تمام ممبرز نے حسب توقع جانے سے پہلے اپنا آخری فیصلہ بہروز کو سنا دیا کہ وہ ایسے مشکل وقت میں

بہروز کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ واقعی، بہروز نے اپنے اردگرد بہت چُن کر لوگ جمع کیے تھے۔ فیروز نے ان کے جاتے ہی دروازہ بند کیا اور پریشانی سے بولا ''ہم سب یہیں رہیں گے، مگر آپ کو فوراً یہاں سے کسی اور ملک نکل جانا چاہیے۔ ان حالات میں بھارت یا پاکستان ہی بہتر رہے گا۔ میں آج رات ہی بڑی لانچ تیار کروا دیتا ہو۔ سمندر میں ہمارے وفاداروں کی کمی نہیں، دو راتوں کے بعد آپ کسی محفوظ مقام پر ہوں گے۔''

بہروز نے اطمینان سے فیروز کی پوری بات سُنی۔ ''کبھی کبھی رُوپوشی انسان کو مزید ظاہر کر دیتی ہے فیروز خان..... تم پُری زاد کو لے کر کسی طرف نکل جاؤ۔ اُس کے ہاتھ ابھی صاف ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے بھی دوسروں کی ساتھ شامل کر کے دھر لیا جائے۔'' بہروز کریم کا لہجہ حتمی تھا۔ فیروز مایوس سا وہاں سے پلٹ گیا، میں نے بھی واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو میرے عقب میں بہروز کی آواز گونجی۔ ''جب کوچ کا وقت آئے تو ضد مت کرنا، چلے جانا۔'' میں نے پلٹ کر جواب دیا ''آپ جانتے ہیں، آپ ہمیں قانون میں مقرر سزا سے بھی بڑی سزا دے رہے ہیں۔'' بہروز نے سگار کا ایک لمبا سا کش لیا اور ایک چیک میری جانب بڑھایا۔ ''اسے رکھ لو، بُرے وقت میں کام آئے گا، اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اپنے آپ کو اتنا حقیر مت جانو، یہ دنیا مَرے ہوئے کو مزید مارتی ہے، مگر جو سینہ تان کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اسے للکارے، اُسی کو سلام کرتی ہے، دنیا کو للکارنا سیکھ لو پُری زاد..... محبت زندگی کی پہلی یا آخری ضرورت نہیں ہوتی اور تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس دل کے بہلانے کو یہ ایک عذر تو موجود ہے کہ کسی کی محبت تمہارا مقدر ہی نہیں۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کا ہے، جو محبت پا کر خود اسے اپنے ہاتھوں سے کھو دیتے ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اکثر تم پر رشک آتا ہے کہ کاش، تمہاری طرح میں بھی عُمر بھر اس عذاب سے محروم رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' میں نے حیرت سے بہروز کی طرف دیکھا۔ شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ''کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا.....''

لیلیٰ صبا کے قتل کی تفتیش کا دائرہ تیزی سے ہمارے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے فیروز سے بہروز کریم کو دبئی سے نکال لے جانے کی ایک آخری کوشش کرنے کو کہا۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ اب شاید یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہ ہو، کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق پولیس نے محل کے اردگرد راستوں کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ فیروز نے ایک حتمی کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم سب نے مل کر کسی نہ کسی طرح بہروز کریم کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ٹھیک تین دن بعد ہم سارے کارندے مع بہروز، دو بڑی لانچوں میں بنکاک یا کسی اور جانب نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں پر لکھا فیصلہ پڑھ کر بہروز سمجھ گیا کہ ہم سے مزید بحث بے فائدہ رہے گی۔ فیروز خان کو ایسے معاملات کی سنگینی کا اندازہ اور ان سے نمٹنے کا طریقہ خوب آتا تھا۔ اس نے ہمارے فرار والی رات ہی محل میں بہروز کی سال گرہ کا جشن اور پارٹی منعقد کرنے کا ڈھونگ رچایا اور شہر کے تمام رئیسوں کو دعوت نامے بھی ارسال کر دیے گئے۔ طے پایا کہ شام کو اندھیرا ڈھلتے ہی جب مہمانوں کی آمد شروع ہونے والی ہوگی، فیروز خان، بہروز اور دیگر چند کارندوں کو لے کر پہلی لانچ پکڑ لے گا، تب تک میں اور دیگر عملہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں گے اور موقع ملتے ہی ہم بھی نکل جائیں گے۔ تیسرے دن شام ہی سے محل میں ہل چل سی مچ گئی۔ فیروز نے مجھے بتایا کہ پہرہ کافی سخت ہے، اس لیے انہیں اندھیرا ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے فیروز کے سامنے ایک ہمیشہ کی آزمائی ہوئی ترکیب تجویز کی۔ فیروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، یہ جوا بھی کھیل لیتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، مگر پھر تمہارا یہاں سے جلدی نکلنا شاید ممکن نہ ہو۔''

بہروز ابھی اپنی خواب گاہ میں تھا۔ میں نے اس کے ڈرائیور کو بہروز کی خاص گاڑی لگانے کو کہا اور گھر سے نکلتے ہوئے لاؤنج میں پڑے بہروز کے سگار کیس سے ایک سگار اٹھا لیا۔ ڈھلتے اندھیرے میں جب بہروز کی کار محل سے باہر نکلی، تو میں ایسے زاویے کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ پہلی نظر میں باہر سے دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کار میں بہروز بیٹھا کہیں جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محل کے دربانوں نے بھی کھٹ سے سلام جڑ دیے۔ شاید ہم لوگوں سے کہیں زیادہ، ان کے معمولات سے مانوس اور آشنا ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذاتی اشیاء، اوقاتِ کار اور عادات ہماری پہچان بن جاتے ہیں اور خود ہم اس پہچان میں کہیں کھو سے جاتے ہیں۔ بہروز کی مخصوص کار کے محل سے نکلتے ہی ایک سیاہ رنگ کی بڑی چرو کی جیپ ہمارے تعاقب میں چل پڑی۔ ہمارا پرانا طریقہ شاید ابھی تک کارآمد تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی کی رفتار بڑھانے کو کہا اور ہم تین چار گھنٹے تک دبئی کی سڑکوں پر اِدھر سے اُدھر بے مقصد کار دوڑاتے رہے۔ تعاقب میں آنے والی جیپ کو ہم نے برابر یہی تاثر دیئے رکھا، جیسے ہم اس کے تعاقب سے جان چُھڑانے کے لیے بار بار کار کی رفتار تیز کر رہے ہیں۔ پرانی انگریزی جاسوسی فلموں میں، مَیں نے ایسے مناظر بارہا دیکھے تھے، مگر تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی میں کبھی یہ مناظر حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ شاید قدرت انسانی ذہن کی اڑان وہاں تک رکھتی ہے، جہاں تک اس جہانِ ناتمام میں ممکنات کی حد ہو۔ ورنہ یہ مصنف، رائٹر اور قلم کار وہ سب کچھ کیسے سوچ اور لکھ لیتے ہیں، جو کبھی اُن کے ساتھ پیش ہی نہ آیا ہو۔ یہ تخیل کیا بلا ہے، جو انہونی کو بھی ہونی کر کے لکھتا ہے۔ مگر میرا پیچھا کرنے والی جیپ میرا تخیل نہیں تھی۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ بہروز کریم اور دیگر ساتھی محل سے نکل کر ساحل تک پہنچ گئے ہوں گے، تب میں نے ڈرائیور کو گاڑی محل کی طرف موڑنے کو کہا۔ میری توقع کے مطابق فیروز خان ان سب کو لے کر نکل چکا تھا۔ مہمانوں کی بھیڑ نے کار اندر آتے دیکھی تو سب ہماری طرف لپکے۔ میں نے بہ مشکل ان سے معذرت کی کہ مالک کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ لوگ تب تک عشائیہ تناول فرمائیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان مہمانوں میں سے کچھ کا تعلق قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی ضرور ہوگا، مگر مجھے بہرحال ان کا یہ بھرم آخری وقت تک سمیٹے رکھنا تھا کہ بہروز ضروری کام نمٹا کر آتا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں، تنہائی آس پاس لوگوں کی غیر موجودگی کا نام نہیں، ہمارے آس پاس موجود انسانوں میں ہماری غیر دل چسپی ہمیں تنہا کرتی ہے۔ میں بھی اس پارٹی کے ہجوم میں تنہا کھڑا محفل برخاست کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہا۔ پھر اچانک محل کے گیٹ پر بہت سی گاڑیوں اور مخصوص سائرن کا ایک شور سا اٹھا۔ چند لمحے بعد دبئی پولیس کا ایک بڑا افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا انداز اس کے عہدے سے کہیں زیادہ تحکمانہ تھا۔

''تمہارا مالک بہروز کریم کہاں ہے.....؟'' ''بس آتے ہی ہوں گے مالک۔'' افسر مخصوص عربی لہجے کی انگریزی میں گرجا۔ ''ہمارے پاس اس کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا ''جب وہ واپس آئیں تو گرفتار کر لیجیے گا۔'' مہمان یہ سارا معاملہ دیکھ کر دھیرے دھیرے چھٹنے لگے اور پھر کچھ دیر بعد اس افسر کا ماتحت باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے افسر کے کان میں کچھ کہا۔ افسر کی بھنویں تن گئیں اور وہ غصے میں میری طرف پلٹا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے.....''

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا دل زور سے دھڑکا، اس پولیس افسر نے مڑ کر اپنے ماتحت سے عربی میں کچھ کہا اور پھر میری طرف پلٹا ''میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں، تمہارا مالک اور دیگر ساتھی پہلے ہی پکڑے جا چکے ہیں۔ فی الحال، تم پر کوئی واضح الزام نہیں، مگر شک کی بنیاد پر حراست میں لیا جا رہا ہے۔'' کبھی کبھی ہمارے خدشات حقیقت کا روپ دھارنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے، شاید ہمارے اندر ابھرتے خوف اور وہم کا تقدیر اور پیش آنے والے واقعات سے کچھ خاص اور براہِ راست رشتہ ہوتا ہے، اسی لیے جب مجھے گرفتار کر کے لاک اپ پہنچایا گیا، تو میں نے اپنے خدشات کے عین مطابق بہروز کریم، فیروز اور دیگر عملے کو مختلف چھوٹے چھوٹے حوالات نُما کمروں میں بند پایا۔ بہروز کے قانونی مشیروں اور چوٹی کے وکلاء کی ٹیم بھی پولیس حکّام کے ساتھ بحث کرتی نظر آئی۔ مجھے بھی ایک لاک اپ میں دھکیل دیا گیا، اور مَیں اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ انسان کی ساری بے چینی اور بے قراری اُسی وقت تک ہوتی ہے، جب تک اختیار اُس کے ہاتھ رہتا ہے، جب فیصلوں کے مختار دوسرے ہو جائیں تو پھر اک اَن جانا سا سکون اور ٹھہراؤ جیسے سارے وجود کی بے چینی سمیٹ لیتا ہے۔ میرا فیصلہ بھی اب میرے صیادوں کے ہاتھ تھا، پھر مجھے بھلا کاہے کی فکر ہوتی۔ اگلے روز ہمیں عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ایک چھوٹے سے ہال نما کمرے میں جمع کیا گیا۔ بہروز کریم کے چہرے پر حسبِ معمول سکون تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''کہو پَری زاد! نیند کیسی رہی؟'' کہتے ہیں مشکلات سے دُور بھاگ کر ہم صرف اس مصیبت کے حل سے اپنا فاصلہ بڑھا رہے ہوتے ہیں، وگرنہ مشکل تو ہمارے ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ بہروز کے وکلاء نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا، مگر اس کی ضمانت کروانے میں کام یاب نہیں ہو سکے۔ رات کو جب لاک اپ میں سناٹا چھا گیا، تو میں نے ساتھ والے لاک اپ کی دیوار پر دھیرے سے دستک دی ''آپ سو تو نہیں گئے مالک.....؟'' کچھ دیر بعد بہروز کی آواز گونجی ''کسی سوتے ہوئے سے یہ بڑا عجیب سوال ہوتا ہے؟'' میں نے ایک گہری سانس لی ''معذرت چاہتا ہوں مالک، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل عدالت میں قاضی کے سامنے مالکن کے قتل کا اعتراف کر کے جُرم اپنے سَر لے لوں گا، آپ میرے اعتراف کے بعد کوئی اعتراض نہ کریں، تو مہربانی ہوگی۔'' بہروز نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اس کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری ''بہروز کریم اتنا ہی بوجھ لادتا ہے، جتنا وہ ڈھو سکے۔ تمہارے اس احسان کا بوجھ بہت بھاری ہے پَری زاد، اور ویسے بھی ولید کا باپ اس کی لیلیٰ سے پرانی رفاقت کے سارے ثبوت لے کر آیا ہے، تم پر یہ قتل ڈال بھی دیے جائیں تو دوسری طرف کا کوئی بھی اچھا وکیل بہت جلد سچ کی تہہ تک پہنچ کر اُسے عدالت کے سامنے پیش کر دے گا۔ میں نے زندگی میں بہت جُرم کیے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر تو رسّی کو تنگ ہونا ہی تھا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ، مجھے ابھی بہت جاگنا ہے۔'' پھر شاید پوری رات میں اور بہروز اپنی اپنی آہنی کوٹھریوں میں ساری رات جاگتے رہے۔ بہ ظاہر ہم دونوں ہی قیدی تھے، لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا، ہم میں سے ایک ساری دنیا جیت کر اور جہاں بھر کی نعمتیں سمیٹ کر اس عقوبت خانے میں پہنچا تھا اور شاید ہی اس کی کوئی حسرت باقی بچی ہو، جب کہ دوسرا وہ بدنصیب تھا، جس کی زندگی ہی عُمر بھر حسرت کا دوسرا نام رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ تقدیر اس دنیا میں ایک ہی وقت میں کسی عرب شہنشاہ یا امریکی ارب پتی کے گھر پیدا ہونے والے اور میری کچّی بستی میں جنم لینے والے دو بچّوں میں کیسے توازن رکھتی ہوگی۔ بادشاہ اور فقیر کے گناہ و ثواب برابر کیسے تولے جا سکتے ہیں، چاہے وہ دونوں ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر اس فرق کی کوئی تو جزا ہوگی۔ کوئی تو صلہ یا انعام طے کر رکھا ہوگا اوپر والے نے۔ کسی مقام پر تو اس فقیر کی محرومیوں کا حساب برابر کیا جائے گا یا پھر اسے بھی تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا جائے گا۔

اگلے روز عدالت میں قاضی کے سامنے وکلاء کی بحث شروع ہونے سے پہلے ہی کریم نے اپنا گناہ قبول کر لیا اور ساتھ ہی عدالت سے درخواست کی کہ گرفتار شدہ عملے میں بہت سے ایسے بھی ہیں، جن کا اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا انہیں ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ ہم سب گم صُم کھڑے بہروز کریم کا بیان سُنتے رہے۔ اس نے اپنے بیان میں اپنے ہر جرم کا مرکزی کردار خود ہی کو ٹھہرایا۔ فیروز اپنے مالک کی باتیں سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہم سبھی کی پلکیں نم تھیں۔ بہروز کریم کا بیان کسی زندہ انسان کا اقرار نامہ نہیں لگتا تھا۔ کہتے ہیں، زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہم بہت دیر بعد اسے جینا شروع کرتے ہیں، لیکن بہروز کے بیان کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس نے زندگی کو جی بھر کے جی لیا ہے، اتنا کہ اب وہ اس تماشے سے اوب چکا ہے۔ کچھ لوگ صدیوں زندہ رہ کر بھی ایک پل زندگی جی نہیں پاتے اور کچھ پل بھر میں صدیوں کا مزہ کشید کر لیتے ہیں، تو پھر ہم کسی بھی شخص کی عمر کو سال اور مہینوں میں کیوں ناپتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ فلاں شخص دو پل جیا اور پھر مر گیا اور فلاں عُمر بھر جیتا رہا۔ ایک مہینے کے اندر قاضی نے بہروز کو موت کی سزا سُنا دی۔ فیروز خان کو بھی اس کی معاونت کے جُرم میں زندگی کی قضاء کی سزا ملی۔ چند کو عمر قید ہوئی اور مجھ سمیت کچھ دوسرے نامکمل شہادتوں کی بنیاد پر رہا کر دیے گئے۔ انصاف وہی ہوتا ہے، جو فوری ہو، ہمارے ہاں تو انصاف اتنی دیر سے ملتا ہے کہ خود انصاف سزا بن جاتا ہے۔ بہروز کریم نے اپنی ساری دولت، جائداد اور اثاثوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے آدھا حصّہ اپنی بیوی اور بچّوں میں بانٹ دیا اور آدھا اپنے تمام بچ جانے والے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے وہ تمام ٹرسٹ اور فلاحی ادارے بھی ہمیشہ کے لیے یک جا کر کے ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کے زیرِ اہتمام کر دیے، جو اس کی سرپرستی میں چلتے تھے اور جن کی کمائی سے ہزاروں ضرورت مندوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ظالم بہت کَنی ہوتا ہے۔ بہروز کریم اگر ظالم تھا تو سخاوت کا یہ معیار اس کے شایانِ شان تھا۔ شاید چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا گناہ گار بھی کہیں نہ کہیں اپنے اعمال کا وزن برابر رکھنے کی

شدید خواہش میں مبتلا رہتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، مگر سزا اور جزا کا یہ نظام خود بہ خود ہی ہماری رگوں میں سرایت کیے رہتا ہے۔ مَیں بہروز کریم کے اثاثوں کی وصیت پڑھتے ہوئے رو پڑا۔ اس نے اپنے محل میں پڑا ہوا بڑا پیانو میرے نام لکھ دیا تھا، اور پھر ساتھ ہی ایک ضمنی نوٹ میں تحریر تھا کہ چوں کہ اس پیانو کا وزن بہت زیادہ ہے اور بہروز کو خدشہ ہے کہ اس کی محبوب بیوی کا یہ پسندیدہ پیانو محل سے کہیں منتقل کیے جانے کی صورت میں اپنی اصل شکل و ہیئت کھو نہ دے، لہٰذا وہ جائداد، جہاں وہ پیانو پڑا ہوا ہے، تمام تر محل اور انیکسی سمیت پَری زاد کے نام کی جاتی ہے۔ بہروز جاتے جاتے ہم سب کے نام اتنا کچھ کر گیا تھا، جو ہم سب کی سات نسلوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے اپنے تمام اداروں میں کام کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ایک معمولی نوکر اور چپڑاسی تک کو برابر پائا تھا۔

آخری ملاقات کی رات، جب ہم سب کارکن اس سے آخری بار مل کر واپس لوٹ رہے تھے، تو میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا رہا۔ سب جا چکے، تو بہروز نے میری طرف دیکھا۔ ''تم مجھ سے نہیں ملو گے پَری زاد.....'' مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں تمام ادب و آداب بالائے طاق رکھ کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور پھر مجھے سنبھالتے ہوئے بہروز بھی رو پڑا۔ اس آہنی اور فولادی وجود و اعصاب کے آدمی کو میں نے پہلی بار نم آنکھیں لیے سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ''کیوں کیا آپ نے ایسا.....؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں جھونک دیا، آپ کے وکلاء اور قانونی مشیر اتنے اہل تو تھے کہ آپ کی سزا کو کم از کم عمر قید میں تبدیل کروا دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سزا آپ نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے، قاضی نے تو بس اپنے دست خط ثبت کیے ہیں، آپ کے فیصلے پر۔'' بہروز نے سر اٹھایا ''شاید میں لیلیٰ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا پَری زاد۔ لیکن یہ محبت بڑے بڑے تناور درختوں کو دیمک کی طرح کھا کر ڈھا سکتی ہے۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا۔ میں نے اپنے لیے یہ سزا اس لیے تجویز نہیں کی کہ میں نے اُسے مار کیوں ڈالا، بلکہ میں نے خود کو یہ سزا اس لیے دی ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی۔ جب کہ میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ اب میری واپسی ناممکن ہے۔ مگر یہ راز تب کھلا، جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔ تب میں نے جانا کہ میں بھی اب اس کے بنا جی نہیں پاؤں گا۔ اگر مزید زندہ رہتا تو یہ منافقت ہوتی۔ اور بہروز نے آج تک ہر گناہ کیا ہے، سوائے منافقت کے۔'' اس نے مجھے آخری مرتبہ بھینچ کر گلے لگایا ''اپنا خیال رکھنا، بہت قیمتی ہو تم، مگر نہ جانے کیوں، خود کو اتنا ارزاں کر رکھا ہے۔'' میں ایک بار پھر رو پڑا۔ بہروز سے رخصت ہونا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، مگر سپاہی میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر میں فیروز خان کی کوٹھری کے پاس رُک گیا، وہ آہٹ سن کر سلاخوں کے قریب آ گیا۔ میں نے نم پلکوں سے اس کا استقبال کیا ''جا رہے ہو فیروز؟'' وہ دُکھ سے مسکرایا ''ایک نہ ایک دن تو جانا ہی تھا۔ مالک کے ساتھ ہی چلا جاؤں، تو بہتر ہے۔ میں نے ان کی زندگی کی حفاظت کی قسم کھا رکھی تھی، دعا کرو کہ کل مجھے اُن سے پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، ورنہ میں اوپر جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا.....؟'' میں نے فیروز کا کاندھا تھپتھپایا ''تم سے بڑھ کر وفاداری اس دنیا میں بھلا کسی اور نے کیا نبھائی ہوگی۔ بے وفا تو ہم ہیں، جنھیں تم یہاں تنہا کسی آسرے کے بغیر چھوڑے جا رہے ہو۔ کہاں ملے گا اب مجھے تم جیسا سچا اور وفادار دوست؟'' فیروز مسکرایا ''پاکستان میں میرا ایک بھائی ہے کبیر خان، ضرورت پڑے تو اسے اپنے پاس بلا لینا، ہم دونوں کا ایک ہی خون ہے۔ اب تم جاؤ پَری زاد، مجھے اپنی آخری عبادت کرنی ہے۔ شاید یہ آخری سجدہ ہی وہاں کام آ جائے، ورنہ عُمر تو بس رائیگاں گئی۔'' میں آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے وہاں سے چلا آیا۔

بہروز اور اس کے وفادار فیروز کی آخری رسومات ایک ساتھ ادا کر کے انہیں اسی شہر میں دفنا دیا گیا، جہاں انہوں نے عروج کی آخری منزل سر کی تھی اور جہاں وہ ایک ساتھ زوال پزیر ہو گئے، بہت دنوں تک تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ غم کی شدت شاید ہماری قوتِ گویائی بھی سلب کر لیتی ہے۔ میں گھنٹوں بڑے ہال میں گم صُم بیٹھا اس بڑے پیانو کو دیکھتا رہتا، جسے کبھی لیلیٰ صبا بیٹھ کر بجایا کرتی تھی۔ شاید اس کی نازک انگلیوں کے نشانات بھی ابھی تک اس پیانو کے سُروں پر ثبت ہوں گے۔ میرا جی ہی نہیں مانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ لگا کر اس کے نشان مٹا دوں۔ پھر ایک شام مارتھا واپس آ گئی اور مجھے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کے بُرے سلوک کے لیے انگلینڈ گئی ہوئی تھی، جب یہ ساری واردات ہوئی۔ میں نے مارتھا کو پھر سے کام پر رکھ لیا اور اس سے انیکسی میں شفٹ ہو جانے کی درخواست بھی کی۔ جانے کیوں وہ مجھے اس محل اور لیلیٰ صبا کا ایک حصہ نظر آتی تھی۔ رفیق کو بھی میں نے دوبارہ ویٹی واپس بلوا لیا تھا، مگر اس نے محل میں منتقل ہونے سے معذرت کر لی ''نہیں پیارے! یہاں پر تو ہی جچتا ہے، مالک یہ سب کچھ تیرے نام کر گئے ہیں، مجھے اسی فلیٹ میں رہنے دے۔'' میں جانتا تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا۔ ''ٹھیک ہے، مگر ایک شرط تمہیں میری بھی ماننی ہوگی، ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے دل سے اپنا دوست نہیں مانا۔'' ''کیسی شرط.....؟'' میں نے دراز سے ایک چابی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ''تم ہمیشہ سے یہاں ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے تھے ناں، یہ تمہارے ریسٹورنٹ کی چابی ہے۔'' رفیق کچھ دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے مجھے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا ''تُو صرف نام ہی کا نہیں، دل کا بھی پَری زاد ہے.....'' بہروز کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ امیر کیسے امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں، دولت ایک ایسا مقناطیس ہے، جو صرف دولت کے لوہے کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ بہروز کے شروع کیے گئے درجنوں منصوبے جو میرے حصے آئے تھے، وہ پیسا کھینچنے کے کچھ ایسے ہی مقناطیس تھے، میرا کام صرف اتارہ گیا تھا کہ میں اپنے منیجرز کی بتائی ہوئی اسکیمز میں پیسے لگاؤں اور پھر ہتھوں بیٹھ کر ان سے حاصل ہونے والا منافع گنتا رہوں۔ اس سے کہیں زیادہ محنت تو میں استادِ مستانہ کے ورکشاپ پر دن کے چند گھنٹوں میں کر لیتا تھا۔ یا پھر شاید ان امیروں کو بیٹھ کر یوں دولت گننا بھی محنت ہی لگتی ہو، لیکن میں اس جمع تفریق کے کھیل سے چند مہینوں ہی میں اکتانے لگا۔ دولت مند کو دولت خرچ کرنے کا سلیقہ آنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ وہی دولت اس کے لیے سر درد بننے لگتی ہے۔ میرے منیجرز مجھے روزانہ پیسا کمانے کے نت نئے گُر بتاتے اور پھر جب ان کے منصوبے کام یاب ہو جاتے تو وہ پارٹی کرتے، جشن مناتے۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں ان کی دماغی عرق ریزی کے نتیجے اب بہت اکتاہٹ سے سُنتا تھا۔ اُن ہی دنوں ایشین کی ایک بڑی تعمیراتی کمپنی نے ہمارا ٹینڈر منظور کر لیا۔ میں سفر سے بہت کتراتا تھا اور حتی الامکان کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خود کہیں جانا نہ پڑے، مگر اس بار کچھ ایسی صورتِ حال بنی کہ مجھے بارسلونا جانا ہی پڑا۔ یہ پیسا بڑے کمال کی چیز ہے۔ ایک ہی جیسے خوش پوش اور معزز دکھائی دینے والے انسانوں کو پَل بھر میں درجوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری فلائٹ کا ٹکٹ عملے نے بزنس ایگزیکٹو کلاس میں سب سے اونچی تقسیم کا بک کروایا تھا، لہٰذا کچھ ہی دیر میں مجھ سے کہیں زیادہ خوش لباس اور اونچے درجے کے دکھائی دینے والے مسافر جہاز کے پچھلے حصے میں بیٹھ چکے تھے اور جہاز کا سارا عملہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ مجھے جانے کیوں اپنے کالج کے روٹ پر چلنے والی لوکل بس یاد آ گئی، جس کے پائیدان پر لٹکتے ہوئے میں نے کالج تک اُن گنت سفر کیے تھے، کیوں کہ میرے پاس اندر بیٹھنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کنڈکٹر ترس کھا کر چند سکّوں کے عوض مجھے پائیدان پر لٹکنے ہی کی اجازت دیتا تھا۔

اسپین کے جس سات ستارہ ہوٹل میں میرا قیام تھا، اس کے صدارتی سوئٹ سے باہر دیکھنے پر دور سفید پتھر اور لکڑی سے بنا ایک بہت بڑا سا گول اکھاڑہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے میزبانوں نے اگلی شام معاہدہ طے ہو جانے کی خوشی میں مجھے اُسی اکھاڑے میں بھینسے کی انسان سے جنگ دکھانے کا اہتمام کر ڈالا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا، مگر میزبان بہ ضد تھے کہ کوئی اسپین آئے اور یہ تماشا نہ دیکھے، تو اسے کفرانِ نعمت کہا جاتا ہے۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو دنیا کے سبھی بڑے شہر اب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ وہی بھاگ دوڑ، نفسا نفسی، سب کا ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ خوش اور مطمئن جان کر خود کو مزید مشقت میں مبتلا کرنا، مگر یہ شہر باقی بڑے شہروں سے کچھ جدا دکھائی دے رہا تھا، مشرقی اور مغربی تعمیر کا سنگم، مجھے بچپن میں آنہ لائبریری سے کرائے پر ملی گئی الف لیلیٰ کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ وہی محرابیں، وہی ستونوں کی قوسِ قزح، اندرونِ شہر عمارتوں کی بَنی گلیاں اور رستے، نئی تعمیر کا شاہ کار، الف لیلوی گھر اور عمارتیں..... مسلمان کیا تھے، اور کیا سے کیا ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ میں جتنا عروج اور پھر جتنا زوال ہم مسلمانوں نے دیکھا ہے، شاید ہی کسی اور قوم اور مذہب نے دیکھا ہو، شام چار بجے ہم اکھاڑے میں اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اکھاڑہ کھچا کھچ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ انسان سدا کا وحشی ہے اور اسے یہ وحشت بھرے تماشے دیکھنے میں ہمیشہ ہی لطف آتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں سیاہ بُل فائٹنگ کے سوٹ پر سُرخ جیکٹ اور سَر پر کالا ہیٹ پہنے ایک سُرخ چادر لہراتا، ہسپانوی بُل فائٹر اکھاڑے میں داخل ہوا، تو تماشائیوں نے تالیوں اور سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کنواری لڑکیوں نے اس وجیہہ لڑکے پر پھولوں کی بارش کر دی۔ مگر بُل فائٹر نے صرف ایک گلاب اٹھا کر اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا، جو اس کی محبوبہ نے اس پر پھینکا تھا۔ میرا خاص میزبان مجھے یہ ساری روداد کسی رواں تبصرے کی طرح سُنا رہا تھا۔ یہ لڑکا اسپین کے بہترین بُل فائٹرز میں سے ایک تھا، جسے لوگ انتونیو کے نام سے جانتے تھے۔ انتونیو آج تک اسپین کے ننانوے جنگلی بھینسوں کو ایسے اکھاڑوں میں ہرا کر موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور آج اس کا یہ ایک سو واں مقابلہ تھا۔ اور اس نے اپنی محبوبہ ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا سیکڑا مکمل کر کے ماریا سے شادی کر لے گا۔ سارا شہر یہ بات جانتا تھا اور اسی لیے آج اکھاڑے میں تِل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دوسری جانب اندھیرے قید خانے میں کھڑا بھینسا بھی آج اپنی سوویں لڑائی لڑنے جا رہا تھا۔ لوگوں نے اس کی وحشیانہ طاقت کی وجہ سے اس کا نام "کلر" رکھ چھوڑا تھا، اور کلر نے اپنے بناوے گزشتہ مقابلوں میں کسی بھی بُل فائٹر کا جسم ادھیڑے بنا اسے اکھاڑے سے واپس نہیں جانے دیا تھا۔ مگر اپنے وقت کے یہ دو بہترین لڑاکا آج پہلی مرتبہ ایک دوسرے کے مدمقابل آ رہے تھے۔ انتونیو نے اپنی تلوار کی چمکتی دھار کو چُھو کر دیکھا، اور کمرے میں بند کلر نے اپنے کُھروں سے ریتیلی زمین کو کھرونچا، ماریا نے انتونیو سے وعدہ لیا تھا کہ اس آخری بھینسے کو زیر کرنے کے بعد وہ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دے گا، کیوں کہ ماریا اپنے محبوب کے توانا جسم پر مزید نوکیلے سینگوں کی کاٹ اور زخموں کے نشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ انتونیو نے اپنی سیاہ مخملی پوشاک کے سنہری بٹن بند کیے اور گھٹنوں تک لمبے مخصوص چمڑے کے جوتوں کے تسمے باندھے اور تلوار کی نوک زمین پر ٹیک کر ایک شانِ بے نیازی سے کھڑا ہو گیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہے۔ تماشائیوں کی تالیوں، سیٹیوں اور شور سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماریا نے اپنے سر پر تَنے سیاہ جالی کے نقاب والے ہیٹ کو ذرا سا سرکا کر انتونیو کو سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑا دوسرا سرخ گلاب بھی اُس پر نچھاور کر دیا۔ ٹھیک اسی لمحے میری نظر اکھاڑے میں دوسری جانب بیٹھے ایک شخص پر پڑی، جو میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تعظیم سے سر جُھکا کر سلام کیا۔ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا، مگر اس وقت میری پوری توجہ انتونیو اور کلر کے مقابلے پر تھی۔ کلر کی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر اس کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ اور اب وہ اکھاڑے میں داخل ہونے کے بعد اپنے سوویں شکار انتونیو اور کلر کے درمیان کھڑا سُرخ کپڑا لہراتے دیکھ رہا تھا، مگر کلر اتنی جنگوں کے بعد ایک بات تو اچھی طرح جان چکا تھا کہ اس کا اصل ہدف وہ بے جان سُرخ کپڑا نہیں بلکہ اس کے عقب میں کھڑا وہ سفاک دشمن ہے، جو پہلے اسے تماشے کی غرض سے خوب تھکائے گا اور پھر نڈھال کرنے کے بعد ٹھیک اس کی دو آنکھوں کے درمیان نازک جلد والے حصے میں اپنی تیز دھار تلوار پوری طرح گھونپ کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا، مگر اسے یہ لمحہ آنے سے پہلے ہی اپنے دشمن کو اپنے نوکیلے سینگوں میں پرو کر آسمان کی جانب اچھال کر اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہوگا۔ بُل فائٹنگ دراصل بھینسے اور لڑاکے (بل فائٹر) کے درمیان اعصاب کی جنگ ہوتی ہے اور جو اپنے اعصاب قابو میں رکھے، وہی فاتح بن کر اکھاڑے سے باہر نکلتا ہے۔

انتونیو نے سُرخ مخملی کپڑا لہرایا، جنگ شروع ہو گئی۔ کلر کا پہلا وار خالی گیا اور انتونیو نے اپنی تلوار سے اس کے جسم پر ایک چرکا لگا کر کلر کے مضبوط جسم پر پڑے درجنوں داغوں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ کلر غضب ناک ہو کر پلٹا اور دُور سے بھاگتے ہوئے قریب آ کر اچانک اپنا زاویہ بدل لیا۔ اس کے تیز دھار سینگ کی نوک نے انتونیو کے پہلو میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں اور ماریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ انتونیو اور کلر دونوں ہی جان چکے تھے کہ ان کا مقابلہ آج کسی عام حریف سے نہیں۔ انتونیو کے ہاتھ میں پکڑی سُرخ چادر اب دھیرے دھیرے چیتھڑوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور جہاں کلر کا جسم انتونیو کی تلوار کے چرکوں سے لہولہان تھا، وہی انتونیو کا بدن بھی بے حد مہارت اور احتیاط کے باوجود خراشوں سے بھر چکا تھا اور دونوں ہی شدید تھکن سے نڈھال تھے۔ ماریا جب اپنے محبوب کو اس خوں خوار قاتل بھینسے کے جسم سے مَس ہوتے دیکھتی تو اس کے حلق سے بے اختیار چیخ بلند ہو جاتی۔ اس نے چلا کر انتونیو سے کہا "انتونیو! بس کر دو، میرے فائٹر، یہ دیوانگی ہے۔ مقابلہ ختم کر دو۔" مگر انتونیو نے مُسکرا کر اپنی زندگی کو دیکھا اور آخری بار چادر لہرا کر پھینک دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بھینسے کی آنکھوں کے درمیان تلوار گھونپنے کے لیے تیار ہے، مگر اس نے خود کو بھی کلر کے سامنے پوری طرح عیاں کر دیا تا کہ بھینسا ساری احتیاط بھلا کر تیزی سے اس کی جانب بڑھے اور انتونیو موقع ملتے ہی اسے ختم کر دے، تماشائیوں کا شور اور چیخیں آسمان تک بلند ہو رہی تھیں اور وہ سب انتونیو کو اس دیوانگی سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انتونیو اپنی زندگی کا آخری مقابلہ ہار کر واپس پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کلر نے پلٹ کر اپنے اس بہادر دشمن کو دیکھا اور چند لمحے رک کر دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تولتے رہے اور پھر کلر غرّاتا اور منہ سے جھاگ بہاتا انتونیو کی طرف دوڑتے ہوئے لپکا۔ انتونیو نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں اکڑا کر تلوار کا دستہ مضبوطی سے اپنے ہوا میں اٹھے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ کلر بھی سمجھ گیا کہ اس کا یہ آخری حملہ ان میں سے کسی ایک کے لیے تختہ یا تختہ ثابت ہونے والا ہے۔ وہ ایک انتہائی ذہین جانور تھا اور دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے اپنے جسم کو اچانک ایک جھکائی دی، تا کہ اپنے سر کی جانب لپکتی تلوار کی نوک سے بچ سکے، مگر تلوار دستے تک اس کے سر میں اتر چکی تھی۔ خود انتونیو بھی کلر کے سُتوں وزنی جسم کی زوردار ٹکر سے کئی فٹ ہوا میں اچھلا اور جب وہ زمین کی طرف گر رہا تھا تو کلر کے نوکیلے سینگ اس کے گرتے جسم کا انتظار کر رہے تھے۔ انتونیو کے جسم میں کلر نے اپنے سینگ پرو دیے۔ اور ایک لمحے بعد ہی دونوں اکھاڑے کی ریتیلی زمین پر گرے اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے، دونوں نے آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنے بہادر دشمن کو آخری پیغام دیا "بہت خوب..... تم واقعی بہترین لڑاکا تھے میرے دشمن....." ماریا اپنے محبوب کی حالت دیکھ کر صدمے سے لہرائی اور وہیں گر کر بے سُدھ ہو گئی۔ سارے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں رو پڑیں، اپنی اپنی زندگی کے آخری مقابلے میں کلر اور انتونیو دونوں ہی برابر رہے تھے۔ تماشا ختم ہو چکا تھا۔ ٹھیک اُسی لمحے کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں اس سارے تماشے میں اتنا محو تھا کہ بُری طرح چونک گیا، یہ وہی شخص تھا، جس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھے سلام کیا تھا۔ وہ پُراسرار انداز میں مسکرایا "بہت تلاش کیا ہے تمہیں۔ آخر کار، آج پکڑے ہی گئے.....!!!

(جاری ہے)



ہاشم ندیم

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف ومنفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے اُس شخص کی طرف دیکھا، وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ''کیا ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' وہ مُسکرایا ''ہم دونوں نہیں، صرف میں تمہیں جانتا ہوں..... تم پَری زاد ہو ناں، بہروز کریم کے جاں نشین.....'' ''نہیں، میں صرف پَری زاد ہوں۔ بہروز کا جاں نشین بننے کی اہلیت نہیں ہے مجھ میں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''لوگ مجھے سیٹھ ابراہیم کے نام سے جانتے ہیں، بھارت کی شان، بمبئی میں رہتا ہوں۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بمبئی'' ہاں بھئی، بمبئی، یہ نیا نام ممبئی ہمیں تو بالکل نہیں جچتا، جو بات بمبئی میں تھی، وہ اس ممبئی میں کہاں۔ جانے یہ لوگ شہروں کے نام کیوں بدل دیتے ہیں، کتنی یادیں جُڑی ہوتی ہیں ان ناموں کے ساتھ، اب تمہارے لاہور کو کوئی کل سے اچانک ٹمبکٹو کہہ کر بلانا شروع کردے، تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' میں اس کی بے تکلفی سے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ''تم نے مجھے بتایا نہیں، تم مجھے کیسے جانتے ہو؟'' سیٹھ ابراہیم میرے ساتھ چلتے چلتے اکھاڑے سے باہر آچکا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے باہر آتے دیکھ کر گاڑی منگوالی۔ میں نے ابھی گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ سیٹھ ابراہیم کی گاڑی بھی ہماری گاڑی کے پیچھے آکر لگ گئی۔ سیٹھ ابراہیم نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ''میں شام کو تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارا مالک بہروز مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم بزنس پارٹنر تھے، باقی باتیں شام کو ہوں گی۔'' سیٹھ ابراہیم مجھے ایک نئی الجھن میں مبتلا کر کے چلا گیا، شام کو سوئمنگ پول کے کنارے بچھی کرسیوں پر وہ مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میں نے براہ راست مدّعے کی بات کی۔ ''ہاں بولو سیٹھ ابراہیم تمہیں مجھ سے ایسا کیا خاص کام ہے؟'' سیٹھ دھیرے سے مسکرایا ''تم نے شاید غور سے میرا نام نہیں سُنا۔ مجھے ابراہیم کہتے ہیں۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میرے دَم سے چلتی ہے، میں زیادہ تر دبئی میں رہتا ہوں۔ یہاں اسپین میں بھی ایک فلم کی افتتاحی تقریب میں آیا تھا۔ خوش قسمتی سے تم بھی یہیں مل گئے۔ شاید بہروز نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کاروبار کا کالا دھن ہماری فلم انڈسٹری ہی میں سفید ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وہ پرانا رشتہ برقرار رہے۔ کہو، کیا کہتے ہو.....؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں.....؟'' ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر لگا قیمتی دھوپ کا چشمہ اتارا ''ہم بھارتی فلموں میں اپنا روپیا لگاتے ہیں، ایک فلم ستّر، اسّی کروڑ تک چلی جاتی ہے۔ فلم چل جائے تو تین چار سو کروڑ لے آتی ہے، پٹ بھی جائے تو ہمارا کچھ نقصان نہیں، ہمارے ٹیکس کے وکیل اس نقصان کو تین گنا بڑھا کر ٹیکس کے گوشواروں میں بھر دیتے ہیں۔ مطلب چت بھی ہماری اور پٹ بھی۔ منافع ہو تو ساری دنیا کے سامنے سفید دھن آتا ہے، نقصان ہو تو ہمارا کالا دھن نقصان کے پردے میں چُھپ جاتا ہے۔ بولو، پیسا لگاؤ گے فلم انڈسٹری میں؟'' ''تمہاری پیش کش کا شکریہ، مگر میرا کالا دھن کمانے یا اسے سفید کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میرے پاس جو ہے، وہ بھی میری اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہیں سنبھلتا۔'' سیٹھ ابراہیم طنز سے مُسکرایا۔ ''جانتا ہوں، تم شاید پہلے بہروز کے خاص محافظ تھے، مگر یاد رکھو، اپنی سلطنت قائم رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے اور شاید تم یہ بات نہیں جانتے کہ بمبئی کی فلم انڈسٹری پر ہمیشہ سے انڈر ورلڈ کا راج رہا ہے۔ ہم ان کٹھ پتلیوں کو اپنی انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ آدھی رات کو بھی ہمارا فون چلا جائے تو ان کے بڑے بڑے ستارے بھاگے چلے آتے ہیں، ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ شاہ رخ، سلمان، کرینہ یا کترینہ کسی کے بیٹے، بھائی کی سال گرہ میں کیک کٹوانے چلے آئیں۔ یا ہمارے خاندانوں کی کسی شادی میں آئٹم نمبر پیش کرنے کو دوڑے آئیں۔ یہ سب

ہماری زیرِ زمین دنیا کی طاقت کے کرشمے ہیں اور سچ پوچھو، تو ان لوگوں پر حکومت کر کے بڑا مزہ آتا ہے۔ اور چوں کہ بہروز کریم ہماری اس سلطنت کا ایک اہم عُہدے دار تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں بھی شمولیت کی دعوت دوں۔ آگے فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے۔ ویسے تم اتنا لیے دیئے کیوں رہتے ہو۔ دبئی میں بھی مَیں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں نہیں دیکھا۔ سُنا ہے، پیتے پلاتے بھی نہیں، کیوں یہ جوگ لے رکھا ہے تم نے.....؟'' میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''شاید یہی جوگ میرا مقدر ہے، اور میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے کسی سلطنت یا رتبے کی کوئی خواہش نہیں۔ میں شاید ازلی طور پر غلام ہی پیدا ہوا ہوں، غلام ابنِ غلام..... ابنِ غلام۔ اور اب مجھ میں کوئی ''خوئے سلطانی'' پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ یہ تم جیسوں ہی کے سَر پر سجتی ہے۔'' سیٹھ ابراہیم میری بات سُن کر سنجیدہ سا ہوگیا۔ ''اتنے کڑوے سچ اتنی آسانی سے کیسے بول لیتے ہو تم.....؟ اور میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ تمہارے بہروز والے محل میں کسی

عورت کا بھی آنا جانا نہیں ہے۔ شراب، عورت اور جوا، اگر یہ سب تمہاری زندگی میں کوئی معنی نہیں رکھتے، تو پھر اتنا پیسا بھی کس کام کا۔ آخر کوئی تو خواہش ہوگی تمہاری.....؟'' میں چپ رہا، اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری خواہش ساری دنیا سے جدا ہے۔ ہر آرزو سے ہوا ہے۔ مجھے تو بس ایک نگاہ چاہیے۔ اپنے نصیب کی ایک جھلک، صرف ایک پیار بھری نظر، جو صرف میرے لیے ہو۔ بنا کسی تحقیر، نفرت، حقارت اور ترحم کے جذبات کے۔ میٹھا ابراہیم جاتے جاتے چند لمحوں کے لیے رُکا۔ ''اچھے لگے ہو تم مجھے، لالچی نہیں ہے تمہارے اندر اور جو شخص اپنی خواہشوں پر قابو پالے، وہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے۔ کبھی کسی مقام پر میری ضرورت پڑے تو یاد کر لینا، ہاں، تمہیں ایک ضروری اطلاع بھی دینی تھی مجھے۔ دبئی پولیس تم پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف تم پر بلکہ بہروز کے ہر قریبی ساتھی پر، ان کی خاص توجہ ہے آج کل..... تم اسی لیے بچے ہوئے ہو، کیوں کہ فی الحال انہیں تمہارے خلاف کسی غیر قانونی سرگرمی کی خبر نہیں ملی، مگر تمہیں بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ بہت عرصے تک بہروز کو بھولنے والے نہیں ہیں۔'' میٹھا ابراہیم واپس پلٹ گیا۔

میں دبئی واپس پہنچا تو پہلی مرتبہ اپنی اطراف غور سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے میٹھا ابراہیم کی بات ٹھیک لگی۔ دبئی ائرپورٹ ہی سے میری نگرانی شروع ہو چکی تھی، ایک سرکاری گاڑی نے گھر تک ہمارا پیچھا کیا اور پھر صبح و شام، آتے جاتے میں نے کچھ مخصوص چہروں اور گاڑیوں کو ہمیشہ اپنے گھر، دفتر اور ہر اس جگہ کے آس پاس پایا، جہاں مجھے پہنچنا ہوتا تھا۔ مجھے ایک عجیب سی گھٹن چوبیس گھنٹے محسوس ہونے لگی، جیسے وہ شہر نہیں، کوئی قید خانہ ہو، شاید سلاخوں کے پیچھے قید رہنا کھلے آسمان تلے قید رہنے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب میرا جی اس ریت اور سیمنٹ سے بنی عمارتوں کے صحرا سے اکتانے لگا تھا، لہٰذا میں نے اپنے مُلک واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ رفیق نے یہ خبر سُنی تو آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''خوش کر دیا تو نے یار..... پتا نہیں کیوں، مگر مجھے ہر وقت تیری طرف سے دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ تُو چل، میں بھی تیرے پیچھے سب سمیٹ کر واپس پلٹتا ہوں۔ ہماری مٹی اور ہمارا خمیر یہاں کا نہیں ہے یار..... چاہے ساری عُمر گزار لیں، پھر بھی ایک اجنبیت اور غیریت کا احساس ہمیشہ بے چین رکھتا ہے۔ چاہے وہاں اپنے ملک میں کچھ بھی ٹھیک نہیں، پر اس اَن جانے پن سے تو نجات ملے گی۔'' میں نے اپنے باقی اثاث کو جمع کر کے اپنی واپسی کا فیصلہ سُنایا تو وہ پریشان ہو گئے کہ پیچھے اتنا بڑا کاروبار کون سنبھالے گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں مہینے میں ایک دو بار چکر لگا لیا کروں گا اور پھر آج کل تو ہزار سہولتیں پیدا کر دی ہیں، ان نت نئی ایجادات نے۔ انسان جسمانی طور پر چاہے موجود نہ ہو، پر تصویر اور آواز کے ذریعے چوبیس گھنٹے رابطے میں رہ سکتا ہے۔ محل کے معاملات میں نے مارتھا کو کیئر ٹیکر بنا کر اس کے حوالے کر دیے اور اس سے، دبئی سے صرف بہروز کا سفید پیا تو پاکستان بھجوانے کی درخواست کی۔

میرے عملے نے دو ہفتے کی جاں فشانی کے بعد میرے لیے شہر کے سب سے پوش علاقے میں میرے لیے ایک بنگلہ خرید کر اسے اپنے طور پر آراستہ بھی کروا دیا تھا اور پھر میری روانگی کا دن بھی آ گیا۔ میں نے رفیق کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ میری واپسی کی خبر کو حتی الامکان زیادہ پھیلنے سے روکے رکھے، مگر میں اسے یہ تاکید کرنا بھول گیا کہ یہی احتیاط وہ پاکستان میں میرے خاندان والوں کے لیے بھی روا رکھے، اور پھر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا، میرے شہر کے ہوائی اڈے کے باہر انتظار گاہ میں میرا سارا خاندان گل دستے اور ہار لیے میرا انتظار کر رہا تھا، بھی، بہن بھائی اور ان کی اولاد، بھابیاں اور بھابیوں کی بہنیں اور ان کے خاندان کے بزرگ، پورا ایک لشکر میرے استقبال کے لیے موجود کھڑا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا، جب میں یہاں سے دبئی جانے کے لیے ایک پرانے رکشے میں ائرپورٹ پہنچا تھا۔ اُس دن میرے گھر کے صحن تک بھی کوئی مجھے رخصت کرنے نہیں آیا تھا۔ وقت بھی کیسی کروٹیں بدل لیتا ہے۔ نہ جانے کیسے پل میں بدل جاتے ہیں، یہ دنیا کے بدلتے رشتے..... ساری عُمر جنہوں نے پَری زاد پر سنگ باری کی، آج وہی لوگ پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے برسائے پتھروں نے اتنی چوٹ نہیں پہنچائی تھی، جتنا لہولہان مجھے ان کے پھینکے ہوئے پھولوں نے کیا۔ بھائیوں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلوں، میں تقریباً سات سال بعد واپس لوٹا تھا اور ان سات سالوں میں، میں نے اپنے سب بہن بھائیوں کو اتنا روپیا بھیجا تھا کہ وہ سب آج اپنے اپنے ذاتی گھروں کے مالک تھے، بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے گھروں میں خوش تھیں، سبھی کی خواہش تھی کہ میں کم از کم پہلا دن ان کے گھر پر گزاروں، بھابیوں کی جو بہنیں اب رشتے کے قابل تھیں، وہ پوری تیاری کے ساتھ بن ٹھن کر آئی تھیں اور ہر بھابی کی تقریباً یہی خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ میں وہیں ائرپورٹ ہی پر ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں، حالاں کہ ان مظلوم لڑکیوں کے چہروں پر لکھی بے چارگی کی داستان صاف نظر آ رہی تھی کہ وہ خود پر کس قدر جبر کر کے خود کو اس امتحان کے لیے تیار کر پائی ہوں گی۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ مجھے ایک بے حد ضروری نوعیت کی کاروباری میٹنگ کے لیے جانا ہے اور نہیں موقع ملتے ہی ان سب کی طرف فرداً فرداً حاضری دینے ضرور آؤں گا۔ میرا پاکستانی عملہ، جس کی بھرتی میرے منیجرز نے چند ہفتے قبل ہی کی تھی، حیرت سے کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ائرپورٹ کی پارکنگ لین میں سیاہ مرسڈیز گاڑیوں کا قافلہ میرے استقبال کے لیے موجود تھا اور میں کسی نہ کسی طرح سب کو مطمئن کر کے، یا شاید غیر مطمئن چھوڑ کر اپنے گھر کو روانہ ہوا تو شہر کے راستے اور گلیاں مجھے اُسی طرح خود پر مُسکراتے نظر آئے، جیسے میں انہیں سات سال پہلے مُسکاتا چھوڑ گیا تھا۔ نہ جانے ہم پردیس جا کر یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی دیس میں سب کچھ بدل چکا ہوگا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی سڑکیں، وہیں راہیں جن پر میں جانے کتنے سال تک جوتیاں چٹخاتا رہا تھا۔ میں شہر کے سب سے قیمتی علاقے میں اپنے نئے گھر پہنچا، تو مجھے ان اجنبی دیواروں سے شناسائی میں کافی وقت لگا۔ بہ ظاہر پتھر کے بے جان نظر آنے والے یہ در و دیوار بھی اپنے اندر ایک عجیب سا احساس رکھتے ہیں۔ ہم سے خوش یا ناخوش رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ہم انسانوں کی محدود سماعت ان کی یہ گفتگو سُن نہیں پاتی۔ شام کو میرے بلاوے پر کبیر بھی پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ بہت حد تک اپنے بڑے بھائی فیروز سے مشابہت رکھتا تھا۔ گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ کبیر بھی فیروز کے ذکر پر افسردہ ہو گیا، میں نے اسے گھر کی تمام تر ذمے داری سونپ دی۔ وہ شروع ہی میں اتنی بڑی ذمے داری لینے سے کچھ ہچکچا رہا تھا، مگر میرے اصرار پر مان گیا۔ میں نے اسی کو اپنا سیکورٹی انچارج بھی مقرر کر دیا اور شاید اپنے بڑے بھائی کی طرح وہ بھی اسی کام میں راحت محسوس کرتا تھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنی جیب سے ایک غیر ممنوعہ پستول کا لائسنس نکال کر مجھے دکھایا۔ ''یہ دیکھو صاب۔ ہمارے پاس اسلحے کا لائسنس بھی ہے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کسی فکر کا ضرورت

نہیں۔'' میں جانتا تھا کہ کبیر خان سچ کہہ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے لوگوں میں شمار کے لیے آج کل ذاتی محافظوں کی ایک فوج بھی لازمی درکار ہوتی ہے۔ مجھے بہروز کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ ''جیسا دیس ہو، بھیس بھی ویسا ہی ضروری ہے..... ورنہ یہ انسان عموماً دوسرے انسان کو کم تر سمجھنے میں دیر نہیں کرتا۔'' اور میں نے پردیس میں اپنی زندگی کے اتنے سال کم تر دکھائی دینے کے لیے ضائع نہیں کیے تھے۔ ہفتے بھر ہی میں سارے شہر کے امراء کو خبر ہو چکی تھی کہ ''پی زیڈ'' نامی کوئی بہت بڑا صنعت کار شہر میں اپنا کاروبار پھیلانے کے لیے وارد ہو چکا ہے۔ ہاں، پی زیڈ۔ یہی نام تجویز کیا تھا میرے منیجرز نے میری نئی کمپنی کے لیے، اور جو مجھے میرے نام سے نہیں جانتے تھے، اب میں ان کے لیے پی زیڈ نامی ایک بڑا انڈسٹریلیسٹ تھا۔ اس طرح مجھے اس تعارفی شرمندگی سے بھی عارضی طور پر نجات مل گئی تھی، جو پورا نام بتانے میں مجھے ہمیشہ اٹھانی پڑتی تھی۔

یہ دولت مند لوگ اندر سے کتنے تنہا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے چند دنوں ہی میں ہو گیا، جب چاروں طرف سے مجھے تعارفی دعوت ناموں نے گھیر لیا۔ یہ شام کی پارٹیاں، رات کی دعوتیں، ظہرانے، عصرانے اور عشائیے۔ آخر ان امیروں کو اپنے اردگرد ہر وقت اتنا ہجوم کیوں چاہیے ہوتا ہے؟ یہ سب اندر سے شدید تنہا ہونے کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے، مگر میں تو ہمیشہ ہی سے ان پُر ہجوم محفلوں سے کتراتا تھا۔ لوگوں کی تیز چبھتی نظریں، طنز اور طعنوں کا عادی ہو جانے کے باوجود میں اس تجربے کو بار بار نہیں دہرانا چاہتا تھا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سی بے چینیاں اور درد اس لیے بھی پال لیتے ہیں کہ ہمیں حقائق سے نظریں چرانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میرا اسٹاف منیجر، کمالی بہت تیز اور چلتا پُرزہ قسم کا بندہ تھا۔ وہ شہر میں ہونے والی کسی بھی بڑی تقریب کا دعوت نامہ مجھ تک پہنچانے میں دیر نہیں کرتا تھا، مگر میں ہر بار کسی نہ کسی طور اسے ٹال دیتا تھا۔

اگلے ہفتے سے میں نے سمندر کنارے ایک اعلیٰ ذاتی عمارت میں قائم اپنے دفتر جانا شروع کر دیا۔ ہمارا زیادہ تر کام ابھی تک دبئی آفس ہی سے ہوتا آ رہا تھا، مگر کمالی نے یہاں بھی خاصا عملہ بھرتی کر لیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر تعارفی مرحلے کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ ایک بات میں کبھی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ ان بڑے بڑے غیر متعلقہ دفتروں میں اتنی بہت سی خواتین کیوں بھرتی کر لی جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ کاموں کی نوعیت اس صنفِ نازک کی موجودگی سے بالکل بھی میل نہیں کھاتی۔ جیسا کہ ہماری تعمیراتی کمپنی، جانے کمالی نے اتنے بہت سے اسسٹنٹ اور ڈپٹی منیجر ٹائپ عہدوں پر ان نازک لڑکیوں کو کیوں بھرتی کر لیا۔ میرے استفسار پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''ساری بات حسِ لطافت کی ہے سر، وہ جسے انگریزی میں Aesthetic Sense کہتے ہیں۔ ویسے بھی ریسرچ نے ثابت کیا ہے کہ جن دفاتر میں خواتین، مَردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں، وہاں کے مرد ورکرز زیادہ ذمّے داری کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ لباس اور اوقات کار کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں سَر جی۔ اور دفتر کا ماحول بھی خوش گوار رہتا ہے۔'' میرا جی چاہا کہ میں کمالی سے پوچھوں کہ اس نے دفاتر اور ان کے طریقہ کار پر ہونے والی سیکڑوں تحقیقات میں سے صرف ایک اسی ریسرچ کو نافذ العمل کیوں سمجھا؟ مگر میں چپ رہا۔ دفتر میں کام کرنے والی خواتین اور لڑکیاں بھی پہلی بار مجھے دیکھ کر اسی تذبذب کا شکار ہوئیں، جو میرے لیے ہر عورت کا خاصّہ رہا تھا۔ مگر میں اس کمپنی کا مالک تھا اور ان کی مجبوری تھی کہ وہ میرے احترام میں کھڑی ہو جائیں اور مجھ سے بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ جمی رہے۔ کمالی نے میرے آنے سے پہلے ہی میرے لیے ایک تیز طرار سی لیڈی سیکرٹری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جسے میں نے پہلے دن ہی کسی ڈپٹی منیجر کے سیکشن میں منتقل کر دیا اور کمالی ہی کو اپنا پی اے بھی مقرر کر لیا۔ جانے یہ کمالی کی ترقی تھی یا تنزلی، مگر وہ اس خدمت سے بہت خوش دکھائی دیا۔ کبیر خان میرے ساتھ ہی میری گاڑی میں دفتر آتا اور میری روانگی تک عمارت کے کسی گوشے میں یا باہر گاڑی ہی میں میرا انتظار کرتا رہتا، مگر نہ جانے کیوں کمالی کی اس سے جان جاتی تھی۔ کمالی کئی بار مجھ سے دبے لفظوں میں یہ گزارش کر چکا تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ دفتر کے اندر تک نہ لایا کروں، کیوں کہ بقول اس کے، کبیر خان کا انداز ہی بڑا خوف ناک تھا۔ اور خود کبیر خان کے بھی کمالی کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں تھے۔ ''ہم کو یہ آدمی کچھ ٹھیک نہیں لگتا صاب۔ یہ بڑا چاپلوس ہے اور خوشامدی لوگ اچھا نہیں ہوتا۔'' وہ دونوں میرے لحاظ کی وجہ سے ایک دوسرے کو برداشت کرتے آ رہے تھے۔ میں نے کبیر خان کو سمجھایا کہ یہ دنیا چلتی ہی خوشامد پر ہے۔ صدر سے لے کر کلرک تک سب کسی نہ کسی خوشامد کی وجہ سے اپنی جگہ اور عُہدے پر قائم ہیں۔ خوشامد شاید دنیا کا سب سے قدیم ہتھیار ہے، جس کی دھار کسی بھی دور میں کند نہیں ہوتی۔

کچھ دن اسی ہنگامہ خیزی کی نذر ہو گئے، مگر جیسے ہی کاروباری معاملات اپنی ڈگر پر آئے، میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکال کر، اسے شہر کے وسط میں واقع ایک گنجان علاقے میں چلنے کے لیے کہا۔ تنگ سڑکوں اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گھنٹہ بھر بعد ایک کھلے میدان میں آ نکلے۔ سامنے ابھی تک وہی پرانا ٹین کا بڑا سا نصف گولائی میں کٹا بورڈ گیٹ پر آویزاں تھا، ''مستانہ گیراج'' میری آنکھوں کے سامنے ماضی کے کئی دن، پل بھر میں لہرا گئے۔ ڈرائیور کو میں نے گاڑی گیراج کے احاطے میں لے جانے کو کہا۔ اس نے دبے لفظوں میں مجھے بتانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی گاڑیوں کے لیے اپنا مخصوص ڈیلر اور گیراج شہر کے پوش علاقے میں موجود ہے، مگر میں نے سُنی ان سُنی کر دی۔ گیراج کے برآمدے میں لکڑی کے ستون کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر وہی پرانا سا ریڈیو لٹکا ہوا تھا اور فضا استاد مستانے کے مَن بھاتے گانوں کی آواز سے گونج رہی تھی ''جو درد دیا، اپنوں نے دیا، غیروں سے شکایت کون کرے.....'' گاڑی اندر داخل ہوتے دیکھ کر ایک شاگرد بھاگتا ہوا ہماری کار کی طرف آیا۔ ''جی صاحب..... حکم کریں، سروس کرنی ہے یا آئل بدلوانا ہے۔ ٹیوننگ بھی ہو جائے گی، پر آپ کی گاڑی کا انجن سیل بند ہے۔ کچھ وقت لگے گا ہماری ورک شاپ پر.....'' یہ کوئی نیا لڑکا تھا۔ کچھ دَور باقی لڑکے ویلڈنگ پلانٹ پر اسی طرح ویلڈنگ میں جُتے ہوئے تھے، جیسے کبھی میں وہاں سارا دن بیٹھ کر اپنا خون ویلڈنگ کی چنگاریوں میں جلایا کرتا تھا۔ میں نے لڑکے سے سختی سے کہا ''تمہارا استاد کہاں ہے؟ اس نے ہماری گاڑیوں کا ستیاناس کر دیا ہے، ٹھیک سے کام نہیں آتا اُسے، جاؤ، بلا کر لاؤ۔'' شاگرد گھبرا کر اندر کی جانب بھاگا اور چند لمحوں بعد استاد کی غصّے میں بھری آواز سنائی دی۔ ''ارے کون سا سیٹھ ہے میاں! ہم بھی تو دیکھیں، استاد مستانے نے آج تک اپنے کام میں ہیرا پھیری نہیں کی۔ ہم محنت کرتے ہیں، چوری نہیں کرتے۔'' استاد مستانہ اپنے مخصوص حلیے میں سر پر دو پلی ٹوپی رکھے، واسکٹ پہنے اور منہ میں پان دبائے بڑبڑاتا ہوا برآمدے سے نکل کر گیراج کے صحن میں آیا اور ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے ڈرائیور اور کبیر کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کو کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میری آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا، جسے میں نے اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ استاد بے خیالی میں غصّے میں بھرا میری طرف بڑھا۔ میں منہ دوسری جانب موڑ کر کھڑا ہو گیا اور غصّے سے بولا۔ ''کیوں استاد مستانے..... یہ گیراج ہے یا ہیرا پھیری کا اڈا.....؟'' مستانے کے سارے شاگرد برآمدے میں دم بخود کھڑے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کب ان کا بھڑکیلا استاد سب کچھ بھول کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے تیور دیکھ کر کبیر خان کا ہاتھ ہولسٹر میں بندھے پسٹل کی جانب بڑھ گیا۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

استاد مستانے کے شاگردوں نے بھی اپنے طور پر آس پاس پڑے اوزار بطور ہتھیار اٹھا لیے، کیوں کہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اُن کا استاد اکیلا ہی ہم سے بھڑ جائے گا۔ تبھی میں نے پلٹ کر بپھرے ہوئے استاد مستانے کی طرف دیکھا۔ ''کم از کم یہ سات سو سال پرانا ریڈیو تو بدل لیتے استاد..... اب تو اس کے اردو گانے بھی چائنیز میں سُنائی دیتے ہیں۔'' استاد کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی جیسے وہ اپنی جگہ جامد ہو گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے ایک جھڑی سی جاری ہو گئی اور دوڑ کر روتے ہوئے میرے گلے لگ گیا۔ ''او بے وفا.....! اتنے دن بعد اپنے استاد کی یاد آئی۔ مجھے رفیق نے فون کر کے بتایا تھا کہ تم واپس آ چکے ہو۔'' سارا گیراج ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا اور پھر چند پرانے شاگردوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور ہمارے گرد ایک جمگھٹا سا لگ گیا۔ استاد نے بڑی مشکل سے انہیں ڈانٹ کر کام پر لگایا، مگر وہ سب بہانے بہانے سے میری کار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ وہ سب جان چکے تھے کہ کل تک میں بھی انہی میں سے ایک تھا، مگر آج اُن کے سامنے ان کے خوابوں کی تعبیر بنا کھڑا تھا۔ ہم کم زور اور بے بس انسان جنم سے لے کر فنا تک یہی تو کرتے رہتے ہیں، اپنے خوابوں کا پیچھا، ان خوابوں کو سچ کرنے کی دُھن میں مگن..... مگر ہر ایک کے حصّے میں تعبیریں بھلا کب آتی ہیں اور گیراج کے معصوم لڑکے یہ بات نہیں جانتے تھے کہ میں آج جو کچھ تھا، یہ کبھی میرا خواب نہیں رہا تھا۔ میں نے تو بہت چھوٹا سا سپنا بُنا تھا۔ بہت معصوم سا خواب تھا میرا، مگر اس کی تعبیر کے لیے جانے مجھے ابھی کتنے طویل رستوں سے گزرنا باقی تھا کہ منزل ابھی تک لاپتا تھی۔ شاید ہر انسان ہی کا مقدر، اپنے خوابوں کو کسی اور کے لیے تعبیر ہوتے دیکھنا ہوتا ہے اور اس کا اپنا خواب سدا کے لیے خواب ہی رہ جاتا ہے۔

استاد مستانے نے نکڑ کے ہوٹل سے میری پسندیدہ دودھ پتّی چائے منگوالی اور خود میرے سامنے بیٹھ کر ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا۔ ''تم نے تو واقعی کر دکھایا پیارے، ورنہ میرا تو کرامات سے یقین ہی اُٹھ چلا تھا۔ جو تم نے چاہا، تمہیں مل گیا۔ ایسا دنیا میں کہاں ہوتا ہے بھلا۔'' میں نے مسکرا کر استاد کی طرف دیکھا۔ ''صرف تھوڑی سی دولت آ گئی ہے، میرے پاس باقی کچھ نہیں بدلا استاد..... میں ابھی تک وہی پَری زاد ہوں۔'' استاد نے پینترا بدل کر کہا۔ ''کمال کرتے ہو تم، دولت سے بڑی تبدیلی بھی کوئی اور ہوتی ہے کیا.....؟ لوگوں کی زندگیاں صرف ہو جاتی ہیں چند دھیلے کمانے میں۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو، سدا کے کنگال ہی رہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کوئی شادی وادی بھی کی ہے یا نہیں، یا ابھی تک وہی شرمیلے، کنوارے پَری زاد ہو؟'' میں نے مزے دار چائے کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ''مجھ سے بھلا کون شادی کرے گی استاد، اور پھر شاگرد بیاہ کر لے اور اس کا استاد کنوارا رہے، یہ کہاں کا دستور ہے؟'' استاد نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''کیوں اس عُمر میں میری لٹیا ڈبونے کی بات کرتے ہو پَری زاد پیارے، اور یہ کیا بات کر دی کہ تم سے کون بیاہ کرے گی، ذرا اعلان تو کر کے دیکھو نکاح کا، پورا سوئمبر رچے گا تمہارا تو.....'' میں نے استاد کی بات دوسری جانب موڑ دی۔ ''میری شادی کی بات چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ گیراج کا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ لگتا ہے برسوں سے رنگ و روغن نہیں کروایا۔ کام والی گاڑیاں بھی اِکا دُکا کھڑی نظر آ رہی ہیں، صحن میں۔ یہ سب کیا ہے.....؟'' استاد نے میری بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''کچھ نہیں دھندے میں تو بھلا مندا چلتا ہی رہتا ہے، تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟'' اتنے میں چائے کے برتن اٹھانے والے لڑکے نے ہماری بات سُن کر راز کھول ہی دیا۔ ''پَری زاد بھائی! گیراج تو گِروی پڑا ہے ہمارا تین سال سے۔ استاد غلط بتا رہا ہے، کوئی دھندا نہیں، صرف مندا ہی مندا ہے آج کل یہاں۔'' استاد نے آنکھیں دکھاتے ہوئے اسے بُری طرح سے جھاڑ پلائی۔ ''کم بخت! تُو باز نہیں آئے گا بڑوں کی باتوں میں دخل دینے سے، چل دفع ہو، جا کر اس اٹھتر بیاسی کرولا کے ڈینٹ نکال۔ شام تک مجھے گاڑی تیار چاہیے، ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری۔'' لڑکا منہ بسورتا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے استاد کی طرف دیکھا۔ ''یہ میں کیا سُن رہا ہوں استاد! گیراج گِروی پڑا ہے، کیوں.....؟'' استاد نے ایک لمبی سانس بھری۔ ''اب کیا بتاؤں پَری زاد! پرانے میکینک اور گیراجوں کا کام ٹھپ ہو چکا ہے۔ گاڑیوں کے انجن اب سیل بند آتے ہیں۔ ٹیوننگ اور مرمت کمپیوٹر والی مشینوں پر ہوتی ہے۔ ٹائر بنا ٹیوب کے آ گئے ہیں اور خرّاد کا کام اب ماڈرن مشین کرتی ہے۔ ہمارے پاس تو وہی چند پرانی کھٹارا گاڑیاں آتی ہیں، جن کا مزاج یہ نئی مشینیں سمجھ نہیں سکتیں۔ خرچے تمہارے سامنے ہی تھے سارے۔ ایسے میں گیراج گِروی نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ مجھے اپنی فکر نہیں، بس یہی سوچ کر پریشان رہتا ہوں کہ گیراج کی قرقی یا نیلامی کے بعد نیا مالک کہیں ان بچّوں کو بے روزگار نہ کر دے۔ تم تو جانتے ہو، ان سب کے گھر، ان ہی کے دم سے چلتے ہیں۔ کئی دفعہ ان سے کہا کہ کم بختو، جاؤ جا کر کوئی نیا دھندا ڈھونڈو..... پر، یہ ہیں کہ یہاں سے ٹلتے ہی نہیں۔'' میں چُپ چاپ بیٹھا استاد کی ساری بات سُنتا رہا۔ ''کس کے پاس گِروی رکھا ہے یہ گیراج تم نے.....؟'' استاد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ اسی علاقے کا ایک مارواڑی سیٹھ، بھلا آدمی ہے۔ قرقی کی تاریخ سے پہلے تنگ نہیں کرے گا۔'' ''مجھے اس سیٹھ کا نام اور مکمل پتا چاہیے استاد۔'' استاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں پیارے! استاد اپنے شاگردوں کو دیتا ضرور لیتا کچھ نہیں۔'' میں نے استاد سے زیادہ بحث نہیں کی اور کمالی کو فون کر کے گیراج پہنچنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ہڑبڑایا سا گیراج میں موجود تھا۔ میں نے گیراج کے سب سے سینئر شاگرد کو کمالی اور ڈرائیور کے ساتھ سیٹھ کی طرف بھجوا دیا، جس کا پتا گیراج کے سبھی لڑکے جانتے تھے۔ تین گھنٹے بعد ہی کمالی رہن رکھے گئے کاغذات کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ ''میں نے جائداد کی آزادی کے کاغذ استاد کی جھولی میں ڈال دیے۔ ''یہ گیراج جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی میرا بھی ہے استاد۔ اگلے ہفتے تک نئی کمپیوٹرائزڈ مشینری بھی آ جائے گی اور تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ اپنی نگرانی میں میرے اس گیراج کو ایک دم ٹپ ٹاپ بنا دو۔ اگلی دفعہ جب میں اپنے گیراج کو دیکھنے آؤں، تو مجھے یہاں میرا پرانا استاد مستانہ چاہیے۔ ہاں، مگر یہ ریڈیو نہ بدلنا۔ اس کے بِنا یہ گیراج مکمل نہیں ہوگا۔'' استاد مستانہ گم صم سا ہاتھوں میں قرقی کھلنے کے کاغذات لیے بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے مُڑا۔ استاد نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ ''پَری زاد.....'' میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ میرے گلے لگ گیا۔ میرے آس پاس گیراج کے سارے لڑکے جمع

ہو چکے تھے، کسی نے میرے ہاتھ تھام رکھے تھے، تو کوئی میرے شانے سے لگا کھڑا تھا۔ یہ کم بخت، بے جان اور کھردرے کاغذ کے چند روپے اپنے اندر کتنی خوشیوں پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ کیسے کیسے کرتب، کرشمے دکھاتا ہے یہ پیسا۔ روتوں کو ہنسا دیتا ہے اور ہنستوں سے پھڑکرا نہیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے اور یہ دولت مند کتنے ان جان رہتے ہیں، اس پیسے کے استعمال سے۔ کاش! ان بے جان کاغذ کے ٹکڑوں کا صرف ایک مصرف ہوتا، خوشیوں کا کاروبار۔ ان لڑکوں کے چہروں پر ایسی خوشی تھی کہ جس کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی لٹا دی جاتی تو کوئی گھاٹے کا سودا نہ ہوتا، مگر عموماً قدرت جنہیں دولت دیتی ہے، بدلے میں ان کا دل نکال لے جاتی ہے، شاید اسی لیے یہ دنیا دل والوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

گیراج سے نکلتے نکلتے سہ پہر کے چار بج گئے۔ دفتر جانے کا وقت تو رہا نہیں تھا، میں نے ڈرائیور کو گاڑی گھر کی طرف موڑنے کا کہہ دیا اور پھر واپسی پر میری نظر اپنی پرانی یونی ورسٹی کے بورڈ پر پڑی۔ میں نے گاڑی رکوا دی اور کچھ دیر کے لیے نیچے اتر کر گیٹ سے اندر چلا گیا۔ اس درس گاہ میں، میں نے اپنی زندگی کے چند اچھے دن گزارے تھے، اچانک ہی میرے اندر خود میرے ہی ہاتھوں دفنایا ہوا، وہ ایک ناکام سا شاعر جاگ اٹھا، جس کے کلام پر داد و تحسین سے کبھی وہ سامنے نظر آنے والا بڑا آڈیٹوریم گونج اٹھتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ دبئی جاتے وقت میں اپنی ساری نظمیں اور کلام ٹین کے ایک بکسے میں بند کر کے اپنے پرانے گھر کے چھت والے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ جانے اب وہ سارے رجسٹر اور کاغذوں کے دستے کہاں ہوں گے۔ کاش! میں وہ سب اپنے ساتھ ہی دبئی لے جاتا۔ میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ میرے عقب میں ایک مانوس سی بھاری آواز گونجی۔ ''تم پُری زاد ہو ناں.....'' میں چونک کر پلٹا۔ میرے عقب میں کھڑی میری گاڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ شیروانی اور جناح ٹوپی پہنے کھڑے مجھے اپنی نظر کے چشمے کے پیچھے سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ''جی..... میں پُری زاد ہوں..... مگر آپ.....؟؟'' وہ میری طرف بڑھے۔ ''بھول گئے، یادداشت کی کم زوری تو بڑھاپے سے مشروط ہوتی ہے، مگر میں نے تو تمہیں پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا۔'' میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ''مجھے پہچاننے کے لیے شاید یادداشت شرط نہ ہو۔ آپ شاید سراحمد ہیں، ہمارے لائبریری انچارج؟؟'' وہ مسکرائے۔ ''ٹھیک پہچانا۔ تمہارے جانے کے بعد اردو بزم ادب کا شعبہ بھی میرے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تمہاری کہی ہوئی نظمیں آج تک جامعہ کے ادبی پرچے میں چھپتی رہتی ہیں اور تمہاری وہ اسٹیج ڈرامے والی نظم ''اگر تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے.....'' ہر سال جب بھی اوتھیلو اسٹیج کیا جاتا ہے، پس منظر میں تمہاری وہ نظم ضرور دہرائی جاتی ہے۔'' میں خاموشی سے احمد صاحب کی بات سنتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ انہیں بتا دوں کہ میں وہ شاعری بھی کسی خاص مقصد سے کیا کرتا تھا۔ کالج کی چند مہ جبینوں میں اک ذرا سی توجہ حاصل کرنا مقصد تھا میرا، اور بس..... انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، تم اچانک یونی ورسٹی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے، تعلیم مکمل کی یا نہیں؟'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''کچھ مجبوریاں تھیں سر، مجھے دبئی جانا پڑا۔'' سراحمد نے پلٹ کر میری قیمتی گاڑی اور گارڈز کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے، تم نے وقت ضائع نہیں کیا وہاں، لیکن تم یہاں باہر لان میں کیوں کھڑے ہو، اندر چلو۔ بہت سے طالب علم تم سے ملنا چاہیں گے۔ شعبۂ اردو میں اکثر تمہاری نظموں پر بات چلتی ہے۔'' میں نے طریقے سے معذرت کی۔ ''نہیں سر..... آج نہیں، یہ میرا کارڈ ہے۔ کبھی فرصت ملے تو میرے دفتر چکر لگائیے گا۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

یونی ورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد بھی، میں بہت دیر تک یونی ورسٹی کی یادوں کو اپنے ذہن سے نکال نہیں پایا۔ مجھے وہ نٹ کھٹ سی لبنیٰ بھی یاد آئی۔ جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ سیٹھ عابد سے شادی کے بعد کبھی اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا تھا۔ لبنیٰ کی ماں کے ایک جملے نے میری زندگی کے تمام راستے بدل دیے تھے، مگر میں دولت کمانے کی دھن میں ایسا مگن ہوا کہ اپنے اندر بسنے والے اُس حساس اور نازک انسان کو بھی کچل کر رکھ دیا، جو کبھی میرا سب سے اچھا دوست تھا، لیکن اس ساری تگ و دو سے مجھے کیا ملا۔ میں تو آج بھی اتنا ہی تنہا اور اکیلا تھا، نہ کسی کے حرفِ دعا میں تھا، نہ کسی کے وسیع طلب میں..... نہ کسی کی آنکھ کا نور تھا، نہ کسی کے دل کا قرار..... مجھے ٹیرس پر بیٹھے جانے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ باہر اندھیرا پھیل کر شام کو رات کی سیاہ چادر میں لپیٹ رہا تھا۔ لوگ دن اور رات کو ایک دوسرے کی ضد کہتے ہیں، مگر مجھے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی لگتے تھے، پکے دوست..... تبھی تو جب دن شدید تھکن سے چُور ہو کر شام تک ہانپنے لگتا ہے، تب شام اپنی مہربان سہیلی، رات کو آواز دے کر بلاتی ہے اور رات اپنی کالی شال میں اس تھکے ماندے دن کو سمیٹ کر سلا لیتی ہے۔ یوں شاید ہر رات کی گود میں ایک بھرپور دن آنکھیں موندے سویا رہتا ہے، بس ہمیں ہی نظر نہیں آتا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے آ کر بتایا کہ کمالی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کمالی ٹیرس پر آیا تو معمول سے کچھ زیادہ پُرتکلف لباس میں ملبوس تھا۔ ''یہ کیا سر.....؟ آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے، ہمیں سیٹھ رحمان کے فارم

ہاؤس جانا ہے، پارٹی میں۔ شام سے تین مرتبہ وہ خود مجھے یاد دہانی کروا چکے ہیں کہ یہ دعوت خاص طور پر آپ کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔'' میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ ''میرا موڈ نہیں ہے کمالی، تم میری طرف سے کوئی مناسب معذرت پیش کر دینا.....'' کمالی گڑبڑا سا گیا۔ ''نہیں سر! اچھا نہیں لگے گا، سارے شہر کے امراء وہاں اکٹھے ہوں گے اور پھر ہمیں وہاں اپنے نئے ٹینڈرز کے امیدواروں سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ نیا نیا کاروبار ہے اپنا سر۔ یہ میل جول رکھنا ضروری ہے۔'' میں نے دل نخواستہ خود کو بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور گھنٹے بھر بعد ہم سیٹھ رحمان کے فارم ہاؤس کی راہ پر گامزن تھے۔

آج کل امیروں کا یہ ایک نیا مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ شہر میں ٹھیک ٹھاک عالی شان گھر یا جائداد ہونے کے باوجود، کسی ویرانے میں سیکڑوں ایکڑ اراضی پر ایک فارم ہاؤس تعمیر کیا جاتا ہے، جہاں ایسی ہی کاروباری اور غیر رسمی دعوتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہ فارم ہاؤسز ایک طرح سے امراء کا اسٹیٹس سمبل بھی ہوتے ہیں اور کچھ خاص لوگوں کے لیے پردے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سیٹھ رحمان کا فارم ہاؤس بھی کچھ ایسا ہی پردہ محسوس ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ گھاس کے میدان اور گالف کورس کے درمیان بنی شیشے کی عمارت، جس کے آس پاس مصنوعی نہر اور فواروں کے ذریعے پانی کے بہاؤ کا انتظام موجود تھا۔ انسان مادی طور پر چاہے جتنی بھی ترقی کر لے۔ پانی اور سبزہ اس کی جبلت سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ ہمارے ذہنوں میں جنت کا تصور بھی تو بہتی نہروں، ٹھنڈے چشموں اور گھنے

سایوں ہی کی صورت نقش ہے۔ سارا فارم ہاؤس برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا، باربی کیو کا بندوبست بھی باہر سبزے ہی میں کیا گیا تھا۔ میں وہاں موجود لوگوں سے صرف نام کی حد تک ہی واقف تھا، مگر لگتا تھا کہ کمالی نے میرا کافی تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ تبھی وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میری کمپنی اگلے ہفتے ایک بہت بڑا آرڈر ٹینڈر کرنے والی تھی۔ معیاری آلات کی فراہمی اور ایک نئی جدید ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے ہمیں بہت بڑی مالیت کا ٹھیکا دینا تھا اور وہاں پارٹی میں موجود سبھی کاروباری طبقے اس ٹھیکے میں دل چسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ سیٹھ رحمان پچاس پچپن سالہ

ایک گھاگ اور شوقین مزاج شخص تھا، جسے باتیں بنانے کے فن سے کافی آگاہی تھی۔ اس نے فرداً فرداً سبھی مہمانوں سے میرا تعارف کروایا اور وقتاً فوقتاً اپنی گفتگو کے دوران مجھے یہ جتانے میں قطعاً عار محسوس نہیں کی کہ وہ ہماری کمپنی کے ٹھیکے میں کافی دل چسپی رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کمالی جس طرح سیٹھ رحمان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا، اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے کمالی کو بھی خوش کر رکھا ہے۔ ''کیا بتاؤں سر جی..... یہ اپنے رحمان صاحب تو یاروں کے یار ہیں، بڑا اعلیٰ گلا رہتا ہے، ان کے فارم ہاؤس پر۔ صوبائی اور وفاقی وزراء اور نوکر شاہی تو سمجھیں کہ بس ان ہی کی دل دادہ ہے، آج بھی جو کافی منسٹرز اور سیکرٹریز آپ کو اس دعوت میں نظر آ رہے ہیں، یہ ان ہی کا کمال ہے۔ سبھی کو خوش رکھنے کا فن تو کوئی رحمان صاحب سے سیکھے۔'' کمالی کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ اس محفل میں مجھے ایک اور ادراک ہوا۔ اخلاقیات اور شرم و حیا کے معیارات ہر طبقے میں اپنے اپنے طور پر طے اور رائج شدہ ہوتے ہیں۔ محفل میں زرق برق اور جھلمل کرتے ملبوسات میں خواتین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو اس آزادانہ ماحول میں یہاں وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھیں اور ان میں زیادہ تر وہ تھیں، جو کسی نہ کسی بڑے آدمی کے ساتھ بطور ''دوست'' اس محفل میں شریک تھیں۔ تعارف کے دوران ان میں سے اکثر نے مجھ سے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ کبھی مشرقی اقدار میں زنانے اور مردانے کا رواج ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی محفلوں اور دعوتوں میں مرد اور خواتین الگ الگ حصوں میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ دولت کی فراوانی کا ان بدلتی قدروں سے کوئی تعلق نہیں تھا، کیوں کہ دولت اور پیسا تو ان کے پاس آج کے ان دولتیوں سے کہیں زیادہ تھا، تو پھر یہ آزاد خیالی اور بے حجابی ہمارے معاشرے میں کہاں سے در آئی۔ چوں کہ انسان کی ابتدا پتھر کے دور سے ہوئی تھی، تو شاید اس کا اختتام بھی پتھر کے دور ہی پر ہوگا۔ درمیانی مدت مکمل عروج اور پھر یک سر زوال کا محض ایک دورانیہ ہی تو ہے، کھانے سے پہلے ہر طرح کے غیر ممنوعہ اور ممنوعہ مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ انسان خدا سے ہمیشہ عقل اور ہوش مندی کا طلب گار رہتا ہے تاکہ زندگی متوازن اور خوش گوار گزار سکے، مگر شام ہوتے ہی ہم میں سے اکثر اس ہوش مندی سے گھبرا کر خود کو مدہوشی کے اندھیرے کنوئیں میں کیوں اتار لیتے ہیں، مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ میرے اردگرد مصنوعی مدہوشی کا دور دورہ تھا، عارضی اور جھوٹی بے خودی۔

میں نے اکتا کر کمالی کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے لپک کر میرے قریب آیا۔ ''اتنی جلدی سر..... کھانا بس لگنے ہی والا ہے۔ سیٹھ رحمان کو کسی خاص مہمان کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی کھانا چُن دیا جائے گا۔'' میں نے اکتاہٹ سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ''ہماری حاضری لگ گئی ہے، تم اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' کمالی نے سر ہلایا اور سیٹھ رحمان کو روانگی سے مطلع کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے ابھی کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ کسی جانب سے رحمان، کمالی کے ساتھ تیز اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا نمودار ہوا۔ ''یہ کیا پی، زیڈ صاحب! آپ ابھی سے چل دیے۔ ابھی تو شام اور محفل ٹھیک طرح سے بھیگی بھی نہیں.....'' میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''میں شام دیر تک اوس میں بھیگتا رہوں، تو مجھے زکام ہو جاتا ہے۔ بھیگنے کے معاملے میں کم ظرف واقع ہوا ہوں میں۔'' سیٹھ میری بات سُن کر زوردار قہقہہ لگا کے ہنسا۔ ''خوب..... بہت خوب..... بھئی میں تو سمجھتا تھا کہ پورے شہر میں، صرف ایک میں ہی بذلہ سنج باقی بچا ہوں، مگر آج اپنا مقابل دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اب تو میں آپ کو ہرگز اتنی جلدی واپس نہیں جانے دوں گا، محفل کے بعد بیٹھ کر آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ برسوں بعد کسی ہم زاد سے واسطہ پڑا ہے۔'' میں نے بہت جان چھڑانے کی کوشش کی کہ ''کل ایک اہم پروجیکٹ کے لیے میٹنگ کی تیاری کرنی ہے، مگر سیٹھ رحمان اڑ گیا۔ ''نہیں بھئی، ابھی تو آپ کو اس محفل کی جان سے ملوانا ہے، شہ پارہ بیگم..... چوٹی کی ایکٹریس ہیں..... بڑی دھوم مچائی ہے انہوں نے فلم انڈسٹری میں۔ ویسے تو وہ کبھی کسی پبلک پلیس پر یوں آتی جاتی نہیں، مگر ہمارے ساتھ کچھ دیرینہ مراسم کا خیال ہے انہیں، اسی لیے آ رہی ہیں۔ یہ لیں، شاید یہ ان ہی کی گاڑی ہے، وہ آ گئیں، آپ بس دو لمحے انتظار کریں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے اُن سے..... وہ خود بھی بہت مشتاق تھیں آپ سے ملنے کی۔ سچ پوچھیں تو وہ صرف آپ سے ملنے ہی آ رہی ہیں۔'' سیٹھ رحمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور میرا سوال میرے مُن ہی میں مچل کر رہ گیا کہ وہ بھلا مجھے جانتا ہی کتنا تھا کہ اسے میری تعریف کی ضرورت پڑ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سیٹھ رحمان ایک زرق برق، ناز و ادا کے پیکر کو لیے میری طرف آتا نظر آیا۔ میری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر ساتھ چلتی عورت پر پڑی تو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کو جانتا تھا، مگر تب اس کا نام شہ پارہ نہیں تھا۔ شہ پارہ کی نظر میری نظر سے ٹکرائی، تو وہ بھی ایک جھٹکے سے ٹھٹھک کر وہیں جم گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''پکچر کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پُری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سیٹھ رحمان کے ساتھ آنے والی عورت لبنیٰ تھی۔ ہاں وہی میری یونی ورسٹی کی سب سے خُوب صورت اور طرح دار لبنیٰ، جس کی شادی سیٹھ عابد نامی ایک دولت مند کباڑیے سے ہوگئی تھی، سیٹھ رحمان ہم دونوں کی کیفیت سے بے خبر ہمارا تعارف کروانے میں مصروف تھا۔ ''شہہ پارہ بیگم! ان سے ملیں، یہی ہیں، پی زیڈ صاحب اور آج کل شہر میں بس انہی کے چرچے ہیں اور یہ ہیں شہہ پارہ... ہمارے ملک کی نام ور آرٹسٹ، پڑوسی ملک میں بھی اپنی اداکاری سے دھوم مچا چکی ہیں۔ آج ہم نے خاص آپ سے ملاقات کے لیے انہیں مدعو کیا ہے''۔ لبنیٰ چپ چاپ کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ ''ہماری پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے رحمان صاحب، مگر تب یہ پی زیڈ نہیں تھے اور نہ مَیں شہہ پارہ''۔ سیٹھ رحمٰن کو شہہ پارہ کی بات سُن کی حیرت کا ایک جھٹکا لگا ''ارے... واقعی... بھئی پی۔ زیڈ صاحب، آپ تو واقعی چھپے رستم نکلے، جب کہ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اس گوہرِ نایاب سے دوستی کا شرف صرف ہمیں ہی حاصل ہے''۔ لبنیٰ عرف شہہ پارہ نے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھے بغیر کہا ''ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیجیے رحمان صاحب... پُرانے بچھڑے ہوئے ملیں، تو کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے دونوں کے درمیان''۔ سیٹھ رحمان لبنیٰ کی بات سُن کر ہڑبڑا کے بولا ''ہاں ہاں، کیوں نہیں، آپ لوگ باتیں کریں، میں کھانا لگوانے کا انتظام کرتا ہوں''۔ سیٹھ رحمان جاتے جاتے بھی ہمیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ لبنیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی میرے قریب آگئی ''پُری زاد... یہ تم ہو ناں! مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا، تو تم ہو شہر کے وہ نئے بگ شاٹ، بڑے صنعت کار، میرا تعلق اب فلم انڈسٹری سے ضرور ہے، مگر ایسا میں نے صرف فلموں ہی میں ہوتے دیکھا ہے۔ تم واقعی ایک فاتح ہو پُری زاد...'' میں نے لبنیٰ کی طرف دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی خُوب صُورت اور جاذبِ نظر تھی، بلکہ اس کے حُسن میں اب اُداسی کی آمیزش نے ایک عجیب سا رنگ بھر دیا تھا۔ حُسن اداس ہو تو کتنا مکمل ہو جاتا ہے۔ ''نہیں، مَیں کبھی فاتح نہیں رہا، بس ہارتا ہی آیا ہوں، مگر تم اور یہ شہہ پارہ، یہ سب کیا ہے، تمہارا شوہر کہاں ہے، وہ سیٹھ عابد...؟'' لبنیٰ دھیمے سے مسکائی ''سیٹھ عابد ایک کام یاب سودا گر تھا۔ اسے جب تک شادی کے سودے میں اپنا فائدہ نظر آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جب سُود سمیت سارا منافع وصول ہوگیا، تو تین لفظ کہہ کر آزاد کر دیا۔ تم نہیں جانتے پُری زاد، اُسے سودے بازی خوب آتی تھی''۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''نہیں، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کیسا سودے باز تھا''۔ لبنیٰ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''اوہ! اس کا مطلب میرا شک صحیح تھا۔ اس نے تم سے بھی تمہاری شاعری کا سودا کیا تھا ناں، مجھے ہمیشہ اس کے نام سے چِھپی اس کتاب کے لفظوں میں تمہاری جھلک نظر آتی تھی، مگر میں خود کو کبھی یہ یقین نہیں دلا پائی کہ تم اپنے فن کو سیٹھ عابد جیسے کسی دکان دار کے ہاتھ بیچ سکتے ہو؟'' میں نے لبنیٰ کی سیاہ غزالی آنکھوں میں چُھپے سوال کا جواب دیا۔ ''ابھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ سیٹھ عابد ایک بہت کام یاب سودا گر تھا۔ اُسے ٹھیک وقت پر اپنے مطلب اور لوگوں کی مجبوریوں کی قیمت لگانا خوب آتا تھا، سچ پوچھو تو آج جو تم مجھے پُری زاد سے پی زیڈ صاحب بنا دیکھ رہی ہو، اس کے پیچھے کہیں نہ کہیں سیٹھ عابد سے کیے ہوئے اس سودے کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر تم یہاں اس محفل میں کیسے، یہ سیٹھ رحمان تو بڑا کائیاں شخص دکھائی دیتا ہے، اور تم اس کی خاص مہمان ہو، یہ سب کیا ہے؟'' لبنیٰ نے ذرا دور کھڑے سیٹھ رحمان کی طرف دیکھا، جو مہمانوں کو کھانا لگنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ ''یہ سیٹھ بھی ایک کام یاب دکان دار ہے، اس نے مجھے تمہیں رجھانے کے لیے آج یہاں مدعو کیا ہے۔ تمہاری فرم سے کوئی ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب میرا مصرف ان بڑے صنعت کاروں کے ہاں بس اتنا ہی رہ گیا ہے''۔ میں نے دکھ سے لبنیٰ کی طرف طرف دیکھا۔ ''اور فرض کرو تم مجھے رجھانے میں ناکام رہتیں، پھر... پھر کیا ہوتا؟'' ''کچھ زیادہ نہیں، میری بچی کھچی عزتِ نفس کو مجروح کیا جاتا اور پھر کسی اور سودے کے لیے پیش کر دیا جاتا، کیوں کہ میری ماں دنیا سے جاتے جاتے اتنے ادھار میری ذات کے لیے چھوڑ گئی ہے کہ اب میں چاہوں بھی تو ان زنجیروں سے خود کو آزاد نہیں کر سکتی''۔ اتنے میں سیٹھ رحمان ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ''مخل ہونے کی معذرت چاہتا ہوں، مگر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ باتوں کے لیے تو ساری رات پڑی ہے، اور پھر مجھے تو لگتا ہے کہ شہہ پارہ بیگم ہم سے کہیں زیادہ آپ کی باتوں کی قدر داں ہیں، ورنہ اتنی لمبی گفتگو تو یہ کسی سے نہیں کرتیں۔ ہم تو بات کرنے کو ترس جاتے ہیں صاحب...''۔ میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ ''نہیں سیٹھ صاحب! اب میں چلوں گا، آپ کا کھانا شاید مجھ سے ہضم نہ ہو سکے۔ کل آپ اپنے مینیجر کو میرے دفتر بھیج دیجیے گا۔ یہ ٹھیکہ آپ ہی کو ملے گا اور یہ کیا، اس جیسے مزید جتنے سودے آپ کرنا چاہیں، میری طرف سے ہاں ہی سمجھیے گا۔ بدلے میں مجھے صرف کسی کی آزادی درکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔ اگر منظور ہو تو اپنے مینیجر کو قیمت بتا کر بھیجیے گا''۔ میں بات ختم کر کے وہاں سے چل پڑا اور سیٹھ رحمان ہکا بکا سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مُڑتے وقت میں نے لبنیٰ کی آنکھوں کی نمی، اپنی آنکھوں میں اُترتی محسوس کی تھی اور پھر ساری رات اس نمی نے میری پلکیں بھگوئے رکھیں۔ بظاہر باہر سے اُجلی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک لیے یہ دنیا اندر سے کبھی کبھی کتنی تاریک اور سیاہ نکلتی ہے۔

اگلے روز سیٹھ رحمان کا مینیجر اپنے وقت پر آن پہنچا۔ واقعی سیٹھ رحمان ایک کام یاب سودا گر تھا۔ مگر نہ جانے کیوں پھر بھی اس کی لگائی ہوئی قیمت مجھے بہت کم محسوس ہوئی۔ لوگ عموماً جسموں کے سودے کرتے وقت ان کے اندر بسی روح کی قیمت لگانا بھول جاتے ہیں۔ کمالی پچھلے دو چار دن سے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، مگر اس روز سیٹھ رحمان کے مینیجر کے جانے کے بعد اپنی چُپ پر قابو نہیں رکھ پایا ''اگر آپ بُرا نہ مانیں سَر! تو میں ایک بات کہنے کی جسارت کرنا چاہتا ہوں، عہدے اور رتبے میں آپ مجھ سے بہت بلند ہیں، مگر عُمر میں مَیں آپ سے بڑا ہوں۔ لہٰذا مجھے میرے تجربے کی رعایت دیتے ہوئے کچھ عرض کرنے دیں''۔ میں نے اطمینان سے اس کی یہ لمبی تمہید سُنی۔ ''جتنی دیر میں تم نے یہ تمہید باندھی ہے، تم اپنی بات ختم بھی کر سکتے تھے''۔ کمالی میری بات سُن کر سٹ پٹا سا گیا۔ ''جی سَر... میں بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ رحمان کی بہت زیادہ قیمت لگا دی۔ میں جانتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی پیسا ہے، اور اُسے خرچ کرنے کا حق بھی صرف آپ ہی کو ہے، مگر آپ کو ابھی سودے بازی نہیں آتی۔ میں جب آپ کو یوں بے دریغ دوسروں پر پیسا لُٹاتے دیکھتا ہوں، تو نہ جانے کیوں بہت دُکھ ہوتا ہے۔ عُمریں لگ جاتی ہیں، یہ پیسا کمانے میں۔ اس طرح تو آپ خود کو بہت جلد برباد کر دیں گے۔ اگر جذبات میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہے، تو مَیں معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھا''۔ کمالی بات ختم کر کے چُپ ہوگیا۔ ''تم نے ٹھیک کہا کمالی! مجھے سودے بازی نہیں آتی، اچھا سودا گر نہیں ہوں میں۔ انسانوں کی قیمت لگانا نہیں جانتا، کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قیمت صرف چیزوں

کی لگائی جاتی ہے، انسان اور رشتوں کی نہیں۔ اچھا میرے ایک سوال کا جواب دو، عام طور پر انسان، پیسا کس لیے کماتا ہے؟'' کمالی نے بلا تامل جواب دیا ''اپنے خواب پورے کرنے کے لیے سر! اپنے لیے آسائشیں اور آسانیاں پیدا کرنے کے لیے، اور اپنے لیے خوشیاں خریدنے کے لیے، عزت اور رتبے کے لیے۔'' ''ٹھیک کہا تم نے، مگر جب کسی کا کوئی خواب ہی باقی نہ بچا ہو، تو آسائشیں اسے بوجھ لگتی ہوں اور اس کی خوشی کسی ایک لمحے میں جامد ہو کر رہ گئی ہو تب وہ شخص کیا کرے؟'' کمالی کچھ دیر خاموش رہا۔ ''پھر شاید وہ شخص اس دنیا کا ہی نہ ہو سر! کیوں کہ آسائشیں، رتبے اور خوشی سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔'' میں مسکرایا۔ ''ہاں! کوئی دیوانہ ہی ہوگا، جسے ان چیزوں سے انکار ہو، مگر ابھی کچھ باقی ہیں دنیا میں۔ مجھے سودا گر بیٹے میں ابھی کچھ وقت لگے گا کمالی۔ خیر چھوڑو، تم نہیں سمجھو گے، اور کمالی، تم نے بھی تو سیٹھ رحمان کے ساتھ ایک سودا کیا تھا۔ تمہارا سودا کیسا رہا...؟'' کمالی نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں، کیسا سودا...؟'' ''ہاں، وہی سودا، جو کنٹریکٹ سیٹھ رحمان کو دلوانے کو صورت میں تمہیں پانچ لاکھ روپے منافع ملنے کے بدلے طے ہوا تھا۔'' کمالی کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ ''وہ سر... وہ... میرا مطلب ہے...'' میں نے غور سے کمالی کی طرف دیکھا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کمالی! میں نے ویسے بھی وہ ٹھیکہ سیٹھ رحمان ہی کو دینا تھا۔ بس میری اتنی بات یاد رکھنا، پیسا کبھی عزتِ نفس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ وقت ملے تو میری بات پر غور کرنا۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' کمالی سر جھکائے میرے کمرے سے نکل گیا۔

اگلے دو ہفتے بہت معروف گزرے، اس دوران میں اپنے بھائیوں کے نئے گھر بھی ہو آیا، بہنوں کی طرف بھی چکر لگا لیا، خوب آؤ بھگت ہوئی میری، مگر ان میں سے کوئی بھی، یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ میں یوں تنہا اتنے بڑے گھر میں پوری زندگی گزار دوں۔ سبھی کو میرا گھر بسانے کی جلدی تھی، مگر ان میں سے شاید یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب دل ہی جل جائیں، تو گھر نہیں بسا کرتے۔ میرا دل بھی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اب کوئی امید، کوئی آس باقی نہیں رہ گئی تھی کہ کبھی کوئی نظر میری طرف بھی اٹھے گی۔ بظاہر میرے اردگرد ایسی بہت سی نازنینائیں تھیں، جن میں سے میں، کسی ایک کی جانب بھی اشارہ کر دیتا، تو اس کے گھر والے بہ صد خوشی اسے میرے ساتھ رخصت کر دیتے، مگر یہ میرا نہیں، میری ظاہری شان و شوکت اور اس دولت کا کمال ہوتا، جسے ابھی تک خود میرے گھر والے بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور چہ مگوئیاں ہوتی رہتی تھیں کہ آخر دس سال کے اندر اندر میرے ہاتھ الہ دین کا ایسا کون سا چراغ لگا ہوگا کہ جس نے میری کایا ہی پلٹ دی، ہمارا معاشرہ بھی کتنا دوغلا ہے۔ جس شخص کی غیر موجودگی میں اس کے رتبے اور دولت پر ناجائز ہونے کے شک میں ہزار باتیں بناتا ہے۔ اُسی شخص کے آنے پر اس کو پوری تعظیم کے ساتھ کھڑے ہو کر ملتا ہے۔ اُس سے ہزار سفارشیں کرواتا ہے اور ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بہروز کریم ٹھیک ہی کہتا تھا، دولت ہزار عیبوں کا ایک پردہ ہے۔

کچھ روز بعد احمد صاحب چند طلبہ کے ساتھ میرے دفتر آئے اور بہت دیر بیٹھے رہے۔ وہ اپنے ساتھ اس سال کا یونی ورسٹی کا سالانہ رسالہ بھی لائے تھے، جس میں میری تین پرانی نظمیں چھپی تھیں۔ میں نے ان کے لاکھ انکار کے باوجود یونی ورسٹی کی بزمِ ادب کے لیے سال بھر کا چندہ ان کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی میری کمپنی سے شہر کی تقریباً ہر بڑی ادبی تحریک اور تنظیم کو عطیات جاتے رہتے تھے۔ شہر میں، میں کافی ادب دوست مشہور ہو چکا تھا، مگر میں خود ان ادبی پروگرامز میں جانے سے گریز کرتا تھا، کیوں کہ اب میں شاید اپنے لفظوں اور شخصیت کے اس واضح تضاد سے اکتا چکا تھا۔ یا پھر اچھے لفظ اور اچھے خیالات صرف اچھی شخصیت کے ساتھ ہی جچتے ہیں۔ مجھ جیسا کوئی کتنے ہی اونچے خیالات کو لفظوں کی خوب صورت مالا میں پرو کر پیش کر دے، حرفِ بے وقعت ہی رہتے ہیں۔ میں خود کو مزید کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دن بڑے بھیا کسی سفارش کے لیے دفتر آئے، تو میں ان سے اپنے پرانے رجسٹر اور مسودوں کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی وہیں پرانے گھر کی دو چھتی والے ٹرنک ہی میں پڑے ہوں شاید، کیوں کہ بہت سا سامان نئے مکان میں منتقل ہونا باقی تھا۔ پرانے گھر کا سودا ہو چکا تھا اور کچھ دن میں وہاں سے سارا سامان بھی اٹھوانا تھا۔ جانے میرے دل میں اچانک ہی میرے پرانے گھر اور محلے کے لیے ایک دم ہی ہوک سی کیوں اٹھی۔ میں نے کاغذات تلاش کرنے کے بہانے بھیا کے ساتھ ڈرائیور کو بھیج کر پرانے گھر کی چابی منگوائی اور اسی شام عصر کے وقت میری گاڑی میرے پرانے محلے کے سال خوردہ لکڑی والے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی محلے کے بڑے میدان سے پرے ہی رکوائی۔ سامنے کچھ بچے کچھ کھیل رہے تھے۔ میں بہت دیر وہیں کھڑا، انہیں یہ کھیل کھیلتے دیکھتا رہا۔ غریب محلے کے بچوں کے کھیل بھی سدا غریبانہ ہی رہتے ہیں۔ کبھی میں بھی اپنی گلیوں اور اسی میدان میں باقی بچوں کے ساتھ سارا دن کچے اور گلی ڈنڈے کا کھیل کھیلا کرتا تھا اور شام کو چھپن چھپائی، مگر زندگی میرے ساتھ ابھی تک چھپن چھپائی ہی کا کھیل کھیلتی آ رہی تھی۔ محلے کے پرانے مکینوں میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ زیادہ تر نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ غربت البتہ وہی پرانی تھی۔ میں نے کبیر خان کو اپنے گھر کا دروازہ کھولنے کو کہا اور پھر اسے گاڑی کی جانب واپس بھیج دیا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں اترتی نمی دیکھ سکے۔ ہمارے کچھ جذبات اور احساسات بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ ہم انہیں کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتے۔ میں بہت دیر تک اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھڑا ان بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا، جب میں دنیا کے ہر غم سے آزاد، اپنے چھوٹے قدموں سے اس صحن میں دوڑتا پھرتا تھا، باورچی خانے سے

اماں کی باجیوں کو ڈانٹنے اور سگھڑاپے کے گر سکھانے کی آوازیں آتی رہتیں۔ ابا صحن میں اپنا حقہ سنبھالے کھانستے اور اخبار پڑھتے رہتے۔ میں مٹی کے صحن میں اپنی پرانی ٹین کی بنی کھلونا موٹر کار کے لیے راستے بناتا رہتا اور دن میں سو سو مرتبہ اس زنگ لگی کار کو اماں کے دوپٹے سے چمکاتا رہتا، ایک لمحے ہی میں میرے آس پاس یہ سب کچھ اس شدت سے میری یاد کے جھروکوں سے باہر چھلکا کہ وہ سب لمحے پھر سے زندہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ میں اس وقت ابا کے حقے کا کڑوا دھواں اور باورچی خانے سے آتی گرم پھلکوں کی مہک بھی محسوس کر سکتا تھا۔ کاش میں ساری زندگی وہی پانچ چھ سالہ پری زاد ہی رہتا، کبھی بڑا نہ ہوتا۔ جانے ہم اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟ ہر بچہ اپنی ماں کے لیے پری زاد ہی تو ہوتا ہے، تو اگر میری بھولی بھالی ماں نے مجھ جیسے کا نام بھی پری زاد رکھ دیا، تو ایسا کیا گناہ کیا۔ میری!؟ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اچانک مجھے اپنے کانوں میں ابا کی!؟ آواز بھی گونجتی محسوس ہوئی۔ ''پری زاد... بیٹا... تم پری زاد ہی ہو ناں'' میں ایک جھٹکے سے اپنے خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ!؟ یا۔ کوئی مجھے واقعی پکار رہا تھا۔ جسے میں ابا کی آواز سمجھا تھا، وہ ہمارے محلے کے ایک بزرگ بشیر چچا کی آواز تھی، میں نے جلدی سے اپنی!؟ آنکھیں پونچھ کر پلٹ کر دیکھا۔ گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر گلی سے گزرتے کچھ پرانے محلے دار گلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے، جن کے ہاتھوں میں میرا بچپن کھیلا تھا۔ سبھی گھل مل گئے اور پرانی یادوں کے سب در بچے وا ہو گئے۔ وہ سب ابا کے دوست اور ساتھی تھے اور پرانی باتیں یاد کر کے سبھی بیک وقت خوش اور غم گین سے ہو گئے تھے۔ گویا یادِ ماضی صرف میرے لیے ہی عذاب نہیں تھی، اور بھی بہت تھے، جو اس عذاب سے دوچار تھے۔ وہ سب میری ترقی دیکھ کر حیران اور دل سے خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ پرانے محلے دار بھی

بڑے دل چسپ رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں، زیادہ تر ایک دوسرے سے خفا اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، مگر انہی میں سے جب کوئی ایک بچھڑ کر کہیں اور چلا جاتا ہے اور عرصے بعد ملتا ہے، تو یہ سارے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ کر اُسے یاد کرتے ہوئے یوں استقبال کرتے ہیں، جیسے وہ ہم سایہ نہیں، کوئی ماں جایا ہو۔ یہ انسانی رشتے ہمیشہ دور جا کر ہی خوب صورت کیوں بن جاتے ہیں؟ فاصلے ہمارے رویوں میں اتنی بڑی تبدیلیاں کیسے لے آتے ہیں۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ نکڑ والے منظور چچا کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے ہاں پُری زاد بیٹا! وہ مرزا صاحب کا پوچھنے ضرور جانا۔ بہت بیمار رہتے ہیں آج کل، ضعیف بھی بہت ہو گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا نام سنتے ہی میرا گال اچانک جلنے لگا۔ ان کا لگایا ہوا طمانچہ آج تک میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں گونج رہا تھا اور تب ہی اچانک ہی وہ واقعِ جاں، ناہید یاد آ گئی۔ اس کا تو ماجد سے رشتہ ہو گیا تھا۔ جانے اب وہ کیسی ہو گی؟

محلے کے بچے میری گاڑی کے گرد جمع تھے اور ڈرائیور انہیں بھگانے کے لیے مختلف طریقے آزما رہا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ مرزا صاحب کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حالت پر ہنسی آ گئی۔ اب تو وہ کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہے اور میں ہوں کہ آج بھی اس کے گھر کے سامنے کھڑا اپنے بے چین دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوں۔ سب اس دشمن دل کے تماشے ہیں۔ میری دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی کے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی۔ میں ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والی نے دروازہ کھولا، تو اس کی نظر مجھ سے پہلے ذرا کھڑی میری کار پر پڑی، اور پھر میری نظر اس کی نظر سے ملی تو جیسے سانس رکنے لگی۔ وہ ناہید ہی تھی۔ ناہید بھی گڑبڑا سی گئی۔ میں نے اسے سلام کیا تو وہ اٹکتے ہوئے بولی۔ ''آپ...! آپ پُری زاد ہیں ناں۔ مجھے ہم سائیوں نے بتایا تھا کہ آپ محلے میں آئے ہوئے ہیں، مگر میں بالکل بھی یہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ آپ ہمارے گھر بھی آئیں گے۔'' ناہید کے بال الجھے، کپڑے مسلے ہوئے اور پیروں میں پرانی چپل تھی۔ اس کا جسم پہلے سے کافی فربہ لگ رہا تھا اور وہ طرح دار، شوخ، نازک اور نٹ کھٹ سی لڑکی، مجھے اس سامنے کھڑی عورت میں بہ مشکل ڈھونڈے سے حصے بخروں میں بٹی نظر آ رہی تھی۔ ناہید نے سٹ پٹا کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ ''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آ جائیں۔ ابا گھر پر ہی ہیں۔'' میں جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ یہ وہی صحن تھا، جہاں میں کبھی شام کو گھنٹہ بھر کے لیے ناہید کو ٹیوشن پڑھانے انگور کی بیل کے سائے میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا اور دن کے باقی تیئس گھنٹے، اسی ایک گھنٹے کی یاد میں گزار دیتا تھا۔ صحن میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے بچے شور اور اودھم مچا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے گھڑے پر رکھا پیتل کا گلاس زور سے پکے فرش پر گرا دیا، تو شور مچ گیا۔ ناہید نے غصے میں اس بچے کو دو ہتڑ مارے اور شرمندگی سے چلائی۔ ''چپ کر جاؤ کم بختو! دیکھ نہیں رہے، گھر میں مہمان آئے ہیں۔ چلو، نکلو یہاں سے۔ باہر جا کر کھیلو۔'' بچے منہ بسورتے صحن سے نکل گئے۔ اندر سے مرزا صاحب کھانستے ہوئے باہر صحن میں نکل آئے۔ ''کون آیا ہے، ناہید بیٹا...'' ناہید نے جلدی سے صحن میں

پڑی پرانی کرسی میرے لیے سیدھی کی ''پُری زاد؟ ہے ہیں ابا جی، ہمارے پرانے ہم سائے''۔ مرزا صاحب نے چونک کر اپنا چشمہ درست کیا اور مجھے غور سے دیکھا۔ ''ارے پُری زاد بیٹا! کیسے ہو تم، تمہارے بھائیوں سے پتا چلا تھا کہ تم پاکستان آ چکے ہو۔ اچھا کیا آ گئے، تمہیں دیکھے بہت عرصہ ہو گیا۔'' مرزا صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ناہید میری موجودگی کی وجہ سے بہت الجھی ہوئی اور بے آرام سی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اچانک مرزا صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ ''ارے ہاں، یاد آیا۔ میں نے کبھی تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کر دی تھی میاں۔ بعد میں حقیقت کھلی تو تم یہاں سے جا چکے تھے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' میں نے جلدی سے کہا ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ مگر یہ ماجد کہاں ہے، دکھائی نہیں دے رہا''۔ مرزا صاحب نے بُرا سا منہ بنایا ''ارے ہو گا کہاں... کہیں نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹک رہا ہو گا۔ ناہید کی ماں کے انتقال کے بعد اسے تو موقع ہی مل گیا۔ مہینوں اپنے بیوی بچوں کو یہاں میکے میں میری خدمت کے بہانے چھوڑ کر جانے کہاں غائب رہتا ہے۔ بہت سے کاروبار آزمائے اس نے، مگر کچھ جما نہیں۔ آج کل نوکری کے لیے دھکے کھاتا رہتا ہے۔'' ناہید چائے کا کپ لیے نمودار ہوئی اور اس نے باپ کو گھور کر دیکھا۔ ''بس کریں ابا جی، یہ وقت بھلا ان باتوں کا ہے؟'' میں کن انکھیوں سے ناہید کو دیکھتا رہا۔ یہ نازک شاخِ گل جیسی لڑکیاں شادی کے بعد اتنی جلدی اپنا روپ کیوں بدل لیتی ہیں، یا پھر شاید، ماجد جو اس کا محبوب تھا اور بطور شوہر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا، اس کے لیے ناہید اب بھی اتنی ہی دل کش اور خوب صورت ہو۔ کہتے ہیں حسن جب ہمارے روزمرہ کے معمول میں شامل ہو جائے، تو عموماً اپنا اثر کھو دیتا ہے، یا پھر سدا کے لیے اپنے پہلے تاثر کے ساتھ ہماری یادداشت میں جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں نے پورے دس سال کے بعد ناہید کو دیکھا تھا، اس لیے شاید میں اس کے بڑھتے ہوئے وزن سے کچھ الجھن محسوس کر رہا تھا، لیکن کیا محبوب کے روپ بدل لینے سے ہماری محبت کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے؟ یا پھر حسن پرستوں کا شیوہ ہی میر کی غزل اور خیام کی رباعی کو کسی سراپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھنا ہوتا ہے۔ میں انہی خیالوں میں مگن چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا۔ ناہید سر جھکائے میرے قریب ہی کھڑی تھی، اتنے میں اچانک صحن کا دروازہ کھلا اور گرد اور دھول میں اٹا ایک تھکا ہارا سا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں کی نظر ملی۔ ناہید کو میرے قریب کھڑے دیکھ کر اس شخص کے ماتھے پر تیوریاں سی پڑ گئیں۔ ناہید بھی کچھ گھبرا سی گئی اور جلدی سے اس کی جانب بڑھی ''ارے ماجد... تم آ گئے... دیکھو، پُری زاد صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ پہچانا نہیں تم نے انہیں۔'' ماجد نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

(جاری ہے)

.....ہاشم ندیم.....



ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شدید غصّے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجّہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ارے پَری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پَری زاد ہی ہوناں..... معاف کرنا، میں تھکن کی وجہ سے پہچان نہیں سکا''۔ شاید ماجد بھی میرے فیتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آ گیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو پیمانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہ جما رہی تھی۔ بہت تھکا ماندہ سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے عُمر بھر کے لیے خاکستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غمِ دوراں کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر، مَیں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا''، ''میں آپ کا دل نہیں دُکھانا چاہتی تھی''، ''آپ دل کے بہت اچھے ہیں..... وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو پُرانے گھاؤ مندمل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے یہ کُھلے زخم لیے گھر واپس پہنچا، تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوئمنگ پُول کے پاس کچھ فائلز گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائلز اُسے واپس کیں ''صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا بوجھل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو''۔ کمالی سَر جُھکائے کھڑا رہا۔ ''مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سَر..... آج صبح میں نے سیٹھ رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک جملے نے مجھے عزتِ نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگمگائیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں''۔ مَیں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے''۔ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ''کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟'' کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''ہاں سَر! بڑا زوردار عشق چلا تھا نو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخرِ کار''۔ میں نے گھبرا کے پوچھا ''کیوں..... کیا ہوا تھا؟'' کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ''ہونا کیا تھا سَر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچّوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھریلو روزمرہ خرچوں، بچّوں کی فرمائشوں اور فیسوں نے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی''۔ کمالی اپنے دکھڑے سُنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم مبتلا ہوں یا غیر مبتلا، یہ محبت ہر پَل ہمارے آس پاس کن سوئیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش رَچ سکے۔ میری یہ حُسن پرستی بھی تو اُسی ستم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خُوب صُورت چہروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے عملے میں، دبئی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کو نازک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں حُسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائٹ ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگا دیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول طے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیئر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی میٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سناٹے میں گونج رہی تھی۔ ''جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان ''گر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....'' اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ''جی سامعین! یہ تھی میرے پسندیدہ شاعر، پَری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنگناتی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک گِلہ بھی ہے۔ میں اُسی یونی ورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پَری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یا ان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ لفظوں سے اپنا ناتا نہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

.....ہاشم ندیم.....



ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماجد شدید غصّے کے عالم میں ناہید کو گھور رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے اسے سرگوشی میں کچھ کہا، تو اس بار ماجد میری طرف متوجّہ ہوا اور پھر اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ارے پَری زاد تم..... میرا مطلب ہے آپ پَری زاد ہی ہوناں..... معاف کرنا، میں تھکن کی وجہ سے پہچان نہیں سکا''۔ شاید ماجد بھی میرے فیتی اعلیٰ لباس اور باہر کھڑی نئی گاڑی سے مرعوب ہو کر فوراً تم سے آپ پر آ گیا تھا۔ انسان نے مرعوبیت کے لیے کتنی ناپائیدار اشیاء کو پیمانہ بنا رکھا ہے۔ میں نے گہری نظروں سے ماجد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وقت کی دھول شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے تہ جما رہی تھی۔ بہت تھکا ماندہ سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی یہی ماجد ہم سب محلے کے لڑکوں کے لیے رشک کا باعث ہوا کرتا تھا اور میں تو خود کو اس پر رشک کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس ہستی کا محبوب تھا، جس کی پلک کا ایک اشارہ مجھے عُمر بھر کے لیے خاکستر کر گیا..... اور آج اتنے برسوں بعد وہ شعلہ جوالہ، میرے سامنے راکھ بنی کھڑی تھی اور اس کا وہ گل فام، غمِ دوراں کے پھیرے میں سب کچھ بھولا دکھائی دیتا تھا۔ کون خوش ہے بھلا اس ناشناس زمانے میں؟ جنہوں نے پایا، انہوں نے پا کر مٹی کر دیا اور جو پا نہیں سکے، وہ بھی ہمیشہ کے لیے خاک ہوئے، مجھ سے زیادہ دیر وہاں ٹھہرا نہیں گیا۔ میں نے آتے وقت اپنا کارڈ ماجد کو دے دیا کہ وہ اگلے روز میرے ایک فیکٹری منیجر سے مل لے۔ میں اپنی گاڑی میں جب گلی سے باہر نکل رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر میں ناہید کو اپنے گھر کے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے جاتے وقت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر، مَیں کیا بات کرتا اس سے؟ وہی معذرتیں، وہی ''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا''، ''میں آپ کا دل نہیں دُکھانا چاہتی تھی''، ''آپ دل کے بہت اچھے ہیں..... وغیرہ وغیرہ، کتنا مصنوعی لگتا ہے یہ سب کچھ۔ کچھ معذرتیں اور وضاحتیں تو پُرانے گھاؤ مندمل کرنے کے بجائے زخموں کا سینہ مزید کھول دیتی ہیں۔ میں بھی اپنے یہ کُھلے زخم لیے گھر واپس پہنچا، تو رات ڈھل رہی تھی۔ کمالی نہ جانے کب سے سوئمنگ پُول کے پاس کچھ فائلز گود میں لیے بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کر کے فائلز اُسے واپس کیں ''صبح لے آتے کمالی، زندگی کو اتنا بوجھل کیوں کر رکھا ہے تم نے، جب تک میرے ساتھ کام کر رہے ہو، نفع نقصان ذہن سے نکال کر کام کیا کرو۔ میں نے تمہیں اُس دن بھی بتایا تھا کہ میرے نقصانات اور فوائد کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ میں زندگی میں اتنی بار ہار چکا ہوں کہ اب جیت مجھے کسی بھی ہار سے کہیں زیادہ اُداس اور پریشان کر دیتی ہے، کل ٹینڈر بھر دینا، باقی اللہ مالک ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو''۔ کمالی سَر جُھکائے کھڑا رہا۔ ''مجھے آپ کو، کچھ اور بھی بتانا تھا سَر..... آج صبح میں نے سیٹھ رحمان کا دیا ہوا چیک واپس کر دیا ہے۔ آپ کے ایک جملے نے مجھے عزتِ نفس کا وہ سبق سکھایا ہے کہ اب کبھی میرے قدم نہیں ڈگمگائیں گے۔ آپ بھی میری اس خطا کو آخری سمجھ کر معاف کر دیں''۔ مَیں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''بھول جاؤ کمالی، زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو، یہ بھول جانے کی نعمت ہونا بہت ضروری ہے''۔ کمالی پلٹ کر جانے لگا، تو میں اچانک اس سے پوچھ بیٹھا۔ ''کمالی! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے.....؟'' کمالی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''ہاں سَر! بڑا زوردار عشق چلا تھا نو جوانی میں اپنا، مگر انجام بہت بُرا ہوا آخرِ کار''۔ میں نے گھبرا کے پوچھا ''کیوں..... کیا ہوا تھا؟'' کمالی نے لمبی سی سانس بھری۔ ''ہونا کیا تھا سَر جی، شادی ہوگئی میری اُس کے ساتھ، آج وہ میرے چار بچّوں کی ماں ہے۔ سارا عشق بھاپ بن کے اُڑ گیا، گھریلو روزمرہ خرچوں، بچّوں کی فرمائشوں اور فیسوں نے کمر توڑ کے رکھ دی۔ ساری محبت ہوا ہوگئی''۔ کمالی اپنے دکھڑے سُنا کر چلا گیا اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نادان انسان ابھی تک یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ محبت کو پالینا بڑا حادثہ ہے یا اس کا کھو جانا بڑا سانحہ؟ کیا شے ہے یہ محبت، ہم مبتلا ہوں یا غیر مبتلا، یہ محبت ہر پَل ہمارے آس پاس کن سوئیاں لیتی، ہماری سرگوشیاں سُنتی رہتی ہے تاکہ ہمارے خلاف پھر کوئی بھرپور سازش رَچ سکے۔ میری یہ حُسن پرستی بھی تو اُسی ستم گر کی ایک سازش تھی۔ لوگ باتیں بنانے لگے تھے کہ میرے آس پاس خُوب صُورت چہروں کا مجمع اکٹھا رہتا ہے۔ دفتر میں، باہر فیلڈ کے عملے میں، دبئی کے دفاتر اور کمپنیوں میں، ہر جگہ انتخاب اگر میرے فیصلے سے ہوتا، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی حسین چہرہ ہی نکلتا، چاہے پھر میرا زندگی بھر اس چہرے سے کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو، مگر لوگوں کو یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ جس طرح ہم میں سے کچھ صفائی پسند ہوتے ہیں، کچھ نفاست پسند، کچھ کو نازک اشیاء پسند آتی ہیں اور کچھ خوشبوؤں کے رسیا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں حُسن پسند تھا اور بس.....

اگلے روز مجھے سائٹ ایریا والی فیکٹری کے منیجر نے بتایا کہ ماجد کو اس کی قابلیت کے اعتبار سے کسی دفتر میں کام پر لگا دیا گیا ہے اور تن خواہ بھی معقول طے ہوگئی ہے۔ رات ایک میٹنگ سے گھر آتے آتے بہت دیر ہوگئی۔ سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ رات کو جانے پہچانے رستے بھی کسی اجنبی کی طرح ہمارا استقبال کرتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، دن پوشیدہ گوشوں کو اپنی روشنی سے اُجال کر اُن کی شناخت ظاہر کرتا ہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا، جیسے لوگوں، جگہوں، چیزوں اور چہروں کی اصل پہچان رات کے اندھیرے ہی میں ہوتی ہے۔ ڈرائیور نے میری بوریت کے خیال سے گاڑی کا ایف ایم ریڈیو چلا دیا۔ یہ ایف ایم ریڈیو بھی ایک اچھا فرار ہے، لمبے راستوں کو مختصر کرنے کا۔ ایف ایم کا ڈی جے یا کمپیئر اگر پڑھا لکھا اور زندگی سے شناسا ہو تو ہماری تنہائی بانٹ لیتا ہے، اُس روز بھی وہ میزبان میری تنہائی بانٹنے کے لیے شعر و ادب کی باتیں کر رہی تھی۔ میں بے دھیانی میں بیٹھا اس کی میٹھی باتیں سُن رہا تھا کہ اچانک اپنی نظم کے دو بول سُن کر زور سے چونک اٹھا، میزبان کی آواز سناٹے میں گونج رہی تھی۔ ''جی ہاں، یہی ہے میری پسندیدہ نظم کا عنوان ''گر کبھی تم کو مجھ سے نفرت ہو جائے..... تو ان راستوں سے نفرت مت کرنا..... جن پر کبھی ہم ایک ساتھ چلے تھے.....'' اُس رات کے اندھیرے میں، خود اپنی نظم اس ایف ایم کی میزبان کی زبانی سُن کر جانے کیوں میری پلکیں نم ہونے لگیں۔ میزبان کہہ رہی تھی۔ ''جی سامعین! یہ تھی میرے پسندیدہ شاعر، پَری زاد کی وہ نظم، جو میں اکثر گنگناتی ہوں، مگر مجھے اُن سے ایک گِلہ بھی ہے۔ میں اُسی یونی ورسٹی کی ایک جونیئر طالبہ ہوں، جہاں پَری زاد نے دورانِ تعلیم کچھ نظمیں، غزلیں کہیں، مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اگر خوش قسمتی سے وہ یا ان کا کوئی جاننے والا اس وقت میرا پروگرام سُن رہے ہوں، تو ان سے میری اور اس پروگرام کے ہزاروں سامعین کی بس یہی ایک چھوٹی سی خواہش ہے کہ وہ لفظوں سے اپنا ناتا نہ توڑیں۔ اب آپ سے آپ کی میزبان

قراۃ العین بخاری اجازت چاہتی ہے۔ کل پھر رات گیارہ بجے آپ کے پسندیدہ پروگرام "بزمِ ادب" کے ساتھ حاضر ہوں گے، تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھیے، شب بخیر"۔ میں پروگرام سُننے میں اس قدر مگن تھا کہ پتا ہی نہیں چلا کہ ہم کب گھر پہنچ گئے۔ رات بھی بستر پر کروٹیں بدلتے، اَن گنت سوچوں میں گزری۔ مجھے اپنے ایک اردو کے استاد کی بات ہمیشہ یاد رہتی تھی کہ لفظ اپنے خالق کا ہمیشہ پیچھا کرتے ہیں۔ اُس کی پہچان بن کر ہمیشہ کے لیے وقت کی کسی لہر میں امر ہو جاتے ہیں۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ میری ٹوٹی پھوٹی شاعری اور بے بسی کے عالم میں لکھی چند نظمیں میری یونی ورسٹی کے سالانہ رسالے میں چھپ کر یوں امر ہو جائیں گی کہ اتنے برسوں بعد بھی میری شناخت بنی رہیں گی۔

اگلے روز دفتر پہنچا تو یونی ورسٹی سے احمد صاحب پہلے ہی آئے بیٹھے تھے اور کافی خفا بھی تھے، کیوں کہ میں کسی نہ کسی بہانے ان کی تمام تقریبات کے دعوت نامے ٹالتا آیا تھا۔ مگر اس روز ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی وعدہ لے کر ہی اٹھیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اگلی شام یونی ورسٹی کی بزمِ ادب کی سالانہ اختتامات کی تقریب تھی اور وہ پہلے ہی زبردستی کارڈ پر میرا نام بھی مہمانِ خصوصی کے طور پر درج کروا کے آئے تھے۔ میں نہ نہ ہی کرتا رہ گیا، لیکن وہ دھمکی دے گئے کہ اگر اس بار بھی میں نے تقریب میں شرکت نہ کی، تو وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے اسٹیج پر بیٹھنے اور ان کے سامنے کچھ بولنے کے خیال ہی سے میرے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ وہی چبھتی نظریں، جو مجھے اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوتی ہیں، وہی دبی دبی سرگوشیاں، طنزیہ مسکراہٹیں، کاش احمد صاحب میرے اس دل ناکارہ کی حالت سمجھ سکتے، مگر یہ ہو نہ سکا اور اگلے روز ٹھیک شام 5 بجے اسٹیج کے ڈائس پر میرا نام پکارا گیا، تو میں نظریں جھکائے مائیک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ہال میں تماشائیوں کی جانب روشنی ہلکی سی تھی، اسی لیے مجھے طلبہ کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ویسے بھی اسٹیج کا فاصلہ پہلی رو کی کرسیوں سے کافی زیادہ تھا، اپنی سانس درست کرنے میں مجھے چند لمحے مزید لگ گئے۔ میری آواز خود مجھے اجنبی سی لگی۔ طلبہ اور دیگر حضرات مجھ سے میری بات سُن رہا تھا۔ "میں کوئی شاعر، مقرر یا لیڈر نہیں ہوں..... بس، کچھ مہربانوں کی محبت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے اور میری اس درس گاہ کا مجھ پر جو حق ہے، وہ مجھے ہمیشہ اس چار دیواری سے جوڑے رکھتا ہے۔ میں احمد صاحب اور ان تمام اساتذہ کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے سالانہ شمارے میں میرا تعارف اور چند پرانی نظمیں شامل کر کے، میرے کچھ بوسیدہ اشعار کو زندہ رکھا۔ یہ اشعار دراصل اشعار نہیں، میرے دل کی نثر ہیں۔ میری اپنے آپ سے کی گئی کچھ باتیں ہیں، جو کبھی صفحات پر آ گئیں تو آپ لوگوں سے بانٹ لیں۔ آپ لوگ اسے شاعری سمجھتے ہیں تو یہ آپ کا حسنِ ظن اور ظرف ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔" میں اپنی بات ختم کر کے پلٹنے لگا تو دُور اک قطار میں بیٹھی، سیاہ پشمینہ لگائے ایک تتلی سی لڑکی کھڑی ہو گئی اور ناظرین کے لیے رکھا ہوا مائیک ہاتھ میں لے کر بولی۔ "سَر! میرا نام قراۃ العین ہے۔ میں اسی یونی ورسٹی میں فائنل ایئر کی طالبہ ہوں اور رات گئے ایف ایم ریڈیو پر "بزمِ ادب" کے نام سے ایک پروگرام بھی کرتی ہوں۔ میرے سُننے والوں کی ایک بڑی تعداد تک آپ کی شاعری میرے پروگرام کے توسط سے پہنچی ہے اور وہ سب آپ سے مزید کچھ نیا سُننے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر آپ نے یونی ورسٹی کے بعد تازہ کچھ کہا ہی نہیں۔ کیا ہم امید رکھیں کہ آپ پھر سے اپنا ناتا حروف سے جوڑنے کی کوشش کریں گے؟" میں نے مختصر جواب دیا۔ "جی ضرور..... اگر غمِ دوراں نے کچھ مہلت دی تو....."

ابھی اک رات قبل ہی میں نے اس لڑکی کا پروگرام سُنا تھا اور آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی، کبھی کبھی وقت کی چالیں بھی کتنی بھلی لگتی ہوتی ہیں۔ تقدیر اپنا اسکرپٹ کیسے دھیمے انداز میں لکھنا شروع کرتی ہے، ہم معصوم انسانوں کو قطعاً خبر نہیں ہوتی کہ مقدر کا یہ مسوّدہ آگے چل کر ہم پر کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے۔ میں بھی آنے والے محشر سے بے خبر تقریب کے خاتمے کے بعد گھر روانہ ہوا تو کمالی سے رہا نہیں گیا۔ "سَر! آپ نے کبھی بتایا نہیں، آپ تو بہت مشہور شاعر ہیں۔ ساری یونی ورسٹی آپ کے لیے ہال میں جمع تھی"۔ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ "یہ خود میرے لیے بھی ایک خبر ہے، اتنے برسوں بعد بھی میرے حرف میری شناخت ہیں۔ مجھے خود بھی حیرت ہے"۔ "اس میں حیرت کی کیا بات ہے سَر جی..... یہ آج کل کی نوجوان نسل ان چیزوں میں بڑی دل چسپی رکھتی ہے۔ ایف ایم، انٹرنیٹ اور حتیٰ کہ سیل فون پر بھی ہر دم ان چیزوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ میر، درد، غالب اور اقبال کو بھی ہم سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں سَر۔ بظاہر بڑی لاابالی ہے یہ نئی نسل، مگر اپنے مطلب کی چیز پڑھتی اور سُنتی ہے۔ چاہے کتاب کے ذریعے یا کسی اور طرح....." میں چُپ رہا۔ "ارے ہاں یاد آیا، وہ ایف ایم کی ڈی جے لڑکی نے آپ کا سیل نمبر مانگا تھا، رات کو اپنے پروگرام میں آپ کو براہِ راست شرکت کی دعوت دینا چاہتی تھی، میں نے آپ سے پوچھے بنا اسے نمبر تو دے دیا ہے، مگر خاص تاکید کی ہے کہ پہلے آپ سے خود بات کر کے اجازت طلب کر لے....." اور پھر رات گئے میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر جگمگانے لگا۔ تیسری کال پر مجبوراً مجھے فون اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف وہی تھی۔ "معاف کیجیے گا سَر! شاید آپ کے مینیجر نے آپ کو میری درخواست نہیں پہنچائی۔ میں ڈی جے ایمی ہوں۔ میں اپنے پروگرام میں آپ کو لائیو کال پر مدعو کرنا چاہتی ہوں..... ہم آپ کے صرف دس منٹ لیں گے، اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....؟" میں نے کچھ لمحے توقف کیا۔ "میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ.....؟" وہ معصومیت سے بولی۔ "کچھ عام سے سوال، آپ کی زندگی کے بارے میں، آپ کی کام یابیوں کے بارے میں، آپ کی ادب دوستی کے بارے میں۔ سُنا ہے، شہر کی سبھی بڑی ادبی تقریبات اور مستقبل کے منصوبوں میں آپ کا حصّہ ضرور ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے سامعین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی ترقی کا راز جاننا چاہتی ہوں، عام طور پر ادب سے جُڑے لوگوں کو یہ معاشرہ مادی ترقی سے بہت دُور سمجھتا ہے۔ یہ ادیب، شاعر عموماً مفلوک الحال دکھائی دیتے ہیں، مگر آپ نے صرف خیالی نہیں، حقیقی دنیا کو بھی فتح کر دکھایا ہے۔ میں یہ سب باتیں جاننا چاہتی ہوں۔" میں اس کی باتیں سُن کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ "مگر آپ کو میرے بارے میں اتنا سب کچھ کیسے پتا ہے؟" وہ ہنس پڑی۔ جیسے بہت دُور کسی مندر میں ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ "احمد سَر نے بتایا، اور پھر میرے ریڈیو پروگرام کی وجہ سے شہر کی تقریباً سبھی بڑی ادبی

ہستیوں کے ساتھ ملاقات رہتی ہے میری۔ سبھی سے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سُننے کو ملتا ہے۔ سچ کہوں تو لوگ بہت متجسّس رہتے ہیں آپ کے بارے میں....." وہ اپنی دھن کی پکی لگتی تھی۔ میرے لاکھ ٹالنے کے باوجود، مجھ سے اپنے اگلے روز کے پروگرام کے لیے کچھ منٹ لینے میں کام یاب ہو ہی گئی اور میں اگلے دن تمام وقت اسی اُلجھن میں مبتلا رہا کہ رات، اس کے ساتھ کیا بات کروں گا؟ میں نے تو بہت زمانہ پہلے خود سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ شام تک یہ اُلجھن اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ میں نے اپنے پی اے کو یہی کام کا وہی فون نمبر ملانے کو کہا، جو گزشتہ رات میرے موبائل فون پر جگمگایا تھا۔ پی اے نے کال ملا کر میری طرف ٹرانسفر کی، تو دوسری جانب سے اس کی بے یقین اور کھلکھلاتی سی آواز سُنائی دی۔ "ارے سَر آپ.....؟ کتنا حسین اتفاق ہے۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ نے خود مجھے کال کی ہے، میں ابھی رات کے پروگرام کی تیاری ہی کر رہی تھی"۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "آپ سے ایک درخواست کرنی ہے، کیا ہم گزشتہ رات کیے ہوئے معاہدے کو کچھ دن کے لیے آگے بڑھا سکتے ہیں، اگر ممکن ہو تو؟" "جی سَر، کیوں نہیں..... مگر کوئی خاص وجہ.....؟" "پتا نہیں، وجہ شاید خاص ہے بھی اور نہیں بھی۔ دراصل میں بہت اُلجھن سی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بات کرنا کبھی پسند نہیں رہا، آپ کچھ وقت دیں گی تو شاید میں خود کو تیار کر پاؤں، ورنہ میرے لیے بہت مشکل ہو گا"۔ دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ "ٹھیک ہے

سر! جیسے آپ کو مناسب لگے، مجھے آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ آپ نے پروگرام سے کافی دیر پہلے خود فون کر کے معذرت کر لی، ورنہ عام طور پر بڑے لوگ ہمیں اطلاع دینا بھی پسند نہیں کرتے، اپنی کسی غیر حاضری کی۔ مگر آپ کو یہ وعدہ تو بہر حال کرنا پڑے گا کہ آپ جب بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر پائے تو یہ معاہدہ پورا ضرور کریں گے"۔ میں ہنس پڑا۔ "ہاں، چلیں وعدہ نبھانے کا ایک اور وعدہ سہی۔ میری مشکل سمجھنے کا شکریہ"۔ میں نے فون کاٹ دیا، مگر کہیں دُور کوئی دوسری لائن جُڑ رہی تھی۔ میرا نادان دل سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی، ہر نتیجے سے بے خبر پھر سے دھڑکنا چاہتا تھا اور میں بڑی سختی اور بے رحمی سے اسے صرف ایک ہی بات ساری رات سمجھاتا رہا کہ کچھ دلوں کا مقدر صرف بہتر کی گنتی پوری کرنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ اور قلب ہوتے ہوں گے کہ جن کی تقدیر میں دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ، جو اپنے دل کے ایک فرض کو دھڑکنے سے تشبیہ دیئے پھرتے ہیں۔ مگر یہ دل بھلا کب کسی کی سُنتے ہیں۔ منہ زور، آزاد، وحشی اور جنگلی گھوڑے بھلا کس لگام کے قابو آتے ہیں۔ میرا دل بھی بے لگام ہونے کو آیا تھا۔

اگلے روز نہ چاہتے ہوئے بھی میں سارا دن اس کے فون کا انتظار کرتا رہا اور پھر شام ڈھلے، جب تھک ہار کر میرا بے چین مَن اپنی بے وقوفی پر مُسکرا کر کچھ آرام پانے کو تھا، تبھی اچانک اس کا فون آ گیا۔ قسمت کی آنکھ مچولی، وقت کا انتخاب خوب چُن کر کرتی ہے اور پھر ان ٹیلی فون کالز کا دورانیہ اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہم بہت عام سی باتیں کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت کی، شام کی چائے کی، رات کی چہل قدمی کی، مگر یہ باتیں میرے لیے کتنی خاص تھیں، یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اُس دن یونی ورسٹی کی تقریب والی ملاقات کے بعد میری آج تک دوبارہ کبھی عینی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، نہ ہی میں نے دوبارہ کبھی اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار ہی کیا تھا۔ یہ ٹیلی فون کی آدھی ملاقات میرے لیے کسی بھی بالمشافہ ملاقات سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں دوبارہ عینی کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ہال میں مجھے کافی فاصلے سے اور مدھم اندھیرے میں دیکھا، میں اپنے اور اس کے درمیان یہ اندھیرا ہمیشہ حائل رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دن اور روشنی میں اس سے ملنے کی تمنا ہی بھلا کب تھی۔ میرا بس چلتا تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے دن کے بارہ گھنٹوں کی روشنی بھی کشید کر لے، کیوں کہ مجھے اُجالے کبھی راس نہیں آتے تھے۔

اگلے روز میرے اسٹاف نے خُوب صُورت سجاوٹی کاغذ میں پیک شدہ ایک پارسل میری میز پر رکھ دیا۔ بھیجنے والے پتے میں قراۃ العین بخاری کا نام درج تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد احتیاط سے کاغذ کی پرتیں کھولیں۔ اندر سے ایک خُوب صُورت سا نمائشی مجسمہ برآمد ہوا، جسے کمرے میں کہیں بھی شوپیس کے طور پر رکھا جا سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے عینی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے اس کی کھنکتی ہوئی آواز ابھری۔ "میں جانتی تھی سر! آپ کا فون آتا ہی ہوگا۔ کہیے، کیسا لگا تحفہ؟" "بہت اچھا..... مگر موقع محل سمجھ نہیں سکا، میں اس تحفے کا۔ آپ نے تکلف کیا عینی....." وہ ہنسی۔ "ارے نہیں سَر! بالکل بھی تکلف نہیں ہے۔ یہ میرا مشغلہ ہے۔ فارغ وقت میں مَیں مٹی اور پلاسٹر آف پیرس سے مجسمے بناتی ہوں۔ میری اپنی ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری ہے، میرے گھر کے اندر، بس وہیں یہ مشق جاری رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی آیئے ناں وقت نکال کر، میں آپ کو اپنا کام دکھاؤں گی۔" میں بولتے بولتے اٹک سا گیا۔ "ہاں کیوں نہیں، مگر آپ اور کیا کچھ کرتی ہیں، ایک ہی بار اپنے سارے ہُنر بتا دیں۔ کبھی کبھی حیرت در حیرت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے دوستوں کے لیے....." میری بات سُن کر وہ شرما سی گئی۔ "نہیں نہیں، مجھ میں بھلا کیا ہُنر ہوگا۔ بس وقت کاٹنے کے بہانے تلاشتی ہوں"۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر میرا بھولا مَن اس لڑکی کے ہُنر کا شکار ہوتا گیا۔ دل موہ لینا بھی تو ایک ہُنر ہے۔ شاید دنیا کا سب سے بڑا ہُنر۔ اور میں اس کی اس کاری گری سے خود کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ مگر پھر ایک دن ہمیشہ کی طرح بہتی، بگڑنے لگی۔ شام ہی سے میری طبیعت عجیب بے چین اور اُداس سی تھی، مجھے ایک بار پھر اپنے آس پاس سب کچھ بنا مقصد اور بے فائدہ دکھائی دے رہا تھا۔ دل کو چُپ سی لگی ہوئی تھی کہ اچانک عینی کا فون آ گیا۔ "کہاں غائب رہتے ہیں سَر آپ، بہت دنوں سے آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں، مگر آپ کی مصروفیت کا خیال آڑے آ جاتا ہے"۔ میں نے گہری سانس لی۔ "میری مصروفیت بس ایک فرار ہے، آپ کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟" وہ کچھ دیر چُپ رہی۔ "دراصل میں آپ کا ایک مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ پھر میں اُسے ساری دنیا کو دکھاؤں گی"۔ جانے کیوں پل بھر ہی میں، میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ مجھے لگا کہ ساری دنیا کی طرح وہ لڑکی بھی آج میرا مذاق اُڑانے کے موڈ میں ہے۔ اس نے مجھے دُور سے ہی سہی، مگر دیکھ تو رکھا تھا۔ ضرور اس نے در پردہ میرے چہرے کی تضحیک کا یہ طریقہ نکالا ہے۔ میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔ "مجسمے خوب صورت چہروں کے بنائے جاتے ہیں مس عینی..... اور میں؟ بہر حال، مجھے آپ سے اس مذاق کی امید ہرگز نہیں تھی۔ آپ بھی دوسروں کی طرح ہی نکلیں۔" میں نے فون پٹخ دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی، مگر میں نے اگلے پورے ہفتے اس سے بات نہیں کی۔ دفتر کے نمبر پر فون آیا بھی، تو اسٹاف سے کہہ دیا کہ مصروفیت کا بہانہ کر دے۔ اس نے کچھ خط بھی بھیجے، مگر میں نے پڑھے بنا ایک طرف رکھ دیئے اور پھر آٹھویں دن وہ خود میرے دفتر آ گئی۔ مَیں آفس میں داخل ہوا تو وہ پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی سیاہ چشمہ اس کے گورے چہرے پر پہرہ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ بولی، تو اس کی آواز رندھ سی گئی، جیسے وہ بہت دیر روتی رہی ہو۔ "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" میں چلا اٹھا۔ "آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ میری صُورت کا مذاق ہی اڑانا تھا تو کوئی اور طریقہ اپنا لیتیں، مگر یہ مجسمہ....." وہ رو پڑی۔ "میں آپ کا مذاق اڑانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی، بہت عزت کرتی ہوں میں آپ کی۔ آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔ میں نے تو بنا دیکھے ہی آپ کا ایک مجسمہ اپنے مَن میں بنا رکھا ہے۔" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" اس نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ "میں دیکھ نہیں سکتی..... نابینا ہوں مَیں....." ایک زوردار جھماکا سا ہوا اور میرے اردگرد تمام کمرے میں اس کی بے نور آنکھوں کا اندھیرا پھیلتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

پیاس کہتی ہے، اب ریت نچوڑی جائے
اپنے حصّے میں سمندر نہیں آنے والا

میں سکتہ زدہ سا بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور وہ روتی رہی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میرا بے وقوف دل مجھ سے آنکھ نہیں ملا پا رہا تھا۔ صدیوں بعد جس ایک نظر پر اُسے اپنے ہونے کا گمان ہوا تھا، وہ نظر تو سدا کی بے نور تھی۔ اور میں نہ جانے کن خوش فہمیوں کا شکار ہو چلا تھا۔ ''میں آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا..... جانے غصّے میں کیا کچھ کہہ گیا۔ میرے اندر کا چور تھا، جو چُپ نہیں رہ سکا''۔ عینی نے سر اٹھایا۔ ''آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں، میں نے آپ کو ہمیشہ آپ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھا ہے۔ اور میں نہیں مانتی کہ اتنی خوب صورت سوچ رکھنے والا شخص بدصورت ہوسکتا ہے، دوبارہ ایسی بات کبھی نہ کہیے گا''۔ میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے کہنے یا نہ کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ سچ وہی ہے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس داغ دار چہرے کا مجسمہ بنا تو جو بات آج تک صرف میرے اردگرد والوں کے علم میں ہے، کل سارے شہر میں پھیل جائے گی، اور لوگ مذاق اڑائیں گے کہ یہ پَری زاد کو کیا سوجھی؟'' عینی نے اپنا چشمہ دوبارہ اپنی آنکھوں پر جمایا اور کھڑی ہوگئی۔ ''میں دیکھ نہیں سکتی، اپنی انگلیوں کی پوروں سے چیزیں چُھو کر انہیں مٹی کے مجسموں کے قالب میں ڈھالتی ہوں، مگر آپ کو دیکھنے کے لیے مجھے اپنی پوروں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پَری زاد..... آپ کے لفظ خود آپ کا تعارف ہیں''۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''دل کے بہلانے کو، یہ خیال اچھا ہے۔ مگر میری تم سے اب بھی یہی درخواست ہے کہ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو قراۃ العین''۔ وہ پلٹنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے رُکی۔ ''میں اپنی گیلری میں آپ کا انتظار کروں گی پَری زاد.....'' وہ پلٹ کر چلی گئی اور میرے کمرے میں صرف اس کی خوشبو رہ گئی۔ آج میں نے پہلی بار اسے آپ نہیں، تم کہا، اور اس نے پہلی بار مجھے سَر یا صاحب نہیں، صرف پَری زاد کہہ کر پکارا تھا۔ یہ طرزِ تخاطب اور القابات بھی تو ہمارے اندر کے بدلتے رویوں اور رشتوں کا ایک اظہار ہوتے ہیں۔ دل کی میٹھی بولیاں اپنے القاب خود طے کرتی ہیں۔

اگلی شام میں جھجکتے قدموں کے ساتھ عینی کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گھر کے نچلے حصّے میں عینی اور اس کی ماں رہتی تھیں، جب کہ اوپر والا حصّہ انہوں نے کسی چھوٹے خاندان کو کرائے پر دے رکھا تھا۔ عینی کے والد کافی عرصے پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے اور اب یہی کرایہ اُن ماں بیٹی کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ گھر کے پچھلے حصّے میں عینی نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی آرٹ گیلری بنا رکھی تھی۔ مجسمہ سازی شروع کرنے سے پہلے عینی نے اپنی نازک مہکتی انگلیوں سے میرے چہرے کو مختلف زاویوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ ٹھنڈک اور بے پناہ سکون کا ایک سمندر اس کے پوروں کے لمس سے میرے سارے وجود کی گہرائیوں تک سرایت کر گیا۔ میری جھلستی، تپتی روح کو جیسے خنک برف کا نخلستان سا مل گیا۔ میری تمام عُمر کی ریاضتوں کا حاصل۔ وہ اس کے ہاتھوں کا مہربان لمس..... عینی نے کام شروع کر دیا۔ میں چُپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہا، اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے مجسمہ بنانے میں تین چار دن لگیں گے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ تین چار صدیاں کیوں نہیں.....؟؟ میری زندگی میں وہ پہلی مہ وش تھی کہ جس خوش ادا کی اتنی قربت اور نزدیکی مجھے شرمندہ اور پریشان نہیں کر رہی تھی، کیوں کہ اتنے قریب موجود ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی طرح اُس کی نظریں میرے چہرے کے آر پار نہیں ہو رہی تھیں۔ نہ ہی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ ابھرتی تھی۔ عام طور پر جیسے ہی کوئی میری طرف نظر بھر کر دیکھتا، میری نظر اگلے ہی پل خود بخود جھک جایا کرتی، لیکن عینی کے کومل چہرے کو گھنٹوں دیکھتے ہوئے مجھے ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ مجھے اس سے نظر ملنے کا ڈر نہیں تھا۔ کتنی بڑی آزادی تھی یہ میرے لیے۔ یہ کوئی مجھ جیسوں سے پوچھے۔

ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے میں اگلے دن اور پھر شام ہونے کا انتظار کرتا رہا، جب مجھے دوبارہ عینی کی گیلری پہنچنا تھا۔ صبح سے دوپہر بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے پہروں کی طوالت پر شبہ ہونے لگا۔ یہ دن کو چار پہروں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے؟ پہلا پہر، دوپہر، سہ پہر اور پھر شام۔ کیا ضرورت تھی، بھلا وقت کو اتنے حصّوں میں بانٹنے کی، بس صبح ہوتی اور شام ہو جایا کرتی، تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس جیسے نہ جانے کتنے مزید بے سروپا خیالات میرے ذہن میں جالے بُن رہے تھے، جب اچانک پی اے نے انٹر کام پر مجھے بتایا کہ میڈم شہ پارہ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں شہ پارہ کو اپنے دفتر پا کر کچھ حیران سا تھا۔ میرے لیے وہ آج بھی وہی پرانی لبنیٰ تھی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ ''میں تم سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں پَری زاد..... میرا فلمی کیریئر سیٹھ رحمان کی وجہ سے برباد ہوگیا۔ میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں۔ کیا تم میری سفارش کسی بڑے پروڈیوسر سے کر سکتے ہو؟ بڑی دھاک ہے تمہاری شہر میں، تم کہو گے تو میں پھر سے اپنے قدم جمانے میں کام یاب ہو جاؤں گی''۔ میں نے الجھن سے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن میں تو کسی بڑے پروڈیوسر سے واقف بھی نہیں ہوں لبنیٰ.....'' وہ مایوس ہوگئی ''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ جانے میں کس پریشانی میں بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی۔ تمہارا کاروبار اور فلمی دنیا بالکل جدا ہیں''۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔ میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''ٹھہرو لبنیٰ! تم چاہو تو میں خود تمہاری فلم میں سرمایہ کاری کر سکتا ہوں۔ کتنے میں بن جاتی ہے ایک معیاری فلم.....؟'' وہ خوشی سے بے یقین ہوگئی۔ ''سچ، تم خود پروڈیوس کرو گے میری فلم۔ واہ..... اس سے اچھی بات بھلا اور کیا ہوسکتی ہے، مگر اس کاروبار میں آج کل نقصان کا زیادہ خطرہ رہتا ہے پَری زاد، میں ڈرتی ہوں کہیں تمہاری رقم ہی نہ ڈوب جائے۔ تمہیں کوئی تجربہ بھی تو نہیں ہے فلم پروڈکشن کا.....'' میں نے مسکرا کر اس کی زلفِ پریشاں کے خم کو دیکھا۔ ''چلو اس بہانے رقم ڈبونے کا قیمتی تجربہ تو حاصل ہو جائے گا ناں! تمہاری فلم کے بدلے یہ تجربہ بھی سہی۔ ویسے بھی میں نے سُنا ہے کہ فلمیں دل سے بنائی جاتی ہیں، دماغ سے نہیں، تو پھر دل کی سودوں میں نفع و نقصان کی فکر بھلا کیسی؟ دل کا ملوث ہونا ہی خسارے کی نشانی ہے''۔ لبنیٰ کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فرطِ جذبات میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''نہیں، میں تمہارا نقصان نہیں ہونے

دوں گی پری زاد..... میں بہت محنت کروں گی، بہت زیادہ۔ میری زندگی کی سب سے یادگار پرفارمینس ہوگی اس فلم میں، میرے پاس ایک کہانی ہے، اگر تمہیں پسند آ گئی، تو میں رائٹر سے کہانی پر کام کرنے کا کہہ دوں گی، مگر تمہیں وقت نکالنا ہوگا اس فلم کے لیے۔ میں تمہاری موجودگی میں بہت سہارا محسوس کروں گی"۔ لبنیٰ چلی گئی اور میں شام کو کسی معمول کی طرح بھنی کی گیلری پہنچ گیا۔ اسے گیلی مٹی گوندتے دیکھ کر نہ جانے مجھے ہر بار ایسا کیوں لگتا تھا، جیسے مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کرتی ہوگی کہ کس کے ہاتھوں اس کا بُت بننے جا رہا ہے۔ اس شام ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔ سب لڑکیاں ایک جیسی باتیں کرتی ہیں، مگر اس کا انداز بیاں کس قدر جدا تھا۔ وہ جب رنگوں، خوشبوؤں، ڈھلتی شاموں اور راتوں کے طلسم کا ذکر کرتی، تو میں دم بخود سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہتا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے میں بھنی کے گھر سے نکلا تو ہوا تیز چل رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھنڈ حیرت سے اس ننھے پری زاد کی طرف دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے، راستے ہی میں چند بوندوں نے ٹپک کر میری گاڑی کی ونڈ اسکرین سے گاڑی کے اندر جھانکا اور مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتی، ہنستی ہوئی برستی بارش میں اپنی دوسری سہیلیوں سے جا ملیں۔ کبیر خان حسب معمول چوکنا سا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ارد گرد پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اتنے میں لبنیٰ کا نمبر میرے سیل فون پر جگمگانے لگا۔ "پری زاد..... کہاں ہو تم؟" "اجنبی شہر کے اجنبی راستے..... اور میں"۔ وہ ہنس پڑی۔ "اسٹوڈیو آ سکتے ہو ابھی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے"۔ میں نے کبیر خان کو اسٹوڈیو چلنے کو کہا۔ ہم ویران سے فلم اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچے تو چند عجیب سے حلیے والی عورتیں اور مرد ہمیں اندر گھومتے نظر آئے۔ عجیب سی اُداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی سارے ماحول پر، جیسے کوئی سوگ برپا ہو۔ ہم ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے، تو وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ کبیر کا حلیہ اور کاندھے سے لٹکا پسٹل دیکھ کر وہ سب کچھ جز بز سے ہو گئے۔ میں نے کبیر کو باہر انتظار کرنے کو کہا، مگر میں جانتا تھا کہ وہ دروازے کے باہر ہی جما کھڑا رہے گا۔ نئی جگہ اور نئے ماحول میں وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ لبنیٰ نے ڈائریکٹر اور باقی لوگوں سے میرا تعارف کروایا۔ ایک جانب کونے میں ایک بوڑھا شخص

ہارمونیم سامنے رکھا بیٹھا تھا اور اس کی آڑ میں سمٹی سمٹائی ایک شرمیلی سی لڑکی، چھوئی موئی سی بنی بیٹھی تھی، جو اس دفتر کے ماحول سے بالکل میل نہیں کھا رہی تھی۔ باقی لوگوں کی چبھتی ہوئی نظریں لڑکی کے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں، مگر میرے آتے ہی ڈائریکٹر نے فالتو عملے کو باہر بھیج دیا، تو لڑکی کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا، مگر ابھی تک وہ وہیں دبکی بیٹھی تھی۔ لبنیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ عمر رسیدہ شخص استاد بنے خان ہے، مشہور موسیقار اور اس کے پہلو میں سمٹی ہوئی لڑکی سنبل ہے، استاد بنے خان کی بیٹی اور آج وہ دونوں لبنیٰ کی آنے والی فلم کی دُھنوں پر کام کرنے کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ڈائریکٹر ایک پکی عمر کا تیز طرار سا بندہ تھا، جسے فلم ملنے کی بے حد خوشی تھی، لیکن کہیں اندر سے کوئی بے یقینی بھی اسے کھائے جا رہی تھی۔ "بس پری زاد صاحب! کیا بتاؤں آپ کو، کبھی یہی فلم اسٹوڈیو تھا کہ چوبیس گھنٹے کام کی شفٹ چلتی رہتی تھی، کہیں ندیم صاحب، تو کہیں محمد علی صاحب۔ کہیں شاہد تو کہیں وحید مراد، کوئی نہ کوئی شوٹنگ جاری رہتی تھی۔ یہ جو فوارہ آپ نے نیچے دیکھا ہے ناں، یہاں تو بہ یک وقت تین تین گانے شوٹ ہوا کرتے تھے۔ بس پھر نہ جانے کیا ہوا، سب برباد ہوتا چلا گیا۔ اب تو سال بھر میں ایک آدھ فلم بنتی ہے، اس کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ سیکڑوں کاری گر اور ان کے خاندان بے روزگار ہو گئے"۔ وہ مزید بناؤ کے یونہی بولتا رہتا، اگر لبنیٰ اسے اشارہ کر کے روک نہ دیتی۔ لبنیٰ ہی کے کہنے پر ڈائریکٹر نے مجھے فلم کی کہانی سنائی، بنیادی پلاٹ محبت کی کہانی پر مرکوز تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں صرف تین یا چار کہانیاں ہی پائی جاتی ہیں۔ باقی ساری کہانیاں انہی کہانیوں سے جنم لیتی ہیں اور مجھے یہ پڑھ کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی، تین چار کی جگہ اگر صرف ایک محبت کی کہانی ہوتی، تو بھی اس کائنات کے لیے کافی تھی۔ درمیان میں ڈائریکٹر ہمیں گانے کی سچوئیشن اور مقام بھی بتاتا رہا اور کہانی کے اختتام کے بعد استاد بنے خان اپنا ہارمونیم اٹھائے کمرے کے وسط میں بیٹھ گئے۔ سنبل بھی استاد کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی اور استاد نے راگ چھیڑ دیا۔ لڑکی کی آواز واقعی سُریلی تھی اور گلے میں نکالا کا لوچ تھا۔ وہ گانے کے دو بول دہراتی اور پھر گھبرا کر میری طرف اپنی ہرنی جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھتی کہ میں دل چسپی لے رہا ہوں یا نہیں۔ فن کو ہمیشہ ستائش کی تمنا رہتی ہے اور شاید فن کار کو اپنے قدر دانوں کی نظریں پڑھنے کا فن آتا ہے۔ "جب بارش کی پہلی بوند گرے..... تم چلے آنا..... میرا سندیسہ ملے نہ ملے..... تم چلے آنا....." باہر برستی بارش کے جلترنگ کے ساتھ مل کر استاد بنے خان کے سُر اور سنبل کی رسیلی آواز ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہے تھے۔ استاد نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی نے بی۔اے کر لیا ہے، مگر اب وہ اسے اپنے آبائی فن سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ شہ پارہ بیگم نے انہیں اپنی نئی فلم میں موقع دینے کا وعدہ کیا ہے، مگر یہ سب میری منظوری پر منحصر ہے۔ استاد کسر نفسی کا پیکر تھا اور اس کی اور بیٹی کی خستہ حالی، ان دونوں کی حالت بھی پوری طرح بیان کر رہی تھی۔ مجھے وہ ایک وضع دار شخص لگا، جسے غالباً کسی بہت بڑی مجبوری نے یوں بیٹی کو فلم انڈسٹری کے ماحول میں بطور گلوکارہ متعارف کروانے پر اکسایا ہوگا۔ جب استاد نے لجاجت سے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے ان باپ بیٹی کا فن پسند آیا، تو میرے لب کپکپا سے گئے۔ "یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ مجھے تو ٹھیک طرح سے سُننا بھی نہیں آتا۔ میں بھلا آپ کے فن کی جانچ کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ کی ریاضت اور محنت نے آپ کو اس مقام پر پہنچایا ہے۔ کوئی ہنر مند ہی آپ کو صحیح داد دے سکتا ہے"۔ استاد بنے کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ لبنیٰ نے موضوع بدل دیا۔ "آپ بھی کن باتوں میں پڑ گئے ماسٹر جی..... پری زاد صاحب کی یہ پہلی فلم ہے"۔ استاد بنے نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ "ہاں، پر ادب والے ہیں۔ شاید اسی لیے آج اس مقام پر ہیں"۔ میں نے لبنیٰ سے دبے لفظوں میں دوبارہ کہا کہ وہ فلم سے متعلق تمام فیصلوں کی مختار ہے۔ مجھے ان جھمیلوں سے دور ہی رکھے، مگر وہ نہیں مانی اور اگلی رات کے لیے پھر سے فلم کی دوسری میٹنگ رکھ دی گئی۔ ہم لوگ چائے پی کر رخصت ہوئے تو گیٹ کے قریب میں نے استاد بنے اور سنبل کو سڑک کنارے انتظار کرتے دیکھا۔ میں نے شیشہ نیچے کر کے پوچھا تو پتا چلا کہ رکشے یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ ان کے لاکھ انکار کے باوجود میں نے انہیں گاڑی میں بٹھا لیا۔ بارش تیز تر ہو چکی تھی۔ ہماری گاڑی اندرون شہر کی چند تاریک گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک پرانے محلے کے بوسیدہ سے لکڑی کے پھاٹک نما گیٹ پر جا کھڑی ہوئی۔ استاد نے بہت اصرار کیا کہ میں ایک کپ چائے پی کر جاؤں، مگر میں نے معذرت کر لی۔ اس کی بیٹی نے بھی دبے لفظوں میں مجھے گھر آنے کا کہا۔ میں نے پھر کبھی آنے کا وعدہ کر لیا۔ وہ دونوں ہماری گاڑی نکلنے تک وہیں کھڑے رہے۔

اگلی شام میں ٹھیک چار بجے بھنی کی گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا، جیسے ایک پڑھاکو بچہ ٹھیک وقت پر اپنی جماعت میں پہنچ کر سبق سنانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ میں نے بھنی کو فلم کے بارے میں بتایا تو خوشی سے چلائی۔ "فلم..... واہ..... پری زاد میں آپ کی فلم کی آرٹ ڈائریکٹر بنوں گی۔ ساری سجاوٹ میری طے کردہ ہوگی، ہر سیٹ پر میری بنائی ہوئی مورتیاں ہوں گی، ٹھیک.....؟" "ہاں ہاں، ٹھیک ہے، مگر پہلے میرا مجسمہ تو مکمل کر دو۔ کہیں اس فلم کے جھمیلے میں ہمارا کام ہی نہ رہ جائے"۔ وہ میری بات سُن کر زور سے ہنس پڑی۔ سناٹے میں یک لخت بہت سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ زندگی بس اسی دورانیے کا نام ہوتی، تو کتنا اچھا ہوتا، مگر ہر اچھے وقت کی طرح یہ پل بھی پل بھر میں کٹ گئے اور مجھے اٹھنا پڑا۔ واپسی پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹوڈیو کی طرف موڑنے کا کہا تو کبیر اپنے چہرے کے تاثرات چھپا نہیں پایا۔ "صاب! اجازت دو تو ایک بات

بولے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''ہاں بولو.....؟'' وہ اگلی سیٹ پر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا کسمسایا ''صاب! یہ فلم اسٹوڈیو کا علاقہ محفوظ نہیں ہے۔ ہزار دوست، ہزار دشمن ہوتا ہے بندے کا.....'' میں نے چونک کر کبیر کی طرف دیکھا۔ وہ تبھی اپنی زبان کھولتا تھا، جب اسے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے شہر میں بہت سوں کی ترقی رک چکی تھی۔ ہر بڑا ٹینڈر میرے نام کھل رہا تھا۔ میری دولت کا مقناطیس اپنے جوبن پر تھا، جو مایا کا کوئی بھی ذرّہ اپنے سے دور جانے نہیں دیتا تھا اور یقیناً یہ بات بہت سوں کو کھلتی بھی ہوگی۔ گاڑی اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی تو حسب معمول چند آوارہ کتوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈائریکٹر کے کمرے میں نشست جمی ہوئی تھی۔ استاد بنّے اور سنبل نے تیار کردہ دُھنوں پر کچھ گیت گنگنائے۔ مگر مجھے شاعری کچھ عامیانہ سی لگی۔ لینی نے میری بے چینی بھانپ لی۔ ''پُری زاد..... تم خود کیوں گیت نہیں لکھتے اپنی فلم کے لیے''۔ سنبل نے شاعری کے ذکر پر چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے

جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں نہیں، مجھے فلمی شاعری کا بالکل تجربہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم کسی مستند فلمی شاعر سے گیت لکھوالیں''۔ سنبل نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور جھجک کر بولی۔ ''اگر آپ لوگ اجازت دیں تو ہمارے محلے میں ہی ایک بہت اچھے شاعر رہتے ہیں۔ دنیاداری سے ناتا نہیں، مگر ضرورت مند بھی ہیں، ہو سکے تو.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ ڈائریکٹر نے منہ بنایا ''دیکھ لیں گے اُسے بھی، کون سا ساحر لدھیانوی یا مجروح سلطان پوری چُھپا بیٹھا ہے اس کے اندر''۔ لینی شاعری میں دیر کی وجہ سے کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے بنّے خان سے کہا کہ ہم ابھی چل کر مل لیتے ہیں اس شاعر سے، ڈائریکٹر بوکھلا سا گیا۔ ''ارے کیا بات کرتے ہیں سر جی..... آپ کیوں جائیں گے، وہ خود آئے گا یہاں''۔ میں نے اس کی سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہم اسٹوڈیو سے باہر نکل رہے تھے کہ اچانک چند لوگ ''شاہ جی..... شاہ جی'' کہتے ہوئے ایک خوش لباس شخص کی طرف لپکے، استاد بنّے نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وہ شخص بہت گرم جوشی اور عزت سے بنّے خان سے ملا۔ گاڑی آگے بڑھی، تو بنّے خان نے مجھے بتایا۔ ''یہ سید نور صاحب ہیں..... پاکستان کی فلم انڈسٹری اب بس انہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ آج کل بڑی اچھی فلم بنا رہے ہیں، مجاجن''۔ گاڑی بنّے خان کے اندھیرے محلے میں پہنچی تو میں بھی باپ بیٹی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ چند گلیاں گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک چھوٹے سے کچے مکان کے آگے رُک گئے۔ دستک کے جواب میں اندر سے کسی نے لرزتی آواز میں کہا ''اندر آجائیے صاحب، مزاروں کے دروازوں پر دستک نہیں دی جاتی''۔ میں، سنبل اور بنّے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے برآمدے کے سامنے بنے واحد کمرے کے اندر لالٹین کی کم زور سی روشنی نے مٹیالا اُجالا پھیلا رکھا تھا۔ بنّے اور سنبل کو دیکھ کر میزبان کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی ''کبھی ہم خود کو، کبھی گھر کو دیکھتے ہیں.....'' بان کی جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا وہ کم زور سا نوجوان اٹھ بیٹھا۔ ''معاف کیجیے گا، کمرے میں ایک ہی کرسی ہے لہٰذا.....'' وہ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، مگر میری نظریں اس کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھی میری چبھتی نظریں محسوس کر کے میری جانب متوجہ ہوگیا۔ اور پھر اس کی حالت بھی مجھ جیسی ہی ہوگئی اور وہ بے تابی سے کھڑا ہوگیا اور لپک کر مجھے شانے سے پکڑ کر سرسراتی آواز میں بولا ''پُری زاد..... یہ، یہ تم ہی ہو ناں.....'' میری آنکھیں نم ہونے لگیں ''کیوں.....؟ یہ چہرہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانا کیا، صرف لباس و حلیہ بدلا ہے میرا۔ مقدر وہی لیے پھر رہا ہوں ناساز.....'' وہ روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ کہاں چلا گیا تھا یار! اپنے دوست کو بھی بُھلا دیا''۔ بنّے خان اور سنبل حیرت زدہ اور پریشانی سے ہم دونوں کو گلے مل کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہاں وہ ناساز ہی تھا۔ میرے کالج کے دور کا واحد دوست، جس نے میرے اندر چھپی شاعری کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلے میں تبدیل کر دیا تھا۔ سنبل نے جھجکتے ہوئے ناساز سے کہا ''آپ انہیں جانتے ہیں، یہی فلم کے پروڈیوسر ہیں پُری زاد..... اور میں نے ان ہی کی فلم کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو کہا تھا آپ سے.....'' ناساز حیرت سے مجھے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا ''یہ کیا انقلاب ہے پیارے، سب فتح کر لیا کیا میرے شہ سوار؟ تُو تو واقعی فاتح نکلا''۔ میں نے مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا ''نہیں..... اب بھی ہار رہا ہوں، بس سونا چاندی جمع ہوتا جا رہا ہے زادِ راہ کے طور پر، دل اتنا ہی ویران اور ناکارہ ہے اب تک''۔ وہ زور سے ہنسا ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا.....'' بنّے خان اور سنبل ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر گھر سے چائے وغیرہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔ ناساز کے گھر کی حالت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پاس شاید چائے کے پورے برتن بھی نہ ہوں۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ کم زور اور لاغر لگ رہا تھا۔ وہ غور سے میری داستان سُنتا رہا۔ اس کے آس پاس دواؤں کا ایک انبار سا لگا ہوا تھا۔ ''یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ناساز..... کالج کا سب سے خوش پوش اور زندہ دل لڑکا یوں بستر سے لگا پڑا ہے۔ سب خیر تو ہے نا.....'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''یاد ہے، کالج کے دور میں ہم نے چُھپ کر ہاسٹل میں وی سی آر پر فلم دیکھی تھی ''نمک حرام'' اس میں وہ شاعر والا گیت ہم دونوں کتنا گنگنایا کرتے تھے۔ ''میں شاعر بدنام..... میں چلا..... محفل سے ناکام..... میں چلا.....'' تو بس یار..... یہ شاعر جو ہوتے ہیں ناں، یہ محفل سے ناکام ہی چلے جاتے ہیں''۔ میں نے اسے غور سے دیکھا ''اور یہ پھولوں جیسی لڑکی سنبل، یہ اس شاعرِ ناکام کی کیا لگتی ہے؟'' اس نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''پگلی ہے، مزاروں کے در کھٹکھٹاتی رہتی ہے۔ اب دیکھو، تمہیں پکڑ لائی ہے اور یہ تم ہی تھے کہ آ گئے، کوئی روایتی فلم پروڈیوسر ہوتا تو کبھی نہ آتا''۔ اتنے میں باہر صحن کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ناساز کو لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل کر دروازہ کھولا تو سنبل چائے کے لوازمات لیے کھڑی تھی۔ ''آپ نے یہ سب تکلف کیوں کیا؟ میں کوئی مہمان تو نہیں ہوں سنبل''۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ اسے بچا لیں پُری زاد صاحب، آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں۔ ہمارا واحد سہارا اب آپ ہیں.....'' میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا ہوا ناساز کو.....'' سنبل کی آنکھیں چھلک پڑیں ''اسے کینسر ہے، اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آخری اسٹیج پر ہے اس کا کینسر.....'' میرے پیروں تلے زمین یک دم سرک گئی۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بکھرے کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

سنبل چائے رکھ کر کمرے سے باہر نکلی، تو میں نے ناساز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چلو میرے ساتھ، اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی، جہاں تمہارا علاج ممکن ہو، تمہیں وہاں پہنچانا اب میری ذمّے داری ہے۔ اٹھو، جلدی کرو۔'' ناساز نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا ''بہت دیر ہو چکی ہے پَری زاد..... اب مجھے یہیں رہنے دو۔ یہ کمرا، یہ تنہائی اب یہی میری سنگت ہے، اور پھر یہاں وہ پگلی بھی تو ہے ناں..... مجھے ان سب کے ساتھ رہنے دو''۔ میں نے غصّے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سُنوں گا، ساری زندگی دوسروں کو جینے کا درس دیتے رہے اور آج خود زندگی سے بھاگ رہے ہو، ایسا کیوں کر رہے ہو میرے یار.....؟'' ناساز نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ ''زندگی خود مجھ سے دامن چُھڑانے کی فکر میں ہے پیارے، میں ہی ڈھیٹوں کی طرح اس کے دامن سے لپٹا ہوا ہوں۔ ہاں، اب اگر مَر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں۔ میرے جانے کے بعد تم سنبل کا خیال رکھو گے ناں پَری زاد.....'' میں نے واپس پلٹنے سے پہلے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا ''کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔ میں تمہیں کچھ ہونے نہیں دوں گا میرے شاعر بدنام، کل تیار رہنا۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہے''۔ ناساز نے ہنس کر میری طرف دیکھا اور شرارت سے بولا۔ ''تشخیص بجا ہے، کہ مجھے عشق ہوا ہے..... نُچے میں لکھوان سے ملاقات مسلسل''

اگلے روز عینی کی گیلری میں بھی میرا دھیان ناساز کی طرف ہی لگا رہا۔ عینی نے حتمی طور پر چند زاویے درست کیے اور مجسمے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ''بس جناب، ہوگیا مکمل''۔ اس کی آواز سے جوش ٹپک رہا تھا ''بتائیں ناں پَری زاد۔ کیسا بنا ہے آپ کا اسکلپچر.....؟'' میں اپنے خیالات کی دنیا سے چونک کر پلٹا۔ اور پھر میری نظر عینی کے بنائے مجسمے پر پڑی تو آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ میں بے اختیار اٹھ کر مجسمے کے قریب آگیا۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں، اتنا بے داغ، خُوب صورت، مردانہ وجاہت سے بھرپور چہرہ، ایسا چہرہ تو میں نے کبھی آئینے میں نہیں دیکھا تھا۔ عینی میری حالت سے بے خبر اپنی دُھن میں بولے جا رہی تھی ''میں اپنی پوروں کی آنکھوں سے آپ کو ایسا دیکھتی ہوں پَری زاد..... بتائیں ناں، کتنا قریب تر ہے یہ آپ سے، آپ چُپ کیوں ہیں، بولتے کیوں نہیں، کیا میں نے بہت بُرا بنایا ہے۔ کچھ تو بولیں، پلیز.....'' وہ پریشان سی ہوگئی۔ میری آواز کی لرزش خود میرے لیے بھی اجنبی تھی ''نہیں، تم نے دنیا کا سب سے خُوب صورت چہرہ تراشا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ پیاری لڑکی میں تو وہ ہوں، جسے دیکھ کر آئینے بھی آنکھیں پھیر لیتے ہیں، سرسراتی ہوائیں گھبرا کر تھم جاتی ہیں، سورج مدھم پڑ جاتا ہے اور چاند کی چاندنی تپتی کرنیں برسانے لگتی ہے۔ وہ تڑپ کر میرے قریب آگئی ''ایسا کیوں کہتے ہیں آپ، میری انگلیوں کی پوریں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، یہ میرے مَن کی تصویر مٹی کے قالب میں ڈھالتی ہیں، سچ بتائیں، اس چہرے کے خدوخال آپ کے چہرے جیسے نہیں ہیں کیا.....؟'' میری آواز بھرّا گئی۔ ''ہاں بلاشبہ، خدوخال، نقوش، آنکھیں سب میرے چہرے سے مشابہ ہیں، مگر جو نُور، حُسن و وجاہت تمہاری پاکیزہ انگلیوں کی کاری گری نے اس مجسمے میں منتقل کر دی ہے، میرے پاس ایسی کوئی روشنی، کوئی حُسن نہیں''۔ وہ رو پڑی۔ کاش میں اسے یہ بات سمجھا سکتا کہ دنیا اس کے کومل مَن کی آنکھوں سے نہیں دیکھتی۔ دنیا بڑی ظاہر پرست ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آج میں اتنا اُداس کیوں ہوں۔ میں نے اسے اپنی اور ناساز کی دوستی کے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ عینی نے ناساز سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں شام ڈھلے اس کے گھر سے واپسی پر اُسے بھی اپنے ساتھ ناساز کے گھر لے آیا۔ ناساز نے عینی کو میرے ساتھ دیکھا، تو حسبِ عادت مصرع اس کے ہونٹوں سے پھسل گیا ''سُنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں.....'' میں نے اُن دونوں کا تعارف کروایا۔ ناساز نے شرارت سے میری طرف دیکھا ''سو، اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں.....'' میں نے اسے گھور کر دیکھا ''باز آجاؤ، عینی تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اپنی ضد چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے۔ دنیا کی کوئی بھی بیماری لاعلاج نہیں ہوتی۔ کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے''۔ عینی اور ناساز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناساز نے فلم کے لیے لکھے اپنے نغمے عینی کو سنائے۔ کچھ دیر بعد سنبل بھی آگئی اور حسبِ معمول دو لڑکیوں کے اکٹھے ہوتے ہی باقی ساری باتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں ایسی گم ہوئیں کہ باقی سب بھول گئیں۔ کہتے ہیں، دو لڑکیاں جب پہلی بار ملتی ہیں تو عموماً ڈھائی تین گھنٹے کی تعارفی ملاقات کے بعد ایک دوسرے سے ان کا پہلا سوال ہوتا ہے ''ویسے تمہارا نام کیا ہے.....؟'' وہ دونوں بھی برآمدے میں بیٹھی شاید ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہی تھیں۔ ناساز سرک کر میرے قریب آگیا ''تم تو بڑے چُھپے رستم نکلے پَری زاد پیارے..... ایسی پری ساتھ لیے پھرتے ہو کہ جس کی پہلی جھلک ہی دھڑکنیں روک دے۔ اور پھر بھی کہتے ہو کہ دل ابھی ویران ہے''۔ میں نے دُکھ سے باہر بیٹھی عینی کی طرف دیکھا۔ ''وہ دیکھ نہیں سکتی، اس لیے میرے ساتھ ہے، ورنہ دوسروں کی طرح یہ رشتہ بھی تضحیک یا ہمدردی کے قالب میں ڈھل جاتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں خود اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اس کے ساتھ چل کر میں نہ صرف خود کو بلکہ اس معصوم، اَن جان لڑکی کو بھی لوگوں کے مذاق کا باعث بنا رہا ہوں''۔ ناساز میری بات سُن کر خاموش سا ہوگیا ''میں باقی ساری دنیا کی طرح یہ کہہ کر تمہارے زخموں پر نمک نہیں چھڑکوں گا کہ دولت ہر مرض کا علاج ہے، لیکن تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ اگر تم اپنے اندر کی اس آواز کو دبا نہیں سکتے، تو پھر اپنا چہرہ بدل ڈالو۔ آخر کب تک خود کو اسے اَن دیکھے عذاب کی بھٹی میں جھونکے رکھو گے؟'' میں نے چونک کر ناساز کی جانب دیکھا ''کیا مطلب؟'' ''مطلب یہ کہ آج کل کیا ممکن نہیں، صرف جیب میں دمڑی ہونی چاہیے، جو ماشاءاللہ اب تمہارے پاس بہت ہے۔ کہیں بھی بیرونِ ملک جا کر پلاسٹک سرجری کروالو۔ آج کل تو ساری دنیا کو چہرہ بدلنے کا خبط سوار ہے۔ اچھے خاصے لوگ علاج کے بہانے اپنے چہرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پلاسٹک سرجری کروا لیتے ہیں۔ تو پھر اگر تم بھی اپنی جون بدل لو گے، تو بھلا کون سی قیامت آجائے گی۔ اتنے میں وہ دونوں اندر چلی آئیں اور ناساز نے بات بدل دی۔

رخصت ہوتے وقت ناساز نے عینی سے کہا ''سُنو لڑکی، آج میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں، جو آج سے پہلے تمہیں شاید کسی نے نہ بتائی ہو۔ تمہاری آنکھیں دنیا کی سب سے خُوب صورت آنکھیں ہیں۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ جلد ہی یہ آنکھیں اس دنیا کے سارے رنگ دیکھ سکیں گی''۔ عینی کی پلکیں نم ہوگئیں اور ہم وہاں سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ لیکن میرا دھیان ساری رات ناساز کی پلاسٹک سرجری والی بات میں الجھا رہا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے، پیدائش سے لے کر آج تک مجھے جن عذابوں کا سامنا رہا ہے، وہ سب الجھنیں، کرب اور عذاب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جائیں گے کیا؟ مگر عُمر بھر کی شناخت

بدلنا تو کچھ آسان نہیں۔ جو لوگ اس بَدی زاد کو جانتے ہیں، وہ ایک نئے اور اُجلے چہرے والے بَدی زاد کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیں گے۔ ساری رات نہ جانے ایسے کتنے بے سروپا خیالات میرے خالی دماغ میں بھٹکتے رہے۔

جانے کب صبح ہوئی اور کب سورج نے میری کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دھوپ کا سلام بھیجا۔ دفتر پہنچا تو کمالی میرے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔ "یہ کیا سَر جی! آپ نے اتنی بڑی فلم شروع کر دی، اور مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی"۔ کمالی کے ہاتھ میں صبح کا اخبار دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ تو یہ خبر چھپ گئی، یہ اخبار والے جانے اتنی جلدی کیسے اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہیں۔ ابھی تو صرف منصوبہ ہی بنا تھا"۔ کمالی نے جوش میں اندرونی صفحہ کھولا۔ "شہ پارہ بیگم کا پورا انٹرویو چھپا ہے سَر! ساری فلم انڈسٹری بلا کر رکھ دی ہے آپ نے، کبھی مجھے بھی بہت شوق تھا فلموں میں کام کرنے کا۔ آہ، مگر اب تو فلم دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملتی"۔ میں کسی اور خیال میں گم بیٹھا تھا۔ کمالی اپنی دُھن میں بولے گیا۔ "اس دن آپ نے مجھ سے پوچھا تھا نا سَر کہ شادی کے اتنے سال بعد بچّوں اور گھر بار کے مسائل کے ہجوم میں ہماری محبت کہاں کھو جاتی ہے، تو بات صرف محبت کی نہیں ہے۔ ہم وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دل کی باقی حسرتیں اور خواہشیں بھی مٹی کر دیتے ہیں اس غمِ دوراں کی آندھی میں۔ اب یہی فلم ایکٹر بننے والی خواہش ہی لے لیں میری۔ کاش! میں شادی کے چکّر میں اس آرزو کا گلا نہ گھونٹتا"۔ کمالی باقاعدہ غم گین ہو گیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "جانتے ہو کمالی، دنیا کا سب سے ناکام آدمی کون ہوتا ہے، وہ، جو اپنے ماضی کے کیے گئے فیصلوں کو یاد کر کے حال میں خود کو کوسے۔ تم نے اُس وقت وہی فیصلہ کیا، جو تمہارے دل نے بہتر جانا۔ تب تمہاری محبت ہی تمہاری ہر خوشی کا حاصل تھی۔ اگر اُس وقت تم فلم انڈسٹری جوائن کر لیتے تو شاید آج ایک نام ور آرٹسٹ کہلاتے، مگر یقین کرو، اپنی محبت کھو دینے کی کسک تمہیں آج زیادہ غم گین رکھتی۔ جسے تم نے پا لیا، بس وہی تمہارا نصیب ہے، باقی سب سراب ہے"۔ کمالی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، مگر پھر یہ پایا ہوا نصیب اپنی کشش کیوں کھو دیتا ہے۔ لاحاصل ہی ہمیشہ پُرکشش کیوں رہتا ہے؟" میں نے لمبی سانس بھری "شاید اس لیے کہ انسان سدا کا ناشکرا ہے۔ اور رہی بات محبت کی، تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے، اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب رفتہ رفتہ ہماری محبت، شفقت میں بدل جاتی ہے۔ محبت، محبت نہیں رہتی، ایک گہری شفقت بن جاتی ہے"۔ کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "شفقت..... میں سمجھا نہیں سر"۔ "ہاں کمالی، شفقت، ہماری محبت کہیں کھوتی نہیں ہے۔ بس کسی اور جذبے میں ڈھل جاتی ہے۔ اور ہم یا تی ساری زندگی اس شفقت ہی کو محبت سمجھتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہماری زندگی میں کسی نئی محبت کے لیے جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور یوں ہماری زندگیوں میں نئی محبتوں کا ڈاکا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جاؤ کمالی، اپنی بیوی بچّوں کو اپنا پورا وقت دیا کرو۔ کیوں کہ کبھی کبھی شفقت کا قرض محبتوں کے اُدھار سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے"۔ کمالی چپ چاپ دفتر سے نکل گیا۔

دوپہر کو لچی کا فون آیا، تو میں نے اسے خوش خبری سُنائی کہ ناساز نے فلم کے سارے گیت لکھ کر استاد بنے خان کے حوالے کر دیے ہیں۔ میوزک بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا، چند اداس گلے ہفتے فلم کی ساری موسیقی ترتیب دے دی گئی۔ سنیل نے مجھے بتایا کہ اس نے مہینوں بعد ناساز کی آنکھوں میں خوشی کی سچی لہر دیکھی، جب اس نے اپنی شاعری پر سنیل کی آواز کا جادو جگتے سُنا۔ لچی کی خواہش تھی کہ فلم کے گانے کینیڈا یا یورپ کے کسی حسین مقام پر فلم بند کیے جائیں۔ فلم کی کاسٹنگ مکمل ہو چکی تھی اور اب صرف شوٹنگ کا مرحلہ شروع ہونا باقی تھا۔ میں دن بھر غیر محسوس طور پر طب کے رسالوں اور انٹرنیٹ پر دنیا کے بہترین پلاسٹک سرجنز کی تفصیلات کھنگالتا رہتا تھا۔ میرے دفتر کی الماریوں اور میز کے خفیہ دراز اب ایسی معلومات سے بھرے رہتے تھے، مگر یہ سب کچھ میں اس طرح چھپ کر کر رہا تھا، جیسے کوئی چور، چوری کرتا رہا۔ پہلے مجھے ہمیشہ یہ خوف اور فکر دامن گیر رہتی تھی کہ لوگ میری صورت کا مذاق اُڑائیں گے اور اب جب ایک راستہ دکھائی دیا تھا تو یہ ڈر دامن سے لپٹا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے.....؟ ہماری زندگی کے نوّے فی صد معاملات کی اُلجھن اسی ایک جملے ہی میں تو پنہاں ہے کہ زمانہ کیا کہے گا.....؟ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم زیادہ تر اُن ہی لوگوں کی باتوں کی فکر میں گھلے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے درحقیقت ہماری زندگی اجیرن ہوتی ہے۔

اگلی شام میں عینی کے گھر پہنچا، تو وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ ریڈیو ایشین کے لیے نکل چکی تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا، تو اس کی والدہ نے مجھے چائے کے لیے روک لیا، کمرے میں چاروں جانب میڈیکل رپورٹس اور آنکھوں سے متعلق دنیا کے کچھ مشہور اسپتالوں کے کتابچوں کا انبار سا لگا تھا۔ عینی کی والدہ نے بتایا کہ عینی سات سال کی عُمر تک بالکل ٹھیک تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کی بینائی جاتی رہی۔ اُس وقت عینی کے والد زندہ تھے اور انہوں نے اپنی سی ہر ممکن کوشش کر دیکھی، مگر عینی کی بینائی واپس نہ آ سکی۔ پھر کئی سال بعد بات یہاں تک پہنچی کہ اگر عینی کے گروپ سے مشابہت رکھتا ہوا لینز (قرنیہ) مل جائے تو عینی کی بصارت واپس آ سکتی ہے۔ عینی کی والدہ نے دنیا بھر کے طبّی اداروں کو اپنی بیٹی کے کیس کی تفصیلات بھجوا رکھی تھیں اور اب مہینوں سے اس جواں ہمت خاتون کا کام بس یہی تھا کہ وہ عینی کے آنکھوں کے قرنیے کی تلاش کے لیے دنیا بھر میں خط و کتابت کرتی رہتی تھیں۔ میں نے انہیں تسلّی دی کہ اللہ نے چاہا تو جلد ہی ان کی تلاش، رنگ لائے گی۔ عینی کے گھر سے نکلتے وقت میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اگر عینی کی بینائی میری سرجری سے پہلے واپس آ گئی تو وہ مجھے دیکھ کر کیا سوچے گی۔ اس کے مَن نے میری جو شبیہ تراشی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جائے گی۔ کاش! اس ساری دنیا میں کسی کی آنکھیں ہی نہ ہوتیں اور ہم سب اپنی انگلیوں کی پوروں سے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر جہاں "کاش" آ جائے، وہاں آخر میں صرف ایک "آہ" رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی ایک لمبی آہ بھری۔ کچھ بھی ہو، مجھے کسی بھی صورت عینی کی بصارت واپس آنے سے پہلے اپنی سرجری کروانی ہوگی، مجھے اپنے چہرے کو عینی کے بنائے ہوئے مجسمے کی شبیہ میں ڈھالنا ہوگا تاکہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھے تو میں اُسے اُسی طرح نظر آؤں، جیسا وہ مجھے محسوس کرتی ہے۔ گاڑی تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور میرے اندر میرے اپنے ہی متضاد خیالات کی ایک ایسی یلغار جاری تھی، جس نے مجھے پوری طرح نڈھال کر کے رکھ دیا۔ وہ پوری رات عجیب کرب میں گزری اور پھر، صبح آ کر میں نے انٹرنیٹ سے جمع شدہ معلومات کے مطابق پلاسٹک سرجری کے تمام اداروں کو ای میلز کر دیں، جن میں اپنی تازہ ترین تصاویر اور باقی تمام جزئیات بھی تحریر کیں۔ دوسرے دن ہی سے مجھے مختلف اداروں سے جوابات موصول ہونا شروع ہو گئے اور تین دن بعد ان جوابات کے انبار میں سے مجھے اپنے مطلب کے ادارے کا انتخاب کرنا آسان ہو گیا۔ ٹورنٹو کے ایک طبّی ادارے نے پلاسٹک سرجری کے لیے جو لوگو ڈیزائن کیا تھا، اس پر لکھی ایک سطر نے مجھے اسے چُننے پر مجبور کر دیا۔ جس کی تحریر کچھ یوں تھی "ہم چاہے تقدیریں نہ بدلیں، مگر چہرے بدل دیتے ہیں۔"

میں نے پائن ہل (Pine Hill) نامی اس پلاسٹک سرجری کے ادارے کی تمام تفصیلات اکٹھی کیں اور پھر اس کے سربراہ پال جونز کو ساری تفصیل لکھ بھیجیں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پال کا جواب آ گیا کہ ان کا ادارہ بنیادی طور پر آگ میں جھلس جانے والوں یا کسی حادثے کے نتیجے میں اپنے اصلی خدوخال کھو دینے والوں کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ اور میرا کیس ان کے ادارے کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ میں نے پال کو دوسری میل بھیجی کہ کیا ان کا ادارہ محبت کرنے والوں کے خواب پورے نہیں کر سکتا؟ میں بھی تو تقدیر نہیں، صرف چہرہ بدلنے کے خواہش مندوں میں شامل ہوں۔ اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں

اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش کروں تو میں اپنے چہرے کھلسا کر ان کے ادارے کی شرط پر پورا اترنے کو تیار ہوں۔ میں نے رات گئے یہ میل پال کو بھیجی اور وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک کر آنکھیں موند لیں، صبح سویرے پرندوں کے شور سے میری آنکھ کھلی تو پال کی میل میرے ان باکس میں نمایاں تھی۔ میں نے جلدی سے اسے کھولا اور تحریر پر نظریں دوڑائیں۔ وہ میل، پال نے ادارے کے آفیشل میل اکاؤنٹ سے نہیں کی تھی، بلکہ اپنے ذاتی پتے سے بھیجی تھی "یہ میل میں اپنے ذاتی پتے سے بھیج رہا ہوں۔ تمہاری میل نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ مشرقی لوگوں کے جذباتی ہونے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا، مگر تمہاری جذباتیت تو دنیا سے جدا ہے، ٹھیک ہے لڑکے، اگر تمہاری یہی ضد ہے، تو میں تمہارے بارے میں کچھ سوچوں گا، لیکن یہ سب کچھ میری ذاتی حیثیت میں ہوگا۔ کیوں کہ میرا ادارہ بہر حال اپنے اصولوں کا پابند ہے۔ میں تمہیں چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ پہلے تم اپنے ملک کے کسی مستند طبی ادارے سے یہ ابتدائی ٹیسٹ کروا کر مجھے بھیج دو۔ پھر جب تمہارے آنے کی ضرورت پڑی، تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ تب تک خدا کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا۔ تمہارا مخلص، ڈاکٹر پال جونز۔" میں نے میل پڑھ کر ایک لمبی اطمینان کی سانس بھری۔ گویا میری سمت طے ہو چکی تھی۔ اور سفر چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے اس کی سمت طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ انسان زندگی میں بہت سے بوجھ ڈھوتا ہے، مگر ان میں سب سے بھاری بوجھ شاید خود ہماری اپنی سوچ، فکر کا ہوتا ہے۔ دفتر پہنچا تو لبنیٰ اور ڈائریکٹر پہلے سے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ لبنیٰ نے شکوہ کیا کہ میں فلم کے مراحل میں پوری دل چسپی نہیں لے رہا ہوں، جب کہ وہ چاہتی ہے کہ ہر شعبے پر میری ذاتی نگرانی اور گرفت رہے۔ میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ ہم بہت جلد گانوں کی فلم بندی کے لیے کینیڈا روانہ ہونے والے ہیں۔ دونوں کے چہرے کھل اٹھے، میں نے سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سب کو فلم کے گانوں کی فلم بندی کا بتا کر یونٹ کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں گا، جہاں تین چار مہینے علاج کے لیے رکنے کا کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈنا ہوگا۔ شاید چھ ماہ بھی لگ جائیں، مگر مجھے کسی طور یہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔

اس وقت، میں چاہتے ہوئے بھی سرجری کے بعد کے حالات پر کوئی سوچ بچار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم انسان بہت کوتاہ نظر اور نزدبین ہوتے ہیں۔ جن فیصلوں میں ہمارے دل کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ان کے اثرات سے نظریں چرانے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کرتے، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ایک بار اپنی مرضی کی سرجری کروالوں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں نے ایک دُور دراز کے بڑے اسپتال سے ڈاکٹر پال کے بتائے ہوئے طبی تجزیے بھی کروا لیے تھے اور اب مجھے ان کی رپورٹس آنے کا شدت سے انتظار تھا۔ مجسمہ بن جانے کے بعد بھی کے گھر جانے کا کوئی خاص بہانہ نہ ہونے کے باوجود میں ہفتے میں ایک آدھ چکر اس کے گھر کا ضرور لگا لیتا تھا۔ کچھ گملیاں اور کوچے اپنی سمت بلانے کے بہانے خود تراش لیتے ہیں۔ جانے وہ من موہنی سی لڑکی کس طرح چند دنوں ہی میں میرے دل کے ہر خانے پر اپنا قبضہ جما بیٹھی تھی۔ حالاں کہ میں نے تو اس دل کے کواڑ سدا کے لیے بند کر کے چابی کسی دریا میں پھینک دی تھی۔ یا پھر شاید مجھ جیسوں کے دل ہمیشہ کسی مخلص اور مہربان ساتھی کی دستک ہی کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ شام کو دفتر سے اٹھتے وقت اچانک فون پر سنبل کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "آپ جلدی سے شوکت خانم اسپتال پہنچیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت بگڑ گئی ہے"۔ میں سب چھوڑ چھاڑ کر کبیر کے ساتھ اسپتال کی طرف بھاگا۔ راہ داری میں کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرے قدموں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ناساز کا رنگ سرسوں کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر خشک سوکھے پتے جیسے ہونٹوں سے بہ مشکل مسکرایا۔ رستہ روک رہی ہے، تھوڑی جان ہے باقی..... جانے ٹوٹے دل میں کیا ارمان ہے باقی..... جانے بھی دے اے دل..... سب کو میرا سلام..... میں چلا، میں شاعرِ بدنام..... میں چلا، محفل سے ناکام..... میں چلا....." میں نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا "کہیں نہیں جا رہے ہو تم، سنا تم نے، میں اس شاعر کو کہیں نہیں جانے دوں گا"۔ اس کے سرہانے کھڑی سنبل اور استاد بنے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر بولا "دیکھا پری زاد پیارے، یہ تو واقعی اسی فلم کا سین بن گیا یار۔ لگتا ہے، جیسے میری کہانی ڈائریکٹر نے تیس چالیس سال پہلے فلما دی تھی، مگر یار، میں بہت تکلیف میں ہوں۔ یہ جان تو نکلتے نکلتے جان نکال دیتی ہے"۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا "چپ ہو جاؤ، خود کو نڈھال مت کرو"۔ "نہیں پیارے، بولنے دو مجھے۔ بس آخری تھکن ہے، اس کے بعد تو آرام ہی آرام ہے"۔ ناساز نے سنبل کی طرف دیکھا "یہ کہانی بھی اُدھوری رہ گئی پری زاد۔ میرے جانے کے بعد ان باپ بیٹی کا پورا خیال رکھنا۔ اور جب تمہاری فلم ریلیز ہو تو اس کے ٹائٹل میں میرا نام....." ناساز بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا "ناساز..... چپ کیوں ہو گئے، بولتے کیوں نہیں..... تم ہم سب کو اتنا بڑا دھوکا دے کر نہیں جا سکتے، بولو، بے وفا، دغا باز..... کچھ تو بولو..... بات کرو....." میری چیخیں سارے اسپتال میں گونج رہی تھیں۔ استاد بنے نے اسپتال کے عملے کی مدد سے مجھے ناساز کے بے جان جسم سے دُور کر دیا۔ میں چیختا چلاتا رہ گیا۔ استاد بنے نے دبوچ کر مجھے گلے لگا لیا "چپ کر جاؤ..... ناساز اب کبھی نہیں بولے گا، وہ مر چکا ہے"۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ناساز کے جانے کے بعد میرا دل ہی اٹھ گیا، کسی کام میں مَن نہیں لگ رہا تھا میرا، بس سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ ناساز کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنی تقدیر میں صرف درد ہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ سُکھ کی سیاہی شاید ان کی باری آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایسی ہی ایک اُداس شام، جب میں اپنے اندھیرے کمرے میں بیٹھا قسمت کے اس ہیر پھیر سے متعلق ہی سوچ رہا تھا، تو عینی آ گئی۔ ''کیوں سزا دے رہے ہیں خود کو، ہم میں سے کوئی بھی ناساز کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، اس کا جانا طے تھا، سو وہ چلا گیا۔ مگر ہم سب ابھی یہیں ہیں، ہماری خاطر ہی سہی، خود کو سنبھالیں''۔ میں نے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ ''اگر سب کا جانا طے ہی ہے، تو پھر ہم سب ایک ساتھ ہی کیوں نہیں چلے جاتے، یہ باریاں کیوں لگا دی گئی ہیں''۔ عینی میرے قریب بیٹھ گئی۔ ''باریاں اس لیے لگائی گئی ہیں کہ ہم جانے والوں کے بعد ان کے اپنوں کا دھیان رکھیں۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ وہ سنبل اور استاد بنے خان کی ذمے داری آپ پر ڈال گئے ہیں۔ کیا انہیں یونہی تنہا چھوڑ دیں گے پری زاد''۔ کیا ستم ہے کہ ہوا کے سب رستے، سب دریچے بند کر دینے کے بعد، زندگی ہمیں سانس لینے پر بھی مجبور کرتی ہے، کیوں کہ جینا تو ہے۔ ہاں، جینا تو پڑے گا، مزید ستم سہنے کے لیے، نئے گھاؤ جھیلنے کے لیے۔ اگلے ایک ہفتے مَیں شہر کی ایک نئی بستی میں استاد بنے خان کے لیے ایک گھر کا انتظام کر دیا گیا، جہاں وہ اپنی موسیقی کی اکیڈمی اور کلاسز بھی شروع کر سکتے تھے۔ کمالی نے اس سارے معاملے میں بہت پُھرتی دکھائی اور دو ہفتوں بعد ہی میوزک اکیڈمی کا اشتہار بھی شہر کے بڑے اخباروں کے پہلے صفحے پر لگ گیا، مجھے یقین تھا کہ اب ان باپ بیٹی کو اپنی گزر بسر کے لیے کسی کے آگے سوال دراز کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میری اس عرصے میں خود سے خود کی ملاقات بہت کم ہو پائی تھی، مگر جیسے ہی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا اور میں نے جانے کتنے دن بعد آئینہ دیکھا، تو مجھے ایک دم ہی ڈاکٹر پال کی یاد آ گئی۔ میں نے اپنی ای میل کھولی تو ڈاکٹر پال کی تین میلز آ چکی تھیں، جس میں اس نے میرے کروائے گئے طبّی تجزیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے اگلی صبح ہی رپورٹ لے کر اُسے ای میل کر دی۔ کمالی اس عرصے میں فلم یونٹ سے مسلسل رابطے میں تھا، اور مجھے وقتاً فوقتاً پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ کینیڈا میں فلم بندی کے انتظامات بھی وہ مکمل کر چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کینیڈا روانگی سے قبل عینی سے اپنے دل کی بات کہہ دوں گا۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ اب اس زندگی کے تپتے صحرا میں تنہا چلتے چلتے میرے پاؤں اتنے آبلہ پا ہو چکے ہیں کہ خود میرے قدموں کے چھالے مجھے دُہائی دیتے ہیں کہ انہیں اب کسی ہم سفر کے ساتھ کی چھاؤں درکار ہے۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا وہ میری عُمر بھری ہم سفر بننا قبول کرے گی، کیا وہ مجھے اس اعزاز کے قابل سمجھتی ہے، کیا وہ میری تمام زندگی کی محرومیاں ختم کر کے مجھے اپنا سکتی ہے.....؟ میں نے راستے میں گاڑی رکوا کر پھول والے سے عینی کے لیے ایک گل دستہ بنوانے کا سوچا، لیکن پھر بہت دیر تک وہاں کھڑا پھولوں کا انتخاب کرتا رہا، دنیا کے سارے پھول پنکھڑیوں سے جُڑ کر بنتے ہیں، مگر جب خود کسی پنکھڑی جیسی کو گلاب پیش کرنا ہو تو کوئی چناؤ کیسے کرے۔ ہر پھول اس کے سامنے ہیچ لگتا تھا۔ ہر رنگ اس کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا۔ مجبوراً مجھے کچھ پھیکے رنگوں والے کم صورت گلابوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ مدِمقابل جب ''گلاب تر'' ہو تو پھولوں کو بھی ہار ماننا ہی پڑتی ہے۔

میں بہت دیر اس کے گھر کے دروازے پر کھڑا رہ کر اپنی اُلجھتی سانسیں درست کرتا رہا۔ ایسے لگ رہا تھا، جیسے حُسن کی عدالت میں یہ میری پہلی پیشی ہے۔ دوسری گھنٹی کے جواب میں اندر سے قدموں کی آہٹ اُبھری اور میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ گل دستے پر میری گرفت سخت ہو گئی اور پھر دروازہ کُھلا تو میرا ہاتھ ہوا ہی میں بلند رہ گیا۔ اندر سے نکلنے والا نوجوان میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ ''جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' میں اُسے دیکھتا رہ گیا، لمبا قد، کُھلتی رنگت، بکھرے بکھرے سے بال، گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی کشش آمیز چمک، وہ مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ خوبرو، بااعتماد اور مغرور سا وہ لڑکا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میرا گل دستے والا ہاتھ میکانیکی طور پر خود بخود پیچھے چلا گیا۔ میں نے گڑبڑا کر اس سے پوچھا ''تم کون ہو.....؟'' وہ لڑکا ہنس پڑا۔ ''لو، وہ بھی ہم سے پوچھتے ہیں.....؟ جناب ہم اپنا تعارف خود آپ ہیں۔ ڈاکٹر عدنان کہتے ہیں مجھے، یہ میری خالہ کا گھر ہے اور میں آج ہی یہاں نازل ہوا ہوں۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟'' میں نے اپنے ڈولتے دل کو سنبھالا۔ ''میں عینی کا دوست ہوں، پری زاد نام ہے میرا''۔ عدنان نے غور سے مجھے دوبارہ دیکھا اور پہلے لفظ کو کافی لمبا کرتا ہوا بولا ''اچھا.....تو آپ ہیں پری زاد.....گریٹ.....سرکھا لیا ہے، اس پاگل لڑکی نے صبح سے آپ کا ذکر کر کر کے۔ سچ بتاؤں، تو میں آپ سے جیلس ہو رہا تھا''۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا وہ زور سے ہنس پڑا۔ ''بُرا مت مانیے گا، مذاق کی عادت ہے میری۔ اندر آئیں ناں۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ خالہ اور عینی اندر ہی ہیں''۔ میں چُپ چاپ اس کھلنڈرے سے لڑکے کے پیچھے اندر داخل ہو گیا، پھر ہاتھوں میں پکڑا گل دستہ نہ جانے کب میرے ہاتھ سے کمرے کے گل دان میں منتقل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عینی بھی آ گئی، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ''ارے آپ آ گئے پری زاد.....دیکھیں، کون آیا ہے۔ میرے بچپن کا ساتھی۔ میرا سب سے بہترین دوست، میرا کزن عدنان۔ سچ بتائیں، اس نالائق کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا ناں کہ یہ ڈاکٹر ہوگا۔ حرکتیں تو ابھی تک وہی گلی کے آوارہ لڑکوں جیسی ہیں اس کی''۔ عدنان نے زوردار قہقہہ لگایا ''تو گلی کا لڑکا ہی تو ہوں۔ تمہاری گلی کا ایک آوارہ، جو گھنٹوں دوپہر میں تمہارا کالج سے واپسی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یاد ہے ناں بلّی.....'' وہ دونوں زور سے ہنس پڑے، جانے کیوں ٹھیک اُسی لمحے میں نے خود کو وہاں بے حد اجنبی سا محسوس کیا، کل تک یہی در و دیوار مجھے کتنے مانوس، کتنے مہربان سے محسوس ہوتے تھے، اور آج ایک اجنبی کے آجانے سے میں خود بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ عینی نے مجھے بتایا کہ عدنان نے طب کی تعلیم کے بعد آنکھوں کی فیلڈ میں اسپیشلائز کیا ہے اور اب اس کی پوسٹنگ اسی شہر میں ہو چکی ہے۔ عدنان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی پوری تن دہی سے عینی کی آنکھوں کے علاج کی کوئی صورت نکالنے میں جُتا ہوا ہے۔ عدنان اور عینی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف محسوس ہوتے تھے اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دے رہے تھے۔ جب تک عینی کی ماں رات کے کھانے کے انتظام کے لیے باورچی خانے میں مصروف رہیں، دونوں بچپن کی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ عینی نے عدنان کو ٹوکا ''بس بس.....رہنے دو یہ تابع داری کی باتیں، خوب جانتی ہوں میں کہ جناب کڑی دوپہروں میں کس کے لیے دھوپ چاٹا کرتے تھے۔ کیا نام تھا اس عینکی کا۔ ہاں، نگہت اور وہ دوسری پھینی، مدوش اور وہ تیسری.....'' عدنان نے جلدی سے اسے روکا۔ ''اوہو، بس بھی کرو، وہ بچپنا تھا میرا.....اور ایسی دو چار معاشقے نما دوستیاں تو سبھی کرتے ہیں لڑکپن میں۔ کیوں پری زاد صاحب، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں مَیں، آپ نے بھی کی ہوں گی۔ کچھ خواب تو پالے ہوں گے، اس عُمر میں آپ نے بھی.....'' میں نے غور سے عدنان کی طرف دیکھا۔ ''نہیں ڈاکٹر صاحب! خواب پالنے کے لیے نیند کے کچھ خوب صورت

"پالنے" بھی ضروری ہوتے ہیں۔ میں تو آج تک نیند کا وہ "پالنا" ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ نیند آ جائے تو شاید کبھی خواب بھی پال سکوں"۔ عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا "واہ، میری پیاری کزن یونہی آپ کی اتنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی، بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے"۔ میں اٹھ کھڑا ہوا "اب میں اجازت چاہوں گا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی"۔ وہ دونوں بوکھلا سے گئے۔ عینی جلدی سے بولی "ارے، آپ کہاں چل دیئے، امّی نے کھانا لگا دیا ہے اور آپ نے تو آنے سے پہلے فون پر کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے، بتائیں ناں.....؟" عدنان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے بات بنائی "ارے ہاں، یاد آیا۔ فلم کا پوائنٹ کینیڈا جا رہا ہے۔ شاید میں بھی جاؤں، سوچا تم سے بھی پوچھ لوں"۔ عینی خوشی سے چلائی "واہ زبردست! کاش میں بھی ساتھ چل سکتی، مگر اب یہ صاحب جو تشریف لے آئے ہیں، میرے دشمنِ جاں..... یہ مجھے کہاں جانے دے گا اب"۔ میں نے چونک کر عینی کی طرف دیکھا "کیوں؟" عدنان نے جلدی سے دخل دیا۔ "پری زاد صاحب! آپ ہی سمجھائیں اس لڑکی کو۔ میں نے امریکا کے ایک بڑے طبّی ادارے سے عینی کی آنکھوں کے میچنگ لینز کی بات کی ہے، وہ لوگ نوّے فی صد پُر امید ہیں کہ وہ یہ آپریشن کر سکتے ہیں اور انہیں مشابہت والا قرنیہ بھی مل جائے گا، کیوں کہ آج کل باہر کے ملکوں میں عموماً سزائے موت کے قیدی یا بستر مرگ پر پڑے مریض اپنے اعضاء مرتے وقت دان کر جاتے ہیں یا اپنے بیوی بچوں کی آئندہ کفالت کے لیے بھاری رقم کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ میں نے عینی کے میچنگ لینز کے لیے ایسے کئی اداروں میں رجسٹریشن کروا رکھی ہے اور وہ لوگ قرنیہ ملتے ہی ہمیں اطلاع کر دیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے وقت میں عینی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہمیں دیر ہو جائے"۔ عینی نے تلخی لہجے میں کہا۔ "خواب دیکھنا چھوڑو بھائی ڈیئر کزن ڈاکٹر عدنان! پہلے تو یہاں سے امریکا جانے کے لیے ہی لاکھوں روپے چاہیے ہوں گے، اور پھر ڈونیشن اور آپریشن کا خرچ الگ۔ کہاں سے آئیں گے اتنے روپے.....؟ اور تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف اپنی جمع کی ہوئی رقم ہی سے اپنا آپریشن کرواؤں گی۔ اور ہم دونوں یہ بات بہت پہلے طے کر چکے ہیں۔ سو نو مور بحث اوکے....." وہ دونوں بچوں کی طرح بحث کر رہے۔ میں نے عینی سے اجازت چاہی اور بھاری قدموں سے وہاں سے اٹھ آیا۔

سارے راستے ان دونوں کی نوک جھونک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ عدنان کو عینی سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر ایک عجیب سی بے چینی میرے رگوں میں پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر خود عینی بھی تو اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی۔ جنہیں ہم چاہتے ہیں، وہ کسی اور سے بے تکلف ہو کر بات کریں تو ہمارے خون کی گردش کیوں تھمنے لگتی ہے۔ کانوں جیسی چبھن اور کسک ہمارے وجود کو کیوں چھلنی کرنے لگتی ہے؟ کیا اسی کو رقابت کہتے ہیں۔ ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ رقابت تو محبت سے بھی زیادہ جان لیوا آزار ہے۔ اگلے روز ٹیلی فون کی ہر گھنٹی پر میں چونک چونک جاتا۔ مگر عینی تو جیسے عدنان کے آنے کے بعد بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ مجھے چڑچڑاہٹ سی ہونے لگی اور میرا عملہ اس کا نشانہ بننے لگا۔ کمالی نے یہ بات نوٹ کر لی اور تیسرے دن ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے۔ میں اُسے کیا بتاتا، مجھے تو خود پتا نہیں تھا کہ میرے اندر کیا چل رہا ہے۔ مگر چوتھے روز جب میرے پی اے نے جب مجھے اطلاع دی کہ "مس قراۃ العین آپ سے ملنے آئی ہیں" تو ایک لمحے میں ساری بے چینیاں، ساری بے تابیاں جانے کہاں ہوا ہو گئیں اور میں تیزی سے ملاقاتی کمرے کی طرف لپکا، مگر وہ تنہا نہیں آئی تھی۔ عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ میری آہٹ سُنتے ہی وہ ناراضی سے بولی "کہاں غائب ہیں آپ، تین دن سے، نہ کوئی فون نہ کوئی خیر خبر۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ جان لیں اچھی طرح"۔ میں نے مصروفیت کا بہانہ کیا، مگر وہ روٹھی رہی، عدنان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "بڑی ضدی ہے یہ بچپن سے سر۔ مجھ سے پوچھیے؟" میں نے گہری نظروں سے اس حُسنِ ناراض کو دیکھا، سفید لباس اور سیاہ دوپٹے میں وہ نور کا ایک ہالہ لگ رہی تھی۔ "چلو کچھ جرمانہ طے کرو، میری غیر حاضری کا"۔ آخر کار، بات یوں بنی کہ مجھے اُن دونوں کو رات کے کھانے پر شہر کے ایک مشہور اوپن ائیر ریستوران میں مدعو کرنا پڑا۔ عدنان نے جاتے وقت عینی کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے مجھے بتایا کہ عینی کے لیے میچنگ لینسز کا انتظام ہو گیا ہے۔ مگر عینی جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ عدنان نے دبے لفظوں میں مجھ سے رات کو عینی کو منانے کی درخواست کی۔ وہ اپنا آبائی گھر بیچ کر عینی کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد پھر سے وہی ہزار خدشے، ہزار وسوسے، مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے میری محبت ریت کے ذرّوں کی طرح میری مٹھی سے نکلتی جا رہی ہے۔ رات کو ریستوران کی محفل پر وہ دونوں مجھ سے پہلے موجود تھے۔ کتنے مکمل لگتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ، جیسے دو جسموں کا جوڑا ہو۔ کوئی ہم تینوں کو وہاں ایک ساتھ بیٹھے دیکھتا، تو اسے میرا وجود ہی اضافی لگتا۔ عدنان کی کوئی فون کال آئی تو وہ اٹھ کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ عینی نے میری خاموشی محسوس کر لی۔ "آپ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں پری زاد..... آج دن کو بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ گم صُم سے ہیں"۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم عدنان کی بات مان کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہا ہے"۔ عینی نے لمبی آہ بھری "اچھا..... تو ڈاکٹر صاحب کا جادو آپ پر بھی چل گیا"۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "ہاں، وہ ہے ہی ایسا جادوگر۔ آج کل چاروں طرف مجھے اسی کا سحر محسوس ہوتا ہے"۔ عینی ہنس دی۔ "ہاں، ٹھیک کہا آپ نے، پتا ہے پری زاد، میں نے سات سال کی عُمر کے بعد عدنان کو نہیں دیکھا، جانے اب کیسا دکھتا ہوگا۔ پہلے تو ہر وقت مٹی میں اَٹا رہتا تھا۔ بڑی مار پڑتی تھی اُسے خالہ سے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں پری زاد۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی کہ جب بھی میری بینائی واپس آئے،

میں سب سے پہلے عدنان ہی کو دیکھوں۔ ہاں، مگر اب اس فہرست میں ایک اور ہستی بھی شامل ہو چکی ہے، اور وہ آپ ہیں پری زاد..... اب میں عدنان کے ساتھ آپ کو بھی پہلی نظر میں دیکھنا چاہتی ہوں"۔ میرا دل چاہا کہ اس سے کہوں کہ کہاں ہیرے اور کوئلے کو ایک ہی صف میں کھڑا کر رہی ہو۔ دیکھے جانے کے قابل صرف عدنان ہے۔ اتنے میں عدنان بھی واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ "جی پری زاد صاحب! کچھ آیا اس پگلی کی عقل میں یا نہیں۔ اسے سمجھائیں کہ اپنوں کے خلوص کو یوں ٹھکرایا نہیں کرتے"۔ عینی نے احتجاج کیا۔ "ایسی بات نہیں ہے، تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ تمہارے پاس تمہارے آبائی گھر کے علاوہ اور ہے ہی کیا۔ اور پھر ہم دونوں کے بچپن کی اور خالہ کی کتنی یادیں وابستہ ہیں اُس گھر سے، میری نظر میں وہ سب یادیں میری بینائی سے بہت زیادہ اہم ہیں۔ بس، ہو گیا فیصلہ۔ تم وہ گھر کبھی نہیں بیچو گے۔ اور اگر کبھی تم نے ایسا کیا تو ساری زندگی مجھ سے بات مت کرنا"۔ عدنان نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دخل اندازی کی "تم دونوں خوامخواہ جھگڑ رہے ہو۔ عینی پر میری دوستی کے بھی کچھ قرض باقی ہیں اور میں اسی دوستی اور رشتے کے حق سے آج یہاں یہی کہنے آیا ہوں کہ عینی کے علاج کا تمام خرچہ میں برداشت کروں گا، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے"۔ "نہیں پری زاد! ایسا مت کہیں، میں آپ سے رقم نہیں لوں گی۔ میں نے زندگی بھر ایک یہی خودداری کا بھرم ہی تو رکھا ہے۔ کیا آپ دونوں مجھ سے میری عُمر بھر کی یہ واحد کمائی بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی بینائی کا کہ جس کے ملنے کے بعد بھی میری نظر تمام عُمر جھکی رہے۔ پلیز، آپ ایسا نہ کریں"۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے، اگر تمہاری یہی مرضی ہے، تو یوں ہی سہی، مگر پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ میں عُمر بھر تمہاری خودداری کا یہ بھرم قائم دیکھنا چاہتا ہوں، لیکن تمہارا علاج بھی اسی قدر ضروری ہے، لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال عدنان کا آبائی گھر میں خرید لوں گا۔ مکان کی رقم سے عدنان تمہارا علاج مکمل کروائے گا، لیکن تم دونوں کے بچپن کی یادوں کا مسکن وہ گھر، میرے پاس عدنان کی امانت کے طور پر رہے گا۔ عدنان جب بھی رقم جمع کر لے گا، مجھ سے اپنا مکان واپس لے سکتا ہے"۔ عینی نے بے چینی سے پہلو بدلا "لیکن....." "کوئی اگر، مگر، لیکن نہیں سنوں گا میں، بس طے ہو گیا۔ تم لوگ جانے کی تیاری کرو، آج کل ویسے بھی اچھے ڈاکٹروں کا کال پڑا ہے۔ مجھے یقین ہے عدنان کچھ ہی برس میں اپنا مکان واپس حاصل کر لے گا"۔ عدنان نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا "یہ ہوئی ناں بات۔ مجھے یقین تھا اس مسئلے کا آپ ہی کوئی نہ کوئی حل نکالیں گے۔ آپ واقعی کمال ہیں پری زاد صاحب....."

اس وقت تو عینی خاموش رہی، لیکن رات گئے اس کا نمبر میرے موبائل فون پر جگمگانے لگا "پری زاد! میں آپ کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوں، میں جانتی ہوں آپ میری خاطر یہ سب کچھ کر رہے ہیں"۔ میں نے بات مذاق میں ٹالی۔ "نہیں بے وقوف لڑکی! تمہیں نہیں پتا کہ پراپرٹی کی قیمتیں آج کل آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ عدنان کا گھر لے کر میں نے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ دیکھ لینا، عدنان رقم پچکا نہ سکا، تو دس گنا زیادہ قیمت پر بیچ دوں گا۔ تم نے پری زاد کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ ہنس پڑی۔ "آپ ہمیشہ گھاٹے کا سودے ہی کرتے ہیں۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن آپ کو میری شرط یاد ہے ناں۔ جب کبھی میں دنیا دوبارہ دیکھوں، تو میری پہلی نظر کے فریم میں آپ کو ضرور موجود رہنا ہوگا۔ بولیں، قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ابھی منع کرتی ہوں عدنان کو کہ گھر کے کاغذات نہ بنوائے آپ کے لیے"۔ میں نے جلدی سے حامی بھری۔ "ٹھیک ہے ضدی لڑکی، مگر دیکھو، اب مزید کوئی بہانہ مت کرنا۔ جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا"۔ میں نے عینی کو تو تسلی دے دی، مگر خود میرا چین و سکون ہمیشہ کے لیے ہوا ہو گیا۔ ساری رات میں یہی سوچ سوچ کر لان میں ٹہلتا رہا کہ آنکھیں مل جانے کے بعد عینی جب مجھے دیکھے گی، تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ صبح سویرے عدنان اپنے گھر کے کاغذات بنوا کر لے آیا۔ میں نے رقم کا چیک عدنان کے حوالے کیا، تو خوشی سے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ عدنان اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ "سنو عدنان....." وہ پلٹا تو میں نے اس کے گھر کے کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ "یہ گھر تمہارا تھا، اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔ میں نے صرف عینی کو منانے کے لیے یہ گھر خریدنے کا ڈراما کیا تھا۔ عینی کی آنکھیں واپس آ جائیں، اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، البتہ یہ مکان والا راز عینی کے لیے ہمیشہ راز ہی رہے گا"۔ عدنان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں پری زاد صاحب! میں دن رات محنت کر کے آپ کی ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔ یقین جانیے، یہ رقم مجھ پر ہمیشہ قرض رہے گی"۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمارا بھی اس لڑکی پر کچھ حق ہے ڈاکٹر صاحب، کچھ قرض ہم پر بھی واجب ہیں ابھی"۔ عدنان جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹا۔ "آپ کو میں ہر لمحے کی خبر دیتا رہوں گا۔ ہم اگلے ہفتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، مگر عینی کی آنکھوں کی پٹی کھلنے سے پہلے آپ کو بھی امریکا پہنچنا ہوگا، ورنہ وہ ضدی لڑکی آپریشن ہی نہیں کروائے گی۔ بہت مان دیتی ہے وہ آپ کو۔ اس نے آپریشن کے لیے "ہاں" بھی صرف آپ کے کہنے ہی پر کی ہے"۔ میں نے عدنان کی آنکھوں میں تارے سے جگمگاتے دیکھے۔ اور یہ ستارے مجھے ہر بار اس کی آنکھوں میں تب دکھائی دیے تھے، جب وہ عینی کا ذکر کرتا تھا۔ "آپ جانتے ہیں پری زاد صاحب۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جس دن عینی پہلی بار یہ رنگین دنیا دیکھے گی، میں اُسی دن اُسے شادی کے لیے پرپوز کر دوں گا۔ میں جانے کب سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں"۔ میرے سر پر جیسے ساری عمارت دھڑام سے گر گئی۔ میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ "کیا..... میرا مطلب ہے کیا عینی کو بھی اس بات کی خبر ہے؟" عدنان نے جیسے خوابوں کی بستی سے جواب دیا۔ "ہاں، وہ بھی جانتی ہے کہ میں ہمیشہ سے اُسے اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس دن یہ پرپوزل اس کے سامنے رکھوں گا۔ میری مرحومہ ماں اور میری خالہ کی بھی ہمیشہ ہی سے یہی خواہش تھی۔ بس اب وہ دن بھی قریب ہے۔ چلتا ہوں، بہت سے کام اُدھورے پڑے ہیں"۔ عدنان پلٹ کر چلا گیا۔

میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا، میں وہیں کرسی ہی پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر میں کمالی کسی کام سے اندر آیا تو میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر.....؟" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "کمالی! میں گھر واپس جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا"۔ میں دروازے تک پہنچ کر رُک گیا۔ کمالی ابھی تک گم صم سا کھڑا تھا۔ "کمالی! تم نے کہا تھا کہ کبھی تم نے بہت ٹوٹ کر کسی سے محبت کی تھی، تو کیا اس محبت کا کوئی رقیب بھی تھا؟" کمالی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "نہیں سر! خوش قسمتی سے رقابت کا زہر میں نے کبھی نہیں پیا۔ مگر سُنا ہے کہ محبت کی اصل روح تبھی ظاہر ہوتی ہے، جب کوئی رقیب درمیان میں پڑتا ہے"۔ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کمالی سے پوچھا۔ "رقیب کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے کمالی؟" "رقیب کے ساتھ رقابت کرنی چاہیے سر۔ رقیب پر رحم کھانے والا دراصل اپنی محبت کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا"۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "لیکن محبت تو محبت ہوتی ہے، کوئی جنگ نہیں"۔ کمالی مسکرا دیا "محبت میں رقابت سے بڑی جنگ بھلا اور کیا ہوگی، اس دنیا میں سر..... اور آپ نے سُنا تو ہوگا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے"۔ میں دفتر سے باہر نکلا تو رقابت کا زہر میرے پورے وجود میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کر چکا تھا۔ جانے کب دن ڈھلا اور کب رات ہوئی۔ میرا سارا جسم جل رہا تھا۔ کبیر نے رات گئے جب گھر کے دروازوں اور گیٹ کو تالا لگانے کی اجازت چاہی تو میری آنکھیں اس پر جم گئیں۔ "کبیر خان تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو.....؟" کبیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "ہم جان لے سکتا ہے اور جان دے بھی سکتا ہے صاحب....."۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

کبیر خان کچھ دیر تک میرے جواب کا انتظار کرتا رہا ''آپ حکم کرو صاب..... کبیر خان کا جان بھی حاضر ہے، آپ کے لیے''۔

میں اپنے خیالات سے چونکا ''ہاں..... فی الحال کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ خیال آ گیا تھا، تم جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔ تمہاری گھر والی راہ دیکھتی ہو گی تمہاری''۔ کبیر کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور الجھن زدہ سا وہاں سے چلا گیا۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر یہ کیسی عجیب سی ایک جنگ چھڑنے لگی تھی۔ جیسے میرا وجود دو حصّوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہو۔ میرے اندر ایک نیا ''پری زاد'' جنم لینے لگا تھا، جو مجھے رقیب سے رقابت کے سبق سکھا رہا تھا۔ وہ سارا دن میرے اندر بولتا رہتا۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو احمق انسان، خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کا انتظام خوب کیا ہے تم نے، اب تمہاری رقم سے عدنان عینی کی آنکھوں کا علاج کروائے گا اور پھر جب وہ لڑکی تمہیں اس شہزادے کے پہلو میں کھڑا دیکھے گی، تو فیصلہ کس کے حق میں ہو گا، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا عدنان نے، وہ بہت مان دیتی ہے مجھے، مگر صرف مان، عزت اور تعظیم۔ اور میں نہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ جس تبسّم کو میں اپنے مقدر کی پھوار سمجھا تھا، وہ تو اس کی عادت نکلا۔ چار دن اس نے مجھ سے ہنس کر بات کیا کر لی اور ذرا سا اپنا وقت مجھ پر صرف کیا کر دیا، میں تو اس کی محبت کا حق دار سمجھ بیٹھا تھا خود کو، احمقوں کی جنت کا سردار تھا میں۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا، اپنے اس سدا کے غدار دل کے ہاتھوں میں نے۔ میں وہ منافق تھا، جسے سو بار ایک ہی سوراخ سے ڈسا گیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چیر کر اس بے وفا قلب کو باہر نکالوں اور اپنے قدموں تلے اُس وقت تک روندتا رہوں، جب تک کہ زندگی کی آخری رمق بھی ختم نہ ہو جائے۔

اگلے دن میں گھر سے نکلا تو جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ڈرائیور کو گاڑی اُس طرف موڑنے کو کہہ دیا۔ میں کچھ دیر تنہا بیٹھنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی تنہائی ہمیں صرف لوگوں کے ہجوم ہی میں ملتی ہے۔ ویرانوں میں تو ہم اپنے سامنے مزید نمایاں ہو جاتے ہیں اور مجھے ایسی تنہائی چاہیے تھی، جہاں خود مجھے بھی میرا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لابی میں بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے گزر گئے۔ یہ پانچ اور سات ستارہ ہوٹل بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ایک دنیا ایک خلقت وہاں آتی جاتی رہتی ہے، مگر کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے، مگر عموماً مسکرانے کی وجہ نامعلوم رہتی ہے، اچانک لابی میں ایک شور سا اٹھا اور کچھ لوگ ایک جانب لپکے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو لبنیٰ اپنے اسٹاف کے ساتھ لابی میں داخل ہو رہی تھی۔ میڈم شہ پارہ کے مداح اس سے آٹو گراف لینے میں مصروف تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لبنیٰ کی ساکھ بطور ہیروئن پھر سے بحال ہو چکی تھی۔ جانے یہ آٹو گراف لینے والے مداح بعد میں اس آٹو گراف کو سینت سنبھال کر بھی رکھتے ہوں گے یا پھر وقت گزرنے کے بعد یہ یادیں بھی ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہیں۔ لبنیٰ کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ سب سے معذرت کر کے میری طرف چلی آئی ''ارے پری زاد، تم.....؟ کیا کوئی میٹنگ وغیرہ ہے؟''

''نہیں، خود سے چُھپنے کے لیے یہاں آ بیٹھا تھا''۔ میرا جواب سُن کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ ''کیوں جلاتے رہتے ہو خود کو ہمیشہ؟ کب تک جلتے رہو گے۔ یہ دنیا تمہارے اندر کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ پلیز، خود کو اس دنیا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو''۔ میں دھیرے سے مسکرایا ''گویا منافقت کا درس دے رہی ہو''۔ ''نہیں، پری زاد نہیں۔ مگر یہ دوغلا پن ہماری فطرت بن چکا ہے۔ کمالی صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ تم ہمارے ساتھ کینیڈا نہیں جا رہے، کیا کوئی پریشانی ہے.....؟'' میں نے بات ٹالی ''نہیں، تم لوگ پہنچو، میں بعد میں آ جاؤں گا اور سنو، مجھے یقین ہے کہ یہ فلم تمہارے کیریئر کی بہترین فلم ہو گی۔ لیکن وعدہ کرو، سُپر ہٹ ہو جانے کے بعد پہلا آٹو گراف میرے لیے ہو گا''۔ وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ ''مت کیا کرو ایسی باتیں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اور اگر میرا بس چلے تو ساری دنیا کو تم سے آٹو گراف لینے بھیج دوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں تمہاری کتنی احسان مند ہوں پری زاد.....'' میں نے شکوہ کیا۔ ''پھر وہی احسان کی بات؟ کتنی بار تمہیں سمجھاؤں کہ دوستی میں احسان نہیں ہوتا''۔ لبنیٰ کی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ ''تم نہیں جانتے پری زاد! مجھ جیسے لوگ جو زندگی میں اَن گنت سمجھوتے کر کے یہاں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے لیے کسی کا یہ بے لوث رویہ دنیا کے کسی بھی احسان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمارے ضمیر کو عمر بھر کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ بدلے میں ہم اپنے محسن کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے اور یہ احساس بڑا بے سکون کر دینے والا ہوتا ہے''۔ لبنیٰ کے جانے کے بعد بھی میں بہت دیر تک بے مقصد وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنا موبائل فون خاموش کر دیا تھا۔ بے خیالی میں نظر پڑی تو کمالی اور عینی سمیت بہت سے لوگوں کی کالز دکھائی دیں۔ عجیب عذاب تماشے ہے یہ سیل فون بھی، ہر وقت ہر کسی کی دسترس میں رکھتا ہے، کسی مضبوط شکنجے جیسا۔

دفتر پہنچا تو پی اے نے بتایا کہ عینی بی بی کا درجنوں بار فون آ چکا ہے۔ اس نے بنا پوچھے فون ملا دیا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ''کہاں چلے جاتے ہیں آپ یوں بنا بتائے۔ چار پانچ دن بعد میری روانگی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں دے رہے۔ یاد رکھیں پری زاد، اگر آپ وقت پر نیویارک نہ پہنچے تو میں آپریشن نہیں کرواؤں گی اور اسے دھمکی مت سمجھیے گا''۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ کچھ تلخ سا ہو گیا۔ ''نہ ہوا کرو میرے لیے اتنا پریشان۔ مجھ جیسے بے مول انسان کی اتنی فکر نہ کیا کرو۔ اور بہت لوگ ہیں یہاں تمہاری توجہ کے قابل''۔ عینی روہانسی ہو گئی۔ ''کیوں، کیا مجھے آپ کے لیے فکر کرنے اور پریشان ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہی''۔ اس نے فون رکھ دیا اور پھر شام تک وہ بڑی مشکل سے مانی۔ جب انسان خود ہی سے روٹھا ہوا ہو تو اسے کسی دوسرے کو منانا کتنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اُس روز ہوا۔ تیسرے دن فلم یونٹ کینیڈا روانہ ہو گیا۔ میری بے چینی بھی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ میرے اندر پلتا نیا پُری زاد مجھے دن بھر کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ رقیب سے رقابت اور دشمن سے دشمنی کی جاتی ہے اور تمہاری محبت کو تم سے چھین کر لے جانے والا تمہارا دشمن نہیں تو اور کیا ہے۔ اب بھی وقت ہے پُری زاد، عینی کی آنکھوں کا آپریشن کروانے میں اتنی جلدی نہ کرو۔ پہلے اس عدنان نامی کانٹے کو نکل جانے دو۔ کاش عینی کو کبھی بینائی ہی نہ مل پائے۔ پُری زاد کے لیے تو اس کی کومل روح کی چاندنی ہی کافی ہے، عمر بھر اُجالا کرنے کے لیے۔ اس کی بینائی کی ضرورت تو اس رقیب کو ہے اور رقیب کی خواہش پوری کرنے والا احمق بھلا اس دنیا میں کون ہو گا۔ میں نے اس بکمار کی گونج سے، درد سے پھٹتے سر کو تھام لیا۔ اُسی وقت کبیر خان کسی کام سے دفتر میں داخل ہوا تو میرا زرد چہرہ اور پسینے سے شرابور وجود دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا صاب..... سب خیر تو ہے؟'' اور شاید ٹھیک وہی لمحہ تھا جب میں اپنی برداشت کی حدیں پار کر گیا۔ ''کبیر خان..... اِدھر تمہارے علاقے میں اگر کوئی تم سے تمہاری محبت چھین کر لے جائے تو تم کیا کرتے ہو.....؟'' ''ہم اس کو قتل کر دیتا ہے صاب..... ہمارا علاقے میں محبت اور غیرت کا نام پر مار دینا عام بات ہے''۔ میں نے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔ ''کوئی میری محبت چھین کر لے جا رہا ہے کبیر خان۔ اس کو بھی ختم کر دو'' کبیر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ''تم صرف اس کا نام بولو صاب..... چوبیس گھنٹے میں وہ اس دنیا سے چلا جائے گا''۔ میں نے ایک کاغذ کے رقعے پر عدنان کا نام اور پتا لکھ کر کبیر کے حوالے کر دیا۔ ''یہ لڑکا آج کل زیادہ تر عینی بی بی کے گھر ہی پر رہتا ہے۔ دھیان رہے۔ یہ کام تب ہونا چاہیے، جب وہ لڑکا تنہا ہو''۔ کبیر نے سر جھکا دیا۔ ''آپ فکر مت کرو صاب۔ ہم سمجھ گیا''۔ کبیر کسی اچھے وفادار کی طرح زیادہ سوال جواب کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

میرے سینے پر رکھا ایک بھاری پتھر ہٹا تو ضمیر کے بوجھ کی دوسری بڑی اور اس سے بھی بھاری سِل پورے وجود کو کچلنے لگی۔ یہ ہم جیسوں کا ضمیر اتنا زندہ کیوں رہتا ہے؟ یہاں تو لوگ پل بھر میں سیکڑوں گھر اُجاڑ دیتے ہیں اور پلٹ کر ذرا دیر رک کر دیکھتے بھی نہیں۔ میں تو پھر بھی صرف اپنے دل کا آنگن آباد کرنا چاہتا تھا۔ کب چاہا تھا، میں نے کہ ایسا ہو، مگر ایسا ہو رہا تھا، تو اس میں میرا قصور کیا تھا؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ضمیر ہمیں گناہ کرنے سے روکتا نہیں۔ صرف گناہ کا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ میں تو وہ بے ہنر تھا کہ نہ نیکی کو نیکی کی طرح ادا کر سکا اور نہ گناہ کو گناہ کی طرح نبھا پایا، کیوں کہ چاہے گناہ ہو یا پھر ثواب، دونوں کے لیے بہر حال ظرف کی ضرورت پڑتی ہے۔ شام کو دفتر سے نکلنے سے پہلے مجھے عینی کا پیغام ملا کہ وہ بیرونِ ملک روانگی سے قبل اپنے مجسموں کی ایک نمائش رکھ چکی ہے، جس کا آج ہی افتتاح ہے۔ لہٰذا میں دفتر سے سیدھا شہر کی بڑی آرٹ گیلری پہنچ جاؤں۔ مجھے لگا، جیسے عدنان کو راستے سے ہٹانے میں قدرت خود میری مدد کرنا چاہتی ہے۔ عینی بہت دیر تک اپنی مصروفیت میں اُلجھی رہے گی اور کبیر خان کو وار کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ میرے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جُرم کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے اور جب کوئی نادان جرم کرنے کی ٹھان لے تو پھر یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاید دنیا کے ہر گناہ کے پیچھے یہی فلسفہ کار فرما رہتا ہے۔

آرٹ گیلری لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کمالی بھی دفتر میں عینی کی دعوت پر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ تقریب کا مہمانِ خصوصی بھی مجھے ہی مقرر کیا گیا ہے۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا، مگر جھٹ فیتہ کاٹنے والی قینچی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ فیتہ کٹا تو تالیوں کی گونج میں ہم اس ہال میں داخل ہو گئے، جہاں عینی کے بنائے ہوئے بہت سے فن پارے رکھے گئے تھے۔ میں نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر مجھے عدنان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میرے دل کے چور نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ میں عینی سے اس کے بارے میں پوچھ سکوں۔ اس لڑکی کی انگلیوں کا ہنر سارے ہال میں بکھرا ہوا تھا اور اس کے فن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگوں نے جی بھر کر اُسے داد دی۔ مغرب کے بعد باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا، تو میں نے کبیر خان کو ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ میں اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا کہ ایک بنی ٹھنی سی لڑکی ایک پختہ عمر عورت کے ساتھ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ''کیسے ہیں پُری زاد صاحب، کبھی غریبوں کو بھی یاد کر لیا کریں۔ آپ نے تو شہ پارہ کے بعد کسی اور فلمی ہیروئن کو دیکھا تک نہیں''۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کمالی نے جلدی سے تعارف کروایا۔ ''سر یہ میڈم زارا ہیں۔ شہ پارہ کی نگر کی ہیروئن ہیں''۔ زارا نے انکساری سے سر جھکایا ''کہاں جی..... شہ پارہ کی نگر کی ہوتی تو آج میں بھی پُری زاد صاحب کی کسی فلم میں کاسٹ ہوتی، مگر انہوں نے تو ہمیں پوچھا تک نہیں''۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں شاید اس کی بات اطمینان سے سنتا، مگر اس وقت میرا سارا دھیان کبیر اور عدنان کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا ''اگر میں نے کوئی دوسری فلم بنائی، تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔ فی الحال میں کسی اور اُلجھن میں ہوں۔ معاف کیجیے گا''۔ کمالی نے میرے ہٹنے کے بعد جانے بات سنبھالنے کے لیے اس حُسنِ بے پروا کو کیا کہا۔ میں ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہو کر بظاہر ایک فن پارہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمالی ہاتھ میں ایک تعارفی کارڈ لیے میری طرف آ گیا۔ ''سر! یہ زارا نے اپنا کارڈ دیا ہے اور اس کے پیچھے اپنا ''خاص'' نمبر بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ کبھی آپ ان کے ساتھ بھی ڈنر وغیرہ کریں''۔ میں نے کارڈ دیکھ کر بے پروائی سے کمالی کے حوالے کر دیا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔ ''تم جانتے ہو کمالی! مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا۔ حُسن جب خود اپنی قیمت لگانے پر تُل جائے تو بہ یک وقت اس سے زیادہ گراں اور ارزاں جنس زمانے میں کوئی دوسری نہیں ہوتی''۔ کمالی مُسکرایا ''یہ آپ ہی ہیں، جو اس جنس کو ارزاں سمجھ رہے ہیں سر، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت بھی شہر بھر کے امرا اسی زارا کے ساتھ لنچ یا ڈنر پر ذرا سا وقت گزارنے کے لیے جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا سر کہ جب حُسن اپنی قیمت لگانے پر آ جائے تو اس سے مہنگی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی''۔ میں نے سر جھٹکا ''وہ حُسن ہی کیا جو بک جائے''۔ ''ٹھیک کہتے ہیں سر آپ، مگر بات اگر سودے بازی کی ہو تو حُسن کے پاس دان کرنے کے لیے سب سے بڑا عطیہ حُسن ہی تو ہوتا ہے۔ شاید آپ جسے بہت مقدس جنس سمجھتے ہیں، زارا جیسی اداکارائیں کے ہاں وہی سب سے آسان سودا ہے۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے سر۔ کسی کے لیے دولت کے انبار، ردّی کاغذ کے ٹکڑوں جیسے ہیں، تو کسی کے لیے حُسن اور ادا اس ردی کا نعم البدل''۔ اتنے میں دوسرے ہال سے اسپیکر پر تقریب شروع ہونے کا اعلان کیا گیا۔ سارے مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں پہلی رو میں اپنے نام والی نشست پر بیٹھا تو اچانک میری نظر اسٹیج کے پیچھے اپنے کاموں میں مصروف عدنان پر پڑی۔ میں نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا تو کبیر خان مجھے ہال کے دروازے پر جما کھڑا نظر آیا۔ میری اُس سے نظر ملی، تو اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے مطمئن رہنے کا اشارہ کیا۔

جیسے کہہ رہا ہو کہ آپ فکر نہ کریں صاب۔ آپ کا غلام موجود ہے یہیں۔ میں نے عینی کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کسی صورت بھی مجھے اسٹیج پر آ کر کچھ کہنے کو نہیں کہے گی، کیوں کہ میری طبیعت اس وقت اجازت نہیں دے رہی، لہٰذا تقریب کے اناؤنسر نے سب سے پہلے میری طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میری طرف سے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک ایک کر کے تقریب میں موجود متعلقہ فن کے ماہرین کو ڈائس پر بلایا جاتا رہا اور وہ عینی کے فن کے بارے میں اپنی رائے دے کر پلٹتے رہے۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''کن خیالوں میں گم ہیں پری زاد صاحب؟'' میں عدنان کی آواز سُن کر اچھل ہی تو پڑا۔ مجھے لگا، جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ مگر وہ اپنی دُھن میں بولے گیا''۔ آپ جانتے ہیں پری زاد! عینی بہت خوش ہے، جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہتی ہے سارا دن کہ جب اس کی بینائی واپس آ جائے گی، تو وہ ایک بار پھر سے میرے ساتھ اپنے بچپن کا اسکول، محلہ، گلی، سڑکیں اور گھر دیکھنے جائے گی اور ہر وہ جگہ، جہاں سے اس کی کوئی یاد جُڑی ہے، لیکن ہر جگہ آپ ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اس معصوم لڑکی نے اپنی زندگی کے کتنے سال اندھیروں میں کاٹ دیے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ میرے رب کی مہربانی سے جب عینی کی بصارت واپس آ جائے گی، تو اس کے نصیب کے ہر اندھیرے کو روشنی میں بدل دوں گا۔ اور یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہو گا پری زاد صاحب۔ اصل میں یہ آپ ہی ہیں، جو ہم دونوں کی زندگی میں ضیا بن کر آئے ہیں''۔ میں گم صُم ساعدنان کی باتیں سُن رہا تھا کہ اسٹیج پر سب سے آخر میں عینی کا نام پکارا گیا، ہال میں تالیوں کی گونج کے دوران وہ دھیرے دھیرے چلتی اپنی کسی ساتھی کے سہارے ڈائس تک پہنچی تو سناٹا سا چھا گیا۔ وہ بولی تو میرے آس پاس صرف اس کے لفظ اپنے سُر بکھیرنے لگے۔ ''آج میری زندگی کا بہت بڑا دن ہے۔ اس لیے نہیں کہ آج میرے فن پاروں کی نمائش ہوئی اور ملک کے نام ور فن کاروں نے میرے فن کو سراہا۔ یہ مدح سرائی تو مجھ جیسی ہر نئی آرٹسٹ کا خواب ہوتی ہے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر بھی ایک خوشی ہے۔ ایک اعزاز ہے میرے

لیے کہ میرے محسن میرے آئیڈیل نے آج میری زندگی کے اس اہم ایونٹ کا افتتاح اپنے ہاتھوں سے کیا۔ آج میں آپ سے اپنی ایک اور اہم خوشی بھی بانٹنا چاہتی ہوں۔ تین دن بعد میری یو ایس اے روانگی ہے، چند ماہ بعد جب میں واپس آؤں گی تو شاید اُس وقت مجھے اس سفید چھڑی کے سہارے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہو گی اور یہ سب بھی میرے اسی محسن کی بہ دولت ہے۔ ہماری زندگی میں کچھ لوگ ایسے بھی آتے ہیں، جن سے قدرت ہمارے نصیب کے سارے تار جوڑ دیتی ہے۔ میری زندگی میں پہلے ایسے دو لوگ تھے، میری ماں اور میرے بچپن کا ساتھی عدنان، جنھوں نے قدم قدم میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے جینے کی راہ دکھائی، مگر اب کوئی اور بھی ہے، جو میری خوشیوں کا ضامن ہے، جس کے ہوتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ غم کبھی میرے آس پاس بھی بھٹک نہیں سکتا، کیوں کہ کچھ لوگوں کا وجود ہی ہمارے اندر روشنی بھر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے اور آج آپ لوگ جو میرے ارد گرد یہ خوشیوں کی بہار دیکھ رہے ہیں یہ سب اسی عظیم ہستی کی دین ہے۔ وہی جو میرے محسن، میرے آئیڈیل اور دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہیں میرے لیے.....'' سارا ہال عینی کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں سے گونج اٹھا اور بہت دیر تک شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دی، لیکن ہال کے اس شور سے کہیں زیادہ شور اور چیخ و پکار خود میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر لگے آئینے میں دوسری جانب کھڑا پری زاد مجھ سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''تم ایک خود غرض انسان ہو پری زاد..... کیا یہی تمہاری نام نہاد محبت ہے کہ خود اپنے ہاتھوں اپنی چاہت کی خوشیوں کا گلا گھونٹنے چلے ہو۔ کتنے کم ظرف ہو تم اور کتنی اعلیٰ ظرف ہے وہ کہ تمھیں اتنا مان دیتی ہے، مگر تم؟ تم اس مان کے قابل کہاں، تم بھی وہی عام دنیا دار نکلے پری زاد..... خود غرض اور مطلب پرست، جتنا تمہارا تن میلا ہے، اتنا ہی تمہارا من گدلا، یہی تمہاری اصلیت اور یہی تمہاری اوقات ہے پری زاد''۔ میرے اندر کی آوازیں اتنی بلند ہونے لگیں کہ میں نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ٹھیک اُسی لمحے اس کی ملائم آواز سنائی دی۔ ''پری زاد..... کہاں چُھپے بیٹھے ہیں آپ! میں آپ کو سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' میں نے گھبرا کر عینی کی طرف دیکھا۔ تقریب ختم ہو چکی تھی اور لوگ ایک ایک کر کے عینی کو کام یاب نمائش پر مبارک باد دے کر واپس پلٹ رہے تھے۔ ''ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یونہی بس ذرا بھیڑ میں جی گھبرا رہا تھا۔ تم بتاؤ، تم خوش تو ہو ناں!! آج تم نے یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیا''۔ عینی ہنس پڑی، وہ بہت ہلکی پھلکی سی لگ رہی تھی۔ ''جناب! یہ سارے معرکے آپ کی وجہ سے سر ہو رہے ہیں۔ پتا ہے، عدنان تو مجھے کہتا ہے کہ آپ میری زندگی میں میرا لکی چارم بن کر آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے آپ کی شاعرانہ گفتگو میں، خوش نصیبی کا ستارہ''۔ عدنان کے ذکر پر جیسے مجھے سب کچھ دوبارہ یاد آ گیا اور میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''مگر یہ عدنان ہے کہاں، دکھائی نہیں دے رہا؟'' عینی مسکرائی ''پتا نہیں، کہہ رہا تھا، مجھے کوئی سرپرائز دینا چاہتا ہے۔ شاید اسی سلسلے میں باہر گیا ہے۔ بس آتا ہی ہو گا''۔ میرے ہوش اُڑ گئے۔ عدنان تنہا باہر نکل چکا تھا۔ میں نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے عینی کو وہیں رُکنے کا کہا اور جلدی میں باہر کی جانب لپکا۔ میرے سارے خدشے شاید آج ہی درست ثابت ہونا تھے۔ میری گاڑی کے قریب میرا ڈرائیور اور گھر کا دوسرا گارڈ مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا ''کبیر خان کہاں ہے؟'' ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا کہ وہ کسی کام کا کہہ کر باہر نکلا ہے۔ میرے ساتھ جانے کے لیے اس نے گھر سے دوسرا گارڈ طلب کر لیا تھا۔ اسی گارڈ نے مجھے بتایا کہ کبیر خان کسی پرائیویٹ گاڑی میں باہر نکلا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ یقیناً کبیر خان عدنان کے پیچھے گیا تھا تاکہ موقع پا کر اسے ختم کر دے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی، مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے جلدی سے دوبارہ نمبر ملایا میرے اندر سمندر کی تیز لہروں جیسا شور اٹھ مار رہا تھا۔ ''فون اٹھاؤ کبیر خان، ورنہ آج ہم دونوں کے ہاتھوں ایک گناہِ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ فون اٹھاؤ کبیر..... خدا کے لیے فون اٹھاؤ.....'' میں نے خود کلامی کرتے ہوئے پانچویں مرتبہ کبیر کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔ میری آواز کانپ گئی۔ ''تم کہاں ہو کبیر خان! جلدی واپس لوٹ آؤ''۔ دوسری جانب ٹریفک کا بہت شور تھا۔ ''ہم شکار کے پیچھے آیا ہے صاب، تم فکر مت کرو، وہ اس وقت ٹھیک ہمارا نشانے پر ہے''۔ میں نے چیخ کر کہا ''نہیں، کبیر خان! ایسی غلطی مت کرنا۔ میرا حکم ہے کہ فوراً واپس آ جاؤ''۔ دوسری جانب کبیر کو میری آواز ٹھیک سنائی نہیں دی۔ ''بہت شور ہے صاب۔ ہم کام ختم کرتے ہی واپس آتا ہے..... وہ لڑکا دوسرا گاڑی میں ہمارا نشانے پر ہے۔ بس ایک منٹ اور.....'' کبیر کی آواز کٹ گئی..... میں اتنی زور سے چلایا کہ ساری پارکنگ میری آواز سے گونج اٹھی۔ ''تم اس لڑکے کو نہیں مارو گے کبیر خان! یہ میرا حکم.....'' میری آواز درمیان ہی میں گھٹ گئی۔ دوسری جانب کے شور میں مجھے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کسی نے فائر کیا تھا۔ میرے ہاتھ سے فون زمین پر گر گیا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، مُلک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں سر پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا، کچھ لمحوں کے لیے ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اچانک مجھے یوں لگا، جیسے قریب پڑے میرے سیل فون سے ابھی تک کبیر خان کی آواز آرہی ہو۔ میں نے جلدی سے فون اٹھایا، دوسری طرف وہی تھا ''کیا ہوا صاب..... اس طرف بہت شور تھا، ابھی بولو.....'' میں نے چلّا کر کبیر سے پوچھا ''کیا تم نے اسے مار دیا کبیر.....؟'' ''نہیں صاب..... اِدھر سگنل پر وہ بالکل نشانے پر تھا، مگر چوک پر کوئی حادثہ ہوگیا، اس لیے رش جمع ہوگیا، مگر ہم اس کے پیچھے ہے، ایک سنسان سڑک پر.....'' میری آواز بیٹھ گئی ''نہیں کبیر خان، نہیں، تم واپس آجاؤ''۔ کبیر نے احتجاج کیا ''مگر صاب.....!!'' میں نے غصّے سے چیخ کر کہا ''یہ میرا حکم ہے، فوراً واپس آؤ'' ''ٹھیک ہے صاب''۔ کبیر نے فون کاٹ دیا۔ میں اس طرح گہرے گہرے سانس لے رہا تھا، جیسے میلوں دُور سے بھاگ کر آیا ہوں، پھر مجھ سے وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور میں گھر واپس لوٹ آیا۔ خود کو کمرے میں بند کر کے اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ آج میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری بازی ہار آیا تھا۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا میرے پاس۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں تجوریوں میں بھری اپنی ساری دولت کو، اس عالی شان گھر کے صحن میں جمع کر کے اپنے ہر اثاثے سمیت جلا کر راکھ کر دوں، آگ لگا دوں اس ساری جائداد اور شان و شوکت کو، کس کام کا تھا یہ سب کچھ۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی میرے دل کا دامن آج بھی اسی پَری زاد کی طرح تہی دست اور خالی تھا، جو کبھی اسی شہر کے ایک کچّے مکان میں رہا کرتا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ دل کی ویران خالی بستیاں مقدروں سے بسا کرتی ہیں اور میرے نصیب میں میرے مَن کی یہی سُونی حویلی ہی لکھی تھی، لیکن اب میں اپنے اس دشمنِ دل کی مزید کسی چال میں آنے والا نہیں تھا۔ بہت مَن مانیاں کر چکا تھا یہ اپنی، بڑی ذلت اور خواری اٹھائی تھی آج تک میں نے اس دل کے کہنے میں آکر، مگر اب اس وحشی دل کو سزا دینے کا وقت آچکا تھا اور مجھ جیسے دل جلے جب خود کو سزا دینے پر آتے ہیں، تو وہ سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ اگلے روز میں نے ایک پاور آف اٹارنی کے ذریعے کچھ اہم فیصلے کیے۔ اپنے تمام پھیلے ہوئے کاروبار اور عملے کو ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کر کے سب کے حصّے مقرر کر دیے۔ میری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصّہ اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر پال کے پلاسٹک سرجری کے ادارے کو جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر پال کو ایک آخری ای میل لکھی۔ ''محترم ڈاکٹر پال! میں نے اپنی پلاسٹک سرجری کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، کیوں کہ آپ ہی کے ادارے کی تعارفی سطر کے مطابق یہ بات بالکل درست نکلی کہ چہرے بدلے جاسکتے ہیں، تقدیریں نہیں۔ اور مجھے شاید اس بات کا احساس بہت دیر میں ہوا کہ مجھے اپنی تقدیر بدلنے کی ضرورت چہرہ بدلنے سے کہیں زیادہ تھی، مگر افسوس، میں کسی ایسے ادارے کو نہیں جانتا، جو اللہ سے سفارش کر کے میری تقدیر بدل ڈالتا۔ میرے ادارے کی آمدنی سے ایک بڑا حصّہ ہر ماہ آپ کے ادارے کو ملتا رہے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ یہ رقم اُن لوگوں کے مفت علاج پر صرف کیجیے گا، جو اپنی سرجری کروانا چاہتے ہیں، مگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ میری آمدنی کا دوسرا بڑا حصّہ میرے اپنے ملک میں ایسے پلاسٹک سرجری کے اداروں کو جائے گا، جو یہاں کے نادار مریضوں کے چہروں کا علاج کریں گے اور پوری سہولیات نہ ہونے کی صورت میں، ایسے لوگوں کو آپ کے ادارے تک پہنچائیں گے۔ میرا اسٹاف آپ کے ادارے کو یہاں کے اداروں سے منسلک کروا دے گا۔ یہ میری آخری ای میل ہے، کیوں کہ اس کے بعد میں خود کو اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم کر دوں گا، اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ جس کے لیے میں اپنے چہرے کی سرجری کروا کر اسے خوش نُما بنانا چاہتا تھا، وہ کبھی میرے اس چہرے کو دیکھے اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے حقارت یا ہم دردی کی وہ لہر پیدا ہو، جو ازل سے میرا مقدر رہے، اور اگر کبھی ایسا ہوا تو وہ لمحہ میرے لیے موت کی اذیت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہوگا۔ میں نے ساری دنیا کی نظریں جھیل لیں، مگر اس ایک نظر کو کبھی برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا..... دعا گو، پَری زاد.....''

شام تک سارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ کمالی سمیت چند دیگر سینئر اور وفادار عملے کے ارکان کو بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا۔ میرے بہن بھائیوں، دوستوں، رشتے داروں اور عملے سمیت سبھی کے لیے ماہانہ مشاہرے کے علاوہ حصّے کے طور پر ایک معقول رقم مخصوص کر دی گئی۔ میں نے کچھ ایسا انتظام کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد بھی سارا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ جب کمالی کو میں نے رات گئے طلب کر کے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا، تو وہ ایک دم گھبرا سا گیا ''مگر سر! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور معاف کیجیے گا سر، یہ پاور آف اٹارنی سے کہیں زیادہ کوئی وصیت نامہ لگتا ہے۔ میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا، اسٹاف سے یہ سب کچھ اکیلے نہیں سنبھلے گا سر!'' میں نے اسے تسلّی دی ''فکر مت کرو، سب یونہی چلتا رہے گا، اور میں کہیں نہیں جا رہا..... بس اچانک کچھ ضروری مسائل پیش آگئے ہیں، اس لیے کچھ عرصہ شاید غیر حاضر رہوں گا اور یاد رہے، میرے کہیں جانے تک یہ کاغذ تمہارے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرا یہ بھرم ضرور قائم رکھو گے''۔ کمالی کی پلکیں بھیگ گئیں ''میں آخری سانس تک آپ کا ہر بھرم نبھاؤں گا سر، مگر یہ تو بتا دیں کہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟ کبھی آپ سے رابطہ کرنا ہو تو کیسے کیا جائے؟'' ''فی الحال تو میرا خود اپنے آپ سے رابطہ بھی ممکن نہیں ہے کمالی، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں مطلع کر سکوں۔ اب تم جاؤ، اور ہاں، کبیر خان کا خاص خیال رکھنا، ایسے وفادار بہت نایاب ہوتے ہیں''۔ کمالی افسردہ سا، دل میں بہت سی باتیں لیے لوٹ گیا۔ کچھ دیر میں کبیر خان آگیا۔ وہ کچھ چُپ چُپ سا تھا۔ میں نے مُسکرا کر اسے دیکھا۔ ''مجھ سے ابھی تک ناراض ہو کبیر خان؟'' کبیر نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''نہیں صاب..... ہم تو آپ کا غلام ہے۔ مگر، آپ نے اس ڈاکٹر کو معاف کر کے اچھا نہیں کیا۔ دشمن پر رحم نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ جب اس کا وقت آئے گا تو وہ آپ پر رحم نہیں کرے گا''۔ میں نے ایک گہری سانس لی ''تم ٹھیک کہتے ہو کبیر خان، مگر محبت شاید ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ کبھی کبھی محبت میں ہم ایسے لوگوں کو بھی بخش دیتے ہیں، جو خود ہمارے قتل کا باعث بن جاتے ہیں اور اس جنگل نُما دنیا کا بس یہی تو قانون ہے، مارو یا پھر خود مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے خود کو مار دیا ہے کبیر خان.....'' کبیر سر جُھکائے واپس چلا گیا۔

اگلے دو دن بھی پَر لگا کر اُڑ گئے اور پھر عدنان اور عینی کی امریکا روانگی کا دن بھی آگیا۔ وہ دونوں بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔ عینی کی اب بھی وہی ضد تھی۔ ''میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تین چار ہفتے میں سارے ٹیسٹ ہو جائیں گے، اور پھر آپریشن کے بعد ہم سب اکٹھے واپس

آ جائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا، جب ہم تینوں وہاں ایک ساتھ ہوں گے ورنہ یہ عدنان تو اپنی بورنگ باتوں سے میرا سر کھا جائے گا اتنے بہت سے دن"۔ میں نے وعدہ کیا۔ تم لوگ پہنچو، میں بھی جلد آنے کی کوشش کروں گا، یہاں پیچھے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں"۔ عدنان نے سر ہلایا" کوشش نہیں جناب، آپ کو اس بلی کے آپریشن سے پہلے ہر حال میں پہنچنا ہی ہوگا۔ اسے اکیلے برداشت کرنا خود میرے بس کی بات بھی نہیں ہے، ہاں البتہ آپ کی موجودگی میں کافی سوبر برتاؤ کرتی ہے"۔ یعنی نے اسے گھورا" بکو مت، بُری زاد جانتے ہیں کہ میں کتنی سوبر اور ویل مینرڈ ہوں، تمہاری گواہی کی ضرورت نہیں"۔ اتنے میں اندر سے ان کی فلائٹ کا اعلان ہونے لگا۔ میں نے اُن دونوں کو رخصت کیا" ٹھیک ہے بابا تم دونوں ہی بہت اچھے ہو۔ چلو، اب دیر نہ کرو، فلائٹ کا اعلان ہو گیا ہے"۔ یعنی جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے پلٹی، میرا دل بے قابو ہونے لگا، وہ میرا سب کچھ لوٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں" بُری زاد، وقت پر پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔ میں وہاں روزانہ آپ کو بہت یاد کروں گی، اپنا بہت خیال رکھیے گا"۔ میری آواز کپکپا سی گئی۔ مجھے یوں لگا، جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بہت زور سے مسل ڈالا ہو" تم بھی ہمیشہ میری یادوں میں رہو گی، میری پیاری آرجے..... الوداع....." وہ ایک لمحہ رُکی اور پلٹ کر اندر لاؤنج کی جانب بڑھ گئی۔ میں بہت دیر تک اسے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہوتا دیکھتا رہا۔ اپنی زندگی کے، خود سے قدم بہ قدم دور جانے کا یہ نظارہ شاید دنیا میں مجھ سے پہلے کسی بدنصیب نے نہ کیا ہو۔ یعنی چلی گئی۔ میں، جہاز کی اُڑان بھرنے کی اناؤنسمنٹ تک وہیں بیٹھا رہا۔ لوہے اور چند دیگر دھاتوں کا بنا ہوا ایک دیو ہیکل ہوائی جہاز مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر بہت دُور اُڑان بھر گیا۔

گھر واپس لوٹا تو آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے، مگر کبیر خان کو اطلاع نہ کرے۔ مجھے شاید کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر جانا پڑے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر میں نے روزمرہ اور ماہانہ خرچوں کے کچھ چیکس پر دستخط کیے اور کمالی کے نام ایک خط میں سارے معاملات کی تفصیل لکھ ڈالی۔ فجر سے کچھ دیر قبل میں تنہا گھر سے باہر نکلا اور ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ یعنی کے جانے کے بعد میرا دل اور دماغ جیسے بالکل سُن سے ہو گئے تھے۔ میں چل پھر رہا تھا، سانس لے رہا تھا، مگر زندہ نہیں تھا۔ پتا نہیں صرف سانس لینا ہی زندگی کی شرط کیوں ٹھہرا دی گئی ہے؟ جیون تو اس سے کہیں بڑھ کر اور سوا ہے۔ ڈرائیور کو باہر انتظار کرتے چھوڑ کر میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچا تو کوئی گاڑی روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے بنا سوچے سمجھے آخری اسٹیشن کا ٹکٹ لیا اور درجہ بندی کے اہتمام کی فکر کیے بغیر پہلی بوگی میں سوار ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں ٹرین نے سیٹی بجائی اور پلیٹ فارم چھوڑ دیا، مگر یادیں دماغ کا پلیٹ فارم بھلا کب چھوڑتی ہیں۔ ٹرین اسٹیشن در اسٹیشن ہوتی جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ لوگ ڈبے میں سوار ہوتے اور اپنی منزل آنے پر اترتے رہے، مگر میری منزل کہاں تھی۔ یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔ دو دن بعد ٹرین کسی بڑے جنکشن پر آ کر کھڑی ہو گئی اور سبھی مسافر اتر گئے۔ پتا چلا کہ یہ آخری اسٹیشن ہے۔ اب اگلے دن یہی ٹرین یہاں سے واپس میرے شہر تک جائے گی۔ کاش! یہ ٹرین تمام عمر یونہی چلتی رہتی، آگے بڑھتی رہتی اور اس کا کوئی آخری اسٹیشن نہ آتا۔ کتنا نادان تھا میں، کیا سوچ کر ٹرین میں آ بیٹھا تھا کہ میرے بقیہ تمام سفر کا سفر اسی ٹرین میں کٹ جائے گا۔ جب تیسری بار ٹرین کے عملے نے مجھے آ کر یہ بتایا کہ اب یہ گاڑی آگے کہیں نہیں جائے گی، تو میں نیچے اتر آیا اور کچھ فاصلے پر بچھے لکڑی کے ایک پُرانے سے بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ دنیا کے سارے ریلوے اسٹیشن شاید ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ ناساز ٹھیک ہی کہتا تھا، منزلیں اپنی جگہ ہیں، راستے اپنی جگہ، جب قدم ہی ساتھ نہ دیں، تو مسافر کیا کرے؟ یہاں پر موجود سبھی مسافر کوئی نہ کوئی منزل اور مقصدِ سفر رکھتے تھے۔ ہر کسی کو کہیں جانے کی جلدی تھی، بچے، بوڑھے، عورتیں اور مرد، بھیڑ، ہجوم اور بھانت بھانت کی بولیاں، غلبلت، ہڑبڑاہٹ اور راستوں کی فکر۔ سبھی کسی نہ کسی دُھن میں مگن تھے، مگر میں بے حس سا بیٹھا اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہا۔ شام ڈھلی اور پھر گہری رات نے ڈیرے ڈال دیے۔ میرے پیچھے وہاں گھر میں ضرور طوفان آ چکا ہو گا۔ کئی گھنٹے انتظار کے بعد میرے واپس نہ لوٹنے پر کبیر نے ضرور اسٹیشن کے باہر میرے انتظار میں کھڑے ڈرائیور سے رابطہ کیا ہو گا یا وہ اس سے بھی پہلے میری تلاش میں نکل چکا ہو گا اور پھر جب ان لوگوں نے مجھے اسٹیشن پر نہیں پایا ہو گا، تو گھر میں کہرام مچ گیا ہو گا۔ کمالی کو تو میرے جانے کا تھوڑا بہت علم تھا، مگر کبیر بک کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ وہ ضرور میری تلاش میں سب چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل پڑا ہو گا۔ کہیں وہ دوسری ٹرین پکڑ کر ہر اسٹیشن کھوجتا یہاں تک بھی نہ آ پہنچے۔ میں گھبرا کر لڑکھڑا گیا۔ گھر سے نکلتے وقت میرے کوٹ کی جیب میں پڑے بٹوے میں بہت سے بڑے نوٹ ابھی باقی تھے۔ میں نے ٹکٹ گھر سے کسی دوسری مخالف سمت جاتی گاڑی کا ایک ٹکٹ لیا اور صبح منہ اندھیرے اس گاؤں میں سوار ہو کر پھر سے ڈبے سے باہر کی بھاگتی دنیا کا نظارہ شروع کر دیا۔ مجھے اپنے ماضی، اپنے دل کی حماقتوں اور اپنی پرانی پہچان سے کچھ ایسی چڑ ہو گئی تھی کہ میں نے اگلے کئی دنوں تک اسی بے مقصد سفر کو اپنی ذات کھو دینے کا بہانہ بنا لیا۔ جہاں گاڑی رُک جاتی، میں وہاں سے کسی اور جانب کا کوئی ٹکٹ لے کر کسی اور گاڑی میں بیٹھ جاتا۔ مجھے شہروں یا بستیوں کے ناموں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی میں نے اس عرصے میں کسی ریلوے پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر، بستی یا گاؤں کو نظر بھر دیکھا تھا۔ میں تو بس چلتے رہنا چاہتا تھا۔ میری شیو بڑھتے بڑھتے داڑھی کی صورت اختیار کرنے لگی تھی اور میرے کپڑے دھول اور مٹی سے غرق ہو چکے تھے، مگر اب مجھے کسی چیز سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جہاں بھوک یا پیاس کا احساس ستاتا تو میں اُتر کر کسی پلیٹ فارم پر لگے نلکے سے پیاس بجھا لیتا اور کسی ٹھیلے والے سے کچھ لے کر کھا لیتا، مجھ پر ایک عجیب سی حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ اسی دو گھونٹ پانی اور چار لقموں کے لیے ہم اپنی زندگیوں کو عمر بھر نہ جانے کیسے کیسے عذاب اور جوکھم میں ڈالے رکھتے ہیں، جب کہ ان دونوں چیزوں کا حصول کبھی اتنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوتا، جتنی زندگی ہم اس بھوک اور پیاس کے لیے گنواتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میری جیب میں موجود رقم ختم ہونے لگی اور پھر ایک دن جب کسی قصبے کے چھوٹے اسٹیشن پر میں نے جیب سے ٹکٹ لینے کے لیے پیسے نکالنا چاہے، تو میرے ہاتھوں میں صرف چند سکّے آئے۔ میں نے الٹ پلٹ کر ساری جیبیں دیکھ ڈالیں، مگر کچھ بھی نہ بچا تھا، میں تھکا ہارا سا اسٹیشن سے باہر آ گیا، ذرا ایک تانگے والا درخت کے سائے میں کھڑا اپنے گھوڑے کو چارہ ڈال رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب لپکا۔" کہاں جاؤ گے بادشاہو..... اس علاقے کے تو نہیں لگتے....." میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے سکّے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے" جہاں تک یہ سکّے لے جا سکتے ہیں، لے چلو۔ اس بستی سے پرے، کسی ویرانے میں....." تانگے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔" بستی سے پرے تو قبرستان ہے..... اوہ اچھا، اب سمجھا، کسی بڑے بوڑھے کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ آؤ بیٹھ جاؤ، میں پہنچا دیتا ہوں"۔ میں چپ چاپ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور تانگے والے نے قصبے کے باہر ہی سے ایک لمبا چکر کاٹ کر ایک بڑے سے قبرستان کی چار دیواری کے باہر تانگا روک دیا" واپس جاؤ گے، میں یہیں انتظار کروں کیا؟" میں خالی ذہن لیے نیچے اتر آیا۔" نہیں تم جاؤ، میں دیر تک یہاں رکوں گا"۔ تانگے والے کے چہرے پر ایک بار پھر بہت سے سوال اُبھرے، مگر میرا بے زار سا رویہ دیکھ کر اس نے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کی اور چابک مار کر تانگا موڑ لیا اور کچھ ہی دیر میں ویران سڑک کے آس پاس بکھرے کھیتوں میں کہیں گم ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک یونہی باہر کھڑا سوچتا رہا اور پھر قبرستان کے لکڑی والے بڑے گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ دُور دُور تک نئی اور پرانی قبروں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ میں قبروں کے کتبے اور ان پر لکھے سنِ وفات پڑھتا ہوا آگے بڑھتا رہا، کچھ تازہ قبروں پر اگربتیوں کے جلے ہوئے ٹوٹے اور کچھ ماش کے دانے بکھرے ہوئے تھے، مُرجھائے ہوئے خشک

پھولوں کی پتیاں جا بجا بکھری تھیں۔ جانے لوگ مٹی میں چلے جانے والوں کے لیے اتنے پھول لے کر کیوں آتے ہیں۔ اس کی زندگی ہی میں اسے گلابوں سے کیوں نہیں نہارتے۔ چلتے چلتے میں تھک گیا تو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک عجیب سی خاموشی چار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ انسان کی عمر بھر کی فریاد اور چیخ پکار کا صلہ بس یہی اک خاموشی ہے۔ اچانک میرے بہت قریب ایک کرخت سی آواز ابھری۔ ''کون ہے بھئی تُو..... اور یہاں کیا کر رہا ہے؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سخت گیر سا ہڈیوں کے ڈھانچے نما بوڑھا کمر پر ہاتھ رکھے تنا ہوا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ ''میں..... وہ..... دراصل.....'' اس نے کڑے تیوروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟'' ''نہیں نہیں، میں تو بس.....'' اس نے مجھے دوبارہ سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ ''اچھا..... میں سمجھا، ڈاکٹری کی پڑھائی والوں کے لیے پُرانی قبروں سے ہڈیاں چُرانے آیا ہے تُو..... پر کان کھول کر سن لے، فقیرا نام ہے میرا۔ میرے باپ دادا بھی اسی قبرستان کے گورکن تھے۔ خبردار، جو یہاں سے ایک ہڈی بھی اِدھر اُدھر کی..... ہاں، میرے ساتھ سیدھی طرح سودا کرے گا تو میں خود تیرے مطلب کی ہڈیاں تجھے بیچ دوں گا''۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کرخت طبیعت بوڑھے کو کیسے سمجھاؤں کہ جو وہ مجھے سمجھ رہا ہے، میں وہ نہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہیں، میں یہاں مُردوں کی ہڈیاں تلاش کرنے نہیں آیا۔ تھک گیا تھا، اس لیے کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے رک گیا''۔ فقیرے نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا ''کہیں تُو، اس چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے کا ساتھی تو نہیں ہے، سچ بتا، کس ارادے سے یہاں آیا تھا؟'' مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے سخت لہجے میں فقیرے کو جھاڑ دیا ''تمہیں ایک بار کی کہی بات سمجھ نہیں آتی کیا۔ میں کسی سلامے کو نہیں جانتا اور نہ ہی میرا، تمہاری قبروں کی اس جاگیر پر قبضے کا کوئی ارادہ ہے۔ میں مسافر ہوں، بس راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا تھا۔ سوچا تھا، شاید یہاں کچھ سکون مل جائے، مگر یہاں بھی تم جیسے بیوپاری، ٹھیکے دار بیٹھے ہیں''۔ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ پیچھے سے فقیرے کی ڈھیلی سی آواز سنائی دی ''ذرا رُک تو سہی.....'' میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا ''معاف کر دے، دراصل پچھلے چند دنوں سے یہ سارے گدھ میرے قبرستان پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ ایک عامل کو بھی بھیجا تھا لوگوں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے۔ اس لیے میں سمجھا کہ پھر انہی کی کوئی شرارت ہے۔ نام کیا ہے تیرا، اس علاقے کا تو نہیں لگتا''۔ مجھے جلدی میں کوئی دوسرا نام نہیں سوجھا تو میں نے اپنے پُرانے ڈرائیور کا نام بتا دیا ''اکبر نام ہے میرا..... میں یہاں کا نہیں ہوں، بلکہ میں کہیں کا نہیں ہوں۔ نہ گھر بار ہے نہ کوئی رشتے دار۔ بس، یونہی بستی بستی بھٹکتا رہتا ہوں۔ یہاں بھی بھٹکتے ہوئے ہی آ گیا تھا۔ تم ناراض ہوتے ہو تو یہاں سے بھی چلا جاتا ہوں''۔ فقیرا بالکل ہی نرم پڑ گیا ''اوئیں نئیں، بس ایسے ہی غصے میں کچھ زیادہ بک گیا میں۔ تیرا جب تک جی چاہے، یہاں رہ سکتا ہے۔ آدمی تو مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ روٹی کھائے گا؟'' میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں الٹ دیا ''میرے پاس پیسے نہیں ہیں''۔ فقیرا زور سے ہنس پڑا ''اوئے جھلے! پیسے کس نے مانگے ہیں تجھ سے، چل آ جا، میری کوٹھری یہیں اسی قبرستان میں ہے۔ صبح ہی ایک مُردہ دفنایا تھا، اس کے گھر والے میٹھے چاولوں کی دیگ بانٹ گئے تھے۔ ابھی بہت سے چاول پڑے ہیں''۔ میں چُپ چاپ فقیرے کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی چھوٹی سی کٹیا میں ایک جھلنگا سی چارپائی، کونے میں پڑی پانی کی صراحی اور گلاس اور ایک جانب چھوٹی سی دیوار کے پیچھے بنے باورچی خانہ نما کونے میں چند پرانے سلور کے برتن پڑے تھے۔ ایک جانب گینتی، بیلچہ، کدال، رسّی اور قبر کھودنے کا دیگر سامان رکھا ہوا تھا۔ فقیرے نے ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ وہ یہاں تنہا رہتا ہے۔ شادی اس نے کبھی کی نہیں، اور میری طرح اس کا بھی کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں شام ڈھل گئی اور جب میں فقیرے کی کٹیا سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ میں نے فقیرے سے رخصت چاہی تو اس نے مجھ سے پوچھا ''اب کہاں جائے گا.....؟'' ''پتا نہیں، جہاں یہ رستہ لے جائے''۔ فقیرے نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے آواز دے کر روک لیا ''تو یہیں کیوں نہیں رہ جاتا، تیرا ٹھکانہ بھی ہو جائے گا اور میرا ہاتھ بٹانے والا بھی مجھے مل جائے گا''۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا ''مگر میں یہاں کیا کروں گا.....؟'' وہ زور سے ہنسا۔ ''میری طرح قبریں کھودے گا اور کیا کرے گا.....؟؟''

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ ''کیا.....!! میں نے آج تک کبھی کوئی قبر نہیں کھودی''۔ فقیرا زور سے ہنسا۔ ''جھوٹ بولتا ہے تُو، ہم سب تو ہر وقت کسی نہ کسی کی قبر کھود رہے ہوتے ہیں۔ فکر نہ کر، میں تجھے سب سکھا دوں گا، محنت سے جی تو نہیں چُرائے گا؟'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''اب میرے پاس چُرانے کے لیے کچھ نہیں ہے، جی بھی نہیں''۔ فقیرے نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ ''ٹھیک ہے پھر آجا اور ہاں، تُو نے یہ کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں، لگتا ہے کسی گورے انگریز کی قبر سے چُرا کر لایا ہے یا پھر لنڈے بازار کا مال ہے، گور کن ایسے کپڑے نہیں پہنتے، چل کیا یاد کرے گا، میں تجھے اپنا ایک جوڑا دے دوں گا، کپڑے بدل کر آرام کرلے، صبح بڑا کام کرنا ہے''۔ ہم دونوں اندر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ فقیرے نے کسی کونے میں پڑے ایک ٹرنک سے ایک بستر نما گدیلا اور ایک چادر نکال کر میرے حوالے کر دی۔ ''یہیں ایک طرف اپنا بستر ڈال لے اور میں رات کو ذرا دیر سے سوتا ہوں، تیری آنکھ لگے تو بھلے سو جانا''۔ فقیرے نے اپنی جیب سے ایک مخصوص برانڈ کی بیڑی ٹٹولی اور اپنی چارپائی کے تکیے کے نیچے سے ایک پڑیا نکالی اور کاغذ میں لپٹی بہت سی بھورے رنگ کی راڈ نما تلیوں میں سے ایک چُن کر اُسے اپنی ہتھیلی پر رکھ کر رگڑنے لگا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس تیلی کی ایک چھوٹی سی گولی بنانے میں کام یاب ہو گیا۔ پھر اس نے وہ گولی بیڑی کے تمباکو میں شامل کر کے بیڑی دوبارہ جوڑ کر سلگالی۔ جھونپڑی میں ایک عجیب سی ناگوار بو پھیل گئی۔ فقیرے نے زوردار تیسرا کش لگایا اور دھواں فضا میں پھیلا کر بولا۔ ''کبھی چرس پی ہے اکبرے.....؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ زور سے ہنسا۔ ''اچھا ہے نہ پیا کر، خون بھی جلا کر پی جاتی ہے یہ کم بخت۔ پر میرا اس کے بنا گزارا نہیں، قبرستان کی راتیں بڑی کالی اور لمبی ہوتی ہیں، سچ بتاؤں تو نوجوانی میں مجھے یہاں اکیلے رہتے بڑا ڈر لگتا تھا، بس انہی دنوں میں یہ لت لگ گئی''۔ فقیرا ساری رات نہ جانے کیا کچھ بڑبڑاتا رہا اور میں چُپ چاپ اس کی رام کہانی سُنتا رہا۔ شاید اسے بہت دنوں کے بعد کوئی سُننے والا ملا تھا، پھر نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب تک وہ بولتا رہا، میرا دھیان بٹا رہا، مگر خاموشی ہوتے ہی میرے اندر چُھپے کئی آسیب اور عفریت مجھے سالم نگلنے کے لیے اندھیرے میں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

مجھے گھر چھوڑے مہینہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ اب تک تو انہوں نے تھک ہار کر میری کھوج ختم کر دی ہو گی۔ وہاں نیویارک میں عینی کے تمام ٹیسٹ ہو چکے ہوں گے اور شاید آج کل میں اس کا آپریشن بھی ہونے والا ہو گا۔ وہ مجھے عین وقت پر وہاں نہ پا کر کتنی مایوس ہوئی ہو گی، مگر یہ مایوسی یقیناً اُس مایوسی سے کہیں کم ہو گی، جو آنکھیں مِلنے کے بعد اسے مجھے دیکھ کر ہوتی۔ عدنان نے ضرور اسے سمجھا بُجھا کر آپریشن پر راضی کر لیا ہو گا۔ کتنی خوش ہو گی وہ، جب پہلی بار، برسوں بعد اس دنیا کے رنگوں کو اپنی خُوب صورت آنکھوں سے دیکھے گی۔ ساری رات باہر قبرستان کے ویرانے سے گیدڑوں، کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور فقیرا بے سُدھ پڑا خرّاٹے لیتا رہا۔ وہاں میرے آس پاس سب ہی تو سو رہے تھے، کچھ اپنی اپنی قبروں میں اور فقیرا اپنی چارپائی پر، بس ایک میں ہی تھا، جسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو فقیرا اپنے اوزار اٹھا کر میرے ساتھ کٹیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے آس پاس پھر کوئی قبر کے لیے جگہ منتخب کی اور پھر کسی بوڑھے گدھ کی طرح قبرستان کے داخلی دروازے پر نظریں جما کر بیٹھ گیا۔ گھنٹے بھر بعد ہی کچھ غم زدہ سے لوگ قبرستان میں داخل ہوئے اور فقیرے کو نئی قبر کا بیعانہ پکڑا گئے۔ فقیرے نے ان کے جاتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''واہ بھئی اکبرے تُو تو میرے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا ہے، پتا ہے دو دن سے فارغ بیٹھا تھا میں۔ کوئی مر کر ہی نہیں دے رہا تھا ساری بستی میں۔ چل آجا شاباش، ہمیں گھنٹے بھر میں قبر تیار کرنی ہو گی، وہ لوگ دوپہر کی نماز کے بعد آئیں گے''۔ میں کسی معمول کی طرح کام میں جُت گیا۔ فقیرا اپنے کام کا ماہر تھا، جلد ہی اس نے چھ فٹ گہری قبر کھود کر مغرب کی جانب لحد تیار کر لی۔ ساتھ ساتھ وہ مجھ سے مٹّی اٹھواتا اور قبر کی تیاری کے آزمودہ نسخے بھی بتاتا جا رہا تھا۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے دبئی کے ابتدائی ایّام میں اس سے کہیں زیادہ سخت محنت مزدوری کی تھی، مگر درمیانی عرصے میں مشقت کی عادت مجھ سے چھوٹ گئی تھی، لیکن میں فقیرے کے ساتھ جُتا رہا۔ میں خود کو اس قدر تھکا دینا چاہتا تھا کہ جسم کی ٹوٹتی رگوں سے میرے ماضی کی یادوں سمیت میری جان بھی قطرہ قطرہ بہہ کر نکل جائے۔ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ آ گیا، مرحوم کے ورثاء نے روتے دھوتے افسردہ اور سوگوار ماحول میں لاش کو قبر میں اتارا اور سب نے مٹّی ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ فقیرا اس تمام عرصے میں ایک جانب لاتعلق سا بیٹھا بیڑیاں پھونکتا رہا، مگر یہ رات والی ''خاص'' بیڑی نہیں تھی۔ میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے مجھے کہنی ماری۔ ''ابھی دیکھنا کچھ ہی دیر میں ان رونے دھونے والوں میں سے سگریٹ پینے والے دھیرے دھیرے ایک جانب سرکنا شروع ہو جائیں گے اور ایک دو کی ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ، بیڑی پھونکیں گے اور اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں گے''۔ اور پھر کچھ دیر میں واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں نے حیرت سے فقیرے کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرایا۔ ''برسوں سے دیکھ رہا ہوں یہ ڈراما..... سگریٹ ایسی بلا ہے، جو موت بھی بُھلا دیتی ہے اور تجھے اب کیا بتاؤں اکبرے، میں نے تو یہاں جنازے پر بھی نشے میں دُھت لوگوں کو آتے دیکھا ہے، کم بخت کہیں بیٹھے پی رہے ہوتے ہیں کہ کسی اپنے کی موت کا پیغام آجاتا ہے، بھاگے دوڑے قبرستان تو پہنچ جاتے ہیں، آخری منہ دکھائی کے لیے، مگر قدم زمین پر نہیں پڑتے ٹھیک طرح''۔ میں نے فقیرے کے ہاتھ میں پکڑی بیڑی غور سے دیکھی۔ ''تم بھی تو سارا دن یہ دھواں اندر انڈیلتے رہتے ہو، میں نے سُنا ہے اس سے کینسر ہو جاتا ہے''۔ فقیرے نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ ''تُو بھی ان جاہلوں کی باتوں پر یقین کرتا ہے اکبرے، میری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہے، پندرہ سال کی عمر میں، میں نے پہلا کش لگایا تھا، یقین کر آج تک کبھی زکام بھی نہیں ہوا مجھے، جب کہ میں نے اسی قبرستان میں اپنے ہاتھوں سے ایسے تیس پینتیس سال کے جوان مُردے بھی دفنائے ہیں، جنہوں نے عمر بھر تمباکو کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور اُن کے ساتھ آنے والے اس بات پر حیران تھے کہ نہ تو سگریٹ پیتا تھا، نہ شراب، پھر اچانک ہی کیسے گزر گیا۔ اب بول کیا بولتا ہے، تیرے حساب سے تو مجھے کب کا کینسر سے مر جانا چاہیے تھا''۔ میں لاجواب ہو گیا۔ ''تو پھر یہ ہر سگریٹ اور بیڑی کے پیکٹ پر موت کا ڈراوا کیوں لکھ دیتے ہیں؟'' فقیرے نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا تاکہ اس کی آواز قبر پر مٹّی ڈالتے ورثاء تک نہ پہنچے۔ ''مجھے تو یہ بھی کچھ بڑوں کی دکان داری لگتی ہے اکبرے! یہ کیا بات ہوئی بھلا زہر ہے، تو پھر بیچتے کیوں ہیں کھلے بازار میں، بند کر دیں اس کی فروخت''۔ مرحوم کے ورثاء دعا سے فارغ ہو کر دھیرے دھیرے پلٹ رہے تھے۔ قبر پر عطر، کیوڑے اور گلاب کی پتّیوں کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ فقیرے نے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ''اب کچھ دن تک اس قبر کے اوپر بڑی رونق رہے گی، روزانہ کچھ لوگ آئیں گے، پھر دھیرے دھیرے ویرانی چھا جائے گی، سب اپنی اپنی دنیاداری میں الجھ کر یہاں سوئے شخص کو بھول جائیں گے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے اکبرے.....!''

شام ڈھلنے سے کچھ دیر قبل فقیرا بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تازہ بیڑی کے کچھ بنڈل تھے۔ اس نے کچھ روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ''یہ تیری مزدوری کا حصّہ ہے، آدھے پیسوں کا میں سامان لے آیا ہوں''۔ میں نے وہ روپے دوبارہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ ''یہ تم ہی رکھو، اب مجھے ان کی ضرورت نہیں پڑتی''۔ فقیرے نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ ''تُو بھی پورا ملنگ ہے، چل ٹھیک ہے، میرے پاس ہی جمع رہنے دے''۔ رات ڈھلی تو باہر قبرستان میں کچھ فاصلے پر عجیب سی جنتر منتر پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ فقیرا جھونپڑی کے باہر بیٹھا بیڑی پھونک رہا تھا۔ ''یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' فقیرے نے حسبِ عادت بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ''کوئی عامل کسی زنانی کو بے وقوف بنانے کے لیے منتر پڑھ رہا ہے''۔ میں نے دُور اندھیرے میں دیکھا تو واقعی کوئی جعلی پیر نما شخص چغہ پہنے دو تین عورتوں سمیت ایک قبر کے گرد بیٹھا آگ جلائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ''یہ سب کیا ہے فقیرے.....؟'' ''یہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سے پریشان ہے اور اپنی سوکن کو اسی قبرستان میں پہنچانا چاہتی ہے، لہٰذا اس نے اپنی ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اس عامل کو کالے عمل کے لیے رقم دی ہے، یہ بے وقوف عورتیں گھر سے چھپ کر یہاں آئی ہیں اور رات بھر میں اچھی خاصی رقم اس ڈھونگی کو پکڑا کر واپس چل دیں گی''۔ میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ''مگر تم اپنے قبرستان میں یہ ڈرامے بازی کیوں ہونے دے رہے ہو؟'' ''اوئے اکبرے! تُو واقعی بڑا بھولا ہے، جھلّے! یہ عامل مجھ سے پہلے ہی سودا کر چکا ہے، آدھے پیسے میری جیب میں آئیں گے۔ کبھی کبھی تو ان جھوٹے عاملوں کے کہنے پر میں خود ہی کسی پرانی قبر میں لیٹ جاتا ہوں اور ان کے عمل کے بیچ میں منہ سے ڈراؤنی آوازیں نکالتا ہوں، تاکہ باہر بیٹھے لوگ اپنے پیر صاحب کی ''کرامت'' کا یقین کر لیں، یاد رکھ اکبرے، قبرستان میں جو بھی دھندا ہوتا ہے، اس کا آدھا حصّہ قبرستان کے رکھوالے اور گورکن کو جاتا ہے''۔ میں حیرت سے منہ کھولے فقیرے کی باتیں سُن رہا تھا۔ میں تو جیتے جاگتے انسانوں کی دنیا کے پھندوں اور مکر و فریب کے جال کو رو رہا تھا، مجھے کیا پتا تھا کہ یہاں مُردوں کی بستی کے بکھیڑے زندوں سے بھی نرالے ہیں۔ اُس رات فقیرے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرانی اور خالی قبریں باقاعدہ نئے بازار اور جواریوں کو کرائے پر دی جاتی ہیں، تاکہ وہ رات بھر اپنا شغل اطمینان سے جاری رکھ سکیں۔ علاقہ حوالدار بھی حصّہ ملنے کے بعد یہاں کا رُخ نہیں کرتا۔ جعلی عامل اور پیر اپنے نئے گراہکوں پر اثر اور رعب ڈالنے کے لیے پہلی ملاقات ہی میں انہیں اپنے ڈیرے سے سیدھا فقیرے کے قبرستان بھیج دیتے ہیں کہ جا کر فلاں قبرستان کی فلاں قبر کے سرہانے کھدائی کرو، تمہارے خلاف دبایا گیا تعویذ یا سفلی عمل وہیں ملے گا۔ ضرورت مند بے چارا بھاگا بھاگا قبرستان آتا ہے، جہاں فقیرا پہلے ہی سے کسی کالی مرغی کا سر، سڑے ہوئے انڈے یا کسی بکرے کی سری دبا چکا ہوتا ہے۔ سائل اپنے عامل کی کرامت کا بھرپور نظارہ دیکھ کر اپنی عمر بھر کی پونجی عامل پر لٹا دیتا ہے اور فقیرے کا حصّہ اُسے مل جاتا ہے''۔ میں دن بھر بیٹھا حیرت سے فقیرے کی باتیں سنتا رہا۔ ''ہر جا جہانِ دیگر'' کا مطلب مجھے اب سمجھ آ رہا تھا۔ میرا دن تو ان سب روزمرہ کی مصروفیات میں گزر جاتا تھا اور میں خود کو شدید حد تک تھکانے کے لیے فقیرے کے حصّے کا کام بھی خود کرنے لگا تھا، مگر رات کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ اچانک ہی کسی پیر وہ میری آنکھوں کے دریچے کھول کر میرے دل کے آنگن میں آ کر بیٹھ جاتی، میں لاکھ خود کو چھپاتا، اپنی آنکھیں بھینچ لیتا، مگر وہ مجھ سے ہم کلام رہتی۔ مجھے اپنے شب و روز بتاتی، میری کرخت انگلیاں، کدال اور بیلچہ چلانے سے کھردرے چھالوں بھرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتی اور مجھ سے شکوہ کرتی کہ میں اسے تنہا چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں، پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور جھونپڑی سے باہر نکل کر ساری رات تارے گنتا رہتا۔

ایک ایسی ہی رات فقیرا ابھی میری آہٹ پر باہر آ گیا۔ ''کیا بات ہے اکبرے! تُو سوتا کیوں نہیں ہے، کوئی پریشانی ہے، تو مجھے بتا، جوان جہان بندہ ہے تُو، کہیں کوئی عشق وشق تو نہیں ہو گیا تجھے.....؟'' میں مُسکرا دیا۔ ''کیوں کیا وہ سارے جوراتوں کو جاگتے ہیں، ان سب کو عشق کی بیماری ہوتی ہے کیا؟'' فقیرا بھی ہنس پڑا۔ ''ہاں اپنا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جوانی کے یہ رت جگے عشق کا نتیجہ ہوتے ہیں، تُو شادی کیوں نہیں کر لیتا، کب تک یوں اکیلا دربدر خوار ہوتا رہے گا؟'' ''اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی، تو پھر.....؟'' فقیرے نے ایک لمبی سی سرد آہ بھری۔ ''او نئیں یار.....! یہ زنانیاں بڑی مطلبی ہوتی ہیں، ان سے بندہ دُور ہی رہے تو اچھا ہے، میں نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ دنیا میں جتنے مسئلے ہوتے ہیں، انہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اچھا خاصا مرد اُن کے چکر میں نہ دین کا رہتا ہے، نہ دنیا کا''۔ میں نے غور سے افسردہ فقیرے کو دیکھا۔ ''پھر تو میرا شک سولہ آنے سچ ہے کہ تم نے بھی کبھی کسی سے بھرپور عشق کیا ہے فقیرے..... ورنہ یوں غم زدہ نہ بیٹھے ہوتے''۔ فقیرے نے تازہ بیڑی سلگائی۔ ''کیوں دل پشوری کرتا ہے اکبرے، ہاں تھی ایک..... یہیں قبرستان میں ملاقات ہوئی تھی، جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، میں نے اس پر بڑا خرچہ کیا، ہر مشکل وقت میں سہارا دیا، پر جیسے ہی اسے مجھ سے بہتر بندہ ملا، دو بول نکاح کے پڑھوا کر جانے کہاں چلی گئی، پلٹ کر پوچھا بھی نہیں مجھ سے۔ بس، اُسی دن سے میرا ان عورتوں سے اعتبار اٹھ گیا، میری بات کان کھول کر سن لے اکبرے، یہ زنانیاں کسی کی نہیں ہوتیں، کبھی ان کے چکر میں نہ پڑنا''۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ واردات مجھ پر جانے کتنی مرتبہ بیت چکی ہے۔ اگلی رات دُور کسی قبر کے سرہانے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ میں ان باتوں کا بہت حد تک عادی ہو چکا تھا، مگر آواز میں اتنا درد تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں کٹیا سے باہر نکلنے لگا تو فقیرے نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''باہر نہ جا اکبرے! کوئی دکھیاری ہے، قبر پر چلّہ کاٹنے آئی ہے اولاد کے لیے''۔ میں نے حیرت سے فقیرے کو دیکھا۔ ''مگر قبر پر چلّہ کاٹنے سے بے اولادی کیسے دُور ہو سکتی ہے؟'' فقیرے نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تُو سمجھتا کیوں نہیں، یہ سارے کم زور عقیدے کے لوگ ہیں، میں نے تو یہاں عورتوں کو اولاد کی خواہش میں کسی نومولود بچے کی قبر پر نہانے کا نسخہ لے کر آتے بھی دیکھا ہے، بس جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دے۔ ہم ان کو یہاں آنے سے روک نہیں سکتے، تو یہ کسی اور قبرستان چلے جائیں گے۔ تُو چپ کر کے سو جا''۔ میں نے زمین پر سر ٹکا لیا، مگر میرا دھیان اب بھی باہر تھا۔ ''فقیرے.....! کیا تم نے کبھی کوئی اچھی بات نہیں دیکھی اس قبرستان میں؟'' ''ہاں بالکل دیکھی ہے، ایک بار کسی اللہ والے کو دفنا گئے تھے، لوگ یہاں۔ پتا نہیں، کتنے دن اس کی قبر سے تازہ گلاب کی خوشبو آتی رہی اور کبھی کبھی تو رات کے اندھیرے میں مجھے وہ قبر بہت نورانی بھی محسوس ہوتی تھی، جیسے روشنی نکل رہی ہو اندر سے، اور کبھی کبھی کسی گناہ گار کی قبر سے عذاب کی آوازیں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔ دیکھ اکبرے..... قبر میں جانے کے بعد بندے کا رابطہ ڈائریکٹ اس کے رب کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر میرے تیرے جیسے گناہ گار انسانوں کو ان معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، سو جا چپ کر کے، کل صبح فجر کے بعد ہی ایک قبر کھودنی ہے، تگڑی رقم ملے گی ان شاء اللہ''۔

اگلے روز فقیرا کہیں سے اخبار اٹھا لایا۔ ''چل بھئی اکبرے، منڈوا دیکھنے چلتے ہیں''۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''منڈوا.....؟'' ''ہاں یار! وہ کیا کہتے ہیں سنیما، یہ دیکھ بڑی زبردست پکچر لگی ہے بازار والے سنیما میں''۔ میں نے اخبار پر نظر دوڑائی تو میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔ لتی کی فلم ریلیز ہو چکی تھی اور سپر ہٹ ہو کر سلور جوبلی منانے کو آئی تھی۔ میں بہت دیر تک فلم کی خبریں پڑھتا رہا۔ اسے لتی عرف شہ پارہ کے کیریئر کی بہترین فلم قرار دیا جا رہا تھا۔ شہ پارہ کا انٹرویو بھی چھپا تھا، جس میں اس نے مُحسن کر مجھے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ پری زاد نہ ہوتا تو یہ فلم کبھی بن ہی نہ پاتی۔ اس نے میرے لیے پیغام بھی چھوڑا تھا کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں، یہ جان لوں کہ شہ پارہ کا خواب پورا ہو گیا ہے اور اس نے پری زاد کو اپنا خواب گر، اپنا سب سے بڑا محسن قرار دیا تھا۔ میں ایک دم بہت اداس ہو گیا۔ میں نے فقیرے کو اکیلے فلم دیکھنے کے لیے بھیج دیا۔ فلمیں وہ لوگ دیکھتے ہیں، جو خواب دیکھنا جانتے ہوں، وہ اپنے کسی خواب کو سنیما کے پردے پر جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں، مگر میرا تو کوئی خواب ہی نہیں بچا تھا، سب پتنے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکے تھے، میں بھلا اب اس قابل ہی کہاں تھا کہ کوئی خواب دیکھ سکتا۔ فقیرے کے جانے کے بعد میں نے سارے اخبار کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے، مگر اخبار کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے کل کی بات ہو۔ وہی بزنس اور کاروبار کی خبریں، وہی جھگڑے فساد کی باتیں، وہی شادی، بیاہ کی تقریبات، وہی دنیا فتح کر لینے کے دعوے..... کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ہم انسان کتنے بھولے ہوتے ہیں، جو یہ سوچ لیے

بیٹھے ہوتے ہیں کہ ہمارے جاتے ہی سب کچھ رُک جائے گا یا بدل جائے گا، مگر کچھ نہیں رکتا، کچھ نہیں بدلتا۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے، بس ہم نہیں ہوتے۔ گویا ہمارا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے، تو پھر اس نہ ہونے کے برابر ہونے کا اتنا زعم کیوں، اتنا گھمنڈ کس لیے.....؟ مجھے پھر اس دشمنِ جاں کا خیال ستانے لگا۔ اب تک تو اس کی بینائی واپس آچکی ہو گی، جانے وہ واپس آنے کے بعد مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں۔ میں آتے وقت دفتر اور گھر سے اپنی ہر ممکنہ تصویر جلا کر وہاں سے نکلا تھا، تاکہ جب کبھی عینی واپس آئے تو اسے میری کوئی بھی صورت دکھائی نہ دے جائے۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے تصویریں کھنچوانے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ایک بار تو ضرور میرے گھر یا دفتر آئی ہو گی اور اس کی آنکھوں نے مجھے وہاں کھوجا بھی ضرور ہو گا۔ کیسی دکھتی ہوں گی، اس کی وہ کھوجتی ہوئی آنکھیں..... اس نازنین نے میرے دفتر اور گھر کے نرم قالین پر اپنے نازک قدم رکھتے ہوئے میرے زیرِ استعمال چیزوں کو چھوا بھی ضرور ہو گا۔ پھر وہ عدنان کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر روتی رہی ہو گی، مگر عدنان نے اسے سنبھال لیا ہو گا۔ اس کی کومل جبیں کو عدنان کا شانہ ہی جچتا تھا۔ میری اس بے وقعت زندگی کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ میں کسی طور اس کی یادوں میں زندہ رہوں۔ کہ میں تمہارے ہی دم سے زندہ ہوں..... مر ہی جاؤں، جو تم فرصت ہو۔

مگر مجھ جیسے کم نصیبوں کو مرنے کی فرصت بھی کہاں میسّر تھی۔ دن، ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن فقیرا صبح سویرے کسی کام سے بازار گیا تو شام تک واپس نہ لوٹا۔ میں جھونپڑی کے باہر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک پولیس کی پرانی ولیز جیپ قبرستان میں داخل ہوئی اور میرے قریب آکر رُک گئی۔ خاکی رنگ کی جیپ سے دو سپاہی نیچے اُترے اور ان میں سے ایک نے حسبِ عادت کڑک کر مجھ سے پوچھا۔ ''اکبر تیرا ہی نام ہے؟'' میں کھڑا ہو گیا۔ ''ہاں، سب خیر تو ہے.....؟'' ''خیر نہیں ہے، تیرے ساتھی فقیرے پر ساتھ والے چھوٹے قبرستان کے گورکن سلامے اور اس کے دوستوں نے حملہ کر دیا ہے، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، جلدی چل، وہ تجھ سے ملنا چاہتا ہے''۔ میں بوکھلایا سا اُن کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں کی آپس میں بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ ان دونوں کی بہت پرانی دشمنی چل رہی تھی، قبرستان کی حد بندی پر، اور آج فقیرا، سلامے اور اس کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ہم اسپتال پہنچے تو فقیرا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''دیکھ لے اکبرے! قبرستان کے دھندے نے قبر تک پہنچا دیا، پر تُو ایسی غلطی نہ کرنا، بندہ جتنی بھی حد بندیاں کر لے، اس کی آخری حد اس کی قبر ہی ہوتی ہے''۔ فقیرا دھیرے دھیرے پھر سے غنودگی میں چلا گیا اور پھر دوبارہ کبھی ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔ سلاما اور اس کے ساتھی قتلِ عمد کے جرم میں پکڑے گئے اور سرکاری وکیل نے عدالت کے ذریعے انہیں سولی تک پہنچانے کا پورا بندوبست کر لیا۔ فقیرے کو اسی کی جاگیر، قبرستان کی چھوٹی سی قبر میں اتار دیا گیا۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا اور فقیرے کے چالیسویں کے بعد میں نے اپنی پوٹلی اٹھائی اور اسٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑ لی، پھر سے وہی سفر اور وہی انجان رستے.....! مگر میری حالت روز بہ روز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ جاڑے کا اثر تھا یا پھر مسلسل برسات کا، مگر میرا بدن تپنے لگا اور پھر شدید تیز بخار نے مجھے آگھیرا۔ مجبوراً مجھے ایک چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اترنا پڑا۔ فقیرا مجھے ملنگ کہہ کر چھیڑتا تھا، مگر اب میرا حلیہ اور میری ظاہری حالت واقعی کسی ملنگ سے بھی بدتر تھی۔ رات ڈھل رہی تھی اور اسٹیشن ویران پڑا تھا۔ مجھے شدید سردی لگ رہی تھی، لہٰذا میں نے اپنی پرانی چادر کی بکل مار کر خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ ڈور چائے کے ٹھیلے پر گرم گرم چائے بن رہی تھی۔ ٹھیلے پر بدنما سی لکھائی میں لکھا تھا ''خانو کی چائے، ہر غم بھگائے'' ٹھیلے والے نے مجھے ٹھٹھرتے دیکھا تو ایک کپ چائے لے کر میرے قریب آگیا۔ ''چائے پیو گے؟'' میں نے انکار کیا۔ ''نہیں مجھے طلب نہیں ہے''۔ ٹھیلے والے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''عجیب بھکاری ہو، بھئی میں خود اپنی مرضی سے دے رہا ہوں، تجھ سے پیسے نہیں مانگ رہا خانو!'' میں نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بھکاری.....؟ ہاں ٹھیک کہا تم نے، میں بھکاری ہی ہوں، بہت بھیک مانگی ہے میں نے ساری زندگی، پر کچھ نہیں ملا..... اب کچھ چاہیے بھی نہیں، جاؤ مجھے تنگ مت کرو''۔ خانو جانے میری ڈانٹ کو کیا سمجھا کہ اس کا لہجہ ایک دم عاجزانہ ہو گیا۔ ''معاف کرنا سائیں! تم تو کوئی اللہ لوک ہو، مجھ سے گستاخی ہو گئی''۔ میں نے اسے جھاڑ دیا۔ ''بے وقوفی کی باتیں مت کرو، میں کوئی سائیں نہیں ہوں، اکیلا چھوڑ دو مجھے!'' خانو نے جاتے جاتے بھی تین بار مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے تھک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی، جس کے تنے کے ارد گرد کچی اینٹوں اور سیمنٹ کا چبوترہ اٹھا کر ایک گول پلیٹ فارم سا بنا دیا گیا تھا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب مکمل بے سُدھ ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ میرے ارد گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھی تھی اور وہ سب آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر خانو نے سب کو ڈانٹ کر ایک طرف سمیٹا۔ ''چلو بابا.....! کیا بھیڑ لگا رکھی ہے..... جوگی بابا کو ہوش آگیا ہے، شاید لمبے مراقبے میں چلے گئے تھے''۔ میں نے چونک کر آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رنگوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

وہ سب ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے یوں سر جھکائے میرے ارد گرد دائرے میں کھڑے تھے، جیسے میں کوئی پیر، ولی یا بزرگ ہوں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوا اور نقاہت سے چکرا گیا۔ میرے ڈگمگاتے جسم کو تھامنے کے لیے کئی ہاتھ بہ یک وقت آگے بڑھے، تو میں نے سب کو جھٹک دیا۔ ''تم لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، جاؤ یہاں سے، مجھے تنہا چھوڑ دو''۔ خانو نے دوبارہ سب کو جھاڑا، جیسے وہ میرا نائب ہو۔ ''سنا نہیں بابا! جاؤ یہاں سے ابھی۔ سائیں جلال میں ہے''۔ لوگ عقیدت سے سلام کرتے وہاں سے بادل نخواستہ چھٹنے لگے۔ خانو نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ''کھانا کھاؤ گے سائیں؟'' میرا صبر جواب دے گیا۔ ''آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟'' خانو منمنایا۔ ''آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں سائیں! شاید آپ کی دعا سے خانو کے دن پھر جائیں۔ پچھلے سال باڑھ میں میرا سب کچھ بہہ گیا تھا۔ اِدھر ٹرینوں کی بدحالی نے بھی دھندا مندا کر دیا ہے سائیں''۔ میں نے جھنجلا کر اسے دھتکارا۔ ''جاہل انسان! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں، اگر میری دُعا میں اثر ہوتا، تو آج میں خود یوں دربدر خوار نہ ہوتا''۔ مگر خانو ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کب تک ہم ظاہر پرست انسان بیرونی حلیے اور لباس کی بنیاد پر لوگوں کے زُہد و تقویٰ کا فیصلہ کرتے رہیں گے؟ سر اور داڑھی کے بے تحاشا بڑھے بال، چہرے اور لباس پر وقت کی دُھول اور غم کی شکنیں، چادر پر درد کی سلوٹیں اور جھولی میں ناکامیوں کے کیکر اور کانٹے..... کیا کسی جوگی کا یہ حلیہ کافی ہوتا ہے، اُسے درویش ثابت کرنے کے لیے؟ میں نے جان چُھڑانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ ''اگر تمہاری تسلّی میری دُعا ہی سے ہوتی ہے، تو جاؤ میں نے تمہیں دعا دی''۔ خانو کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر جانے کیا کیا منّتیں مانگتا وہاں سے ٹل گیا۔ میں نے تھک کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ ان چھوٹے دیہات، قصبوں کے لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں یا پھر شاید آج کا انسان اپنے غم کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹا ہوا ہے کہ اُسے ہمیشہ کسی مسیحا کا انتظار رہتا ہے۔ کاش! اُنہیں کوئی سمجھا سکتا کہ میں مسیحا نہیں۔ اُن سے زیادہ دنیاداری کے داغوں سے اَبَر ص کا وہ مریض ہوں، جو خود ''شفائے عشق'' کی تلاش میں زمانوں سے بھٹک رہا ہے۔ بہ مشکل ایک دن ہی سکون سے گزر پایا اور اگلی صبح جب میں اپنے بخار سے تپتے جسم کو ایک بوسیدہ سے کمبل میں لپیٹے درخت کے نیچے لیٹا تھا، تب ہی اچانک وہی بے وقوف خانو دور سے ہاتھ میں نہ جانے کیا کاغذ پکڑے، لہراتا شور مچاتا میرے قدموں سے آ کر لپٹ گیا۔ ''تم واقعی اللہ لوک ہو سائیں! کمال کر دیا ایک ہی رات میں، جیو سائیں..... جیو''۔ میں نے جلدی سے اپنے پیر لپیٹ کر اسے دھکا دیا۔ ''ہٹو پیچھے، یہ کیا کر رہے ہو؟'' خانو خوشی سے چلایا۔ ''سائیں! یہ دیکھو، آپ کی دُعا سے میرا دس ہزار کا بانڈ نکل آیا ہے۔ سارے دلدّر دُور ہو گئے، پھر بھی تم کہتے ہو کہ تم میرے سائیں نہیں ہو۔ مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو''۔ کچھ ہی دیر میں آس پاس تمام ریلوے اسٹیشن کے عملے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی اور اگلے چند دنوں کے اندر میری زندگی میں نت نئے عذابوں کا ایک دَور شروع ہو گیا۔ میرے ارد گرد قریب اور دُور دراز کے سادہ لوح دیہاتیوں کا ایک ہجوم جمع رہتا، جو میرے قدموں میں دس، بیس اور پچاس کے نوٹ نذرانے کے طور پر پھینک کر نہ جانے کون کون سی منّتیں پوری کرنے کی دعائیں مانگتے رہتے۔ میں جتنا ان لوگوں کو دھتکارتا اور قدموں میں پڑی اس ریزگاری کو لات مارتا، اُتنا ہی ان کی نظر میں معتبر ٹھہرتا۔ میرے بخار اور نقاہت نے مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ میں کسی رات منہ اندھیرے چُپ چاپ وہاں سے کسی اور منزل کی جانب نکل جاؤں، لیکن میں جاتا بھی تو کہاں جاتا؟ ہر طرف اُسی انسان کا سامنا تھا مجھے۔ اور بھلا انسان سے بڑا امتحان اور کیا ہو گا اس جہانِ خراب میں۔ خانو مجھے اس بھیڑ کے ہاتھوں آزار میں مبتلا دیکھتا تو ڈانٹ ڈپٹ کر لوگوں کو

وہاں سے ہٹا دیتا، مگر دو چار گھنٹے بعد پھر وہی ہجوم، پھر وہی بھانت بھانت کے انسان اور ان کی عجیب و غریب فرمائشیں، کوئی عورت دُہائی دیتی۔ ''سائیں! میری بہو، بیٹا نہیں جنتی، چار لڑکیاں اوپر تلے سینے پر مونگ دل رہی ہیں، دعا کرو اس بار بیٹا ہو جائے''۔ کوئی دوسرا کہتا۔ ''بیٹے کو نوکری نہیں ملتی جوگی سائیں! بس، ایک نوکری دلا دو''۔ تیسری جانب سے ایک اور آواز آتی۔ ''بس ایک دُکان کا سوال ہے سائیں، کاروبار جما دو''۔ میں آنکھیں بند کیے منہ لپیٹے پڑا رہتا اور وہ میری خاموشی ہی کو میری دُعا سمجھ کر کچھ دیر رونے دھونے کے بعد اٹھ کر چلے جاتے۔ اُن میں سے کوئی نہ جانے کب لکڑی کی ایک تختی پر خلی حروف میں ''آستانہ جوگی سائیں'' لکھوا کر لے آیا اور تختی کو درخت کے ایک اونچے حصّے پر کیل سے ٹھونک گیا۔ وہ لوگ میری نقاہت اور بیماری کو میرا روزہ یا فاقہ سمجھتے تھے اور میری مردم بے زاری کو پیری فقیری کی نشانی، اُوپر سے قدرت بھی عجب طرح مہربان تھی۔ میرے ارد گرد موجود لوگوں کے جمگھٹے میں سے کسی نہ کسی کی مُراد بر آتی اور وہ اُسے میری ''کرامات'' کے کھاتے میں ڈال دیتا۔ سو میں سے باقی اُن ناہنجار ناکام، مُرادوں کو کوئی نہیں گنتا تھا، جو کبھی پوری نہیں ہو پاتی تھیں۔ کالی رات کے گھُپ اندھیرے میں ایک معمولی دیا سلائی بھی دُور سے جلتی نظر آ جاتی ہے۔ آس پاس بکھری تاریکیوں پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ وہاں سے چُپ چاپ اٹھ کر کسی روز اسٹیشن سے گزرتی کسی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں دُور نکل جاؤں۔ ایک آدھ بار نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر سڑک پر بھی نکل آیا، مگر یہ جوگی سائیں کا لقب اور حلیہ آس پاس اور دُور دراز کے علاقوں میں میری کچھ ایسی پہچان بن چکا تھا، جیسے قیدی کے پیروں میں بیڑیاں یا کسی پیدائشی غلام کے ماتھے پر کھدی کوئی سیاہ مُہر۔ میں جہاں بھی جاتا، میری پیشانی پر ثبت یہ غلام کی مُہر لوگوں کو میرے ارد گرد اکٹھا کر دیتی، میرا دم گھٹنے لگتا، میں گھبرا کر انہیں جھڑکتا، دُور ہٹاتا، وہ میرے اور قریب آتے اور تھک ہار کر میں واپس اُسی آستانے کی راہ لیتا، جہاں سے یہ مُہرِ غلامی میری جبیں پر کندہ کی گئی تھی۔ ایک آدھ بار کسی ویرانے کی راہ بھی اپنائی، مگر مجھ جیسے سیاہ بختوں کو ویرانہ بھی راس نہیں آتا۔ وہاں میری خبر زیادہ تیزی سے پھیلتی اور پھر جمع ہوتی خلقت کی وجہ سے اس ویرانے کی حُرمت بھی مجروح ہو جاتی تھی۔ میں دنیا کو دھتکارتے دھتکارتے تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، جب انسان اسے اپنانا چاہتا ہے، یہ اسے دھکے دے کر دُور بھگاتی ہے، خوار کرتی ہے، ہر پل سسکا کر تڑپاتی ہے، مگر جب وہی انسان دنیا سے بے زار ہو کر اسے لات مارتا ہے اور کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے، تب یہی دنیا خود اس کے قدموں سے لپٹ کر منّتیں، ترلے کرتی ہے کہ اسے ٹھکرا کر نہ جائے۔ اور پھر مجھ جیسوں کا سفر بھی بھلا کیا سفر تھا، میرے لیے تو سب علاقے، جگہیں، لوگ، موسم اور رویّے، سب ہی ایک جیسے تھے۔ کم از کم خانو والے ریلوے اسٹیشن پر میرے پوشیدہ رہنے کے لیے ایک بھیس تو موجود تھا، لہٰذا مختلف علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پہنچ گیا، جس کی منّی سے میرے اس نئے بہروپ کا خمیر اٹھایا گیا تھا۔ مجھے واپس وہاں پا کر سارے اسٹیشن پر

جشن سا برپا ہو گیا۔ اُداس بیٹھے خانو نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ''سائیں! کیا بتاؤں تم کو، جب سے تم روٹھ گئے ہو۔ سارا دھندا مندا ہو گیا ہے۔ سب پریشان ہیں، کہتے ہیں سائیں کی برکت اٹھ گئی ہے یہاں سے، اسی لیے کال پڑ گیا ہے، مگر اب یہ ویرانی دُور ہو جائے گی۔ بس سائیں، اب ہم سب کا بیڑہ پار ہے''۔ میں چُپ چاپ بیٹھا اس بے وقوف کی داستان سُنتا رہا۔ دوسرے روز ہی علاقے کی ایک پرانی بند ٹرین پھر سے رواں کر دی گئی، ہجوم بے قابو سا ہو گیا۔ عجب مداری بنا کر رکھ دیا تھا اس نقدیر نے بھی۔

میں سارا دن سر جُھکائے درخت تلے بیٹھا رہتا اور لوگ آتے جاتے رہتے۔ ایسی ہی ایک گرم دوپہر جب پرندے بھی آگ برساتے سورج سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانوں میں پَر سمیٹے بیٹھے تھے، پلیٹ فارم پر اچانک ہلچل سی مچ گئی۔ پتا چلا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمین دار کی تیسری نئی نویلی دُلہن اپنی خادماؤں اور خاص کارندوں کے جُھرمٹ میں تشریف لائی ہیں۔ نو کرانیوں نے نذر نیاز کی پراتیں میرے

قدموں میں رکھ دیں اور غلاموں نے ارد گرد لگی بھیڑ کو جھڑک کر پرے بھگا دیا۔ لڑکی نوجوان تھی اور اس کو سب ''چھوٹی سرکار'' کے نام سے پکار رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں سر جھکائے ہیضا رہا۔ اس کی چوڑیاں کھنکیں۔ ''میرا نام

گل ناز ہے جوگی سائیں..... رب کا دیا سب کچھ ہے، پر گود ابھی سُونی ہے۔ آپ کی ایک نظر چاہیے''۔ اس کی نرم و ملائم آواز پر میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ اسم با مسمّیٰ تھی، اپنے نام کی طرح، جس پر پھول بھی رشک کریں، وہ گل ناز تھی۔ سُنہری دمکتا رنگ، آنکھوں میں کاجل اور ناک میں سونے کا لونگ، سیاہ کڑھی ہوئی شال لپیٹے وہ خود گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ پل بھر ہی میں مجھے اس کے حسین چہرے میں سب سے پہلے ناہید، پھر لبنیٰ، لیلیٰ، صبا اور عینی کا چہرہ جھلکتا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ''نہیں، اب اور نہیں..... بس..... عورت، چلی جا یہاں سے، جا، پھر کبھی اپنی صورت نہ دکھانا مجھے''۔ گل ناز ڈر کر پیچھے ہٹی، تو خانو دُور سے بھاگتا ہوا آیا۔ ''جوگی سائیں جلال میں آ گیا ہے چھوٹی سرکار۔ بس سمجھو، آپ کی مُراد پوری ہوئی''۔ لڑکی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ ''اچھا؟ میں تو سمجھی کہ سائیں مجھ سے ناراض ہو گئے''۔ خانو نے بڑے دُھم سے جواب دیا۔ ''یہی تو بات ہے ہمارے سائیں کی۔ عورت اور پیسے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر آج تک جس کو بھی سائیں نے ڈانٹا، اس کی نیّا پار ہوئی''۔ گل ناز کچھ دیر مزید عقیدت سے ہاتھ جوڑے میرے قدموں میں بیٹھی رہی اور پھر دھیرے سے اُٹھ کر خراماں خراماں واپس چلی گئی۔ اگلے چند دنوں میں چاروں طرف یہ خبر پھیل چکی تھی کہ جوگی سائیں کو عورت اور خصوصاً خوب صُورت عورت کے وجود ہی سے شدید نفرت ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ حُسن کا یہی زہر تو ہے، جو ازل سے میری رگ رگ میں سرائیت کر کے میری زوج کو تمام عمر تھلساتا رہا ہے اور میں جل جل کر اتنی بار راکھ ہو چکا ہوں کہ اب کوئی چنگاری باقی نہیں رہی، پھر ایک دن ایک نوجوان جوڑا جھجکتے ہوئے میرے پاس آیا۔ لڑکی اور لڑکا دونوں کافی سہمے ہوئے لگتے تھے۔ لڑکے نے بند مُٹھی کھولی اور پچاس روپے کا مُڑا تڑا سا نوٹ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ ''ہمارے لیے دُعا کریں سائیں جی کہ ہماری شادی ہو جائے۔ ہم دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہمارا رشتہ ناممکن ہے''۔ میں نے ہنسوں کے اس جوڑے کی طرف دیکھا۔ ''صرف پچاس روپے میں شادی چاہتے ہو؟ اتنا سستا ہے تمہارا رشتہ.....؟'' لڑکا کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ ''میرے پاس تو اتنی اُجال بس اتنے ہی ہیں''۔ میں نے نوٹ پرے کر دیا۔ ''اتنے پیسوں میں جوگی سائیں شادی نہیں کرواتا''۔ لڑکے نے پریشان ہو کر لڑکی کی طرف دیکھا، لڑکی نے جلدی سے اپنے کانوں میں پہنی سونے کی بالیاں اتار کر میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ''لگتا ہے یہ تم سے زیادہ محبت کرتی ہے، یہ بالیاں واپس اٹھا لو لڑکی، محبت اگر سچّی ہو تو بذاتِ خود دنیا کی سب سے بڑی دُعا بن جاتی ہے۔ واپس چلے جاؤ تم دونوں اپنے گھروں کو۔ اور اس اُمید کے ساتھ جاؤ کہ تمہاری محبت ہی تمہاری دعا ہے، تمہاری منّت اور تمہارا تعویذ ہے''۔ وہ دونوں یوں خوش باش اُٹھے، جیسے آج ہی ان کا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ اُف یہ محبت کرنے والوں کی ''زُود فہمیاں..... ''محبت کرنے والے ہمیشہ ایک

دوسرے کو پانے کی دُھن میں کیوں سرگرداں رہتے ہیں۔ کاش! یہ نادان جان پاتے کہ دنیا میں کسی کا محبوب ہونا ہی کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ محبت کو تو محبوبیت سے غرض ہونی چاہیے، نہ کہ وصل یا وصال سے۔ کسی کا محبوب ہونا کتنا بڑا عہدہ و مرتبہ ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ مجھ جیسے تو اپنی تمام عمر اسی مسند پر ایک لمحہ بیٹھنے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اپنا سارا جیون جلا دیتے ہیں، مگر وہ پل بھر کے لیے بھی کسی کا محبوب نہیں بن پاتے۔ اور پھر میری طرح یہی ایک خواہش دل میں لیے ہمیشہ کے لیے خاک میں مل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

میرے خاک ہونے کے دن بھی قریب آ رہے تھے، میری حالت اب زیادہ تر ابتر رہنے لگی تھی۔ مجھے دن، تاریخ، مہینے اور سن سے اب کوئی سروکار نہیں تھا، مگر دُور کھڑے خانو کے طیلے پر بدلتے ریلوے کے ٹائمنس سے اتنا پتا چل جاتا تھا کہ مجھے گھر چھوڑے پانچ سال سے بھی کچھ زائد عرصہ ہو چکا تھا اور پھر موسم نے کروٹ بدلی اور جاڑے کی سردی اور کہرے نے ماحول پر اپنا سفید غلاف لپیٹ دیا۔ میں رات بھر گیلے لحاف تلے بارش میں بھیگتا رہا اور نتیجہ اگلے روز صاف ظاہر تھا۔ خانو کسی کام سے مجھے اٹھانے آیا تو میرا ہاتھ چھوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ''اوہو..... تمہیں تو تیز تاپ ہے سائیں۔ میں ابھی حکیم صاب کو لے کر آتا ہوں''۔ خانو اُلٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ میں نے آواز دے کر اُسے روکنے کی کوشش کی کہ اب یہ روگ حکیم، طبیب یا ویدوں کے بس سے باہر کی بات ہے، ڈاکٹر اور طبیب مرض کا علاج کر سکتے ہیں، مریض کا نہیں۔ خاص طور پر جب مریض مجھ جیسا ہو کہ جسے خود اپنے فنا ہونے کا انتظار سب سے زیادہ ہو، میں نے خود کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے، مگر یہ زندگی بھی اس دو غلی دنیا جیسی ہی تھی، جو اس سے جان چھڑانا چاہے، یہ اسی کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ خانو گھنٹہ بھر بعد ہی کسی بزرگ حکیم کی جڑی بوٹیوں سے بنی دواؤں کا بکسہ ہاتھ میں تھامے دوبارہ نمودار ہو گیا۔ حکیم صاحب نے میری نبض دیکھ کر تشویش سے سر ہلایا۔ خانو خور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے چمڑے کے بکس میں سے چند سفوف نکالے اور یک جا کر کے تین چار پُڑیاں ہی بنا دیں۔ ''یہ لو خانو میاں..... صبح، دوپہر، شام۔ دن میں تین تین مرتبہ سادے پانی میں گھول کر پلانی ہے یہ دوا۔ سردی لگ گئی ہے تیرے سائیں کو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے''۔ خانو نے کسی تجربہ کار اور مُستند تیماردار کی طرح میرے طبیب کی ساری ہدایات ازبر کر لیں۔ شاید غالب نے خانو جیسے ہم دردوں کے لیے ہی کہا تھا کہ: ''پڑیئے گر بیمار..... کوئی نہ ہو تیماردار'' مگر میرا تیماردار کسی صورت میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ جو میں ساری خلقت کو دعائیں بانٹتا پھرتا ہوں، خود اپنے لیے شفایابی کی دُعا کیوں نہیں کرتا۔ حکیم نے جاتے جاتے میرا شانہ تھپتھپایا اور مُسکرا کر بولے ''فکر نہ کریں سائیں جی، جلد ہی بھلے چنگے ہو جائیں گے''۔ میری زبان بے ساختہ پھسل پڑی۔ ''کچھ مزید بیمار کرنے کی دوا بھی کرتے ہیں کیا آپ؟'' حکیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''نہیں، مجھے صرف شفا دینے کا حکم ہے۔ سو، اپنی سی کوشش جاری رکھتا ہوں۔ مگر لگتا ہے، یہ ہنر آپ نے خوب سیکھ رکھا ہے، پر تقدیر سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں سائیں جی۔ جو جتنی سانسیں لکھوا کر لایا ہے، اُسے اُتنی جینی ہیں۔ خود کو سزا دینا مناسب نہیں''۔ خانو حیرت سے میرے اور حکیم صاحب کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ سُن رہا تھا۔ حکیم صاحب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ''دنیا کی ہر طب کا تعلق کسی نہ کسی طور انسان کے اعصاب اور اس کی شفایابی کی خواہش سے ضرور ہوتا ہے۔ جینے کی خواہش اور صحت کی آرزو، بیمار عضو کے خلیوں کے دروازے، دوا کو اندر کشید کرنے کے لیے کھول دیتی ہے، ورنہ سب دوائیں ناکام و نامراد لوٹ جاتی ہیں۔ اپنے جینے کی کوئی وجہ پیدا کیجیے صاحب''۔ حکیم صاحب پلٹ گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ حکمت کا تعلق صرف علاج اور دوا دارو کے علم سے نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر جھانک لینا ہی اصل دانش و حکمت ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا یہ حکیم بھی کچھ ایسا ہی دانا تھا، جو صرف انسان کی نبض ہی دیکھنا نہیں جانتا تھا، اُس نبض کی بولی بھی پڑھ سکتا تھا۔

خانو شدّ و مد سے حکیم صاحب کی ہدایات کے مطابق میری تیمارداری میں جُتا رہا۔ تیسرے دن ڈھول، بتاشوں کے ساتھ ایک نجوم نذر اور نیاز کی دیگیں، سبز چادریں، سنہری غلاف اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ پہنچا۔ عقدہ کھلا کہ زمیں دار صاحب کی خدا نے سن لی ہے اور ان کی مجی ناز نے انہیں خوش خبری سُنا دی ہے کہ ان شاءاللہ جلد ہی ان کے آنگن میں پھول کھلنے والا ہے۔ تھوڑی دیر میں جشن منانے والے یک دم خاموش اور مؤدب سے کھڑے ہو گئے۔ پتا چلا کہ زمیں دار صاحب خود تشریف لا رہے ہیں۔ زمیں دار پچّی عمر کا ایک سخت گیر اور جہاں دیدہ شخص دکھائی دیتا تھا۔ گل ناز بھی اُس کے ساتھ میرے قدم بوسی کے لیے آئی تھی۔ اس نے دُور ہی

سے اشارہ کر کے اپنے سر کے اشارے سے سائیں کو میری نشان دہی کرادی۔ زمیں دار مؤدب سا میرے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ''میں پہلے اس جھلی کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا سائیں جی..... بچّہ تو مرد کے نصیب سے ہوتا ہے، میں اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا رہا، پر یہ چھپ چھپ کر پیروں فقیروں کے دَر پر منّتیں مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی رہی، مگر اس کے نصیب کا چڑھاوا تو یہیں اسی قصبے کے ریلوے پلیٹ فارم پر انتظار کر رہا تھا۔ آپ بھی ہماری یہ نذر نیاز قبول کرو۔ اور ہاں، آج کے بعد آپ کا تین وقت کا کھانا میری حویلی سے آیا کرے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کرنا''۔ میں نے سر جھکائے، شرمائی سی بیٹھی گل ناز کی طرف دیکھا۔ سارا اسٹیشن دُور کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ مگر صاف نظر آ رہا تھا کہ مزید مشکلات منہ کھولے میری جانب بڑھ رہی ہیں اور میرا رہا سہا چین اور سکون بھی غارت ہونے والا ہے۔ میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید اس پلیٹ فارم پر رُکے رہنا ان کم زور عقیدہ لوگوں کو زیادہ بھٹکانے کا باعث ہو گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تنہائی بھی کسی کے لیے اتنی بڑی نعمت ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ کم نصیب اس کے لیے ترس ہی جائے۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، جتنا میں تنہا رہنا چاہتا تھا، میرے گرد ہجوم اُسی قدر بڑھتا جا رہا تھا۔ رات گئے ایک مال گاڑی اسٹیشن پر لگی، تو میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا۔ پلیٹ فارم پر لگے گھڑیال نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا اور میں دھیرے دھیرے رینگتی مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ خاٹو سمیت سارا پلیٹ فارم چین کی نیند سو رہا تھا۔ میں ایک نسبتاً خالی بوگی میں فرش پر بکھرے خشک بُھوسے پر نیم دراز ہو گیا۔

اگلی دوپہر کسی نے بوگی کا آہنی دروازہ سرکایا تو میری آنکھ کُھل گئی۔ کوئی ریلوے اہل کار تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دُرشت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو، اور یہاں خالی بوگی میں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''فقیر ہوں، ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے، اس لیے یہاں بیٹھ گیا۔ تم اپنا سامان دیکھ لو، میں نے کچھ نہیں اٹھایا''۔ ریلوے اہل کار کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا بادشاہو! پر آپ کو کہاں جانا ہے۔ یہ مال گاڑی تو اب ہفتہ بھر اسی جنکشن پر لگی رہے گی۔ کوئی خدمت ہو ہمارے لائق تو بتاؤ''۔ ''نہیں، تمہاری مہربانی۔ میں یہیں اُتر جاتا ہوں''۔ میں چپ چاپ گاڑی سے اتر کر ایک طرف ہو لیا۔ ریلوے اسٹیشن سُنسان پڑا تھا۔ شاید یہاں گاڑیوں کا گزر کم ہی ہوتا ہو گا، سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ مجھے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک بُرا تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا، لہٰذا اس بار میں نے پلیٹ فارم پر ڈیرہ جمانے کے بجائے، قصبے سے دُور جاتی ایک پگڈنڈی کی راہ لی۔ سارا راستہ کنکر اور کانٹوں سے اَٹا پڑا تھا اور دُور دُور تک سبزے کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ درخت اور جھاڑیاں خشک پڑی تھیں اور راستے بھر دُھول اُڑتی رہی۔ عجیب قحط سالی کی سی کیفیت طاری تھی۔ سارے علاقے میں، میں نے ایک خشک ہوتے جوہڑ سے پرے ڈیرہ جمانے کا فیصلہ کیا، جہاں ایک بُوڑھے درخت کی بے تحاشا پھیلی ہوئی شاخوں اور جڑوں نے ایک مسکن بنا رکھا تھا۔ شام ہونے سے پہلے میں نے آس پاس کی تھوڑی سی جگہ سے کنکر اور کانٹے ہٹا کر اپنے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین صاف کر لی، لیکن اس ذرا سی مشقت ہی نے مجھے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میں وہیں درخت سے ٹیک لگا کر سستا رہا تھا کہ دُور سے ایک بُوڑھا شخص سائیکل پر کسی بچّے کو بٹھائے خراماں خراماں پیڈل مارتا میرے قریب سے گزرا اور پھر آگے جا کر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ دوبارہ میری طرف پلٹا۔ میں نے بے زاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہی آدم زاد.....؟ بوڑھے نے میرے قریب آ کر اچھی طرح میرا جائزہ لیا۔ میں نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ بوڑھے نے مجھ سے پوچھا ''اس علاقے میں نئے آئے لگتے ہو جی..... میرا نام مہر دین ہے، اور یہ میرا پوتا ہے کمالا۔ کوئی روٹی ٹکر چاہیے ہو تو بتاؤ جی۔ میں اس علاقے کا ڈاکیا ہوں''۔ میں نے دُور کھڑی سُرخ سائیکل کے پہیے سے کھیلتے بچّے پر نظر ڈالی۔ ''نہیں میرے پاس جھولے میں کچھ چنے اور گُڑ موجود ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے''۔ بوڑھے مہر دین پر میری کرختگی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ آس پاس میلوں دُور تک پھیلی بنجر و بے آب زمین کو دیکھتے ہوئے حسرت سے بولا۔ ''صاف پانی کا بڑا کال ہے یہاں۔ انسان اور جناور، بندے اور ڈنگر سارے اسی جوہڑ سے پانی پیتے ہیں۔ برسوں سے بارش کا ایک چھینٹا بھی نہیں برسا یہاں پر۔ میں کوشش کروں گا کہ کہیں سے ایک صراحی صاف پانی لادوں تمہیں''۔ بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چل کمالے! تیری ماں راہ دیکھتی ہو گی''۔ مہر دین اپنی سائیکل کی طرف جاتے جاتے دو پل کے لیے رُکا۔ ''جوگی اور سائیں لوگوں کی دُعا میں بڑا اثر ہوتا ہے، ہمارے علاقے کے لیے بھی دو بول پڑھ دینا، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ''۔ میں خاموش رہا۔ مہر دین نے ایک لمبی سی ٹھنڈی آہ بھری اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے شکون کی سانس لی اور آنکھیں موند لیں، مگر شکون بھلا کب لکھا تھا، لکھنے والے نے میری قسمت میں۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کُھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ زور کا مینہ برسا کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ اچانک ایک جانب سے شور سا اٹھا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو مہر دین ایک ہجوم کی قیادت کرتا، میری جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

خلیل جبران نے کہا تھا ''جب کبھی میں نے صبر کی زمین میں اپنے درد کا پودا سینچا' بدلے میں اس نے مجھے خوشی کا پھل دیا'' مگر شاید میرے نصیب میں صرف درد' غم اور پریشانی کے تناور درخت ہی لکھے تھے۔ مہر دین اور اس شور مچاتے ہجوم کی صورت میں ایک نئی مصیبت میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ تیز تر اور ان سب کے نعروں کا شور ہنگامہ خیز تھا۔ پاؤں میں پرانے چپّل اور سروں پر ناکافی اور چھید بھری برائے نام چھتریاں' وہ سب میرے قریب پہنچے تو میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ کچھ لمحوں تک ہمارے درمیان صرف برستی بوندوں کی بولی مترنم کے فرائض سرانجام دیتی رہی' مگر دنیا کا سب سے مشکل کام شاید خاموش رہنا ہے۔ سو' ان سب کو بھی یہ خاموشی کھلنے لگی اور پھر مہر دین ہی نے سب سے پہلے ہمّت کی اور ہلکے سے کھنکار کر بولا ''یہ سب یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں سائیں لوکو..... میں تو کل ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اپنے اس بنجر اور خشک علاقے کی قسمت بھی کھلنے والی ہے' مگر تم نے تو ایک رات ہی میں کرشمہ کر دکھایا''۔ میں نے درشت لہجے میں ان سب کو دھتکارا۔ ''یہ بوڑھا مہر دین دیوانہ ہو گیا ہے شاید..... اور تم سب بھی نرے بدھو ہو' جو اس کی باتوں میں آ کر یہاں چلے آئے ہو.....؟ بارشیں اپنے وقت ہی پر برستی ہیں، چاہے آسمان کے بادلوں کی ہوں یا پھر نصیب کی' جاؤ جا کر پانی ذخیرہ کرنے کی کوئی تدبیر کرو' ورنہ پھر سالوں تک پانی کو ترستے رہو گے''۔ پتا نہیں' اُنہیں میری بات کتنی سمجھ آئی اور کتنی رائیگاں گئی' مگر ان میں سے کچھ بزرگ اور پکّی عمر کے چند لوگ آگے بڑھے' کسی نے چادر' کسی نے چاول' گُڑ اور چنوں سے بھرے جھولے میرے سامنے خالی کر دیے' کوئی جیب میں چند سکّے بھر کر لایا تھا، تو کسی نے دودھ سے بھری گڈوی میرے سامنے دھر دی۔ مہر دین رو پڑا۔ ''ہمارے پاس بس یہی کچھ ہے سائیں لوکو! اسے قبول کر لو اور وعدہ کرو' اب تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہمیشہ ہمارا سایہ بن کر یہیں ڈیرہ ڈالے رہو گے''۔ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان لوگوں کو مزید سمجھانا بے فائدہ تھا' اس لمحے میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس برستی بارش سے لڑ پڑوں' انسان اپنے ظاہری دشمن سے جنگ لڑ سکتا ہے' اُسے ہرا کر شکست دے سکتا ہے۔ اپنی ''فتح'' جیت سکتا ہے' مگر مقدر سے نہیں لڑ سکتا۔ سو، مقدر کے ہاتھوں زخمی ہو کر میں وہیں درخت کے نیچے بیٹھا بھیگتا رہا، پر..... کچھ بارشیں صرف بنجر دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے ہی برستی ہیں' جو دل کے سلگتے آنگن کو بھگو دے' ایسا ساون میری قسمت میں بھلا کب تھا؟ اگلے روز مہر دین میرے پاس آیا، تو میں نے سختی سے اسے منع کیا کہ اگر اس کی بستی والوں نے مجھے زیادہ تنگ کیا یا آس پاس کے علاقوں میں اس اتفاقیہ بارش کا خوامخواہ چرچا کیا، تو میں چپ چاپ یہاں سے اُٹھ کر کسی اور جانب نکل جاؤں گا۔ مہر دین نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور قسم کھائی کہ وہ ایسا ''گناہ'' کرے گا' نہ کسی اور کو کرنے دے گا۔

میرے پاس اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا؟ کسی نئی بستی یا جنگل کی جانب نکلنے سے پہلے کچھ دن یہاں بِتانا اب ناگزیر لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار یہ جو گی سائیں کا لقب اور ان بھولے بھالے لوگوں کی یہ ضعیف الاعتقادی کا بُت ہمیشہ کے لیے توڑ کر ہی آگے بڑھوں گا۔ مہر دین نے میری دھمکی شاید بہت مؤثر انداز میں بستی کے لوگوں تک پہنچا دی تھی، اسی لیے چند دن سکون رہا۔ البتہ عصر کے بعد مغرب تک کے وقفے میں اِکّا دُکّا ضرورت مند مجھ سے کچھ فاصلے پر دُور پگڈنڈی پر آ بیٹھتے اور دُور ہی سے دُعا کی التجا کر کے واپس پلٹ جاتے۔ انسان اور دُعا کا بھی کتنا پرانا، کیسا ازلی، ابدی رشتہ ہے۔ جانے کائنات میں دُعا پہلے وارد ہوئی ہو گی یا انسان؟ میں دن بھر خود کو یہاں وہاں الجھائے رکھنے کی کوشش میں کسی نہ کسی طور صبح سے شام تو کر لیتا تھا' مگر شام ڈھلتے ہی اس کی یادیں کالی رات کے سایوں کی طرح مجھے گھیر لیتیں۔ جانے وہ کیسی ہو گی۔ واپس آ کر اس نے دوبارہ اپنا ریڈیو پروگرام شروع کیا ہو گا کہ نہیں؟ اب وہ کیسی دِکھتی ہو گی؟ کچھ چہروں کا حُسن صرف ضرب کھانا جانتا ہے' کبھی تقسیم نہیں ہوتا۔ وہ بھی دگنی چوگنی دل کش اور حسین ہو چکی ہو گی۔ کاش! دنیا کے کسی جراح کے پاس تو وہ نشتر ہوتا، جو ایک ہی چرکے میں ہمارے سارے جسم سے ان یادوں کا سارا زہر نکال پھینکتا۔

اگلے روز مہر دین کے ساتھ ایک دوسرا بوڑھا بھی کھنکارتے ہوئے، عصر کے بعد میرے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ شکور دین ہے سائیں لوکو..... اپنا شکورا..... اس کی نواسی کو بڑے زور کا بخار ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دو تو دُعا کے لیے اسے یہاں لے آئیں''۔ میں نے ناگواری سے مہر دین کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ ''میں نے اسے بہت سمجھایا ہے سائیں، پر یہ جھلا میری بات سمجھتا ہی نہیں، کہتا ہے' سائیں سے روبرو دُعا کی درخواست کرو دیکھو۔ بڑا مجبور ہے بے چارہ۔ اس کی سکینہ کو جن آتے ہیں جناب۔ دُور کی دُعا سے وہ شیطان بھلا کہاں جان چھوڑیں گے اس کی''۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ میں دُعا کر دوں گا، اگر تین دن تک لڑکی کی طبیعت نہ سنبھلے، تو اسے لے آنا۔ ان دُور دراز کے علاقوں میں جوان لڑکیوں کو مختلف گھریلو اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے ہسٹریا کے یا دیگر نفسیاتی دورے پڑتے رہتے ہیں' جن کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شکورے کی نواسی بھی ایک آدھ دن میں بھلی چنگی ہو جائے گی' مگر ہمیشہ کی طرح میری یہ خوش فہمی بھی تیسرے دن ہی دور ہو گئی۔ جب شکورا سیاہ چادر میں لپٹی گم صُم سی ایک لڑکی کو لے کر میرے ٹھکانے پر آ پہنچا۔ میں خود اپنے ہی الفاظ کے جال میں پھنس چکا تھا۔

سو، بادلِ نخواستہ دکھاوے کے طور پر دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ گلابی شام کے ڈھلتے سورج کی کرن سے سکینہ کے ناک کا لونگ پل بھر کے لیے چمکا تو ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ اُف..... کس قدر ویران آنکھیں تھیں۔ کسی برباد شہر کی طرح' جس کا سب کچھ لُوٹ کر، جاتے ہوئے لٹیرے تیل چھڑک کر آگ بھی لگا گئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سکینہ کی ان جلتی آنکھوں سے۔ شکورا اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا" کچھ عرصہ پہلے تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ ہنستی بولتی تھی' ساری سکھیوں سمیت پورے گاؤں میں اودھم مچاتی پھرتی تھی۔ کوئی بھی محفوظ نہیں تھا، ان کی شیطانیوں سے، باغوں میں جھولے جھولتی تھیں' ایک گھر کی چھت سے دوسری چھت تک کد کڑے لگاتی پھرتی تھی یہ' پھر نہ جانے کیا ہوا۔ رفتہ رفتہ اسے چپ لگتی گئی' ساری ہنسی اور قہقہے کھو گئے اور یہ ایسی ہو گئی۔ اس کی نانی کہتی ہے کہ وہ اسی لیے ان کڑیوں کو شام ڈھلنے کے بعد ویران جگہوں پر جانے سے منع کرتی تھی۔ ضرور کسی ویران درخت تلے بیٹھے بیٹھے اسے کوئی جن چمٹ گیا ہے۔ بس سائیں جی' اب تمہاری دُعا ہی کا آسرا ہے' کچھ ایسا پڑھ کر پھونکو کہ میری سکینہ پھر سے پہلے جیسی ہو جائے"۔ اس تمام عرصے میں، سکینہ ہم دونوں سے لاتعلق سی بیٹھی' کچی زمین پر ایک تنکے کی مدد سے لکیریں بناتی اور مٹاتی رہی' ڈھلتی شام میں، اس کے چہرے کی پیلاہٹ نے آس پاس کے ماحول میں سرسوں سی بکھیر رکھی تھی۔ میں نے بنا کچھ کہے چپ چاپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میری دیکھا دیکھی پہلے شکورے اور پھر سکینہ نے بھی اس کی تقلید میں ہاتھ اٹھا دیئے۔ خود اپنے لیے دعا مانگتی مجھے وہ بہت معصوم لگی۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکورے سے کہا" اسے کسی اچھے حکیم یا طبیب کو دکھاؤ، ہو سکے تو شہر لے جا کر کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ، دُعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہے"۔ شکورے نے آہ بھری" آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں جی، پر یہ پگلی کسی کی سُنتی کب ہے' میں نے شہر چلنے کا کہا تو صاف انکار کر دیا اس نے، کہتی ہے، اس کا جو ہونا ہے' اِدھر ہی ہونا ہے"۔ میں نے غور سے سکینہ کی طرف دیکھا" کیوں لڑکی! کیوں تنگ کرتی ہو اپنے بزرگوں کو۔ بات کیوں نہیں مان لیتی ان کی.....؟" سکینہ میری ڈانٹ سے گھبرا سی گئی" جی.....وہ....." مجھے لگا کہ اپنے نانا کی وجہ سے وہ کھل کر بات نہیں کر پا رہی تھی' سر جھکا کر بس اتنا ہی بول پائی" ٹھیک ہے جی.....آپ کہتے ہو تو مان لوں گی"۔ شکورا خوش ہو گیا" دیکھا سائیں! میں جانتا تھا اس کا علاج تمہارے پاس ہی ملے گا"۔ شکورا سکینہ کو ساتھ لیے واپس پلٹ گیا، مگر نہ جانے کیوں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے سکینہ کی ویران خالی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اپنے آس پاس ہی بھٹکتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ سورج کی زردی شب کی سیاہی میں تبدیل ہوئی تو رات کا چاند سکینہ کے چہرے کا سورج منکھی لیے آسمان پر دوبارہ نمودار ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا وہ کرب' کیسا تھا؟

اگلی صبح مہر دین تازہ پانی کی صراحی لایا تو اس نے خود ہی شکورے کا ذکر چھیڑ دیا" کل سے ذرا سکون ہے' نیازوں کے گھر میں' کیسی ہنستی بولتی چڑیا سی تھی بے چاری سکینہ' اب تو جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے اس کے"۔ میں نے مہر دین کی طرف دیکھا۔" اچانک ایسا کیا ہو گیا اسے.....اور اس کی یہ حالت کب سے ہے؟"" تین سال ہو گئے ہیں سرکار، بہت علاج کروایا' بڑے پھیرے لگائے ہیں شکورے نے

آس پاس کی ساری بستیوں کے' کوئی مزار کوئی درگاہ نہیں چھوڑی' جہاں اس نے دُعا نہ کی ہو، علاقے کے سارے وید' حکیم اور طبیب بھی تھک کر ہمت ہار چکے ہیں۔ کسی نے شکورے کو مشورہ دیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے لڑکی کو لے کر کسی دُور دراز کی بستی چلا جائے، شاید ماحول بدلنے سے کچھ بہتری ہو' مگر یہ طریقہ بھی بے فائدہ رہا۔ آخر کار' شکورے کو واپس لوٹنا ہی پڑا۔ ابھی چند دن پہلے، جس رات تمہاری دُعا سے علاقے میں بارش برسی تھی' اس سے ایک رات پہلے ہی تو شکورا واپس لوٹا تھا اپنی سکینہ کو لے کر"۔ میں نے بے خیالی میں مہر دین سے پوچھا" کہاں لے گیا تھا شکور دین اپنی نواسی کو؟"" شکر گڑھ، وہیں ریلوے پلیٹ فارم کے قریب ہی گھر ہے اس کے داماد کا"۔ میں چونک سا گیا' یہ تو وہی علاقہ تھا' جس کے پلیٹ فارم پر خانو کا کیبن واقع تھا۔" کتنا عرصہ رہی وہاں سکینہ؟"" لگ بھگ چھ ماہ، مگر وہاں بھی اس جھلی کا من نہیں لگا۔ بس دن بھر بیٹھی آسمان کو تکتی رہتی تھی"۔ پھر کچھ سوچ کر مہر دین خود ہی اُداس ہو گیا" اور پتا ہے سائیں جی! کبھی کبھی تو بالکل جوگنوں جیسی حرکتیں کرتی ہے، اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے"۔ مہر دین کی باتیں سُن کر میرے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ میں نے مہر دین سے کہا کہ وہ شام ڈھلنے سے پہلے شکورے کو میرے پاس بھیج دے۔ سرِ شام ہی شکورا سکینہ سمیت آ گیا۔" حکم سائیں"۔" سکینہ کیسی ہے اب؟" شکور دین نے گہرا سانس لیا" پہلے سے کچھ بہتر ہے سائیں! ایک آدھ دن میں شہر کی بڑی ڈاکٹرنی کو بھی دکھانے لے جاؤں گا۔ سکینہ کے باپ کو بھیجا ہے میں نے شہر' ڈاکٹرنی کا پتا لگانے اور وقت لینے کے لیے"۔ میں نے اپنے اندر اُبھرتے ایک عجیب سے موہوم خدشے کی تصدیق چاہی۔" جب تم سکینہ کو دوسری بستی لے گئے تھے، ماحول بدلنے کے لیے' تب وہاں اس کا میل جول کن لوگوں کے ساتھ تھا؟" شکورے نے تاسف بھرے لہجے میں سکینہ کی حالتِ زار بیان کی" وہ کب کسی سے ملتی ہے سائیں جی! وہاں بھی سارا دن گم صُم بیٹھی رہتی تھی"۔ سکینہ اس وقت بھی ہم دونوں کی باتوں سے لاتعلق سے بیٹھی زمین پر تنکے کی مدد سے اپنا پسندیدہ کھیل کھیل رہی تھی۔ اتنے میں گاؤں سے ایک کچی عمر کا جوڑا آ کر ہم سے کچھ دور فاصلے پر بیٹھ گیا۔ عورت کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ مرد نے منت کی" سائیں جی! ہمارا چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ دُعا کرو کہ ٹھیک ہو جائے۔ بڑا تیز بخار ہے اسے تین دن سے"۔ میرا جی چاہا کہ میں انہیں بُری طرح دھتکار دوں۔ میں نے مرد کو جھاڑا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے یہاں کیوں آ گیا ہے؟ مرد نے بتایا کہ وہ کافی علاج کروا چکا ہے، مگر بچے کی حالت نہیں سدھر رہی۔ تنکے کی مدد سے زمین پر لکیریں کھینچتی سکینہ نے دھیرے سے خود کلامی کی" ٹھیک ہو جائے گا صبح تک رب کی مرضی سے، بس آج کی رات کی سختی ہے"۔ شکورا گاؤں سے آئے ہوئے جوڑے سے بات چیت میں مصروف تھا، اس لیے میرے علاوہ کسی نے بھی سکینہ کی یہ

سر گوشی نہیں سُنی۔ ویسے بھی اس کی آواز اتنی دھیمی تھی' جیسے وہ خود اپنے آپ سے بڑبڑا رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ عورت اور مرد دعا لیے بنا وہاں سے نہیں ٹلیں گے' لہٰذا حسبِ معمول میں نے اپنے سدا کے خالی ہاتھوں کا کشکول ہوا میں بلند کر لیا۔ اس جوڑے کے جانے کے بعد شکورا اور سکینہ بھی اٹھ کر چلے گئے۔ شکورے نے جاتے جاتے بتایا کہ اگر شہر میں بات بن گئی تو وہ سکینہ کو کل ہی شہر لے جائے گا۔ میرے اندر کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی، جیسے کوئی بہت بڑا سربستہ راز اپنے قفل کھولنے کو بے تاب ہو' مگر میں اپنی کم علمی اور جہالت کی وجہ سے اس کی کنجی کہیں کھو بیٹھا ہوں۔

اگلی صبح سورج کچھ زیادہ ہی ناراض سا نمودار ہوا اور اپنا غصہ، جھلستی کرنوں کی صورت، بن سایہ جان داروں پر برسانے لگا۔ دوپہر سے پہلے ہی گزشتہ روز والا مرد بھاگتا ہوا آیا اور میرے قدموں میں گر گیا "میرے کاکے کا بخار اتر گیا ہے سائیں جی، کل رات تو ہم سمجھے تھے کہ بس جان لے کر ہی چھوڑے گا یہ بخار اس کی۔ بڑا تڑپا ہے ساری رات بستر پر' جیسے کوئی مچھلی بن پانی کے تڑپتی ہے۔ سچ بتاؤں سائیں، میں تو امید چھوڑ بیٹھا تھا' مگر پھر تمہاری دعا نے فجر کے بعد ایسا اثر دکھایا کہ سورج نکلنے تک میرا کاکا بھلا چنگا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب تمہاری کرامت ہے سائیں۔ سارے تمہاری دُعا کے کرشمے اور برکتیں ہیں۔ قربان جاؤں میں اپنے سوہنڑے رب کے، اُس نے تمہیں ہم غریبوں کی مدد کے لیے بھیجا ہے' اس بستی میں"۔ وجوش میں نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، مگر میرے تو سارے الفاظ ہی جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کل ہی میرے سامنے سکینہ نے یہ سرگوشی کی تھی کہ شکورے کا بچہ رات بھر کی سختی کے بعد صبح شفایاب ہو جائے گا اور اس کی کہی ہوئی بات ہُو بہُو ٹھیک ہوئی تھی، یہ سب کیا ماجرا تھا؟ اور پھر میرے ذہن میں یکے بعد دیگرے جھماکے ہوتے گئے' سکینہ بھی اُسی دن واپس اپنی بستی پہنچی تھی' جس دن میں نے یہاں ڈیرہ ڈالا تھا اور پھر اُسی رات اس علاقے میں برسوں بعد بارش برسی تھی۔ دوسرا جھماکا ہوا' اور مجھے مہر دین کی بات یاد آئی کہ سکینہ کا نانا سکینہ کو ماحول کی تبدیلی کے لیے اسی قصبے میں لے گیا تھا، جہاں ریلوے پلیٹ فارم پر میرا ٹھکانہ تھا۔ میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جہاں جہاں قدرت نے میری دعا کی لاج رکھی تھی، وہاں آس پاس سکینہ کی موجودگی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت سکینہ کے گھر چلا جاؤں' مگر لوگ میری اس حرکت کا نہ جانے کیا مطلب لیتے، میں دو چار قدم بڑھ کر واپس پلٹ آیا۔ اتنے میں دور پگڈنڈی پر سورج کی قہر برساتی دھوپ کی گرمی سے تپتی زمین سے اٹھتی سراب کی لہروں میں مجھے شکورے کا بیولا دھیرے دھیرے لاٹھی ٹیکتا، شہر کی جانب جاتی بڑی سڑک کی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے سر جھکائے گٹھری سی بنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ضرور وہ سکینہ ہی ہو گی۔ ایسے موقعوں پر انسان کے دل اور زبان سے ہمیشہ کچھ اس قسم کے غیر تشکرانہ فقرے ادا ہوتے ہیں کہ "کاش! میں اس وقت کچھ اور مانگ لیتا، تو خدا وہ بھی ضرور دے دیتا" مگر ہم انسان بھی کتنے بھولے ہیں۔ بھلا اس لمحے کسی کو کچھ اور مانگنے کا خیال ہی کب آتا ہے۔ ہمیں ٹھیک قبولیت کے لمحے قدرت جو عطا کرتی ہے، ہم اسی پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے شکورا اور سکینہ ہی اپنی ہر چاہت، ہر دُعا کا بدل نظر آ رہے تھے۔ شکورا میرے قریب پہنچا تو گرمی کی وجہ سے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ "شہر کی بڑی ڈاکٹرنی سے بات ہو گئی ہے سائیں جی..... اس نیاڑی کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ اس کے باپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارا حکم نہ ہوتا تو کبھی نہ جاتا۔ دُعا کرنا ہمارے لیے۔ اگر بس وقت پر مل گئی تو رات تک واپسی ہو گی' ورنہ کل تیری خدمت میں حاضری دوں گا"۔

سکینہ حسبِ معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں نے شکورے کو دو لمحے درخت کے نیچے ستانے کا اشارہ کیا۔ سکینہ نے خود کو سمیٹا اور اپنے کم زور اور مضمحل سے وجود کو شکورے کے پیچھے چھپا لیا۔ شکورے نے سوالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی" کچھ دیر ستا لو، شاید شہر جانے کی ضرورت نہ رہے اب، تم شکر گڑھ کے اسٹیشن پر کھوکھا لگانے والے خانو کو جانتے ہو؟" شکورے نے حیرت سے میری طرف دیکھا" ہاں جی..... وہ میرے داماد کا ہمسایہ ہے۔ وہیں ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی تو کوارٹر ہے میری بیاہتا بیٹی کا"۔ "اور اس علاقے کا چوہدری.....؟ کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہے تمہاری یا سکینہ کی؟" "نہیں جی' براہِ راست تو ملاقات نہیں ہوئی، ہاں ایک آدھ بار میں جب سکینہ کو لے کر ریاست پور کی بڑی درگاہ پر دُعا کے لیے گیا تھا' تب وہاں چوہدری صاحب بھی اپنی گھر والی کے ساتھ دُعا کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہیں دُعا کرتے دیکھا تھا انہیں"۔ اب میرے پاس مزید شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ میں نے شکورے کو ایک جانب ہٹنے کا اشارہ کیا اور براہِ راست سکینہ کی طرف دیکھا، وہ میری نظروں کی کاٹ سے گھبرا کر مزید سمٹ گئی' میری آواز خود میرے لیے اجنبی تھی" کون ہو تم.....؟"

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈراما رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آراء سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین''، روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

میرا سوال سُن کر سکینہ سے زیادہ شکورے کے چہرے پر حیرت اور تعجب کی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سکینہ نے گھبرا کر اپنے نانا کی طرف دیکھا' جیسے اس سے اپنی شناخت کی تصدیق چاہتی ہو۔ شکورے نے گڑبڑا کر کچھ کہنے کی کوشش کی ''سائیں یہ میری نواسی.....'' میں نے ہاتھ اٹھا کر شکورے کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ''سکینہ کو جواب دینے دو'' سکینہ مزید بوکھلا گئی ''وہ جی..... میں..... میں تو بس سکینہ ہوں''۔ ''نہیں' تم وہ نہیں جو' نظر آتی ہو۔ ساری دنیا کو دعائیں دیتی پھرتی ہو۔ ان کے لیے رب سے مانگتی ہو' پھر خود کو اس جوگن کے بھیس میں کیوں دُھال رکھا ہے؟ کیوں فقیرنی بنی پھرتی ہو؟ کیوں خود کو اور اپنے گھر والوں کو اس عذاب میں ڈال رکھا ہے؟ بولو، بولتی کیوں نہیں.....؟'' شکورا میرے غصّے بھرے لہجے کو میرا جلال سمجھ کر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکینہ بالکل روہانسی ہو گئی اور اس نے خود کو شکورے کی اوٹ میں چھپالیا' پھر مجھے احساس ہوا کہ شاید غصّے میں میرا لہجہ کچھ زیادہ ہی تلخ اور بلند ہو گیا تھا۔ یہ لڑکیاں جانے کس ریشم کی بنی ہوتی ہیں، لہجوں کی تیز دھار سے بھی کٹ کٹ جاتی ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شکورے سے کہا کہ فی الحال وہ واپس اپنے گھر چلا جائے، جب ضرورت ہوئی تو میں خود اسے بلالوں گا۔ شکورے کا دل وہاں سے اٹھ کر جانے کو نہیں تھا' مگر میرے لہجے کی سختی نے اسے بادلِ نخواستہ اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سکینہ بھی چپ چاپ اس کے پیچھے چل دی۔ اس کی گھبراہٹ اور آنکھوں میں اُٹھتے سوالوں سے ایک بات تو مجھ پر واضح ہو گئی تھی کہ خود اسے بھی اپنی ان دعاؤں کی قبولیت کی کرامت کا کوئی علم نہیں۔ ساری بات مجھ پر دھیرے دھیرے کھلنے لگی تھی' جانے یہ اتفاق تھا یا میری تقدیر کا ایک اور مذاق' مگر سچ یہی تھا کہ خانو والے پلیٹ فارم سے جہاں میرے ماتھے پر جوگی سائیں کی مُہر لگی تھی، ہر اس جگہ کے آس پاس سکینہ موجود رہی تھی' جہاں لوگ میری دُعا کی قبولیت کے لیے بھٹکتے رہے تھے اور آج تک ان سب جگہوں پر خانو سمیت جس ضرورت مند کی دُعا بھی قبول ہوئی' دراصل وہ سکینہ کی دُعا کی بدولت ہی ممکن ہو سکا تھا۔ قدرت یہ سب میرے کھاتے میں ڈالتی رہی اور سیدھے سادے لوگ میرے مرید بنتے چلے گئے۔ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلا کہ ان کی یہ دُعائیں ایک نڈھال اور لاغر سی لڑکی کی سفارش کے بدلے قبولیت کا رنگ لاتی ہیں۔ اگلے ایک دو روز میں، میں نے باتوں باتوں میں شکورے سے ان سب باتوں کی تصدیق بھی کر لی۔ خانو کی بیوی اپنے ہمسایوں کے سامنے ہر لمحہ خانو کی غریبی اور اپنی معاشی مشکلات کا رونا روتی رہتی تھی اور خانو کا بانڈ کھلنے سے پہلے بھی وہ کئی بار سکینہ کے سامنے اس خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر خانو کا بانڈ کھل جائے، تو ان کے دن پھر جائیں گے' ٹھیک اسی طرح سارے گاؤں کو پتا تھا کہ چوہدرانی کو اولاد کی خواہش ہے' جیسے اس علاقے کے لوگ بارش کی تمنا میں نڈھال تھے، مگر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوا' کتنا پریشان کیا تھا مجھے اس جوگی سائیں کے لقب نے' لوگوں کو سکینہ کی اصلیت کا پتا کیوں نہیں چلا؟ لوگ تو در کنار' خود سکینہ بھی اپنے آپ سے ناواقف نظر آتی تھی' ہمارے معاشرے میں لوگ ہمیشہ سائیوں' بابوں اور جوگیوں ہی کو اپنا آخری مسیحا کیوں سمجھتے ہیں' کوئی سائنٹسٹ، جوگن یا بابی بی ان کی نظر میں دُکھوں کی مسیحا کیوں ثابت نہیں ہوتی؟ سچ کہتے ہیں یہ دنیا مردوں نے اپنی جاگیر سمجھ رکھی ہے۔ کوئی رتبہ' کوئی عہدہ' کوئی نشست بھی تو خالی نہیں چھوڑی، اس نے حوا کی بیٹی کے لیے، مگر ایک سوال خود میرے اندر بھی کسی سنپولیے کی طرح کلبلا رہا تھا۔ سکینہ کو یہ اعزاز کب اور کیسے حاصل ہوا۔ کون سی ریاضت ایسی تھی، جو اسے اس مقام پر لے آئی تھی۔

اگلی شام علاقے سے خانہ بدوشوں کی ایک ٹولی کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرے ڈیرے سے کچھ پرے اپنے خیمے گاڑ لیے اور شب بسری کے لیے آگ کا الاؤ روشن کر لیا۔ ان کے دو بڑے میرے پاس اجازت لینے آئے کہ اگر مجھے ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ان کا معمول رات دیر گئے تک صوفیانہ کلام اور کافیاں گانے کا ہے، میں اب انہیں کیا بتاتا کہ کبھی میرے گھر اور گاڑی میں ہر لمحہ یہ کلام بجا کرتا تھا۔ موسیقی کا ہماری زندگی سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ ہم کبھی اسے مذہب کی وجہ سے رد کرتے ہیں اور کبھی دل کی خاطر اپنا لیتے ہیں۔ حرام اور حلال کی تقسیم میں دنیا کے بڑے بڑے گویّے اس لت سے جان چُھڑانے کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے دوبارہ جڑ جاتے ہیں۔ کچھ خود کو نعتیہ اور حمدیہ کلام تک محدود کر لیتے ہیں' کچھ صرف صوفیانہ کلام کی لَے پکڑ لیتے ہیں' گویا جھگڑا سُر سے نہیں سنگیت سے ہے' لَے کا نہیں، صرف تال کا ہے۔ میں جب دبئی میں تھا، تو میں نے بہت خوب صورت اور سُریلی اذان سُنی تھی۔ یہی حال میرا اسپین کی مسجد کے ایک مؤذن کی خوش الحانی سُن کر بھی ہوا تھا۔ ایسی آواز کہ قدم جکڑ کر رکھ دے۔ انسان خود بہ خود دعوت دینے والے کی جانب بڑھ جائے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت دبئی کے ایک رمضان کی تراویح میں سورۂ رحمان کی تلاوت سُن کر ہوئی تھی میری، شاید کچھ خوش الحانیوں کا تعلق ہماری روح کے کچھ دھاگوں' خمیر کے کچھ ریشوں سے بھی جڑا ہوتا ہے' خانہ بدوش قبیلے کا وہ خوش الحان بھی بہت سُریلا تھا۔ بابا بلھے شاہ کا کلام گڈوی کی تھاپ پر رات کی خاموشی میں سُر بکھیر رہا تھا۔

جا دَس دے دلبر ماہی نوں
میکوں یار بھلایا جاندا نئیں
سر رکھ کے یار دے قدماں وچ
سُر فیر الٹھایا جاندا نئیں
میرا دل اِک اے' میری جان اِک اے
میرا دین اِک' میرا ایمان اِک اے
جدوں رب رسولؐ قرآن اِک اے
دوجا یار بنایا جاندا نئیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گھائل روح ہمیشہ جانتی ہے کہ اس کے رستے زخموں کا مرہم کیا ہے' مسئلہ صرف دماغ کو منانے کا ہے

کہ دل اور دماغ کی یہ ازلی جنگ ہم مجبور' کمزور اور بے بس انسانوں کو سدا دو حصوں میں تقسیم رکھتی ہے' ہم دین کے ہو پاتے ہیں نہ دنیا کے' مجھ جیسے پری زاد بن جاتے ہیں، میں ایک بنجارہ، جس کے لیے نہ کبھی زمین مہرباں رہی نہ آسمان۔ جانے کیا سوچ کر میری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے' تب ہی میرے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری "آپ رو رہے ہو سائیں جی.....؟؟" میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں' سکینہ جانے کب سے میرے قریب کچھ قدم کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔ میں نے حیرت سے آس پاس نظر ڈالی' بستی کے بہت سے گھرانے خانہ بدوشوں کے جگ راتے میں شریک ہونے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کچھ فاصلے پر مہرو بن' اور شکورا بھی بیٹھے سر دھنتے نظر آئے۔ "ہاں..... کچھ یاد کر کے آنکھ بھر آئی۔ تمہاری آنکھیں بھی تو ہر لحہ چھلکنے کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کیا غم ہے تمہیں؟ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے بتا سکتی ہو"۔ سکینہ سر جھکائے بیٹھی رہی' شکورے نے اُٹھ کر میری طرف آنے کی کوشش کی، تو مہرو بن نے اسے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا اور جانے اس کے کان میں کیا کہا۔ شاید مہرو بن بھی سمجھ گیا تھا کہ سکینہ کبھی اپنے نانا کے سامنے کھل کر زبان نہیں کھولے گی۔ سکینہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا" کچھ نہیں ہوا ہے مجھے سائیں جی۔ میرے گھر والے تو بس ایسے ہی ہلکان ہو رہے ہیں۔ خود ہی ذرا کھل کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مجھے بھلا کیا ہونا ہے.....؟" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا" پھر ایک دم دنیا کیوں تیاگ دی تم نے' جوگن کیوں بن گئی ہو.....؟" سکینہ نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں" جوگ تو آپ نے بھی لے رکھا ہے سائیں جی..... آپ نے بھی کوئی روگ لگا رکھا ہے کیا.....؟" میں نے چونک کر سکینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک سوال ہی میں، میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ میں بھی کتنا کم فہم اور نادان تھا۔ اتنے سامنے کی بات سمجھنے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی تھی' دنیا کے ہر جوگ کے پیچھے یہی ایک محبت کا روگ ہی تو چھپا ہوتا ہے' یہی عشق کارفرما رہتا ہے' ہر عذاب کے در پردہ' اسی پیار کے نشتر کی کاٹ کا داغ ملتا ہے، ہر زخم کے پس منظر میں۔ محبت ہمیں سائیں بنا دیتی ہے' جوگی کے روپ میں ڈھال دیتی ہے' فقیر کے بہروپ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ سکینہ کی کہانی بھی اسی محبت کے مارے بدنصیبوں میں سے ایک کی داستان تھی۔ تین سال پہلے جب وہ مکمل زندہ لڑکی تھی' جس کا دل بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی جھولا ڈالنے کے لیے مچلنے لگتا تھا' ہوا کی سرگوشیاں جس کے دل کو گدگداتی تھیں' لمحہ بھر کے لیے ٹھہرے بادل کا سایہ، جسے دن بھر کے لیے خوش کر دیتا تھا۔ تب ایسی ہی ایک کالی رات، جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ برق بھری نوکریوں میں باغ سے آم چرا کر جمع کر رہی تھی، تب ہی اُسے علاقے کے ایک گبھرو، سانول نے دیکھ لیا۔ سانول علاقے کے نمبردار کا پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا بیٹا تھا، جو شہر کی یونی ورسٹی سے ایم اے لسانیات کی ڈگری لے کر آیا تھا اور اس ایک پہلی نظر نے ہی ان دونوں کا کام تمام کر کے رکھ دیا تھا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے، چاند ستاروں پر کمند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی' کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چکے ہیں۔ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں۔ ہر کسی کو ہر لمحہ، ہر رابطہ میسر ہے۔ مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے۔ محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے دنوں کا قصہ کہتے ہیں۔ ہیر رانجھا' سسی پنوں' سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد' الف لیلیٰ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے۔ انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہے' مگر یہ پہلی نظر..... یہ آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چھپائے بیٹھی ہے۔ کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا۔ کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا' نظر کے زہر کا آج تک۔ ہر خرابی کی جڑ میں ایک پہلی نظر ہی تو ہے۔ نئے زمانے کے نئے لوگ لاکھ انکار کریں' لاکھ مذاق اڑائیں' مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے، یہی معاملہ سکینہ اور سانول کے ساتھ بھی ہوا۔ دونوں ایک بار ملے اور پھر ملتے ہی گئے۔ مگر ظالم زمانے کو بھلا یہ ملاپ کب بھاتا ہے' سماج سدا سے محبت کرنے والوں کا دشمن رہا ہے۔ سو' یہاں بھی وہی ہوا۔ علاقے کے کسی بندے نے سکینہ کو سانول سے ملتے ہوئے دیکھ لیا' بات پھیل گئی۔ سانول باقاعدہ رشتہ لے کر اپنے گھر والوں سمیت سکینہ کے گھر جانا چاہتا تھا، مگر اس کے نمبردار باپ کی انا ایک مزارع کے گھر رشتہ لے جانے کے آڑے آ گئی' ویسے بھی علاقے کا پٹواری اپنی بیٹی رضیہ کو سانول کے سنگ رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور نمبردار بھی پٹواری کے گھر رشتہ کرنے کا خواہاں تھا۔ رجو شکل و صورت میں بھی چندے آفتاب، چندے ماہتاب تھی' اور اس کے خوابوں میں بھی نہ جانے کب سے سانول بس رہا تھا۔ وہ تو اس کی یونی ورسٹی کی چھٹیوں کی دعائیں مانگتی پھرتی تھی، تاکہ اس کے دل نگر کا شہزادہ واپس گھر لوٹ سکے' مگر جب اسے پتا چلا کہ سانول اور سکینہ کی کہانیاں ریاست پور کے گلی کوچوں میں پھیل رہی ہیں' تو اس کے سینے پر یہ ایک وقت کئی سانپ لوٹ گئے' جانے یہ محبت کی کہانیاں اتنی جلدی سارے زمانے میں کیوں اور کیسے پھیل جاتی ہیں؟ ورنہ ہر دوسری آفت آ کے گزر بھی جائے' ہم اس کی تباہی سے آخری وقت تک بے خبر رہتے ہیں۔ رضیہ جسے لاڈ سے سارے گھر والے رجو کہتے تھے' اس لیے بھی بے چین تھی کہ اسے یقین تھا کہ بستی بھر میں صرف وہی ایک سانول کے جوڑ کی ہے' اس کے حسن کے چاند کے سامنے بھلا کسی اور کے روپ کا چراغ کیا جلے گا' مگر اس نے جو سوچا تھا' سب اس کے الٹ ہو رہا تھا۔ یہ معمولی سے کمی کمین گھرانے کی سکینہ کہاں اس کے سپنوں کی تجوری پر ڈاکا ڈالنے آ گئی تھی۔ رجو کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی طرح سکینہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اسے عمر بھر کے لیے داغ دار کر دے۔ جانے علاقے کے سب سے وجیہہ نوجوان کو اس کے اندر کیا نظر آتا تھا؟ یہ رقیب بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں' جانے دنیا میں محبت پہلے اتری تھی یا رقابت؟ رقیب ہر لمحہ اپنے حریف کی سانسیں بند کر دینے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ رجو کا بھی یہی حال تھا، اور پھر آخر کار اس کے دل کی مراد بر آئی۔ سانول کی ماں نے اس کے سامنے اپنا دوپٹا ڈال دیا اور بہنوں نے اپنی چادریں پھیلا دیں کہ ان کی محبت اور مان کی خاطر وہ رجو سے بیاہ کے لیے ہاں کر دے۔ دنیا میں چور اور ڈاکو دوسروں کے گھروں میں بڑے بڑے ڈاکے ڈالتے ہیں' مگر اس جہاں کا سب سے بڑا ڈاکا، یہ رشتوں کا ڈاکا ہوتا ہے۔ جو ہمارے ماں باپ' بہن بھائی اپنی محبتوں اور خدمتوں کی دہائی دے کر کسی اپنے ہی چہیتے کی محبت لوٹ کر مارتے ہیں۔ سانول بھی باپ کی ضد' ماں کے آنسوؤں اور بہنوں کی آہوں کے سامنے آخر کار مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی ہی محبت کا خرمن جلا ڈالا' کہتے ہیں ریاست پور کی بڑی بارا توں میں سے ایک بارات تھی نمبردار کے بیٹے کی۔ سانول کی بنج کہا چڑھی' سکینہ کے دل کا دریا ہمیشہ کے لیے اُتر گیا۔

شادی سے ایک رات پہلے سانول آخری بار سکینہ سے ملنے آیا۔ اس نے سکینہ کو اپنے دل کی حالت بتائی اور مجبوریوں کی ساری داستان بیان کی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کی محبت کا اتنا مقروض ہے کہ جس کے سود کے طور پر ان دونوں کو اپنی محبت عمر بھر کے لیے گروی رکھنی پڑے گی۔ سکینہ چپ رہی۔ محبت میں عورت اپنی مجبوری بیان کرے تو اس

پر دنیا بڑے سخت الزامات لگاتی ہے۔ بے وفائی کے طعنے اور سنگ دلی کے طنز کیے جاتے ہیں۔ تیروں سے عورت کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا ہے' مگر مرد جب محبت میں اپنی مجبوری بیان کرتا ہے، تو اسے اپنے رشتوں کا وفادار' زمانہ شناس اور مخلص کہا جاتا ہے۔ اس کی قربانیوں کے گن گائے جاتے ہیں اور زمانہ اسے اپنی پلکوں پر بٹھاتا ہے۔ سانول بھی رجو کی پلکوں کی ڈولی چڑھ گیا' سارا گاؤں ان دونوں کی خوب صورت اور سجیلی جوڑی دیکھنے کے لیے اُمڈ آیا تھا۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں کو بس قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ہی تراشا تھا۔ دلوں کے حال تو خدا بہتر جانتا ہے' مگر کہنے والے کہتے تھے کہ سانول اور رجو کی نظر ایک دوسرے سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھی۔ رجو نے جب شادی کی رات سانول کے گھر میں پہلا قدم رکھا' تب ہی سے سانول کی ماں' بہنیں رجو پر صدقے واری جا رہی تھیں۔ نصف شب تک رسمیں چلتی رہیں اور ماں بہنوں نے اپنے ویر شہزادے کی بارات کا ہر ارمان جی بھر کے پورا کیا۔ سارا محلہ سانول کے گھر کی طرف سے آنے والی شہنائیوں کی آواز اور ڈھول تاشوں کی دھمک سے رات بھر گونجتا رہا۔ ان کے قہقہوں کی آواز سکینہ کے گھر کے آنگن تک بھی آ رہی تھی۔ سکینہ کا دل کبھی نہ پھٹا' گران ہنسی کی آوازوں میں خود اس کے اپنے محبوب کی آواز شامل نہ ہوتی۔ اس درد کا احساس صرف وہ کر سکتا ہے' جس نے زندگی میں کبھی خود محبت کی ہو۔ جگر کیسے چھلنی ہوتا ہے اور سینے سے جلتے دل کا دھواں کیسے نکلتا ہے' جب اپنا ہی سانول کسی اور سانوری کے ساتھ شب عروسی منا رہا ہو۔ سکینہ کے اندر بھی کچھ ایسا شور مچا کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اور پھر اسے ایسی چپ لگی کہ لوگ اس کی آواز سننے کو بھی ترس گئے۔ جسم کے اندر بہتا خون سوکھتا چلا گیا۔ ہونٹوں سے مسکان کا رشتہ کچھ ایسے ٹوٹا کہ وہ سدا کے لیے مسکرانا ہی بھول گئی۔ محبت جب انسان کی شریانوں اور بہتی نسوں میں خون کے ساتھ دوڑتی ہو، تب وہی محبت روٹھ جانے پر، لہو کی روانی روک بھی دیتی ہے۔ خون صرف بہہ کر ہی خشک نہیں ہوتا' کبھی کبھی نسوں کے اندر بھی اپنا بہاؤ کھو بیٹھتا ہے۔ محبت کا مریض دن بہ دن لاغر اور کم زور ہوتا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے طبیب اس کے مرض کی شناخت ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں' مگر مرض کا سرا نہیں ملتا' مریض سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر پرست حکیم اور وید اس کھوج میں گھلتے رہتے ہیں کہ آخر بنا کوئی چوٹ لگے، بنا کسی بیماری کے، اس مریض کا وزن دن بہ دن کم کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ گالوں کی سرخی پیلاہٹ میں کیوں بدل رہی ہے، جسم کی شادابی خشک ہوتے پتے کی طرح رخصت کیوں ہو رہی ہے۔ سکینہ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا اور پھر تین چار ماہ کے اندر اندر وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گئی۔ اس کا محبوب اپنی نئی دنیا میں مگن تھا، ایک آدھ بار قصبے کے بازار یا کسی درگاہ، مزار پر سکینہ کا سامنا ہوا بھی، تو وہ نظریں چرا گیا، یا شاید وہ سکینہ کو پہچان ہی نہ پایا ہو۔ یہ تو وہ سکینہ تھی ہی نہیں' جو کبھی اس کے دل کی رانی تھی۔ سکینہ بس سانول کو دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی کتنا بانکا اور سجیلا تھا اس کا محبوب، مگر رجو کو کسی نوکرانی کی زبانی اس ٹکراؤ کی خبر ملی، تو وہ برداشت نہ کر پائی۔ اسے یوں محسوس ہوا، جیسے سانول اب بھی چھپ چھپ کر سکینہ سے ملتا ہے۔ رقیب ہمیشہ رقیب ہی رہتا ہے۔ محبوب کا درجہ پانے کے بعد بھی اس کے اندر پلتے سدا کے شکوک و شبہات کبھی اسے اس اعزاز کا حق دار نہیں بننے دیتے۔ رقیب نے چوں کہ خود کسی کی محبت پر ڈاکا مارا ہوتا ہے' اس لیے وہ ساری زندگی خود ایسی کسی چوری سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی نیندیں اپنے خزانے کی حفاظت کی فکر میں اڑی رہتی ہیں۔ جلن اور حسد کے سانپ اسے ہمیشہ ڈستے رہتے ہیں۔ رجو بھی کسی ایسی ہی تپش کا شکار تھی۔ وہ یہ بات نہیں بھولی تھی کہ کبھی سانول سکینہ پر مرتا تھا۔ دونوں کی محبت کے ہر موچر چے تھے۔ کون جانے کب سانول کے دل میں پھر سے پرانی محبوبہ کی محبت جاگ اٹھے۔ رجو سوچ سوچ کر ہلکان ہو گئی، تو پھر آخر کار اسے وہ خوف ناک فیصلہ کرنا ہی پڑا' جو صرف ایک رقیب ہی کر سکتا ہے۔ فنا کر دینے کا فیصلہ' جو محبت کرتے ہیں وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں اور جو رقیب ہوتے ہیں' وہ دوسروں کو مار کر اپنی محبت کی بقا ڈھونڈتے ہیں۔ رجو نے علاقے کی نیاز کی رسم کے مطابق منوں دودھ خرید کر ساری بستی میں تقسیم کروایا۔ البتہ اس بانٹ میں بس ایک فرق تھا۔ سکینہ کے گھر جو دودھ کی مٹکی بھیجی گئی تھی، اس کے اندر علاقے کے سب سے زہریلے سانپ کا زہر حاصل کر کے چند بوندیں اس دودھ میں ملا دی گئی تھیں۔ سکینہ کی ماں نے پیتل کی مٹکی سے دودھ نکال کر کٹوری سکینہ کے سامنے رکھ دی۔

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈرامہ رائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''پچیس کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغہ حُسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حسّاس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے اَن گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہر گز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:

sundaymagazine@janggroup.com.pk

ماں چاہتی تھی، اس کی مریض لاڈلی کے بے رونق چہرے پر کچھ رنگ آجائے، شاید اس تازہ اور میٹھے دودھ کی تاثیر ہی سے کچھ پل کے لیے اس کی نڈھال سی دُلاری توانائی محسوس کرے۔ سکینہ نے دودھ کی کٹوری اٹھا کر منہ سے لگائی ہی تھی کہ باہر سے اس کے بوڑھے باپ کے کھانسنے کی آواز سنائی دی، مگر دوسری آواز سُن کر تو جیسے اس کی پوری کی پوری روح ہی جھنجھنا گئی۔ یہ تو سانول کی آواز تھی۔ ہاں..... اسی سانول کی جس کی محبت نے اس کی روح کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ سکینہ کے ہاتھ میں کٹوری کچھ ایسے لرزی کہ سارا دودھ کپڑوں پر چھلک گیا۔ سکینہ نے کٹوری نیچے رکھ دی اور خود پردے کی اوٹ سے باہر ہونے والی بات چیت سُننے لگی۔ پتا چلا کہ سانول کسی کام سے سکینہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ سکینہ کے باپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ پرانی باتوں اور یادوں کا سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ گِلے شکوے زبان تک آگئے۔ سانول نے سکینہ کے باپ کو یقین دلایا کہ وہ آج بھی خود کو ان کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتا ہے، مگر سکینہ کا باپ بضد ہو گیا کہ اب ملاقات ہو ہی گئی ہے، تو دو گھڑی اس کے گھر کے صحن میں بیٹھ کر انہیں عزت بخشے۔ سانول نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر اس کی ایک نہ چلی۔ سکینہ کی ماں جو دل ہی دل میں ہمیشہ ہی سانول کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی، اُسے گھر میں پا کر ایک بار پھر اپنی ناکام آرزو کا غم لیے سانول کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ گھر میں اور کچھ تو تھا نہیں پیش کرنے کے لیے، رجو کے گھر سے آئی دودھ کی مٹکی ہی میں سے ایک کٹوری نکال کر سانول کو تھما دی، جو اس نے ایک سانس میں حلق سے نیچے اتاری اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ سکینہ کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا، مگر سانول دروازے تک بھی نہ پہنچ پایا تھا کہ لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ سارے گھر میں بھونچال سا آگیا، سبھی سانول کی جانب لپکے، سکینہ بھی ساری لاج شرم بھلا کر دروازے کی جانب دوڑی۔ سانول کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر نے زمین پر گلال بکھیر دیا تھا۔ سانول اور سکینہ کی نظر آخری بار ٹکرائی، اُن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی تھی۔ سانول کو کچھ کہنے اور سکینہ کو کچھ سُننے کی مہلت ہی نہ ملی اور سانول نے وہیں سکینہ کے سامنے دَم توڑ دیا۔ ایک قیامت آ گئی، سکینہ پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ سکینہ کے باپ اور گھر کے باقی مردوں کو علاقے کی پولیس قتل کے الزام میں دھر کر لے گئی۔

رجو کو جب سانول کی موت کا پتا چلا، تو اس نے لمحے بھر ہی میں صحن میں بنے کنوئیں کی منڈیر ٹاپ کر گہرائی میں چھلانگ لگا دی۔ خوش قسمتی سے گھر کی نوکرانی نے بروقت اطلاع کر دی اور رجو کو زندہ کنوئیں سے نکال لیا گیا، مگر وہ زندہ کب تھی۔ نہ جانے سانس کی روانی اور دل کے دھڑکنے کو زندگی کا نام کیوں دے دیتے ہیں لوگ..... ! سات دن بعد رجو کا سکتہ ٹوٹا تو وہ پہلی بار ٹوٹ کر روئی۔ اُسے پتا چلا کہ سکینہ کے گھر والوں نے جلن اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے، سانول کو دودھ میں زہر ملا کر مارا۔ ساری بستی یہی سمجھتی تھی کہ یہ حرکت سکینہ کی ہو سکتی ہے، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کے گھر والوں نے خود کو قربانی کے بکرے کے طور پر پولیس کے حوالے کر دیا، تو رجو نے اپنی عدّت کی پروا بھی نہیں کی اور سیاہ چادر اوڑھ کر سکینہ کے گھر پہنچ گئی۔ سکینہ اور رجو کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہیں اور پھر رجو یوں لپک کر سکینہ کے سینے سے جا لگی، جیسے برسوں کے بچھڑے ملتے ہیں۔ دونوں کچھ ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ مانو سیلاب آ گیا۔ صرف وہ دونوں ہی دنیا میں ایسی تھیں، جو ایک دوسرے کے دل کا درد سمجھ سکتی تھیں۔ اُن دونوں کا محبوب اُن سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی رقیب تھیں، مگر رقیب سے زیادہ محبت کے بچھڑنے کا دُکھ بھلا کون جانتا ہے۔ یہاں محاورتاً نہیں حقیقتاً دونوں کا غم ایک تھا۔ صرف وہی دونوں اس کرب کی کاٹ اور جان لیوا عذاب سے واقف تھیں۔ رجو نے پولیس کو اپنا سچا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ سکینہ کے گھر والے رہا ہو گئے اور رجو سلاخوں کے پیچھے چلی گئی، مگر اس محبت کی بھیک نے سکینہ کو کچھ ایسا جلایا کہ وہ سَچ مُچ کُندن ہو گئی۔ ایک ایسا پارس بن گئی، جس سے چھو کر لوہا تو لوہا، مٹی بھی سونا بنتی گئی۔ اسے شاید یہ اعزاز اس لیے ملا کہ اس نے خود اپنے لیے دنیا ترک کر چھوڑی تھی۔ اس کے ہاتھ جب بھی اٹھے یا اس کے لب جب بھی کھلے، صرف اوروں کے لیے ہی کھلے، خود اپنے لیے کچھ بچا ہی کب تھا کہ وہ مانگتی۔ شاید ہم جب کسی دوسرے کے لیے اپنے خدا سے کچھ مانگتے ہیں، تب ہم خلوص، عاجزی اور بندگی کی اس معراج پر ہوتے ہیں، جو دنیا کی ہر دُعا کی قبولیت کا آخری پیمانہ ہے۔

نصف شب ڈھل چکی تھی۔ خانہ بدوش بنجاروں کا جلایا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ بنجارے نے آخری تان لگائی اور محفل برخاست کر دی۔ جانے اُس لمحے پھر مجھے شدت سے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں خود بھی تو ایک بنجارہ ہوں اور وہ مجسمہ ساز کسی چاند نگر کی شہزادی تھی۔ بنجاروں کی پہنچ شہزادیوں تک بھلا کب ہوتی ہے۔ مٹی کے کھلونوں کے بدلے رُوپ کا سونا کون بیچتا ہے؟ رُوپ کے سودے صرف رُوپ کے بدلے ہوتے ہیں اور جو مجھ جیسے بے رُوپ، بدصورت ہوتے ہیں، اُن کے ہاتھ صرف خاک ہی آتی ہے، خاک کے بدلے خاک! شکورا اور مہردین سکینہ کو لے کر واپس جانے لگے، تو میں نے شکورے سے کہا۔ ''اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا، پھر بھی تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہاری نواسی ہنسے بولے اور پھر سے عام زندگی جیے.....؟'' شکورا شرمندگی کے مارے سر جھکائے کھڑا رہا۔ مہردین نے اس کی مدد کی۔ ''یہ ساری بھلا بتانے کی باتیں ہیں سائیں جی! شرمندگی ہی شرمندگی ہے اور پھر تم سے کون سی بات چُھپی ہے سائیں! یہ

نیازاں تو بس اتنا چاہتا ہے کہ اس کی سکینہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ڈولی چڑھ کر اپنے لاڑے کے ساتھ رخصت ہو جائے، اس کا بھی گھر بار ہو، بال بچے ہوں، یہ باتیں سب کے سامنے کہنے والی تو نہیں ہیں ناں سائیں جی.....! بس تم دعا کرو ہماری سکینہ کے لیے۔" میں نے سر جھکائے کھڑی سکینہ پر ایک نظر ڈالی۔ "یہ مجھ جیسے برائے نام اور دکھاوے کے سائیں بابوں کی دُعا سے بہت آگے جا چکی ہے مہر دین! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کی خوشی اور اس کے غم کے معیار اس دنیا کی روایت سے بہت جدا ہیں، اگر تم دونوں اس کی خوشی چاہتے ہو، تو اس سے کہو کہ خود اپنے لیے خوش حالی اور اچھے گھر بار کی دعا کرے، یہ اگر مان گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ اسے زیادہ تنگ نہ کرنا۔ یہ جس حال میں خوش رہے، تم سب اسی کی خوشی میں خوش رہنا۔" مہر دین اور شکورا سر جھکائے چپ چاپ سکینہ کو وہاں سے لے کر چلے گئے۔ کچھ دیر ہی میں صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ سویرے سے انگڑائی اور انگڑائی سے زندگی جاگنے کا استعارہ جوڑ دیا گیا ہے۔ سکینہ کی بستی بھی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی، گھروں سے مرغوں کی بانگیں اور چھتوں کی چمنیوں سے زندگی کی نوید دیتا دھواں آسمان کی طرف بلند ہونے لگا۔ ان سارے دیہات، قصبوں اور بستیوں کی صبح ایک جیسی ہوتی ہے، شہروں کی طرح ایک جھٹکے سے نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے جاگنے والی، سرکتی، پھیلتی دھوپ کی طرح آہستہ آہستہ بستی کے در و بام اور آنگنوں میں اترنے والی.....! میں نے کسی گزرتے راہ گیر سے سانول کی قبر کا پتا پوچھا اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھ آیا۔ قبر کے قریب کچی زمین پر مجھے بہت سی آڑی ترچھی لکیریں کھنچی نظر آئیں، ویسی ہی لکیریں جیسی سکینہ نے میرے ڈیرے کی زمین پر کھینچ رکھی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں ساری بستی کو اکٹھا کر کے انہیں یہ نوید سنا دوں کہ اب انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کے لیے کسی فقیر یا مجذوب کی حمایت کی ضرورت نہیں، وہ دو ہاتھ، ہتھیلیوں کا چاند تو خود ان کی بستی کے ایک کچے گھر میں روشن ہے، مگر یہ سدا کے توہم پرست لوگ بھلا میری بات پر کہاں یقین کریں گے، ہاں اگر سکینہ کسی چوہدری، وڈیرے یا نمبردار کی بیٹی ہوتی، تو یہی لوگ آنکھیں بند کر کے میرے ہر جھوٹ پر بھی یقین کر لیتے اور اس وقت تک سکینہ کی حویلی کے باہر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ چکی ہوتی۔ میں آج تک کبھی یہ بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہم انسان دُعا کی قبولیت کے لیے اپنے جیسے زندہ یا مُردہ انسانوں کی سفارش یا وسیلہ کیوں ڈھونڈتے ہیں، ہم اپنے رب سے براہِ راست کچھ مانگتے ہوئے اتنا جھجکتے اور شرماتے کیوں ہیں؟ یہ کیسی بے یقینی ہے ہمارے اندر، یا شاید یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے، مگر مایوسی کو تو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا یہ سارے بے یقین بھی اپنے اعتبار کے کافر ہیں.....؟

ڈیرے پر واپس پہنچنے سے پہلے میں یہ طے کر چکا تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہاں سے کوچ کر جاؤں گا کہ میں اب اس ڈھونگ کا بوجھ مزید نہیں اٹھا سکتا تھا۔ واپس آ کر میں نے دو گھڑی سستانے کے لیے کمر لگائی ہی تھی کہ مہر دین کا پوتا اپنی چھوٹی سی سرخ سائیکل دوڑاتے، ہانپتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "سب خیر تو ہے کاکے.....؟" بچے نے مجھے چاروں طرف گھوم پھر کر یوں دیکھا جیسے تسلی کر رہا ہو کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں! "کچھ نہیں سائیں جی! دادے نے کہا تھا کہ جا کر دیکھو سائیں جی ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں..... بس اب میں چلا۔" وہ جیسے آیا تھا، ویسے ہی تیز تیز پیڈل چلاتے وہاں سے بھاگ گیا۔ یہ بچے بھی اپنی دنیا میں رہنے والے مست ملنگ ہی ہوتے ہیں، اپنی رمزیں خود ہی جانتے ہیں۔ جانے مہر دین نے اسے کس کام سے بھیجا تھا اور وہ کیا سمجھا تھا، مگر دوپہر ڈھلتے ہی مہر دین خود بھی شکورے کے ساتھ ہڑبڑایا ہوا سا وہاں آن پہنچا۔ اُن دونوں کے چہرے پر لکھی پریشانی کی لکیریں دُور سے پڑھی جا سکتی تھیں۔ "سائیں جی! سب خیری صلا ہے ناں.....؟" "ہاں میں ٹھیک ہوں مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو.....؟" ان دونوں سے کوئی بات ٹھیک سے بُن نہیں پائی۔ "وہ جی سکینہ نے آج صبح یہاں سے واپس جا کر تمہارے لیے بہت بُرا سفنا دیکھا ہے۔" میں ہنس پڑا۔ "بس اتنی سی بات ہے، تم دونوں سکینہ کے بُرے سپنے سے گھبرا کر یہاں دوڑے چلے آئے..... میری زندگی پہلے ہی کسی بُرے خواب سے کم نہیں ہے، جاؤ جا کر سکینہ سے کہہ دو کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میرے لیے فکر مند نہ ہوا کرو تم لوگ.....! کچھ نہیں ہو گا مجھے!" لیکن میری اس بے فکری کا اُن دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شکورا بولا۔ "بات اتنی سادی نہیں ہے جی! سکینہ کے خواب سچے ہوتے ہیں سارے..... جب سے سانول کی موت ہوئی ہے، اس کا کوئی خواب جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔" میں نے ان دونوں کو تسلی دی۔ "مگر تم دونوں اتنے پریشان کیوں ہو، آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خواب میں.....! میرے پاس کھونے کے لیے اب باقی کچھ نہیں بچا ہے۔" شکورے نے گہری سانس لی۔ "سائیں جی! اب میں کیا بتاؤں تمہیں، میری تو زبان خلتی ہے بولتے ہوئے، سکینہ نے خدانخواستہ تمہاری موت دیکھی ہے..... اس نے خواب میں دیکھا کہ ہمارا سائیں فوت ہو گیا ہے اور ہم سب اس کے لیے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔" مہر دین نے شکورے کو سختی سے گھورا اور شکورا گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں کافی دیر میرے قریب بیٹھے رہے، جیسے انہیں خوف ہو کہ ان کے جاتے ہی مجھے کچھ ہو جائے گا۔ پتا چلا کہ سکینہ کے ہر خواب کی تعبیر تب سے سچی ہوتی ہے، جب سے سکینہ خود ایک خواب رفتہ جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ جب شام گہری ہونے لگی، تو میں نے انہیں زبردستی واپس بھیج دیا، ورنہ ان دونوں کا ارادہ اُٹھنے کا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ڈھلا تو میرے دل کے اندھیرے بھی میرے اردگرد رقص کرنے لگے۔ چلو اچھا ہوا، سکینہ نے مجھے میرا انجام کچھ پہلے ہی بتا دیا، ورنہ خود میں اس انجام کے لیے ہمیشہ سے تیار تھا، کہانی ختم ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ میں خود بھی بہت تھک چکا تھا اس بھاگ دوڑ سے، اب لمبی نیند سونے کو جی چاہتا تھا۔ رات ڈھلی تو میں نے یہی سوچ کر آنکھیں موند لیں کہ اب یہ آنکھیں شاید کبھی نہ کھلیں، مگر حشر تک کی نیند شاید ابھی میرا مقدر نہیں تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ! اک نئی صبح کی نوید لے کر آئی تھی، مگر میری آنکھ کھلنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ دُور سڑک کے کنارے ایک بڑی امپورٹڈ گاڑی کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیور سمیت ایک دوسرا شخص بونٹ پر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک تیسرا محافظ نما شخص قریبی جوہڑ سے پانی کا ایک کین بھر کر لایا اور ڈرائیور نے پانی گاڑی کے ریڈی ایٹر میں ڈال دیا۔ میں نے بے زاری سے چہرہ موڑ کر آنکھیں بند کر لیں، مگر پھر اچانک ایک مانوس سی آواز نے میرے وجود میں بجلیاں سی بھر دیں۔ وہ ڈرائیور سے کہہ رہا تھا۔ "اور کتنا دیر لگے گا کم بخت..... سارا دن لگائے گا کیا.....؟" میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بونٹ پر جھکا ہوا دوسرا شخص کبیر خان تھا۔ ہاں وہ کبیر ہی تھا، جو کبھی میرا محافظ ہوا کرتا تھا۔ جانے وہ اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے کچھ کہا اور پھر

اچانک اس کی نظر دُور بیٹھے مجھ پر پڑی۔ میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں کبیر سے خاصے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ماضی اور حال کے جلیے میں زمین آسمان کا فرق تھا، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں کبیر کی نظریں مجھے اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، مگر میں نے لاتعلقی سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کبیر خان نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں کسی بھی بہانے وہاں سے اٹھ کر دوسری جانب چل پڑوں گا۔ کبیر نے اپنے ساتھ کھڑے محافظ سے کچھ کہا اور محافظ سر ہلا کر میری جانب چل پڑا۔ میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ اچھا ہوا کہ کبیر خود میری طرف نہیں آیا، ورنہ وہ میری آواز ضرور پہچان لیتا۔ محافظ نے میرے قریب آ کر سلام کیا اور جیب سے میری ہی ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ ''باباجی! ان صاحب کو یہاں آس پاس کہیں دیکھا ہے آپ نے.....؟'' میں نے بظاہر لاپروائی سے تصویر پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور آنکھیں موند کر جواب دیا۔ ''یہ تو کوئی بڑا آدمی لگتا ہے اپنے حلیے سے..... اس چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اس کا کیا کام..... کون ہے یہ آدمی.....؟'' محافظ نے گہری سانس لی۔ ''یہ میرے صاحب کے صاحب ہیں، بہت عرصہ پہلے کہیں چلے گئے تھے سب چھوڑ چھاڑ کر.....! ہم تب سے انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔'' میں نے چور نظروں سے محافظ کی طرف دیکھا، مگر مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا، شاید کبیر یا کمالی کے ذاتی عملے کا کوئی ملازم ہو گا۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے میرے قریب یوں دیر تک بیٹھے رہنا میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کبیر کسی لمحے بھی میری طرف آ سکتا تھا یا پھر شاید اسی شخص کو میری بڑھی ہوئی داڑھی اور بالوں کے پیچھے میرے ماضی کی کوئی جھلک نظر آ جاتی، لہٰذا میں نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں بہتری جانی۔ ''تم لوگ یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، یہاں آس پاس کی سبھی بستیوں میں اپنی زندگی کے بہت سے سال گزار چکا ہوں، سبھی جگہ آنا جانا لگا رہتا ہے، یہ شخص کبھی یہاں نہیں آیا، جاؤ کہیں اور تلاش کرو..... میں ذرا ڈیرے کے لیے پانی بھر لوں۔'' محافظ بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں مخالف سمتوں کی جانب چل پڑے۔

میں نے کچھ دُور جا کر ایک درخت کی اوٹ سے چھپ کر دیکھا تو محافظ اور کبیر آپس میں کچھ بات کر رہے تھے، پھر وہ تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور ریاست پور سے مخالف سمت میں آگے بڑھ گئے، لیکن میں کبیر خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ آج نہیں، تو کل وہ اس راستے پر ضرور پلٹتا۔ میرے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے موجود تھا کہ میرے یوں چلے جانے کے بعد وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے ہوں گے اور پھر کبیر خان جیسا وفادار تو کبھی ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے ہر وہ جگہ چھان ماری ہو گی، جہاں میری موجودگی کا ذرہ برابر بھی امکان رہا ہو گا۔ میرا دل ایک بار شدت سے مچلا کہ میں ایک لمحے کے لیے کبیر کو روک کر عینی کے بارے میں پوچھ لوں، پھر میں اسے اپنی قسم دے کر منا لیتا کہ وہ کبھی کسی کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا، مگر پھر میں نے خود ہی اپنے اندر کے اس اُبال پر قابو پا لیا۔ کبیر مجھے اپنے ساتھ لیے بنا کبھی واپس نہ جاتا، یا پھر خود بھی عمر بھر کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دیتا۔ ان کے جانے کے بہت دیر بعد تک بھی میرے دل کی دھڑکنیں معمول پر نہیں آئیں، سب کچھ دوبارہ سے تازہ ہو گیا، میرے دل و دماغ میں.....! یادیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، یادِ ماضی کو بھلانا صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں، چاہے ہم ساری عمر بھی اپنی یادوں سے فرار لے کر بھاگتے رہیں۔ ہم جہاں تھک کر گرتے ہیں، وہیں سے یادوں کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ کبیر خان کی آمد نے میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ اب میرا یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کبھی بھی واپس پلٹ سکتا تھا۔ میں نے مہر دین کے ذریعے شکورے کو بلا بھیجا۔ میری امید کے مطابق سکینہ بھی شکورے کے ساتھ چلی آئی، شاید شکورے نے اسے بھی میری روانگی کے خدشے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ میرے لیے کافی فکرمند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ''میری فکر نہ کرنا، میں بہت پہلے مر گیا تھا، اب صرف تصدیق ہونا باقی ہے، ہو سکے تو اپنے ماں، باپ اور نانا کی خاطر کسی بہتر اور نیک بندے کو اپنا جیون ساتھی چن لینا، میں جانتا ہوں تمہارے لیے وہ دُہری زندگی جینا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہو گا، مگر یہ دنیا اپنے لگے بندھے اصولوں پر چلتی ہے، سو، جیسا دیس ہے، ویسا بھیس اپنا لو۔'' میں نے شکورے اور مہر دین کو سختی سے منع کیا تھا کہ وہ بستی میں میری روانگی کا کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت ہم چاروں کی آنکھیں نم تھیں، وہی کچھ جھوٹے وعدے ہوئے پھر سے ملنے کے، جلد لوٹ آنے کے، سدا ایک دوسرے کو یاد رکھنے کے.....! جانے یہ آخری ملاقاتیں ہمیں اتنا جھوٹ بولنے پر کیوں مجبور کر دیتی ہیں، جب کہ رُکنے والے اور جانے والے دونوں ہی جانتے ہیں کہ یہ اُن کی آخری ملاقات ہے۔

صبح منہ اندھیرے میں وہاں سے چل پڑا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی مجھے بس مل گئی۔ میں چپ چاپ سر جھکائے آخری سیٹ کے ایک کونے پر جا کر ٹک گیا۔ بس دیہاتیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گھنٹہ بھر ہچکولے کھانے کے بعد اچانک ہی گاڑی رُک گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، آگے پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا۔ دو پولیس والے اوپر چڑھ آئے۔ اُن کی باتوں سے لگتا تھا، جیسے وہ کسی خاص شخص کی تلاش میں ہیں۔ اتنے میں ان میں سے ایک کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور پھر زور سے چلایا۔ ''یہ تو یہاں بیٹھا ہوا ہے۔''

(جاری ہے)



.....ہاشم ندیم.....

ہاشم ندیم نوجوان نسل کے پسندیدہ، ملک کے معروف و منفرد ڈرامارائٹر، ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولز ''خدا اور محبت'' اور ''بچپن کا دسمبر'' نے بین الاقوامی پذیرائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شایع ہونے والے ناول ''عبداللہ'' کو بھی وقت کے پسندیدہ ترین ناول کا درجہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ نیز، فلم کے شعبے میں ''عبداللہ'' نامی ایک بین الاقوامی فلم کے تخلیق کار کی حیثیت سے بھی قدم رکھ چکے ہیں۔

''پری زاد'' ایک اچھوتے، حساس اور قدرے مشکل موضوع پر مبنی بہت دل گداز سی تحریر ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کتھا ہے، جسے اک کم صورتی کے عیب کے سبب، اس ظاہر پسند، زر پرست دنیا کے ان گنت بدصورت رویّوں، بدہیئت آئینوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول سے متعلق اپنی آرا سے آگاہ کرنا ہرگز مت بھولیے گا۔ ہمارا پتا وہی پرانا ہے:

ایڈیٹر، ''سنڈے میگزین'' روزنامہ جنگ، شعبہ میگزین، اخبار منزل، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ ای میل:
sundaymagazine@janggroup.com.pk

پولیس والے کے اس طرح چلانے پر بس میں بیٹھے سارے دیہاتیوں نے گھبرا کر یوں پلٹ کر میری طرف دیکھا، جیسے بس میں کوئی جنگلی بھینسا گھس آیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں میرے ارد گرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے، مجھے بس سے اتار کر سڑک کنارے کھڑا کر دیا گیا، مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ پولیس والے میرے قریب آنے سے کترا رہے تھے اور میری ہر جنبش پر ان کی مسلسل اور کڑی نظریں جمی تھیں۔ پھر انہوں نے مجھے انتہائی سختی سے ہاتھ فضا میں بلند کر کے کھڑے رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر میں ان کا ایک افسر سرکاری جیپ میں وہاں نمودار ہوا، اور اس نے بس کے ڈرائیور اور مسافروں کے نام، پتے نوٹ کرنے کے بعد بس کو جانے کی اجازت دے دی، اس کے کاندھوں پر سجے پھول بتا رہے تھے کہ وہ انسپکٹر ہے۔ اس کے ماتحتوں نے اسے زوردار سلامی دی اور کچھ کھسر پھسر کی۔ انسپکٹر نے پہلے سر سے پاؤں تک مجھے کئی بار غور سے دیکھا، پھر اپنے ماتحتوں سے پوچھا۔ ''اس کی تلاشی لی ہے.....؟'' ''نہیں صاب جی..... ہم جانچ والے آلے کا انتظار کر رہے تھے۔'' انسپکٹر نے غصّے سے انہیں جھاڑا ''اوئے..... اس ویرانے میں بارود جانچنے والا آلہ تمہارا ماما لے کر آئے گا۔ ویسے کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ وہی خودکش ہے، جس کی مخبری ہوئی تھی؟'' ''صاب جی! حلیہ تو بالکل وہی ہے۔ وہی لمبے بال، گھنی لٹوں جیسی بڑی داڑھی، سرخ آنکھیں، ملنگ کا بھیس..... یہ تصویر دیکھیں ذرا''۔ سب انسپکٹر نے جیب سے ایک سادہ کاغذ پر بنا خاکہ نکال کر انسپکٹر کو دکھایا۔ ان کی باتوں سے مجھے اتنا تو پتا چل چکا تھا کہ انسپکٹر علاقے کا تھانے دار ہے، اور وہ کسی خودکش کی تلاش میں یہاں ناکہ لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ ہوا میں کھڑے کھڑے اکڑنے لگے، تو میں نے تھانے دار کو پہلی بار مخاطب کیا۔ ''اگر آپ اجازت دیں، تو میں اپنے ہاتھ نیچے کر لوں، میں ایک فقیر ہوں۔ ریاست پور سے آرہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تصدیق کروالیں۔ میں کوئی دہشت گرد نہیں۔'' میری آواز سن کر وہ سارے یوں اچھلے، جیسے میں نے واقعی کوئی خودکش دھماکا کر دیا ہو۔ تھانے دار میری بات سے زیادہ میرے لہجے اور سکون بھرے انداز سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے قمیص اتارنے کو کہا۔ میں نے اپنا پھٹا پرانا چولا اتار کر ایک جانب پھینک دیا۔ کچھ دیر تک وہ سارے دُور کھڑے میرا جائزہ لیتے رہے، پھر تھانے دار کے اشارے پر ایک سپاہی نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری مشکیں کس دیں اور پوری طرح جامہ تلاشی لی، تو تھانے دار سمیت سب نے اطمینان کا سانس لیا اور میرے ہاتھ کھول دیے گئے۔ میرے تھیلے سے انہیں صرف کچھ چنے اور گڑ ہی ملا تھا۔ تھانے دار نے جیپ کے وائرلیس سیٹ پر اپنے کسی سینئر سے بات کی اور مجھے قمیص پہننے کا حکم دیا۔ دُور ویرانے میں سامنے سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے کیبن نما کھوکے والے نے تھانے دار کے لیے ابلتی ہوئی دودھ پتی چائے کی ایک چینک اور چند چھوٹے پُرانے سے شیشے کے گلاس بھجوا دیے اور وہیں درخت تلے کرسی لگا کر تھانے دار کا دفتر بنا دیا گیا۔ ان چھوٹے علاقوں میں صدر اور وزیرِ اعظم سے زیادہ تھانے دار کا کروفر ہوتا ہے۔ انسان غلام پیدا ہوا ہے اور سدا غلام ہی رہے گا، کبھی اپنی خواہشوں کا اور کبھی اپنے جیسے انسانوں کا۔ تھانے دار نے ازراہِ کرم مجھے بھی سائے میں اپنے سامنے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ''جب تک ریاست پور سے تمہاری بات کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم زیرِ حراست رہو گے۔ ویسے تمہارا یہ صاف لہجہ اور بات کرنے کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا ہے کہ تم ہمسایہ ملک کے کوئی جاسوس ہو۔ اس علاقے میں کسی کا لہجہ اتنا صاف نہیں اور یہ تمہارے حلیے سے میل بھی نہیں کھاتا..... ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کون ہو.....؟'' میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسوں، کل تک جس حلیے اور بھیس کی وجہ سے یہ دنیا میری راہ میں پلکیں بچھاتی تھی، میری طرف پیٹھ کر کے چلنے کو بھی بے ادبی سمجھتی تھی، آج وہی حلیہ اور جوگی کا بھیس مجھے ایک عادی مجرم ثابت کرنے پر تُلا تھا۔ سکینہ کے حصار سے نکلتے ہی اس کی برکت کے اثرات ختم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چالیس میل کا فاصلہ خاص ہجرت کی مسافت کو مکمل کرتا ہے۔ جیسے چالیس دن کا چلّہ تبلیغ یا دوسرے روحانی عوامل کے لیے بہت اہم ہے۔ شاید کچھ شخصیات کا حصار بھی کسی خاص شخص کی ذات پر چالیس کے ہندسے سے مشروط رہتا ہو۔ میں نے بے خیالی میں تھانے دار سے پوچھا ''یہاں سے ریاست پور کتنی دُور ہے.....؟'' تھانے دار نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''پینسٹھ میل، کیوں؟ مگر تم فکر نہ کرو، ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہے۔ ابھی گھنٹے بھر میں تمہاری اصلیت سب کے سامنے آ جائے گی۔'' تھانے دار نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا کر دوسری آنے والی جیپ میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا جائے۔ ان میں سے کچھ تازہ بھرتی شدہ نوجوان سپاہیوں نے شاید آج تک کوئی دہشت گرد یا خودکش نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کسی عجوبے کی طرح برت رہے تھے۔ خودکش..... ہم بھی کیسے بدقسمت معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ہماری لغت میں جانے کب سے ایسے ہی نئے لفظ شامل ہوتے آرہے ہیں۔ خودکش، دہشت گرد، دراندازی، انتہاپسند، کوئی ایک اچھا نیا لفظ بھی تو نہیں ہمارے مقدر میں۔ ساری دنیا میں انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی راحت کے سامان کے لیے دن رات جتا رہتا ہے۔ مگر نہ جانے ہم ایک دوسرے سے محبت کرنا کب سیکھیں گے؟ کب ہماری لغت میں دہشت گرد، محبت پسند، سکون اندوز نامی لفظ شامل ہوں گے۔ ہم جینا کب سیکھیں گے؟

مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ خلافِ معمول تھانے کی عمارت باہر سے بڑی پُرسکون اور خوب صورت تھی۔ تھانے کے سامنے صاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی، جو تھانے کی عمارت کے آس پاس پھیلے وسیع و عریض اور سرسبز کھیتوں کو سیراب کرنے کے کام آتی ہو گی۔ تھانے کے پس منظر میں دُور پہاڑوں پر سورج کی دھوپ نے سونا پھیلا رکھا تھا۔ نہر کے اوپر ایک چھوٹا سا اینٹوں کا پُل تھا، جو تھانے کے مرکزی چوبی گیٹ کو باہر کی سڑک سے ملاتا تھا۔ جس کے عقب میں تھانے کی پرانی، مگر انگریز دور کی ایک پُرشکوہ عمارت اِستادہ تھی۔ اسی لمحے میں نے ایک عجیب بات محسوس کی کہ بہ ظاہر پُل اور دیواریں ایک جیسے اجزاء اور ساخت کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے ہیں، مگر ''پُل'' ملاپ کا استعارہ ہوتے ہیں، جب کہ دیواریں جدائی کی علامت بن جاتی ہیں۔ پُل لوگوں کو ملاتے ہیں اور دیواریں جدائیاں ڈال دیتی ہیں۔ تھانے کی اونچی لمبی دیواروں نے بھی میرے اور باقی دنیا کے درمیان جدائی کی فصیل کھڑی کر دی اور مجھے ایک حوالاتی کمرے میں بند کر دیا گیا، جو تھانے کے صحن میں دھوپ کے رُخ پر بنا ہوا تھا۔ شاید یہ بھی قیدی کو اذیت میں رکھنے کا ایک طریقہ ہو؟ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے کتنے زیادہ طریقے ایجاد کر لیتے ہیں۔ راحت دینے کے لیے ہمارے پاس تھوڑا سا بھی وقت نہیں بچتا۔ شام ڈھلے تک میں وہیں حوالات میں بیٹھا آتے جاتے سپاہیوں اور دیگر سائلوں کو دیکھتا رہا۔ شام کو عصر کے بعد ایک سپاہی نے کم دودھ،

زیادہ پانی والی پتلی سی چائے کا ایک پیالہ مجھے پکڑا دیا۔ ''جانتے ہو، دہشت گردی کی سزا کیا ہے؟ اگر تم پر الزام ثابت ہو گیا، تو سیدھے سولی چڑھ جاؤ گے۔ کیوں خود کو ہلاکت میں ڈال دیا تم نے؟'' لمحے بھر ہی میں مجھے سکینہ کی پیش گوئی یاد آ گئی، تو گویا میری فنا اس دہشت گردی کے الزام میں سولی چڑھ جانے سے عبارت ہے۔ چلو، یونہی سہی۔ میں نے چشم تصور سے دیکھا کہ تھانے دار نے میرے ورثاء کے طور پر ریاست پور سے شکورے اور مہر دین کو بلا کر میت ان کے حوالے کر دی ہے، کیوں کہ تھانے دار کو میں پہلے ہی ریاست پور میں اپنی جان پہچان کا اشارہ دے چکا تھا۔ میرے بارے میں مزید تو یہ کچھ جانتے نہیں تھے۔ قدرت اپنے منصوبے مکمل اور کسی بھی غلطی یا جھول سے پاک رکھتی ہے۔ میں نے اطمینان سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ قضا نے میرے گرد اپنا جال مکمل بُن لیا تھا۔ اب تو سکون ہی سکون تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور وہ نازِ ادا مجھ سے میری بند آنکھوں کے پردے پر آ بیٹھی۔ کاش! میں ایک بار اسے دیکھ پاتا۔ میرا دل کسی نادان بچے کی طرح مچل سا گیا، جیسے ننگے پاؤں..... پھٹے پرانے کپڑوں والے بچے..... اپنی خالی جیبوں کا احساس لیے..... دل کو اچھی لگنے والی..... مہنگی چیزیں..... کسی دکان کے بند شیشوں سے..... پہروں لگ کر تکتے ہیں ناں..... میں بھی تم کو یوں ہی محسن..... اکثر تکتا رہتا ہوں۔

میں بھی اسی خالی جیبوں والے بچے کی طرح اُسے ایک بار تکنے کی آس میں جانے کب دیوار سے ٹیک لگائے سو گیا۔ مجھ جیسوں کے لیے یہ نیند اور خواب کتنی بڑی نعمت ہیں۔ بیداری میں کچھ نہ پانے والے اکثر اپنے خوابوں میں عمر اریں پا لیتے ہیں۔ میری منت بھی خواب میں پوری ہو گئی۔ میں اس کی آرٹ گیلری میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ حسب معمول اپنے کومل ہاتھوں کی جادو گری سے میرے مجسمے میں جان ڈال رہی تھی۔ مجھے تو وہ خود ہمیشہ کی طرح ایک مجسمہ لگ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے، دنیا کی کسی زبان یا ڈکشنری کا کوئی لفظ بھی تو ایسا نہیں تھا، جو ہم دونوں کے دل کی باتوں کو کسی بولی میں ڈھال کر منتقل کر سکتا ہو۔ ایسی صورت میں صرف نظر ہی نظر کے لیے زبان کا کام دیتی ہے۔ میں نہ جانے کتنی دیر اُس کے ساتھ نظر کی یہ بولی بولتا رہا اور پھر کسی نے مجھے زور سے آواز دے کر اٹھا دیا۔

''چل بھئی ملنگ بادشاہ..... تھانے دار صاب تجھے بلا رہے ہیں'' میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، صبح ہو چکی تھی۔ مجھے ہتھکڑیوں سمیت تھانے دار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں پہلے سے چند دیگر پولیس افسر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ تھانے دار خود ایک جانب مؤدب سا کھڑا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ بیٹھے ہوئے افسر خصوصی طور پر کہیں اور سے یہاں آئے تھے۔ سب نے مجھے غور سے دیکھا۔ میرے چند خاکے بنائے گئے اور پہلے سے لائے گئے چند خاکوں اور تصویروں سے میرا حلیہ جوڑا گیا، پھر ایک افسر نے جو نُمبر دے میں ایس پی تھا، مجھ سے پہلی بار براہ راست بات کی۔ ''ریاست پور سے صرف اتنا پتا چلا کہ تم نے کچھ مہینے وہاں بستی سے باہر درخت تلے گزارے تھے۔ اس سے پہلے تم کہاں تھے؟'' میں دھیرے سے مُسکرایا۔ ''فقیر کا کوئی ایک ٹھکانہ کب ہوتا ہے صاب۔ اس سے پہلے شکر گڑھ کے ریلوے پلیٹ فارم پر ڈیرہ تھا اور اس سے پہلے کہیں اور ویرانہ ٹھکانہ تھا..... اب آپ کی یہ حوالات ہے۔'' ایس پی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''مگر تمہارا یہ لب و لہجہ، یہ اعتماد، تمہارے حلیے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ہمیں الجھا رہا ہے تمہارا یہ اعتماد، میں جانتا ہوں، جن جنگجوؤں کا تم نے ابھی نام لیا، تم نے ضرور وہاں وقت گزارا ہو گا، مگر آخر تم ہو کون؟ تمہارا شناختی کارڈ بھی تو نہیں ہے، جس سے تمہاری پیدائش وغیرہ کا ریکارڈ دیکھا جا سکے۔'' میں نے کمرے میں بیٹھے باقی سب لوگوں پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ''حیرت کی بات ہے، کوئی اگر آپ جیسی کو توالی کے سامنے بات کرتے ہوئے لڑکھڑا جائے، اس کی آواز کانپے، تب بھی آپ لوگ اس پر جھوٹا ہونے کی تہمت لگا دیتے ہیں، اور اگر کوئی بنا گھبرائے اپنا مدعا بیان کر دے، تب بھی آپ لوگوں کو اس کا یہ اعتماد مشکوک لگتا ہے۔ آپ میری باتوں پر یقین نہ کریں۔ اپنی تفتیش پوری کریں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میرے لیے اب سلاخوں کے پیچھے یا اس زندان سے باہر ہونا ایک جیسا ہے۔ میں دونوں طرف ہی قید رہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے اپنی تسلی کریں.....'' میں خاموش ہوا تو ان سب کے تنے ہوئے چہروں پر مزید کئی شکنیں پڑ چکی تھیں۔ ایس پی نے میرے سامنے ایک تصویر رکھی، جو میرے موجودہ حلیے سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ ''ہمیں اس شخص کی تلاش ہے۔ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بہت سے منصوبوں پر عمل کر چکا ہے اور ابھی تک معصوم لوگوں کی جان کے درپے ہے۔ تمہارا حلیہ اور تمہاری ادھوری کہانی ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم ہی دہشت گرد ہو۔ جس کے نہ جانے کتنے نام اور بہروپ ہیں۔ یہ بھی تمہاری طرح بہت سے علاقوں میں جوگی، فقیر یا ملنگ کے حلیے میں گھومتا رہتا ہے اور موقع پاتے ہی اپنا کام کر جاتا ہے۔ سیکڑوں معصوموں کو دھماکوں میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے یہ اب تک..... لہٰذا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی پوری شناخت واضح کر دو، ورنہ ساری عمر انہی سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے۔'' اس کا لہجہ اور ان سب کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی بھی حال میں میری شناخت جانے بنا وہاں سے مجھے جانے نہیں دیں گے، مگر میں انہیں کیا بتاتا۔ میں جس شناخت سے ساری عمر بھاگتا رہا تھا، وہ ایک بار پھر میرا مذاق اُڑانے کے لیے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے پولیس والوں کو پھر وہی جواب دیا کہ میری شناخت ایک بھکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، مگر وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ مجھے دوبارہ حوالات میں بند کر دیا گیا اور اگلے روز مجھے ضلعے کی بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری تصویریں کھینچ کر اخبار اور اشتہار کے ذریعے علاقے میں منادی کروا دی گئی کہ علاقہ پولیس نے ایک مشکوک کو دہشت گردی کے شبے میں پکڑا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں اطلاع ہو تو آ کر پولیس سے ملے۔

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے شکورے اور مہر دین کی آوازیں سنائی دیں۔ پولیس والے انہیں دو جاہل بوڑھے دیہاتی سمجھ کر دھتکار رہے تھے، جب کہ وہ ڈھٹائیاں دے رہے تھے کہ پکڑا جانے والا کوئی دہشت گرد نہیں، ان کا جوگی سائیں ہے، مگر وہاں کوئی ان کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر جانچ کے لیے بڑے شہر بھجوا دیے تھے۔ شکورے اور مہر دین کو تھوڑی دیر کے لیے مجھ سے ملاقات کی اجازت ملی تو وہ دونوں رو پڑے۔ ''سائیں جی! تم ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم وہ نہیں ہو، جو یہ سمجھ رہے ہیں۔'' میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''شاید میں وہ نہیں ہوں، جو تم دونوں مجھے سمجھ رہے ہو اور پھر تم دونوں نے ہی تو کہا تھا کہ سکینہ کا دیکھا ہوا ہر خواب سچ ہوتا ہے، تو شاید اس کے خواب کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔'' وہ دونوں میرے ہتھکڑیوں میں جکڑے ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شکورے نے جاتے جاتے مجھے بتایا کہ جس دن سے سکینہ نے وہ خواب دیکھا ہے، تب ہی سے وہ دعا کے لیے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہے اور اپنے رب سے ہر گھڑی رو رو کر صرف یہی دعا مانگ رہی ہے کہ سائیں کو کچھ نہ ہو، سائیں جی کو ان سب کی نظر لگ جائے، مگر سائیں کی آنے والی فنا ٹل جائے..... اور پھر اگلی صبح چائے پہنچانے والے سنتری نے آ کر زوردار انداز میں سلاخیں کھڑکائیں۔ ''اٹھ جاؤ ملنگ بادشاہ..... تمہاری رہائی کا پروانہ آ گیا ہے۔'' میں حیران سا حوالات سے باہر نکلا تو تھانے دار نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ اس بار اس کا لہجہ بہت نرم اور معذرت خواہانہ تھا۔ ''معاف کرنا فقیر و..... ہم بھی انسان ہیں، ڈیوٹی کرتے وقت اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔ شک کے اوپر ہمارے یقین کا قلعہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بغیر ہمارا کام ہی نہیں چلتا۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اتنی وضاحت کیوں پیش کر رہے ہیں۔ میں نے تو ہلکی سی شکایت بھی نہیں کی۔'' تھانے دار نے چائے والے لڑکے کو چائے، ناشا میز پر سجانے کا اشارہ کیا۔ ''تم نے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیا۔ اس بات نے مجھے مزید شرمندہ کر رکھا ہے۔ ہم جس دہشت گرد کی تلاش میں تھے، اُسے کل رات سرحد کے قریب سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تمہارے لنگر پر نٹس کی رپورٹ بھی کلیئر آئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو، جا سکتے ہو۔ مگر پہلے ناشا کر لو۔'' میرا دل اس وقت کچھ بھی کھانے پینے کا نہیں تھا، مگر

تھانے دار کا دل رکھنے کے لیے میں نے چائے کے چند گھونٹ حلق سے اتارے اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ تھانے دار میرے ساتھ برآمدے تک آیا۔ ''کہاں جاؤ گے؟'' ''کوئی منزل نہیں ہے میری، جہاں قدم اٹھیں گے، اُسی طرف نکل جاؤں گا۔ آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ۔'' تھانے دار مجھ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ ''شاید تمہیں اپنے متعلق بات کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں، چلو جیسے تمہاری مرضی، اکرم خان نام ہے میرا۔ کبھی کسی مدد کی ضرورت ہو تو یاد رکھنا۔ اور ہاں، کل جو دیہاتی تمہارے حق میں گواہی دینے کے لیے آئے تھے، اگر وہ دوبارہ آئیں تو انہیں کیا بتاؤں؟'' میں نے پلٹ کر تھانے دار کی طرف دیکھا۔ ''اُن سے کہیے گا یہاں فنا ہونا، میرے نصیب میں نہیں تھا، جہاں لکھی ہو گی، وہاں خود پہنچ جاؤں گا۔ میری تلاش میں بھٹکنے کی کوشش نہ کریں''۔

میں اکرم خان کو وہیں ہکا بکا چھوڑ کر تھانے کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ پھر وہی پُل اور وہی دیوار۔ میں قصبے کی طرف جاتی پگڈنڈی کی مخالف سمت میں چل پڑا۔ راستے میں بادلوں نے مجھے تنہا چلتے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کیں اور پھر سارے بادل زور سے گڑگڑا کر ہنس پڑے۔ شریر بوندیں ایک بے گھر بنجارے کے ساتھ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلنے، بادلوں کی گود سے ایک ایک کر کے زمین کی طرف لپکنے لگیں۔ بادلوں نے بنجارے کو بھیگتے دیکھ کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جھولی میں بند ساری شرارتی بوندیں اس پر برسا دیں، اور پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ویرانے میں برستی بارش کی بوندوں کی بولی کوئی سُنے تو اسے بارش کی تنہائی پر بھی پیار آ جائے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مجھ سے اٹکھیلیاں اور ضد کر رہی تھیں کہ میں بھی دوسروں کی طرح ان کے شور سے گھبرا کر کسی درخت یا اوٹ کی پناہ تلاش لوں، مگر میں نہیں رُکا۔ بھیگتا رہا، اور بہت دُور تک یونہی چلتا رہا، وہ بہت دیر تک مجھے یاد آتی رہی اور اس اجنبی ویرانے کے اجنبی رستے میری تنہائی پر مُسکراتے رہے۔ یہ شاعر بھی کیسے کیسے خیال جوڑ لاتے ہیں اپنی تخیل کی کرشماتی دنیا سے، زندگی کے ہر قدم پر ہمیں ان کے بول کسی نہ کسی طور اپنے حال سے جُڑے محسوس ہوتے ہیں۔ گھنٹہ بھر بھیگنے کے بعد مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ مگر نہ جانے میں کہاں تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی، کچھ دیر بعد کسی بیل گاڑی والے نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آواز لگائی۔ ''کہاں جا رہے ہو صوفیو! میں پہنچا دوں؟'' میں نے اس دیہاتی سے پوچھا۔ ''یہ رستہ کہاں جاتا ہے؟'' وہ کوئی پرانا لطیفہ یاد کر کے زور سے ہنسا۔ ''راستہ تو کہیں نہیں جاتا..... یہیں پڑا رہتا ہے دن بھر فقیرو..... بس میں ہی آتا جاتا رہتا ہوں۔'' مجھے اس کی زندہ دلی اچھی لگی۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اپنے مَن کی الجھنیں بھلا کر لبوں پر ایک ہلکی سی مسکان برقرار رکھ سکتا ہے، تو یقیناً وہ ''دل والا'' ہے۔ بیل گاڑی نے مجھے پکی سڑک تک پہنچا دیا، جہاں سے اکّا دُکّا سواریاں گزر رہی تھیں، مگر میری حالت سردی لگنے کی وجہ سے بگڑتی جا رہی تھی، رات ڈھلنے سے پہلے مجھے بخار ہو چکا تھا۔ کسی بس والے نے ترس کھا کر مجھے بٹھا لیا اور بنا پوچھے ہی ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر اتار دیا۔ شاید وہی بس کا آخری اسٹاپ تھا۔ ساتھ ہی اس نے اسٹیشن کے ایک چپڑاسی کو میرا خیال رکھنے کا بھی کہہ دیا۔ بخار نے میرے حواس اس بُری طرح متاثر کیے تھے کہ میں خود کوئی فیصلہ لینے کے قابل ہی نہیں رہا تھا، ریلوے اہل کار نے میری حالت دیکھی، تو مجھے کسی بڑے شہر جانے والی ریل گاڑی پر سوار کروا دیا اور ٹی ٹی سے درخواست کی کہ مجھے شہر پہنچتے ہی کسی قلی یا مزدور سے کہلوا کر شہر کے بڑے اسپتال پہنچا دے۔ دو دن کا طویل سفر میرے ہوش اور بے ہوشی کے وقفوں میں یوں گزرا کہ مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔ گاڑی رُکی تو میں بھی ٹی ٹی کو بتائے لڑکھڑاتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میں مزید ان لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ تھکن کے مارے میرا بُرا حال تھا اور غنودگی کے غلبے نے مجھے ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ جب آنے اور جانے والے مسافروں کی بھیڑ چھٹی تو میری نظر پلیٹ فارم کے گھڑیال کے ساتھ لگے جلتے بُجھتے برقی بورڈ پر پڑی، جس کے اوپر شہر کا نام لکھا ہوا تھا۔ میرے اندر ایک دم شدید اور کان پھاڑ دینے والا شور سا اُٹھا، جیسے میری روح کے سارے تار ایک ہی جھٹکے میں کسی نے جھنجھنا کر رکھ دیے ہوں۔ یہ تو میرا اپنا شہر تھا۔ ہاں، وہی شہر، جہاں میں پیدا ہوا تھا، وہی شہر جہاں وہ کوچۂ جاناں تھا، جہاں وہ رہتی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنے اور پلیٹ فارم سے نکلتی ایک گاڑی میں بیٹھنے کی کوشش کی، مگر لڑکھڑا کر وہیں گر گیا۔ کسی قلی نے آخری وقت پر مجھے سنبھال لیا، ورنہ شاید میں ٹرین کے نیچے آ کر کٹ جاتا۔ میرے ارد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ تماشا کہیں بھی ہو، تماش بین مل ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہمیں تماشا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ سب مجھے بُری طرح جھاڑ پلا رہے تھے اور اس حماقت پر ڈانٹ رہے تھے، کچھ نے مجھے خودکشی کے ارادے کے جُرم میں پولیس کے حوالے کر دینے کا مشورہ بھی دیا۔ خودکشی بھی کتنا عجیب جرم ہے، جُرم کا ارادہ ہو یا اگر جُرم نامکمل رہ جائے تو اس کے لیے کڑی سزا ہے، مگر یہی جُرم اگر مکمل ہو جائے تو دنیا کا ہر قانون اس کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے، اتنے میں کسی شناسا کی آواز ہجوم میں اُبھری۔ ''ہٹو دو یہاں سے، جاؤ اپنا کام کرو تم سب لوگ.....'' میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ آخر وہی ہوا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

(جاری ہے)

ہم تم عام تو ہیں ان نسل کے بڑھاپے، طفلہ کے سہارے، اختر داد، اکبر، بادل لکھتے ہیں۔ ان کے ناول "تھا اور رہیں گے" اور "کچھ کا دھیر" نے بہت داد تحسین پائی حاصل کی، تو جنگ، سنڈے میگزین میں شائع ہونے والے ناول "محبوبہ" کو بھی اتنے کے پڑھنے والوں کا بہت بڑا حلقہ حاصل ہوا۔ انہیں ان کی اولی خدمت پر خصوصی پاکستان کے قیام کی گولڈ جوبلی منانے پر

سارا دل غم کسوا ہوا جا رہا ہے گا۔ خرچ کا تمام تکلیم تھا، مگر میری بیوی اس رشتے کو قبول کرنے میں ذرا ہچکچا رہی تھی۔" میں نے حیرت سے اعجاز صاحب کی طرف دیکھا" مگر کیوں؟" اعجاز صاحب نے نظریں جھکا لیں" دراصل لڑکا کچھ کم صورت تھا، ہماری ثریا کی دودھ جیسی شفاف رنگت کے سامنے تکیم کا گہرا سانولا رنگ اور تیکھے نقوش بہت پھیکے محسوس ہوتے تھے۔" اعجاز صاحب کی بات سن کر مجھے ایک زور کا جھٹکا لگا" ثریا نے تکیم کو دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کیا فیصلہ تھا اس بارے میں۔۔۔" "ثریا کا فیصلہ وہی تھا جو کسی بھی شریف مشرقی گھرانے کی لڑکی کا ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ حق اپنے والدین کو تفویض کر دیا تھا۔ ہاں آخر پر چلتے وقت غور کرنے کے بعد قرعہ تکیم کے نام نکلا اور جاری و ذبحی جاری، رعائی اور آنسوؤں کے دھار میں تکیم کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے بے یقینی سے پہلو بدلا۔" پھر آپ اتنے اداس کیوں ہیں، تکاں کا تو آئندہ خوب صورت ہونا چاہیے کہ بیرونی بدصورتی کی تو عادت پڑ جاتی ہے۔" مجھے لگا میرے سوال میں نے اعجاز صاحب سے نہیں، خود اپنے آپ سے کیا ہے۔ اعجاز صاحب نے لمبی "تھوری آہ بھری۔" ہاں، میری ثریا نے پہلے دن ہی سے ہماری خوشی کے لیے تکیم کو پورے دل سے قبول کر لیا تھا۔ تکیم تو پہلے ہی سے ثریا کے پیار میں دیوانہ تھا، مگر۔۔۔!!" میں نے بے یقینی سے پہلو بدلا "مگر کیا؟" "مگر یہ دنیا والے بھلا سب کسی کو پھلتا پھولتا اور خوش دیکھ سکتے ہیں۔ تکیم اور ثریا جس محفل میں بھی جاتے اور جہاں سے بھی گزرتے، دن کی ہر اڑی کو دیکھ کر لوگ معنی خیز اشارے کرتے، طنزیہ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے، پہلوئے حور میں انگور، جیسے فقرے کسے جاتے۔ تنگ آ کر تکیم نے ثریا کو کہیں لے جانا ہی چھوڑ دیا، مگر لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ تکیم اپنی محرومیوں کا شکوہ ثریا پر اتارنے لگا۔ اس کے کان میں کسی نے یہ بات ڈال دی تھی کہ ضرور ثریا کے کردار میں کوئی کھوٹ یا کمی ہو گی، ورنہ اس جیسی پری چہرہ لڑکی تکیم جیسے کم صورت کو کیسے قبول کر لیتی؟ تکیم کا جنون بڑھتا ہی گیا اور ثریا کی خوب صورتی نے اسے شبہاتی مریض بنا کر رکھ دیا۔ اسے لگتا کہ شہر کا ہر بندہ اپنا تعلق اور اثنا محسوس ہونے لگا۔ ثریا کی ذرا سی بے احتیاطی بھی اسے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ رشتہ سمیٹنے جوڑنے والوں میں کمی آنی چاہیے، پھر چاہے جوڑ معاشی حالات کا ہو یا صورت کا۔ بے جوڑ رشتے کبھی زیادہ دیر چل نہیں پاتے۔ تکیم ثریا پر شک کرنے لگا۔ وہ اس کی ہر بات پر وہ اسے ٹوک کر، کھود تا رہتا اور پھر ایک دن ثریا اس حالت میں گھر جو ہاں آئی کہ اس کا چہرہ اور بدن نیلوں نیل تھا۔ اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔" اعجاز صاحب کی قوت گویائی جواب دینے لگی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا" پھر کیا ہوا؟" "اور پھر ثریا کے آنے کے دو راز بعد تکیم نے طلاق بھجوا دی۔۔۔" میری آواز حلق میں اٹک سی گئی" طلاق۔۔۔" "ہاں، طلاق۔۔۔ تین سال پہلے ہماری ثریا گھر واپس آ گئی تھی۔ بہت صابر بنا کر تھی میری بیٹی، کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس کی ماں نصیاتی دباؤ اور شوگر سمیت کئی بیماریوں کا شکار ہوتی گئی، مگر ثریا ہنستی رہتی۔ اور پھر ایک دن چپ چاپ آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ گئی۔" مجھے یوں لگا، جیسے اعجاز صاحب نے کوئی گند پھری ٹیکہ میرے قلب میں اتار دی ہو۔" کیا۔۔۔ ثریا مر گئی؟" "ہاں۔ آج اس کی تیسری برسی ہے۔" مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا، اعجاز صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

مجھے لگا، وہ میری اپنی کہانی سنا کر چلے گئے تھے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ دنیا میں بس ایک میں ہی ان بدنصیبوں کا بسیرا ہوں، مگر یہاں تو ہر قدم پر ایک "چڑی زاد" کسی نہ کسی روپ اور نئے نام کے ساتھ دھرتا دیئے بیٹھے ملتا ہے۔ اعجاز صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جو ترے بیٹھ جوڑ داؤں کے بھلے گنتے ہیں۔ اچھا ہوا، میں نیلی کی زندگی سے چپ چاپ نکل آیا۔ ہم دونوں ہی خوابی خیالوں کے باسی تھے، نیلی مجھے توڑ کر بھی لیتی تو یہ جگ والے کہیں جینے نہ دیتے۔ یہاں روپ کا بادل صرف روپ ہے، تڑاوے کے ایک پڑاؤ سے میں "سن ہو تو ہر موسم بھاتا ہے" کا اسے متوازن کر سکتا ہے، جب وہ خود بھی حسین ہو۔ ساری رات میرے دل و دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہوتی رہی، جیسے قدرت نے میری کہانی کا انجام کسی دوسرے کی زبانی مجھ تک پہنچا دیا ہو۔ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور۔ پھر خانو کی بکلی بکلی تو تو رو نے مجھے وہاں جگا دیا۔ صبح ہو نکلی تھی، خانو مجھے بتانے آیا تھا کہ "سائیں یونہی کب سے آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہتی ہے، سائیں کا بڑا دم تھا ہے۔ دعا لینے آئی ہے۔" میں نے چند تک کر سائنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں ہی میرے لیے آسمان، زمین، دم، جے گیا اور زمین فلک سے جا ملی۔ میرے سامنے مہندی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاں، میری محبت سازہ۔ وہی قرۃ العین۔۔ مگر اس کی آنکھوں پر یہ پلہ ہمیشہ کیوں لگا ہوا تھا، بھی تک۔ میں نے خانو کو مخاطب کیا کہ وہ لڑکی سے کہے، چشم استبارے، مگر خانو جا چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے ہماری آواز میں کہا۔" تیلی! اپنے چہرے سے اپنے میرے کالے پردہ ہٹا دے۔" میں تمہاری" آنکھوں میں جھانک کر تمہارے دل کی بات سمجھ سکوں۔" مگر وہ ہلی نہ جلی۔ "

کے ساتھ نکل جانے دو.....'' عدنان کی آواز لرز رہی تھی، اس ایک نظر کا اتنا ہی خوف تھا تو پھر آپ نے عینی سے محبت کیوں کی تھی.....؟'' ''نہیں، یہ جھوٹ ہے۔ میں نے محبت نہیں کی۔'' عدنان نے میرے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ ''محبت نہیں کی، تو پھر یہ جو گ، تیاگ کیسا؟ اس کا سامنا کرنے کا خوف کیوں۔ کمالی نے امریکا سے واپسی ہی پر ہمیں سب بتا دیا تھا۔ کاش! آپ مجھ سے یہ بات نہ چھپاتے۔ اور پھر ہر گرہ خود کھلتی گئی۔ آپ نے میری محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کر لیا پری زاد، آخر کیوں؟ ایسا کون کرتا ہے، چھین لیتے اُسے مجھ سے۔ اُس پر سب سے زیادہ حق اس ساری دنیا میں صرف آپ کا تھا۔ آپ نے وہ حق بھی مجھے سونپ دیا۔ صرف اس خوف سے کہ وہ آنکھیں ملنے کے بعد آپ کو قبول نہیں کرے گی۔ آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ وہ زندگی کے اتنے اہم موڑ پر اپنے فیصلے کیسے کرے گی۔ اس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ مان دیا۔ اس کے کتنے بھرم آپ سے بڑے تھے اور آپ اسی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ آئے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ آپ کے بغیر کیسے چل پائے گی؟'' میں نے اپنی سانسیں جمع کیں۔ ''میں اس کی نئی رنگوں سے بھری دنیا کو اپنے وجود کی کالک سے سیاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صرف تم ہی اس کے قابل تھے اور میں نے صرف تمہارے بھروسے اُسے چھوڑا تھا، میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کا ہاتھ مانگتا، تو وہ مجھے دیکھ کر بھی شاید انکار نہ کرتی۔ کیوں کہ اس کی روح میرے اَن گنت احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، لیکن مجھے کسی احسان کا بدلہ نہیں چاہیے تھا عدنان..... میری منزل تو بس ایک نظر تھی۔ اس کی پیار بھری ایک نظر۔'' عدنان نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر آپ کو نظر کی پہچان کا اتنا ہی دعویٰ ہے، تو آج یہ بھرم بھی آزما لیتے ہیں۔ وہ آرہی ہے، دیکھتے ہیں آپ کو دیکھ کر اس کی نظر کیا کہتی ہے۔ آج آپ کے مقدر کی وہ نظر خود فیصلہ کرے گی، جب آپ حسبِ وعدہ آپریشن سے پہلے نیویارک نہیں پہنچے، تو عینی نے اپنی آنکھوں کے آپریشن سے انکار کر دیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ آپ کیوں نہیں آئے۔ میں نے آپ کی قسم دے کر اُس کا آپریشن تو کروا دیا، مگر بینائی ملنے کے بعد بھی اس نے اپنی آنکھوں پر آج تک وہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے۔'' میں چلّا اٹھا، ''مگر کیوں، تم نے تو اس کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔'' تبھی عینی کی آواز میرے قریب سے اُبھری۔ ''وعدے تو آپ نے بھی بہت کیے تھے دوستی نبھانے کے پری زاد..... آپ یہ کیسے بھول گئے کہ میرا آپ سے روح کا رشتہ تھا۔ اور جب روح کے رشتے جُڑ جائیں تو چہرے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آپ کو مجھ پر اتنا بھروسا بھی نہیں تھا۔ بس، اتنا ہی جانتے تھے آپ مجھے۔'' خانو نے صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ میں وہیں زمین پر پڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔ عینی نے وہیں زمین پر دوزانو بیٹھ کر میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میری جلتی روح کسی ٹھنڈے پانی کی آبشار تلے آ گئی۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا، تو مجھے یوں لگا، جیسے ہر داغ، ہر سیاہی دُھلتی چلی گئی ہو۔ میں اس کے چُھوتے ہی کتنا خوب صورت ہو گیا تھا۔ ''پری زاد'' بن گیا تھا۔ عینی نے اپنی آنکھوں سے سیاہ چشمہ اتار لیا، میرے نصیب کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ کسی بھی طنز، حقارت، تمسخر یا نفرت سے مبرّا۔ ایک پیار بھری نظر۔ میرے مقدر کی نظر..... ''وہ میرا سر گود میں لیے بیٹھی روتی رہی۔ اور برستی بارش کی بوندیں، اس کے پاک اور معطّر آنسوؤں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے خود ان آنسوؤں میں مل کر پاک ہوتی رہیں۔ ''میں بھی کتنی بدنصیب ہوں۔ آپ نے سب سے چھپا کر جس محبت کو اپنے مَن میں دبائے رکھا، اس کی خبر میرے سوا باقی سب کو تھی۔ ایک بار صرف ایک بار مجھ سے کہہ کر تو دیکھتے..... تب میں آپ کو بتاتی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں..... اتنا کم زور سمجھ رکھا تھا آپ نے قراۃ العین کو۔''

دُور کھڑے قضا کے فرشتے نے مجھے اشارہ کیا۔ ''انشاء جی اٹھو..... اب کوچ کرو۔'' میں نے چند سانسیں مزید اُدھار مانگیں اور اس مہ وَش کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ ''نہیں عینی..... میں تم پر زندگی کے رنگوں کے دروازے بند نہیں کرنا چاہتا تھا، میرے نہ ہونے سے تمہاری روشن دنیا میں ایسی کون سی کمی ہو جاتی۔ میں تو یوں بھی تمہاری زندگی میں اضافی تھا۔'' اس کے آنسو بارش کی تیز بوندوں کے ساتھ مل کر میرے چہرے کو پاک کرتے رہے۔ ''پہلے میں خود نہیں جانتی تھی پری زاد، مگر آپ سے دُور ہو کر جانا کہ میری ہر کمی آپ ہی سے پوری ہوتی ہے۔ آپ نے خود کبھی کہا نہیں اور مجھے امریکا جا کر پتا چلا کہ آپ اضافی نہیں، لازمی ہیں۔'' میں نے عینی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ہاں..... کبھی نہیں کہہ پایا، مگر آج کہتا ہوں، مجھے تم سے محبت ہے قراۃ العین..... شدید محبت۔'' میری نبض ڈوب رہی تھی، میرے کان میں فضا دھیرے دھیرے سے گنگنائی۔ ''وحشی کو سکوں سے کیا مطلب..... جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا؟'' آس پاس کا سارا شور مجھے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے لوگ آپس میں کیا سرگوشیاں کر رہے تھے؟ بارش تیز تر ہو کر بھی مجھے بھگو نہیں پا رہی تھی۔ اتنی تیز آندھی کے باوجود، جس سے میرا دَم کیوں گھٹ رہا تھا، وہ میرا سر گود میں لیے زار و قطار رو رہی تھی۔ زندگی سمٹ کر ان چند لمحوں میں سمٹ آتی ہے، جب عمر بھر کی ریاضت اور دعائیں رنگ لاتی ہیں۔ آج میری عمر بھر کی تپسیا بھی پوری ہوئی۔ اب بھلا کس کو جینے یا مرنے سے غرض تھی۔ کتنی صدیاں اس ایک پل میں جی لی تھیں میں نے۔ زندگی نے ہر قرض چُکا دیا تھا، میری اضافی اور مانگی ہوئی سانسیں پوری ہونے کو آئیں، تو آس پاس دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی، میری آنکھیں پتھرانے لگیں، کبھی سنا تھا کہ دھڑکن بند ہو بھی جائے تو دماغ کچھ لمحے زیادہ جیتا ہے۔ چاروں طرف ایک عجیب سا شور مچ گیا، جیسے بہت سے لوگ مل کر بین کر رہے ہوں۔ جانے سب رو کیوں رہے تھے، میری پتھرائی آنکھیں تو ابھی تک اُسی نظر پر جمی ہوئی تھیں، جس نے میری تکمیل کر دی تھی۔ خانو دھاڑیں مار مار کر سب سے لپٹ کر میری طرف اشارے کر کے جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ عدنان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اس نے عینی کو تھام رکھا تھا۔ ہاں، اب وہی تو اس کا سہارا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر میرے جسم پر سفید چادر ڈال دی۔ میرا چہرہ واضح رہا۔ مجھے اپنے قدموں کی جانب سے خون کی گردش رُک کر سارے جسم میں جامد ہوتی محسوس ہوئی اور میرے ذہن کے اندھیرے بڑھنے لگے، پھر کسی نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زور سے ''اناللہ وانا الیہ راجعون'' کہہ کر میرے پپوٹے بند کر دیے۔ اور میرا دماغ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو
اُسے آواز دینی ہو، اُسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
مدد کرنی ہو اُس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
بدلتے موسموں کی سیر میں، دل کو لگانا ہو
کسی کو یاد رکھنا ہو، کسی کو بھول جانا ہو
کسی کو موت سے پہلے، کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ، اُس کو جا کے یہ بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں.....

(ختم شد)



ڈائمنڈ اردو بکس

تمام کتب فی سبیل اللہ

ایڈمن ٹیم:

شاہ زر خان + کول فائر

جہاں ملیں آپ کو نایاب کتب نایاب ویب سائٹس سے

Rekhta	ناول + کہانیاں
Scribd	ماہانہ ڈائجسٹ
Slide Share	عمران سیریز
Kitab Ghar	بچوں کی کہانیاں
English Book,s	سکول و کالج بکس
English Novel,s	نوٹس + مواد

اس گروپ میں ایڈمنز 24/7 دستیاب ہوتے ہیں

اور آپ کی ڈیمانڈ پر بروقت کام کیا جاتا ہے

03176699066
SHAHZAR KHAN
TEAM DIAMOND URDU BOOKS

COOL FIRE/WAQAS AHMED
RANA M.AZEEM RIZVI
FAISAL MIRZA

تمام کتب انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے مہیا کی جاتی ہیں جو کتاب پیڈ ہو یا پی ڈی ایف میسر نہ ہو وہ شیئر نہیں کی جاتی

ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس گروپس لنکس

گروپ میں ایڈ ہونے کے لیئے گروپ کے نام یا تصویر پہ کلک کریں

 ڈائمنڈ اردوبکس	 ڈائمنڈ اردوبکس
 ڈی یوبی میڈیا	 کاروانِ شعروادب
 اردوتحاریر کاگلدستہ	 ڈائمنڈ لنکس ورلڈ
 کتابوں پر تبصرے	 حمدونعت آفیشل
 ڈی یوبی ٹیلی گرام 300,000+ books	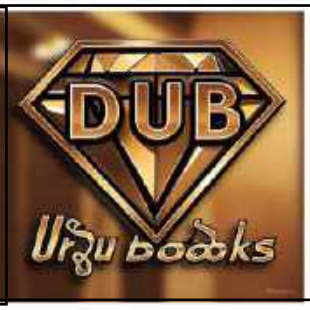 فیس بک گروپ ڈائمنڈ اردوبکس

لنک ری سیٹ ہونے یا کام نہ کرنے کی صورت میں اس نمبر پر رابطہ کریں

شاہ زر خان: 03176699066

DUB

یا اللہ عزوجل　　بسم اللہ الرحمن الرحیم　　یا رسول اللہ ﷺ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معزز اراکینِ ڈائمنڈ اردو بکس !

آپ سب کو ٹیم ڈائمنڈ اردو بکس کے گروپس میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

گروپس کے قواعد و ضوابط :

گروپس میں کسی بھی قسم کی تصاویر ، ویڈیوز ، آڈیوز ، فیس بک/واٹس ایپ لنکس ، یا وائس میسجز شیئر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

کوئی بھی ممبر کسی دوسرے ممبر سے ذاتی رابطہ (بغیر اجازت) نہ کرے۔ شکایت کی صورت میں متعلقہ ممبر کو تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

تمام ممبران اور ایڈمنز کے ساتھ خوش اخلاقی، عزت و وقار اور بہترین تربیت کا مظاہرہ کریں۔

گروپس میں سیاسی ، مذہبی یا کوئی بھی ایسی بحث جس سے انتشار پیدا ہو یا جھگڑے کا خدشہ ہو ، سختی سے منع ہے۔

یہ قواعد سخت ضرور ہیں، لیکن ان کا مقصد گروپ کے نظم و ضبط اور ممبران کی سہولت کو یقینی بنانا ہے۔

انتہائی اہم اعلامیہ

گروپ میں قادیانی، مرزائی، احمدی، مرتد، گستاخِ رسول، گستاخِ صحابہ و اہلِ بیت، گستاخِ اولیاء، دہشت گرد تنظیموں، پاکستان و اسلام مخالف افراد، فوج یا سرکاری اداروں کے خلاف بولنے والوں کا داخلہ سختی سے ممنوع ہے۔ ایسے افراد کی شناخت کی صورت میں انہیں فوری طور پر تمام گروپس سے نکال دیا جائے گا۔

ہم صرف معیاری کتب فراہم کرتے ہیں، تاہم درج ذیل کتب ہماری پالیسی کا حصہ نہیں ہیں:

شیعہ مکتبہ فکر کی کتب , انتشار پھیلانے والی تحریریں , اداروں اور ریاست پاکستان کے خلاف مواد , لادین، ملحد یا فتنہ پرور مصنفین کی کتب

نوٹ :

تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش کر کے فی سبیل اللّٰہ اور بغیر کسی معاوضے کے فراہم کی جاتی ہیں (خود سکین نہیں کرتے)۔ اگر کسی کتاب سے متعلق کاپی رائٹ مسئلہ ہو تو براہِ کرم ایڈمنز سے رابطہ کریں، متعلقہ کتاب گروپ سے حذف کر دی جائے گی۔

رابطہ برائے شمولیت یا گروپ لنک ری سیٹ

سپر ایڈمن شاہ زر خان

+92 317 6699066

ایڈمن وقاص احمد/کول فائر

+44 7716 717193

+994 40 729 52 41